عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

۲۶

- شہریت اور اس سے متعلق بعض مسائل
- غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل
- سماجی مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے
- نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 26

شہریت اور اس سے متعلق بعض مسائل
غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے اہم مسائل
سماجی مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے
نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات وکمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے۔ جزاک اللہ

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی
طبع اول: نومبر 2017ء
تعداد: 500
طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

...........ملنے کے پتے...........

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم اردو بازار کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور و اردو بازار کراچی
مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد
دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کر رہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پا سکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہو کر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کر سکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرما دی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کر دیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار و مقاصد کے مطابق ہو جائے بہر حال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت واخراجات کر کے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱...... اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کر دیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲...... پورے علمی ذخیرے کو از سر نو بڑے سائز میں کمپوز و سیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳...... پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ رنمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴...... ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جا سکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵...... بحمد للہ! اب "سلسلۂ جدید فقہی مباحث" کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

۶...... اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع بنا دیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دار العلوم کراچی پاکستان

''مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کرسکے۔......فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

تقدیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبۂ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہوسکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

"اذا جاء نا امر ليس فيه أمر و لا نهي فما ذا تأمرنا فيه"

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه برای خاص"

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگادی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کردے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہوسکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

"کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔"

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے، تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہوجانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہوجانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہوجاتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگادی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آوازہ بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کرسکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہوکر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کرسکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کرسکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کرکے میں علاج کرسکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کرکے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کردے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ بھیجا تاکہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کرکے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطہ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہوسکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہوسکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہوگیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کرلیں...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کردیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جونئی وبا مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کرلیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ...... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعت نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہوکر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمدللہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل وکرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ لہٰذا چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات وفلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کے پاس ہتھیار، جن کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور وشغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آگئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلویٰ کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کرلے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباع ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کرلی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور تلفیق بین المذاہب کا راستہ اختیار کرلیا...... اتباع ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباع ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوٰتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہوسکتی۔ ان کے نزدیک مدتِ قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدتِ سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا..... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مدنظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مدنظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاہب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہویٰ کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعۃً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہویٰ، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیراور تکراراً عرض کردی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو...... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر نئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ......جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یاکلھن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتادیا:

"تزرعون سبع سنین داباً۔ فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتادیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی...... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کیے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمد للہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور وتوجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

شہریت
اور اس سے متعلق مسائل

شہریت اور اسلامی نقطہ نظر

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ۲۳ویں سمینار مورخہ ۱ تا ۳ر مارچ ۲۰۱۴ء منعقدہ جامعہ علوم القرآن، جمبوسر (گجرات) میں پیش کئے جانے والے علمی و تحقیقی مقالات، مباحثات اور مناقشات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارُالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

پیش لفظ

شہریت اور اسلامی نقطہ نظر

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی یہ وسیع وعریض بستی اپنے تمام بندوں کے لئے بسائی ہے، انسان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوقات نے عملی طور پر اس آفاقیت کو باقی رکھا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک ملک کے شیر کو دوسرے ملک میں جانے کی اجازت نہیں ہو، یا ایک خطہ میں رہنے والی ہرن کو دوسرے خطے میں رہنے کے لئے ویزے کی ضرورت پڑتی ہو، انسان کے بارے میں بھی اسلام کا بنیادی تصور یہی ہے، بقول شاعر:

ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

لیکن انسان کی فطرت میں کچھ ایسی تنگ نظری واقع ہوئی ہے کہ اسے اپنے ہی ہم جنسوں کا وجود گوارہ نہیں، اسی لئے اس نے اس دنیا کو براعظموں، ملکوں اور صوبوں میں تقسیم کردیا ہے اور بہت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں دنیا بٹ گئی ہے، اسی تقسیم کے بطن سے شہریت کا مسئلہ پیدا ہوا ہے، ہر ملک نے اپنی سرحدوں کو باہر کے لوگوں کے لئے بند کر رکھا ہے، سرحد سے باہر جا ہے ایک ہی زبان بولنے والے لوگ، ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے اور ایک ہی مذہب کے ماننے والے ہوں، لیکن انہیں سرحد پار کرنے کی اجازت نہیں اور نہ ان کو سرحد کے اس پار رہنے والوں کے مماثل حقوق واختیارات حاصل ہیں؛ اسی لئے شہریت کے مسئلہ نے اس دور میں بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے اور اس سے بہت سے حقوق اور ذمہ داریاں متعلق ہوگئی ہیں۔

حقوق وفرائض کی تعیین میں عدل واعتدال ضروری ہے اور اسلام نے جس نظام حیات کا تصور پیش کیا ہے، اس میں بنیادی طور پر اس پہلو کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اسی پس منظر میں اکیڈمی کے ۲۳ویں فقہی سمینار منعقدہ جمبوسر (گجرات) بتاریخ ۲۸-۲۹ر ربیع الثانی و یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱-۳ر مارچ ۲۰۱۴ء میں اس بین الاقوامی مسئلہ کو شامل کیا گیا، عام طور پر ہمارے روایتی علماء کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے تقاضوں سے نابلد اور عالمی حالات ومسائل سے بے خبر ہیں، لیکن اس سمینار میں علماء اور ارباب افتاء نے جو گراں قدر مقالات لکھے، جس فکری گہرائی کے ساتھ مسائل پر غور کیا، حالات پر احکام شریعت کو منطبق کیا اور شریعت کی اصل روح ''قیام عدل'' کو اخذ واستنباط کی بنیاد بنایا، وہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کافی ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اس مسئلہ پر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کے اعتبار سے رہنما ثابت ہوگا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے محب عزیز مولانا احمد نادر القاسمی رفیق شعبہ علمی کو کہ انہوں نے دقت نظر کے ساتھ اس مجلہ کی پروف ریڈینگ کی ہے اور اس کے اکثر حصہ کی ایڈیٹنگ کا بھی فریضہ انجام دیا ہے، جبکہ کچھ صفحات کی ایڈیٹنگ شعبہ علمی کے ایک اور رفیق ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی نے کی ہے، دعا ہے کہ یہ مجموعہ عند اللہ وعند الناس مقبول ہو، ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

۲ر ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ — خالد سیف اللہ رحمانی

۲۳ر جنوری ۲۰۱۵ء — (جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

☆☆☆

پہلا باب تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ:

شہریت سے متعلق مسائل

۱۔ اسلام ایک دین اور مسلمان ایک امت ہیں، اسلام مسلمانوں کو ایک وحدت سے جوڑتا ہے اور ان کو ایک جسم وجان کا درجہ دیتا ہے، اس لحاظ سے اسلام کا اصل مزاج یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہوں، کلمہ کی بنیاد پر ایک امت ہیں، اور ان کے درمیان کسی تفریق وامتیاز کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی جانبدارانہ سلوک کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۲۔ البتہ عہد جدید میں مغرب کے اثرات سے موجودہ نظام شہریت نے جو حد بندیاں قائم کی ہیں اور جغرافیائی بنیادوں پر انسانوں میں تقسیمات کی گئی ہیں نیز ہر ملک کے شہری کو ایک الگ قوم تصور کیا جاتا ہے، افسوس کہ اس کے اثرات امت مسلمہ پر بھی پڑے ہیں، مختلف ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کو قومِ واحد کی بجائے مختلف قوموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان کی آزادانہ نقل وحرکت اور قیام وسکونت میں مشکلات پیدا ہوگئی ہیں، گویہ نظام، اسلام کے آفاقی نظریۂ وحدت سے ہم آہنگ نہیں ہے، لیکن موجودہ بین الاقوامی احوال اور علاقائی مصالح واسباب کے تحت ملکوں میں شہریت کا جو نظام رائج ہے، موجودہ حالات میں اس کو قبول کرنے کی گنجائش ہے۔

۳۔ مسلم یا غیر مسلم ملک کا مسلمان کسی مسلم ملک میں شہریت کا خواہش مند ہو اور اس کے اپنے ملک میں دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کو سخت خطرہ درپیش ہو تو اس مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا لازم ہوگا۔

۴۔ کسی ملک کے مسلمان مجبور ہو کر دوسرے مسلم ملک میں پناہ گزیں ہو جائیں تو ایسے ملک کا فریضہ ہے کہ وہ ان پناہ گزینوں کو تمام شہری حقوق عطا کرے۔

۵۔ کسی مسلمان کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی درج ذیل صورتیں ہیں:

(الف) ایسا غیر مسلم ملک جہاں دین وایمان جان ومال اور نسل کے تحفظ کو خطرہ ہو وہاں کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ اس قسم کے خطرات نہ ہوں تو جائز ہے۔

(ب) کسی ملک کی غیر اسلامی تہذیب وتمدن سے متاثر ہو کر وہاں کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

(ج) محض معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے مسلم ملک کے کسی شہر کا غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا ناپسندیدہ ہے۔

(د) معاشی مجبوریوں طبی ضرورتوں، اور تعلیمی مقاصد کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت کا حصول جائز ہے۔

(ھ) دعوتی اغراض کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا مستحب ہے۔

☆☆☆

سوالنامہ:

شہریت سے متعلق بعض مسائل

گزشتہ ادوار میں کسی ملک میں بسنے کے لئے قانونی طور پر شہریت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، جب عالم اسلام ایک جھنڈے کے نیچے تھا تب تو یہ صورت حال تھی، جب مختلف مسلم مملکتیں موجود میں آگئیں، اس وقت بھی یہی صورت حال باقی رہی، غیر مسلم حضرات بھی مسلم ممالک میں اسی طرح آباد ہوسکتے تھے؛ البتہ جب ایک ملک میں بسنے والا وقتی ضرورت اور عارضی قیام کے لئے دوسرے ملک میں جاتا تو اسے امان حاصل کرنی پڑتی اور تجارتی مقاصد کے تحت جاتا تو ٹیکس ادا کرنا ہوتا؛ لیکن موجودہ دور میں قومی عصبیتوں اور علاقہ و وطن کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم کے مغربی تصور کے تحت ایک ملک کا رہنے والا یونہی نہ تو دوسرے ملک میں داخل ہوسکتا ہے اور نہ وہاں آباد ہوسکتا ہے، یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اس معاملہ میں مغربی ملکوں سے زیادہ دل ونگاہ کی تنگی مسلم ملکوں میں پائی جاتی ہے۔

دوسری طرف عصر حاضر میں معاشی مقاصد، سیاسی حالات، تہذیبی مماثلت اور موسم کی موافقت وعدم موافقت کی وجہ سے نقل آبادی کا سلسلہ جاری ہے، اس پس منظر میں یہ مسئلہ جسے حق شہریت حاصل کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اب یہ بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اقوام متحدہ نے اس سلسلہ میں کئی اہم فیصلے کئے ہیں۔

اس پس منظر میں شرعی نقطۂ سے چند سوالات آپ کی تحقیق وتوجہ کے طالب ہیں:

(۱) اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے: کسی ملک میں بود و باش اختیار کر لینے کو، وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینے کو، ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام کو، یا کسی اور بات کو؟

(۲) اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً ضروری ہوگا یا نہیں؟

(۳) بعض دفعہ کسی خاص خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں اور وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں تو انھیں پناہ گزیں کا درجہ دیا جاتا ہے؛ لیکن انھیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا یہ بات شرعاً درست ہے؟ کیا یہ بات جائز مانی جاسکتی ہے کہ مسلمان تارکین وطن کو دوسرے مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں نہیں دی جائیں؟

(۴) اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے کیا حقوق مانے جائیں گے؟ جیسے: ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں اُمیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمد ورفت کا حق، وغیرہ۔

(۵) شریعتِ اسلامی میں پناہ گزینوں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے، نیز کون سے حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے اور ان کو حاصل نہیں ہوں گے؟

(۶) کیا کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی؟

(۷) کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

شہریت کا مسئلہ

ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی[1]

بنی نوع انسان شروع زمانہ سے ہی نقل مکانی کرتا آرہا ہے، اور تب ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ آباد ہوجانا آسان تھا، لیکن اب سرحدی حدبندیوں نے نقل مکانی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں، نقل مکانی کرکے کسی دوسری جگہ مستقل سکونت اختیار کرنا روز بروز مشکل ہوتا جارہا ہے، موجودہ زمانہ کی جنگی صورتحال، معاشی ناہمواری اور مختلف قوموں کے درمیان ذہنی انتشار نے اس راہ میں مزید مشکلات پیدا کردی ہیں، اس کے نتیجہ میں کسی ملک کی شہریت کے حصول میں طرح طرح کے مسائل سامنے آنے لگے ہیں، خاص طور پر پناہ گزینوں کے تعلق سے نئی پیچیدگیاں سامنے آرہی ہیں، یہ ایک اہم اور حساس مسئلہ بنتا جارہا ہے، اس لئے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اس کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ۲۳ویں فقہی سمینار (منعقدہ ۱۔۳ مارچ ۲۰۱۴ء جمبوسر گجرات) کا موضوع بحث بنایا ہے، اس موضوع پر ملکی اور بیرون ملک علماء کے اب تک ۳۲؍مقالے اکیڈمی کو موصول ہوچکے ہیں، جن کی تلخیص ذیل میں پیش کی جارہی ہے، تاکہ ہر ایک کی آراء سے استفادہ آسان ہوسکے۔

اکیڈمی نے اس موضوع سے متعلق سات سوالات علماء کی خدمت میں ارسال کئے تھے جن میں سے پہلا سوال تھا:

سوال نمبر: (۱) اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟

شہریت کا موضوع ہونے کی وجہ سے بعض حضرات نے لفظ شہریت کے معنی ومطالب پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور اس لفظ کو موجودہ دور کی اصطلاح قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہریت (Citizenship) کا ترجمہ ہے اور قومیت (Nationality) اسی کا وسیع تر مفہوم ہے، جس کا معنی ہے: کسی بھی ملک میں قانونی طور سے رہنے کا حق پانا، یعنی فرد اور ملک کے درمیان رابطہ وتعلق کا نام شہریت ہے، جس کا تعین ملکی آئین وقانون کرتا ہے اور اس آئین وقانون کے مطابق اس شہری کو حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس پر ملک کے تعلق سے ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں (دائرۃ المعارف البریطانیہ، آکسفورڈ ڈکشنری) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد توقیر بدر القاسمی، مولانا نثار احمد حصیر القاسمی وغیرہ)۔

جبکہ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کا کہنا ہے کہ شہریت اپنے جدید مفاہیم کے ساتھ معاصر دور کی پیداوار تو ہے، لیکن اس کے ابتدائی خدوخال سے اسلام کی تاریخ ناآشنا نہیں ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ میثاق مدینہ کی بعض دفعات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جس اجتماعیت کی بنیاد رکھی تھی اس میں مختلف اہل مذاہب شریک تھے، شہر کی حفاظت ان سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی، شہر پر حملہ ہو یا اس معاہدہ میں شامل فریقوں میں سے کسی فریق پر حملہ ہو تو اس کی مدد اور شہر کا مقابلہ تمام فریقوں پر لازم تھا۔ غور کیا جائے تو شہریت کے موجودہ تصور کی بنیاد میں یہی بات شامل ہے۔

اس شہریت کی بعض حضرات نے دو قسمیں کی ہیں: پیدائشی شہریت اور اکتسابی یا اختیاری شہریت۔

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا احمد نور عینی قاسمی کے بقول پیدائشی شہریت سے مراد کسی ملک میں پیدائش کی بنیاد پر بچہ کو ملنے والی شہریت ہے، لیکن مولانا احمد نور عینی قاسمی نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے اس کی دو شقیں بیان کی ہیں: ایک یہ کہ بچہ کی جائے پیدائش کا اعتبار کیا جائے گا، خواہ اس کے والدین کہیں اور کے رہنے والے ہوں، جیسا کہ ارجنٹینا میں قانونی طور پر اس کا اعتبار کیا جاتا ہے، اگر ارجنٹینا کے رہنے والے والدین کے بچے کی پیدائش کسی اور ملک میں ہوئی تو وہ بچہ ارجنٹینا کا شہری نہیں سمجھا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ بچہ کی پیدائش میں والدین کی شہریت کا اعتبار کیا جاتا ہے، والدین جس ملک کے باشندہ ہیں بچہ کو اسی ملک کا شہری سمجھا جائے گا، خواہ اس کی پیدائش کہیں پر بھی ہو، جیسا کہ جرمنی، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ کا قانون ہے، لیکن بعض ممالک ایسے

[1] رفیق شعبہ علمی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

ہیں کہ ان کے یہاں دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں یعنی ان کے ملک کے والدین کے بچے کی پیدائش کہیں پر بھی ہو وہ والدین کے ملک کے شہری کہلائیں گے، اور اگر غیر ملکی والدین کے بچے کی پیدائش اس ملک میں ہوئی ہے تو وہ بھی والدین کے ملک کے بجائے اپنے پیدائشی ملک کے شہری کہلائیں گے، جیسا کہ امریکہ، برطانیہ، فرانس وغیرہ میں یہ قانون ہے۔

اکتسابی یا اختیاری شہریت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص پیدائشی طور پر کسی ملک کا شہری ہے، لیکن وہ کسی دوسرے ملک کا شہری بننا چاہتا ہے، یعنی اس کے حصول میں سعی وارادہ کا دخل ہو، اس شہریت کے حصول کے دو طریقوں کا ذکر مولانا اختر امام عادل قاسمی نے کیا ہے:

۱۔ اس ملک میں شادی کرلی جائے۔

۲۔ حکومت سے شہریت کے حصول کی درخواست کی جائے۔

جبکہ مولانا احمد نور عینی قاسمی نے مزید چار طریقوں کا اضافہ کیا ہے:

۱۔ زمین خریدنا۔

۲۔ سرکاری ملازمت اختیار کرنا۔

۳۔ لمبے عرصے تک قیام کرنا۔

۴۔ غیر ملکی والدین کے بچوں کو بالغ ہونے کے بعد شہریت کا اختیار حاصل ہونا۔

لیکن مولانا اختر امام عادل صاحب نے یہ بھی تفصیل کی ہے کہ کبھی ایسا ہوگا کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے، جیسے کہ اگر کوئی ہندوستانی برطانیہ کی شہریت حاصل کرلے تو اس کی ہندوستانی شہریت منسوخ ہوجائے گی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے، جیسے کہ اگر کوئی پاکستانی برطانیہ کی شہریت حاصل کرلے تو اسے دونوں جگہوں کی شہریت برقرار رکھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کی رائے ہے کہ شہریت کے لئے قریب ترین لفظ وطن ہے، جیسا کہ قرآن نے ''ومساکن ترضونها'' (توبہ: ۲۴) کو اوطان کے معنی میں استعمال کیا ہے، اسی طرح استدلال میں ''المسلم مواطنا فی أوربا'' کی یہ عبارت بھی پیش کرتے ہیں: كلمة الوطن في اللغة تشير إلى الأرض التي يقيم عليها الإنسان وهو محل الإنسان (ص ۲۴)۔

اور مولانا نثار احمد حصیر قاسمی کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں شہریت وطنیت کے ہم معنی ہے، جبکہ مولانا محمد فخر عالم نعمانی کا کہنا ہے کہ شہریت کی اصطلاح وطنیت سے قریب تو ہے، لیکن مفہوم میں بڑا فرق ہے، شہریت جنسیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جب کہ وطنیت کے لفظ میں بہت توسع ہے، وقتی رہائش گاہ کے لئے بھی وطن کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے، مگر دونوں میں فرق کرنے کے لئے مستقل قیام گاہوں کو وطن اصلی یا وطن قرار کہا جاتا ہے، اور عارضی قیام گاہوں کو وطن اقامت، وطن سکونت یا وطن مستعار کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس معنی میں آج شہریت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ اصطلاح صرف وطن اصلی یا وطن قرار میں پائی جاتی ہے، اس کی تفصیل مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اپنے مقالہ میں پیش کی ہے۔

اسلام میں حصول شہریت کی بنیادیں: ...... اکثر مقالہ نگار حضرات نے پیدائش، رشتہ ازدواج اور مستقلاً بود وباش اختیار کر لینے کو شہریت کے حصول کی بنیاد قرار دیا ہے، اور اسے وطن اصلی سے مشابہ یا قائم مقام قرار دے کر مندرجہ ذیل عبارتوں کو اپنا مستدل بنایا ہے:

آیات:

۱۔ ''ومن آياته خلق السموات والأرض واختلاف ألسنتكم وألوانكم إن في ذلك لآيات للعالمين'' (الروم: ۲۲) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۲۔ ''ولا تكونوا كالتي نقضت غزلها من بعد قوة أنكاثا تتخذون أيمانكم دخلا بينكم أن تكون أمة هي أربى

من أمة إنما يبلوكم الله به وليبينن لكم يوم القيامة ما كنتم فيه تختلفون'' (النحل: ۹۲) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۳۔ ''يا أيها الناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم'' (الحجرات: ۱۳) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۴۔ ''يأيها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالاً كثيراً ونساء'' (النساء: ۱) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۵۔ ''والذين آووا ونصروا أولئك هم المؤمنون حقا'' (انفال: ۷۴) (مقالہ مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی)۔

۶۔ ''ولقد بوأنا بنى إسرائيل مبوأ صدق'' (یونس: ۹۳) (مقالہ مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی)۔

عبارات:

۱۔ ''الوطن الأصلى هو موطن ولادته أو تأهله أى تزوجه، قال فى شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به، فقيل: لا يصير مقيما، وقيل: يصير مقيما، وهو الأوجه، ولو كان له أهل ببلدتين فأيتهما دخلها صار مقيما، أو توطنه، أى عزم على القرار فيه وعدم الارتحال، وإن لم يتأهل'' (رد المحتار ۱:۵۸۶) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ریحان مبشر قاسمی)۔

۲۔ ''الأوطان ثلاثة: وطن أصلى وهو مولد الإنسان، وموضع تأهل به، أو من قصد التعيش به لا الارتحال، ولو تزوج المسافر فى بلد لم ينو الإقامة فيه، قيل: يصير متيما، وقيل: لا'' (فتح القدير ۲:۴۱) (مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۳۔ ''الوطن الأصلى هو مولد الرجل والبلد الذى هو فيه'' (التعريفات للجرجانى ۲۲۷) (مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۴۔ ''من تأهل ببلدة فهو من أهلها'' (شرح السير الكبير ۱:۱۰۷) (مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ریحان مبشر قاسمی)۔

۵۔ ''الأوطان ثلاثة: وطن أصلى وهو وطن الإنسان فى بلدته أو بلدة أخرى اتخذها داراً وتوطن بها مع أهله وولده وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها، وطن الإقامة وهو أن يقصد الإنسان أن يمكث فى موضوع صالح للإقامة خمسة عشر يوماً أو أكثر، ووطن السكنى وهو أن يقصد الإنسان المقام فى غير بلدته أقل من خمسة عشر يوما'' (بدائع الصنائع ۱:۲۸۰) (مقالہ مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

۶۔ ''والوطن فى الثانية هو المسافر بقرية فيها أهله وولده، فأقام عندهم ولو صلاة واحدة أتم... ومن كتاب ابن المواز: وإذا لم تكن مسكنه، ولكنه نكح بها فلا يتم حتى يبنى بأهله ويلزمه السكنى'' (مواهب الجليل بشرح مختصر خليل للحطاب ۲:۵۰۰) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۷۔ ''وطن أصلى وهو مولد الرجل والبلد الذى تأهل به'' (المحيط البرهانى فى الفقه النعمانى ۲:۲۵) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی)۔

۸۔ ''هو الذى ولد فيه أو تزوج أو لم يتزوج وقصد التعيش فيه لا الارتحال عنه'' (الفقه الاسلامى وادلته ۲:۴۲۳) (مقالہ مفتی اشرف عباس قاسمی)۔

۹۔ ''الأول الوطن وهو ما اتخذ فيه الإقامة بنية التأبيد'' (شرح مختصر خليل للخرشى ۵:۸۸) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

بعض مقالہ نگاروں نے اس میں کچھ اضافے بھی کئے ہیں اور مختلف رجحانات کا اظہار کیا ہے، جیسا کہ مولانا ریحان مبشر مئوی قاسمی نے بعض ممالک کے

تعلق سے زمین کی خریداری، سرکاری ملازمت کا حصول، معاشی سرگرمی انجام دینے اور ملک کے انضمام کو بھی شہریت کے حصول کی بنیاد قرار دیا ہے، لیکن آگے کہتے ہیں کہ اول الذکر تینوں اصولوں کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بنیاد نہیں بنایا جاسکتا کہ یہ ٹھوس معیار یا مسلّم اصول نہیں ہیں اور انہیں اختیار کرنے میں بہت سارے مسائل سامنے آسکتے ہیں۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید انور اعظمی اور مولانا محمد شاہجہاں ندوی وغیرہ نے ایمان وعقیدہ اور وحدت دین کو بھی شہریت اور وطنیت کی بنیاد قرار دیا ہے، مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض'' (التوبہ: ۷۱)۔

۲۔ ''إن الأرض لله يورثها من يشاء من عباده'' (الاعراف: ۱۲۸)۔

۳۔ ''يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا الكافرين أولياء من دون المؤمنين أتريدون أن تجعلوا لله عليكم سلطاناً مبيناً'' (النساء: ۱۴۴)۔

۴۔ ''إنما المؤمنون إخوة'' (الحجرات: ۱۰) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے والے صحابہ کرام مدینہ منورہ کے شہری ایمان کی بنیاد پر قرار پائے۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اس کے مستدلات میں درج ذیل دو حدیثوں کا اضافہ کیا ہے:

۱۔ ''المسلمون كرجل واحد إن اشتكى عينه اشتكى كله وإن اشتكى رأسه اشتكى كله'' (صحيح مسلم، باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم، حدیث نمبر: ۶۷۵۴)۔

۲۔ ''إنما مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم كالجسد إذا اشتكى منه شيئاً تداعى له سائر الجسد'' (مسند الشهاب القضاعي، حدیث نمبر: ۱۳۶۷)۔

☆ مفتی محمد ابوبکر قاسمی نے مورث کی شہریت کو بھی وارث کے لئے اس ملک کی شہریت کے حصول کی بنیاد قرار دیا ہے۔

☆ مولانا محمد توقیر بدر قاسمی اور مفتی سعید اسعد قاسمی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان اپنے معاشی نظام کو بہتر بنانے کے لئے کسی ملک میں مستقل سکونت اختیار کرلے تو اسے شہریت کے حصول کی بنیاد مانا جائے گا۔

☆ مولانا محمد مصطفی قاسمی کے مطابق معاشی سرگرمیاں انجام دینے اور ایک مخصوص مدت تک قیام کرنے کو بھی شہریت کے حصول کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

☆ قاری ظفر الاسلام صدیقی نے اکیڈمی کے ۱۷ ویں سمینار کی دو تجاویز کو شہریت کی بنیاد بنانے کی بات کہی ہے، جو درج ذیل ہے:

۱۔ جائے ملازمت وتجارت میں طویل اقامت کے ساتھ ذاتی مکان بھی بنالینا دائمی قیام کی نیت پر دلالت کرتا ہے، اس لئے مذکورہ جگہ وطن اصلی شمار کی جائے گی۔

۲۔ جائے ملازمت وتجارت میں ذاتی مکان تو نہیں بنایا، بلکہ کرایہ کے مکان یا ادارہ وکمپنی کے فراہم کردہ مکان میں اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت سے رہائش پذیر ہے تو اس جگہ کو وطن اصلی کا حکم حاصل ہوگا۔

واضح ہو کہ ان دونوں قراردادوں میں اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت کو جنسیت کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

لیکن مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی اور مفتی محمد جعفر ملی رحمانی کی رائے ہے کہ تجارتی ومعاشی مقاصد کے تحت محدود ومخصوص مدت تک قیام یا کسی اور مقصد سے عارضی قیام کو شہریت کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا ہے، ان حضرات نے درج ذیل عبارتوں کو اپنا مستدل قرار دیا ہے:

۱۔ ''وطن الإقامة: موضع ينوي أن يستقر فيه خمسة عشر يوما أو أكثر من غير أن يتخذه مسكنا'' (التعریفات ۳۲۷)

۲۔ ''لو انتقل من البلد الذي تأهل به بأهله وتوطن ببلدة أخرى لا تبقى البلدة المنتقل عنها وطنا له، ألا ترى أن مكة كانت وطنا أصلياً لرسول الله ﷺ ثم هاجر منها إلى المدينة بأهله وتوطن ثمة انتقض وطنه بمكة حتى قال عليه

السلام عام حجة الوداع: أتمّوا صلاتكم يا أهل مكة، فإنا قوم سفر'' (كفاية شرح هدايه ۲/۱۷)۔

۳۔ ''ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به فقيل: لا يصير مقيما، وقيل: يصير مقيما وهو الأوجه'' (رد المحتار ۲/۱۳۱)۔

۴۔ ''وإن قال الميمنة غدا على أهل المصيصة فكان رجل من أهل الكوفة سكن المصيصة، فإن كان اتخذها منزلا فهو من المصيصة، لقوله ﷺ: ''من تأهل ببلدة فهو من أهلها''، ولأن من يكون ساكنا فى بلدة مقيما بها يعد فى الناس من أهلها، ألا ترى أنا إذا عددنا فقهاء الكوفة ذكرنا فى جملتهم النخعى والشعبى وأبا حنيفة رضى الله عنهم وهم ما كانوا من الكوفة فى الأصل ولكنهم سكنوها'' (شرح كتاب السير الكبير ۱/۱۷۰)۔

جبکہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور ایک حد تک مولانا ریحان مبشر قاسمی کا رجحان یہ ہے کہ اگر مصلحت متقاضی ہو اور مسلمانوں کے مفادات متاثر نہ ہوتے ہوں تو ایک مخصوص مدت کے قیام کے بعد شہریت دے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، مستدلات درج ذیل ہیں:

۱۔ ''تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة'' (الاشباه ۱/۳۲۸)۔

۲۔ ''والأصل أن الحربي إذا دخل دار الإسلام بأمان، ينبغي للإمام أن يتقدم إليه، فيضرب له مدة معلومة على حسب ما يقتضى رأيه، ويقول له: إن جاوزت المدة جعلتك من أهل الذمة، فقد رضى بصيرورته ذميا'' (بدائع الصنائع ۷/۱۱۰)۔

☆ مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی محمد سلمان منصور پوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور مولانا محمد قمر الزماں ندوی وغیرہ نے شہریت کے حصول کے لئے ملک کی حکومت کی اجازت، اس کی مصلحت اور اس کے قوانین وضوابط کو بنیاد بنایا ہے، لیکن مولانا عبید اللہ ندوی نے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے کہ یہ اصول وضابطے اور قوانین خلاف شرع نہ ہوں، نیز کسی حرام کے ارتکاب پر مبنی نہ ہوں، اور بقول مفتی ثناء الہدی قاسمی حکومت کی اجازت کے بغیر وہاں داخل ہونا یا وہاں بود وباش اختیار کرنا شرعا ممنوع ہوگا۔ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے کسی ملک میں بود وباش اختیار کر لینے کو شہریت کے حصول کی بنیاد بنانے کے لئے حکومت سے اجازت لینے کی قید لگائی ہے، اور اس سلسلہ میں بعض احادیث سے استدلال کیا ہے، مثلاً:

۱۔ ایک اعرابی نے مدینہ ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''ويحك إن شأن الهجرة شديد، فهل لك من إبل؟ قال: نعم، قال: فهل تؤدى صدقتها؟ قال: نعم، قال: فاعمل من وراء البحار، فإن الله لم يترك من عمل لك شيئاً'' (بخاری ۲/۹۱۱، کتاب الادب)۔

۲۔ بخاری کی حدیث میں غزوہ طائف کے بیان میں ایک مخنث کا ذکر آیا ہے جس کا نام ''ھیت'' تھا، اس نے عبد اللہ بن ابی امیہ کے سامنے نازیبا انداز گفتگو اپنایا، جس پر حضور ﷺ نے اس کی تنبیہ کی، علامہ قسطلانی کے حوالہ سے محشی لکھتے ہیں: ''ثم أجلاه من المدينة إلى الحمى، فلما ولي عمر بن الخطاب قيل له: إنه قد ضعف وكبر، فاحتاج فأذن له أن يدخل كل جمعة فيسأل الناس ويرد إلى مكانه'' (حاشیہ بخاری ۲/۶۱۹، کتاب المغازی)۔

۳۔ صاحب ''عمدۃ القاری'' نے حضرت ابوموسیٰ کے حوالہ سے دور صدیقی وفاروقی میں اس طرح کے پیش آنے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''نفى أبو بكر ماتعاً إلى فدك، وليس بها أحد يومئذ من المسلمين، وأخرج عمر فلاناً وفلاناً'' (عمدة القاری ۹/۳۲)۔

☆ مولانا رحمت اللہ ندوی کے نزدیک شہریت کی بنیاد کوئی ایک متعین شئ نہیں ہے، بلکہ مختلف چیزوں میں سے کسی کو بھی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، اور اس سلسلہ میں جس ملک کی جو پالیسی یا قانون حکومت ہو اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

دوہری شہریت:

مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا محمد فخر عالم نعمانی کی رائے میں ایک شخص دوہری شہریت بھی حاصل کرسکتا ہے، مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو شہریت کے حصول کے مستقل بنیادوں میں سے کوئی ایک بنیاد (مثلاً رشتہ ازدواج) حاصل ہوگئی، یعنی پہلے سے اس کے اہل وعیال کسی ملک میں ہوں اور اس نے کسی دوسرے ملک میں شادی کرلی تو اسے دونوں جگہوں کی شہریت حاصل ہوجائے گی اور دونوں جگہوں کی حیثیت اس کے لئے وطن اصلی کی ہوگی، استدلال کے طور پر یہ عبارت پیش کی ہے:

''وإن كان له أهل ببلدة فاستحدث بلدة أخرى أهلاً فكل واحد منهما وطن أصلي وروى أنه كان لعثمان رضى الله عنه أهل بمكة وأهل بمدينة، وكان يتم الصلاة بهما جميعا'' (المحيط البرهاني ۲.۳۶)۔

غیر مسلم کی شہریت:

بعض مقالہ نگاروں نے غیر مسلم کی شہریت کے تعلق سے بھی بحث کی ہے، اور اس سلسلہ میں ولاء اور عقد ذمہ کو بنیاد بنایا ہے، اور ''وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه'' (سورۂ توبہ:۶۰) کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

☆ مولانا احمد نور عینی قاسمی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں حصول شہریت کی اصل دو بنیادیں ہیں: غیر مسلموں کے لئے عقد ذمہ اور مسلمانوں کے لئے ہجرت، اگر کوئی شخص ہجرت کر کے دارالاسلام آجائے تو وہ پورے دارالاسلام کا شہری ہوگا، اور اگر شہریت کا طالب کوئی غیر مسلم ہے تو اسے مسلم مملکت کا شہری بننے کے لئے عقد ذمہ کرنا پڑے گا، البتہ مولانا موصوف نے ایک قید یہ لگائی ہے کہ اگر کوئی شخص دارالاسلام میں آتا ہے یا کوئی مسلمان دارالاسلام سے باہر کہیں سکونت اختیار کرلیتا ہے تو ایسے شخص کو مملکت کو حرج وضرر سے بچانے کے لئے اپنا رجسٹریشن کرانے کا پابند بنایا جاسکتا ہے۔

☆ مولانا محمد قمر الزماں ندوی عقد ذمہ کے ساتھ ساتھ معاہدہ ولاء کو بھی اسلامی مملکت کی شہریت کے حصول کے لئے بنیاد قرار دیتے ہیں، اور استدلال میں میثاق مدینہ کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہریت کی یہ اساس عقیدہ کی اساس کے علاوہ تھی جو اختلاف عقیدہ کے باوجود انہیں اسلامی ریاست کا فرد شمار کرتی تھی، اور نبی کریم ﷺ کا یہ قول: ''لهم ما للمسلمين وعليهم ما عليهم'' (ابن حبان) اس سلسلہ میں قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا احمد نور عینی قاسمی وغیرہ نے ذمی کی شہریت کے تعلق سے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم وقتی قیام کی غرض سے یا مستامن کی حیثیت سے دارالاسلام میں داخل ہوکر طویل مدت تک قیام کرے یا مستقل قیام کا ارادہ کرلے، یا کسی متوطن سے رشتہ ازدواج قائم کرلے، یا کوئی خراجی زمین خریدلے تو اسے شہریت حاصل ہوجائے گی اور ذمی، یعنی اسلامی ریاست کا غیر مسلم شہری قرار پائے گا۔

عارضی قیام کی مدت:

بعض حضرات نے عارضی قیام کی مدت پر بھی بات کی ہے، اور کم از کم مدت ایک سال قرار دیا ہے، بعض حضرات نے اس مدت کو حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن مولانا رحمت اللہ ندوی کہتے ہیں کہ یہ عارضی مدت ایک ہفتہ کی بھی ہوسکتی ہے، اور طویل مدت ایک سال یا اس سے زائد ہوسکتی ہے۔ ''إذا دخل الحربي إلينا مستأمنا لم يمكّن أن يقيم في دارنا سنة، ويقول له الإمام: إن أقمت تمام السنة وضعت عليك الجزية ... وللإمام أن يوقت في ذلك ما دون السنة كالشهر والشهرين'' (ہدایہ ثانی/۵۸۵)۔

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے مدت کی تعیین میں افراد کے اعتبار سے فرق کیا ہے، ان کا رجحان یہ ہے کہ غیر مسلم مستامن کے لئے شہریت کے حصول کے لئے ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ ایک سال کی ہوگی، لیکن اگر کوئی ایسا غیر مسلم جو کسی میدان میں اختصاص رکھتا ہو، اور مستقبل میں اس سے ضرر کا اندیشہ نہ ہو اور ملک کو اس کی خدمات کی اشد ضرورت ہو تو کسی مدت کے بغیر ہی اسے شہریت دی جاسکتی ہے، اپنی رائے کی تائید میں والیٔ مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کا وہ واقعہ پیش کیا ہے کہ جب آپ کو قسطنطنیہ کے مشہور عیسائی طبیب اتوشیوس راسطیوس کے فضل وکمال کی شہرت کا پتہ چلا تو اسے اپنے پاس بلا کر اپنے ساتھ رکھ لیا، ''فلازمه وكان لا يكاد يفارقه'' (دیکھئے: معارف، جلد ۶۶، ماہ نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۴۳)۔

مفتی محمد اقبال ٹنکاروی اور مولانا عبید اللہ ندوی وغیرہ نے ۴ سال یا ۱۰ سال سے زائد کی مدت کو بہتر قرار دیا ہے، اور محدثین کے اس اصول سے استدلال کیا ہے

کہ راوی کو کسی شہر کی طرف منسوب کرنے کے لئے اس کے قیام کی مدت اس شہر میں کتنی ہونی چاہئے؟ ''کم المدة التي إن أقامها الشخص في بلد نسب إليها؟ أربع سنين، وهو قول عبد الله بن المبارك'' (تيسير مصطلح الحديث، باب۲۰، ص۲۲۲)، بعض محدثین کے یہاں اس سے کم مدت بھی ہے (دیکھئے: الباعث الحثیث، باب معرفة أوطان الرواة وبلدانهم)۔

موجودہ نظام شہریت:

متعدد حضرات نے موجودہ نظام شہریت کے ضمن میں دار الحرب، دار الاسلام اور دار المعاہدہ وغیرہ کی بحث کی ہے، اور مختلف حوالے درج کئے ہیں، اسی ضمن میں مولانا رحمت اللہ ندوی نے لکھا ہے کہ ملکوں کی تقسیم دار الحرب اور دار الاسلام کے اعتبار سے کرنا آج کل محل نظر ہے، اس پر سب سے تفصیلی بحث مولانا احمد نور عینی قاسمی نے کی ہے، جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> اسلامی تعلیمات میں شہریت کے بنیادی تصور (یعنی کسی مملکت کا مستقل باشندہ بننا اور مملکتوں کے اختلاف سے حقوق وفرائض کا مختلف ہونا) کو تسلیم کیا گیا ہے؛ لیکن چونکہ مروجہ نظام شہریت کی رو سے دار الاسلام کی شہریت کا تعدد لازم آتا ہے، ہر مسلم مملکت کی علاحدہ شہریت ہے اور شہریت کا یہ تعدد حقوق وفرائض کے سلسلہ میں مسلمانوں کو اجنبی اور شہری کے خانوں میں تقسیم کرتا ہے اس لئے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک جدید مسئلہ ہے، اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے شہریت کے سلسلہ میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے؛ تاکہ دائرۂ بحث کی تحدید ہو جائے:

☆ شہریت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ دار الاسلام اور دار الحرب کی الگ الگ شہریتیں تسلیم کی جائیں اور دار الحرب کی مختلف مملکتوں کی شہریتوں کو مستقل الگ شہریت کا درجہ دیا جائے، فقہ اسلامی میں اس کی صراحت موجود ہے، بلہذا یہ دائرۂ بحث سے خارج ہے۔

☆ شہریت سے اگر مراد کسی مملکت (دار) کا مستقل باشندہ بننا ہو تو اس کا بھی واضح تصور فقہ اسلامی میں موجود ہے، اس لئے اس پر بحث کرنا بے سود ہے۔

☆ شریعت میں چوں کہ بہ غرض تعارف علاقہ وقبائل کی طرف نسبت کرنا جائز ہے؛ اس لئے شہریت کا یہ پہلو کہ علاقے کی طرف نسبت کر کے مصری شہری یا فلسطینی شہری کہا جائے، کسی بحث کا محتاج نہیں ہے۔

☆ مسلمانوں کے سلسلہ میں اصل تو یہی ہے کہ مسلمان دار الاسلام کے جس حصے کو چاہیں اپنا مسکن بنائیں؛ لیکن موجودہ دور کے پیچیدہ نظام حکومت میں اس اصل پر مطلقاً عمل کرنے میں کاروبار سلطنت حرج اور ضرر سے دوچار ہو سکتا ہے، اس لئے ''الحرج مدفوع'' اور ''الضرر يزال'' جیسے فقہی قواعد کی رو سے نو واردین اور مہاجرین کو رجسٹریشن کا پابند بنایا جا سکتا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں اصل یہی ہے کہ ان کی درخواست قبول کر لی جائے؛ البتہ کسی شرعی مانع اور معقول عذر کی وجہ سے ان کی درخواست رد کی جا سکتی ہے۔

☆ وہ مباح امور جن کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں شریعت خاموش ہو اور ان کے جائز ہونے کی صراحت شرع میں وارد نہ ہوئی ہو، ایسے امر کے بارے میں مسلم مملکتوں کے حکمراں باہمی رضامندی سے ''الأصل في الأشياء الإباحة'' اور ''المسلمون على شروطهم'' (ترمذی: حدیث نمبر ۱۳۵۲) کی رو سے شہریت سے متعلق قانون سازی کر سکتے ہیں۔

☆ مذکورہ بالا باتیں اس قدر واضح ہیں کہ ان پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے؛ لیکن قومیت کو قوانین شہریت کا مدار بنانا، دار الاسلام کو کسی مرکز کے تابع کرنے کے بجائے ہر مملکت کو مستقل مملکت کی حیثیت دینا، مسلمانوں کے حقوق وفرائض کا جغرافیائی سرحدوں تک سمٹ آنا، علاقہ وملک کی بنیاد پر مسلمانوں کے حقوق وفرائض تقسیم کرنا، ان کو ملکی وغیر ملکی شہری واجنبی اور مستقل باشندہ و پناہ گزیں کے خانوں میں بانٹنا، حصول شہریت کے طریقہ کار اور فسخ شہریت کے اسباب کے سلسلہ میں وضعی قوانین نافذ کرنا...... مروجہ نظام شہریت سے متعلق یہ وہ امور ہیں جو بحث وتحقیق کے متقاضی ہیں اور ان ہی امور کی وجہ سے شہریت کا مروجہ نظام ایک جدید مسئلہ بن گیا ہے، اس مسئلہ کی تکییف شرعی کی بابت دونوں طرح کے نقاط نظر ہیں، ایک جواز کا نقطۂ نظر اور دوسرا عدم جواز کا، ان دونوں نقاط نظر کے دلائل حسب ذیل ہیں:

جواز کے دلائل:

۱۔ **ولاء الموالاۃ:** اس ولاء کی تعریف "موسوعہ فقہیہ" میں یوں مذکور ہے:

"هو أن يعاهد شخص شخصا آخر على أنه إن جنى فعليه أرشه، وإن مات فميراثه له" (ولاء: ۴۵،۱۲۸)۔

حنفیہ نے اس کی توضیح یوں کی ہے: "تفسير ولاء الموالاة أن يسلم الرجل على يدى رجل فيقول للذى أسلم على يديه أو لغيره: واليتك على أني إن مت فميراثي لك، وإن جنيت فعقلي عليك وعلى عاقلتك، وقبل الآخر منه. فهذا هو نفس ولاء الموالاة" (المحيط البرهاني ۴،۱۸۷)۔

ولاء الموالاۃ کی مذکورہ بالا تعریف وتوضیح سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اس کے ذریعہ موالات کرنے والے (المولی الأسفل) اور جس کے ساتھ موالات کی گئی (المولی الاعلی) دونوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور دونوں پر فرائض عائد ہوتے ہیں؛ لہٰذا جس طرح اس ولاء کے ذریعہ کسی دوسرے نسب اور خاندان کے فرد سے حقوق وفرائض متعلق ہوتے ہیں، جو ولاء الموالاۃ نہ کرنے والے سے متعلق نہیں ہوتے اسی طرح مملکت بھی ایک بڑا قومی خاندان ہے اور اگر کوئی شخص شہریت حاصل کرے تو اس سے وہ حقوق وفرائض متعلق ہوتے ہیں جو شہریت حاصل نہ کرنے والوں سے متعلق نہیں ہوتے؛ لہٰذا جب ولاء الموالاۃ شرعاً جائز ہے تو عقد شہریت بھی شرعاً جائز ہوگا۔

۲۔ "عن أبي الدرداء قال: قال رسول الله ﷺ: ما أحل الله فى كتابه فهو حلال وما حرم فهو حرام وما سكت منه فهو عفو. فاقبلوا من الله عافيته، فإن الله لم يكن لينسى شيئاً. ثم تلا: "وما كان ربك نسياً" رواه البزار والطبراني فى الكبير وإسناده حسن ورجاله موثقون" (مجمع الزوائد: كتاب العلم ۱،۴۱۶)۔

اس حدیث میں یہ واضح حکم ہے جن چیزوں کی حلت وحرمت مذکور نہ ہو؛ بلکہ وہ مباح درج کی ہوں تو وہ جواز کے دائرے میں رہیں گی، موجودہ نظام شہریت کا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے، اس لئے اسے اختیار کرنا شرعاً جائز ہوگا۔

۳۔ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: "الأصل فى الأشياء الإباحة" اس قاعدہ کی رو سے فقہاء نے بے شمار مسائل کو مباح ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، موجودہ نظام شہریت بھی اسی اصل کی رو سے مباح ہے؛ لہٰذا حاکموں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اسے قانون کی شکل میں نافذ کر سکیں، اس کی نظیر تدوین دواوین کا نظام ہے، جو "الأصل فى الأشياء الإباحة" کے تحت مباح تھا، حضرت عمرؓ نے اس کو باضابطہ مملکت کے ایک نظام کی شکل دی۔

۴۔ موجودہ نظام شہریت کا تعلق ایک طرح سے بین الاقوامی قانون ومعاہدہ سے ہے اور معاہدہ کی پابندی شرعاً ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"يا أيها الذين آمنوا أوفوا بالعقود" (المائدہ: ۱) (اے ایمان والو! اپنے عقود ومعاہدے پورے کرو)۔

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً. والمسلمون على شروطهم إلا شرطاً حلالاً أو أحل حراماً۔ قال أبوعيسى: هذا حديث حسن صحيح" (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۵۲)۔

لہٰذا بین الاقوامی معاہدے کی وجہ سے مسلم مملکتوں میں مروجہ شہریت کے نظام کو اپنانا اسلامی مزاج کے عین مطابق ہے۔

۵۔ بالفرض اگر موجودہ نظام شہریت کو اصلاً ناجائز مان بھی لیا جائے تو بھی شہریت کا حصول ایک مجبوری بن گئی ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر کوئی بھی شخص کسی دوسری مملکت کا باشندہ نہیں بن سکتا، اس لئے "الضرورات تبيح المحظورات" قاعدے کے تحت شہریت کا یہ نظام جواز کے دائرہ میں آجائے گا۔

عدم جواز کے دلائل:

۱۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمداً عبده ورسوله، وأن يستقبلوا قبلتنا ويأكلوا ذبيحتنا وأن يصلوا صلاتنا. فإذا فعلوا ذلك حرمت علينا دماؤهم وأموالهم إلا بحقها، لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين .. قال أبوعيسى: هذا حديث حسن صحيح غريب من هذا

الوجہ'' (ترمذی حدیث نمبر: ۲۶۰۸)۔

اس حدیث میں مسلمانوں کو حقوق حاصل ہونے اور ان پر فرائض عائد ہونے کی بنیاد اسلام کو بنایا گیا ہے اور جنس و وطن اور علاقہ و ملک سے قطع نظر تمام مسلمانوں کو حقوق و فرائض کے سلسلہ میں یکساں درجہ دیا گیا ہے۔

وہ قبائل جو مملکت مدینہ کی حدود میں داخل نہیں تھے؛ بلکہ بعد میں مملکت مدینہ کے ساتھ الحاق کر لیا تھا ان کو بھی آپ ﷺ نے یہی بتایا کہ ان میں سے جو لوگ ایمان قبول کر لیں ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور ان پر وہی فرائض عائد ہوں گے جو ہم پر عائد ہیں؛ مثلاً آپ ﷺ نے شاہان حمیر کے قاصد کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا کہ:

''إنه من أسلم من يهودی أو نصرانی فإنه من المؤمنين، له ما لهم وعليه ما عليهم'' (سیرت ابن ہشام ۲،۵۸۸)۔

اور عمرو بن حزمؓ کو یمن روانہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: ''من أسلم من يهودی أو نصرانی إسلاماً خالصاً من نفسه ودان بدين الإسلام، فإنه من المؤمنين، له مثل ما لهم وعليه مثل ما عليهم'' (سیرت ابن ہشام ۲، ۵۹۴)۔

اسی طرح قبیلۂ غفار کے نام آپ ﷺ نے یہ نامہ مبارک رقم فرمایا: ''... أنهم من المسلمين، لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين'' (طبقات ابن سعد، ذکر بعثت الرسول)۔

یہی بات حضرت سلمان فارسیؓ نے مملکت فارس کے معرکہ آراؤں سے کہی تھی:

''فإن أسلمتم فلكم مثل الذی لنا وعليكم مثل الذی علينا'' (ترمذی، کتاب السیر، حدیث نمبر: ۱۵۴۸)۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی یہ حدیث اس بات کی مزید وضاحت کرتی ہے کہ اگر مملکت فارس کی فارسی قوم بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائے تو انہیں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو عرب کی قوم کو حاصل ہیں اور اس پر بھی وہی فرائض عائد ہوں گے جو عربوں پر عائد ہیں؛ کیونکہ حقوق و فرائض کی بنیاد اسلام ہے؛ نہ کہ نسل و ملک، مگر موجودہ نظام شہریت میں حقوق و فرائض کی بنیاد ملک و مملکت ہے نہ کہ اسلام، یہی وجہ ہے کہ ایک مسلم مملکت کے باشندے کو دوسری مسلم مملکت میں اجنبیوں کے درجہ میں رکھا جاتا ہے، اسی لئے موجودہ نظام شہریت اپنے وضعی اصولوں کے ساتھ شرعاً نا قابل قبول ہے۔

۲۔ مسلم ملک کا کسی دوسرے ملک کے مسلمان کو شہریت دینا:

اکثر مقالہ نگار حضرات نے شہریت کی درخواست کو قبول کرنا مسلم ملک پر شرعاً واجب اور ضروری قرار دیا ہے، اگر وہ مسلمان کسی مجبوری خصوصاً ایمان و اسلام کی حفاظت کی وجہ سے اس مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے، جیسا کہ آیات و احادیث سے واضح ہوتا ہے:

۱۔ ''إنما المؤمنون إخوة'' (الحجرات: ۱۰)۔

۲۔ ''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض'' (التوبہ: ۷۱)۔

۳۔ ''وإن استنصروكم فی الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعملون بصير'' (انفال: ۷۲)۔

۴۔ ''قال رسول الله ﷺ: انصر أخاك ظالماً أو مظلوماً، فقال رجل: يا رسول الله! أنصره إذا كان مظلوماً أفرأيت إذا كان ظالماً كيف أنصره؟ قال: تحجزه أو تمنعه من الظلم فإن ذلك نصره'' (بخاری ۲،۱۰۲۸)۔

مگر بعض حضرات نے اس سلسلہ میں قیود اور شرطیں لگائی ہیں، مثلاً:

☆ مولانا احمد نور عینی قاسمی کا کہنا ہے کہ شہریت کی درخواست کو قبول کرنا اگر اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں یا مسلم ملک کی مصلحت کے خلاف ہو تو پھر اس کی درخواست رد کی جا سکتی ہے، موصوف نے مثال میں اس واقعہ کو پیش کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو بعض انتظامی مصلحتوں کی وجہ سے مدینہ سے باہر منتقل کر دیا تھا، کیونکہ ان کا مدینہ میں رہنا بعض پہلوؤں سے مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں تھا۔

☆ مولانا سعید اسعد قاسمی یہ شرط لگاتے ہیں کہ شرعی وسائل اور رقبہ میں اس کے آباد کرنے کی گنجائش موجود ہو۔

☆ مولانا زبیر احمد قاسمی نے یہ شرط لگائی کہ درخواست کو قبول کرنے میں اس مسلم ملک کو کوئی ضرر شدید لاحق نہ ہو۔

☆ مفتی اشرف عباس قاسمی کی رائے ہے کہ اگر کسی معاہدے کی خلاف ورزی ہو رہی ہو تو درخواست قبول نہ ہوگی، کیونکہ معاہدوں پر قائم رہنا اور وعدوں کا ایفاء کرنا بھی اسلامی مملکت کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے، اور مثال میں حضرت ابوجندلؓ اور حضرت ابوبصیرؓ کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔

لیکن مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اس معاہدہ سے خواتین کو الگ رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ پوری مدت معاہدہ میں کسی کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی گئی، لیکن ہجرت کرکے آنے والی خواتین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس نہیں فرمایا، اس لئے کہ معاہدہ کی رو سے حضرت ام کلثوم بنت عقبہ یا سبیعہ بنت حارث اسلمیہ کی واپسی کا مسئلہ اٹھا تو اس پر ''يا أيها الذين آمنوا إذا جائكم المؤمنات مهاجرات. . .'' (سورۂ ممتحنہ: ۱۰) والی آیت اتری اور مدینہ آنے والی خواتین کو اس معاہدہ سے مستثنیٰ کیا گیا، چنانچہ مولانا موصوف بھی اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کے معاہدوں کا اطلاق خواتین پر نہیں ہونا چاہئے۔

جبکہ مولانا محمد فخر عالم نعمانی ایسے معاہدہ کو کالعدم قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر اسلامی ریاست غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے معاملہ میں کوئی معاہدہ کرے جس کی رو سے دوسرے ملکوں کے مہاجرین کو اسلامی حکومتیں اپنے یہاں مستقل سکونت نہ دے سکتی ہوں تو یہ شرط حنفیہ کے نزدیک باطل ہے اور اس طرح کے کسی معاہدہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے (فتاوی ہندیہ ۲/۱۹۷)۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ وہ مسلمان فساد اور بغاوت کا مزاج نہ رکھتا ہو۔

☆ مولانا زبیر احمد قاسمی اور مفتی عبداللہ کاوی والا کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مسلمان صرف خواہش کی بنیاد پر شہریت اختیار کرنا چاہے تو مسلم ملک پر اس درخواست کو قبول کرنا ضروری نہ ہوگا، حکومت کو اختیار ہوگا چاہے تو قبول کرے اور چاہے تو رد کردے۔ لیکن مولانا محمد توقیر بدر قاسمی اور مفتی سعید اسعد قاسمی کا رجحان یہ ہے کہ اگر وہ مسلمان علم دوست ہے، دینی مزاج رکھتا ہے، اور اس کے اس ملک میں آنے سے مسلمانوں کا بھلا ہوگا تو ایسے شخص کی درخواست قبول کی جانی چاہئے، بلکہ بقول مولانا محمد توقیر بدر قاسمی ایسی صورت میں واجب اور ضروری ہے، اور استدلال میں قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے: ''ولا تطرد الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه ما عليك من حسابهم من شئ وما من حسابك عليهم من شئ فتطردهم فتكون من الظالمين'' (الانعام: ۵۲)۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی کی رائے ہے کہ مجبوری اگر ایسی ہے کہ اس سے دین یا جان یا عزت وآبرو یا مال کو شدید خطرہ لاحق ہو تو ایسی صورت میں شہریت کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً فرض ہوگا، اور دلیل کے طور پر یہ آیات پیش کی ہیں:

۱۔ ''إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض والذين آمنوا ولم يهاجروا مالكم من ولايتهم من شئ حتى يهاجروا وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر'' (الانفال: ۷۲)۔

۲۔ ''والذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك هم المؤمنون حقا لهم مغفرة ورزق كريم'' (الانفال: ۷۴)۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی اور مولانا عبیداللہ ندوی نے مجبوری یا خواہش کے بجائے مطلق ہجرت کرکے دار الاسلام میں آنے والوں کے لئے توسع کا رکھا ہے، اور قرآن کی اس آیت کو دلیل بنایا ہے:

۱۔ ''إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي أنفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين في الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئك مأواهم جهنم وساءت مصيرا'' (النساء: ۹۷) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۲۔ ''يا أيها الذين آمنوا إذا جائتكم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن الله أعلم بإيمانهن فإن علمتموهن مؤمنات فلا ترجعوهن إلى الكفار'' (الممتحنہ: ۱۰) (مقالہ مولانا محمد فخر عالم نعمانی)۔

۳۔ ''لا تثریب علیکم الیوم...'' (معارف القرآن ۵،۲۰۹) (مقالہ مولانا محمد مصطفی قاسمی)۔

☆ مولانا عبید اللہ ندوی نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا استثناء کیا ہے، اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ وہاں شہریت دیئے جانے سے تعداد میں کافی اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے حج وعمرہ کی ادائیگی میں دشواری ہوگی۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، اور مولانا ریحان مبشر قاسمی اگر کوئی مسلمان مجبوری کے بجائے صرف اپنی خواہش کی بنیاد پر کسی مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا واجب وضروری کے بجائے صرف مستحب ہوگا۔ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کی ہے: ''المسلم أخو المسلم لا یظلمه ولا یسلمه، من کان فی حاجة أخیه، کان الله عزوجل فی حاجته'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۲، مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰)۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی نے صرف دینی وشرعی مجبوری کی وجہ سے درخواست کو قبول کرنے کو واجب قرار دیا ہے، اور دلیل کے طور پر یہ آیت ذکر کی ہے: ''وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر إلا علی قوم بینکم وبینهم میثاق والله بما تعملون بصیر'' (انفال: ۷۲)۔

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی وغیرہ نے درخواست دینے والے مسلمان کے سلسلہ میں مسلم ملک اور غیر مسلم ملک کا باشندہ ہونے میں فرق کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اگر وہ کسی مسلم ملک کا باشندہ ہے اور وہاں اسے کوئی مجبوری نہیں ہے، صرف ایک قلبی تمنا وخواہش ہے کہ کسی دوسرے ملک میں آباد ہو تو ایسے مسلمان کی درخواست کو قبول کرنا دوسرے مسلم ملک پر ضروری نہ ہونا چاہئے؛ کیونکہ یہاں بھی وہ کسی مسلمان حاکم کی ولایت میں ہے اور یہاں وہ تمام دینی امور اچھی طرح ادا کرسکتا ہے۔

ہاں! اگر مجبوری ہے، مسلم حکومت ہونے کے باوجود کچھ دینی امور، دینی تعلیم اور بنیادی مذہبی وشہری حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، پھر بھی یہ مسلمان اس ملک میں رہ کر جدوجہد کرے اور بنیادی حقوق کے حصول کے لئے کوشاں رہے، تو امید ہے کہ ماحول سازگار ہوگا، سعی وکاوشیں بارآور ہوں گی۔

پھر بھی اگر یہ لوگ کسی دوسرے مسلم ملک میں مجبوری کی وجہ سے شہریت لینا چاہتے ہیں تو ان کو حق شہریت دینے کے بجائے یہ صورت زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے مسلم ممالک اس مسلم ملک پر دباؤ بنائیں جو اپنے مسلم شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھے ہوئے ہے۔ کیوں کہ شہریت طلب کرنے والے کو شہریت دے دینا یہ کوئی حل معلوم نہیں ہوتا، اہل حکومت مسلمان ہیں؛ لہذا انہیں کسی کا آلۂ کار نہ بننے پر سمجھایا جائے، اور رعایا کے حقوق سمجھائے جائیں؛ تاکہ وہ لوگ جو کسی مجبوری کی وجہ سے کسی طرح دوسرے ملک کی شہریت لینے کے خواہش مند ہونے کے باوجود شہریت نہیں لے سکتے انہیں بھی فائدہ ہو۔

ہاں! اگر کسی مسلمان ملک کا حاکم یا برسر اقتدار جماعت کسی فرقۂ ضالہ کی ہمنوا ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا بیجا ہو کہ وہ کسی مسلمان کو ان کے بنیادی حقوق، دینی امور کی ادائیگی اور بنیادی دینی تعلیم کا حق دے تو ایسے مسلمان کو حق شہریت طلب کرنے پر اخوت ایمانی، بھائی چارگی، غیرت وحمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے دوسرے ملک کو شہریت دینی چاہئے۔ کیونکہ اس مسلمان پر اب مسلم ملک میں زمین تنگ کردی گئی ہے؛ حالانکہ اللہ پاک کی پیدا کردہ زمین میں وسعت ہے تو اب دوسرا مسلم ملک اس وسعت میں اپنے اس مسلم بھائی کو آباد کرے۔

اور اگر وہ کسی کافر ملک میں آباد ہے اور اب کسی مسلم ملک میں شہریت لینا چاہتا ہے تو اگر اس مسلمان کو کافر ملک میں پریشانی نہیں ہے اور حالات بھی سازگار ہیں، لوگوں کو عبادات وغیرہ کی اجازت ہے اور وہ مسلمان اس کافر ملک سے مسلمان ملک میں آباد ہونا چاہے تو بھی اس کو حق شہریت دینا بہتر معلوم ہوتا ہے، جیسے مہاجرین حبشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں حبشہ ہجرت کرکے آباد ہوئے تھے اور وہاں کے بادشاہ کی طرف سے کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں تھی، وہ صحابہ کرام وہیں رہے۔ حضرت جعفرؓ فرماتے ہیں:

''لما نزلنا أرض الحبشة جاورنا خیر جار وأمنا علی دیننا، عبدنا الله تعالی لا نؤذی ونسمع شیئاً نکرهه'' (السیرۃ الحلبیه: باب الهجرۃ الثانیة إلی الحبشه ۲،۳۰)۔

فتح خیبر کے بعد مہاجرین حبشہ میں سے حضرت جعفر بن ابوطالبؓ کو آپ نے حبشہ واپس نہیں لوٹایا، بلکہ ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ ''السیرۃ الحلبیہ'' میں ہے:

"وقدم عليه ﷺ بعد فتح خيبر جعفر بن أبي طالب رضي الله عنه من أرض الحبشة ومعه الأشعريون... ولما أقبل عليه ﷺ جعفر رضي الله عنه قام ﷺ إلى جعفر وقبله بين عينيه" (غزوہ خیبر ۲،۷۵۶)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت جعفرؓ عیسائی مملکت حبشہ میں ایک طویل مدت تک مقیم رہے، بلکہ ہجرت نبوی ﷺ کے بعد بھی کئی سال تک مقیم رہے، اسی لئے ان کی آمد پر آپ ﷺ بہت خوش ہوئے، کیوں کہ لمبی مدت کے بعد ملاقات بھی ہو رہی تھی، "ما أدري أنا بقدوم جعفر أسر أو بفتح خيبر"، حضرت جعفرؓ کی یہ آمد سن ہجری ۷ ھ میں ہوئی، اس کے بعد وہ حبشہ نہیں گئے، اور ۹ ھ میں موتہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔

اور اگر وہ ایسے کافر ملک سے آیا ہے جہاں مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھایا جارہا ہے، عبادات پر پابندیاں اور شعائر کی بے حرمتی ہو رہی ہے، تو ایسے لوگوں کو مسلمان ملک میں شہریت دینا لازم ہونا چاہئے، جیسے کئی صحابہ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی اور انہیں ہمیشہ کے لئے وہاں اقامت مل گئی، اسی طرح کئی دیگر شہروں اور ملکوں سے صحابہ اسلام میں داخل ہوئے اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ شہریت کی درخواست کو قبول کرنا مسلم ملک پر ضروری نہ ہوگا، یہ رائے مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی محمد سلمان منصور پوری وغیرہ کی ہے، البتہ مفتی محمد سلمان منصور پوری اور مفتی ثناء الہدی قاسمی وغیرہ کہتے ہیں کہ اگر درخواست دہندہ کے حالات متقاضی ہوں تو اسلامی اخوت کی بنیاد پر شہریت دی جانی چاہئے۔ "يجب أن يعلم بأن الأمان كما يجوز مرسلاً يجوز معلقا بالشرط" (فتاوی تاتارخانیہ ۷،٦٧)۔

☆ مولانا نثار احمد حصیر قاسمی کی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مجبوری کی وجہ سے شہریت کے حصول کی درخواست دیتا ہے تو اس درخواست کو قبول کرنا اس ملک پر صرف اخلاقی ذمہ داری ہوگی، اگر جان ومال، عزت وآبرو اور دین ومذہب خطرے میں ہو تو اس وقت اس کی درخواست قبول کرنا لازم وضروری ہوگا۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی کا رجحان یہ ہے کہ اگر دنیاوی مجبوری ہے تو درخواست کو قبول کرنا ضرور واجب نہ ہوگا، اور اگر دینی مجبوری ہو تبھی اس درخواست کو قبول کرنا مسلم ملک پر واجب ہوگا۔

☆ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی دینی یا دنیاوی ضرورت کے بغیر صرف خواہش کے تحت دوسرے ملک کی منتقلی چاہتا ہے تو ایسی درخواست کو قبول کرنے کا فیصلہ ارباب ملک ملکی مفاد کے پیش نظر کرنے میں خود مختار ہوں گے۔

۳۔ پناہ گزینوں کو شہریت اور ملک کے قدیم باشندوں کی طرح جملہ حقوق دیئے جانے کا مسئلہ:

اس سلسلہ میں اکثر مقالہ نگاروں کا رجحان یہ ہے کہ ظلم وزیادتی یا خانہ جنگی کی وجہ سے وطن چھوڑنے والے مسلمان پناہ گزینوں کو پناہ دینے والے مسلم ملک پر شرعاً یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ ان مہاجرین کو شہریت بھی دے اور وہ حقوق وسہولتیں بھی دے جو وہاں کے باشندوں کو حاصل ہیں، ان میں سے اکثر حضرات نے دلیل کے طور پر ہجرت مدینہ کو مثال میں پیش کیا ہے، اور مندرجہ ذیل آیات واحادیث سے بھی استدلال کیا ہے:

آیات:

۱۔ "إنما المؤمنون إخوة" (حجرات: ۱۰) (مقالہ مفتی عبد اللہ کاوی والا، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد اقبال ٹنکاروی)۔

۲۔ "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (توبہ: ۷۱) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی)۔

۳۔ "إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض والذين آمنوا ولم يهاجروا مالكم من ولايتهم من شئ حتى يهاجروا وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعملون بصير" (الانفال: ۷۲) (مقالہ مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۴۔ "ومن يهاجر في سبيل الله يجد في الأرض مراغماً كثيراً وسعة" (النساء: ۱۰۰) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۵۔ ''وما لكم لا تقاتلون فی سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها واجعل لنا من لدنك ولياً واجعل لنا من لدنك نصيراً'' (النساء: ۷۵) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبید اللہ ندوی)۔

۶۔ ''والذين هاجروا فی الله من بعد ما ظلموا لنبوئنهم فی الدنيا حسنة ولأجر الآخرة أكبر لو كانوا يعلمون'' (نحل: ۴۱) (مقالہ مولانا عبید اللہ ندوی)۔

احادیث:

۱۔ ''قال رسول الله ﷺ: انصر أخاك ظالماً أو مظلوماً'' (بخاری ۱۰۹۲۸/۲) (مقالہ مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی)

۲۔ ''قال رسول الله ﷺ: الخلق عيال الله فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله'' (مشکوۃ ۴۲۵/۲) (مقالہ مولانا محمد مصطفی قاسمی)۔

۳۔ ''المؤمن للمؤمن كالبنيان يشدّ بعضه بعضا'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۲۶) (مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۴۔ ''المسلم أخو المسلم لايظلمه ولا يسلمه ومن كان فی حاجة أخيه كان الله فی حاجته ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۶۲) (مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۵۔ ''قال رسول الله ﷺ: مثل المؤمنين فی توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل الجسد، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۵) (مقالہ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی)۔

۶۔ ''كونوا عباد الله إخواناً المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يكذبه ولا يحقره'' (مسلم، حدیث نمبر: ۶۷۰۶)۔

۷۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے امیر لشکر کو حکم دیا: ''ثم ادعهم إلى التحول من دارهم إلى دار المهاجرين، وأعلمهم إن فعلوا ذلك أن لهم ما للمهاجرين، وأن عليهم ما على المهاجرين'' (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۳۱) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۸۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے: ''دعا النبی ﷺ الأنصار أن يقطع لهم البحرين، قالوا: لا، إلا أن تقطع لإخواننا من المهاجرين مثلها'' (بخاری، حدیث نمبر: ۳۱۶۳) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۹۔ ''قال النبی ﷺ ألا من ظلم معاهداً أو انتقص حقه أو كلّفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئاً بغير طيب نفس منه. فأنا حجيجه يوم القيامة'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۲) (مقالہ مفتی محمد سلمان منصور پوری)۔

عبارات:

۱۔ ''امرأة مسلمة سبيت بالمشرق وجب على أهل المغرب تخليصها من الأسر ما لم تدخل دار الحرب؛ لأن دار الإسلام كمكان واحد'' (فتاوی بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶،۳۰۸) (مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۲۔ ''القاعدة العامة فی حقوق أهل الذمة: أن لهم ما لنا وعليهم ما علينا، وهذه القاعدة جرت على لسان فقهاء الحنفية وتدل عليها عبارات فقهاء المالكية والشافعية والحنابلة'' (بدائع الصنائع ۶،۱۱۱) (مقالہ مفتی محمد سلمان منصور پوری)۔

۳۔ ''ويؤيدها بعض الآثار عن السلف: فقد روى عن على بن أبي طالب أنه قال: إنما قبلوا الجزية لتكون أموالهم

كأموالنا ودماؤهم كدمائنا'' (الموسوعة الفقهيه ۷،۱۲۷) (مقالہ مفتی محمد سلمان منصور پوری)۔

☆ مفتی سعید اسعد قاسمی اور مولانا محمد توقیر بدر قاسمی کا کہنا ہے کہ پناہ گزیں کا اگر اس ملک میں مستقل ٹھہرنے کا ارادہ ہے تب تو اس ملک پر شہریت دینا لازم ہوگا، لیکن اگر اس کا اپنے ملک لوٹ جانے کا ارادہ ہو تو لوٹتے وقت تک اس کی دادرسی ایک دینی فریضہ سمجھ کر کی جائے گی، حدیث میں ہے:

''قال رسول الله ﷺ: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه'' (بخاری ۲،۸۸۹)، اسی طرح علامہ جصاص رازی احکام القرآن میں لکھتے ہیں: ''وليس يمتنع أن يكون نفي الولاية مقتضيا للأمرين جميعا من نفي التوارث والنصرة، ثم نسخ نفي الميراث بإيجاب التوارث بالأرحام مهاجراً كان أو غير مهاجر وإسقاطه بالهجرة فحسب، ونسخ نفي إيجاب النصرة بقوله تعالى: ''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض'' (احکام القرآن ۳،۹۸)۔

☆ مفتی عبد اللہ کاوی والا، مفتی محمد شاہجہاں ندوی اور مولانا محمد ابوبکر قاسمی نے مظلوم مسلم پناہ گزینوں کو شہریت سے محروم رکھنا اور ان کے قدیم باشندوں کے درمیان تفریق روا رکھنے کو سراسر ظلم وعدوان قرار دیا ہے، مولانا شاہجہاں ندوی مزید لکھتے ہیں کہ اگر صورتحال یہ ہو کہ دار الکفر کے مسلمان اسلام کے جرم میں ستائے جا رہے ہوں تو ان کو ظلم سے بچانے کے لئے ان کی مدد کرنا فرض ہے، اور معاہد قوم سے جنگ نہ کرنے کا جواز اس وقت ہے جبکہ تارکین وطن مسلمانوں کو مسلم ملک اپنا شہری بنانے کے لئے تیار ہو، بصورت دیگر عہد توڑ کر ظالم کی سرکوبی لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''والذين تبوؤا الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجر إليهم ولا يجدون في صدورهم حاجة مما أوتوا ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة، ومن يوق شحّ نفسه فأولئك هم المفلحون'' (الحشر: ۹)۔

☆ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کے بقول اسلامی اخوت ایسی مصیبت کے موقع پر ان کی باعزت امداد ونصرت کو لازمی قرار دیتی ہے۔ اگر انہیں باعزت شہری کا درجہ دے کر ملک کی آبادی میں شامل کر لیا جائے تو یہ پناہ گزیں ملک کی معیشت اور قوت میں اضافہ کا ذریعہ بنیں گے۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی نے اس سوال کے جواب کی تفصیل کرتے ہوئے دو نمونے پیش کئے ہیں، ایک حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر میں قیام کو نمونہ بنایا ہے، اور دوسرا ہجرت حبشہ کے واقعہ کو نمونہ بنایا ہے، پہلے نمونہ کا خلاصہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مظالم کے باوجود کسی مسلم ملک میں پناہ لینے کے لئے ترک وطن نہیں کرنا چاہئے؛ بلکہ وہیں کے عوام اور حکام حکومت کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ رہنا چاہئے، جبکہ دوسرے نمونہ کا خلاصہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مظالم سے تنگ آ کر کسی دوسرے مسلم ملک کی طرف ترک وطن کر کے پناہ لینا شرعاً جائز ہے، اگر وہ حکومت ان کو اپنا شہری تسلیم کر کے شہریت دیدے تو بہت بہتر ہے۔

☆ مولانا احمد نور عینی قاسمی کی رائے ہے کہ پناہ گزینوں اور شہریوں کے درمیان امتیازی سلوک کرنا شرعاً روا نہیں ہے، البتہ پناہ گزینوں کو حق رائے دہی اور حق امیدواری سے استفادہ نہ کرنے دینے کی شرعاً گنجائش ہے۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا محمد فخر عالم نعمانی کا خیال ہے کہ سیاسی پناہ کے لئے کسی ملک میں اقامت اختیار کرنا ایک وقتی عمل ہوتا ہے۔۔۔ظاہر ہے کہ شہریت کے حصول کے لئے مستقل قیام کا ارادہ ضروری ہے، لہذا اگر اس بنیاد پر ملک کے عام شہری اور سیاسی پناہ گزینوں میں فرق کیا جاتا ہے تو شرعاً کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، اور مثال میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ سے باہر قیام پذیر لوگوں کے بارے میں فرمایا: ''فإن أبوا أن يتحولوا منها فأخبرهم أنهم يكونون كأعراب المسلمين يجري عليهم حكم الله الذي يجري على المؤمنين ولا يكون لهم في الغنيمة والفيء شئ إلا أن يجاهدوا مع المسلمين'' (مسلم، حدیث نمبر: ۴۶۱۹)۔

☆ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی نے مظالم کے شکار پناہ گزینوں کے لئے اعانت کی دو صورتیں ذکر کی ہیں، ایک یہ کہ یہ مسلم ملک اس ظالم ملک کے حاکم پر کسی طرح دباؤ بنائے تاکہ ان مظلومین کو سکون مل سکے، دوسرے یہ کہ امن وپناہ دینے کے بجائے ان پناہ گزینوں کو شہریت دے دے تاکہ یہ پرامن و پرسکون زندگی گزار سکیں، دلیل کے طور پر درج ذیل دو حدیثیں ذکر کی ہیں:

۱۔ ''ولينصر الرجل أخاه ظالماً أو مظلوماً، إن كان ظالماً فلينهه فإنه له نصر، وإن كان مظلوماً فلينصره'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۴)۔

۲۔ ''من فرّج عن مسلم كربة فرّج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰)۔

☆ مولانا عبید اللہ ندوی کا کہنا ہے کہ اگر پناہ گزینوں کی نیت یہ ہے کہ حالات درست ہونے کے بعد ہم اپنے ملک واپس چلے جائیں گے تو ان کو پناہ گزین کا درجہ دینے اور اس ملک کا شہری تسلیم نہ کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ پناہ گزین ہونے کے باوجود انہیں تمام انسانی اور مدنی حقوق ملیں گے، لیکن آگے انہوں نے اس کا بھی اضافہ کیا کہ اگر ان پناہ گزینوں کو ملک کے قدیم باشندوں کی طرح سہولتیں نہ دی جائیں تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس تعلق سے موصوف نے دلیل کے طور پر تین مثالیں دی ہیں:

۱۔ ''لا يستوي منكم من أنفق من قبل الفتح وقاتل أولئك أعظم درجة من الذين أنفقوا من بعد وقاتلوا، وكلاً وعد الله الحسنى'' (الحدید: ۱۰)۔

۲۔ علماء و محدثین نے صحابہ کرام کے مراتب قائم کئے ہیں، مثلاً سابقین اولین، بدریین، احدیین وغیرہ۔

۳۔ محدثین نے بعض مواقع پر قدیم الاسلام اور حدیث العہد بالاسلام رواۃ میں فرق کیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سہولیات میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے۔

پناہ گزینوں کو شہری تسلیم نہ کرنا:

بعض مقالہ نگار حضرات نے پناہ گزینوں کو شہری تسلیم نہ کئے جانے کو راجح قرار دیا ہے، جیسا کہ مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کا کہنا ہے کہ پناہ گزینوں کو شہری سہولیات تو دی جائیں گی، مگر شہری حقوق نہیں، پناہ گزینوں کو شہری تسلیم نہ کیا جانا شرعاً درست ہے، اس لئے کہ ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ حالات سازگار ہونے کے بعد وہ اپنے ملک لوٹ جائیں گے۔

☆ مولانا اشرف عباس قاسمی کی رائے ہے کہ شہریت کے لئے بین الاقوامی ضوابط اور ملکی نزاکتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر انہیں جدید اصطلاح کے اعتبار سے شہری تسلیم نہ کرے فقط پناہ گزیں قرار دے تب بھی گنجائش ہے۔

☆ حافظ کلیم اللہ عمری مدنی کے نزدیک ان مہاجرین کی حیثیت ایک مہمان کی ہے، ان کے لئے شہریوں کی طرح پوری رعایتیں دینا یا سہولتیں فراہم کرنا حکومت کے واجبات میں سے نہیں ہے۔

☆ مفتی محمد سلمان منصور پوری کی رائے ہے کہ اگر قومی یا بین الاقوامی مصلحت اس میں کسی وجہ سے مانع ہو تو اسلامی حکومت کو ایسے مسلمانوں کو شہریت دینا لازم نہیں ہے۔

☆ مولانا رحمت اللہ ندوی کے نزدیک پناہ گزینوں کو اس شرط کے ساتھ شہریت حاصل ہوگی کہ ملک میں گنجائش ہو اور وہاں کے قدیم باشندوں کے حقوق متاثر نہ ہوں، اور تقریباً یہی رجحان مولانا قمر الزماں ندوی کا بھی ہے۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی نے شہری تسلیم نہ کئے جانے کی دو صورتیں ذکر کی ہیں، ایک یہ کہ صرف کاغذی طور پر شہری نہ ہوں باقی ساری سہولیات انہیں فراہم ہوں، دوسرے یہ کہ شہری حقوق سے ان کو محروم رکھا جائے۔ پہلی صورت میں اگر وہ شہری تسلیم نہ کئے جائیں، بلکہ انہیں مہاجر سمجھا جائے، مگر انہیں سارے حقوق حاصل ہوں تو بظاہر اس میں کوئی اشکال معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں سیاسی حقوق سے محروم کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

۴۔ اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے کیا کیا حقوق مانے جائیں گے؟

تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں نے سوالنامہ میں دیئے گئے تمام حقوق کو شہریت کے حقوق مانا ہے، اور کہا ہے کہ نئے شہریوں کو بھی قدیم شہریوں کی طرح تمام حقوق ملیں گے۔

۱۔ ''إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل، إن الله نعمّا يعظكم به إن الله كان سميعاً بصيراً'' (النساء: ۵۸) (مقالہ مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی محمد ابوبکر قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی)۔

۲۔ ''ألا كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته، فالأمير الذي على الناس راع عليهم وهو مسئول عنهم'' (ابوداؤد

۲،۴۰۶)۔

البتہ بعض حضرات نے ان حقوق میں مزید اضافے کئے ہیں اور کچھ قیود وشرائط بھی بیان کی ہیں، مثلاً:

☆ مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی اور مفتی محمد سلمان منصور پوری کے مطابق ملک اور حکومت کا جو قانون اور دستور ہوگا اسی کے مطابق انہیں حقوق اور سہولتیں دی جائیں گی۔

۱۔ ''أما بعد: فقد نزل عليّ رسلكم راجعين إلى قريتكم، فإذا جائكم كتابي هذا فإنكم آمنون لكم ذمة الله وذمة رسوله، وإن رسول الله غافر لكم سيئاتكم، ولا ظلم ولا عدوى وإن رسول الله جاركم مما منع منه نفسه، وإن عليكم رجع ما خرجت نخلكم، فإن سمعتم وأطعتم فإن على رسول الله ﷺ أن يكرم كريمكم ويعفو عن سيئكم وأن ليس عليكم أمير إلا من عند أنفسكم أو من أهل رسول الله ﷺ'' (طبقات ابن سعد ۱،۲۸، ۲،۳۰)

۲۔ ''ولنجران وحاشيتهم جوار الله، ومن سأل منهم حقا فبينهم النصف غير ظالمين ولا مظلومين، ولا يؤاخذ أحداً منهم بظلم آخر، وعلى ما فيه هذه الصحيفة جوار الله وذمة النبي ﷺ'' (الطبقات الكبرى لابن سعد ۲،۳۶)۔

☆ مفتی محمد ابوبکر قاسمی نے مذہب، عقل، مال، نسب اور جان کی حفاظت اور مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے ذاتی ملکیت کی حفاظت، شخصی آزادی، آزادی اظہار رائے اور عقیدہ ومسلک کی آزادی جیسے حقوق کا اضافہ کیا ہے، لیکن مفتی ابوبکر قاسمی نے ووٹ دینے یا امیدوار بننے یا ملازمت یا علاج کے سلسلہ میں یہ رائے دی ہے کہ حکومت حسب صلاحیت اور حسب لیاقت قانون وضع کرسکتی ہے۔

☆ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا رجحان یہ ہے کہ اگر ملک جمہوری بنیادوں پر قائم ہو تبھی ووٹ دینے کا حق ہوگا، اگر حکومت کی بنیاد عوامی رائے پر نہ ہو تو ہر شہری اس کا مجاز نہیں ہوگا کہ وہ ووٹ دے کر حکمراں کا انتخاب کرے، اور دلیل کے طور پر تاتارخانیہ کی یہ عبارت پیش کی ہے: ''قال غلماؤنا: يصير المرء سلطانا بأمرين: بالمبايعة معه ويعتبر بالمبايحة معه مبايعة أشرافهم وأعيانهم'' (تاتارخانیہ ۷،۵۵)۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ ہر شہری کو تمام سرکاری اداروں سے انتفاع کا حق ہوگا۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا فخر عالم نعمانی کہتے ہیں کہ اسلام میں شہریت کے وہ تمام حقوق قابل قبول ہوں گے جس کی تعیین معروف پر ہو، انسانیت کی فلاح وبہبود پیش نظر ہو اور شریعت کے کسی نص سے متصادم نہ ہو۔

☆ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کی رائے یہ ہے کہ ملک کے ہر شہری کو اپنی انسانی اور مذہبی زندگی کو بہتر طور پر گزارنے نیز ملک کے نظم ونسق کو چلانے میں یکساں طور پر شامل ہونے کے لئے جتنے بھی قسم کے حقوق واختیارات ہوسکتے ہیں وہ سب شہریت کے حقوق تسلیم کئے جائیں گے۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی نے اسلامی نقطہ نظر سے شہریت کے حقوق سے ان حقوق کو مراد لیا ہے جن کا تعلق مصالح ضروریہ یعنی حفاظت دین، حفاظت جان، حفاظت عقل، حفاظت نسل اور حفاظت مال سے ہو۔

☆ مفتی اشرف عباس قاسمی لکھتے ہیں کہ جمہوری نظام حکومت میں شہریوں کے جتنے حقوق ہیں اسلام ان سب کی تقریر کرتا ہے، اور ملک کے استحکام اور دفاع کی مشترکہ کوششوں کی اجازت، بلکہ ترغیب دیتا ہے، معاہدہ حلف الفضول اور میثاق مدینہ کی مختلف دفعات پر نظر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے، اور آگے لکھتے ہیں کہ مسلم مملکت میں غیر مسلم شہریوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلم شہریوں کو حاصل ہیں، البتہ ووٹ دینے کا حق یا انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق وغیرہ وہ حقوق ہیں جو محض شہری ہونے کی حیثیت سے مسلم مملکت غیر مسلم مواطن کو بھی فراہم کرے یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

☆ قاضی محمد حسن ندوی کا کہنا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے بحیثیت انسان وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شہریت کے لئے ناگزیر ہیں؛ لیکن آگے وہ کہتے ہیں کہ جو بھی حقوق دیئے جائیں وہ شریعت کے دائرہ میں ہوں، اس سے چشم پوشی کرکے کوئی حق دینا یا اس کا استعمال کرنا شرعاً درست نہ ہوگا۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے سوالنامہ میں مذکور حقوق میں شخصی آزادی کا حق، عقیدہ کی آزادی کا حق، اظہار رائے کا حق اور معصیت سے دوری کے حق کا اضافہ کیا ہے، اور ''لا ينال عهدي الظالمين'' (بقرہ: ۱۲۴)، ''لا طاعة لمخلوق في معصية الله عزوجل'' (مسند احمد، نمبر: ۱۰۹۴)، ''لا

طاعة في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف'' (بخاری، نمبر:۷۲۵۷) کو دلیل کے طور پر اپنی بات کی تائید میں پیش کیا ہے، جبکہ مولانا رحمت اللہ ندوی نے اقلیتوں کو اپنے مفادات کے تحفظ کا حق اور تشکیل حکومت کے عمل میں شرکت کے حق کا اضافہ کیا ہے۔

☆ مولانا محمد مصطفی قاسمی کے مطابق جو بھی بنیادی وقانونی حق ہیں وہ سب شہریوں کو حاصل ہوں گے، موصوف نے اسلامی نقطہ نظر سے شہریوں کو حاصل ہونے والے حقوق کی تعداد ۵۵ گنوائی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) تحفظ دین کا حق، (۲) تحفظ نفس کا حق، (۳) تحفظ نسل کا حق، (۴) تحفظ مال کا حق، (۵) تحفظ عقل کا حق، (۶) تحفظ عزت وآبرو کا حق، (۷) تحفظ نجی زندگی کا حق، (۸) تحفظ شخصی آزادی کا حق، (۹) عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت کا حق، (۱۰) ظلم کے خلاف احتجاج کا حق، (۱۱) مساوات کا حق، (۱۵) حصول عدل وانصاف کا حق، (۱۶) تحفظ معاش کا حق، (۱۷) معصیت سے اجتناب کا حق، (۱۸) سیاسی زندگی میں شرکت کا حق، (۱۹) آزادی نقل وحرکت اور سکونت کا حق، (۲۰) آزادی نقل وحرکت اور ہجرت کا حق، (۲۱) اجرت ومعاوضہ کا حق، (۲۲) ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق، (۲۳) مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق، (۲۴) تحفظ ناموس خواتین کا حق، (۲۵) شک وشبہات کی بنا پر کارروائی نہ کرنے کا حق، (۲۶) نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون کا حق، (۲۷) معذوروں اور کم زوروں کے تحفظ کا حق، (۲۸) ووٹ دینے کا حق، (۲۹) الیکشن میں امیدوار ہونے کا حق، (۳۰) سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، (۳۱) سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، (۳۲) سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، (۳۳) روزگار کا حق، (۳۴) عدالتی چارہ جوئی کا حق، (۳۵) معاشی تگ ودو کا حق، (۳۶) ایک مقام سے دوسرے مقام پر بلا اجازت آمد ورفت کا حق، (۳۷) تجارت اور صنعت وحرفت کا حق، (۳۸) مقامات مقدسہ کے تحفظ کا حق، (۳۹) ازدواجی زندگی گزارنے کا حق، (۴۰) رہبانیت سے اجتناب کا حق، (۴۱) ازدواجی زندگی میں شقاق ونفاق حائل ہوجانے پر طلاق کا حق، (۴۲) مسلم لا کے تحفظ کا حق، (۴۳) مسلم اوقاف کے تحفظ کا حق، (۴۴) مساجد ومدارس کے تحفظ کا حق، (۴۵) خانقاہ ومقابر کے تحفظ کا حق، (۴۶) عورت کا حق مہر، (۴۷) عورت کو خلع کا حق، (۴۸) عورت کو نفقہ کا حق، (۴۹) قصاص وخون بہا کا حق، (۵۰) وراثت ووصیت کا حق، (۵۱) معاملات کا حق، (۵۲) تعزیرات ومحاربت کا حق، (۵۳) عورت کو عصمت وعفت کی زندگی گزارنے کا حق، (۵۴) عورت کو اپنے محرم کے علاوہ نامحرم سے پردہ کرنے کا حق، (۵۵) عورت کو گھر میں پردہ نشیں رہنے کا حق۔ یہ سب بنیادی حقوق میں شامل ہیں، ان حقوق کو کوئی سلب وغصب نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کی جانب سے عطا کردہ حقوق ہیں۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی نے حقوق پر بحث کرتے ہوئے ان کی چار نظریاتی تقسیم کی ہے: قدرتی حقوق کا نظریہ، حقوق کا تاریخی نظریہ، حقوق کا سماجی فلاحی نظریہ اور حقوق کا عینی یا فرد کی شخصیت کا نظریہ، اور پھر اس کے بعد حقوق کی چار بنیادی تقسیمیں کی ہیں: قدرتی حقوق، اخلاقی حقوق، قانونی حقوق اور معاشی حقوق۔ اور پھر ان کے ضمن میں آنے والے ذیلی حقوق کو مندرجہ ذیل چارٹ میں سمونے کی کوشش کی ہے:

☆ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی نے حقوق کی قدرے تفصیل کی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حکومتوں نے حقوق کی تقسیم حریت، مساوات اور اخوت کے اصول کی روشنی میں کی ہے، یہ اصول نہ صرف مشترکہ طور پر تمام حقوق کی تعیین کرتے ہیں، بلکہ ان میں سے ہر اصول اپنے مخصوص زمرہ میں مخصوص حقوق سے بھی ہم رشتہ ہے، اس لحاظ سے موصوف نے ان حقوق کی چار زمروں میں تقسیم کی ہے اور پھر ان کی ذیلی تقسیمیں کی ہیں:

(۱) حریت کے حقوق، (۲) مساوات کے حقوق، (۳) فلاحی حقوق، (۴) نجی ملکیت کے حقوق۔

(۱) حریت کے حقوق تین زمروں میں منقسم ہیں: الف۔ سیاسی آزادی کے حقوق۔ ب۔ شہری آزادی کے حقوق۔ ج۔ اقتصادی آزادی کے حقوق۔

سیاسی آزادی کے حقوق میں عموماً ملکی انتخابات میں حصہ لینے، سیاسی عہدوں کے لئے امیدوار ہونے، حکام کو عرضداشت اور اپنی شکایات کرنے اور ان کا ازالہ کرانے کے حقوق شامل ہیں، سیاسی پارٹی بنانے کا حق اگر چہ سیاسی آزادی ہی کا ایک جزو ہے، لیکن رسماً اظہار رائے، جلسہ وجلوس اور اجتماع کی عام شہری آزادیوں سے منسلک ہے۔

شہری آزادی (سول لبرٹی) کے حقوق کو فی زمانہ تین خانوں میں منقسم کیا گیا ہے:

ا۔ شخصی آزادی یعنی جان وتن یا تشخص کی سلامتی کا حق (مثلاً جسمانی ایذا، حبس بے جا، غیر انسانی سزا اور خلوت ومسکنت میں دخل بے جا سے تحفظ کا حق، اندرون ملک نقل وحرکت کی آزادی، کسی بھی مقام پر ٹھہرنے یا بسنے کی آزادی، ملک سے باہر سفر کرنے اور ملک میں واپس آنے کی آزادی، اور دوسرے ممالک میں پناہ گزینی کا حق۔

۲۔ ذہنی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق مثلاً عقیدہ، ضمیر اور مذہب کی آزادی، فکری اور نظریاتی آزادی کے حقوق، اظہار رائے، جلسہ وجلوس اور جماعت سازی کی آزادی۔

۳۔ عملی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق مثلاً معاہدہ کرنے کی آزادی، کاروبار کی آزادی، نجی جائیداد کی خرید وفروخت کی آزادی، شادی بیاہ کرنے اور خاندان بسانے کا حق، وغیرہ۔

(۲) مساوات کے حقوق: اس زمرہ میں کم از کم چھ حقوق آتے ہیں:

۱۔ قانونی مساوات: یعنی قانونی مرتبہ کی مساوات کا حق۔

۲۔ عدالتی کارروائی میں دوسروں کے مساوی قانونی سلوک پانے کا حق اور قانون کے تحت مساویانہ تحفظ پانے کا حق۔

۳۔ ٹیکسوں کی ادائیگی میں دوسروں کے مساوی سلوک پانے کا حق۔

۴۔ دوسروں کے برابر سماجی مواقع پانے کا حق۔

۵۔ دوسروں کے برابر سرکاری ملازمتوں، سیاسی عہدوں اور سرکاری اعزازات میں حصہ پانے کا حق۔

۶۔ سیاسی مساوات، یعنی ملکی سیاست میں دوسروں کے برابر نمائندگی اور حصہ داری پانے کا حق، سرکاری حکام سے اپنی شکایات کا ازالہ کرانے کا حق اور استبداد وبدعنوانی کے خلاف مناسب طریقہ پر حدود کی رعایت کے ساتھ احتجاج، سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کرنے کا حق۔

(۳) فلاحی خدمات پانے کا حق: فرانسیسی ماہر قانون لیوں ڈیوگوئی نے اخوت کے بجائے ''سماجی سالمیت'' کی اصطلاح استعمال کرکے افراد کے تین فلاحی حقوق اور ان کے متوازی سرکار کے تین بنیادی فرائض متعین کئے ہیں، یعنی:

۱۔ تعلیم پانے کا حق۔

۲۔ بوقت ضرورت سرکاری امداد پانے کا حق۔

۳۔ روزگار اور ذریعۂ معاش پانے کا حق۔

اخوت یا تعاون کا اصول نہ صرف سرکاری امداد اور معیشت کو بلکہ سماجی زندگی کے تمام دوسرے زمروں کو بھی محیط ہے، اس کے مطابق افراد کو ہر میدان میں اپنی ذہنی ومادی بہبود کے لئے درکار تمام سہولیات اور خدمات پانے کا حق ہے۔

(۴) نجی ملکیت کے حقوق: فطری حقوق اور انسانی حقوق کے اب تک کے تمام اعلانات میں نجی ملکیت کے حقوق کو نمایاں جگہ دی گئی ہے، قدیم زمانہ سے آج تک سیاسی مفکروں کی اکثریت نجی ملکیت کو فرد کی مسرت اور بہبود کے لئے لابدی قرار دیتی ہے (مبادی سیاسیات: باب ۴، شہریت اور شہری حقوق وفرائض، حقوق کی زمرہ بندی کا بیان، ص: ۷۱-۷۸)۔

پھر آگے چل کر موصوف نے شہریوں کو ملنے والے حقوق کا ذکر چارٹ کی شکل میں کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

۵۔ شرعی نقطۂ نظر سے پناہ گزینوں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے، نیز کون سے حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے اور ان کو حاصل نہیں ہوں گے؟

اس سلسلہ میں بعض مقالہ نگار حضرات کا رجحان یہ ہے کہ پناہ گزینوں کو وہ سب حقوق حاصل ہوں گے جو حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے، یہ رائے ان تمام حضرات کی ہے: مفتی عبداللہ کاوی والا، مفتی محمد سلمان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا احمد نور عینی قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مفتی محمد ابوبکر قاسمی۔

☆ البتہ مولانا احمد نور عینی قاسمی نے حقوق میں یکسانیت کی وجہ دار الاسلام کی وحدت کو قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ دار الاسلام کی حدود میں خواہ کتنی ہی مملکتیں وجود میں آجائیں، مملکتوں کا یہ تعدد مسلمانوں کے حقوق وفرائض اور ان کے احکام پر چنداں اثر انداز نہیں ہوگا؛ کیونکہ دار الاسلام ٹکڑیوں میں بٹ جانے کے باوجود بھی ایک مملکت کے حکم میں ہے۔ تائید میں مندرجہ ذیل عبارتیں پیش کی ہیں:

۱۔ ''... لأن الإسلام دار أحكام، فباختلاف المنعة والملك لا تتباين الدار فيما بين المسلمين؛ لأن حكم الإسلام يجمعهم، فأما دار الحرب ليست بدار أحكام ولكن دار قهر، فباختلاف المنعة والملك تختلف الدار فيما بينهم'' (المبسوط ۳۳/۳، اسی سے ملتے جلتے الفاظ البحر الرائق ۵۷۳/۸ اور تبیین الحقائق ۲۴۰/۶ میں بھی ہیں)۔

۲۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی میراث کی بحث میں شامی قانون کی ایک دفعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

وأما القانون السوري في المادة (۲۶۴) ''فإنه نص على أنه لا يمنح الأجنبي حق الإرث ... وهذا شامل مع الأسف المسلمين من جنسيات مختلفة، وهو لم يقل به فقيه ... لأن المسلم لا يعتبر في بلاد دار الإسلام أجنبيا'' (الفقه الاسلامي وادلته ۱۰،۷۷۲۶)۔ تقریباً یہی موقف معاصر اہل علم میں سے ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے ''احکام الذمیین والمستأمنین'' ص:۷۳ میں، جسٹس علی علی منصور نے ''الشريعة الإسلامية والقانون الدولي'' ص/۹۱ میں، ڈاکٹر علی بن عبد الرحمن الطیار نے ''حقوق غير المسلمين في الدولة الإسلامية'' ص۷۷ میں، ایران کے شیعہ اسکالر صدرالدین قبانچی نے ''المذهب السياسي في الإسلام'' ص/۱۲۹ میں اختیار کیا ہے (مقالہ: مولانا احمد نور عینی قاسمی)۔

☆ قاضی محمد حسن ندوی نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ''أنزل الناس على قدر منازلهم'' کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ حقوق میں فرق کیا ہے، مثلاً پناہ گزینوں کو شروع میں ووٹ دینے کا حق اور امیدوار ہونے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

☆ مولانا زبیر احمد قاسمی کہتے ہیں کہ جن حقوق کا تعلق انسان کی بنیادی ضرورتوں سے نہیں ہے تو وہ پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے، مثلاً ووٹ دینے کا حق، امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لینے کا حق وغیرہ۔

☆ جبکہ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی کی رائے یہ ہے کہ پناہ گزینوں کو بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ سیاسی حقوق میں سے ووٹ دہی کا حق اور عدالتی چارہ جوئی کا حق ملنا چاہئے، یہاں تک کہ موصوف یہ کہتے ہیں کہ اگر پناہ گزینوں کی آبادی ایک ہی جگہ ہے تو ان میں سے کسی آدمی کو منتخب کرکے ایوان میں بھیجا جانا چاہئے تا کہ وہ پناہ گزینوں کے مسائل ایوان میں رکھ سکے۔

☆ مفتی محمد سلمان منصور پوری کی رائے میں شریعت میں پناہ گزیں کی الگ سے اصطلاح نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے، لیکن حکم یہی ہے کہ پناہ گزینی کی وجہ سے کوئی تفریق نہیں کی جائے گی، بلکہ اسے شہریوں کے برابر حقوق ملیں گے۔

۱۔ ''وحكم أموالهم حكم أموال المسلمين في حرمتها'' (ابن عابدين ۳،۲۴۳)۔

۲۔ ''وعلى ذلك فلأهل الذمة حق الإقامة آمنين مطمئنين على دمائهم وأموالهم وأعراضهم وعلى الإمام حمايتهم كل من أراد بهم سوءاً من المسلمين أو أهل الحرب أو أهل الذمة، لأنه التزم بالعهد حفظهم من الاعتداء عليهم، فيجب عليه الذب عنهم ومنع من يقصدهم بالأذى من المسلمين أو الكفار، واستنقاذ من أسر منهم واسترجاع ما أخذ من أموالهم سواء كانوا مع المسلمين أم منفردين عنهم في بلدهم، لأنهم بذلوا الجزية لحفظهم وحفظ أموالهم'' (دیکھئے: بدائع الصنائع ۷،۱۱۱، الشرح الصغير للدردير ۱،۱۴۰، المهذب ۲،۲۵۶، كشاف القناع ۳،۱۳۹، المغني ۸،۵۳۵)۔

☆ لیکن اس کے برعکس مفتی اشرف عباس قاسمی کا کہنا ہے کہ پناہ یا جوار کا حق قدیم عربی اور اسلامی خصائل میں سے ہے، اور عرب شاعری میں اس کے بکثرت نمونے موجود ہیں (دیکھئے: اللجوء في الإسلام للدكتور أحمد ابوالوفاء)، اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب حبشہ ہجرت کرنا چاہا تو ابن الدغنہ نے انہیں اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیا۔ مکہ مکرمہ کے ستائے ہوئے مسلمانوں کو شاہ حبشہ نجاشی نے اور مدینہ منورہ کے قبیلہ اوس وخزرج نے پناہ دی۔ اسی طرح قرآن کریم کی اس آیت کی روشنی میں اسلام میں پناہ گزینوں کے تعلق سے احکام کے خط وخال متعین کئے جاسکتے ہیں: ''والذين تبوؤا الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجر إليهم ولا يجدون في صدورهم حاجة مما أوتوا ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة ومن يوق شح نفسه فأولئك هم المفلحون'' (الحشر: ۹)۔ اور یہی کچھ تفصیلات مولانا ریحان مبشر قاسمی نے بھی ذکر کی ہیں۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ پناہ گزینوں کا قیام عارضی ہوتا ہے، لہذا ان کو شہری حقوق نہیں حاصل ہوں گے، مفتی ثناء الہدی قاسمی کہتے ہیں کہ ان کی

حیثیت مہمانوں کی سی ہے، ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک ہونا چاہئے، جبکہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور حافظ کلیم اللہ عمری کا کہنا ہے کہ شہریوں کی طرح بنیادی حقوق ان کو حاصل ہوں گے، اور ملکی انتظامی امور سے متعلق جو حقوق ہیں ان کو دینے کی بظاہر ضرورت متقاضی نہیں ہے، یہی رجحان مولانا عبید اللہ ندوی کا ہے اگر انہیں شہری تسلیم نہیں کیا گیا ہے، لیکن مولانا ابوسفیان مفتاحی کی رائے بغیر کسی قید وشرط کے مطلق یہ ہے کہ جو حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے وہ پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے۔ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی کا خیال یہ ہے کہ پناہ گزیں کا حکم مستأمن کی طرح ہے، اور ایک مستأمن کو کسی ملک میں پناہ لینے پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ تمام حقوق پناہ گزینوں کو حاصل ہوں گے، ''المستأمن أي طالب للأمان (هو من يدخل دار غيره بأمان) مسلماً كان أو حربياً (دخل مسلم دار الحرب بأمان حرم تعرضه لشئ) من دم ومال وفرج (منهم) إذ المسلمون عند شروطهم'' (الدر المختار مع الشامیہ ۴ر۲۴۷)۔ مولانا رحمت اللہ ندوی کے بقول پناہ گزینوں کو شہریوں کے مساوی حقوق نہیں ملیں گے، البتہ معاہدہ کے تحت حقوق کا استحقاق رکھیں گے، لیکن اگر پناہ گزیں شہری بن جائیں تو انہیں بھی وہ جملہ حقوق حاصل ہو جائیں گے جو شہریوں کو حاصل ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کا کہنا ہے کہ پناہ گزین اگر مختصر مدت کے لئے ہیں تو ان کی حیثیت مہمان کی ہوگی اور انہیں بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں گے، لیکن اگر پناہ گزیں طویل مدت کے لئے آئے ہوئے ہیں تو ایسے مسلم پناہ گزینوں کو مکمل شہری حقوق فراہم کرنا کسی بھی مسلم ملک کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہوگا۔

بعض حضرات نے پناہ گزینوں کے حقوق کے تعلق سے قدرے تفصیل کی ہے، مثلاً:

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے پناہ گزینوں کے درج ذیل حقوق ذکر کئے ہیں:

۱۔ ان کا دفاع کیا جائے، ان کی حمایت ونصرت کی جائے، ان کو پناہ دی جائے اور ان کو ٹھہرانے کا نظم کیا جائے۔

۲۔ پناہ گزینوں پر اگر ظلم وجبر کا اندیشہ ہو تو انہیں ان کے ملک کے حوالہ نہ کیا جائے۔

۳۔ پناہ گزینوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جن سے شہری مستفید ہوتے ہیں، جیسے جان ومال، عزت وآبرو کا تحفظ، معاشی حمایت، عدل وانصاف، عقیدہ ورائے کی آزادی، چلنے پھرنے، سفر کرنے کی آزادی، شادی بیاہ اور خاندان کی تشکیل، پرامن جماعتوں اور پارٹیوں میں شرکت، کام اور پیشہ اختیار کرنے، سونے اور آرام کرنے، صحت کے تحفظ اور تحصیل علم کے حقوق حاصل ہوں گے۔

پناہ گزینوں اور شہریوں کے حقوق کے درمیان فرق کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں کہ اگر مستقل اور دائمی طور سے پناہ دی گئی ہے تو پناہ گزینوں اور عام شہریوں کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہوگا، جیسا کہ انصار نے مہاجرین کو دائمی پناہ دی تھی، اور تمام انسانی اور شہری حقوق میں ان کو شریک کیا تھا۔ اور اگر عارضی طور سے پناہ دی گئی ہے اور پناہ گزیں غیر مسلم ہے تو ایسی صورت میں سیاسی حقوق کے علاوہ دیگر انسانی حقوق اسے حاصل رہیں گے۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی کے نزدیک پناہ گزینوں کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہوں گے:

۱۔ دار الاسلام میں داخلے اور بقدر حاجت رکنے کا حق، ۲۔ مذہبی آزادی کا حق، ۳۔ نفس کے تحفظ کا حق، ۴۔ عقل کے تحفظ کا حق، ۵۔ عزت وآبرو کے تحفظ کا حق، ۶۔ مناسب گھر بنانے کا حق، ۷۔ تعامل وتملک کا حق، ۸۔ آزادی کا حق، ۹۔ تعلیم کا حق، ۱۰۔ واپس نہ کئے جانے کا حق۔

شہریوں کے خصوصی حقوق کے تعلق سے موصوف لکھتے ہیں کہ وہ حقوق جو سیاسی امور سے متعلق ہیں مثلاً: ووٹ دینا، انتخاب میں حصہ لینا، الیکشن لڑنا، قانون ساز اداروں کا ممبر بننا، سیاسی عہدوں پر مامور ہونا، یہ سب شہریوں کو حاصل ہوں گے، لیکن پناہ گزینوں کے تعلق سے اگر ملک کی مصلحت ان سے محروم رکھنے کی ہو تو انہیں محروم رکھا جا سکتا ہے۔

☆ مولانا قمر الزماں ندوی کا کہنا ہے کہ پناہ گزینوں کو وہ سارے حقوق حاصل نہیں ہو سکتے جو وہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں، مثلاً پناہ گزینوں کو اراضی کی خریداری کی اجازت بغیر حکومت کی اجازت حاصل کئے نہیں ہوگی، اگر حکومت نے ان کو کیمپ رہنے کے لئے فراہم کر دیا ہے اور انہیں کیمپوں میں رہنے کا مکلف بنایا ہے تو ان کو پختہ مکان بنانے کی اجازت نہیں ہوگی، اسی طرح سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق اور وہ حقوق جو شہریوں کے لئے خاص ہیں وہ بھی پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے، الا یہ کہ حکومت اجازت دیدے۔

لیکن مولانا نثار احمد حصیر قاسمی نے اور حقوق کے ساتھ جائیدادوں کا مالک بننا، کاروبار کرنا اور ملازمت کرنا بھی پناہ گزینوں کا حق قرار دیا ہے، اور اس کے

لئے دلیل کے طور پر درج ذیل آیت وحدیث پیش کی ہے:

۱۔ ''والذین آمنوا من بعد وهاجروا وجاهدوا معكم فأولئك منكم وأولوا الأرحام بعضهم أولى ببعض فى كتاب الله إن الله بكل شئ عليم'' (انفال: ۷۵)۔

۲۔ ''إن حقوق المهاجرين هى نفس حقوق من يستضيفونهم''۔

۶۔ **کیا کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی؟**

اکثر مقالہ نگار حضرات نے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت دی ہے اور اسے درست قرار دیا ہے اگر ضرورت اور مجبوری کی بنا پر ہو، لیکن ان میں سے اکثر حضرات نے دین وایمان کے محفوظ ہونے کی بھی شرط لگائی ہے۔

آیات:

۱۔ ''هو الذى جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقه'' (الملک:۱۵) (مقالہ: مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)

احادیث:

۱۔ حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں: ''دخلت أسماء بنت عميس وهى ممن قدم معنا على حفصة زوج النبى ﷺ زائرة، وقد كانت هاجرت إلى النجاشى فيمن هاجر إليه فدخل عمر على حفصة، وأسماء عندها، فقال عمر حين رأى أسماء: من هذه؟ قالت: أسماء بنت عميس، قال عمر: الحبشية هذه؟ البحرية هذه؟ فقالت أسماء: نعم، فقال عمر: سبقناكم بالهجرة، فنحن أحق برسول الله ﷺ منكم، فغضبت، وقالت كلمة: كذبت يا عمر كلا، والله كنتم مع رسول الله ﷺ يطعم جائعكم، ويعظ جاهلكم، وكنا فى دار، أو فى أرض البعداء البغضاء فى الحبشة، وذلك فى الله وفى رسوله، وأيم الله لا أطعم طعاماً ولا أشرب شراباً حتى أذكر ما قلت لرسول الله ﷺ، ونحن كنا نؤذى ونخاف، وسأذكر ذلك لرسول الله ﷺ وأسأله، ووالله لا أكذب ولا أزيغ ولا أزيد على ذلك، قال: فلما جاء النبى ﷺ قالت: يا نبى الله! إن عمر قال: كذا وكذا، فقال رسول الله ﷺ: ليس بأحق بى منكم، وله ولأصحابه هجرة واحدة، ولكم أنتم أهل السفينة هجرتان'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۰۳) (مقالہ مولانا محمد توقیر بدر قاسمی)۔

۲۔ ''فهذا ضماد الأزدى أسلم ثم رجع إلى قومه وعاش معهم حتى هاجر رسول الله ﷺ إلى المدينة الخ'' (مسلم، کتاب الجمعہ ۱،۲۸۴) (مقالہ: مفتی محمد سلمان منصور پوری، مفتی ثناء الہدی قاسمی)۔

۳۔ حضرت عمرو بن عبسہ السلمی نے اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ میں سکونت کی خواہش ظاہر کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لكن ارجع إلى أهلك فإذا سمعت بى قد ظهرت فأتنى'' (مسلم، حدیث نمبر: ۸۳۲) (مقالہ: مفتی اشرف عباس قاسمی)۔

عبارات:

۱۔ ''إن اضطر إليه مسلم بسبب أنه أوذى فى وطنه أو اضطهد بالسجن أو مصادرة أمواله للغير ما ذنب أو جريمة ولم يجد لنفسه مأمنا إلا فى مثل هذه البلاد فإنه يجوز له التجنس بهذه الجنسيات دون أى كراهة بشرط أن يعزم على نفسه المحافظة على دينه وفى حياته العلمية والابتعاد عن المنكرات الشائعة هناك والدليل على ذلك أن الصحابة رضى الله عنهم هاجروا إلى الحبشة بعد ما اضطهدوا من قبل أهل مكة والحبشة يومئذ يسودها الكفار'' (بحوث فى قضايا فقهية معاصرة للشيخ محمد تقى العثمانى، ص ۳۲۸) (مقالہ مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۲۔ ''والمسلم يمكنه أن يعيش خارج دار الإسلام وحتى فى دار الحرب إذا كان متمكنا من إظهار دينه، وإذا كان بعض الفقهاء تحدثوا عن وجوب الهجرة من دار الحرب، فقد كان ذلك مشروطا بعدم القدرة على إظهار الدين ....، ولا بد أن يشير إلى أن الأحناف لا يوجبون الهجرة من دار الحرب فى جميع الظروف لقول رسول اللهﷺ: لاهجرة بعد الفتح، ولكن جهاد ونية، وهذا يؤكد أن جمهور المذاهب والعلماء يرون مشروعية العيش المشترك مع غير المسلمين ولو كان ذلك تحت سلطان غير إسلامى'' (المسلم مواطنا فى أوربا للشيخ فيصل مولوى، ص۱۸۔۱۹) (مقالہ: مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محمد سلمان منصور پوری، مفتی ثناء الہدی قاسمی)۔

۳۔ ''جواز الهجرة إلى دار الكفر والبقاء فيها حيث إن هؤلاء الأصحاب بقوا إلى عام خيبر حيث يقول جعفر رضى الله عنه: فخرجنا حتى أتينا المدينة فتلقانى رسول اللهﷺ وأعتنقنى ثم قال: ما أدرى أنا بفتح خيبر أفرح أم بقدوم جعفر'' (البداية والنهايه ۴٫۱۷۹، مجمع الزوائد ۶٫۲۰) (مقالہ: مفتی محمد سلمان منصور پوری)۔

☆ اور مولانا ریحان مبشر قاسمی نے احکام کے اعتبار سے شہریت اختیار کرنے والوں کی تفصیل بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں: اس پورے حالات اور پس منظر کے بعد کسی مسلمان کے لئے غیر مسلم میں سکونت اختیار کرنے کے بارے میں تفصیل ہوگی اور حالات کے اعتبار سے حکم میں فرق آئے گا اور درج ذیل احکام مرتب ہوں گے:

(۱) بلا کراہت جائز، (۲) مستحب اور موجب اجر وثواب، (۳) واجب، (۴) مکروہ، (۵) حرام۔

(۱) اگر کسی مسلمان کو اس کے وطن میں ناحق ایذا پہنچائی جائے یا بلا جرم کے قید وبند کی صعوبتیں دی جائیں یا مال ودولت کو آمرانہ طور پر غصب کیا جائے اور کوئی مامون جگہ نہ مل سکے تو غیر مسلم ملک میں تین شرط کے ساتھ رہنا جائز ہوسکتا ہے:

۱۔ اس ملک میں دین پر عمل کرنے کی آزادی ہو اور آدمی کو یقین ہو کہ وہ اپنے مذہب کا پابند رہے گا۔

۲۔ ماحول سے اس کے عقیدے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور وہاں رائج فواحش ومنکرات سے بچے رہنا ممکن ہو۔ خصوصاً نوجوان غیر شادی شدہ طبقہ؛ کیوں کہ ان ممالک میں فتنوں کے چوپٹ دروازے کھلے رہتے ہیں۔

۳۔ آدمی کے پاس اتنا علم ہو کہ وہ شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے پر قادر ہو۔

''قد سئل الشيخ عبد الله بن جبرين ما حكم الحصول على الجنسية الكافرة؟ أجاب لقوله: من اضطر إلى طلب جنسية دولة كافرة كمطارد من بلده، ولم يجد مأوى، فيجوز له ذلك بشرط أن يظهر دينه ويكون متمكنا من أداء الشعائر الدينية، وأما الحصول على الجنسية من أجل مصلحة دنيوية محضة فلا أرى جوازه'' (اسلام ویب: مركز الفتوى، رقم الفتوى: ۱۸۸۱۴۲)۔

یا کوئی شخص اپنے معاشی مسئلے میں الجھن کا شکار ہو اور اسے اپنے ملک میں تلاش بسیار کے باوجود جائز ملازمت اور معاشی وسائل حاصل نہ ہوں اور اسے فقر وفاقہ کی نوبت آپہنچے اور غیر مسلم ملک میں جائز ملازمت مل رہی ہو تو مذکورہ بالا تینوں شرائط کے ساتھ وہاں رہنے کی اجازت ہوگی، کیونکہ اہل علم نے مصیبت کے نزول کے وقت اپنے وطن سے نکلنے کی اجازت دی ہے۔

''ذكر ابن العربى فى أحكام القرآن عند قوله تعالى: ''وإذ أخرجه الذين كفروا...الآية'' (توبہ: ۴۰) فى هذه الآية دليل على جواز الفرار من خوف العدد وترك الصبر على ما ينزل من بلا ء الله وعدم الاستسلام المؤدى إلى الآلام والهموم'' (احكام القرآن لابن العربى ۲٫۵۱۴)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حصول رزق بھی شریعت کا ایک حکم ہے اور اسے ایک فریضہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

''عن عبد الله بن مسعودؓ قال: قال رسول اللهﷺ: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة'' (رواه البيهقى فى شعب الايمان؛ مشكاة كتاب البيوع، باب الكسب مطلب الحلال)، اور اپنے ہاتھ کی کمائی کو شریعت بہت پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے:

''عن رافع بن خديج قال: قيل يا رسول الله! أى الكسب أطيب؟ قال: عمل الرجل بيده وكل بيع مبرور'' (مشكاة، كتاب البيوع باب الكسب مطلب الحلال)۔

اور اس کے لئے شریعت نے کسی خاص امکان اور مخصوص جگہ کی قید نہیں لگائی بلکہ آزادی دے رکھی ہے کہ جہاں مرضی ہو اپنا رزق تلاش کرو، فرمان باری تعالی ہے:

''هو الذى جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور'' (ملک: ۱۵)۔

اس حکم میں ایک اور صورت بھی داخل ہو سکتی ہے (یعنی وہاں رہنا جائز ہوگا) جو ہندوستان اور اس جیسے ممالک پر منطبق ہے جہاں پر مسلمان اپنے دامن اور جان ومال کے لحاظ سے (عمومی حالات میں) محفوظ ہیں اور جہاں پر انہیں آزادی مکمل طور پر حاصل ہے، اور شعائر دین پر بلا تکلیف وایذاء کے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا حالات میں اس جیسے ممالک میں بھی سکونت اختیار کرنا جائز ہوگا؛ کیونکہ وہ شرعی ہجرت اس وقت واجب ہوتی ہے جب کسی ملک کے حالات دینی اعتبار سے ناگفتہ بہ ہوں اور وہاں کے مسلمانوں کو اپنا دین ومال وعزت بچانا دشوار ہو، ہاں اس بات کے استحباب سے قطعاً انکار کی گنجائش نہ ہوگی کہ آدمی وہاں سے ہجرت کر کے کسی مسلم ملک کی پناہ لے لے بشرطیکہ اس کا حصول متعذر نہ ہو؛ کیونکہ وہاں رہ کر جو دینی مصالح ہو سکتے ہیں غیر مسلم ملک میں وہ نہیں ہو سکتے، مثلاً: خیر ومعروف کی کثرت، منکرات وفواحش کی قلت، علماء کرام اور مشائخ عظام کی زیارت، مسلمان کی جماعت میں کثرت پیدا کرنا اور ان کی معاونت، کفار سے عدم اختلاط اور عدم تکثیر سواد کفار وغیرہ وغیرہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ اسلام لانے کے بعد مکہ میں ہی مقیم تھے اور فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کی ہے، اسی طرح حضرت نعیم نحامؓ نے جب مدینہ منورہ ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی قوم بنو عدی ان کے پاس آئی اور کہا: آپ ہمارے درمیان ہی رہیں یہاں سے ہجرت نہ کریں، جو آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرے گا، ہم اس سے نمٹیں گے، اور جن یتیموں اور بے سہارا عورتوں کی کفالت کرتے تھے کرتے رہیں، چنانچہ وہ ہجرت سے رک گئے، پھر اس کے بعد ہجرت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تمہاری قوم میری قوم سے بہتر ہے، میری قوم نے مجھے نکالا اور میرے قتل کا ارادہ کیا، اور تمہاری قوم نے نہ صرف تمہیں روکا، بلکہ تمہاری حفاظت کا بھی وعدہ کیا (مغنی ۱۳/۱۵۱، کتاب الجہاد، فصل فی الہجرۃ)۔

ابن قدامہ علیہ الرحمہ اپنی مایہ ناز تصنیف ''المغنی'' میں رقم طراز ہیں: ''فالناس فى الهجرة على ثلاثة أضرب: أحدها: من تجب عليه وهو من يقدر عليها، ولا يمكنه إظهار دينه أو لا تمكنه إقامة واجبات دينه مع المقام بين الكفار فهذا تجب عليه الهجرة، لقول الله تعالى: ''إن الذين توفاهم الملائكة ظالمى أنفسهم قالوا فيم كنتم، قالوا كنا مستضعفين فى الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئك مأواهم جهنم وساء ت مصيرا''، وهذا وعيد يدل على الوجوب۔ الثانى: من لاهجرة عليه وهو من يعجز عنها، إما لمرض أو إكراه على الإقامة، وأضعف من النساء والولدان وشبههم، فهذا لاهجرة عليه، لقول الله تعالى: ''إلا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلاً، فأولئك عسى الله أن يعفو عنهم، وكان الله عفواً غفوراً'' ولا توصف باستحباب، لأنها غير مقدور عليها۔ والثالث: من يستحب له ولا تجب عليه، وهو من يقدر عليها، ولكنه يتمكن من إظهار دينه، وإقامته فى دار الكفر فتستحب له ليتمكن من جهادهم، وتكثير المسلمين ومعونتهم، ويتخلص من تكثير الكفار ومخالطتهم، ورؤية المنكر بينهم، ولا تجب عليه، لإمكان إقامة واجب دينه بدون الهجرة'' (المغنى ۱۳/۱۵۱، كتاب الجهاد، فصل فى الهجرة)۔

مذکورہ عبارت سے یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ مشرکین کے ساتھ رہنے میں جو وعیدیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں، وہ اس مقامات پر محمول ہیں جہاں مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنا مشکل ہو یا عقیدہ خراب ہونے کا اندیشہ ہو، یا جان ومال، عزت وآبرو اور اہل وعیال پر خوف ہو۔

حضرت مفتی شفیعؒ کی عبارت اس سلسلے میں بھی کافی چشم کشا ہے، جس کو نقل کرنا افادیت سے خالی نہیں، بغرض افادیت نقل کی جاتی ہے:

''جس دار الکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض واجب تو نہیں، مگر مستحب بہر حال ہے، اور اس میں دار الکفر ہونا بھی

ضروری نہیں، دار الفسق جہاں احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی اعلاناً ہوتی ہو، اس کا بھی یہی حکم ہے، اگر چہ وہاں کے حکمراں کے مسلمان ہونے کی بنا پر اس کو دار الاسلام کہا جاتا ہو۔ یہ تفصیل حافظ ابن حجرؒ نے تحریر فرمائی ہے، اور قواعد حنفیہ میں کوئی چیز اس کے منافی نہیں، اور مسند احمد کی ایک روایت جو ابو یحییٰ مولی زبیر بن عوام سے منقول ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "البلاد بلاد اللہ والعباد عباد اللہ حیثما أصبت خیراً فأقم"، سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہو جائیں وہاں اقامت کرو" (معارف القرآن ۶/۱۱۷، سورہ عنکبوت: ۵۶)۔

(۲) مستحب: غیر مسلم ممالک میں رہنے سے مقصود اگر دین کی اشاعت ہو یا وہاں رہنے والے مسلمانوں کو دین اور احکام اسلام سے روشناس کرانا ہو، اور انہیں ثابت قدمی پر ابھارنا ہو تو یہ نہ صرف مستحب، بلکہ موجب اجر و ثواب بھی ہوگا، کیونکہ بہت سے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی نیک مقصد سے اور دینی جذبے سے سرشار ہو کر غیر مسلم ممالک میں سکونت اختیار کی ہے، اور بعد میں یہ چیزیں ان کے مناقب میں شمار ہوئیں۔

(۳) واجب: غیر مسلم ممالک میں کوئی مقتدی اور مستند عالم ہو اور لوگ اس سے فیض یاب ہو رہے ہوں اور وہ دین اسلام کی ترویج اور احکامات الٰہیہ کی اشاعت کا ذریعہ اور سبب ہو، اور اس کے وہاں سے منتقل ہونے میں ضرر لاحق ہو تو ایسے شخص کو ان مقامات پر سکونت اختیار کرنا واجب ہوگا۔

(۴) مکروہ: اگر کسی کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل ہیں کہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے تو محض عیش و عشرت یا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت اور سکونت کراہت سے خالی نہ ہوگی؛ کیونکہ وہاں رائج فواحش و منکرات سے آدمی کے رہن و اخلاق متاثر ہونے کا نہ صرف اندیشہ ہوتا ہے، بلکہ صورت حال یہ دیکھی گئی ہے کہ وہاں رہنے سے دینی حمیت کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے آدمی پگھل جاتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"والمشابهة والمشاركة في الأمور الظاهرة، توجب مشابهة ومشاكلة في الأمور الباطنة على وجه المسارقة والتدريج الخفي، وقد رأينا اليهود والنصارى الذين عاشروا المسلمين هم أقل كفراً من غيرهم. كما رأينا المسلمين الذين أكثروا من معاشرة اليهود والنصارى هم أقل إيماناً من غيرهم ممن جرّد الإسلام" (اقتضاء الصراط المستقيم ۱/۴۸۸، كتاب الاعياد ط: مكتبة الرشيد الرياض)۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے، چناں چہ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله" (ابو داؤد: كتاب الجهاد باب الإقامة بأرض الشرك)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "عن جرير بن عبد الله قال قال (رسول الله ﷺ): أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله! لم؟ قال: لا ترائى ناراهما" (ابوداؤد كتاب الجهاد، باب النهي عن قتل من المتصم بالسجود)۔ قال ابن قدامة: ومعناه لا يكون بموضع يرى نارهم ويرون ناره إذا أوقدت" (المغني ۱۳/۱۵۱، ط: دار عالم الكتب الرياض)۔

مراسیل ابی داؤد میں حضرت مکحول سے مروی ہے کہ اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو (مراسیل ابی داؤد)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے: حصول مال کی غرض سے مسلمانوں کا دار الحرب میں سکونت اختیار کرنے اور ان کی جماعت و تعداد میں اضافہ کرنے سے دین خطرے میں پڑ جاتا ہے، اور یہ ایسا سبب ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوتی ہے، کیوں کہ ایسا آدمی جھوٹی گواہی دینے میں نہیں جھجکتا۔

"وفي شرح أدب القاضي للشهيد حسام الدين: أسباب الجرح كثيرة: منها ركوب بحر الهند، لأنه مخاطرة بنفسه ودينه من سكنى دار الحرب، وتكثير سوادهم وعددهم، لأجل المال ومثله لا يبالي بشهادة الزور" (تكملة البحر الرائق ۷/۱۵۱، كتاب الشهادات، باب من تقبل شهادته ومن لا تقبل)۔

اور یہ بات محقق و مسلم ہے کہ عدالت گناہ کے کام سے مجروح ہوتی ہے۔

(۵) حرام: بعض صورت میں غیر مسلم ممالک میں رہنا حرام ہے، اس کو حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے، یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت دار الاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے، یا اپنی پوری عملی زندگی بود و باش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے۔ ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں" (فقہی مقالات ۱/۲۳۵)۔

آخر میں علامہ ابن عثیمین کا فتویٰ نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

"الإقامة فی بلاد الكفار خطر عظيم على دين المسلم وأخلاقه وسلوكه وآدابه وقد شاهدنا وعبرنا انحراف كثير ممن أقاموا هناك، فرجعوا بغير ما ذهبوا به، رجعوا فساقاً، وبعضهم يرجع مرتداً عن دينه وكافراً به وبسائر الأديان والعياذ بالله، حتى صاروا إلى الجحود المطلق، والاستهزاء بالدين وأهله السابقين منهم واللاحقين. و لهذا كان ينبغي؛ بل يتعين التحفظ من ذلك ووضع الشروط التي تمنع من الهوى فی تلك المهالك. فالإقامة فی بلاد الكفر لا بد فيها من شرطين أساسيين:

الشرط الأول: أمن المقيم على دينه بحيث يكون عنده من العلم والإيمان وقوة العزيمة ما يطمئنه على الثبات على دينه، والحذر من الانحراف والزيغ وأن يكون مضمراً لعداوة الكافرين وبغضهم مبتعداً عن موالاتهم ومحبتهم مما ينافي الإيمان"۔

الشرط الثاني: أن يتمكن من إظهار دينه بحيث يقوم بشعائر الإسلام بدون مانع، فلا يمنع من إقامة الصلاة والجمعة والجماعات إن كان معه من يصلي جماعة ومن يقيم الجمعة ولا يمنع من الزكاة والصيام والحج وغيرها من شعائر الدين، وإن كان لا يتمكن من ذلك لم تجز الإقامة لوجوب الهجرة حينئذ" (الفتاوی الشرعیه فی المسائل العصرية من فتاوى علماء البلد الحرام: ۹۳۴، أحكام الكفار، الإقامة فی بلاد الكفار)۔

۴۔ بعض حضرات نے مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتاب فقہی مقالات (جلد اول) سے یہ تحریر بھی بطور دلیل پیش کی ہے:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک میں اس ملک کے باشندے اور شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کے اغراض و مقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے اور وہاں رائج شدہ منکرات و فواحشات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی حالات سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں؛ حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہوجائے، ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے تو مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے، جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی؛ بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو؛ چنانچہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے:

"هو الذی جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه، وإليه النشور" (سورۂ ملک: ۱۵)۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا، اس نیت سے وہاں

رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے؛ بلکہ موجب اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی اور جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی (مقالہ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، قاضی محمد حسن ندوی)۔

(۴) اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلا ضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں، ان میں دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ "سنن ابوداود" میں حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله" (جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے) (ابوداود: کتاب الضحایا)۔

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله! لم؟ قال: لا ترآى ناراهما" (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، تم یہ امتیاز نہیں کرسکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے)۔

امام خطابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے، چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہوسکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دار الاسلام اور دار الکفر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کردیا ہے، لہذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے کہ یہ بھی انہیں میں سے ہیں، علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دار الکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے (معالم السنن للخطابی ۳/۴۳۷)۔

اور مراسیل ابوداود عن المکحول میں روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو" (تہذیب السنن لابن قیم ۴۳۷/۳)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمان کا دار الحرب میں رہائش اختیار کرنا، اور ان کی تعداد میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوجاتی ہے (تکملہ رد المحتار ۱/۱۰۱)۔

۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت کو دار الاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود وباش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (فقہی مقالات: مقالہ: مغربی ممالک کے چند جدید فقہی مسائل ۱/۲۲۳-۲۲۵) (مقالہ: مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا قمر الزماں ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا محمد مصطفی قاسمی)۔

☆ جبکہ مولانا محمد مصطفی قاسمی نے شہریت اختیار کرنے والوں کے اغراض ومقاصد کے تنوع کو بنیاد بنا کر شہریت کے احکام کو بیان کیا ہے۔ پانچ اقسام تو وہی ہیں جو اوپر فقہی مقالات کے حوالہ سے بیان ہوئے، مزید کا اضافہ آپ نے کیا ہے، لکھتے ہیں: اسی طرح اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرتا ہے حالانکہ خود اس کے ملک اور شہر میں وافر مقدار میں تعلیمی وسائل حاصل ہیں، ایسی صورت حال میں وہ کسی غیر مسلم ملک میں تعلیمی مشن کی تکمیل کے لئے رہائش کرتا ہے تو ایسی رہائش اختیار کرنا اس کے لئے زہر ہلاہل ثابت ہوگی، شرعی نقطہ نظر سے مطلقا اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا حرام ہوگا۔

مفتی جعفر ملی رحمانی نے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کو چند شرطوں کے ساتھ مقید کیا ہے:

۱۔ غیر مسلم ممالک یا شہروں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص احکام اسلام پر مکمل کاربند رہے۔ ''یا أیها الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطان'' (البقرہ: ۲۰۸)۔

۲۔ وہاں مروجہ منکرات ومحظورات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھے۔ ''إن الله یأمر بالعدل والإحسان وإیتاء ذی القربی وینهی عن الفحشاء والمنکر والبغی'' (النحل: ۹۰)۔

۳۔ اس کے پاس دینی وشرعی علم اتنا ہو کہ جس سے وہ احکام اسلام سے متعلق پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دفع کرسکتا ہو۔

۴۔ اس کے پاس اتنا تقوی ودیانت ہو جو اسے سہولت سے روک سکے۔ ''شرط علی المسافر إلی تلك البلاد أن یکون عنده علم یدفع به الشبهات، ودین یمنعه الشهوات، وأن یکون محتاجاً إلی ذلك السفر'' (مجموع الثمین للعثیمین، ص ۵۰)۔

۵۔ ایسے ملک کی شہریت اختیار کرے جو اسے فوج میں داخلہ، مسلمانوں کے خلاف جنگ اور غیر اسلامی امور کی انجام دہی پر مجبور نہ کرے۔ ''إن کان المسلم المسافر إلی بلاد الکفار یقدر علی إظهار دینه ولا یخاف من الفتنة فیه، ولا یوالی المشرکین، فهذا یجوز له السفر، کما فعل بعض الصحابة رضی الله عنهم کأبی بکر الصدیق رضی الله عنه فقد سافر إلی بلدان المشرکین للتجارة، ولم ینکر علیه النبی ﷺ، وکما صرح بذلك العلماء أن القادر علی إظهار دینه فی دیار الکفار فلا بأس بإقامته فیها، وهذا یدل علی أن من سافر إلیها لغرض وقدر علی إظهار دینه جاز له ذلك'' (اختلاف الدین وآثاره فی أحکام الشریعة الإسلامیة، ص ۱۷۰)۔

☆ لیکن مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا اس سلسلہ میں کہنا ہے کہ ملکوں کی صورتحال کے اعتبار سے وہاں کی شہریت کے احکام میں اختلاف ہوگا، وہ لکھتے ہیں:

(۱) پہلی قسم ان غیر مسلم ممالک کی ہے جن کی صورتحال مکی زندگی کے مشابہ ہو، یعنی وہاں دین وایمان محفوظ نہ رہے، مگر ہجرت پر قدرت بھی ہو، تو ایسے وقت دوسرے ملک جانا خواہ وہ غیر مسلم ملک ہی کیوں نہ ہو، واجب ہوگا، قرآن کریم نے ان لوگوں کو ڈانٹ پلائی ہے جنہوں نے ہجرت کی قدرت کے باوجود ہجرت نہیں کی، اور قتل ہو گئے۔

''إن الذین توفاهم الملائکة ظالمی أنفسهم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الأرض، قالوا ألم تکن أرض الله واسعة فتهاجروا فیها، فأولئك مأواهم جهنم وساءت مصیرا'' (نساء: ۷۹)۔

البتہ بمصلحت قیام کرے تو حرج نہیں ہوگا، جیسا کہ حضرت عباس نے بمصلحت تاخیر سے ہجرت کی۔

(۲) دوسری صورت حال یہ ہے کہ ملک میں امن وامان نہیں، دین وایمان کو ہر لحظہ خطرہ، مگر ہجرت کی قدرت بھی نہیں تو ایسی صورت میں اس ملک میں رہنے میں گناہ نہیں ہے، قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت میں استثناء موجود ہے:

''إلا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلة ولا یهتدون سبیلا فأولئك عسی الله أن یعفو عنهم وکان الله عفوا غفورا'' (نساء: ۹۹، ۹۸)۔

(۳) تیسری قسم ان ملکوں کی ہے جو ہیں غیر مسلم ملک، مگر کسی مسلمان کا وہاں رہنا بحیثیت اقلیت بھی مضر نہیں ہے، بلکہ دین وایمان اور جان ومال ہر ایک کو تحفظ

حاصل ہے، جیسا کہ آج غیر مسلم ملکوں کی صورتحال ہے، اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ان ممالک میں زیادہ مواقع ہیں کہ مسلمان ترقی کرے۔ ایسے ملکوں میں رہنے کے سلسلے میں دو نظریے ہیں:

(۱) حضرت امام مالک کے نزدیک ایسے ملکوں میں رہنا جائز نہیں، خواہ دین پر عمل کرنا کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو، یہ تو غیر اسلامی قانون کو اپنے اوپر تھوپ لینا ہے۔

(۲) جبکہ دوسری رائے جمہور کی ہے، بالخصوص حنابلہ وحنفیہ کی کہ ایسے ملکوں میں رہنا جائز ہے۔

اختلاف کا منشا حدیثوں میں اختلاف ہے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا حکم منسوخ ہوگیا "لا ھجرۃ بعد الفتح" (بخاری ۱،۴۲۳)۔

اور بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا سلسلہ جاری ہے: "لا تنقطع الھجرۃ حتی تنقطع التوبۃ ولا تنقطع التوبۃ حتی تطلع الشمس من مغربھا" (ابوداؤد ۱،۳۳۶)۔

البتہ دوسری قسم کی حدیثیں ایسی حالت پر محمول ہیں کہ جب دین وایمان محفوظ نہ ہو، یا ایسے ملکوں پر محمول ہیں جو قبل الفتح مکہ کے نقش قدم پر ہوں۔

جبکہ امام مالکؒ دوسری قسم کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہر وہ ملک جو غیر مسلم اقتدار کے ماتحت ہے وہاں رہنا یا وہاں کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں، بلکہ وہاں سے بھاگنا ضروری ہے، نیز ترمذی کی روایت جو سابق میں گذر چکی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلموں کے ساتھ رہنے والے سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔

بیہقی کی روایت میں صاف طور پر منع کیا گیا ہے: "لا تساکنوا المشرکین ولا تجامعوھم، فمن ساکنھم أو جامعھم فھو مثلھم" (بیہقی ۹،۱۸، کتاب السیر، باب الرخصہ فی الاقامہ بدار المشرك)۔

ترمذی کی روایت اور بیہقی کی روایت دونوں ہی متکلم فیہ ہیں، اگر اس سے اعراض بھی کیا جائے تو یہ جمہور کے نزدیک انہی ممالک پر محمول ہیں جہاں فتنہ کا خوف ہو۔

امام مالکؒ کی عقلی دلیل کہ غیر اسلامی قانون کو اپنے اوپر تھوپ لینا ہے، اس کی معنویت اس دور میں ختم ہوگئی ہے، غیر مسلم ملکوں میں دین وشریعت پر عمل کرنے والے جس قدر آزاد ہیں، خدا معاف کرے اسلامی ملکوں میں بسنے والے اسی قدر گھٹن محسوس کرتے ہیں، غیر مسلم ملکوں میں آج کوئی رکاوٹ نہیں ہے، آج ان ممالک کی مثال حبشہ جیسی ہے، جس طرح حبشہ کی سکونت میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا تھا، اسی طرح ان ملکوں میں سکونت بھی جائز ہونی چاہئے۔

☆ مولانا نور احمد عینی قاسمی نے اس میں دو قسم کے ممالک کا اضافہ کر کے لکھا ہے کہ اسرائیل کی شہریت اختیار کرنا اور ٹھیٹھ قسم کے دار الحرب میں جہاں دین پر عمل کرنا دشوار ترین ہو تو ایسے ممالک کی شہریت اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کی ہے، ملکوں کی صورتحال اور احکام کی نوعیت میں فرق کے اعتبار سے تفصیلات پیش کی ہیں، مولانا محمد فخر عالم نعمانی نے اس کا خلاصہ پیش کیا ہے جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

فقہاء نے غیر مسلم ملکوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور ان تینوں کے الگ الگ احکام بیان کئے ہیں:

ا۔ پہلی قسم ان غیر مسلم ممالک کی ہے جہاں بحیثیت مسلمان کسی شخص کا قیام سخت مشکل ہو، دین پر قائم رہ کر وہاں رہنا ممکن نہ ہو۔ ایسے ملکوں میں جانا وہاں قیام کرنا باتفاق فقہاء کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۳/۲۲۸، المدونۃ الکبری ۵/۱۵۶۵، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل ص:۱۶، قاموس الفقہ ۵/۳۳۳)۔

۲۔ دوسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے جہاں کھل کر دین پر عمل کرنے کی آزادی نہ ہو، جان ومال عزت وآبرو پر خطرات کے بادل منڈلاتے رہتے ہوں مگر مسلمانوں کے لئے کوئی دوسری جائے ہجرت نہ ہو یا ہجرت کے اخراجات کے متحمل نہ ہوں، ایسے مسلمانوں پر باتفاق فقہاء ہجرت واجب نہیں ہے اور ان ملکوں میں اقامت ان کے لئے باعث گناہ نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۳/۲۲۸، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل ص:۱۷، قاموس الفقہ ۵/۳۳۳)۔

۳۔ تیسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے، جہاں مسلمانوں کے لئے بحیثیت ایک اقلیت کوئی خطرہ نہ ہو، مذہبی آزادی حاصل ہو، اس کے یا اس کی نسلوں کے دین وایمان کو مکمل تحفظ فراہم ہو۔ ایسے ملکوں میں اقامت اختیار کرنے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۱) ایک رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایسے ملکوں میں جانا یا رہنا بھی جائز نہیں، اگر قدرت میسر ہو تو مقیم مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے، یہ رائے فقہائے مالکیہ کی ہے اور شافعیہ کا ایک قول بھی اسی کے مطابق ملتا ہے (المدونۃ الکبری ۵/ ۱۵۶۵)۔

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ ایسے ملکوں میں جانا قیام کرنا درست ہے اور مقیم مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے، یہ رائے حنفیہ اور حنابلہ کی ہے اور شافعیہ کا صحیح مسلک بھی یہی ہے (احکام القرآن للجصاص ۲/ ۳۰۵، اعلاء السنن للتھانوی ۱۲/ ۳۶۱)۔ دور حاضر کے علماء کی بھی نظریات مختلف ہیں: (۱) علماء کا ایک طبقہ عدم جواز کا قائل ہے، (۲) اور دوسرا طبقہ جواز کا قائل ہے۔

عدم جواز کے قائلین کی دو رائیں ہیں:

الف۔ ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے اور ایسے تمام حضرات پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کا قائل ہے جو غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں (فتاوی الامام محمد رشید رضا ۵/ ۱۷۵۰)۔

ب۔ دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا، بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے (مجلۃ الفقہ الاسلامی ۲/ ۱۱۵۶)۔

پھر جواز کے قائلین میں بھی دو نقطۂ نظر ہیں:

الف۔ ایک کی رائے یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بوقت ضرورت ہے۔ عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی رکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے۔ مصری دار الافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتوی دیا ہے (فتوی نمبر: ۸۸۹، ۲۰۰۰ء)۔

ب۔ دوسری رائے اصلاً جواز کا ہے۔ البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے، عصر حاضر کے جمہور علماء کی رائے یہی ہے۔ اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہ ہیں:

ڈاکٹر یوسف القرضاوی (ان کا فتوی ویب سائٹ پر موجود ہے)، ڈاکٹر محمد رأفت عثمانی عمید الکلیۃ الشرعیۃ جامعۃ ازہر، ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی (فقہ الاقلیات المسلمہ ص: ۶۰۹)۔ مفتی محمد تقی عثمانی (بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ ص: ۳۲۰)۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (قاموس الفقہ ۵/ ۳۳۴) وغیرہ۔

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جو حضرات عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے موقف کی درج ذیل دلیلیں ہیں:

۱۔ ''ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالاً بعيداً'' (سورہ نساء: ۶۰)۔

طاغوت سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔ غیر مسلم ملک میں شہریت حاصل کرنا گویا با اختیار اسلامی نظام قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف ہے (فتاوی محمد رشید رضا مصری ۵/ ۱۷۵۵)۔

۲۔ ''ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين'' (آل عمران: ۸۵)۔

جو حضرات اسلامی مملکت سے نکل کر غیر اسلامی مملکت میں قیام پذیر ہیں یا قیام کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں۔

۳۔ بعض احادیث سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے جن میں صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان اقامت وسکونت سے منع کیا گیا ہے: ''لا تساكنوا المشركين ولا تجامعوهم فمن يساكنهم أو جامعهم فهو مثلهم'' (ترمذی باب ما جاء في كراهية المقام كتاب السير ۹،۲۸۹)۔

۴۔ ''أنا بريئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين'' (ترمذی كتاب السير باب ما جاء في كراهية المقام بين أظهر المشركين ۱،۲۸۹)

جب غیر اسلامی ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو ان ملکوں کے چھوڑ دینے کا حکم دیا جا رہا ہے تو مسلم ملکوں سے منتقل ہو کر وہاں جانے کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟

ایک عقلی استدلال یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کے غیر اسلامی ملک میں جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ کو اسلامی قوانین کے سایہ سے نکال کر غیر اسلامی قوانین کے لئے پیش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی صاحب ایمان کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی (مقدمات ابن رشد مع المدونۃ الکبری ۹/ ۱۵۹، ۳، المدونۃ الکبری

الامام المالک ۱۵۶۵/۵)۔

قائلین جواز کے دلائل:

جمہور علماء کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے، مثلاً:

۱۔ ''هو الذی أرسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون'' (سورہ توبہ: ۳۳)۔

۲۔ ''وما أرسلناك إلا کافة للناس بشیراً ونذیراً ولکن أکثر الناس لا یعلمون'' (سورہ سبا: ۲۸)۔

۳۔ ''ادع إلی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن'' (النحل: ۱۲۵)۔

۴۔ ''قل هذه سبیلی أدعو إلی الله علی بصیرة أنا ومن اتبعنی'' (یوسف: ۱۰۸)۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دنیا کے ہر خطے میں پہنچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر اسلامی ملکوں میں جائیں اور اسلام کی دعوت چار دانگ عالم میں پہنچائیں۔ صحابہ کرام کا عمل ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے کہ انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا وہاں قیام کیا اور دین کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔

قول راجح:

مذکورہ مباحث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور کا موقف ہی زیادہ مضبوط اور لائق ترجیح ہے۔ کیونکہ اب غیر اسلامی ممالک کی صورت حال بدل گئی ہے، آج ان ممالک میں فکر وعقیدہ اور اظہار وخیالات ونظریات کی آزادی ہے۔

اگر عدم جواز کی رائے مان بھی لی جائے تو اس کو استعماری دور پر محمول کیا جائے گا جب کہ غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحب ایمان کا داخلہ مشکل تھا اور اس کو ارتداد کے مترادف مانا جاتا تھا، اب وہ صورت حال باقی نہیں، آج وہاں اسلامی ادارے، دینی تحریکات وتنظیمات کی خاصی تعداد خدمت دین میں مصروف ہے اور ان کے لئے کوئی قانونی یا سیاسی رکاوٹ نہیں ہے، اس لئے آج ان ممالک میں نہ اسلام کے لئے کوئی خطرہ ہے اور نہ مسلمانوں کے لئے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کے وہاں داخلہ یا اقامت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

معاشی وطبی مقاصد کے لئے غیر مسلم ملک کی سکونت اختیار کرنا:

اس کی کئی صورتیں ہیں:

الف۔ اپنے ملک میں معاش کی بنیادی وسائل میسر نہ ہوں اس کی وجہ سے کوئی مسلمان غیر مسلم ملک چلا جائے اور وہاں اقامت کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے (المبسوط للسرخسی ۸۸/۱۰، احکام القرآن للعربی ۵۱۵/۱)۔

ب۔ بنیادی وسائل معاش اپنے ملک میں میسر ہوں جس سے زندگی گذر بسر ہوسکتی ہو، مگر اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے کسی غیر مسلم میں ملک میں قیام کرے تو اس کی بھی گنجائش ہے (احکام القرآن لابن العربی ۴۸۶/۱، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۳۵۱/۵)۔

ج۔ تجارتی مقاصد کے تحت غیر اسلامی ملکوں میں قیام کیا جائے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بھی جائز ہے (المبسوط للسرخسی ۸۸/۱۰)۔ بعض اماموں کے نزدیک دنیوی اغراض کے لئے غیر اسلامی ملک میں قیام جائز نہیں ہے (مقدمات ابن رشد ۳۱۵۹/۹)۔

د۔ اگر کسی مرض کا مناسب علاج مسلم ملک میں میسر نہ ہو تو اس کے لئے غیر مسلم ملک کا سفر کرنا اور صحت کے لئے وہاں قیام کرنا جائز ہے (فتاوی ورسائل للمسافرین علماء کی ایک جماعت، ص: ۳۹)۔

بعض مقالہ نگار حضرات کا کہنا ہے کہ ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا درست نہیں ہے، مختلف حضرات نے مختلف وجوہات بیان کی ہیں، مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب مطلقاً اجازت نہیں دیتے ہیں، البتہ بغیر شہریت اختیار کئے ہوئے صرف غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔ مولانا خورشید انور اعظمی صاحب نے صرف تبلیغ دین اور مصالح مسلمین کی خاطر غیر مسلم ملک میں قیام کی اجازت دی ہے، اور تجارت کی خاطر وہاں صرف

جانے کی اجازت دیتے ہیں اقامت کی نہیں، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ اور سعید بن زیدؓ وغیرہم نے تجارتی سفر کیا تھا۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے شہریت اختیار نہ کرنے کے وجوہات میں لکھا ہے کہ غیر مسلم ملک میں ایمان پر ڈاکہ ڈالنے والے امور موجود ہوتے ہیں، برائیوں، شرور وفتن کا دور دورہ ہوتا ہے، اسلامی تشخص کا تحفظ دشوار ہوجاتا ہے، حلال وحرام کے درمیان تمیز آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے، کفار ومشرکین کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے، قرآن کریم نے کفار ومشرکین کے ساتھ ایسی دوستی کو مذموم قرار دیا ہے، جو اسلام کے مصالح کے خلاف ہو۔

۱۔ ''يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا آبائكم وإخوانكم أولياء إن استحبوا الكفر على الإيمان، ومن يتولهم منكم فأولئك هم الظالمون'' (التوبہ: ۲۳)۔

۲۔ ''الذين يتخذون الكافرين أولياء من دون المؤمنين أيبتغون عندهم العزة فإن العزة لله جميعا. وقد نزل عليكم فى الكتاب أن إذا سمعتم آيات الله يكفر بها ويستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا فى حديث غيره إنكم إذا مثلهم إن الله جامع المنافقين والكافرين فى جهنم جميعا'' (النساء: ۱۳۹-۱۴۰)۔

۳۔ من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله (ابوداؤد، حدیث: ۲۷۸۷) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۴۔ ''أنا بريئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله! لم؟ قال: لا ترا ئى ناراهما'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۶۴۵) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۵۔ ابن رشد (الجد) لکھتے ہیں: ''فكيف يباح لأحد الدخول إلا بلادهم، حيث تجرى عليه أحكامهم فى تجارة أو غيرها، وقد كره مالك رحمه الله تعالى أن يسكن أحد ببلد يسب فيه السلف، فكيف ببلد يكفر فيه الرحمن، وتعبد فيه من دونه الأوثان، لا تستقر نفس أحد على هذا إلا وهو مسلم سوء مريض الإيمان'' (المقدمات الممهدات ۲/۱۵۲)۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب نے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کو بعض وجوہ سے ناجائز اور حرام لکھا ہے، ان کا خیال ہے اور یہی رجحان مفتی ابوبکر قاسمی کا بھی ہے کہ یہ مرادف ہے غیر مسلموں کے ساتھ محبت وموالاۃ کو اور اس کے شریعت مخالف قوانین کے تسلیم کرلینے کو، قرآن میں اس کی ممانعت وارد ہے۔

۱۔ ''لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين، ومن يفعل ذلك فليس من الله فى شئ إلا أن تتقوا منهم تقاة ويحذركم الله نفسه وإلى الله المصير'' (آل عمران: ۲۸)۔

۲۔ ''يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا الكافرين أولياء من دون المؤمنين أتريدون أن تجعلوا لله عليكم سلطانا مبينا'' (النساء: ۱۴۴)۔

۳۔ ''يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض، ومن يتولهم منكم فإنه منهم إن الله لا يهدى القوم الظالمين'' (المائدہ: ۵۱)۔

۴۔ ''فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم'' (النساء: ۶۵)۔

اخیر میں مولانا موصوف یہ لکھتے ہیں کہ دونوں رجحانات یعنی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے اور نہ کرنے کے مآخذ ودلائل کے پیش نظر ایک رجحان یہ بھی سامنے آتا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اگر مسلمان کو کسی مسلم ملک کی سکونت میسر ہو تو بلا وجہ شرعی یا ضرورت شدیدہ کسی غیر مسلم ملک کی سکونت اختیار نہ کرے۔

بہر حال بدرجہ مجبوری غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کی جاسکتی ہے، لیکن مولانا محمد تو قیر بدر قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی وغیرہ کے بقول محض معاشی فوائد اور خوشحال زندگی کی خاطر ایک مسلمان کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا درست اور مناسب نہیں ہے۔ ان حضرات کی دلیل ہے:

۱۔ ''قال النبی ﷺ: ألا إنى بريء من كل مسلم مع مشرك'' (مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰/۲۸۶)۔

لیکن مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کی رائے یہ ہے کہ اگر اس کے ملک میں معاشی وسائل مفقود ہوں کہ ضروریات زندگی بھی میسر نہیں ہو پا رہی ہو تو اس کے لئے دینی شعائر کی حفاظ کے ساتھ اجازت ہے، کیونکہ کسب معاش فرض کے بعد دوسرا فریضہ ہے، ''هو الذى جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور'' (ملک:۱۵)۔

مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی نے بھی معاشی فوائد کی خاطر غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت اسی وقت دی ہے جبکہ دین وایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو، اور مسلم ملک میں عزت وآبرو کے ساتھ معاشی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، اور یہ شرط بھی لگائی کہ شہریت اختیار کرنے والا اپنے داعیانہ کردار کو فراموش نہ کرے، ''أم كنتم شهداء إذ حضر يعقوب الموت، إذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدى، قالوا نعبد إلهك وإله آبائك إبراهيم وإسماعيل وإسحاق إلها واحدا ونحن له مسلمون'' (بقرہ:۱۳۳)۔

۷۔ کسی مسلم ملک کا غیر مسلموں کو شہریت دینا:

سوال نمبر: ۷۔ کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ مکہ ومدینہ کو چھوڑ کر کسی بھی مسلم ملک میں غیر مسلموں کو آباد کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کو شہریت دینے میں قومی، ملی اور ملکی مصالح کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

۱۔ ''ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد النبى رسول الله على أموالهم وأنفسهم وملتهم وغائبتهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير لا يغير أسقف من أسقفيته ولا راهب من رهبانيته'' (الطبقات الكبرى لابن سعد ۲،۳۶، الوثائق السياسية للعهد النبوى ۱۴۰) (مقالہ مولانا محمد سلمان منصور پوری)۔

۲۔ ''جمهور الفقهاء على أن عقد الذمة مع غير المسلمين يتولى إبرامه الإمام أو نائبه، لأن ذلك يتعلق بنظر الإمام وما يراه من المصلحة'' (موسوعہ فقہیہ ۷،۱۲۲) (مقالہ مولانا محمد سلمان منصور پوری)۔

۳۔ ''وقال الحنفية وهو رواية عند المالكية ورواية عن أحمد يجوز عقد الذمة لجميع الكفار إلا عبدة الأوثان من العرب'' (موسوعہ فقہیہ ۷،۱۲۴) (مقالہ مولانا نازبیر احمد قاسمی)۔

۴۔ ''عن عمرو بن ميمون قال: وأصيه بذمة الله وذمة رسوله أن يؤفى لهم بعهدهم وأن يقاتل من ورائهم ولا يكلفوا إلا طاقتهم'' (بخاری ۱،۴۲۹) (مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

مفتی سعید اسعد قاسمی اور مولانا محمد توقیر بدر قاسمی نے مکہ اور مدینہ کے ساتھ ساتھ یمامہ کو بھی شامل کیا ہے کہ یہ علاقے چھوڑ کر ہی غیر مسلم کو آباد کیا جا سکتا ہے، کہ قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔ ''لاينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فى الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين'' (ممتحنہ:۸)۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ کا کہنا ہے کہ خلافت راشدہ، خلافت امویہ، خلافت عباسیہ اور خلافت عثمانیہ کے تمام ہی ادوار میں غیر مسلموں کو اسلامی سلطنت میں مستقل شہری کی حیثیت سے رہائش کی اجازت رہی ہے، خواہ جزیہ لے کر ہو یا بغیر جزیہ کے۔

☆ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی اور ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کے بقول جزیرۃ العرب کے علاوہ علاقوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا۔ ''وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلك بأنهم قوم لايعلمون'' (توبہ:۶)۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور ڈاکٹر مولانا ظفر الاسلام صدیقی اور مولانا نثار احمد حصیر قاسمی کہتے ہیں کہ اگر اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا تقاضا ہو تو چند غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کیا جا سکتا ہے، ''والأصل فيه أن الحربى لا يمكن من إقامة دائمة فى دارنا إلا بالاسترقاق

أو الجزية، لأنه يصير عينا لهم وعونا علينا فيلحق المضرة بالمسلمين'' (ہدایہ مع البنایہ ۷،۲۰۷)۔

☆ قاضی محمد حسن ندوی لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کو مسلم معاشرہ میں آباد کرنے میں دو صورتیں پیدا ہوں گی، ایک اعتبار سے منفعت ہے کہ اسلامی تعلیمات و اخلاق کی تبلیغ آسان ہوگی، دوسری صورت میں مضرت ہے کہ غیر اسلامی تہذیب سے مسلمانوں کا متاثر ہونا لازم آئے گا، لہذا غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی سے ہٹ کر علاحدہ جگہ میں آباد کرنے کی اجازت ہوگی تاکہ مسلمان ان کی تہذیب سے متاثر نہ ہوں، اور ان کی مدد کرنے میں اور ان کو دین اسلام سے قریب کرنے میں سہولت بھی ہو۔ اور بقول مفتی ثناء الہدی قاسمی اور مولانا محمد توقیر بدر قاسمی کا بھی یہی رجحان ہے کہ یہ امت دعوت ہیں اور مسلمانوں کی قربت سے ان کے حق قبول کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور یہ صلہ رحمی کی تعلیمات کے عین مطابق بھی ہے۔

☆ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا کہنا ہے کہ غیر مسلموں کو دو شرطوں کے ساتھ مسلم ملک میں مستقل سکونت کی اجازت دی جا سکتی ہے، ان دونوں شرطوں کے بارے میں ابن قدامہ لکھتے ہیں: ''لا يجوز عقد الذمة المؤبدة إلا بشرطين: أحدهما: أن يلتزموا إعطاء الجزية في كل حول، والثاني: التزام أحكام الإسلام وهو قبول ما يحكم به عليهم من أداء حق أو ترك محرم لقول الله تعالى: حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون، وقول النبي ﷺ في حديث بريدة: فادعهم إلى أداء الجزية، فإن أجابوك فاقبل منهم وكف عنهم'' (المغنی لابن قدامہ ۱۰،۵۶۳) ''ترك الكافر في دار الإسلام بالجزية جائز'' (تاتارخانیہ ۱،۲۵۶)۔

☆ مولانا احمد نور عینی قاسمی نے غیر مسلموں کو آباد کرنے کو درست تو قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تین باتوں کو پیش نظر رکھنے پر زور دیا ہے۔

۱۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''أخرجوا المشركين من جزيرة العرب'' (بخاری، حدیث: ۳۱۶۸) اور ''لا يجتمع دينان في جزيرة العرب'' (موطا امام مالک، حدیث نمبر: ۱۶۷)، ان کو شہریت دینے کے سلسلہ میں ان احادیث کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔

۲۔ استعمار کی [illegible] تاریخ پیش نظر رہنی چاہئے، اور استعماری عناصر کو شہریت دینے کے سلسلہ میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ غیر مسلموں کو آباد کرنے کے سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ کہیں ان کی بڑھتی تعداد مسلم مملکت کے لئے خطرہ کا باعث نہ ہو اور وہ اپنی کثیر تعداد کی وجہ سے ووٹ کی طاقت کے ذریعہ اسلامی مملکت کی بیخ کنی کر دیں، یا بغاوت کر کے اپنی الگ مملکت قائم کر لیں۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا محمد فخر عالم نعمانی نے حرم وحجاز کے علاوہ علاقوں میں غیر مسلموں کو آباد کرنے کو چند باتوں کے ساتھ مشروط کیا ہے، جن کی تعمیل غیر مسلموں کے لئے ضروری ہوگی۔

۱۔ کتاب الہی کا احترام کریں، اور اس کے بارے میں کسی طعن وتحریف کا تذکرہ نہ کریں، ۲۔ ناموس رسالت میں کوئی بے ادبی نہ ہو، ۳۔ دین اسلام کی تحقیر نہ کریں، ۴۔ کسی مسلم خاتون کی عصمت وعفت کو داغدار نہ کریں، ۵۔ کسی مسلمان کو دینی یا مالی فتنہ میں مبتلا نہ کریں، ۶۔ اہل حرب کی مدد اور ان کے لئے جاسوسی نہ کریں، ۷۔ مسلمانوں کے شہر میں علی الاعلان شراب وخنزیر فروخت نہ کریں، ۸۔ کھلم کھلا فواحش کا اظہار وارتکاب نہ کریں (الأحکام السلطانیہ للماوردی ر۱۴۵)۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی کا کہنا ہے کہ ایسا غیر مسلم جو مرتد نہ ہوا سے حجاز کے علاوہ میں شہریت دینا جائز ہوگا، موصوف کا کہنا ہے کہ یہود ونصاری اور مجوسیوں سے عقد ذمہ کیا جا سکتا ہے، لیکن مشرکین عرب اور مرتدین سے عقد ذمہ کرنا جائز نہ ہوگا۔

مفتی اشرف عباس قاسمی اور مولانا ریحان مبشر قاسمی وغیرہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کو عہدے اور مناصب بھی دیے جا سکتے ہیں کہ اس کی مثالیں عہد خلفائے راشدین، عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس اور بعد کے ادوار میں ملتی ہیں، ایک مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ ''ہمیں بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم اسلامی تاریخ میں غیر مسلموں کو حکومت کے مناصب پر دیکھتے ہیں'' (احکام الذمیین ۷۹)، اسی طرح مشہور مؤرخ آدم میز نے لکھا ہے کہ ''من الأمور التي تعجب لها كثرة عدد العمال والولاة وكبار المؤظفين والمتصرفين غير المسلمين في الدولة الاسلامية فكأن النصارى هم الذين يحكمون المسلمين في بلاد الاسلام'' (الحضارة الاسلامية ۱،۱۱۸)۔

مسلم ملک کی شہریت نہ دینا:

بعض مقالہ نگار حضرات نے غیر مسلموں کو مسلم ملک کی شہریت نہ دینے کو بہتر قرار دیا ہے، اور اس پر تو سبھی کا اتفاق ہے کہ حرم اور حجاز کے اطراف میں کسی غیر مسلم کو شہریت دی ہی نہیں جاسکتی، چونکہ قرآن میں ارشاد ہے: ''إنما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا'' (توبہ:۲۸)، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''أخرجوا المشركين من جزيرة العرب'' (بخاری، حدیث:۳۱۶۸)، ''لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب حتى لا أدع إلا مسلما'' (مسلم، حدیث نمبر:۴۶۹۳) ''لا يجتمع في أرض العرب دينان'' (مسند احمد ۶، ۲۵۷)۔

☆ حافظ کلیم اللہ عمری مدنی کا کہنا ہے کہ غیر مسلموں کو زیادہ سے زیادہ پناہ گزینوں کی طرح انسانی ہمدردی اور دعوتی نقطۂ نظر سے مسلم ملکوں میں وقتی طور پر پناہ دیا جاسکتا ہے۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب ان کو آباد کرنا اس لئے درست قرار نہیں دیتے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی آبادی میں بڑھ کر مسلم ملکوں میں بغاوت وفساد کی آگ بھڑکانا شروع کردیں گے اور اپنی آبادی کے بٹوارہ وعلاحدگی کے لئے مسلم ملکوں سے احتجاج شروع کردیں گے، اور جس خطہ میں ان کی آبادی غالب ہوگی اور مسلمان کم ہوں گے تو وہ مسلمانوں کو مارنا پیٹنا اور تنگ کرنا شروع کردیں گے۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی صاحب کے مطابق غیر مسلم کو جزیرۃ العرب میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ وہ جزیرۃ العرب کے علاوہ دوسرے مسلم ملکوں میں سکونت اختیار کرسکتا ہے، بخلاف أمصار المسلمين التي ليست في جزيرة العرب، يمكنون من سكناها ولا خلاف في ذلك (فتح القدیر ۵،۳۰۱)۔

☆ مفتی محمد اقبال ٹنکاروی صاحب کی رائے ہے کہ آج کل اسلام ومسلم دشمنی اور مسلمانوں سے عناد سے کوئی ناواقف نہیں ہے، ایسے میں کچھ جزوی حالات میں کڑی شرائط کے ساتھ آباد کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن انہیں حساس شعبے، لشکر، حکومتوں کے اعلی شعبے ومناصب وغیرہ میں ملازمتیں نہیں دی جائیں گی۔

☆ مفتی محمد ابوبکر قاسمی صاحب بالعموم یہ کہتے ہیں کہ مسلم ملکوں خصوصاً جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دے کر بسانا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔

☆ مولانا قمر الزماں ندوی لکھتے ہیں کہ سرزمین حجاز میں غیر مسلموں اور اہل کتاب کو مستقل یا عارضی شہری کی حیثیت سے آباد کرنا کسی حال میں درست نہیں ہے، اور دلیلوں کے ساتھ علامہ ابن باز کی یہ تحریر بھی بطور دلیل پیش کی ہے:

''لقد صح أن الرسول ﷺ قال: ''لا يجتمع في الجزيرة دينان'' وصح عنه ايضا أنه أمر بإخراج اليهود والنصارى من الجزيرة وأمر أن لا يبقى فيها إلا مسلم، وأوصى عند موته عليه الصلاة والسلام باخراج المشركين من الجزيرة. فهذا أمر ثابت عن رسول الله و وليس فيه شك، والواجب على الحكام أن ينفذوا هذه الوصية كما نفذها خليفة المسلمين عمر رضي الله عنه باخراج اليهود من خيبر واجلائهم''۔

موصوف پھر آگے لکھتے ہیں کہ عرب ملکوں میں ضرورت کی بنا پر ایسے ہی غیر مسلموں کو رہائش کی اجازت دی جائے جو مسلمانوں کے دشمن نہ ہوں یا ان سے برسر جنگ نہ ہوں، اور جب ان کو شہریت کی اجازت مل جائے تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ان میں دعوت وتبلیغ سے غافل نہ ہوں اور اسلام کے محاسن کو بیان کرنے سے پیچھے نہ رہیں (دیکھئے: مجموع فتاوی الشیخ ابن باز)۔

☆ مولانا محمد مصطفی قاسمی صاحب جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کو شہریت نہ دیئے جانے کے تمام دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح بخاری میں جمہور علماء کی رائے نقل کی ہے کہ جزیرۃ العرب میں صرف حجاز کے اندر مشرکوں کو داخل ہونے یا شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوگی، حجاز میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، حدیبیہ، یمامہ، طائف وغیرہ کے قرب وجواب کے تمام علاقے اس زمرہ میں شامل ہوں گے، ان کے علاوہ جزیرۃ العرب میں شمار ہونے والے دیگر مقامات کا یہ حکم نہیں ہوگا، کیونکہ علماء کا اتفاق ہے کہ یمن میں مشرکوں کا داخلہ ممنوع نہیں ہے، حالانکہ یمن بھی جزیرۃ العرب میں داخل ہے، حنفیہ کے نزدیک مسجد الحرام کے علاوہ حدود حرم کے دیگر مقامات میں داخلہ کی اجازت ہے، امام مالک کے نزدیک تجارت کی غرض سے حرم میں داخلہ کی اجازت

ہے، امام شافعی کے نزدیک حرم میں داخلہ کی اجازت بالکل نہیں ہے، ہاں اس صورت میں جب صرف مسلمانوں کی کوئی مصلحت وحکمت ہو تو اس کی رعایت و نصرت کے خیال سے حکومت کی اجازت ہی سے وہ داخل ہو سکتے ہیں (فتح الباری ۶/۱۹۷)۔

☆ مولانا عبید اللہ ندوی نے اس سوال کے جواب میں جو تفصیلات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

کفار کے حق میں مسلم ممالک کی تین اقسام ہیں:

الف۔ حرم پاک: تو کسی کافر کے لئے اس میں داخل ہونا کسی بھی حال میں درست نہیں، چاہے وہ ذمی ہو یا مستامن، ائمہ اربعہ میں سے امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اسی کے قائل ہیں، حتی کہ اگر دار الکفر سے کفار کا کوئی قاصد آئے اور امام المسلمین حرم میں ہو تو بھی اس کو دخول کی اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ امام المسلمین خود باہر تشریف لا کر یا اپنا نمائندہ اور قاصد بھیج کر اس کا پیغام سنیں گے۔

دلیل: ان حضرات ائمہ کی دلیل قرآن پاک کی آیت "إنما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام" (سورۂ توبہ: ۲۸) کا ظاہری مفہوم ہے۔

ائمہ حنفیہ کی دلیل بھی قرآن پاک کی یہی آیت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آیت کا دو مفہوم ہے:

الف۔ ممانعت ان مشرکین کے ساتھ خاص ہے جن کو دخول مکہ اور دیگر تمام مساجد میں دخول سے روک دیا گیا تھا، ذمہ نہ ہونے کی وجہ سے، اور ان سے اسلام اور قتال کے سوا کوئی چیز (ذمہ، جزیہ وغیرہ) قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ مشرکین عرب ہیں۔

ب۔ مشرکین کو حج کے لئے دخول مکہ سے روکا گیا ہے، یعنی کوئی کافر و مشرک حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہو سکتا، دلیل اس کی یہ ہے کہ:

۱۔ سن ۹ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اعلان کرایا گیا تھا: ''ألا لا يحج بعد العام مشرك ولا يطوفن بالبيت عريان'' (ترمذی: ۳۰۹۱) (سن لو! اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی کعبۃ اللہ کا برہنہ طواف کرے گا)، چنانچہ سن ۱۰ھ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع فرمایا تو وہاں کوئی مشرک موجود نہ تھا۔

۲۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اسی آیت کے آگلے حصہ میں ہے: ''وإن خفتم عيلة فسوف يغنيكم الله من فضله'' (سورۂ توبہ: ۲۸) سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حج کے لئے دخول ممنوع ہے۔

۳۔ آیت میں ''نجس'' سے مراد نجس اعتقادی ہے، چنانچہ ثقیف کا وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قیام کے لئے مسجد میں سائبان لگوا دیا تھا، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ نجس لوگ ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان لوگوں کی نجاست کا کچھ اثر زمین پر نہیں پڑتا ہے بلکہ ان کی نجاست کا اثر خود ان پر پڑتا ہے (بحوالہ ابحاث ہیئۃ کبار العلماء ۷/۵۳۲)۔

رہ گئی بات یہ کہ کافر اور ذمی کا استثناء کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کافر معاہد کا استثناء اس آیت کی وجہ سے ہے: ''إلا الذين عاهدتم من المشركين'' (التوبہ: ۴)۔

نیز حضرت ابو الزبیر فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہوئے سنا: ''فلا يقربوا المسجد إلا أن يكون عبداً أو واحداً من أهل الذمة'' (احکام القرآن ۴، ۲۷۹-۲۸۱)۔

۲۔ بلاد اسلام کی دوسری قسم حجاز مقدس یا جزیرۃ العرب ہے، اس کی حد بندی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس کی حد یمامہ، نجد، یمن اور مدینہ منورہ کے درمیان کا حصہ ہے، کلبی فرماتے ہیں کہ حجاز کی حد جبل طئی اور طریق عراق کے درمیان کا حصہ ہے، حربی فرماتے ہیں: تبوک بھی حجاز کا حصہ ہے (فقہ السنۃ ۳/۵۵، موسوعہ فقہیہ ۳/۱۲۶، ۱۲۷)، اب جزیرۃ العرب کو صرف تین حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے: ایک اس کے مغربی اور جنوبی ساحلوں کے پہاڑ اور ان کے ساحل و میدان، اس میں حجاز، تہامہ، عسیر، یمن، حضر موت، شحر مرہ وطفار، اور عمان شامل ہیں۔ دوسرے جزیرۃ العرب کے مختلف صحراء وریگستان اس میں صحراء الربع الخالی، الدہناء، النفوذ اور بادیۃ الشام شامل ہیں۔ تیسرے اس کی سطح مرتفع نیز اس کے مشرق میں واقع سواحل اور میدان، اس میں نجد (یمامہ، قصیم، جبال طئی) احساء، قطر، کویت اور بحرین شامل ہیں (جزیرۃ العرب ص ۲۶، ۲۷)۔

ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ امام، خلیفہ یا اس کے نائب کی اجازت سے کفار اس میں داخل ہو سکتے ہیں، لیکن مدت مسافرت (تین دن) سے زیادہ قیام نہیں

کر سکتے ہیں۔

امام صاحب فرماتے ہیں: ان کو قیام اور استیطان (وطن بنانے) سے منع نہیں کیا جائے گا۔

بلاد اسلام کی ان دو قسموں کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ ان ممالک کے دین، امن وسکون اور استقرار کے پیش نظر اور کفار کے قیام کی وجہ سے پڑوسی ممالک کو جو خطرات لاحق ہوئے ہیں ان کے پیش نظر کسی بھی غیر مسلم کو ان میں مستقل قیام اور استیطان کی ہرگز اجازت نہ دی جائے۔

۳۔ تیسری قسم تمام بلاد اسلام ہے، ان میں کافر عہد، ذمہ اور امان لے کر قیام کر سکتا ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک مساجد میں داخل نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ کسی مسلمان کی اجازت نہ حاصل کر لے، امام صاحبؒ کے نزدیک بغیر اجازت بھی داخل ہو سکا ہے، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک کسی بھی حال میں داخل نہیں ہو سکتا ہے چاہے اجازت ہو یا نہ ہو (فقہ السنہ ۳/۵۵)۔

غیر مسلموں کو مسلم ملک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنے کے سلسلے میں روایات اور عمل صحابہ اور فقہاء کی عبارتوں سے جواز اور عدم جواز دونوں کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ حدیث ہے: ''أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین'' (ابوداؤد کتاب الجهاد رقم: ۲۶۴۵)، نیز دوسری حدیث میں ہے: ''من جامع المشرکین وسکن معه فإنه مثله'' (ابوداؤدکتاب الجهاد: ۲۷۸۷)، مراسیل ابوداؤد میں ہے: ''لا تنزلوا الذرية بإزاء العدو'' (ابوداؤد فی المراسیل، باب إنزال الذرية الثغور والسواحل)۔

یہ اور اس طرح کی تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے نہ آباد کرنا چاہئے نہ خود آباد ہونا چاہئے۔

لیکن دوسری طرف جب ہم صحابہ کرام کا عمل دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ صحابہؓ کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ملکوں میں ان کے درمیان آباد ہوئی، نیز فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر دار الکفر سے کوئی کافر دار الاسلام آئے تو امام المسلمین اسے اپنی صوابدید پر زیادہ سے زیادہ ایک سال کی مہلت دے سکتا ہے، اگر وہ اس سے زیادہ رہ گیا تو اب وہ اپنے وطن نہیں جا سکتا بلکہ وہ اسی ملک کا شہری شمار ہوگا، چنانچہ صاحب ہدایہ تحریر کرتے ہیں:

''وإذا دخل الحربي إلينا مستأمنا لم يمكّن أن يقيم في دارنا سنة، ويقول له الإمام: إن أقمت تمام السنة وضعت عليك الجزية وإذا أقامها بعد مقال الإمام يصير ذمياً، ثم لا يترك أن يرجع إلى دار الحرب'' (هدايه ۲/۵۸۶)۔

نیز قرآن پاک میں ہے: ''وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله'' (سورۂ توبہ: ۶)، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو قیام کی اجازت ہونی چاہئے تا کہ وہ محاسن اسلام سے واقف ہو سکے۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''المؤمن الذي يخالط الناس ويصبر على أذاهم خير من الذي لم يخالط الناس ولم يصبر على أذاهم'' (ترمذی رقم: ۲۵۰۰، ابن ماجہ رقم: ۴۰۳۲)۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے درمیان اقامت کی اجازت دینا یا خود ان کے درمیان سکونت اختیار کرنا جائز ہے۔

دلائل پر غور کرنے کے بعد راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ جواز اور عدم جواز کا نہیں بلکہ اولی اور غیر اولی کا ہے، اولی اور بہتر یہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادیاں الگ قائم کریں، کالونیاں الگ بنائیں، لیکن اگر ان کے درمیان رہنے یا ان کو اپنے درمیان رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو اس انداز سے رہیں کہ ان کے محلے الگ اور مسلمانوں کے محلے الگ ہوں، اور اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو غالب اکثریت والے مسلمانوں کے علاقہ میں رہائش اختیار کریں۔

خلاصہ یہ کہ اگر ضرورت ہو تو غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا جائز ہوگا، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''قال القرطبي: فيه (أخرجوا المشركين من جزيرة العرب) أن على الامام إخراج كل من دان بغير دين الإسلام من كل بلد غلب عليها المسلمون عنوة إذا لم يكن بالمسلمين ضرورة إليهم كعمل الأرض ونحو ذلك وعلى ذلك أقر عمر رضي الله عنه من أقر بالسواد والشام'' (فتح الباری ۶/۲۰۸)۔

البتہ اس امر کا خیال ضرور ہے کہ وہ تعداد کے اعتبار سے مغلوب اور مسلمان غالب ہی رہیں، واللہ اعلم۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

مسئلہ شہریت پر علماء کی آراء۔ تنقیح وتجزیہ

مولانا اختر امام عادل قاسمی[1]

کسی ملک میں انسان کی شہریت کا مسئلہ ایک جدید اور حساس مسئلہ ہے، اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی کے جاری کردہ سوالنامہ پر ۲۹ علماء اور اصحاب افتاء نے اپنے جوابات ارسال فرمائے، جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

ا۔ مولانا زبیر احمد قاسمی (سیتامڑھی، بہار)، ۲۔ مفتی حبیب اللہ قاسمی (مہذب پور اعظم گڈھ)، ۳۔ مفتی عبداللہ کاوی والا (کنتھاریہ گجرات) ۴۔ مولانا نثار احمد حصیر القاسمی (حیدرآباد) ۵۔ مولانا احمد نور عینی القاسمی (متعلم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) ۶۔ قاضی محمد حسن ندوی (بھروچ) ۷۔ مولانا محمد توقیر بدر القاسمی (پھلواری شریف پٹنہ) ۸۔ مولانا عبید اللہ ندوی (بھروچ گجرات) ۹۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (دار العلوم مئو) ۱۰۔ مولانا ریحان مبشر قاسمی (اجراڑہ میرٹھ) ۱۱۔ مولانا محمد قمر الزماں ندوی (پرتاپ گڈھ) ۱۲۔ مولانا رحمت اللہ ندوی (دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) ۱۳۔ مفتی سعید اسعد قاسمی (بردوان) ۱۴۔ مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی (پھلواری شریف پٹنہ) ۱۵۔ حافظ کلیم اللہ عمری (عمرآباد) ۱۶۔ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی (کیرالا) ۱۷۔ مفتی محمد شاہجہاں ندوی (کیرالا) ۱۸۔ مفتی فخر عالم نعمانی (منورواشریف سمستی پور بہار) ۱۹۔ مولانا جعفر ملی صاحب (اکل کوا مہاراشٹر) ۲۰۔ مولانا خورشید انور اعظمی (بنارس) ۲۱۔ مفتی محمد سلمان منصور پوری (شاہی مرادآباد) ۲۲۔ دکتور رشید کھوس جامعہ قرویین (عربی مقالہ) ۲۳۔ مولانا اشرف عباس (دار العلوم دیوبند) ۲۴۔ مولانا خورشید احمد اعظمی (مئو) ۲۵۔ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی (ماٹلی والا بھروچ) ۲۶۔ مفتی محمد ابوبکر قاسمی (برہم پور دربھنگہ) ۲۷۔ مولانا ابوسفیان مفتاحی (مفتاح العلوم مئو) ۲۸۔ مولانا مصطفیٰ قاسمی (شکر پور بھرواره دربھنگہ) ۲۹۔ اور حقیر راقم الحروف اختر امام عادل قاسمی۔

ان کے علاوہ تین اور مقالے عربی زبان میں آئے ہیں، جو موضوع سے متعلق ہیں، مگر سوالنامہ کی ترتیب پر نہیں ہیں اور نہ ان میں سوالنامہ کے تمام اجزاء سے تعرض کیا گیا ہے، مثلاً:

ا۔ ڈاکٹر علی محی الدین القرۃ داغی (دوحہ) کا مقالہ ''المواطنة فی الاسلام وحقوق المواطنین غیر المسلمین فی ظلہ'' (صفحات ۴۴) شہریت کے موضوع پر علمی وتحقیقی مقالہ ہے، نیز اس میں غیر مسلم شہریوں کے حقوق پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، لیکن سوالنامہ کے کئی اجزاء کا جواب اس میں موجود نہیں ہے، مثلاً مسلم ملکوں میں کسی بیرونی مسلمان کو شہریت دینے کے اصول کیا ہیں؟ اس ضمن میں حکومت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ شہریوں کے حقوق کی تفصیلات؟ پناہ گزینوں کے حقوق؟ قدیم اور جدید شہریوں کے حقوق میں فرق کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کسی مسلمان کے لئے غیر مسلم ملک میں قیام یا شہریت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟......وغیرہ اس طرح کے کئی سوالات کے جوابات اس مقالہ میں موجود نہیں ہیں،......شہریت کی بنیادوں سے بھی کوئی خاص بحث نہیں کی گئی ہے،......ایسا لگتا ہے کہ مرتب کے پیش نظر فقہ اکیڈمی کا سوالنامہ نہیں ہے، بلکہ غالباً یہ پہلے کی تحریر ہے، اسی لئے ہمارے بعض مقالہ نگاروں کے یہاں بھی اس کا حوالہ موجود ہے۔

۲۔ ڈاکٹر حسن السید خطاب (مصر) کا مقالہ "حقوق المواطنة وواجباتها فی ضوء الكتاب والسنة" (صفحات ۲۷) بھی بہت معلوماتی ہے اور اس میں شہریت کے مفہوم وماخذ اور اس سے وابستہ حقوق وواجبات پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بہت سے اہم علمی نکات کی اس میں نشاندہی کی گئی ہے، مگر ہمارے سوالنامہ کے کئی پہلو اس میں بھی تشنۂ جواب ہیں، مثلاً: شہریوں کے مابین حقوق کے امتیازات کا مسئلہ، امیدوار مسلمانوں کی درخواستوں پر حکومت کی ذمہ داریاں، پناہ گزینوں کے حقوق، غیر مسلم ملکوں کی شہریت کا حکم وغیرہ کئی اہم پہلوؤں سے اس مقالہ میں کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

---

[1] مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف۔

۳- ڈاکٹر ولید خالد الربیع (کویت) کا مقالہ "حق اللجوء السیاسی فی الفقہ الاسلامی والقانون الدولی" (صفحات ۵۶) پناہ گزینوں کے حقوق واحکام پر محققانہ تفصیلی مقالہ ہے، جس میں اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون کا بہترین علمی موازنہ پیش کیا گیا ہے، لیکن سوالنامہ کے دوسرے اجزاء کے بارے میں یہ مقالہ کلیتاً خاموش ہے۔

اس لئے یہ تینوں مقالات اپنی انفرادی علمی اہمیت کے باوجود ہمارے عرض میں شامل نہیں ہیں۔

شہریت سے متعلق چار اہم مباحث (یعنی سوال نمبر ۱ تا ۴) میرے عرض کا موضوع ہیں،:

(۱) کسی بھی ملک میں شہریت کی شرعی بنیادیں کیا ہیں؟ جن کے پیش نظر حکومت اسلامی کسی کی شہریت کا فیصلہ کرے، یا کوئی امیدوار ان کو بنیاد بنا کر اپنی شہریت کی درخواست پیش کرے۔

(۲) امیدوار مسلمانوں کی درخواست شہریت کے تعلق سے حکومت اسلامی کی شرعی ذمہ داری کیا ہے؟

(۳) مسلم ملکوں میں پناہ گزیں افراد کے حقوق اور قدیم شہریوں سے ان کے امتیاز کا معاملہ۔

(۴) حقوق شہریت۔ اسلامی نقطۂ نظر سے۔

۱۔ شہریت۔ مفہوم، حکم شرعی اور بنیادیں...... سوالنامہ میں شہریت کے مفہوم اور اس کے حکم شرعی پر کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ مسئلہ کی تحقیق وتطبیق ان پر موقوف ہے، شی ءکی حقیقت معلوم نہ ہو یا معلوم ہو، لیکن ہم اس کو جائز تصور نہ کریں تو اس کے اسباب وعوامل کی بھی ضرورت نہ ہوگی، اس لئے شہریت کی بنیادوں پر گفتگو سے پہلے بالترتیب شہریت کی حقیقت اور اس کے حکم شرعی پر بھی تھوڑی روشنی ڈالنی ضروری ہے:

شہریت کا مفہوم:

اکثر مقالہ نگاروں نے اپنے مفہوم ذہنی سے کام لیا ہے اور شہریت کے مفہوم اور اس کی حقیقت سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ بعض حضرات نے اس جانب توجہ دی ہے اور اس نئی اصطلاح کا مطلب واضح کیا ہے، ان کے اسماء گرامی ہیں:

۱۔ مولانا نثار احمد حصیر القاسمی ۲۔ مولانا احمد نور عینی قاسمی ۳۔ قاضی محمد حسن ندوی ۴۔ مفتی ثناء الہدی قاسمی ۵۔ مفتی فخر عالم نعمانی ۶۔ مولانا خورشید احمد اعظمی ۷۔ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی ۸۔ اور حقیر راقم الحروف اختر امام عادل قاسمی،

تعبیرات کے معمولی فرق کے ساتھ تقریباً ان سبھی حضرات نے شہریت کی یہ تعریف کی ہے:

"شہریت موجودہ اصطلاح میں فرد اور حکومت کے درمیان اس مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے، یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس ریاست کی طرف منسوب ہوجاتا ہے جہاں کا وہ شہری ہے، مثلاً ہندوستانی، امریکی وغیرہ (اختر امام عادل قاسمی)

بعض لوگوں نے اسی کو کسی ملک میں قانونی طور پر مستقل رہنے کے حق سے تعبیر کیا ہے (مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا احمد نور عینی قاسمی)

بعض حضرات نے شہریت کی قسموں پر بھی روشنی ڈالی ہے: ۱۔ پیدائشی یا غیر اختیاری شہریت، جو کسی سرزمین پر ولادت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے ۲۔ اختیاری شہریت، جو سعی وارادہ سے حاصل کی جائے، مثلاً اس ملک کے متوطن سے شادی کرکے یا حکومت کو درخواست دے کر وغیرہ (اختر امام عادل قاسمی، مولانا احمد نور عینی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا فخر عالم نعمانی)

بہر حال یہ ایک اتفاقی نکتہ ہے، جن لوگوں نے شہریت کی تعریف ذکر نہیں کی ہے ان کے ذہن میں بھی بظاہر شہریت کا یہی تصور ہے۔

مروجہ نظام شہریت کی شرعی حیثیت

شہریت کی مذکورہ بالا تعریف کے مطابق ساری دنیا میں مروج نظام شہریت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟...... ہمارے تمام مقالہ نگار اور اصحاب افتاء نے اس کو

درست مان کر گفتگو کی ہے، البتہ مولانا احمد نور عینی القاسمی صاحب نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ کو اٹھایا ہے، ان کے پیش نظر متعدد عرب مفکرین کی تحریریں ہیں جن میں اکثر وحدت اسلامی اور دعوت اسلامی کے علمبردار ہیں اور ان کا موضوع فقہی احکام ومسائل کی تحقیق وتحلیل سے زیادہ اسلام کے آفاقی تصورات کی توسیع وتبلیغ ہے۔

مولانا احمد نور صاحب کو سرے سے مروجہ نظام شہریت ہی سے اتفاق نہیں ہے، ان کے نزدیک یہ ایک غیر اسلامی اور باطل نظام ہے،......

قاضی محمد حسن ندوی صاحب کو بھی ان کا ہی ہم خیال کہنا چاہئے، اس لئے کہ گو انہوں نے اس نظام شہریت پر صراحت کے ساتھ کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا ہے اور نہ اس ضمن میں کوئی بحث کی ہے، لیکن ان کے نزدیک بھی کسی اسلامی ملک میں سکونت وشہریت کے لئے صرف مسلمان ہونا کافی ہے، باقی آج شہریت کی جو بنیادیں مانی جاتی ہیں، ولادت، بودوباش، معاشی سرگرمیاں اور شادی بیاہ وغیرہ یہ سب مغربی فکر کی پیداوار ہیں،

مولانا احمد نور عینی صاحب نے اپنے مقالہ میں مروجہ شہریت کے عدم جواز پر کئی دلیلیں پیش کی ہیں، مثلاً:

(الف) ساری دنیا کے مسلمانوں کو خلافت واحدہ کے سایہ میں زندگی گذارنی چاہئے، حدیث میں ہے کہ دوسرا خلیفہ ہو تو اسے قتل کرڈالو، اسی لئے فقہاء دار الحرب میں تعدد کے قائل ہیں دار الاسلام میں نہیں، دنیا کے تمام مسلمان خواہ وہ کہیں رہتے ہوں ایک ہی برادری کے افراد ہیں، ان میں سکونت وشہریت کے باب میں کوئی فرق نہیں ہے، ہمارے اسلامی ذخیرہ میں کوئی ایسی نظیر موجود نہیں ہے جو مسلمانوں کو زمینی اعتبار سے تقسیم کرتی ہو، پورے فقہی ذخیرہ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ دار الاسلام میں رہنے کے لئے مسلمانوں سے اسلام کے علاوہ کسی اور عقد کا مطالبہ کیا گیا ہو، کوئی بھی مسلمان ہجرت کرکے دار الاسلام میں رہائش اختیار کرسکتا تھا، البتہ غیر مسلموں سے عقد ذمہ کرایا جاتا تھا اور اس کے لئے کچھ بنیادیں بھی مقرر کی گئی تھیں۔

(ب) ہجرت مدینہ کے بعد جو دستور مدینہ تیار ہوا اس میں مسلم شہری اور غیر مسلم شہری کی تقسیم تو ملتی ہے، لیکن مسلمانوں میں کوئی دوسری تقسیم نہیں ملتی، سارے مسلمانوں کے خون کی قیمت ایک رکھی گئی ہے، (المسلمون تتکافأ دماءھم) ان کی صلح کو صلح واحد کا درجہ دیا گیا ہے (ان سلم المؤمنین واحدۃ)۔

(ج) مروجہ نظام شہریت غیر اسلامی نظریات پر مبنی ہے اور اس میں ناجائز وجوہات سے مسلمانوں میں تفریق کی گئی ہے مثلاً ملک کی حفاظت کا فریضہ دنیا کے تمام مسلمانوں پر ہے، اسی طرح مسلم قیدیوں کی رہائی کا فریضہ اور مظلوموں کی طرف سے دفاعی جنگ کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ہے، جبکہ مروجہ نظام شہریت یہ ذمہ داریاں صرف اس ملک کے باشندوں پر عائد کرتا ہے...... اسلام کہتا ہے کہ ساری زمین اللہ کی ہے (ان ارضی واسعۃ) (سورۂ عنکبوت: ۵۶) کہیں بھی مسلمان رہ سکتے ہیں، لیکن مروجہ شہریت اس کی اجازت نہیں دیتی، اگر کوئی مسلمان نقل مکانی کرکے دوسرے ملک چلا جائے تو مروجہ نظام اس کی شہریت کو ختم کردیتا ہے وغیرہ۔

لیکن مسئلہ کا یہ جذباتی پہلو ہے اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو مذکورہ دلائل میں کوئی زیادہ وزن نہیں ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

(الف) مذکورہ تمام دلائل کا تعلق اسلام کے آفاقی تصورات اور وحدت اسلامی کے نظریات سے ہے، جن پر ہمارا پورا یقین ہے، مگر وہ اسلام کے حالت غلبہ کے احکام ہیں، لیکن جب مسلمان حالت غلبہ میں نہ ہوں اور روئے زمین پر کئی متوازی نظام سیاست رائج ہوں (جن کے اتحاد پر مسلمانوں کے بہت سے عالمی مسائل موقوف ہوں)، ان سے یکسر صرف نظر کرلینا زمینی حقائق وواقعات کا انکار اور بیلکو نہ خود فریبی کے ہم معنی ہے، ایسی صورت حال میں اسلام کی وہ تعلیمات اور فقہی نظائر پیش نظر رہنی چاہئیں جو عہد مغلوبی میں امت کے لئے رہنما خطوط بن سکیں مثلاً:

☆ عہد نبوت کا وہ حصہ جس میں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل نہیں تھا کی دور یا قیام حبشہ کا دور ☆ یا پھر مسلمانوں کے سیاسی انتشار کے بعد جب دنیا میں متعدد مسلم مملکتیں وجود میں آگئیں اور خلافت واحدہ کا آفاقی نظریہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں عملاً پامال کردیا گیا اور دوسری غیر مسلم طاقتیں روئے زمین پر ابھرنے لگیں، اس وقت کے علماء اور اصحاب رشد نے کیا طرز عمل اختیار کیا؟ اور کیسی عملی ہدایات دیں؟ آج کے دور میں ان سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے،......عہد عباسی کے بعد بلکہ اسی دور سے مسلمانوں کی سیاسی وحدت ٹوٹنے لگی تھی اور دنیا میں ایک سے زائد مسلم حکومتیں وجود میں آگئی تھیں، ان کے متحد کرنے کی تو کچھ کوششیں ضرور ہوئیں، لیکن کسی نے ان کو ناجائز مملکت قرار نہیں دیا۔

(ب) مقالہ نگار موصوف شہریت کی اصطلاح سے تو خائف ہیں، لیکن رجسٹریشن کا اصول تسلیم کرتے ہیں یعنی باہر سے آنے والے مسلمان اپنا رجسٹریشن

کرائیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اس کا مکمل اختیار حکومت کو حاصل ہے، یعنی اگر حکومت مصلحت نہ سمجھے تو رجسٹریشن سے انکار یا آئندہ کے لئے موخر کرسکتی ہے، ...... نتیجہ دونوں کا ایک ہے اس کو شہریت کا نام دیں یا رجسٹریشن کا، حاصل ایک ہی ہے...... شہریت کے تمام اصول وضوابط یہی جاننے کے لئے ہوتے ہیں کہ امید وار کی درخواست قبول کرنا ملک وملت کے مفاد میں ہوگا یا نہیں؟......

(ج) یہ درست ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر مسلمان کو کسی بھی مسلم ملک میں رہنے کا قانونی حق ہے، لیکن ہر وہ شخص جو اپنے کو مسلمان ظاہر کرے اس کو بلا تحقیق شہریت دے دی جائے تو فساد عظیم برپا ہوگا، اسلام میں ایسی نظیریں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مدعی اسلام امیدوار کو مملکت میں سکونت کی فوری اجازت دینا ضروری نہیں ہے، قرآن کریم میں ہے:

''یایها الذین آمنوا إذا جاء تکم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن الله اعلم بایمانهن فإن علمتموهن مؤمنات فلاترجعوهن إلی الکفار'' (الممتحنة: ۱۰)۔ ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے پاس مؤمن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا جائزہ لو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جانتا ہے، اگر وہ تمہیں مؤمن معلوم ہوں تو ان کو کافروں کے پاس مت لوٹاؤ۔

ہر آنے والے کا ایمان علم الٰہی میں ہونے کے باوجود اس کے دعوائے اسلام کی تصدیق کے لئے ظاہری کاروائی کا حکم دیا گیا اور تفتیشی مراحل کی تکمیل تک مملکت میں داخلہ سے روکنے کا اختیار دیا گیا،...... جب کہ عورتوں کا معاملہ زیادہ حساس ہے اس کے باجود تحقیقی مراحل عبور کرنے کی اجازت دی گئی،...... شہریت کے جملہ قواعد اسی تحقیق پر مبنی ہیں کہ امیدوار شخص کس حد تک اس ملک کے قانون سے اپنی وفاداری نباہ سکے گا؟ اور ملک وملت کے لئے اس کی افادیت کتنی ہوگی؟ وغیرہ......

ایک اور آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے: ''إن جاء کم فاسق بنبإ فتبینوا'' (سورۃ الحجرات: ۶) (جب کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کرلو) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی دعویٰ یا درخواست کو بلا تامل اس لئے مان لینا کہ وہ کسی مسلمان کی طرف سے پیش ہوا ہے یہ مؤمنانہ سادگی نہیں حماقت ہے۔

نیز بخاری شریف میں ایک اعرابی کا قصہ مذکور ہے جو مدینہ ہجرت کرنے کا خواہشمند تھا لیکن اس کے حالات معلوم کرنے کے بعد اس کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ سمندر پار دور دراز خطہ میں اپنے مقام پر ہی رہنے کا حکم دیا گیا'' فاعمل من وراء البحار (بخاری کتاب الادب باب ماجاء فی الرجل ویحك ج ۲ ص ۹۱۱)۔

اسی طرح ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ حکومت بعض مصالح کے تحت کسی شخص کی سکونت کو محدود کردے مثلاً خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو مدینہ سے باہر ایک پہاڑی علاقہ میں بھیج دیا تھا اور ان کے تمام تر تقدس کے باوجود ان کو مدینہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

(د) یہ تصور بھی اصولی طور پر اپنی جگہ درست ہے کہ دنیا کے تمام ملی مسائل ہر مسلمان کے لئے مرکز توجہ ہیں جیسے قیدیوں کے چھڑانے کا معاملہ، مظلوموں کے دفاع کا مسئلہ، ملک کے تحفظ کا معاملہ وغیرہ،...... لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کے عالمی مسائل کا براہ راست تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ اولوا الامر اور ارباب اقتدار سے ہے، یہی حضرات بین الاقوامی سیاسی معاملات میں عام مسلمانوں کی نمائندگی کرسکتے ہیں، ہر شخص کو اس کا پابند کرنا اور اس جدو جہد میں شرکت کا حکم دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

نیز ایسی بعض مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انتظامی طور پر یہ ذمہ داریاں خطوں کے لحاظ سے تقسیم کی جاسکتی ہیں جس میں دوسرے خطہ کے لوگ شریک نہ ہوں، مثلاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی اسلامی ریاست تشکیل دینے کے بعد وہاں کے قبائل کی مستقل اکائیاں بنادی تھیں، اس وقت ہر قبیلہ کی الگ الگ آبادی ہوا کرتی تھی، ہر قبیلہ اپنی آبادی کا ذمہ دار ہوتا تھا، اور دیت ادا کرنا اور قیدیوں کو چھڑانا وغیرہ ہر محلہ کی مستقل اپنی ذمہ داری ہوتی تھی اور اس ذمہ داری کی ادائیگی میں عموماً دوسرے قبیلہ (محلہ) کے لوگ شریک نہیں ہوتے تھے (السیرۃ النبویۃ لعبد الملک بن ہشام ج ۲ ص ۳۶۸ تا ۳۷۰)۔

تعزیرات اسلامی میں اس کی ایک مثال قسامۃ آج بھی موجود ہے، جو صرف ایک مخصوص آبادی پر عائد ہوتی ہے،

اسی طرح یہ خیال بھی کلیتاً درست نہیں کہ مسلمان دار الاسلام میں رہ کر ہی ملک کے دفاع کا کام انجام دے سکتے ہیں، حضرت عباسؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

حکم پر مکہ میں رہ کر اسلام اور مملکت اسلامیہ کی جو بے نظیر خدمت انجام دی، وہ اسلام کی سیاسی تاریخ کا روشن باب ہے، نیز اس باب میں اسلام کے بین الاقوامی معاملات کے اس جزئیہ سے بھی روشنی ملتی ہے کہ اسلامی سیاست کے کسی دور میں اگر دوبارہ حدیبیہ جیسے حالات پیدا ہو جائیں اور کفار مسلمانوں سے مغلوبانہ شرطوں کے لئے اصرار کریں اور مسلمان مجبور ہو کر یا کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر اس طرح کا یک طرفہ معاہدہ کرلیں کہ اسلامی مملکت کسی مسلمان کو اپنے حدود میں ان کی مرضی کے بغیر سکونت یا شہریت نہیں دے گی جو دار الکفر سے وہاں جانا چاہتے ہوں،...... تو کیا اس طرح کے معاہدہ کی گنجائش ہوگی؟ اور کیا یہ قابل عمل ہوگا؟...... مالکیہ اور حنابلہ مطلقاً اور شافعیہ دین و ایمان اور جان و مال کے تحفظ کی قید کے ساتھ اس معاہدہ کو درست اور قابل عمل قرار دیتے ہیں، گویا ان کے نزدیک صلح حدیبیہ کا معاملہ وقتی نہیں تھا اور وہ سنت قائمہ ہے منسوخ نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی حالت مغلوبی کے ساتھ خاص ہے اور جب بھی مسلمان ان حالات سے دوچار ہونگے ان کو حدیبیہ کے فارمولہ پر عمل کرنے کی گنجائش ہوگی (حاشیۃ الدسوقی ج ۲ ص ۲۰۶، ۲۰۷، الخرشی ج ۳ ص ۱۵۱، کشاف القناع للبہوتی ج ۳ ص ۱۱۴، المغنی لابن قدامہ ج ۱۰ ص ۵۱۷، نہایۃ المحتاج للرملی ج ۸ ص ۱۱۰، مغنی المحتاج للشربینی ج ۴ ص ۲۶۴)۔

حنفیہ اس معاہدہ کو باطل قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک صلح حدیبیہ کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، اب مسلمانوں کو ذلت و مغلوبیت کے ساتھ یک طرفہ معاہدہ کی اجازت نہیں ہے، اللہ نے اسلام کو سربلندی عطا کی ہے، اس لئے کسی مسلم حکمراں کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ ذلت آمیز شرطوں پر معاہدہ کرے (فتاوی ہندیہ ج ۲ ص ۱۹۷ ط دار الفکر بیروت لبنان، وشرح السیر الکبیر ج ۵ ص ۴۱)

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ذلت و مغلوبیت کے بغیر شہریت وسکونت کے تعلق سے کوئی بین الاقوامی قرارداد پاس ہو جس کی پابندی ہر ملک کے لئے مساوی طور پر ضروری ہو تو اس صورت میں حنفیہ کے اصول کا بھی تقاضا ہونا چاہئے کہ شہریت کی عالمی قرارداد منظور کی جائے اور کسی بھی ملک سے آنے والے امیدوار کے معاملے میں اس کی رعایت کی جائے، ورنہ ملک کی سالمیت و وقار پر سوالیہ نشان لگ سکتا ہے، راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

(ح) یہ درست ہے کہ شہریت عصر حاضر کی نئی اصطلاح ہے، لیکن یہ خیال درست نہیں کہ اس کی جڑیں ہماری قدیم اصطلاحات میں موجود نہیں ہیں، بڑی حد تک یہ اصطلاح وطنیت سے قریب ہے، شہریت کے ضمن میں جن حقوق وواجبات کا ذکر کیا جاتا ہے اگر آپ جائزہ لیں تو وہ سب آپ کو کسی نہ کسی عنوان سے حدیث وسیر اور فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گے، وطن سے محبت ووفاداری، اس کے لئے جان ومال کی قربانی، وطن کی نسبت پر عزت وافتخار، وطن میں ہر طرح کی آزادی وغیرہ کا تصور پہلے سے موجود ہے، خود میثاق مدینہ نے پہلی بار وطن کی بنیاد پر ایک نئی امت اور نئی قوم کا جو تصور دیا تھا اور حقوق وواجبات کی جو تفصیلات فراہم کی تھیں آج کی وطنیت اسی کی نقل محسوس ہوتی ہے، دکتور رشید کہوس نے اپنے مقالہ میں اس پر اچھی بحث کی ہے...... فرق صرف نئی عنوان بندی کا ہے...... نیز پہلے یہ ایک شخص کا انفرادی جذبہ وعمل مانا جاتا تھا، اب اس میں حکومت بھی شریک ہوگئی ہے اور اس کو ایک معاہدہ کی شکل دے دی گئی ہے،......

اس فرق کی وجہ عرف وعادات کا تغیر ہے، پہلے بہت سے ان عرفی حقوق وواجبات کا تصور نہیں تھا جو آج حکومت کی طرف سے فرد کو حاصل ہوتے ہیں اس لئے کسی کی وطنیت کی اطلاع حکومت کو دینی ضروری نہیں ہوتی تھی، لیکن آج بہت سے حقوق اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ حکومت کے پاس آنے جانے والوں کی تفصیلات موجود ہوں، شہریت کی ضابطہ بندی کا بڑا مقصد یہی ہے، اس کی مثال عہد فاروقی میں مردم شماری کا نظام ہے، عہد نبوت اور عہد صدیقی میں ریاست کے عام شہریوں کے لئے وظائف کا انتظام نہیں تھا، اس لئے نہ مردم شماری کی ضرورت تھی اور نہ دفتری ریکارڈ کی، عہد فاروقی میں بیت المال سے وظائف کا سلسلہ شروع ہوا، اس لئے پوری مملکت کا سروے کیا گیا اور تمام شہریوں کی تفصیلات دفتر میں محفوظ کی گئیں، اس کے بغیر حکومت کی جانب سے ملنے والی سہولیات ملک کے شہریوں تک پہونچ نہیں سکتی تھیں،...... تو نظم وضبط کے نقطۂ نظر سے اس طرح کی قانون سازی کی گنجائش ہے۔

(و) اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں کہ مروجہ نظام شہریت میں جن اسباب سے شہریت ختم کردی جاتی ہے وہ سراسر ظلم اور غیر اسلامی ہے...... اسلئے کہ یہ محض اندرونی انتظام ہے، یعنی حکومت سے حاصل ہونے والے حقوق کے موانع کیا ہیں؟ اس ضمن میں ان کی تفصیلات درج ہوتی ہیں اور موانع حقوق کا نظام شریعت میں پہلے سے موجود ہے، مثلاً میراث میں فلاں فلاں چیزیں مانع ارث ہیں،...... کسی کا شوہر لاپتہ ہو جائے تو اس کو نکاح کی اجازت کب ہوگی؟ وغیرہ۔

علاوہ ازیں وطنیت کے خاتمہ کا تصور بھی نیا نہیں، بہت قدیم ہے، ہماری تمام کتابوں میں یہ بحث آئی ہے کہ وطن اصلی کس صورت میں باطل ہوتا ہے؟ اور وطن اقامت کس صورت میں؟۔

مذکورہ بالا وجوہات کے پیش نظر مروجہ شہریت کے عدم جواز والی بات صحیح معلوم نہیں ہوتی اور جمہور علماء کا موقف جواز ہی درست نظر آتا ہے۔

شہریت کی بنیادیں

۳۔ اب بنائے شہریت کے مسئلہ پر آیئے، گو یہ مسئلہ جدید ہے اور پچھلے ادوار میں عام مسلمانوں کی شہریت کے لئے اس طرح کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہ تھا، لیکن اگر اس کے لئے کوئی نظام بنایا جائے تو اس کی بنیادیں کیا ہونگی؟...... واضح رہے کہ یہ اصلاً انتظامی اور سیاسی معاملہ ہے، لیکن اگر حکومت کی طرف سے کچھ انتظامی قواعد مقرر ہوتے ہیں تو ان کی پاسداری اور اس معاملہ میں حکومت کی اطاعت یقیناً عین دین ہے۔

اس مسئلہ پر قاضی محمد حسن ندوی اور مولانا احمد نور عینی کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہجرت کر کے دارالاسلام چلا جائے اور وہاں رجسٹریشن کرالے، البتہ غیر مسلموں کے لئے مولانا احمد نور نے عقد ذمہ کو بنیاد قرار دیا ہے۔

انکے علاوہ باقی تمام مقالہ نگار علماء جو مروجہ نظام شہریت کو درست مانتے ہیں ان میں سے چند حضرات (مولانا زبیر احمد قاسمی، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا ابو سفیان مفتاحی اور مولانا نثار احمد حصیر القاسمی) نے اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا ہے، مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب نے بھی اس کو حکومت پر محول کیا ہے، جبکہ مفتی حبیب اللہ صاحب اور حافظ کلیم اللہ عمری صاحب نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی ہے ان کے نزدیک ہر ملک کا اپنا جو قانون ہے وہی معتبر ہے، اسلام کے نام پر اس میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

باقی اکثر حضرات نے ایک یا چند بنیادوں کا تذکرہ کیا ہے، بعض کو ان میں جزوی اختلاف بھی ہے، البتہ یہ احساس تقریباً قدر مشترک ہے کہ ہر ملک اپنے مصالح کے تحت شہریت کی قانون سازی میں بنیادوں کے تعین کا خود اختیار رکھتا ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو، سوالنامہ میں جن بنیادوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر وہ حکومتوں کے یہاں معمول بہ ہیں تو ان کو شہریت کی اساس قرار دینے میں مضائقہ نہیں،...... مثلاً:

☆ **ولادت:** یعنی وہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو، یہ غیر اختیاری شہریت کی صورت ہے، سوالنامہ میں اس کا ذکر نہیں ہے، لیکن یہ شہریت کی سب مضبوط قسم ہے۔

☆ **نکاح:** یعنی وہاں کے متوطن سے رشتۂ زوجیت قائم کر لے۔

☆ **مستقل بود و باش** کا ارادہ ہو خواہ ملازمت اور ذریعہ معاش کے سلسلے میں یا کسی اور وجہ سے۔

فقہاء کے یہاں ان تینوں چیزوں کا تذکرہ آیا ہے اور انہوں نے ان کو فی الجملہ وطنیت کی اساس قرار دیا ہے، حوالہ کے لئے دیکھئے (المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی ج ۲ ص ۳۵، ۳۶، بدائع الصنائع للکاسانی ج ۱ ص ۳۱۶، المبسوط ج ۱۰ ص ۸۴ کتاب السیر باب فی توظیف الخراج، فقہ مالکی میں: شرح مختصر خلیل للخرشیؒ ج ۵ ص ۸۸، مواہب الجلیل لشرح مختصر خلیل للحطابؒ ج ۲ ص ۵۰۰)۔

مفتی ثناء الہدیٰ صاحب مستقل بود و باش کو شہریت کی بنیاد نہیں مانتے، انہوں نے اس کا ماخذ تحریر نہیں کیا ہے، البتہ اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ مغربی ممالک میں اس کا تعامل نہیں ہے،...... مگر اس دلیل کی معقولیت کے علاوہ واقعیت بھی تصدیق طلب ہے۔

☆ **مخصوص مدت تک قیام:** فقہاء نے اس کو فی الجملہ شہریت کی اساس مانا ہے، البتہ اس مدت کی حد کیا ہوگی؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر علماء نے اس کی مدت ایک سال بیان کی ہے، اس کا ماٴخذ مستامن کے بارے فقہاء کا یہ قول ہے کہ اگر وہ ایک سال قیام کر لے تو وہ ذمی (یعنی غیر مسلم شہری) ہو جائے گا اور اگر وہ اہل وعیال کے ساتھ مقیم ہے تو اس کی پوری فیملی وہاں کی شہری قرار پائے گی (دیکھئے: البدائع للکاسانیؒ ج ۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیة للماوردیؒ ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدین ج ۳ ص ۳۴۶، المہذب للشیرازیؒ ج ۲ ص ۲۵۱ وغیرہ)

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی کی رائے یہ ہے کہ چار سال یا اس سے زائد کی مدت مقرر ہونی چاہئے، اس لئے کہ محدثین ایسے شخص کو کسی مقام کی طرف منسوب کرتے ہیں جو کم از کم چار سال وہاں مقیم رہا ہو (تیسیر مصطلح الحدیث باب ۲۰ ص ۲۳۳)۔

جبکہ ان کے برعکس ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب صرف دو ہفتہ کا قیام کافی قرار دیتے ہیں، انہوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں لکھا، ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کی کتاب "النظریة العامة للشریعة الاسلامیة" کا حوالہ دیا ہے،...... لیکن فقہاء نے جہاں اس مسئلہ کو بیان کیا ہے وہاں اس کی وضاحت ہے کہ قیام طویل ہونا چاہئے، دو ہفتہ کا قیام تو بہت مختصر ہے۔

میرے خیال سے مدت قیام کے تعین کا مسئلہ ہر ملک کے اپنے حالات ومصالح کے لحاظ سے مختلف ہوسکتا ہے، اس لئے اس کو حکومتوں کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہئے۔

☆ زمین کی خرید: یعنی کوئی شخص کسی ملک میں جاکر زمین خرید لے،...... فقہاء نے مستامن کے ضمن میں یہ بات لکھی ہے کہ زمین خریدنے سے وہ ذمی ہوجائے گا (حوالہ بالا)۔

☆ کوئی مضبوط ذریعہ معاش اختیار کرنا: بعض حضرات نے اس کا ذکر کیا ہے (مولانا رحمت اللہ ندوی) فقہاء کے یہاں گو صراحت کے ساتھ اس کا ذکر نہیں آیا ہے، لیکن دلالۃً یہ خریداری زمین کے ضمن میں آتا ہے، اس لئے کہ تجارت بھی زراعت کی طرح منفعت بخش ہے، جس سے تاجر اور حکومت دونوں کا نفع وابستہ ہے، البتہ چلتی پھرتی تجارت معتبر نہ ہوگی، بلکہ زمین کی طرح اس کی بنیادیں مضبوط ہوں۔

☆ اسی ضمن میں سرکاری ملازمت کے حصول کو بھی سبب مانا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اس میں مالی نفع کے ساتھ ملک کی جانی خدمت بھی ہے۔

مولانا ریحان مبشر، مولانا جعفر ملی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی آخر الذکر چاروں بنیادوں (مخصوص مدت تک قیام، زمین کی خرید، تجارت، اور ملازمت) کو شہریت کے باب میں مؤثر نہیں مانتے، ان کا خیال یہ ہے کہ آج کے تیز رفتار دور میں تجارت وملازمت کہیں سے بھی کی جاسکتی ہے (مولانا جعفر ملی)، نیز وطن اصلی کے ضمن میں فقہاء نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے (مولانا خورشید احمد)...... لیکن ظاہر ہے کہ فقہاء نے دوسرے مقام پر ان چیزوں کا ذکر کیا ہے، جبکہ سرحدوں کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے پہلے زمانہ میں بھی لوگ مختلف ملکوں میں تجارتیں کیا کرتے تھے۔

میرے خیال میں فقہاء نے مذکورہ جن چیزوں کا ذکر کیا ہے، وہ حصر کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ اس دور کی چند معروف صورتوں کا تذکرہ ہے، کیونکہ یہ چیزیں منصوص نہیں ہیں، بلکہ اجتہادی ہیں، جن میں عرف وعادت اور مشاہدہ وتجربہ کا دخل ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی ملک کی انتظامیہ شہریت کے لئے کچھ نئی بنیادیں وضع کرے، یا مذکورہ چیزوں میں ترمیم کرے یا کچھ شرطوں کا اضافہ کرے تو اس کی گنجائش ہوگی، بشرطیکہ اس کا مقصد ملک وملت کی سلامتی اور مسلمانوں کا تحفظ ہو، اس لئے کہ عرف وعادت میں تغیر ممکن ہے، ملکی قانون میں تبدیلی تغیر عرف کی علامت قرار دی جائے گی۔

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شریعت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو مثلاً کئی ملکوں میں تبنیت (یعنی کسی اجنبی شخص کو اپنی جائز اولاد قرار دینے) کو بھی شہریت کی اساس مانا جاتا ہے، (اصول سیاسیات، ڈاکٹر ہاشم قدوائی ص ۱۳۵) مگر ظاہر ہے کہ یہ اسلام کے حکم صریح کے خلاف ہے، اس لئے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔

مفتی محمد شاہجہاں ندوی صاحب نے شہریت کی بنیادوں میں سب سے پہلے ایمان کا تذکرہ کیا ہے،...... حالانکہ غیر مسلموں کو بھی دار الاسلام (جزیرۃ العرب کا استثنا کرکے) کی شہریت دی جاسکتی ہے۔

۲۔ شہریت کے امیدوار مسلمانوں کے لئے اسلامی ریاست کی ذمہ داری:

سوالنامہ کا دوسرا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ کسی مسلم یا غیر مسلم ملک کا رہنے والا مسلمان کسی اسلامی ملک میں شہریت کا خواہشمند ہو تو اس اسلامی ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

اکثر حضرات نے حالات کی قید کے ساتھ جواب تحریر کیا ہے، البتہ مفتی حبیب اللہ صاحب، حافظ کلیم اللہ عمری صاحب، مولانا جعفر ملی صاحب، مفتی سلمان منصور پوری صاحب نے علی الاطلاق یہ جواب دیا ہے کہ شہریت کی درخواست قبول کرنا اسلامی ملک پر ضروری نہیں ہے، ہر ملک کا اپنا نظام قانون ہے، اس کے مطابق وہ جو چاہے فیصلہ کرنے کا مجاز ہے...... مولانا جعفر ملی صاحب نے وضاحت کی ہے کہ اخلاقاً ضروری ہے بشرطیکہ آدمی اچھا ہو۔

ان کے بالمقابل ڈاکٹر رشید کھوس، مولانا مصطفی قاسمی اور مولانا ابوسفیان مفتاحی سکونت وپناہ کی ہر اس درخواست کی تعمیل ضروری قرار دیتے ہیں جو کسی مسلمان کی طرف سے آئی ہو، ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ اسلام کی نسبت پر کوئی بھی مسلمان کسی بھی مسلم ملک میں منتقل ہونے کا حق رکھتا ہے،...... اس پر گفتگو گذر چکی ہے۔

مولانا رحمت اللہ ندوی صاحب کا جواب واضح نہیں ہے۔

ان کے علاوہ تمام حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر اس ملک میں جہاں کا وہ باشی ہے اس کے لئے حالات انتہائی سنگین ہوں اور اس کے دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کو سخت خطرہ درپیش ہو...... تو اسلامی ریاست پر اس کی درخواست کو قبول کرنا لازم ہوگا، بشرطیکہ اس ملک کے اپنے اجتماعی مصالح متاثر ہونے کا

اندیشہ نہ ہو۔

اس حکم کا ماخذ وہ آیات واحادیث ہیں جن میں ہجرت کی تاکید اور غیر اسلامی ماحول میں قیام وسکونت کی ناپسندیدگی وارد ہوئی ہے،......

اسی طرح وہ آیات وروایات بھی جن میں مسلمانوں کو عموماً اور مسلم قیادتوں کو خصوصاً مخاطب کر کے اپنے مظلوم ومجبور بھائیوں کی نصرت ومدد کی تلقین سنائی گئی ہے،

نیز سواد مسلمین کی کثرت، اسلامی ماحول کی قوت اور غیر اسلامی معاشرہ سے حتی الامکان اجتناب کی تلقین کرنے والے نصوص بھی اس باب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، کئی حضرات نے اس طرح کی کئی چیزوں کو پیش کیا ہے، احقر کے مقالہ میں بھی اس سلسلے کی تفصیلات موجود ہیں،

☆ البتہ اگر کسی ملک کے قانونی نظام میں اس کی گنجائش نہ ہو مثلاً اس ملک سے کوئی خاص معاہدہ ہو یا امیدواروں کی تعداد اتنی زیادہ ہو جس کا تحمل اس کے اقتصادی نظام میں نہ ہو تو ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ شہریت کی درخواست قبول کرنے کو واجب نہیں کہا جا سکتا، قانونی گنجائش والی بات اکثر لوگوں نے نہیں لکھی ہے، لیکن ملکوں کے معاہدات کے تعلق سے فقہاء نے جو بحثیں کی ہیں ان کی روشنی میں اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے حالات میں شہریت کے لزوم کی بات بہر حال مشکل ہوگی،...... مفتی محمد سلمان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی اور مولانا اشرف عباس قاسمی نے اس کا ذکر کیا ہے، اسی طرح حقیر راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ رقمطراز ہیں: مگر جس جماعت سے آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہے، اس کے مقابلے میں تا ایفائے عہد دار الحرب کے مسلمانوں کی امداد نہیں کی جا سکتی (حاشیہ عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند ص ۲۴۷) (مقالہ مولانا خورشید اعظمی)۔

ابن کثیرؒ، طبریؒ اور دیگر مفسرین نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے (جامع البیان للطبریؒ ج ۲۰ ص ۶۶-۷۰)

البتہ ان حالات میں بھی مدینہ اور انصار کی تاریخ پر نظر رکھتے ہوئے اور اللہ کی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے بہتر یہی ہوگا کہ ممکن حد تک قربانی کی تاریخ تازہ کی جائے اور جذبہ ایثار کے ساتھ اپنے مظلوم بھائیوں کی شہریت قبول کی جائے۔

☆ جس صورت میں شہریت دینا ممکن نہ ہو اس صورت میں اسلامی ملکوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ باہر سے ان مسلمانوں کو ہر ممکن قانونی اور مالی امداد بہم پہونچائیں۔

☆ اگر درخواست دہندہ کو اپنے ملک میں ذاتی طور پر اس کے دین یا جان ومال کے معاملے میں کوئی دشواری نہ ہو، لیکن بہتر مستقبل یا اسلامی ماحول کی امید پر وہ مسلم ملک میں منتقل ہونے کا خواہشمند ہے تو اس درخواست کو قبول کرنا ضروری نہیں ہے، وہ ملک اپنے نظام کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا، اس لئے کہ معتبر قول کے مطابق اگر دین وایمان اور جان ومال کو خطرہ نہ ہو تو غیر اسلامی ملک میں قیام وسکونت کی اجازت ہے، بلکہ دینی اور ملی مقاصد کے تحت بہتر ہے کہ مسلمان ساری دنیا کے ملکوں میں بڑی تعداد میں موجود ہوں اور وہاں کے سیاسی، ثقافتی، معاشی اور دفاعی نظام میں مؤثر کردار ادا کریں......، عہد نبوت سے لیکر بعد کے کئی ادوار میں مسلمانوں نے غیر اسلامی علاقوں میں رہ کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، یہ سنہری تاریخ ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہنی چاہئے۔

۳۔ اسلامی مملکت میں پناہ گزینوں اور قدیم شہریوں کے مابین امتیاز کا معاملہ

سوالنامہ کا تیسرا جزو یہ ہے کہ بعض دفعہ کسی ملک کے مسلمان مجبور ہو کر کسی مسلم ملک سے سیاسی پناہ کی درخواست کرتے ہیں اور مسلم ملک اس کو سیاسی پناہ دینے پر آمادہ بھی ہو جاتے ہیں، لیکن ان کو پناہ گزیں کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے، انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا اس کی شرعاً گنجائش ہوگی؟

اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

(الف) سیاسی پناہ محدود مدت کے لئے لی جائے، یعنی اگر ان کے ملک کے حالات درست ہو گئے تو وہ لوٹ جائیں گے،...... ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی حیثیت مہمانوں کی ہوگی، مقامی شہریوں کا درجہ انہیں حاصل نہ ہوگا، انہیں زندگی کی تمام جائز سہولیات فراہم کی جائیں گی، لیکن شہریت کے حقوق ومراعات سے محروم رہیں گے،...... ہمارے اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہی ہے...... البتہ مولانا جعفر ملی صاحب، مولانا مصطفی قاسمی اور مفتی سلمان منصور پوری صاحب عارضی پناہ کی صورت میں بھی جملہ حقوق کی فراہمی ضروری قرار دیتے ہیں اور اس میں کسی فرق کو روا نہیں سمجھتے، مگر ان کی یہ بات دو وجہ سے کمزور ہے:

☆ ایک یہ کہ ان سے مستقل شہریت کا معاہدہ ہی نہیں ہوا، ایسی حالت میں امتیاز اور فرق مراتب قدرتی ہے،...... خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دار الہجرت مدینہ منورہ کی اصل آبادی اور وقتی مقاصد کے تحت باہر سے آنے والوں کے درمیان امتیاز قائم فرمایا تھا: ''إنهم يكونون كأعراب المسلمين

... "ولا یکون لھم فی الغنیمة والفیء شیء" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۴۶۱۹) ترجمہ: وہ اعرابی مسلمانوں کی طرح ہونگے...... غنیمت وفیء میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

☆ نیز اسلامی قانون کا مسلمہ اصول ہے: "المغنم بالمغرم فی الإسلام" (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۱ ص ۹۰) ترجمہ: اسلام میں نفع نقصان کے ساتھ وابستہ ہے۔

شہریوں کو حقوق ملتے ہیں تو ان سے مطالبات بھی وابستہ ہوتے ہیں۔

(ب) لیکن اگر سیاسی پناہ کا عمل وقتی نہ ہو، بلکہ مستقل طور پر اس ملک میں آباد ہوجانے کا عزم ہو اور اپنے ملک واپسی کا کوئی ارادہ نہ ہو، ایسی صورت میں حافظ کلیم اللہ عمری صاحب، مفتی حبیب اللہ صاحب اور مولانا اشرف عباس قاسمی صاحب کی رائے یہ ہے کہ امتیاز درست ہے اور مستقل شہری کا درجہ دینا ضروری نہیں ہے، صرف بہتر ہے، یہ ملک کے اپنے نظام اور عالمی حالات پر انحصار کرتا ہے۔

ان کے علاوہ بقیہ تمام مقالہ نگار حضرات امتیازی سلوک کو روا نہیں سمجھتے، بلکہ ان کو مستقل شہری کا درجہ دیا جانا ضروری قرار دیتے ہیں، قدیم وجدید میں اخلاقی فرق کا امکان تو ہے، مگر قانونی طور پر حقوق شہریت میں ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرنا جائز نہیں ہے،......

میرے خیال میں یہی رائے زیادہ مضبوط اور اسلام کی روح اور مزاج سے قریب ہے، اور اس کی کئی وجوہ ہیں:

☆ اس کا مأخذ قرآن وحدیث کے وہ نصوص ہیں جن میں قدیم باشندوں اور باہر سے آنے والے مہاجرین کو باہم اولیاء قرار دیا گیا ہے، مثلاً: قرآن کریم کا یہ ارشاد اس سلسلے میں بہت واضح ہے:

"إن الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا بأموالھم وأنفسھم فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا أولئك بعضھم أولیاء بعض" (الانفال: ۷۲)۔ (جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کے لئے اپنی جانی اور مالی صلاحیتیں خرچ کیں اور وہ لوگ جنہوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں)۔

☆ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دار الاسلام منتقل ہوجانے والے مسلمانوں کو وہاں کے مقیم مسلمانوں کے مساوی قرار دیا، اور ان کو باہم بھائی بھائی بنادیا، اسلام میں جغرافیہ اور رنگ ونسل کوئی چیز نہیں ہے، یہ صرف باہم تعارف کے ذرائع ہیں، لیکن اصل پہچان رشتۂ ایمان ہے، اگر کوئی چیز اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو اس کو فنا کرکے صرف کلمہ کو پہچان کی بنیاد بنایا جائے گا، اور کلمہ شریک تمام لوگ بھائی بھائی قرار دیئے جائیں گے۔

☆ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من صلی صلاتنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبیحتنا فھو المسلم له ما للمسلم وعلیه ما علی المسلم" (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۳ حدیث نمبر ۳۸۵ ط دار ابن کثیر بیروت ۱۹۸۷ء)۔ (جو ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، وہ مسلمان ہے اور اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور اس پر وہ تمام واجبات عائد ہونگی جو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں)۔

☆ اس کی تائید اس مسئلہ شرعی سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی مستامن (وقتی امان لیکر آنے والا غیر مسلم) یا ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم شہری) اسلام قبول کرلے تو باتفاق فقہاء اس کا عقد ذمہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ تمام امتیازات بھی کالعدم ہوجاتے ہیں جو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جملہ حقوق وواجبات میں وہ وہاں کے قدیم شہریوں کے مساوی قرار پاتا ہے (ہدایہ مع فتح القدیر ج ۵ ص ۳۰۳، جواہر الاکلیل ج ۱ ص ۲۶۷، مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۵۸، الاحکام السلطانیة لابی یعلی ص ۱۴۳، ۱۴۴)۔

اس سے وحدت ایمانی کی معنویت سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور زیر بحث مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

البتہ شہریت کی تکمیل کے لئے انتظامی طور پر کچھ قواعد وضوابط بنائے جاسکتے ہیں اور اس کے لئے کچھ مدت یا مراحل بھی مقرر کئے جاسکتے ہیں......

مثلاً اس باب میں ہم مستامن کے مسئلے سے استیناس کرسکتے ہیں کہ اگر کوئی مستامن دار الاسلام میں ایک مخصوص مدت (حنفیہ کے نزدیک اس کی مدت ایک سال ہے، علی اختلاف الاقوال) تک قیام کرلے، یا وہاں کے متوطن سے شادی کرلے، یا کوئی خراجی زمین خرید لے وغیرہ تو اس کو ذمی یعنی دار الاسلام کا باقاعدہ شہری قرار دیا جائے گا (البدائع للکاسانی ج ۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیة للماوردی ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدین ج ۳ ص

۳۴۶، المہذب للشیرازیؒ ج ۲ ص ۲۵۱)۔

نیز ہدایہ کی یہ عبارت: ''وللإمام أن یوقت فی ذلك مادون السنة کالشهر والشهرین'' (هداية مع الفتح ج ٦ ص ۲۲) ترجمہ: امام اس میں مہینہ دو مہینہ مدت کی تعیین کر سکتا ہے۔

اس فقہی جزئیہ کو انتظامی مراحل کے لئے بطور رہنما اصول استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ حقوق شہریت

چوتھا سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے حقوق کیا ہیں؟ سوالنامہ میں بطور مثال چند چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جیسے: ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری اسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تنگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق وغیرہ۔

تمام مقالہ نگاروں نے مذکور چیزوں کو حقوق شہریت کے ضمن میں تسلیم کیا ہے، مولانا عبید اللہ ندوی نے حقوق کی تین قسمیں کی ہیں، انسانی حقوق، شہری حقوق اور سیاسی حقوق،

مولانا ریحان مبشر نے حقوق کی چار قسمیں کی ہیں: قدرتی حقوق، اخلاقی حقوق، قانونی حقوق، معاشی حقوق، پھر ہر ایک کی قسم در قسم بیان کی ہے،

مولانا زبیر احمد قاسمی نے عقد ذمہ کے ضمن میں فقہاء کے ذکر کردہ بعض حقوق کا تذکرہ کیا ہے،

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا محبوب فروغ احمد اور مولانا شاہجہاں ندوی نے بھی بعض حقوق کی تفصیل بیان کی ہے،

مفتی حبیب اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ ہر ملک کا آئین جو حق دے گا وہی ملے گا اس سے زیادہ نہیں،

دراصل اسلام نے حقوق وواجبات کی کوئی تفصیل مقرر نہیں کی ہے، کچھ حقوق بنیادی ہیں اور کچھ احوال وظروف اور زمان ومکان کے تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ان کی تفصیلات کا تعین ممکن نہیں، بس معروف کی بنیاد پر جو حقوق وواجبات ہر ملک کے اپنے عرف میں شہریت سے متعلق سمجھے جاتے ہیں، شریعت ان کی نفی نہیں کرتی، ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں ''له ما للمسلم وعليه ما على المسلم'' (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۳)۔

یعنی وہ تمام حقوق جو مسلمانوں کو ملتے ہیں وہ اس کو ملیں گے اور وہ تمام واجبات جو مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں اس پر عائد ہونگے۔ اس مضمون کی اور بھی جو روایات آئی ہیں ان میں بھی عموماً یہی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہجرت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو میثاق مدینہ تیار فرمایا اس میں بلا امتیاز مذہب وملت داخلی اور خارجی سطح پر جن حقوق وواجبات کی نشاندہی کی گئی ہے، ان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حقوق کے باب میں کوئی خاص شکل مقرر نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق مختلف ملکوں کے اپنے حالات، تقاضے، اور عرف سے ہے اور اس معاملے میں ہر ملک کی انتظامیہ پوری طرح آزاد ہے کہ کس چیز کو وہ حق قرار دیتی ہے اور کس چیز کو واجبات میں شامل کرتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ اس تعین کی بنیاد معروف پر ہو، انسانیت کی فلاح پیش نظر ہو، اسلام کی روح اور مقاصد سے ہم آہنگ ہو اور شریعت کی کسی نص سے متصادم نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمه اتم واحکم۔

شہریت اور اس سے متعلق مسائل

(سوال نمبر ۵،۶،۷)

ڈاکٹر مفتی محمد شاجہاں ندوی [1]

احقر کو شہریت اور اس سے متعلق مسائل کے سوال نمبر ۵ تا ۷ کے تعلق سے عرض مسئلہ پیش کرنے کا مکلف کیا گیا ہے، چنانچہ اکیڈمی سے اس موضوع پر مجھے بتیس مقالات موصول ہوئے۔

سوال نمبر (۵) شریعتِ اسلامی میں پناہ گزینوں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے، نیز کون سے حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے اور ان کو حاصل نہیں ہوں گے؟

اس سوال کی دو شقیں ہیں: شق اول، یعنی اسلامی شریعت میں پناہ گزینوں کے حقوق، اس کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ اسلام میں پناہ گزینوں کو تمام انسانی حقوق حاصل ہوں گے، جیسے: مذہب، جان و مال، عقل اور عزت و آبرو کے تحفظ، سرکاری ہاسپٹل میں علاج و معالجہ خورد ونوش اور رہائش کی سہولت، خرید وفروخت اور ملکیت حاصل کرنے، باہمی نزاع ختم کرنے کے لئے عدالتی چارہ جوئی تعلیم حاصل کرنے، ظلم و جبر سے حفاظت، حالات کی سازگاری تک رکنے اور نصرت وحمایت کے دیگر حقوق حاصل ہوں گے۔

اس موقف کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ''إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله، والذين أ ووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض'' (انفال:۷۲)۔

۲۔ ''لا إكراه في الدين، قدتبين الرشد من الغي'' (بقره:۲۵۶)۔

۳۔ ''إن الله يأمر بالعدل والاحسان'' (نحل:۹۰)۔

۴۔ ''وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه'' (توبہ:۶)۔

۵۔ ''لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم. إن الله يحب المقسطين'' (ممتحنہ:۸)۔

ان تمام آیتوں میں بے بسوں کے ساتھ ہمدردی، حمایت اور ظلم و جبر سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔

۶۔ مظلوموں، کمزوروں اور بے کسوں کی مدد کے لئے ہونے والے معاہدہ (حلف الفضول) کے متعلق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لقد شهدت في دار عبد الله: جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم، ولو أد...به في الإسلام لأجبت'' (معرفة السنن والآثار للبیہقی حدیث نمبر ۱۳۲۳۲)۔

دوسری شق، یعنی شہریوں اور پناہ گزینوں کے حقوق کے درمیان فرق کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ پناہ گزینوں کا قیام عارضی ہوتا ہے، یہی عرف و عادت ہے، چنانچہ وہ خود حالات سازگار ہونے کے بعد اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہوجاتے ہیں، لہذا ان کو بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں گے، لیکن سیاسی حقوق جیسے امیدوار بننے، ووٹ ڈالنے اور اہم ملکی وانتظامی مناصب پر فائز ہونے کے حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ البتہ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی کے

---

[1] صدر شعبہ حدیث وعلوم حدیث واستاذ فقہ واصول فقہ، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، مالاپورم کیرالا۔

نزدیک سیاسی حقوق میں ووٹ دہی اور عدالتی چارہ جوئی کا حق ملے گا، دیگر حقوق حاصل نہیں ہوں گے، اس موقوف کے دلائل درج ذیل ہیں:

ا۔ ''المغنم بالمغرم في الإسلام'' (درر الحکام شرح مجلة الأحکام ۱،۹۰۱، دفعہ ۸۷) (نفع نقصان کے ساتھ جڑا ہوا ہے)۔

چنانچہ ملک کے مستقل شہریوں پر بہت سی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، جیسے: ملک کے تحفظ ودفاع کے لئے جان ومال کی قربانی دینا، سرکاری خزانہ کے استحکام کے لئے ٹیکس ادا کرنا وغیرہ، لہذا انہیں جو سیاسی حقوق حاصل ہیں، وہ پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے، البتہ اگر مستقل اور دائمی طور سے پناہ دی گئی ہو، تو پناہ گزینوں اور عام شہریوں کے حقوق میں کوئی فرق نہ ہوگا، جیسا کہ انصار نے مہاجرین کو دائمی پناہ دی تھی، اور تمام انسانی اور شہری حقوق میں ان کو شریک کیا تھا، اسی وجہ سے ان کا لقب ''انصار'' پڑا۔

دوسری رائے مفتی محمد سلمان منصور پوری، مولانا محمد مصطفی قاسمی اور مفتی عبداللہ کاوی والا کی ہے کہ پناہ گزینوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو قدیم شہریوں کو حاصل ہیں، ان میں کوئی تفریق نہیں ہوگی، یہی رائے قاضی محمد حسن ندوی کی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ خدمت خلق، انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا یہی تقاضا ہے کہ عام شہریوں اور پناہ گزینوں کے حقوق میں کوئی فرق وامتیاز نہ کیا جائے، تیسری رائے: مولانا خورشید احمد اعظمی اور راقم الحروف کی ہے کہ اگر پناہ گزین غیر مسلم ہے اور اسے عارضی پناہ دی گئی ہے، تو اسے سیاسی حقوق کے علاوہ دیگر انسانی حقوق حاصل ہوں گے، البتہ مسلم پناہ گزین جو عارضی پناہ کے لئے آیا اس کے اور ملک کے اصلی اور مستقل شہریوں کے درمیان حقوق میں فرق کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ مسلم پناہ گزین انسانی رشتہ کے ساتھ ایمانی اخوت میں بھی بندھا ہوا ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (سورۂ توبہ: ۷۱)۔

اور اکثریت کی یہ دلیل محل نظر ہے کہ مستقل باشندگان کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں، کیونکہ مسلم پناہ گزینوں کو تمام ذمہ داریوں میں شریک کیا جا سکتا ہے، نیز کتاب وسنت میں کوئی ایسی نص موجود نہیں ہے جو درجات کی بلندی اور اجر وثواب کے علاوہ دیگر حقوق میں مسلمانوں کے حقوق کے درمیان تفریق کرتی ہو، نیز یہ کہنا کہ بہت سے وفود وقتی تعلیم وتربیت کے لئے مدینہ منورہ آتے تھے اور کچھ دنوں قیام کر کے واپس چلے جاتے تھے ظاہر ہے کہ حقوق وواجبات کے معاملے میں ان کو اہل مدینہ کا مقام تو حاصل نہیں ہو سکتا تھا؟ یہ ایک ظن ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

اسی طرح یہ استدلال محل نظر ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو مدینہ سے باہر قیام پذیر تھے، ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ: ''اگر یہ لوگ دار الہجرت منتقل ہونے پر رضامند نہ ہوں، تو ان کو خبردار کردو کہ وہ اعرابی مسلمانوں کے درجے میں ہوں گے، اور وہ حکم الہی کے اسی طرح پابند ہوں گے، جس طرح دیگر مسلمان پابند ہیں، مگر ان کو مال غنیمت اور فيء میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت نہ کریں'' (صحیح مسلم حدیث نمبر ۴۶۱۹) یہ استدلال محل نظر اس لئے ہے کہ یہ حضرات مدنی اسٹیٹ سے باہر تھے، جبکہ موضوع بحث ریاست کے اندر آنے والے پناہ گزین ہیں۔

سوال نمبر (۶) کیا کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی؟

اس کے جواب میں تقریبا تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ اس مسئلہ پر رہائش اختیار کرنے والے کے اغراض ومقاصد اور غیر مسلم ملک کی صورتحال کے لحاظ سے حکم لگے گا، چنانچہ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

ا۔ ایسے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا حرام ہے، جہاں دین پر عمل کرنا دشوار ہو، اور انفرادی زندگی میں بھی اسلامی احکام کی بجا آوری مشکل ہو، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ''ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالا بعيدا'' (نساء: ۶۰)۔

نیز فرمان الہی ہے: ''يا يها الذين آمنوا لا تتخذوا ء أباء كم وإخوانكم أولياء إن استحبوا الكفر على الإيمان ومن يتولهم منكم فأولئك هم الظالمون'' (توبہ: ۲۳)، پہلی آیت میں جس طاغوت سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو، چنانچہ غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا، یہ اختیار خود اسلامی نظام قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف کے مترادف ہے، اور دوسری آیت میں رشتہ دار کفار کی موالات سے منع کیا گیا ہے، تو دوسرے کفار کی موالات اختیار کرنا کیونکر درست ہوگا؟ اور اسی جیسی حالت کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۲۷۸۷، اور اس کی سند صحیح ہے)۔

اور ایک دیگر موقع سے ارشاد ہے: ''أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله، ولم؟ قال: لا ترا ءى ناراهما'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۲۶۴۵، اگرچہ اس حدیث کے بارے میں ارسال کا کلام ہے، پھر بھی یہ صحیح ہے)۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کا سبب غیر مسلموں سے قلبی تعلق، ان کے تہذیب وتمدن پر فخر، ان کے طرز زندگی کی مشابہت اختیار کرنا، اور مسلمانوں سے نفرت ہو، تو ایسی حالت میں غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا، ناجائز ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''الذين يتخذون الكافرين أولياء من دون المؤمنين، يبتغون عندهم العزة، وإن العزة لله جميعا'' (نساء:۱۳۹)، نیز فرمان الہی ہے: ''يايها الذين ء امنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض، ومن يتولهم، منكم، فإنهم منهم إن الله لا يهدى القوم الظالمين'' (مائدہ:۵۱)، ان جیسی آیات کریمہ میں غیر مسلم سے قلبی تعلق کی صریح ممانعت ہے۔

۳۔ اگر خدانخواستہ ایسی مجبوری ہو کہ مسلم ملک میں بادشاہی یا ڈکٹیٹر نظام کی وجہ سے دین ومذہب، جان ومال، عقل وخرد اور عزت وآبرو کو خطرہ ہو، اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، تو ایسی صورت میں غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس بات کا اطمینان ہو کہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا، اور وہاں رائج شدہ منکرات سے خود کو محفوظ رکھ سکے گا، ارشاد الہی ہے: ''ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها، فأولئك مأواهم جهنم وساء ت مصيرا'' (نساء:۴)، اس آیت میں دین کے تحفظ اور مظالم سے نجات کے لئے ہجرت کو واجب قرار دیا گیا ہے، اور فقہی قاعدہ ہے: ''الأخذ بأعظم المصلحتين، ودفع أعظم المفسدتين'' (الأشباه والنظائر لابن نجیم ۱،۸۸، الأشباه للسيوطي ص۸۷)۔

۴۔ غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا دعوتی نقطہ نظر سے ہو، تو ایسا کرنا درست ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين'' (انبیاء:۱۰۷)، ایک جگہ ارشاد ہے: ''هو الذي أرسل رسوله بالهدى و دين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون'' (توبہ:۳۳)، نیز فرمان الہی ہے: ''أدع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة، وجادهم بالتي هي أحسن'' (نحل:۱۳۵)، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دنیا کے ہر خطہ میں پہنچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے، اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کریں، تاکہ اسلام کی دعوت اور اسلامی زندگی کے نمونے دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچے۔

۵۔ مسلم ملک میں عزت وآبرو کے ساتھ معاشی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، اور غیر مسلم ملک میں اپنے اور اپنی نسل کے دین وایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو، تو ایسی حالت میں معاش کے مقصد سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا جائز ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''هو الذى جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا فى مناكبها، وكلوا من رزقه، وإليه النشور'' (ملک:۱۵)، نیز فرمان الہی ہے: ''ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلا من ربكم'' (بقرہ:۱۹۸)، ان آیات کریمہ کا تقاضہ ہے کہ جہاں رزق دستیاب ہو، وہاں جا کر حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۶۔ محض معیار زندگی بلند کرنے اور مالی فراخی حاصل کرنے کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا مکروہ ہے، کیونکہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر خود کو وہاں رائج منکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے، اور بلا ضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ غیر مسلم ملک میں ہر طرف ایمان پر ڈاکہ ڈالنے والے امور موجود ہوتے ہیں، برائیوں اور شر وروفتن کا دور دورہ ہوتا ہے، اور برے مناظر عام ہوتے ہیں، جس سے معصیت کا رجحان پروان چڑھتا ہے، اور نیکی اور تقوی کی روح کمزور ہو جاتی ہے، اسلامی تشخص کا تحفظ دشوار ہو جاتا ہے، حلال و حرام کے درمیان تمیز آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے، کفار ومشرکین کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے، اور ایک دو نسل تک اسلام کی حفاظت کسی حد تک ہو جاتی ہے، لیکن بعد کی نسلوں سے اسلام یا تو دور ہو جاتا ہے، یا برائے نام رہ جاتا ہے۔

۷۔ غیر مسلم ملک میں پیدائش کی بنیاد پر شہریت حاصل ہو، اور دین وایمان کو کوئی خطرہ نہ ہو، اور دعوتی مواقع حاصل ہوں، اور مسلم ملک کی طرف ہجرت کی گنجائش نہ ہو، تو ایسے ملک میں رہنا جائز ہے، چنانچہ اسی جیسی حالت کے لئے ماوردیؒ نے لکھا ہے: ''إذا قدر على إظهار الدين في بلد من بلاد الكفر، فقد صارت البلدة دار اسلام، فالإقامة فيها أفضل من الرحلة عنها، لما يترجى من دخول غيره فى الإسلام'' (المجموع ۱۹،۲۶۴)۔

۸۔ اسرائیل کی شہریت اختیار کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کی زمین غصب کر کے تشکیل کی گئی ریاست ہے، چنانچہ وہاں کے عہدیداروں کو شہریت کی درخواست پیش کرنا اس بات کا اعتراف ہوگا کہ یہ ملک ان غاصبوں کا ہے، البتہ مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب کی رائے یہ ہے کہ شہریت اختیار کئے بغیر رہ سکتا ہے لیکن شہریت اختیار کرنا مطلقاً جائز نہیں ہوگا، لیکن یہ رائے نظر ثانی کی محتاج ہے، اس لئے کہ دعوتی نقطہ نظر سے شہریت اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

سوال نمبر (۷) کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

اس کے جواب میں بھی تقریباً تمام مقالہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ جزیرۃ العرب کو چھوڑ کر مسلم ملک کے دیگر خطوں میں غیر مسلم حضرات کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہے، بشرطیکہ ان کی سکونت سے اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کو نہ فی الحال اور نہ ہی مستقبل میں کوئی خطرہ ہو، اور انہیں مسلم ملک کے آئین کی پاسداری منظور ہو۔

اس موقف کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ''أخرجوا المشركين من جزيرة العرب'' (بخاری شریف حدیث نمبر ۳۱۶۸)۔

۲۔ ''لا يجتمع دينان في جزيرة العرب'' (مؤطا مالک حدیث نمبر ۱۶۷)۔

۳۔ ''عن عبد الله بن عمرو، قال: قال رسول الله ﷺ ''من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة، وإن ريحها لتوجد من مسيرة أربعين عاما'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳۱۶۶، ۶۹۱۴، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۶۸۶) اس حدیث سے واضح ہے کہ بلا جرم ناحق کسی ذمی کو قتل کرنا حرام ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ذمی دار الاسلام کا مستقل باشندہ ہوتا ہے۔

۴۔ ''الأصل أن إعطاء الأمان أو طلبه مباح، وقد يكون حراما أو مكروها، إذا كان يؤدي إلى ضرر أو إخلال بواجب أو مندوب'' (الموسوعة الفقهية ٦،٢٢٣)۔

۵۔ ''ترك الكافر في دار الإسلام بالجزية جائز'' (تاتارخانیہ ۲۵۶/۷، مسئلہ نمبر ۱۰۴۳۲)، البتہ مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب کی رائے ہے کہ آج کے پرفتن دور میں مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ آئندہ مسلمانوں کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں، لیکن یہ رائے محل نظر ہے، اس لئے کہ غیر مسلموں کی معمولی تعداد کا مسلمانوں کے لئے خطرہ بننا مستبعد ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب ماہرین کی تحریریں

شہریت کے حقوق وفرائض قرآن وحدیث کی روشنی میں

پروفیسر ڈاکٹر حسن السید خطاب[1]

الحمدللہ رب العالمین الملك الحق المبین والصلاۃ والسلام علی النبی الامی سیدنا محمد ﷺ وآلہ وأصحابہ وسلم والتابعین لھم باحسان الی یوم الدین وبعد!

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہریت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس کا شمار ایک ایسے رابطہ کے طور پر ہوتا ہے جو حکومت کو شہریوں سے مربوط کرتا ہے، وہ محض فرد اور حکومت کے درمیان ایک تعلق ہی نہیں ہے بلکہ ایک عملی کردار کا نام ہے جس کا اثر تمام شہریوں پر پڑتا ہے، اور جس کے نتیجہ میں تمام افراد شہریوں کے درمیان باہمی مساوات کی اہمیت کا ادراک کرتے ہیں، یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شہریت معاشرہ میں تمام افراد کی کامل رکنیت کی حیثیت کو اس پر مرتب ہونے والے حقوق وفرائض کے ساتھ تسلیم کرتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ قوم کے تمام ہی فرزندان جو وطن کی سرزمین پر زندگی گزارتے ہیں بلا کسی امتیاز کے سب برابر ہیں، قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں شریعت نے شہریت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے، انہی آیات میں سے ایک آیت ہے:

”لاینھاکم اللہ عن الذین یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین“ (سورہ ممتحنہ:۸)۔ (جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی ہو اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا ہو، ان کے ساتھ سلوک واحسان اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتا، بے شک اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زائد مواقع پر یہودیوں سے مصالحت کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہریت ایک عمومی حق ہے اور یہ کہ تمام مذاہب کے پیروکاروں کا احترام کرنا، ان کے حقوق ادا کرنا اور ان کی عزت وآبرو کی حفاظت کرنا لازم ہے، اس طرح تمام گروہوں اور جماعتوں کے لئے عمومی نقطہ اتحاد واجتماعیت دراصل وہ شہریت ہے جس کا سرچشمہ نص شرعی ہے، جو ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے موافق حکومت کی تشکیل کی بنیادوں کا لحاظ کرنے والی ہے، اور جس کا مطلب صرف شہریت کے حقوق وفرائض ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب وہ عمومی فرائض وذمہ داریاں بھی ہیں جو ہر شہری کے کندھے پر ڈالی گئی ہے، اور جب اسلام کے رو سے شہریت کا یہ مطلب ہے کہ جس کے نتیجہ میں ہر شہری کے ذمہ حقوق کے ساتھ ایسے فرائض بھی ہیں جو معاشرہ میں انسانی تعلقات اور رابطوں کو مستحکم کرتے ہیں، ہر ایک کے حقوق اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتے ہیں، امن وامان اور عدل وانصاف فراہم کرتے ہیں، میں زیر تحریر اس مقالہ کی تیاری میں اللہ تعالیٰ سے خیر کی توفیق مانگتا ہوں جس کا عنوان ہی ”شہریت کے حقوق وفرائض: قرآن وسنت کی روشنی میں“۔

موضوع کے انتخاب کی اہمیت:

اس موضوع کی اہمیت کا خلاصہ اس طرح ہے: شہریت ایک وطن کے تمام باشندوں کے حقوق وفرائض پر مشتمل ہوتی ہے، اس لئے اس مقالہ میں ان بہت سے مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج معاشرہ پر چھائے ہوئے ہیں، جن میں سیاسی، ثقافتی ومعاشرتی حالات کی دشواریاں بھی ہیں جن سے آج عام طور پر پورا معاشرہ گزر رہا ہے، اور خاص طور پر مصری معاشرہ دوچار ہے، اور وہ چیلنجز بھی ہیں جن کا سامنا معاشرہ کر رہا ہے، کیونکہ شہریت کے فقہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے یہ حالات ملک کی سالمیت اور اس کی داخلی وحدت سے متعلق ہیں۔

آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ معاشرہ کی داخلی وحدت کو مضبوط کیا جائے، یہ بات یقینی ہے کہ شہریت کے حقوق وفرائض کی فعالیت اس میں اہم

[1] پروفیسر اسلامک اسٹڈیز کلیۃ الآداب المنوفیہ یونیورسیٹی، مصر۔

کردار ادا کرسکتی ہے، کیونکہ شہریت اس رابطہ وتعلق کی نمائندگی کرتی ہے جو حکومت وملک کو اس کے شہریوں اور باشندوں سے جوڑتا ہے۔

یہ مقالہ مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے:

تمہید، مقدمہ، چار مقاصد، خاتمہ:

تمہید میں مقالہ کا خاکہ، منہج وانداز اور اس کے انتخاب کے اسباب پر گفتگو کی گئی ہے۔

مقدمہ میں شہریت کے لغوی واصطلاحی معنی کی وضاحت کی گئی ہے۔

مقصد اول میں قرآن وسنت کی روشنی میں شہریت کی بنیادوں اور خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔

مقصد دوم میں قرآن وسنت کی روشنی میں شہریت کے شرعی اصول بیان کئے گئے ہیں۔

مقصد سوم میں قرآن وحدیث کی روشنی میں شہریت کے فرائض کی وضاحت کی گئی ہے۔

مقصد چہارم میں قرآن وحدیث کی روشنی میں شہریت کے حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔

خاتمہ میں اس بحث کے نتائج اور تجاویز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس بحث کے اولین نتائج حسب ذیل ہیں:

۱۔ اسلام فرد مسلم کو وطن سے مربوط رہنے اور اس کے لئے وفاداری پر آمادہ کرتا ہے۔

۲۔ شہریت صرف اس بات کا تقاضہ نہیں کرتی ہے کہ انسان وطن پر عائد ہونے والے اپنے واجبی حقوق کو حاصل کرے بلکہ اس پر یہ بھی لازم کرتی ہے کہ وہ وطن سے متعلق اپنے اوپر عائد ہونے والے حقوق بھی ادا کرے۔

شہریت کے حقوق میں سے حفاظت کا حق، عقیدہ کی آزادی کا حق، انصاف میں مساوات کا حق، وطن کے اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ پوری آزادی کے ساتھ آنے جانے کا حق، کانفرنسوں، اجتماعات وجلسے اور انتخابات میں شرکت کی آزادی کا حق جیسے حقوق شامل ہیں۔

اسی طرح شہریت کے فرائض میں بھلائی کے کاموں میں امیر (ولی امر) کی اطاعت، وطن کا دفاع اور حفاظت، وطن کے قانون کا احترام اور دوسروں کی آزادی اور ان کی خصوصیات کا احترام شامل ہے۔

مقدمہ:

مواطنہ (شہریت) کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

مواطنہ (شہریت) کی لغوی تعریف:

مواطنہ (شہریت) لغت میں مفاعلہ کے وزن پر ہے جو موطن بروزن مفعل سے ماخوذ ہے، موطن اور وطن دونوں کے ایک ہی معنی ہیں لسان العرب میں مذکور ہے:

وطن وہ جگہ ہے جہاں آدمی رہتا ہے وہی اس کا جائے قیام اور ٹھکانہ ہوتا ہے، وطن بالمکان اور أوطن دونوں أقام کے معنی میں ہیں، یعنی قیام کرنا، وطن بنانا، کہا جاتا ہے أوطنه أي اتخذه وطنا یعنی اس نے فلاں قام کو وطن بنایا، اور موطن جنگ کے میدان کو بھی کہا جاتا ہے، اس کی جمع مواطن ہے، قرآن کریم میں یہ لفظ آیا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''لقد نصركم الله في مواطن كثيرة'' (سورہ توبہ:۲۵) ''أوطنت الارض ووطنتها واستوطنتها'' یہ فعل مختلف ابواب سے استعمال ہوتا ہے، اور سب کے معنی ہیں 'میں نے اس سرزمین کو وطن بنایا' اسی طرح توطین باب تفعیل سے آمادہ کرنے کے معنی میں آتا ہے، مثلاً "توطين النفس على الشئي" یعنی نفس کو کسی چیز کے لئے آمادہ کرنا (لسان العرب، ناشر دار صادر بیروت، ج ۱۳، ص:۴۵۱)۔

وطن اصلی اس شہر اور جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان پیدا ہوا اور جہاں وہ رہتا ہے، اور وطن اقامت اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کرتا ہے، البتہ اس جگہ مستقل رہائش اختیار نہیں کرتا (التعریفات، باب 'و' ج ۱، ص:۳۲۷)۔

چنانچہ مواطنہ (شہریت) دراصل وطن کی نسبت ہے، اس کا مطلب اس جگہ کی طرف نسبت کرنا ہے جس کو اس نے وطن بنایا ہے، اور جب مفاعلۃ کا صیغہ عربی زبان میں طرفین (یعنی دو شخصوں یا چیزوں) کے درمیان اشتراک فعل کا فائدہ دیتا ہے، جیسے دو شریک (پارٹنرز) کے درمیان شرکت کا معاملہ، کسان اور مالک زمین کے درمیان بٹائی کا معاملہ، تجارت میں صاحب مال اور محنت وعمل کرنے والے کے درمیان مضاربت کا معاملہ، تو اسی طرح مواطنہ (جو مفاعلہ کے وزن پر ہے) کے معنی ہوں گے: ملک کے باشندوں اور وطن کے درمیان اشتراک عمل کا معاملہ۔

اس اعتبار سے مواطنہ (شہریت) کا معنی ہے وہ بھروسہ منداور معتبر جذبات واحساسات جو شہری اور وطن کے درمیان پائے جاتے ہیں، بسا اوقات بعض احساسات فطری وتکوینی ہوتے ہیں جو دو شخصوں کے درمیان مختلف ہوسکتے ہیں، کیونکہ شہری کے اعتبارات اس کی شخصی، روحانی، جذباتی، لسانی، قومی، مادی اور تاریخی اعتبار سے یا اس کی تعلیم وثقافت کے معیار اور اس کی شخصیت کے لوازمات کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔

لوگوں کی تعلیم وثقافت اور ان کے اعتبارات کے اختلاف کی وجہ سے ان کی قسمیں مختلف ہیں، اور ان کے نزدیک وطن اور موطن کے مفہوم کا دائرہ اور اس کے متعلق ہونے والے الفاظ اور صیغوں کے مفہوم کا دائرہ بھی مختلف ہے، چنانچہ جو اپنے قومی ترانہ میں قومی احساس وشعور میں ڈوبنا چاہتا ہے وہ یہ ترانہ گاتا ہے:

''بلاد العرب أوطاني'' سارا ملک عرب میرا وطن ہے

اور جس کو اپنی قومیت سے زیادہ اپنے دین کی فکر ہوتی ہے وہ یہ شعر گنگناتا ہے:

اضحی لنا الاسلام دینا　　　وجمیع الکون لنا وطنا

اسلام ہمارا دین ہے اور ساری کائنات ہمارا وطن ہے۔

بہر حال 'وطن' کے لغوی معنی ہیں وہ منزل یا ٹھہرنے کی جگہ جہاں آدمی قیام کرے، اس مفہوم کے دائرہ میں مواطنہ (شہریت) کا مطلب ہے کسی حکومت یا ملک کی مکمل رکنیت جس میں شہریوں کو بعض حقوق حاصل ہوں، جیسے اجتماع کرنے کا حق، ووٹ دینے کا حق، عام مناصب پر فائز ہونے کا حق، اسی طرح بعض ذمہ داریاں اور فرائض بھی عائد ہوتے ہیں مثلاً ٹیکس ادا کرنے اور اپنے ملک کے دفاع کے ساتھ دیگر بہت سی ذمہ داریاں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں مواطنہ (شہریت) کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

مواطنہ (شہریت) فرد اور حکومت کے مابین ایک ایسا تعلق ہے جس کا تعیین اس ملک کا قانون کرتا ہے اور جس کے ضمن میں بعض حقوق حاصل ہوتے ہیں اور ساتھ ہی بعض ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں (الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ، ص: ۱۱۰)۔

اس تعریف میں اگر چہ مواطنہ (شہریت) کے لغوی اور عرفی معنی کے بعض عناصر کا لحاظ رکھا گیا ہے، جیسے وہ جگہ جہاں آدمی قیام کرے، اور یہی وطن اور موطن کا لغوی اور اصطلاحی مدلول ہے، اسی طرح شہری اور اس کے وطن کے درمیان اشتراک عمل جو مواطنہ کے صیغہ کا مدلول ہے، مگر یہ تعریف ان تمام معانی سے مختلف ہے، علاقہ کے دائرہ اور وہاں پر قائم حکومت کے اعتبار سے، شہری اور حکومت کے درمیان اشتراک عمل کی نوعیت کے اعتبار سے اور وہاں کے نظام وقانون کے مطابق اس پر مرتب ہونے والے حقوق وفرائض کے اعتبار سے۔

ماہرین سیاست کی ایک جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مواطنہ (شہریت) صرف فرد اور حکومت کے مابین تعلق ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک عملی اور تجرباتی کردار ہے جس کا اثر تمام شہریوں پر پڑتا ہے، اور جس کے نتیجہ میں تمام لوگوں کو دین ومذہب، رنگ ونسل اور جنس کی تفریق کے بغیر تمام شہریوں کے مساوات کی اہمیت کا ادراک ہوتا ہے۔

چنانچہ اس تعریف کے اعتبار سے مواطنہ (شہریت) مساوات کی بنیاد پر قائم ہونے والی کی حکومت میں شہریوں کے درمیان ایک عملی وتجرباتی کردار ہے، یہ صرف ایک قانونی تعلق کا نام نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مواطنہ (شہریت) ایک اصطلاح ہے جو کسی قوم یا وطن کی جانب نسبت کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس طور پر کہ وہ معاشرہ میں ایک کامل ومساوی رکنیت ہے جس پر بہت سے حقوق وفرائض مرتب ہوتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ابنائے قوم جو وطن کی سرزمین پر زندگی گزارتے ہیں، بلا کسی امتیاز کے سب کے سب برابر ہیں، خواہ وہ امتیاز کسی بھی تحکیمی معیار پر ہی کیوں نہ قائم ہو، جیسے دین یا جنس یا رنگ یا اقتصادی معیار یا سیاسی وابستگی یا فکری

موقف (المواطنة فی زمن العولمة، مصنف: السید یاسین، ناشر: الدار المصریة، قاہرہ، سن اشاعت ۲۰۰۲ء، ص: ۲۲، المواطنة والوطنیة: اتماء وعی، مصنف: ڈاکٹر حسن طوالبة، ص: ۱۲)۔

مواطنہ اسلامی فقہ کی روشنی میں:

سیاسی مواطنہ (شہریت) کی اس کے آخری معنی کے اعتبار سے فقہ اسلامی کے معیار میں کوئی صحیح جگہ نہیں ہے کیونکہ فقہ اسلامی نے اپنی تشریع میں تمام انسانوں کے درمیان پائے جانے والے بہت سے فروق کو مٹایا اور باطل قرار دیا، چہ جائیکہ وہ ایک ہی وطن کے تمام باشندوں کے درمیان ہو، اور کسی بھی معنی کے اعتبار سے ہو، البتہ اس نے ایسے فروق کو مانا ہے جو عقلاء کے نزدیک بھی معتبر ہے، نیز اپنے مخصوص پیمانے سے دیگر فروق کو بھی وضع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لایستوی القاعدون من المؤمنین غیرأولی الضرروالمجاهدون فی سبیل الله بأموالهم وأنفسهم فضل الله المجاهدین بأموالهم وأنفسهم علی القاعدین درجة وکلا وعدالله الحسنی وفضل الله المجاهدین علی القاعدین أجرا عظیما'' (سورہ نساء: ۹۵)۔ (جن مسلمانوں کو کوئی معذوری لاحق نہ ہو اور وہ (جہاد میں جانے کے بجائے گھر میں) بیٹھ رہے وہ اللہ کے راستے میں اپنے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہیں، جو لوگ اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں ان کو اللہ نے بیٹھے رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے، اور اللہ نے سب سے اچھائی کا وعدہ کر رکھا ہے، اور اللہ نے مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں پر بڑی فضیلت دے کر بڑا ثواب بخشا ہے)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''الرجال قوامون علی النساء بمافضل الله بعضهم علی بعض وبماانفقوامن أموالهم'' (سورہ نساء: ۳۴)۔ (مرد عورتوں کے نگراں ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور کیونکہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یأیها الناس انا خلقناکم من ذکروأنثی وجعلناکم شعوباوقبائل لتعارفوا ان أکرمکم عندالله أتقاکم ان الله علیم خبیر'' (سورہ حجرات: ۱۳)۔ (اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضکم علی بعض" (سورہ نساء: ۳۲)۔

(اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو)۔

شارع حکیم نے رنگ ونسل اور وطن کے فرق کو مٹایا ہے، لیکن ساتھ ہی اس نے بعض دیگر فروق کو قائم کیا ہے، جیسا کہ ان مذکورہ آیات اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں ان کا ذکر ہے، اور وہ بہت ہی زیادہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے، یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ سیکولر نظریہ انسانوں کے درمیان پائی جانے والی برتری وفوقیت میں دین اور دین سے وابستگی کے کسی کردار کا قائل نہیں ہے، جیسا کہ آسمانی مذاہب اور آسمانی شریعتوں میں ہے۔

پہلا مقصد: شہریت کی بنیادیں اور خصوصیات۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں:

شہریت انسان کی کسی متعین علاقہ اور ملک کی طرف نسبت ووابستگی کا نام ہے، چنانچہ یہ چند باتوں کا تقاضہ کرتی ہے، جن میں سے کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ نئے معنی کے اعتبار سے ملک یا حکومت کا وجود ہو۔

۲۔ ایسے وطن کا وجود ہو جس میں تمام سرگرمیاں جاری ہوں یا وہ ایسا علاقہ ہو جس کی سرحدیں متعین ہوں۔

۳۔ فرد اور حکومت کے درمیان اجتماعی تعلق قائم ہو۔

۴۔ معاشرہ کے افراد کے درمیان پرامن بقائے باہم کے ضابطہ کا التزام ہو۔

۵۔ حقوق وفرائض میں باہمی اشتراک ہو۔

۶۔ حکومتی نظام کا احترام ہو، اور دستوری، قانونی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، اور تہذیبی سطح پر حاکم سے اس کا تعلق ہو۔

چنانچہ شہری مقررہ ضمانتوں کے سایہ میں پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے اور اپنی مصلحتوں کا اظہار کر سکتا ہو۔

شہریت کی بنیادیں:

معاشرہ میں شہریت اچھی شکل میں فروغ پاسکے اس کے لئے دو بنیادوں کا پایا جانا ضروری ہے:

پہلی بنیاد: آزادی اور حاکم کی طرف سے ظلم واستبداد کا نہ ہونا

دوسری بنیاد: دین، مذہب اور عرف سے قطع نظر حقوق وفرائض میں تمام شہریوں کے درمیان مساوات وبرابری کا پایا جانا، یہ دونوں بنیادیں اسی وقت پائی جاسکتی ہیں جب مندرجہ ذیل نظام موجود ہو۔

۱۔ سیاسی نظام: جس کا مقصد جمہوریت کی خدمت ہے، جو دراصل قوم کی حکومت قوم کے ذریعہ اور قوم کے لئے ہے۔

۲۔ قانونی نظام: جس کا مقصد شہریوں کے حقوق اور اس کے فرائض کا جاننا ہے۔

۳۔ اجتماعی نظام: اس نظام کا دارومدار وطن کی محبت اور وطن کے حقوق کی معرفت پر ہے، اور اس عملی کردار پر ہے جس کے ذریعہ ابناء وطن پر عائد ہونے والے حقوق کا احترام ظاہر ہوتا ہے، جیسے وطن اور وطن کے باشندوں کا دفاع، اسی طرح ان کے حقوق اور حکومت کے حقوق کا دفاع وغیرہ۔

شہریت کی خصوصیات:

اسلام میں شہریت کا سیاسی وشہری مفہوم کے علاوہ ایک دینی مفہوم بھی ہے، جیسے اسلامی اخوت کا مفہوم، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شہریت نے نسلی، دینی، تہذیبی تنوع کے باوجود اعتدال اور توازن پیدا کیا ہے، جبکہ دوسرے معاشرہ میں شہریت نسلی، دینی، اور ثقافتی کشمکش کے راستہ پر چل پڑی، اور مغرب تو ان مقابلہ آرائیوں کی انتہاء پر پہونچ گیا ہے، اس لئے کہ اس نے شہریت کو نسلی رجحان سے ہم آہنگ کردیا، جیسا کہ بیسویں صدی میں دو عالمی جنگوں نے اس کا آشکارا کردیا، اسلام میں شہریت امت اسلامیہ اور اس کی وحدت کے ساتھ ولاء وفاداری کے تعلق سے معارض نہیں ہے، کیونکہ شہریت اسلامی تناظر میں ایک انسانی مفہوم ہے نہ کہ نسلی، اور وہ تمام مسلمانوں کو شامل ہے، چنانچہ اسلام میں شہریت تمام شہریوں کے لئے ان حقوق کی ضمانت دیتی ہے جن کو حقوق انسانی کے نام سے جانا جاتا ہے، کیونکہ یہ رواداری کے قاعدہ پر قائم ہیں، چنانچہ یہ صرف نعرہ ہی نہیں ہے بلکہ تعمیر واستحکام کا ذریعہ بھی ہیں، اس لئے کہ اس کی بنیاد آزادی ومساوات پر ہے، چنانچہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے جامع انسانی وحدت کی طرف بلایا تا کہ لوگ محبت وتعاون اور امن وسکون کے سایہ میں زندگی گزار سکیں، قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں اس موضوع پر دلالت کرنے والے نصوص کثرت سے ہیں، چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

''یأیھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ'' (سورہ نساء:۱)۔

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''یأیھا الناس إن ربکم واحد وان أباکم واحد کلکم من آدم وآدم من تراب ان أکرمکم عنداللہ أتقاکم لیس لعربي علی عجمي فضل إلا بالتقوی'' (شرح مسلم للنووی، ۱۱۳، ص:۱۶۷)۔

دوسرا مقصد: مواطنہ (شہریت) کے شرعی اصول، قرآن وحدیث کی روشنی میں:

اسلامی شریعت نے متعدد مواقع پر شہریت کے حق کی تائید کی ہے، جن میں چند اس طرح ہیں:

۱۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''قالوا یاشعیب مانفقه کثیرا مما تقول انا لنراك فینا ضعیفا'' (سورہ ہود:۹۱)۔ (وہ بولے اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے درمیان ایک کمزور آدمی ہو)۔

یہاں لفظ 'فینا' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کے کفر کے باوجود ان کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، اور وطنیت وشہریت میں ان کے ساتھ شریک تھے۔

۲۔ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے کہا: ''اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم'' (سورہ یوسف:۵۵)۔ (آپ مجھے ملک کے

خزانوں پر مقرر کر دیجئے، یقین رکھئے کہ مجھے حفاظت کرنا خوب آتا ہے اور میں پورا علم رکھتا ہوں)۔

حالانکہ اس وقت بادشاہ کافر تھے، یعنی مصر کے بادشاہ اور ان کی قوم۔

۳۔ اسلام نے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام لوگ اپنی اصل، جنس اور فطری میلان ورجحان میں یکساں اور برابر ہیں، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی شہریت اور وطن کی محبت پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

مذکورہ باتوں کو ہم درج ذیل سطور میں تلاش کرتے ہیں:

(الف) اللہ تعالیٰ نے وطن سے نکالنے کو صراحت کے ساتھ قتل نفس کے برابر قرار دیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"ولو انا کتبنا علیهم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوه الا قلیل منهم" (سورہ نساء:۶۶)۔

چنانچہ وطن کے ساتھ یا وطن کی نسبت کے ساتھ مضبوط تعلق ووابستگی انسانی طبیعت ومزاج میں شامل ہے، اور نفس انسانی میں چھپی ہوئی فطرت ہے، خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "لولا حب الاوطان لخرب بلد السوء" یعنی وطنیت انسان کے لئے ایک لازمی ضرورت ہے، گرچہ وہ ملک غریب ہی کیوں نہ ہو، اور وہاں کے باشندہ برے اور بد معاش ہی کیوں نہ ہوں۔

(ب) جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا حکم فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس وطن کی طرف دیکھا جس میں آپ پیدا ہوئے یعنی مکہ اور فرمایا:

"واللہ انك لأحب البلاد الی ولولا أن قومك اخرجونی منك ماخرجت"

(خدا کی قسم اے مکہ تو مجھے تمام شہروں سے سب سے زیادہ محبوب ہے، اگر تیری قوم نے مجھے تجھ سے نہ نکالا ہوتا تو میں نہ نکلتا)۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی خاطر کے لئے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: "ان الذی فرض علیك القرآن لرادك الی معاد" (سورہ قصص:۸۵)۔

(ج) قرآن کریم وطن کے دفاع کو جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: "ولیعلم الذین نافقوا وقیل لهم تعالوا قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعوا..." (سورہ آل عمران:۱۶۷)۔

اوپر بیان کردہ آیات واحادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وطن کی محبت انسان کو وطن کے دفاع کے لئے راستہ میں جان دینے پر آمادہ کرتی ہے، اور یہ بالکل اسی طرح مشروع وجائز ہے جس طرح اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کرنا مشروع ہے۔

۴۔ اسلام میں شہریت کا دائرہ وطن اسلامی کے جغرافیائی وعلاقائی حدود سے زیادہ وسیع ہے، اور وطن کا ہر فرد خواہ مسلمان ہو یا معاہد اس وطن کا شہری ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ امت مسلمہ کا ایک رکن ہے، جسے ہر طرح کے حقوق حاصل ہیں، اور اس پر تمام قسم کی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، چنانچہ مسلمانوں کا کوئی ایک مخصوص وطن نہیں ہوتا ہے، بلکہ سارے اسلامی ممالک اس کا وطن ہیں، اور علاقائیت کے تنگ مفہوم میں وطن سے اس کی محبت بالعموم پوری امت مسلمہ سے اس کی محبت مانع نہیں ہوتی، چنانچہ تمام شہری وطن کے تنگ دائرہ میں غنیمت وتاوان اور نفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اور یہی پہلا دائرہ ہے، پھر اس کا دائرہ مزید وسیع ہوتا ہے، تاکہ تمام مسلمانوں کے اندر وحدت وقوت پیدا کی جائے، ان کی عزت وکرامت کی حفاظت کی جائے، اور اس میں پوری امت مسلمہ شامل ہوں۔

اس کا تقاضہ ہے کہ مسلسل آپسی تعاون کو فروغ دیا جائے، اور تعاون کے حلقے قائم کئے جائیں جو ایک دوسرے کو تقویت پہونچائیں، چنانچہ اجتماعی زندگی کی حفاظت تو دفاع کے پے در پے اقدام سے کی جاسکتی ہے، جو ایک کے بعد ایک ہو، اور آخر میں اس سب کا فائدہ اور بھلائی پوری امت کے مفاد کے لئے ہو، کیونکہ یہ ایک امت ہے، جسے چھوٹی چھوٹی مصلحتیں ٹکڑوں میں نہیں بانٹ سکتیں اور جس کے مضبوط وجامع رابطہ کو معمولی وجزئی مسائل نہیں توڑ سکتے، اسی وجہ سے اس آیت کے لئے ایک امت کی تعبیر اختیار کی گئی ہے نہ کہ ایک قوم کی، چنانچہ اس امت کی عمارت کسی بھی اسلامی مملکت کے ایسے معاشرہ کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے جس کے اندر متعدد نظریات اور مختلف رنگ ونسل کے لوگ رہتے ہوں، ان کے مقاصد واغراض بھی مختلف ہوں، مگر وہ سب ایک ہی عقیدہ پر ایمان رکھتے ہوں، ایک ہی شریعت کے سایہ میں زندگی گزارتے ہوں، اور ایک ہی اخوت وبھائی چارگی ان سب کو ایک لڑی میں پروتی ہو، جیسا کہ اللہ رب العزت کا

ارشاد ہے: ''انما المومنون اخوۃ'' (سورہ حجرات:۱۰)۔

۵۔ مدینہ منورہ کے معاہدوں میں شہریت کا مفہوم: موجودہ زمانہ کی حکومت کے مفہوم کے ظاہر ہونے سے پہلے اور دسمبر ۱۹۴۸ء میں انسانی حقوق کے عالمی اعلان پر اتفاق سے بھی پہلے ہی اسلام نے عہد نبوی ہی میں شہریت کے اصول وضوابط کو بیان کر دیا۔

شہریت کے اصول بیان کرنے میں اسلام کی یہ سبقت اس معروف معاہدہ نامہ میں بھی ظاہر ہوتی ہے جو صحیفہ مدینہ کے نام سے معروف ہے، یہ معاہدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد اور بعثت نبوی کے ۱۳ سال بعد ۶۲۲ھ میں کیا تھا، اس معاہدہ نے دو باتیں نمایاں کیں:

اول: نئے وطن میں اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔

دوم: تہذیبی واعتقادی تنوع (یعنی مسلمانوں، یہودیوں اور اوس وخزرج کے مشرکین جو ایمان نہیں لائے تھے) اور نسلی تنوع (مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین جو متعدد عدنانی قبائل سے تعلق رکھتے تھے، نصار جو قحطانی قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور یہود جو سامی قبائل سے تعلق رکھتے تھے) کے باوجود مدینہ کا معاشرہ ایک امت میں ڈھل گیا۔

صحیفہ مدینہ یا معاہدہ نامہ کے دفعات جن سے شہریت ثابت ہوتی ہے، اور جسے ہمارے زمانہ میں دستور مملکت کہا جاتا ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جب آپ کی عمر شریف ۵۳ سال کی تھی، یعنی ہجرت کے پہلے سال بعثت کے تیرہویں سال مطابق ۶۲۲ھ مسلمانوں اور مدینہ کے دیگر گروہوں اور باشندوں کے درمیان ایک معاہدہ کیا، یہ پہلا سیاسی معاہدہ تھا جو ۴۸ دفعات یا فقروں پر مشتمل تھا، اس معاہدہ کی بعض دفعات اس طرح ہیں:

یہ تحریر محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایمان والوں اور قریش ویثرب کے اطاعت گزاروں کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جنہوں نے مسلمانوں کی تبعیت اختیار کی، ان سے مل گئے اور ان کے ساتھ جہاد میں شامل رہے:

۱۔ یہ سب لوگ (دیگر لوگوں کو چھوڑ کر) ایک ہی امت ہیں۔

۲۔ کوئی مشرک کسی مسلمان کے خلاف قریش کے مال یا ان کے افراد کو پناہ نہیں دے گا، اور نہ ان کے درمیان حائل ہوگا۔

۳۔ یہودیوں میں سے جنہوں نے ہماری تبعیت اختیار کی ہے ان کے لئے مدد اور حمایت ہے، ان کے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا، اور نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی، ان کے موالی بھی ان کے ساتھ ان کی طرح ہیں، سوائے اس کے جو ظلم کرے یا کسی جرم کا ارتکاب کرے، اس وقت وہ خود اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو ہلاک کرنے والا ہوگا۔

۴۔ بنی عوف کے یہود ایمان والوں کے ساتھ امت ہیں، یہود کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین ہے۔

۵۔ یہود بھی مسلمانوں کے ساتھ خرچ کریں گے جب تک حالت جنگ میں ہوں گے۔

۶۔ یہود کے ذمہ خود ان کا خرچ ہے، اور مسلمانوں کے ذمہ ان کا خرچ ہے۔

۷۔ بنی حارث کے یہود کے لئے اس جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۸۔ بنی نجار کے یہود کے لئے اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۹۔ بنی حبشہ کے یہود کے لئے اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۱۰۔ بنی ثعلبہ کے یہود کے لئے اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۱۱۔ بنی اوس کے یہود کے لئے اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے لئے ہیں۔

۱۲۔ ثعلبہ کا بطن (شاخ) جفنہ بھی خود ان کی طرح ہے (یعنی ثعلبہ کی طرح)

۱۳۔ بنی شطیبہ کے لئے بھی اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۱۴۔ یہ معاہدہ بھلائی ونیکی کے کاموں میں ہے، نہ کہ گناہ کے کاموں میں۔

۱۵۔ ثعلبہ کے موالی بھی خود ثعلبہ کی طرح ہیں۔

۱۶۔ یہ کہ اس معاہدنامہ یا میثاق پر اتفاق کرنے والوں سے جو جنگ کرے گا اس کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد لازم ہوگی۔

۱۷۔ یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی وخیر اندیشی اور بھلائی کا معاملہ کیا جائے گا، برائی اور گناہ کے کاموں میں ساتھ نہیں دیا جائے گا۔

۱۸۔ کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ مخالفانہ کاروائی نہیں کرے گا۔

۱۹۔ مظلوم کی مدد ونصرت کی جائے گی۔

۲۰۔ مدینہ کے اندر کشت وخون کرنا اس معاہدہ پر اتفاق کرنے والوں پر حرام ہوگا۔

۲۱۔ اس معاہدہ پر اتفاق کرنے والوں کے درمیان اگر کوئی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہوجائے جس میں فساد کا خوف ہو تو اس کا فیصلہ خدا اور اللہ کے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کیا جائے گا۔

۲۲۔ قریش کو پناہ نہیں دی جائے گی، نہ ہی اس کے مددگار ومعاونین کو پناہ دی جائے گی۔

۲۳۔ یثرت (مدینہ) پر جو بھی چڑھائی کرے گا اس کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا لازم ہوگا، اور یہ کہ معاہدہ ظالم وگنہگار کے درمیان حائل نہیں ہوگا۔

اس معاہدہ نے مدینہ کے تمام باشندوں، مہاجرین، انصار، یہود اور اس کے علاوہ دیگر لوگوں کو ان کے عقیدہ سے صرف نظر کرتے ہوئے شہریت کا حق دیا ہے، اور یہی وہ حقوق ہیں جو آج شہری یا مدنی حقوق کے نام سے معروف ہیں، اسی طرح اس معاہدہ نے مدینہ کی حکومت میں غیر مسلموں کو شہری قرار دیا اور اس حکومت میں ان کے حقوق بھی مسلمانوں کے حقوق جیسے قرار دیے گئے، اور ان پر بھی وہی ذمہ داریاں اور فرائض عائد کئے گئے جو مسلمانوں پر عائد کئے گئے، البتہ تشریع احکام سے متعلق مسلمانوں کے بعض مخصوص مسائل میں دیگر لوگوں سے الگ تھے۔

بعض اوقات بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں شہریت کا تصور صرف مسلمانوں کے درمیان ہے، ہم کہتے ہیں کہ ایک سے زیادہ مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودیوں کے درمیان مصالحت ہوئی، جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شہریت کا تصور عام ہے، اسی طرح میثاق مدینہ کے دفعات بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں، اس کے علاوہ بہت سی آیات واحادیث اہل ذمہ کے احترام، ان کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی عزت وآبرو کی حفاظت کا حکم دیتی ہیں، اس سلسلہ کی سب سے نمایاں آیت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

"لاینھاکم اللہ عن الذین یقاتلونکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین" (سورہ ممتحنہ: ۸)۔ (جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی ہو اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا ہو، ان کے ساتھ سلوک واحسان اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتا، بے شک اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

اس بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمان جو اپنے دینی اقدار اور دینی احکام کی روح سے آشنا ہوں، ان سے اس کے علاوہ کسی اور بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ ایک اچھا شہری ہوگا، ذمہ داری کا احساس رکھنے والا، اپنے ہم وطنوں کے ساتھ تعاون وہم آہنگی رکھنے والا اور اپنے وطن کے تعلق سے غیرت وحمیت رکھنے والا ہوگا، کیونکہ اسلام انسان کو اپنے وطن سے مربوط رہنے اور اپنے دین اور پھر اپنے وطن کے ساتھ وفاداری پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ دستوری معاہدہ نامہ دشمنوں کے خلاف مدینہ کے تمام گروہوں اور باشندوں کے درمیان ایک فوجی وعسکری معاہدہ وجود میں لانے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے ساتھ کسی بھی طرح کے تعاون سے روکنے پر اتفاق کے ساتھ ساتھ شہریت کے مسائل اور شہریوں کے حقوق وفرائض پر مشتمل ہے۔

چنانچہ دفعہ ۱/ تمام شہریوں کے درمیان شہری وحدت کی بنیاد کو مستحکم کرتا ہے، اور یہ ثابت کرتا ہے کہ مدینہ کے تمام گروہ اور باشندے حکومت کی رعایا ہیں، اور عصر حاضر کے مفہوم کے اعتبار سے حکومت کی عوام ہیں، یا امت کے مفہوم کو وجود میں لانے والی جماعتیں ہیں۔

اس کا دفعہ ۲/ مکہ میں قریش کے مشرکین کے ساتھ مدینہ والوں کی طرف سے تعاون پر پابندی عائد کرتا ہے، خواہ یہ تعاون جان کے تحفظ سے متعلق

ہو یا مال کے تحفظ سے متعلق یا عام اقتصادیات سے متعلق۔

دفعہ ۳/ یہودیوں کے ساتھ باہمی نصرت وتعاون کی ضرورت کا اعلان کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں پر یہودیوں کا حق ہے کہ وہ ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد وحمایت کریں۔

دفعہ ۴/ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ظلم وزیادتی کو چھوڑ کر عدل وانصاف کے دائرہ میں رہتے ہوئے شہری وطنی وحدت کا اعلان کرتا ہے، ظلم کی صورت میں ظالم اپنے ظلم کے انجام کا خود ذمہ دار ہوگا۔

دفعہ ۵/ دشمنوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کی صورت میں حکومت کو اقتصادی طور پر مضبوط کرنے میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان مساوات کی بنیاد کو مستحکم کرتا ہے، اور یہ بتاتا ہے کہ حالت جنگ میں حکومت کے ساتھ وفاداری کا تعلق رکھنا اور اس کی نصرت وحمایت کا اعلان کرنا واجب ہے۔

دفعہ ۶/ مسلمانوں اور یہودیوں میں سے ہر ایک پر اقتصادی ذمہ داری اور بوجھ کو تقسیم کرتا ہے۔

دفعہ ۷/ تا دفعہ ۱۵/ (یہ اصل معاہدہ نامہ میں دفعہ ۲۶ سے دفعہ ۳۵ تک ہے) مسلمانوں اور یہودیوں کے نو قبائل کے درمیان (بنی عوف کے یہودیوں کو شامل کرکے) حقوق وفرائض میں برابری ومساوات کی بنیاد کو واضح کرتے ہیں۔

دفعہ ۱۶/ اور دفعہ ۱۷/ یہ دونوں دفعات اہل معاہدہ اور ان کے دشمنوں کے درمیان جو ان سے برسرِ پیکار ہوں، باہمی نصرت وتعاون کی ترجیحات کو متعین کرتے ہیں، اور یہی عسکری ودفاعی مفہوم ہے، اس کے ساتھ ساتھ رائے، مشورہ اور نصیحت وخیر خواہی کے اظہار میں باہمی تعاون کی ضرورت کو بیان کرتے ہیں، اور یہی شہریت کا بنیادی واجتماعی مفہوم ہے۔

دفعہ ۱۸/ شخصی وانفرادی ذمہ داری کے اصول کو بیان کرتا ہے، کیونکہ ہر انسان اپنے خاص تصرفات اور اپنے ظالمانہ کردار کا خود ذمہ دار ہے، اور یہ اسلام کا قابل فخر ضابطہ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

''ولا تزر وازرة وزر أخری'' (سورہ انعام: ۱۶۴) (اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے)۔

''کل أمری بما کسب رھین'' (سورہ طور: ۲۱) (ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا گروی ہے)۔

''کل نفس بما کسبت رھینة'' (سورہ مدثر: ۳۸) (ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے)۔

دفعہ ۱۹/ حاکم کے پاس مقدمہ لے جانے کے اصول کی وضاحت کرتا ہے اور قضاء وفیصلہ کا مفہوم بیان کرتا ہے۔

دفعہ ۲۰/ شہریت کے جغرافیائی مفہوم کے دائرہ کی تحدید کرتا ہے۔

دفعہ ۲۱/ باہمی نزاع یا قانونی لڑائی کو ختم کرانے کی حالت میں اس کے مرجع وسرچشمہ کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے، یعنی حاکمیت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے، اس لئے کہ اسلامی شریعت ایک زمینی دائرہ رکھتی ہے۔

دفعہ ۲۲/ قریش اور ان کے حلیفوں کے ساتھ عسکری وفوجی تعاون کے تمام تعلقات کو ختم کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

دفعہ ۲۳/ اس بات کا عام اعلان کرتا ہے کہ مدینہ کا دفاع کرنا واجب ہے، اور یہ کہ حق اور انصاف کی حالت میں مدد کی جائے گی، نہ کہ ظلم وزیادتی کی حالت میں، چنانچہ ظلم وزیادتی اور گناہ کی حالت میں شہریت اس کو بے گناہی اور امتیازی برتاؤ کا حق نہیں دے گی، کیونکہ اسلام حق کی مدد کرتا ہے نہ کہ باطل کی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام شہریوں کے ساتھ مساوات کی واضح بنیاد پر معاملہ کیا جائے گا، چنانچہ یہاں ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ درجہ اول کے شہری ہوں اور دوسرے لوگ درجہ دوم یا درجہ سوم کے، کہ قانون کے سامنے سب برابر ہیں، اور کسی کو نظام قانون کی پکڑ سے معافی نہیں دی جاسکتی خواہ اسکا تعلق جنائی قانون سے ہو یا دیگر دستوری، انتظامی یا ملکی قوانین سے۔

تیسرا مقصد: شہریت کے فرائض، قرآن وحدیث کی روشنی میں

شہریت ہر شہری پر کچھ فرائض عائد کرتی ہے، جن کو انجام دینا اور اس کے تقاضے کو پورا کرنا وطن کے حق اور اس کی سلامتی کا لحاظ کرتے ہوئے ضروری

ہے، اس لئے کہ اگر وطن کے فرزندان وطن کے تئیں خود پر عائد ہونے والے حقوق کو پورے طور پر ادا نہیں کریں گے تو ان کے شہری حقوق بھی ضائع ہو جائیں گے جن کے وہ مستحق ہیں۔

شہریت کے بعض فرائض درج ذیل ہیں:

پہلی بات: حکومت اور وطن کے تئیں اخلاص و وفاداری اور ان لوگوں سے محبت و ہمدردی جو وطن میں ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسی طرح وہ ساتھ مل کر ہر مصیبت و تکلیف اور خطرات واندیشے کا سامنا کرتے ہیں اور وطن کے منافع سے ایک ساتھ فائدہ اٹھاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں وطن سب کے لئے خیر و بھلائی اور لطف و دلچسپی کا ذریعہ بن جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر أن الأرض یرثھا عبادی الصالحون ان فی ھذا لبلاغا لقوم عابدین'' (سورہ انبیاء:۱۰۵)۔ (ہم زبور میں پند و نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے، عبادت گزار بندوں کے لئے اس میں ایک بڑا پیغام ہے)۔

جہاں تک دشمنوں سے ولاء و وفاداری کی بات ہے تو یہ ایک واقعی اور حقیقی نقصان ہے، اور اس سے سوائے شر اور برائی کے اور کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی، اسی لئے اللہ تعالی نے دشمن کے ساتھ موالات وفاداری سے منع فرمایا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''یأیھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم أولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاء کم من الحق'' (سورہ ممتحنہ:۱)۔ (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، تم دوستی سے ان کی طرف پیغام بھیجتے ہو اور وہ اس حق کے ساتھ جو تمہارے پاس آچکا ہے کفر کرتے ہیں)۔

نیز اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین'' (سورہ بقرہ:۱۹۰)۔ (تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بے شک انہی میں سے ہے، ظالموں کو اللہ ہرگز راہ راست نہیں دکھاتا)۔

اور جو شخص اپنے ملک کے مفاد اور اپنے وطن کی مصلحت کے خلاف دشمنوں سے معاہدہ کرتا ہے تو وہ اپنے ملک اور وطن کے حقوق میں خیانت کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا شمار کیا جاتا ہے، اور ہر خائن کو تاریخ باہر نکال دیتی ہے، اور وہ سزا کا مستحق قرار پاتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''یأیھا الذین آمنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا أماناتکم وأنتم تعلمون'' (سورہ انفال:۲۷)۔ (اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے حقوق میں جانتے ہوئے خیانت مت کرو، اور اپنی قابل حفاظت چیزوں میں بھی خیانت مت کرو)۔

دوسری بات: وطن کا دفاع ایک مقدس فریضہ ہے، کیونکہ وطن ہر ایک کا ہے، اور بھلائی و برائی سب کو عام ہے، یہ دفاع جان و مال اور کائنات کی سب سے قیمتی شئی کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ جو شہری ہتھیار اٹھانے پر قادر ہو وہ جماعت پر فدا ہو جائے، اور سب کے لئے قربانی پیش کرے تا کہ تاریخ اسے معزز لوگوں کی صفحات میں جگہ دے، اور جب وہ تکلیف و مصیبت یا موت سے دوچار ہو تو زندہ جاوید لوگوں میں شمار کیا جائے، شہداء کے مقام و مرتبہ کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ أمواتا بل أحیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما اتاھم اللہ من فضلہ'' (سورہ آل عمران:۱۶۹-۱۷۰)۔ (جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کئے گئے ہیں ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھیں بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس، ان کو روزیاں دی جاتی ہیں)۔

دشمن کا مقابلہ یا تو جان سے ہو گا یا مال سے یا زبان سے یعنی (ذرائع ابلاغ کی جنگ) کیونکہ نبی پاک علیہ السلام کا ارشاد ہے: ''جاھدوا المشرکین بأموالکم وأنفسکم وألسنتکم'' (سنن ابی داؤد، مسند احمد، سنن بیہقی، صحیح ابن حبان)۔ (مشرکین سے اپنے مال، جان اور زبان سے جہاد کرو)۔

اور جب شہری دفاع کے فریضہ سے دستبردار ہو جائے گا تو اسی پر فدیہ یا ٹیکس دینا لازم ہوگا جسے قرآن کریم میں جزیہ کا نام دیا گیا ہے، اور جو سال میں ایک دینار ہے، چنانچہ اگر وہ خود جہاد کرے گا یا جہاد سے عاجز ہو جائیگا تو اس صورت میں اس سے اور اس جیسے لوگوں سے یہ فدیہ یا جزیہ ساقط ہو جائے گا۔

تیسری بات: حکومت کے نظام و دستور کا احترام:

اسلام نے ہر شہری پر عہد و پیمان اور حاکم کی بیعت کا لحاظ کرنا ضروری قرار دیا ہے، اسی طرح امت کے مفاد کا تحفظ کرنا اور اپنی دینی، اجتماعی،

حفاظتی، اقتصادی، صحت اور ثقافت سے متعلق ذمہ داریوں کا ادا کرنا لازم ہے، کیونکہ اس سے امن وامان قائم ہوتا ہے، آپسی برتاؤ کے نظام کی حفاظت ہوتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں امت کی اقتصادی ترقی ہوتی ہے، اور خوشحالی آتی ہے، لاقانونیت وبدنظمی کا خاتمہ ہوتا ہے، فساد وانتشار کی بیخ کنی ہوتی ہے، اور پسماندگی وتخریب کے تمام اسباب ومظاہر کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

چوتھا مقصد: شہریت کے حقوق، قرآن وحدیث کی روشنی میں:

شہریت کے حقوق قرآن وسنت کی روشنی میں شہریت کے فرائض سے کہیں زیادہ ہیں، اور یہ حقوق بڑی حد تک عالمی معاہدہ نامے میں دیئے گئے شہریت کے بنیادی وضمنی حقوق سے بڑھ کر ہیں، ان میں سے بعض اہم حقوق درج ذیل ہیں:

پہلا حق: مذہبی وغیر مذہبی آزادی:

اسلام نے کسی کو اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کرنے سے منع کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي'' (سورہ بقرہ: ۲۵۶)۔ (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے روشن ہوچکی ہے)۔

اللہ تعالی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تبدیلی مذہب پر کسی بھی طرح دباؤ ڈالنے یا زبردستی کرنے سے منع کرتے ہوئے مخاطب فرمایا ہے (اس اعتبار سے کہ آپ امت کے قائد ہیں، اور آپ کو خطاب کرنا پوری امت کو خطاب کرنا ہے) چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ولو شاء ربك لآمن من في الارض كلهم أجمعين أفأنت تكره الناس حتى يكونوا مومنين'' (سورہ یونس: ۹۹)۔ (اگر آپ کا رب چاہتا تو روئے زمین کے سب ایمان لے آتے، تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرسکتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مومن ہی ہوجائیں)۔

ایسا اس لئے ہے کہ ہدایت اور اسلام کے بارے میں شرح صدر کا ہونا اللہ کی توفیق پر موقوف ہے، کیونکہ اللہ کو معلوم ہے کہ کس کے اندر حق قبول کرنے اور باطل کو رد کرنے کی کتنی استعداد ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے: ''وألف بين قلوبهم لو انفقت ما في الارض جميعا ما الفت بين قلوبهم ولكن الله ألف بينهم'' (سورہ انفال: ۶۳)۔ (ان کے دلوں میں باہمی الفت بھی اسی نے ڈالی ہے، زمین میں جو کچھ ہے اگر تو سارا کا سارا بھی خرچ کرڈالتا تو بھی ان کے دل آپس میں نہ ملا سکتا، یہ تو اللہ نے ان کے دلوں میں الفت ڈال دی)۔

قرآن کریم نے آزادی مقرر کرنے میں صرف عقیدہ کی آزادی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلام نے اپنے سیاسی طریقہ کار میں عام نظام کے قواعد کو چھیڑ چھاڑ کئے بغیر تمام قسم کی آزادی کو شامل کیا ہے، مثلاً تنقید واعتراض کی آزادی، نقل وحرکت کی آزادی، کام کاج کی آزادی، دینی شعائر کو بجالانے کی آزادی، حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''وإنما بذلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودمائهم كدمائنا'' (صحیح البخاری، ج۲، ص: ۸۷)۔ (ان لوگوں نے تو جزیہ اس لئے دیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کی جانیں ہماری جانوں کی طرح ہوجائیں)۔

اور فقہاء معاہدہ کرنے والے اہل ذمہ کے حقوق کے بارے میں فرماتے ہیں: "لهم مالنا وعليهم ما علينا" ان کے بھی وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں، اور ان کی بھی وہی ذمہ داریاں ہیں جو ہماری ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تمام معاہدے اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ بغیر کسی اعتراض اور چھیڑ چھاڑ کے غیر مسلموں کو اپنے دینی امور ومعاملات انجام دینے کی اجازت ہوگی، اور ان کی آزادی کو تسلیم کیا جائے گا، جیسے نجران کے نصاری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ہوا، جن کو آپ نے مسجد نبوی میں ٹھہرایا، جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان بنکر آئے، اس معاہدہ نامہ میں درج ہے:

> نجران اور اس کے اطراف والوں کے لئے اللہ کی پناہ اور محمد جو اللہ کے رسول ہیں، ان کا ذمہ ہے، ان کے مال وجان، زمین وملت، غائب وحاضر، خاندان وعبادت خانے اور ہر قلیل وکثیر کی حفاظت پر جو ان کے زیر ملکیت وزیر تصرف ہیں، کسی پادری کو اس کے عہدہ سے، کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے، اور کسی کاہن کو اس کی کہانت سے برخاست نہیں کیا جائے گا، ان پر زمانہ جاہلیت کی نہ تو دیت ہوگی نہ خون ہوگا، نہ ان کو نقصان پہونچایا جائے گا، اور نہ ہی تنگی میں مبتلا کیا جائے گا، نہ ہی ان کی سرزمین پر کوئی لشکر چڑھائی کرے گا، ان میں جو بھی کوئی حق مانگے گا تو ان کے درمیان برابر تقسیم کیا جائے گا، نہ ان کو ظلم کرنے دیا جائے گا اور ان پر ظلم کیا جائے گا (اخبار عمر، از علی طنطاوی، ص: ۱۵۵)۔

اسی طرح بیت المقدس کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمر اور بیت المقدس کے باشندوں کے درمیان مقام جابیہ میں طے ہونے والا معاہدہ عمریہ ہے جس میں ان کے مال وجان اور کنیسہ وصلیب کی حفاظت وامان سے متعلق ضمانت دی گئی ہے، اسی طرح حضرت خالد بن ولید کے حیرہ اور حمص کے باشندوں سے اور حضرت عمرو بن عاص نے شہنشاہ مقوقس اور مصر کے قبطیوں سے اسی طرح کے معاہدوں پر صلح کی۔

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے حقوق میں سے یہ ہیں کہ وہ اپنے خاندان وعائلی مسائل جیسے شادی بیاہ، فسخ وطلاق وغیرہ کو اپنے دین کے مطابق انجام دینے میں آزاد ہوں گے، اور جس چیز کو وہ حلال سمجھتے ہیں جیسے شراب اور خنزیر تو ان چیزوں کے استعمال پر ان کو سزا نہیں دی جائے گی۔

ان بلند وعالی مثالوں میں وہ نو آیتیں بھی ہیں جو حقوق انسانی اور زرہ چرانے کے الزام سے ایک یہودی کی براءت کے بارے میں نازل ہوئیں، جسے طعمہ بن ابیرق نے اپنے ایک پڑوسی قتادہ نعمان کے گھر سے چرایا تھا، اور اس نے اور اس کے خاندان والوں نے اس زرہ کی چوری کا الزام زید بن سمین نامی یہودی کے سر تھوپنا چاہا، یہ آیتیں درج ذیل ہیں: ''انا انزلنا الیك الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما أراك الله ولا تکن للخائنین خصیما'' (سورہ نساء:۱۰۵)۔ (یقیناً ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ تعالیٰ نے تم کو شناسا کیا ہے، اور خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو)۔

اور اگر غیر مسلم معاہد افراد ہم مسلمانوں کے پاس اپنے مقدمات لے کر آنا چاہیں تو ان کو اسلامی عدالتوں میں مقدمات لے جانے اور فیصلہ کرانے کی آزادی حاصل ہے، اور ان کے تعلق سے حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فان جاؤك فاحکم بینھم أو أعرض عنھم وان تعرضوا عنھم فلن یضروك شیئا وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان الله یحب المقسطین'' (سورہ مائدہ:۴۲)۔ (اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں اختیار ہے خواہ ان کے آپس کا فیصلہ کر دیا کرو یا ان کو ٹال دو، اگر تم ان سے منہ پھیرو گے تو بھی یہ تم کو ہرگز کوئی ضرر نہیں پہونچا سکتے، اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، یقیناً عدل کرنے والوں کے ساتھ اللہ محبت رکھتا ہے)۔

دوسرا حق: انسانی عزت وکرامت کا حق اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم مکرم وباعزت بنایا ہے، اس لئے کہ وہ بھی اللہ کی صناعت اور اس کی مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ انسان کے وصف کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''لقد خلقنا الانسان فی أحسن تقویم'' (سورہ تین:۴)۔ (ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا)۔

حق تعالیٰ نے جنس بشر وانسان کی تکریم کو قرآن کریم میں اس طرح واضح کیا ہے: ''ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا'' (سورہ اسراء:۷۰)۔ (یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی، انہیں خشکی وتری کی سواریاں دیں، اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دیں اور اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی)۔

اسی تکریم الٰہی کے مظاہر میں سے یہ ہے کہ اللہ نے تمام فرشتوں کو ہمارے باپ حضرت آدم کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''واذ قلنا للملائکة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس أبی'' (سورہ طہٰ:۱۱۶)۔ (اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، اس نے انکار کیا)۔

قرآن کریم میں یہ اور اس طرح کی دیگر آیتیں انسانی جان کے احترام کے وجوب پر مطلقاً دلالت کرتی ہیں، خواہ زندگی کی حالت ہو یا مرنے کے بعد کی حالت ہو، اور ہم اوپر جان چکے ہیں کہ اسلام نے ایک آیت میں انسانی وحدت کی دعوت دی ہے: ''یأیھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحد'' (سورہ نساء:۱)۔ (اے لوگو! ڈرو اپنے اس پروردگار سے جس نے تم کو ایک اکیلی جان سے پیدا کیا)۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف قبائل اور قوموں کی آپسی ملاقات کو تعارف کی غرض سے واجب قرار دیا ہے، نہ پاپسندیدگی، باہمی اختلاف اور کشمکش کی غرض سے: ''یأیھا الناس انا خلقناکم من ذکر وأنثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا'' (سورہ حجرات:۱۳)۔ (اے لوگو! بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو)۔

حجۃ الوداع کے خطبہ نے اس کی مزید تائید کر دی: ''یأیھا الناس ان ربکم واحد وان أباکم واحد'' (مسند احمد بن حنبل، ج۱۲۳، ص:۲۲۶)۔ (اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ بھی ایک ہے)۔

قرآن کریم نے غیر مسلموں کے ساتھ بحث ومناظرہ کرنے میں اس بات کو لازم قرار دیا ہے کہ یہ جدال ومناظرہ اچھے انداز میں ہو، ارشاد باری ہے: ''ولاتجادلوا أهل الكتاب الا بالتي هي أحسن'' (سورہ عنکبوت:۴۶)۔ (اور اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ نہ کرو، مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو)۔

قرآن کریم نے جھگڑے واختلافات اور مسائل ومشکلات پیدا کرنے اور کشمکش برپا کرنے سے روکنے کی خاطر مشرکوں اور بت پرستوں کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ''ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم'' (سورہ انعام:۱۰۸)۔ (اور گالی مت دو ان کو جن کو یہ لوگ اللہ تعالی کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ پھر وہ جہل کی وجہ سے حد سے گزر کر اللہ تعالی کی شان میں گستاخی کریں گے)۔

تکریم انسانیت اور احترام آدمیت کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ جب ایک یہودی کا جنازہ جارہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے، آپ سے کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو آپ نے فرمایا: أليست نفسا کیا وہ انسانی جان نہیں ہے۔

اور جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی میت کی نعش کے پاس سے گزرتے تو تکریم انسانی کی خاطر اس کو دفن کرنے کا حکم دیتے۔

حضرت عمر بن الخطاب نے حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے اور خود حضرت عمرو بن العاص سے صرف اسی لئے قصاص لیا کہ اول الذکر نے ایک قبطی کو جب اس کا گھوڑا آگے بڑھ گیا تھا یہ کہتے ہوئے کوڑا مارا کہ "انا ابن الا کرمین" میں معزز باپ کا بیٹا ہوں، پھر انہوں نے حضرت عمرو بن العاص حاکم مصر کے سر پر کوڑے مارے، اس لئے کہ بیٹے نے باپ کے اثر ورسوخ کا فائدہ اٹھایا تھا، اور پھر قبطی سے مخاطب ہو کر حضرت عمر بن الخطاب نے کہا: ''یہ درہ لو اور معزز باپ کے بیٹے کو مارو'' پھر حضرت عمر نے کہا ''یہ درہ عمرو بن العاص کے سر پر مارو'' کیونکہ خدا کی قسم ان کے بیٹے نے تمہیں ان ہی کے دبدبے کی وجہ سے مارا، پھر حضرت عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر کہا: "ياعمرو متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا" (اے عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا)۔

قرآن کریم میں دوسروں کی رائے کے احترام اور ان کو حق جاننے اور اس کے رائے کو سمجھنے کے لئے غور وفکر کی دعوت دینے اور انسان کی عزت وکرامت کی حفاظت کی خاطر گفتگو اور مباحثہ کے آداب کو ملحوظ رکھنے کی بلند مثالیں اور عمدہ نمونے وآداب موجود ہیں، جن کو قرآن نے اس آیت میں بیان کیا ہے: ''قل من يرزقكم من السموات والارض قل الله وانا واياكم لعلى هدى أو في ضلال مبين'' (سورہ سبا:۲۴)۔ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پوچھئے کہ تمہیں آسمان وزمین سے روزی کون پہونچاتا ہے، خود جواب دیجئے کہ اللہ تعالی، سنو ہم یا تم یا تو یقینا ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں)۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں: یہ ایسا منصف کلام ہے کہ ہر شخص جو اس کو سنے گا خواہ وہ دوست یا دشمن وہ اس کلام کے مخاطب سے کہہ پڑے گا: تمہارے دوست نے تمہارے ساتھ انصاف کیا، جیسے کوئی آدمی اپنے دوست سے کہے: اللہ جانتا ہے کہ ہم میں سے اور تم میں سے سچا کون ہے اور بے شک ہم میں سے ایک جھوٹا ہے۔

تیسرا حق: نجی اور ذاتی ملکیت کا حق

انسانی جان ومال (ملکیت) کی حفاظت کا حق مقاصد شریعت کا ایک بنیادی مقصد ہے، چنانچہ ملک ووطن میں رہنے والے کسی بھی انسان پر زیادتی حرام ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ملک کا شہری ہو یا کسی اور ملک سے آنے والا، اس لئے کہ اسلام میں خون کی حرمت کو بڑی عظمت حاصل ہے، سوائے اس کے کہ کوئی کسی خیانت کا مجرم ہو، جیسے قصاص یا حد نافذ کرنا، اس کا مقصد بھی امن وسلامتی اور استقرار کی حفاظت ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''وماكان لمومن أن يقتل مومنا الا خطا'' (سورہ نساء:۹۲)۔ (کسی مومن کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے)۔

اس میں آیت میں لفظ 'مومنا' سے صرف مومن ہی نہیں غیر مومن بھی مراد ہے، پھر اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ومن يقتل مومنا متعمدا فجزاءه جهنم خالدا فيها وغضب الله عليه ولعنه وأعدله عذابا عظيما'' (سورہ نساء:۹۲-۹۳)۔ اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کرڈالے اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالی کا غضب ہے، اور اسے اللہ تعالی نے لعنت کی ہے، اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا ہے۔

نیز اللہ تعالی کا یہ بھی فرمان ہے: ''من أجل ذلك كتبنا على بني اسرائيل أنه من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الارض

فکأنماقتل الناس جمیعاومن أحیاھافکأنماأحیاالناس جمیعا'' (سورہ مائدہ:۳۲)۔(اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جوشخص بھی بغیر اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد مچانے والا ہو قتل کرڈالے،تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کردیا،اور جس شخص نے کسی ایک کی جان بچائی اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کردیا)۔

ہم نے اسلام کی طرح کسی مذہب کو ایسا نہیں پایا جو ایک جان کے قتل کو تمام انسانوں کے قتل کے برابر قرار دیتا ہے،اور ایک جان بچانے کو تمام لوگوں کی جان بچانے کے برابر قرار دیتا ہے،اور مال بھی روح کا قرین اور ساتھی ہے،حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی اس کا ذکر ہے جو خطبہ ایک عام اور دائمی میثاق ہے:''إن دمائکم وأموالکم وأعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذافی بلدکم ھذافی شھرکم ھذا'' (صحیح البخاری، ج۲، ص:۱۹۱)۔(بے شک تمہارا خون،تمہارے مال،تمہاری آبرواسی طرح تم پر حرام ہے جس طرح آج کے اس دن کی حرمت ہے،تمہارے اس شہر میں تمہارے اس مہینہ میں)۔

غیر مسلموں کا خون،ان کی عزت وآبرواوران کے مال بھی مسلمانوں کی طرح ہیں،چنانچہ ان پر زیادتی اور دست درازی جائز نہیں ہے،یہ بات سنت نبویہ کے عین مطابق ہے اور تاریخ میں ثابت شدہ حقیقت ہے،محدثین نے روایت کیا ہے کہ ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کردیا،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کا مقدمہ لایا گیا،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"ان أحق من أوفی بذمتہ"میں اس کا زیادہ حق دار ہوں جو اپنے عہد کو پورا کرے،پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا چنانچہ اس مسلمان قاتل کو قتل کردیا گیا،خلفاء راشدین بھی اسی راستہ پر گامزن رہے،بطور خاص حقیقی اور واقعی صورت میں حضرت عمر اور حضرت علی کے عہد میں۔

البتہ جہاں تک جہاد کا تعلق ہے تو وہ بھی زیادتی وجارحیت کا جواب دینے کے لئے ایک استثنائی قانون وشریعت ہے،جس طرح قدیم وجدید زمانہ میں قانونی جنگ کے بقیہ اصول وقواعد رہے ہیں۔

جہاد کی مشروعیت کے حالات درج ذیل ہیں:

۱۔ زیادتی وجارحیت کا جواب دینا:چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''وقاتلوافی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولاتعتدوان اللہ لایحب المعتدین'' (سورہ بقرہ:۱۹۰)۔اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں،اور زیادتی نہ کرو،اللہ تعالی زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔

۲۔ کمزوروں اور مظلوموں کی مدد کرنا:اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''ومالکم لاتقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان'' (سورہ نساء:۷۵)۔(بھلا کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ناتواں مردوں اور عورتوں اور ننھے منھے بچوں کے چھٹکارے کے لئے جہاد نہ کرو)۔

۳۔ دعوت کی آزادی سلب کرلی جائے یا داعیوں کو قتل کردیا جائے،یا مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹادیا جائے،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''أذن للذین یقاتلون بأنھم ظلموا وأن اللہ علی نصرھم لقدیر'' (سورہ حج:۳۹)۔(جن مسلمانوں سے کافر جنگ کررہے ہیں انہیں مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے)۔

اسلامی حکومت میں امان مسلمانوں،دائمی طور پر معاہدہ کرنے والے ذمیوں اور امان حاصل کرکے اسلامی ممالک میں داخل ہونے والے مستأمن کو یکساں طور پر حاصل ہے،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''وان أحد من المشرکین استجارك فأجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم أبلغہ مامنہ ذلك بأنھم قوم لایعلمون'' (سورہ توبہ:۶)۔(اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دے،یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے،پھر اسے اپنی جائے امن تک پہونچادے،یہ اس لئے کہ یہ لوگ بے علم ہیں)۔

چوتھا حق:عدل وانصاف کا حق:

اسلام نے لوگوں کے درمیان حق،انصاف اور عدل کے ذریعہ بغیر کسی جانب داری اختیار کئے ہوئے یا ذمی کے خلاف مسلمانوں کی طرف مائل ہوئے یا مسلمان کے خلاف اہل ذمہ کی طرف مائل ہوئے فیصلہ کرنا واجب قرار دیا ہے،اس لئے کہ اسلام حق اور عدل کا مذہب ہے،اور عدل وانصاف کی بدولت آسمان وزمان کا نظام قائم ہے،عدل وانصاف حکومت کی بنیاد ہے،اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''إن اللہ یأمرکم أن تودوا الامانات إلی أھلھاواذا حکمتم بین الناس أن تحکموابالعدل ان اللہ نعمایعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا بصیرا'' (سورہ مائدہ:۴۲)۔(اللہ

تعالی تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہونچادو، اور جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو، یقیناوہ بہتر چیز ہے جس کی نصیحت تمہیں اللہ تعالی کر رہا ہے، بے شک اللہ تعالی سنتا ہے دیکھتا ہے)۔

کسی بھی حال میں قاضی کے لئے عدل وانصاف کے قاعدہ سے ہٹنا جائز نہیں ہے، یہاںتک کہ دشمنوں کے ساتھ بھی نہیں، اللہ سبحانہ وتقدس کا ارشاد ہے:

''یاأیھاالذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط ولایجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھوأقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون'' (سورۂ مائدہ:۸)(اخبار القضاۃ، از وکیع، ج۲،ص:۲۰۰)۔

منصفانہ وعادلانہ فیصلے کے واقعات میں سے ایک وہ واقعہ ہے جو حضرت علیؓ اور ایک یہودی کے درمیان ایک زرہ کی ملکیت کے سلسلہ میں قاضی شریح کے سامنے پیش آیا، جب اثبات ملکیت کے شواہد پورے نہ ہوسکے، چنانچہ قاضی شریح نے حضرت حسن کی شہادت کو ان کے باپ حضرت علی کے حق میں قبول کرنے سے انکار کردیا اور یہودی کے حق میں زرہ کا فیصلہ کیا، یہ دیکھ کر اس یہودی نے برجستہ کہا کہ امیر المومنین نے مجھے اپنے قاضی شرع کے سامنے پیش کیا اور انہی کے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ کردیا، میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ دین دین حق ہے، اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اور اے امیر المومنین یہ زرہ آپ ہی کا ہے، جو رات میں آپ سے گر گیا تھا (اخبار دمشق، از: ابن عساکر، ج۵،ص:۳۵۸)۔

غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف کی بہت سی مثالیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب عباس بن ولید بن عبدالملک نے اہل حمص کی ایک معاہد (ذمی) کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا جسے ولید نے عباس کو قانونی طور پر دے دیا تھا، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس زمین کے بارے میں معاہد کے حق میں فیصلہ کیا اور کہا ''اللہ کی کتاب ولید بن عبدالملک کی تحریر سے زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، اے عباس! اٹھو اور اس ذمی کی جائیداد اس کو واپس کرو، چنانچہ انہوں نے وہ زمین اس ذمی کو واپس کردی۔

اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کو حکم دیا کہ وہ سمرقند کے علاقے سے اپنے لشکر کے ساتھ باہر آجائیں، کیونکہ وہ بغیر جنگی وارننگ واطلاع کے وہاں داخل ہوگئے تھے، چنانچہ اس کے نتیجہ میں سمرقند کے بہت سے باشندے مسلمان ہوگئے (الکامل، از: ابن الاثیر، ج۵،ص:۴۴، فتوح البلدان، از: بلاذری)۔

اسی طرح قرآنی طرز عمل اور عملی کردار کو جو چیز مزید موکد کرتی ہے وہ سنت نبویہ میں موجود عدل وانصاف کے اصول کی پابندی سے متعلق قطعی تعلیمات ہیں، ان میں سے ایک وہ روایت ہے جس کی تخریج امام ابوداؤد وامام بیہقی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ألا من ظلم معاھدا أو انتقصہ أو کلفہ فوق طاقتہ أو أخذ شیئا بغیر طیب نفس منہ فانا حجیجہ یوم القیامۃ''۔ (خبردار جو کوئی کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کی تنقیص کرے گا یا اس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف بنائے گا یا اس کی طیب نفس کے بغیر اس سے کوئی چیز لے گا تو میں قیامت کے دن اس پر حجت قائم کروں گا)۔

پانچواں حق: مساوات وبرابری کا حق:

عام عہدوں اور ملازمت میں معاہدہ کے ساتھ رہنے والے غیر مسلموں کو مسلمانوں کے ساتھ یکساں حقوق حاصل ہیں، البتہ اکثریت کے رجحان کی ترجمانی کرنے والے بعض مخصوص حالات کے پیش نظر بعض اہم عہدوں جیسے صدر مملکت کا عہدہ یا انتہائی حساس عہدے جیسے فوج کی قیادت کا عہدہ اس سے مستثنی ہیں، جیسا کہ موجودہ دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں میں متعارف ہے۔

مذکورہ عہدوں کے علاوہ دیگر تمام عہدوں میں معاہد غیر مسلم باشندوں کے حقوق وفرائض میں مساوات کے حق سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، خواہ کسی قسم کی زیادتی سے مکمل تحفظ کا حق ہو، یا زندگی گزارنے، مذہبی آزادی کے ساتھ رہنے، اپنے مخصوص شعائر کو انجام دینے اور دیگر کسی بھی نوعیت کی آزادی کا حق ہو، قانون کے سامنے انہیں مساوات کا حق حاصل ہے، ملک کی قومیت سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، اسی کے ساتھ انہیں اپنی خاص زبان استعمال کرنے میں آزادی کا حق حاصل ہے، اور انہیں یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ مدغم نہ ہوں، اور عائلی مسائل جیسے نکاح، طلاق، وغیرہ میں اپنے مخصوص احکام اور طریقے کو نافذ کرنے اور ان پر عمل کرنے میں انہیں پوری آزادی حاصل ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں: اگر وہ لوگ جزیہ دینے کو قبول کرلیں (اور وہ دفاع کا ٹیکس ہے جس کی تعداد قدرت رکھنے والے افراد پر ایک دینار ہے) تو ان کے لئے بھی وہ حقوق ہوں گے جو ہمارے لئے ہیں، اور ان کے اوپر بھی وہ ذمہ داریاں ہوں گی جو ہمارے اوپر ہیں، یعنی دوسروں کے ساتھ

...عدل وانصاف کرنا اور دوسروں سے عدل وانصاف کو حاصل کرنا، اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اوپر بھی ان کے حقوق ہیں، اور ان کے اوپر بھی ہمارے حقوق ہیں، اگر ہم ان کے خون اور مال کے درپے ہوں یا وہ ہمارے خون اور مال کے درپے ہوں تو اس تعرض کے وقت ہم میں سے ایک دوسرے پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

علامہ ماوردیؒ لکھتے ہیں: جزیہ دینے کے نتیجہ میں انہیں دوطرح کے حقوق حاصل ہوں گے، ایک تو ان سے ہاتھ روک لینا (یعنی ان سے تعرض نہ کرنا) دوسرے ان کی حفاظت کرنا تاکہ وہ ہاتھ روک لینے کی وجہ سے مامون ہو جائیں اور حفاظت کی وجہ سے محفوظ ہو جائیں، حضرت نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''کان آخر ما تکلم به النبی ﷺ ان قال احفظوا فی ذمتی'' (الاحکام السلطانیۃ، از ماوردی، ص: ۱۳۸)۔

رسول اللہ ﷺ نے سب سے آخر میں جو بات ارشاد فرمائی وہ یہ کہ: ''میری ذمہ داری کے بارے میں میری حفاظت کرنا'' یعنی میرے معاہدے کا پاس ولحاظ کرنا۔

مسلمانوں کے ساتھ ذمیوں کو جو مساوات وبرابری کا حق دیا گیا ہے اس کی مثالوں میں سے ایک وہ ضابطہ ہے جو دیگر فقہاء کرام نے مقرر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''إن أصل الحرب إذا أسروا أهل الذمة من دار الإسلام لایملکونهم لأنهم أحرار'' (الاموال، از: ابوعبید، ص: ۱۹۱)۔ (جنگ کا ضابطہ یہ ہے کہ جب مسلمان لشکر دارالاسلام کے ذمیوں کو گرفتار کریں گے تو وہ ان کے مالک نہیں ہوں گے، یعنی وہ ان کو غلام نہیں بنا سکیں گے کیونکہ وہ آزاد ہیں)۔

ان حقوق کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی عملی سنت ہے جیسا کہ طائف میں قبیلہ ثقیف کے لئے آپ ﷺ کے معاہدہ نامہ میں درج ہے، کہ اگر کوئی ثقیف کے خلاف کوئی اکسائے یا کوئی ظالم ان پر ظلم کرے، تو ان کے مال وجان کے سلسلہ میں ان کی بات نہیں مانی جائے گی، اور پیغمبر ﷺ اور تمام مومنین اس ظالم کے خلاف ان کی مدد کریں گے، اور لوگوں میں سے جنہیں یہ بات پسند ہو کہ وہ ان کے پاس جائے تو وہ ان پاس نہ جائے، اور بے شک بازار اور خرید وفروخت گھروں کے باہر صحنوں میں ہوگا، اور انہی میں سے بعض کو امیر بنایا جائے گا، بنو مالک کے لئے ان کے امیر ہوں گے، اور ان کے حلیفوں کے لئے ان کے امیر ہوں گے (اختلاف الفقہاء، از طبری، ص: ۲۴۱)۔

یہ معاہدہ نامہ آج کے خودمختارانہ نظام حکومت سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔ جہاں تک ان کی جان ومال پر کسی بھی قسم کی زیادتی کے خلاف ان کے دفاع کا تعلق ہے تو یہ متفق علیہ حکم ہے (شرح البخاری از: قسطلانی، ج ۵، ص: ۲۲۵)۔

جویریہ بن قدامہ نے روایت کی ہے فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب کو فرماتے ہوئے سنا، اس وقت جب ہم نے امیر المومنین سے وصیت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا ''میں تمہیں اللہ کے ذمہ (عہد) کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، بے شک وہ تمہارے نبی کا بھی ذمہ ہے، اور تمہارے بچوں اور زیر پرورش لوگوں کی روزی ہے (شرح البخاری از: قسطلانی، ج ۵، ص: ۲۲۵)۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے اپنی وفات کے وقت جو گفتگو فرمائی ان میں سے یہ بات بھی تھی کہ ''میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو رسول اللہ ﷺ کے ذمہ کی وصیت کرتا ہوں کہ ان کے عہد کو پورا کیا جائے، ان کے مقابل لوگوں سے قتال کیا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہ بنایا جائے (عمدۃ القاری، از عینی، ج ۱۵، ص: ۸۶، شرح البخاری از: قسطلانی، ج ۵، ص: ۲۲۵)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی معاہد کو ناحق قتل کرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس کی جاتی ہے (تفسیر المنار، از شیخ رشید رضا، ج ۴، ص: ۷۴-۸۱)۔

معاہد کو بعض اوقات کسی عام عہدے سے روکنے کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مسلمان کو روکنا اور یہ مفاد عامہ کے پیش نظر اور بااختیار حاکم یعنی سربراہ مملکت یا مقننہ یعنی قانون ساز اداروں کے سربراہوں کے فیصلہ سے کیا جاتا ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے انتظامی دفاتر کے لئے روم کے نصاریٰ کو مقرر کیا تھا، اور ان کے بعد دونوں خلیفہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے بعد شاہان بنوامیہ اسی پر قائم رہے، یہاں تک کہ عبدالملک بن مروان نے ان دفاتر کو رومیوں سے عربوں کی طرف منتقل کیا، عباسی حکمرانوں اور دیگر مسلمان

بادشاہوں نے حکومت کی بہت سی خدمات کو یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں کے سپرد کر رکھا تھا جن میں سے طبی خدمات اور تجرباتی سائنسی خدمت، اسی طرح سلطنت عثمانیہ نے اجنبی ممالک میں اپنے اکثر سفراء اور نمائندے عیسائیوں میں سے مقرر کئے تھے (الرسالۃ الخالدہ، از: پروفیسر عبدالرحمن عزام، ص: ۱۰۸)۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ممالک میں مستقل طور پر رہنے والے معاہد اور ذمی افراد دوسرے درجہ کے شہری نہیں ہیں جیسا کہ بعض کینہ پرور مستشرقین خیال کرتے ہیں، بلکہ وہ سب ایک ہی درجہ کے شہری ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے ساتھ طے پانے والے معاہدہ کا موجودہ زمانہ کے سامراجی نظام سے کسی طرح کا کوئی تعلق یا مشابہت نہیں ہے، اس لئے کہ اسلامی نظام آزادی، مساوات اور انسانیت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، جبکہ سامراجی نظام مغلوب اقوام سے آزادی سلب کرنے اور ان تمام چیزوں کو اپنے لئے مباح سمجھنے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے جو ان اقوام کی ملکیت ہیں اور جن پر سامراج کو فتح حاصل ہوتا ہے، غیر مسلموں کے ساتھ اس سلوک و برتاؤ کی بنیاد دراصل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

''لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلونکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین، انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم أن تولوھم ومن یتولھم فأولئك ھم الظالمون'' (سورۂ ممتحنہ: ۸، ۹۔ الاسلام و مسٹر سکوٹ، از محمد عبدہ، ص: ۳۰)۔

یہ بات قابل غور ہے کہ مستشرق مسٹر سکوٹ جو شیخ محمد عبدہ کے معاصر ہیں، ان کا خیال ہے کہ ذمہ کو مخصوص رہائش، لباس، اسباب معیشت اور طرز زندگی میں وہ آزادی حاصل نہیں تھی جو مسلمانوں کو حاصل تھی، لیکن اوپر جو وضاحت کی گئی ہے کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مساوات کی بنیاد پر تمام حقوق حاصل تھے، اس سے ان کے اس دعوی کی تردید ہوجاتی ہے، البتہ جہاں تک لباس میں یا اسلام کے معروف طریقہ پر سلام کرنے میں جو نہ اس کے سلام کا طریقہ ہے اور نہ ہی ان کا عرف ہے، جو بعض ظاہری فرق نظر آتا ہے وہ دراصل زمانہ ماضی کے خاص وقتی حالات اور عرفی احوال کے پیش نظر تھا۔

فقہائے حنفیہ کہتے ہیں کہ اہل ذمہ معاملات میں مسلمانوں کی طرح ہیں، اسلامی ممالک میں جو کام مسلمانوں کے لئے کرنا جائز ہے وہ ان کے لئے بھی جائز ہیں اور جو کام مسلمانوں کے لئے ناجائز ہیں وہ ان کے لئے بھی ناجائز ہیں (الفتاوی الخیریہ، ج ۱، ص: ۹۲)۔

اوپر کی باتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ذمی حکومت کے عام فیصلہ کے تابع ہوں گے، اور ان پر بعض استثنائی معاملات جیسے عقائد، پرسنل لاء کے علاوہ میں اسلامی قانون نافذ ہوگا، ایسا اس لئے ہوگا کہ قانونی مرجع ہونے کی حیثیت تو اکثریت ہی کے قانون کو حاصل ہوگی، کیونکہ اسلامی شریعت کا نفاذ علاقہ پر ہوتا ہے نہ کہ کسی شخصیت پر، اور ذمی افراد بھی کامل درجے کے شہری شمار کئے جاتے ہیں، نہ کہ صرف سیاسی معاملات کے اعتبار سے رعایا، لہٰذا ان معاملات میں سے اسلامی قومیت بھی ہے (المدخل للفقہ الاسلامی، از: ڈاکٹر محمد سلام مدکور، ص: ۳۷۹)۔

چھٹا حق: حفاظت کا حق:

اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی سرزمین میں کسی بھی خارجی دشمن سے غیر مسلموں کو تحفظ فراہم کرے، اس لئے کہ ان کو ہر قسم کی ایذا رسانی اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے حفاظت و دفاع کا حق حاصل ہے، جس طرح مسلمانوں کو حاصل ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔

اس کی بہت سی مثالیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے ملک شام فتح کرتے وقت جزیہ دینے پر شام والوں سے صلح کی (جیسا کہ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ذکر کیا ہے) تو جب اہل ذمہ نے اپنے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری اور حسن سلوک دیکھا تو وہ مسلمانوں کے دشمنوں پر سخت ہوگئے، اور ان کے خلاف مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے، چنانچہ وہی لوگ رومیوں اور ان کے بادشاہوں کے حالات اور ان کی خبروں کی جاسوسی کرتے تھے، اور جب مسلمانوں پر رومیوں کی جانب سے خطرہ بڑھ گیا تو ابوعبیدہ بن جراح نے حمص اور دیگر علاقہ کے نصاری سے لیا گیا جزیہ و خراج واپس کرنے کا حکم دیا، لہٰذا مسلمانوں نے ان سے وصول کیا گیا مال ان کو واپس کردیا، یہ دیکھ کر ان لوگوں نے کہا ''اللہ آپ لوگوں کو ہمارے پاس دوبارہ واپس لائے اور ان پر آپ کو فتح دے، کیونکہ اگر وہ لوگ ہوتے (یعنی رومی ہوتے) تو وہ ہمیں کچھ بھی واپس نہیں کرتے، بلکہ دیگر باقی ماندہ مال بھی لے جاتے، اور ہمارے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتے''، اور حمص اور دیگر علاقے کے باشندوں کو صلیبیوں کی حکومت کے زوال سے دوبارہ یہ خوشی حاصل ہوئی۔

اگر دشمنوں کی طرف سے بعض ذمیوں کو قید کرلیا جائے تو مسلمانوں پر ان کا چھڑانا واجب ہے، اس کی بھی بہت سی مثالیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب تاتاریوں کو ملک شام پر غلبہ حاصل ہوا تو شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے قیدیوں کی رہائی کے بارے میں قطلوشاہ سے گفتگو کے لئے خود تشریف لے

گئے، تاتاری سپہ سالار نے ذمی قیدیوں کو چھوڑ کر مسلمان قیدیوں کی رہائی پر اتفاق کیا تو علامہ ابن تیمیہ نے کہا ''ہم یہود و نصاریٰ کے تمام قیدیوں کو چھڑائے بغیر راضی نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ ہمارے اہل ذمہ ہیں، اور ہم کسی بھی قیدی کو نہیں چھوڑے گے، چاہے وہ اہل ذمہ میں سے ہوں یا اہل ملت میں سے، چنانچہ اس نے شیخ الاسلام کے اصرار اور ان کی شدت کو دیکھ کر سب قیدیوں کو رہا کر دیا (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، از: ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ص:۱۰)۔

یہ در اصل اہل ذمہ کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کی وصیتوں سے حاصل ہونے والی روشنی ہے جیسا کہ اوپر گزرا، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ذمیوں کو ایذا پہونچانے اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے باز رہنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''من آذی ذمیا فقد آذانی و من آذانی فقد آذان اللہ'' (آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، دراسہ مقارنہ، ص:۷۰۸)۔ (جس نے کسی ذمی کو تکلیف پہونچائی اس نے مجھے تکلیف پہونچائی، اور جس نے مجھے تکلیف پہونچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہونچائی)۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''من آذی ذمیا فأنا خصمه و من کنت خصمه خصمته یوم القیامة'' (اس روایت کو خطیب نے اور علی القاری نے الاسرار المرفوعہ میں بیان کیا ہے، یہ ضعیف ہے)۔ جو کسی ذمی کو تکلیف پہنچائے گا تو میں اس کا فریق ہوں گا اور میں جس کا فریق ہوں گا تو قیامت کے دن اس کو مغلوب کر دوں گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''ألا من ظلم معاهدا أو کلفه فوق طاقته أو أخذ شیئا بغیر طیب نفسه منه فأنا حجیجه یوم القیامة'' (سنن البیہقی وغیرہ)۔ (خبردار! جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف بنائے گا یا اس کی طیب نفس کے بغیر اس کی کوئی چیز لے گا تو میں قیامت کے دن اس کا مد مقابل ہوں گے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی تکلیف و ایذاء سے غیر مسلم کی حفاظت و نگرانی کرنا اسلامی حکومت کی ایک بنیادی ذمہ داری ہے، علامہ قرافی فرماتے ہیں: ذمہ اور عہد کا معاملہ ذمیوں کے تعلق سے ہم پر کچھ حقوق لازم کرتا ہے، کیونکہ وہ ہماری پناہ اور ہماری حفاظت میں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے رسول ﷺ کے عہد دین اسلام کے عہد میں ہے، چنانچہ جو بھی ان پر زیادتی کرے گا گرچہ زبان سے کسی تکلیف دہ بات کے ذریعہ یا ان میں کسی کی آبرو کے سلسلہ میں غیبت کے ذریعہ، یا کسی بھی قسم کی تکلیف کے ذریعہ تو اس نے اللہ تعالیٰ کے ذمہ، اس کے رسول کے ذمہ اور اسلام کے ذمہ کو ضائع کیا (کتاب الفروق، ج ۳، ص:۱۴)۔

ساتواں حق: خصوصیات کے احترام کا حق:

مسلمان اپنے دین و شریعت کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اس قاعدہ کے مطابق کہ ''ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیں'' غیر مسلموں کے ساتھ بہت بلند برتاؤ کرتے ہیں، چنانچہ اسلامی ملکوں میں مسلمان ان کو اپنے عقائد، مذاہب اور معاملات میں پوری طرح آزادی کے ساتھ رہنے کا حق دیتے ہیں، ان کو کسی بات پر تنگ نہیں کرتے ہیں، عقیدہ اور دینی و مذہبی شعائر و رسومات ادا کرنے میں یعنی عبادت و ریاضت اور دیگر معاملات میں ان کے حقوق کا احترام کرتے ہیں، ان کو اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ جن چیزوں کو مباح و جائز سمجھتے ہیں ان کو کھائیں اور پئیں، جیسے نشہ آور اشیاء اور خنزیر کا گوشت کھانا، اپنے تہواروں اور مقدس ایام میں خوشی منانا، جنازہ میں شرکت و مشایعت کرنا، ایک دوسرے کی تعزیت کرنا، اس کے علاوہ دیگر تقریبات کا انعقاد کرنا اور اس میں ایک دوسرے کو تہنیتی پیغام اور مبارکبادی پیش کرنا، اسی طرح جن جن باتوں پر ان سے معاہدہ کیا گیا ہے ان اس کے علاوہ کسی اور بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اور ان کاموں کا مکلف نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

وہ بقدر ضرورت اپنے کنیسوں اور عبادت خانوں کی مرمت و تعمیر کرنے میں بھی آزاد ہیں اور یہ تمام کام اسی دائرہ اور حدود میں کر سکتے ہیں جن کی اجازت موجودہ زمانہ کے مختلف قوانین میں طے شدہ آداب اور نظام عدل کے اصول و قواعد دیتے ہوں، چنانچہ انہیں اسلام کے بنیادی اصول اور مقدسات یعنی قرآن و حدیث، عقیدہ و عبادت، اخلاقی و تاریخی مسلمات میں سے کسی چیز کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے اور ٹھیس پہونچانے کا حق حاصل نہیں ہوگا، اسی طرح ان میں سے کسی چیز کے بارے میں بدزبانی یا استہزاء اور تمسخر کر کے دینی فتنہ و فساد بھڑکانے یا اسلامی اقدار، اس کی تاریخ و تہذیب پر زبان طعن دراز کرنے اور عزت و آبرو اور حرمت و کرامت پر دست درازی کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

آٹھواں حق: تعلیم و تعلم کا حق:

غیر مسلموں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنی تاریخ سے متعلق احوال وواقعات کو خود سیکھیں اور اپنے اسکولوں، گھروں اور کنیساؤں میں اپنے نوخیز بچوں کو اس کی تعلیم دیں، اس لئے کہ اسلام اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ مختلف قسم کے علوم وفنون حاصل کئے جائیں، ثقافتوں کو فروغ دیا جائے، تہذیب وتمدن اور بیداری ان تمام چیزوں کو فروغ دیا جائے، جو معاشرہ کے لئے نفع بخش اور مفید ہوں، اس لئے کہ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہونچے گا، اور پسماندگی کے حالات کو ختم کرنے میں اس کا اہم رول ہوگا، اس سے عزت ووقار میں اضافہ ہوگا، اور کرامت وشرافت کی حفاظت ہوگی، اس سے داخلی اور خارجی برائیوں اور زیادتیوں کو دور کیا جاسکے گا۔

اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعمیری، سنجیدہ اور بامقصد ڈائلاگ کیا جائے، اور بہتر طریقہ سے ان سے بحث ومباحثہ کیا جائے، جبکہ فتنہ بھڑکانا یا کشمکش برپا کرنا، کینہ، تعصب اور نفرت کی بیج بونا، یا وطن کی کرامت کے خلاف دشمنوں کی مدد اور ان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنا مقصود نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''أدع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن'' (سورہ نحل: ۱۲۵)۔

بلکہ قرآن کریم نے اہل کتاب، یہود اور نصاریٰ کے ساتھ ڈائیلاگ اور بات چیت کے مسئلہ پر صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ''ولاتجادلوا أهل الکتاب الا بالتی هی أحسن إلا الذین ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذی أنزل الینا وأنزل إلیکم وإلهنا وإلهکم واحد ونحن له مسلمون'' (سورہ عنکبوت: ۴۶)۔

یہ بات بدیہی ہے کہ ان کو الحاد وزندقہ کی ترویج، مذہب پسندی کے مظاہر سے آزادی، یا اصول دین اور وحی الٰہی میں کسی بھی چیز پر طعن کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، اور یہی بات خود مسلمانوں کے لئے بھی ہے، کیونکہ اسے مفید اور نفع بخش تعلیم شمار نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ تو تخریب وتفریق اور مشکلات ومسائل پیدا کرنا ہوگا، امن وامان کو عام کرنا اور استحکام برقرار رکھنے کے لئے وطنی وحدت کے تقاضے کی حفاظت کرنا ان کا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ قوم کی ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ آپس میں اعتماد واطمینان کی فضاء قائم کی جائے، اور آپسی گروہ بندیوں اور دھڑے بندیوں سے اوپر اٹھا جائے، جو جذبات کی یکسانیت اور قوم ووطن کی مصلحت کی حفاظت کو نقصان پہونچانے والی ہوں۔

نواں حق: اچھے برتاؤ اور حسن معاملہ کا حق:

حسن ظن اور اعتماد کی راہ ہموار کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے مشترک فضاء قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے، اور دونوں ہی کے مشترک مفاد میں یہ بات ہوگی کہ دونوں جانب سے حسن سلوک اور اچھا برتاؤ ہو، یعنی دوستانہ ملاقات ہو، ہدیے تحفے کا تبادلہ ہو، اجتماعی عرف وعادت کے مناسب خوشگوار سلام ودعاء ہو، بیماروں کی عیادت کی جائے، ایسے تہواروں اور خوشی کے مواقع پر مبارکبادی پیش کی جائے جس میں بنیادی عقائد پر آنچ نہ آتی ہو، مصائب وآلام اور رنج وغم پر ہمدردی ومحبت کا معاملہ کیا جائے اور ایک دوسرے کی تعزیت کی جائے، کیونکہ یہ بھی حسن سلوک کا ایک حصہ ہے، اور معاملات میں اعتماد کا پختہ ماحول بنانے اور قوم ووطن کے لئے مشترکہ بھلائی پیش کرنے کا حیات بخش فائدہ پوشیدہ ہے۔

اس کا سرچشمہ قرآن کریم کی وہ دو آیتیں ہیں جن کو اوپر بیان کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہیں: ''لاینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروهم وتقسطوا الیهم ان الله یحب المقسطین انما ینهاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظاهروا علی اخراجکم أن تولوهم ومن یتولهم فأولئك هم الظالمون'' (سورہ ممتحنہ: ۸-۹)۔

اور یہ انتہائی اہم دو اجتماعی بنیادوں کی وضاحت ہے، اول نیکی وبھلائی، الفت ومحبت اور اچھے کام اور اعتماد کو عام کرنا، دوم: دشمنوں کے ساتھ تعاون وخیر خواہی کرنے اور ان سے مدد طلب کرنے کی بہر صورت مذمت کرنا۔

''بر'' یعنی نیکی وبھلائی ایک مثبت قدم ہے جو اچھے برتاؤ کی فضیلت سے بڑھ کر ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کے مریضوں کی عیادت اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے، ان کے قرض کا لین دین کرتے تھے، اور ان کے تجار کے ساتھ تجارت کرتے تھے، ان کا استقبال کرتے تھے، ان کو اپنی مسجد میں بطور

مہمان ٹھہراتے تھے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران اور حبشہ کے عیسائیوں کے وفد کے ساتھ کیا۔

لفظ برّ کے معنی ومقصود کی تعیین کرتے وقت بعض قدیم علماء نے اس کی کتنی عمدہ اور خوبصورت وضاحت کی ہے، چنانچہ علامہ قرافی فرماتے ہیں:

برکا مطلب ہے کمزوروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا، ان کے ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنا، ان کے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ان کے ننگوں کو کپڑا پہنانا، ان کے ساتھ لطف ومہربانی کے طور پر نہ کہ خوف وذلت کے طور پر نرمی سے پیش آنا، اگر وہ پڑوس میں ہوں تو ان کی اذیت کے ازالہ پر قدرت کے باوجود ان کی اذیت کو برداشت کرنا، یہ سب کچھ ان کے ساتھ بطور مہربانی کے ہو نہ کہ خوف وطمع میں ہو، ان کے لئے ہدایت کی دعاء کرنا اور اس بات کی بھی دعا کرنا کہ وہ اہل سعادت میں بنا دیئے جائیں، ان کے تمام امور میں خواہ دینی ہو یا دنیوی ان کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا، جب کوئی ان کو اذیت پہونچانے کے درپے ہو تو اس کی حفاظت کرنا، ان کے مال وعیال، ان کی عزت وآبرو، اور ان کے تمام حقوق ومصالح کا خیال کرنا، ان سے ظلم کو دفع کرنے پر ان کے ساتھ تعاون کرنا، اور ان کو ان کے تمام حقوق تک پہونچانا (کتاب الفروق، ج ۳ص: ۱۵، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: استوصوا باہل الذمۃ خیرا)۔

پوری تاریخ میں دائمی عمل کی صورت میں یہی رجحان برقرار رہا، اور مسلمان خلفاء اور حکام اور عامۃ المسلمین کے درمیان یہ ایک عام اور معمولی طریقہ کار اور طرز عمل بن گیا، خواہ مشرقی ممالک ہوں یا مغربی ممالک، اس وقت بھی مسلمانوں نے یہودیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کیا جب وہ خود اندلس سے بھگائے جارہے تھے، اور ان کا خاتمہ کیا جارہا تھا، یعنی ان کے ساتھ حفاظت وحمایت کا معاملہ کیا، اور ان کو کسی قسم کا نقصان یا ضرر پہونچنے نہ دیا، آرنولڈ نے اپنی کتاب 'دعوت اسلام' (The Preaching of Islam) میں ذمیوں کے بارے میں لکھا ہے:

وہ لوگ یعنی ذمی حضرات اسلامی حکومت میں اطمینان وسکون اور خوش دلی کے ساتھ اسی طرح رہے جس طرح مسلم حکمرانوں نے اپنی قدیم عادت کے مطابق ہمیشہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ رواداری وکشادہ قلبی کا معاملہ کیا۔

یہ بات معلوم ہے کہ اسلام شہریت ووطنیت کے اصول کی حفاظت کرنے کی وجہ سے نفرت وکراہیت اور نسل پرستانہ تہذیب وثقافت کو مسترد کرتا ہے، اور دوسروں کے ساتھ خیر خواہی وبھلائی کی چاہت پر مسلمانوں کی تربیت کرتا ہے۔

دسواں حق: ضمان یا اجتماعی کفالت کا نظام:

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کو بھی طبی سہولیات، اجتماعی کفالت اور محتاجوں کی اعانت کے دائرہ میں شامل کیا گیا تھا، ان کے لئے بھی دائمی وظیفہ مقرر کیا گیا تھا، خواہ وہ بوڑھے ہوں یا کام کاج سے عاجز ہوں، یا بے روزگار ہوں، اور ان کے پاس مناسب وجائز کوئی ذریعہ معاش نہ ہو، تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، جو عملی صورت میں غیر مسلموں کے تعلق سے اس اصول کی رعایت پر دلالت کرتی ہیں۔

ان میں سے ایک مثال حضرت عمرؓ اور ایک عیسائی بوڑھے شخص کے درمیان کا قصہ ہے، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ایک بوڑھے آدمی کے پاس سے گزرے جو مسجدوں کے دروازوں پر جا جا کر جزیہ ادا کرنے کی غرض سے اپنی ضرورت اور بڑھاپے کی وجہ سے بھیک مانگتا تھا، ان کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا ہم نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا، ہم تم سے تمہارے اس بڑھاپے میں بھی جزیہ لیتے رہے پھر ہم نے تمہیں تمہاری اس کبرسنی میں ضائع کر دیا، پھر حضرت عمرؓ نے ان کے لئے بیت المال سے اتنا وظیفہ جاری کر دیا جس سے ان کی حالت درست ہوجائے، اور ان سے اور ان جیسے لوگوں سے جزیہ ساقط کر دیا (الخراج از: امام ابو یوسف، ص: ۱۲۶، منتخب کنز العمال من مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۰۹)۔

حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں مصارف زکوۃ کی آیت "انما الصدقات للفقراء والمساکین" سے استدلال کیا (سورہ توبہ: ۶۰)۔

فقراء سے مراد تو خود مسلمان بھی ہیں اور یہ شخص اہل کتاب کے مساکین میں سے تھے۔

حضرت خالد بن ولید اور حیرہ والوں کا واقعہ:

حضرت خالد بن ولیدؓ اور عراق میں واقع حیرہ کے باشندوں کے درمیان طے پانے والے صلح نامہ میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ "میں نے ان کو حق دیا ہے کہ جو بھی شخص بڑھاپے کی وجہ سے کام کاج سے عاجز ہوجائے گا یا اسے کوئی آفت وپریشانی لاحق ہو یا وہ پہلے مالدار تھا پھر محتاج ہو گیا ہو اور اس کے مذہب والے اس کو صدقہ دیتے ہوں، ایسے شخص کا جزیہ اس سے ساقط کر دیا جائے گا، اور بیت المال سے اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کفالت کی جائے گی، جب تک وہ

دارالہجرت اور دارالاسلام میں مقیم رہے گا'' (کتاب الاموال، از ابوعبید،ص:۵۷)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اور بصرہ میں ان کے عامل کا قصہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بصرہ کے عامل عدی بن ارطاۃ کے نام فرمان جاری کیا جس میں لکھا کہ ''تمہارے پاس جو بھی اہل ذمہ ہیں ان میں سے جو بوڑھے ہوگئے، جن کے اعضاء کمزور ہوگئے، جن کے اسباب معیشت ختم ہوگئے، ان کی خبرگیری کرو اور مسلمانوں کے بیت المال سے ان کے لئے اتنا وظیفہ جاری کردو جس سے ان کی حالت درست ہوجائے'' (کتاب الاموال، از ابوعبید،ص:۵۷)۔

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے حقوق کے یہ چند نمونے ہیں جسے تاریخ نے بڑی خوبصورت انداز اور عمدہ اسلوب میں ہمارے لئے ریکارڈ کیا ہے، اور یہ سب کتاب وسنت اور اسلامی تاریخ سے مستفاد ہیں، اور یہی اسلام میں انسانی حقوق کی واضح قسمیں ہیں، اور انہی حقوق کے مطابق ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں غیر مسلم اقلیتیں اسلامی امت کا ایک حصہ ہیں، اور وہ شہریت ووطنیت، اسلامی قومیت اور اس پر مرتب ہونے والے بنیادی حقوق سے مستفید ہورہے ہیں، اور ناموں کے اختلاف کے باوجود وہ مسلمانوں کے ساتھ برابر درجہ کے شہری ہیں، چنانچہ زکوۃ مسلمانوں کے ذمہ ایک فریضہ ہے، یہ اس لئے فرض کیا گیا ہے تاکہ یہ اسلام میں اجتماعی کفالتی نظام کو بروکار لانے میں زبردست کردار ادا کرسکے، اور یہ پانچ قسم کے مالوں میں فرض کیا گیا ہے:

ا۔نقد رقومات پر ۲۔تجارتی اموال پر ۳۔کھیتی اور پھلوں پر ۴۔جانوروں پر ۵۔خزانے اور قیمتی معادن پر، اور یہ آمدنی کے بیس فیصد سے زائد ہے، جبکہ نقدی یعنی سونے چاندی اور رقومات میں زکوۃ کا تناسب ڈھائی فیصد ہے۔

اور جسے جزیہ کہا جاتا ہے اسے اگر آپ چاہیں تو زکوۃ کہہ لیں یا صدقہ یا ٹیکس، جیسے عرب کے نصاری بنی تغلب پر لاگو کیا گیا تھا، جنہوں نے جزیہ دینے سے انکار کردیا تھا اور صدقہ کے ضابطہ کو قبول کیا تھا، یا اسے جزیہ اس معنی میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ دراصل جنگوں میں شرکت کا بدل ہے، اور وہ بھی صرف سال میں ایک دینار ایسے لوگوں پر لازم کیا گیا ہے جو کمانے پر قادر ہوں، آج غیر مسلموں کی بھی موجودہ زمانے کی حکومتوں کے قانون میں مسلمانوں کی طرح مختلف قسم کے ٹیکس ادا کرنے ہوتے ہیں جو ایک دینار سے کہیں زیادہ ہے۔

عین اسی وقت ہم دوسری طرف دنیائے مشرق ومغرب کے چہار جانب مسلم اقلیتوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ چھ سوملین سے زیادہ تعداد میں ہیں، پھر بھی انہیں صحیح شہریت کے حقوق حاصل نہیں ہیں، اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے، اگرچہ ان کو کسی حد تک اپنے دینی شعائر کی ادائیگی میں آزادی حاصل ہے، لیکن وہ قانونی اعتبار سے عائلی مسائل میں بھی اپنے اوپر اسلامی شریعت نافذ کرنے سے محروم ہیں، اور حقیقی صورت حال کے اعتبار سے اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی مسائل میں ان کے ساتھ دوسرے شہریوں کے برابر کا برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے، غیر مسلموں کے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ عام حساس واقعات کے رونما ہونے پر بہت برا سلوک کیا جاتا ہے، خواہ یہ معاملہ نظام حکومت میں ہو یا حقوق انسانی کی مختلف قسموں کو برتنے میں ہو، اور اس کی نئی اور پرانی بہت سی مثالیں ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

ا۔ مورخہ ۳۰/۹/۲۰۰۵ء کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے استہزاء پر مشتمل کارٹون شائع کیا گیا اور یورپ کے اخبارات اور بعض عرب اخباروں نے اچھی یا بری نیت سے اسے مسلسل شائع کیا، اور اس کی توجیہ یہ پیش کی کہ اس معاملہ کا تعلق اظہار رائے کی آزادی سے ہے، اور اس میں حکومت کوئی مداخلت نہیں کرسکتی، یا دیگر بہت سے اخبارات میں یہ توجیہ پیش کی گئی کہ اس کا تعلق صحافت کی آزادی سے ہے۔

۲۔ اسی طرح حضرت عیسی مسیح علیہ السلام کی شخصیت کو مجروح کرنے والے ڈرامہ کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی، یہ جانتے ہوئے کہ ہم مسلمان تمام پیغمبروں کا احترام کرتے ہیں۔

۳۔ یورپ کے اسکولوں کے نصاب تعلیم میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں بعض جھوٹی اور مغالطہ آمیز معلومات شامل کی گئی ہیں، اور انہیں نصاب کی کتابوں میں اپنی جانب سے گڑھ کر اسلام کے نام پر پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ قبرص میں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا ہے جس کا مشن ہی اسلام پر مسلسل حملہ کرنا اور اسلامی آثار کی صورت مسخ کرنا ہے۔

۵۔ مغرب کے بعض ذرائع ابلاغ کے پروگراموں کو اس لئے مخصوص کیا گیا ہے کہ تمام مسلمانوں کو جھوٹ، بہتان اور مغالطہ کے ذریعہ دہشت گرد کے

طور پر مشہور کیا جائے۔

۶۔ مسجد اقصی کے نیچے سرنگیں کھودی گئی ہیں جن سے مسجد اقصی کو حقیقی خطرہ لاحق ہے۔

شہری حقوق کی پامالی اور بعض ناروا سلوک کی یہ چند مثالیں ہیں، جن کا غیر مسلم ملکوں میں مسلم اقلیتیں سامنا کر رہی ہیں، تو پھر عالمی استحکام اور امن قائم کرنے، دنیا سے دہشت گردی کا خاتمہ کرنے اور شہریت کے اصول کا احترام کرنے کی سوچ کہاں چلی گئی!

خاتمہ: بحث کے نتائج اور تجاویز:

اوپر جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان سے درج ذیل نتائج بطور خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

۱۔ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے جامع انسانی وحدت کی دعوت دی تا کہ لوگ الفت ومحبت، تعاون و ہمدردی اور امن واستحکام کے ساتھ زندگی گزاریں اور یہ کہ اسلام ہی نے وطن سے تعلق رکھنے اور وفاداری اختیار کرنے پر مسلمانوں کو آمادہ کیا ہے۔

۲۔ اسلام میں شہریت ایک تمدنی وسیاسی مفہوم ہے جبکہ اسلام کے علاوہ میں یہ ایک دینی مفہوم ہے، یہی وجہ ہے کہ شہریت نسلی، مذہبی اور ثقافتی تنوع کے باوجود معاشرہ میں اعتدال وتوازن پیدا کرتی ہے۔

۳۔ وطنیت وشہریت صرف اس بات کا تقاضہ نہیں کرتی کہ انسان وطن کے ذمہ اپنے لازمی حقوق کا مطالبہ کرے بلکہ اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وطن کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو بھی ادا کرے۔

۴۔ شہریت کے حقوق میں سے مذہبی آزادی، ایک دوسرے کی خصوصیات کا احترام اور نجی ملکیت کا حق ہے، اسی طرح انسانی کرامت کا حق، حمایت وحفاظت کا حق، اور عقیدہ کی آزادی کا حق ہے، عدل وانصاف اور مذہبی مساوات کا حق اور اچھے برتاؤ کا حق ہے۔

۵۔ شہریت کے فرائض میں سے اچھے کاموں میں ولی امر یعنی حاکم وامیر کی اطاعت، وطن کا دفاع، قانون کا احترام اور دوسرے کی خصوصیات وآزادی کا احترام ہے۔

بعض تجاویز درج ذیل ہیں:

الف۔ صحیح اسلام کو سمجھنے، اسلام کے بارے میں مسخ شدہ خیال کو ترک کرنے، حق وانصاف اور عدل ومساوات کی باتوں پر کان دھرنے اور عمدہ اخلاق کے اصولوں پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے۔

ب۔ ثقافتی وتہذیبی ڈائیلاگ اور دوسری تہذیبوں کے احترام کو فعال بنانے کی کوشش کی جائے۔

ج۔ اسلام کی رواداری ہی امن واستحکام کی فضاء قائم کرسکتی ہے، اور دوسروں کے تعلق سے ہر قسم کے تعصب وکراہیت اور نفرت وحسد کو ختم کرسکتی ہے، اور اسی سے انتہا پسندی، غلو وزیادتی کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

د۔ جذبہ خیر سگالی، دوستانہ بقائے باہم اور حقوق وفرائض کے احترام پر قائم پرامن بین الاقوامی تعلقات کے اصولوں کے احترام کی دعوت دی جائے، خواہ مسلموں کے ملک میں ہو یا غیر مسلموں کے ملکوں میں۔

☆☆☆

ملکی آئین اور بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کا مسئلہ

عبداللہ بن علی سالم

مختصر تعریف:

آئین سے مراد ہر ملک کا دستور ہے، چونکہ ہر ملک کے دستور کی بنیادیں مختلف ہوتی ہیں، اس لئے ہر ملک کا دستور وآئین مختلف ہوتا ہے، دستوروں کے تنوع اور ان کو بنانے والے اداروں پر یہاں گفتگو نہیں کی جاسکتی، اور اس وقت اس کا موقعہ اور گنجائش بھی نہیں ہے۔

بین الاقوامی معاہدات مختلف ممالک کے درمیان تعلقات کو طرح طرح کے متون کے ذریعہ منظم کرتے ہیں۔

اور خود بین الاقوامی معاہدات کو بین الاقوامی قانون منظم کرتا ہے۔

بین الاقوامی قانون کے سلسلہ میں ماہرین کا یہ اختلاف بہت پہلے سے چلا آرہا ہے کہ کیا اسے واقعی قانون مانا جاسکتا ہے؟

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس قانون کے قواعد نہیں پائے جاتے ہیں جو اسے قانونی قاعدہ کی خصوصیات سے بہرہ ورہ کریں۔

قانون کے سلسلے میں ایک بالکل بنیادی اور اولین درجہ کی بات یہ ہے کہ قانونی قاعدہ عام، مجرد اور لازمی ہوتا ہے، جبکہ بین الاقوامی قانون میں عام طور پر لازمی ہونے کی صفت نہیں پائی جاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی ملک اس قانون کو نافذ نہیں کرتا ہے تو اسے اس کا پابند نہیں کیا جاپاتا ہے۔

بڑی تعداد میں ممالک نے اپنے دستوروں میں بین الاقوامی قوانین بالخصوص حقوق انسانی کے عالمی منشور کے احترام کی بات کہی ہے۔

مثلاً موریتانیا کے دستور کی تمہید میں لکھا گیا ہے: "قوم اپنی روحانی وتہذیبی اقدار کی بنیاد پر دین اسلام، ۱۰/۱۲/۱۹۸۱ء کو جاری ہونے والے عالمی حقوق انسانی منشور میں مذکور جمہوریت کے اصولوں، ۲۸/۶/۱۹۸۱ء کو ہونے والے افریقی معاہدہ بابت حقوق انسانی اور ان تمام بین الاقوامی معاہدات کی پاسداری کا اعلان کرتی ہے جن میں موریتانیا بھی شریک ہے۔

ملکی قوانین کی بین الاقوامی معاہدات و بین الاقوامی قانون سے ہم آہنگی

تمہید:

بین الاقوامی معاہدات بین الاقوامی قانون کا ایک اور بنیادی حصہ ہیں، تمام ممالک اس بین الاقوامی نظام کا ایک حصہ ہیں، اور اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں وپابندیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے، اسی طرح دنیا کے مختلف ممالک بین الاقوامی تعاون کے تحت ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں، یہ ممالک اپنے بہت سے بنیادی حقوق ومصالح کو بین الاقوامی تعاون کے ذریعہ ہی حاصل کرپاتے ہیں۔

بین الاقوامی قانون کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ خود مختار ممالک کے باہمی تعلقات کو منظم کرنے والے قواعد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو باہمی معاہدہ واتفاق، عرف اور بین الاقوامی برادری کی خواہشات سے اپنی طاقت حاصل کرتا ہے، یہ قانون بین الاقوامی برادری کی خواہشات کا عکاس ہوتا ہے، یہ قانون بین الاقوامی تنظیموں کے ذریعہ مختلف ممالک کے تعلقات منظم کرتا ہے، اور چند معاہدات پر مشتمل ہوتا ہے۔

ملکی قوانین کی بین الاقوامی معاہدات اور بین الاقوامی قانون سے ہم آہنگی چند اسباب کی بنا پر اہمیت کی حامل ہے، جن میں سے چند یہ ہیں: اس کا اظہار کہ ممالک کے درمیان کچھ بین الاقوامی معاہدات ہیں، اور یہ ممالک تمام انسانیت کو درپیش مشترک مسائل کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں تمام ممالک کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اور اس طرح بین الاقوامی سطح پر اپنی موجودگی درج کراتے ہیں۔

یہ معاہدے بین الاقوامی سطح پر حقوق انسانی کی قانونی حفاظت کا کام کرتے ہیں، انہیں معاہدات، اور پروٹوکول بھی کہتے ہیں، یہ معاہدات متعلقہ ممالک کے درمیان قانونی پابندیوں سے عبارت ہوتے ہیں، معاہدہ کا متن متعلقہ ممالک کے نمائندگان کی موجودگی میں ترتیب دیا جاتا ہے، بہت سے طریقے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں انجام دے کر ممالک کسی معاہدہ کو قبول کرنے یا اس میں شامل ہونے کا کام کرتے ہیں، تصدیق وشمولیت ان طریقوں کو ہی وسعت دیتے ہیں۔

معاہدات کو منظم کرنے کا قانون:

مختلف ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدات کو منظم کرنے کے لئے ایک مستقل قانون ہے، یہ قانون ایک ایسے بین الاقوامی معاہدہ کے تحت بنایا گیا ہے جو ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدات کو منظم کرتا ہے، یہ قانون قانونِ معاہدات ہے، یہ قانون ایک بین الاقوامی معاہدہ کے تحت بنا تھا جسے "ویانا" معاہدہ کہا جاتا ہے، یہ مئی ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا، اور جنوری ۱۹۸۰ء سے نافذ ہوا ہے۔

"معاہدۂ ویانا" نے مختلف ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدات کے تمام پہلوؤں کو منظم کیا ہے، یہ معاہدے بین الاقوامی قانون کا ایک سرچشمہ شمار ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ میں چونکہ ان معاہدات کا نہایت اہم کردار رہا ہے، اور چونکہ ان معاہدات کی بین الاقوامی قانون کے ایک سرچشمہ اور مختلف ممالک کے درمیان پرامن تعلقات کو ترقی دینے کے ایک طریقہ کار کے طور پر اہمیت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس لئے تمام ممالک نے اس "معاہدۂ ویانا" پر دستخط کئے ہیں۔

یہ معاہدہ مندرجہ ذیل امور کو منظم کرتا ہے:

۱۔ کسی ملک کی رضامندی کے وسائلِ تعبیر۔ ۲۔ تحفظات۔ ۳۔ معاہدات کا نفاذ۔ ۴۔ معاہدات کا احترام۔ ۵۔ معاہدات اور دیگر ممالک۔ ۶۔ معاہدات کی ترمیمات۔ ۷۔ معاہدات کا خاتمہ اور ان پر عمل کا رک جانا۔

ملک کے اندرونی قانون سے بین الاقوامی قانون کا اختلاف:

اس سلسلے میں ماہرین کی آرا مختلف ہیں، یہ آرا دو طرح کی ہیں

۱۔ وحدت قانون کا نظریہ:

اس نظریہ کے حاملین کی رائے یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون داخلی قانون سے بے تعلق نہیں ہے، ان لوگوں کے نزدیک قانون چند لازمی قواعد پر مشتمل ایک اکائی ہے، خواہ یہ قواعد حکومت کے لئے ہوں، افراد کے لئے یا دیگر اکائیوں کے لئے، یہ رائے اُس قانون کے حقیقی تصور سے ہم آہنگ ہے جو کسی معاشرہ میں سماجی سرگرمی کے بنیادی تنظیمی امور پر مشتمل ایک ڈھانچہ مانا جاتا ہے، اس قانون کا سرچشمہ انسان کی سماجی ومعقول فطرت میں ہوتا ہے، اسی لئے زمانی وعلاقائی طور پر یہ قانون اپنی اس فطرت سے مختلف نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے ہم قانون کی ایسی قسموں کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہوں، اس لئے کہ سرچشمہ کی یگانگت ان تمام قسموں کو ایک جیسا بنا دیتی ہے۔

اس نظریہ کے حاملین میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان دونوں قسموں میں سے کون سی قسم دوسری قسم کے مقابلہ بالاتر ہے، بعض حضرات کے نزدیک داخلی قانون بالاتر ہے، جبکہ دیگر حضرات کے نزدیک بین الاقوامی قانون، اس لئے کہ وہ بین الاقوامی معاہدات جن کی تصدیق ہوچکی ہے ان کے زیر اثر دائرہ داخلی قوانین سے زیادہ ہے، بشرطیکہ دوسرا فریق بھی اسی معاہدہ کو نافذ کرے، لہذا معاہداتی قاعدہ کا مرتبہ داخلی قانونی قاعدہ سے زیادہ ہے، دو قاعدوں کے درمیان تعارض کی صورت میں معاہداتی قاعدہ زیادہ اہم ہے۔

۲۔ قانون کی دوئی کا نظریہ:

اس نظریہ کے حاملین کے نزدیک بین الاقوامی قانون اور داخلی قانون دو بالکل مستقل اور باہم دیگر مختلف نظام ہیں، اس لئے کہ ان دونوں میں یہ فرق پائے جاتے ہیں:

(۱) موضوع کے اعتبار سے: داخلی قانون کا موضوع فرد ہے، جبکہ بین الاقوامی قانون کا موضوع حکومت ہے۔

(۲) سرچشمہ کے اعتبار سے: داخلی قانون کا سرچشمہ حکومت کا ارادہ ہے تو بین الاقوامی قانون کا سرچشمہ متعدد ممالک کا اجتماعی ارادہ ہے۔

(۳) قانونی قواعد کے ذریعہ منظم روابط کی نوعیت کے اعتبار سے: داخلی قانون ملک کے اندر افراد کے درمیان باہمی تعلقات کو منظم کرتا ہے، جبکہ بین الاقوامی

قوانین صلح یا جنگ کے حالات میں ممالک کے درمیان تعلقات کو منظم کرتے ہیں۔

اس نظریہ کے مندرجہ ذیل نتائج ہیں:

الف۔ دونوں قوانین کے قواعد اپنے موضوع اور اپنی ساخت کے اعتبار سے الگ الگ ہوتے ہیں، بین الاقوامی قانونی قواعد داخلی قانون میں لازمی ہونے کی صفت سے اس وقت تک متصف نہیں ہوتے ہیں جب تک وہ داخلی قوانین کی تشکیل کے لئے مروجہ طریقہ ہائے کار کے مطابق داخلی قانونی قواعد کی صورت نہ اختیار کرلیں۔

ب۔ ملکی عدالتیں صرف داخلی قوانین کی ہی تشریح وتنفیذ کرسکتی ہیں، وہ بین الاقوامی قوانین کی تنفیذ اس وقت تک نہیں کرسکتی ہیں جب تک وہ داخلی قوانین نہ بن جائیں۔

اسی طرح بین الاقوامی عدالت اس وقت تک داخلی قوانین کی تشریح وتنفیذ نہیں کرسکتی ہیں جب تک وہ بین الاقوامی قواعد کی صفت نہ حاصل کرلیں۔

ان دونوں نظریات کے درمیان تقابل:

یہ بات صحیح ہے کہ تاریخی طور پر مقامی معاشرہ تنظیم میں بین الاقوامی معاشرہ سے مقدم ہے، لیکن بین الاقوامی معاشرہ کے تاریخی طور پر اس پچھڑے پن کو داخلی قانون پر بین الاقوامی قانون کی بالاتری سے کم کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اس معاشرہ کی ترقی میں یہ معاون ہے، اسی طرح بین الاقوامی معاشرہ کو انتشار ولاقانونیت سے بچانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم ممالک کی بے سروپا آزادی کو روکیں۔

لہذا عملی پہلو اس بات کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ ہم بین الاقوامی قانون کو داخلی قانون پر بالاتر قرار دیں، اور ان دونوں میں نزاع کی صورت میں بین الاقوامی قانون کو داخلی قانون پر ترجیح دیں۔

ملکی قوانین کو بین الاقوامی معاہدات سے ہم آہنگ کرنا:

ہم آہنگ کرنے سے مراد داخلی (یا ملکی) قوانین اور ان بین الاقوامی معاہدات ومنشورات کے درمیان پائے جانے والے تعارض کو دور کرنے کے لئے کوششیں کرنا ہے جن پر ملک نے دستخط کئے ہوں۔

بین الاقوامی معاہدات اور بین الاقوامی قانون کے متصادم قوانین کا پایا جانا کوئی صحیح بات نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تعارض وتصادم کسی ایسے ملک کے قوانین کے نفاذ میں ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں جس نے ان بین الاقوامی معاہدات پر دستخط کئے ہوں، یہ معاہدات بین الاقوامی قانون کا بنیادی اور اہم حصہ ہوتے ہیں، اس کے علاوہ آج تمام ممالک ایک بین الاقوامی نظام کا حصہ بن گئے ہیں، اور اپنی بین الاقوامی پابندیوں سے چھٹکارا نہیں پاسکتے ہیں۔

بعض ممالک میں ان بین الاقوامی معاہدات کے احکام ملکی داخلی قانون کی بہ نسبت راجح ہوتے ہیں جن پر اس متعلقہ ملک نے دستخط کردی ہوتی ہے، جب کہ دیگر ممالک میں ایسے بین الاقوامی معاہدات کے احکام کو قانون کی صورت میں پاس کرنا ضروری ہوتا ہے، اس سے صرف نظر بین الاقوامی قانون کے قواعد کے مطابق تمام ممالک کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملکی قوانین اور اپنے بین الاقوامی معاہدات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام ضرور کریں۔

تمام ممالک پر بین الاقوامی قانون کی پابندی لازم ہے، اس لئے کہ یہ قانون ممالک کے لئے لازمی قواعد پر مشتمل ایک ایسا نظام ہے، جو ان ممالک کے لئے یہ لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ اس قانون کے قواعد سے براہ راست اپنے قانونی نظام اخذ کریں، بلکہ ملکی قوانین میں اس کا تذکرہ نہ ہونا ایک بین الاقوامی مخالفت کا سبب بن رہا ہے، اس کے نتیجہ میں ایک بین الاقوامی ذمہ داری وجود میں آسکتی ہے، یہ ذمہ داری بین الاقوامی غیر قانونی طرز عمل کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے، اور یہ صورت حال بین الاقوامی ذمہ داری کی مخالفت ہے......

عصر حاضر میں ملکی سسٹمس بین الاقوامی قانون کے تصور سے بہت متاثر ہوئے ہیں، اس قانون نے ممالک کے ذمہ یہ لازم کیا ہے وہ اپنے ان قوانین اور انتظامی طرز ہائے عمل کو منسوخ کردیں جو بین الاقوامی معاہدات کے اہداف سے معارض ہوں۔

بین الاقوامی قانون مکمل طور پر داخلی سسٹمس سے مربوط ہے، یہ سسٹمس بین الاقوامی قانون کے ان مظاہر میں سے ایک ہے جو ہر علاقہ کے افراد کے حقوق اور ان کی آزادیوں کا تحفظ کرکے بین الاقوامی معاشرہ پر، بہت توجہ دینے کے سلسلے میں اس بین الاقوامی قانون کے کردار کو مستحکم کرسکتے ہیں۔

معاہدہ ممالک کے لئے کب لازمی ہوتا ہے؟

اور کب ممالک کے لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ان کے قوانین معاہدہ سے ہم آہنگ ہوں؟

قانونِ معاہدات کی بابت ہونے والے "معاہدۂ ویانا" کی دفعہ ۲۶ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ معاہدہ معاہدین کے مابین قانون کی سی حیثیت رکھتا ہے، ہر معاہدہ پر عمل تمام فریقوں کے لئے لازمی ہے، ہر فریق کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ حسن نیت کے ساتھ معاہدہ کو جاری کرے۔

"معاہدۂ ویانا" کی دفعہ ۱۰ کے مطابق معاہدوں کے جس متن پر دستخط کی جائے گی وہی معاہدہ شمار ہوگا۔

قانون معاہدات کی دفعہ ۱۱ کے مطابق کسی ملک کے ذریعہ معاہدہ پر دستخط کرنے، معاہدہ کی انجام دہی کی دستاویزات کے تبادلہ، ان کی تصدیق کرنے، ان سے اتفاق کرنے، ان کو قبول کرنے یا کسی اور طریقہ سے ان میں شامل ہونے کو ملک کی جانب سے معاہدہ کے پابند رہنے کا اظہار واعتراف مانا جائے گا۔

معاہدہ کی پابندی کی بابت اپنی رضامندی کے اعتراف واظہار کے وسائل کے ساتھ ممالک معاہدہ کی دفعات پر عمل کے پابند ہوجاتے ہیں، ان وسائل کے ذریعہ اعتراف واظہار کے بعد معاہدہ قانونی وحتمی ہوجاتا ہے، اور ممالک حسن نیت کے ساتھ اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے پابند ہوجاتے ہیں، اس کے لئے ممالک کو اپنے ملکی قوانین اور اپنے بین الاقوامی معاہدات کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنی ہوتی ہے، نیز ان کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لئے انتظامات کرنے ہوتے ہیں۔

"معاہدۂ ویانا" کی دفعہ ۲۷ میں ہے کہ معاہدہ کا کوئی فریق اپنے داخلی قانون کے متون کو دلیل بنا کر معاہدہ کے نفاذ میں کسی طرح کی کوتاہی کو جائز نہ قرار دیں۔

"معاہدۂ ویانا" کی دفعہ ۴۶ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی بھی ملک معاہدہ کے تئیں اپنی رضامندی کے اظہار کے بعد داخلی قانون کے کسی حکم کے ساتھ اس کے تضاد کو اس رضامندی کے خاتمہ کا سبب نہ بتائے، الا یہ کہ یہ تضاد بالکل واضح ہو، کسی تضاد کو واضح اس وقت مانا جائے گا جب وہ موضوعی طور پر کسی ایسے ملک کے لئے واضح ہو جو اس سلسلے میں معمول کے تعاون کے مطابق حسن نیت کے ساتھ طرز کار اختیار کرے۔

اسی طرح بعض بین الاقوامی معاہدات نافذ کرنے کے سلسلہ میں اقدامات نہ کرنے کے بارے میں کئے جانے والے استدلالات بھی بہانے ہی مانے جائیں گے اور یہ عمل کوتاہی شمار ہوگا۔

بین الاقوامی قانون اور داخلی قانون کے درمیان تعارض کا حکم شرعی کیا ہے؟

خاص طور پر اسلامی ممالک میں یہ بحث بہت زوروں میں چھڑی ہوئی ہے کہ بین الاقوامی قانون کا کوئی عنصر (مثلاً عالمی منشور بابت حقوق انسانی) اگر اسلامی شریعت کے ناقابل تغیر احکام اور مسلمانوں کے لئے مقدس تعلیمات سے متعارض ہو تو ایسی صورت میں کیا ہوگا؟ اس بابت بہت سی باتیں کہی گئی ہیں، جن کے تذکرہ کی اس وقت گنجائش نہیں ہے، لیکن یہاں پر یہ بتانا مناسب ہوگا کہ "عالمی منشور برائے حقوق انسانی" پر دستخط کرنے والے اسلامی ممالک نے خود اسی منشور کے اندر سے اپنے لئے ایک گنجائش ڈھونڈ لی ہے، اس لئے کہ اس کی دفعہ ۲۹ کی شق: ۲ میں یہ لکھا گیا ہے کہ: فرد اپنے حقوق اور اپنی آزادیوں کے استعمال میں اس قانون کی عائد کردہ پابندیوں کا پابند صرف دوسروں کے حقوق اور ان کی آزادیوں کو یقینی بنانے، ان کا احترام کرنے اور عام نظام، مصلحت عامہ واخلاق کے انصاف پسندانہ تقاضوں کو حاصل کرنے کے لئے ہے"۔

شرعی پہلو سے بھی صلح حدیبیہ کے اسوہ کی بنیاد پر علماء امت میں یہ اختلاف ہے کہ کیا احکام شریعت کے خلاف امور پر کفار سے صلح کی جاسکتی ہے۔

نزھۃ الأفکار شرح قرۃ الابصار (از: علامہ مجدد عبدالقادر بن محمد بن محمد سالم مجلسی شنقیطی جلد اول، صفحہ: ۳۰۲) میں صلح حدیبیہ پر گفتگو کے آخر میں لکھا گیا ہے:

فائدہ: علماء کا اس بابت اختلاف ہے کہ کیا کفار کے ساتھ اس بات پر صلح (معاہدہ) جائز ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو شخص مسلمان ہوکر آئے گا وہ اسے کفار کو واپس کردیں گے، بعض لوگوں کے نزدیک یہ جائز ہے، اس لئے کہ ابوجندل اور ابوبصیر کے قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے، بعض حضرات کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس قصہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ ابوداؤد وترمذی کی روایت کردہ اس حدیث نبوی سے منسوخ ہے جس میں ہے: "میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہو، لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ایسا کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان دونوں کی آگ ایک دوسرے کو نہ دیکھ پائے۔ ☆☆☆

اسلام میں شہریت کی حیثیت اور اسلامی ممالک میں رہنے والے غیر مسلموں کے شہری حقوق قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک تحقیقی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی[1]

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا وحبیبنا وقدوتنا محمد المبعوث رحمۃ للعالمین وعلی اخوانہ من الأنبیاء والمرسلین وعلی آلہ الطیبین وصحبہ المیامین ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین۔

امابعد!

دور حاضر میں ہمارے سامنے بہت سی سیاسی، سماجی اور اقتصادی اصطلاحات ہیں جن کا ایک خاص مفہوم ہے، اور جن کے ابعاد اپنے اصلی اور لغوی ابعاد سے مختلف ہیں، جیسے مواطنہ (شہریت)، قومیت، وغیرہ، اس لئے ان اصطلاحات کے نئے مفاہیم کی تحدید اور شریعت کے اصول اور مقاصد کی روشنی میں ان پر حکم لگانا ضروری ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کو مکمل قبول کرنا ہے یا انہیں رد کرنا ہے یا ان میں کچھ تفصیل ہے۔

قرآن کریم نے واضح کیا ہے کہ اصطلاحات کی اہمیت ہوتی ہے، اور اس کا اعتبار کیا جاتا ہے، اسی لئے زمانہ جاہلیت میں رائج اصطلاح 'راعنا' کی ممانعت آئی، کیونکہ یہودی اس اصطلاح کو اچھے معنی میں استعمال نہیں کرتے تھے، جبکہ عربی لغت اور عربی اسلوب میں اس کے اچھے معانی آئے ہیں، قرآن نے صرف ممانعت پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ اس کی جگہ دوسری اصطلاح 'انظرنا' بیان فرمایا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''یایھا الذین آمنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا و اسمعوا و للکافرین عذاب ألیم'' (سورہ بقرہ:۱۰۴)۔

اصطلاحات کے تعلق سے قرآن کریم کا یہ اسلوب اور تعامل اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس امت پر واجب وضروری ہے کہ وہ بھی اصطلاحات کو اختیار کرنے، بلکہ اس کے استعمال کرنے میں بھی اور اپنے افراد کو اسے برتنے کی تربیت کرنے میں غایت درجہ بیداری اور شعور کا ثبوت دے۔

انہی جدید مروج اصطلاحات میں جن کا اصطلاحی مفہوم اپنے لغوی مفہوم سے الگ ہے، ایک مواطنہ (شہریت) ہے، جو انقلاب فرانس کے ساتھ ہی مشہور ہوا اور پھر اسلامی ممالک تک پہونچا۔

اس تحقیقی مقالہ میں، ہم مواطنہ کے لغوی واصطلاحی معنی بیان کریں گے، پھر اس کی تفصیل اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حکم، نیز اس بارے میں اسلامی فکر کے موقف کو واضح کریں گے، اس ضمن میں اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو حاصل حقوق کو بھی بیان کریں گے، نیز میثاق مدینہ کی مختصر تشریح کریں گے، جو کہ حقوق کی تاریخ میں پہلا دستور مانا جاتا ہے۔

اللہ تعالی ہمیں صحیح بات کی رہنمائی فرمائے، اور عقیدہ، قول اور عمل میں لغزش اور گمراہی سے بچائے! آمین

مواطنہ (شہریت) کی تعریف:

لغوی اعتبار سے 'مواطنہ' لفظ 'واطن' کا مصدر ہے، جس کی اصل ''وطن بالمکان یطن وطنا'' ہے، یعنی کسی جگہ قیام کرنا، کہا جاتا ہے، ''اتطن البلد''، یعنی اس شہر کو وطن بنایا، اور ''استوطن البلد''، یعنی اس شہر کو وطن بنالیا، ''ووطن الشخص''، یعنی وہ شہر جہاں وہ رہتا ہے (القاموس المحیط، لسان العرب، المعجم الوسیط مادہ 'وطن')۔

---

[1] جنرل سکریٹری الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین، ونائب صدر المجلس الاوروبی للافتاء والبحوث۔

مواطنہ کو واطن سے مانتے ہوئے یہ مفہوم لینا کہ کسی ملک میں وہاں کے باشندوں کے ساتھ رہنا تو اس بارے میں "المعجم الوسیط" کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ محدثہ (جدید) ہے، (واضح رہے کہ المعجم الوسیط مجمع اللغۃ قاہرہ کی نمائندگی کرتا ہے) کیونکہ اہل عرب نے اس لفظ کو اس جدید معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔

فقہاء نے وطن الاقامۃ کا لفظ بلد السفر کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے، یعنی وہ جگہ جہاں مسافر اتنی مدت تک ٹھہرے کہ جس مدت میں مسافر سفر کے احکام سے خارج ہو جاتا ہے، یعنی کم سے کم پندرہ دن (التعریفات للجرجانی ص ۲۴۷)۔

اسی طرح موجودہ عرف میں وطنی اس کو کہتے ہیں جو وطنیت پر مبنی فکر کو اوڑھ لے، اس کا دفاع کرے اور حقوق وواجبات کے سلسلہ میں جملہ شہریوں کے درمیان اس لفظ کو ذریعہ کے طور پر استعمال کرے، اور مواطن اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس اس ملک کی نیشنلیٹی ہو، بعض لوگ شہریوں کے درمیان اس طرح فرق کرتے ہیں:

مواطن اصلی: ان کے حقوق زیادہ ہوتے ہیں (ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اپنے مقالہ 'مفہوم المواطنہ فی المنظور الاسلامی' میں یہ بات لکھی ہے)۔

مواطن متجنس: ان کے حقوق کم ہوتے ہیں، یا ایسے شہری جو دوسری جگہ سے یہاں آ کر رہ رہے ہیں، اس طرح اور بھی لوگوں نے وطن کی قسمیں بیان کی ہیں، لیکن قرآن وحدیث میں اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے، اللہ تعالی نے قومیت اور وطنیت کو محض تعارف کیلئے بنایا ہے نہ کہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ اختلاف پیدا ہو اور آپس میں فخر وغرور کا سبب بنے، اسی طرح قدیم عربوں نے بھی لفظ 'وطن' اس جدید معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ انہوں نے وطن کو منزل اور مکان کے لئے استعمال کیا ہے جہاں انسان رہتا ہے، "لسان العرب" میں ہے:

"الوطن: هو المنزل الذی یقیم به و هو موطن الإنسان ومحله" (لسان العرب، ماده 'وطن')۔

فیروز آبادی لکھتے ہیں: "الوطن: منزل الاقامة ومربط البقر والغنم وجمعه أوطان... وموطن مکه: مواقفها، ومن الحرب مشاهدها وتوطین النفس: تمهیدها... وواطنه علی الامر: وافقه" (القاموس المحیط ماده 'وطن'، ص: ۱۵۹۸)

اس معنی میں عربوں نے اشعار بھی کہے ہیں، ابن رومی اپنے گھر کے بارے میں کہتا ہے:

ولی الوطن ألیت أن لا أبیعه وألا أری غیری له الدهر مالکا

اذا ذکروا أوطانهم ذکرتهم عهود الصبا فیها فحنوا لذلکا

خلاصہ کلام یہ کہ وطن اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان پیدا ہوا ہو، بچپن سے جوانی تک وہاں رہا ہو، اور اس جگہ سے اور وہاں کے لوگوں سے اس کو محبت ہو، نہ یہ کہ معینہ حقوق حاصل ہوں، یا کوئی ایسا معاہدہ ہو جس کا سیاسی معاہدات کی دنیا میں کوئی خاص مفہوم ہو۔

اہل عرب جب وطن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ جگہ مراد لیتے ہیں جہاں وہ پیدا ہوا ہے اور جہاں اس کی نشوونما ہوئی ہے، یا وہ جگہ جہاں اس نے قیام کیا اور اس جگہ سے اس کا وجدانی اور جذباتی تعلق ہو گیا ہو۔

قرآن کریم نے لفظ 'مواطن' استعمال کیا ہے اور اس سے جگہیں مراد لیا ہے، جائے پیدائش سے وابستگی نہیں، اللہ تعالی فرماتا ہے: "ولقد نصرکم الله فی مواطن کثیرة" (سورہ توبہ: ۲۵) ہم نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد کی ہے، جیسے بدر اور حنین سے پہلے کے غزوات، کہ یہ مسلمانوں کی پیدائش کی جگہ تھی اور نہ ان کے نشوونما کی جگہ (تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص: ۳۳۶)۔

ایسا لگتا ہے کہ لفظ "الوطنی" "الوطنیة" اور "الوطن" کو اس کے سیاسی معنی میں سب سے پہلے عالم عرب میں طہطاوی (۱۸۰۱ - ۱۸۷۳ء) نے استعمال کیا ہے، ان کے بعد بطرس البستانی (۱۸۱۰ - ۱۸۸۳ء) کی کتاب میں استعمال ہوا ہے، طہطاوی لکھتے ہیں: ملک کا باشندہ اصلی باشندہ ہے یا وہاں کمائی کی غرض سے آیا اور اس میں اقامت اختیار کر لی اور اسی کو اپنا وطن بنایا ہو، اور اسی کی طرف نسبت کرتا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ملک کے حقوق سے مستفید ہو رہا ہے، لہذا ملک کے قوانین کو ماننا وطن کی طرف سے اس بات کی ضمانت ہے کہ شہری حقوق سے مستفید ہو، اور شہری خصوصیات کو اپنانا چاہتا ہے، اس معنی میں وہ وطنی اور بلدی ہے، یعنی وہ شہر کا ایک جزو اور ممبر شمار ہوتا ہے، گویا وہ شہر کے جسم کے ایک عضو کی طرح ہے، متمدن قوموں کے نزدیک یہ سب سے بڑی خصوصیات میں سے ہے" اس کے بعد وہ کہتے ہیں "وطنیت (شہریت) کا وصف صرف اس بات کی متقاضی نہیں کہ انسان اپنے واجب حقوق کا مطالبہ کرے، بلکہ اس کی یہ بھی ذمہ

داری ہے کہ وطن کے تئیں جو حقوق اس پر ہیں ان کو بھی ادا کرے، چنانچہ اگر کوئی شہری ملک کے حقوق ادا نہیں کرتا ہے تو وہ بھی ملک کے تئیں اپنا شہری حقوق کا استحقاق نہیں رکھے گا (رفاعۃ الطہطاوی، ج ۲ ص ۴۳۳۔۴۳۴)۔

بطرس البستانی نے بھی الوطن، الوطنی اور الوطنیۃ کی تعریف میں اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ طہطاوی نے وطن کا یہ مفہوم موجودہ مغربی فکر سے لیا ہے، کیونکہ انہوں نے فرانس میں زندگی گزاری، جامع ازہر مصر نے ان کو وہاں مبعوث کر کے بھیجا تھا، پھر یہ اصطلاح مسلمانوں میں عام ہوگئی، بلکہ بعض مسلمانوں نے مغرب سے زیادہ اس اصطلاح کو استعمال کیا، یہاں تک کہ ۱۹۷۹ء میں کامپ ڈیفیڈ معاہدہ کے بعد یہ نعرہ بلند ہوا: "مصر للمصریین" یعنی مصر مصریوں کیلئے ہے، اس زمانے کے مصری مجلات ورسائل کو میں پڑھتا رہتا تھا، مجھے محسوس ہوتا تھا کہ بعض رسائل بغض، کینہ، عداوت اور تعصب کو ہوا دے رہے تھے، اور عرب اور مسلمانوں کے شیرازہ کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، گویا کہ قومیت جس نے امت اسلامیہ کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا اور خلافت عثمانیہ کے زوال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اب تک اپنا کردار ادا نہیں کر پائی، کیونکہ عرب اب تک متحد تھے، چنانچہ اسی منفی طرز پر یہ فکر سامنے آئی، تا کہ عربوں کو بھی قومیت کے نام پر مختلف حصوں میں تقسیم کر دے۔

مواطنہ (شہریت) کا تاریخی پس منظر:

مواطنہ کا اولین تصور اس حکومت کے ذریعہ آیا جو دشمنوں اور مخالف چیلنجز کے سامنے اپنی قوت اور وحدت ثابت کرنے کیلئے اپنے پیروکاروں کو ایک جامع نظام پر لانا چاہتی تھی، اسی لئے ان حکومتوں میں اس کی بعض نشانیاں ملتی ہیں جن کی بنیاد قومیت وعصبیت پر ہے، جیسے آشور بین، فارس اور روم وغیرہ، لیکن جب ان قوموں نے ایک خاص دین کو اپنا لیا تو اب یہ دین ہی ان کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بن گیا۔

پچھلی تہذیبوں نے اور خاص طور پر اسلامی تہذیب نے بھی ان شہریوں کے حقوق و واجبات کو واضح کیا ہے جو اس ملک یا سلطنت میں رہتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اسلامی تہذیب نے شہریت کا کچھ الگ مفہوم بھی متعین کیا تھا، جو غیر محدود تھا، متنوع تھا، اور جو جدید مفہوم کے قریب بھی تھا اور دور بھی (تفصیل کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر راشد غنوشی کا مقالہ بعنوان 'المواطنۃ'، ڈاکٹر خلیفہ کواری کا مقالہ بعنوان: المواطنۃ فی الدولۃ القومیۃ، مطبوع مجلہ المستقبل العربی، ۲۰۰۱ء، ڈاکٹر محمد سلیم عوا کا مقالہ بعنوان: فکرۃ المواطنۃ وتطورہا، دکتور محمد عمار کا مقالہ بعنوان: حقوق المواطنۃ فی الاسلام، اور ڈاکٹر سامر مؤید عبد اللطیف کا مقالہ وغیرہ)، یہاں تک کہ یوروپی انقلاب کا دور آیا، جس نے مواطنہ کے مفہوم کو محدود کر دیا اور اس کو بڑی حد تک قومیت سے جوڑ دیا، ہم اس مقالہ میں اسی موضوع پر گفتگو کریں گے۔

شہریت عصر حاضر میں:

موجودہ سیاسی افکار کے مطابق شہریت سے مراد کسی ایسے معاشرہ میں شامل ہونا ہے جس کا سیاسی، سماجی اور ثقافتی ڈھانچہ ایک ہو، (موسوعۃ ویکیپیڈیا الحرۃ، اصطلاح 'مواطنہ') جس کی بنیاد پر حقوق و واجبات مرتب ہوتے ہوں، لہذا شہریت کی موجودہ تعریف متعین حکومت کی ارتباط ہے، لہذا جو ان حقوق سے مستفید نہ ہو وہ وہاں کا شہری نہیں کہلائے گا، چنانچہ شہری اس سماجی معاہدہ میں داخل ہوگا جو شہریوں اور حکومت کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے، اسی وجہ سے اکثر دستور شہریوں کے حقوق اور ان کے فرائض مرتب کرتا ہے، اس روشنی میں شہریوں کے فرائض اس طرح ہیں:

۱۔ ملک سے وفاداری کا تعلق رکھنا۔

۲۔ مالی واجبات کو برداشت کرنا، جب مطالبہ ہو تو ٹیکس ادا کرنا، فوج میں شامل ہونا، دستور اور عمومی نظام کا احترام کرنا، عوامی سرمایہ کی حفاظت کرنا، وطن کے ساتھ خیانت نہ کرنا، اشتعال انگیز افواہوں کو روکنا، ملک کی حفاظت میں لوگوں کے شانہ بشانہ رہنا۔

۳۔ عوامی زندگی میں شریک ہونا، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا۔

۴۔ تمام شہریوں کو اس کے شہری ہونے کی بنیاد پر قبول کرنا، چاہے ان کا عقیدہ اور مذہب کچھ بھی ہو۔

ملک کی ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:

۱۔ ملکی حقوق کی حفاظت کرنا، شہریوں کے حقوق، ان کی آزادی، عزت، انسانیت اور ان کی زندگی کی حفاظت کرنا۔

۲۔ عدل وانصاف اور مساوات کے ساتھ سیاسی، سماجی، اقتصادی صحت، ثقافت، تعلیم، قانون اور عدالت کے امن وامان کو فراہم کرنے کیلئے سنجیدہ کوشش کرنا۔

۳۔ حقوق وواجبات اور مواقع فراہم کرانے میں شہریوں کے درمیان برابری کا معاملہ کرنا۔

۴۔ دستور اور انصاف پر مبنی قانون کے مطابق دولت کی تقسیم عادلانہ طور پر ہو، عادلانہ قوانین کی حفاظت، اس کے نفاذ اور ہر شہری کو ایک پرامن زندگی فراہم کرنے کے لئے سنجیدہ کوشش کرنا (حوالہ سابق)۔

وطنیت (شہریت) کی اصطلاح کا استعمال وطنی فکر کو اپنانے اور اس کو ایک محور کے طور پر ماننے میں ہوتا ہے، لہذا وطنی وہ ہے جس نے اس ملک کی فکر کو اپنالیا ہو اور وطن سے جذبہ محبت کا اظہار کرتا ہو۔

موجودہ زمانہ میں شہریت کا تحقق قومیت سے ہوتا ہے، اس طور پر کہ وہی شخص اس ملک کا شہری ہوسکتا ہے جو اس ملک کے کسی آدمی کا بیٹا ہو یا اس نے قانونی طور پر اس ملک کی شہریت حاصل کرلی ہو، اس لحاظ سے شہریت کے بنیادی ڈھانچہ میں حکومت، قوم، زمین اور وہ جامع تعلق جو قومیت کی نمائندگی کرے، شامل ہیں، اس لئے کہ شہریت کا یہ نظریہ اس کلیسا کے نظریہ کے مقابلہ میں ظاہر ہوا جو قوم پرست انقلابیوں کے خلاف اپنے لوگوں کو سمیٹے ہوئے تھی۔

پروفیسر علی کواری لکھتے ہیں: یورپ میں تین بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں، انہی تبدیلیوں نے موجودہ جمہوری حکومت میں شہریت کی بنیاد کو راسخ کیا ہے، وہ تین تبدیلیاں اس طرح ہیں:

۱۔ کلیسا اور بادشاہوں کے درمیان کشمکش کے نتیجے میں جمہوری حکومت کا ظہور۔

۲۔ سیاست میں شہریوں کی شرکت۔

۳۔ ایسے قوانین کی ترتیب جو شہریت کی بنیاد پر تعلقات استوار کرتے ہیں، لیکن گلوبلائزیشن کے پروپیگنڈہ کے دور میں شہریت مراجعت کے مرحلہ سے گزر رہی ہے جو ہر طرح کی قومی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتی ہے، جیسا کہ موجودہ دور میں یورپی یونین کا حال ہے، کہ جس نے شہریت کے سارے حدود کو توڑ دیا ہے (دیکھئے، مقالہ علی الکواری)۔

یورپ اپنے سیاسی اور اقتصادی اتحاد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکا اور چین کے بعد دوسری یا تیسری اقتصادی طاقت بن گیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو بعض ملکوں کو اقتصادی افلاس سے بچانا ممکن نہ ہوتا، جیسے یونان، اسپین اور اٹلی وغیرہ، اسی طرح اگر یہ اتحاد نہ ہوتا تو یورپ کے بعض ممالک اتنی زبردست سیاسی قوت حاصل نہ کرپاتے جس سے وہ اپنا اور اپنے مفاد کا دفاع کرسکیں، اسی طرح عالمی اور علاقائی سطح پر ایسی سیاسی قوت حاصل ہوئی جو قذافی جیسی حکومت کو گرانے کا ذریعہ بنی، اور اس کی فوجی قوت یہاں تک پہونچ گئی کہ اس نے امریکا کے تعاون سے ناٹو کی فوجی قوت کے ذریعہ تمام بڑی فوجوں کو اکٹھا کرنے کیلئے زبردست مال بینک کو فراہم کیا۔

اس تفصیل سے میرا مقصد اس پہلو کو سامنے لانا ہے کہ قومیت یا شہریت کے تنگ دائرہ میں رہنے کے منفی پہلو بھی بہت ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے مثبت پہلو سے فائدہ اٹھائیں اور منفی پہلوؤں کو چھوڑ دیں جس کو ہم آئندہ بیان کریں گے، بلکہ مغرب کا معاملہ اس کے ساتھ منافع کو لینے اور مفاسد کو چھوڑنے کا ہے، جب اس نے دیکھا کہ یورپی اتحاد، بلکہ یورپی امریکی اتحاد میں اس کے مصالح ہیں تو اس نے قومیت اور وطنیت کے تئیں جوش کا اظہار نہیں کیا۔ اسلامی مفکر پروفیسر راشد غنوشی کہتے ہیں:

نئے سیاسی نظریہ میں شہریت کا مفہوم ایک جہت سے قومی حکومت سے جڑا ہوا ہے اور دوسری جہت سے اس کا تعلق جمہوری حکومت سے ہے، اور زیادہ تعلق لادینیت سے ہے، اسلئے کہ عہد کلیسا میں حکومت دین مسیحی سے منسلک تھی جو بہت سی قوموں اور نسلوں کو جمع کرنے کا ذریعہ تھی، ان سب کو جوڑنے والا دین ہی تھا، لیکن جب یورپ نے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا تو اس نے قومی وطنیت کو اپنالیا، لیکن اس نے شہریت کو مساوات سے نہیں جوڑا (حوالہ سابق)۔

یہ حقیقت ہے کہ ریڈ انڈین (اصلی باشندے) اور جن امریکیوں نے امریکہ کو وطن بنایا ان دونوں کے درمیان امریکہ میں وطنیت کی بنیاد پر مساوات نہیں برتا گیا، جیسے ماضی قریب تک سیاہ فاموں کے ساتھ بھی مساوات کا تحقق نہیں ہوا، جس طرح المانیا نے نازی حکومت کے دور میں یہودی شہریوں کے ساتھ ہالوکاسٹ کیا، اسی طرح آج یورپ کے دائیں بازو کے انتہاء پسندانہ افکار وہاں کے پشتینی مسلمان اور دوسرے لوگوں کے درمیان مساوات کا قائل نہیں ہے، بلکہ

ان کا مطالبہ ہے کہ ان کو یورپ سے بھگا دیا جائے اور ان کی مذہبی آزادی پر پابندی لگادی جائے، اسی ضمن میں بعض ممالک میں نقاب اور بعض میں حجاب پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

جنسیت اور شہریت کے درمیان فرق کے ابعاد:

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہریت کی بنیاد جنسیت پر ہے، جس کے پاس کسی ملک کی جنسیت (نیشنلیٹی) ہو وہ اصولی طور پر دستور میں دئے گئے تمام حقوق سے مستفید ہوگا، اس طرح اس پر کچھ فرائض بھی عائد ہوں گے، اس بنیاد پر اکثر محققین یا عالمی انسائیکلو پیڈیا نے ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے، گویا دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، یا دونوں کا حاصل ایک ہی ہے (الموسوعۃ الدولیۃ، موسوعۃ کولیر)۔

لیکن ''انسائیکلو پیڈیا بریطانیہ'' نے دونوں کے درمیان اس طرح فرق کیا ہے کہ جنسیت میں شہریت کے علاوہ کچھ دوسرے حقوق بھی شامل ہیں، جیسے باہر سے پشت پناہی وغیرہ (دائرۃ المعارف بریطانیہ، مصطلح 'المواطنہ')۔

میری رائے یہ ہے کہ یہ فرق جوہری نہیں ہے، اسلئے کہ ملک کے تئیں ہر شہری کا یہ حق ہے کہ ملک کا دفاع کرے اور ہر طرح کے وسائل سے اس کی حفاظت کرے، یہاں تک کہ ملک سے باہر رہنے کی صورت میں بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے۔

عالمی شہریت:

بیسویں صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے اوائل میں مغربی مفکرین نے محسوس کیا کہ شہریت کے موجودہ مفہوم کو مشکلات اور عالمی چیلنجز کا سامنا ہے، جیسے انسانی حقوق کے میدان میں سماج واقتصاد، ٹکنالوجی، عمل وغیرہ میں مساوات کا فقدان، چنانچہ مؤثر تہذیب و مذہب پر مبنی قومیں، مختلف ثقافتیں، گلوبلائزیشن کا ظہور اور اقوام متحدہ کی جانب سے انسانی حقوق وغیرہ کی وجہ سے شہریت کے مفہوم میں وسعت دینے اور اسے عالمی بنانے کی ضرورت پڑی، تاکہ ایک نئی اصطلاح سامنے آئے اور وہ ہے ''بین الاقوامی شہریت''، لہذا اب اس کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے، جس کی صفات درج ذیل ہیں:

۱۔ ملک کے اندر غیر ملکیوں کے حقوق اور ان کی آزادی کا احترام کرنا۔

۲۔ ملک کی اپنی تہذیب اور مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب وثقافت کو تسلیم کرنا۔

۳۔ مختلف سیاسی واقتصادی آیڈیالوجی کو سمجھنا اور اس کو عمل میں لانا۔

۴۔ بین الاقوامی معاملات (امور) کا خیال رکھنا۔

۵۔ پرامن زندگی پر لوگوں کو ابھارنا اور بین الاقوامی امن وسلامتی کے فروغ میں شریک ہونا۔

۶۔ اختلاف وکشمکش کے ماحول میں تشدد سے بچتے ہوئے ڈائیلاگ کی حوصلہ افزائی کرنا۔

بین الاقوامی شہریت کے مفہوم کی اس وسعت نے قومیت کے دائرہ کو کمزور کر دیا ہے، یہ اصطلاح اسلامی شہریت کے مفہوم سے قریب تر ہے، اس لئے کہ وطن سے کسی ایک جماعت کا قومی وطن مراد لینا یا اس جماعت کے کسی چھوٹے یا بڑے جزء کی جنس سے اس کی تحدید کر دینا اگرچہ اس کے بعض حقوق اسلام میں ہیں (جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے) لیکن یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کا دائرہ اتنا محدود اور تنگ ہو کہ حقوق وواجبات اس تنگ دائرہ میں منحصر ہو کر رہ جائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تلخ تجربات کے بعد دنیا اسلام اور اس کے عظیم اصول کی طرف لوٹنے پر مجبور ہو رہی ہے، چاہے فوراً لوٹے یا کچھ تاخیر سے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''سنریهم آیاتنا فی الأفاق وفی أنفسهم حتی یتبین لهم أنه الحق أو لم یکف بربك أنه علی کل شیء شهید'' (سورہ فصلت: ۵۳)۔

موجودہ شہریت کے نظریہ کے سلسلے میں اسلام کا موقف

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام معاشرہ، امت اور حکومت کو عقیدہ اور دین کی بنیاد پر قائم کرتا ہے، اسلام اس بات کی پوری کوشش کرتا ہے کہ اصولی، نظریاتی، تطبیقی اور عملی ہر اعتبار سے حقیقی اخوت ومحبت قائم ہو، اللہ تعالیٰ حصر کے ساتھ فرماتا ہے: ''إنما المؤمنون إخوة'' (سورہ حجرات: ۱۰) اور تمام

مسلمانوں پر اخوت کے حقوق کو لازم قرار دیتا ہے، یعنی آپس میں ایک دوسرے سے دوستی، تعاون کرنا، کفالت کرنا اور ضمانت لینا وغیرہ، اللہ تعالی فرماتا ہے:

''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر و يقيمون الصلوة ويؤتون الذكاة ويطيعون الله ورسوله أولئك سيرحمهم الله إن الله عزيز حكيم''(سورہ توبہ:۷۱)۔

بلکہ اللہ تعالی نے ایمان کی حفاظت اور دشمنوں کو روکنے کیلئے اس جامع ولایت کی ضرورت کو بھی بیان کیا ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو، اس جامع ولایت کے مقابلہ میں جو کفر و نفاق پر قائم ہو، اور جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی ہو:''والذين كفروا بعضهم أولياء بعض الا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير''(سورہ أنفال:۷۳)۔

حدیث میں اس ایمانی اخوت اور اس کے حقوق و آثار کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔(اس موضوع پر حدیث کی کتابیں اور بطور خاص ریاض الصالحین دیکھی جاسکتی ہے)۔

اسلام شہریت میں مثبت اور انسانی دونوں پہلوؤں کی رعایت کا داعی:

اس جامع ایمانی اخوت کے ساتھ ساتھ اسلام نے اس کے اس مثبت پہلو سے اعراض نہیں کیا ہے جو تعصب اور قومیت و وطنیت کو پارہ پارہ کرنے والا نہ ہو، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) اسلامی مفہوم میں وطن سے مراد امت اسلامیہ کا وطن کبیر ہے، چنانچہ خلافت راشدہ سے دولت عثمانیہ کے زوال تک اسلامی حکومت میں شہری (چاہے مسلمان ہو یا کافر) عالم اسلام کے طول و عرض میں بغیر کسی قید و شرط کے گھوم سکتا تھا، گویا اس کی جنسیت جنس اسلام ہے، لہذا وہ جہاں بھی قیام کرے وہ اس کا وطن ہے، اس کو اس کے حقوق حاصل ہوں گے، اسی طرح وطن کے تئیں اس کے واجبات بھی ہیں، چنانچہ مسلمان کا ولاء وسیع اسلامی ملک ہے۔

(۲) اسی کے ساتھ اسلام نے انسان کے فطری پہلو کی رعایت کی ہے، کیونکہ انسان کو اپنی جائے پیدائش سے محبت ہوتی ہے، بلکہ اس علاقہ سے اس کو محبت ہوتی ہے جس کی طرف خود کو منسوب کرتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو مکہ مکرمہ سے حد درجہ محبت تھی، صحیح روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو مخاطب کرکے فرمایا:''ما أطيبك من بلد وأحبك إلي ولولا أن قومك أخرجوني منك ما سكنت غيرك''(سنن الترمذی، حدیث نمبر:۳۹۲۶)۔

اور صحابہ کرام نے جس وقت مکہ سے مدینہ ہجرت کی اس وقت انہیں مکہ سے والہانہ تعلق تھا، حضرت بلالؓ فرماتے تھے:

ألا ليت شعري هل أبيتن ليلة بواد و حولي اذخر وجليل

وهل أردن يوما مياه مجنة وهل يبدون لي شامة وطفيل

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ سنا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اللّٰهم حبب إلينا المدينة كحبنا مكة أوأشد، اللّٰهم بارك لنا في صاعنا وفي مدنا وصححها لنا وانقل حماها إلى الجحفة''(صحيح البخاري، كتاب فضائل المدينة، حدیث نمبر:۱۷۹۰)۔

اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء قبول فرمائی، اور ان کے دلوں میں مدینہ کی محبت پیدا فرمادی۔

اسی طرح مسلم شعراء نے بھی وطن کی محبت میں اشعار کہے ہیں، ابن رومی کہتے ہیں:

ولي وطن أليت ألا أبيعه ولا أرى غيري له الدهر مالكا

(زہر الآداب وثمر الالباب للحصری، ج۱، ص:۲۸۳)

اور شاعر ابن الأبار اپنے شاندار قصیدہ کے ذریعہ وطن پر اس طرح آنسو بہاتا ہے:

أنين واشتياق وارتياء لقد حملت ما لا يستاء

فلعبرات بعدهم انحدار ولَلزافرات إثرهم ارتفاع
نأوا حقا ولا أدری أيقفی تلاق أو يباح لنا اجتماع

(ڈاکٹر علی دباب، فی الشعر العربی الاندلسی، ص: ۲۲۶)

اندلس کے اموی خلیفہ عبدالرحمان الداخل نے جب کھجور کے درخت کو دیکھا تو مشرق اور شام سے ان کی محبت بھڑک اٹھی، انہوں نے کہا:

فقلت شبيهی فی التغرب والنوی وطول اكتئابی عن بنی وعن أهلی
ان جسمی كماتراه بأرض وفؤادی ومالكيه بأرض

(حوالہ سابق، ص: ۵۰)

لیکن مسلم شعراء کی محبت اپنے ملک سے ان مقامات سے متاثر ہو کر تھی جن کا اسلام میں بڑا مقام ہے، چنانچہ تمام مسلم شعراء مکہ، مدینہ اور بیت المقدس سے دوسرے مقامات کے مقابلہ میں زیادہ محبت رکھتے ہیں، اسلامی شاعر علامہ اقبال کہتے ہیں:

أشواقنا نحو الحجاز تطلعت كحنين مغترب الى الأوطان

(فلسفۂ اقبال، ط: دراحیاء الکتب العربیۃ، قاہرہ، ص: ۹۱)

ب: اسلام یہ کہتا ہے کہ انسان کو اس ملک سے نکالنا جہاں وہ پیدا ہوا ہے یا اس علاقے سے نکالنا جہاں سے اس کا تعلق ہے جہاد اور قتال کے اہم وجوہات میں سے ہے، جہاد کے سلسلے میں جو پہلی آیت نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وان الله على نصرهم لقدير الذين اخرجوا من ديارهم بغير حق الا أن يقولوا ربنا الله ولو لا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومسجد يذكر فيها اسم الله كثيرا ولينصرن الله من ينصره ان الله لقوي عزيز'' (سورۂ حج: ۳۹:۴۰)۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے جہاد کی مشروعیت کا پہلا سبب ملک بدر کرنا بتایا ہے، اس کے ذریعہ اس حکم کی تاکید ہے جو اللہ نے دوسرے انبیاء کو دئے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ طالوت وجالوت کے قصہ میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''ألم تر الى الملأ من بنی اسرائيل من بعد موسى اذ قالوا لنبي لهم ابعث لنا ملكا نقاتل فی سبيل الله قال هل عسيتم ان كتب عليكم القتال ألا تقاتلوا قالوا وما لنا ألا نقاتل فی سبيل الله وقد أخرجنا من ديارنا وأبناء نا فلما كتب عليهم القتال تولوا الا قليلا منهم و الله عليم بالظالمين'' (سورہ بقرۃ: ۲۴۶)۔

ج: قرآن کریم نے ایسے مسلمان جو اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہتے ہیں اور وہ مسلمان جو اس حکومت کے زیر سایہ نہیں رہتے دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے، پہلے طبقہ کا حق اسلامی حکومت پر یہ ہے کہ اس کی پوری پوری حمایت ونصرت کی جائے اور دوسرے طبقہ کے لئے ولایت ونصرت کا حق ہے، البتہ اگر کسی قوم یا کسی اسلامی حکومت سے اس کا معاہدہ ہو تب یہ حق نہیں ہوگا، اللہ فرماتا ہے: ''ان الذين أمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك بعضهم اولياء بعض والذين أمنو ولم يهاجروا ما لكم من ولايتهم من شي حتی يهاجروا وان استنصروكم فی الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعملون بصير'' (سورۃ أنفال: ۷۲)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارتے ہیں ان کو زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں بمقابلہ اس شخص کے جو اس حکومت سے باہر ہے، اگر چہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ اس حالت میں اسلامی حکومت ان کے ساتھ معاہدہ وصلح نامہ اور مصالح کے مطابق معاملہ کرے گی۔

د- مدینہ کے دستاویز یا دستور نے صرف عقیدہ کے رباط کو ذکر کر کے شہریت اور ایک مشترک ملک میں زندگی گزارنے کے رباط کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ رباط کی دونوں قسموں کو اس کی حیثیت اور اہمیت کے ساتھ سے ملایا۔

اول عقیدہ میں یکسانیت کا رباط: اس دستاویز کی عبارت ہے: ''أن اليهود أمة و المسلمون آمة''، یعنی یہود ایک امت ہیں اور مسلمان ایک امت ہیں، یعنی عقیدہ، مذہب اور شعائر واقدار کے لحاظ سے امت۔

دوم ملک میں شرکت کا رباط: عبارت یہ ہے: "وأن يهود بني عوف أمة مع المؤمنين. لليهود دينهم. وللمسلمين دينهم" (بنی عوف کے یہود مسلمانوں کیساتھ ایک قوم ہیں، یہود کیلئے ان کا اپنا مذہب ہے اور مسلمان کیلئے ان کا اپنا مذہب)۔

پھر اس کے بعد یہود کے دوسرے قبائل، مثلاً بنو نجار وغیرہ کا ذکر کیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اور یہود ایک امت ہیں، لیکن ان دونوں کی وحدت ایک رباط کے ذریعہ ہی ممکن ہے، جو دونوں کو شامل ہو، اسی چیز کو ہمارے زمانہ میں رباط شہریت سے تعبیر کرتے ہیں، شیخ راشد غنوشی کہتے ہیں: نئی اصطلاح میں اس کو سیاسی یا شہری امت کہہ سکتے ہیں، یعنی ایک سیاسی نظام میں شریک ہیں جو ان کو اہل کتاب اور اہل ذمہ ہونے کے اعتبار سے برابر کے حقوق عطا کرتا ہے، یعنی ایسے شہری جس نے اسلامی حکومت کی جنسیت حاصل کی ہو (الاسلام والمواطنۃ، مؤلف: شیخ راشد غنوشی)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ملک میں رہنے والے غیر مسلموں کو شہریت کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے، اس بنیاد پر کہ وہ ملک کے حصہ دار ہیں، چنانچہ ان پر شہریت کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی ہوں گی اور اس کے حقوق بھی، اس سلسلے میں ان کی حالت مسلمانوں جیسی ہے، اس لئے مذکورہ دستاویز میں حقوق وفرائض کے سلسلہ میں مدینہ کی حفاظت کی بھی صراحت ہے۔

یہاں تک کہ جزیہ کا مسئلہ غیر مسلم کے لئے ضمانت کی طرح مالی واجبات میں سے ہے، جیسے اس مقصد کے لئے مسلمان زکوۃ دیتے ہیں، جب نام کے سلسلے میں مشکل پیش آئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونوں اصطلاح کو ایک کردیا اور بنی تغلب پر ان کے مطالبہ کے مطابق زکوۃ متعین فرمایا (الأموال لأبی عبید، نیز دیکھئے: فقہ الذکاۃ للشیخ القرضاوی) جبکہ زکاۃ کے مقابلہ میں جزیہ کی مقدار بہت کم ہے، موجودہ زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے ہمیں یہ راہ بتاتی ہے کہ ہم ٹیکس اور اس کے مصرف کے عملی کاز کو یکساں کرنے کی اہمیت کو اختیار کریں (تفصیل کے لئے دیکھئے: الأموال لأبی عبیدہ اور شیخ قرضاوی کی فقہ الذکاۃ)۔

اس کی مزید تفصیل دستاویز مدینہ کی دفعات میں آئے گی۔

اختصار کے ساتھ خلاصہ اور موازنہ:

سابقہ تفصیل کے مطابق یہ بات واضح ہوگئی کہ موجودہ سیاسی عرف میں شہریت کی اصطلاح یورپ میں پروان چڑھی ہے، دو اہم پہلوؤں کی تکمیل کیلئے، یہ دونوں پہلو اس طرح ہیں:

اول: شہریت کی یہ اصطلاح جس میں قومیت بھی شامل ہے، بلکہ اس کے لوازمات میں سے ہے دوسرے رابطہ کی جگہ پر آجائے خاص کر دین یا کلیسا کے رابطہ کی جگہ لے لے جس نے بہت سر اٹھایا اور مذہبی جنگوں کا سبب بنی، اسی طرح یہ قوانین، حقوق اور علوم وفنون کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی، اسی لئے یورپ نے اس رابطہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی اتنی قدردانی کی، تاکہ وہ دینی تقدس کی جگہ لے لے۔

دوم: ضروری فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ہر شہری کو انسانی، سیاسی، اقتصادی، سماجی، علمی اور ثقافتی حقوق فراہم کرنا، شہری ہونے کی بنیاد پر ہر ایک کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کرنا۔

ان دونوں امور کو اگر اسلامی شریعت اور اس کے عام اصول پر پرکھیں تو ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ دوسرا معاملہ قابل قبول، بلکہ اصولی اعتبار سے مطلوب ہے، کیونکہ اسلام عدل ومساوات کا مذہب ہے اور برابری کا حق دیتا ہے اور ہر ایک شہری کو چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم جو اس کی سرزمین میں رہتا ہے اس کو پورا حق دیتا ہے۔

اعتراض پہلے پہلو پر ہوتا ہے، وہ یہ کہ شہریت کو عقیدہ (اسلام) کے درجہ میں رکھا جائے، یہ شرعاً ناجائز ہے، کوئی بھی مسلمان اس کو قبول نہیں کرسکتا، کیونکہ کتاب وسنت کے دلائل اس کی حرمت وممانعت پر دال ہیں:

(ا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ورضيت لكم الاسلام دينا" (سورہ مائدۃ: ۳)۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ مکمل طور پر ہمارا حقیقی تعلق اسلام سے ہونا چاہئے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: "إنما المؤمنون اخوۃ" (سورہ حجرات:۱۰)۔

لہٰذا جو اخوت، اخوت کی تمام قسموں پر فوقیت رکھتی ہو وہ ایمانی اخوت ہے، جو ہمیں جوڑے ہوئے ہے، دسیوں قرآنی آیات اور احادیث نبویہ امت اسلامیہ کی وحدت، امت اسلامیہ کی جانب نسبت کرنے اور یہ کہ مسلمان ایک جسم کی طرح ہے، بلکہ ایک ہاتھ ہے پر توجہ مرکوز کراتی ہیں (ان احادیث کے لئے دیکھئے: ریاض الصالحین)۔

(۳) بہت سی آیات اور احادیث اس پر دال ہیں کہ ولاء صرف اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کیلئے ہے، مثال کے طور پر قرآن کی یہ آیت:

"قل ان كان أباؤ كم وأبناؤكم وإخوانكم وأزواجكم وعشيرتكم وأموال ن اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومساكن ترضونها أحب اليكم من الله ورسوله وجهاد فى سبيله. فتربصوا حتى يأتى الله بأمره والله لايهدى القوم الفاسقين" (التوبہ:۲۴)۔

واضح طور پر یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام، اللہ، اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے پہلے کسی قوم، خاندان، اعزہ واقارب، وطن اور مال سے تعلق رکھنا جائز نہیں ہے، اسی طرح اس کی تاکید اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

"لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الاخر يوادون من حاد ا لله ورسوله ولو كانوا أبائهم وأبناهم أو اخوانهم أو عشيرتهم اولئك كتب فى قلوبهم الايمان أيدهم بروح منه ويدخلهم جنات تجرى من تحتها الأنهر خلدين فيها رضى الله عنهم ورضوا عنه أولئك حزب الله ألا حزب الله هم المفلحون" (المجادلۃ:۲۲)۔

یہ مسئلہ تمام مسلمانوں کے درمیان متفق علیہ ہے کہ ولاء اور تعلق صرف اللہ، اس کے رسول، اسلام اور مسلمانوں کیلئے ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس ولاء کے علاوہ اور کوئی ولاء نہیں ہے، اور اس نسبت کے علاوہ اور کوئی نسبت نہیں ہے۔ قرآن کریم، سیرت نبوی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کرنے پر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اسلام ہر طرح کی ولاء اور نسبت کو قبول کرتا ہے اور بہت دقت اور حکمت کے ساتھ ان کا احاطہ کرتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ ولاء کی تمام قسمیں پہلے والے ولاء کے ضمن میں ہوں، یا اس سے تعارض نہ ہو، اسی طرح اسلام خود بھی شہریت، قرابت اور قومیت وغیرہ کے ذریعہ ایسی ولاء کو وجود میں لاتا ہے جو مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے درمیان جامع ہو، اس بنیاد پر شہریت اور اس طرح کے افکار کو قبول کرنا شریعت اسلامی کی روشنی میں جائز ہے، البتہ ایسا دو دائروں میں رہ کر ہوگا:

پہلا دائرہ جو مسلمانوں کیلئے خاص ہے: یہ ہے کہ مسلمان اپنی قوم، خاندان اور قبیلہ سے محبت ونصرت اور خدمت کا تعلق رکھے، بلکہ وہ ان کے حقوق دوسروں کے مقابلہ میں پہلے ادا کرے، اس بابت کوئی چیز مانع نہیں ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ اس کا بنیادی رشتہ اور تعلق اسلام اور مسلمانوں کیلئے ہو، اور یہ چیز عصبیت اور عنصریت تک نہ پہونچنے پائے، دوسرے کے حقوق پامال نہ ہوں، بلکہ یہ صرف نیکی اور تقوی کی بنیاد پر تعاون کے جذبہ سے ہو اور اس بنیاد پر کہ قرابت دار حسن سلوک کے زیادہ مستحق ہیں، جیسے قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ نیکی اور احسان میں الاقرب فالاقرب کو مقدم رکھنے پر دلالت کرتی ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو ان سے فرمایا: "خذها أى الصدقات من أغنياء هم وردوها على فقراء هم" (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۱۳۹۵، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۹، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۱۵۸۴)۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کسی خاص ملک کے غریب شہری وہاں کے اغنیاء کے صدقات کے زیادہ مستحق ہیں، لیکن یہ جائز نہیں کہ کسی خاص ملک یا قوم کے اغنیاء کسی دوسرے ملک یا قوم کے فقراء کا خیال نہ رکھیں، اس بات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ اسلام کے رحمت عامہ اور اخلاقیات کے خلاف ہے، مثلاً اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک مسلمان کہے کہ میں عربی مسلمان ہوں، میں قطری ہوں، میرا تعلق فلاں قبیلہ سے ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اس کا ولاء، اس کی نصرت اور محبت سب سے پہلے اللہ، اس کے رسول، اسلام اور مسلمانوں کیلئے ہو، اس کے بعد اسلام کے پاکیزہ اصول کے ضمن میں دوسرے فروعی تعلقات آئیں گے، اور یہ تعلق ظلم وزیادتی اور فخر وتکبر سے پاک ہو، یا اس سے کسی کی تحقیر شان مقصود نہ ہو۔

اس اصول کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان فروعی نسبتوں کی اجازت دیتے تھے، جبکہ یہ نسبتیں مہذب ومثقف ہوں اور ہر اس چیز سے پاک ہوں جنکی اسلام میں گنجائش نہیں۔

نسبت کے اجزاء ترکیبی:

اگرچہ ہم نے نسبت کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ ایک نظریہ ہے، یا شعور واحساس ہے، یا نفسانی ضرورت ہے، یا ایک رجحان ہے، لیکن کوئی بھی انسان اس سے خالی نہیں، بلکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی عقل مند انسان نسبت سے خالی ہو، آج کے عرف میں ملکی نسبت مندرجہ ذیل اجزاء سے مرکب ہوتا ہے: شخصیت، قومیت (یعنی جس قوم کی طرف منسوب ہو) ولاء، یہ تعلق کی اصل ہے، محبت، نرمی، ملک اور جمہوریت کے حاکم دستور وقوانین اور معیار کو لازم پکڑنا۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نسبت اپنے اجزاء کے ساتھ اگر وہ اسلامی نسبت کا بدل نہ ہو اور عقیدہ کی جگہ نہ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ یہ ممکن ہے کہ اس ملکی رابطہ کو ایک قومیت اور ایک زبان بولنے والے متحدہ شہریوں کے تعلقات کو بڑھانے کا ذریعہ بنالیا جائے اور حقوق وواجبات کی پابندی مزید بڑھ جائے، لسانی یکسانیت اور قرابت کے ذریعہ محبت وقربت میں مضبوطی آئے، اس طرح یہ نسبت ایجابی ہوگی نہ کہ سلبی، نفع بخش اور طاقتور ہوگی نہ کہ نقصان دہ اور تفریق پیدا کرنے والی۔

دوسرا دائرہ جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کو شامل ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام نے خود شہریت کا استعمال کیا ہے، تاکہ اس بڑے اسلامی ملک میں رہنے والے تمام شہریوں کے درمیان رابطہ کا کام کرے، جیسے گذشتہ صفحات میں مذکور دستاویز مدینہ کے ذیل میں بیان ہوا، اس بارے میں مزید ہم آئندہ بحث کریں گے۔

غیر مسلموں کو حکومت اور ملک سے جوڑنے کے لئے، اور ان کے ولاء اور نصرت کو مؤکد کرنے کے لئے مختلف اہم روابط کو مضبوط کرتا ہے، جس کا مقصد مسلمان اور غیر مسلم مثلاً اہل کتاب کے درمیان زندگی گزارنے کو یقینی بنانا ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد شہریت کے حقوق اور فرائض کی تکمیل بھی ہوتا ہے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام درج ذیل طریقہ سے مشارکت کی تاکید کرتا ہے:

۱) جامع انسانی اشتراک: اس دائرہ میں بہت سی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تمام انسان درج ذیل چیزوں میں مشترک ہیں:

الف: سارے انسان کی اصل ایک ہے، سب کے سب آدم اور حواء کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، قرآن کی ایک سے زائد آیت میں اس بات کی تاکید دراصل تمام انسانوں میں حقیقی مساوات کے اصول کو ذہن نشین کرانا ہے، پھر اس پر ترکیز کہ ہماری اصل مٹی اور زمین ہے، اس سے بھی وطن کی اہمیت ثابت ہوتی ہے، میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ حواء سے پہلے زمین ہماری ماں ہے اور یہی ہماری آغوش ہے، جس میں مرنے کے بعد ہمیں جانا ہے، یہ ہماری بوسیدہ ہڈیوں کی حفاظت کرے گی، یہاں تک کہ اسی سے ہم کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة أخرى'' (سورہ طہ: ۵۵)۔

ب۔ رحم انسانیت کا تعلق تمام انسانوں کو جوڑے ہوئے ہے، چنانچہ ایک باپ اور ایک ماں (آدم وحواء) کی اولاد ہونے کی بناء پر سب آپس میں بھائی بہن ہیں، اسلئے قرآن تمام انسانوں سے اس قرابت اور تعلق کی رعایت کرنے کا مطالبہ کرتا ہے: ''ياايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منها رجالا كثيرا ونساء واتقوا الله الذى تساءلون به والأرحام إن الله كان عليكم رقيبا'' (سورہ نساء: ۱)۔

یہاں اس رحم کی وضاحت رحم بشریت کے ذریعہ کی گئی ہے۔

ج۔ حضرت آدم علیہ السلام پوری انسانیت کے باپ (ابوالبشر) ہیں، وہ صرف مسلمانوں یا اہل کتاب کے باپ نہیں ہیں، تمام انسانوں کے اس باپ کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا اور پھر ان میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں سے ان کو سجدہ کروایا، ارشاد باری ہے:

''فاذا سويته ونفخت فيه من روحى فقعوا له ساجدين'' (سورہ حجر: ۲۹)۔

ان تین مفاہیم کی تاکید انسان کے بحیثیت انسان اس کی اہمیت اور اس کے بلند مرتبہ پر دلالت کرتی ہے۔

د۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے سرفراز فرمایا ہے، اللہ فرماتا ہے: ''ولقد كرمنا بنى آدم وحملنهم فى البر و البحر و رزقناهم من الطيبت وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا'' (سورہ اسراء: ۷۰)۔

یہ انسانی اشتراکات آپسی تعلقات ومحبت کو تقویت دیتے ہیں۔

۲) مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان جامع اشتراکات اس طور پر ہیں کہ اسلام نے ان سب کو ایک خصوصیت دی ہے، اہل کتاب کو اہل کتاب ہونے کے اعتبار سے اور مسلمانوں کو اہل ایمان ہونے کے اعتبار سے، اسی لئے ان کی پاکدامن عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے اور ان کے ذبیحہ کو جائز بتایا ہے، یہ وہ اشتراکات ہیں جو مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کو پہلے سے زیادہ مضبوط بناتے ہیں، اس لئے کہ کتابی کبھی ان کی بیوی کا باپ ہوسکتا ہے یا دادا، یا ماموں ہوسکتا ہے۔

۳) انسانی اشتراکات اس طور پر بھی ہیں کہ انسان کو اللہ نے پیدا کیا اور مدنی الطبع بنایا ہے، وہ سماج، مدنیت اور تمدن سے محبت رکھتا ہے، اسی لئے اللہ نے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جو بھی چاہے اس سے تعاون حاصل کرے، اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کرے، اس کے دین اور مذہب کو دیکھے بغیر، اللہ فرماتا ہے:

''وتعاونوا على البر و التقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب''(سورہ مائدہ:۲)۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے جس کے ساتھ تعاون کیا جائے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے، اصل ہے تعاون کا محل، اگر محل تعاون بہتر ہے تو تعاون ضروری ہے، اگر برا ہے تو تعاون حرام ہے۔

اسی طرح اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سب کے ساتھ بیٹھیں، ان سے گفتگو کریں، اگر بحث ومباحثہ ہو تو اچھے طریقے سے ہو، کیونکہ حقیقت کی تلاش میں سب برابر کے شریک ہیں، اللہ فرماتا ہے:

''وانا أو اياكم لعلى هدى أوفى ضلل مبين قل لاتسألون عما أجرمنا ولا نسأل عما تعملون''(سبا:۲۴-۲۵)۔

اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ اسی اسلوب میں غیر مسلموں، حتی کہ مشرکین وملحدین کو بھی مخاطب کریں۔

یہ تمام اشتراکات ایجابی تعلق اور عدل وانصاف کے ساتھ حقوق کی ادائیگی میں مدد کرتے ہیں۔

دار الاسلام اور دار الحرب (دار المواطنۃ):

فقہاء کے دور میں جو دار کی تین تقسیم: دار اسلام، دار حرب یا دار عہد مروج ہے، اس میں درحقیقت وطن اور شہریوں کی رعایت مقصود ہے، اسلئے کہ دار الاسلام میں رہنے والے تمام افراد چاہے وہ مسلمان ہوں یا ذمی، اس ملک کے شہری ہیں اور حکومت کے ذمہ ان کے شہری حقوق ہیں، اسی لئے ان افراد پر ملک کے تئیں کچھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ مسلمانوں اور ذمیوں کے درمیان ان کی حفاظت کے واجب ہونے اور دفاع کے سلسلہ میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ دار اسلام کے اندر ہوں یا قید میں ہوں، فقہاء کہتے ہیں کہ مملکت اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ مسلمان اور ذمی قیدیوں کو آزاد کرانے کی یکساں کوشش کرے، علامہ ابن حزم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ کوئی ذمی اگر ہمارے ملک میں ہے اور دشمن اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو اس سے جنگ کیلئے نکلنا فرض ہے، یہاں تک کہ ہم اس شخص کی حفاظت میں اپنی جان دے دیں، جو اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ میں ہے، اس لئے اس کو دشمن کے سپرد کرنا ذمہ کے عقد میں کوتاہی کرنا ہے (السلوک لمعرفۃ دول الملوک لابن الأزرق-ص:۸۰)۔

اور جہاں تک مستامن کا تعلق ہے جو تجارت یا دوسرے مقصد سے دار الاسلام میں داخل ہوا ہے اور اس نے حکومت یا شہریوں سے امان لے رکھا ہے، تو ایسا شخص شہری نہیں ہوگا لیکن اس کو بعض حقوق حاصل ہوں گے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام مسلمانوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک مؤثر، فعال اور صحیح عقیدہ رکھیں جو اسے ہر اس شخص کے ساتھ بھلائی واحسان کرنے پر آمادہ کرے جو احسان کے مستحق ہیں، اور یہ کہ اس کا عقیدہ اور اس کی شریعت اس پر لازم کرتی ہے کہ وہ اپنے دین، علاقے اور وطن کا دفاع کریں اور ہر اس شخص کا دفاع کریں جو دفاع کے مستحق ہیں حتی کہ حیوانات اور ماحول کا بھی۔

اسلامی نظریہ میں شہریت عقیدہ کے بعد وطن اور شہریوں سے محبت کا مطالبہ کرتا ہے، اور یہ کہ ملک کی خدمت اور اس کی عظمت وشان کیلئے پوری کوشش کرے، اور مثبت طور پر ہر اس سرگرمی میں حصہ لے جس سے ملک کی خدمت اور اس کی ترقی مقصود ہو، اور ہر طرح کے مطلوبہ وسائل سے وطن کا دفاع کرے (حوالہ سابق)۔

مدینہ کا دستاویز وہ پہلا دستور ہے جو شہریت کے حقوق عطا کرتا ہے:

پہلی اسلامی حکومت مدینہ منورہ میں تشکیل پائی تو یہ حکومت مسلمان اور مہاجرین وانصار کے درمیان بھائی چارہ (مواخات) کی بنیاد پر قائم ہوئی، اور اس بنیاد پر کہ دوسروں کے مقابلہ وہ سب ایک امت ہیں، اور ان کی مثال ایک جسم کی سی ہے، اور یہ کہ دشمن کے مقابلہ میں وہ سب متحد ہیں اور اس کی بنیاد غیر مسلموں (یعنی یہود، اہل کتاب اور مشرکین جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے) کے ساتھ عدل وانصاف، شہریت اور برابر کے حقوق وواجبات پر تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وثیقہ لکھا جس کے اکثر دفعات یہودیوں اور دوسرے مشرکین کے حقوق سے متعلق تھے، یہ دستاویز تقریباً ۴۷ دفعات پر مشتمل تھا، ان میں سے چند اس طرح ہیں:

(۱) اللہ کا ذمہ ایک ہے، ایک ادنیٰ شخص کو بھی اس پر مجبور کیا جائے گا، اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ذمہ دار ہیں۔

(۲) جو یہودی ہمارے ماتحت ہیں ان کی مدد کرنا، ان پر ظلم نہ کرنا اور ان کے خلاف کسی کا ساتھ نہ دینا ہماری ذمہ داری ہے۔

(۳) مسلمانوں کی امن وسلامتی ایک ہے، چنانچہ جہاد فی سبیل اللہ میں ایک مسلمان کو چھوڑ کر دوسرے مسلمان سے مصالحت نہیں کی جائے گی، مگر عدل وانصاف اور برابری کے ساتھ۔

(۴) جو حملہ آور ہوگا ہم اسے سزا دیں گے۔

(۵) تمہارے درمیان آپس میں چاہے جتنا بھی اختلاف ہو ان سب کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے گا۔

(۶) جب تک حالت جنگ میں رہیں مسلمان کے ساتھ یہود بھی خرچ کریں گے۔

(۷) یہودیوں پر یہودیوں کا نفقہ ہے اور مسلمانوں پر مسلمانوں کا نفقہ ہے، اور اس معاہدہ میں شامل افراد میں جو بھی جنگ کرے گا ان کے دشمن کے خلاف مدد کرنا ہر ایک پر ضروری ہے اور ان کے درمیان خیر خواہی، نصیحت اور نیکی کا معاملہ ہوگا۔

(۸) کوئی شخص اپنے حلیف کی وجہ سے مجرم نہیں ہوگا اور مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

(۹) گھر والوں کی اجازت کے بغیر کسی حرمت کو پامال نہیں کیا جائے گا۔

(۱۰) اس صلح نامہ والوں کے درمیان جو بھی جھگڑا یا اختلاف تھا جس سے فساد کا اندیشہ ہے اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹایا جائے، اس وثیقہ میں جو اچھی اور بہتر بات ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے۔

(۱۱) یثرب پر حملہ کی صورت میں سب ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

(۱۲) جب مصالحت کے لئے بلایا جائے تو وہ مصالحت کریں گے۔

(۱۳) ہر شخص کو پہلے والوں کے اعتبار سے اس کا اپنا حصہ ملے گا۔

(۱۴) اہل وثیقہ میں سے اوس کے یہود، ان کے غلام اور وہ خود بھی اسی حکم پر ہوں گے جو وثیقہ میں مذکور ہے، بھلائی کے ساتھ جو بھی کوئی گناہ کرے گا وہ اپنے اوپر کرے گا، اللہ اس وثیقہ کی سچی اور نیک باتوں کے ساتھ ہے۔

(۱۵) ظالم اور مجرم کے علاوہ کوئی اس وثیقہ کو نہیں بدل سکتا، جو نکل گیا وہ مامون ہے اور جو مدینہ میں بیٹھا رہا وہ بھی مامون ہے، سوائے ان کے جو ظلم کرے، اللہ نیکی کرنے والے اور متقیوں کے ساتھ ہے (مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ ص ۴۱-۴۷)۔

اسی طرح اس وثیقہ میں مذہبی آزادی کی بات پوری وضاحت سے کہہ دی گئی ہے کہ مسلمانوں کیلئے ان کا مذہب، یہود کیلئے ان کا مذہب، یہاں تک کہ بعض انصار صحابہ نے اپنے خاندان کے بعض لوگوں کو جو یہود بن گئے تھے اسلام کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا تو یہ آیت نازل ہوئی: "لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" (سورہ بقرۃ:۲۵۶) اس دستاویز کے ایک دفعہ میں اس کی صراحت ہے کہ یہود کیلئے ان کا مذہب ہے اور مسلمانوں کیلئے ان کا مذہب، ان کے غلام اور وہ دونوں برابر ہیں، ہاں جو ظلم وزیادتی کرے گا وہ اپنے خلاف کرے گا، اس طرح اس وثیقہ میں شخصی اور انفرادی ذمہ داری کی تاکید کی گئی ہے، اس

آیت کی وجہ سے ''ولا تزر وازرۃ وزر أخری'' (سورہ انعام: ۱۶۴)۔

لیکن یہود نے اس دستاویز اور اس کے مشمولات کی پابندی نہیں کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئے گئے عہد کو توڑ دیا تو ان کے ساتھ وہ معاملہ ہوا جو ان کے ظلم اور بدعہدی پر ہونا چاہئے۔

دستاویز میں مرقوم دفعات کا خلاصہ:

دستاویز کے دفعات میں سے ہم نے بہت سے عمومی احکام اور اصول کو چھانٹا ہے، ان میں سے چند اہم کا ذکر کر رہے ہیں:

الف۔ مدینہ میں شہریت کی بنیاد پر اہل کتاب کے حقوق کا اعتراف، اسلئے کہ شہریت، سیاست اور ملک کے دفاع ونصرت کے معاملہ انہیں مسلمانوں کے ساتھ ایک امت بنا دیا گیا ہے۔

ب۔ مختلف ادیان، مثلاً مشرک، یہود ونصاریٰ سب کو تسلیم کیا جائے گا۔

ج۔ عقیدہ کے سلسلے میں دو مختلف قوموں مثلاً مسلمان اور یہود شہریت کی بنیاد پر باہم ایک دوسرے کی مدد کی پابندی، اور اس ملک کے تئیں حقوق وواجبات میں شرکت کا التزام۔

یہ پابندی ملک کی طرف سے ہے، نہ کہ دین کی طرف سے، اسلئے کہ ہر ایک کا مذہب دوسرے سے جدا ہے، یہاں شہریت کا مفہوم، اور اس کے حقوق وفرائض پوری وضاحت کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہیں، اسی بنیاد پر آج غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا معاملہ شہریت کی بنیاد پر ہونا چاہیے، کیونکہ ان کے لئے ان کا مذہب ہوگا اور ہمارے لئے ہمارا مذہب۔

د۔ پناہ اور امان دینے کے سلسلے میں حقوق وواجبات میں برابری، البتہ محارب مشرکین اس سے الگ ہوں گے۔

ھ۔ تمام لوگوں کے لئے دینی آزادی۔

و۔ حقوق کی حفاظت اور کسی کے لئے اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں۔

ز۔ ذمہ داری انفرادی ہوگی، لیکن دستاویز میں دئے گئے حقوق کی حفاظت سب کی ذمہ داری ہوگی، اور ان حقوق کی پامالی سے ہر ایک کو روکا جائے گا، قریش کے دشمن کی پشت پناہی سے بھی روکا جائے گا، اور اس بارے میں اجتماعی ذمہ داری کی رعایت کی جائے گی۔

ح۔ وطن کی تحدید، جیسے دستاویز مدینہ میں یثرب کی تحدید ہے۔

ط۔ حقوق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہیں، اس لئے کسی کو اس کی بے حرمتی کی اجازت نہیں ہوگی، یہ صرف اسلامی حقوق کی خصوصیت ہے، اسی لئے مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کی پامالی کریں، گرچہ وہ ان حقوق کا پابند نہ ہو۔

ی۔ اسلام میں حقوق ذمہ داریوں کے مقابلہ میں ہیں، ان میں بعض حقوق مقدس ہیں، ان کا دفاع کرنا لازم ہے، مثلاً دستاویز ظلم وزیادتی، فساد کے خلاف تعاون اور کمزوروں کی پشت پناہی پر زور دیتا ہے۔

حق وعدالت پر مبنی حکومت کی خشت اول:

اس طرح اسلام نے حق وعدل پر مبنی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس میں کسی پر ظلم وزیادتی کی قطعاً اجازت نہیں ہے، وہ ایک ایسی حکومت تھی جس میں حقوق وواجبات کے قوانین واضح تھے، لیکن قبائل اور خصوصاً قریش اور اہل ادیان باطلہ نے اسے پسند نہیں کیا، بلکہ ظلم وزیادتی کے تمام تر وسائل کو اختیار کرتے ہوئے اس کے مقابلہ کیلئے میدان میں آگئے اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی، اس وجہ سے اسلامی حکومت اور ان لوگوں کے تعلقات میں محبت والفت کے بجائے عداوت ونفرت تھی، ان سب کے باوجود اسلام نے اپنے متبعین کو عدل وانصاف کا درس دیا، چنانچہ اسلامی حکومت کا اپنی جانب سے دفاع کرنا ایک فطری بات تھی اور اس نے ایسا کیا، اس کا دفاعی پہلو جہاد سے متعلق نازل ہونے والی پہلی آیت میں ہم محسوس کرتے ہیں:

''أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وإن الله على نصرهم لقدير'' (سورہ حج: ۳۹)۔

پھر دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ جہاد وقتال کے وجوبات یہ تھے کہ مسلمانوں پر ظلم کیا گیا اور وہ اپنے گھروں سے نکالے گئے، چنانچہ اس کے فوراً بعد مسلمان اپنی مدافعت، ظلم وستم کو ختم کرنے، اور اپنے عقیدے وعبادت کی جگہوں، یہاں تک کہ غیر مسلم کے مقامات عبادت کا دفاع کرنے لگے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق إلا أن يقولوا ربنا الله ولولادفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيهااسم الله كثيرا و لينصر الله من ينصره إن الله لقوي عزيز'' (سورہ حج:۴۰)۔

اس وجہ سے اسلام کی نظر میں جنگ ایک ضرورت ہے، جس کی اجازت مجبوری اور اضطراری حالت کی صورت میں اس وقت دی جاتی ہے جب قبول اسلام اور دعوت وتبلیغ کی راہیں مسدود ہو جائیں، یا پھر جزیہ کی ادائیگی کے ذریعہ اسلامی حکومت کو قبول کر لیا جائے، جزیہ غیر مسلموں سے امن اور شہریت کی ذمہ داری کے طور پر لیا جاتا ہے، جیسے مسلمان اپنے زکوۃ وصدقات کے ذریعہ اس سے کہیں زیادہ ادا کرتے ہیں، لہذا مسلمان اپنے مدمقابل سے جنگ کرنے میں پہل نہیں کرتے ہیں، پہلے انہیں دعوت دیتے ہیں اگر وہ قبول کر لیں تو ٹھیک، ورنہ ان پر جزیہ کی ادائیگی لازم ہوتی ہے، یعنی مسالمت اور صلح۔

جنگ کا یہ اسلامی پہلو صلح حدیبیہ میں مکمل طور پر نمایاں نظر آتا ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شرائط کو قبول فرمایا جن میں بے جا طرفداری اور ظلم وستم تھا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''و الله لاتدعوني قريش إلى خطة يسألوني فيهاصلة الرحم إلا اعطيتهم إياها'' (صحيح البخاري مع الفتح ج۵، ص:۳۲۹)۔ اللہ کی قسم! قریش جو بھی تجویز پیش کریں گے اور اس میں صلہ رحمی ہو تو اسے بخوشی قبول کرونگا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو فتح مبین سے تعبیر فرمایا اور اس سلسلہ میں سورہ فتح نامی سورت نازل ہوئی۔

قرآن کریم نے بہت سی آیات میں اس منہج وطریقے کی وضاحت کی ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله'' (سورہ انفال:۶۱)۔

فقہی اعتبار سے دیکھیں تو فقہائے احناف وشوافع، حنابلہ اور مالکیہ (مجمع الانہر ۱/ص:۶۳۵، الشرح الکبیر مع الدسوقی ج ۲، ص:۱۷۶، روضۃ الطالبین ج ۱۰، ص:۲۳۹، المغنی مع الشرح الکبیر ج ۱۰، ص:۳۷۹) ایک قول کے مطابق اس کے قائل ہیں کہ جنگ کی ابتداء سے قبل دعوت دینا واجب ہے، ان حضرات کا مستدل قرآن کی آیت: ''وماكنا معذبين حتى نبعث رسولا'' (سورہ اسراء:۱۵) ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اس بارے صحابہ کرام کے لئے آپ کی وصیت یہ تھی: ''...وإذا لقيت عدولك من المشركين فادعهم إلى احدى ثلاث أو خلال فايهن أجابولك إليهافاقبل منهم وكف عنهم ثم ادعهم إلى الإسلام'' (صحيح مسلم، كتاب الجهاد، ج۲، ص:۱۳۵۷)۔ (جب تم کسی دشمن سے ملو تو انہیں تین چیزوں میں سے کسی ایک کی دعوت دو، وہ جسکو بھی قبول کر لیں تم ان سے راضی ہو جاؤ، ان سے اپنے ہاتھوں کو روک لو، پھر انہیں اسلام کی دعوت دو)۔

ترجمان قرآن اور حبر الامۃ حضرت ابن عباسؓ نے اس حکم کو حصر کے ساتھ بیان فرمایا ہے، آپ نے فرمایا: ''ما قاتل رسول الله ﷺ قوما قط حتى يدعوهم إلى الاسلام'' (مسند احمد ج۱، ص:۲۳۱، السنن الکبری، ج۹، ص:۱۰۷)۔

جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی مصطلق پر حملہ کرنے کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مدینہ پر حملہ کی تیاری کرنے کے لئے آپ سے قتال شروع کر دیا (دیکھئے: صحیح مسلم کتاب الجہاد، ج ۳، ص:۱۳۵۶، سیرت ابن ہشام ۲۲۸/۳) اور اس طرح ان تک دعوت بھی پہونچ گئی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہود ونصاری کی کچھ مثالیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں اور قوم یہود کے مابین تعلقات کا ایک دستاویز تیار کروایا تھا جو صلح کی تمام کیفیات اور شہریت کے تمام جائز حقوق کی بہترین مثال ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں اور یہود ونصاری کے درمیان بعض معاملات اور معاہدے تحریر فرمائے تھے، جن میں چند اس طرح ہیں:

۹ھ میں غزوہ تبوک سے لوٹنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے نصاری سے معاہدہ فرمایا، جو عدل وانصاف، عالی ظرفی، رواداری اور شخصی آزادی کی بہترین مثال ہے، اس معاہدہ میں انہیں دینی آزادی، ان کی حفاظت ونگرانی، اور نصرت کی بات کہی گئی ہے، اور ان پر معمولی جزیہ جو متعین تھا لازم کیا گیا، معاہدہ کی عبارت یوں تھی: ''...ولنجران وحاشيهم جوار الله... ومن سأل منهم حقا فبينهم النصف غير ظالمين ولا مظلومين ...ولايوخذ أحد منهم بظلم آخر وعلى ما فيه هذه الصحيفة جوار الله وذمة النبي ﷺ أبدا حتى يأتي الله بأمره إن

نصحوا و أصلحوا علیهم'' (الطبقات الکبری لابن سعد ج۲، ص:۳۶، فتوح البلدان للبلاذری، ج۱، ص:۷۶، تاریخ الیعقوبی ج۲، ص:۷۱)۔ (نجران اور اس کے گردو پیش کے لوگوں کے لئے اللہ کی پناہ ہے، ان میں سے جو کوئی اپنا حق طلب کرے تو اس کو اس کا نصف بغیر کسی ظلم و جبر کے دیا جائیگا، نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کی طرف سے ظلم برداشت کیا جائے گا، اور نہ ان میں کسی ایک کے ظلم کے بدلہ دوسرے سے مواخذہ کیا جائیگا، اس صحیفہ میں جو کچھ مذکور ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ضامن ہیں، یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے) (الطبقات الکبری ج۲، ص:۳۶، تاریخ الیعقوبی، ج۲، ص:۱۷)۔

اسی طرح رسول ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ بھی معاہدہ کیا، حالانکہ مدینہ میں کچھ یہودیوں کی طرف سے احزاب کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف بھی پہونچی تھی، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب کے شمال میں بعض یہودی کمیونیٹیوں کے خلاف لشکر بھی روانہ فرمائے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جنبۃ جو خلیج عقبہ میں ایلۃ سے قریب مقنعہ مقام پر آباد تھا اس کو معاہدہ نامہ لکھ کر بھیجا اس میں مذکور ہے:

امابعد! میرے پاس تمہارے کچھ نمائندے تمہاری غلطیوں کا عذر لے کر آئے، تو جب تم تک میرا یہ عہد نامہ پہنچ جائے تو تم سب کو امان ہے، اللہ اور اس کے رسول کی ضمانت ہے تم سب پر، اللہ کا رسول تم سب کی غلطیوں کی مغفرت کیلئے دعاء گو ہے، تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور نہ کوئی زیادتی ہوگی، رسول اللہ تمہاری ان چیزوں میں ضامن ہیں جن میں وہ خود باز رہے ہیں، کھجور کی پیداوار میں سے تمہارا چوتھائی حصہ ہوگا، اگر تم سنتے رہو اور اطاعت کرتے رہو، رسول اللہ ﷺ تمہارے معزز فرد کا خیال رکھنے والے ہیں اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمادیں گے، تمہارا رہبر تمہاری قوم کا کوئی فرد ہوگا یا پھر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے بھیجا گیا فرد تمہارا رہبر ہوگا (طبقات ابن سعد ج۱ ص ۲۸)۔

اسی طرح کا معاملہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عادی، اہل حرباء اور آذرح کے یہودیوں کے ساتھ بھی کیا۔

اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودی قبائل کو اسلامی حکومت کے شہریوں کی جماعت میں مدغم کرنے میں کامیابی ملی، وہ اسلامی ریاست کی جانب سے متعین کردہ ٹیکس نقد یا عین کی شکل میں ادا کرتے، اس کی طاقت اور وہاں کے بادشاہ کی حفاظت کرتے، اور وہاں کے عدل وانصاف کا بھر پور فائدہ اٹھاتے، ایسے بہت سے تاریخی حقائق ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خیبر کے بعد بھی یہودیوں سے معاملہ فرمایا، آپ نے اپنے گورنر معاذ بن جبل ؓ کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ یہودیوں کو ان کے مذہب سے نہ پھیریں، اسی طرح بحرین کے یہودیوں کے ساتھ بھی معاملہ کیا گیا، انہیں صرف ٹیکس اداء کرنا پڑتا تھا اور وہ ہمیشہ اپنے اجداد کے مذہب پر قائم رہے (مقالہ دکتور عماد الدین خلیل، بعنوان: المسلم والآخر رویۃ تاریخیۃ)۔

صحیح بات یہ ہے کہ اسلام کا مزاج ہمیشہ دوسروں کو قبول کرنے اور ان کی حفاظت کی کوشش کا رہا ہے، ٹیکس کی حقیقت ہی یہی ہے کہ دوسروں کو قبول کرلیا گیا ہے اور اس کی حق شہریت تسلیم کرلی گئی ہے اور ان کو امن وامان کے بدلہ میں اپنی طرف سے یہ مالی حقوق ادا کرنے پڑتے ہیں، سرٹامس آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب 'دعوت اسلام' (Preaching Of Islam) میں لکھا ہے کہ جب اہل حیرہ نے ٹیکس پیش کیا تو انہوں نے اس ٹیکس کی ادائیگی کے وقت صراحت کے ساتھ یہ شرط رکھی کہ ان کی اور ان کے امراء کی ہر طرح کی زیادتی سے حفاظت کی جائے گی، خواہ یہ زیادتی مسلمانوں کی طرف سے ہو یا کسی اور کی طرف سے، اسی طرح حضرت خالد بن ولید نے بھی حیرہ کے پڑوسی علاقہ والوں سے ہوئے ایک معاہدہ میں لکھا تھا کہ اگر ہم تمہاری حفاظت کرینگے تو ہمارے لئے جزیہ جائز ہوگا، ورنہ نہیں، مسلمانوں نے اس کا ہمیشہ خیال رکھا ہے اور جہاں ان سے یہ نہ ہوسکا انہوں نے جزیہ بھی ترک کردیا۔

اس شرط پر مسلمانوں کا عمل کرنا صراحت ووضاحت کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوا جب حضرت عمر ؓ کے زمانہ خلافت میں یہ واقعہ پیش آیا، ہرقل نے ایک بڑی فوج جمع کی، تاکہ مسلمانوں کی طاقت روک سکیں اور ادھر مسلمان بھی اس معرکہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے پورے طور پر سرگرم تھے، جب اس کا علم حضرت ابوعبیدہ ؓ کو ہوا تو انہوں نے شام کے مفتوح شہروں کے گورنروں کو لکھا کہ وہ ان شہروں سے حاصل ہونے والے جزیہ کو انہیں لوٹادیں اور لوگوں کو بتادیں کہ ہم نے تم کو تمہارا مال واپس کردیا ہے، اس لئے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ دشمنوں نے ایک بڑا لشکر جمع کیا ہے اور تمہاری یہ شرط تھی کہ ہم تمہارا تحفظ کریں گے، لیکن اس وقت ہم اس پر قادر نہیں ہیں، اس لئے ہم نے تم سے وصول کردہ ٹیکس تم کو واپس کردیا، اگر اللہ نے ان دشمنوں پر ہمیں غلبہ عطا کیا تو ہم نئے سرے سے اپنے معاہدہ اور شرط پر عمل کریں گے۔

اس طرح ملک کی ایک بڑی دولت لوگوں کو واپس کردی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے مسلم بادشاہوں کے حق میں دعائیں کیں کہ اللہ تعالی آپ کو

ہم پر دوبارہ سردار مقرر کرے اور آپ کے دشمنوں کو شکست عطا فرمائے، اگر آپ لوگوں کی جگہ رومی ہمارے حاکم ہوتے تو وہ ہمیں کچھ بھی واپس نہیں کرتے، بلکہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ بھی لے لیتے۔

اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق:۔

ہم نے جس منہج کو اختیار کیا ہے وہ ''فقہ المیز ان'' کہلاتا ہے، جنگ کی حالت میں غیر مسلموں کے حقوق حالت امن کے حقوق سے مختلف ہوتے ہیں، اس تناظر میں ہم کہتے ہیں:

اول: اس زمانہ میں جو غیر مسلم طویل عرصہ سے مسلم ملکوں میں رہتے ہیں وہ اس ملک کے شہری ہوں گے، اور انہیں شہریوں کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے، اسی کے ساتھ ان پر کچھ ذمہ داریاں بھی ہوں گی، اور ان حقوق وواجبات سے صرف وہی چیز مستثنی ہوگی جس کا استثناء صریح اور قطعی الدلالۃ نص کرتی ہو، یا جو اقلیت واکثریت کے مذہب کی بنیاد پر کسی خاص حقوق کا استثناء ہوگا۔

یہ استثناء معقول ہے، جدید نظام میں بھی بعض افراد اس شرط کے قائل ہیں اور یورپ اور مغرب میں تو اکثر افراد اس کے قائل ہیں کہ ملک کا صدر یا سربراہ وہاں کی اکثریت کے مذہب کا ہو، یعنی مثلاً عیسائی ہو، لہذا یہ شرط لگانا کہ صدر اکثریت کے مذہب کا ہو معقول بھی ہے اور مروج بھی، جو ممالک جمہوریت کے علمبردار ہیں وہاں بھی یہ بات رائج ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے حقوق وواجبات میں مساوات کا مسئلہ متاثر نہیں ہوتا ہے، اور نہ ہی شہریت کے حقوق میں کوئی بنیادی فرق آتا ہے۔ اس کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ وثیقہ یا صحیفہ یا جنہیں ملک کا دستور کہا جاتا ہے، وہ شہریت، دینی آزادی اور تحالف کا حق دیتا ہے، البتہ یہ تحالف دشمنوں سے نہیں ہوگا (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۴، ص: ۹۹، عارضۃ الاحوذی، ج ۲، ص: ۸۶، مزید دیکھئے: احکام الذمیین والمستامنین فی دار الاسلام، ص: ۶۳، مقالہ ڈاکٹر جعفر عبد السلام: علاقۃ الدول الاسلامیۃ بالدولۃ الاخری) گذشتہ صفحات میں یہ بات آچکی ہے۔

۲۔ اہل ذمہ کے حق میں یہ عام قاعدہ ہے کہ جو حقوق ہمارے لئے ہیں وہ ان کے لئے بھی ہوں گے اور جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں وہ ان پر بھی عائد ہوں گی، حضرت علیؓ کا قول ہے: اگر وہ جزیہ قبول کر لیتے ہیں تو ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے، اور ان کا خون ہمارے خون کی طرح محترم ہوگا (بدائع الصنائع ج ۶، ص: ۱۱۱، القوانین الفقہیۃ، ص: ۱۰۵، الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص: ۲۴۷)۔

غیر مسلموں کے حقوق اور تحفظ پر بے شمار نصوص ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۳۔ اسلام نے اہل ذمہ پر جو جزیہ اور خراج لازم کیا وہ دراصل شہریت کے حقوق میں سے ہی ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ لفظ ''اہل ذمہ'' کا مطلب اللہ اور رسول کا ذمہ ہے۔

دوم: قدیم وجدید تمام علماء نے ان حقوق کی تفصیل بیان کی ہے، معتبر مذاہب کی کتب فقہ میں تفصیلات موجود ہیں، اس موضوع پر براہ راست قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلی بحث لکھنے والے معاصر علماء میں پروفیسر ڈاکٹر عبد الکریم زیدان، علامہ شیخ یوسف القرضاوی (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص: ۹) قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے کتاب وسنت کی بہت سی نصوص پر اعتماد کیا ہے، ان کو مختصراً بیان کرتے ہیں:

۱۔ خارجی ظلم وستم سے ان کو بچانا، انکا دفاع کرنا اور انکے قیدیوں کو رہا کرنا حکومت پر واجب ہے، بلکہ جو ان سے جنگ کرے ان سے قتال پر اجماع نقل کیا گیا ہے، اگرچہ کسی شہر میں وہ علاحدہ رہتے ہوں (مطالب اولی النہی، ج ۲، ص: ۲۰۳)۔

علامہ قرافی لکھتے ہیں: ذمیوں کا معاہدہ انکے حقوق کو ہم پر واجب کرتا ہے، کیونکہ وہ ہمارے پڑوسی ہیں، ہماری نگرانی میں ہیں، اللہ تعالی، اس کے رسول اور دین اسلام کے ذمہ میں ہیں، لہذا اگر کوئی ان پر زیادتی کرے، خواہ برے الفاظ کے ذریعہ ہو، یا ان کے عزت پر حملہ کیا جائے، یا کسی طرح کی کوئی تکلیف پہونچائی جائے، یا ایسا کرنے والوں کی کوئی مدد کرے، تو اس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین کے ذمہ کو ضائع کیا۔

اسی طرح علامہ ابن حزم ''مراتب الاجماع'' میں تحریر کرتے ہیں: اگر حربی ہمارے شہر میں گھس آئے اور ان ذمیوں کو پکڑنا چاہے تو ہمارے اوپر واجب ہے کہ ہم ان اہل ذمہ کی جانب سے پورے اسلحہ کے ساتھ نکلیں اور ان سے قتال کریں، خواہ ان کے حفاظت میں اپنی جان دینی پڑے، کیونکہ یہ ایسے لوگوں کی

حفاظت ہوگی جو اللہ اور رسول اللہ کے ذمہ میں ہیں (الفروق ج ۳، ص: ۱۴)۔

تاریخ میں ایسا بارہا ہوا ہے کہ اسلامی حکومت نے مسلمان قیدیوں کی رہائی کو اس وقت قبول کیا جب اہل ذمہ قیدیوں کی بھی رہائی ہوئی (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص: ۹)۔

۲۔ چھ ضروریات اور حاجیات کا تحفظ:

اس بارے میں ان کی حالت مسلمانوں کی طرح ہے، اس طور پر کہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے، فقہاء نے اسکی علت یہ بتائی ہے کہ وہ معاہدہ کی وجہ سے دار الاسلام کے شہری ہو گئے، اس لئے ان کی جانوں و مالوں اور عزتوں کی مکمل طور پر حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، چنانچہ اسلامی حکومت پر ان چیزوں کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے جنہیں وہ مال شمار کرتے ہیں، مثلاً ان کی شرابیں، خنزیر، جبکہ یہ چیزیں اگر کسی مسلمان کے پاس ہوں تو اس کو ضائع کرنا واجب ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان اہل ذمہ کے خمر، خنزیر کو ہلاک کردے تو فقہائے احناف کے نزدیک اس پر اس کی ضمان واجب ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع الصنائع ج ۵، ص: ۱۴۳، جواہر الاکلیل ج ۱، ص: ۲۰۷، حاشیۃ الجمل ج ۳، ص: ۴۸۱، الاحکام السلطانیہ ص: ۱۴۵، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلی، ص: ۱۴۳، المغنی ج ۵، ص: ۲۲۳)۔

لہذا اسلامی حکومت پر انکی دینی آزادی، ان کے اموال اور ان کی عزتوں کی حفاظت کرنا واجب ہے، اس سلسلہ میں ان کا حکم مسلمانوں کی طرح ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة، وأن ريحها توجد من مسيرة أربعين عاما'' (صحيح البخاري، كتاب الجزيه مع فتح الباري ٦، ص: ٢٦٩، مسند احمد ٥، ٢٧٧)۔ جس نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائیگا، گرچہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آتی ہے۔

اسی بنیاد پر فقہاء کی جماعت جن میں فقہائے حنفیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ مسلمان ذمی کے قتل کے بدلہ قتل کیا جائیگا، یہی رائے شعبی، نخعی، ابن ابی لیلی، عثمان البتی کی ہے، اور یہ اصلاً حضرت علی بن ابی طالب اور عمر بن عبد العزیز سے مروی ہے، خلافت عباسیہ اور دولت عثمانیہ میں عموماً اسی رائے پر عمل ہوتا رہا ہے، فقہائے مالکیہ فرماتے ہیں کہ دھوکہ سے قتل کی صورت میں ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کیا جائیگا (دیکھئے: حاشیہ ابن عابدین ۳/ ۳۴۹، بدائع الصنائع ۷/ ۲۳۶، المہذب ۲/ ۱۸۵، الخرشی ۸/ ۳، المغنی ۷/ ۶۵۲)۔

۳۔ ان کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرنا، اور ہر طرح کے ظلم سے انہیں بچانا، ان باتوں پر تمام نصوص عمومی طور پر دلالت کرتے ہیں جن میں عدل کی بنیاد پر فیصلہ اور معاملہ کرنے کو ضروری کہا گیا ہے، اور جو نصوص ظلم کے حرام ہونے سے متعلق ہیں، ان کے علاوہ اہل ذمہ سے متعلق خاص نصوص بھی ہیں، انہی نصوص میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''ألا من ظلم معاهدا أو انتقصه حقه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئا بغير طيب نفسه فأنا حجيجه يوم القيامة'' (سنن ابی داؤد، ج ۳، ص: ۴۳۷، عراقی کہتے ہیں: اس کی سند جید ہے، جیسے تنزیہ الشریعہ میں ہے، دیکھئے: ج ۲، ص: ۱۸۲، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۵، ص: ۲۰۵)۔ (جو کوئی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حق کو مارے گا یا اسکی استطاعت سے زیادہ کام کا اس کو مکلف بنائے گا یا اس کی خوش دلی کے بغیر کوئی اس کا سامان لے گا، میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا)۔

اس وجہ سے خلفاء راشدین اور ان کے بعد کے خلفاء نے اہل ذمہ سے ظلم کو دور کرنے پر پوری توجہ دی، حضرت عمر تو مختلف شہروں سے آنے والوں سے اہل ذمہ کے بارے دریافت کرتے رہتے، عموماً ان کا جواب ہوتا کہ ہم ان کے بارے میں وفا ہی جانتے ہیں (تاریخ الطبری، ج ۴، ص: ۲۱۸)۔

امام بخاری حضرت جویریہ بن قدامہ تمیمی کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر سے سنا، ہم نے کہا اے امیر المومنین: ہمیں وصیت کیجئے، آپ نے فرمایا: ''أوصيكم بذمة الله فإنه ذمة نبيكم'' (صحيح البخاري مع الفتح ۶، ص: ۲۶۷) اور عمرو بن میمون کی روایت کے الفاظ ہیں: ''وأوصيه بذمة الله وذمة رسوله، أن يوفى لهم بعهدهم وأن يقاتل من ورائهم وأن لا يكلفوا إلا طاقتهم'' (فتح الباري ۶، ص: ۲۶۷)۔

۴۔ فقر وفاقہ، عاجزی و پریشانی اور بڑھاپے کی حالت میں ان کے لئے تکافل اجتماعی کا انتظام کرنا، لہذا جب غیر مسلم شہری تنگدست، عاجز اور بالکل بوڑھا ہو جائے تو اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کو ذلیل ورسوا ہونے کے لئے نہ چھوڑے، بلکہ ان کے ساتھ انصاف کرے اور ان کی حفاظت کرے اور اس کے

اچھی زندگی کیلئے انتظام کرے، یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے، بلکہ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی ایسا تھا، حضرت خالد بن ولید نے عراق میں مقیم حیرہ والوں کے نام ایک خط لکھا جو نصاری تھے، اس میں لکھا تھا: جو سن رسیدہ کام کرنے سے عاجز ہو جائے، یا انہیں کوئی مصیبت آ جائے، یا وہ مالدار تھا، لیکن اتنا ضرورت مند ہو گیا کہ ان کے مذہب کے لوگ ان پر صدقہ کریں ایسے لوگوں کے بارے میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ اس کا جزیہ معاف کر دیا جائیگا، اور جب تک وہ شخص دار الاسلام اور دار الهجرۃ میں رہے، اس وقت تک مسلمانوں کے بیت المال سے اسکی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت کی جائے گی (الخراج لابی یوسف، ص: ۲۹۰)۔

حضرت امام ابو یوسف اور دیگر حضرات سے روایت ہے کہ حضرت عمر کسی قوم کے دروازہ کے پاس سے گذر رہے تھے، وہاں ایک شخص لوگوں سے مانگ رہا تھا، وہ بہت بوڑھا تھا، نگاہ کمزور ہو چکی تھی، آپ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور پوچھا تم کون سے کتابی ہو؟ اس نے جواب دیا: یہودی، آپ نے فرمایا، تمہیں اس حال پر کس نے پہونچایا، اس نے جواب دیا، میں جزیہ کی ادائیگی کے لئے مانگ رہا ہوں، بڑھاپا ہے اور ضرورت مند بھی ہوں، حضرت عمر نے اس شخص کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے، پھر بیت المال کے خازن کو بلوایا، جب خازن آیا تو ان سے کہا: اس شخص کو دیکھو، اور اس کی بینائی کو دیکھو، خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اس کی جوانی سے فائدہ اٹھایا، اور حالت ضعیفی میں اس کو ذلیل ہونے کے لئے چھوڑ دیا (الخراج لابی یوسف، ص: ۲۵۹)۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد میں اس طرح کا معاملہ بار ہا پیش آیا، جس کو ہم اجماع سے تعبیر کر سکتے ہیں، اجماع اس بات پر کہ ضمان اجتماعی ایک عام اصول ہے، جس میں سماج کے تمام افراد شامل ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، لہذا یہ درست نہیں ہے کہ سماج کا کوئی فرد اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص ۹)۔

فقہائے شوافع نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ مسلمانوں سے مصیبتوں کو دور کرنا فرض کفایہ ہے، اور اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اس حکم میں اہل ذمہ بھی شامل ہیں، لہذا ان سے نقصان کو دور کرنا واجب ہے، دفع ضرر سے مراد ان کی معیشت، رہائش، دواء اور غذا کا انتظام کرنا ہے، نہ کہ صرف اتنی ذمہ داری جو سد رمق کیلئے کافی ہو، اس بارے میں دو اقوال ہیں، لیکن ان کے نزدیک صحیح قول یہی ہے (نہایۃ المحتاج شرح المنہاج ۸، ص: ۴۶)۔

۵۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے معاہدوں اور معاملات کا احترام:

امام ابو یوسف (م: ۱۸۲ھ) نے ذکر کیا کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے شام کے باشندوں سے چند شرطوں کے ساتھ مصالحت کی، جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ انہیں امن و سلامتی فراہم کیا جائے گا، اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کی جائے گی، اس زمانہ میں ہوا یہ کہ روم نے ایک بڑا لشکر تیار کیا، حضرت ابو عبیدہ کو یہ خوف ہوا کہ وہ ان کی حفاظت نہیں کر سکیں گے، چنانچہ آپ نے مختلف شہروں کے گورنروں کو خط لکھا کہ ان علاقوں سے جو جزیہ اور خراج وصول کیا گیا ہے، وہ ان کو لوٹا دیا جائے، اور ان سے کہہ دیا جائے کہ ہم نے تمہارا مال تم کو لوٹا دیا، کیونکہ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ ہمارے لئے ایک بڑا لشکر جمع کیا گیا ہے اور تم نے اپنے معاہدہ میں یہ شرط لگائی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کرینگے، لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ اس پر ہم قادر نہیں...... اگر اللہ نے ان کے خلاف ہمیں فتح عطا فرمائی تو ہم انہیں شرطوں پر قائم ہونگے جو ہمارے اور تمہارے درمیان طے پایا ہے، جب ان تک یہ پیغام پہونچا اور ان کا مال ان کو لوٹا دیا گیا جو ان سے لیا گیا تھا تو انہوں نے کہا: اللہ تمہیں پھر سے لوٹائے اور ان پر فتح عطا فرمائے، اگر وہ ہمارے حاکم ہوتے تو کچھ بھی نہ دیتے، بلکہ تمام چیزیں لے لیتے اور کچھ نہ چھوڑتے (الخراج لابی یوسف، ص ۲۸۲)۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: جب اہل ذمہ نے ان کے مسلمانوں کی وفاداری دیکھی اور ان کی حسن سیرت کا مشاہدہ کیا تو وہ مسلمانوں کے دشمنوں پر خود مسلمان سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، چنانچہ جن سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا ان میں سے ہر شہر کے لوگوں نے اپنے لوگ کو دشمن کے علاقہ میں بھیجے، تا کہ روم کی خبریں لائیں اور ان کی سرگرمیوں کا پتہ لگائیں (حوالہ سابق)۔

۶۔ ان کے دینی آزادی کا تحفظ:

قرآن کریم نے متعدد آیات میں غیر مسلموں کی دینی آزادی اور انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرنے کی تاکید کی ہے، ارشاد ہے:

''لا إکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی'' (سورہ بقرہ: ۲۵۶)۔

''فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر'' (سورہ کہف: ۲۹)۔

''أفانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین'' (سورہ یونس: ۹۹)۔

اس سلسلہ میں مزید تفصیل پیچھے گزر چکی ہے، لیکن یہاں جس چیز کا تذکرہ کرنا ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ عہد و مواثیق جو مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان صلح کے وقت مکمل ہوئے اور جو شرطیں رکھی گئیں ان سب کا مقصد یہ تھا کہ غیر مسلم مسلمانوں کے جذبات کا، ان کے دین کے تقدس کا خیال رکھیں، اور اشتعال انگیزی نہ کریں اور فتنہ نہ پیدا کریں (کتاب الخراج لابی یوسف رص ۲۸۱)۔

خود منصف مزاج مغربی مفکرین اور مستشرقین نے اس دینی آزادی کا صراحت کے ساتھ اعتراف کیا ہے، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، غوستاف لوبون لکھتے ہیں:

ہم نے قرآن کریم کی آیتوں میں دیکھا جسکا ذکر ابھی ہم نے کیا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ نرم دلی کا معاملہ حد سے آگے کا تھا، اور انکی طرح دوسرے ادیان کی کسی شخصیت نے کبھی ایسا معاملہ نہیں کیا، خواہ وہ یہودیت ہو یا نصرانیت کے مذہبی افراد ہوں، ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء نے آپ کے طریقہ پر کیسے عمل کیا، اس بات کا اعتراف یورپ کے بعض اہل علم نے بھی کیا ہے (حضارة العرب، ص:۲۸)۔

۷۔ ان کے عقیدہ و مذہب کے مطابق عقود و معاملات اور نکاح وغیرہ کی آزادی:

ایک عام قاعدہ یہ ہے کہ معاملات، کام اور حصول رزق کی آزادی میں اہل ذمہ مسلمان کے طرح ہیں۔ حنفی فقیہ امام جصاص کہتے ہیں:

''إن الذميين فی المعاملات والتجارات كالبيوع وسائر التصرفات كالمسلمين'' (الاحکام للجصاص ۲، ص:۲۳۶، حاشیۃ ابن عابدین ج۳، ص:۲۷۶)۔

معاملات اور تجارت، مثلاً بیوع اور دیگر تصرفات میں ذمی مسلمانوں کے مثل ہیں۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: بیوع کی جو شکلیں مسلمانوں کے لئے جائز ہیں وہ تمام شکلیں اہل ذمہ کے لئے بھی جائز ہیں، اور بیوع کی جو شکلیں مسلمانوں کے لئے فاسد ہیں وہ اہل ذمہ کے حق میں بھی فاسد ہیں، سوائے خمر و خنزیر کے (بدائع الصنائع ج ۴، ص: ۱۷۴)۔

فقہائے احناف کے نزدیک خمر و خنزیر کا استثناء اس صورت میں ہے جب اس طرح کا عقد ان کے درمیان باہم طے پایا ہو، لیکن اگر عقد مسلمان اور اہل ذمہ کے درمیان ہے تو یہ عقد باطل ہو یا فاسد ہوگا (المبسوط ج ۱۰، ص: ۸۴)، جبکہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ خمر اور خنزیر میں بھی مسلمانوں اور ذمیوں کے درمیان کوئی استثناء نہیں ہے (جواہر الاکلیل ج ۲، ص: ۵۲، حاشیۃ الجمل، ج ۳، ص: ۴۸۱، الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص: ۱۴۵، المغنی ج ۵، ص: ۲۲۳)، امام شافعی فرماتے ہیں: بیوع کی جو شکلیں مسلمانوں کے درمیان باطل ہیں وہ ذمیوں کے درمیان بھی باطل ہوں گی، البتہ اگر عقد ہو جائے اور مبیع استعمال ہو جائے تو بیع باطل نہیں ہوگی، اگر اہل ذمہ میں سے دو شخصوں نے شراب کی خرید و فروخت کی، اور ابھی قبضہ نہیں ہوا ہے، تو ہم اس بیع کے باطل ہونے کا حکم لگائیں گے، لیکن اگر ان دونوں نے عوض پر قبضہ کر لیا تو ہم اس کے جائز نہ ہونے کی بات نہیں کہیں گے، کیونکہ بیع تو منعقد ہو چکی ہے (الام ج ۴، ص: ۲۱۱)۔

فقہاء حنفیہ کے علاوہ تمام فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر شراب و خنزیر سے متعلق عقود اگر اہل ذمہ کے درمیان ہو تو اسلامی حکومت تعارض نہیں کریگی، کیونکہ غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا تقاضہ یہ ہے کہ جن معاملات کو وہ جائز سمجھتے ہیں ان میں تعارض نہ کیا جائے (حوالہ سابق، مزید دیکھئے، ج ۷، ص: ۱۳۲) جمہور فقہاء اور فقہائے احناف کے درمیان اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ خمر و خنزیر ان کے حق میں مال متقوم ہے، لہٰذا اس بنیاد پر مسلمان ان کی شراب اور خنزیر کو ہلاک کر دے تو اس کا عوض اور ضمان واجب ہوگا، یہ حضرات کا مستدل حضرت عمر کا وہ مکتوب ہے جو آپ نے شام کے گورنروں کو لکھا تھا، اس مکتوب میں آپ نے میتہ، خنزیر اور شراب لینے سے منع کرتے ہوئے مزید فرمایا: ''لا تفعلوا ولكن ولوا أربابها بيعها ثم خذوا الثمن منهم'' (الخراج لابی یوسف ص: ۲۶۰، کتاب الاموال لابی عبید، ص: ۶۱)۔

اسی طرح فقہائے احناف ان کے نکاح کو ان کے عقائد کے مطابق باقی رکھتے ہیں، مزید وہ اس کے قائل ہیں کہ مسلمان کا کتابیہ سے نکاح جائز ہے، دلیل یہ آیت ہے: ''... والمحصنات من الذين أوتوا الكتاب من قبلكم'' (سورہ مائدہ: ۵)۔

۸۔ حکومت کی ذمہ داری قبول کرنا:

اہل ذمہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت سے متعلق ذمہ داری قبول کرے، البتہ اس سے دینی شعبہ مستثنی ہوگا، اسی طرح ایسے شعبے بھی مستثنی ہوں گے جو اکثریت کے مذہب سے متعلق ہوں، فقہاء نے وزارت تنفیذ کی ذمہ داری قبول کرنیکی اجازت دی ہے، یہ اصطلاح وزارت تفویض کے مقابلہ میں استعمال

ہوتا ہے، تفویض کا مطلب یہ ہے امیر المومنین احکام صادر کرنے کا اختیار کسی وزیر کو سپرد کردیں، تاکہ وزیر اپنی صوابدید سے معاملات انجام دیں، یہ حکومت کے مشابہ ہے، جہاں تک وزارت تنفیذ کا تعلق ہے تو اس سے مراد احکام کو نافذ کرنا ہے، اس تفصیل کی روشنی میں موجودہ وقت کی تمام وزارت اسی ضمن میں آتے ہیں، بلکہ وزیر اعظم کے منصب کو بھی یہ شامل ہے، اس کیلئے اس زمانہ میں یہ منصب بھی ان قوانین وضوابط کے تابع ہوتا ہے جسے حکومت کے ادارے متعین کرتے ہیں، نیز قوانین کا مرجع ملک کے صدر ہوتے ہیں، ماوردی کہتے ہیں:

> جہاں تک وزارت تنفیذ کا تعلق ہے تو اس کا حکم ضعیف ہے، اور اس کے شرائط بہت کم ہیں، کیونکہ ان مسائل میں غور وفکر کرنا امام کی رائے اور تدبیر پر منحصر ہے، یہ وزیر اپنے امام، رعایا اور گورنروں کے درمیان بیچ کا واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے، امام کے حکم کے مطابق معاملات کو انجام دیتا ہے، ان کے احکامات کی تنفیذ کرتا ہے، گورنروں کو مقرر کرنے کی اطلاع دیتا ہے، لشکر تیار کرتا ہے، اہم معاملات ومسائل ان پر پیش کرتا ہے، ...... اس کے بعد ماوردی مزید کہتے ہیں کہ اس طرح کا وزیر ذمی بن سکتا ہے (الاحکام السلطانیۃ، ص: ۲۷)۔

اسلامی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ غیر مسلم وزارت اور عمومی منصب پر فائز ہوئے، عہد عباسی میں وزارت کے منصب پر بہت سے عیسائی فائز ہوئے، جیسے نصر بن ہارون (م: ۳۶۹ھ)، عیسی بن قسطور (م: ۳۸۰ھ) وغیرہ، مشہور مورخ آدم میز لکھتے ہیں: تعجب خیز امور میں سے ایک یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں بڑے بڑے عہدے اور مناصب پر غیر مسلم فائز ہوئے، عیسائیوں نے متعدد شہروں میں مسلمانوں پر حکومت کی ہے، اور اہل ذمہ کو منصب دینے کے تعلق سے مسلمانوں کا شکوہ پرانی بات ہے (الحضارۃ الاسلامیۃ ۱/ ۱۱۸)۔

امام سیوطی کہتے ہیں: ابوسعد تستری یہودی سلطنت عبیدیہ میں امور حکومت انجام دیتا تھا، چنانچہ بعض شعراء نے کہا:

يهود هذا الزمان قد بلغوا	غاية آمالهم وقد ملكوا
المجد فيهم والمال عندهم	ومنهم المستشار والملك
يا أهل مصر إني نصحت لكم	تهودوا قد تهود الفلك

(حسن المحاضرۃ ج ۲، ص: ۲۰۱)۔

امام سیوطیؒ نے اسلامی ممالک (مصر اور اس جیسے عبیدیہ سلطنت) میں متعدد وزراء کا تذکرہ کیا جو اپنے مذہب، یعنی یہودیت ونصرانیت پر باقی تھے، مثلا بہرام ارمنی عیسائی وغیرہ، یہ لوگ حکومت پر قابض تھے، اور انہوں نے سیرت کو بگاڑا (حوالہ سابق)۔

آدم میز لکھتے ہیں: اسلامی قانون میں کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کا دروازہ ذمیوں کے لئے بند ہو، صنعت وحرفت پر ان کا قبضہ تھا، جس سے نفع کی ندیاں بہتی ہیں، وہ صراف تھے، تجار تھے، اہل حرفت تھے، ڈاکٹر تھے، انہوں نے اپنی ذات کو اتنا منظم کیا تھا کہ ملک شام کے اکثر صراف یہودی تھے، جبکہ اکثر ڈاکٹر اور کاتب عیسائی تھے، بغداد میں عیسائیوں کے سردار بادشاہ کے طبیب خاص تھے، یہودیوں کے سردار اور ناقدین اسی کے پاس رہتے ہیں۔

آگے مزید لکھتے ہیں: حیرت انگیز امور میں سے ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلم عمال، ولاۃ، اور افسران کی کثرت ہے، گویا عیسائی ہی اسلامی حکومت میں مسلمانوں پر حکومت کر رہے ہیں، البتہ ذمیوں کو حاکم بنانے کے بارے میں مسلمانوں کا شکوہ پرانا ہے۔

اسلامی ممالک میں رہائش پذیر غیر مسلموں کی ذمہ داریاں:

گذشتہ سطور میں ہم نے غیر مسلموں (ذمیوں) کے تئیں حکومت اور مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا ہے، اب ہم غیر مسلموں کی ذمہ داریاں بیان کرنا چاہتے ہیں:

ان کی ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:

اول: مالی واجبات کی ادائیگی: اس میں افراد پر جزیہ، زمین کا ٹیکس اور تجارت کا عشر شامل ہے، ان چیزوں کو ہم ٹیکس یا زکوۃ سے تعبیر کرسکتے ہیں (مزید دیکھئے: عبدالکریم زیدان کی کتاب، حوالہ سابق، ص: ۱۵۵)۔

درج ذیل صورتوں میں جزیہ ساقط ہوسکتا ہے:

۱۔ جب حکومت ذمیوں کی حفاظت سے معذور ہو۔

۲۔ جنگ اور وطن سے دفاع میں عملی شرکت ہو، ڈاکٹر یوسف القرضاوی تحریر فرماتے ہیں: اگر ذمی اسلامی حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ اور ملک کی حفاظت میں شریک رہیں تو ان سے جزیہ ساقط ہوجائے گا، حضرت عمرؓ کے دور میں مسلمان اور اہل ذمہ کے درمیان ہوئے بعض معاہدوں میں اس کی صراحت ملتی ہے، اس طرح کہ جب ابوعبیدہؓ کے قاصد نے مسیحیوں کی ایک جماعت (الجراجمۃ) کے ساتھ مصالحت کیا تو معاہدہ میں یہ بھی مذکور تھا کہ وہ مسلمانوں کے معاون ہوں گے، اور دشمنوں کے درمیان جاسوسی کا کام کریں گے، اس کے بدلے ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا (شیخ قرضاوی کی کتاب، حوالہ سابق ص: ۳۵)۔

لہذا آج بھی اگر عیسائی اسلامی ممالک میں وطن سے دفاع کی ذمہ داری ادا کریں گے تو ان لوگوں سے جزیہ ساقط ہوجائے گا۔

دوم: اسلامی ممالک سے صادر اسلامی قوانین کی پیروی: اس حکم سے ان کے عائلی مسائل اور خنزیر و شراب مستثنیٰ ہیں، جس کی بحث پیچھے گذر چکی ہے۔

اس اصول کو 'اقلیمیۃ القانون' کا نام دیا گیا ہے، یہ قانون آج پوری دنیا میں نافذ ہے، بلکہ جدید حکومتیں اس قانون کو سیادت اور قوت کے ارکان میں شمار کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں اس کے ملکی قوانین کے علاوہ کسی اور قانون کو منطبق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، یہاں تک کہ احوال الشخصیہ اور عائلی مسائل میں بھی ملکی قوانین کی پابندی ہوتی ہے، اسی بناء پر اکثر غیر مسلم ممالک میں عائلی مسائل میں سخت پریشانی ہوتی ہے، کیونکہ ان مسائل میں ملکی قوانین کی پابندی لازم ہوتی ہے، حالانکہ یہ قوانین شریعت کے مطابقت نہیں ہوتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس اسلامی شریعت غیر مسلموں کو ان کے مذہبی احکام، یعنی حلال و حرام، عبادات اور احوال شخصیہ (عائلی مسائل) پر عمل کی پوری اجازت دیتی ہیں، اور بعض فقہاء نے تو ان کے تمام دینی احکام پر عمل کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دینی قوانین پر عمل کرنا چاہیں، ان فقہاء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: "فإن جاؤك فاحكم بينهم أو أعرض عنهم" (سورہ مائدہ: ۴۲)۔

حضرت امام شافعی تخییر کی آیت کو ان لوگوں پر محمول کیا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصالحت کی تھی، جیسے مدینہ کے یہود کہ جن سے جزیہ نہ دینے پر مصالحت ہوئی تھی، حالانکہ انہوں نے اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ ان پر وہی احکام جاری کئے ہیں، جیسے درج ذیل آیت میں صراحت ہے: ''وكيف يحكمونك وعندهم التوراة...'' (سورہ مائدہ: ۴۹) اسی طرح اس آیت کی شان نزول اس پر دلالت کرتی ہے، آیت نمبر ۴۹ اہل ذمہ سے متعلق ہے، امام شافعی فرماتے ہیں: جب معاہدین اللہ تعالیٰ کے حد کے بارے میں کوئی معاملہ لے کر امام کے پاس آئے تو امام کو کوئی اختیار نہیں ہے، ان پر حد قائم کرنا ضروری ہے، اسی طرح جب کوئی دوسرے کے حق کا انکار کرے، اور حق کا طالب امام کے پاس اپنے حق کے لئے آئے تو امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس عقیدہ کا حامل ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، گرچہ دوسرا فریق اس حکم پر راضی نہ ہو، یا وہ اس حکم پر ناراضگی کا اظہار کرے،...... اور جو فیصلہ کو نہ مانے ان کے لئے دار الاسلام میں رہنا جائز نہیں ہے،...... لہذا آیت کریمہ: ''وإن احكم بينهم بما أنزل الله'' (سورۃ المائدۃ ۴۹) کا مطلب ''وأن يحكم بينهم'' ہے، اس کے بعد امام شافعیؒ نے اس آیت سے بہت سے جزوی مسائل کا استنباط کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: اگر کوئی عورت یہ دعوی کرے کہ شوہر نے اس کو طلاق دیدیا ہے، تو مسلمانوں کے مطابق ہی اس کا فیصلہ کیا جائے گا، اور جو بیوع مسلمانوں کے درمیان باطل ہیں وہ ان ذمیوں کے درمیان بھی باطل ہوں گے (احکام القرآن للشافعی، ج ۲ ص: ۸۷)۔

ابن العربی کہتے ہیں: اگر اہل کتاب اپنے مسائل ہماری عدالت میں دائر کریں تو اگر ان کا پیش کردہ معاملہ ظلم پر مبنی ہے، جو خود ان کی شریعت میں جائز نہیں ہے، مثلاً غصب، قتل اور اس جیسے دوسرے احکام...... تو ان پر وہی احکام نافذ ہوں گے جو مسلمانوں پر ہوتے ہیں، اور اگر معاملہ ایسا ہے جس میں شریعتیں مختلف ہیں تو ایسے معاملہ میں امام کو اختیار ہوگا (احکام القرآن لابن العربی، ج ۲ ص: ۶۱۷)۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں، جمہور فقہاء، یعنی فقہاء احناف (سوائے امام ابوحنیفہ کے) شوافع، ایک روایت کے مطابق امام احمد اور ظاہریہ کا مسلک یہ ہے کہ ان کے حق میں اسلامی شریعت کی تنفیذ ہوگی، اور قاضی ان پر حکم کو نافذ کرے گا، یہ رائے حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ سے مروی ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ اور فقہاء مالکیہ اور ایک قول کے مطابق امام احمد کی رائے یہ ہے کہ امام کو اختیار ہوگا، البتہ امام مالک نے تخییر کو ان مسائل کے ساتھ خاص کیا ہے جن کی حرمت مذاہب میں متفق علیہ نہ ہو، اور اگر مسئلہ متفق علیہ ہے، مثلاً زنا، تو ایسے مسئلہ میں مذکورہ جرم کا ارتکاب کرنے والے پر امام اسلامی شریعت کا حکم

نافذ کرے گا، ان دونوں میں راجح پہلا قول ہے، کیونکہ ذمیوں کو امام ان کی طرف سے اس بات کی رضامندی پر دی گئی ہے کہ ان پر اسلامی احکام نافذ ہوگا، اور ان دونوں آیتوں میں کوئی تضاد نہیں، بایں طور کہ آیت تخییر ان معاہدین کیلئے ہے جن سے صلح ہوئی تھی، جزیہ ادا کرنے کا معاملہ نہیں ہوا تھا، جیسے یہود کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت مصالحت کی جب آپ مدینہ تشریف لائے، اور آیت کا حکم ان تمام معاہدین کو شامل ہے جو جزیہ ادا کرنے پر رضامند تھے، اس بنیاد پر جب حاکم کے پاس ذمیوں کی طرف سے ایسے جرم سے متعلق معاملہ آئے جس میں سزا واجب ہوتی ہے، تو قاضی ان پر سزا کے حکم کو نافذ کرے گا، البتہ نکاح اور بعض معاملات جو ان کے دین میں حلال ہیں مستثنیٰ ہوں گے، صحیح حدیث میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں دو یہودیوں کو رجم کیا تھا جن پر زنا ثابت ہوا، یہ روایت بخاری و مسلم میں موجود ہے (دیکھئے: احکام القرآن للشافعی، ج ۲ ص: ۸۷، احکام القرآن للجصاص، ص: ۴۳۴، تفسیر الطبری، ج ۴ ص: ۱۷۷، الام للشافعی، ج ۴ ص: ۲۱۰، فتح القدیر ج ۲ ص: ۵۰۲، بدایۃ المجتہد ج ۲ ص: ۴۳۵، الغایۃ القصوی، ۲ ص: ۹۲۷، المغنی لابن قدامہ، ج ۸ ص: ۲۱۴)۔

ابن حزم اندلسی (ت: ۴۵۶ھ) فرماتے ہیں: جس نے ذمیوں کو اور ان کے احکام کو چھوڑ دیا، انہوں نے خواہشوں کی پیروی کی، اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی (المحلی، ج ۱۳ ص: ۶۹)۔

سوم۔ مسلمانوں کے جذبات کا احترام اور اسلامی حکومت کی ہیبت: ...... لہٰذا ان کو اسلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن مجید، اور اس کے احکام کے بارے میں اعلانیہ بدزبانی، عقائد و افکار کو پھیلانے، شراب پینے، خنزیر کھانے، مسلمانوں کے درمیان اسلام کے خلاف اخلاق کی ترویج و شاعت سے روکا جائے گا (فقہاء نے ان ذمہ داریوں کو اپنے اجتہاد کے ذریعہ بیان کیا ہے، لہٰذا ان کے ساتھ عرف اور ہر عہد کی خصوصیات کو بھی دیکھا جانا چاہیے، البنایہ علی الہدایہ ج ۴ ص: ۸۴۰، البدائع ج ۷ ص: ۱۱۳، جواہر الاکلیل ج ۱ ص: ۲۶۸، مغنی المحتاج، ج ۴ ص: ۲۵۶، کشاف القناع، ج ۳ ص: ۱۲۶، الاحکام السلطانیہ للماوردی ص: ۱۴۴، الاحکام السلطانیہ لابی یعلی، ص: ۱۴۴، الموسوعۃ الفقہیہ ج ۷ ص: ۱۳۵، شیخ یوسف القرضاوی کی کتاب، حوالہ سابق ص: ۴۱)۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات میں بلند اسلامی آداب:

اسلام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین حقوق وواجبات کی تنفید میں صرف لازمی قوانین پر ہی اکتفاء نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ اخلاقی اور معاملاتی آداب بھی اختیار کرتا ہے، اس طور پر کہ وہ ایک مسلمان کے دل میں حسن اخلاق، شیریں گفتار، خوش روئی، نرمی، رحمدلی، آسانی، حلم وبردباری، شفقت، محبت، حسن سلوک، معافی، علم نا آشنا افراد سے اعراض، تکلیف کو گوارہ کرنے، بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا جواب دینے، برائی کو اچھائی سے بدلنے جیسے اوصاف کو تمام لوگوں کے حق میں پیدا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ادفع بالتی ھی أحسن فإذا الذی بینك وبینه عداوة كأنه ولی حمیم. وما یلقاھا إلا الذین صبروا وما یلقاھا إلا ذو حظ عظیم'' (سورہ فصلت: ۳۴)۔

اسی طرح اسلام اس اجر عظیم پر ابھارتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رحم اور احسان کرنے والوں کے لئے طے کر رکھا ہے: ''والكاظمین الغیظ والعافین عن الناس والله یحب المحسنین'' (سورہ آل عمران: ۱۳۴)۔

یہ باتیں ہر چیز میں عدل کے واجب ہونے کے علاوہ ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: ریاض الصالحین، اس میں ان ابواب سے متعلق احادیث کثرت سے موجود ہیں)۔

واضح رہے کہ یہ اخلاقیات اور عدل صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں، بلکہ یہ حکم تمام لوگوں کے لئے یکساں ہے، یہاں تک کہ جانوروں اور تمام حیوانات کے بارے میں حسن سلوک کا حکم ہے، صحیح شرعی نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بیوہ عورت نے بلی کو باندھے رکھا اور وہ مرگئی، اس وجہ سے اس کو جہنم میں ڈالا گیا (صحیح البخاری مع الفتح، ج ۶ ص: ۳۵۶، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۶۱۹) اور ایک بدکار عورت پیاسا کتا کو پانی پلانے کی بناء پر جنت میں داخل ہوئی (صحیح البخاری مع الفتح، ج ۵ ص: ۱۱۳، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۲۴۵)۔

باہم نرمی اور رحمدلی کے محرکات:

الف: نرمی اور رحمدلی کے معاون ذرائع میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام ایک مسلمان کو اہل کتاب کی عورت سے نکاح کی اجازت دیتا ہے، اہل کتاب خاتون مسلمان کی بیوی ہوسکتی ہے، ان کی اولاد کی ماں ہوسکتی ہے، بیوی کا بھائی، یعنی سالہ اور بچوں کا ماموں بن سکتا ہے، اس کی ماں اپنی ماں کے درجہ میں ہے اور وہ بچوں کی نانی ہے، اور اس کے باپ بچوں کے نانا ہوتے ہیں، اس طرح مسلمان اور اہل کتاب کے درمیان مصاہرت اور قرابت کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے، جس کے حقوق

ہیں، نفقہ ہے اور ضمانت ہے، قرآن کریم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، گرچہ وہ اپنی اولاد کو گمراہ کرنے کی کوشش ہی کیوں نہ کریں، ارشاد ہے:

''وإن جاهداك على أن تشرك بي ما ليس لك به علم فلا تطعهما و صاحبهما في الدنيا معروفا و اتبع سبيل من أناب إلي، ثم إلي مرجعكم فأنبئكم بما كنتم تعملون'' (سورہ لقمان:۱۵)۔

ب: اسلام نے غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق کو لازم کیا ہے، چنانچہ پڑوسیوں کے حقوق سے متعلق جملہ نصوص میں غیر مسلم پڑوسی بھی شامل ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: ریاض الصالحین، ص:۱۲۶)۔

ج: مباحثہ کے وقت بلند اخلاق کا التزام کرنا، اللہ تعالی نے اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ بہتر انداز اور بہترین اسلوب میں کرنے کو خاص طور پر ذکر کیا ہے: ''ولاتجادلوا أهل الكتاب إلا بالتي هي أحسن إلا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذي أنزل إلينا و أنزل إليكم وإلهنا و إلهكم واحد ونحن له مسلمون'' (سورہ عنکبوت:۴۶)۔

د: معاملات میں بلند اخلاق کا برتاؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ اور ان کے ساتھ مباحثہ میں اچھے اخلاق کا برتاؤ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات فرماتے، ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے، ان کے بیماروں کی تیمارداری کرتے، بلکہ انہیں اپنی مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت تھی، سیرت نگار لکھتے ہیں کہ جب نجران کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو وہ لوگ سیدھے مسجد میں آئے، مغرب کا وقت قریب تھا انہوں نے مسجد نبوی میں مغرب کی نماز پڑھی، صحابہ نے چاہا کہ انہیں منع کردیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا، آپ نے فرمایا آنے والوں کا استقبال کرو، اس درمیان ان لوگوں نے اپنی نمازیں پوری کرلیں (سیرت ابن ہشام، ج۱، ص:۵۷۳)۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن قیم لکھتے ہیں: اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب کا مسلمانوں کی مسجد میں داخل ہونا جائز ہے، نیز اسی واقعہ میں انہیں مسلمانوں کی موجودگی میں اپنی نمازیں پوری کرنے پر قدرت دینا بھی ہے، جبکہ یہ عارضی ہو (زاد المعاد ج۳ ص:۲۳۸)۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے مستقل جدال کی کیفیت میں رہنا نہیں چاہتے تھے، یہی حال آپ کے بعد آپ کے صحابہ کا بھی تھا، اللہ تعالی نے مکہ اور مدینہ دونوں جگہ ان کے ساتھ بہتر انداز میں مباحثہ کا حکم دیا ہے، اسی طرح دین کی اشاعت ہوئی، اور اللہ تعالی نے تلوار کو دلیل کا معاون بنایا ہے (حوالہ سابق)۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کا ہدیہ قبول فرمایا، اور ان کا احترام فرمایا، یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک فرد کا جنازہ جا رہا تھا تو آپ کھڑے ہوگئے، اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا وہ انسان نہیں تھا؟ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہمارے سامنے سے جنازہ گزرا، یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے، چنانچہ ہم لوگ بھی کھڑے ہوگئے، صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہوجایا کرو (صحیح البخاری ج۳ ص:۱۷۹، صحیح مسلم، کتاب الجنائز ج۲ ص:۶۵۹)۔

اسی طرح سہیل بن حنیف اور قیس بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا، آپ سے کہا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے، آپ نے فرمایا: ''أليست نفسا؟'' کیا اس میں جان نہیں ہے (حوالہ سابق)۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''أليست نفسا؟'' کو بطور علت بیان فرمایا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جنازہ کو دیکھ کر کھڑا ہونا مستحب ہے (فتح الباری ج۳ ص:۸۱) فقہاء کا ایک گروہ اس کے وجوب کا بھی قائل ہے، کیونکہ صحیحین کی متعدد روایات میں یہ لفظ امر کے ساتھ آیا ہے، راجح قول استحباب کا ہے، اس کی دلیل حضرت علی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے، پھر بیٹھ گئے (صحیح مسلم، ج۲ ص:۲۶۶) یہاں بیٹھنے کو بیان جواز پر محمول کیا گیا ہے (فتح الباری، ج۳ ص:۱۸۱)۔

غیر اسلامی ممالک میں مسلم اقلیت کے اپنے ہم وطنوں سے تعلقات:

اس موضوع پر بہت سی کتابیں اور قیمتی مقالات لکھے گئے ہیں، جن شخصیات نے شریعت کے بنیادی مآخذ کی روشنی میں تفصیل سے لکھا ہے ان میں ان میں شیخ یوسف القرضاوی، شیخ فیصل مولوی، ڈاکٹر جابر علوانی، ڈاکٹر جمال الدین عطیہ اور دیگر حضرات کے اسماء قابل ذکر ہیں، اس لئے جو باتیں یہ حضرات لکھ چکے

ہیں ان کے اعادہ کے بجائے ہم چند عمومی اصول اور کلی قواعد بیان کریں گے، ان اصول وقواعد کو ایک سطر میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

''إقرار الحقوق المتقابلة بين الأقلية الإسلامية والدولة الأكثرية''۔

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اس اصول کو ہم نے مسلمانوں اور غیر مسلم کے درمیان ہر طرح کے تعلقات میں بنیاد قرار دیا ہے، یہ اصول خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے فضل وکرم سے ثابت فرمایا؛ یہاں تک کہ مسلمان اور اللہ تعالی کے مابین بھی یہی اصول کارفرما ہے۔

بہت سے حقوق وواجبات اس جامع اصول سے متفرع ہوتے ہیں، ان کی دو جہتیں ہیں:

(ا) غیر اسلامی ملک میں رہنے والے مسلمانوں پر عائد اہم حقوق وواجبات، جن کی تلخیص درج ذیل ہے:

الف: ان تمام عہد وپیمان اور معاہدوں کو پورا کرنا ضروری ہے جو غیر اسلامی ملک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں، البتہ اس پابندی سے ایسے معاہدے مستثنی ہوں گے جو قطعی الدلالۃ اور قطعی الثبوت نصوص سے متعارض ہوں، جنہیں ''ثوابت'' کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان عہد وپیمان اور معاہدوں کے لازم ہونے پر دلائل اس کثرت سے ہیں کہ حد شمار سے باہر ہیں، انہی دلائل میں ایک اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: ''يايها الذين آمنو أوفوا بالعقود'' (سورہ مائدہ:۱)۔

''وأوفوا بالعهد إن العهد كان عنه مسئولا'' (سورہ اسراء:۳۴)۔

اور یہ ارشاد: ''يايها الذين آمنوا لم تقولون مالا تفعلون كبر مقتا عند الله أن تقولوا مالا تفعلون'' (سورہ صف:۲-۳)۔

اللہ تعالی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عہد کو بھی پورا کرنے کا حکم دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان قبائل کے کے درمیان طے پائے تھے، جن کی طرف سے وقتا فوقتا مسلمانوں پر ظلم ہوتا رہتا تھا، اللہ کا ارشاد ہے: ''وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر إلاعلى قوم بينكم وبينهم ميثاق و الله بما تعملون بصير'' (سورہ انفال:۷۲)۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عہد وپیمان کی پاسداری ہجرت نہ کرنے والے مومنین کے حقوق سے بھی بالاتر ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: جامع البیان للطبری، ج۲۰، ص:۷۰)۔

علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں: اگر وہ دینی جنگ میں تم سے مدد چاہیں تو تم مدد کرو، یہ تم پر ضروری ہے کیونکہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، سوائے اس کے وہ ان کفار کے مقابلے میں مدد چاہیں جن سے تمہارے عہد وپیمان ہیں...... تو اپنا عہد وپیمان مت توڑو، یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے (تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص:۱۳۱۸)۔

اسی طرح مشرکین کے حقوق کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''فما استقاموا لكم فاستقيموا لهم إن الله يحب المتقين'' (سورہ توبہ:۷)۔

علامہ ابن کثیر اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: تم نے ان سے جنگ بندی کا جو معاہدہ کیا ہے اس پر جمے رہو، اللہ تعالی پاکبازوں کو پسند فرماتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اسی حکم کے مطابق عمل کیا،...... یہاں تک کہ قریش نے خود ہی عہد شکنی کی اور اپنے حلیف بنی بکر کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بنی خزاعہ پر آمادۂ جنگ کیا اور ان کے ساتھ مل کر حرم میں بھی قتال کیا (تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص:۱۳۱۸)۔

اس بارے میں جو احادیث ہیں وہ بھی حد شمار سے باہر ہیں، انہی میں سے ایک متفق علیہ حدیث یہ ہے: ''أية المنافق ثلاث إذا حدث كذب وإذا وعد أخلف وإذا أؤتمن خان'' (صحيح البخاري مع الفتح، ۱/۱۰، ص:۸۳، صحيح مسلم، حدیث نمبر:۵۹)۔

مسلم کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے: ''وإن صام وصلى وزعم انه مسلم'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۵۹)۔

اسی سلسلہ میں یہ روایت بھی ہے، جسے بخاری ومسلم نے بیان کیا، روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: ''أربع من كن فيه كان منافقا خالصا

ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها: إذا أؤتمن خان، وإذا حدث كذب وإذا عاهد غدر وإذا خاصم فجر'' (صحیح البخاری مع الفتح، ج۱، ص:۸۴، صحیح مسلم حدیث نمبر:۵۸)۔

ب: ملک کے تئیں دھوکہ، جھوٹ، مکر سے اجتناب، یہی حکم ملک کے علاوہ کے لئے بھی ہے، کیونکہ دھوکہ، جھوٹ، مکروفریب، تلبیس، بدعہدی حرام ہے۔

اکثر محدثین نے دھوکہ، خیانت، مکروفریب اور جھوٹ کی حرمت کے بارے میں مستقل علاحدہ علاحدہ ابواب قائم کئے ہیں، جن میں ان موضوعات سے متعلق بہت سی احادیث ذکر کی جاتی ہیں، ان احادیث میں یہ متفق علیہ حدیث بھی ہے، جس کے الفاظ اس طرح ہیں: ''لكل غادر لواء يوم القيامة يقال هذه غدرة فلان'' (صحیح البخاری مع الفتح، ج۱۰، ص:۴۶۴، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۷۳۵)۔

اسی موضوع سے متعلق ایک روایت جسے امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ کی سند سے مرفوعاً نقل کی ہے، اس طرح ہے: ''قال الله تعالى ثلاثة أناخصمهم يوم القيامة: رجل أعطى بي ثم غدر...'' (صحیح البخاری مع الفتح، ج۴، ص:۴۴۶)۔

دھوکہ کے بارے میں اسلام کا موقف بہت سخت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من حمل علينا السلاح فليس منا ومن غشنا فليس منا'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۰۱)۔

یہ حدیث صاف صاف اعلان کررہی ہے کہ دھوکہ باز اس امت محمدیہ کا فرد نہیں ہے جس امت کو رسول اللہ تیار کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اگر مشرکین وکفار بدعہدی کریں تب بھی قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان معاہدوں کے تئیں دھوکہ اور بدعہدی کی اجازت نہیں دی، ارشاد ہے: ''وإن يريدوا أن يخدعوك فإن حسبك الله هو الذي أيدك بنصره وبالمومنين'' (سورہ انفال:۶۲)۔

اور جہاں تک جھوٹ کا تعلق ہے تو ہم نے بعض صحیح احادیث ذکر کی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جھوٹ نفاق کی علامت ہے، بلکہ اس کا شمار تو کبیرہ گناہوں میں ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جہنم کا راہبر قرار دیا ہے، ارشاد ہے: ''إن الصدق يهدى إلى البر وإن البر يهدى إلى الجنة، وإن الرجل ليصدق حتى يكتب عند الله صديقا، وإن الكذب يهدى إلى الفجور وإن الفجور يهدى إلى النار. وإن الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابا'' (صحیح البخاری مع الفتح ج۱۰، ص:۴۲۲، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۲۶۰۷)۔

یہ حقوق گرچہ بندوں سے متعلق ہیں، لیکن ان کا شمار حقوق اللہ میں بھی ہے، لہذا بندوں کے حقوق میں تعدی اللہ کے حقوق میں تعدی سمجھی جائے گی، اس پر مستزاد یہ کہ اسلامی اخلاقیات کی پابندی نہ کرنے سے غیر مسلموں کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ خراب ہوتی ہے، اور ایسی بری تصویر سامنے آتی ہے جو اسلام سے دوری کا سبب بنتی اور اسلام میں داخل ہونے میں رکاوٹ بنتی ہے، تجربات سے ثابت ہے کہ عمدہ اخلاق دخول اسلام کے لئے بہت بڑا محرک ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم کی دعا نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ربنا لا تجعلنا فتنة للذين كفروا'' (سورہ ممتحنہ:۵)۔

اور بلند اخلاق سے متصف نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دخول اسلام کی راہ میں مانع بننا بھی تو ایک فتنہ ہے۔

ج۔ ملک میں نافذ تمام قوانین کی پابندی، بشرطیکہ وہ اسلامی اصولوں سے متعارض نہ ہوں، اور اسی زمرہ میں سے وہ قوانین بھی ہیں جو ٹیکسوں سے متعلق ہیں، کہ ٹیکسوں سے حاصل مال بھی عمومارفاہ عام میں ہی خرچ کیا جاتا ہے۔

د۔ معاشرہ کے اندر امن وآشتی کی حفاظت۔

ھ۔ غیر مسلموں کو بہتر طریقہ سے حق، عدل اور اسلام کی دعوت دینا، دعوت کے لئے سنجیدہ طریقہ اختیار کرنا، اشتعال سے احتراز کرنا۔

و۔ اسلام اور مسلمانوں کی مثبت اور حقیقی تصویر پیش کرنا، اور باہم ہم آہنگی، تعاون اور آپسی بھائی چارہ کی روح کو تقویت دینا۔

دوم: مسلم اقلیت کے حقوق حکومت پر جس کے زیر سایہ وہ رہتے ہیں:

غیر مسلم ملک کو اپنی اقلیتوں کے تئیں جن حقوق کی پاسداری لازم ہے ان میں اہم اس طرح ہیں:

ا۔ قانون کے دائرہ میں عدل ومساوات اور آزادی کو یقینی بنانا اور ایسے افکار کو روکنا جن سے مسلمانوں کے مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہو، مسلمانوں کے جذبات کی رعایت کرنا، انہیں مشتعل نہ کرنا اور تمام مذاہب کی بنیادی باتوں کے ساتھ گستاخی وتوہین کو روکنا، خواہ وہ کسی بھی نام سے ہو، اور ایسے قوانین نافذ کرنا جو مسلمانوں کے حقوق اور ان کی دینی آزادی کی حفاظت کی ضامن ہو۔

۲۔ ان اہم حقوق میں ایک یہ بھی ہے کہ ایسی شرعی عدالتیں قائم کرنے کی اجازت ہو جہاں عائلی مسائل، معاشرتی مسائل اور مسلمانوں سے متعلق دینی مسائل حل کرنے کی اجازت ہو، جیسا مذکورہ مسائل کے حل کے لئے ممالک اسلامیہ میں خاص عدالتیں قائم ہیں۔

اس معاملہ میں برطانیہ کی حکومت واقعی قابل تعریف ہے جس نے مسلمانوں کے عائلی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لئے شرعی عدالت قائم کرنے کی اجازت دینے میں پہل کی ہے، لندن کے اخبار سنڈے ٹائمز'' کا کہنا ہے کہ حکومت کی آمادگی اس کی سنجیدگی کو بتاتی ہے، حکومت نے شرعی قاضیوں کو طلاق اور گھریلو مسائل سے متعلق مالی جھگڑوں کے بارے میں فیصلے کرنے کا حق دیا ہے، حالانکہ اس سے قبل برطانیہ میں ان عدالتوں کے لئے کوئی تجویز نافذ کرنا بھی ممکن نہیں تھا، اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ اس طرح کی شرعی عدالتیں لندن برمنگھم، براڈفورڈ، مانچسٹر میں قائم ہیں، اس کا صدر مقام نونیٹون اور واروکشیر میں قائم ہے، جبکہ گلاسکو اور اڈبرہ میں دو عدالتوں کا قائم ہونا بھی طے ہے (دیکھئے: ویب سائٹ القدس اخبار: http://web.alqluds.com/node/10269)۔

اسی طرح ہم ان حکومتوں کو بھی سلام پیش کرتے ہیں جنہوں نے اسلامی بینکوں کے قیام کی جازت دی یا سودی بینکوں ہی میں اسلامی ونڈوز کے قیام کی اجازت دی۔

۳۔ اقلیت کے تشخص اور اس کی خصوصیتوں کی حفاظت دراصل تنوع اور رنگارنگی کی حفاظت ہے جو مطلوب ہے، لہذا کسی بھی حکومت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلم اقلیت کو ہضم کرنے اور اسے یورپی یا مغربی یا غیر اسلامی معاشرہ میں مکمل مدغم کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ اس کا مطلب ہے تعدد اور تنوع کا خاتمہ، اور یہ دراصل دین، شناخت اور تشخص کو بدلنے کی جانب ایک خطرناک قدم ہوگا۔

اس موقعہ پر ہم یہ کہتے ہیں کہ تاریخ پورے فخر، سچائی اور صراحت کے ساتھ اسلامی حکومتوں کی رواداری کا اعلان کرتی ہے، زمانہ نبوت سے لے کر آج تک کبھی کسی مسلم اقلیت کو اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی وہاں آج بھی اقلیتیں عزت کے ساتھ موجود ہیں، بلکہ جب یہودیوں کو یورپ چھوڑنا پڑا تو انہیں اسلامی ممالک کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہیں ملی، ہم مثبت شمولیت کے قائل ہیں، جو ایک مسلمان کے دین وعقیدہ کی حفاظت کی ضمانت ہے، ساتھ ہی وہ اپنے نئے وطن سے محبت، سنجیدہ محنت اور فائدہ پہونچانے کا تعلق رکھے، اور یہ چیز وطن اور اس ولاء کے درمیان ہو جو ولاء اللہ تعالی اور تمام مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے۔

سوم: حکومت اور اقلیت کے مابین مشترک حقوق:

مسلم اقلیت اور غیر اسلامی ملک کے مابین اہم مشترک حقوق جو بقاء باہم، آپسی ہم آہنگی، اجتماعی امن وآشتی، اور معاشرہ کی ترقی اور استقرار میں دونوں طرف کے کردار کا ضامن ہو حسب ذیل ہیں:

ا۔ قریب سے تعارف اور ایک دوسرے کا اعتراف، اللہ کا ارشاد ہے: ''یایها الناس إنا خلقنا کم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند الله اتقاکم'' (سورہ انعام: ۱۶۴)۔

اس آیت میں اللہ تعالی مومن اور کافر تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ وہ سب ایک اصل سے ہیں، اور یہ بات ایک دوسرے کے اعتراف کا تقاضہ کرتی ہے، ایک دوسرے سے تکبر نہیں کرنا چاہئے، بلکہ دوسرے کو بھائی سمجھنا چاہئے: ''کلکم من آدم وآدم من تراب'' تو پھر یہ تفاخر، بڑائی کا اظہار، یہ خوں ریزی اور قتل وقتال کیوں؟

اس کے بعد اللہ تعالی نے بیان فرمایا کہ اس ایک جڑ سے کئی شاخیں نکلیں، یہی اقوام اور قبائل ہیں، اور اللہ تعالی ہر قوم اور ہر قبیلہ کو چند صفات، کمالات اور خصائص کے ذریعہ ایک دوسرے سے ممتاز کیا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ ان صفات وخصائص، مذاہب وادیان کو جانا جائے، ان کے احساسات وجذبات سے واقف ہوا جائے، جب ہر ایک، ایک دوسرے سے متعارف ہوگا، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے متعارف ہوگا، ہر مذہب والے دوسرے مذہب والے سے متعارف

ہوں گے تبھی وہ حقیقی تعاون شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے جس پر باہمی ہم آہنگی کا دارومدار ہے، اور تمام خصائص وصفات وعناصر سے استفادہ ممکن ہوسکے گا، اسی وقت تہذیب مکمل ہوگی اور ترقی کی شاہراہ کو طے کرے گی۔

اس کے پیش نظر غیر مسلم حکومتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے دین، قوم اور ماحول کے اعتبار سے صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان کی خوبیوں اور اچھائیوں سے فائدہ اٹھائیں، اسی کا پاس ولحاظ مسلم اقلیت کو بھی رکھنا ضروری ہے، اس طرح کہ مسلم اقلیت مغربی ماحول، وہاں کی خصوصیات، ایجادات، تہذیب وتمدن اور اس کے طریقۂ کار کو اچھی طرح سمجھے، اور ان چیزوں سے بھرپور طریقہ سے فائدہ اٹھائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک مثبت پہلو سامنے آئے گا۔

اور وہ مسلمان جو یورپ میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ مغربی معاشرہ کے تعلق سے عمومی طور سے اپنے نظریہ کو درست رکھیں، کہ مغربی معاشرہ گرچہ لادینی ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے دین پر عمل کرنے کی راہ قطعی طور پر موجود ہے، جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی وجہ سے یورپ کے معاشرتی ڈھانچہ میں کسی نئی تبدیلی کے بغیر اسلامی ثقافتی سرگرمیوں کی اجازت دی گئی ہے، ساتھ ہی ساتھ دوسرے علاقوں پر بھی نظر رہے، جو اپنے یہاں اسلامی رجحان رکھنے والی یا مستقل اسلامی ڈھانچہ رکھنے والی تنظیم کو قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتے، اسی وجہ سے اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں سنجیدگی بہتر ہے، کیونکہ مقصود ومطلوب ایسا ٹھوس عمل ہے جو ہادی ورہنما ہو اور ایسی حکمت عملی پر قائم ہو جو مغرب کو اس کے اعتبار سے دیکھتا ہو، کسی ایک پہلو سے نہ دیکھتا ہو، اور ساتھ ہی ساتھ ایک حد تک اس کے سیاسی تنوعات سے بھی فائدہ اٹھائیں، قانونی اعتبار سے اس کے اقدار ورجحانات کو بھی دیکھیں کہ یورپ ایک علمی اور ثقافتی ترقی اور جدید ٹکنالوجی والا معاشرہ ہے، اسی طرح یہاں قائم ان دینی مراکز کو بھی دیکھیں جس کی اہمیت برابر بڑھتی جارہی ہے، اور یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ مغربی معاشرہ کے افراد کے ذہنوں میں صلیبی جنگوں اور بعد کے دور میں امریکہ اور یورپ میں ہونے والے دہشت انگیز واقعات سے اسلام کے تئیں خوف اور ڈر پیدا ہوگیا ہے، اور بعض ان شدت پسند تنظیموں کی وجہ سے جو عراق میں انتقام کے نام پر قائم ہیں، اس کی غلط شبیہ ان کے ذہنوں میں پیدا ہوگئی ہے۔

۲۔ ایک دوسرے کا تعاون کرنا نیکی اور تقوی کی بنیاد پر ہو، یا اس طریقہ پر تعاون کیا جائے جس میں تمام انسانوں کی خیرخواہی اور بھلائی مضمر ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان'' (سورۂ مائدہ: ۲)۔

چنانچہ اللہ تعالی نے واضح کردیا ہے کہ تعاون وہمدردی کی جگہ نیکی، احسان، خیرخواہی اور تقوی ہے، اور تعاون کا معاملہ کس سے کریں اور کس سے نہ کریں؟ اس کو مطلق بیان کیا ہے، کہ مسلمان کے لئے روا ہے کہ ان سبھوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کریں جہاں نیکی اور تقوی پایا جائے، اس کی کوئی تحدید نہیں فرمائی کہ کس کے ساتھ تعاون کا معاملہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعاون وخیرخواہی کی اہمیت کو بیان فرماتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں عبداللہ بن جدعان کے گھر ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا جو مجھے سو سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے، اگر زمانہ اسلام میں مجھے اس طرح کے کسی معاہدہ کے لئے بلایا جاتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا، اس معاہدہ کی نوعیت یہ تھی کہ قریش کے بڑے بڑے لیڈران نے دیکھا کہ لوگ ظلم وزیادتی کا معاملہ کررہے ہیں اور محتاج لوگ حاجت براری نہ ہونے کی وجہ سے موت کا نوالہ بن رہے ہیں، اور کمزور ولاچار انسانوں کا کوئی مددگار بھی نہیں ہے، ان حالات کو دیکھ کر زعمائے قریش کی رگ حمیت بھڑک اٹھی، اور وہ ''حلف الفضول'' کے لئے جمع ہوئے اور یہ معاہدہ کیا کہ ہم کمزوروں کی مدد کریں گے، فریادیوں کی فریاد سنیں گے، مہمانوں کی مہمان نوازی کریں گے، اور اس طرح مکارم اخلاق کے قبیل کے کام کریں گے۔

مسلم اقلیت کے لئے قرآن وسیرت کے یہ دونوں نمونے موجود ہیں، جو ہمیشہ بطور نمونہ ومثال باقی رہیں گے۔

قرآن وسنت میں مسلم اقلیت کے لئے دو نمونے:

جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ان مسلمانوں کے لئے جو کسی ضرورت اور خاص حالات کے سبب کسی غیر اسلامی سوسائٹی میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے، کتنا عمدہ اور قیمتی نمونہ موجود ہے، ان نمونوں میں سے ایک نمونہ ہمارے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات وشخصیت کا ہے اور دوسرا نمونہ جو سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک بڑی تعداد جو مرد وخواتین پر مشتمل تھی حبشہ ہجرت کی اور وہاں امن وسکون اور اطمینان وخوشی کے ساتھ رہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں مثالوں کو ذرا تحلیل وتجزیہ کے ساتھ ساتھ مختصراً بیان کریں۔

پہلا نمونہ: مصر میں اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام کا نمونہ

قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ہمارے موضوع سے متعلق اس کی کچھ باتیں یہاں بیان کی جارہی ہیں:

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں اخلاق وکردار اور دین وعقیدہ کی حفاظت کے ساتھ ایک مثالی زندگی گزاری، وہ نفسانی لذت اور خواہشات سے دور رہے، باوجودیکہ عزیز مصر کی بیوی اور دیگر عورتوں کی طرف سے گناہ کے ارتکاب کے لئے ان پر زبردست دباؤ ڈالا گیا، پھر معاملہ یہاں تک پہونچ گیا جس کو قرآن شریف میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''...وغلقت الأبواب وقالت هيت لك قال معاذ الله إنه ربي أحسن مثواي إنه لا يفلح الظالمون'' (سورہ یوسف: ۲۳)۔(اس عورت نے جس کے گھر میں حضرت یوسف تھے، دروازہ بند کر کے ان سے کہنے لگی تو آجاؤ تو حضرت یوسف نے کہا اللہ کی پناہ! وہ میرا رب ہے، مجھے اس نے بہت اچھی طرح رکھا ہے، بلاشبہ ظلم کرنے والوں کا بھلا نہیں ہوتا)۔

اسی طرح حضرت یوسف نے اپنے کردار کی حفاظت کی خاطر بہت سی قربانیاں دی ہیں، حتی کہ اس کردار کے تحفظ کی خاطر کئی سالوں تک قید وبند کی زندگی گزاری ہے۔

چنانچہ مسلم اقلیت کو چاہئے کہ وہ اپنے دین وعقیدہ اور اخلاق وکردار کی حفاظت میں حضرت یوسف کو اپنا آئیڈیل اور نمونہ بنائیں، اس مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی مادی، روحانی، تربیتی اور عملی اسباب وذرائع اختیار کئے جائیں، تب ہی اپنے تشخص کی حفاظت کی جاسکتی ہے، ورنہ دنیوی مقصد چاہے جتنا عظیم اور بڑا ہو، اگر دین وکردار کی پامالی ہورہی ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی، حضرت یوسفؑ کے اس نکتہ کو قرآن شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''رب السجن أحب إلى مما تدعونني إليه'' (سورہ یوسف: ۳۳)۔اے میرے پروردگار! جس گناہ کی دعوت یہ عورتیں مجھے دے رہی ہیں اس کے مقابلہ میں مجھے جیل خانہ بہت پسند ہے۔

اس جگہ لفظ "السجن" مطلق بیان کیا گیا ہے، وقت کی کوئی قید نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی معصیت جو اللہ کے عتاب اور ناراضگی کا سبب ہو اس سے بچنے کے لئے تمام عمر کی قید وبند برداشت کرنا بہتر اور لائق تحسین ہے، کفر وشرک اور الحاد ودہریت اختیار کرنا اور اس رنگ اور سانچہ میں ڈھلنا تو بہت دور کی بات ہے۔

(۲) احسان کرنے والوں کے ساتھ وفاداری کرنا، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، عزیز مصر نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا تو اس وقت اپنی بیوی سے کہا کہ: "أكرمي مثواه عسى أن ينفعنا أو نتخذه ولدا" (سورہ یوسف: ۲۱)۔''اسے بہت عزت واحترام کے ساتھ رکھو، بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہونچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں''

اللہ تعالی کے خوف وڈر کے بعد یہی وفاداری ان کے پیش نظر تھی، جس کی وجہ سے انہوں نے عزیز مصر کی بیوی کی درخواست کو رد کردیا، حضرت یوسف نے کہا: ''إنه ربي أحسن مثواي'' (سورہ یوسف: ۲۳)۔''وہ میرا رب ہے، مجھے اس نے بہت اچھی طرح رکھا ہے''

بعض مفسرین نے "انہ" کی ضمیر کا مرجع قرینۂ حال مان کر عزیز مصر کو قرار دیا ہے، اگر اس کا مرجع اللہ تعالی کو قرار دیا جائے تو بھی درست ہے، کیونکہ آیت کا تکملہ اسی پر دلالت کررہا ہے، ارشاد ہے: "إنه لا يفلح الظالمون" (سورہ یوسف: ۲۳)۔

(۳) شہریوں پر عدم تشدد: اگر مہاجرین، اقلیت یا مسلم ملکوں پر ارکان مملکت اور حکام وقت میں سے کسی کی طرف سے استعمار کے ذریعہ ظلم وتشدد کیا جائے، تو ظلم کا مقابلہ ظلم سے نہیں ہوتا، عزیز مصر کی بیوی نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ گناہ کے ارتکاب کی کوشش کی تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: "إنه لا يفلح الظالمون" (سورہ یوسف: ۲۳) کہ بیشک ناانصافی اور ظلم وتشدد کرنے والوں کا بھلا نہیں ہوتا۔

اس آیت میں بعض مسلم مہاجرین کی زبردست تردید ہے جو یورپی ممالک اور امریکہ کے مال میں زیادتی کو جائز قرار دیتے ہیں، اس دلیل کی بنیاد پر کہ یہ ایسے استعماری ممالک ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے مال کو غصب کر رکھا ہے، لہذا یہ ان کے غصب کرنے کے عوض ہوگا، یہ استدلال کمزور اور شریعت کے منافی ہے، اس تشدد اور ظلم کا سیدھا جواب یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا ظلم ہے، اس کے دلائل بہت سے ہیں، بعض اوپر ذکر کئے جاچکے ہیں، ان میں ایک یہ آیت بھی ہے: "ولا تزر وازرة وزر أخرى" (سورہ انعام: ۱۶۴)، دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ مسلمان ان مظلوم مسلمانوں کے نمائندہ نہیں ہیں۔

(۴) توطن: جس ملک میں بھی بود وباش اختیار کی جائے اس کو اپنا ملک سمجھا جائے اور اس سے محبت کی جائے، غور فرمایئے کہ جب مصر میں ان عورتوں کی جانب سے یوسف علیہ السلام کا جینا دوبھر ہوگیا تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہاں سے نکل جانا بہتر ہے، اس گناہ سے جس کی دعوت یہ عورتیں دے رہی ہیں، بلکہ

فرمایا: "رب السجن أحب إلي مما يدعونني إليه" (سورہ یوسف: ۳۳)۔ (اے میرے پروردگار! جس گناہ کی دعوت یہ عورتیں مجھے دے رہی ہیں اس کے مقابلہ تو مجھے جیل خانہ ہی زیادہ پسند ہے)۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مصر کو اپنا وطن سمجھتے تھے، اسی لئے انہوں نے مصر سے نکل جانے کے بجائے وہیں جیل میں رہنے کو ترجیح دی، بلکہ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ انہیں مصر کا وزیر خزانہ بنادیا جائے، تاکہ وہ اپنے عوام کی خدمت اور مدد کرسکیں، بلکہ انہوں نے اپنے والدین اور تمام بھائیوں کو مصر بلالیا، باوجودیکہ اہل مصر حضرت ابراہیم کے مذہب کے پیروکار نہیں تھے۔

(۵) اچھے اسلوب وانداز اور حکمت ودانشمندی کے ساتھ دعوت کا کام انجام دینا: حضرت یوسف علیہ السلام نے مشکل ترین حالات میں بھی فریضۂ دعوت کو ترک نہیں کیا، ذرا اندازہ کیجئے وہ کتنے بے بس تھے، ان کو ظلماً بیچا گیا، پھر غلام بنا کر رکھا گیا، ابتداء میں ان کی سماجی حالت بھی کس قدر کمزور تھی، اس کے باوجود دعوتی مشن کو قید خانہ میں بھی ترک نہیں کیا، بلکہ قید خانہ کا زمانۂ قیام ان کی کامیابیوں کا پیش خیمہ بنا اور بے انتہا مفید اور ثمر آور ثابت ہوا، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے دو قیدی ساتھیوں نے ایک شب عجیب وغریب خواب دیکھا جس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ کے فضل وکرم سے بتانے کا وعدہ کیا اور اسی بہانے دین ابراہیمی کی تعبیر وتشریح، اس کی خصوصیت اور شرک سے اس کی بیزاری وغیرہ ان کے سامنے بیان کی، اور شرک کے خطرناک انجام، معبودان باطل کی بے توقیری اور بے بسی کو بھی بیان کیا، اور یہ بتایا کہ حکومت وسرداری اور عبادت کے لائق بس ایک اللہ کی ذات ہے جس کا شریک وسہیم کوئی اور نہیں ہے، اس کے بعد ان دونوں کو خواب کی تعبیر بتائی (سورہ یوسف: ۳۶)۔

بعینہ اسی طرح مسلم اقلیت کو چاہیے کہ وہ حکمت ودانشمندی اور بہتر اسلوب میں غیر مسلموں کو دعوت دیں، اس لئے کہ دعوت کا کام تمام مسلمانوں پر حسب استطاعت ضروری ہے، چاہے ایک ہی آیت کیوں نہ ہو، حدیث شریف میں ہے: "بلغوا عني ولو آية" (صحيح البخاري) "میری طرف سے پہونچادو اگر چہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو" بلکہ اللہ تبارک وتعالی نے داعی الی اللہ کو کامیاب وکامران قرار دیا ہے: "ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر وأولئك هم المفلحون" (سورہ آل عمران: ۱۰۴)۔ (تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے، اور یہی لوگ فلاح ونجات پانے والے ہیں)۔

(۶) غیر مسلم (کفار) سب کے سب برابر نہیں ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو دنیوی معاملات میں انصاف پسند، صاف دل اور اچھے کردار کے حامل ہیں، کچھ ایسے ہیں جو اپنے ہی ملک میں مسلمان کو اپنے لئے بطور حاکم تسلیم کرتے ہیں، پھر یہی مسلم حاکم ان کو اچھی تنخواہ اور ملازمت دیتا ہے، اور کچھ لوگ اس کے بالکل برعکس ہیں، تو سب پر ایک ہی حکم لگانا صحیح نہیں ہے چنانچہ عزیز مصر عدل وانصاف اور باہمی معاملات میں بہت اچھے تھے، اس نے شروع ہی میں اپنی بیوی سے کہا تھا: "اكرمي مثواه" (سورہ یوسف: ۲۱) اور جب اس نے اپنے اہل خانہ میں سے ایک گواہ کی موجودگی میں حضرت یوسف اور اپنی بیوی کو دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس وقت اس نے معذرت کے انداز میں کہا: "يوسف اعرض عن هذا" (سورہ یوسف: ۲۹) اور اپنی بیوی سے کہا: "واستغفري لذنبك" (سورہ یوسف: ۲۹) کہ "اے عورت! تو اپنے گناہ سے توبہ کر" اور اس نے اپنی بیوی کی اس بات کو ماننے سے انکار کردیا جب اس نے کہا کہ: "ما جزاء من أراد بأهلك سوءا إلا أن يسجن أو عذاب أليم" (سورہ یوسف: ۲۵)۔ (جو شخص تیری بیوی کے ساتھ برا ارادہ کرے اس کی سزا بس یہی ہے کہ اسے قید کردیا جائے یا اور کوئی دردناک سزا دی جائے)۔

بلکہ عزیز مصر نے اس پر زبردست پھٹکار لگائی اور اس کے اس کرتوت کو سراسر سازش قرار دیا، قرآن مجید اس کو بیان کرتا ہے: "فلما رأى قميصه قد من دبر قال إنه من كيدكن إن كيدكن عظيم يوسف أعرض عن هذا واستغفري لذنبك إنك كنت من الخاطئين" (سورہ یوسف: ۲۸)۔ (خاوند نے جو دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیٹھ کی جانب سے پھاڑا گیا ہے تو صاف کہہ دیا کہ یہ تم عورتوں کی طرف سے چالبازی ہے بیشک تمہاری چالبازی بہت بڑی ہے، یوسف! اس بات کو جانے دو اور اے عورت تو اپنے گناہ سے توبہ کر، بیشک تو ہی قصوروار ہے)۔

یہ سچ ہے کہ اگر بعینہ ایسا واقعہ آج کی تاریخ میں کسی ظالم وجابر بادشاہ کے ساتھ پیش آجاتا تو وہ یوسف کو اپنی عزت وشرف کی خاطر ہلاک کرڈالتا یا پھر ان کو پھانسی کی سزا سنائی جاتی یا کوئی اور دردناک سزا کا مژدہ سنایا جاتا، اور وہ اپنی بیوی کو ایک اجنبی کے سامنے درست قرار دے دیتا، لیکن عزیز مصر کی خودداری اور جاہ وحشمت نے انہیں کوئی غلط فیصلہ پر آمادہ نہیں کیا اور انہوں نے اپنی بیوی کو سچا ماننے سے انکار کردیا، بلکہ اس مسئلہ میں انہوں نے ایک گواہ کی بات بغور سنی اور اسے

درست مانتے ہوئے اپنی بیوی کو مجرم قرار دیا اور اس کے اس کرتوت کو زبردست سازش سے تعبیر کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے معافی مانگتے ہوئے کہا "یوسف! اب اس بات کو جانے دو"۔"أعرض عن هذا" (سورہ یوسف:۲۹)۔

اس دنیا میں اس طرح کے بھی صاف دل، صاف ذہن، دوراندیش اور اعلیٰ کردار کے حامل بادشاہ ہوتے ہیں جو اپنے عوام کی ترجیحات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور علم اور اہل علم کی خوبیوں، ان کے کارناموں اور ان کے مقام ومرتبہ کو فراموش نہیں کرتے ہیں، حضرت یوسف نے جب اس کے خواب کی تعبیر بتادی اور اس کے نمائندہ کو یہ کہتے ہوئے پوری تفصیل بتادی: "تزرعون سبع سنين دأبا فما حصدتم فذوره في سنبله إلا قليلا مما تأكلون" (سورہ یوسف:۴۷)۔(تم لوگ سات سال تک پے درپے حسب عادت غلہ بویا کرنا اور فصل کاٹ کر اسے بالیوں سمیت ہی رہنے دینا، سوائے اپنے کھانے کی تھوڑی سی مقدار کے)۔

لیکن ان کی زبانی سننے کے لئے بادشاہ نے انہیں طلب کیا، اگر واقعہ ہمارے اس زمانہ کا ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ بادشاہ اس تعبیر کو اپنی طرف منسوب کرلیتا اور اس اجنبی بے خانماں ملزم اور بے قصور قیدی کے اس مرتبہ کا قائل نہ ہوتا، کہ کیسے وہ ایک اجنبی اور غلام شخص کی بات مان لیتا اور مقام ومرتبہ کو اس کی طرف منسوب کرتا، ہم آج دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی امیر و وزیر ہیں جو عمدہ افکار و خیالات اپنے مشیر کار سے لیتے ہیں، لیکن اس کی نسبت اپنی جانب کرتے ہیں۔

جب یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے پاس جانے کی درخواست یہ کہتے ہوئے رد کردیا کہ ان عورتوں کے ساتھ غیر جانبدارانہ تحقیق ہونی چاہئے جو ان کے جیل جانے کا سبب بنی ہیں، اس وقت بھی بادشاہ کی عظمت اور شان وشوکت نے اس کو کسی غلط فیصلہ پر آمادہ نہیں کیا، بلکہ بخوشی اس درخواست کو قبول کرلی اور غیر جانبدارانہ تحقیق کے بعد یوسف کو بے قصور قرار دیا۔

پھر اس کے بعد بادشاہ نے ان کو یہ کہتے ہوئے طلب کیا کہ وہ انہیں اپنا مشیر اور رازداں بنانا چاہتا ہے: "ائتوني به استخلصه لنفسي" (سورہ یوسف:۵۴) "اسے میرے پاس لاؤ کہ میں اسے اپنے خاص کاموں کیلئے مقرر کرلوں" لیکن جب ان سے بات چیت کی تو اسے محسوس ہوا کہ یوسف تو نظیر پیش کرنے، تجزیہ اور تنفید کے معاملہ میں بلند مرتبہ کے حامل ہیں، تو اس نے یوسف علیہ السلام سے کہا: "إنك اليوم لدينا مكين أمين" (سورہ یوسف:۵۴) یعنی آپ کو جو علم اور امانت کی دولت حاصل ہے اس کی وجہ سے قیادت اور تنفیذ کا جو عہدہ چاہیں وہ آپ کے لئے ہے، اس وقت حضرت یوسف نے اپنے لئے ایک مناسب عہدہ کا اظہار کیا، فرمایا: "اجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم" (سورہ یوسف:۵۵) "آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کردیجئے، میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں" یہ عہدہ آج کے لحاظ سے چار وزارتوں پر مشتمل تھا: وزارت مالیات، وزارت زراعت وکاشتکاری، وزارت تجارت واقتصادیات اور وزارت اجتماعی امور وترقی، اس خواب کے ایک اور پہلو پر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کافر بادشاہ کو بالکل سچا اور حقیقی خواب دکھایا جو اس بات پر دلیل ہے کہ کافر بھی صاف دل ودماغ ہوتے ہیں، چنانچہ ان کے خواب سچے ہوسکتے ہیں۔

(۷) اقلیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بڑی وزارتوں اور عہدہ ومناصب کو اختیار کرے، یہ بحث ابھی اوپر گزری ہے۔

(۸) مسلمان خواہ کہیں بھی ہو وہ زندگی کی تعمیر وترقی کا مکلف اور ذمہ دار ہے، نہ کہ قتل وغارت گری اور تخریب کاری کا، حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک ایسی عوام کے لئے جو مسلمان نہیں تھے ان کی تعمیر وترقی کے لئے کام سرانجام دیا، انہیں بھوک مری، قحط سالی اور ہلاکت سے بچایا اور ان کے سامنے اپنے افکار کو پیش کیا، بلکہ وحی والہام اور نبوت کی برکت عطا کی، جس کے ذریعہ انہیں ہلاکت سے نجات ملی، لہذا مسلم اقلیت کو چاہئے کہ اپنے وطن کی تعمیر وترقی کے لئے تمام قسم کے علوم وایجادات اور گراں قدر خدمات پیش کریں، حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ایسا ہی کیا تھا جب انہوں نے مصر اور اس کے پڑوسی ممالک جو قحط سالی اور مشکلات سے جوجھ رہے تھے اور قریب تھا کہ سب کے سب تباہ وبرباد ہوجائیں تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے علم وہنر کی روشنی میں ایک جامع اور مکمل لائحہ عمل تیار کیا اور اسے عملی طور پر نافذ کیا جس سے لوگوں کی پریشانیاں ختم ہوگئیں۔

(۹) مادر وطن کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے، اس کی محبت اور جذبات کو ہمیشہ دل میں زندہ رکھنا چاہئے اور وہاں کے باشندوں کو حسب استطاعت اپنی خدمات پیش کرتے رہنا چاہئے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ایسا کیا تھا، انہوں نے اپنے بھائیوں کا تعاون کیا تھا اور ان کی خدمت میں اشیاء خوردنی اور مزید کچھ سامان تحفتاً پیش کیا تھا، بلکہ انہوں نے اپنے تمام بھائیوں اور والدین سے درخواست کی تھی کہ وہ مصر تشریف لائیں: "وقال ادخلوا مصر إن شاء الله آمنين" (سورہ یوسف:۹۹)۔

(۱۰) اگر ہم وطنوں کی طرف سے بدسلوکی ہوئی ہو تو اس کو بھلا دینا چاہئے، انتقام کے جذبہ سے خالی ہوکر زندگی گزارنا چاہئے۔

مسلم مہاجر کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے باشندوں کی زیادتی کو برداشت کریں، خواہ عوام کی طرف سے زیادتی ہو یا حکام کی طرف سے، جبکہ اللہ تعالی انہیں ایک دوسرا وطن بھی عطا کر چکا ہے، چنانچہ انتقام کے جذبہ کے ساتھ نہیں زندگی گزارنا چاہیے، اور ملک کی منفی چیزوں کو ساتھ نہیں لے جانا چاہیے، اس لئے کہ اب وطن بدل چکا ہے، حضرت یوسفؑ نے بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا، جنہوں نے حضرت یوسف کو قتل کرنے کی کوشش کی اور کنواں میں ڈالنے کی تدبیر کی تھی، کہ یہی واقعہ ان کی فروختگی، ان کی غلامی اور ان کی عزت وآبرو کے لئے چیلنج بن گیا تھا، پھر ان بھائیوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد بھی ان کے دل حسد و بغض سے بھرے رہے، اس کا اظہار اس وقت ہوا جب بادشاہ کا پیالہ ان کے سگے بھائی بنیامین کے پاس ملا تو اس وقت انہوں نے اپنے اس پوشیدہ بغض وعناد کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "قالوا إن يسرق فقد سرق أخ له من قبل فأسرها يوسف في نفسه ولم يبدها لهم" (سورہ یوسف: ۷۷) اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس کا بھائی بھی پہلے چوری کر چکا ہے، یوسف علیہ السلام نے اس بات کو اپنے دل میں رکھ لیا اور ان کے سامنے بالکل ظاہر نہ کیا۔

یہ جھوٹ ان کے کینہ وحسد، بغض وعناد اور حضرت یوسف سے بے انتہا نفرت پر صاف دلالت کر رہی ہے، ان سب کے باوجود حضرت یوسف نے اس کا بدلہ نہیں لیا، بلکہ اس کے جواب میں ان کو اشرار کہنے کے بجائے صرف انکی جانب 'شر' کی نسبت کی اور کہا: "انتم شر مكانا والله اعلم بما تصفون" (سورہ یوسف: ۷۷) یہاں تک کہ اس وقت حضرت یوسف کے لئے ممکن تھا کہ ان کی اس چوری کو ثابت کر دیتے، یا ثبوت کے بغیر ان کو سزا دیتے، لیکن آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا، لیکن جب تاریکی چھٹ گئی اور یہ راز ان پر منکشف ہو گیا اور ان کے بھائیوں کو کافی شرمندگی اور پشیمانی ہوئی، اس وقت بھی حضرت یوسف نے ان کے ساتھ مالی اور قلبی ہر طرح کا بہترین سلوک کیا اور کہا:

"قال هل علمتم ما فعلتم بيوسف وأخيه إذ أنتم جاهلون. قالوا إنك لأنت يوسف قال انا يوسف وهذا أخي قد من الله علينا إنه من يتق و يصبر فإن الله لا يضيع أجر المحسنين قالوا تالله لقد آثرك الله علينا و إن كنا لخاطئين قال لا تثريب عليكم اليوم يغفر الله لكم وهو أرحم الراحمين اذهبوا بقميصي هذا فألقوه على وجه أبي يأت بصيرا وآتوني بأهلكم أجمعين" (سورہ یوسف: ۸۹-۹۳)۔ "اے بھائیو! تم جانتے بھی ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ اپنی نادانی کی حالت میں کیا کیا؟ انہوں نے کہا (واقعی) تو ہی یوسف ہے، جواب دیا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، اللہ نے ہم پر فضل وکرم کیا، بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیزگاری اور صبر کرے گا اللہ تعالی کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں کرتا، انہوں نے کہا کہ اللہ کی قسم! اللہ تعالی نے تم کو ہم پر برتری دی ہے اور یہ بھی بالکل سچ ہے کہ ہم خطاکار تھے، جواب دیا آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، اللہ تمہیں بخشے، وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے، میرا یہ کرتا لے جاؤ اور اسے میرے والد کے منہ پر ڈال دو کہ وہ دیکھنے لگیں اور اپنے تمام خاندان کو میرے پاس لے آؤ"۔

آیت بالا سے مندرجہ ذیل نقاط واضح ہوتے ہیں:

(۱) حضرت یوسف نے ان کے اس کرتوت کو جہالت ونادانی قرار دیا اور یہ نہ کہا کہ تم لوگوں نے عمداً وقصداً ایسا کیا، جبکہ یوسف علیہ السلام اس بات کو اچھی طرح سے جان رہے تھے: "قال هل علمتم ما فعلتم بيوسف وأخيه إذ أنتم جاهلون" (سورہ یوسف: ۸۹)۔ انہوں نے فرمایا: اے بھائیو! تم جانتے بھی ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ اپنی نادانی میں کیا کیا؟

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کیا اور یہ نہ کہا کہ تم لوگوں نے جو میرے ساتھ کیا وہ کافی تکلیف دہ اور دردناک واقعہ تھا، بلکہ فرمایا: "انا يوسف وهذا أخي قد من الله علينا إنه من يتق ويصبر فإن الله لا يضيع أجر المحسنين" (سورہ یوسف ۹۰)۔ ہاں میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے، اللہ نے مجھ پر فضل وکرم کیا ہے، بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیزگاری اور صبر اختیار کرے تو اللہ تعالی کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے (سورہ یوسف: ۹۲)۔

اس انداز گفتگو کا مقصد حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کی شرمندگی کو ختم کرنا اور انہیں یہ بتانا تھا کہ جو کچھ تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا ہے اس سے مجھے بڑا فائدہ ملا اور آج اسی کی بدولت میں ارض مصر پر فرمانروائی کر رہا ہوں۔

(۳) حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں پر ملامت کرنے کے بجائے ان سے یہ کہا: "لا تثريب عليكم اليوم" (سورہ یوسف: ۹۲) آج تم سب کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، یعنی ہماری طرف سے تم کو کوئی لعنت وملامت نہیں ہے، حالانکہ وہ وقت گناہ عظیم سے مغفرت کا تھا، گویا ان کی طرف سے نفسیاتی تکلیف کو کم

کرنا تھا کہ کوئی اہم بات نہیں ہے، کوئی لعنت وملامت نہیں۔

(۴) حضرت یوسف کا کہنا: "یغفر اللہ لکم" (سورہ یوسف:۹۲) دراصل حضرت یوسف کی اپنے بھائیوں سے محبت کو بتاتا ہے کہ انہوں اللہ تبارک وتعالی سے دعا کی، اور یہ بتاتا ہے کہ معاملہ اللہ تعالی کے سامنے ہے، اس لئے میں اللہ سے تمہاری مغفرت چاہتا ہوں، اور اللہ تعالی ارحم الراحمین ہے، لہذا وہ تمہاری مغفرت فرمادیں گے۔

(۵) ان کے اس قول: "هو أرحم الراحمين" (سورہ یوسف:۹۲) میں یہ اشارہ ہے میں تمہارے ساتھ شفقت ورحم کا معاملہ کررہا ہوں تو وہ جوارحم الرحمین ہے وہ ضرور تم سب کو معاف کردیگا۔

(۶) ان کے والدین اور بھائیوں کے عرش کے سامنے جھکنے (سجدہ تعظیمی) کے بعد اللہ کا یہ ارشاد: ''هذا تأويل رؤياء من قبل قد جعلها ربي حقا وقد أحسن بي إذ أخرجني من السجن وجاء بكم من البدو من بعد ان نزغ الشيطان بيني وبين إخوتي إن ربي لطيف لما يشاء إنه هو العليم الحكيم'' (سورہ یوسف:۱۰۰)۔

''اباجان! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے، میرے رب نے اسے سچا کردکھایا، اس نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا جبکہ مجھے جیل خانہ سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحراء سے لے آیا، اس اختلاف کے بعد جو شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں ڈالا دیا تھا، میرا رب جو چاہے اس کے لئے بڑی تدبیر کرنے والا ہے اور وہ، بہت علم حکمت والا ہے''۔

اپنے پہلو میں متعدد سہولتیں رکھتا ہے، بلکہ اپنے بھائیوں کے لئے دل داریاں کرتا ہے، اور اس سے آگے بڑھ کر ذیل کے نکات کی روشنی میں شکر وامتنان کو ضروری قرار دیتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

الف۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پورے واقعہ کے ذریعہ انجام کو بتایا اور ان کے لئے اور تمام بھائیوں کے جو خیر حاصل ہوا صرف اسی کو بتایا، اور اس سلسلہ میں جو مصائب وآلام اٹھائے ان کو بیان نہیں کیا۔

ب۔ انہوں اس پورے واقعہ کی نسبت اپنے خواب کی تعبیر کی طرف کی جسے اللہ تعالی نے سچ کردکھایا تھا، فرمایا: "هذا تاويل رؤياي من قبل قد جعلها ربي حقا" (سورہ یوسف:۱۰۰) اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالی کی تدبیر اور حکمت کی وجہ سے ہی یہ بلند مقام حاصل ہوا ہے۔

ج۔ انہوں نے اچھے نتائج کو بیان کیا اور اللہ کے شکر واحسان کو ذکر کیا، فرمایا: "وقد أحسن بي إذ أخرجني من السجن وجاء بكم من البدو" (سورہ یوسف:۱۰۰) گویا ماضی کی تلخ یادوں کی طرف نہیں گئے، بلکہ جیل سے نکلنے اور اور مصر کی فرمانروائی جیسی نعمتوں کا تذکرہ کیا۔

د۔ اپنے بھائیوں کی طرف سے جو کچھ ہوا اس کی نسبت شیطان کے فریب اور چالبازی کی طرف کی: "من بعد ان نزغ الشيطان بيني وبين إخوتي" (سورہ یوسف:۱۰۰)۔

ہ۔ اپنے بھائیوں سے پہلے اپنی طرف نزغ شیطان کی نسبت کی، حالانکہ وہ چھوٹے تھے، گویا اس کے ذریعہ یہ بتانا تھا کہ سب لوگ شیطان کے فریب کے شکار ہوئے۔

و۔ لفظ "إخوتي" اضافت کے ساتھ استعمال کیا، عربی میں نسبت اس وقت کی جاتی ہے جب کسی چیز سے اپنے بے پناہ تعلق ومحبت اور غایت درجہ جذبات کا اظہار مقصود ہو۔

پوری دنیا کی مسلم اقلیات کے لئے حضرت یوسف کا نمونہ اسوہ اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ کہ جس وطن میں قیام پذیر ہو اور وطن اول جہاں پریشانیاں برداشت کرنی پڑی، ان دونوں سے معاملہ اور سلوک حضرت یوسف کی طرح کرنا چاہیے، خدا کی قسم اگر ہمارا سلوک حضرت یوسف کی طرح ہوجائے تو دنیا کا بڑا حصہ دائرہ اسلام میں داخل ہوجائے، جیسے مسلم تجار کے اخلاق، حسن سلوک، اور ان کی دعوتی کوششوں کے نتیجہ میں مشرقی ایشیا کی قومیں مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

دوسرا نمونہ: حبشہ کے مہاجرین:

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب قریش نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ المکرمہ میں جینا دوبھر کردیا اور ان پر ظلم وستم کی انتہا کردی تو اس وقت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کمزور مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دی، تاریخ ابن کثیر میں ہے کہ جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی حالت زار نہ دیکھی گئی، آپ اللہ تعالی کی طرف سے عافیت میں تھے، اور اپنے چچا ابوطالب کی وجہ سے بھی راحت تھی، لیکن صورت حال یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب پر ہونے والے ظلم کو نہیں روک سکتے تھے، چنانچہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مسلمانوں سے فرمایا کہ تم لوگ حبشہ چلے جاؤ بہتر ہوگا، کیونکہ وہاں کا بادشاہ نیک اور صالح ہے، وہ ظلم وتشدد کو سخت ناپسند کرتا ہے، وہ سرزمین صدق وصفا کی علامت ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالی اس پریشانی کا حل پیدا فرمادے، یہ سنتے ہی اکثر مسلمان فتنہ کو چھوڑ کر اپنے دین کے ساتھ ارض حبشہ ہجرت کر گئے، تاریخ اسلامی کی یہ سب سے پہلی ہجرت تھی، اولین مہاجرین میں حضرت عثمان بن عفان اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نام آتا ہے (البدایہ والنہایہ، ج ۴، ص: ۱۶۶) پھر حضرت جعفر بن ابی طالب نے اپنی زوجہ اسماء بنت عمیس کے ساتھ ہجرت کی، اس وقت حضرت اسماء بنت عمیس حمل سے تھیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن جعفر وہیں حبشہ میں پیدا ہوئے، اس کے بعد مسلمان پے در پے ارض حبشہ ہجرت کرنے لگے اور اس طرح حبشہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جا بسی (تفصیل کے لئے دیکھئے: سیرت ابن اسحاق، ص: ۲۰۸، سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۲۳)۔

حضرت امام احمد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی سند سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سب کو نجاشی کے پاس بھیج دیا، اس وقت ہم لوگوں کی کل تعداد اسی تھی، جس میں عبداللہ بن مسعود، حضرت جعفر، حضرت عبداللہ بن عرفطہ، حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت موسی رضی اللہ عنہم اجمعین شامل تھے، یہ لوگ نجاشی کے پاس آئے، دوسری طرف قریش نے عمرو بن العاص اور عمارة بن الولید کو پیش قیمت تحفہ وتحائف لے کر نجاشی کے پاس بھیجا، یہ سب نجاشی کے پاس سجدہ تعظیمی کرتے ہوئے دربار میں داخل ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے چچا کی اولاد میں سے کچھ سر پھرے نوجوان اپنے مذہب وملت کو چھوڑ کر یہاں آپ کے پاس قیام پذیر ہیں، نجاشی نے پوچھا وہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا: آپ کی سرزمین میں، انہیں ہمارے پاس دوبارہ واپس کر دیجئے، بادشاہ نجاشی نے ان سب کو بلوایا، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا آج میں آپ لوگوں کا ترجمان ہوں، آپ لوگ میری اتباع کریں، چنانچہ وہ لوگ سلام کرتے ہوئے داخل ہوئے، انہوں نے سجدہ نہیں کیا، درباریوں نے اعتراض کیا کہ انہوں نے بادشاہ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ اس پر حضرت جعفر نے کہا کہ ہم لوگ ایک اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے ہیں، ان لوگوں نے کہا یہ کیا ہے؟ حضرت جعفر نے کہا: اللہ تعالی نے ہمارے پاس رسول بھیجا، اس نے ہمیں بتایا کہ ہم صرف اللہ کو سجدہ کریں، نیز اس نے حکم دیا کہ نماز ادا کریں اور زکوۃ دیں، اس پر عمرو بول پڑے کہ بادشاہ سلامت! یہ لوگ تو عیسی بن مریم کے بارے میں آپ کے خلاف رائے رکھتے ہیں، بادشاہ نے پوچھا تم لوگ عیسی بن مریم اور ان کی ماں کی شان میں کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم وہی کہتے ہیں جو اللہ تعالی نے کہا ہے کہ عیسی بن مریم اس کا کلمہ اور اس کی روح ہیں جو اس نے مریم میں ڈالا تھا، مریم کو کسی انسان نے نہیں چھوا تھا، یہ سنتے ہی بادشاہ نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے حبشہ والو، اے راہبو! خدا کی قسم ان کا عقیدہ حضرت عیسی کے سلسلہ میں بعینہ وہی ہے جو ہمارا عقیدہ ہے، تم لوگ اور تمہارے نبی بڑے مبارک لوگ ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں، ان کے سلسلہ میں میں نے انجیل میں پڑھا ہے اور عیسی مسیح نے ان کی بشارت بھی دی ہے، اس ملک میں تم جہاں چاہو وہاں رہو، خدا کی قسم اگر میرے پاس ملک کی یہ ساری ذمہ داریاں نہ ہوتی تو میں ان کے پاس سفر کر کے جاتا اور ان کی جوتی اٹھانے کو اپنے لئے باعث شرف سمجھتا، اس کے بعد ان دونوں کے تحفہ کو واپس کر دیا، پھر حضرت عبداللہ بن مسعود نے جلدی کی یہاں تک کہ بدر میں شریک ہوئے، ان کا خیال ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نجاشی کے انتقال کی خبر پہونچی تو آپ نے ان کے حق میں استغفار کیا، ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند قوی ہے، بہتر ہے، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ سے حبشہ ہجرت کرنے والوں میں ابوموسی بھی شامل ہیں، گرچہ بعض راویوں نے ان کا نام ذکر نہیں کیا ہے (مسند احمد ۱/۴۶۱)۔

اس موقعہ پر ہم حبشہ کی جنگ اور اس بارے میں صحابہ کرام کا موقف بھی بیان کرنا چاہتے ہیں، حضرت ام سلمہؓ جوان مہاجرین میں شامل ہیں، بیان کرتی ہیں کہ ہم لوگ بہتر سرزمین میں اچھے پڑوسی کی طرح رہتے تھے، کچھ ہی عرصہ گزرا کہ حبشہ ہی کے ایک شخص نے بادشاہ حبشہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، اس واقعہ سے ہم لوگوں کو جو تکلیف پہونچی وہ بیان سے باہر ہے، ہمیں یہ خوف تھا کہ کہیں وہ بادشاہ پر غالب نہ ہو جائے اور اس طرح کوئی ایسا بادشاہ نہ آئے جو ہمارے حقوق کا اتنا لحاظ نہ کرے جتنا یہ بادشاہ کرتے ہیں، چنانچہ ہم لوگ اللہ تعالی سے دعا کرتے تھے اور بادشاہ کی نصرت طلب کرتے تھے، ایک بار وہ باغی غصہ کی حالت میں نکلا، صحابہ نے ایک دوسرے سے کہا کہ اس واقعہ کو دیکھنے کون جائے گا، تا کہ معلوم ہو سکے کہ کون غالب آتا ہے، حضرت زبیرؓ ان میں سب سے چھوٹے تھے، انہوں نے کہا میں جاؤں گا، چنانچہ ایک مشکیزہ میں سوراخ کیا گیا، جس کو انہوں نے اپنے گلے میں باندھ لیا، اور دریائے نیل میں تیرتے ہوئے اس پار سے اس پار چلے گئے، جہاں لوگ جمع تھے، انہوں نے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اللہ نے اس باغی کو شکست دی، اور نجاشی اس پر غالب آ گئے، اور اس کو قتل کر دیا، پھر حضرت زبیر ہمارے پاس آئے، وہ اپنی چادر لہرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: بشارت ہو، اللہ تعالی نے نجاشی کو کامیابی عطا فرمائی، ام سلمہؓ کہتی

ہیں: خدا کی قسم! نجاشی کی کامیابی سے ہمیں جتنی خوشی ہوئی اتنی کسی چیز سے نہیں ہوئی، اس کے بعد ہم لوگ وہیں رہے، یہاں تک کہ ہم میں سے بعض افراد مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے، جو باقی رہے وہ وہیں آباد رہے (البدایہ والنہایہ ج ۴، ص: ۱۸۵)۔

اس پورے واقعہ کا ماحصل:

۱) دوسروں کے دلوں میں جگہ پانے کا طریقہ یہ ہے کہ مشترک عقائد اور متفق علیہ باتوں سے بات شروع کی جائے اور اچھے اوصاف کا تذکرہ کیا جائے، کیونکہ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی، جس میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہما السلام کے اچھے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نجاشی آبدیدہ ہو گئے، اس موقعہ پر تثلیث کو بیان نہیں کیا، جیسا کہ قرآن نے بعض عیسائیوں کا عقیدہ نقل کیا ہے، اسی طرح عیسائیوں کی مذمت سے متعلق کوئی آیت نقل نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اقلیت کو ہمیشہ مشترک اور متفق علیہ عقائد اور محبت آمیز باتیں کرنی چاہیے۔

۲) حالات جیسے بھی ہوں، ہمیشہ دین کی قطعی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے، اس بات کی تائید حضرات صحابہؓ کے اسی واقعہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نہایت صبر آزما اور سنگین حالات میں بھی بادشاہ کے سجدہ کو گوارا نہ کیا، حالانکہ اس وقت حالات کا تقاضہ یہی تھا کہ سجدہ کیا جائے، کیونکہ ان کے آنے سے پہلے قریش کا ایک وفد قیمتی ہدایا کے ساتھ مسلمانوں کو واپس لے جانے کے لئے دربار شاہی میں حاضر ہو چکا تھا، اور انہوں نے آداب شاہی کی قدیم روایات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بادشاہ کے سامنے سجدہ بھی کیا تھا، لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں نے بادشاہ کو صرف سلام کیا، سجدہ تعظیمی نہیں کیا، جس کی وجہ سے بادشاہ نے پوچھا کہ جس طرح تمہاری قوم کے کچھ افراد نے آداب بجالایا اس طرح تم نے نہیں کیا، حضرت جعفرؓ نے فرمایا:

> جہاں تک سلام کی بات ہے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ جنتیوں کے تحیہ کا طریقہ السلام ہے، اور ہمیں اسی طرح سلام کرنے کا حکم ہے، چنانچہ ہم لوگ ایک دوسرے کو اسی طرح سلام کرتے ہیں، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کے سامنے سجدہ نہ کریں (مسند احمد، ج ۱، ص: ۴۶۱، نیز دیکھئے: معجم الکبیر طبرانی، ج ۲، ص: ۱۴۷۸)۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلم اقلیت پر واجب ہے کہ دین کے قطعی احکام سے تنازل اختیار نہ کرے، اور کوئی ایسی چیز قبول نہ کرے جو اس کے دین کے قطعی احکام یا عقیدہ کے متعارض ہو، یا جو اسے ضم کر لے یا اس کے تشخص کو ختم کر دے، یہ معاملہ نہایت اہمیت کا حامل ہے، ورنہ اس خوش حال زندگی کا کیا فائدہ جب دین کے قطعی احکام اور عقیدہ ہی خطرہ میں ہو، اس لئے مسلم اقلیت کے لئے ضروری ہے کہ اس راہ میں ہر قربانی کے لئے تیار رہے، اور اپنے اسلامی تشخص کی حفاظت کے لئے اپنی قیمتی سے قیمتی متاع خرچ کرے۔

۳) دار الکفر کی جانب ہجرت کرنا اور وہاں رہنا جائز ہے، کیونکہ صحابہ کرام فتح خیبر تک حبشہ میں قیام پذیر رہے، حضرت جعفر کی روایت میں ہے: ہم لوگ حبشہ سے نکلے اور مدینہ پہونچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی، آپ نے مجھے گلے لگالیا، پھر فرمایا: مجھے نہیں معلوم کہ خیبر کی فتح سے زیادہ خوشی ہوئی یا جعفر کی آمد سے (البدایہ والنہایہ ج ۴، ص: ۱۷۹)۔

۴) دوسرا وطن جہاں وہ مقیم ہو اس سے محبت، دشمن پر اس کی کامیابی سے خوشی، اس کی کامیابی کے لئے دعاء، حادثہ کے موقعہ پر کسی کا جانا اور اس کی کامیابی کی مبارک باد دینا (البدایہ والنہایہ ج ۴، ص: ۱۸۵، سیرت ابن اسحاق، ص: ۱۹۷)۔

اس واقعہ میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اوپر کی تفصیلات اور اللہ ورسول اللہ اور مسلمانوں کے ولاء کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔

۵) وفاداری: امام بیہقی اور دیگر محدثین ابوامامہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ جب نجاشی کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ان کی خدمت کے لئے کھڑے ہو گئے، صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم لوگ آپ کی طرف سے کافی ہیں، آپ نے فرمایا: ان لوگوں نے ہمارے اصحاب کا اکرام کیا، ہم چاہتے ہیں کہ اس کا بدلہ دیا جائے (دلائل النبوۃ للبیہقی، ج ۴، ص: ۱۹۴)۔

اس وفد کے افراد غیر مسلم تھے، اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اکرام کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں پر اپنے محسنوں کی وفاداری اور اللہ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، خواہ احسان کرنے والا کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو۔

اس واقعہ اور حضرت جعفر اور ان کے ساتھیوں کے نمونہ سے مستنبط یہ چند مسائل ہیں۔

بعض مسخ شدہ اسلامی اصطلاحات:

اسلام میں غیر مسلم رعایا پر عائد ہونے والے مالی حقوق کی صحیح حیثیت واضح کرنے کے لئے چند اصطلاحات استعمال کئے گئے ہیں، جیسے جزیہ، ذمہ وغیرہ جن سے ان کے سلسلہ میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری واضح ہوتی ہے، لیکن گمراہ کن پروپیگنڈوں کے ذریعہ ان اصطلاحات کو مسخ کردیا گیا ہے، اس لئے ہم ان کا صحیح مفہوم واضح کرنے کی کوشش کریں گے:

جزیہ کے معنی لغت میں بدلہ اور عوض کے ہیں (القاموس المحیط، لسان العرب، المصباح المنیر مادہ 'جزی')۔

فقہاء کے نزدیک جزیہ اس مال کو کہتے ہیں جو ذمیوں سے وصول کیا جائے، حضرت امام شافعی نے جزیہ کی تعریف یہ کی ہے کہ جزیہ ایسا مال ہے جو ان سے اسلامی ریاست میں رہنے، یا ان کی جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت یا ان سے جنگ نہ کرنے کے بدلہ ان کی رضامندی سے لیا جائے (حاشیۃ القلیوبی علی حاشیۃ المحلی، ج ۴، ص:۲۲۸)۔

اسی طرح یا اس کے قریب قریب جمہور فقہاء نے بھی تعریف کی ہے (دیکھئے: الفتاوی الہندیہ ج ۲، ص: ۲۴۴، جواہر الاکلیل ج ۱، ص: ۲۶۶، المغنی ج ۸، ص: ۴۹۵) اور یہ معنی اس کے لغوی معنی کے قریب ہے۔

ان تعریفات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مال اسلامی ملک میں رہنے والے غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، انہیں امن وامان پہونچانے کے عوض لیا جاتا ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مال حقوق شہرت کے عوض کے طور پر لیا جاتا ہے، جیسے افراد کے اعتبار سے زکوۃ اور صدقۂ فطر مسلم شہریوں سے وصول کیا جاتا ہے، ویسے ہی غیر مسلموں سے فی نفر جزیہ وصول کیا جاتا ہے، اور خراج زمین کا ٹیکس ہے جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، قبیلہ بنو تغلب کے بعض عیسائیوں نے جزیہ کے نام سے حکومت کو تاوان دینے سے انکار کیا، لیکن زکوۃ یا اس کے دوگنا ادا کرنے پر راضی ہوئے تو خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ نے اسے قبول کیا (تفصیل کے لئے دیکھئے: الاموال لابی عبید ص: ۵۴۱، الخراج لابی یوسف ص: ۱۴۳، فقہ الزکوۃ شیخ قرضاوی، ج ۱، ص: ۱۸۱)۔

دوسرے پہلو سے دیکھیں تو جزیہ ادا کرنا اسلامی حکومت کو تسلیم کرنے کی واضح دلیل ہے، بایں طور اس میں دونوں فریق کی جانب سے اطمینان کا پہلو ہے۔

جزیہ کی مشروعیت کب ہوئی؟ اس بارے میں علماء کی رائے مختلف ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جزیہ کی مشروعیت سن ۸ھ میں ہوئی، جبکہ بعض ۹ھ کے قائل ہیں (زاد المعاد، ج ۲، ص: ۸۸، تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص: ۷۵۴) جب نجران کے عیسائیوں، ہجر کے آتش پرست، اس کے بعد ایلیہ، آزرج اور تبوک کے بعض یہودی قبائل سے لیا گیا، جزیہ کی مقدار ایک درہم ہے (چار گرام اعشاریہ چار سونا) یہ سالانہ ہر بالغ عاقل پر لازم ہے، بچے، مجنون، راہب، عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں، ابو عبید اور دیگر حضرات سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن والوں کے نام جو مکتوب لکھا اس کی عبارت یہ تھی:

''من محمد إلى أهل اليمن... وأنه من أسلم من يهودي أو نصراني، فإنه من المومنين له ما لهم وعليه ما عليهم ومن كان على يهوديته أو نصرانيته، فإنه لايفتن عليه وعليه الجزية'' (الاموال، ص:۳۷)۔

جزیہ تاوان ہے یا حق شہریت؟

حکومت، خواہ دینی ہو یا سماجی، اس کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اور کچھ فرائض وواجبات، مثلاً امن وامان کا تحقق، تکافل داخلی وغیرہ، اسی طرح حکومت کا شہریوں پر یہ حق ہے کہ وہ افرادی اور مالی وسائل کے ذریعہ حکومت کا تعاون کریں، تاکہ اس کے ذریعہ ایسے مقاصد حاصل کئے جائیں جن کا فائدہ تمام لوگوں کو پہونچے، امن، سیاست اور اقتصادیات میں بگاڑ ہر چیز کو ڈھا دیتی ہے، اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جس کا مشاہدہ آج ہم عراق میں کررہے ہیں۔

دیگر قدیم وجدید تمام حکومتوں کی طرح اسلامی حکومت نے بھی مالی حقوق متعین کئے ہیں، تاکہ فرد اور جماعت کا امن اور شہریوں کی کفالت کی تکمیل ہوسکے، لیکن اسلامی ریاست نے ان مالی حقوق کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ مالی حقوق جن میں اصولی طور پر عبادت کا مفہوم شامل ہے، جیسے زکوۃ، اسلام نے مسلمانوں پر زکوۃ بطور عبادت اور بطور تکافل فرض کیا ہے، اس لئے اس میں اصول اور عام قواعد کے مطابق نیت اور دل کا ارادہ لازمی ہے، اسلامی شریعت کی طرف سے اسکا مطالبہ صرف مسلمانوں سے ہے، کیونکہ اس کی ادائیگی کا مستحق ہونے کیلئے دائرہ اسلام میں داخل ہونا ضروری ہے، مذکورہ خصوصیت کے پیش نظر

فطری طور پر اس مال کی مقدار، اس کا مصرف متعین ہوگا باوجود اس کے اگر کوئی غیر مسلم شہری جزیہ کے بدلہ زکوۃ دینے پر اصرار کرے تو اسلامی حکومت اس کا استقبال کرے گی، کیونکہ زکوۃ کی رقم جزیہ کی رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔

دوسرے وہ مالی حقوق جس میں اصولی طور پر عبادت کا مفہوم شامل نہیں ہوتا، اس لئے یہ مصرف اور مقدار کے لحاظ مختلف ہوتا ہے، اس میں دو باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

اول یہ کہ غیر مسلم شہری اسلامی ریاست کو اس طور پر تسلیم کرے کہ دونوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تحقق ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ ریاست کے کندھے پر اپنی رعایا کے امن وامان اور ریاست کے داخلی وخارجی دشمنوں سے جانی ومالی تحفظ فراہم کرنے کے تعلق سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں شرکت ہو، یعنی امن اور جنگ سے متعلق جو کوششیں ہوں ان میں شرکت، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ترقی، تکافل اور اجتماعی ضمان جو ضرورت مندوں کے لئے ہوتا ہے ان سب میں شرکت ہو، جزیہ کا مصرف بیت المال ہوتا ہے، اور اسے عمومی ترقیات، تکافل، اور ضمان اجتماعی میں خرچ کیا جاتا ہے، تاکہ اس کا فائدہ ان تمام لوگوں کو پہونچے جو اسلامی حکومت میں موجود تمام باشندوں کو پہونچے، خواہ وہ مسلم یا غیر مسلم۔

اس تفصیل کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ جزیہ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بدلہ کو شامل ہے جس کی تفصیل اوپر گزری، اور اس لفظ میں دوسرے کی تحقیر یا تذلیل کا کوئی پہلو نہیں ہے، لیکن میڈیائی پروپیگنڈوں نے اس سلسلہ میں ذہنوں کو پراگندہ کر دیا ہے، اس لئے اس میں کوئی حرج کی بات نہیں کہ غیر مسلموں سے جو وصول کیا جائے اسے ٹیکس یا اس طرح کوئی اور نام دیا جائے، بلکہ اگر اس کو زکوۃ کہا جائے تب بھی شرعی اعتبار سے کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ حضرت عمر کے دور خلافت میں تو اس کی نظیر بھی ملتی ہے، جب بنو تغلب نے جزیہ کے نام سے کوئی مالی ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا، انہوں نے کہا کہ ہم لوگ جزیہ کا دوگنا دیں گے، لیکن اسے جزیہ کے بدلے زکوۃ کہا جائے، حضرت عمرؓ نے اس سے اتفاق فرمایا تھا، اس لئے نام میں کوئی مسئلہ نہیں ہے، یہ حق غیر مسلموں سے وصول کیا جائے گا اور حکومت، ملک اور اس کے باشندوں کی فلاح کے لئے خرچ کیا جائے گا۔

ذمی کی اصطلاح:

جزیہ کی طرح ذمی جیسے عمدہ لفظ کے بارے میں حساسیت پیدا کی گئی، حالانکہ یہ لفظ اہم معانی اور انسانیت کے متعدد پہلو پر دلالت کرتا ہے، اس کے معنی لغت میں گردن، آدمی، یا عہد کے ہیں، شرعی نصوص میں اسکی تفسیر اللہ اور رسول اللہ کی پناہ سے کیا گیا ہے، اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ نے اہل ذمہ کو عہد وامان اور پناہ عطا فرمایا ہے، سب سے پہلے اس لفظ کا استعمال دستاویز میں ہوا، اور اس معاہدہ میں ہوا جو نجران کے عیسائیوں کے ساتھ ہوا تھا۔

لفظ ذمی استعمال کرنا ضروری ہو ایسا نہیں ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس کی جگہ دوسری اصطلاح مثلاً شہری وغیرہ استعمال ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام دوسرے مذہب اور دوسرے مذہب والوں کے ساتھ رہنے کو بغیر کسی جبر وتشدد کے قبول کرتا ہے، اور اس کو جملہ حقوق عطا کرتا ہے، اسلام کا یہ موقف سابقہ دور کے تناظر میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے، تاریخ اس کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتا ہے کہ ایک مذہب دوسرے مذہب کو قبول کرتا ہو، خواہ اسی کی قوم سے کیوں نہ ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہودیوں نے دین مسیح کو قبول نہیں کیا، بلکہ حضرت مسیح، ان کے پیروکاروں پر ظلم وبربریت کی المناک داستان رقم کی، یہاں تک کہ انہوں نے حضرت مسیح کو قتل کرنے تک کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالی نے ان کے ساتھ خاص شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا، انہیں ان جیسے لوگوں سے نجات دیا اور اوپر اٹھالیا، اسی طرح جب عیسائیوں کی قسمت کا ستارہ چمکا اور انہیں حکومت واقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے یہودیوں کے ساتھ ظلم وستم کی انتہاء کردی، ایسا اسلام سے پہلے بھی ہوا اور اسلام آنے کے بعد بھی، انہوں نے یہوں کو مارا، اذیت ناک تکلیفیں دیں، اور دھتکارتے رہے۔

☆☆☆

شہریت کا مسئلہ

شہریت، حقوق انسانی اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں

ڈاکٹر عرشی خان[1]

انسانی تاریخ میں معاشرتی علوم بالخصوص علم سیاست ہمیشہ سے ہی گفتگو کا موضوع رہا ہے۔ مقدونیائی فلسفی ارسطو نے اسے تمام علوم کا مرکز کہا ہے۔ بقول ارسطو سیاست ایک ایسا عملی سائنس ہے جو ریاست کے متفرق گوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔ دیگر علوم کی طرح اسکی نظر بھی انسان کامل پر رہتی ہے۔ جسے بعض مقامات پر کبھی بادشاہ، تو کبھی خدا، کبھی صوفی اور کبھی معتقدین کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

یہ کبھی یونانی شاعری، مجسمہ سازی اور فن کا موضوع بنتا ہے تو کبھی کلام الٰہی میں اسکا ذکر آتا ہے۔ قران کریم نے تو اسے وہ مقام عطا کر دیا ہے کہ کائنات کی دوسری مخلوق کا اس سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ قران نے اسے اشرف المخلوقات کے منصب پر بٹھا دیا ہے۔ انھیں اس سرزمین پر اللہ اور کائنات کے تئیں انکے فرائض و ذمہداری کا احساس دلانے کے مقصد سے بھیجا گیا ہے۔

مغرب میں پلیٹو، ارسطو، سسرو جیسے فلسفیوں اور رومن سلطنت کے اکابرین نے بھی اس راز کو جاننے کی کوشش کی۔ قرون وسطیٰ کے علمائے کرام نے عوام الناس کو سلاطین کے جبر و ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی آزادی تو دی لیکن زندگی کے تمام شعبوں میں چرچ اور پوپ کی مداخلت و تسلط کو نہ صرف جائز ٹھہرانے کی کوشش کی بلکہ زیادتیوں کی مخالفت اور اسکے خلاف آواز اٹھانے کا حق بھی ان سے چھین لیا۔ مذہبی اور حکمراں طبقہ دونوں خود کو خدا و مسیح کا نمائندہ گردانے لگے۔ انکا دعویٰ تھا کہ وہ زمین پر اسکے نائب ہیں۔ اسے لیکر دونوں کے مابین تنازعہ بھی ہوا جسکا نتیجہ چودھویں عیسوی صدی میں چرچ کے زوال کی شکل میں سامنے آیا۔ نشاۃ ثانیہ، مطلق العنانی، سامراجیت، سلطنتیں مادیت پرستی سبھی ایک دوسرے میں ضم ہو کر ترقی کرتی رہیں۔ جدید طرز فکر نے انہیں نئی جہت عطا کی۔ اس آمیزش سے پہلے جمہوریت اور بعد میں ریاست کا وجود عمل میں آیا۔

پلیٹو کے دور میں انسانی اقدار کی شناخت اسکے اخلاقی کردار اور تعلیمی معیار سے طے کی جاتی تھی۔ حقوق انسانی کی اہمیت نہیں تھی، انسانی فرائض اسکی بنیادی ذمہ داری میں شامل تھے۔ وہ ایک ایسی جماعت تیار کرنے پر توجہ مرکوز کئے رہتا ہے جسے حکومت، معاشیات اور حفاظتی معاملات کی ذمہ داری سونپی جا سکے۔ وہ اقتصادی امور سے جڑے لوگوں کو سیاسی حقوق دینے کی سفارش نہیں کرتا۔ انہیں عوامی معاملہ کے ماہرین کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ رومن جمہوریہ کے دور میں لوگوں کو انتخابی عمل میں بھی شامل کیا جانے لگا۔ قونصل کے انتخاب میں انہیں حق رائے دہی کا اختیار دیا گیا۔

پلیٹو کے شاگرد اور یونان کے شہرا تھنس میں واقع اسکی درسگاہ کے وارث ارسطو نے پہلی دفعہ حکومت کا اصول وضع کیا۔ عملی طور پر حکومت کا فلسفہ اشرافیہ اور جمہور کے اختلاط سے ہی ممکن تھا۔ اس میں درمیانی طبقہ کے پروان چڑھنے کے بھرپور مواقع تھے۔ بعد میں سسرو اور سنیسا جیسے مفکر سیاسی میدان سے باصلاحیت افراد کی کم ہوتی قدر و قیمت اور رومی سلاطین کی مطلق العنانی سے بیحد مایوس تھے۔

کلاسیکی عہد کے دوران مغرب میں فطرت کو عقلی اور سائنسی بنیاد پر سمجھنے کا زور رہا۔ عہد وسطیٰ میں جبکہ مسیحی طرز فکر کے زیر اثر تھومزم کا زور تھا، ایک ایسا اصول وضع کیا گیا جہاں آدمی کو فرائض کا پابند رکھا جائے۔ حکومت کے حقوق طاقت کے مظہر نہیں تھے بلکہ متعلقہ صلاحیت کے اعتبار سے اسکی اخلاقی ذمہ داری تصور کی گئی۔ انصاف، نیکی اور مسرت کی حصولیابی کے لئے اخلاقیات سب سے موثر ذریعہ سمجھا گیا۔ معمولات زندگی میں مذہب کی مداخلت میں اضافہ ہوتا رہا۔ قانون کے نفاذ اور ترقیاتی عمل میں اسکی برتری تسلیم کی جانے لگی۔ اسطرح اخلاقی دعویٰ، مذہب سے وابستگی اور مالکانہ بالادستی سے انکار کے جذبے نے سیاسی اداروں کی

[1] ڈپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نگرانی کا کام کیا۔

سلطنت عثمانیہ کے تاریخی دستاویزات سے بخوبی واقف ترکی کے ایک مورخ کا کہنا ہیکہ 'دولت عالیہ عثمانیہ دراصل حکومت نہیں، بلکہ ایک ریاست تھی، جسکا نصب العین انصاف قائم کرنا اور حق کو فروغ دینا تھا۔ عثمانیہ حکومت اپنے دور میں ملت کے طور پر جانی جاتی تھی۔ جو غیر مسلموں کے حقوق کی بھی ایمانداری سے پاسداری کرتی تھی۔ عثمانی دور میں انہیں ذاتی و مذہبی آزادی حاصل تھی۔

ترکی کے مورخین نے مغرب کے ان مورخین کی تنقید کی ہے جنہیں نہ تو ترکی زبان کا علم ہے اور نہ ہی تحقیق کے دوران جنھوں نے ماہرین زبان سے رابطہ کیا۔ برعکس اسکے جمہوری بنیاد پر قائم سیکولر ریاستوں کے ان مورخین نے نہ تو مذہبی آزادی اور نہ ہی کرد نسل کے جائز حقوق کو توجہ طلب سمجھا۔ ۱۹۲۳ میں جب سلطان وخلافت مخالف رجحان رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں باگڈور آئی تب ترکیوں کے لئے شریعت، انکی زبان اور انکے اپنے لباس ہی انکے لئے اجنبی ہو گئے۔ ان اسباب کے پیش نظر کہہ سکتے ہیں کہ حکومت کی نوعیت اور اسکے طور طریقوں سے شہریوں وعوام کے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ سیکولرزم کے آغاز سے ہی اسکے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، جہاں انسان خود اپنی مرضی کا مالک ہوتا تھا۔ الٰہی اصول وضابطے ذاتیات تک ہی محدود رہتے۔ انگلینڈ، فرانس اور امریکہ کے سیاسی انقلاب نے حقوق انسانی اور انسانی وقار کی حفاظت کا نعرہ دیا جس نے آگے چلکر جمہوریت کو جلا بخشی۔ سیاسی منظر نامہ کی تبدیلی کے بعد صنعتی انقلاب رونما ہوا۔ دونوں کا مقصد ایک ایسی ریاست و ایک ایسی حکومت کا قیام ہے جو سرمایہ داری کو فروغ دے سکے۔ جہاں قانون اور حقوق کا تصور آزادی، مساوات اور انصاف پر مبنی ہو۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ شہری کے حقوق اور قوانین کا تعین مغربی سیاق وسباق میں کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ مغرب نے ہمیشہ ہی معاشی حقوق وقومی وسائل پر حکومت کی اجارہ داری کو مسترد کیا ہے۔ کمیونسٹ ریاستوں میں عموما ایسا ہی ہوتا تھا۔ بعض ممالک میں یہ دستور اب بھی رائج ہے۔ لبرل اور کمیونسٹ دونوں جب سیاسی اور معاشی حقوق کی بات کرتے ہیں تو انکی نظر سماجی وتہذیبی پس منظر کو سرے سے نظر انداز کر دیتی ہے۔ سماج میں مساوات اور سرحدی قید وبند سے آزاد ریاست کا خواب دیکھنے والے کمیونسٹوں کا سفر بالآخر پارٹی پر آ کر ہی تھم جاتا ہے۔ اسٹیٹ اور سماج انکے لئے ثانوی درجہ کی چیز ہو جاتی ہے۔ روس کے بکھراؤ کے بعد عالمگیریت کے دعوے دار کھلے بازار، جمہوریت اور حقوق انسانی کی بات کرنے لگے۔ اب حقوق کا مسئلہ کثیر الثقافتی، نسوانیت اور ماحولیاتی تناظر میں دیکھا جانے لگا۔

شہریت کا جدید تصور:

شہریت کی جامع مثال مشکل ہے، لیکن اسکی کردار سازی میں میانہ روی کا عنصر غالب ہے۔ یہ عوامی فوائد، جذبے، سیاسی شمولیت، شخصی وذاتی حقوق اور نجی فائدے کی وکالت کرتا ہے۔ اس طبقے نے جو عورتوں اور کام گاروں کی حمایت کرتا ہے، شہریت کی اس تعریف کی تنقید کی اس کے مطابق یہ خصوصیت کے حامل افراد کی ہی نمائندگی کرتا ہے۔ سول سوسائٹی کا اصول وضع کرنے والے دانشوروں نے بھی اسکی نکتہ چینی کی اور تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ لیکن شہریت کی بنیاد پر صرف اسلامی نظریے اور اسلامی تعلیمات نے ہی سوال اٹھائے۔ سیکولر اسٹیٹ کے نظریے کی بنیاد اس بات پر تھی کہ انسان خود اپنا مالک ہے۔ انسان اسٹیٹ کو شہری کی تحفظ آزادی کے لئے ذریعہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جمہوری آلات انسان کو قانونی دائرے کے اندر آزادی دیتے ہیں۔ یہ قانون سبھی شہری پر لاگو ہوتے ہیں، لیکن اس سے ایک غیر فعال شہریت کا تصور ابھرتا ہے۔ اسکا مطلب ہیکہ عوامی معاملات اور حکومتی بندوبست میں شامل ہوئے بغیر ہی ایک شخص ریاست کا شہری ہو سکتا ہے۔

شہریت کا جدید فلسفہ دراصل ایک غیر فعال نظریہ ہے۔ اسمیں عام اختیارات شہری کی بنیادی تشویش کا باعث بن جاتی ہے۔ شہریت کا غیر فعال نظریہ انسان کو تحفظ ودفاعی اختیارات کا طلبگار بنا دیتا ہے۔ 'ہوبس' جسمانی زندگی کے دفاع کی بات کرتا ہے۔ 'لوکے' جائداد کے حق کی بات کرتا ہے اور 'بینتھم' شخصی خوشی کے تعین کی۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں سیاسی مساوات وشہری حقوق کے نعرہ میں شہریت کا نظریہ پروان چڑھا۔ جدید جمہوری ممالک نے برابری اور عالمگیریت کو فروغ دیا۔ اسکے تحت سیاسی برادری میں سبھی ممالک ایک جیسے وہم پلہ ہیں۔

اسکا مطلب یہ ہیکہ برابری کا یہ فلسفہ سیاسی برادری کے ممبر ممالک کے درمیان درجہ بند نابرابری کی مخالفت کرتا ہے، نیز انضمام کی یہ بنیاد شہریت کے دائرے کی توسیع کی بھی مظہر ہے۔ جو مزید لوگوں کو اپنے ساتھ جوڑنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ سیاسی برادری میں برابری اور اسکی مکمل رکنیت شناخت، ریاست سے تعلق، قومی ثقافت وسماجی وراثت میں حصہ داری کے تیقن کا مظہر ہوتا ہے۔ لیکن شہریت کی بنیاد ان درجہ بند نابرابری کے اثرات کو نظر انداز کر دیتی ہے جو اکثریتی، فرقہ وارانہ، ذات، مذہب، نسل اور جنس پر منحصر سیاست کرتے ہیں۔

'ڈیوڈ لاکووڈ' دلیل دیتا ہےکہ برابری وحقوق کا اصلی مزہ نابرابری کے دومحور سے منسلک ہے۔قانون ونوکرشاہی کی موجودگی یا غیر موجودگی اور اخلاقی یا مادی وسائل پر قبضہ جو کہ عام طور پر رسمی طور پر ہی کام کرتے ہیں۔قانونی حق اور اخلاقی و مادی محور کا مطلب ہےکہ شہری اور غیر شہری کے تعلق سے مجموعی ناانصافی کا خاتمہ ہو۔دراصل حقوق انسانی نابرابری کی پیچیدگیوں کو ادارہ جاتی شکل دینے میں مدد کرتا ہے۔قانونی طور پر دعویٰ کیا جاتا ہےکہ حقوق انسانی کے کارکن یہ مانتے ہیں کہ جہاں میٹرو یا کلی سیاسی کلچر ہوتا ہے،وہ نئے طرز کی رسمی اور اہم نابرابری کی صورت پیدا کرتی ہیں،یقیناً کچھ معاملوں میں دیکھا گیا ہےکہ حقوق انسانی کی حفاظت میں انسان خود کو ایسے حالات سے گھرا پاتا ہے جہاں اسکے بنیادی حقوق کی مزید پامالی کا خطرہ ہوتا ہے۔

'کیٹ ناش' ریاست میں رہنے والے شہری اور غیر شہریوں پر بین الاقوامی حقوق انسانی کی قانونی حیثیت کے اثرات مرتب ہوتے ہیں،اسکی تفتیش کرتا ہے۔دریافت کے لئے وہ سماجی طریقہ کار کا استعمال کرتا ہے۔اسمیں یہ واضح ہوتا ہےکہ یورپ تک میں عالمی اخوت پر مبنی قانون بھی انصاف اور مساوات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔دراصل حقیقی معنوں میں کلی شہریت کا کردار اس درجہ گروپ کا پھیلاؤ ہے جو نئے طرز کی نابرابری کے زمرے میں آتی ہے۔مثلاً اعلیٰ شہری،حاشیہ بردار شہری،برائے نام شہری،ذیلی اور غیر شہری۔شہریت کے یہ اقسام نابرابری کی ہی تصویر ہے۔حقیقی معنوں میں عالمی حقوق انسانی کے اس عہد میں عالمگیریت کا قانون ایسے ضوابط مرتب کرتا ہے جو انسان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

ایسی ریاستیں جو جمہوری اور غیر جانبداری کے اصول پر کاربند ہیں،وہ منصفانہ رکنیت کی حواشی مروجہ تعریف اور عارضی قانون کو برابری کے حقوق اور ایک جیسا تحفظ فراہم کرتی ہیں۔جمہوری اور جدید ریاستیں سماجی وثقافتی صفات کی اندیکھی کرتی ہیں۔اسلئے وہ تمام شہریوں کو برابری کا درجہ دیتی ہے اور تمام رشتوں کے لئے ایک جیسا معیار اور قانون مرتب کرتی ہے۔امتیازی سلوک،علیحدگی اور اپنے دائرے میں حد سے زیادہ لوگوں کی شمولیت جمہوریت کے اس نقطہ نظر کو ناکام بناتی ہے۔ان لوگوں کو جنھیں نوکری،ترقی،تعلیم،رہائش،سرکاری منصوبہ بندی اور دیگر فوائد میں سیاسی تحفظ حاصل ہوتا ہے،وہ حد سے زیادہ شمولیت کے بڑے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔جہاں پر سیاسی تحفظ اور تناسبی نمائندگی نہیں ہوتی ہے ان جگہوں پر یا تو کچھ مخصوص جماعتوں کا یا پھر مذہبی،نسلی یا ذات پات پر مبنی سیاست کرنے والی پارٹیوں کا غلبہ ہوتا ہے۔

ہندو اکثریت اقلیتوں پر اپنا زور چلاتے ہیں:

جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے اسٹیٹ پاور (قومی وصوبائی حکومت) پر ہندو اکثریتی فرقے کا غلبہ ہے۔یہ طاقتیں اقلیتی طبقے بالخصوص مسلمانوں پر،جو ملک کی مجموعی آبادی کا سرکاری اعداد وشمار کے مطابق چودہ اور غیر سرکاری ذرائع کے مطابق اٹھارہ فیصد ہے،اپنا زور چلاتے ہیں۔اسکے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔سماجی اخراج،امتیازی سلوک،محرومی،منظم تشدد (مسلمانوں کے خلاف) نسل کشی،وقار کا مجروح ہونا،تحفظ وانصاف کی عدم دستیابی اور دہشت گردی کا لزام (باوجود اسکے کہ دہشت گردی کے کچھ معاملوں میں آر ایس ایس کارکنان کی شمولیت ثابت ہوچکی ہے) ان تمام معاملوں میں وفاقی اور صوبائی حکومتیں باضابطہ طور پر یا تو مسلمانوں کے خلاف کاروائی کرتی ہیں،یا پھر براہ راست یا بالواسطہ مسلم مخالف طاقتوں کی حمایت کرتی ہیں۔ایسے معاملوں میں جہاں مسلم مخالف دہشت گرد انسانیت کے خلاف جب کوئی کاروائی کرتے ہیں تو بارہا یہ دیکھا گیا ہےکہ مسلمانوں کے تحفظ وحفاظت کے سلسلے میں حکومتیں محض تماشائی بنی رہتی ہیں۔

اسطرح شہریت کے حقوق جو انفرادی صلاحیت کی بات کرتے ہیں موروثی طور پر سماجی وثقافتی درجہ اور سیاسی وتعلیمی حالت سے منسلک ہوتے ہیں۔شہریت کا آزاد جمہوری نظریہ سیاسی برادری کی مکمل ومساعی رکنیت کی وکالت تو کرتا ہے،لیکن اسے یقینی بنانے کی سعی نہیں کرتا۔اقلیتی فرقے اور مین اسٹریم سے خارج طبقے کے مسائل حل کرنے میں قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں،سیاسی جماعتیں،شہری سماج اور بین الاقوامی برادری سبھی بری طرح ناکام ثابت ہوئے ہیں۔یہی وجہ ہےکہ تمام متعلقہ شعبوں کے مبصرین ومشاہدین اس نقطہ نظر کی تنقید کرتے ہیں۔جہاں تک شہریت سے متعلقہ قانون کا سوال ہے اسکے متن کی سیاسی وعلاقائی وجوہات اور قانونی بنیاد پر وضاحت اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔گذشتہ چھ دہائیوں میں حکومت کو مزید طاقتور بنانے کے لئے اس قسم کے قوانین سرعت سے وضع کئے گئے ہیں۔حکومتیں یہ طاقت اپنے شہریوں،یا پھر ان لوگوں کے خلاف استعمال کرتی ہیں جو متعلقہ حکومت کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔

علمی پیرامیٹر اور قانون شہریت کا معیار:

جہاں تک لفظ شہریت کا تعلق ہے وہ انگریزی لفظ سیٹیزن کا اردو ترجمہ ہے۔اسکا اختراع لاٹن زبان کے لفظ سیوکس سے ہوا ہے،جسکے لغوی معنی (شہر سے متعلق) ہوتا ہے۔قدیم یونانی عہد اور سلاطین رومن کے عہد میں شہریت کا تصور شہری کی عوامی وسیاسی معاملات میں شمولیت سے تعبیر کی جاتی تھی۔حکومت کا

برابری اور منصفانہ رویہ اصولی طور پر شہری اور اسٹیٹ کے درمیان ایک ایسا رشتہ استوار کرتا ہے جو سیاسی ترقی اور آزاد ریاست کے قیام کا ضامن ہوتا ہے۔شہریت عوام کے ان حقوق کا نام ہے جن کے ذریعہ وہ خود کو ریاست سے جڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔اس سے اسمیں برابری و کلی رکنیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ایک انسان جو شہری کے زمرے میں آتا ہے وہ خود بخود سیاسی برادری کا حصہ بن جاتا ہے۔اسطرح شہریت کے نظریہ کو ہم شہری کے سیاسی برادری میں انضمام سے سمجھ سکتے ہیں۔ایسا لگتا ہیکہ برابری اور اختلاط کا جذبہ حکومت کے غیر تفریقی رویہ اور ذمہ داری کے احساس سے معمور ہے۔آگے چلکر یہی رویہ شہریت کا قانونی جواز بنتا ہے۔

دنیا ریاستوں میں منقسم ہے۔جو اقوام متحدہ کے ضوابط کے مطابق اپنے قومی قوانین ملکی ضرورتوں ومقصدوں کی حصولیابی کے لئے وضع کرتی ہیں۔ہر ممالک کے اپنے قوانین اور شہریت کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔شہریت عوام اور ریاست کے قانونی رشتوں کا نام ہے جہاں اسے اپنی تمام زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔اسٹیٹ کی علاقائی اور جمہوری شناخت نوع انسانی کو مختلف قومیت میں تقسیم کرتی ہے۔انسان کی قومیت اور شہریت عموماً ریاستی نظام کی عکاسی ہے۔نظام کی صفات اسکی شخصیت کا اہم حصہ ہوتی ہے۔عام طور پر شہریت ریاست کے وضع کردہ معیار کی تکمیل کا نام ہے۔یہ معیار بالعموم جمہوری ہوتے ہیں اسرائیل کو اس سے مستثنٰی رکھا جاسکتا ہے جہاں اسرائیلی کو مذہب کی بنیاد پر شہریت عطا کی جاتی ہے۔مختلف ریاستوں کے علاقائی اصول وتاریخی تجربات بنی نوع انسان کو مخصوص قومیت کے زاویہ سے دیکھتے ہیں۔۱۹۴۵ اور دیوار برلن کے مسمار ہونے کے بعد مختلف ممالک میں شہریت سے متعلق قوانین میں تبدیلی آئی ہے۔تقسیم اور اشتراک کے بعد ریاستی سرحدوں میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔معاشی اصلاح وترقی، بین الاقوامی ہجرت اور سرحدی دراندازی نے جہاں شہریت کے لئے مسائل پیدا کئے ہیں وہیں اسے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچایا ہے۔اسی لئے مختلف ممالک میں آج شہریت کا عنوان انکے پالیسی ایجنڈے میں شامل ہے۔

دوہری شہریت:

کئی ممالک میں دوہری شہریت پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ دوہری شہریت رکھنے والے شہری بعض اوقات الیی صورتحال سے دوچار ہوجاتے ہیں کہ ان کی ایک ملک سے متعلق ذمہ داریاں دوسرے ملک کے قوانین سے متصادم ہوتی ہیں، اس کی ایک مثال فوجی صف آرائی کے دوران اس کی ذمہ داریوں کی ہے، ایسی صورت میں اگر ایسا شخص ملک سے باہر ہے تو اسے سفارتی یا قونصل کی جانب سے حفاظتی اقدام میں رکاوٹ پڑسکتی ہے، اکثر ممالک دوہری شہریت کو تسلیم نہیں کرتے، یعنی ان کی حکومتیں کسی شخص کے ان اختیار یا مراعات یا مصون (محفوظ) ہونے کو تسلیم نہیں کرتیں جو کسی دوسرے ملک کا خصوصی اختیار ہو۔

دوہری شہریت فطری انداز میں بھی حاصل کی جاسکتی ہے کوئی ملک ایسے افراد کو جو کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر لیتے ہیں اپنی اصل شہریت برقرار رکھنے کی اجازت دے سکتا ہے وہ ملک جہاں ایسے لوگ دوہری شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس پر اصرار نہ کرے کہ یہ شخص اپنی سابقہ شہریت سے دستبردار ہوجائے، بعض ممالک دیگر ممالک سے ایک معاہدہ کے ذریعہ اپنے شہریوں کے درمیان دوہری شہریت کا معاملہ کر لیتے ہیں اور یہی کاروائی غیر حاضری میں بھی ہوسکتی ہے، ایک شخص جو کسی دوسرے ملک میں پیدا ہو وہ اپنے اصل ملک کی منظوری کے بغیر بھی اسے اصل ملک کی شہریت برقرار رکھنے والا سمجھا جاسکتا ہے اگر اصل ملک نے یہ اعلامیہ جاری نہ کیا ہو کہ دوہری شہریت حاصل کرلی گئی ہے، یہ ممکن ہے کہ دونوں ممالک سرکاری طور پر اس کا اندراج کریں شہریت کے عالمی قوانین۔آئی ایس یکم مارچ ۲۰۰۱ء اہل کاروں کے نظم کا امریکی دفتر۔تفتیشی سروس۔

دونوں میں کوئی بھی شخص شہریت سے محروم ہوسکتا ہے، رضا کارانہ یا غیر رضا کارانہ طور پر شہریت سے محرومی، اکثر ممالک میں ایسے قوانین موجود ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص کس طرح شہریت ترک کرسکتا ہے، اکثر معاملات میں ایک شخص سفارت خانہ یا قونصل خانہ کے ذریعہ کاغذی کاروائی کر کے ایسا کرسکتا ہے، بعض ممالک کے قوانین کے تحت شہریت ترک کرنے والے شخص کو اپنے ملک میں واپس آکر یہ کاروائی پوری کرنی ہوگی، بعض ممالک میں شہریوں کو رضا کارانہ طور پر شہریت ترک کرنا بہت دشوار عمل ہوتا ہے، غیر رضا کارانہ طور پر شہریت ترک کرنے کے زمرے کے تحت کوئی ملک اپنے کسی شہری کو شہریت سے محروم کرسکتا ہے، اکثر ممالک میں کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر لینے والے شخص کی شہریت کو ختم کر دیا جاتا ہے، "رضا کارانہ" اصطلاح کی تعبیر وتشریح ہر جگہ ایک جیسی نہیں ہے، بعض ممالک میں جب تک کوئی شہری واضح طور پر اس کا اعلان نہ کرے کہ اس نے کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرلی ہے اسے رضا کارانہ نہیں سمجھا جاتا، مثال کے طور پر آسٹریا میں اگر کوئی شخص آسٹریائی یونیورسٹی میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہوجائے تو وہ خود بخود آسٹریا کا شہری بن جائے گا، بعض ممالک میں اسے غیر رضا کارانہ شہریت قرار دیا جاتا ہے اور قانون کے تحت شہریت باطل نہیں ہوتی بعض ممالک کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی

دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرلے اور اسے ترک کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ شہریت سے محروم ہوجائے گا، فطری شہریت اس حالت میں باطل ہوجاتی ہے، جبکہ وہ شہری کسی معینہ مدت تک کسی غیر ملک میں رہا ہو۔

فریب یا غلط بیانی سے دوسرے ملک کی شہریت حاصل کی ہو۔

اس نے پہلی شہریت ترک نہ کی ہو۔

خواہ کسی ملک کا قانون یہ کہے کہ بعض حالات میں شہریت خود بخود ختم ہوجاتی ہے، لیکن جب تک سرکاری اہلکاروں یا سفارت خانہ کو مطلع نہ کیا جائے تب تک سفارت خانہ اس شخص کا نام اپنے شہریوں کی فہرست میں برقرار رکھ سکتا ہے (ایضا)۔

دوہری شہریت کی بابت پیچیدہ قوانین:......بعض ممالک عموماً دوہری یا تکثیری شہریت کی اجازت نہیں دیتے یا اسے ممنوع قرار دیتے ہیں، لیکن اس بارے میں ان کے قوانین پیچیدہ ہیں، بعض ملکوں میں دوہری شہریت کی اجازت ہے، لیکن دوہری شہریت کا حق محدود ہے، مثلاً آسٹریلیا اور مصر میں دوہری شہریت کے حامل افراد پارلیمنٹ کا الیکشن نہیں لڑسکتے، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں شہریت حاصل کرنے والے افراد صدر یا نائب صدر کا الیکشن نہیں لڑسکتے، اس کے لئے متعلقہ شخص کو امریکہ میں پیدا ہونے والا فطری شہری ہونا لازمی ہے، تاہم وہ کسی دیگر عہدے پر فائز ہوسکتے ہیں، جرمنی اور آسٹریا میں عموماً دوہری شہریت کی اجازت نہیں دی جاتی سوائے ایسے لوگوں کے جنہوں نے پیدائش کے وقت دوہری شہریت حاصل کرلی ہو، جرمنی اور آسٹریائی شہری دوہری شہریت اختیار کرتے وقت اپنی پہلی شہریت برقرار رکھنے کے لئے درخواست دے سکتے ہیں، مثلاً وہ آسٹریائی اور امریکی شہریت کے لئے ایسا کرسکتے ہیں دونوں ممالک آسٹریائی شہری آرنلڈ کو اپنا شہری سمجھیں گے، ورنہ عام حالات میں اگر آسٹریائی شہری کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے، تو وہ آسٹریائی شہریت سے خود بخود محروم ہوجائے گا، اگست ۲۰۰۷ء سے جرمنی میں دوہری شہریت کو منظور کیا گیا ہے، بشرطیکہ متعلقہ شخص یورپی یونین کے کسی ملک یا سوئزرلینڈ کی شہریت اختیار کرلے۔

دوہری شہریت کی اجازت والے ممالک:

اگر کوئی شخص پیدائشی طور پر اسپین کا شہری ہے تو یہ بات اسے لاطینی امریکہ کے کسی ملک کی شہریت سے محروم کردینے کی کافی وجہ نہیں ہوگی، وہ انڈورا، فلپین، ایکواڈور، گویانا، یا پرتگال کا شہری ہوسکتا ہے، اسپین ارجنٹینا، بولیویا، چلی، کولمبیا، کوسٹاریکا، ڈومینکن ری پبلک، ایکواڈور، ہونڈورس، گواٹی مالا، نکاراگوا، پیراگوئے اور پیرو سے دوہری شہریت کے معاہدے کررکھے ہیں۔

اگر اسپین کے شہری ان ملکوں کی شہریت اختیار کرلیتے ہیں تو وہ بھی اسپین کی شہریت سے محروم نہیں ہوتے، دیگر ممالک کے تعلق سے اگر کوئی اسپینی شہری دیگر ملک کی شہریت اختیار کرلے تو تین سال بعد اس کی اسپینی شہریت ختم ہوجائے گی، بشرطیکہ ایسے شخص سرکاری طور پر اس کا اظہار نہ کریں کہ وہ اپنی اسپینی شہریت برقرار رکھنا چاہتے ہیں (شہریت سے متعلق اسپینی قوانین) پورٹوریکو کے شہریوں کی درخواست پر اسپین نے انہیں اسپینی شہریت اختیار کرنے کی اجازت دے دی، ۲۰۱۱ء تک جنوبی کوریا میں بھی ۲۱ سال کی عمر کے بعد دوہری شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن اب محدود تعداد میں لوگوں کو اس کی اجازت دے دی گئی ہے، جرمنی اور آسٹریائی اسی طرح جنوبی افریقہ میں بھی اگر کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو اسے جنوبی افریقہ میں اپنی شہریت برقرار رکھنے کے لئے درخواست دینی ہوگی، ورنہ وہ شہریت سے محروم ہوجائے گا۔

ترکی قانون کے تحت اگر کوئی ترک کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو اسے اس بارے میں متعلقہ ترکی حکام کو اطلاع دینی چاہئے یعنی قریبی ترکی سفارت خانے یا قونصل کو مطلع کرنا چاہئے اسی کے ساتھ اسے فطری شہری ہونے کا اصل سرٹیفکٹ کو پیش کرنا چاہئے، نیز اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کا سرٹیفکٹ فوجی خدمت (اگر مرد ہے) اور چار فوٹو بھی ان تمام کاغذات کے ساتھ پیش کرتے جائیں، دوہری شہریت کے افراد کو ترکی میں آنے یا وہاں سے جانے کے لئے ترکی پاسپورٹ پیش کرنا ضروری نہیں، پاکستان میں دوہری شہریت کی اجازت ہے، لیکن یہ صرف ۱۶ر ممالک کے لئے ہے آسٹریلیا، بلجیم، کناڈا، مصر، فرانس، آئس لینڈ، آئرلینڈ، اٹلی، اردن، نیدرلینڈ، نیوزی لینڈ، سویڈن، سوازی لینڈ، شام، برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ۔

یورپی یونین اور ای ایف ٹی اے کے ممالک میں دوہری شہریت کے بارے میں متفرق قوانین ہیں، کیونکہ ہر ملک اپنے قوانین بنا سکتا ہے، صرف ایک قانون یہ ہے کہ یورپی یونین کا کوئی شہری یوروپی یونین کے کسی ملک میں غیر متعینہ مدت کے لئے قیام کرسکتا ہے اور چار ایف ٹی اے ممالک میں ان ملکوں کے

شہری یوروپی یونین کے ممالک میں غیر معینہ مدت کے لئے قیام اور کام کر سکتے ہیں، فی الوقت یوروپی یونین کے ۱۴ ممالک دوہری شہریت کو محدود کرتے ہیں۔ یا ممنوع قرار دیتے ہیں، آسٹریا، بلغاریہ، کروشیا، زیک ری پبلک، ڈنمارک، ایسٹونیا، جرمنی، آئرلینڈ، لاتیویا (یکم اکتوبر ۲۰۱۳ء سے یورپی یونین ناٹو اور ای ایف ٹی اے کے متعدد ممالک کے ساتھ لاتیویا کی دوہری شہریت کی اجازت دے دی جائے گی)، آئس لینڈ، لاکٹن سین، ناروے، سوئٹزر لینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، وینی زولا، برازیل، لیتھوانیا، نیدرلینڈ، اسپین، سلووک روپبلک، سلووانیا، پولینڈ اور جنوبی قبرص۔

پولینڈ کے قانون میں دوہری شہریت کی بابت کچھ نہیں کہا گیا ہے، لیکن دوہری شہریت کو برداشت کیا جاتا ہے، کیونکہ ایسا کرنے پر کوئی جرمانہ نہیں ہے، تاہم اگر کوئی شخص اپنی دوہری شہریت کا مظاہرہ کرنے کے لئے شناختی دستاویزات دکھائے، پولیس یا فوجی حکام کی اجازت کے بغیر غیر ملکی فوج میں ملازمت کرے تو وہ تعزیر کا مستوجب ہوگا، دوہری شہریت رکھنے والے افراد کو پولینڈ کے شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاتا (جنوبی) قبرص اور شمالی قبرص کا معاملہ دلچسپ ہے، جنوبی قبرص میں دوہری شہریت کی اجازت ہے۔

شمالی قبرص کو عالمی برادری کے بہت سے ممالک تسلیم نہیں کرتے، (یوروپی یونین کے ممالک قبرص کو ناقابل تقسیم سمجھتے ہیں اور شمالی قبرص کو ایک "مخصوص خطہ" مانتے ہیں، آزاد مملکت کے طور پر اسے تسلیم نہیں کرتے) ترکی ہی وہ اہم اور واحد ملک ہے جو شمالی قبرص کو تسلیم کرتا ہے، اکثر ممالک میں شمالی قبرص کے پاسپورٹ کو سفر کے لئے جائز دستاویز نہیں مانا جاتا (ماسوائے آسٹریلیا، شام، برطانیہ، فرانس، متحدہ امریکہ اور ترکی) ترکی میں شمالی قبرص کے باشندوں کو انہی شرائط پر قیام اور کام کی اجازت ہے، جیسا کہ ترکی کے دیگر شہریوں کو ہے، جنوبی قبرص کی حکومت شمالی قبرص کو غیر قانونی قرار دیتی ہے (شمالی قبرص کی مملکت شمالی قبرص کی ترک جمہوریہ کا وجود ۱۹۸۳ میں عمل میں آیا جبکہ جزیرہ قبرص کی تقسیم ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی)۔

یکم مئی ۲۰۰۴ء کو جنوبی قبرص نے یوروپی یونین میں شرکت کرلی، یہ تقسیم شدہ یورپی یونین کا حصہ سمجھا جاتا ہے، لیکن شمالی قبرص کا علاقہ جس پر جنوبی قبرص کا کنٹرول نہیں ہے وہاں یوروپی یونین کے قوانین معطل سمجھے جاتے ہیں، یہ معاہدہ الحاق ۲۰۰۳ء کے پروٹوکول ۱۰ کے ماتحت کیا گیا ہے، یعنی یہ علاقے مثال کے طور پر یوروپی یونین کے مالیاتی اور کسٹم ضابطوں سے باہر ہیں، تاہم معطل رکھے جانے کے باوجود شمالی قبرص کے باشندوں کے حقوق جو یوروپی یونین کے شہری ہونے کے ناطے انہیں حاصل ہیں وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے وہ یوروپی یونین کے ایک ممبر ملک کے شہری ہیں، حالانکہ قبرص ترکی جمہوریہ پر حکومت کا کنٹرول نہیں ہے۔

یوروپی یونین کے ممالک شمالی قبرص کی جمہوریہ کے پاسپورٹ اور ویزا کو تسلیم نہیں کرتے یونان اور یونانی جنوبی قبرص کے لوگ یوروپی یونین کی آسانیاں شمالی قبرص تک نہیں پہنچنے دیتے۔

یوروپی یونین کے ممبر ممالک مقدونیہ، مونٹی نیگرو سربیا اور ترکی صرف مخصوص کیسوں میں ہی دوہری شہریت کی اجازت دیتے ہیں، مانتی ہنگرو میں دوہری شہریت ممنوع ہے، لیکن اخلاف کے شہریوں کو اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا، لہذا عملاً وہ یہ شہریت حاصل کر لیتے ہیں، سربیا میں دوہری شہریت کی اجازت ہے، ترکی میں بھی دوہری شہریت کی اجازت ہے، لیکن جو شخص دوہری شہریت حاصل کرنا چاہتا ہے اسے سب سے پہلے ترکی حکام کو اس بارے میں مطلع کرنا چاہئے، سابق ترکی شہریوں کے لئے نیلا کارڈ (ماوی کارٹ) بنایا گیا تھا اس کے حامل شخص کو ترکی میں رہنے، کام کرنے، زمین جائداد رکھنے اور وراثت میں حصہ حاصل کرنے کا حق ہے، لیکن اسے ووٹ دینے کا حق نہیں ہے، بوسنیا ہرزگوینا اور کوسوو میں بھی دوہری شہریت کی اجازت ہے، لیکن تمام ممالک چار بہت چھوٹی ریاستوں سے گھرے ہوئے ہیں انڈورا، منا کو سان مارینو، اور ویٹی کن سٹی، صرف ویٹی کن سٹی میں ہی محدود مدت کے لئے دوہری شہریت دی جاتی ہے، جبکہ اندورا، ساکو اور سان مارینو میں دوہری شہریت ممنوع ہے، پوپ کے ہوم گارڈوں کو اجازت ہے کہ وہ سوئیزرلینڈ اور ویٹی کن سٹی کی دوہری شہریت اختیار کر سکتے ہیں جبکہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہوں۔

ہندوستان میں دوہری شہریت کا قانون:

ہندوستان کے دستور میں دوہری شہریت یا دوہری قومیت کی اجازت نہیں ہے، ماسوائے نابالغوں کے جو غیر ارادی طور پر اسے حاصل کرتے ہیں، ہندوستانی حکام کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جو ہندوستانی پاسپورٹ کا حامل ہے وہ کسی دوسرے ملک کا پاسپورٹ حاصل نہیں کر سکتا خواہ وہ نابالغ ہو جسے کوئی دوسرا ملک اپنا شہری قرار دیتا ہو، حالانکہ وہ بیرونی سفر کے لئے یہ دستاویز استعمال کر سکتا ہے، (جیسے کوئی بچہ جو امریکہ میں پیدا ہوا ہو اور اس کے والدین ہندوستانی ہوں) ہندوستانی عدالتوں نے اس بارے میں حکام کو امتیازی اختیار دیا ہے، ۲۰۰۵ء میں ہندوستان نے شہریت قانون ۱۹۵۵ میں ترمیم کی جس کے تحت سمندر پار

رہنے والے ہندوستانیوں کو اس طرح کی شہریت دی گئی ہے تو دوہری شہریت سے کچھ ہی کم ہے اور ایک طرح سے مستقل سکونت کے انداز کی ہے، اسے سمندر پار شہریوں کو دوہری شہریت کی ممانعت کے قانون سے مستثنی کر دیا گیا ہے۔ وہ ووٹ نہیں دے سکتے کسی منصب کے امیدوار نہیں ہو سکتے، فوج میں ملازمت نہیں کر سکتے اور سرکاری عہدہ پر بھی فائز نہیں ہو سکتے، علاوہ ازیں پاکستان اور بنگلہ دیش کے شہریوں کو ان سمندر پار رہنے والے ہندوستانیوں جیسی شہریت نہیں دی جاسکتی کناڈا، امریکہ، یوروپی یونین کے ممالک اور سوئزرلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ میں غیر ملکیوں کو مستقل سکونت کی اجازت ہے یعنی وہ ان ممالک میں غیر معینہ مدت تک قیام اور کام کر سکتے ہیں، لیکن انہیں بعض مراعات حاصل نہیں ہو سکتیں، یعنی وہ نہ ووٹ دے سکتے ہیں، نہ انہیں ووٹ دیا جاسکتا ہے، نہ انہیں دوسرے ملک میں مامور کیا جاسکتا ہے، نہ ان پر مملکت کے دیگر شہریوں جیسی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان ملکوں میں مستقل سکونت رکھنے والے افراد کئی سال کی سکونت کے بعد شہریت حاصل کرنے کی درخواست دے سکتے ہیں، کچھ ممالک نے سفر اور ملازمت حاصل کرنے سے متعلق معاہدے بھی کرر کھے ہیں (وہ غیر سرکاری اور غیر فوجی اداروں میں کام کر سکتے ہیں) یوروپی یونین کے کسی ملک کا شہری کسی دیگر یوروپی ملک اور چاروں ای ایف ٹی اے ممالک میں غیر معینہ مدت تک رہ سکتا ہے، اسی طرح (ای ایف ٹی اے کے چاروں ممالک کے باشندے بھی یوروپی یونین کے ممالک میں سکونت اختیار کر سکتے ہیں) اور ائے تسمانیہ معاہدہ جو آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے درمیان نافذ ہے اس کے تحت ان دونوں ملکوں کے باشندے ان دونوں ملکوں میں قیام اور کام کر سکتے ہیں، جی سی سی ممالک (بحرین، قطر، کویت، عمان، سعودیہ) اور عرب امارات کے شہری ان ممالک میں سکونت اختیار کر سکتے ہیں، لیکن دوہری شہریت کی اجازت نہیں ہے، ہندوستانی باشندوں کو نیپال اور بھوٹان جانے کے لئے ویزا کی ضرورت نہیں، لیکن ان تینوں ممالک میں دوہری شہریت ممنوع ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ جس سولی لاطینی اصطلاح حق شہریت کو تسلیم کرتا ہے اسے عام طور پر شہریت کا پیدائشی حق کے طور پر جانا جاتا ہے، لاطینی امریکہ کے اکثر ممالک جس سولی کی اصطلاح کو تسلیم کرتے ہیں ان میں کینڈا، میکسکو (جو پیدائش کی بنیاد پر قومیت کو تسلیم کرتے ہیں)، نیز وسطی اور افریقی ممالک اور اصطلاح کو مشکل سے ہی قبول کیا جاتا ہے، اسے جس سنگیس سے مخلوط کر دیا جاتا ہے، یوروپ ایشیا اور اکثر افریقی ممالک میں جس سنگوریس (لاطینی اصطلاح خون کا حق) کو مانا جاتا ہے یہی شہریت کا معیار ہے کسی شخص کی شہریت سے متعلق پالیسیوں میں وسیع اختلاف ہے، حالیہ دہائیوں میں متعدد ممالک نے ان قوانین میں ترمیم کی ہے، ۱۹۸۶ء میں آسٹریلیا نے ایک ایسا نظام وضع کیا جس کے تحت صرف اس خود بخود شہریت حاصل ہوگی جس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک آسٹریلیائی ہو، یا قانونی طور پر وہاں کی مستقل سکونت رکھتا ہو، بہر حال آسٹریلین بچے جو خود بخود اس ملک کے شہری نہیں ہیں وہ دس گیارہ سال کی عمر کو پہنچ کر وہاں کے شہری بن سکتے ہیں بشرطیکہ وہ زیادہ تر آسٹریلیا میں ہی قیام پذیر رہے ہوں، پہلے فرانس میں جس سولی شہریت کے اصول کو تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن ۱۹۹۳ء میں قانون میں ترمیم کی گئی جس کے مطابق غیر ملکی افراد کے جو بچے فرانس میں پیدا ہوئے انہیں دس سال کی عمر کے بعد یا بلوغت کی عمر کو پہنچنے پر فرانس کی شہریت کے لئے درخواست دینی ہوگی۔

جرمنی میں جس سنگوریس پر سختی سے عمل کرتے ہوئے ۲۰۰۰ء تک صرف انہی بچوں کو خود بخود شہریت حاصل ہوئی تھی جن کے والدین جرمن شہری ہوں اس کے بعد اس قانون میں ترمیم کر دی گئی اب ان بچوں کو جو غیر جرمن والدین کے ہاں پیدا ہوئے ہوں اسی وقت شہریت دی جائے گی جب والدین میں سے کوئی ایک جرمنی کی مستقل قانونی سکونت کم از کم تین سال کی ہو یا وہ سال سے جرمنی میں قیام پذیر ہو، ایسے بچوں کو ۲۳ سال کی عمر تک پہنچنے تک جرمن شہریت کے لئے درخواست دینا ضروری ہے، برطانیہ نے جس سولی سسٹم کو ۱۹۸۱ء میں ختم کر دیا اب صرف ان ہی بچوں کو خود بخود شہریت حاصل ہوگی جن کے والدین میں سے کوئی ایک برطانیہ کا شہری ہو یا وہاں قانونی طور پر مستقل سکونت حاصل کر چکا ہو، جب ۲۰۰۵ء میں پیرس میں فسادات ہوئے تو جو دو افریقن نسل کے نوعمر کی حادثاتی طور پر بجلی کا کرنٹ لگنے سے موت کی وجہ سے ہوئے ان فسادات میں فرانس کی سابق افریقی کالونیوں کے نوجوان شامل تھے تو اس وقت یہ کہا گیا کہ شہریت کا دو مرحلہ ایک ایسا نظم بنایا جائے جس کے تحت فرانس میں پیدا ہونے والے دیگر جوانوں کو پیدائشی شہریت کا حق دیا جائے (ان جوانوں کو نہیں) جس کے تحت معاشرتی علاحدگی کا عنصر بھی ہو۔

کسی بھی ملک کا شہری نہ ہونا:

ایک دوسرا موضوع کسی ملک کا شہری نہ ہونا بھی ہے، بہت سے بچے جو غیر ممالک میں پیدا ہوتے ہیں انہیں اس ملک کا شہری سمجھا جاتا ہے جہاں کے ان کے والدین شہری ہیں ایسا جس سنگوریس کے تحت ہوتا ہے (جس پر امریکہ میں عمل ہوتا ہے) لیکن معاملہ ایسا نہیں ہوتا، ادارہ پالیسی برائے مہاجرین کی رپورٹ ۲۰۰۶ء میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں کسی بھی ملک سے تعلق نہ رکھنے والے افراد (اسٹیٹ لیس) کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، اقوام متحدہ نے اسٹیٹ لیس افراد

کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ لوگ جو کسی بھی ملک کے شہری نہیں ہیں جس سنگوریس کی سخت پالیسی کے سبب اسٹیٹ لیس افراد کی تعداد بڑھ سکتی ہے، دیگر کیسوں میں ایک بچہ جو ایک قومیت سے محروم باپ کے وہاں ایک ملک میں قومیت کی حامل ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، صنفی تحدید کی بنیاد پر قومیت سے محروم رکھا جاسکتا ہے، کسی بھی ملک سے بے تعلق ہونے کی کیفیت (اسٹیٹ لیس نیس) اس حال میں بھی پیش آسکتی ہے جب طویل عرصہ سے سکونت پذیر نسلی آبادی کو شہریت سے محروم کردیا جائے یا نسلی بنیاد پر ان کی شہریت منسوخ کردی جائے۔

جس سولی کو ماننے والے دیگر ممالک میں جو شہریت سے متعلق اپنی پالیسیوں میں سخت گیری اختیار کرنا چاہتے ہیں، دنیا کے ۱۹۴ ممالک میں سے صرف ۳۰ ایسے ہیں جو غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کے بچوں کو خود بخود شہریت کا حق عطا کرتے ہیں، ترقی یافتہ ممالک میں کناڈا اور امریکہ ایسے ممالک ہیں جو غیر قانونی طور پر مقیم افراد کے بچوں کو خود بخود شہریت عطا کرتے ہیں، (دیکھئے یکم جنوری ۲۰۱۴ کو شہریت کے پیدائشی حق تک رسائی) کچھ ممالک شہریت کے پیدائشی حق کو تسلیم کرتے ہیں پر کچھ نہیں کرتے، مثال کے طور پر باربا ڈوس کو اپنی وسعت سے بھی زیادہ قانونی اور غیر قانونی مہاجرین کے مسئلہ سے الجھنا پڑ رہا ہے اور وہاں غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کے بچوں کو پیدائشی حق شہریت نہ دینے کی بات سوچا جا رہا ہے، پچھلے سال وہاں غیر ملکی جو غیر قانونی طور پر مقیم تھے انہیں رعایت دینے کا فیصلہ کیا گیا، ان غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کو چھ ماہ کی مدت میں اپنے قیام کو قانونی طور پر تسلیم کرانا تھا، جو شخص یکم دسمبر ۲۰۰۹ء کے بعد غیر قانونی طور پر مقیم پایا جائے گا اسے ملک سے خارج کردیا جائے گا، اس رعایت کے ساتھ متعدد شرائط بھی تھیں، سوکوئی غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکی جس کے تین یا زیادہ متعلقین ہوں وہ خود بخود شہریت کے مستحق نہیں ہوسکتے، لہٰذا غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کے بچوں (جو وہاں پیدا ہوئے) کا مسئلہ سیاسی بحث کا خصوصی موضوع بن گیا، ملک کے محکمہ برائے مہاجر امور نے متعدد تبدیلیوں کا مشورہ دیا ہے، ان میں سے ایک تبدیلی پیدائشی حق شہریت کو ختم کرنا بھی ہے، وہ ممالک جنہوں نے نہ فاقی حق پیدائش برائے شہریت کو ۱۹۸۰ سے ختم کردیا ان میں برطانیہ ہندوستان، مالٹا، آئرلینڈ، نیوزی لینڈ اور حال ہی میں ڈومی نکن ری پبلک شامل ہیں جہاں غیر قانونی طور سے مہاجرت ان ملکوں میں اس قدم کا اہم سبب ہے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ پیدائش کی بنیاد پر شہریت کے حصول پر ایک تقابلی جائزہ پیش کیا جائے، شہریت کا یہ حق، خواہ وراثت میں ہو یا اس ملک میں پیدائش کی بنیاد پر، تاکہ متعلقہ اصولوں پر معلوماتی بحث کو سمجھا جاسکے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے یوروپ میں پیدائشی حق شہریت کے بارے میں دو وسیع رجحانات ابھرے ہیں، اکثر ممالک نے موروثی حق شہریت کے بارے میں صنفی مساوات کے اصول کو تسلیم کرلیا ہے، وسطی اور مشرقی یوروپ میں یہ رجحان جنگ کے بعد سوویت یونین کے قانون سے متاثر ہوکر ایسا ہوا، جبکہ مغربی یوروپ میں، چند دہائیوں کے بعد یہ عمل مکمل ہوا، ۱۹۹۰ء کی دہائی کے بعد مساوات کا یہ عمل ایسے بچوں پر خصوصی طور پر مرکوز ہوگیا، جنہیں گود لیا گیا، یا جو ملک سے باہر پیدا ہوئے موخر الذکر زمرے سے متعلق جس سنگوریس (خون کا رشتہ) کو محدود کرنے پر کچھ مخالف تحریکیں بھی چلی ہیں۔ جس سولی اور جس سنگوریس کے بارے میں ان ملکوں میں ایک واضح اتفاق پایا جاتا ہے۔

جس سولی اور جس سنگوریس پر عامل ہیں (بیلجیم، جرمنی اور یونان) انہوں نے دوسری اور تیسری نسل کے مہاجرین کے لئے جس سولی کو شروع کردیا ہے یا اس میں توسیع کردی ہے، جبکہ جس سولی ماننے والے قدیم ملک (برطانیہ اور آئرلینڈ) نے ان دفعات کو محدود کردیا ہے، اتفاق کے اس رجحان کے باوجود تکثیری شہریت کے حوالے سے اس پر تنقید بھی ہوتی ہے، نہ صرف بالٹک ممالک میں جہاں قومی اقلیتوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، بلکہ مغربی یوروپ (آسٹریا، ڈنمارک، ناروے) میں بھی ایسا ہوتا ہے، ۱۹۸۰ء سے اکثر یوروپی ریاستوں نے یکطرفہ نظم کو جس کے تحت بیوی شوہر کی شہریت کی تابع ہوتی ہے، تبدیل کردیا ہے، اس جگہ دوطرفہ نظم جاری کیا ہے جس کے تحت عورت اپنے شوہر سے الگ بھی شہریت حاصل کرسکتی ہے اور شادی، شہریت حاصل کرنے یا اس سے محروم ہونے کا خود بخود ذریعہ نہیں بنے گی) دیکھئے: (جیرالڈ رینے ڈی گروٹ، قومیت سے محرومی، ایک تفصیلی تنقید، ڈی کارٹن اور ہیل بروز کے ایڈیشن دوہری قومیت کے حامل افراد کے فرائض اور حقوق، ارتقا اور امکانات ولی ہیگ، کلوور لاء انٹرنیشنل ۲۰۰۳ء، ۲۶۸، ۲۷۰) بہرحال اکثر یوروپی ممالک نے ۶۰-۱۹۵۰ کی دہائی میں اپنے شہریت سے متعلق دفعات میں مطابقت پیدا کرلئے ہیں، پرتگال (۱۹۸۱) یونان (۱۹۸۴) بلجیم (۱۹۸۳) لکسمبرگ (۱۹۸۶)، ۱۹۸۰ تک ان قوانین کو منسوخ کیا جن کے تحت اگر کوئی عورت کسی غیر ملکی سے شادی کرے تو وہ شہریت سے محروم ہوجائے گی، بچوں کو شہریت دیئے جانے سے متعلق صنفی امتیاز (مرد و عورت) قانون کو بھی ۱۹۸۰ء کے وسط سے پہلے مکمل نہیں کیا جاسکا۔

شہریت سے متعلق قوانین کے مسائل:

سوئزرلینڈ میں امتیازی قانون نافذ تھا جس کی دفعات کو صرف ۲۰۰۶ء میں ختم کیا گیا، وہ یہ تھا کہ جو عورت شادی کے ذریعہ سوئزرلینڈ کی شہریت حاصل کرلیتی ہے اس کے بچے کو خود بخود شہریت حاصل نہیں ہوجائے گی، آسٹریا کے قانون کے آرٹیکل ۷(۳) میں کہا گیا ہے کہ صرف اسی بچے کو شہریت عطا کی جائے گی جس کی ماں آسٹریائی شہری ہو، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باپ کے بارے مین یہ قانون امتیاز کرتا ہے، یوروپی ممالک میں جس سنگوریس کا جو قانون نافذ ہے وہ اس سلسلہ میں اچھا ہے، جس سنگوریس پر لکھی گئی کتاب میں ماں اور باپ کے حوالے سے خون کے رشتہ کی بنیاد پر شہریت کے قوانین پر گفتگو کی گئی ہے، جو لوگ غیر ملک میں پیدا ہوئے ان کے بارے میں مختلف یوروپی ممالک میں شہریت کے مخصوص تقاضوں کی بابت قومی قانون میں درج ذیل دفعات ہیں۔

آسٹرین دستور کی دفعہ آرٹیکل ۷(۱)، ۷(۳) جسے ۱۹۸۳ میں پیش کیا گیا اس میں کہا گیا ہے کہ اگر ماں باپ بلجیئم میں پیدا نہیں ہوئے ہیں تو بچے کی پیدائش کے ۵ سال بعد اس کا رجسٹریشن کرانا ہوگا، بشرطیکہ وہ بچہ کسی بھی ملک کا باشندہ (سٹیٹ لیس) نہ ہو، بلغاریہ میں ۱۹۴۸ء میں نافذ قانون کے آرٹیکل ۸ کے تحت بغیر کسی خصوصی ضرورت کے جس سنگوریس پر گفتگو کی گئی ہے۔

کروشیا جو پہلے یوگوسلاویہ کا ایک حصہ تھا وہاں ۱۹۴۵ کے آرٹیکل ۴ اور ۵ کو برقرار رکھا گیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اس ملک کا شہری ہے تو ۱۸ سال سے قبل یا کروشیا میں سکونت اختیار کرنے کے بعد رجسٹریشن ضروری ہے (جنوبی) قبرص میں آرٹیکل ۱۰۹(۱) اور ۱۰۹(۲) جسے ۱۹۹۹ء میں نافذ کیا گیا، اس میں کہا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اس ملک کا باشندہ ہے تو وہ قبرص سے باہر رہتا ہے تو بچہ کی پیدائش کے دو سال کے اندر جسٹریشن کرانا ہوگا اگر اس کے بعد رجسٹریشن کرایا جائے تو تاخیر کے خصوصی حالات بیان کرنے ہوں گے، زیک ری پبلک کے آرٹیکل ۳(اے) جو پہلے ہی زیوسلواکیہ کے دستور ۱۹۴۹ کا حصہ ہے اس میں ان متعلقہ امور کا تذکرہ کیا گیا ہے، ڈنمارک کے آرٹیکل ۱(۱) جسے ۱۹۷۸ء میں نافذ کیا گیا بچہ (لڑکا/لڑکی) کی شہریت کے حصول کی بابت کہا گیا ہے کہ اگر صرف باپ اس ملک کا باشندہ ہے استونیا جو پہلے اشتراکی روس (سوویت یونین) کا حصہ تھا، اس کے آرٹیکل ۵(۱)، ۱۹۴۵/۱۹۱۸ (سوویت یونین) اس مین بہت کچھ پہلا ہی موجود ہے، یہی حال فرانس کے آرٹیکل ۱۸ کا ہے جسے ۱۹۴۵ء میں نافذ کیا گیا، یونان کا آرٹیکل (۱) ۱۹۸۴، ہنگری کا ۳(۱) ۱۹۵۷ء، اٹلی کا آرٹیکل ۱(۱)(اے) ۱۹۸۳، لتھوانیا کا آرٹیکل ۸(۱) اور (۹) ۱۹۴۵، ۱۹۱۸ (سوویت یونین)، مالابویا کا آرٹیکل ۱۱(۱)(اے) لگسمبرگ کا ۱۹۸۷، نیدرلینڈ کا آرٹیکل ۳(اے)، ۱۹۸۵ء ناروے کا آرٹیکل ۴(۱) ۱۹۷۹ فرانس کا آرٹیکل (۱)، (۱) آرٹیکل ۹ اور ۲۶ (۱)(۲) جو ۱۹۸۴ء میں نافذ کئے گئے اس میں غیر ملک میں پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اسی حالت میں شہری مانا جائے گا اگر اس کا باپ یہاں کا باشندہ ہے، جرمنی میں ۱۹۷۵ء کے آرٹیکل ۴(اے) ۴(۴) کہا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک جرمنی میں پیدا نہیں ہوا ہے تو بچہ کی پیدائش کے ایک سال کے اندر اس کا رجسٹریشن کرانا ہوگا، بشرطیکہ بچہ اسٹیٹ لیس نہ ہو، یہ ضابطہ ۲۰۰۰ء سے نافذ ہے۔

پولینڈ کے دستور کے آرٹیکل ۱(۱) جسے ۱۹۵۱ء نافذ کیا گیا اس میں غیر ملک میں پیدا ہونے والے اشخاص کے بارے میں خصوصی مطلوبات کا ذکر کیا گیا ہے، ایسے بچے جن کے والدین میں سے کوئی ایک پولینڈ کا باشندہ ہے اس نے اس ملک کی شہریت حاصل کرلی ہے بشرطیکہ والدین بچے کی پیدائش کے تین ماہ کے بعد مطلع کریں کہ بچہ دیگر والدین کی شہریت حاصل کرے گا سلووانیا کے آرٹیکل ۴(۱) ۴(۲) ۱۹۴۵ (یوگوسلاویہ) میں کہا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اس ملک کا باشندہ ہے یا ساکن ہے تو ۱۸ سال کی عمر سے پہلے یا ۳۰ کی عمر تک (۲۰۰۲۔۳۳ سے قبل) رجسٹریشن کرانا ہوگا، سوئیڈن میں ۱۹۷۹ میں نافذ کئے گئے آرٹیکل (۱) میں کہا گیا ہے کہ اگر باپ سوئڈن کا باشندہ ہے اور بچہ شادی سے پیدا ہوا ہے تو ڈیکلریشن دینا ہوگا، سوئزرلینڈ میں آرٹیکل ۱(۱)(اے)(۱)(بی) جو ۱۹۸۵/۲۰۰۶ء میں نافذ ہوا ان لوگوں کی بابت بنا ہے جو غیر ملک میں پیدا ہوئے، ۲۰۰۶ء تک کسی بچے کو خود بخود سوئزرلینڈ کی شہریت حاصل نہیں ہوسکتی تھی جس کی ماں نے شادی کے ذریعہ سوئس شہریت حاصل کی ہو، برطانیہ کے قومی قانون میں ۱۹۸۳ میں نافذ کیا گیا اس کے آرٹیکل میں کہا گیا ہے کہ اگر ماں باپ میں سے کوئی برطانیہ میں پیدا نہیں ہوا (یا) بچہ بصورت دیگر سٹیٹ لیس ہے تو بچہ کی پیدائش کے ایک سال کے اندر رجسٹریشن کرانا ہوگا اگر بعض شرائط پوری کی جائیں بشرطیکہ والدین میں سے کوئی ایک سرکاری ملازمت میں غیر ملک میں ہو۔

شہریت کے حصول سے متعلق تمام ممالک اصولی طور پر مانتے ہیں کہ اگر بچے کی ماں بچہ کی پیدائش کے وقت اس ملک کی شہریت کی حامل ہے تو اسے شہریت ملے گی، صرف بلجیئم، قبرص، جرمنی، آئرلینڈ، مالٹا، پرتگال اور برطانیہ غیر ملک میں پیدا ہوئے بچے کے سلسلہ میں اس ضابطہ سے استثنیٰ دیتے ہیں، کروشیا،

لاتیویا اور سلوواکیہ صرف اسی حالت میں استثنی دیتے ہیں جبکہ والدین میں سے کوئی ایک ان کے ملک کا شہری ہو اور بچہ باہر پیدا ہو (ذیل میں دیکھئے) اصولی طور پر ماں وہ عورت ہے جو کسی بچے کو جنم دیتی ہے (مثلاً دیکھئے نیدر لینڈ (۱) اے سی برطانیہ ۵۰ (۹) اور ۱۹۶۲ کے کنونشن بچوں کی مادری ولدیت کی بابت کمیشن انٹرنیشل (سی آئی ای سی) کے قیام کو فروغ دیتا ہے، لہذا اصولی طور پر کسی عورت کو کسی بچہ سے متعلق جو شادی سے پیدا ہوا ہو، اس کے اور اس بچہ کے درمیان خاندانی رشتہ کو تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بعض قوانین میں اب بھی شادی سے پیدا ہونے والے بچے کے درمیان رشتہ کو تسلیم کئے جانے کی دفعات موجود ہیں اور یہ بھی کہ مادریت کو عدالت کے ذریعہ ثابت کیا جائے، مارٹن بی اور جیر الڈ رینے ڈی گروٹ، شہریت کا پیدائشی حق یوروپ میں رجحانات اور ضوابط ای یوڈی او شہریت کے مشاہدہ کو تقابلی رپورٹی ای یوڈی او شہریت کی مشاہداتی رپورٹ شومن سنٹر برائے اعلی مطالعات ایڈنبرا یونیورسٹی لاء اسکول کے تعاون سے آر ایس سی اے ایس۔ ای یوڈی او (۸/ ۲۰۱۰) (مارکس وی بلجیم ای سی ایچ آر ۱۳ جون ۱۹۷۹ ای سی ایچ آر سیریز اے جلد ۳۱)۔

ہر ایک خصوصی کیس میں مثلاً محرمات سے جنسی تعلق کے ارتکاب سے پیدا ہونے والے بچے، بعض قوانین میں کہا گیا ہے کہ بچے اور ماں کے خاندانی رشتہ ثابت کرنے کو ممنوع قرار دیا جائے، تاہم ایسے کیس میں بھی بچے کی پیدائش کی رجسٹریشن کی جائے گی، اس سلسلہ میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے یوروپ اٹلی کا قانون شہریت ۲ (۳) یوروپ میں منفرد ہے، اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ عدالتی ثبوت کو تسلیم کرنے کے ضوابط اس شخص پر بھی لاگو ہوں گے جس کی مادری یا پدری ولایت کا اظہار نہیں کیا جاسکتا، بشرطیکہ ان کے اخراجات کا حق قانونی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہو، اگر کسی بچہ کی پیدائش کے معاملہ میں کوئی تیسرا شخص بھی ملوث ہے تو اس میں خصوصی وراثتی شہریت کے مسائل بھی سامنے آسکتے ہیں، خصوصا کوئی شخص ان بچوں کے قتل کے بڑھتی تعداد کے بارے میں سوچ سکتا ہے جو مصنوعی ماں کے بطن سے پیدا ہوتے ہوں، ایسے کیسوں میں یہ امکانی تنازعہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے کی اصلی فطری ماں کون ہے اس کا تعین نہ ہونے کی صورت میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ بچہ سٹیٹ لیس (کسی ملک کا شہری نہیں) قرار دے دیا جائے اگر اس مصنوعی ماں کی شہریت بچہ کی شہریت سے مناسبت نہیں رکھتی اور اس ماں کی حیثیت اس کی شہریت سے نسبت نہیں رکھتی خواہ اس وجہ سے کہ اس عورت نے اس بچہ کو جنم نہ دیا ہو (دیکھئے مارٹن پی ونک اور جیرالڈ رینے ڈی گروٹ، پیدائشی حق شہریت یوروپ میں رجحان اور قوانین رص ۸)۔

بعض کیسوں میں ایسے بچے کو شہریت حاصل ہوجاتی ہے جبکہ یہ اس شوہر یا شخص کی جانب سے اس بچے کی ولایت تسلیم کئے جانے کی صورت میں ہوسکتا ہے، لیکن ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا مختلف ممالک میں مختلف طریقے ہیں، لہذا یوروپین کونسل نے اپنی سفارش ۱۳/ ۲۰۱۲ء ضابطہ ۱۲ کے تحت سفارش کی کہ ریاست کو خون کے رشتہ کی بنیاد پر بچہ کو شہریت دینے کے اصول پر عمل کریں اگر بچہ کسی طبی تکنیک کے ذریعہ پیدا ہوا ہو یا ایسے بچے کا خاندانی رشتہ قانونی طور پر ثابت یا تسلیم کیا گیا ہو (ایضا)۔

باپ کے معاملہ میں تمام ممالک اصولی طور پر اس کی شہریت کو مانتے ہیں بشرطیکہ اس بچہ کی پیدائش کے وقت وہ شخص اس ملک کا شہری تھا، جس سنگوریس کے تحت یہ فیصلہ کر کے کہ بچہ کسی حد تک شہریت کا مستحق ہے، بلاشبہ یہ تعین کرنا ہوگا کہ کوئی شخص کسی نہ کسی باپ کا بیٹا ہے، یعنی متعلقہ ضوابط کے تحت یہ طے کیا جائے گا، تمام ممالک میں یہ ضابطہ ہے کہ جو بچہ شادی سے پیدا ہوا ہے وہ اپنی ماں کے شوہر (باپ) کی شہریت کا حامل ہوتا ہے۔

مثلاً آسٹریا ۷ (۱) (اے) جنوبی قبرص ۴ (۱) ۱۰ اے) اور ۲ (اے) ڈنمارک ۱ (۱) فن لینڈ ۹ (۲) آئرلینڈ ۱ (۱) سویڈن ۱ (۳)، سوئزرلینڈ ۱ (اے) ایس ڈبلو، علاوہ ازیں شہریت باپ سے حاصل ہوتی ہے، خواہ بچہ کی پیدائش کے وقت اس (باپ) کی موت ہو بھی گئی ہو، آسٹریا ۷ (۱) (بی) بلجیم ۸ (۲)، استونیا ۵ (۱) ۲ سویڈن ۱ (۳) فن لینڈ ۹ (۳)، ہندر لینڈ ۳ (۱) ناروے ۴ (۲) سویڈن ۱ (۴) اور (۵) لکسمبرگ ۱ (۱) (ایضا) بلجیم اور جرمنی نے پیدائش کے وقت جس سولی شہریت کا ضابطہ لاگو ہوتا ہے جو عموماً ۱۸ سال کی عمر سے ہوتا ہے علاوہ ازیں شہریت حاصل کرنے کے طریقوں میں اکثر بڑا واضح اختلاف ہوتا ہے، ایکس پیچ (جرمن میں) ڈیکلریشن کے ذریعہ (بلجیم میں) یا قومیت کے ایک سہل طریقہ سے (جیسا کہ آسٹریا میں) یوڈی ایچ آر کے دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کے وقار اور نا قابل بغیر مساوات عدل اور امن عالم ہی آزادی کی بنیاد ہیں اس میں کہا گیا ہے کہ ان اصولوں کی نفی اور نا قدری ہی بربریت کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے جس سے انسانی ضمیر تڑپ اٹھتا ہے، ایک ایسی دنیا کا وجود جہاں انسانوں کو اظہار رائے کی آزادی اپنے عقائد پر عمل کرنے کا حق خوف اور احتیاج سے چھٹکارا عام انسان کی سب سے بلند آرزوئیں ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں عوام نے بنیادی انسانی حقوق کی بابت اپنے یقین واثق کا اظہار کیا ہے، اسی کے ساتھ انسان کے وقار اور وزن، مردوں، عورتوں کے مساوی حقوق پر بھی ان کا یقین ہے، اور وہ سماجی ترقی کو فروغ دینے اور وسیع تر آزادی کے ساتھ بہتر معیار زندگی کے حصول کا بھی عہد کرتے ہیں۔

یوڈی ایچ آر میں کہا گیا ہے کہ ہر فرد اور سماج کی ہر تنظیم اس اعلامیہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے ان حقوق اور آزادیوں کو فروغ دینے اور لوگوں کو بنانے رسکھانے کی کوشش کرے، اور ترقی پسند ذرائع سے قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر ان کو تسلیم کئے جانے اور عمل کرنے کے جذبہ کو عام کرنے کے لئے کوشش کرے، اپنے عوام کے درمیان اور ان علاقوں میں جو ان کے دائرہ عمل میں آتے ہیں، اقوام متحدہ کے ممبر ممالک ان اقدار کو فروغ دینے کے لئے موثر اقدام کریں، آرٹیکل ۱ کے تحت کہا گیا ہے کہ تمام انسان پیدائشی طور پر وقار اور انسانی حقوق کے حامل ہوتے ہیں، آرٹیکل ۲ میں کہا گیا ہے کہ اس ڈیکلریشن میں جن حقوق اور آزادیوں کی بات کہی گئی ہے تمام انسان ان کے مساوی طور پر مستحق ہیں، اس میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے، رنگ ونسل، مذہب، زبان، جنس پیدائش قوم سماجی مرتبہ سیاست یا فکر رائے کوئی بھی امتیاز نا قابل قبول ہے۔

آرٹیکل ۳ کے تحت کہا گیا ہے کہ ہر فرد کو زندگی، آزادی، شخصی تحفظ کا حق حاصل ہے، آرٹیکل میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو ظلم وتعذیب کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا، قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں، اور قانون کے تحت تحفظ کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا، ہر ایک کو اس کا حق ہے کہ اگر اس ڈیکلریشن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان کے ساتھ امتیاز کیا گیا ہو یا اشتعال انگیزی تو وہ اس سے تحفظ حاصل کریں، آرٹیکل ۹ میں بلا جواز گرفتاری قید یا ملک بدر کئے جانے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، آرٹیکل ۱۳ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو ملک کی حدود میں نقل وحرکت سکونت کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو اپنا یا دوسرا کوئی ملک چھوڑنے اور پھر واپس آجانے کا حق ہے، آرٹیکل ۱۵ کہتا ہے کہ ہر شخص کو قومیت کا حق ہے اور کسی شخص کو بلا جواز اس کی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے اپنی قومیت تبدیل کرنے کے حق سے محروم کیا جائے گا (ایضا)۔

ہیکل العاد اسرائیل میں ایسوسی ایشن برائے سول حقوق (اے سی آر آئی) کے ایگزیکیٹیو ڈائریکٹر ہیں، اے سی آر آئی اسرائیل میں رہنے والے عربوں کو شہریت کے حقوق دیئے جانے کے دعویداروں میں سے ایک ہے۔

انہوں نے اسرائیلی ہائیکورٹ کے ایک حالیہ فیصلہ کا جائزہ لیا جو نسلی بنیاد پر دیا گیا ہے، اسرائیلی ہائی کورٹ نے اسرائیل کے شہریت قانون کے خلاف عرضداشت کو مسترد کر دیا اس قانون کے تحت اسرائیل شہریت کے فلسطینی جوڑوں کو اسرائیل میں کوئی حیثیت دینے کی ممانعت کرتا ہے، اسے ایک بہت اہم فیصلہ بتایا گیا ہے، اسرائیلی سپریم کورٹ کے جج جسٹس آشیر گرونس نے مماثلت پر قائم رہتے ہوئے صاف گوئی اور اختصار کے درمیان اپنی رائے کو کافی مختصر رکھا، انہوں نے اسرائیلی شہریت قانون کے خلاف عرضداشت کو رد کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے ایک حالیہ فیصلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ واضح اقتباس نقل کیا کہ قومی خودکشی کے لئے انسانی حقوق کوئی نسخہ نہیں ہیں۔

یہ اقتباس عدالت کے ایک سابق صدر جسٹس اہارون بارک کے ایک سابقہ فیصلے سے نقل کیا گیا ہے، جیسا کہ گرونس نے وضاحت کی جسٹس بارک کے یہ الفاظ امریکی سپریم کورٹ کے ۱۹۴۹ء کے فیصلے پر مبنی ہیں تو ٹرمی نیلو بنام شکا گو شہر کے فیصلہ میں لکھے گئے جس میں جسٹس رابرٹ جیکسن نے اس فیصلہ میں جو اقلیت ججوں کی اکثریت کی رائے سے مختلف فیصلہ تھا اپنے ساتھی ججوں کو متنبہ کیا جن کی اکثریت تھی۔

انہوں نے لکھا کہ اگر ججوں نے تھوڑی عملی سوجھ بوجھ کے ذریعہ اپنی منطق کو ترک نہ کیا تو یہ خطرہ ہے کہ حقوق سے متعلق دستوری بل خودکشی کا عمل بن جائے گا، گرونس نے جسٹس جیکسن کے ۶۳ سال قبل کے فیصلے کے برخلاف اکثریتی رائے سے اپنا فیصلہ دیا جسٹس مدیر جو کہ اس اکثریتی فیصلہ کے شریک جج تھے وہ تو اس حد تک گئے کہ انہوں نے ایٹمی توانائی اور ایٹمی فضلہ آب وہوا کی تبدیلی اور اسی قسم کے دیگر خطرات کا حوالہ دیا، ہر ایک جج نے اس خوفناک منظرنامے کو پیش کرنے کے لئے اسی حوالے سے تقویت حاصل کی (ہیکل العاد شہریت کا قانون انسانی حقوق کے معاملے میں امتیاز کو ترجیح دیتا ہے، ۲۴ رجنوری ۲۰۱۲ء ایچ آر ٹی ی ۲-۹۷ رجنگ کوم شہریت کے قانون نے ہمیں قانونی فیصلہ کے خلاف حقوق انسانی کی حفاظت پر مجبور کیا ر ۲۳-۷ سو ۳ (ایضا)۔

ان ججوں نے متنازعہ عبوری قانون کے پس پشت تحفظ کے مسئلہ کی قانونی حیثیت پر اچھی طرح غور کرتے ہوئے اصل معاملہ کو نظر انداز کر دیا، تحفظ کو بھی نہیں صرف آبادی کے مسئلہ کو سامنے رکھا، جیسا کہ ایک جج لیوی نے کہا کہ حقوق کے اتلاف کی غیر حساسیت اس نتیجہ کی روشنی میں اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس قانون میں سیکورٹی (تحفظ) کے علاوہ دیگر مقاصد بھی شامل ہیں۔ اور عبوری نوعیت کے بارے میں کیا کہا جائے، شہریت اور اسرائیل میں داخل ہونے کا قانون عبوری نوعیت کا قطعی نہیں ہے، بلکہ اس کے حوصلہ مندانہ عنوان کے باوجود سالوں تک ہمارا تحفظ اس کا مقصد ہے، اس مسئلہ کے قانونی پہلو کی جانچ کرنا ہمیں دلدل میں پھنسا دے گا، اس پر غور کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا (ایضا)۔

جج لیوی کے الفاظ میں "ایک حقیقت جس کا نمایاں نتیجہ ان بعض اسرائیلی باشندوں کے حقوق کا دائرہ تنگ کرنا ہے جو کہ عرب ہیں، اس کے لئے اضافی قانون سازی کی راہ نکلے گی جس کی اس جمہوری نظریہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ ایک ایسی اہم قانون سازی ہوگی جس کی اسرائیل کی جمہوری تاریخ میں کوئی مثال نہیں، اس کے اسرائیلی جمہوریت کے امکانات پر ایسے اثرات مرتب ہوں گے جو موجودہ چیلنجوں کا مقابلہ کرسکیں، وہ غلطی پر ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ جب یہ قانون بنے گا تو اکثریت اس کے نقصانات کو برداشت کرسکے گی، حالانکہ اس میں وہ بنیاد ہی خطرے میں پڑ جائے گی جس کے ہم موید اور حامی ہیں اور شانہ بشانہ کھڑے ہیں (ایضا)۔

اب جبکہ قانون شہریت ایک ایسا داغ بن گیا ہے جو کبھی زائل نہیں ہوگا اسے ہمارے سب سے زیادہ سینئر قانون دانوں نے دستوری منظوری عطا کی ہے۔

بعض اسرائیلیوں کے لئے شہریت کا دائرہ تنگ کرنا، کیونکہ وہ عرب میں کوئی نئی بات نہیں جب سے اس ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے تب ہی سے ایسا ہو رہا ہے، یہ وہ حقائق ہیں جنہیں سب جانتے ہیں اور ان کی تفصیل بھی واضح ہے، جج لیوی مزید لکھتا ہے کہ محض اس بات پر اہلیت سے امتیاز کرنا کہ وہ کون لوگ ہیں یہ ہمارے بنیادی تصور کے خلاف ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جج کے یہ خوبصورت الفاظ بدنما حقائق کے سامنے اپنی کشش کھو بیٹھے ہیں، بہر کیف خواہ لکھنے والا اپنے الفاظ میں جس قدر بھی عقیدہ اور یقین رکھنے کی کوشش کرے، لیکن الفاظ حقائق کے سامنے اپنا حسن کھونے لگتے ہیں (ایضا)، اس فیصلے کا اہم اثر کسی اور جگہ ہی ہے اس کا وسیع سایہ اسرائیل کی جمہوریت کے امکانات ہیں نہیں جس کے چیلنجوں کا وہ اب تک سامنا کرتا آیا ہے، کیونکہ ایسا نہیں ہے، لیکن سایوں کے باوجود جو کہ سمٹتے جارہے ہیں، کیونکہ پرکشش الفاظ مایوس کن حقائق کے درمیان چیلنج تنگ ہوتی جارہی ہے، حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ قانون کی عملداری سے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جانا چاہئے، جبکہ ہائی کورٹ نسلی امتیاز پر مبنی اپنے فیصلہ سے انسانی حقوق کے اتلاف کی علانیہ منظوری دی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لازمی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعہ نقصان پہنچائے جانے سے بچایا جائے اور ان کا تحفظ کیا جائے (ایضا)۔

ہندوستان پر ایک نظر:

ہندوستان کی آبادی دو طبقات میں تقسیم ہے، ملک کے شہری اور غیر ملکی اول الذکر کو تمام سیاسی اور شہریت سے متعلق حقوق حاصل ہیں موخر الذکر کو ان میں سے تمام حقوق حاصل نہیں ہیں ملک کے شہری ایک سیاسی طبقہ ہیں جن کے ذریعہ ریاست رقوم مملکت کا وجود عمل میں آتا ہے، دستور ہند (۱۹۵۰) کے تحت ہندوستان کے شہریوں کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہیں، ان میں سے بعض بنیادی حقوق صرف ہندوستانی شہریوں کو ہی اصل ہیں جن کے تحت وہ ایسے عہدہ پر فائز ہوتے ہیں جیسے صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ ہند، سپریم کورٹ کے جج، ہائی کورٹ کے جج، اٹارنی جنرل، کسی صوبائی یا وفاقی یونٹ کے گورنر، ایڈوکیٹ جنرل بن سکتے ہیں، انہیں الیکشن میں ووٹ دینے اور پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلی کا ممبر بننے کا بھی حق حاصل ہے، دستور ہند میں غیر ملکی کے دو زمرے بتائے گئے ہیں:

دوست ملک کے غیر ملکی اور دشمن ملک کے غیر ملکی، موخر الذکر زمرہ کے شہریوں کو بعض رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے انہیں آرٹیکل ۲۲ کی کلاز (۱) اور (۲) جو گرفتاری اور حراست کے بارے میں ہیں) کے تحت تحفظ حاصل نہیں ہے، دشمن ملک کے یہ غیر ملکی وہ ہوسکتے ہیں جن کا ملک ہندوستان سے برسر پیکار ہے یا وہ ہندوستانی شہری جو رضا کارانہ طور پر ایسے ملک میں رہتا ہے یا اس سے کاروبار کرتا ہے۔

دستور ہند میں ہندوستانی شہریت کے بارے میں واضح طور پر مبسوط قانون نہیں ہے، یہ معاملہ پارلیمنٹ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس بارے میں قانون اور متعلقہ ضوابط بنائے، ہندوستان میں شہریت یا قانون قومیت ایک عمومی طور پر رائج معیار پر ملتی ہے جس سنگوریس (خون کا رشتہ) (دستور ہند کے حصہ دوم آرٹیکل ۵ تا ۱۱) کسی شخص کے ہندوستانی شہریت کا حامل ہونے سے متعلق ہیں، دستور میں صرف اس زمرہ کے ہندوستانیوں کی بات کہی گئی ہے جو دستور ہند کے نفاذ کے وقت اس ملک کے شہری سمجھے جائیں گے (ایم پی جین دستوری قانون نئی دہلی ودھوا اینڈ کمپنی ناگپور ۲۰۰۷ء ص ۸۰-۹۲ ڈی ڈی باسو ہندوستانی دستور کا پیش لفظ گورگاؤں لیکس نیکس بٹرورتھ ودھوا اگست ۲۰۱۲ء ص ۴۷-۸۷، اس سی کشیپ، ہمارا دستور نئی دہلی نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۲۰۱۱ء ص ۸۵-۹۳)۔

آرٹیکل ۵ تا ۸ کے تحت ہر اس شخص کو شہریت کا حق عطا کیا ہے جو دستور ہند کے نفاذ کے وقت مندرجہ معیار پر پورا اترتا ہو۔

جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور ہندوستان میں سکونت رکھتا ہو۔

یہاں سکونت پذیر، لیکن یہاں پیدا نہیں ہوا، مگر اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔

یہاں سکونت پذیر یہاں پیدا نہیں ہوا مگر پانچ سال کے عرصہ سے زائد وہ یہاں قیام پذیر ہے۔
ہندوستان میں مقیم، لیکن یکم مارچ ۱۹۴۷ کے بعد پاکستان چلا گیا، پھر رہائشی پرمٹ حاصل کر کے واپس آ گیا۔
پاکستان کا ساکن، مگر یکم جولائی ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کو ہجرت کی، یا جو اس تاریخ کے بعد آیا ۶ ماہ سے زیادہ مقیم رہا، پھر مقررہ طریقہ کار کے مطابق رجسٹریشن کرایا۔

ہندوستان سے باہر مقیم، مگر خود وہ یا اس کے والدین یا اجداد میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا۔

دستور کے نفاذ کے وقت سکونت، پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والے اور غیر ممالک میں مقیم ہندوستانیوں کے لئے بھی شہریت کی گنجائش رکھی گئی ہے، دستور کے آرٹیکل کے تحت کسی شخص کا مستقل قیام سکونت ہے، کوئی شخص سکونت کے بغیر ہو سکتا ہے اور نہ کسی شخص کے پاس ایک سے زیادہ عملی سکونت ہو سکتی ہے، اپنی سکونت کا انتخاب کرنے کے لئے قومی سرحدی حدود کسی شخص کے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مرد و عورت کسی ایک ملک میں قیام پذیر ہے، لیکن اس کی قومیت کسی دوسرے ملک کی ہے، دستور کے آرٹیکل ۶ میں دستور کے نفاذ سے قبل پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کو شہریت کا حق دیا گیا ہے، ایک شخص جو ۲۹ر جولائی ۱۹۴۸ء سے قبل پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گیا اسے ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا، بشرطیکہ اس کے والدین یا اس کے اجداد میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں کہا گیا ہے اور اس تاریخ سے وہ سکونت پذیر ہے اور ہجرت کی تاریخ کو بھی وہ مقیم تھا، ۱۹ر جولائی ۱۹۴۸ کے بعد ہجرت کرنے والے اشخاص کو حکومت ہند کے کسی اہل کار کے ذریعہ بطور ہندوستانی شہری اپنا رجسٹریشن کرانا چاہئے۔

لیکن رجسٹریشن کرانے والے شخص کو رجسٹریشن کی درخواست پیش کرنے کی تاریخ سے کم از کم ۶ ماہ پہلے سے ہندوستان میں سکونت پذیر ہونا چاہئے۔

دستور کے آرٹیکل ۷ کے تحت ان اشخاص کے لئے خصوصی گنجائش رکھی گئی ہے جو یکم مارچ ۱۹۴۷ کو پاکستان ہجرت کر گئے تھے، مگر بعد کو واپس آ گئے، ایسے لوگ ہندوستان کے شہری ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ان شرائط کو پوری کرتے ہوں جو دستور کے آرٹیکل ۶ کے تحت پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کے لئے درج کی گئی ہیں، آرٹیکل ۸ میں کہا گیا ہے کہ وہ شخص جس کے والدین یا اجداد میں سے کوئی ایک یا وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں مذکور ہے، اور وہ کسی دیگر ملک میں مقیم ہے تو اگر وہ اس ملک میں واقع ہندوستانی سفارت خانے یا قونصل کے وہاں مقررہ فارم پر درخواست دے کر اپنے آپ کو بطور ہندوستانی شہری رجسٹریشن کرالیتا ہے تو اسے ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا، یہ عمل خواہ دستور ہند کے نفاذ سے قبل کیا جائے یا بعد کو اسے درست سمجھا جائے گا، آرٹیکل ۹ میں کہا گیا ہے کہ کوئی شخص آرٹیکل ۵ کی مندرجات کے تحت ہندوستانی شہری نہیں سمجھا جائے گا نہ آرٹیکل ۶ اور ۸ کے تحت اس کی یہ حیثیت تسلیم کی جائے گی، اگر اس نے اپنی مرضی سے کسی ملک کی شہریت حاصل کر لی ہے، آرٹیکل ۱۰ میں کہا گیا ہے کہ جسے آرٹیکل ۵ تا ۱۰ کی مندرجات کے تحت ہندوستانی سمجھا جائے تو پارلیمنٹ کے ذریعہ شہریت سے متعلق کوئی قانون بنائے جانے کی صورت میں بھی اسے ہندوستانی شہری تسلیم کیا جاتا رہے گا، بالفاظ دیگر پارلیمنٹ کی جانب سے واضح قانون سازی کے بغیر کسی شخص کو اس کی شہریت سے محروم نہیں کیا جا سکتا (دیکھیں۔ کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا ۱۲ر جنوری ۲۰۱۲ء کو ہندوستانی شہریت کے ضابطے)، پارلیمنٹ نے قانون شہریت ۱۹۵۳ بنایا جس میں شہریت ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۶ء کے ذریعہ ترمیم کی گئی، پھر ۱۹۹۲ء کے ترمیمی ایکٹ ۲۰۰۳ء کے شہریت ایکٹ اور ۲۰۰۵ء کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ ترامیم کی گئیں، اصل ایکٹ میں کہا گیا ہے، جو شخص ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا اسے بعض مستثنیات کے ساتھ پیدائشی ہندوستانی سمجھا جائے گا۔

جو شخص ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کے بعد ہندوستان سے باہر پیدا ہوا ہو تو اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کا باپ ہندوستانی شہری تھا تو وہ بھی ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا۔

بعض شرائط کے تحت بعض زمروں کے تحت آنے والے افراد بھی مقررہ فارم پر رجسٹریشن کی درخواست پیش کر کے ہندوستانی شہریت حاصل کر سکتے ہیں۔
بعض شرائط کے تحت غیر ملکی بھی قومیت کے لئے درخواست پیش کر کے شہریت حاصل کر سکتے ہیں۔
اگر کوئی سرزمین (علاقہ) ہندوستان کا حصہ بن جائے تو حکومت ہند ایک حکم نامہ کے ذریعہ اس علاقہ کے باشندوں کو ہندوستانی شہری قرار دے گی۔

بعض بنیادوں کے تحت شہریت منسوخ کی جاسکتی ہے، ختم کی جاسکتی ہے، یا کسی شخص کو شہریت سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) ملک کے کسی شہری کو ہندوستان کا کامن ویلتھ ہندوستانی شہری کا درجہ دیا جائے گا، حکومت ہند جوابی اقدام کے طور پر اس بارے میں قانون بنا سکتی ہے۔

جو شخص ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ یا اس کے بعد پیدا ہوا ہو، لیکن ۱۹۸۶ء کے ایکٹ کے نفاذ سے قبل جو یکم جولائی ۱۹۸۷ کو نافذ ہوا ایسے شخص کو بھی پیدائشی ہندوستانی سمجھا جائے گا، کوئی شخص جو یکم جولائی ۱۹۸۷ء کو اس کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا تو اگر اس کے والدین میں سے کوئی ایک اس کی پیدائش کے وقت ہندوستانی شہری تھا تو ایسا شخص بھی ہندوستان کا شہری قرار پائے گا۔

جو شخص ۳دسمبر ۲۰۰۴ء کو مارچ کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا تو اسی حالت میں اسے ہندوستانی سمجھا جائے گا، جب اس کے والدین ہندوستانی ہوں یا ان میں سے ایک اس کی پیدائش کے وقت ہندوستانی ہو اور دوسرا غیر قانونی طور پر ہندوستان میں مقیم نہ ہو۔

وہ شخص جو ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ کو یا اس کے بعد لیکن ۱۰ ردسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے غیر ممالک میں پیدا ہوا تو اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کا باپ ہندوستانی شہری تھا تو اسے بھی وراثت کے طور پر ہندوستانی شہری مانا جائے گا، ۱۰ ردسمبر ۱۹۹۲ کو اس کے بعد غیر ممالک میں پیدا ہونے والے شخص کو بھی ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا، بشرطیکہ اس کی پیدائش کے وقت اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستانی شہری ہو ۳ ردسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد جو شخص ہندوستان سے باہر پیدا ہوا ہو تو اگر اس کی پیدائش کے ایک سال کے اندر اس ملک میں موجود ہندوستانی قونصل کے وہاں اس کی رجسٹریشن نہیں کرائی گئی تو اسے ہندوستانی شہری نہیں سمجھا جائے گا، بعض حالات میں اگر رجسٹریشن ایک سال کی مدت کے بعد کرا جاتا ہے تو مرکزی حکومت کی اجازت سے اسے بطور ہندوستانی شہری تسلیم کیا جائے گا لیکن نابالغ کے بطور ہندوستانی شہری رجسٹریشن کے لئے ہندوستان قونصل خانے میں دی گئی درخواست کے ساتھ یہ تحریری حلف نامہ بھی داخل کیا جانا چاہئے کہ نابالغ (لڑکا رلڑکی) کے پاس کوئی غیر ملکی پاسپورٹ نہیں ہے، اگر کوئی غیر ملکی بارہ سال تک ہندوستان میں رہتا ہے تو اسے فطری طور پر ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا، درخواست دہندہ کو ۱۴ سال کی مدت میں پورے ۱۲ سال تک ہندوستان میں مقیم ہونا چاہئے، اور کم از کم ۱۲ ماہ تک اس کا قیام مسلسل ہونا چاہئے تب وہ شہریت کے لئے درخواست دے سکتا ہے، دستور کے شہریت قانون ۱۹۵۵ کے شیڈول ۸ میں دست برداری کے بارے میں بتایا گیا ہے اگر کوئی بالغ شخص ہندوستانی شہریت ترک کرنے کا ڈیکلریشن (اعلان) پیش کرتا ہے تو وہ اپنی شہریت سے محروم ہو جائے گا اور اس کے نابالغ بچے بھی ڈیکلیریشن دینے کی تاریخ سے ہندوستانی شہریت سے محروم ہو جائیں گے، تاہم ۱۸ سال کی عمر کو پہنچے پر یہ بچے ہندوستانی شہریت دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، ہندوستانی شہریت سے دستبرداری کے ضوابط میں کہا گیا ہے کہ دستبرداری کا ڈیکلریشن دینے والا شخص پوری عمر اور صحت وصلاحیت کا حامل ہونا چاہئے، شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ کی دفعہ ۹ شہریت ختم کرنے سے متعلق ہے، شہریت ختم کئے جانے کے ضابطے ہندوستانی شہریت سے دستبرداری کے ضوابط سے علاحدہ اور واضح ہیں، دفعہ ۹(۱) میں کہا گیا ہے کہ کوئی ہندوستانی شہری جو فطری یا رجسٹریشن ایکٹ کے ذریعہ کسی غیر ملک کی شہریت حاصل کرتا ہے تو وہ ہندوسانی شہریت سے محروم ہو جائے گا، واضح طور پر شہریت ختم کرنے والے ضوابط شہریت سے دستبرداری کے ضوابط سے مختلف ہیں، کیونکہ ان کا اطلاق کسی بھی ہندوستانی شہری پر ہوتا ہے اور صرف بالغ شخص تک ہی محدود نہیں ہیں، بچے بھی ہندوستانی شہریت سے خود بخود محروم ہو جائیں گے اگر پیدائش کے بعد کسی وقت بھی وہ غیر ملکی شہریت اختیار کر لیتے ہیں مثال کے طور پر رجسٹریشن یا فطری طور پر شہریت حاصل کرنے پر خواہ یہ شہریت ان کے والدین نے ہی کیوں نہ حاصل کی ہو۔

کسی دیگر ملک کا پاسپورٹ حاصل کرنا بھی شہریت ضوابط ۱۹۵۶ کی مندرجات کے تحت اپنی مرضی سے دوسرے ملک کی قومیت حاصل کرنے کا عمل سمجھا جائے گا۔

شہریت رولز ۱۹۵۶ء کے شیڈول III کے رول (ضابطہ) ۳ میں کہا گیا ہے کہ یہ حقیقت کہ کسی ہندوستانی شہری نے کسی بھی تاریخ کو کسی غیر ملک کی حکومت سے پاسپورٹ حاصل کیا، اس بات کا پورا ثبوت ہوگا کہ اس شخص نے اس تاریخ سے قبل اس ملک کی شہریت اپنی مرضی سے حاصل کر لی ہے، مزید یہ کہ اس رول (ضابطہ) کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے کہ بچے کے والدین نے اس لڑکے رلڑکی کا غیر ملکی پاسپورٹ حاصل کیا ہو اور خواہ اس پاسپورٹ کا رکھنا اس غیر ملک کے قانون کے تحت مطلوب ہو جو اس بچے کو اپنے ملک کا شہری سمجھتا ہے (مثلاً ہندوستانی والدین کا بچہ جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پیدا ہوا ہو اور امریکی قانون کے تحت اسے پاسپورٹ کا حامل ہونا ضروری ہے، تا کہ وہ باہر کے ملک کا سفر کر سکے، کیونکہ قانون کے تحت وہ امریکی شہری ہے) اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی شخص کے

پاس ہندوستانی پاسپورٹ بھی ہے، اگر پیدائش کی بنیاد پر غیر ملکی قومیت خود بخود حاصل ہوگئی ہو اور پیدائش کے بعد یہ اپنی مرضی سے حاصل نہ کی گئی ہو ایسے معاملہ پر بھی اس ضابطہ کا اطلاق ہوگا، جو لوگ کسی دوسرے ملک کی شہریت حاصل کر لیتے ہیں وہ جس تاریخ سے اس ملک کی شہریت یا پاسپورٹ حاصل کرتے ہیں ہندوستانی شہریت سے محروم ہو جائیں گے۔

گوا دمن اور دیو سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی شہریوں کے لئے خصوصی ضوابط موجود ہیں، شہریت رولز ۱۹۵۶ کے شیڈول III کے رول (ضابطہ) ۱۳ اے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص گوا، دمن، دیو (شہریت) حکم نامہ ۱۹۶۲ کے تحت ہندوستانی شہری قرار پاتا ہے یا دادر نگر حویلی (شہریت) حکم نامہ ۱۹۶۲ (شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ کے سیکشن ۷ کے تحت جاری کئے گئے) تو اگر ایسے شخص کے پاس غیر ملکی پاسپورٹ ہو اور اس نے ۱۹ر جنوری ۱۹۶۳ کو یا اس سے قبل اسے واپس نہ کر دیا ہو تو یہ اس بات کا پکا ثبوت ہوگا کہ اس شخص نے اپنی مرضی سے اس تاریخ سے قبل اس غیر ملک کی شہریت اختیار کر لی ہے، ۱۶ر فروری ۱۹۶۲ کو سپریم کورٹ آف انڈیا کی دستوری بنچ نے ایک مقدمہ اظہار احمد خاں بنام یونین آف انڈیا میں فیصلہ صادر کیا کہ اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ شخص مذکور نے قومیت یا رجسٹریشن کے ذریعہ کسی دیگر ملک کی شہریت حاصل کر لی تھی تو اس میں کوئی شک نہیں رہ جائے گا کہ اسی قومیت یا رجسٹریشن کے بعد وہ ہندوستانی شہریت سے محروم ہو جائے گا (انڈین سی زن شپ ۱۲/ ۱۲/ ۲۰۱۲ء)۔

دوہری شہریت:

اگست ۲۰۰۵ء میں شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ میں ترمیم کر کے سمندر پار کر کے ہندوستانی شہری (اوسی آئی) اسکیم شروع کی گئی، یہ اسکیم پرسار بھارتی دوس کنونشن منعقدہ حیدرآباد ۲۰۰۶ء کے دوران شروع کی گئی، ہندوستانی حکام کے قول کے مطابق قانون یہ کہتا ہے کہ کوئی شخص ہندوستانی پاسپورٹ کا حامل ہوتے ہوئے کسی دیگر ملک کا پاسپورٹ نہیں رکھ سکتا، یہ ضابطہ اس بچے پر بھی لاگو ہوگا جو کسی دیگر ملک میں پیدا ہوا اور وہ ملک اس بچے کو اپنے ملک کا شہری قرار دیتا ہے، اور قانون کے تحت اسے پاسپورٹ رکھنے کا حق ہے، تاکہ وہ غیر ملک کا سفر کر سکے (مثلاً ہندوستانی والدین کے وہاں کوئی بچہ امریکہ یا سنگاپور میں پیدا ہوا) ہندوستانی عدلیہ نے اس معاملہ میں انتظامیہ کو وسیع اختیارات عطا کئے ہیں، لہذا سمندر پار رہنے والے ہندوستانی افراد کی شہریت واقعی طور پر ہندوستانی شہریت نہیں ہے، لہذا یہ دوہری شہریت یا دوہری قومیت کے دائرے میں نہیں آتی علاوہ ازیں اوسی آئی کارڈ ہندوستانی ویزے کا متبادل نہیں ہے، اس لئے اوسی آئی کارڈ کے حامل شخص کو ہندوستان کا سفر کرنے کے لئے پاسپورٹ رکھنا چاہئے جس میں سفر کے لئے ویزا لگا ہوتا ہے۔

سمندر پار رہنے والے ہندوستانی کے حقوق اور مراعات غیر مقیم ہندوستانیوں، جیسے ہی ہوں گے، سمندر پار مقیم ہندوستانی کا موجودہ غیر ملکی پاسپورٹ جس میں وہ ویزا بھی شامل ہونا چاہئے جسے یو ویزا کہا جاتا ہے اور جو کثیر المقاصد اور کثیر زیارتی تاعمر کام آنے والا ویزا ہے، اس کے ایک سمندر پار مقیم ہندوستانی کسی بھی وقت کتنی ہی مدت کے لئے اور کسی مقصد کے لئے ملک میں آسکتا ہے، وہ سمندر پار مقیم ہندوستانی مندرجہ ذیل حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتا، خواہ وہ ہندوستان میں ہی مقیم کیوں نہ ہو، (ا) ووٹ ڈالنے کا حق، (II) صدر نائب صدر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج کے منصب پر فائز ہونے کا حق، لوک سبھا راجیہ سبھا یا کسی صوبائی اسمبلی یا کونسل کا ممبر بننے کا حق (III) سرکاری نوکری میں تقرر، معاشی، مالیاتی اور تعلیمی امور میں اوسی آئی کارڈ ہولڈر زراعتی اراضی خریدنے کا حق یا پودے لگانے کی اراضی حاصل کرنے کا حق نہیں ہوگا یا کوئی سرکاری منصب حاصل کرنے کے مجاز بھی نہیں ہوں گے۔

ہندوستان آنے پر انہیں غیر ملکیوں کے علاقائی رجسٹریشن آفیسر (ایف آر آر او) کے وہاں رجسٹریشن کرانے سے بھی چھوٹ حاصل ہوگی اور وہ جب تک چاہیں ملک میں قیام کر سکتے ہیں، اوسی آئی کارڈ رکھنے والے مختصر وقفہ کے نوٹس پر سفر کر سکتے ہیں، اور ہندوستان میں کوئی ذمہ داری قبول کر سکتے ہیں، جبکہ دیگر لوگ ملازمت کے ویزا پر آئیں انہیں دفتری تاخیر میں الجھنے کا اندیشہ رہتا ہے، متعدد کمپنیاں اپنے کاروبار کی وسعت کے لئے پی آئی او ہندوستان بھیجنے کی پالیسی تیزی سے اختیار کر رہی ہیں، غیر ممالک میں ہندوستان کے قونصل قانون میں اوسی آئی کی بہت ہی زیادہ درخواستیں موصول ہو رہی ہیں۔ پوری دنیا میں ان قونصل قانون نے اوسی آئی کے جو کارڈ جاری کئے ہیں، ان کی تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے اور متعدد قونصل خانے پچھلی درخواستوں پر کاروائی میں مصروف ہیں اوسی آئی کارڈ رکھنے والے ہندوستان میں ذمہ داریاں سنبھالنے کے بہت خواہش مند ہیں، اکانومک ٹائمز ۱۵ر نومبر ۲۰۰۹، انڈیا غیر مقیم ہندوستانیوں میں سمندر پار ہندوستانی بننے کا رجحان بڑھ رہا ہے، آئی اے این ایس ۲۴ر مارچ ۲۰۰۹)، پاکستان، بنگلہ دیش اور بعض دیگر ممالک کے شہری جن کی تفصیل مرکزی سرکار کی جانب سے کی جائے گی، یہ شہری ہندوستانی نسل کا فرد کارڈ رکھنے کے مستحق نہیں ہیں، انہیں ایسے کارڈ کی منظوری نہیں دی جاسکتی ہندوستان کے کسی پورٹ (ساحل رسوائی اڈہ) پر آنے یا

گذرنے پر غیر ملکی پاسپورٹ کے ساتھ پی آئی او (ہندوستانی نسل کا فرد) کا کارڈ بھی پیش کرنا ضروری ہے، غیر ملکی پاسپورٹ اور بی آئی او کارڈ میں تمام تبدیلیوں نام، پاسپورٹ کی تجدید وغیرہ کو دکھایا جانا چاہئے، بی آئی او کارڈ عموماً تاریخ اجراء سے پندرہ سال تک کے لئے جائز ہوتا ہے، ۲۰۱۱ء کے اوائل میں وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بتایا کہ بی آئی او کارڈ کو سمندر پار ہندوستانی کے کارڈ کے ساتھ ضم کر دیا جائے گا اس مجوزہ کارڈ کو انڈین اوورسیز کارڈ کہا جائے گا۔

آسام میں قومیت کے بارے میں امتیازی تفریق:

آسام ہندوستان کا وہ نمایاں مشرقی صوبہ ہے جہاں مسلم اقلیت کو وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مسلم مخالف تعصب کے سبب قومیت کے مسئلہ سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اور اس صوبہ کی ایک وسیع مسلم آبادی کو اس معاملے میں امتیازی تفریق کے تحت قومیت سے محروم کیا جا رہا ہے، یہ نہ صرف اپنی نوعیت کے اعتبار سے متنازعہ ہے، بلکہ سیاسی طور پر پھیلایا گیا منصوبہ ہے، تاکہ مذہبی اور فرقہ وارانہ جذبات کو ابھار کر اس اقلیت کے خلاف غیر دوستانہ ماحول کو ابھارا جائے، آسام میں شناخت کی جو تحریک چلائی گئی وہ غیر ملکیوں کے خلاف تحریک میں بدل گئی اور جلد ہی اس نے بنگالی زبان بولنے والے مسلمانوں کے خلاف تشدد، نفرت اور امتیاز کا ایک منصوبہ بند رخ اختیار کر لیا، مذہبی جذبات کو بھڑکا کر چلائی جانے والی یہ نفسیاتی اور سیاسی مہم اقلیت کو خارج کرنے اور یکطرفہ شرائط پر انہیں حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کی دھمکیاں دیئے جانے پر منتج ہوئیں، آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ پر عدلیہ کا جو رویہ ہے اس کے سبب اقلیت میں غیر یقینی عدم تحفظ خوف اور احساس کمتری پیدا ہوئی ہے، انہیں ہندوستانی قومیت سے محروم کئے جانے کے سوال کے نتیجہ میں ان ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد ایسے پناہ گزینوں میں بدل گئی ہے جو بے حال ہیں اور ریاستی و مرکزی حکومتوں کے رحم و کرم پر حیران و پریشان جی رہے ہیں، قومیت عطا کرنے سے انکار کے سبب انہیں روزمرہ کی زندگی، روزی کمانے اور بطور شہری اور انسان اپنے وقار کو برقرار رکھنے میں شدید دشواریاں پیش آ رہی ہیں، کچھ چھوٹی پارٹیوں کے ماسوا کوئی بڑی سیاسی پارٹی اس اقلیت کے مسئلہ اور مصائب کے بارے میں سنجیدہ نہیں نظر آتی، بڑی پارٹیاں جو سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں وہ انہیں ووٹنگ مشین کے طور پر استعمال کرتی ہیں، ان کے مسائل سے بیگانہ ہیں اور موجودہ صورت حال کو ہی برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بنگلہ زبان بولنے والوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اصل باشندے جیسے کچھار، وُہ لوگ جو برطانوی عہد کے دوران ملک کے مختلف حصوں سے آکر آسام میں آباد ہو گئے، وہ جو ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے یہاں آئے، یہ علاقہ پاکستان سے آزاد ہو کر اب بنگلہ دیش کے نام سے جانا جاتا ہے، بہرکیف اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ یہ ہجرت کرنے والے مسلم غلبہ والے مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں اکثریتی غلبہ کے اصل یا مفروضہ خوف کے سبب یہاں آئے، اس سیاسی مہم کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہ آسامی تحریک جو آسامیوں کے ثقافتی اور لسانی تحفظ کے لئے شروع کی گئی تھی وہ بتدریج آسامی مسلمانوں کے خلاف مہم میں بدل گئی اور انہیں بنگلہ دیشی کہہ کر حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں، سیاسی طور پر ایجنڈا یہ ہے کہ آسامی مسلمانوں کی وسیع آبادی کو غیر ملکی قرار دے دیا جائے، خواہ انہیں ہندوستانی شہریت و قومیت ملے یا نہ ملے میڈیا انہیں غیر ملکی کے طور پر ہی پیش کرتا ہے اور انہیں ان کے حقوق سے عملاً محروم رکھا جاتا ہے، غیر قانونی طور پر ہجرت کرنے والوں کا مسئلہ ہندوستان کی آزادی کے وقت سے ہی اٹھایا گیا اور اب یہ ریاست کی سیاست کا سب سے اہم موضوع ہے (محمد حسیب الرحمن، غیر قانونی طور پر ہجرت کرنے والے اور ہندوستانی مسلمان، ہی گزٹ ۱۶ تا ۳۱ جنوری ۲۰۰۵ء)۔

دوسری طرف آسام کے بنگلہ بولنے والے باشندے اس الزام سے انکار کرتے ہیں اور اسے ایک ایسا سیاسی ہتھکنڈا بتاتے ہیں، جو انہیں پریشان کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، علاوہ ازیں بنگلہ دیش کی حکومت بھی ایسے دعووں کو تسلیم نہیں کرتی جو ہندوستان میں کئے جا رہے ہیں ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے ایک مسلم اکثریتی ملک کی حیثیت سے وجود میں آنے پر وہاں کے ہندو باشندوں نے آسام اور شمالی مشرق کے دیگر صوبوں میں ہجرت کر کے سکونت اختیار کی، ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان آزاد ہو کر بنگلہ دیش بنا بہت سے ہندو اور مسلمان ۱۹۷۱ء کی ہند پاک جنگ کے دوران ہجرت کر کے آسام آ گئے اس کے بعد بہت سے ہندو ہجرت کر کے آسام اور دیگر صوبوں میں آ گئے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں مہاجرین سے متعلق ہند بنگلہ دیش معاہدہ کے باوجود علاقائی عصبیت رکھنے والے عناصر بنگلہ دیشی قومیت کا سوال اٹھا کر مسلم آبادی کو پریشان کر رہے ہیں، یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندو پناہ گزینوں کی کل تعداد میں سے جس نے بنگلہ دیش آزادی کی جنگ کے دوران پناہ لی تھی، ۱۵ سے ۲۰ لاکھ تک افراد یہاں رک کر رہے اور ریاست میں آباد ہو گئے، اگرچہ یہ حقیقت سب کو معلوم ہے پھر بھی ایسے افراد کی شناخت کر کے انہیں جلاوطن کرنے کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی، بس ریاست میں رہنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو ہی منصوبہ بند طریقے سے نشانہ بنایا جا رہا ہے (ایضاً)۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ غیر ملکی مسلمانوں کی غیر قانونی آمد ۷۱-۱۹۶۱ میں بہت تیزی سے گھٹ کر صرف ۲۷۰۰۰ رہ گئی جبکہ ۶۱-۱۹۵۱ یہ تعداد ۲۲۰۰۰۰ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد مشکل سے ہی بنگلہ دیشی مسلمان غیر قانونی طور پر ریاست میں داخل ہوئے، ان ۱۷۵۷۰۰ غیر ملکیوں میں سے جو ۱۹۷۱ء میں آسام میں داخل ہوئے مسلمانوں کی تعداد صرف ۷۰۰۰۴ تھی، دراصل انہیں غیر ملکی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ یہ وہ مسلمان ہیں جو ۵۰-۱۹۴۸ کے فسادات کے دوران ۵۰۰۰۰ سے ۶۰۰۰۰ تک ہندوستانی مسلمان بے گھر ہو کر آسام چھوڑ کر مشرقی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور یہاں وہ اپنی ساری جائداد اور املاک چھوڑ گئے جب ۱۸/اپریل ۱۹۵۰ کے نہرو لیاقت ایکٹ کے بعد ان میں کچھ واپس آئے تو انہیں فوراً غیر ملکی درانداز (گھس پیٹھئے) قرار دے دیا گیا، ۱۹۵۲ سے ۲۰۰۲ء کے دوران کم از کم ۳۳۷۰۰۶ ہندوستانی مسلمانوں کو غیر ملکی ناپسندیدہ اور وطن دشمن غیر ملکی کہہ کر نکال دیا گیا (۲۰۰۲-۱۹۸۵ کے دوران یہ تعداد ۱۵۰۳ تھی) (ایضا)۔

فرقہ وارانہ یکجہتی کے ریکارڈ کے باوجود (یہاں برطانوی عہد کے بنگال اور شمالی ہند کے مقابلہ میں ہندو مسلم تعلقات بے حد خوشگوار رہے ہیں) تقسیم ہند کے نتیجہ میں ۱۹۴۷ء میں یہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جس کے باعث آسام کے نشیبی علاقہ میں رہنے والے ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان بے گھر ہو گئے، ممتاز آسامی پارلیمنٹرین ہیم بروا نے اعتراف کیا کہ ۵۳۰۰۰ مسلمان خاندان بے گھر ہوئے تھے (ہیم بروا۔ سرخ دریا اور نیلی پہاڑی۔ گوہاٹی لایرس بک اسٹال ۱۹۶۲/ص ۴۶، یہ منیر الحسن کی کتاب، ریاست، شناخت کی تحریک اور شمالی مشرق میں اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے، میں بنایا گیا ہے، ای پی ڈبلو ۱۹۴۵)۔

۱۹۵۰ء میں ہندو پاک کے درمیان نہرو لیاقت پیکٹ ہوا اس میں یقین دلایا گیا تھا کہ ایسے لوگوں کی بحفاظت واپسی اور باز آبادکاری کی جائے گی، دو سال بعد بہت سے لوگ گھر لوٹ آئے، ۱۹۶۲ کی ہند چین جنگ کے بعد ریاستی اسمبلی اور میڈیا میں پاکستانی دراندازوں کو نکالنے کا مطالبہ کیا گیا، آسام حکومت نے پاکستانی دراندازوں کو روکنے کی اسکیم (پی آئی پی) کا نفاذ کیا جس کے تحت بہت سے آسامی مسلمانوں کو ان کے اقلیتی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔

ہیرن گوہین نے کہا کہ آسام کے دانشوروں نے اس ظلم وستم سے آنکھیں بند کر لیں جو آسامی پولیس غیر آسامی مسلمانوں پر ڈھائے، ہیرن گوہین ہیرن، اسمیا مسلمان آئی اور وابیاسات، اسمیا اڈستارلی، آسام۔ گوہاٹی شانتی پرکاشن ۱۹۸۸/ص ۴۴، ۳۲، منیر الحسن کی کتاب شمال مشرق میں، ریاست شناخت کی تحریک اور اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے/ص ۱۹۵۱(۵)۔

پی آئی پی اسکیم کے تحت کاروائی سے غیر منظم اور بے سہارا دیہی مسلمان کسان خاص طور سے غیر آسامی مسلمان پوری برہم پتر وادی میں خوف زدہ ہو کر رہ گئے، ۶۷-۱۹۶۱ کے دوران آسامی پولیس نے صرف نوگاؤں ضلع سے ہی ۱۵۶۹۱ افراد کو جلاوطن کر دیا، نوگاؤں ڈسٹرکٹ گزیٹر گورنمنٹ آف آسام ۱۹۷۸ منیر الحسن۔ آسام کی تحریک طبقہ وادی نظریہ اور شناخت نئی دہلی مانک پبلیکیشن ۱۹۹۳/ص ۲۱۶)، آسام کے سابق وزیر اعلی ہیتیشور سیکیہ نے اعتراف کیا کہ ۶۷-۱۹۶۱ کے دوران ۱۹۲۰۷۹ مسلمانوں کو آسام سے مشرقی پاکستان میں جلاوطن کر دیا گیا (منیر الحسن آسامی تحریک طبقہ داری نظریہ اور شناخت نئی دہلی مانک پبلیکیشن ۱۹۹۳/ص ۲۱۹-۲۱۵)، اس طرح سیاسی اور حقیقی طور پر جلاوطن اور بے گھر کئے جانے کے خوف نے ان مصیبت کے سالوں میں آسام کی اس اقلیت کو سہارا رکھا ہے، اگرچہ یہ لوگ مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان سے نہیں) سے تقسیم کے بعد سے بہت پہلے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے، آزادی کے بعد یہ لوگ آسامی قومیت سے ہم آہنگ ہو گئے اور آسامی بن گئے (منیر الحسن موجودہ آسام کے مسلمان، ایک سماجی تعارف، نارتھ ایسٹ انڈیا کونسل، فار سوشل سائنس ریسرچ جلد ۱۱ نمبر ۲/اکتوبر ۱۹۸۷ء حسین ہندوستانی ریاست آسام کے مسلمان، جرنل انسٹی ٹیوٹ برائے مسلم اقلیت کے مسائل لندن جلد ۸-۱۹۸۷ حسین ہندوستان میں مسلمانوں کا مسئلہ جرنل برائے عصری ایشیا جلد ۲۰ نمبر ۳ (۱۹۸۹) حسین آسامی تحریک طبقاتی نظریہ اور شناخت ۱۹۹۳)۔ ۲/لاکھ سے زیادہ ایسے افراد نشیبی آسام میں ایک طویل مدت سے پناہ گزین کیمپوں میں رہ رہے ہیں بہت سے ۱۹۹۳ سے ان کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔

آسامی تحریک آل آسام اسٹوڈنٹ یونین (آسو) اور آسام گن پریشد (اے جی پی) نے شروع کی تھی یہ اتحاد ۲۷/اگست ۱۹۷۹ کو تشکیل دیا گیا اس میں آسو آسام ساہتیہ سبھا اور جاتیہ وادی دل شامل تھے، یہ ان کا "پرامن" پرامن، مگر پرتشدد ایجی ٹیشن تھا جسے آسامی ایجی ٹیشن کے نام سے جانا جاتا ہے، اور غیر ملکیوں کے خلاف تھا، یہ آسامی بولنے والے اعلی ذات کے ہندوؤں کی جذباتی مہم میں تبدیل ہو گیا جس نے پوری ریاست کو اپنے حصار میں لے لیا ان کا اہم مطالبہ یہ تھا کہ غیر ملکیوں کی شناخت کی جائے اور ۱۹۵۱ کے شہریوں کے پرسنل رجسٹر اور شناختی کارڈ برائے ووٹرز کی بنیاد پر شناخت کر کے انہیں رائے دہندگی کے حق سے محروم کیا جائے، نومبر ۱۹۷۰ کے آغاز میں اسٹوڈنٹ یونین نے گوہاٹی میں ایک بڑی ریلی (اجتماع) نکالی، ان کے نزدیک بنگلہ بولنے والے مسلمان ایک

سیاسی خطرہ اور بنگلہ بولنے والے ہندو ایک اقتصادی خطرہ تھے، انہوں نے بنگلہ زبان بولنے والے لوگوں کے خلاف قبائیلوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی، انہیں بنگلہ زبان بولنے والے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے اختلاط پر بھی تشویش تھی یہ تحریک عموماً بنگالیوں اور دیگر نسلی اور لسانی طبقات کے خلاف تھی، ۱۹۴۷ سے پہلے غیر ملکیوں کو میمن سنگھیا کہا جاتا تھا، اب انہیں بنگلہ دیشی کہا جانے لگا، سنڈے کلکتہ ۱۹/اپریل ۱۹۸۳، ۱۹۴۷ سے پہلے (جو کہ ہندوستان کی آزادی کا حال ہے) یہ لوگ اکثر مسلمان تھے، لیکن بعد میں ان میں سے ہندو بھی بڑی تعداد میں شامل ہو گئے۔

آر ایس ایس نے اس تحریک کی حمایت کی، تاکہ وہ آسام کی صورتحال کو فرقہ واریت کا رنگ دے سکے، اگر آر ایس ایس کو اس طرح اس کا کھیل کھیلنے دیا جائے تو اصلی مسلم باشندوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی (شاہد مسعود۔ ہندوستانی سیکولرزم کے مظلوم، نظام آباد، پاکستان، المعارف اکیڈمی ۱۹۸۳، ص ۱۱۸)، آر ایس ایس شروع سے مسلم مہاجرین کے خلاف نفرت پھیلانے اور دشمنی کو ابھارنے میں مصروف تھیں، ان تیس سالوں کے دوران حکومت یا قومی لیڈرشپ نے سیکولر نظریات کی تلقین میں، بہت کچھ نہیں کیا (حمید نسیم رفیع آبادی۔ آسام ایجی ٹیشن سے معاہدہ تک، نئی دہلی جنوین پبلیکیشن اینڈ میڈیا لمیٹیڈ ۱۹۸۸، ص ۷) اس وقت مرکز میں جو سرکار تھی اس میں بی جے پی، آر ایس ایس کے لیڈر بھی شامل تھے اور وہ اپنے ایجنڈے پر عمل کرنے میں مصروف تھے، آسامی مسلمانوں کے خلاف ایجی ٹیشن کو آر ایس ایس نے پوری طرح کنٹرول کیا، قبائیلوں کو یقین دلایا گیا کہ جب مسلمان چلے جائیں گے تو ان کی چھوڑی ہوئی جائدادیں قبائیلوں کو دے دی جائیں گی، آر ایس ایس کو آسام میں تیس شاکھائیں قائم کرنے کی اجازت دی گئی (ہیرن گوہین۔ آسام ایک جلتا ہوا سوال گوہاٹی ۱۹۸۵، ص ۱۱۶)۔

یونائیٹڈ مائنارٹی فرنٹ آف آسام نے بتایا کہ ۱۹۸۱ء میں آسام میں مردم شماری نہیں ہوئی، ان کا کہنا کہ ہندوستان کے لاکھوں اصلی باشندوں کو غیر ملکی بتا کر انہیں اذیت دی جارہی ہے، سجان راما چندرن، آپریشن پشپک، سنگھ پریوار اسٹیٹ، نئی دلی میں سلم اور غیر قانونی طور پر مقیم بنگلہ دیشی، ای پی ڈبلیو جلد ۳۸ نمبر ۷ (۲۰۰۳ء)، ص ۶۴-۶۳۴) فرنٹ کو غیر ملکیوں کی شناخت پر کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن اس عمل میں دستور اور ملک کے قانون کی خلاف ورزی تو نہیں کی جانی چاہئے تھی، فرنٹ نے ۸ سیاسی قتل پر بھی صدمہ کا اظہار کیا اس میں یونائیٹڈ مائنارٹی فرنٹ (یوایم ایف) کے صدر کالی یداسین کا قتل بھی شامل ہے، اسی طرح کونشن آف دی مائنارٹی کورڈی نیشن کمیٹی ۱۹۸۵ نے اکارڈ کی پیچیدگیوں پر اپنی تشویش ظاہر کی، ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق آسام کی کل آبادی میں مسلم آبادی کا تناسب ۳۱ فیصد سے زیادہ ہے، اس ۳۱ فیصد آبادی میں ۷۵ فیصد سے زیادہ لوگ بنگلہ بولتے ہیں جنہیں آسام کے اصل باشندے عموماً بنگلہ دیشیوں کی طرح سمجھتے ہیں، ملک کے شمالی حصہ میں میڈیا اور نام نہاد قوم پرستوں نے ایک نیا پروپگنڈہ شروع کیا کہ ملک کے بہت سے حصوں میں بنگلہ دیشی مقیم ہیں۔

۱۹۹۲ میں ایک سخت گیر پولیس اور تفتیشی ایجنسیوں کی مشترکہ مہم شروع کی گئی، تاکہ نئی دہلی میں غیر قانونی طور سے رہنے والے بنگلہ دیشیوں کی شناخت کر کے انہیں ملک سے نکالا جائے اس مہم میں، بہت سے ایسے لوگ بھی شکار ہوئے جن کا کہنا تھا کہ وہ ہندوستان کے اصلی باشندے ہیں (وان ڈیلوشنڈل دی بنگال بارڈر لینڈ، جنوبی ایشاء میں ریاست اور قوم سے ماورا لندن انتھم پریس ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۱)۔

آسام میں مسلمانوں کو جو سیاسی سہولت حاصل ہے وہ ہندوؤں کو پسند نہیں ہے، انہیں اندیشہ ہے کہ ایک دن آسام میں مسلمانوں کا غلبہ ہو جائے گا، ان خدشات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بی جے پی نے ریاست میں ہندو ووٹ اپنے حق میں کر لئے، رام جنم بھومی تحریک کے دور سے ہی اس نے اپنے انتہائی جذباتی فرقہ پرست نعروں سے ہندو وٹروں کو اپنی طرف راغب کرنا شروع کر دیا، اسی دوران پارلیمنٹ کے الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہو گیا، اس اعلان کے ساتھ ہی ملک کے مختلف حصوں میں آئی ایس آئی کے ایجنٹوں کی گرفتاری اور ان کے پاس سے آر ڈی ایکس کے دھماکہ خیز مادہ سے بھرے ہوئے تھیلے برآمد ہونے کی خبریں بھی شائع ہوئیں۔ آسام میں بھی سیکورٹی فورسیز (فوجی عملہ) نے دعویٰ کیا انہوں نے ریاست میں آئی ایس آئی کے جال کو توڑ دیا ہے اور آئی ایس آئی کے چار سب سے بڑے ایجنٹوں اور ۲۷ دیگر ایجنٹوں کو گرفتار کیا ہے، علاقائی اخبارات نے یہ خبریں شائع کیں کہ ریاست میں ایک درجن سے زیادہ اسلامی گروپ کام کر رہے ہیں، جنہیں آئی ایس آئی سے مدد ملتی ہے، خود آسام کے وزیر اعلیٰ پرفل کمار مہنتا اس پریس کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے جس میں آئی ایس آئی کے جال کو منتشر کرنے کا اعلان کیا گیا، انہوں نے علانیہ طور پر یہ الزام لگایا کہ آسام کے سرحدی اضلاع میں مدرسہ اور علماء آئی ایس ائی کے تحت چلنے والی تنظیموں کے لئے مسلم نوجوانوں کو بھرتی کر رہے ہیں، یہ اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کہ اس قسم کے بیان کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا، انہوں نے اسمبلی انتخابات میں اپنی جیت کے لئے آسامی ہندوؤں کو رجھانے کی کوشش کی، جسونت سنگھ، شہریت کے بارے میں آسامی کرائسس۔ سیاسی غلطیوں کا ایک جائزہ۔ ایشین سروے جلد ۲۴ نمبر ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۴، ص ۱۰۵۹)، ۲۰۰۸ء میں آسام میں کئی جگہ بم دھماکے ہوئے جس کے نتیجہ میں وہاں کے مسلمانوں کو پریشان کیا گیا، یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی، تاکہ انہیں دشمن اور غیر ملکی کہہ کر بدنام کیا جائے، ۲۰۰۸ء کے آخر تک آسامی پولیس کے بعض اعلیٰ افسران نے جو دہشت گردی کے خلاف محکمہ

میں تھے ایسے فسطائی لیڈروں اور تنظیموں کے ناموں کو ظاہر کردیا جن کا تعلق اکثریتی فرقہ سے تھا، یہ لوگ ایسے متعدد معاملات میں ملوث پائے گئے جنھیں اس سے پہلے یا تو ہندوستانی مسلمانوں یا پاکستان کو ملوث بتایا گیا تھا (جے مل شمال مشرق میں آبادی کا حملہ، اگنائزر، والیتر ۲۰۰۴ ہندو نیشنلسٹ تعبیر کے مطابق آسام میں بنگلہ دیشی سے مراد مسلمان ہوتے ہیں، ان میں ہندو شامل نہیں ہیں، انہیں (ہندوؤں کو) ایسا سمجھا جاتا ہے جیسے وہ اپنے گھر واپس آرہے ہیں، ہندوستانی سیاست میں یہ ذہن فروغ پارہا ہے کہ بنگلہ دیش کے غیر قانونی مہاجرین صرف مسلمان ہیں وہ اس بات کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ ان مہاجرین میں خاصی بڑی تعداد ہندوؤں کی ہے، سنجیو بروا۔ تقسیم کا طویل سایہ آسام میں شہریت کی بابت الہام۔ انڈیا رص ۵۹۸)۔

اخبارات میں آسام کے سابق وزیر اعلی ہتیشور سیکیہ کا انتہائی متنازعہ بیان شائع کیا، انہوں نے ۱۰ راپریل ۱۹۹۲ کو ریاستی اسمبلی میں کہا کہ آسام میں ۲۰ سے ۳۰ لاکھ تک بنگلہ دیشی درانداز ہیں جب اس بنا پر وہ شدید تنقید کا نشانہ بنے تو انہوں نے وضاحت کی کہ ریاست میں ایک بھی غیر قانونی مہاجر نہیں ہے (ایضا ر ۶۰۲)، سیکیہ نے اپنے بیان میں بنگلہ دیشیوں کو عوام کا دشمن بھی کہا، ایم ایس پر بھاکر، سراب کا تعاقب فرنٹ لائن چنئی، ۱۳، ۲۰، ۴ر جولائی ۲۰۰۳ء رص ۴۲)۔

یہ بات بڑی المناک ہے کہ آسام کے گورنر لفٹنٹ جنرل ایس کے سنہا نے صدر جمہوریہ کو جو رپورٹ ارسال کی اس میں بھی حکومت کی سطح پر ایسے ہی تعصب کا اظہار کیا گیا، اس کے ساتھ جو خط مورخہ ۸ رنومبر ۱۹۹۸ منسلک ہے اس میں کہا گیا ہے کہ کئی دہائیوں سے مشرقی پاکستان ر بنگلہ دیش سے بڑی تعداد میں جو غیر قانونی طور پر درانداز آرہے ہیں ان کی وجہ سے ریاست میں آبادی کا تناسب بدل رہا ہے، اس کی وجہ سے آسامیوں کی شناخت اور سماجی قومی سیکورٹی کو شدید خطرہ لاحق ہے، اس رپورٹ کے پوائنٹ ۴ میں کہا گیا ہے کہ بنگلہ دیش سے تری پورہ اور مغربی بنگال میں ہندو ریفیوجیوں کی آمد جاری ہے۔

آسام میں بنگلہ دیش سے غیر قانونی طور پر جو لوگ آتے ہیں ان میں تقریبا تمام لوگ مسلمان ہیں، رپورٹ کے پوائنٹ ۱۰ میں کہا گیا کہ نسلی، زبانی اور مذہبی یکسانیت جوان لوگوں کو ہماری سرحد میں رہنے والوں سے ہے اس کی وجہ سے ان غیر قانونی دراندازوں کو یہاں پناہ مل جاتی ہے اس کی وجہ سے ان کی شناخت میں بھی مشکل پیش آتی ہے (آسام میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والوں کی بابت رپورٹ، جو صدر جمہوریہ ہند کو پیش کی گئی، راج بھون، گوہاٹی ۸ رنومبر ۱۹۹۸)۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ بنگلہ دیشی حکام آبادی کی اس نقل وحرکت کو بڑھاوا دے رہے ہیں، لیکن انہوں نے اسے روکنے کی بھی کوشش نہیں کی، اور دراصل وہ اس سے خوش ہوں گے کہ اس طرح ان کے وہاں بڑھتی آبادی کا جو دباؤ ہے وہ کم ہورہا ہے، اس طرح اب اس نقل و حرکت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے، وزیر اعظم شیخ حسینہ نے یقین دلایا ہے کہ ہندوستان میں غیر قانونی طور پر مقیم کوئی بنگلہ دیشی نہیں ہے (ایضا)، اس میں مزید کہا گیا ہے کہ ان غیر ملکی دراندازوں کی تعداد معلوم کرنے کے لئے کوئی مردم شماری نہیں کی گئی ہے۔ صحیح اور قطعی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں، تاہم اندازے اور قیاس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں میں ہے (ایضا)، رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بنگلہ دیش کے اخبارات نے ہندوستان کی ہندو بنیاد پرست حکومت پر سخت تنقید کی تھی کہ وہ ہمارے معصوم ہندوستانی مسلمانوں کو نکالنے اور انہیں بنگلہ دیش میں پھینکنے کی کوشش کررہی ہے، ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ بنگلہ دیش کو ہندوستان سے نمٹنے کے لئے امریکہ سے مدد لینی چاہئے، وزیر اعظم شیخ حسینہ جو ہندوستان کی دوست مانی جاتی ہیں انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ ہندوستان میں کوئی بنگلہ دیشی غیر قانونی طور پر مقیم نہیں ہے (ایضا)۔

فروری ۲۰۰۵ء میں آسام کے گورنر نے کہا کہ ہر روز قریبا ۶ ہزار بنگلہ دیشی ہندوستان میں داخل ہوتے ہیں، یہ لوگ کام کی تلاش میں یہاں آتے ہیں، پھر یہیں رک جاتے ہیں اور ہمارے یہاں تقریباً ۲۰ لاکھ غیر قانونی طور پر مقیم مہاجرین ان میں شامل ہوجاتے ہیں۔

مہاجرین کا مسئلہ زور پکڑ رہا ہے (ٹری بیونل چنڈی گڑھ ۴ مئی ۲۰۰۵ء) اس کے برعکس آسام کے وزیر اعلی ترن گوگوئی نے سنگھ کے اس بیان کو قطعی بے بنیاد بتایا اور کہا کہ یہ سطحی بیان ہے جو حقائق اور اعداد و شمار پر مبنی نہیں ہے (گوگوئی نے گورنر کی رپورٹ پر اعتراض کیا، نارتھ ایسٹ انکوائرر، جلد ۳ نمبر ۲۸، ۲۲ رمئی سے ۶ جون ۲۰۰۵ یہ بات بھی تکلیف دہ ہے کہ ہندوستانی عدلیہ نے اعلی سطح پر غیر قانونی مہاجرین ٹری بیونل کے ذریعہ شناخت ایکٹ ۱۹۸۳ پر رائے دی جسے مرکزی پارلیمنٹ نے پاس کیا تھا جو غیر قانونی طور پر دراندازوں کی شناخت اور انہیں ملک بدر کرنے کے بارے میں ہے جن پر عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔

سیاسی مقاصد کے تحت ہی سیاسی ایجنسیوں کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ آئی ایم ڈی ٹی کو گمراہ کرسکیں، ۱۲ رجولائی ۲۰۰۵ء کو سپریم کورٹ آف انڈیا نے آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ ۱۸۸۳ کو غیر دستوری قرار دے کر مسترد کردیا، کیونکہ آسامی تحریک کے دعووں سے ہم آہنگ تھا، تعجب انگیز طور پر عدالت نے کہا کہ اس ایکٹ

کی وجہ سے آسام میں بنگلہ دیش سے غیر قانونی طور پر آنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے، اور غیر قانونی طور پر آنے والے افراد کی شناخت میں یہ ایکٹ ایک رکاوٹ ہے، عدالت نے یہ فیصلہ ۲۰۰۲ء میں سربندا سامووا کی رٹ پٹیشن پر دیا تھا، بنچ نے ہدایت کی کہ (غیر ملکی) ایکٹ آرڈر ۱۹۶۴ کے تحت نئے ٹریبیونل قائم کئے جائیں (سپریم کورٹ نے کہا کہ آئی ایم ڈی ایکٹ جلاوطن کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے (دی ہندو ۱۴ر جولائی ۲۰۰۵ء) فسطائی میڈیا اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا (سپریم کورٹ کے فیصلہ کو نافذ کیا جائے، جے جی اروڑا۔ آرگنائزر ۲۱ر اگست ۲۰۰۵ء) دوسری جانب ایک مشہور وکیل نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا، ان تمام ۴۰ سالوں کے دوران میں نے سپریم کورٹ کا مشاہدہ کیا ہے، میں نے کبھی ایک ایسا فیصلہ نہیں دیکھا جو اس قدر تنگ دلی پر مبنی آمرانہ ہو، یہ درحقیقت فسطائی اور ذہن کے اعتبار سے فرقہ وارانہ ہے، اس میں دستور کی ایسی انوکھی تشریح کی گئی ہے، جو بنیادی قانونی اصولوں سے عدم واقفیت کو ظاہر کرتی ہے اور حقوق انسانی، نیز بنیادی انسانی قدروں سے اس درجہ بے حسی کی مظہر ہے (شانتی بھوشن۔ آئی ایم ٹی ڈی آسام یہ فیصلہ انسانی حقوق اور اصولوں کے خلاف ہے، سہ ماہی ہیومن رائٹ ٹوڈے (نئی دہلی) جولائی تمبر ۲۰۰۵ء)۔

۱۹۸۳ سے قبل، غیر ملکی دراندازوں کی شناخت اور انہیں نکالنے کا کام غیر ملکیوں کی بابت ایکٹ ۱۹۴۶ء کے تحت کیا گیا تھا جس میں حکام خصوصا پولیس کو غیر محدود اختیارات دیئے گئے تھے کہ وہ کسی کو بھی غیر ملکی قرار دے کر اسے نکال دے، اس ایکٹ کے تحت اگر کسی شخص کو غیر ملکی قرار دے دیا جائے تو یہ ثابت کرنا اس شخص کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ غیر ملکی نہیں ہے، ایسے لوگ جن کے پاس پیدائش کے سرٹیفکٹ یا زمین کی ملکیت کے کاغذات نہیں ہوتے تھے، یہ ثابت کرنا عملاً ناممکن ہوجاتا تھا ان پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے پارلیمنٹ نے ۱۹۸۳ء میں غیر ملکی مہاجرین (ٹریبونل کے ذریعہ شناخت) ایکٹ (آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ) بنایا، اس کے تحت غیر ملکیوں کی بابت ایکٹ کے تحت شہریت سے متعلق تنازعات ان عدالتی ٹریبونل کے ذریعہ کئے جاتے تھے، اگر چہ یہ ایک ایکٹ پورے ملک کے لئے تھا، لیکن شروع میں اس کا نفاذ صرف آسام پر کیا گیا، اس کے بعد اگر گورنمنٹ ملک کے دیگر علاقوں میں اس کا نفاذ کرے تو نوٹی فیکشن کے ذریعہ ایسا کرسکتی ہے، سرکاری اعداد وشمار کے مطابق آئی ایم ڈی ٹی کی ۲۰ سالہ کارکردگی کے دوران ٹریبونل میں جو ۶۲۲۸ ۷ معاملات پیش کئے گئے ان میں سے ۲۰۰۳ تک ٹریبونل نے صرف ۲۱۱۶۹ معاملات کا فیصلہ کیا، ان میں ۱۱۶۳۸ لوگ غیر ملکی مہاجر قرار دیئے گئے ان میں سے بھی صرف ۱۵۱۷ کو ہی نکالا جاسکا (ایضا)۔

اس کیس کی سماعت زیر التوا ہونے کے دوران پولیس دہلی میں، غیر ملکی ایکٹ کے تحت کاروائی کے نام پر جھگی جھوپڑی علاقوں میں رہنے والے غریب بنگالی مسلمانوں سے غیر قانونی طور پر روپیہ وصولتی رہی، شہریوں کے ایک بے حد ممتاز گروپ نے جو خود جمہوریت کی بقاء کے لئے شہریوں کی مہم کے نام سے معروف تھا اپنی ایک جانچ رپورٹ میں بتایا کہ ان غریب بنگالی مسلمانوں کو مقامی پولیس غیر ملکی ایکٹ کے تحت پکڑ کر لے جاتی اور میونسپل کارپوریشن کے نظر بندی کیمپ میں رکھا جاتا پھر گاڑی کے ڈبوں میں انہیں روانہ کردیا جاتا تھا، یہ لوگ بنگلہ دیش کی سرحد پر لے جائے جاتے، ان کے پاس جو کچھ ہوتا وہ چھین لیا جاتا اور ان سے کہا جاتا کہ بھاگ جاؤ، رپورٹ کے الفاظ ہیں: "جب ان لوگوں کو جبراً سرحد پر اتارا جاتا ہے تو ان سے ہر وہ چیز چھین لی جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ یہ بتا سکیں کہ وہ ہندوستانی ہیں، انہیں دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر وہ واپس آئے تو انہیں درانداز قرار دے کر گولی ماردی جائے گی، رخصتی ہدایت کے طور پر ان سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر بنگلہ دیش رائفلز کے سپاہی انہیں سرحد پر پکڑیں تو کہہ دیں کہ ہم کسی خاص گاؤں سے کام یا شادہ میں شرکت کے بعد واپس آرہے ہیں۔

اپنی شناخت اور شہریت سے جبراً محروم کئے جانے پر یہ غریب لوگ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں دیکھتے کہ پھر غیر قانونی طور پر آنے کی کوشش کریں، تاکہ کسی طرح وہ زندہ رہ سکیں (اتیج سیکتھ، آسام کے مسئلہ کو فرقہ واریت کا رنگ دینا، اے جی پی کا فائدہ، بی جے پی کا نقصان، جلد ۳۴ نمبر ۳۹، ۴ ستمبر ۱۰/۱۹۹۹ء، رص ۳۴۱۳)۔

درحقیقت سپریم کورٹ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جسے دستور کے تحت شہریوں کے بنیادی حقوق کی ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ غیر ملکیوں سے متعلق ایکٹ کو غیر دستوری قرار دیتی جس کے تحت حکام کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ عدالت کی جانچ کے بعد شہریوں کو غیر ملکی قرار دے کر نکال دیں، کسی بھی شہری کو عدالت کے ذریعہ اس کا حق ثابت ہونے تک نکالا نہیں جاسکتا، لہذا غیر ملکی ایکٹ کے تحت حکام کو شہریوں کو جلاوطن کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے وہ نامناسب ہے اور آزادی کے بنیادی حق کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے جواب میں عدالت نے کہا کہ اگر غیر قانونی طور پر داخل ہونے والے کسی شخص کو ملک سے نکالا جاتا ہے تو اسے بنیادی حق کی خلاف ورزی نہیں مانا جائے گا، کچھ سال پہلے تک اکثر لوگوں کے پاس ایسے دستاویز نہیں ہوتے تھے جن سے ان کی ہندوستانی شہریت ثابت ہوسکے، ابوحنیف کے پاس پاسپورٹ تھا، الیکشن کا شناختی کارڈ اور راشن کارڈ بھی تھا، پھر بھی پولیس نے اسے بنگلہ دیشی قرار دیا، لیکن بیشتر لوگوں کے پاس ایسے کاغذات یا سرکاری دستاویز نہیں ہوتے جس کی بنیاد پر وہ اپنی ہندوستانی شہریت ثابت کرسکیں، کیا ایسے حالات کے تحت انہیں ہندوستان سے نکالا جاسکتا ہے؟

اس فیصلہ سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے (ایضا)۔

جمہوریت کی بقاء کے لئے شہریوں کی مہم (سی سی پی ڈی) کے تحت منعقدہ ایک سیمنار میں بولتے ہوئے وکیلوں اور جرنلسٹوں نے سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ پر اپنی تشویش کا اظہار کیا، سپریم کورٹ وکیل پرشانت بھوشن نے کہا کہ یہ دلائل سنے بغیر کہ کس طرح دلی پولس نے غیر ملکی ایکٹ کا غلط استعمال کرتے ہوئے غریب لوگوں کو پریشان کیا اور انہیں غیر قانونی درانداز قرار دے دیا، سپریم کورٹ نے اس ایکٹ کو قلم زد کر دیا، جبکہ آئی ایم ڈی ایکٹ کے تحت (جو کہ عدالت کے ذریعہ قلم زد کئے جانے سے قبل صرف آسام کی حدود میں نافذ تھا) یہ ثابت کرنا کہ متعلقہ شخص غیر ملکی نہیں ہے، اس شخص یا گورنمنٹ کی ذمہ داری تھی جو ایسا دعوی کرتی ہے یہ غیر ملکی افراد کی بابت ایکٹ جو بقیہ ملک میں نافذ ہے اس کے تحت اب یہ ثابت کرنا کہ مذکورہ شخص غیر ملکی نہیں ہے خود اس شخص کی ذمہ داری ہوگئی ہے، اس فیصلہ پر تنقید کرتے ہوئے کہ عدالت نے اس کی بنیاد دستور کی دفعہ ۳۵۵ پر رکھی ہے، جو مرکز کی یہ ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ ملک کو خارجی حملوں اور اندرونی بدامنی سے بچائے، مسئلہ پر پرشانت بھوشن نے کہا کہ یہ پہلی بار ہے کہ انہوں نے دستور کی اس دفعہ کی یہ تشریح دیکھی ہے، انہوں نے کہا کہ عدالت نے خارجی جارحیت کو بنگلہ دیشیوں کی غیر قانونی درآمد کے مساوی بنادیا ہے (آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کو منسوخ کئے جانے پر شہریوں کی تنظیم نے تنقید کی، دی ہندو ۱۱ اگست ۲۰۰۵ء) وہ قوانین جن کے تحت مسلمانوں کو آسام سے نکالا گیا وہ یہ ہیں:

۱۔ غیر ملکیوں سے متعلق ایکٹ ۱۹۴۶ مہاجرین (آسام سے نکالنے) ایکٹ ۱۹۵۰ (۳) غیر ملکیوں سے متعلق (ٹریبیونل) آرڈر ۱۹۶۴ (۴) پاکستان سے ہونے والی دراندازی روکنا، پلان ۱۹۶۴ جسے پی آئی پی پلان کے نام سے معروف ہے، (۵) غیر ملکی درانداز (ٹریبیونل کے ذریعہ شناخت) ایکٹ ۱۹۸۳ء موخر الذکر کو چھوڑ کر دیگر تمام قوانین فرقہ وارانہ رنگ کے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف عصبیت کو ظاہر کرتے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کو درانداز ناپسندیدہ عناصر قوم دشمن قرار دے کر نکالنے سے ثابت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو آسام سے نکالا جا رہا ہے، کیونکہ مشرقی پاکستان/ بنگلہ دیش سے بہت ہی کم تعداد میں غیر ملکی مسلمان غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے، کیونکہ اب ہندوستانی مسلمانوں کو درانداز کہہ کر نکال دینا ممکن نہیں ہے، تو اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ انہیں مشکوک شہری قرار دیا جائے، اس کے نتیجہ میں ۲۷۵۰۰۰ مسلمانوں کو مشکوک شہری قرار دے کر ان کے نام ۱۹۹۷ کے ووٹر لسٹ سے حذف کر دیئے گئے (محمد حبیب الرحمن ملی گزٹ ۳۔۱۶ / جنوری ۲۰۰۵ء)۔

آل آسام اسٹوڈنٹ یونین نے ایک اشتہاری مہم چلائی کہ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۸۲۴۰۶۱۱ میں سے ۵۰۰۰۰۰۰ نام حذف کر دیئے جائیں، بالفاظ دیگر یہ لوگ دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آسام کے مسلمانوں کی اکثریت غیر ملکی ہے، ۱۹۵۱ میں ریاست میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۱۹۹۵۹۶۳ تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۵۱ سے ۲۰۰۱ء کے پچاس سالوں کے دوران مسلمانوں کی مجموعی آبادی میں صرف (۳۲۴۰۶۱۱ منفی ۱۹۹۵۹۶۱ جو برابر ہے ۱۲۴۴۶۵۰) کا اضافہ ہوا، لیکن آسام میں مسلمانوں کی آبادی ۱۹۴۱ء میں ۳۴۴۲۸۹۶۹۔ ۱۹۶۱ء میں ۲۷۶۵۵۰۲۔ ۱۹۷۱ء میں ۳۵۹۲۱۲۴ اور ۱۹۹۱ء میں ۶۳۷۳۲۰۴ تھی۔ ایم ایس یو کے ایجی ٹیشن کے سبب بے مثال بدامنی کے سبب ۱۹۸۱ء میں مردم شماری نہیں ہوسکی، ریاست میں مسلمانوں کی آبادی میں کوئی غیر معمولی اضافہ نہیں ہوا ہے، ایم ایس یو اور اس کے ممبران کے دعوے درست نہیں ہیں، یہ سب فرقہ وارانہ اور سیاسی مفاد اور مقاصد سے کیا جارہا ہے۔ آسام میں مسلمانوں کی آبادی ۱۹۴۱ میں ۳۴۴۲۸۹۶۹ تھی جو ۱۹۵۱ء میں گھٹ کر ۱۹۹۵۹۶۳ رہ گئی، کیونکہ سہلٹ ضلع مشرقی پاکستان میں چلا گیا پھر ۱۹۵۰۔۱۹۴۸ میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن کی وجہ سے لاکھوں مسلمان مشرقی پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے) (محمد حبیب الرحمن، دی ملی گزٹ ۱۶۔۳۱/ جنوری ۲۰۰۵)۔

مردم شماری کی رپورٹوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی، اگر بنگلہ دیش سے آنے والوں کی تعداد اسی طرح بڑھی تو ملک اور خصوصا ملک کے شمال مشرق علاقوں میں آبادی کا تناسب بہت بڑھ جائے گا جبکہ اس کے خلاف آبادی کے تناسب میں گراوٹ پائی گئی ہے، ہندوستان میں آبادی میں اضافہ کا تناسب میں ۲۰۰۱۔۱۹۹۱ کے دوران ۲۳۰۶۶ فیصد سے گھٹ کر ۲۴۳۴ فیصد کی گراوٹ آئی، شمال مشرقی علاقہ میں بھی آبادی کے تناسب میں گراوٹ آئی ہے، ۲۰۰۱۔۱۹۹۹ء کی دہائی کے دوران شمالی مشرقی علاقہ میں آبادی کے تناسب میں جو اس قدر گراوٹ آئی ہے وہ یہ واضح کرتی ہے کہ اس علاقہ میں بنگلہ دیش سے کوئی غیر قانونی دراندازی نہیں ہوئی آسام جسے غیر قانونی دراندازوں کی پناہ گاہ بتایا جاتا ہے وہاں بھی آبادی کے تناسب میں گراوٹ آئی ہے، ۲۰۰۱۔۱۹۹۹ میں یہ تناسب ۱۸٫۸۵ فیصد رہ گیا، جبکہ ۱۹۹۹۔۱۹۸۱ کی دہائی کے دوران یہ ۲۴۰۲۴ فیصد تھا، ۱۹۴۱ء میں تری پورہ کی مجموعی آبادی ۵۱۳۰۱۰ تھی، ۱۹۹۱ میں اس میں بے حد اضافہ ہوا، اور یہ ۲۷۴۴۸۲۷۰، اور ۲۰۰۱ء میں ۳۱۹۱۱۶۸ ہوگئی، یہ اس وجہ سے ہو کہ بنگلہ دیش سے بڑی تعداد میں بنگالی ہندو درانداز ریاست میں آ گئے،

ریاست میں مسلم آبادی ۱۹۴۱ء میں ۳۴۵۴ ۱۲۳ تھی، اس میں معمولی اضافہ ہوکر ۱۹۹۱ میں ۱۹۶۴۹۸ ہوگئی، ان حقائق کی بنیاد پر بلا شک وشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تری پورہ اور شمالی مشرق کی دیگر ریاستوں میں بنگلہ دیشی مسلمانوں کی غیر قانونی دراندازی نہیں ہوئی (ایضا)۔

آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ ایک متوازن قانون سازی تھی، ہندوستانی مسلمان، غیر ملکیوں کی شناخت اور انہیں ملک سے نکالے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کرتے، ان کا موقف یہ ہے کہ غیر ملکیوں کی شناخت ان کی مذہبی اور لسانی شناخت کی بنیاد پر نہ کی جائے جو بھی غیر ملکی ہو اس کی شناخت کر کے عدالتی کاروائی کے تحت انہیں جلاوطن کیا جائے اس عمل میں ان کے انسانی حقوق کو بھی پامال نہیں کیا جانا چاہئے ہندوستانی مسلمان جو صدیوں سے آسام میں رہ رہے ہیں وہ ریاست کے سماجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کا لازمی حصہ بن گئے ہیں وہ ریاست کی اقتصادی، صنعتی زراعتی، ترقی، سڑکیں، پل، عمارتیں بنانے، زبان، ادب امور ثقافت میں فروغ میں بنادی کردار ادا کررہے ہیں (ایضا)۔

آسام میں مسلمانوں کی آبادکاری اور اس مذہب سے وابستگی پر تیرہ سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے، آسام کے مسلمانوں کو دو زمروں کے تحت لایا جاسکتا ہے وہ مسلمان جو آسامی اصل کے ہیں اور بنگلہ بولنے والے مسلمان جو تاریخ کے مختلف ادوار میں وہاں آکر آباد ہوگئے، ان میں سے بہت سے وہ ہیں جنہیں انگریزوں نے یہاں لاکر آباد کیا اور اس کے بعد کانگریس کے اقتدار میں انہیں یہاں لایا گیا تاکہ وہ ریاست کی ترقی میں مدد کریں اور یہاں کی بنجر اور جنگلات کے تحت پڑی زمین کو زرخیز بنائیں۔

اس وقت ریاست میں نیشنل رجسٹر آف سٹیزنز (این سی آر) ۱۹۵۱ء کے پروجیکٹ کو مکمل کرنے کا کام جاری ہے جس کی وجہ سے ریاست کے بنگلہ بولنے والے مسلمان پریشان ہیں، آسام کے دو ضلعوں میں یہ کام بڑے پیمانے پر ہورہا ہے، بار پیٹا مالیاتی علاقہ بار پیٹا ضلع کے تحت ہے اور جایا گاؤں مالیاتی علاقہ جو کامروپ ضلع کے تحت ہے اس پروجیکٹ کے تحت شہریوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اسٹینڈرڈ سرکاری فارم کے ساتھ اسے دستاویز بھی منسلک کریں جن سے ان کی ہندوستانی شہریت ثابت ہوتی ہو ان دستاویزوں میں این آر سی ۱۹۵۱ کی فہرست ۱۹۶۶ اور ۱۹۷۱ کے الیکشن لسٹ کی نقل گورنمنٹ کا کہنا ہے کہ این سی آر کا مقصد ریاست کے ہندوستانی باشندوں کی شناخت اور ان کے نام فہرست میں درج کرنا ہے، بنگلہ بولنے والے مسلمان اور کچھ بنگلہ بولنے والے ہندوؤں نے اس پراجیکٹ پر شدید اعتراض کیا ہے، یہ احتجاج روز بروز شدت اختیار کرتا جارہا ہے، وہ عملاً اس پراجیکٹ کا بائیکاٹ کررہے ہیں، مثال کے طور پر پہلے مرحلہ میں ۷۴ ہزار فارم بنگلہ بولنے والوں کو تقسیم کئے گئے تھے ان میں سے صرف ۷۴ فارم ہی خانہ پری کر کے واپس کئے گئے (محمد علی آسام میں ہندوستانی شہریوں کے سوال پر تنازعہ ابھر سکتا ہے، ۲ سرکل نیٹ ۱۷/ جولائی ۲۰۱۰ء)۔

عبدالرحیم خاں، سکریٹری، آل انڈین یونائٹیڈ فرنٹ کا کہنا ہے کہ حکام، اہلی ہندوستانی باشندوں کو بنگلہ دیشی ثابت کرنے کے لئے غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کررہے ہیں، انہوں نے بتایا کہ بار پیٹا مالیہ سرکل کے تمام دولاکھ بنگلہ بولنے والے مسلمانوں کا مقام پیدائش میمن سنگھ ڈھاکہ بنگلہ دیش لکھا گیا ہے، سرکاری کاغذات میں اس اندراج کی بابت انہوں نے سوال اٹھایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمام دولاکھ افراد کا مقام پیدائش ڈھاکہ کا ہی ایک مقام ہو، سرکاری طور پر یہ پروپگنڈہ قطعی جھوٹ ہے، ایک اور معاندانہ بات ہے جو بنگلہ بولنے والی آبادی کے لئے ناقابل برداشت ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی باشندوں کا ایسا رجسٹریشن ملک میں کہیں اور نہیں ہورہا ہے، ایسا صرف آسام میں ہورہا ہے، انہوں نے مزید کہا کہ ملک میں کسی اور جگہ ایسا رجسٹریشن نہیں ہورہا ہے اس سے این سی آر کے مشتبہ اور غیر قانونی ہونا ظاہر ہوتا ہے، یہ کاروائی ہمیں نشانہ بنانے اور ہمارے خلاف امتیاز کے مقصد سے کی جارہی ہے، انہوں نے بتایا کہ سرکاری حکام نے جو فہرستیں فراہم کی ہیں ان میں ۲۵ فیصد بنگلہ بولنے والی آبادی کو جو بار پٹیا کے ان علاقہ میں رہتی ہے، اسے مشتبہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے "ڈی" کا حرف لکھا گیا ہے، جو فہرست میں نام کے ساتھ دکھایا گیا ہے (ایضا)۔

غالباً بنگلہ دیشی بنائے جانے کی بدنامی (اور کون جانے کب انہیں بنگلہ دیش میں ڈھکیل دیا جائے) سب سے بڑی وجہ ہے کہ بنگلہ بولنے والی آبادی این سی آر کی مخالفت کرتی ہے، اے آئی یو ڈی ایف کے جنرل سکریٹری بہار الاسلام نے ۱۹۵۱ میں ۱۹۶۶ اور ۱۹۷۱ کی الیکشن فہرست اور ۱۹۵۱ کے این سی آر میں غلطیوں، بے ضابطگیوں اور غلط اندراج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۶ اور ۱۹۷۱ کی الیکشن و دیگر فہرستوں میں ہزاروں ناموں کا اندراج نہیں کیا گیا، بہت سے اصلی شہریوں کو غیر ملکی (بنگلہ دیشی) ہونے کے نوٹس بھیجے گئے ہیں (ایضا)، بار بٹیا مالیہ حلقہ کے گاؤں میں رہنے والے تمام بنگلہ بولنے والی آبادی نے اجتماعی طور پر فیصلہ کیا ہے، وہ رجسٹریشن کے عمل کا بائی کاٹ کریں گے اور فارموں کو پیش نہیں کریں گے، این سی آر ۱۹۵۱ء کو مکمل کرنے کی کاروائی ان کے نزدیک مشتبہ اور بد

اعتمادی پر مبنی ہے، ان کا اندیشہ ہے کہ جو غلطیاں اور بے ضابطگیاں ہیں ان کی آڑ میں، ان فارموں کی جانچ کرتے وقت ان کے ناموں کو حاشیہ پر کر دیا جائے گا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست کے حکام این سی آر سے ان کے نام خارج کریں گے (ایضا)۔

اسحاق علی دیوانی صدر آسام کھلانچہ مسلم انا بن پریشد نے کہا ہمیں پائلٹ پراجیکٹ نہیں ہے، این سی آر زہر پھیلاتا ہے، ہم ایسی لسٹ کا کیا کریں گے جس میں آخر کار ہمارے نام نہیں ہوں گے (ایضا)۔

از برجن خدشات کا اظہار آسام کی بنگلہ بولنے والی آبادی نے کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد نہیں ہے، اس کی تصدیق آسامی روز نامہ اگر دوت کے صحافی نے بھی کی ہے اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے وہ لکھتے ہیں ان سالوں کے دوران حکومت کی پالیسی یہ رہے کہ بنگلہ بولنے والی آبادی کو سرکاری طور پر کم کر کے دکھایا جائے۔ اصل اعداد و شمار کو بدلنے کے لئے لاکھوں ہندوستانیوں کے نام ووٹر لسٹ سے خارج کر دیئے گئے ہیں یا پھر انہیں مشتبہ شہری دکھایا گیا ہے (ایضا)۔

او پر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہریت کے قوانین کا معیار جس کی اوپر مثالیں دی گئی اس خدید خیال پر مبنی ہے کہ ملک کی مخصوص حدود میں رہنے والے افراد کی قومیت منظور اور رد کی جائے، یہ قوانین یا تو اس متعلقہ ملک کے دستور میں درج ہیں یا قانون سازی میں ہیں، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد ان قوانین میں بکثرت تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں، ان میں ان مسائل پر توجہ نہیں دی گئی ہے جو درج ذیل زمینی حقائق اور معاشرتی و ثقافتی اور سیاسی پیچیدگیوں کے سبب پیش آرہے ہیں، ابھی تک بہت سے ممالک خود کو ان عالمی قانون سے ہم آہنگ نہیں کر سکے ہیں حالانکہ یہ قانون اقلیتوں پناہ گزینوں وطن سے نکالے گئے افراد ایسے افراد جو کسی ملک کے باشندے نہیں سمجھے جاتے (اسٹیٹ لیس) اور وہ فرقہ جو جمہوری اداروں کے ذریعہ دوسرے فرقہ کے کنٹرول میں ہے، وغیرہ کے مسائل حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔

اسرائیل میں عرب شہریوں کو یہودی شہریوں کے مساوی حقوق حاصل نہیں ہیں، مقبوضہ یروشلم، مغربی کنارہ اور غزہ فلسطینیوں کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، اسرائیل نے ان علاقوں کو ضمنی طور پر اپنی مملکت کا حصہ بنا لیا ہے اور ان علاقوں کے باشندوں کے شہری حقوق غصب کر لئے ہیں، ۱۹۴۸ء میں فلسطین زمین پر اسرائیل کا غیر قانونی ملک وجود میں آیا، جو فلسطینی وہاں سے بے وطن ہو کر ادھر ادھر رہ رہے ہیں انہیں اپنے گھروں کو واپس آنے کی اجازت نہیں ہے، اسرائیل اسی غاصبانہ پالیسی پر عمل پیرا ہے، عالمی برادری، یوروپین یونین اقوام متحدہ، سیکورٹی کونسل کوئی بھی فلسطین کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتا، اسی طرح وہ ان افغان ریفیوجیوں کے مسئلہ پر دھیان نہیں دیتے جو عارضی طور پر پاکستان اور ایران میں پناہ لئے ہوئے ہیں، اسی طرح ان فلسطینیوں کا مسئلہ ہے جو ۲۰۰۳ء میں امریکہ کی جانب سے عراق پر بمباری کے سبب بے گھر ہوئے، اسی طرح دیگر مسائل میں جو بعض ممالک کی طرف سے پیسہ، ہتھیار اور منفی ذہن کے سبب مسلم اکثریت والے ممالک کے خلاف جارحیت سے پیدا ہوئے ہیں، ہندوستان میں ریاست آسام میں بنگلہ زبان بولنے والے جو لوگ بنگلہ دیش کے سرحدی علاقوں میں رہتے ہیں، وہ قومیت کے مسئلہ سے دوچار ہیں، یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب کی پالیسی کا نتیجہ ہے، دوسری طرف متعدد ملکوں میں جو شہری حقوق ہیں وہ ثقافت اور کثرت آبادی کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں اور ان میں اقلیتوں کے مسائل کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، لہذا جمہوریت کے مفاد میں یہ اہم ذمہ داری ہے کہ شہریت کے قوانین کو انسانی قدروں میں ڈھالا جائے۔

ہندوستان میں شہریت کا قانون۔ایک جائزہ

پروفیسر اقبال علی خان[1]

کسی بھی دوسرے جدید ملک کی طرح ہندوستان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں، ملک کے شہری اور غیر ملکی، ملکی عوام ہندوستان کے مکمل شہری ہیں اور ریاست کے وفادار ہیں انہیں جملہ شہری اور سیاسی حقوق حاصل ہیں، دوسری جانب دیگر ممالک کے لوگ ہیں، اس لئے انہیں تمام شہری اور سیاسی حقوق حاصل نہیں ہیں، یہ غیر ملکی شہری بھی، ان زمروں کے تحت آتے ہیں دوست ممالک کے شہری اور دشمن ملک کے شہری، یعنی وہ دوست ممالک جن کے ہندوستان سے خوشگوار تعلقات ہیں، دوسرے وہ ملک جو ہندوستان سے برسر پیکار ہیں، دوست ممالک کے شہریوں کے مقابلے میں دشمن ملک کے شہریوں کو کم حقوق حاصل ہوتے ہیں، انہیں گرفتاری اور نظر بندی سے بھی تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔

شہریت سے مراد یہ ہے کہ ایک فرد کا ریاست سے تعلق یا جماعتوں کا ممالک سے ربط شہریت حاصل ہونے سے عموماً اس ملک میں رہنے اور کام کرنے کا حق ہوتا ہے جس مرد کو کسی ریاست میں شہریت حاصل ہو وہ اس ملک کا شہری کہلاتا ہے ایک شہری وہ ہے جو ریاست کی حکومت کا وفادار ہو اور حکومت اسے تحفظ فراہم کرے (انسائیکلو پیڈیا امریکہ ،ص ا، ۲۔ ۲۵۷)، کسی مملکت کے شہری کو جملہ شہری اور سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں، ان شہریوں کو ریاست کے دستور کے تحت بعض ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں، جو غیر ملکیوں کو حاصل نہیں ہوتے۔

مثلاً دستور کی دفعات ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۲۹ کے تحت بنیادی حقوق، یہ حقوق صرف ریاست کے شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں، صدر، نائب صدر، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج اور اٹارنی جنرل کے منصب صرف ریاست کے شہریوں کو ہی حاصل ہو سکتے ہیں، صرف ریاست کے شہریوں کو ہی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن میں ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے، دستور ہند کے تحت صرف ایک ہی شہریت عطا کی گئی ہے اور وہ ہے ہندوستانی شہریت، امریکی دستور کے برخلاف دستور ہند کے تحت صرف ایک ہی شہریت کو تسلیم کیا جاتا ہے، جبکہ امریکہ میں دوہری شہریت کا قانون ہے۔

قومیت اور شہریت:

قومیت اور شہریت دو اصطلاحات ہیں جنہیں بعض اوقات متبادل کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ہم معنی سمجھا جاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان میں کئی پہلوؤں سے اختلاف ہے، پہلے دیکھتے ہیں کہ قومیت سے کیا مراد ہے سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ یہ اصطلاح اس ملک کے لئے استعمال کی جاتی ہے جہاں کوئی فرد پیدا ہوا، پھر شہریت سے کیا مراد ہے، یہ ایک قانونی درجہ یا حیثیت ہے، یعنی ایک وہ فرد جس کا کسی ملک میں قانون حکومت کے تحت اس حیثیت سے اندراج کیا گیا ہو۔

ایک شخص اپنی پیدائش کے تحت متعلقہ ملک کی قومیت کا حامل ہوتا ہے، قومیت والدین سے وراثت میں بھی حاصل ہوتی ہے اور اسے فطری واقعہ کہا جاتا ہے، دوسری جانب کوئی فرد صرف اسی صورت میں کسی ملک کا شہری کہلائے گا جبکہ وہ اس ملک کے سیاسی دائرۂ عمل میں ازروئے قانون تسلیم کیا گیا ہو، ایک شخص جو ہندوستان میں پیدا ہوا اسے ہندوستانی قومیت حاصل ہوگی، لیکن اگر وہ امریکہ میں بطور شہری اپنا اندراج کرالے تو وہ وہاں کا شہری قرار پائے گا۔

کوئی فرد اپنی قومیت تبدیل نہیں کر سکتا لیکن کوئی شخص مختلف شہریتوں کا حامل ہو سکتا ہے، مگر وہ اپنی قومیت تبدیل نہیں کر سکتا، دوسری مثال یہ ہے کہ یوروپی یونین کے لوگ یوروپی یونین کی شہریت حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اس سے کسی کی قومیت تبدیل نہیں ہوگی۔

بعض اقوام افراد کو اعزازی شہریت بھی عطا کرتی ہیں، لیکن کوئی ملک کسی شخص کو اعزازی قومیت عطا نہیں کر سکتا، کیونکہ اس شخص کی جائے پیدائش کو تبدیل نہیں کیا جائے گا۔

قومیت کی اس طرح بھی تعبیر کی جاسکتی ہے کہ اس کا اطلاق کسی ایسی جماعت پر ہوتا ہے جس کی تہذیب، ثقافت، روایات، تاریخ، زبان اور دیگر عام

---

[1] ڈین فیکلٹی آف لاء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

مشابہت میں یکسانیت ہو، جبکہ شہریت کا اطلاق کسی ایک ہی قسم کی جماعت پر نہیں ہوگا، مثال کے طور پر ایک ہندوستانی امریکی شہری ہوسکتا ہے، لیکن وہ امریکن قومیت کے حامل افراد میں شامل نہیں ہوسکتا۔

دستور ساز اسمبلی میں شہریت:

دستور ساز اسمبلی کو دنیا کے دیگر ممالک میں رہنے والے ہندوستانی نسل کے افراد کی جانب سے مختلف عرضداشتیں پیش کی گئیں، لیکن دستور ساز اسمبلی میں دوہری شہریت کے سوال پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ہوتی، اس خیال کو نہ قبول کیا گیا نہ رد کیا گیا، آرٹیکل ۹ کے تحت کسی دیگر ملک کی رضا کارانہ طور پر قومیت حاصل کرنے کے نتیجہ میں قومیت سے محروم ہوجانے کے سوال پر واضح طور پر غور کیا گیا، یہ غالباً تقسیم ملک اور اس کے نتائج کی وجہ سے شہریت کے مسئلہ پر الجھاؤ سے بچنے کے لئے کیا گیا ہو۔ اس آرٹیکل کے مسودہ پر دستور ساز اسمبلی میں جو بحث ہوئی اس سے ظاہر تھا کہ شہریت کا مسئلہ جو دستور کے آغاز پر ہوگا وہ توجہ کا مرکز تھا جب ۱۰/اگست ۱۹۴۹ کو آرٹیکل ۵ اور ۶ کے اصل مسودہ کا ڈرافٹ زیر بحث آیا تو دستور ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کہا کہ ان دونوں آرٹیکل سے متعلق ۱۳۰ سے ۱۴۰ تک ترامیم پیش کی گئی ہیں۔

انہوں نے ڈاکٹر بی آر امبیڈکر سے کہا کہ وہ آرٹیکل کو اس شکل میں پیش کریں جسے انہوں نے قطعی طور پر مرتب کیا ہے، امبیڈکر نے بار بار وضاحت کی کہ اس آرٹیکل کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ملک کے لئے شہریت سے متعلق کوئی مستقل قانون بنایا جائے، شہریت سے متعلق مستقل قانون بنانے کا کام پارلیمنٹ کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے، اور جیسا کہ ممبران آرٹیکل ۶ کے الفاظ دیکھیں گے جسے میں نے پیش کیا ہے شہریت سے متعلق مسئلہ پارلیمنٹ کے لئے چھوڑا گیا ہے جو کسی ایسے قانون کے مطابق اس کا تعین کرے گی جو وہ مناسب سمجھے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے مزید کہا کہ آرٹیکل ۶ کے تحت پارلیمنٹ ایسے افراد کی شہریت ضبط کرسکتی ہے جو دستور کے نفاذ کے وقت آرٹیکل ۵ کے تحت شہری قرار دیئے گئے تھے اور جو ان کے بعد آئے، بلکہ پارلیمنٹ اس بارے میں نئے اصول بھی مرتب کرسکتی ہے، انہوں نے زور دے کر کہا کہ دستور کی جو مندرجات ہیں وہ مستقل یا نا قابل ترمیم نہیں ہیں، اور ان آرٹیکل کے تحت جو کچھ کہا گیا ہے وہ عبوری اور وقتی نوعیت کی ہیں، دستور کی وہ مندرجات جو دفعہ ۱۱ میں دی گئی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ دستور کے نفاذ کے وقت شہریت عطا کی جائے، ملک کی تقسیم کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ دستور کے نفاذ کے وقت شہریت کی تشریح کی جائے، تاکہ ایسے لوگوں کی شہریت کو خارج کردیا جائے جنہوں نے تقسیم کے بعد ہندوستان کے بجائے پاکستان کی شہریت اختیار کرلی تھی، باقی پارلیمنٹ پر چھوڑ دیا گیا ہے، جیسا کہ دستور ساز اسمبلی کے صدر نے ۱۱/اگست ۱۹۴۹ء کو بحث کے دوران کہا:

ڈاکٹر امبیڈکر نے دو اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے: اول یہ کہ مسودہ دستور کے نافذ العمل ہونے پر شہریت کے محدود سوال سے متعلق ہے، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ دیگر تمام امور بشمول ان کے جو اس مسودہ میں درج ہیں وہ پارلیمنٹ کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنے صوابدید کے مطابق فیصلہ کرے، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ بحث کو کافی حد تک مختصر کردیا جانا چاہئے اور معاملہ تیزی سے طے کرلیا جانا چاہئے، ۱۹۴۹ کا آٹھواں مہینہ پہلے ہی شروع ہوچکا ہے اور دستور ساز اسمبلی اس بحث ومباحثہ کو ختم کرنا چاہتی ہے، بہرحال شہریت کا سارا مسئلہ دستور میں درج نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ دستور میں شہریت سے متعلق دفعات عبوری ہیں اور شہریت سے متعلق امور کی قانون سازی پارلیمنٹ کے لئے چھوڑ دی گئی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر کے بیشتر حصہ میں ان لوگوں کے بارے میں کہا جو پاکستان چلے گئے تھے اور پھر حکومت ہند کے جاری کردہ پرمٹ کی بنیاد پر ہندوستان واپس آگئے، ایسے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی، مگر بحث اسی موضوع پر زیادہ ہوتی رہی۔

شری الادی کرشنا سوامی ائیر جو ایک ماہر قانون اور مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی کے ممبر بھی تھے انہوں نے وضاحت کی کہ شہریت سے متعلق مسودہ آرٹیکل کا مقصد ایوان کے سامنے قومیت کا کوئی قانون پیش کرنا نہیں تھا اور کوئی بھی ملک اپنے دستور کے آغاز میں شہریت سے متعلق قانون مرتب نہیں کرتا، انہوں نے کہا، لہٰذا کسی دستور خصوصاً ہمارے اس دستور میں جو اس وقت شہریت سے متعلق عبوری تجاویز بنا رہا ہے دوہری شہریت یا دوہری قومیت کے بارے میں کوشش سے کوئی فائدہ نہیں۔

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے اپنی تقریر میں خاص طور پر ان لوگوں کو شہریت دینے کے بارے میں کہا جو پاکستان چلے گئے تھے، لیکن پھر ہندوستان لوٹ آئے۔ شری گوپالا سوامی اینگر نے اس تجویز کی تائید کی۔

بحث کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی تقریر کے بڑے حصہ میں پاکستان سے آئے ہوئے تارکین وطن کے مسئلہ اور ان لوگوں کے بارے

میں جو پاکستان جاکر ہندوستان لوٹ آئے ہیں پر مرکوز رکھا، انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ شہریت سے متعلق قانون پارلیمنٹ کو بنانا چاہئے۔

دستور ساز اسمبلی میں ہونے والی بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسمبلی کی اہم توجہ دستور کے نفاذ کے وقت شہریت کے حقوق عطا کرنا دوسرے ان افراد کو شہریت کے زمرے سے خارج کرنا تھا جو ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تھے اور دوسرے ملک کی قومیت اختیار کرلی تھی، (ان میں پاکستان جانے والے خاص طور پر شامل تھے) تیسرے وہ لوگ جو پاکستان ہجرت کر گئے تھے، مگر پھر ہندوستانی شہری کی حیثیت سے واپس آگئے تھے، دیگر سوال جو قومیت اور دوہری قومیت کے بارے میں تھے پارلیمنٹ کے لئے چھوڑ دیئے گئے۔

اگر چہ دوہری قومیت کے سوال پر جزوی طور پر بعض ممبران نے اظہار خیال کیا ان میں پروفیسر کے ٹی شاہ اور پنڈت جواہر لال نہرو خاص طور پر شامل تھے اور یہ سوال برقرار رہا (ایضا)۔

دستور ہند کے تحت شہریت:

دستور میں آرٹیکل ۵ تا ۱۱ کے تحت یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ہندوستان کے شہری کون ہیں؟ یعنی ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ کو جس دن یہ دستور نافذ العمل ہوا، شہریوں کو مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ سکونت کے اعتبار سے شہری۔ ۲۔ ترک وطن کرکے آنے والے شہری۔ ۳۔ اور رجسٹریشن کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے والے۔

۱۔ سکونت کے اعتبار سے شہری: اس کے تحت ہر وہ شخص جو دستور ہند کے نفاذ کے وقت ملک میں سکونت پذیر تھا اور مندرجہ ذیل شرائط پوری کرتا تھا وہ ملک کا شہری ہے:

۱۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، ۲۔ اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، ۳۔ وہ دستور کے نافذ ہونے سے کم از کم پانچ سال قبل سے ہندوستان میں سکونت پذیر تھا۔

مذکورہ بالا شرائط (۱، ۲، ۳) مجموعی نہیں، بلکہ متبادل ہیں، لہذا کوئی بھی شخص جو ان میں سے کسی ایک کو بھی پورا کرے اور ملک میں سکونت پذیر ہو وہ ہندوستان کا شہری شمار کیا جائے گا (عبد الستار...... ریاست گجرات کے اے آئی آر ۱۷۶۵) سکونت سے مراد کسی شخص کی مستقل رہائش ہونا ہے، کوئی شخص سکونت کے بغیر اور نہ کوئی شخص ایک سے زیادہ سکونت کا حامل ہوسکتا ہے، قومی سرحدیں کسی شخص کے سکونت کے اختیار میں رکاوٹ نہیں سمجھی جائیں گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایک ملک کی قومیت کا حامل ہے، لیکن اس کی سکونت کسی اور ملک میں ہے۔

سکونت سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کا کسی علاقائی نظام قانون سے مربوط ہونا، دراصل شہریت سکونت سے حاصل ہوتی ہے اس کے برعکس نہیں، موخر الذکر شہریت سے قابل امتیاز ہے اس حد تک کہ یہ لازمی طور پر علاقائیت سے متعلق ہے کسی فرقہ سے منسلک ہونے سے متعلق نہیں ہے، یہی شہریت کے تصور کی بنیاد ہے۔

ہمارے یہاں صرف ایک ہی شہریت ہے یعنی انڈین یونین کی شہریت، یہاں امریکہ کی طرح کسی اور ریاست کا شہری ہونے کا دستور نہیں ہے، جیسا کہ سپریم کورٹ نے سنٹرل بینک آف انڈیا بنام رام نرائن (اے آئی آر ۱۹۵۵) میں فیصلہ دیا "کسی ملک میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہونے کا ارادہ جہاں کسی شخص نے سکونت اختیار کرلی ہو، وہ اس ملک میں اس کی سکونت کے واقع ہونے کا سبب سے لازمی تشکیلی عامل ہے" سپریم کورٹ نے یہ نظریہ لوئی ڈی رانڈی بنام یونین آف انڈیا میں واضح کیا۔

اپنے اختیار کی سکونت حاصل کرنے کے لئے یہ ظاہر ہونا چاہئے کہ متعلقہ شخص ایک قسم کے ذہن کا حامل ہے، اگر وہ یہ دعوی کرتا ہے کہ اس نے کسی خاص وقت ایک نئی سکونت حاصل کی تو اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اس سکونت والے ملک میں اپنی مستقل سکونت کا ارادہ رکھتا تھا، اس کے ایسے ذہنی ارادہ کے بغیر محض سکونت رکھنا کافی نہیں ہے۔

اپنی رہائش کے ملک میں مستقل مکان بنانے کا ارادہ اور وہاں مستقل رہائش برقرار رکھنا ضروری ہے، اس ارادہ کے بغیر محض رہائش اختیار کرلینا کافی نہیں ہے۔

ایک ہندوستانی جو ۳۰ سال تک انگلینڈ میں مقیم رہا اور وہیں فوت ہوا اس کی ہندوستان میں سکونت کو تسلیم کیا گیا، کیونکہ اس نے اپنے بعض خطوط میں ہندوستان واپس آنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا (شنکرن گووندن بنام لکشمن بھارتی اے آئی آر ۱۹۶۴)۔

لیکن اس فیصلہ کے خلاف اپیل پر سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ متوفی کا ہندوستان واپس آنے کا مصمم ارادہ نہیں تھا اور وہ انگلینڈ میں سکونت رکھتے ہوئے ہی

وہاں فوت ہوگئے (شنکرن بنام لکشمن اے آئی آر ۱۹۷۴)۔

لوئی ڈی رانڈی کے مقدمہ میں ایک غیر ملکی ۷ ۱۹۴۳ء سے ہندوستان میں سکونت پذیر تھا، یعنی دستور کے نافذ العمل ہونے سے پانچ سال سے بھی زیادہ عرصہ سے، اس نے دستور کے آرٹیکل ۵ (ای) کے تحت ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کا دعوی کیا، لیکن سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ درحقیقت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دستور ہند کے نفاذ کے وقت وہ پانچ سال سے زیادہ سے سکونت پذیر تھا۔

محض رہائش اختیار کرلینا ہی کافی نہیں ہے:

سوال یہ تھا کہ آیا مدعی کا ہندوستان میں مستقل سکونت کا ارادہ تھا؟ اس کا ثبوت فراہم کرنا مدعی کی ذمہ داری تھی، لوئی ہندوستانی حکام کی اجازت سے غیر ملکی پاسپورٹ کی بنیاد پر یہاں مقیم تھا، کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے کسی طرح یہ ثابت ہوسکے کہ اس کا یہاں مستقل سکونت کا ارادہ تھا۔

ایک نابالغ اپنے باپ کی سکونت حاصل کرتا ہے (داؤد محمد بنام یونین آف انڈیا ۱۹۶۹) ایک عورت اپنے شوہر کی سکونت میں شریک ہوتی ہے (کریم النساء بنام یونین آف انڈیا، مدھیہ پردیش اے آئی آر ۱۹۵۵)۔

مہاجرت (ترک وطن) کے ذریعہ شہریت:...... پاکستان سے ترک وطن آرٹیکل ۶ کے تحت دستور ہند کے نفاذ سے قبل پاکستان سے ہجرت کرنے والوں کے لئے شہریت عطا کی گئی ہے، ایک شخص جس نے ۱۹/جولائی ۱۹۴۸ سے پہلے پاکستان سے ہندوستان کے لئے ترک وطن کیا اسے ہندوستان کا شہری سمجھا جائے گا بشرطیکہ اس شخص کے والدین یا دادا دادی میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوں، جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت درج ہے، اور یہ کہ وہ ترک وطن کی تاریخ سے ہی وہاں مقیم تھا، جو لوگ ۱۹/جولائی ۱۹۴۸ کے بعد ترک وطن کر کے آئے ایسے شخص کو حکومت کے حکام ہندوستانی شہری شمار کریں گے، لیکن رجسٹریشن کے لئے متعلقہ شخص کو درخواست دینے کی تاریخ سے چھ ماہ قبل ہندوستان میں سکونت پذیر ہونا چاہئے (وزارت قانون)۔

پاکستان کو ہجرت کرنے والے:...... دستور کے آرٹیکل ۷ میں ایسے افراد کے لئے جو یکم مارچ ۱۹۴۷ کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے، مگر بعد کو واپس آگئے، خصوصی بندوبست کیا گیا ہے، ایسے افراد ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کے حقدار ہیں، بشرطیکہ وہ ان شرائط کو پوری کرتے ہوں جو پاکستان سے آنے والوں کے لئے اور آرٹیکل ۶ کے تحت درج کی گئی ہیں، مگر ایسے کیسوں میں بھی ضروری ہے کہ ہجرت مختصر مدت کے لئے ہو یا عارضی نوعیت کی، کاروباری یا کسی دیگر مقصد کے لئے ہو (ایضا)۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ایسے کیسوں میں مذکورہ آرٹیکل کے تحت عمل ہوگا، کیونکہ یہ دستور ہند کے نفاذ سے قبل کے ہیں اس کے بعد کے کیس شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ء کے تحت آئیں گے۔

۳۔ رجسٹریشن کے ذریعہ شہریت:...... دستور کی دفعہ ۸ کے تحت مذکور ہے کہ کوئی شخص جس کے والدین یا دادا دادی میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ میں وضاحت کی گئی ہے اور وہ عام طور پر ہندوستان سے باہر کسی ملک میں مقیم ہے اسے ہندوستانی سمجھا جائے گا، بشرطیکہ وہ دستور کے نفاذ سے قبل یا بعد اگر ہندوستانی سفارت خانہ یا قونصل سے متعلقہ فارم حاصل کر کے ایسے درخواست پیش کردیتا ہے (ایضا)۔

۴۔ رضا کارانہ طور پر کسی غیر ملک کی شہریت حاصل کرنا:...... دستور کے آرٹیکل ۹ کے تحت مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی غیر ملک کی شہریت اختیار کرلیتا ہے تو اسے آرٹیکل ۶ یا ۸ کی مندرجات کے تحت ہندوستانی شہری نہیں سمجھا جائے گا، لہذا ان مندرجات سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ہندوستانی دہری یا تکثیری شہریت کا حامل نہیں ہوگا، بہر حال یہ آرٹیکل ۱۱ کے تحت یہ پارلیمنٹ کے اختیار میں ہے کہ دیگر امور کے علاوہ خصوصی شہریت کی بابت بھی کوئی فیصلہ کرے، لہذا آرٹیکل ۹ کا اطلاق صرف ان کیسوں پر ہوگا جہاں دستور ہند کے نفاذ سے قبل (اس کے بعد نہیں) غیر ملکی شہریت اختیار کرلی گئی تھی۔

اس کے بعد پیش آنے والے کیسوں پر ہندوستانی شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ کی دفعات کے مطابق کارروائی عمل میں آئے گی۔

۵۔ شہریت کا حق برقرار رکھنا:...... آرٹیکل ۱۰ میں مذکور ہے کہ کوئی بھی شخص اوپر مندرجہ آرٹیکل ۵۔ ۱۰ کے تحت ہندوستان کا شہری ہے یا اسے ہندوستانی شہری سمجھا جاتا ہے وہ ہندوستانی شہری ہی سمجھا جاتا رہے گا، بشرطیکہ پارلیمنٹ کے ذریعہ بنائے گئے متعلقہ قوانین کے تقاضے پورے ہوتے ہوں، بالفاظ دیگر

پارلیمنٹ کے ذریعہ واضح قانون سازی کے بغیر کسی شخص سے اس کی شہریت کا حق چھینا نہیں جاسکتا۔

۶۔ **پارلیمنٹ قانون کے ذریعہ شہریت کے حقوق کا ضابطہ بنائے گی:**...... اور مذکورہ مندرجات پارلیمنٹ کے اس اختیار کو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ شہریت اختیار کرنے یا منقطع کرنے، نیز دیگر متعلقہ امور کی بابت قوانین مرتب کرسکتی ہے۔

قانون شہریت ۱۹۵۵:

دستور ہند کی مندرجات کے تحت صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ دستور کے نفاذ کے وقت ہندوستانی شہری کون ہیں، مگر اس تاریخ کے بعد شہریت اختیار کرنے والوں کے مسئلے پر کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے اور نہ دستور میں شہریت منقطع کرنے (آرٹیکل ۷ اور ۹ کے علاوہ) یا شہریت سے متعلق دیگر امور کے بارے میں کچھ کہا گیا ہے، آرٹیکل ۱۱ کے تحت واضح طور پر کہا گیا ہے کہ پارلیمنٹ ان امور کے بارے میں قانون سازی کرسکتی ہے، لہذا پارلیمنٹ نے قانون شہریت ۱۹۵۵ وضع کیا جس کے تحت ہندوستانی شہریت اختیار کرنے اور شہریت کی تشریح وتعبیر کی گئی ہے۔

قانون شہریت ۱۹۵۵ء کے تحت دستور کے نفاذ کے بعد ہندوستانی شہریت حاصل کرنے یا اس سے محروم ہونے کے بارے میں مندرجات ہیں، اس ایکٹ میں مندرجہ ذیل ایکٹ کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ترامیم کی جاتی رہی ہیں:

۱۔ قانون شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۸۶ء ۲۔ قانون شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۹۲ء ۳۔ قانون شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۲۰۰۳ء

۴۔ قانون شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۲۰۰۵ء

ابتداء میں قانون شہریت ۱۹۵۵ء میں دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) شہریت کی گنجائش رکھی گئی تھی، لیکن شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۲۰۰۳ء کے ذریعہ اسے منسوخ کردیا گیا۔

حصول شہریت:

قانون شہریت ۱۹۵۵ کے تحت حصول شہریت کے لئے ۵ طریقے درج کئے گئے ہیں یعنی پیدائش، وراثت، رجسٹریشن، قومیت کے تحت لینا اور کسی علاقہ کا انضمام۔

۱۔ بذریعہ پیدائش: کوئی شخص جو ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ کو یا اس کے بعد میں (لیکن یکم جولائی ۱۹۸۷ سے قبل) ہندوستان میں پیدا ہوا وہ پیدائش کے اعتبار سے ہندوستان کا شہری شمار ہوگا، خواہ اس کے والدین کی قومیت کوئی بھی ہو۔

کوئی شخص جو یکم جولائی ۱۹۸۷ء کو یا اس کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا اسے صرف اسی صورت میں ہندوستان کا شہری مانا جائے گا جب اس کی پیدائش کے وقت اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستانی شہریت کا حامل ہو۔

مزید ۳/دسمبر ۲۰۰۳ء کو یا اس کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو محض اس صورت میں ہندوستانی شہری مانا جائے گا جب اس کے والدین ہندوستان کے شہری ہوں یا والدین میں سے کوئی ایک ہندوستانی شہری ہو، اور پیدائش کے وقت دوسرا (شوہر/بیوی) غیر قانونی طور پر ہندوستان میں نہ آیا ہو۔

ہندوستان میں تعینات غیر ملکی سفارت کار یا دشمن ملک کے غیر ملکی پیدائش کی بنیاد پر ہندوستانی شہریت حاصل نہیں کرسکتے۔

وراثت (اخلاف) کے ذریعہ شہریت:

جو شخص ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء کو یا اس کے بعد، لیکن ۱۰/دسمبر ۱۹۹۲ء سے قبل کسی غیر ملک میں پیدا ہوا ہو تو اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کا باپ ہندوستانی شہری تھا تو وہ شخص بھی ہندوستانی مانا جائے گا۔

جو شخص ۱۰/دسمبر ۱۹۹۲ کو یا اس کے بعد ہندوستان سے باہر کسی بھی ملک میں پیدا ہوا تو اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستانی شہریت کا حامل تھا تو ایسا شخص بھی ہندوستانی شہری ہوگا۔

۳/دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد اگر کوئی شخص ہندوستان سے باہر کسی ملک میں پیدا ہوا تو اسے وراثت کے ذریعہ ہندوستانی تسلیم نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس

کی پیدائش کے ایک سال کے اندر اس کی پیدائش کا اندراج ہندوستانی قونصل کے یہاں نہیں کرالیا جاتا، یا اس مدت کے ختم ہوجانے پر مرکزی حکومت کی اجازت سے یہ کارروائی نہ کرائی گئی ہو، ایسے بچے کے رجسٹریشن کے لئے درخواست کے فارم پر جو قونصل کے وہاں پیش کی جائے گی اس بچے کے والدین کو تحریری طور پر یہ بیان بھی داخل کرنا ہوگا کہ ان میں سے کسی کے پاس غیر ملکی پاسپورٹ نہیں ہے۔

۳۔ رجسٹریشن کے ذریعہ (حصول شہریت) مرکزی حکومت ایک درخواست موصول ہونے پر کسی شخص کو بطور ہندوستانی شہری رجسٹریشن کرسکتی ہے (بشرطیکہ وہ غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل نہ ہوا ہو) اور مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک زمرہ کے تحت آتا ہو۔

(الف) ہندوستانی نسل کا کوئی شخص جو شہریت کی درخواست دینے کی تاریخ سے سات سال تک ہندوستان میں مقیم رہا ہو۔

(ب) ہندوستانی نسل کا وہ شخص جو غیر تقسیم شدہ ہندوستان سے باہر کسی ملک یا مقام پر مقیم ہو۔

(ج) جس شخص نے کسی ہندوستانی سے شادی کی ہو اور رجسٹریشن کی درخواست دینے سے قبل وہ سات سال تک یہاں مقیم رہا ہو۔

(د) ہندوستانی شہریوں کے نابالغ بچے۔

(ھ) پوری عمر اور صلاحیت کا وہ شخص جس کے والدین کا بطور ہندوستانی شہری رجسٹریشن ہوا ہو۔

(و) ایک بالغ اور باصلاحیت شخص جو یا اس کے والدین میں سے کوئی ایک پہلے آزاد ہندوستان کے شہری ہوں اور رجسٹریشن کی درخواست دینے سے فوراً قبل وہ ایک سال تک یہاں مقیم رہا ہو۔

(ز) ایک بالغ اور باصلاحیت رصحت مند شخص جس کا پانچ سال تک بطور سمندر پار رہنے والے ہندوستانی کی حیثیت سے اندراج ہوا اور رجسٹریشن کی درخواست دینے سے قبل ایک سال تک یہاں مقیم رہا ہو۔

(الف) وہ رجسٹریشن کی درخواست دینے سے فوراً قبل پورے ۱۲ رمہینے تک یہاں مقیم رہا ہو۔

(ب) ان ۱۲ مہینوں سے قبل آٹھ سال کے عرصہ میں وہ یہاں مقیم رہا ہو اور یہ مدت کم از کم ۶ سال ہونی چاہئے۔

اس شخص کو ہندوستانی نسل کا سمجھا جائے گا جو یا اس کے والدین میں سے کوئی ایک متحدہ ہندوستان میں پیدا ہوئے یا اس علاقہ میں پیدا ہوئے ہوں جو ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کا حصہ بن گئے۔

مندرجہ بالا زمروں کے تحت درج تمام افراد کو بطور ہندوستانی رجسٹرڈ کئے جانے سے قبل وطن سے وفاداری کی بابت ایک حلف نامہ پر دستخط کرنا ہوں گے، حلف نامہ کے فارم کی عبارت درج ذیل ہے:

میں اے ربی.........صدق دل سے اقرار کرتا ہوں (قسم کھاتا ہوں) کہ میں دستور ہند میں جیسا کہ از روئے قانون ثابت ہے میں عقیدہ رکھوں گا اور اس کا وفادار رہوں گا اور یہ کہ میں ملک کے قانون کی پابندی کروں گا اور بطور ہندوستانی شہری اپنے فرائض کو پورا کروں گا۔

۴۔ قومیت دیئے جانے کے ذریعہ رجسٹریشن:

مرکزی حکومت کسی شخص کی جانب سے درخواست آنے پر بشرطیکہ وہ غیر قانونی پر یہاں مقیم نہ ہو، قومیت کا سرٹیفکٹ عطا کرسکتی ہے، اگر وہ مندرجہ ذیل شرائط پوری کرتا ہے۔

الف۔ کسی ایسے ملک کا باشندہ نہ ہو جہاں ہندوستانیوں کو قومیت کے ذریعہ اس ملک کا شہری یا باشندہ بنانے کی ممانعت ہو۔

ب۔ وہ جس ملک کا باشندہ ہے اسے اس کی درخواست منظور کئے جانے سے قبل یہ عہدنامہ پیش کرنا ہوگا کہ اس نے اس ملک کی قومیت کو ترک کردیا ہے۔

ج۔ یہ کہ وہ یا تو ہندوستان میں مقیم ہے یا یہاں سرکاری ملازمت میں ہے یا جزوی طور پر ان میں سے کسی ایک پوزیشن میں قومیت کی درخواست پیش کرنے کی تاریخ سے ۱۲ ماہ تک وہ یہاں مقیم رہا ہے۔

د۔ یہ کہ ۱۲ رماہ کی مدت سے قبل ۱۴ رسال تک وہ یہاں مقیم رہا ہے یا حکومت ہند کی ملازمت میں رہا ہے یا ان میں سے کسی ایک پوزیشن میں رہا ہے، یہ

اعلان شدہ مدت مجموعی طور پر ۱۱ سال سے کم نہیں ہونی چاہیے۔

ھ۔ یہ کہ وہ اچھے کردار کا حامل ہو۔

الف۔ یہ کہ اسے دستور ہند میں درج آٹھویں شیڈول کے تحت کسی زبان سے واقفیت ہونی چاہیے۔

ب۔ یہ کہ اسے قومیت کا سرٹیفکٹ دیئے جانے کی صورت میں وہ ہندوستان میں سکونت کا ارادہ رکھتا ہو، یا اگر وہ حکومت ہند کا ملازم ہے تو یہ ملازمت جاری رکھے یا سرکاری ملازمت اختیار کرے یا کسی ایسی بین الاقوامی تنظیم میں ملازم ہو جس کا ہندوستان ایک رکن ہے یا کسی ایسی سوسائٹی یا کمپنی کا ادارہ میں ہو جو ہندوستان میں قائم کی گئی ہو۔

بہر کیف اگر حکومت ہند چاہے تو وہ کسی ایسے شخص کے لئے جس نے سائنس، ادب، فلسفہ میں بیش بہا خدمات انجام دی ہوں امن عالم اور انسانی بہبود کے لئے اہم کام کیا ہو مذکورہ بالا شرائط میں سے کسی ایک یا جملہ شرائط سے مستثنیٰ قرار دے سکتی ہے۔

قومیت اختیار کرنے والے ہر شخص کو دستور ہند سے وفاداری کا عہد کرنا ہوگا۔

۵۔کسی علاقہ کو شامل کئے جانے کے ذریعہ:

اگر کوئی بیرونی علاقہ ہندوستان کا حصہ قرار پاتا ہے تو حکومت ہند اس علاقہ کے انضمام کے ساتھ اس علاقہ کے باشندوں کو بھی ہندوستانی شہری قرار دے گی یہ لوگ مشتہر کئے جانے کی تاریخ سے ہندوستانی شہری تسلیم کئے جائیں گے، مثال کے طور پر جب پانڈیچیری ہندوستان کا حصہ بن گیا تو حکومت ہند نے شہریت (پانڈیچیری) آرڈر ۱۹۶۲ء جاری کیا جو شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ء کے تحت جاری کیا گیا تھا، قانون شہریت ۱۹۵۵ء کے تحت شہریت منقطع کئے جانے کے طریقے بتائے گئے ہیں یہ شہریت خواہ ایکٹ کے تحت حاصل کی گئی ہو یا دستور کے تحت اس سے قبل لی گئی ہو، مثلاً شہریت ترک کرنا منقطع کرنا یا جلاوطن کر دینا۔

ا۔ شہریت ترک کرنا: کوئی بالغ باشعور ہندوستانی شہری اپنی ہندوستانی شہریت ترک کرنے کا اعلان کر سکتا ہے اس اعلان (ڈیکلریشن) کے رجسٹر کئے جانے کے بعد وہ شخص ہندوستان کا شہری نہیں رہے گا، لیکن اگر ایسا ڈیکلریشن کسی جنگ کے دوران کیا گیا جس میں ہندوستان ایک فریق ہو تو مرکزی حکومت ایسے ڈیکلریشن کو رد کر سکتی ہے۔

مزید یہ کہ جب کوئی شخص اپنی ہندوستانی شہریت ترک کرتا ہے تو اس کے نابالغ بچے بھی ہندوستانی شہریت سے محروم ہو جائیں گے، لیکن ۱۸ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد یہ بچے ہندوستانی شہریت اختیار کر سکتے ہیں۔

۲۔انقطاع کے ذریعہ:......اگر کوئی شخص رضا کارانہ طور پر اپنی مرضی سے بلا کسی جبر، دباؤ اثر یا جان بوجھ کر شعوری طور پر ہندوستانی شہریت ترک کرتا ہے تو اس کی شہریت خود بخود ختم ہو جائے گی، لیکن اگر کسی جنگ کے دوران جس میں ہندوستان شریک ہو ایسا اقدام کیا جائے تو اس پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۳۔محروم کئے جانے کے ذریعہ:

یہ مرکزی حکومت کی جانب سے جبری اقدام ہے

الف۔ اگر کسی شخص نے فریب کاری کے ذریعہ شہریت حاصل کی ہو۔

ب۔ شہری نے دستور ہند سے عدم وفاداری کا مظاہرہ کیا ہو۔

ج۔ اگر جنگ کے دوران شہری نے دشمن سے لین دین یا رابطہ قائم کیا ہو۔

د۔ اگر شہریت یا قومیت کے رجسٹریشن کے پانچ سال کے اندر اس شہری کو کسی بھی ملک میں دو سال کی قید ہوئی ہو۔

ھ۔ اگر وہ شہری سات سال سے زیادہ مدت تک عموماً ہندوستان سے باہر ہی مقیم رہا ہو (اس شرط کا اطلاق طالب علموں، حکومت ہند کے ملازمین اور کسی بین الاقوامی تنظیم میں کام کرنے والوں پر جس کا ہندوستان بھی ایک رکن ہے نہیں ہوگا، یا وہ ہر سال ہندوستانی قونصل کے دفتر میں اپنے اس ارادہ کی اطلاع دیتا ہے کہ وہ ہندوستانی شہریت پر برقرار رہے گا)۔

اکہری شہریت:

ہندوستان کا دستور وفاقی ہے، اس میں دوہرا نظام حکومت دکھایا گیا ہے (مرکزی اور ریاستی) لیکن شہریت صرف اکہری ہی ہے، یعنی ہندوستانی شہریت، ہندوستان کے شہری انڈین یونین کے وفادار ہیں، یہاں ریاستی شہریت کا تصور نہیں ہے۔

کوئی کمپنی یا کارپوریشن شہری کی حیثیت کی حامل نہیں: کوئی کمپنی رجسٹریشن کے بعد قانونی حیثیت حاصل کر لیتی ہے، جو ممبران سے ممتاز ہے، لیکن اس کی حیثیت شہری کی نہیں ہے نہ دستور ہند کے تحت نہ ہندوستانی شہریت ایکٹ کے تحت (سنگل ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا اے آئی آر ۱۹۶۳) جو کمپنی انڈین کمپنی ایکٹ از روئے قانون قائم شدہ کارپوریشن ہو اسی کو بطور شہری تسلیم کیا جائے گا (ایضا)۔

انڈین کمپنی ایکٹ یا اسٹیچوری کارپوریشن کے طور پر رجسٹریشن کے بعد وہ ان بنیادی حقوق کو نافذ کر سکتی ہیں جن کی شہری یا غیر شہری کو ضمانت ہے، لیکن یہ کمپنی یا کارپوریشن ایک شہری کی حیثیت نہ رکھنے کی صورت میں ان بنیادی حقوق کو نافذ نہیں کر سکتیں جن کی شہریوں کے لئے ضمانت دی گئی ہے (ایضا)۔

مگر اب رجحان یہ ہے کہ عدالتیں ایسی کمپنی یا کارپوریشن یا ان کے حصہ دار یا حصہ داروں کی طرف سے دائر کردہ ایسی عرضیاں بھی برائے سماعت قبول کر لیتی ہیں جن میں ان بنیادی حقوق کو چیلنج کیا جاتا ہے جن کی دستور میں شہریوں کو ضمانت دی گئی ہے (برٹش......اے آئی آر ۱۹۷۰)۔

اسٹیٹسمین بنام حقائق معلوم کرنے والی کمیٹی (اے آئی آر ۱۹۷۵) میں حکومت ہند نے اخباری صنعت کی اقتصادیات کی بابت حقائق معلوم کرنے کے لئے ایک کمیٹی تقرر کی تھی، اسے اسٹیٹسمین کی جانب سے جو کہ ایک کمپنی اور کمپنی کا شیئر ہولڈر ہے عدالت میں چیلنج کرنے کی کوشش کی گئی، ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ کمپنی کو بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں، لیکن شیئر ہولڈر کو ہیں لہذا مقدمہ سماعت کے لئے منظور کیا جا سکتا ہے، پریس اخبارات کے ذریعہ عوام تک رسائی حاصل کرتا ہے اور شیئر ہولڈر ایڈیٹر کے ذریعہ اپنی بات کہتے ہیں (بی ٹی آئی بنام یونین آف انڈیا اے آئی آر ۱۹۷۴)۔

اس حقیقت کے باوجود کہ کمپنی نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا، عدالت نے شیئر ہولڈروں کو راحت عطا کی۔

جب ایک ریاستی حکومت نے ایک بجلی کمپنی کو قومیانے (نیشنلائزیشن) کے لئے اقدام کیا تو کمپنی اور اس کے ایک شیئر ہولڈر نے اس اقدام کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا، شیئر ہولڈر کی درخواست آرٹیکل (۱۹)(ا) اور (بی) کے تحت منظور کر لی گئی، کیونکہ اس کے تحت اسے کمپنی کے ذریعہ کاروبار چلانے کا حق حاصل تھا اور کمپنی کی جائداد میں بھی وہ جزوی طور پر حصہ دار تھا اور کمپنی کو ریاستی اختیار کے تحت جانے سے اس کا خسارہ تھا (گولڈن الیکٹرک کمپنی بنام ریاست گجرات اے آئی آر ۱۹۷۵)۔

حکومت ہند نے ورکنگ جرنلسوں کی تنخواہ مقرر کرنے کے بارے میں ایک حکم جاری کیا کمپنی کے ایک شیئر ہولڈر نے اس حکم کے خلاف حلف استغاثہ دائر کیا جسے آرٹکل ۱۹(ا) ایف) کے تحت برائے سماعت منظور کر لیا گیا۔

اگر کمپنی کے وسائل پر بھاری مالی بوجھ ڈالا گیا تو اس سے شیئر ہولڈر کا نقصان ہوگا اور یہ ان کے حقوق میں دخل اندازی ہے، لہذا ایک شیئر ہولڈر نے آرٹیکل ۱۹ کے تحت اس حکم کو جائز طور پر چیلنج کیا (بی ٹی آئی بنام یونین آف انڈیا اے آئی آر ۱۹۷۴)۔

ان عدالتی فیصلوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ ایک تسلیم شدہ روایت بن گئی کہ حکومت کی جانب سے کسی مخالف اقدام کو متعلقہ کمپنی اور شیئر ہولڈر عدالت میں چیلنج کرتے ہیں اور ان بنیادی حقوق کا حوالہ دیتے ہیں جو صرف شہریوں کو دیئے گئے ہیں اسی طرح عدالت کے ایسے احکام کے خلاف بچاؤ کا ایک طریقہ پالیا گیا ہے جن سے انہیں نقصان ہو سکتا تھا۔

امرتسر میونسپلٹی بنام ریاست پنجاب کے مقدمہ میں (اے آئی آر ۱۹۶۹) عدالت نے فیصلہ دیا کہ میونسپلٹی آرٹیکل ۱۹ کی مندرجات کے تحت شہری کی تعریف میں نہیں آتی۔

دستور کی مندرجہ بالا مندرجات اور ایکٹ کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شہریت سے متعلق قانون ہے، اچھا ہے، لیکن اس کا نفاذ امتیازی نوعیت کا ہے، گذشتہ کئی دہائیوں سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلم شہریوں کو ان حقوق اور مراعات سے محروم رکھا جاتا ہے جو دیگر ہندوستانی شہریوں کو عطا کئے گئے ہیں۔

☆☆☆

کسی مسلم ریاست کی شہریت: مسائل وچیلنجز

ڈاکٹر سیف الدین عبدالفتاح

زیر نظر عنوان جن الفاظ سے مرکب ہے ان پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم جس مسئلہ پر اس وقت گفتگو کرنے جارہے ہیں وہ کئی عناصر سے مرکب اور ان کا آمیزہ ہے، یہ عناصر ان تین الفاظ میں جلوہ گر ہیں:

۱۔ شہریت، ۲۔ ریاست، ۳۔ مسلم، اس پہلو سے غور کریں تو ان مسائل کی بنیاد یہ ہے کہ شہریت کا تصور ان مغربی افکار وتصورات میں سے ایک ہے، جن کو پوری دنیا میں تسلیم کرلیا گیا ہے، اور اب وہ اپنے مغربی تہذیبی پس منظر کے اسیر نہیں رہے ہیں، دوسرا لفظ بھی ایک مغربی صورت حال سے مربوط ہے، یہ صورت حال الگ الگ طرح کے ملکوں میں قومی ریاست، اس کے تقاضوں اور اس کے مسائل سے متعلق ہے[1]۔ تیسرے لفظ کا تعلق مسلم یا اسلامی کے وصف سے ہے، اس سیمینار کے منتظمین نے مسلم کی صفت کو اصل صفت کے طور پر ذکر کرکے بہت اچھا کیا کہ یہ صفت ایک بہت اہم کیفیت کی تعبیر ہے، یعنی عالم اسلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا ادراک کرے کہ وہ اس وقت ایک ایسے زمانہ سے گزر رہا ہے جس میں رجحانات مسلسل تغیر پذیر ہیں، اس لئے ہمیں اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اور اس کی روشنی میں ایک نقطۂ نظر طے کرنے کے بعد غور وفکر کا منہج ترتیب دینا چاہئے۔

یعنی ہمیں ایک ایسا بہت اہم مسئلہ درپیش ہے جس کے نتائج ہمیں اسلام ومغرب کے درمیان پائی جانے والی فکری کشمکش میں، قومی ریاست کے تصور میں اور مسلم دنیا کے موجودہ حالات میں نظر آتے ہیں، اس حوالہ سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اصل مسئلہ کی نوعیت کی تعیین کرنا ہمارے لئے لازم ہے، اور تعیین کے اس عمل میں حالات ومسائل کے صحیح فہم کے ساتھ ساتھ تعیین مناط کا بھی کام کرنا ہے، کشمکش، قومی ریاست اور مسلم دنیا کے درمیان پائے جانے والا یہ ربط عملی طور پر ایسے مرکب مسائل وجود میں لاتا ہے جو ایک ایسے واضح منہجی نظریہ کے متقاضی ہیں جو غور وفکر اور عمل کے طریقہ ہائے کار کی تعیین کریں، اس حوالہ سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم مقاصدی اجتہاد کو اس مرکب مسئلہ پر غور وفکر کرنے کے لئے بنیادی طریقہ بنائیں[2]، اس لئے کہ مقاصدی اجتہاد ظاہری امور سے آگے بڑھ کر حقیقی صورت حال اور متوقع انجام کے ہر پہلو پر غور کرتا ہے، اسی لئے یہ منہجی، بنیادی مسئلہ ہمارے لئے یہ لازم کرتا ہے کہ ہم شہریت سے متعلق مسائل پر قومی ریاست کے پس منظر میں اور مسلم دنیا کی اسلامی مرجعیت کا خیال رکھتے ہوئے غور کریں، اس کام کے لئے ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم موجودہ حالات ودرپیش مسائل کے تئیں رویہ اختیار کرنے کی بابت غور وفکر کے مناہج ترتیب دیں، اس لئے کہ اس غور وفکر میں تمام حالات کے اجمالی حکم کے ساتھ ساتھ مقام، زمانہ یا فرد کے اعتبار سے وجود میں آنے والے گوناگوں جماعتوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

شہریت سے متعلق بہت سے گہرے مسائل واشکالات سامنے آتے ہیں، ان میں سب سے اہم مسئلہ کی بنیاد وطن کے لئے وفاداری خالص کرنے اور تمام دیگر جزوی نسبتوں وتشخصوں پر اس کو مقدم کرنے پر ہے، ایک ہی وطن کے اندر آباد افراد کی مختلف نسبتوں کی وجہ سے باہمی اختلاف پایا جاتا ہے، اسلامی طرز فکر ونظر نے ایسے مختلف رجحانات کے درمیان پائے جانے والے اختلافات سے نپٹنے کے لئے ایک زبردست توازن وہم آہنگی کو وجود بخشتا ہے، اس طرح شہریت کے حقوق اور اس کی حدود کی بابت اسلامی نظریہ مسلسل جدید سے جدید تر ہونے والے آفاق کا حامل ہے، لیکن ہمیں عصر حاضر میں مسلمانوں کے اندر وہ طرز فکر نہیں نظر آتا ہے جو ریاست اور جدید سیاسی معاشرہ کی اقداری نظریہ سازی کی تہ میں جاکر شہریت پر کلام کرے۔

لہٰذا ہمارے لئے یہ واجب ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ریاست سے استفادہ کریں، اس لئے کہ یہ وہ اسوہ ہے جس کا اتباع کرکے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو شہریت کی حدود طے کرنی چاہئیں، نیز اس کو درپیش مسائل وچیلنجس کو عصر حاضر کے مزاج کے مطابق اسلامی طریقہ ہائے کار اختیار کرکے حل کرنا

---

[1] سیف عبدالفتاح، عواقب الدولة القومية، في حولية أمتي والعالم، تحریر ونگرانی: ڈاکٹر نادیہ مصطفی، سیف عبدالفتاح، قاہرہ۔

[2] سیف عبدالفتاح، هندسة الاجتهاد المقاصدي۔

چاہئے، اسی اسوہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے ہمیں شہریت کی صفات، اس کے پہلوؤں اور اس کی حقیقت کی تعیین کرنی چاہئے، نیز اس کی اہمیت ثابت کرنی چاہئے۔

اس کی روشنی میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ: ''اس منہج نے شہریت کا ایک ایسا متوازن نظریہ پیش کیا ہے جو مسلم افراد کی مختلف نسبتوں پر حاوی ہے، اور اس میں اسلامی تشخص ونسبت، نیز اس کے لوازم کی ترجیح پر آنچ بھی نہیں آئی ہے''۔[1]

یہ کیفیت اس زندہ مسئلہ کی جانب اشارہ کرتی ہے جو شہریت اور دین، شہریت اور دیگر نسبتوں، شہریت اور اس کے سیاسی پہلو، شہریت اور ان مغربی افکار کے درمیان تعلق سے متعلق ہے جو شہریت کو خود ایک مستقل بالذات نظام کے طور پر دیکھتے ہیں، اب ہمیں اس اصطلاح کی ایک ایسی تعریف کرنی ہوگی جو اسلامی نظریہ کے مطابق ہو اور اس انسانی وتہذیبی پس منظر میں ہو جو قومی ریاست کو مختلف ممالک کے باہمی تعلق کی بنیاد کے طور پر دیکھتا ہے۔

اس موقع پر ہمیں عرب ومسلم دنیا میں ریاست کے مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہئے،[2] اس لئے کہ قومی ریاست کے موجودہ نظریہ وطریقہ ہائے کار نے بہت سے ماضی کے اجتہادات کو محل نظر بنادیا ہے، فقہ واقع اور تحقیق مناط اس کے متقاضی ہیں، اس سلسلے میں اصل بنیادی مسئلہ قومی ریاست کے تصور کا وہ منہجی مسئلہ ہے جو لازماً شہریت کے تصور اور اس کے نتائج پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس ریاست کے مسلم ہونے کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے جو شہریت اور قومی ریاست کے طرز عمل سے بیک وقت متعلق ایک منہجی مسئلہ کی تعبیر ہے، اس طرح یہ مسئلہ عالم اسلامی کو عصر حاضر میں درپیش ایک مسئلہ کی تعبیر ہے، یہ مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عالم اسلامی میں دو نظریات پائے جاتے ہیں: ایک مغربی نظریہ، جو زمانہ کی غالب تہذیب کے زیر اثر غالب ہو رہا ہے، جبکہ دوسرا نظریہ تہذیب اسلامی کا ہے، اور وہ معاصر زندگی میں ان دونوں نظریات کے درمیان مشترک اقدار سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔[3]

اسی لئے اس بابت ہمارا موقف چند ایسے حقائق سے عبارت ہونا چاہئے، جن کے ذریعہ ہم ایک ایسے منہجی طرز پر اشتراک کو ختم کرنے کے عمل کی بابت بنیادی موقف واضح کرسکیں جو اسلامی تہذیب میں شہریت کے تصور کی تشکیل کرسکے، اور پھر اسے قومی ریاست کے تصورات میں قابل عمل بناسکے، نیز اس کے لئے ضروری اجتہادی وتجدیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکے، اس طرح ہم تین امور کی قید سے باہر آسکیں گے، ا۔ مغربی افکار وتصورات کی نوعیت اور ان کے لازمے، ۲۔ وہ روایتی فقہ جو اپنے زمانوں سے متعلق تھی، ۳۔ ایسے حقیقی اسلامی نظریہ کے تحت شہریت کے تصور کو بروئے کار لانا جو جدید تصورات سے بے تعلق نہ ہو، اور ان تصورات کو مقاصدی اصولوں کی روشنی میں اسلامی طریقہ پر استعمال کرنے کے اصول بنانا، یہ مقاصدی اصول زندگی کے تغیرات اور اصول شریعت دونوں کی رعایت کرتے ہیں، یعنی یہ ایک مرکب (مختلف پہلوؤں کے حامل) کام کی انجام دہی اور ایک ایسے رویہ وموقف کی تشکیل ہے جو ان مسائل پر اصولی، سسٹاٹیک اور ڈائینمک طور پر غور وفکر کرے، لہٰذا کسی مسلم ریاست میں شہریت کے مسئلہ پر صحیح وعمیق نظریہ کی تشکیل کے لئے متعدد موضوعات پر کلام ضروری ہے۔

درحقیقت ہمیں اس مرکب نظریہ پر گفتگو کرنے کے لئے شہریت کے مغربی تصور کو سامنے رکھ کر اس پر اسلامی یا غیر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقیدی گفتگو کرنی ہوگی، دوسری بات یہ بھی ضروری ہے کہ ہم شہریت سے متعلق تمام تصورات کو معاصر سیاق میں اس طرح دیکھیں کہ وہ نبوی تجربہ سے ہم آہنگ اصول ومعانی کو مزید یقینی بنائیں، شہریت کی بابت صحیح نظریہ قائم کرنے اور سیاسی معاشرہ کی تعمیر کرنے کے لئے میثاق مدینہ ایک اہم بنیاد ہے، تیسری ضروری بات کلی مقاصدی نظریہ، قومی معاشرہ کے حقائق اور شہریت کے متعدد تصورات کی روشنی میں نظریۂ شہریت کی از سر نو تشکیل ہے، اس طرح ہم صرف اس نظریہ کی تشکیل کرکے اس کے تقاضوں کو روبہ عمل لاسکتے ہیں، اس کے عوامل کا استعمال کرسکتے ہیں، اور اس کے طریقہ ہائے کار کو برت سکتے ہیں، اس کلی نظریہ کے تحت شہریت کا تصور غور وفکر کے کلی مناہج، جزوی مناہج، درپیش حالات ومسائل کے تئیں رویہ اختیار کرنے کے مناہج کی بابت ایک امتحان وجانچ کی حیثیت رکھتا ہے، ساتھ ہی ان نظریات وان کے نتائج کو مستقبل کے امکانات کے پس منظر میں دیکھنے کے چیلنجس سے بھی صرف نظر نہیں کرتے ہیں۔

ا۔ اجتہادی نظام اور تہذیبی فقہ کے اصول:

تہذیبی تعمیر، مقاصدی اجتہاد، اس کے عناصر وعمرانی وتہذیبی اصولوں پر توجہ دینا بھی بہت ضروری ہے، تاکہ امت کی جامعیت کی تجدید کا نظریہ قائم کیا

---

[1] سامر مؤید عبد اللطیف، المعالجة الاسلامية لاشكاليات المواطنة: رؤية تحليلية معاصرة، عراق، جامعه كربلاء كلية القانون، ۲۰۰۹ء

[2] نزيه نصيف ايوبي "العرب ومشكلة الدولة"۔

[3] سيف الدين عبد الفتاح، ''مقدمات أساسية حول عملية بناء المفاهيم''، ڈاکٹر علی جمعہ، ڈاکٹر سیف الدین عبد الفتاح (نگرانی) بناء المفاهيم دراسة معرفية ونماذج تطبيقية، المعهد العالمي للفكر الاسلامي، طبع اول ۱۹۹۸ء، ۱/۲۷۔

جاسکے، تمام چیلنجس کا مقابلہ کرنے اور پالیسیز کو تشکیل دینے کے لئے امت کے متفق علیہ امور کے دائرہ میں امت کے اندر اتحاد پیدا کرنا نہایت ضروری ہے، امت کے درمیان انسانی وقومی بنیاد پر اتحاد قائم کرنے کا یہ کلی اصول ریاست کے نظام کو مستحکم کرنے کی ایک بنیاد ہے۔

شہریت کو معاصر اتحاد کا ایک اہم عنصر شمار کیا جاتا ہے، سسٹامینک اجتہاد جو طرز اجتہاد وجود میں لاتا ہے وہ شہریت کو ایک ایسے اجتہاد کے تحت لاتا ہے جو اتحاد، قومی معاشرہ، معاشرتی ہم آہنگی اور معاشرہ کو قابل اتحاد امور کے سلسلے میں متحد کرنے کی کوششوں کے سلسلے میں شہریت کو استعمال کرتا ہے۔

کلی وجزوی اور اصل وفرع کے درمیان تعلق قائم کرنا ایسے منہجی عمل ہیں جو جزوی کو کلی کے تحت رکھتے ہیں، اور اصل وفرع کے درمیان ربط قائم کرتے ہیں۔

فروع وجزئیات سے اعتنا اس طرح نہیں ہونا چاہئے کہ کلیات سے صرف نظر ہو جائے یا اصل میں نقص یا اس کا بطلان لازم آئے، کہ کلیات جزئیات پر حاکم ہیں اور فروع اصول سے وابستہ ہیں، یعنی اصول حاکم ہیں...... لیکن تفصیلات کی حیثیت واجب کے مقدمات یا نتیجہ تک پہنچانے والے طریقوں کی ہے۔

اس طرح ہم اس اجتہاد پر غور کرسکتے ہیں جسے ہم منہجی اجتہاد کا نام دیتے ہیں، "ولکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا" (سورۂ مائدہ: ۴۸) منہج، منہاج، اور منہاجیت ایک عظیم کام ہے، اور اس کا مقاصدی اجتہاد سے ربط لازم ہے، کہ ہر مقصد اور ہدف کے حصول کا ایک طریقہ اور راستہ ہوتا ہے، "وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعو السبل فتفرق بکم عن سبیلہ" (سورۂ انعام: ۱۵۳) (یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس اس کا اتباع کرو، اور دیگر راستوں کا اتباع نہ کرو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹادیں گے)۔

ہمیں اس اجتہادی نظام کی سب سے زیادہ ضرورت اپنی زندگی ومعاصر دنیا کے ان پہلوؤں اور دائروں سے واقفیت کے سلسلے میں ہے: اشخاص، افکار، اشیاء، واقعات، رموز، سسٹمس، تصورات، مہارتیں، نمونے، طرز ہائے عمل، پیش قدمیاں، ادراکات، چیلنجس، جوابات، پالیسیاں، تہذیبی تشکیل، تہذیبی ڈھانچے، ثقافت اور عقل وفکر کے گوشے، ترقی، عزم، ذمہ داری کی ادائیگی، تیاری، خوش حالی وتنگ دستی، طاقت وکمزوری نیز غلبہ ومغلوبیت کے درمیان مشترکہ پہلو، تعلقات، پالیسیاں، ادارے، متبادل موقف، احکام، نظریات، اقدار، اخلاق، مناہج، منظم غور وفکر، سیاست، معیشت، سماجیات، تربیت، ثقافت وفکر کے مختلف میدان، افراد، معاشرتی ڈھانچہ وفکر وتحریک۔

ان مذکورہ بالا امور سے اجتہاد سے وابستہ امور اور وہ تجدیدی اعمال مربوط ہوتے ہیں جو تہذیبی عمرانیات کی ترغیب دیتے ہیں، نیز یہ امور بھی متعلق ہوتے ہیں: اسباب ومسببات، وسائل، ذرائع، قواعد، ادارے، وسائط، رکاوٹیں، آسان بنانے والے امور، بین الاقوامی نظام، بین الاقوامی تعلقات، سیاسی نظام، داخل وخارج، شرکت، قانونیت، قیادت اجتماعی تحریکوں، سیاسی طاقتوں اور شہریت سے متعلق کارروائیاں، تاریخی، نفسیاتی اور فکری نمونے۔

یہ متنوع، پیچیدہ اور تغیر پذیر امور ہیں، کیا ہم ان تمام امور کو معتبر مان کر ان کی حقیقت، نوعیت، ان کے ارتقاء ان کے اثرات، انجام اور مستقبل کو سمجھیں گے، یہ تمام عناصر ان اسٹریٹیجک نظریات کے تحت آتے ہیں جو ہمیں مقاصدی اجتہاد تک پہنچاتے ہیں، یہ مقاصدی اجتہاد عمرانی، اسٹریٹیجک اور تہذیبی فقہ کے اصولوں کے تحت تہذیبی واسٹریٹیجک تعمیر کی ضروریات ہیں، یہ فقہ قومی ریاست اور عالمی سیاست کے منظرنامے میں امت کو متحد کرے گی اور اسے انتشار سے محفوظ رکھے گی[۱]۔

۲- شہریت کے مطالعہ کے لئے ایک محفوظ منہج ہے:

سیاق کے نظریہ اور شرعی احکام پر اس کے اثرات کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ ضرور جاننا چاہئے کہ سیاق کا اجتہادی عمل کی ایک اہم شرط ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ سیاق سے مراد صرف عبارت سے مراد وہ اسلوبی سیاق نہیں ہے جو لغوی واسلوبی سیاقوں کے تحت کسی عبارت کے علمی فہم کے اصولوں سے عبارت ہے، سیاق اس سے بہت زیادہ وسیع تصور ہے، یہ حالات ووسائل اور ان کے تمام دروبست سے متعلق سیاقوں سے عبارت ہے، اسی لئے سیاق اپنی دلالت کے تحت کلی واقعات سے متعلق فقہ پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے۔ اسی لئے ہم اس تصور سیاق پر توجہ مبذول کرتے ہیں جسے ہم مقاصدی اصولوں کے سیاق کہہ سکتے ہیں، یہ تصور باہم مربوط مفردات کو منظم کرکے نظریہ سیاق کو مکمل کرتا ہے، اور ایسے متعدد سیاق تشکیل دیتا ہے جو باہم معاون ہوتے ہیں اور متعدد عناصر کی وضاحت کرتے ہیں، ان کے علاوہ کچھ اور سیاقوں کو تہذیبی فقہ کے اصولوں کے سیاقوں کا نظام تشکیل دیتا ہے، پھر یہ تمام سیاق مل کر تین عناصر کو وجود بخشتے ہیں، یہ عناصر اعتنا وتوجہ کے اس مثلث کو وجود میں لاتے ہیں جو سیاقوں کے نظریہ کو روبہ عمل لاتے ہیں، اور پیہم عمل کے ذریعہ ان کے ضامن ہوتے ہیں، یہ مثلث تین

---

[۱] سیف عبد الفتاح، ہندسۃ الاجتہاد المقاصدی، حوالہ بالا۔

کاموں پر توجہ دیتا ہے:

۱۔تاصیل، ۲۔تفعیل، ۳۔تشغیل۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان تینوں کاموں کے درمیان ربط نظریہ سیاق کے وسیع ہونے سے پیدا ہوتا ہے، یہ نظریہ ان کاموں کے ذریعہ ایسے باہم معاون سیاق وجود میں لاتا ہے جو ایک دوسرے کا سبب بن کر ایک ایسا معیار بناتے ہیں جو علم وآگہی کے عناصر اور محنت وکاوش کے مقاصد تشکیل دیتے ہیں، یہ عناصر ومقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔سیاق محل سے متعلق، ۲۔سیاقِ ترجیح سے متعلق، ۳۔سیاق حفاظت سے متعلق، ۴۔سیاق معیارات سے متعلق، ۵۔سیاق مناط سے متعلق، ۶۔سیاق حال واعتدال سے متعلق، ۷۔سیاق انجام سے متعلق، ۸۔سیاق وسائل سے متعلق۔

یہ سات محکم عناصرِ علم ومقاصدِ کاوش ہیں، جو مذکورہ بالا باہم معاون سیاقوں سے وجود میں آتے ہیں، اور ان میں شریعت ایک سیاق میں اور ایک سطح پر ایک اکائی کی صورت میں نظر آتی ہے، یہ فقہ کے معانی کی تاصیل کرتے ہیں، اور مناط عمل کا پتہ دیتے ہیں۔

ان آٹھ امور کی دریافت شریعت کے درمیان وصل اصل سے ہوتی ہے، اس لئے کہ شریعت اپنے علمی ڈھانچہ کے اعتبار سے حکمت، اقداری نظام کے اعتبار سے عدل، اپنے سلوکی نظام کے اعتبار سے رحمت، اور ایسی مصلحت ہے جو مقاصد وغایات کے نظام کو مؤکد کرتی ہے، اس طرح شریعت ان کلیات کے ذریعہ سیاق کے اعتبار اور اس کی رعایت کو لازمی بناتی ہے[1]۔

اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی احکام کے نفاذ کے لئے ایک دوسرے مختلف منہج کی ضرورت ہے، جو ایک ایسی تطبیقی فقہ پر مبنی ہو جس کا ہدف صرف دین کے حقائق پر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس کی تشریح کرنا نہیں ہو، بلکہ اس کا ہدف ان حقائق کے لئے راہ ہموار کرنا ہو، تاکہ یہ لوگوں کی زندگی میں جاری نظر آئیں۔

۳۔تصور شہریت کی تشکیل، اسلامی نقطۂ نظر:

اس عنوان کے تحت ہم بنیادی تصورات کی مختصر تشریح کر کے مقاصد کی روشنی میں ان کے باہمی ربط پر گفتگو کریں گے، یہ تصورات یہ ہیں: مناط (یا علت)، اس کے جیسے دیگر تصورات مثلاً حکمت، مصلحت، قدر، مقصد، نیت، مناطی عمل کا تعارف: تخریج، تحریر، تنقیح، تحقیق، اس مناط کا نص وحکم شرعی سے تعلق۔

پھر ان امور کی وضاحت کی جائے گی: نظریہ مناط اور مقاصد شریعت سے اس کا تعلق، مناط اور حکم کا سیاق سے تعلق، ان سب میں سب سے معتبر وغیر معتبر، ان دونوں کے درمیان پایا جانے والا سیاقِ مرسل، یہاں ہمارا مقصد مناہج ہیں مسائل نہیں، اسی طرح ہمارے مقصود بنیادی تصورات ہی ہیں، اس لئے کہ مناط نص کے دائروں کا مرکز ہے، اس کے بعد جزوی حکم کا نمبر آتا ہے، پھر سب پر حاوی سیاق کا، جو کہ شریعت کی حکمتوں، اس کے مقاصد واقدار، نیز مخلوق کے عام وخاص مصالح سے متعلق ہے، منہج یعنی واضح سیدھا راستہ وہ ہے جسے ان دائروں کے درمیان تعلق کو محکم کرنا چاہئے۔

ہم نے مناط (یا علت) کو الگ مانا ہے، سبب، شرط ومانع کو (بطور وضعی احکام کی بنیادیں) الگ مانا ہے، مقاصد کو الگ مانا ہے، اسی طرح حکمت، مصلحت اور قدر کو بھی جداگانہ حیثیت دی ہے، ایسا ہم نے مطالعہ وتجزیہ کی سہولت، تشریح، ضابطہ بندی اور تمیز کرنے کے پیش نظر کیا ہے، لیکن یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ تمام امور باہم مربوط ہوگئے ہیں، ہاں ایسا عام طور پر فقہی عمل میں ہوا ہے، اصولی مباحث میں کم ہی ایسا ہوا ہے، اس پہلو پر ''اصول فقہ تہذیبی'' کو نگاہ رکھنی چاہئے، یہ علم کلی پر مرکوز رہتا ہے، مسائل کو کلیات کے تحت لانے پر، ان عناصر سے منہجی تاسیس کے طور پر ایک ہمہ گیر منظم نظریہ کی تشکیل پر اور زیادہ گونا گوں خصوصیات کی حامل، نیز عصر حاضر کی پیچیدگیوں پر زیادہ حاوی عقل کی تشکیل پر بطور خاص توجہ دیتا ہے۔

فقہ الواقع کے اس سیاق میں (اور جیسا کہ ہم نے بھی ''واقع'' کی تعریف، زمانی ومکانی اعتبار سے اس کی ہمہ گیری اس کی انفرادی واجتماعی سطحوں، اس کے تمام تہذیبی عناصر، اور مواصلاتی ومعلوماتی انقلاب کے عناصر کی وجہ سے زبردست رابطہ کا تذکرہ کیا) یہ ضروری ہے کہ ہم فقہ الواقع کے اہم مراحل سے واقف ہوں:

فقہ الحال: وہ فقہ جو زمان ومکان کے پیدا کردہ اسباب کی وجہ سے درپیش صورت حال سے متعلق راہ عمل طے کرنے کے عوامل طے کرتی ہے، بین الاقوامی مسائل کی کثرت اور پوری دنیا پر ان کے اثرات کی وجہ سے ان مسائل کی بابت سرگرم کردار فقہ الحال کے ذریعہ ہی ادا کیا جاسکتا ہے، اس پر گفتگو کو ضرورت کے وقت

---

[1] سیف عبدالفتاح، المدخل المقاصدی واعتبارات السیاق۔

کے بعد کے لئے اٹھا کے نہیں رکھا جاسکتا ہے، اس فقہ کو وقت کے اہم ترین فرائض میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

فقہ المجال: داخل وخارج کے درمیان اور "واقع" کے مختلف دائروں کے درمیان رابطہ کے دائرہ میں یہ سب سے وابستہ مرکز ہے۔

فقہ المآل: انجام (مآل) کا اعتبار ان شرعی مقصودات میں سے ہے جو تہذیبی عمل کے عناصر کی منصوبہ بندی نیز اس کی بابت غور وفکر اور تدبر کو ضروری قرار دیتے ہیں، اس حوالہ سے "واقع" ایک بے سروپا شی نہیں ہے، بلکہ وہ ایسے تہذیبی افعال کا مجموعہ ہے جس کے اوپر متعدد آثار ونتائج مرتب ہوتے ہیں، فقہ مآل مستقبل کو سامنے رکھ کر کئے جانے والے غور وفکر کا اولین مرحلہ ہے، جو امور کے انجام کی بابت غور وفکر کرنے کے عناصر کو محرک کرتا ہے۔

سیاقِ مآلات: مناطوں کا مطالعہ ایک جانب جزوی حکم سے اور دوسری جانب "واقع" سے متعلق ہے، فقہ واقع سے وصفی وتحریکی طور پر متعلق سیاق ان نہایت اہم عناصر سے متعلق ہوتا ہے جو مآلی سیاقوں سے مربوط ہوتے ہیں، سیاق مآل کا مطلب فعل پر مرتب ہونے والے آثار ونتائج اور افعال کے متوقع نتائج کی بابت تحقیق ہے، یہ تحقیق اس لئے کی جاتی ہے، تاکہ علوم تدبیر کے سیاقوں سے وابستہ اور مستقبل کو پیش نظر رکھ کر ایک موقف بنایا جائے۔

یہ مآلی سیاقات مجتہد کو حکم شرعی وجزوی کے بیان تک محدود نہ رکھ کر اس کے لئے ایسے بنیادی مقدمات تشکیل دیتے ہیں جن پر مآلی غور وفکر مبنی ہوتی ہے، تاکہ مکلف حرج ومشقت میں مبتلا نہ ہو جائے، اس مآلی سیاق کا کام یہ ہے کہ وہ مجتہد کے اجتہادی عمل میں مسلسل حاضر وموجود رہے، اسی طرح یہ سیاق مجتہد کے اندر ایسے علوم مستقبلیہ کو وجود میں لانے کی ضرورت کا احساس پیدا کرتا ہے جو تہذیبی فقہ کے اصولوں کے اندر ایک بنیادی اصول تشکیل دیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسے مجتہد کی ضرورت ہے جو جزوی غور وفکر کے ذریعہ ایک گہری فقہ، تہذیبی غور وفکر کے ذریعہ ایک دقیق فقہ، اور ایک ایسی منظم فقہ کو وجود میں لاسکتا ہو جس میں جزوی عمل کے عناصر تہذیبی عمل کے ساتھ اس تہذیبی فقہ کے کلی اصولوں کے ذریعہ منظم اور مربوط ہوں، یہ تہذیبی فقہ مجتہد کی ذہنیت اور عقلی صلاحیت کو امور بالا کے قابل بناتی ہے۔

یہ کام افراد ومعاشروں کو در پیش چیلنجوں سے متعلق فقہ سے مربوط ہے، یہ فقہ افراد ومعاشروں کے درمیان تربیتی، ثقافتی وتعلیمی سرگرمیوں کے ذریعہ ربط پیدا کرتی ہے۔

یہ فقہ غور وفکر کا ایک ایسا منہج تشکیل دیتی ہے جس کے مضامین اور مقاصد باہم مربوط ہوتے ہیں، یعنی ہم اس کے ذریعہ سیاق اصغر کی حدود سے باہر نکل کر سیاقِ اکبر کو اختیار کر سکتے ہیں، یہ عمل ایک ایسے سیاقی نظام کے تحت ہوتا ہے جو ان کلیات کو متحرک کر کے ان کے درمیان باہمی ربط قائم کرتا رہے گا، تاکہ ان کلیات کے تحت جزئیات بحسن وخوبی آجاتی ہیں۔

یہ مسئلہ صرف منظم اور مربوط طور پر سیاق اکبر کی اہمیت ہی نہیں بتاتا ہے، بلکہ ہمارے نزدیک تصور سیاق ایسا بلند وبالا ہے کہ وہ مجتہد کے اجتہاد کو بیک وقت کلی تہذیبی نقطۂ نظر اور فقہی اجتہادی نقطۂ نظر سے ایک عمیق عمل بناتے ہیں۔

ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے ایک ساتھ جمع ہونے سے ایک ایسا منہج وجود میں آتا ہے جو ان تعلیمی وتربیتی سیاقات سے متعلق بھی ہونا چاہئے، جو قول وعمل میں ہم آہنگی اور منہجی دائروں میں باہمی تعاون کا سبب ہوتے ہیں، یہ منہجی دائرے جزوی وکلی احکام میں اجتہاد کو سرگرم کرتے ہیں، اس پوری گفتگو کا مسلم ریاست کی شہریت سے کیا تعلق؟

۴۔ شہریت کے ایک ایسے تصور کی تشکیل جو قومی واسلامی اتحاد کی حفاظت کرے:

ایسے طریقے اور وسائل استعمال کرنا لازمی ہیں جو امت کے اتحاد کو قائم رکھیں، اس فقہ کی رو سے وسائل تہذیبی وعمرانی فقہ کا ایک ایسا اہم باب ہیں جو دو اہم مقدمات تشکیل دیتے ہیں۔

پہلا مقدمہ چیلنجس کا مقابلہ کرنے سے متعلق ہے، جبکہ دوسرے کا تعلق ایسے وسائل سے ہے جو امت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں، وسائل کی یہ قسم پچھلی قسم کے ساتھ مل کر امت کے لئے خیر کا باعث ہوتے ہیں۔

جن وسائل سے اعتنا لازمی ہے، ہم انہیں امت کی ترقی وبیداری کے منصوبہ کے تحت تین باہم مربوط ومعاون قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلی قسم منہجی وعملی وسائل سے عبارت ہے۔

دوسری قسم کا تعلق ان بنیادی امور سے ہے جو اس اتحاد کو مفاسد سے محفوظ رکھ کر مصالح سے بہرہ ور کر سکتے ہیں۔

وسائل کی تیسری قسم کا تعلق امت کے ذریعہ اپنی جزوی پالیسیز اور اپنے کلی منصوبوں کی بتدریج تنفیذ کی بابت امت کی صلاحیت سے ہے، اس کے ذریعہ جزوی وکلی کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتے ہیں، اور ایسے اصول تشکیل پاتے ہیں جو فقہ الحال اور فقہ المجال سے متعلق اصولوں کو مربوط طریقہ ہائے کار کے طور پر وجود میں لاتے ہیں۔

باہم معاون صلاحیتوں اور موقفوں کی تشکیل کے لئے کوشش کرنا یا پالیسی بنانا امت کو درپیش چیلنجس کے صحیح طور پر جواب دینے کا ایک مقدمہ ہے، اسی لئے فنون اختلاف واتحاد کی یکساں تربیت کے سلسلہ میں ثقافتی وتربیتی عمل نہایت اہم ہے، اس لئے کہ اس طرح یہ فنون امت کو باہمی اختلاف سے نجات دلا کر جمع مصالح کی راہ پر ڈال دیتے ہیں، "تعمیر مصالح" ان مشترکہ اہم اہداف میں سے ایک ہے جن کا ثقافتی، تربیتی، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی بنیادوں پر مبنی ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں ایک سرگرم تجدید وجود میں آتی ہے، اور امت کے لئے خیر، ترقی اور بیداری کا سبب بنتی ہے۔

تصور شہریت کی اصول سازی اور اس کو سرگرم کرنے کی تمام ترکاوشیں ایک ایسے اسٹریٹیجک تصور کے تحت ہونی چاہئے جو امت کے اتحاد اور اس کے سرگرم کردار کو یقینی بنائے، اسے ان صفات سے متصف کرے جو امت کی بیداری میں معاون ہوں، اسے عمرانی کاموں کے قابل بنائیں، جو مشترکہ مصالح کو اس کام کے لئے اس طرح متحرک کرے کہ جیسے یہ زمانہ کی ایک بڑی ضرورت ہے، اور اس کی تکمیل میں تمام ثوابت وکلیات کا التزام کیا جائے، ان ہی امور کی وجہ سے دینی خطاب کی بنیاد اور اس کے ظاہری ڈھانچے کی تجدید میں کلی اصولوں میں سے مقاصدی اصول کا استعمال ضروری ہے[۱]، بشرطیکہ تجدید کا یہ عمل ایک اسٹریٹیجک مقصد کے حصول کے لئے ہو، مثلاً امت کے اتحاد اور اس کے سرگرم کردار کو یقینی بنانا، اس تہذیبی اسٹریٹیجک کردار کی ادائیگی کے لئے وہ اپنے تہذیبی کردار اور مقام کی از سر نو تشکیل کرے، اس سیاق کے تحت شہریت ایک مرجع، ایک دافع، ایک نقطۂ اتحاد اور ایک تجدیدی عمل ہے۔

۵۔ مرجعیت کی تعریف اور شہریت سے اس کا تعلق:

مرجعیت سے مراد وہ عام ثقافتی وفکری اصول ہیں جن کے قائل تمام فرزندان وطن ہوں، اور جو ایک انسانی جماعت وگروہ کی حیثیت سے ان کے اندر بنیادی صلاحیت اتحاد پیدا کرتے ہیں، یہ وہ ثقافتی اور فکری اصول بھی ہیں جن سے سیاسی جماعتی جیسی عام جماعت یا ان فروعی جماعتوں کے سیاسی واجتماعی ڈھانچے تیار ہوتے ہیں جن سے معاشرہ ترتیب پاتا ہے[۲]۔

انسان عالم کا نظریہ اور مرجعی دائرہ: مرجعی دائرہ ان بنیادی نظریات اور افتراضات کے مجموعہ پر مشتمل ہوتا ہے جو زندگی کی نوعیت، اس کے بنیادی پہلوؤں اور اس کے طریقۂ کار کا پتہ دیتا ہے، ان امور پر انسان یقین رکھتا ہے، یا انہیں مختلف تہذیبی ظواہر کے سلسلے میں مرجع اور مرشد بناتا ہے۔

اسی لئے مرجعی دائرہ انسان کے طریقۂ کار اور ظواہر کی تشریح کرنے والے سلوکی، اقداری، فکری وعلمی نظاموں کی تحدید کرتا ہے، مرجعی دائرہ ہی انسان کو یہ بتاتا ہے کہ تہذیبی ظواہر پر غور وفکر کے سلسلے میں کون چیزیں اہم اور دلالت والی ہیں، اور کن کو اس دلالت واہمیت کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ہمیں مرجعیت کے سلسلے میں وہ گفتگو کرنی چاہئے جو متبادر ہو، لیکن یہ گفتگو ایسی ہونی چاہئے کہ وہ انسان، کائنات اور زندگی، نیز ان سے پیدا ہونے والے تعلقات کا مکمل نظریہ سامنے لائے۔

مرجعی جماعت امت کو "خیریت" کا وصف، "وسطیت" کا منہج اور "شہادت" کا منصب وکردار دیتی ہے، یہ دیگر فرعی مرجعی جماعات کے منافی نہیں ہے اور نہ ان کی نفی کرتی ہے، بلکہ انہیں پوری امت کے نظام میں مناسب مقام دیتی ہے، اور اس کے بنیادی عناصر "خیریت" "وسطیت" اور "شہادت" سے متعلق کرتی ہے، مرجعی دلائل کا نظام ان مراجع ومصادر میں شامل ہے جن سے اس طور پر استفادہ لازمی ہے کہ نہ ان پر اکتفا کیا جائے اور نہ ان سے صرف نظر کیا جائے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ یہ تمام مصادر اپنے اس اہم ترین وصف کے حصول کے لئے کوشاں رہیں جو تقابل کے دائرہ میں اپنے غیر محدود سیاق سے متعلق ہوتے ہیں، اسی طرح وہ اعمال لازمی ہیں جو علم نافع کے عناصر اور معانی حکمت کے درمیان تمام سیاقوں میں تعلقات کو محکم کریں۔

---

[۱] سیف الدین عبد الفتاح، تجدید الخطاب الدینی من الحملۃ الفرنسیۃ إلی الحملۃ الأمریکیۃ۔

[۲] طارق بشری، الوضع القانونی بین الشریعۃ الإسلامیۃ والقانون الوضعی، قاہرہ: دار الشروق، طبع دوم، ۲۰۰۵، ص: ۱۴۰۔

یعنی اجرائی ترجمہ کے عناصر کے مطابق ادراک، اقدار، سلوک ومصالح کے نظاموں کا مرجع ہونے کے اعتبار سے مرجعیت ایک ہمہ گیر اور سرگرم فکر کی تعبیر ہے۔

اسی لئے مرجعیت کے وہ عناصر جو تاسیسی نظریات اور واقع ومرجعی وطنی جماعت کے اعتبارات نظام عام کے قواعد واصولوں، نیز زبان، رموز اور تمام ثقافتی عناصر کے تشکیل کردہ ثقافتی سیاقوں کے جامع ہوتے ہیں وہ ایک ایسی عمارت کے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس مرجعیت کے اصول اس وقت تشکیل دیتی ہے، جب یہ عناصر ہم آہنگ ومعاون ہوتے ہیں، یہ ستون اپنی شکل وصورت اور اپنے نتائج کے اعتبار سے گوناگوں ہوتے ہیں، لیکن ان ستونوں کے ذریعہ ہی انسان کی تہذیبی وعمرانی عمارت کی چھت بلند وبالا ہوتی ہے۔

یہ ستون اگر چہ اپنے ظاہر اور اپنی بنیاد کے اعتبار سے مختلف وگوناگوں ہوتے ہیں، لیکن اپنی حقیقت اپنے جوہر اور پانے کردار کے اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں، افراد امت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امت کے اس اختلاف کو رحمت کا وہ اختلاف بنادیں جو عظیم وصحت مند تہذیبی وجود کے عناصر تشکیل دیتا ہے۔

۶۔ شریعت اسلامی اور شہریت...... وطنی جماعت کی تاسیس کی کوشش:

شریعت وشہریت کے درمیان تعلق کا مسئلہ مرکب مسائل میں شمار ہوتا ہے، ایسا ان دونوں کے ایک سطح پر جمع ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ اس اعتبار سے ہے جس میں شریعت وشہریت کے مسئلہ پر وہ بوجھ ڈالا جاتا ہے، جو اس کے بس کا نہیں ہوتا ہے، اس کے نتیجہ میں اس تعلق کی حقیقت کو ایسے نظریات کے ضمن میں تصور کیا جاتا ہے جو شریعت وشہریت کے درمیان تصادم مانتے ہیں، حالانکہ شریعت کا مسئلہ مرجعیت کے دائرہ اور عام نظام سے متعلق قواعد سے وابستہ ہے، جبکہ شہریت کا مسئلہ اس مرجعیت کی بنیادوں سے مربوط ہے جو اس واقعہ سے متعلق ہے جو تمام شہریوں کو ایک وطن اور ایک جیسی شہریت کی لڑی میں پرو دیتا ہے، یہ مرجعیت حقوق وذمہ داریوں میں عام مساوات کے قاعدہ کے تحت باہمی تعلق کے اصول ترتیب دیتی ہے۔

باہمی الفت، منافست اور تصادم کے دائروں میں شہریت وشریعت کے درمیان تعلق پر غور وفکر کے منہج کی تعیین کریں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ شریعت وشہریت دونوں ہم آہنگ ہیں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ سیاسی عمل ان دونوں پر مشتمل نہیں ہے، اور ان دونوں کے الگ الگ میدان ہیں، جبکہ تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ شریعت وشہریت دو بالکل جدا جدا چیزیں ہیں، چوتھا فریق کہتا ہے کہ شریعت وشہریت باہم متصادم ہیں، یہ درحقیقت استبدادی نظام کے ذریعہ امت کے مختلف حلقوں کے درمیان اخلافات پیدا کرنے اور اس اختلاف کو اپنے استبدادی مصالح کے لئے استعمال کرنے کی پالیسی کا نتیجہ ہے، اختلافات پیدا کرنا اور تصادموں کو مدد پہنچانا سیاسی استبدادی کی ایک سوچی سمجھی پالیسی ہے، جس کے ذریعہ وہ شہریوں، اور لوگوں کو درپیش ان حقیقی مسائل سے توجہ دیتا ہے جو ان کے حقوق سے متعلق ہوتے ہیں۔

شریعت سے متعلق بنیادی مبادیات کو اس عام وکلی نقطۂ نظر کے تحت ہی جانا جاسکتا ہے جو سب سے پہلے شریعت کے عام کلی مقاصد سے مربوط ہو اور دین (شریعت) وسیاست (شہریت) کے درمیان، نیز شریعت کے مبادی اور شہریت کی سیاسی جماعت (وطن کے تمام شہریوں) کے درمیان تعلق کی نوعیت واضح کرے، یہ نظریہ حقیقتوں اور ملمع سازیوں کے درمیان امتیاز کرتا ہے، اس کے مختلف پہلو اور رجحانات ہوتے ہیں، جن میں بہت سے احکام پائے جاتے ہیں، متعدد تعمیمات پائی جاتی ہیں، ان احکام وتعمیمات پر نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ دینی امور کا سیاسی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، انسانی سماجیات کے سلسلے میں حقیقی وجوہری دینی تاثیر اور دین کو سیاسی رنگ دینے کے درمیان خلط ملط کرنا، شریعت پر عمل فرض ہے، یا اسے درکنار کردینا چاہئے، اقلیت اور گروہ بندیاں شریعت کی نظر میں، دستور: میدان کی یکسانیت، وسائل کی کشمکش اور تصور موازنہ۔

یہ تمام مسائل (بالخصوص اپنے غیر منظم ہونے اور اپنی غلط نمائندگی کئے جانے کی صورت میں) عام سیاق میں منفی تضمینوں سے دوچار ہیں، جو ان جیسے بہت سے خیالات کا باعث بنتی ہیں، یہ سیاق ان امور کے سیاق میں ایجابی یا سلبی طور پر مؤثر ہوتا ہے جو وطنی جماعت اس کے اندر اتحاد کا سبب بننے والے اوامر اور اس کا شیرازہ منتشر کرنے والے امور پر غور وفکر میں معاون ہوتے ہیں، یہ ایک ایسا تاریخی سیاق وجود میں لاتا ہے جس پر غور وفکر کرنا اور جس کو نہایت باریک بینی، حساسیت اور زیرکی کے ساتھ برتنا لازمی ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس میڈیا کے سیاق اور اس رائج زبان کو بھی قابل اعتنا مانا جائے جس پر تہذیب مشتمل ہوتی ہے، اسی طرح ان تربیتی وتہذیبی اصولوں کے سیاق پر غور کرنا بھی ضروری ہے جو وطنی جماعت کی تاسیس اور اس کے فہم ونظریہ کی تشکیل کی شرطیں وجود میں لانے والے اس عمل سے متعلق ہوتے ہیں۔

اس مسئلہ سے اعتنا کرنے والے کچھ لوگوں نے فرقہ پرستی کا ایک ایسا علاج تجویز کیا ہے جو اس مسئلہ کے رائج پرامن علاج سے کم خطرناک نہیں ہے، ابھی

تک فرقہ پرستی کے فتنہ کے حل کے لئے یہ پرامن علاج ہی پایا جاتا تھا،لیکن اب کچھ لوگوں نے ایک پرفتن حل تجویز کیا ہے،جو مزید اشتعال کا سبب بنتا ہے،اسی لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم امور کو ان کے حقیقی مقامات پر ہی رکھیں، دین میں بے جا دخل اندازی نہ کریں، مدد کے لئے اس طرح نہ اپیل کریں کہ جیسے ہم مذہب کی وجہ سے ادھر ادھر ہونے والی حق تلفیوں پر واویلا کر رہے ہوں، بہت سے مسائل وحادثات کا حل اس طرح ڈھونڈھا جانے لگا ہے جسے ہم پرفتن حل کہہ سکتے ہیں، یہ حل سماجی ومعاشی تعلقات کے دائرہ سے متعلق ہوسکتا ہے، اس میں دین کو کم مدتی راہ عمل کے ذریعہ داخل کیا جاتا ہے[1]۔

۷۔ قانون بنیاد عام نظام کے اصول اور عام میدان:

عام نظام کا تصور علم قانون کے اساسی افکار میں سے ایک ہے،لیکن یہ ایک خالص قانونی تصور نہیں ہے، کہ علم قانون نے ہی اسے وجود بخشا ہو، اور اس میں ہی وہ منحصر ہو، بلکہ علم قانون کے علاوہ دوسرے انسانی علوم میں بھی وہ ہمیں ملتا ہے، علم قانون، علوم سیاسات، سماجیات ومعاشیات کے مشترکہ دائرہ میں یہ تصور محسوس ہوتا ہے، یعنی یہ تصور ان علوم کے معاشرہ وریاست کے اندر ایک قوتِ تاثیر ہونے کے ان کے باہمی ربط کی ایک کڑی ہے، عام نظام کے معاصر تصور کی تشریح کی جاتی ہے: وہ ''کسی بھی سماجی نظام کو ان امور سے محفوظ رکھنے کا سامان ہے جو اس کی بنیادوں کے لئے خطرہ ہوں، نیز وہ معاشرہ کے ذریعہ اپنے اہداف کے حصول کی کاوش کا ایک ذریعہ قانون بھی ہے''۔

یہ بات تو یقینی ہے کہ نظام عام کا تصور مغربی تصور قانون کی پیداوار ہے،لیکن اس کے کردار اور اس کے مضمون پر غور وفکر سے اسے مختلف پہلو واضح ہوجاتے ہیں، معاشرہ کی بنیادی اقدار اس کی عقائدی مرجعیت، اور اس کی نظریاتی بنیادوں (جنہیں اصول وکلیات کے نام سے جانا جاتا ہے، اور جن پر کوئی معاشرہ اپنے راہ عمل کی بنیاد رکھتا ہے) کی حفاظت کی ذمہ داری کا کام شریعت اسلامی کے تصورات ونظریات بھی کرتے ہیں۔

عام میدان اور قبطیوں کا مسئلہ: دینی اداروں کے غلبہ سے ایک سوال اٹھتا ہے:

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی ادارے سیکولر نظریہ کے تحت عام میدان سے مکمل طور پر دور رہیں، معاملہ ایسا نہیں ہے، بہت سے دینی اداروں (یہاں تک کہ مغرب میں بھی) عام میدان (چہ جائیکہ سیاسی میدان میں) دخل رکھنے والی یونٹس بنائی ہے، مثلاً پولینڈ اور لاطینی امریکا کا کلید، یعنی مسئلہ ان اداروں کے عام میدان میں براہ راست طریقہ پر دخل اندازی کا نہیں ہے کہ کلیسا بھی دیگر اداروں کی طرح عام میدان اور عام خطاب سے لازماً مربوط ہوجائے اس سب سے واضح نمونہ کلیسا کے شعبوں کے بارے میں بار بار گفتگو ہونا اور فرقہ وارانہ فسادات کو سیاسی رنگ دینے کی کوششیں ہیں۔ اسی وقت یہ بھی ہوا کہ ریاست نے عام میدان سے متعلق ایک گوشہ سے دستبرداری اختیار کرلی، اس کی وجہ سے ایک خلا پیدا ہوا، اور چونکہ یہ معاملہ ایک ایسے نقطۂ نظر سے متعلق تھا جو قبطیوں کو ایک فرقہ یا اقلیت کی صورت میں دیکھتا تھا، اس لئے بعض اداروں نے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔

اس مسئلہ کے سلسلے میں غور وفکر کے جدا جدا اسلوب پائے جاتے ہیں، نیز خود عام میدان کی بابت بھی طرح طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں، اس لئے کہ عام میدان کی بابت متعدد طبقات کے درمیان اختلاف رہا ہے، کلیسا بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔

اس سیاق میں دیکھئے تو مصر میں قبطیوں کی سرگرمیاں اس پس منظر سے ہی متعلق ہیں، مگر چند سوالات واضح جواب کے منتظر ہیں، یہ سوالات بار ہا پیش کئے جاتے ہیں یا ان کی بابت سکوت اختیار کیا جاتا ہے، ہمیں ان سوالات کی بابت ایسا شفاف رویہ اختیار کرنا چاہئے، جو امت کے سماجی تانے بانے کے عناصر کے درمیان تعلق کی حقیقت واضح کرتے، ایسا مرجعیت کی بابت مندرجہ ذیل دو اصولوں کے تحت ہی ہوسکتا ہے، ان سے واقف ہونا ضروری ہے:

وطنی جماعت کی مرجعیت اور عام نظام کے وہ قواعد جو اسلامی تہذیب کو ایک محکم اصول بناتے ہیں۔ (عام تہذیب اور متنوع فرعی تہذیبوں کا اعتراف)۔

سیاسی عمل عام معاملہ، نیز حقوق وواجبات کے مسائل کی بابت شہریت کی مرجعیت، جو پورے وطن میں قومیت پیدا کرے۔

۸۔ ریاست کا قیام اور دستور مدینہ: مسلم ملک میں شہریت:

میثاق مدینہ میں واضح طور پر مدینہ میں قائم ہونے والی جدید اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اسلام کو بتایا گیا ہے، اس دستاویز میں قبائلی رابطہ کی جگہ دینی رابطہ کو دی گئی ہے، اسی لئے مسلمانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ: ''دیگر لوگوں سے ممتاز ایک امت ہیں'' (۲/۴) اس عبارت نے تمام مسلمانوں کو ان

---

[1] طارق بشری، المسلمون والأقباط في إطار الجماعة الوطنية، قاهرہ: دار الشروق، طبع دوم، ۱۹۸۸ء، ص: ۵۔

کے قبیلوں اور خاندانوں سے صرف نظر کر کے ایک امت بتایا گیا ہے، عربوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ ایک بالکل نایاب معاملہ تھا، اس سے پہلے تک لوگ رشتہ ونسب کی بنیاد پر ہی جمع ہوتے تھے۔

مسلمانوں کی شہریت مدینہ میں مقیم مسلمانوں (وہاں کے اصل باشندوں اور مہاجرین) تک ہی محدود تھی، دوسرے اس میں داخل نہ تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا: ''والذین آمنوا ولم یهاجروا مالکم من ولایتهم من شیء حتی یهاجروا وإن استنصروا کم فی الدین فعلیکم النصر الا علیٰ قوم بینکم وبینهم میثاق'' (انفال: ۷۲) (جو لوگ ایمان تو لے آئے، مگر ہجرت کر کے نہ آجائیں، وہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جن سے تمہارا معاہدہ ہو)۔

پہلی اسلامی ریاست میں شہریت صرف مسلمانوں کے لئے نہ تھی، بلکہ اس میثاق نے وضاحت کی ہے کہ مدینہ میں مقیم یہودی بھی ریاست کے شہری ہیں، اس میثاق میں ان کے حقوق وواجبات بھی متعین کیے گئے ہیں، مثلاً اس کی دفعہ ۲۵ / میں لکھا گیا ہے کہ بنوعوف کے یہودی امت کے ساتھ ایک قوم ہیں، یہودیوں کو اپنے دین کی آزادی ہوگی اور مسلمانوں کا اپنا دین ہوگا، ہاں ظالم کا معاملہ دیگر ہے''۔ یہ بات صرف بنوعوف کے یہودیوں تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ دفعہ ۲۶ / سے لے کر دفعہ ۳۶ / تک کے متن میں دیگر قبیلوں کے یہودیوں کے لئے بنی عوف کے یہودیوں والے حقوق ہی بیان کئے گئے ہیں، بلکہ اس میثاق کی بعض عبارتیں مدینہ کے مشرکین کی ذمہ داریاں بتاتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی نئی ریاست کی حکومت میں داخل ہیں، اور میثاق میں مذکورہ اس کے نظام کی بنیادوں کے پابند ہیں۔ اس طرح کی واضح ترین عبارت فقرہ (۲۰ ب) ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ: ''شرک کسی قریشی کے مال یا اس کے نفس کو پناہ نہیں دے گا، اور کسی مومن کو قریش کے مال ونفس سے نہیں روکے گا''۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ریاست کے قیام کے وقت سے ہی ہم وطنی کے رشتہ نے یہودیوں اور مشرکین کو حق شہریت دیا تھا، اور ان کے لئے ان تمام حقوق سے بہرہ ور ہونے کی ضمانت دی تھی جن کا تذکرہ اس میثاق میں تھا۔

اس کے بعد قرآن وحدیث میں اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے احکام بیان کئے گئے، اہل ذمہ کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں نے اور تمام ابواب فقہ پر مشتمل کتابوں نے اہل ذمہ کے عنوان کے تحت ان احکام کو درج کیا، مسلم وغیر مسلم اصحاب قلم کا اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسلام نے اہل ذمہ کے لئے ایک اچھی زندگی کی ذمہ داری لی ہے۔ جس کی بنیاد ان کے ساتھ انصاف، ان کے اور مسلمانوں کے درمیان متعین اسلامی احکام کے مطابق مساوات پر ہے، ان کے ساتھ ہر وہ نرمی اختیار کی جاتی ہے جس سے دین اسلام کے احکام اور اس کے نظام حکومت پر آنچ نہ آئے۔

اسلامی نظام شریعت اسلامی پر قائم نظام ہے، جس کی تفصیلات اجتہاد، استنباط، تفسیر وتاویل کی بابت اس کے قواعد کے مطابق ہیں، اور مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی حکومت کے قیام کے وقت سے ہی غیر مسلم مسلمانوں کے ہم وطن رہے ہیں، بعد کی تمام اسلامی حکومتوں میں بھی ایسا ہی رہا ہے۔

اس سلسلہ میں چند اہم اصول ہیں جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جارہا ہے:

پہلا اصول: قرآنی اور صحیح احادیث کے نصوص شریعت کی بالادستی۔

دوسرا اصول: دار یا ہماری معاصر زبان میں وطن میں شرکت کے تقاضوں کو قبول کرنا۔

تیسرا اصول: انسانی اخوت سے صرف نظر نہ کر کے اس کا اعتبار، اس اخوف کے منافی قول، رائے اور عملی قرآنی وحدیث کے بیان کردہ ایک اصول سے دستبرداری ہے۔

''وہ دیگر لوگوں سے الگ ایک امت ہیں''۔

امت سے مراد یقینی طور پر ایک امتیازی سیاسی جماعت ہے، جس پر ''دیگر لوگوں سے الگ'' سے دلالت ہوتی ہے، یہ امتیاز ایک نئے اصول کی بنیاد پر ہے، جو نہ قبائلی ہے اور نہ خونی رشتہ، یہ ایک عقائدی اصول ہے،...... امت کا اتحاد ایک ثابت شدہ امر ہے، جس کی بابت کسی طرح کا شک کرنا ناممکن ہے اور جس میں خلل ڈالنا حرام ہے، لیکن امت کے متحد رہتے ہوئے بھی سیاسی معاشرہ گوناگوں ہوسکتا ہے، اور ایک ہی امت کے اندر سیاسی معاشرہ کے اعتبار سے ریاست بھی

متعدد ہو سکتی ہیں۔[۱] ...... اسلام ایک ہی ریاست اور نظام حکومت کے تحت ایک سیاسی معاشرہ کے قیام کے تصور کو قبول کرتا ہے، اسلام کی بنیاد پر سب لوگ ریاست کے اندر مکمل شہریت کے حقوق سے بہرہ ور ہوتے ہیں، حکومت کے قیام کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک خالص اسلامی معاشرہ کی ہو[۲]۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچتے ہی اولین اسلامی ریاست کے قیام اور نئے سیاسی تجربہ کا آغاز کیا، آپ کے سامنے ایک ایسا "واقع" تھا جسے مکمل طور پر کسی بھی صورت میں عقیدہ کی بنیاد پر محمول نہیں کیا جا سکتا تھا، یہاں تک کہ جو مسلمان عقیدہ کے اعتبار سے یکساں تھے وہ بھی مکمل طور پر یکساں نہیں تھے، انصار کے پاس زمینیں تھیں، معاشی امکانات تھے، وہ اسی خطہ کے باشندے تھے، جبکہ مہاجرین کا معاملہ دیگر تھا، یہ صورت حال ہی ان کے درمیان مواخات کا باعث ہوئی تھی، تا کہ اس فرق کو دور کیا جاسکے جو نئے تجربہ میں ان کی شمولیت میں مانع تھی، اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس وخزرج کے درمیان اختلافات دور کئے، وہ مسجد بنائی جو ریاست کا مرکز بنی، اس میں نمازیں پڑھی جاتی تھیں اور فیصلے کئے جاتے تھے، پھر آپ نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کرائی، اس بے نظیر اقدام نے تمام مسلمانوں کے احساسات یکساں کر دئے اور انہیں عملی طور پر ایک جسم بنا دیا۔

آپ کے سامنے ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں غیر مسلم مشرکین و یہود بھی آباد تھے، اسی لئے مدینہ میں جس سیاسی نظام کے قیام کا منصوبہ تھا اس کے لئے عقیدہ کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا تھا، کہ دینی اخوت اور عقیدہ کا اشتراک صرف مسلمانوں کے درمیان رابطہ کی بنیاد ہو سکتے ہیں، جبکہ مدینہ میں غیر مسلم بھی تھے، اسی لئے اس تجربہ میں جس سیاسی منصوبہ کا قیام مقصود تھا اس کا تقاضہ تھا کہ اس کے لئے اس سے زیادہ وسیع رابطہ کی بنیاد اختیار کی جائے جو مدینہ کے گونا گوں حالات اور متنوع سماجی وعقائدی پہلوؤں کے اعتبار سے صحیح ہو، ایسا ہی رسول اکرمؐ نے کیا، آپ نے "صحیفہ مدینہ" (میثاق مدینہ) کے نام سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک معاہدہ کیا، آپ یقیناً پہلے ایسے شخص تھے جنہوں نے اس ذمہ دارانہ شہریت کی حقیقی تشریح کی تھی جس کی حدود خود آپ نے ایسی علامتوں کے طور پر وضع کر دی تھیں جو اس کو نقصان پہنچانے والے حکومت اسلام کے دائرہ کے تحت اور اس کی مرجعیت کے تحت ذمہ دار قرار دیتی تھیں، ایسا میثاق مدینہ کے احکام کی مرجعیت کی بنیاد پر تھا، ان احکام کو ہم جدید اصطلاح میں اہالیان مدینہ کے لئے دستوری مرجعیت کہہ سکتے ہیں، اس میثاق میں ۴۷ دفعات ہیں، اور ان پر غور وفکر کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ میثاق شہریت کے اصول کے ساتھ اقداری مشترک امور کی وضاحت کرتا ہے، اس سلسلہ میں تعدد کا اعتراف کیا جاتا ہے، اور مدینہ کے تمام مسلم وغیر مسلم باشندگان کے حقوق وواجبات کا احترام کیا جاتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس معاہدہ میں داخل ہونے والے مسلمانوں اور یہودیوں کو دیگر لوگوں سے الگ ایک "امت" (جماعت) کہا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ اس جماعت کے مابین ایک ایسا معاہدہ ہے جو مدینہ سے باہر کی دیگر جماعتوں سے الگ صرف مدینہ کی جماعت (گروہ) کے لئے خاص ہے، اس کی وضاحت میثاق میں یوں کی گئی ہے: "یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لکھا گیا وہ معاہدہ ہے جو قریش ویثرب کے مسلمانوں اور بعد میں ان میں شامل ہونے والوں اور ان کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے درمیان ہے"۔

میثاق میں مسلم وغیر مسلم اہالیان مدینہ کے درمیان باہمی مدد پر بھی زور دیا گیا ہے، (ملاحظہ ہو دفعہ ۱۶۔ ۳۷) "یہودیوں پر اپنے خرچ کی ذمہ داری ہے، مسلمانوں پر اپنے خرچ کی ذمہ داری ہے، اس میثاق والوں سے کوئی جنگ کرے تو تمام میثاق والوں پر اس کے خلاف مدد کرنا لازمی ہے، ان کے درمیان باہمی تعلق خیر خواہی اور تعاون کا ہوگا بے تعاونی اور بدخواہی کا نہیں، اگر کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ معاہدہ کے خلاف حرکت کرے گا تو مظلوم کی مدد کی جائے گی"۔ میثاق میں متعدد مقامات پر یہ لکھا گیا ہے کہ اختلاف کی صورت میں فیصلہ اللہ ورسول کا ہوگا، (دفعہ ۲۳۔ ۴۲) اس سے قانونی بالادستی کی وضاحت ہوتی ہے۔

امت کی یہ وسیع تعریف سیاسی جماعت کا وہ دائرہ ہے جس کی بنیاد پر مدنی معاشرہ کو اس میثاق کی دفعات میں قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ میثاق مختلف انسانی جماعتوں اور دینوں کے درمیان تعلق کا ایک وسیع دائرہ ہے۔

یہ صورت شہریت کے اس تصور سے ہم آہنگ ہے جو ریاست کے سیاسی معاشرہ کے افراد کے درمیان عضوی تعلق کے نظریہ پر قائم ہے، اور جو لوگوں کی گونا گونی کا تقاضا ہے، یہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان ایک ایسا رابطہ وجود میں لایا جائے جو تمام لوگوں پر حاوی ہو۔

دوسری جانب اس میثاق نے جماعتوں اور افراد کے حقوق منظم کئے ہیں، اس میں لکھا گیا ہے کہ تمام افراد امت جوار دینے کے حق میں یکساں

---

[۱] "آیة الله" مهدی شمس الدین، فی الاجتماع السیاسی الإسلامي، بیروت: المؤسسة الدولية للدراسات والنشر، طبع دوم، ۱۹۹۹ء، ۲۶۳۔ ۲۶۵۔

[۲] ایضاً، ص: ۲۶۶۔

ہیں، اس لئے کہ اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے، ان کا ادنیٰ شخص بھی سب کی طرف سے جوار دے سکتا ہے، لیکن میثاق نے یہ حق مشرکین کو نہیں دیا ہے، اس میں کہا گیا ہے: ''کوئی مشرک قریش کے کسی مال اور کسی شخص کو جوار نہ دے گا اور کسی مسلمان سے اس کی آڑ نہ کرے گا''، ایسا اس لئے تھا کہ مشرکین قریش مسلمانوں کے ساتھ حالات جنگ میں تھے، اس میثاق نے غیر مسلموں کو دین کی آزادی دی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ: ''یہودیوں کا اپنا دین ہوگا، مسلمانوں کا اپنا دین ہوگا'' اس کی بنیاد اس ارشاد خداوندی پر ہے: ''لا إکراہ فی الدین'' (سورۂ بقرہ: ۲۵۶) (دین کے سلسلے میں کوئی جبر نہیں ہے)، رسول اکرمؐ نے بھی اہل یمن کو لکھے گئے اپنے گرامی نامہ میں لکھا تھا کہ: ''یہودیوں اور نصرانیوں کو ان کے دین کی وجہ سے تنگ نہیں کیا جائے گا، ان پر جزیہ عائد ہوگا، انہیں اپنے معبود دونوں کی عبادت کا حق حاصل ہوگا''۔

اسی طرح آپ نے غیر مسلموں کو اپنے مذاہب کے اعتبار سے اپنے ذاتی معاملات (نکاح وطلاق وغیرہ) انجام دینے کی اجازت دی، بلکہ حکومت ان کے لئے ان میں سے ہی ایک قاضی متعین کرتی تھی جو ان کے مقدمات دیکھتا تھا، اشیاء خورد ونوش اور ملبوسات کے سلسلے میں بھی وہ عام نظام کے تحت اپنے دین کے احکام کے مطابق عمل کرتے تھے، انتظام حقوق کی بات کریں تو مملکت کی تمام رعایا یکساں حق رکھتی تھی، ہاں دینی مناصب کا معاملہ مختلف تھا، ہر باصلاحیت مرد وزن کو (خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم) شعبہ کا ذمہ دار یا رکن ہونے کا حق حاصل تھا، اسلامی مملکت کی شہریت رکھنے والا ہر شخص (خواہ وہ کسی دین ونسل سے تعلق رکھتا ہو) مجلس شوریٰ کا رکن ہوسکتا تھا، مسلم فقرا کی طرح حکومت غیر مسلم فقرا پر بھی خرچ کرتی تھی، انہیں مسلمانوں کی طرح باعزت زندگی گزارنے کا موقع دیتی تھی، مسلمانوں کی طرح کرسکتا تھا، بے مصرف زمینوں کو بامصرف بنا سکتا تھا، ان کی شخصی عزت کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری تھی۔

خاص قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میثاق مدینہ نے حقوق کو عطیہ خداوندی مانا تھا کہ کوئی انہیں فوت نہیں کرسکتا، اس میثاق نے ایک ذمہ دار اور بامقصد زندگی کو وجود میں لانے کے لئے حقوق وواجبات کو ایک دوسرے سے بدرجۂ کمال متعلق کردیا تھا، حقوق انسانی کو تقدس دیتے ہوئے ظلم، فساد اور سرکشی کے خلاف تعاون اور کمزوری کی حمایت پر زور دیا تھا، کسی فریق کو کوئی خاص امتیاز نہیں دیا تھا، اور تمام انسانوں کے درمیان ایمان، انصاف، مساوات وتعاون کا رشتہ محکم کیا تھا۔

اسلامی نصوص نے جس طرح جزائی ذمہ داری کو ہر مسلم فرد کے ساتھ خاص کیا تھا، اسی طرح یہ قاعدہ غیر مسلموں سے بھی متعلق تھا، میثاق میں کہا گیا ہے: ''جو ظلم کرے گا اس کی سزا اسے ہی دی جائے گی۔ میثاق نے غیر مسلموں (بالخصوص یہودیوں) کی ذمہ داریاں واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ قریش اور ان کے معاونین کو جوار نہیں دے سکتے ہیں، ان کی ایک ذمہ داری یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہو تو وہ اس کے خلاف مسلمانوں کی مدد کریں گے، اسی طرح اس جغرافیائی حدود کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ جس کے اندر جرم کرنے پر کسی سے مواخذہ ہوگا (دفعہ ۳۹-۴۴) ان عبارتوں کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنی حکومت کے ماتحت رہنے والے تمام افراد کو گروہ وقبیلہ سے صرف نظر کرکے ایک اکائی مانتا ہے، اسلام کسی کو اقلیت نہیں مانتا، انسانی بنیاد پر تمام شہری یکساں ہیں، ریاست کی شہریت رکھنے والے تمام لوگ (مسلمان ہوں کہ غیر مسلم) شریعت کے مقرر کردہ تمام حقوق سے بہرہ ور ہوں گے، تمام رعایا پر اسلام بطور قانون نافذ ہوگا، مثلاً معاملات وسزاؤں کے احکام کے نفاذ کے وقت قانونی پہلو پر نظر کی جائے گی، دینی وروحانی پہلو پر نہیں۔

میثاق مدینہ کو ایسی پہلی قانونی دستاویز مانا جاتا ہے جس نے سیاسی جماعت کے افراد کے درمیان تعلق کو منظم کیا، اور دینی ونسلی اختلاف سے صرف نظر حقوق وواجبات کو یقینی بنایا، اس کو اپنے زمانہ کا ایک ممتاز شہریت کا عقد مانا جاتا ہے، جو کہ سربراہ ریاست، ان کے مسلمان ساتھیوں اور غیر مسلم اہالیان مدینہ کے درمیان ہوا تھا[1]۔

۹۔ شہریت (المواطنۃ)[2]: اصطلاح لغوی، ثقافتی، تاریخی اور فکری پس منظر میں:

کچھ ماہرین لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ اپنے جدید اصطلاحی معنیٰ پر کسی طرح کی دلالت نہیں کرتا ہے، اس لئے کہ ''واطن'' کے لغوی معنی صرف موافقت کے ہیں، جبکہ بعض دیگر معاصرین کے خیال میں جدید اصطلاحی معنی کی قریبی دلالت ممکن ہے، یعنی ''مواطنہ'' کے لفظ کو ایک وطن میں ایک ساتھ رہنے کے معنی میں مانا جائے، اسے فعل ''واطن'' سے مستقل مانا جائے، فعل ''وطن'' سے نہیں۔

یہ اصطلاح citizenship کا انگریزی مترادف ہے، جس کے معنی انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں یہ بتائے گئے ہیں: ''فرد وریاست کے درمیان ریاست کے قانون کی روشنی میں تعلق، یہ تعلق ریاست میں باہمی حقوق وذمہ داریوں پر اس طرح مشتمل ہوتا ہے کہ یہ فرد کو آزادی دینے کے

[1] احمد قائد شعیبی، وثیقۃ المدینۃ المضمون والدلالۃ، کتاب الأمۃ، قطر: وزارۃ الأوقاف، شمارہ: ۲۰۰۶ء ۱۱۰۔
[2] اگلی سطریں پڑھنے سے پہلے خیال رہے کہ عربی میں شہریت کو (المواطنۃ) کہتے ہیں، اس لئے لغوی بحث کرتے ہوئے اسی لفظ کے اعتبار سے گفتگو کی گئی ہے۔

ساتھ اس کی ذمہ داریاں بھی اسے بتاتا ہے[۱]۔

وطن، مواطن، اور وطنیۃ ایسی عام تعبیرات ہیں جن کے معنیٰ میں صفت قدر سے مل گئی ہے، لیکن یہ سب تعبیرات بنیادی صورتوں پر مشتمل ہوتا ہے، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اس کا سرچشمہ عربی علمی دائرہ سے باہر کا ہے، اوراس زمانہ میں لوگوں کی بدلی ہوتی حاجات پر اسے نافذ کیا جارہا ہے۔

سترہویں صدی سے جب سے سیکولر فکر سامنے آئی ہے تصور شہریت اس کے ایک اہم تصورات ونظریات میں سے ایک ہے، اگلی دوصدیوں میں اسے فکر کو مغرب میں اقتصادی وسیاسی میدانوں میں نافذ کیا گیا، بیسویں صدی اوراس صدی کے آغاز میں اس کے اثرات سماجی نظاموں اور انسانی تعلقات میں بھی نظر آئے۔

چونکہ سیکولرزم کا محور اپنے آغاز سے انفرادی آزادی، عقل پسندی اور ایسے سیاسی معاشرہ میں فرد کی حیثیت کو محکم کرنے پر ہے جس کی بنیاد محکم سماجی بنیادوں پر بیداری کے زمانہ کے قواعد پر ہو، اس لئے سیکولر نظریہ کے ارتقا کے ساتھ ساتھ شہریت کے تصور میں بھی ارتقا ہوا، اور عمل کے دائروں، متمدن معاشرہ، عام میدان اور فرصت کے وقت مین اس کے یومیہ سیاسی وحیاتی اختیارات کے سلسلے میں فرد کی خواہش کو مرجع کی حیثیت حاصل ہوا اور فرد کے مطلق اختیارات اس تصور کا محور بنے۔ اور یہ ایک ایسا تصور بنا جس کے مختلف پہلوؤں اوراس کے جدید ارتقاءات کا احاطہ کئے بغیر سیکولرزم اور اس کی حقیقت کو سمجھنا ناممکن ہے، اس لئے کہ یہ تصور فرد، جماعت، سیاسی رابطہ، ریاست کے کردار، انسانی تعلقات، اقدار اور اخلاق کے تصور پر مشتمل ہے۔

اس اصطلاح کے مضمون، استعمال اوراس کی دلالت میں بہت تبدیلیاں ہوئیں، اب یہ اصطلاح سیاسی قانونی پہلو میں پہلے کی طرح صرف فرد وریاست کے تعلق کو ہی بیان نہیں کرتا ہے، بلکہ جدید سیاسی مطالعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی نظریہ میں شہریت کے تصور پر اب پھر توجہ دی جانے لگی ہے، جبکہ اسی کی دہائی کے اخر میں ''ریاست'' کے تصور پر بہت زیادہ توجہ دی جارہی تھی، اس کے متعدد عوامل ہیں، جن میں سب سے اہم اس قومی ریاست کے تصور کو درپیش بحران ہے جو ایک طویل عرصہ تک سیکولر نظریہ کا محور رہی ہے، یہ بیسویں صدی کے آخر میں ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے:

اول: دنیا کے بہت سے ممالک میں نسلی ومذہبی مسائل کا اضافہ، تشدد، بلکہ خونی تباہی کی کثرت، ایسا صرف تیسری دنیا کے ان ممالک میں ہی نہیں ہوا جن میں جدیدیت کا نظریہ نہیں پھیلا تھا، بلکہ ایسا مغرب کے قلب میں بھی اس کی بڑی طاقتوں کے ہاتھوں ہوا، اس کا آغاز جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام سے ہو (جیسا کہ کہا جاتا ہے)، پھر ہیروشیما میں ایٹم بم نے تباہی مچائی، صربوں نے مسلمانوں، امریکہ نے عراقیوں ور افغانیوں کو تباہ کیا، اور فلسطینیوں کو تباہ کرنے کا کام جاری ہی ہے۔

دوم: گلوبائزیشن کا نظریہ سامنے آیا جس کی بنیاد سرمایہ داری کے حدود نا آشنا فروغ، ٹیکنالوجی وذرائع اتصال کے انقلاب اوراس تصور پر نظر ثانی کی ضرورت پر تھی جس کی بنیاد وطن کے حدود، سیاسی جماعت اور قومی ریاست کی بالادستی کے تصور پر تھی، ان تمام سطحوں پر نوعیاتی تبدیلیاں دکھائی دیں۔

دوسری طرف سیکولرزم کی لیباریٹری کی حیثیت رکھنے والے ممالک میں بنیاد پرست وشدت پسند مسیحی نظریات کا اضافہ عرب ومسلم اقلیتوں کے وجود کی وجہ سے پیچیدہ مغربی سماجی وسیاسی صورت حال میں ان افکار اوران کے اثرات کے مقابلہ کے لئے اس نظریہ پر نظر ثانی اوراس کی محوریت کو یقینی بنانے کا سبب ہوا، نیز فرد کی آزادی وعزت کے حصول کے لئے مثالی تصور کے طور پر انفرادیت سیکولر دنیا میں ایک خطرناک موڑ تک پہنچ گئی، اس لئے کہ اس کی عملی تطبیق میں انتہا پسندی اور افراد کے ذریعہ صرف اپنے محدود مصالح پر ہی توجہ دینے سے وہ سماجی باہمی تحفظ خطرہ میں پڑ گیا جو کسی بھی سیاسی معاشرہ کی بنیاد ہوتا ہے، اب ذاتی مصالح کے لئے عام امور پر توجہ دی جانے لگی، بعض حضرات کی اصطلاح کے مطابق ''سیاست کی موت'' ہونے لگی اور ''یومیہ زندگی کی پالیسیز'' سامنے آنے لگیں۔

عرب ومسلم عقل کے سامنے اس سلسلہ میں جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ سیکولر نظریہ نے صرف مغربی دنیا میں جمہوری تجربات کے آغاز پر اکتفا

---

[۱] سامر مؤید، المعالجة الإسلامية لإشكالات المواطنة۔

نہیں کیا ہے، بلکہ اب وہ تیسری دنیا کے ان ممالک میں اکیلے فکری وسیاسی آپشن کے طور پر خود کو پیش کر رہا ہے، جیسا کہ مشہور صاحب قلم فوکو یاما کی کتاب "The end of history" میں یہ لکھا گیا ہے کہ سیکولرزم نے تمام نظریات کو شکست دی ہے، یا ہنٹنگٹن کی کتاب "clash of civizations" میں مغربی تہذیب کو سب سے بالا و برتر ثابت کیا گیا ہے، شہریت کے تصور کو سیکولر سرمایہ دارانہ نظام غیر مغربی ممالک میں فروغ دے رہا ہے، اور آگے بڑھ کر اسے جنوب کے مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، جس کے تحت وہاں کے معاشروں کے سیاسی رابطہ کی موجودہ بنیادوں (قبائل ورشتہ داریوں وغیرہ) کی جگہ پر شہریت کو بنیادی مقام دینے کی کوشش ہورہی ہے، اور اسے ایک ایسے رابطہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے جو دین، نسل ونظریہ کے رابطوں کو ختم کردیتا ہے، یہ صورت مزید غور وفکر اور تبدیلی کی متقاضی ہے۔

پچھلی دہائیوں میں بین الاقوامی سطح پر وقوع پذیر ہونے والی جس طرح کی تبدیلیوں کا اوپر تذکرہ آیا ہے ان کی وجہ سے بعض مطالعات میں ایسے واقعات ومظاہر پر خاص توجہ دی گئی ہے جنہوں نے شہریت کے تصور میں تبدیلی کر کے اسے نئے پہلوؤں پر محیط کیا ہے، لیبرل سیاسی نظریہ کی ابتدائی تحریروں میں عقل پسندی کا نظریہ فلسفیانہ اقدار سے مربوط تھا، پھر ان میں شخصی منفعت کا تصور آیا اور پھر مادی واقتصادی منفعت کا، ان تحریروں نے اجمالی طور پر سیاسی نظریاتی تصورات اور اقتصادی نظریات کو باہم مربوط کردیا، اسکی بابت کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ سیاسی پہلو پر معاشی پہلو کو اور سیکولر فکر پر مادیت پرستی کو غالب کر کے لیبرل جمہوریت کو جموری لیبرلزم بنادیا گیا ہے، لیبرل معاشیات نے لیبرالزم کے اس کلاسیکل نظریہ کے بجائے جو ریاست کی دخل اندازی کو ناروا سمجھتی تھی اس جدید نظریہ نیولیبرالزم کو اختیار کرلیا ہے جو خوشحالی لانے کے لئے ریاست کی دخل اندازی کا مؤید ہے۔ اس طرح شہریت کا رابطہ ایسے متعین مادی منافع وحقوق سے عبارت ہوگیا جس کا مطالبہ شہری صحت وتعلیم کے میدان میں کرتا ہے، یعنی تمام تر توجہ حقوق پر رہ گئی ہے، واجبات سے مکمل صرف نظر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ گفتگو کا موضوع ریاست، متمدن معاشرہ اور کارکنان کے درمیان شرکت پر گفتگو کے ذریعہ گورننس ہوگیا۔

اس طرح شہریت کا تصور خالص ذاتی منفعت پسندی کا ہوگیا، اسی طرح اس کی بنیاد ایک ایسی پیچیدہ صورت حال پر ہوگئی جس کے اصل مطلوبہ ومثالی نتائج غلط ریاست کے وجود کی وجہ سے سامنے نہیں آرہے ہیں، اگرچہ یہ وجود بالکل تبدیل ہوکر رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہونے لگا ہے کہ اب یہ نظریہ کمزور پڑ گیا ہے، اور اب اس کا کردار بس عالمی بازار کو فائدہ پہنچانا ہے، یہ صحیح گمان نہیں ہے۔

اس تضاد کے مساوی اور متضاد رجحانات سامنے آئے ہیں:

اول: حقیقت پسند، یہ براہ راست مصلحت پر بہت تاکید کرتا ہے، اور ان عظیم اقدار وساجی نیز مؤجل منافع کو آگے بڑھاتا ہے، جن پر پہلے سرمایہ دارانہ انقلاب کی بنیاد تھی۔

دوم: روشن خیال، یہ رجحان بعض ان تحریروں میں سامنے آتا ہے جن میں اقتصادی نظریہ میں اخلاقی پہلو کو داخل کرنے کی بات کہی جاتی ہے، یعنی ان میں مادیت پسند معاشیات کو انسانی اقدار سے قریب تر کیا جاتا ہے، اور معاشی نظریہ وتجزیہ میں انسانی، ساجی واخلاقی پہلوؤں کو واپس لایا جائے، اس کے نتیجے میں تصور شہریت کے تجزیہ کے وقت لیبرل فکر میں اسے بڑے سوالات سے مربوط کرنا لازم آتا ہے، جن میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ تصور شہریت کے تجزیہ کے وقت لیبرل فکر میں اسے بڑے سوالات سے مربوط کرنا لازم آتا ہے، جن میں سب سے اہم فرد کے تصورات، سیاست کی تعریف اور اس پر مرتب ہونے والا سیاسی معاشرہ کی نوعیت کا تصور ہے، اگرچہ بہت سی معاصر لیبرل تحریروں میں ان تبدیلیوں پر توجہ دی گئی ہے جو اقتصادی وتکنیکی میدانوں اور جدید اصطلاحات کے استعمال سے پیدا کی ہیں، لیکن ہمیں کسی بھی تحریر میں ان تبدیلیوں کی مکمل تشریح نہیں ملی ہے، عربی زبان کی ایسی تحریروں میں سب سے فائق تحریر مصری ماہر معاشیات مرحوم رمزی زکی کی تحریر ہیں۔

نئے میدان اور وسیع فکری مسافتیں:

سرمایہ داری کے گلوبائزیشن اور جدید لیبرل نظریات کی بالاتری کی وجہ سے شہریت کا تصور کوئی سادہ تصور نہیں رہ گیا ہے، ترقی یا پچھڑاپن؟ یا تہذیب یا تہذیب کی مخالفت کی طرح یہ سوال نہیں ہے کہ شہریت یا بے شہریت؟ معاملہ اس سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے اور یہ تصورات شدید گمراہ کن ہیں۔

کون سی شہریت؟ یہ ایک تحقیقی سوال ہے یعنی کیا وہ روشن خیال تصور شہریت جو فرد کا احترام کرتا ہے معاشرہ کی بنیاد اتفاقی نظریہ پر رکھتا ہے یا مابعد جدیدیت کا سرمایہ دارانہ تصور شہریت؟

وہ ظاہری یکساں قانونی شہریت جس میں ایک ہی پہلو ہوتا ہے یا انسانی تہذیبی منصوبے کے تحت مرکب اتفاق پسند، جمہوری اور ثقافتی شہریت؟

وہ شہریت جو آزادی، مساوات، سیاسی ڈھانچے، عدل اور شوریٰ کی بات کرتی ہے، یا وہ شہریت جو سیاسی اقدار سے بے اعتنائی کرتی ہو کسی حقیقہ اور تہذیب کے مفادات کے لئے معاشرہ کو تقسیم کرتی ہو جو جسم و لذت کی پالیسیز کو انسانی اقدار عامہ اور سیاسی جسم پر بالاتر کرتی ہو۔

کس علاقائی سیاق میں شہریت؟ سماجی شہروں میں ثقافتی اور انسانی نوعیت کی روشن خیال اور لبرل شہریت، یا معاشرہ کی دشمن اور نفع خوری پر مبنی عالمی سرمایہ داری کے شہروں کی شہریت؟

اور آخری بات یہ کہ انسانی اہداف، عام نفع، تاریخی اجتماعی ارتقاء کے سلسلہ میں تنگ دائرہ والی شہریت؟ یا صرف ذات کو سامنے رکھ کر بنائی گئی سوچ جس میں دوسرا اور باہم امر کا ذکر ہے، جو زمان و مکان کے تصورات کی تشکیل نو کرے، جو عام وطن کی تحریکوں کی تشکیل نو کرے، ایسے جو تمام تصورات میں شہریت کے تصور کے لئے خطرہ بنے، یہ تحقیقی سوالات اور اجتہادات وجہاد کے میدان ہیں۔[1]

یہ تنقید کے میدان ہیں، واجب نہیں تقابل کے میدان ہیں، تصور شہریت اصول تنقید و تقابل کے مطابق تشکیل نو، ترمیم و تاویل کے اصول اور استعمال کے متقاضی امور کے ترتیب جدید کا محتاج ہے، تاکہ یہ تصور موقف کے تصورات کے تحت کی تعمیر نو کا ایک ماڈل بن سکے۔

شہریت کے اندر بیک وقت متعدد معانی پائے جاتے ہیں: شہریوں کے درمیان قانونی مساوات، رنگ، قوم، دین اور نسل سے صرف نظر قانونی مساوات، بغیر قانونی یا عرفی قیود کے سیاسی شرکت اور باعزت زندگی، مغربی تجربہ اسی تسلسل پر رواں دواں ہے، اس میں شہری پہلے قانونی مساوات حاصل کرتا ہے، پھر سیاسی شرکت کا حق پاتا ہے اور پھر سماجی خوشحالی کا حق پاتا ہے، شہری کے سماجی رفاہ کے مطالبہ کو حکومت کے ذریعہ قبولیت ملنا اس تصور کی تکمیل کی دلیل ہے۔

۱۰۔ شہریت وطنی جماعت کے دائرہ میں ایک سسٹم کی اصطلاح ہے:

شہریت کا موضوع جو شہریت کے حقوق سے بہرہ ور ہونے اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قانونی وسیاسی دائرہ کی تعبیر ہے، شہریت کی اصطلاح کا وجود چند مبادی کے اعتراف، چند اداروں کی پابندی، اور اس کے عملی نفاذ کو یقینی بنانے والے وسائل کے استعمال کا متقاضی ہے، اس تصور کے مطابق شہریت پابندیوں، فکری وقدری ڈھانچہ، قانونی ودستوری ڈھانچہ اور پالیسیز وطریقہ ہائے کار کے ایک ڈھانچہ سے عبارت ہے۔

یہ ان ہمہ گیر تصورات واصطلاحات میں سے ہے جو دیگر قانونی وسیاسی تصورات کا متقاضی ہے، اس لحاظ سے یہ تصور ایک ایسے سسٹم کا تصور ہے جو بنیادی انسانی حقوق، تمدنی وسیاسی حقوق، نیز سماجی، معاشی وثقافتی حقوق سے متعلق ہے، یہ سسٹم انسانی سرگرمیوں کے تمام میدانوں (شخصی، خاص، عام وسیاسی) سے متعلق ہے۔

شہریت کے موضوع کی بابت ایک نص کے طور پر اقتدار و معاشرہ کے خطاب کے مطالعہ کے وقت یہ امور کافی اہم ہیں۔

۱۱۔ عقیدہ، انسان اور تشخص:

(دینی) عقیدہ کی تجدید، انسان رفرد: وافعیت، رافعیت، سرگرمی: یعنی ریاست، معاشرہ، شہریت اور مرجعیت کے درمیان پایا جانے والا تعلق ان امور میں سے کسی کے قابل انحراف ہونے کے مسئلہ کے تحت آسکتا ہے، یہ انحراف کسی امر کے حصول، اس کی بابت غور وفکر، اس کے نفاذ اور اس کا

---

[1] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو: ڈاکٹر عبدالرؤف کی تحریریں، بالخصوص ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ: دراسة تطور المفهوم في الفكر الليبرالي، (غیر مطبوعہ) جامعہ قاہرہ: كلية الاقتصاد والعلوم السياسة، ۲۰۰۷ء۔

مناسب ہونے میں سے کسی کی بابت ہوسکتا ہے۔

اس سیاق میں دیکھیں تو بنیادی خیال یہ ہے کہ اچھا معاشرہ وہ معاشرہ ہے جو اپنے معاملات (بابت: فکر، اقدار اور اداروں) میں ریاست کی دخل اندازی سے مستغنی ہے، اور ریاست کا کام صرف اپنی خارجی وداخلی ذمہ داریوں کی تکمیل ہے، ایک مفکر اس بابت کہتے ہیں: معاشرہ ہماری خوبیوں کی دین ہے، اور ریاست ہمارے عیوب کی پیدا کردہ" یعنی ریاست معاشرہ کے فساد کو کم کرتی ہے۔

یہ صورت حال ہمیں ان پہلوؤں کی طرف متوجہ کرتی ہے جو ایسے بے سروپا مظاہر کو مشترکہ طور پر وجود بخشتے ہیں جن میں سسٹمس اور معاشرے مبتلا ہیں، یعنی ریاست یا بالفاظ دیگر مقتدرہ ایسے بے ترتیب مظاہر کو وجود بخشتی ہے جو اس کے ظلم وفساد کے عناصر پر پردہ ڈال سکیں، یہ گمراہ جماعتیں گمراہ فرد وانسان کو وجود بخشنے کی فیکٹریاں ہیں، سماجی، اقتصادی اور سماجی طور پر محروم کرنے سے ایک ایسا انسان سامنے آتا ہے جو ان گوناگوں پہلوؤں کے درمیان تعلقات کو بگاڑ دیتے ہیں، اور اتحاد کے امکانات کے باوجود ان کو باہمی اختلاف کا اسیر بنا دیتے ہیں۔

''دافعیت'' سے مراد وہ امور ہیں جو فرد کو متعین سلوکی طرز اختیار پر آمادہ کرتے ہیں، اور اس سلوکی کو وہ رخ دیتے ہیں جو کسی مقصد کے حصول کا باعث ہوتا ہے، اور اس مقصد کے حصول تک اس کے تسلسل کا ضامن ہوتا ہے، اس سے انسانی وجود کے وہ تصورات واہداف، نیز ان اہداف کے لئے کی جانے والی وہ کاوشیں مراد ہوتی ہیں جو انسان کی سرگرمیوں سے رکاوٹوں کے کردار اور ان کے سلبی وایجابی اثرات سے صرف نظر کئے بغیر ہوں، زندگی کی ''دافعیت سے مراد انسانی زندگی کے لئے راستہ ہموار کرنا اس کی حفاظت کرنا اور اس کو نقصان نہ پہنچانا ہے زندگی کی ''دافعیت'' کی بنیاد ضروریات کی حفاظت، حاجیات کی فراہمی، تحسینات کی تسہیل اور حصول ہدف کے لئے کی جانے والی کاوش کو منظم کرنے پر ہے۔

یہ ''دافعیت'' مؤثر عمل کے لئے کی جانے والی کاوش سے مربوط ہے، گویا کہ یہ اس ''کدح'' (رفتہ رفتہ جانے) کی ایک حالت ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں کیا گیا ہے: ''یا أیها الإنسان إنك كادح إلى ربك كدحا فملاقيه'' (سورۂ انشقاق:۶) (اے انسان تو اپنے رب کی جانب کشاں کشاں جارہا ہے پھر اس سے ملے گا یا اس کے حضور حاضر ہوگا)۔

ہمتوں کو انگیز کرنے والے عمل پر آمادہ کرنے والے ایمانی دوافع میں بسا اوقات کمی اور کمزوری آنے لگتی ہے، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب فرد تبدیلی کے عمل میں اور امت کی بیداری کے منصوبوں کے لئے تقویت کا باعث بننے والی پابندیوں سے خلاصی چاہتا ہے۔

اس نئی صورت حال میں امت کو بہت سے چیلنجز درپیش ہیں، کچھ اور اسباب بھی ایسے ہیں جو امت کی نشأۃ ثانیہ کے لئے رکاوٹ بن رہے ہیں۔

شہری، وطنی جماعت اور تشخص: تشخص، عقیدہ، فرد ''میں''، جماعت ''ہم'' تربیت اور تشخص کا احساس، تشخص کی تربیت: تشخص کی بابت جاری بحث کو روکنا مجھے بہت مشکل لگتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک صدی سے زائد عرصہ سے جاری بحث ہے، میرا ارادہ تشخص کے دو اسباق سے تعرض اور ان کی تحقیق ہے، اس مقام پر دو تصورات سامنے آتے ہیں: ایک کا تعلق تشخص کے احساس سے ہے، اور دوسرے کا تشخص کی تربیت سے۔ تشخص کا احساس تین عناصر پر مشتمل ہوتا ہے:

پہلا عنصر تشخص کے حقیقی اور غیر مصنوعی سوالات کی بابت ہے، حکماء کا کہنا ہے کہ صحیح سوال نصف جواب ہے، ہم کون ہیں؟ ہم کسی چیز کے مالک ہیں؟ ہم کیا لیتے ہیں اور کیا مسترد کرتے ہیں؟ کس زمین پر ہم کھڑے ہیں؟ باہم متعلق سوالات ایک دوسرے کے صحیح جوابات فراہم کرتے ہیں۔

دوسرا عنصر ان بنیادی عناصر کی فراہمی کا ضروری ہونا ہے جسے حکیم بشری نے اس ''بنیادی رجحان'' کا نام دیا ہے، جو جو تشخص کے مسئلہ کی مضبوط بنیاد کے ادراک اور اہم تہذیبی مسائل کے مکالماتی اصولوں کی تحدید پر قادر ہے۔

تیسرا عنصر کشتی کی وہ ثقافت جو ایک مشترک وطن، مشترک انجام کی بنیاد پر قائم ہے، اور تشخص کی کشتی کی ان خرافات کی تحقیق جو بے شمار ہیں اور جو ہلاکت وبربادی کا سامان ہیں، تشخص کی کشتی میں چھوٹا سا سوراخ پوری جماعت کے لئے ایک وسیع قبر سے عبارت ہے، یہ معاملہ نہایت سنگین ہے۔

یہ تمام عناصر تشخص کی حفاظت کرنے والا بنیادی نظام تشکیل کرتے ہیں، اور اسی طرح تشخص کے شعور کے عناصر کی بنیاد پڑتی ہے، (ذات کا شعور غیر کا شعور، موقف کا شعور)، اور یہ کام اس نظام کے تحت ہوتا ہے جو معاشرہ کی تعمیر اور اس کے سماجی وتہذیبی تانے بانے کی حفاظت میں معاون ہوتا ہے[1]۔

---

[1] سیف عبدالفتاح، الفرد والعقيدة والدولة۔

اسلام کے نقطہ نظر سے شہریت مسلمان کی اپنے مخصوص معاشرے میں اسلامیت کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ یہ ایک آزاد عمل ہے، دیندار مسلم معاشرہ کا قیام دیگر معاشروں کے تئیں ہدف رکھتا ہے، یہ معاشرہ تنوع کو معتبر مانتا ہے، یہ معاشرہ مسلم معاشروں کے ساتھ اتحاد کرکے ان کے غم کو اپنا غم بناتا ہے، اور دوسرے معاشرہ میں انسانی اقدار کو رائج کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے، تاکہ دینا پرامن زندگی گزار سکے، اور پورا معاشرہ ایک دوسرے سے تہذیبی استفادہ کرسکے اور اچھے ومفید انسانی تعارف کے ساتھ رہ سکے۔

اسلام انسانوں کے فطری تقاضوں کو روکنے کے لئے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ ان تقاضوں کو صحیح رخ دیتا ہے، وہ خاندان کے سماجی انتساب کا اعتراف کرتا ہے (أدعوهم لآبائهم) (سورۂ احزاب:۵) (انہیں ان کے آباء واجداد کی جانب منسوب کرو) قبائل انتسب کو معتبر مانتا ہے (وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا) (سورۂ حجرات:۱۳) (اور ہم نے تم کو مختلف قوموں اور قبائل میں تقسیم کردیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہنچاسکو) ملکی انتساب کو بھی اسلام صحیح مانتا ہے (وقال الذي اشتراه من مصر لامرأته أكرمي مثواه) (سورۂ یوسف:۲۱) (اور جس نے حضرت یوسف کو مصر سے خریدا تھا اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو اچھی طرح رکھنا) ان امور اور فطری تقاضوں کو اسلام نے سماجی زندگی کا ایک مقصد بنادیا، قرآن نے انسان کو اس کے ملک کی جانب منسوب کیا، لیکن ساتھ ہی اپنے رسول سے اللہ نے یہ بھی کہلوادیا کہ: جو عصبیت (یا جاہلیت وقومیت) دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں ہے، اس طرح کے واقعات سے سیرت کے صفحات بھرے پڑے ہیں[1]۔

ان تمام باہم معاون نظریات کے ضمن میں شریعت وشہریت کے درمیان کے اس تعلق کو سمجھنا ممکن ہے، تاکہ وطنی جماعت کی تشکیل میں ان دونوں میں سے ہر ایک کو اس کا واجب حق دیا جائے، اور شریعت کی بنیاد پر قائم وطنی جماعت کے تعاقدی تعلقات کو عام نظام کے قواعد کے طور پر پیش کیا جاسکے، جیسے سماجی تانے بانے کے اہم عناصر کی تشکیل کا قاعدہ۔

۱۲۔غور وفکر کا منہج: شہریت کس طرح ان مسائل کو حل کرنے کا ایک اصول فراہم کرتی ہے جن کا تعلق شہریت کی جامعیت سے ہے؟

اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض لوگ شریعت کے خلاف حقوق انسانی سے استدلال کرتے ہیں، یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں حقوق انسانی اصل مرجع ہیں، اور شریعت کی مرجعیت پر اصرار کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا کہنا اس وقت تو صحیح ہوسکتا تھا جب شریعت حقوق انسانی کا خیال نہیں رکھتی، یا اس کے خلاف ہوتی، جبکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے حقوق انسانی کو اپنی کلی فرعی مرجعیات میں سے ایک مانا ہے، لہٰذا حقوق انسانی شریعت کے منافی نہیں اس سے ہم آہنگ ہی ہیں۔

لہٰذا حقوق انسانی کو شریعت کے خلاف حجت بنانے کی کوئی معقول وجہ یا دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ ہر طرح کے حقوق (سیاسی، تمدنی، فردی، سماجی، اقتصادی، جماعتی، ترقیاتی، علمی، حقوق وغیرہ) کو شریعت کی مرجعیت کے تحت ایک مناسب اہمیت ومقام حاصل ہے، یہ حقوق ان امور سیاست کے تحت آتے ہیں جن کا تذکرہ ابن قیم نے اس مکالمہ کو نقل کرتے وقت کیا ہے جو ایک شافعیا وران کے استاذ ابن عقیل کے درمیان ''سیاست'' کی بابت ہوا تھا، اس کی بخوبی وضاحت شاطبی کے اس قول سے ہوتی ہے کہ وہ ''سیاست شرعیہ'' معتبر ہے جو مصلحت کو حاصل کرے اور اس کو یقینی بنائے، اسی طرح عزبن عبدالسلام نے قواعد الأحکام فی مصالح الأنام میں ان کلی قواعد کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ صرف مسلم دنیا کے لئے نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیا کے لئے ہیں۔

شہریت وجمہوریت بنیادی طور پر سیکولر اصطلاحات ہیں، یہ لوگ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ دین باہمی تعلق واتحاد کی تاکید کرکے شہریت کا وہ نظریہ پیش کرتا ہے جو حاکم ومحکوم کے درمیان تعلق کو منضبط کرنے کے قواعد کے تحت اس سیاسی رابطہ کے اصولوں کو وجود میں لاتا ہے، یہ تعلق اتحاد کو مزید تقویت پہنچاتا ہے، اگر اس سلسلہ میں سیکولرزم کو ایک شرط کے طور پر نہ پیش کیا جائے تو دین معاشروں کی تاسیس اور سماجی وسیاسی تعلقات کا نظام تشکیل دیئے جانے کے خلاف نہیں ہے۔

---

[1] حوالۂ بالا المعالجة الإسلامية للمواطنة۔

ہمیں ایک ایسے تعلق کا سامنا ہے جو بہت مرکب ہے اور ہمیں اس کے بارے میں یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ شہریت کی اصطلاح اس سیاق میں تعلق کی بابت ایک بہت اہم علمی ایجاد ہوگئی ہے، اور اس سے بہت زیادہ مربوط ہوگئی ہے، ہمیں اس سیاق میں اسے ایک سسٹامیٹک اصطلاح ہی ماننا ہوگا، اس اصطلاح نے ایک نئی زبان ایجاد کی ہے جسے جاننا ہمارے لئے ضروری ہے، اس صورت حال نے ایسے بہت سے سوالات اٹھائے ہیں جو ہمیں لازماً متبادل نظام کی طرف لے جاتے ہیں۔

(شخص، خاص، عام اور سیاسی) میدانوں کے درمیان ترتیب قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم صرف ''علوم اشباہ ونظائر'' کو ہی استعمال کرکے نہیں، بلکہ ''علم فروق کو بھی استعمال کرکے تعلقات، اشتراک وامتیازات کو منضبط کریں، ان اصولوں میں سے کس سے ہم اس سلسلہ میں استفادہ کرسکتے ہیں؟

کیا تمدنی ودینی کے درمیان صرف تصادم ہی کا تعلق ہے، یا یہ دونوں ایک دوسرے سے استفادہ کرسکتے ہیں؟ مختلف تبدیلیوں نے اس سوال کو بہت پیش کیا ہے۔

سیاسی امور کے سلسلے میں غور وفکر کی جانب وجود میں آنے والی تبدیلی کن تاثیرات کو ترک کرسکتی ہے، سیاسی امور اپنی وسیع دلالتوں کے ذریعہ سیاسی عمرانیات، یومیہ زندگی کے حقائق اور تحتی سیاست کے ڈھانچے سے متعلق اعمال کے دائرہ سے قریب ہوجاتے ہیں، ان سوالات نے ہمارے لئے یہ لازم کردیا ہے کہ ہم متعدد ایسے متبادلوں پر غور کریں جن کے تحت تمام تعلقات آتے ہیں، اور جو نا قابل انکار تبدیلیوں کو ضرور معتبر مانیں۔

متبادل میدان اور شہریت:

شخص	شہریت	شہری۔فرد (ڈھانچہ)
خاص	شہریت	شہری۔خصوصیت (حقوق)
عام ''معاشرہ''	شہریت	شہری۔عام (سماجی حقوق)
سیاست	شہریت	شہری۔سیاسی (سیاسی حقوق)
دینی	شہریت	شہری۔دینی (عقائدی حقوق)
گلوبلائزڈ	شہریت	شہری۔گلوبلائزڈ (مشترک مستقبل)

ان مختلف متبادلات کے نظریہ کے تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمدنی شہریت سے متعلق میدانوں میں سے ایک میدان ہے، لیکن چونکہ گلابلائزیشن اور سیکولر طرز زندگی کی مدد سے تمدن کا مفہوم مختلف دائروں پر اس طرح چھا گیا ہے کہ اب اس کا ایک ہی نمونہ رائج ہے، اس لئے اس سے واقفیت، اس کے مدلولات کی تلاش اور اس کے انجاموں سے تعارف، اور فعل، تفعیل وفاعلیت میں تصور یا صفت کی صحت ومناسبت کا علم ضروری ہے۔

اس طرح ہمیں تصور شہریت ایسے باہم معاون ڈھانچوں کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں:

تہذیبی، علمی، ثقافتی، فکری وفلسفی ڈھانچہ

حقوقی، قانونی ودستوری ڈھانچہ

پابندیوں اور سزاؤں کا ڈھانچہ (شہریت کا تحتی ڈھانچہ)

وہ عالمی ڈھانچہ جو تصورات کی تشکیل اور ان کی ترویج کی کوشش کرتا ہے

اداراتی ڈھانچہ اور انسانی حفاظت کے ادارے

فکری ڈھانچہ اور اقداری اصول۔

اجتماعی ڈھانچہ

شہریت اور حقوق وواجبات کے درمیان تعلق کا ڈھانچہ

سیاست کی بابت ڈھانچہ

اعمال سے متعلق ڈھانچہ

شہریت: ڈھانچوں اور میدانوں کے درمیان تعلقات، بنیادوں اور میدانوں کے درمیان تعاون کا ایک سسٹم۔

میدانوں تعلقات اور ڈھانچوں میں شہریت کی رسائی کے اصول

۱۔ رسائی کے چینلس کے درمیان وسائل کا انسداد۔

۲۔ کثافت، دباؤ اور آمیزش کی صلاحیت نہ ہونے کے سلسلے میں سیال اشیاء کا اختلاف۔

۳۔ تجربات کرنے والے کا شعور، وطن کے چینلس میں رسائی کے شہریاتی تجربہ کے اجرا کے لئے مناسب طریقہ کے مانع عناصر کا ادراک۔

۴۔ آمیزش کے حصول، علاحدگی کی ممانعت کی بنیادی شرط کے طور پر مناسب وقت کی کیفیت۔

شہریت ایک تعاقدی صورت ہے، جو تبادلہ کے مبادل حقوق وواجب کے تعلق کے اصول اور عقود کی کسوٹی تشکیل دیتی ہے۔

شہریت حکومت راشدہ کے نظام کے ان قواعد میں سے ایک قاعدہ ہے جو اس حکومت کے اقدار اور تقاضوں کو روبہ عمل لاتے ہیں[1]، ان قواعد کا انصاف وظلم ہیں کفر وایمان نہیں، اس موضوع پر علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الحسبۃ فی الاسلام میں بہت اچھا کلام کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے: "اہل کتاب موت کے بعد جزا پر متفق ہیں، لیکن دنیوی جزا پر پوری دنیا متفق ہے، ان کا اس بابت کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ظلم کا انجام برا اور انصاف کا انجام اچھا ہوتا ہے، اسی لئے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ: اللہ انصاف پسند حکومت کی مدد کرتا ہے خواہ وہ کافر ہو اور ظالم حکومت کی مدد نہیں کرتا خواہ وہ مسلم ہو"[2]۔

ابن تیمیہ کا یہ کلام سماجیات، سماجی فقہ، تہذیب وثقافت کے فہم کے سلسلے میں بہت بلند پایہ ہے، اسی طرح یہ کلام دنیا وآخرت کی کامیابی کی بیک وقت کامیابی کی بنیادوں کو واضح کرتا ہے، تمام اعلیٰ اقدار اور ان کی تنقید کی چند شرطیں ہیں، جو ان کو پورا کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو پورا نہیں کرے گا وہ ناکام ہوگا، (ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا تھا، بلکہ خود ہی انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا" وما ظلمهم الله ولكن كانوا أنفسهم يظلمون" (سورۂ نحل: ۳۳) اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شہری جب بھی اپنا فریضہ ادا کرتا ہے زندگی کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔

۱۳۔ انتساب کے دائرے اور تجزیہ کی اکائیاں: شہریت اور انتساب کے باہم دگر مربوط دائرے:

اس موقع پر یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بشری حکیم نے منہج سے ایک ایسا وسیع اصول تشکیل دیا ہے جو لغوی مادہ "نہج" کے تمام معانی پر حاوی ہے، اس کا اہم ترین تعلق یہ ہے کہ منہج منزل تک پہنچانے والا راستہ، اور اسی لئے وہ بیک وقت "واقع" اور "قصہ" سے مربوط ہے۔

اس معنی میں منہج صرف نظریہ یا نظریہ سازی کا ایک منہج نہیں ہے، بلکہ وہ کلی نظریہ، تحقیقی وسائل واسالیب کی ایک تعبیر ہے، یہ کلی نظریہ بہر حال راہ عمل کی وضاحت کرتا ہے، اس کو برتنے اور مقصد کو حاصل کرنے کی کیفیت بیان کرتا ہے، اسی لئے بشری کے نزدیک منہج کا اہم ترین اصول یہ ہے کہ منہج "واقع" کے لئے ہے، اسی لئے انتساب کی اکائیوں کی بابت ان کی گفتگو ان کے اکثر مطالعات میں تجزیہ کی اکائیوں پر گفتگو کا ایک مقدمہ اور اس کی ایک بنیاد ہے۔

انہوں نے امت کو اپنے تجزیہ کی بنیادی اکائی بنا کر اور وطنی جماعت کو تجزیہ کی "واقعی" اکائی بنا کر وطنی جماعت میں امت کے معنی کی تحقیق کرنی چاہی ہے، یہ کام امت کی تجزیہ کی مرجعی اکائی ہونے کی حیثیت ختم نہیں کرتی ہے، لیکن یہ عمل اسے تجزیہ کی ان اکائیوں سے محفوظ رکھتا ہے جو مسئلہ کو سمجھنے اور اسے برتنے، نیز اسکو صحیح رخ دینے کے عمل کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

---

[1] سیف عبدالفتاح، الحكم الراشد۔

[2] ابن تیمیہ: الحسبۃ فی الإسلام۔

اسی لئے انہوں نے لکھا ہے کہ علم سیاست وعلم ساجیات میں سے کوئی بھی صرف اس غور وفکر پر اکتفا نہیں کر سکتا ہے جو انتساب کی عام اکائی یا انتساب کی اس بنیادی اکائی پر مرکوز ہو جس پر ریاست کی بنیاد ہوتی ہے، اور جس سے نظام حکومت متعلق ہوتا ہے، یہ علوم نظام حکومت کے حالات اور ان کی نوعیت کے فہم کے لئے اکتفا نہیں کرتے ہیں، یہ فہم متعدد اداروں اور جماعتوں کا امکان کھلا رہتا ہے، یہ شہریوں کو صرف ایسے افراد نہیں مانتا ہے جنہیں پارٹیاں اور ریاست کے ادارے جمع کریں۔

ایسا اس لئے ہے کہ سیاست ومعاشرہ سے متعلق علوم صرف دائرہ بنا دینے اور چیلنس کی تحدید کرنے پر اکتفا نہیں کرتے ہیں، ان علوم میں غور وفکر اور بحث وتحقیق کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس کے اندر افراد پر مشتمل فروعی جماعتیں اور ان جماعتوں کی بنیاد پر قائم ادارے وڈھانچے بھی آتے ہیں، غلطی کی ابتدا شہریوں کو بطور افراد دیکھنے، ان پر مشتمل فروعی، جماعتوں انتساب کی فروعی اکائیوں، نیز ان جماعتوں اور اکائیوں کے اداروں کا ادراک نہ کرنا ہے۔

معاشرہ انتساب کی بے شمار اکائیوں پر مشتمل ہوتا ہے، متعدد اعتبارات سے یہ اکائیاں مختلف انواع کی ہوتی ہیں، ان کی بنیاد دین، مسلک، صوفی طریقہ، ملت، ثقافی مشرب، زبان، لہجہ، تعلیم، پیشہ، کسی فوج، یونیورسٹی یا بڑی کمپنی سے وابستگی، علاقہ، محلہ، گاؤں قبیلہ یا خاندان جیسے ایسے امور پر ہوتی ہے جن کی تعداد، انواع، اور اعتبارات تقسیم کا شمار ناممکن ہے، اعتبارات تقسیم کی گونا گونی کی وجہ سے ان کو انتساب کی جامع اکائیاں مانا جاتا ہے، لیکن ان کا مانع ہونا ضروری نہیں ہے، ایک اعتبار تقسیم کے تحت آنے والی اکائیوں میں سے کسی ایک کی جانب فرد کی نسبت اسی اعتبار تقسیم کے اندر دوسری اکائی کی جانب اس کے انتساب سے مانع ہے، لیکن دوسرے اعتبار تقسیم کے اندر فرد کسی اکائی کی جانب منسوب ہو سکتا ہے، مثلاً اہل سنت سے انتساب رکھنے والا شخص شیعوں سے انتساب نہیں رکھ سکتا، اس لئے کہ ایک اعتبار تقسیم نے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے، لیکن یہ شخص اہل طریق کی جانب، قبیلہ وعلاقہ کی جانب انتساب رکھ سکتا ہے، اس لئے کہ اعتبار تصنیف جدا ہے، یعنی یہ اکائیاں باہم مربوط ہوتی ہیں اور ان کے دائرے ایسی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو جدا نہیں ہیں، ان اکائیوں کے تعدد، اور ان کے اعتبارات تقسیم کے تنوع کی وجہ سے یہ اکائیاں یکساں نہیں ہیں، اور ان میں پایا جانے والا اختلاف صرف تنوع اور تعدد کا نہیں ہے، یہ اختلاف عموم وخصوص کا بھی ہوتا ہے، اور جنس ونوع کا بھی ہوتا ہے، اصل وفروع کا بھی ہوتا ہے، دین کی اکائی اور دینی مسالک کی اکائی کے درمیان، اہل سنت کی اکائی اور ان کے مسالک کی اکائی کے درمیان، تصوف کی اکائی اور اس کے طریقوں کے قسموں کی اکائی کے درمیان، علاقائی کے تعلقات کی اکائیوں کے درمیان، پیشہ سے متعلق اکائیوں کے درمیان اور خونی رشتوں کی اکائیوں کے درمیان ایسا ہی اختلاف ہے۔

ان اکائیوں کے ذریعہ ہر تاریخی مرحلہ میں انتساب کی وہ عام اکائی سامنے آتی ہے جسے وہ بڑی اور بنیادی کڑی مانا جاتا ہے جو معاشرہ کی اپنے مطابق تشکیل کرتی ہے، اور جسے دیگر کڑیوں پر بالادست کڑی یا دیگر اکائیوں پر بالادست اکائی کی ماجانا جاتا ہے، اس کے علاوہ دیگر اکائیوں کو انتساب کی فرعی اکائیاں سمجھا جا سکتا ہے، انتساب کی عام اکائی ان دو بنیادی عاملوں کے مطابق سامنے آتی ہے:

وہ تاریخی اور سماجی حالات جو اسے بنیادی کردار ادا کرنے اور ان بنیادی چیلنجس کا جواب دینے کا اہل بناتے ہیں جن کا سامنا جماعت کی تمام اکائیوں کو کسی متعین تاریخی مرحلہ میں ہوتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ انتساب کی عام اکائی کو ایک حد تک اضافی ثبات حاصل ہے، لیکن وہ اپنے اندر سے نوعیاتی اکائیوں اور باہر سے گرد وپیش کے عام حالات سے متاثر ہوتی ہے، یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ ہر زندہ معاشرہ میں متعدد ذیلی اکائیاں پائے جانے کے باوجود کوئی ایک لفظ اتحاد ضرور پایا جاتا ہے، یعنی انتساب کی ایک عام اکائی ایسی ضرور پائی جاتی ہے جو معاشرہ پر اور اس معاشرے کے افراد کے ذہنوں پر غالب رہتی ہے، درپیش چیلنجس کا مقابلہ کرتی ہے، مصالح کی آخری حد کو یقینی بناتی ہے، معاشرہ کے مختلف طبقات کی عظیم مشترکہ مصالح کی رعایت کرتی ہے، یہ مختلف طبقات گوکہ مختلف اعتبارات تقسیم کے اعتبار سے مختلف اکائیوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن یہ اکائیاں باہم دگر مربوط ہوتی ہیں، اور عام اکائی ان کے لئے وجود، بقا اور مصالح کی ضامن ہے، اس وجہ سے عام وفرعی کے درمیان باہمی تعاون کے تعلقات ہوتے ہیں، اگر ان امور کی ضمانت نہ ہو تو پھر

فرعی اکائیاں مصالح کے لئے متحد ہو کر کسی متعین مرحلہ کی اس عام اکائی کے خلاف ہو جائیں گی۔

میرا خیال ہے کہ معاشرہ کو درپیش چیلنج کی نوعیت اور مقدار انتساب کے وجود اور متعین تاریخی مرحلوں میں اکائیوں کے ایک دوسرے پر غلبہ کے سلسلے میں سلبی یا ایجابی طور پر مؤثر ہوتے ہیں، مغربی طاقتوں نے ہمارے ممالک پر قبضہ کر کے کیونکہ ان کو تقسیم کر دیا خلافت اسلامی کا سقوط ہو گیا تھا اور اس طرح نسبت کی ایک مشترکہ عام اکائی ختم ہو گئی تھی، اس لئے ایسا ہمارے یہاں بہت ہوا۔

ان حالات میں جو چھوٹے چھوٹے ممالک وجود میں آئے ہیں وہ اپنے اندر سے ایسی ترتیبات قائم کرتے ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے حالات سے نبٹ سکیں، وہ ایک زندہ عضو ہوتے ہیں، اور ان کی زندگی انہیں اس قابل بناتی ہے، پھر وہ اپنے اس ٹوٹے پھوٹے جغرافیہ کو ایک سیاسی اکائی اور عام انتسابی اکائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یہ اکائی ان ممالک کے لئے ایسے اہداف، نظریات اور تصورات قائم کرتی ہے جس کے ذریعہ یہ ممالک سیاسی وسماجی زندگی کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

پھر بیرونی خطرات ایسے ملک کے لئے مقابلہ کی طاقت پیدا کرتے ہیں، اور انتساب کی ایسی اکائیاں پیدا کرتے ہیں جو مطلوبہ سطح پر ان خطرات کے مقابلہ کی صلاحیت رکھتی ہیں، اسی طرح داخلی مسائل میں ان مسائل کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والی صلاحیتیں جدید مسائل سے نبٹنے کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔

لیکن بعض ایسی عام اکائیاں بھی سامنے آتی ہیں جو معاصر مسائل سے نبٹنے کے لئے مقابلہ کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں، اس کی ایک مثال صلیبیوں کے خلاف مسلمانوں کا اتحاد ہے۔

بشری نے لکھا ہے کہ وہ ان تمام اکائیوں کے وجود کے لئے سماجی وتہذیبی اہمیت کی وضاحت کرتے ہیں، اس لئے کہ فرعی اکائیوں کا وجود عام اکائیوں کو غذا دیتا ہے اور ان سے غذا حاصل کرتا ہے۔

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ فروعی اکائیوں کا وجود عام اکائیوں کی حیثیت واہمیت میں کمی کرتا ہے، انسان مدنی الطبع ہے، کوئی بھی فرد بغیر جماعت کے نہیں پایا جاتا ہے، فرد کو بلا جماعت تصور کرنا ایک فرضی تصور ہے، اس لئے کہ فرد ہمیشہ ان جماعتی اکائیوں میں سے کسی ایک یا زائد اکائیوں کے تحت ہوتا ہے، نظام ان اکائیوں، ان کی سرگرمیوں اور ان کے باہمی تعلقات سے اپنی زندگی حاصل کرتا ہے۔

معاشرہ کی زندگی، اپنی سرگرمی کو گونا گون بنانے کی اس کی صلاحیت، بدلتے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے پر اس کی قدرت درپیش چیلنجس کا مقابلہ کرنے کی اس کی استطاعت، یہ سب چیزیں انتساب کی ان اکائیوں کی سرگرمی پر منحصر ہے جو معاشرہ کے لئے مضبوط بندھن کی حیثیت رکھنے والی باہم دگر مربوط جماعتوں کی ان قسموں میں افراد کو مربوط کرتی ہیں اگر مصریت کمزور ہوگی تو وہ ایک وسیع اسلامی اتحاد کے پارہ پارہ ہونے کی صورت میں انگریز جماعت کا مقابلہ نہ کر سکے گی، یعنی وہ ایک ایسی خاص اکائی تشکیل نہ دے سکے گی جو زندگی اور مقابلہ کی صلاحیت رکھتی ہو، اگر اسلامیت اور عربیت کمزور ہوگی تو ہم عظیم عالمی مقابلوں میں اپنا مطلوبہ ہدف حاصل نہیں کر سکیں گے، ہم نے معاصر تاریخ میں دسیوں برس تک زبردست استقامت ومقابلہ کی ایک زبردست مثال پیش کی ہے، مقابلہ کی ایک صورت کو چھوڑ کر دوسری صورت اختیار کرنے کی لچک وصلاحیت کا مدار ان اکائیوں کی زندگی اور ان کی سرگرمیوں کی کیفیت پر موقوف ہے، ہرگز وہرگز ان اکائیوں میں سے کسی کو دوسری اکائیوں کی وجہ سے کمزور نہیں کرنا چاہئے، ہاں ہمیں ان کی ایسی ترتیب از سر نو قائم کرنی چاہئے جس کے ذریعہ یہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہو جائیں۔

فرعی جماعتیں ہی عام جماعت کی زندگی وسرگرمی کا منبع ہوتی ہیں، اگر ہم انتساب کی عام اکائیوں کو ان بالیوں کے مثل سمجھیں گے جن میں مختلف دانے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوتے ہیں اور جن میں بالکل ایک جیسی اکائیاں ہوتی ہیں جن میں گونا گوں وباہم تعاون نہیں پایا جاتا ہے تو ہم غلط کریں گے، اور یہ غلطی ہم سے ہوئی ہے۔

قومیت براہ راست افراد پر مشتمل نہیں ہوتی ہے، اسلامیت بھی براہ راست افراد پر مشتمل نہیں ہوتی ہے، مصریت، عراقیت یا مغربیت بھی براہ راست افراد پر مشتمل نہیں ہوتی ہیں، بلکہ یہ براہ راست انتساب کی ایسی اکائیوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک کی سرگرمی وزندگی کے اپنے سرچشمے ہوتے ہیں۔

اگر ہم اپنے معاشروں کو مغربی معاشروں کی بابت اپنے نظریات سے دیکھیں گے تو ہم غلطی کریں گے۔ حالات حاضرہ کے سیاق میں انتساب کے دائروں کو مطالعاتی تجزیہ کی اکائیاں مان کر کئے گئے بشری کی اس گفتگو سے دو نقاط واضح ہوجاتے ہیں:

۱۔ فرعی انتساب کی بہت سی اکائیاں تباہ ہوگئیں، یا تو اس کا سبب یہ تھا کہ مغربی استعمال ہمیں برباد کرنا چاہتا تھا، یا اس لئے کہ ہم نے جب انہیں مغربی نقطۂ نظر کی پیروی کرتے ہوئے یا اس نقطۂ نظر سے دیکھا جو ہمارے نزدیک مغربی معاشرہ کا سمجھا تھا تو ہمیں اپنے ادارے انتساب کی ایسی اکائیاں محسوس ہوئے جو اصلاح وتجدید کے لئے رکاوٹ تھے، پس ہم نے ''تجدید'' و''اصلاح'' کو ہی ختم کردیا۔

پھر جب ہم نے مغربی طرز پر یہ ڈھانچہ ترتیب دیا تو ہمیں ان فروعی تشکیلات نے وہ تعاون نہیں مل سکا جو نئے اداروں کے لئے مفید ہوتا۔

۲۔ ہم نے مغرب سے ماخوذ نظام پر اس کے اس فلسفی پس منظر میں غور کیا جو فرد سے آغاز کرکے براہ راست عام کلی تصور پر پہنچ جاتا ہے، مغرب میں فرد کی اہمیت کو بڑھایا گیا، تاکہ فرد کو ان اداروں سے نجات دلائی جاسکے جو اسے خود معاشرہ میں ہی پیدا ہونے والے دیگر اجتماعی اداروں سے وابستہ ہونے میں مانع تھے، اس طرح اسے غلامی سے نجات دلائی گئی، اور اسے اس بات کی آزادی دی گئی کہ وہ خود معاشرہ کی پیدا کردہ شہروں، کارخانوں، سوسائیٹیوں وغیرہ کی انتساب کی اکائیوں سے قریب ہوسکے، یعنی وہاں فردیت پر توجہ اس لئے نہیں مرکوز کی گئی تھی کہ لوگ بکھر جائیں، بلکہ ایسا اس لئے ہوا تھا کہ ان کے سامنے وابستہ ہونے کے لئے دیگر اکائیوں کے امکانات آجائیں۔

جبکہ ہم نے معاشرہ کا تصور اس طرح قائم کیا کہ فرد کا تعلق براہ راست قومی جماعت، ریاست یا پارٹی سے ہو، اس طرح ہم نے بیچ کی کڑیوں کو نظر انداز کردیا۔

اور جب پوری قوم افراد ہوگئی تو فرد بھی حاکم ہوگیا، اس لئے کہ اس کو قابو میں رکھنے کے ادارے پابند تھے، اور اس لئے کہ اس وقت انتساب کی بس ایک عام اکائی پائی جاتی تھی جو اسے دیگر افراد سے الگ مانتی تھی۔

حکیم بشری کا مقصود اس تصور کی تحدید کرکے شہریت کی تربیت تھی، اگر ہم تربیت کے اپنے نظام کو تشکیل اور سرگرم کرنا چاہیں تو ہم اس پروجیکٹ کے قواعد استعمال کرسکتے ہیں، بشری کے نزدیک شہریت کی تربیت ایسی متمدن تربیت کی شہریت نہیں ہے جو ایک ''عالمی شہری'' بنانا چاہتی ہے، اور اس طرح فرد کا تعلق وطن سے توڑ دیتی ہے، بشری کے نزدیک شہریت وطن کے ذریعہ ہی ہوتی ہے، یہ نظریہ استبداد اور بیرونی قبضہ کی ہر قسم کو روکتا ہے۔

۱۴۔ سیاسی جماعت کا جامع فقہی اصول:

یہ وضاحت بہت اہم ہے کہ فقہ اسلامی کا آغاز وارتقاء عرب ماحول میں ہوا، عراق، حجاز، شام ومصر میں جو مکاتب فکر سامنے آئے وہ بھی اسی بنیاد پر آئے، یعنی وہ فقہ ہے جسے عربوں کے لئے ترتیب دیا گیا ہے، یہ بتانا بھی بہت اہم ہے کہ یہ بات پہلے سنہوری نے بھی اپنے ایک مقالہ ''عرب سول قانون'' میں کہی ہے، اس فقہ پر عرب ممالک صدیوں عمل پیرا رہے ہیں، اس لئے یہ ان عناصر میں سے ایک ہے جو عرب اتحاد وتاریخی رابطہ کا سامنا ہم پہنچاتے ہیں، سول قانون کے ماہر ڈاکٹر شفیق شحاتہ نے ۱۹۶۰ء میں لکھا تھا کہ ''عرب ممالک کے زمانۂ عروج میں وہاں ایک ایسا قانون نافذ تھا جو ان ممالک کے باشندگان کے عقیدہ کی دین تھا، یعنی شریعت اسلامی، صدیوں اسلامی شریعت عرب زندگی کے مختلف گوشوں میں نافذ رہی، اب اگر ہم عرب ممالک کو ان کے اصل عناصر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے اس سرچشمہ سے استفادہ لازم ہوگا، تاکہ ہم اس سے حالات زمانہ کے مطابق نظام اخذ کرسکیں''۔

پھر عرب ممالک میں قانون سازی کے مصادر آج کل جیسے گوناگوں ہیں ان کے ہوتے ہوئے ان میں اتحاد پیدا کرنا بہت مشکل ہے، ان

میں سے کچھ قوانین لاطینی قانونی سے مستفاد ہیں، جیسے مصر، شام ولبنان کے قوانین کچھ قانون سکیس قوانین سے مستفاد ہیں، جیسے سوڈان کا قانون اور عراق کے کچھ قوانین، بعض قوانین شریعت سے مستفاد ہیں، جیسے سعودی عرب ویمن کے قوانین، کچھ قوانین میں تشریح اسلامی کو مغربی قوانین سے ملا دیا گیا ہے جیسے عراق کا سول قانون، بعض قوانین شرعی قوانین سے ماخوذ ہیں، جیسے سعودی عرب ویمن کے قوانین۔

دوسرے پہلو سے دیکھیں تو اسلامی قانون عربوں اور عرب ممالک میں آباد غیر عرب اقلیتوں (بربر اور کرد وغیرہ) کے درمیان ایک نقطۂ اتحاد بھی ہوسکتا ہے[۱]۔

''اللہ شیخ عبدالوہاب خلاف کو غریقِ رحمت کرے، جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کا قانون یا تو باہمی محبت پر مبنی ہوگا تو وہ وسعتوں والا ہوگا، یا پھر ٹکراؤ والا ہوگا تو تنگیوں کا باعث ہوگا، اس لئے کہ یہ ایک ایسی فرع ہے جو جماعت کے مصالح کی رعایت کرتی ہے اور ان امور میں اس کے تابع ہوتی ہے..... '' جدت وگونا گونی کی صلاحیت پائی جانے کی وجہ سے نفاذ شریعت کی بابت غور وفکر کرتے ہوئے تمام لوگوں کا یہ حق ہوگا کہ ان کے ساتھ اسلامی نقطہ ہائے نظر واضح کردیئے جائیں، قطعی احکام اور ان فقہی اجتہادات کے درمیان فرق کیا جائے جنہیں قبول ورد کیا جاسکتا ہے اور جن میں زمان ومقام کی رعایت سے تبدیلی کی جاسکتی ہے[۲]۔

۱۵۔ مقاصدی اصول اور شہریت کی از سرنو تعریف:

دین کلی مقاصد کے ایک نظام سے عبارت ہے جو دین کے اصولوں، نیز نفس، نسل، عقل ومال کی حفاظت کے لئے ہوتے ہیں۔

''دین اللہ پر ایسا ایمان پیدا کرتا ہے جو لوگوں کی دنیا حقیقی معنیٰ میں بناتا ہے، دین تہذیب ساز عقیدہ اور معاشرہ کی مربی عبادت بھی تشکیل دیتا ہے''۔ دین نام ہے: ایسی زندگی، طرز عمل اور قانون سازی کا جو صرف چند الفاظ روایات اور جامد مظاہر میں منحصر نہیں ہوتا ہے.....'' وہ زندگی کا اور گردوپیش کے حالات میں راہنما دین ہے۔

کوئی فی نفسہ صالح شخص اس وقت تک نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ اجتماعی اصلاح کی کوشش نہ کرے، معاشرہ کی اصلاح میں اس کی بھلائی ہے، اس طرح وہ خود بھی صالح ہوگا، دوسروں کو، اپنی جماعت کو اور اپنے معاشرہ کو صالح بنائے گا۔

دین کو نافذ کرنے کی کوشش کرنا اور اسے حاشیہ پر ڈالنے کی کوشش کرنا، دینی سرگرمیوں کو بڑھانا یا انہیں کم کرنا یہ تمام امور دین کے اقتدار اور مقتدرہ کے دین کے درمیان کی کشمکش کے مظاہر ہیں[۳]۔

چونکہ عام کلی مقاصد ایک علمی، تحقیقی اور منہجی ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں اور استفادہ وبرتنے کے میدان فراہم کرتے ہیں، اس لئے دین مقصد (حفاظتِ دین اہم تر مقصد ہے، اور دیگر مقاصد، یعنی حفاظت نفس، نسل، عقل ومال انسانی کی تعمیر کے عناصر ہیں، یہ قواعد ''انسانی گھر کے چار ستونوں پر تعمیر سے عبارت ہیں، ایسا ''انسانی ترقی'' یا ابن جلدوں کی تعبیر میں ''انسانی عمرانیات'' اور انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ رپورٹس کی زبان میں زندگی کی نوعیت کے عناصر کے تحت ہوتا ہے۔

دین کا یہ کلی مقاصدی نظریہ ان تمام میدانوں سے ماخوذ ہوتا ہے، اور یہ دین کے فعل، اس کی تفعیل اور اس کی فاعلیت سے متعلق ہوتا ہے: (وہ دین جس کی اتباع کی جائے، باعزت نفس، ایک سرگرم ومؤثر مضبوط نسل، مدبر سمجھ دار عقل، زمانہ کی سرسبزی اور عمرانیات رفتار بتانے والا مال)۔ یہ دین کے ہمہ گیری عام کلی مقاصدی نظریہ کا سسٹم ہے[۴]۔

---

[۱] طارق بشری، فی المسئلة الإسلامية المعاصرة... الوضع القانوني المعاصر بين الشريعة الإسلامية والقانون الوضعي، قاهره: دار الشروق، طبع اول، ۱۹۹۶ء، ص:۳۸۔

[۲] حوالۂ بالا، ص:۱۱۲۔

[۳] سیف عبدالفتاح، الزحف غير المقدس، تأميم الدولة للدين، ص:۱۰۲۔

[۴] سیف الدین عبدالفتاح، نحو واقع سدید۔

مقاصدی نقطہ نظر سے شہریت:

دین سے صرف نظر کئے بغیر شہریت کی سرگرمی:

شہریت کی مقاصدی تاسیس	مقاصد کے مراتب مقاصد کے میدان	دفع ضرر جلب مصلحت پر مقدم ہے	ضروری	حاجی	تحسینی	اہمیت جاننے کے عناصر
شہریت اور دین	حفاظت دین، پالسیز، ادارے تعلقات، صلاحیتیں امکانات اہداف	دفع ضرر۔ سلبی حفاظت	شہریت کی ضروریات (کفاف)	شہریت کی حاجیات (کفایت)		شہریت کی تحسینیات (تکمیل، احسان)
شہریت اور انسان کے بنیادی حقوق	حفاظت نسل					
شہریت اور نسانی ترقی انسانی کی عمرانیات	حفاظت نسل					
شہریت اور فہم و آگہی	حفاظت عقل					
شہریت اور معاشیات	حفاظت مال					

۱۶۔ سماجی تعلقات کے نظام کی تاسیس: ایک معاشرہ کی تشکیل:

فرد و معاشرہ کے درمیان تعلق کے سیاق میں[1] اس تعلق کو ایک ایسے ماڈل کے تحت تشکیل دیا جاسکتا ہے جو جماعت اور جماعیت کے مقام کی حفاظت کے ساتھ فرد کا تحفظ کرنے والے تعلقات کو منظم کرتا ہے، یہ نظام جہد فرد و جماعت کے درمیان مطلوبہ توازن پیدا کرتا ہے، وہیں وطنی جماعت اس ماڈل کی تشکیل کے لئے بہت اہم عناصر تشکیل دیتی ہے۔

اس نظام کو ہم کشتی والا ماڈل کہہ سکتے ہیں، اس سے مراد وہ ماڈل ہے جو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''حدود خداوندی کا لحاظ کرنے والوں اور ان کا لحاظ نہ کرنے والوں کی مثال ایک ایسی قوم کی ہے جنہوں نے ایک کشتی پر سوار ہونے کے سلسلے میں قرعہ اندازی کی، بعض لوگوں کو اس کی بالائی منزل میں جگہ ملی تو کچھ کو زیریں میں، نیچے والوں کو پانی لینے کے لئے اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا، اس لئے انہوں نے کہا کہ اگر ہم اپنے ہی حصہ میں سوراخ کرلیں تو ہم اوپر والوں کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے، اگر اوپر والوں نے ان کو ان کے اس ارادہ سے باز نہ رکھا تو سب سوار ہلاک ہوجائیں گے، اور اگر انہوں نے ان کو ایسا کرنے سے روک دیا تو سب بچ جائیں گے (بخاری)۔

یہ حدیث موقفوں اور احکام کا ایک مکمل نظریہ و نظام پیش کررہی ہے، جس سے تحقیقی مقصد تک پہنچنے کے لئے چہ جائیکہ سماجی، تربیتی و تہذیبی اہداف تک پہنچنے کے لئے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔

[1] مالك بن نبي، ميلاد مجتمع۔ (شبكة العلاقات الاجتماعية)، ترجمه: عبدالصبور شاهين، قاهره، مطبع دار الجهاد، ۱۹۶۲ء۔

۱۷۔ تربیتی اصول: ایک مشترکہ زندگی:

اس بنیادی مقصد کے حصول کے لئے مکالمہ کے ذریعہ سماجی تانے بانے اور ایک زندگی کی اصول سازی کے مقصد سے شہریت کے ذریعہ وطنی جماعت میں داخلہ کے دائرہ میں ایک زندگی۔ ایک ایسے دائرہ میں جو مشترکہ زندگی اور باہمی تعارف کے اصول بناتا ہے۔

مشترکہ زندگی فردیت، جماعت، گروہ، انضمان اور علیحدگی جیسے افکار سے مختلف نہیں ہے، اسی طرح یہ مشترک کی تعظیم، کی تنظیم اور تنوع کی تکمیل کے امکانات سے بھی دور نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تمام امور اختلاف کی جگہ اتحاد کا طریقہ اختیار کرنے سے عبارت سمجھے جاتے ہیں[۱]۔

۱۸۔ وطنی جماعت کی تاسیس کے اصول (اقلیت، تعدد، شہریت اور وطن):

وطن کے ذریعہ شہریت کے اتحاد کو جاننا بہت ضروری ہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم وطنی جماعت کی تاسیس کے اصول اس میں ضم ہونے کے قواعد، اور خود اس جماعت کے ذریعہ اپنی تاریخ، عرفوں اور اپنے عام نظام کے قواعد کی روشنی میں طے کردہ سرگرمیوں میں اضافہ کو جانیں، مثلاً حکیم بشری نے لکھا ہے: اگر مصر کی معاصر تاریخ سے کوئی قاعدہ وطنی جماعت کی تشکیل، اور اس کے اندر اس کے متعدد گونا گوں عناصر کے انضمان کی بابت بنایا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس وطنی جماعت کے عناصر بیرونی خطرات سے حفاظت، اور اپنی اراضی، اپنے فکری ثوابت، اور اپنی دور گامی معاشی وسیاسی مصلحتوں سے دفاع کے لئے اپنے اجتماعی شعور کے بعد ہی باہم معاون ہوتے ہیں۔

بیرونی خطرات اس اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم وہ اقوام ہیں جن کی وطنی جماعت نے بیرونی خطرات سے اپنا اور جماعتی ورثہ کا دفاع اتحاد کے ساتھ کیا ہے، خارجی اثرات جس قدر بڑھتے ہیں علیحدگی کا رجحان اتنا ہی طاقتور ہوتا ہے، اور اس خارجی نفوذ کے وطنی مقابلہ کی طاقت کے ساتھ انضمان کا رجحان بڑھتا ہے[۲]۔

اس موقعہ پر چند ان عناصر سے واقف ہوا جاسکتا ہے جن کی طرف یہ قانون اشارہ کرتا ہے:

۱۔ وطنی جماعت کی تشکیل، اور اس کے متعدد ومتنوع عناصر کا انضمان۔

۲۔ خارجی خطرات سے حفاظت کے سلسلے میں وطنی جماعت کا اتحاد

۳۔ وطنی جماعت، اس کی صلاحیت اور اس کے تسلسل کے کچھ بالادست عام قواعد ہیں۔

۴۔ خارج بسا اوقات اتحاد توڑنے میں کردار ادا کرتا ہے۔

۵۔ خارجی نفوذ کے بڑھنے کے ساتھ علیحدگی کا رجحان بڑھتا ہے، اور وطن کو درپیش مسائل، خطرات و چیلنجس کے مقابلہ کے لئے وطنی اتحاد وقوت مقابلہ کے ساتھ انضمان کا رجحان بڑھتا ہے۔

اس پس منظر میں مسلمانوں اور قبطیوں کے درمیان اتحاد کا سر رشتہ ڈھونڈا جاسکتا ہے، اہم ترین بات یہ ہے کہ مسلمان قبطیوں کو علیحدہ نہ کریں، وہ ان کو الگ تھلگ نہ کریں، یہ پوری وطنی جماعت کی مشترکہ ذمہ داری ہے، اس لئے کہ اس کی توجہ کا مرکز صرف وطن اور شہریت کو ہونا چاہئے، کہ یہ دونوں فرقہ وارانہ فتنہ کے عناصر سے حفاظت کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کسی بھی معاشرہ وجماعت کو اس کے بقدر مالدار سمجھنا چاہئے کہ بقدر غنی نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ اسے اس کے سرگرم مثبت ومفید افکار کے بقدر مالدار سمجھنا چاہئے، اور افکار کی سرگرمی تعلقات کے نٹ ورک کے تابع ہوتی ہے، لہذا ان ضروری تعلقات کے بغیر اشخاص، افکار واشیاء کے ملتے جلتے عمل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، تعلقات جس قدر محکم ہوں گے عمل اتنا ہی مؤثر ہوگا، جب اشخاص اور نظام افراط کا شکار ہوں گے تو سماجی تعلقات فاسد ہوں گے، اور مشترکہ سماجی عمل مشکل یا ناممکن ہوجائے گا، کہ پھر مباحثہ مسائل کے حل کے لئے نہیں باہمی لڑائی جھگڑے کے لئے ہوگا، صحت مند صورت حال میں مسائل پر مباحثہ ان کے حل کے لئے ہوتا ہے، بصورت دیگر ان پر مباحثہ باہمی اختلافات بھڑکاتا ہے، اور ایسی صورت میں ان کا حل مشکل ہوجاتا ہے، ایسا افکار واشیاء کے دیوالیہ پن کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ تعلقات کا نظام فطری رخ پر قائم نہیں ہوتا ہے۔

---

[۱] سیف عبد الفتاح، التربية المدنية۔

[۲] طارق بشرى، فى المسألة الإسلامية المعاصره... الوضع القانونى المعاصر، ص:۳۸۔

شہریت اور پناہ گزینوں سے متعلق حقوق

سیرت نبوی کی روشنی میں، اور بین الاقوامی قوانین سے موازنہ کے ساتھ

ڈاکٹر رشید کھوس[1]

مقدمہ

الحمد لله الذی جعل مدد النبوة مستمرة السريان فی الامة، وأبقى نورهادائم الاشراق فضلا منه ورحمة. وأشهد أن لااله الاالله خالق الارض والسموات، وأشهد أن سيدناوحبيبناوشفيعنامحمدا المبعوث الى كافة البريات صلى الله عليه وعلى آله الطيبين وأصحابه المكرمين وأزواجه الطاهرات۔

امابعد!

اللہ تعالی فرماتے ہیں: ''ولقدكرمنابنی آدم وحملناهم فی البروالبحر ورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على كثيرممن خلقناتفضيل'' (سورہ اسراء: ۷۰)۔ (اور یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی ہے اور انہیں خشکی اور تری کی سواریاں دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دی اور اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی)۔

اللہ تعالی نے دین اسلام کو جو کہ تمام شریعتوں کا خاتم ہے، ان تمام تعلیمات کا حامل بنایا ہے جو انسان کی پوری زندگی کے لئے کافی ہے، نیز جو ہر انسان کے لئے متعین حقوق کی ایسی وضاحت کرتا ہے جو شک اور اختلاف سے دور ہے، اور جو انسان کو مقام بلند عطا کرتا ہے، اور انسان کے لئے ایسے حقوق کو لازم قرار دیتا ہے جو کافی ہے اور بلندی کو پہونچا ہوا ہے۔

جن حقوق کو اسلام نے نظری اور تطبیقی دونوں اعتبار سے مقرر کیا، اور انہیں اس حد تک ترقی دی کہ انہیں دین کا لازمی اور ضروری حصہ قرار دیا جس میں خلل ڈالنا حرام ہے، انہی حقوق میں شہریت اور پناہ گزینوں کے حقوق بھی ہیں، یہ حقوق انسانیت کی تکریم، ان کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنے اور سیاسی حد بندیوں سے قطع نظر عام انسانی بھائی چارہ کا احساس دلانے کے لئے ہیں۔

ان حقوق کا سرچشمہ اسلامی شریعت کے متعدد مصادر ہیں، اور ان کا مقصد مصالح کو بروئے کار لانا، مفاسد کو دور کرنا، انسان کے ساتھ ہمدردی اور زمین میں

---

[1] پروفیسر: کلیۃ اصول الدین، جامعۃ القرویین، تطوان، مراکش۔
صدر: مرکز آل عمران للدراسات والبحوث فی فقہ الاسرۃ والتغیرات المعاصرۃ
صدر: مجموعۃ البحث فی السنن الالٰہیۃ فی القرآن والسنۃ والتاریخ، کلیۃ اصول الدین، تطوان
رکن: الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین
رکن: الہیئۃ العالمیۃ لفعالیۃ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدولیۃ
رکن: اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔
مترجم: منور سلطان ندوی (رفیق علمی دارالافتاء، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

خلافت کو یقینی بنانا ہے۔

اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت کے تناظر میں ہم نے اس کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، تا کہ شہریت اور پناہ گزینوں سے متعلق اسلامی تصور کے نقوش کو سامنے لایا جائے، کیونکہ یہ انسانی حقوق کے ان اہم مسائل میں سے ہیں جن کی طرف اس زمانہ میں ادارے، سرکاری وغیر سرکاری تنظیمیں اور حقوق سے متعلق جماعتیں خاص توجہ دے رہی ہیں، نیز یہ ان مسائل میں سے ہیں جن کے صحیح و مکمل اور جامع تصور کو اسلامی شریعت اور فقہ الواقع سے مستفاد رائے کی روشنی واضح کرنا ضروری ہے۔

اس مقالہ کو ہم نے دو مرکزی محاور میں تقسیم کیا ہے:

پہلا محور شہریت سے متعلق حقوق کے لئے خاص ہے، اس باب میں اسلام میں شہریت کے معنی اور معاہدۂ مدینہ کی روشنی میں شہریت کے حقوق ذکر کیا ہے، کیونکہ معاہدۂ مدینہ پوری شہریت کا عمدہ نمونہ ہے۔

آخری محور پناہ گزینوں کے حقوق پر مشتمل ہے، اس باب میں پناہ گزینی کے معنی اور اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں پناہ گزینوں کے حقوق کو بیان کیا ہے، اور اخیر میں پناہ گزینی کے خاتمہ کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس تمہید کے اختتام پر اسلامک فقہ اکیڈمی کا شکریہ ادا کرنا اور اسلامی شریعت کے تئیں ان کی گراں قدر خدمات پر مبارک باد پیش کرنا ضروری ہے، اور خاص طور پر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، محترم مولانا امین عثمانی ندوی صاحب اور اکیڈمی کے تمام رفقاء کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور دست بدعا ہوں کہ اللہ عزوجل آپ تمام حضرات کی کوششوں کو آپ کے حسنات میں شامل فرمائے، آپ کے ذریعہ امت کو خوب خوب نفع پہونچے اور جہالت کے پردے چاک ہوں۔

اللہ تعالی سے ہم توفیق، راستی اور ہدایت طلب کرتے ہیں، بیشک وہی سب سے زیادہ سننے والا اور سب سے زیادہ قبول کرنے والا ہے۔

پہلا محور: شہریت کا اسلامی تصور

ا۔ اسلام میں وطن کی حیثیت

لفظ 'مواطنة' عربی زبان میں وطن کی جانب انتساب میں شرکت اور وطن کے حقوق کی ادائیگی کو بتاتا ہے، لغوی اعتبار سے مفاعلت کا صیغہ دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی عمل کی ادائیگی میں شرکت کو بیان کرتا ہے، جیسے لفظ مجادلہ اور مناقشہ وغیرہ، 'مواطنة' کے تین عناصر ہیں، وطن، وطن میں رہنے والے، اور وطن کی طرف انتساب میں شعوری اور عملی شرکت، وطن سے متعلق حقوق کی ادائیگی، وطن کا دفاع اور اس کی ترقی کے لئے کوشش وغیرہ۔

شہریت سلامتی، امان اور باہم زندگی گزارنے کے اہم ترین قدروں میں سے ہے، جو وطن سے متعلق ذمہ داریوں، اور وطن کی طرف نسبت کی ذمہ داری کے احساس پر قائم ہے، یہ محض قیام کرنے یا کہیں رہنے کے مفہوم سے بڑھ کر ہے۔

اسلامی تناظر میں وطن اس جگہ کو کہتے ہیں جسے انسان وطن بنائے، جہاں رہے، قیام کرے، اور جس کی طرف نسبت کرے، کبھی اس لفظ کی وسعت میں قوم اور امت بھی شامل ہوتی ہے، اور کبھی یہ لفظ اس قدر تنگ ہوتا ہے کہ صرف ایک خاندان کے جائے قیام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، ایک خاتون نے اپنے قبیلہ کی زمین کا دفاع کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

''وهي وطني وداري'' (سنن ابی دائود، کتاب الخراج الفئی والامارة، باب ماجاء فی أقطاع الأرضین، حدیث نمبر: ۳۰۷۰)۔

قرآن واحادیث میں لفظ 'موطن' متعدد بار آیا ہے، یہ لفظ عموماً ایسی جگہ کو بتاتا ہے جہاں انسان رہتا ہے اور جسے مستقر بناتا ہے یا جہاں واقعات پیش آتے ہیں، اسی مفہوم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''لقد نصركم الله في مواطن كثيرة'' (سورہ توبہ: ۲۵) (بے شک اللہ تعالی نے بہت سے موقعوں پر تمہاری نصرت کی ہے)۔

اور اسی مفہوم میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے: ''مامن امرئ يخذل امرأ مسلما عند موطن تنتهك فيه حرمته وينتقص فيه من عرضه إلا خذله الله عزوجل في موطن يحب فيه نصرته ومامن امرئ ينصر امرأ مسلما في موطن ينتقص فيه من عرضه وينتهك فيه من حرمته إلا نصره الله في موطن يحب فيه نصرته'' (مسند احمد بن حنبل، ۴؍۳۰، ص: ۲۸۸)

(جو شخص کسی مسلمان کو ایسے وقت رسوا کرتا ہے جب اس کی بے عزتی کی جارہی ہو تو اللہ تعالی اس آدمی کو اس وقت ذلیل وخوار کرتا ہے جب وہ اللہ کی مدد کا طالب ہوتا ہے، اور جو شخص کسی مسلمان کی ایسے موقعہ پر مدد کرتا ہے جب اس کے عزت سے کھلواڑ کیا جارہا ہو تو اللہ تعالی اس شخص کی اس وقت نصرت فرماتے ہیں جب وہ اللہ کی نصرت کا طلبگار ہوتا ہے)۔

مزید یہ کہ وطن سے نکالنے کو قرآنی نصوص قتل سے کم تصور نہیں کرتا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیئاتھم ولأدخلنھم جنات تجری من تحتھا الانھار ثوابا من عند اللہ واللہ عندہ حسن الثواب'' (سورہ آل عمران: ۱۹۵)۔ (جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے شہر سے نکالے گئے اور بھی تکلیفیں انہیں میری راہ میں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے ان کی خطائیں ضرور ان سے معاف کردی جائیں گی، اور میں ضرور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اللہ کے پاس سے ثواب ملے گا اور اللہ ہی کے پاس تو بہترین ثواب ہے)۔

اور وطن سے نکالنے کو روح نکالنے کے مساوی قرار دیتا ہے: ''ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم أو اخرجوا من دیارکم مافعلوہ الا قلیل منھم'' (سورہ نساء: ۶۶)۔ (اور اگر ہم نے ان پر فرض کردیا ہوتا کہ اپنے آپ کو مار ڈالو یا یہ کہ اپنے وطن سے نکل جاؤ تو اس کو بس تھوڑے لوگ ہی کرتے)۔

اسی طرح دین کی نصرت کی خاطر زبردستی وطن سے نکلنے کو ایثار کا اعلی مرتبہ قرار دیتا ہے، اور یہ بات تاکید کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ جو اپنے وطن سے نکلتا ہے وہ اللہ کی نصرت کا مستحق ہوتا ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں: ''الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا أن یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ قوی عزیز'' (سورۂ حج: ۴۰)۔ (یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دئے گئے، ان کا کوئی جرم نہ تھا، اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے، اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا تو کسی قوم کی عبادت زمین پر محفوظ نہ رہتی، خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جاچکے ہوتے، جو کوئی اللہ کی حمایت کرے گا اللہ اس کی مدد ضرور فرمائے گا، بیشک وہ قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے)۔

لفظ 'موطن' شہر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اور وہ ایسی جگہ ہے جس سے انسان شعوری طور پر وابستہ ہوتا ہے اور اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں وطن کی محبت پوری طرح راسخ تھی، چنانچہ جب آپ کی قوم آپ کی زندگی کے درپے ہوگئی اور آپ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تو مکہ کو الوداع کہتے ہوئے فرمایا: ''ما أطیبك من بلد واحبك إلی ولولا أن قومی اخرجونی منك ماسکنت غیرك'' (سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب فی فضل مکۃ، حدیث نمبر: ۳۹۲۶)۔

اور مدینہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد جب صحابہ کرامؓ کو وطن سے جدائیگی کا غیر معمولی احساس ہوا اور اپنے وطن مکہ کے لئے ان کا اشتیاق بڑھنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے یہ دعا فرمائی: ''اللھم حبب إلینا المدینۃ کحبنا مکۃ أو أشد'' (صحیح البخاری، کتاب فضائل مدینۃ، باب کراھیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تعری المدینۃ، حدیث نمبر: ۱۷۹۰)۔

اسلام کا شہریت سے جو رشتہ ہے وہ اس بات کو لازم قرار دیتا ہے کہ اسے شریعت کے کلی مقاصد اور سماجی تعلقات کے تصور میں تلاش کیا جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اسے شرعی نصوص اور فرد کے سماجی نظام سے متعلق جزئی احکام میں تلاش کیا جائے۔

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ شہریت کے فروغ کے سلسلہ میں اسلام کی کوششیں تمام تر اس کے اس خاص اسلوب سے ہم آہنگ ہیں جو اس نے اخلاقی قدروں کو ثابت کرنے میں اپنایا ہے، وہ اسلوب یہ ہے کہ جس بات کی رہنمائی کی جائے اسے عبادت کے لبادہ میں پیش کیا جائے، تاکہ اللہ کی اطاعت سمجھ کر فرد اسے قبول کرے، اور اس کی عدم ادائیگی اللہ کی معصیت قرار پائے، یہ بات شہریت سے متعلق احکام میں زیادہ لزوم پیدا کرتا ہے، بنسبت اس کے کہ اس میں سے عبادت کا مفہوم نکال دیا جائے، اور یہ اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے جو اس نے معاشرہ کی اصلاح میں اختیار کیا ہے۔

شہریت سے اسلام کا تعلق اس سے بھی پوری طرح واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''حلف الفضول'' کو پسند فرمایا، اس معاہدہ میں آپ بذات خود اپنے

عہد شباب میں شریک ہوئے، اسلام سے قبل قریش نے یہ معاہدہ کیا، اور اس کا نام حلف الفضول اور حلف المطیبین رکھا گیا، اس معاہدہ کا پس منظر یہ ہے کہ جب قریش کے بعض سربرآوردہ لوگوں نے دیکھا کہ ان کے بعض افراد اپنے سماجی مقام ومرتبہ کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں پر ظلم کرنے لگے ہیں، عاص بن وائل بھی ایسے لوگوں میں تھے، اس نے کسی پردیسی تاجر سے جو مکہ آیا ہوا تھا کچھ تجارتی سامان خریدا، اور پھر قیمت ادا کرنے سے انکار کردیا، چنانچہ قریش عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے اور تمام لوگوں نے یہ معاہدہ کیا کہ وہ ظالم کے مقابلہ میں ہر مظلوم کے ساتھ متحد ہوں گے، ان لوگوں نے پردیسی تاجر کو قیمت دلوایا، اس معاہدہ میں ان کی روش سے مظلوموں کے ساتھ انصاف کرنے اور ان کے حقوق کا مطالبہ کئے جائے کا اصول ثابت ہوا، خواہ یہ حق قوم کے چودھریوں اور رہنماؤں سے متعلق ہی کیوں نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاہدہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم ولو ادعى به في الإسلام لاجبت'' (سنن البیہقی ۵، ۵۹۶، حدیث نمبر: ۱۳۰۸۰)۔

اور جن احکام سے شہریت کے حقوق اور معاشرہ سے تعلق پر اسلام کی توجہ اور خواہش ظاہر ہوتی ہے ان میں یہ بھی ہے کہ عبادت کا خاص تعلق معاشرہ اور اس معاشرہ کے افراد سے ہوتا ہے، گرچہ عبادت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ بندہ اپنے رب اور خالق سے تعلق استوار کرتا ہے [illegible]ت کا معاشرہ اور سماج سے تعلق اس طرح بھی واضح ہے کہ بعض عبادات اسی وقت کامل طریقہ پر ادا ہوسکتی ہیں جب وہ لوگوں کی ایک جماعت کے ساتھ ادا کی جائیں، گویا لوگوں کا ساتھ ہونا اس عبادت کی شرائط میں سے ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة'' (صحيح البخاری، کتاب الاذان، باب وجوب صلاة الجماعة، حدیث نمبر: ۶۱۹)۔

بعض عبادتوں کی ادائیگی دوسروں سے تعلق قائم کرنے پر موقوف ہے، اس کی مثالوں میں یہ ہے کہ اسلام میں توبہ، اللہ تعالیٰ کی طرف یکسوئی اور بعض گناہوں کے ارتکاب کے بعد اللہ سے تعلق استوار کرنے کے لئے بعض کفارے متعین کیے گئے ہیں، اور یہ کفارے معاشرہ کے کچھ افراد کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کے ذریعہ ہی ادا ہوسکتے ہیں، اس کا طریقہ ان کو کھانا کھلانا، کپڑا پہنانا اور غلامی کے طوق سے آزادی دلانا ہے، کفارہ کی حکمت سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ توبہ اور اللہ سے تعلق کا استوار ہونا معاشرہ کے بعض افراد کے ساتھ گھلنے ملنے اور ان کی تکالیف ومشکلات کو کم کرنے نیز ان کی لغزشوں کو معاف کرنے کے بغیر نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لا يؤاخذكم الله باللغو في أيمانكم ولكن يؤاخذكم بما عقدتم الأيمان فكفارته إطعام عشرة مساكين من أوسط ما تطعمون أهليكم أو كسوتهم أو تحرير رقبة'' (سورہ مائدہ: ۸۹)۔ (اللہ تم سے تمہاری بے معنی قسموں پر مواخذہ نہیں کرتا، لیکن جن قسموں کو تم مضبوط کرچکے ہو ان پر تم سے مواخذہ کرتا ہے، تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو، انہیں کپڑا دینا یا غلام آزاد کرنا ہے)۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ متعدد عبادتوں، قربت کے اسباب اور طاعتوں میں دوسروں کو یاد رکھنے کا حکم موجود ہے، مثلاً زکوۃ، اور نفلی صدقات وخیرات وغیرہ، اس طرح کے احکام اتنے زیادہ ہیں کہ دوسرے مذاہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله والله عليم حكيم'' (سورہ توبہ: ۶۰)۔ (صدقات تو صرف غریبوں کا اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق ہے جو ان پر مقرر ہے اور نیز ان کا جن کی دلجوئی منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور قرضداروں میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی امداد میں اللہ کی طرف سے فرض ہے، اور اللہ بڑا علم والا اور بڑا حکمت والا ہے۔)

مزید یہ کہ اسلام معاشرہ کے تمام عناصر کے ساتھ اجتماعی تکافل کی دعوت دیتا ہے تاکہ معاشرتی ترقی ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ''وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب'' (سورہ مائدہ: ۲)۔ (اور ایک دوسرے کی مدد نیکی اور تقوی میں کرتے رہو، اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے)۔

سماجی ومعاشرتی امور میں شرکت لازم ہونے کی شکلوں میں سے قسامہ کا مسئلہ بھی ہے، جیسا کہ ابن حمزہ نے بیان کیا ہے، قسامہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب کسی آبادعلاقہ کے کسی محلہ میں کوئی مقتول پایا جائے اور قاتل معلوم نہ ہو تو حکم یہ ہے کہ وہاں کے باشندوں میں سے پچاس افراد منتخب کئے جائیں گے جو اس بات کی قسم کھائیں گے کہ انہوں نے مقتول کو قتل نہیں کیا ہے، اور وہ لوگ قاتل کے بارے میں نہیں جانتے ہیں، اس وقت محلہ کے تمام افراد پر قتل کی دیت لازم

ہوگی، اگر یہ کہا جائے کہ جولوگ قتل کا ذریعہ نہیں بنے وہ دیت کیوں ادا کریں گے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ محلہ کے لوگوں نے امن فراہم کرنے میں کوتاہی کی ہے، انہیں امن فراہم کرنا چاہیے تھا خواہ پہرے دار رکھ کر ہی ہو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امن فراہم کرنے میں پورے معاشرہ کی شرکت ضروری ہے، جس سے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتے، موجودہ دور میں امن قائم کرنے اور سکون فراہم کرنے کے سلسلہ میں بعض آلات بھی آچکے ہیں۔

اسلام جن احکام کے ذریعہ شہریت کی ثقافت اور اجتماعی ذمہ داری کو پختگی عطا کرتا ہے ان میں یہ بھی ہے کہ اسلام میں فرائض کی دو تقسیم ہے، فرائض کفائی، اور فرائض عینی، فرائض عینی کا تعلق براہ راست افراد سے ہوتا ہے، اور فرائض کفائی کا تعلق سماجی ڈھانچہ سے، اور جب بعض افراد اس کو انجام دے دیتے ہیں تو بقیہ افراد سے ذمہ ساقط ہو جاتا ہے، لیکن جب معاشرہ کے سارے افراد کوتاہی برتیں تو سب کے سب گنہ گار ہوں گے۔

اس بنیاد پر فرائض کفائی کی ادائیگی دراصل پورے معاشرہ کی طرف سے ادائیگی کے قائم مقام ہوتی ہے، اور اس میں وہ تمام سماجی امور شامل ہوتے ہیں جن کی ادائیگی معاشرہ کی ضرورت کے پیش نظر مطلوب ہوتی ہے، خواہ اس ضرورت کا تعلق امن سے ہو، صحت سے ہو، علم سے ہو، ترقی سے ہو، انصاف کے قیام سے ہو، یا اسلامی معاشرہ میں بہتر زندگی کے تقاضوں کی تکمیل سے ہو۔

اور جن احکام سے شہریت سے متعلق تعلیمات کے فروغ میں اسلام کی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے ان میں یہ بھی ہے کہ اسلام مسلمانوں کو اچھائی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے کو لازم قرار دیتا ہے، قرآن کریم نے اس اہم فریضہ کو امت کی بہتری کا سبب قرار دیا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے: ''كنتم خير امة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله'' (سورہ آل عمران: ۱۱۰)۔

سید قطب شہیدؒ تحریر فرماتے ہیں:

امت مسلمہ کو اس ذمہ داری کا ادراک ہونا چاہیے، اسی صورت میں وہ اپنی حقیقت اور اپنی قدر و قیمت سے واقف ہو سکتی ہے، وہ اس لئے وجود میں لائی گئی ہے کہ وہ انسانیت کے لئے ہراول دستہ بنے، اور قیادت اس کے ہاتھ میں ہو، یہ اس لئے کہ وہ بہترین امت ہے، اور اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ اس زمین میں قیادت اچھے افراد کے ہاتھ میں ہو، برے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں، اس لئے یہ بات اس امت کے شایان شان نہیں کہ وہ جاہلی امتوں سے ہدایات اخذ کرے، بلکہ اس کی حالت تو یہ ہونی چاہیے کہ وہ ہمیشہ دوسری امتوں کو دینے کی پوزیشن میں ہو، اور ہمیشہ ان کے پاس وہ رہنمائی ہونا چاہیے جو وہ دوسروں کو دے سکے، صحیح عقیدہ، صحیح فکر، صحیح نظام، اچھے اخلاق، صحیح کردار، صحیح معرفت، صحیح علم، یہ وہ فریضہ ہے جو اس کا مقام اور اس کا مقصد وجود اس پر عائد کرتا ہے۔

امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہمیشہ سب سے آگے رہے، اور ہمیشہ قیادت کے مرکز میں رہے، مرکز قیادت میں رہنے کی کچھ ذمہ داریاں ہیں، یہ ذمہ داری محض دعووں سے حاصل نہیں ہوتی، اور نہ یہ منصب بغیر اہلیت کے ملتا ہے، بلاشبہ امت مسلمہ اپنے اعتقادی فکر اور اپنے اجتماعی نظام کے ذریعہ اس منصب کی اہلیت رکھتی ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ خلافت ارضی کا حق ادا کرتے ہوئے وہ علمی ترقیات اور زمین کی آبادکاری و تعمیر کے ذریعہ اپنی اہلیت قیادت ثابت کرے، یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ امت جس نظام کی علمبردار ہے وہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہے اور اس سے ہر میدان میں آگے بڑھنے کا تقاضا کرتی ہے، بشرطیکہ وہ اس کی پابندی کرے، اور اس منصب کے تقاضوں اور اس سے متعلق ذمہ داریوں کے احساس کا ادراک کرے۔

اس منصب کے اولین تقاضوں میں سے یہ ہے کہ امت مسلمہ زندگی کو شر اور فساد سے بچانے لئے اٹھ کھڑی ہو، اور اس کے پاس ایسی طاقت ہو جس کے ذریعہ اچھائی کا حکم اور برائی سے روکنے کا عمل انجام دے، کہ یہ خیر امت ہے جو لوگوں کی بہتری کے لئے مبعوث کی گئی ہے، امت کا اس منصب پر تقرر کسی رواداری یا اتفاق کی بنا پر نہیں ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے بہت بلند ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں خصوصیات اور اعزازات کی تقسیم اس طرح نہیں ہوتی، جیسے اہل کتاب کہتے تھے: ''نحن ابناء اللہ واحباءہ'' کہ ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں، بلکہ امت مسلمہ کو خیر امت قرار دیا جانا ایک مثبت اور ایجابی عمل ہے، تاکہ امت کے ہاتھوں حیات انسانی کو منکر سے بچایا جائے اور معروف کے راستہ پر گامزن کیا جائے، اسی کے ساتھ ایمان لازمی ہے، کیونکہ ایمان سے ہی معروف اور منکر کی تحدید و تعیین ہوتی ہے "تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله" (آل عمران: ۱۱۰)۔

خیر امت کی یہ ذمہ داریاں ہیں، جن سے اسے عہدہ برآ ہونا ہے، حالانکہ یہ ذمہ داریاں اپنے ساتھ مصائب و مشکلات لاتی ہیں، یہ راہ کانٹوں سے بھری

ہے، دراصل شر کو روکنا، خیر پر آمادہ کرنا اور معاشرہ کو بگاڑ کے اسباب سے روکنا گرچہ دشوار اور تھکا دینے والا ہے لیکن صالح معاشرہ کے قیام، اور اس کی صالحیت کے تحفظ کے لئے ان ذمہ داریوں کا ادا کرنا ضروری ہے، اور اسی طرح زندگی کی وہ شکل قائم و برپا ہوسکتی ہے جسے اللہ تعالی پسند کرتا اور محبوب رکھتا ہے (فی ظلال القرآن، ۱/ ۴۴۷)۔

جس معروف کی طرف مسلمانوں کو دعوت دینا ضروری ہے اس میں ہر طرح کے انفرادی اور اجتماعی مصالح کی تکمیل شامل ہے، اور اسی میں ذمہ داری کو ادا کرنے کی دعوت، علم حاصل کرنے کی دعوت، وطن سے متعلق حقوق کی ادائیگی کی دعوت اور اخلاقی قدروں کی پابندی کی دعوت بھی ہے، اور منکر سے روکنے میں تمام دینی منکرات اور شرعی محرمات کے ساتھ دنیوی منکرات بھی شامل ہیں، اور انہی میں ہر طرح کے انتظامی، اخلاقی و معاشی فساد و بگاڑ اور شعبہ کو نقصان پہونچانے کی ہر صورت اور ماحول کے اجزاء ترکیبی کو تباہ کرنے کی ساری شکلیں، اس کے علاوہ وہ تمام ناشائستہ حرکتیں اور فساد و بگاڑ کی شکلیں جن کا مسلمان اپنے رضا کارانہ اعمال کو انفرادی یا اجتماعی طور پر انجام دینے، بازاروں اور پیشوں کے لئے محتسب اور نگرانوں کی تقرری میں ارتکاب کرتے ہیں، شامل ہیں۔

خلاصہ یہ کہ شہریت سے متعلق اسلامی تصور اور مغربی تصور کے درمیان واضح فرق ہے، مغربی تصور میں شہریت کا مفہوم انفرادی فلسفہ پر منحصر ہے، جو فرد کو خاص اہمیت دیتی ہے، (بایں طور کہ مغربی قانون کی تشکیل میں فرد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے) جبکہ شہریت کا اسلامی تصور جماعت کے اس مفہوم پر انحصار کرتا ہے جو دینی توجہ کی بنیاد اور اصل ہے، تمام عملی اور فکری میدانوں میں فرد سے زیادہ جماعت پر توجہ دی گئی ہے، گذشتہ صفحات میں بعض عبادات اور معاملات کی مثالیں گزری ہیں وہ اس کی بہترین مثال ہیں۔

۲۔ مدینہ کا معاہدہ نامہ اور شہریت:

معاہدہ نامہ، میثاق مدینہ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوب گرامی، مدنی قانون، مدنی معاہدہ، ان تمام ناموں سے اس مدنی اور تاریخی دستاویز کا ذکر ملتا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ ہجرت کرنے اور وہاں اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت تشکیل دینے کے بعد مدینہ کے مختلف عناصر کے درمیان تعلقات مضبوط کرنے لئے اساسی طور پر وضع فرمایا تھا، یہ ڈھانچہ مہاجرین وانصار جو مدینہ میں مسلمانوں کی جماعت کے دو عظیم ستون تھے، اور یہود اور بقیہ بت پرست عرب پر مشتمل تھا، یہ دستاویز ایک ایسے معاہدہ، قانونی اور حقوقی دستاویز کی نمائندگی کرتا تھا جو مدنی معاشرہ کی مختلف جماعتوں کے درمیان معاشرتی تعلق، اس کے ضوابط اور اس کے حدود کو متعین کرتا تھا، نیز مدینہ کی ہر جماعت کے لئے حقوق اور ذمہ داریوں کی تشکیل کرتا تھا، اسی طرح یہ دستاویز شہریت کی بنیاد اور اس کی ذمہ داریوں اور مختلف عقائد اور قومیت کے احترام کو موکد کرتا تھا۔

اسی طرح مدنی دستاویز کی حیثیت ایک ایسے اصول کی ہے جس سے بین الاقوامی قانون سے متعلق نصوص کی بہت سے جزئیات نکلتی ہیں، نیز عقائد اور وطن کے فرق کے باوجود مختلف جماعتوں اور قوموں کے درمیان تعلقات کی تنظیم ہوتی ہے۔

اس معاہدہ کی مکمل عبارت اس طرح ہے: شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، یہ دستاویز محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو نبی ہیں کی طرف سے قریش اور اہل یثرب کے مومنین اور اطاعت گزاروں نیز ان لوگوں کے درمیان جو ان کے تابع ہوں یا ان کے ساتھ شامل ہوجائیں اور ان کے ہمراہ جہاد میں حصہ لیں، کے درمیان ہے۔

۱۔ دوسرے لوگوں کے بالمقابل وہ ایک امت (سیاسی وحدت) ہوں گے۔

۲۔ قریش کے مہاجر قبل اسلام کے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے، اور اپنے اسیروں کا فدیہ ادا کریں گے، تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۳۔ اور بنی عوف کے لوگ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے، اور ہر گروہ اپنے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۴۔ اور بنی حارث اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور ہر گروہ اپنے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۵۔ اور بنی ساعدہ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور ہر گروہ اپنی قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۶۔ اور بنی جشم اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور ہر گروہ اپنی قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۷۔ اور بنی نجار اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور ہر گروہ اپنی قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۸۔ اور بنی عمرو بن عوف اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور ہر گروہ اپنی قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۹۔ اور بنی النبیت اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور ہر گروہ اپنی قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۰۔ اور بنی اوس اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور ہر گروہ اپنی قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۱۔ اور مسلمان کسی مفلس اور زیر بار کو مدد دئے بغیر نہیں چھوڑیں گے تا کہ اس کا فدیہ یا خون بہا بخوبی ادا ہو سکے۔

۱۲۔ اور کوئی مومن کسی دوسرے مومن کی اجازت کے بغیر اس کے مولی سے معاہدہ نہیں کرے گا۔

۱۳۔ اور متقی مومن ہر اس شخص کی مخالفت پر کمر بستہ رہیں گے جو ان میں سے سرکشی کرے، جو ظلم یا گناہ یا زیادتی کا مرتکب ہو، یا مسلمانوں کے درمیان فساد پھیلائے، ان سب کے ہاتھ ایسے شخص کی مخالفت پر ایک ساتھ اٹھیں گے خواہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۴۔ اور مومن کسی دوسرے مومن کو کافر کی خاطر قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مومن کے خلاف کافر کی مدد کرے گا۔

۱۵۔ اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے، مسلمانوں میں ادنی فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا، اور مومنین دوسرے لوگوں کے مقابلے میں باہم بھائی بھائی ہیں۔

۱۶۔ اور یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا اسے ساوات حاصل ہوگی، نہ اس پر ظلم ہوگا اور نہ اس کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

۱۷۔ مومنین کی صلح ایک ہی ہوگی، اللہ کی راہ میں کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا جب تک کہ یہ صلح سب کے لئے برابر نہ ہو۔

۱۸۔ وہ تمام لوگ جو ہمارے ساتھ ہو کر جنگ کریں گے وہ ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے۔

۱۹۔ اور مومنین اس کا بدلہ لیں جو خدا کی راہ میں ان کے خون کو پہونچے۔

۲۰۔ اور متقی مومنین سب سے بہتر راہ اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

۲۱۔ اور کوئی مشرک قریش کے مال اور جان کو پناہ نہیں دے گا، اور نہ مومن کے لئے اس سلسلہ میں رکاوٹ بنے گا۔

۲۲۔ اور جو شخص کسی مومن کو ناحق قتل کرے گا اور گواہوں سے اس کا ثبوت بھی مل جائے گا تو اس سے قصاص لیا جائے گا، بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے اور تمام مومنین اس کی تعمیل کے لئے اٹھیں گے اور اس کے سوا ان کے لئے کوئی صورت نہ ہوگی۔

۲۳۔ اور کسی مومن کے لئے جو اس دستاویز کے مندرجات کا اقرار کر چکا ہو، نیز خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، جائز نہیں ہے کہ کسی فتنہ اٹھانے والے کی مدد کرے، یا اسے پناہ دے، جو اسے پناہ دے گا قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور غضب کا مستحق ٹھہرے گا، اور اسے کوئی فدیہ یا بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

۲۴۔ اور جب تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف پیدا ہو گا تو اللہ تعالی اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

۲۵۔ اور یہود جب تک مومنین کے ساتھ مل کر جنگ کرتے رہیں مصارف بھی برداشت کرتے جائیں گے۔

۲۶۔ اور بنی عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ ایک امت تسلیم کئے جائیں گے، یہودی اپنے دین پر رہیں، مسلمان اپنے دین پر، خواہ موالی ہوں یا اصل، البتہ جو لوگ ظلم اور جرم کے مرتکب ہوں گے وہ اپنی ذات یا گھرانہ کے سوا کسی کو ہلاکت وفساد میں نہیں ڈالیں گے۔

۲۷۔ اور بنی نجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۸۔ بنی حارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۹۔ اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۰۔ اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۱۔ اور بنی اوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۲۔ اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو، البتہ جو ظلم یا جرم کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مبتلائے ہلاکت وفساد نہیں ہوگا۔

۳۳۔ اور جفنہ بھی بنی ثعلبہ کی شاخ ہیں، انہیں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۴۔ اور بنی شطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو، وفاشعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

۳۵۔ اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۶۔ اور یہودیوں کے قبائل کو شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۷۔ اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر جنگ کے لئے نہیں نکلے گا۔

۳۸۔ اور زخم کا بدلہ لینے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی، جو شخص خونریزی کرے تو ذمہ داری اس پر اور اس کے گھرانے پر ہوگی، بجز اس شخص کے جس پر ظلم کیا گیا ہو، اللہ ان کے ساتھ ہے۔

۳۹۔ یہودی اپنے خرچ کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے خرچ کے۔

۴۰۔ جو کوئی اس دستور العمل کو قبول کرنے والوں کے خلاف جنگ کرے تو وہ یہودی اور مسلمان ایک دوسرے کی مدد کریں گے، وہ ایک دوسرے کی خیر خواہی پر عمل پیرا رہیں گے، اور باہم مشورہ کریں گے، وفا ان کا شیوہ ہوگا نہ کہ بدعہدی۔

۴۱۔ کوئی شخص اپنے حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے گا اور مظلوم کو بہر حال مدد دی جائے گی۔

۴۲۔ یہودی اس وقت تک مصارف برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جنگ میں شریک رہیں گے۔

۴۳۔ یثرب کا میدان اس دستاویز کو ماننے والوں کے نزدیک مقدس ہوگا۔

۴۴۔ پناہ گزیں سے ویسا ہی سلوک کیا جائے گا جیسا کہ اصل پناہ دہندہ سے ہو رہا ہو، نہ اسے کوئی نقصان پہنچایا جائے اور نہ وہ کسی جرم کا مرتکب ہوگا۔

۴۵۔ کسی عورت کو اس کے کنبے والوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔

۴۶۔ اس دستاویز کو قبول کرنے والوں کے درمیان کوئی نیا معاملہ یا جھگڑا پیدا ہو جس پر فساد رونما ہونے کا خوف ہو تو اسے اللہ تعالی کی طرف اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے گا، اس دستاویز میں جو کچھ ہے اللہ تعالی کو اس پر زیادہ احتیاط اور وفاداری پسند ہے۔

۴۷۔ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی اور نہ اس شخص کو جو اس کا معاون ہو۔

۴۸۔ اگر کوئی یثرب پر حملہ آور ہو تو ان (معاہد فریقوں یعنی یہودیوں اور مسلمانوں پر) ایک دوسرے کی امداد ونصرت لازم ہوگی۔

۴۹۔ اگر انہیں صلح کر لینے اور اس میں شرکت کرنے کی دعوت دی جائے گی تو یہ اسے قبول کر لیں گے اور شریک ہوں گے، اسی طرح وہ کسی کو صلح کے لئے بلائیں گے تو انہ سے قبول کریں گے اور مسلمانوں پر بھی قبول کرنا لازم ہوگا، بجز اس صورت کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔

۵۰۔ ہر شخص کے حصے میں اس کی مدافعت آئے گی جو اس کے بالمقابل ہوگا۔

۵۱۔ اور اس کے یہودیوں کو خواہ اصل ہو یا موالی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستاویز کے ماننے والوں کو حاصل ہے، بشرطیکہ اس دستاویز کے شریکوں کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو۔

۵۲۔ اور وفاداری عہدی شکنی سے مانع ہوگی، ہر شخص کے کئے دھرے کا نقصان اسی پر ہوگا، اور اللہ اس شخص کی حمایت اس کے ساتھ ہوگا جو اس دستاویز کے مشمولات پر زیادہ سچائی اور زیادہ وفاداری سے قائم رہیں گے، اور یہ دستاویز کسی ظالم یا مجرم کے آڑے نہیں آئے گا۔

۵۳۔ جو شخص جنگ کے لئے نکلے وہ بھی اور جو شخص گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی امن کا مستحق ہوگا، صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو ظلم یا جرم کے مرتکب ہوں گے، اور اللہ اس شخص کا حامی ہے جو عہد و اقرار میں وفا شعار اور پرہیز گار ہے، اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے حامی ہیں (سیرت ابن ہشام، از عبدالملک بن ہشام ۲/ ۳۶۸، ۳۷۰)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد کے بعد وہاں مذہب وعقیدہ اور قبائلی وخاندانی نسبت اور طرز زندگی کے اعتبار سے متنوع صفت مجموعہ تشکیل پایا، چنانچہ اس مجموعہ میں قریش کے مہاجرین، اوس وخزرج کے مسلمان، اوس وخزرج کے بت پرست، اوس وخزرج کے یہود، اور یہودیوں کے تین قبائل: بنوقینقاع، بنونضیر، اور بنوقریظہ، مدینہ کے باشندے اعرابی، ان کے موالی، غلام اور حلفاء تھے، ان سب کا ذریعہ معاش جدا جدا تھا مثلاً تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، گلہ بانی، شکار، لکڑی چننا وغیرہ، بلاشبہ مدنی دستاویز کے مطابق جس نبوی نمونہ کی تشکیل کا آغاز ہوا وہ دو باہم موافق سمتوں میں بٹا ہوا تھا، ایک سمت ان مسلمانوں سے متعلق تھا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے تھے اور اللہ کی شریعت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے تھے، اسی پر عمل کرتے تھے، اور اپنی زندگی میں منطبق کرتے تھے، جبکہ دوسری سمت مسلمانوں، اوس وخزرج اور اہل کتاب سے متعلق تھی جن میں باہم امن کی بنیاد پر اتحاد تھا (السیرۃ النبویۃ، از: مروان الشیخ الارض، ص: ۲۳، ۲۴)۔

میثاق مدینہ چار محاور پر مشتمل تھا:

اول: مدینہ کے تمام باشندوں کے درمیان اجتماعی امن وامان اور پرامن بقائے باہم، اور نفس کے تحفظ کی طرح پڑوس کے حق کا بھی تحفظ کیا گیا۔

دوم: تمام باشندوں کے لئے عقیدہ کی آزادی کی ضمانت، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ثابت ہے ''للیھود دینھم وللمسلمین دینھم'' یہ دراصل قرآن کا دیا ہوا حق ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین'' (سورہ ممتحنۃ: ۸)۔

اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو دین کے لئے تم سے لڑے نہیں، اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ ان سے بھلائی اور انصاف کا سلوک کرو، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

سوم: مدنی معاشرہ میں تمام باشندوں کے لئے انصاف اور برابری کا تحقق، جو زندگی کے مختلف میدان میں موثر شرکت کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔

چہارم: انفرادی ذمہ داری کے قاعدہ کا اقرار، اور اس ذمہ داری کی اساس وبنیاد نظام کا اظہار اور اس پر اتفاق رائے ہے، دستاویز کی یہ شق اس بات کی تاکید کرتی ہے: ''وإن البر دون الاثم لایکسب کاسب الا علی نفسه وان اللہ علی اصدق مافی ھذہ الصحیفة وابرہ انه لایحول ھذا الکتاب دون ظالم وآثم''

میثاق مدینہ پہلا دستور شمار کیا جاتا ہے جو حقیقی شہریت کے مفہوم کو متعین کرتا ہے، اس طور پر کہ اس میں شہریت کے حقوق اور مکمل شہریت (جس میں مسلمان مدینہ منورہ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ برابری کا حق رکھتے ہیں) کی بنیاد پر عائد ہونے والی ذمہ داریاں وضع کی گئی ہیں، یہ بات اس دستاویز کے سرنامہ سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے، ''ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم''

اس جملہ میں ان اہل کتاب کو جو مسلمانوں کے وطن کے ارد گرد رہتے تھے شہری قرار دیا گیا، اور یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہوں گے، بشرطیکہ وہ شہریت کی بنیاد پر عائد ہونے والے حقوق کی ادائیگی کرتے رہیں، چنانچہ دستاویز کے مطابق دین کا فرق شہریت سے محرومی کا سبب نہیں ہے، اسی طرح جو ان کے ساتھ شریک ہو جائیں ان کو بھی اس قوم کا فرد اور اسلامی مملکت کا شہری قرار دیا گیا ہے۔

معروف اسلامی مفکر محمد عمارۃ تحریر کرتے ہیں: اسلام اس دوسرے طبقہ سے صرف ایک چیز چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دوسرا طبقہ اسلامی حکومت کی ملکی وتہذیبی امن کی دیوار کی اینٹ ثابت ہو، اور اس کی مکمل وفاداری حکومت اور وطن کے لئے ہو، اور اس کی نسبت خالص امت کی طرف ہو جس کا وہ بنیادی حصہ ہے، اور کسی بھی دشمن کو فائدہ پہونچانے کا ذریعہ نہ بنے (حقائق وشبہات حول السماحۃ الاسلامیۃ وحقوق الانسان ر ۳۲)۔

خلاصہ یہ کہ میثاق مدینہ نے شہریت کے حق کے لئے جدید بنیاد تشکیل دی، جو دو مثبت عناصر سے مرکب ہے، پہلا عنصر وطن کی طرف نسبت ہے، اور دوسرا عنصر معاہدوں اور معاملات سے وفاداری ہے۔

وطن کی طرف نسبت قبیلہ یا گروہ کی طرف نسبت سے الگ ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کی بنیاد ایسی ثابت شدہ نصوص پر ہے جو انسان کے حقوق اور اس کی کرامت و آزادی پر مبنی ہے، نیز یہ انسانوں کے درمیان مساوات اور شہریوں اور معاشرہ کے افراد کے درمیان باہمی تعاون واتحاد اور عمومی صلاح کے فروغ اور مفاسد سے اجتناب کو پختہ کرتا ہے۔

چنانچہ معاہدہ مدینہ منورہ شہریت کی بنیاد فراہم کرتا ہے، لیکن اس سے قبل وہ دین کی مختلف جماعتوں کو اور مختلف مشرب کے لوگوں کو ایک امت اور ایک معاشرہ بنا چکا تھا۔

پھر دار الاسلام سے مکمل وفاداری کے عوض جو چیز ملتی ہے وہ حقوق، آزادی اور ذمہ داریوں میں مساوات ہے، یہیں سے شہریت کے اسلامی تصور اور مغربی تصور کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے، کہ مغرب میں شہریت سیکولرزم کی بنیاد پر کھڑی ہے، جبکہ اسلام نے جس شہریت کی وضاحت چودہ سو سال پہلے کی، اس کا سرچشمہ اور ستون دین ہے، اور شہریت دین کے ساتھ کبھی متصادم نہیں ہوتا، چنانچہ اللہ کے حقوق کے لئے اسلامی معاشرہ کا ہر طبقہ اور اس کی نظریات کو اللہ تعالی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے، اور اسلام اس کو اپنے اندر داخل ہونے پر مجبور نہیں کرتا، اور جہاں تک بندوں کے حقوق کی بات ہے تو تمام لوگوں کے مصالح کے تحفظ اور مفاسد کو ختم کرنے کے لئے اسلام اپنے قوانین اور معاملات کے ذریعہ دخل اندازی کرتا ہے، تاکہ معاشرہ کی رفتار کو منضبط کیا جائے۔

مزید یہ کہ میثاق مدینہ کی اہمیت اس کے صحیح طریقہ پر نازل ہونے اور حقیقی دنیا میں منطبق ہونے سے بھی ظاہر ہوتی ہے، یعنی مختلف عقائد، جنس اور قبائل کے افراد کے درمیان پرامن بقائے باہم کا اسلامی نظریہ کی اس طرح تطبیق عمل میں آئی کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، اس پوری مدت میں کسی یہودی کی زبان پر حرف شکایت نہیں آیا، اور ان کے درمیان اور مسلمانوں کے درمیان جو متوازن معاشرتی وحدت تھی اس میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا، گرچہ یہودی اسلامی معاشرہ کے اندر خفیہ سازشوں کے تانے بانے بنتے رہے، کبھی عصبیت کو ہوا دے کر، کبھی جاہلی نعرے بلند کر کے، اور کبھی جاہلیت کے خونی کینہ توزیوں کو بڑھاوا دے کر، اس کے علاوہ وہ لوگ مستقل مسلمانوں کے ذہنوں میں دین کے حوالہ سے شکوک وشبہات کے کانٹے بونے کی کوشش کرتے رہے، اور اس سلسلہ میں سب سے خطرناک اقدام رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی سلول سے خفیہ پینگیں تھیں، لیکن ان سب کے باوجود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کا اکرام کرتے رہے، آپ ان کی گفتگو کو توجہ سے سنتے، اور ان کی شکایات کو جو ایک دوسرے کے خلاف ہوتی پورے شرح صدر، کشادہ قلبی اور ذمہ داری کے ساتھ سماعت فرماتے، یہاں تک کہ انہیں تورات میں مذکور شرعی احکام پر لوٹاتے، تاکہ ان کے بارے میں کوئی ایسا اسلامی حکم نازل نہ ہو جائے جس سے وہ واقف نہ ہوں۔

سچائی یہی ہے کہ شہریت ملک کے باشندوں کی صفت ہے جو حقوق سے مستفید ہوتے ہیں اور وطن سے نسبت کی بنیاد پر قانون اور دستور کی طرف سے عائد ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں، چنانچہ ہر شہری کو کچھ معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حقوق حاصل ہوتے ہیں، ملکی نظام ان حقوق کی ضمانت دیتا ہے، مثلاً عقیدہ کا تحفظ، نفس کا تحفظ، اہل وعیال کا تحفظ، عزت وناموس کا تحفظ، اموال وملکیت کا تحفظ، تعلیم علاج ومعالجہ کی فراہمی، مہذب زندگی، عدل وانصاف کا قیام، شخصی آزادی، نیز ملکیت کی آزادی، عمل کی آزادی، مذہب کی آزادی، رائے وتقریر کی آزادی، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی آزادی وغیرہ۔

اسی طرح شہریوں کے لئے وطن اور معاشرہ کے تئیں (جہاں وہ رہتا ہے اور جس کی طرف نسبت کرتا ہے) کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، ان ذمہ داریوں کا خلاصہ اس طرح ہے: دستور وقانون کا احترام، عمومی نظام کا احترام، وطن کا دفاع، اس کی سرحدوں کی حفاظت میں شرکت، اقتصادی، علمی اور معاشرتی ترقی میں شرکت، ملکی سرمایہ کی حفاظت، معاشرہ کے افراد کے درمیان باہم محبت والفت تاکہ سکون واطمینان کی فضاء قائم رہے، وطن کے ساتھ خیانت نہ کرنا، ملک دشمنوں کے ساتھ عدم تعاون، ان کو پناہ نہ دینا اور ان کے مصالح کی خاطر جاسوسی سے احتراز وغیرہ۔

دوسرا محور: اسلام اور بین الاقوامی قانون میں پناہ گزینوں کے حقوق:

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے: ''إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي انفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين في الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئك مأواهم جهنم وسائت مصيرا'' (سورہ نساء: ۹۷)۔

(بے شک ان لوگوں کی جان جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے، جب فرشتہ قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے، وہ بولیں گے ہم اس ملک میں بے بس تھے، فرشتہ کہیں گے کہ اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے، تو یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے)۔

شہریت کے حقوق میں ایک حق یہ بھی ہے کہ آدمی کسی بھی وجہ سے دوسرے ملک کو جائے یا وہاں قیام کرے، یہ حق اسلامی شریعت کی طرف سے مسلم اور بین الاقوامی قوانین معاہدوں اور عالمی اعلامیہ سے بھی ثابت شدہ ہے۔

چنانچہ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے اندر یا ملک کے باہر جہاں چاہے آئے جائے، اس کی یہ آزادی کوئی چھین نہیں سکتا، بلکہ اسلام ظلم کے وقت اور جب انسانی حقوق کا پاس ولحاظ ختم ہوجائے تب دوسرے ملک جانے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس بات سے بھی منع کرتا ہے کہ کسی فرد کو وطن چھوڑنے یا اس سے دور ہونے پر مجبور کیا جائے، سوائے کسی عذر شرعی کے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''يسألونك عن الشهر الحرام قتال فيه قل قتال فيه كبير وصد عن سبيل الله وكفر به والمسجد الحرام وإخراج أهله منه اكبر عند الله والفتنة اكبر من القتل''(سورہ بقرہ:۲۱۷)۔ (اور آپ سے حرمت والے مہینوں کی بابت اس میں قتال کی بابت دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اس میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے، اور اس سے کہیں بڑے جرم اللہ کے نزدیک اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روک دینا اور اس سے اس کے رہنے والوں کو نکال دینا ہیں)۔

اسی طرح قرآن نے ان مہاجرین پناہ گزینوں کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے جنہوں نے وطن چھوڑنے کو ترجیح دی، اور اپنے عقیدہ اور دین کی حفاظت کی خاطر مال ومتاع کو قربان کیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا في سبيل الله بأموالهم وأنفسهم أعظم درجة عند الله وأولئك هم الفائزون'' (سورہ توبہ:۲۰)۔ (اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد اپنے مال اور اپنی جان سے کیا، وہ درجہ میں، بہت بڑے ہیں اللہ کے نزدیک اور یہی لوگ کامیاب ہیں)۔

اسلام میں اصول یہ ہے کہ دار الاسلام ہر مسلمان کا وطن ہوتا ہے، چنانچہ ملک کے اندرون میں کہیں جانے یا رہنے کے حق کو محدود کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ہر اسلامی ملک پر لازم ہے کہ وہ ہر مسلمان کو اپنے ملک میں آنے یا رہنے کی بغیر سیاسی حد بندیوں کے اجازت دے۔

بلکہ پناہ گزین اپنے عقیدہ، نسبت اور وطنیت کے فرق کے باوجود ان تمام حقوق سے مستفید ہوں گے جن کی ضمانت اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قوانین میں دی گئی ہے، کوئی ملک جو پناہ دینے کے حق سے اتفاق کرتا ہو وہ اس حق کو بدل نہیں سکتا اور نہ ہی بغیر کسی معقول سبب کے اس سے انکار کر سکتا ہے، کیونکہ وہ معاہدہ ۱۹۵۱ء اور اس معاہدہ کو مکمل کرنے والا پروٹوکول ۱۹۶۷ء (یہ دونوں پناہ گزینوں کے مرکز سے متعلق ہیں) پر دستخط کر چکا ہے، چہ جائیکہ معاہدہ جنیوا ۱۹۴۹ء، اور دو اضافی پروٹوکول ۱۹۷۷ء، اور انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ ۱۹۴۷ء وغیرہ، جہاں دنیا کے اکثر ممالک کے دستور نے فیصلہ کیا کہ ہر ملک کو اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے عالمی منشور کے ضابطہ کے مطابق عمل کرنے کا پابند بنایا جائے۔

پناہ گزینی کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے اسباب وعوامل کیا ہیں، نیز پناہ گزینوں کے حقوق کیا ہیں؟ ان باتوں کو ہم اس محور میں بیان کریں گے:

ا۔ پناہ گزینی (پناہ کے عمل) کی تعریف:

پناہ کے عمل کے لئے عربی میں 'اللجوء' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، لفظ 'اللجوء' مشتق ہے لفظ 'لجأ' سے، کہا جاتا ہے: لجأت إلى فلان وعنه، والتجأت وتلجأت (میں نے کسی کا سہارا لیا، فلاں سے تقویت حاصل کی، یا ایک کی طرف سے دوسری طرف رجوع کیا)، اسی طرح کہا جاتا ہے: ألجأه الی الشئی (کسی بات پر مجبور کرنا) ألجأه (مامون ومحفوظ کرنا) وغیرہ، گویا اس مفہوم میں لفظ 'اللجوء' میں نکلنے اور تنہا ہونے کی طرف اشارہ ہے (دیکھئے: لسان العرب، از ابن منظور ۱/۱۵۲، مادہ لجأ)۔

اور اصطلاح میں پناہ گزیں ہر ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جس کی زندگی، یا سلامتی یا آزادی خطرے میں ہو، ایسی حالت میں اسے پناہ کی جگہ تلاش کرنے کا حق ہے (القانون الدولی العام، علی صادق ابو ہیف، ص:۲۴۹)۔

اور پناہ گزیں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: ''كل شخص هجر موطنه الأصلي أو أبعد عنه بوسائل التخويف فلجأ إلى إقليم دولة أخرى طلبا للحماية أو لحرمانه من العودة الى وطنه الاصلي'' (مبادی القانون الدولی العام، محمدی حافظ غانم، ص:۵۴)۔ ہر وہ شخص جو خوف کی وجہ سے اپنے وطن اصلی کو چھوڑ دے یا اس سے دور ہوجائے، اور تحفظ کی تلاش میں یا اپنے وطن اصلی کی طرف واپسی سے محروم ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے ملک کی پناہ لے۔

اور جہاں تک قرآنی اصطلاح کی بات ہے تو قرآن میں یہ لفظ صراحت کے ساتھ نہیں آیا ہے، لیکن مختلف آیات میں اس کا مفہوم موجود ہے، جیسے لفظ

استجارہ، استئمان، ہجرۃ، ابن السبیل وغیرہ، اس کی تفصیل اس طرح ہے: الاستجارہ: امن طلب کرنا، جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد میں ہے: ''وإن احد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلك بأنهم قوم لايعلمون'' (سورہ توبہ:۶)۔ (اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الٰہی سن سکے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہونچا دیجئے، یہ حکم اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو پوری خبر نہیں رکھتے)۔

المستامن: امن طالب کرنے والا، یعنی ایسا شخص جو بیت اللہ شریف کی پشت پناہی حاصل کرنے کے ارادہ سے اس کی پناہ لے، اسلامی شریعت اس طرح کے تحفظ سے آگاہ ہے، اس پر قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت شاہد ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وإذجعلنا البيت مثابة للناس وأمنا'' (سورہ بقرہ:۱۲۵)۔ (اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے ایک مقام رجوع اور مقام امن قرار دیا)۔

اور رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی اس کی دلیل ہے: ''ومن دخل المسجد فهو آمن'' (سنن ابی دائود، كتاب الخراج والفى والامارة، باب ماجاء فى خبر مكة، حدیث نمبر:۳۰۲۲، شیخ البانی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے)۔

اور حضرت ام ہانی بنت ابی طالب سے مروی ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ: ''ذهبت الى رسول الله ﷺ عام الفتح فوجدته يغتسل وفاطمة ابنته تستره، قالت: سلمت عليه فقال: من هذه، فقلت انا أم هانى بنت أبى طالب، فقال: مرحبا بأم هانى فلما فرغ من غسله قال: فصلى ثمانى ركعات ملتحفا فى ثوب واحد، فلما انصرف قلت: يارسول الله زعم ابن أمي أنه قاتل رجلا قد أجرته فلان ابن هبيرة فقال رسول الله ﷺ: قد أجرنا من اجرت يا ام هانى، قالت أم هانى: وذاك ضحى'' (صحيح البخارى، كتاب الصلاة، باب الصلاة فى ثوب واحد، حدیث نمبر:۳۵۰)۔

الہجرۃ: صحابہ کی پہلی جماعت نے طرح طرح کے تکالیف، ظلم وستم اور اللہ کے راستہ سے روکے جانے پر حبشہ کی طرف ہجرت کی، جبکہ ان کے پاس قوت وطاقت نہیں تھی جس سے وہ اپنا تحفظ کر سکیں، چنانچہ کمزور مسلمان مرد وعورت نے دو مرتبہ حبشہ ہجرت کی، اس کے بعد باقی مسلمانوں نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه وأعد لهم جنات تجرى تحتها الأنهار خالدين فيها أبدا ذلك الفوز العظيم'' (سورہ توبہ:۱۰۰)۔ (مہاجرین وانصار میں سے جو سابق ومقدم ہیں اور جتنے لوگوں نے نیک کرداری میں ان کی پیروی کی اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے، اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں کہ ان کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے)۔

نیز اللہ عزوجل کا یہ ارشاد گرامی: ''للفقراء المهاجرين الذين أخرجوا من ديارهم وأموالهم يبتغون فضلا من الله ورضوانا وينصرون الله ورسوله أولئك هم الصادقون'' (سورہ حشر:۸)۔ (ان مفلس مہاجروں کے لئے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنی جائیدادوں سے بے دخل کئے گئے وہ اللہ اور اس کے رسول کا فضل اور رضامندی تلاش کرتے ہیں، وہی لوگ سچے ہیں)۔

ابن السبیل: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وآت ذا القربى حقه والمسكين وابن السبيل ولاتبذر تبذيرا'' (سورہ اسراء:۲۶)۔

ابن السبیل سے مراد ایسا اجنبی مسافر جو راستہ بھول چکا ہو اور اپنے گھر واپس ہونا چاہتا ہو، لیکن اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ گھر پہونچ سکے، چنانچہ ایسے شخص کے لئے صدقات سے ایک حصہ متعین ہے، جمہور فقہاء کی نظر میں ابن السبیل ایسا شخص ہے جو اپنے شہر سے دوسرے شہر میں داخل ہو چکا ہو (فقہ الزکوۃ، از علامہ یوسف القرضاوی ۶۷۱/۱)۔

۲۔ بین الاقوامی قوانین میں پناہ گزینی کے اسباب:

پناہ گزینوں سے متعلق اقوام متحدہ کے معاہدہ ۱۹۵۱ء اور ملکی پناہ کیمپ سے متعلق اقوام متحدہ کے پروٹوکول میں پناہ گزینی کے اسباب کی تفصیل آئی ہے، جو اس طرح ہے:

۱۔ ظلم وستم کے نتیجہ میں پیدا شدہ خوف، جس کی وجہ سے آدمی ایسی جگہ کی تلاش کرے جہاں اسے امن وامان ملنے کی امید ہو۔

۲۔ زندگی اور آزادی خطرے میں پڑنے اور بین الاقوامی ڈکلریشنوں اور دستاویز سے ثابت شدہ انسانی حقوق کی پامالی کے نتیجہ میں پیدا شدہ ظلم وزیادتی۔

۳۔ معاملات، آزادی، حقوق اور ذمہ داریوں میں امتیازی سلوک، جس کے نتیجہ میں امان کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

۴۔ جنسیت، اور جماعتی تعدد: یعنی ایسی جماعت کا فرد ہو جو وہاں کی اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت میں ہو، اور اپنے حقوق کی پامالی اور آزادی سلب کئے جانے سے دوچار ہو۔

۵۔ دین، یعنی وہ عقیدہ جس پر انسان ایمان رکھتا ہے اور دینی آزادی جس کی ضمانت بین الاقوامی ڈکلریشنوں اور عالمی دستاویزات میں دی گئی ہے۔

۶۔ کسی متعین جماعت سے انتساب، بایں طور کہ حکمران جماعت اور بعض رعایا کے درمیان بے اعتمادی ہو اور سیاسی یا فکری جماعت سے وابستگی کی وجہ سے حکمراں جماعت سے وفاداری نہ ہو، جس کی وجہ سے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔

۷۔ سیاسی نقطہ نظر، یعنی سیاسی نظام کی آراء کے خلاف جداگانہ رائے قائم ہو جو ظلم وزیادتی اور تعاقب کا خوف پیدا کرے، البتہ عملی حقوق کی پامالیوں کے ذریعہ اس طرح کے اندیشوں کے لئے جواز پیدا ہونا ضروری ہے، جیسے تنگ کرنا، صفایا کرنا اور قید وبند میں ڈالنا وغیرہ۔

۳۔ اسلامی شریعت میں پناہ گزینوں کے حقوق:

اسلامی شریعت نے پناہ گزینوں کو حقوق اور ذمہ داریاں عطا کر کے، ان کی طرف توجہ کر کے، انہیں تحفظ فراہم کر کے، ان کے دین، جان ومال، عزت وآبرو، ان کی عقل اور ان کی نسل کو تحفظ فراہم کر کے انہیں بلند مقام سے نوازا ہے۔

بلکہ اسلامی شریعت نے پناہ گزینوں کو ایسے حقوق عطا کیا ہے جو ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کے لئے مناسب ہے، اس طرح اسلامی شریعت کو دیگر قوانین پر فوقیت حاصل ہے، اسی بنیاد پر ایک جدید مطالعہ (جس کی نگرانی اقوام متحدہ میں پناہ گزینوں کے حقوق سے متعلق اعلی کمیٹی نے امیر نایف عربی یونیورسیٹی اور تنظیم اسلامی کانفرنس کے تعاون سے انجام دی ہے) نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اسلامی شریعت کے مصادر پناہ گزینوں سے متعلق حقوق کی قانون سازی میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی ہے، ان قوانین سے پوری دنیا میں لکھوکھا پناہ گزیں مستفید ہو رہے ہیں، اس مطالعہ میں اسلامی شریعت اور پناہ گزینوں کے بین الاقوامی قانون کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے۔

اعلی کمیٹی کے نمائندہ 'انٹونیو جوٹریز' نے بتا کہ تنظیم نے اسلام کے عطا کردہ حقوق سے ہی استفادہ کر کے قانون کی بنیاد بنائی ہے، مثلا پناہ گزینوں کو امان فراہم کرنا، اور انہیں ان مصائب میں دوبارہ نہ دھکیلنا جن سے وہ بھاگے ہیں، مزید یہ کہ پناہ گزینوں کے تحفظ میں غیر مسلم بھی شامل ہیں، جنہیں اسلام اپنا مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرتا ہے، اسلام ان کے حقوق کے بدلے ان کا سودا نہیں کرتا، بلکہ اسلام انہیں اور ان کی جائیداد کو تحفظ فراہم کرتا ہے، اور اس کے خاندانی شیرازہ کو بکھرنے سے بچاتا ہے، اور یہ سب کچھ اسلام چودہ سو سال سے کر رہا ہے۔

جوٹریز مسلمان پناہ گزینوں کے تئیں نسل پرستی کو ختم کرنے اور اسلام کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں، نیز وہ بتاتے ہیں کہ بین الاقوامی سماج کی ذمہ داری ہے کہ پناہ گزینوں کے لئے اسلام نے جن حقوق کی ضمانت دی ہے ان کی قدر کریں۔

پناہ گزینوں سے متعلق اہم حقوق کا خلاصہ اس طرح ہے:

☆ ہر ستم رسیدہ مسلمان یا ہر مظلوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دار الاسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے جہاں امان حاصل ہو وہاں پناہ لیں، اسلام ہر ستم رسیدہ کے لئے اس حق کی ضمانت دیتا ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کا عقیدہ کیا ہے، وہ کس رنگ کا ہے اور کس نسل کا ہے۔

اگر کوئی پناہ گزیں اپنی سلامتی، امان اور زندگی سے متعلق خطرات سے تحفظ کے لئے دار الاسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے تو امام المسلمین یا اس منصب فائز شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے شخص کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت دے، بشرطیکہ وہ مذکورہ مقصد سے آئے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلك بأنهم قوم لا يعلمون'' (سورہ توبہ: ۶)۔ (اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیجئے تا کہ وہ کلام الہی سن سکے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہونچا دیجئے، یہ حکم اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو پوری خبر نہیں رکھتے)۔

جب ایک مشرک کے لئے یہ حکم ہے تو کسی مسلمان کو پناہ دینا بدرجہ اولی ہوگا، بشرطیکہ جس ملک نے اسے پناہ دیا ہے اس کے مصالح کے لئے وہ نقصاندہ نہ ہو۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کے دین کا تحفظ، اپنے شعار کی ادائیگی کی آزادی، اور دوسرا مذہب کو قبول کرنے پر مجبور نہ کئے جانے کا حق بھی ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں: ''لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقى لا انفصام لها والله سميع عليم'' (سورہ بقرہ: ۲۵۶)۔

یہ آیت کریمہ صاف واضح کر رہی ہے کہ اسلام تمام افراد اور تمام قوموں کے لئے مذہب کی آزادی کا قائل ہے، اس حق کی تاکید میثاق مدینہ منورہ میں بھی آئی ہے ''لليهود دينهم وللمسلمين دينهم ومواليهم وأنفسهم''

ان تفصیلات کی روشنی میں ایسے معاشرہ میں مسلم غیر مسلم تعلقات کی شکل واضح ہوتی ہے جہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بقائے باہم کا اصول ہو، خواہ ایک ملک کے اندر رہنے کی بات ہو، یا مصلحتوں کے تبادلہ کی بات ہو یا بین الاقوامی تعلقات کی بات ہو یا اس کے علاوہ بقائے باہم کی شکلیں ہو، چنانچہ مذہب کا مسئلہ عام معاملات سے الگ ہوتا ہے، قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان دوسروں کے عقائد کے بارے میں جوابدہ نہیں ہیں، اور نہ ہی ان سے دوسروں سے محاسبہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، لہذا جب ہمارے درمیان اور ان کے درمیان اس حوالہ سے مباحثہ کی نوبت آئے گی تو یہ ادب کے دائرہ میں اور مناقشہ کے بہتر طریقہ کے ساتھ ہوگا (مجلہ منبر الاسلام، شمارہ ۱۰، ۲۰۱۲ء، از طلعت محمد عفیفی، ص ۲)۔

اس کی طرف قرآن میں بھی اشارہ موجود ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں: ''ولا تجادلوا أهل الكتاب الا بالتي هي أحسن إلا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذي أنزل إلينا وأنزل إليكم وإلهنا وإلهكم واحد ونحن له مسلمون'' (سورہ عنکبوت: ۴۶)۔ اور جھگڑا نہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو، مگر جو ان میں بے انصاف ہیں، اور یوں کہو کہ ہم اس کو مانتے ہیں جو ہم پر اور تم پر نازل کیا گیا، ہمارے اور تمہارے معبود ایک ہی ہیں، اور ہم اسی کے حکم پر چلتے ہیں)۔

چنانچہ اسلام عیسائی پر عیسائیت چھوڑنے کو ضروری قرار نہیں دیتا، اور نہ یہودیوں کو یہودیت ترک کرنے پر مجبور کرتا ہے، بلکہ وہ ان دونوں سے جب تک کہ وہ اپنے قدیم دین سے وابستہ ہیں، یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسلام کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں، جو اس مذہب کو اختیار کرنا چاہے کرے، بغیر کسی تلخ چھیڑ چھاڑ اور برے انداز میں مناقشہ کے (حقوق الانسان، از محمد الغزالی، ص ۷۴)۔

ان باتوں کے ساتھ اس کا بھی اضافہ کیجئے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کا احترام امام ابن قیم کے اس جملہ سے بھی واضح ہے جو انہوں نے اپنی کتاب احکام اہل الذمہ میں تحریر فرمایا ہے، وہ تحریر کرتے ہیں: ''وقد صح عن النبي ﷺ انه انزل وفد نصارى نجران في مسجده وحانت صلاتهم فصلوا فيه وذلك عام الوفود'' (احكام اهل الذمة، محمد بن ابي بكر بن ايوب ابن قيم الجوزيه، تحقيق: يوسف بن احمد البكري وشاكر بن توفيق العاروري، دمام، ط: ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۷ء، ۱/۳۹۷)۔

یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے نجران کے عیسائی وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا، اور جب ان کی نماز کا وقت آیا تو انہوں نے مسجد میں ہی نماز ادا کی، اور یہ وفود والے سال کی بات ہے۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کی جان کا تحفظ بھی ہے، اور یہ حق پناہ گزیں اور غیر پناہ گزیں دونوں کے لئے یکساں ہے، پناہ گزیں اس ملک کے ذمہ میں ہوں گے جن کی پشت پناہی انہوں نے حاصل کی ہے۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کی عقل کا تحفظ بھی ہے، کہ عقل ہی مکلف ہونے کی بنیاد ہے، اللہ تعالی نے انسان کو دوسری مخلوقات سے عقل کے ذریعہ ہی ممتاز کیا ہے، اس سے مادی اور معنوی تمام چیزوں سے پناہ گزینوں کی عقل کی حفاظت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کی عزت وآبرو کا تحفظ بھی ہے، لہذا تہمت، سب وشتم یا کسی اور طرح سے ان کے ناموس سے کھلواڑ کرنا درست نہیں ہے، خواہ پناہ گزیں مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور جن پر تہمت لگایا گیا ہے اگر وہ اہل کتاب میں سے ہے تو تہمت لگانے والے پر حد جاری کرنا ضروری ہے، اللہ تعالی نے اہل کتاب کو پاکبازی کی صفت سے متصف فرمایا ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں: ''والمحصنات من المؤمنات والمحصنات من الذين أوتوا الكتاب من قبلكم اذا آتيتموهن أجورهن محصنين غير مسافحين ولا متخذي أخدان'' (سورہ مائدہ: ۵)۔ (اور اسی طرح جائز ہیں تمہارے لئے مسلمان پارسائیں اور ان کی پارسائیں جن کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے، جب تم انہیں ان کے مہر دیدو، اور قید نکاح میں لانے والے

ہو نہ کہ مستی نکالنے والے، اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے)۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں رہائش کا حق بھی ہے، بشرطیکہ وہ پڑوسیوں کے لئے ضرر رساں نہ بنیں، اسی طرح اس کی رہائش گاہ بھی قابل احترام ہوگی، کسی کو اس کی اجازت کے بغیر وہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی، اور عذر شرعی کے بغیر اس رہائش میں تنگی کرنا درست نہ ہوگا۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ انہیں خرید وفروخت، ہبہ، صدقہ، ملکیت، قبضہ، اور دیگر تمام صحیح معاملات کا حق حاصل ہوگا، نیز یہ کہ وہ وارث بھی ہوں اور مورث بھی۔

☆ پناہ گزینوں کو شخصی آزادی حاصل ہوگی، تاکہ امان کا تحقق ہو، کہ سارے افراد بشری طبیعت اور اصلی خلقت کے اعتبار سے برابر ہوتے ہیں، ان میں باہم کوئی فرق اور تفاضل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''ولقد کرمنا بنی آدم وحملناهم فی البر والبحر و رزقناهم من الطیبات وفضلناهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیل'' (سورہ اسراء: ۷۰)۔ (اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور جنگلوں اور دریا میں سواری دی، اور صاف ستھری چیزوں سے رزق دیا اور ان بہت سوں پر فضیلت دی جنکو ہم نے پیدا کیا)۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے علی العموم سارے بنی آدم کو فضیلت بخشی ہے، جس کا تقاضہ ہے کہ ان کی شخصی آزادی کی حفاظت کی جائے، سوائے ان مواقع پر جہاں شریعت میں امتیاز اور فوقیت ثابت ہے۔

شیخ الدعاۃ محمد الغزالی تحریر کرتے ہیں: انسان کی آزادی اس کی زندگی کی طرح قابل احترام ہے، یہ انسان کی خلقی صفت ہے جس پر انسان پیدا ہوتا ہے، "ما من مولود یولد علی الفطرۃ" یہ صفت مستقل کے لئے ہے، کسی کے لئے اس پر زیادتی کرنا درست نہیں ہے، "متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا" فرد کی آزادی کی مکمل ضمانت دینا ضروری ہے، اس آزادی کو محدود کرنا یا اس کی حد بندی کرنا سوائے شرعی دلیل یا شریعت سے ثابت کاروائی کے درست نہیں ہے (حقوق الانسان، از محمد الغزالی رص: ۲۱۲)۔

اسلام افراد کی بنیادی آزادی کے حق کو بلند مقام تک پہونچاتا ہے، بایں طور کہ وہ مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے، چنانچہ اسلامی حکومت کا اپنے شہریوں کو تحفظ دینا اور اس کے ساتھ بہترین سلوک کرنے کا عمل اس ملک کے غیر مسلم شہری ہونے کی وجہ سے متاثر نہیں ہوتا۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ انہیں ان کے وطن کی طرف واپس نہیں کیا جائے گا جہاں ان پر ظلم ہوا ہے، اور شاید یہ پناہ گزینوں کو حاصل ہونے والے حقوق میں سب سے اہم حق ہے جس کی خواہش پناہ گزیں کرتے ہیں، چنانچہ پناہ گزیں اور اس ظالمانہ نظام کے درمیان جہاں سے وہ فرار ہوا ہے اسلام حائل ہو جاتا ہے، اس کی مثالوں میں یہ ہے کہ ابوطالب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا، جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دیں اور تکلیفیں پہنچائیں، اور اس حق کی اہمیت کی وجہ سے اسے بین الاقوامی دستاویزات میں بڑی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ اقوام متحدہ کے ڈکلریشن کی دفعہ (۳) کے پہلے فقرہ میں مذکور ہے، مذکورہ لوگوں یعنی پناہ گزینوں میں سے کسی بھی فرد کو سرحد کے پاس پہونچنے سے روکنے جیسی کاروائی کرنا درست نہیں ہے، اسی طرح جب وہ کسی ایسے ملک میں داخل ہو جائے جہاں کی پناہ چاہتا ہے تو جلاوطن کرنا، یا جبراً کسی ایسے ملک واپس کرنا جہاں وہ دوبارہ ظلم کا شکار ہو سکتا ہے، صحیح نہیں ہے (حقوق اللاجئی طبقا لمواثیق الامم المتحدۃ محمد شوقی عبدالعال رص ۴۰)۔

اسی طرح ۱۹۵۱ء کے معاہدہ، پناہ گزینوں کی حالت سے متعلق قانون، اس کے اضافی پروٹوکول ۱۹۶۷ء، اور معاہدہ کے دفعہ ۳۲ میں تین ضمانتیں دی گئی ہیں، جو اس طرح ہیں:

۱۔ پناہ گزیں کو جلاوطن کرنے سے متعلق حکومت کے اختیار کو محدود کرنا، اور یہ کام عمومی قاعدہ کے تحت جلاوطن کرنے کو ممنوع قرار دیکر ہو سکتا ہے۔

۲۔ جلاوطن کرنے سے متعلق تجویز منظور کرنے پر لازمی کاروائی کرنا، کیونکہ یہ بھی لازم ہے کہ یہ جلاوطنی قانون کے ذریعہ متعین کردہ راہوں کے مطابق انجام دیا جائے، نیز پناہ گزینوں کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے، فیصلہ پر اعتراض کرنے، اور قانونی مدد حاصل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۳۔ اور جلاوطن کرنے سے متعلق تجویز جتنی شکل میں منظور ہو جانے پر پناہ گزینوں کو معقول مہلت دینا، تاکہ دوسری پناہ گاہ تلاش کرنا ممکن ہو (دیکھئے: حق اللجوء السیاسی، دراسۃ فی نظریۃ حق الملجأ فی القانون الدولی، از برہان امر اللہ رص ۲۲۵)۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں برابری اور امتیاز کا نہ ہونا بھی ہے، یہ حق پناہ گزینوں سے متعلق معاہدہ ۱۹۵۱ء میں پوری وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، اس کی دفعہ ۳ میں ہے: حکومتوں پر لازم ہے کہ وہ پناہ گزینوں سے متعلق مذکورہ معاہدہ کو نسل، مذہب اور وطن کی تفریق کے بغیر منطبق کریں (دیکھئے: نسبیۃ الحریات العامۃ وانعکاساتہا علی التنظیم الدولی، از سعاد الشرقاوی، ط: دار النہضۃ العربیۃ، مصر، طباعت: ۱۹۷۹ء، ص: ۱۷۸)۔

ان معاہدات سے صدیوں قبل میثاق مدینہ میں صراحت ہے کہ "الناس أمة واحدة" سارے لوگ ایک امت ہیں، یہاں شہریت کے تمام پہلوؤں میں برابری کے لئے لفظ 'امت' کا استعمال کیا گیا ہے، چنانچہ مومنین ایک امت ہیں، یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہیں، یہودیوں کے لئے ان کا مذہب ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا مذہب، "وإنه من تبعنا من اليهود فان له النصر والأسوة" اور جو مسلمانوں کی پناہ حاصل کر لے وہ مسلمانوں کے ساتھ امت ہیں، ومن لحق بهم۔

☆ فضائی، زمینی اور سمندری ہر طرح سے پورے ملک میں نقل وحرکت کی آزادی بھی پناہ گزینوں کے حقوق میں سے ہے، پناہ گزینوں سے متعلق خاص معاہدہ ۱۹۵۴ء کے دفعہ ۲۶ میں مذکور ہے،'اس معاہدہ میں شریک ہر ملک اپنے ملک میں مقیم پناہ گزینوں کو اپنے لئے رہائش اختیار کرنے کا حق، اور آزادی کے ساتھ اپنی سرزمین میں نقل وحرکت کا حق دے گا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ کسی ایسے قانون کے ماتحت ہو جو ان جیسے خاص حالات میں غیر ملکیوں پر نافذ ہوتا ہو۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں وطن واپسی کا حق بھی ہے، انسانی حقوق سے متعلق عالمی اعلامیہ کے دفعہ ۱۳ میں واپسی کے حق کی تاکید اس طرح آئی ہے: "ہر فرد کو اپنے وطن کے اندر کہیں آنے جانے اور اسی طرح اپنے وطن واپس آنے کا حق ہوگا"

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں تعلیم کا حق بھی ہے، یہ عمومی حق ہے جس میں سارے افراد شامل ہیں، معاہدہ ۱۹۵۱ء کے دفعہ ۲۲ میں اور پناہ گزینوں کی حالت سے متعلق معاہدہ ۱۹۵۱ء میں اس کی صراحت آئی ہے، عبارت اس طرح ہے: "معاہدہ میں شامل تمام ممالک پناہ گزینوں کو ملک کے باشندوں کے مساوی تعلیمی حق دیں گے"

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کی بنیادی حفظان صحت کا حق بھی ہے، معاہدہ کی عبارت اس طرح ہے:"ملک کے ہر فرد کو حفظان صحت کا حق دیا جائے گا، یہی حق مناسب طریقہ پر افراد، خاندان اور معاشرہ کو بھی دیا جائے گا، کیونکہ ان سب سے مکمل شرکت کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور یہ معاشرہ کے بجٹ کے مطابق دیا جائے گا"۔ (دیکھئے: تنظیم عالمی صحت کی ویب سائٹ)

☆ ان تمام حقوق کے ساتھ زندگی کی ہر ضروریات کا حق مثلاً ملازمت، رہائش، کھانا، ہر طرح کی آزادی، انصاف اور قومیت وغیرہ کے حقوق بھی شامل ہیں۔

شریعت اور بین الاقوامی قوانین میں پناہ گزینی ختم ہونے کے اسباب

☆ پناہ گزینی کے اسباب ختم ہو جائیں یا پناہ گزیں کی وفات ہو جائے تو پناہ گزینی ختم ہو جائے گی، چنانچہ جب مسلمانوں کو حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کی خبر ملی تو وہ مکہ مکرمہ واپس ہو گئے، اسی طرح باقی مسلمان صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

☆ پناہ گزینی ختم ہونے کے اسباب میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ استہزاء بھی ہے، چنانچہ اگر پناہ گزیں کی طرف سے اسلام، اسلامی تعلیمات شریعت، مسلمان اور مذہبی شخصیات کے استہزاء پر مشتمل کوئی بات سامنے آئے تو پناہ گزینی ختم ہو جائے گی، کیونکہ مسلمان ایسے فرد کو پناہ نہیں دے سکتے ہیں جو ان کا اور ان کے دین کا مذاق اڑائے (دیکھئے: مقالہ عبداللہ محمد، اللجوء فی الاسلام، پیش کردہ جامعہ نایف العربیہ للعلوم الامنیۃ، سعودی عرب، ۲۰۰۶ء، ص: ۷)۔

☆ خیانت: اس سے مراد اس ملک کے ساتھ خیانت ہے جس نے اسے پناہ دیا ہے، اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، مثلاً پناہ دینے والے ملک کے دشمنوں سے تعلق یا دشمنوں کے مفاد میں جاسوسی وغیرہ، جب اس طرح کی کوئی بات سامنے آجائے تو اسلامی حکومت کو وہ پناہ ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا جو اس نے دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وإما تخافن من قوم خيانة فانبذ اليهم على سواء ان الله لا يحب الخائنين" (سورہ انفال: ۵۸)۔ (اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو آپ (وہ عہد) ان کی طرف اسی طرح واپس کر دیں، بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

سید قطب شہیدؒ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ آیت کریمہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے نازل کی گئی جو اس وقت بالفعل (جب کہ مدینہ میں اسلامی ریاست نشوونما پا رہی تھی) اسلامی جماعت کو درپیش تھی، ان کے ذریعہ مسلم قیادت کو وہ احکام وہدایات دی جا رہی تھیں جن سے وہ اس حالت کا مقابلہ کر سکے، یہ ہدایت مسلم کیمپ اور اس کے گرد وپیش موجود دیگر کیمپوں کے مابین خارجہ تعلقات کے باب میں ایک اہم اساس کی حیثیت رکھتی ہے، جن میں اگرچہ بعد میں کچھ

جزوی ترامیم کی گئیں اور پھر انہیں قطعی شکل دی گئی، تاہم بین الاقوامی سطح پر اسلام کے طریقہ معاملات میں ایک بنیادی اصول کے بطور ان کا درجہ باقی و مسلم ہے۔

ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف کیمپوں کے مابین بقائے باہم کی غرض سے سلامتی کے معاہدے کیے جاسکتے ہیں بشرطیکہ ممکن حد تک یہ معاہدے عہد شکنی سے محفوظ رکھے جائیں اور ہر فریق ان کا مکمل احترام کرے اور صدق دل سے معاہدے کی دفعات کی پابندی کرتا رہے، لیکن فریق ثانی اگر ان معاہدوں کی آڑ میں خیانت دغداری کو کالعدم قرار دیدے اور فریق مخالف کو ان کی منسوخی کی اطلاع کردے، پھر مسلم ریاست کا سربراہ آزاد ہوگا کہ وہ جب چاہے ان خائنوں اور غداروں کی سرکوبی کرے......اور یہ سرکوبی ایسی سخت اور عبرتناک ہوگی کہ ان تمام لوگوں پر دہشت طاری ہوجائے جو کھلے یا چھپے مسلم معاشرہ سے تعرض کرنے کا خیال دل میں پال رہے ہیں (فی ظلال القرآن ۱۵۳۹/۳)۔

آپ مزید تحریر فرماتے ہیں: اسلام معاہدہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی پاسداری کرے اور اپنے پیمان کو برقرار رکھے، لیکن جب فریق ثانی کی جانب سے اسے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو وہ اس ہونے والے معاہدے کو علی الاعلان اس کے آگے پھینک دیتا ہے اور معاہدہ ختم کرنے کی اسے اطلاع دیتا ہے، وہ خیانت وغداری نہیں کرتا اور نہ دھوکہ دہی اور دغابازی کو اپنا شعار بناتا ہے، وہ دوسروں کو صاف صاف بتادیتا ہے کہ ان معاہدے سے وہ دست کش ہوچکا ہے، اب اس کے اور ان کے مابین امن کا معاہدہ باقی نہیں رہا، اس طرح اسلام انسانیت کو شرف واستقامت کے اعلیٰ مراتب پر فائز کرتا اور امن واطمینان کی وسعتوں میں لے جاتا ہے، وہ دوسروں پر ناگہانی شب خون نہیں مارتا اور نہ ان لوگوں پر اچانک اور فاجرانہ یلغار کرنے کا قائل ہے، جو بے خوف اور مطمئن بیٹھے ہوں، اور انہیں ان معاہدوں اور دستاویزات پر بھروسہ ہو جن کی منسوخی کی انہیں اطلاع نہ دی گئی ہو، اسلام ایسے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کا روادار نہیں جنہوں نے دفاع ومحافظت کا سامان ساتھ نہ لیا ہو، اس صورت میں بھی نہیں جب ان کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو، ہاں معاہدہ ختم ہوجانے کے بعد جب جنگی حالت پیدا ہوجائے تو اس وقت الحرب خدعۃ کے اصول پر جنگی چالیں جائز ہوجاتی ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہر فریق چوکنا ومحتاط ہوچکا ہوتا اور دفاعی تدابیر اپنا چکا ہوتا ہے، اب اگر دشمن کے خلاف جنگی چال روا رکھی جاتی ہے تو یہ اس کے ساتھ دغابازی اور غدر کے مترادف نہیں ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ غافل ہے، اس وقت فریب کے سارے حربے مباح ہیں، کیونکہ مقصد غداری وبدعہدی نہیں ہے۔

اسلام انسانیت کا معیار بلند کرنا چاہتا ہے، اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ انسانیت کا دامن پاک وصاف ہو، لہٰذا وہ غلبہ وعروج کی خاطر غدر اور دھوکہ کو روا نہیں رکھتا اور یہ کیونکر ممکن ہے جب کہ اس کی جدوجہد ایک اعلیٰ وارفع مقصد کی راہ میں ہے، اس لئے وہ اس بات کی قطعا اجازت نہیں دیتا کہ ایک اونچے مقصد کے حصول کے واسطے گھٹیا طور طریق اپنایا جائے۔

اسلام کو خیانت سے شدید نفرت ہے، وہ خائنوں اور عہد شکنوں کو حقارت بھری نظر سے دیکھتا ہے، اس وجہ سے وہ پسند نہیں کرتا کہ مسلمان امانت عہد میں دھوکہ دہی کے مرتکب ہوں، خواہ یہ ایسے مقصد کی راہ میں ہو جو بجائے خود اعلیٰ واشرف ہو، کیونکہ نفس انسانی ایک منقسم اکائی ہے، اور جب وہ اپنے لئے کوئی خسیس ذریعہ جائز ٹھہرا لے گی تو اس کے لئے کسی شریف مقصد کو محفوظ رکھ پانا ممکن نہ ہوگا......اور وہ شخص مسلمان نہیں جو اچھے مقاصد کے لئے ہر قسم کے ذرائع ووسائل استعمال کرنے کو درست سمجھتا ہو، یہ اصول، اسلامی شعور کے لئے بالکل اجنبی ہے، جس کا اسلام کی نگاہ میں کوئی جواز نہیں، اسلئے کہ نفس انسانی کی دنیا میں بلحاظ اس کی ساخت ذرائع اور مقاصد میں کوئی فرق نہیں، کسی مرغزار تک پہونچنے کی خواہش ایک مسلمان کو کیچڑ کے تالاب سے گذرنے پر آمادہ نہیں کرسکتی، کیونکہ بالآخر اس کے کیچڑ آلود پاؤں اس سبزہ زار کو بھی گندہ وپلید بنادیں گے، یہی وہ اسباب ہیں جنکی بناء پر اللہ تعالیٰ خائنوں وبدعہدوں کو ناپسند کرتا ہے، اور اسے خیانت وبدعہدی سے سخت نفرت ہے، "إن الله لا يحب الخائنين" (فی ظلال القرآن ۱۵۴۲،۳)۔

ان باتوں کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیجئے کہ جب نجران کے عیسائیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان سے معاہدہ فرمایا، آپ نے بعض شرائط رکھے جن کی پابندی اور معاہدہ سے وفاداری ان کے دین کے لحاظ سے بھی ضروری تھی، ان میں بعض شرائط اس طرح تھے، :ان میں کوئی جاسوس نہیں ہوگا، اور نہ کسی حربی کے لئے مسلمانوں میں سے کسی کی نگرانی کرے گا نہ خفیہ نہ علانیہ، نہ مسلمانوں کے دشمنوں میں سے کسی کو بھی اپنے گھر میں آنے دے گا، جس کے ذریعہ موقع سے فائدہ اٹھانا اور حملہ کرنا چاہتا ہو اور نہ انہیں نہ ان کے علاوہ دوسروں کو سوائے اپنی ملت کے اپنے گھروں، اپنی زمینوں، اور اپنی عبادت خانوں میں داخل کرے گا، نہ مسلمانوں کے خلاف کسی حربی کی ہتھیار، گھوڑے یا افراد کے ذریعہ مدد دے گا، نہ اس کے ساتھ رواداری برتے گا......اگر اپنے پاس، اپنے گھروں میں، اور اپنے عبادت خانوں میں مسلمانوں میں سے کسی کو چھپانے کی ضرورت پڑے تو وہ اس کو پناہ دیں گے، اس کی مہمان

نوازی کریں گے، اور زندگی کے مسائل میں اس کی غمخواری کریں گے، اور اس کو راز میں رکھیں گے، دشمن کو اس کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہیں کرے گا، اور نہ اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کریں گے۔

اور جہاں تک بین الاقوامی قانون میں پناہ گزینی کے خاتمہ کی بات ہے تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنے اجلاس ۱۹۶۴ء میں یہ تجویز منظور کی تھی کہ جب تک پناہ گزینوں کی طرف سے معقول اسباب نہ پائے جائیں انہیں اپنے اصلی وطن واپس ہونے پر مجبور نہ کیا جائے، چنانچہ معاہدہ ۱۹۵۱ء کے دفعہ (ا) میں ہے کہ اس معاہدہ کا اجراء اس شخص پر موقوف ہے جس پر پیراگراف (الف) کے احکام منطبق ہوتے ہیں، اس صورت حال میں جب اس ملک کی حمایت جاری رکھنا جس کی وہ قومیت رکھتا ہے اس پر دشوار ہو جائے ان اسباب کے ختم ہو جانے کی وجہ سے جن کی وجہ سے وہ پناہ گزیں سمجھا جائے (دیکھئے: حقائق وشبہات حول السماحۃ الاسلامیۃ وحقوق الانسان، ص: ۳۲)۔

بین الاقوامی قانون میں پناہ ختم ہونے کے اسباب کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱۔ وفات: وفات سے پناہ گزیں کی پناہ گزینی ختم ہو جائے گی۔

۲۔ اخراج/جلاوطنی: پناہ دینے والے ملک کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ پناہ گزیں کو واپس کرنے کے لئے یا جلاوطن کے لئے آخری تاریخ مقرر کرے، پناہ گزینوں کے حالات سے متعلق خاص معاہدہ میں تحدید کی گئی ہے کہ پناہ گزیں کے حق میں اخراج ممکن ہے، لیکن یہ عمل درج ذیل شرائط کے ساتھ ہونے چاہیے:

الف: پناہ دینے والا ملک قانونی پناہ گزیں کو صرف ملکی امن یا عمومی نظام کے اسباب کے تحت ہی جلاوطن کر سکتا ہے۔

ب: پناہ دینے والا ملک اسی وقت کسی کو جلاوطن کر سکتا ہے جب دوسرے ملک میں داخل ہونے کی اجازت اسے حاصل ہو جائے (دیکھئے: الملجأ فی القانون الدولی، حمدی الغنیمی، ص: ۶۳۹)۔

۳۔ رضا کارانہ واپسی: یہ پناہ گزیں کا اپنے ملک واپس ہونا ہے، بلاشبہ یہ مثالی طریقہ ہے جس سے پناہ گزینی (پناہ کا عمل) ختم ہو جاتی ہے۔

۴۔ پناہ دینے والے ملک کی شہریت حاصل ہو جائے: یعنی پناہ دینے والا ملک پناہ گزیں کو قومیت (نیشنلٹی) عطا کر دے، اس وقت بھی پناہ گزینی ختم ہو جائے گی، کیونکہ اس وقت وہ جس ملک سے راہ فرار اختیار کیا تھا، اس کے علاوہ دوسرے ملک کی قومیت سے مستفید ہو رہا ہے (الاعلام بقواعد القانون الدولی والعلاقات الدولیۃ فی شریعۃ الاسلام، احمد ابوالوفا، دار النہضۃ العربیۃ، مصر، سن طباعت: ۱۹۹۲ء، ج ۶، ص: ۲۶۸)۔

خاتمہ: ...... ان مختصر صفحات میں ہم نے شہریت اور پناہ گزینوں کے حقوق کو اسلامی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے، اور اس سلسلہ میں بین الاقوامی قانون میں موجود بعض باتوں کو پیش کیا ہے، اس تحقیق سے درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں:

الف: ایسی شہریت جو معاشرہ کے مختلف میدانوں میں ترقی عطا کر سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسی ذہنیت/مزاج تیار ہو جس کے اندر شعور ہو، ثقافت ہو، اور تجربہ ہو، اس طرح ریاستی ترقی کے تمام مراحل کی تکمیل کے لئے مثبت شہریت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

ب: مسلمان مواطن ہوں یا مقیم، اس کا مغربی دنیا میں ہم آہنگ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سرگرمیاں اسلامی اصول وضابطہ کے دائرہ میں ہو، اور اس کا تعامل غیر مسلم معاشرہ کے ساتھ منظم اور باشعور ہو، اس لئے کہ مسلمان صاحب پیغام اور داعی ہے۔

ج: وطن سے تعلق اور محبت کا مطلب زمین کی باز آبادکاری، قوم کے ساتھ حسن سلوک، قانون کی پابندی اور معروف میں حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔

د: اسلام کا پیغام پوری انسانیت کے لئے ہے، "وما أرسلناك إلا كافة للناس بشيرا ونذيرا" (سورہ سبا: ۲۸) فرد ہو یا جماعت، قبیلہ ہو یا قوم، اسلام کا پیغام انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے، اور انسان کے اندرون میں جو امن کی روح ہے اس سے ہم آہنگ ہے، ہمارے دین نے جن حقوق کو (ان میں شہریت اور پناہ گزینی کے حقوق بھی ہیں) لازم قرار دیا ہے وہ ایسی ضرورتیں ہیں جن سے لوگوں کو مفر نہیں، اس لئے کہ یہ حقوق انسان کے اس مقام بلند کی دلیل ہے جو اللہ تعالی نے عطا کیا ہے اور جس نے اس کو زمین میں جانشیں بنایا ہے۔

"وصل اللّٰھم وسلم علی بدر التمام ومصباح الظلام ومفتاح دار السلام وشمس دین الاسلام سیدنا وحبیبنا محمد خیر الانام وعلی اھل بیتہ وصحبہ الکرام والحمد للہ رب العالمین فی البدء والختام"۔ ☆☆☆

تیسرا باب تفصیلی مقالات

شہریت اور شہری حقوق کی شرعی بنیادیں

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی [1]

اسلام میں اخوت اور بھائی چارگی کی بنیاد ایمان ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "إنما المؤمنون إخوة" (سورۂ حجرات: ۱۰) (مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں)، بلاشبہ اصل انسانیت میں تمام انسان برابر ہیں، اور انسانی رشتہ سب کے ساتھ قائم ہے، جس کی بنا پر کسی انسان پر ظلم روا نہیں، اور بہترین سماجی تعلقات سب کے ساتھ قائم کرنا مطلوب ہے، البتہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ انسانی رشتہ کے ساتھ ایمانی اخوت میں بھی بندھا ہوا ہے، لہذا قومی، قبائلی، خاندانی، علاقائی، سیاسی اور ذاتی مصالح کے پیش نظر اس رشتہ اخوت کو پامال کرنا یا کمزور کرنا یا اس میں رخنہ ڈالنا ایک جرم عظیم ہے، اس مختصر سی تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

ا۔ اسلام میں شہریت حاصل ہونے کی اصل بنیاد: ا۔ "ایمان" ہے، چنانچہ مومن کا وطن ہر وہ ملک ہے جہاں اسلامی شریعت نافذ ہو، احکام الٰہی پر ہو، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (توبہ: ۷۱) (اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں)، ایک جگہ ارشاد ہے: "إن الأرض لله يرثها من يشاء من عباده" (سورۂ اعراف: ۱۲۸) (زمین اللہ کی ہے وہ جن کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا وارث بناتا ہے)، ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "يايها الذين آمنوا لا تتخذوا الكافرين أولياء من دون المؤمنين أتريدون أن تجعلوا لله عليكم سلطانا مبينا" (سورۂ نساء: ۱۴۴) (اے ایمان والو، مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرالو)، نیز فرمان الٰہی ہے: "إنما المؤمنون إخوة" (الحجرات: ۱۰) (مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔

چنانچہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے والے صحابہ کرام مدینہ منورہ کے شہری "ایمان" کی بنیاد قرار پائے۔

دوسری بنیاد: "مستقل بودوباش" ہے، چنانچہ جو جس ملک میں مستقل بودوباش رکھتا ہو، اس طرح کہ نسل در نسل وہاں قیام کئے ہو، وہ اس ملک کا شہری ہے، چنانچہ قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ملک میں متعدد قومیں آباد رہ سکتی ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "ومن آياته خلق السموات والأرض واختلاف ألسنتكم وألوانكم إن في ذلك لآيات للعالمين" (سورۂ روم: ۲۲)۔ (اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری بولیوں اور تمہارے رنگوں کا تنوع بھی ہے، بے شک اس کے اندر علم والوں کے لئے گوناگوں نشانیاں ہیں)۔

ایک جگہ ارشاد ہے: "ولا تكونوا كالتي نقضت غزلها من بعد قوة أنكاثا، تتخذون أيمانكم دخلا بينكم أن تكون أمة هي أربى من أمة، إنما يبلوكم الله به، وليبنن لكم يوم القيامة ماكنتم فيه تختلفون" (سورۂ نحل: ۹۲)۔ (اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ، جس نے اپنا سوت خوب مضبوط کاتنے کے بعد تار تار ادھیڑ کر رکھ دیا تم اپنی قسموں کو اس اندیشہ سے آپس کے فساد کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک امت دوسری امت سے کہیں بڑھ نہ جائے، اللہ اس کے ذریعہ سے تمہاری آزمائش کر رہا ہے، اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو اچھی طرح تم پر واضح کردے گا، جس میں تم اختلاف کر رہے ہو)۔

علامہ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: "أي تحلفون للناس إذا كانوا أكثر منكم ليطمئنوا إليكم، إذا أمكنكم الغدر بهم

---

[1] استاذ فقہ واصول فقہ، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، مالاپورم، کیرالا۔

غدرتم. فنهى الله عن ذلك، لينبه بالأدنى على الأعلى إذا كان قد نهى عن الغدر والحالة هذه، فلأن ينهى عنه مع التمكن والقدرة لطريق الأولى'' (تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ۳،۱۳۱۰، بیروت، مؤسسة الریان طبع ۲۶، ۱۴۲۸ھ)۔ (یعنی تم لوگوں کے سامنے قسم کھاتے ہو، جب وہ تم سے زیادہ ہوتے ہیں، تاکہ وہ تم سے مطمئن ہو جائیں، پھر جب ان کے ساتھ عہد شکنی تمہارے لئے ممکن ہوتی ہے، تو تم عہد توڑ بیٹھتے ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا، تاکہ کم تر صورتحال سے برتر صورتحال پر متنبہ فرمائے کہ جب اس حالت میں عہد شکنی سے منع فرمایا ہے، تو بدرجہ اولیٰ قدرت وقابو کی حالت میں اس سے منع فرمایا جائے گا)۔

نیز فرمان باری ہے: ''يايها الناس إنا خلقنا كم من ذكروانثى، وجعلناكم شعوبا و قبائل لتعارفوا، إن اكرمكم عند الله يتقاكم'' (سورۂ حجرات: ۱۳)۔

ابو جعفر محمد بن جریر طبری اس کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: ''يقول: وجعلناكم متناسبين، فبعضكم يناسب بعضا نسبا بعيدا، وبعضكم يناسب بعضا نسبا قريبا'' (جامع البیان ۱۱،۳۹۷، طبع اول، دار الکتب العلمیہ ۱۴۱۲ھ)۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اور ہم نے تم کو ہم آہنگ کر کے پیدا کیا ہے، چنانچہ تم میں سے بعض دوسرے بعض کے ساتھ دور کے رشتہ کی بنا پر مناسبت رکھتے ہوں، اور تم میں سے بعض بعض سے نزدیکی رشتہ کی بنا پر مناسبت رکھتے ہو)۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: ''يأيها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة، وخلق منها زوجها، وبث منهما رجالا كثيرا ونساء'' (سورۂ نساء: ۱)۔

ان تمام آیتوں سے واضح ہے کہ مسلم ملک میں متعدد قومیں آباد ہو سکتی ہیں، کیونکہ تمام انسان ایک باپ آدم اور ایک ماں حوا سے پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا جو جہاں پیدا ہوا ہے، وہاں بسنے اور بود و باش رکھنے کا حق دار ہے۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی نئی اسلامی ریاست کا ۴۷ دفعات پر مشتمل جو دستور مرتب کیا تھا، اس کی ایک دفعہ ہے: ''إنه من تبعنا من يهود، فإن له النصر والأسوة، غير مظلومين ولا متناصرين عليهم'' (سیرت ابن ہشام ۱،۵۰۳، ط مصر، الحلبی ۱۳۷۵)۔ (یہود میں سے جو ہماری تابعداری کرے، اس کی مدد کی جائے گی، اور اس پر ظلم نہ ہوگا، اور نہ اس کے خلاف مدد ہوگی)۔

اور ایک دوسری دفعہ میں ہے: ''إن يهود بني عوف أمة مع المؤمنين، لليهود دينهم، وللمسلمين دينهم، مواليهم وأنفسهم وأهل بيته إلا من ظلم وأثم، فإنه لا يوتغ إلا نفسه وأهل بيته'' (سیرت ابن ہشام ۱،۵۰۳)۔ (یہود بنی عوف اہل ایمان کے ساتھ ایک امت ہیں، یہود کو اپنے دین کی آزادی ہے، اور خود مسلمانوں اور ان کے موالی (آزاد کردہ غلام) کو ان کے دین کی آزادی ہے، مگر جو ظلم کرے اور گناہ کا مرتکب ہو، تو وہ خود اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کو ہلاک کرے گا)۔

اس تاریخ ساز دستور سے بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد قومیں مسلم ریاست کی سربراہی میں ایک درجہ کے شہری بن کر رہ سکتے ہیں۔

تیسری بنیاد: ''مخصوص مدت تک کسی ملک میں قیام'' ہے، خواہ قیام معاشی سرگرمی انجام دینے کے لئے ہو، یا نوکری وملازمت کی خاطر ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کو اس بنیاد پر شہریت دی جاسکتی ہے، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، جبکہ اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کے خلاف نہ ہو، علامہ کاسانی رقم طراز ہیں: ''والأصل أن الحربي إذا دخل دار الاسلام بأمان، ينبغي للإمام أن يتقدم إليه فيضرب له مدة معلومة على حسب ما يقتضي لرأيه، ويقول له: إن جاوزت المدة، جعلتك من أهل الذمة، فإذا جاوزها صار ذميا؛ لأنه لما قال له ذلك، فلم يخرج حتى مضت المدة، فقد رضي بضير ورته ذميا'' (بدائع الصنائع کتاب السیر، مطلب الأمان المؤبد ۷،۱۱۰)۔ (اور ضابطہ یہ ہے کہ حربی دار الاسلام میں اگر امان کے ساتھ داخل ہو تو امام کے۔ لئے مناسب ہے کہ اسے آگاہ کر دے اور اپنی رائے کے مطابق ایک متعین مدت مقرر کر دے، اور اس سے کہے کہ اگر تم اس مدت سے تجاوز کرو گے، تو میں تجھے ذمیوں میں سے بنادوں گا، تو اگر وہ اس مدت سے تجاوز کرے گا، تو ذمی ہو جائے گا، اس لئے کہ جب اس نے اس سے یہ بات کہہ دی، اور وہ گیا نہیں، یہاں تک کہ مدت گذر گئی، تو وہ اپنے ذمی ہونے پر راضی ہو گیا)۔

یقیناً بڑی حد تک اس کی بنیاد مصلحت پر ہے، اگر ملک اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے کہ کسی شخص کو ایک مخصوص مدت کے قیام کے بعد شہریت دے دی

جائے تو شہریت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ اسلامی شریعت مصالح کی تحصیل وتکمیل کرتی ہے، جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے: ''الشريعة جاءت لتحصيل المصالح وتكميلها، وتعطيل المفاسد وتقليلها'' (الاستقامة لابن تيميه ۱؍۲۸۸ طبع اول جامعة الامام محمد بن سعود ۱۴۰۳ھ)۔ (شریعت مصالح کی تحصیل اور اس کی تکمیل اور مفاسد کے ازالہ اور اسے کم کرنے کے لئے آئی ہے)۔

۲۔ اس کی دوصورتیں ہیں: اول: اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری کی بنا پر دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے، اور وہ مجبوری ایسی ہو کہ اگر اس کی رعایت نہ کی جائے، تو اس کے دین یا جان یا عزت وآبرو یا مال کو شدید خطرہ لاحق ہو، تو ایسی صورت میں اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً فرض ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله، والذين آووا ونصروا، اؤلئك بعضهم أولياء بعض، والذين آمنوا ولم يهاجروا مالكم من ولايتهم من شئ حتى يهاجروا وإن استنصروكم في الدين، فعليكم النصر'' (سورۂ انفال:۷۲)۔ (وہ لوگ جو ایمان لائے، اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کیا، اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ باہم اگر ایک دوسرے کے ولی وحامی اور مددگار ہیں، رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تو تمہارا ان سے کوئی رشتہ ولایت نہیں، یہاں تک وہ ہجرت کریں اور وہ دین کے معاملے میں تم سے طالب مدد ہوں تو تم پر مدد واجب ہے)۔

ایک جگہ ارشاد ہے: ''والذين امنوا وهاجروا وجاهدوا في سبيل الله، والذين آووا ونصروا، أولئك هم المؤمنون حقا، لهم مغفرة ورزق كريم'' (سورۂ انفال:۷۴)۔ (اور جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ پکے مؤمن ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور باعزت روزی ہے)۔

ان آیات سے بالکل واضح ہے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمانوں کے دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کو بچانا فرض اور حقیقی ایمان کی علامت ہے، چنانچہ علامہ ابن کثیر تحریر کرتے ہیں: ''بعضهم أولياء بعض أي: كل منهم أحق بالآخر من كل أحد'' (تفسير القرآن العظيم ۲؍۱۰۲۱) (ان میں سے ہر ایک شخص دوسرے کا عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہے)۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''فإنه واجب عليكم نصرهم؛ لأنهم إخوانكم في الدين'' (مرجع سابق ۲؍۱۰۳۲) (تو تم پر ان کی مدد واجب ہے، اس لئے کہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں)، اور ابن حجر رقم طراز ہیں: ''وكانت الحكمة أيضا في وجوب الهجرة على من أسلم، يسلم من أذى ذويه من الكفار، فإنهم كانوا يعذبون من أسلم منهم، إلى أن يرجع عن دينه، وفيهم نزلت: إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي أنفسهم، قالوا: فيم كنتم، قالوا:كنا مستضعفين في الأرض، قالوا: ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها'' (نساء:۹۷)، وهذا اهجرة باقية في حق من أسلم في دار الكفر، وقدر على الخروج منها'' (فتح الباری ۶؍۳۸-۳۹)۔ (مسلمان ہونے والے پر ہجرت کے وجوب کی یہ بھی حکمت تھی کہ وہ اپنے کافر رشتہ داروں کی ایذا رسانی سے محفوظ رہے، کیونکہ وہ اس شخص کو تکلیف دیتے تھے، جو ان میں سے مسلمان ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے دین سے لوٹ جائے، اور ان ہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے ہیں، وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے، وہ جواب دیں گے، ہم تو اس ملک میں بالکل بے بس تھے، وہ کہیں گے کہ اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے) اور یہ ہجرت اس شخص کے حق میں باقی ہے جو دار الکفر میں اسلام لائے، اور وہاں سے نکلنے پر قادر ہو)۔

اور علامہ ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں: ''فالناس في الهجرة على ثلاثة أضرب'' (المغنی، کتاب الجهاد، فصل فی الهجرة ۹؍۲۹۴) پوری عربی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

(ہجرت کے سلسلہ میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس پر ہجرہ واجب ہے، اور یہ وہ شخص ہے جو اس پر قادر ہو، اور اس کے لئے اپنے دین کو ظاہر کرنا ممکن نہ ہو، اور کفار کے درمیان رہ کر اپنے دین کے فرائض وواجبات کو انجام دینا ممکن نہ ہو، تو اس پر ہجرت واجب ہے...... ۲۔ دوسری قسم وہ ہے جس پر ہجرت نہیں ہے، اور یہ عورتوں، بچوں اور ان کی مانند میں سے وہ حضرات ہیں، جو اس سے عاجز ہوں، مرض یا قیام کرنے پر مجبور کئے جانے یا کمزوری کی وجہ سے، تو اس دوسری قسم پر ہجرت نہیں ہے، اس لئے کہ فرمان الٰہی ہے: (البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں، اور بچے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے اور نہ کوئی راہ پا رہے ہیں، یہ

لوگ توقع ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے، بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے)......اور ۳۔ تیسری قسم وہ ہے جس کے لئے ہجرت مستحب ہے اور واجب نہیں، اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس پر قادر ہوں، لیکن اپنے دین کے اظہار اور اسے قائم کرنے کی قدرت رکھتے ہوں، تو ان کے لئے ہجرت مستحب ہے، تاکہ کفار سے جہاد کرسکیں، اور مسلمانوں کی تعداد بڑھا سکیں، اور ان کی مدد کرسکیں، اور کفار کی تعداد بڑھانے سے بچ سکیں، اور ان کے ساتھ اختلاط سے محفوظ رہیں، اور ان کے درمیان برائیوں کے دیکھنے سے دور رہیں، اور اس قسم پر ہجرت واجب نہیں، اس لئے کہ یہ ہجرت کے بغیر اپنے دین کے واجبات انجام دے سکتے ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا مسلمان ہونے کے باوجود مکہ میں مقیم تھے)۔

اور ظاہر سی بات ہے کہ مسلم ملک مجبوری کی بھی اگر رعایت نہ کرے، تو پھر ہجرت کے وجوب کی ادائیگی کس طرح ہوگی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "المسلم أخو المسلم، لا يظلمه ولا يخذله" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۵۶۴،سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۴۸۸۲)۔ (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے)، لہذا مجبوری کی حالت میں اسے بے یار و مددگار چھوڑنا جائز نہیں، اور اس کی شہریت کی درخواست قبول کرنا دوسرے مسلم ملک پر واجب ہے۔

۲۔ اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان محض خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اگر اس خطہ میں گنجائش ہو، تو اس دوسرے ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا مستحب ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "المسلم أخو المسلم: لا يظلمه ولا يسلمه، من كان في حاجة أخيه، كان الله عزوجل في حاجته" (صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۴۴۲، ۶۹۵۱،صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۵۸۰)۔ (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے، اور نہ اسے تباہی کے حوالہ کرتا ہے، جو اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا، اللہ عزوجل اس کی حاجت پوری کرے گا)۔

۳۔ یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ تمام ممالک جہاں اللہ تعالیٰ کی شریعت نافذ ہو، سارے مسلمانوں کا وطن ہے، لہذا مسلم ملک کی سب سے پہلی ذمہ داری ہے کہ وہ فوجی طاقت کے لحاظ سے اس قدر مضبوط ہو کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں پر ظلم نہ ہوسکے، لیکن اگر اس کے اندر مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو روکنے کی طاقت نہیں ہے، تو پھر شرعاً اس کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ دوسرے ملک کے پناہ لینے والے مسلمانوں کو پناہ گزیں کا درجہ دے، اور ان تارکین وطن مسلمانوں کو شہری تسلیم نہ کرے، اور ملک کے قدیم باشندوں کی طرح شہری ہونے کی سہولتیں انہیں فراہم نہ کرے، انہیں پناہ گزیں قرار دینا ایک سنگین جرم، اسلام کے ساتھ ایک عظیم خیانت اور مغرب کی اندھی تقلید ہے، جس کی بنا پر مسلمانوں کو مختلف خانوں اور سرحدوں میں بانٹ دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "من يهاجر في سبيل الله يجد في الأرض مراغما كثيرا وسعة" (نساء:۱۰۰) (جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں بڑے ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا)۔

اگر اللہ تعالیٰ کی زمین میں تارکین وطن مسلمانوں کے ساتھ دوہرا معیار اختیار کیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کی زمین ان کے حق میں وسیع کیسے ہوگی اور اسے ناگواریوں سے چھٹکارا کیسے ملے گا، چنانچہ علامہ کثیرؒ رقم طراز ہیں: "هذا تحريض على الهجرة، وترغيب في مفارقة المشركين، وأن المؤمن حيثما ذهب وجد عنهم مندوحة وملجأ يتحصن فيه" (تفسير القرآن العظيم ۱/۶۰۸) (یہ ہجرت پر ابھارنا ہے، اور مشرکوں سے جدا ہونے کی رغبت دلانا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ مومن جہاں جائے گا تو ان سے نجات کی جگہ اور پناہ گاہ پائے گا، جہاں محفوظ ہوسکے)۔

اور اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے: "وإن استنصروكم في الدين، فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق، والله بما تعملون بصير" (انفال:۷۲)۔ (اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد طلب کریں، تو تم پر مدد واجب ہے، مگر یہ کہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابلہ میں ہو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو، اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہے) اور یہ بالکل واضح ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ دار الاسلام کا دروازہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہو، دار الاسلام ان کو دار الکفر سے ہجرت کی دعوت دے رہا ہو اور ان کو یکساں اور برابر درجہ کا شہری قرار دینے کے لئے بے تاب ہو، اگر صورتحال یہ ہو کہ دار الکفر کے مسلمان اسلام کے جرم میں ستائے جا رہے ہوں، تو ان کو ظلم سے بچانے کے لئے ان کی مدد کرنا فرض ہے، اور اگر مدد کی صورت یہ ہو کہ وہاں سے ان کو نکال لیا جائے، تو ان کو وہاں سے نکال کر مسلم ملک کی شہریت عطا کرنا ضروری ہے، اور معاہد قوم سے جنگ نہ کرنے کا جواز اس وقت ہے، جبکہ تارکین وطن مسلمانوں کو مسلم ملک اپنا شہری بنانے کے لئے تیار ہو، بصورت دیگر عہد توڑ کر ظالم کی سرکوبی لازم ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "والذين تبوءوا الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجر إليهم ولا يجدون في صدورهم حاجة مما أوتوا، ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة، ومن يوق شح نفسه فأولئك هم

المفلحون'' (حشر:۹)۔ (اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے اور ایمان استوار کئے ہوئے ہیں، وہ دوست رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہجرت کر کے ان کی طرف آرہے ہیں، اور جو کچھ ان کو دیا جارہا ہے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کر رہے ہیں، اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں، اگر چہ انہیں کوئی احتیاج ہو، اور جو خود غرضی سے محفوظ رکھے گئے، تو درحقیقت وہی لوگ کامیاب ہیں)۔

یہ آیت واضح طور پر اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ مسلمان تارکین وطن کے ساتھ فراخ دلی کا برتاؤ ہونا چاہئے، ان کو برابر درجہ کے حقوق ملنے پر قدیم باشندوں کے دلوں میں کوئی رشک وحسد کا جذبہ پیدا نہ ہونا چاہئے، اور ان کا کشادہ دلی سے خیر مقدم اور استقبال ہونا چاہئے۔

اور ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر لشکر کو حکم دیا ہے: ''ثم ادعهم إلى التحول من دارهم إلى دار المهاجرين، وأعلمهم إن فعلوا ذلك أن لهم ما للمهاجرين، وأن عليهم ما على المهاجرين'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۷۳۱)۔ (پھر مسلمان ہونے والی قوم کو اپنے ملک سے ہجرت گاہ سے منتقل ہونے کی دعوت دو، اور انہیں بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کے حقوق دیگر مہاجرین کی طرح ہوں گے اور ان کی ذمہ داریاں بھی دیگر مہاجرین کی طرح ہوں گی)۔

اس حدیث سے بالکل واضح ہے کہ مسلمان تارکین وطن اور کسی ملک کے قدیم باشندوں کے درمیان ایک شہری ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو مہاجرین کا ملک قرار دیا ہے۔

اور حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ''دعا النبي ﷺ الأنصار أن يقطع لهم البحرين، قالوا: لا، إلا أن تقطع لإخواننا من المهاجرين مثلها'' (صحيح البخاری حدیث نمبر: ۲۱۶۳، ۳۱۶۳، ۳۷۹۴)۔ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر یہ خواہش ظاہر کی کہ (بحرین) کا علاقہ انہیں جاگیر دے دی جائے، تو انہوں نے منع کر دیا اور یہ خواہش کی کہ ہمارے مہاجر بھائی کو بھی اس کے برابر جاگیر دے دی جائے تب ہی ہم جاگیر لینا پسند کریں گے) اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ مسلمان تارکین وطن اور کسی مسلم ملک کے قدیم باشندوں کے درمیان شہری ہونے کی سہولتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ انصار نے کہا: ''اقسم بيننا وبين إخواننا النخيل، قال: ''لا'' فقالوا: أتكفوننا المؤنة ونشرككم في الثمرة؟ قالوا: سمعنا وأطعنا'' (صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۳۲۵، ۲۷۱۹، ۳۷۸۲)۔ (ہمارے اور ہمارے مہاجرین بھائیوں کے درمیان کھجور کے باغ تقسیم کر دیجئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، تب انصار نے کہا کہ آپ حضرات باغ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھال لیں، اور ہم پھل میں آپ کے شریک رہیں گے، تو دونوں فریق نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور اطاعت کی، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی، اس بات کے سلسلہ میں جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا)۔

اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ مسلمان تارکین وطن اور مسلم ملک کے قدیم باشندوں کے درمیان شہریت کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے، بلاشبہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان فرق کرنا صریح ظلم ہے، اور ظلم حرام ہے، اور یقیناً شہریت کے حقوق میں مسلمان تارکین وطن اور مسلم ملک کے قدیم باشندوں کے درمیان فرق کرنا کھلا ہوا ظلم ہے جو مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔

۴۔ اسلامی نقطہ نظر سے شہریت کے درج ذیل حقوق ہیں:

۱۔ شخصی آزادی کا حق: اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ملک میں مکمل آزادی کے ساتھ کہیں بھی آجا سکتا ہے، اور کسی بھی جگہ کا سفر کر سکتا ہے، بغیر کسی سبب کے نہ اسے سزا دی جا سکتی ہے، اور نہ اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ''ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين'' (بقرہ: ۱۹۰) (اور حد سے بڑھنے والے نہ بنو، بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں کر رکھتا۔

اور حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے روایت کی کہ وہ فرماتا ہے: "یا عبادی إنی حرمت الظلم علی نفسي، وجعلته بينكم محرما، فلا تظالموا..." (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۵۷۷)۔ (اے میرے بندو، میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام ٹھہرا لیا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے، لہٰذا آپس میں ظلم نہ کرو)۔

چونکہ انسان مکرم ہے، لہٰذا اس کی تکریم کا تقاضا شخصی آزادی ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ''ولقد كرمنا بني آدم وحملناهم في

البر والبحر، ورزقناهم من الطيبات، وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا'' (اسراء:۷۰) (اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری عطا کی، اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا، اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی)۔

۲۔ سماجی حق: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شہری کو اپنے مذہب کے دربناہ میں رہ کر شادی بیاہ کی آزادی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''فانكحوا ماطاب لكم من النساء مثنى وثلث وربع، فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة'' (نساء:۳) (تو عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں، ان سے دودو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلو، اور اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کرسکو گے، تو ایک ہی پر بس کرو)۔

۳۔ معاشی حق: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شہری پوری آزادی اور اپنے مکمل اختیار کے ساتھ کوئی کام، پیشہ، تجارت وروزگار اور سرکاری اداروں میں ملازمت کرنے کا حق رکھتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ''هو الذي جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا في مناكبها، وكلوا من رزقه وإليه النشور'' (سورۂ ملک:۱۵) (وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ایک فرمانبردار اونٹنی کی مانند بنایا، تو بخشے ہوئے رزق میں سے برتو، اور اس کی طرف پھر اکٹھے ہونا ہے)۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: ''فإذا قضيت الصلاة فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل الله'' (جمعہ:۱۰) (پھر جب نماز ختم ہوجائے، تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ کے فضل کے طالب بنو)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لأن يحتطب أحدكم حزمة على ظهره، خير من أن يسأل أحدا فيعطيه أو يمنعه" (صحیح البخاری، حدیث نمبر ۲۰۷۴، ۲۳۷۴، صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۰۴۲) (تم میں سے کوئی لکڑی چنے اور اس کا گٹھر اپنی پشت پر لے کر آئے، یہ اس بات سے بہتر ہے کہ کسی سے بھیک مانگے کہ وہ دے یا نہ دے)۔

۴۔ سماجی تکافل کا حق: ہر شہری کو فقر وفاقہ اور احتیاج کے وقت سماجی تعاون اور سماجی کفالت کا حق حاصل ہے اور بیماری کی حالت میں سرکاری ہسپتالوں میں مفت علاج کا حق ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (مائدہ:۲) (نیکی اور تقوی میں تم تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم زیادتی میں تعاون نہ کرو)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''أنا أولى المؤمنين من أنفسهم، فمن مات وعليه دين، ولم يترك وفاء فعلينا قضاؤه، ومن ترك مالا فلو رثته'' (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۲۹۸، ۶۷۳۱، صحیح مسلم ۱۶۱۹)۔ (میں مومنوں سے خود ان کی جانوں کے مقابل میں زیادہ قریب ہوں، سو جو مرجائے اور اس کے ذمہ دین ہو، اور ادائیگی کے لئے مال نہ چھوڑ جائے تو ہمارے ذمہ اسے ادا کرنا ہے، اور جو مال چھوڑ جائے تو وہ اسکے ورثہ کا ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ سرکاری خزانہ سے محتاجوں کی مدد کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور یہ احسان نہیں، بلکہ فقراء ومحتاجین کا حق ہے، لہذا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ کام پر قادر کے لئے کام کے مواقع فراہم کرے اور محتاجوں کی مدد کرے۔

۵۔ تعلیم وتعلم کا حق: ہر شہری کو سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم وتعلم کا حق ہے، چنانچہ قرآن کریم کی پہلی آیت ہی لوگوں کو پڑھنے اور لکھنے کے ذریعہ تحصیل علم کا حکم دیتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''اقرأ باسم ربك الذي خلق، خلق الإنسان من علق، اقرأ وربك الأكرم، الذي علم بالقلم، علم الإنسان مالم يعلم'' (العلق:۱-۵) (پڑھ اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، انسان کو خون کے لوتھڑے سے، پڑھ، اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم کے واسطہ سے تعلیم دی، اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا)۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسان پڑھنے لکھنے کی ذمہ داری سے پوری طرح اسی وقت سبکدوش ہوسکتا ہے، جبکہ حکومت اس کے مواقع سب کے لئے یکساں طور پر فراہم کرے، تاکہ علم عام ہو، اور ہر شخص تحصیل علم کرسکے، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے چھپانے کو سخت جرم اور قابل سزا گناہ قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ''من سئل عن علم فكتمه ألجم بلجام من نار يوم القيامة'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۳۶۵۸، صحیح ابن حبان حدیث نمبر ۹۵، اور اس کی سند صحیح ہے) (جس سے کسی علم کے بارے میں دریافت کیا جائے اور وہ اسے چھپالے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی)۔

۶۔ عدالتی چارہ جوئی اور انصاف حاصل کرنے کا حق: اسلام کی نظر میں ہر شہری کو عدالتی چارہ جوئی اور انصاف حاصل کرنے کا حق ہے، ارشاد باری تعالی

ہے: ''وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل...'' (نساء:۵۸) (اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو)، دوسری جگہ ارشاد ہے: ''يأيها الذين آمنوا كونوا قوامين لله شهداء بالقسط، ولا يجرمنكم شنآن قوم على ألا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقوى، واتقوا الله، إن الله خبير بما تعملون'' (مائدہ:۸)۔ (اے ایمان والو، عدل کے علمبردار بنو، اللہ کے لئے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی تقوی سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اس سے باخبر ہے)، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إياكم والظلم، فإن الظلم ظلمات يوم القيامة'' (صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۵۷۸، الأدب المفرد للبخاري حدیث نمبر ۴۸۸) (ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کا سبب ہے)۔

۷۔ سیاسی حقوق: ہر شہری کو اسلام کی نظر میں ووٹ دینے، انتخاب میں امیدوار ہونے اور سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق ہے، اور ان سیاسی حقوق کے واسطہ سے وہ اپنی حکومت کے معاملات کو انجام دینے میں شریک ہو سکتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وشاورهم في الأمر" (آل عمران:۱۵۹) (اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو) اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "وأمرهم شورى بينهم" (شوری:۳۸) (اور ان کے معاملات شوری سے طے پاتے ہیں)، اور یہ بالکل واضح ہے کہ ان سیاسی حقوق کے حاصل ہوئے بغیر حکومت کے معاملات کو انجام دینے میں شہری کی شرکت نہیں ہو سکتی ہے، اور حضرت ابوموسی اشعریؓ کہتے ہیں: ''دخلت على النبي ﷺ أنا ورجلان من قومي، فقال أحد الرجلين: أمرنا يا رسول الله، وقال الآخر مثله، فقال ﷺ: إنا لا نولي هذا من سأله، ولا من حرص عليه'' (صحیح البخاری حدیث نمبر ۷۱۴۹، المنتقی لابن الجارود ر ۲۳۳۷) (میں اور میری قوم کے دو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، تو ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، ہمیں حاکم بنا دیجئے، اور دوسرے نے بھی یہی بات کہی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم اس منصب پر طالب اور حریص کو فائز نہیں کرتے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حکومت ملازمت کی شرائط تو متعین کر سکتی ہے، لیکن اس حق سے شہریوں کو محروم نہیں کر سکتی ہے، اور حضرت ابورقیہ تمیم بن اوس داریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "الدين النصيحة، قلنا: لمن؟ قال: لله ولكتابه ولرسوله، ولأئمة المسلمين وعامتهم" (صحیح مسلم حدیث نمبر:۵۵) (دین خیر خواہی کا نام ہے، ہم نے کہا: کس کے لئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول اور مسلمانوں کے حکمراں اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی کا نام دین ہے)۔

اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کے حق میں جو بہتر اور مصلحت کا تقاضا ہو اسے انجام دیا جائے، لہذا ہر شہری کو ووٹ دینے کا حق ہے، تاکہ عام لوگوں کے لئے بہتر شخص کا انتخاب ہو سکے، جو ان کے مصالح کو بروئے کار لائے، اور جسے ووٹ دینے کا حق ہے اسے انتخاب میں امیدوار ہونے کا بھی حق ہے۔

۸۔ رائے کی آزادی کا حق: ہر شہری کو دوسرے کو اذیت پہنچائے بغیر رائے اختیار کرنے اور اس کے اظہار کرنے کا حق ہے، جیسا کہ گذرا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمرانوں کی خیر خواہی کو دین قرار دیا ہے، اور اس خیر خواہی کی ادائیگی اسی وقت ہوگی، جبکہ حکام کو بتایا جائے کہ کون سی پالیسی مسلمانوں کے لئے نفع بخش ہے اور کون سی پالیسی مضرت رساں ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر'' (آل عمران:۱۱۰) (نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو)۔ اور یہ بالکل واضح ہے کہ بھلائی کا حکم اور برائی کی ممانعت آزادی رائے کے حق کے بغیر ممکن نہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۴۳۴۴، سنن ترمذی حدیث نمبر ۲۱۷۴، مسند احمد حدیث نمبر ۱۱۱۴۳، اور اس کی سند صحیح ہے) (بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے پاس حق بات کہنا ہے)۔

اور یہ ظاہر ہے کہ حق گوئی آزادی رائے کے حق کے بغیر ممکن نہیں۔

۹۔ عقیدہ کی آزادی کا حق: ہر شہری کو اختیار ہے کہ اپنے پسندیدہ دین کو اختیار کرے، ارشاد ربانی ہے: "لا إكراه في الدين" (بقرہ:۲۵۶) (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے)، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو دعوت پر آمادہ کرتے ہوئے فرمایا: ''فو الله، لأن يهدي الله بك رجلا واحدا، خير لك من أن يكون لك حمر النعم'' (صحیح بخاری حدیث نمبر:۳۰۰۹، ۳۷۰۱، صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۴۰۶) (اللہ کی قسم، اللہ تعالی تمہارے ذریعہ ایک شخص کو ہدایت دے دے، یہ تمہارے حق میں اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تم سرخ اونٹوں کے مالک بن جاؤ)۔

۱۰۔ معصیت سے دوری کا حق: کسی شہری کو اسلامی نقطہ نظر سے کسی معصیت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، ارشاد الٰہی ہے: "لا ینال عهدی الظالمین" (بقرہ:۱۲۴) (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں جو ظالم ہوں گے)، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لا طاعة لمخلوق فی معصية الله عز وجل" (مسند احمد حدیث نمبر ۱۰۹۴، اور اس کی سند صحیح ہے) (اللہ عزوجل کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں)، اور ایک روایت میں ہے: "لا طاعة فی معصية الله، إنما الطاعة فی المعروف" (صحیح البخاری حدیث نمبر ۷۲۵۷، صحیح مسلم ۱۸۴۰) (اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں، طاعت تو بس نیک کاموں میں ہے)۔

۵۔ شریعت اسلامی میں پناہ گزینوں کے درج ذیل حقوق ہیں:

۱۔ ان کا دفاع کیا جائے، ان کی حمایت ونصرت کی جائے، ان کے بچاؤ کا انتظام کیا جائے، ان کو پناہ دی جائے، اور ان کے ٹھہرانے کا نظم کیا جائے کہ یہی عدل وانصاف کا تقاضا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إن الله يأمر بالعدل والإحسان وإيتآی ذی القربی، وينهی عن الفحشاء والمنكر والبغی" (نحل:۹۰) (یقیناً اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور رشتہ داروں کو دیتے رہنے کا، اور بے حیائی، برائی اور سرکشی سے روکتا ہے)، اور ایک جگہ عاجز اور بے بس کفار کی مدد کرنے کے سلسلہ میں ارشاد ہے: "ويطعمون الطعام علی حبه مسكينا ويتيما وأسيرا" (دہر:۸) (اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں) اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت تھی:

"إنك لتصل الرحم، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقری الضيف وتعن علی نوائب الحق" (صحیح بخاری، حدیث نمبر:۳) (آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزور کی مدد کرتے ہیں اور محتاج کو مال عطا کرتے ہیں، مہمان کی میزبانی کرتے ہیں اور قدرتی آفات کے وقت لوگوں کی مدد فرماتے ہیں)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "حلف الفضول" کو مبارک معاہدہ قرار دیا، جو مظلوموں کی مدد اور کمزوروں اور بے سہاروں کی پشت پناہی کے لئے کیا گیا تھا، جیسا کہ حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم، ولو أدعى به في الإسلام لأجبت" (معرفۃ السنن والآثار للبیہقی حدیث نمبر ۱۳۲۳۲، السنن الکبریٰ للبیہقی حدیث نمبر:۱۳۰۸۰)۔ (میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا کہ جس کے بدلہ مجھے سرخ اونٹ بھی پسند نہیں، اور اگر اس طرح کے معاہدہ کی مجھے اسلام کی حالت میں بھی دعوت دی جائے تو میں ضرور قبول کروں)۔

۲۔ دوسرا حق: پناہ گزینوں کو ان کے ملک کے حوالہ نہ کرنا، اگر ان پر ظلم وجبر کا اندیشہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتی يسمع كلام الله، ثم أبلغه مأمنه" (توبہ:۶) (اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے امان کا طالب ہو، تو اس کو امان دے دو، تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اس کو اس کے امان کی جگہ پہنچا دو)۔

ایک جگہ فرمایا: "والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار، والذين اتبعوهم بإحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه" (توبہ:۱۰۰) (اور مہاجرین وانصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے، اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اس سے راضی ہوئے)۔

اس آیت میں باشندگان مدینہ میں سے ان کی تعریف کی گئی ہے، جنہوں نے مظلوم مہاجرین کی مدد کی اور ان کو کفار مکہ کے حوالہ نہیں کیا۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "لقد تاب الله علی النبي والمهاجرين والأنصار الذين اتبعوه في ساعة العسرة" (توبہ:۱۱۷) (اللہ نے نبی اور ان مہاجرین وانصار پر رحمت کی نظر کی، جنہوں نے نبی کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا)۔

اس آیت کے اندر بھی ان باشندگان مدینہ کی مدح کی گئی ہے، جنہوں نے مدینہ میں پناہ لینے والوں کی مدد کی، یہاں تک کہ ان کا لقب ہی (انصار) (مدد کرنے والے) پڑ گیا۔

۳۔ تیسرا حق: پناہ گزینوں کو وہ تمام انسانی حقوق حاصل ہوں گے، جن سے شہری مستفید ہوتے ہیں، جیسے جان ومال، عزت وآبرو کے تحفظ، معاشی حمایت، عدل وانصاف، عقیدہ ورائے کی آزادی، چلنے پھرنے، سفر کرنے کی آزادی، شادی، اور خاندان کی تشکیل، پرامن جماعتوں اور پارٹیوں میں شرکت، کام اور پیشہ اختیار کرنے، سونے اور آرام کرنے، صحت کے تحفظ اور تحصیل علم کے حقوق حاصل ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "والذين آمنوا وهاجروا

وجاهدوا في سبيل الله، والذين آووا ونصروا، أولئك هم المؤمنون حقا، لهم مغفرة ورزق كريم. والذين آمنوا من بعد وهاجروا وجاهدوا معكم فأولئك منكم، وأولوا الأرحام بعضهم أولى ببعض في كتاب الله، إن الله بكل شيئ عليم" (انفال: ۷۴، ۷۵)۔ (اور جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ پکے مومن ہیں، ان کے لئے بخشش اور باعزت روزی ہے، اور جو ایمان لائیں اس کے بعد اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ جہاد میں شریک ہوں، یہ بھی تم ہی میں سے ہیں، اور رحمی رشتے والے اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے)۔

اور فرمان الٰہی ہے: "لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين، ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم، إن الله يحب المقسطين" (ممتحنہ: ۸)۔ (اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، جنہوں نے دین کے معاملہ میں نہ تم سے جنگ کی ہے، اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے)۔

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وأمرت لأعدل بينكم" (شوریٰ: ۱۵) (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں)۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ انصاف ہر ایک کے ساتھ مطلوب ہے، لہذا تمام انسانی حقوق پناہ گزینوں کو بھی حاصل ہوں گے۔

پناہ گزینوں اور شہریوں کے حقوق کے درمیان فرق:

اگر مستقل اور دائمی طور سے پناہ دی گئی ہے، تو پناہ گزینوں اور عام شہریوں کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے، جیسا کہ انصار نے مہاجرین کو دائمی پناہ دی تھی، اور تمام انسانی اور شہری حقوق میں ان کو شریک کیا تھا، اسی لئے ان کا لقب "انصار" (مدد کرنے والے) پڑا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم و أنفسهم في سبيل الله، والذين آووا ونصروا، أولئك بعضهم أولياء بعض" (انفال: ۷۲)۔

"إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم في الدين وأخرجوكم من دياركم، وظاهروا على إخراجكم أن تولوهم، ومن يتولهم فأولئك هم الظالمون" (ممتحنہ: ۹)۔

"إن الله يأمر بالعدل والإحسان" (نحل: ۹۰)۔

یہ آیت مطلق ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم سب کے ساتھ سماجی انصاف مطلوب ہے۔

اور اگر عارضی طور سے پناہ دی گئی ہے، اور پناہ گزیں غیر مسلم ہے، تو ایسی صورت میں سیاسی حقوق کے علاوہ دیگر انسانی حقوق اسے حاصل رہیں گے۔

۶۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار نہ کرے، اس لئے کہ غیر مسلم ملک میں ہر طرف ایمان پر ڈاکہ ڈالنے والے امور موجود ہوتے ہیں، برائیوں، شرور اور فتن کا دور دورہ ہوتا ہے اور برے مناظر عام ہوتے ہیں، جس سے معصیت کی روح پروان چڑھتی ہے، اور نیکی اور تقوی کی اسپرٹ کمزور ہوتی جاتی ہے، اسلامی تشخص کا تحفظ دشوار ہو جاتا ہے، حلال وحرام کے درمیان تمیز آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے، کفار و مشرکین کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے، ایک دو نسل تک اسلام کی حفاظت کسی حد تک ہو جاتی ہے، لیکن بعد کی نسلوں سے اسلام یا تو دور ہو جاتا ہے، یا برائے نام رہ جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم نے کفار و مشرکین کے ساتھ ایسی دوستی کو مذموم قرار دیا ہے جو اسلام کے مصالح کے خلاف ہو، "يأيها الذين آمنوا لا تتخذوا آباء كم وإخوانكم أولياء، إن استحبوا الكفر على الإيمان، ومن يتولهم منكم فأولئك هم الظالمون" (سورۂ توبہ: ۲۳)۔

اس آیت کے اندر اپنے کفار رشتہ دار کو ولی بنانے کی ممانعت ہے، تو پھر دور دراز کے کفار کو ولی بنانا کس طرح روا ہوگا؟

اور اسی جیسی حالت کے لئے جس میں اسلامی تشخص کا برقرار رکھنا دشوار ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۲۷۸۷ اور اس کی سند صحیح ہے)۔ (جو مشرک کے ساتھ اکٹھا ہوا اور ان کے ساتھ رہے، تو وہ اسی کی مانند ہے)۔

اور ایک حدیث میں فرمایا: "أنا بريئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله، ولم؟ قال: "لا تراءى ناراهما" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۶۴۵، ترمذی حدیث نمبر ۱۶۰۴، نسائی حدیث نمبر ۴۷۷۹، اگر چہ اس حدیث کے بارے میں ارسال کا کلام ہے، پھر بھی وہ صحیح ہے)۔ (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان اقامت کرے، صحابہ نے عرض کیا، ایسا کیوں؟ اے اللہ کے رسول، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جو بد دینی کی آگ ایک ساتھ نظر نہیں آتی چاہئے)۔

اور یہی خوب لکھا ہے ابو الولید محمد بن احمد بن رشد قرطبی (جد) (م ۵۲۰ھ) نے: "فكيف يباح لأحد الدخول إلى بلادهم حيث تجري عليه أحكامهم في تجارة أو غيرها. وقد كره مالك رحمه الله تعالى أن يسكن أحد ببلد يسب فيه السلف. فكيف ببلد يكفر فيه بالرحمن. وتعبد فيه من دونه الأوثان. لا تستقر نفس أحد على هذا. إلا وهو مسلم سوء مريض الإيمان" (المقدمات الممهدات ۲/۱۵۳، طبعة أولى دار الغرب الإسلامي ۱۴۰۸ھ) (تو کسی کے لئے کفار و مشرکین کے ملک میں داخل ہونا کیسے مباح ہوگا جہاں اس پر تجارت وغیرہ کے سلسلہ میں ان کے احکام نافذ ہوں گے جبکہ امام مالک نے ایسے شہر کی سکونت کو مکروہ قرار دیا ہے جہاں سلف کو برا بھلا کہا جاتا ہو تو ایسے شہر میں سکونت کیسے جائز ہوگی جہاں رحمان کے ساتھ کفر کیا جاتا ہو اور اسے چھوڑ کر بتوں کی پوجا کی جاتی ہو، اس صورتحال سے وہی کوئی مطمئن ہو سکتا ہے جو برا مسلمان اور مریض ایمان والا ہو)۔

ب- اگر غیر مسلم ملک کی شہریت لینا مجبوری ہو اور مسلم ملک میں بادشاہی یا حکمراں کی وجہ سے دین و مذہب، جان و مال، عقل اور عزت و آبرو خطرہ میں ہو اور غیر مسلم ملک میں مذہبی آزادی اور باعزت زندگی کی سہولت دستیاب ہو، دعوت الی اللہ اور اسلامی تعلیم کی نشر و اشاعت پر کوئی پابندی نہ ہو اور مستقبل قریب میں بھی اپنے اور اپنی آل و نسل کے ایمان و اسلامی تشخص کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو تو اس مجبوری کی حالت میں کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ مشہور فقہی قاعدہ ہے: "الضرورات تبيح المحظورات" اور اسی جیسی حالت کے لئے امام نووی نے لکھا ہے: "إذا قدر على إظهار الدين في بلد من بلاد الكفر، فقد صارت البلدة دار إسلام، فالإقامة فيها أفضل من الرحلة عنها، لما يترجى من دخول غيره في الإسلام" (المجموع شرح المهذب، کتاب السیر ۱۹/۲۶۳) (اگر کفار کے ممالک میں سے کسی ملک میں دین کے اظہار کرنے پر قادر ہو تو وہ ملک (اس کے حق میں) دار الاسلام (کے حکم میں) ہو گیا، سو وہاں مقیم رہنا وہاں سے کوچ کرنے سے بہتر ہے کیونکہ اس کی بدولت دوسرے شخص کے اسلام میں داخل ہونے کی امید ہے)۔

ج- محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت اس وقت ہوگی جبکہ اپنے اور اپنے آل و نسل کے دین و ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو اور مسلم ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ معاشی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، نیز یہ بھی شرط ہوگی کہ شہریت اختیار کرنے والا اپنے دینی احکام کو فراموش نہ کرے، دین و ایمان اور عمل صالح کے تقاضے کو ہر حال میں مقدم رکھے کیونکہ ایمان سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں، لہذا دنیا اگر جاتی رہے، زندگی تنگ ہو جائے اور حیات مصائب و مشکلات میں گزرے لیکن ایمان پر آنچ نہ آئے، اسی لئے سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے اپنے آخری وقت میں توحید و اسلام کا عہد لیا تھا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "أم كنتم شهداء إذ حضر يعقوب الموت. إذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدي. قالوا: نعبد إلهك وإله آبائك. ابراهيم واسماعيل واسحاق إلها واحدا ونحن له مسلمون" (بقرہ: ۱۳۳)۔

د- اس کا تعلق مصلحت سے ہے، اگر اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا تقاضا ہو کہ چند غیر مسلم حضرات کو مسلم ملک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کیا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، علامہ مرغینانی تحریر کرتے ہیں: "والأصل فيه أن الحربي لا يمكن من إقامة دائمة في دارنا إلا بالاسترقاق أو الجزية؛ لأنه يصير عينا لهم وعونا علينا فيلتحق المضرة بالمسلمين" (ہدایہ مع البنایہ، کتاب السیر، باب المستأمن ۷/۲۰۰) (اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ حربی کو غلام بنا کر یا اس سے جزیہ لے کر ہی دار الاسلام کے دائمی قیام کی قدرت دی جا سکتی ہے کیونکہ وہ کفار کا جاسوس اور ہمارے خلاف ان کا مددگار ہو جائے گا، سو وہ مسلمانوں کو ضرر پہنچائے گا)۔

اور علامہ سرخسی رقم طراز ہیں: "وفي التقدم إليه. إن بين مدة، فقال: إن خرجت إلى وقت كذا، وإلا جعلتك ذميا. فإن خرج إلى ذلك الوقت تركه ليذهب. وإن لم يخرج لم يمكنه من الخروج بعد ذلك. وجعله ذميا؛ لأن مقامه بعد التقدم إليه حتى مضت المدة رضا منه بالمقام في دارنا على التأبيد" (المبسوط ۱۰/۸۳) (اور اسے آگاہ کرنے کے وقت اگر امام نے مدت بیان کر دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ اگر فلاں وقت تک نکل گئے تو بہتر ہے ورنہ میں تمہیں ذمی بنا دوں گا، سو اگر وہ اس وقت تک نکل جائے تو اسے جانے دے اور اگر نہ نکلے تو اس کے بعد نکلنے سے روک دے اور اسے ذمی قرار دے، اس لئے کہ آگاہ کرنے کے بعد اس کا مزید قیام کرنا دار الاسلام میں ہمیشہ قیام کرنے پر رضامندی ہے)۔

اس سے پتہ چلا کہ اگر مجلس شوریٰ کے مشورہ سے امام کی رائے میں کسی غیر مسلم کو ذمی شہری کی حیثیت سے آباد کرنا مناسب ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ☆☆☆

انسان کی شہریت اور حقوق کا مسئلہ۔فقہ وقانون کی نظر میں

مولانا اختر امام عادل قاسمی [1]

انسان کی شہریت کا مسئلہ عہد حاضر کے جدید ترین مسائل میں ہے، جس پر مختلف جہتوں سے کئی دہائیوں سے گفتگو ہو رہی ہے،...... آج سے دس بارہ سال قبل جب میری کتاب ''غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل'' شائع ہوئی، تو اس وقت یہ بالکل نیا مسئلہ تھا، اور بہت کم مصنفین نے اس پر تفصیلی بحثیں کی تھیں، ......میں نے اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی، جو غالباً اردو زبان میں اس موضوع پر پہلی باقاعدہ علمی تحریر تھی، اس میں بڑی حد تک موضوع کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، کئی ممتاز اہل علم نے جن کے نام میرے پاس محفوظ ہیں اس مسئلہ پر میری حوصلہ افزائی اور تحسین فرمائی...... فجزاھم اللہ۔

قومیت کا قدیم تصور

یہ اس دور کا بہت حساس مسئلہ ہے، یہ اس دور میں انسان کی شناخت کا اولین ذریعہ بن گیا ہے، مذہب، اور رنگ و نسل کی بنیادیں آج ثانوی درجہ میں چلی گئی ہیں،...... گویا یہ عہد کے لحاظ سے معیار کی تبدیلی ہے، پہلے انسان کی پہچان اس کے وطن یا جغرافیہ سے نہیں، بلکہ اس کے افکار و خیالات اور مذہبی تصورات سے ہوتی تھی، ان کے علاوہ رنگ و نسل اور زبان و بیان بھی انسانی امتیاز کا معیار بنتے تھے...... پہلے کے لوگ جغرافیائی بنیادوں پر اتنا یقین نہیں رکھتے تھے، اور نہ ان پابندیوں کے قائل تھے، اسی لئے جب کبھی تصورات و نظریات اور نسلی یا لسانی معاملات میں جغرافیہ حائل ہونے کی کوشش کرتا تو وہ ہمیشہ جغرافیائی زنجیریں توڑ کے نکل جاتے، انہوں نے کبھی جغرافیہ کو گلے کا طوق نہیں بنایا، اور نہ تاریخ کے پچھلے معتبر ادوار میں کبھی جغرافیائی اور زمینی حدود کو قومیت (یعنی انسان جس نسبت سے پہچانا جائے) کی بنیاد بنایا گیا، بلکہ زمین کے ہر خطہ کو ہر فکر و نظر اور ہر رنگ و نسل کے لئے آزاد سمجھا جاتا تھا۔

فطرت سے قریب تر معیار:

قرآن کریم کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا وہی پرانا معیار فطرت سے قریب تھا، سورہ حجرات میں ارشاد ہے: ''یاأیها الناس إنا خلقناكم من ذكر وانثىٰ وجعلناكم شعوباً وقبائل لتعارفوا إنّ أكرمكم عندالله اتقاكم'' (الحجرات:۱۳)۔ (اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے، تاکہ تمہاری شناخت قائم ہو، بلاشبہ اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے)۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو دنیا کے تمام انسان ایک مرکز وحدت سے وابستہ ہیں، لیکن ان کے درمیان نسلی اور خاندانی امتیازات موجود ہیں، رنگ اور زبان کا تفاوت بھی خاندانی فرق سے پیدا ہوتا ہے، اور مختلف رنگوں کی آمیزش سے نئے رنگ، نئی زبانیں اور نئی تہذیبیں وجود میں آتی ہیں،...... خالق کائنات نے خود پردہ اٹھایا ہے کہ یہ امتیازات صرف باہمی شناخت کے لئے ہیں، اور یہ فرق مصنوعی نہیں فطری ہیں، جو خود خلاق فطرت نے قائم کئے ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو کسی کو پہچاننا اور ایک دوسرے میں فرق کرنا مشکل ہو جائے، لیکن ان میں سے کوئی بات معیار شرافت نہیں ہے، معیار فضیلت صرف تقویٰ، خوف خدا ہے، اور قومیت کی اصل بنیاد نظریہ ایمان ہے۔

آیت کریمہ واضح طور پر اشارہ کر رہی ہے کہ خاندان، رنگ اور زبانیں بھی قومیت کی فطری بنیادیں ہیں، اور ان کی بنیاد پر جو انسانی اکائیاں بنتی ہیں وہ بالکل غیر فطری نہیں ہیں، البتہ خود خالق فطرت کے نزدیک قومیت کی بہترین بنیاد وحدت فکر و نظر ہے، اہل تقویٰ دنیا میں جہاں بھی ہیں وہ بظاہر خواہ کتنی ہی اکائیوں میں منقسم ہوں، لیکن حقیقت میں وہ ایک ہی وحدت سے منسلک ہیں، جس کو بھی اس طرح بیان کیا گیا کہ: إنما المؤمنون إخوة (سورۂ حجرات:۱۰) (تمام اہل

---

[1] مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف، سمستی پور بہار۔

ایمان بھائی بھائی ہیں)۔

اور کہیں اس طرح فرمایا گیا: ''المسلمون کرجل واحد إن اشتکی عینہ إشتکی کلہ وإن اشتکی راسہ إشتکی کلہ'' (صحیح مسلم باب تراحم المؤمنین وتعاطفھم ج۸ ص ۲۰ حدیث نمبر ۶۷۵۴ ط دار الجیل بیروت)۔ (تمام مسلمان شخص واحد کی طرح ہیں، اس کی آنکھ دکھتی ہے تو پورا جسم دکھتا ہے اور سر میں تکلیف ہوتی ہے تو پورے جسم میں تکلیف ہوتی ہے)۔

''إنما مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم کالجسد إذا اشتکی منہ شیئا تداعی لہ سائر الجسد'' (مسند الشہاب القضاعی لمحمد بن سلامۃ بن جعفر القضاعی المصری (المتوفی ۴۵۴ھ) حدیث نمبر ۱۳۶۷، ط موسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۸۶ء)۔ (مسلمانوں کی مثال باہمی محبت وتعلق میں ایک جسم کی ہے، کہ جسم کے ایک حصہ میں تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس سے متاثر ہوتا ہے)۔

قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص اس پر شاہد ہیں کہ کلمہ کا رشتہ تمام رشتوں پر یہاں تک کہ خون کے رشتہ پر بھی مقدم ہے، قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آیا ہے، طوفان کے موقعہ پر حضرت نوحؑ کی ہزار خواہش کے باوجود ان کا بیٹا طوفان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا، جبکہ وعدۂ الٰہی تھا کہ حضرت نوحؑ کے اہل خانہ کی حفاظت کی جائے گی، اللہ پاک نے اس کی یہ توجیہ فرمائی کہ: ''إنہ لیس من أھلك'' (سورۂ ہود: ۴۶) (اے نوح تیرا بیٹا تیرے افراد خاندان میں شامل نہیں تھا)۔

ولدیت کا طاقتور ترین رشتہ ہونے کے باوجود خاندان نوحؑ سے کنعان کا نام خارج کر دیا گیا، اس طرح کے نصوص واشارات سے، اسلام کا نقطۂ نظر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خاندان، اور اس طرح کی دوسری تمام بنیادیں اگر چیکہ خود صناع قدرت کی بنائی ہوئی ہیں، لیکن قومیت کی اصل بنیاد اللہ کے نزدیک وحدت کلمہ اور وحدت فکر ونظر ہے۔

چنانچہ تاریخ کے پچھلے تمام تر ادوار انہی بنیادوں کے گرد گردش کرتے ہیں، خود یورپ کا کلیسائی نظام اسی تصور کا علمبردار تھا، بلکہ یک گونہ اس میں شدت پسندی پائی جاتی تھی، ...... مگر یورپ کے مادی عروج کے بعد جب مغربی اقوام پر مذہب بیزاری اور لادینیت کا غلبہ ہوا، تو انہوں نے صدیوں پرانے کلیسائی نظام سے آہستہ آہستہ آزادی حاصل کرلی، اس کے بعد لادینی رجحانات کا فروغ ہوا، اور اس کے اثرات یورپ کے زیر نگیں تمام علاقوں میں پہونچے، خواہ وہ ان کی قدیم آبادیاں ہوں یا نو آبادیات کا علاقہ، کوئی اس وبا سے محفوظ نہ رہ سکا، پھر دین کی جگہ پر وطنیت کا نیا بت تراشا گیا، اور اس بنیاد پر انسانوں کو انسانوں سے بانٹا گیا، مذہب اور خون کے رشتوں کو کاٹا گیا، ایک وطن میں رہنے والے تمام لوگوں کو، خواہ وہ کسی رنگ ونسل کے ہوں اور کسی بھی فکر ونظر اور مذہب وملت کے حامل ہوں ایک قوم قرار دیا گیا، ...... یہ وطنیت کا نیا تصور تھا، اور اسی بنیاد پر مغرب نے عالم اسلام کو بھی پارہ پارہ کر دیا، بقول ڈاکٹر اقبال:

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا ۔۔۔ سادگی اپنوں کی دیکھ، دشمن کی عیاری بھی دیکھ

اور اسی تصور کی بنیاد پر ملکوں کی سرحدی پابندیاں شروع ہوئیں، اور آمد ورفت اور بود وباش کی سہولتیں محدود کی گئیں، اور اس کے لئے نئے قواعد وضوابط وضع کئے گئے، اور یورپ کے عالمی قوت بن جانے کے بعد ان اصولوں کو بھی عالمی حیثیت دی گئی اور تمام ممالک کے لئے ان کی پابندی لازم کر دی گئی۔

وطنیت کی بنیادیں:

ملکوں کی سرحدیں پہلے بھی تھیں، ایک ملک سے دوسرے ملک آمد ورفت اور تجارت کا سلسلہ بھی جاری تھا، بین الاقوامی معاہدات بھی ہوتے تھے، تجارتی قواعد بھی تھے، جنگی کا نظام بھی تھا، وطنیت کا تصور بھی موجود تھا، اور اس تعلق سے کچھ قواعد وضوابط بھی تھے، ہماری کتب فقہ میں وطن کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں:

''الاوطان ثلاثۃ: وطن اصلی وھو وطن الانسان فی بلدتہ أو بلدۃ أخری اتخذھا دارا وتوطن بھا مع أھلہ وولدہ ولیس من قصدہ الارتحال عنھا، بل التعیش بھا، وطن الإقامۃ وھو أن یقصد الإنسان أن یمکث فی موضع صالح للإقامۃ خمسۃ عشر یوما أو أکثر، ووطن السکنی: وھو أن یقصد الانسان المقام فی غیر بلدتہ اقل من خمسۃ عشر یوما'' (بدائع الصنائع للکاسانی (م ۵۸۷ھ) ج ۱ ص ۳۱۶ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان ۱۹۸۶ء، المبسوط للسرخسی ج ۱ ص ۲۶۴ ط دار الفکر بیروت لبنان ۲۰۰۰ء وغیرہ)۔

(وطن اصلی: یعنی مقام پیدائش یا ایسا مقام جہاں وہ مستقل طور پر اپنے اہل وعیال کے ساتھ منتقل ہو چکا ہو، اور وہاں سے واپسی کا کوئی ارادہ نہ رکھتا ہو، وطن اقامت: ایسا مقام جہاں پندرہ دن یا اس سے زیادہ عارضی قیام کا ارادہ ہو، (۳) وطن سکونت: ایسا مقام جہاں پندرہ دن سے بھی کم قیام کا ارادہ ہو)۔

بعض فقہاء نے وطن کی دو ہی قسمیں کی ہیں (۱) وطن قرار: مقام پیدائش یا وہ مقام جہاں مستقل بود و باش کا ارادہ ہو، (۲) وطن مستعار: جہاں مستقل قیام کا ارادہ نہ ہو (حوالۂ بالا)۔

اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لئے ویزہ کا نظام بھی بہت پہلے سے قائم ہے، البتہ اس کی ضرورت عموماً اس وقت پڑتی تھی جب دو ملک باہم برسر پیکار ہوں یا جنگ کے حالات پیدا ہو چکے ہوں، امن کے حالات میں عام طور پر اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اسی لئے اس وقت کے حالات کے مطابق ویزہ کے لئے امان کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، یہ اصطلاح خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ضرورت صرف جنگی حالات میں تھی،...... پھر ویزہ (امان) کی بھی کئی قسمیں تھیں:

☆ شخصی ویزہ......(استامن لنفسه......) ☆ فیملی ویزہ......(طلب الامان لاهله......) ☆ گروپ ویزہ......(آمنوني على عشرة......) وغیرہ (دیکھئے البحر الرائق شرح کنز الدقائق لابن نجیم المصریؒ (م ۹۷۰ھ) ج ۵ ص ۸۷ ط دار المعرفۃ بیروت)۔

تفصیل کے لئے دیکھئے کتب فقہ میں کتاب السیر، اس موضوع پر راقم الحروف کی کتاب "اسلام اور بین الاقوامی قانون" میں بھی کافی تفصیل موجود ہے)۔

شہریت کا تصور:

یہ اس دور کی بات ہے جب ساری دنیا پر عالم اسلام کی بالادستی قائم تھی، اور بین الاقوامی معاملات میں اسلامی ضابطوں کو برتری حاصل تھی،...... لیکن جب مسلمانوں پر زوال آیا، وہ عالمی قوت کے طور پر باقی نہ رہے، اور اقوام مغرب کو عالمی بالادستی حاصل ہوئی، تو عالمی سیاست کا معیار بھی تبدیل ہوا، خارجہ پالیسیاں بدلیں، اور لادینی بنیادوں پر نئے قواعد وضوابط وجود میں آئے،...... انہی تبدیلیوں میں ایک بڑی تبدیلی قدیم اصطلاحات کو نئے تصور دینا اور پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں پیش کرنا ہے۔

انہی محرف اور مسخ شدہ اصطلاحات میں شہریت کی اصطلاح بھی ہے، عربی میں اب اس کے لئے جنسیت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جنسیت دراصل قومیت (nationeltiy) کا مترادف ہے، یعنی اب نئے معیار کے مطابق قوم مذہب یا رنگ ونسل سے نہیں، بلکہ وطن سے بنتی ہے، اس لئے اس کی جنس اسی ملک کی طرف منسوب ہوگی، عالمی سیاست پر مغرب کی بالادستی سے قبل ان اصطلاحات کا وجود نہیں تھا، پہلے اس کے لئے عربی زبان میں "وطنیت یا توطن" کا لفظ استعمال ہوتا تھا، اردو میں شہریت کی اصطلاح بڑی حد تک وطنیت سے قریب ہے، لیکن مفہوم میں بڑا فرق ہے، اب شہریت "جنسیت" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، وطنیت کے لفظ میں، بہت توسع ہے، عارضی اقامتگاہوں کے لئے بھی وطن کا لفظ استعمال کیا جا سکتا تھا، البتہ دونوں میں فرق کرنے کے لئے مستقل اقامتگاہوں کو وطن اصلی یا وطن قرار کہا جاتا تھا اور عارضی اقامتگاہوں کو وطن اقامت، وطن سکونت یا وطن مستعار کہا جاتا تھا،...... اصل میں یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں بالعموم کتاب الصلوٰۃ میں مسافرت کی نماز کے ضمن میں آیا ہے، اور بحث نماز کے اتمام اور قصر کی ہے، اس لئے فقہاء نے محدود مدت والی اقامتگاہوں کو بھی از راہ توسع وطن قرار دیا، تاکہ حالت سفر میں اتمام صلوٰۃ کی نوبت نہ آئے،...... ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس معنی میں آج شہریت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، وہ بڑی حد تک صرف "وطن اصلی" یا وطن قرار" میں پایا جاتا ہے، اور اسی روشنی میں شہریت کے حدود اربعہ کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اصطلاحی تعریف اور قسمیں:

شہریت موجودہ اصطلاح میں فرد اور حکومت کے درمیان اس مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے، یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس ریاست کی طرف منسوب ہو جاتا ہے، جہاں کا وہ شہری ہے، مثلاً ہندوستانی، امریکی، برطانوی اور سعودی وغیرہ۔

پھر شہریت کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) پیدائشی شہریت: یعنی کسی ملک میں پیدائش کی بنیاد پر بلا اختیار بچہ کو شہریت حاصل ہو جائے۔

(۲) اختیاری شہریت: یعنی جو شہریت سعی وارادہ سے حاصل کی جائے، مثلاً اس ملک کی کسی لڑکی یا لڑکا سے شادی کرلی جائے، یا حکومت سے درخواست کر کے شہریت حاصل کی جائے، وغیرہ۔

پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے، مثلاً ہندوستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرلے تو برطانوی شہریت حاصل ہوتے ہی ہندوستانی شہریت اس کی ختم ہوجائے گی، یعنی اب وہ ہندوستانی نہیں بلکہ برطانوی کہلائے گا،......اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے، مثلاً پاکستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرے تو اسے دونوں جگہوں کی شہریت برقرار رکھنے کا حق ہوگا، یعنی وہ بیک وقت پاکستانی بھی ہوگا اور برطانوی بھی،......پاکستان میں پاکستانی رہے گا اور برطانیہ میں برطانوی، یہ مختلف ملکوں کے اپنے اپنے معاہدات کی روشنی میں طے پاتا ہے، کہ کس ملک میں شہری کے ساتھ کیا معاملہ روا رکھا جائے؟ (الجنسیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ لرحیل الرحیل ص ۱۳ بحوالہ راقم کی کتاب "غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل" ص ۳۵)۔

پھر جب کوئی شخص کسی ملک کا شہری بن جاتا ہے تو اس کو وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہوجاتے ہیں جو ایک پیدائشی شہری کو حاصل ہیں، اور تمام وہ ضمانتیں جو بحیثیت شہری کے ملنی چاہئے مل جاتی ہیں اسی کے ساتھ اس پر بعض واجبات اور مطالبات بھی عائد ہوتے ہیں جن کی تکمیل بحیثیت فرد اس کو کرنی پڑتی ہے:

☆ حقوق مثلاً: ہر شہری کو اپنے ملک میں مستقل قیام کا حق حاصل ہے۔

☆ وہ ملک کے تمام وسائل سے بلا امتیاز استفادہ کرسکتا ہے۔

☆ وہ اپنی صلاحیت سے ملک کے کسی بھی باوقار عہدہ تک پہونچ سکتا ہے، کسی بھی قسم کی ملازمت حاصل کرسکتا ہے، کسی بھی قسم کی تجارت کرسکتا ہے۔

☆ اسے اپنے ملک میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی۔

☆ اس کی جان و مال اور عزت و وقار کو تحفظ فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، وغیرہ۔

☆ واجبات مثلاً: ملکی آئین کے ساتھ اس کی وفاداری ضروری ہے۔

☆ ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے۔

☆ ملکی مفادات کے تحفظ کے لئے ہر طرح کی خدمت و قربانی کے لئے تیار رہے وغیرہ۔

وطنیت کا یہ تصور بہت قدیم ہے، اور لوگ ہر دور میں ارض وطن کے ساتھ اسی قسم کی جذباتی وابستگی رکھتے رہے ہیں، اور ہر ریاست اپنے شہریوں کے لئے اسی قسم کے احساسات کی حامل رہی ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ معظمہ کے مہاجر مسلمانوں نے جب مدینہ منورہ کو اپنا نیا وطن قرار دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ انتہائی خیر خواہانہ جذبات کا اظہار فرمایا اور دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہونے کی دعا فرمائی: "اللّٰهم حبب إلينا المدينة كحبنا مكة أو أشد" (صحیح البخاری ج ۲ ص ۶۶۷ حدیث نمبر ۱۷۹۰ ط دار ابن کثیر، الیمامۃ بیروت ۱۹۸۷ء)۔ ترجمہ: اے اللہ مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں اسی طرح ڈال دیجئے، جیسے کہ مکہ کی محبت بسی ہوئی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

ارض وطن کی نگرانی کرتے ہوئے مرنے والے کو شہید قرار دیا گیا: "من مات مرابطاً مات شهيداً" (کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال لعلی المتقی (م ۹۷۵ھ) ج ۴ ص ۴۱۸ ط مؤسسة الرسالة ۱۹۸۱ء)۔ (جو سرحد کی نگرانی کرتا ہوا مرے وہ شہید ہے)۔

ارض وطن میں رہنا ہر شہری کا حق ہے، کوئی اپنے اس حق کے تحفظ کے لئے مارا جائے تو اسے شہید کہا گیا ہے: "إذا جاء ك المسلم يريد أن يقاتلك من أجل أن يخرجك من بلدك أو من بيتك فقاتله إن قتلته فهو في النار وإن قتلك فأنت شهيد" (شرح ریاض الصالحین (للنووی) للعثیمین (م ۱۴۲۱ھ) ج ۱ ص ۱۰)۔ (کوئی مسلمان تم سے تمہیں اپنے شہر یا گھر سے نکالنے کے لئے لڑے تو تم اس سے لڑو اگر تم نے اسے قتل کردیا تو جہنم رسید ہوا اور اگر تم مارے گئے تو تم شہید ہو)۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد وہاں کے مقامی لوگوں کے ساتھ جن میں انصار صحابہ کے علاوہ بہت سے غیر مسلم بھی تھے، قیام ریاست کے ضمن میں جو معاہدہ نامہ تیار ہوا اس کی کئی دفعات میں فرد و ریاست کے تعلق سے اسی طرح محبت و ذمہ داری کا تصور ملتا ہے، مثلاً:

☆ ''وإن المؤمنين المتقين علىٰ من بغىٰ منهم أو ابتغىٰ دسيعة ظلم أو إثم أو عدوان أو فساد بين المؤمنين وأن أيديهم عليه جميعاً ولو كان ولد أحدهم'' (متقی مسلمان باغیوں اور ظالموں کے ظلم و گناہ اور فساد وطغیان کے خلاف مضبوط دیوار ہونگے، سب کی قوت ایک مانی جائے گی چاہے ان میں سے کسی کا کوئی بچہ ہی کیوں نہ ہو)۔

☆ ''وإنه من تبعنا من يهود فإن له النصر والاسوة غير المظلومين ولا متناصرين عليهم'' (جو یہود ہمارے حمایتی ہونگے ان کو یکساں طور پر امداد و استحقاق حاصل ہوگا ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی)۔

☆ ''وإن بينهم - بين المسلمين واليهود - النصر علىٰ من حارب أهل هذه الصحيفة'' (مسلمان اور یہودی باہم تعاون کے پابند ہونگے ان لوگوں کے خلاف جو اس میثاق میں شامل فریقوں سے برسرپیکار ہوں)۔

☆ ''وإن بينهم النصح والنصيحة'' (ان کے درمیان باہم ہمدردانہ اور خیرخواہانہ جذبات کارفرما رہیں گے)۔

☆ ''وإن بينهم النصر على من دهم يثرب'' (مدینہ منورہ پر یلغار کرنے والوں کے خلاف یہ باہم ایک دوسرے کے تعاون کے پابند ہونگے) (سیرت ابن ہشامؒ ۱/۵۰۱، الروض الانف للسہیلیؒ ۲/۳۴۵، عیون الاثر لابن سید الناسؒ ۱/۲۶۰، النہایۃ فی غریب الاثر لابن محمد الجزریؒ ۳/۵۳۴)۔

شہریت کے حدود اربعہ اور بنیادیں:

(۱) رہا یہ مسئلہ کہ اسلام میں شہریت یا وطنیت کے حدود کیا ہیں؟ اور اس کے لئے کن چیزوں کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟...... قرآن وسنت میں اس ضمن میں کوئی تصریح نہیں ملتی، اور نہ فقہاء کے یہاں اس سلسلے میں کوئی صراحت موجود ہے، البتہ وطن کی تفصیلات کے ضمن میں بعض چیزیں تذکرۃً آئی ہیں جن سے اس مسئلہ پر روشنی حاصل کی جاسکتی ہے...... اس ضمن کے مباحث فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں موجود نہیں ہیں، فقہاء مالکیہ کے یہاں بھی اجمال کے ساتھ آئی ہے، البتہ فقہاء حنفیہ کے یہاں نسبتاً زیادہ تفصیل ملتی ہے، اور اکثر علماء حنفیہ نے اس موضوع سے تعرض کیا ہے، زیر بحث مسئلے میں ان تفصیلات سے فی الجملہ تین بنیادیں ابھر کر آتی ہیں، جن کو شہریت کے مسئلے میں مدار بنایا جاسکتا ہے:

(۱) ولادت: یعنی وہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو۔

(۲) نکاح: یعنی وہاں کے کسی شخص سے زوجیت کا رشتہ قائم ہوا ہو۔

(۳) مستقل بود و باش کا ارادہ، خواہ ملازمت اور ذریعۂ معاش کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے۔

علامہ محمود ابن مازہ بخاری شہیدؒ (م ۶۱۶ھ) لکھتے ہیں: ''وطن أصلي وهو مولد الرجل والبلد الذي تأهل به'' (المحيط البرهاني في الفقه النعماني ج ۲ ص ۳۶، ۳۵ ط دار الكتب العلمية بيروت ۲۰۰۴ء)۔ (وطن اصلی: جو مقام پیدائش ہو یا اس نے وہاں شادی کی ہو)۔

علامہ کاسانیؒ رقمطراز ہیں: ''أو بلدة أخرىٰ اتخذها داراً وتوطن بها مع أهله وولده وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها'' (بدائع الصنائع للكاساني (م ۵۸۷ھ) ج ۱ ص ۲۱۶)۔ (کسی مقام پر اس نے اپنا گھر بنالیا اور اہل وعیال کے ساتھ وہاں مستقل بود و باش کا ارادہ کرلیا، اور وہاں سے واپسی کا کوئی ارادہ نہ ہو)۔

فقہاء حنفیہ کے یہاں عام طور پر ان تینوں بنیادوں کا تذکرہ ملتا ہے، بعض فقہاء مالکیہ نے بھی ان میں سے کچھ چیزوں کا ذکر کیا ہے، محمد بن عبد اللہ الخرشیؒ مختصر خلیل کی شرح میں لکھتے ہیں: ''الأول الوطن وهو ما اتخذ فيه الإقامة بنية التأبيد'' (شرح مختصر خليل للخرشي (م ۱۱۰۱ھ) ج ۵ ص ۱۸۸ الشاملة)۔ (وطن وہ ہے جہاں اس نے ہمیشہ کی نیت سے قیام کا ارادہ کرلیا ہو)۔

''والوطن في الثانية هو المسافر بقرية فيها أهله وولده فاقام عندهم ولو صلاة واحدة أتم ... ومن كتاب إبن المواز وإذا لم تكن مسكنه ولكنه نكح بها فلا يتم حتى يبني بأهله ويلزمه السكنیٰ'' (مواهب الجليل لشرح مختصر خليل للحطاب الرعيني (م ۹۵۴ھ) باب صلاة السفر ج ۲ ص ۵۰۰ ط دار عالم الكتب)۔ (وطن سے مراد ایسی بستی کا سفر ہے جہاں اس کے اہل وعیال رہتے ہوں، وہاں ایک نماز کے برابر بھی قیام کرے گا تو اس پر اتمام ضروری ہے...... اور اگر اس کا وہ مسکن نہ ہو لیکن اس نے نکاح کیا ہو تو پوری نماز اس وقت پڑھے گا

جبکہ اپنی بیوی کے ساتھ وہیں زفاف گذارے، اور سکونت لازم ہے)۔

☆ فقہاء کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وطنیت کے حصول کے لئے یہ تینوں بنیادیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں، یعنی ان میں سے کوئی ایک بنیاد بھی موجود ہو تو شہریت حاصل ہو جائے گی، اسی لئے اگر کسی کو دو جداگانہ مقامات پر ان میں سے کوئی ایک چیز حاصل ہو تو اسے دوہری شہریت حاصل ہوگی اور دونوں جگہیں اس کے لئے وطن کا درجہ رکھیں گی: المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی للبخاری میں ہے: ''وإن كان له أهل ببلدة فاستحدث ببلدة أخرىٰ أهلاً فكل واحد منهما وطن أصلي، وروى أنه كان لعثمان ﷺ أهل بمكة وأهل بمدينة، وكان يتم الصلوٰة بهما جميعاً'' (۲ ص ۳۶)۔ (اگر کسی کے اہل وعیال ایک شہر میں ہوں پھر دوسرے شہر میں اس نے شادی کرلی تو دونوں شہروں کی شہریت اسے حاصل ہوگی، روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کی ایک بیوی مکہ معظمہ میں رہتی تھیں اور دوسری اہلیہ مدینہ منورہ میں اور دونوں جگہ وہ نماز پوری پڑھتے تھے)۔

☆ اسی طرح فقہاء نے مستامن کی بحث میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ وقتی قیام کی غرض سے کوئی غیر مسلم دارالاسلام میں داخل ہو، وہ اگر مستقل قیام کا ارادہ کرلے، یا (علی اختلاف الاقوال) طویل مدت تک قیام کرے، یا وہاں کے کسی متوطن سے رشتۂ ازدواج قائم کرلے، یا وہاں کی کوئی خراجی زمین خرید لے تو دارالاسلام کی شہریت اسے حاصل ہو جائے گی، اور پھر وہ مستامن باقی نہیں رہے گا، نیز اگر وہ اہل وعیال کے ساتھ ہے تو اس کے ساتھ وہ بھی اہل ذمہ (یعنی اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری) قرار پائیں گے (البدائع للکاسانی ج ۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدین ج ۳ ص ۳۴۶، المہذب للشیرازیؒ ج ۲ ص ۲۵۱ وغیرہ)۔

یہ بات اگرچہ غیر مسلموں کے تعلق سے کہی گئی ہے مگر فی الجملہ اس کو شہریت کے حصول کے معاملے میں بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

شہریت کے نئے قواعد بنائے جاسکتے ہیں:...... میرے خیال میں فقہاء نے مذکورہ جن چیزوں کا ذکر کیا ہے، وہ حصر کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ اس دور کی چند معروف صورتوں کا تذکرہ ہے، کیونکہ یہ چیزیں منصوص نہیں ہیں، بلکہ اجتہادی ہیں، جن میں عرف وعادت اور مشاہدہ وتجربہ کا دخل ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی ملک کی انتظامیہ شہریت کے لئے کچھ نئی بنیادیں وضع کرے، یا مذکورہ چیزوں میں ترمیم کرے یا کچھ شرطوں کا اضافہ کرے تو اس کی گنجائش محسوس ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد ملک وملت کی سلامتی اور مسلمانوں کا تحفظ ہو، اس لئے کہ عرف وعادت میں تغیر ممکن ہے، بلکہ قانون میں تبدیلی تغیر عرف کی علامت قرار دی جائے گی۔

مسلم ملک میں کسی بیرونی مسلمان کو شہریت دینے کا مسئلہ:

(۲) اس ضمن میں یہاں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی مسلم ملک کے لئے ہر ایسی درخواست شہریت کی تعمیل ضروری ہے جو کسی دوسرے ملک کے مسلم امیدوار کی جانب سے پیش کی جائے؟......

اس معاملہ میں اسلام کا اصل مزاج جو قرآن وحدیث کی نصوص سے سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کا مزاج ایسے تمام مسلم امیدواروں کے لئے توسع کا ہونا چاہئے، کئی نصوص سے اس پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً:

☆ ''إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي أنفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين في الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فاولئك مأواهم جهنم وساء ت مصيراً'' (سورۂ نساء: ۷۹)۔ (بے شک ان لوگوں کی جان جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے (جب) فرشتہ قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے وہ بولیں گے، ہم اس ملک میں بے بس تھے، فرشتے کہیں گے کہ اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی، کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے)۔

اس آیت کریمہ میں جہاں ایسی سرزمین میں اقامت کو جرم قرار دیا گیا ہے جہاں نظام طاغوت کی حکمرانی ہو، وہیں اسلامی حکومتوں کو یہ اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ اللہ کی زمین اللہ کے نام پر آنے والوں کے لئے تنگ نہیں کی جانی چاہئے، بلکہ مہاجرین کے لئے وہاں ہمیشہ گنجائش رہنی چاہئے، اس لئے کہ ہجرت کے حکم سے قبل مقام ہجرت کا وجود شرط ہے، اس کے بغیر حکم ہجرت کی کوئی معنویت باقی نہیں رہتی، ...... مہاجرین کے لئے حالات کے تحت حکم میں فرق ہوسکتا ہے، مگر ایک خالص اسلامی ریاست کو اس حکم کی تعمیل میں ہر وقت لچک باقی رکھنی ہوگی۔

☆ مدینہ کی پہلی اسلامی ریاست قائم ہونے کے بعد مدینہ میں مہاجرین کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے تمام لوگوں سے جو غیر اسلامی ماحول میں قیام پذیر تھے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا: ''انا برئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین قالوا یا رسول اللہ ولم؟ قال لاتراء ی ناراهما'' (ترمذی کتاب السیر باب ماجاء فی کراهیة المقام بین اظهر المشرکین حدیث نمبر ۱۶۰۴ ج ۴ ص ۱۵۵ ط دار احیاء التراث العربی بیروت، سنن ابی داؤد کتاب الجهاد، باب النهی عن القتل من اعتصم بالسجود حدیث نمبر ۲۶۴۷ ج ۲ ص ۲۴۹ ط دار الکتاب العربی بیروت)۔ (میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیوں؟ آپ نے ارشاد فرمایا، دونوں اتنی دور رہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکے)۔

ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا: ''لاتساکنوا المشرکین ولاتجامعوهم فمن ساکنهم أو جامعهم فهو مثلهم'' (السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب السیر باب الرخصة فی الاقامة بدار الشرك لمن لایخاف الفتنة ج ۹ ص ۱۸)۔ (مشرکانہ ماحول میں سکونت اور اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کرو، جوان کے ساتھ رہے گا یا اکٹھا ہوگا وہ انہی کی طرح سمجھا جائے گا)۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''من جامع المشرك وسکن معه فإنه مثله'' (ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الاقامة بارض الشرك ج ۲ ص ۴۸ حدیث نمبر ۲۷۸۹)۔

نبوت کی طرف سے یہ احکامات اسلامی حکومت کے فرائض کی نشاندہی کرتے ہیں اور کلمہ گو مہاجرین کے لئے اس پر عائد ذمہ داریوں کے لئے دلیل راہ ہیں، اس طرح کے احکامات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی عہد نبوت میں نہیں دیئے، اس لئے کہ اس وقت ان کی کوئی معنویت سمجھ میں نہیں آتی ...... مدینہ کی اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد یہ اعلانات بحیثیت پیغمبر بھی ممکن ہوئے اور بحیثیت صدر مملکت بھی۔

☆ اسی لئے دار الہجرت کے قیام کے بعد جنگی دستوں کے ذریعہ مختلف علاقوں میں مشرف باسلام ہونے والے لوگوں کو دار الہجرت منتقل ہونے کی باقاعدہ منادی کرائی گئی، حضرت بریدہؓ کی روایت کے الفاظ جو مختلف کتب احادیث میں آئے ہیں: ''إذا لقیت عدو اللہ من المشرکین فادعهم إلی ثلاثة خصال أو خلال فأیتهن أجابوك فأقبل منهم وکف عنهم ثم ادعهم إلی الاسلام، فإن أجابوك فأقبل منهم وکف عنهم، ثم ادعهم إلی التحول من دارهم إلی دار المهاجرین وأخبرهم أنهم إن فعلوا ذلك، فلهم ما للمهاجرین وعلیهم ماعلی المهاجرین'' (صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۳۹ حدیث نمبر ۴۶۱۹ ط دار الجیل بیروت لبنان، سنن ترمذی ج ۴ ص ۱۶۲ حدیث نمبر ۱۶۱۷ ط دار احیاء التراث العربی بیروت)۔ (غیر مسلموں سے سامنا ہو تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو، اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی قبول کرلیں تو جنگ سے گریز کرو، ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کرلیں تو جنگ سے گریز کرو، پھر ان کو اپنے ملکوں سے دار الہجرت منتقل ہو جانے کی دعوت دو، اور ان کو بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کو وہی ملے گا جو مہاجرین کو ملتا ہے، اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو مہاجرین پر عائد ہوتی ہیں)۔

☆ اسی طرح قرآن کریم میں ہجرت کرکے مدینہ آنے والی خواتین کے بارے میں فرمایا گیا: ''یا یها الذین آمنوا إذا جاءتکم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن اللہ اعلم بإیمانهن، فإن علمتموهن مؤمنات فلاترجعوهن إلی الکفار'' (الممتحنة: ۱۰)۔ (اے ایمان والو! تمہارے پاس مؤمن عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو ان کا جائزہ لو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جانتا ہے، اگر وہ تمہیں مؤمن معلوم ہوں تو ان کو کافروں کے پاس مت لوٹاؤ)۔

دراصل یہ حکم ایک خاص پس منظر میں دیا گیا تھا صلح حدیبیہ کے موقعہ پر اہل مکہ کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آنے والے مسلمانوں کو مدینہ کی سکونت نہیں دی جا سکتی تھی، بلکہ ان کو مکہ واپس کرنا ضروری تھا، اس کے برعکس اگر کوئی شخص مدینہ سے مکہ چلا جاتا تو اہل مکہ پر ان کو لوٹانا ضروری نہیں تھا...... یہ معاہدہ اگرچہ کہ مردوں اور عورتوں سب کے لئے بظاہر یکساں تھا، لیکن عملاً عورتوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوا، چنانچہ حضرت ابوجندلؓ کو مقام حدیبیہ ہی سے واپس کردیا گیا اور اس کے بعد بھی پوری مدت معاہدہ میں کسی کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی گئی، لیکن ہجرت کرکے آنے والی خواتین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس نہیں فرمایا، بشرطیکہ انہوں نے اسلام کے لئے ہجرت کی ہو، حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ہجرت کرکے مکہ سے نکلیں تو مسلمانوں کو بڑی تشویش ہوئی کہ ان کو کیا جائے، اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ مقام حدیبیہ میں صلح نامہ کی کتابت کے بعد ہی ایک مسلم خاتون سبیعۃ بنت حارث اسلمیہؓ مکہ سے بھاگ کر وہاں پہونچیں، تو ان کے غیر مسلم شوہر مسافر المخزومی (ایک روایت کے مطابق صیفی ابن الراہب) نے اپنی بیوی کی واپسی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ابھی تو معاہدہ نامہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے، ابھی آپ کے امتحان کا وقت آ گیا، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی، یعنی عورتیں اس معاہدہ میں شامل نہیں ہیں (شرح الوقایہ ج ۳ ص ۲۸۹)۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ عورتیں اس معاہدہ میں داخل ہی نہیں تھیں، اس کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں صلح نامہ کے یہ الفاظ منقول ہیں:

(لا یاتیہ رجل) یعنی اس معاہدہ میں صرف مرد داخل تھے (الروض الانف للسہیلیؒ (م ۵۸۱ھ) ج ۴ ص ۴۸)۔

بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ معاہدہ تو عام تھا (جیسا کہ معاہدہ نامہ کے الفاظ اکثر روایات میں یہ نقل ہوئے ہیں: ''لا یاتیہ أحد'' (الروض الانف للسہیلی (م ۵۸۱ھ) ج ۴ ص ۴۸) لیکن عورتوں کے حق میں اس کو منسوخ کر دیا گیا تھا (دیکھئے احکام القرآن لاحمد ابی بکر جصاص الرازی الحنفیؒ (م ۳۷۰ھ) ج ۳ ص ۵۸۴ ط دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۴ء)۔

بہر حال معاہدہ کی بنا پر تھوڑی دشواری پیدا ہو گئی تھی، لیکن اسلام کا اصل حکم عام حالات کے لئے یہی ہے کہ آنے والے مہاجرین کو اسلامی حکومت قبول کرے، واپس نہ کرے۔

مسلم ملک کا غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے مسئلہ پر معاہدہ کرنا

☆ البتہ اگر اسلامی ریاست غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے معاملہ میں کوئی معاہدہ کرلے، یا اس قسم کے کسی بین الاقوامی منشور کو منظوری دے دے جس کی رو سے دوسرے ملکوں کے مہاجرین کو اسلامی حکومتیں اپنے یہاں مستقل سکونت نہ دے سکتی ہوں، تو اس صورت میں حکم شرعی کیا ہوگا؟

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

مالکیہ اور حنابلہ کی رائے:

مالکیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں معاہدہ پر عمل کرتے ہوئے مہاجرین سے شہریت کے معاملے میں معذرت کا جواز ہے، البتہ اسلامی حمیت کے نقطۂ نظر سے خارجی طور پر ان کی مدد کی جائے گی (حاشیۃ الدسوقی ج ۲ ص ۲۰۶، ۲۰۷، الخرشی ج ۳ ص ۱۵۱، کشاف القناع للبہوتیؒ ج ۳ ص ۱۱۴، المغنی لابن قدامہؒ ج ۱۰ ص ۵۱۷)۔

ان کی اس بات کا ماخذ یہ ہے کہ:

(۱) اسلام میں معاہدات کی پابندی کی بڑی اہمیت ہے، خواہ وہ مسلمانوں سے کیا جائے یا غیر مسلموں سے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وأوفوا بعهد الله إذا عاهدتم ولا تنقضوا الأيمان بعد توكيدها وقد جعلتم الله عليكم كفيلاً إن الله يعلم ما تفعلون'' (النحل: ۹۱)۔ (جب معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو، اور قسمیں مؤکد کرنے کے بعد نہ توڑو، جب کہ تم نے اللہ کو اپنے اوپر کفیل بنالیا ہے، جو تم کرتے ہو اللہ پاک اسے جانتے ہیں)۔

ایک روایت سے بھی اس مضمون کی عملی تائید ہوتی ہے: حضرت ابو طفیلؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میری شرکت اس لئے نہیں ہو سکی کہ میں اور میرے والد حسیل مکہ سے نکلے تو کفار قریش نے ہمیں پکڑ لیا کہ تم لوگ محمد ﷺ کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے ہو، ہم نے کہا نہیں ہم صرف مدینہ جانا چاہتے ہیں، تو ان لوگوں نے ہم سے اللہ کے نام پر ہم سے عہد و پیمان لیا کہ ہم سیدھے مدینہ جائیں، اور محمد ﷺ کے ساتھ جنگ میں شرکت نہ کریں، چنانچہ ہم سیدھے رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، (آپ ﷺ بدر میں تھے) اور سارا ماجرا سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''انصرفا نفي لهم بعهدهم ونستعين الله عليهم'' (صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۷۵ حدیث نمبر ۴۷۴۰ ط دار الجبل بیروت، مسند احمد بن حنبلؒ ج ۵ ص ۳۹۵ حدیث نمبر ۲۳۴۰۲ ط مؤسسہ قرطبہ القاہرۃ، سنن الکبری للبیہقی ج ۹ ص ۱۴۵ حدیث نمبر: ۱۸۲۱۰ ط مکتبہ دار الباز مکہ المکرمہ ۱۹۹۴ء)۔ (تم دونوں مدینہ واپس جاؤ، ہم ان کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ان کے خلاف مدد چاہیں گے)۔

(۲) نیز رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد جو طرز عمل اختیار فرمایا اس سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، حضرت ابو جندلؓ کو حدیبیہ ہی سے واپس کر دیا گیا۔

بعد میں حضرت ابوبصیرؓ کے واقعہ کا ذکر تاریخ وسیر کی تقریباً تمام ہی کتابوں میں ہے، کہ وہ کسی طرح بھاگ کر مدینہ پہنچے، مکہ والے ان کو لینے کے لئے مدینہ آ گئے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حسب معاہدہ واپس کر دیا، ...... لیکن حضرت ابوبصیرؓ کسی طرح مکہ نہ جا کر ساحل سمندر کے علاقے میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے، یہ خبر مکہ کے دوسرے مجبور مسلمانوں کو ملی جو معاہدہ کی بنا پر مدینہ نہ آ سکتے تھے، چنانچہ حضرت ابوجندلؓ سمیت ساٹھ ستر اور بعض روایات کے مطابق تین سو (۳۰۰) مسلمانوں کی ایک تعداد وہاں جمع ہو گئی جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے گذرتے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس وقت تک مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی جب تک کہ خود مکہ والوں نے ہی ان کو مدینہ واپس بلانے کی رضامندی نہ دے دی (اسد الغابہ لابن الاثیرؒ (م ۶۳۰ھ) ج ۳ ص ۱۴۵، الاستیعاب للقرطبیؒ (م ۴۶۳ھ) ج ۲ ص ۱۳، الطبقات الکبریٰ لابن سعدؒ (م ۲۳۰ھ) ج ۷ ص ۴۰۵ ط دار صادر بیروت ۱۹۶۸ء وغیرہ)۔

یعنی ان فقہاء (مالکیہ وحنابلہ) کے نزدیک حدیبیہ کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ کار اختیار فرمایا، اور اس وقت کے حالات کے مطابق یک طرفہ طور پر کفار کی شرطوں کو قبول فرمایا جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کے شہر کا کوئی مسلمان ان کی مرضی کے بغیر دار الکفر (مکہ) سے نکل کر دار الاسلام (مدینہ) نہیں جا سکتا، یہ آج بھی سنت قائمہ ہے اور آج بھی ویسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس کو قانون کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

☆ **شافعیہ کا موقف:** ...... شافعیہ اس طرف گئے ہیں کہ اس طرح کی شرطوں کو قبول کرنا درست نہیں اور نہ آنے والے مسلمانوں کو واپس کرنا جائز ہے، البتہ اگر ان کے اہل خاندان اپنے ملک میں مضبوط اور صاحب اثر ورسوخ ہوں، اور انہیں خاندانی حمایت حاصل ہو جس سے ان کے دینی ابتلا کا اندیشہ کم ہو تو واپس کرنے کی گنجائش ہے، بعض شوافع کا خیال ہے کہ جس مسلمان پر ہجرت فرض نہ ہو اس کو واپس کیا جا سکتا ہے، ...... ان کے یہاں ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ آزاد شخص کو واپس کرنے کی مطلق اجازت ہے، یعنی وہ واپس جانے کے بجائے کہیں اور اپنی پناہ گاہ تلاش کر سکتا ہے جس طرح کہ حضرت ابوبصیرؓ نے کیا تھا (نہایۃ المحتاج للرملیؒ ج ۸ ص ۱۱۰، مغنی المحتاج للشربینیؒ ج ۴ ص ۲۶۴)۔

☆ حنفیہ کا مسلک:

جبکہ حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ شرط باطل ہے اور اس طرح کے کسی معاہدہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے (فتاوىٰ ہندیہ ج ۲ ص ۱۹۷ ط دار الفکر بیروت لبنان، وشرح السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۴، شرح الوقایہ ج ۶ ص ۸۰)۔

اس کی کئی وجوہات ہیں:

(الف) حنفیہ کے نزدیک صلح حدیبیہ کا واقعہ دائمی نہیں وقتی تھا اور بعد میں اس کو منسوخ کر دیا گیا، قرآن کریم کی یہ آیت اس پر شاہد ہے: ''فإن علمتموهن مؤمنات فلا ترجعوهن إلى الكفار'' (الممتحنة: ۱۰)۔ (یعنی ان کے ایمان کا علم ہو جانے کے بعد ان کو کافروں کے پاس واپس بھیجنا درست نہیں ہے)۔

(یہ اس تاویل پر مبنی ہے کہ معاہدہ کو مردوں اور عورتوں کے لئے عام قرار دیا جائے، جیسا کہ مشہور یہی ہے) (فتح القدیر لابن الہمامؒ ج ۵ ص ۴۶۰ ط دار الفکر بیروت لبنان ۱۹۷۷ء، وشرح السیر الکبیر ج ۱ ص ۲۰۶، ج ۴ ص ۱۳۰۲ الشاملۃ)۔

(ب) نیز یہ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا، اس لئے کہ آپ صاحب وحی تھے، آپ وحی کے ذریعہ معلوم کر سکتے تھے کہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں؟، جیسا کہ حدیبیہ کے بظاہر مغلوبانہ معاہدہ کو قرآن کریم نے فتح مبین قرار دیا، یہ ظاہری صورت کے اعتبار سے نہیں بلکہ نتائج کے اعتبار سے تھا، عہد نبوت کے بعد اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ واقعات کے نتائج کا پہلے سے علم ہو، اس لئے اب اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ مسلمان کفر کے مقابلے میں مغلوبانہ پوزیشن اختیار کریں، اور حقارت آمیز شرطوں پر معاہدے کریں (شرح السیر الکبیر ج ۴ ص ۳۰۲)۔

غور طلب یہ ہے کہ حنفیہ نے اس طرح کی شرطوں کا انکار دو وجہ سے کیا ہے، ایک ذلت وحقارت اور دوسرے دینی فتنہ کی بنا پر، لیکن اگر معاہدہ دوطرفہ مساوات پر مبنی ہو اور دار الکفر میں بھی دینی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، جیسا کہ آج کے دور میں ہے تو حنفیہ اپنے اس حکم پر اصرار نہیں کریں گے۔

لیکن بعض کتابوں کی عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واپسی کے معاہدہ پر برابری کی صورت میں بھی وہ راضی نہیں ہیں، اور اس شق کو وہ صریح طور پر معاہدہ نامہ سے خارج کئے جانے کے قائل ہیں، یعنی معاہد ملکوں کو صراحت کے ساتھ بتا دیا جائے کہ ہم اپنے ملکوں میں ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو واپس نہیں

کریں گے، "شرح السیر الکبیر" میں ہے:

"وهذا شرط لاينبغي أن يترك ذكره في الكتاب؛ لأنه اخرج إلينا منهم مسلم أوذمي لايجوز لنا أن نرده عليهم فالظاهر أنهم يطالبوننا بالمناصفة ويقولون كما لاتردون أنتم فنحن لانرد وبعد ذكر هذا الشرط تنقطع هذه المحاجة" (شرح السیر الکبیر ج ۵ ص ۴۱)۔ (معاہدہ نامہ میں اس شرط کا ذکر نہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ اگر کوئی مسلمان یا ذمی ان کے پاس سے نکل کر ہمارے پاس چلا آئے تو ہمارے لئے ان کو واپس کرنا جائز نہیں ہوگا، مگر وہ برابری کا مطالبہ کریں گے اور کہیں گے کہ جیسے تم ہمارے آدمی کو نہیں لوٹاتے ہو ہم بھی نہیں لوٹائیں گے، لیکن صراحتاً اس شرط کے تحریر میں آجانے کے بعد حجت باقی نہیں رہے گی)۔

بحالات موجودہ میرے خیال میں عالمی حالات کافی بدل چکے ہیں، سیاسی طور پر مسلمانوں کی وہ پہلی سی شان بھی باقی نہ رہی اور مسئلہ اختلافی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح شرط کا قبول کرنا قطعی طور پر ثابت ہے، البتہ اس کے نسخ کی نوعیت میں اختلاف ہے، نیز حنفیہ کے ذہن میں اسلام کی ذلت وتحقیر اور مہاجرین کے دینی فتنہ کا جو اندیشہ ہے، اس کے پیش نظر مسئلہ کو منسوخ ماننے کے بجائے اختلاف احوال پر محمول کیا جاسکتا ہے، یعنی عہد غلبہ اور عہد مغلوبیت کے احکام میں فرق کرنا ہوگا، حدیبیہ کا قصہ اس دور کا ہے جب عرب کی سطح پر مسلمان عہد غلبہ میں داخل نہیں ہوئے تھے، مسلمانوں کا عہد غلبہ صحیح معنیٰ میں فتح مکہ کے بعد شروع ہوا، عہد نبوت کے مختلف ادوار کو مسلمانوں کے مختلف حالات سے جوڑا جانا چاہئے، اور حسب ضرورت ان سے روشنی حاصل کی جانی چاہئے، کسی شق کے نسخ سے زیادہ تطبیق پر توجہ دی جائے تو زیادہ بہتر عمل ہوگا، ہمارے فقہاء نے عہد غلبہ کے احکام لکھے ہیں، اگر وہ عہد مغلوبیت میں ہوتے تو وہ بھی حدیبیہ کے پس منظر کو قانونی حیثیت دینے پر رضامند ہوجاتے، اس طرح اس اختلاف کو اختلاف برہان پر نہیں بلکہ اختلاف احوال وزمان پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

مسلم ملک میں مسلمان پناہ گزینوں کا مسئلہ:

(۳) بعض دفعہ کسی ملک کے مسلمان مجبور ہو کر کسی مسلم ملک سے سیاسی پناہ کی درخواست کرتے ہیں، اور مسلم ملک اس کو سیاسی پناہ دینے پر آمادہ ہوتے ہیں، لیکن ان کو پناہ گزیں کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے، انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا اس کی شرعاً گنجائش ہوگی؟...... اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

(الف) میرے خیال میں سیاسی پناہ کے لئے کسی ملک میں اقامت اختیار کرنا عموماً ایک وقتی عمل ہوتا ہے یعنی اگر اس کے اپنے ملک کے حالات درست ہوگئے تو واپس ہوجائے گا...... ظاہر ہے کہ شہریت کے حصول کے لئے مستقل قیام کا ارادہ ضروری ہے، اس لئے اگر اس بنیاد پر ملک کے عام شہری اور سیاسی پناہ گزینوں میں فرق کیا جاتا ہے تو شرعاً کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، اس لئے کہ عارضی قیام کرنے والوں کو اس ملک کے اصل باشندوں کا درجہ نہ دیا جائے تو یہ ایک انتظامی عمل ہے، اور اس پر کوئی نکیر شریعت میں موجود نہیں ہے، اس طرح کے فرق کا ثبوت خود عہد نبوت میں بھی ملتا ہے، مثلاً:

☆ بہت سے وفود وقتی تعلیم وتربیت کے لئے مدینہ منورہ آتے تھے، اور کچھ دنوں قیام کرکے واپس چلے جاتے تھے، ظاہر ہے کہ حقوق وواجبات کے معاملے میں ان کو اہل مدینہ کا مقام تو حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

☆ اسی طرح بہت سے وہ لوگ جو مدینہ سے باہر قیام پذیر تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "فإن أبوا أن يتحولوا منها فأخبرهم أنهم يكونون كأعراب المسلمين يجري عليهم حكم الله الذي يجري على المؤمنين ولايكون لهم في الغنيمة والفيء شيء إلا أن يجاهدوا مع المسلمين" (صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۳۹ حدیث نمبر ۴۶۱۹ ط دار الجبل بیروت لبنان، سنن ترمذی ج ۴ ص ۱۶۲ حدیث نمبر ۱۶۱۷ ط دار احیاء التراث العربی بیروت)۔ (اگر یہ لوگ دار الہجرت میں واپس ہونے پر رضامند نہ ہوں تو ان کو خبردار کردو کہ وہ اعرابی مسلمانوں کے درجے میں ہونگے، اور وہ حکم الٰہی کے اسی طرح پابند ہونگے جس طرح دیگر مسلمان پابند ہیں، مگر ان کو مال غنیمت اور فیء میں کوئی حصہ نہیں ملے گا جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت نہ کریں)۔

☆ نیز اسلام کا یہ متفقہ اصول ہے کہ: "المغنم بالمغرم في الاسلام" (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۱ ص ۹۰ مادة ۸۷)۔ (نفع نقصان کے ساتھ جڑا ہوا ہے)۔

جو ملک کے مستقل شہری ہیں ان پر ملک کی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، مثلاً ان کو خزانہ مال کے استحکام کے لئے ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، ملک کے تحفظ کے لئے جان ومال کی قربانی کرنی پڑتی ہے وغیرہ، اس لئے بہت سے اضافی حقوق بھی انہی کو مل سکتے ہیں جو محض سیاسی پناہ کے لئے مقیم حضرات کو نہیں مل سکتے۔

(ب) البتہ اگر سیاسی پناہ کا قیام وقتی نہ ہو بلکہ مستقل طور پر اس ملک میں آباد ہوجانے کا ارادہ ہو، اور سیاسی پناہ محض اس ملک میں داخلہ کا عنوان ہو تو پھر ایسے لوگوں کو مستقل شہریوں کا درجہ حاصل ہونا چاہئے، ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنا درست نہ ہوگا، قرآن کریم کا یہ ارشاد اس سلسلے میں بہت واضح ہے: ''إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض'' (الانفال: ۷۲)۔ (جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کے لئے اپنی جانی اور مالی صلاحیتیں خرچ کیں اور وہ لوگ جنہوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں)۔

''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض'' (سورۂ توبہ: ۷۱)۔ (تمام مؤمن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں)۔

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دارالاسلام منتقل ہوجانے والے مسلمانوں کو وہاں کے مقیم مسلمانوں کے مساوی قرار دیا، اور ان کو باہم بھائی بھائی بنادیا، اسلام میں جغرافیہ اور رنگ و نسل کوئی چیز نہیں ہے، یہ صرف باہم تعارف کے ذرائع ہیں، لیکن اصل پہچان رشتۂ ایمان ہے، اگر کوئی چیز اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو اس کو فنا کر کے صرف کلمہ کو پہچان کی بنیاد بنائی جائے گی، اور کلمہ شریک تمام لوگ بھائی بھائی قرار دئے جائیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبيحتنا فهو المسلم له ما للمسلم وعليه ما على المسلم'' (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۳ حدیث نمبر ۳۸۵ ط دار ابن کثیر بیروت ۱۹۸۷ء)۔ (جو ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کا استقبال کرے، اور ہمارا ذبیحہ کھائے، وہ مسلمان ہے اور اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور اس پر وہ تمام واجبات عائد ہونگی جو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں)۔

ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ''كونوا عباد الله إخواناً المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا يكذبه ولا يحقره'' (صحيح المسلم ج ۸ ص ۱۰ حدیث نمبر ۶۷۰۶ باب تحريم ظلم المسلم وخذله ط دار الجبل بيروت)۔ (اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ کوئی اس پر ظلم کرے، نہ جھٹلائے اور نہ کمتر جانے)۔

☆ اس کی تائید اس مسئلہ شرعی سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی متامن (وقتی امان لیکر آنے والا غیر مسلم) یا ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم شہری) اسلام قبول کرلے تو باتفاق فقہاء اس کا عقد ذمہ ختم ہوجاتا ہے، اور وہ تمام امتیازات بھی کالعدم ہوجاتے ہیں جو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور جملہ حقوق وواجبات میں وہ وہاں کے قدیم شہریوں کے مساوی قرار پاتا ہے، اس سے وحدت ایمانی کی معنویت سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور زیر بحث مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے (ہدایہ مع فتح القدیر ج ۵ ص ۳۰۳، جواہر الاکلیل ج ۱ ص ۲۶۷، مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۵۸، الاحکام السلطانیہ لابی یعلیٰ ص ۱۴۳، ۱۴۴)۔

البتہ شہریت کی تکمیل کے لئے انتظامی طور پر کچھ قواعد وضوابط وضع کئے جاسکتے ہیں، اور اس کے لئے کوئی مدت یا مراحل مقرر کئے جاسکتے ہیں۔

اس باب میں، ہم متامن کے مسئلے سے بھی استیناس کر سکتے ہیں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، کہ اگر وقتی قیام کے ارادہ سے دارالاسلام میں آنے والا شخص ایک مخصوص مدت (حنفیہ کے نزدیک اس کی مدت ایک سال ہے، علی اختلاف الاقوال) تک قیام کرلے، یا وہاں کے متوطن سے شادی کرلے، یا کوئی خراجی زمین خرید لے وغیرہ تو اس کو ذمی یعنی دارالاسلام کا باقاعدہ شہری قرار دیا جائے گا (البدائع للکاسانی ج ۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدین ج ۳ ص ۳۴۶، المہذب للشیرازی ج ۲ ص ۲۵۱)۔

اس فقہی جزئیہ کو انتظامی مراحل کے لئے بطور رہنما اصول ہم استعمال کرسکتے ہیں۔

شہریت سے وابستہ حقوق وواجبات:

(۴) رہا یہ مسئلہ کہ شہریت کی بنیاد پر کیا کیا حقوق وواجبات عائد ہوتے ہیں؟ یعنی وہ کیا چیزیں ہیں جو بطور حق شہریوں کو ملتی ہیں اور بطور ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے؟..... تو میرے علم ومطالعہ کی حد تک اسلام میں اس کی کوئی تفصیل مقرر نہیں ہے، کچھ حقوق بنیادی ہیں اور کچھ احوال وظروف اور زمان ومکان کے تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ان کی تفصیلات کا تعین ممکن نہیں، بس معروف کی بنیاد پر جو حقوق وواجبات وہاں کے عرف میں شہریت سے متعلق سمجھے جاتے ہیں، شریعت ان کی نفی نہیں کرتی، گذشتہ صفحات میں ایک روایت کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں عمومیت کے ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں: ''له ما للمسلم وعليه ما على المسلم'' (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۳)۔ یعنی وہ تمام حقوق جو مسلمانوں کو ملتے ہیں وہ اس کو ملیں گے اور وہ تمام واجبات جو مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں اس پر عائد ہونگے۔

اس مضمون کی اور بھی جو روایات آئی ہیں ان میں بھی یہی عمومی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہجرت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو میثاق مدینہ تیار فرمایا اس میں بلا امتیاز مذہب وملت داخلی اور خارجی سطح پر جن حقوق وواجبات کی نشاندہی کی گئی ہے، ان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حقوق کے باب میں کوئی خاص شکل مقرر نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق مختلف ملکوں کے اپنے حالات، تقاضے، اور عرف سے ہے، اور اس معاملے میں ہر ملک کی انتظامیہ پوری طرح آزاد ہے کہ کس چیز کو وہ حق قرار دیتی ہے اور کس چیز کو واجبات میں شامل کرتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ اس تعین کی بنیاد معروف پر ہو، انسانیت کی فلاح پیش نظر ہو، اسلام کی روح اور مقاصد سے ہم آہنگ ہو اور شریعت کی کسی نص سے متصادم نہ ہو۔

(۵) پناہ گزینوں اور شہریوں کے حقوق اور فرق مراتب کی بحث شق نمبر (۳) کے ضمن میں آچکی ہے۔

مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کرنا:

(۶) اگر کوئی مسلمان ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟......

ہمارے قدیم مراجع میں باضابطہ یہ بحث نہیں ملتی، لیکن عصر حاضر میں یہ مسئلہ علماء کے درمیان زیر بحث رہا ہے حقیر راقم الحروف کی کتاب "غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل" میں اس موضوع پر تفصیلی بحث موجود ہے:

دو نقطۂ نظر:

عصر حاضر میں اس موضوع پر علماء اور اہل قلم کی طرف سے جو مباحث پیش کئے گئے ہیں، ان کو پڑھنے سے علماء کے دو نقطۂ نظر سامنے آتے ہیں:

(۱) ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے اور ایسے تمام حضرات پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کا قائل ہے، جو غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں (فتاویٰ الامام محمد رشید رضا ج۵ ص ۱۷۵۰)۔

اس طبقہ کے مشہور نام عرب علماء میں یہ ہیں، شیخ محمد رشید رضا مصری، شیخ محمد یوسف الدجوی، اور شیخ محمد شاکر، (یہ ازہر کے اکابر اہل علم میں ہیں) شیخ ادریس شریف محفوظ یہ اپنے وقت میں بیروت کے مفتی تھے (حکم التجنس بجنسیۃ دولۃ غیر اسلامیۃ ص ۱۷۔۹۷) اور ڈاکٹر محمد عبد الکریم الجزائری (تبدیل الجنسیۃ ردۃ وخیانۃ ص ۲۷) وغیرہ۔

(ب) دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا، بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے اس طبقہ میں شیخ مختار السلامی رکن مجمع الفقہ الاسلامی اور شیخ محمد عبد اللہ بن سبیل امام وخطیب مسجد حرام عضو ہیئۃ کبار العلماء السعودیہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ویسے ناموں کی فہرست لمبی ہے (مجلۃ الفقہ الاسلامی ج ۲ ص ۱۱۵۶، حکم التجنس بجنسیۃ دولۃ غیر اسلامیۃ ص ۱۳)۔

"اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء" نے بھی یہی فتویٰ جاری کیا ہے (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث والافتاء ج ۱۲ ص ۵۸)۔

(۲) دوسری رائے جواز کی ہے، پھر جواز کے قائلین میں بھی دو نقطۂ نظر ہو گئے ہیں:

(الف) ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بوقت ضرورت ہے،...... عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی مفتی عام سلطنت عمان اور رکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے، مصری دار الافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے (فتویٰ نمبر ۸۸۹، ۲۰۰۰ء) وغیرہ

(ب) دوسرا نقطۂ نظر اصلاً جواز کا ہے، البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے۔

عہد حاضر کے جمہور علماء کی رائے یہی ہے، اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہ ہیں۔

ڈاکٹر یوسف القرضاویؒ (ویب سائٹ پر ان کا فتویٰ موجود ہے، (www.qardawi.net)، ڈاکٹر محمد رافت عثمانی عمید الکلیۃ الشرعیۃ والقانون جامعۃ الازہر، ڈاکٹر وہبہ الزحیلیؒ (فقہ الاقلیات المسلمۃ ص ۶۰۹) اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ ص ۳۲۰) وغیرہ۔

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جو حضرات عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے موقف کی دلیلیں درج ذیل ہیں:

(۱) "ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى

الطاغوت وقد أمروا أن یکفروا بہ یرید الشیطان أن یضلھم ضلالاً بعیداً'' (سورۂ نساء:۶۰)۔ (کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی، جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں، جو آپ پر نازل کی گئی ہے، اور جو آپ سے قبل نازل ہو چکی ہے، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم مل چکا ہے، کہ اس کے مقابلے میں کفر اختیار کریں، اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں بھٹکا کر بہت دور دراز لے جائے)۔

طاغوت سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو، غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا گویا باختیار خود اسلامی نظام قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف کے مترادف ہے (فتاویٰ محمد رشید رضا مصری ج ۵ ص ۱۷۵۵)۔

(۲) ''ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین'' (آل عمران:۸۵)۔ (جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں شمار ہوگا)۔

علامہ بیضاویؒ نے اسلام کی تفسیر توحید اور اتباع امر اللہ سے کی ہے (بیضاوی مع حاشیۃ الشہاب ج ۳ ص ۴۳)۔

ان کے نزدیک جو حضرات اسلامی مملکت، اسلامی نظام قانون اور مسلم بالادستی سے نکل کر غیر اسلامی مملکت میں قیام پذیر ہیں یا قیام کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں۔

(۳) ایک اور مقام پر قرآن نے مومن اور غیر مومن کے درمیان امتیاز کا معیار بیان کیا ہے۔ ''فلا وربك لایومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی أنفسھم حرجاً مماقضیت ویسلموا تسلیماً'' (نساء:۶۵)۔ (پس آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے، جب تک کہ یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہوں آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کردیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کریں)۔

ابوبکر جصاصؒ اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں کہ ''اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ یا اس کے رسول ﷺ کے کسی امر کو رد کردے، وہ خارج از اسلام ہے، خواہ شک کی بنیاد پر رد کرے یا اس کو بالقصد قبول کرنے سے انکار کردے (احکام القرآن للجصاص ج ۳ ص ۸۱۸)۔

غیر اسلامی مملکت میں قیام دوسرے لفظوں میں احکام الٰہی کو قبول کرنے سے بالارادہ گریز ہے۔

(۴) ان آیات کریمہ سے بھی استدلال کیا گیا ہے جن میں غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

☆ ''یأیھا الذین آمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ أولیاء بعضھم أولیاء بعض. ومن یتولھم منکم فإنہ منھم. إن اللہ لایھدی القوم الظالمین'' (سورۂ مائدۃ:۵۱)۔ (اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو ان سے دوستی کرے گا اس کا شمار انہی کے ساتھ ہوگا، بیشک اللہ ظالم لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتے)۔

☆ ''یاایھا الذین آمنوا لاتتخذوا آباءکم وإخوانکم أولیاء إن استحبوا الکفر علی الإیمان ومن یتولھم منکم فأولئك ھم الظالمون'' (توبۃ:۲۳)۔ (اے ایمان والو! اپنے آباء اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، جو ان سے دوستی کرے گا وہ ظالم قرار پائے گا)۔

ان دونوں آیات میں غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور ان کی اتباع و فرمانبرداری کو صریح ظلم و ارتداد قرار دیا گیا ہے،...... غیر مسلم ملکوں میں اقامت اختیار کرنا اور بالارادہ ان کی معیت و رفاقت، ان سے ربط و تعلق اور قانونی اطاعت و فرمانبرداری کے مترادف ہے، اس لئے اس کی گنجائش نہیں ہے۔

(۵) بعض احادیث سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے، جن میں صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان اقامت و سکونت سے منع کیا گیا ہے، اور حضور ﷺ نے ایسے مسلمانوں سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے، جو غیر مسلموں کے درمیان رہائش پذیر ہیں: ''أنا بریء من کل مسلم یقیم بین أظھر المشرکین'' (ترمذی کتاب السیر حدیث نمبر ۱۶۵۴)۔ (میں ہر ایسے مسلمان سے بیزار ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہوں)۔

(۶) عقلی طور پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام کا مطلب ان ملکوں کے تمام قانونی تقاضوں کی تکمیل ہے، جن میں بہت سی چیزیں خلاف شرع

بھی ہیں، اور کبھی اس سے فوجی خدمات کا بھی مطالبہ ہوسکتا ہے، اور فوجی ملازمت کے دوران اگر خدانخواستہ کسی اسلامی سلطنت سے جنگ چھڑ جائے تو اس میں غیر مسلم فوجیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لینا ہوگا، ان کے علاوہ اور بھی کئی مراحل آسکتے ہیں جن میں خلاف شرع باتوں پر اس کو عمل کرنا پڑے، ظاہر ہے کہ ایک مومن کے لئے جائز نہیں کہ وہ جان بوجھ کر دینی طور پر اپنے کو ان شدید خطرات میں مبتلا کرے اور اپنی ہلاکت کا سامان کرے۔

جمہور کے دلائل:

لیکن جو علماء جواز کے قائل ہیں، ان کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے، مثلاً:

☆ ''ھو الذی أرسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون'' (سورۂ توبۃ:۳۳)۔ (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردے، چاہے مشرکوں کو ناپسند لگے)۔

☆ ''وما أرسلناك إلا رحمة للعالمین'' (سورہ انبیاء:۱۰۷)۔ (اور ہم نے آپ کو سارے عالم کے لئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا)۔

☆ ''وما أرسلناك إلا كافة للناس بشیراً ونذیراً ولكن أكثر الناس لا یعلمون'' (سورۂ سبا:۲۸)۔ (ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے صرف بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)۔

☆ ''ادع إلی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی أحسن'' (سورۂ نحل:۱۲۵)۔ (راہ خدا کی طرف حکمت اور بہترین انداز سے دعوت دو اور ان کے ساتھ بہتر طریق پر جدال کرو)۔

☆ ''قل ھذہ سبیلی أدعو الی اللہ علی بصیرة أنا ومن اتبعنی'' (سورۂ یوسف:۱۰۸)۔ (آپ کہہ دیجئے کہ میرا طریق یہی ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے پیرو بھی)۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دنیا کے ہر خطہ میں پہونچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے، اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر مسلم ملکوں میں بھی جائیں، اور اسلام کی دعوت چار دانگ عالم میں پہونچائیں، اگر مسلمان اپنے ہی ملکوں میں سمٹ کر رہ جائیں تو اسلام کی دعوت اور اس کے نمونے اسلامی دنیا تک کیسے پہونچیں گے۔

صحابہ کرام نے دنیا کے سامنے جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے، انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا، وہاں قیام کیا اور دین کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچائی، انہوں نے دعوت وتبلیغ کے باب میں جغرافیائی امتیاز نہیں رکھا، اور زمین کے کسی حصہ کو صرف اس لئے نظر انداز نہیں کیا کہ وہاں غیر اسلامی حکومت قائم ہے، اگر صحابہ اپنے آپ کو اسلامی ملکوں تک محدود کر لیتے تو ان کے ذریعہ وہ عالمی دعوت کا کام انجام نہ پاتا جو ان کا امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

قواعد فقہ سے رہنمائی:

اس سلسلے میں بعض قواعد فقہیہ سے بھی رہنمائی ملتی ہے:

(۱) مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے۔ ''لا ینكر تغیر الأحكام بتغیر الأزمان''
(قواعد الفقہ لعمیم الاحسان المجددی البركتی ط دار النشر ج ۱ ص ۲۳ وكذا فی الفروق للقرافی (م ۶۸۴ھ) ج ۲ ص ۶۸ ط دار الكتب العلمیة بیروت ۱۹۹۸ء)۔

جس دور میں بعض عرب علماء نے غیر مسلم ملک کی شہریت کو حرام قرار دیا تھا وہ فرانسیسی استعمار کا دور تھا، عرب ممالک بالخصوص تونس اور الجزائر کا علاقہ اس استعمار کے زیادہ شکار تھے، اس استعمار کا مقصد اسلام کے خلاف منصوبے بنانا، اس کی بنیادوں کو کمزور کرنا، اس کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا، سچے مسلمانوں کے اوپر ظلم وجبر کرنا اور دینی انحراف پھیلانا تھا۔

اس دور میں ظاہر ہے کہ اسلام دشمنوں کے ملکوں میں رہنا اور وہاں کا شہری بننا ایک خطرناک عمل تھا، جو عام مسلمانوں کے لئے ناقابل جواز تھا لیکن آج

حالات بدل چکے ہیں، مذہبی آزادی کا اصول بین الاقوامی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے، اس لئے آج اس قدیم فتویٰ پر (جو عبوری دور میں دیا گیا تھا) اصرار کرنا مناسب نہیں ہے، آج ضرورت ہے کہ حالات کے تغیر کے مطابق فتویٰ میں بھی تبدیلی لائی جائے۔

(۲) مصالح ومفاسد کے درمیان تعارض ہوجائے تو موازنہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اور جو پہلو غالب ہو اس کے مطابق حکم شرعی عائد کیا جاتا ہے، یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ ''إذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما'' (الاشباه والنظائر لابن نجيم ج ۱ ص ۱۱۱)۔ (جب دو مفسدوں میں تعارض ہوجائے تو بڑی مضرت کی رعایت کی جائے گی اور ہلکے مفسدہ کی اجازت دی جائے گی)۔

''الأخذ بأعظم المصلحتين ودفع أعظم المفسدتين'' (الاشباه والنظائر لابن نجيم ج ۱ ص ۸۸، الاشباه والنظائر للسيوطی ص ۸۷)۔ (دو مصلحتوں میں سے بڑی مصلحت کو اختیار کیا جائے گا اور دو مفسدوں میں سے بڑے مفسدہ کو دور کیا جائے گا)۔

آج کے دور میں کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت میں کچھ نقصانات ضرور متوقع ہیں لیکن ان کی تلافی کی صورتیں بھی موجود ہیں، وہاں دینی ادارے قائم کئے جائیں، مدارس ومکاتب بنائے جائیں، مساجد کی تعمیر ہو، علماء ودعاۃ سے رابطہ رکھا جائے، وغیرہ تو بڑی حد تک جو ارکفر کی مضرتوں سے بچا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی مصلحتیں ہیں جو مسلمانوں کے وہاں قیام کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہیں مثلاً:

(الف) غیر مسلم ممالک اپنے شہریوں کو مکمل مذہبی آزادی، فکر وخیال کی آزادی، اظہار کی آزادی اور سیاسی، اقتصادی اور فوجی حقوق دیتے ہیں، جس کے مطابق کوئی بھی شخص باعزت زندگی گذار سکتا ہے، اور اپنے آئینی حقوق کے ذریعہ وہاں کی حکومت پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔

آج غیر مسلم طاقتیں بالخصوص مغربی ممالک جس طرح اسلام اور مسلم ممالک کے خلاف محاذ آراء ہیں، یا اس کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد وہاں موجود ہو تو ان کے اس قسم کے فیصلوں پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، اور خود حکومتوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف اس قسم کے فیصلوں میں دس با رسوچنا ہوگا کہ اس کے نتائج خود ان ملکوں میں کیا ظاہر ہوں گے؟...... اگر مسلمان وہاں نہ ہوں تو یہ بڑا قومی فائدہ اسلام اور ملت اسلامیہ کو حاصل نہیں ہوسکتا۔

(ب) غیر اسلامی ملکوں میں رہ کر مسلمان اپنے وسائل سے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کرسکتے ہیں، اور جو علماء، دعاۃ اور مسلمان وہاں پہونچیں ان کے لئے بہتر معاون ومددگار ثابت ہوسکتے ہیں، اگر ان ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں میں مسلمان نہ ہوں تو مسلم اقلیتوں کو وہاں کے وسائل سے استفادہ کی صورت کیا ہوگی؟

(۳) فقہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے: ''ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب'' (الاشباه والنظائر ص ۹۱)۔ (جس کے بغیر واجب پورا نہ ہوتا ہو وہ بھی واجب ہے)۔

دعوت الی اللہ اس امت کا منصبی فریضہ ہے، اور اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ روئے زمین کے تمام باشندوں تک اسلام کی آواز نہ پہونچ جائے، اور اس کے عملی نمونے ان کے سامنے نہ آجائیں، آج کے دور میں اسلام کی آواز ترقی یافتہ وسائل ابلاغ کے ذریعہ پہونچائی جاسکتی ہے، اور اسلامی تعلیمات سے بھی کسی حد تک روشناس کرایا جاسکتا ہے، لیکن عملی نمونے کے لئے مسلمانوں کے ایک طبقہ کا وجود وہاں ضروری ہے، جو غیر مسلموں کے درمیان اسلامی آئیڈیل کا کام دے،..... علاوہ ازیں یہ مسلمان خود بھی اپنے قول وعمل اور اخلاق وکردار سے امت غیر مسلمہ میں دعوت کا کام کریں، اس کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کریں اور خود ان کے ملک کا حصہ بن جائیں کیونکہ غیر ملکیوں کا قول وعمل آج کی دنیا میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

(۴) فقہ کا ایک اور مشہور قاعدہ ہے: ''الضرورات تبيح المحظورات'' (قواعد الفقه لعميم الاحسان ج ۱ ص ۱۹ ط دار النشر، فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت ج ۱ ص ۴۳، الفروق للقرافی ج ۷ ص ۳۸۳)۔ (ضرورت کی بنیاد پر بعض ممنوعات کی اجازت دی جاتی ہے)۔

کبھی مسلمانوں کو اپنے ملک کے بعض مسائل کی بنیاد پر ہجرت کی ضرورت پیش آتی ہے، اور بحالات موجودہ ساری دنیا میں کوئی ایسی مملکت اسلامی موجود نہیں ہے، جو پوری وسعت نظری کے ساتھ کسی بیرونی مسلمان کو بحیثیت شہری قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو، جبکہ بہت سے غیر مسلم ملکوں میں شہریت کے معاملے میں زیادہ توسع موجود ہے، ان حالات میں بدرجۂ مجبوری مسلمانوں کو غیر مسلم ملکوں میں قیام وشہریت کی اجازت دینی چاہئے، اور غیر مسلم ملکوں کے توسع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

مسلک راجح:

مذکورہ مباحث پر تحقیقی نظر ڈالنے سے جمہور کا مسلک زیادہ مضبوط، قابل قبول اور لائق ترجیح محسوس ہوتا ہے، جس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) اس حد تک تمام علماء کا اتفاق ہے (خواہ وہ جواز کی رائے رکھتے ہوں یا عدم جواز کی) کہ غیر مسلموں سے تعلق خاطر اور مسلم ملکوں کے مقابلے میں ان کی عظمت واحترام کی بنا پر غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا ناجائز ہے، عدم جواز کے وہ تمام دلائل جو مانعین پیش کرتے ہیں ان میں بہ آسانی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ ان کا مصداق یہی قدر مشترک ہے۔

(۲) اور اگر عدم جواز کی رائے علی الاطلاق مان بھی لی جائے تو اس کو استعماری دور پر محمول کیا جائے گا، جب غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحب ایمان کا داخلہ مشکل سمجھا جاتا تھا اور اس کو ارتداد یا تعاون علی الکفر کے مترادف تصور کیا جاتا تھا...... آج وہ صورت حال باقی نہیں رہی، اب مسلمانوں کی بڑی تعداد وہاں مقیم ہے اور بڑے سکون اور آزادی کے ساتھ دینی زندگی گذار رہی ہے، بڑے بڑے دینی مراکز وہاں قائم ہیں اسلام کی اشاعت کا کام بھی وہاں ہو رہا ہے، اور مسلمان اپنے نومسلم بھائیوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کرتے ہیں، ان مسلمانوں نے اپنی تمام تر توقعات اور صلاحیتیں اسی سرزمین کے لئے مرکوز کردی ہیں، اور دوبارہ وطن واپسی کا کوئی خیال نہیں رکھتے، ان حالات میں عدم جواز کی رائے یقینا بعد از وقت اور دشوار کن ہے۔

(۳) عدم جواز کے قائلین نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اپنے مفہوم ومصداق کے اعتبار سے قطعی نہیں ہے، بلکہ ان میں تاویل کا احتمال موجود ہے مثلا:

(الف) جن آیات کریمہ کو اس استدلال میں پیش کیا گیا ہے کہ غیر مسلم ملک کی شہریت احکام اسلامی کا بالارادہ ترک اور کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا اظہار ہے، اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں کے جو قوانین اسلامی احکام سے متصادم ہیں، ضروری نہیں کہ مسلمان ان کو من وعن قبول کرلیں، بلکہ ان کو حق ہے (اور ان کو یہ کرنا چاہئے) کہ وہ ان قوانین کے بارے میں اپنے مشترکہ احساسات ایوان حکومت تک پہونچائیں، ان کو تبدیل یا ان میں مناسب ترمیم کرانے کی متحدہ جدوجہد کریں اور جب یہ ترمیم منظور ہوجائے تو قانون کی اس لچک سے فائدہ اٹھائیں، مثلاً مرنے کے بعد مورث کے ترکہ کا قانون یورپی ملکوں میں غیر اسلامی ہے، لیکن اس میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے، کہ اگر کوئی فرد مرنے سے پہلے اپنے ورثہ کی تقسیم کے لئے کوئی لائحہ عمل تجویز کردے تو اس کی موت کے بعد ورثہ پر لازم ہوگا کہ وہ اس کے تجویز کردہ طریقہ کار کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں، قانون کی اس شق سے استفادہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو چاہئے کہ مرنے سے قبل یہ وصیت تحریر کرجائیں کہ اس کی موت کے بعد اس کے ترکہ کی تقسیم اسلامی شریعت کے مطابق ہوگی، مورث کے اس عمل کے بعد ورثہ پر قانونی طور پر لازم ہوجائے گا کہ وہ شریعت کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں۔

اسی طرح ان ملکوں میں نکاح کا رجسٹریشن کرانا قانونی طور پر لازم ہے، اس کے بغیر نکاح غیر قانونی، غیر لازم اور غیر نافذ قرار پاتا ہے، اور نہ اس کے بغیر کسی قسم کے مطالبات ثابت ہوسکتے ہیں، لیکن اگر کوئی مسلمان اسلامی طور پر نکاح کرے اور اس کا رجسٹریشن بھی کرائے تو قانونی طور پر ممنوع نہیں ہے۔

اس طرح ان غیر مسلم ملکوں میں قانونی مشکلات کا حل دریافت کیا جاسکتا ہے، اور وہاں کی شہریت سے ہرگز ضروری نہیں کہ اس شخص نے اپنے دین وایمان کا سودا بھی کرلیا ہو، العیاذ باللہ۔

(ب) بہت سے غیر مسلم ملکوں میں مسلم ممالک کو یہ قانونی اختیار دیا گیا ہے کہ وہاں کا کوئی شخص اگر غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرلے تو یہاں کی شہریت کے ساتھ اپنے ملک کی شہریت بھی باقی رکھ سکتا ہے، یعنی بیک وقت وہ دو ملکوں کی شہریت کا حامل ہوسکتا ہے، دو پاسپورٹ رکھ سکتا ہے، اس لئے غیر مسلم ملک کی شہریت سے لازم نہیں آتا کہ اسلامی ریاست اور اس کے نظام قانون سے بھی دستبردار ہوگیا ہو۔

(ج) پھر غیر مسلموں کے ساتھ معاملات اور سماجی تعلقات اسلام میں ممنوع نہیں ہیں، صرف ان سے وہ قلبی ارتباط ممنوع ہے جس سے انسان کی دینی زندگی متاثر ہو اور اس کا ایمانی رسوخ کمزور ہو، اسلام نے صرف ان غیر مسلموں سے قطع تعلق کا حکم دیا ہے، جو ان کے دشمن ہوں، یا ان کے اور ملت اسلامیہ کے لئے نقصان دہ ہوں، لیکن عام امن پسند غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات ومعاملات سے وہ ہرگز نہیں روکتا، قرآن کریم نے یہ مضمون پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے: "لا ینہاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا إلیھم" (سورۂ ممتحنہ: ۸)۔ (اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، جن سے تمہاری دینی جنگ نہیں ہے، اور جو تم کو تمہارے ملکوں سے

نکالنا نہیں چاہتے)۔

(د) دراصل اس موقعہ پر یہ فرق ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے، کہ قرآن کا ممنوعہ موالات اور جس ملک میں انسان آباد ہو وہاں کے انتظامی قوانین (جن کا اسلامی احکام سے کوئی تعلق نہ ہو) کا احترام یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

(ھ) جہاں تک غیر مسلم ملکوں میں عسکری ملازمت کا مسئلہ ہے تو اولاً جو ملک ہر قسم کے مطالبات اور جملہ حقوق فراہم کرتا ہے، الغرم بالغنم کے اصول پر اس ملازمت کا مطالبہ بیجا نہیں ہے۔

☆ نیز فوجی ملازمت میں اگر کچھ نقصانات ہیں تو فوائد اس سے زیادہ ہیں، سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آج بڑی طاقتوں کے پاس جو فنون حرب اور جنگی صلاحیتیں ہیں مسلمان فوج کا حصہ بن کر اس سے کافی استفادہ کر سکتے ہیں، اور اس کی بڑی ضرورت ہے اس لئے کہ بڑی طاقتوں کے مقابلے کے لئے جو ضروری تیاریاں اور جنگی صلاحیتیں ہونی چاہئے وہ ہماری مسلم افواج اور حکومتوں کے پاس مفقود ہیں، جو حکم الٰہی ''أعدوا لهم ما استطعتم من قوة'' (الانفال: ۶۰) کے خلاف ہے، اس لئے غیر مسلم ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو اگر ایسے مواقع ہاتھ آتے ہیں تو ان کو ضائع کرنا مناسب نہیں ہے، فقہ کا اہم ترین ضابطہ ہے:

''المصلحة العامة مقدمة على المصلحة الخاصة'' (الاشباه والنظائر لابن نجيم ص ۸۸ ط دار الكتب العلمية بيروت ۱۹۸۰ء، الاشباه والنظائر للسيوطى ص ۸۷ ط دار الكتب العلمية بيروت، درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج ۱ ص ۴۱ مادة ۲۸)۔ (مصلحت عام مصلحت خاص پر مقدم ہوتی ہے)۔

☆ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر غیر مسلم افواج میں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہو تو مسلم ممالک پر فوج کشی اتنی آسان نہ ہوگی جس قدر آج ان کے لئے محسوس ہوتی ہے،...... اس لئے ''أخف الضررين'' (المستصفى للغزالى (م ۵۰۵ھ) ج ۱ ص ۴۲۶ ط مؤسسة الرسالة بيروت ۱۹۹۷ء، كشف الاسرار للبزدوى (م ۷۳۰ھ) ج ۴ ص ۱۳۴ ط دار الكتب العلمية بيروت ۱۹۹۷ء) کے اصول پر عسکری ملازمت کی وجہ سے مسلمانوں کو بددل نہیں ہونا چاہئے۔

☆ علاوہ ازیں فوجی ملازمت سے کنارہ کشی پر مسلمانوں پر غداری اور دیگر الزامات بھی لگ سکتے ہیں، جو بحیثیت قوم سخت نقصان دہ ہے اور اسلام کی اشاعت کی راہ میں بھی اس سے خلل پڑ سکتا ہے، اس لئے ''لاضرر ولاضرار'' (الاشباه والنظائر لابن نجيم ص ۸۵، الاشباه والنظائر للسيوطى ص ۸۳) کے ضابطہ پر مسلمانوں کو فوجی ملازمت سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

☆ پھر ہر ملک میں فوجی ملازمت کا جبری اصول نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر ملکوں میں انسان کے اپنے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے قیام کے لئے ایسے ملک کا انتخاب کریں جہاں فوج کی جبری ملازمت کا قانون نہیں ہے۔

☆ اور فوجی ملازمت کی صورت میں بھی مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالات میں فوجی مہم میں شرکت سے معذرت کر دیں، اس لئے کہ تمام ملکوں نے حریت ادیان کا اصول تسلیم کر لیا ہے، اور فوج میں باقاعدہ مذہبی رہنما رکھے جاتے ہیں، ان کے لئے مساجد اور بنیادی دینی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے، غرض اس طرح کے جتنے شبہات وخطرات پیش کئے جاتے ہیں ان تمام کا مناسب حل موجود ہے۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام یا وہاں کی شہریت شجر ممنوعہ ہرگز نہیں ہے، البتہ مسلمانوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ اگر وہ کسی مسلم ملک میں قیام پذیر ہیں، اور وہاں کے حالات ان کے لئے پریشان کن نہیں ہیں تو اپنے ملکوں میں ہی قیام کریں، اور اسلامی نظام قانون کے تحت زندگی گذاریں اور دوسرے ملکوں کا سفر یا قیام عارضی طور پر محض ضرورت کے بقدر کریں، ان حالات میں غیر مسلم ملکوں میں مستقل قیام یا شہریت کا حصول کراہت سے خالی نہیں ہے،...... البتہ اگر کسی کے لئے ایسے حالات وظروف پیدا ہو جائیں کہ مسلم ملکوں میں قیام اس کی پریشانیوں کا باعث ہو، اور کسی غیر مسلم ملک میں اس کے لئے بہتر مواقع میسر ہوں تو اس کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنے کی گنجائش ہوگی بشرطیکہ:

(۱) وہاں رہ کر اس کا دینی تشخص اور اسلامی وجود مجروح نہ ہو، اور مستقبل قریب میں اس کے یا اس کی اولاد یا اس کی عزت ووقار کے لئے دینی اعتبار سے کوئی خطرہ نہ ہو۔

(۲) مسلمان وہاں دین وملت کا صحیح نمائندہ ہو، اپنے اخلاق وعمل اور خلوص وصداقت سے اسلام کا آئینہ دار ہو جس کے اثرات اس کے غیر مسلم پڑوسیوں پر پڑیں۔

(۳) اس ترک وطن کو وہ ہجرت حبشہ کی طرح پاک مقاصد کے لئے اختیار کرے، اور اپنے احساسات واعمال کے ذریعہ اس نقل مکانی کو اپنے اور ملت اسلامیہ

کے لئے ہر طرح مفید اور بامقصد ثابت کرے۔

معاشی مقاصد کے تحت ترک وطن کرنا

اس حکم میں معاشی مجبوریوں کے تحت نقل مکانی بھی شامل ہے:

(الف) بشرطیکہ اس کے اپنے ملک میں معاش کے ضروری وسائل میسر نہ ہوں، اور اس کی بنا پر مجبوراً کوئی مسلمان غیر مسلم ملک چلا جائے، اور اپنے دینی تشخصات کی حفاظت کے ساتھ وہاں کی اقامت یا شہریت اختیار کرے، جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے (المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۸۸، احکام القرآن لابن العربی ج ۱ ص ۵۱۵، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۵ ص ۳۵۱، کشاف القناع للبہوتی ج ۳ ص ۱۳۱)۔

اس لئے کہ کسب معاش بھی ایک اہم ترین فریضہ ہے، اور اس کے لئے شریعت نے کسی مکان کی قید نہیں رکھی ہے، قرآن کریم میں ہے: ''هو الذي جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور'' (سورہ الملک: ۱۵)۔ (وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع بنایا پس اس کے کاندھوں پر چلو اور اس کی دی ہوئی رزق استعمال کرو اور اسی کی طرف پھر اٹھایا جانا ہے)۔

(ب) البتہ وسائل معاش میسر ہوں، لیکن زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی غرض سے کوئی شخص کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت کا خواہاں ہو تو ظاہر ہے کہ یہ صورت کراہت سے خالی نہیں ہے، اس لئے کہ کفار کی صحبت بد کے اثرات، بہر حال مرتب ہوتے ہیں، اور یہ اثرات اس سے زیادہ اس کے اہل وعیال پر پڑتے ہیں، حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی اس روایت کی حساسیت ملاحظہ کیجئے: ''من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله'' (سنن ابوداؤد باب الاقامة بارض الشرك ج ۲ ص ۴۸ حدیث نمبر ۲۷۸۹ ط دار الکتاب العربی بیروت)۔ (جو مشرک کے ساتھ اکٹھا ہوا اور سکونت رکھے وہ اسی کی طرح ہے)

علامہ خطابیؒ (م ۳۸۸ھ) تشریح حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''وفيه دلالة على كراهة دخول المسلم دار الحرب للتجارة والمقام فيها أكثر من مدة اربعة أيام'' (معالم السنن للخطابی، کتاب الجهاد باب على مايقاتل المشركون ج ۲ ص ۲۷۲ طبع اول المطبعة العلمیة حلب ۱۹۳۳ء)۔ (حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی مسلمان کے لئے تجارت کی غرض سے دار الحرب کا سفر کرنا یا وہاں چار دن سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے)۔

ابوداؤدؒ نے مراسیل میں مکحولؒ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لاتتركوا الذرية إزاء العدو'' (مراسیل ابی داؤد ج ۱ ص ۲۸۳ حدیث نمبر ۳۲۲، حاشیة ابن قیم علی سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۲۱۹ ط دار الکتب العلمیة بیروت ۱۹۹۵ء) (اپنی اولاد کو دشمن کے بالمقابل مت چھوڑو)۔

بعض فقہاء نے مالی اغراض کے تحت دار الحرب کی سکونت اور اہل کفر کی آبادی میں اضافہ کو سقوط عدالت کا سبب قرار دیا ہے (تکملۃ رد المحتار ج ۱ ص ۱۰۱)۔

یہ تمام چیزیں اس طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ محض دولت کی ہوس اور زیادہ سے زیادہ امیر بننے کی آرزو کے لئے غیر مسلم ملک کی سکونت وشہریت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(ج) اگر بنیادی وسائل معاش اپنے ملک میں میسر ہوں جس سے فاقہ کی نوبت تو نہ آتی ہو مگر اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی پوزیشن بہتر کرنے کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں اقامت وسکونت اختیار کرے؟...... اس صورت میں صرف عارضی قیام وسکونت کی گنجائش نظر آتی ہے، جیسا کہ بعض علماء نے اس کی صراحت کی ہے (احکام القرآن لابن العربیؒ ج ۱ ص ۴۸۶، الجامع لاحکام القرآن للقرطبیؒ ج ۵ ص ۳۵۱)۔

☆ اس لئے کہ حصول رزق کے لئے مکان کی قید نہیں ہے: ''ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلاً من ربكم'' (سورۂ بقرۃ: ۱۹۸)۔ (کوئی مضائقہ نہیں اس بات میں کہ تم اپنے رب کی دی ہوئی رزق تلاش کرو)۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے: ''البلاد بلاد الله والعباد عباد الله فحيثما أصبت خيراً فأقم'' (مسند احمد بن حلبل ج ۱ ص ۱۶۶ ط مؤسسة قرطبة الاندلس، الجامع الصغير للسيوطی ج ۱ ص ۴۹۶ ط دار الفکر بیروت حدیث ضعیف ہے)۔ (تمام شہر اللہ کے ہیں اور بندے سارے اللہ کے ہیں، اس لئے جہاں سے تم کو خیر کی امید ہو وہاں قیام کرو)۔

لیکن مستقل سکونت اور باقاعدہ شہریت کی اجازت دینا اس صورت میں بہت مشکل ہے۔

(د) تجارتی مقاصد کے تحت غیر اسلامی ملکوں کا سفر اور وہاں قیام کرنے کی جمہور علماء کے نزدیک اجازت ہے لیکن یہ بھی وقتی قیام کی حد تک ہے (المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۸)۔

امام مالکؒ اور علامہ ابن حزمؒ کو وقتی قیام سے بھی اختلاف ہے، ان کے نزدیک علی الاطلاق دنیوی اغراض کے لئے غیر اسلامی ملک میں قیام کرنا جائز نہیں ہے (البیان والتحصیل لابن رشد ج ۴ ص ۱۷۱ ط دار المغرب الاسلامی بیروت ۱۹۸۴ء، ملحق المدونۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۶۶ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۴ء، المحلی لابن حزم ج ۱۱ ص ۳۴۹)۔

دراصل جمہور فقہاء کے پیش نظر عہد نبوی کے بعض واقعات ہیں جن میں بعض صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے مختلف اغراض کے تحت غیر مسلم ملکوں میں اقامت اختیار کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر نہیں فرمائی، اس لئے کہ ان کے لئے دینی فتنہ کا اندیشہ نہیں تھا، یا یہ کہ ان کا وہیں قیام کرنا زیادہ مفید تھا، مثلاً:

☆ حضرت عباسؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی اور اپنے اسلام پر قائم رہے (المغنی لابن قدامۃ ج ۱۰ ص ۵۰۷)۔

☆ اسی طرح نجاشی نے بھی قبول اسلام کے بعد ہجرت نہیں کی اور اپنی غیر اسلامی مملکت میں مقیم رہے (فتح الباری شرح صحیح البخاریؒ لابن حجرؒ ج ۷ ص ۱۹۱ ط دار الفکر بیروت)۔

☆ حضرت نعیم النحامؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کے قبیلہ بنو عدی نے آکر ان سے کہا کہ آپ ہم کو چھوڑ کر نہ جائیں، اور اپنے دین پر آزادانہ طور پر عمل کریں، اور اپنی خدمات سے ہمیں محروم نہ کریں اگر کوئی آپ کو تکلیف پہونچائے گا تو ہم آپ کا دفاع کریں گے، دراصل وہ کافی صاحب اثر اور غرباء و مساکین اور بیواؤں اور یتیموں کے بڑے خدمتگار تھے، اس لئے ان کی قوم کو ان کی جدائی شاق گذری، اس طرح ایک مدت تک وہ ہجرت نہ کر سکے، عرصہ کے بعد جب مدینہ ہجرت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''قومك كانوا خيراً لك من قومي لي قومي اخرجوني وأرادوا قتلي وقومك حفظوك ومنعوك. فقال يا رسول الله، بل قومك اخرجوك إلى طاعة الله وجهاد عدوه'' (الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج ۴ ص ۱۳۸ ط دار صادر بيروت ۱۹۸۵ء، الاستيعاب في اسماء الاصحاب للقرطبي ج ۳ ص ۵۲۷ ط دار الكتاب العربي بيروت، اسد الغابة في معرفة الصحابة لابن الاثير ج ۴ ص ۵۷۰ ط دار الفكر بيروت ۱۹۸۹ء، الاصابة في تمييز الصحابة لابن حجر ج ۲ ص ۵۲۷ ط دار الكتاب العربي بيروت، روایت میں کچھ ضعف ہے)۔ (تمہاری قوم میری قوم سے بہتر ہے، میری قوم نے مجھے شہر بدر کیا، اور میرے قتل کا ارادہ کیا، جبکہ تمہاری قوم نے تمہاری حفاظت کی اور تمہیں پناہ دی، حضرت نعیمؓ نے عرض کیا، آپؐ کی قوم نے آپ کو اطاعت الٰہی اور جہاد کی طرف نکلنے پر مجبور کیا)۔

☆ حضرت فدیکؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جس نے ہجرت نہیں کی وہ ہلاک ہو گیا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''يافديك أقم الصلاة وآت الزكاة واهجر السوء واسكن من دار قومك حيث شئت، قال: وأظنه قال: تكن مهاجراً'' (سنن البيهقي ج ۹ ص ۱۷، صحيح ابن حبان مع الاحسان في تقريب صحيح ابن حبان لعلاء الدين علي بن بلبان ج ۱۱ ص ۲۰۲ ط مؤسسة الرسالة بيروت ۱۹۸۸ء، رجالہ ثقات)۔ (اے فدیک! نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو، اور برائیوں سے پرہیز کرو اور اپنی قوم کے ملک میں جہاں چاہے رہو فرماتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم مہاجر کے حکم میں رہوگے)۔

بالخصوص آج کے دور میں مسلم ممالک تجارت وصنعت کے میدان میں جس قدر پسماندہ ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ مسلم تجار ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں کا دورہ کریں، وہاں قیام کریں اور اعلیٰ صنعتوں سے روشناس ہوں،...... یوں بھی تجارتی بنیادوں پر افراد کار کی آمد ورفت اور اشیاء کا تبادلہ اس دور میں ملک کی ترقی کے بہترین ذرائع میں سے ہے۔

اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تجارت اگر پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق کی جائے، تو غیر مسلم برادری پر اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھے اثرات پڑیں گے، اور اس سے دعوت کی راہ کھلنے کے بڑے امکانات ہیں...... ماضی میں تجارت ہی کے عنوان سے ہمارے اسلامی قافلوں نے مختلف ملکوں کا سفر کیا اور انہی قافلوں کے ذریعہ اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پہونچا، اس لئے تجارت آج کے دور میں دعوت کا بہترین وسیلہ ہے، اور اس وسیلہ کو کھودینا ہرگز دانشمندی نہیں ہوگی۔

ظاہر ہے کہ یہ ضرورت وقتی قیام سے بھی پوری ہو سکتی ہے، اس کے لئے مستقل شہریت کی ضرورت نہیں ہے...... البتہ اگر کوئی شخص تجارت کو محض وسیلۂ دعوت کے طور پر اختیار کرے، اور اصل مقصد دعوت وتبلیغ ہو تو اس کے لئے بلاشبہ غیر مسلم ملکوں کی شہریت نہ صرف جائز بلکہ باعث فضیلت ہوگی۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہریت دینا:

(۷) یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، فقہاء نے اس مسئلہ کو بہت پہلے صاف کر دیا ہے، ہماری تمام فقہی کتابوں میں "اہل ذمہ" کا باقاعدہ باب قائم کیا گیا ہے، اور ان سے متعلق احکام کی پوری تفصیل موجود ہے۔

ذمی ہر ایسے غیر مسلم کو کہتے ہیں جس کو حکومت (اور حنفیہ کے نزدیک کسی بھی مسلمان) کی طرف سے جزیہ اور دنیوی آئین اسلام کی اطاعت کی شرط پر ملک میں دائمی طور پر رہنے کی اجازت دی گئی ہو اور حکومت نے اس کے لئے تمام تحفظات و مراعات اور حقوق و واجبات (بعض استثناءات کو چھوڑ کر) کی ضمانت دی ہو۔

فرد اور حکومت کے اسی قانونی رابطہ کا نام شہریت ہے، حنفیہ کے علاوہ تمام فقہاء اس طرح کے قانونی معاہدہ کا اختیار صرف حکومت یا امیر المؤمنین کو دیتے ہیں، حنفیہ اس اختیار کو عامۃ المسلمین تک توسیع کرتے ہیں (البدائع للکاسانی ج ۷ ص ۱۱۱، ابن عابدین ج ۳ ص ۲۷۵، الاموال لابی عبید ص ۸۷، الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۴۵)۔

بعض فقہاء نے ان شرائط کی تفصیل بھی لکھی ہے، جن کی پابندی غیر مسلم شہریوں پر ضروری ہوتی ہے، علامہ ماوردی نے ایسی چھ (۶) چیزوں کا تذکرہ کیا ہے:

☆ کتاب الٰہی کا احترام کریں اور ان کے بارے میں کسی طعن و تحریف کا تذکرہ نہ کریں۔

☆ ناموس رسالت میں کوئی بے ادبی نہ ہو۔

☆ دین اسلام کی تحقیر نہ کریں۔

☆ کسی مسلمان خاتون سے زنا یا نکاح کا تعلق قائم نہ کریں۔

☆ کسی مسلمان کو دینی یا مالی فتنہ میں مبتلا نہ کریں۔

☆ اہل حرب کی مدد یا ان کے لئے جاسوسی نہ کریں۔

ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی پر ان کی شہریت منسوخ کی جا سکتی ہے (الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۴۵)۔

بعض فقہاء نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ وہ اپنی عمارتیں مسلمانوں سے اونچی نہیں بنا سکتے، اسی طرح اگر ان کی تعداد زیادہ ہو تو ان کی آبادی مسلمانوں سے الگ ہونی چاہئے (ابن عابدین ج ۳ ص ۲۷۵، الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۴۵، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلی ص ۱۴۳)۔

دراصل عقد ذمہ کو غیر مسلموں کے حق میں اسلام کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، اور اس کا مقصد غیر مسلموں سے حصول مال نہیں بلکہ ان کو اسلامی معاشرہ میں رکھ کر اسلام کی عملی دعوت دینا مقصود ہے (فتح القدیر و العنایۃ علی الہدایۃ ج ۵ ص ۲۱۳، ۲۱۴)۔

اسی لئے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم شہریوں کے ساتھ پوری مراعات کرنے کا حکم دیا ہے اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کو سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: "ألا من ظلم معاهداً أو انتقص حقه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئاً بغير طيب نفس منه فأنا حجيجه يوم القيمة" (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۶ ط دار الكتاب العربي بيروت)۔ (خبردار! جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا، اس کی حق تلفی کرے گا، یا اس کی طاقت سے زیادہ زیر بار کرے گا، یا بغیر اس کی رضامندی کے اس کی کوئی چیز لے لے گا تو بروز قیامت اس کے خلاف میں خود مستغیث بنوں گا)۔

عقد ذمہ کی یہ حقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ مسلم ملکوں کے دروازے ہر وقت غیر مسلموں کے لئے کھلے رہنے چاہئیں، اور بلا کسی معقول وجہ کے اس کو بند نہیں کرنا چاہئے، یہ دعوتی اعتبار سے بھی فائدہ مند ہے، ...... مالی طور بھی سودمند ہے، ...... دوسرے ملکوں سے معاہدات میں مفید ہے ...... اور اس سے خود مسلمانوں کے لئے بھی غیر مسلم ملکوں میں اقامت و شہریت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

جزیرۃ العرب میں کسی غیر مسلم کو شہریت نہیں دی جا سکتی

البتہ اس میں باتفاق فقہاء جزیرۂ عرب کا استثناء کیا گیا ہے (ابن عابدین ج ۳ ص ۲۷۵، الماوردی ص ۱۶۷، احکام اہل الذمہ لابن القیم ج ۱ ص ۱۷۶-۱۸۶)۔

اور اس کی وجہ وہ حدیث پاک ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے: ''لاخرجن الیهود والنصاریٰ من جزیرة العرب حتی لادع إلا مسلماً'' (صحیح مسلم باب اخراج الیهود والنصاریٰ من جزیرة العرب ج ۵ ص ۱۶۰ حدیث نمبر ۴۶۹۳ ط دار الجیل بیروت، ترمذی ج ۴ ص ۱۵۶ حدیث نمبر ۱۶۰۶ ط دار احیاء التراث العربی بیروت)۔ (میں یہود ونصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے ضرور نکالوں گا اور یہاں کسی مسلمان کے علاوہ کسی کو رہنے کی اجازت نہ دوں گا)۔

ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ''لایجتمع فی أرض العرب دینان'' (مسند احمد ج ۶ ص ۲۷۵ ط المیمنیة، مجمع الزوائد للهیثمی ج ۵ ص ۳۲۵ ط القدسی، الاموال لابی عبید ص ۱۲۸ ط دار الفکر ۱۳۹۵ھ)۔ (عرب کی سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہو سکتے)۔

جزیرۃ العرب اہل جغرافیہ کے مطابق عرب کے اس جزیرہ نما علاقہ کا نام ہے جس کے غرب میں بحر قلزم (بحر احمر)، جنوب میں بحر عرب، اور شرق میں خلیج بصرۃ (خلیج عربی) ہے، جانب شمال کی حد کیا ہے اس میں اختلاف ہے، صاحب معجم البلدان کے مطابق اس کی حد عذیب سے حضر موت تک ہے، ابن الاعرابی نے بھی اس کی تحسین کی ہے، جبکہ اصمعی کا بیان یہ ہے کہ جزیرۃ العرب طول میں عدن سے ریف عراق تک اور عرض میں ابلہ سے جدۃ تک ہے (معجم البلدان لیاقوت الحموی (م ۶۲۶ھ) جزیرۃ العرب ج ۱ ص ۴۹۵)۔

انہی لئے فقہاء کرام میں حنفیہ اور مالکیہ نے جزیرۃ العرب کو صرف مکہ اور مدینہ تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ پورا خطۂ عرب (جس کو اہل بلدیات جزیرۃ العرب مانتے ہیں) اس میں شامل ہے، اس لئے کہ الفاظ حدیث میں عموم ہے (فتح القدیر لابن ہمامؒ ج ۴ ص ۳۷۹، حاشیۃ ابن عابدینؒ ج ۳ ص ۲۷۵)۔

البتہ مالکیہ میں علامہ قرطبیؒ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد مکہ، مدینہ، یمامۃ اور یمن کے اطراف ہیں (الحطاب ج ۳ ص ۳۸۱ بحوالہ الموسوعۃ ارض العرب)۔

شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں اس سے مراد سرزمین حجاز ہے (احکام اہل الذمۃ لابن القیمؒ ج ۱ ص ۱۷۶)۔

حجاز کی تشریح امام غزالیؒ وغیرہ نے یہ کی ہے کہ اس میں مکہ، مدینہ، یمامہ، نجد اور اطراف آتے ہیں، الوج، طائف اور خیبر مدینہ کے اطراف میں شامل ہیں، یمن اس میں داخل ہے کہ نہیں اس میں اختلاف ہے، اس لئے کہ بعض لوگ جزیرۃ العرب کو شام وعراق تک توسیع کرتے ہیں (الوجیز للغزالیؒ ج ۲ ص ۱۹۹ بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ ج ۳ ص ۱۲۹)۔

☆☆☆

شرعی اور سیاسی تناظر میں شہریت اور اس سے متعلق احکام

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی[1]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو حقوق دیئے ہیں، ان میں سے ایک ''کائنات سے استفادہ کا حق'' ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ وسیع کائنات انسان کے لئے انتہائی موزون بنائی ہے، بحر و بر اس کے لئے مسخر کردیئے ہیں، زمین اس کے لئے مستقر ہے؛ تا کہ اس پر رہ سکے اور زندگی گذار سکے اور انسان ہونے کے ناطے اللہ پاک کی نعمتوں سے جتنا چاہے فائدہ اٹھائے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے: ''اللہ الذي خلق السموت والأرض وأنزل من السماء ماءً فأخرج به من الثمرات رزقا لكم، وسخر لكم الفلك لتجري في البحر بامره، وسخر لكم الانھر...... (سورۂ مریم: ۳۲-۳۴)۔

گویا انسان کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا میں بے شمار نعمتیں پیدا کی ہیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا ہے، یہ اور اس جیسے دوسرے حقوق بیان کرنے سے پہلے شہریت کی وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) **شہری اور شہریت کی تعریف:** اسٹیٹ کی آبادی میں دو طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں، ایک تو ملکی باشندے یا مملکت کے شہری یا اتباع اور دوسرے غیر ملکی باشندے یا اجانب، لفظاً شہری کے معنی شہر کے باشندے کے ہیں؛ لیکن اصطلاحاً اس سے مراد مملکت کے فقط وہ ارکان ہیں؛ جنہیں ملکی دستور اور قوانین کے تحت مدنی اور سیاسی حقوق حاصل ہوں، ان کے مقابلہ میں اجانب کو چند شخصی تحفظات حاصل ہوتے ہیں، لیکن وہ مدنی اور سیاسی حقوق سے محروم ہوتے ہیں۔

فی زمانا حق شہریت حاصل کرنے یا ہونے کے لئے عموماً دو میں سے ایک اصول کو اپنایا جاتا ہے، ایک خونی رشتہ کا اصول جس کے مطابق کسی ملک کی شہریت رکھنے والے ماں باپ سے پیدا شدہ بچہ خود بخود اپنے والدین کے ملک کا شہری مانا جائے گا، دوسرا جائے پیدائش کا اصول، یعنی جو بچہ جس ملک کی سرزمین پر پیدا ہوا وہاں کا شہری مانا جاتا ہے، برطانیہ، ولایات متحدہ امریکہ میں شہریت کے تعین کا فارمولا ان دونوں اصول سے مرکب ہے، مزید براں مملکت کو حق ہے کہ وہ کسی بھی غیر ملکی کو ''ملکیانے'' Naturalilzation کے عمل سے شہریت عطا کر سکتی ہے (مبادیٔ سیاسیات: باب: ۴، ص: ۶۹-۷۰، قاضی پبلیشرز ڈسٹری بیوٹرز دہلی)۔

دوسرا اصول تو ہر ایک ملک میں رائج ہے اور ضروری بھی ہے؛ تا کہ نو مولود پیدا ہوتے ہی شہری حقوق کا حقدار ہوجائے؛ لیکن ایک شخص ایک ملک میں پیدا ہوا، وہاں کی شہریت اسے حاصل ہے اور اب وہ اس ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں آباد ہونا چاہتا ہے۔

تو اس کو حق شہرت ملے اس کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جائے؟ بنیادیں مختلف ہیں، جیسے معاشی سرگرمیاں انجام دینا، لیکن آدمی سکون واطمینان کے ساتھ معاشی سرگرمیاں اسی وقت انجام دے سکتا ہے؛ جبکہ اس کو سکونت وقیام کے بارے میں اطمینان ہوجائے اور کامل اطمینان اس وقت ہوگا، جبکہ حق شہریت مل جائے، یہ اس کی فطرت ہے۔

اور کسی آدمی کا بودوباش کا پختہ ارادہ ہے اس کا علم، بلکہ یقین بھی اسی وقت ہوسکتا ہے، جبکہ وہ ایک طویل مدت تک رہے، لہٰذا ایک مخصوص مدت تک قیام کو بنیاد بنانا بہتر معلوم ہوتا ہے، اب یہ مدت کتنی ہونی چاہئے؟ احقر کی رائے میں ۴ رسال یا اس سے ایک دو سال زائد بہتر ہے، محدثین کے یہاں ایک اصول بتلایا جاتا ہے کہ راوی کسی شہر میں کتنی مدت رہے تو ان کو اس شہر کی طرف منسوب کیا جائے؟ عبد اللہ بن مبارک ۴ رسال کے قائل ہیں، ''کم المدة التي إن أقامها الشخص في بلد نسب إليها؟ أربع سنين، وهو قول عبد الله بن المبارك۔ (تيسير مصلح الحديث: باب: ۲۰، ص: ۲۲۳، ط: مکتبہ فیصل دیوبند)۔

(۲) ایک ملک کا شہری دوسرے ملک میں آباد ہونا چاہے تو اس کی ۴ رصورتیں متصور ہوسکتی ہیں، (۱) کافر کسی کافر ملک میں آباد ہونا چاہے (۲) مسلمان کسی

[1] مہتمم دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ، گجرات۔

مسلمان ملک میں آباد ہونا چاہے (۳) کافر کسی مسلمان ملک میں آباد ہونا چاہے (۴) مسلمان کسی کافر ملک میں آباد ہونا چاہے۔

پہلی صورت سے ہمیں کوئی بحث نہیں ہے یعنی (کسی مسلمان یا کافر ملک کا) کافر شہری کسی کافر ملک میں آباد ہونا چاہے۔

دوسری صورت سوال نمبر ۲ رمیں ذکر کی ہے۔ تیسری صورت سوال نمبر ۷ رمیں مذکور ہے۔ چوتھی صورت سوال نمبر ۶ رمیں مذکور ہے۔

دوسری صورت کے سوال کے مطابق اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو یہ دیکھا جائے کہ وہ مسلم ملک کا باشندہ ہے یا غیر مسلم ملک کا۔

۲۔ اگر وہ کسی مسلم ملک کا باشندہ ہے اور وہاں اسے کوئی مجبوری نہیں ہے، صرف ایک قلبی تمنی وخواہش ہے کہ کسی دوسرے ملک میں آباد ہو تو ایسے مسلمان کی درخواست کو قبول کرنا دوسرے مسلم ملک پر ضروری نہ ہونا چاہئے؛ کیونکہ یہاں بھی وہ کسی مسلمان حاکم کی ولایت میں ہے اور یہاں وہ تمام دینی امور اچھی طرح ادا کرسکتا ہے۔

ہاں! اگر مجبوری ہے، مسلم حکومت ہونے کے باوجود کچھ دینی امور، دینی تعلیم اور بنیادی مذہبی وشہری حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے؛ پھر بھی یہ مسلمان اس ملک میں رہ کر جدوجہد کرے اور بنیادی حقوق کے حصول کے لئے کوشاں رہے، تو امید ہے کہ ماحول سازگار ہوگا، سعی وکاوشیں بارآور ہوگی۔

پھر بھی اگر یہ لوگ کسی دوسرے مسلم ملک میں مجبوری کی وجہ سے شہریت لینا چاہتے ہیں تو ان کو حق شہریت کے بجائے یہ صورت زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے مسلم ممالک اس مسلم ملک پر دباؤ بنائے جو اپنے مسلم شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔

کیونکہ شہریت طلب کرنے والے کو شہریت دے دینا یہ کوئی حل معلوم نہیں ہوتا، اہل حکومت مسلمان ہیں بلہذا انہیں کسی کا آلہ کار نہ بننے پر سمجھایا جائے، اور رعایا کے حقوق سمجھائے جائیں؛ تاکہ وہ لوگ جو کسی مجبوری کی وجہ سے کسی طرح دوسرے ملک کی شہریت لینے کے خواہش مند ہونے کے باوجود شہریت نہیں لے سکتے انہیں بھی فائدہ ہو۔

ہاں! اگر کسی مسلمان ملک کا حاکم یا برسراقتدار جماعت کسی فرقۂ ضالہ کی ہمنوا ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا بیجا ہو کہ وہ کسی مسلمان کو ان کے بنیادی حقوق، دینی امور کی ادائیگی اور بنیادی دینی تعلیم کا حق دے تو ایسے مسلمان کو حق شہریت طلب کرنے پر اخوت ایمانی، بھائی چارگی، غیرت وحمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے ملک کو شہریت دینی چاہئے۔

کیونکہ اس مسلمان پر اب مسلم ملک میں زمین تنگ کردی گئی ہے؛ حالانکہ اللہ پاک کی پیدا کردہ زمین میں وسعت ہے تو اب دوسرا مسلم ملک اس وسعت میں اپنے اس مسلم بھائی کو آباد کرے۔

اور اگر وہ کسی کافر ملک میں آباد ہے اور اب کسی مسلم ملک میں شہریت لینا چاہتا ہے تو اگر اس مسلمان کو کافر ملک میں پریشانی نہیں ہے اور حالات بھی سازگار ہے، لوگوں کو عبادات وغیرہ کی اجازت ہے اور وہ مسلمان اس کافر ملک سے مسلمان ملک میں آباد ہونا چاہے تو بھی اس کو حق شہریت دینا بہتر معلوم ہوتا ہے، جیسے مہاجرین حبشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں حبشہ ہجرت کر کے آباد ہوئے تھے اور وہاں کے بادشاہ کی طرف سے کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں تھی، وہ صحابۂ کرام وہیں رہے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''لما نزلنا أرض الحبشة جاورنا خير جار وامنا على ديننا، عبدنا الله تعالىٰ لا نؤذى ونسمع شيئا نكرهه'' (السيرة الحلبية: باب الهجرة الثانية الى الحبشة، ص:۳۰، ج:۲، ط: دار المعرفه بيروت)۔ فتح خیبر کے بعد مہاجرین حبشہ میں سے حضرت جعفر بن ابی طالب ؓ کو آپ نے حبشہ واپس نہیں لوٹایا، بلکہ ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ ''السیرۃ الحلبیہ'' میں ہے:

''وقدم عليه ﷺ بعد فتح خيبر جعفر بن ابي طالب رضي الله عنه من أرض الحبشة ومعه الاشعريون ... ولما أقبل عليه ﷺ جعفر رضي الله عنه قام ﷺ إلى جعفر وقبله بين عينيه'' (غزوۂ خیبر، ص:۷۵۶، ج:۲، ط: دار المعرفه بیروت)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ عیسائی مملکت میں ایک طویل مدت تک مقیم رہے، بلکہ ہجرت نبوی ﷺ کے بعد بھی کئی سال تک مقیم رہے، اسی لئے ان کی آمد پر آپ ﷺ بہت خوش ہوئے؛ کیوں کہ لمبی مدت کے بعد ملاقات بھی ہورہی تھی، ما أدري انا بقدوم جعفر أسر أو بفتح خيبر، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی یہ آمد سن ہجری ۷ رمیں ہوئی، اس کے بعد وہ حبشہ نہیں گئے، اور ۹ھ میں موتہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔

اور اگر وہ ایسے کافر ملک سے آیا ہے جہاں مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھایا جارہا ہے، عبادات پر پابندیاں اور شعائر کی بے حرمتی ہورہی ہے، تو ایسے لوگوں کو مسلمان ملک میں شہریت دینا لازم ہونا چاہئے، جیسے کئی صحابہ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی اور انہیں ہمیشہ کے لئے وہاں اقامت مل گئی، اسی طرح کئی دیگر شہروں اور ملکوں سے صحابہ اسلام میں داخل ہوئے اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

اتنا ہی نہیں؛ بلکہ دو۔دو صحابہ کے درمیان اخوت قائم کی اور انصاری صحابہ نے مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی ملکیت میں حصہ تک کی پیش کش کی۔

اور دوسرا فائدہ ان کو حق شہریت دینے میں یہ بھی ہے کہ وہ کسی کافر حاکم کی ولایت سے نکل کر مسلمان حاکم کی ماتحتی اور ولایت میں آجائیں گے۔

(۳) اسلام میں ایک مؤمن کو دوسرے مؤمن سے قلبی تعلق ومحبت پر ابھارا ہے، اور "إنما المؤمنون اخوة" کے پیش نظر سب کے درمیان اخوت ایمانی قائم کر کے بھائی چارگی اور محبت پیدا کردی، نیز تمام مؤمنین کو ایک جسم کی طرح قرار دیا کہ اگر ایک مؤمن کو تکلیف ہو تو اس کے دکھ اور درد کا احساس دوسرے کو بھی ہونا چاہئے۔

"عن النعمان بن بشير قال؛ قال رسول الله ﷺ: مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل الجسد. إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى" (مسلم: كتاب البر والصله، باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم، رقم الحديث: ۶۵/۲۵۸۵، ص: ۱۱۲۲، دار ابن حزم بیروت)۔

اس میں ایک دوسرے کے الم ومصیبت اور تکلیف میں شرکت کرنے پر ابھارا ہے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "تداعى نه اي دعا بعضه بعضا إلى المشاركة في الألم" (تكمله فتح الملهم: رقم الحديث: ۶۶/۲۵۸۶، ص: ۳۰۴، ج: ۱۱، ط: المكتبه الاشرفيه ديوبند)۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "قال ابن أبي جمرة: الذي يظهر أن التراحم والتوادد والتعاطف، وإن كانت متقاربة في المعنى، لكن بينهما فرق لطيف... وأما التعاطف فالمراد به إعانة بعضهم بعضا كما يعطف الثوب عليه ليقويه. كذا في فتح الباري" (تكمله فتح الملهم: رقم الحديث: ۶۶/۲۵۸۶، ص: ۳۰۴، ج: ۱۱، ط: المكتبه الاشرفيه ديوبند)۔

اب کوئی مؤمن کسی ملک میں ظلم وستم کا شکار ہے تو دوسرے ملک کے مؤمن حاکم کی طرف سے اس کی اعانت کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اس ظالم ملک کے حاکم پر کسی طرح دباؤ بنائے؛ تاکہ مظلومین کو سکون ملے، لیکن فی زمانہ یہ شکل مشکل معلوم ہورہی ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس ملک کے مظلوم مسلمانوں میں سے جو مسلمان اسکے ملک میں آئے اس کو امن وپناہ دینے کے بجائے شہریت دے دیوے؛ تاکہ یہ پر امن وپرسکون زندگی گذارے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا: "ولينصر الرجل أخاه ظالما أو مظلوما، إن كان ظالما فلينهه، فإنه له نصر، وإن كان مظلوما فلينصره" (صحيح مسلم: كتاب البر والصله، باب نصر الاخ ظالما او مظلوما، رقم الحديث: ۶۲/۲۵۸۴، ص: ۱۱۲۲، ط: دار ابن حزم بيروت)۔

نیز اس مسلم ملک کے حاکم کو "ومن فرّج عن مسلم كربة فرج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة" (صحيح مسلم: رقم الحديث: ۵۸، ۲۵۸۰) جیسی حدیثیں بھی مدنظر رکھنی چاہئے، تاکہ اس مظلوم مؤمن کی تکلیف حق شہریت ملنے کی وجہ سے مکمل ہی رفع ہوجائے۔

اگر پناہ دی ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس کو اپنے ملک میں واپسی کی صورت میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑے، اس مدت کے درمیان اس کی ملکیتیں ہلاک کردی گئی ہو، اور یہاں بھی پناہ گزیں کی حیثیت سے رہے گا تو یہاں بھی اس کو وہ اطمینان نہ ہوگا، جو ایک شہری کو ہوتا ہے، کیونکہ کبھی پناہ ختم ہونے کا امکان ہے، جس کے نتیجہ میں زندگی اجیرن ہوجائے، اس لئے مسلم ملک کے حاکم کے لئے مظلوم مسلمانوں کو پناہ دینے کا جذبہ اور قدم یقینا قابل مدح ہے؛ لیکن اعانت میں ایک قدم اور آگے بڑھیں تو یہ یقینا اعانت کے آخری درجات میں سے ہوسکتا ہے۔

۴۔ اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے لئے درج ذیل حقوق حاصل ہونے چاہئے: ووٹ دینے کا حق جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے کس کو خلافت کے لئے منتخب کیا جائے، اس کے حل کے لئے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سب کی رائے لی؛ حتی کہ پردہ نشین عورتوں سے بھی رائے طلب کی، اس میں یہ امتیاز نہیں کیا کہ جو مدینہ کے باشندے ہیں، انہیں سے پوچھ لیا جائے اور باقی حضرات جو دیگر ممالک یا شہروں سے آکر آباد ہوئے

ہیں ان کو چھوڑ دیا جائے؛ بلکہ ہر ایک سے انہوں نے رائے طلب کی حتی کہ اعرابی اور راہگیروں کی بھی رائے لی۔

''ویروي أن أهل الشورى جعلوا الأمر إلى عبد الرحمن ليجتهد المسلمين في أفضلهم ليوليه. فيذكر أنه سأل من يمكنه سواله من أهل الشورى وغيرهم فلا يشير إلا بعثمان بن عفان، حتى أنه قال لعلي: ارأيت إن لم أولنك بمن تشير به علي؟ قال: بعثمان، وقال لعثمان: ارأيت ان لم اولك بمن يشير به؟ قال: بعلي بن ابي طالب. وينخلع عبدالرحمن منها لينظر الأفضل، والله عليه والإسلام ليجتهدن في أفضل الرجلين فيوافيه. ثم نهض عبدالرحمن بن عوف رضي الله عنه يستشير الناس فيهما ويجمع رأى المسلمين برأي رؤس الناس واقيادهم جميعا وأشتاتا. مثنى وفرادى ومجتمعين، سرا وجهرا، حتى خلص إلى النساء المخدرات في حجابهن، وحتى سأل الولدان في المكاتب، وحتى سأل من يرد من الركبان والأعراب إلى المدينة، في مدة ثلاثة أيام بلياليها'' (البدايه والنهايه: خلافة امير المؤمنين عثمان بن عفان رضي الله عنه، ص: ۱۶۰،۱۵۹، ج: ۷، ط: دار الفكر العربي)۔

انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق: اگر اس آدمی میں صلاحیت، ملکی مسائل سے دل چسپی اور اس کے حل کی مہارت، امانت و دیانت اور دیگر جو شرائط ایک والی اور حاکم کے لئے ہونی چاہئے وہ پائی جائے تو اسے یہ حق بھی ملنا چاہئے، اور آج کل کئی ممالک میں حق شہریت کے بعد یہ حق بھی دیا جاتا ہے، خود خلفائے اربعہ ہجرت کر کے مدینہ آئے اور وہیں کے ہو رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد یہ بالترتیب خلیفہ بنے، اور کئی ایک صحابہ جو دوسرے ملکوں سے یا دوسرے شہروں سے آئے تھے؛ وہ گورنر بنے۔

سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق: جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ملک یمن میں قبیلۂ دوس سے تعلق رکھتے تھے، قبول اسلام کے بعد تبوک کے موقع پر مدینہ منورہ میں تشریف لائے، حتی کہ مدینہ منورہ دائمی اقامت کرلی، امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں بحرین کا گورنر نامزد کیا، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وہ مدینہ منورہ کے گورنر رہے، اور اس طرح ان کو ایک سرکاری ملازمت سپرد کی گئی۔

محمد احمد غضنفر لکھتے ہیں: امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بحرین کا گورنر نامزد کیا...... حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں حضرت ابو ہریرہؓ کو مدینہ منورہ کے گورنر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، کبھی مروان بن حکم اس عہدے پر فائز ہوتا اور کبھی حضرت ابو ہریرہؓ مسند امارت مدینہ پر جلوہ افروز ہوتے (حکمران صحابہ: ص: ۶۴۳، ۶۴۶، ط: فرید بکڈپو)۔

بحرین کی گورنری سے پہلے وہ دوسری بھی سرکاری ملازمت سنبھال چکے تھے، بحرین میں عمرؓ نے قدامہ بن مظعون کو ٹیکس کا محکمہ سپرد کیا اور ابو ہریرہؓ کو محکمہ پولس اور نماز کی ذمہ داری سونپی، ایک اور روایت کے مطابق قدامہ بن مظعونؓ کو ٹیکس اور پولس کا محکمہ دیا، جب کہ ابو ہریرہؓ کو نماز اور قضا کی ذمہ داری دی۔

بہر حال کچھ دنوں تک ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ واپس مدینہ لوٹ آئے...... اس کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بحرین کے گورنر بنائے (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حیات وخدمات: باب: ۴، خلافت راشدہ، ص: ۶۳، ط: مکتبہ نعیمیہ دیوبند)۔

سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، روزگار کا حق:

معاشی تگ ودو کا حق: حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن الربیع خزرجی کے ساتھ ان کی مواخات قائم فرمائی، ''وآخى بينه وبين سعد بن الربيع الخزرجي'' (تهذيب الكمال في اسماء الرجال: رقم الترجمة: ۳۹۲۲، ص: ۳۲۱، ج: ۱۷، ط: موسسه الرساله)۔

دیگر مہاجرین صحابہ کی طرح انہیں بھی ان کے انصاری بھائی حضرت سعد کی طرف سے اپنی مملوک اشیاء میں حصہ اور شرکت کی پیش کش کی گئی؛ لیکن انہوں نے اس کو قبول کرنے کے بجائے تجارت کی غرض سے بازار کا راستہ دریافت کیا اور معاشی تگ ودو اور طلب رزق میں بھی لگے۔ بخاری شریف میں ہے:

''لما قدموا المدينة آخى رسول الله صلى الله عليه وسلم بين عبد الرحمن بن عوف وسعد بن الربيع، قال لعبد الرحمن: إني أكثر الأنصار مالا، فاقسم مالي نصفين، ولي امرأتان، فانظر اعجبهما إليك فسمها لي اطلقها فإذا انقضت

عدتها فتزوجتها۔ قال: بارك الله لك في أهلك ومالك، اين سوقكم ؟ فدلوه على سوق بني قينقاع، فما انقلب إلا ومعه فضل من اقط وسمن. . . '' (فتح الباری؛کتاب مناقب الانصار، باب اخاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المهاجرین والانصار، رقم الحدیث: ۳۷۸۰، ص: ۴۸۶، ج: ۷، ط: دار الفکر بیروت لبنان)۔

انصاف حاصل کرنے کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق: یہ حق بھی اس آدمی کے لئے ضروری ہے، جسے کسی جگہ حق شہریت ملے؛ تاکہ وہ ظلم وجور کا شکار نہ ہو، اور پرامن فضا میں سانس لے سکے۔

محمد محمود فیض آبادی نے ایسے تمام حقوق کو یکجا جمع کیا ہے، جو ایک شہری کے لئے ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں: مملکت کی حتمی غایت اپنے شہریوں کی حفاظت اور ان کی شخصیات کے نشوونما کے لئے ضروری اسباب و وسائل مہیا کرنا ہے، مملکت کے قانون کی غرض وغایت انصاف کے اسی نصب العین کا حصول ہے، مملکت کا قانون اسی لئے مبنی برحق تسلیم کیا جاتا ہے؛ کیونکہ وہ سماج میں ان خارجی حالات کی ضمانت دیتا ہے، جن کے بغیر افراد اپنی شخصیات کی تکمیل کے قابل نہیں ہوسکتے، سماج میں انہیں خارجی کیفیات کو (Rights) کا نام دیا گیا ہے۔

مملکت کا بنیادی وظیفہ ان حقوق کو قانوناً تسلیم کرکے انہیں نافذ کرنا ہے، اگر مملکت کا وجود انسانی شخصیت کی نشوونما کے لئے ہوا ہے تو اس مقصد کا حصول قانونی حقوق کے نظام کے بغیر ممکن نہیں ہے، تمام حقوق کا معیار ان کی انسانی افادیت ہے، وہ حقوق اسی لئے کہلاتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول میں مد ومعاون ہیں، جن کے لئے مملکت کا وجود ہوا ہے، لیکن جہاں افراد کو مملکت کے اوپر کچھ حقوق حاصل ہیں وہیں ان حقوق کی لازمی شرائط کے طور پر مملکت کے تئیں ان کے اوپر بھی چند فرائض عائد ہوتے ہیں، کیونکہ سماج تکافل باہم (Interdipendence) کی بنیاد پر قائم ہے۔

مملکت اپنے شہریوں کے حقوق کی تعیین اپنے عین العیون یعنی عدل وانصاف کی روشنی میں کرتی ہے، عدل یا انصاف وہ اعلی ترین قدر ہے، جو حریت، مساوات اور اخوت کی تینوں اخلاقی قدروں کی میزان اور مجموعہ ہے، انصاف سے مراد ان تینوں بنیادی انسانی قدروں کے درمیان مناسبت، توازن اور ہم آہنگی کی کیفیت ہے، اگر حریت انصاف کا ایک مبدا ہے تو انصاف نہ صرف حریت کی مختلف شکلوں کے درمیان، بلکہ حریت اور مساوات کے درمیان اور ان دونوں اور اخوت کے درمیان مناسبت اور مطابقت قائم کرتا ہے، انصاف کا اعلی ترین مبدا انہیں تینوں مبادی کا مجموعہ اور میزان ہے، وہ ان تینوں کے مختلف الجہات تقاضوں اور عملیات کے درمیان تناسب اور توازن لاتا ہے، وہ نہ صرف ان تینوں اقدار کے درمیان بلکہ مختلف زمروں کے حقوق کے درمیان جو بسا اوقات آپس میں متصادم بھی ہوسکتے ہیں؛ تناسب قائم رکھتا ہے۔

حریت کی تین خاص انواع یہ ہیں:

(۱) شخصی حریت (۲) مدنی اور سیاسی حریت (۳) اقتصادی حریت

جس طرح ہر فرد بہ حیثیت انسانی فرد کے مملکت کا آزاد رکن ہے، اسی طرح ہر فرد دوسرے افراد کے برابر درجہ کا شہری ہے؛ لیکن مساوات کے معنی مطلق یا فطری (نیچرل) مساوات کے نہیں، کیونکہ خدا نے سب انسانوں کو یکساں بنایا ہے؛ نہ سب کو یکساں صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں، نہ سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جانا ممکن ہے؛ بلکہ مدنی زندگی میں مساوات سے مراد ہر فرد کے قانونی مرتبہ اور قانونی اہلیت کی مساوات ہے۔

مساوات کی دوسری اور اہم تر نوع ''سماجی مساوات'' ہے، یعنی سماج میں افراد کی دوسروں کے برابر سماجی مواقع سے بہرہ ور ہونے کی آزادی، اس کے لئے لازم ہے کہ سماج میں نہ تو مخصوص افراد اور مخصوص طبقات کو خصوصی مراعات یا خصوصی تحفظات دیئے جائیں، نہ کسی کے ساتھ بھید بھاؤ یا امتیازی برتاؤ کی اجازت دی جائے۔

مساوات کی تیسری نوع ''سیاسی مساوات'' ہے، یعنی سیاسی زندگی میں افراد کی دوسروں کے برابر ووٹ دینے، سیاسی عہدوں کے لئے امیدوار ہونے اور ہر طرح سے سیاست وانتظام میں حصہ داری کی آزادی۔ مساوات کی چوتھی نوع ''اقتصادی مساوات'' یعنی دوسرے کے ساتھ مساویانہ درجہ میں روزگار، آمدنی، معقول شرائط ملازمت پانے اور مقابلہ کرنے کی آزادی ہے۔

آج کل مملکتیں اپنے شہریوں کے درمیان حقوق کی تقسیم حریت، مساوات اور اخوت کے رہ نما اصول کی روشنی میں کرتی ہے اور انہیں اپنے قانونی نظام کے ذریعہ نافذ کرتی ہے، یہ اصول نہ صرف مشترکہ طور سے تمام حقوق کی تعیین کرتے ہیں؛ بلکہ ان میں سے ہر اصول اپنے مخصوص زمرہ میں مخصوص حقوق سے بھی ہم

رشتہ ہے اور اپنے زمرہ میں ان کی تقسیم کا تصفیہ کرتا ہے، اس لحاظ سے ہم حقوق کو چار خاص زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) حریت کے حقوق (۲) مساوات کے حقوق (۳) فلاحی حقوق (۴) نجی ملکیت کے حقوق۔

(۱) حریت کے حقوق تین زمروں میں منقسم ہیں: (الف) سیاسی آزادی کے حقوق (باء) شہری آزادی کے حقوق اور (جیم) اقتصادی آزادی کے حقوق۔

سیاسی آزادی کے حقوق میں عموماً ملکی انتخابات میں حصہ لینے، سیاسی عہدوں کے لئے امیدوار ہونے، حکام کو عرضداشت اور اپنی شکایات کرنے اور ان کا ازالہ کرانے کے حقوق شامل ہیں، سیاسی پارٹی بنانے کا حق اگر چہ سیاسی آزادی ہی کا ایک جزو ہے، لیکن رسماً اظہار رائے، جلسہ وجلوس اور اجتماع کی عام شہری آزادیوں سے منسلک ہے۔

شہری آزادی (سول لبرٹی) کے حقوق کو فی زمانہ تین خانوں میں منقسم کیا گیا ہے: (۱) شخصی آزادی یعنی جان وتن یا ہوئیت کی سلامتی کا حق (مثلاً جسمانی ایذا، حبس بے جا، غیر انسانی سزا اور خلوت ومسکنت میں دخل بے جا سے تحفظ کا حق، اندرون ملک نقل وحرکت کی آزادی، کسی بھی مقام پر ٹھہرنے یا بسنے کی آزادی، ملک سے باہر سفر کرنے اور ملک میں واپس آنے کی آزادی، اور دوسرے ممالک میں پناہ گزیں کا حق، (۲) ذہنی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق مثلاً عقیدہ، ضمیر اور مذہب کی آزادی، فکری اور نظریاتی آزدای کے حقوق، اظہار رائے، جلسہ وجلوس اور جماعت سازی کی آزادی، اور (۳) عملی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق مثلاً معاہدہ کرنے کی آزادی، کاروبار کی آزادی، نجی جائداد کی خرید وفروخت کی آزادی، شادی بیاہ کرنے اور خاندان بسانے کا حق، وغیرہ۔

(۲) مساوات کے حقوق: اس زمرہ میں کم از کم چھ حقوق آتے ہیں: (۱) قانونی مساوات یعنی قانونی مرتبہ کی مساوات کا حق (۲) عدالتی کارروائی میں دوسروں کے مساوی قانونی سلوک پانے کا حق اور قانون کے تحت مساویانہ تحفظ پانے کا حق (۲) ٹیکسوں کی ادائیگی میں دوسروں کے مساوی سلوک پانے کا حق (۳) دوسروں کے برابر سماجی مواقع پانے کا حق (۴) دوسروں کے برابر سرکاری ملازمتوں، سیاسی عہدوں اور سرکاری اعزازات میں حصہ پانے کا حق (۵) سیاسی مساوات یعنی ملکی سیاست میں دوسروں کے برابر نمائندگی اور حصہ داری پانے کا حق، سرکاری حکام سے اپنی شکایات کا ازالہ کرانے کا حق اور استبداد وبدعنوانی کے خلاف مناسب طریقہ پر حدود کی رعایت کے ساتھ احتجاج، سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کرنے کا حق۔

(۳) فلاحی خدمات پانے کا حق: فرانسیسی ماہر قانون لیوں ڈیوگوئی نے اخوت کے بجائے "سماجی سالمیت" کی اصطلاح استعمال کر کے افراد کے تین فلاحی حقوق اور ان کے متوازی سرکار کے تین بنیادی فرائض متعین کئے ہیں، یعنی (۱) تعلیم پانے کا حق (۲) بوقت ضرورت سرکاری امداد پانے کا حق اور (۳) روزگار اور ذریعۂ معاش پانے کا حق، اخوت یا تعاون کا اصول نہ صرف سرکاری امداد اور معیشت کو، بلکہ سماجی زندگی کے تمام دوسرے زمروں کو بھی محیط ہے، اس کے مطابق افراد کو ہر میدان میں اپنی ذہنی ومادی بہبود کے لئے درکار تمام سہولیات اور خدمات پانے کا حق ہے۔

(۴) نجی ملکیت کے حقوق: فطری حقوق اور انسانی حقوق کے اب تک کے تمام اعلانات میں نجی ملکیت کے حقوق کو نمایاں جگہ دی گئی ہے، قدیم زمانہ سے آج تک سیاسی مفکروں کی اکثریت نجی ملکیت کو فرد کی مسرت اور بہبود کے لئے لابدی قرار دیتی ہے (مبادی سیاسیات: باب ۴، شہریت اور شہری حقوق وفرائض، حقوق کی زمرہ بندی کا بیان، ص: ۷۱-۸۷، ط: قاضی پبلیشرز وڈسٹری بیوٹرز دہلی)۔

ابھی تک سطور بالا میں جو کچھ حقوق ذکر کئے گئے ہیں اس کو ذیل میں بالترتیب ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

انسانی حقوق کے نظریہ کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو انسانی زندگی گذارنے کے لئے کچھ آزادی، کچھ وقار اور کچھ حقوق چاہئے، جن کی عدم موجودگی میں کوئی بھی انسان انسان کی طرح نہیں جی سکتا، یہ حقوق ہر انسان کو صرف انسان ہونے کی حیثیت سے ملتے ہیں۔

اسلام نے شروع سے ہی حقوق انسان میں بے حد دل چسپی لی، یہ دل چسپی ملکی سطح پر تھی، چونکہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جزیرۃ العرب (ملک) تک اسلام کا پھیلاؤ ہوا تھا، اس لئے ملکی سطح پر قوانین بیان کردیئے گئے، پھر خلفائے اربعہ کے دور میں اسلام نے ملکی سطح سے باہر قدم رکھے اور عالمی سطح پر پھیلنے لگا، تو خلفاء نے اپنے اپنے دور میں اجتہاد کر کے جو عملی قوانین جاری کئے، آج کل اقوام متحدہ بھی ایسے حقوق میں کاغذی سطح پر دل چسپی لے رہی ہے، ان قوانین میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

ہر فرد کو زندگی، آزادی اور ان دونوں کے تحفظ کا پورا حق ہونا چاہئے۔

کسی بھی انسان کو ایذا، ظلم اور غیر انسانی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

ہر فرد کو ایک انسانی پہچان دی جائے گی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نام اور انفرادی پہچان ہوگی۔

قانون کے سامنے ہر فرد برابر ہوگا، کسی قسم کا ترجیحی سلوک حقوق انسان کی سخت خلاف ورزی ہوگی۔ جیسے حضرت علی کا مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہوا، تو امیر المؤمنین ہونے کے باوجود قاضی صاحب نے خصمین کے درمیان مساوی سلوک کیا اور خلیفہ وقت کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا۔

ہر فرد حقوق انسان اور بنیادی حقوق دونوں کے استحصال کے خلاف ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں جاسکتا ہے۔ جیسے مہر کے باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف فوراً ایک خاتون نے اسی مقام پر اپنی رائے قرآنی آیت کو متدل بناتے ہوئے پیش کیا، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ وقت تھے، اور قاضیوں کی تقرری وہ خود ہی کرتے تھے، گویا قاضی القضاۃ بھی تھے۔

بغیر کسی وجہ کے کسی کو نہ قید کیا جائے گا نہ نظر بند اور نہ جلاوطن ہی کیا جائے گا۔

ہر قسم کی حراست میں بند ہر انسان کو صاف ستھری مساوات پر مبنی اور غیر جانبدار عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا جیسے جنگی قیدیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرنا اور صحابہ کو ان قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تائید۔

اپنی ریاستی حدود میں کہیں بھی رہنے یا سفر کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہوگا، جیسے صلح حدیبیہ کی قرارداد کے مطابق راستے پرامن بنائے گئے؛ تاکہ لوگوں کو آمد ورفت میں سہولت رہے۔

دوسرے ممالک میں پناہ اور تحفظ حاصل کرنے کا بھی ہر شخص کو حق ہوگا، جیسے صلح حدیبیہ میں ایک دفعہ یہ بھی شامل کی گئی، مگر کافروں نے غلبہ کی وجہ سے من جانب واحد اس کو منظور کیا۔

ہر فرد کو شہریت کا حق حاصل ہوگا، نہ کسی کی شہریت زبردستی غصب کی جائے گی اور نہ ہی نیشنلٹی Nationality تبدیل کرنے سے روکا جائے گا۔

ہر فرد شرکت میں یا ذاتی طور پر جائداد خرید سکتا ہے، کسی کو اس کی جائداد سے جس کا وہ قانونی طور پر مالک ہے؛ بلا وجہ محروم نہیں کیا جائے گا۔

ہر فرد کو اپنے اصول اور نظریہ اپنے ضمیر اور مذہب کی روشنی میں رکھنے کی پوری آزادی ہونی چاہئے، اس کا اظہار کرنے کا بھی پورا موقع اسے میسر ہونا چاہئے۔

ہر فرد کو آزادیٔ رائے اور اظہار خیال کی پوری آزادی ہونی چاہئے؛ لیکن اس سے کسی کی عزت وآبرو، ذاتی زندگی، خاندانی و پرائیویٹ معاملات میں رائے زنی سے بچا جائے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سامنے خاتون کا واقعہ، جس نے مہر کے باب میں اپنی رائے فوراً پیش کردی۔

آج کے جمہوری طرز کے مطابق ہر فرد کو پرامن طور پر ملنے، انجمن بنانے اور مظاہرہ کرنے کا حق ہونا چاہئے، لیکن کسی کو کسی انجمن کا ممبر بننے کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

اپنے ملک میں ہونے والے سیاسی واقعات اور سرکار کے انتخاب میں حصہ لینے کا ہر ایک کو اختیار ہے۔ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے وقت حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہر ایک کی رائے جاننا۔

اپنی حکومت کے تحت چلنے والی خدمات اور رفاہی امور پر ہر ایک کا برابر حق ہے۔

جمہوری طرز کے صحیح اور صاف ستھرے انتخابات ہونا بھی ہر ایک فرد کا حق ہے اور ان میں حصہ لینا بھی بنیادی انسانی حق ہے۔

ہر فرد کو کام کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے، بے روزگاری سے تحفظ بھی اس میں شامل ہے، ہر فرد کو اپنے کام کرنے کے سلسلہ میں ٹریڈ یونین کا ممبر ہونے، ٹریڈ یونین قائم کرنے اور اس میں حصہ لینے کا پورا حق ہونا چاہئے۔

ہر فرد کو کام کے ساتھ آرام اور تفریح کا بھی پورا حق حاصل ہونا چاہئے، اس میں کام کے گھنٹوں اور چھٹیوں کا معاملہ بھی شامل ہے۔

ہر فرد کو ایک خوش حال معیار زندگی کا حق حاصل ہونا چاہئے، اس میں روٹی، کپڑا، مکان، دوا اور سماجی تحفظ شامل ہے، اس کے علاوہ زچگی اور حمل کے دوران خصوصی دیکھ بھال اور بچے کی صحیح پرورش کا پورا حق ہر عورت اور بچے کو حاصل ہونا چاہئے، جبکہ بچہ شادی شدہ تعلقات سے پیدا ہوا ہو اور اگر شادی کے بغیر پیدا ہوا تو بھی بچہ کو حق پرورش ملنا چاہئے، چاہے عورت کو اس کے جرم کی پاداش میں سزا عائد کی جائے؛ البتہ سزا میں پرورش کی مدت تک تاخیر ہونی چاہئے۔ جیسے ایک

خاتون (امرأۃ غامدیہ) نے خدمت نبوی میں آکر اقرار زنا کیا تو آپ نے وضع حمل تک حد مؤخر کی، وضع حمل کے بعد وہ خاتون پھر حاضر ہوئی تو آپ نے بچہ کی پرورش تک حد مؤخر کی اور بچہ کی پرورش کی طرف توجہ دی۔

''وإذا زنت الحامل حدّها الجلد لم يجلد حتى تتعالى من نفاسها أي ترتفع يريد به تخرج منه؛ لأن النفاس نوع مرض فيؤخر إلى زمان البرء بخلاف الرجم؛ لأن التأخير لأجل الولد، وقد انفصل. وعن أبي حنيفة رحمه الله أنه يؤخر إلى أن يستغني ولدها عنها إذا لم يكن أحد يقوم بتربيته؛ لأن في التأخير صيانة الولد عن الضياع'' (هدايه: كتاب الحدود، ص: ۵۱۳، ج: ۲)۔

ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہونا چاہئے، بنیادی تعلیم فراہم کرنا جمہوری حکومت کا فرض ہے۔

ہر فرد کو اپنی تمدنی زندگی گزارنے کا اور سائنسی ایجادات سے ہونے والے فوائد حاصل کرنے کا پورا حق ہونا چاہئے، اپنی ایجادات اور دریافتوں سے ہونے والے معاشی اور اخلاقی فوائد کے تحفظ کا اختیار بھی اس میں شامل ہے۔

مقامی اور عالمی سطح پر دی جانے والی آزادی پر بھی حق ہونا چاہئے، تاکہ ان تمام حقوق پر عمل ممکن بنایا جاسکے۔

تمام عالم انسانی کے لئے ہر فرد کے مختلف سطح پر فرائض بھی ہیں؛ جو دوسروں کے حقوق انسانی کے تحفظ کی گارنٹی دیتے ہیں، اس طرح انسانی حقوق پر مبنی معاشرہ عالم میں وجود میں آتا ہے، جو کہ دراصل ہر فرد کو اس کی شخصیت کی ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے، اس طرح ہر فرد فرائض اور حقوق کے ذریعہ فلاح انسانی کے ایک خاص معیار کو حاصل کرسکتا ہے۔

اور آج کل نئے اکثر ملکوں کے حالات کے پس منظر میں ان حقوق انسان کی اس طرح تاویل نہ کی جائے کہ امن، آشتی، آزادی اور دوسرے کے حقوق کا استحصال ہونے لگے، دوسرے الفاظ میں اپنی کلچرل آزادی دوسروں کے لئے دہشت گردی نہ بن جائے (جامع اردو انسائیکلو پیڈیا ص: ۹۵، ج: ۳)۔

(۵) سوویت یونین کی طرف سے ''پناہ حاصل کرنے کا حق'' بھی دیا گیا ہے، لیکن یہ کاغذی سطح پر ہے، ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول کے تحت بہت سے ممالک میں پناہ حاصل کرنے والوں کو کالمعلقہ کردیا ہے، لیکن یہ عالمی ادارہ خاموش ہے، اسلام میں یہ اختیار انسان دوستی اور مظلوم سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، جو انتہائی قابل تعریف ہے؛ حتی کہ جنگ کے مواقع پر پناہ لینے والوں کو بھی پناہ دی گئی ہے؛ حالانکہ وہ دشمنی میں مقابلہ کے لئے آئے تھے۔

احقر کی رائے اس باب میں یہ ہے کہ ان کو اوپر ذکر کردہ حقوق میں سے ہر قسم کے حقوق ملے، صرف سیاسی حقوق میں ووٹ دہی کا حق اور عدالتی چارہ جوئی کا حق ملے، بقیہ حقوق نہ دیئے جائیں، اور اگر پناہ گزیں ایک ہی جگہ پر آباد ہیں، تو انہیں میں سے کسی آدمی کو وہ لوگ چن کر ایوان میں بھیجیں، تاکہ وہ آدمی پناہ گزیں کے مسائل ایوان میں رکھ سکے۔

(۶) جس غیر مسلم ملک میں کوئی مسلمان قیام کرنا چاہتا ہے، قانونی اور اسلامی طور پر ایک مؤمن کے لئے وہاں کی صورت حال کیا ہے؟ وہاں قیام کا سبب اور محرک کیا ہے؟ یہ دونوں باتیں جاننا بھی ضروری ہے؛ تاکہ اس کے مطابق حکم معلوم کیا جاسکے۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک میں اس ملک کے باشندے اور شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی حالات سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں؛ حتی کہ وہ نان

جویں کا بھی محتاج ہو جائے، ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بناء پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے تو مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے، جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی؛ بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو؛ چنانچہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے: ''هو الذی جعل لكم الأرض ذلولا فأمشوا في مناكبها وكلوا من رزقه، وإليه النشور'' (سورۂ ملک:۱۵)۔ (وہ ایسی ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کردیا، اب تم اس کے راستہ میں چلو اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے)۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا، اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے؛ بلکہ موجب اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی اور جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی۔

(۴) اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلا ضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں، ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ سنن ابوداود میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله''، جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے (ابوداؤد شریف: کتاب الضحایا)۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أنا بريئي من كل مسلم يقيم بين اظهر المشركين، قالوا: يارسول الله ! لم؟ قال: لا تر اي ناراهما''۔ (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، تم یہ امتیاز نہیں کرسکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے)۔

امام خطابیؒ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے، چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دارالاسلام اور دارالکفر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کردیا ہے، لہٰذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے کہ یہ بھی انہیں میں سے ہیں، علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دارالکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے (معالم السنن للخطابی: ص:۷۷، ج:۳)۔

اور مراسیل ابوداود عن المکحول میں روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو'' (تہذیب السنن لابن قیم، ص:۷۷، ج:۳)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمان کا دارالحرب میں رہائش اختیار کرنا، اور ان کی تعداد میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہو جاتی ہے (تکملہ ردالمحتار: ج:۱، ص:۱۰۱)۔

۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش

اختیار کرتا ہے یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت کو دار الاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (فقہی مقالات: مقالہ: مغربی ممالک کے چند جدید فقہی مسائل، ص: ۲۲۲-۲۲۵، ج:۱، ط: زم زم بک ڈپو دیوبند)۔

۷۔ متعدد زمانوں میں غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کیا گیا ہے اور ان کو حقوق بھی دیئے گئے ہیں، جو "ذمیوں کے احکام" سے کتابوں میں معروف ہے، لیکن آج کل کے اسلام و مسلم دشمنی اور مسلمانوں سے عناد سے کوئی ناواقف نہیں ہے، ایسے میں کسی غیر مسلم غیر ملکی شہری کو ایک طویل مدت کے لئے ویزا (امان) دینے میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ جاسوسی اور سازشیں کرنے لگے اور اس کی آمد مسلمان ملکوں کے لئے یا ان کے کئی اہم مسائل کے لئے خطرہ بن جائے، تو اگر طویل مدتی ویزا میں جب یہ خطرہ ہے تو ایک شہری کی حیثیت سے آباد کرنے میں یہ اندیشہ دو چند ہو سکتا ہے، اس لئے کچھ جزوی حالات میں کڑی شرائط کے ساتھ آباد کرنے کی گنجائش دی جائے؛ لیکن انہیں حساس شعبے، لشکر، حکومتوں کے اعلی شعبے و مناصب وغیرہ میں ملازمتیں نہ دی جائیں اور ان کی خاص نگرانی رکھی جائے۔

خلاصۂ بحث:

۱۔ ایک مخصوص مدت تک قیام کو شہریت کے حصول کے لئے بنیاد بنانا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ اگر اس مسلم کے لئے جس مسلم یا غیر مسلم ملک میں آباد ہے وہاں عبادات پر روک ہے، یا شعائر پر پابندی ہے یا برسر اقتدار کسی خاص فرقہ ضالہ کا ہمنوا ہے، اس لئے دوسری جماعت کے لوگوں پر ظلم ڈھایا جاتا ہے، تو ایسے مسلمان کی درخواست کو قبول کرنا دوسرے مسلم ملک پر ضروری ہونا چاہئے۔

اور اگر اسے اس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے، عبادات بھی کھلے عام ادا کر سکتا ہے، صرف اپنے ایک شوق اور خواہش میں دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے، تو شرعاً اس کی درخواست قبول کرنا ضروری نہ ہونا چاہئے۔

۳۔ انہیں شہری تسلیم نہ کیا جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔

۴۔ وہ حقوق درج ذیل ہیں: ۱۔ مثبت حقوق: اس کے ضمن میں چار (۴) حقوق ہیں۔ ۲۔ سیاسی حقوق: اس کے تحت چھ (۶) حقوق ہیں۔ ۳۔ معاشی حقوق: اس میں چار (۴) حقوق ہیں۔ ۴۔ شخصی حقوق: اس میں سات (۷) حقوق شامل ہیں۔ ۵۔ نجی افراد و گروہوں کے خلاف حقوق: اس میں چھ (۶) حقوق مندرج ہیں۔

کوئی آدمی مزید تحقیق کرے تو اور بھی حقوق بیان کر سکتا ہے، اور اجمالی طور پر بیان کرے تو اس میں کمی وبیشی کر سکتا ہے، ان سب حقوق کی تفصیل جواب نمبر ۴ (چار) کے جدول میں مذکور ہے۔

۵۔ سیاسی حقوق میں سے صرف ووٹ دہی کا حق اور عدالتی چارہ جوئی کا حق دیا جائے، باقی حقوق میں سے سب دیئے جائیں، جیسے مثبت حقوق، معاشی حقوق وغیرہ۔

۶۔ اس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض و مقاصد کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے۔

اگر کسی مسلمان کو اپنے مسلم ملک میں بغیر کسی جرم کے تکلیف پہنچائی جا رہی ہو یا قید و بند کی صعوبتیں دی جاتی ہوں یا اس کی جائدادیں ضبط کی جاتی ہوں اور اب غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی کوئی راہ نہ ہو تو اس کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہو جائے اور تلاش بسیار کے باوجود اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوتے ہوں اور دوسرے کسی غیر مسلم ملک میں جائز وسائل مل جاتے ہوں تو وہاں شہریت کے حصول کی اس کو اجازت ہونی چاہئے۔

اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں غیر مسلموں کے درمیان تبلیغ دین اور وہاں مقیم مسلمانوں کے درمیان اشاعت احکام شریعت کی غرض سے شہریت لینا چاہتا ہے تو ایسے آدمی کو بھی اجازت ہونی چاہئے۔

کوئی آدمی محض معیار زندگی بلند کرنے کے لئے یا محض دوسرے ملک کی شہریت کے حصول کی خواہش و جذبہ کی تسکین کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اسے اجازت نہ ہونی چاہئے۔

۷۔ جزوی حالات میں کڑی شرائط کے ساتھ درست ہونا چاہئے لیکن انہیں حساس شعبہ اور سرکاری اعلی مناصب پر ملازمتیں نہ دی جائیں۔ ☆☆☆

غیر مسلموں کو مسلم ملک میں شہریت دینا

مولانا ابوسفیان مفتاحی [1]

۱۔ وطن وہ جگہ ہے جس میں انسان پیدا ہوا ہے، یا اپنے بچپن اور جوانی میں جہاں مقیم ہو اس جگہ کی محبت سے ربط و تعلق ہو اور اس کی طرف اور اس کے باشندوں کی طرف میلان ہو، نہ یہ کہ محدود حقوق کے بعد حاصل کرے۔

اور قرآن کریم نے لفظ مواطن ذکر کیا ہے اور مراد لیا ہے اس سے جگہیں بغیر ربط و تعلق کے، یہاں تک کہ مقام ولادت اور نشوونما کے تعلق کے بغیر، چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے: "لقد نصرکم الله فی مواطن کثیرة" (بقرہ:۲۵) یعنی بہت سی جگہیں جیسے مقام بدر جو وطن نہیں تھا بدلہ لینے والوں کی ولادت کا یا ان کی نشوونما کا، اور جیسے بقیہ غزوات غزوہ حنین سے پہلے (المواطنة فی الاسلام ۳-۴)۔

اسلام کا موقف شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے بلاشبہ اسلام اجتماعیت اور امت وقوم اور دولت وحکومت کو قائم کرتا ہے عقیدہ و دین کے تعلقات کی بنیاد پر، اور بہت کوشش کرتا ہے حقوق اخوت کو ثابت کرنے کے لئے بطور اصل ونظیر بنانے کے اور اس کے مطابق بنانے اور تاثیر کے، چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے: "انما المومنون إخوة" (سورۂ حجرات:۱۰) اس واضح انحصاری طریقہ سے تمام مسلمانوں پر بھائی چارگی کے حقوق کو فرض کرتا ہے، یعنی محبت و ہمدردی، اور نفرت وتعاون باہمی، اور آپس میں ایک دوسرے کا کفیل وضامن ہونا، چنانچہ اللہ تعالی فرماتا ہے: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر، ويقيمون الصلوة ويؤتون الزكوة ويطيعون الله ورسوله أولئك سيرحمهم الله إن الله عزيز حكيم" (سورۂ توبہ:۷۱)، بلکہ اللہ تعالی نے بیان کیا ہے اس محبت و ہمدردی کی ضرورت کو جو ایمان پر جامع ہے اس کی حمایت وحفاظت کے لئے اور عدوان ودشمنی کے دفاع کے لئے اور وہ محبت و ہمدردی جو کفر ونفاق پر جامع ہے قضاء وفیصلہ کے لئے اسلام و مسلمانوں پر تو اللہ تعالی نے فرمایا ہے: "والذين كفروا بعضهم أولياء بعض إلا تفعلوه تكن فتنة فى الأرض وفساد كبير" (سورۂ انفال:۷۳)، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے فیض جاری کیا ہے اس ایمانی بھائی چارگی اور اس کے حقوق وآثار کے سلسلہ میں (مراجع کتاب ریاض الصالحین)۔

اسلام نے رعایت کی ہے شہریت کے سلسلہ میں ایجابی وانسانی جہتوں کی اور اس ایمانی بھائی چارگی کے ساتھ جو جامع ہے تو اس لئے کہ اسلام نے بیکار نہیں چھوڑا ہے ان ایجابی پہلوؤں کو جو قومیت وشہریت کو علاحدہ کرنے وفرقہ بندی کرنے اور تعصب سے دور ہے اس روشنی میں وطن وشہر اسلامی مفہوم میں وہ امت اسلامیہ کے لئے وطن کبیر ہے جہاں بھی رہے وطن بنائے اور شہریت والا مسلمان ہو کہ کافر وہند واسلامی حکومت میں خلافت راشدہ سے دولت عثمانیہ کے زوال تک جہاں بھی رہتا اور گھومتا تھا عالم اسلامی کے طول وعرض میں بغیر کسی قید وشرط کے، پس اس کی جنسیت وقومیت اسلام ہو تو وہ جہاں بھی مقیم ہو وہی اس کا وطن وشہر ہے، اس کے لئے اس کے حقوق ہوں گے اور اس پر واجبات ہوں گے، پس مسلمان کی محبت اور تعلق اس کے اسلامی کبیر وطن کے لئے ہوگا۔

۲۔ اور اس کے ساتھ اسلام نے رعایت کی ہے انسان کے فطری پہلو کی، یعنی اس کی محبت اس کے وطن وشہر کے لئے جس میں وہ پیدا ہوا ہے، بلکہ اس کے اس ملک کے لئے ہے جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ مکہ مکرمہ سے سخت محبت کرتے تھے، اور صحیح حدیث سے ثابت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو مخاطب کر کے فرمایا کتنا اچھا و پاکیزہ شہر ہے تو اور تو میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اگر تیری قوم مجھ کو تجھ سے نہ نکالے ہوتی تو میں اس کے علاوہ شہر میں نہ رہتا، اور صحابہ کرامؓ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ کی جانب بہت محبت ظاہر کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے بارے میں دعا کیا تھا: اے اللہ ہم کو محبوب کردے مدینہ کو ہماری محبت کی طرح مکہ سے یا اس سے زیادہ: "اللّٰهم بارك لنا فى صاعنا، وفى مدنا وصححها

---

[1] صدر مدرس مفتاح العلوم مئو۔

لنا، وانقل حماها إلى الجحفة'' (رواه البخاری) تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمایا تو ان کے اندر دلوں میں مدینہ کی محبت گاڑ دیا۔

ب۔ اعتبار کیا ہے اسلام نے کہ انسان کو اس کے ولادت کے وطن وشہر سے یا اس کے اس ملک سے جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے نکالنا اللہ کی راہ میں قتال و جہاد کے اہم واسباب میں سے ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے شروع میں جہاد کے سلسلہ میں فرمایا ہے: ''أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وإن الله على نصرهم لقدير، الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق إلا أن يقولوا ربنا الله، ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا ولينصرن الله من ينصره إن الله لقوى عزيز'' (سورۂ حج: ۳۹-۴۰)۔

تو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے جہاد وقتال کے مشروع ہونے کا پہلا سبب وہ گھروں اور بستیوں سے نکالنا ہے اور اس سے تاکید ہے اس کی جس کو باقی رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے بقیہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے لئے، چنانچہ ذکر کرتا ہے ہمارے لئے طالوت وجالوت کے قصہ میں اس حقیقت کو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''الم تر إلى الملأ من بنى اسرآئيل من بعد موسى إذ قالوا لنبى لهم ابعث لنا ملكا نقاتل فى سبيل الله قال هل عسيتم إن كتب عليكم القتال الا نقاتلوا قالوا ومالنا الا نقاتل فى سبيل الله وقد اخرجنا من ديارنا وابنآئنا فلما كتب عليهم القتال تولوا إلا قليلا منهم والله عليم بالظالمين'' (بقرہ: ۲۴۶)۔

ج۔ ذکر کیا ہے فرق کو اس مسلمان شہری کے درمیان جو اسلامی حکومت کے سایہ میں زندگی گذارتا ہے اور اس مسلمان کے درمیان جو اسلامی حکومت کے سایہ میں زندگی نہیں گذارتا، تو پہلے مسلمان کو حق ہوگا حمایت وحفاظت اور نصرت میں جو اسلامی حکومت پر معلق ہے اور دوسرا تو اس کے لئے ولایت ومحبت اور نصرت کا حق ہے، مگر اس قوم یا حکومت پر جس کے لئے عہد ومیثاق ہے اسلامی حکومت کے ساتھ، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''إن الذين امنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم فى سبيل الله والذين أووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض، والذين آمنوا ولم يهاجروا مالكم من ولايتهم من شئ حتى يهاجروا وإن استنصروكم فى الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق، والله بما تعملون بصير'' (سورۂ انفال: ۷۲)۔

اسلامی حکومت کے سایہ میں زندگی گذارنا فرض کرتا ہے، بہت سے حقوق کو اس کے حقوق سے زیادہ جو حکومت کے خارج میں زندگی گذارتا ہے، یہاں تک کہ وہ رہے برحق مسلمان، تو اسلامی حکومت اس حالت میں معاملہ کرے گی عہود ومواثیق کے موافق اور اونچی مصلحتوں کے مطابق۔

د۔ شہر کا دستور بتم غافل نہ ہونا عقیدہ کے تعلق کی جانب سے، ساتھ ہی وطن وشہر بنانے کے تعلق سے، اور زندگی گذارنے کے تعلق سے ایک مشترک وطن میں تعلق کی دو قسمیں ہیں: ا۔ ایک عقیدہ والا تعلق، چنانچہ یہود ایک امت ہیں، اور تمام مسلمان ایک امت ہیں، یعنی عقیدہ ودین اور علامات کی امت۔

۲۔ وطن وشہر میں شرکت کا تعلق کہ یہود بنی عوف ایک امت ہیں مؤمنین کے ساتھ ہیں، یہود کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین ہے، پھر ذکر کیا یہود بنی نجار وغیرہ کے بقیہ قبائل کو اس طرح ثابت کیا گیا ہے کہ تمام مسلمان اور یہود ایک امت ہیں تو ان مسلمین ویہود کی دعوت اور ایک ہونے کو ثابت کرنا صرف ممکن ہے اس تعلق کے درمیان جو جامع ہے، اور تمام کو سمیٹ لیتا ہے اور اس کو ہمارے موجودہ زمانہ میں رباط مواطنہ نام دیا جاتا ہے، ایک ہونے کا مطلب ہے کہ تمام مسلم ویہود ایک سیاسی نظام میں شریک ہیں ان کے اہل کتاب ہونے کے اعتبار سے برابر کے حقوق ہیں (المواطنۃ فی الاسلام للدکتور علی محی الدین القرہ داغی ۱۰/۸)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے مسلمان کے لئے اخوت ایمانی بنیاد ہے، اور بود وباش اختیار کر لینا، وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینا، ایک مدت تک وہاں قیام کرنا بھی بنیاد ہو سکتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ شخص مسلم حکومت کی آفس میں درخواست پیش کرے اور حاکم اس کو تسلیم کر کے دستخط کر دے اور اپنے مہر لگا دے، بہر حال غیر مسلم کے لئے درخواست پیش کرنا اور منظوری دستخط ومہر کے ساتھ شہری ہونے کے ضروری بنیاد ہے۔

کسی مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا:

ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً ضروری ہے اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس شرط سے کہ وہ فساد اور بغاوت کا مزاج نہ رکھتا ہو اس کی تحقیق کرنا ضروری ہے، اور اگر وہ غیر مسلم ہے اور مزاجاً شریف ہے، فساد وبغاوت کا ذہن نہیں رکھتا، تو مسلم حکمراں اس کی درخواست قبول کر سکتا ہے، اور اگر مسلمان غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا

چاہے تو حاکم غیر مسلم کو اختیار ہوگا کہ درخواست قبول کرے یا نہ کرے اور اگر غیر مسلم دوسرے غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا چاہے تو غیر مسلم حاکم اپنے شہریت کے قانون کی رعایت کرے گا، قانونا شہریت دینے کے لئے اس کو اختیار ہوگا۔

۳۔ بعض دفعہ کسی خاص خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے اور وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں تو انہیں پناہ گزیں کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا تو شرعا ان کے ساتھ حسن سلوک وعمل خیر اور نفع پہنچانا واجب ہے، ''تعاونوا علی البر والتقوی'' (سورۂ مائدہ:۲)، اللہ تعالی نے واجب کیا ہے کہ وہ محل تعاون ہیں تو ان کے ساتھ بر وحسن وسلوک اور عمل خیر، نفع پہنچانا اور تقوی کا تعاون کیا جائے اور اس کے بعد آزادی کو مطلق رکھا تعاون کرنے والوں کے ساتھ، اس طرح کے مسلمان کے لئے جائز ہے کہ تعاون کرے تمام کے ساتھ جب تک تعاون کا محل بر وتقوی باقی ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے تعاون کرنے والوں کی کوئی تحدید نہیں کی اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعاون کی اہمیت کو بیان کیا مشرکین جاہلین کے ساتھ بھی جس وقت فرمایا: ''لقد شهدت في دار عبد الله من جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم ولو أدعى به في الإسلام لاجبت'' (رواه البيهقي في السنن الكبرى ۶/۳۶۷، المعارف لابن قتيبه ص ۶۰۴)۔

اسی طرح زعماء قریش نے دیکھا کہ یہاں کچھ مظلوم لوگ ہیں اور محتاج ہیں جو محتاجگی کی وجہ سے مرجائیں گے اور عاجز وکمزور ہیں جن کی کوئی مدد نہیں کرتا تو فطرت سلیمہ ان میں حرکت میں آئی تو زعما قریش حلف الفضول میں اکٹھا ہوئے بعثت سے پہلے اور معاہدہ کیا اس پر کہ وہ کمزور کی مدد کریں گے اور عاجز کی فریاد رسی کریں اور محتاج کی مدد کریں گے اور مہمان کی مہمان نوازی کریں گے، اور یہ سب چیزیں مکارم اخلاق سے ہیں۔

مسلم اقلیت کے لئے قرآن وسیرت میں دو نمونے ہیں دونوں کو رہنما رہنا چاہئے۔

اور جس وقت ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ قرآن نے ایک بہترین نمونہ مسلمان شخص کے لئے ذکر کیا ہے جس کو کہ حالات زمانہ نے چھوڑ رکھا ہے، کیونکہ جو مسلمان غیر مسلم سماج میں زندگی گذارتا ہے اور وہ نمونہ سیدنا یوسفؑ ہیں، جیسا کہ کتب سیرت نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مرد اور عورتوںؓ کی ایک کثیر تعداد نے حبشہ کی طرف ہجرت کیا اور زندگی گذارا مناسب موقع تک، اسی لئے ہم پر لازم ہے کہ کچھ چیزیں ان دونوں نمونوں کی ذکر کریں۔

پہلا نمونہ: اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام کا ہے قرآن نے اس کی مکمل تفصیل ذکر کی ہے، ہم اس کا خلاصہ ذکر کر رہے ہیں کہ انہوں نے مصر میں زندگی گذارا، اپنے دین وعقیدہ اور اخلاق کی حفاظت کرتے ہوئے اور اللہ کے فضل وکرم سے شہوتوں کی جانب پھسلے نہیں امرأہ عزیز کے سخت حملہ علی الرغم جس کو قرآن کریم نے بیان کیا ہے: ''وغلقت الأبواب وقالت هيت لك قال معاذ الله إنه ربي أحسن مثواي إنی لا يفلح الظالمون'' (سورۂ یوسف: ۲۳)۔

اس پس منظر میں واجب ہے مسلم اقلیت پر کہ رہنمائی لے حضرت یوسف علیہ السلام سے اس بات میں کہ مسلم اقلیت کی بڑی فکر اور سوچ اپنے دین وعقیدہ اور اخلاق کی حفاظت ہو اس مقصد کو ثابت کرنے کے لئے، اور یہاں ظاہر ہوتا ہے ثبات قدمی اور حفاظت کا دور تنظیم وافراد پر، ورنہ تو کوئی قیمت نہیں ہے کسی دینوی مقصد کبیر وعظیم کی، جبکہ دین اور اخلاق ضائع ہوجائے، اور اسی کی وضاحت سیدنا یوسف علیہ السلام نے کی...... تو اگر لوگ انہیں کے مثل کرلیں تو عالم کا بڑا حصہ اسلام میں داخل ہوجائے گا، جیسا کہ داخل ہوئے ہیں مشرق ایشیاء کے قبیلے تجار مسلمین اور ان کے اخلاق سے متاثر ہوکر اور ان کی دعوت سے متاثر ہوکر۔

دوسرا نمونہ مہاجرین الی الحبشہ کا:

اصحاب سیر رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے کہ قریش نے جب زیادہ کردیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ ایذاء پہنچانا اور عذاب دینا اور تنگ کرنا مکہ مکرمہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرامؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی، جیسا کہ تاریخ ابن کثیر میں ہے۔

تمام غیر مسلمین (کفار وہنود) برابر نہیں ہوتے، پس بعض ان میں سے شریف اچھے عادل ہوتے ہیں دنیوی معاملات میں اور ان میں سے بعض مسلمان کو قبول کرتے ہیں، تاکہ اس کے ملک وشہر میں رہے، پس اس کا ٹیکس وغیرہ ادا کرے، اور ان میں سے بعض اس کے سوا شریر ہوتے ہیں اور اس لئے جائز نہیں ہے ان میں قانون برابر۔

(پس غیر مسلم ملک سے ترک وطن مناسب نہیں ہے، پس معروف طریقہ سے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں تو ضرور ملے گا، جیسا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہی سابقہ پڑتا ہے اور ان کو حقوق دیئے جاتے ہیں)۔

اقلیت کے لئے حق ہے کہ وہ اونچے مناصب پر اور وزارتوں وغیرہ میں آئے، جیسا کہ ہندوستان میں ہے، پس ترک وطن غیر مناسب ہے۔

مسلمان مکلف ہے زندگی بنانے کا ہر جگہ میں، چنانچہ حضرت یوسفؑ قائم رہے باعتبار فعل عظیم زندگی کے بنانے میں غیر مسلم حکومت میں۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان ہر ملک میں شرعاً رہ سکتا ہے اگر قانوناً بھی ہے اور اگر نہیں ہے تو اس ملک سے اجازت لینا ضروری ہے۔

مادر وطن کو نہ بھولنا اور محبت و ہمدردی اس کے لئے باقی رکھنا اس کے باشندوں کے ساتھ احسان کو مقدم رکھتے ہوئے اور اسی کو کیا ہے، حضرت یوسفؑ نے، جب کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کی مدد کی اور ان کے ساتھ احسان کیا عطیہ اور کھانے پینے کی چیزوں کو دے کر پھر اپنے والدین اور بھائیوں سے طلب کی کہ وہ لوگ مصر میں اکرام وعزت اور امان کے ساتھ داخل ہو جائیں (سورۂ یوسف: ۹۹)۔

اس کے ملک والوں کی بدسلوکیوں کو بھول جانا عوام کی طرف سے ہو یا حکام کی طرف سے، یہ عظیم رہنما نمونہ ہے ہر مسلم اقلیت کے لئے تمام عالم میں کہ حضرت یوسفؑ کے مثل ہو کر معاملہ کریں اپنے اس وطن کے ساتھ جس میں پناہ لئے ہیں اور اپنے پہلے وطن کے ساتھ اس کے اس باشندوں کے ساتھ جنہوں نے بدسلوکی کی ہے ان میں رہ کر لمبی عمر گذارنا بہت محبوب اور افضل ہے اس معصیت و گناہ میں پڑنے سے جو اللہ تعالی کے غضب کی طرف پہنچائے تو تمہارا کیا حال ہوگا کفر وارتداد میں پڑنے سے، یعنی پناہ گزیں کا درجہ دیا جانا بہتر ہے معصیت یا کفر وارتداد میں پڑنے سے۔

ہر محسن کے لئے وفادار ہونا اگرچہ کافر ہندو ہو، جس طرح عزیز مصر نے حضرت یوسفؑ کو خرید کر احسان کیا اور عزیز مصر کی عورت نے جب ان کو اپنی طرف ورغلایا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت اس احسان کو نہ بھولے (تو پناہ گزینوں کو پناہ دینا احسان ہے اس پر شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اس مسلم حکومت کا احسان ہے)۔

۴۔ اہل شہر کے لئے ظلم نہ ہونا یہاں تک کہ اگر بعض اہل شہر کی طرف سے یا ان کے حکام کی طرف سے اور ان کی حکومتوں کی طرف سے مہاجر یا اقلیت کے لئے ظلم کا وقوع ہو جائے اسلامی حکومت کی طرف سے تو محض ظلم کے مقابل میں ظلم نہ ہونا چاہئے، حضرت یوسفؑ نے اسی کو کہا ہے: "إنه لا يفلح الظالمون" (سورۂ یوسف: ۲۳)۔

اور اس میں قوی تردید ہے ان بعض مہاجر مسلمانوں پر جو زیادتی کرتے ہیں یورپی یا امریکی حکومتوں کے مالوں پر اس طرح کہ یہ ظالم حکومتیں ہیں مسلمانوں کے مالوں کو لیا ہے تو جو ہم لیتے ہیں وہ بدلہ ہے ان کا تو یہ کمزور سمجھ ہے مخالف شرع ہے۔

دوسرے ملک کو وطن بنانا اور اس وطن کی محبت جس میں اس نے زندگی گذارا ہے تو سیدنا یوسفؑ ان صورتوں کی طرف سے تنگی کئے جانے کے باوجود نہیں فرمایا کہ یہاں سے ہجرت کر جانا یا نکل جانا میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے (سورۂ یوسف: ۳۳)۔

اور یہ دلیل ہے اس پر کہ انہوں نے مصر کو وطن بنایا اور اس کو محبوب رکھا اور جیل میں رہنے کو اس سے نکلنے پر ترجیح دیا اور اس سے زیادہ کیا کہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ بادشاہ ان کو بنادے زمین کے خزانوں پر، تا کہ خدمت کریں مصر کے شعبوں کی، بلکہ اپنے والدین اور بھائیوں کو لائے مصر، تا کہ وہ لوگ اسی میں وطن بنائیں باوجودیکہ مصر دین ابراہیمی پر نہیں تھا (پس پناہ گزینوں کو اپنے ملک سے ہجرت نہ کرنا چاہئے، بلکہ باوجود ظلم کے ڈٹے رہنا چاہئے)۔

خلاصہ کلام یہ کہ مسلم اقلیت جہاں بھی رہے وجوبی طور پر اپنے دین کے عقائد سے نہ اترے اور اس کے خلاف کو قبول نہ کرے، دار الکفر، یعنی غیر مسلم کی طرف بھی ترک وطن کر کے جانا جائز ہے اور اس میں رہنا جائز ہے، اس جدید وطن ملک سے محبت جس نے ان کو پناہ دی ہے اور اس ملک کے دشمنوں کی جانب سے حملہ وانتقام پر غمگین نہ ہونا اور اس ملک کی نصرت کے لئے دعا کرنا اور اس جنگ میں تارک وطن کا شریک ہونا اور اس ملک کی مدد پر خوش ہونا۔

نیز مظالم کے باوجود کسی مسلم ملک میں پناہ لینے کے لئے ترک وطن نہ کرنا چاہئے، بلکہ وہیں کے عوام اور حکام حکومت کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ رہنا چاہئے اور حکومت کی وفاداری پر قائم رہنا چاہئے اور اپنے لوگوں کو اس پر ترغیب دینا چاہئے اور ہماری شریعت کا جو نمونہ ہے جو حجت ہے۔ جس خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے رہتے ہیں اور ان کے تنگ کئے جانے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے تو کسی دوسرے مسلم ملک کی طرف ترک وطن کر کے پناہ لینا شرعاً جائز ہے اور ان کی پناہ میں رہنا جائز ہے اگر وہ حکومت ان کو اپنا شہری تسلیم کر کے شہریت دے دے تو بہت بہتر، چاہے ان کی درخواست کے بغیر یا ان کی درخواست کی روشنی میں اور یہ بات جائز ہے کہ مسلمان تارکین وطن کو دوسرے مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں دی جائیں۔

اور غیر مسلم ملک میں بھی ترک وطن کر کے پناہ لینا ہجرت کرنا اور اس میں باقی رہنا جائز ہے، ان نئے شہریوں کے ذمہ اس جدید وطن کی محبت وہمدردی ہونی چاہئے اور ان کی وفاداری کرنا لازم ہے۔

۵۔ اسلامی نقطہ نظر سے ووٹ دینے کا حق انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق وغیرہ یہ حقوق مانے جائیں گے۔

۶۔ شریعت اسلامی میں شہریوں کو جو حقوق حاصل ہوں گے وہ ذکر کئے جا چکے ہیں، اور پناہ گزینوں کو یہ حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔

۷۔ کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہیں، بلکہ دار الکفر اور غیر مسلم کی طرف ہجرت کرنا اور اس میں رہنا جائز ہے، بغیر اس کی شہریت اختیار کئے ہوئے، اس لئے کہ یہ صحابہؓ حبشہ میں رہے عام خیبر تک، یعنی فتح خیبر تک (البدایہ النہایہ ۴/۱۷۹، معجم الکبیر للطبرانی ۲/۱۴۷۸، مجمع الزوائد ۶/۳۰)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کے بغیر محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔

۸۔ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا آج کے اس دور میں درست نہیں، کیونکہ وہ رفتہ رفتہ اپنی آبادی میں بڑھ کر مسلم ملکوں میں بغاوت و فساد کی آگ کا شعلہ بھڑکانا شروع کردیں گے اور اپنی آبادی کے بٹوارہ وعلاحدگی کے لئے مسلم ملکوں سے احتجاج شروع کردیں گے اور جس خطہ میں ان کی آبادی غالب ہوگی اور مسلمان کم ہوں گے تو وہ مسلمانوں کو مارنا پیٹنا تنگ کرنا شروع کردیں گے جس کی وجہ سے مسلم ملکوں کے حکمرانوں کی پریشانیاں بڑھ جائیں گی، یہاں تک کہ وہ مسلم افواج سے دوسرے غیر مسلم ملکوں کے تعاون سے جنگ شروع کردیں گے تو مزید پریشانیاں بڑھ جائیں گی، خلاصہ یہ کہ آج کے اس دور میں غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست نہیں، جیسا کہ آج کا مشاہدہ شاہد عدل ہے اس پر خوب غور کرلیا جائے، جلد بازی نہ کی جائے۔

☆☆☆

اسلام میں حصول شہریت کی بنیاد اور موجودہ سیاسی نظام

مولانا خورشید انور اعظمی [1]

قدیم زمانے میں کسی ملک میں شہریت حاصل کرنے کا مسئلہ نہیں تھا، ہر شخص مکمل طور پر آزاد تھا کہ جہاں چاہے جائے اور جہاں چاہے سکونت اختیار کرے، دنیا کے کسی بھی حصے میں آنے جانے اور رہنے سہنے کی ہر فرد و بشر کو عام اجازت تھی، لیکن حالات بدلے اور ملکی قوانین وضوابط کا سلسلہ شروع ہوا، یہاں تک کہ آج کی صورت حال یہ ہے کہ ہر ملک کا اپنا مخصوص آئین ہے اور وہاں کا ہر شہری اس کا لازمی طور پر پابند ہے، اسی طرح اگر دوسرے ملک کا کوئی باشندہ وہاں جا کر تجارت کرنا چاہے یا بود و باش اختیار کرنا چاہے یا کسی اور غرض سے کچھ دنوں کے لئے رہنا چاہے تو وہاں کے ملکی قانون کا پابند ہونا لازم ہوگا، قانونی مراحل سے گذرے بغیر کسی بھی ملک میں تجارت، سکونت، سیاحت یا کسی اور غرض سے جانا ممکن نہیں ہے۔

اسلام میں وطن سے محبت کی تعلیم ضرور ہے اور یہ عین فطرت بھی ہے، لیکن وطنیت کے تعلق سے اس کا تصور محدود نہیں، بلکہ آفاقی ہے وہ یہ کہ پوری دنیا اللہ کی ملکیت ہے، اور ہر بندہ خدا اس میں زندگی بسر کرنے کا پورے طور پر حقدار ہے، نیز وطن کا قیام، وحدت دین وعقیدہ کی بنیاد پر عمل میں آتا ہے۔

ا۔ اسلام میں حصول شہریت کی بنیاد:

اسلام کی نگاہ میں انسان کا وطن وہ مقام ہے جہاں وہ پیدا ہوتا ہے یا ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے یا مستقلاً بود و باش اختیار کر لیتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی "ردالمحتار" میں لکھتے ہیں: "الوطن الأصلی هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه" (ردالمحتار ۱/۷۴۲)۔ (وطن اصلی سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کی جائے پیدائش ہو یا وہاں اس کی شادی ہوئی ہو یا اسے اس نے وطن بنالیا ہو)۔

علامہ سید شریف جرجانی تحریر فرماتے ہیں: "الوطن الأصلی هو مولد الرجل والبلد الذی هو فیه" (التعریفات ص ۳۲۷)۔ (وطن اصلی سے مراد یہ ہے کہ وہ آدمی کی جائے پیدائش ہو اور وہ شہر جس میں وہ رہتا ہو)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ جس جگہ سے آدمی کا ازدواجی تعلق ہوتا ہے وہاں کا وہ شہری مان لیا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من تأهل ببلدة فهو من أهلها" (شرح السیر الکبیر ۱۰۷)۔ (جس نے کسی شہر میں شادی کی وہ وہیں کا مانا جائے گا)۔

اور اگر کوئی شخص کسی جگہ صرف معاشی مقاصد کے تحت یا کسی اور غرض سے مخصوص مدت تک قیام پذیر ہوتا ہے اور وہاں مستقلاً بود و باش اختیار نہیں کرتا تو اسے وہاں کا شہری نہیں مانا جائے گا، علامہ جرجانی "التعریفات" میں وطن اقامت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وطن الإقامة: موضع ینوی أن یستقر فیه خمسة عشر یوما أو أکثر من غیر أن یتخذه مسکنا" (التعریفات: ۳۲۷)۔ (وطن اقامت سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان اپنا گھر بنائے بغیر پندرہ یوم یا اس سے زیادہ اقامت کرے)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ شہریت کے حصول کی بنیاد بود و باش اختیار کر لینے پر ہے، اسی لئے اگر ایک شہر چھوڑ کر دوسری جگہ مستقلاً سکونت اختیار کر لی جائے تو سابقہ وطن کی اصلیت باقی نہیں رہتی، "کفایہ شرح ہدایہ" میں ہے: "لو انتقل من البلد الذی تأهل به بأهله وتوطن ببلدة أخری لا تبقی البلدة المنتقل عنها وطنا له، ألا تری أن مکة کانت وطنا أصلیا لرسول الله علیه السلام ثم هاجر منها إلی المدینة بأهله و توطن ثمة انتقض وطنه بمکة حتی قال علیه السلام عام حجة الوداع "اتموا صلاتکم یا أهل مکة فأنا قوم سفر" (کفایہ شرح ہدایہ علی ہامش فتح القدیر ۲/۱۷)۔ (آدمی اگر اس شہر سے جہاں اس نے شادی کی ہے اپنے اہل وعیال کے

[1] صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم بنارس۔

ساتھ منتقل ہو گیا اور کسی دوسرے شہر میں وطن بنالیا تو جس شہر سے منتقل ہوا ہے اب اس کا وطن باقی نہیں رہے گا، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن اصلی تھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ ہجرت کی، اور وہاں اپنا وطن بنالیا تو آپ کا مکہ والا وطن ختم ہو گیا، یہاں تک کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: اے اہل مکہ آپ لوگ اپنی نماز پوری کرلیں، ہم لوگ مسافر ہیں)۔

۲۔ دوسرے ملک میں شہریت اختیار کرنے کا مسئلہ:

اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اور ہر مسلمان ملت اسلامیہ کا رکن ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "إنما المؤمنون أخوة" (الحجرات: ۱۰) (مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (توبہ: ۷۱) (ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں)۔

اس صورتحال میں اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں مقیم ہے، لیکن اس کے لئے اپنے دین پر باقی رہنا دشوار ہے تو اسے وہاں سے کسی ایسے ملک میں ہجرت کرنا واجب ہے جہاں وہ اپنے دین پر قائم رہ سکے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یا عبادی الذین آمنوا ان أرضی واسعة فإیای فاعبدون" (العنکبوت: ۵۶)۔ (اے بندو میرے جو ایمان لائے ہو، میری زمین کشادہ ہے، سو مجھ ہی کی بندگی کرو)۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "هذا أمر من الله تعالى لعباده المؤمنين بالهجرة من البلد الذى لا يقدرون فيه على إقامة الدين إلى أرض الله الواسعة حيث يمكن إقامة الدين" (تفسیر ابن کثیر ۳، ۴۱۹)۔ (اللہ تعالیٰ اس آیت میں ایمان والوں کو ہجرت کا حکم دیتا ہے کہ جہاں وہ دین کو قائم نہ رکھ سکتے ہوں وہاں سے اس جگہ چلے جائیں جہاں ان کے دین میں انہیں آزادی رہے، خدا کی زمین بہت کشادہ ہے)۔

البتہ اگر دوسری جگہ منتقل ہونے پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ نہ مل رہی ہو جہاں وہ ہجرت کر سکے تو ایسی صورت میں وہ معذور سمجھا جائے گا، مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں: "جس شہر یا ملک میں انسان کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی نہ ہو دوسرے شہر یا ملک میں جہاں دین پر عمل کی آزادی ہو چلا جانا بشرطیکہ قدرت ہو واجب ہے، البتہ جس کو سفر پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ میسر نہ ہو جہاں آزادی سے دین پر عمل کر سکے وہ شرعا معذور ہے" (معارف القرآن ۶ / ۷۱۱)۔

مذکورہ بالا صورتحال سے دوچار شخص اگر کسی مسلم ملک سے درخواست کرتا ہے کہ وہاں کی شہریت اختیار کرے تو اس ملک کو چاہئے کہ حتی المقدور اس شخص کا تعاون کرے اور اپنے ملک میں اسے جگہ دے کر ایک شرعی فریضہ انجام دے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وان استنصروكم في الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق، والله بما تعملون بصير" (سورۂ توبہ: ۷۲)۔ (اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں دین میں تو تم پر لازم ہے ان کی مدد کرنی، مگر مقابلہ میں ان لوگوں کے کہ ان میں اور تم میں عہد ہو اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے)۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "ان استنصروكم هولاء الأعراب الذين لم يهاجروا فى قتال دينى على عدولهم فانصروهم فإنه واجب عليكم نصرتهم، لأنهم إخوانكم في الدين" (تفسیر ابن کثیر ۳، ۲۵۳)۔ (جو دیہاتی مسلمان وہیں مقیم ہیں، ہجرت نہیں کی یہ اگر کسی وقت تم سے مدد کی خواہش کریں دشمنان دین کے مقابلے پر تمہیں بلائیں تو ان کی مدد تم پر واجب ہے، اس لئے کہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں: "دار الحرب کے مسلمان جس وقت دینی معاملہ میں آزاد مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو ان کو اپنے مقدور کے مطابق مدد کرنا چاہئے، مگر جس جماعت سے آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہو اس کے مقابلہ میں تابقائے عہد دار الحرب کے مسلمانوں کی امداد نہیں کی جاسکتی" (حاشیہ عثمانی برترجمہ شیخ الہند ص ۲۴۷)۔

اور اگر وہ شخص ایسے غیر مسلم ملک میں رہتا ہے جہاں دین پر عمل کرنے کی آزادی ہے، یا کسی ایسے مسلم ملک میں سکونت پذیر ہے جہاں احکام الٰہی کی علی الاعلان خلاف ورزی ہو رہی ہے اور وہ شخص اس کے روکنے پر قادر بھی نہ ہو تو وہاں سے منتقل ہو جانا مستحب ہے، علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں: "والمقيم بها

إن كان عاجزا عن إقامة دينه وجبت الهجرة عليه، وإلا استحبت ولم تجب'' (فتاوی ابن تیمیہ ۲۸،۲۴۰)۔ (غیر مسلم ملک میں مقیم مسلمان اگر اپنے دین کے قائم کرنے سے عاجز ہوں تو ان پر ہجرت واجب ہے، ورنہ مستحب ہے، واجب نہیں)۔

مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں: ''جس دار الکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض و واجب تو نہیں ہے، مگر مستحب بہر حال ہے، اور اس میں دار الکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دار الفسق جہاں احکام الہیہ کی خلاف ورزی اعلانا ہوتی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، اگر چہ وہاں کے حکمراں کے مسلمان ہونے کی بنا پر اس کو دار الاسلام کہا جاتا ہو'' (معارف القرآن ۶/۱۷)۔

اس صورت حال میں مسلم ملک کے حکمراں کے لئے مستحب ہوگا کہ کسی مسلمان کی درخواست بسلسلہ حصول شہریت پر غور کرے اور اسے اپنے ملک کا شہری بنائے، الغرض مسلم حکمراں کو چاہئے کہ مسلم مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے مظلوم و بے کس مسلمانوں کا حسب مقدرت تعاون کرے اور انہیں اپنے ملک کی شہریت عطا کرے، اگر مسلمان کے لئے اپنے ملک میں دین پر قائم رہنا مشکل ہو اور اس کی وجہ سے اس کا وہاں سے نقل مکانی کرنا از روئے شرع واجب ہو تو مسلم ملک کے لئے اس کا شہری بنانا واجب ہوگا، ورنہ مستحب۔

۳۔ تارکین وطن کو پناہ دینے کا مسئلہ:

اگر کسی علاقے میں مظالم ڈھائے گئے اور وہاں کے مسلمان ترک وطن کر کے کسی مسلم ملک میں پناہ گزیں ہوئے تو اس ملک کو چاہئے کہ ان بے سہارا مسلمانوں کا ہر ممکن تعاون کرے، اگر ہو سکے تو ملکی مفاہمت کے ذریعہ یا اقوام متحدہ کے وضع کردہ قوانین کے ذریعہ ان کا مسئلہ حل کرائے، ورنہ انہیں اپنے ملک کا شہری تسلیم کرے، اس وجہ سے کہ یہی اسلامی اخوت ہے، اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ''إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض'' (توبہ:۷۲)۔ (جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں، اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا'' (صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۲۶۶، صحیح مسلم ۴۶۸۴)۔ (مومن، مومن کے لئے عمارت کے مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه ومن كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيمة، ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة'' (صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۲۶۲، صحیح مسلم حدیث نمبر ۴۶۷۷)۔ (مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو کسی کے حوالہ کرتا ہے، جس نے اپنے بھائی کی ضرورت پوری کی اللہ تعالی اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جس نے کسی مسلم کی پریشانی دور کی اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی پریشانی دور کرے گا، جس نے کسی مسلمان کے عیوب چھپائے اللہ تعالی قیامت کے دن اس کے عیوب چھپائیں گے)۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی اخوت کا تقاضا یہی ہے کہ مسلم ممالک پریشان حال تارکین وطن کو اپنے ملک کا شہری بنائیں، اس وجہ سے کہ دار الاسلام بمنزلہ ایک جگہ کے ہوتا ہے۔

''بزازیہ'' میں ہے: ''امرأة مسلمة سبيت بالمشرق وجب على أهل المغرب تخليصها من الأسر مالم تدخل دار الحرب؛ لأن دار الإسلام كمكان واحد'' (فتاوی بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶،۳۰۸)۔ (اگر کوئی مسلمان عورت مشرق میں گرفتار ہو تو مغرب والوں پر اس کی قید سے رہائی دلانا واجب ہے، جب تک وہ دار الحرب میں داخل نہ ہو جائے، اس وجہ سے کہ دار الاسلام مکان واحد کے مثل ہے)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ دوسرے مظلوم و بے بس مسلمانوں کا حتی المقدور تعاون کرے، لہذا مسلم ممالک کو چاہئے کہ مسلم تارکین وطن کو اپنے ملک کا شہری بنائیں اور انہیں قدیم باشندوں کی طرح سہولتیں فراہم کریں۔

۴۔ شہریت کے حقوق:

اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کا تعلق مصالح ضروریہ، یعنی حفاظت دین، حفاظت جان، حفاظت عقل، حفاظت نسل اور

حفاظت مال سے ہو، حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المقدس کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ جو حقوق دیئے تھے، ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ نے جان، مال اور مذہب جیسے بنیادی حقوق کو مفتوحہ اقوام کے حق میں محفوظ رکھا، وہ حقوق یہ تھے:

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمرؓ نے اہل ایلیا کو دی، یہ امان جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہل مذہب کے لئے ہے، نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی، نہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا" (تاریخ اسلام ۱/۲۲۲ بحوالہ طبری)۔

۵۔ پناہ گزینوں کے حقوق:

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر شخص خدا کی زمین میں جہاں خیر و بھلائی پائے، مقیم ہو کر زندگی بسر کرے، ابن کثیر نے مسند احمد کی ایک روایت نقل کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "البلاد بلاد الله والعباد عباد الله حيثما أصبت خيرا فاقم" (ابن کثیر بحوالہ معارف القرآن ۶/۷۱۱)۔ (سب شہر اللہ کے شہر ہیں، اور سب بندے اللہ کے بندے، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہو وہاں اقامت کرو)۔

اس لئے مسلم حکمراں کے فرائض میں سے ہے کہ مظلوم مسلمانوں کی دادرسی کے لئے ہمہ وقت تیار رہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم حکمراں کو "ظل اللہ فی الأرض" کہا ہے، اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کے زیر سایہ پوری امت مسلمہ سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی کے لمحات گذار سکے، اور پریشان حال و بے سہارا افراد اسلامی مملکت کی حدود میں آکر ٹھکانا پاسکیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "السلطان ظل الله في الأرض يأوى إليه كل ضعيف وملهوف" (فتاوی ابن تیمیہ ۳۵،۴۵)۔ (بادشاہ، زمین میں اللہ کا سایہ ہے، ہر کمزور مظلوم شخص اس کی پناہ لیتا ہے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پناہ گزینوں کا ہر ممکن تعاون کرنا لازم ہے، ان کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لئے سعی بلیغ کرنی چاہئے، یہاں تک کہ انہیں اپنا شہری تسلیم کر کے امن و چین کے ساتھ زندگی گذارنے کا حق فراہم کرنا چاہئے، اور ایسا نظام بنا دینا چاہئے جس سے انہیں وہ تمام حقوق انسانی حاصل ہوسکیں، جو دیگر شہریوں کو پہلے سے حاصل ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان جو رشتہ اخوت قائم فرمایا تھا، اس سے بھی یہی روشنی ملتی ہے۔

۶۔ مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کا مسئلہ:

ایک مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں کسی وجہ شرعی کے بغیر شہریت اختیار کرے، درست نہیں ہے، البتہ اگر تبلیغ دین کی غرض سے وہاں اقامت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، علامہ ماوردی نے اس طرح کی اقامت کو افضل قرار دیا ہے، اس وجہ سے کہ دعوت و تبلیغ اور اظہار شعائر دینی کے ذریعہ دوسروں کو اسلام کے سمجھنے اور اس کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔

اسی طرح ایسے امور کے سبب بھی غیر مسلم ممالک میں اقامت پذیر ہونے کی اجازت ہے جن کا تعلق مصالح مسلمین سے ہے۔ "الاستعانة بغير المسلمين في الفقه الاسلامي" میں ہے: "ذلك؛ لأن ما يترتب على بقائه من الخير سيتضاعف على ما يمكن أن يجعل له من الشر والضرر على أن يكون قادرا على إظهار دعوته وشعار دينه، وهكذا الحكم في إقامته من أجل مصلحة تهم المسلمين، كتعلم نوع من العلوم أو صنعة من الصنائع أو نحوهما مما تحتاجه الأمة الاسلامية ولا يوجد في ديارهم أو ليكون سفير الدولة الإسلام عندهم" (ص ۷۸،۷۹)۔ (یہ اس وجہ سے کہ اس کے وہاں رہنے سے جو خیر حاصل ہوگا وہاں کے ممکنہ شر و نقصان سے دو چند ہوگا، اس وجہ سے کہ وہ دعوت اور دینی شعائر کے اظہار پر قادر ہوگا، نیز یہی حکم ہے مصالح مسلمین کے تعلق سے اقامت کرنے کا، مثلاً کسی خاص علم یا صنعت یا کسی اور چیز کا سیکھنا جس کی امت اسلامیہ کو ضرورت ہو اور وہ چیز مسلمانوں کے شہر میں نہ پائی جاتی ہو، یا یہ کہ وہ اسلامی حکومت کا سفیر ہو)۔

اسی طرح ایک مسلمان تجارت کی غرض سے غیر مسلم ممالک میں جا سکتا ہے، "بدائع الصنائع" میں ہے: "ولا بأس بحمل الثياب والمتاع والطعام ونحو ذلك إليهم لا نعدام معنى الامداد و الإعانة، وعلى ذلك جرت العادة من تجار الأمصار أنهم يدخلون دار الحرب للتجارة من غير ظهور الرد والإنكار عليهم، إلا أن الترك أفضل؛ لأنهم يستخفون بالمسلمين، ويدعونهم إلى ما هم عليه فكان الكف والإمساك عن الدخول من صيانة النفس عن الهوان والدين عن الزوال، فكان

أولی'' (۶،۶۵)۔ (کپڑا، سامان اور کھانا وغیرہ کو غیر مسلموں کے پاس لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس وجہ سے کہ یہ امداد و معاونت نہیں ہے، برایں بنا مسلم شہروں کے تاجروں کا معمول رہا ہے کہ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر بغرض تجارت دار الحرب میں جاتے ہیں، مگر نہ جانا افضل ہے، اس وجہ سے کہ وہ لوگ مسلمانوں کو حقیر جانتے ہیں، اور انہیں اپنے عادات واطوار اور دین ومذہب کی دعوت دیتے ہیں، لہذا اپنے کو ذلت سے اور دین کو برباد ہونے سے بچانے کے لئے وہاں نہ جانا بہتر ہوگا)۔

صحابہ کرام کے عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرات نے بغرض تجارت غیر مسلم ممالک کا سفر کیا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بصرہ کا تجارتی سفر کیا (الطبرانی فی المعجم الکبیر ص ۶۷۵)، اسی طرح طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل وغیرہ ''بحر روم'' میں تجارت کیا کرتے تھے (تاریخ دمشق ۲۵ر۵۷)۔

حاصل یہ کہ شرعی وجہ کے بغیر غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا درست نہیں ہے، تاہم تجارت کی غرض سے وہاں آنے جانے کی اجازت ہے، مگر نہ جانے کو افضل قرار دیا گیا ہے، نیز اظہار دین ومصالح مسلمین کے تحت اگر کوئی وہاں اقامت کرتا ہے تو اس کی بھی اجازت ہے، الغرض اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑا مسئلہ دین اور شعائر دین کے تحفظ کا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو ہمہ وقت اس کے لئے فکر مند ہونا چاہئے، اور ایسے ماحول، معاشرہ اور شہر وملک سے حتی المقدور احتراز کرنا چاہئے، جہاں دینی شعائر اور اسلامی تشخص کو خطرہ لاحق ہو۔

۷۔ غیر مسلم کا مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کا مسئلہ:

غیر مسلم کو جزیرۃ العرب میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے، ''بدائع الصنائع'' میں ہے: ''ویمنع المشرکون أن یتخذوا أرض العرب مسکنا کذا ذکرہ محمد تفضیلا لأرض العرب علی غیرھا وتطیرالھاعن الدین الباطل'' (۶ر۸۵)۔ (مشرکین کو اس بات سے منع کیا جائے گا کہ وہ سرزمین عرب کو اپنا مسکن بنائیں، امام محمد نے ایسا ہی ذکر کیا ہے، اس کا مقصد سرزمین عرب کو دیگر زمینوں پر فضیلت دینا اور اس کو باطل دین سے پاک کرنا ہے)۔

''فتح القدیر'' میں ہے: ''ویمنعون من أن یتخذوا أرض العرب مسکنا ووطنا'' (فتح القدیر ۵،۳۰۱)۔ (یہ لوگ اس بات سے منع کئے جائیں گے کہ سرزمین عرب کو اپنا مسکن اور وطن بنائیں)۔

علامہ شامی نے ''درمختار'' کی عبارت: ''لمنعون من استیطان مکۃ والمدینۃ؛ لأنھما من أرض العرب'' پر کلام کرتے ہوئے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ اس میں تمام جزیرۃ العرب شامل ہے: ''إن الحکم غیر مقصور علی مکۃ والمدینۃ، بل جزیرۃ العرب کلھا، کما عبربہ فی الفتح وغیرہ'' (ردالمحتار ۴،۲۰۹)۔ (بلاشبہ یہ حکم مکہ ومدینہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ پورا جزیرۃ العرب ہے، جیسا کہ ''فتح القدیر'' وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے)۔

جزیرۃ العرب کے علاوہ دوسرے مسلم شہروں میں غیر مسلم کو سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، ''فتح القدیر'' میں ہے: ''بخلاف أمصار المسلمین التی لیست فی جزیرۃ العرب، یمکنون من سکناھا ولا خلاف فی ذلک'' (فتح القدیر ۵،۳۰۱)۔ (مسلمانوں کے دیگر شہروں کے برخلاف جو جزیرۃ العرب میں نہیں ہیں، ان میں انہیں سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے)۔

''بدائع الصنائع'' میں ہے: ''ویترکون أن یسکنوا فی أمصار المسلمین یبیعون ویشترون، لأن عقد الذمۃ شرع لیکون وسیلۃ لھم إلی الاسلام وتمکینھم من المقام فی أمصار المسلمین أبلغ فی المقصود، وفیہ أیضا منعۃ المسلمین بالبیع والشراء فیمکنون من ذلک'' (بدائع ۶،۸۳)۔ (انہیں مسلمانوں کے شہروں میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی کہ یہ لوگ معاملہ بیع وشراء کیا کریں، اس وجہ سے کہ عقد ذمہ کی مشروعیت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ یہ ان کے اسلام کا ذریعہ بنے، ان کو مسلم شہروں میں ٹھہرانے سے یہ مقصود پورے طور پر حاصل ہوگا، نیز اس میں خرید وفروخت کی وجہ سے مسلمانوں کی منفعت بھی ہے، لہذا انہیں اس کی اجازت دی جائے گی)۔

علامہ شامی نے علامہ سرخسی کے حوالہ سے فرمایا: ''قال السرخسی فی شرح الکبیر: فإن مصر الإمام فی أراضیھم کما مصر عمر رضی اللہ عنہ البصرۃ والکوفۃ فاشتری بھا أھل الذمۃ دورا وسکنوا مع المسلمین لم یمنعوا من ذلک، فانا قبلنا منھم عقد

الذمة ليقفوا على محاسن الدين، فعسى أن يؤمنوا واختلاطهم بالمسلمين والسكن معهم يحقق هذا المعنى'' (ردالمحتار ۴، ۲۱۰)۔ (علامہ سرخسی نے شرح کبیر میں کہا ہے کہ اگر امام اپنی اراضی میں شہر بساتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ وکوفہ کو بسایا، اور اس میں ذمیوں نے مکانات خریدے اور مسلمانوں کے ساتھ بود وباش اختیار کی تو انہیں اس سے منع نہیں کیا جائے گا، اس وجہ سے کہ ہم نے ان سے عقد ذمہ اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ وہ لوگ محاسن دین سے واقف ہوسکیں، ہوسکتا ہے کہ ایمان لے آئیں، مسلمانوں کے ساتھ ان کے اختلاط اور رہن سہن میں یہ مقصد پورا ہوسکتا ہے)۔

البتہ اگر غیر مسلم کے سکونت اختیار کرنے سے ملکی مصالح متاثر ہورہے ہوں تو انہیں شہر کے ایسے مقامات پر بسنے کو کہا جائے گا جہاں ان سے کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو، جیسا کہ علامہ شمس الائمہ حلوانی نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۴ر ۲۱۰)۔

اسی طرح غیر مسلم کسی بھی مسلم ملک میں بغرض تجارت آسکتا ہے، درمختار میں ہے: ''ولودخل لتجارة جاز ولا يطيل'' (۴، ۲۰۹)۔ (اور اگر تجارت کے لئے داخل ہو تو جائز ہے البتہ زیادہ نہ ٹھہرے)۔

غیر مسلم، کسی مسلم ملک میں ذمی بن کر رہ سکتا ہے اور اس کو تجارت کی عام اجازت ہوتی ہے، لیکن اگر امان (ویزا) لے مسلم ملک میں آتا ہے تو اسے تجارت کی اجازت تو ہوتی ہے، لیکن ملکی مصالح کے پیش نظر سال بھر سے پہلے ہی اس کو وہاں سے واپس آجانا ضروری ہوتا ہے۔

علامہ مرغینانی تحریر فرماتے ہیں: ''والأصل أن الحربي لا يمكن من إقامة دائمة في دارنا إلا بالاسترقاق أو الجزية، لأنه يصير عونا عليهم فيلتحق المضرة بالمسلمين، ويمكن من الإقامة اليسيرة؛ لأن في منعنها قطع الميرة والجلب، وسد باب التجارة ففصلنا بينهما بسنة'' (هدايه ۲، ۵۸۶)۔ (اصل یہ ہے کہ حربی کو ہمارے ملک میں مستقل اقامت کی اجازت نہیں دی جائے گی، الا یہ کہ اسے غلام بنالیا جائے یا وہ جزیہ ادا کرے، اس وجہ سے کہ وہ اہل حرب کا جاسوس اور ان کا معاون ہوگا جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور اسے کم مدت تک اقامت کرنے کی اجازت دی جائے گی اس وجہ سے کہ اس کے نہ دینے سے غلہ اور مال کو ختم کرنا اور تجارت کے دروازے کو بند کرنا لازم آئے گا، اس وجہ سے ہم نے دونوں مدتوں کے درمیان ایک سال کو حد فاصل بنادیا)۔

حاصل یہ کہ غیر مسلم جزیرۃ العرب کی شہریت اختیار نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ دیگر شہروں میں ذمی بن کر شہریت اختیار کرسکتا ہے، اور اسے تجارت وغیرہ کی آزادی ہوگی، البتہ اگر ان کی وجہ سے مسلمانوں کے نظام میں کوئی خلل واقع ہورہا ہو تو انہیں ایسی جگہ سکونت اختیار کرنے کو کہا جائے گا کہ کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو اور اگر کوئی غیر مسلم صرف امان حاصل کرکے تجارت کی غرض سے مسلم ملک میں جاتا ہے تو جائز ہے، لیکن ملکی مصالح کے پیش نظر اس کو بتادیا جائے گا کہ سال کے اندر اندر وہ یہاں سے واپس چلا جائے۔

☆☆☆

کسی بھی ملک کا شہری ہونے کی شرعی بنیادیں

مولانا خورشید احمد اعظمی[1]

شہریت سے مراد کسی ملک کا باشندہ ہونا ہے، جس کو جنسیہ، وطنیت، قومیت اور نیشنلٹی سے بھی تعبیر کرتے ہیں، جو کسی فرد اور ملک (حکومت) کے مابین ایک سیاسی اور قانونی رابطہ ہے، جو دونوں کے اوپر ایک دوسرے کے کچھ حقوق کو واجب کرتا ہے، اور اس کی رعایت ہر دو پر ضروری ہوتی ہے۔ ''رابطة سياسية وقانونية بين الفرد والدولة'' (فرد اور حکومت کے درمیان ایک سیاسی اور قانونی رابطہ ہے)۔

''رابطة تربط شخصا معينا بدولة معينة، وتعتبره عضوا في تلك الدولة وتمكنه من المطالبة بحمايتها، وتخضعه كذلك لتنفيذ ما تفرض عليه دولته من واجبات''۔ (ایک رابطہ ہے جو کسی شخص معین کو کسی متعینہ حکومت سے مربوط کرتا ہے، اور اس فرد کو اس حکومت کا ایک ممبر اور فرد مانتا ہے، اور اس کو اپنی حمایت کے مطالبہ کا حق دیتا ہے، اور ایسے ہی حکومت اس پر جو ذمہ داریاں عائد کرتی ہے ان کو نافذ کرنے کے لئے اس کو تابع بناتا ہے)۔

''وعرفتها محكمة العدل في السادس من ابريل سنة ١٩٥١، بأنها رابطة قائمة أساسا على رابطة اجتماعية وتضامن فعال في المعيشة والمصالح والمشاعر مع التلازم بين الحقوق والواجبات'' (الأحكام الشرعية للنوازل السياسية ص ٧١٢)۔ (اور محکمۃ العدل نے ٦، اپریل ١٩٥١ میں (شہریت کی) یہ تعریف کیا ہے، کہ یہ ایک رابطہ ہے جو اساسی طور پر حقوق وواجبات میں تلازم کے ساتھ معیشت ومصالح میں ایک اجتماعی رابطہ اور فعال شمولیت پر قائم ہے)۔

کسی ملک کا شہری ہونے کی بنیاد چند امور ہوسکتے ہیں مثلاً:

(۱) آدمی کی پیدائش اس ملک کی ہو (۲) آدمی کا اس ملک میں اپنا گھر اور مکان ہو جس میں اس کی مستقل رہائش اور سکونت ہو (۳) اس ملک میں شادی کر لیا ہو (۴) اس کے والدین میں سے کوئی ایک اس ملک کا پیدا یا باشندہ ہو۔ ان امور کی بنیاد پر کوئی شخص کسی ملک کا شہری قرار دیا جاسکتا ہے، کسی ملک یا شہر میں محض معاشی اور تجارتی سرگرمیاں انجام دینے سے یا چند سال عارضی قیام سے وہ اس ملک کا شہری قرار نہیں پائے گا۔

''باب صلاۃ المسافر'' کے تحت وطن اصلی اور وطن اقامت کی تعریف میں مذکور ہے: ''الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه''۔ أو تأهله کے تحت علامہ شامی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''أي تزوجه، قال في شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به، فقيل لا يصير مقيما، وقيل يصير مقيما، وهو الأوجه، ولو كان له أهل ببلدتين فأيتهما دخلها صار مقيما'' (یعنی اس شہر میں شادی کر لیا ہو، شرح منیۃ میں کہا ہے: اور اگر مسافر نے کسی شہر میں شادی کر لیا، اور اس میں رہنے کا ارادہ نہیں کیا تو کہا گیا ہے کہ وہ مقیم نہیں ہوگا، اور کہا گیا ہے کہ مقیم ہوجائے گا، اور یہی زیادہ وجیہ ہے، اور اگر اس کے اہل دو شہروں میں ہوں، تو ان میں سے جس میں بھی وہ داخل ہوگا، مقیم ہوگا) (رد المحتار ۲، ۶۴۱)۔

نیز ''شرح کتاب السیر الکبیر'' میں مذکور ہے: ''وإن قال الميمنة غدا على أهل المصيصة فكان رجل من أهل الكوفة سكن المصيصة، فإن كان اتخذها منزلا فهو من المصيصة، لقوله ﷺ: ''من تأهل ببلدة فهو من أهلها''۔ ولأن من يكون ساكنا في بلدة مقيما بها يعد في الناس من أهلها، ألا ترى أنا إذا عددنا فقهاء الكوفة ذكرنا في جملتهم النخعي والشعبي وأبا حنيفة رضي الله عنهم وهم ما كانوا من الكوفة في الأصل ولكنهم سكنوها'' (ج ۱، ص ۱۷۰)۔ (اور اگر کہا کہ

---

[1]

میمنہ، کل اہل مصیصہ پر مشتمل ہوگا، تو اگر کوفہ کا کوئی آدمی مصیصہ کا ساکن ہے، اور اس نے مصیصہ کو اپنی جائے رہائش بنالیا ہے تو وہ مصیصہ کا ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی وجہ سے کہ جو اپنے اہل کے ساتھ کسی شہر میں رہنے لگا تو وہ اس شہر کے لوگوں میں سے ہے، اور اس لئے کہ جو شخص کسی شہر میں مقیم کی حیثیت سے ساکن ہو تو لوگوں میں اس کا اہل شمار کیا جاتا ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ جب ہم لوگ فقہاء کوفہ کا شمار کرتے ہیں تو ان میں نخعی، شعبی اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا بھی ذکر کرتے ہیں، حالانکہ یہ لوگ اصلاً اہل کوفہ سے نہیں، لیکن وہاں سکونت اختیار کیا ہے)۔

۲۔ کوئی مسلمان جو کسی مسلم یا غیر مسلم ملک کا باشندہ ہے، جہاں اسے دینی شعائر قائم کرنے اور فرائض کے انجام دینے پر کوئی ممانعت اور پابندی نہیں ہے، اور وہ کسی دوسرے مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اس مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا واجب نہیں ہوگا، ایک حدیث میں وارد ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: کیا اپنے اونٹوں کی زکوۃ دیتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گاؤں میں ہی عمل کرتے رہو، اللہ تمھارے اعمال میں (اس کے ثواب میں) کوئی کمی نہیں کریں گے؛ "إن أعرابيا سأل رسول الله ﷺ عن الهجرة، فقال: ويحك؛ إن شأن الهجرة لشديد، فهل لك من ابل؟ قال نعم، قال فهل تؤتي صدقتها؟ قال نعم، قال: فاعمل من وراء البحار، فإن الله لن يترك من عملك شيئا" (صحیح مسلم، کتاب الامارہ، حدیث ۸۷)، بحار، سے مراد یہاں پر قری اور گاؤں ہیں، جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے صراحت کیا ہے، نیز اس حدیث کی شرح میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے: "ولكن اعمل بالخير في وطنك وحيث ما كنت فهو ينفعك ولا ينقصك الله منه شيئا" (شرح مسلم ۹، ۱۳)۔ (اپنے وطن میں یا جہاں کہیں بھی رہو، اچھے عمل کرتے رہو، وہ تمھیں نفع دے گا، اور اللہ اس میں سے تم سے کچھ کم نہیں کرے گا)۔

اور اگر کسی دینی وشرعی مجبوری کی وجہ سے وہ کسی دوسرے مسلم ملک میں قیام کرنا چاہتا ہے، تو اس مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا واجب ہوگا، جیسا کہ آیت کریمہ کے اس حصہ سے ظاہر ہے: "وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر، إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعملون بصير" (سورہ انفال آیت ۷۲)۔ (اگر وہ تم سے دین میں مدد طلب کریں تو تمھارے اوپر مدد کرنا واجب ہے......)۔

۳۔ کسی ملک یا اس کے بعض خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں، اور وہاں کے مسلمان کسی دوسرے مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں، جہاں انھیں پناہ گزیں کا درجہ دیا جاتا ہے، اور انھیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، لیکن شرعاً اسے درست نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ مسلمان ہونے کے اعتبار سے پوری دنیا کے مسلمان ایک جیسے ہیں، ایک ہی ملک میں دو مسلمانوں کے درمیان بنیادی حقوق میں تفریق مناسب نہیں، "المسلمون تتكافأ دماؤهم" (سنن ابوداؤد حدیث ۲۷۵۱، کتاب الجہاد) (مسلمان، ان کے خون ایک جیسے ہیں)۔

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: "إنما المؤمنون اخوة" (الحجرات: ۱۰)۔ (بلاشبہ مومنین بھائی بھائی ہیں)۔

اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (التوبة: ۷۱)۔ (مومن مرد اور مومن عورتیں، بعض، بعض کے ولی (معاون ومددگار) ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا" (صحیح مسلم کتاب البر والصلة ۶۵۳)۔ (مومن، مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے، بعض، بعض کی پشت پناہی کرتا ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے: "المسلم أخو المسلم، لا يظلمه ولا يخذله... الحديث" (صحیح مسلم کتاب البر والصلة ۳۲۳)۔ (مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کی مدد کرنا ترک کرتا ہے)۔

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وأما لا يخذله، فقال العلماء الخذل: ترك الإعانة والنصر، ومعناه إذا استعان به في دفع ظالم ونحوه لزمه اعانته إذا أمكنه ولم يكن له عذر شرعي" (شرح مسلم ۱۶، ۱۲۰)۔ (علماء نے کہا ہے کہ خذل، مدد اور اعانت کا ترک کرنا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب ظالم یا اس کے مثل دفع کرنے کے لئے اس سے مدد طلب کرے، تو اس کی مدد کرنا لازم ہے، جبکہ اس کے لئے ممکن ہو اور کوئی عذر شرعی نہ ہو)۔

یہ آیات واحادیث جن میں اللہ اور اس کے رسول نے، مومنین کے درمیان اخوت اور بھائی چارگی قائم کی ہے، اس کا تقاضایہ ہے کہ مسلمان، خواہ کسی ملک کا

رہنے والا ہو مظلوم ہو کر اپنے ملک یا شہر میں پناہ لیتا ہے تو اس کی مدد کی جائے، اس کو اپنے جیسا سمجھا جائے، اگر چہ پہلے سے کوئی عقد و معاہدہ نہ ہو، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کا قائم کیا ہوا عقد واخوت موجود ہے، ''لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه'' (تم میں کا کوئی کامل مومن نہیں ہوگا یہاں تک کہ پسند کرے اپنے بھائی کے لئے ویسا ہی جیسا اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

نیز قرآن کریم کا مذکورہ فرمان: ''وإن استنصروکم فی الدین، فعلیکم النصر'' (سورۂ انفال: ۷۲) سے بھی یہی حکم ماخوذ ہوتا ہے، اور آیت کریمہ: ''وما لکم لاتقاتلون فی سبیل الله، والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا أخرجنا من هذه القریة الظالم أهلها واجعل لنا من لدنك ولیا واجعل لنا من لدنك نصیرا۔'' (سورۂ نساء آیت ۷۵) سے مظلوم، کمزور مسلمان خواہ کہیں بھی بستے ہوں ان کی مدد کرنا، اور ان کو ظلم سے نجات دلانا فرض معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں صاحب تفسیر قرطبی لکھتے ہیں: ''حض علی الجهاد، وهو یتضمن تخلیص المستضعفین من أیدی کفرة المشرکین الذین یسومونهم سوء العذاب، ویفتنونهم عن الدین، فأوجب تعالی الجهاد لاعلاء کلمته وإظهار دینه واستنقاذ المؤمنین الضعفاء من عباده، وإن کان فی ذلك تلف النفوس'' (الجامع لاحکام القرآن ۵،۲۷۹)۔ (جہاد پر ابھارنا ہے، اور یہ شامل ہے کمزور لوگوں کو ان مشرکین کفار کے ظلم سے نجات دلانے کو، جو ان پر ظلم کرتے ہیں اور دین کی طرف سے آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے جہاد واجب کیا ہے اپنے کلمہ کو بلند اور اپنے دین کو غالب کرنے کے لئے، اور اپنے بندوں میں سے کمزور مومنین کو نجات دلانے کے لئے، اگر چہ اس میں جانوں کا ضیاع ہو)۔

ان آیات کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو کسی ملک میں ظلم اور جبر واستبداد سے دوچار ہیں انکی مدد کرنا، ظلم سے نجات دلانا، ان کے حق میں ظالم ملک کے خلاف آواز اٹھانا اور ان کو اپنے ملک میں جگہ دینا کسی بھی مسلم ملک پر لازم ہے۔

۴۔ کسی ملک کا شہری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک کے مفاد، اسکے اموال وجائداد کے تحفظ اور اس کے دفاع کے حقوق اپنے ذمہ تسلیم اور لازم کئے جائیں، جیسا کہ ملک کے اوپر اس کے شہریوں کے تحفظ، انکی حمایت، ان کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کرنے، ان کے باہمی معاملات وخصومات میں انصاف دلانے وغیرہ کے حقوق عائد ہوتے ہیں، اس لحاظ سے کسی بھی شہری کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخاب میں امیدوار ہونے، ووٹ دینے، سرکاری اداروں میں ملازمت کرنے، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے، سرکاری ہسپتالوں میں علاج، عدالتی چارہ جوئی، روزگار ومعاش، اور پیشگی اجازت کے بغیر ملک کے کسی بھی حصہ میں آمد ورفت کے حقوق حاصل ہونگے۔

۵۔ مسلم ملک میں پناہ لینے والے اگر مسلمان ہیں تو ان کو وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو وہاں کے کسی شہری کو حاصل ہیں، جیسا کہ نصوص مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے، اور اگر پناہ لینے والے غیر مسلم ہیں، تو پھر یہ سربراہان مملکت کی صواب دید پر ہوگا، اولی یہ ہے کہ انھیں پناہ دی جائے۔

''ولا خلاف بین کافة العلماء أن أمان السلطان جائز، لأنه مقدم للنظر والمصلحة، نائب عن الجمیع فی جلب المنافع ودفع المضار'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۸،۷۶)۔

نیز آیت کریمہ میں ارشاد ہے: ''وإن أحد من المشرکین استجارك فأجره حتی یسمع کلام الله ثم أبلغه مأمنه، ذلك بأنهم قوم لایعلمون'' (سورۂ توبہ آیت ۶)۔

اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے: ''وقال ابن القاسم: وکذلك الذی یوجد وقد نزل تاجرا بساحلنا فیقول: ظننت أن لا تعرضوا لمن جاء تاجرا حتی یبیع، وظاهر الأیة إنما هی فیمن یرید سماع القرآن و النظر فی الاسلام، فأما الإجازة لغیر ذلك، فإنما هی لمصلحة المسلمین والنظر فیما تعود علیهم به منفعته'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۸،۷۶)۔ (ابن قاسم نے کہا ہے کہ ایسے ہی وہ شخص جو پایا جائے، حاصل یہ کہ وہ آیا ہو ہمارے علاقہ میں بطور تاجر کے، اور وہ کہے کہ میرا گمان یہ تھا کہ آپ لوگ تجار سے تعرض نہیں کرتے، (یعنی اس کو بھی پناہ دی جائے گی) اور ظاہر آیت یہ ہے کہ یہ حکم اس شخص کے بارے میں ہے جو قرآن سننے اور اسلام کے بارے میں سمجھنے کا ارادہ رکھتا ہو، بہر حال اس کے علاوہ کے لئے اجازت تو مسلمانوں کی مصلحت اور ان کی منفعت کے پیش نظر ہوگی)۔

لہٰذا جو مظلوم ہو کر اسلامی مملکت کی حدود میں بغرض پناہ داخل ہوئے ہیں ان کو مامون ہونے تک پناہ دینا انسانی اخوت کے تقاضہ کو پورا کرنا ہے،

البتہ ان غیر مسلم پناہ گزینوں کو مسلمان شہریوں جیسے حقوق حاصل نہیں ہونگے، ان کو پیشگی اجازت کے بغیر ملک کے کسی بھی حصہ میں آمد ورفت کا حق نہیں ہوگا، اور نہ انتخابات یا انتظامی امور میں کسی طرح کا حق ان کو حاصل ہوگا، اور نہ سرکاری ملازمتوں یا سرکاری اداروں میں تعلیم کا حق ان کو ہونا چاہئے۔

۶۔ مسلمانوں کا غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا شرعی اعتبار سے مختلف فیہ ہوسکتا ہے۔

بعض وجوہ سے یہ ناجائز اور حرام معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کسی مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا، مرادف ہے اس غیر مسلم ملک اور اس کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ محبت وموالاۃ کو، اسکے شریعت مخالف قوانین کے تسلیم کرنے کو، اس کی فوج میں شرکت اور اس کی طرف سے دفاع کرنے کو جو کسی مسلم ملک کے خلاف بھی ہوسکتا ہے، اور قرآن وحدیث میں ان امور سے ممانعت وارد ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين، ومن يفعل ذلك فليس من الله في شئ الا أن تتقوا منهم تقاة، ويحذركم الله نفسه وإلى الله المصير'' (آل عمران ۲۸)۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: ''يأيها الذين آمنوا لا تتخذوا الكافرين أولياء من دون المؤمنين. أتريدون أن تجعلوا لله عليكم سلطانا مبينا'' (النساء ۱۴۴)۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے: ''يأيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض، ومن يتولهم منكم فإنه منهم، إن الله لا يهدي القوم الظلمين'' (المائدہ ۵۱)، نیز اس مفہوم کی متعدد آیات ہیں جس میں کفار ومشرکین کی موالاۃ سے ممانعت وارد ہے۔

اسی طرح اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے خلاف حکم کے بارے میں وارد ہے: ''فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم'' (النساء ۶۵) اور ''ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون'' اور ''أولئك هم الظلمون'' (المائدہ ۴۵، ۴۴)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين'' (سنن ابی داؤد ۲۶۴۵)۔ (میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے بیچ قیام کرے)۔

ایک اور حدیث میں ہے: ''من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله'' (سنن ابوداؤد ۲۷۸۷)۔ (جو شخص مشرک کے ساتھ اٹھے بیٹھے، اور اس کے ساتھ سکونت اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے)۔

جن میں صراحۃً مشرکین کے ساتھ سکونت سے منع کیا گیا ہے، نیز بہز بن حکیم سے مروی ایک حدیث میں مذکور ہے: ''لا يقبل الله عز وجل من مشرك بعد ما أسلم عملاً أو يفارق المشركين إلى المسلمين'' (سنن النسائی ۵، ۸۳، کتاب الزکاۃ)۔

''أي الى أن يفارق، وحاصله أن الهجرة من دار الشرك إلى دار الإسلام واجب على كل من آمن. فمن ترك فهو عاص يستحق رد العمل'' (السندی فی شرحہ)۔

نیز غیر مسلم ممالک میں سکونت کا ایک زبردست نقصان یہ ہے کہ باہمی اختلاط کی وجہ سے غیر مسلموں کی بہت ساری عادات، انکے طور طریقے، انکے رسوم ورواج غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور بہت سارے منکرات کے منکر ہونے کا احساس نہیں رہ جاتا حتی کہ غیر شعوری طور پر کچھ غیر شرعی معتقدات اور افکار ونظریات بھی رچ بس جاتے ہیں۔

اس لئے ایک رجحان تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر اسلامی ممالک کی شہریت نہیں اختیار کرنی چاہئے۔

اور بعض وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ متعدد صحابہ کو ایمان لانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اپنے ہی قبیلہ میں رہنے کا حکم دیا، مگر اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت ابھی کسی اسلامی سلطنت کا قیام نہیں ہوا تھا۔

دوسری وجہ جواز مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت اور وہاں قیام کا حکم دینا ہے، وجہ استدلال، مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی ایک طویل مدت تک مسلمانوں کا حبشہ میں باقی رہنا ہے، مہاجرین حبشہ کی واپسی مدینہ منورہ ۷ ہجری میں ہوئی ہے۔

ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے: ''أن أعرابیا سأل رسول الله ﷺ عن الهجرة فقال: ویحك أن شأن الهجرة لشدید، فهل لك من إبل ؟قال نعم، قال: فهل تؤتی صدقتها ؟ قال نعم، قال: فاعمل من وراء البحار، فان الله لن یترك من عملك شیئا'' (صحیح مسلم، کتاب الاماره)۔ (ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے ہجرت کے متعلق سوال کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہجرت کا معاملہ تو مشکل ہے، کیا تمھارے پاس اونٹ ہیں ؟ اس نے کہا، ہاں، آپ نے فرمایا اس کی زکوۃ ادا کرتے ہو، اس نے کہا، ہاں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گاؤں میں ہی رہ کر عمل کرو، اللہ تعالی تمھارے عمل کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کریں گے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان اپنے فرائض پر عمل کرتا ہے تو کہیں بھی سکونت اختیار کرے، اسکے لئے اجازت ہے۔ اس کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''قال رسول الله ﷺ البلاد بلاد الله والعباد عباد الله، فحیثما أصبت خیرا فأقم'' (مسند احمد ۱۶۶/۱، فیض القدیر ۲۲۳/۳، حدیث ۳۲۲۱)۔ (ملک اللہ کا ہے اور بندے اللہ کے ہیں، جہاں خیر ملے وہاں قیام کرلو) (مگر اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے)۔

دونوں رجحانات کے مآخذ و دلائل کے پیش نظر: ایک رجحان یہ بھی سامنے آتا ہے، کہ بہتر یہ ہے کہ اگر مسلمان کو کسی مسلم ملک کی سکونت میسر ہو تو بلا وجہ شرعی یا ضرورت شدیدہ کسی غیر مسلم ملک کی سکونت اختیار نہ کرے، بسا اوقات ایک مسلمان ملک میں ہی شریعت کا پابند مسلمان ظلم وستم کا شکار ہوتا ہے، اس کے لئے اپنے شرعی احکام پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے، اور کسی دوسرے مسلم ملک میں رہائش کی سہولت میسر نہیں ہوتی، اور کسی غیر مسلم ملک میں اسے اپنی شریعت پر عمل کی آزادی ملتی ہے، جیسا کہ موجودہ دور میں اکثر ممالک کا یہی حال ہے، تو اس صورت میں کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

اسی طرح وہ مسلمان جو کسی غیر مسلم ملک کے ہی اصل باشندہ ہیں، اور انکے لئے وہاں اپنی شریعت پر عمل کرنے میں کوئی پابندی اور مشکل نہیں ہے تو ان پر اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی مسلم ملک کی طرف ہجرت کو لازم وواجب نہیں کہا جائیگا، کیونکہ علی الاطلاق ہجرت کی فرضیت فتح مکہ سے پہلے تک ہی تھی "لا هجرة بعد الفتح"۔

اسی طرح اگر کوئی مسلمان دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی سکونت اختیار کرتا ہے تو اسے بھی ناجائز نہیں ہونا چاہئے "انما الأعمال بالنیات"۔ محض معاشی مفاد کی غرض سے کسی غیر مسلم کی سکونت کو اختیار کرنا درست نہیں ہوگا۔ ان نصوص کے پیش نظر جو غیر مسلموں کے ساتھ رہائش کی ممانعت پر مشتمل ہیں۔

۷۔ البتہ مسلم ملک میں غیر مسلم کو سکونت ورہائش کی اجازت دی جاسکتی ہے، مدینہ منورہ میں اسلامی قوت وغلبہ کے بعد بھی وہاں یہودیوں کو رہائش کی اجازت تھی اور اسکے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اسلامی ریاست میں توسیع ہوئی، اور خلافت راشدہ، خلافت امویہ، خلافت عباسیہ اور خلافت عثمانیہ، تمام ہی ادوار میں غیر مسلموں کو اسلامی سلطنت میں، مستقل شہری کی حیثیت سے رہائش کی اجازت رہی ہے، خواہ جزیہ لیکر یا بغیر جزیہ کے، اور ان کے حقوق کی رعایت کی گئی ہے، البتہ جزیرۃ العرب میں بشمول یہود ونصاری کسی بھی غیر مسلم کو مستقل رہائش کی اجازت نہیں دی جائیگی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''أخرجوا المشرکین من جزیرة العرب'' اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''قال الطبری: فیه أن علی الإمام إخراج کل من دان بغیر دین الإسلام من کل بلد غلب علیها المسلمون عنوة إذا لم یکن بالمسلمین ضرورة إلیهم کعمل الأرض ونحو ذلك'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ۲۷۱/۶، ح ۳۱۶۸)۔ (مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کرو،...... طبری نے کہا ہے کہ اس حدیث میں یہ ہے کہ امام پر واجب ہے کہ ہر اس شخص کو جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین پر ہو۔ اس کو ہر اس ملک سے نکال دے، جس پر مسلمانوں کا قبضہ بزور قوت ہوا ہو، جبکہ مسلمانوں کو ان کی ضرورت نہ ہو)۔

اگر چہ اس صورت میں بھی اس کا خدشہ ہے کہ ان کے غیر اسلامی عادات واطوار، اختلاط کی وجہ سے مسلمانوں میں سرایت کریں گے، لیکن اس کی تلافی ممکن ہے، اس لئے کہ غلبہ اسلامی قوت کا ہوگا، اور اس خطرہ کے پیش نظر ان پر کچھ پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں، نیز حاکم وقت کی صوابدید پر اور عام مسلمانوں کے مفاد کی مصلحت میں ان کو حسب ضرورت وتقاضا، انتظامی امور میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

حقوق شہریت کی حقیقت واصلیت شرعی نقطہ نظر سے

مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری[1]

۱۔ اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق کو ہی اساس و بنیاد بنایا جائے گا، تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان کا وجود، خالق و مالک نے جس طرح اس کی طبعی زندگی کے لئے ہوا، پانی، خوراک، روشنی اور دوسرے بے شمار اسباب زندگی فراہم کئے ہیں اسی طرح اسے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ضابطہ حیات بھی آغاز زندگی کے ساتھ ہی عطا کردیا گیا تھا۔ دنیا میں بھیجنے اور منصب خلافت پر فائز کرنے سے پہلے اسے حقوق و فرائض کا شعور عطا کردیا گیا تھا اور اسباب زندگی کی فراہمی کے ساتھ ہی آداب زندگی بھی سکھادیا گیا تھا (سورہ بقرہ: ۳۰ تا ۳۸، معارف القرآن ۱/ ۱۱۸ تا ۱۲۸، تفہیم القرآن ۱/ ۶۳ تا ۶۹ مرکزی جماعت اسلامی ہند پبلشرز نئی دہلی ۲۰۰۴، نیز اس کی تفصیلات کے لئے دیکھئے: بنیادی حقوق ص ۱۱۷ تا ۱۲۴ محمد صلاح الدین ایڈیٹر جسارت مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۹ء)۔

حق کا مطلب ہے ثابت قدم، یعنی ٹھہرنے والا، نہ مٹنے والا، جو بات ثابت ہو اٹل ہو اور امٹ ہو اسے "حق" کہا جاتا ہے، "حق" اللہ تعالی کا نام بھی ہے، کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کون ہے جو ثابت ہو، اٹل اور امٹ ہو، ارشاد باری تعالی ہے: "انه لحق مثل ما أنكم تنطقون" (سورۂ ذاریات: ۲۳) (وہ برحق ہے جیسا تم باتیں کر رہے ہو)۔ حق کے معنی سچ کے بھی ہیں کیونکہ سچائی اٹل اور امر ہوتی ہے، حق اس مانگ کو بھی کہتے ہیں جو پکی اور سچی ہو، جس سے آپ انکار نہ کرسکیں، جن کا پورا کرنا ضروری ہو، جیسے اللہ کا حق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق، ماں باپ کا حق، استاد کا حق، بہن بھائی اور رشتہ داروں کا حق، پڑوسیوں، محلہ والوں، گاؤں والوں کا حق، حکمراں کا حق، عوام و رعایا کا حق، ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک حق دار کا حق پہنچانے اور اس کو ادا کرے اسی طرح حکمراں کا فرض ہے کہ عوام و رعایات کا حق جو ان پر ہے اس کو پہنچانا اور اس کو ادا کرے، ارشاد گرامی ہے: "فاعط كل ذى حق حقه" (ترمذی ۲۰۶۷، ابواب الزهد. باب هذا حديث صحيح) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پھر تو ہر ایک حق دار کو اس کا حق ادا کرو) اس سے یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ حقوق شہریت بھی تمام انسانوں کے لئے واجبی و لازمی حقوق ہیں یہ ایسے بنیادی حقوق ہیں جس سے دست برداری مشکل ترین اور کٹھن مرحلہ ہے، بلکہ ان حقوق کے نہ ملنے کی صورت میں عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ حقوق حاصل کرنے کا شرعا حق حاصل ہے۔

۲۔ شہریت دراصل اس وابستگی کی بنیاد ہے جو موجودہ حکومتوں کے لئے "وطنیت" کو شناخت قرار دیتی ہے، شہریت اس مٹی سے وابستگی کا نام ہے جو ایک جغرافیائی دائرہ کے اندر محدود ہوتی ہے، اس مٹی سے جو بھی وابستہ ہوں گے وہ شہری ہوں گے اور شہریت کے وہ سارے حقوق اور ذمہ داریاں ان پر عائد ہوں گی (حقوق شہریت ص ۶ طبع قاضی پبلشرز نئی دہلی)۔

عصر حاضر میں مساوات اور قومی سالمیت اور انسانی آزادی کے احترام کا دور جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوا ہے اس کو عام طور پر لوگ اس جدید مغربی انقلاب سے منسوب کرتے ہیں جس کی ایک علامت اقوام متحدہ ہے، مگر خود جدید انقلاب اور اقوام متحدہ اس اسلامی انقلاب کی پیداوار ہیں جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے عالمی سطح پر پیدا کیا تھا (سفرنامہ غیر ملکی اسفار جلد اول ص ۷۶ ۳ مولانا وحید الدین خاں)۔

بین الاقوامی ادارہ حلف الفضول "اقوام متحدہ" کا قیام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ۵۸۶ھ میں ہوا، اس ادارہ کی تشکیل و تالیف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معاونت کی تھی اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۰ سال کی تھی، ان کے چار ارکان تھے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں: فضل، فضالہ، مفضل، فضیل، عبداللہ بن جدعان بنی تیم کے سردار کے گھر پر اس ادارہ کی تشکیل ہوئی تھی (حلف الفضول کی تفصیل کے لئے دیکھئے: لسان العرب ۱۱/ ۵۲۷ دار صادر بیروت لبنان)۔

---

[1] مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھروارہ، دربھنگہ، بہار۔

عصر حاضر میں اقوام متحدہ نے جو انسانی حقوق کا چارٹر تیار کیا ہے، ۳۰ دفعات پر مشتمل جن میں شہریت سے متعلق دفعات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہر فرد کو اپنی حدود ریاست میں نقل وحرکت اور رہائش کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

۲۔ ہر فرد کو بیرون ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہوگا۔

۳۔ ہر فرد کو ظلم وتشدد سے بچنے کے لئے دوسرے ممالک میں پناہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔

۴۔ ہر فرد کو شہریت حاصل کرنے کا حق ہوگا۔

۵۔ کسی فرد کو بلا جواز اس کی شہریت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ شہریت کی تبدیلی کا حق سلب کیا جائے گا۔

۴۔ آئین بھارت کے تناظر میں حقوق شہریت کی وضاحت وصراحت:

دفعہ ۵۔ اس آئین کی تاریخ نفاذ پر ہر وہ شخص بھارت کا شہری ہوگا جس کی بھارت کے علاقہ میں مستقل جائے سکونت ہو اور

الف۔ جو بھارت کے علاقہ میں پیدا ہوا تھا، یا

ب۔ جس کے والدین میں سے کوئی ایک بھارت کے علاقہ میں پیدا ہوا تھا، یا

ج۔ جو ایسی تاریخ نفاذ کے عین قبل کم سے کم پانچ سال تک بھارت کے علاقہ کا معمولا باشندہ رہا ہو۔

دفعہ ۶۔ دفعہ ۵ میں کسی امر کے باوجود کسی شخص کا جس نے اس علاقہ سے جو اس وقت پاکستان میں شامل ہے بھارت کے علاقہ میں ترک وطن کیا ہے، اس آئین کی تاریخ نفاذ پر بھارت کا شہری ہونا متصور ہوگا اگر۔

الف۔ وہ یا اس کے والدین میں سے کوئی ایک یا اس کے والدین کے والدین میں سے کوئی بھارت میں جس کی تعریف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں کی گئی ہے (جیسا کہ وہ ابتداء وضع کیا گیا تھا) پیدا ہوا تھا؛

ب۔ (۱) اس صورت میں جب ایسے شخص نے ۱۹ رجولائی ۱۹۴۸ء سے پہلے اس طرح ترک وطن کیا ہو کہ وہ اس کے ترک وطن کرنے کی تاریخ سے بھارت کے علاقہ کا معمولا باشندہ رہا ہو، یا۔

(۲) ایسی صورت میں جب ایسے شخص نے ۱۹ رجولائی ۱۹۴۸ء کو یا اس کے بعد بھارت میں اس طرح ترک وطن کیا ہے کہ اس کا نام بھارت ڈومینین کی حکومت کے اس بارے میں تقرر کئے ہوئے کسی عہدہ دار نے اس کی درخواست پر بھارت کے شہری کی حیثیت سے درج رجسٹر کیا ہو جو اس نے اس عہدہ دار کو اس حکومت کے مقرر کئے ہوئے نمونہ اور طریقہ کے مطابق اس آئین کی تاریخ نفاذ کے قبل اس غرض سے دے دی ہو۔

بہ شرط کہ کسی شخص کا اس طرح سے درج رجسٹر نہ ہوگا بہ جز اس کے کہ وہ بھارت کے علاقہ کا اس کی درخواست کی تاریخ سے عین قبل کم سے کم چھ ماہ تک باشندہ رہا ہو (دیکھئے بھارت کا آئین ص ۴۰ تا ۴۲ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی)۔

اسلامی تناظر کی روشنی میں شہریت حاصل ہونے یا کرنے کے لئے کسی ملک میں بود وباش اختیار کر لینے، وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینے، ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام کرنے کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے، قرآن وسنت سے یہ بات واضح ہے کہ ہر شخص کو ساری سہولیات حاصل ہے، اب اگر اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو اس کی ڈکٹیٹر شپ ہوگی اس کے لئے دیکھئے (سورۂ بقرہ: ۳۰ تا ۳۸، ۸۵، سورۂ اعراف: ۱۲۸، سورۂ روم ۲۱ تا ۲۳، مسند امام احمد بن حنبل ۸۶/۲۴، مسلم ۱۲۶/۲، بین الاقوامی منشور کی دفعہ ۱۵) ہر فرد کو شہریت حاصل کرنے کا حق ہوگا، کسی فرد کو بلا جواز اس کی شہریت سے محروم نہیں کیا جائے گا، اور نہ شہریت کی تبدیلی کا حق سلب کیا جائے گا، ہر ملک کے حکمراں کو ایسے شخص کو خوشی بہ خوشی حقوق شہریت دے دینی چاہئے اس میں ٹال مٹول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

غیر ملکی مسلمان کسی ملک کی شہریت اختیار کرنے کی خواہش کرے تو اس کی درخواست قبول کرنا شرعا ضروری ہوگا:

اگر ایک مسلم ملک یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعا ضروری ولابدی ہوگا، فتح مکہ کے وقت بہت سے روسا قریش جو پہلے سے اسلام کی حقانیت کا یقین رکھتے

تھے، مگر برادری کے خوف سے اظہار نہ کر سکتے تھے، اب ان کو موقع مل گیا وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے اور جو اس وقت بھی اپنے قدیم مذہب کفر پر جمے رہے ان کو بہ جز معدودے چند افراد کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو جان و مال کا امان دے کر پیغمبرانہ اور معجزانہ اخلاق کا ثبوت دیا جس کا دوسرے لوگوں سے تصور بھی نہیں ہو سکتا، ان کی تمام گذشتہ عداوتوں اور مظالم اور بے رحمی کے واقعات کو یکسر نظر انداز فرما کر ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اس وقت کہی تھی، جبکہ وہ والدین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے پاس مصر پہنچے (معارف القرآن ۵/۳۰۹)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت مغلوب دشمنوں کے ساتھ بے نظیر کریمانہ سلوک کیا اور یہ ایک مجبور مسلمان ہے جو مسلم ملک کے حکمراں سے اپنے یہاں امن و امان کے ساتھ سکونت پذیر ہونے کی درخواست کرتا ہے تو بدرجہ اولی اس کی درخواست کو قبول کرنا چاہئے، کیونکہ یہ اقدام اسوہ حسنہ کے مطابق ہے۔

”وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلك بأنهم قوم لا يعلمون“ (سورۂ توبہ:۶) (اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا، پھر پہنچادے اس کو اس کی امن کی جگہ، یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے)۔

تشریح: اس آیت سے بھی چند مسائل اور فوائد حاصل ہوئے جن کو امام ابوبکر جصاص نے تفصیل سے بیان کیا ہے، اول یہ کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کافر مسلمان سے اس کا مطالبہ کرے کہ مجھے اسلام کی حقانیت دلیل سے سمجھاؤ تو مسلمان پر لازم ہے کہ اس کا مطالبہ پورا کریں۔

دوسرے یہ کہ جو شخص اسلام کی تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس آئے تو ہم پر واجب ہے کہ اس کو اجازت دیں اور اس کی حفاظت کریں، اس کو کسی قسم کی تکلیف یا نقصان پہنچانا جائز نہیں، تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے، جبکہ اس کے آنے کا مقصد اللہ کا کلام سننا اور اسلام کی تحقیق کرنا ہو اور اگر کوئی دوسری غرض تجارت وغیرہ ہو تو وہ مسلمانوں کے مصالح اور حاکم مسلمین کی صوابدید پر موقوف ہے، مناسب سمجھے تو اجازت دے، ورنہ اختیار ہے، تیسرے یہ کہ غیر مسلم حربی جس کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ نہ ہو اس کو ضرورت سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے چوتھے یہ کہ مسلمان حاکم وامیر کے فرائض میں سے ہے کہ جب کوئی حربی غیر مسلم کسی ضرورت کی بنا پر ہم سے اجازت (ویزا) لے کر ہمارے ملک میں داخل ہو تو اس کے حالات پر نظر رکھے اور جب وہ اپنا کام پورا کر چکے تو اس کو حفاظت کے ساتھ واپس کردے (تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ۴/ ۳۱۸، ۳۱۹)۔

”لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا اليهم إن الله يحب المقسطين“ (سورۂ ممتحنہ:۸) (اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان سے کرو بھلائی اور انصاف کا سلوک بے شک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو)۔

تشریح: صحیح بخاری حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ ان کی والدہ بہ حالت کفر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہنچیں، مسند احمد کی روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے، جبکہ غزوہ حدیبیہ کے بعد قریش مکہ سے معاہدہ صلح ہو گیا تھا اور ان کی والدہ کا نام قتیلہ ہے، یہ اپنی بیٹی اسماء کے لئے کچھ تحفے ہدیے لے کر مدینہ طیبہ پہنچیں تو حضرت اسماءؓ نے ان کے تحفے کو قبول کرنے سے انکار کردیا، اور اپنے گھر میں آنے کی بھی اجازت اس وقت تک نہ دی جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کرلیا، غرض حضرت اسماءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری والدہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی ہیں اور وہ کافرہ ہیں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی والدہ کی صلہ رحمی کرو، یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو؟ اس پر یہ آیات نازل ہوئی "لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين" (سورۂ ممتحنہ:۸)، یعنی روایات میں ہے کہ حضرت اسماءؓ کی والدہ قتیلہ کو صدیق اکبرؓ نے زمانہ جاہلیت میں طلاق دے دی تھی، حضرت اسماءؓ اسی کے بطن سے تھیں اور ان کی بہن ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیق اکبرؓ کی دوسری بیوی ام رومان کے بطن سے تھیں، یہ مسلمان ہو گئی تھیں (ابن کثیر ومظہری)۔

اس آیت میں ایسے کفار جنہوں نے مسلمانوں سے مقابلہ نہیں کیا، اور ان کے گھروں سے نکالنے میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا ان کے ساتھ احسان کے معاملہ اور اچھے سلوک اور عدل وانصاف کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، عدل وانصاف تو ہر کافر کے ساتھ ضروری ہے جس میں کافر ذمی اور مصالح اور کافر حربی ودشمن سب برابر ہیں، بلکہ اسلام میں تو عدل وانصاف جانوروں کے ساتھ بھی واجب ہے کہ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بار نہ ڈالے اور ان کے چارے اور آرام کی نگہداشت رکھے، اس آیت میں اصل مقصود بر واحسان کرنے کی ہدایت ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ۸/ ۴۰۵، ۴۰۶)۔

زبدۃ الخلاصہ: سورۂ توبہ آیت ۶ سے یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ جب اللہ تعالی ایک مشرک کو پناہ دینے کی اجازت دیتے ہیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا

حکم دیتے ہیں تو پھر مجبوری و اضطراری حالت میں ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان کسی دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً بہ درجہ اولیٰ واجب ہوگیا، کیونکہ یہ مظلوم اور بے آسرا ہے مصیبت زدوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کی ضرورت ہے، جب یہ شخص مستقل سکونت پذیر ہونے کے لئے درخواست دے رہا ہے، تاکہ اس ملک کے سماج میں گھل مل کر اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کر سکے تو اس مسلم ملک کے حکمراں کو شرعی نقطہ نظر سے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجازت دے کر اپنی عاقبت بنانے کی سعی بلیغ کرنی چاہئے، اس سے ان کے ملک کی آبادی بڑھے گی، تجارت و معیشت کی منڈی آباد ہوگی اور خوشحالی آئے گی، طرح طرح کے بیش بہا فوائد حاصل ہوں گے۔

سورۂ ممتحنہ آیت ۸ سے بھی یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اصل مقصود بر و احسان کرنے کی ہدایت کر رہے ہیں، حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں؛ عہد جاہلیت کے ہر اچھے اخلاق کو اسلام نے برقرار رکھا اور ہر بری عادت و اخلاق سے باز رہنے کا حکم دیا، اسلام نے گھٹیا اخلاق اور ناپسندیدہ عادات سے روک دیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قبائل عرب کے سامنے دعوت اسلام پیش کرنے کا حکم دیا، چنانچہ حج کے موقع پر قبیلہ ابن شیبانی بن ثعلبہ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور انہیں اسلام اور اپنے تعاون کی دعوت دی۔

ان تمام معروضات کی روشنی میں یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ اس دوسرے مسلم ملک کے سربراہ اعلیٰ پر اس مظلوم تارکین وطن کی درخواست کو شرعاً قبول کرنا واجب ہوگا۔

پناہ گزیں کو آئین شرعی کی روشنی میں شہری کا درجہ ملے گا:

بعض دفعہ کسی خاص خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں اور وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں تو انہیں پناہ گزین کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا یہ بات شرعاً درست ہے؟ یہ اسلام کی تعلیم نہیں ہے، اسلام ہمدردی، غم خواری خیر خواہی، تعاون و امداد، محبت و الفت احسان و سلوک کا درس دیتا ہے کہ انسان بھی اپنے رب کا پرتو کا پیکر ہے، اس کی سیرت و کردار، گفتار و رفتار سے رحم دلی کا مظاہرہ ہو، شرعی نقطہ نظر سے مسلم ملک کے حکمراں کا یہ رویہ اور سلوک قطعاً درست نہیں ہے، بلکہ سراسر ظلم و ستم ہے اور کیا یہ بات جائز مانی جاسکتی ہے کہ مسلمان تارکین وطن کو دوسرے مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں نہیں دی جائیں؟، جب یہ پناہ گزیں کسی مسلم ملک میں آکر زندگی بسر کرنے لگیں، اس کے ساتھ اپنی وابستگی اور فرمانبرداری کا اظہار بھی کرتے ہوں تو پھر اب تارکین وطن کو اس مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب“ (سورۂ مائدہ: ۲) (اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیز گاری پر اور مدد نہ کرو گناہ اور ظلم پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے)۔

”إنما الصدقات للفقرآء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفة قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضة من اللہ واللہ علیم حکیم“ (سورۂ توبہ: ۶۰) (زکوۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور راہ کے مسافر کو ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے)۔

چنانچہ زیاد بن حارث صدائی یہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اس مجلس میں حاضر تھا کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ سوال لے کر حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب دیا کہ صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے بھی حوالہ نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرمادیئے، اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں (معارف القرآن ۴/ ۳۹۳) عصر حاضر کے پناہ گزیں تارکین وطن حضرات بھی اس زمرہ میں شامل ہوں گے اور اسی سے سارے حقوق ولوازمات بھی ثابت ہوں گے، شہریت اسلامی حکومت یا غیر اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان کا حق ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہو، یہاں اپنے مل کو چھوڑ کر آتا ہو، ہر حال میں حقوق شہریت پانے کا مستحق ہے۔

”ان الذین امنوا وھاجروا وجاھدوا بأموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین اووا ونصروا اولائك بعضھم اولیاء بعض والذین آمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شئ حتی یھاجروا وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر إلا علی قوم بینکم وبینھم میثاق واللہ بما تعملون بصیر“ (سورۂ انفال: ۷۲)۔

(جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کی جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں، رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے، مگر ہجرت کر کے (دار اسلام) میں آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے)۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ اس کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی ایک اہم دفعہ ہے، اس میں یہ اصول مقرر کیا گیا ہے کہ "ولایت" کا تعلق صرف ان مسلمانوں کے درمیان ہوگا جو یا تو دارالاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر باہر سے آئیں تو ہجرت کر کے آئیں باقی رہے وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے حدود ارضی سے باہر ہوں، تو ان کے ساتھ مذہبی اخوت تو ضرور قائم رہے گی، لیکن "ولایت" کا تعلق نہ ہوگا، اور اسی طرح ان مسلمانوں سے بھی یہ تعلق ولایت نہ رہے گا جو ہجرت کر کے نہ آئیں، بلکہ دارالکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے دار اسلام میں آئیں، "ولایت" کا لفظ عربی زبان میں حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات کے لئے بولا جاتا ہے، اور اس آیت کے سیاق وسباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے، اور شہریوں کا اپنی ریاست سے، اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے، پس یہ آیت "دستوری وسیاسی ولایت" کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے، اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج قرار دیتی ہے، اس عدم ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے، مثال کے طور پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اسی عدم ولایت کی بنا پر دارالکفر اور دار اسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے ہیں، ایک دوسرے کے قانونی ولی (Guardian) نہیں بن سکتے، باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے، اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے یہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دارالکفر سے شہریت کا تعلق نہ توڑا ہو، علاوہ ازیں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے، اس کی رو سے دولت اسلامیہ کی ذمہ داری ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہیں، باہر کے مسلمانوں کے لئے کسی ذمہ داری کا بار اس کے سر نہیں ہے، یہی وہ بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ "انا بریٔ من کل مسلم یقیم بن أظہر المشرکین" (میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت وحفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو) اسی طرح اسلامی قانون نے اس جھگڑے کی جڑ کاٹ دی ہے جو بالعموم بین الاقوامی پیچیدگیوں کا سبب بنتا ہے، کیونکہ جب کوئی حکومت اپنے حدود سے باہر رہنے والی بعض اقلیتوں کا ذمہ اپنے سر لے لیتی ہے تو اس کی وجہ سے ایسی الجھنیں پڑ جاتی ہیں جن کو بار بار کی لڑائیاں بھی نہیں سلجھا سکیں (تفہیم القرآن ۲/۱۶۱ تا ۱۶۲، حقوق شہریت رص ۶۷ تا ۷۲)۔

راشد غنوشی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں: شہریت اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان کا حق ہے دو بنیادی قسم کے لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں، ایک اسلامی حکومت میں سکونت پذیر مسلمان اس کی دلیل درج بالا آیت ہے، دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں اصطلاح میں ذمی کہا جاتا ہے، اس قسم میں علامہ مودودی کے بقول وہ تمام غیر مسلم لوگ آتے ہیں جو اسلامی حکومت کے حدود میں رہتے ہوں، اس کے ساتھ اپنی وابستگی اور فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہوں، قطع نظر اس سے کہ وہ دیار اسلام ہی میں پیدا ہوئے ہوں یا دوسری جگہ سے آ کر حکومت سے درخواست گزار ہوئے ہوں کہ انہیں اہل ذمہ میں شامل کرلیا جائے، اسلام ایسے تمام لوگوں کو ملک کے داخلی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے برابر حقوق عطا کرتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: حقوق شہریت ۷۳/۷۸)۔

زبدۃ الخلاصہ: سورۂ انفال: ۷۲ میں شہریت کے لئے دو بنیادوں کا ذکر ہوا ہے، ایک ایمان اور دوسرے دیار اسلام میں سکونت یا اس کی جانب ہجرت، لہذا کوئی مسلمان شخص اگر دیار اسلام کی جانب ہجرت نہیں کرتا ہے اور اسے اپنا وطن بناتا ہے، تو وہ دیار اسلام والوں میں شمار نہیں ہوگا، یعنی جو لوگ دیار اسلام میں سکونت پذیر ہوں خواہ وہیں ان کی پیدائش ہوئی یا دیار کفر سے منتقل ہو کر وہاں آ گئے ہوں وہ دیار اسلام والوں میں شمار ہوں گے اور سبھوں کے حقوق برابر ہوں گے (نظریۃ اسلام وہدیہ رص ۳۰۰ تا ۳۰۱، از مولانا سید ابوالاعلی مودودی بحوالہ حقوق شہریت رص ۷۳)۔

صورت مسئولہ فی السوال کی بھی دراصل حقیقت یہی ہے، لیکن ڈکٹیٹر شپ والے کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ان کے نزدیک مسلم سے زیادہ سپر پاور، اور یہودیوں کی حیثیت ہے، اس کی آواز پر غیروں کو دینے کے لئے تیار رہتے ہیں، کیونکہ وہ آقا ومولا ہے، تف ہے ایسی زندگی پر، لیکن اپنے مظلوم تارکین وطن بھائیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتے، بہر حال مظلوم مسلمان تارکین وطن کیا ذمیوں کے مقابلہ میں کم تر درجہ رکھتے ہیں، اس لئے یہ فرق امتیاز

کیا جارہا ہے، اسلامی قانونی نقطہ نظر سے حقوق میں مسلم ذمی و دیگر اقوام برابر ہیں، کسی مسلم والی کو ان میں ترمیم و تنسیخ کا کوئی جواز نہیں ہے تو اس سلسلے میں بھی ان کو ردوبدل اور فرق و امتیاز کا کوئی حق جواز نہیں ہوگا۔

یہ لوگ دیار کفر سے ستم رسیدہ ہو کر دیار اسلام میں آ گئے ہیں، اس لئے یہ تمام تارکین وطن دیار اسلام والوں میں شمار ہوں گے اور سبھوں کے حقوق برابر ہوں گے اور ان لوگوں کو بھی قدیم باشندوں کی طرح شہری تسلیم کیا جائے گا اور ایک شہری ہونے کی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی (تفصیل کے لئے دیکھئے: الجہاد فی الاسلام)۔

اسلامی نقطہ نظر سے شہریت کے جمیع بنیادی وفاقی حقوق مانے جائیں گے:

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان کا وجود انسان کے خالق و مالک نے جس طرح اس کی طبعی زندگی کے لئے ہوا، پانی، خوراک، روشنی اور دوسرے بے شمار اسباب زندگی فراہم کئے ہیں، اسی طرح اسے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ضابطہ حیات بھی آغاز زندگی کے ساتھ عطا کر دیا تھا۔

قرآن کی پیش کردہ تاریخ انسانی حقوق اس امر کا واضح ثبوت مہیا کر دیتی ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور اولین انسان کی پیدائش کے دن سے موجود ہے، اور اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان حقوق کا ماخذ کیا ہے؟۔

اہل مغرب کا دعوی ہے کہ بنیادی حقوق کی تاریخ صرف تین چار سو سال پرانی ہے، اور انہوں نے اس عرصے میں اپنے یہاں بڑی جدوجہد اور کاوشوں سے جو کچھ حاصل کیا ہے آج پوری دنیا اس سے فیض یاب ہو رہی ہے، لیکن قرآن جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس دن اولین انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا تھا بنیادی حقوق اسی دن سے اس کے احساس و شعور کا حصہ ہیں، اور ان کا حصول و تعین اس کا اپنا کارنامہ نہیں، بلکہ خود مقتدر اعلی نے اسے بہ تدریج یہ حقوق عطا کئے ہیں، آج جہاں کہیں ان حقوق کی بازگشت سنائی دے رہی ہے وہاں الہامی تعلیمات کے پرتو ہی سے بنیادی حقوق کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔

قرآن کی پیش کردہ تاریخ کے آئینہ میں دیکھا جائے تو فطری حقوق (Natural Rights) اور پیدائشی حقوق (Birth Rights) کی اصطلاح استعمال کرنے کا حق صرف اسلام کو ہے، کیونکہ ان اصطلاحوں کے سلسلہ میں مغرب کے تصور حقوق میں جو ابہام پایا جاتا ہے وہ یہاں موجود نہیں ہے، اسلام اس سوال کا واضح جواب دیتا ہے کہ ان حقوق کو متعین کس نے کیا ہے؟ جبکہ نظریہ فطری حقوق کے مغربی علم بردار (Benthem) اور دوسرے معترضین نے اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے کہ فطرت سے ان کی کیا مراد ہے؟ اور ان حقوق کا تعین کرنے والی اتھارٹی کون ہے؟ بہ الفاظ دیگر ان کی پشت پر سند جواز (Senction) کیا ہے؟ اسلام نے حقوق کے فطری اور پیدائشی پہلو کو پوری وضاحت سے پیش کر کے اس طرح کے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: بنیادی حقوق، ص ۱۴۷ تا ۱۶۷)۔

اسلامی نقطہ نظر سے شہریوں کو جن بنیادی حقوق کی سہولتیں فراہم کی گئی ہے جو بلا امتیاز عقائد تمام شہریوں کو بہ حیثیت انسان یکساں طور پر حاصل ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

تحفظ دین کا حق، تحفظ نفس کا حق، تحفظ نسل کا حق، تحفظ مال کا حق، تحفظ عقل کا حق، تحفظ عزت و آبرو کا حق، تحفظ نجی زندگی کا حق، تحفظ شخصی آزادی کا حق، عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت کا حق، ظلم کے خلاف احتجاج کا حق، آزادی اظہار رائے کا حق، آزادی ضمیر و اعتقاد کا حق، آزادی تنظیم و اجتماع کا حق، مساوات کا حق، حصول عدل و انصاف کا حق، تحفظ معاش کا حق، معصیت سے اجتناب کا حق، سیاسی زندگی میں شرکت کا حق، آزادی نقل و حرکت اور سکونت کا حق، آزادی نقل و حرکت و ہجرت کا حق، اجرت و معاوضہ کا حق، ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق، مذہبی دل آزادی سے تحفظ کا حق، تحفظ ناموس خواتین کا حق، شکوک و شبہات کی بنا پر کاروائی نہ کرنے کا حق، نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون کا حق، معذوروں اور کمزوروں کے تحفظ کا حق، ووٹ دینے کا حق، الیکشن میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ و دو کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر بلا اجازت آمد و رفت کا حق، تجارت اور صنعت و حرفت کا حق، مقامات مقدسہ کے تحفظ کا حق، ازدواجی زندگی گذارنے کا حق، رہبانیت سے اجتناب کا حق، ازدواجی زندگی میں شقاق و نفاق حائل ہو جانے پر طلاق کا حق، مسلم لا کے تحفظ کا حق، مسلم اوقاف کے تحفظ کا حق، مساجد و مدارس کے تحفظ کا حق، خانقاہ و مقابر کے تحفظ کا حق، عورت کا حق مہر، عورت کو خلع کا حق، عورت کو نفقہ کا حق، قصاص و خون بہا کا حق، وراثت و وصیت کا حق، معاملات کا حق، تعزیرات و محاربت کا حق، عورت کو عصمت و عفت کی زندگی گذارنے کا حق، عورت کو اپنے محرم کے علاوہ نامحرم سے پردہ کرنے کا حق، عورت

کو گھر میں پردہ نشیں رہنے کا حق، یہ سب بنیادی حقوق میں شامل ہیں ان حقوق کو کوئی سلب و غصب نہیں کرسکتا، کیونکہ اللہ تعالی کی جانب سے عطا کردہ حقوق ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: انسان کے بنیادی حقوق ص ۳ تا ۱۲۹)۔

بنیادی حقوق کی وضاحت ایڈیٹر جسارت کی زبانی:

ان حقوق کی ضمانت ملک کے عام قوانین کی بہ جائے سب سے بالاتر قانون ''دستور'' میں دی جاتی ہے انہیں ''بنیادی حقوق'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی باز و خواہ وہ انتظامی ہو یا قانون ساز ان کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا، یہ حقوق فرد کو کسی ریاست کا شہری ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ عالمگیر انسانی برادری کا رکن ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوتے ہیں، یہ رنگ، نسل، علاقے، زبان اور دوسرے تمام امتیازات سے ماوراء ہیں اور انسان کو محض انسان ہونے کی بنا پر حاصل ہیں اور اس کے وجود کا لازمی حصہ ہیں، کوئی ریاست انہیں تسلیم یا نافذ کرنے سے گریز کرتی ہے تو اسے فطرت کے عطا کردہ حقوق کو غصب کرنے کا مجرم سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ حقوق غیر منفک (nalianable) اور نا قابل تنسیخ (Irrevocable) ہیں، ریاست کو ان کی تنسیخ تو کجا ان میں ترمیم، تحدید یا کسی عذر کی بنا پر ان کے عارضی تعطل کا بھی اختیار نہیں، الا یہ کہ خود مقتدر اعلی یعنی عوام نے اسے دستور میں متعین حدود و شرائط کے ساتھ یہ اختیار بخشا ہو، یہ گنجائش بھی صرف مغرب کے دساتیر میں رکھی گئی ہے، اسلامی دستور میں کسی بھی فرد، ادارے، بلکہ بہ حیثیت مجموعی پوری امت تک کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ بنیادی حقوق کو کسی بھی صورت میں منسوخ، محدود یا معطل کرسکے (بنیادی حقوق ص ۲۶)۔

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) اور قانونی حقوق (Legal Rights) میں آ کر اس کے سوا اور کیا فرق ہے کہ بنیادی حقوق ناقابل ترمیم و تنسیخ ہیں، یہ ریاست کے عام اختیارات قانون سازی سے ماوراء ہیں......اس کے برعکس قانونی حقوق عام قانون سازی (Legislation) کے دائرہ میں آتے ہیں اور ریاست جب چاہے اپنے اختیارات قانون سازی کے ذریعہ ان میں ترمیم و تنسیخ اور کمی بیشی کرسکتی ہے۔

شریعت اسلامی کی روشنی میں پناہ گزینوں کو بھی شہریت کے سارے حقوق حاصل ہوں گے:

شریعت اسلامی میں پناہ گزینوں کو بھی وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو شہریت کے لئے صفت لازم کی حیثیت رکھتی ہے، شہریت کے لئے مسلم، کافر، گورا، کالا، مالدار، غیر مالدار، قدیم باشندہ، جدید باشندہ مرد، عورت، جیسی آہنی دیوار حائل کرنے کی اجازت اسلامی نقطہ نظر سے نہیں دی جائے گی۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ رقم طراز ہیں: اسلامی حکومت میں شہریوں کے درمیان مساوات کا اصول بالکل طے شدہ ہوتا ہے، مسلم اور غیر مسلم دونوں حقوق اور ذمہ داریوں میں برابر ہوتے ہیں، البتہ عقائد کی چیزیں مستثنی ہوتی ہیں، کیونکہ جس طرح دو برابر اشیاء کے درمیان برابری عدل ہے اسی طرح دو غیر برابر چیزوں کے درمیان برابری ظلم ہے، لہذا عقائدی امور کے اندر مساوات یہی ہے کہ برابری نہ برتی جائے، شہید عبدالقادر عودۃؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں یا ذمیوں کو ان کے عقائد کے خلاف چیزوں پر آمادہ کرنا عدل و مساوات کے خلاف ہے۔ مثلاً ذمی کو شراب چھوڑنے کا حکم دیا جائے یا مسلمان کو طلاق نہ دینے کا حکم دیا جائے۔

ذمی کو بھی اسی طرح فکر، اظہار اور عقیدہ کی آزادی حاصل ہے جس طرح ایک مسلمان کو حاصل ہے، بلکہ حربی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ اپنے عقیدہ و مذہب کا دفاع کرے، دوسرے عقائد و مذاہب کے بالمقابل اس کی خوبیوں کا اظہار کرے، شیخ زیدان کے بہ قول اسلامی شریعت میں ذمیوں کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ قانون اسلامی کے حدود میں رہتے ہوئے اپنے اجتماعات منعقد کریں، امن پسند تنظیمیں قائم کریں اور حکومت کے ساتھ وفاداری برتتے ہوئے دیگر سرگرمیاں انجام دیں (حقوق شہریت راشد غنوشی ص ۷۵)۔

اسی طرح پناہ گزینوں کو بھی سارے حقوق شہریت دیئے جائیں گے جس طرح قدیم باشندوں کو سارے حقوق شہریت حاصل ہیں، جس کو آپ نے پناہ دی ہے تو آپ پر اس کے سارے حقوق کی ادائیگی واجب و لازم ہوگی اس سے بے اعتنائی برتنا شرعاً ممنوع و حرام ہوگا۔

''عن عمر بن الخطاب عن النبی ﷺ فی هذه القصة قال وتغيثوا الملهوف وتهدوا الضال'' (ابوداؤد ۲۰۶۶۳) (حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اس قصہ میں راستہ میں بیٹھنے والوں کو راستہ کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں ارشاد فرمایا مظلوم کی اعانت کرو اور بھٹکے ہوئے راہ گیر کو راستہ کی صحیح رہنمائی کرو)۔

غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرنے کا شرعی حکم:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن ووطن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف وانقلاب اور رہائش اختیار کرنے والوں کے اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے، عصر حاضر میں اختلاف نوعیت کی سات قسمیں ہیں:

پہلی قسم: اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائیداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بہ شرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا، اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا۔

دوسری قسم: اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان جویں کا محتاج ہوجائے ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا، اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو (سورۂ ملک:۱۵)۔

''عن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة'' (المعجم الكبير الطبراني ۱۰۹۹۰، اتحاف السادة المتقين ۱۳۱/۱) (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حلال روزی حاصل کرنے کی فکر وکوشش فرض کے بعد ایک فریضہ ہے)۔

تیسری قسم تبلیغی واصلاحی: اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرتا ہے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا اور تبلیغ کرے گا اسی نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے، بلکہ موجب اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، اور جو بعد میں ان کے فضائل اور مناقب ومحاسن میں شمار ہونے لگی (سورۂ کہف: ۳۰، فقہی مقالات ۲۳۳/۱ مولانا تقی عثمانی)۔

چوتھی قسم معیار زندگی کی بلندی وخوشحالی: اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوش حالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرتا ہے تو ایسی رہائش اختیار کرنا موجب اجر وثواب نہیں ہے، بلکہ مکروہ تحریمی ہے۔

پانچویں قسم تعلّی اور استخفاف اسلام:

پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت کو دار الاسلام کی شہریت وقومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود وباش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (سورۂ توبہ: ۶۹ تا ۷۰، فقہی مقالات ۲۳۵/۱)۔

چھٹی قسم تجارتی: اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وتجارتی وسائل حاصل ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے ساتھ تجارت کرکے اعلی معیار کے مطابق ایک اچھے تاجر کی حیثیت سے زندگی گذار سکتا اور اعلی قسم کا تاجر وسیٹھ بن سکتا ہے، لیکن صرف معیار تجارت بلند کرنے کی غرض سے اور اپنا نام ونمود اور شہریت حاصل کرنے کی غرض سے اور اعلی قسم کی خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی ہنود ویہود اور نصاری جیسی گزارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی

رہائش اختیار کرتا ہے تو ایسی رہائش اختیار کرنا کراہت تحریمی سے خالی نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے، اور بلاضرورت اپنی دینی واخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں، اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

ساتویں قسم تعلیمی: اسی طرح اگر کوئی شخص اعلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرتا ہے، حالانکہ خود اس کے ملک اور شہر میں وافر مقدار میں تعلیمی وسائل حاصل ہیں، جس کالج، یا یونیورسٹی اور جس شعبہ تعلیم میں وہ داخلہ کا خواہش مند ہوگا، اس کی ضرورت تعلیم اکمل طریقہ سے پوری کی جائے گی، کوئی تشنگی باقی نہ رہے گی، مگر مغربی تہذیب وتمدن کا اتنا فریفتہ ہے گویا کہ وہ اس کے نزدیک منزل من السماء ہے، اس لئے وہاں جا کر ہی تعلیم حاصل کرے گا اس کے نگاہ میں اسلامی تہذیب وتمدن فرسودہ اور خام خیالی ہے، ایسی صورت حال میں وہ کسی غیر مسلم ملک میں تعلیمی مشن کی تکمیل کے لئے رہائش کرتا ہے تو ایسی رہائش اختیار کرنا اس کے لئے زہر ہلاہل ثابت ہوگی، اور اسلام کا قلادہ اس کی گردن سے نکل کر مغربی تہذیب وتمدن کے مسموم بحر ذخار کی تہہ میں جا گرے گا، شرعی نقطہ نظر سے مطلقاً اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا حرام ہوگا، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (سورۃ توبہ: ۶۹ تا ۷۰)۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنے کا شرعی حکم:

''عن أبي هريرة قال: بينما نحن في المسجد خرج النبي ﷺ فقال: انطلقوا إلى يهود فخرجنا حتى اذا جئنا بيت المدارس فقال اسلموا تسلموا، واعلموا أن الارض لله ورسوله وأني أريد ان أجليتكم من هذه الأرض فمن يجد منكم بماله شيئا فليبعه، وإلا فاعلمو أن الأرض لله ورسوله'' (البخاری ۱،۴۴۹، کتاب الجزية والموادعة باب اخراج اليهود من جزيرة العرب، مكتبه رشيديه دہلی)۔ (حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ ہم ابھی مسجد نبوی میں موجود تھے کہ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ یہودیوں کے پاس چلو چنانچہ ہم روانہ ہوئے یہاں تک کہ یہودیوں کے مدرسہ بیت المدارس پر پہنچے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسلام قبول کرلو سلامت رہو گے اور جان لو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ تم کو اس زمین ''حجاز'' سے نکال دوں تو اگر تم میں سے کوئی اپنے مال کا عوض قیمت پائے تو اسے بیچ دے، ورنہ جان لو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے)۔

''عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال في مرضه الذي توفي فيه: لا يجتمع دينان في جزيرة العرب'' (نصب الرايه ۳،۴۵۴ مجلس علمي ڈابھیل ۱۹۸۸ء)۔ (حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ فی الواقع رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری کی حالت میں جس میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی تھی، ارشاد فرمایا کہ جزیرۃ العرب میں دو مذہب جمع نہیں ہوں گے)۔

۳۔ ''عن ابن شهاب أن رسول الله ﷺ قال: لا تجتمع دينان في جزيرة العرب'' (موطا امام مالك ص۳۶۰، كتاب الجامع، ماجاء في اجلاء اليهود من المدينة، ادارہ مرکز ادب دیوبند)۔ (حضرت ابن شہاب زہریؒ سے روایت ہے کہ فی الواقع رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جزیرۃ العرب میں دو مذہب جمع نہیں ہوں گے)۔

''عمر بن الخطاب أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب حتى لا ادع إلا مسلما'' (مسلم ۲،۹۴، كتاب الجهاد والسير بابا جلاء اليهود بن الحجاز، مكتبه رشيديه، مصنف عبد الرزاق ۶،۵۴ طبع المكتب الاسلامي بيروت)۔ (حضرت عمرؓ نے رسول ﷺ سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میں یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے ضرور نکال دوں گا اور مسلمان کے علاوہ وہاں کسی اور کو نہیں رہنے دوں گا)۔

ان تمام احادیث کی روشنی میں یہ بات الم نشرح ہوگئی ہے کہ جزیرۃ العرب میں کسی بھی جگہ غیر مسلم کو رہنے کی اجازت نہ ہوگی اور نہ کسی مسلم ملک میں غیر مسلم کو رہنے کی اجازت ہوگی تو یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا، دور دراز غیر مسلم ملکوں سے غیر مسلم کو بلوا کر آباد کرنا، رہائش اختیار کرنے کی اجازت دینا بدرجہ اولی حرام وممنوع ہوگا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بخاری شریف، کتاب الجہاد "باب ہل یستشفع الی اہل الذمۃ ومعاملتہم" کے ذیل میں فتح الباری شرح بخاری میں جمہور علماء کی رائے نقل کی ہے کہ جزیرۃ العرب میں صرف حجاز کے اندر مشرکوں کو داخل ہونے کی یا شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، حجاز میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، حدیبیہ، یمامہ، طائف وغیرہ کے قرب وجوار کے تمام علاقے اس زمرہ میں شامل ہوں گے، ان کے علاوہ جزیرۃ العرب میں شمار ہونے والے دیگر مقامات کا یہ حکم نہیں ہوگا، کیونکہ علماء کا اتفاق ہے کہ یمن میں مشرکوں کا داخلہ ممنوع نہیں ہے، حالانکہ یمن بھی جزیرۃ العرب میں داخل ہے، حنفیہ کے نزدیک مسجد الحرام کے علاوہ حدود حرم کے دیگر مقامات میں داخلہ کی اجازت ہے، امام مالکؒ کے نزدیک تجارت کی غرض سے حرم میں داخلہ کی اجازت ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک حرم میں داخلہ کی اجازت بالکل نہیں ہے، ہاں اس صورت میں جب صرف مسلمانوں کی کوئی مصلحت وحکمت ہو تو اس کی رعایت ونصرت کے خیال سے امام حکم ران کی اجازت ہی سے وہ داخل ہو سکتے ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح الباری ۶/ ۱۹۷ تا ۱۹۸ دار الریان للتراث القاہرہ ۱۹۸۷ء)۔

حضرت عمر بن خطابؓ اپنے دور خلافت میں یہود ونصاریٰ اور ذمی وغیرہ کو مدینہ منورہ میں تجارت کی غرض سے تین روز تک ٹھہرنے کی اجازت دیتے تھے اور ان کی عورتوں کو بھی پردے اور حجاب کا مکمل اہتمام کی شرط کے ساتھ رہنے کی اور زیب وزینت اور زیورات پہننے کی اجازت مرحمت فرماتے تھے (مصنف عبد الرزاق ۶/ ۵۴ طبع بیروت لبنان طبع دوم ۱۹۸۳ء)۔

غیر مسلم کو حرم میں قیام کرنے کی اجازت بالکل نہیں دی جائے گی اور نہ حرم سے گذرنے کی اجازت دی جائے گی، قرآن وحدیث سے اس کی ممانعت منصوص ہے، عصر حاضر کی شرارت وخباثت حد سے بڑھ چکی ہے اس کے پیش نظر تو پوری مملکت سعودیہ میں اس کے داخلے پر ممانعت کر دینی چاہئے، بہر حال حدود ومیقات حدود حرم میں داخلے کی پابندی اس کے اوپر برقرار رہے گی، پورے صوبہ حجاز میں کہیں بھی اس کو قیام ورہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اس سلسلے میں حکومت سعودیہ کو مکمل چاق وچوبند اور مستعد رہنے اور مکمل ممانعت پر کاربند رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

☆☆☆

اسلام اور شہریت

مولانا اشرف عباس قاسمی [ط]

۱۔ اسلام میں حصول شہریت کی بنیاد:

اسلام میں معاصر حالات کے تناظر میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے اس کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص وہاں کی بود وباش اختیار کرے ہمیں اس سلسلے میں فقہاء کی تصریحات سے روشنی مل سکتی ہے۔ فقہی اعتبار سے جو مقام کسی کے لیے وطن اصلی کی حیثیت اختیار کرلے، اس شخص کو وہاں کا شہری تسلیم کیا جانا چاہئے، احناف کے یہاں وطن اصلی کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے: ''ھوالذی ولد فیہ أو تزوج أولم یتزوج وقصد التعیش فیہ لا الارتحال عنہ'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲۰۴۲)۔

اور کسی انسان کا وطن اصلی وہ ہے جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو یا اس نے وہاں شادی کی ہو یا شادی نہ کی ہو، مگر وہیں مستقل رہائش اختیار کرلی ہو، اس سے یہ بھی واضح ہے کہ کسی مقام پر محض معاشی سرگرمیاں انجام دینا اس کے وہاں کے مواطن ہونے کے لے کافی نہیں ہے، بلکہ اصل مدار اس پر ہے کہ وہ اس جگہ بود وباش اختیار کرلے، خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، لہذا اگر کوئی غیر مسلم کسی اسلامی ملک میں اس معیار پر کھرا اترے تو اس کو اس اسلامی ملک کا شہری تسلیم کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کسی خاص مدت کی تعیین مشکل امر ہے اس کا تعلق ملکی مصالح اور معاصر حالات کے تقاضوں سے ہے، اگرچہ ہمیں فقہاء کے یہاں اس حوالے سے بھی بعض تصریحات مل جاتی ہیں؛ چنانچہ اگر کوئی مستأمن (وقتی اجازت سے آنے والا غیر مسلم شخص)۔

دارالاسلام میں آئے تو اسے وہاں زیادہ سے زیادہ ایک سال قیام کی اجازت دی جاسکتی ہے، لیکن اگر وہ دارالاسلام میں ایک سال قیام کرلے تو اسے دارالاسلام کی شہریت دے دی جائے گی اور وہ ذمی (مسلم ملک کا غیر مسلم شہری) قرار پائے گا جمہور فقہاء احناف وشوافع وحنابلہ کی یہی رائے ہے، جبکہ بعض علماء کی رائے ہے کہ اسے اختیار دیا جائے گا کہ یا تو وہ فوری طور سے دارالاسلام سے نکل جائے یا ذمی کی حیثیت سے وہاں کا شہری بن جائے (المسلم مواطنانی اوربا ص ۱۸ نقلا عن البدائع ۷/۱۱۱ والخراج لأبی یوسف ۱۸۹)۔

درج بالا جزئیہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ایک سال سے زائد قیام پر شہریت دے دی جائیگی، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جغرافیائی حد بندیوں اور ملکوں کی تقسیم سے صورت حال یکسر بدل چکی ہے، اس لے حالات ومصالح کو سامنے رکھ کر اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔

۲۔ کیا مسلم ملک پر شہریت کی درخواست قبول کرنا ضروری ہے؟

اگر ایک مسلمان، خواہ وہ کسی خطے سے تعلق رکھتا ہو مسلم ملک میں رہتا ہو یا غیر مسلم ملک میں، اگر کسی دوسرے ملک کی شہریت کسی مجبوری کی وجہ سے اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے مسلم ملک کو اس کی درخواست ضرور قبول کرنی چاہئے، قرآن کریم نے واضح طور پر کہا ہے: "إنما المؤمنون إخوة" (الحجرات ۱۰) (مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں)۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: ''والمؤمنون والمؤمنات بعضھم أولیاء بعض'' (التوبۃ: ۷۱)۔

ان آیات سے اور اس مفہوم کی بہت ساری احادیث مبارکہ سے واضح ہے کہ اسلام، معاشرہ قوم یا ملک کو دین وعقیدے کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے اور اس ایمانی رشتے کی اس کے نزدیک بڑی اہمیت ہے؛ چنانچہ جب مکہ مکرمہ کے خانماں برباد ی مظلوم ومقہور مسلمانوں نے مدینہ منورہ کی شہریت اختیار کرنی چاہی تو مدینہ کے مسلمانوں نے یہ جانتے ہوئے کہ ان کے اس اقدام سے عرب کا ایک بڑا طبقہ چراغ پا ہوجائے گا، لیکن انھوں نے ان مخالفتوں کی بالکل پرواہ نہیں کی،

[ط]

اور اخوت اسلامی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اخوت ونصرت کی وہ مثال قائم کی کہ انھیں انصار کا خطاب ملا، البتہ اگر کسی معاہدے کی خلاف ورزی ہو رہی ہو تو درخواست قبول نہ ہوگی؛ کیونکہ معاہدوں پر قائم رہنا اور وعدوں کا ایفاء کرنا بھی اسلامی مملکت کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے۔

چنانچہ آیت کریمہ میں ہے: ''وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم و بينهم ميثاق والله بما تعملون بصير'' (الانفال ۷۲)۔

حافظ ابن کثیر اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''وان استنصروكم في قتال ديني على عدولهم فانصروهم' فإنه واجب عليكم؛ لأنهم إخوانكم في الدين، إلا أن يستنصروكم على قوم من الكفار بينكم وبينهم ميثاق، فلا تخفروا ذمتكم ولا تنقضوا أيمانكم مع الذين عاهدتم، وهذا مروي عن ابن عباس'' (دیکھئے: جامع البيان للطبري، ۲۰/۶۶-۷۰) المواطنه في الاسلام'' ص ۳۰)۔ (اور اگر وہ اپنے دشمنوں کے خلاف مذہبی جنگ میں تمہاری مدد چاہیں تو تم ان کی مدد کرو، اس لئے کہ یہ تمہارا فریضہ ہے وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، البتہ اگر وہ کفار کی اس جماعت کے خلاف تمہاری مدد چاہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے تو تم عہد شکنی مت کرو اور جن لوگوں کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے ان سے عہد و پیمان کو نبھاؤ۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے)۔

دکتور علی محی الدین القرہ داغی فرماتے ہیں: کہ آیت بالا سے معلوم ہو رہا ہے کہ عہد کو پورا کرنا ایک ایسا حق ہے جو بعض ان اہل ایمان کے حقوق سے بڑھ کر ہے جنہوں نے ہجرت نہیں کی ہے (المواطنۃ ۲۹)۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر طے پانے والے معاہدے کی بعض دفعات کی بنا پر مسلمانوں کے سخت اضطراب کے باوجود حضرت ابوجندلؓ کو مکہ والوں کے ہی سپرد کر دیا اور حضرت ابوبصیر وغیرہ کو بھی محض اس معاہدے کی بنا پر مدینہ منورہ میں قیام کی اجازت نہیں دی، جیسا کہ ساری تفصیلات کتب حدیث وسیر میں موجود ہیں؛ لہٰذا مسلم ملک کے لیے ہر درخواست شہریت کو قبول کرنا ضروری نہیں قرار پائے گا۔

۳۔ کسی مسلمان کو شہری تسلیم کئے بغیر پناہ گزیں کا درجہ دینا:

بعض دفعہ کسی خاص خطے میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں تو انہیں پناہ گزین کا درجہ تو دیا جاتا ہے، لیکن شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، تو اس سلسلے میں جہاں تک تعلق ہے خاطر مدارات اور پناہ کا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم ملک کے حکمران کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مظلوم اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی اشک شوئی کرے، ان کی ضیافت اور اکرام میں پیش پیش رہے اور اخوت ایمانی کے تقاضوں کو پورا کرے۔

یہ شرعی واخلاقی ذمہ داریوں سے آنکھ موند لینے کی بات ہے کہ مظلوم وبے سہارا مسلمانوں کو پناہ دینے کے بجائے سرحد کی دیواریں اونچی کر کے انھیں ظالموں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے، بلکہ انھیں بھی دوسرے شہریوں کے مساوی حقوق دیئے جانے چاہئیں، لیکن شہریت کے لئے بین الاقوامی ضوابط اور ملکی نزاکتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر انھیں جدید اصطلاح کے اعتبار سے شہری تسلیم نہ کرے فقط پناہ گزیں قرار دے تب بھی گنجائش ہے، جبکہ انسانیت کی بنیاد پر دیگر حقوق ومراعات مل رہی ہوں۔

۴۔ اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے حقوق:

اس وقت عام طور سے جمہوری نظام حکومت رائج ہے، جمہوریت میں عوامی حکمرانی کا تصور ہوتا ہے، رائے عامہ کے ذریعہ حکمرانوں کا انتخاب ہوتا ہے، جمہوری نظام حکومت میں مملکت کا کوئی خاص مذہب نہیں ہوتا ہے، جمہوری نظام بعض جہتوں سے اسلام کے شورائی نظام سے مماثلت رکھتا ہے، اس لئے کوئی حرج نہیں کہ مسلمان اپنے معتقدات اور شخصی امتیازات پر قائم رہتے ہوئے اس نظام کا حصہ بنیں، بالخصوص ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور یہ بات مشاہدے میں ہے کہ جمہوری اور سیکولر نظام مسلمانوں کے لئے بسا اوقات غنیمت ثابت ہوا ہے، بلکہ ہو رہا ہے۔

جمہوری نظام حکومت میں شہریوں کے جتنے حقوق ہیں، اسلام ان سب کی تقریر کرتا ہے، اور ملک کے استحکام اور دفاع کی مشترکہ کوششوں کی اجازت، بلکہ ترغیب دیتا ہے، معاہدۂ حلف الفضول اور میثاق مدینہ کی مختلف دفعات پر نظر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، اور قرآن کریم کا بھی عام اور صریح حکم ہے ''وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (المائدہ: ۲)۔ (اور نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کی اعانت کیا کرو،

اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کیا کرو)۔

اور جہاں تک تعلق ہے ان ملکوں کا جہاں اسلامی نظام حکومت ہے، تو کیا ایسی اسلامی مملکت میں بھی تمام شہریوں کو بہ شمول غیر مسلم یہ سارے حقوق حاصل ہوں گے؟ اس سلسلے میں دقت نظر سے احکام شرع کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض بنیادی حقوق جن کا تعلق انسانی حقوق سے ہے، مملکت اسلامی کے ہر فرد کو حاصل ہیں؛ چنانچہ کسی بھی غیر مسلم شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہے؛ کیونکہ میثاق مدینہ کی ایک دفعہ ہے: ''لليهود دينهم وللمسلمين دينهم'' (یہود اپنے مذہب پر عمل پیرا رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب پر)۔

اسی طرح جب بعض انصاری صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے بعض افراد خاندان کو جو یہودی ہو چکے تھے، مسلمان ہونے پر مجبور کرنا چاہا تو اللہ پاک نے آیت نازل فرمائی:- ''لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي'' (البقرہ: ۲۵۶)۔ (دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقینا گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے)۔

نیز پوری اسلامی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی رعیت اور غیر مسلم شہریوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو۔ اسی طرح روزگار اور معاشی تگ ودو کے بھی یکساں حقوق حاصل ہیں، امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں: ''إن الذميين في المعاملات والتجارات كالبيوع وسائر التصرفات كالمسلمين'' (احکام القرآن، ۲/ ۲۴۶)۔

''اسلامی ملک کے غیر مسلم شہری (ذمی) آپسی معاملات اور تجارت، مثلاً بیع وشراء اور تمام تصرفات میں مسلمانوں کی طرح ہیں''۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ''كلما جاز من بيوع المسلمين جاز من بيوع أهل الذمة وما يبطل أو يفسد من بيوع المسلمين يبطل ويفسد من بيوعهم إلا الخمر والخنزير'' (البدائع: ۴/۱۷۶)۔ (بزنس اور تجارت کے جو معاملات مسلمانوں کے لئے جائز ہیں وہ ذمیوں کے لیے بھی جائز ہیں، اور تجارت کی جو صورتیں مسلمانوں کے لئے باطل یا فاسد ہیں وہ ذمیوں کے تعلق سے بھی باطل یا فاسد ہیں، البتہ خمر اور خنزیر کا استثناء ہے)۔

اسی طرح غیر مسلم شہریوں کو عدالتی چارہ جوئی اور انصاف حاصل کرنے کے بھی یکساں حقوق حاصل ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد گرامی ہے:

''ألا من ظلم معاهداً أو انتقصه حقه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئاً بغير طيب نفس منه فأنا حجيجه يوم القيامة'' (سنن ابی داؤد، الحدیث، رقم: ۳۰۵۲)۔ (آگاہ رہو! جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کی حق تلفی کرے گا، یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ کا بوجھ ڈالے گا، یا اس کی کوئی چیز اس کی بشاشت کے بغیر لے لیگا تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے حجت قائم کروں گا)۔

ان غیر مسلم شہریوں کے جان ومال کی حفاظت بھی اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے؛ چنانچہ مال کے سلسلے میں فقہاء احناف یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ اگر کوئی مسلم شہری ان کے خمر وخنزیر جیسی چیز کو بھی جو مسلمان کے نزدیک غیر متقوم اور قابل نفرت ہے، تلف کردے تو معاوضہ ادا کرنا پڑے گا (دیکھئے: بدائع: ۵/ ۱۴۳)۔

اور جان ومال کی حرمت کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے: ''من قتل معاهداً لم يرح رائحة الجنة وإن ريحها توجد من مسيرة أربعين عاماً'' (صحیح البخاری، کتاب الجزیہ)۔ (جس شخص نے کسی معاہد کو قتل کردیا اس کو جنت کی خوشبو نصیب نہ ہوگی، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال مسافت کی دوری سے محسوس کی جاسکے گی)۔

اس لئے فقہاء احناف کی رائے یہ ہے کہ کسی غیر مسلم شہری کا قاتل مستحق قتل ہے، اگرچہ وہ مسلم شہری ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلم شہریوں کو حاصل ہیں، البتہ ووٹ دینے کا حق یا انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق وغیرہ وہ حقوق ہیں جو محض شہری ہونے کی حیثیت سے اسلامی مملکت غیر مسلم مواطن کو بھی فراہم کرے یہ کوئی ضروری نہیں ہے؛ اس لئے کہ مسلم ملک میں اسلامی احکام کی بالادستی بھی مطلوب ہے، اس لئے اس طرح کے بہت حد تک خود مختار اور کلیدی عہدوں تک غیر مسلم شہریوں کی رسائی بہت سے مسائل جنم دے گی، اسی طرح ایسے عہدے پر انہیں فائز نہیں کیا جائے گا جو خالص مذہبی نوعیت کے ہوں۔

البتہ ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے بھی کھلے رہیں گے، اور دیگر عہدے اور مناصب بھی انہیں سونپے جاسکتے ہیں، حتی کہ علامہ ماوردیؒ نے وزارت تنفیذ کے سلسلے میں بھی جس میں اصل حکم سلطان اور حاکم اعلی کا ہوتا ہے، وزیر محض اس کے نافذ کرنے کا پابند ہوتا ہے، فرمایا ہے: ''ويجوز أن يكون

هذا الوزير من أهل الذمة'' (الأحكام السلطانية: ص، ٢٨)۔ ''اور اس درجے کا وزیر کسی ذمی شخص کو بنایا جاسکتا ہے''۔

۵۔ شریعت اسلامی میں پناہ گزینوں کے حقوق:

پناہ یا جوار کا حق قدیم عربی اور اسلامی خصال میں سے ہے، عرب جب کسی کو پناہ دیتے تو نہ صرف یہ کہ اسے پوری طرح نباہتے تھے، بلکہ اس کے اخفار اور عہد شکنی کو توہین تصور کرتے تھے، عرب شاعری میں اس کے بہ کثرت نمونے موجود ہیں (دیکھئے: ''اللجوء في الإسلام۔ للدکتور احمد ابوالوفاء، ا۔ ۲۔ ۳)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حبشہ ہجرت کرنا چاہا تو سید القارۃ ابن الدغنہ نے انہیں اپنی حفاظت اور پناہ میں لینے کا اعلان کیا اور قریش کے سردار اس کی مخالفت نہ کرسکے۔ مکہ مکرمہ کے ستائے ہوئے مظلوم اور مقہور مسلمانوں کو شاہ حبشہ نجاشی نے اور مدینہ منورہ کے قبیلۂ اوس وخزرج نے پناہ دی۔

پناہ کی تعریف:

دکتور ابوالوفاء کے مطابق اسلام کے نقطۂ نظر سے پناہ، ملجاء یا جوار کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے:۔ ''إعطاء الأمن لملهوف فار إلى دار الإسلام من اضطهاد وظلم أو وضع سيء يمكن أن يتعرض له'' (اللجوء في الإسلام: ص ۴)۔ (پناہ نام ہے کسی ایسے مصیبت زدہ شخص کو امن فراہم کرنے کا جو کسی ظلم وستم یا کسی ایسی صورت حال سے بھاگ کر دار الاسلام آگیا ہو جو اسے پیش آسکتی ہے)۔

قرآن کریم میں اور عموماً بین الاقوامی اسلامی قانون میں اس کے لئے استجارہ یا اجارہ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۂ حشر کی آیت نمبر ۹ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں اسلام میں پناہ گزینوں کے تعلق سے احکام کے خط وخال متعین کیے جاسکتے ہیں۔

آیت کریمہ یہ ہے: ''والذين تبوّؤ الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجر إليهم ولا يجدون في صدورهم حاجةً مما أوتوا ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة ومن يوق شُحّ نفسه فأولئك هم المفلحون'' (سورة الحشر: ۹)۔ (اور ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو دار الاسلام (یعنی مدینہ) میں ان (مہاجرین) کے آنے کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے، اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں، اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے، اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو) (ترجمہ تھانوی)۔

آیت کریمہ سے لاجئین کے سلسلے میں چار بنیادی باتیں معلوم ہورہی ہیں:۔

(۱) خندہ پیشانی کے ساتھ مہاجرین اور پناہ کے متلاشی افراد کا استقبال اور حسن سلوک، جیسا کہ ''يحبون من هاجر إليهم'' سے معلوم ہورہا ہے، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انہیں اپنی سرحدوں کی طرف واپس کردینا اور ان کا استقبال نہ کرنا درست نہیں ہے۔

(۲) ان کے ساتھ احسان اور ایثار کا برتاؤ کیا جائے، جیسا کہ ارشاد باری: ''ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة'' (سورۂ حشر: ۹) سے واضح ہے۔

(۳) پناہ کے طالب افراد کا استقبال کیا جائے، خواہ وہ اہل ثروت ہوں یا فقراء، یعنی ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اگر وہ ذی وجاہت یا مالدار یا سیاسی حیثیت کے حامل ہوں تو انہیں پناہ دی جائے اور بے سہارا لوگوں کو نظر انداز کردیا جائے، اس لئے کہ اصل مقصد حمایت اور امن وامان فراہم کرنا ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، آیت کے درج ذیل جز سے اس کی طرف اشارہ ہورہا ہے:۔ ''ولا يجدون في صدورهم حاجة مما أوتوا'' (سورۂ حشر: ۹) ''اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے''۔

(۴) ان مہاجرین اور پناہ گزینوں کی درخواست بھی رد نہیں کی جاسکتی جن کا تعلق انتہائی غربت زدہ خطے سے ہو۔

''ولو كان بهم خصاصة'' (اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو)۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد پناہ گزینوں کی تعداد میں زبردست اضافے اور نت نئے مسائل کے پیش نظر اقوام متحدہ نے اس حوالے سے خاص ضوابط وضع کیے، چنانچہ ۱۹۶۷ء اور بعد کے اقوام متحدہ کے چارٹر میں پناہ گزینوں کے بنیادی حقوق کا تعین کرنے کے ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ جس ملک میں پناہ لیں

وہاں کے تعلق سے ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، بہت حد تک یہ وہی حقوق ہیں جو اسلامی تعلیمات میں پہلے ہی بیان کیے جاچکے ہیں اور عملی اعتبار سے اسلامی مملکتوں میں نافذ رہے ہیں۔

میرا مقصد اس مختصر تحریر میں دونوں قوانین کا مطالعہ کر کے ایک ایک شق کا مقابلہ وموازنہ نہیں ہے، البتہ بنیادی طور پر جو اہم بات بین الاقوامی قانون میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ پناہ کے طالب شخص کو پناہ فراہم کرنا اور اس کے بنیادی حقوق کی رعایت رکھنا کسی بھی حکومت کا فرض ہے۔ یہ بات اسلامی قانون میں واضح طور پر موجود ہے، پناہ گزیں کو ایسے ملک میں واپس جانے پر مجبور کرنا یا ایسی حکومتوں کے سپرد کر دینا جہاں اسکی عزت وآبرو اور جان ومال کو خطرہ ہے، اسلام کی نگاہ میں جرم ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پناہ گزیں مسلمان ہے یا غیر مسلم، اس لئے کہ امان یا ذمہ کی وجہ سے وہ ان تمام مراعات کا مستحق ہوجاتا ہے جو ایک مسلم شہری کو حاصل ہیں، بلکہ ہمارے فقہاء نے وضاحت کی ہے کہ ایسے شخص کو کسی مسلم قیدی کی رہائی کے عوض بھی اس کے متعلقہ ملک کو سونپا نہیں جاسکتا اگر وہ اس پر راضی نہ ہو۔

چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں: ''فإن دخل حربي منهم إلينا بأمان فطلبوا مفاداة الأسير بذالك المستأمن وكره ذلك المستأمن وقال: إن دفعتموني إليهم قتلوني فليس ينبغي لنا أن ندفعه إليهم، لأنه في أمان منا. فيكون كالذمي إذا كره المفاداة'' (شرح السیر الکبیر، حیدرآباد، ۲ ص ۲۰۰)۔ (اور اگر کوئی حربی ہماری اجازت اور امان سے ہمارے پاس آئے اور اس کے ملک کے حکمراں، اس مستامن (اجازت لے کر آنے والا شخص) کے عوض قیدی کی رہائی کا مطالبہ کریں، لیکن وہ مستامن اس پر راضی نہ ہو اور کہے کہ اگر تم نے مجھے میرے ملک کے حکمرانوں کے سپرد کر دیا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے، اس صورت میں اس کو ان کے سپرد کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ وہ ہماری امان اور حفاظت میں ہے)۔

اسی طرح شاہ حبشہ نجاشی نے ان مسلمانوں کو قریش کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا جنہوں نے اس کے پاس پناہ لی تھی۔

خلاصہ یہ کہ لاجئین اور پناہ گزینوں کے سلسلے میں اسلامی شریعت میں تفصیلات بکھری پڑی ہیں، اور اس کو مستقل موضوع بنا کر اس پر کافی کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

۶۔ غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا:

کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے دنیا کے کسی بھی ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہے، بہ شرطیکہ وہاں اسے فکر ونظر اور واجبات دینیہ کی ادائیگی کی آزادی ہو، اور ایک انسان وشہری ہونے کے ناطے جو حقوق معروف ہیں وہ اسے حاصل ہوں۔

چنانچہ حدیث وسیر کی کتابوں میں متعدد صحابۂ کرام کے سلسلے میں منقول ہے کہ قبول اسلام کے بعد بھی انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے اپنے غیر مسلم قبیلے میں سکونت باقی رکھی۔

حضرت عمرو بن عبسہ السلمیؓ نے مکہ میں اسلام قبول کرنے کے بعد وہیں سکونت کی خواہش ظاہر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لكن ارجع إلى أهلك فإذا سمعت بي قد ظهرت فأتني'' ''نہیں تم اپنی برادری اور قبیلے میں چلے جاؤ، اور جب میرے غلبے کی بابت سنو تو میرے پاس آجانا'' (صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، (رقم/۸۳۲)۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی آپ نے اسی طرح ارشاد فرمایا تھا: (دیکھئے: صحیح مسلم: رقم/۲۴۷۳)۔

حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ مکہ میں اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن اپنی قوم میں ہی قیام کر کے انہیں دعوت اسلام دیتے رہے، یہاں تک کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر حضرت ابوہریرہؓ سمیت یا اسی افراد کے ہمراہ مدینہ طیبہ آئے (سیرۂ حلبیہ: ۱/۵۱۳)۔

اسی طرح مہاجرین حبشہ کا ۷ھ تک حبشہ میں غیر مسلم مواطنین کے درمیان قیام کیے رہنا، باوجودیکہ مدینہ منورہ میں مکہ مکرمہ جیسی صورت حال نہیں تھی، یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ غیر مسلم ملک میں بھی پر امن بقاء باہم کی گنجائش ہے۔

اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تا کہ ان غیر مسلم مواطنین تک صحیح معنوں میں اسلامی پیغام کے پہنچانے کی ذمہ داری پوری کی جاسکے۔

لیکن یہ سب اس وقت ہے جب کہ وہاں دین وعقیدے کی آزادی ہو، جن فقہاء نے غیر مسلم ملک کی شہریت کے عدم جواز اور دار الحرب کے ہجرت کے وجوب کا قول کیا ہے، وہ اسی پس منظر میں ہے کہ وہاں دین وشریعت پر عمل کی آزادی نہ ہو، ورنہ اگر ایسی صورت حال نہ ہو، جیسا کہ اس وقت عام طور سے دنیا کے

ملکوں میں ہے تو وہاں قیام میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۷۔ مسلم ملک میں غیر مسلم کو شہری کی حیثیت سے آباد کرنا:

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر ملکی اور دینی مفادات پر اس سے زد نہ پڑتی ہو، چنانچہ میثاق مدینہ کی بعض دفعات میں یہودیوں کو مستقل شہری کی حیثیت دیتے ہوئے ان کے حقوق کے تحفظ کی بات کہی گئی ہے۔

اسی طرح خلفاء راشدین کے عہد میں جو ممالک فتح ہو کر بلاد اسلامیہ کا حصہ بنتے گئے، ہر جگہ چند شرائط کے ساتھ غیر مسلم شہریوں کو بھی رہنے کی اجازت دی گئی۔ تاریخ میں کہیں ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ اسلامی ملک سے غیر مسلموں کو محض مسلمان نہ ہونے کی پاداش میں شہر بدر کر دیا گیا ہو، بلکہ عباسی خلفاء کا عہد جو علم وثقافت کے اعتبار سے عہد زریں کہلاتا ہے، اس میں بڑے بڑے اہم عہدے اور مناصب پر غیر مسلم شہری تعینات نظر آتے ہیں۔

مشہور مورخ آدم میزا اپنے تجزیے میں کہاں تک لکھ گیا ہے:

''من الأمور التي تعجب لها كثرة عدد العمال ''الولاة وكبار المؤظفين والمتصرفين غير المسلمين في الدولة الإسلامية فكأن النصارى هم الذين يحكمون المسلمين في بلاد الإسلام''(الحضارة الإسلامية: ۱/ ۱۱۸، المواطنة في الإسلام، ص ۲۴)۔

(نیز ایک تعجب خیز امر اسلامی حکومت میں غیر مسلم کارکنان کی کثرت ہے جن میں وزراء، بڑے بڑے عہدے دار اور با اثر افراد شامل ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی ملکوں میں عیسائی ہی مسلمانوں پر حکمرانی کرتے تھے)۔

البتہ اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی قباحت نہیں کہ بعد کے مسلم حکمرانوں کی اس دریا دلی نے بعض مرتبہ اسلامی مملکتوں کو غیر مستحکم کرنے میں افسوسناک کردار ادا کیا ہے، اور مسلمانوں کو ایسے زخم پہنچائے ہیں جو اب تک مندمل نہیں ہو سکے ہیں؛ اس لئے مسلم حکمرانوں کو ایسے عناصر کو شہریت دینے سے گریز کرنا چاہئے، جن سے مملکت کی بنیادیں متزلزل ہو سکتی ہیں؛ چنانچہ مدینہ کے یہود اپنی طبعی شرارتوں اور ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آئے تو ان کا ویزا منسوخ کر کے انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔

☆☆☆

شہریت کا مسئلہ حقوق اور احکام کے تناظر میں

مولانا رحمت اللہ ندوی [1]

اصولی اور بنیادی بات یہی ہے کہ اسلام کے احکام اور اس کی ہدایت وتعلیمات زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے، اور اس میں ہر موقع کی رہنمائی موجود ہے، جس طرح عبادات، معاملات، اخلاقیات اور سماجیات سے متعلق احکام ملتے ہیں اسی طرح معاشیات اور سیاسیات کے بارے میں بھی بنیادی ہدایات واحکام اور اصول وقواعد موجود ہیں، جن کی روشنی میں علماء اسلام اور فقہاء کرام نئے مسائل کے احکام سے امت کی رہبری کر سکتے ہیں۔

البتہ معاشیات وسیاسیات، حکومت کے آئین ودساتیر مفصل بیان نہیں ہوئے ہیں اور ایسا اس لئے ہے کہ یہ احکام ماحول، مصالح اور حالات کے تطور وتغیر کی وجہ سے بدلتے رہتے ہیں، اس وجہ سے مناسب یہی تھا کہ اساسی اصول اور عمومی قواعد پر اکتفا کیا جائے تا کہ ہر دور کے سربراہان مملکت اور والیان امور کے لئے اس کی گنجائش رہے کہ وہ حدود شریعت میں رہتے ہوئے حسب مصلحت وضرورت اپنے قوانین کی تفصیل وتشریح کرلیں (ملاحظہ ہو علم اصول الفقہ الخلاف رص ۳۳، ۳۴)۔

غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر رہنا اس کا حکم زمانہ، حالات اور اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوگا، مفتی تقی عثمانی کی کتاب ''فقہی مقالات'' میں اس سے متعلق جو صورتیں لکھی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اگر ایک مسلمان اپنے وطن میں ناحق کسی جرم کے بغیر ستایا جارہا ہو، یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش کے علاوہ مظالم سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کر کے وہاں کا باشندہ اور شہری بن کر رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے اور منکرات وفواحش سے بچنے پر اطمینان ہو۔

۲۔ اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہو جائے اور کوشش وتلاش کے باوجود کسی اسلامی ملک میں معاشی مسائل نہ حاصل ہوسکیں تو کسی جائز ملازمت کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرسکتا ہے، کیونکہ شریعت نے کسی جگہ اور ملک کی قید رزق حلال تلاش کرنے کے لئے نہیں لگائی ہے، بلکہ عام اجازت دی ہے۔

۳۔ غیر مسلموں کو دعوت دین دینے اور انہیں مسلمان بنانے کے لئے رہائش اختیار کرنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ موجب اجر وثواب ہے، صحابہ اور تابعین نے اسی نیک مقصد اور ارادے سے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن ومحامد میں شمار ہونے لگی۔

۴۔ محض معیار زندگی بلند کرنے اور خوش حالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرنا کراہت سے خالی نہیں، کیونکہ بلا کسی دینی یا دنیاوی ضرورت کے اپنے آپ کو وہاں کے رائج فواحش ومنکرات کے طوفان میں ڈالنا اور اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ سے دوچار کرنا ہے، ایسی رہائش سے دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے اور ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیزی سے پگھل جاتے ہیں، اسی لئے حدیث میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے، ''من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله'' (ابوداؤد)۔ (جو شخص کسی مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی جیسا ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا: ''أنا بريئ من كل مسلم مقيم بين أظهر المشركين، قالوا يا رسول الله! لم؟ قال: لا تراي ناراهما'' (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان مقیم رہے، صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول کیوں؟ فرمایا: تم مسلمان اور کافر کی آگ میں امتیاز نہیں کرسکو گے)۔

---

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۵۔ اپنی سوسائٹی اور سماج میں معزز بنے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اپنانا یا دار الکفر کی شہریت کو دار الاسلام پر ترجیح دینا، اور اس کو برتر وافضل سمجھنا یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود وباش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں مشابہت اپنانا اور ان جیسا بننا، مطلقاً حرام ہے (فقہی مقالات ار ۲۳۲ تا ۲۳۵)۔

ڈاکٹر صلاح سلطان لکھتے ہیں: ''غیر مسلم ممالک میں قیام پذیر ہونے کا مسئلہ اگر چہ اب تک مختلف فیہ ہے، مگر جو حضرات مسلمان اقلیتوں کے لئے فتوی دینے اور اجتہاد کرنے کے اہل ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ اسلامی پیغام کی امین ومبلغ ہونے اور سب کی بھلائی کے لئے برپا کی جانے والی امت کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے غیر اسلامی ممالک میں قیام پذیر ہونا صحیح یا مستحب یا واجب ہے''۔

کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''بہر حال اگر روئے زمین کے تمام فقہاء اس بات پر اجماع کرلیں کہ غیر مسلم ممالک میں قیام پذیر ہونا درست نہیں ہے تو اس فیصلہ سے ان لوگوں کی صورتحال میں کوئی فرق نہیں واقع ہوگا، جو ان ممالک کے حقیقی باشندے ہیں، مہاجرین کی اکثریت ہرگز ان ملکوں میں واپس نہیں جائے گی، جہاں سے مشکلات جھیل کر وہ آئے ہیں، تو کیا اب فقہ کا یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ لوگوں کو گنہگار بنائے یا اس کا کام یہ ہے کہ لوگوں پر سے وہ بیڑیاں اور زنجیرین ہٹائے جن میں وہ جکڑ دیئے گئے ہیں؟...... میرے سامنے روز بروز پوری شدت کے ساتھ اس رائے کی کمزوری واضح ہوتی جارہی ہے کہ مغرب میں قیام پذیر ہونا یا مغربی ممالک کا سفر کرنا ناجائز ہے (فقہ الاقلیات رص ۳۳، ۳۵)۔

ڈاکٹر صلاح سلطان مزید لکھتے ہیں کہ میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں اس نتیجہ تک پہنچ چکا ہوں کہ اگر غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت کرنے اور وہاں اقامت پذیر ہونے پر مجبور کرنے والے حالات نہ بھی پیش آتے جب بھی پوری دنیا میں ایک منظم اور منصوبہ بند طریقہ پر اشاعت اسلام کی غرض سے وہاں جانا اور مقیم ہونا فرض تھا، کیونکہ اقامت کا یہ مطلب نہیں کہ ان نظاموں میں ضم ہو جایا جائے، خاص طور پر اعتقادی اصولوں، اخلاقی اقدار اور شرعی مسلمات سے متصادم امور میں تو ہرگز نہیں'' (ایضا رص ۳۵)۔

ایک منہجی مسئلہ یہ ہے کہ دار الحرب اور دار الاسلام کا جو ذکر اور تعیین ہماری فقہی کتابوں میں ہے وہ اس دور اور مخصوص صورتحال پر منطبق تھی، لیکن آجکل یا تو دار الاسلام ہے یا دار الامان، یا دار العہد یا دار الدعوۃ ہے، ایک منہجی غلطی یہ ہے کہ مجموعی طور پر تمام غیر اسلامی ممالک میں قیام پذیر ہونے کو حرام یا مکروہ قرار دیا جاتا ہے، یہ اجمالی حکم لگانا درست نہیں، کیونکہ غیر اسلامی ممالک کے درمیان عام طور پر اپنی اقوام اور خاص طور سے مسلمانوں کے حوالہ سے آزادی اور پابندی کے دائروں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ جنوبی اور وسطی امریکہ کی بعض ریاستیں متحفظ ہیں اور کچھ ریاستوں جیسے نیویارک اور کیلی فورنیا میں اباحیت اور بے لگام آزادی کا رجحان پایا جاتا ہے، جو مشرق میں قابل مذمت ہیں، بعض ایسے مسلم اور غیر مسلم ممالک ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید ترین مہم کی آڑ میں جواب کو غیر قانونی قرار دیتے ہیں، دین کے داعیوں پر پابندی عائد کرتے اور دین دار نوجوانوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں، جبکہ بہت سے غیر مسلم ملکوں کا موقف یہ ہے کہ وہ جلاوطن داعیوں کو پناہ دیتے، اور ان مظلوموں کے ساتھ حسن سلوک کرتے اور ان کے لئے سیاسی پناہ گزیں کی حیثیت سے تنخواہیں مقرر کر دیتے ہیں۔

امام نسفیؒ نے سچ فرمایا ہے: ''ملکوں اور مقامات کی نوعیت اس پہلو سے بہت حد تک بدل جاتی ہے کہ وہاں ایک مسلمان کا دین، اس کے اہل وعیال، اس کی عزت ومال محفوظ ہیں یا نہیں (فقہ الاقلیات رص ۳۵، ۳۶)۔

شہریت کی بنیاد کیا ہے؟

عاجز کے نزدیک شہریت کی بنیاد کوئی ایک متعین شئی نہیں ہے، بلکہ مختلف چیزوں میں سے کسی کو بھی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، اور اس سلسلہ میں جس ملک کی جو پالیسی یا قانون حکومت ہو اسی کا اعتبار کیا جائے گا، کسی جگہ شادی کرلینا یا وہاں زمین یا جائداد خرید لینا یا مکانات تعمیر کرلینا جس سے مستقل رہائش کا ارادہ معلوم ہو، یا وہاں کے اصل باشندوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف دفاعی اور مقابلہ آرائی کی پوزیشن حاصل کرلینا یا تجارتی ومعاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا، یا مخصوص مدت جس کی تعیین سلطان یا امیر اور ملک کا دستور کرے گا، تک قیام پذیر رہتا ہے۔

مہاجرین مدینہ کے حالات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے مذکورہ بالا تمام امور کی طرف رہنمائی یا اشارہ ملتا ہے، اگر کسی جگہ مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں، ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جارہا ہو، ان کی مذہبی آزادی سلب کرلی گئی ہو اور ان کی جان ومال خطرہ اور عزت وآبرو غیر محفوظ ہو تو وہاں سے ہجرت کرنا فرض ہے، اور مسلم ملک پر ان مہاجرین کو پناہ دینا اور ان کے دینی اعمال کی انجام دہی کو یقینی بنانا لازم ہے۔

ملکوں کی تقسیم دارالحرب اور دارالاسلام کے اعتبار سے آج کل محل نظر ہے، ہر ملک کے اپنے کچھ آئین اور قوانین ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لئے ویزا لینا ہوتا ہے، پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے، مزید کچھ کاروائیاں ہوتی ہیں، پہلے زمانہ میں جو ''امان'' کے ساتھ جانے کا رواج تھا آج وہی ویزا کہلاتا ہے، ویزا کے ساتھ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے والے کی مدت مختصر بھی ہوسکتی ہے اور طویل بھی، مختصر ایک ہفتہ یا اس سے کم اور طویل ایک سال یا اس سے زائد ہوسکتی ہے۔

ہدایہ میں ہے: ''إذا دخل الحربي إلينا مستأمناً لم يمكن أن يقيم في دارنا سنة، ويقول له الإمام: إن أقمت تمام السنة وضعت عليك الجزية... وللإمام أن يوقت في ذلك ما دون السنة كالشهر والشهرين'' (ہدایہ ثانی ص ۵۸۵، ۵۸۶)۔ (اگر حربی دارالاسلام مستامن بن کر آئے تو ایک سال تک قیام کا موقع نہیں دے گا، اور امام اس سے کہہ دے گا کہ اگر تم پورا سال ٹھہرے تو میں تم پر جزیہ مقرر کردوں گا...... اور امام کو اختیار ہے کہ اس سلسلہ میں سال سے کم مثلاً ایک اور دو ماہ کا وقت متعین کردے)۔

امام جصاصؒ نے آیت کریمہ: ''وإن أحد من المشركين استجارك... أبلغه مأمنه'' (سورۂ توبہ:۶) کے تحت لکھا ہے: ''قال أصحابنا: لا ينبغي للإمام أن يترك الحربي في دار الإسلام مقيما بغير عذر ولا سبب يوجب إقامته وإن عليه أن يتقدم إليه بالخروج إلى داره، فإن أقام بعد التقدم إليه سنة في دار الإسلام صار ذميا ووضع عليه الخراج'' (احکام القرآن للجصاص ۳، ۱۰۴)۔ (ہمارے اصحاب کا کہنا ہے کہ امام کے لئے مناسب نہیں کہ وہ حربی کو دارالاسلام میں بغیر کسی عذر اور سبب کے اقامت کرنے دے کہ وہ مقیم ہوجائے، امام پر لازم ہے کہ وہ حربی کو پہلے اپنے ملک جانے کی بات کہے اگر وہ اس طرف پیش قدمی کے بعد دارالاسلام میں سال بھر رہ جائے تو وہ ذمی ہوجائے گا اور اس پر خراج ہوگا)۔

ڈاکٹر زحیلی مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''الآية تفيد عموم حكم الأمان لأهداف دينية أو سياسية أو تجارية، قال ابن كثير: والغرض أن من قدم من دار الحرب إلى دار الإسلام في أداء رسالة أو تجارة أو طلب صلح أو مهادنة أو حمل جزية أو نحو ذلك ومن الأسباب، وطلب من الإمام أو نائبه أمانا، أعطى أمانا، مادام مترددا في دار الإسلام، حتى يرجع إلى مأمنه ووطنه'' (آیت دینی یا سیاسی یا تجارتی مقاصد کے لئے امان کے عمومی حکم کا فائدہ دیتی ہے، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: آیت کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص دارالحرب سے دارالاسلام پیغام رسانی یا تجارت یا طلب مصالحت یا معاہدہ یا جزیہ وغیرہ اسباب میں سے کسی وجہ سے آئے اور امام یا اس کے نائب سے امان طلب کرے، تو وہ امان دے گا جب تک کہ وہ حربی دارالاسلام میں رہے، یہاں تک کہ اپنے وطن یا جائے امن لوٹ جائے)۔

ڈاکٹر موصوف آگے مزید لکھتے ہیں: ''نص الحنفية والشافعية وغيرهم على أن الحربي إذا دخل دار الإسلام مستجيرا لغرض شرعي كسماع كلام الله أو دخل بأمان للتجارة، وجب تأمينه وحماية نفسه وماله إلى أن يبلغ داره التي يأمن فيها'' (التفسير المنير ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۰، سورۂ توبہ:۶)۔ (حنفیہ اور شافعیہ وغیرہم نے اس کی صراحت کی ہے کہ حربی جب دارالاسلام کسی شرعی مقصد، جیسے کلام اللہ کا سننا، کی خاطر پناہ لے کر آئے یا تجارت کے لئے امان کے ذریعہ داخل ہو تو اس کو امان دینا اور اس کی جان و مال کی حفاظت ونگرانی کرنا واجب ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے مامون گھر میں پہنچ جائے)۔

علامہ جصاصؒ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ: ''في هذا دليل أيضا على أن على الإمام حفظ أهل الذمة والمنع من أذيتهم والتخطي إلى ظلمهم، وفيه الدلالة على أنه لا يجوز اقرار الحربي في دار الإسلام مدة طويلة، وأنه لا يترك فيها إلا بمقدار قضاء حاجته'' (احکام القرآن للجصاص ۳، ۱۰۳)۔ (اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امام پر اہل ذمہ کی حفاظت، ان کو اذیت سے بچانا اور ان پر ظلم ڈھانے سے روکنا لازم ہے، اور اس میں یہ دلالت ہے کہ دارالاسلام میں حربی کو طویل مدت باقی رکھنا جائز نہیں، اور یہ کہ اس کو صرف اپنی ضرورت پوری کرنے کے بقدر دارالاسلام میں رہنے دیا جائے گا، اس سے زیادہ نہیں)۔

حربی کا ذمی اور مستامن کا حربی بن جانا:

باہمی رضامندی یا دارالاسلام میں ایک سال تک اقامت، یا شادی کرنے یا غلبہ وفتح کے ذریعہ حربی ذمہ بن جاتا ہے، اسی طرح مستامن، یعنی وہ حربی جو

دار الاسلام میں عارضی طور پر مقیم ہو، دار الاسلام میں مقررہ مدت اقامت ختم ہونے کے ساتھ ہی حربی بن جاتا ہے...... بسا اوقات مستامن خود اپنی طرف سے "امان" ختم کرنے سے یا اقامت کی نیت سے دار الحرب میں لوٹ آنے کے سبب حربی بن جاتا ہے، اگر تجارت، سیر و تفریح یا کسی ضرورت کے تحت دار الحرب جائے اور پھر وہاں سے دار الاسلام لوٹ آئے تو حربی نہیں بنے گا (موسوعہ فقہیہ ۷/ ۱۶۳)۔

جمہور فقہاء کے یہاں اگر مسلمان یا ذمی کسی حربی کو (خواہ وہ مستامن ہو) قتل کردے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، جیسا کہ اگر وہ غیر مستامن حربی کو قتل کردے تو ان پر دیت واجب نہیں ہوتی، اس لئے کہ حربی کے خون کے مباح ہونے میں شبہ موجود ہے اور اس لئے کہ اصل میں وہ مباح الدم ہے (موسوعہ فقہیہ ۷/ ۱۶۶)۔

مستامن کے لئے مدت قیام:

اصل یہ ہے کہ غیر مسلم جس کے ساتھ عقد ذمہ نہ ہو، اس کو دار الاسلام میں مستقل اقامت نہیں کرنے دیا جائے گا، صرف وقتی امان کے ذریعہ کچھ دنوں اقامت کی اجازت ہوگی اور اس امان والے کو مستامن کہتے ہیں، جمہور فقہاء (حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ) کے نزدیک مستامن کی دار الاسلام میں اقامت کی مدت پورے سال نہیں ہوگی، اگر وہ ایک سال یا اس سے زیادہ اقامت کرلے تو اس پر جزیہ عائد کردیا جائے گا، اور اس کے بعد وہ ذمی ہوجائے گا۔

لہذا غیر مسلموں کی لمبی اقامت اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ دائمی اقامت اور اہل ذمہ کے شرائط قبول کرنے پر راضی ہیں۔

واضح رہے کہ اگر امام نے کوئی مدت مقرر کی تھی تو جس دن امام نے کہا تھا اس دن سے ایک سال تک اقامت کرے تو جزیہ لیا جائے گا۔

اور اگر کوئی مدت مقرر نہیں کی تھی تو اکثر حنفیہ کے نزدیک ایک سال اقامت کرنے سے ذمہ بن جائے گا، جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ جس دن امام نے نکلنے کا نوٹس دیا ہے، اس ایک سال کا لحاظ اس تاریخ کے اعتبار سے ہوگا (ایضا)۔

پناہ گزینوں کے حقوق:

اگر کسی ملک نے دوسرے ملک کے باشندوں کو مظالم یا آفات سماویہ کی وجہ اپنے ملک میں پناہ دے رکھی ہے تو یہ عارضی پناہ گزیں مستقل شہریوں کے مساوی حقوق میں نہ ہوں گے، بلکہ معاہدہ کے تحت حقوق کا استحقاق رکھیں گے، اب اس ملک کا امیر یا سلطان حسب گنجائش ان کو آئندہ ایک شہری کی حیثیت بھی دے سکتا ہے اور حالات معمول پر آنے کی صورت میں انہیں ان کے ممالک بھی واپس کرسکتا ہے، کیونکہ اخلاقی وانسانی اعتبار سے اس نے نازک گھڑی میں ان کا ساتھ دیا، اور سہولت فراہم کی یہی کیا کم خدمت ونصرت ہے۔

ہاں اگر یہ پناہ گزیں مستقل شہری بن جاتے ہیں تو قدیم وجدید کا فرق نہیں ہوگا، بلکہ ان کو ایک شہری کی حیثیت سے وہ جملہ حقوق حاصل ہوں گے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

☆☆☆

شہریت سے متعلق چند اہم مسائل

قاضی محمد حسن ندوی مدھوبنی[1]

ا۔ اسلام میں شہریت کی بنیاد:

یہ بات مسلم ہے کہ اسلام ہی ایک واحد مذہب ہے جس نے ہر زمانے میں انسانوں کو حقوق عطا کئے ہیں، اور اس کے کچھ اصول و بنیاد مقرر کئے ہیں، شرعی تعلیمات کی روشنی میں قرآن وحدیث سے دو اصول و بنیاد کی طرف رہنمائی ملتی ہے:

ا۔ ایک اصول یہ ہے کہ انسان کا اللہ تعالی کی وحدانیت کا اعتراف کر کے اللہ کی عبدیت کو قبول کرنا اور زبان و دل سے کلمہ کا اقرار کرنا، اقرار عبدیت کی وجہ سے شہری اور مدنی تمام حقوق کے مستحق ہوں گے۔

حدیث شریف میں ہے: ''وقد قال رسول الله ﷺ: أمرت أن اقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله، فمن قال لا إله إلا الله عصم مني ماله ونفسه إلا بحقه'' (مشکوۃ ۲،۱۵۷)۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ مجھے اس وقت تک لوگوں سے مقاتلہ کرنے کا حکم دیا گیا جب تک کہ کلمہ نہ پڑھ لے، جب کلمہ کا اقرار کرلیا تو اس کا مال اور جان محفوظ ہوگئی، مگر حق کے ساتھ)۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ طیبی تحریر کرتے ہیں: ''من قال لا اله الا الله وأظهر الإسلام نترك مقاتله ولا نفتش باطنه هو مخلص أم لا'' (مرقاۃ المفاتیح ۴،۲۸۸) (جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اسلام کا اظہار کیا تو ہم اس سے جنگ ترک کر دیتے ہیں اور اس کے باطنی حالات کی تفتیش نہیں کرتے کہ آیا وہ مخلص ہیں یا نہیں)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی اقرار اسلام کو حفظ نفس اور مال کا سبب قرار دیا ہے، ''وإعلان الإسلام يؤدي إلى عصمة دم الإنسان وماله من أي أذى'' (موسوعہ فقہیہ ۱۳،۲۷۱)۔ (اسلام کا اعلان انسان کی جان و مال کی حفاظت کا سبب ہے)۔

دوسری جگہ پر ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ''حدد التشريع الاسامي اطرا العلاقات الثلاث علاقة الانسان بربه وعلاقته بنفسه وعلاقته لمجتمعه'' (موسوعة الفقه ۱۲،۶۰۷)۔

''لأن رسالة الاسلام ذات نزعة عالمية موجهة لجميع الناس فتكرر الخطاب بكلمة ''يا ايها الناس'' (حوالہ سابق)

شریعت مطہرہ نے شہری حقوق کے لئے تین باتوں کو بنیاد بنایا ہے، انسان کا اللہ تعالی سے تعلق ہونا، اپنے ذات سے تعلق ہونا اور انسان کا اپنے معاشرہ سے تعلق ہونا۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی اس عبارت سے یہی بات عیاں ہوتی ہے کہ شہریت کی اصل بنیاد اسلام قبول کرنا، اور انسان کا اللہ تعالی سے عبدیت کا رشتہ استوار ہونا، اگر یہ رشتہ قائم ہے تو وہ انسانی تمام حقوق کا مستحق ہے، ورنہ نہیں۔

۲۔ حقوق انسانی کی دوسری بنیاد انسانی کرامت و شرافت ہے، کیونکہ بحیثیت انسان سارے لوگ برابر ہیں اور کائنات کی ساری چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، اس لئے انسان ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ حق دار ہوگا، اور اس کائنات میں انسان ہی کو سب سے زیادہ معزز اور قابل احترام مخلوق تصور کیا جائے گا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ولقد كرمنا بني آدم وحملناهم في البر والبحر ورزقناهم من الطيبات و فضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا'' (بنی اسرائیل: ۷۰)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی حقوق انسان کی بنیاد تکریم انسان کو قرار دیا ہے۔

---

[1] استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ماٹلی والا بھروچ گجرات۔

"وإنما أساس هذه الحقوق في الإسلام هو إقرار الكرامة الإنسانية أو التكريم الإلهي للإنسان، وهي تستلزم الاعتراف بالحرية، والعدل والسلام والحقوق الضرورية أو الحاجة الإنسانية في العلم والتربية والعمل والكسب والانتقال وغير ذلك" (موسوعه الفقه الاسلامي والقضايا المعاصره ۲،۶۰۸)۔ (یقیناً اسلام میں ان حقوق کی بنیاد کرامت انسانی کا اقرار کرنا ہے، یا انسان کو اللہ تعالی کی وحدانیت کے اقرار کرنے کی وجہ سے مکرم ومحترم سمجھنا ہے اور یہی حقوق عدل، حریت وسلامتی، ضروری حقوق، یا انسانی زندگی کے تمام حاجات کے معترف کا مستلزم ہے)۔

غرض یہ کہ تکریم انسان کا تصور اسلام کے بنیادی تصورات میں سے ہے، اس اعتبار سے سارے انسان برابر ہیں، خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم شہری ہوں یا پناہ گزیں۔

مغرب کا تصور شہریت:

لیکن اسلام کے علاوہ دوسرے ممالک کا تصور مختلف ہے، اور مغربی ممالک کا تصور بالکل آزادانہ ہے، یہ لوگ حقوق شہریت کو ایک طبعی حق سمجھتے ہیں، اس کے لئے کسی اصول وبنیاد کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ صاحب "موسوعة الحقوق الانسانی" لکھتے ہیں: "ويرى الفكر الغربي ذلك حقا طبيعيا ينبع من السيادة المطلقة للإنسان التي لا تعلو لها سيادة" (ص۴، مطبع دار السلام)۔ (مغربی فکر کا تصور یہ ہے کہ یہ ایک طبعی حق ہے جو انسان کو مطلق سیادت وحکومت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے)۔

البتہ بعض ممالک کے حکمراں نے (یعنی ہندوستان، برطانیہ اور امریکہ نے) حقوق شہریت کے حصول کے لئے دو اصول وضع کئے ہیں۔

۱۔ ایک اصول خونی رشتہ کا اصول ہے، جس کے مطابق کسی ملک کی شہریت رکھنے والے ماں باپ سے پیدا ہونے والا بچہ خود بخود اپنے والدین کے ملک کا شہری مانا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا اصول پیدائش کا ہونا ہے، یعنی جو بچہ جس ملک کی سرزمین پر پیدا ہوا وہاں کا شہری مانا جاتا ہے، جیسا کہ صاحب "مبادی سیاسیات" تحریر کرتے ہیں:

دستور ہند کے پارٹ (۲) میں لکھا ہے کہ ہر وہ شخص جو ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور ہند کے نفاذ کے وقت ہندوستان میں سکونت پذیر تھا، یا ہندوستان کے کسی علاقہ میں پیدا ہوا یا جو دستور ہند کے نفاذ کے فوراً بعد کم از کم پانچ سال ہندوستان کے کسی علاقہ میں سکونت پذیر رہا وہ ہندوستان کا شہری مانا جائے گا (مبادی سیاسیات، ص ۳۵۴)۔

اسی طرح امریکی دستور اور نظام حکومت کا تاثر ہے، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: سارے انسان مساوی پیدا ہوئے ہیں، یہ کہ خالق کائنات نے انہیں چند نا قابل تنسیخ حقوق عطا کئے ہیں، یہ کہ ان حقوق میں جان وتن کی سلامتی، آزادی وحریت کے حقوق شامل ہیں، اور حکومت کے قیام کا مقصد ہے حقوق کی حفاظت کرنا، جب کوئی حکومت مقاصد میں ناکام ثابت ہوتی ہے تو عوام کو حق ہے کہ وہ اسے بدل ڈالیں، اور اس کی جگہ پر نئی حکومت نصب کریں (مبادی سیاسیات، ص ۳۳۰)۔

۲۔ شہریت حاصل ہونے کی بنیاد کے تعلق سے اوپر تفصیل سے وضاحت کی گئی کہ اسلام میں اس کی دو بنیادیں ہیں: ایک مسلمان ہونا، دوسری بنیاد انسان ہونا، یعنی اسلام نے ان ہی دو باتوں کو شہریت کے حقوق کا سبب قرار دیا ہے (موسوعة الفقہ الاسلامی ۱۲/۶۰۸)۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالی نے سارے انسان کو خیر امت کہا ہے، اور آپس میں کسی وجہ سے تفاوت اور تفوق کسی پر روا نہیں کیا ہے، نہ کسی کو کسی پر ترجیح دی ہے، بلکہ سبھوں کو محترم ومکرم قرار دیا ہے، ہر انسان، خواہ کسی بھی مذہب وملت پر ہو اچھی صورت اور عزت وتکریم والا ہے، اور آپس میں سب برابر ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "هو الذي خلقكم من نفس واحدة" (اعراف: ۱۸۹)، اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔

اسی طرح سیرت نبوی سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے عالم کے انسانوں کو وحدت کی لڑی میں پرونے کی کوشش کی ہے۔

"لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي، كلكم من آدم وآدم من تراب" (کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے)۔

دوسری جگہ پر ارشاد نبوی ہے: "قال أي يوم هذا؟ قالوا يوم حرام، ثم قال أي شهر هذا؟ قالوا شهر حرام، قال أي بلد هذا؟ قالوا بلد حرام، قال: فإن الله قد حرم بينكم دمائكم وأموالكم أو اعراضكم كحرمة يومكم هذا، في شهركم هذا، في بلدكم هذا" (مسند امام احمد بن حنبلؒ حدیث نمبر: ۲۳۳۸۱)۔ (اللہ کے رسول ﷺ نے کہا یہ کون سا دن ہے؟ صحابہ کرام نے کہا: یوم حرام

ہے، پھر پوچھا کون سا مہینہ ہے؟ کہا شہر حرام ہے، کہا کون سا شہر ہے؟ تو کہا محترم شہر (مکہ) ہے، پھر کہا اللہ تعالی نے تمہارے درمیان اس دن، مہینہ اور اس شہر کی طرح ایک دوسرے کا خون، مال اور عزتوں کو حرام قرار دیا ہے)۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ تعلیمات کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ عملی نمونے بھی پیش کئے ہیں، تاریخ اسلام اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب بھی کسی ملک سے اسلام قبول کر کے آپ کے پاس اور آپ کی صحبت میں رہنے کی درخواست کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف پناہ ہی نہیں دیا، بلکہ اسے شہری تمام حقوق عطا کئے، اور کسی کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا، مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم ذمی اور مستامن کے معاہدہ کا خود پاس ولحاظ کیا اور صحابہ کرام کو بھی اس کی وصیت فرمائی۔

ہجرت کے بعد امت مسلمہ کے ساتھ آپ کا جو کردار تھا اس کے بارے میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی رقم طراز ہیں: ''كل هذه التصرفات السياسية والإدارية تدل على أن الرسول ﷺ كان رسولا و قائدا وحاكما في المدينة المنورة التي اكتسب فيها المسلمون وجودا دوليا خارجيا و محليا'' (موسوعة الفقه الاسلامي ۱۲،۶۱۷)۔ (یہ سیاسی اور حکومتی تصرفات ہیں جو اس بات پر دال ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واحد رسول وقائد اور حاکم تھے جن کی وجہ سے تمام مسلمانوں کو اپنا وجود اور سیاسی خارجی اور داخلی تمام حقوق حاصل ہوئے)۔

دوسری جگہ پر لکھتے ہیں: ''وفي المدينة بعد الهجرة وضع الرسول ﷺ نظام الدولة الاسلامية جاعلا إياها محل الوحدة القومية وأصبح المسلمون مساوين جميعا'' (موسوعة الفقه الاسلاميه ۱۲،۶۱۸)۔ (ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکومت کے زمام کو امت وحدۃ کے مقام پر لا کھڑا کیا اور اسی وجہ سے سارے مسلمان برابر ہو گئے)۔

انصاری صحابہ کرام نے مہاجرین صحابہ کرام کے ساتھ جو سلوک پیش کئے وہ بھی اس وقت کے حالات میں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں، نمونہ کے طور پر ایک یہاں مثال پیش کی جارہی ہے: ''عن أنس أنه قال: قدم علينا عبد الرحمن بن عوف وآخا رسول الله ﷺ بينه وبين سعد بن الربيع و كان كثير المال فقال سعد: قد علمت الانصار أني من أكثرها مالا سا قسم مالي بيني و بينك شطرين، ولي امرأتان فانظر اعجبهما إليك فاطلقها حتى إذا حلت تزوجتها فقال عبد الرحمن بارك الله لك في أهلك'' (بخاری ۱،۵۳۳)

اس واقعہ میں دیکھئے کہ حضرت سعد بن ربیع نے مواخات کا کیا نمونہ پیش کیا مال کا آدھا حصہ مہاجر صحابی عبد الرحمن بن عوف کو دے دیا نیز دو بیویوں میں سے ایک بیوی کو اس کے نکاح میں دینے کے لئے طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا، اور پسند کرنے کے لئے کہا، اس پر عبد الرحمن ؓ نے دعا دی۔

بہر حال اوپر کی بحث اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور صحابہ کے کردار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی مسلم کسی شرعی عذر کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کے لئے درخواست دے تو شرعاً اور اخلاقاً درخواست قبول کرنا ضروری ہوگا۔

۳۔ یہ بات اوپر کی بحث وتحقیق سے نمایاں ہوئی کہ اسلام میں شہریت کی بنیاد صرف دو چیزیں ہیں، مسلمان ہونا اور دوسری بنیاد انسان کا بحیثیت انسان مکرم و محترم ہونا، لہذا جن لوگوں میں دونوں صفات یا ایک صفت پائی جائے گی انہیں مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کا موقع اور حق حاصل ہوگا۔

لہذا اگر کوئی مسلمان ظلم سے بچنے کے لئے یا شعائر اسلام کے تحفظ کے لئے کسی مسلم ملک میں پناہ لے تو اسے شہری تسلیم کرنا چاہئے، یہ حق دینا شرعاً درست ہی نہیں ہے، بلکہ اولی وافضل ہوگا، نیز اسے ملک کے قدیم شہری کی طرح حق اور سہولتیں نہ دینا شرعاً جائز نہیں ہوگا۔

لیکن مغربی ممالک اور ہندوستان کے قانون اور اساس شہریت کے اعتبار سے غیر ملکی باشندے (پناہ گزیں) کو چند ہی حقوق حاصل ہوتے ہیں، البتہ وہ مدنی اور سیاسی بہت سے حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں، اور قدیم باشندوں کی طرح تمام سہولتیں نہیں دی جاتی ہیں (مبادی سیاسیات رص ۶۹)۔

۴۔ اسلامی نقطہ نظر سے بحیثیت انسان وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شہریت کے لئے ناگزیر ہیں، مثلاً شخصی آزادی، یعنی جان وتن اور تحفظ جان کا حق، اندرون ملک نقل وحرکت کی آزادی، کسی بھی مقام پر بسنے کی آزادی، ملک سے باہر سفر کرنے اور ملک واپس آنے کی آزادی، اور دوسرے ملک میں پناہ گزین کا حق، ذہنی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق، عقیدہ ضمیر اور مذہب کی آزادی، فکری اور نظریاتی آزادی، اظہار رائے، جلسہ جلوس اور جماعت سازی کے حقوق، نجی جائداد کی فروخت کی آزادی، شادی بیاہ کرنے اور خاندان بنانے کا حق۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی قلمبند کرتے ہیں:

''یقر الاسلام ما تضمنه الاعلان العالمی عن حقوق الانسان فی العاشر من کانون أول (دیسمبر) عام ۱۹۴۸ م (۱) المادة ۱۶ المتعلقة بحق الرجل والمرأة فی التزوج وحریتهما فی تکوین أسرة من غیر تقیید. (۲) المادة ۱۸ فی حق الانسان فی تغییر دینه أو اعتقاده وهی تتعارض مع منع المسلم من ترك دینه والارتداد إلى دین آخر. (۳) المادة ۲۵ التی تقر بثبوت النسب من غیر طریق شرعی. أما النظر الاسلامیة فلا تمنع من رعایة اللقطا وأولاد الزنا و تربینهم والإحسان إلیهم، هذه هی المواد التی یتحفظ علیها المسلمون. وما عدا هذه المواد من میثاق حقوق الاسلام یقره الاسلام ویدعو إلیه مثل حریة التعبیر والرائی والمساواة بین الناس من غیر اعتبار العنصر والجنس واللون و حق التربیة والتعلیم والتعلم وحق الحیاة، والعیش الکریم، وحق العمل والتنقل وتکوین الدولة وتقلد الوضائف ومراعاة الحقوق الاقتصادیة و الاجتماعیة و غیر ذلك'' (موسوعہ الفقہ الاسلامی ۱۲،۶۱۲)۔

یعنی حقوق انسانی کے تحفظ کے خاطر ۱۹۴۸ء میں جو قوانین ودفعات وضع کئے گئے، اسلام ان کی تائید کرتا ہے، البتہ دفعہ/ ۱۸ کی مخالفت کرتا ہے (یعنی تبدیلی مذہب کا حق) کیونکہ یہ حق اسلامی نظریہ سے ٹکراتا ہے، اس کے علاوہ اسلام درج ذیل حقوق کو روا سمجھتا ہے، مثلاً آزادی رائے کا حق، لوگوں کے درمیان غیر جانبدارانہ صورت میں مساوات کو برتنا، تربیت، تعلیم و تعلم کا حق، رہائش اختیار کرنے، منتقل ہونے کا حق، مال حاصل کرنے کا حق اور تمام معاشی اور معاشرتی حقوق کا حاصل ہونا، جیسا کہ ''موسوعۃ الفقہ الاسلامی'' میں ہے: ''الحقوق المدینة والسیاسیة: أهمها أحق فی الحیاة والکرامة الإنسانیة والحریة بأنوا عها، وحق العدل أو المساواة أمام الشرع والقانون. وحق التدین والحرة الدینیة وحریة الرائی والتعبیر والاعتقاد و حقوق التعلیم والتربیة'' (۱۲،۵۴۵)۔

اسی طرح ایک شہری کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو اخروی اور دنیوی ترقی میں معین و مددگار ثابت ہوں گے اور یہ سب حقوق شریعت کے نقطہ نظر سے حاصل ہوں گے۔

''فمن حیث المصدر نجد أن مصدر الحقوق الشرعیة من کتاب و سنة'' (موسوعة حقوق الانسان فی الانسان ص ۷)۔ بلاشبہ حقوق شرعیہ کے دلائل وہ باتیں ہیں جو اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آئیں اور وہ دلائل ہیں جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔

لہٰذا انسانوں کو شہریت کے جو بھی حقوق دیئے جائیں گے وہ شریعت کے آئینے میں ہوں گے، اسے چشم پوشی کر کے کوئی حق دینا یا اس کا استعمال کرنا شرعاً درست نہیں ہوگا۔

۵۔ چونکہ اسلام نے عام شہریوں کے حقوق اور پناہ گزینوں کے حقوق میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا ہے، بلکہ دونوں کو مسلمانوں اور انسان (بنو آدم) ہونے کی وجہ سے یکساں حقوق دیئے ہیں، ارشاد باری ہے: ''یا یها الناس انا خلقنا کم من ذکر وانثی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا إن اکرمکم عند الله اتقاکم'' (حجرات: ۱۳)۔ (اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پرہیز گار بڑا شریف ہے)۔

کیونکہ اسلام ایک ایسا واحد مذہب ہے جو انسانیت کا احترام کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنے کی ترغیب دیتا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ حکومت کا سلوک ہر انسان کے ساتھ یکساں ہو، شہری اور غیر شہری کے اعتبار سے فرق نہ کیا جائے، سیرت نبوی اور خلفائے راشدین کے عمل سے یہی پیغام ملتا ہے، اور یہ خدمت خلق، انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا تقاضہ ہے، چنانچہ فقہ اکیڈمی کے سمینار کی چند تجاویز سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے:

۱۔ اسلام انسانیت کا احترام کرتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے حتی المقدور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر غیر مسلم بھائیوں کی مدد کرنا ان کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی طرف سے خدمت خلق کے اداروں کے ذریعہ بلاتفریق مذہب تمام لوگوں کی خدمت اور اعانت کرنی چاہئے، یہی انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے (دیکھئے: غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ مسائل: ص ۵۰)۔

گرچہ یہ تجاویز غیر مسلم کے سلسلہ میں ہیں تو مسلم کے سلسلہ میں بدرجہ اولی حکومت کا سلوک اور کردار بہت ہی بہتر ہونا چاہئے، اس لئے پناہ گزینوں کو اسلامی نقطہ نظر سے عام شہریوں کی طرح تمام حقوق حاصل ہوں گے، البتہ ملکی قانون اور نظم وضبط کو بحال رکھنے کے لئے "انزل الناس علی قدر منازلھم" قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے کچھ حقوق میں فرق ہوگا، مثلاً پناہ گزینوں کو شروع میں ووٹ دینے کا حق اور امیدوار ہونے کا حق حاصل نہیں ہوگا، اس کے علاوہ تمام حقوق حاصل ہوں گے (مبادی سیاسیات رص ۶۹)۔

البتہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے عقیدہ توحید کی بنیاد پر سیاسی حقوق کو صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص کیا ہے، لیکن اساسی حقوق میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو یکساں شریک کیا ہے (موسوعۃ الفقہ الاسلامی ۱۲ر ۵۴۴)۔

۶۔ رزق حلال کے لئے محنت کرنا، بھاگ دوڑ کرنا اور جائز ذرائع کو اختیار کرنا درست ہی نہیں، بلکہ دوسرے فرائض کی طرح ایک اہم اور دینی فریضہ ہے جس کی ترغیب قرآن پاک میں کئی جگہوں پر آئی ہے (دیکھئے: سورۃ مومنون ر ۳۴، جمعہ ر ۱۰)۔

حدیث شریف میں ہے: ''عن انس أن رجلا من الانصار اتی النبي ﷺ يسأله فقال: أما في بيتك شئ؟ فقال: بلی حلس نلبس بعضه ونبسط بعضه وقعنب نشرب فيه من الماء... واشتر بالآخر قدوما فائتنني به فأتاه به فشد فيه رسول اللہ ﷺ عودا بيده ثم، قال: اذهب فاحتطب وبع ولا ارينك خمسة عشر يوما...'' (مشکوۃ ۲،۱۶۳)۔

حدیث پاک سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معاش کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے جائز طریقہ اختیار کرنا درست ہے، نیز اس کے لئے سفر کرنا حتی کہ غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی گنجائش ملتی ہے، کیونکہ آیات اور حدیث میں مطلقا اس کی ترغیب ہے، دار الاسلام اور دار الحرب کی کوئی تحدید نہیں ہے، اس لئے کچھ شرطوں کے ساتھ مسلمان کے لئے معاش کو بہتر بنانے کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، جیسا کہ مفتی تقی عثمانی صاحب نے چند صورتوں میں گنجائش دی ہے۔

۱۔ کسی مسلمان کو اپنے وطن میں بلا وجہ تکلیف پہنچائی جارہی ہو، یا اس کی جائداد ضبط کرلی گئی ہے، حفظ مال کے لئے غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا اور کوئی صورت نہ ہو تو اس صورت میں درست ہوگا۔

۲۔ مسلم ملک میں رہتے ہوئے معاشی مسائل درست نہ ہو حتی کہ فاقہ سے دوچار ہو تو دوسرے غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا درست ہوگا، جبکہ شریعت پر چلنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

۳۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے خاطر وہاں بود وباش اختیار کرنا درست ہی نہیں، بلکہ موجب اجر وثواب ہوگا، یہی وجہ ہے کہ عہد عمرؓ میں بے شمار صحابہ نے مدینہ کو چھوڑ کر کوفہ میں رہائش اختیار کرنے کو دین کے لئے ترجیح دی۔

۴۔ اگر کسی مسلمان کو اپنے ملک میں ضرورت کے مطابق معاش حاصل ہے، لیکن معیار کے مطابق نہیں ہے تو صرف معیار زندگی بلند کرنے کے لئے غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہوگا (فقہی مقالات ۱ر ۲۳۲)۔

۷۔ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور مسلمان زندگی سے بھرپور آفاقی ضمانت رکھنے والی قوم ہے، انہوں نے تاریخ کے ایک طویل عرصہ پر حکمرانی کی ہے، مگر کبھی کسی اقلیت کے بنیادی مسائل میں تنگ نظری، حق تلفی یا جانبداری کا ثبوت نہیں دیا ہے، بلکہ اقلیت کو عام مسلمانوں کے حقوق عطا کئے ہیں، نیز اس کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہانہ کردار ادا کرنے کی تعلیم خود قرآن نے دی ہے (ممتحنہ: ۸)۔

امام قرطبی نے (سورہ ممتحنہ: ۸) کے سلسلہ میں فرمایا: اللہ تعالی کی طرف سے مسلمانوں کو رخصت واجازت دی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کریں جو مسلمانوں سے عداوت نہیں رکھتے ہیں اور نہ ان سے جنگ کرتے ہیں (تفسیر قرطبی: ۱۸، ۵۹)۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: اللہ تعالی ان کفار کے ساتھ احسان اور حسن سلوک سے منع نہیں کرتے جو تم سے برسر پیکار نہیں ہیں کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو (تفسیر ابن کثیر ۴ر ۳۷۴)۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات میں غیر مسلموں کے حقوق کا بڑا خیال کیا گیا ہے، نمونہ کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین ہدایت

پیش کی جارہی ہے جو اپنے عمال کو فرمائی تھی: ''ألا من ظلم معاهدا أو إنتقصه أو كلفه فوق طاقته أو اخذ منه شيئا بغير طيب نفس فأنا حجيجه يوم القيامة'' (رواه ابوداؤد كتاب الجهاد مشكوة على المرقاة كتاب الصلح ۹،۸۹)۔(خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث ہوں گا)۔

یہ صرف کتابی نظریہ اور قانونی دفعات کی حد تک نہیں ہے، بلکہ عہد اسلامی کے خلفاء نے ان کو عملی طور پر ثابت کیا ہے۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں کسی مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کیا، تو انہوں نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے ورثہ کے حوالہ کر دیا جائے، مقتول کے ورثہ نے اسلامی مساوات اور حضرت علیؓ کے انصاف سے متاثر ہو کر قاتل کو معاف کر دیا اور حضرت علی کے پاس حاضر ہو کر اس کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ تم پر کچھ دباؤ تو نہیں ڈالا گیا (نصب الرایہ ۴/۳۳۷)۔

مذکورہ آیت، فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عملی نمونے سے یہ بات واضح ہوئی کہ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہری کی حیثیت سے آباد ہونے کی اجازت دی جائے، مگر دوسری طرف کئی آیات میں ان کو دوست اور قریب کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''يايها الذين آمنوا لا تتخذوا عدوى وعدوكم أولياء'' (ممتحنہ:۱)۔(اے ایمان والو! میرے اور تم اپنے دشمن کو دوست (راز داں) مت بناؤ)۔

دوسری جگہ پر ہے: ''يايها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض ومن يتولهم منكم فانه منهم'' (مائدہ:۵۱)۔(اے ایمان والو! تم یہود ونصاریٰ کو دوست مت بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو شخص ان کے ساتھ دوستی کرے گا وہ ان ہی میں سے ہوگا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث: ''أنا بري من كل مسلم أقام مع المشركين لا ترای ناراهما'' (مجمع الزوائد ۵،۲۶۰)(میں اس مسلمان سے براءت کا اظہار کرتا ہوں جس نے مشرکوں کے ساتھ بود وباش اختیار کیا ان کو تو اس طرح رہنا چاہئے کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے)۔

بہر حال غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں حقوق انسانی کے تعلق سے تمام حقوق حاصل ہوں گے، لیکن مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کے ساتھ ہمدردی اور اخلاق سے متاثر کرے ان کو اپنے سے قریب کرے، ان کے عقیدے اور تہذیب سے متاثر ہونا اور ان کے رسومات میں شرکت کرنا شرعا درست نہیں ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں علاحدہ رہنا ضروری ہوگا۔

یہاں پر ارشادات تھانوی کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھتے ہیں: کفار کے ساتھ تعلق کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ موالات یعنی دوستی وقلبی تعلق، ۲۔ مدارات یعنی ان کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا، ۳۔ مواسات یعنی کچھ دے دلا کر ان کو فائدہ پہنچانا۔

پہلی قسم کا تعلق تو بالکل ناجائز ہے، جہاں تک دوسری اور تیسری صورت کا تعلق ہے تو یہ تین مواقع پر درست ہیں: ۱۔ دفع ضرر کے لئے، ۲۔ کافر کی دینی مصلحت کے لئے، ۳۔ اگر وہ مہمان ہے یا معزز لوگوں میں سے ہے تو اس کا اکرام کیا جائے گا (احکام القرآن بحوالہ اقلیتوں کے حقوق)۔

مخلوط آبادی:

غرضیکہ مشترکہ طور پر غیر مسلموں کو مسلم معاشرہ میں آباد کرنے میں دو صورتیں پیدا ہوں گی، ایک اعتبار سے منفعت ہے، یعنی اسلامی تعلیمات واخلاق کی تبلیغ آسان ہوگی، دوسری صورت میں مضرت ہے، یعنی غیر اسلامی تہذیب سے مسلمانوں کا متاثر ہونا لازم آئے گا، اور فقہاء کا ایک مسلمہ قاعدہ ہے: ''دفع المضرة أولى من جلب المنفعة'' (منفعت حاصل کرنے کے مقابلہ میں مضرت کو دور کرنا اولیٰ ہے)، لہٰذا غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی سے ہٹ کر بود وباش اختیار کرنے کی اجازت دینا درست ہوگا، تاکہ مسلمان ان کی تہذیب سے متاثر نہ ہوں، اور ان کی مدد کرنے میں اور دین اسلام سے قریب کرنے میں سہولت بھی ہو۔

☆☆☆

شہریت حاصل کرنے کی شرعی بنیاد

مولانا محمد قمر الزماں ندوی[1]

اسلام میں شہریت حاصل کرنے یا شہریت حاصل ہونے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جائے اس کا انحصار حکومت کی صوابدید پر ہے، اگر حکومت کسی کو ملک میں محض بود و باش اختیار کر لینے پر یا معاشی سرگرمیاں انجام دینے پر یا ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام پر شہریت دے دیتی ہے تو یہ اس کے دائرہ اختیار میں ہے، کیونکہ عصر حاضر میں مستقل شہریت کے رائج طریق کار کے مطابق صرف حکومت ان معاملات میں مجاز (Compitent Authority) ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں احقر کی رائے یہ ہے کہ حکومت اور ارباب حکومت کو میثاق مدینہ، مہاجرین حبشہ کا حبشہ میں عارضی قیام اور نجاشی اور حکومت نجاشی اور وہاں کی عوام کے ان کے ساتھ سلوک، نیز مدینہ کے اندر مہاجرین کی شہریت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہریت کے سلسلہ میں رہنما اصول سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے اور خاص طور پر مسلم ممالک کو دل و نگاہ کی تنگی کو ختم کر کے شہریت کے اصول وضابطہ میں نرمی پیدا کرنا چاہئے اور پوری دنیا کے حکمراں کو یہ باور کرانا چاہئے کہ شہریت کے مسئلہ کا حل اگر کسی کے پاس ہے تو صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے اور اس کے اصول اور ضابطے صرف تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ اسلام شہریت کے مسئلہ میں فراخ دلی اور کشادہ قلبی کی تعلیمات دیتا ہے، میثاق مدینہ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر مسلم افراد کے لئے شہریت کی بنیاد اسلامی سلطنت میں "ولاء" اور تبعیت کے معاہدہ کے تحت موجود تھی، شہریت کی یہ اساس عقیدہ کی اساس کے علاوہ تھی جو اختلاف عقیدہ کے باوجود انہیں اسلامی ریاست کا فرد شمار کرتی تھی، اس اساس پر ملنے والی شہریت کے حقوق و فرائض کے تعین کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقولہ فقہی قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لهم ما للمسلمين وعليهم ما عليهم" (ابن حبان)۔

یہ حدیث میثاق مدینہ کے پچیسویں دفعہ کے ابتدائی فقروں کی ترجمانی کرتی ہے جس کے تحت یہود اور مسلمانوں کو معاہدہ ولاء کے تحت یکساں حیثیت کی شہریت حاصل تھی، شہریت کے ضمن میں میثاق مدینہ کی یہ دفعہ دو اہم نکات کی نشاندہی کرتی ہے۔

۱۔ مدنی ریاست کا دستور عقیدہ کی آزادی کے اصول پر قائم ہوا تھا۔

۲۔ اس ریاست کا دستور دیگر سماوی ادیان کے ساتھ برداشت، رواداری کے اصولوں پر مبنی تھا۔

مذہب اسلام نے عقد ذمہ سے بھی غیر مسلموں کو شہریت کے حقوق عطا کئے ہیں، میثاق مدینہ کی شق نمبر ۱۵ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، دفعہ کے الفاظ ہیں:

"اور اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے (ان مسلمانوں) کا ادنیٰ فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا)۔

اوپر کی تفصیلات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہریت کے مسئلہ کو کتنے بہتر انداز میں حل فرمایا تھا کہ مسلم تو مسلم غیر مسلم کے لئے بھی شہریت حاصل کرنا کتنا آسان تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کو کس قدر خوش اسلوبی سے حل فرمایا تھا، آج ضرورت ہے کہ مسلم حکمراں خاص طور پر اور پوری دنیا کے سربراہان مملکت عام طور پر میثاق مدینہ اور مدنی شہریت، نیز ارض حبشہ میں مسلمانوں کی بحیثیت مہاجر اقامت اور نجاشی بادشاہ کی فراخ دلی کا گہرائی سے مطالعہ کریں اور پھر اس کی بنیاد پر شہریت کے مسئلہ کو حل کریں اور اس حدیث کو پیش نظر رکھیں۔

"الخلق عيال الله" پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور اس سلسلے میں بیجا شدت اور غیر انسانی اصول اور ضابطہ کو ختم کرنے کی کوشش کریں، نیز ایک ہی ملک میں وہاں کے باشندوں کے ساتھ امتیاز اور غیر مساویانہ سلوک سے حتی الامکان پرہیز کریں۔

مسلم یا غیر مسلم کی شہریت کی درخواست قبول کرنا کیا حکومت پر ضروری ہے؟

---

[1] استاذ مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپ گڑھ۔

اس مسئلہ کا حل سوال نمبر ایک کے جواب کی روشنی میں ہم تلاش کر سکتے ہیں کہ کسی مسلم یا غیر مسلم کی شہریت کی درخواست کو قبول کرنا وہاں کی حکومت کے اختیار میں ہے، اگر اس ملک میں گنجائش ہے اور وہاں مال وزر اور اسباب وسائل کا افراط ہے، اور درخواست دہندہ کے وہاں قیام سے ملک وملت کا کوئی دینی، معاشی اور سماجی نقصان بھی نہیں ہے، بلکہ یہ شخص اس ملک کا شہری بن کر ملک کا نام روشن کر سکتا ہے یا وہاں کی حکومت کے لئے مفید بن سکتا ہے، اور وہ شخص اپنے ملک میں معاشی پریشانی سے دوچار ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں "كاد الفقر أن يكون كفرا" کی حدیث کا مصداق نہ بن جائے تو ایسی صورت میں اس ملک کی اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ اس کی درخواست کو ضرور بالضرور قبول کرے اور اس کو کفر کی دہلیز پر جانے سے بچائے، جبکہ عام حالت میں جبکہ مسلمان صرف اور صرف معاشی فائدے کی غرض سے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کی غرض سے درخواست پیش کرتا ہے تو حکومت پر ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کی درخواست کو ضرور قبول ہی کرے، بلکہ وہ اپنے ملک اور وہاں کے باشندوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنے اور قبول کرنے کا مجاز ہوگا، ایسے موقعہ پر حکومت کو حتی الامکان وسعت سے کام لینا چاہئے اور وسعت ظرفی کا ثبوت دینا چاہئے۔

مسلمان تارکین وطن مسلمان ملک میں کس درجہ کے شہری ہوں گے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ملک کے لئے شان زیبا تو یہی ہے کہ وہ ان تارکین وطن کو اپنے ملک میں قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں فراہم کرے جس طرح کہ انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کو شہر مدینہ میں بسایا اور ان کو ہر طرح کی سہولیات فراہم کیا، لیکن یہ بات یاد رہے کہ مذکورہ حکم اس وقت ہوگا، جبکہ اس ملک میں تارکین وطن کے دائمی قیام کے لئے گنجائش ہو اور ان تارکین وطن کے مستقل قیام سے وہاں کی حکومت اور عوام کو دینی سماجی اور معاشی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، لیکن اگر اس ملک میں ان تارکین وطن کو مستقل قیام کی اجازت سے حکومت اور عوام کو پریشانی کا زبردست سامنا کرنا پڑ سکتا ہو تو اس ملک اور حکومت کو اس کی اجازت ہوگی کہ انہیں پناہ گزیں کا درجہ دے اور ملک کے قدیم باشندوں کی طرح انہیں ایک شہری ہونے کی سہولتیں نہ فراہم کرے، بلکہ حکومت کو اس کا اختیار ہوگا کہ جس ملک سے وہ آئے ہیں وہاں حالات درست ہو جائیں اور مظالم کا سلسلہ بند ہو جائے تو ان پناہ گزیں کو اپنے ملک واپس بھیج دیں۔

(نوٹ) حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مسلمان جب تک اس ملک میں رہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کریں اور ان کو مہمان کا درجہ دے کر ان کی خوب خاطر مدارات کریں، اور ان کی ضروریات کی مکمل کفالت کریں۔

شہریت کے حقوق کیا ہیں؟

اس سوال کا جواب اور حل پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میثاق مدینہ کے حوالہ سے چند تمہیدی باتیں سامنے آجائیں۔

اسلامی مملکت کے قیام کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ کا اہتمام کیا، اور مہاجرین، انصار، یہود وعیسائی اور دیگر قبائل کو جمع کیا اور اس موقع پر ایک تحریر لکھوائی، جس کو ہم پہلا تحریری دستور قرار دے سکتے ہیں، جس میں امن وامان کی ضمانت، اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری، فکری ومذہبی آزادی کا پورا خیال رکھا گیا جس کے بنیادی اجزاء ونکات کو ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ آبادیوں میں امن رہے گا، تاکہ سکون سے نئی نسل کی تربیت کی جاسکے، ۲۔ مذہب اور معاش کی آزادی ہوگی، ۳۔ فتنہ وفساد کو قوت سے ختم کیا جائے گا، ۴۔ بیرونی حملوں کا مل کر مقابلہ کیا جائے گا، ۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کوئی جنگ کے لئے نہیں نکلے گا، ۶۔ میثاق کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا جائے گا۔

اس معاہدے میں مسلمانوں، یہودیوں اور مختلف قبیلوں کے لئے الگ الگ دفعات مرقوم ہیں، یہ اصل میں مدینہ کی شہری مملکت کے نظم ونسق کا ابتدائی ڈھانچہ تھا۔

یہاں یہ بات واضح طور پر ذہن میں رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یونان کی شہری ریاستوں کی طرح کوئی محدود ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عالمگیر مملکت کی بنیاد ڈالی تھی جو مدینہ کی چند گلیوں سے شروع ہوئی اور روزانہ ۹۰۰ سو کلومیٹر کی رفتار سے پھیلتی رہی، اس وقت دس لاکھ مربع میل کی مملکت تھی جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمایا (مستفاد از محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤلف ڈاکٹر حمید اللہ)۔

اس میثاق، یعنی صحیفہ میں بلدیاتی نظام کے تعلق سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

امن وامان کا قیام، ۲۔ تعلیم وتربیت کی سہولتیں، ۳۔ روزگار سکونت اور ضروریات زندگی کی فراہمی۔

اوپر کی تفصیلات کا گہرائی سے اگر مطالعہ کیا جائے تو اسلامی نقطۂ نظر سے وہ سارے حقوق جن کا سوال نمبر ۴ میں ذکر آیا ہے شہریت کے حقوق مانے جائیں گے، مثلاً ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری اسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق۔

(نوٹ) اگر اس ملک میں کسی خاص ریاست یا صوبہ (میں) کے لئے حکومت نے کسی خاص مصلحت سے دوسرے صوبے کے لوگوں کے لئے زمین کی خریداری پر روک لگادی ہو تو اس ملک کا نیا بننے والا شہری بھی اس آرڈر اور حکم کا مکلف ہوگا۔

شریعت میں پناہ گزینوں کے حقوق:

شریعت اسلامی کی رو سے اگر کسی ملک میں وہاں کی حکومت کی اجازت سے لوگ پناہ لیتے ہیں جن کو عرف عام میں آج پناہ گزیں کہا جاتا ہے تو ایسے لوگوں کو اس ملک میں زندگی گزارنے، نیز اولاد کی تعلیم وتربیت اور حفظان صحت کے سلسلے میں تمام رعایتیں دی جائیں گی اور اگر حکومت ان لوگوں کے خورد ونوش اور رہائش کا انتظام کرنے سے اپنے کو بے بس ظاہر کرتی ہے اور ان کو مکلف بناتی ہے کہ اپنے خورد ونوش کا انتظام خود کریں تو اس صورت میں ان پناہ گزینوں کو معاشی تگ ودو کی مکمل اجازت دینا حکومت کی ذمہ داری ہوگی، البتہ ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار بننے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا باضابطہ حق، نیز وہاں کے سرکاری اسپتالوں میں علاج ومعالجہ کے سلسلے میں عام شہری کی طرح حق، روزگار کا حق، سرکاری طور پر حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقلی کا حق، یہ تمام حقوق وہ ہیں جو ان پناہ گزینوں کو اس وقت حاصل ہوں گے جب وہاں کی حکومت ان لوگوں کو اس کی اجازت قانونی طور پر دے دے۔

البتہ حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جب ان لوگوں کو وقتی طور پر ہی سہی اگر ملک میں رہنے کی اجازت دی ہے تو دامے درمے ان کی مدد کریں ان کے بچوں کی تعلیم کی فکر کریں، حفظان صحت کے سلسلے میں ان کی مدد کریں ان کے دوا وعلاج کا مفت انتظام کریں، موسم کی شدت وحدت کے دنوں میں ان کا خاص خیال رکھیں، اور اس سلسلے میں یہ کوشش بھی کریں کہ اگر ان کی ضروریات خود پوری نہ کرسکیں تو متمول اسلامی ممالک سے تعاون کی درخواست کریں اور اقوام متحدہ کے مالی فنڈ سے ان کی مدد کرائیں، ان کے لئے انسانیت نوازی کا پورا ثبوت دیں۔

اس سلسلے میں حکومت اور وہاں کے باشندوں کی ذمہ داری ہے کہ اگر چہ وہ لوگ وہاں کے حقیقی شہری نہیں ہیں، لیکن اسلام نے ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان سے اخوت کے رشتے سے جوڑ دیا ہے، اس لئے ان پناہ گزینوں کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان سے تعصب نہ برتیں۔

الغرض پناہ گزینوں کو جو حقوق حاصل ہونے چاہئیں وہ مختصراً یوں ہیں:

۱۔ ضمیر کی آزادی، ۲۔ زبان کی آزادی، ۳۔ زندگی گذارنے کی آزادی، ۴۔ رہائش اور امن وامان کا حق۔

غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا کیسا ہے؟

کسی مسلمان کے لئے مجبوری اور ضرورت شدیدہ کی بنا پر غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اسلام میں گنجائش نظر آتی ہے، عام حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ حدیث کی مشہور کتاب ''ابوداؤد'' میں حضرت سمرہ بن جندب کی روایت موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله'' (ابوداؤد کتاب الضحایا) (جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے)۔

حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين قالوا يا رسول الله! لم؟ قال لا تراءى ناراهما'' (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہ کرامؓ نے سوال کیا یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، تم یہ امتیاز کرسکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے)۔

امام خطابیؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے، چنانچہ بعض اہل علم

کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دار الاسلام اور دار الکفر دونوں کو علاحدہ علاحدہ کر دیا ہے، لہٰذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے کہ یہ بھی انہیں میں سے ہے، علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دار الکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے'' (معالم السنن للخطابی ۳؍۴۳۷، بحوالہ فقہی مقالات جلد اول)۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو)۔

یہی وجہ ہے کہ عام حالت میں مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے، البتہ مخصوص حالات میں ضرورت شدیدہ کی بنا پر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، نیز غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کے مقصد سے بھی وہاں قیام کی گنجائش فقہاء نے دی ہے۔

غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے بدل بھی سکتا ہے، چنانچہ فقہاء کے یہاں ایک مشہور قاعدہ ہے: "لا ینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان"، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مفتی تقی عثمانی صاحب کی تحریر پیش کر دی جائے:

''کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی شہریت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو مستقل مسکن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض و مقاصد کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً:

۱۔ اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کر لیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کر لی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرے کہ وہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کار بند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکرات و فواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

۲۔ اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہو جائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہو جائے ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرے تو مذکورہ بالا دو شرائط (جن کا بیان نمبر ایک میں گزرا) اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

''هو الذي جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور'' (سورۂ ملک) (وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا، اب تم اس کے راستوں میں چلو، اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے)۔

۳۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شریعہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے، بلکہ اجر و ثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، اور جو بعد میں ان کے فضائل و مناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی۔

۴۔ اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات و منکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلا ضرورت دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش و عشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت کو دار الاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (بحوالہ فقہی مقالات جلد اول)۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کی مستقل شہریت کا شرعی حکم:

سرزمین حجاز مقدسہ میں غیر مسلموں اور اہل کتاب کو مستقل یا عارضی شہری کی حیثیت سے آباد کرنا کسی حال میں درست نہیں ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ انہیں سرزمین حجاز سے باہر نکال دو، ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا یجتمع فی الجزیرة دینان" جزیرہ عرب میں دو دین ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، یعنی اسلام اور کفر ایک ساتھ اکٹھا نہیں ہو سکتے۔

عرب ملکوں میں ضرورت کی بناء پر جن غیر مسلموں کو رہائش کی اجازت مل سکتی ہے ان کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن نہ ہوں یا ان سے برسر جنگ نہ ہوں، چونکہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک، اور عدل کرنے سے نہیں رکتا، بلکہ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات سے روکتا ہے جو مسلمانوں کے خلاف برسر جنگ ہوں اور ان کے خلاف جارحیت اختیار کریں۔

اگر ضرورت شدیدہ کی بنا پر غیر مسلموں کو شہریت کی اجازت دینی ہی پڑ جائے تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان میں دعوت و تبلیغ سے غافل نہ ہوں اور اسلام کے محاسن کو بیان کرنے سے پیچھے نہ رہیں، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں علامہ ابن بازؒ لکھتے ہیں:

''الطریق لهذا والسبیل إلیه هو دعوة غیر المسلمین إلی الخیر والهدی، وأن یفسر لهم ما جاء به الرسول ﷺ من الهدی ودین الحق بالأسلوب الذی یفهمونه وبیان محاسن الإسلام لهم لعلهم یدخلون فی دین الله ولعلهم یخرجون من ظلمات الشرك والجهل والظلم إلی نور التوحید والإیمان وعدالة الاسلام۔ فمن قبل الحق واستقام علی دین الله فالحمد لله، وإلا أمکن أبعاده إلی بلاد الکفرة إذا کان لیس من أهل الوطن، وإن کان منهم أمکن أن یستتاب، فان تاب وإلاقتل إن کان لیس من أهل الکتاب ولا عن المجوس، وإن کان من المجوس أو من اهل الکتاب توخذ منهم الجزیة، ویبقی فی صغار و ذل حتی یدخل فی دین الله ویسلم الناس من شره ویعرفونه۔۔۔وهذا کله فی غیر الجزیرة العربیة، أما فی الجزیرة العربیة فالوا جب أن یمنعوا من دخولها وأن لا یبقوا فیها'' (مجموع فتاوی ابن باز)۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ عرب ملکوں (جزیرۃ العرب کو چھوڑ کر) میں بھی شہری کے طور پر صرف اہل کتاب اور اہل مجوس ہی رہ سکتے ہیں، وہ بھی خاص شرطوں کے ساتھ غیر مسلموں، یعنی مشرکوں کو اگر مجبوری کی بنا پر قیام اور شہریت کی اجازت دے دی بھی گئی تو بھی حکومت کو حق ہے کہ ان کو اسلامی ملکوں سے ضرورت ختم ہونے پر باہر کر دیں اور شریعت نے بھی اس کی اجازت دی ہے، البتہ جب تک وہ رہیں گے ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے گا اور ان کو تمام جمہوری اور دستوری حقوق حاصل ہوں گے۔

☆☆☆

اسلام میں حصول شہریت کے بنیادی عناصر

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی [1]

ا۔ کسی بھی جگہ سکونت کی مختلف نوعیت ہوتی ہے، اور ہر ایک کے الگ الگ احکام ہوتے ہیں، فقہاء نے قیام کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے: وطن اصلی، وطن اقامت، وطن سکونت، گفتگو کا محور زیر بحث تحریر میں صرف "وطن اصلی" ہے، جس کو شہریت سے تعبیر کرتے ہیں۔

فقہاء نے وطن اصلی کے حصول کے بنیادی عناصر کی طرف اشارہ کیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہریت کا تحقق دو جہت سے ہوسکتا ہے۔

الف۔ غیر اختیاری، جس کو پیدائشی شہریت بھی کہتے ہیں، یعنی جس جگہ ایک انسان پیدا ہوا ہے وہ از خود اس کا وطن بن گیا۔

ب۔ اختیاری شہریت: یعنی ایسی شہریت جو کوشش کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس کی بھی دو صورت ہے، ایک تو یہ کہ کسی بھی جگہ کو مستقل قیام کے لئے منتخب کرلیا جائے، حتی کہ وہاں سے فی الفور جانے کا ارادہ نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس مقام پر کسی خاتون سے جس کو پہلے ہی سے وہاں کی شہریت حاصل ہو، اس سے شادی کرلی جائے۔

یہ دوسری صورت وطنیت کے لئے کافی ہوگی یا نہیں، تھوڑا اختلاف پایا جاتا ہے؛

"ردالمحتار" میں ہے: "الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أي: تزوجه، قال في شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة، فقيل لا يصير مقيما، وقيل: يصير مقيما، وهو الأوجه، أو توطنه، أي: عزم على القرار فيه وعدم الارتحال، وإن لم يتأهل" (ردالمحتار ۱.۵۸۶، باب المسافر، مطلب في الوطن الأصلي، مطبوعہ رشیدیہ پاکستان)۔ (وطن اصلی تو وہ مقام ولادت ہے، یا جائے ازدواج، شرح منیہ میں ہے: اگر مسافر نے کسی شہر میں شادی کرلی اور اقامت کی نیت نہیں کی تو ایک قول یہ ہے کہ مقیم نہیں ہوگا، دوسرا قول ہے: مقیم ہوجائے گا، یہی مروجہ ہے، یا وطن اصلی توطن کی وجہ سے ہوگا، یعنی وہاں رہنے کا عزم ہے، جانے کا نہیں، اگرچہ شادی نہ کی ہو)۔

ابن ہمام لکھتے ہیں: "الأوطان ثلاثة: وطن أصلي، وهو مولد الإنسان، وموضع تأهل به، أو من قصد التعيش به لا الارتحال، ولو تزوج المسافر في بلد لم ينو الإقامة فيه، قيل يصير مقيما، وقيل لا" (فتح القدير ۲.۴۱، كتاب المسافرين، مطبوعه زكريا ديوبند ۱۴۲۱ھ)۔ (وطن کی تین قسمیں ہیں: وطن اصلی اور وہ انسان کی جائے پیدائش ہے، یا وہ جگہ ہے جہاں شادی کی ہے، یا اس جگہ زندگی گزارنے کا قصد ہے، جانے کا ارادہ نہیں ہے، اگر مسافر نے کسی شہر میں شادی کی، مقیم ہونے کی نیت نہیں ہے تو کہا گیا ہے کہ مقیم ہوگا، اور کہا گیا ہے کہ نہیں ہوگا)۔

اس سے شہریت کا معیار سمجھ میں آتا ہے اور وہ تین چیزیں ہیں: جن کو بنیاد بنا کر کسی بھی شخص کی شہریت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے: ۱۔ پیدائشی مقام، ۲۔ بود و باش کی نیت سے کسی جگہ قیام، ۳۔ اس جگہ کی مستقل شہری خاتون سے نکاح و زواج، اس تیسری شق میں اختلاف بھی ہے، حضرت عثمان غنیؓ تیسرے خلیفہ راشد کی رائے بھی جائے نکاح میں مقیم ہونے کی لگتی ہے، اسی وجہ سے جب وہ مکہ حج کی نیت سے جاتے تو تاہل کی وجہ سے اتمام فرمایا کرتے تھے۔

کیا حکومت کی اجازت پر شہریت کا حصول موقوف ہے؟

احادیث اور واقعات پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص مستقل طور پر کسی جگہ بود و باش اختیار کرنا چاہتا ہے، مگر حکومت اجازت نہیں دیتی ہے تو وہ شہری باور نہیں کیا جاسکتا، بعض حدیثوں اور بعض واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

الف۔ بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے ایک اعرابی کا قصہ مذکور ہے، اعرابی نے مدینہ ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] خادم حدیث مدرسہ حسینیہ کیرالا۔

''ويحك إن شأن الهجرة شديد، فهل لك من إبل، قال: نعم، قال: فهل تؤدي صدقتها قال: نعم، قال: فاعمل من وراء البحار، فإن الله هلم يترك من عملك شيئا'' (بخاری ۲،۹۱۱، کتاب الأدب، باب ماجاء في الرجل ويهلك)۔ (کیا کہہ رہے ہو!! ہجرت کا معاملہ سخت ہے، کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں، اس نے کہا: ہاں ہے! حضور نے فرمایا: کیا اس کی زکاۃ دیتے ہو؟ کہا: ہاں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہاں سے دور دراز علاقے میں (سمندر پار رہ کر) رہتے ہوئے عمل کرو، اللہ تعالی تمہارے عمل میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا)۔

اس سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ توطن اور بود و باش اختیار کرنے کے لئے سرکار سے اجازت بھی اہم حیثیت رکھتی ہے، حکومت کو حق ہے کسی کو ارادہ کے باوجود روک دے کہ تم یہاں بود و باش کی نیت سے نہیں رہ سکتے ہو۔

ب۔ غزوہ طائف کے بیان میں ایک مخنث کا ذکر احادیث میں آتا ہے، اس کا نام ''ہیت'' تھا، اس نے کچھ نازیبا انداز گفتگو عبداللہ بن ابی امیہ کے سامنے اختیار کیا، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی کہ یہ مخنث نہیں ہے، بلکہ مردانہ صفت کا حامل ہے لہذا عورتوں کے پاس نہ آوے (بخاری ۲،۶۱۹، کتاب المغازی، باب: غزوۃ الطائف)۔

علامہ قسطلانی کے حوالہ سے محشی لکھتے ہیں: ''ثم أجلاه من المدينة إلى الحمى، فلما ولي عمر بن الخطاب قيل له: إنه قد ضعف وكبر، فاحتاج فأذن له أن يدخل كل جمعة فيسأل الناس، يرد إلى مكانه'' (حاشية البخاری ۲،۶۱۲، ۹:۲)۔ (پھر اس کو مدینہ سے ''حمی'' کی جانب جلاوطن کردیا، جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ سے ذکر کیا گیا: وہ مخنث ضعیف ہوگیا ہے، چنانچہ مال کا محتاج ہے، تو حضرت عمرؓ نے اجازت دی کہ ہر جمعہ وہ مدینہ آیا کرے اور سوال کرلیا کرے اور اپنے مکان چلا جایا کرے)۔

اسی طرح کے واقعات دور صدیقی و فاروقی میں بھی پیش آئے، ''عمدۃ القاری'' میں ابوموسی کے حوالہ سے اس طرح مرقوم ہے: ''نفى أبو بكر ما تعا إلى فدك، وليس بها أحد يومئذ من المسلمين، وأخرج عمر فلانا وفلانا'' (عمدة القاری ۹،۳۰۴)۔ (حضرت ابوبکرؓ نے ماتع نامی مخنث کو فدک روانہ کردیا وہاں اس وقت کوئی بھی مسلمان نہیں تھا، اور حضرت عمرؓ نے فلاں وفلاں کو نکال دیا)۔

اس سے اتنی بات تو معلوم ہو رہی ہے کہ کسی کی بھی وطنیت کو ختم کرنے میں سرکار کو دخل ہوتا ہے، اس لئے شہریت کی بنیاد ''بود و باش'' کو بنانے کے ساتھ اس قید کا اضافہ بھی مناسب ہوگا، اگر حکومت کی اجازت سے بود و باش اختیار کی جائے تو شہریت حاصل ہوگی، ورنہ نہیں۔

۲۔ مسلم ملک پر کسی مسلمان کی درخواست شہریت قبول کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک جانے کے لئے کچھ نہ کچھ محرکات ہوں گے، اگر وہ محرکات ایسے ہیں جن سے فتنہ میں ابتلاء کا اندیشہ ہے، یا جان و مال کو حقیقی خطرہ ہے، نیز یہ صورت حال جس طرح دار الکفر میں پیش آسکتی ہے، بعض اوقات دار الاسلام میں بھی پیش آتی ہے، اپنے ملک میں ہوتے ہوئے بھی اپنی جان اور مال کو محفوظ نہیں سمجھتا، عزت و آبرو کو بعض اوقات ایسا خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ دوسری جگہ جانے پر مجبور ہوتا ہے، امام زہری کے حالات میں ہے کہ ولید بن یزید نے دھمکی دی تھی کہ میں تم کو ہشام کے بعد قتل کردوں گا (سیر اعلام النبلاء ۶/۱۴۶ ترجمہ ۷۷۴، دار الفکر بیروت)۔

بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے عزم مصمم کرلیا تھا کہ اگر ولی کی تاج پوشی ہوگئی تو میں روم چلا جاؤں گا، لیکن اللہ نے ان کو ولید کے دست برد سے محفوظ رکھا، اس کے خلیفہ ہونے سے پہلے ہی حضرت امام زہری دنیا سے رخصت ہوگئے۔

ایسے مجبور کن حالات میں ایک مسلمان سیاسی پناہ کا متلاشی ہوتا ہے، اس کے لئے سب سے بہتر جگہ مسلم حکومت ہی ہوسکتی ہے، نیز ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی نصرت و معاونت حتی المقدور لازم وضروری ہے، اس کا تقاضا ہے کہ خواہ مسلم ملک کا باشندہ ہو یا دار الکفر کا رہنے والا مسلمان، ہو اگر وہ مجبوری کی حالت میں ہے اور ایک مسلم ملک سے سیاسی پناہ کا طالب ہے تو اس کی درخواست قبول کرے، اور سیاسی پناہ دے، نیز حالات اگر ایسے ہوں کہ وہ اپنے ملک واپس نہیں جاسکتا ہے تو مستقل شہری کی حیثیت دے کر اس کو سرفراز کرے۔

لیکن کبھی کبھی ترک وطن کا محرک محض معاشی خوشحالی، اور دنیاوی جاہ و جلال کی افزونی ہوتی ہے، اپنے ملک میں اس کی جان و مال کو بھرپور تحفظ حاصل ہے، دین و ایمان کو کوئی خطرہ نہیں، تو ایسے موقع پر کسی بھی مسلم ملک پر لازم نہیں ہے کہ اس کی خواہش کے احترام میں اپنے یہاں کی شہریت کی اجازت دے۔

پچھلی سطور میں بخاری کے حوالہ سے مذکور ہو چکا ہے کہ ایک اعرابی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مدینہ ہجرت کر جاؤں، ان کو اپنے خطے میں رہتے ہوئے دینی

پریشانی بھی نہیں تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف منع کر دیا تھا، "فاعمل من وراء البحار" ایسے حالات میں سمندر پار رہ کر بھی اگر عمل کروگے تو اللہ تمہارے عمل میں کوئی کمی نہیں کرے گا، جبکہ اس واقعہ میں دنیوی ترقی مقصود نہیں تھی، نبی کی صحبت ومعیت مطلوب تھی، پھر بھی اجازت نہیں ملی۔

تارکین وطن اور حق شہریت:

اسلامی تعلیمات کا لب لباب تو یہ ہے کہ اپنے ملک میں رہنے والے ہر شخص کو رہنے سہنے کی ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، حتی کہ ایسے مقام پر بھی ان کے مالکانہ تصرف کو گوارہ کیا گیا جہاں کفار کی بودوباش ناجائز ہے، جزیرۃ العرب یا خاص خطہ حجاز مسلمانوں کے لئے خاص ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وصیت میں صراحت کی ہے: "أخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب" لیکن پھر بھی جب تک مسلمانوں کے پاس ان کے رہنے سہنے کے لئے خطہ حجاز سے باہر زمین حاصل نہیں ہوسکی اس وقت تک خیبر کے یہود مدینہ میں ہی مقیم رہے، حضرت عمر فاروق کے دور خلافت میں ان کو اریحاو تیما کی طرف بھیجا گیا، زمین فراہم کی گئی، اتنے دنوں تک مدینہ میں رہنا گوارہ کیا گیا، اس میں راز یہی تھا کہ دار الخلافہ کے پاس مدینہ سے باہر زمین اپنی نہیں تھی۔

اسی طرح نجران کے عیسائیوں کو فاروقی دور میں شام کی طرف جلاوطن کیا گیا، حضرت عمر فاروق کا فرمان یعلی بن امیہ کو پہنچا، ملک یمن جاکر نجران کے عیسائیوں سے کہہ دو کہ اس ملک کو چھوڑ دیں، ہم تم کو حدود عرب سے باہر ملک شام میں تمہاری ان زمینوں سے زیادہ زرخیز زمینیں اور ان زمینوں سے زیادہ وسیع زمین دیتے ہیں، اور تم کو کسی مالی وجسمانی محنت ونقصان میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے، ملک عرب اب صرف مسلمانوں کے لئے رہے گا، غیر مسلم ہونے کی حالت میں تمہارا یہاں قیام ممکن نہیں (تاریخ اسلام نجیب آبادی ۱/۳۱۷)۔

اسی طرح جتنے بھی لوگ اسیری کی حالت میں آکر مسلمان ہوئے، یا مسلمان ہوکر دار الخلافہ حاضر ہوئے ہیں اگر ان کا رہنا منظور کر لیا گیا تو ان کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا گیا، ہرمزان ایران کا نامی گرامی سردار ہے جنگ قادسیہ سے فرار ہوکر اہواز میں مقیم ہوا، پھر پکڑا گیا، مدینہ حاضر کیا گیا، بعد میں اسلام لے آیا، حضرت عمر فاروقؓ نے مدینہ میں رہنے کی جگہ دی، دو ہزار سالانہ تنخواہ مقرر کر دی، مہم فارس میں اکثر ان سے مشورہ لیتے رہے (تاریخ اسلام نجیب آبادی ۱/۳۵۶)۔

اس لئے نئے بسنے والوں کے ساتھ دوہری پالیسی رکھنا اسلامی ملک کی اقلیت کے لئے سم قاتل ہے، قلب ونگاہ میں نفرت وعداوت کی چنگاری چھپی رہتی ہے جو کبھی کبھار شعلہ بن کر خرمن اسلام کے بعض حصہ کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اس لئے کسی طرح زیبا نہیں کہ اپنے یہاں موجود مسلمانوں کو پرانے مسلمانوں کے ساتھ شریک وسہیم نہ کر کے حکومت اسلامیہ کی بنیاد کھوکھلی کی جائے۔

لیکن بعض ایسی روایت بھی ملتی ہے جس کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ملک میں بسنے والوں کے مابین کسی جائز بنیاد پر تفریق بھی ہوسکتی ہے، ہر چند کہ اس جیسی تفریق وتقسیم سے غیر معمولی کمزوری بھی آجائے گی، جس سے امت کا بھاری نقصان متوقع ہے۔

مشہور روایت ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر انصار کے ساتھ خصوصی لطف وانعام کا معاملہ کرنا چاہا، لیکن انصار نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ جب تک ہمارے مہاجرین بھائیوں کو برابر کا شریک نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ہم خصوصی امتیاز کو حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نئے لوگوں کے ساتھ دادودہش کا معاملہ کیا تو اس پر بھی بعض انصار کو شبہ ہوا جس کا ازالہ کرتے ہوئے وہی جملہ فرمایا کہ جو انصار کے انکار کے وقت کہا تھا" فاصبروا حتى تلقوني فإنه ستصيبكم أثرة بعدى" (البخاری ۱/۵۳۵، کتاب المناقب، باب قول النبی الانصار اصبروا الخ)۔ (تم لوگ صبر کرو یہاں تک کہ حوض پر ملاقات ہوگی، اس لئے کہ میرے بعد تمہارے اوپر ترجیحی معاملہ ہوگا) نسائی شریف کی ایک روایت میں اس ترجیح پر بیعت لینے کا ذکر بھی ہے (نسائی ۲/۱۶۱، باب البیعۃ، باب البیعۃ علی الأثرۃ)۔

شارحین کے بیان کے مطابق یہ ترجیحی معاملہ امور دنیا سے متعلق ہے، اور تقسیم مناصب میں رونما بھی ہوا، بعض انصار نے حضرت معاویہ سے اس کی شکایت بھی کی تو حضرت معاویہ نے فرمایا: تم کو ایسے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکم دیا تھا، تو انصاری نے جواب دیا: صبر کرنے کی تلقین کی تھی، حضرت امیر معاویہؓ نے فرمایا: پھر صبر کرو (حاشیہ بخاری ۱/۵۳۵ کتاب المناقب، مناقب الانصار)۔

اس سے اتنی بات اور معلوم ہورہی ہے کہ اگر ایک ملک میں رہنے والوں کے مابین ترجیحی سلوک بھی اور جن پر ترجیح دی جارہی ہے ان کو منظور بھی ہو تو حد جواز میں آسکتا ہے، لیکن یہ ایسی چیز ہے جو ملت کے مفاد کے خلاف ہے، اور وحدت قوم کو پارہ پارہ کرسکتی ہے، اس لئے حوصلہ افزائی تو نہیں کی جاسکتی، لیکن ملکی

مصالح یا خارجہ پالیسی کے تحت ایسا ہو تو حد گنجائش میں آسکتا ہے۔

۴۔ شہریت کے حقوق:

ملک فرد کا نام نہیں، افراد و اشخاص کی مختلف اصناف کے مجموعہ کا نام ہے، افرادی قوت سے ملکی قوت استوار رہتی ہے، جب تک ایک ملک کا ہر باشندہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کوشاں و فکر مند نہیں ہوگا ملک صحیح راہ پر گامزن نہیں رہ سکتا، حکام و عوام کی تقسیم محض سہولت کے لئے ہے، سب کی حاجت ملک سے وابستہ ہے اور سب سے ملک کا مفاد متعلق ہے، جو معیشت کی خوشحالی، وقار کی مضبوطی اور ٹھوس و با اثر کردار کے بغیر روبعمل نہیں ہو سکتا ہے، باہر کی طاقت سے مقابلہ وزور آزمائی، اندرونی وسائل و ذرائع کی تقویت کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے ملکی ترقی کے لئے ہر کوشش کا مستحق ملک میں بسنے والا ہر شہری ہے۔

ہماری اسلامی تاریخ کا روشن باب ہے کہ ہر ایک کے حقوق کی خاطر خواہ رعایت کی جائے، دور اول کے خلفاء نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی، حضرت فاروق اعظم کا دور ہی کو لے لیا جائے، تو رفاہ عام کے لئے خلیفہ وقت کی تگ و دو دیکھ کر انسان حیران رہ جائے گا، ایک طرف بیت المال کا قیام، تا کہ ہر شہری کو روزینہ جاری کیا جا سکے، ممالک مفتوحہ کو آٹھ حصے میں تقسیم، تا کہ انتظام انصرام میں مضبوطی آئے، جگہ جگہ سرائے اور مہمان خانوں کی تعمیر، تا کہ آنے جانے والوں کو سہولت ہو، دیوانی وفوجی نظام کی بنیاد تا کہ ہر مسلم کو فوجی بنا کر لشکر اسلام میں شریک کیا جا سکے، ایسے با مقصد اور بافیض خدمات ہیں جو ساری دنیا کے لئے مشعل راہ ہیں۔

اس سے بخوبی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ملک کی ترقی کی ہر کوشش میں شرکت ایک عام شہری کا حق ہے جو اپنے حدود وقیود کے ساتھ نافذ العمل ہوگی۔

ووٹ دینے کا حق:

اگر ملک جمہوری بنیاد پر قائم ہے، عوامی گنتی کو اہمیت حاصل ہے تو ایسے ملک ملک میں ہر بالغ شہری کو ووٹ دینے کا حق ہوگا، ووٹ عوامی نمائندگی کا بہترین ذریعہ ہے، سارے لوگ دار الخلافۃ تک نہیں پہنچ سکتے، اور سارے لوگوں کی فوج ظفر موج کار حکومت کو مختل بھی کر سکتی ہے، اس لئے ایسے مسلم جمہوری ملک میں ووٹ کی بنیاد پر انتخاب ہوتا ہے، اس لئے ہر شہری کو حق حاصل ہوگا کہ اس حق کو استعمال کرے۔

ابن خلدون حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں عمال کی تقرری کے طریقہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: دو طریقے تھے: دوسرا طریقہ صوبے یا ضلع کے باشندوں کو انتخاب کا حکم بھیج دیتے تھے جن کو وہ لوگ منتخب کرتے اس کو انتظامی ملکی خدمت سپرد کر دی جاتی (تاریخ ابن خلدون مترجم ار ۸۷ ۳، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی پاکستان)۔

لیکن سلطنت وحکومت کی بنیاد اگر عوامی رائے پر نہ ہو، بلکہ خواص اور ارباب حل وعقد کے مشورے سے اسمبلی و پارلیمنٹ کا قیام ہو جو شخصی حکومت یا بادشاہت کی روح ہے تو ظاہر ہے ہر شہری اس کا مجاز نہیں ہوگا کہ وہ ووٹ دے کر حکمراں کا انتخاب کرے، بلکہ ارباب حل وعقد ہی اس عہدہ جلیلہ کو برپا کر سکتے ہیں، تاتارخانیہ کی عبارت ہے: ''في الخانية: قال علماؤنا يصير المرء سلطانا بأمرين: بالمبايعة معه ويعتبر بالمبايعة معه مبايعة أشرافهم وأعيانهم'' (تاتارخانیہ ۷٫۵۵، کتاب الامارة والسلطنة، الفصل العاشر ۱۹۹۴۰)۔ (خانیہ میں ہے: علمائے حنفیہ نے فرمایا: انسان بادشاہ دو طرح ہوتا ہے: اس کے ساتھ بیعت کے ذریعہ، بیعت وہ معتبر ہے جو اشراف اور خاصان قوم کی بیعت ہو)۔

سرکاری اداروں سے انتفاع کا حق:

اسی طرح حکومت کا ہر سرکاری ادارہ خواہ تعلیم گاہ ہو، رفاہ عام کے لئے اسپتال ہو، باہمی نزاعات حل کرنے کے لئے عدالت ہو سب کا مقصد ہی عوام کو سہولت بہم کرنا ہے، بغیر ان اداروں سے انتفاع کا حق دئے ہوئے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی ہے، خلفائے راشدین کے دور میں بھی فوجی نظام قائم ہو چکا تھا، ڈاک خانے اور تعلیمی ادارے کھل چکے تھے، سیاسی دفاتر کا وجود ہو چکا تھا، دور حاضر میں رائج اکثر طریق حکمرانی کا وجود شرعی قواعد وضوابط کی بنیاد پر ہو چکا تھا، اگر شرعی قانون کے مطابق ان اداروں میں کوئی فساد نہیں ہے تو یقیناً ان سے انتفاع کا حق حسب صلاحیت ہر شہری کو ہوگا۔

اسی طرح ان اداروں کے چلانے کے لئے رجال کار کی ضرورت ہے جو اپنی قابلیت وصلاحیت سے عوام تک ان مقاصد کو پہنچانے میں نمایاں رول ادا کر سکتے ہیں، جن کے لئے ان کو بنایا گیا ہے، تو کیونکہ یہ حق باشندگان وطن کو نہ دیا جائے، حضرت ابوبکر و عمرؓ کے دور خلافت میں معیار افضلیت واہلیت تھی، لیکن کوشش یہ بھی ہوتی کہ ایسے باکمال اور دردمند افراد حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں جو اس جگہ سے کسی نہ کسی بنا پر تعلق خاطر رکھتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر

نے بصرہ کا حاکم عتبہ بن غزوان کو مقرر کیا، کیونکہ انہوں نے بصرہ کو آباد کیا، کوفہ کا گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص کو بنایا جو کوفہ کے مؤسس تھے، جزیرہ کا حاکم عیاض بن غنم کو بنایا کہ وہ فاتح ایران ہیں، مکہ کا گورنر خالد بن العاص کو منتخب کیا وہ ابوجہل کے بھتیجے ہیں اور معزز شخص ہیں، غالباً یہ اس لئے ہوا کہ جتنی ہمدردی ملک سے ان حضرات کو ہوگی دوسروں کو نہیں ہوگی، آج اہل وطن کو جو دردمندی اپنے ملک سے ہوگی بشرطیکہ اس عہدہ کی قابلیت واہلیت بھی وہ شخص رکھتا ہو، دوسرے کو نہیں ہوسکتی، اس لئے یہ شہری کا حق سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اسلام حریت کا پاسبان ہے، غلامیت حقیقت میں اس کی روح کے خلاف ہے، زنجیری اسیری کو کاٹنے میں اسلام نے کیا کیا رول ادا کیا ہے یہ مستقل عنوان ہے، آزادی وحریت کا نتیجہ ہے کہ اسلام کی کوئی سرحد نہیں، بعض مصالح اور سیاسی اغراض کے لحاظ سرحد کا تصور بھی پایا جاتا ہے، اس لئے روح اسلام کا تقاضا ہے کہ نقل وحرکت کی اصلاً آزادی ہو، کسی خاص قوم یا فرد پر کسی خاص مصلحت سے حکومت کو جس کا حق بھی ہے، لیکن یہ عارضی اور خارجی اسباب و عوامل کی بنا پر ہے۔

۵۔ پناہ گزینوں کے حقوق:

اب رہ گیا مسئلہ پناہ گزینوں کے حقوق کا، ظاہر ہے پناہ گزین کا قیام عارضی ہوتا ہے، حاجت وضرورت جب تک ہے اس وقت تک وہ کسی ملک میں ہیں بعدہ وہ اپنے ملک منتقل ہوجاتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے بنیادی سہولت، علاج ومعالجہ کا سرکاری اداروں میں حق، ایسی ملازمتوں کا حق جن سے ان کے خورد ونوش کا مسئلہ بحال رہے، باہمی نزاع کو ختم کرنے کے لئے عدالتی چارہ جوئی کا حق، یہ وہ بنیادی حقوق ہیں جن پر ان کی حیات کا مدار ہے جو پناہ گزینوں کو بھی حاصل ہوں گے، لیکن ملکی انتظام وانصرام سے متعلق جو حقوق ہیں ان کو دینے کی بظاہر ضرورت متقاضی نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں پورے حجاز کو قحط نے اپنی لپیٹ میں ایک مرتبہ لے لیا تھا، زمین پر رہنے والوں کی بات تو اور ہے، ہوا میں اڑتے پرندے بھی بے خود ہوکر تلملا کر زمین پر گر پڑتے تھے، مدینہ کا گرد ونواح حجاز کا پورا علاقہ اس چپیٹ میں تھا، زندگی کی رونق ختم ہوچکی تھی، بھوک کی وجہ سے لاشوں کا انبار تھا، لوگوں نے اپنے علاقوں کو چھوڑ کر مدینہ میں پناہ لیا، فاروق اعظم نے دارالاسلام کے ہر ملک میں گشتی فرمان جاری کیا کہ مدینہ لوگ اپنی اپنی امداد بھیجیں، ہر طرف سے مدد بھی ہوئی، یہ سلسلہ نو مہینے تک جاری رہا، پھر اللہ نے فضل فرمایا، استسقاء کا عمل بھی ہوا، پھر لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے، اس موقع پر حضرت عمر کی حالت قابل دید تھی، ہروقت پریشان، ہر قسم کی راحت رسانی طبی امداد کی فراہمی میں کوشاں تھے (البدایہ والنہایہ ۷/ ۹۰)۔

اس سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ پناہ گزینوں کا قیام عارضی ہوتا ہے، اس لئے بنیادی حقوق ان کو حاصل ہوں گے، البتہ ملکی وانتظامی امور میں مداخلت کا حق ان کو نہیں ہوگا، لہٰذا امیدوار بننے، ووٹ ڈالنے، نیز گورنمنٹ نے جس جگہ پناہ دی ہے وہاں سے بغیر اجازت دوسری جگہ نقل وحرکت کا حق نہیں ہوگا۔

۶۔ مسلمانوں کے لئے غیر مسلم کی شہریت:

ایک مسلمان اپنے ملک کو کیوں چھوڑتا ہے، پہلے اس پر غور کرنا ہوگا، اس کا پس منظر یا تو سیاسی پناہ کا حصول ہے، اس لئے کہ اپنا ملک خواہ وہ مسلم ملک ہی کیوں نہ ہو تنگ ہو رہا ہے، عزت وآبرو کی حفاظت مشکل ہوجا رہی ہے، جان ومال پر ہر وقت خطرہ ہے، ایسے موقع پر وہ کسی دوسرے ملک کو ترجیح دیتا ہے، دوسرا ملک بعض اوقات وہ ہوتا ہے جو غیر مسلم اقتدار کے ماتحت ہوتا ہے، اگر اس کو یقین ہے کہ اس ملک میں جاکر اپنے دین وایمان پر آنچ آنے نہیں دے گا، اور غیر مسلموں کے ساتھ غیر اسلامی امور میں تعاون نہیں کرے گا، تو اپنے نفس ومال، یا عزت وآبرو کی حفاظت کی ضرورت سے غیر مسلم ملک کی شہریت کے لئے تگ ودو کرے، اس کی سب سے بڑی دلیل تحفظ نفس وتحفظ مال کی ضرورت ہے، اسی طرح اس سے بھی استیناس کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ نے حبشہ کی ہجرت کی، جبکہ وہاں عیسائی حکومت تھی، ہجرت مدینہ کے بہت بعد تک بعض صحابہ وہیں مقیم رہے، جعفر بن ابی طالب کا قافلہ تو قبیلہ اشعریین کے وفد کو لے کر غزوہ خیبر کے بعد واپس آیا، جس وقت یہ ہجرت ہورہی تھی ہوسکتا ہے بہ نیت دوام نہ ہو، لیکن بادشاہ نے جو ہمدردی وبہی خواہی کا رویہ اختیار کیا، نیز صحابہ ضرورت پوری ہونے کے باوجود مقیم رہے یہ تو دلیل بن سکتی ہے، یہ بھی عذر کہنا نامناسب ہوگا کہ بادشاہ تو مسلمان ہوچکا تھا، اس لئے اس کا ایمان مخفی تھا، حتی کہ نماز جنازہ بھی ملک حبشہ میں نہیں ہوسکی۔

مسلمانوں کا رویہ بھی اپنے ملک کی مانند تھا، ایک نازک وقت بادشاہ پر آیا، ایک شخص نے نجاشی کے خلاف فوج کشی کی، اور ملک کا اقتدار چھیننا چاہا تو وہاں مقیم صحابہ نے مشورہ کیا، اگر کوئی دوسرا اقتدار میں آتا ہے تو وہ ہمارے احوال سے واقف نہیں ہوگا، اس لئے ہم لوگوں کو بادشاہ وقت کی مدد کرنی چاہئے، سب نے نجاشی کی فتح ونصرت کے لئے دعائیں کیں، حضرت زبیر بن العوام کو دریا عبور کرکے بادشاہ کی مدد کے لئے بھیجا بالآخر اللہ نے نجاشی کو فتح سے سرفراز کیا (سیرت

ابن ہشام ار ۲۶۷، مطبوعہ دارالخیر ۱۴۱۶ھ)۔

کبھی دوسرے کسی غیر مسلم ملک جانے کا محرک غیر مسلموں سے قلبی تعلق اور مسلمانوں سے نفرت ہوتی ہے، ایسے وقت میں کسی بھی غیر مسلم ملک کی بود و باش اختیار کرنا جائز نہیں ہوگا۔

''یا أیها الذین آمنوا لا تتخذوا الیهود والنصاری أولیاء، بعضهم أولیاء بعض، ومن یتولهم منکم فإنه منهم'' (سورۂ مائدہ:۵۱)

ایک محرک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے ملک میں معاش کا حال اچھا نہیں ہے، وہ اپنی روزی روٹی چلانے پر قادر نہیں ہے، دوسرا ملک اس قسم کے وسائل و ذرائع سے بھر پور ہے، تو ایسی صورت میں بھی دوسرے ملک کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے "هو الذی جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه وإلیه النشور" (سورۂ ملک:۱۵)۔

اسی طرح "لیس علیکم حرج أن تبتغوا فضلا من ربکم" (سورۂ بقرہ:۱۹۸) کا مقتضا ہے کہ جہاں بھی رزق دستیاب ہو وہاں تک پہنچ کر حصول کرے، صورتحال ضرورت کی حد تک پہنچ چکی ہے، ضرورت کی بنا پر تو بعض محظورات بھی روا ہو جاتی ہیں۔

ہاں صرف مالی فراخی کے لئے غیر مسلم ملک کو مسلم ملک پر ترجیح دینا مکروہ ہوگا، ترمذی شریف کی روایت کا محمل یہی ہوگا۔

''انا بریء من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین، قالوا: یا رسول الله! قال: لا ترآی ناراهما'' (ترمذی ۲۸۹، اکتاب السیر، باب کراهیة المقام بین اظهر المشرکین)۔ (میں ہر ایسے مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکوں کے مابین مقیم ہو، صحابہ نے پوچھا، کیوں؟ اے اللہ کے رسول، حضور نے فرمایا ان دونوں کی آگ ایک دوسرے کو نظر نہیں آنی چاہئے)۔

البتہ امام مالک کے نزدیک کسی بھی دنیوی غرض کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت کیا، سکونت بھی جائز نہیں ہے (مقدمات ابن رشد ۲/۴ ۲۶۶، مطبوعہ مع المدونہ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ۱۴۱۵ھ)۔

ملکوں کی صورتحال کے اعتبار سے حکم میں فرق:

اسی طرح ملکوں کی صورتحال کے اعتبار سے بھی حکم میں فرق پڑے گا، پہلی قسم ان غیر مسلم ممالک کی ہے جن کی صورتحال مکی زندگی کے مشابہ ہو، یعنی وہاں دین و ایمان محفوظ نہ رہے، مگر ہجرت پر قدرت بھی ہو، تو ایسے وقت دوسرے ملک جانا، خواہ وہ غیر مسلم ملک ہی کیوں نہ ہو، واجب ہوگا، قرآن کریم نے ان لوگوں کو ڈانٹ پلائی ہے جنہوں نے نے ہجرت کی قدرت کے باوجود ہجرت نہیں کی، اور قتل ہو گئے۔

''إن الذین توفاهم الملائکة ظالمی أنفسهم، قالوا فیم کنتم، قالوا کنا مستضعفین فی الأرض، قالوا ألم تکن أرض الله واسعة فتهاجروا فیها، فأولئك ماواهم جهنم وساءت مصیرا'' (سورۂ نساء)۔

البتہ بمصلحت قیام کرے تو حرج نہیں ہوگا، جیسا کہ حضرت عباس نے بمصلحت تاخیر سے ہجرت کی۔

دوسری صورت حال یہ ہے کہ ملک میں امن و امان نہیں، دین و ایمان کو ہر لحہ خطرہ، مگر ہجرت کی قدرت بھی نہیں تو ایسی صورت میں ایسے ہی ملک میں رہنے میں گناہ نہیں ہے، قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت میں استثناء موجود ہے: ''إلا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلة ولا یهتدون سبیلا وأولئك عسی الله أن یعفو عنهم وکان الله عفوا غفورا'' (نساء:۹۸، ۹۹)۔

تیسری قسم ان ملکوں کی ہے جو ہیں غیر مسلم ملک، مگر کسی مسلمان کا وہاں رہنا بحیثیت اقلیت بھی مضر نہیں ہے، بلکہ دین و ایمان اور جان و مال ہر ایک کو تحفظ حاصل ہے، جیسا کہ آج غیر مسلم ملکوں کی صورتحال ہے، اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ان ممالک میں زیادہ مواقع ہیں کہ مسلمان ترقی کرے۔

ایسے ملکوں میں رہنے کے سلسلے میں دو نظریے ہیں:

حضرت امام مالک کے نزدیک ایسے ملکوں میں رہنا جائز نہیں، خواہ دین پر عمل کرنا کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو، یہ تو غیر اسلامی قانون کو اپنے اوپر تھوپ لینا ہے۔

جبکہ دوسری رائے جمہور کی ہے، بالخصوص حنابلہ وحنفیہ کی کہ ایسے ملکوں میں رہنا جائز ہے، اختلاف کا منشا حدیثوں میں اختلاف ہے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا حکم منسوخ ہوگیا "لا هجرة بعد الفتح" (بخاری ۱،۴۲۲ کتاب الجهاد باب لا هجرة بعد الفتح)۔

اور بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا سلسلہ جاری ہے: "لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس من مغربها" (ابوداؤد ۱،۳۳۶ کتاب الجهاد، باب الهجرة هل انقطعت)۔ (جب تک توبہ باقی ہے ہجرت کا حکم باقی ہے، اور توبہ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے تک باقی رہے گی)۔

جمہور فرماتے ہیں: حضور نے جن حدیثوں میں انقطاع ہجرت کی خبر دی ہے وہ معلل بعلت ہے، وہ انہی معاملات میں رکاوٹ کا باقی نہ رہنا ہے، جس طرح یہ حکم مکہ کے لئے ہے اسی طرح ہر ایسے خطے کے لئے جہاں رکاوٹ نہ ہو (فتح الباری ۶/ ۲۳۳)۔

یا پھر ابتداء میں ہجرت اس لئے ضروری تھی کہ مسلمانوں کی جمعیت یکجا ہو کر دار الخلافہ کو مستحکم کر سکیں لیکن اب استحکام کی حاجت نہیں ہے، اس لئے ایسے ممالک میں رہنے کی گنجائش ہے۔

البتہ دوسری قسم کی حدیثیں ایسی حالت پر محمول ہیں کہ جب دین وایمان محفوظ نہ ہو، یا ایسے ملکوں پر محمول ہیں جو قبل الفتح مکہ کے نقش قدم پر ہوں۔

جبکہ امام مالکؒ دوسری قسم کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہر وہ ملک جو غیر مسلم اقتدار کے ماتحت ہے وہاں رہنا یا وہاں کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں، بلکہ وہاں سے بھاگنا ضروری ہے، نیز ترمذی کی روایت جو سابق میں گذر چکی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلموں کے ساتھ رہنے والے سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔

"بیہقی" کی روایت میں صاف طور پر منع کیا گیا ہے: "لا تساكنوا المشركين ولا تجامعوهم، فمن ساكنهم أو جامعهم فهو مثلهم" (بیہقی ۹،۱۸، کتاب السير، باب الرخصه فى الاقامه بدار المشرك)۔ (مشرکوں کے ساتھ نہ رہو، اور نہ ان کے ساتھ اکٹھے ہو، جو ان کے ساتھ رہے گا یا اکٹھا ہو گا وہ انہی کی طرح ہے)۔

ترمذی کی روایت اور بیہقی کی روایت دونوں ہی متکلم فیہ ہیں، اگر اس سے اغماض بھی کیا جائے تو یہ جمہور کے نزدیک انہی ممالک پر محمول ہیں جہاں فتنہ کا خوف ہو۔

امام مالکؒ کی عقلی دلیل کے غیر اسلامی قانون کو اپنے اوپر تھونپ لینا ہے، اس کی معنویت اس دور میں ختم ہوگئی ہے، غیر مسلم ملکوں میں دین وشریعت پر عمل کرنے والے جس قدر آزاد ہیں، خدا معاف کرے اسلامی ملکوں میں بسنے والے اسی قدر گھٹن محسوس کرتے ہیں، غیر مسلم ملکوں میں آج کوئی رکاوٹ نہیں ہے، آج ان ممالک کی مثال حبشہ جیسی ہے، جس طرح حبشہ کی سکونت میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا تھا، اسی طرح ان ملکوں میں سکونت بھی جائز ہونی چاہئے۔

۷۔ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کی مستقل سکونت:

خطہ عرب یا بالخصوص خطہ حجاز میں غیر مسلموں کے لئے سکونت حدیث کی رو سے ممنوع ہے، اس کے ماسوا دیگر مسلم حصوں میں غیر مسلم کو ذمی بنا کر رہنے دینے کا سلسلہ قرن اول سے معہود ومعروف ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد کے خلیفہ کے لئے جو بڑی قیمتی وصیت کی ہے، محدثین نے اس کا تھوڑا تھوڑا حصہ کر کے مختلف ابواب میں زیب قرطاس کیا ہے، بخاری کی روایت ہے: "عن عمرو بن ميمون قال: وأوصيه بذمة الله وذمة رسوله أن يؤتى لهم بعهدهم، وأن يقاتل من ورائهم ولا يكلفوا إلا طاقتهم" (بخاری ۱،۴۲۹، کتاب الجهاد، باب يقاتل عن أهل الذمة)۔ (عمرو بن میمون فرماتے ہیں: میں اپنے بعد والے خلیفہ کو اللہ ورسول کے ذمہ کی وصیت کرتا ہوں کہ ان کے عہد (حفظ وامان) کو پورا کیا جائے، ان کی طرف سے قتال کیا جائے، نیز طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے)۔

ہر قتال کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی مہمات کے اہم مقاصد اور اس کے نشیب وفراز امیر الجیش کو ذہن نشین کرایا کرتے تھے، ان میں ایک بنیادی بات یہ ہوا کرتی کہ اگر کوئی جزیہ ادا کرنا منظور کر لے تو ان سے قتال ختم، اب مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی پوری حفاظت کرے۔

"عن بريدة: فإن هم أبوا فسلهم الجزية، فإن أجابوك فاقبل منهم، وكف عنهم" (مسلم ۲،۸۱۲ کتاب الجهاد والسير، باب تامير الامام الأمراء)۔

(حضرت بریدہ فرماتے ہیں (حضور ﷺ نے امیر سریہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا) اگر وہ لوگ (اسلام لانے سے انکار کریں) تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو، اگر وہ قبول کرلیں تو ان سے قبول کرو اور لڑائی روک لو)۔

اس لئے اگر غیر مسلم، کسی بھی مسلم ملک میں دو شرطوں کو پوری کرتے رہیں تو اس کی مستقل سکونت بھی صحیح ہوگی، ان دو شرطوں کو بیان کرتے ہوئے ابن قدامہ لکھتے ہیں: ''لا يجوز عقد الذمة المؤبدة إلا بشرطين: أحدهما: أن يلتزموا إعطاء الجزية في كل حول. والثاني: التزام أحكام الإسلام وهو قبول ما يحكم به عليهم من أداء حق أو ترك محرم لقول الله تعالى: ''حتى يعطوا الجزية عن يدوهم صاغرون''، وقول النبي ﷺ في حديث بريدة: فادعهم إلى أداء الجزية، فإن أجابوك فاقبل منهم وكف عنهم'' (مغنی ابن قدامه ۱۰،۵۶۳، مسئله ۷۶۲۱، فصل فی الهجرة)۔ (دائمی عقد ذمہ دو شرطوں سے جائز ہے (۱) ہر سال جزیہ دینا لازم کرلے (۲) احکام اسلام کا التزام اور وہ ان احکام کو قبول کرنا ہے جن کا فیصلہ ان کے اوپر کیا جائے، یعنی ادائے حق، اور حرام کا ترک، اللہ تعالی کے ارشاد "حتى يعطوا الجزية الخ" کی وجہ کر، اور حضور ﷺ کا بریدہ کو ارشاد ہے ان کو ادائے جزیہ کی دعوت دو، اگر قبول کرلیں، تو ان سے قبول کرلو اور آپ اپنے ہاتھ ان سے روک لو)۔

شیخ فریدالدین عالم رقم طراز ہیں: ''ترك الكافر في دار الإسلام بالجزية جائز'' (تاتارخانیه ۷،۲۵۶، کتاب الخراج، بیان النوع الثاني وهو خراج الرروس والجزيه ۱۰۴۳۲)۔ (کافر کو دارالاسلام میں جزیہ کے عوض چھوڑے رکھنا جائز ہے)۔

لہذا اس طرح سے غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں دائمی سکونت دینا کہ وہ احکام اسلام کے ماتحت رہیں مسلمانوں کی اذیت اور ان پر برتری کا کوئی عمل ان سے سرزد نہ ہو تو مستقل اقامت دینے میں حرج نہیں ہوگا۔

☆☆☆

اسلام کے عطا کردہ شہری و دیگر حقوق

مولانا عبید اللہ ندوی [1]

اسلام افراد، جماعتوں اور حکومتوں کے درمیان امن وسلامتی کے تعلقات استوار رکھتا ہے اور تعلقات کی اس استواری میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات، نیز غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں مساوات وبرابری قائم رکھتا ہے، چنانچہ اسلامی قانون کی کتابوں میں ذمیوں یا اسلامی سلطنت میں رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق وفرائض کے لئے یہ تعبیر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگئی ہے: "لھم ما لنا وعلیھم ما علینا" (مشکوۃ ۲/۲۲۱ بمعناہ) (ان کے لئے وہی حقوق ہیں جو ہمارے لئے ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہیں جو ہم مسلمانوں پر ہیں)۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے: "ان غیر مسلموں نے اسلامی سلطنت کے ساتھ معاہدہ اس لئے کیا ہے کہ ان کا مال، ہمارے مال کی طرح اور ان کا خون ہمارے خون کی طرح ہو جائے" (بدائع الصنائع ۷/۱۱۱ بحوالہ اسلام اور عصر حاضر)۔

مشہور فقیہ امام سرخسی فرماتے ہیں: "ان غیر مسلموں نے عقد ذمہ اسی لئے قبول کیا ہے کہ ان کے اقوال اور ان کے حقوق مسلمانوں کے اقوال اور حقوق کے برابر ہو جائیں" (شرح السیر الکبیر ۳/۲۵۰ بحوالہ سابق)۔

جہاں تک ذمیوں کے شہری حقوق کا تعلق ہے تو اس کی وضاحت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات کے ذریعہ کردی ہے، نجران کے نصاری کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی تھی کہ: ان میں کا کوئی شخص دوسرے کے ظلم میں ماخوذ نہیں ہوگا (الطبقات الکبری لابن سعد ۱/۲۸۷ مطولا)، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: جو کوئی کسی ذمی کو تکلیف دے گا میں قیامت کے دن ان کے خلاف لڑوں گا (ابوداؤد: رقم: ۳۰۵۳)۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاءؓ نے اس کی بھرپور رعایت کی اور اپنے بعد آنے والوں کو اس کی وصیت کرتے رہے کہ ذمیوں اور غیر مسلموں کے حقوق کی دیکھ بھال کی جائے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے انسانوں کو جو حقوق دیئے ہیں اور ان میں جو مساوات قائم کی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اسلام میں فرد کی عزت اور حقوق کا اعتراف:

اسلام نے لوگوں کے درمیان امن وسلامتی کے تعلقات قائم کرنے اور اس کے اصول کی تشہیر کرنے کے بعد انسان کی، انسان ہونے کی وجہ سے تکریم فرمائی ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی جنسیت، وطنیت، قومیت، دین ومذہب، زبان اور رنگ ونسل کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: "ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا" (سورۂ اسراء: ۷۰)۔

اسی تکریم کا مظہر ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنے دست مبارک سے پیدا فرمایا، اس میں روح ڈالی، ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا، اور کائنات کی تمام اشیاء اس کے لئے مسخر کردیں، اس کو کرۂ ارض کا مالک وسردار بنایا اور اپنا خلیفہ ونائب منتخب فرمایا، تاکہ اس کائنات کی اصلاح وتعمیر ہوتی رہے، اور اس وجہ سے کہ یہ تکریم واقعی اور حقیقی بن جائے اسلام نے تمام انسانوں کے حقوق کی ضمانت لی ہے، اور اس کی صیانت وحفاظت اور رعایت وحمایت کو واجب قرار دیا، خواہ وہ حقوق دینی ہوں یا دنیاوی، شہری ہوں یا تمدنی یا سیاسی، چنانچہ انہیں حقوق میں سے یہ ہیں:

۱۔ حق حیات، ۲۔ حق حفاظت مال، ۳۔ حق عرض (آبرو)، ۴۔ حق حریت، ۵۔ حق اظہار رائے، ۶۔ حق ماوی (یعنی جائے پناہ اختیار کرنے کا حق)، ۷۔ حق تعلیم، ۸۔ ظلم کے خلاف احتجاج ومزاحمت کا حق، ۹۔ حصول انصاف کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق، ۱۰۔ عدالتی امور میں مساوات،

[1]

برابری اور یکسانیت کا حق، ۱۱۔ اجتماع کا حق، ۱۲۔ لاچاروں، حاجتمندوں کا سرکاری خزانہ سے امداد پانے کا حق، ۱۳۔ حکام پر نکتہ چینی اور ان کے محاسبہ کا حق، ۱۴۔ ضمیر واعتقاد اور مذہب اختیار کرنے کی آزادی وحق، ۱۵۔ عورتوں کے خصوصی حقوق اور تحفظات، ۱۶۔ شوری کی کاروائیوں میں حصہ لینے کا حق وغیرہ (قاموس الفقہ ۱/ ۴۷۶، مبادی سیاسیات رص ۳۵۶)۔

یہ وہ انسانی اور مدنی حقوق ہیں جو نصوص شرعیہ سے صراحۃً ثابت ہیں (قاموس الفقہ ۱/ ۴۷۹)، اور عملاً اسلام زمانہ حکمرانی میں تمام شہریوں کو حاصل تھے، حقیقت یہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ سائنٹفک اور عملی دنیا بھی انسانی حقوق کے تحفظ اور اس کے اکرام واحترام میں اسلام سے بہت پیچھے ہے اور وہ اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود انسانوں کی ہلاکت وبربادی اور ایذا رسانی اور انسانی واخلاقی قدروں کی پامالی کے سوا کچھ نہیں کررہی ہے۔

خلاصہ بحث:

اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا کرنے کے لئے کئی باتوں کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے، منجملہ ان کے یہ ہیں:

الف۔ ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام کو، دلیل اس کی یہ ہے کہ تقریباً تمام فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ اگر دار الکفر کا کوئی باشندہ امان لے کر اسلامی مملکت میں داخل ہو تو ایسے آدمی کو امیر المسلمین اپنی صوابدید پر زیادہ سے زیادہ ایک سال تک یہاں قیام کی اجازت دے سکتا ہے، اس لئے کہ اس سے زیادہ مدت تک کسی غیر ملکی شہری کے رہنے کی وجہ سے اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ جاسوسی اور سازشیں کرنے لگے، چنانچہ اگر اس کے بعد ایک سال تک وہ یہاں رہ جائے تو وہ اس ملک کا شہری ہوگا (ہدایہ ۲/ ۵۸۶)۔

ب۔ نیز تمام محدثین نے اصول حدیث کی کتابوں میں یہ سوال اٹھایا ہے: "كم المدة التي إن أقامها الشخص في بلد نسب إليها" (تیسیر مصطلح الحدیث، باب معرفة أوطان الرواة وبلدانهم)۔ (وہ مدت کتنی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ملک، یا شہر میں اتنی مدت قیام کرلے تو اس کی طرف منسوب ہوگا؟ محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: چار سال کی مدت (تیسیر مصطلح الحدیث رص ۲۳۳)، اور بعض دیگر محدثین اس سے کم مدت بیان کرتے ہیں (الباعث الحثیث، باب معرفة أوطان الرواة وبلدانہم)۔

محدثین کے مابین مدت اقامت میں اختلاف ضرور ہے، لیکن اس سے اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ قیام ہی کو حق شہریت کی بنیاد بنایا جائے گا، رہا سوال یہ کہ وہ مدت کتنی ہوگی؟ تو اس کو ملکی قانون یا حاکم پر چھوڑ دیا جائے گا وہ اپنی صوابدید سے اس کی تعیین کرسکتے ہیں۔

۲۔ خونی رشتہ کو بھی بنیاد بنا سکتے ہیں، یعنی کسی ملک کی شہریت رکھنے والے ماں باپ سے پیدا شدہ بچہ اپنے والدین کے ملک کا شہری تصور کیا جائے گا۔

۳۔ جائے ولادت، یعنی جو شخص جس ملک کی سرزمین پر پیدا ہوا ہو، وہ وہاں کا شہری مانا جائے گا۔

فی زمانناانہیں دونوں اصولوں پر عمل کیا جارہا ہے، چنانچہ ہندوستان، برطانیہ، ولایات متحدہ امریکہ وغیرہ میں شہریت کا یہی اصول چلتا ہے (مبادی سیاسیات رص ۷۰)۔

۴۔ کوئی بھی ملک کسی بھی غیر ملکی کو شہریت دینے کے لئے سوال میں مذکور کسی بھی چیز کو بطور اصول مقرر کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ اصول وضابطہ خلاف شرع نہ ہو، اسلام کے متعین کردہ اصول سے ٹکراتا نہ ہو، نیز کسی حرام کام کے ارتکاب پر مبنی نہ ہو۔

۲۔ اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں رہنے والا انسان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو باستثناء مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اس دوسرے ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا شرعاً ضروری ہوگا کیونکہ:

الف۔ سکونت اور انتقال وطن ایک انسان کے انسانی ومدنی حقوق میں سے ہیں جو نصوص سے صراحتاً ثابت ہیں (تفسیر سورہ بقرہ: ۸۵)۔

ب۔ اگر وہ مسلمان کسی غیر مسلم ملک کا باشندہ ہے تو اس کی درخواست قبول کرنا اس لئے بھی ضروری ہوگا، کیونکہ اس سے مسلمانوں کی اجتماعیت، وحدت، کثرت اور قوت میں اضافہ ہوگا، جو اسلام میں مطلوب ہے، اس کی پوری تفصیل اصل مقالہ میں کی جاچکی ہے۔

ج۔ ایک مسلمان کا بلا وجہ شرعی کسی غیر مسلم ملک میں رہنا بہر حال بہتر اور پسندیدہ نہیں ہے، اگرچہ دین اور دینی شعائر پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، کیونکہ غیر مسلموں کے درمیان رہ کر ان کے اثرات قبول کرنے کا اندیشہ ہے، نیز اس سے دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے۔

د۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''أنا بري من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين'' (ابوداؤد کتاب الجہاد: ۲۶۴۵) (میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان سکونت اختیار کرے)۔

(نوٹ) مکہ اور مدینہ کا استثناء اس لئے ہے کہ وہاں شہریت دیئے جانے سے تعداد میں کافی اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے حج وعمرہ کی ادائیگی میں دشواری ہوگی۔

۳۔الف: اگر وہ پناہ گزین خود اس ملک کی شہریت نہیں چاہتے ہیں، بلکہ ان کی نیت یہ ہے کہ ہمارے ملک کے حالات درست ہونے کے بعد ہم اپنے ملک واپس چلے جائیں گے تب تو ان کو پناہ گزین کا درجہ دینے اور اپنے ملک کا شہری تسلیم نہ کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے، البتہ پناہ گزین ہونے کے باوجود بھی ان کو وہ تمام حقوق ملیں گے جو انسانی اور مدنی حقوق کہلاتے ہیں جس کی تفصیل اصل مقالہ میں آچکی ہے۔

لیکن اگر وہ اس ملک کی شہریت چاہتے ہیں تو پھر ان کو شہری تسلیم نہ کرنا، بلکہ پناہ گزین کا درجہ دینا شرعاً درست نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''مالكم لا تقاتلون في سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها واجعل لنا من لدنك وليا، واجعل لنا من لدنك نصيرا'' (سورۂ نساء: ۷۵)۔

اس آیت کریمہ میں ان کمزور ولاچار مسلمانوں کا تذکرہ ہے جو مکہ مکرمہ میں اسلام لائے جیسے ابن عباسؓ، ان کی والدہ مسلمہ بن ہشام، ولید بن ولید، اور ابوجندل بن سہیلؓ وغیرہ، لیکن اپنے ضعف جسمانی اور کم سامانی کی وجہ سے ہجرت پر قادر نہیں تھے اور قریش بھی انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، یہاں تک کہ ان مظلوموں نے اللہ سے خلاصی کی دعائیں کیں، تاکہ ان کو ظالموں کی تکالیف سے نجات ملے اور دین وعقیدہ کی آزادی حاصل ہو، آیات کا شان نزول اگر چہ مسلمانان مکہ سے متعلق ہے، لیکن بقاعدہ "العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص المعنى" (اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ مخصوص معانی کا) کے تحت رہتی دنیا تک کے تمام مسلمان اس میں داخل ہیں، لہٰذا ایسے تمام مسلمانوں کی حفاظت وصیانت اور مظلوموں کی فریادرسی تمام مسلمانان عالم کا اہم شرعی واخلاقی فریضہ ہے، آیت میں صاف لفظوں میں حکم قتال دینے کے بجائے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا "مالكم لا تقاتلون" جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان حالات میں قتال وجہاد ایک طبعی اور فطری فریضہ جس کا نہ کرنا کسی بھلے آدمی سے بہت بعید ہے (معارف القرآن ۲/۴۷۶، ۴۷۷)، خلاصہ یہ کہ اگر مسلم ممالک ان مظلوموں کی حفاظت اور مدد کے لئے جہاد وقتال نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کو اپنے ملک کا شہری تسلیم کریں انہیں پناہ گزین کا درجہ تو نہ دیں۔

ب۔ "والذين هاجروا في الله من بعد ما ظلموا لنبوئنهم في الدنيا حسنة ولأجر الآخرة أكبر لو كانوا يعلمون" (سورۂ نحل: ۴۱) کی مفسرین نے کئی تفسیریں بیان کی ہیں، میری رائے میں ان مظلوموں کو اپنے ملک کا شہری تسلیم کرنا بھی اس میں داخل ہے، اس سے بڑھ کر اچھا ٹھکانا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان ملک انہیں اپنے ملک کا شہری اور باشندہ تسلیم کرلے، انہیں ترقی کے مواقع فراہم کرے۔

ج۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أنصر أخاك ظالما كان أو مظلوما" (بخاری، کتاب المظالم، رقم: ۲۴۴۳) (اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم) اور مظلوم بھائی کی مدد میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کو اپنے ملک میں شہریت دی جائے، کیونکہ وہ بے گھر اور بے وطن ہو چکا ہے اور یہ اس کی بنیادی واولین ضرورت ہے۔

د۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد مظلوموں کی امداد بھی ہے (حجۃ اللہ البالغۃ ۲/ ۴۶۳، ۴۶۴)، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ کار نبوت امتی کو انجام دینا ہے اس کی شکل کچھ بھی ہو۔

ھ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے ہر طرح سے انکا تعاون کیا، تجارت، زراعت، کاروبار، معاش، اچھا ٹھکانا وغیرہ وغیرہ ہیں۔

ب۔ وہ حقوق جو انسانی اور مدنی ہیں اور نصوص سے ثابت ہیں وہ تو انہیں ہر حال میں ملیں گے، رہی یہ بات کہ ان تارکین وطن کو اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں نہ دی جائیں تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، چنانچہ شریعت میں اس کے کئی نظائر موجود ہیں مثلاً:

۱۔ ''لا يستوي منكم من أنفق من قبل الفتح وقاتل أولئك أعظم درجة من الذين أنفقوا من بعد وقاتلوا، وكلاً وعد الله الحسنى'' (سورۂ حدید: ۱۰)، ظاہری بات ہے کہ یہ درجات کی بلندی ان کی قربانیوں اور وفاداریوں اور ملک وطن کے لئے کوششوں کی وجہ سے ہی ہے۔

۲۔ علماء ومحدثین نے صحابہ کرامؓ کے مراتب قائم کئے ہیں، مثلاً سابقین اولین، بدریین، احدیین وغیرہ۔

۳۔ نیز محدثین نے بعض مواقع پر قدیم الاسلام اور حدیث العہد بالاسلام رواۃ میں فرق کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ صرف سہولیات میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ اسلام نے حقوق کی تین قسمیں کی ہیں: ا۔انسانی حقوق، ۲۔شہری حقوق، ۳۔سیاسی حقوق، لہذا اسلامی نقطہ نظر سے شادی بیاہ، کام کاج، تجارت، ملازمت، الیکشن میں امیدواری، اور ووٹ دینا، سرکاری اداروں میں ملازمت، سرکاری اسکولوں میں تعلیم، اجتماعی ضمان، نجی ملکیت بنانے، آمدورفت، انسان کی عزت وحرمت خواہ زندہ ہو یا مردہ سرکاری اسپتالوں میں علاج، روزگار، عدالتی چارہ جوئی، انصاف حاصل کرنا، حکومت کی طرف سے جاری کردہ رفاہی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا وغیرہ سب حقوق شہریت میں آئیں گے۔

۵۔ پناہ گزینوں کی دو صورتیں ممکن ہیں:

الف۔ جس ملک میں انہوں نے پناہ لی ہے اس ملک نے انہیں شہری تسلیم کیا ہے یا نہیں؟ اگر انہیں باقاعدہ شہری تسلیم کرلیا گیا ہے تب انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو اس ملک کے دیگر شہریوں کو حاصل ہیں۔

ب۔ اور اگر انہیں صرف جائے پناہ دی گئی ہے، شہری تسلیم نہیں کیا گیا ہے تو انہیں وہ تمام حقوق جو بنیادی انسانی حقوق ہیں، حاصل ہوں گے، مثلاً تعلیم کا حق، علاج و معالجہ کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، انصاف کا حق، معاشی تگ ودو کا حق وغیرہ، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی، البتہ انہیں ووٹ دینے کا حق، الیکشن میں امیدوار بننے کا حق، کسی اہم سرکاری عہدہ اور منصب پر بحیثیت ملازم فائز ہونے کا حق مثلاً جج، ڈی ایم، وغیرہ حاصل نہیں ہوگا، یہ حقوق صرف شہریوں کو حاصل ہوں گے۔

۶۔ کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنانا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانے اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والے کی اغراض ومقاصد کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، مثلاً:

ا۔ اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو، یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، تو ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکر اور فواحش سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

۲۔ اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان شبینہ کا بھی محتاج ہوجائے ان حالات میں اگر اسے غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے تو مذکورہ بالا دو شرائط (جن کا بیان نمبر ایک میں گذرا) کے ساتھ اس کا وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کی طرح ایک فرض ہے، جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو۔

۳۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرتا ہے کہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شریعت پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ موجب اجر وثواب ہوگا، چنانچہ بہت سے صحابہؓ اور تابعین نے اسی نیت اور نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار کیا گیا۔

۴۔ اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحش ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مرادف ہے اور بلاضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے، ان کی سوچ وفکر کے انداز بدل جاتے ہیں، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے (ابوداؤد کتاب الجہاد رقم: ۲۷۸۷)۔

فقہاء فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمان کا دار الحرب میں رہائش اختیار کرنا اور ان کی تعداد میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہو جاتی ہے (تکملۃ رد المحتار ۱/۱۰۱، بحوالہ فقہی مقالات ۲/۲۳۵)۔

۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دار الکفر کی قومیت اور شہریت کو دار الاسلام کی شہریت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل و برتر سمجھتے ہوئے ان کی شہریت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے تو ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (فقہی مقالات ۲/ ۲۳۲ تا ۲۳۵)۔

خلاصہ یہ کہ سوال کی پہلی شق مجبوری کی صورت میں جواب کا دوسرا جزء منطبق ہوگا اور سوال کی دوسری شق محض معاشی فوائد والی صورت میں جواب کا چوتھا جزء منطبق ہوگا۔

۷۔ کفار کے حق میں مسلم ممالک کی تین اقسام ہیں:

الف۔ حرم پاک: تو کسی کافر کے لئے اس میں داخل ہونا کسی بھی حال میں درست نہیں، چاہے وہ ذمی ہو یا مستأمن، ائمہ اربعہ میں سے امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اسی کے قائل ہیں، حتی کہ اگر دار الکفر سے کفار کا کوئی قاصد آئے اور امام المسلمین حرم میں ہو تو بھی اس کو دخول کی اجازت نہیں دی جائے گی، بلکہ امام المسلمین خود باہر تشریف لاکر یا اپنا نمائندہ اور قاصد بھیج کر اس کا پیغام سنیں گے۔

دلیل: ان حضرات ائمہ کی دلیل قرآن پاک کی آیت: "إنما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام" (سورۂ توبہ: ۲۸) کا ظاہری مفہوم ہے۔

ائمہ حنفیہ کی دلیل بھی قرآن پاک کی یہی آیت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آیت کا دو مفہوم ہے:

الف۔ ممانعت ان مشرکین کے ساتھ خاص ہے جن کو دخول مکہ اور دیگر تمام مساجد میں دخول سے روک دیا گیا تھا، ذمہ نہ ہونے کی وجہ سے، اور ان سے اسلام اور قتال کے سوا کوئی چیز (ذمہ، جزیہ وغیرہ) قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ مشرکین عرب ہیں۔

ب۔ مشرکین کو حج کے لئے دخول مکہ سے روکا گیا ہے، یعنی کوئی کافر و مشرک حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہو سکتا، دلیل اس کی یہ ہے کہ:

۱۔ ۹ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اعلان کرایا گیا تھا: "أن لا يحج بعد العام مشرك ولا يطوفن بالبيت عريان" (ترمذی: ۳۰۹۱) (سن لو! اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی کعبۃ اللہ کا برہنہ طواف کرے گا)، چنانچہ ۱۰ھ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع فرمایا تو وہاں کوئی مشرک موجود نہ تھا۔

۲۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اسی آیت کے اگلے حصہ میں ہے: "وإن خفتم عيلة فسوف يغنيكم الله من فضله" (سورۂ توبہ: ۲۸) سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حج کے لئے دخول ممنوع ہے۔

۳۔ آیت میں "نجس" سے مراد نجس اعتقادی ہے، چنانچہ ثقیف کا وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قیام کے لئے مسجد میں سائبان لگوا دیا تھا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ نجس لوگ ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان لوگوں کی نجاست کا کچھ اثر زمین پر نہیں پڑتا ہے، بلکہ ان کی نجاست کا اثر خود ان پر پڑتا ہے (بحوالہ ابحاث ہیئۃ کبار العلماء ۷/۵۳۲)۔

رہ گئی بات یہ کہ کافر اور ذمی کا استثناء کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کافر معاہد کا استثناء اس آیت کی وجہ سے ہے: "إلا الذين عاهدتم من المشركين" (احکام القرآن ۳/۲۷۹ تا ۲۸۱)۔

۴۔ بلاد اسلام کی دوسری قسم حجاز مقدس یا جزیرۃ العرب ہے، اس کی حد بندی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس کی حد یمامہ، نجد، یمن اور مدینہ منورہ کے درمیان کا حصہ ہے، کلبی فرماتے ہیں کہ حجاز کی حد جبل طیٔ اور طریق عراق کے درمیان کا حصہ ہے، حربی فرماتے ہیں: تبوک بھی حجاز کا حصہ ہے (فقہ السنۃ ۳/۵۵، موسوعہ فقہیہ ۳/۱۲۶، ۱۲۷)، اب جزیرۃ العرب کو صرف تین حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے، ایک اس کے مغربی اور جنوبی ساحلوں کے پہاڑ اور ان کے ساحل و میدان، اس میں حجاز، تہامہ، عسیر، یمن، حضر موت، شحر مدہ و ظفار، اور عمان شامل ہیں۔

دوسرے جزیرۃ العرب کے مختلف صحراء وریگستان اس میں صحراء الربع الخالی، الدہناء، النفوذ اور بادیۃ الشام شامل ہیں، تیسرے اس کی سطح مرتفع، نیز اس کے مشرق میں واقع سواحل اور میدان، اس میں نجد (یمامہ، قصیم، جبال طئی) احساء، قطر، کویت اور بحرین شامل ہیں (جزیرۃ العرب ص ۲۶، ۲۷)۔

ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ امام خلیفہ یا اس کے نائب کی اجازت سے کفار اس میں داخل ہوسکتے ہیں لیکن مدت مسافرت (تین دن) سے زیادہ قیام نہیں کرسکتے ہیں۔

امام صاحب فرماتے ہیں: ان کو قیام اور استیطان (وطن بنانے) سے منع نہیں کیا جائے گا۔

جمہور فقہاء کے دلائل:

۱۔ ''لأخرجن الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب'' (مشکوۃ: ۴۰۵۲) (میں ضرور بالضرور یہود ونصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالوں گا)۔

۲۔ ''أخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب'' (مسلم کتاب الوصیۃ: ۱۶۳۷) (مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالو)۔

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ہنگامی حالات کی وجہ سے فرصت نہ مل سکی تو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو جلاوطن کیا، اور جو تجارت کی غرض سے آئے تھے ان کو تین دن کی مہلت دی۔

۳۔ ''لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب'' (السنن الکبری للبیھقی ۹،۲۰۸) (جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہیں ہوسکتے)۔

بلاد اسلام کی ان دو قسموں کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ ان ممالک کے دین، امن وسکون اور استقرار کے پیش نظر اور کفار کے قیام کی وجہ سے پڑوسی ممالک کو جو خطرات لاحق ہوئے ہیں ان کے پیش نظر کسی بھی غیر مسلم کو ان میں مستقل قیام اور استیطان کی ہرگز اجازت نہ دی جائے، اس لئے کہ وہ اس دین کے دشمن ہیں ان سے دغا، فریب، دھوکہ اور خیانت کا صدور کبھی بھی ہوسکتا ہے، وہ کسی بھی وقت اعداء اسلام سے ساز باز کرسکتے ہیں، اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ قرآن کا فرمان ہے: ''لا یرقبون فی مومن إلا ولا ذمہ یرضونکم بأفواھھم وتأبی قلوبھم وا کثرھم فاسقون'' (سورۂ توبہ: ۱۰) (وہ نہیں لحاظ کریں گے تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا وہ تم کو اپنے منہ کی بات سے راضی کردیتے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے ہیں، اور ان میں سے اکثر بدعہد ہیں)۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

الف۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوگیا تھا کہ زمانہ کا پانسہ پلٹتا رہتا ہے، ممکن ہے کہ اسلام کسی زمانے میں کمزور پڑ جائے اور اس کا شیرازہ بکھر جائے، اگر ایسے حالات میں یہ کفار دشمنان خدا اور سول اور اسلام، اسلام کی اصل اور مرکز میں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی حرمات اور دینی شعائر کی بے حرمتی و پامالی کا سبب بنیں گے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دار العلم کے اردگرد سے ان کو نکالنے کا حکم فرمایا۔

ب۔ کفار کے ساتھ بود وباش، رہن سہن، مسلمانوں کے دین کو بگاڑتا ہے، ان کے نفوس میں تبدیلی پیدا کرتا ہے، دینی غیرت وحمیت کو کمزور کرتا ہے، لیکن چونکہ دوسرے ممالک اسلامیہ میں ان کے ساتھ رہنے کے سوال کوئی چارہ نہیں ہے تو کم از کم حرمین شریفین کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کیا جائے۔

ج۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری زمانے کے حالات منکشف ہوگئے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إن الدین لیأرز إلی المدینۃ کما تأرز الحیۃ إلی حجرھا'' (بخاری کتاب فضائل المدینہ حدیث نمبر ۱۸۷۶، مسلم کتاب الایمان ۱۴۷) (دین مدینہ منورہ کی طرف ایسا سمٹ آئے گا جیسے سانپ اپنے بل میں سمٹ جاتا ہے) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تکمیل صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ دوسرے تمام ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کو وہاں سے نکال دیا جائے (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۷۰۳، ۵۳۸،۵۳)۔

۳۔ تیسری قسم تمام بلاد اسلام ہے ان میں کافر عہد، ذمہ اور امان لے کر قیام کرسکتا ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک مساجد میں داخل نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ کسی مسلمان کی اجازت نہ حاصل کرلے، امام صاحبؒ کے نزدیک بغیر اجازت بھی داخل ہوسکتا ہے، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک کسی بھی حال میں داخل نہیں ہوسکتا ہے چاہے اجازت ہو یا نہ ہو (فقہ السنہ ۳/۵۵)۔

غیر مسلموں کو مسلم ملک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنے کے سلسلے میں روایات اور عمل صحابہ اور فقہاء کی عبارتوں سے جواز اور عدم جواز دونوں کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ ''ابوداؤد شریف'' میں حدیث ہے: ''أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظھر المشرکین'' (ابوداؤد کتاب الجہاد رقم: ۲۶۴۵) (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے)، نیز دوسری حدیث میں ہے: ''من جامع المشرکین

وسكن معه، فإنه مثله'' (ابوداؤد کتاب الجہاد:۲۷۸۷) (جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے، مراسیل ابوداؤد میں ہے: ''لا تنزلوا الذرية بإزاء العدو'' (ابوداؤد فی المراسیل، باب إنزال الذرية الثغور والسواحل) (اپنی اولاد کو دشمنوں (مشرکین) کے درمیان نہ چھوڑو)۔

یہ اور اس طرح کی تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے نہ آباد کرنا چاہئے نہ خود آباد ہونا چاہئے۔

لیکن دوسری طرف جب ہم صحابہ کرام کا عمل دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ صحابہؓ کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ملکوں میں ان کے درمیان آباد ہوئی، نیز فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر دار الکفر سے کوئی کافر دار الاسلام آئے تو امام المسلمین اسے اپنی صوابدید پر زیادہ سے زیادہ ایک سال کی مہلت دے سکتا ہے اگر وہ اس سے زیادہ رہ گیا تو اب وہ اپنے وطن نہیں جاسکتا، بلکہ وہ اسی ملک کا شہری شمار ہوگا، چنانچہ صاحب ''ہدایہ'' تحریر کرتے ہیں: ''وإذا دخل الحربي إلينا مستأمنا لم يمكن أن يقيم في دارنا سنة، ويقول له الإمام: إن أقمت تمام السنة وضعت عليك الجزية، وإذا أقامها بعد مقال الإمام يصير ذمياً، ثم لا يترك أن يرجع إلى دار الحرب'' (ہدایہ ۲،۵۸۶)۔ (حربی دار الاسلام امان لے کر آئے تو اس کو دار الاسلام میں ایک سال سے زیادہ قیام کی اجازت نہیں دی جائے گی اور امام المسلمین اس سے کہے گا کہ اگر تم مکمل ایک سال قیام کرو گے تو میں تمہارے اوپر جزیہ لاگو کروں گا، پھر اگر وہ امام کے یہ کہنے کے بعد بھی وہاں مقیم رہا تو وہ ذمی ہو جائے، پھر اسے دار الحرب واپس جانے کی اجازت نہ ہوگی)۔

نیز قرآن پاک میں ہے: ''وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله'' (سورۂ توبہ:۶)، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو قیام کی اجازت ہونی چاہئے، تاکہ وہ محاسن اسلام سے واقف ہو سکے۔

نیز حضور ﷺ نے فرمایا: ''المؤمن الذي يخالط الناس ويصبر على أذاهم خير من الذي لم يخالط الناس ولم يصبر على أذاهم'' (ترمذی رقم:۲۵۰، ابن ماجہ رقم:۴۰۳۲)۔ (وہ مومن جو لوگوں کے درمیان رہتا ہے اور ان سے میل جول قائم رکھتا ہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہے وہ اس مومن سے بہتر ہے جو لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا ہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر نہیں کرتا ہے) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے درمیان اقامت کی اجازت دینا یا خود ان کے درمیان سکونت اختیار کرنا جائز ہے۔

دلائل پر غور کرنے کے بعد راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ جواز اور عدم جواز کا نہیں، بلکہ اولی اور غیر اولی کا ہے، اولی اور بہتر یہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادیاں الگ قائم کریں، کالونیاں الگ بنائیں، لیکن اگر ان کے درمیان رہنے یا ان کو اپنے درمیان رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو اس انداز سے رہیں کہ ان کے محلے الگ اور مسلمانوں کے محلے الگ ہوں اور اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو غالب اکثریت والے مسلمانوں کے علاقہ میں رہائش اختیار کریں۔

خلاصہ یہ کہ اگر ضرورت ہو تو غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا جائز ہوگا، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ''قال القرطبي: فيه أن على الامام إخراج كل من دان بغير دين الاسلام من كل بلد غلب عليها المسلمون عنوة إذا لم يكن بالمسلمين ضرورة إليهم كعمل الأرض ونحو ذلك، وعلى ذلك أقر عمر رضي الله عنه من أقر بالسواد والشام'' (فتح الباری ۶،۲۰۸)۔ قرطبی فرماتے ہیں: اس حدیث (مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالو) میں ہے کہ امام المسلمین ہر ایسے شخص کو جو دین اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا پیرو ہو، ہر ایسے شہر سے نکال دے جس پر مسلمانوں نے فتح کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا ہو، بشرطیکہ وہاں کے مسلمانوں کو ان کی کوئی ضرورت نہ ہو، مثلاً کاشت، زمین کی جوتائی وغیرہ، اور اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ نے سواد اور شام کے کچھ لوگوں کو باقی رکھا تھا۔

البتہ اس امر کا خیال ضرور رہے کہ وہ تعداد کے اعتبار سے مغلوب اور مسلمان غالب ہی رہیں۔

☆☆☆

قانون اسلام میں شہریت کا مفہوم اور شہریوں کے حقوق

مولانا نثار احمد حصیر القاسمی[1]

شہریت کا مفہوم اور اس سے متعلق احکام:

شہریت ووطنیت کا مسئلہ دور حاضر میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے، موجودہ دور کے مسائل میں یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے، درحقیقت شہریت دور حاضر کی اصطلاح ہے جو سٹیزن شپ (citizenship) کا ترجمہ ہے، اسی کو وسیع تر مفہوم میں نیشنلٹی سے تعبیر کرسکتے ہیں، شہریت فرد اور ملک کے درمیان کے تعلقات سے عبارت ہے جس کا تعین ملکی قانون کرتا ہے، اور اس سے فرد کو بہت سے حقوق وآزادی حاصل ہوتی ہے اور ان پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں (دائرۃ المعارف البریطانیہ ووکی پیڈیا)۔

اسلامی اصطلاح کی ڈکشنری میں شہریت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ شہریت اس مقام ومرتبہ یا سماجی رابطے وتعلق کا نام ہے جو کسی زمین پر بسے افراد کو سیاسی ڈھانچے یا ملک سے مربوط کرتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان خاص رشتہ قائم کرتا ہے، اس تعلق کے ذریعہ فریق اول وفاداری پیش کرتا ہے اور فریق ثانی تحفظ فراہم کرتا ہے، فرد اور ملک کے درمیان اس تعلق کو قانون کے ذریعہ متعین ومحدود کیا جاتا ہے۔

اسلامی شریعت میں شہریت، وطنیت کے ہم معنی ہے جو مسلم فرد اور امت کے عناصر کو دیگر افراد سے اور حاکم ومحکوم کو جوڑتا ہے، پھر ان تمام رابطوں کو وہ رابطہ مضبوط کرتا ہے جو ایک طرف مسلمانوں اور حکمرانوں کو یکجا کرتا اور دوسری طرف زمین اور اس میں تمام بسنے والوں کو جوڑتا ہے، یہ تعریف درحقیقت اس دار الاسلام کی ہے جہاں مسلمان اور غیر مسلم سب آباد ہوتے ہیں۔

عربک انسائیکلوپیڈیا میں اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ وطنیت کا مطلب فرد کا اپنے وطن سے محبت کرنا اور اخلاص برتنا ہے، جو زمین سے اس پر بسنے والوں سے اور وہاں کے عادات واطوار اور رسم ورواج سے وابستگی کا متقاضی ہے اس میں وطن کی تاریخ پر فخر کرنا اور وطن کی خدمت میں قربانی دینا بھی شامل ہے۔

وطنیت یا شہریت اور اس کی تنفیذ کے طریقے دور حاضر میں حسب ذیل ہیں:

۱۔ وفاداری ووابستگی۔ شہریت کے لئے ضروری ہے کہ وطن سے وابستگی اختیار کرے، وابستگی کا احساس ہر شہری کے اندر جوش وجذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ وطن کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور اس کے دفاع میں ہر شہری اپنے وطن کے ساتھ وفاداری برتے، اپنے وطن پر فخر کرے، اس کا دفاع کرے، اس کی سلامتی کا حریص رہے، اور ملکی علامتوں جیسے قومی ترانہ، پرچم، زبان اور رسم ورواج کا احترام کرے۔

۲۔ ہر شہری کو سماجی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق یکساں طور پر حاصل ہوں گے، اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ملک میں بسنے والے ہر شہری کو درج ذیل سہولیات فراہم کرے۔

جان کی حفاظت کرے، مال اور تمام املاک کی حفاظت کرے، اس کے دین ومذہب کی حفاظت کرے، تعلیم فراہم کرے، میڈیکل سہولیات مہیا کرے، بنیادی خدمات فراہم کرے، باعزت زندگی گذارنے کی راہ ہموار کرے، ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف اور مساوات برتے، ہر کسی کو شخصی آزادی دے، جس میں سرفہرست جائیدادوں کا مالک بننے کی آزادی کام کرنے اور ملازمت اختیار کرنے کی آزادی، عقیدے کی آزادی، رائے کی آزادی، دین ومذہب کی آزادی، آنے جانے کی آزادی ہے، اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آزادیاں ہیں۔

۳۔ شہریت رکھنے والوں پر ملک اور سماج کے تعلق سے کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، مثلاً دستور، قانون اور ملکی نظام کا احترام کرنا، ملک کے دفاع میں حصہ لینا

---

[1] سکریٹری جنرل اکیڈمی آف ریسرچ اینڈ اسلامک اسٹڈیز، پوسٹ باکس 601 حیدرآباد۔

اور ضرورت ہو تو فوجی خدمات انجام دینا،حکومت کی جانب سے عائد کردہ ٹیکس اور فیسیز ادا کرنا، عام املاک کی حفاظت کرنا اسے نقصان پہنچانے سے گریز کرنا، وطن کے ساتھ خیانت وغداری نہ کرنا اور ملک کو نشانہ بنانے والے پروپیگنڈوں کا مقابلہ کرنا اور سماج کے افراد کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر کام کرنا۔

۴۔ ملک کی سیاسی وسماجی سرگرمیوں میں شریک رہنا،وطنیت وشہریت کی خاص علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ ملک کا ہر شہری سیاسی عمل میں حصہ لے (انتخابات میں حق کا استعمال کرے) سیاسی فیصلوں اور موقفوں پر اپنی رائے اور مشوروں کا اظہار کرے، سماجی سرگرمیوں، انسانی خدمات، اور ملکی مفاد سے متعلق عمل میں شریک رہے۔

لغوی اعتبار سے وطن چونکہ اس جگہ اور مقام کا نام ہے جہاں انسان رہائش پذیر ہوتا اور اسے اپنا وطن بناتا ہے، اس لئے اس کا بھی تقاضہ ہے کہ وہ اس سے مربوط ووابستہ رہے، اس کے ساتھ وفاداری کرے، اور اس مقام کے مفاد میں جو ہو اس میں ہاتھ بٹائے۔

شہریت کی اساس:

کسی بھی ملک کے اندر حقوق اور واجبات کے تبادلے کے دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں اور اسی پر سیٹیزن شپ کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، ایک عنصر عوام اور دوسرا عنصر ملک ہے، انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، وہ دوسروں کے ساتھ مربوط رہکر اور باہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹ کر جینا چاہتا ہے، یہ اس کی فطری ضرورت اور زندگی کا لازمہ ہے، بلکہ اسی پر اس کا وجود قائم ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی انفرادیت میں سب سے زیادہ غلو کرنے والا مذہب بھی اس ضرورت کا اعتراف کرتا ہے کہ لوگوں کے درمیان کچھ اقدار واخلاقیات کا ہونا ضروری ہے جو افراد کے تعلقات کو منظم کر سکے اور اسے باضابطہ بنا سکے۔

سماج کے افراد کو جوڑنے والے تعلق کو اسلام اس طرح استوار کرنا چاہتا ہے کہ انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ اچھا ہو، اس کے عہد کو انسانیت کی فلاح کے لئے پورا کرے، اس کے بالمقابل اس ربط وتعلق کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے حقوق کی پامالی، زمین میں فساد وبگاڑ پیدا کرنے کی کوشش اور اللہ کے عہد ومیثاق کو توڑنے کو اللہ کی ناراضگی اور دائمی شقاوت وبدبختی کا سبب قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: { وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ } (الرعد: ۲۵)۔ (رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جو ان جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانہ ہے)۔

عوامی سطح پر باہم حقوق وواجبات کی بے شمار صورتیں ہیں، جیسے والدین واولاد کے حقوق، زوجین کے حقوق، ذوی الارحام کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، اور اس کے علاوہ بے شمار حقوق، غرض سماج کے افراد کے درمیان کے تعلقات کو انسانی سطح پر پہنچانے کے لئے اونچے اقدار واخلاق کی ضرورت ہے جسے دین اسلام نے مشروع کیا اور ایمان والوں کو اسے اپنانے کی تاکید کی ہے، ان اخلاق میں سرفہرست ولاء ووفاداری اور الفت ومحبت ہے، جو امت کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس وفاداری کا تذکرہ یوں کیا ہے۔ { وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ } (الانفال: ۷۳)۔ (جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا)۔

ایک اخلاق ہمدردی وجذبہ ایثار ہے جس سے انسان نفسیاتی طریقہ پر ایک دوسرے سے قریب ومانوس ہوتا ہے، یہ ہمدردی انسانی بنیاد پر ہوتی ہے، کسی مفاد یا دکھاوے کے طور پر نہیں، اللہ کے رسول صلعم کا ارشاد ہے: ''ترى المؤمن في تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد، إذا اشتكى عضوا تداعى له سائر جسده بالسهر والحمى'' (صحيح البخاري، كتاب الأدب، حدیث نمبر: ۵۶۶۵)۔ (مؤمن کی مثال باہم محبت کرنے، رحم دلی کرنے، اور ہمدردی کرنے میں جسد واحد کی طرح ہے کہ اس کے کسی ایک حصے کو اگر بیماری لاحق ہوتی ہے تو پورا جسم شب بیداری اور بخار میں اس کے لئے ٹوٹ پڑتا ہے)۔

ایک اخلاق نصیحت وخیر خواہی ہے، جس کا مطلب ہے کہ ہر ایسے کام کی کوشش کی جائے جس سے دوسرے کا بھلا ہو، اللہ کے نبی صلعم بیعت لیتے ہوئے اس کی بھی تاکید فرمایا کرتے تھے (يعني والنصح لكل مسلم) آپ ﷺ کا واضح ارشاد ہے: ''الدين النصيحة، قلنا: لمن يارسول الله ؟ قال: لله، ولكتابه، ولرسوله، ولأئمة المسلمين، والمسلم أخو المسلم، لا يخذله، ولا يكذبه، ولا يظلمه، وإن أحدكم مرآة أخيه، فإن رأى به أذى فليمطه عنه'' (جامع الأصول في أحاديث الرسول، حدیث نمبر: ۴۷۹۴)۔ (دین نصیحت وخیر خواہی کا نام

ہے، (صحابہ فرماتے ہیں) ہم نے کہا، کس کے لئے اے اللہ کے رسول؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے لئے، اس کی کتاب کے لئے اس کے رسول کے لئے، مسلمانوں کے ائمہ کے لئے، اور مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اسے رسوا کرے، نہ اس کے ساتھ دروغ گوئی کرے، نہ اس پر ظلم کرے، تم میں سے ہر کوئی اپنے دوسرے بھائی کے لئے آئینہ ہے، اس میں اگر کوئی تکلیف دہ چیز پائے تو اسے چاہئے کہ اسے دور کردے)۔

ایسے ہی بنیادی، اخلاق میں سے ایک نصرت ومدد ہے، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ وہ اس کی مادی ومعنوی ہر طرح سے مدد کرے، اللہ کے نبی کا ارشاد ہے: ''أنصر أخاك ظالما أو مظلوما، فقال رجل: یارسول اللّٰہ ! أنصرہ إذا کان مظلوما فکیف أفرأیت إذا کان ظالما کیف أنصرہ ؟ قال: تحجزہ أو تمنعہ من الظلم، فإن ذلك نصرہ'' (صحیح البخاري، کتاب العلم، حدیث نمبر: ۶۹۵۲)۔ (اپنے بھائی کی مدد کرو، ظلم ہو یا مظلوم، ایک شخص نے کہا ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں جبکہ وہ مظلوم ہو، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو ہم کس طرح اس کی مدد کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے ظلم کرنے سے روکو اور منع کرو، یہی اس کی مدد کرنا ہے)۔

اسلام نے اخلاقی اقدار کو اس لئے مشروع کیا کہ یہ اسلامی زندگی کا ضابطہ اور اس کی رہنمائی کا قاعدہ بنے اور سماج کا ڈھانچہ مضبوط ومستحکم ہو، یہ ایسے اقدار واخلاقیات ہیں کہ نئی نسل کے ذہن میں اگر اسے راسخ کردیا جائے، اور اس پر ان کی شخصیت کی تعمیر کی جائے، تو ایسا سماج سامنے آئے گا جس میں انسانیت کا بول بالا ہوگا، اور اس کا ہر فرد نفسیاتی، فکری، حرکیاتی ہر اعتبار سے بلند معیار کا مکمل انسانیت کا حامل ہوگا۔

شہری اور ملک:

شرعی اصطلاح میں عام شہری کو رعایا سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے راعی، یعنی حکومت رعایا کے ساتھ مکمل نگرانی وتحفظ کا معاملہ کرے، اسے انصاف دے، اس کے حقوق ادا کرے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ألا کلکم راع وکلکم مسؤول عن رعیتہ. فالإمام الأعظم الذي علی الناس راع وھو مسؤول عن رعیتہ، والرجل راع علی أھل بیتہ وھو مسؤول عن رعیتہ. والمرأۃ راعیۃ علی أھل بیت زوجھا، وولدہ وھي مسؤولۃ عنھم، وعبد الرجل راع علی مال سیدہ وھو مسؤول عنہ. ألا فکلکم راع وکلکم مسؤول عن رعیتہ'' (صحیح البخاري، کتاب العلم، حدیث نمبر: ۷۱۳۸)۔ (آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر کوئی نگہباں ہے، اور تم میں سے ہر کسی سے اپنی زیر سرپرستی ونگرانی کے بارے میں سوال کیا جائے گا (وہ اس کا ذمہ دار ہے) امام اعظم (حکمراں) جو لوگوں پر ہوتا ہے، وہ نگراں ہے اور اس سے رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا، مرد گھر والوں کا نگراں ہے اور وہ اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، اس سے پوچھا جائے گا، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگراں ہے اور اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا، کسی شخص کا غلام آقا کے مال کا نگراں ہے اور وہ اس کا ذمہ دار ہے، اس کے بارے میں پوچھ ہوگی، آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر کوئی نگہباں ہے اور وہ اپنے زیر نگرانی وسرپرستی کے بارے میں پوچھا جائے گا)۔

مسلمان اپنے دینی تشخص وماحول کی وجہ سے یہ اور اس طرح کے احکام کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے ان میں آج جیسی برائی پیدا نہیں ہوئی، انہوں نے اپنی رعایا کے مستقبل سے کھلواڑ نہیں کیا؛ بلکہ انہوں نے آج کی سمجھ کے برعکس سمجھا، انہوں نے خیال کیا کہ رعایا کے حقوق بہت زیادہ ہیں اور ان کی ذمہ داری نہایت اہم اور پر خطر ہے، انہوں نے مانا کہ ملک کے باشندوں میں اصل رعایا ہے، راعی وحکمراں نہیں، وہ تو محض ان کے امور کا منتظم اور خادم ہے۔

اس پس منظر میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملک پر عام شہری کا حق ہے کہ اقتدار اور حکمرانی عوام کی پسند کے مطابق ہو، عوام اگر مسلمان ہوں تو اللہ کی شریعت نافذ کی جائے، رعایا کے تمام افراد کے ساتھ خیر خواہی کی جائے، ان کے ساتھ دھوکا بازی نہ کی جائے، نہ تعلیمی وثقافتی دھوکا نہ سماجی دھوکا، اللہ کے نبی کا ارشاد ہے: ''ما من عبد یسترعیہ اللّٰہ رعیۃ یموت یوم یموت وھو غاش لرعیتہ إلا حرم اللّٰہ علیہ الجنۃ'' (؟) (جس بندے کو بھی اللہ رعایا پر نگراں بنایا ہو (حکمرانی دی ہو) اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ عوام کے ساتھ دھوکا کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ جنت اس پر حرام کردے گا)۔

اس کا مطلب ہے کہ حکومت کو عوام کے ساتھ سچائی برتنی چاہئے، انہیں اندھیرے میں نہ رکھا جائے اور نہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ آنکھ میں دھول جھونکنے کی کوشش کی جائے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من غشنا فلیس منا'' (صحیح البخاري، کتاب الإیمان، حدیث نمبر: ۲۹۴)۔ (جو ہمارے ساتھ دھوکا کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

اسی طرح عوام کا حق ہے کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے اور مساوات وبرابری برتی جائے، وطن کے دشمنوں کے سامنے ذمہ داری نبھائے، اسی طرح

عوام کے لئے کام کے مواقع فراہم کئے جائیں؛ تاکہ وہ اپنے معاش ومعاد کی اصلاح کر سکیں، ملک کا حق رعایا پر یہ ہے کہ وہ انتخاب میں حصہ لیں، ملکی نظام کی وفاداری کریں، ملکی مفاد کو مقدم رکھیں، اور اپنے وطن سے جڑے رہیں اور اس کیلئے قربانیاں دینے کے لئے تیار رہیں، ملک کے ساتھ وفاداری برتیں دستور، قانون، حکومتی فیصلوں اور ہدایات پر اگر وہ شرع اسلام سے ٹکراتا ہوا نہ ہوتو عمل کریں، اسے توڑنے یا اس کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش نہ کریں، ملک کے لئے کام کرنے میں مخلص ہوں، اور اس کی تعمیر وترقی میں ہاتھ بٹائیں، غلط فیصلوں پر حکومت کو پرامن طریقے پر مشورے دیں اور امن وامان کی برقراری کی کوشش کریں، اور ملک سے باہر ملک کی اچھی نمائندگی کریں اور اسے بدنام کرنے سے گریز کریں، اور حکومت جو بھی (ظالمانہ نہیں بلکہ عادلانہ) ٹیکس عائد کرے یا فیس متعین کرے اسے ادا کریں۔

بہر حال وطن سے وابستگی اور لگاؤ انسان کی فطرت میں داخل ہے، مگر کبھی اس وابستگی میں ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے؛ اسی لئے اسلام نے اس ٹکراؤ کی کیفیت کو ختم کرنے کی کوشش کی اور واضح کیا ہے کہ عقیدے کا اتحاد الگ ہے اور زمینی ووطنی اتحاد الگ، شہریت کے اصول وضابطے اور دینی بھائی چارگی کے تقاضے کچھ اور ہیں جبکہ دینی بھائی چارگی زمان ومکان سے آزاد ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے وطن اور اہل وطن کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کو تقسیم کر دیا ہے، ان حقوق اور انداز حکمرانی میں عوام کے ارادوں اور توقعات کی رعایت اہم ہے، تاکہ عدل وانصاف کے ضوابط کو برتا جا سکے، عوام کو تحفظ دیا جائے، اندرونی وبیرونی خطروں سے عوام کو بچایا جائے، اور کام کے مواقع فراہم کئے جائیں، ان کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ ملک کے ساتھ وفاداری برتیں ملک کو ترقی دیں اور اس کی شان وشوکت بلند کرنے کی کوشش کریں، حکام کو گاہے بگاہے مشورے دیں، ہر جائز طریقہ پر ملک کا اندرونی وبیرونی دشمنوں سے دفاع کریں، عائد کردہ ٹیکس ادا کریں اور ملکی قانون کی پابندی کریں۔

اسلام اور پناہ گزینوں کے حقوق:

ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں بارہ ملین پناہ گزیں ہیں، ان کی اکثریت کا تعلق مسلم ملکوں سے ہے، اسی طرح اس وقت دنیا میں کم وبیش ۳۰ ملین تارکین وطن ہیں جو ملک کے دوسرے علاقوں میں یا ملک سے باہر کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، ان تارکین وطن میں سے ۱۰ ملین سے زائد افراد کی میزبانی مسلم ممالک کر رہے ہیں، حالیہ بہار عرب کے دوران اس میں 9000000 نو لاکھ تارکین وطن کا اضافہ ہوا ہے، جو ملک میں جنگ وجدال، خانہ جنگی اور انقلاب کے نتیجہ میں بے گھر ہوئے ہیں، بین الاقوامی قانون کی رو سے پناہ گزینوں اور تارکین وطن کو تحفظ فراہم کرنا اندرون یا بیرون ملک جہاں یہ پہنچیں اس ملک کی ذمہ داری ہے جس کی ضمانت بین الاقوامی انسانی قانون کے اندر دی گئی ہے، اور اس کی بنیاد ۱۹۴۹ میں کئے گئے جنیوا معاہدہ ۱۹۷۷ میں اضافہ کئے گئے پروٹوکول ۱۹۸۷ میں طے کئے گئے پناہ گزینی معاہدہ اور ۱۹۶۷ کے پروٹوکول پر ہے، اس کے علاوہ حقوق انسانی کے بین الاقوامی قانون نے بھی ان کے حقوق کو تسلیم کیا اور انہیں تحفظ فراہم کرنے کو لازم کیا ہے، اور اس قانون کی بنیاد ۱۹۴۸ کے بین الاقوامی اعلامیہ برائے حقوق انسانی پر ہے، اس اعلامیہ کی روشنی میں ہی ۱۹۶۶ اور اس کے بعد معاہدات روبعمل لائے گئے اور اس میں ان کے لئے شہری، سیاسی اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور دیگر حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے، اس کی فراہمی کو لازم کیا گیا۔

اسلام ایمان والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کمزوروں (مستضعفین) کی مدد کریں، انہیں تحفظ فراہم کریں، اور ان کے لئے ایسے وسائل وذرائع مہیا کریں جس سے ان کی زندگی کی گاڑی چلتی رہے، تاہم اسلام اور اسلامی شریعت پناہ گزینوں وتارکین وطن کے لئے وسیع تر قانونی ایسا نظام فراہم نہیں کرتا جو تحفظ فراہم کرنے کے موجودہ مفہوم کے مطابق ہو، مثال کے طور پر اسلام میں پناہ حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے، اور اس کی سب سے بڑی مثال خود رسول اللہ کا ظلم وبربریت سے بچنے کے لئے مدینہ منورہ کی ہجرت ہے، گذشتہ چند سالوں کے درمیان مسلم دنیا میں حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ سے متعلق کافی ردوقدح اور بحث ومباحثہ ہوتا رہا، اور یہ بحث چھڑی رہی ہے کہ یہ اعلامیہ شریعت اسلامیہ سے مطابقت وموافقت رکھتا ہے یا نہیں، حقوق انسانی کا مسلم وغیر مسلم دفاع کرنے والے یہ خدشات پیش کرتے ہیں کہ اسلام یا اسلامی شریعت حقوق انسانی سے ہم آہنگی نہیں ہے، یا کم از کم حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ سے ہم آہنگ ومطابقت رکھنے والی نہیں ہے، اس کا مطلب ہوا کہ اسلامی شریعت ان کے بقول حقوق انسانی کے بین الاقوامی قانون سے ہم آہنگ نہیں ہے، دوسری طرف کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ براہ راست شریعت اسلامیہ کے بعض مبادی اور بنیادی ضابطوں سے ٹکراتا ہے؛ اس لئے وہ عالم اسلام کے لئے مناسب نہیں ہے، اور اس اختلاف کی وجہ شاید یہ ہے کہ حقوق انسانی کے تعلق سے اسلامی نقطۂ نظر اور بین الاقوامی نقطۂ نظر کا خود حقوق کے مفہوم میں اختلاف ہے، عالمی اعلامیہ انسان کے حقوق کے عالمی ہونے پر زور دیتا ہے، جبکہ اسلام دو طرح کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے ایک تو وہ حق ہے جو انسان کو اس سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق

ہے، اور اس اعتبار سے اس کی پابندی کرنا اور اسے بجالانا اس پر لازم ہے اور ایک حقوق وہ ہیں جس کی انسان دوسرے انسانوں سے توقع کرتا ہے، حقوق کی یہ دوسری قسم متعارف حقوق انسانی سے ہم آہنگی ومطابقت رکھتی ہے؛ البتہ پہلی قسم کے حقوق وہ ہیں جو دین وایمان کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں، اس اعتبار سے اللہ ہی کی ذات ایسی ہے جو حقوق کی مالک ہے، رہا انسانوں کے حقوق تو وہ اللہ کے احکام کو ماننے کے اندر پنہا ہے، افراد کے یہ حقوق ان قوانین کی پابندی کرنے میں ہے جسے اللہ نے بنایا ہے، اور اس پر عمل اور اس حق سے استفادہ اللہ کے نظام پر عمل کر کے ہی ہوسکتا ہے؛ اس لئے یہ غیر مسلموں کو شامل نہیں ہوگا، ایک اور مسئلہ عورت ومرد کے درمیان مساوات کا ہے، حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ ان دونوں صنفوں کے درمیان کسی قید وشرط کے بغیر مکمل مساوات پر زور دیتا ہے، مگر اس کے برخلاف اسلامی شریعت میں عورت کو حق حاصل ہے کہ مرد اس کی کفالت کرے، اس کی نگرانی وحفاظت کرے، اور اس پر انفاق کرے، دوسری طرف مرد عورت کے مقابلہ پر دگنا میراث پاتا ہے، ممکن ہے کہ اس طرح کے مسائل پناہ گزینی وترک وطن کی صورت میں ان کے حق سے متعلق اور املاک واپس لینے کے باب میں مسئلہ پیدا کریں، خاص طور پر جبکہ بہت سی فیملی ایسی ہوتی ہے جس کی سربراہ عورت ہوتی ہے، وہی بقاء کی جدوجہد کرتی اور از سرنو زندگی تعمیر کرنے نقل مکانی پر مجبور ہونے اور جنگ وجدال کے بعد معاش کی تگ ودو میں رہتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے عملی طور پر کئی طرح کے بے شمار حقوق فراہم کئے ہیں جو ہر انسان کا حق ہے، یہ حق انہیں اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں، یہ حقوق عصر حاضر کے تناظر میں بھی حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ میں پیش کردہ حقوق سے مختلف نہیں؛ بلکہ اس سے ہم آہنگ ہیں، مثال کے طور پر زندگی اور جینے کا حق اسلام میں انسانوں کا بنیادی حق ہے جو عورتوں، مردوں، مسلموں اور غیر مسلموں سب کو یکساں طور پر حاصل ہے، دین ومذہب سے قطع نظر ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جسمانی اذیت سے اسے تحفظ حاصل ہو، اور اگر وہ کسی ایسے جرم کا مرتکب نہ ہوا ہو جس کی اسلامی شریعت میں سزائے جسمانی یا سزائے موت مقرر کی گئی ہو تو اسے جسمانی سزا دینا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور ممنوع ہوگا، موجودہ سیکولر جمہوری ملکوں میں تنہا صرف اور صرف ملک کو ہی تشدد اختیار کرنے اور سختیوں پر مبنی کارروائی کرنے کا اختیار ہے؛ لیکن اسلام میں یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے، کسی بندے، کسی حکومت یا کسی اتھاریٹی کو نہیں، قانون اسلامی کے اندر یہ گوشہ بالکل عیاں ہے، اسی طرح انصاف، مساوات، امن وامان اور انسانی شرافت، جیسے: حقوق اسلام کے دئے ہوئے بنیادی حقوق میں سے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی ضمنی حقوق ہیں جو ان حقوق کی تکمیل کرنے والے ہیں، جیسے: سماجی تکافل، حق تعلیم، مالک بننے کا حق، غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا حق اور اس طرح کے دیگر حقوق اس سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ حقوق انسانی سے متعلق عالمی اعلامیہ کے اندر جن حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے، درحقیقت یہ وہ حقوق ہیں جسے اسلام نے آج سے ۱۴ صدی پہلے ہی تسلیم کیا اور لوگوں کو اس کا پابند بنایا ہے، مگر اس سے اس کی نفی نہیں ہوتی کہ اس عالمی اعلامیہ کے پہلوؤں کو ان ملکوں کے اندر نافذ کرنا مشکل ہے جو اپنے یہاں کے نظام کو اسلامی شریعت کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں، اسی کا احساس کرتے ہوئے "تنظیم مؤتمر اسلامی" نے جس کے تمام مسلم ممالک رکن ہیں حقوق انسانی سے متعلق ایک مخصوص چارٹر تیار کیا ہے جو حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ سے ہی ماخوذ ہے، مگر اس میں تھوڑی تبدیلی کر کے اسے اسلامی شریعت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے اندر زور دیا گیا ہے کہ "رکن ممالک پر لازم ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور بنیادی انسانی حقوق کی پابندی کریں، اس زور دینے کے ساتھ ہی اس میں دین اسلامی اور شریعت اسلامیہ کے مبادی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مگر افسوس کہ اسلام میں حقوق انسانی سے متعلق "تنظیم مؤتمر اسلامی" کے چارٹر یا قاہرہ اعلامیہ ۱۰ کا نفاذ کہیں نہیں ہوسکا اور ہنوز وہ کاغذی شکل ہی میں ہے۔

ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اسلام بنیادی طور پر دین مساوات وانصاف ہے اور اس سے متعلق حقوق کی گارنٹی دیتا ہے، ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ آٹھ مسلم ملکوں میں سے جن سات نے ۱۹۴۸ء میں پہلی بار ووٹ ڈالنے کے لئے منعقدہ اجلاس میں شریک تھے ووٹنگ کے وقت حقوق انسانی کے بین الاقوامی اعلامیہ کے حتمی مسودے کے اندر کوئی ایسی بات نہیں پائی تھی جو اسلامی مبادی واصول سے ٹکراتے ہوں، اس لئے انہوں نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا، بلکہ اس کی تیاری میں ایران ولبنان بھی شریک تھے، اور اس وقت کے پاکستانی وزیر خارجہ نے بھی اسے اپنانے کی اپیل کی تھی، حقوق انسانی کا یہ بین الاقوامی اعلامیہ کوئی معاہدہ نہیں ہے کہ اس پر دستخط کرنا ضروری ہو؛ بلکہ یہ دستاویز اور تمام انسانوں کے حقوق کا عالمی منہج ہے؛ البتہ کسی ملک کی جانب سے اس اعلامیہ کے روح کی عملی پابندی انفرادی معاہدے پر دستخط کے ذریعہ ہی لازم ہوتی ہے اس کا مطلب ہے کہ حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ معاہدوں کے طے کرنے کا ذریعہ ہے قانونی دستاویز نہیں ہے، اس کے علاوہ بیشتر بین الاقوامی معاہدے دستخط کرنے والے فریقوں کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ کسی خاص پیراگراف یا مخصوص دفعات سے متعلق اپنے تحفظات کا اظہار کریں، یہ ملک کے مخصوص حالات کی وجہ سے بھی ہوسکتے ہیں، اور مذہبی وثقافتی وجوہات کی بنیاد پر بھی۔

بیشتر مسلم ملکوں نے اس طرح کے معاہدوں پر دستخط کئے ہیں اور بعضوں نے اس کی تفصیلات میں اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا ہے جو سیاسی اسباب کی وجہ

سے بھی ہیں اور مذہبی اسباب کی وجہ سے بھی (جیسے تمام میدانوں اور میراث وغیرہ میں بھی عورتوں اور مردوں کو مساوی حق دینے میں) بین الاقوامی معاہدوں کو اپنا کر اسلامی نظام تحفظ کی خلیج کو پاٹا جا سکتا ہے، خاص طور پر اس وقت، جبکہ بیشتر مسلم ملکوں کے عوام کی جانب سے شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ قومی قانون سازی کے لئے اسلامی شریعت کو بنیاد بنایا جائے، اس میں شبہ نہیں کہ کمزور طبقوں کی مدد کرنا ایسا قدم ہے جو اسلامی اصولوں اور اسلامی شریعت سے میل کھاتا ہے؛ اس لئے اندورن یا بیرون ملک تارک وطن اور پناہ گزینوں کے تحفظ کے لئے بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جانے والا قانونی دائرہ بنانا قابل ستائش اور خیر مقدم کیا جانے والا قدم ہوگا۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پناہ طلب کرنے والوں، پناہ گزینوں اور نقل مکانی کرنے والوں کے حقوق کا دفاع کرنے میں اسلام کا اہم رول رہا ہے، اسلام ان کمزوروں کا احترام کرتا اور جو ان کے لئے پناہ گاہیں فراہم کرتے اور مدد کرتے ہیں شریعت اسلامی ان کی قدردانی کرتی ہے، اسلام نے ہجرت کرنے والوں کے مصائب ومشکلات پر خاص توجہ دی اور مسلمانوں کو اس کے ازالہ کا پابند بنایا ہے، مسلمانوں کی جانب سے غیر مسلموں کے لئے فراہم کردہ پناہ کے لئے اسلامی قانون میں ''امان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس طرح کے پناہ کو توڑنا اور پامال کرنا جائز نہیں ہے، اگر چہ جسے پناہ دی گئی ہو اس کی مسلمانوں سے لڑائی ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ ...} (التوبۃ: ٦)۔ (اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے؛ تاکہ اللہ کا کلام سنے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس (کی امن کی جگہ) تک پہنچا دو، یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے)۔

فقہاء اسلام کا خیال ہے کہ امان سے ایسی پابندی لازم ہو جاتی ہے جس سے روگردانی حلال نہیں ہے، قرآن کریم اور تاریخ کی کتابوں میں ہجرت کے واقعات کا تذکرہ تفصیل سے آیا ہے کہ ایمان والوں اور انبیاء نے ہجرتیں کیں، مسلمان جب ظلم وبربریت کا شکار اور سخت اذیتوں اور عقوبتوں سے دوچار ہو گئے تو انہوں نے رسول اللہ کے حکم سے مکہ سے حبشہ کو ہجرت کی اور وہاں انہیں عیسائی بادشاہ سے تحفظ ملا، خود نبی کریم پناہ گزیں تھے، کہ آپ نے اپنے اصحاب کے ساتھ ۶۲۲ء میں مکہ سے ہجرت کی اور دیگر مسلمانوں کو بھی ہجرت کر کے مدینہ آجانے کا حکم دیا، آپ کو پناہ گزیں کی حیثیت سے میزبان معاشرہ کی جانب سے ساری سہولیات فراہم کی گئیں، اسی طرح حضرت ابراہیم ؑ ہجرت پر مجبور ہوئے اور اپنی پوری فیملی کے ساتھ نقل مکانی کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں تحفظ دیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ} (الأنبیاء: ٧١)۔ (اور ہم اسے اور لوط (ؑ) کو بچا کر اس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں)۔

موسیٰ نے بھی ہجرت کر کے مدین میں اس وقت پناہ لی جب فرعون ان کی جان کے درپے ہو گیا اور وہاں کا معاشرہ ان کے خلاف سازشوں میں لگ گیا اور ان کے ساتھ بدسلوکی پر اتر آیا مدین میں انہیں نہ صرف سر چھپانے کو گھر ملا بلکہ انہیں کام بھی ملا اور راحت وآرام کے سارے وسائل ملے، وہاں کے سماج نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا اور معاشرے کا ایک فرد بنا کر داماد بنا لیا۔ {وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ ... فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ} (القصص: ٢٠-٢٨) (تمام آیتوں کے ترجمے مع تفاسیر اردو تفسیر میں ملاحظہ کیا جائے)۔

قرآن کی یہ آیتیں واضح کر رہی ہیں کہ ہجرت سختی وشدت کے وقت اور ناگفتہ بہ حالات میں جبکہ انسانی زندگی اور اس کا ایمان وعقیدہ خطرے میں پڑ جائے انسانی ضرورت بن جاتی ہے، بلکہ بعض قرآنی آیتیں تو ایمان والوں سے مطالبہ کرتی ہیں کہ ان حالات میں ایمان بچانے اور جان ومال کی حفاظت کے مقصد سے ہجرت کر جائیں اور دوسری مامون جگہ پر جا کر پناہ حاصل کر لیں، بشرطیکہ ایسا کرنے کی ان میں قدرت ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: {إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ ...} (النساء: ٩٧-١٠٠)۔

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور ومجبور تھے، فرشتوں نے کہا، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے، ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے، اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے، بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے)۔

قرآن کریم نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ دیگر معاہدوں کی طرح پناہ گزینوں کے حقوق سے متعلق کئے گئے معاہدوں کی بھی پابندی کریں، ارشاد ہے: {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ} (المائدۃ:۱)۔ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو بندشوں کی پوری پابندی کرو)۔

قرآن نے مہاجرین و پناہ گزینوں کے ساتھ سلوک کرنے کے تعلق سے متعدد احکام وہدایات ایمان والوں کو دی ہیں اور اس کی پابندی کرنے کو کہا ہے، ان لوگوں کی تعریفیں کی گئی ہیں جو مصیبت کے وقت لوگوں کے لئے دست تعاون بڑھاتے اور ان کی دستگیری کرتے ہیں، اور مومنوں سے کہا گیا ہے کہ وہ پناہ گزینوں کو تحفظ فراہم کریں: {لَقَد تَّابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ ... إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ} (التوبہ: ۱۱۷) (اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین وانصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا، اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے، مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا، بلکہ نبی کا ساتھ ہی دیا تو اللہ نے انہیں معاف کر دیا، بیشک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت ومہربانی کا ہے)۔

قرآن نے پناہ گزینوں اور تارکین وطن کے حقوق کو تسلیم کیا اور انہیں مخصوص حقوق عطا کئے ہیں، انہی حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ ان کے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے: {إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا ... إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ} (الانفال: ۷۲-۷۵)۔ (جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے، مگر ہجرت کر کے دار الاسلام میں آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے، جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا، جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں، ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے، اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں، مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے)۔

{وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ} (النحل: ۴۱)۔ (جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش جان لیں وہ مظلوم)۔

قرآن نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جن کی وجہ سے لوگ اجتماعی ہجرت ونقل مکانی پر مجبور ہوئے ہیں، ایسا کرنے والوں اور دوسروں کو ترک وطن پر مجبور کرنے والوں کو قرآن نے کافر قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ ... وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ} (البقرۃ: ۸۴-۸۵)۔ (پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم وزیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پٹے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں، تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ کا لین دین کرتے ہو، حالانکہ انہیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا، تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے، جو تم کر رہے ہو)۔

اسلام میں پناہ گزینوں کے حقوق سے متعلق تنظیم موتمر اسلامی کے قاہرہ اعلامیہ کے پیراگراف نمبر ۲ میں صراحت کی گئی ہے:

(ہر انسان کو شریعت کے دائرہ میں نقل وحرکت کرنے، آنے جانے، ملک کے اندر یا باہر مقام اقامت کا انتخاب کرنے اور جہاں اسے امن محسوس ہو سکونت اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، اور اگر اس پر ظلم ہو تو دوسرے ملک میں پناہ لینے کا بھی اسے حق حاصل ہے، اور جس ملک میں وہ پناہ لینا چاہے اس ملک کو چاہئے کہ وہ اسے اس وقت تک پناہ دے جب تک اسے امن کی ضرورت ہو)۔

عام طور پر جنگ وجدال، بدامنی، فتنہ وفساد اور خانہ جنگیوں میں سب سے زیادہ عورتیں اور بچے ہی متاثر ہوتے اور وہی زیادتیوں کا شکار بنتے ہیں، اس لئے

قرآن نے ان کی مدد کرنے کی بطور خاص تاکید کی ہے: {وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا} (النساء:۹)۔ (لوگوں کو اس بات کا خیال کرکے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں)۔

{وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ ... وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا} (النساء:۷۵)۔ (آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبالیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے)۔

{إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ ... وَكَانَ اللهُ غَفُورًا رَّحِيمًا} (النساء:۹۸-۱۰۰)۔ (ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے۔ بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کردے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے)۔

ان نصوص کی روشنی میں نقل مکانی کرنے والے تارکین وطن اور پناہ گزینوں کی مدد کرنا اور خطرات سے دوچار ہو کر بھاگنے والوں کو پناہ دینا اور زندگی گذارنے کے لئے لازمی سہولیات مہیا کرنا واجب ہے خواہ یہ پناہ گزین مسلم ہوں یا غیر مسلم، کیونکہ اسلامی تشریعات کی اساس و بنیاد عدل ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ... وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ} (المائدة:۸)۔ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جا، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے)۔

ابن سبیل کے ضمن میں زکات وصدقات بھی ان پناہ گزینوں کو دیا جاسکتا اور اس سے ان کی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں، اسلامی شریعت کی نگاہ میں ان پناہ گزینوں کی میزبانی کرنے والے ملک کے اندر عورتوں، مردوں اور بچوں کو جو حقوق حاصل ہوں گے، انہیں جائدادوں کا مالک بننے، کاروبار کرنے، ملازمت کرنے، آزادی کے ساتھ آنے جانے اور اس طرح کے سارے حقوق حاصل ہوں گے: {وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا ... إِنَّ اللهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ} (الانفال:۷۵)۔ (اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کرکے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں، مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے)۔

اسی لئے اللہ کے نبی انے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ کرایا اور فرمایا: ''إن حقوق المهاجرين هي نفس حقوق من يستضيفونهم'' (مہاجرین کے حقوق وہی ہیں جو میزبانی کرنے والے انصار کے ہیں)۔

اسلامی تشریعات میں ان پناہ گزینوں کو تعلیم وصحت کا بھی حق حاصل ہوگا کہ انہیں میڈیکل سہولیات اور تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مہیا کئے جائیں، یہ بھی ضروری ہے کہ ان پناہ گزینوں کو منتشر نہ ہونے دیا جائے، بلکہ ان کی شیرازہ بندی کی جائے اور حتی الامکان ایک خاندان کے افراد کو ایک جگہ رکھا جائے، اور میزبان ملک کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ان کی سیاسی مدد کریں، اپنے وطن لوٹنے کی راہ ہموار کرنے میں اپنا رول ادا کریں لیکن ایسا اسی وقت کیا جاسکتا ہے، جبکہ ان کی اپنے وطن کو واپسی مامون ومحفوظ ہو۔

خلاصہ:

گذشتہ تفصیل سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی مسلم یا غیر مسلم ملک میں بود و باش اختیار کرلینے سے انسان کو اس کی شہریت حاصل کرلینے کا حق حاصل ہوجاتا ہے، اور اس میزبان ملک کی ذمہ داری ہے کہ اپنی سرزمین پر آکر بسنے والے شخص کو شہریت دے اور انہیں وہ تمام حقوق عطا کرے جو میزبان ملک کے قدیم شہریوں کو حاصل ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے ملک سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوتا یا کسی مجبوری کی وجہ سے ترک وطن کرکے دوسرے ملک میں پناہ لیتا اور شہریت حاصل کرنے کی درخواست دیتا ہے تو اس درخواست کو قبول کرنا اس ملک کی اخلاقی ذمہ داری ہے، اس پر لازم وضروری نہیں ہے، ملکی حالات ومفادات اور سیاسی تناظر میں درخواست قبول کرنے یا نہ کرنے کا ملک کو اختیار رکھتا ہے؛ البتہ اگر ملک میں شہریوں پر مظالم ہو رہے ہوں، ان کی جان مال عزت

دآبرو اور دین ومذہب خطرے میں پڑ گئے ہوں، اور اس کے تحفظ میں وہ کسی دوسرے ملک میں داخل ہو کر پناہ لیئے ہوں تو انہیں تمام تر شہری حقوق حاصل ہوں گے، اور اس ملک پر لازم ہوگا کہ وہ شہریت یا پناہ کے حصول سے متعلق ان کی درخواست کو قبول کرے۔

شہری حقوق میں وہ تمام حقوق شامل ہیں جو کسی بھی ملک کے باشندے کو حاصل ہوتے ہیں، جیسے ووٹ دینے، امیدوار بننے، ملازمت اختیار کرنے اور اس جیسے دیگر حقوق، ایک مسلمان غیر مسلم ملک کی شہریت مجبوری میں یا معاشی فوائد حاصل کرنے کے مقصد سے اختیار کرسکتا ہے مگر اسی وقت جبکہ وہاں اسے تمام مذہبی وفکری آزادی حاصل ہو، تاہم مسلمانوں کو اس سے گریز کرنا چاہئے کیونکہ اللہ کے نبی صلعم نے مسلمانوں کو غیر مسلم آبادی میں رہنے بسنے سے منع کیا اور فرمایا: "لاترای نارا ھما" اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہریت دی جاسکتی ہے، اسوۂ رسول اور صحابہ وخلفائے راشدین کا طرز عمل اس کی بہترین دلیل ہے، تاہم اس میں بھی حکمرانوں کو ملکی مفاد پیش نظر رکھنا چاہئے ملکی مفاد اگر متقاضی ہو یا اس کی اجازت دیتی ہو تو غیر مسلموں کو شہریت اور اس کے ساتھ تمام تر حقوق دئے جاسکتے ہیں، لیکن ان کا وجود اگر ملک کے مفاد میں نہ ہو یا خطرہ بنے تو انہیں شہریت دینا درست نہ ہوگا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے قتال کے لئے گیارہ دستے ترتیب دئے تھے، اور ہر دستے کا ایک افسر مقرر کیا تھا، انہیں جن باتوں کی ہدایتیں دی تھیں ان میں سے ایک یہ تھا:

''وأن يمنع أصحابه العجلة والفساد، وأن يدخل فيهم حشوا حتى يعرفهم ويعلم ما هم لئلا يكونوا عيونا، ولئلا يؤتى المسلمون من قبلهم'' (جمهرة رسائل العرب۔ رساله ابي بكر)۔

یہ اپنے ساتھیوں کو جلد بازی، فساد وبگاڑ بدعنوانی وکرپشن سے روکیں، اور اپنے اندر ہر کسی کو جیسے تیسے بھرتی نہ کرلیں، انہیں اسی وقت اپنے ساتھ شامل کریں جب انہیں خوب اچھی طرح جان پہچان لیں کہ وہ کون ہیں، تاکہ وہ ہمارے اندر دوسروں کے جاسوس نہ ہوں، اور اس لئے بھی کہ ان کی وجہ سے کفار کی جانب سے مسلمانوں پر کوئی افتاد نہ آجائے۔

☆☆☆

شہریت کے شرعی احکام

مولانا محمد توقیر بدر القاسمی [1]

۱۔ سوال میں ''اسلام میں شہریت'' جیسی تعبیر سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمیں مقالہ میں جواب دیتے وقت صرف اور صرف خالص ''اسلامی احکام'' کو بیان کرنا ہے، قطع نظر اس کے کہ دیگر مذاہب اور سماج میں کیا کچھ ہے؟ ملکی اور بین الاقوامی قوانین کے کیا مندرجات ہیں؟

چنانچہ اس کے لئے ہمیں کتاب اللہ، سنت نبویہ اور آثار صحابہ کے ساتھ ساتھ فقہاء امت کے اجتہادات سے ہی فائدہ اٹھانا ہے، سوال میں مذکورہ لفظ ''شہریت'' اصلا انگریزی لفظ {{Citizenships}} کا ترجمہ ہے، جس کا سادہ سا مطلب ''کسی بھی ملک میں قانونی طور سے رہنے کا حق پانا'' ہے، جہاں اس کی اپنی کچھ شہری ذمہ داری ہوتی ہے اور اس ملک کے مطابق اس کے حقوق اور فرائض کو بجالانا ہوتا ہے (دیکھئے: انگلش کی معروف لغ: چیمبرس ص ۲۸۰ اور السٹریٹیڈ آکسفورڈ ڈکشنری ص ۱۳۲) اس میں خاص بات ہے ''کسی بھی ملک میں رہنا'' اس میں کافی وسعت ہے؛ کیونکہ ''رہنا یا قیام کرنا'' یا تو تجارتی سرگرمیاں یا بود و باش، یا پھر مخصوص مدت تک وہاں ٹھہرنا، الغرض کسی بھی مقصد سے ہوسکتا ہے۔

تاہم اسلام کی نظر میں ان میں سے کون سی چیز مسئولہ ''شہریت'' کے لئے بنیاد بن سکتی ہے، اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اول مرحلہ میں قرآن کریم کی آیات مقدسہ ہماری راہ نمائی کرتی نظر آتی ہیں، بموقع ہجرت سورہ انفال '' والذين۔آووانصروا أولئك هم المومنون حقا'' (سورۂ انفال: ۷۴)، اور بموقع امتنان بنی اسرائیل کے حوالے سے سورہ یونس "ولقد بوأنا مبوأ صدق" (سورۂ یونس: ۹۳) یہ آیتیں صاف صاف اپنے سیاق وسباق کی روشنی میں ہمارے سوال کا بہت حد تک جواب فراہم کرتی ہیں، دونوں آیتوں کا مفاد یہی ہے کہ اصلا کسی ملک میں ایک مسلمان کا اس نیت اور مقصد سے کہ معاش و معاد کو بہتر بناسکیں گے اس جگہ مستقل قرار پکڑنا اور ہمیشہ کے لئے سکون کے ساتھ ٹھہر جانا ہی عند اللہ پسندیدہ رہائش حالت کی دلیل ہے، جسے ہم آج ''شہریت'' کی بنیاد سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

''سنن ابی داؤد'' کتاب الملاحم کی ایک روایت میں اس کی تائید ملتی ہیں؛ ''عن أبي الدرداء: أن رسول الله ﷺ قال: ان فسطاط المسلمين يوم الملحمه بالغوطة إلى جانب مدينة يقال لها: دمشق من خير مدائن الشام'' (ابوداؤد باب: ۲،۵۹۰۔۵۹۱ في المعقل من الملاحم)۔ (حضرت ابو درداءؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنگ کے موقعہ پر مسلمانوں کا خیمہ (مرکز) دمشق نامی شہر کی جانب واقع مقام ''غوطہ'' ہوگا اور دمشق شام کے بہترین شہروں میں سے ہوگا)۔

اس حدیث میں ''فسطاط مسلمین'' (مسلمانوں کا خیمہ) قابل غور ہے، ظاہری بات ہے کہ ''خیمہ'' سے مراد رہائشی جگہ اور مقام ہی ہوسکتے ہیں، جہاں انسان اپنا سر اور تن چھپاتا ہے، اور اس کی نوبت اسی وقت آتی ہے، جب کوئی کہیں عارضی یا مستقل رہنے کا ارادہ اور عزم کرلے، البتہ جنگ کے موقع پر ایسا ہونا اور پھر اس مقام کی خصوصیت ''مقام خیر'' بتانا یقینا دینی مقاصد اور اس کی بقا کو ہی ثابت کرتا ہے۔

چنانچہ فقہاء امت بھی بتلاتے ہیں کہ ''وطن اصلی'' سے مراد ایسا وطن ہے جہاں انسان پیدا ہوا ہو یا اس نے کسی اور جگہ کو مستقل جائے سکونت بنالیا ہو اور تادم زیست وہیں رہنے کا عزم ہو، اسے وہاں نماز کی تکمیل ہی کرنا ہوگی، صاحب ''بدائع'' یہی رقم کرتے ہیں: ''وطن أصلي وهو وطن الإنسان في بلدة أو بلدة أخرى اتخذها دارا أو توطن بها مع أهله وولده وليس من قصده الا رتحال عنها، بل التعيش بها'' (بدائع الصنائع ۱،۲۸۰)۔

اس لئے راقم کے نزدیک اصلاً کسی ملک میں ایک مسلمان کا اس نیت اور مقصد سے معاش و معاد کو بہتر بناسکیں گے اس جگہ مستقل قرار پکڑنا اور ہمیشہ کے

[1] متخصص: المعہد العالی پھلواری شریف، پٹنہ۔

لئے سکون کے ساتھ ٹھہر جانا ہی، جو عند اللہ پسندیدہ رہائشی حالت کی دلیل بھی ہے، آج کی مطلوب "شہریت" کی بنیاد بھی قرار پائے گی۔

۲۔ مذکورہ سوال کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے؛ یعنی اگر مسلمان ہے اور اس قدر مجبور ہے کہ اس کی جان و مال، عزت و آبرو اور دین سبھی خطرے کی زد میں ہو تو آنے والے ملک کو دیکھا جائے گا اس کے لحاظ سے اس کا اور حکم ہوگا! اور اگر خواہش سے آنا چاہتا ہے تو پھر اس میں بھی ملکی اور خود اس کی حیثیت کے پیش نظر حکم اور ہوگا!

اگر ایک "پر آشوب غیر مسلم" ملک سے آنے والا مسلمان بحالت مذکورہ مجبوری دوسرے پر امن مسلم ملک میں بود و باش اختیار کرنے کی درخواست لے کر آتا ہے تو ایسی صورت میں اس پر امن مسلم ملک کے لئے اس کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اس کی مدد کرنا اس پر شرعاً واجب اور ضروری ہے، "سورۂ انفال" میں اس کی صراحت موجود ہے: "وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر" (انفال:۷۲)۔

حضرت انسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل فرماتے ہیں: "قال رسول الله ﷺ: انصر أخاك ظالما أو مظلوما فقال رجل: يا رسول الله، انصره إذا كان مظلوما أفرايت إذا كان ظالما كيف انصره؟ قال: تحجزه، أو تمنعه، من الظلم فإن ذلك نصره" (بخاری ۲/۱۰۲۸)۔

ابن حجرؒ اس کی متعدد سندوں سے وضاحت کو بیان کرتے ہوئے باب "أعن اخاک ظالما او مظلوما" کے تحت رقم فرماتے ہیں: "قوله في الطريق الثانية: قال: يا رسول الله في رواية أبي الوقت في البخاري! قالوا، وفي الرواية التي في الاكراه: فقال رجل: ولم أقف على تسمية قوله. فقال: تأخذ فوق يديه كني به عن كفه عن الظلم بالفعل إن لم يكف بالقول وعبر بالفوقية إشارة إلى الأخذ بالاستعلاء والقوة" (دیکھئے: فتح الباری ۵/۱۲۳، ۱۲۲)۔

قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی بات کا درس دیتا نظر آتا ہے، کہ اس مجبور انسان کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً ضروری ہے، بشرطیکہ شہری وسائل اور رقبہ، نیز آبادی میں گنجائش اس کی اجازت دیتے ہوں، ورنہ "لا يكلف الله نفسا إلا وسعها" (بقرہ:۲۸۶) کے مطابق شرعاً واجب نہ ہوگا، بلکہ اس کے صواب دید پر موقوف ہوگا۔

اور اگر پر آشوب "مسلم ملک" سے منتقل ہو کر یہاں کی بود و باش کے لئے درخواست دے رہا ہو اور وہ بھی اسی طرح مجبور ہو، جیسا کہ آج اغیار کی ملی بھگت اور سازش کے نتیجے میں بعض مسلم ملکوں میں ایسی حالتیں پیش آ رہی ہیں، تو اس صورت میں بھی حدیث مذکورہ کی وجہ سے مذکورہ حکم نافذ ہوگا۔

رہ گئی بات "خواہش" سے ہجرت کرنے کی، تو اس بات کا اعتراف تو ہر کوئی کرتا ہے کہ خواہش کسی نہ کسی بہتر اور برتر شی کی ہی کی جاتی ہے ورنہ وہ پھر عبث کام ٹھہرتا ہے جس کا صدور ایک عقلمند انسان سے بعید ہے، بہر حال اگر آنے والا کسی مجبوری کے بجائے خواہش سے آنا اور شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ یہ شخص دینی خواہش رکھنے والا عالم دین اور متقی انسان ہے، یا یوں ہی دین کے علاوہ کسی اور مقصد سے آنا چاہتا ہے، اگر دینی مزاج کا حامل اور علم دوست شخص ہے تو اس کے آنے، نیز یہاں کی یکسوئی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تقریر و تحریر کے ذریعہ عوام کی بھلائی اور راہ نمائی کا کام انجام پانا متوقع ہو تو احقر کے نزدیک ایسے صالح فرد کی درخواست کو قبول کرنا بھی قول باری تعالیٰ: "ولا تطرد الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه ما عليك من حسابهم من شئ وما من حسابك عليهم من شئ فتطردهم فتكون من الظالمين" (انعام:۵۲)۔ (انہیں اپنی مجلس سے محروم نہ کیجئے جو رات و دن اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں اور ان کی خوشنودی میں لگے ہوئے ہیں، ان کے حساب میں سے کسی بھی چیز کا بار آپ پر نہیں اور آپ کے حساب میں سے کسی بھی چیز کا بار ان پر نہیں، اس پر بھی اگر انہیں اپنی مجلس سے محروم کریں گے تو آپ کا شمار ظالموں میں ہوگا) کی روشنی میں واجب اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ پناہ اور اسی کے ساتھ ساتھ پناہ گاہ، نیز پناہ گزیں یہ سبھی اپنے مالہ اور ماعلیہ کے ساتھ آج کی مغرور اور متکبر اور نام نہاد مہذب دنیا کی پیداوار ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان اصطلاحات کی تعریفات ان ہی کتابوں میں ملتی ہیں، پناہ (Refuge) کے بارے میں السٹریٹیڈ آکسفورڈ ڈکشنری میں درج ہے:

A place or state of safety from danger or trouble

اور پناہ گزیں کے بارے میں ہے:

(Refugee: person who has been forced to leave their country because of war or because they are being persecuted for their beliefs: pg:564)

ان کی لغات میں اس کا حقیقی مفہوم سمجھیں! مذکورہ عبارتیں صاف صاف بتارہی ہیں کہ پناہ گزین وہ شخص ہوتا ہے جس کو اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا جائے، یا اس کے عقائد کے حوالے سے اسے اتنا ستایا جائے کہ مجبوراً اپنا ملک چھوڑ کر اس خطرے اور پریشانی سے دور کسی مامون ومحفوظ جگہ یا حکومت کی پناہ لے لے جس (ستائے جانے اور عقیدہ پر مجبور کرنے) کا اسلام میں کوئی تصور نہیں، ہاں ان اہل ایمان وصاحب قرآن کی کتابوں میں اگر کوئی لفظ ہے تو اس کے لئے صرف اور صرف "ہجرت" جیسا مقدس لفظ دکھائی دیتا ہے، وہ بھی بحیثیت مظلوم نہ کہ ظالم!

اور مہاجر و مظلوم کے حوالے سے صرف اتنا ہے کہ اگر کسی مومن کے ساتھ ظلم ہوا ہے تو دنیا کے تمام مومنوں کا اپنی اپنی حیثیت کے مطابق "لا یکلف الله نفسا إلا وسعها" (بقرہ:۲۸۶) کے تحت نہ صرف اخلاقی، بلکہ دینی فریضہ اس کی دادرسی کرنا ہے، علامہ جصاص رازی "احکام القرآن" میں رقم کرتے ہیں: یعنی نصرت کی نفی جو کی گئی تھی وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "تمام مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے حمایتی ہیں" کے حوالے سے منسوخ ہوگئی (التوبۃ:۷۱، احکام القرآن للجصاص ۳/۹۸)۔

اسی کے ساتھ علامہ قرطبی مالکیؒ رقم کرتے ہیں: "الثانية (قوله تعالى: وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر) يريد إن يدعوا هولاء المومنون الذين لم يهاجروا من أرض الحرب عونكم بنفير أو مأل لا ستقناذهم فأعينوهم فذلك فرض فلا تخذلوهم" (قرطبی ۷/۸،۲۷)، اس تفصیل کے مطابق مجبور مسلمان کی دادرسی کو دوسرے خوشحال مسلمان حکومت وافراد پر جان اور مال سے فرض قرار دیا گیا ہے۔

نیز حضرت انسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کرتے ہیں: "قال رسول الله ﷺ: انصر أخاك ظالما أو مظلوما فقال رجل: يا رسول الله، انصره إذا كان مظلوما افرايت إذا كان ظالما كيف انصره؟ قال: تحجزه، أو تمنعه، من الظلم فإن ذلك نصره" (بخاری ۲/۱۰۲۸)۔

اگر کسی مومن کے ساتھ ظلم ہوا ہے تو دنیا کے تمام مومنوں کا اپنی اپنی حیثیت کے مطابق نہ صرف اخلاقی، بلکہ دینی فریضہ اس کی دادرسی کرنا ہے، اور نہ یہ کہ صرف مظلوم کی دادرسی ہے، بلکہ اس میں ظالم کی مدد بھی کارفرما ہے جو صرف اسلام کی نمایاں خصوصیت میں سے ہے، نیز سوال اول میں یہ بات تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے کہ "شہریت" کے لئے مذکورہ آیت اور روایت ہی کافی ہے، اس لئے ایک مسلم ملک کے حکمراں کا اپنے ایک پریشان حال مسلمان کے لئے باوجود گنجائش کے قدیم باشندوں کی طرح سہولت نہ دینا اور شہریت سے محروم رکھنا راقم کی نظر میں شرعاً غلط اور نادرست ہے، کیونکہ اگر ایسا نہیں کرتے ہیں تو ہم اسلام کے پیروکار کے بجائے غیر اسلامی امور کے پیروکار کہلائیں گے اور قرآن وحدیث، نیز فقہاء کرام کے اجتہادات سے منحرف ٹھہریں گے، اسی لئے شرعاً لازم ہے کہ مسلم ملک گنجائش کی شکل میں اس کو شہریت اور اس کی تمام سہولتیں عطا کرے۔

اگر لوٹنا ممکن ہی نہیں، بلکہ اس کے لئے تمام تر کوششیں اور کارروائیاں انجام دے رہا ہو تو لوٹتے وقت تک اس کی دادرسی کرنا جہاں شرعاً لازم ہے وہیں اخلاقی طور سے بحیثیت مہمان اس کا اکرام بھی مطلوب و مستحسن ہے (دیکھئے: فتح الباری ۱۰/۶۵۳، احکام القرآن للجصاص رازی ۳/۲۵۷)۔

۴- اگر شہریت اختیار کرنے والا خود مسلمان ہے اور ملک بھی مسلمانوں کا ہے تو اس کو جصاص رازی حنفی کی تفصیل کے مطابق وہاں مذکورہ تمام حقوق حاصل ہوں گے، "ونسخ نفي إيجاب النصرة بقوله تعالى: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (توبہ:۷۱)۔

یعنی نصرت کی نفی جو کی گئی تھی وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "تمام مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے حمایتی ہیں" کے حوالے سے منسوخ ہوگیا، اور مدد کرنا شرعاً لازم اور ضروری ہے (سورۂ انفال:۷۲، مع احکام القرآن للجصاص ۳/۹۸)، کیونکہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو روئے زمین پر فساد بھیانک شکل میں پھیل سکتا ہے، جیسا کہ اس کی وضاحت بھی خود قرآن کریم کے اندر اسی سورہ کی اگلی آیت میں موجود ہے، خود علامہ جصاص رازی اس کی وضاحت یوں رقم کرتے ہیں: "قوله تعالى "إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير" والله اعلم، إن تفعلوا ما أمرتم به في هاتين الآيتين من إيجاب الموالاة والتناصر والتوارث بالأخوة والهجرة ومن قطعها بترك الهجرة تكن فتنة في الأرض وفساد كبير وهذا مخرجه مخرج الخبر ومعناه الأمر" (احكام القرآن للجصاص ۳،۹۸) اور "إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل إن الله نعما يعظكم به إن الله كان سميعا بصيرا" (سورۂ نساء:۵۸)۔

مذکورہ آیات کی روشنی میں راقم کی یہی رائے ہے کہ اس مہاجر (پناہ گزیں) کو ایک شہری ہونے کے ناطے قدیم شہری کی طرح شہریت عطا کرنے کے بعد تمام تر سہولتیں: جیسے ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتال میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تنگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق وغیرہ جو ضروری ہیں مہیا کرنا شرعاً ضروری ہے، ان میں اور قدیم شہری میں کسی بھی طرح کی تفریق پیدا کرنا جہاں شریعت کے خلاف ہے وہیں کسی مہذب سماج اور انسانیت کے بھی خواہ کہلانے والے ملک ومعاشرہ کے ماتھے پر بھی کلنک ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ اقوام متحدہ، یوروپی کونسل، یونیسکو اور عالمی لیبر جیسی تنظیمیں بار باراس طرح کے مساوات کی قرار دادیں پاس کر کے سرخرو ہونے کا موقع پارہی ہو۔

۵۔ اس سوال کا جواب مسلم پناہ گزین کی صورت میں مختصراً یوں دیا جاسکتا ہے کہ جب گذشتہ قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں یہ طے ہو چکا کہ اپنے سابق ملک نہ لوٹ سکنے والے اس ستم رسیدہ مسلمان کو شرعاً بشرط سہولت شہریت کا درجہ دیا جانا واجب ہے، تو اس کے طے ہو جانے کے بعد اس کو تمام حقوق ملنا بھی طے ہو جاتے ہیں، لہٰذا اس میں کسی بھی طرح کی تفریق کیا جانا احقر کی رائے میں نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہاں البتہ حالات اور امکانات ایسے ہوں کہ ان کا واپس اپنے سابق ملک میں لوٹ جانا واضح ہو تو ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت ایک مہمان کی ہے، ان کے اپنے سابق ملک لوٹتے وقت تک اس کی دادرسی کرنا جہاں شرعاً لازم ہے وہیں اخلاقی طور سے بحیثیت مہمان اس کا اکرام بھی مطلوب و مستحسن ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مومن کی شان یہی بتلائی ہے: ''عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله ﷺ: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره، ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه، ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيرا أو ليصمت'' (بخاری ۲/۸۸۹)۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس مسلم پناہ گزیں کو بھی پناہ گزینوں سے متعلق ان تمام قوانین کی پابندی کرنی ہوگی جس کی صراحت اس ملک کے دستور میں ہوگی، تا کہ ''أوفوا بالعهد إن كان مسئولا'' (بنی اسرائیل: ۳۵) کی خلاف ورزی نہ ہو، اور اگر پناہ گزیں غیر مسلم ہو تو اس کا تفصیلی جواب سوال ۷ کے جواب میں آ رہا ہے۔

۶۔ ایک مسلمان کے لئے دنیا میں کہیں بھی کسی بھی ملک میں کس طرح زندگی گذارنی ہے؟ اس کی ہدایت دوٹوک انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہتی دنیا تک کے لئے دے دی ہے، چنانچہ اگر کوئی انتہائی مجبوری میں کسی غیر مسلم ملک کو مامون اپنے لئے سمجھتا ہے تو اس کی پناہ لینے یا شہریت اختیار کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان کافی ہے جس میں ستائے جانے والے مسلمین مکہ کے لئے ہجرت حبشہ کا حکم صادر ہوا تھا، حضرت ابوموسیٰ فرماتے ہیں:

''قال فدخلت أسماء بنت عميس، وهي ممن قدم معنا، على حفصة زوج النبي ﷺ زائرة، وقد كانت هاجرت إلى النجاشي فيمن هاجر إليه، فدخل عمر على حفصة، وأسماء عندها، فقال عمر حين رأى أسماء: من هذه؟ قال: أسماء بنت عميس، قال عمر: الحبشية هذه؟ البحرية هذه؟ فقالت أسماء: نعم، فقال عمر: سبقناكم بالهجرة، فنحن أحق برسول الله ﷺ منكم، فغضبت، وقالت كلمة: كذبت يا عمر كلا، والله كنتم مع رسول الله ﷺ يطعم جائعكم ويعظ جاهلكم، وكنا في دار، أو في أرض البعداء البغضاء في الحبشة، وذلك في الله وفي رسوله، وايم الله لا أطعم طعاما ولا أشرب شرابا حتى أذكر ما قلت لرسول الله ﷺ، ونحن كنا نؤذى ونخاف، وسأذكر ذلك لرسول الله ﷺ وأسأله، ووالله لا أكذب ولا أزيغ ولا أزيد على ذلك، قال: فلما جاء النبي ﷺ قال: يا نبي الله إن عمر قال: كذا وكذا، فقال رسول الله ﷺ ليس بأحق بي منكم، وله ولأصحابه هجرة واحدة، ولكم أنتم أهل السفينة هجرتان'' (مسلم رقم الحديث ۲۵۰۲، ۲/۳۰۴)، اس روایت میں صحابیہ کا ''ونحن كنا نؤذى ونخاف'' کہنا اور ان کا حبشہ کو ''دار البعداء البغضاء'' سے تعبیر کرنا بقول شارح مسلم امام نووی ''وكنا في دار البعداء البغضاء، قال العلماء البعداء في النسب، البغضاء في الدين؛ لأنهم كفار'' (۲/۳۰۴) ہمارے نظریہ کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔

تاہم تمام تر دینی ودنیوی امن وسکون میسر ہونے کے بعد بھی اگر کوئی محض کسی معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلک ملک میں بودوباش اختیار کرنا چاہے تو ایسی صورت میں راقم کے نزدیک شرعاً یہ محظور وممنوع ہوگا اس کی دلیل مصنف ابن ابی شیبہ کی وہ روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی ایک جماعت کو قبیلہ

خثعم کی مہم پہ روانہ کیا تھا اور جب مسلمان غالب آئے تو کچھ لوگوں (ان میں گھلے ملے مسلمانوں) نے سجدہ کر کے (خود کو ایمان والا ظاہر کر کے) ان صحابہ کرام کے ہاتھوں سے بچنا چاہا، مگر اس کے باوجود بھی ان کے ہاتھوں کچھ لوگ قتل ہو گئے، اس کی خبر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ناراضگی اور مشرکوں و کافروں کے درمیان گھل مل کر رہنے والے مسلمان سے اپنی براءت کا اظہار کیا، البتہ ان کی نصف دیت بھی دلوادی (مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰/۲۸۶، رقم الحدیث: ۳۶۶۳۰)۔

دیت کا فیصلہ بھی بقول امام شافعیؒ بطور تطوع کے تھا، آئندہ اگر کوئی مسلمانوں کے ہاتھوں اسلامی مہم میں مارا گیا تو اس کی کوئی دیت ہوگی نہ اس کے اولیاء شرعاً لازمی طور سے قصاص کے مطالبہ کے حقدار ہونگے، اس کی وضاحت بزبان امام شافعیؒ بحوالہ امام بیہقیؒ یوں ہے: ''قال الشافعي: إن كان هذا ثبت فأحسب النبي ﷺ، والله أعلم أعطى من أعطى منهم متطوعا، وأعلمهم أنه بريء من كل مسلم مع مشرك، والله أعلم، في دار شرك ليعلمهم أن لا ديات لهم ولا قود. قال الشيخ الفقيه رحمه الله: وقد روي هذا موصولا'' (السنن الكبرى للبيهقي رقم الحديث ۲۳۰، ۱۲، ۱۶۹۳۸-۲۲۱، مصنف ابن ابي شيبه ۲۰، ۲۸۶. رقم الحديث ۳۶۶۳۰) ممکن ہے کوئی نام نہاد روشن خیال آج جہاد کا انکار کرتے ہوئے ان سب باتوں کی تردید کرے تاہم فرقہ وارانہ فسادات اور کھلی ملی آبادی پر اس کے نتائج بد سے تو آج بچہ بچہ واقف ہے، اس لئے معاشی فوائد کی صورت میں غیر مسلم ملک کے اندر شہریت اختیار کرنا اس بات کے پیش نظر کہ نہ جانے وہ کب تعصب اور تشدد کا شکار ہو جائے؛ راقم کے نزدیک شرعاً یہ محظور و ممنوع ہے۔

۷۔ مذکورہ سوال کا جواب سورہ ممتحنہ میں بخوبی موجود ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين'' (ممتحنہ: ۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چند مخصوص شہروں، مثلاً مکہ، مدینہ اور یمامہ کے اطراف کو چھوڑ کر کسی بھی مسلم ملک میں بود و باش غیر مسلم اختیار کر سکتا ہے اور انسانیت اور ''امت دعوت'' نیز اگر وہ کسی مسلمان کا رشتہ دار ہو تو صلہ رحمی کے پیش نظر اس کو یہ موقع فراہم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس دعوت دین اور ایک مسلمان کے لئے اپنے رشتہ دار سے صلہ رحمی سے بڑھ کر اور کوئی بر و احسان ان کے حق میں نہیں ہو سکتا ہے۔

اس کی تفسیر میں علامہ ابن کثیرؒ احادیث کی روشنی میں اس بابت لکھتے ہیں: ''قوله تعالى: ''لا ينهاكم الله'' الآية وأخرج الطيالسي وأحمد والبزار وأبو يعلى وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم والنحاس في تاريخه والحاكم وصححه والطبراني وابن مردويه عن عبد الله بن الزبير قال: قدمت قتيلة بنت عبد العزى على ابنتها سماء بنت أبي بكر بهدايا ضبا وأقط وسمن وهي مشركة فأبت أسماء أن تقبل هديتها أو تدخلها بيتها حتى أرسلت إلى عائشة أن سلي عن هذا رسول الله ﷺ فسألته فأنزل الله (لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين) إلى آخر الآية فأمرها أن تقبل هديتها وتدخلها بيتها وأخرج البخاري وابن المنذر والنحاس والبيهقي في شعب الإيمان عن أسماء بنت أبي بكر قالت: أتتني أمي راغبة وهي مشركة في عهد قريش إذا عاهدوا رسول الله ﷺ فسألت النبي ﷺ أصلها فأنزل الله (لا ينهاكم الله عن الذبن لم يقاتلوكم في الدين) فقال: نعم صلي أمك'' (تفسیر علامہ ابن کثیر، بخاری ۱/۴۲۹)۔

البتہ مذکورہ شہروں کا استثناء دراصل سورہ توبہ کی آیت: ۲۸ ''إنما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا'' (توبہ: ۲۸) کی بنا پر کیا گیا ہے۔

اور جہاں تک ان مسلم ملکوں میں ان کو ملنے والے سیاسی حقوق (Political Rights) کی بات ہے تو اس سلسلہ میں صاف واضح ہے کہ مسلمانوں کے برابر ان کو کلیدی مناصب (Key Positions) جو قانون سازی سے تعلق رکھتے ہوں، ان پر بحال نہیں کیا جا سکتا، مولانا مودودی صاحب اس فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم کرتے ہیں:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں وہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں چونکہ غیر مسلم نہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اسپرٹ کے مطابق ایمانداری سے کام چلا سکتے ہیں (دیکھئے: رسائل و مسائل ۴/۲۲۲)۔ بہر حال سورہ یوسف (۴۰) اور سورہ نساء (۱۴۱) میں مذکورہ نظام کی وضاحت موجود ہے، علامہ قرطبی ان آیتوں کے ذیل میں رقم فرماتے ہیں: کہ انہیں اس طرح نہ دخیل بنالیں کہ وہ ہمارے اسلامی آثار و حکومت یا پھر ہماری جان و

مال کی ہلاکت کے فیصلے کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی منہ مانگی مراد اور منصوبہ خداوندی کو انگوٹھا دکھائے جیسا کہ آج کرہ ارضی پر موجود پارلیمانی دستوروں کے حوالے سے ان سب حقائق کا پتہ لگانا دشوار نہیں ہے، علامہ کی عبارت کے لئے ملاحظہ فرمائیں: (قرطبی ۲۶۹/۵)۔

البتہ جہاں تک مدنی حقوق (Civil Rights) کے حوالے سے ان کی مذہبی آزادی، جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت، نیز بنا کسی شرانگیزی کہ محض دلائل کے بنیاد پر تعلیم وتبلیغ اور حصول انصاف کی بات ہے تو اس کی اجازت پورے طور سے ان کو ملے گی اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ تعزیری قوانین اور اسلامی دستور کے مطابق تمام حدود کے بھی پابند ہوں گے، اس کی بنیاد بھی راقم کے نزدیک باری تعالی کا وہ ارشاد ہے: ''إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل إن الله نعما يعظكم به إن الله كان سميعا بصيرا'' (سورۂ نساء: ۵۸) اور امام قرطبی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ''والأظهر في الآية أنها عامة في جميع الناس فهي تتناول الولاة فيما إليهم من الأمانات في قسمة الأموال ورد الظلامات والعدل في الحكومات'' (قرطبی ۱۶۵/۵)۔

اور امام ابوداؤدؒ نے روایت نقل کی ہے: ''عن عبد الله بن عمر، أن رسول الله ﷺ قال: ألا كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته، فالأمير الذي على الناس راع عليهم، وهو مسئول عنهم'' (ابوداؤد ۲،۴۰۶)۔

مذکورہ وضاحت کے پیش نظر راقم کی حقیر رائے بھی یہی ہے کہ غیر مسلم کو حسب گنجائش وسہولت ارض حجاز (مکہ، مدینہ، یمامہ) کو چھوڑ کر بقیہ روئے زمین پر پھیلے ہوئے مسلم ممالک میں مذکورہ حقوق وفرائض کے ساتھ شہریت مل سکتی ہے۔

☆☆☆

حصول شہریت کے موجودہ مسائل

مولانا ریحان مبشر قاسمی[1]

۱۔ آج ہم جس دور میں زندگی گزار رہے ہیں یہ عہد ماضی سے بالکل مختلف ہے، نت نئی ایجادات واکتشافات، معیار زیست کی بالیدگی وبلندی، ان سب سے بڑھ کر پورے عالم کا ایک گاؤں میں متشکل ہوجانا ہے، پہلے جہاں ایک ملک سے دوسری جگہ جانے کے لئے تصور مشکل تھا آج آن واحد میں انسان ان دوریوں کو طے کرلیتا ہے، اور لوگوں کا سیر وتفریح وتجارت ومعیشت حصول علم اور علاج ومعالجہ کے لئے دوسرے ممالک کا سفر کرنا عام بات ہے۔

ظاہر بات ہے کہ کوئی بھی ملک ہر کس وناکس کو اپنی خارجی اور اندرونی پالیسی کے سبب ملک میں قیام کرنے کی اجازت یا اسے مستقل شہری تسلیم نہیں کرسکتا، ورنہ اجتماعیہ کے تعلق سے، بہت سارے مسائل سے دوچار ہونا پڑسکتا ہے اور اس صورت میں ملک کے داخلی نظام کو متوازن رکھنا مشکل ہوسکتا ہے، لہذا ضرورت پڑتی ہے کہ کچھ ایسے معیار واصول واساس کی جس کے ذریعہ کسی فرد کو اجنبی ملک میں رہنا سہل ہو، یہ معیار اور قوانین خطوں اور ممالک کے اعتبار سے مختلف ہیں، لیکن مسلمان ہونے کے ناطے ہم پر ذمہ داری ہوگی کہ ان کو ہم اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں، یا اسلام کا جو اپنا معیار ہے اس کو واضح کریں اسی سلسلے میں یہ تحریر چشم گزار کی جاتی ہے:

جو طریقے حصول شہریت کے عموما رائج ہیں، پہلے انہیں تحریر کیا جاتا ہے، اس کی روشنی میں اسلامی معیار کو اخذ کرنا سہل ہوجائے گا۔

بنیادی طور پر شہری دو قسم کے ہیں: ۱۔ قدرتی (Natural) ۲۔ مصنوعی، بنایا ہوا (Naturalised) قدرتی سے مراد وہ شہری ہیں جنہیں پیدائش کے ذریعہ شہریت کے حقوق حاصل ہوں، اور مصنوعی سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی ملک میں بود وباش اختیار کرکے شہری بنیں، پیدائش کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے کے بھی دو اصول ہیں: ایک جائے پیدائش یا جنم بھومی کی بنیاد پر دوسرے آبائی حق یا خونی رشتے کی بنیاد پر، جائے پیدائش کے اعتبار سے شہریت کے حصول کے لئے یہ دیکھا جائیگا کہ وہ بچہ کہاں پیدا ہوا؟ اس میں والدین کی شہریت سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ کس ملک کے باشندے ہیں، اس اصول پر ارجنٹائنا میں عمل ہوتا ہے، چنانچہ اس اصول کے مطابق اگر انگریز والدین کا بچہ ارجنٹائنا میں پیدا ہو تو وہ ارجنٹائنا کا شہری تسلیم کرلیا جاتا ہے اور اسے وہ ساری مراعات ملتی ہیں جو ایک ارجنٹائنا کے شہری کو دی جاتی ہے، لیکن اگر ارجنٹائنا کے والدین کو برطانیہ میں بچہ پیدا ہو تو حکومت ارجنٹائنا اس نوزائیدہ کو اپنا شہری تسلیم نہیں کرتی، اگر خون کے رشتے کو دیکھا جائے تو مثلاً فرانسیسی والدین کو اگر ہندوستان میں بچہ ہو تو وہ فرانسیسی ہوگا، اسی طرح اگر ہندوستانی ماں باپ کو فرانس میں بچہ ہو تو وہ ہندوستانی ہوگا فرانسیسی شہریت اور اس کی مراعات سے وہ محروم رہے گا، زیادہ تر مملکتیں شہریت کے تعلق سے اسی خونی رشتے کو معیار مانتی ہیں، مگر بعض ممالک جن میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ قابل ذکر ہیں دونوں، اصول پر کاربند ہیں، ہمارے ملک میں شہریت حاصل کرنے کے لئے خونی رشتے اور جنم بھومی دونوں اصول پر عمل ہے، چنانچہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان سے آنے والے افراد کو ہندوستان نے اپنا شہری تسلیم کیا۔

شادی: شادی بھی شہریت حاصل کرنے کا معیار تسلیم کی جاتی ہے، چنانچہ ہندوستان کا آدمی امریکہ میں اقامت کے دوران کسی امریکن عورت سے شادی کرلے تو اس ہندوستانی مرد کو امریکہ کا شہری اور اس عورت کو ہندوستانی شہری تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

جائز اولاد قرار دینا:...... کسی شہری باپ اور غیر ملکی ماں کے ناجائز بچے کو خاص قانون کے ذریعہ جائز اولاد قرار دیا جاتا ہے اور اس بچے کو وہی شہریت حاصل ہوتی ہے جس ملک کا اس کا باپ رہنے والا ہو۔

زمین کی خریداری:...... زمین کی خریداری سے بھی بعض جگہ شہریت حاصل کی جاتی ہے، چنانچہ کسی ملک میں اگر اجنبی شخص زمین خرید لے تو وہ اس جگہ کا

---

[1] جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ میرٹھ (یوپی)۔

شہری کہلانے لگتا ہے۔

سرکاری ملازمت کا حصول:...... کچھ ملکوں میں ان غیر ملکیوں کو بھی اپنا شہری تسلیم کیا جاتا ہے جو کسی سرکاری ملازمت کو حاصل کرلیں یا ان کا کسی سرکاری عہدہ پر تقرر ہو جائے۔

معاشی سرگرمی انجام دینا:...... اگر کوئی شخص کسی ملک کی معاشی حالت کو سدھارنے میں کلیدی رول ادا کرے یا وہاں قوم وملت کے مفاد کے تحت معاشی سرگرمی انجام دے تو اس کو بھی شہری تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

اقامت:...... بسا اوقات کوئی غیر ملکی کسی ملک میں ایک خاص مدت تک یا مستقلا سکونت اختیار کرلے تو اسے بھی شہریت کے حقوق عطا کردیئے جاتے ہیں، برطانیہ اور امریکہ میں اس کی مدت غالبا پانچ برس اور فرانس میں دس برس ہے (ماخوذ اصول سیاسیات رص ۱۳۵، ڈاکٹر ہاشم قدوائی)۔

ملک کا انضمام:...... اگر کوئی ملک یا اس کا کوئی حصہ کسی دوسرے ملک سے زمینی اعتبار سے مل جائے تو ملنے والے ممالک کے شہریوں کو اسی ملک کا شہری تسلیم کیا جاتا ہے جس ملک کے ساتھ انضمام ہوا ہو۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان اصولوں پر طائرانہ نظر:

شہریت کے حصول کے لئے پہلا: جنم بھومی اور جائے پیدائش والا معیار بہت واضح ہے اور اس کو اختیار کرنے میں بڑی سہولیت بھی، مگر اسے معیار بنانے کی صورت میں بعض دفعہ بڑی دقت پیش آسکتی ہے، مثلاً فرانسیسی والدین کے یہاں اگر امریکہ میں بچہ پیدا ہو تو اس نوازئیدہ کو دونوں جگہ کی شہریت ملتی ہے اور جنگ کے دوران دونوں ممالک اس فوج میں بھرتی ہونے کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ معیار درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جائے پیدائش کو بھی شریعت میں بڑا دخل حاصل ہے اور اس سے احکامات تبدیل ہوتے ہیں چنانچہ اتمام وقصر کے سلسلے میں فقہاء کرام جائے ولادت کو وطن اصلی سے تعبیر کرتے ہوئے اسے حقیقی وطن قرار دیتے ہیں، اور اس پر اتمام کو واجب کرتے ہیں، خواہ وہاں پندرہ دن قیام کی نیت نہ رہی ہو، جائے ولادت کو اس کا وطن ماننے میں فقہاء کی عبارت بہت صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہے، ''درمختار'' میں ہے:

''الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه'' (الدر) ''(الوطن الأصلى) وسمى بالأهلي ووطن الفطرة والقرار'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۶۱۴ کتاب الصلاۃ باب صلاۃ المسافر طبع زکریا)۔

دوسرا معیار شادی کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے کا ہے، اسلامی نقطہ نظر سے یہ معیار بھی درست معلوم ہوتا ہے، بشرطیکہ ملکی مصالح کے خلاف نہ ہو اور اس سلسلے میں مبسوط کے اس جزئیہ سے راہ نمائی ملتی ہے:

اگر کوئی حربیہ مستامنہ کسی مسلمان یا ذمی سے شادی کرلے تو وہ دار الاسلام اس کا وطن ہوتا ہے اور وہ ذمیہ بن جاتی ہے ''الحربية المستأمنة إذا تزوجت مسلماً أو ذميا فقد توطنت وصارت ذمية'' (مبسوط ۱۰/۸۴ کتاب السیر باب فی توظیف الخراج دار المعرفة بیروت) سعودی عرب میں اس اصول پر شہریت دے دی جاتی ہے:

''نصت المادة: ۱۶ من نظام الجنسية العربية السعودية لسنة: ۱۳۷۴ھ تكتسب المرأة الأجنبية بالزواج جنسية زوجها السعودي'' (احکام الذمیین: ۳۶ الدکتور عبد الکریم الزیدان)۔

لیکن دوسرے جمہور عرب ممالک میں بعض شرائط کا اضافہ ہے کہ عورت وزیر داخلہ کے پاس شہریت حاصل کرنے کی درخواست دے، اور وزیر داخلہ اس کی درخواست کو رد نہ کردے اور اعلان کے بعد زوجین میں کم از کم دو سال تک نکاح باقی رہے۔

تیسرا اصول جائز اولاد قرار دینا ہے: یہ اصول قواعد اسلامیہ پر منطبق نہیں، کیونکہ شریعت ایسی اولاد کو ثابت النسب نہیں مانتی، ''الولد للفراش وللعاهر الحجر'' (مبسوط ۱۷/۲۹ طبع دار المعرفہ بیروت)، لہذا تعلقات یا ناجائز تعلقات سے پیدا ہونے والے بچے کو محض والدین کے کہنے سے باپ سے اس کا نسب ثابت نہیں ہوسکتا اور جب اس کا ثبوت ہی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے تو اس کو معیار بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح زمین کی خریداری، سرکاری ملازمتوں کا حصول اور معاشی سرگرمی انجام دینے کو بھی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ یہ ٹھوس معیار یا مستحکم اصول نہیں ہے، اور اسے اختیار کرنے میں بہت سارے مسائل سامنے آسکتے ہیں، جہاں تک معاشی سرگرمی انجام دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کا عمل یہ رہا ہے کہ مدینہ منورہ میں جو نصاری تجارت کی غرض سے آتے تھے آپ انہیں تین دن سے زائد رکنے نہیں دیتے تھے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشی سرگرمی اصول نہیں بن سکتی۔

کسی ملک یا شہر کا دوسرے ملک کے ساتھ انضمام ہوجائے تو دونوں ایک ملک کے شہری بن سکتے ہیں اس میں بظاہر کوئی اشکال نظر نہیں آتا اور نہ اس کو اختیار کرنے میں کسی دقت کے سامنے آنے کا امکان ہے، ہاں تسلیم نہ کرنے میں مشکلات ضرور پیش آسکتی ہیں۔

رہ گیا اقامت کا مسئلہ تو محدود مدت تک قیام معیار نہیں بن سکتا، البتہ مستقل رہنے کا عزم ہو اور وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ نہ ہو تو یہ چیز اصول بن سکتی ہے اور اس سلسلے میں نبی کریم علیہ السلام کے اس فرمان سے استدلال کیا جاسکتا ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے لگے تو وہ اس کے باشندوں میں سے ہوجاتا ہے ''من تأهل ببلدة فهو من أهلها'' (شرح السیر الکبیر ۱۲۰/۱)۔

یہ حدیث اگرچہ نماز کے قصر واتمام کے تعلق سے ہے کہ جو شخص کسی شہر میں مستقلا رہنے لگے تو وہ اس جگہ کا باشندہ ہوگا اور اس پر اتمام کرنا ضروری ہوگا، مگر حدیث کے عمومی لفظ سے زیر بحث مسئلہ پر بھی استدلال ممکن ہے۔

وطن بننے کے لئے وہاں مستقل رہنے، اور وہاں سے کوچ نہ کرنے کی شرط فقہاء کے اس قول کی وجہ سے لگائی گئی ہے: ''فلو كان له أبوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتأهل به، فليس ذلك وطنا له إلا إذا عزم على القرار فيه، وترك الوطن الذي كان له قبله'' (رد المحتار ۶۱۴/۲ طبع زکریا)۔

تنبیہ: جن صورتوں میں شہریت کا حصول جائز ہے یا بالفاظ دیگر وہ معیار بن سکتی ہیں، ان تمام میں یہ شرط ملحوظ رہے گی کہ ان کی وجہ سے قومی، ملکی اور ملی مصالح متاثر نہ ہوں، اسی طرح رعایا کے لئے پریشانی کا باعث نہ ہوں، نیز ان سے عوام کو ضرر لاحق نہ ہو، کیونکہ امام المسلمین کے تصرفات مصلحت پر موقوف ہوتے ہیں، مشہور قاعدہ ہے: ''تصرف الامام على الرعية منوط بالمصلحة'' (الاشباہ ۳۲۱/۱، الفن الاول: القاعدة الكامسة طبع ادارة القرآن كراتشي)۔ شہریت کے حصول کے مقابل ایک بحث اس کے منسوخ ہونے کی بھی ہے کہ کن صورتوں میں شہریت کو منسوخ کیا جاسکتا ہے؟ احقر نے اس سلسلے میں بھی کچھ صورتیں مسودہ میں تحریر کی ہیں، مگر موضوع سے متعلق نہ ہونے اور طوالت کے خوف سے اس کو ترک کردیا ہے۔

۲۔ غیر مسلم ملک یا مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان جو اپنی مجبوری کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے کا متمنی ہو تو مطلوبہ ملک پر درخواست قبول کرنے کے سلسلے میں تفصیل ہوگی وجوب، عدم وجوب میں سے علی الاطلاق کسی ایک جانب کو راجح قرار نہیں دیا جائے گا۔

مجبوری دو قسم کی ہوسکتی ہے: دنیاوی مجبوری، شرعی مجبوری۔

دنیاوی مجبوری یہ ہے کہ آدمی جس ملک میں مقیم ہے اس کو وہاں بہتر روزگار کے مواقع فراہم نہیں، مگر اسے فقر و فاقہ کی نوبت نہیں، کسی دوسرے جائز ذرائع سے عزت کی روٹی کما کر اپنے طبقہ کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزارنے پر قادر ہے، نیز اس ملک میں مذہبی آزادی حاصل ہے اور شعائر اسلام کو ادا کرنے پر کوئی پابندی نہیں، محض ایمانی غیرت وحمیت اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے بہتر نوکری کی تلاش میں مسلم ملک میں رہنے کا متمنی ہے اور اس کی شہریت کے حصول کے لئے درخواست دیتا ہے تو ایسے آدمی کی درخواست کو قبول کرنا شرعا واجب وضروری نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں اگر درخواست قبول کرنے کو واجب قرار دیا جائے تو اس مسلم ملک کو بہت ساری دقتیں پیش آئیں گی، اور ملک کے انتظامی امور میں خلل واقع ہوگا اور متوازن حکومت برقرار رکھنے میں کافی حرج ہوگا، اسی طرح اگر کسی کی خواہش اور آرزو مسلم ملک میں رہنے کی ہو اور اس کو اپنے ملک میں بہتر روزگار بھی حاصل ہو اور مذہب پر عمل کی آزادی بھی ہو تو ایسے شخص کی درخواست پر بھی حکومت اپنی صوابدید پر فیصلہ کرسکتی ہے، قبول کرنا واجب نہ ہوگا، ہاں ایسے شخص کی مذکورہ آمد قابل احترام اور باعث اجر وثواب ضرور ہوگی، سعودی اور دیگر عربی ممالک میں اسی پر عمل ہے کہ حکومت اپنے صوابدید پر فیصلہ کرتی ہے:

''والمعمول بها حاليا في الدول الإسلامية كالعربية المتحدة والعراق والسعودية أن عقد الذمة وهو يقابل منح الجنسية بطريق التجنس متروك لتقدير الحكومة، فلها أن ترفض الطلب ولها أن توافق عليه. وهذا الاتجاه

لایخالف أحکام الشریعة ؛لأن الإمام له سلطة النظر في الأمور العامة منها: النظر في منح الأجنبي جنسية الدولة'' (احکام الذمیین:۳۱)۔

شرعی مجبوری: اس کے مختلف درجات اور صورتیں ہیں: اس مضمون کو ہجرت کے اقسام سے اخذ کیا جاسکتا ہے، ہجرت کی بنیادی طور پر چند قسمیں ہیں: پہلی قسم وہ ہے جو فتح مکہ سے قبل فرض تھی اور فتح مکہ کے بعد اس کا حکم منسوخ ہوگیا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، اس وقت ہجرت پر قدرت رکھنے والوں کے لئے ہجرت کرنا نہ صرف فرض عین تھا، بلکہ یہ ایمان کی علامت سمجھی جاتی تھی، چنانچہ جو کوئی ہجرت پر قادر ہونے کے باوجود ہجرت نہ کرتا اس کو مسلمان نہیں سمجھتے تھے، اور اس کے ساتھ وہی معاملہ ہوتا جو کفار کے ساتھ ہوا کرتا تھا، اس کا بیان سورہ نساء (۸۹) میں ہے: "حتی یہاجروا فی سبیل اللہ" مگر جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو ہجرت کا یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا، کیونکہ اس کے بعد مکہ مکرمہ خود دارالاسلام بن چکا تھا، اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بیان فرمایا: "لا ھجرۃ بعد الفتح" یعنی فتح مکہ کے بعد اب ہجرت کی ضرورت نہیں، اس طرح اس ہجرت کا فرض ہونا، پھر منسوخ ہونا خود نصوص سے ثابت ہے۔

ابن حجر علیہ الرحمہ نے اس پورے واقعہ سے چند مسائل کا استخراج کیا ہے، ان کو اگر قواعد حنفیہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ اس سے متعارض نہیں، بلکہ من کل الوجوہ میل کھاتے نظر آتے ہیں:

جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی نہ ہو، وہ کفر و شرک یا احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی پر مجبور ہوں ایسے مقامات سے اگر ہجرت کرنے پر آدمی کو قدرت ہو تو اس کے لئے کسی ایسی مامون جگہ کا انتخاب کرنا واجب ہوگا جہاں شعائر اسلام کو آزادی کے ساتھ انجام دیا جاسکتا ہو اور جس دار الکفر میں احکامات پر عمل کرنے میں پابندی نہ ہو تو وہاں سے ہجرت فرض نہیں، مستحب اور مستحسن ہے اور جو ہجرت پر قادر نہ ہو قید ہونے کی وجہ سے یا معذوری کی وجہ سے تو اسے اس جگہ رہنا جائز ہوگا۔

''أما قبل فتح البلد فمن به من المسلمين أحد ثلاثة: الأول: قادر على الهجرة منها لا يمكنه إظهار دينه. إلا أداء واجباته، فالهجرة فيه واجبة، الثاني قادر؛لكنه يمكنه اظهار دينه، وأماء واجباته فمستحبة لتكثير المسلمين بها، الثالث: عاجز يعذر من أسر أو مرض أوغيره، فتجوز له الإقامة، فإن حمل على نفسه وتكلف الخروج منها أجر'' (فتح الباری:۶،۲۲۰)۔

یہی مضمون ابن قدامہ حنبلی علیہ الرحمہ نے (المغنی ۱۳/۱۵۱) پر ذکر کیا ہے جس کو آگے ذکر کیا جائے گا، لہذا کوئی ایسا ملک جہاں پر مسلمانوں کو اپنی مذہبی آزادی حاصل نہ ہو کفر و شرک یا احکامات شرع کی خلاف ورزی پر انہیں مجبور کیا جاتا ہو ایسے لوگوں کو اگر وہاں سے نکل جانے پر قدرت ہو تو وہاں سے خروج ضروری ہوگا اور دارالاسلام یا اسلامی ملک سے بہتر کوئی اور موزوں جگہ نہیں، اگر ان کے علاوہ کہیں اور جگہ نہ مل سکے اور ہر جگہ کفر و شرک اور مذہب پر پابندی عام ہو تو اس درخواست کو اسلامی ممالک کے لئے قبول کرنا ضروری ہوگا، اسی طرح اگر کہیں بھی روزگار نہ ملے اور آدمی کو فقر و فاقہ کی نوبت آپہنچے اور کوئی ملک پناہ دینے پر آمادہ نہ ہو یا پناہ دے سکتا ہو، مگر وہاں مذہبی آزادی حاصل نہ ہو اور ایسا بے روزگار آدمی اسلامی ملک میں رہنے کی درخواست دے تو اس کی درخواست کو بھی قبول کرنا ضروری ہوگا، کہ بے سہارا افراد خاص کر مسلم حضرات کی اعانت اور ان کا تعاون ہمارا اسلامی فریضہ ہے اور ایک طرح سے یہ سنت انصار کو زندہ کرنا ہے، جن کے لئے قرآن کریم میں واضح لفظوں میں مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔

۳۔ شہری تسلیم نہ کئے جانے کی دو صورت ہے:

۱۔ صرف کاغذی طور پر وہ شہری نہ ہوں، باقی ساری سہولیات انہیں فراہم ہو۔

۲۔ شہری حقوق سے ان کو محروم رکھا جائے، اگر پہلی صورت ہو کہ صرف کاغذی طور پر شہری تسلیم نہ کئے جاتے ہوں، مہاجرین میں ان کا شمار ہوتا ہو، مگر وہ شہری معاشی اخلاقی جن کا بیان جواب ۴ میں ہے، انہیں وہ سارے حقوق حاصل ہوں تو بظاہر اس میں کوئی اشکال معلوم نہیں ہوتا، البتہ اگر ان کو ان بنیادی حقوق سے محروم کردیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے، ہاں اگر انہیں سیاسۃ مصلحۃ سیاسی حقوق سے محروم کردیا جائے، مثلاً ووٹ نہیں دے سکتے، الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے، تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے، جیسا کہ سوڈان اور ہمارے ملک ہندوستان میں اس پر عمل ہوتا آرہا ہے، البتہ اعلی بات یہ ہوگی کہ "یؤثرون علی أنفسھم ولو کان بھم

خصاصة" (سورہ حشر:۹) کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ساتھ نہ صرف مساوات برتی جائے، بلکہ خصوصی حقوق کو بھی پاس کرالیا جائے، تا کہ وہ خوف وہراس سے نکل کر پرسکون زندگی جی سکیں جیسا کہ انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔

۴۔ انسانی معاشرہ کو خوشگوار بنانے کے لئے حقوق واجبات طے کر لینا کام کو سہل بنا دیتا ہے، شریعت بھی اسے پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے، بشرطیہ ان حقوق کو طے کرنے میں اللہ تعالی کی رضامندی کو ملحوظ رکھتا ہو اور دوسرے افراد کی ایذاء رسانی سے محفوظ رکھا گیا ہو۔

سوالنامے میں جن حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسلام کی رو سے سماج میں رہنے والے شہری کو حاصل ہوں گے یا نہیں؟ اس کا جواب اسی وقت آشکارا ہو سکتا ہے جب حقوق کی ماہیت وحقیقت کھل کر سامنے آئے، معاشرہ میں بسنے والے افراد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ باہمی تعاون، اخوت ومساوات ایثار وقربانی کے جذبے سے سرشار ہو کر زندگی گذاریں، کیف ما اتفق لوگوں کے لئے دل آزاری کا سبب بن کر نہیں، مشہور حدیث ہے: حقیقت میں کامل مومن وہی ہے جس کے دست ولسان سے آدمی محفوظ رہ سکیں: ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده'' (مسلم: كتاب الايمان، باب بيان تفاضل الاسلام) اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر شخص کو سوچنے یا کام کرنے کی اپنی فطری صلاحیتوں کو پوری طرح سے کام میں لانے کی آزادی حاصل ہو، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دوسرے افراد اس آزادی کو تسلیم کریں بغیر اس کے معاشرتی زندگی کا تصور مشکل ہے، ان ہی آزادی اور سہولتوں کو حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب تک یہ فرد کو حاصل نہ ہوں گے، اس وقت تک آدمی نہ تو اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکتا ہے اور نہ دوسرے افراد اس کی خوابیدہ صلاحیتوں سے مستفیض ہو سکتے ہیں، اگر یہ سہولیات مخصوص افراد کو حاصل ہوں اور شہر کی اکثریت اس سے محروم رہے تو اسے مراعات کا نام دیا جاتا ہے، اسے حقوق کہنا مشکل ہے۔

حقوق کے حوالے سے درج ذیل چار نظریئے ملتے ہیں:

۱۔ **قدرتی حقوق کا نظریہ:** یہ نظریہ سب سے قدیم ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ حقوق قدرت کا عطیہ ہیں جو انسان کو پیدا ہوتے ہی حاصل ہوتے ہیں، ان کو سلب نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان پر کسی قسم کی پابندی لگائی جا سکتی ہے، یہ حقوق تب سے حاصل ہیں جب اسٹیٹ کا قیام عمل میں نہ آیا تھا اور زمانہ فطری تھا۔

حقوق کا تاریخی نظریہ: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق اسٹیٹ کی پیداوار ہیں اور وہی ان کا خالق ہے، لہذا جن حقوق کو وہ تسلیم کرے صرف انہیں کا اعتبار ہوگا۔

حقوق کا سماجی فلاحی نظریہ: ان کا ماحصل یہ ہے کہ حقوق کا انحصار پچھلی تواریخ پر ہے اور حقوق تاریخ ہی کی پیداوار ہیں اور ان کی بنیاد رسم ورواج ہیں۔

حقوق کا عینی یا فرد کی شخصیت کا نظریہ: اس نظریئے کے مطابق حقوق وہ سہولتیں ہیں جو فرد کی شخصیت کی ترقی کے لئے ضروری ہوں، حقوق فرد کو اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذہنی، جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے ترقی دے، اسی میں سارے سماج کی ترقی ممکن ہے، یہ نظریہ حقوق کو اخلاقی نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہے، موجودہ جمہوری مملکتوں میں شہریوں کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں مستقل باب ہیں، جن سے حکومت اپنے شہریوں کو محروم نہیں کر سکتی، اور اگر کرے تو شہریوں کو ان حقوق کی بازیابی کے لئے عدالتی چارہ جوئی کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔

سوال نامے میں جو حقوق مذکورہ ہیں یا جو ذکر کرنے سے رہ گئے ان تمام حقوق کو بنیادی طور پر چار قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ **قدرتی حقوق:** اس سے مراد وہ حقوق ہیں جو انسان کو دنیا کی ابتداء سے حاصل ہیں، ان کے بغیر زندگی گذارنے کا تصور ممکن نہیں، ان میں سرفہرست حق حیات، حق مساوات اور انصاف پانے کا حق ہے۔

۲۔ **اخلاقی حقوق:** وہ ہیں جنہیں دوسرے انسان تسلیم کرتے ہوں اور حکومت بھی ان کا احترام کرتی ہو، مثلاً مصیبت زدگان کی مدد کرنا۔

۳۔ **قانونی حقوق:** وہ حقوق جن کی پشت پر قانون ہوتا ہے اور حکومت بزور طاقت اسے منواتی ہے۔

۴۔ **معاشی حقوق:** اس سے مراد وہ حقوق ہیں جنہیں بروئے کار لا کر انسان اپنی روزی روٹی کا انتظام کر سکے ان بنیادی حقوق کے ضمن میں کچھ ذیلی حقوق بھی آتے ہیں، جنہیں (نقشہ صفحہ نمبر:) پر تحریر کیا جاتا ہے:

زندگی کا حق:

ہر شخص کو اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہے، اور کسی مملکت یا اسٹیٹ کو اسے سلب کرنے کا اختیار نہیں، اسی وجہ سے قتل کو ایک سنگین جرم بتلایا گیا ہے کہ ایک فرد کے قتل سے گویا پوری انسانیت کی موت ہوتی ہے، عقلی طور پر اس حق کا ملنا سمجھ میں آتا ہے، کیونکہ انسان کو جانی تحفظ جب مل نہ پائے اور وہ خطرات میں رہتے

ہوئے زندگی بسر کرے تو اس کو چین وسکون نصیب نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی کام، خواہ ذاتی ہو کہ قومی، ملکی ہو یا عالمی، مناسب طریقہ سے انجام دیا جاسکتا ہے، اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسے قوانین وضع کریں جس سے کسی بھی فرد کے لئے زندہ رہنے کا حق پورے طور پر حاصل ہوسکے، اس لئے تمام ممالک میں ناحق قتل کی سزا نہایت سنگین اور بہت سخت رکھی گئی ہے، اس حق کو درج ذیل دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے: "من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعا" (مائدہ:۳۲) اسی طرح دوسروں کے قتل بجائے خود اپنے کو قتل کرنے اور خودکشی کو شریعت بری نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسے بھی جرم عظیم قرار دیتی ہے: "ولا تقتلوا أنفسكم إن الله كان بكم رحيما، ومن يفعل ذلك عدوانا وظلما فسوف نصليه نارا وكان ذلك على الله يسيرا" (نساء:۲۹)۔

ارشاد نبوی ہے: "من قتل نفسه بحديدة فحديدته بيده يتوجأبها (يضرب بها) في نار جهنم خالدا مخلدا فيها أبدا" (بخاری: کتاب الطب باب شرب السم والدواء به)۔

قتل وغارت گری کو روکنے اور حق حیات برقرار رکھنے کے لئے شریعت نے فسادیوں کے لئے سخت سزائیں تجویز کیں، اور اس کے بالمقابل حیات انسانی کے تحفظ کو پوری انسانیت کی تعمیر سے تعبیر کیا ہے، "من أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا" (مائدہ:۳۲)۔

دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں جس کی مذہبی کتابوں میں کسی ایک فرد کے قتل کو ساری انسانیت کے قتل اور کسی ایک فرد کو بچانے کو ساری انسانیت کو بچانے کے مرادف بتلایا گیا ہو، یہ اسلام کے امن پسند ہونے کی واضح اور بین دلیل ہے۔

مساوات وبرابری کا حق:

بنو آدم سب کے سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں، اس لئے عوام حق مساوات سے مستفیض ہوں گے، حکومت کی ذمہ داری ہوگی وہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے، ذات پات، رنگ وروپ سے ماوراء ہر ایک کے لئے قانون برابر ہوں گے، اقرباء پروری اور روابط کی وجہ سے بھید بھاؤ نہ ہوگا، اس کی دلیل درج ذیل ہے: "قال رسول الله ﷺ: لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا الأسود على أحمر إلا بالتقوى" (مسند احمد: حديث رجل من أصحاب النبي ﷺ الرقم: ۲۳۳۹)۔

احکام کو نافذ کرنے میں کسی سفارش کو دخل نہ ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو، قانون سب کے لئے برابر ہوں گے، مشہور واقعہ ہے کہ کسی عورت نے چوری کرلی تھی تو لوگوں نے حضرت اسامہ سے اس سلسلے میں تخفیف کے لئے سفارش کرنے کو کہا، انہوں نے جا کر سفارش کی تو آپ ﷺ ان کی بات سن کر بہت غصہ ہوئے اور فرمایا: اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا (بخاری ابواب الحدود، باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحدود)۔

انصاف پانے کا حق:

ہر شخص کو انصاف پانے کا بھی مکمل حق حاصل رہے گا، تاکہ انسانیت کی تکریم سلامت رہے، اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: "إن الله يأمر بالعدل والإحسان" (نحل:۹۰) (اور لوگوں سے مطالبہ کیا ہے کہ فیصلہ کے وقت انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں)۔

"وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل" (نساء:۵۸)۔ حتی کہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے کہ ایسے افراد کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت دشمنی کا ظہور نہ ہونے پائے جس سے ناانصافی وجود میں آئے، ارشاد خداوندی ہے: "ولا يجرمنكم شنآن قوم على أن لا تعدلوا، إعدلوا هو أقرب للتقوى" (مائدہ:۸)۔

شہری حقوق کا بیان:

......اس میں زندہ رہنے کا حق سب سے مقدم ہے، اس کا بیان قدرتی حقوق کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

جائداد یا ملکیت کا حق:

مال ومتاع اور جائداد کی محبت فطرت انسانی میں ودیعت کی گئی ہے اور ان کے حصول کے لئے انسان انتھک کوشش کرتا ہے، اور خون پسینہ بہا کر اموال اور جائداد کی ذخیرہ اندوزہ کرتا ہے، اس لئے اس بات کا حق ملنا چاہئے کہ ان جائداد واملاک میں اس کی ملکیت ثابت ہو اور اس سے نفع اٹھا سکے، شہریوں کے لئے اچھی زندگی گزارنا اسی وقت ممکن ہوگا جب انہیں اطمینان ہو کہ انہیں ان کے املاک سے محروم نہ کیا جائے گا ان اموال پر ان کی اجارہ داری قائم ہوگی، اس حق کی وجہ سے

مملکت کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ہر شہری کی جائداد اور املاک کی حفاظت کرے اور اس کے تئیں قوانین وضع کرے، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص کسی کے اموال کی چوری کرتا ہے تو حکومت اسے گرفتار کر کے سزا دیتی ہے، اس حق کے ثبوت کو اسلام کے قانون میراث سے اخذ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ متوفی کے اموال میں وراثت جاری ہونے کا مفہوم ملکیت کو متضمن ہے، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی کا مال کسی کے لئے اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔

''ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه'' (مشكاة ۲۵۶ كتاب البيوع بالغصب العارية)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فإن دمائكم وأموالكم وأعراضكم بينكم حرام كحرمة يومكم هذا. في شهركم هذا، في بلدكم هذا'' (بخاری: كتاب العلم، قول النبي: رب مبلغ أدعى من سامع)۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بلیغ اور جامع خطبہ دیا تھا، مذکورہ حدیث اسی خطبے حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بلیغ اور جامع خطبہ دیا تھا، مذکورہ حدیث اسی خطبے کا ایک ٹکڑا ہے، اس حدیث میں آپ نے اموال کو دوسرے پر حرام قرار دیا ہے، یہ اس بات کا غماز ہے کہ مالک کی اس میں ملکیت قائم ہے۔

۵۔ خاندانی زندگی کا حق:...... شہریت کے حقوق میں سے ایک حق خاندانی زندگی کا حق ہے، اس کے تحت آدمی کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ ایک خاندانی زندگی گذارے، کسی کی مداخلت کئے بغیر اپنی رائے سے شادی کرے، اور اولاد کی پرورش و تربیت کرے، ان کو تعلیم دلائے اور خاندان والوں کے ساتھ تعاون و امداد کا معاملہ کرے، ضرورت کے موقع پر حکومت ان چیزوں کے تعلق سے قانون بھی بناسکتی ہے، بشرطیکہ وہ اسلامی تعلیمات کے منافی اور مغائر متضاد نہ ہو، مثلاً ہمارے ہندوستان میں اٹھارہ سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی قانونا جرم ہوتی ہے، اور طلاق کی صورت میں عدت کے بعد بھی نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ہی عائد ہوتی ہے، گو کہ یہ قانون شہریت کے مخالف ہے۔

آزادی تحریر و تقریر اور اظہار رائے کی آزادی کا حق:

جن ممالک میں جمہوری نظام قائم ہے وہاں اس حق کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، کیونکہ جمہوریت کی بنیاد ہی رائے عامہ پر ہوتی ہے، اس حق کے مطابق ہر شہری کو آزادی کے ساتھ اپنی رائے کے اظہار کا حق بذریعہ تحریر و تقریر حاصل ہوتا ہے بشرطیکہ اس سے کسی طبقے کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں، یا کسی مخصوص فرد کی ہتک عزت نہ ہوتی ہو، ان جمہوری ممالک میں اگر عوام سے یہ حق سلب کرلیا جائے تو وہ معاشرتی اور سماجی زندگی میں حصہ نہیں لے سکتے اور یہ چیز جمہوریت کے حق میں نہیں جاتی، بلکہ اس کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔

البتہ اگر اضطراری حالات میں ملک کا تحفظ اس سے خطرے میں بڑے یا بغاوت کا اندیشہ ہو، یا مختلف اہل مذاہب کے درمیان نفرت وعداوت پھیلے تو حکومت اس پر عارضی طور پر پابندی عائد کرسکتی ہے۔

نوٹ: واضح ہو کہ یہ حق اسلامی طرز حکومت کے اسلوب کے خلاف ہے۔ کیونکہ جمہوریت کا نظام اسلام کے نظامہائے حکومت سے میل نہیں کھاتا، مسلمان اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس نظام کو بدل دیں اور متبادل نظام کو فروغ دیں، مجبوری کے حالات میں اس نظام کو قبول کیا جاسکتا ہے۔
تفصیل ''سیاسی حقوق'' کے ضمن میں انشاء اللہ آئے گی۔

مذہبی آزادی کا حق:

شہریوں کے حقوق میں ایک حق مذہبی آزادی کا ہے، اس حق کی وجہ سے تمام لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور شعائر کو انجام دینے کی اجازت ہوگی، جمہوری ملک میں بسنے والے افراد کو حکومت یہ حق عطا کرتی ہے، اور ان کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرتی، اور نہ کسی فرقے پر اس کا مذہب چھوڑنے کا پابند کرتی ہے، یہ مذہبی آزادی شریعت کے بھی منافی نہیں، کیونکہ اسلام نے بھی غیر مسلموں کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا ہے، مشہور قاعدہ ہے: "نترك وما يدينون" (بحر ۸/۲۲۲ طبع زکریا) اسی لئے فقہ اسلامی میں "احکام الذمیین" کا مستقل باب قائم کیا جاتا ہے، اس حق کے ثبوت پر درج ذیل دلائل قائم کئے جاسکتے ہیں:

"لكم دينكم ولي دين" (کافرون: ۶) ہر ایک کے لئے علاحدہ علاحدہ دین ہے اور اس اختیار کو سلب کرنے کے سلسلے میں سورہ بقرہ کی (آیت نمبر ۲۵۶) نازل ہوئی کہ کسی کو دین میں زبردستی داخل نہیں کیا جاسکتا، "لا إكراه في الدين" (سورۂ بقرہ: ۲۵۶)، نیز فرمایا گیا: "أفأنت تكره الناس حتى يكونوا

مؤمنین" (یونس:۹۹) حتی کہ دوسرے مذاہب کے شعار اور ان کے معبودان باطلہ کو برا کہنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم" (انعام:۱۰۸) ان تمام دلائل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جمہوری ملک میں بسنے والے انسان یا اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلمین کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

۸۔ قانونی برابری کا حق:

شہریوں کے حقوق میں سے ایک حق قانونی برابری کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون سارے شہریوں کے لئے یکساں ہو، ذات پات، رنگ ونسل یا کسی اور بنا پر ان کے ساتھ کسی قسم کی تفریق نہ ہو، امیر اور غریب سب کے لئے یکساں قانون ہو، اس لئے کہ اگر ان میں تفریق ہونے لگے یا دوہرا معیار برتا جانے لگے تو حقیقی آزادی ختم ہوجائے گی اور قانون جانبدارانہ بن جائے گا نتیجۃً معاشرہ میں بدامنی پھیلے گی اور چین وسکون کے ساتھ رہنا دوبھر ہوجائے گا، اس کے مقابل اگر حکومت قانونی مساوات کو سامنے رکھ کر خاطی ومجرم کو سزا دے تو معاشرہ پھلے پھولے گا اور امن کی فضا ہموار ہوگی، اس حق کے بغیر شہریوں کو انسانوں کی طرح جینا مشکل ہوجائے گا۔

تنبیہ شریعت اسلامیہ نے غلام اور آزاد کے درمیان فرق کیا ہے، مراعات اور حدود وسزاؤں میں تفریق ہے، اس لئے اگر اسلامی تناظر میں مذکورہ حق کو دیکھا جائے تو وہ آزاد آدمی کے ہوں گے۔ اس حق پر درج ذیل حدیث شاہد بن سکتی ہے: "لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمد یدها" (بخاری کتاب الحدود باب کراهية الشفاعة في الحدود)۔

اسی طرح حدود کے سلسلے میں وہ ساری آیات جو رنگ ونسل اور ذات پات سے پرے عمومی الفاظ کے ساتھ نازل ہوئی ہیں قانونی برابری کے حق میں دلیل بن سکتی ہیں، مثلاً: "ولكم في القصاص حياة يا أولي الألباب" (سورۂ بقرہ:۱۷۹)۔

"الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة" (سورۂ نور:۲)۔

"السارق والسارقه فاقطعوا أيديهما جزاء بما كسبا نكالا من الله" (سورۂ مائدہ:۳۸)۔

۹۔ تعلیم حاصل کرنے کا حق:

شہریوں کے لئے حصول تعلیم کا حق ثابت کیا جائے گا، اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے شہریوں کی تعلیم کا انتظام کرے، کیونکہ امی اور ناخواندہ افراد سے کسی معاشرے یا حکومت کی ترقی متصور نہیں، اسلام نے اپنے آغاز ہی سے تعلیم پر مکمل ضرور دیا ہے، چنانچہ جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی، وہ علم ہی سے متعلق ہے، فرمایا گیا: "أقرأ باسم ربك الذي خلق" (علق:۱) (پڑھیے اس رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا ہے)، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم، وفي رواية، مسلمة" (مرقاۃ ۱،۲۸۴ نقاب العلم طبع امدادیہ) علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔

ضروریات دین کے بقدر علم دین سیکھنا جس سے حرام وحلال کی تمیز ہو، فرائض وواجبات سے آگہی ہو فرض ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب کسی مملکت میں شہریوں کو حصول تعلیم کا حق دیا گیا ہو، حصول تعلیم کا یہ حق سارے شہریوں کو یکساں ملے گا، رنگ ونسل کے اعتبار سے تفریق نہ ہوگی اور ہر طبقے کے افراد اس سے بہرہ ور ہوں گے، اور اپنی آرزو کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے مجاز۔

۱۰۔ تاسیس بزم اور کمیٹی بنانے کا حق: ...... شہریوں کو اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انجمنوں کے قیام یا اپنے پیشہ وحرفت یا متعلقہ ذمہ داری کے تعلق سے کمیٹی کے قیام کی اجازت ہوگی، اس حق کے تحت کسی مذہب کے مخصوص افراد اپنی مذہبی انجمنیں یا کسی مخصوص پیشہ سے متعلق افراد اپنے متعلقین کے واسطے کمیٹی بنا سکتے ہیں، حکومت کو انہیں بند کرنے کا حق نہیں ہوگا، البتہ اگر کوئی کمیٹی ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ ہو، یا حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر اس کی اساس وبنیاد ہو تو حکومت اسے خلاف قانون قرار دے کر اس کو موقوف کرنے کی مجاز ہوگی، یہ حق بظاہر قواعد اسلامیہ سے متعارض بھی نہیں معلوم ہوتا ہے۔

۱۱۔ سرکاری علاج ومعالجہ کا حق: ...... شہریوں کو سرکاری طور پر علاج ومعالجہ کرانے کا حق ہوگ، اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ شہریوں کی سہولیات کے

لئے ایسے شفا خانے اور اسپتالوں کو قائم کرے، ظاہر بات ہے کہ معاشرے میں بسنے والے سبھی افراد یکساں نہیں بلکہ ان میں ہر اعتبار سے فرق ہوتا ہے، امیر غریب، تعلیم یافتہ ناخواندہ، معزز شریف ہر طرح کے ہوتے ہیں اور انسانوں کے ساتھ حالات بھی بدلتے ہیں، کبھی تندرست ہوتا ہے تو وہ کبھی مرض کے حملے کا شکار ہوتا ہے، غریب ناتواں آدمی کو اگر بیماری لگ جائے تو وہ اپنی تنگدستی کے باعث علاج پر قادر نہیں ہوسکتا، ایسے لوگوں کے علاج کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ سرکار اور حکومت و مملکت ان کی کفالت اور ذمہ داری اٹھائے۔

۱۲۔ آمد و رفت کا حق:...... شہریوں کو اپنے ملک میں بلا روک ٹوک سفر کرنے اور ادھر ادھر آنے جانے کی اجازت ہوگی، البتہ اگر کسی ملک کے حالات فرقہ وارانہ فسادات یا کسی اور وجہ سے ناگفتہ بہ ہوجائیں تو حکومت عارضی طور پر اس حق کو موقوف کرسکتی ہے، جیسے کرفیو کے ایام میں افراد کو ان کے مقامات میں نظر بند کردیا جاتا ہے۔

سیاسی حقوق کا بیان:

اس کے ضمن میں عموماً ان حقوق کو بیان کیا جائے گا جو جمہوری طرز کے ممالک میں رہنے والے افراد کو حاصل ہوتے ہیں، مثلاً الیکشن میں حصہ لینا، یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ جمہوریت اور اسلام کے نظامہائے مملکت میں منافات اور تغائر ہے، کیونکہ جمہوریت کا ارتکاز تین چیزوں پر ہے، قانون سازی، قضا اور احکام کا نفاذ۔

جمہوریت میں مقننہ یا قانون ساز اداروں کو قانون وضع کرنے کا حق ہوتا ہے، جبکہ قانون بنانے والی ذات صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ہے "ان الحکم إلا للہ" (انعام: ۵۷، یوسف: ۴۰-۶۷) "ألا له الخلق والأمر تبارك الله رب العالمين" (اعراف: ۵۴) دوسری بنیاد قضا ہے، اس نظام میں ارباب حل وعقد کو اسی کے دستور کے موافق فیصلہ کرنا لازم ہوتا ہے، خواہ وہ فیصلے اسلامی دستور سے میل نہ کھاتے ہوں اور یہ چیز بہ نص قرآنی جائز نہیں: "ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الظالمون" (مائدہ: ۴۵)، "فاحكم بينهم بما أنزل الله ولا تتبع أهواءهم" (مائدہ: ۴۸)۔

حتی کہ اس کے وضع کردہ دستور کے خلاف فیصلے کرنے کو ناقابل تلافی جرم تسلیم کیا جاتا ہے، تیسری چیز احکام کا نفاذ ہے، اس میں صرف انہیں احکام کا نفاذ ممکن ہے جو آئین جمہوریت کے موافق ہوں وہ اسلام سے موافقت رکھتے ہوں یا نہیں اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ مذکورہ بالا تینوں چیزیں اسلامی نصوص سے متصادم و معارض ہیں، اس لئے جزئیات سے مل کر جو شئ مرکب ہوگی وہ بھی ناجائز ہوگی، کیونکہ ناجائز چیز کا مجموعہ بھی ناجائز ہوتا ہے۔

جن جمہوری ممالک میں مسلمان آباد ہیں ان کے سامنے دو راستے رہ جاتے ہیں: اول یہ کہ وہ اس نظام سے کنارہ کشی اختیار کرلیں اور اس کے متعلقات میں کسی بھی طرح حصہ نہ لیں، دوم یہ کہ اس کو دل سے برا سمجھتے ہوئے اپنالیں، پہلی صورت اختیار کرنا مسلمانوں کی رہی سہی اہمیت اور حیثیت ختم کرنے کے مرادف ہوگا، اس طرح مسلمانوں کے عائلی قوانین کا تحفظ بھی خطرے میں پڑسکتا ہے، دوسری صورت اس کو دل سے برا سمجھتے ہوئے اختیار کرنے کی ہے، یہ فسطائی طاقتوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کا مؤثر ذریعہ ہے، اگر دونوں میں تجزیہ کیا جائے تو یہ دوسری صورت اہون اور اخف نظر آتی ہے اور فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسے نازک حالات میں اگر دو مفسدے جمع ہوجائیں تو اخف اور اہون اختیار کیا جاسکتا ہے، اس لئے اس طریقہ کو قبول کرنے اور اس کے متعلقات میں حصہ لینے کی گنجائش ہوگی، بلکہ یہی صورت ان مسلمانوں کے لئے بہتر اور نفع بخش ثابت ہوسکتی ہے جب جمہوریت کو بدرجہ مجبوری قبول کرلیا گیا ہو تو اس کے جتنے حقوق ہوں گے ان کا ثبوت بھی ہوگا، کیونکہ قاعدہ ہے: "إذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه" (العنایہ)۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں، سیاسی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جو شہریوں کو حکومت کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں حاصل ہوتے ہیں، ان حقوق کے حاملین حکومت کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، انہیں حقوق کی بدولت، حکومت کو آمرانہ و جابرانہ طرز اختیار کرنے یا عام شہریوں کے خلاف قانون پاس کرنے سے روکنے کے مجاز ہوتے ہیں۔

۱۳۔ ووٹ دینے کا حق:...... ان میں سب سے پہلا حق ووٹ دینے کا ہے، اس حق کی وجہ سے شہری اپنی مرضی سے اپنے پسند کے آدمیوں کو قبضہ یا قانون ساز اداروں بلدیہ اور نگر پنچایتوں میں بھیجتے ہیں، جمہوری ممالک میں یہ حق عاقل بالغ شہری کو حاصل ہوتا ہے، نابالغ اور مجنون و پاگل میں چونکہ سیاسی بصیرت

نہیں ہوتی، اس لئے ان کو اس حق سے محروم رکھا جاتا ہے، یہ طریقہ بظاہر اسلامی طرز سے مغائر ہے، کیونکہ ووٹ دے کر کسی انسان کو اپنا حاکم بنانا اور اس کے لئے حاکمیت کا اعتراف کرنا ہے جو صرف اللہ کے لئے خاص ہے، مگر مجبوری میں یہ حق جمہوری ممالک میں مسلمانوں کو ملے گا، جیسا کہ سیاسی حقوق کی تمہید میں گذر چکا ہے۔

۱۴۔ الیکشن لڑنے کا حق:

سیاسی حقوق میں سے ایک حق الیکشن لڑنے کا ہے، ہر فرد کو انتخابات میں امیدوار بننے کا حق حاصل ہوگا، اس حق پر کسی فرد یا جماعت کی اجارہ داری نہ ہوگی، جمہوری نظام میں الیکشن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس میں امیدواران ازخود اپنے رفقاء اور حمایت کنندگان کے ساتھ پرچہ نامزدگی داخل کرتے ہیں اور بہ ظاہر یہ دعوی کرتے ہیں کہ ہم اس منصب کے اہل ہیں اور در پردہ آپ اپنے کو اس عہدے کے لئے پیش کرکے اس عہدہ کے طلب گار ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اور اس ذمہ دارانہ منصب کا بزبان خود مدعی وطالب ہونا اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے امت کو یہ تعلیم دی ہے، کہ طالب عہدہ کو منصب سے سرفراز نہ کیا جائے، چنانچہ آپ نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کو نصیحت کی ہے کہ امارت کو طلب مت کرنا، اگر تمہیں وہ عہدہ سوال کرکے دیا گیا ہے تو اس کی ذمہ داری تمہیں پر سونپ دی جائے گی (اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوگی) اور اگر بن مانگے وہ عہدہ ملا تو تمہاری مدد کی جائے گی۔

''لا تسأل الإمارة، فإن أعطيتها عن مسئلة وكلت إليها، وإن إعطيتها من غير مسئلة أعنت عليها'' (مسلم: کتاب الإمارة باب النہی عن طلب الإمارة) اس لئے مناسب اور بہتر طریق کار یہ ہوگا کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اسے اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کرے۔

۱۵۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا حق:

ہر شہری کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ مطلوبہ عہدے کے لئے درخواست دہندہ میں اس لحاظ کی قابلیت وصلاحیت موجود ہو اور اس سلسلے کی وہ ساری شرائط پوری کرتا ہو۔

البتہ اسلامی مملکت کے وہ کلیدی عہدے جس میں اسلام اور آزادی شرط ہے، ان سرکاری عہدوں پر غیر مسلمین اور غلاموں کو مامور کرنا درست نہ ہوگا، بقیہ اس کے علاوہ مناصب میں شرائط پوری کرنے والے افراد حقدار ہو سکتے ہیں۔

۱۶۔ حکومت پر نکتہ چینی کا حق:

سیاسی حقوق میں یہ حق بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس حق کے مطابق شہریوں کو حکومت کے ان تصرفات پر اعتراض کا حق ہوتا ہے جو ان کے مفاد میں نہ ہوں اور اس سے ان کا نقصان ہوتا ہو، یا کوئی قانون جو کسی مذہب کے اصول سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متصادم ہو تو اس عقیدے کے حاملین اس قانون کے خلاف نکتہ چینی یا اعتراض کے مجاز ہوں گے، اور اسلامی مملکت ہونے کی صورت میں حکومت کے اقدامات جو نصوص اور اسلامی قوانین کے خلاف ہوں تو رعایا کو مخالفت کرنے کا حق حاصل ہوگا، اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان ہوگا جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ: تم میں سے اگر کوئی کسی خلاف شرع کام کو دیکھے تو (استطاعت ہونے کی صورت میں اس کو ہاتھ سے بدل دے (روک دے) اور اگر قدرت نہ ہو تو زبان سے منع کرے، اس پر بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کم درجہ ہے۔

''من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان'' (مسلم کتاب الایمان، بیان کون النہی عن المنکر من الایمان) اسی طرح حضرت عمر فاروق کا ارشاد کہ اگر میں حکومت درست طریقہ سے نہ چلا سکوں تو مجھے دستبردار کردینا۔

۱۷۔ سیاسی انجمن قائم کرنے کا حق:...... سیاسی حقوق میں سے ایک ''سیاسی انجمن'' بنانے کا ہے، اس حق کو استعمال کرتے ہوئے شہریوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ علاحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کر سکتے ہیں، برسر اقتدار حکومت ان کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی اور نہ ہی تاسیس سے منع کر سکتی ہے۔

۱۸۔ عدالتی چارہ جوئی کا حق:...... ہر شہری کو عدالتی چارہ جوئی کا حق ملے گا، تاکہ ظلم وجور، ناانصافی اور حق تلفی کی صورت میں وہ انصاف پا سکیں، اس کی نظیر

شریعت میں موجود ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ اپنی شکایات لے کر آتے تھے، اور آپ ان کے درمیان فیصلہ کرتے تھے، بعد میں صحابہ کرام نے بھی اس اسوہ کو باقی رکھا ہے، اور یہ حضرات صحابہ لوگوں کی شکایات سن کر ان کے درمیان انصاف قائم کرتے تھے، تاریخ کے بے شمار صفحات ان جیسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

۱۹۔ معاشی حقوق کا بیان:...... کام کرنے کا حق: ہر شہری کو کام کرنے کا حق ملے گا، اور اس کو بروئے کار لا کر وہ اپنی روزی روٹی کا انتظام کرنے کے مجاز ہوں گے، نیز حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ شہریوں کے واسطے روزگار کے مواقع فراہم کرے، بے روزگاری کو ملک سے ختم کرنے کی کوشش کرے۔

۲۰۔ مناسب اجرت پانے کا حق:...... شہریوں کو یہ حق بھی حاصل ہوگا ان کے لئے حکومت مناسب اجرتوں کا تعین کرے، یعنی یہ نہ ہو کہ انہیں مل مالک یا کارخانے دار، یا حکومت برائے نام اجرت دیں، بلکہ انہیں کم سے کم اتنی اجرت ملے کہ وہ نہ صرف اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کر سکیں، بلکہ ان کا معیار زندگی بھی اونچا ہو، نیز حکومت کی ذمہ داری یہ بھی ہوگی کہ ان کے کام کے اوقات مقرر کرے، تاکہ زیادہ کام کرنے سے یا بہت زیادہ محنت کرنے سے ان کی صحت پر برا اثر نہ پڑے، اس حق کے ثبوت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے استدلال کیا جا سکتا ہے: ''ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة. ومن كنت خصمه خصمته يوم القيامة... رجل استأجر أجيرا فاستوفى منه ولم يوفه أجره'' (ابن ماجه كتاب الاحكام باب أجر الإجراء)۔

۲۱۔ معاہدہ کرنے کا حق:...... اس سے مراد یہ ہے کہ شہریوں کو یہ حق ملنا چاہئے کہ وہ لین دین اور خرید و فروخت کے سلسلے میں کسی بھی قسم کا معاہدہ کر سکتے ہیں، حکومت صرف اس صورت میں دخل دے گی جب وہ معاہدے عام انسان اخلاق کے منافی ہوں یا اسلامی مملکت ہو تو ان معاہدوں پر پابندی لگا سکتی ہے جو قواعد اسلامیہ سے متعارض ہوں، اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''المسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما'' (ترمذی: كتاب الاحكام باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح)۔

پناہ گزینوں کے حقوق:

۵۔ تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو قدیم معاشرہ میں اجنبیوں اور پناہ گزینوں کو پناہ لینے والے ممالک میں کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے، بلکہ اجنبی آدمی اپنے خطے اور اقلیم کا دشمن سمجھا جاتا تھا، اس پر قابو پا کر اس کی بیع وشراء ہوتی تھی اس معاشرے میں ایک اجنبی آدمی عرصہ دراز تک عمومی حقوق تو درکنار ان بنیادی حقوق سے بھی محروم رہا کرتا تھا جو اس کے وجود کے لئے لازم تھے اور انسانیت جن کی متقاضی تھی، مثلاً شادی کرنے کا حق، وراثت پانے کا حق، اپنے معاملات میں تصرف کرنے کا حق، ملکیت کا حق وغیرہ وغیرہ، مگر بعد میں حالات میں سدھار ہوا تو ان کے ساتھ کرم واحسان اور ہمدردی کا معاملہ ہونے لگا، اسلام نے ان حقوق کی بنیاد کو اور مستحکم کر دیا، البتہ اس میں پناہ گزینوں کے تعلق سے کوئی ایسا واضح اور مکمل قانون بظاہر نہیں ملتا، جس طرح عائلی یا عباداتی قوانین بسط و تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں، ہاں ہجرت اور دوسرے ممالک میں پناہ لینے کے واقعات ملتے ہیں، ان واقعات سے لوگوں کے طریقۂ زیست، انصار و مہاجرین کے آپسی معاملات سے ان حقوق اور دستور کو اخذ کیا جا سکتا ہے، اس سلسلے کی سب سے اہم پیش رفت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صحابہ کرام کا حبشہ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کا مدینہ منورہ ہجرت کرنا ہے۔

اسلام کے دستور سیر و مغازی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پناہ گزینوں کے تعلق سے سب سے پہلی آیت غالباً سورہ حشر کی (آیت نمبر ۹) ہے، جو ان کے خصوصی حقوق یا ان کے ساتھ حسن معاملہ کی غماز ہے۔ اس آیت سے ایسے چند امور مستفاد ہوتے ہیں جن سے پناہ گزینوں کے حقوق کی طرف رہنمائی مل سکتی ہے، مثلاً:

ا۔ مہاجرین اور پناہ گزینوں کے آنے پر ان کے ساتھ خوشی کا اظہار کرنا۔

ان کے ساتھ احسان کرنا اور ان کو ترجیح دینا۔

ان کا استقبال کرنا، خواہ وہ مالدار ہوں یا غریب۔

پناہ لینا جائز ہے ناگزیر حالات میں۔

ان کے علاوہ پناہ گزینوں کو اصولی درج ذیل حقوق حاصل ہوں گے:

۱۔ **دار الاسلام میں داخلے اور بہ قدر حاجت رکنے کا حق:** اگر کوئی شخص اپنی زندگی و مال و متاع کی سلامتی کے واسطے دار الاسلام کی پناہ لینا چاہے تو امام المسلمین یا اس کے نائب کے لئے مندوب ہے کہ اس غرض سے پسنے والے افراد کو داخلے کی اجازت دے، مذکورہ حالات میں ایسے مضطر کو دار الاسلام میں داخلے کا حق شریعت نے عطا کیا ہے، مسلمان کے حق میں تو ظاہر ہے غیر مسلمین کو پناہ دینے سے اگر ملکی قومی ملی مصالح متاثر نہ ہوں تو انہیں بھی اجازت دی جاسکتی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله" (توبہ:٦)۔

۲۔ **مذہبی آزادی کا حق:** ہر پناہ گزیں کو اس کے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی، اس کو دین چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، فرمان باری ہے:

''لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي'' (بقرہ:۲۵۶)۔

۳۔ نفس کے تحفظ کا حق:

یہ حق عام ہے، شہری، مہاجر اور پناہ گزیں ہر ایک کو ملے گا، خصوصیت سے پناہ گزینوں کے حقوق میں اسکو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پناہ گزینوں کو ثانوی درجہ میں رکھا جاتا ہے، ملکی قومی سطح پر ان کی خاطر خواہ اہمیت و وقعت نہیں ہوتی، حالانکہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان دار الاسلام میں کسی معاہد کو بھی قتل کردیتا ہے تو اسے بھی عند الاحناف قتل کیا جاتا ہے، ہدایہ میں ہے: ''يقتل الحر بالحر... والمسلم بالذمي'' (ہدایہ ۴،۵۶۲ کتاب الجنایات باب مایوجب القصاص)۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة، وإن ريحها توجد من مسيرة أربعين عاما'' (بخاری: کتاب الجزیہ باب اثم من قتل معاهدا بغير جرم)۔

حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کردیا تھا، جرم ثابت ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے اس کو پکڑ لیا اور فرمایا، جس کے لئے ہمارا ذمہ ہو تو اس کا خون ہمارے خون کے مانند ہے ''من كان له ذمتنا فدمه كدمائنا'' (سنن کبری للبیہقی ۸،۶۲ کتاب الخراج باب بیان ضعف الجز الذی ۵۹۳۴ طبع دار الکتب)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک مسلمان نے ایک معاہد کو قتل کردیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسلمان کو قصاصا قتل کروایا ہے الحتار ۱۰/۱۶۵ طبع زکریا)۔

۴۔ **عقل کے تحفظ کا حق:**...... عقل انسان کی ایک بیش بہا نعمت ہے اسی کے ذریعہ وہ دیگر مخلوقات سے ممتاز ہوتا ہے اور اس کو استعمال کرکے ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہتا ہے پناہ گزینوں کو ان کے عقل کا تحفظ ملے گا، چنانچہ کوئی ایسا فعل جس سے ان کی عقل سلب ہو یا اس میں فتور آئے، مثلاً نارچر کرنا، درست نہیں ہوگا اور اس سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا حکم یکساں ہوگا، اس حق پر درج ذیل آیات سے استدلال ممکن ہے: "كذلك يبين الله لكم آياته لعلكم تعقلون" (بقرہ:۲۴۲) "قد بينا لكم الآيات إن كنتم تعقلون" (آل عمران:۱۱۸)۔

۵۔ **عزت و آبرو کے تحفظ کا حق:**...... انسان کی عزت و آبرو اس کا قیمتی سرمایہ ہے، اور فطرت بھی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ کسی آدمی کی آبرو کو تار تار نہ کیا جائے، کیونکہ بسا اوقات اس سانحے کے بعد آدمی اپنی زندگی کو موت پر ترجیح دیتا ہے، چنانچہ بہت واقعات سننے میں آتے ہیں کہ آدمی نے بے عزت ہوکر خودکشی کی طرف قدم بڑھالیا اس لئے شریعت نے پناہ گزینوں کو اپنی عزت و ناموس کے تحفظ کا حق عطا کیا، لہذا ان پر کیچڑ اچھالنا بہتان لگانا درست نہ ہوگا، مسلمان کے حق میں یہ تمام امور ظاہر ہیں، غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہوگا، درمختار میں ہے: ''ويجب كف الأذى عنه ويحرم غيبته كالمسلم'' (الدر المختار مع رد المحتار ۶،۲۸۲ کتاب الجہاد باب المستامن)۔

۶۔ **مناسب گھر بنانے کا حق:**...... پناہ گزینوں کو اس بات کا حق ملے گا کہ وہ رہنے کے لئے مناسب ٹھکانہ اختیار کرلیں، مگر شرط یہ ہوگی کہ اس سے پڑوسی مسلمان کو ضرر لاحق نہ ہو، مسلمانوں کے مکانات کی طرح ان کی بھی حرمت ثابت ہوگی، اس لئے بغیر اجازت اندر جانا شرعاً ممنوع ہوگا، اسی طرح بغیر کسی سبب شرعی کے ان کے مکانات تنگ کرنا ان کی زمین کو دبانا شرعاً درست نہ ہوگا۔

۷۔ **تعامل وتملک کا حق:**...... پناہ گزینوں کو لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا حق ہوگا، اگر انہیں لباس پوشاک، اشیاء خورد ونوش، اور سواری گاڑی کی ضرورت پڑے تو وہ خریدنے کے مجاز ہوں گے اور بیع وشراء کے بعد وہ اس کے مالک بھی، مسلمان کے حق میں تو یہ ظاہر ہے کفار کا بھی یہی حکم ہوگا۔

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے کہ ایک طویل القامت مضبوط ہٹا کٹا مشرک بکریاں ہانکتا ہوا آیا، حضور ﷺ نے فرمایا: یہ بیچنے کے لئے ہے یا عطیہ کے لئے اس نے کہا: بیچنے کے لئے، پھر آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ بکریاں خریدیں (بخاری، کتاب البیوع، باب الشراء والبیع مع المشرکین)۔

۸۔ آزادی کا حق: پیدائشی طور پر ہر شخص آزاد ہے، کوئی کسی کا غلام نہیں، تمام انسان برابر ہیں انسان ہونے کے ناطے کوئی ایسی حرکت روا نہ ہوگی جو انسانیت کی تکریم کے خلاف ہو" ولقد کرمنا بنی آدم وحملناهم في البر والبحر" (اسراء: ۷۰)، اس لئے پناہ گزیں بھی آزاد رہیں گے، اور انہیں یہ حق ملے گا۔

۹۔ **تعلیم کا حق:**...... تعلیم ہر انسان کا بنیادی حق ہے، اسی کے ذریعہ خیر وشر میں تمیز پیدا کرنے کا ملکہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے شریعت نے دوسرے لوگوں کے ساتھ پناہ گزینوں اور مہاجرین کو بھی اس حق سے سرفراز کر رکھا ہے۔

۱۰۔ واپس نہ کئے جانے کا حق:

پناہ گزینوں نے حالات خراب ہونے کی وجہ سے جس خطے سے ہجرت کی ہے، انتشار وفسادات کی حالت میں انہیں ان کے مقامات کی طرف لوٹایا نہیں جائے گا، یہ حق تمام حقوق میں سب سے اہم ہے اور ان کے لئے ہر دل عزیز بھی نبی کریم ﷺ کے مشفق چچا حضرت ابوطالب سے جب قریش نے ان کے بھتیجے کو سپرد کرنے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے منع کرتے ہوئے فرمایا: "امض على أمرك وافعل ما حببت فو الله لا أسلمك" (بدایہ والنہایہ ۳۰۵۶ دار احیاء التراث العربی)۔

پناہ گزینوں کو ان کے خطے میں واپس کرنے سے فقہ اسلامی کا اصول: مستامن کے ذمہ کو نہ توڑنا، کی خلاف ورزی لازم آتی ہے، نیز اس میں غدر اور دھوکہ بھی ہے، اس لئے انہیں واپس نہ کریں گے۔

شاہ نجاشی نے بھی مہاجرین مسلمان کو ابوسفیان کے حوالے کرنے سے منع کر دیا تھا۔

نیز امان کے لئے عربی زبان کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ کسی بھی زبان کا کوئی لفظ امان پر دلالت کرتا ہو تو اس سے امان کا تحقق ہوجاتا ہے، پناہ دینا بھی ایک امان ہے، اس لئے بھی انہیں واپس نہیں کیا جائے گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ان مترس بالفارسية هو الأمان، فمن قلتم له ذلك ممن لا يفقه لسانكم فقد امنتموه" (البدایہ والنہایہ ۱۰۳،۱۰۴،۳ دار الحدیث القاہرہ)۔

اس مسئلہ پر شرح کبیر کے اس جزئیہ سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے، کہ اگر کوئی حربی امان لے کر دارالاسلام میں داخل ہوا ہو اور کفار اس کا مطالبہ کر رہے ہوں اور واپس کرنے کی صورت میں اس کے قتل کر دیئے جانے کا امکان ہو تو اس کو ان کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

"فإن دخل حربي منهم إلينا بأمان فطلبوا مفاداة الأسير بذلك المستأمن وكره ذلك المستامن وقال: إن دفعتموني إليهم قتلوني، فليس ينبغي لنا أن ندفعه إليهم، لأنه في أمان منا" (شرح السیر الکبیر شیبانی ۳،۲۰۰ حیدرآباد دکن)۔

ان حقوق کے علاوہ: حق عدل، حق حیات، جو انسان کے لئے ضروری اور لابدی ہوتے ہیں اور جن کا بیان شہریوں کے حقوق میں گزرا، اس حق سے بھی پناہ گزیں بہرور ہوں گے، کیونکہ یہ حقوق فطری ہیں ان کے بغیر کسی بھی فرد کا زندگی گزارنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔

شہریوں کے خصوصی حقوق:

وہ حقوق جو سیاسی امور سے متعلق ہیں: مثلاً ووٹ دینا، انتخاب میں حصہ لینا، الیکشن لڑنا، قانون ساز اداروں کا ممبر بننا، سیاسی عہدوں پر مامور ہونا، یہ سب

شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں، پناہ گزینوں کے تعلق سے احقر کی ناقص رائے یہ ہے کہ اگر ملک کی مصلحت انہیں اس سے محروم رکھنے کی متقاضی ہو تو انہیں محروم رکھا جاسکتا ہے۔

سوڈان میں اسی پر عمل ہے: اس سلسلے کی قرارداد درج ذیل ہے: ''ولا يجوز لأي لا جئي ممارسة أي نشاط سياسي أثناء وجوده في السودان'' (الجوء في العالمين العربي الاسلامی:٦)۔

ہندیونین میں انگریز یا امریکن یا دوسرے ملکوں کے رہنے والے آباد ہیں انہیں وہ (سیاسی) حقوق حاصل نہیں جو ہندوستانی شہریوں کو حاصل ہیں، مثلاً نہ تو وہ ووٹ دے سکتے ہیں اور نہ وہ کسی الیکشن میں کھڑے ہوسکتے ہیں، اور نہ انہیں سرکاری ملازمت کرنے کا حق حاصل ہے (اصول سیاسیات ۳۴۲، ایم ہاشم قدوائی)۔

٦۔ غیر مسلم ممالک میں شہریت اختیار کرنا:

غیر مسلم ممالک میں شہریت اختیار کرنے کے تعلق سے بنیادی طور پر دو نظریئے پائے جاتے ہیں:

اول: غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرنے سے آدمی اپنے مذہب کا پابند ہو، شعائر اسلام پر عمل کرنے کی اجازت ہو تو ان ممالک میں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، یہ رائے امام محمد عبدہ کی طرف منسوب ہے، ان کا کہنا ہے کہ جو مسلمان یورپی ممالک میں مقیم ہیں انہیں وہاں سے ہجرت کرنا لازم نہیں، کیونکہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے، اس رائے سے اتفاق کرنے والے امام مراغی بھی ہیں، انہوں نے بھی آزادی ملنے کی صورت میں ہجرت کو ضروری قرار نہیں دیا، بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ بعض دفعہ ان مقامات میں مقیم رہنے سے محاسن اسلام کے پھیلنے اور لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، جیسے آج کل انگلینڈ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی صورت حال ہے، کہ لوگوں پر اسلام کی صداقت وحقانیت وا ہورہی ہے اور لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہو کر قلبی وذہنی سکون جو وہاں کا نازک اور حساس مسئلہ ہے، سے بہرہ ور ہورہے ہیں، البتہ اگر وہاں رہنے سے دین واخلاق، مال وعزت پر خوف ہو تو کسی مامون جگہ ہجرت کرنا واجب ہوجائے گا (تفسیر منار ۲۹۱/۵ تفسیر مراغی ۱۳۳/۲۰)۔

دلائل: ''إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي أنفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين في الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئك ماواهم جهنم وساءت مصيرا'' (سورۂ نساء:۹۷)۔

ابتدائی مکہ مکرمہ میں جب دین پر عمل کرنا دشوار تھا تو اس وقت وہاں سے مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفا کی طرف ہجرت نہ صرف فرض تھی، بلکہ ایمان کی علامت سمجھی جاتی تھی، لیکن جن افراد نے قدرت کے باوجود ہجرت نہ کی انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، یعنی وہ ایک گناہ کے مرتکب ہوئے، ان کی موت کے وقت فرشتوں سے جو باتیں ہوئیں اس مکالمے کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ ہجرت اس وقت فرض تھی جب دین پر عمل دشوار ہوگیا تھا، اس لئے جن مقامات میں عمل ممکن ہو وہاں سے ہجرت فرض نہ ہوگی وہاں پر قیام جائز رہے گا۔

''عن الزبير بن العوام رضي الله عنه: قال رسول الله ﷺ: البلاد بلاد الله، والعباد عباد الله فحيثما أصبت خيرا فأقم'' (مسند احمد: مسند الزبير بن العوام ۱۴۲۶) (سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہوں وہاں اقامت کرو)۔

اسلام کے ابتدائی دور میں نبی کریم ﷺ کے فرمانے کی وجہ سے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے حبشہ ہجرت کی اور اسے اپنا مستقر ٹھکانہ بنایا ہے، جبکہ وہاں عیسائی حکومت تھی اور پوری رعایات بھی نصرانیت پر قائم تھی۔

عقلی اعتبار سے بھی ان ممالک میں سکونت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے کسی خطے اور قبیلے کے ساتھ خاص نہیں، اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پیغام کو پوری دنیا میں پھیلائیں اور تبلیغ دین ان ممالک میں سکونت اختیار کئے بغیر ممکن نہیں۔

البتہ حالات کے اعتبار سے کسی مسلمان کے لئے غیر مسلم ملک میں سکونت اختیار کرنے کے بارے میں تفصیل ہوگی اور حالات کے اعتبار سے حکم میں فرق آئے گا اور درج ذیل احکام مرتب ہوں گے: بلاکراہت جائز، مستحب اور موجب اجر وثواب، واجب، مکروہ، حرام۔

اگر کسی مسلمان کو اس کے وطن میں ناحق ایذا پہنچائی جائے یا بلا جرم کے قید وبند کی صعوبتیں دی جائیں یا مال ودولت کو آمرانہ طور پر غصب کیا جائے اور کوئی

مامون جگہ نہ مل سکے تو غیر مسلم ملک میں تین شرط کے ساتھ رہنا جائز ہو سکتا ہے:

۱۔ اس ملک میں دین پر عمل کرنے کی آزادی ہو اور آدمی کو یقین ہو کہ وہ اپنے مذہب کا پابند رہے گا۔

۲۔ ماحول سے اس کے عقیدے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور وہاں رائج فواحش ومنکرات سے بچے رہنا ممکن ہو۔

خصوصاً نوجوان غیر شادی شدہ طبقہ، کیونکہ ان ممالک میں فتنوں کے چوپٹ دروازے کھلے رہتے ہیں۔ آدمی کے پاس اتنا علم ہو کہ وہ شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے پر قادر ہو۔

''قد سئل الشيخ عبد الله بن جبرين ما حكم الحصول على الجنسية الكافرة أجاب بقوله: من اضطر إلى طلب جنسية دولة كافرة كمطارد من بلده، ولم يجد مأوى، فيجوز له ذلك بشرط أن يظهر دينه ويكون متمكنا من أداء الشعائر الدينية، وأما الحصول على الجنسية من أجل مصلحة دنيوية محضة، فلا أرى جوازه'' (اسلام ویب: مركز الفتوى، رقم الفتوى: ۱۸۸۱۴۳ شروط جواز الحصول على الجنسية الكافرة)۔

یا کوئی شخص اپنے معاشی مسئلے میں الجھن کا شکار ہو اور اسے اپنے ملک میں تلاش بسیار کے باوجود جائز ملازمت اور معاشی وسائل حاصل نہ ہوں اور اسے فقر وفاقہ کی نوبت آپہنچے اور غیر مسلم ملک میں جائز ملازمت مل رہی ہو تو مذکورہ بالا تینوں شرائط کے ساتھ وہاں رہنے کی اجازت ہوگی، کیونکہ اہل علم نے مصیبت کے نزول کے وقت اپنے وطن سے نکلنے کی اجازت دی ہے۔

''ذكر ابن العربي في أحكام القرآن عند قوله تعالى: وإذا أخرجه الذين كفروا الآية (توبہ ۴۰) في هذه الآية دليل على جواز الفرار من خوف العدو وترك الصبر على ما ينزل من بلاء الله وعدم الاستسلام المؤدي إلى الآلام والهموم'' (احكام القرآن لابن العربي ۲/۵۱۴، سورہ توبہ: ۴۰ دار الكتب العلميہ بیروت)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حصول رزق بھی شریعت کا ایک حکم ہے اور اسے ایک فریضہ سے تعبیر کیا گیا ہے ''عن عبد الله بن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة، رواه البيهقي في شعب الايمان'' (مشكاة كتاب البيوع باب الكسب وطلب الحلال) اور اپنے ہاتھ کی کمائی کو شریعت بہت پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔

''عن رافع بن خديج قال: قيل يا رسول الله! أي الكسب أطيب؟ قال: عمل الرجل بيده وكل بيع مبرور'' (مشكاة، كتاب البيوع باب الكسب وطلب الحلال)۔

اور اس کے لئے شریعت نے کسی خاص مکان اور مخصوص جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ آزادی دے رکھی ہے کہ جہاں مرضی ہو اپنا رزق تلاش کرو، فرمان باری تعالیٰ ہے: ''هو الذي جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور'' (سورۂ ملک ۱۵)۔

اس حکم میں ایک اور صورت بھی داخل ہو سکتی ہے (یعنی وہاں رہنا جائز ہوگا) جو ہندوستان اور اس جیسے ممالک پر منطبق ہے جہاں پر مسلمان اپنے دین اور جان ومال کے لحاظ سے (عمومی حالات میں) محفوظ ہیں اور جہاں پر انہیں آزادی مکمل طور پر حاصل ہے، اور شعائر دین پر بلا تکلیف وایذاء کے عمل پیرا ہوتے ہیں، مذکورہ بالا حالات میں اس جیسے ممالک میں بھی سکونت اختیار کرنا جائز ہوگا، کیونکہ وہ شرعی ہجرت اس وقت واجب ہوتی ہے جب کسی ملک کے حالات دینی اعتبار سے ناگفتہ بہ ہوں اور وہاں کے مسلمانوں کو اپنا دین ومال وعزت بچانا دشوار ہو اور مذہب پر پابندی لگا دی گئی ہو یا عمل کرنے کی صورت میں شدید جانی ومالی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہو، ہاں اس بات کے استحباب سے قطعاً انکار کی گنجائش نہ ہوگی کہ آدمی وہاں سے ہجرت کر کے کسی مسلم ملک میں پناہ لے لے بشرطیکہ اس کا حصول متعذر نہ ہو، کیونکہ وہاں رہ کر جو دینی مصالح ہو سکتے ہیں، غیر مسلم ملک میں وہ نہیں ہو سکتے، مثلاً خیر ومعروف کی کثرت، منکرات وفحواش کی قلت، علماء ومشائخ کی زیارت، مسلمان کی جماعت میں کثرت پیدا کرنا اور ان کی معاونت، کفار سے عدم اختلاط اور عدم تکثیر سواد کفار وغیرہ وغیرہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ اسلام لانے کے بعد مکہ میں ہی مقیم تھے اور فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کی ہے، اسی طرح حضرت نعیم نحامؓ نے جب مدینہ منورہ ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی قوم بنو عدی ان کے پاس آئی اور کہا: آپ ہمارے درمیان ہی رہیں یہاں سے ہجرت نہ کریں، جو آپ کو تکلیف پہنچانے

کی کوشش کرے گا، ہم اس سے نمٹیں گے، اور جن یتیموں اور بے سہارا عورتوں کی کفالت کرتے تھے کرتے رہیں۔

چنانچہ وہ ہجرت سے رک گئے، پھر اس کے بعد ہجرت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا، تمہاری قوم میری قوم سے بہتر ہے، میری قوم نے مجھے نکالا اور میرے قتل کا ارادہ کیا، اور تمہاری قوم نے نہ صرف تمہیں روکا، بلکہ تمہاری حفاظت کا بھی وعدہ کیا (مغنی: ۱۳/۱۵۱، کتاب الجہاد، مقتعل فی الہجرۃ، طبع دار عالم الکتب الریاض)۔

ابن قدامہ علیہ الرحمہ اپنی مایہ ناز تصنیف "المغنی" میں رقم طراز ہیں: "فالناس في الهجرة على ثلاثة أضرب: أحدها: من تجلب عليه وهو من يقدر عليها، ولا يمكنه إظهار دينه أولا تمكنه إقامة واجبات دينه مع المقام بين الكفار. فهذا تجب عنه الهجرة، بقول الله تعالى: "إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي أنفسهم قالوا: فيم كنتم. قالوا: كنا مستضعفين في الأرض، قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها. فاولئك ماواهم جهنم وساءت مصيرا". وهذا وعيد شديد يدل على الوجوب، الثاني: من لاهجرة عليه، وهو من يعجز عنها: إما لمرض أو إكراه على الإقامة. أو ضعف من النساء والوالدان وشبههم. فهذا لاهجرة عليه، لقول الله تعالى: "إلا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلا، فأولئك عسى الله أن يعفوعنهم. وكان الله عفوا غفورا". ولا توصف باستحباب، لأنها غير مقدور عليها، والثالث: من تستجب له ولا تجب عليه، وهو من يقدر عليها. ولكنه يتمكن من إظهار دينه. وإقامته في دار الكفر فتستجب له ليتمكن من جهادهم، وتكثيرا المسلمين ومعونتهم. ويتخلص من تكثير الكفار ومخالطتهم، ورؤية المنكر بينهم، ولاتجب عليه، لامكان إقامة واجب عينه بدون الهجرة" (المغنى ۱۳، ۱۵۱ كتاب الجهاد، فصل في الهجرة دار عالم الكتب الرياض)۔

مذکورہ عبارت سے یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ مشرکین کے ساتھ رہنے میں جو وعیدیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان مقامات پر محمول ہیں جہاں مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنا مشکل ہو، یا عقیدہ خراب ہونے کا اندیشہ ہو، یا جان و مال عزت آبرو اور اہل وعیال پر خوف ہو۔

حضرت مفتی شفیع علیہ الرحمہ کی عبارت اس سلسلے میں بھی کافی چشم کشا ہے، جس کو نقل کرنا افادیت سے خالی نہیں، بغرض افادیت نقل کی جاتی ہے:

"جس دار الکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض و واجب تو نہیں، مگر مستحب بہر حال ہے، اور اس میں دار الکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دار الفسق جہاں احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی اعلانا ہوتی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، اگر چہ وہاں کے حکمراں کے مسلمان ہونے کی بناء پر اس کو دار الاسلام کہا جاتا ہو، یہ تفصیل حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے تحریر فرمائی ہے، اور قواعد حنفیہ میں کوئی چیز اس کے منافی نہیں، اور مسند احمد کی ایک روایت جو ابو یحییٰ مولی زبیر بن عوام سے منقول ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "البلاد بلاد الله والعباد عباد الله حيثما أصبت خيرا فأقم" (معارف القرآن ۶/۱۱۷، سورۂ عنکبوت ۵۶) (سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہو جائیں وہاں اقامت کرو)۔

مستحب: غیر مسلم ممالک میں رہنے سے مقصود اگر دین کی اشاعت ہو، یا وہاں رہنے والے مسلمانوں کو دین اور احکام اسلام سے روشناس کرانا ہو، اور انہیں ثابت قدمی پر ابھارنا ہو تو یہ نہ صرف مستحب، بلکہ موجب اجر و ثواب بھی ہوگا، کیونکہ بہت سے صحابہ کرام اور تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی نیک مقصد سے اور دینی جذبے سے سرشار ہو کر غیر مسلم ممالک میں سکونت اختیار کی ہے، اور بعد میں یہ چیزیں ان کے مناقب میں شمار ہوئیں۔

واجب: غیر مسلم ممالک میں کوئی مفتی اور مستند عالم ہو اور لوگ اس سے فیض یاب ہو رہے ہوں اور وہ دین اسلام کی ترویج اور احکامات الٰہیہ کی اشاعت کا ذریعہ اور سبب ہو اور اس کے وہاں سے منتقل ہونے میں ضرر لاحق ہو تو ایسے شخص کو ان مقامات پر سکونت اختیار کرنا واجب ہوگا۔

مکروہ: اگر کسی کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل ہیں کہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے تو محض عیش و عشرت یا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت اور سکونت کراہت سے خالی نہ ہوگی، کیونکہ وہاں رائج فواحش و منکرات سے آدمی کے دین و اخلاق متاثر ہونے کا نہ صرف اندیشہ ہوتا ہے، بلکہ صورت حال یہ دیکھی گئی ہے کہ وہاں رہنے سے دینی حمیت کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے آدمی پگھل جاتا ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"فالمشابهة والمشاركة في الأمور الظاهرة توجب مشابهة ومشاكلة في الأمور الباطنة على وجه المسارقة

والتدريج الخفي. وقد رأينا اليهود والنصارى الذين عاشروا المسلمين هم أقل كفرا من غيرهم. كما رأينا المسلمين الذين أكثروا من معاشرة اليهود والنصارى هم أقل إيمانا من غيرهم ممن جرد الاسلام'' (اقتضاء الصراط المستقيم: ۱/۴۸۸، كتاب الأعياد طبع مكتبه الرشيد الرياض)۔

(ظاہری امور میں مشابہت وشرکت باطنی امور میں مشابہت کی طرف آہستہ آہستہ اس طور پر منتج ہوتی ہے کہ آدمی کو اس کا احساس نہیں ہوتا ہم نے مسلمانوں کے ساتھ رہنے والے بہت سے یہود ونصاری کو دیکھا ہے کہ وہ مسلمانوں سے دور رہنے والے یہود ونصاری کے مقابلے میں کافرانہ حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں، یہی فرق یہود ونصاری کے ساتھ رہنے والے اور ان سے علاحدہ رہنے والے مسلمانوں میں ہے کہ ان کے ساتھ رہنے والوں میں دینی حمیت کم ہوتی ہے)۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے، چنانچہ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے، ''من جامع المشرك و سكن معه فإنه مثله'' (ابوداؤد: كتاب الجهاد باب الاقامة بأرض الشرك)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں مشرکین کے درمیان رہنے والے مسلمانوں سے بری ہوں (ابوداؤد کتاب الجہاد باب النہی عن قتل من اعتصم بالسجود)۔

مراسیل ابی داؤد میں حضرت مکحول سے مروی ہے کہ اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو (مراسیل ابی داؤد)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ حصول یابی کی غرض سے مسلمانوں کا دار الحرب میں سکونت اختیار کرنے اور ان کی جماعت وتعداد میں اضافہ کرنے سے دین خطرے میں پڑ جاتا ہے اور یہ ایسا سبب ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوتی ہے، کیونکہ ایسا آدمی جھوٹی گواہی دینے میں نہیں جھجکتا (تفصیل کے لئے دیکھئے: تکملہ البحر الرائق ۷/۱۵۱)۔

بعض صورت میں غیر مسلم ممالک میں رہنا حرام ہے، اس کو مفتی تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے: وہ لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے، یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت دار الاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے، یا اپنی پوری عملی زندگی بود و باش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (فقہی مقالات: ۱/۲۳۵ طبع زمزم دیوبند)۔

۷۔ مسلمان ہی درحقیقت دار الاسلام کا باشندہ ہوتا ہے، لیکن ضرورت کی وجہ سے اگر کفار امان لے کر بلفظ دیگر مستامن بن کر داخل ہونا چاہیں تو اسلام اس سے منع بھی نہیں کرتا، بلکہ فقہاء کرام نے تو یہاں تک صراحت کی ہے اگر وہ امان لے کر ذمی بن کر دار الاسلام میں رہیں گے تو وہ حرمت میں مسلمانوں کے مانند ہو جائیں گے، پہلے آبادی کی قلت کے سبب ان طریق کو اپنانے میں کوئی دقت نہ تھی، مگر اب آبادی کی کثرت، دیانت کے فقدان اور ہر ملک کی اپنی علاحدہ خارجی وداخلی پالیسی کی وجہ سے حالات تبدیل ہو گئے ہیں اور مستقل ''شہریت'' کا مسئلہ سامنے آتا ہے، سوالنامے میں جو ''غیر مسلم کو مسلم ممالک میں بسانے کا مسئلہ ہے، اس کے جواب کے لئے ہم تین امور پر بحث کرتے ہیں: اس سے کسی صحیح نقطے تک رسائی ہو سکتی ہے:

۱۔ امان یا ذمہ اور شہریت میں حقیقت کے اعتبار سے فرق ہے یا دونوں ایک ہیں، صرف الفاظ بدلے ہوئے ہیں؟ اگر ایک ہیں تو غیر مسلموں کو شہریت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۲۔ کس طرح کے کافر کو امان دی جاسکتی ہے؟

۳۔ مملکت اسلامیہ کے کن خطوں میں مستقلاً امان دے کر غیر مسلم کو ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اگر ہم اس پر غور کریں تو دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں لگتا، دونوں ہی یکساں نظر آتے ہیں، صرف الفاظ کا فرق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ شہریت کہتے ہیں کسی فرد کا کسی اقلیم، ملک سے منسوب ہو جانا، جیسے ہندوستانی پاکستانی، امریکی وغیرہ اور اس کے بنیادی تین عناصر ہیں، عوام، ملک اور حکومت، شہریت کا یہ مفہوم شریعت اسلامیہ میں موجود ہے، شریعت اسلامیہ کی ایک اصطلاح ''دار الاسلام'' ہے، اس میں بھی تینوں عناصر ہوتے ہیں، چنانچہ اس کے باشندہ کو ''اہل دار الاسلام'' کہا جاتا ہے، جیسے اس کے مقابل ''دار الحرب'' کے باشندے کو ''اہل دار الحرب'' کہتے ہیں، اب یہ دار السلام کا باشندہ اگر مسلمان ہو تو کوئی اشکال نہیں، اگر غیر مسلم امان کے ذریعہ داخل ہوں اور

ذمی بن کر رہنا چاہیں تو وہ بھی اہل دار الاسلام میں سے ہو جاتے ہیں، فقہاء کی عبارات ملاحظہ ہوں:

''یقول الکاسانی: والذمي من أهل دار الاسلام'' (بدائع الصنائع. کتاب الطهارة، نیز دیکھئے: شرح السیر الکبیر. المغنی. شرح منتهی الارادات)۔

خلاصہ یہ کہ ذمی بھی دار الاسلام کے فرد میں سے ایک فرد ہے ان کے جان و اموال مسلمانوں کے جان و اموال کی طرح محترم ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ امان اور شہریت دینا ایک شئ ہے تو شرعا ان کو شہریت دیجاسکتی ہے اور انہیں دار الاسلام کا شہری بنانا جائز ہوسکتا ہے۔

احمد طہ السنوسی کہتے ہیں کہ ان کو شہری بنانا جائز نہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ: ذمیوں کو وہ حقوق کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتے جو مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں، چنانچہ سیاسی حقوق مسلمانوں کو ملتے ہیں ذمیوں کو نہیں، جزیہ کا ادا کرنا مسلمانوں پر نہیں ہے ذمیوں پر واجب ہے، زکاۃ ادا کرنے کے مکلف مسلمان ہوتے ہیں ذمی نہیں، یہ ساری چیزیں اس بات پر دال ہیں کہ ذمی شہریت نہیں پاسکتا، کیونکہ اگر اس کو شہریت دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سارے حقوق جو مسلمانوں کے ساتھ خاص ہوے ہیں ایک شہری ہونے کے ناطے انہیں بھی ملیں، جیسا کہ آج کی دنیا میں ہورہا ہے۔

لیکن اس دلیل میں بظاہر پختگی معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ جن مسلم ممالک میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان مساوات کا قانون نافذ ہے تو صرف ان حقوق میں مساوات برتی جاتی ہے جن کی بنیاد عقائد و دیانت پر نہیں ہوتی، رہے وہ حقوق جو عقائد و دین پر مبنی ہیں ان میں تفریق برتی جاتی ہے، لیکن یہ چیزیں ذمیوں کو شہری بنانے سے مانع جواز نہیں بن سکتیں، کیونکہ ان ممالک میں بھی بسا اوقات اس کے اپنے شہریوں میں تفریق ہوتی ہے، جب کہ سارے لوگ شہری کہلاتے ہیں، اس لئے ان کو شہری بنانا جائز ہوگا۔

غیر مسلموں کو شہریت دینے کے دلائل:

کافروں کو ذمی بنانے کے بعد مملکت اسلامیہ جو حقوق انہیں فراہم کرتی ہے، یہ سارے وہی حقوق عامہ ہیں جو کسی ملک میں شہری کو عطا ہوتے ہیں، جن حقوق کو حاصل کئے بغیر کسی فرد کا معاشرہ میں زندگی گذارنا مشکل ہوتا ہے، ان میں سرفہرست جان و اموال اور آزادی کا حق ہے انہیں جان کے تحفظ کا حق حاصل ہے، چنانچہ اگر کوئی مسلم کسی ذمی معاہد کو قتل کرتا ہے اس پر بھی حد قصاص جاری ہوتی ہے اور اسے قصاصا قتل کیا جاتا ہے، درمختار میں ہے: ''یجب القود أي القصاص بقتل کل محقون الدم وهو المسلم والذمي، فیقتل... المسلم بالذمي'' (الدر وفی حاشیه)۔

''لاطلاق الکتاب والسنة وحدیث ابن السلمانی و محمد بن المنکدر، أن رسول الله ﷺ أتي برجل من المسلمین قد قتل معاهدا من أهل الذمة، فأمر به فضرب عنقه، وقال: أنا أولى من وفى بذمته أو قال علی رضی الله عنه: انما بذلوا الجزیة لتکون دمائهم کدمائنا وأموالهم کأموالنا'' (الدر المختار مع رد المحتار ۱۶۵،۱۰ کتاب الجنایات طبع زکریا)

اور انکو جسمانی تکلیف پہنچانے سے منع کیا گیا ہے، فرمان نبوی ﷺ ہے: ''ألا من ظلم معاهدا کلفه فوق طاقته، أو أخذ منه شیئا لغیر طیب نفس فأنا حجیجه یوم القیامة'' (ابوداؤد: کتاب الخراج باب فی تعشیر اہل الذمة) وفی حدیث آخر: دمن آذی ذمیا فأنا خصمه، ومن کنت خصمه خصمته یوم القیامة'' (جامع صغیر ۲،۴۷۳)۔

قرآن کریم نے بھی ان پر ظلم کرنے سے منع کیا ہے، چنانچہ امن پسند ذمیوں کے بارے میں فرمایا: "فلا عدوان إلا علی الظالمین" (سورۂ بقرہ: ۹۳)۔

نبی ﷺ کے بعد صحابہ کرام نے بھی ان کے ساتھ خیر خواہی برتی اور ان کے جان و اموال کو محفوظ رکھا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے پوری خلافت میں انہیں تحفظ عطا کیا تھا، اور زندگی کے آخری ایام میں ان کے ساتھ خیر و بھلائی کی وصیت کی۔

حضرت علیؓ کا فرمان اوپر گذر چکا ہے، البتہ اگر وہ کسی جرم کے مرتکب ہوں تو وہ استثنائی حالت ہے بقدر جرم انہیں سزا دی جاسکتی ہے۔

دار اسلام کے وہ علاقے جہاں ان کا گذرنا یا اقامت اختیار کرنا، مثلاً حرم مکہ و مدینہ علی حسب اختلاف العلماء ممنوع ہو، ان مقامات کے علاوہ وہ آنے جانے کے مجاز ہوں گے حتی کہ اگر بغرض تجارت دار الحرب جانا چاہیں اور ان کے لوٹنے کا اطمینان ہو تو وہاں بھی جانے کی اجازت ہوگی، علامہ شامی لکھتے ہیں: ''قلت: والمراد الخروج علی وجه اللحاق بهم، وإذ لو خرج لتجارة مع آمن عوده عادة لا یمنع کالمسلم'' (ردالمحتار

۶،۲۸۳ کتاب الجہاد باب المستامن زکریا)۔

البتہ مستقل رہائش کے تعلق سے حنفیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اقامت کی وجہ سے مسلمانوں کو دقت و پریشانی ہو تو انہیں مصر سے علاحدہ کسی مخصوص جگہ پر بسایا جائے گا اور اگر پریشانی نہ ہو تو انہیں مسلمانوں کے بستیوں میں رہنے کی اجازت ہوگی، تاکہ وہ لوگ محاسن اسلام کو قریب سے دیکھ سکیں (الاشباہ مع الحموی ۳/۹۹ ۳ الفن الثالث، احکام الذمی دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

اسی طرح انہیں مکانات کا تحفظ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ مکان انسان کے رازوں کا امین ہوتا ہے، اور یہیں وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ چین وسکون کی زندگی گذارتا ہے، اس لئے فطری بات ہوتی ہے کہ ان مکانات کی حرمت ہو، اس وجہ سے شریعت نے بھی ذمیوں کے مکانات کی حرمت کو برقرار رکھا ہے، چنانچہ بغیر اجازت اور رضامندی کے ان کے گھروں میں داخلہ ممنوع ہوگا، قرآن کریم نے دوسرے کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے سے منع کیا ہے، اور عقد ذمہ کی وجہ سے وہ بھی مسلمانوں کے مثل ہوئے تو انہیں آیات سے ان کے مکانوں میں داخلہ بغیر اجازت ممنوع ہوگا (سورۂ نور: ۲۷، ۲۸)۔

اسی طرح اسلام نے ان کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھا ہے اور انہیں زبردستی دین میں داخل نہیں کیا جاتا ہے، ''لا اکراہ فی الدین'' (سورۂ بقرہ: ۲۵۶)، البتہ انہیں دین کی دعوت، اسلام کے محاسن حکمت ودانائی کے ساتھ بتائے جاتے رہیں گے، نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس وثیقے میں آپ نے درج ذیل مضمون بھی تحریر کروائے، ''ولنجران و حاشيتها جوار الله وذمة محمد النبي رسول الله ﷺ على أموالهم وأنفسهم وأرضهم وملتهم'' (کتاب الخراج لأبي يوسف: ۷۲ فصل قصة نجران وأهلها دار المعرفة)۔

اسی طرح انہیں وہ سارے معاشرتی حقوق دیئے گئے ہیں جو کسی ملک میں رہنے والے باشندوں کو ملتے ہیں، مثلاً ان کے ساتھ بیع وشراء کرنا جائز ہے، بیمار پرسی اور عیادت جائز ہے، ضیافت کرنا جائز ہے، اس طرح کے حقوق کو ابن نجیمؒ نے ''الاشباہ'' میں ''الفن الثالث'' میں ''احکام الذمی'' کے عنوان سے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''ولا تكره عيادة جاره الذمي... ولا تكره ضيافة'' (الاشباہ ۲،۴۰۲ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

اسی طرح شریعت نے انہیں تعلیمی آزادی دے رکھی ہے، چنانچہ وہ اپنی اولاد کو اگر اپنے دین ومذہب کے موافق تعلیم دیں تو شریعت ان پر قدغن نہیں لگاتی۔

مسلمانوں نے جب خیبر فتح کر لیا تو مال غنیمت میں تورات کے کچھ نسخے ملے تھے، آپ ﷺ نے انہیں یہودیوں کو لوٹانے کا حکم دیا تھا۔

اسی طرح اظہار رائے کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور حکومت کی عام سہولیات سے بھی وہ متمتع ہوتے ہیں، مثلاً مواصلات، آبی وسائل وغیرہ، اور ضرورت کے موقع پر بیت المال سے ان کی کفالت بھی کی جاتی ہے، چنانچہ سعید بن مسیبؒ سے مروی ہے کہ ایک یہودی کے گھر پر صدقہ کیا تھا اسی طرح جب مکہ میں قحط پڑا تو آپ ﷺ نے کچھ چیزیں وہاں بھجوائیں تھیں، تاکہ ضرورت مندوں پر انہیں خرچ کر دیا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ جب دمشق سے واپس آرہے تھے تو ان کا گزر کچھ مجذوم نصاری کے پاس سے ہوا تھا تو آپ نے ان پر صدقہ کرنے اور کچھ وظیفہ مقرر کرنے کا حکم دیا تھا (احکام الذمین ۱۰۲۔ ۱۰۴ طبع موسسۃ الرسالۃ)۔

درمختار میں ہے: ''ولا شئ لذمي في بيت المال إلا أن يهلك بضعفه نيعطيه ما ليسدجوعته'' (الدر المختار مع رد المحتار ۶،۳۵۲ کتاب الجہاد باب العشر والخراج طبع زکریا)۔

اسی طرح شریعت انہیں دار الاسلام میں معاشی اور تجارتی سرگرمی کی اجازت دیتی ہے، فقہاء کی عبارات سے واضح ہے کہ ذمی معاملات وتجارات اور تمام تصرفات میں مسلمانوں کے مانند ہیں، علاوہ ان چند امور کے جنہیں مستثنی رکھا گیا ہے، مگر خمر وخنزیر کی ان کے اپنے علاقے میں بیع وشراء کرنا۔

ثانیا:

وہ عہدے جن میں دیانت لازمی نہیں ہوتی ان عہدوں پر ذمیوں کو مامور کیا گیا ہے، اس سلسلے کے ہم یہاں چند نظائر نقل کر رہے ہیں۔

۱۔ غزوہ بدر کے موقع پر ستر کفار قیدی بنائے گئے تھے، جو فدیہ دے کر خلاصی حاصل نہ کر سکے تھے، آپ ﷺ نے انہیں انصار کے دس دس بچوں کو فن کتابت سکھانے پر مامور کیا تھا۔

سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ ھ میں مکہ کا رخ کر کے ذوالحلیفہ پہنچے تھے تو ایک کافر کو قریش کے احوال معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا، حالانکہ یہ خطرناک کام تھا، مگر آپ کو اس پر اعتماد تھا، اس لئے یہ نازک ذمہ داری اس کو سونپی تھی، اس لئے معلوم ہوا کہ جس پر اطمینان ہو اس کو عہدہ دیا جاسکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے پاس قیساریہ کے قیدی آئے ان میں بعض کتابت جانتے تھے تو آپ نے ان کو سارے مسلمانوں کو سکھانے پر مامور کیا تھا۔

سلیمان بن عبدالملک نے رملہ فلسطین میں مسجد کی تعمیر کے دوران ایک نصرانی جس کا نام البطریق تھا مسجد کی نگرانی اور نفقات پر مامور کیا تھا۔

مسلمانوں نے جب مصر فتح کرلیا تو بازنطینی عاملوں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا گیا۔ حضرت معاویہؓ کا کاتب ''سرجون'' نامی نصرانی تھا۔ اموی دور حکومت میں ''اثناسیوس'' نامی نصرانی حکومت کے کلیدی عہدے پر فائز رہ چکا ہے، حتی کہ کوئی بھی رجسٹران کے ناموں سے خالی نہیں رہا ہے۔ عباسی دور حکومت میں ابوجعفر المنصور کے زمانے میں ''موسیٰ'' نامی یہودی جاسوس رہ چکا ہے، اسی وجہ سے مغرب کے متعصب مؤرخ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

ہمیں بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم اسلامی تاریخ میں غیر مسلموں کو حکومت کے مناصب پر دیکھتے ہیں (احکام الذمیین ۷۹۔۸۰)۔

ان تمام حقوق اور واقعات سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ شرعا ان کو شہریت دی جاسکتی ہے، شرعا ناجائز نہیں ہے، البتہ فی زمانا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو آباد کیا جاسکتا ہے، علاحدہ مسئلہ ہے، اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

دوسری بحث: کس طرح کے کافروں کو امان دی جائے گی؟

یہود و نصاریٰ جو اہل کتاب ہوں ان سے عقد ذمہ کرنا (انہیں شہریت دینا) جائز ہے، اور اس کا ثبوت نص قرآنی ہوتا ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں (بدائع ۹/۴۲۸، کتاب السیر دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

مجوسیوں کو بھی ذمی بنانا جائز ہے (بدائع ۹/۴۲۸۔۴۳۳ دار الکتب العلمیہ)۔

مشرکین عرب کو ذمی بنانا جائز نہیں ان کے سامنے دو راستے ہیں، یا تو وہ اسلام قبول کرلیں، ورنہ ان سے جہاد ہے، ان سے جزیہ لینا جائز نہیں، کیونکہ سورۂ توبہ آیت/۵ مشرکین عرب کے بارے میں آئی ہے، ان سے قتال کا حکم ہے، ان کے راستے کو چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے، ہاں اگر وہ توبہ کرلیں، یعنی مسلمان ہوجائیں تو راستہ چھوڑ دیا جائے گا (بدائع ۹/۴۲۸ کتاب السیر بیان ما یتعرض لہ وما لا یتعرض لہ دار الکتب العلمیہ)۔

مرتدین سے بھی عقد ذمہ کرنا جائز نہیں، ان کے سامنے صرف دو راستے ہیں یا تو وہ دین کی طرف لوٹ جائیں یا وہ قتال کے لئے تیار ہوجائیں (ہامش البدائع ۹، ۴۲۹ کتاب السیر دار الکتب العلمیہ)۔

تیسری بحث: کن خطوں میں مستقلا امان دی جاسکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کرام نے دار الاسلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، حرم، حجاز اور ان کے علاوہ کے مقامات، حرم میں غیر مسلموں کا اپنا وطن اور مسکن بنانا قطعا جائز نہیں ہے۔

حجاز: اس سے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمامہ اور ان کے دیہات طائف خیبر وغیرہ مراد ہیں، اس میں ذمیوں کو سکونت اختیار کرنا جائز نہیں، یہ ائمہ اربعہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے (بدائع ۹/۴۵۰ کتاب السیر طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا يجتمع دينان في جزيرة العرب'' (مسند احمد ۶.۲۷۵ طبع مکتبہ میمنیہ)۔

''وقال أيضا: لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب حتى لا أدع إلا مسلما'' (كتاب الجهاد والسير. اخراج اليهود والنصارى من جزيرة العرب)۔

ان دونوں کے علاوہ جو زمین ہے وہاں مستقلا اقامت اختیار کرنا جائز ہوگا، علامہ کاسانی نے ذمیوں کے پورے احکام بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''هذا الذي ذكرنا حكم أرض العجم'' (بدائع ۹.۴۵۱ کتاب الجہاد دار الکتب العلمیہ)۔

خلاصہ: ایسا غیر مسلم جو مرتد نہ ہواسے حجاز کے علاوہ میں شہریت دینا جائز ہوگا، البتہ اگر ان کو مستقل شہری بنانے سے اسلام کا نقصان ہو یا مسلمانوں کو ضرر ہو یا ملکی قومی مذہبی مصالح متاثر ہوں تو ان کو شہری نہیں بنایا جائے گا۔

نقشہ:

حقوق

قدرتی حقوق — اخلاقی حقوق — قانونی حقوق — معاشی حقوق

حیات — مساوات — حصول انصاف — عمل — مناسب اجرت کا حصول — معاہدہ

شہری حقوق — سیاسی حقوق

مال — خاندانی زندگی — آزادی تحریر وتقریر — مذہبی آزادی — قانونی برابری — حصول تعلیم — تاسیس بزم — سرکاری علاج ومعالجہ — آمد ورفت

ووٹ دینا — الیکشن لڑنا — سرکاری ملازمت کا حصول — سیاسی انجمن کا قیام — عدالتی چارہ جوئی — حکومت کے خلاف جدو جہد یا مخالفت کرنا

اسلام میں شہریت کی بنیادیں

مولانا محمد فخر عالم نعمانی[1]

شہریت کی تعریف:

شہریت موجودہ قانون کی نگاہ میں فرد اور حکومت کے درمیان ایک مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر ایک دوسرے پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے، یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس حکومت کی طرف منسوب ہوجاتا ہے، جہاں کا وہ شہری ہے، مثلاً ہندوستانی، پاکستانی، امریکی اور سعودی وغیرہ۔

شہریت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ پیدائشی شہریت: جس ملک میں بچہ کے والدین رہتے ہیں پیدا ہونے والے بچے کو بلا اختیار اس ملک کی شہریت مل جائے۔

۲۔ اختیاری شہریت: وہ ہے، جو کوشش کر کے حاصل کی جائے، مثلاً اس ملک کی کسی لڑکی سے شادی کرلی جائے یا حکومت سے درخواست کر کے شہریت حاصل کی جائے۔

جیسے امریکی آئین کی چودھویں ترمیم ۱۸۶۸ء کے مطابق ہر امریکی شہری کو اپنی ریاست کی شہریت اور وفاق کی شہریت حاصل ہے، امریکن والدین کی اولاد، خواہ وہ کہیں پیدا ہو امریکی شہری ہی ہوگا، اسی طرح امریکہ میں پیدا ہونے والا بچہ، خواہ اس کے والدین غیر ملکی ہوں، امریکی ہوگا، جو لوگ امریکہ کی شہریت اختیار کرنا چاہتے ہیں انہیں انگریزی زبان امریکی تاریخ اور طرز حکومت کے اصولوں سے واقف ہونا، دس سال تک امریکہ میں مقیم رہنا اور یہ حلف لینا پڑتا ہے کہ وہ گذشتہ دس سال سے کسی ایسی تنظیم سے منسلک نہیں ہے جس کا مقصد امریکی حکومت کا تختہ الٹنا ہے (قوانین عالم ۲/۵۲)۔

پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد بھی سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے۔ یہ مختلف ملکوں کے اپنے اپنے معاہدات کی روشنی میں طے پاتا ہے کہ کس ملک کے شہری کے ساتھ کیا معاملہ روا رکھا جائے، پھر جب کوئی شخص کسی غیر اسلامی ملک کا شہری بن جاتا ہے تو اس کو وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہوجاتے ہیں جو ایک پیدائشی شہری کو حاصل ہوتے ہیں، تشکیل حکومت کے عمل میں شرکت کرسکتا ہے، اقتصادی مسابقت میں حصہ لے سکتا ہے، ملازمت حاصل کرسکتا ہے، زمین و جائداد خرید سکتا ہے اور تمام وہ ضمانتیں جو بحیثیت شہری ملنی چاہئے مل جاتی ہیں، اسی کے ساتھ اس پر بعض واجبات اور مطالبات بھی عائد ہوتے ہیں جن کی تکمیل بحیثیت فرد اس کو کرنی پڑتی ہے، فوجی خدمات اس سے لی جاسکتی ہیں، ملک کے آئین کا احترام اور اس کی اطاعت لازم ہوجاتی ہے، مقررہ ٹیکسوں کی ادائیگی کا وہ پابند ہوتا ہے، وطنیت کا یہ تصور اور وطن کے ساتھ اس قسم کی وابستگی اسلامی تعلیمات کا جزء لاینفک رہی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانثار مہاجرین صحابہؓ نے جب مکہ کو خیر باد کہا اور مدینہ کو اپنا وطن قرار دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی محبت دل میں جاں گزیں ہونے کی دعا فرمائی (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۶۷، حدیث نمبر: ۷۰ ادارابن کثیر بیروت ۱۹۸۷)۔

شہریت کی بنیاد:

۱۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیث پاک میں کوئی روایت تو موجود نہیں ہے، البتہ فقہاء کرام کی چند جزئیات سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے، اس فقہی جزئیہ کو ہم اصول کے طور پر اپنا سکتے ہیں۔

علامہ کاسانیؒ مستامن کی بحث میں لکھتے ہیں کہ اگر وقتی قیام کے ارادہ سے دار الاسلام میں آنے والا شخص (مستامن) ایک مخصوص مدت تک قیام کرلے، یا وہاں کے متوطن سے شادی کرلے، یا کوئی خراجی زمین خرید لے تو اس کو ذمی، یعنی دار الاسلام کا باقاعدہ شہری قرار دیا جائے گا (البدائع الصنائع ۶/۸۷، مکتبہ زکریا

[1] خادم تدریس والافتاء جامعہ ربانی، منوراشریف، سمستی پور۔

دیوبند ۱۹۹۸، الاحکام السلطانیہ للماوردی رص ۱۴۶)۔

اسی طرح وطن کے سلسلہ میں جو تفصیلات فقہی کتابوں میں مذکور ہیں ان تفصیلات سے بھی اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔

''وطن أصلى وهو مولد الرجل والبلد الذى تأهل به'' (المحيط البرهانى فى الفقه النعمانى ۲،۳۵،۳۶، دار الكتب العلميه. بيروت لبنان ۲۰۰۴ء) (وطن اصلی مقام پیدائش ہو یا اس نے وہاں شادی کی ہو)۔

''أو بلدة أخرى اتخذهادارا وتوطن بها مع أهله وولده وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها'' (بدائع الصنائع ۱،۲۸۰، مکتبہ زکریا دیوبند ۱۹۹۸) (کسی مقام پر اس نے اپنا گھر بنالیا ہو اور اہل وعیال کے ساتھ وہاں مستقل بود وباش کا ارادہ کرلیا اور وہاں سے واپسی کا کائی ارادہ نہ ہو)۔

فقہاء کرام کی ان جزئیات سے تین باتیں سامنے آتی ہیں جن کو شہریت کے مسئلہ میں بنیاد بنایا جاسکتا ہے:

۱۔ ولادت، یعنی اس جگہ اس کی پیدائش ہوئی ہو، ۲۔ نکاح، یعنی جہاں کسی شخص کا وہاں کی کسی شہری خاتون سے رشتہ ازدواج قائم ہوا ہو، ۳۔ مستقل بود وباش کا ارادہ، یعنی جس جگہ مستقل رہنا چاہتا ہو واپسی کا ارادہ نہ ہو۔

حضرت علامہ محمود ابن مازہ بخاری شہید متوفی ۶۱۶ھ نے اپنی کتاب ''المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی'' میں ذکر فرمایا ہے کہ یہ تینوں بنیادیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں ان میں سے ایک بھی بنیاد موجود ہو تو شہریت حاصل ہوجائے گی، اس بنیاد پر اگر کسی شخص کو دو الگ الگ مقامات پر ان میں سے کوئی ایک چیز حاصل ہوجائے تو اسے دوہری شہریت حاصل ہوگی اور دونوں جگہیں اس کے لئے وطن اصلی ہوں گی۔

''وإن كان له أهل بلدة فاستحدث بلدة أخرى أهلا فكل واحد منهما وطن أصلى، وروى أنه كان لعثمان رضى الله عنه أهل بمكة وأهل بمدينة، وكان يتم الصلوة بهما جميعا'' (المحيط البرهانى ۲،۳۶)۔ (اگر کسی کے اہل و عیال ایک شہر میں ہوں پھر دوسرے شہر میں اس نے شادی کرلی تو دونوں شہروں کی شہریت اسے حاصل ہوں گی، روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ایک بیوی مکہ معظمہ میں رہتی تھیں اور دوسری اہلیہ مدینہ منورہ میں اور دونوں جگہ وہ نماز پوری پڑھتے تھے)۔

مسلم ملک میں کسی بیرونی مسلمان کو شہریت دینے کا حکم:

اسلام کا شہری اصول عام حالات کے لئے یہی ہے کہ آنے والے مہاجرین کو اسلامی حکومت قبول کرے، واپس نہ کرے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''يايها الذين آمنو إذا جاءتكم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن الله اعلم بإيمانهن فإن علمتموهن مومنات فلا ترجعوهن إلى الكفار'' (سورۂ ممتحنہ:۱۰) اگرچہ یہ حکم مخصوص پس منظر میں، یعنی صلح حدیبیہ کے موقع پر دیا گیا تھا، لیکن حنفیہ کے نزدیک صلح حدیبیہ کا واقعہ دائمی نہیں تھا وقتی تھا بعد میں اس کو منسوخ کردیا گیا، صلح منسوخ ہونے پر یہی آیت دال ہے (فتح القدیر ۵؍۴۶۰، دار الفکر بیروت لبنان ۱۹۷۷)۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اسلامی ریاست غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے معاملہ میں کوئی معاہدہ کرلے جس کی رو سے دوسرے ملکوں کے مہاجرین کو اسلامی حکومتیں اپنے یہاں مستقل سکونت نہ دے سکتی ہو تو یہ شرط حنفیہ کے نزدیک باطل ہے اور اس طرح کے کسی معاہدہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے (فتاوی ہندیہ جلد ۲؍۱۹۷ دار الفکر بیروت لبنان)۔

اسی طرح قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کریمہ: ''إن الذين توفاهم الملائكة ظالمى أنفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين فى الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئك ماواهم جهنم وسات مصيرا'' (سورۂ نساء:۹۷) اس آیت کریمہ کی عبارت النص ودلالۃ النص جہاں دار الکفر کی اقامت کو جرم قرار دے رہی ہے وہیں اشارۃ النص اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کو مہاجرین کے لئے دار الاسلام میں قیام کی گنجائش کو بھی ثابت کررہی ہے، اسلام نے ہمیشہ دار الکفر میں قیام کو ناپسند کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا تساكنوا المشركين ولا تجامعوهم فمن ساكنهم أوجامعهم فهو مثلهم'' (ترمذى كتاب السير باب ما جاء فى كراهيته المقام بين اظهر المشركين ۱،۲۸۹) (مشرکوں کے ساتھ رہن سہن اور اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کرو جو ان کے ساتھ رہن سہن یا اٹھنا بیٹھنا کرے گا

انہیں کی طرح سمجھا جائے گا)۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله'' (ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الاقامة بارض الشرك ۲،۳۷ مکتبه رحیمیه دیوبند) (جو شخص مشرکوں کے ساتھ رہنا سہنا کرے گا اسی کے مثل ہوگا)۔

ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ''انا بریئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا يارسول الله! ولم؟ قال: لاتراءى ناراهما'' (ترمذی کتاب السیر باب ما جاء فی کراهية المقام بين اظهر المشركين ۱،۲۸۹) (میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دونوں اتنی دور رہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکے)۔

اسی طرح دار الہجرت پہلی اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد مختلف علاقوں میں اسلام قبول کرنے والے لوگوں کو دار الہجرت منتقل ہونے کی باقاعدہ دعوت دی گئی، حضرت سلیمان بن بریدہ کی روایت جو مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔

''إذا لقيت على والله من المشركين فادعهم إلى ثلاثة خصال أو خلال فأيتهن أجابوك فاقبل منهم وكف عنهم ثم أدعهم إلى الاسلام، فإن أجابوك فاقبل منهم وكف عنهم، ثم ادعهم إلى التحول من دراهم إلى دار المهاجرين وأخبرهم أنهم فعلوا ذلك فلهم ما للمهاجرين وعليهم ما على المهاجرين'' (مسلم شريف كتاب الجهاد باب تامير الامام الامراء على البعوث وصية اياهم ۲،۸۲)۔

(غیر مسلموں سے سامنا ہو تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو، اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی قبول کرلیں تو جنگ سے گریز کرو ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کرلیں تو جنگ سے گریز کرو، پھر ان کو اپنے ملکوں سے دار الہجرت منتقل ہوجانے کی دعوت دو اور ان کو بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کو وہی ملے گا جو مہاجرین کو ملتا ہے اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو مہاجرین پر عائد ہوتی ہیں)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مملکت اسلامی کے سربراہان پر مسلم مہاجرین کی ذمہ داری کو ثابت کررہی ہے، کیونکہ ہجرت کے حکم سے قبل مقام ہونے کا وجود شرط ہے، بغیر مقام ہجرت کے ہجرت کا حکم بے معنی ہے۔

۳۔ مسلم ملک میں مسلم پناہ گزیں کا حکم:

سیاسی پناہ گزینوں کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ سیاسی پناہ کا قیام وقتی ہو، ۲۔ سیاسی پناہ گزین کا قیام وقتی نہ ہو مستقل ہو، عام طور پر سیاسی پناہ گزینوں کا قیام کسی ملک میں وقتی ہوتا ہے، جب تک ان کے ملک کے حالات خراب ہوتے ہیں تب تک وہ پناہ لئے رہتے ہیں، جیسے ہی ان کے ملک کے حالات اچھے ہوتے ہیں وہ پناہ گزین اپنے ملکوں کو واپس لوٹ جاتے ہیں، اگر کسی طرح کا کوئی مسلم پناہ گزین اپنے ملک کے مسائل کی بنیاد پر کسی مسلم ملک میں وقتی قیام کے ارادہ سے پناہ حاصل کرلے تو اس کو عام شہری کا درجہ نہ دے کر اس کے ساتھ سیاسی پناہ گزینوں جیسا برتاؤ کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، اس کی مثال عہد نبوت میں موجود ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے بارے میں جو مدینہ سے باہر قیام پذیر تھے، ارشاد فرمایا: ''فإن أبوأن يتحولوا منها فأخبرهم أنهم يكونون كأعراب المسلمين يجرى عليهم حكم الله الذى يجرى على المؤمنين. ولا يكون لهم فى الغنيمة والفئ شئ. إلا أن يجاهد وامع المسلمين'' (مسلم شريف كتاب الجهاد باب تامير الامام الامرا على البعوث ۲،۸۲)۔

(اگر یہ لوگ دار الہجرت میں واپس ہونے پر رضامند ہوں تو ان کو خبردار کردو کہ وہ اعرابی مسلمان کے درجہ میں ہوں گے اور حکم الہی کے اسی طرح پابند ہوں گے جس طرح دیگر مسلمان پابند ہیں، مگر ان کو مال غنیمت اور فئی میں کوئی حصہ نہیں ملے گا جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت نہ کریں، نیز اسلام کا متفقہ قاعدہ ہے کہ ''المغنم بالمغرم فى الإسلام'' (درر الحکام شرح مجلة الاحكام ۱،۹۰) (نفع نقصان کے ساتھ جڑا ہوا ہے)۔

سیاسی پناہ گزیں کا قیام مستقل ہو:

لیکن اگر کوئی مسلم پناہ گزیں مستقل طور پر اپنا ملک خیرباد کہہ کر مسلم ملک میں آباد ہونا چاہتے ہیں تو اس کو شہریت سے محروم کرنا اور مستقل شہریوں کا درجہ نہ دینا ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرنا، پناہ گزینوں جیسا معاملہ کرنا، قدیم باشندوں جیسا سلوک نہ کرنا درست نہ ہوگا، فرمان نبی کے خلاف ہوگا، کیونکہ مذکورہ روایت

میں ''إلا أن يجاهد واﻣﻊ المسلمين''کی شرط ہے، یعنی اگر کوئی مسلم پناہ گزیں مستقل شہری بن کر مجاہدوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہو (یعنی ملک کے مفاد میں حصہ لے) تو اس کو بھی ایک عام شہری کی طرح تمام سہولیات فراہم کی جائیں گی، قرآن کریم میں بھی اس کا واضح ثبوت موجود ہے: ''ان الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض'' (سورۂ انفال:۷۲)۔

''والمومنين والمؤمنات بعضهم اولياء بعض'' (سورۂ توبہ:۷۱)۔

حدیث شریف میں ہے: ''من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبيحتنا فهو المسلم له ما للمسلم وعليه ما على المسلم'' (صحیح بخاری شریف ۱؍۱۵۳، حدیث نمبر ۳۸۵ دار ابن کثیر بیروت ۱۹۸۷ء) (جو ہماری طرح نماز پڑھے ہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے، اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمان کو حاصل ہے اور اس پر وہ تمام واجبات عائد ہوں گی جو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں)۔

۶۔ مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ملک میں شہریت کا مسئلہ: متقدمین فقہاء نے مسلمانوں کو ایک غالب قوت تسلیم کرتے ہوئے غیر مسلموں کے مسائل ومعاملات پر گفتگو کی اور مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی جو نوعیت ممکن تھی اسی کے مطابق احکام کا استخراج کیا، اسی لئے عام فقہی کتابوں میں بالعموم ایک ہی انداز کی بحثیں ملتی ہیں، اس دور میں یہ کہاں سوچا جاسکتا تھا کہ تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائیگی اور مسلمان پھر کبھی مدینہ کے ابتدائی دور یا حبشی اور مکی دور میں پہنچ جائیں گے، حالانکہ حدیث پاک میں اشارہ کردیا گیا تھا کہ ''بدأ الاسلام غريبا وسيعود كما بداء'' (رواہ مسلم. مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنہ ص۲۹) (یعنی دین کا آغاز جس غربت کے ساتھ ہوا ہے وہ تاریخ پھر اپنے اپ کو دہرائے گی)۔

غیر مسلم ملکوں کی قسمیں:

فقہاء نے غیر مسلم ملکوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور ان تینوں کے الگ الگ احکام بیان کئے ہیں: ۱۔ پہلی قسم ان غیر مسلم ممالک کی ہے جہاں بحیثیت مسلمان کسی شخص کا قیام سخت مشکل ہو، دین پر قائم رہ کر وہاں رہنا ممکن نہ ہو، ایسے ملکوں میں جانا وہاں قیام کرنا باتفاق فقہاء کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۳؍۲۲۸، المدونۃ الکبری ۵؍۱۵۶۵، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل ۱۶، قاموس الفقہ ۵؍۳۳۳)۔

دوسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے جہاں کھل کر دین پر عمل کرنے کی آزادی نہ ہو، جان ومال عزت وآبرو پر خطرات کے بادل منڈلاتے رہتے ہوں، مگر مسلمانوں کے لئے کوئی دوسری جائے ہجرت نہ ہو، یا ہجرت کے اخراجات کے متحمل نہ ہوں، ایسے مسلمانوں پر باتفاق فقہاء ہجرت واجب نہیں ہے اور ان ملکوں میں اقامت ان کے لئے باعث گناہ نہیں ہے (احکام القرآن ۳؍۲۲۸)۔

۳۔ تیسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے جہاں مسلمانوں کے لئے بحیثیت ایک اقلیت کوئی خطرہ نہ ہو، مذہبی آزادی حاصل ہو سکے یا اس کی نسلوں کے دین وایمان کو مکمل تحفظ فراہم ہو، ایسے ملکوں میں اقامت اختیار کرنے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایسے ملکوں میں جانا یا رہنا بھی جائز نہیں، اگر قدرت میسر ہو تو مقیم مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے، یہ رائے فقہاء مالکیہ کی ہے اور شافعیہ کا ایک قول بھی اسی کے مطابق ملتا ہے (المدونۃ ۵؍۱۵۶۵)۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ایسے ملکوں میں جانا قیام کرنا درست ہے اور مقیم مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے، یہ رائے حنفیہ اور حنابلہ کی ہے اور شافعیہ کا صحیح مسلک بھی یہی ہے (احکام القرآن للجصاص ۲؍۳۰۵، اعلاء السنن للتھانوی ۱۲؍۳۶۱)۔

دور حاضر کے علماء کے بھی نظریات مختلف ہیں: ۱۔ علماء کا ایک طبقہ عدم جواز کا قائل ہے، ۲۔ اور دوسرا طبقہ جواز کا قائل ہے۔

الف۔ ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے اور ایسے تمام حضرات پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کے قائل ہیں جو غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں (فتاوی الامام محمد رشید رضا ۵؍۱۷۵۰)۔

ب۔ دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا، بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے (مجلہ فقہ اسلامی ۲؍۱۱۵۶)۔

۲۔ پھر جواز کے قائلین میں بھی دو رائیں ہیں: الف۔ ایک کی رائے یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بوقت ضرورت ہے، عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی اور

رکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے، مصری دارالافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے (فتویٰ نمبر ۸۸۹، ۲۰۰۰ء)۔

ب۔ دوسری رائے اصلاً جواز کی ہے، البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں فرق ہوسکتا ہے، عصر حاضر کے جمہور علماء کی یہی رائے ہے، اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہی ہیں: ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ڈاکٹر محمد رفت عثمانی، ڈاکٹر وہبہ زحیلی، مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مفتی اختر امام عادل قاسمی وغیرہ۔

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جو حضرات عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے موقف کی درج ذیل دلیلیں ہیں:

۱۔ ''ألم ترإلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك، وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالا بعيدا'' (سورۂ نساء: ۶۰)۔

طاغوت سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو، غیر مسلم ملک میں شہریت حاصل کرنا گویا باختیار اسلامی نظام قانون سے نکال کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف ہے (فتاویٰ محمد رشید رضا مصری ۵/ ۱۷۵۵)۔

۲۔ بعض احادیث سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے جن میں صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان اقامت وسکونت سے منع کیا گیا ہے، ''لاتساكنوا المشركين ولاتجامعوهم فمن ساكنهم أو جامعهم فهو مثلهم'' (ترمذی باب ما جاء فی کراهية المقام کتاب السیر ۱،۲۸۹) (مشرکوں کے ساتھ نہ رہو اور نہ ان کے ساتھ اکٹھے ہو جو ان کے ساتھ رہے گا یا اکٹھے ہوگا وہ انہیں کی طرح سمجھا جائے گا)۔

۳۔ ''أنا بري من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين'' (ترمذی کتاب السیر باب ما جاء فی کراهية المقام بين اظهر المشرکین ۱،۲۸۹) (میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو)۔

جب غیر اسلامی ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو ان ملکوں کے چھوڑ دینے کا حکم دیا جارہا ہے تو مسلم ملکوں سے منتقل ہوکر وہاں جانے کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟

عقلی استدلال:...... ایک عقلی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایک مسلمان کے غیر اسلامی ملک میں جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ کو اسلامی قوانین کے سایہ سے نکال کر غیر اسلامی قوانین کے لئے پیش کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ کسی صاحب ایمان کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی (مقدمات ابن رشد مع المدونۃ الکبریٰ ۹/ ۱۵۹، ۳، المدونۃ الکبریٰ الامام المالک ۵/ ۱۵۶۵)۔

قائلین جواز کے دلائل:...... جمہور علماء کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے، مثلاً ''هو الذى أرسل رسوله بالهدى و دين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون'' (سورۂ توبہ: ۳۳)، ''وما أرسلنك إلاكافة للناس بشيرا و نذيرا ولكن أكثر الناس لا يعلمون'' (سورہ سبا: ۲۸)، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دینا کے ہر خطے میں پہنچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے، اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر اسلامی ملکوں میں جائیں اور اسلام کی دعوت چاردانگ عالم میں پہنچائے۔

صحابہ کرام کا عمل ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے کہ انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا، وہاں قیام کیا اور دین کی دعوت دینا کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔

قول راجح:...... مذکورہ مباحث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور کا موقف ہی زیادہ مضبوط اور لائق ترجیح ہے۔ کیونکہ اب غیر اسلامی ممالک کی صورتحال بدل گئی ہے، آج ان ممالک میں فکر وعقیدہ اور اظہار خیالات ونظریات کی آزادی ہے، اگر عدم جواز کی رائے مان بھی لی جائے تو اس کو استعماری دور پر محمول کیا جائے گا، جبکہ غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحب ایمان کا داخلہ مشکل تھا اور اس کو ارتداد کے مترادف مانا جاتا تھا، اب وہ صورت حال باقی نہیں، آج وہاں اسلامی ادارے، دینی تحریکات وتنظیمات کی خاصی تعداد خدمت دین میں مصروف ہے اور ان کے لئے کوئی قانونی یا سیاسی رکاوٹ نہیں ہے، اس لئے آج ان ممالک میں نہ اسلام کے لئے کوئی خطرہ ہے اور نہ مسلمانوں کے لئے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کے وہاں داخلہ یا اقامت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

کسی عمل کے لئے قیام: اس کی کئی صورتیں ہیں:...... الف۔ اپنے ملک میں معاش کے بنیادی وسائل میسر نہ ہوں، اس کی وجہ سے کوئی مسلمان غیر مسلم ملک چلا جائے اور وہاں اقامت اختیار کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے (المبسوط للسرخسی ۱۰/۸۸، احکام القرآن للعربی ۱/۵۱۵)۔

ب۔ بنیادی وسائل معاش اپنے ملک میں میسر ہوں جس سے زندگی گذر بسر ہو سکتی ہو، مگر اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں قیام کرے تو اس کی بھی گنجائش ہے (احکام القرآن لابن العربی ۱/۴۸۶، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵/۳۵۱)۔

ج۔ تجارتی مقاصد کے تحت غیر اسلامی ملکوں میں قیام کیا جائے، جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بھی جائز ہے (المبسوط للسرخسی ۱۰/۸۸)۔

بعض اماموں کے نزدیک دنیوی اغراض کے لئے غیر اسلامی ملک میں قیام جائز نہیں ہے (مقدمات ابن رشد ۹/۱۵۹۳)۔

طبی اغراض کے تحت قیام:...... اگر کسی مرض کا مناسب علاج مسلم ملک میں میسر نہ ہو تو اس کے لئے غیر مسلم ملک کا سفر کرنا اور صحت کے لئے قیام کرنا جائز ہے (فتاوی ورسائل للمسافرین علماء کی ایک جماعت/۳۹)۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہریت دینے کا حکم:...... فقہی کتابوں میں فقہاء کرام نے اس مسئلہ کو اہم ذمہ کے نام سے ذکر کیا ہے اور ان سے متعلق احکام کو پوری تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

ذمی کی تعریف:...... ذمی ہر ایسے غیر مسلم کو کہتے ہیں جس کو حکومت نے جزیہ دے کر ملک میں عام شہری کی طرح رہنے کی اجازت دی ہو اور اس کے بدلے جان ومال کی حفاظت کی ضمانت لی ہو (موسوعہ فقہیہ (اہل الذمہ) ۷/۱۳۵)۔

مملکت اسلامی کے اقسام: قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اسلامی مملکت کو کافروں کے قیام کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے:

۱۔ حرم شریف میں کافروں کا داخل ہونا بھی ممنوع ہے۔ ''الحرم فلا یجوز للکافر أن یدخله ذمیا کان أو مستامنا، وإذا جاء رسول من دار الکفار إلی الإمام والإمام فی الحرم لا بأس له فی دخول الحرم'' (تفسیر المظہری ۴،۱۶۰ زکریا بکڈپو دیوبند)۔

۲۔ حجاز۔ بلاد حجاز میں کافروں کے داخل ہونے کی گنجائش تو ہے، لیکن اقامت ممنوع ہے۔ ''والقسم الثانی من بلاد الاسلام۔ الحجاز فلایجوز للکافر الاقامة فیها أکثر من مقام السفر وهو ثلاثة أیام لکن جاز له دخولها'' (حوالہ بالا)۔

جزیرۃ العرب میں کافروں کے لئے شہریت ممنوع ہونے کی وجہ حضرت عمرؓ کی روایت ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: ''لأخرجن الیهود والنصری من جزیرة العرب حتی لاأدع فیها إلا مسلما'' (مسلم، کتاب الجهاد والسیر باب اجلاء الیهود من الحجاز ۲.۹۴)۔

''لا یجتمع دینان فی جزیرة العرب'' (مسند احمد ۶.۲۷۵ طبع المیمنیه)۔

اور دوسری وجہ حضور کی وصیت ہے: ''عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ أوصی بثلاث۔ قال: أخرجوا المشرکین من جزیرة العرب'' (بخاری کتاب الجهاد باب جوائز الوفد ۲.۴۲۹)۔ (حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین وصیتیں فرمائیں: پہلی وصیت یہ تھی کہ مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دو، اسی وجہ سے جزیرۃ العرب میں کسی غیر مسلم کو شہریت نہیں دیئے جانے پر فقہاء کرام متفق ہیں)۔

۳۔ باقی اسلامی مملکت، حرم وحجاز کے علاوہ باقی اسلامی مملکت میں چند شرطوں کے ساتھ غیر مسلموں کو شہریت دی جا سکتی ہے، جن شرطوں کی تعمیل غیر مسلم شہریوں کے لئے ضروری ہے۔

کتاب الٰہی کا احترام کریں، ناموس رسالت میں گستاخی نہ کریں، دین اسلام کی تحقیر نہ کریں، کسی مسلم خاتون کی عصمت وعفت کو تار تار نہ کریں، کسی مسلمان کو فتنہ میں مبتلا نہ کریں، باطل کی مدد اور ان کے لئے جاسوسی نہ کریں، مسلمانوں کے شہر میں علی الاعلانیہ شراب وخنزیر فروخت نہ کریں، کھلم کھلا فواحش کا اظہار وارتکاب نہ کریں (الاحکام السلطانیہ للماوردی/ص ۱۴۵، موسوعہ فقہیہ ۷/۱۳۵، وزارت اوقاف کویت ۱۹۹۳)۔

مگر وہ غیر مسلم جو دار الاسلام کے باشندے نہ ہوں ان کو ضرورت سے زائد دار الاسلام میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ☆☆☆

مروجہ نظامِ شہریت اور اسلامی شریعت

مولانا احمد نور عینی قاسمی[1]

مروجہ نظامِ شہریت ۔ ایک تعارف:

کسی بھی مملکت کی آبادی کا قانونی فرد بننے اور ہر قسم کے شہری و سیاسی حقوق و فرائض حاصل کرنے کے لئے اس مملکت کی شہریت کا حصول ضروری ہے، کسی بھی مملکت میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں، ایک: شہری، دوسرے: غیر ملکی یا اجنبی، شہری کے لغوی معنی ''شہر کا باشندہ'' کے ہیں اور سیاسیات کی اصطلاح میں اس سے مراد مملکت کا وہ باشندہ ہے جسے قانوناً مملکت کے تمام حقوق شہریت سے استفادہ کا حق حاصل ہوتا ہے اور مملکت کی طرف سے عائد ہونے والے فرائض کی انجام دہی قبول کرنی پڑتی ہے، غیر ملکی شخص چونکہ مملکت کا قانونی باشندہ نہیں ہوتا، اس لئے اسے بہت سارے حقوق حاصل نہیں ہوتے، مثلاً وہ ووٹ نہیں دے سکتا، الیکشن نہیں لڑ سکتا وغیرہ، اسی طرح وہ بہت سے فرائض سے بھی سبک دوش رہتا ہے۔

شہریت کی قسمیں (Kinds of Citizenship)

شہریوں کی دو قسمیں ہیں: پیدائشی شہری (Natural Citizen) اور اکتسابی شہری (Naturalised Citizen) ان دونوں قسموں کے پیش نظر حصولِ شہریت کے دو طریقے مروج ہیں: پیدائشی اور اکتسابی۔

ا۔ پیدائشی شہریت (Natural Citizenship)

پیدائشی شہریت سے مراد پیدائش کی بنیاد پر ملنے والی شہریت ہے، اس کے لئے کسی قانونی کاروائی کی ضرورت نہیں؛ بلکہ بچہ کا پیدا ہو جانا ہی حصولِ شہریت کے لئے کافی ہے، پیدائش کی بنیاد پر حاصل ہونے والی شہریت کے دو اُصول ہیں، ایک: جائے پیدائش کا اُصول، دوسرا: خونی رشتہ کا اُصول، پہلے کو اصطلاح میں

" u

اور دوسرے کو Jussan"

n i

کہا جاتا ہے، پہلے اُصول کے مطابق بچے کے والدین کی شہریت سے قطع نظر بچے کی جائے پیدائش کا اعتبار کیا جاتا ہے، سیاسیات کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ارجنٹائنا میں اسی اُصول پر عمل ہے: لہٰذا ارجنٹائنا کی سرزمین پر پیدا ہونے والا ہر بچہ ارجنٹائنا کا شہری ہے، خواہ اس کے والدین غیر ملکی ہوں اور ارجنٹائنا سے باہر پیدا ہونے والا ہر بچہ غیر ملکی ہے، خواہ اس کے والدین ارجنٹائنا کے شہری ہوں، دوسرے اُصول کے مطابق بچہ کی جائے پیدائش سے قطع نظر اس کے والدین کی شہریت کا اعتبار کیا جاتا ہے، جرمنی، سویڈن اور سوئزرلینڈ وغیرہ میں اسی اُصول پر عمل ہے: لہٰذا جرمنی کی شہریت رکھنے والے والدین کا ہر بچہ جرمنی کا شہری ہے، خواہ وہ جرمنی کے باہر پیدا ہوا ہو اور غیر ملکی والدین کا ہر بچہ غیر ملکی ہے خواہ وہ جرمنی کی سرزمین پر پیدا ہوا ہو، اس وقت دنیا کی زیادہ تر مملکتیں اسی خونی رشتے کے اُصول پر عمل پیرا ہیں؛ البتہ بعض مملکتیں مثلاً: امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ اپنے شہریوں کے متعلق خونی رشتے کے اُصول پر اور غیر ملکیوں کے بچوں کے متعلق جائے پیدائش کے اُصول پر عامل ہیں۔

۲۔ اکتسابی شہریت (Naturalised Citizenship)

اکتسابی شہریت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص پیدائشی طور پر کسی مملکت کا شہری ہے؛ لیکن وہ کسی دوسری مملکت کا شہری بننا چاہتا ہے، تو وہ اب اس دوسری

---

[1] شعبۂ تحقیق و تالیف: المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد۔

مملکت کی جو شہریت حاصل کرے گا وہ اکتسابی شہریت کہلائے گی، اکتسابی شہریت حاصل ہونے کے ضابطے ہر مملکت میں یکساں نہیں ہیں، فی الجملہ جو طریقے رائج ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) زمین خریدنا، (۲) سرکاری ملازمت اختیار کرنا، (۳) لمبے عرصے تک قیام کرنا، (۴) غیر ملکی والدین کے بچوں کو بالغ ہونے کے بعد شہریت کا اختیار حاصل ہونا، (۵) غیر ملکی عورت کا کسی شہری سے شادی کرنا، (۶) حصولِ شہریت کی درخواست داخل کرنا۔

شہریت سے محرومی کے اسباب

مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر کسی بھی شہری کی شہریت منسوخ کی جاسکتی ہے:

(۱) کسی دوسری مملکت کی سرکاری ملازمت اختیار کرنا، (۲) طویل مدت تک مملکت سے باہر رہنا، (۳) مملکت سے غداری کر کے یا میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کر کے کسی دوسری مملکت میں پناہ لینا، (۴) کسی دوسری مملکت کی باضابطہ شہریت اختیار کرنا، (۵) کسی شہری عورت کا کسی غیر ملکی سے شادی کرنا۔

شہریوں کے حقوق

مملکت کے شہریوں کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہوتے ہیں:

(۱) زندہ رہنے کا حق، (۲) جائداد یا ملکیت کا حق، (۳) خاندانی زندگی کا حق، (۴) آزادی تحریر و تقریر یا اظہار رائے کا حق، (۵) مذہبی آزادی کا حق، (۶) قانونی برابری کا حق، (۷) حصولِ تعلیم کا حق، (۸) انجمن یا تنظیم وغیرہ بنانے کا حق، (۹) کام کرنے کا حق، (۱۰) آپسی لین دین اور عقد و معاہدہ کا حق، (۱۱) شخصی آزادی کا حق، (۱۲) ووٹ دینے کا حق، (۱۳) انتخاب لڑنے کا حق، (۱۴) حکومت اور سیاست دانوں کے خلاف تنقید کرنے کا حق، (۱۵) سیاسی پارٹی یا سیاسی و نیم سیاسی تنظیم بنانے کا حق، (۱۶) سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا حق، (۱۷) شکایتوں کے ازالے کے لئے درخواست دینے کا حق، (۱۸) حقوق کو منوانے کا حق وغیرہ۔

شہریوں کے فرائض

مملکت کی طرف سے شہریوں پر عائد ہونے والے وہ فرائض جن کی بجا آوری ازروئے قانون ضروری ہے، حسبِ ذیل ہیں:

(۱) قانون کی اطاعت، (۲) اسٹیٹ کے ساتھ وفاداری، (۳) ٹیکس کی ادائے گی، (۴) امن اور قانون کو برقرار رکھنے میں حکومت کے ساتھ تعاون، (۵) مملکت کی مدافعت وغیرہ (دیکھئے: اُصولِ سیاسیات: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی: ۱۳۱ـ ۱۵۳، ط: ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، پرنسپل آف پولیٹیکل سائنس: این گلکرسٹ: ۲۳۲ـ ۲۳۸)۔

اسلام میں شہریت کا تصور

''شہریت'' یا ''الجنسیة'' یا

جدید دور کی وضع کردہ اصطلاحات ہیں، فقہ اسلامی کا ذخیرہ ان سے نا آشنا ہے؛ لیکن شہریت کا جو بنیادی مفہوم ہے یعنی کسی مملکت کا مستقل باشندہ بننا، اس کا واضح تصور فقہ اسلامی کے ذخیرے اور خاص کر ''سیر'' کے ابواب میں ہمیں بہ کثرت ملتا ہے، فقہاء اسلام مسلم مملکت کے باشندے کو "من أهل دار الإسلام" یا "من أهل دارنا" سے، غیر مسلم مملکت کے باشندے کو "من أهل دار الحرب" یا "من أهل دارهم" سے اور معاہد مملکت کے باشندے کو "من أهل دار الموادعة" یا "من أهل دار الموادعين" سے تعبیر کیا کرتے تھے، مثلاً بدائع الصنائع میں ہے:

''لا تقبل شهادة المستأمن على الذمي ؛ لأنه ليس من أهل دار الاسلام حقيقة وإن كان فيها صورة ؛ لأنه ما دخل دارنا للسكنى فيها؛ بل ليقضي حوائجه ثم يعود عن قريب، فلم يكن من أهل دار الإسلام، والذمي من أهل دار الإسلام'' (بدائع، فصل في شرائط ركن الشهادة، كتاب الشهادة: ۵،۴۲۳)۔

مستامن کی گواہی ذمی کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی؛ کیوں کہ وہ (مستامن) حقیقت میں دار الاسلام کا باشندہ نہیں ہے؛ اگر چہ صورتاً وہ دار الاسلام میں قیام پذیر ہے، اس لئے کہ وہ ہماری مملکت میں رہائش اختیار کرنے نہیں آیا؛ بلکہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے آیا ہے اور پھر بہت جلد ہی وہ واپس لوٹ جائے گا؛

لہٰذا وہ دارالاسلام کا باشندہ نہیں ہے، جب کہ ذمی دارالاسلام کا باشندہ ہے۔

"... لأن الحربي المستأمن من أهل دار الحرب، وإنما دخل دار الإسلام على سبيل العارية لقضاء بعض حاجاته لا للتوطن، فلا يبطل حكم دار الحرب في حقه كالمسلم إذا دخل دار الحرب بأمان؛ لا يصير بالدخول من أهل دار الحرب ..." (بدائع، کتاب النکاح، الفصل الأخير: ۲،۶۵۸)۔

......کیونکہ غیر ملکی مستامن دارالحرب کا باشندہ ہے اور دارالاسلام میں وقتی طور پر اپنی بعض ضروریات پوری کرنے آیا ہے، دارالاسلام کو اپنا وطن بنانا اس کا مقصد نہیں ہے؛ اسی وجہ سے دارالحرب میں امان کے ساتھ داخل ہو تو وہ محض دارالحرب میں داخل ہونے کی وجہ سے دارالحرب کا باشندہ نہیں کہلائے گا۔

شرح السیر الکبیر میں ہے: "لو أن هولاء المستأمنين كانوا من أهل دار الموادعة دخلوا إلينا بتلك الموادعة" (باب مايجب على المسلمين نصرتهم: ۵،۱۷۱، من المكتبة الشاملة، الإصدار الثاني)

اگر یہ مستامنین دارالموادعہ کے باشندے ہوں تو یہ لوگ اس (سابقہ) معاہدہ کی وجہ سے (پرامن طور پر) ہماری مملکت میں داخل ہو سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا عبارتیں بہ طور مثال پیش کی گئی ہیں؛ ورنہ اس طرح کے بے شمار مسائل کتب فقہ میں موجود ہیں جو دارالعہد، دارالحرب اور دارالاسلام: تینوں داروں کی مستقل علاحدہ شہریت کا تصور پیش کرتے ہیں، بدائع کی مذکورہ بالا عبارت میں موجود "توطن" کا لفظ شہریت کے سلسلہ میں بالکل صریح ہے؛ کیوں کہ اس لفظ میں شہریت کا مفہوم پایا جاتا ہے؛ چنانچہ "القاموس الوحید" میں ہے: "توطن البلد: وطن بنانا (القاموس الوحید: ۱۸۶۸، ط: کتب خانہ حسینیہ دیوبند)۔

اور ظاہر ہے شہریت بھی کسی ملک کو اپنا مستقل وطن بنانے کے لئے حاصل کی جاتی ہے؛ لہٰذا فقہ اسلامی کی رو سے مستامن گو دارالاسلام میں اقامت پذیر رہتا ہے؛ لیکن چونکہ اس کا مقصد دارالاسلام کو اپنا مستقل وطن بنانا نہیں ہوتا، اس لئے وہ دارالحرب کا شہری ہے، ذمی چوں کہ دارالاسلام کو مستقل اپنا وطن اور مسکن بنالیتا ہے، اس لئے وہ دارالاسلام کا شہری ہے، دارالاسلام کی طرف ہجرت کر کے آنے والا مسلمان دارالاسلام کا شہری ہے اور معاہد مملکت کے باشندگان دارالعہد کے شہری ہیں۔

اسلامی شہریت کی بنیادیں

اسلام نے شہریت حاصل کرنے والے کے اعتبار سے حصولِ شہریت کی دو بنیادیں مقرر کی ہیں: غیر مسلموں کے لیے عقد ذمہ اور مسلمانوں کے لیے ہجرت۔

(۱) **عقد ذمہ:** کسی غیر مسلم کا ادائیگی جزیہ پر رضامند ہو کر اسلامی قانون کے تحت دارالاسلام میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا عقد کرنا "عقد ذمہ" کہلاتا ہے، موسوعہ فقہیہ میں ہے: "عقد الذمة: اقرار بعض الكفار على كفره بشرط بذل الجزية والتزام أحكام الاسلام الدنيوية" (موسوعه فقهيه: ۷،۱۲۱)۔ (عقد ذمہ: بعض کفار کو ان کے کفر پر برقرار رکھنا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ جزیہ ادا کریں اور اسلام کے دنیوی احکام کی بجا آوری کریں)۔

اس کی اصل قرآن کریم کی یہ آیت: "قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ" (سورۂ توبہ: ۲۹)۔

(جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں)۔

اور حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے: "... وإذا لقيت عدوك من المشركين فادعهم إلى ثلاث خصال أو خلال، فأيتهن ما أجابوك فاقبل منهم وكف عنهم: ثم ادعهم إلى الإسلام ... فإن هم أبوا فاسئلهم الجزية، فإن هم أجابوك فأقبل منهم وكف عنهم، فإن هم أبوا فاستعن بالله وقاتلهم" (مسلم: كتاب الجهاد، باب تأمير الإمام الأمراء: ۴۵۲۲)۔

(جب (جنگ میں) تیری ملاقات مشرک دشمنوں سے ہو تو ان کو تین باتوں کی دعوت دے، ان تینوں میں سے جس بات پر بھی وہ آمادہ ہو جائیں تو اسے قبول کر لے اور ان سے ہاتھ روک لے، انھیں اسلام کی دعوت دے...... اگر انکار کریں تو جزیہ کا مطالبہ کر، اگر وہ اس پر رضامند ہو جائیں تو ٹھیک ہے، ورنہ اللہ سے مدد طلب کر اور شمشیر آزمائی شروع کر دے)۔

مذکورہ بالا آیت قرآنی اور حدیث نبوی دونوں کا مفہوم یہی ہے کہ اگر غیر مسلم جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائے تو اسے دارالاسلام کا باشندہ بنالیا جائے گا اور اس کی

جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا، گویا عقد ذمہ کرنا جدید اصطلاح میں مسلم اسٹیٹ کی شہریت اختیار کرنا ہے؛ (تفصیل کے لئے دیکھئے: غیر المسلمین فی المجتمع الإسلامی: ۷، شرح السیر الکبیر باب الوقت الذی یمکن فیہ: ۵/۱۴۹، درمختار مع ردالمحتار: ۶/۲۷۸، الانصاف: کتاب الجہاد، باب الامان: ۴/۲۳۸، مغنی المحتاج: ۱۳/۲۵۶، مغنی المحتاج: ۴/۲۳۸، المغنی: مسألۃ أمان الرجل والمرأۃ: فصل، طلب الامان لیسمع کلام اللہ: ۱۳/۷۹، درمختار مع ردالمحتار: ۶/۲۷۸، بدائع الصنائع: کتاب السیر، فصل الامان المؤبد: ۶/۷۹، المغنی: مسألۃ أمان الرجل والمرأۃ: فصل دخلت الحربیۃ إلینا: ۱۳/۸۲، درمختار مع ردالمحتار: ۶/۸۳)۔

غیر مسلموں کو مسلم مملکت کی شہریت دینے کے لئے زمانہ و حالات اور علاقہ و مکان کی مناسبت سے سیاسی وانتظامی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء کے صراحت کردہ مذکورہ بالا طریقوں میں کسی ایک کو یا چند کو یا سبھی کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؛ البتہ شہریت کے طالب کو رجسٹریشن کا پابند بنانا اور حکومت کی طرف سے منظوری کے بعد ہی اسے شہریت دینا موجودہ حالات میں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ہجرت: فقہاء نے دارالاسلام کا شہری بننے کے لئے جس عقد ذمہ پر تفصیلی بحث کی ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ خاص ہے، مسلمانوں کو دارالاسلام کا شہری بننے کے لئے اس طرح کے کسی عقد کا کوئی تذکرہ نہ فقہ اسلامی کے عظیم ذخیرے میں ملتا ہے اور نہ تاریخ اسلامی کے ضخیم لٹریچر میں؛ کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے ''دائرۂ اسلام'' میں آجانا ہی ''دارالاسلام'' میں آنے اور آبسنے کی اجازت حاصل کرلینا ہے، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ دارالحرب کا کوئی مسلمان جب تک ہجرت کرکے دارالاسلام کے حدود میں داخل نہ ہوجائے وہ دارالاسلام کا حقیقی شہری نہیں کہلائے گا اور مملکت اسلامیہ کو اس پر ولایت حاصل نہیں ہوگی؛ البتہ دینی اُخوت اور دین کی بنیاد پر ہر جائز نصرت کا تعلق بہرصورت برقرار رہے گا؛ چنانچہ ارشاد باری ہے: ''وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَإِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'' (الانفال: ۷۲)۔ (اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت نہیں کی تو تمہیں ان پر ولایت حاصل نہ ہوگی؛ تا آں کہ وہ ہجرت کرلیں اور اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد طلب کریں تو ان کی مدد کرنا تم پر ضروری ہے، مگر ان لوگوں کے خلاف جن سے تمہارا معاہدہ ہو اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے)۔

سورۂ ممتحنہ کی دسویں آیت میں بھی اس بات کے اشارے موجود ہیں؛ فرمانِ باری ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ'' (الممتحنۃ: ۱۰)۔ (اے ایمان والو! جب مومن عورتیں تمہارے پاس ہجرت کرکے آئیں تو تم ان کا امتحان لے لیا کرو، اللہ ان کے ایمان سے زیادہ واقف ہے، پس اگر تمہیں معلوم ہوجائے کہ وہ لوگ (حقیقت میں) ایمان والی ہیں تو پھر تم انھیں کافروں کے پاس واپس نہ بھیجو)۔

یہ آیت گو مہاجر عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ لیکن اس سے یہ عمومی اُصول سمجھ میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص ہجرت کرکے دارالاسلام آئے اور اس کا مسلمان ہونا مشکوک نہ ہو تو اسے دارالاسلام میں باضابطہ سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی اور وہ دارالاسلام کا مستقل شہری شمار ہوگا۔

مملکت مدینہ کے قیام کے فوراً بعد معلوم انسانی تاریخ کا جو سب سے پہلا تحریری دستور ترتیب دیا گیا اس کی پہلی دفعہ میں ہی اسلامی شہریت کے اس اُصول کا ذکر موجود ہے (الوثائق السیاسیۃ، ڈاکٹر حمید اللہ: ۵۹)۔

مروجہ نظامِ شہریت کی شرعی حیثیت

یہ بحث پیچھے گذر چکی ہے کہ اسلامی تعلیمات میں شہریت کے بنیادی تصور (یعنی کسی مملکت کا مستقل باشندہ بننا اور مملکتوں کے اختلاف سے حقوق وفرائض کا مختلف ہونا) کو تسلیم کیا گیا ہے؛ لیکن چونکہ مروجہ نظام شہریت کی رو سے دارالاسلام کی شہریت کا تعدد لازم آتا ہے، ہر مسلم مملکت کی علاحدہ شہریت ہے اور شہریت کا یہ تعدد حقوق وفرائض کے سلسلہ میں مسلمانوں کو اجنبی اور شہری کے خانوں میں تقسیم کرتا ہے، اس لئے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک جدید مسئلہ ہے، اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے شہریت کے سلسلہ میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے؛ تاکہ دائرۂ بحث کی تحدید ہوجائے:

شہریت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی الگ الگ شہریتیں تسلیم کی جائیں اور دارالحرب کی مختلف مملکتوں کی شہریتوں کو مستقل الگ شہریت کا درجہ دیا جائے، فقہ اسلامی میں اس کی صراحت موجود ہے؛ لہٰذا یہ دائرۂ بحث سے خارج ہے۔

شہریت سے اگر مراد کسی مملکت (دار) کا مستقل باشندہ بننا ہو تو اس کا بھی واضح تصور فقہ اسلامی میں موجود ہے، اس لیے اس پر بحث کرنا بے سود ہے۔

شریعت میں چونکہ بہ غرضِ تعارف علاقہ وقبائل کی طرف نسبت کرنا جائز ہے؛ اس لیے شہریت کا یہ پہلو کہ علاقے کی طرف نسبت کر کے مصری شہری یا فلسطینی شہری کہا جائے، کسی بحث کا محتاج نہیں ہے۔

مسلمانوں کے سلسلہ میں اصل تو یہی ہے کہ مسلمان دارالاسلام کے جس حصے کو چاہیں اپنا مسکن بنائیں؛ لیکن موجودہ دور کے پیچیدہ نظام حکومت میں اس اصل پر مطلقاً عمل کرنے میں کاروبارِ سلطنت حرج اور ضرر سے دو چار ہو سکتا ہے، اس لیے "الحرج مدفوع" اور "الضرر یزال" جیسے فقہی قواعد کی رو سے نو واردین اور مہاجرین کو رجسٹریشن کا پابند بنایا جا سکتا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں اصل یہی ہے کہ ان کی درخواست قبول کرلی جائے؛ البتہ کسی شرعی مانع اور معقول عذر کی وجہ سے ان کی درخواست رد کی جا سکتی ہے۔

وہ مباح اُمور جن کے جواز اور عدمِ جواز کے سلسلہ میں شریعت خاموش ہو اور ان کے جائز ہونے کی صراحت شرع میں وارد نہ ہوئی ہو، ایسے مباح اُمور کے بارے میں مسلم مملکتوں کے حکمراں باہمی رضامندی سے ''الأصل فی الأشیاء الاباحة'' اور ''المسلمون علی شروطھم'' کی رو سے شہریت سے متعلق قانون سازی کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا باتیں اس قدر واضح ہیں کہ ان پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے؛ لیکن قومیت کو قوانین شہریت کا مدار بنانا، دارالاسلام کو کسی مرکز کے تابع کرنے کے بجائے ہر مملکت کو مستقل مملکت کی حیثیت دینا، مسلمانوں کے حقوق وفرائض کا جغرافیائی سرحدوں تک سمٹ آنا، علاقہ وملک کی بنیاد پر مسلمانوں کے حقوق و فرائض تقسیم کرنا، ان کو ملکی وغیر ملکی شہری واجنبی اور مستقل باشندہ وپناہ گزین کے خانوں میں بانٹنا، حصولِ شہریت کے طریقہ کار اور فسخ شہریت کے اسباب کے سلسلہ میں وضعی قوانین نافذ کرنا...... مروجہ نظام شہریت سے متعلق یہ وہ اُمور ہیں جو بحث وتحقیق کے متقاضی ہیں اور ان ہی اُمور کی وجہ سے شہریت کا مروجہ نظام ایک جدید مسئلہ بن گیا ہے، اس مسئلہ کی تکییف شرعی کی بابت دونوں طرح کے نقاطِ نظر ہیں، ایک جواز کا نقطۂ نظر اور دوسرا عدم جواز کا، ان دونوں نقاطِ نظر کے دلائل حسب ذیل ہیں:

جواز کے دلائل:

(۱) ولاء الموالاة: اس ولاء کی تعریف موسوعہ فقہیہ میں یوں مذکور ہے: ''ھو أن یعاھد شخص شخصاً آخر علی أنه إن جنی فعلیه أرشه وإن مات فمیراثه له'' (ولاء: ۴۵،۱۲۸) وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ساتھ اس بات کا معاہدہ کرے کہ اگر وہ جنایت کرے گا تو وہ دوسرا شخص اس کا تاوان ادا کرے گا اور اگر وہ مرجائے گا تو وہ دوسرا شخص اس کی میراث پائے گا۔

حنفیہ نے اس کی توضیح یوں کی ہے: ''تفسیر ولاء الموالاة أن یسلم الرجل علی یدی رجل فیقول للذی أسلم علی یدیه أو لغیره والیتك علی أنی إن مت فمیراثی لك وإن جنیت فعقلی علیك وعلی عاقلتك، وقبل الأخر منه. فھذا ھو نفس ولاء الموالاة'' (المحیط البرھانی: ۴،۱۸۷، دارالکتب العلمیه، بیروت)۔ ولاء الموالاة کی توضیح یہ ہے کہ ایک آدمی کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ پر ایمان لائے، پھر جس کے ہاتھ پر ایمان لایا ہے اس سے یا کسی اور سے کہے کہ میں آپ سے عقد موالاة کرتا ہوں، اس بات پر کہ اگر میں مرجاؤں تو میری میراث آپ کو ملے گی اور اگر میں کوئی جنایت کروں تو میرا تاوان آپ یا آپ کے عاقلہ کے سر ہوگا اور دوسرا شخص اس موالات کو قبول کرلے تو اسی کا نام ولاء الموالاة ہے۔

ولاء الموالاة کی مذکورہ بالا تعریف وتوضیح سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اس کے ذریعہ موالات کرنے والے (المولی الاسفل) اور جس کے ساتھ موالات کی گئی (المولی الاعلیٰ) دونوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور دونوں پر فرائض عائد ہوتے ہیں؛ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی دوسرے نسب اور خاندان کے فرد سے ولاء الموالاة کرے تو مولی اعلیٰ کو مولی اسفل کی میراث حاصل کرنے کا حق ہوتا ہے اور مولی اسفل کی جنایت کا تاوان ادا کرنے کا فریضہ مولی اعلیٰ پر عائد ہوتا ہے، اور مولی اسفل کا فریضہ بنتا ہے کہ مولی اعلیٰ کو اپنی میراث کا وارث بنائے، جس طرح اس ولاء کے ذریعہ کسی دوسرے نسب اور خاندان کے فرد سے حقوق وفرائض متعلق ہوتے ہیں، جو ولاء الموالاة نہ کرنے والے سے متعلق نہیں ہوتے اسی طرح مملکت بھی ایک بڑا قومی خاندان ہے اور اگر کوئی شخص شہریت حاصل کرے تو اس سے وہ حقوق وفرائض متعلق ہوتے ہیں جو شہریت حاصل نہ کرنے والوں سے متعلق نہیں ہوتے؛ لہٰذا جب ولاء الموالاة شرعاً جائز ہے تو عقدِ شہریت بھی شرعاً جائز ہوگا۔

(۲) ''عن أبي الدرداء قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ما أحل الله فی کتابه فھو حلال وما حرم فھو حرام وما سکت منه فھو عفو. فاقبلوا من الله عافیته، فإن الله لم یکن لینسی شیئاً، ثم تلا: ''وما کان ربك نسیاً'' رواہ البزار والطبرانی فی الکبیر وإسنادہ حسن ورجاله موثقون'' (مجمع الزوائد: کتاب العلم. فی اتباع الکتاب والسنة ومعرفة الحلال

والحرام: ۴۱۶، ۴۹۳)۔ (حضرت ابودرداء سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: اللہ نے اپنی کتاب میں جو چیز حلال کی ہے وہ حلال ہے اور جو حرام کی ہے وہ حرام ہے اور جس سے خاموش رہا وہ معاف ہے تو تم اللہ کی عافیت قبول کرو؛ کیونکہ اللہ کوئی چیز بھولتا نہیں، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے، اس کو بزار نے اور معجم کبیر میں طبرانی نے روایت کیا ہے، اس کی سند حسن درجہ کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

اس حدیث میں یہ واضح حکم ہے کہ جن چیزوں کی حلت وحرمت مذکور نہ ہو؛ بلکہ وہ مباح درجہ کی ہوں تو وہ جواز کے دائرے میں رہیں گی، موجودہ نظام شہریت کا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے، اس لئے اسے اختیار کرنا شرعاً جائز ہوگا۔

(۳) فقہ کا مشہور قاعدہ ہے ''الأصل فی الأشیاء الإباحۃ'' اس قاعدہ کی رو سے فقہاء نے بے شمار مسائل کو مباح ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، موجودہ نظام شہریت بھی اسی اصل کی رو سے مباح ہے؛ لہٰذا حاکموں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اسے قانون کی شکل میں نافذ کرسکیں، اس کی نظیر تدوین دواوین کا نظام ہے، جو "الأصل فی الأشیاء الإباحۃ" کے تحت مباح تھا، حضرت عمرؓ نے اس کو باضابطہ مملکت کے ایک نظام کی شکل دی۔

(۴) موجودہ نظام شہریت کا تعلق ایک طرح سے بین الاقوامی قانون ومعاہدے سے ہے اور معاہدے کی پابندی شرعاً ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ'' (المائدۃ: ۱) (اے ایمان والو! اپنے عقود ومعاہدے پورے کرو)۔

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''الصلح جائز بين المسلمين الا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً. والمسلمون على شروطهم إلا شرطاً حرم حلالاً أو أحل حراماً ... قال أبو عيسى هذا حديث حسن صحيح'' (كتاب الأحكام، في الصلح بين الناس: ۱۳۵۲)۔ مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے؛ البتہ وہ صلح جس میں حرام کو حلال یا حلال کو حرام کیا گیا ہو، مسلمانوں کو اپنی شرطیں پوری کرنی چاہئیں؛ البتہ وہ شرطیں جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرتی ہوں (ناجائز ہیں)۔

لہٰذا بین الاقوامی معاہدے کی وجہ سے مسلم مملکتوں میں مروجہ شہریت کے نظام کو اپنانا اسلامی مزاج کے عین مطابق ہے۔

(۵) بالفرض اگر موجودہ نظام شہریت کو اصلاً ناجائز مان بھی لیا جائے تو بھی شہریت کا حصول ایک مجبوری بن گئی ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر کوئی بھی شخص کسی دوسری مملکت کا باشندہ نہیں بن سکتا، اس لئے "الضرورات تبيح المحظورات" قاعدے کے تحت شہریت کا یہ نظام جواز کے دائرے میں آجائے گا۔

عدم جواز کے دلائل:

(۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله، وأن يستقبلوا قبلتنا ويأكلوا ذبيحتنا وأن يصلوا صلاتنا، فإذا فعلوا ذلك حرمت علينا دماؤهم وأموالهم إلا بحقها، لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين ... قال أبوعيسى: هذا حديث حسن صحيح غريب من هذا الوجه'' (ترمذی، كتاب الإيمان، ماجاء في قول النبي أمرت بقتالهم: ۲۶۰۸)۔ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے رزم آرائی کروں؛ تا آں کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ وہ ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کریں، ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں، جب لوگ ایسا کرلیں تو ہم پر ان کے جان ومال سے ناحق تعرض کرنا حرام ہوجائے گا، ان کو وہ حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور ان پر وہ فرائض عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر عائد ہیں۔

اس حدیث میں مسلمانوں کو حقوق حاصل ہونے اور ان پر فرائض عائد ہونے کی بنیاد اسلام کو بنایا گیا ہے اور جنس ووطن اور علاقہ وملک سے قطع نظر تمام مسلمانوں کو حقوق وفرائض کے سلسلہ میں یکساں درجہ دیا گیا ہے۔

وہ قبائل جو مملکت مدینہ کی حدود میں داخل نہیں تھے؛ بلکہ بعد میں مملکت مدینہ کے ساتھ الحاق کرلیا تھا ان کو بھی آپ ﷺ نے یہی بتایا کہ ان میں سے جو لوگ ایمان قبول کرلیں ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور ان پر وہی فرائض عائد ہوں گے جو ہم پر عائد ہیں؛ مثلاً آپ ﷺ نے شاہان حمیر کے قاصد کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا کہ: ''انه من أسلم من يهودي أو نصراني فإنه من المؤمنين، له مالهم وعليه ماعليهم'' (

سیرت ابن ہشام، قدوم رسول ملوك حمير بكتابهم: ۲،۵۸۸)۔ (جو کوئی یہودی یا نصرانی اسلام قبول کرلے تو وہ مومنین میں سے ہے، اسے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان (مسلمانوں) کو حاصل ہیں اور اس پر وہی فرائض عائد ہوں گے جو ان (مسلمانوں) پر عائد ہیں)۔

اور عمرو بن حزم کو یمن روانہ فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: ''من أسلم من يهودي أو نصراني إسلاماً خالصاً من نفسه ودان بدين الإسلام، فإنه من المؤمنين، له مثل مالهم وعليه مثل ما عليهم'' (سیرت ابن ہشام: کتاب الرسول لابن خالد: ۲،۵۹۴) (جو کوئی یہودی یا نصرانی خالص اسلام قبول کرلے اور دین اسلام کا پیرو بن جائے تو مومنین میں سے ہے، اسے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان مومنین کو حاصل ہیں اور اس پر وہی فرائض عائد ہوں گے جو ان پر عائد ہیں)۔

اسی طرح قبیلۂ غفار کے نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نامہ مبارک رقم فرمایا: ''... أنهم من المسلمين، لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين'' (طبقات ابن سعد، ذكر بعثت الرسول) (قبیلۂ بنو غفار کے لوگ مسلمانوں میں سے ہیں، انھیں وہی حقوق حاصل ہیں، جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور ان پر وہی فرائض عائد ہیں جو مسلمانوں پر عائد ہیں)۔

یہی بات حضرت سلمان فارسی ؓ نے مملکتِ فارس کے معرکہ آراؤں سے کہی تھی: ''فإن أسلمتم فلكم مثل الذي لنا وعليكم مثل الذي علينا'' (ترمذی، کتاب السير، باب ماجاء في الدعوة قبل القتال: ۱۵۴۸، وحديث سلمان حديث حسن) (اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں بھی اسی طرح کے حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور تم پر بھی اسی طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو ہم پر عائد ہیں، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے)۔

حضرت سلمان فارسی ؓ کی یہ حدیث اس بات کی مزید وضاحت کرتی ہے کہ اگر مملکت فارس کی فارسی قوم بھی حلقہ بگوش اسلام ہوجائے تو اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو عرب کی قوم کو حاصل ہیں اور اس پر بھی وہی فرائض عائد ہوں گے جو عربوں پر عائد ہیں؛ کیونکہ حقوق وفرائض کی بنیاد اسلام ہے؛ نہ کہ نسل وملک، مگر موجودہ نظام شہریت میں حقوق وفرائض کی بنیاد ملک ومملکت ہے نہ کہ اسلام، یہی وجہ ہے کہ ایک مسلم مملکت کے باشندے کو دوسری مسلم مملکت میں اجنبیوں کے درجہ میں رکھا جاتا ہے، اسی لئے موجودہ نظامِ شہریت اپنے وضعی اُصولوں کے ساتھ شرعاً ناقابل قبول ہے۔

(الف) مملکت کی مدافعت کا فریضہ: مروجہ نظام شہریت کے مطابق اجنبیوں پر مملکت کی دفاع کا فریضہ عائد نہیں ہوتا، جب کہ اسلامی شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر کسی علاقہ میں دشمن ہلہ بول دیں اور اس علاقے کے مسلمان اپنا دفاع نہ کرسکیں یا سہل انگاری کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لیں تو آس پاس کی مملکت کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہوجائے گا، ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے قومیت ووطنیت کی بحث کے ذیل میں اس بات کو شامی کے حوالے سے اپنے خاص اُسلوب میں یوں بیان کیا ہے:

(۲) حصولِ شہریت کے جو طریقے ابتداء بحث میں ذکر کئے گئے ہیں، فقہاء نے ذمیوں کو اسلامی شہریت دینے کے لئے توفی الجملہ ان کا تذکرہ کیا ہے، لیکن یہ کہیں نہیں ملتا کہ مسلمانوں کو دار الاسلام کی شہریت حاصل کرنے کے لئے کسی نئے عقد کی ضرورت ہو، فقہ اسلامی کا ذخیرہ بھی اس طرح کے عقد شہریت سے ناآشنا ہے اور تاریخ اسلامی بھی اس کی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، لیکن موجودہ دور میں مسلمان شہریت حاصل کیے بغیر نہ کسی مسلم مملکت کو اپنا وطن بناسکتا ہے اور نہ وہاں کے حقوق سے استفادہ کرسکتا ہے۔

(۳) مروجہ قوانین میں شہریت سے محرومی کے جو اُصول ہیں وہ بھی اسلامی احکام سے میل نہیں کھاتے، شہریت سے محرومی کے جو اسباب پیچھے ذکر کیے گئے ہیں، ان میں سے کوئی سبب بھی ایسا نہیں ہے، جس کی وجہ سے کوئی مسلمان دار الاسلام کی شہریت سے محروم ہوجائے؛ بلکہ فقہ حنفی کی رو سے تو ان اسباب کی وجہ سے کوئی غیر مسلم شہری بھی اسلامی شہریت سے محروم نہیں ہوگا؛ کیونکہ غیر مسلم شہری کی شہریت صرف دو وجوہ سے ہی منسوخ ہوسکتی ہے: ایک یہ کہ وہ دار الحرب کی شہریت اختیار کرلے، دوسرے یہ کہ غیر مسلموں کا کوئی گروہ دار الاسلام کے کسی علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے کر مسلم حکومت سے برسرپیکار ہوجائے (دیکھئے: بدائع، کتاب السیر فصل الامان المؤبد: ۶/ ۸۲)۔

(۴) قرآن کی یہ آیتیں: ''أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا'' (النساء: ۹۷) ''يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّ أَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ'' (العنكبوت: ۵۶) اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ مسلمان دار الاسلام کے جس حصے میں چاہیں اپنی زندگی گزاریں؛

لہٰذا ان کو ذمیوں کی طرح کسی نئے عقد کا پابند بنانا صحیح نہیں ہے اور قرآن کریم کی اس آیت میں: ''إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ ... أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ'' (المائدۃ: ۳۳) کسی فرد کو کسی علاقہ میں رہنے نہ دینے اور وہاں سے جلاوطن کرنے کو بہ طور سزا کے ذکر کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی مسلمان دار الاسلام کے کسی علاقے کو اپنا مسکن بنانا چاہے تو اس سلسلہ میں اصل یہی ہے کہ اس کو وہاں رہنے کی اجازت دی جائے؛ البتہ اگر کسی شرعی مانع اور معقول عذر کی وجہ سے اجازت نہ دی جائے تو یہ استثنائی صورت ہے۔

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ''المسلمون تتكافأ دماؤهم، يسعى بذمتهم أدناهم، ويجير عليهم أقصاهم وهم يد على من سواهم'' (أبوداؤد، الجهاد، في السرية، تيرد على أهل العسكر: ۲۷۵۱)۔ (تمام مسلمانوں کا خون برابر ہے، ان کے ادنیٰ شخص کے بھی ذمہ کی پابندی سب پر ضروری ہے، ان میں کا دور دراز رہنے والا شخص بھی ان پر کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور تمام مسلمان اپنے علاوہ کے لئے ایک متحدہ طاقت ہیں) (شیخ البانی نے اس حدیث کے صحیح ہونے کی صراحت کی ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف سنن أبي داؤد: ۲۷۵۱، طبع مرکز نور الاسلام لابحاث القرآن والسنۃ، اسکندریہ)۔

اس حدیث نبوی کا ایک ایک جملہ مسلمانوں کی وحدت اور حقوق وفرائض میں تمام مسلمانوں کی یکسانیت کا غماز ہے کہ تمام مسلمانوں کے خون کی قیمت برابر ہے، ان سب کا ذمہ ایک ہے، ان میں سے کوئی ایک بھی کسی کو پناہ دے دے تو تمام پر اس کی پاسداری ضروری ہے، اور رنگ ونسل اور ملک وطن کے اختلاف کے بغیر تمام مسلمان ایک جماعت ہیں اور اپنے سوا کے خلاف ایک متحدہ طاقت ہیں، ان باتوں کو اگر مروجہ نظام شہریت میں تلاش کیا جائے تو ان کا دائرہ مملکت کی جغرافیائی سرحدوں تک محدود ہوتا نظر آئے گا۔

(۶) دستور نبوی کی دفعات: مدینہ میں اسلامک اسٹیٹ قائم ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دستور ترتیب دیا تھا، اس میں اسلامی شہریت کے اصول بجا طور پر ہمیں ملتے ہیں، دستورِ مدینہ کا اگر بہ غور جائزہ لیا جائے تو ہمیں شہریوں کی دو قسمیں نظر آتی ہیں: ایک وہ جنھیں شہریت حاصل کرنے کے لئے معاہدے کی ضرورت پڑی تھی، یعنی غیر مسلم شہری اور دوسرے وہ جنھیں حصولِ شہریت کے لئے کسی معاہدے کی ضرورت نہیں پڑی، یعنی مسلم شہری، پھر مسلم شہری دو طرح کے تھے، ایک وہ جو مدینہ کے پیدائشی شہری تھے، یعنی انصار اور دوسرے وہ جو اکتسابی شہریت کے حامل تھے، یعنی مہاجرین۔ دستور کی دفعات میں موجود شہریت سے متعلق بعض باتیں قابل ذکر ہیں:

☆ دستور کی دفعہ ۳۶ (الف) کے تحت یہ حکم ہے کہ کوئی بھی شخص حضور کی اجازت کے بغیر فوجی کارروائی کے لئے مدینہ سے باہر نہ نکلے، اس دفعہ کے الفاظ ہیں: ''وأنه لا يخرج منهم أحد إلا بإذن محمد'' (الوثائق السیاسیۃ، ڈاکٹر حمید اللہ: ۶۱)۔ اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی شخص محمد (ا) کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جاسکتا۔

شارحین دستور نے اس خروج سے فوجی کارروائی کے لئے باہر نکلنا مراد لیا ہے، (دیکھئے: رسول اللہ کی حکمرانی وجانشینی: ۶۴، سیرۃ الرسول کی آئینی ودستوری اہمیت، ڈاکٹر طاہر القادری: ۵۱) یہاں یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ سیاست خارجہ کے باب میں جنگی مہم جوئی جس طرح ایک نازک مسئلہ ہے اسی طرح سیاست داخلہ کے باب میں غیر ملکیوں کا مملکت کی مستقل شہریت اختیار کرنا ایک اہم مسئلہ ہے، اس لئے اس دفعہ پر قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ مدینہ میں آبسنے والوں کے لئے بھی یہ دفعہ لگائی جاتی کہ کسی بھی شخص کو حضرت محمد ا کی اجازت کے بغیر مدینہ کا مستقل باشندہ بننے کی اجازت نہیں ہے؛ لیکن اس کے برخلاف یہ کہا گیا کہ جو کوئی مسلمان مدینہ کے مسلمان شہریوں کی تابع داری اختیار کرے، پھر (ہجرت کرکے) ان کے ساتھ آملے وہ سیاسی وحدت کا ایک فرد ہوگا، یعنی مملکت کا ایک شہری ہوگا:

> ''هذا كتاب من محمد النبي بين المؤمنين والمسلمين من قريش وأهل يثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم، أنهم أمة واحدة من دون الناس'' (الوثائق السياسية: ۵۹)۔ (یہ ایک حکم نامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمد کا قریش اور اہل یثرب میں ایمان لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہوجائیں اور ان کے ہم راہ جنگ میں حصہ لیں، تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علاحدہ سیاسی وحدت ہوگی)۔

ان دفعات میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ مسلمانوں کو مملکتِ اسلامیہ کی سیاسی وحدت کا فرد بننے کے لئے کسی عقد کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ غیر مسلموں کو حصولِ شہریت کے لئے عقد ومعاہدے کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ جو کوئی بھی مسلمان ہو کر مدینہ آیا اسے شہریت کے لئے کوئی عقد نہیں کرنا پڑا، اس کے برعکس ان ہی غیر مسلموں کو مملکت مدینہ کی شہریت دی گئی، جنھوں نے مملکت سے اس کا معاہدہ کیا۔

☆ دستور کی دفعہ: ۱۷ کے مطابق تمام مسلمانوں کی صلح ایک ہی ہوگی، دفعہ کے الفاظ ہیں: "وإن سلم المؤمنين واحدة" (حوالہ سابق: ۶۰)۔(اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی)۔

اس وحدت صلح کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی ایک صلح کرلے تو سب پر اس کی پابندی ضروری قرار پائے؛ چونکہ جنگ کی حالت میں کسی مسلمان کا دشمن سے صلح کرنا مملکت کی مصلحت کے خلاف ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ جب تک صلح تمام مسلمانوں کے مفاد میں نہ ہو اس وقت تک صلح نہ کی جائے؛ چنانچہ اسی دفعہ میں یہ الفاظ بھی بڑھائے گئے:

> اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا، جب تک کہ یہ صلح ان سب کے لئے برابر اور یکساں نہ ہو۔ (الوثائق السیاسیۃ: ۶۰-۶۷، رسول اللہ کی حکمرانی و جانشینی: ۶۲)

جب کہ غیر مسلموں کی شہریت کے باب میں ہمیں صلح و معاہدہ کی وحدت کا یہ رنگ نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ بنوقینقاع نے جب معاہدہ شکنی کی تو صرف ان ہی کو جلاوطن کیا گیا، بنونضیر اور بنوقریظہ کے معاہدہ کو برقرار رکھا گیا اور بنونظیر نے جب عہد کی پامالی کی تو صرف ان ہی کا محاصرہ کیا گیا، بنوقریظہ پر کسی بھی طرح کی آنچ آنے نہ دی گئی؛ لیکن جب بنوقریظہ نے بھی غداری کی تو انھیں بھی مار بھگایا گیا، دستور نبوی کی مذکورہ بالا دفعہ اور یہودی قبائل سے متعلق سیرت نبوی کا یہ روشن پہلو اس بات پر دال ہیں کہ غیر مسلموں کی صلح اور ان سے کئے جانے والے معاہدے قبائل اور علاقوں کی بنیاد پر تو ہو سکتے ہیں؛ لیکن مسلمانوں کی صلح صرف اور صرف اسلام کی بنیاد پر استوار ہوگی...... افسوس کہ مروجہ نظام شہریت کے وضعی قوانین کو اپنانے کی وجہ سے مسلمانوں کی صلح اور ان کے معاہدے جو کبھی آفاقی تھے، اب مملکت کی حدود تک سمٹ آئے ہیں۔

☆ دستور مدینہ میں جن غیر مسلموں کو حقوق دیئے گئے ہیں، ان کے قبائل کا نام بہ نام تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے، (دیکھئے: دفعہ: ۲۵-۲۳، الوثائق السیاسیۃ: ۶۱) کیوں کہ یہی وہ قبائل تھے، جنھوں نے معاہدہ کے ذریعہ حق شہریت حاصل کیا تھا: اس کے برخلاف مسلمانوں کو ایک جسد واحد قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ دفعہ: ۱۵ میں ہے: "وإن المؤمنين بعضهم موالى بعض دون الناس" (الوثائق السیاسیۃ: ۶۰)۔(اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا) کے لوگوں کے مقابل)۔ "وإن سلم المؤمنين واحدة" (حوالہ سابق) (اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی)۔

اور بعض دفعات میں تو "جمیعاً" اور "کافۃً" کے تاکیدی الفاظ لاکر حق شہریت کے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا گیا، جیسا کہ دفعہ: ۱۳ کے الفاظ ہیں: "وأن المؤمنين المتقين أيديهم على كل من بغى منهم أو ابتغى دسيعة ظلماً أو إثماً أو عدواناً أو فساداً بين المؤمنين وأن أيديهم عليه جميعاً ولو كان ولد أحدهم" (حوالہ سابق)۔(اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھیں گے، خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو)۔

اور دفعہ: ۲۱ میں ہے: "وأن المؤمنين عليه كافة ولا يحل لهم إلا قيام عليه" (حوالہ سابق: ۶۱)۔(اور تمام ایمان والے قاتل کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کے سوا انھیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی)۔

دستور کی مذکورہ بالا دفعات یہ صراحت کرتی ہیں کہ انھیں غیر مسلموں کو حق شہریت حاصل ہوگا، جن کا مملکت کے ساتھ معاہدہ ہو، اس کے برخلاف مسلمانوں کے حق شہریت کی بنیاد اسلام ہے، تمام مسلمان دارالاسلام کے برابر درجہ کے شہری ہیں، تمام کو یکساں حق شہریت حاصل ہے اور تمام کے حقوق بھی یکساں ہیں اور فرائض بھی، علاقہ و قبائل کا اختلاف ان کے حقوق و فرائض کو مختلف نہیں کر سکتا۔

(۷) مروجہ نظام شہریت کو مسلم مملکتوں میں نافذ کرنے کی وجہ سے علاقہ واریت اور قومیت پروان چڑھ رہی ہے اور اسلامی قیادت کی وحدت و مرکزیت دن کے خواب کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے، اس لئے شرعاً اس کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

فقہاء کرام کی تائید:

فقہاء کرام نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ دارالاسلام کی حدود میں خواہ کتنی ہی مملکتیں وجود میں آجائیں، مملکتوں کا یہ تعدد مسلمانوں کے حقوق و فرائض اور

ان کے احکام پر چنداں اثر انداز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ دارالاسلام ٹکڑیوں میں بٹ جانے کے باوجود بھی ایک مملکت کے حکم میں ہے، جب کہ دارالحرب کی ہر مملکت مستقل حیثیت کی حامل ہے؛ چنانچہ مبسوط میں ہے: ''... لأن دارالإسلام دار أحكام، فبإختلاف المنعة والملك. لا تتباين الدار فيما بين المسلمين ؛ لأن حكم الإسلام يجمعهم. فأما دارالحرب ليست بدار أحكام ولكن دار قهر. فبإختلاف المنعة والملك تختلف الدار فيما بينهم'' (كتاب الفرئض، مواريث أهل الكفر: ۳۰،۳۲)۔ (...... کیونکہ دارالاسلام دار احکام ہے؛ لہٰذا لشکر واقتدار کے اختلاف سے مسلمانوں کے درمیان دار مختلف نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اسلام کا حکم سب کو شامل ہے، رہی بات دارالحرب کی تو وہ دار احکام نہیں ہے؛ بلکہ دار قہر ہے؛ لہٰذا لشکر واقتدار کے تفاوت سے ان کے درمیان دار بھی مختلف ہوجائے گا) (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: کتاب الفرائض، انواع الحجب: ۸ / ۵۷۳، تبیین الحقائق، کتاب الفرائض، العصبات: ۶ / ۲۴۰، الفقہ الاسلامی وأدلتہ، کتاب الفرائض الباب السادس، المیراث، المانع الثانی القتل: ۱۰ / ۷۲۶۲، اختلاف الدار: ۲ / ۲۰۴، أحکام الذمیین والمستامنین، الباب التمہیدی، الفصل الثانی، البحث الأول: الذمیون: ۷۳، الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الدولی: ۹۱، ط: القاہرۃ ۱۹۷۱، حقوق غیر المسلمین فی الدولۃ الإسلامیۃ: ۷۷، مکتبۃ الفہد الوطنیۃ، السعودیۃ، المذہب السیاسی فی الاسلام: ۱۲۹، ط: دارالاضواء، بیروت)۔

حاصل کلام یہ کہ اسلام شہریت کے اس بنیادی تصور کو تسلیم کرتا ہے کہ کسی مملکت کا مستقل باشندہ بنا جائے اور مملکت (دار) کے اختلاف سے احکام مختلف ہوں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دارالحرب، دارالعہد اور دارالاسلام کے احکام یکساں نہیں ہیں؛ لیکن دارالاسلام کی شہریت کا تعدد، مسلمانوں کے لئے حصولِ شہریت کا لزوم اور دارالاسلام کے مسلم باشندوں کے درمیان حقوق وفرائض کی بابت علاقہ وملک کی بنیاد پر ملکی وغیر ملکی کی تقسیم اسلامی مزاج کے بھی خلاف ہے اور اسلامی تعلیمات کے بھی مغائر، نیز مروجہ قوانین میں حصولِ شہریت کے ذرائع، شہریت سے محرومی کے اسباب اور شہریت کی وجہ سے حاصل ہونے والے حقوق وسہولیات اور عائد ہونے والے فرائض وواجبات کے جو اُصول ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا جواز سمجھ میں نہیں آتا؛ کیوں کہ اسلام جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے مسلمانوں کو تقسیم نہیں کرتا، اس کی نظر میں دارالاسلام کے سارے شہری برابر ہیں، دارالاسلام کی حدود میں کھنچی علاقائی سرحدوں کی لکیریں مسلمان شہریوں کے حقوق وفرائض کے درمیان تفریق کی لکیر نہیں کھینچ سکتیں؛ لہٰذا مسلم مملکتوں کی طرف سے مسلمانوں کو یہ اجازت ہونی چاہئے کہ وہ دارالاسلام کے جس گوشے و علاقے کو چاہیں اپنا مسکن بنائیں، مسلم مملکتوں کی جغرافیائی سرحدیں بھی مہاجرین ونووار دین کے لئے سراپا استقبال ہوں اور مسلم حکمرانوں کے دل بھی قومیت و علاقائیت سے پرے ہو کر پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کی بے لوث محبت کے لئے وا ہوں۔

البتہ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ موجودہ دور کے پیچیدہ نظام حکومت میں اگر شہریوں کی تعداد کا اور آبادی کی شرح کا صحیح اندازہ نہ ہو تو مملکت کو انتظامی اُمور مثلاً: معاشی منصوبہ بندی وبجٹ سازی وغیرہ میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے، اس لئے انتظامی مصلحت کے پیش نظر نووار دین ومہاجرین کو اس بات کا پابند بنایا جاسکتا ہے کہ وہ متعلقہ حکومتی دفتر میں اپنا رجسٹریشن کرائیں اور اپنا نام ودیگر تفصیلات کا اندراج کرائیں، اگر کوئی نو وارد واقعتاً اسلام یا مسلمانوں یا مسلم مملکت کے لئے ضرر کا باعث ہو تو ''الضرر یزال'' قاعدے کے تحت اس کو واپس کیا جاسکتا ہے، تاہم یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اندراج کی یہ کارروائی محض انتظامی نوعیت کی ہوگی، اس کی وجہ سے شریعت اسلامیہ کی طرف سے حاصل ہونے والے حقوق وسہولیات اور فرائض وواجبات میں کچھ تبدیلی نہیں ہوگی، وہ جیسے پہلے حاصل تھے اب بھی حاصل رہیں گے اور اگر اندراج کی اجازت نہ ملے تب بھی حاصل رہیں گے۔ هذا ما عندي والله اعلم بالصواب !!

رجسٹریشن کی درخواست قبول کرنا:

شہریت کی درخواست کے بجائے رجسٹریشن کی درخواست کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا کہ شہریت کے لفظ سے ذہن مروجہ نظام شہریت کی طرف جاتا ہے جو کہ اسلامی مزاج کے خلاف ہے؛ کیونکہ جب کوئی مسلمان دارالاسلام کے کسی علاقے کو اپنا مسکن بنالے تو وہ پورے دارالاسلام کا شہری ہوجاتا ہے، علاقوں کے بدلنے سے اس کے حقوق وفرائض نہیں بدلا کرتے؛ البتہ "وجعلنا کم شعوباً وقبائل لتعارفوا" (سورۂ حجرات: ۱۳) کے پیش نظر مسلمان دارالاسلام کے جس علاقے میں آباد ہوں بغرضِ تعارف اس علاقے کی طرف اپنے آپ کو منسوب کر سکتے ہیں، مثلاً مصری، فلسطینی وغیرہ، صحابہ کرام میں بھی ہمیں اس کی مثال ملتی ہیں، جیسے بلال حبشی، سلمان فارسی، صہیب رومی وغیرہ؛ لہٰذا اگر شہریت سے مراد حقوق وفرائض سے قطع نظر کسی علاقہ کا مستقل باشندہ بننا اور اس علاقہ کی طرف اپنی نسبت کرنا ہو تو مصری شہری اور فلسطینی شہری وغیرہ الفاظ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بہر حال یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی مسلم مملکت کا مستقل باشندہ بننا چاہے اور اس کے لئے وہ متعلقہ حکومتی دفتر میں درخواست پیش کرے؛

تاکہ اس کا رجسٹریشن ہو سکے، تو کیا حکومت پر اس کی درخواست قبول کرنا ضروری ہوگا؟ اس سلسلہ میں اگر ایک نظر اس عقد شہریت پر ڈال لی جائے جسے فقہاء نے عقد ذمہ کے نام سے ذکر کیا ہے تو یہ مسئلہ بہت آسانی کے ساتھ حل ہو جائے گا۔

احناف نے عقد ذمہ قبول کرنے کو مطلقاً واجب قرار دیا ہے، شوافع نے بھی جاسوس کے استثناء کے ساتھ وجوب کی بات کہی ہے، حنابلہ نے بھی وجوب کا موقف اختیار کیا ہے، بشرطیکہ درخواست گزار کی طرف سے کسی غداری کی اندیشہ نہ ہو، مالکیہ نے گو مصلحت کو بنیاد بنایا ہے؛ لیکن فی الجملہ وجوب کی بات کہی ہے، (دیکھئے: عنایہ مع الفتح، کتاب السیر، فصل فی الامان: ۵/۵۴۴، مغنی المحتاج، کتاب عقد الجزیہ: ۴/۲۴۳، الانصاف، کتاب الجہاد، باب عقد الذمۃ: ۱۰/۴۹۳، شرح مختصر خلیل للخرشی، باب احکام الجہاد، فصل فی مقدمۃ الجزیۃ: ۱۰/۱۲۵)...... یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ موجودہ دور میں غیر مسلموں کے عقد ذمہ کو قبول کرنے کے بارے میں حکومت کا کیا موقف ہونا چاہئے، یہاں بتانا یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی رو سے جب غیر مسلموں کا عقد ذمہ قبول کرنا واجب ہے تو مسلمانوں کی طرف سے پیش کی جانے والی مستقل سکونت اختیار کرنے کی درخواست قبول کرنا بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا، الا یہ کہ کسی درخواست کو قبول کرنا اگر اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں یا مسلم مملکت کی مصلحت کے خلاف ہو تو پھر اس کی درخواست رد کی جاسکتی ہے، اس سلسلہ میں حضرت عثمان ؓ کے اس عمل سے استدلال نہیں تو کم از کم استیناس کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے حضرت ابوذر ؓ کو بعض انتظامی مصلحتوں کی وجہ سے مدینہ سے باہر منتقل کر دیا تھا اور مدینہ میں رہنے کی ان کو اجازت نہیں تھی؛ کیوں کہ ان کا مدینہ میں رہنا بعض پہلوؤں سے مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں تھا؛ لہٰذا اگر کسی کی درخواست قبول کرنا مسلمانوں اور مسلم مملکت کے مفاد کے خلاف ہو تو اس کی درخواست رد کرنے کی گنجائش ہوگی؛ لیکن یہ استثنائی صورت ہے، اصل یہی ہے کہ درخواست قبول کر لی جائے۔

پناہ گزینوں کے حقوق (Rights of Refugees)

کسی بھی مسلم مملکت میں پناہ حاصل کرنے والے مسلمان دو طرح کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ جو اپنے وطن سے ہجرت کر کے آئے ہوں اور پناہ دہندہ مملکت میں مستقل سکونت اختیار کرنا چاہتے ہوں، ایسے پناہ گزین کو مملکت کا مستقل باشندہ بنا لیا جائے گا؛ کیوں کہ ان مفلوک الحال وستم رسیدہ مہاجرین کو بلا کسی عذر شرعی کے مستقل سکونت کی اجازت نہ دینا ہجرت کے مقصد کو نظر انداز کرنا ہے؛ بلکہ ہجرت کے مقدس فریضے کا سد باب کرنا ہے، دوسرے وہ پناہ گزین ہیں، جو عارضی طور پر مقیم ہوں اور وطن کے حالات سازگار ہونے کے منتظر ہوں، ایسے پناہ گزینوں (Refugees) کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کے درمیان اور اس مملکت کے قدیم باشندوں کے درمیان حقوق وفرائض کے باب میں فرق روا رکھا جاسکتا ہے؟ کیا اس مملکت کے باشندوں کو ملنے والی بہت سی سہولیات سے انھیں محروم رکھا جاسکتا ہے؟

فقہ اسلامی میں ہمیں دار الحرب، دار العہد اور دار الاسلام کے احکام میں اختلاف نظر آتا ہے؛ لیکن دار الاسلام کی حدود میں واقع علاقہ وملک کے اختلاف سے احکام میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا؛ کیوں کہ یہ بات پیچھے گذر چکی کہ دار الاسلام کے تمام شہریوں کو برابر درجہ کے حقوق حاصل ہیں، اور ان پر مساوی درجہ کے فرائض عائد ہیں اور تمام شہریوں کو حکومت کی طرف سے یکساں سہولتیں حاصل ہیں اور علاقہ ووطن کا اختلاف اس سلسلہ میں کوئی معنی نہیں رکھتا، اس لئے حقوق و فرائض کے سلسلہ میں علاقہ وملک کی بنیاد پر ملکی وغیر ملکی اور پناہ گزین وشہری کے نام پر دار الاسلام کے مسلم شہریوں کے درمیان تفریق کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے، شیخ مفتی محمد عبدہ کے نظریات سے یقیناً اختلاف کیا جاسکتا ہے؛ لیکن ان کا یہ فتویٰ مبنی برحقیقت ہے:

"لا جنسية في الإسلام، ولا امتياز في الحقوق بين مسلم ومسلم"۔ (فتاویٰ ازہر: ۴۲۳/۵، المکتبۃ الشاملۃ) (اسلام میں (مروجہ) شہریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور مسلمانوں کے درمیان حقوق کے سلسلہ میں کوئی اختلاف روا نہیں رکھا جاسکتا ہے)۔

البتہ پناہ گزینوں کو دیئے جانے والے سیاسی حقوق میں سے دو طرح کے حقوق، یعنی انتخاب لڑنے یا سیاسی عہدہ حاصل کرنے کا حق اور ووٹ دینے کا حق قابل توجہ ہیں:

(۱) موجودہ دور میں عوام اپنے نمائندے محلوں، قریوں اور شہروں یعنی علاقوں کی بنیاد پر منتخب کر کے ایوانِ حکومت میں بھیجتے ہیں، یہ نمائندے اپنے علاقوں کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والے باشندوں کے وکیل بھی ہوتے ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ پناہ گزین جن علاقوں میں عارضی طور پر مقیم ہیں ان کا ان علاقوں سے تعلق نہیں اور نہ ہی وہاں مستقل سکونت اختیار کرنا ان کا ارادہ ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ایوانِ حکومت میں پہنچنے والے نمائندے اپنے علاقوں کے مستقل باشندوں کے وکیل ہوتے ہیں، نہ کہ عارضی طور پر قیام کرنے والے لوگوں کے، اس لئے پناہ گزینوں کو اگر ووٹ دینے سے روکا جائے تو اس کی

گنجائش ہے، اس سلسلہ میں ہمیں دستورِ مدینہ کی بعض دفعات سے رہنمائی ملتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکت مدینہ تشکیل دینے کے بعد وہاں کے قبائل کی مستقل اکائیاں بنادی تھیں اور اس وقت ہر قبیلہ اپنے آپ میں ایک محلہ ہوا کرتا تھا، گویا کہا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکت کو محلوں کی بنیاد پر مستقل اکائیوں میں بانٹ دیا تھا، ہر قبیلہ اپنے محلے کا ذمہ دار تھا اور دیت ادا کرنا اور قیدیوں کو چھڑانا ہر ایک محلہ کی مستقل اپنی ذمہ داری تھی اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں...... عام حالات میں...... صرف اس قبیلے کے لوگ ہی شریک تھے، (دیکھئے: دفعہ: ۴۔۱۱، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی اور جانشینی، ڈاکٹر حمید اللہ: ۶۰۔۶۱)...... اسی طرح موجودہ دور میں بھی حکومت کی بہت ساری ذمہ داریاں علاقائی اکائیوں میں تقسیم ہیں اور ہر علاقے کا مستقل اپنا ایک ذمہ دار ہوتا ہے جو اپنے علاقے کی نمائندگی بھی کرتا ہے اور پناہ گزینوں کا تعلق چونکہ اس علاقے سے نہیں ہے اس لئے انھیں اس علاقے کا ذمہ دار اور نمائندہ منتخب کرنے کا حق دینا بے سود ہے، اس کی مزید وضاحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا تھا:

''أخرجوا إلي اثني عشر نقيباً منكم، يكونون على قومهم'' (مجمع الزوائد: ۹۸۸، کتاب المغازی، ابتداء امر الأنصار: ۶،۱۵۲) (تم اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کرکے لاؤ وہ اپنی قوم (اپنے اپنے قبیلوں) کے ذمہ دار ہوں گے)۔

اس زمانے میں قبائلی نظام رائج تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلوں کی بنیاد پر نمائندے منتخب کرائے اور ''أخرجوا'' اور ''منکم'' کے ذریعہ یہ بات بھی واضح کردی کہ نمائندے انصار ہی میں سے ہوں اور انصار ہی انھیں منتخب کریں، موجودہ دور میں نمائندگی کے لیے قبائلی نظام کے بجائے علاقائی نظام رائج ہے، اس لئے حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا جاسکتا ہے کہ جس علاقے کا نمائندہ منتخب کیا جارہا ہے اسی علاقے کے باشندوں کو انتخاب کرنے کا حق ہے، عارضی طور پر رہائش پذیر لوگوں کو اس کا حق نہیں۔

(۲) عہدے اور منصب اسلامی نقطۂ نظر سے ''حق'' نہیں؛ بلکہ عظیم ''ذمہ داری'' ہیں، ایسی عظیم ذمہ داری مظلوم پناہ گزینوں کے کاندھوں پر ڈالنا بجائے خود ایک ظلم ہے؛ اس لئے پناہ گزینوں کو الیکشن لڑنے اور سیاسی عہدہ ومنصب حاصل کرنے سے دور رکھا جاسکتا ہے اور اگر ان پناہ گزینوں میں سے کوئی شخص یہ عہدہ و منصب طلب کرے تو حدیث نبوی کی رو سے اسے عہدہ ومنصب نہ دینا جائز ہے؛ چنانچہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''إنا والله لا نولي على عملنا هذا من سأله أو حرص عليه'' (بخاری، کتاب الاحکام: ۷۱۴۸)۔

(خدا کی قسم ہم اپنے اس کام کا کسی ایسے شخص کو ذمہ دار نہیں بنائیں گے جو اسے طلب کرے یا اس کی لالچ کرے)۔

تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اگر کسی پناہ گزین کے اندر صلاحیت وقابلیت ہو اور اس کو اس کی صلاحیت کے اعتبار سے کوئی عہدہ ومنصب تفویض کرنا مسلم مملکت اور مسلمانوں کے مفاد میں ہو تو ایسا کرنا شرعاً ناجائز بھی نہیں ہے۔

غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا:

غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی مختلف امکانی صورتیں ہیں اور ہر صورت کا حکم بھی ایک جیسا نہیں ہے:

(۱) یہودیوں کا ملک اسرائیل چونکہ مسلمانوں کی زمین غصب کرکے ناجائز طور پر تشکیل دیا گیا ہے، اس لئے اس ملک کی مستقل شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس کے عہدیداروں کو شہریت کی درخواست پیش کرنا اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ یہ ملک ان غاصبوں کا ہے اور اس کا وجود جائز بنیادوں پر استوار ہے

(۲) وہ ممالک جو ٹھیٹھ معنوں میں دار الحرب ہوں، جہاں دین پر عمل کرنا دشوار ترین امر ہو، مذہبی آزادی حاصل نہ ہو اور انفرادی زندگی میں بھی اسلامی احکام کی بجا آوری مشکل ہو تو ایسے ملک کی بھی شہریت اختیار کرنا صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ ایسے ممالک سے بہ صورتِ امکان ہجرت واجب ہے؛ چہ جائے کہ وہاں کی شہریت اختیار کی جائے، صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ بھی اسی طرح کا دار الحرب تھا؛ اس لئے قدرت ہونے کے باوجود کسی عذر شرعی کے بغیر وہاں سے ہجرت نہ کرنے والوں کے بارے میں سنگین وعید نازل ہوئی: ''أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَأُوْلَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيْراً'' (النساء: ۹۷) (کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کرجاتے، یہی ہیں وہ لوگ جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے)۔

(۳) کسی مسلمان کو اس کے ملک میں روزگار کے ذرائع میسر نہ ہوں، پوری تگ ودو کے باوجود بھی کسی مسلم ملک میں روزی روٹی کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ

ہو پائے اور تنگی کی وجہ سے فاقہ کشی کی نوبت بھی آجاتی ہو، ایسے شخص کو اگر کسی غیر مسلم ملک میں ملازمت ملے یا روزگار کا کوئی ذریعہ ہاتھ آئے جس کی وجہ سے وہ وہاں کی شہریت اختیار کرلے تو اس کی گنجائش ہے؛ کیونکہ یہ اضطرار کی حالت ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے دین وایمان کے سلسلے میں مامون ہو؛ کیوں کہ حفظ دین کا درجہ حفظ نفس سے بڑھا ہوا ہے۔

(۴) یہی حکم اس شخص کے بارے میں بھی ہوگا جو اپنے ملک میں ناحق ظلم وستم کا شکار ہو، بلا کسی جرم کے قید وبند کی صعوبتوں سے دوچار ہو، ارباب اقتدار کی چیرہ دستیوں سے زندگی اجیرن بن گئی ہو اور کوئی دوسرا مسلم ملک بھی شہریت دینے پر آمادہ نہ ہو یا اگر کسی دوسرے مسلم ملک میں شہریت مل بھی جائے تو بھی ظالموں کے ہاتھ وہاں تک پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو، جس کی وجہ سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کے سوا اس کے سامنے اور کوئی راستہ نہ ہو۔

(۵) کوئی شخص فاقہ کشی کا شکار نہ ہو اور نہ ہی ظلم وستم سے دوچار ہو اور جس ملک کی شہریت اختیار کررہا ہو وہاں مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہو؛ لیکن تہذیب وتمدن کے نام پر بدتہذیبی کا ایسا سیلاب ہو کہ سفینۂ ایمان دین بے زاری کے گرداب میں غرقاب ہوجائے اور اس کے پاس ''عشق'' کی عظیم دولت کی فراوانی بھی نہ ہو کہ ''عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام''، جس کی وجہ سے ماحول میں ڈھل جانے اور ایمانی حمیت کے ختم ہوجانے کا قوی اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے اس غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ موت تک اسلامی احکام پر کاربند رہنا فرض ہے: ''یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلاَ تَمُوْتُنَّ إِلاَّ وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ'' (آل عمران: ۱۰۲)۔ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان رہو)۔

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین'' (أبوداؤد، کتاب الجهاد، النهی عن قتل من اعتصم بالسجود: ۲۶۴۵)۔ (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان اقامت اختیار کرے)۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو اپنے دین وایمان کے سلامت رہنے کے سلسلہ میں مامون نہ ہو: ''وهذا محمول علی من لم یأمن علی دینه'' (فتح الباری: الجهاد والسیر، وجوب النفیر: ۶؍۴۸)۔ (یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جو اپنے دین پر مامون نہ ہو)۔

(۶) کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں خالص دعوتی نقطۂ نظر سے رہائش اختیار کرنا چاہے؛ تاکہ وہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے، اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دے، لوگوں کے شبہات کا ازالہ کرے یا مسلمانوں کے درمیان تعلیم وتبلیغ کا فریضہ انجام دے اور کفر کے اندھیروں میں ہوا کی تندی وتیزی سے بے پرواہ ہوکر اسلام کی شمع روشن کرے، تو ایسے شخص کا اس غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا صرف جائز ہی نہیں؛ بلکہ امر مستحسن ہے اور اس کا یہ عمل قابل ستائش ہے، غیر مسلم ملکوں میں موجود صحابہ کرامؓ کی قبریں جواز کی دلیل کے لئے کافی ہیں۔

(۷) کوئی شخص دعوتی مقصد کے تحت کسی غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہتا ہے؛ لیکن ساتھ میں اس کا ارادہ معاشی استحکام پیدا کرنا بھی ہے تو یہ صورت بھی شرعاً جواز کے دائرے میں ہوگی، اللہ تعالیٰ نے عازمین حج کو ایام حج میں تجارت کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا: ''لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّکُمْ'' (البقرة: ۱۹۸)۔ (تم پر کچھ حرج نہیں ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو)۔

یعنی کسی کا اصل مقصد حج کرنا ہو اور ساتھ میں وہ تجارت بھی کرے تو اس کی اجازت ہے، کذا هذا۔

(۸) اگر مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت نہ ہو، یعنی جس مملکت کی شہریت حاصل کرنی ہے، وہ دار الحرب بھی نہ ہو، اسرائیل جیسی ریاست بھی نہ ہو، مذہب پر عمل کرنے میں دشواری بھی نہ ہو، ماحول میں ڈھل جانے کا اندیشہ بھی نہ ہو اور شہریت حاصل کرنے والا فاقہ کشی سے دوچار بھی نہ ہو، ظلم وستم کا شکار بھی نہ ہو اور اس شہریت حاصل کرنے کے پیچھے کوئی خاص دعوتی مقصد بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے اور حسب ذیل روایات سے استدلال کیا جاتا ہے:

☆ ''عن النبي ﷺ قال: أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین، قالوا: یا رسول الله! لم؟ قال: لا تراءیٰ نارا هما'' (أبوداؤد، کتاب الجهاد، النهی عن قتل من اعتصم بالسجود: ۲۶۴۵)۔ (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان اقامت اختیار کرے، صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں؟ آپ نے جواب دیا: ان دونوں کی آگ میں امتیاز نہیں ہوسکے گا)۔

☆ ''من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله'' (أبوداؤد، كتاب الجهاد، في الاقامة بأرض الشرك: ۲۷۸۷) جو مشرک کے ساتھ میل جول رکھے اور ان کے ساتھ سکونت اختیار کرے تو وہ اس مشرک جیسا ہے۔

☆ ''لا تساكنوا المشركين ولا تجامعوهم، فمن ساكنهم أو جامعهم فهو مثلهم'' (ترمذی، كتاب البر، ماجاء في كراهية المقام بين أظهر المشركين: ۱۶۰۵)۔ (مشرکوں کے ساتھ سکونت اختیار مت کرو اور ان سے میل ملاپ نہ رکھو، جو کوئی ان کے ساتھ سکونت اختیار کرے گا یا ان سے میل ملاپ رکھے گا تو وہ ان ہی جیسا شمار ہوگا)۔

☆ ''لا تتركوا الذرية ؛ يعني بإزاء العدو'' (مراسيل لأبي داؤد، باب ماجاء في إنزال الذرية السواحل والثغور: ۱،۲۵۳)۔ (اپنی اولاد کو نہ چھوڑو، یعنی دشمن کے درمیان)۔

ان احادیث کی وجہ سے عام طور پر غیر مسلم مملکت کی شہریت حاصل کرنے سے منع کیا جاتا ہے؛ لیکن خیال ہوتا ہے کہ یہ احادیث عام نہیں ہیں؛ کیوں کہ اگر یہ عام ہوتیں تو غیر مسلم ملک کے شہریوں پر بہر صورت ہجرت واجب ہوتی؛ حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ شارح حدیث علامہ ابن حجرؒ نے اس نہی کو مخصوص صورت حال پر محمول کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''أنا بريئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، وهذا محمول على من لم يأمن على دينه'' (فتح الباري، كتاب الجهاد والسير، وجوب النفير: ۶،۴۸) (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد) مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرنے والے ہر مسلمان سے میں بری ہوں، کا مصداق وہ شخص ہے جو اپنے دین کے سلسلہ میں مامون نہ ہو۔

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے دین و ایمان کے سلسلہ میں مامون اور مطمئن ہو اور اسلام مخالف ماحول میں ڈھل جانے کا اندیشہ نہ ہو تو خواہ اس کا مقصد خالص معاشی فوائد حاصل کرنا ہی کیوں نہ ہو اسے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

غیر مسلموں کو مسلم ملکوں کی شہریت دینا:

غیر مسلموں کو مسلم ملکوں کی شہریت دینا شرعاً جائز ہے، کتبِ فقہ میں عقد ذمہ کے عنوان سے اس کی تفصیلات ملتی ہیں، اس عقد ذمہ کی مشروعیت سورۂ توبہ کی جزیہ والی آیت سے ثابت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دستور مدینہ میں یہودی قبائل کو مملکتِ مدینہ کے شہری ہونے کی حیثیت دی تھی، دورِ نبوی، دورِ خلفاء راشدین اور بعد کے ادوار میں بھی اہل ذمہ کو مسلم مملکت کی شہریت حاصل رہی؛ اس لئے مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا شرعی نقطۂ نظر سے درست اور جائز ہے؛ البتہ اس سلسلہ میں تین باتیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''أخرجوا المشركين من جزيرة العرب'' (بخاری: كتاب الجزية، باب إخراج اليهود: ۳۱۶۸) اور ''لا يجتمع دينان في جزيرة العرب'' (مؤطا امام مالك، الجامع: في إجلاء اليهود من المدينة: ۱۶۷۱) غیر مسلموں کو مسلم مملکت کی شہریت دینے کے سلسلہ میں ان احادیث کو نظر انداز کر دینا سنگین غلطی ہوگی۔

(۲) استعمار کی سیاہ تاریخ ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہ استعمار جہاں بعض ملکوں میں شمشیر و آہن کی جھنکار کے ساتھ آیا، وہیں بعض دوسرے ملکوں میں رہائش اختیار کرنے کے بہانے دبے پاؤں آیا اور آہستہ آہستہ اپنے قدم مضبوط کئے؛ لہٰذا گو فقہاء نے غیر مسلموں کی درخواستِ شہریت کو قبول کرنا واجب قرار دیا ہے؛ لیکن اس طرح کے استعماری عناصر کو شہریت دینے کے سلسلہ میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

(۳) مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنے کے سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کہیں ان کی بڑھتی تعداد مسلم مملکت کے لئے خطرے کا باعث نہ ہو اور وہ اپنی کثیر تعداد کی وجہ سے ووٹ کی طاقت کے ذریعہ اسلامی مملکت کی ہی بیخ کنی کر دیں، یا بغاوت کر کے اپنی الگ مملکت قائم کر لیں، اسرائیل کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے کہ یہ ناجائز مملکت ۱۹۴۸ء میں یک بہ یک تشکیل نہیں پا گئی؛ بلکہ پہلے وہاں یہود آباد ہونے شروع ہوئے اور برطانیہ کی سرپرستی میں اپنے قدم مضبوط کئے، پھر اس کے بعد اقوام متحدہ سے قرارداد پاس کرائی۔

☆☆☆

چوتھا باب مختصر تحریریں

شہریت سے متعلق جوابات

مولانا نازبیر احمد قاسمی[1]

۱۔ اسلامی نقطہ نظر سے شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے امن چین کی خوشحال زندگی اور معاشی طور پر فارغ البالی کے حصول کے ساتھ دائرہ شریعت میں ہونے والے تمام ہی توقعات وامکانات کی تکمیل کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

۲۔ کسی مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کو اپنے ملک میں رہتے ہوئے جان مال عزت وآبرو یا دین وایمان کے تعلق سے کوئی خطرہ لاحق ہو تو اب اگر وہ اپنی اس مجبوری کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے تو میرے خیال سے اس مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا ضروری ہونا چاہیے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے خود اس مسلم ملک کو کوئی ضرر شدید لاحق نہ ہو؛ البتہ اگر اس کو اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں محض اپنی خواہش سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا ضروری نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں پر ظلم وزیادتی ہو رہی ہو جس کی وجہ سے وہاں کے مسلمان کسی مسلم ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہوں تو انسانی ہمدردی اور اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ وہاں کی حکومت ان مظلوم تارکین وطن کو وہ تمام شہری حقوق اور سہولتیں عطا کرے جو اس ملک کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں، اور یہ بات عقلاً شرعاً کسی اعتبار سے درست معلوم نہیں ہوتی کہ ان مظلوموں کو پناہ گزیں یا دوسرے نمبر کا شہری قرار دیا جائے، اسلام کی روشن تعلیم ہمیں یہی سبق دیتی ہے؛ چنانچہ کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر جب مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو مدینہ میں انہیں پناہ گزیں یا دوسرے نمبر کا شہری قرار نہیں دیا گیا، بلکہ وہاں کے قدیم باشندوں نے ان تارکین وطن مسلمانوں کے ساتھ اخوت وہمدردی کا ایسا معاملہ کیا جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا عاجز ہے؛ بلکہ اس سلسلہ میں تو ہمارے مسلم حکمرانوں کو غیر مسلم حکمرانوں سے سبق لینا چاہیے کہ تقسیم ہند کے بعد جب دونوں ملکوں میں فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے جس کے نتیجہ میں بہت سے ہندو، سکھ وغیرہ پاکستان چھوڑ کر ہندوستان آگئے، تو یہاں کی حکومت نے انہیں پناہ گزیں کا درجہ نہیں دیا، بلکہ انہیں مستقل شہریت دیکر وہ تمام حقوق دیئے جو یہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل تھے، اور وہ یہاں کے معاشرے میں اس طرح ضم ہو گئے کہ آج یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ کون یہاں کا قدیم باشندہ ہے اور کون پاکستان سے آیا ہوا ہے۔

۴۔ آج کی سیاسی اصطلاح میں حقوق شہریت کا جو تصور ہے بنیادی اعتبار سے یہ وہی حقوق ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے ذمیوں کو عطا کیا ہے، اور ذمیوں کے سلسلہ میں اسلام کا یہ اصول مشہور ہے: لهم مالنا وعليهم ما علينا۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اسلامی نقطہ نظر سے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو وہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں، مثلاً جان، مال، عزت وآبرو کے تحفظ کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق سرکاری اداروں، مثلاً سرکاری اسکول، سرکاری

[1] ناظم الجامعۃ العربیہ اشرف العلوم کنھواں سیتامڑھی (بہار)۔

ہسپتال وغیرہ سے استفادہ کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، ایک جگہ سے دوسری جگہ پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق، ووٹ دینے کا حق، بحیثیت امیدوار الیکشن میں شرکت کا حق وغیرہ۔

''وحقوق أهل الذمة من حيث الاساس كحقوق المواطنة والقاعدة المعروفة عندنا: ,,لهم مالنا وعليهم ماعلينا،، فهم يتمتعون بكامل الحقوق فى عقيدتهم وعباداتهم وأحوالهم الشخصية ويستفيدون من حماية الدولة لأموالهم ودماءهم وأعراضهم، ولهم حقهم فى كفالة الدولة أسوة بالمسلمين ... ويتمتعون بحق اللجوء إلى القضاء لما يتهم من كل أنواع الظلم حتى ولوكان المهتم هو الخليفة نفسه فحق الذمى بماقاضاته كحق اى فرد من المسلمين... إننا نرى أن المواطنة فى هذا العصرتتفق فى عناصرها الأساسية مع ''عقد الذمة'' (المسلم مواطنا فى اوروبا ص۶۰)۔

۵۔ اسلامی نقطہ نظر سے پناہ گزینوں کو شہریوں کی طرح وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جن کا تعلق انسان کی بنیادی ضروریات سے ہے، مثلاً جان، مال، عزت وآبرو کے تحفظ کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، مذہبی آزادی وغیرہ۔

''ذهب جمهور الفقهاء إلى أنه إذاوقع الأمان من الإمام أو من غيره بشروطه وجب على المسلمين جميعا الوفاء به، فلايجوز قتلهم ولاأسرهم ولاأخذ شئى من مالهم ولا التعرض لهم بعصمتهم ولا أذ يتهم بغير وجه شرعى'' (الموسوعة الفقهية ۳۷، ۱۷۰)۔

البتہ وہ حقوق جن کا تعلق انسان کی بنیادی ضرورتوں سے نہیں، بلکہ وہ آسائش وسہولت یا شہری اعزاز کے قبیل سے ہے تو میرے خیال سے وہ پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہونگے، مثلاً ووٹ دینے کا حق، امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لینے کا حق وغیرہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۶۔ ضرورت ومجبوری کی وجہ سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا درست ہوگا، اور محض معاشی فوائد کی غرض سے مکروہ ہوگا؛ چنانچہ اس سلسلہ میں مفتی تقی عثمانی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

اگر کسی مسلمان کو اپنے ملک میں جان ومال، دین وایمان اور عزت وآبرو کا خطرہ درپیش ہو تو اس کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہاں جاکر اپنے اور اپنے اہل وعیال کے دین وایمان کی حفاظت اور وہاں کی برائیوں سے اجتناب کا پختہ ارادہ ہو۔ دلیل اس کی ہجرت حبشہ کا واقعہ ہے کہ غیر مسلم ملک ہونے کے باوجود صحابہ کرام نے وہاں اقامت اختیار کیا۔ اس طرح اگر اس کو اپنے ملک میں بقدر ضرورت روزی میسر نہ ہو تو اس معاشی مجبوری کی وجہ سے بھی شرط مذکورہ کے ساتھ درست ہوگا؛ کیونکہ کسب معاش فرض ہے اور اللہ تعالی نے اس کو کسی خاص جگہ کے ساتھ مقید نہیں کیا؛ چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''هوالذى جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقه'' (سورۂ ملک: ۱۵)، البتہ اس طرح کی اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو محض معاشی فوائد کی غرض سے جانا کراہت سے خالی نہیں اور یہی صورت ان احادیث کا مصداق ہے جن میں نبی پاک ﷺ نے غیر مسلموں کی بستیوں میں قیام کرنے سے منع فرمایا ہے (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ص ۳۲۸)۔

۷۔ غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں آباد کرنا فی نفسہ درست ہے، البتہ اگر ان کو مستقل شہریت دینے میں ملک وملت کا کوئی نقصان ہو تو درست نہیں ہوگا۔

''وقال الحنفية وهورواية عند المالكية ورواية عن أحمد: يجوز عقد الذمة لجميع الكفار، إلا عبدة الأوثان من العرب'' (موسوعه فقهيه ۷،۲۲۴)۔

''الأصل أن إعطاء الأمان أوطلبه مباح وقد يكون حراما أومكروها إذاكان يؤدى إلى ضرر أو إخلال بواجب أومندوب'' (موسوعه فقهيه ۶،۲۲۴)۔

خلاصۂ بحث

(۱) اسلام میں حصول شہریت کے لئے امن چین کی خوشحال زندگی اور معاشی طور پر فارغ البالی کے حصول کے ساتھ دائرہ شریعت میں ہونے والے تمام ہی توقعات وامکانات کی تکمیل کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

(۲) اگر کسی مسلمان کو اپنے ملک میں جان، مال، عزت وآبرو اور مذہبی آزادی کے تعلق سے کوئی خطرہ ہو پھر وہ اس مجبوری کی وجہ سے کسی مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا چاہتا ہو تو میرے خیال سے اس صورت میں مسلم ملک پر درخواست قبول کرنا شرعاً ضروری ہوگا؛ البتہ اس طرح کی اگر کوئی مجبوری نہ ہو محض اپنی خواہش سے جانا چاہتا ہے تو درخواست قبول کرنا شرعاً ضروری نہیں، حاکم چاہے تو قبول کرے اور اگر ملکی مصلحت کے خلاف سمجھے تو رد کرے۔

(۳) اگر کسی علاقہ کے مسلمان اپنے اوپر ظلم وزیادتی سے تنگ آکر کسی مسلم ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہوں تو وہاں کی حکومت کے لئے یہ بات جائز نہیں ہوگی کہ ان تارکین وطن مظلوموں کو صرف پناہ گزیں کا درجہ دے اور انہیں مستقل شہری تسلیم نہ کرے۔

(۴) اگر کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اسلامی نقطہ نظر سے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو وہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں۔

(۵) جو حقوق انسان کی بنیادی ضرورت کے قبیل سے ہیں وہ شہری کی طرح پناہ گزیں کو بھی حاصل ہوں گے اور جو حقوق آسائش وسہولت یا شہری اعزاز کے قبیل سے ہوں وہ پناہ گزیں کو حاصل نہیں ہوں گے۔

(۶) ضرورت ومجبوری کی وجہ سے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا جائز ہے، اور بغیر کسی مجبوری کے محض معاشی فوائد کے حصول کے لئے مکروہ ہے۔

(۷) مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دیکر آباد کرنا فی نفسہٖ جائز ہے، الا یہ کہ ان کو مستقل طور پر آباد کرنے میں ملک وملت کا کوئی نقصان ہو تو درست نہیں۔

☆☆☆

ممالک اسلامیہ میں غیر مسلم کو شہریت دینے کا مسئلہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی [1]

ا۔ غیر مسلم کی شہریت کے تعلق سے اولا "الموسوعة الفقهيه" (۱۲۵/۷) سے یہ تحریر عرض ہے:

"وجمهور الفقهاء (الحنفية والشافعية والحنابله) على أن مدة الإقامة فى دار الإسلام للمستامن لا تبلغ سنة فإذا أقام فيها سنة كاملة أوأكثر تفرض عليه الجزية ويصير ذميا" (موسوعه فقهيه ۷،۱۲۵)۔ (جمہور فقہاء کا قول ہے کہ مستامن کے لئے دارالاسلام میں اقامت ایک سال نہ ہوگی، ایک سال یا اس سے زائد ہونے پر اس پر جزیہ عائد کردیا جائے گا اور وہ ذمی بن جائے گا)، معمولی فرق کے ساتھ یہ دوسری تحریر المستشار شیخ فیصل مولوی کی پیش ہے:

"قال الفقهاء: لو دخل غير المسلم المستامن بلاد المسلمين، فإن أقصى مدة يسمح له بالإقامة فيها سنة واحدة، فإذا استمر فى دار الاسلام أكثر من سنة من تاريخ دخوله أو من تاريخ انذار الإمام له با لخروج اكتسب جنسية دار الاسلام، وأصبح ذميا عند جمهور الفقهاء من الحنفية والشافعيه والحنابله" (المسلم مواطنا فى اوروبا ص ۱۸)۔

(فقہاء کہتے ہیں اگر غیر مسلم مستامن مسلم ملک میں داخل ہو تو اس کی وہاں سکونت زیادہ سے زیادہ ایک سال ہوگی اگر اس کی تاریخ دخول یا امام کے اسے نکلنے کا حکم دینے کی تاریخ سے ایک سال سے زیادہ ہوجائے تو پھر اسے دارالاسلام کی شہریت مل جائے گی اور وہ ذمی ہوجائے گا، حنفیہ وشافعیہ وحنابلہ کا یہی مسلک ہے)۔

عقد ذمہ کن لوگوں کے ساتھ ہوگا اس کے تحت فقہاء کے آراء عرض ہیں، حنفیہ کے قول اور امام مالک وامام احمد بن حنبل کے ایک قول میں یہ ہے کہ بت پرست عربوں کے علاوہ تمام کفار کے ساتھ عقد ذمہ کرنا درست ہے، لیکن مالکیہ کے مشہور قول کے مطابق عقد ذمہ ہر طرح کے کفار کے ساتھ جائز ہے، کتابی ہو یا غیر کتابی، عربی بت پرست اور غیر عربی بت پرست کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

"وقال الحنفية وهو رواية عند المالكية ورواية عن أحمد: يجوز عقد الذمة بجميع الكفار، إلا عبدة الأوثان من العرب" (موسوعه فقهيه ۷،۱۲۲)۔

ذمی کے شہریت دینے کے کئی فوائد ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی عبادات اور اخلاق ومعاملات کو دیکھ کر متاثر ہوں، نیز ممکن ہے کہ اسلام بھی قبول کرلیں۔ احقر کی رائے ہے کہ یہ شہریت محدود پیمانہ پر دی جانی چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تعداد میں مسلمانوں سے زیادہ ہوجائیں اور پھر مستقبل میں مسلمانوں اور خود ان کے ملک کے لئے مسائل پیدا ہوجائیں جو اہل خبر پر مخفی نہیں۔

اگر وہ غیر مسلم غیر ملکی یا مسلم غیر ملکی تعلیمی یا اقتصادی یا طبی میدان میں اختصاص رکھتا ہو اور مستقبل میں اس سے کسی طرح کے ضرر کا امکان نہ ہو اور ملک کو اس کی خدمات کی اشد ضرورت ہو تو میرے خیال میں کسی مدت کے بغیر اسے شہریت دی جاسکتی ہے، عمرو بن عاص والی مصر کو جب مشہور عیسائی طبیب اتوشیوس یا اسطیوس جسے قسطنطنیہ کے عیسائی دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اس کے فضل وکمال کی شہرت کا پتہ چلا تو انہوں نے اسے بلایا ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ "اكرمه وورى له موضعا" (ص ۱۰۴)۔ اور اس کی عزت کی اور خاص حیثیت اس کی ان کی نظر میں قائم ہوگئی، قفطی نے اس واقعہ کا ذکر کر کے لکھا ہے: "فلازمه وكان لا يكاد يفارقه" (ص ۲۳۲)۔ اور اس کو عمرو بن عاص نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے (معارف جلد ۶۶ نومبر ۱۹۵۰، ص ۳۴۳، ۳۴۴)۔

---

[1] شیخ الحدیث دار العلوم مئو۔

مسلمان کے کسی اسلامی ملک کے شہری بننے کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی اس سلسلہ میں ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کی کتاب "النظرية العامة للشريعة الاسلامية" کے ترجمہ "اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ" کے صفحہ (۳۱۳) سے ایک عبارت پیش ہے:

"جو مسلمان کسی غیر اسلامی ملک کا شہری ہو اگر وہ اسلامی ملک کا شہری بننا چاہے تو اس کے لئے صرف اتنا ضروری ہے کہ اپنی اس خواہش کا اعلان کردے اور کسی اسلامی ملک میں محض دو ہفتے ٹھہرنے سے وہ اس ملک کا شہری ہو جائے گا اور اس کے وہی حقوق وفرائض ہوں گے جو اس ملک کے دوسرے شہریوں کے ہیں، اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ مسلمان ملکوں کی شہریت کے قوانین اور دستوروں میں یہ صراحت کردی جائے کہ ہر مسلمان کو اسلامی مملکت کی شہریت حاصل کرنے کا حق ہے"۔

احقر کی رائے یہ ہے کہ سترہویں فقہی سمینار میں فقہ اکیڈمی نے "وطن اصلی کے ساتھ دوسری جگہ مستقل قیام اور قصر واتمام کے احکام" کے ذیل میں جو دو تجاویز پاس کی ہیں اسے شہریت کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ جائے ملازمت وتجارت میں طویل اقامت کے ساتھ ذاتی مکان بھی بنالینا دائمی قیام کی نیت پر دلالت کرتا ہے، اس لئے مذکورہ جگہ وطن اصلی شمار کی جائے گی۔ ۲۔ جائے ملازمت وتجارت میں ذاتی مکان تو نہیں بنایا، بلکہ کرایہ کے مکان یا ادارہ وکمپنی کے فراہم کردہ مکان میں اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت سے رہائش پذیر ہے تو اس جگہ کو وطن اصلی کا حکم حاصل ہوگا۔ واضح ہو کہ ان دونوں قراردادوں ۱۔ ذاتی مکان بنالینا، ۲۔ کرایہ وادارہ ہی کا مکان سہی، لیکن اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت کو جنسیت کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

۲۔ وہ مسلمان جو دار الحرب میں رہتے ہوں اور اظہار دین پر قدرت نہ ہو تو وہاں سے ان کے لئے ہجرت ضروری ہے، اس صورت میں دوسرے مسلم ملک کے لئے ان کی درخواست قبول کرنا شرعاً ضروری ہونا چاہئے، بصورت دیگر اگر اس ملک کی کوئی سیاسی مجبوری نہ ہو تو درخواست قبول کرلینا چاہئے۔

۳۔ شہری سہولیات تو دی جائیں گی، مگر شہری حقوق نہیں، محمد محمود فیض آبادی (مبادی سیاسیات رص ۶۹) پر لکھتے ہیں: "شہری کے معنی شہر کے باشندہ کے ہیں، لیکن اصطلاحاً اس سے مراد مملکت کے فقط وہ ارکان جنہیں ملکی دستور اور قوانین کے تحت مدنی وسیاسی حقوق حاصل ہوں، ان کے مقابلے میں اجانب کو چند شخصی تحفظات ضرور حاصل ہوتے ہیں، لیکن وہ مدنی اور سیاسی حقوق سے محروم ہوتے ہیں"۔

پناہ گزیں وقتی طور پر کہیں پناہ لیتے ہیں، پناہ دینے والوں اور پناہ چاہنے والوں دونوں کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ ان کے حالات کے سازگار ہونے کے بعد وہ اپنے ملک لوٹ جائیں گے، اس لئے انہیں شہری تسلیم نہ کیا جانا درست ہے۔

۴۔ مذکورہ ساری چیزیں اسلامی نقطہ نظر سے شہری وسیاسی حقوق ہیں اور ایک شہری کو یہ تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔

۵۔ اس کا جواب ۳ میں گذر چکا ہے، جو شہری وغیر شہری ہونے پر منحصر ہے۔

۶۔ جن اسباب کے تحت غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہے وہ یہ ہیں:

"إن اضطر إليه مسلم بسبب أنه أوذی فی وطنه أو اضطهد بالسجن أو مصادرة أمواله للغير ماذنب أو جريمة ولم يجد لنفسه مأمنا إلا فی مثل هذه البلاد، فإنه يجوز له التجنس بهذه الجنسيات دون إلى كراهة بشرط أن يعزم على نفسه المحافظة على دينه، وفی حياته العلمية والابتعاد عن المنكرات الشائعة هناك، والدليل على ذلك أن الصحابة رضی الله عنهم هاجروا إلى الحبشة بعد ما اضطهدوامن قبل أهل مكة والحبشة يومئذ يسودها الكفار" (بحوث فی قضايا فقهيه معاصره للشيخ محمد تقی عثمانی ص ۳۲۸)

(اگر کوئی مسلمان اپنے وطن کے چھوڑنے پر اس لئے مجبور ہوگیا کہ اسے وہاں ایذاء پہنچائی جارہی ہو، ظلماً قید کیا جارہا ہو، اس کا مال غیروں کے لئے بدون کسی گناہ اور جرم کے مباح سمجھا جارہا ہو اور وہ اپنے لئے کوئی فریادرس وپناہ گاہ بھی نہیں پاتا ہو تو اس صورت میں غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا بغیر کسی کراہت کے درست ہے، بشرطیکہ اس کا دینی شعائر پر باقی رہنا اور منکرات سے بچنا درجہ یقین پر ہو، صحابہ کرامؓ نے مشرکین مکہ کے ظلم سے پریشان ہو کر حبشہ ہجرت فرمائی، جبکہ وہاں کا فرماں روا کافر تھا)۔

شیخ فیصل مولوی اپنے مقالہ "قضایا الأمة۔المسلم موطنا فی أوروبا" (ص۱۸۔۱۹) پر بھی یہی تحریر فرماتے ہیں: ''والمسلم یمکنه أن یعیش خارج دارالاسلام وحتی فی دارالحرب إذا کان متمکنا من إظهار دینه، وإذا کان بعض الفقهاء تحدثوا عن وجوب الهجرة من دارالحرب، فقد کان ذلك مشروطا بعدم القدرة علی إظهار الدین...ولا بد أن یشیر إلی أن الأحناف لا یوجبون الهجرة من دار الحرب فی جمیع الظروف لقول رسول اللہ ﷺ: ''لاهجرة بعد الفتح. ولکن جهاد و نیة''، وهذا یؤکد أن جمهور المذاهب والعلماء یرون مشروعیة العیش المشترك مع غیر المسلمین، ولو کان ذلك تحت سلطان غیر اسلامی''۔

(مسلمانوں کے لئے دارالاسلام کے علاوہ حتی کہ دارالحرب میں بھی سکونت کی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ شعائر دینی پر مضبوطی سے کاربند رہے، اگرچہ بعض فقہاء نے دارالحرب سے ہجرت کرجانے کا حکم دیا ہے، مگر وہ اسی صورت میں ہے جبکہ اظہار دین پر استطاعت نہ ہو......ضروری ہے کہ حنفیہ کے مسلک کی طرف رہنمائی کردی جائے کہ وہ تمام حالتوں میں دارالحرب سے ہجرت کے قائل نہیں ہیں، بسبب حدیث رسول اللہ ﷺ: "لا هجرة بعد الفتح ولکن جهاد ونیة" کے اور یہ جمہور علماء وائمہ کے مذہب پر بھی دلیل ہوگی، کیونکہ وہ حضرات غیر مسلمین کے ساتھ مشترک زندگی گذارنے کے قائل ہیں، اگرچہ وہ حکومت غیر اسلامی ہو)۔

شیخ فیصل مولوی کی ایک تحریر اور ملاحظہ فرمائیں: ''إن المهاجرین إلی الحبشة من أصحاب رسول اللہ ﷺ هاجروا فرارا من الاضطهاد الذی کان یمارس علیهم فی مکة، و عند قیام دولة الإسلام فی المدینة کان بمکانهم أن یعودوا إلیها ویعیشوا مع أخوانهم المسلمین لکنهم فضلوا البقاء فی الحبشة یعیشون مع أهلها غیر المسلمین وظلموا هنالك سبع سنوات بعد الهجرة، ولم یعودوا إلی المدینة إلا فی غزوة خیبر فی السنة السابعه للهجرة الخ...بل ان عیش المسلم مع غیر المسلمین فی مجتمع غیر إسلامی لا یقل فی درجة الفضل عن العیش فی دولة إسلامیة'' (قضایا الامة۔المسلم موطنا فی اوربا ص۱۴۔۱۵)۔

صحابہ کرام پر جو کفار مکہ کی طرف سے پیہم مظالم کئے جارہے تھے جس کے سبب ان حضرات نے حبشہ کی جانب ہجرت فرمائی ان کا قیام وہاں مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد تک رہا حبشہ سے مدینہ خیبر کے سال، یعنی سن سات ہجری میں آئے......بلکہ مسلمانوں کا غیر مسلمین کے ساتھ غیر اسلامی معاشرہ میں زندگی گذارنا اسلامی معاشرہ میں زندگی گذارنے کے اعتبار سے افضلیت میں کمتر نہیں ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب جواز کی دوسری صورت رقم فرماتے ہیں: ''وکذالك إن اضطرالیه مسلم بسبب إذ لم تیسیر له فی بلده وسائل المعاش الضروریة التی لابدله منها ولم یجدها إلا فی مثل هذه البلاد، فإنه یجوز له ذلك بالشرط المذکور. ولأن ذلك کسب المعاش فریضة، بعد الفریضة ولم یقیده الشرع بمکان دون مکان. قال اللہ تعالی: ''هو الذی جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه وإلیه النشور'' (بحوث فی قضایا فقهیه معاصره ص۳۲۹) (ایسے ہی اگر اس کے ملک میں اس کے معاشی وسائل مفقود ہوں کہ ضروریات زندگی بھی میسر نہیں ہو پارہی ہیں تو اس کے لئے بھی مذکورہ شرط کے ساتھ اجازت ہے، کیونکہ کسب معاش فرض کے بعد دوسرا فریضہ ہے جس کے لئے کسی مکان مخصوص کی شرط نہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وہی ہے جس نے کیا تمہارے آگے زمین کو پست اب چلو پھرو اس کے کندھوں پر اور کھاؤ اس کی کچھ دی ہوئی روزی اور اسی کی طرف جی اٹھنا ہے)۔

اس کے بعد مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر معیار زندگی کو بلند کرنے کی خاطر وہ غیر مسلم ممالک کا سفر کرتا ہے تو اس کی اجازت نہ ہوگی ابوداؤد و ترمذی سے روایت پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ''قال الخطابی فی شرحه فیه وجوه، أحدها: معناه لا یستوی حکما هما قاله بعض أهل العلم، وقال بعضهم: معناه أن اللہ قد فرق بین دارالاسلام والکفر فلا یجوز لمسلم أن یساکن الکفار فی بلادهم حتی إذا أوقدوانارا کان منهم بحیث یراها، وفیه دلالة علی کراهة دخول المسلم دارالحرب للتجارة والمقام فیها أکثر من مدة أربعة ایام...ومن هنا ذکر بعض الفقهاء أن سکنی دارالحرب وتکثیر سوادهم

لأجل المال فما يسقط العدالة'' (بحوث فی قضایا فقهیه معاصره ص ۲۳۰) مذکورہ تحریر سے معلوم ہوا کہ دار الحرب میں چار یوم سے زیادہ قیام کراہت سے خالی نہیں، حتی کہ بعض فقہاء نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تکثیر مال کی غرض سے دار الحرب کا قیام عدالت کو ساقط کر دیتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع سے المتشار شیخ فیصل مولوی کی تحریر ''قضایا الامۃ۔ المسلم موطنانی اوروباص ۹۳'' پیش کر دی جائے: ''من هذه المصطلحات قولهم: (كل كافر حربي) وقولهم: (الأصل فى العلاقات بين المسلمين وغيرهم الحرب) إن خطورة أمثال هذه المصطلحات هى فى اعتبارها مبادى ثابتة لا تخضع لظروف سعينة أن اعتبار الكافر حربيا، يعنى إباحة دمه وماله ومعاملة بأحكام الحرب من جواز الكذب والاحتيال فضلا عن البعض والكراهية والفقهاء الذين يردون هذه المصطلحات يجمعون على أن حالة الحرب تنتهى بالعهد، لكن هذه العهود كانت نادرة فى التاريخ فلم توثر على استعمال هذه المصطلحات''۔

شیخ نے مذکورہ عبارت ''أوربه اليوم دار عهد وليست دار حرب'' کے ذیل میں تحریر فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جیسی سنگین اصطلاحات جن کو ٹھوس بنیاد کے طور پر تسلیم کیا جائے متعین احوال و کیفیات کے تابع نہ ہو کر اور مطلقاً یہ کہہ دیا جائے کہ کافر حربی ہے اس کا خون و مال مباح ہے اور ہر کافر کے ساتھ حربی جیسا معاملہ کیا جائے تو یہ ایک طرف کذب اور دھوکہ دہی کے جواز کو لازم کرتا ہے تو دوسری طرف دونوں کے مابین بغض و نفرت کو جنم دیتا ہے، الخ۔ موصوف دوسری سرخی ص ۹۵ پر اس طرح لگاتے ہیں: ''علة القتال الحرابة وليس الكفر''۔

مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اگر یہی غیر مسلم ملکوں میں رہائش اعزاز و افتخار کی غرض سے یا مسلم شہریت پر اس کی افضلیت کی خاطر ہو تو یہ حرام ہے اور اس کی دلیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

''أما إذا كان التجنس بالجنسيات الأجنبية اعتزاز ابهاو افتخارا أو لتفضيلها على الجنسيات المسلمة... فإن ذلك حرام مطلقا ولا حاجة إلى التذليل ذلك'' (بحوث فی قضایا فقهیه معاصره ص ۲۳۰-۲۳۱)۔

یہی بات ''قضایا الامۃ'' کے مقالہ نگار ص ۱۶ پر مختصر تحریر فرماتے ہیں: ''فاننا لانرى وجوب الهجرة من حيث الأصل ونرى أنها على أصل الإباحة ويمكن أن يتحول الحكم فيها إلى الاستحباب أوالوجوب أو الكراهة أو التحريم حسب الظروف الخاصة بكل مسلم''۔

میرے خیال میں ہجرت کی بنیادی وجہ وجوب نہیں، بلکہ اباحت ہے، ہاں خاص ظروف و احوال کے اعتبار سے کبھی استحباب کبھی وجوب، کبھی کراہت کبھی حرام ہو جاتی ہے۔

۷۔ سید جلال الدین انصر عمری ''القرطبی لاحکام القرآن'' کی یہ تحریر پیش فرماتے ہیں: ''انما هى من يريد سماع القرآن والنظر فى الإسلام فأما الإجازة لغير ذلك فإنما هى لمصلحة المسلمين، والنظر فيما تعود عليهم به منفعة'' (غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق ص ۲۶۰) اگر محارب قوم کا کوئی فرد قرآن اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے علاوہ اگر اسلامی ریاست میں آنا چاہے تو اگر مفاد کا تقاضا ہو تو اجازت دی جائے گی، ورنہ نہیں۔

☆☆☆

تبدیلیٔ وطن کے جواز اور تحصیل شہریت کا حکم

مفتی حبیب اللہ قاسمی جامعہ اسلامیہ دار العلوم، مہذب پور، اعظم گڈھ۔

اس میں شک نہیں کہ ماضی بعید میں کسی بھی ملک میں جانے اور رہنے اور قیام پذیر ہونے اور اس کو وطن بنانے کے لئے کوئی دقت نہیں تھی جن دقتوں کا سامنا آج دنیا کے انسانوں کو کرنا پڑ رہا ہے، بالخصوص مسلمانوں کے لئے تبدیلیٔ وطن اور کسی بھی وطن میں جا کر متوطن ہونا اور شہریت حاصل کرنا ایک اہم اور نازک تر مسئلہ بن گیا ہے؛ بلکہ بالتدریج مسلمانوں کے لئے وہ روئے زمین بظاہر تنگ ہوتی دکھائی دے رہی ہے جس کی وسعت اور جس کی ملکیت اور جس پر دسترس کا عام اعلان پیغام خداوندی میں موجود ہے؛ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشی، ثقافتی اور تہذیبی عموم نے اپنے دامن کو اتنا وسیع کر لیا ہے کہ ان چیزوں کے حصول کے لئے سفر اور مسافرت اور بعض مواقع پر بعض ضرورتوں کے تحت توطن اور اقامت پذیری سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

کسی بھی مسلمان کا کسی بھی ملک میں جانا اور وہاں اپنی ضروریات کی تکمیل کی حد تک قیام پذیر رہنا نہ غیر شرعی ہے نہ غیر اسلامی؛ البتہ اتنا ضرور ہے کہ خواہ مخواہ غیر ضروری چیزوں کو ضروری بنا کر اس کی تحصیل کے لئے میسر راحت کو ترک کر کے خیالی اور موہوم چیزوں کی تحصیل کے لئے اپنے کو ذلت اور رسوائی کے حوالے کرنے کی اجازت شریعت نے نہیں دی ہے، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "لا ینبغی للمؤ من أن یذل نفسه" اور نہ ہی اس زمانے میں ہجرت کو واجب یا فرض کہا جاسکتا ہے؛ البتہ حد اباحت میں اس کو رکھتے ہوئے اس کی اجازت ضرور دی جاسکتی ہے۔

لیکن ہر مسلمان کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اس کے ایمان اور اسلام اور شعائر اسلام کا تحفظ ہر حال میں ضروری ہے؛ بلہذا کسی ایسی جگہ کو وطن بنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جہاں مسلمان کی جان، مال، عزت وآبرو، دین اور اسلام، شریعت ومذہب کو خطرہ ہو، ان چند تمہیدی سطور کے بعد سوالات کے جوابات سپرد قلم ہیں۔

۱۔ کسی بھی ملک میں اس کے شہری ہونے کے لئے یا شہری بننے کے لئے دستوری طور پر جو قانون اس ملک کا ہے اس کو تسلیم کئے بغیر کوئی بھی ملک اس کو شہریت کی اتھارٹی نہیں دے سکتا، چاہے وہ کتنے ہی دنوں تک وہاں مقیم رہ چکا ہو، یا طویل زمانے سے اس کی تجارتی سرگرمیاں رہی ہوں، یا طویل زمانے سے وہاں قیام پذیر ہو، لیکن جب تک اس ملک کے وضع کردہ قانون کے دائرے میں وہ شخص نہیں آئیگا اس وقت تک قانونی شہریت اس کو نہیں حاصل ہوسکتی، اس مسئلہ میں اسلامی قانون دوسروں پر نہ تھوپا جاسکتا ہے، نہ اسکی آڑ میں شہریت حاصل کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ ہر ملک کے اپنے بنائے ہوئے اصول اور دستور کی پابندی اور اسکے دائرے میں رہتے ہوئے شہریت کے حاصل کرنے کی جدوجہد ہی قابل قبول ایک راہ ہے۔

۲۔ ہر ملک کے اپنے قوانین ہوتے ہیں انکا اپنا دستور ہوتا ہے اس دستور کے مطابق ہر ملک چلتا ہے، اس لئے کسی ملک پر شریعت کی آڑ میں کسی درخواست کو قبول کرنے کا آرڈیننس جاری نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ ظلم بہر حال ظلم ہے اور مظلوم کی فریاد رسی اور داد خواہی اور نصرت کا حکم اسلام نے دیا ہے ارشاد نبوی ہے: "انصر أخاك ظالما أو مظلوما" جب آج تک ہندوستان چھوڑ کر اسلام کے نام پر پاکستان گئے ہوئے مسلمانوں کو اسلامی ملک میں مہاجر بن کے نام پر رہنا پڑ رہا ہے اور وہ وہاں کے پرانے مقیم شہریوں کی طرح شہری نہیں بن سکے تو دوسرے کسی ملک کو کس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پناہ گزینوں کو آپ شہری تسلیم کریں۔

۴۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ہر ملک کا اپنا دستور اور نظام ہے وہ اپنے دستور کے مطابق اپنے شہریوں کو جتنے حقوق دے گا اتنے حقوق کا وہ شہری مالک ہوگا اس سے آگے بڑھنے کی اس کو اجازت نہیں ہوگی۔

۵۔ پناہ گزینوں کے حقوق سے متعلق بحیثیت مظلوم اسلام کا دامن بہت وسیع ہے وہ ان کی ہر طرح کی نصرت واعانت کو پسند ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے۔

۶۔ مسلمان کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اسکا دین وایمان اسلام اور شعائر اسلام مکمل طور پر محفوظ ہو، بصورت دیگر بقاء وتحفظ دین وایمان کی خاطر اس ملک کو چھوڑنا ضروری ہوگا۔

۷۔ ماضی میں دار الاسلام میں بہت سے غیر مسلم پوری آزادی اور تحفظ جان ومال کے ساتھ دار الاسلام میں آباد رہ چکے ہیں جس کے نظائر کتب سیر وتاریخ میں موجود ہیں۔ ☆☆

شہریت، حصول شہریت اور حقوق

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی[1]

ایک دور تھا جب ہمارے دلوں میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ "ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" یہ وہ دور تھا، جب انسان اس قدر متمدن اور مہذب نہیں ہوا تھا، دیواریں علاقائیت قبائلیت اور سرحدوں کی قائم تھیں، لیکن انسانوں کا اپنے پسندیدہ ملک میں بود وباش اختیار کرنا مشکل نہیں تھا، پاسپورٹ، ویزا، اقامۃ، بطاقۃ اور کفالۃ جیسی اصطلاحیں وجود میں نہیں آئی تھیں اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی، قوت وطاقت کے بل پر ایک دوسرے کو زیر کرنے کا عمل حکمراں اور اس کے ٹولے تک محدود رہتا تھا، شہریت کے مسائل، معاملات پر بہت حاوی نہیں ہوا کرتے تھے، جلاوطنی کے واقعات کے باوجود بعض مخصوص حالات کے علاوہ وہاں کی آبادی کو شہریت سے محروم نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ فاتح قوم کو بھی فتح کے نتیجے میں شہریت مل جاتی تھی۔

مگر اب زمانہ بدل گیا ہے، قدریں بدل گئی ہیں، ہر ملک کے اپنے مسائل ہیں، وسائل کی محدودیت نے دل کی دنیا کو بھی تنگ کر دیا ہے، اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ شہریت کے حصول کے لیے کچھ معیار مقرر کیے جائیں، ان باتوں کا ذکر کیا جائے جن کو بنیاد بنا کر اسلام میں شہریت حاصل کرنے یا ہونے کی شکلیں طے کی جائیں۔

۱۔ شہریت (Citizen Ships) کا مطلب ہوتا ہے کسی بھی ملک میں قانونی طور پر مستقل رہنے کا حق، یہ رہنا کسی بھی مقصد سے ہو سکتا ہے؛ لیکن قانونی طور پر ہونا چاہئے، مستقل کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ سیاحت کے لئے جتنے دن آدمی رہتا ہے یا کاروبار، تعلیم اور دوسرے مقاصد سے جز وقتی رہائش اختیار کرتا ہے، وہ بھی قانونی ہوتا ہے، لیکن اسے ہم شہریت کے ذیل میں نہیں لاسکتے، کیونکہ ان صورتوں میں وہاں رہنے والے کو شہری حقوق حاصل نہیں ہوتے اور زائرین، واردین صادرین کو اصطلاح میں شہری نہیں کہا جاتا۔

عربی میں اس سے قریب تر لفظ وطن ہے، جہاں انسان قیام پذیر ہوتا ہے۔

''كلمة الوطن في اللغة تشير إلى الأرض التي يقيم عليها الانسان وهو(محل الانسان)''(المسلم مواطنا فی اوربا:۲۴ بحوالہ مختار الصحاح للرازي دار القلم بيروت)۔ (لغت میں وطن کا اطلاق زمین کے اس حصہ پر ہوتا ہے جہاں انسان ٹھہرا ہوا ہے اور وہی انسان کا وطن ہے)۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اوطان کو "مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا" (سورۂ توبہ:۲۴) سے تعبیر کیا ہے، یعنی جہاں وہ رہنے پر راضی ہے۔ شریعت میں ایک اصطلاح وطن اصلی کی مستعمل ہے، جس کا اطلاق پیدائشی اور انتقال مکانی کے بعد جس کو وطن بنالیا گیا ہو دونوں پر ہوتا ہے اور دونوں کا حکم شرعی یکساں ہے، صاحب "بدائع" لکھتے ہیں: ''وطن أصلي: وهو وطن الإنسان في بلدة أو بلدة أخرى اتخذ ها دارا أو توطن بها مع أهله وولده وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها'' (بدائع الصنائع ۱،۲۸۰)۔ (وطن اصلی انسان کی وہ جگہ یا دوسری جگہ ہے جہاں وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے لگا اور وہاں گھر بنالیا اور سے اس کا کوچ کا ارادہ نہ ہو، بلکہ وہاں زندگی گذارنے کا ارادہ ہو)۔

ڈاکٹر محی الدین قرۃ داغی لکھتے ہیں: ''والخلاصة أن الوطن هو المكان الذي ولد فيه أو أقام فيه الانسان في حياته وشبابه وارتبط بحبه والحنين إليه وإلى أهله (المواطنة في الإسلام وحقوق المواطنين غير المسلمين في ظله)'' (المسلم مواطنا فی اوربا ۳۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ وطن وہ جگہ ہے جہاں آدمی پیدا ہوا یا اپنی زندگی وجوانی میں وہاں قیام پذیر ہو گیا اور اس سے اور وہاں کے رہنے والوں سے قلبی محبت اور

---

[1] نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

وارفتگی کا تعلق ہو گیا ہو۔

گویا کہ وطن اصلاوہ ہے جہاں وہ پیدا ہوا، یا دوسری جگہ جہاں وہ پورے لوازمات زندگی کے ساتھ قیام پذیر ہو گیا، اس شخص کے معاملہ میں شہریت کی بنیاد واساس ہے، مغربی قوانین بھی اس کی طرف مشیر ہیں، اور ان کے یہاں بھی تعامل یہی ہے۔

لیکن شہریت یک طرفہ معاملہ نہیں ہے یہ ایک تعلق ہے شہری اور مملکت کا، اور ایک دوسرے کے حقوق اس سے متعلق ہیں، اس لیے کسی آدمی کا یوں ہی کسی ملک میں جاکر بودوباش اختیار کرنا شہریت کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

الشیخ فیصل مولوی لکھتے ہیں: ''المواطنة لم تعد مجرد انتماء إلى أرض معينة، بل هي انتماء أيضا إلى الناس الذين يسكنون هذه الأرض وإلى النظام الذى يحكم علاقاتهم وأحوالهم'' (المواطنة والديمقراطية في البلاد العربية ۳۰)۔

مواطنہ محض کسی متعین سرزمین سے منسوب ہونے کا نام نہیں ہے؛ بلکہ یہ تعلق ان لوگوں کے ساتھ بھی ہے جو اس زمین پر رہتے ہیں، اور اس نظام کی طرف ہے جو ان کے احوال وعلائق کے سلسلہ میں فیصل ہیں۔

مغربی ممالک میں شہریت کے جو اصول رائج ہیں، ان سے وطنیت اور جنسیہ کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف معلوم ہوتے ہیں، ان کے یہاں جو تعریف مروج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''علاقة بين فردودولة كما يحددها قانون تلك الدولة وبما تتضمنه تلك العلاقة من واجبات وحقوق (ايضا)۔

شہریت، فرد اور حکومت کا ایک تعلق ہے، جو اس ملک کے قوانین کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے اور وہ تعلق فرائض وحقوق کو شامل ہوتا ہے۔

۲۔ اسی لیے کسی انسان کا کسی خاص علاقہ میں بودوباش کے ارادہ سے چلا جانا اس ملک کی نگاہ میں اسے شہری نہیں بناتا دوسرے ملک جاکر کوئی مسلمان بھی مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو شرعی طور پر اسے وہاں کے مروجہ قوانین کی پاسداری کرنی ہوگی اور ان مراحل سے اسے گذرنا ہوگا اور صرف اس بنیاد پر کہ جانے والا مسلمان ہے، اور وہ ملک بھی جہاں جارہا ہے مسلمان ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لازما اسے شہریت دیدینی چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ قائم کیا اور اس مواخاۃ کے ذریعہ مقامی باشندوں میں سے جو مسلمان تھے، ربط وتعلق کی شکل نکالی گئی اور ہر دو کے حقوق وفرائض مواخاۃ کے ذریعہ قائم ہوئے۔ اور مدینہ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ معاہدوں کے ذریعہ ارتباط پیدا کیا گیا۔

میرا خیال یہ ہے کہ جس طرح گھر کے حد میں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع ہے، ویسے ہی ملک، وطن وغیرہ وسیع معنی میں گھر کی طرح ہے اور حکمراں اور حکومت کے قوانین گھر کی چہار دیواری کے مانند ہیں، اس لیے دوسرے ملک میں بغیر اجازت (ویزہ) کے داخلہ شرعا ممنوع ہوگا، اور جس طرح دوسرے کے گھر میں بلا اجازت رہنا ممنوع ہے، وہاں مستقل بودوباش اختیار کرنا بھی ممنوع ہوگا۔

۳۔ اب اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس دوسرے ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعا ضروری نہیں ہوگا۔ البتہ اگر شہریت کی درخواست کسی مسلمان کی طرف سے آتی ہے اور جس ملک میں رہ رہا تھا وہاں کے احوال اس کے لیے نامساعد ہو رہے ہیں تو مسلم ملک کو اخلاقی طور پر اس کی مجبوری اور مظلومی، نیز اپنے ملک کے حالات ووسائل کو سامنے رکھ کر اسے شہریت دیدینا چاہیے، تاکہ ایک مظلوم کی مدد ہوسکے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''أنصر اخاك ظالما أو مظلوما'' (البخاری ۲،۱۰۲۸) اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ اور اگر ملکی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے اور وسائل مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تو یہ اخلاقی ذمہ داری بھی نہیں ہوگی اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''لا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْساً إِلَّا وُسْعَهَا'' (سورۂ بقرہ: ۷۲)۔

۴۔ اب اگر کسی ملک نے شہریت دینے کا فیصلہ کیا، تو اس ملک کے جو قوانین ہوں گے اسی کے مطابق اس کو حقوق حاصل ہوں گے، عموما جب کوئی ملک شہریت دیتا ہے تو اس شہری کو دوسرے شہری کی طرح ووٹ دینے، انتخاب میں امیدوار بننے، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کے حصول، سرکاری شفاخانوں میں علاج کی سہولت، روزگار، معاشی تگ ودو، عدالتی چارہ جوئی اور حصول انصاف سے متعلق تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں اور قدیم شہری اور جدید شہری میں ان حقوق اور تقاضوں میں تفریق شرعا درست نہیں ہوگا، لیکن یہ معاملہ صرف حقوق وفرائض سے متعلق ہوگا، جہاں تک اہمیت کا معاملہ ہے اس ملک کے قدیم

شہری کو اپنی قدامت کی وجہ سے زیادہ اہم سمجھنا غیر شرعی نہیں ہوگا، تمام ادارے، تنظیموں میں قدیم نمک خواروں اور خدمات گاروں کی اہمیت جدید لوگوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے، یہ معاملہ تنخواہ اور مراعات تک میں ہوتا ہے تو ملکی پیمانے پر ایسا ہونا فطری ہے، خود قرآن کریم کی آیت: "وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ" (سورہ توبہ:۱۰۰) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

۵۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پڑوسی ملک میں ایسے احوال پیدا ہوجاتے ہیں کہ کسی خاص طبقے اور مذہب کے ماننے والے کا وہاں قیام دشوار ہوجاتا ہے اور لوگ تیزی سے پڑوسی ملک کی سرحد کو عبور کرنے لگتے ہیں، متعلقہ ملک پر یک بارگی بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ اخلاقی طور پر بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں متعلق ملک کو ان لوگوں کے لیے زیست کا سامان کرنا پڑتا ہے، ان لوگوں کی حیثیت پناہ گزیں کی ہوتی ہے ان کے شہری حقوق نہیں ہوتے؛ لیکن بقاء زیست کے لیے ملکی حکومت فکر مند ہوتی ہے۔ یہ نووارد ین اصلاً شہری نہیں، مہمان ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ" (ترمذی وابن ماجہ) ان کے بن بلائے مہمان ہونے کی وجہ سے شرعی احکام پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

۶۔ ملکی حالات کی وجہ سے کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمان اپنی ضرورت، مجبوری یا محض معاشی فوائد کے لیے غیر مسلم ملک کا رخ کرے، اور وہاں کی شہریت حاصل کرلے، میرے خیال میں ایسا کرنا شرعاً درست ہوگا، ہجرت حبشہ کو سامنے رکھیں تو یہ ہجرت غیر مسلم ملک سے غیر مسلم ملک کی طرف ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کا ایک غیر مسلم ملک سے منتقل ہوکر دوسرے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ احادیث میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں ضمادی الازدی مکہ مکرمہ آکر مسلمان ہوئے اور پھر اپنی قوم میں لوٹ گئے (البخاری ۲/۸۸۹)، جو سب کے سب کفار تھے، عمرو بن عبسة السلمی مکہ مکرمہ میں مسلمان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کی خواہش کا اظہار کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں کا حال دیکھ رہے ہو، اپنے خاندان کی طرف لوٹ جاؤ (اخرجہ مسلم کتاب الجمعۃ باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ) اسی طرح طفیل بن عمر دوسیؓ حضرت ابوذر غفاریؓ وغیرہ کو بھی اسلام لانے کے بعد غیر مسلم ملک لوٹنے کا حکم ہوا جس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم ملک میں بودوباش اختیار کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اگر یہ دعوت اسلام کے مواقع بڑھا دیتا ہو تو مستحسن ہے۔ تمام انبیاء ورسل نے غیر مسلم ملک میں ہی بودوباش باقی رکھا اور دعوت کا کام کرتے رہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء مسلم وغیر مسلم کی مخلوط اور مشترکہ رہائش اور بودوباش کو شرعی قرار دیتے ہیں؛ چاہے یہ رہائش غیر مسلم حاکم کے تحت ہی کیوں نہ، اس کی بنیاد "لا هجرة بعد الفتح ولكن جهاد ونية" (صحيح مسلم: كتاب صلاة المسافرين رقم ۸۳۲) ہے شیخ فیصل مولوی لکھتے ہیں:

"وهذا يؤكد أن جمهور المذاهب والعلماء يرون مشروعية العيش المشترك مع غير المسلمين ولو كان ذالك تحت سلطان غير إسلامي" (اخرجه البخاري كتاب الجهاد والسير باب وجوب النفير وما يجب من الجهاد والنية)۔

اس سے یہ بات مؤکد ہوتی ہے کہ تمام مذاہب اور علماء غیر مسلم کے ساتھ مشترکہ رہائش کو شرعی سمجھتے ہیں، چاہے یہ زندگی غیر اسلامی فرماں روا کے زیر سایہ گذرے۔

البتہ ضروری ہے کہ مسلمان ان اعمال وعقائد سے اپنی براءت کا اظہار کردے جو غیر مسلموں کے یہاں پائے جاتے ہیں، اس میں گھل مل اور رل مل اس طرح نہ جائے کہ تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم میں تمیز کرنا دشوار ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار یہ اعلان کروایا گیا۔

"اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ" (المسلم مواطنا في او ربا:۱۹) (میں بری ہوں ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو)۔

"اِنَّنِیْ بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ" (سورہ انعام:۱۹) (میں بری ہوں ان چیزوں سے جن کی تم عبادت کرتے ہو)۔

"اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ" (سورہ شعراء:۲۱۶) (میں بری ہوں ان اعمال سے جو تم کرتے ہو)۔

۷۔ اس کے برعکس یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ حرمین شریفین کو چھوڑ کر کسی بھی ملک اور کسی بھی علاقہ میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ امت دعوت ہیں، اور مسلمانوں کی قربت سے ان کے حق قبول کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور یہ صلہ رحمی کی تعلیمات کے عین مطابق بھی ہے کہ ان کو تمام شہری حقوق دیئے جائیں؛ البتہ ایسے کلیدی مناصب جن پر پہنچ کر یہ مسلمانوں کے لیے خطرات پیدا کرسکیں، اس سے احتراز کیا جائے گا، ان کی حیثیت ذمی کی ہوگی اور جو مقررہ ٹیکس سرکار کی طرف سے نافذ کیا جائے گا اس کی ادائیگی انہیں کرنی ہوگی۔

☆☆☆

شہریت اور سائنٹفک تعریف

ڈاکٹر محمد ظفر الدین[1]

[illegible] Citizenship [illegible] Naturalization [illegible]

[illegible]

[illegible] Security [illegible] Justice [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] Internal Security [illegible]

[illegible]

[illegible] صورت حال یہ ہے کہ شہریت حاصل کرنے کے کچھ اصول اور ضوابط طے کر دیے گئے ہیں۔ [illegible] شہریت کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ پیدائش ہے۔ جو افراد ملک میں پیدا ہوتے ہیں وہ فطری طور پر اس ملک کے شہری قرار پاتے ہیں۔ [illegible] پیدائش Birth Certificate کا لزوم اسی کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ [illegible] والدین کی شہریت بھی حصول شہریت کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ شادی کے ذریعہ بھی شہریت حاصل کی جاتی ہے نیز ایک طویل عرصہ تک قیام کے بعد بھی شہریت کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے۔ حصول شہریت کے ان ضوابط میں [illegible]

---

[1] مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کچھ فرق بھی ہے۔ کم وبیش یہی صورت حال مسلم ممالک کی بھی ہے۔

شہریت کے رائج الوقت تصور اور اس سے وابستہ حقوق واختیارات کی وجہ سے ہی موجودہ دور میں پناہ گزینوں کا مسئلہ بھی پیدا ہوا ہے۔ پہلے یہ ممکن تھا کہ اگر ایک مقام پر رہائش دشوار ہو یا ضرورت درپیش ہو تو اپنی پسند کے کسی بھی علاقہ میں رہائش اختیار کرلی جاسکتی تھی۔ اسلام کے تصور عالمگیریت اور دعوتی ضرورت کے تحت یہ بات ضروری بھی تھی۔ چنانچہ اسلامی ممالک کی سرحدیں مسلمانوں کے لئے ہمیشہ کھلی رہی تھیں، اور علماء وفقہاء اور صوفیاء عظام کے ذریعہ دین کی اشاعت وخدمت اور مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کی عظیم الشان تاریخ اسی ذریعہ سے رقم ہوتی رہی تھی۔ لیکن جدید دور میں شہریت کے مذکور الصدر تصور کے رواج نے اس عظیم اور اہم دینی ضرورت اور اسلامی عالمگیریت پر بندش قائم کردی ہے۔ اب ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک میں قیام اور پھر وہاں بود وباش اختیار کرنا موجودہ قانون شہریت کے دائرہ میں ہی ممکن رہ گیا ہے۔ اور یہ بھی کچھ زیادہ سہولت بخش اور آسان نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کسی ملک کی جنگی صورت حال کی وجہ سے یا افراد کی انفرادی مشکلات کی وجہ سے ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک میں جانے والے افراد ایسے پناہ گزیں کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں ملک کے اصلی باشندوں کی طرح شہریت کے تمام حقوق حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ اور یہ پناہ گزیں اگر بڑی تعداد میں ہوں تو ان کی زندگی بے انتہا مشکلات ومصائب کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ یہ ایک نئی صورت حال ہے، اور اس کے نتیجہ میں جہاں افادیت اور دعوت کے بہت سے راستے بند ہوئے ہیں، وہیں افراد کے انسانی حقوق اور ضروریات کے حوالے سے متعدد سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے ہی سوالات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ شہریت کے حصول کی بنیاد:

جیسا کہ اوپر کی سطور میں مذکور ہوا، موجودہ قوانین کی رو سے اب یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کوئی فرد اپنی ذاتی پسند کے تحت ایک ملک سے نکل کر بلا روک ٹوک کسی دوسرے ملک میں جاکر آباد ہوجائے۔ اور وہاں کے اصل باشندوں کی طرح تمام سہولیات سے مستفید ہو۔ بلکہ شہریت کے حصول کیلئے درخواست دینی اور حکومت کی جانب سے منظوری حاصل ہونی ضروری ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے ایک مسلم ملک کے اندر کسی بھی مسلمان کو قیام کی اجازت ہونی چاہئے۔ اس کے لئے کسی خاص مدت تک قیام یا وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینے جیسے کسی عمل کی قید ضروری نہیں ہونی چاہئے۔ بالخصوص اس موقع پر جب اپنے دین کے تحفظ اور عقیدہ وعمل کی آزادی کے لئے اپنے ملک سے ہجرت ضروری ہوگئی ہو۔ صحابہ کرام نے اسی ضرورت کے تحت مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی اور پوری اسلامی تاریخ میں ایسی ہجرتیں پیش آتی رہی ہیں۔ سیر وسیاحت اور سفر کی یہ سہولت دین کی نشر واشاعت کے لئے ضروری تھی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''ومن يهاجر في سبيل الله يجد في الأرض مرغما كثيرا و سعة'' (نساء:۱۰۰)۔ (جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا)۔

بلکہ بسا اوقات ایسی ہجرت ضروری ہوجاتی ہے۔ قرآن میں ایسے موقع کے لئے پوچھا گیا ہے کہ: ''الم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها'' (نساء:۹۸)۔ (کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟)۔

موجودہ دور میں آبادی کی کثرت اور شہری وسائل کی محدودیت، نیز امن وامان کی برقراری کے پیش نظر اگر کوئی مسلم ملک عطائے شہریت کے لئے کچھ اصول وضوابط اور شرائط طے کرتا ہے تو نظم وضبط کی سہولت کے لئے اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔ لیکن کسی مسلمان کو مسلم ملک میں معقول وجوہات کی موجودگی کے باوجود شہریت دینے سے انکار درست نہیں ہوگا۔

۲۔ مذکورہ بالا تفصیل کی رو سے کسی مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اگر اپنے دین وعقیدہ کے تحفظ کے لئے یا اپنی کسی ضرورت کے تحت دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کی درخواست قبول کرنا ضروری ہوگا۔ ہاں اگر کسی دینی یا دنیاوی ضرورت کے بغیر صرف خواہش کے تحت دوسرے ملک کی منتقلی چاہتا ہے تو ایسی درخواست کو قبول کرنے کا فیصلہ ارباب ملک ملکی مفاد کے پیش نظر کرنے میں خود مختار ہوں گے۔

۳۔ پناہ گزینی کا مسئلہ:

پناہ گزینی موجودہ وقت کا ایک انتہائی اہم اور سنگین مسئلہ ہے۔ مختلف ملکوں میں مسلم آبادی ظلم وجبر اور بدترین استحصال کا شکار ہے۔ بہت سی جگہوں پر توان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی بربادی سامان ارزاں بن چکی ہے۔ لٹے پٹے یہ بے سروسامان مسلمان سرحدی علاقوں کے مسلم ملکوں میں جان وعزت اور دین ومذہب کی پناہ لیتے ہیں۔ ایسے پناہ گزیں اس وقت لاکھوں نہیں کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ ان کے مصائب کی سنگینی بیان سے باہر ہے۔ (واضح رہے کہ

یونائیٹیڈ نیشن رفیوجی ایجنسی (UNRA) کے مطابق 2012 تک دنیا بھر میں 4.15 ملین رفیوجی تھے۔ شام کے پناہ گزینوں کی تعداد اور ان کے مصائب تو ابھی تازہ زخم کی مانند ہے)۔ شہریت کے موجودہ قوانین انھیں پناہ دہندہ ملک کا شہری نہیں بننے دیتے۔ حالانکہ یہ لٹے پٹے ضرور ہوتے ہیں، پر اعلی دماغی قابلیت، قوت بازو، عزم وحوصلہ اور فکر ونظر کے مالک بھی ہوتے ہیں، انھیں اگر باعزت شہری کا درجہ دے کر ملک کی آبادی میں شامل کرلیا جائے، اور اگر ان کی تعداد زیادہ ہے تو مختلف مسلم ممالک اپنے اپنے یہاں معقول تعداد کو تقسیم کرلیں تو یہ پناہ گزیں ملک کی معیشت اور قوت میں اضافہ کا ذریعہ بن جائیں اور خود ان کی کسمپرسی ختم ہوجائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مختلف علاقوں سے آکر مدینہ میں بسنے والوں کو اس طرح مدینہ کے شہری سماج میں ضم کرلیا تھا کہ وہ وہاں کی قدیم آبادی کے لئے بوجھ Liability نہیں، بلکہ سرمایہ Asset بن گئے تھے۔ ایسے پناہ گزینوں کو یہ اختیار بھی رہے گا کہ جب ان کے ملکی احوال درست ہوں گے تو وہ اپنی مرضی سے وہاں لوٹ سکتے ہیں۔ یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے کہ مصیبت کے مارے مسلم پناہ گزینوں کو سرحد پر جانوروں سے بدتر زندگی گذارنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ وہ ایک مسلم ملک میں بنیادی انسانی حقوق جیسے نوکری، تجارت، اندرون ملک آزادانہ سفر اور ملکی ترقی میں حصہ داری وغیرہ سے صرف اس لئے محروم رکھے جائیں کہ وہ کسی دوسرے ملک سے آئے ہیں؟ اسلامی اخوت تو ایسی مصیبت کے موقع پر ان کی باعزت امداد ونصرت کو لازمی قرار دیتی ہے۔ قرآن اور حدیث کی بے شمار تعلیمات اس سلسلہ میں موجود ہیں۔

۴۔ ملک کے ہر شہری کو اپنی انسانی اور مذہبی زندگی کو بہتر طور پر گذارنے، نیز ملک کے نظم ونسق اور نظام کو چلانے میں یکساں طور پر شامل ہونے کے لئے جتنے بھی قسم کے حقوق واختیارات ہوسکتے ہوں وہ سب شہریت کے حقوق تسلیم کئے جائیں گے۔ موجودہ قوانین ان تمام حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسلامی شریعت تو انسانی عزت واحترام، آزادی واختیار، عدل وانصاف، معاشی جدوجہد اور تعلیم وصحت کے باب میں دنیا کے دوسرے قوانین کے مقابلہ زیادہ وسعت وفراخی رکھتی ہے۔

۵۔ پناہ گزیں اگر مختصر مدت کیلئے ہیں تو ان کے لئے عام شہریوں سے ہٹ کر قوانین بنائے جاسکتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں ان کی حیثیت مہمان کی ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ان کو بنیادی انسانی حقوق جیسے صحت وعلاج اور تعلیم کی فراہمی، رزق حلال کی تلاش کے مواقع، مذہبی عبادات کی ادائیگی اور باعزت و پرامن رہائش کی سہولیات حاصل ہوں۔ لیکن اگر پناہ گزیں طویل مدت کے لئے آئے ہوئے ہیں، اور عموماً جنگی احوال سے دوچار ممالک سے جان بچا کر آنے والے پناہ گزیں غیر یقینی صورت حال کا شکار ہونے کی وجہ سے طویل مدتوں کے لئے آجاتے ہیں تو ایسے مسلم پناہ گزینوں کو مکمل شہری حقوق فراہم کرنا کسی بھی مسلم ملک کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے۔

۶۔ غیر مسلم ملک کی شہریت:

موجودہ وقت میں بدقسمتی سے امن وامان، معاشی فارغ البالی کے مواقع، ظلم واستبداد سے تحفظ، قانون وانصاف کی بالادستی اور آزادی رائے کے حوالے سے کئی غیر مسلم ممالک متعدد مسلم ملکوں سے بہتر ریکارڈ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ملکوں سے نکل کر غیر مسلم ملکوں میں شہریت اختیار کرنے والے عام مسلمانوں اور مسلم علماء ودانشوروں کی معقول تعداد دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ ان کے لئے اختیار نہیں بلکہ ضرورت ہے۔ ان علماء، زعماء اور دانشوروں کو یہ اجازت حاصل نہ ہو تو نہ صرف وہ اپنی ذاتی زندگی میں مضرتوں کے شکار ہوں گے، بلکہ امت مسلمہ کو ان کی ذات سے پہنچنے والے بہت سارے دینی ودنیاوی فوائد سے محرومی ہوگی۔ غیر مسلم ملکوں میں ان کی موجودگی دعوتی نقطہ نظر سے بھی باعث افادیت ہورہی ہے۔ نیز وہاں کی قدیم مسلم اقلیتوں کی بھی بہتر دینی رہنمائی ممکن ہورہی ہے۔

جہاں تک معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنے کا مسئلہ ہے تو اگر دینی مفادات متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔

دراصل ایسی صورت میں ایک مسلمان کے لئے داعیانہ کردار کا حامل ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ وصف تھا جسے لے کر صحابہ کرام مدینہ سے نکل کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے اور دین اسلام کی روشنی سے ان علاقوں کو منور کردیا۔ ورنہ اسلام کی تبلیغ دنیا کے دور دراز خطوں میں کیونکر ممکن ہوسکتی تھی۔

۷۔ جزیرۃ العرب کی مخصوص مذہبی نوعیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی موجود ہے کہ جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہ رہیں۔ اس خطہ کو چھوڑ کر دیگر مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو عہد نامہ دیا تھا کہ ان کے لئے مذہبی آزادی برقرار رہے گی۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس کے موقع پر اہل جابیہ کو جان ومال اور کنیسہ وصلیب کی آزادی دی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اہل حیرہ واہل حمص کے ساتھ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اہل مصر کے ساتھ صلح میں انھیں مذہبی آزادی عطا کی تھی۔ یہ سارے لوگ مسلم زیر انتظام علاقوں میں غیر مسلم شہری کے طور پر باقی رکھے گئے تھے۔

☆☆☆

کسی دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی [1]

۱۔ اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے کسی ملک میں مستقل بودوباش اختیار کر لینے کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے، اس کی تائید فقہ اسلامی کے اس قانون سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی مقام پر مع اہل وعیال مستقل بودوباش اختیار کرتا ہے تو وہ مقام اس کے حق میں وطن اصلی بن جاتا ہے، جیسا کہ "البحر الرائق" میں ہے: "والوطن الأصلي هو وطن الإنسان في بلدته أو بلدة أخرى اتخذها دارا وتوطن بها مع أهله وولده و ليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها" (البحر الرائق ۲،۲۳۹، بدائع الصنائع ۱،۲۸۰)۔

رہیں معاشی سرگرمیاں، یا مخصوص مدت تک کسی جگہ پر قیام تو یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کی بنیاد بنایا جائے، کیونکہ آج کے اس عالمگیریت (Globalization) کے زمانے میں آدمی کی سکونت کہیں ہوتی ہے، اور اس کی معاشی سرگرمیاں کہیں اور، نیز دور حاضر میں نقل و حمل اور آمدورفت کی سہولیات بھی اس قدر میسر ہیں جو ماضی میں نہیں تھیں۔

۲۔ اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہئے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا شرعا مستحب اور اخلاقی طور پر ضروری ہے، کیونکہ اسلام ضعیف و مجبور، لاچار اور بے بس لوگوں کے ساتھ نصرت، مودت اور اخوت و بھائی چارگی کی تعلیم دیتا ہے، بشرطیکہ اس طالب شہریت شخص کا قیام ملک وملت کے حق میں دینی، سماجی اور معاشرتی اعتبار سے نقصان دہ نہ ہو۔

۳۔ الف: یہ بات شرعا درست نہیں ہے۔

ب۔ یہ بات جائز نہیں مانی جاسکتی (بلکہ قدیم باشندوں کی طرح تارکین وطن پناہ گزینوں کو بھی شہری ہونے کی سہولتیں دی جانی چاہئے، کیونکہ حفاظت نفس، نسل، مال، عزت وآبرو مقاصد شریعت میں سے ہے، نیز بنی نوع انسان مکرم ومحترم ہیں، خصوصا ایک مسلم کی حرمت تو کعبہ کی حرمت سے بھی بڑھی ہوئی ہے، اور زمین پوری کی پوری اللہ کی ملک ہے، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، اس لئے مظلوم ومجبور اور پناہ گزیں مسلمانوں کو قدیم شہری باشندوں کی طرح مراعات نہ دینا گویا ایک مسلمان کی حرمت کو پامال کرنا ہے)۔

۴۔ ایک مسلمان جب کسی ملک یا شہر کو اپنا وطن اصلی اور مستقل مستقر بنالے، تو پھر اسلامی نقطہ نظر سے اس کو وہ تمام مراعات وحقوق حاصل ہوں گے، جو عام شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں، جیسے ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق، اسی طرح اس کے جان وآبرو کی حفاظت، ذاتی ملکیت کی حفاظت، شخصی آزادی، آزادی اظہار رائے، عقیدہ ومسلک کی آزادی، عدل وانصاف۔

۵۔ پناہ گزیں کا حکم مستامن کی طرح ہے، اور ایک مستامن کو کسی ملک میں پناہ لینے پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ تمام حقوق پناہ گزینوں کو حاصل ہوں گے، اور ان کے نفس، نسل، عقل، مال اور دین ومذہب تمام چیزوں کی حفاظت لازم ہوگی۔

نوٹ: اگر پناہ گزیں مسلمان ہیں اور اس ملک یا شہر میں مستقل سکونت اور بودوباش اختیار کر چکے ہیں تو انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو دیگر باشندوں کو حاصل ہیں، البتہ اگر پناہ گزیں غیر مسلم ہیں، تو پھر انہیں سیاسی (Political) اعتبار سے ملکی انتخابات میں حصہ لینے اور امیدوار بننے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

---

[1] اکل کوا، مہاراشٹرا۔

کیونکہ ووٹ کی ایک حیثیت شہادت کی بھی ہے اور کافر کی شہادت مسلمان کے خلاف ناقابل قبول ہے، کیونکہ شہادت میں بھی ایک قسم کا غلبہ "تنفیذ القول علی الغیر" پایا جاتا ہے، اور قاعدہ مسلمہ ہے: "اسلام غالب ہوتا ہے، مغلوب نہیں"۔

۶ (الف)۔ کسی ضرورت ومجبوری کی بنا پر، مثلاً مسلمانوں کی آبادی میں جان ومال کو تحفظ حاصل نہ ہو، ہمہ وقت بلاکسی جرم کے گرفتار ہوجانے یا قتل کردیئے جانے کا شدید خطرہ لاحق ہو، اور غیر مسلموں کی مخلوط آبادی میں رہائش اختیار کرنے کے علاوہ بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، مسلمانوں کی آبادی میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں، اور غیر مسلموں کے علاقہ میں رہنے سے جائز ملازمت کا حصول آسان ہو، یا کوئی مسلمان حلال روزی کی خاطر غیر مسلموں کی آبادی میں رہ جائے، یا غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کی نیت ہو، یا جو مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مقیم ہیں ان کو دین اسلام پر جمے رہنے کی تلقین کرنا مقصود ہو، تو ان تمام صورتوں میں چند شرطوں کے ساتھ غیر مسلم ملک میں شہریت وجنسیت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی:

۱۔ غیر مسلم ممالک میں یا شہروں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص احکام اسلام پر مکمل طور پر کاربند رہے۔

۲۔ وہاں مروجہ منکرات ومحظورات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھے۔

۳۔ اس کے پاس دینی وشرعی اتنا علم ہو کہ جس سے وہ احکام اسلام سے متعلق پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دفع کرسکتا ہو۔

۴۔ اس کے پاس اتنا تقوی ودیانت ہو جو اسے شہوات سے روک سکے۔

۵۔ ایسے ملک کی شہریت اختیار کرے جو اسے فوج میں داخلہ مسلمانوں کے خلاف جنگ اور غیر اسلامی امور کی انجام دہی پر مجبور نہ کرے۔

ب۔ جب اپنے ملک میں بقدر کفاف معاشی وسائل حاصل ہوں اس کے باوجود محض معاشی فوائد، خوشحالی وخوش عیشی، یا سماج ومعاشرہ میں معزز بننے، یا دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کا اظہار، فخر ومباہات، یا اپنی عملی زندگی میں غیر مسلموں کا طرز اختیار کرکے ان جیسا بننے کی غرض سے غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

نوٹ: خصوصاً آج کے اس دور میں مسلمانوں کو مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا مناسب نہیں، بلکہ مسلمانوں کی اپنی الگ آبادی ہونی چاہئے، یا مسلم اکثریتی علاقوں میں رہنا بہتر ہے، تاکہ مسجد کی وجہ سے نماز کا اہتمام، اور مکتب کی وجہ سے اپنی اولاد کی بنیادی تعلیم کا نظم ہوسکے، مخلوط علاقے میں رہنے سے پڑوس کی وجہ سے تہذیب کا اثر پڑتا ہے، جیسا کہ ماضی میں اس کا تجربہ ہوچکا ہے، ان کے درمیان رہن سے نفع کم اور مضرت وخطرات زیادہ ہیں، اور مزید یہ کہ غیر مسلموں میں رہنے کی وجہ سے ان کی تہذیب کے اثرات سے نئی نسل کا متاثر ہوجانا بھی یقینی ہے، جس سے عقائد، عادات وعبادات پر زد پڑسکتی ہے، اور قومی وملکی حالات کے پیش نظر، اور آئے دن ہونے والے فسادات کی وجہ سے جانی ومالی نقصان سے بچنے کی تدبیر بھی یہی ہے کہ ان علاقوں میں سکونت اختیار نہ کی جائے۔

۷۔ جزیرۃ العرب کے علاوہ علاقوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا، البتہ سیاسی طور پر پناہ لینے والے غیر مسلموں کی طرف سے کسی فتنے، بغاوت یا ظلم کا اندیشہ ہو، جس سے مسلم حکومت کو خطرہ ہو، یا غیر مسلموں کی اکثریت ہوجاوے اور مسلمان اقلیت میں آکر تعطل کا شکار ہوجاوے، تو پھر ایسے حالات میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دینے سے احتراز ضروری ہے۔

☆☆☆

شہریت کا مسئلہ قرآن وسنت کی روشنی میں

مفتی محمد ابوبکر قاسمی [1]

یہ زمین اللہ رب العزت کی ہے وہی ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، اس نے تخلیق انسانی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "واذ قال ربك للملائكة إني جاعل في الأرض خليفة" (سورۂ بقرہ:۳۰) (یاد کرو اس وقت کو جبکہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں) اس آیت میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے، پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھیجا گیا تو فرمایا گیا: "ولكم في الأرض مستقر و متاع إلى حين" (سورۂ بقرہ:۳۶) (اور تم سب آدم کی ذریات کو زمین میں ٹھہرنا ہے اور ایک مقررہ مدت تک فائدہ اٹھانا ہے)، اسی طرح ارشاد باری ہے: "هو الذي خلق لكم ما في الأرض جميعا" (سورۂ بقرہ:۲۹) (اللہ رب العزت ہی نے تم سب کے لئے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے جو زمین میں ہے)، اسی طرح سورہ رحمان: ۱۰ میں فرمان باری ہے: "والأرض وضعها للأنام" (اور زمین کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے بنایا ہے)۔

ان تمام آیات کے مطالعہ اور ان میں غور و تدبیر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین اور اس کی ساری چیزیں انسانوں کے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہیں، البتہ خود انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور خلافت کے لئے پیدا فرمایا ہے، چنانچہ "سورۂ ذاریات" میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون" (ذاریات:۵۶)، نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: "هو الذي جعلكم خلائف في الأرض" (سورۂ فاطر:۳۹)۔

لہٰذا ہر انسان پر لازم ہے کہ خدا کی عبادت کرے اسی کو معبود جانے، اللہ رب العزت کی مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، کوئی فتنہ و فساد کا کام نہ کرے، "لا تفسدوا في الأرض" (سورۂ بقرہ:۱۱) (زمین میں فساد و بگاڑ کو نہ پھیلاؤ)، لیکن یہ انسان ضعیف البنیان جب کوئی عہدہ و منصب یا مال و دولت پالیتا ہے تو پھر اپنے ہی جیسے انسان کو خاطر میں نہیں لاتا، چنانچہ قارون نامی شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں نہایت مالدار شخص گذرا ہے، جس کا تفصیلی تذکرہ سورہ قصص میں ہے: "إن قارون كان من قوم موسى فبغى عليهم" (سورۂ قصص:۷۵) حضرت موسیٰ نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا: "وأحسن كما أحسن الله إليك ولا تبغ الفساد في الأرض، إن الله لا يحب المفسدين" (سورۂ آیت:۷۷) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی لوگوں پہ احسان کرو، زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا)، جب وہ اپنے برے عمل سے باز نہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا "فخسفنا به وبداره الأرض" (سورۂ قصص:۸۱)۔

اس سے پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص خدا کی عبادت و بندگی کرے، اللہ کے بندوں کو نہ ستائے، لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اگر اللہ تعالیٰ نے اسے مال و دولت سے نوازا ہے تو اللہ کے کمزور بندوں پر خرچ بھی کرے، حق بات کا انکار نہ کرے تو وہ زمین پر رہنے کا مستحق ہے، جب اس دنیا میں کم انسان تھے تو جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں رہ گیا جب انسانوں کی آبادی بڑھی علاقے تقسیم ہوئے، ممالک، صوبہ اضلاع تقسیم ہوئے تو اب جو شخص جس علاقہ میں آباد اور سکونت پذیر ہے اور وہاں اس کو عبادت و بندگی کی سہولت حاصل ہے تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ وہیں دین پر عامل بن کر اور دین کا داعی بن کر رہے، ہاں حصول علم کے لئے یا کاروبار و تجارت کے لئے یا سیر و سیاحت کے لئے یا حصول صحت کے لئے اسی طرح دوست و احباب سے زیارت و ملاقات کے لئے یا لوگوں کو دین کی دعوت دینے کے لئے جہاں چاہے جاسکتا ہے اور عارضی طور سے رہ سکتا ہے، رہا شہریت و وطنیت کے حصول کے لئے کس چیز کو بنیاد بنایا جائے تو اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان ہے اور کفار و فجار کے ظلم سے تنگ آ کر ترک وطن کرنا چاہتا ہے تو حسب گنجائش اسے جگہ مہیا کرے، اسی طرح کسی مسلمان کا کوئی مورث کہیں رہ رہا تھا، وہ وفات پا گیا تو اس کا وارث شرعی بھی اپنے مورث کی جگہ رہ سکتا ہے، خواہ وہ کہیں کا باشندہ ہو، مرتد، قاتل ناحق اور شادی شدہ زانی کو تو جینے ہی کا حق حاصل نہیں ہے، بلکہ عند الشرع وہ واجب القتل ہے تو ایسے شخص کو یا کسی باغی اور طاغی کو کسی بھی ملک میں جگہ دینا جائز نہیں ہے، البتہ مومنوں اور اپنے نیک بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی وسعت ارضی کا اعلان کیا ہے، سورۂ عنکبوت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "يعبادي الذين آمنوا إن أرضي واسعة

[1] مہتمم جامعہ رحیمیہ برہم پورا۔

فإياي فاعبدون'' (عنکبوت:۵۶)۔

لہذا کسی مومن کو کسی بھی جائز مقصد کے لئے کوئی بھی اسلامی حکومت اپنے یہاں عارضی اور دائمی جگہ دے سکتی ہے، البتہ اگر کسی کافر کو کسی خاص مصلحت سے جگہ دے تو عارضی جگہ دے، ہاں کسی بھی ملک کے قدیم باشندوں کو وہاں سے نہ بھگائے، سورہ توبہ میں ارشاد ربانی ہے: ''وان أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله، ثم أبلغه مأمنه'' (سورۂ توبہ:۶)۔

۲۔ کسی مسلم ملک میں کسی دوسرے ملک کے شہری کو جگہ دینا:

کوئی بھی مسلم ملک اپنے یہاں کسی دوسرے ملک کے مسلم باشندے کو کسی مجبوری کی وجہ سے یا کسی دوسری مصلحت کی وجہ سے جگہ دے سکتا ہے، البتہ کسی کافر کو بلا سخت مجبوری کے اپنے یہاں مستقل رہائش کی جگہ نہ دے، ہاں کوئی مظلوم ہو اور وہ پناہ کا طالب ہو تو اسے عارضی پناہ دی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه'' (سورۂ توبہ:۶)۔

یہ آیت بڑی معنی خیز ہے اور کسی کافر کو پناہ دینے کے سلسلہ میں جبکہ وہ مظلوم ہو خاص مصلحت سے عارضی پناہ دینے اور پھر اپنے ٹھکانے تک اسے پہنچا دینے کا صاف اعلان کرتی ہے، آگے آیت (۱۱) میں توبہ اقامت صلوۃ اور ایتاء زکوۃ کی شرط کے ساتھ متصف اشخاص کو مسلمانوں کا دینی بھائی کہا گیا ہے، اور مشرکین کی فطرت اور حقیقت سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے، لہذا مسلم حکمراں کو کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو شہریت دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان ہدایات ربانی کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے:

''كيف يكون للمشركين عهد'' (سورۂ توبہ:۷) ''كيف وان يظهروا عليكم لا يرقبوا فيكم إلا ولا ذمة'' (سورۂ توبہ:۸) ''فقاتلوا أئمة الكفر'' (سورۂ توبہ:۱۲)، ''إنما المشركين نجس'' (سورۂ توبہ:۲۸)، ''لتجدن أشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين أشركوا'' (مائدہ:۸۲)۔

۳۔ کسی مسلم ملک میں کسی دوسرے ملک کے مظلوم پناہ گزین مسلمانوں کو شہریت سے محروم رکھنا؟...... اگر کسی ملک یا خاص خطہ میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے سبب وہاں کے مسلم باشندے کسی دوسرے ملک میں ہجرت کر جائیں تو انہیں صرف عارضی پناہ دینا اور حقوق شہریت سے محروم رکھنا کسی مسلم ملک کے حکمراں کے لئے جائز نہیں ہے، ایسے نازک حالات میں تو انسانیت کے ناطے کافر حکمراں بھی مسلمانوں کو پناہ دے دیتے ہیں، چنانچہ جب مسلمانوں نے کفار مکہ کے مظالم سے نجات کی خاطر حبشہ کی طرف ہجرت کیا تھا تو وہاں کے کافر بادشاہ نے مسلمانوں کو بھرپور پناہ دیا تھا جس کا تفصیلی تذکرہ اسلامی تاریخوں میں موجود و محفوظ ہے، لہذا مسلم ملک کے مسلم حکمراں کا مظلوم پناہ گزین مسلمانوں کو اپنے ملک میں شہریت سے محروم رکھنا سراسر ظلم و عدوان ہے۔

۴۔ حقوق شہریت کا دائرہ، اسلامی نقطہ نظر:

اسلامی ملک کا باشندہ اپنے مذہب، عقل، مال، نسب اور جان کے تحفظ کا پانچ بنیادی حق رکھتا ہے اور جو اس حق کو سلب کرے اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے، رہا ووٹ دینے یا امیدوار بننے یا ملازمت یا علاج کا حق تو ان امور کے سلسلہ میں حسب صلاحیت اور حسب لیاقت حکومت قانون وضع کر سکتی ہے، مستحق کو اس کا جائز حق دیا جائے اور غیر مستحق کو خلاف شرع مقرر کر کے خیانت کرنے سے بچا جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ان الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها'' (سورۂ مائدہ:۵۸)، ''وقال النبي ﷺ إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة'' (رواه البخاري حديث ۵۹)۔

ہر ایک مقام سے دوسرے مقام تک بغیر پیشگی اجازت کے آمد و رفت کی ہر باشندہ کو عام حالات میں اجازت ہوگی، فتنہ و فسادات کے حالات کا استثناء ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''قل سيروا في الأرض'' (سورۂ نمل:۶۹، سورۂ عنکبوت:۲۰، روم:۴۲) ''سيروا فيها ليالي وأياما آمنين'' (سبا:۱۸)۔

۵۔ مظلوم پناہ گزینوں اور عام شہریوں کے حقوق:...... مذہب جان و مال، عقل اور نسب کے تحفظ کا پانچ بنیادی حق ہر انسان کو حاصل ہے، اسی طرح دینی تعلیم کی تحصیل کی اجازت سب مسلمانوں کے لئے یکساں ہے، رہا دنیاوی حقوق اور اسباب معیشت مہیا کرنے کے حقوق اسی طرح کوئی عہدہ و منصب حاصل

کرنا تو اس کی اجازت لیاقت اور ضرورت کو دیکھ کر دی جائے، تاکہ ملک وملت کا نظم درست رہے، معصیت اور گناہ کے کاموں کے کرنے کی اجازت دینا یا مجرمین کو سزا دینے میں ڈھیل دینا ہرگز کسی بھی اسلامی ملک کے لئے جائز نہیں ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (مائدہ:۲)۔

۶۔ کسی مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا:...... عام حالات میں کسی مسلمان کو اپنا ملک اپنا علاقہ چھوڑ کر غیر مسلموں کے ساتھ رہنا ان کے ساتھ موالات کرنا ممنوع ہے، ہاں کسی سخت مجبوری یا دین کی دعوت کو پھیلانے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک میں جاکر شہریت اختیار کر کے رہنا شرعا درست ہوگا، رہا صرف معاشی فوائد کے لئے غیر مسلم ملک میں شہریت حاصل کر کے مستقل رہنا تو یہ بھی کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے، ہاں اگر اس میں دعوت دین کی نیت کو شامل کر لیں تو پھر اجازت ہو سکتی ہے "قال النبی ﷺ: إنما الأعمال بالنیات" (بخاری)۔

۷۔ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دینے کا حکم:...... مسلم ملکوں میں خصوصا جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دے کر بسانا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے، کیونکہ مشرکین ومنافقین اور یہود وہنود ہرگز ہرگز بھروسہ کے لائق نہیں ہیں، ''عن ابن عباس أوصی (النبي ﷺ) عند موته بثلاث (إحداها) أخرجوا المشركين من جزيرة العرب'' (بخاری کتاب الجہاد باب ۱۷۵، حدیث نمبر: ۳۰۵۳)۔

☆☆☆

شہریت اور شہری حقوق کے حصول کا مسئلہ

مولانا عبداللہ کاوی والا[1]

۱۔ جب کوئی کسی ملک میں دائمی طور پر بود و باش اختیار کرنا چاہے تو اس کو حق شہریت ملنا چاہئے، چاہے اس ملک کی معاشی سرگرمیاں انجام دے یا انجام نہ دے۔

۲۔ مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان دوسرے مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے مجبوری کی وجہ سے، خاص کر اپنے ایمان واسلام کی حفاظت کے خاطر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے اور وہاں اپنے ایمان واسلام کی حفاظت کا یقین ہو تو ایسے مجبور مسلمان کو دوسرے مسلم ملک کی شہریت کی درخواست کو قبول کرنا ضروری رہے گا، اور اگر درخواست صرف خواہش کی وجہ سے ہے تو دوسرے مسلم ملک کو اس کی درخواست قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رہے گا، چاہے قبول کرے اور نہ چاہے تو قبول نہ کرے۔

۳۔ مظلوم مسلمانوں کو مسلم ملک میں جہاں پناہ کے لئے پہنچے ہیں ان کو مکمل شہری حقوق قدیم باشندوں کی طرح دینا چاہئے، یہ ایک قسم کا حق ہے جو انصاف والی غیر متعصبانہ بات ہے، "انما المؤمنون اخوة" (سورہ حجرات: ۱۰) کا کردار ہے، اسلام میں عصبیت نہیں ہے، ان کو پناہ گزیں کا درجہ دینا اور قدیم باشندوں کی طرح حقوق نہ دینا یہ بھی ظلم ہے اور عصبیت قبل الاسلام جہالت والا کام ہے؛ جبکہ اسلام میں ذمہ طلب کر کے رہنے والے غیر مسلموں کو تمام شہری حقوق دینے کا حکم فقہ واحادیث میں موجود ہے، تو مظلوم مسلمان کو یہ حق کیوں حاصل نہیں ہوگا، بایں وجہ مظلوم پناہ گزیں مسلمانوں کو ملک کے قدیم باشندوں کی طرح تمام حقوق، سہولتیں ملنی چاہئے اور دینی چاہئے۔

۴۔ سوال میں مذکورہ تمام حقوق قدیم باشندوں کی طرح پناہ گزیں مسلمانوں کے لئے مانے جائیں گے، قدیم باشندوں کی طرح مکمل شہریت دینا چاہے۔

۵۔ پناہ گزینوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو قدیم شہریوں کو حاصل ہیں، ان میں کوئی تفریق نہیں ہوگی۔

۶۔ غیر مسلم ملک میں اگر مسلمان کے اور مسلمان کی اولاد اور نسل کے ایمان واسلام کی حفاظت ہوتی ہو تو اس مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا، اختیار کرنا، چاہے کسی مجبوری کی وجہ سے ہو یا معاشی فوائد کی وجہ سے ہو اس کی اجازت ہوگی، اور اگر مسلمان اور اولاد کے ایمان واسلام کے لئے ایمان واسلام کا خطرہ ہو تو غیر مسلم کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوگی؛ کیونکہ اصل ایمان واسلام کی حفاظت مقصود ہے۔

۷۔ غیر مسلم اگر اسلام و مسلمان اور مسلم ملک کے لئے خطرہ ہو تو ایسے غیر مسلم، جیسا کہ یہود و مشرکین، عیسائی، مسلم ملکوں میں رہ کر مسلم ملکوں کے خلاف خانہ جنگی شروع کردینے کا قوی خطرہ ہو ان کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا نہیں چاہئے، ان کے علاوہ وہ غیر مسلم جن سے کوئی خطرہ نہ ہو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا، مقامات مقدسہ، جیسے مکۃ المکرمہ، مدینہ منورہ کے علاوہ کہ وہاں درست نہیں ہے، وہاں کی ممانعت نص سے ثابت ہے، خاص کر مکہ مکرمہ کے لئے۔

☆☆☆

[1] دار الافتاء، دار العلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ، گجرات۔

شریعت اسلامی میں شہریت کی اساس

مفتی محمد سلمان منصور پوری[1]

۱۔ موجودہ دور میں شہریت کا معاملہ مذہبی سے زیادہ سیاسی بن گیا ہے، اور یہ بھی دراصل دنیا کی بالادست طاقتوں کے بچھائے ہوئے جالوں میں سے ایک جال ہے؛ تاکہ ان کے برپا کردہ نظام کو پورے عالم میں نافذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، اور انسانوں کی نقل وحرکت پر ان کی بھرپور نظر رہے، ورنہ اسلامی نقطۂ نظر سے غیر اسلامی ملکوں کے غیر مسلم شہریوں کے لئے تو اسلامی ملک میں آنے اور بود وباش اختیار کرنے کے لئے اجازت شہریت وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے؛ لیکن مسلم یا غیر مسلم ملکوں کے مسلمان شہریوں کے لئے کسی مسلم ملک میں رہائش شرعاً ممنوع نہیں ہے، اور اس کے لئے کسی اجازت کی بھی شرعاً ضرورت نہیں ہے۔

البتہ چونکہ اس وقت ساری دنیا اقوام متحدہ کے بنائے ہوئے چارٹر اور منشور سے متفق ہو کر گویا ایک معاہدہ کی پابند ہو چکی ہے، اس معاہدہ میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی بھی ملک کا شہری دوسرے ملک میں ویزے کے بغیر نہ تو داخل ہو سکتا ہے اور نہ رہائش اختیار کر سکتا ہے، اور اس میں مسلم اور غیر مسلم ملکوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اقوام متحدہ سے جڑے ہوئے سبھی ممالک اس کے پابند ہیں، تو جب تک یہ معاہدہ باقی ہے اس کے موافق عمل کرنا شریعت کے خلاف نہیں ہے، اس کی تائید صلح حدیبیہ کے واقعہ سے ہوتی ہے، جس میں یہ شرط لگادی گئی تھی کہ مکہ کا کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا تو اس کو وہاں رہنے نہیں دیا جائے گا، چنانچہ جب حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واپس فرمادیا۔

☆ "ثم رجع إلى المدينة، فجاء أبوبصير رجل من قريش، فأرسلوا في طلبه، فدفعه إلى الرجلين فخرجا به" (بذل المجهود بيروت ۹،۴۹۲-۴۹۳)۔

☆ "فقال النبي صلى الله عليه وسلم: أكتب هذا ما قاضى عليه محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم وقص الخبر، فقال سهيل: وعلى أنه لا يأتيك منا رجل وإن كان على دينك إلا رددته إلينا، فأنكر المسلمون على هذا الشرط، فجاء أبوجندل بن سهيل بن عمرو فوقع الإصرار والإنكار في رده؛ لكن ردّه رسول الله صلى الله عليه وسلم" (بذل المجهود بيروت ۹،۴۹۱-۴۹۲)

☆ "وكان فيما اشترط سهيل بن عمرو أنه قال: لا يأتيك منا أحد وإن كان على دينك إلا رددته إلينا وخلّيت بيننا وبينه وأبى سهيل أن يقاضى رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا على ذٰلك. فكره المؤمنون ذٰلك وامتعضوا فتكلموا فيه، فلما أبى سهيل أن يقاضى رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا على ذٰلك كاتبه رسول الله، فرد رسول الله صلى الله عليه وسلم أبا جندل بن سهيل بن عمرو إلى أبيه سهيل بن عمرو ولم يأت رسول الله صلى الله عليه وسلم أحدٌ من الرجال إلا ردّه في تلك المدة، وإن كان مسلماً" (بخاري ۲۰۶۰۱ رقم: ۴۰۸۳، فتح الباري رقم: ۴۱۸۱)۔

اس تمہید کی روشنی میں متعلقہ سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

(۱) شہریت دینے کا اختیار حکومت کو ہے، وہ اپنی مصلحت دیکھ کر جس کو چاہے شہریت دے جس کو چاہے انکار کردے، اور وہ اپنے طور پر اس کے لئے جو مناسب سمجھے، معیار بنا سکتی ہے۔

---

[1] جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد۔

☆''المستفاد: يجب أن يعلم بأن الأمان كما يجوز مرسلاً يجوز معلقاً بالشرط'' (فتاوىٰ تاتارخانية زكريا ٤٦٠٦، رقم: ٩٩٧١)۔

☆''وللإمام أن يؤقت في ذٰلك ما دون السنة كالشهر والشهرين'' (هداية مع الفتح ٦،٢٢)۔

۲۔ کوئی بھی مسلمان کسی مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے کی کوشش کرسکتا ہے؛ لیکن اس مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا اقوام متحدہ کے منشور کے اعتبار سے ضروری نہیں ہے؛ البتہ اگر درخواست دہندہ کے حالات اس کے متقاضی ہوں کہ اس کو مسلم ملک میں شہریت دی جائے، تو اسلامی اخوت کی بنیاد پر ایسے افراد کو شہریت دینے میں دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

☆''يجب أن يعلم بأن الأمان كما يجوز مرسلاً يجوز معلقاً بالشرط'' (فتاوىٰ تاتارخانية زكريا ٤٦٠٦، رقم: ٩٩٧١)۔

☆''مستفاد: إذا رأى الإمام أن يصالح أهل الحرب أو فريقاً منهم وكان ذٰلك مصلحة للمسلمين، فلا بأس به، لقوله تعالىٰ: {وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله}'' (هداية مع الفتح ٥،٤٤٠)۔

۳۔ مسلم حکومتوں کا شرعی اور اخلاقی فرض یہی بنتا ہے کہ وہ مجبور اور بے کس مسلمانوں کو اپنے یہاں بلا کران کو مکمل شہری حقوق سے نوازیں، اور ان میں اور مستقل شہریوں میں کوئی تفریق نہ کریں؛ لیکن اگر قومی یا بین الاقوامی مصلحت اس میں کسی وجہ سے مانع ہو، تو اسلامی حکومت کو ایسے مسلمانوں کو شہریت دینا لازم نہ ہوگا۔

☆''القاعدة العامة في حقوق أهل الذمة: أن لهم مالنا وعليهم ما علينا، وهٰذه القاعدة جرت على لسان فقهاء الحنفية وتدل عليها عبارات فقهاء المالكية والشافعية والحنابلة'' (بدائع الصنائع زكريا ٦،١١١، المغني لابن قدامة ٥،٧٤٨، بحواله: الموسوعة الفقهية ٧،١٢٧)۔

☆''ويؤيدها بعض الآثار عن السلف: فقد روي عن علي بن أبي طالب أنه قال: إنما قبلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا'' (الموسوعة الفقهية ٧،١٢٧)۔

☆''قال النبي صلى الله عليه وسلم: ألا من ظلم معاهداً أو انتقص حقه أو كلّفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئاً بغير طيبِ نفسٍ منه، فأنا حجيجه يوم القيامة'' (أبوداؤد بيروت ٣،٤٣٧، رقم: ٣٠٥٢)۔

۴۔ شہریت کے اندر آزادی سے متعلق تمام حقوق آتے ہیں، اور اس کی تعیین کرنا حکومتوں کا کام ہے، حکومت جو بھی ذمہ داریاں شہریوں پر عائد کرے اور جو سہولتیں انہیں عطا کرے، ان کی پابندی ہونی چاہئے۔

☆''أما بعد: فقد نزل عليّ رسلكم راجعين إلى قريتكم، فإذا جاء كم كتابي هٰذا فإنكم آمنون لكم ذمة الله وذمة رسوله، وإن رسول الله غافر لكم سيئاتكم، ولا ظلم ولا عدوىٰ وإن رسول الله جاركم مما منع منه نفسه، وإن عليكم رجع ما خرجت نخلكم، فإن سمعتم وأطعتم فإن على رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يكرم كريمكم ويعفو عن سيئكم وأن ليس عليكم أمير إلا من عند أنفسكم أو من أهل رسول الله صلى الله عليه وسلم'' (طبقات ابن سعد ١،٢٨، ٢،٣٠)۔

☆''إن القاعدة العامة في حقوق أهل الذمة هي: أن لهم مالنا وعليهم ماعلينا حيث قال علي رضي الله عنه: إنما قبلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا'' (بدائع الصنائع زكريا ٦،١١١، القوانين الفقهية ١٠٥، المذاهب للشيرازي ٢،٢٥٦، الأحكام السلطانية للماوردي ٢٢٧، المغني ٨،٤٤٥، بحواله: المواطنة في الإسلام وحقوق المواطنين غير المسلمين في ظله ٢٠)

☆''ولنجران وحاشيتهم جوار الله، ومن سأل منهم حقا فبينهم النصف غير ظالمين ولا مظلومين، ولا يؤاخذ

أحداً منهم بظلم آخر، وعلى ما فيه هٰذه الصحيفة جوار الله وذمة النبي صلى الله عليه وسلم الخ'' (الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ۲،۳۶، فتوح البلدان للبلاذري ۷۶،۱-۷۸، بحواله: المواطنة في الإسلام وحقوق المواطنين غير المسلمين في ظله ۱۸)۔

۵۔ شریعت میں پناہ گزینوں کی الگ سے اصطلاح نہیں ہے، یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے، شرعی حکم تو یہی ہے کہ جو شخص بھی اسلامی ملک میں رہائش اختیار کرے، اس کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں، اور پناہ گزینی کی وجہ سے تفریق نہیں ہونی چاہئے۔

*''القاعدة العامة في حقوق أهل الذمة: أن لهم مالنا وعليهم ما علينا وهٰذه القاعدة جرت على لسان فقهاء الحنفية وتدل عليها عبارات فقهاء المالكية والشافعية والحنابلة، ويؤيدها بعض الآثار عن السلف، فقد روي عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه أنه قال: إنما قبلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا'' (الموسوعة الفقهية ۷،۱۲۷، بدائع الصنائع ۶،۱۱۱، المغني لابن قدامة ۵،۵۳۸، بحواله: الموسوعة الفقهية ۷،۱۲۷)۔

☆''وفي كتاب النبي صلى الله عليه وسلم لأهل نجران: ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم على أموالهم وملتهم وبيعهم، وكل ما تحت أيديهم'' (أخرجه البيهقي في دلائل النبوة ۵،۳۸۵، البداية والنهاية ۵،۴۸)۔

☆''وعلى ذٰلك فلأهل الذمة حق الإقامة آمنين مطمئنين على دمائهم وأموالهم وأعراضهم وعلى الإمام حمايتهم كل من أراد بهم سوءاً من المسلمين أوأهل الحرب أو أهل الذمة؛ لأنه التزم بالعهد حفظهم من الاعتداء عليهم فيجب عليه الذب عنهم ومنع من يقصدهم بالأذى من المسلمين أو الكفار، واستنقاذ من أسر منهم واسترجاع ما أخذ من أموالهم سواء كانوا مع المسلمين أم منفردين عنهم في بلدهم؛ لأنهم بذلوا الجزية لحفظهم وحفظ أموالهم'' (بدائع الصنائع بيروت ۷،۱۱۱، الشرح الصغير للدردير ۱،۱۴۰، المهذب ۲،۲۵۶، كشاف القناع ۳،۱۳۹، المغني ۸،۵۳۵، بحواله: الموسوعة الفقهية ۷،۱۲۷)۔

☆''وحكم أموالهم حكم أموال المسلمين في حرمتها'' (ابن عابدين ۳،۲۲۳، بحواله: الموسوعة الفقهية ۷،۱۲۸)۔

☆''لأهل الذمة أن يقيموا في دار الإسلام آمنين مطمئنين على أنفسهم وأموالهم ما لم يظهر ما ينتقص به عهدهم؛ لأنهم إنما بذلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا، والمسلمون على شروطهم'' (الموسوعة الفقهية ۷،۱۲۸)۔

۶۔ مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دین وایمان کے تحفظ کا پختہ انتظام کرلیں، اگر ایسا انتظام نہ ہو تو ان ممالک میں بود وباش اختیار کرنا درست نہ ہوگا۔

☆''فقد جاء في تاريخ ابن كثير: قال محمد بن اسحق: فلما رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم ما يصيب أصحابه من البلاء وما هو فيه من العافية بمكانه من الله عزوجل، ومن عمه أبي طالب وأنه لا يقدر على أن يمنعهم مما هم فيه من البلاء، قال لهم: لو خرجتم إلى أرض الحبشة، فإن بها ملكاً لا يظلم عنده أحد وهي أرض صدق، حتى يجعل الله لكم فرجاً مما أنتم فيه، فخرج عند ذٰلك المسلمون من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى أرض الحبشة مخافة الفتنة وفراراً إلى الله بدينهم، فكانت أول هجرة كانت في الإسلام فكان أول من خرج من المسلمين عثمان بن عفان وزوجته رقية بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم'' (البداية والنهاية بيروت ۳،۱۶۶-۱۶۷، مسند أحمد ۱،۳۶۱)

☆''جواز الهجرة إلى دار الكفر والبقاء فيها حيث إن هٰؤلاء الأصحاب بقوا إلى عام خيبر حيث يقول جعفر رضي الله عنه: فخرجنا حتى أتينا المدينة فتلقاني رسول الله صلى الله عليه وسلم واعتنقني ثم قال: ما أدري أنا بفتح

خيبر أفرح أم بقدوم جعفر'' (البداية والنهاية ۴،۱۴۹، معجم الكبير للطبراني ۲،۱۴۷۸، مجمع الزوائد ۶،۳۰)۔

☆ ''والمسلم يمكنه أن يعيش خارج دار الإسلام وحتى في دار الحرب إذا كان متمكناً من إظهار دينه، وإذا كان بعض الفقهاء تحدثوا عن وجوب الهجرة من دار الحرب فقد كان ذلك مشروطاً بعدم القدرة على إظهار الدين'' (الموسوعة الفقهية باب دار الحرب نقلاً عن نهاية المحتاج ۸،۸۲، كشاف القناع ۳،۴۳، اسنى المطالب ۴،۲۰۴، المغنى ۸،۴۵۶، عمدة القاري ۱،۳۵، الأنصاف ۴،۱۲۱، بحواله: المسلم موطناً في اوروبا ۱۸)۔

☆''عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: جاء الطفيل بن عمرو إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: إن دوساً قد هلكت عصت وأبت فادع الله عليهم، فقال: اللّٰهم اهد دوساً وأت بهم'' (بخاري ۲،۶۳۰، رقم: ۴۲۱، السيرة الحلبية ۱،۵۱۳)۔

☆ ''فهٰذا ضماد الأزدي أسلم ثم رجع إلى قومه وعاش معهم حتى هاجر رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى المدينة الخ'' (مسلم، كتاب الجمعة ۱،۲۸۴)۔

۷۔ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو ذمی کی حیثیت سے حقوقِ شہریت عطا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، دورِ نبوت اور دورِ صحابہ سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے، بشرطیکہ قومی، ملی اور ملکی مصلحت کے خلاف نہ ہو۔

☆ ''ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد النبي رسول الله على أموالهم وأنفسهم وملتهم وغائبتهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير لا يغير أسقف من أسقفيته ولا راهب من رهبانيته'' (الوثائق السياسية للعهد النبي ۱۴۰، الطبقات الكبرى لابن سعد ۲،۱،۳۶، ۸۴۔۸۵، فتوح البلدان للبلاذري ۱،۷۶۔۷۸، بحواله: المواطنة في الإسلام وحقوق المواطنين غير المسلمين في ظله ۴۰، بحواله: المسلمون مواطناً في اوروبا ۴۲، اخرجه البيهقي في دلائل النبوة ۵،۳۸۵، البداية والنهاية ۵،۴۸)۔

☆''جمهور الفقهاء على أن عقد الذمة مع غير المسلمين يتولى إبرامه الإمام أونائبه؛ لأن ذلك يتعلق بنظر الإمام وما يراه من المصلحة'' (الخرشي ۳،۱۴۳، القليوبي ۴،۲۲۸، مغني المحتاج ۴،۲۴۳، المغني لابن قدامة ۸،۵۰۵، كشاف القناع ۳،۱۱۶، بحواله: الموسوعة الفقهية ۷،۱۲۲)۔

☆''لأن عقد الذمة فيه التزام أحكام الإسلام فيما يرجع إلى المعاملات'' (السير الكبير ۵،۱۸۴۰، بحواله: الموسوعة الفقهية ۷،۱۲۶)۔

☆''وهو في الأسارى بالخيار إن شاء قتلهم؛ لأنه عليه السلام قد قتل، وإن شاء استرقهم؛ لأن فيه دفع شرهم مع وفور المنفعة لأهل الإسلام، وإن شاء تركهم احراراً ذمة للمسلمين'' (هداية مع الفتح ۵،۴۶۰)۔

☆☆☆

مسلم ملکوں میں غیر مسلم کی شہریت کا مسئلہ

مفتی ظہیر احمد کانپوری[1]

جیسا کہ آپ کے سوال سے واضح ہے کہ شہریت کا مسئلہ موجودہ دور کی پیداوار ہے، اسلام میں اور قدیم زمانہ میں اس کی وہ حیثیت نہیں تھی جو موجودہ دور میں بن چکی ہے، اس کے مختلف اسباب ہیں۔

موجودہ دور میں شہریت جس کو عربی زبان میں مواطنت یا جنسیہ یا انگریزی میں Nationality کہا جاتا ہے، جو انگریزی کے لفظ Nation کی طرف منسوب ہے، دور جدید میں Nation وہ جدید اسٹیٹ ہے جو ایک مخصوص علاقہ اور خطہ کے رہنے والے لوگوں کے ملک تک محدود ہے، کہ وہ اس خطہ اور علاقہ میں رہنے والے لوگوں کو ہی اپنا سہری اور باشندہ تسلیم کرتی ہے، اور انہی کو وہ تمام یا جملہ شہری حقوق دیتی ہے، اس خطہ اور علاقہ سے باہر رہنے والوں کو وہ اپنا شہری اور باشندہ تصور نہیں کرتی ہے، ان شہری حقوق میں ملکی انتظام میں حق شراکت بھی ہے۔

اس Nation State کی بنیاد جمہوریت Democracy اور سیکولرزم Secularism پر ہے۔ جو بندوں کو لامحدود اختیارات تفویض کرتی ہے، کہ لوگ جس چیز کو چاہیں جائز قرار دیں اور جس کو چاہیں ناجائز قرار دیں، اور مذہب و دین کا نیشن اسٹیٹ میں کوئی دخل نہیں۔

اور اس نے مذہب و دین اور حکومت و سیاست کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ دیا، کہ مذہب بندہ اور خدا کے مابین تعلق کا نام ہے، اور حکومت و سیاست فرد و حکومت کے درمیان تعلقات کا نام ہے، مذہب و دین سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں، جو کلیسا اور جدید نظریات کے حامل نصاریٰ سائنسدانوں کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔

بہر حال ان لوگوں نے ایک مخصوص خطہ اور علاقہ کے لوگوں کو ہی ایک Nation (قوم) تک محدود کر کے صرف انہی کو اپنا شہری تسلیم کر کے صرف انہی کو جملہ شہری حقوق کا حق دار قرار دیا۔

جبکہ اسلام میں مذہب و سیاست، دین اور حکومت علاحدہ چیزیں نہیں، بلکہ حکومت و سیاست بھی دین اسلام کا ایک حصہ ہے، جائز اور ناجائز قرار دینے کا حق صرف اللہ اور اس کے رسول کو ہے، انسانوں کو نہیں، شریعت اسلامیہ میں اصلا ہر شخص کو کسی بھی جگہ رہنے کا حق حاصل ہے جس پر نصوص دلالت کرتے ہیں۔

"لله ملك السموات والارض" (سورۂ بقرہ: ۲۸۴) (حکومت اور سلطنت صرف اللہ ہی کے لئے ہے) لہذا اس کے احکام وقوانین جاری ہوں گے، بندہ تو اس کا خلیفہ اور نائب ہے، "انی جاعل فی الأرض خلیفة" (سورۂ بقرہ: ۳۰) (انسان کے ذمہ لازم ہے کہ اس کے احکام وقوانین کا زمین پر نفاذ کرے)۔

''ومن لم یحکم بما أنزل الله فاولئك هم الكافرون، الظالمون، الفاسقون'' (سورۂ مائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷) اور ساری کی ساری زمین اللہ ہی کی ہے، "لله مافی السموات ومافی الأرض" (سورۂ بقرہ: ۲۸۴) اللہ نے روئے زمین پر کہیں بھی رہنے جانے اور گھومنے کی اجازت دی ہے، ''قل سیروا فی الأرض''، لہذا اس کے رہنے گھومنے پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا ہے، سارے کے سارے انسان ایک کنبہ کے افراد ہیں، ''لقول النبی ﷺ الخلق عیال الله'' (الحدیث) ''ولقوله تعالی: یایها الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا'' (سورۂ حجرات: ۱۳)، اور دوسری جگہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''الدنیا خلقت لکم وانما خلقتم للأخرة''، ارشاد باری تعالیٰ ''والمومنون والمؤمنات بعضهم أولیاء بعض'' (سورۂ توبہ: ۷۱)، ان تمام نصوص کی روشنی سے یہ بات

---

[1] مسجد حلوہ سوہن، پٹکاپور، کانپور۔

واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کسی مخصوص علاقہ کے لوگوں کو ہی اپنا شہری نہیں تسلیم کرتا، بلکہ جو بھی اسلامی نظریات کا حامل ہو اور اسلامی قوانین کی بالادستی قبول کرتا ہو وہ اسلامی مملکت کا شہری اور باشندہ ہے، خواہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، جبکہ وہ دنیاوی امور میں اسلامی احکامات کا پابند ہو عقد ذمہ کے ماتحت۔

اسی طرح حکومت اسلامیہ ایک نظریاتی ریاست ہے جو کسی مخصوص علاقہ تک محدود نہیں، بلکہ وہ تمام روئے زمین کو شامل ہے اور اس کا ہر وہ شخص شہری ہے جو اس نظریہ کا حامی اور قائل ہو باغی نہ ہو، اور ان سب کو جملہ حقوق شہریت حاصل ہوں گے، البتہ اسلام میں انتظام ملکی، یعنی حکومت اسلامیہ کے قیام اور اس کے چلانے کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے، غیر مسلم کی ملکی نظام کے چلانے میں، یعنی اس کی Keypost پر کوئی شرکت نہیں ہو سکتی ہے، جیسا کہ عصری نیشن اسٹیٹ کے نظام میں ہے، اسلام میں نظام حکومت چلانے کے لئے مسلمان ہونے کی قید اس لئے ہے کہ اسلامی احکام کے نافذ کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ نافذ کرنے والا اس نظریہ کا حامل ہو کہ اسلامی حکومت دراصل حکومت الہیہ ہے اور حاکم محض اس کا نائب اور خلیفہ ہے، البتہ اسلامی ملک میں رہنے اور بود و باش اختیار کرنے کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس کے لئے صرف اس نظام کو تسلیم کرنے کی شرط ہے جس کو عقد ذمہ کہا جاتا ہے، موجودہ دور میں بھی باغی کو حکومت میں شریک ہونے کی اجازت نہیں، گو کہ وہ مذہبی بنیاد پر کسی کو حکومت میں شرکت سے نہیں روکتے، چونکہ ان کے نزدیک مذہب امور سیاست میں قابل لحاظ ہی نہیں، ہاں اگر کوئی مذہبی یا غیر مذہبی غیر ملحد ان کے نظام کا مخالف ہوگا تو وہ بھی ان کے نظام حکومت میں شرکت کا اہل نہیں۔

لہٰذا اسلامی مملکت میں اصلاً کوئی بھی مسلمان کسی بھی مسلم ملک میں رہ سکتا ہے، بلکہ غیر مسلم بھی کسی بھی مسلم ملک میں سکونت اختیار کر سکتا ہے اور ایک اسلامی ملک کا شہری بن سکتا ہے، بشرطیکہ وہ عقد ذمہ کر لے۔

بغیر عقد ذمہ صرف امان لے کر اسلامی ملک میں داخل ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ قیام کی مدت فقہاء کرام نے ایک سال قرار دی ہے، جیسا کہ (موسوعہ فقہیہ باب اہل الذمۃ نقلاً عن البدائع ۷ / ۱۱۷ باب اہل الذمہ، اور احکام السلطانیہ للماوردی / ۱۴۶ والاحکام السلطانیہ لابی یعلی / ۱۴۵، فتح القدیر ۵ / ۲۷۲ الخراج لابی یوسف / ۱۸۹ نقلاً عن المسلم مواطنا فی اوربا للشیخ فیصل مولوی / ص ۱۸) میں صراحت ہے۔

اس طرح غیر مسلم کے لئے کسی بھی اسلامی ملک میں مستقل سکونت اختیار کرنے اور شہری بننے کے لئے صرف عقد ذمہ ضروری ہے اور بس، اور مسلم کو کسی بھی اسلامی ملک میں رہنے اور سکونت اختیار کرنے کے لئے اصلاً کوئی شرط نہیں، البتہ اس کی صحیح شناخت اور اس کے احوال کی جانچ کے لئے کچھ وقت متعین کیا جا سکتا ہے، تا کہ اس مدت میں اس کے اخلاق واطوار اور احوال پر نگاہ رکھی جائے کہ وہ واقعی مسلم ہے اور اسلامی ملک کے لئے خطرہ تو نہیں۔

اور غیر مسلموں کے لئے اسلامی حکومت میں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو کسی بھی مسلمان کو حاصل ہیں، اس میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہ ہوگی، اسی طرح ان کی وہ تمام ذمہ داریاں اور فرائض ہوں گے جو کسی مسلم کے فرائض اور ذمہ داریاں ہوں گی۔

اس سلسلہ میں فقہاء کا قاعدہ مشہور ہے: ''لهم مالنا وعليهم ما علينا'' (ابن حبان) اور مسلمانوں کے کسی بھی اسلامی ملک میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت کے سلسلہ میں درج ذیل نصوص ہیں: ''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض (سورہ: ۷۱). يايها الناس انا خلقنا كم من ذكر وانثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا، يايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة، لله ما فى السموات وما فى الأرض، لله ملك السموات والارض'' (سورۂ حجرات: ۱۳)۔

اسی طرح اصولی طور پر کوئی بھی مسلم کسی بھی مسلم ملک کی مستقل شہریت بلا شرط حاصل کر سکتا ہے، مگر موجودہ احوال میں ملکی نظام کی درستگی اور اس کو صحیح طریقہ پر چلانے کے لئے اور یک طرفہ نقل مکانی کو روکنے کے لئے کچھ شرائط عائد کئے جا سکتے ہیں، جو ملکی نظام کے چلانے میں معاون ہوں۔

اس پس منظر میں شہریت سے متعلق سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلامی مملکت میں حق شہریت کے لئے صرف مسلمان ہونا کافی ہے، جبکہ غیر مسلموں کے لئے عقد ذمہ لازم ہے، بغیر عقد ذمہ کے وہ بطور امان کے ایک سال تک اسلامی حکومت میں رہ سکتے ہیں، غیر مسلم کے لئے عقد ذمہ کرنے سے پہلے آزمائشی مدت جو امان کی مدت ہے اس سے کم یا زیادہ متعین کی جا سکتی ہے، اسی طرح مسلمان کے لئے اس کی آزمائش کے لئے کچھ وقت متعین کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اس کی درخواست کو قبول کرنا ضروری ہوگا، بشرطیکہ وہ ملکی نظام کی شرائط کو قبول کرتا ہو جو شرائط ملکی نظام کو چلانے کے لئے ضروری ہوں، اور اس کی پختہ جانچ پرکھ کے بعد کہ کہیں وہ مسلم کے نام پر غیر مسلم جاسوس نہ ہوں۔

۳۔ مسلم پناہ گزینوں کی مدد کرنا مسلم ملک کے لئے شرعاً واجب ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو جسد واحد قرار دیا، لہذا مسلم تارکین وطن اور پناہ گزینوں کو دوسرے مسلمان ممالک میں اسی ملک کے قدیم باشندوں کی طرح تمام سہولیات مہیا کرانی چاہئے، ان کے مابین تفریق درست نہیں۔

۴۔ یہ تمام حقوق حاصل ہوں گے، یعنی ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، روزگار حاصل کرنے کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق وغیرہ سارے حقوق، حقوق شہریت تصور کئے جائیں گے اور ان کی فراہمی مملکت اسلامی کے حاکم پر لازم ہیں۔

۵۔ پناہ گزین اگر شہریت کے حصول کے لئے درخواست دیتے ہیں تو ان کو حقوق شہریت دینا لازم ہوگا، ورنہ صرف ان کی انسانی اور اسلامی برادری سے تعلق رکھنے کے نقطۂ نظر سے ہر طرح کی مدد لازم ہوگی۔

۶۔ بالکل اجازت ہوگی، اس لئے کہ اب دار الحرب سے بھی ہجرت کرنا واجب اور ضروری نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''لا هجرة بعد الفتح ولكن جهادونية'' (مجله كتاب الجهاد والسير باب وجوب النفيروما يجب من الجهاد والنية. دیکھئے: المبسوط ۱۰/۶ ناقلاص ۱۶-۱۹)۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو بھی مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا، جبکہ وہ اسلامی اسٹیٹ کے لئے خطرہ نہ ہوں اور جب تک عقد ذمہ کی پابندی کرتے رہیں، ان کا عقد ذمہ مؤبد ودائمی ہوگا، بغیر عقد ذمہ کے مستقل شہری کی حیثیت حاصل نہیں اور بغیر عقد ذمہ کے بطور امان کے زیادہ سے زیادہ ایک سال رہ سکتے ہیں، جیسا کہ اس کے پہلے صراحت کی جاچکی ہے۔

ایک سال تک امان (Visa) پر رہنے کے بعد یا تو وہ واپس اپنے ملک چلا جائے یا پھر عقد ذمہ کرے۔

موجودہ حالات میں اسلامی ملک اس مدت کو بطور آزمائش کے بھی عقد ذمہ کرنے کی شرط لگا سکتی ہے کہ اس غیر مسلم کا کیسا برتاؤ ہے، اسلامی ملک کے لئے مفید ہے یا نہیں، جیسا کہ عصر حاضر میں بھی بیشتر ممالک میں اس طرح کی شرط ہے کہ شہریت کے لئے کم از کم پانچ سال بطور (Visa) کے عارضی طور پر رہنا ہوگا اس کے بعد ہی اس ملک کی شہریت دی جاتی ہے، لیکن یہ ضابطہ صرف غیر مسلم کے لئے ہوگا۔

جہاں تک دوسرے ملک سے آنے والے مسلمان کا تعلق ہے تو اس کو کسی عقد ذمہ کی ضرورت نہ ہوگی، محض درخواست کافی ہوگی، لیکن Probation Period مسلم کے لئے بھی موجودہ حالات میں متعین کیا جاسکتا ہے کہ اس مدت میں اس کی سرگرمیوں کے بارے میں اور اس کے صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کے بارے میں معلوم ہوسکے، ورنہ دوسرے غیر مسلم ممالک بطور جاسوس کے اپنے لوگوں کو مسلمان بنا کر بھی بھیج سکتے ہیں۔

☆☆☆

عصر حاضر میں حصول شہریت کا مسئلہ

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی[1]

۱۔ شہریت کے تعلق سے ہر ملک کا اپنا ایک مخصوص قانون اور نظام مقرر ہوتا ہے، ہر ملک کے قانون کی ایک حیثیت بھی ہوتی ہے، لہذا ہر ملک اپنے بنائے ہوئے قانون کا پابند ہوگا، محض بود وباش اختیار کرنے کو یا معاشی سرگرمیاں انجام دینے کو یا طویل مدت کے قیام کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ ہر ملک کی معاشی واقتصادی اور سیاسی حالات کے پیش نظر وہ ملک شہریت دینے کے اصول وضوابط تیار کرنے کے کا مجاز ہوگا۔

۲۔ صورت مسؤلہ میں اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً کوئی ضروری نہیں ہوگا، بلکہ ہر ملک کے امیگریشن کے قوانین کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا، شہریت دینے کے لئے اپنے وضع کردہ قانون اور ملک کی سلامتی مقدم رکھنا لازم ہوگا، البتہ کسی مجبور انسان کو ضرورۃ پناہ دینا اور اسے حالات سازگار ہونے تک اپنے ملک میں پناہ گزین یا مہاجر کا درجہ دینا من باب الاستحسان ہوگا،

۳۔ مذکورہ مسئلہ سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہے، ہر ملک اپنے شہریوں کو سہولتیں اور رعایتیں دینے کا مجاز ہے، کلی طور پر مہاجرین یا تارکین وطن کو اپنے شہریوں کے سارے حقوق دینا ممکن نہیں ہے، بلکہ ہر ملک اپنے شہریوں کی جان ومال، عزت وآبرو، اور ان کے دینی اور مذہبی آزادی کی حفاظت کا ضامن ہے، اس لئے کہ ان سے ٹیکس وصول کرتا ہے، اور انتخابات کے وقت ان باتوں کا معاہدہ بھی ہوتا ہے، گویا ان وعدوں کو پورا کرنا شہریوں کو راحت پہنچانا، امن عام فراہم کرنا حکومت وقت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، البتہ ان مہاجرین کی حیثیت ایک مہمان کی ہے، ان کے لئے پوری رعایتیں دینا یا سہولتیں فراہم کرنا، یعنی شہریوں کی طرح حکومت کے واجبات میں سے نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ مستحبات میں شامل ہوگا۔

۴۔ مذکورہ حقوق ہر شہری کو فراہم کرنا حکومتوں کا فرض عین اور ان کا فرض منصبی بھی ہے، بلکہ نا گہانی حالات میں جان ومال کا تحفظ فراہم کرنا بھی واجبات میں شامل ہوگا۔

۵۔ مہاجروں کو مدنی دور کے سارے حقوق فراہم کرنا حکومت وقت کا اخلاقی فریضہ ہوگا، یعنی ان مجبوروں کے ساتھ ہمدردی کرنا اسی طرح ممکن ہے جس طرح مدنی دور میں مواخاۃ، یعنی بھائی چارگی کا ماحول قائم کیا گیا، اس طریقہ سے بہت سارے اقتصادی وسماجی ومعاشرتی مسائل حل ہوسکیں گے، البتہ ان مہاجروں کو مقامی باشندوں کی طرح سو فیصد حقوق حاصل ہوں یہ ناممکنات میں سے ہے، زیادہ سے زیادہ ان پناہ گزینوں کو حق تعلیم وتعلم، اقتصادی ومعاشی سرگرمیوں کی آزادی، جان ومال کا تحفظ دینا، ان کی عزت وآبرو کی سلامتی کے لئے ہر ممکن قانون بنانا اور اس پر عمل کرانا یہ ساری باتیں حکومت کی سرپرستی میں عمل میں آئیں گی، البتہ شہریوں کے حقوق خاصہ، جیسے سرکاری نوکری، سرکار بنانے کی آزادی، انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنے وغیرہ کے مخصوص حقوق صرف شہریوں کو حاصل ہوں گے، اور پناہ گزین کی حیثیت مہمانوں یا مہاجروں کی ہوگی، جب ان لوگوں کی ملکی حالت پر امن ہوگی تو یہ لوگ اپنے وطن عزیز واپس لوٹ جائیں گے۔

۶۔ مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی شرعاً اجازت ہوگی، بشرطیکہ اسلام پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، مذہبی آزادی پوری طرح میسر ہو، جان ومال عزت وآبرو کا تحفظ شامل ہو، دین کی حفاظت مقدم ہو، اس صورت میں جواز کا حکم رہے گا، ورنہ نہیں، یعنی دینی تشخص محفوظ نہ ہو یا دینی وضع قطع، داڑھی یا پردہ پر پابندی عائد ہو، شعائر اسلام کا مذاق اڑایا جاتا ہو تو یا غیر اسلامی کلچر کا فروغ ہو، ایسی جگہ میں شہریت حاصل کرنے کی کوشش اور تگ ودو جائز نہیں ہے، مسلمان ایسے مقام میں زندگی بسر کرے جہاں اسلام زندہ رہے، ورنہ اس کی زندگی موت کے برابر ہے، معاذ اللہ

۷۔ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا اس وقت درست ہوگا، جبکہ اسلامی شعائر متاثر نہ ہوں، ان کی وجہ سے شرک کا دروازہ نہ کھل جائے، یا غیر اسلامی تہذیب کو فروغ دینے کے مسائل کھڑے نہ ہوں، عام طور پر جنہیں شہری تسلیم کئے جائیں تو لازماً ان کو سارے حقوق (مذہبی، تعلیمی، سماجی، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی) دینا حکومتوں کی ذمہ داری ہوجاتی ہے، لہذا غیر مسلموں کو شہریت نہ دینا بہتر ہے، زیادہ سے زیادہ انہیں پناہ گزینوں کی طرح انسانی ہمدردی اور دعوتی نقطہ نظر سے مسلم ملکوں میں موقتاً پناہ دینا مناسب ہوگا۔

☆☆☆

[1] استاذ ومفتی جامعہ دار السلام عمر آباد۔

شہریت سے متعلق بعض اہم مسائل

مفتی سعید اسعد قاسمی[1]

۱۔ قرآن کریم کی آیت: ''والذين آووا ونصروا أولئك هم المومنون حقا'' (انفال: ۷۴) اور: ''ولقد بوأنا بني إسرائيل مبوأ صدق'' (سورۂ یونس: ۹۳) یہ دونوں آیتیں شہریت کے لئے بنیادی اصول کی ہیں، یعنی اس طرح کہ کسی ملک میں ایک مسلمان کا اس نیت اور مقصد سے کہ معاشی نظام کو بہتر بنا سکیں گے، مستقل قرار پکڑنا عند اللہ محبوب ہے، جسے موجودہ زمانہ میں شہریت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے حضرت ابو درداء روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنگ کے موقعوں پر مسلمانوں کا خیمہ دمشق نامی شہر کے جانب واقع مقام غوطہ ہوگا اور دمشق شام کے بہترین شہروں میں سے ہوگا۔

''عن أبي درداء أن رسول الله ﷺ قال: إن فسطاط المسلمين يوم الملحمة بالغوطة إلى جانب مدينة يقال لها: دمشق من خير مدائن'' (السنن لأبي داؤد: ۲،۵۹۱،۵۹۰)۔

حدیث مذکورہ میں فسطاس سے مراد رہائشی جگہ اور مقام ہے۔ فقہاء کرام نے وطن اصلی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہاں انسان پیدا ہوا یا اس نے کسی اور جگہ کو مستقل جائے سکونت بنا لیا ہو اور تا حیات وہاں قیام کا عزم ہو۔ صاحب ''بدائع الصنائع'' علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''وطن أصلي وهو وطن الإنسان في بلدة أو بلدة أخرى اتخذها دارا أو وطنا بها مع أهله وولده وليس من قصده الارتحال عنها، بل التعيش بها'' (بدائع الصنائع: ۱،۲۸۰)۔

لہٰذا مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں راقم السطور کی رائے یہ ہے کہ کسی ملک میں ایک مسلمان کا اس مقصد سے مستقل بود و باش اختیار کرنا کہ اس سے معاشی نظام کو بہتر بنا سکیں گے یہ آج کی شہریت کی بنیاد قرار پائے گی۔

۲۔ اگر غیر مسلم ملک سے آنے والا مسلمان وہاں کے غیر مسلموں کے ظلم واستبداد سے تنگ آ کر بدرجہ مجبوری دوسرے پرامن مسلم ملک میں بود و باش اختیار کرنے کی درخواست پیش کرتا ہے تو ایسی صورت میں مسلم ملک کے لئے اس کی درخواست قبول کرنا شرعا واجب وضروری ہے۔ بشرطیکہ شرعی وسائل اور رقبہ میں اس کے آباد کرنے میں گنجائش موجود ہو۔

''سورہ انفال'' میں ہے: ''وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر'' (انفال: ۷۲)۔

مذکورہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے مکہ سے ہجرت نہ کر کے مدینہ کے مسلمانوں سے اپنی جگہ پر مقیم رہتے ہوئے مدد کی درخواست کی تو ایسی صورت میں مدینہ میں زندگی بسر کرنے والے صحابہ کرام پر ان کی مدد کو واجب قرار دیا گیا۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے "الجامع لاحکام القرآن للقرطبی" میں علامہ قرطبی رقم طراز ہیں: ''الثانية قوله: وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر. يريد أن يدعو هؤلاء المؤمنون لم يهاجروهم أرض الحرب عونكم بنصر أو مآل لاستنقاذهم فأعينوهم. فذلك فرض فلا تخذلوهم'' (الجامع لأحكام القرآن للقرطبی ۸،۲۷)۔

اب رہا یہ سوال کہ بلا مجبوری محض خواہش کی بنیاد پر درخواست پیش کرے تو اس کا حکم کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ شخص عالم دین، علم

---

[1] رفیق دار القضاء امارت شرعیہ آسنسول بردوان۔

دوست ہے، اس کے اس ملک میں آباد ہونے سے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کا بھلا ہوگا تو اس کی درخواست بھی قبول کرنی چاہئے، البتہ اس کا قبول کرنا واجب وضروری نہیں ہے۔

۳۔ مسلمانوں پر جہاں کہیں بھی ظلم ہو تو دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر اپنی اپنی وسعت کے مطابق ان کی امداد واعانت ایک دینی فریضہ ہے، ''احکام القرآن'' میں ہے: جس نصرت کی نفی کی گئی تھی وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (سورۂ توبہ:۷۱) تمام مومن مرد اور مومنہ عورت ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، کے حوالہ سے منسوخ ہوگئی۔

''وليس يمتنع أن يكون نفي الولاية مقتضيا للأمرين جميعا من نفي التوارث والنصرة ثم نسخ نفي الميراث بإيجاب التوارث بالأرحام مهاجرا كان أو غير مهاجر، وإسقاطه بالهجرة، فحسب۔ ونسخ نفي إيجاب النصرة بقوله والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض'' (احکام القرآن:۳،۹۸)۔

حدیث شریف میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

''قال رسول الله ﷺ: انصر أخاك ظالما أو مظلوما'' (صحیح البخاری:۲،۱۰۹۲۸)۔

قرآنی آیات اور حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی مسلمان پر ظلم ہو تو دنیا کے مسلمانوں پر حسب استطاعت ووسعت اللہ رب العزت کے فرمان: "لا يكلف الله نفسا إلا وسعها" (سورۂ توبہ:۲۸۶) کے تحت تعاون شرعاً لازم وضروری ہے، لہذا اگر کوئی مظلوم مسلمان کسی مسلم ملک میں آکر قیام کرے اور اس کا وہاں مستقل ٹھہرنے کا ارادہ ہو، اپنے سابق ملک لوٹنا محال اور ناممکن ہو تو اس کے ساتھ بھی قدیم شہری کی طرح معاملہ کیا جائے گا؛ البتہ اگر مستقل ٹھہرنے کا ارادہ نہ ہو چند روز ہی قیام کا ارادہ ہو اور اپنے ملک لوٹ جانے کا پروگرام ہو تو لوٹتے وقت تک اس کی دادرسی ایک دینی فریضہ ہے، لہذا اخلاقی طور پر بحیثیت مہمان اس کا اعزاز واکرام شریعت اسلامیہ کا محمود ومطلوب ہے؛ اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے۔

''عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه'' (صحیح البخاری:۲،۸۸۹)۔ (حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہونچائے اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمانوں کا اکرام کرے)۔

۴۔ اگر شہریت اختیار کرنے والا مسلمان ہے اور ملک بھی اسلامی ہے تو امام جصاص رازی کی صراحت کے مطابق اس کو مذکورہ تمام حقوق حاصل ہوں گے۔

''ونسخ نفي إيجاب النصرة بقوله تعالىٰ: والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض'' (التوبہ:۷۱)۔

قرآن کریم میں ہے: ''إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات الى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل، إن الله نعما يعظكم به إن الله كان سميعا بصيرا'' (سورۂ نساء:۵۸)۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ قرطبی تحریر فرماتے ہیں: ''والأظهر في الآية أنها عامة في جميع الناس فهي تتناول الولاة فيما إليهم من الأمانات في قسمة الأموال ورد الظلمات والعدل في الحكومة'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی:۵،۱۶۵)۔

مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں راقم السطور کے نزدیک پناہ گزیں کو ایک شہری ہونے کے ناطے قدیم شہری کی طرح شہریت کے تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ جیسے ووٹ ڈالنے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونا، سرکاری ادارہ میں ملازمت، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری اسپتال سے علاج وروزگار کا حق۔

۵۔ مسلم پناہ گزیں کو بھی تمام مراعات وسہولیات فراہم کرانا مسلم ملک کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ حدیث شریف: ''من كان يؤمن بالله

والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ ومن کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ'' (صحیح البخاری: ۲،۸۸۹) کی روشنی میں مذکورہ حکم سمجھ میں آتا ہے؛ البتہ مسلم پناہ گزیں پر بھی پناہ گزینوں سے متعلق ان تمام قوانین کی پابندی کرنی ہوگی۔ جن کی صراحت ملک کے دستور میں ہے اور اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: ''أوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا'' (بنی اسرائیل: ۳۰)۔

۶۔ ایک مسلمان اپنی زندگی گذارنے میں قرآن وسنت کا پابند ہے، اس کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کی روشنی میں ہی اسے زندگی گزارنی ہوگی، چنانچہ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: آگاہ ہوجاؤ! میں ایسے مسلمانوں سے جو (بلاضرورت شرعی) مشرکین کے ساتھ بود وباش اختیار کرتا ہو بری ہوں۔

''قال النبی ﷺ: ألا إني بريء من كل مسلم مع مشرك'' (مصنف ابن ابی شیبۃ: ۲۰،۲۸۶)۔

لہذا محض معاشی فوائد کی خاطر ایک مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

۷۔ چند مخصوص شہر مکہ، مدینہ اور یمامہ کے اطراف کو چھوڑ کر کسی بھی ملک میں غیر مسلم رہائش اختیار کرسکتا ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ نے صرف جزیرۃ العرب میں مشرکین کے داخلہ کو منع فرمایا ہے: ''أخرجوا المشركين من جزيرة العرب'' (صحیح بخاری: ۱،۴۲۹)۔

مذکورہ شہروں کے علاوہ میں بود وباش اختیار کرنے کی اجازت قرآن کریم کی آیت سے بھی ملتی ہے: ''لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين'' (ممتحنۃ: ۸)۔

البتہ جہاں تک ان مسلم ملکوں میں ان کو ملنے والے سیاسی حقوق کی بات ہے تو اس سلسلہ میں صاف واضح ہے: ''فالله يحكم بينكم يوم القيامة ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا'' (نساء: ۱۴۴)۔

لہذا مسلمانوں کے برابر ان کو کلیدی عہدوں پر جو قانون سازی سے متعلق ہیں، بحال نہیں کیا جاسکتا ہے؛ لیکن ان کی مذہبی آزادی، جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت، نیز کسی شرانگیزی کے بغیر تعلیم اور حصول انصاف کا تعلق ہے تو یہ چیزیں ان کو حاصل ہوں گی، اسی کے ساتھ وہ تعزیری قوانین اور اسلامی دستور کے مطابق تمام حدود کے بھی پابند ہوں گے۔

☆☆☆

شہریت کے فقہی وقانونی اصول وضوابط

مولانا ضیاء اللہ عباس ندوی[1]

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جوانسان کے تمام گوشہ ہائے زندگی پر محیط ہے جوانسان کی ہر ہر موڑ پر صحیح رہنمائی کرتا ہے، اس کے پاس خدا کی طرف سے لایا ہوا ایک ایسا دستور حیات ہے جس میں تمام انسانوں کی بھلائی وکامیابی موجود ہے، اس نے انسانوں کو مکمل مساوات وعدل بھائی چارگی شفقت ومہربانی اور انسانیت کا درس دیا حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں جوانسانوں کو حقوق شہریت کے منشور اعظم دیئے وہ تاریخ تمدن میں نہایت ہی اہم درجہ رکھتے ہیں، ان میں تفصیل سے آپ نے رعایا کے حقوق وفرائض کا تذکرہ فرمایا۔

یہ ایک بڑی ہی تلخ حقیقت ہے کہ جدید دنیا کے ایک بڑے حصے نے یورپ کے علاقائی نیشنلزم کو ایک طے شدہ اصول کے طور پر قبول کرلیا ہے اور عالم اسلام میں بھی بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جو نہیں ہونے چاہئے تھے، دکتور علی محی الدین القرہ داغی نے اپنے مقالہ (دراسہ علی ضوء الکتاب والسنہ) المصطلحات السیاسیۃ والاجتماعیۃ میں (ص ۵۲) پر مواطنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

”المواطنة لغة مصدر واطن، وأصله من وطن بالمكان يطن وطنا أى اقام به اتطن البلد أى اتخذه بلداً واستوطن البلد، ولكن الفقهاء استعملو(وطن الاقامة) فى مقابل بلد السفرأى الموضع الذى استقرفيه أو يستقرفيه مدة يخرج بها المسافر عن الأحكام السفر مثل خمسة عشر يوما“۔

مواطنہ لغۃ مصدر ہے واطن سے اس کی اصل وطن یطن وطنا بالمکان ہے سکونت اختیار کرنا شہریت اختیار کرنا کسی ملک کو وطن اقامت بنانا، لیکن فقہاء کرام نے وطن اقامت کو مسافر کے معنی میں استعمال کیا ہے جس آدمی مدت سفر سے نکل جاتا ہے اور مقیم ہوجاتا ہے، مثلاً پندرہ دن کی نیت سے کسی جگہ سکونت اختیار کرنا مقیم ہوجانا۔

آگے چل کر عصر حاضر میں شہریت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”العرف المعاصر (الوطنى) الذى يتبنى الفكر الوطنى ويدافع عنه أو يجعله الوسيلة الجامعة بين المواطنين فى الحقوق والواجبات(المواطن) الذى له جنيه ذلك البلد كما أن هناك من يفرق المواطنين إلى مواطنين اصليتين لهم حقوق اكثر ومواطنين متجنين لهم حقوق اقل“ (حوالہ سابق)۔

موجودہ دور میں شہریت (وطنیت) اس کو کہتے ہیں جس کی بنیاد پر وطنیت کی بنیاد رکھی جائے اور اس کی طرف سے دفاع کیا جائے یا جس کو ایک اہم وسیلہ بنایا جائے جس کے ذریعہ تمام حقوق وواجبات حاصل ہوسکیں، یا یہ کہ موجودہ دور میں شہری ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اس ملک کا اصل باشندہ ہو جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو جس کی بنیاد پر اسے شہریت کے وہ سارے حقوق حاصل ہوگئے ہوں جو دوسروں کو حاصل نہ ہوں۔

ڈاکٹر ہاشم قدوائی اصول سیاسیات میں (صفحہ ۱۳۲) پر شہریت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: شہری کے لفظی معنی شہر کے رہنے والے کے ہیں، لیکن علم سیاسیات میں اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو کسی نہ کسی ریاست کا رکن ہو اور اس حیثیت سے حقوق کا مالک ہو اور اپنے فرائض انجام دیتا ہو، مثلاً شہری کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر شہریوں کو حاصل نہیں ہوتا اسی طرح ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرنے میں حصہ لے، لیکن کسی غیر ملکی کو اس کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا۔

شہریت سے مراد شہری کا مرتبہ ہے جس کی رو سے اسے اپنی ریاست میں ہر قسم کے شہری اور سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اسے فرائض بھی

---

[1] اقصی کالونی لکھنؤ (یوپی)۔

انجام دینے ہوتے ہیں، آگے چل کر شہریت کی قسمیں اور حاصل ہونے کے طریقے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: شہری دوطرح کے ہوتے ہیں، قدرتی (Natural) اور بنائے ہوئے (Naturalised) شہریت حاصل کرنے کے دوطریقے ہیں ایک طریقہ پیدائش کے ذریعہ شہریت کے حقوق حاصل کرنے کا ہے اور دوسرا کسی ملک میں بود و باش اختیار کر کے شہری بننے کا ہے، انہیں بنایا ہوا شہری (Naturalised Citizens) کہتے ہیں، پیدائش کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے کے بھی دو اصول ہیں ایک تو جائے پیدائش Jussoli کی بنیاد پر، دوسرے آبائی حق یا خونی رشتے (Jussanguinis) کی بنیاد پر، ظاہری بات ہے کہ موجودہ دور میں شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے لازم وضروری ہے، جیسے نسل رنگ زبان علاقہ خونی رشتہ، یہ تمام چیزیں اسلام میں ناقابل قبول ہیں، فقہاء اسلام نے ان کو اس لائق بھی نہ جانا کہ ان پر بحث کی جائے، انہوں نے دارالاسلام کو ہمیشہ ایک سیاسی وحدت کے طور پر تسلیم کیا ہے اور اسی بنیاد پر فقہ وسیر کے جملہ احکام کو مرتب کیا ہے، مختلف ریاستوں کے باوجود جنہیں بیک وقت دارالاسلام کہا جاتا تھا، دنیائے اسلام میں مشترکہ شہریت کا اصول تھا جو شخص ایک مسلم ریاست کا شہری تھا اس کو دوسرے مسلم ملک کی شہریت خود بخود حاصل ہوتی تھی۔

اس بات کو موکد کرتے ہوئے دکتور علی قرہ داغی اپنے مقالہ کے صفحہ ۱۵ پر لکھتے ہیں:

"إن مما لا شك فيه أن الإسلام يقيم المجتمع والأمة والدولة على أساس روابط العقيدة والدين وسعى جاهدا لتحقيق الأخوة الحقيقة تأصيلا وتنظيرا وتطبيقا وتفعيلا، فقال تعالى: "إنما المومنون اخوة" (سورۂ حجرات:۱۰) بهذا الأسلوب الحصري الواضح ويفرض على المسلمين جميعا حقوق الأخوة من الولاء والنصرة والتعاون والتكافل والتضامن"۔

اس میں کوئی شک نہیں اسلام میں حکومت قومیت اور سوسائٹی کی بنیاد عقیدہ اور دین کی بنا پر ہے اور اسی لئے تمام تگ اور کوشش کی جاتی ہیں، تاکہ فطری، فکری اصلی اور حقیقی تمام اعتبار سے اسلامی اخوت و بھائی چارگی ان کے درمیان پیدا ہوسکیں، جیسا کہ اللہ تعالی کا قول ہے: تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں، آگے چل کر اسلام میں شہریت حاصل ہونے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے کہ تحت لکھتے ہیں:

"الوطن في المفهوم الاسلامي هو الوطن الكبير لأمة الاسلامية، حيث كان المواطن مسلما أو كافرا في الدولة الإسلامية عند الخلافة الراشدة إلى سقوط الدولة العثمانية يصول ويجول في عرض العالم الإسلامي وطوله دون قيد ولا شرط فكانت جنسية الإسلام فاينما أقام فهو وطنه له حقوقه وعليه الواجبات. فالمسلم ولاءة الإسلامي الكبير"۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک مسلمان جو اسلامی ملک میں رہ رہا ہے اگر دوسرے اسلامی ملک میں آئے تو آتے ہی اس ملک میں اسے تمام حقوق حاصل ہوجائیں گے، جو اسلامی ملک میں نہیں رہتے ہیں تو اگر وہ اس اسلامی ملک کا باشندہ ہونا چاہتا ہے تو داخل ہوتے ہی اپنی خواہش کا اعلان کردے اور پندرہ دن ٹھہرنے کے بعد وہ اس ملک کا شہری ہوجائے گا اور اس کے بھی وہی حقوق وفرائض ہوں گے جو دوسرے شہریوں کے ہیں (خطبات بہاولپور ص ۲۰۱۹)۔

یہ باتیں قرآن کی مندرجہ ذیل آیتوں سے معلوم ہوتی ہیں: "إنما المومنون إخوة" (سورۂ حجرات:۱۰)، "والمومنون والمومنات بعضهم أولياء بعض" (سورہ توبہ:۱۷)، "إن هذه أمتكم أمة واحدة وأنا ربكم فاتقون" (سورۂ مومنون:۵۲)۔

حربی اور مستامن کے حقوق:

یہ توحکم مسلمانوں کے لئے تھا، مستامن یا حربی جو دار الحرب سے تعلق رکھتا ہو اس کے لئے فقہاء کرام نے یہ اصول وضع کیا ہے "الجباية بازاء الحماية، الخراج بالضمان" اگر وہ ایک سال تک اسلامی ریاست میں قیام پذیر رہے تو اس کے بعد اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوجائیں گے جو ایک شہری کو حاصل ہوتے ہیں، اسی طرح اس پر وہ تمام فرائض بھی عائد ہوجائیں گے جو اسلامی ریاست میں ایک شہری پر عائد ہوتے ہیں، ایک سال کی شرط اس لئے عائد کی گئی کہ جو مستامن یا ذمی اسلامی ریاست میں ایک سال رہے تو ایک سال کے بعد اس پر جزیہ عائد ہوجائے گا، اس کی وجہ یہی ہے

جواد پر اصول بیان ہوا کہ۔ مستامن کے لئے علاوہ ازیں حصول شہریت کا ایک اور طریقہ علماء نے بیان کیا ہے اور وہ اسلامی ریاست کے کسی شہری سے شادی ہے، اگر مستامن اسلامی ریاست کی کسی خاتون شہری سے شادی کر لیتا ہے تو بھی اس کو شہریت کے حقوق حاصل ہو جائیں گے، اس گفتگو سے پتہ چلا کہ اسلامی ریاست میں انہیں دو قسموں کا تصور ہے، تیسری کوئی قسم نہیں، ایک تو وہ مسلمان شہری جو ابتداء سے ہی اسلامی ریاست کا شہری ہے، اور دوسرے وہ غیر مسلم مستامن جو عارضی طور پر اجازت لے کر اسلامی ریاست میں آئے اور پھر یہیں کا ہو کر رہ جائے، اسی کلیہ کو امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الام'' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "إن دار الإسلام لا تكون دار مقام لأحد المسلم أو معاهد" فقہاء اسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی ریاست میں دوران قیام اسلام قبول کر لے تو وہ اسلام قبول کرتے ہی اسلامی ریاست کا شہری بن جائے گا (خطبات بہاولپور، ص ۳۲۳ تا ۳۲۴)۔

اوپر جتنی باتیں ہم نے اسلام میں شہریت حاصل ہونے کے لئے ایک اسلامی ملک میں بیان کی ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ایک مسلمان عالم اسلام کے ہر اسلامی ملک کا بالقوہ شہری ہے، یعنی اس کے لئے کسی درخواست قبول کرنے کی ضرورت نہیں، اسی طرح اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر مسلمان کسی اسلامی ملک میں پناہ لیتے ہیں تو وہ اس اسلامی ملک میں آتے ہی اس کے شہری شمار ہوں گے اور ان کے ساتھ کسی طرح کا امتیازی سلوک کرنا اور دوسرے درجہ کا شہری سمجھنا کسی طرح بھی جائز نہیں، اسی طرح قدیم شہریوں کی طرح ان کو بنیادی سہولیات فراہم نہ کرنا جائز نہ ہونا یہ چیزیں اخوت اسلامی کے بالکل منافی اور متضاد چیزیں ہیں۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' (۸۲۵/۷) پر اہم قرارات اور فیصلے نقل کئے ہیں جو اسلامی نقطہ نظر سے مانے بھی گئے ہیں، جن میں پہلا اساسی حق یہ ہے:

''البشر في كل اقطارهم أسرة واحدة مخلوقون من نفس واحد مستاوون في الكرامة الإنسانية. وفي أصل التكليف والمسئولية أكرمهم عند الله اتقاهم''

''يولد الإنسان حرا ولا عبودية لغير الله تعالى وليس لمخلوق أن يستعبده أو يذله أو يشغله''۔

تمام انسان ایک کنبہ ہے وہ انسان ہونے کے ناطے انسانیت میں برابر ہے، ان میں بھی سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، ہر انسان آزاد ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبودیت جائز نہیں، ہر شخص کو آزادی کے ساتھ شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے اپنی رائے کے اظہار کا حق بذریعہ تحریر وتقریر حاصل ہے، ہر شہری کو ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح ہر شہری کو انتخابات میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح ووٹ دینے کا حق حاصل ہے (الدولۃ الاسلامیہ، ص ۸۲۹)۔

اسی طرح ہر شہری کو سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، نیز سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق اور عدالتی چارہ جوئی کا حق حاصل ہے۔

ہر شہری کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمد ورفت کا حق حاصل ہے (شرعۃ حقوق الانسان فی الاسلام، ص ۸۲۲، ۸۳۱)۔

شریعت اسلامی میں حالت امن میں غیر مسلموں کی آخری قسم جو ریاست میں موجود ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے وہ مستامن، یعنی پناہ گزینوں کی ہے، مستامن کے لغوی معنی امان طلب کرنے کے ہیں، لیکن اصطلاح میں دوسرے ملک بالعموم دار الحرب کا باشندہ جو کسی عارضی قیام یا سفر کی غرض سے (امان یا اجازت نامہ یا ویزا) لے کر دار الاسلام آیا ہو، فقہاء اسلام نے عموماً مستامن کی اصطلاح دار الحرب کے باشندوں کے لئے ہی استعمال کی ہے، دار العہد یا دار الصلح کے باشندوں سے چونکہ اجتماعی طور پر معاہدہ دوستی موجود ہے، اس لئے ان کے لئے اگر وہ دار الاسلام آئے تو مستامن کی اصطلاح شاید غیر موزوں سمجھی گئی، تاہم دور جدید کے مصنفین مثلاً ڈاکٹر عبد الکریم زیدان نے ہر غیر ملکی کے لئے جو عارضی طور پر قیام کے لئے دار الاسلام آئے مستامن ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے، اور یہی قاعدہ عام ہے، "المستامن بمنزلة أهل الذمة في دارنا مستامن" ہمارے علاقہ کی حدود میں ایسا ہی سمجھا جائے گا، جیسا کہ ذمی سمجھا جاتا ہے، لیکن مستامن کو سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوتے، کیونکہ وہ دار الاسلام کا شہری نہیں، ہاں دوسرے حقوق عامہ سے مستامن بھی متمتع ہوسکتا ہے، انہیں حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ بیت المال اس کا کفیل ہے۔

مستامن کو دار الاسلام میں ٹھہرنے کے لئے جتنی مدت متعین کر دی گئی ہے اس مدت تک اسے دار الاسلام میں قیام کا حق حاصل ہے، اس مدت

کے دوران مستامن کو مختلف قسم کی انفرادی آزادی حاصل رہے گی، لیکن اسلامی حکومت حالات کے تقاضے سے اگر اس کو نکالنا ضروری سمجھے تو نکال سکتی ہے، انفرادی حقوق کے سلسلے میں مستامن کو مسلمانوں و غیر مسلموں کے ساتھ مالی معاملات کرنے کا بھی حق حاصل ہے اور منقول غیر منقول جائداد بنانے کا بھی حق ہے، بلکہ اسے یہاں تک حق ہے کہ وہ مسلمانوں سے حق شفعہ پر کوئی جائداد لے لے اسلام نے مستامن کو جو حقوق دیئے ہیں وہ غیر ملکیوں کے ان حقوق سے بہت زیادہ وسیع ہیں جو انہیں نئے ممالک میں حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ اکثر ملکوں میں غیر ملکی جائداد کا مالک نہیں ہوسکتا، مستامن پر یہ بھی پابندی ہے کہ وہ ایسی چیزیں لے کر دار الاسلام سے نہ جائے جن سے حربی ملکوں کو قوت پہنچے، لیکن مستامن اگر ایسی چیزوں کو لے کر داخل ہوا تھا تو ان چیزوں کو لے جانے کا بھی حق دیا جائے گا (خطبات بھاولپور رص ۳۲۸)۔

غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ، حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض و مقاصد کے اعتبار سے مختلف ہو جاتا ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب (فقہی مقالات رص ۲۳۲) میں ''مغربی ممالک کے چند جدید فقہی مسائل'' کے تئیں جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو، یا جیل میں اس کو ظلماً قید کردیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو تو ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا بلا کراہت جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی معاشی مسئلہ سے دوچار ہے اور تلاش بسیار کے بعد بھی اسے اپنے ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ روٹی کپڑا کا بھی محتاج ہوجائے تو اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال رزق کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے۔

اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا، یا وہاں مقیم مسلمانوں کو شریعت کے احکام بتلائے گا تو یہ نہ صرف جائز، بلکہ موجب اجر وثواب ہے۔

اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوش حال اور عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں (فقہی مقالات جلد اول رص ۲۳۲، ۲۳۳ مفتی تقی عثمانی)۔

غیر مسلمین اگر اسلامی ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے قیام کرنا چاہیں تو ایسے لوگوں کو مستقل باشندگان کی حیثیت سے آباد کرنا حکومت وقت کے لئے ضروری ہوگا، تاکہ وہ اسلام کے محاسن سے پورے طور پر واقف ہوسکیں اور اسلام کو سمجھ کر اس پر عمل کرسکیں۔

☆☆☆

اسلامی نقطہ نظر سے حقوق شہریت

مولانا محمد ثوبان اعظم القاسمی[1]

موجودہ زمانے میں ''قانون شہریت'' انتظامی نقطہ نگاہ سے ایک لازمی ضرورت ہے، تاکہ ملکی نظم ونسق باقی رہے اور دراندازی اور دیگر مفاسد عامہ اور خاصہ سے حفاظت ہو، توضیح مسئلہ کے لئے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت اس مسئلہ میں درپیش مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔

دارالاسلام:

دارالاسلام میں دوسرے ممالک کی طرح انتظامی طور پر اگر ''قانون شہریت'' موجود ہے تو شرعی نقطہ نظر سے ایسا ہونا نہ صرف یہ کہ مناسب ہے، بلکہ ضروری ہے، تاکہ داخلی اور خارجی خطرات سے ملک محفوظ رہے۔

دوسرے ممالک کی طرح دارالاسلام بھی دوسرے ممالک کے خواہش مندوں کو حقوق شہریت دینے میں شرعاً مختار اور آزاد ہے، رعایا کی حفاظت بیرونی اور اندرونی مفاسد سے، مقاصد شریعت میں سے ہے۔

دارالاسلام مظلوموں کی امداد اپنی استعداد کے مطابق کرے گا، اور پناہ گزینوں کو نصرت حتی المقدور دے گا، ضرورت محسوس کرنے پر اپنی استطاعت کے مطابق حقوق شہریت عارضی یا دائمی فراہم کرے گا، اس لئے کہ ہر ملک اپنی استعدادوں سے خود زیادہ واقف ہوتا ہے، اور انتظامی پریشانیوں اور مجبوریوں سے خود زیادہ آگاہ ہوتا ہے، دوسروں کی خواہشوں اور تنقیدوں کی پرواہ نہیں کرے گا، انسانی ہمدردی اور اسلامی اخوت ہوتے ہوئے بھی بعض مواقع پر مجبوریاں سد راہ ہوتی ہیں، اور شریعت میں ملکوں کی مجبوریوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اسلامی ممالک میں غیر مسلم ماہرین صنعت وحرفت وتجار سے استفادہ کے لئے اجازت شہریت دائمی یا عارضی جائز ہوگی، جب تک ہر قسم کی دہشت گردی اور ہر قسم کی جاسوسی سے مامونیت رہے گی۔

اسلامی نقطہ نظر سے حقوق شہریت میں ہر قسم کے جائز انسانی آرام وسکون کے امور ہوں گے، مگر ملکی مصالح سب پر مقدم ہوں گے۔

دارالاسلام کی شہریت اور اس کی حصولیابی کے قوانین:

دارالاسلام کے لئے ضروری ہے کہ وسعت حاصل ہو تو اپنے ممالک میں حقوق شہریت دینے میں مسلمانوں کو ترجیح دے، نیز مسلم ممالک کی مصنوعات جو معیار کے مطابق ہوں دوسروں کی مصنوعات پر ترجیح دے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ عارضی یا دائمی ہجرت میں یا حصول معاش کے لئے دوسرے ممالک کی شہریت اختیار کرنے میں دارالاسلام کو ترجیح دے اور وہاں کی شہریت عارضی اور دائمی کے لئے کوشش کرے، شہریت کے حصول کے بعد اسلامی ممالک کے تمام قوانین کی پابندی کرے، اس لئے کہ معاہدے کی پاسداری اور احسان شناسی کی اسلامی شریعت سخت تاکید کرتی ہے، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا دین لمن لا عهد له" (وہ دیندار نہیں جو معاہدہ کا پابند نہیں)، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی ظالم اور مظلوم دونوں حالتوں میں مدد کرو، مطلب حدیث واضح ہے، ظالم مسلمان کو ظلم سے باز رکھنا اور مظلوموں کو ہر قسم کے ظلموں سے محفوظ کرنا ضروری ہے، نیز مظلوموں کی ہر قدم پر امداد کرنا اسلامی اور انسانی فرائض میں شامل ہے۔

---

[1] مہتمم وشیخ الحدیث مدرسہ عربیہ اسلامیہ خانپور میرٹھ۔

دارالاسلام میں شہریت کی بنیاد حفاظت دین، حفاظت جان وآبرو، حفاظت مال، اور ضرورت معاش کی تکمیل، اور حفاظت عقل اور حفاظت نسل ہوگی؛ چونکہ شریعت اسلامی مذکورہ چیزوں کی حفاظت کے لئے نازل کی گئی ہے۔

دارالاسلام حقوق شہریت دینے میں اپنے ملکی مصالح کا لحاظ رکھے گا؛ اس لئے کہ پہلے سے جس رعایا کا راعی ہے اس کے بارے میں ''ذمہ دار'' سے ذمہ دارانہ (قیامت کے دن) سوال کیا جائے گا، ثانیاً غیر ملکی مسلم شہریوں کی حسب استعداد ذمہ داری قبول کرے گا، اور حسب موقع فیصلہ میں آزاد ہوگا، خواہ پناہ گزیں مسلمانوں کا مسئلہ شہریت ہو یا دوسرے مسلم شہریوں کا جو اپنی ضرورتوں کے لئے ویزا کے خواہشمند ہوں، اور خواہ پوری نصرت کا مسئلہ ہو یا تھوڑی امداد کا، بہر نوع دارالاسلام شرعاً حسب موقع فیصلہ میں آزاد ہوگا، اور صاحب معاملہ پر اطاعت واجب ہوگی۔

دارالحرب یا غیر مسلم ممالک کے احکام حصول شہریت:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنالینا ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کے اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے، مثلاً:

۱۔ اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے، یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی اور اعتقادی زندگی میں دین اسلام کے احکام پر کاربند رہ سکے گا، اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

۲۔ اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہوجائے، ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے تو مذکورہ بالا دو شرائط کے ساتھ اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے، جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو، چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے:

"ھو الذی جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ وإلیہ النشور" (ملک/۱۵) (وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کردیا، اب تم اس کے راستوں میں چلو اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہوکر جانا ہے)۔

۳۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرلے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا، اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا، اس نیت سے وہاں رہائش کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے، بلکہ موجب اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہؓ نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگیں۔

۴۔ اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوش حالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلا ضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان

میں دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں، اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ ''ابوداؤد'' میں حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے (ابوداؤد: کتاب الضحایا)۔

حضرت جریر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہؓ نے سوال کیا، یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، تم یہ امتیاز نہیں کرسکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے۔

حضرت امام خطابیؒ تحریر فرماتے ہیں: مختلف اہل علم نے اس قول مبارک کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے، چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہوسکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں، اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے دارالاسلام اور دارالکفر دونوں کو علاحدہ کردیا ہے، لہذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں رہائش ان کے ساتھ اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے لوگ یہی خیال کریں گے کہ یہ بھی انہیں میں سے ہے، علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دارالکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے (معالم السنن للخطابی ۳/۴۳۷)۔

اور ''مراسیل ابوداؤد عن المکحول'' میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو (تہذیب السنن ابن قیم ۳/۴۳۷)۔

اسی وجہ سے فقہاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے مسلمانوں کا دارالحرب میں رہائش اختیار کرنا اور ان کی تعداد میں اضافہ کرنا اور اس کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوجاتی ہے (تکملہ ردالمحتار ۱/۱۰۱)۔

۵۔ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے اور دوسرے مسلمانوں پر اظہار بڑائی کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر ہوتا ہے یا دارالکفر کی شہریت اور قومیت کو دارالاسلام کی شہریت اور قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے تو ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں۔

۶۔ تربیت اولاد کے لئے غیر مسلم ملکوں میں اجتماعی اور انفرادی زندگی میں مضبوط علم دین اور مضبوط تربیت کا انتظام فرض ہوگا، ورنہ صورت اور نام کے اعتبار سے بظاہر اولاد مسلمان ہوگی اور انجاماً کافر ہوگی، جو اہل تجربہ پر مخفی نہیں۔

۷۔ غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے قیام کی اجازت "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) کے اصول پر ہوگی، یعنی مسلمانوں کے لئے اجتماعی یا انفرادی ہر قسم کے نقصانات والی ملازمت اختیار نہ کرنا ضروری ہوگا۔

☆☆☆

پانچواں باب اختتامی امور

مناقشہ:

شہریت اور اس سے متعلق مسائل

مولانا عتیق احمد بستوی:

ماشاء اللہ آپ حضرات نے بڑی توجہ کے ساتھ عرض مسئلہ سنا اور اب انشاء اللہ آپ کی باری ہے، اس موضوع پر جو سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں اور جو آراء پیش کی گئی ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں، میری درخواست یہ ہے کہ جو حضرات اظہار خیال فرمانا چاہتے ہیں، کوئی نئی بات پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا نام کسی کاغذ پر لکھ کر رضا کار آپ کے ارد گرد موجود ہیں ان کے ذریعہ یہاں بھیج دیں۔

میرے بزرگو اور دوستو! مسئلہ بہت ہی اہم اور نازک ہے، مولانا اختر امام عادل صاحب نے جو عرض پیش کیا اس میں اس بات کو انہوں نے بیان کیا ہے کہ آج ہم جس صورتحال سے دوچار ہیں وہ مغلوبیت کی صورتحال ہے، غلبہ کی صورتحال ہوتی تو ہمارے اختیار میں ہوتا اور ہم اسلام کی جو اصل تعلیم ہے اس کی روشنی میں غور کرتے کہ کیا سسٹم ہونا چاہئے، کیا نظام ہونا چاہئے، مگر حقیقت حال یہ نہیں ہے، اس لئے یہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے۔ میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جو ہماری اصل تعلیمات ہیں جس کو کہ ہمیں برپا کرنا ہے، نافذ کرنا ہے وہ بھی ہمارے ذہنوں کے اندر ہو اور اس کی چھاپ ہماری تحریر کے اندر ہو اور مغلوبیت کی بنیاد پر جو صورتحال ہے اس کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے، ان دونوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں تجاویز مرتب کرنی ہے، ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ حضرات صاحب علم ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ بنو امیہ کے دور تک دار الاسلام کی وحدت رہی، خلافت راشدہ اور خلافت بنو امیہ جب تک رہی تب تک دار الاسلام گویا ایک تھا اور عالم اسلامی ایک تھا اور اس کے بعد بنو عباس کے دور میں جب اندلس میں مسلمانوں، یعنی امویوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت سے گویا دو مسلم ملک اس طرح سے قائم ہوئے اور اس وقت فقہاء نے اس پر گفتگو کی اور کافی بحث کی کہ کیا دو دار الاسلام ہو سکتے ہیں یا نہیں، اس تعلق سے سب بحثیں آپ کے سامنے ہیں، رہی بات دار الحرب میں تعدد کی تو اس کی تو فقہاء نے صراحت کی ہے، لیکن دار الاسلام میں بھی کیا تعدد ہو سکتا ہے؟ اور میراث کے موضوع پر آپ جب مطالعہ کرتے ہیں تو تباین دار اور تباین مذہب کے مختلف اسباب آپ کے سامنے آتے ہیں، تباین دار کی بحث میں اب بھی ہم شاید فتوی دیتے ہیں کہ اگر دو مسلمان دو مسلم ملکوں میں رہتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، اور اس طرح کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں جو ہمارے ذہن میں ہیں ان سب پر ہم کو روشنی ڈالنی ہے اور یہ جو وطنیت کا مسئلہ ہے یا شہریت کا اس کو جوڑنا وطن اصلی وطن اقامت سے یہ مجھے کچھ خلط ملط سی بات لگتی ہے، وطن اصلی اور وطن اقامت کی گفتگو بالکل الگ چیز ہے اس سے کچھ استیناس کریں وہ الگ مسئلہ ہوا، لیکن اصل جس موضوع پر ہم گفتگو کر رہے ہیں کہ شہریت کی بنیادیں کیا ہیں اور کیا ہو سکتی ہیں شرعا، یہ مسئلہ اور پھر فقہاء نے جو بحث کی ہے مسافر کے احکام اور وطن اصلی اور وطن اقامت کے احکام کہ شادی کرنے سے وطن اصلی بن جاتا ہے اور پیدائش سے وطن اصلی بن جاتا ہے وہ ظاہر ہے کہ وہ وطنیت اور شہریت کے معنی میں نہیں ہے، اس لئے اس مسئلہ سے زیادہ استیناس شاید مناسب نہ ہو تو اس پر بھی ہم توجہ فرمائیں۔

لیکن صورتحال یہ ہے کہ عالم اسلام کی اجتماعیت تو بکھر گئی یہ واقعہ ہے اور ہم مغلوبیت کے دور میں ہیں، لیکن اس وقت جو حالات ہیں اور صورتحال ہے دنیا کی کہ آج جو مسلمانوں کے اجتماعی مفادات ہیں دینی ہوں، سماجی ہوں یا سیاسی ہوں وہ سارے خطرے میں ہیں اور مسلم ملکوں میں کوئی ایسا اتحاد نہیں ہے کم سے کم مسلمانوں کے معاملات پر کچھ موضوعات پر دباؤ ڈال سکے، پریشر ڈال سکے اور ان کا تحفظ کر سکے اور شہریت کا مسئلہ بھی مجھے کہنے دیجئے کہ شہریت کے مسئلہ میں جتنی تنگی ہمارے مسلم ممالک میں ہے مغربی ملکوں میں نہیں ہے، امریکہ ہو، یا کناڈا ایک آدمی وہاں جاتا ہے رہتا ہے محنت کرتا ہے کچھ دنوں میں اس کو حق مل جاتا ہے وہ وہاں کا شہری ہو جاتا ہے اور اس کو سارے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسلم نسلیں گذر جاتی ہیں کسی مسلم ملک میں آباد ہوئے ایک نسل دو نسل اور شہریت سے محروم رہتے ہیں، ظاہر ہے یہ کھلا ہوا ظلم ہے، ان حالات کا بھی ہمیں تجزیہ کرنا چاہئے اور ہمیں اپنے

فیصلوں اور تجاویز میں اس پر کچھ نہ کچھ ضرور کہنا چاہئے، ظاہر ہے کہ اس وقت جو شام کی صورتحال ہے شام سے بڑی تعداد میں پناہ گزیں ترکی میں اور آس پاس میں لاکھوں کی تعداد میں، ان کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں ظاہر بات ہے یہ بھی مسئلہ ہے کہ ان سارے لوگوں کو شہریت دینا اس کے جو تقاضے ہیں اس کے جو لوازمات ہیں آسان نہیں ہے، یہ مجبوری بھی ہے، لیکن جب تک جہاں تک ممکن ہو کرنا چاہئے، پاکستان کا مسئلہ جب افغانستان پر حملہ ہوا تو لاکھوں کی آبادی منتقل ہوئی پاکستان میں کتنے دنوں تک رہی اور اب بھی کچھ نہ کچھ لوگ ہیں کچھ مسائل ایسے ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی مفادات سے متعلق ہیں، ٹھیک ہے خلافت نہیں، اجتماعیت نہیں، لیکن ایسا کچھ تو ہونا چاہئے کہ مسلم ملک جو اسلامی ممالک کہلاتے ہیں وہ جو عالمی مسائل ہیں ان پر ان کی کچھ تو آواز ہو؟ وہ اس پر کچھ دھیان دیں، بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ جو چیز یہاں سے پیش کی جائے گی اس میں تمام اہل علم کی آراء اور مبتلا بہ کے حالات کا جائزہ ہوگا اور اس کی کچھ رہنمائی ہوگی اور ہماری جو مجبوریاں ہیں انشاء اللہ اس کو بھی ہم پیش نظر رکھیں گے، اس سلسلہ میں انشاء اللہ ہم کچھ کریں گے، قد جاء فینا ضیفنا المکرم الدکتور عز الدین بو زغیبہ رئیس قسم الدراسات والنشر والشئون الخاصة لمرکز ''جمعه الماجد الامارات العربیة المتحدہ'' نرحبه ترحیباً حاراً. وہکذا نرحب الشیخ ہاشم الندوی. إن شاء الله سوف نستفید من خطابه فی الیوم الآتی. نرحبه ترحیباً حاراً۔ اب میں دعوت دیتا ہوں مولانا شاہین جمالی صاحب کو۔

مولانا شاہین جمالی:

میں سمجھتا ہوں کہ فقہاء کے سارے احکام خلیفۃ المومنین، امیر المومنین یا امام المومنین سے متعلق ہیں، اب جبکہ دنیا کے نظام سیاسی میں صرف دو نظام رائج ہیں کنگڈم یا سیکولر ڈیموکریسی اور کوئی مسلم ملک اسلامی ملک نہیں ہے، ایسی صورتحال میں ہماری یہ ساری بحثیں کیا کچھ افادیت و معنویت رکھتی ہیں اور کیا ان جزئیات کا انطباق ان مسلم ملکوں پر بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کو واضح کیا جائے۔

مولانا عثمان گورینی:

مجھے اسلامی مملکت میں پناہ گزینوں اور قدیم شہریوں کے مابین امتیاز کے معاملہ میں بات کرنی ہے، یعنی سیاسی پناہ جو محدود مدت کے لئے لی جاتی ہے جس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ اگر ان کے ملک کے حالات درست ہو جائیں گے تو لوٹ جائیں گے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان پناہ گزینوں کی مہمانوں کی حیثیت ہوگی اور اس پر جو استدلال کیا گیا ہے وہ بہت ہی کمزور روایت سے کیا گیا ہے، مجھے اسی سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ کہ جو لوگ کسی مسلم ملک میں پناہ گزیں کی حیثیت سے مقیم ہو جائیں ان کے درمیان اور وہاں کے مستقل باشندوں کے درمیان فرق و امتیاز کرنا شرعاً درست نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیمات یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مسلم ملک میں مقیم ہو جائے اور وہاں کا مستامن ہو جائے تو اس کے لئے اکثر معاملات میں چند مذہبی معاملات کو چھوڑ کر اس ملک کے مستقل باشندوں کا حکم اختیار کر لیتا ہے اور اس کو تمام وہی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور تمام وہی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور تمام احکام بھی وہی حکم عائد ہوتے ہیں، جیسا کہ کتب فقہیہ میں اس کی صراحت ہے تو اس سے بدلالۃ النص یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلم مسلم ملک میں پناہ گزیں ہو جائے وہاں کی وطنیت اختیار کر لے یا وہاں رہائش پذیر ہو جائے تو اس کو بھی وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں، یہ فرق کرنا کہ نہیں وہ مہمان ہے اور یہ مستقل شہری ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

اور جس روایت سے اس کا استدلال کیا گیا ہے اس کا تعلق بھی اس سے نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی جہاد میں شریک ہو اس میں معاون ہو تو اس کو مال فیئ میں حصہ ملتا ہے اور جس کا دور کا واسطہ نہیں ہے وہ اس کا حقدار نہیں ہے، اس لئے کہ مال غنیمت میں حصہ ملنا اور مال فیئ میں حصہ ملنا اس کی معاونت پر ہے، اس لئے اس کا حقدار ہے، لیکن جو لوگ اس میں معاون نہیں ان کو حصہ کیسے مل سکتا ہے؟ اور دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ اسرائیل کی شہریت اختیار کرنا یہ درست نہیں ہے تو اس کے حکم میں مجھے کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اسرائیل کے ذریعہ سے مسلمانوں پر ظلم و تعدی کی جاتی ہے تو جو لوگ اس کا حصہ بنیں گے وہ اس میں معاون بنیں گے اس میں شریک ہوں گے، اس لئے جائز نہیں، یہ بات اپنی جگہ درست ہے، لیکن جو دلیل دی گئی ہے وہ دلیل بڑی عجیب سی لگتی ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کی زمین غصب کر کے قائم کی گئی ہے یہ ریاست اس میں تو کوئی فقہاء کی صراحت ہے کہ تغلب غیر مسلمین سے ان کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، پھر اس پر یہ مسئلہ کہنا کہ ان کی ملکیت الگ ہے اور ان کی ملکیت غصب کی ہے، اس لئے وہاں قیام صحیح نہیں ایسے تو پھر کسٹوڈین کا مسئلہ اٹھ جائے گا اور پھر ہندوستان میں بہت زمین مسلم نوابوں کی زمینداروں کی سب زمینیں ان سے لے لی گئیں تو اب ان کی شہریت

خطرے میں پڑ جائے گی کہ اس کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے مجھے دلیل پر اشکال ہے اس کے حکم پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب:

مجھے مولانا اختر امام عادل صاحب سے بڑے ادب کے ساتھ ایک بات یہ کہنی ہے کہ آپ نے جو ہماری رائے لکھی وہ ہم نے جمال الدین بن عطیہ کی کتاب جس کا ترجمہ مولانا عتیق صاحب نے کیا ہے، ان کا قول نقل کیا ہے، لیکن ہم نے اپنی رائے اس کے نیچے چار پانچ سطروں کے بعد لکھی ہوئی ہے اور خلاصہ جوابات میں بھی لکھا ہوا ہے، اس لئے صفحہ دو اور صفحہ چھ پر ہماری رائے موجود ہے، محترم موصوف نے ہماری رائے دوسری لکھی، بڑے ادب کے ساتھ ان سے درخواست ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

بہتر بات ہے، اور بھی بعض حضرات کی تحریر آئی ہے مولانا اختر امام عادل صاحب کے عرض کے متعلق، اور بھی جن لوگوں کا احساس ہو عرض کے سلسلہ میں وہ لکھ کر دیدیں، تاکہ آئندہ عرض کی اشاعت کے وقت اس کی تصحیح کر لی جائے۔

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی:

السلام علیکم، میں جو کہنا چاہ رہا تھا مولانا عتیق صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ وطنیت یا شہریت کا جو مفہوم ہے ظاہر ہے کہ مغرب کی طرف سے ایجاد کردہ ہے اور یہ اسٹیٹ کی بالادستی اور حکمرانی سے مربوط ہے، علامہ اقبال نے کہا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے...... جو پیرہن ہے اس کا وہ ملت کا کفن ہے

اس لئے اس کے لئے اسلام یا کتاب وسنت میں بنیادیں تلاش کرنا اور یہ کہنا کہ نہیں کتاب وسنت میں اس کی نظیریں موجود ہیں یہ صحیح نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ مقہوری یا مغلوبی یا مجبوری کی زندگی گزار رہے ہیں، اس میں کچھ استثنائی شکلیں ہوسکتی ہیں، ظاہر ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں، اس لئے چار و ناچار اس کو ماننا ہی ہے، دوسرے یہ کہ انہوں نے جو حدیث نقل کی ہے صحیح مسلم کے حوالہ سے، میرا خیال ہے کہ انہوں نے حدیث کاٹ دی ہے، کیونکہ اصل مفہوم کچھ خلط ہو گیا ہے یا خبط ہو گیا ہے، حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جب تم غیر مسلموں کے پاس جاؤ تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو ایک تو یہ ہے کہ تم ان کو اسلام قبول کرنے کے لئے کہو اور اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں آمادہ کرو کہ وہ مدینہ آجائیں شارح لکھتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت تھا جب مدینہ کی طرف ہجرت کرنا لازمی وضروری تھا، اور پھر ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ اعرابی ہجرت نہ کریں تو ان کو کہا گیا ہے اعراب المسلمین، لیکن مدینہ کے جو مہاجرین ہیں ان کو یہ حکم حاصل نہیں ہوں گے، یعنی مال غنیمت وفیئ میں سے نہیں ملے گا اس کے بعد کہا گیا ہے کہ وہ اگر مدینہ آجائیں تو ان کو تمام حقوق حاصل ہوں گے اور پھر یہ کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان کو ذمہ کے لئے کہا جائے، ان تین چیزوں کی دعوت دینے کی بات کہی گئی ہے، تو حدیث پوری نقل کی جاتی تو شاید یہ اشکال نہ ہوتا کسی کو۔

مولانا ظہیر احمد کانپور:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، مجھ کو دو چیزوں سے متعلق بولنا ہے، ایک یہ ہے کہ شہریت کی بنیاد کیا ہے؟ دوسرا حقوق شہریت کے سلسلہ میں، ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں جو شہریت وغیرہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، جسے ہم یہاں پر استعمال کر رہے ہیں، اس میں شہریت الگ چیز ہے اور نیشنلٹی الگ چیز ہے، جو شہری حقوق ہیں وہ اصل میں شہریت سے ہی متعلق ہیں یہاں پر ہماری جو بحث ہو رہی ہے، اس میں دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، دونوں میں کافی فرق ہے، لیکن اصل میں یہاں پر دونوں مل گئے ہیں، لیکن بہر حال جو پہلی چیز ہے یعنی شہریت جس کو ہم بنیاد مان رہے ہیں، موجودہ دور کے اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ وہ فرد اور حکومت کے درمیان رشتے کا نام ہے اور جس کو ہمارے پروفیسر صاحب نے بھی ذکر کیا ہے وہ دراصل علاقائیت پر مبنی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اصل بنیاد علاقائیت ہے، کسی بھی چیز میں، اب اس میں جو خونی رشتے ہیں یا دیگر چیز ہے یا رجسٹریشن ہے یا کچھ دن سکونت پذیر وہاں پر ہونا ہے یہ بھی صرف علاقائیت ہی کی بنیاد پر ہوتی ہے، تو یہ تو موجودہ دور میں اصل میں علاقائیت ہے لیکن اسلام میں اگر دیکھا جائے تو اس میں شہریت یا جنسیت کی بنیاد اسلام کا غلبہ قبول کر لینا ہے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی شرط اور کوئی قید نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے دور میں بھی وہاں مسلمان بھی رہتے

تھے، اور غیر مسلم بھی رہتے تھے ایسا نہیں ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہوجانے کے بعد میں سارے غیر مسلموں کو وہاں سے نکال دیا گیا ہو، بلکہ وہ عقد ذمہ کے تحت میں رہا کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جو بنیاد ہے وہ اسلام کا غلبہ قبول کر لینا ہے، ظاہر ہے کہ مسلمان تو مانتا ہی ہے، جب ہی وہ مسلم ہوگا لیکن غیر مسلم بھی اس میں شریک ہوجائیں گے جب وہ عقد ذمہ کریں گے تو وہ بھی اس کا حصہ بن جائیں گے، تو اصل بنیاد یہ ٹھہری کہ کوئی شخص اسلام کی طاقت کو قبول کرلے تو وہ غیر مسلم گویا شہری ہوسکتا ہے، یہ تو ہے جس کو ہم جنسیت یا نیشنلٹی کے معنی میں موجودہ دور کے تقابل میں اسلام کے نقطہ نظر سے بنیاد مان سکتے ہیں، اور دوسری چیز جہاں تک حقوق شہریت کی بات ہے تو وہ جو جملہ حقوق ہیں جو تمام شہریوں کو حاصل ہوں گے اس میں ہمارے یہاں فرق ہے مسلم اور غیر مسلم میں، وہ فرق یہاں پر آتا ہے کہ انسانی بنیادوں پر جو شہری حقوق ہیں اس میں تو سب شریک ہوں گے لیکن غیر مسلموں کے لئے حکومت چلانے کے حق کا جہاں تک تعلق ہے، غیر مسلم اس میں شریک نہیں ہوگا، کیونکہ ہمارے یہاں انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور حکومت الٰہیہ میں وہ نائب کے درجہ میں ہے وہ اسلامی احکام کو نافذ کرنے والا ہے تو اس کے اندر تو ایمان کی شرط ہمارے یہاں ہے، لہٰذا اس میں غیر مسلم شریک نہیں ہوسکتا ہے، گویا شہری حقوق میں تو بحیثیت بشر غیر مسلم بھی شریک ہوں گے، اور حکومت کے جو دیگر عہدے ہیں موجودہ دور میں اس میں بھی وہ شریک ہوں گے، لیکن اسلام کی جو کی پوسٹیں (Key Posts) ہیں اور امیر المؤمنین ہونا ہے اس کے اندر غیر مسلم شریک نہیں ہوسکتا۔

مولانا احمد نور عین قاسمی:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، چند وضاحتیں اور چند سوالات ہیں، عرض مسئلہ میں جس طرح میرا موقف بیان کیا گیا اس سے ایسا لگ رہا ہے کہ میں اسلام میں شہریت کا بالکل ہی مخالف ہوں، ایسا نہیں ہے، بلکہ میں نے بھی اسلام میں شہریت کی بنیادوں کو قبول کیا ہے، ہاں مروجہ شہریت کی بنیاد چونکہ سیکولرائزیشن ہے، لہٰذا اس کی اسپرٹ اور روح نیشنلٹی ہے، اس لئے میں نے مروجہ شہریت کے نظام کو من وعن قبول کر لینے کو قبول نہیں کیا ہے، دوسری وضاحت یہ ہے کہ عرض مسئلہ میں کہا گیا ہے کہ رجسٹریشن اور شہریت میں کوئی فرق نہیں ہے، حالانکہ میں نے جو بات لکھی ہے رجسٹریشن کے سلسلہ میں وہ ہے اقامت کے سلسلہ میں رجسٹریشن، یعنی اقامت موبدہ کے سلسلہ میں رجسٹریشن کا پابند ہونا کے سلسلہ میں کہی ہے کہ اگر مسلم حکومت چاہے تو رجسٹریشن کا پابند بنا سکتی ہے، اس کی گنجائش ہے، جبکہ شہریت کا تصور ہے اور اس کا مکمل کنسپٹ ہے جس میں اس کے حقوق اور فرائض ہیں اس کے قبول کرنے کے اور اس کے منسوب ہونے کے پورے اصول ہیں تو اس طرح رجسٹریشن اور شہریت میں فرق ہے، ایک اور وضاحت ہے کہ مسلم مملکت میں عرض مسئلہ میں کہا گیا کہ ہمیں مغلوبیت کے دور کو دیکھنا چاہئے کہ بنو امیہ کے دور میں جب مسلم مملکت کا تعدد ہوگیا تھا اس کو دیکھنا چاہئے تو عرض یہ ہے کہ اس وقت مسلم مملکت کا تعدد ضرور ہوگیا تھا لیکن شہریت کا تعدد نہیں ہوا تھا، دوسری بات یہ ہے کہ کیا مسلم ملک کے تعدد کو کیا فقہاء نے قبول کیا ہے؟ چند کے علاوہ کسی نے قبول نہیں کیا۔

دو سوالات ہیں، پہلا یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی کہا کہ شہریت میں مروجہ نظام شہریت کی بنیاد سیکولرائزیشن ہے، ہم نے عرض مسئلہ میں جو باتیں دیکھیں اس میں ہم نے دیکھا کہ فقہاء نے عقد ذمہ کے سلسلہ میں غیر مسلموں کو شہری بنانے کے سلسلہ میں جو باتیں اور بنیادیں لکھی ہیں ہم نے بھی مسلمانوں کو شہری بنانے کے سلسلہ میں وہی باتیں لکھی ہیں، تو کیا یہ سیکولرائزیشن نہیں ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ شہریت کے سلسلہ میں جو سوالات کئے گئے اس کا تعلق کس سے ہے، حکومت سے یا عوام سے، اگر عوام سے ہے تو "الضرورات تبیح المحظورات" کے دائرہ میں بہت سی باتیں جائز ہوجاتی ہیں، اگر حکومت سے ہے تو پھر معذرت خواہانہ انداز مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

آخری نام جو میرے پاس آیا تھا وہ یہ ہے، آپ حضرات کی گفتگو ہوگئی ہے اور اب مولانا خالد سیف اللہ صاحب اظہار خیال فرمائیں گے، میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اظہار خیال فرمائیں، کسی اور کو اظہار خیال کرنا ہو تو ابھی ہمارے پاس وقت ہے، مجھے حیرت ہے کہ اتنے مختصر نام کیوں آئے، آپ سب نے پورا موضوع پڑھ لیا ہے، تلخیصات پڑھ لیے اور عرض پڑھ لیا، نقصان تھوڑا ہمارا ہوگیا کہ مناقشہ کم ہوگیا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، یہ بڑا اہم اور نازک موضوع ہے، اور بین الاقوامی اور عالمی حالات سے اس کا تعلق ہے، اور ہماری شہریت فرد کے لئے بھی ہے، محلہ کے لئے اور شہرت کے لئے بھی اور پورے عالم کے لئے بھی، اس لئے علماء ایسے مسائل سے دست کش نہیں ہوسکتے، اسی پس منظر میں یہ

عنوان رکھا گیا ہے، آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ سوالنامہ میں ابتدائی چار سوالات اور ساتواں سوال، یعنی پانچ سوالات ان کا تعلق حکومت سے ہے، اور دو سوالات جو سوال نمبر ۵ اور ۶ ہے اس کا تعلق افراد سے ہے، ہمیں کسی مسئلہ پر رائے قائم کرتے ہوئے اس کے پس منظر کو بھی سامنے رکھنا چاہئے اور موجودہ حالات بھی ہمارے پیش نظر ہونے چاہئیں، ہماری فقہ کی کتابوں میں مستقل ''کتاب السیر'' کے عنوان موجود ہیں، لیکن آپ دیکھئے کہ وہاں شہریت کے موضوع پر کوئی خاص بحث نہیں کی گئی ہے، یہاں تک کہ مسلم ممالک ہی نہیں غیر مسلم ممالک تک کا حال یہ ہے کہ خود ہندوستان میں ہندوستان کے جنوبی علاقہ سے بحثیت داعی جو مسلمان یہاں آئے، کہیں ان کو ملک میں شہریت کے لئے درخواست دینی نہیں پڑی، یعنی شاید اس جدید جمہوری دور کے مقابلہ اس زمانہ میں انسانی قدریں زیادہ زندہ تھیں، اور انسانوں کو انسانوں سے درندوں کی طرح خوف نہیں کھائے جاتا تھا، بلکہ ان کا استقبال کیا جاتا تھا، اس وقت جو سوالات ہمارے درمیان اٹھ رہے ہیں وطنیت کے، یہ دراصل موجودہ مغربی نظام کا پیدا کیا ہوا ہے۔

اور میرا خیال ہے کہ مغربی ممالک نے بیک وقت اس سے دو فائدے اٹھائے ہیں: ایک طرف اس نے اسے اپنے درمیان اتحاد کا ذریعہ بنایا اور دوسری طرف اس کو عالم اسلام میں تفریق کا ذریعہ بنایا، جب چرچ اور عوام کے جنگ میں اور حکومت کی جنگ میں جب یہ بات طے ہوگئی کہ مذہب کا سیاست میں کوئی رول نہیں ہوگا، تو اہل مغرب کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی جو ان کے لئے نقطۂ اتحاد بن سکے، جو ان کے مختلف طبقات کو متحد کرسکے تو انہوں نے وطنیت وقومیت کو بڑھاوا دیا، عالم اسلام میں چونکہ مذہب مسلمانوں کی وحدت کی بنیاد تھی، اسی لئے اسی قومیت کو اسی تصور کو انہوں نے مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کرنے کا ذریعہ بنایا، علامہ اقبال کا یہ شعر جو ابھی ہمارے دوست مولانا ولی اللہ مجید قاسمی نے پڑھا کہ

''ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے...... جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے''

اسی پس منظر میں علامہ اقبال نے یہ شعر کہا ہے، اور آپ محسوس کرسکتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کا سقوط اسی بنیاد پر ہوا اور اس کا منحوس سایہ آج تک عالم اسلام پر موجود ہے، دنیا کے جو حالات ہیں ان کو بھی سامنے رکھنا چاہئے، بعض مسلم ممالک یہاں تک کہ بعض خلیجی ممالک ایسے ہیں جہاں بہت سے ایسے بے آسرا لوگ ہیں جن کے پاس ضابطہ میں کہیں کی شہریت حاصل نہیں ہے، کسی خاص ملک سے ان کا پس منظر تھا اور پرانا تعلق تھا وہاں کی حکومت سے یہاں کی حکومت کا کچھ اختلاف ہوگیا وہاں کے قدیم باشندوں کو نکالا نہیں گیا، لیکن ان کی شہریت ان سے چھین لی گئی۔

ابھی ہمارے ایک دوست نے اس آیت سے استدلال کیا جو مہاجرات کے سلسلہ میں ہے: "فامتحنوھن اللہ أعلم بإیمانھن (سورۂ ممتحنہ: ۱۰)، ان کا امتحان لو، لیکن کیا یہ امتحان ایمان تھا یا امتحان وفاداری تھا؟ کیا قرآن نے یہ حکم دیا کہ ان کی وفاداری کا امتحان لو؟ علماء نے تو یہ کہا کہ ان کا امتحان لو کہ کیا واقعی وہ مسلمان ہیں، یا مسلم معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے لئے اور فساد پیدا کرنے کے لئے تو داخل نہیں ہوئی ہیں، لیکن آج حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں پر عالم اسلام کی زمین جتنی تنگ ہے دنیا کی کوئی زمین اتنی تنگ نہیں، اور یہ مغرب کا ایک فتنہ ہے جس کا صور اس نے عالم اسلام میں پھونکا ہے، چھوٹے چھوٹے ممالک ہیں بڑے بڑے وسائل ہیں ان کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ مسلمانوں کو اور نئے لوگوں کو زیادہ شہریت نہیں دیں گے، ورنہ آپ کا تشخص ختم ہوجائے گا، آپ کی شناخت مٹ جائے گی، آپ کے یہاں ارہاب پیدا ہوگا، دہشت گردی پیدا ہوگی، مقصود یہ ہے کہ جو مالی وسائل ہیں چھوٹے چھوٹے ملکوں کے پاس، جو عالم اسلام میں جو ملک طاقت حاصل کرسکتے ہوں یہ وسائل ان تک نہیں پہنچے، تو یہ صورتحال ہے، وطنیت کے بڑھتے ہوئے تصور میں، آپ دیکھئے برما میں کیسے قیامت برپا ہوئی اعداد وشمار کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ برما کے مسلمانوں کی جانیں وہاں کے ظالم حکمرانوں کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے زیادہ گئی یا پڑوسی مسلم مملکت کی بے اعتنائی کی وجہ سے زیادہ گئی، پوری پوری کشتیاں ڈبودی گئیں سمندر میں، تو یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے موجودہ حالات کیا ہیں، اور اس لحاظ سے ہمیں کیا عمل کرنا چاہئے، لیکن ہمیں اسلام کا جو بنیادی تصور ہے اس سلسلہ میں وہ پیش کرنا چاہئے، جیسا کہ حضرت مولانا عتیق صاحب نے فرمایا عباسی دور اور عباسی دور میں بھی اندلس میں جو اموی حکومت قائم ہوگئی اس سے پہلے پورا عالم اسلام متحد تھا، قاضی ابوالحسن ماوردی وغیرہ نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں جب تعدد وطن کی بحث کی ہے انہوں نے بھی جو بنیاد بنایا ہے وہ بیچ میں سمندر کے حائل ہونے کو، کہ اگر دو الگ الگ خطوں میں دو مسلم حکومتیں قائم ہوجائیں اور بیچ میں سمندر حائل ہو یا کوئی ایسی چیز حائل ہو جس کی وجہ سے بیک وقت دونوں ملکوں کے نظام کو نہ دیکھا جاسکتا ہو تو وہاں اس کی گنجائش ہے کہ ایک سے زیادہ مملکت کو تسلیم کرلیا جائے۔

تو میں سمجھتا ہوں کہ اب سب سے بڑا مسئلہ عالم اسلام میں شہریت کے سلب کرلینے کا ہے، دیکھئے حضرت ابوذر غفاریؓ کے واقعہ کو وہ حجر کا واقعہ ہے شہریت ختم نہیں ہوئی تھی، ایسا نہیں تھا کہ ان سے کوئی ایسا معاہدہ ہوا ہے حجر کا ہے جو آپ پڑھتے ہیں کہ کن حضرات پر حکومت کو بعض اوقات مصلحت کی بنا پر حجر کی

اجازت ہے، تخریب، جس یہ تو ملتے ہیں ہماری فقہ کی کتابوں میں، لیکن کسی مسلمان کو مسلمان ہونے کے باوجود حکومت سے کسی خاص موقف پر اتفاق نہ ہونے کی بنا پر اس کو شہریت سے محروم کردیا جائے اس کا میں نہیں سمجھتا کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں کوئی ذکر بھی ہے، ہمیں ہمیشہ احکام پر رائے دیتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ حالات کو ذہن میں رکھنا چاہئے، ہمارے بہت ہی قابل احترام دوست نے اسرائیل کے بارے میں کہا کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہاں کی شہریت نہیں لینی چاہئے، لیکن جن فلسطینی کو اسرائیل سے اجاڑ دیا گیا ہے اور جن کو اسرائیل شہریت دینا نہیں چاہتا ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ اسرائیل تو چاہتا ہے کہ اس ملک کا نقشہ ایسا تبدیل ہو جائے کہ ہم عربوں کو مغلوب کر چکے ہیں اب مغلوب تر ان کو بنادیں، ان کے ثقافتی ورثہ کو مٹادیں، ان کی تاریخ کو مٹادیں، ان کی پہچان اور شناخت کو ختم کردیں، کیونکہ ان کا تصور یہ ہے کہ یہ خدا کی زمین ہے کہ جس کو اسرائیل کے لئے دی ہے جس کو حضرت یعقوبؑ اور حضرت اسحاقؑ کی اولاد کے لئے دی ہے، تو ہمیں رائے قائم کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ فقہاء نے جو استیلاء کا حکم بیان کیا ہے اس کا مطلب استعمار کو قبول کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق انفرادی معاملات سے ہے، کسی نے کسی دشمن فوج نے کسی چیز پر قبضہ کرلیا اور وہ چیز فروخت ہوتے ہوئے ہم تک پہنچ گئی اس کو مال مغصوبہ سمجھیں یا مال مملوکہ سمجھیں، لیکن ہم استعمار کو جواز بخش دیں جو ہماری زمین ہے جو عالم اسلام کا علاقہ ہے اگر کوئی بالا دست طاقت جور وظلم کے ذریعہ اس پر قابض ہو جائے تو اس کی ملکیت قبول کرنے کو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اپنے آپ کو نقصان پہنچانے والی بات ہوگی، تو میری گزارش کا منشا صرف یہ تھا کہ یہ واقعی بہت اہم مسئلہ ہے ہمارے یہاں سے ایسی تجویز منظور ہونی چاہئے جس میں عالم اسلام کے لئے بھی ایک پیغام ہو اور جس میں مسلمانوں کے لئے بھی ایک پیغام ہو، کہ ان کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ خاص کر غیر مسلم ممالک کی شہریت کے سلسلہ میں کیا رویہ ہونا چاہئے اور ہم کو اس فکری پس منظر کو اور آج کے دور کے تاریخی پس منظر کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے، آپ کو معلوم ہے کہ خلافت عثمانیہ کو یعنی ترکوں کی حکومت جو اخیر میں باقی رہی اس میں یہ شرط لگائی گئی کہ آپ خلافت کو زندہ نہیں کریں گے، کیونکہ ان کو مسلمانوں کے اتحاد سے زیادہ کسی چیز سے بغض نہیں تھا، اور مسلمانوں کے اختلاف سے زیادہ کسی چیز سے مسرت نہیں تھی۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

اللہ کا فضل ہے کہ بہت ہی فکر انگیز باتیں اور بنیادی باتیں آپ کے سامنے آئیں، اور شاید آپ حضرات کو معلوم ہو کہ اسرائیل تنہا وہ ملک ہے جس کا ہر یہودی شہری ہے، خواہ وہ امریکہ میں ہو یا کناڈا میں ہو یا ہندوستان میں ہو اس کی شہریت وہاں محفوظ رہتی ہے کہ وہ اسرائیل کا شہری ہے، مذہب کی بنیاد پر، ہمارے یہاں صورتحال جو ہے وہ آپ کے سامنے ہے، مولانا نے فرمایا کہ تاریخی پس منظر کو اور حالات کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، بہت بنیادی چیز ہے، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد علامہ اقبال نے جو کہا تھا کہ

چاق کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

تو کیا کچھ اس کے بعد ہوا اور جو کچھ عالم اسلام میں ہو رہا ہے اسی منحوس قدم کا اثر ہے کہ اب جو ملک بڑے بڑے ہیں ان کو بھی حصہ بخرہ کرنا ہے، چھوٹے چھوٹے ہو گئے تو ہو گئے، اب مزید جو بڑے بڑے دکھتے ہیں ان کو بھی حصوں میں بانٹنا ہے، تو یہ سارے حالات ہمارے ذہنوں میں ہونے چاہئیں اور میرے پاس کئی کاغذات ایک ساتھ آئے ہوئے ہیں، تھوڑا گھبرایا بھی کہ کافی نام آ گئے ہیں اظہار خیال کے لئے، لیکن اس میں سے کئی تحریریں ہیں جس میں یہ اظہار کیا ہے کہ عرض مسئلہ میں ہماری رائے صحیح طور پر پیش نہیں کی گئی ہے، انشاء اللہ اس کو دیکھ کر کے صحیح کر دیا جائے گا، اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ بہت ہی سنجیدہ ماحول میں اس موضوع پر آپ حضرات نے اظہار خیال کیا اور کر رہے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ پوری تیاری آپ نے کی تھی عرض بھی پورا پڑھا آپ نے پہلے سے اور ساتھ میں تلخیصات بھی تفصیل کے ساتھ دی جا چکی ہیں، اس لئے ہمارے شرکاء نے زیادہ بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور بہت سے سوالات والے طلباء بھی اس میں شریک ہوئے ہیں مختلف دار الافتاء کے اور مختلف معاہد کے، ان حضرات نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں جو ذاتی سوالات ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اس کا موقع نہیں ہے کہ ان چیزوں کی یہاں وضاحت کریں، کوئی متعلق چیز ہو تو الگ چیز ہوتی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس ڈاکٹر صاحب تشریف لائیں جو عرشی ہونے کے باوجود انہوں نے فرشی گفتگو کی ہے اور ہماری زبان میں گفتگو کی ہے، تشریف لائیں۔

ڈاکٹر عرشی خان:

کچھ سوالات تھے جن میں آپ نے سوال کیا کنگڈم اور ڈیموکریسی سے متعلق، جس میں آپ نے کہا کہ ہم اسلامی پروسپیکٹیو، یعنی اسلام کا جو شہری قانون

ہے اس کی کیا حیثیت ہے جب کنگڈم اور ڈیموکریسی ہے تو پھر کیا ضروری ہے کہ ہم اسلام کے شہری قانون کو نافذ کریں؟ بہت اہم سوال ہے، میرے خیال سے یہاں پر میرا تعلق دنیاوی علوم سے زیادہ ہے، دیکھنے میں میں مفتی لگتا ہوں، لیکن ہوں نہیں بالکل، ہاں، نالج نہیں ہے میرے پاس تعلیم نہیں ہے میرے پاس تو میں کیا کرسکتا ہوں میں جاہل ہی آپ کے سامنے، لیکن دنیاوی تعلیم میں کچھ تھوڑا بہت جانکاری حاصل کی ہے خاص کر میں نے کئی ملکوں کا دورہ کیا ہے زیادہ تر مغربی ممالک کا تو واقف ہوں، ایک بہت بڑے دنیاوی عالم ہیں جن کا نام ہے انٹونی گرامشی، انہوں نے کہا کہ "سیاسی حلقے میں اپنے وجود کو قائم کرنے کے لئے فکری حلقے میں اپنے وجود کو دکھانا پڑتا ہے"، مطلب انہوں نے پولیٹیکل ہرمونی کو کلچرل ہرمونی سے لنک کیا ہے، ایک میں مثال دے رہا ہوں آپ کو ۱۹۸۰ء کے بعد آپ دیکھئے کہ لگاتار آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن کہ انہوں نے طرح طرح کے ایپیسوڈ اور رامائن مہابھارت شروع کردیا، اس کے بعد ۱۹۸۴ء سے بابری مسجد کے خلاف انہوں نے مہم شروع کی، اس سلسلہ میں بہت سارے اسپیکر، بہت سارے ریڈیو پروگرام اور بہت سارے جلسے انہوں نے کئے اور پھر دھیرے دھیرے ان کے لوگ ذرائع ابلاغ میں پھیلتے گئے، جگہ جگہ ان کی بہت سی چیزیں ہوتی رہتی ہیں، وہ جو کلچرل مینیفسٹرل ہے ان کا وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ سے یہ نہیں ہوگا تو پولیٹکل میدان میں بھی آپ کی مضبوطی نہیں آئے گی، میرے خیال سے آپ لوگوں کی جوبات میں نے سنی اور جو میں سمجھ پایا، مجھے یہ لگا کہ چاہے کوئی ایگری کرے یا نہ کرے آپ سے، پوری دنیا منظور نہ کرے مان لیجئے، لیکن آپ اپنے ذہنی خزانے کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں، اس لئے کہ ہمارے پاس یہی ایک سرمایہ بچا ہے جس کو ہم کمبٹ کر سکتے ہیں۔

اسی لئے میں آپ کو بتاؤں کہ اس وقت پوری دنیا میں صرف ذہنی جنگ چل رہی ہے، اس لئے کہ امریکی سیاست کا میں طالب علم ہوں، آپ دیکھئے کہ ہر جگہ انہوں نے شور برپا کر رکھا ہے کہ مسلم ارہاب، مسلم جہاد وغیرہ وغیرہ کیا کیا چیزیں، اور خود ان کا کیا کیا کام ہے وہ میں نہیں کہہ سکتا، لیکن ان کو جو خطرہ ہے مسلمانوں سے وہ بیسکلی اسلام میں جو مضبوطی ہے اس کا جو فکری ٹھوس پن اور مضبوطی ہے اس سے خطرہ ہے، اس لئے میں نہیں سمجھتا ہوں کہ اس کی اہمیت نہیں ہے کہ کنگڈم اور سیکولر نظام میں، بلکہ اس کی اہمیت خود اپنے آپ میں ہے، اور ہوسکتا ہے کہ ایک وقت آئے جب اس کی اہمیت کو دنیا سمجھ لے، اور دوسری چیز ایک سوال تھا کہ جو سیاسی پناہ گزیں ہیں وہ جب کسی مسلم ملک میں جائیں تو وہاں ڈیفریشٹ نہیں کرنا چاہئے وہاں کے عوام ہیں، لیکن جیسا کہ ایک صاحب نے کہا کہ مسلم ممالک میں حالات اور خراب ہیں، خاص کرکے میں آپ کو ایک بات بتاؤں گلف کنٹریز ہیں ان کے اندر ایک شہری جیسے قطر کے جو شہری ہیں وہ بحرین میں جاسکتے ہیں آپس میں آجاسکتے ہیں رہ بھی سکتے ہیں، جس کو ریسی ڈینشیل پرمٹ بولتے ہیں تو اس طرح کی چیزیں پورے یوروپی یونین میں ہے، ۲۸ ممبران کے یونین ممالک ہیں آپس میں ان میں ریسی ڈینشیل پرمٹ ہے جیسے میں اٹلی میں ہوں پروفیسر ہوں اور میں رسیا میں جاکر لیکچر بھی دے رہا ہوں اور رہ بھی رہا ہوں، میرا وہاں بھی گھر ہے یہاں بھی ہے، اس کو ریسی ڈینشیل پرمٹ بولتے ہیں، ریسی ڈینبی جتنا سال رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں، آپ کی مدت جیسے جرمنی میں ہے آٹھ سال دس سال اور ہندوستان میں بھی ہے بارہ سال چودہ سال تو اگر آپ اس کی مدت پوری کرتے ہیں تو آپ نیشنلائزیشن کے ذریعہ وہاں کے سیٹیزن بن سکتے ہیں، لیکن مسلم ممالک میں جیسا کہ آپ نے کہا کہ مدتیں گزر گئیں اور پیڑھی پیڑھی گذر گئی، لیکن نہیں بن پائے، دیکھئے سب سے امپورٹنٹ چیز ہے، ابھی ابھی اسرائیل پر بات ہوئی، دیکھئے فلسطین پر میں نے کام کیا ۱۹۹۹ء سے، دیکھئے اسرائیل میں اگر کوئی یہودی فلسطین میں کسی مسلم لڑکی سے شادی کرلیتا ہے مان لیجئے تو اسرائیل کے کورٹ نے ہمیشہ کے لئے اس کو شہریت دینے سے انکار کردیا، آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم نہیں لیں گے وہ دینے کو تیار نہیں ہیں، جبکہ ان کا جو قانون ہے ۱۹۵۰ء کا وہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی یہودی جیسے ہی اسرائیل میں قدم رکھتا ہے وہ وہاں کی شہریت حاصل کرلیتا ہے، خالی یہودی ہونا چاہئے، واحد ملک ہے پوری دنیا میں جہاں پر مذہب کی بنیاد پر شہریت ملتی ہے اور اس میں رہ سکتا ہے، اس لئے آپ دیکھیں کہ پورے اسرائیل میں ۹۰ ملک کے لوگ وہاں پر ہیں اور امریکہ میں ۶۸ کنٹریز کے۔

اور ایک آخری سوال یہ تھا ایک صاحب کانپور سے تھے شاید، زیادہ تر مغربی ملکوں میں لوگ نیشنلٹی کو اور سیٹیزن شپ کو ایک مانتے ہیں، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اپنا فریم آپ لوگ رکھیے یہ امپورٹنٹ ہے، مان لیجئے مجھے اگر کام کرنا ہو تو میں کہاں دیکھوں گا، آپ کی بات کوئی مانے یا نہ مانے وہ سب چھوڑ دیجئے آپ کا فریم ہوگا تبھی کمپٹیشن ہوگا فریم نہیں ہوگا تو کمپٹیشن نہیں ہوگا، اور اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے بڑے جو عالم ہیں جن کو معلومات ہے بڑا نالج ہے قرآن پاک کا تو وہ خوب گہرائی سے مطالعہ کرکے اپنی رائے کو پیش کریں، وہ ذرا بھی نہ سوچیں کہ کسی کو پسند آرہی ہے کہ نہیں، اس لئے کہ اب فریم کی بات ہے، ہم نے جو یہاں پر فریم دیا وہ نیشنل فریم ہے، وہ نیشنل اسٹائل کا فریم ہے وہ آپ کے سامنے آگیا، میرے اسٹائل کا ہی مکان ڈھونڈنا چاہئے جس کو بولتے ہیں پاراڈائم، اسپٹونولوجی، میری اسپٹونولوجی نہیں ہے اور جب تک ہم اس کو ڈیولوپ نہیں کریں گے تو ہماری جو آگے کی نسلیں ہیں وہ کام نہیں کریں گی، مجھے بہت اچھا لگا آپ لوگوں کے بیچ میں۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

الحمد للہ مناقشہ اور گفتگو مکمل ہوئی، انشاء اللہ اب اس وقت کچھ کتابوں کا اجراء بھی کرنا ہوگا جس کو یہاں یعنی جامعہ علوم القرآن کے لوگوں نے

شائع کیا ہے، اور صدارتی کلمات آپ کو معلوم ہے کہ اس مجلس کی صدارت حضرت مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب فرما رہے ہیں جو دار العلوم دیو بند کے قدیم استاذ اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت آپ شیکا گو میں ہیں شیکا گو میں آپ کا جو ادارہ ہے معہد تعلیم الاسلام وہ غیر معمولی کارنامہ حضرت قاری صاحب کا ہے یہ سمجھئے کہ یہاں جیسے ہمارے مدارس ہوتے ہیں اسی نہج پر وہاں کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے مولانا نے وہاں ادارہ قائم کیا ہے لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے، اور وہاں جاکر دل خوش ہوتا ہے اور لگتا ہے کہ اپنے ماحول میں ہم پہنچ گئے، حضرت مولانا کی صدارت ہے انشاء اللہ ان کا صدارتی خطاب بھی ہوگا اس سے پہلے جو مہمان تشریف لائے ہوئے ہیں موقع غنیمت ہے کہ ہم ان سے استفادہ کریں۔

صدارتی کلمات

مولانا عبداللہ سلیم صاحب شیکا گو

بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، أما بعد!

میں آج ہی جب عصر کی اذان ہو رہی تھی تب پہنچا صبح پانچ بجے گوہاٹی سے جس ہوٹل میں قیام تھا وہاں سے روانہ ہوا اور ساڑھے تین بجے بڑودہ فلائٹ پہنچی، عصر کی نماز کے بعد یہ حکم ملا کہ مغرب کے بعد جو نشست ہے اس کی صدارت کرنی ہے علاوہ اس کے کہ میں تھکا ہوا اور اپنے اندر وہ بڑی بات ہے کہ قابلیت نہیں ہے، یہاں بڑے بڑے بزرگ اصحاب افتاء اور فقہ کے ماہرین، اسی طرح سے حدیث کے اندر ان کا اونچا مقام ہے ایسے افراد تشریف رکھتے ہوں تو میرے جیسے فرد جس کو طالب علم کہنا بھی مشکل ہے اس کو یہ اہم ذمہ داری دینا میرے لئے ہی، بہت ہی حیرت انگیز ہے، اگر چہ اس سے پہلے ہانسوٹ میں فقہ اکیڈمی کا جو سمینار ہوا تھا اور اس کے بعد رامپور میں وہاں بھی مجھے یہ شرف بخشا گیا تھا تو اس کے باوجود میرا تاثر یہی ہے کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔

بہر حال جو موضوع ہے اس نشست کا وہ تو بہت ہی اہم ہے، بہت نازک ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ نصوص شرعیہ میں گہری بصیرت کی ضرورت ہے، بلکہ جو مروجہ قوانین ہیں ممالک اور بلاد میں ان سے بھی اگر ماہرانہ نہیں تو کما حقہ واقفیت ہونا بھی ضروری ہے، اگر ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک چیز میں بھی کمی رہی تو کسی نتیجہ تک پہنچنا اور وہ نتیجہ مفید ہو، مشکل ہے، اس سلسلہ میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ میرے خیال سے شیخ نے اس پر اشارہ بھی کیا ہے کہ جو نصوص ہیں ان میں جو احکام منصوصہ ہیں کون سے ہیں جو ابدی اور دوامی ہیں اور کون سے وہ ہیں جو موقت ہیں، وقتی ہیں، ان میں سے کچھ کا اندازہ تو احادیث سے ہی ہوجاتا ہے کہ یہ وقتی تھے اور یہ ابدی تھے اور کچھ کا اندازہ ہوتا ہے حضرات صحابہ کرام کے طرز عمل سے، مثلاً اس میں جو خلاصہ ہے کہ جو مباحث ہمارے سامنے پڑھ کر بھی سنایا گیا کہ اگر ایک امیر کے ہوتے ہوئے دوسرا امیر کھڑا ہو تو اس کو قتل کر دو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے بعد حضرت امیر معاویہؓ مدعی ہوئے اور ان کا نظام سلطنت قائم ہوا، ان سے جہاد ضرور کیا گیا لڑائی کی گئی، مگر جو بھی نتیجہ اس کے بعد نکلا سب اپنی اپنی جگہ پر یہ کہئے کہ مطمئن ہوگئے جو امیر معاویہؓ کے ساتھ تھے وہ ادھر رہے جو حضرت علیؓ کے ساتھ تھے وہ ادھر رہے کسی نے اس کے بعد یہ نہیں کہا کہ وہ واجب القتل ہے کہ ایک امام کے ہوتے ہوئے وہ کھڑے ہوگئے ان کا ساتھ دینے والوں سے ہمارا ہمیشہ کا مقاطعہ ہو یہ نہیں ہوا، تو اس کے معنی یہ ہوگئے کہ ایک امیر کے ہوتے ہوئے دوسرا امیر اگر کھڑا ہو تو اس کو قتل کر دو شاید صحابہ نے اس میں کسی درجہ میں تاویل کرلی ہوگی یا اس حکم کو موبدنہ سمجھا ہوگا، اس میں بہر حال دیکھنا ہوگا اور بطور نظیر کے اس سے دوسرا مسائل میں بھی مدد لی جاسکتی ہے، اسی طرح جو مقاصد ہیں شریعت کے، احکام ہیں شریعت میں اس میں بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ مقاصد شریعت میں موبدہ ہیں یا موقتہ ہیں، تو یہ چیزیں ہم کو دیکھنی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت کے جو حالات ہیں جس کے بارے میں سوال وجواب میں بھی اور مضمون نگار حضرات نے بھی اس پر بحث کی ہے کہ یہ شہریت کا مسئلہ اور یہ سارے جو مسئلے ہیں یہ بدعت ہے مغربی ملکوں کی اور ان کی سیاست کی دین ہے، لیکن سوال تو یہ ہے کہ اب پوری دنیا اسی کی لپیٹ میں ہے اور ہم اس کو نظر انداز کر کے خالصتاً اسلامی نقطہ نظر سے جو ایک مسلمان ملک ہے اس کی رہنمائی کرنے کے واسطے ہم اکٹھے ہوئے ہیں اور ہم جو فیصلہ کریں گے وہ اگر سو فیصد نہیں تو کم سے کم پچاس فیصد تو مانیں گے، مسئلہ یہ نہیں ہے، مسئلہ ہے اس وقت پوری دنیا کا، اب مان لیجئے کہ مثلاً امریکہ ہے، امریکہ میں جو صورت ہے ابھی وہ ہمارے ڈاکٹر صاحب نے بھی ذکر کیا کہ وہاں نیشنلزم، سیٹیزن شپ اور نیچورلائزیشن یہ سب جو ہیں ایک ہی مقصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں، حالانکہ لغوی اعتبار سے ان میں کافی فرق ہے، چنانچہ وہاں ایک ادارہ ہے حکومت کا ڈپارٹمنٹ آف امیگریشن اینڈ نیچورلائزیشن تو جو وہاں پناہ گزیں ہوں جن کو گرین کارڈ دیا جاتا ہے بطور سند کے تو وہ ہیں امیگرینٹس اور دوسرا ہے نیچورلائزیٹ کے معنی، یعنی جس کی یہاں پیدائش ہوئی ہو یا وہ یہاں آنے کے بعد ایک مدت تک یہاں ٹھہرا رہا امیگریٹ کے طور پر اور اس کو یہ حق حاصل ہوگیا کہ وہ یہاں کی سیٹیزن شپ لے اور جب سیٹیزن شپ مل جائے گی تو اس کی نیشنلٹی امریکن بن جائے گی،

اب یہ مسئلہ ہے وہاں، تو وہ چاہتے یہ ہیں کہ دوسرے ملک بھی اسی کو اختیار کریں، چنانچہ اب جو یہ بات آرہی ہے کہ بھائی یہ خلیجی ملک اور اسلامی ملک ان کی بہت ہی بری حالت ہے اور وہ دوسرے ملکوں کے اور دوسرے ملکوں کے پیدا ہوئے لوگ یہاں آکر بس گئے ہیں اور کئی کئی نسلیں بس گئی ہیں، لیکن ان کو وہ سہولتیں شہریت کی نہیں دی جارہی ہیں مثلاً، کیا مجبوریاں ہیں آخر اس کو دیکھنے کی ضرورت ہے، آج صورت حال یہ ہے کہ جس روز وہ اس بات کو کھول دیں گے کہ عام مسلمان جو بھی آکر رہنا چاہے وہ رہ سکتا ہے اسی وقت مغربی ملکوں کا ان پر دباؤ ہوگا کہ بھائی ہمارے ملکوں کے جو غیر مسلم ہیں ان کو کیسے روک سکتے ہیں، اگر مسلمان ہمارے ملک میں آکر رہنا چاہتے ہیں تو تمہارے ملک میں غیر مسلم جائے گا تو کیسے روک سکتے ہو، ظاہر بات ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ غیر مسلم ہے اور ہم مسلمان ہیں، یہ فلسفہ جو ہے ان کے سامنے تو نہیں پیش کیا جاسکتا، اس لئے پھر ہمارے لئے یعنی مسلمانوں کے لئے ہی مشکل ہوگی کہ وہاں نہ جائیں۔

تیسری بات اس میں یہ بھی دیکھنے کی ہے میرے خیال میں ابھی اس پر بحث نہیں ہوئی وہ یہ ہے کہ کیا کوئی بھی اسلامی ملک اپنے باشندوں کو چاہے وہ کسی بھی بنیاد پر ہو وہ روک سکتا ہے کہ صاحب یہ ملک چھوڑ کر کسی اور ملک میں نہ جائیں، چاہے وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، مثلاً فنکار ہیں، ارباب علم ہیں ان کے جانے سے ملک کو نقصان ہو رہا ہے اگر وہ بعض زائد مفادات کے واسطے یا کسی اور وجہ سے دوسرے ملک میں چلے جائیں چاہے وہ اسلامی ملک ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس ملک کو تو نقصان پہنچ رہا ہے، اس کے لئے شاید ہم کو اس سے سند مل جائے کہ جب ابتداء میں ہجرت کا حکم تھا کہ اس کے بغیر کسی شخص کو مسلمان یا مومن ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک وہ ہجرت نہ کرلے اور پھر بعد میں کہا گیا کہ "لا هجرة بعد الفتح" یہ کیوں ہوا، کہ فتح مکہ سے پہلے مدینہ طیبہ بطور اسلامی اسٹیٹ قائم ہو رہا تھا ضرورت تھی کہ مسلمان وہاں آئیں، مسلمان اگر نہیں آئیں گے تو ظاہر ہے کہ وہاں جو مملکہ ہے وہ طاقتور نہیں ہوگی اور مضبوط نہیں ہوگی تو اس سے ہم سند لے سکتے ہیں کہ کوئی ملک اپنے ماہرین کو باہر جانے سے روک دے ایسی کوئی صورت ہوسکتی ہے، اسی طرح سے اور ایک مسئلہ یہ بھی اسی واقعہ سے نکالا جاسکتا ہے جو میں نے عرض کیا ہجرت کا، مثال کے طور پر کوئی ایک ملک ہے جس میں آبادی بہت تھوڑی ہے مسلمانوں کی اور مسلم ملک ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ صاحب یہاں مائگریشن ہو، تاکہ ہم مسلمانوں کی تعداد یہاں بڑھ جائے اور اگر ہم نے آبادی نہ بڑھائی تو پھر غیر مسلم آئیں گے اور ہم ان کو روک نہ سکیں گے تو یہ وہ چیز ہے جس کے لئے اصل میں ضرورت کے مطابق قوانین بنانے پڑتے ہیں، ابھی مثلاً اسرائیل کی بات آئی تو یہ کوئی اسرائیل ہی کی اختراع تھوڑے ہی ہے، بلکہ مغربی ملکوں نے بھی یہی چاہا کہ ایک یہودی جو دنیا میں کہیں بھی ہو اسرائیل میں اس کی شہریت مان لی جائے، تاکہ یہودی دنیا میں جہاں بھی ہو سب کھینچ کر یہاں آجائیں تو اس کی ایک مصلحت ہے، تو معلوم ہوا کہ شہریت کا ایک الگ انداز ہے، اسی طرح یہ معلوم ہوا کہ یہودی اور اسرائیلی وہ اسرائیل کا بھی شہری مانا جائے گا اور امریکہ کا بھی شہری مانا جائے گا، ظاہر ہے کہ یہ بالکل الگ نوعیت کی ایک چیز ہوگئی ہے، اس لئے یہ جو سارے مسائل ہیں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، ہمیں ان کا گہرائی سے مطالعہ اس طرح کرنا ہوگا کہ ان کے پیچھے سیاستیں کیا ہیں اور ان کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟، ہم کو جو فیصلے کرنے ہیں وہ ان کی سیاستیں اور ان کے اثرات جو ہیں ان کو سامنے رکھ کر کے جس سے کہ مسلمانوں کو دنیا بھر میں نقصان نہ پہنچے، ان چیزوں کو بھی دیکھنا ہوگا، ورنہ یہ مسئلہ کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کو ایک دو نشستوں میں حل کیا جائے میری گزارش یہ ہے کہ ایسے مسائل میں یہ مسئلہ اور اس طرح کے اور بھی جو مسائل ہوں ان کو ایک ہی نشست و اجلاس میں ختم نہ کیا جائے، بلکہ اس کو پھر جو کانفرنس ہوگی انشاء اللہ آئندہ سال اس میں اس کو ضرور رکھا جائے۔

اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ جتنی بحثیں یہاں پر ہو چکی ہیں ان کو یہیں ختم کیا جائے، مکرر نہ ہو اور پھر نئے سرے سے وہاں بحث شروع ہو جائے اور اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ جن لوگوں نے اب یہاں بحث میں حصہ لیا ہے وہاں ان کو مزید سوچنے سمجھنے کا موقع ملے گا اور اس سے اور راہیں کھلیں گی، دوسری صورت یہ ہے کہ جس طرح سب کی رائیں جمع کی جاتی ہیں اسی طرح ایک کمیٹی بنادی جائے کہ وہ اس پر مزید غور و فکر کرکے اور لوگوں سے رابطہ قائم کرکے اور پھر یکجا مرتب کردیا جائے ساری چیزوں کو اور پھر آنے والی کانفرنس میں اس کو لایا جائے اور اس پر بحث ہو، ایسے مسائل کا ایک نشست میں اور ایک کانفرنس میں حل ہونا مشکل ہے میری یہی گزارش ہے، بہرحال اس مسئلے پر اور زیادہ کچھ میں عرض نہیں کرسکتا، کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا کہ مجھ پر تو لفظ طالب علم بھی فٹ نہیں بیٹھتا چہ جائے کہ عالم ہونا، آخر جاہل آدمی کیا بولے گا جتنا بھی میں نے بولا اس کو حکم کی تعمیل ہی سمجھئے اور عشاء کی اذان بھی ہوگئی ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس اجتماع کو قبول فرمائے اور آنے والوں کے آنے کو اور اسی طرح منتظمین کے انتظام کو قبول فرمائے اور اجر عظیم عطا فرمائے اور ہم سب کے علم میں، عمل میں اور حال میں اللہ تعالیٰ خیر و برکت عطا فرمائے اور ہم سے راضی ہو اور مسلمانوں اور اسلام کو شوکت نصیب ہو،

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات
غیر مسلموں کے جنازے میں شرکت
غیر مسلموں کے مذہبی امور میں چندہ دینا
غیر مسلموں کے تہواروں پر مبارکباد دینا
غیر مسلموں کی سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کا حکم
غیر مسلموں کے تحفے وصول کرنا
غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت
اور دیگر اہم مسائل کا شرعی حل

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارُالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

پیش لفظ:

خطبہ استقبالیہ:

اکیڈمی کا کارواں-منزل بہ منزل:

تلخیص مقالات:

مفصل مقالات:

مختصر مقالات:

تحریری آراء:

مناقشہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اسلام عالمگیر اور آفاقی دین ہے، اور وہ ہر طرح کے حالات میں رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے، اسی لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف صبر آزما حالات سے بھی گذارا گیا، تا کہ امت کے لئے ہر طرح کے حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارکہ موجود رہے، جسے وہ اپنے لئے مشعل راہ بنا سکے، اسی لئے شریعت اسلامی جس طرح مسلم اکثریت کی رہنمائی کرتی ہے، اسی طرح مسلم اقلیت کو بھی لائحہ عمل بتاتی ہے، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا زیادہ تر حصہ ایک ایسے ماحول کا نمونہ تھا، جس میں اقتدار کی باگ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، وہیں مکی زندگی ان مسلمانوں کے لئے نقشہ کار فراہم کرتی ہے، جو اپنے طاقتور دشمنوں کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں، اور مدنی زندگی کا ابتدائی دور، نیز مہاجرین حبش کے حالات ان مسلمانوں کے لئے خضر طریق ہے، جو غیر مسلم ہمسایہ کے ساتھ باہمی امن وآشتی اور مذہبی آزادی کے معاہدہ کے ساتھ رہ رہے ہوں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دنیا کی نصف مسلمان آبادی ان ممالک میں ہے، جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے، یہ مسلمان اقلیتیں بعض ایسے مسائل سے دوچار ہیں، جن سے گذشتہ ادوار میں مسلمانوں کو سابقہ پیش نہیں آتا تھا، اس کی بنیاد یہ ہے کہ پہلے ہر سلطنت کا ایک مذہب متعین ہوتا تھا، اسی لئے قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر پیغمبروں سے حکومت وقت کے تصادم کی نوبت آیا کرتی تھی، حالانکہ انبیاء کرام حکومت واقتدار کے طلب گار نہیں تھے، ان کی دعوت "إن أجري إلا علی اللہ" کے اعلان کے ساتھ ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود حکومتیں ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوجاتی تھیں، خود جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، تو اس وقت بھی بڑی بڑی سلطنتیں، روم، ایران وغیرہ ایک خاص مذہب کے پیرو تھے، غالباً اسی لئے یہود جزیرۃ العرب میں پناہ گزیں ہوئے، جہاں باضابطہ کوئی حکومت قائم نہیں تھی، اور کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین، انصار اور یہود کے درمیان جو میثاق طے فرمایا تھا، وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی کوشش تھی، جس میں مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے انسانی حقوق کا احترام کرتے ہوئے رہیں، اور ایک دوسرے کے مذہبی معاملات میں جبر اور تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کریں، غور کیا جائے تو صلح حدیبیہ کی روح بھی یہی تھی۔

اسلامی فتوحات کے بعد صدیوں تک صورتحال یہ رہی کہ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کا قدم پیچھے ہٹ جاتا، اور کوئی خطہ ان کے اقتدار سے نکل جاتا، تو وہاں کے بچے کھچے مسلمان دار الاسلام کی طرف ہجرت کرجاتے، کیونکہ جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کی آزادی حاصل نہ ہو، اور وہ وہاں سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنے پر قادر ہوں، تو ان پر ہجرت واجب قرار دی گئی ہے، غالباً پہلی بار اندلس میں مسلمانوں کی شکست کے بعد یہ صورتحال پیدا ہوئی کہ اس کے بعض علاقوں جیسے قرطبہ، بلنسیہ وغیرہ میں کچھ مسلمان باقی رہ گئے، جو صلیبی فاتحین کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت رک گئے تھے، لیکن بعد میں ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا، اور ان پر بڑے مظالم ڈھائے گئے، فقہاء نے ان علاقوں کے مسلمانوں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے، انتخاب امیر، نصب قاضی، قیام جمعہ وعیدین، یتیموں کی ولایت وغیرہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے، لیکن اس زمانہ میں آج کی طرح بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں کے غیر مسلموں کے زیر اقتدار رہنے کا تصور نہیں تھا۔

سترہویں صدی سے ایک نئے جمہوری نظام کا تصور ابھرا، حکومت اور کلیسا کی جنگ اور اس جنگ میں حکومت کی فتح نے لادینی جمہوریت کے تصور کو فروغ دیا، اور آج پوری دنیا میں جمہوری نظام سکہ رائج الوقت کی طرح جاری وساری ہے، لادینی جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ سلطنت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوگا، اور تمام مذہبی گروہوں کو نجی زندگی میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی گنجائش ہوگی، اب یہ اور بات ہے کہ بعض حکومتوں نے مذہب کے دائرہ کو بہت محدود کردیا ہے، اور صرف عقیدہ وعبادت کو اس میں شامل رکھا گیا ہے، اور بعض ملکوں میں اس دائرہ کو نسبتاً وسیع رکھا گیا ہے، جیسے ہندوستان کہ یہاں خاندانی زندگی کے قوانین بھی مذہبی آزادی میں داخل مانے گئے ہیں، اس نظام نے ایک نئی صورتحال پیدا کردی ہے، اور اس پس منظر میں مسلمان تارکین وطن کی بہت بڑی تعداد یوروپ اور امریکہ میں آباد ہے، یا جہاں مسلمان پہلے سے موجود تھے، مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمہ کے بعد بھی وہ برادران وطن کے ساتھ مقیم ہیں، جیسے ہندوستان اور روس وچین کے بعض صوبے۔

ان ملکوں میں مسلمان نہ اتنے خود مختار ہیں کہ ان کے منشاء کے مطابق ہی قانون بنے، اور وہ اسلامی نقطہ نظر کے خلاف جانے والے قوانین کو روک سکیں، اور نہ اتنے مجبور ہیں کہ وہ اعلانیہ بہت سے مذہبی احکام پر عمل کرنے سے قاصر ہوں، یا انہیں جس بات سے اختلاف ہو، اس پر صدائے احتجاج بلند کرنے اور اس کے خلاف فضا ہموار کرنے سے بھی عاجز ہوں، غرض کہ وہ ایک نئی صورتحال سے دوچار ہیں، اور ان ملکوں میں بہت سے ایسے مسائل پیدا ہورہے ہیں، جن پر غور کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے ان پہلوؤں کے گہرے تجزیئے کی ضرورت ہے، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے فقہاء نے سیاسی اور بین قومی مسائل پر بھی بڑی دقت نظر کے ساتھ گفتگو کی ہے، لیکن چونکہ ہماری فقہ اس عہد میں مرتب کی گئی تھی، جو مسلمانوں کے غلبہ واقتدار کا زمانہ تھا، اس لئے ان کے اجتہاد واستنباط میں ان احوال کی پوری پوری جھلک موجود ہے، اسی لئے ہمیں قانون، صلح و جنگ اور مسلم ملک میں آباد غیر مسلم اقلیت کے حقوق کی جتنی زیادہ تفصیلات ملتی ہیں، دارالکفر میں مقیم مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا، بلکہ دارالکفر میں آباد مسلمانوں سے متعلق اتنے کم مسائل ہیں، جنہیں انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے، اس پس منظر میں ''فقہ الأقلیات'' کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اور ان مسائل پر غور کرتے ہوئے سلف کے اجتہادات سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کے ارشادات، سیرت نبوی کے اشارات اور شریعت کے بنیادی اصول وقواعد کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔

چنانچہ عالم اسلام اور یوروپ وامریکہ کے مختلف فقہی اداروں نے مسلمان اقلیتوں کے مسائل پر سمینار کئے ہیں، چونکہ ہر ملک کے مسائل الگ الگ ہیں، اس لئے ہندوستان کے مسلمان بعض ایسے مسائل سے دوچار ہیں جن سے مغرب کے مسلمان دوچار نہیں ہیں، اور مغرب میں بعض ایسے مسائل پیدا ہوئے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان ان سے نبرد آزما نہیں ہیں، اسی کے پیش نظر اکیڈمی نے ''چودہویں فقہی سمینار'' کے موضوعات میں بنیادی اور اساسی موضوع کی حیثیت سے ''غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل'' کو رکھا تھا، اس وقت جب یہ موضوع طے ہورہا تھا، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نور اللہ مرقدہ بانی اکیڈمی حیات سے تھے، ان کی تشویش ناک اور مسلسل علالت کی وجہ سے سمینار کے سلسلہ میں پیش رفت نہیں ہوسکی، ان کی وفات کے بعد یہ پہلا سمینار منعقد ہوا، اور اسی روایت اور اہتمام کے ساتھ ہوا، جس طرح ان کی حیات میں ہوا کرتا تھا، اس سے ضرور ان کی روح کو تسکین ہوئی ہوگی، اس سمینار کی میزبانی کی پیش کش حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ سابق نائب صدر اکیڈمی کی طرف سے ہوئی تھی، ان کی علالت کی وجہ سے سمینار کے انعقاد میں مزید تاخیر ہوئی، بہر حال مؤرخہ ۱-۳ر جمادی الاولی ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰-۲۲ر جون ۲۰۰۴ء کو دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے احاطہ میں یہ سمینار منعقد ہوا، افسوس کہ اس کے چند ہی ماہ بعد ان کی بھی وفات ہوگئی، اس طرح اس سمینار سے ہمارے ان دو بزرگوں کی یادیں بھی وابستہ ہوگئی ہیں، اللہ تعالی ان حضرات کو شایان شان اجر عطا فرمائے۔

یہ مجموعہ جو آپ کے سامنے ہے، اسی سمینار کے مقالات، اہل علم کی آراء، سمینار میں ہونے والے مناقشہ، موضوع سے متعلق سوالنامہ اور طے پانے والی قراردادوں پر مشتمل ہے، حسن اتفاق ہے کہ یہ تمام قراردادیں باتفاق رائے طے پائی ہیں، مقالات میں ضمنی طور پر جو آراء آئی ہیں، وہ اکیڈمی کے موقف کی نمائندگی نہیں کرتی ہیں، بلکہ جو قراردادیں طے پائی ہیں، وہ اکیڈمی کا اصل موقف ہے، اسی لئے تجاویز، مقالات سے پہلے رکھی گئی ہیں، تاکہ قارئین پہلی نظر میں موضوع کے لب لباب سے واقف ہوجائیں، اس موقع سے حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ صاحب نے بڑا عالمانہ اور ادیبانہ خطبہ استقبالیہ پیش فرمایا تھا، اور اس حقیر نے اکیڈمی کی بابت رپورٹ کارکردگی پیش کی تھی، جس میں اکیڈمی کی اب تک کی مختصر تاریخ آگئی ہے، اس لئے سمینار کی مناسبت سے یہ دو تحریریں بھی اس مجموعہ میں شریک اشاعت ہیں۔

اس مجموعہ کی ترتیب وایڈیٹنگ کا بیشتر کام اکیڈمی کے شعبہ علمی کے رفیق امتیاز احمد قاسمی نے انجام دیا اور دیگر رفقاء مولانا صفدر علی ندوی اور مولانا سراج احمد قاسمی زیدت حسناتہم نے بڑی توجہ کے ساتھ اس کام میں تعاون کیا، چنانچہ حشو وزوائد کو حذف کیا گیا، عبارتوں کے ترجے کئے گئے، اور الفاظ وتعبیرات کی واضح فروگذاشتوں کو درست کیا گیا، امید ہے کہ سمینار کے مقالات کے دوسرے مجموعوں کی طرح اسے بھی اہل علم اور اصحاب ذوق کی بارگاہ میں قبولیت حاصل ہوگی، دعا ہے کہ اللہ تعالی علم وتحقیق کے اس قافلہ کو اپنی منزل کی طرف رواں دواں رکھے، اور امت کو اس سے نفع پہنچائے۔

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم۔

خالد سیف اللہ رحمانی ر (خادم اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

یکم مارچ ۲۰۰۶ء، مطابق ۳۰ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

خطبہ استقبالیہ

مولانا محمد رضوان القاسمی
صدر مجلس استقبالیہ و ناظم دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم!

علم کی اس بستی اور تعلیم کے اس مرکز میں قافلہ فکر و نظر اور مسافران راہ علم و تحقیق کو خوش آمدید کہتے ہوئے اور ان کا استقبال کرتے ہوئے آج ہم جس مسرت کا احساس کر رہے ہیں، زبان و قلم سے اس کا اظہار ممکن نہیں، یہ دن اور یہ ساعت نہ صرف اس راقم الحروف کے لئے اور دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کے منتظمین، اساتذہ و طلبہ کے لئے سعادت کی گھڑی اور نیک بختی کی ساعت ہے، بلکہ یہ اس پورے شہر کے لئے ایک یادگار اور تاریخی دن ہے، آپ میں سے بہت سوں کے علم میں یہ بات ہوگی کہ اسی شہر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی خشت اول رکھی گئی تھی، اور یہیں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا، دار العلوم سبیل السلام اور حیدر آباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس شہر میں ہمیں دوسری بار سمینار کی میزبانی کا شرف حاصل ہو رہا ہے، اکیڈمی کے چوتھے فقہی سمینار کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۹ / اگست ۱۹۹۱ء کو اکیڈمی کے موسس استاذ گرامی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا تھا، جس کے الفاظ آج بھی کان میں گونج رہے ہیں، مولانا نے فرمایا تھا:

''غالباً ۱۹۸۰ء کی بات ہے، اسی شہر حیدر آباد میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس کی وجہ سے اصحاب علم و تحقیق کی ایک خاصی تعداد یہاں موجود تھی، میں نے ان میں سے چند علماء کو جمع کیا، اور اس بات پر گفتگو ہوئی کہ ہندوستان میں نئے مسائل پر غور و فکر کے لئے علماء اور جدید علوم کے ماہرین کا ایک پلیٹ فارم ہونا چاہئے، جو ہر طرح کی جماعتی اور گروہی تنگ نظریوں سے بالاتر ہو کر محض ملت کے مفاد کے لئے کام کرے، اور نئے مسائل کا حل امت کے سامنے پیش کرے، چنانچہ اسی مقصد کے لئے ''مرکز البحث العلمی'' کا قیام عمل میں آیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ جو سفر ہم نے سرزمین حیدر آباد سے شروع کیا تھا، اب ایک بار پھر ہم اسی علم پرور اور ادب خیز زمین پر خیمہ زن ہوئے ہیں، وہ شہر جو عرصہ تک اس ملک ہی نہیں پورے عالم اسلام میں علوم اسلامیہ کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کا نشان سمجھا جاتا تھا، اور اہل نظر جس کو ''بغداد ہند'' سے تعبیر کرتے تھے، جس ریاست میں فتاوی عادل شاہی اور فتاوی عالمگیری جیسی فقہ کی جامع ترین کتابیں مرتب ہوئیں اور جس کے ذریعہ فقہ اسلامی کی دسیوں نادر تالیفات جو مخطوطات کے دفینوں میں تھیں، طباعت و اشاعت کے سفینوں میں منتقل ہوئیں، اور اہل تحقیق کی چشم اشتیاق کا سرمہ بنیں''۔

کاش! فرشتہائے رحمت حضرت قاضی صاحبؒ کو مطلع کرتے کہ ان ہی کی منشاء کے مطابق ایک بار پھر یہ کاروان علم اسی زمین پر خیمہ زن ہوا ہے، اور اسی جگہ علم و تحقیق کی یہ بزم پوری آب و تاب کے ساتھ دوبارہ آراستہ ہو رہی ہے، جہاں انہوں نے اپنے مبارک ہاتھوں سے مسجد عمر بن الخطابؓ کی بنیاد رکھی تھی، اگر اس دنیائے بے ثبات کی خبریں عالم ارواح تک پہنچتی ہوں تو یقیناً آج کا دن ان کے لئے تسکین و طمانیت کا باعث ہوگا۔

راقم السطور نے جب حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات سے چند ماہ پہلے چودہویں فقہی سمینار کے لئے ان کی چھپی ہوئی خواہش کا اشارہ پاکر میزبانی کے لئے پیشکش کی تو انہوں نے اپنی دیرینہ شفقت و عنایت اور اندرونی تقاضے کے مطابق بلا تامل اسے منظور فرمایا، اور اس سلسلہ میں حوصلہ افزاء کلمات بھی تحریر فرمائے۔ آج یہ ساری باتیں ذہن کے افق پر ان کی یاد اور محبت کو تازہ کرنے اور ان کے فراق کے زخم کو ہرا کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ تاہم اس زخم کے لئے شاعر کی یہ آواز مرہم کا کام کرتی ہے۔

ہوگا کسی فلک پہ وہ خورشید جلوہ گر
کہتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

حضرت قاضی صاحبؒ میرے استاذ بھی تھے، خاندانی قرابت کا بھی تعلق تھا، لیکن رشتہ و تعلق کی دو جہتیں سب سے زیادہ میری نگاہ میں اہم ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں عصری تعلیم کی راہ میں ڈالا جانے والا تھا، بلکہ ڈالا جا چکا تھا، اور اس راہ کا سفر شروع ہو گیا تھا، قاضی صاحب کی خواہش بلکہ اصرار پر میرے تعلیمی سفر کی سمت تبدیل کی گئی اور تعلیم کے اعتبار سے مجھے دنیا سے دین کی طرف ہجرت کی سعادت حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تھوڑی بہت خدمت دین کی توفیق عطا فرمائی، اور آج بھی اس سلسلہ کی جو سعادت میسر ہے، اس کے اصل محرک گویا قاضی صاحب ہی تھے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے ہم سے اس سلسلہ میں کوئی نیکی کرائی ہو تو وہ اس کے اجر میں برابر کے شریک اور حصہ دار ہوں گے۔

ان کا دوسرا احسان فکری تربیت ہے، وہ اتحاد امت کے داعی تھے، اور وسیع القلبی اور فراخ چشمی ان کا خاص وصف تھا، ان کی مجلسوں میں بیٹھنے، ان کی نصیحتوں کو سننے اور ان کی تربیت میں رہنے کی وجہ سے راقم الحروف کو اعتدال و میانہ روی اور وسیع النظری کا سبق سیکھنے کا موقع ملا۔ اس لئے حضرت قاضی صاحبؒ سے غیر معمولی فکری ہم آہنگی کا احساس اس وقت بھی ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، اور ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پورا کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

آج اس موقع سے میں یہ اعلان کرتے ہوئے غیر معمولی مسرت اور اپنے لئے سعادت و نیک بختی محسوس کرتا ہوں کہ مسجد کے دامن میں زیر تعمیر یہ کانفرنس ہال حضرت قاضی صاحبؒ سے معنون ہوگا، اور اس کا نام ''قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ہال'' ہوگا۔ چونکہ انہوں نے مسجد عمر بن الخطابؓ کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور اس کی تعمیر کے سلسلہ میں سب سے پہلے اپنا گرانقدر و مخلصانہ عطیہ پانچ ہزار روپے کی شکل میں عنایت فرمایا تھا، اب مسجد کے نیچے جو ہال تکمیلی مراحل طے کر رہا ہے، بہر طور اس تاریخی پس منظر، اس شہر سے قلبی لگاؤ اور یہاں سے حضرت قاضی صاحب کی قیادت میں فقہی کارواں کی تشکیل کا تقاضہ ہے کہ اس ہال کا نام ''قاضی ہال'' ہی رکھا جائے۔ مشہور بھی ہے

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شد بس است

مہمانان کرام! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج آپ کا یہ تاریخی اجتماع ایک تاریخی شہر میں منعقد ہو رہا ہے، محمد قلی قطب شاہ جو اپنے زمانہ کا عابد و زاہد اور علم پرور حکمراں تھا، نے ۹۹۹ھ م ۱۵۹۰ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی، اور دکنی زبان میں خدا سے دعا کی:

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر

بادشاہ کی یہ دعا ایسی مقبول ہوئی اور اس کی زندگی ہی میں شہر ایسا شاد و آباد ہوا کہ اس نے اپنے حسن انتخاب پر خود داد دی اور کہا:

لطیف و دل کشاب آب و ہوائے مبارک منزلے، فرخندہ جائے

پھر اس شہر نے ہمیشہ شاعروں، ادیبوں، عالموں اور صوفیوں سے خراج تحسین وصول کیا، امیر مینائی بے ساختہ کہہ اٹھے:

اللہ اللہ رے بہار چمنستان دکن حور پر ہے یہ جوبن نہ پری پر یہ پھبن

شاہ نصیر نے جب دہلی سے حیدر آباد کے لئے رخت سفر باندھا تو اپنے شاگرد عزیز ذوق سے کہا:

وہ بہشت ہے بہشت میں جاتا ہوں چلو تم بھی چلو

مولانا حالی اور داغ نے اس شہر پر اپنے جذبات عقیدت نثار کئے اور میر احسن نے اس شہر کے لئے خدا سے دعا کی:

سرسبز یہ شہر حیدر آباد رہے یا رب، آباد حیدر آباد رہے

داغ دہلوی کا یہ شعر تو بہت مشہور ہے:

نہیں حیدر آباد پیرس سے کچھ کم یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

منشی بشویشور پرشاد منور لکھنوی کی ایک پوری نظم ''دکن'' پر ہے، جس کا ایک شعر ہے:

حسین صبح دکن ہے، حسین شام دکن جمیل فرش دکن ہے، جمیل بام دکن

یہ شہر صوفیوں کا شہر ہے، جہاں حضرت شاہ معین الدین چشتی معروف بہ حضرت شاہ خاموشؒ نے اقامت اختیار کی، جس کو شیخ مخدوم علاء الدین انصاری اور حضرات یوسفینؒ کے قیام کا شرف حاصل ہوا اور کتنے ہی صوفیاء و مشائخ ہیں جو آج بھی اس کی آغوش میں محو خواب ہیں۔

یہ علماء اور محققین کا شہر ہے، علم خیز اور علم پرور بھی، تاریخ کے ہر دور میں بالخصوص ماضی قریب میں اصحاب تحقیق علماء کے قیام و ورود کا جو شرف اس شہر کو حاصل ہے، اس کی مثال کم ملے گی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا الیاس برنی، مولانا عبد القدیر بدایونی، مولانا حافظ محمد دیوبندی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا ماہر القادری اور کیسے کیسے علماء ہیں جن کے فیضان علمی نے اس شہر کے علمی رونق میں اضافہ کیا، اور خود اس خطہ سے بانی جامعہ نظامیہ مولانا انوار اللہ خاں فاروقی، محدث دکن مولانا عبد اللہ شاہ صاحب اور مولانا سید ابو الاعلی مودودی، جیسے اصحاب علم و فضل پیدا ہوئے، پیرس میں اسلامی دعوت کی جو عظیم شخصیت ایک عرصہ سے موجود تھی اور جس نے اسلامی دنیا میں تحقیق و تصنیف کی ایک مثال قائم کی ہے اور اس نے اس راہ میں نئے نئے چراغ جلائے ہیں، میری مراد ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے ہے، ان کا تعلق بھی اسی ''بغداد علمی'' سے ہے، مشہور زمانہ سحر انگیز خطیب اور ریاض رسول اللہ ﷺ کا چہکتا ہوا بلبل نواب بہادر یار جنگ بھی اسی خطہ ارضی سے پوری امت کے لئے اتحاد و محبت کا پیغام اپنے خاص سر اور لے کے ساتھ دیتے رہے ہیں۔

یہ ادیبوں اور شاعروں کا شہر ہے جہاں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ''محمد علی قطب شاہ'' پیدا ہوئے۔ اور جو اردو زبان کی معلوم تاریخ کے پہلے معروف شاعر ''ولی دکنی'' کا مسکن ہے، جہاں قطب شاہی دور میں اردو پیدا ہوئی، اسی شہر نے امجد حیدرآبادی جیسے مصلح اور مذہبی، صفی جیسے قادر الکلام، مخدوم محی الدین جیسے باغی، انقلابی، شاذ تمکنت جیسے جدید لب ولہجہ کے ترجمان اور اوج یعقوبی جیسے متین اور قدیم روایات کے امین شعراء کو وجود بخشا۔

علم وادب اور اردو زبان میں اس شہر کی خدمت کو کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا، یہیں ''دار الترجمہ'' قائم ہوا، اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۰ء تک اس نے سائنس، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کے معیاری لٹریچر کو اردو میں منتقل کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے، اسی دار الترجمہ نے اردو زبان میں وضع اصطلاحات کا کام کیا اور اس کے لئے پورے ملک سے منتخب علماء، ادباء مولوی ظفر علی خاں، مولوی عبد الحلیم شرر اور مولانا عبد اللہ عمادی وغیرہ سے مدد لی گئی۔

یہیں ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' کی بنیاد پڑی، جس نے علوم اسلامی کے سینکڑوں مخطوطات کو زندگی عطا کی، اور ان کو طبع کرایا۔ کنز العمال، بیہقی، مشکل الآثار، انساب، امام محمد کی کتاب الاصل، مولانا عبد الحئیؒ (پدر بزرگوار مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ) کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' اور فقہ و حدیث، تفسیر وکلام، طب وادب، سیر و رجال اور لغت، نیز فلسفہ و تاریخ کی کتنی ہی کتابیں ہیں جو اپنی طباعت و اشاعت اور تصحیح و تعلیق میں دائرۃ المعارف کی رہین منت ہیں۔ اسی طرح اس شہر نے اپنے قیمتی، معیاری اور وسیع کتب خانوں کے ذریعہ بھی علم وادب کی خدمت کی ہے، مفتی محمد سعید خاں کا کتب خانہ سعیدیہ (جواب مدراس یعنی چنئی منتقل ہوگیا ہے) اپنے علمی جواہر پاروں کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری) ملک کے چند معروف کتب خانوں میں ایک ہے، سالار جنگ میوزیم کا کتب خانہ بھی مخطوطات کے لئے عالمی شہرت رکھتا ہے، اردو کتابوں کے بھی متعدد اہم کتب خانے شہر میں موجود ہیں، علوم اسلامی کے مخطوطات کی حفاظت میں بھی غالبا پٹنہ اور کلکتہ کے بعد یہ شہر سب سے آگے ہے، اور مخطوطات ونوادرات کو اپنے دامن میں چھپائے رکھنے کی شہرت پوری دنیا میں اسے حاصل ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اس شہر کی رونق شاہی نوازشات اور حکومت کے زیر سایہ علمی و ادبی خدمات سے تھی، ۱۹۴۸ء کے بعد گو رونق وشادمانی کا یہ سامان باقی نہ رہا، لیکن غیرت ایمانی اور اسلام کے لئے دردمندی، نیز ادب پروری اور علم دوستی کا جو سبق یہاں کے اسلاف نے اپنے اخلاف کو دیا تھا، اس کی چنگاریاں اب بھی موجود تھیں، اس کا اثر یہ ہوا کہ یہاں از سر نو ادبی انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے، تنظیمیں اور جمعیتیں قائم ہوئیں اور جو پہلے سے قائم تھیں ان میں سرگرمی اور حرارت پیدا ہوئی اور دینی مدارس و مکاتب قائم کئے گئے، جن کی ضرورت بہ مقابلہ دوسرے علاقوں کے یہاں زیادہ

تھی، اسی طرح اب یہاں باوقار عصری درسگاہوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، متعدد انجینئرنگ کالجس ہیں، میڈیکل کالج بھی ہیں، متعدد ہاسپٹل بھی ہیں، اور یہ سب اقلیتی ادارے مسلم انتظامیہ کے تحت خوبی اور کامیابی کے ساتھ بحمد اللہ چل رہے ہیں۔

حضرات! یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا قیام ہندوستان کی علمی، اسلامی تاریخ کا ایک سنہرا باب اور روشن کارنامہ ہے، اکیڈمی نے نئے مسائل کو حل کرنے کے علاوہ علماء اور ارباب افتاء میں ایسے مسائل پر غور و تحقیق کی جو امنگ پیدا کی ہے، کوئی صاحب انصاف اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کرسکتا، کاش! لوگ اپنی ذہنی تنگ نائیوں سے باہر نکل کر حقیقت کا اعتراف کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کریں، اس سلسلہ میں عرب وعجم کی مقبول ترین علمی، ادبی اور دعوتی شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے وہ تاثرات نقل کرنے کو دل چاہتا ہے جو انہوں نے اکیڈمی کے چوتھے فقہی سمینار منعقدہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے موقع سے بطور پیغام راقم الحروف کے ایک خط کے جواب میں روانہ فرمایا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں:

''کسی اسلامی ملک اور ملت اسلامیہ کے کسی اہم عنصر اور جزو کے لئے اتنی بات کافی نہیں کہ وہ بڑی تعداد میں ہے اور سیاسی واقتصادی حیثیت سے وہ وزن اور اثر رکھتی ہے، اس کے دینی شعور، قوت عمل، افادیت اور نہ صرف صلاحیت بقاء، بلکہ صلاحیت قیادت کے ثبوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو کہ وہ دین وشریعت کے نہ صرف بقاء بلکہ اس کی ترقی وارتقاء اور نئی نسل اور نئے دور کی رہنمائی کا ثبوت دینے کے لئے وہ کیا جدوجہد کر رہی ہے، اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے کیا وسائل اختیار کر رکھے ہیں؟''

اسی سلسلہ کا ایک اہم کام شریعت اسلامی اور احکام فقہی کے اس بدلے ہوئے دور میں نہ صرف قابل عمل ہونے کی صلاحیت کا ثبوت دینا ہے، بلکہ ان کی برتری کو بھی ثابت کرنا ہے، اس سلسلہ کا ایک بنیادی اور اہم ترین کام یہ ہے کہ کتاب وسنت، شریعت اسلامی اور احکام فقہی کی روشنی میں بدلے ہوئے حالات اور نئے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں شرعی احکام اور مسائل ومشکلات کے حل پیش کئے جائیں، اور اصول شرعی کی ابدیت، شرعی وفقہی ذخیرہ کی وسعت اور استنباط واجتہاد کی صلاحیت کا ثبوت دیا جائے۔ اسی سلسلہ میں ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے، جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں''۔

خوشی کی بات ہے کہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے اکیڈمی کے لئے جو خطوط اور منہج متعین کئے تھے، انہی خطوط پر اب بھی اکیڈمی کا سفر جاری ہے، اس کے کام میں تسلسل ہے، اور اس کی علمی وفقہی کاوشوں میں کہیں کوئی توقف نہیں آیا ہے، اس میں جہاں بانی اکیڈمی کے اخلاص کو دخل ہے، وہیں بڑا حصہ ان کی افراد سازی اور مردم گری کی طرف خاص توجہ کا بھی ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ نچلی سطح سے قیادت کو اٹھنا چاہئے اور نئی نسل کو کام کے لئے تیار کرنا چاہئے، جن جن اداروں سے وہ وابستہ تھے، ان تمام اداروں میں انہوں نے عملی طور پر یہی طریقہ کار اختیار کیا۔ اس پس منظر میں ہم سبھوں پر اکیڈمی کے تئیں ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم علم وتحقیق اور دین ودانش کی اس امانت کو نہ صرف سنبھال کر رکھیں، بلکہ اسے آگے بڑھائیں، آنے والی نسل تک پہنچائیں اور اس کی افادیت کے دائرہ کو وسیع تر کرنے کی کوشش کریں۔

حضرات! ہمیں بخوبی علم ہے کہ جب کارواں چلتا ہے تو گرد اٹھتی ہے، لیکن گرد طالبان منزل اور اصحاب ہمت وعزیمت کے لئے سد راہ نہیں بنتی۔ ہمیں مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا یہ فکر انگیز جملہ بھی یاد ہے کہ ''مخالفت کو منی آرڈر کی واپسی رسید سمجھنی چاہئے''، یعنی یہ رسید بتاتی ہے کہ جو پیغام آپ پہنچانا چاہتے تھے وہ پہنچ گیا۔ مولانا علی میاںؒ یہ معنی خیز شعر بھی اکثر پڑھا کرتے تھے:

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے	نگاہ یار سلامت ہزار میخانے

ہماری نظر اقبال کے اس چشم کشا شعر پر بھی ہے:

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی	جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

محترم حضرات! اس سمینار کے لئے اکیڈمی نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے، وہ نہایت اہم، ضروری اور بروقت ہیں، اور ذمہ داران اکیڈمی کی زمانہ آگہی کی دلیل بھی ہیں، ''مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات'' کا مسئلہ موجودہ حالات میں خاص کر ۱۱ رستمبر کے بعد اسلام کے خلاف امریکہ اور مغرب کی بین الاقوامی دہشت گردی اور پروپگنڈہ مہم نے اس مسئلہ کو بے حد اہم بنادیا ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر نہایت گہرائی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو موجودہ حالات میں صحیح طریقہ عمل کا پیغام بھی ملے، اور اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں ان کا ازالہ بھی ہوسکے، اس پس منظر میں ''اسلام اور امن عالم'' کا موضوع بھی نہایت اہم ہے، اس موضوع کے تحت ہمیں دنیا کے سامنے امن و آشتی اور تکریم انسانیت پر مبنی اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے کا موقع ملے گا۔

آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں، تعلیمی پسماندگی اور غربت وافلاس نے انہیں جس طرح جکڑ رکھا ہے، ان کے تدارک میں اوقاف سے بہت مدد مل سکتی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک بھر میں مسلمانوں کے جو قیمتی اوقاف موجود ہیں، انہیں زیادہ ثمر آور اور نتیجہ خیز بنایا جائے، اور مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لئے انہیں استعمال کرنے کے مواقع پیدا کئے جائیں، نیز مسلمانوں میں وقف کے جذبہ کو ابھارا جائے، مجھے امید ہے کہ سمینار میں اس موضوع پر ہونے والی بحث اور طے پانے والی قرارداد اس سلسلہ میں موثر کردار ادا کرے گی، اسی طرح غذاؤں اور دواؤں میں جلاٹین کے استعمال کی جو کثرت ہے، اس پس منظر میں اس موضوع کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، توقع ہے کہ ان مسائل پر سمینار جو فیصلہ کرے گا، اس کے مثبت اور دور رس اثرات مرتب ہوں گے۔

محترم سامعین!

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد جس کو اس وقت آپ نے تشریف آوری کا شرف بخشا ہے، ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۲ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، اور قیام کے سولہویں سال ۱۴۰۸ھ میں دورۂ حدیث شریف کا افتتاح ہوا، فقہ کے میدان میں مردان کار کی تیاری شروع سے جامعہ ہذا کے ذمہ داران اور اساتذہ کا مطمح نظر ہے، اسی مقصد کے لئے ۱۴۰۹ھ میں ''تخصص فی الفقہ'' کے دوسالہ نصاب کا افتتاح عمل میں آیا، فرق باطلہ اور قدیم وجدید مذاہب ونظام کے مطالعہ اور مخالف اسلام تحریکات سے آگہی نیز اسلام کے اصول دعوت سے واقفیت کے لئے ۱۴۱۰ھ میں تخصص فی الدعوۃ کا شعبہ قائم ہوا، ۱۴۲۲ھ میں ائمہ مساجد کی تربیت وتدریب کے لئے ''تدریب الائمہ'' کا ایک سالہ نصاب شروع کیا گیا، اس کے علاوہ قرآن وحدیث اور عربی ادب میں بھی ماضی قریب میں تخصصات کے شعبے قائم کئے گئے ہیں، اور عصری تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے عالم کورس کی ایک خصوصی مختصر مدتی جماعت کا قیام بھی عمل میں آیا ہے، جامعہ نے عصری علوم اور خدمت خلق کے کاموں کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے شعبہ کمپیوٹر اور ٹیلرنگ سنٹر بھی قائم کئے ہیں، اور ''السلام ہاسپٹل'' کی تعمیر کا کام بھی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے، ان شعبوں سے نہ صرف جامعہ ہذا کے اساتذہ وطلبہ کو فائدہ ہوگا، بلکہ قرب وجوار کے عام مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں گے، آپ تمام حضرات سے گزارش ہے کہ اس ادارہ کے استحکام اور اس کی ترقی و فروغ کے لئے اپنے مخلصانہ مشوروں سے بھی نوازیں اور اسے اپنی دعاؤں میں بھی یاد رکھیں۔

میں اس موقع پر عالم عرب اور عالم اسلام سے آنے والے مہمانوں، ملک کے کونے کونے سے تشریف لانے والے علماء وارباب افتاء، زعماء امت کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ نے ہمیں اپنی میزبانی کا شرف بخشا، ہم اس موقع پر جامعہ ہذا کے اساتذہ، طلبہ اور سمینار کی مجلس استقبالیہ کے اراکین کے بھی بے حد شکر گذار ہیں کہ ان سب کی اجتماعی کوششوں اور محنتوں سے ہی سمینار کا انعقاد ممکن ہوا۔ اس موقع پر مجلس استقبالیہ کے تمام اراکین خصوصیت کے ساتھ: جناب سید جمیل الدین، جناب محمد جعفر، جناب میر مظہر الدین، جناب محمد سلمان صدیقی اور ان کے رفقاء جناب ایس اے انجم، جناب عبد اللطیف عثمان، جناب عبد المقتدر، ڈاکٹر محمد یوسف اعظم، جناب عبد المجید فہیم، جناب عبد الوحید، جناب آفتاب پاشا، جناب محمد اقبال علی، جناب سید عمر حسینی، جناب محمد سلیم، جناب صفدر علی خاں، جناب عطاء الرحمن، جناب افتخار حسین، جناب نبیل حسین کا شکریہ ادا کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں، جن کا عملی تعاون ہر قدم پر ساتھ رہا، اور شب وروز سمینار کے کامیاب بنانے کے لئے متوجہ اور متفکر رہے۔ اردو اخبارات سیاست، منصف، رہنمائے دکن، عوام اور انگریزی اور تلگو اخبارات ودیگر ذرائع ابلاغ کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کا بھرپور تعاون بھی ہمیں حاصل رہا۔

اس کے ساتھ آپ حضرات سے ملتجی ہوں کہ ہماری طرف سے جو کچھ کوتاہی اور کمی پیش آئی ہو، آپ اس سے ہمیں درگذر فرمائیں۔

آخر میں ایک طرف آپ حضرات پر نظر ڈالتا ہوں تو شاعر کی یہ ندا دل کی دھڑکن بن جاتی ہے:

عنایت کا، توجہ کی نظر کا، مہربانی کا
زبان قاصر ہے کیوں کر اس کا شکریہ ادا ہوگا

دوسری طرف ذرا کان لگاتا ہوں تو اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے لئے جانب لاہور سے اقبال یہ پیغام دے رہے ہیں:

کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ ودو
ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو

اقبال کا پیغام شرکاء مجلس کے لئے یہ ہے:

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ

اقبال اپنے ''مرد درویش'' اور اہل دینی مدارس کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں:

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ
ہوا ہے گو تندوتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سمینار کو کامیاب، بامقصد اور نتیجہ خیز بنائے، بھرپور قدموں کے ساتھ مستحکم بنیادوں پر اس کا سفر جاری رہے۔ اور مصادر شریعت کی روشنی میں جدید اور پیش آمدہ مسائل کا حل اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ ملت اور امت کے سامنے ایک تسلسل کے ساتھ آتا رہے، اور علماء، فقہاء اور اہل افتاء کی زندگی میں کلیم عاجز کے اس شعر کی تعبیر ملتی رہے:

جہاں روشنی کی کمی ملی، وہیں اک چراغ جلا دیا
کوئی بزم ہو، کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

اکیڈمی کا کارواں۔ منزل بہ منزل

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

جناب صدر، عالم اسلام سے آئے ہوئے مہمانان گرامی، ہندوستان کے کونہ کونہ سے تشریف لانے والے علماء وفقہاء وارباب افتاء اور علم و تحقیق، زبان وادب اور تہذیب وثقافت کے شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد سے آنے والے معزز برادران اسلام! سلامتی اور اللہ کی رحمت آپ پر سایہ فگن ہو اور آپ کا آنا آپ کے لئے بھی اور داعیوں اور میزبانوں کے لئے بھی مبارک ومسعود ہو:

آمدنت باعث سعادت ما

آج وہ منظر میری نگاہوں میں گھوم رہا ہے جو یکم نومبر ۱۹۸۹ء کو جامعہ ہمدرد دہلی کے سیمینار ہال میں پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا تھا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ ڈائس پر جلوہ افروز ہیں، داعی اجلاس حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی صدائے درد اور نوائے محبت اس طرح گونج رہی ہے کہ کوئی آنکھ نہ تھی جو نم نہ ہو اور کوئی دل نہ تھا جس کو محبت کی آگ نے پگھلایا نہ ہو، دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کرام، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اہل علم، بریلی سے آئے ہوئے اہل افتاء، دبستان اہل حدیث کی نمائندہ شخصیتیں، مختلف مکاتب فکر، مختلف جماعتوں اور تحریکوں اور مختلف درسگاہوں اور اداروں، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کی اہم علمی وفقہی شخصیتوں کو ایک خالص علمی و مذہبی اجتماع میں پہلی بار پہلو بہ پہلو اور دوش بدوش دیکھا جاسکتا تھا، علماء وفقہاء کی اس بزم میں علوم جدیدہ کے ماہرین بھی فکر وخیال کی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کے جذبۂ احترام سے معمور بیٹھے ہوئے تھے، ایسا لگتا تھا کہ دریا کے دو کنارے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں اور لمحوں نے مدتوں کے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے، کہا جاتا ہے کہ خلافت کمیٹی کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے پہلی بار مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اس اجتماعیت کے لئے ہمارے بزرگوں نے شب وروز جدوجہد کی اور شکستہ قلوب کو جوڑنے کے لئے ایثار، کسر نفسی اور اپنے درجہ ومقام سے تنزل اختیار کرکے ایک ایسا وفاق تیار کرنے میں کامیاب ہوئے جسے انہونی بات سمجھا جاتا تھا، مگر یہ اتحاد واشتراک اصل میں حکومت اور شریعت اسلامی کی معاندین کے مقابلہ میں تھا اور مدافعت کے موقع پر مشترک مسائل کے لئے لوگوں کو جمع کرلینا نسبتاً آسان ہوتا ہے، لیکن آج کا یہ اجتماع خالص مثبت مقصد کے تحت اور احکام شرعیہ کی تحقیق کی نسبت سے منعقد ہو رہا تھا اور ایسے مقصد کے لئے مختلف الفکر اور مختلف الذوق لوگوں کو جمع کرنا نسبتۂ زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

لیکن ایک ایسی شخصیت نے اس ہمہ بوگلدستہ کو سجایا اور اس ہمہ رنگ گلشن کو سنوارا تھا جس کو اللہ نے بیک وقت دل دردمند اور فکر ارجمند سے بھی نوازا تھا اور سخن دلنواز اور جان پرسوز سے بھی، جو ملک کے کونہ کونہ میں امت کی وحدت اور باہمی محبت کے گیت گاتا تھا اور جس کی صدائے درد آشنا سے دل ہی نہیں پتھر کی سل بھی پگھل جاتی تھی، جس کا ہر لفظ اخوت کا بیان اور جس کا ہر عمل امت کی فکر اور ملت کے غم کا ترجمان تھا، میری مراد اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے موسس فقیہ النفس حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے ہے۔

کم سے کم ہندوستان کے علماء کے لئے یہ بہت ہی تعجب خیز اور مسرت انگیز منظر تھا، جس میں علم وتحقیق کے معرکے گرم ہوئے، ایک ایک لفظ پر بحث ومناقشہ ہوا، چھوٹوں نے بڑوں سے اور شاگردوں نے اپنے اساتذہ سے اختلاف رائے کیا، چوٹی کے اہل علم نے مخالف نقطۂ نظر کو صبر وسکون کے ساتھ سنا اور ایسا بھی ہوا کہ اصرار کے بجائے قبول واعتراف کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اگر اختلاف کرنے والوں نے کوئی معقول ومدلل بات کہی تو اسے بہ سروچشم قبول کیا اور تحمل اختلاف اور قبولیت حق کے معاملہ میں سلف صالحین کے بارے میں جو کچھ پڑھا جاتا تھا، بہ چشم سر آج اسے دیکھنے کی

سعادت حاصل ہوئی، کتنا خوشگوار تھا یہ منظر کہ بعض لوگ جو ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کرنے سے بھی گریزاں تھے اور جن کے لئے ایک دوسرے سے سلام ومصافحہ بھی بار خاطر تھا، وہ آج تحقیق دین کے جذبہ سے اور امت کی مشکلات کو حل کرنے کی غرض سے کاندھے سے کاندھا ملا کر بیٹھے ہوئے تھے، اللہ کرے امت مسلمہ کی یہ وحدت اور اجتماعیت قائم رہے، مزید مستحکم ہو اور نظر بد سے محفوظ رہے۔

اللهم ألف بين قلوبنا وأصلح ذات بيننا

ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم۔

حضرات! شریعت اسلامی کا سب سے بڑا امتیاز اس کی عالمگیریت اور ابدیت ہے، اور یہ عقیدہ ختم نبوت کا لازمی تقاضہ ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن وحدیث میں اصول ومقاصد کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور جزئیات کا خاص کر معاملات اور عادات کے باب میں احاطہ نہیں کیا گیا ہے، اسی لئے علامہ سرخسی اور دوسرے فقہاء نے لکھا ہے: "النصوص معدودة والحوادث ممدودة" اور ایک ایسا دین اور قانون جو قیامت تک کے لئے ہو اور جو قدم قدم پر قانون فطرت سے ہم آہنگ اور حالات اور مواقع کی ضرورتوں اور تبدیلیوں سے مطابقت رکھنے والا ہو، اس کے لئے یہ بات ناگزیر تھی کہ جزوی تفصیلات کی تحدید سے گریز کیا جائے، کیونکہ اخلاقی حالات، عرف اور سماجی عادات ومصالح کی تبدیلی کی وجہ سے ایسا ممکن ہے کہ ایک ہی حکم، جو کسی عہد کے لئے موزوں ہوں، وہ دوسرے عہد میں اس درجہ موزوں باقی نہ رہے، اس لئے ہر دور کے علماء اور فقہاء کی ذمہ داری ہے کہ احکام شریعت کی تطبیق کریں اور جو نئے مسائل پیدا ہوں، شریعت کے اصول ومقاصد اور سلف صالحین کے اجتہادات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے بارے میں امت کی رہنمائی کی جائے، کیونکہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور یہ وراثت دعوت دین میں بھی ہے اور حفاظت دین میں بھی، تنفیذ دین میں بھی ہے اور تحقیق دین میں بھی۔

تحقیق دین یعنی مسائل کے حل کا ایک طریقہ انفرادی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو انفرادی اجتہاد کی اجازت مرحمت فرمائی تھی، اور دوسرا طریقہ اجتماعی ہے، جس کا ذکر حضرت علیؓ کی روایت میں ہے کہ جو نئے مسائل پیش آئیں ان کے حل کے لئے فقہاء عابدین یعنی ان اہل علم کو جو خشیت الٰہی سے معمور اور ورع وتقوی پر قائم ہوں، جمع کرو اور ان سے مشورہ کرو، اجمعوا له الفقهاء العابدين وشاوروهم۔

یہ اجتماعی طریقہ غور وفکر زیادہ محفوظ ومامون صورت ہے اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "يد الله على الجماعة" کے تحت اس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت وتوفیق کے مواقع زیادہ ہیں، چنانچہ صحابہ میں حضرت عمر فاروقؓ نے، اولاد صحابہ میں مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ نے اور تابعین وتبع تابعین کے دور میں فقہ کے مدون اول امام ابوحنیفہؒ نے اسی طریقہ کار کو اختیار فرمایا۔

موجودہ دور میں جو علم وتحقیق کے اعتبار سے کم حوصلگی اور دون ہمتی اور ورع وتقوی اور خشیت الٰہی کے لحاظ سے خدا ناترسی، نفس پرستی اور مداہنت کا دور ہے، نئے مسائل پر غور کرنے کے لئے اجتماعی غور وفکر کا طریقہ ہی موزوں اور مناسب ہے، چنانچہ عالم اسلام میں اسی مقصد کے تحت مختلف فقہ اکیڈمیاں قائم ہیں، برصغیر میں بھی علماء اس فریضہ سے غافل نہیں رہے، فتاوی عالمگیری اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں نوازل کو خاص اہتمام کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، ماضی قریب میں بھی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس پر خصوصی توجہ دی، جس کے نتیجہ میں "الحيلة الناجزة" کی ترتیب عمل میں آئی۔ پھر ان کے تلامذہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے پاکستان میں "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت کئی فیصلے کئے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ندوۃ العلماء میں "مجلس تحقیقات شرعیہ" قائم کی، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے جمعیۃ علماء ہند کے تحت "ادارة المباحث الفقهيه" قائم فرمایا، اور ان اداروں نے بحیثیت مجموعی تقریبا ایک درجن مسائل میں فیصلے کئے۔

لیکن چونکہ ان اداروں کی حیثیت ضمنی تھی اور اس ادارہ اور اس کے متعلقین و متفقین تک اس کا دائرہ محدود تھا، اس لئے پیش آنے والے مسائل کی تیز گامی اور کثرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے محسوس کیا گیا کہ خاص اس مقصد کے لئے ایک مستقل ادارہ ہو، تاکہ اس کام میں تسلسل باقی رہے اور مختلف الفکر اہل علم کو اکٹھا کر کے زیادہ وسعت کے ساتھ غور وفکر کیا جا سکے، اسی پس منظر میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ۱۹۸۹ء میں اسلامک

فقہ اکیڈمی کی بنیاد رکھی، جس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس پورے خطہ میں ایک نئی علمی امنگ، ذوق تحقیق، اعتدال فکر اور فقہی تحریک کو وجود بخشا، اکیڈمی کے فقہی مجلات جن کی پوری دنیا میں تحسین کی جارہی ہے اور جن کے حوالہ سے اہل علم اپنی تحقیقات کو پیش کررہے ہیں، اس کے شاہد عدل ہیں۔

اکیڈمی نے اپنی پندرہ سالہ عمر کے عرصہ میں تیرہ سمینار کئے ہیں اور ان سمیناروں میں مجموعی اعتبار سے چالیس موضوعات پر غور وخوض کیا گیا ہے، جن میں اسلام کے اصول قانون سے متعلق پانچ، عبادات سے متعلق اٹھارہ، سماجی مسائل سے متعلق آٹھ اور معاشی وتجارتی مسائل سے متعلق تیرہ موضوعات شامل ہیں، اور ان کے علاوہ اتحاد امت سے متعلق اعلامیہ بھی جاری کیا گیا ہے، چالیس میں سے سات موضوعات وہ ہے جن میں قطعی فیصلہ کو ملتوی رکھا گیا ہے اور مختلف موضوعات کی گیارہ شقوں میں فیصلے اختلاف رائے سے ہوئے ہیں، باقی فیصلے باتفاق رائے کئے گئے ہیں، ان سمیناروں میں جو مقالات پیش کئے گئے ہیں، ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جن اہل علم اور اصحاب افتاء نے شرکت کی ہے، مجموعی طور پر ان کی تعداد ساڑھے پانچ سو سے زیادہ ہے، بیرون ملک سے سمینار میں شریک ہونے والے فضلاء کی تعداد تقریباً تیس ہے، جن کا تعلق دنیا کے بیس ملکوں سے ہے، اب تک ان سمیناروں کے مقالات پر مشتمل سترہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جو بحیثیت مجموعی ۹۲۹۳ صفحات پر مشتمل ہیں، ان کے علاوہ وقف سے متعلق منتخب مقالات کا عربی ترجمہ اور غیر سودی بینک کاری سے متعلق اہم مقالات کا انگریزی ترجمہ بھی انہی سمیناروں کا فیض ہے۔

اکیڈمی ان مجلات کے علاوہ علمی وتحقیقی نقطہ نظر سے اہم مسائل پر مشتمل کتابیں بھی شائع کرتی رہی ہے، مجلات اور حالیہ مطبوعات کو لے کر مجموعی طور سے اکیڈمی کی تقریباً سو مطبوعات منظر عام پر آچکی ہیں اور ان میں ایک بڑی تعداد ان کتابوں کی ہے جن کا نیا ایڈیشن لانے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اکیڈمی کے مقاصد میں سے ایک علمی وفقہی کاموں کے لئے افراد سازی اور مردم گری بھی ہے، اس نقطہ نظر سے اکیڈمی نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بجائے خود بہت اہم ہیں، اس مقصد کے لئے مختلف دینی مدارس میں چار تربیتی کیمپ قائم کئے گئے، جن میں بیسیوں مدارس کے سینکڑوں طلبہ نے شرکت کی، ملک کی سترہ بڑی اور مرکزی درسگاہوں میں عصری علوم کے ماہرین کے لکچرز رکھے گئے تاکہ مدارس اسلامیہ کے فضلاء اپنے عہد کے حالات اور عصری تقاضوں سے باخبر ہوں، دار العلوم وقف دیوبند میں مدارس کے منتہی درجات کے طلبہ کے لئے ''بین مدارس فقہی مذاکرہ'' رکھا گیا جس میں بیس مدارس سے پچاس طلبہ نے شرکت کی، طلبہ کی جانب سے انیس تحقیقی مقالات پیش ہوئے اور امتیاز حاصل کرنے والے طلبہ کو تشجیعی انعامات دیئے گئے۔

اس سلسلہ کا اپنی نوعیت کا ایک منفرد پانچ روزہ ورکشاپ دسمبر ۲۰۰۳ء کے آخری ہفتہ میں دہلی میں رکھا گیا، جس میں ہندوستان کے ممتاز اہل علم کے علاوہ ''المعهد العالی للفکر الاسلامی'' (امریکہ) کے نمائندہ ڈاکٹر صلاح الدین سلطان کے نہایت قیمتی محاضرات ہوئے، نیز ڈاکٹر جابر فیاض علوانی اور ڈاکٹر علی ریسونی جیسے علماء اصول کے محاضرات بھی سی ڈی (CD) کے ذریعہ پیش کئے گئے، اس کیمپ میں شریعت کے مقاصد ومصالح، ان کے مدارج، ان کے تطبیقی اصول، احکام شریعت اور خاص کر جدید مسائل کے حل میں اس موضوع کی اہمیت، ضرورت اور افادیت پر چشم کشا بحثیں ہوئیں اور ملک کی اہم ممتاز دینی درسگاہوں سے فقہ واصول فقہ کے چالیس اساتذہ اور نوجوان فضلاء نے اکیڈمی کی دعوت پر اس میں شرکت کی، بحمداللہ اس ورکشاپ میں پیش کئے گئے محاضرات اور مباحثات کا مجموعہ مرتب ہو کر طبع ہو چکا ہے اور اس طرح انشاء اللہ اس سے استفادہ کا دائرہ مزید وسیع ہوگا۔

اکیڈمی کے مقاصد میں سے ایک عالم اسلام میں ہونے والے علمی کاموں سے علماء ہند اور مسلمانان ہند کو مربوط کرنا بھی ہے، چنانچہ اس مناسبت سے رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی ''مجمع الفقه الاسلامی'' کی تجاویز کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا جس کا تازہ ایڈیشن اسی سمینار میں آپ کے سامنے پیش ہوگا، انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے فیصلوں کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے، انشاء اللہ عنقریب اس کی اشاعت عمل میں آئے گی، اس طرح مسلمانان ہند کے لئے یہ بات ممکن ہو سکے گی کہ وہ نئے فقہی مسائل کے بارے میں عالم عرب کی آراء اور ان کے فتاوی سے آگاہ ہو سکیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی دور

اخیر کے اصولی عالم اور اسرار شریعت کے رمز شناس امام ابواسحاق شاطبی کے افکار پر ڈاکٹر ریسونی کی "نظرية المقاصد عند الامام الشاطبی" کی اشاعت ہے، انشاء اللہ اس کتاب کے ذریعہ ہندوستان کے اہل علم بہ سہولت علامہ شاطبی کے نقطۂ نظر اور افکار کا مطالعہ کر سکیں گے۔

اکیڈمی کا ایک عظیم الشان کام بلکہ کارنامہ "وزارت اوقاف کویت" کے زیر اہتمام طبع ہونے والی فقہی انسائیکلوپیڈیا (الموسوعة الفقهية) کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی خدمت ہے، جس کی چالیس جلدوں کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے، انشاء اللہ جیسے جیسے کتاب کی جلدیں شائع ہوتی جائیں گی، کوشش کی جائے گی کہ ساتھ ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی ہوتا جائے، یہ اردو دنیا میں نہ صرف علماء، علوم اسلامی کے اساتذہ وطلبہ اور اصحاب فقہ وافتاء کے لئے اکیڈمی کا ایک قیمتی تحفہ ہوگا، بلکہ عام اصحاب ذوق اور قانون داں حضرات بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اگر اکیڈمی نے صرف یہی ایک کام کیا ہوتا تو یہ اس کے افتخار کے لئے کافی ہوتا، اس سلسلہ میں بانی اکیڈمی حضرت قاضی صاحبؒ کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ ممتاز صاحب علم اور اکیڈمی کے نائب صدر حضرت مولانا بدر الحسن قاسمی حفظہ اللہ (مقیم کویت) کی کاوشیں بھی لائق تحسین اور مستحق شکریہ ہیں، اللہ کرے کہ جلد یہ ترجمہ شائع ہو کر منظر عام پر آئے اور اصحاب ذوق کی چشم محبت کا سرمہ بنے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء سلف کے بہت سے علمی خزینے آج بھی مخطوطات کے دفینے میں قید ہیں اور اہل علم ان لعل وگہر تک رسائی سے محروم ہیں، ابھی امریکہ، عراق جنگ میں بہت سے قیمتی مخطوطات کا نذر آتش ہو جانا ایک ایسا تاریخی حادثہ ہے جو فتنۂ تاتار کے موقع پر بغداد کے عظیم الشان کتاب خانوں کی بربادی کا غم تازہ کرتا ہے اور اس کی یاد دلاتا ہے، اللہ تعالیٰ جلد عالم اسلام کو اس ابتلاء سے نجات دلائے، اس لئے بزرگوں کے علمی ذخیرہ کو تحقیق وتعلیق کے ساتھ منظر عام پر لانا اور اہل علم کے لئے ان کو قابل حصول بنانا ہم سب کی ذمہ داری ہے، اکیڈمی نے بھی اپنے مقاصد میں اسلامی اور خاص کر فقہی مخطوطات کو تحقیق وتعلیق کے ساتھ علمی دنیا تک پہنچانے کو اپنے پروگرام میں رکھا ہے، اس سلسلہ کا ایک اہم کام علامہ قاضی عماد الدین اشفور قانی (م ۶۴۶ھ) کی "صنوان القضاء وعنوان الإفتاء" کی تحقیق وتعلیق کا کام ہے جسے حضرت قاضی صاحبؒ نے انجام دیا اور جو وزارت اوقاف کویت کی طرف سے چار جلدوں میں طبع ہو چکی ہے، نیز فقہ حنفی کے دو اہم مخطوطے "التجنيس والمزيد" اور "مختارات النوازل" پر کام چل رہا ہے اور توقع ہے کہ مستقبل قریب میں انشاء اللہ یہ قابل طباعت ہو جائے گا۔

اکیڈمی نے شرعی مسائل میں عام مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے باضابطہ دار الافتاء بھی قائم کیا ہے اور بحمد اللہ دہلی اور اس کے مضافات سے خصوصاً اور ملک کے دوسرے علاقوں سے عموماً اہل ضرورت رجوع کر رہے ہیں، اب تک جو فتاوی جاری کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر سماجی اور اقتصادی مسائل سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ اکیڈمی نے علمی استفسارات کا بھی شعبہ رکھا ہے اور انٹرنیٹ کے ذریعہ دنیا کے مختلف علاقوں سے سوالات کئے جاتے ہیں اور ان کی ضروری رہنمائی کی جاتی ہے، اسی طرح اکیڈمی کی لائبریری کو بھی وسعت دینے کی کوشش کی جارہی ہے، تاکہ یہ لائبریری فقہ اسلامی کے مراجع ومصادر کا ایک قابل استفادہ مرکز ہو جائے اور اکیڈمی کے رفقاء کے علاوہ دوسرے لوگ بھی علم وتحقیق کے کام میں اس لائبریری سے استفادہ کر سکیں، اکیڈمی کے فقہی فیصلوں اور اس کی بعض دستاویزی مطبوعات نے استفادہ کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے انٹرنیٹ پر مستقل ویب سائٹ (Website) بنائی گئی ہے اور بحمد اللہ پوری دنیا سے اہل ذوق اس ویب سائٹ کو استعمال کر رہے ہیں۔

حضرات! حضرت قاضی صاحبؒ کے بعد اکیڈمی کے ٹرسٹ نے اس کے کاموں کو اجتماعی صورت دینے اور انتظام وانصرام کو زیادہ شورائی بنانے کی غرض سے باتفاق رائے انتظامی ڈھانچہ کو اور وسیع کیا ہے، اس نئے نظام کے تحت جہاں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی اور حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی اسے حاصل ہے، وہیں یہ قافلہ ممتاز صاحب علم اور معروف صاحب قلم نیز دار العلوم دیوبند کے سینئر مفتی حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی مدظلہ صدر اکیڈمی کی قیادت میں رواں دواں ہے، حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، حضرت مولانا مفتی اشرف علی سعودی، حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی اور حضرت مولانا بدر الحسن قاسمی جیسے اصحاب علم وفضل اکیڈمی کے نائبین صدر اور سربراہان ہیں، ان کے علاوہ جنرل سکریٹری اور مختلف شعبوں سے متعلق تین سکریٹریز حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی، حضرت مولانا عتیق احمد بستوی اور محترم مولانا امین عثمانی کی خدمات اسے حاصل ہیں۔ اکیڈمی کے ٹرسٹیز میں حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی استاذ دار العلوم دیوبند، حضرت

مولانا انیس الرحمن قاسمی ناظم امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ، حضرت مولانا محمد زبیر قاسمی ناظم جامعہ اشرف العلوم، حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی ناظم جامعہ علوم القرآن جمبوسر، حضرت مولانا قاضی عبدالاحد ازہری ناظم معہد ملت مالیگاؤں اور حضرت مولانا محمد مصطفی مفتاحی استاذ حدیث دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد جیسی شخصیتیں ہیں، یہ سب اس قافلہ کے مخلص، معتدل الفکر اور آزمودہ کار سالار ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ان کی قیادت میں اکیڈمی، بانی اکیڈمی کے قائم کئے ہوئے خطوط اور منہج پر آگے بڑھ رہی ہے۔

اس علمی سفر کا ایک حصہ یہ ''چودھواں فقہی سمینار'' ہے جو حضرت قاضی صاحبؒ کی علالت، وفات اور پھر ملکی حالات کے پس منظر میں دو سال کے وقفہ سے منعقد ہو رہا ہے اور یہ اجتماع اس بات کا مظہر ہے کہ ہمارے اس سفر میں کوئی توقف اور ٹھہراؤ نہیں ہے، اس سمینار کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے، عالمی حالات اور خود ہندوستان میں فاشسٹ طاقتوں کے عزائم اور اثرات کے پس منظر میں نہایت اہم ہیں اور اس طرح اکیڈمی ایک نئے سلسلہ کا آغاز کر رہی ہے۔ یہ سلسلہ فقہ الاقلیات کا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ انقلاب فرانس اور جمہوری نظام کے قیام سے پہلے دنیا کے اکثر بلکہ قریب قریب سبھی ممالک میں، سلطنت ایک مذہب کی پابند ہوتی تھی اور عوام کو عامۃً اسی مذہب کا متبع ہونا پڑتا تھا، اگر دوسرے مذہب کے لوگ ہوتے تو وہ مذہبی آزادی سے محروم ہوتے اور زیادہ سے زیادہ انہیں عقیدہ وعبادت میں آزادی حاصل ہوتی تھی، وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کے حق سے محروم ہوتے تھے، اسی لئے ان پر ہجرت واجب قرار دی جاتی تھی، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں مدینہ منورہ سے باہر کے مسلمانوں پر واجب تھی، اگر کوئی خطہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جاتا تو مسلمان وہاں سے ہجرت کر جاتے اور بدرجہ مجبوری ہی دار الکفر میں قیام کو گوارہ کرتے۔

لیکن جمہوری نظام کے جہاں بہت سے مفاسد ہیں، وہیں اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ جمہوری حکومتوں کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور ملک کے تمام باشندوں کو اپنے عقیدہ، اس پر عمل اور اس کی تبلیغ کی اجازت ہوتی ہے، ایسی ہمہ مذہبی مملکتوں نے ایک نئی صورت حال پیدا کی ہے اور آج پوری دنیا میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا پچاس فیصد سے زیادہ حصہ غیر مسلم ممالک میں آباد ہے، انہیں ان ملکوں سے ہجرت کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ مغرب نے قومیت اور وطنیت کا جو صور پھونکا ہے، جس نے خلافت اسلامی کی قبا کو چاک چاک کر کے رکھ دیا تھا، اسلامی اخوت کے جذبہ کو سرد کر دیا ہے، آج یورپ کے ملکوں میں تو مسلمانوں کو شہریت مل سکتی ہے، لیکن مسلمان ملکوں میں اسے پناہ نہیں مل سکتی، پھر یہ کہ مسلمانوں کا ان غیر مسلم ملکوں میں ہونا سیاسی اور معاشی اعتبار سے بھی عالم اسلام کے مفاد میں ہے اور یہ دعوت دین کے کاز کے لئے بھی ایک مفید صورت ہے، اور ان ملکوں میں مسلمانوں کا حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے زیادہ مہاجرین حبشہ کے حالات سے قریب ہے۔

ہمارے قدیم فقہاء عام طور پر اس نئی صورت حال سے دوچار نہیں ہوئے تھے، پھر بھی ان کے یہاں بہت سے احکام میں دار الاسلام اور دار الحرب کی تفریق ملتی ہے اور خاص کر سقوط قرطبہ اور سقوط بلنسیہ کے بعد فقہاء نے دار الکفر کے تئیں قلم اٹھایا ہے، اس لئے آج کے حالات میں ''فقہ الاقلیات'' ایک اہم موضوع ہے، کیونکہ یہ شریعت کا بنیادی اصول ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت وقوت کے مطابق ہی حلال وحرام کا مکلف بنایا جائے گا، "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعھا" (بقرہ/۲۸۶)، اسی لئے حالت اختیار اور حالت مجبوری کے احکام میں فرق کیا گیا ہے اور اس کی کتنی ہی نظیریں قرآن وحدیث میں موجود ہیں، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو، احکام شریعت کا مکلف ہے، وہ خدا اور رسول کے احکام سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا، ان حالات میں افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اعتدال اور توازن کے ساتھ غیر مسلم ممالک میں بسنے والی مسلمان اقلیتوں کی مشکلات ومسائل کے بارے میں غور کرنا ہوگا، اس سمینار کے دو بنیادی موضوعات: ''غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل'' اور ''اسلام اور امن عالم'' اسی پس منظر میں ہیں، اس کے علاوہ کیمیاوی طور پر تبدیل کی گئی اشیاء کی طہارت ونجاست اور حلت وحرمت اور مسلمانوں کے سماجی مسائل کے حل کے لئے اوقاف کے قیام جیسے موضوعات بھی حالات اور ضروریات کے تناظر میں بہت اہم ہیں۔

اخیر میں ہم اکیڈمی کی طرف سے آپ تمام مہمانوں کا اور بالخصوص بیرون ملک سے سفر کی مشقتیں برداشت کر کے آنے والے فضلاء کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور انہیں سرزمین ہند اور علوم اسلامی کے رشتہ کی یاد بھی دلانا چاہتے ہیں، صرف علم فقہ پر ہی نگاہ کریں تو فتاوی عالمگیری، فتاوی

تا تارخانیہ، فتاوی ابراہیم شاہی، فتاوی عادل شاہی اور خزانۃ الروایات جیسے فقہ کے عظیم ذخائر اسی خطہ عجم میں عجمی نژاد علماء کے ہاتھوں مرتب ہوئے۔ علامہ صفی ہندی جیسے متکلم اور اصولی (افسوس کہ ان کی تالیفات اب تک مخطوطات کے دفینے میں بند ہیں) کا تعلق اسی سرزمین سے تھا، پھر یہیں فقہاء و متکلمین کے اسلوب کو جامع اصول فقہ کا متن متین ''مسلم الثبوت'' علامہ محب اللہ بہاری کے قلم سے وجود میں آیا اور اس پر بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلیؒ نے تعلیق لکھی، پھر اخیر دور میں مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلیؒ جیسا وسیع العلم اور دقیق النظر عالم اور نواب صدیق حسن خاں قنوجیؒ جیسا کثیر التالیف مؤلف اسی ملک کی دین ہے۔

پھر اگر فقہ کے موضوع کو وسعت دیں تو فقہ القرآن میں ملاجیونؒ کی ''تفسیرات احمدیہ''، نواب صدیق حسن خاںؒ کی ''نیل المرام'' اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے رفقاء کی ''احکام القرآن'' (پانچ جلدیں)، نیز مولانا ثناء اللہ پانی پتی کی ''تفسیر مظہری'' اور فقہ الحدیث میں مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کی ''آثار السنن''، مولانا عبد اللہ شاہؒ محدث دکن کی ''زجاجۃ المصابیح'' اور احادیث احکام کا جامع ترین مجموعہ ''اعلاء السنن'' (بائیس جلدیں) کی تالیف یہیں عمل میں آئی اور کتب سنن کی تشریح وتوضیح پر تو علماء ہند کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے تذکرہ کے لئے مستقل کتاب درکار ہے، پھر اردو میں فقہ وفتاوی کا جو عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آیا ہے بلا مبالغہ عربی زبان کے بعد کسی اور زبان میں شاید اس کا ۲۵ فیصد بھی موجود نہ ہو، فقہ کا ایک اہم شعبہ احکام شریعت کے اسرار ومصالح ہیں، اس سلسلہ مین علامہ مخدوم علی مہائمیؒ (م ۸۵۳ھ) کی ''انعام الملک العلام'' اولین تالیف قرار دی جاسکتی ہے، پھر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی صورت میں اس موضوع پر جو تاریخی کتاب لکھی ہے۔ جو اسلامی تاریخ کی چند منفرد اور ممتاز ترین تالیفات میں ہے، یہ بھی اسی خاک وآب سے اٹھے تھے اور پھر اسی خاک کے پیوند ہوئے، اسی ملک بلکہ اسی شہر حیدرآباد کے توسط سے علمی دنیا پہلی بار علامہ سرخسی کی ''اصول''، امام محمدؒ کی ''کتاب الاصل''، ''جامع کبیر'' اور ''الحجۃ علی اہل المدینۃ'' اور امام ابو یوسفؒ کی ''اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلی'' اور ''کتاب الرد علی سیر الاوزاعی'' اور امام محمدؒ کی سیر پر، علامہ سرخسیؒ کی ''شرح السیر الکبیر''، نیز جامع کبیر پر عتابی کی شرح، مختصر امام طحاوی، امام ابو بکر خصافؒ اور امام ابو بکر جصاص رازیؒ کی ''کتاب النفقات'' جیسی تاریخی اور تاریخ کے دفینوں میں بند علمی مصادر سے روشناس ہوئی اور اسی ملک سے مشہور شافعی فقیہ علامہ عبد العزیز مالاباریؒ کا بھی تعلق تھا، اس لئے جیسے جزیرۂ عرب کے ذریعہ خطہ حجاز کی بادنسیم اس ملک تک پہنچتی ہے، اسی طرح اسلامی اور عربی علوم کے بوئے شمیم نے بھی ہمیشہ اس خطہ کو عطر بار اور مشک زار رکھا ہے، ہم علم وادب اور دین ودانش کی اس سرزمین میں آپ کا استقبال کرتے ہیں۔

اکیڈمی کے لئے بہت زیادہ شکریہ اور سپاس کے مستحق صاحب نظر عالم اور دل نواز صاحب قلم حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی دامت برکاتہم ہیں جو ایک طرف اکیڈمی کے نائب صدر اور ذمہ دار بھی ہیں اور اس سمینار کے میزبان اور دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد کے ناظم بھی، جنہوں نے علوم نبوت کے اس گلشن کو اپنے خون جگر سے سینچا اور اپنے دست اعجاز سے سنوارا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی امت اسلامیہ ہند پر تادیر ان کا سایہ قائم رکھے اور ان کا لگایا ہوا یہ چمن ہمیشہ بہار بردوش رہے،

آمین یا رب العالمین۔

خالد سیف اللہ رحمانی (خادم اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)
یکم جمادی الاولی ۱۴۲۵ھ/۲۰ رجون ۲۰۰۴ء

✧✧✧

سوالنامہ:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ایسے ملکوں میں آباد ہے جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اور وہاں سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی اعتبار سے غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہے، ان ملکوں کے حالات جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان علاقوں سے قطعی مختلف ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور خاص طور پر جب مسلمان کسی ایسے ملک میں ہوں جہاں سیاست کی باگ ڈور غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو اور مسلمان اس موقف میں نہ ہوں کہ وہ نظام سیاست کو خالص اسلامی تعلیمات پر استوار کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ حالات اور مواقع کی تبدیلی سے احکام بھی مختلف ہوتے ہیں، اور ہر عہد کے فقہاء بطور ایک قاعدہ شرعیہ اس بات کو تسلیم کرتے آئے ہیں کہ ضرورت کے مواقع اور عمومی حالات یعنی اضطرار و اختیار دونوں کے احکام ایک دوسرے سے مختلف اور علاحدہ ہوتے ہیں، چنانچہ قرآن وحدیث کے شواہد کی روشنی میں فقہاء نے ایک مستقل قاعدہ مقرر کیا ہے: "لا ینکر تغیر الأحکام بتغیر الزمان"، اسی طرح ائمہ مجتہدین میں سے خود امام شافعی فرماتے ہیں: "یجوز في الضرورة ما لا یجوز في غیرها" (الأم ۴/۱۶۸)، اور ظاہر ہے کہ جہاں مسلمان غیر مسلم اقوام کے ساتھ رہ رہے ہوں، اور زمام اقتدار ان کے ہاتھوں میں نہ ہو، وہاں وہ اسلامی نظام کے غلبہ والے ملک کا سا رویہ اختیار کرنے سے قاصر ہیں، لہٰذا ایسی تنگی کی کیفیت میں ان کے لئے وسعت وسہولت کی راہ نکالنا علماء امت کے لئے ضروری ہے، جیسا کہ فقہاء کے یہاں مسلمہ قاعدہ ہے: "إذا ضاق الأمر اتسع" (الأشباہ والنظائر)۔ اسی بنیاد پر بعض معاصر اہل علم نے "فقہ الاقلیات" پر مستقل موضوع کی حیثیت سے بحث اور غور وفکر کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اس پس منظر میں کچھ اہم مسائل درپیش ہیں جن میں سے ایک مسئلہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا ہے، اور دوسرا مسئلہ بقائے باہم اور سماجی میل جول کا ہے، پہلا مسئلہ بنیادی طور پر نئے سیاسی نظام کے تحت پیدا ہوا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث میں اس کا صریح حکم نہیں مل سکتا، اور فقہاء متقدمین ومتاخرین کے یہاں بھی اس مسئلہ کی صراحت ووضاحت ملنی مشکل ہے، اس لئے کہ فقہاء کے اجتہادات بھی اپنے عہد کے واقعات اور احوال سے متعلق ہوتے ہیں۔

پس اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تین بنیادی باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں:

اول: یہ کہ موجودہ جمہوری نظام اپنی بنیادی فکر کے اعتبار سے اسلام کے سیاسی تصورات سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں ہے۔

دوم: یہ کہ حالت اختیار اور حالت مجبوری کے احکام الگ الگ ہیں۔

سوم: یہ کہ اگر دو مفاسد سامنے ہوں اور دونوں سے بچنا ممکن نہ ہو تو پھر کمتر درجہ کے مفسدہ کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔

اگر ان باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو صورت حال یوں بنتی ہے کہ ووٹ دینے کی صورت میں یہ مفسدہ ہے کہ پارلیمنٹ میں بعض اوقات ایسے بھی قوانین طے پائیں جو احکام شرعیہ سے معارض ہوں یا مسلمانوں کے قومی وملی مفادات کے مغائر ہوں۔

اور دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کے جمہوری نظام میں ووٹ بہت بڑی طاقت ہے، اور اسی طاقت کے اعتبار سے سیاسی اور سماجی زندگی میں قوموں کا درجہ و مقام متعین ہوتا ہے اور اس کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے، اگر مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ہو، یا ایسے ارکان موجود ہوں جن کے انتخاب میں مسلم ووٹ اثر انداز رہا ہو، تو ان کے ذریعہ نہ صرف مسلمانوں کے قومی بلکہ ان کے مذہبی مفادات کا بھی تحفظ ہوتا ہے، اگر مسلمان ایسے ممالک میں الیکشن سے بالکل کنارہ کش ہوجائیں تو سیاسی اور قومی سطح پر ان کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہے گی بلکہ بعض حالات میں وہ مذہبی حقوق سے بھی محروم ہوسکتے ہیں۔

چنانچہ اس پس منظر میں درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

سوال نمبر ۱: اس وقت دنیا کے اکثر ممالک جمہوری نوعیت کے ہیں، جن میں انتخابات کے ذریعہ حکومت بنتی ہے، ان انتخابات میں تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو

ووٹ دینے کا حق ہوتا ہے، جو لوگ الیکشن میں امیدوار ہوتے ہیں، انہیں اپنے آپ کو امیدواری کے لئے امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنا پڑتا ہے، پھر جب عوامی انتخاب سے اسمبلی اور پارلیامنٹ وجود میں آتی ہے تو پارلیامنٹ کے تمام اراکین کو ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ پارلیامنٹ بہت سے ایسے قوانین بھی وضع کرتی ہے جو شریعت اسلامی کے مغائر بلکہ اس سے متصادم ہوتے ہیں تو:

الف: کیا ان ممالک میں مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا شرعاً جائز ہوگا؟

ب: چوں کہ ان انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات بھی متعلق ہو سکتے ہیں، تو کیا اس بنیاد پر مسلمانوں کے لئے ووٹ دینا شرعاً واجب قرار دیا جا سکتا ہے؟

ج: اگر بعض ایسی سیاسی جماعتیں الیکشن میں حصہ لیتی ہوں جنہوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو، لیکن ان کے بعض امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب ہو تو کیا مسلمانوں کے لئے ان کی جماعتی فکر سے قطع نظر اشخاص و افراد کے ذاتی حالات کی بنا پر انہیں ووٹ دینا جائز ہوگا؟ اور کیا خود مسلمانوں کے لئے ایسی سیاسی جماعتوں میں شمولیت درست ہوگی؟

د: اور کیا انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے، ان میں شرکت اور ان کی حمایت کی جا سکتی ہے یا نہیں، اور شرعاً اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

ھ: معروف کو پھیلانا، منکر سے روکنا، انسانیت کے نفع کے لئے کام کرنا اور معاشرہ میں عدل و انصاف اور امن و سلامتی کی فضا قائم کرنا امت مسلمہ کا شرعی فریضہ ہے، ان مقاصد کے لئے بعض اوقات سماج کے مختلف طبقات سے تعاون حاصل کرنا پڑتا ہے اور ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض دفعہ غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر ان کاموں کو انجام دیا جائے، تو کیا سماج کی مشترکہ ذمہ داریوں اور اچھی باتوں کی ترویج اور منکرات کو روکنے کے لئے غیر مسلم بھائیوں کے اشتراک کے ساتھ کام کیا جا سکتا ہے اور ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کی جا سکتی ہیں جن میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں؟

سوال نمبر:۲- جہاں مسلمان غیر مسلم اقوام کے ساتھ رہتے ہیں، وہاں سماجی زندگی میں ایک دوسرے کی قربت کی وجہ سے مختلف مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں درج ذیل سوالات قابل توجہ ہیں:

الف: کیا مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا بہتر ہے تا کہ وہ غیر مسلموں کو اسلامی اخلاق و کردار کے ذریعہ متاثر کر سکیں، یا اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا بہتر ہے تا کہ وہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رہ سکیں؟

ب: ایک ساتھ رہنے کا تقاضہ ہوتا ہے کہ خوشی و غم میں ایک دوسرے کی شرکت ہو، اس سلسلہ میں دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب غیر مسلم دوست یا پڑوسی کے یہاں کسی کا انتقال ہو جائے، کیا مسلمان ایسے مواقع پر ان کے جلوس جنازہ میں شرکت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ بعض لوگ غیر مسلم میتوں کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب بھی کرتے ہیں، کیا شریعت میں اس کی کوئی گنجائش ہے؟

ج: غیر مسلم حضرات اپنے تیوہاروں اور دوسری تقریبات کے موقع پر مٹھائیاں اور ان کے عقیدہ کے مطابق تبرکات اپنے مسلمان دوستوں کو پیش کرتے ہیں، یہ تقریبات مذہبی بھی ہوتی ہیں اور غیر مذہبی بھی جیسے شادی، بچہ کی پیدائش وغیرہ سے متعلق، اور جو تحفے دیئے جاتے ہیں وہ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، بعض بتوں پر چڑھائے ہوئے اور بعض بغیر چڑھائے ہوئے، ہمارے برادران وطن ان کو "پرشاد" کہتے ہیں، تو ایسی چیزوں کا قبول کرنا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

د: باہمی میل جول کی وجہ سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مسلم حضرات مسجدوں میں تعاون پیش کرتے ہیں، مسلمانوں کے مذہبی جلسوں میں چندہ دیتے ہیں، بعض حضرات دینی مدارس کا تعاون کرتے ہیں، پھر وہ اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر اور مذہبی تیوہاروں اور جلسوں وغیرہ کے لئے مسلمانوں سے تعاون کے خواستگار ہوتے ہیں، تو کیا مسلمانوں کے لئے انکی اس طرح کی اعانتوں کو قبول کرنا اور انکی مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کی تعمیر کے لئے تعاون کرنا درست ہوگا؟

ھ: آج کل ایک رجحان یہ پیدا ہو رہا ہے کہ مختلف قومیں ایک دوسرے کی مذہبی تقریبات میں شریک ہوں، اور ان میں تعاون کریں، چنانچہ رمضان المبارک اور عید وغیرہ کی مناسبت سے، بہت سے غیر مسلم سماجی اور سیاسی قائدین مسلمانوں کے ساتھ افطار میں شریک ہوتے ہیں، عید کی تہنیتی تقریب رکھتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں سے بھی اس بات کی توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ بھی دوسرے مذہبی گروہوں کے تہواروں میں شریک ہوں۔

الف۔ تو کیا مسلمانوں کے لئے ایسی تقریبات میں شریک ہونا جائز ہے؟

ب۔ اور کیا غیر مسلم بھائیوں کو ان کے تیوہاروں کی مبارک باد دینا درست ہے؟

سوال نمبر:۳- مسلمان اقلیتیں بعض ایسے مسائل سے بھی دو چار ہوتی ہیں جن کو دوسری قومیں محض ایک سیاسی اور قومی مسئلہ سمجھتی ہیں، لیکن مسلمان انہیں مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اس سلسلہ میں چند سوالات خاص طور پر علماء اور ارباب افتاء کے لئے قابل توجہ ہیں:

الف: آج کل اکثر ملکوں میں جھنڈے کو سلامی دینے کا رواج ہے، اور اسے جھنڈے کا احترام سمجھا جاتا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے کیا یہ درست ہے؟

ب: بعض ملکوں میں ایسے قومی ترانے مروج ہیں جن میں مشرکانہ مضامین شامل ہیں، خود ہندوستان میں وندے ماترم پڑھنے کو کہا جاتا ہے، جس میں ارض وطن کی معبودیت کا تصور پایا جاتا ہے، کیا مسلمانوں کے لئے اس قسم کے ترانوں کا پڑھنا جائز ہوگا؟

ج: جو ادارے ملک کے باشندوں کو انصاف فراہم کرتے ہیں وہ ملک میں مروج قانون شہادت یا دوسرے قوانین کی وجہ سے بعض اوقات ایسے فیصلے بھی کر سکتے ہیں جو اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہوں، ایسے معاملات میں اگر دونوں فریق مسلمان ہوں تو انہیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ اور جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوا ہے کیا اس کے لئے اس سے استفادہ کرنے کی گنجائش ہے؟

سوال نمبر:۴- امت مسلمہ بنیادی طور پر ایک ایسی امت ہے جس کو لوگوں تک حق کی دعوت پہنچانے کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کے لئے ایک طرف یہ بات ضروری ہے کہ خود یہ امت فکر صحیح کی حامل ہو، حالات چاہے موافق ہوں یا ناموافق وہ احکام دین پر عامل ہو، دوسری طرف بندگان خدا کے ساتھ اس کا تعلق محبت و ہمدردی اور اخوت و نصرت کا ہو۔ اس پس منظر میں چند سوالات قابل توجہ ہیں:

الف: موجودہ دور میں عالمی سطح پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ لوگوں میں تمدنی اور ثقافتی وحدت پیدا ہو جائے، ثقافتی انجذاب اور تہذیبی انضمام کی اس کوشش میں مذہب کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے، اس کے لئے مغرب نے ایک کوشش تو یہ کی کہ مذہب کو انسان کی عملی زندگی سے علاحدہ کر دیا، اور کچھ عباداتی رسوم ہی اس کے دائرہ میں باقی رکھی گئیں، مذہب کو مزید بے اثر کرنے کے لئے دوسری کوشش یہ کی جارہی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ راستے الگ الگ ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے، اور ان مذاہب کی حیثیت ایک ہی منزل تک جانے والے مختلف راستوں کی ہے، بہت سے مسلمان دانشور بھی اس فکر کے اسیر ہوتے جارہے ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے کیا یہ کسی بھی درجہ میں قابل قبول ہے؟

ب: دنیا کے بعض علاقوں میں غیر مسلموں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو ظلم اور استحصال کا شکار بنائے ہوا ہے، ہندوستان میں ایک بہت بڑی آبادی جو دلت کہلاتی ہے، صدیوں سے ہندوؤں میں اونچی ذات سمجھے جانے والے طبقہ کے مظالم کا شکار ہے، جن کو سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ بنائے رکھنے کی منظم اور منصوبہ بند کوشش ہوتی رہی ہے، اسی طرح بعض ملکوں میں کالی اور گوری نسل کے درمیان تفریق روا رکھی گئی ہے، اس صورت حال میں اس مظلوم طبقہ کے تئیں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ کیا مسلمانوں پر انسانی اخوت کے رشتہ سے ان کا تعاون کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے؟ یا چونکہ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہیں ہے، اس لئے وہ اس بارے میں جواب دہ نہیں ہیں؟

ج: یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام میں خدمت خلق کی بڑی اہمیت ہے، اور قرآن و حدیث میں مختلف طریقوں پر اس کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسرے اہل مذاہب سے امت مسلمہ کا رشتہ اخوت انسانی پر مبنی ہے، اور مسلمانوں سے اس کا دوہرا تعلق ہے، ایک انسانی بھائی چارہ کا، اور دوسرے اسلامی او ایمانی اخوت کا، ان حالات میں مسلمان اگر خدمت خلق کا کوئی ادارہ قائم کریں، جیسے ہاسپیٹل وغیرہ، تو انہیں ان اداروں سے غیر مسلم حضرات کو نفع پہنچانے میں کیا صورت اختیار کرنی چاہئے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے ایسے اداروں کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا بہتر ہے، یا بلا تفریق مذہب تمام لوگوں کے لئے خدمت و اعانت کے دروازہ کو کھلا رکھنا؟

د: جب کوئی قدرتی آفت آتی ہے، جیسے زلزلہ، سیلاب، متعدی امراض وغیرہ، تو اس کا اثر سماج میں بسنے والے تمام ہی لوگوں پر پڑتا ہے، اور سبھی لوگ مدد کے محتاج ہوتے ہیں، بدقسمتی سے ہندوستان میں بعض فرقہ پرست عناصر ایسے ہیں کہ ایسی مصیبت کی گھڑی میں بھی وہ مختلف طبقات کے درمیان تفریق و امتیاز سے کام لیتے ہیں، مسلمانوں کی بھی بہت سی تنظیمیں ایسے مواقع پر ریلیف کا کام انجام دیتی ہیں، تو ان حالات میں برادران وطن کے ساتھ مسلم تنظیموں کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ ✧✧✧

اکیڈمی کے فیصلے:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

۱- اسلام کا اپنا ایک مستقل نظام حکمرانی ہے۔ لیکن موجودہ عالمی حالات میں دوسرے غیر اسلامی نظامہائے حکومت کے مقابلہ میں مروج جمہوری نظام ہی مسلم اقلیتوں کے لئے قابل ترجیح ہے۔ لہذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز ہے۔

۲- مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات کا تقاضا ہے کہ وہ ووٹ دینے کا قانونی حق بھرپور طریقہ سے استعمال کریں۔

۳- جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ، اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو، ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو۔

۴- جمہوری سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کئے جاسکتے ہیں۔

۵- ملک اور انسانیت کے نفع اور معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے اور ان کے اشتراک سے تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔

۶- مسلمانوں کو ایسی جگہ رہائش اختیار کرنی چاہئے جہاں وہ اپنے دین وایمان اور اپنے تشخص کو برقرار رکھ سکیں اور تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہئے جس سے اپنے دینی وملی تشخص کی حفاظت کرسکیں۔

۷- اسلام میں غیر مسلم پڑوسیوں اور اہل تعلق کے بھی حقوق ہیں، اس لئے ان کی بیماری وغم کے موقعوں پر ان کی عیادت وتعزیت کی جائے گی۔

۸- وندے ماترم جیسے گیت میں شرکیہ الفاظ ہیں اور ہندوستان کی سرزمین کو معبود کا درجہ دیئے جانے کا تصور پایا جاتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے اس جیسے گیت کا پڑھنا شرعاً حرام ہے۔ اور ان پر اس سے احتراز کرنا لازم ہے۔

۹- اگر غیر اسلامی قانون شہادت یا دوسرے قوانین کی بنیاد پر کسی مسلمان کے حق میں خلاف شرع فیصلے ہوجائیں تو اس کے لئے اس سے استفادہ جائز نہیں ہے۔ یہ سمینار تمام مسلمانون سے اپیل کرتا ہے کہ اپنے تنازعات دارالقضاء ہی میں لے جائیں اور وہاں جو فیصلہ ہو اس کو قبول کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض مقدمات میں مسلمان قاضی کا فیصلہ ہی شرعاً معتبر ہے۔

۱۰- وحدت ادیان کا تصور غیر اسلامی ہے اور کتاب وسنت کی رو سے باطل اور عملی طور پر غیر مفید ہے، بلکہ یہ دراصل اسلام کے تشخص کو مٹانے کی ایک گہری سازش اور مسلمانوں کو گمراہی پر ڈالنے کی ایک ناپاک کوشش ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو ایسے فتنہ سے بچنا چاہئے۔

۱۱- اسلام انسانیت کا احترام کرتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے حتی المقدور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مظلوم غیر مسلم بھائیوں کی مدد کرنا ان کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔

۱۲- مسلمانوں کی طرف سے چلائے جانے والے خدمت خلق کے اداروں مثلاً ہاسپٹل وغیرہ کے ذریعہ بلاتفریق مذہب تمام لوگوں کی خدمت واعانت کرنی چاہئے، یہی انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے، البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ زکاۃ کی رقم صرف مستحق مسلمانوں ہی پر خرچ کی جائے۔

۱۳- اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ قدرتی آفات کے موقع پر مسلم تنظیموں کی جانب سے برادران وطن کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا جائے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ ✧✧✧

تلخیص مقالات:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا صفدر زبیر ندوی / مولانا ہشام الحق ندوی

سوال نمبر ۱ - الف: الیکشن میں حصہ لینا:

کیا جمہوری ممالک میں مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا شرعاً جائز ہوگا؟

بیشتر مقالہ نگار حضرات نے اس سوال کے جواب میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا یا کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز اور درست ہے۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبید اللہ اسعدی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی وغیرہ)۔

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا نیاز احمد عبد الحمید مدنی اور مولانا محمد شمس الدین نے اصولی طور پر موجودہ دنیا کے جمہوری نظام کو اسلامی نظام حکومت کے خلاف بتایا ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالی کے اقتدار اعلی کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود ضرورت و اضطرار اور ملی مصالح کے پیش نظر ان حضرات نے الیکشن میں حصہ لینے، ووٹ دینے، امیدوار بننے اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانے کے عمل کو جائز قرار دیا ہے۔ البتہ ان حضرات میں سے بعض نے کچھ شرائط عائد کی ہیں۔

مثلاً مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا محی الدین غازی فلاحی کے نزدیک رائے دہندہ اور امیدوار کے ذہن میں اللہ تعالی کے حاکم وشارع حقیقی ہونے کا تصور بالکل واضح ہونا ضروری ہے۔ مولانا ابوالعاص وحیدی اور مولانا نیاز احمد عبد الحمید مدنی نے اس کے لئے احتیاط کی شرط عائد کی ہے۔

الیکشن میں شرکت کے دلائل:

عمومی جواز کے قائلین اور بعض تحفظات کے ساتھ جواز کی رائے رکھنے والوں کی مشترک دلیل یہ ہے کہ جمہوری ممالک میں انتخابات میں شرکت سے بے شمار دینی وملی مصالح اور مقاصد وابستہ ہیں اور کہیں کہیں تو اس کے بغیر ملت کا تشخص اور وجود ہی خطرہ میں ہے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی اور مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی کے نزدیک اسلام کے خلاف بنائے گئے قوانین کو چیلنج کرنے اور ان کو منسوخ کرانے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ انتخابات میں شرکت کی جائے اور عوامی حمایت حاصل کر کے پارلیمنٹ ہی سے ان قوانین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے۔

مولانا ثابت شمیم رشادی کے بقول جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ سے بنائے گئے اسلام مخالف قوانین کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل ایک مؤثر ذریعہ ہے، مولانا راشد حسین ندوی کا خیال ہے کہ جمہوری ممالک میں اگر الیکشن میں حصہ لینے اور اپنی طرف سے حتی الامکان شریعت سے متصادم قوانین کو منسوخ کرانے کی کوششوں کے باوجود کچھ ناکامیوں کا سامنا ہو تو ایسی صورت میں مسلمانوں کی حیثیت مکرہ کی سی ہے۔ انہوں نے "إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان" اور "لا يكلف الله نفسا إلا وسعها" سے استدلال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس صورت میں مسلمان حدیث "من رأى منكم الخ" کے مطابق دل میں ایسے اقدامات کو غلط سمجھیں گے۔ لیکن مولانا اسعد قاسم سنبھلی اکراہ واضطرار کی اس توجیہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فردی سطح پر تو اضطرار و اکراہ کی بات سمجھ میں آتی ہے مگر کروڑوں کی آبادی دائمی طور پر مضطر ہو جائے اور رخصت کی طالب ہو جائے یہ بات ناقابل فہم ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اگر یہ صورت عارضی ہو تو بھی قابل فہم ہے لیکن اس ضمن میں مکی زندگی کا حوالہ دینا، اور عالمی صورت حال کو ماضی سے مختلف قرار دے کر دار الاسلام اور دار الحرب کی تفریق کو ختم کرنا اور پھر اس تصور کے نتیجہ میں "فقہ الاقلیات" کی تدوین کا موضوع چھیڑنا کسی طرح درست نہیں۔

اس کے برعکس ڈاکٹر محروس المدرس اعظمی (عراق) کا خیال ہے کہ جس زمانہ میں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور روز بروز اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا تھا اور ایک سلطنت کے زیر انتظام مختلف علاقے آپس میں مربوط رہتے تھے اس زمانے میں اگر مسلمانوں نے اپنے زیر انتظام تمام علاقوں کو دار الاسلام اور کفار کے زیر کنٹرول علاقوں کو دار الکفر قرار دیا تو اس وقت کی صورت حال کے مطابق یہ بات منطقی اور مناسب معلوم ہوتی ہے مگر اب جبکہ بیشتر ممالک سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو چکا ہے، غیر مسلم ممالک میں بڑے پیمانے پر مسلمان آباد ہو گئے اور وہاں کی شہریت حاصل کر کے ان تمام حقوق ومراعات کے مستحق قرار پائے جو ان ممالک کے دوسرے باشندوں کو حاصل تھے تو صورت حال کے یکسر تبدیل ہو جانے سے اب سابقہ تقسیم کی ضرورت وافادیت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اگر دار الاسلام اور دار الحرب کی سابقہ تقسیم کو من وعن تسلیم کیا جائے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ محسوس کی جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ:

الف-غیر مسلم ممالک میں اسلام قبول کرنے والے وہاں سے لازماً اپنے دین کو بچانے کے لئے ہجرت کریں۔

ب-جن ممالک میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو گیا ہے وہاں سے بھی لازماً مسلمان آبادی ہجرت کر جائے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان ناقابل تلافی نقصانات کی ایک فہرست درج کی ہے جو اس طریقہ کار پر عمل کرنے کی صورت میں پوری امت کو لاحق ہوں گے۔ ان میں سے چند اہم نقصانات یہ ہیں:

۱-مسلمان اپنی زیر ملکیت جائدادیں اور تجارتی، سیاسی اور اجتماعی مراکز چھوڑنے پر مجبور ہوں گے۔

۲-اپنے علمی مراکز، دینی اداروں، مساجد اور جامعات سے مجبوراً دست بردار ہوں گے۔

۳-جہاں وہ پہلے سے آباد رہے ہیں وہاں رہنے کی صورت میں وہاں کے حکمرانوں کے فیصلہ پر وہ اثر انداز ہیں اور نتیجتاً عالم اسلام سے متعلق ان کی پالیسیوں پر بھی۔ اب اگر وہ ان ممالک کو چھوڑ دیں گے تو گویا اپنے اختیارات اور اثر ورسوخ سے خود دست بردار ہوں گے۔

۴-جن ممالک کی شہریت مسلمانوں کو حاصل ہے، وہاں کے سماج سے ان کے گہرے روابط ہیں، وہاں ان کو بے شمار قسم کی آزادیاں اور سہولتیں حاصل ہیں جو خود مسلم ممالک میں نہیں ہیں، اسی طرح دعوت وتبلیغ کے میدان، ذرائع ابلاغ، طباعت کی اعلیٰ ترین کوالٹی، عالمی سطح کی مشہور لائبریریوں اور مکتبوں سے استفادہ اور کتب کی فراہمی جو بیشتر مسلم ممالک میں دستیاب نہیں ہیں، مسلمان ان سے محروم ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ان وجوہ ومصالح کے پیش نظر میں ان لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا جو غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں پر وہاں سے منتقلی کو لازم قرار دیتے ہیں ورنہ اس کی رو سے تو لازم آئے گا کہ نیپال، بھارت، فلپائن، تھائی لینڈ، سری لنکا، میانمار، علاوہ ازیں امریکہ، برطانیہ، جاپان، یوروپی ممالک، لاطینی امریکہ، افریقہ کے بیشتر ممالک، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ سے مسلمان نکل جائیں، کیا ان میں کوئی معقولیت ہے؟ کیا یہ نقطہ نظر مقاصد شرع سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے؟ پھر فرماتے ہیں: نصوص کی تاویل کسی ایک گروہ کو نہیں پوری امت کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر کی جائے گی۔

مفتی ذاکر حسن نعمانی کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کا ایک طریقہ اور ذریعہ انتخابات میں شرکت بھی ہے، جبکہ قاضی محمد ہارون مینگل کے نزدیک انتخابات میں شرکت کی حیثیت دینی نہیں محض دنیوی اور معاشرتی ہے۔

مولانا محمد شمس الدین اور مفتی جمیل احمد نذیری نے پارلیمنٹ میں جا کر خلاف اسلام بنائے گئے قوانین کی منسوخی اور لوگوں کی خدمت کی نیت سے انتخابات میں حصہ لینے کو جائز قرار دیا ہے، ان دونوں حضرات نے فتاوی محمودیہ ۱۳ / ۴۲۵ کا ایک فتوی اپنی رائے کی تاکید میں نقل کیا ہے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی کا خیال ہے کہ اگر پارلیمنٹ کے ذریعہ عام طور پر یا بیشتر خلاف اسلام قوانین بنائے جاتے ہوں تو انتخابات میں حصہ لینا ناجائز ہوگا اور اگر کبھی کبھی یہ صورت پیش آتی ہو تو انتخابات میں شرکت جائز ہوگی۔

اصولاً موجودہ جمہوری نظام کو غیر اسلامی قرار دینے والوں نے انتخابات میں شرکت کو "أهون البليتين" کے فقہی قاعدہ کی بنا پر جائز قرار دیا ہے، عمومی جواز کے قائلین میں سے مولانا خورشید احمد اعظمی اور مفتی حبیب اللہ قاسمی نے اسی قاعدہ سے استدلال کیا ہے۔ مولانا محمد عبید اللہ صاحب (جامعہ اشرفیہ لاہور) نے ہندوستان کے موجودہ آئین کو کفر پر مبنی قرار دیا ہے اور ان کے بقول دیگر جمہوری ممالک میں بھی جو نظام رائج ہے اس میں عوام اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ہوتے ہیں، کیونکہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کے مالک وہی ہوتے ہیں۔ ان وجوہ سے مولانا موصوف کے نزدیک ہندوستان اور دیگر جمہوری ممالک میں الیکشن میں حصہ لینا

ناجائز ہے۔انہوں نے زبدۃ الاصول مع حاشیہ/ص ۲ کا حوالہ دیتے ہوئے حاکمیت الہ کے پہلو کو اسلام کے بنیادی، قطعی اور ناقابل ترمیم و تنسیخ حصوں میں شمار کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے۔

مولانا سید امیر حسین گیلانی نے حدیث "من رأی منکم منکرًا" سے انتخابات میں شرکت کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی نے قوی مومن کے ضعیف مومن سے افضل ہونے والی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اس میں سیاسی قوت وضعف کو بھی شامل کیا ہے۔

مولانا عبید اللہ اسعدی نے انتخابات میں شرکت کو تترس پر قیاس کیا ہے۔ یعنی جس طرح کفار مسلمانوں سے جنگ کی صورت میں اگر مسلمانوں ہی کو ڈھال بنائیں اوران ہی کو آگے آگے رکھیں پھر بھی اسلامی ملک کے مصالح کے پیش نظر اسلامی لشکران کو مجبوراً نشانہ بنائے گا، اسی طرح الیکشن اور حکومتی نظام کی شرعی قباحتوں کے باوجود ان میں شرکت کی جائے گی۔ مولانا محمد صادق مبارکپوری نے حضرت یوسف کے واقعہ سے استدلال کیا ہے، اسی طرح انہوں نے شامی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں۔

مولانا نعیم اختر قاسمی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی نے اس ضمن میں حلف برداری کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے، ان حضرات کے نزدیک بھارت کا آئین چونکہ ہر مذہب کے احترام اور عقیدہ و آزادی کے اظہار پر مبنی ہے اس لئے اس سے حلف اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

الیکشن میں شرکت کی حیثیت اور آداب:

تمام مقالہ نگار حضرات نے امیدوار کے لئے اہلیت و دیانت کی صفات سے متصف ہونے کی شرط لگائی ہے، اسی طرح انہوں نے امیدوار کے لئے چلائی جانے والی مہم میں جھوٹ اور ایک دوسرے پر بے جا الزامات لگانے اور رکیک حملے کرنے سے اجتناب کو لازم قرار دیا ہے۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات نے ووٹ کی تین شرعی حیثیتیں ذکر کی ہیں: شہادت، شفاعت اور وکالت (جواہر الفقہ ۲/۲۹۱) (مقالہ مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی رفیع عثمانی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا محمد اقبال قاسمی وغیرہ) مولانا راشد حسین ندوی نے شہادت کے پہلو پر اور مولانا اسرار الحق سبیلی اور قاضی محمد ہارون مینگل نے وکالت کے پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔ قاضی محمد ہارون مینگل نے اسلامی نظریاتی کونسل کی سالانہ رپورٹ مجریہ ۱۹۸۲-۱۹۸۱ کے حوالہ سے کونسل کا یہ متفقہ فیصلہ بھی نقل کیا ہے کہ ووٹ درحقیقت توکیل، تفویض، متضمن شہادت اور مستلزم ولایت ہے۔ قاضی موصوف کے نزدیک غیر مسلم ممالک میں شہادت کے مقابلہ میں توکیل کی حیثیت ہی زیادہ صحیح ہے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ثابت شمیم رشادی اور مولانا محمد اقبال قاسمی نے امیدوار بننے کی صورت میں پائی جانے والی طلب کو اسلامی شریعت کی رو سے طلب غیر ممنوع قرار دیا ہے۔ اس پہلو پر مولانا ثابت شمیم رشادی ایک دوسرے زاویہ سے نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس وقت جمہوری ممالک میں یہ صورت کہ کوئی خود کو خود سے نامزد کرے نہیں پائی جاتی بلکہ چند افراد کسی کو نامزد کرتے ہیں اور الیکشن کمیشن میں امیدوار کا غذات نامزدگی داخل کر کے دراصل اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔

سوال نمبر ۱ (ب) ووٹ دینے کا شرعی حکم؟

وجوب کے قائلین:

اس ضمن میں اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے ووٹ دینے کو واجب قرار دیئے جانے کی ہے، البتہ وجوہات میں اختلاف ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مسلمانوں کے مذہبی و ملی مفادات متعلق ہوں تو ووٹ دینا شرعاً واجب و لازم ہوگا (مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، سید قدرت اللہ باقوی، مولانا عامر ظفر، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا ابو العاص وحیدی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد ابوبکر قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی)۔

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا ابو العاص وحیدی اور سلطان احمد اصلاحی اپنی آراء کی دلیل میں اصول "فانہ ما لا یتم الواجب إلا بہ فھو واجب" کو پیش کرتے ہیں، جبکہ مولانا محمد ارشاد قاسمی کہتے ہیں کہ ووٹ اسی وقت دینا اور اسی امیدوار کو دینا شرعاً واجب ہو سکتا ہے جو اپنے مقابل کے اعتبار سے صالح اور مذہب اسلام کی رعایت کرنے والا ہو۔

مفتی ذاکر حسن نعمانی اور سید امیر حسین گیلانی کا کہنا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر مسلمان کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ذمہ داری ہے اور ووٹ بھی اسی کی طرح بالواسطہ ایک ذمہ داری ہے لہذا اس کا استعمال واجب ہوگا۔

مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا عبداللطیف اور مولانا محمد سلمان کھلی کی رائے ہے کہ چونکہ ووٹ کی ایک حیثیت شہادت کی ہے، اور سچی شہادت واجب و لازم ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "کونوا قوامین بالقسط شهداء لله"، اسی طرح شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے، جیسا کہ آیت میں ہے: "ولا تکتموا الشهادة ومن یکتمها فانه آثم قلبه"، لہذا مسلمانوں پر الیکشن میں حصہ لینا بھی واجب ہوگا۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی کہتے ہیں کہ کسی خاص موڑ پر یہ ہوسکتا ہے کہ ووٹ دینا شرعی طور پر اسی طرح واجب ہوجائے جس طرح باطل قوتوں سے جہاد ضروری ہوتا ہے۔

یہی بات مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا عبدالرشید قاسمی بھی کہتے ہیں اور دلیل میں یہ نصوص پیش کرتے ہیں:

"فإن أمن بعضكم بعضا فليؤد الذى اؤتمن أمانته وليتق الله ربه ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فانه آثم قلبه" (سورۂ بقرہ / ۲۸۳)۔

"من كتم شهادة إذا دعى إليها كان كمن شهد بالزور" (جمع الفوائد ا/ ۲۲)۔

"ألا أخبركم بخير الشهداء الذى يأتي بشهادة قبل أن يسئلها" (ایضا/ ۲۶۱)۔

مولانا تنظیم عالم قاسمی کا خیال ہے کہ اگر ووٹ نہ دینے سے ظالم حکومت کا برسر اقتدار آنا یقینی ہو تو ووٹ دینا واجب ہوگا، اور اسے قومی و مذہبی فریضہ بھی قرار دیا ہے، اور تقریباً یہی بات مولانا عبدالرحیم قاسمی بھی کہتے ہیں (فقہی مقالات ۲/ ۲۹۳)۔

ووٹ کی شرعی حیثیت بیان کرتے ہوئے مولانا اسرار الحق سبیلی نے کہا کہ اگر ووٹ کی حیثیت شہادت کی مان لی جائے تو اس کا وجوب ثابت کیا جاسکتا ہے اور دلیل میں درج ذیل آیات ذکر کی ہیں:

۱- "ولا یأب الشهداء إذا ما دعوا" (سورۂ بقرہ/ ۲۸۲)۔

۲- "ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فانه آثم قلبه" (سورۂ بقرہ/ ۲۸۳)۔

"وأقيموا الشهادة لله" (سورۂ طلاق/ ۲)۔

اور اگر ووٹ کی حیثیت وکالت کی مانی جائے تو بھی اس کا وجوب قرآن کی ان آیات واحادیث سے ثابت ہوگا جن میں انصاف قائم کرنے اور ایک دوسرے کا تعاون کرنے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ کے احکام ہیں:

۱- "یا أیها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط" (سورۂ نساء/ ۱۳۵)۔

۲- "اعدلوا هو أقرب للتقوى" (سورۂ مائدہ/ ۸)۔

۳- "لا خير فى كثير من نجواهم إلا من أمر بصدقة أو معروف أو اصلاح بين الناس" (سورۂ نساء/ ۱۱۴)۔

۴- "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ/ ۲)۔

۵- "وافعلوا الخير لعلكم تفلحون" (سورۂ حج/ ۷۷)۔

۶- "فاتقوا الله وأصلحوا ذات بينكم" (سورۂ انفال/ ۱)۔

چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱- "من رأى منكم منكرًا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه..." (مسلم/ ۴۹)۔

۲- "المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه من كان فى حاجة أخيه كان الله فى حاجته" (بخاری ۵/ ۷۰، مسلم: ۲۵۸)۔

۳- "والله فى عون العبد ما كان العبد فى عون أخيه" (مسلم/ ۲۶۹۹)۔

۴- ''من دل علی خیر فله مثل أجر فاعله'' (مسلم/ ۱۸۹۳)۔

مولانا نعیم اختر قاسمی کہتے ہیں کہ جمہوری ملک میں بلا کسی عذر کے ووٹ نہ دینا ملک کے دستور کی خلاف ورزی ہے اور دستور کی خلاف ورزی قانون کے دائرہ میں آتی ہے، لہٰذا اس نقطہ نظر سے ووٹ دینا واجب ہونا چاہئے۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی کہتے ہیں کہ حالت اضطرار اور مختلف فوائد کے پیش نظر ووٹ دینے کو واجب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور تقریباً یہی بات مولانا عبید اللہ اسعدی اور مفتی جمیل احمد نذیری بھی کہتے ہیں۔

مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا ابوبکر قاسمی کے بقول ایسے نمائندہ کو ووٹ دینا واجب قرار دیا جاسکتا ہے جس میں ملی و مذہبی مفادات کے حصول کی اہلیت ہو۔

اور تقریباً یہی بات مولانا شمس الدین بھی کہتے ہیں، لیکن آگے لکھتے ہیں کہ البتہ سیاسۃً اس کا وجوب ہوسکتا ہے، اور اسے دو جہتوں سے ضروری قرار دیا ہے:

۱- مردم شماری کے لئے تاکہ تشخص برقرار رہے۔ ۲- شہریت اور حقوق شہریت کے حصول کے لئے

اور یہی خیال مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کا بھی ہے، مزید کہتے ہیں کہ شرعی واجب قرار دینے میں زیادۃ فی الدین لازم آئے گا جبکہ دین مکمل ہو چکا ہے۔

مفتی محبوب علی وجیہی کی رائے ہے کہ تحفظ اسلام و تحفظ مسلمین اور حقوق مسلمین کے حصول کی نیت سے ووٹ دینا اگر ضروری قرار دے دیا جائے تو صحیح ہے۔

جواز کے قائلین:

درج ذیل حضرات اس سلسلہ میں کوئی منصوص اور قوی دلیل نہ ہونے کی وجہ سے صرف جائز کہتے ہیں:

مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا برہان الدین سنبھلی، سید خورشید حسن رضوی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی۔

مولانا محمد ارشد مدنی صاحب نے قاعدہ ''یجوز فی الضرورۃ مالا یجوز فی غیرھا'' اور ''أخف الضررین'' کو بنیاد بنایا ہے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب اور مولانا اسعد قاسم صاحب نے مفتی محمد شفیع صاحب کے فتویٰ جس میں انہوں نے ووٹ کو شہادت قرار دیا ہے، پر تنقید کی ہے، اور کہا ہے کہ یہ بات مسلم ملک کے لئے تو صحیح ہوسکتی ہے لیکن دوسرے ملکوں پر بھی یہی بات صادق آئے یہ کوئی ضروری نہیں۔

عدم وجوب کے قائلین:

جو حضرات ووٹ دینے کو واجب نہیں کہتے ہیں یہ حضرات ہیں: مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، قاضی محمد ہارون مینگل، سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا محمد رفیع عثمانی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، سید خورشید حسن رضوی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد شمس الدین، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا عبید اللہ۔

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی کا کہنا ہے کہ ووٹ دینا کفر عملی اور فسق عظیم میں اعانت ہے، بدرجہ مجبوری رخصت ہے، واجب کسی حال میں بھی نہیں۔

مسلمانوں کے لئے ووٹ دینے کو واجب قرار دینا شرعی طور سے درست نہیں معلوم ہوتا (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

موجودہ صورت حال ایسی نہیں ہے کہ ووٹ دینا واجب ہو جائے (مولانا محی الدین غازی فلاحی)۔

قاضی محمد ہارون مینگل کہتے ہیں کہ ملی اور مذہبی مفادات کی موہوم امید پر ووٹ دینے کو شرعی واجب کی حیثیت نہیں دی جاسکتی، اور نہ ہی غیر مسلم ممالک میں ووٹ دینے کو شہادت قرار دیا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر ۱ (ج) مسلم مخالف سیاسی جماعتوں کو ووٹ دینا:

اس سوال میں دو شق ہیں: ایک یہ کہ ایسی سیاسی جماعتیں جن کا مقصد ہی اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت ہو اگر ان میں کا کوئی امیدوار نیک خصلت اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہو تو کیا ایسے امیدوار کو ووٹ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ کیا مسلمان خود ہی ایسی جماعتوں میں شامل ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ تو اکثر مقالہ نگار حضرات کا رجحان اس سلسلہ میں عدم جواز کا ہے، اور ذاتی طور پر نیک خصلت امیدوار کو ووٹ دینا بھی نادرست ہے، اس لئے کہ افراد کی

ذاتی رائے پارٹی کے منشور یا فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتی، اور ایسے امیدوار کو جتانا جس کا تعلق اسلام اور مسلم دشمن پارٹی سے ہو پارٹی کو مضبوط کرنا ہوگا جس سے اسلام اور مسلمانوں کا نقصان ہوگا، اور یہ جرم اور سرکشی پر تعاون دینا ہوگا۔

(مولانا ابوسفیان مفتاحی، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، سید قدرت اللہ باقوی، مولانا نیاز احمد عبدالحمید مدنی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبیداللہ اسعدی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد ارشد مدنی، مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی وغیرہ)۔

مولانا اسعد قاسم سنبھلی صاحب اسلام اور مسلم مخالف پارٹی کو حزب الشیطان سے تعبیر کرتے ہیں اور اس میں شمولیت کو حرام بلکہ موجب کفر قرار دیتے ہیں۔

دلائل:

"ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ/۲)۔

"وإثمهما أكبر من نفعهما" (سورۂ بقرہ/۲۱۹)۔

"إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم في الدين وأخرجوكم من دياركم وظاهروا على إخراجكم أن تولوهم ومن يتولهم فأولئك هم الظالمون" (سورۂ ممتحنہ/۹) (مقالہ قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی)۔

"من كثر سواد قوم فهو منهم" (مقالہ مولانا عبیداللہ، قاضی محمد ہارون مینگل)۔

"الاعتبار للأكثر لا للأقل" (مقالہ مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

"لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادون من حاد الله ورسوله ولو كانوا آباءهم أو ابناءهم أو إخوانهم أو عشيرتهم" (سورۂ مجادلہ/۲۲) (مقالہ مولانا اسعد قاسم سنبھلی)۔

"يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا الذين اتخذوا دينكم هزوا ولعبا من الذين أوتوا الكتاب من قبلكم والكفار أولياء واتقوا الله إن كنتم مؤمنين" (سورۂ مائدہ/۵۷) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

"ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار ومالكم من دون الله من أولياء ثم لا تنصرون" (سورۂ ہود/۱۱۳)

(مقالہ مولانا اسرار الحق سبیلی)۔

"الذين يتخذون الكافرين أولياء من دون المؤمنين أيبتغون عندهم العزة فإن العزة لله جميعا" (سورۂ نساء/۱۳۹)۔

"وقد نزل عليكم في الكتاب أن إذا سمعتم آيات الله يكفر بها ويستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا في حديث غيره" (سورۂ نساء/۱۴۰)۔

مسلم مخالف پارٹی سے تعاون کی گنجائش:

بعض حضرات کسی نہ کسی صورت میں مسلم دشمن پارٹیوں کے نیک خصلت افراد کو ذاتی طور پر ووٹ دینے کا رجحان رکھتے ہیں، مثلاً:

مولانا نعیم اختر قاسمی کا خیال ہے کہ پارٹی اگر اپنے ایجنڈے سے اسلام و مسلم دشمنی کو خارج کردے تو اس کے نیک خصلت امیدوار کو ذاتی اعتبار سے ووٹ دینا جائز ہوسکتا ہے: "أما من استغنى فأنت له تصدى" (سورۂ عبس/۵،۶)۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر تمام امیدوار ایسی پارٹی سے منسلک ہیں یا خود وہ مسلمانوں کے کھلے دشمن ہیں تو ایسی صورت میں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ جماعتی فکر سے قطع نظر امیدوار کی شخصیت کو دیکھا جائے جس امیدوار سے مسلمانوں کے مفاد کی امید ہو اسی کو ووٹ دیا جائے گا (مولانا عامر ظفر)۔

مولانا راشد حسین ندوی صاحب کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بارے میں یقین ہے کہ وہ اتنی زیادہ ہمدردی اور خیر خواہی رکھتا ہے کہ خواہ اپنی سیٹ گنوانی پڑے لیکن مسلمانوں کے خلاف آنے والے کسی بل کی حمایت نہیں کرے گا تو بشرط اہلیت اسی کو ووٹ دیا جائے مگر اس مفاد پرستی کے دور میں ایسے شخص کا وجود محال اور صرف فرضی ہے۔

اور مفتی جمیل احمد نذیری صاحب لکھتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا بارسوخ ہو کہ اپنی جماعت میں پالیسی ساز افراد میں شامل ہو، وعدہ کرے کہ میں اپنی جماعت کی سوچ، فکر اور ذہن کو بدلنے کی کوشش کروں گا تو اسے ووٹ دینے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اسرار الحق سبیلی، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا یعقوب قاسمی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی وغیرہ کی رائے ہے کہ ایسی پارٹی کے نیک خصلت امیدوار سے اگر مسلمانوں کو جلب منفعت اور دفع مضرت کی امید ہو تو ایسے امیدوار کو ووٹ دینا درست ہے بشرطیکہ اس سے بہتر کوئی دوسرا امیدوار نہ ہو:

۱- ''دفع المضرة أولى من جلب المنفعة''۔

۲- ''من ابتلى ببليتين فليختر اهونهما''۔

۳- ''درء المفاسد أولى من جلب المصالح''۔

مسلم مخالف پارٹی میں شمولیت:

بعض حضرات کی رائے ہے کہ سیاسی تدبیر یا کسی خاص مصلحت کے تحت ایسی پارٹی میں شمولیت اختیار کی جا سکتی ہے

(ڈاکٹر یوسف قاسم، مولانا سلطان احمد اصلاحی، سید خورشید حسن رضوی، سید امیر حسین گیلانی، مولانا محمد شمس الدین، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

دلائل:

۱- "وإن جنحوا للسلم فاجنح لها" (سورۂ انفال/۶۰)۔

۲- سید امیر حسین گیلانی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ آنے کے بعد غیر مسلموں سے معاہدہ کرنے کو بھی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

۳- مولانا شمس الدین صاحب نے مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (فتاوی محمودیہ ۱۳/ ۴۲۵) کی رائے یعنی سیاسی جماعت میں شمولیت کے درست ہونے کو اپنی دلیل بنایا ہے۔

لیکن مولانا عقیل الرحمن قاسمی صاحب نے شامل ہونے والے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ اس جماعت کے نظریات سے متفق نہ ہو، اور مفتی عبدالرحیم صاحب نے ایسے شخص کے لئے اپنے دین وایمان کی حفاظت کرنے کی شرط لگائی ہے۔

سوال نمبر ۱ (د) ملی مفادات کے تحت غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے:

اس سوال کے دو شق ہیں:

ایک تو ملی مفادات کے تحت انتخابات کے موقع پر ان کے ساتھ معاہدے، شرکت اور ان کی حمایت سے متعلق ہے، اور دوسرا یہ کہ شرعی طور پر اس کی حیثیت کیا بنتی ہے، تو تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات نے ایسا کرنے کو جائز اور درست قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ صلح حدیبیہ، حلف الفضول، مشرکین مکہ سے معاہدہ اور اطراف مدینہ کے یہودی قبائل سے معاہدہ جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے، ہمارے لئے مثال ہیں، مگر اس کو عمومی حیثیت نہیں دینا چاہئے۔

مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا عامر ظفر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایک امر مستحسن ہے، اور مولانا عبید اللہ اسعدی اور مولانا اسرار الحق سبیلی صاحب کی رائے ہے کہ ایسا کرنا حسب موقع ضروری ہوگا، اور مولانا نعیم اختر قاسمی صاحب کہتے ہیں کہ اگر کسی بڑے ضرر کا اندیشہ ہو تو ایسا کرنا واجب ہوگا۔

دلائل:

"إنافتحنالك فتحا مبينا" (سورۂ فتح:۱) (مقالہ مولانا شمس الدین، مولانا عقیل الرحمن قاسمی)۔

"وإن جنحوا للسلم فاجنح لها" (سورۂ انفال:۶۱) (قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا ثابت شمیم رشادی)۔

"تعاونوا على البر والتقوى" (سورۂ مائدہ:۲) (مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

''كان بينهم وبين النبی ﷺ عهد۔۔۔'' (فتح الباری ۶/ ۲۷۲ کتاب الجزية والموادعة) (مولانا نیاز احمد مدنی)۔

''وقد كان النبی ﷺ عاهدحين قدم المدينة أصنافا من المشركين منهم النضير وبنو قينقاع وقريظة وعاهد قبائل من المشركين ثم كانت بينه وبين قريش هدنة الحديبية إلى أن نقضت قريش ذلك العهد بقتالها خزاعة حلفاء النبی ﷺ'' (احكام القرآن للجصاص ۳/ ۶۹) (مقالہ مولانا ثابت شمیم رشادی)۔

''الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف'' (مقالہ مولانا محمد صادق مبارکپوری)۔

اور مولانا راشد حسین ندوی نے معاہدے کے یہ دلائل ذکر کئے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے خلاف قبیلہ خزاعہ سے معاہدہ کیا تھا:

''ودخلت خزاعة فی عقد رسول الله ﷺ وعهده۔۔۔ الخ'' (سیرت ابن ہشام ۲/ ۳۹۰)۔

اور مدینہ میں یہود سے معاہدہ کیا: ''وإن يهود بنی عوف أمة مع المؤمنين لليهود دينهم و للمسلمين دينهم إلا من ظلم وأثم۔۔۔وإن بينهم النصر على من حارب أهل هذه الصحيفة'' (أيضا ۱/ ۵۰۳)۔

اس صلح نامہ کا ذکر مولانا عقیل الرحمن قاسمی نے البدایہ والنہایہ (۳/ ۲۲۴) کے حوالہ سے کیا ہے۔

مفتی عبدالرحیم قاسمی نے جنگ کی صورتحال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کفار سے مدد لینے کو بنیاد بنایا ہے، اور یہ اصول بھی ذکر کیا ہے:

''إذا ابتلى ببليتين فليختر أهونهما'' (کفایت المفتی ۹/ ۳۳۹) اور یہی رائے مفتی حبیب اللہ قاسمی کی بھی ہے۔

سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی صاحب نے مختلف فقہاء کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ معاہدے یا حمایت وتعاون اجتماعی بھی ہو سکتے ہیں اور انفرادی بھی (نيل الأوطار ۷/ ۲۲۳، سبل السلام ۴/ ۴۹، البدائع ۷/ ۱۰۱، مغنی المحتاج ۴/ ۳۸۹، البحر الزخار ۵/ ۳۸۹، الميزان للشعرانی ۷/ ۱۸۱، الفقه الاسلامی وأدلته ۸/ ۶۴۲۱)۔

۱- ''واستعار الرسول ﷺ أيضا يوم حنين أدرعًا من صفوان بن أميه وهو يومئذ مشرك'' (سیرۃ ابن ہشام ۱/ ۴۸۰)۔

۲- ''واستعان كذلك فی هذه المعركة للاشتراك فی الجهاد بجماعة من المشركين تالفهم من الغنائم'' (سبل السلام ۴/ ۵۰، الفقه الاسلامی ۸/ ۶۴۲۱)۔

معاہدہ کے آداب:

یہ معاہدے ضروری ہے کہ شرعی حدود میں ہوں اور ناجائز مطالبات کی تائید نہ کی جائے، اور اصحاب بصیرت مسلمانوں سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا جائے، یہ رائے مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا عبیداللہ، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا عامر ظفر، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا ابوبکر قاسمی اور سید شکیل احمد انور صاحبان کی ہے، البتہ مفتی محبوب علی وجیہی صاحب معاہدہ کے تحریری ہونے کی شرط لگاتے ہیں، اور مولانا محمد ارشد مدنی صاحب کا کہنا ہے کہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں الگ ہوجانا ضرور ہوگا۔

۱- "وأمرهم شورى بينهم" (سورۂ شوری/ ۳۸)۔

۲- "وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا" (سورۂ اسراء/ ۳۴)۔

۳-''من لا یھتم بأمر المسلمین فلیس منھم ومن لم یصبح ویمسی ناصحا للہ ورسولہ ولکتابہ ولإمامہ ولعامۃ المسلمین فلیس منھم'' (الاوسط للطبرانی)۔

مخصوص حالات میں معاہدہ:

دفع مضرت اور جلب منفعت کے اصول کے تحت حالات اور مصالح کے تقاضے کی رعایت کرتے ہوئے معاہدے یا حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا، اور جو پارٹیاں متعصب، اسلام دشمن اور مسلم مخالف نہ ہوں صرف ان ہی کے ساتھ معاہدے کئے جائیں گے (دیکھئے: مقالہ مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مفتی محمد رفیع عثمانی، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا عبدالرشید قاسمی) لیکن مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب کا کہنا ہے کہ معاہدہ نہ کرکے صرف شرکت یا حمایت کی پالیسی اختیار کی جائے، جبکہ مفتی رفیع عثمانی اور مولانا محمد اقبال قاسمی یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ حمایت یا معاہدے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہ ہوں، اور نہ اس سے اسلامی عقائد پر کوئی زد پڑتی ہو (مولانا ابراہیم گجیا مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محی الدین غازی فلاحی)۔

۱- "لا ینھا کم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیار کم الخ" (سورۂ ممتحنہ/۸)۔

۲- ''فیکون ھذا من باب ارتکاب أخف الضررین'' (الفقہ الحنفی وأدلتہ للشیخ اسعد محمد سعید الصاعرجی ۱/ ۶۱)۔

۳- ''ان اللہ لیؤد ھذا الدین بالرجل الفاجر'' (الحدیث)۔

۴- مولانا محمد مصطفی قاسمی اور مولانا محمد اقبال قاسمی نے کفایت المفتی (۹/ ۳۹۲، ۴۰۱) اور بیان القرآن (جلد اول، سورۂ آل عمران/ ۲۸) کے حوالہ سے اس کے جواز کی رائے نقل کی ہے۔

غیر مسلموں سے تعاون لینے کے سلسلے میں مولانا محمد مصطفی قاسمی صاحب نے مختلف فقہاء کی آراء بھی نقل کی ہیں کہ ابن منذر، جوزجانی اسے مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیتے ہیں، امام احمد اور خرقی اسے جائز کہتے ہیں، امام شافعی اس کے جواز میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ غیر مسلم مسلمانوں کے حق میں اچھی رائے رکھتا ہو، امام مالک اور ان کے اصحاب غیر مسلم سے خدمت لینے کو جائز ومباح کہتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی رائے بھی تعاون اور خدمت لینے کے جواز کی ہے (المغنی ۱۰/ ۴۵۶، اعلاء السنن ۱۲/ ۵۱)۔

معاہدہ کا عدم جواز:

بعض مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ اسلام اور مسلم مخالف پارٹیوں سے معاہدہ کرنا یا ان کی حمایت کرنا درست نہیں ہے (مولانا برہان الدین سنبھلی، مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد مصطفی قاسمی وغیرہ)، مفتی رفیع عثمانی صاحب مزید یہ کہتے ہیں کہ اگر قیادت غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو تو اجتناب کرنا واجب ہوگا۔

۱-''ایھا الناس! اتقوا الظلم فانہ ظلمات یوم القیامۃ'' (مسلم ۲/ ۳۲۰، المسند ۲/ ۹۲، ۱۵۵، ۳/ ۳۲۳، تفسیر ابن کثیر ۶/ ۱۸۷، مرویات الامام احمد بن حنبل فی التفسیر ۲/ ۳۲۰)۔

۲- یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے۔

۳- "یا أیھا الذین آمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم الخ" (سورۂ آل عمران/ ۱۱۸)۔

۴- "یا أیھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاری أولیاء بعضھم أولیاء بعض ومن یتولھم منکم فإنہ منھم" (سورۂ مائدہ/ ۵۱)۔

۵- "لا یتخذ المومنون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین" (سورۂ آل عمران/ ۲۸)۔

ان آیات کے ضمن میں مفسرین نے لکھا ہے کہ غیر مسلموں سے موالاۃ کرنا اور مسلمانوں کے امور میں ان سے تعاون وحمایت لینا خاص طور سے دینی امور میں درست نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۳/ ۱۲۳، تفسیر ابوالسعود ۱/ ۲۲۶ بحوالہ جواہر الفقہ)۔

معاہدہ کی شرعی حیثیت:

سوال کے دوسرے شق کہ شرعی طور پر اس کی حیثیت کیا ہوگی تو اس سلسلہ میں چند ہی مقالہ نگار حضرات نے صراحت کے ساتھ اس کا جواب تحریر کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شرعاً اس کی حیثیت عہد اور معاہدہ کی ہوگی (مولانا امیر حسین جیلانی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، قاضی ہارون مینگل)، مولانا ابوسفیان مفتاحی

کے نزدیک اس کی حیثیت دفع مضرت کی ہے، اور مولانا جمیل احمد نذیری کا کہنا ہے کہ اس کی حیثیت صرف ایک مشورہ کی ہوگی، لیکن مولانا ثابت شمیم رشادی کے بقول اس کی حیثیت بس جائز کی ہوگی، جیسا کہ ابن عربی کہتے ہیں:

''وعقد الصلح ليس بلازم للمسلمين وإنما جائز باتفاقهم'' (تفسیر ماجدی ۲/ ۲۱۰)

اور مولانا خورشید احمد اعظمی کا کہنا ہے کہ اہمیت وضرورت کے مطابق ہی اس کی شرعی حیثیت متعین کی جائے گی، اور مولانا اسعد قاسم صاحب اس ضمن میں کہتے ہیں کہ معاہدہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس کو شرعی رنگ دینا یا مقتدی شخصیات کا اس میں شریک ہونا درست نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱ (ھ) امر بالمعروف ونہی عن المنکر، عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ کام کرنا:

اس سوال کے ضمن میں تقریباً تمام ہی حضرات نے کہا ہے کہ ان امور کو انجام دینے کے لئے غیر مسلموں کے تعاون اور ان کے اشتراک کے ساتھ کام کیا جا سکتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ادارے اور تنظیمیں بھی قائم کی جا سکتی ہیں، ان حضرات نے درج ذیل دلائل دیئے ہیں، اور خاص طور پر تعاون علی البر اور حلف الفضول کے واقعہ سے استدلال کیا ہے:

"كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر" (سورۂ آل عمران/ ۱۱۰)

(مقالہ مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

"إنما المؤمنون أخوة فأصلحوا بين أخويكم" (سورۂ حجرات/ ۱۰) (مقالہ مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

"ان الله يأمر بالعدل والاحسان وإيتاء ذى القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر والبغى" (سورۂ نحل/ ۹۰) (مقالہ مولانا محمد اقبال قاسمی)۔

''والذى نفسى بيده لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليوشكن الله أن يبعث عليكم عقابا منه ثم تدعونه فلا يستجاب لكم'' (ترمذی ۲/ ۴۰) (مقالہ مولانا ثابت شمیم رشادی)۔

''انصر أخاك ظالما أو مظلومًا'' (مقالہ مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

"تعاونوا على البر والتقوى" (سورۂ مائدہ: ۲) (مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا شمس الدین، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی)۔

مولانا عبد الرشید قاسمی اور مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی برّ (نیکی) میں انسانیت کے نفع کے لئے جتنے کام ہو سکتے ہیں ان سب کو شامل کیا ہے۔

اور مولانا ابوسفیان مفتاحی نے اس حدیث کو دلیل بنایا ہے: ''إن الله يؤيد هذا الدين بقوم لا خلاق لهم''۔

بعض حضرات نے حلف الفضول کے واقعہ سے بھی استدلال کیا ہے، اور کہا ہے کہ سوال میں جن امور کا تذکرہ کیا گیا ہے حلف الفضول کے مقاصد بھی قریب قریب وہی تھے، مولانا راشد حسین ندوی اس کی عبارت یوں نقل کرتے ہیں:

''وشهد رسول الله ﷺ حلف الفضول (إلى) وتعاقدوا وتعاهدوا بالله ليكونن يدا واحدة مع المظلوم على الظالم حتى يؤدى حقه (إلى) لقد شهدت فى دار عبد الله بن جدعان حلفا لودعيت به فى الاسلام لأجبت. تحالفوا أن يردوا الفضول على أهلها وأن لايعز الظالم مظلوما'' (سیرت ابن کثیر ۱/ ۲۵۹، ۲۵۷)

(مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

مولانا محمد ارشاد قاسمی نے ان امور کو مکارم اخلاق سے متعلق قرار دیا اور کہا کہ اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

۱- ''إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق'' (شعب الايمان للبيهقى ۶/ ۲۳۱، مستدرك حاكم ۲/ ۶۱۳، مكارم ابن ابى الدنيا/ ۲۰۰)۔

۲- حضرت جابر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے مجھے عمدہ اخلاق اور کامل درجہ کے عمدہ افعال کے لئے بھیجا ہے (شعب الایمان للبیہقی ۶/ ۲۳۱)۔

۳- عبداللہ بن مبارکؒ سے مروی ہے کہ لوگوں سے کشادہ روئی سے ملنا، بھلائی کا معاملہ کرنا، تکلیف دہ امور سے بچانا۔

انہوں نے مزید کہا کہ یہ تعاون صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام انسانوں حتی کہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی بہتر برتاؤ اور تعاون کا حکم ہے:

۴-"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خالق الناس بخلق حسن" (ترمذی ۲/ ۱۹)۔

۵-"قال رسول الله ﷺ: الخلق عيال الله فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله" (مشكوة: ۴۲۵، بیہقی فی شعب الایمان)

۶-امام بخاری نے "باب صلة الوالد المشرك" اور "باب صلة الاخ المشرك" کا عنوان قائم کر کے اس کی طرف اشارہ کیا کہ کافر غیر مسلم کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک اور بھلائی کا برتاؤ کیا جائے گا۔

۷-"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم..." (سورۂ ممتحنہ/ ۹)

(مقالہ مولانا برہان الدین سنبھلی، قاضی محمد ہارون مینگل، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

اور آپ ﷺ نے بذات خود بھی کافروں کی مدد اور ان کی اعانت فرمائی ہے، مولانا محمد ارشاد قاسمی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

۱-حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ قریش (کفار مکہ) کو سخت قحط کا سامنا کرنا پڑا تو آپ ﷺ نے سونے کی گٹھلیاں ابوسفیان کو بھیجیں کہ وہ اپنی قوم کے درمیان تقسیم کردیں، جب سفیان کو یہ پہنچا تو اس نے کہا: محمد ﷺ کے پاس بہترین اخلاق ہی تو ہیں (مکارم ابن ابی الدنیا/ ۲۵۸)۔

۲-علامہ شامی لکھتے ہیں: "ان النبي ﷺ بعث خمسمائة دينار إلى مكة حين قحطوا وأمر بدفعها إلى أبي سفيان وصفوان بن أمية ليفرقا على فقراء أهل مكة" (شامی ۲/ ۳۵۳)۔

۳-امام محمد نے السیر الکبیر میں لکھا ہے: "لا بأس للمسلم أن يعطي كافرا حربيا أو ذميا."

اس پر علامہ شامی لکھتے ہیں: "ولأن صلة الرحم محمودة في كل دين والاهداء إلى الغير من مكارم الاخلاق" (۲/ ۳۵۳)۔

مولانا سید قدرت اللہ باقوی کا کہنا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون اور اشتراک اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ دونوں کا مقصد مشترک ہو، اور دلیل میں آیت: "تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم" پیش کرتے ہیں۔

مولانا محمد ارشد مدنی لکھتے ہیں کہ مدینہ میں مسلمانوں کے قریب ترین پڑوسی یہودی تھے جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے ایک معاہدہ کیا تھا، اس معاہدہ کی دفعات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں امن وامان اور عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے اپنے ملک اور پڑوس میں رہنے والے غیر مسلم برادران وطن سے، بہت حد تک تعاون لیا جاسکتا ہے، بلکہ مشترکہ طور پر یہ ذمہ داری اگر انجام دی جائے تو اس کے اثرات اچھے ہوں گے۔

اور مفتی حبیب اللہ قاسمی اور مولانا ابوبکر قاسمی نے آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک کو دلیل بنایا ہے۔

مولانا ابوبکر قاسمی نے یہ دلائل پیش کئے ہیں:

۱-کتب سیر میں منقول ہے کہ جب حضور ﷺ مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ نے مدینہ کے یہود سے معاہدہ کیا اور اس معاہدہ میں یہ عہد نامہ بھی تھا کہ

"وان بينهم النصر على من دهم يثرب" (سيرة ابن ہشام ۲/ ۱۱۹)۔

۲-واقدیؒ نے مغازی میں نقل کیا ہے کہ

"خرج رسول الله ﷺ بعشرة من يهود المدينة غزا بهم أهل خيبر" (نصب الرایہ ۳/ ۴۲۲)۔

۳-"روى الشافعي في مسنده عن ابن عباس أن النبي ﷺ استعان بناس من اليهود في حربه"۔

۴-غزوہ بدر سے پہلے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "لن استعين بمشرك" لیکن پھر غزوہ بدر کے بعد آپ ﷺ کو کفار سے استعانت کی اجازت و رخصت دے دی گئی تھی (ردالمحتار ۳/ ۲۵۷)۔

۵-ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں ذکر کیا ہے کہ حضرت صفوان نے غزوۂ حنین میں جبکہ وہ کافر تھے شرکت کی اور تعاون کیا تو کفار قریش نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تم محمد کے ساتھ مل کر جنگ کرتے ہو حالانکہ تم ان کے دین پر عمل پیرا نہیں ہو، تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ ہاں قبیلہ قریش کا رب ہوازن کے رب سے

بہتر ہے۔

۶- علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے:

''وھل یستعان بالکافر عندنا إذا دعت الحاجة جاز وھو قول الشافعی''۔

۷- علامہ کاسانی نے کفار سے قتال کے لئے کافروں سے مدد لینے کو بوقت ضرورت جائز لکھا ہے (بدائع الصنائع ۷/ ۱۰۱)۔

نیز ائمہ اربعہ نے بھی باتفاق رائے بوقت ضرورت کفار ومشرکین سے مدد لینے کو جائز لکھا ہے۔

مولانا محمد مصطفی قاسمی اور مفتی عبد الرحیم قاسمی کے بقول باہمی صلح وآشتی کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی عزت برقرار رکھتے ہوئے اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے، اور انہوں نے کفایت المفتی (۹/ ۳۹۳، ۴۴۵) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تمام محکموں میں اور تجارت، صنعت اور زراعت میں اپنے دین وایمان کی حفاظت کے ساتھ شرکت مباح ہے۔

کچھ قیود کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اجازت:

بعض مقالہ نگار حضرات نے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کرنے اور ادارے یا تنظیمیں بنانے کی اجازت تو دی ہے لیکن کچھ امور کو ملحوظ رکھے جانے کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً مولانا محی الدین غازی فلاحی دو امور کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں:

۱- بہتر یہ ہے کہ اس نوعیت کے کام بھی مسلم تنظیمیں یا افراد مستقل طور سے مسلم شناخت کے ساتھ انجام دیں تا کہ اس کا کریڈٹ براہ راست اسلام اور مسلمانوں کو ملے۔

۲- یا ان تنظیموں اور اداروں پر بالادستی اور کنٹرول باشعور مسلمانوں کا ہو تا کہ ان اداروں کو دوسرے مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکے۔

سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی اس حدیث: ۔''أخرج الامام احمد و ابوداؤد والنسائی وابن حبان والحاکم عن انس بن مالك أن النبی ﷺ قال: جاھدوا المشرکین بأموالکم وأنفسکم وألسنتکم'' (الفقہ الاسلامی ۳/ ۲۰۱۴) کے ضمن میں کہتے ہیں کہ واضح بات ہے کہ استمالت قلبی کے لئے مالی امداد ہوگی، اگر تنظیمیں ہیں تو ان سے تعاون ہوگا اور انسانیت کی بہبود کے لئے آگے بڑھنا ہوگا، مسلمان حکومتوں میں ذمیوں سے مل کر مسلمان ایسے سارے معاملات کرتے رہے ہیں تو کافر حکومت کے تحت اسلامی مصلحتوں کے لئے ایسا کرنا بہتر واولی ہوگا۔

علامہ زحیلی کے حوالہ سے یہاں تک وہ کہتے ہیں کہ انسانیت کی فلاح کے لئے ہم اپنے صدقات تک غیر مسلموں کو دے سکتے ہیں:

''وتحل الصدقة أیضا علی فاسق وکافر من یہود و نصرانی أو مجوسی ذمی أو حربی'' (الفقہ الاسلامی ۲/ ۲۰۵۲)

صاحب کتاب نے مسئلہ کی وضاحت کے لئے اس آیت کو دلیل بنائی ہے: ''ویطعمون الطعام علی حبه مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا''۔

مسکین اور یتیم تو مسلمان معاشرے میں موجود تھے، لیکن اسیر سے مراد تو بقول مصنف اس دور میں صرف غیر مسلم جنگی ہی ہوسکتا ہے۔

مختلف رفاہی، انسانی اور معاشرتی مسائل میں غیر مسلموں سے تعاون کے سلسلہ میں علامہ زحیلی کی ایک اور عبارت انہوں نے نقل کی ہے:

''والخلاصة أن الاسلام لایتوانی لحظة واحدة عن سعیه لإقامة علاقات طیبة مع غیر المسلمین لتحقیق التعاون البناء فی سبیل الخیر والعدل والبر والامن وحمایة الحرمات ونحوذلك'' (الفقہ الاسلامی ۸/ ۶۴۲۱)۔

اس سب کے ساتھ وہ اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ آپ اپنی انفرادیت اور تشخص کو قائم رکھیں، اکثریت میں جذب نہ ہوجائیں۔

جبکہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ نہ صرف یہ کہ تعاون کرنا ضروری ہے بلکہ علماء وقائدین کو اس میں پہل کرنی چاہئے اس لئے کہ یہ مسلمانوں اور اسلام کی اچھی شبیہ پیش کرنے کا ذریعہ بنیں گی لیکن شرط یہ ہے کہ طریقہ کار اسلام کے خلاف نہ ہو اور نہ اس سے اسلامی مفادات کو کوئی نقصان پہنچے۔

(مولانا ابو العاص وحیدی، مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا شمس الدین، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا ظفر عالم ندوی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا عبید اللہ اسعدی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا محمد ارشاد قاسمی)۔

اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حتی الامکان مسلمانوں کو خود ہی یہ فرائض انجام دینے چاہئیں اور مسلمان خود ہی اس قسم کے اپنے ادارے اور تنظیمیں قائم کریں اور اگر غیر مسلموں کو بھی بوقت ضرورت شریک کرلیں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اختیارات اور فیصلے کا حق مسلمانوں کے پاس ہی رہنے چاہئیں (مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا عامر ظفر، مفتی محمد سلمان کھلی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا عبید اللہ، مفتی رفیع عثمانی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عامر ظفر، سید امیر حسین جیلانی وغیرہ)۔

مفتی عبدالرحیم قاسمی لکھتے ہیں کہ کفار کے ساتھ ان کے مذہب کی پسندیدگی کے لحاظ سے دوستی اور محبت رکھنا تو حرام ہے لیکن محض یکجائی سکونت اور ہمسائیگی کے طور پر یا تمدنی اور معاشرتی ضرورتوں کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا، بات چیت کرنا، ان کے ساتھ بیع وشراء کرنا، ہدیہ دینا اور ہدیہ قبول کرنا یہ سب جائز اور مباح ہے (کفایت المفتی ۹/ ۲۷۲)، اور امیر حسین جیلانی کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان قلیل ہیں اور سیاسی لحاظ سے کمزور ہیں تو عذر مجبوری ہے:

۱-"ومن يفعل ذلك فليس من الله في شئ إلا أن تتقوا منهم تقاة" (سورۂ آل عمران/ ۲۷)۔

۲-"وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم..." (سورۂ انعام/ ۱۱۹)۔

۳-ہدایہ میں ہے: ''إذا رأى الامام أن يصالح أهل الحرب أو فريقا منهم وكان ذلك مصلحة للمسلمين فلا بأس به''۔

ان سب رایوں کے برعکس مولانا اسعد قاسم سنبھلی اپنی ایک الگ رائے رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ معروف ومنکر خالص شرعی اصطلاحیں ہیں جن کے امر ونہی کی ذمہ داری قرآن نے ہر جگہ اہل ایمان پر ڈالی ہے، یہ اس وقت ہی ممکن ہے جبکہ مسلمانوں کو اختیارات حاصل ہوں، اور قانون زیادہ نہیں تو ایک حد تک ان کی پشت پر ہو، اور یہ پوزیشن ہمیں اس وقت حاصل نہیں، پھر یہاں عدل وانصاف کا قیام ہماری ذمہ داری بھی نہیں، اس لئے ایسے ادارے قائم کرنا اور ان میں شرکت کرنا درست نہیں، ہمیں یہ کام حسب سابق اپنے ہی طور پر کرنا چاہئے۔

اس سوال کے اندر لفظ "غیر مسلم بھائیوں" کے استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے کئی جگہ غیر مسلموں کو دوست بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اور بھائی بنانا تو دور کی بات ہے، اخوت کا رشتہ تو صرف اہل اسلام کے درمیان ہی ہوسکتا ہے، اس سلسلہ کی چند آیات یہ ہیں:

۱-"يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا عدوي وعدوكم أولياء تلقون إليهم بالمودة وقد كفروا بما جاء كم من الحق..." (سورۂ ممتحنہ/ ۱)۔

۲-"يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا الذين اتخذوا دينكم هزوا ولعبا من الذين أوتوا الكتاب من قبلكم والكفار أولياء" (المائدہ/ ۵۰)۔

۳-"يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض ومن يتولهم منكم فانه منهم" (سورۂ مائدہ/ ۵۱)۔

۴-"إنما المؤمنون إخوة" (سورۂ حجرات/ ۱۰)۔

سوال ۲-(الف): مسلمانوں کا مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا اور اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا:

تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے اپنی الگ آبادیاں بنانا یا مسلم اکثریتی علاقوں میں رہنا ہی بہتر ہے، مختلف حضرات نے اس کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں، اکثر حضرات نے ان احادیث وقواعد کو دلیل بنایا ہے:

۱-''أنا برئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله: لم؟ قال: لا تراءى ناراهما'' (ابوداؤد: کتاب الجهاد، باب/ ۹۵، نسائی: کتاب القسامه، باب/ ۲۷)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی اس حدیث کے ضمن میں کہتے ہیں کہ خطابی نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے:

''وقال بعضهم: معناه ان الله قد فرق بين داري الاسلام والكفر، فلا يجوز لمسلم أن يساكن الكفار في بلادهم'' (معالم السنن مع تهذيب ابن القيم ۳/ ۴۳۷)

اور علامہ سیوطی نے "النہایہ" کے حوالہ سے لکھا ہے:

''قال في النهاية أي يلزم المسلم ويجب عليه أن يتباعد منزله عن منزل المشرك'' (شرحه على النسائی ۸/ ۳۶)

اور ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے: ''ومنع رسول الله ﷺ من إقامة المسلم بين المشركين إذا قدر على الهجرة من

بينهم'' (زاد المعاد ۳/ ۱۲۲)۔

اور تقریباً یہی تفصیل مفتی عبدالرحیم قاسمی نے بھی ذکر کی ہے۔

۲''من جامع المشرك وسكن معه فانه مثله''۔

اس حدیث کے ضمن میں مولانا عبدالرشید قاسمی لکھتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ جوار اور تہذیب کا اثر پڑتا ہے، لیکن عرف عام میں موافقت دوسرے کی بات کی تائید اور اس کا طرز عمل اختیار کرنے کو کہتے ہیں، اب ارشاد نبوی کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص مشرکین کا ہم خیال اور ان کے طرز عمل اور بود و باش کو اختیار کرتا ہے اس کا شمار مشرکین میں ہوگا، اس مومن کا شمار نہیں ہوگا جو دعوت اسلامی اور تعلیمات نبوی کی تبلیغ کے لئے مشرکین کے مابین رہائش اختیار کرتا ہے۔

۳-''لا تساكنوا المشركين ولا تجامعوهم''۔

۴-''لا تتركوا الذرية يعني بإزاء العدو'' (مراسیل ابی داؤد/ ص۱۵)۔

۵-''دفع المضرة أولى من جلب المنفعة''۔

۶-''درء المفاسد أولى من جلب المصالح''۔

۷-''إذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبًا'' (الاشباہ والنظائر/ ۱۴۷)۔

مولانا محمد ارشاد قاسمی نے حضرت جریر بن عبداللہ البجلی کی روایت سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مشرکین کے ساتھ بود و باش اختیار کرے اس کا ذمہ خدا سے بری ہے۔ اسی طرح وہ اس حدیث کو بھی بطور استدلال پیش کرتے ہیں:

''عن عمر قال قال رسول الله ﷺ: لاتجالسوا أهل القدر ولاتفاتحوهم'' (مشکوۃ/ ۲۲)

کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرقہ قدریہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور میل ملاپ سے منع فرمایا تو کفار و مشرکین کے ساتھ بدرجہ اولی ممنوع ہوں گے۔

بعض حضرات نے یہ وجوہات بیان کی ہیں کہ مخلوط آبادی میں رہائش سے امید و نفع کم اور مضرت و خطرات زیادہ ہیں اور مزید یہ کہ غیر مسلموں کی تہذیبی اثرات سے نئی نسل کا متاثر ہو جانا بھی یقینی ہے اور اس کا اثر عقائد و عادات اور رسم و رواج پر بھی پڑے گا لہذا غیر مسلم اکثریتی آبادی سے اجتناب واحتیاط ضروری ہے اور اپنی الگ مستقل آبادیاں بسانا یا مسلم اکثریتی علاقوں میں سکونت اختیار کرنا بہتر ہے۔ (مولانا عبیداللہ اسعدی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا نیاز احمد مدنی، سید قدرت اللہ باقوی، مفتی محمد سلمان کھلی، مولانا عامر ظفر، مولانا محمد عبیداللہ، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا تنظیم عالم قاسمی)۔

مفتی جمیل احمد نذیری نے امداد المفتیین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس میں بھی ایسا کرنے کو برا کہا گیا ہے (فتاوی دار العلوم دیوبند مع امداد المفتیین ۱/ ۵۰)۔

مولانا قمر الزماں ندوی نے بھی مولانا عتیق احمد بستوی کے حوالہ سے اسی طرح کی رائے نقل کی ہے (بحث ونظر: شمارہ/ ۵۲/ص ۳۸)۔

مولانا محمد مصطفی قاسمی نے اس تجویز کی عبارت کو بھی بطور حوالہ پیش کیا ہے جو''غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں کے مسائل'' کے موضوع پر کل ہند مجلس تعمیر ملت کے تحت حیدرآباد میں ۱۶/ ۱۸/ جون ۲۰۰۰ء کو ہونے والے سمینار میں متفقہ طور پر پاس کی گئی تھی۔

اور مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد مصطفی قاسمی اور مولانا محمد ارشاد قاسمی نے شامی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مسلمان اگر اپنی علاحدہ آبادیاں بسائیں تو غیر مسلموں کے لئے بھی دروازہ کھلا رکھیں لیکن اسی حد تک کہ ان کا غلبہ نہ ہو جائے تا کہ وہ دین کے محاسن اور خوبیوں سے واقف ہو سکیں اور ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں وہ ایمان لے آئیں۔

اور مولانا محمد صادق مبارکپوری نے اسی مفہوم کی عبارت عالمگیری (۲/ ۲۵۲) کے حوالہ سے نقل کی ہے اور یہی رائے مولانا سلطان احمد اصلاحی کی بھی ہے۔

حالات کے تحت رہائش اختیار کرنا:

لیکن بعض دوسرے مقالہ نگار حضرات نے غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ ملکی حالات اور آئے دن ہونے والے فسادات سے ہونے والے جانی و مالی نقصانات کو بھی وجہ قرار دیا ہے، لہٰذا ان کا کہنا ہے کہ مسلمان اپنی الگ کالونیاں بنائیں اور بستیاں بسائیں یا کثیر مسلم آبادی والے علاقوں میں رہیں تا کہ غیر مسلموں کے غلط اثرات سے بھی محفوظ رہ سکیں اور فسادات کے موقع پر اجتماعی قوت کے ذریعہ اپنا دفاع بھی کر سکیں (مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا ابراہم گجیا فلاحی، مولانا شمس الدین، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی)۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی کہتے ہیں کہ مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا یا اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا یہ دونوں باتیں اس شہر کے مخصوص حالات اور ماحول پر منحصر ہیں، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بہتر یہی ہے کہ مسلمان اپنی علاحدہ کالونیاں بنا کر رہیں اور تقریباً یہی رائے سید خورشید حسن رضوی کی بھی ہے۔

جبکہ مولانا ثابت شمیم رشادی کا کہنا ہے کہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں جہاں غیر مسلم اقوام کی اکثریت ہے اور حکومت کے مختلف محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز بعض افراد فسادات کے موقع پر بجلی یا پانی کی سپلائی بند کر کے مزید تکلیف سے دوچار کرتے ہیں، مخلوط آبادی میں اس تکلیف سے محفوظ رہا جاسکتا ہے، لہٰذا اگر حالات مناسب ہوں اور ذکر کردہ مسائل پیش نہ آتے ہوں تو علاحدہ آبادی مناسب ہوگی ورنہ مخلوط آبادی ہی بہتر ہے۔

اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کے بقول یہ اسی صورت میں جبکہ مخلوط آبادی میں مسلمانوں کا گھر اکا دکا ہو اور ناموافق حالات میں جان و مال کا یقینی خطرہ ہو تو اس طرح کی صورتحال میں بادل ناخواستہ بھی مسلمان کا وہاں سے ہٹ جانا مناسب اور بہتر ہے جبکہ بعض حالات میں ایسا کرنا واجب ہوگا۔

دعوت الی الحق کی خاطر مخلوط آبادی میں رہائش اختیار کرنا:

بعض حضرات کہتے ہیں کہ او پر مذکورہ مقاصد کی خاطر مسلمانوں کے لئے اپنی علاحدہ بستیاں بسانا تو بہتر ہے لیکن اگر مقصد مخلوط آبادی میں رہ کر دین کی نشر و اشاعت اور اسلامی اخلاق و آداب سے متاثر کرنا اور دعوت الی الحق ہو تو غیر مسلموں پر مشتمل مخلوط آبادی میں ہی سکونت اختیار کرنا بہتر ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اپنے دین و ایمان کی پختگی، عقائد و اعمال کی سلامتی اور اسلامی شعائر کی بجا آوری میں کوئی پریشانی نہ ہو تو ایسی صورت میں مخلوط آبادی میں سکونت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا سید امیر حسین جیلانی، ڈاکٹر یوسف قاسم، مولانا برہان الدین سنبھلی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد صادق، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی وغیرہ)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی کے بقول اگر علاحدہ رہنا ممکن نہ ہو اور سرکاری و قانونی کوئی رکاوٹ ہو تو مخلوط آبادی میں اس نیت سے رہائش بہتر ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلامی اخلاق و کردار کے ذریعہ متاثر کرسکیں، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عطاء اللہ قاسمی کے نزدیک خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے مخلوط آبادی میں قیام پذیر رہنا مسلمانوں کے لئے جہاد عظیم ہے، اسی کو ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی خاموش جہاد کا نام دیتے ہیں۔

مولانا عبدالرشید قاسمی مزید لکھتے ہیں کہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بھی اسی کے قائل اور داعی رہے (کاروان زندگی ۷/ ۲۶۰)۔

مولانا ابوبکر قاسمی نے مولانا تقی عثمانی کے حوالہ سے غیر مسلموں کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی پانچ صورتیں لکھی ہیں، جن میں سے تین صورتوں میں رہائش اختیار کرنا جائز اور دو صورتوں میں ناجائز ہے، جواز کی صورتوں میں سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی میں جان و مال کو تحفظ حاصل نہ ہو، اور ہر وقت بلا کسی جرم کے گرفتار ہو جانے، یا قتل کر دیئے جانے کا شدید خطرہ ہو، اور غیر مسلموں کی مخلوط آبادی میں رہائش اختیار کرنے کے علاوہ بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی آبادی میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں، اس کے برعکس غیر مسلموں کی آبادی میں رہنے سے جائز ملازمت مل جائے، گویا کسی مسلمان کو حلال روزی کے حصول کی خاطر غیر مسلموں کی آبادی میں رہنا پڑ جائے، اور تیسرے یہ کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے اور ان کو مسلمان بنانے کی نیت سے یا جو مسلمان پہلے سے غیر مسلموں کے ساتھ مقیم ہیں ان کو دین اسلام پر جمے رہنے کی تلقین کرنے کی غرض سے رہائش اختیار کی جائے۔

لیکن یہ تینوں صورتیں اس وقت جائز ہیں جبکہ ان میں دو شرطیں پائی جائیں: ایک یہ کہ احکام اسلام پر پورے طور سے کاربند رہے، اور دوسرے یہ کہ مروجہ

منکرات وفواحش سے بالکل محفوظ رہے۔

عدم جواز کی صورتوں میں سے یہ ہے کہ بقدر کفاف معاشی وسائل ہونے کے باوجود خوشحالی وخوش عیشی کی نیت سے غیر مسلموں کے ساتھ رہائش اختیار کی جائے، اور دوسرے یہ کہ سماج وسوسائٹی میں معزز بننے یا دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار یا اپنی عملی زندگی میں غیر مسلموں کا طرز اختیار کر کے ان جیسا بننے کی نیت سے رہائش اختیار کی جائے، تو شرعاً یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔

مولانا محی الدین غازی فلاحی کے بقول مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمان بااختیار ہیں اور جہاں چاہیں رہائش اختیار کرلیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان اس وقت مخلوط آبادی میں بھی اور علاحدہ آبادی میں بھی رہ رہے ہیں، اور اب فرقہ وارانہ منافرت کی وجہ سے بعض مسلمان علاحدہ آبادی کا رجحان قبول کررہے ہیں جبکہ بعض دوسرے مسلمان معاشی ضرورتوں اور دوسری سہولیات کی خاطر مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہو رہے ہیں، اور دونوں کے حق میں دلائل بھی ہیں:

مخلوط آبادی میں رہائش اختیار کرنے کے دلائل:

۱-مسلمان غیر مسلموں کو اخلاق وکردار سے متاثر کرسکیں گے۔

۲-دعوتی روابط بہ آسانی قائم کئے جاسکیں گے۔

۳-قومی کشمکش کا احساس کم ہوگا، ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع زیادہ ملیں گے۔

اور علاحدہ آبادیاں بسانے کے دلائل:

۱-غیر مسلم معاشرہ کے تہذیبی اثرات سے مسلمان محفوظ رہ سکیں گے۔

۲-تحفظ کا احساس قوی ہوگا۔

۳-اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی جانب پیش رفت آسان ہوگی۔

مزید لکھتے ہیں کہ جمہور کی رائے یہی تھی کہ مسلمان کے لئے دار الکفر چھوڑ دینا ہی مستحب ہے، خواہ اسے وہاں دینی آزادی میسر ہو (المبسوط ۱۰/ ۴۷، المجموع ۱۹/ ۲۶۲) اور فقہاء نے بھی ایک قاعدہ مرتب کیا: "نية الاستمرار في دار الكفر لا تحل بلا مبرر شرعي"، اور یہ حدیث: "أنا بريء ..." بھی اسی سیاق میں نقل کی جاتی ہے، لیکن زیر نظر مسئلہ اس سے بالکل الگ ہے، یہاں تو ان مسلمانوں کا مسئلہ ہے جو دار الکفر کے شہری ہیں اور ہجرت کے دروازے ان پر بند ہیں، لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ علاحدہ آبادی کی جانب حکمت کے ساتھ بتدریج پیش رفت ہو اور بامقصد طور سے ہو، دوسری جانب ہر دو آبادی کے مسلمان اپنا دینی اور دعوتی کردار ادا کرتے رہیں، ملک کے مسلمانوں کے حق میں دونوں صورتیں رحمت ثابت ہوسکتی ہیں اگر وہ اپنا نصب العین پیش نظر رکھیں۔

چنانچہ مفتی ذاکر حسن نعمانی نے کفری سماج میں مجبوراً ومقہوراً پھنس جانے والے مسلمان پر دو باتیں لازم قرار دی ہیں: ایک اسلامی اقدار کا انفرادی اور اجتماعی تحفظ، اور دوسرے دعوت وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دینا، اگر کوئی مسلمان مجبوراً معیشت، علاج یا تعلیم کی وجہ سے کفری سماج میں رہ رہا ہے تو وہ بھی اسلامی اقدار کی حفاظت کرے گا اور حتی الوسع دعوت وتبلیغ کے فریضہ کو جاری رکھے گا۔

سوال ۲-(ب): غیر مسلموں کی تعزیت، جلوس جنازہ میں شرکت اور ان کے لئے قرآن خوانی کا حکم:

اس سوال میں تین شقیں ہیں: ایک تو یہ کہ کسی مسلمان کا کسی غیر مسلم کے جنازہ میں شریک ہونا، دوسرے یہ کہ آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہنا، اور تیسرا یہ کہ غیر مسلم میتوں کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کرنا، ان سوالوں کے مختلف مقالہ نگار حضرات نے مختلف جوابات دیئے ہیں، تقریباً اکثر حضرات اس پر متفق ہیں کہ غیر مسلم کے جلوس جنازہ میں شریک ہوسکتے ہیں، اسی طرح اس کے گھر تعزیت اور پرسہ دینے کے لئے بھی جاسکتے ہیں، لیکن جب میت کو آگ لگائی جارہی ہو تو اس میں شریک نہ ہوں اور نہ اپنے ہاتھ سے اس کی چتا میں آگ لگائیں۔

(مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا نیاز احمد مدنی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا عبید اللہ اسعدی وغیرہ)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا شمس الدین، مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں کہ اگر اس کی آخری رسومات کو پورا کرنے والے اس کے ہم مذہب موجود ہوں گے تو مسلمان اس میں کوئی تعاون نہیں کریں گے الا یہ کہ وہ غیر مسلم اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہو۔

(شامی ۳/ ۱۳۴، نصب الرایہ ۲/ ۲۸۱، اعلاء السنن ۸/ ۲۸۲، التلخیص الحبیر ۱/ ۱۵۷)

اور جلوس جنازہ میں اس سے آگے یا کنارے دوری بنائے ہوئے شرکت کی جاسکتی ہے جس میں مسلمانوں کی انفرادیت اور اسلامی امتیاز کا تحفظ ہو۔

(مصنف عبدالرزاق ۶/ ۳۶)۔

جبکہ ڈاکٹر یوسف قاسم کا کہنا ہے کہ غیر مسلم کے جنازہ کو دیکھ کر کھڑا ہو جانا جائز ہے، اور حدیث سے ثابت ہے:

''إذا رأيتم الجنازة فقوموا فمن تبعها فلا يجلس حتى توضع'' (متفق عليه)

اس حدیث سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ غیر مسلم کے جنازہ کے پیچھے چلنا بھی جائز ہے۔

اور قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا ذاکر حسین شاہ سیالوی اور مولانا سید قدرت اللہ باقوی کے بقول اگر اس سے کوئی ناجائز اور شرکیہ فعل یا بات نہ کرائی جائے تو شرکت کر سکتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کی تدفین کے متعلق حضرت علیؓ سے فرمایا: جاؤ اپنے باپ کو دفن کرو، حضرت علیؓ نے عرض کیا: وہ مشرک اور ہدایت سے محروم تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ اور اپنے باپ کو دفن کرو (نصب الرایہ ۲/ ۲۸۱)۔

مولانا محمد ارشد مدنی اس روایت کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ جب ایک مسلمان غیر مسلم میت کو دفنا سکتا ہے تو پھر وہ وہاں رہ کیوں نہیں سکتا لیکن مولانا ابوالعاص وحیدی کی رائے یہ ہے کہ آخری رسومات کے وقت میت کے پاس نہیں رہ سکتے، امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ کسی یہودی یا نصرانی کا انتقال ہو جائے تو اس کی مسلمان اولاد سواری پر جنازہ کے آگے چلے اور دفن کے وقت واپس ہو جائے، انہوں نے یہ بات حضرت عمر کے ایک فتوی کے پیش نظر کہی ہے (المغنی ۳/ ۴۶۶)۔

لیکن اس ضمن میں مولانا تنظیم عالم قاسمی کا کہنا ہے کہ جلوس جنازہ میں شرکت کے جواز کے لئے جو لوگ حضرت علی والے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں وہ درست نہیں، چونکہ ابو طالب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ساری مصیبتوں کو برداشت کیا تھا، خاندان اور پھر لا متناہی احسان کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی فریضہ تھا کہ کفن دفن کا انتظام کریں، اس لئے حضرت علی کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی، محل غور بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شرکت نہیں کی بلکہ اس فریضہ کو نبھانے کے لئے دوسرے کے حوالہ کر دیا، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم شرکت کے ذریعہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور حضرت علی کے حوالہ کر کے اپنے اخلاقی فریضہ کی تکمیل کی۔

جبکہ مولانا سلطان احمد اصلاحی نے حضرت علیؓ کے واقعہ کو ''البدایہ والنہایہ لابن کثیر'' (۲/ ۱۲۳) کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ الفاظ: ''اذهب فواره'' کے ظاہر کا تقاضہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے ساتھ اپنے مشرک چچا کی تدفین کے لئے نہیں گئے، البتہ آگے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں ہے: ''أن النبي ﷺ عاد من جنازة أبي طالب'' جس سے یہ لگتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازہ کے ساتھ گئے، لیکن آگے یہ بھی صراحت ہے: ''ولم يقم على قبره'' دونوں کے درمیان تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں گئے اور دور سے ہی واپس آگئے۔

پھر آگے انہوں نے نصرانی کی عیادت اور اس کے جنازہ کی مشایعت کی بابت علامہ ابن تیمیہ کی یہ عبارت نقل کی ہے:

''لا يتبع جنازته، أما عيادته فلا بأس بها، فانه قد يكون فى ذلك مصلحة لتأليفه على الاسلام. فإذا مات كافرا فقد وجبت له النار ولهذا لا يصلى عليه'' (فتاوى ابن تيميه ۲۴/ ۲۶۵)۔

جواز کے دلائل:

غیر مسلم کے جلوس جنازہ میں شرکت اور اس کی آخری رسومات کے وقت موجود رہنے کے جواز کے قائلین کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- مشہور تابعی مکحول کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کے جنازہ میں شرکت کی تھی، کنارے کنارے چلے، ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، فرمایا: رشتہ نے آپ کو مجھ سے جوڑ دیا ہے، ان کی قبر پر آپ کھڑے نہیں ہوئے (مصنف عبدالرزاق ۶/ ۳۸)۔

۲-امام شعبی کہتے ہیں کہ حارث بن ابی ربیعہ کی والدہ نصرانی تھیں، ان کا انتقال ہوا تو (بعض) صحابہ نے ان کے جنازہ کی مشایعت کی (مصنف عبدالرزاق ۶/۳۶)

۳-عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں: ''إن کانت قرابة قریبة بین مسلم و کافر فلیتبع جنازته'' (مصنف عبد الرزاق ۶/۳۶)۔

۴-ابووائل کہتے ہیں کہ میری ماں کا انتقال ہوا، وہ نصرانیہ تھیں، میں نے حضرت عمرؓ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا: جب اس کا جنازہ روانہ ہو تو تم سواری پر آگے آگے چلو۔

۵-حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے، وہ نصرانیہ تھیں، کیا اس کی تدفین میں شریک ہوسکتا ہوں، انہوں نے جواب دیا کہ جنازہ کے آگے چلو، اس لئے کہ تم (دینی لحاظ سے) اس کے ساتھ نہیں ہو (مصنف عبدالرزاق ۶/۳۷)۔

۶-قتادہ کہتے ہیں کہ مسلمان کافر کے جنازہ کے پیچھے چلے گا اور کنارے رہے گا، اس سے قریب نہیں ہوگا (مصنف عبدالرزاق ۶/۳۷) (مقالہ مولانا محمد ارشد مدنی)۔

مولانا اختر امام عادل صاحب نے اس ضمن میں ایک روایت دار قطنی کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور اپنی نصرانی ماں کی موت کی خبر سنائی اور عرض کیا کہ میں اس کے جنازہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ارکب دابتك وسر أمامها فانك إذا کنت أمامها لم تکن معها''

آگے لکھتے ہیں کہ امام احمد کا نقطۂ نظر اسی حدیث کے مطابق ہے کہ غیر مسلم رشتہ دار کی موت میں شرکت جائز نہیں، لیکن علامہ زیلعی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے (نصب الرایہ ۲/۲۸۱)۔

۸-حضرت ابن عباس کا قول ہے: ''وما علیه لو اتبعها'' (مصنف عبدالرزاق ۶/۴۰)۔

۹-اس مسئلہ کی تفصیل "من فقه الاقلیات المسلمة لخالد محمد عبد القادر" (ص/۱۱۸، ۱۱۹) میں موجود ہے، جس میں ہے کہ غیر مسلم کے جلوس جنازہ میں شرکت کرسکتے ہیں، حنفیہ اور شافعیہ کی رائے یہی ہے لیکن مالکیہ اور حنابلہ کی رائے اس کے برخلاف ہے (المغنی ۲/۳۱۵، البیان والتحصیل ۲/۲۴۸، الفتاوی الهندیه ۱/۱۶۳، المجموع ۵/۱۵۳)۔

۱۰-''ولا بأس بعیادة الیهود والنصرانی لانه نوع بر فی حقهم وما نهینا عن ذلك، وصح أن النبی ﷺ عاد یهودیا مرض بجواره'' (ہدایہ ۴/۴۷۴، ردالمحتار ۵/۲۴۰) (مقالہ قاضی محمد ہارون مینگل، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا شمس الدین، مولانا محمد یعقوب قاسمی)۔

۱۱-مسلمان غیر مسلم کی تعزیت کرے گا اور یہ الفاظ کہے گا: ''اعظم الله اجرک وصبرک'' یا "اخلفه الله علیك خیرا منه واصلحك" (درمختار ۵/۳۴۱، ردالمحتار ۱/۶۶۵) (مقالہ مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا شمس الدین، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا عبیداللہ، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل)۔

غیر مسلم کے جلوس جنازہ میں عدم شرکت کے قائلین:

درج ذیل مقالہ نگار حضرات کے نزدیک کسی صورت میں بھی جلوس جنازہ میں شرکت کرنا صحیح نہیں ہے، صرف غیر مسلم پڑوسی کی تعزیت کرلینے اور پرسہ دینے کے قائل ہیں:

مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا عبیداللہ، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا امیر حسین جیلانی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد صادق، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابراہیم گجیا، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی محمد سلمان کھلی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، سید خورشید حسن رضوی۔

یہ حضرات درج ذیل دلائل دیتے ہیں:

۱......"ولا تصل علی أحد منهم مات أبدا ولا تقم علی قبره" (سورۂ توبہ/۸۴)

(مقالہ مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا امیر حسین جیلانی،

مولانا اسعد قاسم، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی، مولانا اختر امام عادل)۔

مولانا راشد حسین ندوی کا عیادت وتعزیت سے متعلق کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے چچا ابوطالب اور ایک یہودی لڑکے کی عیادت کرنا ثابت ہے (زاد المعاد ۱/ ۴۹۴، بخاری: کتاب الجنائز) فقہی کتابوں میں بھی اس کو جائز قرار دیا گیا ہے (فتاوی ہندیہ ۵/ ۲۴۸)، اسی طرح کافر کی تعزیت کرنا بھی جائز ہے (ہندیہ ۵/ ۲۴۸، شامی ۵/ ۲۷۴)، اور جلوس جنازہ اور آخری رسومات میں شرکت کے تعلق سے کہتے ہیں کہ چونکہ اس میں شرکیہ افعال انجام دیئے جاتے ہیں، لہذا عام حالات میں ان امور میں شرکت مکروہ ہے (مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی)۔

مولانا محمد ارشاد قاسمی اس حدیث: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی کے جنازہ میں شرکت کی تھی، کے ضمن میں کہتے ہیں کہ اس سے ہنود کے جنازہ میں شرکت کے جواز کو ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے، اس کی چند وجوہ بیان کی ہیں:

۱- یہ کہ اہل کتاب کے ساتھ ابتداء میں موافقت کا حکم تھا بعد میں یہ حکم منسوخ ہوکر "خالفوهم" کا حکم ہوگیا۔

۲- اہل کتاب اور بت پرستوں کے معاملوں میں فرق ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے، بخلاف بت پرستوں کے۔

۳- اہل کتاب کے جنازہ میں سادگی کے ساتھ دفن کرنا ہوتا تھا، بخلاف ہنود کے کہ ان کے یہاں کافرانہ رسوم کے ساتھ جنازہ کو چتا میں ڈال کر جلانا ہوتا ہے، لہذا مسلمانوں کا ہندوؤں کے جنازہ میں شریک ہونا جائز نہیں ہے۔

مخصوص حالات میں شرکت کی اجازت:

مولانا سلطان احمد اصلاحی کہتے ہیں کہ جنازہ اور تدفین میں شریک نہیں ہوسکتا، البتہ مخصوص حالات میں "الضرورات تبيح المحظورات" کے تحت محدود دائرے میں اس کی اجازت دی جائے تو علاحدہ بات ہے۔ مولانا شمس الدین، مولانا محمد عبید اللہ، مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا ابوسفیان مفتاحی بھی ضرورت اور مصلحت کے تحت ہی شرکت کی اجازت دیتے ہیں۔

مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری لکھتے ہیں:

کسی مصلحت یا ضرورت سے غیر مسلموں سے ملنا جلنا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور انسانیت کے ناطے ان کا تعاون کرنا خاص کر جبکہ پڑوسی ہوں شرعاً جائز ہے، نیت اچھی اور اصلاح کی ہونی چاہئے، مداہنت کی صورت نہ ہو، البتہ ان کے مذہبی معاملات اور مذہبی رسومات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، لہذا کوئی کافر بیمار ہوگیا یا اس کے یہاں کسی کا انتقال ہوگیا تو اس کی عیادت اور تعزیت کرنا تو جائز ہے مگر میت اور جنازہ لے کر چلنا اور ان کے دیگر مذہبی رسومات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے (فتاوی رحیمیہ ۸/ ۱۸۰، احسن الفتاوی ۴/ ۲۳۳، منتخبات نظام الفتاوی ۲/ ۳۷۵)

(مقالہ مولانا راشد حسین ندوی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی)۔

اور تقریباً یہی باتیں مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا تنظیم عالم قاسمی وغیرہ نے (فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۳۴۵، جامع الفتاوی ۱/ ۵۰۴، امداد المفتین/ ۱۰۱۸، کفایت المفتی ۴/ ۱۹۱، نصاب الاحتساب/ ۱۱۰) کے حوالہ سے نقل کی ہیں۔

غیر مسلم میت کے لئے ایصال ثواب کرنا:

اس سوال کے تیسرے شق یعنی غیر مسلم میتوں کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کرنا یا ان کے لئے مغفرت کی دعا کرنا، کے سلسلہ میں تمام مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایسا کرنا حرام و ناجائز ہے، دلائل درج ذیل ہیں:

۱- "ولا تصل على أحد منهم مات أبدا ولا تقم على قبره إنهم كفروا بالله ورسوله وماتوا وهم فاسقون"

(مقالہ مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا اسرار الحق سبیلی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محمد اقبال قاسمی)۔

۲- "استغفر لهم أو لا تستغفر لهم إن تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم" (سورۂ توبہ/ ۸۰)

(مقالہ مولانا شمس الدین، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی)۔

بخاری میں ہے: ''عن ابن عمر قال لما توفی عبدالله بن أبي جاء ابنه عبدالله إلى رسول الله ﷺ فسأله أن يعطيه قميصه يكفن فيه أباه فأعطاه ثم سأله أن يصلي عليه فقام رسول الله ﷺ ليصلي فقام عمر فأخذ بثوب رسول الله ﷺ فقال يارسول الله تصلي عليه وقد نهاك ربك أن تصلي عليه فقال رسول الله ﷺ إنما خيرني الله فقال استغفرلهم أولا تستغفرلهم إن تستغفرلهم سبعين مرة فلن يغفرالله لهم وسأزيده على السبعين قال انه منافق قال فصلى عليه رسول الله ﷺ قال فأنزل الله: ولا تصل على أحد منهم مات أبدا ولا تقم على قبره'' (بخاری شریف ۲/ ۶۷۳) (مقالہ مفتی حبیب اللہ قاسمی)

مولانا اختر امام عادل نے اس واقعہ کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے نقل کیا ہے (متفق علیہ، مشکوۃ/ ۱۴۴)۔

۳- علامہ نووی لکھتے ہیں: ''الصلاة على الكافر والدعاء له بالمغفرة حرام بنص القرآن والاجماع'' (المجموع شرح المهذب ۵/ ۱۴۴) (مقالہ مولانا ابوالعاص وحیدی)۔

۴- "ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين ولو كانوا أولي قربى من بعد ما تبين لهم أنهم أصحاب الجحيم" (سورۂ توبہ/ ۱۱۳)

(مقالہ مولانا سید قدرت اللہ باقوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا عبیداللہ، مولانا محمد صادق، مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، سید امیر حسین جیلانی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی)۔

روح المعانی میں ہے: ''والآية على الصحيح نزلت في أبي طالب فقد أخرج أحمد وابن أبي شيبة والبخاري و مسلم والنسائي وابن جرير وابن المنذر والبيهقي في الدلائل وآخرون عن المسيب لما حضرت أبا طالب الوفاة'' (روح المعانی ۷/ ۴۷)۔

''فقد أخرج مسلم وأحمد وأبوداؤد و ابن ماجه والنسائي عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: أتى رسول الله ﷺ قبر أمه فبكى وأبكى من حوله فقال عليه الصلاة والسلام استاذنت ربي أن أستغفر لها فلم يأذن لي'' (روح المعانی ۷/ ۴۹)

(مقالہ مولانا راشد حسین ندوی)، مولانا محمد صادق مبارکپوری نے اس کا ذکر بحوالہ لباب النقول برحاشیہ جلالین/ ۱۸۰ کیا ہے، اور مولانا ابوبکر قاسمی نے بھی اپنے مقالہ میں اس کا ذکر بحوالہ حاشیہ جلالین/ ۱۶۷ کیا ہے، اور مفتی حبیب اللہ قاسمی نے اس کو قسطلانی علی ہامش بخاری ۲/ ۶۷۵ اور الکرمانی علی ہامش جلالین ۱/ ۱۶۷ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

بخاری میں ہے: ''عن سعيد بن المسيب عن أبيه قال لما حضرت أبا طالب الوفاة دخل عليه النبي ﷺ وعنده ابوجهل و عبدالله بن أبي أمية فقال النبي ﷺ: اى عم قل لا إله إلا الله أحاج لك بها عند الله فقال أبوجهل و عبدالله بن أبي أمية: يا أبا طالب أترغب عن ملة عبد المطلب فقال النبي ﷺ: لأستغفرن لك مالم أنه عنك فنزلت: ماكان للنبي... الخ'' (بخاری ۲/ ۶۷۵) (مقالہ مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

۵- "وما كان استغفار إبراهيم لأبيه إلا عن موعدة وعدها إياه فلما تبين له أنه عدو لله تبرأ منه" (سورۂ توبہ/ ۱۱۴)

(مقالہ مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

مولانا محمد ابوبکر قاسمی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے کافر باپ کے لئے مغفرت کی دعا کی تھی، تو اس کا جواب خود قرآن کی سورۂ توبہ/ ۱۱۴ میں موجود ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک ان پر اپنے والد کا کفر پر مرنا اور دشمن خدا ہونا ظاہر نہ تھا، اس وقت انہوں نے اپنے والد سے استغفار کا وعدہ کرلیا تھا اور مرنے کے بعد اس وعدہ کو پورا کیا تھا، لیکن جب ان پر اپنے والد کا جہنمی ہونا منکشف ہوگیا تو انہوں نے استغفار کرنا چھوڑ دیا...... اس سے معلوم ہوا کہ مردہ کافر کے لئے تو دعاء مغفرت جائز نہیں البتہ زندہ کافر کے لئے اسلام قبول کرنے کی توقع کی صورت میں دعائے مغفرت کی جاسکتی ہے۔

۷- مولانا محمد مصطفی قاسمی اور مولانا ابوبکر قاسمی نے اس ضمن میں حیدرآباد میں بتاریخ ۱۶، ۱۸ جون ۲۰۰۰ء بعنوان ''غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں کے مسائل'' کے تحت ہونے والے سمینار کی اس تجویز کا بھی ذکر کیا ہے: ''قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے، اور جو لوگ اس کتاب پر ایمان ہی نہ رکھتے ہوں ان کی میت پر قرآن مجید کی تلاوت اور ایصال ثواب کی نہ شریعت اسلامی اجازت دیتی ہے اور نہ عقلی اعتبار سے یہ بات قابل قبول ہے'' (ماہنامہ جامعۃ الرشاد/ ص ۳۶، شمارہ ۵، جلد ۴۰، نومبر

۲۰۰۰ء)۔

بعض حضرات نے فتاوی ہندیہ (۵ / ۳۸۴)، درمختار بحوالہ فتاوی محمودیہ (۹ / ۱۶۱)، کفایت المفتی (۹ / ۴۴۱) اور معارف القرآن (۶ / ۵۳) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کسی کافر کے لئے ایصال ثواب یا دعائے مغفرت جائز ہی نہیں ہے (دیکھئے: مقالہ مولانا محمد شمس الدین، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل)۔

غیر مسلم میت کے لئے قرآن خوانی کرنا ایک لغو عمل ہے اس کا ثواب ان کو پہنچ ہی نہیں سکتا، اور پھر یہ ایک طرح سے قرآن کی توہین کرنا ہے (دیکھئے: مقالہ مولانا محی الدین غازی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی وغیرہ)۔

سوال ۲-(ج): غیر مسلموں کی مذہبی وغیر مذہبی تقریبات کے تحفے قبول کرنا اور کھانا:

اس امر پر تمام مقالہ نگاران کا اتفاق ہے کہ بتوں پر چڑھائے ہوئے کھانے اور مٹھائیوں کا کھانا جسے پرشاد کہا جاتا ہے، جائز و درست نہیں ہے، اس لئے کہ بتوں پر چڑھانا تقرب إلی غیر اللہ ہے اور ایسا کرنا "ما أهل به لغير الله" میں داخل ہے (مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا شمس الدین، مولانا ابوسفیان مفتاحی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا محی الدین غازی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا سعید الرحمن فاروقی، مولانا محمد ارشد مدنی) بعض لوگوں کے نزدیک "وما ذبح على النصب" میں داخل ہے (مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی) البتہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو پرشاد کو قبول کرلے لیکن اسے کھائے نہیں بلکہ اسے کسی غیر مسلم کو دے دے یا ضائع کردے (مولانا عبید اللہ اسعدی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ظفر عالم ندوی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی)۔

دلائل درج ذیل ہیں:

۱- "انما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل به لغير الله" (سورۂ بقرہ/۱۷۳)

(مقالہ مولانا عبید اللہ، مولانا تنظیم عالم قاسمی)۔

۲- "قل لا أجد فيما أوحي إلي محرما على طاعم يطعمه إلا أن يكون ميتة أو دما مسفوحا أو لحم خنزير فانه رجس أو فسقا أهل لغير الله به فمن اضطر غير باغ ولا عاد فان ربك غفور رحيم" (سورۂ انعام/۱۴۶) (مقالہ مولانا محمد ارشد مدنی)۔

۳- "ما ذبح على النصب" میں جس طرح چڑھاوے کا جانور حرام ہے اسی طرح چڑھاوے کی چیزیں بھی حرام ہیں، چونکہ تعظیم نصب کی علت میں یہ بھی شریک و داخل ہے، جیسا کہ الجامع لاحکام القران (۵ / ۶۰) میں قرطبی لکھتے ہیں:

"وما ذبح على النصب... والنية فيها تعظيم النصب لا ان الذبح عليها غير جائز" (مقالہ مولانا محمد ارشاد قاسمی)۔

۴- "حرمت عليكم الميتة (إلى قوله) وما ذبح على النصب" (سورۂ مائدہ/۳) (مقالہ مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

۵- "قال أخبرني انه سمع عبدالله يحدث عن رسول الله ﷺ انه لقي زيد بن عمرو بن نفيل بأسفل بلدح وذالك قبل أن ينزل على رسول الله ﷺ الوحي فقدم إليه رسول الله ﷺ سفرة فيها لحم فأبى أن يأكل منها ثم قال إني لا آكل مما تذبحون على أنصابكم ولا نأكل إلا مما ذكر اسم الله عليه" (بخاری ۲/ ۸۲۷، باب ما ذبح على النصب والاصنام) (مقالہ مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

بعض حضرات نے مختلف فتاوی کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پوجا اور بتوں یا دیوی دیوتاؤں پر چڑھائے ہوئے کھانے اور مٹھائیاں کھانا ناجائز اور حرام ہے (فتاوی رحیمیہ ۶ / ۲۳۲، فتاوی محمودیہ ۱۴ /۳۸۱، ۱۷ / ۴۸۲، مجموعۃ الفتاوی ۲ /۱۰۶، امداد الفتاوی ۴ / ۹۷، معارف القرآن ۱ / ۴۲۴)

(دیکھئے: مقالہ مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی وغیرہ)۔

مولانا محمد ارشاد قاسمی صاحب نے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی یہ رائے نقل کی ہے کہ بہتر یہی ہے کہ غیر مسلم کے ہدایا و تحائف کو قبول ہی نہ کیا جائے (احکام

القرآن ۳/۳۵)۔

تقریبات کے تحائف قبول کرنے کا جواز:

اور اس امر پر بھی تمام حضرات کا اتفاق ہے کہ غیر مذہبی تقریبات کے کھانے اور تحفے قبول کرنا اور کھانا درست ہے، بشرطیکہ وہ پاک ہوں اور ان میں کوئی حرام شئ نہ ملی ہوئی ہو، اور یہ کہ وہ بتوں پر چڑھائے نہ ہوں (دیکھئے: مقالہ مولانا سلطان احمد اصلاحی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی ذاکر حسن نعمانی، سید امیر حسین جیلانی، مولانا اختر امام عادل وغیرہ)، اور بقول مولانا محمد عبید اللہ یہ ہدایا و تحائف مداہنت فی الدین کا ذریعہ نہ بنیں، اور مولانا نیاز احمد مدنی کا کہنا ہے کہ اگر یہ منذور لغیر اللہ ہوں تو ان کا لینا جائز نہیں۔

بعض حضرات مذہبی اور غیر مذہبی تقریبات میں فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہبی تقریبات کی مٹھائیاں اور کھانوں کے استعمال سے اجتناب ہی اولی اور احوط ہے، اور غیر مذہبی تقریبات کے تحفے اور مٹھائیاں قبول کرنا اور کھانا دونوں جائز ہے، ان حضرات نے عام طور پر ان روایات کو دلیل بنایا ہے جن میں غیر مسلموں کی طرف سے ہدیہ دینے اور ہدیہ قبول کرنے کا ذکر ہے:

۱- ''إن كسرى أهدى له فقبل ومن الملوك أهدوا له فقبل منهم'' (ترمذی ۱/۱۹۱)
(مقالہ مولانا ظفر الاسلام قاسمی، مولانا عامر ظفر، مولانا محمد ارشد مدنی)۔

۲- ''عن اسحاق بن عبدالله بن الحارث ان رسول الله ﷺ اشترى حلة ببضعة وعشرين قلوصا فأهداها إلى ذى يزن'' (ابوداؤد) (مقالہ مولانا ظفر الاسلام قاسمی)۔

امام بخاری نے غیر مسلم کے تحائف کے سلسلہ میں یہ باب باندھا ہے: ''باب قبول الهدية من المشركين''، اور اس ضمن میں کئی روایتیں ذکر کی ہیں:

۳- ''قال أبوحميد أهدى ملك أيله للنبي ﷺ بغلة بيضاء فكساه بردًا'' (بخاری/ص ۳۵۶)
(مقالہ مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا نیاز احمد مدنی)۔

۴- ''ان كيدر دومة أهدى إلى النبي ﷺ...'' (بخاری/ص ۳۵۶) (مقالہ مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا عامر ظفر)۔

۵- ''قال أبوهريرة عن النبي ﷺ: هاجر إبراهيم عليه السلام بسارة فدخل قرية فيها ملك أو جبار فقال: اعطوها أجر'' (فتح الباری ۵/۲۳۰) (مقالہ مولانا نیاز احمد مدنی)۔

۶- ''عن قبيصة بن وهلب عن أبيه قال: سألت النبي ﷺ عن طعام النصارى وفى رواية سأله رجل فقال إن من الطعام أتحرج منه فقال: لايتخلجن فى صدرك شئ'' (مشکوۃ/۳۵۸، کتاب الصید والذبائح) (مقالہ مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

۷- عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پنیر کا ایک ٹکڑا پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے چھری طلب فرمائی، اللہ کا نام لے کر قطع کیا اور تناول فرمایا (ابوداؤد)، نیل الاوطار میں ہے کہ پنیر حجاز میں تیار نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ شام وغیرہ سے آتی تھی (نیل الاوطار ۱/۲۶) (مقالہ مولانا محمد ارشد مدنی)

۸- حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ملک ذی یزن نے رسول کریم ﷺ کو ایک حلہ (جوڑا) کی سوغات بھیجی جو اس نے تیس اونٹ کے بدلے خریدا تھا، آپ ﷺ نے یہ جوڑا قبول فرمایا (ابوداؤد مع العون ۴/۷۹) (مقالہ مولانا محمد ارشد مدنی)۔

۹- ''عن يحيى بن يحيى التميمى شيخ مسلم قال اخبرنا جرير عن قابوس قال أرسل أبى امرأة إلى عائشة رضى الله تعالى عنها وأمرها أن تقرأ عليها السلام منه، قالت امرأة عند ذلك من الناس: يا أم المومنين إن لنا أظآرًا من العجم لايزال يكون لهم عيد فيهدون لنا منه، أفنأكل منه شيئا، قالت: أما ماذبح لذلك اليوم فلاتأكلون ولكن كلوا من أشجارهم'' (مصنف ابن ابی شیبہ) (مقالہ مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا اختر امام عادل)۔

۱۰- حضرت علی بن ابی طالبؓ سے منقول ہے کہ کسی غیر مسلم نے ان کی خدمت میں نیروز کا ہدیہ پیش کیا تو آپ نے اسے قبول کرلیا۔

۱۱-حضرت ابوبرزہ اسلمی سے منقول ہے کہ مجوسیوں سے ان کے بعض روابط تھے، ان کے پڑوس میں وہ لوگ آباد تھے، نیروز اور مہرجان کے موقع پر وہ لوگ تحفے وغیرہ بھیجا کرتے تھے تو وہ اپنے گھر والوں سے فرماتے کہ پھل وغیرہ تو کھالو اور باقی چیزیں واپس کردو (اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ/ ۱۲۰)

(مقالہ مولانا اختر امام عادل)۔

فتاوی عبدالحئی (ص: ۴۰۳، ۴۸۶)، فتاوی رشیدیہ (ص: ۵۷۵)، احسن الفتاوی (۸/ ۱۶۲) اور کفایت المفتی (۹/ ۳۲۸) میں غیر مسلموں کی تقریبات کی مٹھائیاں اور کھانے قبول کرنا اور کھانا درست ہے (دیکھئے: مقالہ مولانا راشد حسین ندوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی وغیرہ)۔

بعض تحفے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس تو نہیں کئے لیکن خود بھی استعمال نہیں کیا بلکہ اسے لوگوں میں تقسیم کرادیا، مثلاً:

۱-حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ شاہ روم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سونٹھ کا گھڑا ہدیہ میں بھیجا، اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے درمیان تقسیم فرمادیا (عمدۃ القاری ۱۱/ ۴۷) (مقالہ مولانا محمد ارشد مدنی)۔

۲-ہرقل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ دینار بطور ہدیہ بھیجے تھے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا تھا، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں قیام فرماتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جھوٹا قرار دیا اور اس کے بھیجے ہوئے دینار لوگوں میں تقسیم کرادیئے (مسند احمد بن حنبل ۳/ ۴۴۱، ۴/ ۴۷، تاریخ دمشق لابن عساکر/ ۴۲۰، کتاب الاموال لابی عبید: فصل/ ۶۲۴، ۶۲۵، الوثائق السیاسیہ/ ۱۱۴) (مقالہ مولانا اختر امام عادل)۔

اور بعض تحفے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ردفرمادیئے تھے، مثلاً: ابو براء عامر بن مالک بن جعفر ملاعب الالسنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گھوڑا بطور ہدیہ بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا گھوڑا یہ کہہ کر واپس فرمادیا کہ: ''انی نهيت عن زبد المشركين'' (روض الانف ۲/ ۲۲۱، کتاب الاموال لابی عبید/ ۶۳۰، الوثائق السیاسیہ/ ۲۱۴) (مقالہ مولانا اختر امام عادل، مولانا عامر ظفر وغیرہ)۔

اسی واقعہ کو مولانا ظفر الاسلام صاحب نے فتح الباری ۵/ ۱۴۴ کے حوالہ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

''عن عبد الرحمن بن كعب بن مالك ورجال من أهل العلم أن عامر بن مالك الذي يدعى ملاعب الالسنة قدم على رسول الله ﷺ وهو مشرك فأهدى له فقال: انى لا أقبل هدية مشرك''۔

اور مولانا محمد ارشاد قاسمی نے بھی اس روایت کو احکام القرآن للمفتی شفیع (۳/ ۳۵) کے حوالہ سے تین مختلف الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

بعض حضرات نے جو غیر مسلموں کے مذہبی تیوہاروں کے موقع کے ہدایا کو جائز لیکن نہ قبول کرنے کو اولی اور اس سے اجتناب کو بہتر قرار دیا ہے ان کے پیش نظر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی وہ عبارت ہے جو الذخیرہ کے حوالہ سے انہوں نے نقل کی ہے، لکھتے ہیں: واقعی ان اشیاء کا کھانا جو ہنود اپنے تہوار کے موقع پر رضا و رغبت پیش کرتے ہیں جائز ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ تہوار کے دنوں میں ہدایا قبول نہ کریں تاکہ موافقت کا شبہ نہ رہے، ذخیرہ میں ہے:

''لا ينبغي لمؤمن أن يقبل هدية كافر في يوم عيدهم ولو قبل لا يعطيهم ولا يرسل إليهم'' (فتاوی مولانا عبدالحی/ ۴۰۳)

(مقالہ مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا اختر امام عادل وغیرہ)۔

مولانا اختر امام عادل صاحب نے اس کی تفصیلی توجیہ کی ہے اور کہا ہے کہ بظاہر اس عبارت سے تہوار کے موقع پر غیر مسلموں کے تحائف قبول کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، لیکن ذخیرہ کا محمل متعین کرنے کے بعد اس قسم کے تحفے قبول کرنے کی گنجائش نکلتی ہے۔

مولانا عامر ظفر صاحب لکھتے ہیں کہ مذکورہ واقعات و روایات میں جو تضاد محسوس ہوتا ہے اسے کئی پہلوؤں سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

۱-ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ جن احادیث سے غیر مسلموں سے تحفہ قبول کرنے کا ثبوت ملتا ہے انہیں وہ حدیث منسوخ کرتی ہے جن سے ان کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، اس کے برعکس یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو احادیث جواز کا ثبوت فراہم کرتی ہیں وہ ناسخ ہیں اور جن سے عدم جواز کا اظہار ہوتا ہے وہ منسوخ ہیں۔ یہ دونوں باتیں مجرد دعووں کی حیثیت رکھتی ہیں کسی حکم کو ناسخ ماننے کے لئے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ منسوخ حکم کے بعد دیا گیا ہے اور یہاں پر اس کا ثبوت نہیں ہے۔

۲-بعض حضرات نے کہا کہ غیر مسلموں کا ہدیہ قبول کرنے کی اجازت فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تھی کسی دوسرے کو اس کی اجازت نہیں، یہ آپ کی ذات کے ساتھ

مخصوص ہے، لیکن اس تخصیص کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، جب تک کسی معاملہ میں تخصیص ثابت نہ ہو آپ کا اسوہ سب کے لئے ہے۔

۳- امام خطابی کہتے ہیں کہ حدیث میں مشرکین کے ہدایا قبول کرنے کی ممانعت ہے اور یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کا ہدیہ قبول فرمایا ہے، ان دونوں میں تضاد نہیں ہے، اس لئے کہ نجاشی نصرانی تھا، شریعت نے بعض احکام میں اہل کتاب اور مشرکین کے درمیان فرق کیا ہے اور یہ ان ہی میں سے ہے (خطابی: معالم السنن ۳/ ۴۱)۔

۴- لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اسلام اور مسلمانوں کا مفاد رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے بارے میں دیکھا کہ ان کے ہدایا قبول کرنے سے ان کی تالیف قلب ہوگی اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوں گے ان کے ہدیے قبول فرمائے، لیکن جہاں اس طرح کی مصلحت نہیں تھی وہاں آپ نے ہدیے رد بھی کردیئے۔

سوال ۲- (د) مساجد ومدارس کی تعمیر میں غیر مسلموں کا تعاون لینا اور ان کی عبادت گاہوں کی تعمیر کے لئے چندہ دینا:

اس سوال کے دو شق ہیں: ایک تو مساجد ومدارس اور مذہبی جلسوں کے لئے غیر مسلموں کا تعاون قبول کرنا ہے، اور دوسرے غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کی تعمیر کے لئے مسلمانوں کا تعاون کرنا ہے، اس پر تمام مقالہ نگار حضرات علماء کا اتفاق ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی تعمیر اور مذہبی تقریبات میں تعاون کرنا اور چندہ دینا درست نہیں ہے، اور ایسا کرنا تعاون علی الاثم والمعصیت ہے، صرف چند حضرات اس میں اس کا اضافہ کرتے ہیں کہ اگر فساد وضرر کا اندیشہ ہو اور جان ومال، عزت وآبرو اور ملازمت چلے جانے کا خطرہ ہو تو بکراہت خاطر اور اضطراراً تعاون کرنا درست ہوگا، اور بہتر یہ ہے کہ مالک بنانے کی نیت سے اسے چندہ دے دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ تم اسے جہاں چاہو خرچ کرو (دیکھئے: مقالہ مولانا ولی اللہ قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ظفر الاسلام قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا شمس الدین، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی محمد سلمان کھلی وغیرہ)، اس رائے کے حاملین نے درج ذیل دلائل دیئے ہیں:

۱- "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ/ ۲)

(مقالہ مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا سعید الرحمن فاروقی، مولانا قمر الزماں ندوی وغیرہ)۔

۲- ''عن جریر قال کان بیت فی الجاھلیة یقال له ذو الخلصة والکعبة الیمانیة والکعبة الشامیة فقال لی النبی ﷺ ألا تریحنی من ذی الخلصة فنفرت فی مائة وخمسین راکبا فکسرناه وقتلنا من وجدنا عنده فأتیت النبی ﷺ فأخبرته فدعا لنا ولأحمس'' (بخاری ۲/ ۶۲۴) (مقالہ مولانا محمد مصطفی قاسمی)۔

مولانا محمد ارشد مدنی نے اس سلسلہ میں درج ذیل دلائل ذکر کئے ہیں:

۳- حضرت عمرؓ کی ایک عمومی روایت ہے: ''اجتنبوا أعداء الله فی عیدھم'' (اللہ کے دشمنوں کی عید سے بچو)۔

۴- محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نیروز کے موقع پر اپنی زبان سے یہ لفظ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے (اقتضاء الصراط المستقیم/ ص ۱۷۸)۔

مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ ان دونوں مذکورہ بالا روایت واثر سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں تعاون کرنا درست نہیں ہے، اور مولانا نے مندرجہ ذیل روایت کو بھی اس کے لئے مستدل بنایا ہے۔

۵- ابو واقد لیثیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم جنگ حنین کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقام حنین کی طرف جا رہے تھے، اور ہمارا زمانہ کفر ابھی نیا نیا گزرا تھا، راستے میں ایک جگہ بیری کا ایک درخت آیا جس کو ''ذات انواط'' کہا جاتا تھا، مشرکین اس کی عبادت کرتے تھے، اور اپنے ہتھیار بھی برکت کے لئے اس پر لٹکایا کرتے تھے، ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جیسے ان مشرکین کے لئے ذات انواط ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے بھی ایک ذات انواط مقرر فرمادیجئے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اللہ اکبر، یہ تو گزشتہ قوموں کے راستے ہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم بالکل وہی بات کہہ رہے ہو جو بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کہی تھی کہ

:''اجعل لنا إلها کما لھم آلھة قال انکم قوم تجھلون'' (سورہ اعراف/ ۱۳۸) اللہ کی قسم تم لوگ گزشتہ قوموں کے نقش قدم پر چلو گے (ترمذی)۔

۶-مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی اور مولانا قمر الزماں ندوی فتاوی رحیمیہ (۴/ ۱۳)، فتاوی محمودیہ (۱۲/ ۱۷۳، ۱۷/ ۵۰۱)، جامع الفتاوی (۱/ ۵۱۱) اور فقہی مقالات (۱/ ۲۶۳) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ کسی مسلمان کے لئے غیر مسلم کی عبادتگاہوں کی تعمیر میں چندہ دینا یا تعاون کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، البتہ مولانا عتیق احمد قاسمی اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا کہنا ہے کہ تعاون نہ کرنے کی صورت میں اگر انتہائی خطرہ پیدا ہوجائے تو بکراہت خاطر چندہ دے دینے کی گنجائش ہے (جدید فقہی مسائل/ص ۴۴۳، مجلہ بحث ونظر/ص ۴۰)۔

مساجد ومدارس کی تعمیر میں غیر مسلموں کا تعاون قبول کرنا جائز ہے:

بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ مساجد ومدارس کی تعمیر میں مذہبی جلسوں کے لئے غیر مسلموں کی طرف سے تعاون یا چندہ قبول کرنا جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ پُن یعنی ثواب سمجھ کر تعاون کر رہے ہوں، ان کا تعاون کرنا مساجد ومدارس کے مصالح کے خلاف نہ ہو، اس کے ساتھ ساتھ ان کی طرف سے تعاون کر کے احسان جتلانے کا اندیشہ نہ ہو، اور نہ وہ اس کے امیدوار وطالب ہوں کہ اس کے بدلہ میں مسلمان بھی ان کی عبادتگاہوں کی تعمیر میں تعاون کریں گے، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱-"عن أبي وائل قال جلست مع شيبة على الكرسي في الكعبة لقد جلس هذا المجلس فقال عمر قد هممت أن لا أدع فيها صفراء ولا بيضاء إلا قسمته قلت أن صاحبيك لم يفعلا قال: هما المرآن اقتدى بهما" (بخاری: کتاب الحج؛ باب كسوة الكعبة ۱/ ۲۱۷)۔

کافروں کا مال مسجد حرام میں مدفون رہا اس کو نکال کر تقسیم نہیں کیا گیا، اگر کافر کا مال مسجد میں لگانا درست نہ ہوتا تو اس مال مدفون کو نکال کر پھینک دیا جاتا۔

۲-"قوله وأن يكون قربة في ذاته قال الشامي فتعين أن هذا شرط في وقف المسلم فقط بخلاف الذمي لما في البحر وغيره ان شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم كالوقف على الفقراء وعلى مسجد القدس" (شامی ۳/ ۳۶۰) (مقالہ مولانا اختر امام عادل، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد عبید اللہ، مفتی حبیب اللہ قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل وغیرہ)۔

۳-"ومنها إذا أوصى بما يكون قربة في حقنا وفي حقهم (إلى) وهذا جائز" (ہدایہ ۴/ ۶۸۹) (مقالہ مولانا راشد حسین ندوی)۔

مولانا محمد صادق مبارکپوری نے غیر مسلموں کا تعاون قبول کرنے کے جواز کی چند وجوہات بیان کی ہیں:

۱-فتح مکہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی تعمیر مشرکین کو برقرار رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال مسجد میں لگانا جائز ہے (مقالہ مفتی عبدالرحیم قاسمی)

۲-کتنی ہندو ریاستیں ہیں جہاں ہندو راجاؤں نے مسلم رعایا کے لئے مسجدیں بنوا رکھی ہیں جن میں بغیر نکیر صدیوں سے نماز ہوتی آرہی ہے۔

(فتاوی محمودیہ ۱۰/ ۱۸۹) (نیز مقالہ مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

اسی طرح درمختار مع ردالمحتار (۳/ ۲۸۰)، البحر الرائق (۵/ ۱۸۹) اور فتاوی عالمگیری (۲/ ۳۵۲ کتاب الوقف) وغیرہ میں بھی مساجد کی تعمیر میں تعاون کے لئے مسلمان ہونے کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے، بلکہ اسے غیر مسلم کی طرف سے بھی قبول کیا جاسکتا ہے (نیز دیکھئے: مقالہ مولانا محمد شمس الدین)۔

نیز اسی طرح امداد الفتاوی (۳/ ۴۶۴)، فتاوی محمودیہ ۱۷/ ۳۵۶)، فتاوی رشیدیہ/ص ۵۳۸)، فتاوی رحیمیہ (۹/ ۱۹۸) وغیرہ میں بھی مسجد کے لئے غیر مسلموں کی طرف سے دیئے گئے تعاون کو قبول کرنے کو درست کہا گیا ہے (دیکھئے: مقالہ مولانا عامر ظفر، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد اقبال قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی)۔

مولانا شمس الدین صاحب اس سلسلہ میں پانچ صورتیں بیان کرتے ہیں:

اول- یہ کہ ہندو کوئی مال کسی مسلمان کو ہبہ کردے اور مسلمان اس مال کا مالک ہوکر اپنی جانب سے مسجد میں لگادے، مثلاً پختہ اینٹیں مسلمان کو دیں اور انہیں مالک بنادیا اور مسلمانوں نے یہ اینٹیں مسجد میں لگادیں۔

دوم- یہ کہ ہندو نے کچھ روپیہ مسلمانوں کو دیا اور انہیں مالک بنادیا اور مسلمان اسے مسجد کی تعمیر میں خرچ کردیں۔

سوم- یہ کہ ہندو نے کچھ سامان مثلاً اینٹ وغیرہ مسلمانوں کو یہ کہہ کردیا کہ تم انہیں اپنی مسجد میں لگاؤ، یعنی اس نے مسلمانوں کو مالک نہیں بنایا بلکہ اس سامان کو مسجد

میں لگانے کا وکیل بنایا۔

چہارم- یہ کہ اس نے اس طرح روپیہ مسلمانوں کو دیا کہ یہ روپیہ مسجد کی تعمیر میں خرچ کرو۔

پنجم- یہ کہ کسی شکستہ مسجد کی کسی ہندو نے خود مرمت کرائی اور اپنا سامان یا روپیہ اس کی مرمت میں یا تعمیر میں خرچ کیا اور منتظم تعمیر بھی خود رہا۔

مولانا موصوف ان صورتوں کی تفصیل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلی اور دوسری صورت میں تو کسی کا اختلاف نہ ہونا چاہئے، کیونکہ جب ہندو نے سامان یا روپیہ کا مالک مسلمان کو بنا دیا تو اب وہ ہندو کا مال ہی نہ رہا، بلکہ تبدل ملک سے حکمًا تبدل عین ہو کر وہ مسلمان کا مال ہو گیا، اور اس کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں۔

تیسری اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ وہ بھی جائز ہے، کیونکہ کافر کا مال جبکہ وہ اپنی خوشی سے مسجد میں لگانے کے لئے دیں محض اس وجہ سے کہ وہ کافروں کا مال ہے لینے اور مسجدوں میں لگانے سے کوئی وجہ شرعی مانع نہیں ہے۔

اور پانچویں صورت کا حکم یہ ہے کہ کفار کو یہ موقع دینا کہ وہ مسجد کی تعمیر کریں ناجائز ہے، لیکن وجہ عدم جواز یہ نہیں کہ وہ کفار کا مال ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ معابد خاصہ اہل اسلام پر کفار کا تصرف وتسلط ممنوع ہے، کیونکہ کافر بحیثیت کافر ہونے کے شعائر اسلام اور خانہ خدا پر تسلط رکھنے کا مستحق نہیں جیسا کہ آیت "ما کان للمشرکین..." سے اس تقدیر پر کہ تعمیر سے تعمیر معروف مراد ہو، ثابت ہوتا ہے، پس آیت میں اس تعمیر کے استحقاق کی نفی ہے جو تصرف اور تسلط کو مستلزم ہو (اور تقریبًا یہی تفصیلات مولانا ابوبکر قاسمی نے کفایت المفتی ۷ /۷۷ تا ۸۰ کے حوالہ سے نقل کی ہیں)۔

عدم جواز کے قائلین:

بعض مقالہ نگار حضرات نے آیت: "ما كان للمشركين أن يعمروا مساجد الله شاهدين على أنفسهم بالكفر" (سورۂ توبہ/۱۷) کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس آیت سے مساجد کی تعمیر میں غیر مسلموں سے تعاون لینے کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے، اور صاحب تفسیر خازن کے نزدیک دینی کاموں میں خاص طور پر مسجد کی تعمیر یا مرمت میں غیر مسلموں کا تعاون درست نہیں، چنانچہ انہوں نے مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے:

"واختلفوا فى المراد بالعمارة على قولين أحدهما أن المراد بالعمارة العمارة المعروفة من بناء المساجد وتشييدها ومرمتها عند خرابها فيمنع للكافر حتى لو أوصى ببناء مسجد لم تقبل وصيته" (تفسیر ماجدی ۱/ ۳۹۷)

(مقالہ مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا ثابت شمیم رشادی)۔

مولانا محمد ارشد مدنی صاحب نے مندرجہ ذیل دلائل ذکر کئے ہیں:

۱- امام ابن الجوزیؒ مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مسجدوں کو آباد کرنے کا دو مفہوم ہے، ایک مسجدوں میں داخل ہونا اور اس میں جلوس اختیار کرنا، اور دوسرا مفہوم ہے اس کی تعمیر و مرمت کرنا، اور یہ دونوں چیزیں کافروں کے اوپر حرام ہیں، اور قرآن کریم کی اس آیت "ما کان للمشرکین" سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مومنوں پر واجب ہے کہ وہ ان چیزوں سے کفار و مشرکین کو روک دیں (زاد المسیر ۳/ ۴۰۸)۔

۲- علامہ جصاص فرماتے ہیں کہ مساجد کو آباد کرنے کا دو مفہوم ہے، ایک مساجد کی زیارت کرنا اور اس میں ٹھہرنا، اور دوسرا مفہوم ہے اس کی تعمیر کرنا، اور نقصان پہنچے تو اس کی مرمت کرنا، اور آیت سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ مسجدوں میں داخل ہونا، اس کی تعمیر و مرمت کرنا، اور اس کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ کافروں کے لئے مناسب نہیں ہے (فتح القدیر للشوکانی ۲/ ۷ ۴۲، احکام القرآن ۳/ ۸۷) (نیز مقالہ مولانا ثابت شمیم رشادی)۔

مولانا موصوف مزید یہ بھی لکھتے ہیں کہ حنابلہ کے نزدیک مساجد کی تعمیر اور مرمت وغیرہ میں غیر مسلموں کی اعانتوں کو قبول کیا جاسکتا ہے جیسا کہ الآداب الشرعیہ ۳/ ۴۱۶ میں ہے: "وتجوز عمارة كل مسجد وكسوته وإشعاله بمال كافر وأن يبنيه بيده" لیکن حنابلہ کا یہ قول درست نہیں ہے۔

جبکہ مولانا ثابت شمیم رشادی کا کہنا ہے کہ فقہاء کرام نے اس کی اجازت دی ہے کہ اگر غیر مسلم حضرات مساجد یا مسلمانوں کے دیگر مذہبی و دینی اداروں میں تعاون پیش کریں تو چند شرائط کے ساتھ قبول کرنا جائز ہے:

۱- وہ شخص اپنے عقیدہ کے مطابق اسے قربت سمجھتا ہو۔

۲- اس کے قبول کرنے میں غیر مسلمین کی تولیت کا خوف نہ ہو۔

۳- مسلمان اپنے دینی معاملات میں مداہنت سے کام نہ لیں گے۔

۴- وہ غیر مسلم اس تعاون کے ذریعہ مسلمانوں پر احسان نہ رکھے۔

۵- اس کے بدل میں اپنی عبادتگاہوں اور مذہبی تیوہاروں میں تعاون کا خواستگار نہ ہو۔

(مولانا محمد اقبال قاسمی اور مولانا محمد مصطفی قاسمی نے بھی اس کا ذکر احسن الفتاوی (۶/۴۳۹) اور معارف القرآن (۴/۳۴۰) کے حوالہ سے کیا ہے)۔

اور مولانا محمد صادق مبارکپوری، مفتی رشید احمد صاحب کے حوالہ سے لکھتے ہیں: آیت کے سیاق وسباق اور شان نزول پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں مسجد حرام کی تعمیر اور سقایہ حاج پر افتخار مشرکین کا رد ہے، اس طرح کہ مشرکین میں قبول عمل کی شرط (ایمان) نہ ہونے کی وجہ سے ان کا یہ عمل مقبول نہیں، اور عمل غیر مقبول پر فخر کرنا لغو ہے، اس آیت میں جواز اور عدم جواز سے کوئی تعرض نہیں، لہذا "للمشرکین" میں لام جواز نہیں بلکہ استحقاق وصلاحیت کا ہے، (والتفصیل فی بیان القرآن)، اس سے معلوم ہوا کہ بعض مفسرین کا اس آیت سے عدم جواز ثابت کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ آیت کے سیاق وسباق وشان نزول کے خلاف ہونے کے علاوہ تصریحات فقہاء سے بھی معارض ہے، اور بوقت معارضہ مفسرین کا قول قابل قبول نہ ہوگا، "فانہ لکل فن رجال" (احسن الفتاوی ۶/۴۳۹، ۴۴۰) (نیز مقالہ مولانا محمد مصطفی قاسمی)۔

بہرحال مساجد ومدارس کے لئے غیر مسلموں کا تعاون لینے سے حتی الوسع اجتناب واحتراز ہی اولی واحوط ہے (مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد ابراہیم گجیا فلاحی، مولانا قاری ظفر الاسلام صاحب وغیرہ)۔

اس لئے کہ غیر مسلموں سے تعاون لینا اسلامی غیرت وحمیت کے خلاف ہے (مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی)۔

لہذا مساجد کے علاوہ میں غیر مسلموں کا تعاون لیا جاسکتا ہے لیکن مساجد کے لئے نہیں (مولانا محمد ارشد مدنی، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی وغیرہ)۔

اگر ان کا تعاون لے بھی لیا جائے تو اسے مسجد کے بیت الخلاء اور غسل خانہ وغیرہ میں استعمال کیا جاسکتا ہے مسجد کی تعمیر میں نہیں (سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی) لیکن مفتی محبوب علی وجیہی کہتے ہیں کہ اس کا استعمال بیت الخلاء وغیرہ میں بھی صحیح نہیں اس لئے کہ وہ بھی متعلقات مسجد ہے، اور اگر وہ ہم کو تملیک کا دیں تو ہم اسے اپنی طرف سے لگا سکتے ہیں۔

لیکن مولانا عبید اللہ اسعدی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کا کہنا ہے کہ اس طرح کا باہمی تعاون کچھ شرائط کے ساتھ درست ہے، جبکہ مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ابوالعاص وحیدی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا نیاز احمد مدنی وغیرہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے نہ تعاون لینا درست ہے اور نہ دینا درست ہے۔

سوال ۲-(ھ) غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت اور ان کو تہواروں کی مبارکباد دینا:

الف- اس سوال کی دونوں شقوں پر علماء حضرات کی آراء مختلف ہیں، بیشتر حضرات اس طرف گئے ہیں کہ غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات جن میں شرکیہ افعال انجام دیئے جاتے ہیں ان میں مسلمانوں کا شریک ہونا ناجائز اور حرام ہے، ان حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱- "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (مولانا شمس الدین، مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

۲- "وقد نزل علیکم فی الکتاب أن إذا سمعتم آیات اللہ یکفر بہا ویستہزأ بہا فلا تقعدوا معہم" (سورۂ نساء/۱۴۰) (مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری)۔

۳- "ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار" (سورۂ ہود/ ۱۱۳) (مولانا تنظیم عالم قاسمی)۔

۴- "فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین" (مولانا محمد عبید اللہ، مفتی ذاکر حسن نعمانی)۔

۵- "من کثر سواد قوم فہو منہم" (مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا محمد عبید اللہ، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی مجاہد الاسلام

قاسمی، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا محمد سلمان کھلی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۶-''من تشبہ بقوم فھو منھم'' (ابوداؤد ۲/ ۳۷۵)(مولانا یعقوب قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا نیاز احمد مدنی)۔

۷-''لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق'' (مولانا محمد ارشاد قاسمی)۔

۸-حضرت عمرو بن مرۃ ''لایشھدون الزور'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''لا یمالئون أھل الشرك علی شرکھم ولا یخالطونھم'' (الاقتضاء/ ۸۱) (مقالہ مولانا اختر امام عادل)۔

۹-حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''إیاکم وان تدخلوا علی المشرکین یوم عیدھم فی کنائسھم'' (الاقتضاء/ ۸۶) اور بیہقی نے بھی اس کی روایت کی ہے (اعلاء السنن ۱۲/ ۷۰۲)

(مولانا اختر امام عادل) (مولانا محی الدین غازی فلاحی نے اس اثر کو بیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے)۔

۱۰-حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں: ''من بنی ببلاد الاعاجم وصنع نیروزھم ومھرجانھم وتشبہ بھم حتی یموت وھو کذلك حشر معھم یوم القیامۃ'' (الاقتضاء/ ۹۵)

(مولانا اختر امام عادل) (نیز مولانا محمد ارشد مدنی اور مولانا محی الدین غازی فلاحی نے بھی تقریباً یہی عبارتیں اپنے مقالہ میں درج کی ہیں)۔

(او پر دونوں مذکورہ حدیثوں کا ذکر مولانا محمد مصطفی قاسمی نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ احکام اہل الذمہ ۲/ ۷۲۳ کے حوالہ سے کیا ہے)۔

مولانا اختر امام عادل صاحب نے اس سلسلہ میں بعض عمومی احادیث کو بھی مستدل بنایا ہے:

۱۱-حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک ولیمہ کی دعوت ملی اور وہ تشریف لے گئے، لیکن وہاں خرافات دیکھ کر واپس لوٹ گئے، لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''من کثر سواد قوم فھو منھم ومن رضی عمل قوم کان شریك من عمل بہ'' (رواہ ابو یعلی فی مسندہ، نصب الرایہ ۴/ ۳۴۶، کنز العمال ۹/ ۲۲، جامع المسانید والسنن ۲۷/ ۳۰۸)۔

۱۲-حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یغزو جیش الکعبۃ فإذا کانوا ببیداء من الارض یخسف بأولھم وآخرھم قالت: قلت یا رسول اللہ کیف یخسف بأولھم وآخرھم وفیھم أسواقھم ومن لیس منھم قال: یخسف باولھم وآخرھم ثم یبعثون علی نیاتھم'' (بخاری مع الفتح ۶/ ۱۵۰، ترمذی ۲/ ۲۴، فتح الملھم ۶/ ۳۶۲)۔

لیکن مولانا محمد ارشد مدنی صاحب نے درج ذیل روایات کو اپنا مستدل بنایا ہے:

۱۳-حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو سال میں دو دن جاہلی عید کا رواج دیکھا، دریافت کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے تمہارے لئے اس سے بہتر دو عیدیں مقرر کی ہیں (ابوداؤد)۔

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: کہ اس حدیث میں تبدیلی کا لفظ بتاتا ہے کہ جب یہ دونئی عیدیں جاہلی عیدوں کی جگہ مقرر ہوئیں تو وہ عیدیں خود بخود منسوخ ہوگئی اور منسوخی کے بعد پھر ان میں شرکت کا مطلب اللہ تعالی کے حکم کی نافرمانی ہی ہوگی...... (اقتضاء الصراط المستقیم/ ۱۶۵)۔

۱۴-ثابت بن ضحاک سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے مقام بوانہ میں ایک اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی، اس کے بارے میں اس نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا، آپ ﷺ نے کہا کہ کیا وہاں جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت ہے جس کی پرستش کی جاتی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وہاں مشرکین کے میلوں میں سے کوئی میلا لگتا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں، رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنی نذر پوری کرو، اس لئے کہ اللہ کی معصیت اور نافرمانی کی کسی نذر کا پورا کرنا درست نہیں ہے اور نہ کسی ایسی نذر کو پورا کرنا ہے جو آدمی کی قدرت اور بس سے باہر ہو (ابوداؤد)۔

۱۵-میمونہ بنت کرومؓ کی روایت ہے کہ میں زمانہ حج میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھی، آپ کو میں نے ایک اونٹ پر سوار دیکھا، اور آپ ﷺ ہاتھ

میں معلمین کی طرح کا درہ لئے ہوئے تھے، میرے والد نے قریب جا کر پائے مبارک تھام لیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر میرے ہاں اولادِ نرینہ ہوگئی تو بوانہ میں چند اونٹ ذبح کروں گا، آپ ﷺ نے معلوم کر کے کہ وہاں کوئی بت نہیں، انہیں ایفائے نذر کا حکم دیا (ابوداؤد)۔

۱۶- عمرو بن شعیب کی ایک روایت ہے کہ ایک عورت نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے آپ کے پاس دف بجانے کی نذر مانی تھی، آپ نے فرمایا نذر پوری کر لے، پھر اس نے کہا کہ میں فلاں مقام پر قربانی بھی کرنا چاہتی ہوں، آپ نے اطمینان کرنے کے بعد اس کی بھی اجازت دے دی (ابوداؤد)۔

علامہ ابن تیمیہؒ ان روایات کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جب جاہلی میلوں اور عبادتگاہوں پر کسی عقیدت مندانہ حاضری کو منع کر دیا گیا تو خود جاہلی عیدوں میں شرکت بدرجہ اولی ممنوع ہوگی (اقتضاء الصراط المستقیم/۱۶۶)۔

بعض حضرات نے فتاوی محمودیہ (۱۴/ ۴۰۴)، مجموعۃ الفتاوی (۲/ ۱۱۹)، فتاوی رشیدیہ (ص/ ۵۵۶) اور کفایت المفتی (۹/ ۳۳۶) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ غیر مسلموں کی مذہبی تہواروں میں شرکت ممنوع اور حرام ہے (مقالہ مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا محمد شمس الدین، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

مولانا عبدالرشید قاسمی نے غیر مسلم تقریبات کی چار صورتیں بیان کی ہیں اور سب کا حکم بھی بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

۱- شادی کی تقریب، اس میں شرکت کی گنجائش نکل سکتی ہے، کیونکہ اس میں شرکت کی غرض مسرت کا اظہار اور مبارکباد دینا ہوتا ہے۔

۲- تقریب بوقت موت، اس میں شرکت کی گنجائش نہیں، ”ولا تصل علی أحد منهم مات أبدا ولا تقم علی قبره“، جب قبر پر قیام کی گنجائش نہیں تو شرکت کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے۔

۳- موت کے چند دنوں بعد ایک تقریب ہوتی ہے جس میں قریبی رشتہ دار اور دوست جمع ہوتے ہیں اور تعزیتی کلمات کہے جاتے ہیں، تو اس میں شرکت اور تعزیتی کلمات کہنے کی اجازت ہے، ”إذا مات الكافر قال لوالديه أو قريبه في تعزيته اخلف الله عليك خيرا منه واصلحك اى اصلحك بالاسلام ورزقك مسلما لان خيرية به تظهر“ (عالمگیری ۵/ ۳۴۸)۔

۴- پوجاپاٹ وغیرہ کی بھی تقریب ہوتی ہے جس میں شرک وکفر کے افعال واقوال انجام دیئے جاتے ہیں، اور شرک وکفر اللہ کے نزدیک انتہائی مبغوض ہے، "إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك..." (سورۂ نساء/ ۱۴۸)۔

اور آگے لکھتے ہیں کہ فتاوی عالمگیری کے درج ذیل جزئیہ سے غیر مسلموں کی دوسری، تیسری اور چوتھی قسم کی تقریبات میں عدم شرکت پر استدلال کیا جا سکتا ہے:

”من دعي إلى وليمة فوجد ثمة لعبا أو غناء فلا بأس أن يقعد ويأكل فإن قدر على المنع يمنعهم وإن لم يقدر يصبر وهذا إذا لم يكن مقتدى به، وهذا كله بعد الحضور، واما إذا علم قبل الحضور فلا يحضر“ (عالمگیری ۵/ ۳۴۳)۔

مفتی عبدالرحیم قاسمی صاحب نے ہندوؤں کے مذہبی میلوں میں شرکت کی کئی قسمیں کی ہیں اور سب کا حکم بھی بیان کیا ہے مثلاً:

۱- مسلمان ان میلوں میں اگر اس طرح شریک ہوں کہ ان کے کاموں کو مقدس سمجھیں تو ایسی شرکت غیر متصور ہے۔

۲- ایسی شرکت کہ مسلمانوں کا ہندوؤں سے اختلاف نہ ثابت ہو مباح ہے بشرطیکہ ان کے کسی مذہبی فعل کی طرفداری یا تعظیم نہ کریں۔

۳- بعض صورتوں میں اگر شرکت کا مقصد کوئی اعلی ہو تو وہ مستحب ہو سکتی ہے۔

۴- کسی جلوس کے راستہ میں باہمی ارتباط کے لئے پانی دینا یا پانی پلانا مباح ہوگا۔

۵- اگر پانی پلانے کا کام شعائر کفر کی تعظیم کے لئے ہو تو کفر ہے۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے مذہبی تہواروں میں سبیل لگانا یا پانی وغیرہ تقسیم کرنا اگر ان کے تہوار کی تعظیم وتکریم کے لئے ہو تو یہ کفر ہے، اور قیام امن اور باہمی رواداری کی نیت سے ہو اور ان کے مذہبی اعمال کی تحسین مقصود نہ ہو اور یہ کام ان کے خاص موقع سے علاحدہ راستے میں ہو تو مباح ہے اور خاص موقع میں ہو تو مکروہ تحریمی یا حرام ہے مگر کفر نہیں، کفر تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اسے اچھا سمجھیں اور ان کے طرز عمل سے ان اعمال کی تصدیق وتحسین ہوتی ہو

(کفایت المفتی ۹/۲۷۹،۲۸۰)

(نیز مقالہ مولانا راشد حسین ندوی: انہوں نے اس فتوی کو غیر مسلموں کو ان کے تہواروں پر مبارکباد دینے کے سلسلے میں اپنا مستدل بنایا ہے)۔

مولانا محی الدین غازی فلاحی نے دوسرے دلائل کے ساتھ یہ دلیل بھی دی ہے کہ امام بخاری نے حضرت عمر کا یہ قول نقل کیا ہے:

''اجتنبوا أعداء الله في عيدهم''۔

شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے شرکت کے قائلین:

اب ذیل میں ان بعض حضرات کی آراء درج کی جاتی ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی شرط کے ساتھ غیر مسلموں کی تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت کو درست قرار دیتے ہیں، مثلاً:

۱- مفتی عبد الرحیم قاسمی صاحب، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا ابوالعاص وحیدی اور مولانا نیاز احمد مدنی صاحب کی رائے ہے کہ غیر مسلموں کی شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت مباح ہے، اسی طرح غیر مسلم اجتماعات میں انتظام وقیام امن کی غرض سے مسلم رضاکاروں کی شرکت بھی مباح ہے بشرطیکہ ان کی کسی مشرکانہ رسم میں شرکت نہ ہو (مستفاد از کفایت المفتی ۹/۲۷۷، اقتضاء الصراط المستقیم ۱/۴۷۱)۔

۲- جو تقریبات محض جشن واظہار خوشی کے طور پر ہوں اور یہ اہل اسلام سے کسی معاندت کی بنیاد پر نہ ہوں تو شرکت کی گنجائش ہے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

۳- اس آیت ''وإذا رأيت الذين يخوضون في آياتنا فاعرض عنهم حتى يخوضوا في حديث غيره'' (سورۂ انعام/۶۸) سے شرکت کا جواز معلوم ہوتا ہے (سید امیر حسین گیلانی)۔

۴- اگر کسی ملی یا قومی مصلحت کی بنا پر مجبوری ہو یا خصوصی تقاضوں کی وجہ سے شریک ہونا پڑے بشرطیکہ ان کے کسی مذہبی فعل کی طرفداری یا تعظیم نہ کریں تو مباح ہے (مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی محمد سلمان کھلی)۔

۵- ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی صاحب کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کو اسلام سے قریب کرنے یا ان کی تالیف قلب کی غرض سے شریک ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ ان کی مذہبی رسومات سے دور رہے، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں تبلیغ کی غرض سے تشریف لے جاتے تھے (تقریباً یہی رائے مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، ڈاکٹر یوسف قاسم اور مفتی ذاکر حسن نعمانی صاحب کی ہے)۔

۶- غیر مسلموں کی غیر مشرکانہ تہواروں (نیا سال، موسمی تہوار) میں شرکت کی جاسکتی ہے (سید شکیل احمد انور، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا عامر ظفر، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی)۔

۷- مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب کی رائے ہے کہ مذہبی تقریبات کی مناسبت سے کھانے پینے میں شرکت تو درست ہے مگر نفس اعمال میں شرکت کسی طرح درست نہیں اور حرام کھانے سے بچیں، اور برصغیر کی تحریک کے دنوں میں ہمارے جید علماء دیوبند ہندو برادری کے ساتھ سب معاملات میں شریک رہے ہیں۔

افطار پارٹی میں شرکت:

افطار پارٹی یا عید ملن وہولی ملن جیسی ملی جلی تقریبات میں شرکت کے سلسلہ میں بھی علماء کی آراء مختلف ہیں جس میں بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم افطار پارٹی کا اہتمام کرتے ہیں اور مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود مسلمان ہی افطار پارٹی یا عید ملن کا اہتمام کرتے ہیں اور اس میں غیر مسلموں کو مدعو کرتے ہیں، مقالہ نگار حضرات کی آراء ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

مولانا راشد حسین ندوی کے نزدیک غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا جائز ہے:

''ولا بأس بالذهاب إلى ضيافة أهل الذمة بكذا ذكره محمد رحمه الله''۔

کبھی کبھار ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن مستقل عادت نہ بنائے:

''ولم يذكر محمد رحمه الله الأكل مع المجوسي ومع غيره من أهل الشرك انه هل يحل أمر لا وحكي عن الحاكم

الامام عبد الرحمن الکاتب انه ان ابتلی به المسلم مرة أو مرتين فلا بأس به وأما الدوام عليه فيكره''

یہاں تک کہ خود غیر مسلموں کی دعوت کرنا بھی جائز ہے:

''ولا بأس بضيافة الذمي وإن لم يكن بينهما الا معرفة كذا في الملتقط'' (فتاوی ہندیہ ۵/۳۴۷)۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ دعوت افطار بھی ایک دعوت ہی ہے اس لئے اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اس اباحت کے باوجود بہتر یہی ہے کہ:

۱- اس طرح کی دعوتوں سے احتیاط کی جائے، اس لئے کہ اس میں روزہ داروں اور غیر روزہ داروں کا اجتماع ہوتا ہے جس کی وجہ سے روزہ داروں کو کئی دقتیں پیش آتی ہیں۔

۲- یہ کہ عام طور سے اس طرح کی دعوتوں میں نماز مغرب کی جماعت مسجد میں چھوٹ جاتی ہیں۔

۳- یہ کہ افطار کا وقت اجابت دعا کا ہے، جبکہ اس طرح کے مجمعوں میں یہ موقع شور شرابہ میں ضائع ہوجاتا ہے۔ اگر یہ خرابیاں نہ ہوں یا مصلحت کا تقاضہ ہو تو شرکت کی گنجائش بہر حال ہے۔

مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں کہ امام غزالی نے حضرت حسن بصری کا مسلک نقل کیا ہے کہ وہ پڑوسی یہودی یا نصرانی کو قربانی کا گوشت کھلانے کی اجازت دیتے تھے (احیاء علوم الدین ۲/ ۲۳۳ بحث حقوق الجوار) اس پر قیاس کرتے ہوئے اگر غیر مسلموں کے لئے افطار یا عید کے ماکولات و مشروبات کا الگ نظم کردیا جائے، مسلمانوں کے ساتھ مخلوط نہ ہو تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ افطار وغیرہ کے مواقع شریعت میں متبرک ہیں اور ان کو عبادت کا درجہ حاصل ہے، ایسے متبرک مواقع پر کفر کی نحوست سے نقصان کا بہر حال اندیشہ ہے۔ اس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کی طرف سے جو افطار پارٹیاں دی جاتی ہیں ان میں شرکت تو فی نفسہ ناجائز معلوم نہیں پڑتی لیکن مقصد افطار فوت ہوجاتا ہے، اس لئے کراہت سے خالی نہیں ہے اور اس پر مداومت گناہ ہے۔

مولانا اقبال قاسمی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کا کہنا ہے کہ اگر افطار میں غیر مسلم حضرات کو دعوت دی جائے اور مقصد ان تک اسلامی پیغام پہنچانا ہو یا مسلمانوں کو ملی یا سماجی فائدہ پہنچانا ہو تو دعوت افطار کا اہتمام مستحسن ہے۔

مولانا شمس الدین صاحب کہتے ہیں کہ غیر مسلم حضرات جو مسلمانوں کے ساتھ افطار میں شریک ہوتے ہیں، عید کی تہنیتی تقریب رکھتے ہیں اور مسلمانوں سے اس کی توقع ہوتی ہے کہ وہ بھی دوسرے مذہبی گروہوں کے تہواروں میں شریک ہوں ظاہر ہے یہ جائز نہیں ہوگا (نیز مقالہ مولانا راشد حسین ندوی)۔

مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا ابو العاص وحیدی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی اور مولانا قمر الزماں ندوی لکھتے ہیں کہ غیر مسلم سیاسی جماعتوں وغیرہ کی طرف سے جو افطار پارٹیاں دی جاتی ہیں اس سے احتراز کیا جانا چاہئے، کیونکہ رمضان المبارک کا وہ مخصوص وقت جس میں دعائیں قبول کی جاتی ہیں نمائش اور لغو مشاغل میں ضائع ہوجاتا ہے، جبکہ مولانا یعقوب قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مولانا خورشید احمد اعظمی، اور مولانا تنظیم عالم قاسمی کی رائے ہے کہ شرکت کرنا ہی درست نہیں ہے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی اور مولانا محی الدین غازی فلاحی کی رائے ہے کہ مختلف تہواروں کے موقع پر اگر خیر سگالی کے لئے کوئی ملن پارٹی ہوتی ہے تو اس میں وسیع تر مفاد کی خاطر شرکت کی جاسکتی ہے بشرطیکہ تہوار کی رسومات سے الگ ہٹ کر یہ تقریب ہو، اور اس میں شرکت اس تہوار میں شرکت نہ سمجھی جائے۔

مفتی محبوب علی وجیہی کہتے ہیں کہ اگر غیر مسلم حضرات مسلمانوں کے گھر آجائیں اور وقت افطار ہو اور از راہ مروت یا دلجوئی مسلمان ان کو شریک کرلیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ب- غیر مسلموں کو ان کے تہواروں کی مبارکباد دینا:

غیر مسلم بھائیوں کو ان کے تہواروں کی مبارکباد دینا درست ہے یا نہیں؟ تو بیشتر مقالہ نگار حضرات علماء کی رائے ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے تہواروں کی

مبارکباد دینا درست نہیں ہے اس لئے کہ اس سے ان کے شرکیہ رسوم اور تہواروں کی تعظیم لازم آتی ہے۔

مولانا تنظیم عالم قاسمی کا کہنا ہے کہ یہ اس لئے کہ ایسا کرنا رضاء بالکفر ہے، مولانا عبدالرشید قاسمی کہتے ہیں کہ مبارکباد دینا ان کی خواہشات کی تائید کرنا ہے، جبکہ مولانا ابوبکر قاسمی کی رائے ہے کہ مبارکباد نہ دے کر سکوت اختیار کریں۔

بعض حضرات نے اس ضمن میں چند دلائل بھی دیئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱- "إن تكفروا فإن الله غني عنكم ولا يرضى لعباده الكفر وإن تشكروا يرضه لكم" (سورۂ زمر: ۷) (مولانا محمد ارشد مدنی)۔

۲- "اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا" (سورۂ مائدہ: ۳) (مولانا محمد ارشد مدنی)۔

۳- "ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار" (سورۂ ہود: ۱۱۳) (مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی)۔

۴- "ولئن اتبعت أهواءهم بعد الذي جاءك من العلم مالك من الله من ولي ولا نصير" (سورۂ مائدہ: ۱۲۰) (مولانا عبدالرشید قاسمی)

۵- حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی، اس نے وہ پیش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دعا دی کہ اللہ تمہیں حسین وجمیل رکھے، چنانچہ مرتے وقت تک اس کے بال سیاہ تھے (مصنف ابن عبدالرزاق ۱۰/ ۳۹۲) (مولانا ظفر الاسلام قاسمی)۔

۶- حاشیہ صاوی میں آیت کے ضمن میں لکھا ہے: ''انكم إذا مثلهم اى في الاثم اى كفرا أو غيره فالراضي بالكفر كفر والراضي بالمحرم عاص'' (حاشیہ صاوی مع جلالین ۱/ ۲۲۷) (مفتی حبیب اللہ قاسمی)۔

۷- حافظ ابن قیم نے احکام اہل الذمہ (۱/ ۲۰۵) میں لکھا ہے کہ کفر سے تعلق رکھنے والے شعائر جو اس کے ساتھ خاص بھی ہوں، کی مبارکباد دینا متفقہ طور پر حرام ہے (مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا محمد عبیداللہ، قاضی محمد ہارون مینگل)۔

۸- فتاوی رشیدیہ (ص/ ۴۸۸) اور من فقہ الاقلیات المسلمہ (ص/ ۱۵۳) میں بھی ہے کہ غیر مسلموں کے تہواروں کی مبارکباد دینا یا کسی قسم کا تعاون کرنا یا تہوار کی تعریف میں اشعار بنا کر بچوں کو دینا بالکل درست نہیں ہے (مولانا محمد شمس الدین، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محی الدین غازی فلاحی)۔

مبارکباد دینے میں کوئی حرج نہیں:

بعض مقالہ نگار حضرات ایسے بھی ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کو ان کے تہواروں کی مبارکباد دینے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ فرقہ وارانہ یکجہتی کے جذبہ سے اور خیر سگالی کی نیت سے اور تالیف قلب کے لئے ایسا کرنا بہتر ہے (مقالہ مولانا محمد ارشاد قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، سید امیر حسین جیلانی، مولانا برہان الدین سنبھلی، ڈاکٹر یوسف قاسم، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبیداللہ اسعدی، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، مفتی محبوب علی وجیہی وغیرہ)۔

جبکہ قاری ظفر الاسلام قاسمی صاحب نے ایک دوسری بات کہی ہے اور وہ یہ کہ مبارکباد دعا نہیں ہے، دعا کے لئے لفظ آشیرواد آتا ہے، مبارکباد کی جگہ بدھائی کا لفظ استعمال کرنا زیادہ موزوں ہے، اگر ضرر یا تعلقات کی ناہمواری کا اندیشہ ہو تو بدھائی وغیرہ کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

بعض مقالہ نگار حضرات کچھ شرائط وقیود کے ساتھ ان کو مبارکباد دینے کو درست قرار دیتے ہیں، مثلاً:

۱- ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی لکھتے ہیں کہ سماجی اخلاقیات کا تقاضہ ہے کہ اگر وہ ہمارے تہواروں پر ہمیں مبارکباد دیتے ہیں تو ہم بھی ان کو ان کے تہواروں پر مبارکباد دیں لیکن یہ کہ آدمی خود ان پر کوئی یقین نہ رکھتا ہو، مزید یہ لکھتے ہیں کہ آیت: "وإذا حييتم بتحية فحيوا بأحسن منها أو ردوها..." کے عموم میں یہ چیز آسکتی ہے۔

۲- مولانا محمد ابراہیم گیا اور مولانا عامر ظفر صاحب کہتے ہیں کہ اگر احکام اسلام سے متصادم نہ ہوں اور ایسا کرنے سے تشابہ لازم نہ آتا ہو تو جائز ہے۔

۳- ضرورت اور مجبوری کے تحت اس کو "لكم دينكم ولي دين" کے انداز میں مبارکباد دینے میں کوئی حرج نہیں ہے (مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی محمد سلمان کھلی)۔

۴-مولانا قمر الزماں ندوی کا کہنا ہے کہ:

الف-غیر مسلم حضرات کو ان کے تہواروں کی مبارکباد دینا اگر اس نیت سے ہو کہ مذہب کی بنیاد پر منافرت کا ماحول ختم ہوگا اور غیر مسلم سماج میں مسلمانوں کے تئیں محبت وہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے تو جائز ہے۔

ب-اسی طرح دفع ضرر کے واسطے یا اس کافر کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے اگر کوئی مبارکباد پیش کرتا ہے تو جائز ہے۔

سوال ۳-(الف) جھنڈے کو سلامی دینے کا حکم:

اس سلسلہ میں اکثر حضرات کی رائے ہے کہ جھنڈے کو سلامی دینا اور اس کے احترام وتعظیم میں سر کو جھکانا شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ ایسی تعظیم عبادت میں داخل ہے اور غیر اللہ کی عبادت کرنا شرک ہے، لہذا ایسا کرنا شرک میں داخل ہوگا جس سے اجتناب واحتراز ضروری ولازم ہے (مقالہ مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عامر ظفر ندوی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد ارشد مدنی)۔

"یاایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون" (سورۂ مائدہ: ۹۰)

بعض حضرات نے اس ضمن میں طویل بحثیں کی ہیں اور مختلف صورتوں کے ساتھ ان کے دلائل بھی دینے کی کوشش کی ہے، ان کے دلائل اور صورتیں درج ذیل ہیں:

مولانا اختر امام عادل صاحب نے اس سلسلہ میں دونقطہ نظر کو بیان کیا ہے اور دوسرے نقطہ نظر کو تفصیل سے بیان کیا ہے جس میں عدم جواز کا رجحان ملتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مفصل فتوی امداد الفتاوی میں "عجالۃ کشف الحجاب عن مسئلۃ تعظیم بعض الانصاب" کے نام سے موجود ہے جس میں انہوں نے اس عمل کو ناجائز اور غیر اسلامی قرار دیا ہے، اور غور کیا جائے تو یہ نقطہ نظر دلائل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط ہے۔

یہ کہ جھنڈے کے اردگرد کھڑے ہونے (قیام) کی حیثیت کیا ہے، خواہ سر جھکایا جائے یا نہیں اور ہاتھ جوڑا جائے یا نہیں؟ اس کا تفصیلی ذکر انہوں نے کیا ہے لیکن ذیل میں صرف اشارہ دیا جاتا ہے، انہوں نے ہیئت کے لحاظ سے قیام کی چار صورتیں اور ان کی تعریفات لکھی ہیں:

(۱) قیام لہ، (۲) قیام الیہ، (۳) قیام علیہ، (۴) قیام بین یدیہ

اسی طرح حکم کے لحاظ سے اس کی چار تقسیمیں کی ہیں اور ان کی تعریفات لکھی ہیں: (۱) قیام ناجائز، (۲) قیام مکروہ، (۳) قیام جائز، (۴) قیام مستحب۔

مزید لکھتے ہیں کہ قیام برائے اکرام کی اجازت بھی فقہاء نے صرف اس صورت میں دی ہے جبکہ جس کے لئے قیام کیا جائے وہ مستحق تعظیم ہو اور اہل فضل و کمال میں سے ہو (درمختار مع رد المحتار ۹/ ۵۵۱) اور جھنڈے کا مستحق تعظیم ہونا ثابت نہیں، اس لئے کہ "انصاب" اور "غیر اسلامی" دونوں لحاظ سے وہ تعظیم کا مستحق نہیں بنتا، اس لئے اس کے واسطہ قیام جائز نہ ہوگا۔

مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا تنظیم عالم قاسمی نے شامی، امداد الفتاوی اور امام نووی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کسی مخلوق کے لئے جھکنا اور جھنڈے کی تعظیم کرنا شرعاً ناجائز ہے (رد المحتار ۵/ ۲۷۱، امداد الفتاوی ۴/ ۲۶۷)۔

بعض مقالہ نگار حضرات نے جھنڈے کو محترم قرار دیا ہے اور حوالہ میں جنگ موتہ میں حضرت جعفر طیار کا جھنڈے کو بلند رکھنے کی کوشش کرتے رہنا، اور ایک جنگ میں مصعب بن عمیر کے شہید ہوجانے کے بعد فوراً ہی دوسرے صحابی کا جھنڈے کو تھام لینا اور گرنے نہ دینا، اور اسی طرح جنگ خیبر کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا عنایت کرنے کے لئے ایک دن پہلے اعلان کرنا، ان جیسے واقعات کو پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دور اول میں بھی جھنڈے کو قومی شعار کے طور پر محترم سمجھا جاتا رہا ہے (مقالہ مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا سید امیر حسین جیلانی)۔

جبکہ مولانا ابوسفیان مفتاحی کا کہنا ہے کہ جھنڈے کو سلامی دینے کا رواج ہونا اور اسے جھنڈے کا احترام سمجھنا شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں، چنانچہ مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں بلہذا کسی خاص ہیئت ونوعیت کا تعین پھر اس کی خصوصیت کا اور اس میں خاص تقدس کا ادعاء بالکل غلط اور بے بنیاد ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۱۴۵)۔

جھنڈے کی سلامی کے جواز کے قائلین:

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ جھنڈے کو سلامی دینے میں کوئی حرج نہیں اگر جھک کر اور ہاتھ جوڑ کر نہ دیا جائے (مقالہ مولانا سلطان احمد اصلاحی، ڈاکٹر یوسف قاسم، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی محبوب علی وجیہی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا عبید اللہ اسعدی، سید امیر حسین جیلانی، قاضی محمد ہارون مینگل وغیرہ)۔

بعض دوسرے حضرات یہ شرط لگاتے ہیں کہ سلامی نہ دینے کی صورت میں ملک مخالف ہونے کی تہمت کا اندیشہ ہو یا اکراہ کی صورت پیش آجائے یا اتنا مجبور ہو جائے کہ ملازمت وغیرہ چلے جانے کا اندیشہ ہو تو بہ کراہت خاطر اس کی گنجائش ہو سکتی ہے اور انشاء اللہ اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا (مولانا جمیل احمد نذیری، مفتی اسرار الحق سبیلی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا سعید الرحمن فاروقی، مولانا محمد عبید اللہ، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد مصطفی قاسمی وغیرہ)۔

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- "الضرورات تبيح المحظورات" (مقالہ مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا شمس الدین، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا ارشاد قاسمی)۔

۲- "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" (مقالہ مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا شمس الدین، مولانا قمر الزماں ندوی)۔

۳- مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں: جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے اور اسلامی ملکوں میں بھی ہوتی ہے، وہ ایک فوجی عمل ہے اس میں اصلاح ہو سکتی ہے مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ عمل قرار دینا صحیح نہیں ہے (نقیب پٹنہ: جلد/ ۷، ۹/ جولائی ۱۹۳۹ء) (مقالہ مولانا اختر امام عادل، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا سعید الرحمن فاروقی، مولانا ابراہیم گجیا، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد یعقوب قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا محمد صادق، مولانا تنظیم عالم قاسمی وغیرہ)۔

۴- فتاوی رحیمیہ (۶/ ۲۸۸) میں ہے: یہ محض سیاسی چیز ہے اور حکومتوں کا طریقہ ہے، اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتا ہے، بچنا اچھا ہے، اگر فتنہ کا ڈر ہو تو بادل نخواستہ کرنے میں مواخذہ نہیں ہوگا انشاء اللہ (مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مولانا ابوبکر قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا محمد مصطفی قاسمی)۔

۵- کل ہند تعمیر مجلس ملت حیدرآباد کے ایک سمینار میں جھنڈے کو سلامی دینے سے متعلق یہ تجویز پاس ہوئی: قومی پرچم کو سلامی دینا اور قومی ترانہ کے درمیان کھڑا ہونا عبادت و بندگی کے قبیل سے نہیں بلکہ ملک سے محبت و تعلق کے اظہار کی ایک علامت سمجھی جاتی ہے، اس پہلو سے اس میں گنجائش ہے لیکن یہ اسلامی مزاج کے ہم آہنگ نہیں ہے (ماہنامہ الرشاد/ ص ۳۵، جلد/ ۴۰، شمارہ ۳۳۵، نومبر ۲۰۰۰ء) (مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی)۔

سوال ۳- (ب) وندے ماترم یا اس قسم کے دیگر ترانوں کا حکم:

اس ضمن میں تقریباً تمام حضرات کی رائے ہے کہ وندے ماترم جیسا ترانہ مسلمانوں کے لئے پڑھنا ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ اس میں ارض وطن کو معبود کا درجہ دیئے جانے جیسے شرکیہ عقائد و تصورات پائے جاتے ہیں، لہذا اس سے اجتناب کرنا چاہئے (مقالہ مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی اسرار الحق سبیلی، ڈاکٹر یوسف قاسم، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا عبید اللہ اسعدی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی وغیرہ)۔

بعض حضرات نے درج ذیل عبارتوں کو اپنے مستدل کے طور پر پیش کیا ہے:

۱- "انه من يشرك بالله فقد حرم الله عليه الجنة ومأواه النار وما للظالمين من انصار" (سورۂ مائدہ: ۷۲) (مقالہ مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا شمس الدین)۔

۲- "قل أفغير الله تأمروني أعبد أيها الجاهلون" (سورۂ زمر: ۶۴) (مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا شمس الدین)۔

۳- "إن الشرك لظلم عظيم" (سورۂ لقمان: ۱۳) (مولانا راشد حسین ندوی)۔

۴- ''لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق'' (مولانا شمس الدین، مولانا عامر ظفر، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی)۔

۵- ''عن الربيع بنت معوذ بن عفراء قالت: جاء النبي ﷺ فدخل حين بنى علي فجلس على فراشي كمجلسك مني فجعلت جويريات لنا يضربن بالدف ويندبن من قتل من آبائي يوم بدر إذ قالت إحداهن: وفينا نبي يعلم ما في غد، فقال: دعي هذه وقولي بالذي كنت تقولين. رواه البخاري'' (مشكوة المصابيح ۲/۲۷۱) (مقالہ مولانا محمد عبید اللہ)

۶- اس موضوع پر کل ہند مجلس تعمیر ملت حیدرآباد نے ایک سمینار کیا تھا جس میں شریک علماء ودانشوران نے درج ذیل فیصلہ کیا: اس سمینار کا متفقہ احساس ہے کہ وندے ماترم کو قومی گیت قرار دینا نہ صرف مسلمانوں بلکہ ملک کی دوسری مذہبی اقلیتوں پر بھی ایک ایسی چیز تھوپنا ہے جو ان کے ضمیر وعقیدہ کے خلاف ہے، مسلمانوں کے لئے یہ گیت پڑھنا قطعاً جائز نہیں۔ (ماہنامہ الرشاد جلد/۴۰، شمارہ/۵، ۳ نومبر ۲۰۰۰ء) (مقالہ مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی)

مزید مولانا اختر امام عادل کا کہنا ہے کہ اس نظم میں کئی الفاظ ایسے نامانوس ہیں جن کے معنی معلوم نہیں، اور ایسے الفاظ زبان پر لانا جائز نہیں جس کے معنی معلوم نہ ہوں، کہ ممکن ہے ان میں شرک وکفر کے معنی ہوں (شرح مسلم للنووی ۲/۲۱۹)۔

بدرجہ مجبوری پڑھنے کا جواز:

جبکہ بعض حضرات نے ایسے شخص کے لئے بدرجہ مجبوری اجازت دی ہے جسے ایسا ترانہ نہ پڑھنے کی صورت میں شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو دل سے برا سمجھتے ہوئے پڑھنے کی گنجائش ہوگی، یہ رائے مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی محمد ہارون مینگل، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، سید امیر حسین جیلانی، مولانا اختر امام عادل، سید ذاکر حسین شاہ سیالوی، سید شکیل احمد انور، سید خورشید حسن رضوی صاحبان کی ہے۔

ان حضرات کا استدلال درج ذیل آیات وعبارات سے ہے:

۱- ''من كفر بالله من بعد إيمانه إلا من أكره وقلبه مطمئن بالايمان ولكن من شرح بالكفر صدرا فعليهم غضب من الله ولهم عذاب عظيم'' (سورۂ نحل/۱۰۶)۔

۲- ''إلا ما اضطررتم'' (سورۂ أنعام/۱۱۹)۔

۳- ''الضرورات تبيح المحظورات'' (شرح الاشباه والنظائر ۱/۲۵۱)۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی کا کہنا ہے کہ ایسا ترانہ پڑھنے پر علی الاطلاق کفر کا فتوی نہیں لگایا جائے گا کیونکہ وندے ماترم کے معنی جہاں وطن کی پوجا کرنے کے ہیں وہیں دوسرے معانی بھی ہیں۔

اور ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی کا خیال ہے کہ ایسا ترانہ گانے والوں کے ساتھ اگر خاموش شریک رہتا ہے تو اس کے دین وایمان میں نقص نہیں آئے گا، اس لئے کہ ''الایمان اقرار باللسان وتصدیق بالقلب'' ہے، اور یہ دونوں چیزیں یہاں نہیں پائی جاتیں۔

لیکن مولانا شمس الدین صاحب نے اکراہ کی دو قسمیں کرتے ہوئے کہا کہ اس آیت "من كفر بالله من بعد إيمانه إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان" میں جس اکراہ کا ذکر ہے وہ اکراہ ملجی ہے جس کے اندر جان کا خطرہ ہوتا ہے لہذا یہاں رخصت دی جائے گی، اور وندے ماترم کے اندر جو اکراہ ہے وہ ملجی نہیں بلکہ غیر ملجی ہے، لہذا یہاں رخصت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

سوال ۳-(ج): عدلیہ کے فیصلوں کی شرعی حیثیت:

بعض مقالہ نگار حضرات کا کہنا ہے کہ جمہوری ممالک کے مسلمانوں کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ سب سے پہلے حکومت سے اپنے لئے کسی مسلمان امیر کے مقرر کئے جانے کا مطالبہ کریں، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو خود ہی کسی امیر کا انتخاب کرلیں اور وہ مسلمانوں کے لئے قاضی مقرر کردے جو شریعت کے مطابق فیصلے کرے (مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا محمد اقبال قاسمی وغیرہ) یہ اس لئے کہ کافر کو مسلمانوں پر ولایت عامہ حاصل نہیں ہے، مولانا عبد الرشید قاسمی علامہ کاسانی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

”ومنها الاسلام إلى قوله لأن القضاء من باب الولاية بل هو أعظم الولايات وهؤلاء ليست لهم أهلية ادنى الولايات وهى الشهادة فلان لايكون لهم أهلية أعلاها أولى“ (بدائع الصنائع)۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اولاً تو مسلمانوں کے لئے اپنے معاملات غیر شرعی عدالتوں میں لے جانا ہی درست نہیں ہے بلکہ دونوں فریق اگر مسلمان ہیں تو انہیں اپنے معاملات میں شرعی پنچایت، دار القضاء، علماء اور ارباب افتاء سے رجوع کرنا چاہئے (مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا عبید اللہ، مفتی عبد الرحیم قاسمی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابو العاص وحیدی، مفتی اسرار الحق سبیلی، مولانا شمس الدین وغیرہ)، ان حضرات نے درج ذیل دلائل دیئے ہیں:

۱۔۔۔ "قل أطيعوا الله والرسول فان تولوا فان الله لا يحب الكافرين" (سورۂ آل عمران/ ۳۲)

(مولانا راشد حسین ندوی)۔

۲۔۔۔ "ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالا مبينا" (سورۂ نساء/ ۶۰)۔

۳۔۔۔ "فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما" (سورۂ نساء/ ۶۵)۔

۴۔۔۔ "ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون/هم الفاسقون/هم الظالمون" (سورۂ مائدہ/ ۴۵،۴۴،۴۷)۔

۵۔۔۔ "يا أيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولى الأمر منكم فإن تنازعتم فى شئ فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر" (سورۂ نساء/ ۵۹)۔

۶۔۔۔ "وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا" (سورۂ حشر/ ۷)۔

۷۔۔۔ "لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين ومن يفعل ذلك فليس من الله فى شئ إلا أن تتقوا منهم تقاة" (سورۂ آل عمران/ ۲۸)۔

۸۔۔۔ "أفحكم الجاهلية يبغون ومن أحسن من الله حكما لقوم يوقنون" (سورۂ مائدہ/ ۵۰)۔

۹۔۔۔ "ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم وساءت مصيرا" (سورۂ نساء/ ۱۱۵)۔

۱۰۔۔۔ علامہ ابن القیم جوزی لکھتے ہیں: ”إن من تحاكم أو حاكم إلى غير ماجاء به الرسول فقد حكم الطاغوت وتحاكم إليه... فطاغوت كل قوم من يتحاكمون إليه غير الله ورسوله أو يعبدونه من دون إليه، أو يتبعونه على غير بصيرة من الله أو يطيعونه فيما لا يعلمون أنه طاعة الله فهذه طواغيت العالم، إذا تأملتها وتأملت أحوال الناس معها رأيت أكثرهم عدلوا عن عبادة الله إلى عبادة الطاغوت وعن التحاكم إلى الله وإلى الرسول إلى التحاكم إلى الطاغوت وعن طاعته ومتابعة رسولة إلى طاعة الطاغوت ومتابعته“ (إعلام الموقعين عن رب العالمين/ ۱/ ۵۰) (مولانا نیاز احمد مدنی)۔

ان تمام وعیدوں کے باوجود اگر کوئی فریق غیر مسلم عدالت یا جج کے پاس اپنا معاملہ لے جاتا ہے اور وہ خلاف شرع فیصلہ کرتا ہے تو وہ قابل قبول ہی نہ ہوگا، یہاں تک کہ اگر مسلم قاضی بھی اگر خلاف شرع فیصلہ کرے تو اس کا فیصلہ بھی صرف ظاہراً نافذ ہوگا باطناً اور دیانتاً نافذ نہیں ہوگا (مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابو بکر قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی)۔

دیانۃً نافذ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس کے خلاف فیصلہ ہوا ہے وہ تو مجبور ہے لیکن جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اس فریق کے لئے اس چیز سے استفادہ

شرعاً درست نہ ہوگا، یہی رائے اکثر مقالہ نگار حضرات کی ہے (مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا شمس الدین، مولانا اختر امام عادل، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا خورشید احمد اعظمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی وغیرہ)۔

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱... ''إنما أنا بشر، وانكم تختصمون إليّ، ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض، فأقضي له على نحو ما أسمع، فمن قضيت له من حق أخيه شيئا فلا يأخذه، فإنما أقطع له قطعة من النار'' (متفق عليه)۔

۲... ''لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق''۔

۳... ''السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحب وكره مالم يؤمر بمعصية فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة'' (بخاری ۲/ ۱۰۵۷، باب السمع والطاعة مالم تكن معصية)۔

۴... ''لا طاعة في معصية إنما الطاعة في المعروف'' متفق عليه (مشكوة/ ص ۳۲۹، كتاب الامارة والقضاء)۔

۵... ''من قضى له بحق أخيه فلا يأخذه فان قضاء الحاكم لا يحل حراما ويحرم حلالا'' (بخاری ۲/ ۱۰۶۴)۔

لیکن مولانا خورشید احمد اعظمی کا کہنا ہے کہ بعض امور میں ظاہراً اور باطناً اور بعض امور میں صرف ظاہراً نافذ ہوگا، اور مولانا محمد اقبال قاسمی نے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی یہ رائے تحریر کی ہے کہ اگر حاکم نے ایسی شہادتوں پر اعتماد کیا ہے جو شرعاً نامعتبر اور ناکافی ہیں تو وہ دیانتاً نافذ نہیں ہوں گے اور جن فیصلوں کی بنیاد اتنی اور ایسی شہادتوں پر ہو جو شریعت کی نظر میں بھی کافی ہو اور قانون کی نظر میں بھی، تو اب یہ مقدمات دو طرح کے ہیں، ایک وہ جن میں محض سبب شرعی کا پایا جانا کافی ہے، قاضی کا حکم ضروری نہیں،...... ایسے معاملات میں تو غیر مسلم حاکم بھی فیصلہ کرسکتا ہے، لیکن جن امور میں سبب شرعی کا پایا جانا کافی نہیں بلکہ قاضی کا حکم بھی ضروری ہے ان میں غیر مسلم منصف کا فیصلہ معتبر نہیں (بحث ونظر/ ص ۴۵، شمارہ/ ۵۱) یہی رائے مولانا عقیل الرحمن قاسمی اور مولانا اسرار الحق سبیلی وغیرہ کی بھی ہے۔

مولانا عقیل الرحمن قاسمی نے پہلے مقدمہ کی مثال یہ دی ہے: مورث کی موت سے ورثاء کے لئے میراث کا حق اور خرید وفروخت کی وجہ سے مبیع پر خریدار کی ملکیت وغیرہ، اور دوسرے مقدمہ کی مثال میں فسخ نکاح کا معاملہ ہے کہ اس میں محض اسباب فسخ کا پایا جانا کافی نہیں بلکہ قضاء قاضی بھی ضروری ہے، جبکہ مولانا اختر امام عادل اس مسئلہ کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ایسے معاملات جن میں سبب ملک کی وضاحت نہ ہو کہ کس ذریعہ سے مدعی کو ملکیت یا حق ملکیت حاصل ہوئی ہے ان معاملات میں عدالت حقیقت کے خلاف فیصلہ کردے تو فیصلہ سے وہ چیز مدعی کے لئے فی الواقع حلال نہ ہوگی، البتہ ایسے معاملات جن میں سبب ملکیت کی وضاحت کی گئی ہو تو ایسے معاملات میں عدالت کا فیصلہ نافذ ہوگا۔

جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اس کے لئے استفادہ کا جواز:

اگر فیصلہ شرعی شہادت کے مطابق ہو اور جج کا مسلم ہونا شرط نہیں ہو تو اس فیصلہ سے استفادہ کی گنجائش ہے جیسے وراثت کا مسئلہ (مولانا قمر الزماں ندوی)۔

اور تقریباً یہی رائے مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا سید امیر حسین جیلانی، اور مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام قاسمی صاحبان کی ہے، بشرطیکہ وہ فیصلہ شریعت کے معارض نہ ہو اور شرعاً فی نفسہ اس کا استعمال جائز ہو۔

مولانا راشد حسین ندوی لکھتے ہیں کہ جج کا فیصلہ اگر کتاب وسنت کے منصوص حکم کے خلاف ہے تو اس فیصلہ سے استفادہ کرنا جائز نہیں، اور اگر حکم کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو لیکن مستنبط کے مخالف ہو تب بھی بہتر یہی ہے استفادہ نہ کرے لیکن اس صورت میں استفادہ کرنے کی گنجائش احقر کے نزدیک ہوسکتی ہے، جیسا کہ فتاوی ہندیہ (۳/ ۳۱۲) کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

''ثم إذا قضى بالاجتهاد فان خالف النص لا يجوز قضاءه وان لم يخالف النص لكنه رأى بعد ذلك رأيا آخر لا يبطل ما مضى ويقضى في المستأنف بما يراه''۔

مولانا اختر امام عادل کہتے ہیں کہ قضائے قاضی کے نفاذ کا مسئلہ قدیم سے فقہاء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے حضرت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک کسی بھی معاملہ میں عدالتی فیصلہ اگر خلاف واقعہ صادر ہوا اور فریقین اس سے واقف ہوں تو یہ فیصلہ صرف ظاہری طور پر نافذ ہوگا، مگر حقیقی طور پر اس سے استفادہ جائز نہ ہوگا، لیکن حضرت امام ابوحنیفہ کے اصول پر ایسے معاملات جن کو وجود میں لانے کا قاضی کو اختیار ہے ان میں عدالتی فیصلہ سے استفادہ کرنا جائز ہے، اور جو معاملات اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہوں ان میں عدالتی فیصلہ سے استفادہ درست نہیں، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''فالأصل أن قضاء القاضي بشاهدي الزور فيما له ولاية إنشائه في الجملة يفيد الحل عند أبي حنيفة وقضاءه بهما فيما ليس له ولاية إنشائه أصلا لايفيد الحل بالإجماع، وعند أبي يوسف ومحمد والشافعي رحمهم الله لايفيد الحل فيهما جميعا'' (بدائع الصنائع ۵/ ۴۵۸ کتاب القضاء)۔

امام ابوحنیفہ کے اس موقف کی بنیاد دو روایات ہیں:

۱- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''إنكم تختصمون إليّ ولعل بعضكم ألحن بحجته من بعض، وانما انا بشر فمن قضيت له من مال أخيه شيئا بغير حق فإنما أقطعه له قطعة من النار'' (بخاری: کتاب المظالم/ ۲۴۵۸)۔

۲- دوسری روایت حضرت علیؓ کی ہے: ''ذكر أبو يوسف عن عمرو بن أبي المقدام عن ابيه أن رجلا من الحي خطب امرأة وهو دونها في الحسب، فأبت أن تزوجه فادعى أنه تزوجها وأقام شاهدين عند علي، فقالت: إني لم أتزوجه، فقال: قد زوجك الشاهدان فأمضى عليها النكاح'' (احکام القرآن للجصاص ۱/ ۲۵۳)۔

ان دونوں روایات کو سامنے رکھتے ہوئے امام صاحب نے مذکورہ بالا موقف اختیار کیا ہے، حضرت علی کی حدیث کو نکاح وطلاق اور ایسے معاملات سے متعلق کیا ہے جن میں سبب ملک کی وضاحت موجود ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان کو عام معاملات سے متعلق قرار دیا، اس طرح دونوں روایات میں تطبیق بھی پیدا ہوجاتی ہے۔

مولانا عبید اللہ اسعدی کی رائے یہ ہے کہ جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اس کے لئے حنفیہ کے اس قول کے تحت گنجائش ہوسکتی ہے کہ قاضی کا فیصلہ ظاہراً او باطناً دونوں طرح نافذ ہوتا ہے۔

سوال ۴- (الف) تہذیبی وثقافتی انضمام اور وحدت ادیان کا تصور:

تمام مقالہ نگار حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وحدت ادیان کا تصور کتاب وسنت کی رو سے باطل اور عملی طور پر غیر مفید ہے بلکہ یہ دراصل اسلام اور کفر کو جمع کرنے اور اسلام کے تشخص کو مٹانے کی ایک سازش ہے (مثال کے طور پر دیکھئے: مقالہ مولانا سید امیر حسین گیلانی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا راشد حسین ندوی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا محمد سلمان کھلی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا ظفر الاسلام، مولانا یعقوب قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ)۔

سوال ۴- (ب): انسانی اخوت کی بنیاد پر مظلوم طبقات کا تعاون کرنا:

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں کو حتی المقدور انسانی اخوت کی بنیاد پر پسماندہ غیر مسلم برادریوں کی مدد کرنی چاہئے۔ بیشتر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک مظلوم غیر مسلموں کا تعاون مسلمانوں کا اخلاقی، انسانی اور دینی فریضہ ہے اور مسلمان اس سلسلہ میں اللہ کے نزدیک جوابدہ ہیں خواہ ان کے پاس حکومت وطاقت ہو یا نہ ہو، اور انہیں تعاون کے ساتھ اسلام کی دعوت دینے کی بھی ضرورت ہے (دیکھئے: مقالہ مولانا نیاز احمد عبد الحمید مدنی، مولانا ابو العاص وحیدی، مولانا عبید اللہ اسعدی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا یعقوب قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، سید شکیل احمد انور وغیرہ)۔

مولانا محمد عبید اللہ صاحب نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام سے قریب کرنے کے لئے صدقات نافلہ وغیرہ سے ان کی مدد کرنی چاہئے۔

سید خورشید حسن رضوی لکھتے ہیں کہ دلتوں اور مظلوم غیر مسلم طبقات کی مدد کرنا اسی وقت مفید ہوگا جب وہ خود اپنے اندر بیداری پیدا کر کے اپنے آپ کو

اکثریت کے دام فریب سے نکالنے میں کامیاب ہوں گے، کیونکہ اس کے بغیر اگر صرف مسلمان ان کی مدد کریں گے تو اس سے ہندو اکثریت کو مسلمانوں کے خلاف فتنہ برپا کرنے کا موقع ملے گا اور پہلے کی طرح اکثریت ان مظلوم طبقات کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب ہوجائے گی، اور مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی کے بقول جہاد کی فرضیت مظلوم و بے سہارا انسانوں کی حفاظت ہی کے لئے ہوئی ہے۔

سوال ۴-(ج): خدمت خلق کے لئے ادارے قائم کرنا:

بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے چلائے جانے والے خدمت خلق کے اداروں کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا مومنانہ شان کے خلاف ہے، درست بات یہی ہے کہ ایسے اداروں کی خدمات کے دروازے بلاتفریق مذہب وملت تمام انسانوں کے لئے کھلے رہنے چاہئیں۔ یہ اور بات ہے کہ عام انسانوں سے مسلمانوں کا تعلق صرف انسانی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے جب کہ مسلمانوں کا آپسی تعلق انسانی کے ساتھ ساتھ اسلامی اخوت پر بھی مبنی ہوتا ہے، اس لئے ترجیح کی صورت اختیار کرنے میں بالخصوص جبکہ مسلمان زیادہ ضرورتمند ہوں، کوئی قباحت نہیں، لیکن تفریق بہر صورت غلط ہے (دیکھئے: مقالہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا محمد عبید اللہ، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، مولانا سید اسرار الحق سبیلی وغیرہ)۔

مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا محمد سلمان کھلی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، سید خورشید حسن رضوی اور مولانا محمد اقبال قاسمی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر ان اداروں کے وسائل محدود ہوں تو ان کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا بہتر اور قرین مصلحت ہے، کیونکہ مسلمان پہلے ہی تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہیں، اب ایسی صورت میں ان کے اپنے مخصوص اداروں کی خدمات بھی اگر عام ہوگئیں تو ان کے مزید پسماندہ ہونے کا اندیشہ ہے، مولانا محی الدین غازی فلاحی نے ایسے اداروں کے قیام پر زور دیا ہے جن کی شناخت ملی کے بجائے انسانی ہو، اور مولانا سلطان احمد اصلاحی نے اس قسم کے اداروں کو غیر جانبدارانہ ناموں سے موسوم کرنے کو مفید قرار دیا ہے جیسا کہ ان کے بقول متعدد قرآنی سورتوں کے نام اس طرز پر ہیں مثلاً بقرہ، روم، عنکبوت وغیرہ۔ مولانا ظفر الاسلام، مولانا محمد سلمان کھلی اور مولانا قمر الزماں ندوی اسلام کے کٹر دشمن اور معاند کو مسلمان اداروں کی امداد کا مستحق نہیں مانتے ہیں، مقالہ نگار حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱... "ليس عليك هداهم ولكن الله يهدى من يشاء، وما تنفقوا من خير فلأنفسكم وما تنفقون إلا ابتغاء وجه الله وما تنفقوا من خير يوف إليكم وأنتم لا تظلمون" (سورۂ بقرہ/ ۲۷۲)۔

تفسیر ابن جریر (۵/ ۵۸۷) میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مشرکین پر خرچ نہیں کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی (مولانا راشد حسین ندوی)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابوبکر جصاص رازی کا یہ قول ہے: ''المراد إباحة الصدقة عليهم وإن لم يكونوا على دين الاسلام وروي ذلك عن جماعة السلف'' (مولانا تنظیم عالم قاسمی)۔

قرطبی نے آیت "وما تنفقوا من خير" کے ذیل میں لکھا ہے:

''هذا الكلام متصل بذكر الصدقات فكأنه بين فيه جواز الصدقة على المشركين'' (۲/ ۳۳۷) (مولانا ظفر الاسلام قاسمی)۔

۲... "ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرا إنما نطعمكم لوجه الله لا نريد منكم جزاء ولا شكورا" (سورۂ دہر/ ۸،۹)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ جصاص کا یہ قول ہے کہ اسیران جنگ سے مراد غیر مسلم اور مشرک ہیں، لہذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ زکاۃ کے علاوہ ہر قسم کے صدقہ کی رقوم انہیں دی جاسکتی ہیں (احکام القرآن ۱/ ۵۴۸)۔

مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی اور مفتی محبوب علی وجیہی نے ان اداروں کی خدمات کے عام ہونے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ اس عمل سے کسی فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی نے آیت: ''ويمنعون الماعون'' کی روشنی میں خدمت خلق میں عقیدہ و مذہب کی تفریق برتنے کو منافقوں کا شیوہ بتایا ہے۔

مولانا راشد حسین ندوی نے خدمت خلق کے لئے قائم مسلمانوں کے اداروں کو تمام اہل مذاہب کے لئے عام رکھنے کے ضمن میں دو امور کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے: ایک یہ کہ غیر مسلموں کو زکاۃ کی رقوم نہ دی جائیں (ہدایہ ۱/ ۲۰۵)

دوسرے یہ کہ اموال زکاۃ اور بطور خاص مسلمانوں سے لئے گئے چندوں میں چندہ دہندگان کی جہت کا خیال رکھا جائے (شامی ۳/ ۳۹۵)

اسی خیال کا اظہار مولانا عبید اللہ، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا ارشاد قاسمی اور مولانا محمد اقبال قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی اور مولانا اسعد قاسم سنبھلی نے بھی کیا ہے، مولانا اسعد قاسم سنبھلی نے "تؤخذ من أغنيائهم وترد على فقرائهم" سے استدلال کیا ہے۔

۳... "واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئًا وبالوالدين إحسانا وبذي القربى واليتامى والمساكين والجار ذي القربى والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبيل" (سورۂ نساء/ ۳۶) (مقالہ مولانا راشد حسین ندوی)۔

مولانا ظفر الاسلام نے "الجار الجنب" کی تفسیر میں قرطبی کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"فالوصاة بالجار مأمور بها مندوب إليها مسلمًا كان أو كافرًا" (الجامع الأحكام القرآن ۵/ ۱۸۳)

اس کے بعد ابن جریر کی تفسیر (۵/ ۵۱) سے یہ عبارت نقل کی ہے: "وأولى القولين في ذلك بالصواب قول من قال: معنى الجنب في هذا الموضع القريب البعيد مسلما كان أو مشركا، يهوديا كان أو نصرانيا"۔

۴... "لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (سورۂ ممتحنہ/ ۸)۔

۵... "تعاونوا على البر والتقوى" (سورۂ مائدہ/ ۲)۔

۶... "خير الناس من ينفع الناس" (الجامع الصغير للسيوطی ۲/ ۹، کشف الخفا للعجلونی)۔

۷... "والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه"۔

۸... "بعثت لأتمم مكارم الأخلاق"۔

۹... "من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته"۔

۱۰..... مولانا عامر ظفر اور مولانا محمد ارشد مدنی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت اسماء بنت ابی بکر کو اپنی کافرہ ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی اجازت دیئے جانے سے استدلال کیا ہے۔ مولانا عامر ظفر نے اس واقعہ کو امام نووی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

۱۱... "أطعموا الجائع وعودوا المريض وفكوا العاني" (بخاری ۲/ ۸۴۳)۔

۱۲... "الخلق عيال الله"۔

۱۳..... حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ليس الواصل بالمكافي ولكن الواصل الذي إذا انقطعت رحمه وصلها" (ترمذی ۲/ ۱۳)۔

۱۴..... حضرت عثمان غنیؓ کے خریدے ہوئے کنویں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اہل مدینہ کو پانی لینے کی اجازت دی۔ اس وقت مدینہ میں صرف اہل اسلام ہی آباد نہیں تھے بلکہ یہودی اور عیسائی بھی رہ رہے تھے اور سب بئر عثمان سے پانی پیتے تھے۔

مولانا نیاز احمد عبد الحمید مدنی نے انسانوں سے تعلقات کی تین نوعیتیں ذکر کی ہیں، ایک موالات، دوسری مدارات، تیسری مواسات۔ ان کے بقول دل سے دوستی موالات ہے اور یہ ممنوع ہے، مفتی رفیع عثمانی اور مفتی ذاکر حسن نعمانی نے بھی تعلق کی اس قسم کو ممنوع قرار دیا ہے، مفتی محمد رفیع عثمانی نے آیت "لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين" سے استدلال کرتے ہوئے اس ضمن میں مفسر ابو السعود کا حوالہ دیا ہے (تفسیر ابن السعود ۱/ ۲۲۶ بحوالہ جواہر الفقہ)۔

مولانا نیاز احمد عبد الحمید مدنی کے بقول مدارات یعنی غیر مسلم اگر کسی کے گھر آ جائے تو اس کی خاطر تواضع کرنا، اور مواسات یعنی ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہونا، جائز ہے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی اور مولانا محمد اقبال قاسمی نے غیر مسلموں کی امداد کے ضمن میں ''الأقرب فالأقرب'' اور ''الأحوج فالأحوج'' کے اصول ذکر کیے ہیں۔

سوال ۴-(د): قدرتی آفات کے مواقع پر مسلم تنظیموں کا رویہ:

بیشتر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک ایسی صورت میں مسلم تنظیموں کو حسن سلوک اور حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے، ان کا رویہ برادران وطن کے ساتھ ہمدردانہ ہونا چاہئے۔ ان کے فرقہ پرست عناصر کی تنگ نظری کا جواب ہمیں اپنی تنگ نظری سے نہیں دینا چاہئے بلکہ ہمیں اس سلسلے میں آپ ﷺ اور صحابہ کے اسوہ کو اپنانا چاہئے (دیکھئے: مقالہ مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا راشد حسین ندوی، سید شکیل احمد انور وغیرہ)۔

مفتی عبد الرحیم قاسمی کے نزدیک فرقہ پرست عناصر کی طرف سے کی جانے والی تفریق کی صورت میں مسلمانوں سے حاصل کی گئی رقوم کو ان غریب مسلمانوں ہی پر صرف کرنا فرض ہے جن کو ظالمانہ طور پر محروم رکھا گیا ہو۔ مولانا موصوف نے مندرجہ ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے: تمام ایمان والے ایک انسان کی طرح ہیں، اگر اس کی آنکھ میں تکلیف ہو تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں تکلیف ہو تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے (مسلم، مشکاۃ ۲/ ۴۲۲)۔

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہنگامی صورت حال میں تفریق درست نہیں ہے البتہ عام حالات میں مسلمانوں کی ضروریات کو ترجیح حاصل ہونی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱... ''من يسر على معسر يسر الله عليه في الدنيا والآخرة'' (مشکاۃ)۔

۲... ''عن الأحوص عن أبيه قال: قلت: يا رسول الله الرجل أمرّ به فلا يقريني ولا يضيفني فيمر بي أفأجزيه قال: لا، اقر'' (ترمذی ۲/ ۲۱، ابواب البر والصلة: باب ماجاء في الإحسان والعفو)۔

۳... ''عن حذيفة قال: قال رسول الله ﷺ: لاتكونوا إمعة تقولون: إن أحسن الناس أحسنا وإن ظلموا ظلمنا ولكن وطنوا أنفسكم إن أحسن الناس أن تحسنوا وإن أساؤ افلا تظلموا'' (ترمذی ۲/ ۲۱، ابواب البر والصلة: باب ماجاء في الإحسان والعفو)۔

۴... ''الإسلام يعلو ولا يعلى''۔

۵... ''فإذا الذي بينك وبينه عداوة كأنه ولي حميم'' (سورۂ حم السجدہ: ۳۴)۔

۶..... آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے جانی دشمنوں کو بھی عام معافی دے دی، یہ متعصب لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کے حسن سلوک کی بہترین مثال ہے۔

۷..... بلاذری کے مطابق حضرت عمرؓ نے سفر شام کے دوران زکاۃ کی مد سے غریب اور محتاج عیسائیوں کی مدد کرنے کا حکم دیا۔

۸..... ابوعبید کی کتاب الاموال فقرہ/ ۱۹۹۶، ۱۹۹۷ کے مطابق صدقۂ فطر بھی عیسائی راہبوں کو دیا جاتا تھا (خطبات بہاولپور/ ۳۸۰ از ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم)۔

✧✧✧

عرض مسئلہ:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ مسائل

سوال نمبرا (الف، ب، ج، د، ہ):

مفتی جمیل احمد نذیری (مبارکپور)

''غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل'' کے پہلے سوال کی تمہید یوں ہے:

الف- اس وقت دنیا کے اکثر ممالک جمہوری نوعیت کے ہیں، جن میں انتخابات کے ذریعہ حکومت بنتی ہے۔ ان انتخابات میں تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ہوتا ہے۔ جو لوگ الیکشن میں امیدوار ہوتے ہیں، انہیں اپنے آپ کو امیدواری کے لئے امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنا پڑتا ہے، پھر جب عوامی انتخاب سے اسمبلی اور پارلیمنٹ وجود میں آتی ہے تو پارلیمنٹ کے تمام اراکین کو ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ بہت سے ایسے قوانین بھی وضع کرتی ہے جو شریعت اسلامی کے مغائر، بلکہ اس سے متصادم ہوتے ہیں تو:

اس تمہید کے بعد سوال کو (الف، ب) وغیرہ کے تحت کئی شقوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جواب پر مشتمل موصول شدہ مقالات کی تعداد پچاس ہے۔ مقالہ نگار حضرات درج ذیل ہیں:

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا نیاز احمد عبدالحمید مدنی، مولانا محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مفتی اسعد قاسم سنبھلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا یعقوب قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عامر ظفر، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد صادق مبارکپوری، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، مولانا محمد سلمان کھلی، سید خورشید حسن رضوی، مفتی سید اسرار الحق سبیلی، سید شکیل احمد انور، مفتی مجاہد الاسلام قاسمی، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد شمس الدین، مولانا محمد عبید اللہ (لاہور)، مولانا قاضی محمد ہارون مینگل (پاکستان)، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی (پاکستان)، مولانا سید امیر حسین گیلانی (پاکستان)، مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی (پاکستان)، مفتی ذاکر حسن نعمانی (پاکستان)، مولانا عبدالرشید قاسمی جونپوری، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا محمد ارشد مدنی، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، ایم اے عبدالقادر مسلیار، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا عبداللطیف پالنپوری۔

شق الف:

پہلے سوال کی شق (الف) میں پوچھا گیا تھا: ''کیا ان ممالک میں مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا شرعاً جائز ہوگا؟''۔

مقالہ نگاروں کی غالب تعداد نے موجودہ جمہوری نظام کو غیر شرعی تسلیم کرنے کے باوجود قواعد فقہیہ ''الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف، يختار أهون الشرين، الضرورات تبيح المحظورات'' وغیرہ کے تحت غیر مسلموں کی مذہبی یا آمرانہ حکومت کے مقابلے میں اسے ''أهون البليتين'' قرار دے کر مذکورہ ساری چیزوں میں شرکت کی اجازت دی۔ کئی حضرات نے اس شرکت کو شرائط کے ساتھ مشروط کیا ہے، بعض نے اختصار سے کام لیا ہے۔ مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی عقیل الرحمن قاسمی کہتے ہیں کہ موجودہ جمہوری نظام میں اس نیت کے ساتھ شرکت کی جائے کہ یہ وقتی ضرورت ہے۔ اسی پر قانع بن جانے کا ذہن نہ ہو، شرعی خطوط پر اصول حکمرانی و قانون سازی رو بعمل لانے کی کوشش یا کم از کم نیت ضرور ہونی چاہئے۔

بعض حضرات نے اس شرکت کی اجازت کے سلسلے میں مخصوص تعبیرات استعمال کی ہیں، مثلاً مولانا برہان الدین سنبھلی لکھتے ہیں: ''اکثر قوانین یا بالعموم خلاف اسلام بنتے ہوں یا بننے کا غالب گمان ہو تو ناجائز، ورنہ جائز''۔

احقر جمیل احمد نذیری نے لکھا ہے:

موجودہ الیکشنی نظام میں غیر شرعی قوانین کی ترمیم و تنسیخ کی کوشش کی نیت رکھتے ہوئے حصہ لیا جائے، خواہ اس پر عمل کی نوبت آئے یا نہ آئے۔

اس سلسلے میں حضرت تھانویؒ کی درج ذیل عبارت سے استدلال کیا گیا ہے، جو انہوں نے حصص کمپنی کے سودی معاملہ کے متعلق لکھی ہے:

''اور جن کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کردیں، گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا۔ مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی'' (امداد الفتاوی ۳/۴۹۱)

مولانا ابوبکر قاسمی لکھتے ہیں: ''تاہم اس قسم کی حکومت میں شمولیت اس نیت و ارادہ سے ہو کہ ہم خلاف شرع قوانین کی منظوری و تجویز پر نکیر کریں گے اور دل و جان سے اس سے نفرت کریں گے''۔

مولانا عبید اللہ اسعدی لکھتے ہیں: ''ملکی قوانین میں دستور کے ساتھ وفاداری کا جہاں تک معاملہ ہے تو مخالف شرع قوانین کچھ ہی ہوتے ہیں اور یہ جواز بنیادی مقاصد و مصالح پر مبنی ہے''۔

دستور سے وفاداری سے متعلق چند آراء اور ملاحظہ کیجئے: ''اراکین پارلیمنٹ ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھاتے ہیں نہ کہ قانون سے وفاداری کا، کیونکہ قانون کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ خواہ وہ پارلیمنٹ کا رکن ہو یا ایک عام شہری، تو اگر ملک کا دستور سیکولر ہو، بایں معنی کہ ہر شخص کو اس کے مذہبی معاملات میں آزادی حاصل ہوگی، یعنی مذہبی معاملات میں عدم مداخلت، جیسا کہ دنیا کے اکثر ممالک کے دستور میں شامل ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ملک کے دستور میں کوئی چیز شریعت اسلامی سے متصادم نہ ہوگی۔ لہٰذا اس ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا جائز ہوگا'' (مولانا نعیم اختر قاسمی)۔

''ہندوستان جیسے ملکوں کے دستور کا حلف اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کی بنیاد الحاد اور انکار خدا پر نہیں ہے، بلکہ عقیدے اور مذہب پر عمل کی آزادی اس کی بنیادی دفعات میں سے ہے۔ مسلمان اس کا حلف اسی کی نیت سے اٹھائے گا: ''إنما الأعمال بالنيات'' (مولانا سلطان احمد اصلاحی)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی لکھتے ہیں: جہاں تک ہمارے ملک ہندوستان کا مسئلہ ہے تو اس کو غیر مسلم ممالک میں شمار نہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ جمہوری ملک ہے اور جمہوری ملک میں تمام لوگوں کو یکساں طور پر مکمل باشندگی کا حق ہے۔

قاضی محمد ہارون صاحب غیر مسلم ممالک میں ہونے والے الیکشن کی دینی حیثیت تسلیم نہیں کرتے، وہ اس کی دنیوی اور معاشرتی حیثیت قرار دیتے ہیں۔
مفتی اسعد قاسم سنبھلی لکھتے ہیں: ''شرعی زبان میں اس عمل کو جائز کہتے ہوئے دل لرزتا ہے''۔

اس کے برخلاف درج ذیل حضرات نے الیکشن کی مذکورہ سرگرمیوں میں حصہ لینا واجب قرار دیا ہے۔

مفتی محمد ظفر عالم ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا اختر امام عادل۔

وہیں مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم (جامعہ اشرفیہ لاہور پاکستان)۔ الیکشن کی مذکورہ ساری سرگرمیوں میں شمولیت کو ناجائز کہتے ہوئے لکھتے ہیں:
''ہندوستان کا آئین ایک کفریہ آئین ہے اور وہاں مسلمانوں (منتخب نمائندوں) کو کفری آئین پر حلف وفاداری اٹھانا پڑتا ہے جو کہ رضا بالکفر کی وجہ سے حرام اور کفر ہے۔ پھر مسلمانوں کو اپنے مقاصد و حقوق کے جدوجہد کی تلقین کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اگر یہ صورت ممکن نہیں اور وہ شعائر و فرائض اسلام بہ آزادی نہیں بجالا سکتے تو ان پر ہجرت کرنا فرض ہے اور ہجرت ایسے علاقے میں کریں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو، وہ اپنے دین وایمان کو محفوظ کرسکیں، چاہے وہ علاقہ اسی ملک میں ہو یا کسی اور ملک میں''۔

لیکن اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلم اکثریتی ملک میں ہجرت کرنا بھی چاہے تو اس معاملہ میں زمینی حقیقت کیا ہے؟ اسے مولانا محمد شمس الدین صاحب کی زبانی سنئے: ''کسی بھی قوم کا اندازہ جمہوریت کے اندر اس کی مردم شماری سے لگایا جاتا ہے کہ اگر مردم شماری میں کوئی قوم دیگر اقوام پر سبقت حاصل کرلیتی ہے تو مملکت جمہوریہ اس کی طاقت کو تسلیم کرتی ہے اور پھر مردم شماری کا مدار اس کے یہاں ووٹ پر ہے اور اسی پر شہریت کا مدار بھی ہے۔ اگر ووٹر لسٹ میں نام درج ہے تو شہریت حاصل ہوگی ورنہ غیر شہری قرار دیا جاتا ہے، اور حقوق شہریت سے ایسے لوگوں کو محروم گردانا جاتا ہے، اس کی بہت زندہ مثال چند سال قبل کا واقعہ ہے جس

میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو غیر ملکی، پاکستانی، بنگلہ دیشی قرار دے کران کے پیدائشی وطن سرزمین ہند سے نکال کر باڈر پر لے جا کر چھوڑا گیا جنہیں دوسری حکومت نے بھی قبول نہیں کیا اور پھر اس کے بعد انہیں موت کی میٹھی نیند سلا دیا گیا"۔

جن مقالہ نگار حضرات نے الیکشن اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دی یا اسے واجب کہا، انہوں نے امید وار کے اوصاف و خصائل، امیدواری کے طریقے اور انتخابی مہم چلانے کے اصول پر بھی کافی بحث کی ہے، مثلاً امانت و دیانت، اخلاقی برتری، مخالف پر الزام تراشی اور الزام سے احتراز، جھوٹے وعدے نہ کرنا۔ رکن اسمبلی یا رکن پارلیمنٹ ہو جانے کی صورت میں رکنیت کی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت، اسمبلی و پارلیمنٹ میں مسلمانوں کے مفادات کا پورا پورا تحفظ کرنے کا عزم وارادہ وغیرہ وغیرہ۔ اور اپنی باتوں کو آیات کریمہ واحادیث نبویہ سے مبرہن کیا ہے۔

اس سلسلے میں عہدہ ومنصب طلب کرنے پر بھی تفصیلی گفتگو موجود ہے۔ غیر مسلم کا دیا ہوا منصب قبول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یہ بحث بھی آئی ہے۔ بیشتر مقالہ نگار حضرات نے سورۂ یوسف آیت ۵۵ اور آیت ۷۶ نقل کرتے ہوئے دونوں کا جواز ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس وقت کسی عہدہ کے لئے خود کو پیش کرنا جائز ہے جب دیانۃً یہ سمجھتا ہو کہ میں اس کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کر لے جاؤں گا۔ اگر میں خود کو نہیں پیش کروں گا تو یہ منصب نااہلوں کے سپرد ہو جائے گا جس سے مسلمانوں کا نقصان ہوگا۔ حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: "سبحان اللہ فإذا لم يستعمل خيار كم يستعمل شرار كم" (التلخیص الحبیر لابن حجر ۲/ ۴۰۲) (سبحان اللہ! اگر تم میں اچھے لوگ کام میں نہ لگیں گے تو برے لوگوں کو یہ کام دلایا جائے گا) (مقالہ مولانا اختر امام عادل)۔

کئی مقالہ نگار حضرات نے امیدواروں کے لئے یہ شکل بتائی ہے کہ "مسلمانوں کی ایک جماعت اہل کو نامزد کرے" (مولانا عبد اللطیف پالنپوری، محمد سلمان کھلی، مفتی محمد رفیع عثمانی)۔

یہاں مولانا ثابت شمیم رشادی کے مقالہ کا یہ حصہ سامنے رہے تو بہتر ہے:

"جمہوریت میں کوئی خود کو نامزد نہیں کرتا، بلکہ چند افراد کسی کو نامزد کرتے ہیں اور وہ شخص الیکشن آفیسر کے سامنے اپنے کاغذات نامزدگی کو داخل کر کے اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے، اور پھر عوام اپنے ووٹ کے ذریعہ اس فرد کے نمائندہ ہونے یا نہ ہونے کا اظہار کرتے ہیں"۔

شق (ب):

اس کا سوال یوں تھا: "چونکہ ان انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات بھی متعلق ہو سکتے ہیں، تو کیا اس بنیاد پر مسلمانوں کے لئے ووٹ دینا شرعاً واجب قرار دیا جا سکتا ہے؟"۔

اس کے جواب میں زیادہ تر حضرات نے واجب ہی کہا ہے۔ کچھ حضرات نے جائز، کچھ حضرات نے بہتر، مفتی مجاہد الاسلام قاسمی نے دنیوی اعتبار سے واجب کہا ہے اور یہ حدیث نقل کی ہے: "أنتم أعلم بأمور دنيا كم"، لیکن راقم کے خیال میں شرعی واجب قرار دینے میں زیادتی فی الدین لازم آئے گا، جبکہ دین مکمل ہو چکا ہے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی لکھتے ہیں: "واجب قرار دینا تو مشکل ہے، کیونکہ وجوب کے لئے قوی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ جائز یا مناسب قرار دیا جا سکتا ہے"۔ مولانا لکھتے ہیں کہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ووٹ کے استعمال کی ایک شرعی حیثیت "شہادت" بھی بتائی ہے۔ لیکن یہ رائے پاکستان جیسے مسلم اکثریت والے ملک کو پیش نظر رکھ کر دی گئی معلوم ہوتی ہے، مگر ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریت والے ملک کی، مسلم اکثریت والے ملکوں سے برابری یا من کل الوجوہ مماثلت ضروری نہیں"۔ اس قسم کی بات مفتی اسعد قاسم سنبھلی نے بھی لکھی ہے۔

قاضی محمد ہارون مینگل لکھتے ہیں: "اس موہوم امید پر ووٹ دینے کو شرعی واجب کی حیثیت نہیں دی جا سکتی، اور نہ ہی غیر مسلم ممالک میں ووٹ دینے کو شہادت قرار دیا جا سکتا ہے، جو ضروری ہو اور اس کے کتمان کو گناہ قرار دیا جائے"۔

سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی (پاکستان) نے ووٹ کے استعمال کی چار صورتیں بیان کر کے دو کو واجب، تیسری کو مستحسن ومباح، چوتھی کو ممنوع وحرام قرار دیا ہے (یعنی جب متعصب غیر مسلم کو ووٹ دینے کا مرحلہ ہو)۔

ووٹ کی شرعی حیثیت کو متعین کرنے کے لئے مقالہ نگار حضرات نے "شہادت"، "وکالت"، "شفاعت" والی نصوص وآثار سے استدلال کیا ہے۔ بعض

حضرات نے تفصیل کی ہے، بعض نے مختصراً لکھا ہے۔ البتہ مولانا اختر امام عادل صاحب نے اس میں ایک چوتھی حیثیت ''مشورہ'' کا اضافہ بھی کیا ہے۔

شق (ج):

اس شق میں پوچھا گیا تھا: ''اگر بعض ایسی سیاسی جماعتیں الیکشن میں حصہ لیتی ہوں جنہوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو، لیکن ان کے بعض امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب ہو تو کیا مسلمانوں کے لئے ان کی جماعتی فکر سے قطع نظر اشخاص وافراد کے ذاتی حالات کی بنا پر انہیں ووٹ دینا جائز ہوگا؟ اور کیا خود مسلمانوں کے لئے ایسی سیاسی جماعتوں میں شمولیت درست ہوگی؟''

اس سلسلے میں مقالہ نگار حضرات کا عام رجحان یہی ہے کہ نہ ایسی پارٹی میں شمولیت درست ہے، نہ ایسی پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دینا ہی درست ہے، خواہ ذاتی اعتبار سے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہی کیوں نہ ہو۔

مفتی اسعد قاسم سنبھلی لکھتے ہیں: قرآن کی اصطلاح میں وہ حزب الشیطان ہے۔ مضبوط ایمان کی موجودگی میں اس گروہ سے نبرد آزمائی ہی کے لئے تو امت کو مبعوث کیا گیا ہے، اب اس میں شمولیت کے کیا معنی؟

دونوں باتوں کو ناجائز کہنے والے بتاتے ہیں کہ موجودہ جماعتی سیاست، اور دل بدلے قانون کی موجودگی میں جماعت سے باہر فرد کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ شخص نہ چاہتے ہوئے بھی پارٹی اگر کوئی مسلم دشمن بل لائے تو حمایت پر مجبور ہوگا۔ دوم یہ کہ اس سے اس کی پارٹی کو اکثریت مل سکتی ہے۔

اس کے برخلاف کچھ حضرات نے دونوں کی اجازت دی ہے۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی لکھتے ہیں: ''اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی نیت سے مسلمانوں کا ایک طبقہ اگر بھاجپا میں شامل ہوتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں''۔ مفتی عبد الرحیم قاسمی لکھتے ہیں: ''دین وایمان کی حفاظت کے ساتھ ایسی پارٹیوں میں مسلمانوں کی شرکت ممکن ہو تو شریک ہوسکتے ہیں''۔

یہاں مولانا ارشاد احمد قاسمی بھاگلپوری کی یہ عبارت بھی سامنے رہے تو بہتر ہے: خیال رہے کہ اس شخص سے فائدہ موہوم اور منشور کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونا یقینی ہے، لہذا یقینی کو موہوم کے تابع کرکے نہ ووٹ دینا جائز ہوگا اور نہ ایسی جماعتوں میں شمولیت جائز ہوگی۔

جو حضرات صرف امیدوار کو ووٹ دینے کی اجازت دیتے ہیں، ان کی آراء یہ ہیں: ''اگر اس سے بہتر کوئی امیدوار مسلمانوں کے حق میں نہ ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں مسلمان اس امیدوار کو ووٹ دے سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے حقوق دلوانے کا وعدہ کرے'' (مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا عامر ظفر ولد محمد صاحب)

''اگر کوئی ایسا بارسوخ ہو کہ اپنی جماعت میں پالیسی ساز افراد میں شامل ہو، وعدہ کرے کہ میں اپنی جماعت کی سوچ فکر اور ذہن کو بدلنے کی کوشش کروں گا تو اسے ووٹ دینے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے'' (جمیل احمد نذیری)۔

سیاسی تدبیر کے تقاضے کے طور پر استثنائی حالات میں ان کے کسی نیک خصلت امیدوار کو کامیاب کرانے کی خفیہ سعی کی جاسکتی ہے۔ اور اس طرح مضبوط کردار اور مخلصانہ ایمان کے حامل کسی مسلمان امیدوار کو ان کے ٹکٹ پر کامیاب کرانے میں حصہ لیا جاسکتا ہے...... یہ طرز عمل کسی موزوں متبادل کی عدم موجودگی میں ہی قابل غور ہے ورنہ نہیں (سید شکیل احمد انور حیدرآباد)۔

''اگر وہ اسمبلی تک ہی محدود ہے تو اسے ووٹ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے حلقہ کے حکام سے رابطہ رکھتا ہے، اس کا اثر ہے اور یقینی ہے کہ وہ مسلمانوں کا تحفظ کرے گا تو پھر اسے ووٹ دینا جائز ہوگا'' (سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، پاکستان)۔

یہ وہ حضرات تھے، جنہوں نے مخصوص شرائط کے ساتھ ایسے امیدوار کو ووٹ دینے کی اجازت دی تھی، لیکن مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، سید امیر حسین گیلانی (پاکستان) نے امیدوار کی نیک خصلت اور مسلمانوں کے ساتھ مناسب رویہ کو ہی ووٹ دینے کے لئے کافی قرار دیا ہے۔ اور سید خورشید حسن رضوی حیدرآباد لکھتے ہیں: یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں، حالات کا سنجیدگی اور باریک بینی سے جائزہ لے کر جو بھی مناسب نظر آئے اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

شق (د):

اس کا سوال یوں ہے: ''اور کیا انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے، ان میں شرکت اور ان کی حمایت کی جاسکتی

ہے یا نہیں، اور شرعاً اس کی کیا حیثیت ہوگی؟"۔

اس سوال کا جواب تقریباً سارے ہی مقالہ نگار حضرات نے اثبات میں دیا ہے۔ کسی نے صرف جائز کہا ہے، کسی نے ضروری، کسی نے مستحسن۔ لیکن کچھ حضرات نے قیود لگائی ہیں۔

ملی مفادات کے تحت معاہدات کئے جاسکتے ہیں، لیکن اس مہم کو شرعی رنگ دینا یا مقتدی شخصیات کا اس میں شریک ہونا درست نہیں (مفتی اسعد قاسم سنبھلی)۔

بشرطیکہ ان سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ نہ ہو (مفتی محمد رفیع عثمانی)۔

بشرطیکہ وہ مذہب اسلام کے معاند اور مسلمانوں کے خلاف نہ ہوں (مولانا محمد ارشاد قاسمی)۔

بشرطیکہ اسلام اور مسلمانوں کا وقار مجروح نہ ہو (مولانا اختر امام عادل)۔

مقالہ نگار حضرات نے معاہدات کے جواز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان معاہدات سے استدلال کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد مختلف اوقات میں کبھی یہود سے، کبھی قریش مکہ سے، کبھی دوسرے قبائل سے کئے تھے۔

شق (ھ):

اس کا سوال یوں تھا:

"معروف کو پھیلانا، منکر سے روکنا، انسانیت کے نفع کے لئے کام کرنا اور معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا امت مسلمہ کا شرعی فریضہ ہے۔ ان مقاصد کے لئے بعض اوقات سماج کے مختلف طبقات سے تعاون حاصل کرنا پڑتا ہے اور ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض دفعہ غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر ان کاموں کو انجام دیا جاتا ہے، تو کیا سماج کی مشترکہ ذمہ داریوں اور اچھی باتوں کی ترویج اور منکرات کو روکنے کے لئے غیر مسلم بھائیوں کے اشتراک کے ساتھ کام کیا جاسکتا ہے اور ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کی جاسکتی ہیں جن میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں؟"۔

اسکا جواب بھی تقریباً سارے مقالہ نگاروں نے اثبات میں دیا ہے، اس کی مشہور مثال "حلف الفضول" سے دی ہے۔ بعض حضرات نے صرف جائز کہنے پر اکتفاء کیا ہے، بعض حضرات نے شرطیں لگائی ہیں کہ مقاصد اسلام کو نقصان نہ پہنچے، مسلمانوں کا وقار مجروح نہ ہو، وہ ہم کو منکر میں شریک نہ کریں تو جائز ہے۔

مولانا محی الدین غازی فلاحی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا عامر ظفر، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا محمد عبیداللہ (لاہور)، مفتی محمد رفیع عثمانی (پاکستان)، مولانا سید امیر حسین گیلانی اور مولانا محمد اقبال قاسمی نے لکھا ہے کہ اس طرح کی تنظیمیں خود مسلمان بنائیں یا پھر ان میں مسلمانوں کا غلبہ ہو، آخری فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہو، مسلم شناخت کے ساتھ ہو تاکہ اس کا کریڈٹ مسلمانوں کو ملے۔

مفتی اسعد قاسم سنبھلی نے اس سوال کو ہی عجیب قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "معروف ومنکر خالص شرعی اصطلاحیں ہیں جن کے امر ونہی کی ذمہ داری قرآن کریم نے ہر جگہ اہل ایمان پر ڈالی ہے،..... پھر دوسطروں کے بعد لکھتے ہیں: یہ سوال کچھ عجیب سا لگتا ہے، اول تو معروف ومنکر کی تعیین ہی میں ہمارے اور ان کے درمیان بڑا اختلاف پیدا ہوگا اور شاید چند ہی چیزیں متفق علیہ ہوں گی۔ اب ہمارے مخاطب اگر غیر مسلم ہیں تو یہ درست نہیں، کیونکہ وہ پہلے ایمان لانے کے مکلف ہیں۔ اگر مخاطب مسلمان ہیں تو ان پر سب سے زیادہ اخلاقی دباؤ علماء امت ہی کا پڑتا ہے، دوسروں کی شرکت سے بدگمانی پیدا ہوگی اور حق وباطل کا تصور بھی ختم ہوجائے گا، اس لئے ایسے ادارے قائم کرنا اور ان میں شرکت کرنا درست نہیں۔ ہمیں یہ کام حسب سابق اپنے ہی طور پر کرنا چاہئے"۔

مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کو بھی سوال کے ایک لفظ پر اشکال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"نوٹ: سوال نمبر (ھ) میں دوجگہ غیر مسلموں کے لئے "غیر مسلم بھائیوں" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے کئی جگہ غیر مسلموں کو دوست بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اور بھائی بنانا تو دور کی بات ہے، اخوت کا رشتہ تو صرف اہل اسلام کے درمیان ہی ہوسکتا ہے۔

پھر سورۂ ممتحنہ/۱، سورہ مائدہ/۵۷، سورہ مائدہ: ۵۱، سورۂ حجرات: ۱۰ کی آیات کریمہ نقل کی ہیں۔

٭٭٭

عرض مسئلہ:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ مسائل

سوال نمبر ۲ (الف، ب، ج، د، ھ):

مفتی انور علی اعظمی، دار العلوم مئو

سوالنامہ "غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ مسائل کے سوال ۲ کی سبھی پانچ شقوں کے عرض کی ذمہ داری راقم الحروف کے سپرد کی گئی ہے۔

اس سوال میں پانچ شقیں ہیں:

(الف) میں یہ پوچھا گیا ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا بہتر ہے تاکہ وہ غیر مسلموں کو اسلامی اخلاق و کردار کے ذریعہ متاثر کر سکیں، یا اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا بہتر ہے تاکہ وہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رہ سکیں؟

اس سوال کے جواب میں زیادہ تر مقالہ نگاروں نے علاحدہ آبادی بنانے کو بہتر قرار دیا گیا ہے تاکہ غیر مسلموں کے مذہبی اور ثقافتی اثرات سے محفوظ رہ سکیں، اس رائے سے موافقت کرنے والوں میں مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مفتی اسعد قاسم سنبھلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا یعقوب قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عامر ظفر اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا سلمان کھلی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا شکیل احمد انور، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا شمس الدین (نوگاؤں)، مولانا عبید اللہ (لاہور)، قاضی محمد ہارون (پاکستان)، مفتی ذاکر حسین (پشاور)، مولانا ارشاد احمد (گورینی)، مولانا ارشد مدنی (جامعہ ابن تیمیہ)، مفتی عبدالرحیم قاسمی (بھوپال)، مولانا اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی (دربھنگہ)، مولانا اختر امام عادل وغیرہ ہیں۔

اختلاف کرنے والوں میں ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا عبدالرشید قاسمی جونپوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا امیر حسین گیلانی (رکن جمعیت علماء اسلام پاکستان) لکھتے ہیں کہ پختہ اور مضبوط مسلمانوں کو مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا چاہئے اور کمزور مسلمانوں کو علاحدہ آبادی میں۔ یہی رائے مولانا ذاکر حسین (رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان) کی بھی ہے۔

مولانا ثابت شمیم رشادی لکھتے ہیں کہ سکونت کا مسئلہ حالات پر چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔ مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی کی بھی یہی رائے ہے۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی رائے ہے کہ دونوں طرح کی آبادی میں رہائش اختیار کرنا درست ہے۔

راقم الحروف کی نظر میں ہندوستان جیسے ملک میں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت، نیز اپنے دین و ایمان کے تحفظ کے لئے علاحدہ آبادیوں میں رہنا تو بہت بہتر ہے، لیکن سارے مسلمانوں کے لئے ایسا کرنا عملاً بہت مشکل ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ دیہات کے غریب مسلمانوں کے لئے مالیات کی فراہمی کا ہے۔ دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی مسجدیں موجود ہیں، اگر سارے مسلمان ایسی آبادیاں چھوڑ کر اپنی الگ بستیاں بسانے کی کوشش کریں گے تو ہزاروں مسجدیں ویران ہو جائیں گی، ہزاروں مقابر کی بے حرمتی ہوگی۔ ابھی ہم ایک بابری مسجد کے مسئلہ میں الجھے ہوئے ہیں، ہمارے سامنے ایسے سینکڑوں مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بعض حضرات نے غیر مسلم آبادیوں سے الگ ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

"أنا بريئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين"۔ (رواه الثلاثة وإسناده صحيح) (سبل السلام ۴/ ۹۷)

لیکن اس حدیث کا تعلق دار الحرب کے مسلمانوں سے ہے۔ بعض حضرات نے "ابوداؤد شریف" کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے:

''من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله'' (بذل المجهود ۴/ ۷۲)

لیکن اس حدیث کی شرح میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری تحریر فرماتے ہیں:

''والأحسن أن يقال: معناه اجتمع معه أي اشترك في الرسوم والعادة والهيئة والزي... ويحتمل أنه تغليظ'' (۵/ ۶۷)

اس زمانہ میں بعض ترقی پسند مسلمان مسلم محلوں سے کوچ کر کے غیر مسلم محلوں میں بسنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کو اپنی ترقی سمجھتے ہیں۔ اس کی بعض مثالیں احمد آباد (گجرات) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مسلمانوں کا یہ طریقہ ان کی مذہبی بیزاری کی علامت ہے۔ بعض مسلمان اکا دکا غیر مسلم محلوں میں آباد دکھائی دیتے ہیں، وہاں مسجد بھی نہیں ہوتی، اسلامی شعار کے ساتھ رہنا بھی مشکل ہے۔ ایسے مسلمانوں کو یقیناً مسلم آبادیوں میں منتقل ہوجانا چاہئے، لیکن جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادیاں موجود ہیں، مساجد و مقابر ہیں، اگر ان آبادیوں میں غیر مسلموں کی رہائش بھی ہو تو وہاں ان کے مذہبی اور ثقافتی اثرات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے دعوتی اور تبلیغی نظام کو مضبوط کیا جائے۔ دینی مراکز قائم کئے جائیں، مسلمانوں کی دینی حس بیدار کی جائے، آبادیاں چھوڑ کر بھاگنا ہمارے مسئلہ کا مستقل حل نہیں ہے، بلکہ اپنی کمزوریوں کا علاج تلاش کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی غفلت دور کرنے کی فکر نہیں کریں گے تو کہیں بھی دینی تشخص کے ساتھ رہنا مشکل ہوگا۔ اس کی مثال میں بہت سے مسلم شہروں بلکہ بعض مسلم ملکوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ب- اس شق میں دو باتیں مذکور ہیں، مسئلہ کی وضاحت کے لئے ان کو الگ الگ کرنا مناسب ہوگا۔ ایک مسئلہ ہے کسی غیر مسلم میت کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کرنے کا۔ اس کے جواب میں تقریباً سارے مقالہ نگار حضرات متفق ہیں کہ کسی غیر مسلم میت کے لئے ایصال ثواب، دعا اور استغفار جائز نہیں۔ واضح دلیلیں کتاب وسنت میں موجود ہیں:

"ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين ولو كانوا أولي قربى من بعد ما تبين لهم أنهم أصحاب الجحيم" (سورۂ توبہ: ۱۱۳)۔

دوسری واضح دلیل صحیح مسلم ''کتاب الجنائز'' میں موجود ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ماں کے لئے دعائے مغفرت کی اجازت چاہی تو اللہ رب العزت نے اس کی اجازت نہیں دی، صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیارت قبر کی اجازت ملی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم گئے اور خود بھی روئے اور ساتھ والوں کو بھی رلایا (صحیح مسلم کتاب الجنائز، جلد ا)۔

اس شق میں دوسرا مسئلہ ہے کسی مشرک کے جنازہ میں شرکت کرنے اور آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہنے کا۔

اکثر مقالہ نگاروں نے جنازہ اور آخری رسومات میں شرکت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ مانعین کے اسماء یہ ہیں: مولانا راشد حسین ندوی، مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا صادق مبارکپوری، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا خورشید حسن رضوی، مولانا اسرار الحق سبیلی، سید شکیل انور، مفتی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا شمس الدین (آسام)، مولانا عبیداللہ (لاہور)، قاضی محمد ہارون (پاکستان)، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی۔

سید امیر حسین گیلانی (پاکستان)، مفتی ذاکر حسین نعمانی (پشاور)، مولانا ارشاد احمد (گوریی)، مولانا عبدالرحیم (بھوپال)، مولانا ابوبکر قاسمی (دربھنگہ)، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ثابت شمیم رشادی اور مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں کہ جنازہ سے آگے یا کنارے دوری بنائے ہوئے شرکت کی جاسکتی ہے۔ مولانا ارشد مدنی (جامعہ ابن تیمیہ) کی رائے بھی یہی ہے، مفتی جمیل احمد نذیری اور ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی نے جلوس جنازہ میں شرکت کی گنجائش ذکر کی ہے۔ ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی صاحب بھی اس رائے سے متفق ہیں۔

جلوس جنازہ میں شرکت کی اجازت دینے والوں نے مصنف عبدالرزاق کے آثار کا حوالہ دیا ہے۔ مانعین نے قرآنی آیت: ''ولا تصل على أحد منهم مات أبدًا ولا تقم على قبره'' (سورۂ توبہ) سے استدلال کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کے انتقال پر حضرت علیؓ سے کہا: ''اذهب فواره'' (جاؤ اس نعش کو چھپا دو)، ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود نہیں گئے۔ اس لئے عام حالات میں مسلمانوں کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ کفار کے جنازہ و مذہبی رسومات میں شرکت نہ کریں۔ بعض حالات استثنائی ہوتے ہیں، شریعت بھی شدید ضرورت کے وقت کچھ گنجائش دیتی ہے۔

مصنف عبدالرزاق کی روایات کو اسی طرح کی شدید مجبوریوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ عمومی حالات میں مسلمانوں کا وطیرہ وہی ہونا چاہئے جو قرآن کریم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ میں ذکر کیا ہے: ''فلما تبين له أنه عدو لله تبرأ منه'' (سورۂ توبہ)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے لئے دعا

کرتے رہے، لیکن جب ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے، یعنی حالت کفر پر مر چکا ہے تو ابراہیم علیہ السلام بالکل الگ ہو گئے۔ اس کے بعد اس کی ہمدردی اور مروت میں کوئی کام نہیں کیا۔ اس دور کے نامور مفتیان کرام مثلاً مفتی محمود الحسنؒ، مفتی نظام الدینؒ، مفتی عبدالرحیم لاجپوری، مفتی رشید احمد نعمانی وغیرہم کی رائے بھی یہی ہے۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ یہ فتنہ اور مداہنت کا دور ہے۔ اگر عمومی اجازت دے دی جائے تو مسلمانوں میں ایک مصلحت پسند طبقہ ہے، وہ اس اجازت کا غلط مطلب نکالے گا اور وہ کھلم کھلا غیر مسلموں کے جنازہ میں شرکت کرنے لگے گا۔ ان کے مذہبی نعروں سے متاثر ہوگا۔ اس لئے اس مسئلہ میں عمومی اجازت کا دروازہ بند کر دینا چاہئے، اگر کہیں کوئی شدید مجبوری ہو تو وہاں مفتی سے مسئلہ پوچھ کر ہی عمل کیا جائے۔

ج- غیر مذہبی تقریبات جیسے شادی، بچہ کی پیدائش وغیرہ کے مواقع پر کسی غیر مسلم کی طرف سے جو تحفے تحائف یا مٹھائی وغیرہ مسلمانوں کو بھیجے جاتے ہیں، ان کے بارے میں عمومی رجحان یہ ہے کہ ان کے لینے اور کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض حضرات نے اس میں یہ شرط ذکر کی ہے کہ اس کے پاک ہونے کا گمان غالب ہو، یا اس میں کوئی پلید اور ناپاک شئ نہ ملی ہو۔ اس شرط سے اصل مسئلہ میں کوئی خلل نہیں پڑتا، کیونکہ ناپاکی کا معمولی سا بھی شبہ ہو جانے کے بعد کوئی مسلمان نہ اسے قبول کرے گا اور نہ ہی کھائے گا۔ مذہبی تقریبات سے متعلق جو تحائف ہوتے ہیں ان کی دو قسم ہے: ایک تو وہ جو بتوں کو چڑھائے ہوئے ہوں، جن کو پرشاد کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں بھی عمومی رائے یہی ہے کہ ان کا لینا اور کھانا جائز نہیں ہے۔ مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی لکھتے ہیں کہ بتوں کا چڑھاوا وصول کر کے کسی غیر مسلم کو بطور ہدیہ بھیج دینا چاہئے، لیکن عام مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ ایسا ہدیہ قبول نہ کیا جائے، کیونکہ وہ "ما أھل بہ لغیر اللہ" کے زمرہ میں آتا ہے۔ مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی لکھتے ہیں کہ ایسے ہدیہ کو قبول نہ کرنے کی معقول وجہ ان کو سمجھا دی جائے تاکہ کسی طرح کی بد دلی نہ ہو۔ تہوار پر ملنے والے غیر مسلم کے تحفہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کا پوجا پاٹ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ محض خوشی کا اظہار مقصود ہو، جیسے دیوالی کے موقع پر ملنے والا تحفہ، کاروباری تعلق کی بنا پر غیر مسلم اپنے مسلم تعلق والوں کو مٹھائیاں بھی دیتے ہیں اور سامان بھی۔ اگر کسی غیر مسلم کا کسی مسلم سے لمبا تجارتی لین دین ہو تو اس موقع پر بڑے بڑے قیمتی سامان، مثلاً فریج، کولر وغیرہ دیتا ہے اور عام تعلق والوں کو مٹھائی کی پرچیاں دیتے ہیں کہ فلاں دکان سے اتنی مٹھائی لے لو، اس دکاندار سے ان کا معاملہ پہلے طے ہوتا ہے۔ اس قسم کے ہدایا کے بارے میں عام رجحان جواز کا ہے، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی دیوالی کے تحفہ کو جائز قرار دیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے "الاقتضاء" میں متعدد صحابہ کرام کے آثار مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے نقل کئے ہیں، ان سے غیر مسلموں کے تہوار کے تحفے قبول کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا کہ مجوسیوں سے ہمارے تعلقات ہیں اور اس کی وجہ سے وہ اپنے تہوار کے موقع پر ہمیں ہدیہ دیتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا: وہ اگر گوشت وغیرہ دیں تو نہ کھاؤ، البتہ پھل وغیرہ کھا سکتی ہو۔ حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے بھی یہی منقول ہے، انہوں نے اپنے گھر والوں کو ہدایت کی کہ نیروز اور مہرجان کے موقع پر جو تحفے مجوسی لوگ بھیجتے ہیں ان میں سے پھل وغیرہ تو کھا لو اور باقی چیزیں واپس کر دو (مصنف ابن ابی شیبہ بحوالہ الاقتضاء)۔

د- مساجد و مدارس اور مذہبی جلسوں میں غیر مسلموں کا تعاون درست ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اگر غیر مسلم اپنے اعتقاد میں اس کو قربت سمجھتا ہے اور یہ اندیشہ بھی نہیں ہے کہ اس پر احسان جتلائے گا یا اس کے عوض اپنی عبادت گاہ یا مذہبی رسومات میں چندہ طلب کرے گا تو اس کا چندہ لینا درست ہے۔ اس کے قائل ہیں: مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عامر ظفر، مولانا خورشید احمد، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد صادق مبارکپوری، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا شمس الدین (آسام)، مولانا عبید اللہ لاہوری، سید امیر حسین گیلانی، مولانا عبدالرشید صاحب جونپوری، مولانا ذاکر حسن (پاکستان)، مولانا ارشاد احمد بھاگلپوری، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا عبدالقادر، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی۔

اس رائے سے اختلاف کرنے والوں میں مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مولانا ابوالعاص وحیدی، قاضی محمد ہارون مینگل ہیں۔ مولانا سید خورشید حسن رضوی لکھتے ہیں کہ اس رجحان کی ہمت شکنی ہونی چاہئے۔ مولانا اسعد قاسم سنبھلی کہتے ہیں کہ فقہاء اسے درست نہیں سمجھتے، لیکن اس پر انہوں نے کوئی دلیل نہیں دی۔ اسی طرح مولانا نیاز احمد مدنی اور مولانا ابوالعاص وحیدی نے بھی اپنی رائے پر کوئی دلیل نہیں ذکر کی۔ قاضی محمد ہارون مینگل (پاکستان) نے عدم جواز پر (ردالمحتار ۳/ ۳۹۴) کی ایک عبارت نقل کی ہے، مگر وہ عبارت عدم جواز کے بجائے جواز پر صراحۃ دلالت کرتی ہے:

''أن شرط وقف الذمی أن یکون قربۃ عندنا وعندھم کالوقف علی الفقراء'' اور ''علی مسجد القدس'' الخ۔

اس مسئلہ میں معقول اور مناسب رائے وہی ہے جو پہلے ذکر کی گئی، یعنی اگر چندہ دینے والے غیر مسلم اپنے اعتقاد میں اسے قربت سمجھتے ہیں اور اس کے عوض ان کی عبادتگاہ میں چندہ کے مطالبہ کا اندیشہ نہ ہو تو ان کا پیسہ مساجد مدارس اور جلسوں میں قبول کیا جاسکتا ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی، مفتیان دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور دیگر اصحاب افتاء کی یہی رائے چلی آرہی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہئے کہ ہندوستان میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسی مسجدیں ہیں جنہیں ہندو راجاؤں اور زمینداروں نے اپنی زمینوں پر اپنے صرفہ سے تعمیر کرایا اور علماء نے اس کو مسجد تسلیم کیا۔ آج بھی وہ مسجد کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ البتہ جہاں اس قسم کے اندیشے موجود ہوں کہ اس کے عوض وہ مندر میں چندہ کا مطالبہ کریں گے، وہاں یقیناً پرہیز کیا جانا چاہئے۔ بعض حضرات نے اس کو اسلامی غیرت کے خلاف لکھا ہے۔ میری سمجھ سے یہ بات وہیں ہوسکتی ہے جہاں ان سے مطالبہ کیا جائے اور اگر وہ بغیر مطالبہ کے محض قربت اور نیکی کے تصور سے دے رہے ہیں، وہاں اسلامی غیرت بھی برقرار رہتی ہے۔

ھ- ایک مسلمان دوسرے مذہبی گروہ کے تہوار میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان کی مذہبی تقریبات اور تہواروں میں شرکت جائز نہیں ہے۔ اس کے قائل ہیں: مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا اسعد قاسم سنبھلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابو العاص وحیدی، مولانا یعقوب قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید احمد، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، مولانا عبد اللطیف، مولانا اسرار الحق سبیلی، شکیل احمد انور حیدر آباد، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا شمس الدین (آسام)، مولانا عبید اللہ (لاہور)، قاضی محمد ہارون مینگل، سید امیر حسین گیلانی (پاکستان)، ذاکر حسین نعمانی (پاکستان)، مولانا عبد الرشید جونپوری، مولانا ارشد مدنی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا عبد الرحیم قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، ایم اے عبد القادر، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ارشاد عالم بھاگلپوری۔

جواز کے قائلین میں مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے کوئی دلیل ذکر نہیں کی اور مولانا محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی نے ضرورت واضطرار کو بنیاد بنایا ہے۔ مولانا پاکستان میں رہتے ہیں، اس لئے انہیں اندازہ لگانے میں دشواری ہوئی، ہم لوگ ہندوستان میں اس حد تک مجبور ہرگز نہیں ہیں، لہذا ایسے مسائل میں ضرورت کو بنیاد بنا کر فسق وفجور اور شرک وکفر کے مراکز پر جانے کی اجازت دینا بہت سے مفاسد کو جنم دے گا اور ہمارے نوجوانوں کے لئے بے راہ روی کا سبب ہوگا۔

غیر مسلموں کو ان کے تہواروں پر مبارکباد دینا بھی درست نہیں۔ اس کے قائل ہیں: مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا محمد یعقوب قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا شکیل انور حیدر آباد، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا شمس الدین (آسام)، مولانا عبید اللہ لاہور، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا عبد الرشید جونپوری، مولانا ارشد مدنی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، ایم اے عبد القادر، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا اختر امام عادل۔

مقالہ نگاروں میں بہت سے حضرات مبارکباد دینے کو درست قرار دیتے ہیں۔ ان کے اسماء یہ ہیں: مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عامر ظفر، مولانا سلطان احمد اصلاحی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، مولانا ارشاد احمد بھاگلپوری، مولانا عبد الرحیم قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی۔

مفتی عبد الرحیم قاسمی صاحب کا یہ جملہ بہت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ یکجہتی، خیر سگالی اور رواداری کی نیت سے غیر مسلموں کو ان کے تہواروں پر مبارکبادی جاسکتی ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں اس کی گنجائش مولانا برہان الدین سنبھلی بھی دیتے ہیں۔ عید کے موقع پر وہ مسلمانوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں لفظی تہنیت مسلمان بھی دے دیں۔ عید ملن کے جواب میں بعض شہروں میں ہولی ملن وغیرہ کی رسمی تقریبات ہوتی ہیں۔ ان کا مقصد فرقہ وارانہ یکجہتی اور خیر سگالی ہوتا ہے۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ ماحول میں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے اس طرح کے پروگرام میں کچھ مسلمان شریک ہولیں اور کچھ رسمی اور لفظی مبارکباد دے دیں، تاکہ مسلمانوں پر فرقہ واریت کا الزام نہ آئے۔

غیر مسلموں کی طرف سے افطار پارٹی کی رسم زیادہ تر سیاسی مقاصد سے کی جاتی ہے، اس سے ہمارے روزہ کا تقدس متاثر ہوتا ہے، ایسی پارٹیوں کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہئے۔

✦✦✦

عرض مسئلہ:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ مسائل

سوال نمبر ۳ (الف، ب، ج)

سید اسرار الحق سبیلی، حیدر آباد

سوال نامہ: ''غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل'' کے سوال نمبر: ۳ سے متعلق عرض مسئلہ تیار کرنے کے لئے مجھے (۴۸) مقالات موصول ہوئے۔ یہ سوال تین حصوں پر مشتمل ہے، حصہ الف کا سوال ہے:

''آج کل اکثر ملکوں میں جھنڈے کو سلامی دینے کا رواج ہے، اور اسے جھنڈے کا احترام سمجھا جاتا ہے، شرعی نقطہ نظر سے کیا یہ درست ہے''؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاروں کی رائیں مختلف ہیں، ہم نے انہیں (۶) گروہ میں تقسیم کیا ہے، ۹ حضرات نے اسے مطلق ناجائز قرار دیا ہے، ایک صاحب نے بدعت قرار دیا ہے، ۲ حضرات کی رائے میں یہ مکروہ ہے، ۳ حضرات نے اسے مشروط طور پر ناجائز قرار دیا ہے، جبکہ ۱۵ مقالہ نگار نے بہ حالت مجبوری اسے جائز قرار دیا ہے اور ۱۷ اصحاب نے اسے مطلق جائز قرار دیا ہے۔

۱- مطلق ناجائز قرار دینے والے ۹ حضرات کے نام یہ ہیں:

مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا ابو العاص وحیدی، مفتی مجاہد الاسلام قاسمی (آسام)، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی۔

مولانا عبدالرشید قاسمی نے ایک آیت اور سیدنا عمر فاروقؓ کے قول سے استدلال کیا ہے:

''يا أيها الناس اعبدوا ربكم الذي خلقكم والذين من قبلكم لعلكم تتقون'' (سورۂ بقرہ: ۲۱)۔

''إني لأعلم أنك حجر لا تضر ولا تنفع، ولولا أني رأيت النبي ﷺ يقبلك ما قبلتك'' (بخاری ۱/ ۲۱۷)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی نے دلیل میں ''جواہر الفقہ'' کی یہ عبارت ذکر کی ہے:

''لہذا کسی خاص ہیئت ونوعیت کا یقین، پھر اس کی خصوصیت کا اور اس میں خاص تقدس کا ادعا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے'' (جواہر الفقہ ۱/ ۱۴۵)۔

مولانا اختر امام عادل نے ''امداد الفتاوی'' میں حضرت تھانویؒ کا مفصل فتوی: کا حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے قومی جھنڈے کو سب سے بڑے ''سیاسی بت'' سے تعبیر کیا ہے، جس کو قرآن کی زبان میں ''الانصاب'' کہا جاسکتا ہے: ''يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان'' (سورۂ مائدہ: ۸۹)۔ انہوں نے ''رد المحتار، البحر الرائق، فتاوی بزازیہ اور ہندیہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ غیر مسلم کو عزت افزائی کے لئے سلام کرنا جائز نہیں۔ بعض فقہاء نے اس کو کفر تک کہا ہے، نیز غیر مسلم کی درازی عمر اور سدا سلامتی کی دعا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ انہوں نے ''اعلاء السنن'' اور ''فتح الباری'' کی روشنی میں جھنڈے کے گرد کھڑے ہونے کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب نے دلائل کے لئے اپنی کتاب: ''موجودہ مسائل کا شرعی حل'' میں موجود مقالہ کا حوالہ دیا ہے، لیکن وہ کتاب مجھے دستیاب نہیں ہوسکی۔

مفتی مجاہد الاسلام قاسمی نے "مسند احمد" کی یہ حدیث ذکر کی ہے:

"ولو كنت آمرا أحدا أن يسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها"۔

۲- جھنڈے کی سلامی کو بدعت قرار دینے والے واحد شخص مولانا محمد ارشد المدنی (جامعۃ الامام ابن تیمیہ) ہیں، انہوں نے اس بارے میں دو احادیث ذکر کی ہیں:

"من أحدث في أمرنا هٰذا ما ليس منه فهو رد" (بخاری: ۱/۳۷۱)۔

"إياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة" (ابوداؤد ۲/۲۷۹)۔

۳- مکروہ قرار دینے والے دو حضرات: مولانا محمد اقبال قاسمی اور مولانا ظفر عالم ندوی ہیں۔ مولانا محمد اقبال قاسمی نے احترام میں غلو کی بنا پر مکروہ قرار دیا ہے اور مولانا ظفر عالم ندوی نے اسے لا حاصل احترام کہا ہے، جو شریعت اسلامی کی روح کے خلاف ہے۔

۴- مشروط طور پر ناجائز قرار دینے والے تین اصحاب ہیں:

مولانا عامر ظفر، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی۔

ان حضرات کے نزدیک اگر سلامی کے وقت سر جھکایا جائے اور ہاتھ جوڑا جائے تو ہی ناجائز ہے، ورنہ جائز ہے، واضح ہو کہ سلامی کے وقت سر جھکا ہوا نہیں ہوتا، بلکہ سر اوپر کی طرف اور نگاہ پرچم کی طرف ہوتی ہے اور ایک ہتھیلی کان کے پاس ہوتی ہے۔

۵- بہ حالت مجبوری اور مصلحۃً جائز قرار دینے والے ۱۵ حضرات ہیں:

مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا محمد سلمان (گجرات)، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد شمس الدین (آسام)، مفتی اسعد قاسم سنبھلی، مولانا راشد حسین ندوی، سید اسرار الحق سبیلی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا محمد ارشاد بھاگل پوری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا محمد عبید اللہ (لاہور)۔

مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی اسعد قاسم سنبھلی، مولانا محمد سلمان، راشد حسین ندوی اور مولانا محمد ارشاد بھاگل پوری نے "فتاوی رحیمیہ" کا حوالہ دیا ہے۔ "فتاوی رحیمیہ" کی عبارت ہے: "یہ محض سیاسی چیز ہے اور حکومتوں کا طریقہ ہے، اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتا ہے، بچنا اچھا ہے، اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو بادل ناخواستہ کرنے میں مؤاخذہ نہیں ہوگا، انشاء اللہ" (فتاوی رحیمیہ: ۶/۲۸۸)۔

مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا محمد ارشاد اور مولانا راشد حسین ندوی نے مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتوی پیش کیا ہے، جو ۱۹۳۹ء میں ہفتہ وار "نقیب" پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ فتوی کا متن اس طرح ہے: "جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے اور اسلامی ملکوں میں بھی ہوتا ہے۔ سلامی ایک فوجی عمل ہے، اس میں اصلاح ہو سکتی ہے، مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ عمل قرار دینا صحیح نہیں ہے" (نقیب، پٹنہ، جولائی ۱۹۳۹ء)۔

مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد شمس الدین اور مولانا ثابت شمیم رشادی نے فقہی قواعد: "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" اور "الضرورات تبيح المحظورات" پیش کئے ہیں۔ مولانا محمد ارشاد بھاگل پوری نے فقہی قاعدہ: "إذا ضاق الأمر اتسع" سے بھی استدلال کیا ہے۔

۶- ۱۷ حضرات جنہوں نے جھنڈے کی سلامی کو مطلق جائز قرار دیا ہے، ان کے نام درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا ابراہیم، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبید اللہ اسعدی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، جناب سید خورشید حسن رضوی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا سید امیر حسین گیلانی، مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، جناب سید شکیل احمد انور۔

اس گروہ نے جھنڈے کو ایک سیاسی رواج قرار دیا ہے کہ اس کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مفتی محبوب علی وجیہی نے لکھا ہے کہ جھنڈا فی نفسہ کوئی قابل احترام چیز نہیں ہے، صرف اس کی سلامی اس ملک کے اصول وقوانین کے احترام کو ظاہر کرنے کے لئے رکھی گئی ہے، تا کہ یہ معلوم ہو کہ اس

ملک کا ادب واحترام ہمارے دلوں میں ہے، اس نیت سے اگر جھنڈے کو سلامی دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قاضی محمد ہارون مینگل صاحب نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام نے اسلامی جھنڈے کو آخری دم تک گرنے نہیں دیا، احتراما ہر قوم کو اپنا جھنڈا عزیز ہے، لہذا اگر وہ اس کا احترام کریں تو یہ ان کا حق ہے، خواہ ملک کا باشندہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ان کی رائے میں جھنڈے کی سلامی اس کا احترام اور اس کی سلامتی کی دعا ہے، اس کے احترام میں کوئی خرابی نہیں، لہذا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی کا کہنا ہے کہ ایک مسلمان کی طرف سے ایسے موقع پر نیت یہ ہونی چاہئے کہ اس کا ملک جس کا یہ جھنڈا ہے، وہ خوش حال وشاداب، آفتوں اور بلاؤں سے محفوظ رہے، غیر مسلم اکثریتی ملک ہونے کی صورت میں اللہ اس کے باشندوں کو اسلام کی طرف راغب ہونے کی توفیق عطا کرے۔ "إنما الأعمال بالنيات" کے بموجب اس نیت سے جھنڈے کو سلامی دی جاسکتی ہے۔ مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی نے لکھا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں، انہوں نے حدیث: "مارآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن" سے استدلال کیا ہے۔

ان کے علاوہ مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مفتی حبیب اللہ قاسمی اور مولانا محمد مصطفی قاسمی نے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا فتوی نقل کیا ہے۔ مولانا محمد مصطفی قاسمی نے کل ہند مجلس تعمیر ملت حیدرآباد کے سمینار کی تجویز نقل کی ہے، یہ سمینار جون ۲۰۰۰ء میں حیدرآباد میں "غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں کے مسائل" کے عنوان سے منعقد ہوا تھا۔ مذکورہ مسئلہ سے متعلق اس کی تجویز اس طرح ہے: "قومی پرچم کو سلامی دینا اور قومی ترانہ کے درمیان کھڑا ہونا عبادت وبندگی کے قبیل سے نہیں، بلکہ ملک سے محبت وتعلق کے اظہار کی ایک علامت سمجھی جاتی ہے، اس پہلو سے گو اس کی گنجائش ہے، لیکن یہ اسلامی مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے" (ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ، نومبر ۲۰۰۰ء)۔

اسی طرح دیکھا جائے تو مقالہ نگاروں میں صرف دو قسم کی آراء پائی جاتی ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ جھنڈے کو سلامی دینا کسی صورت جائز نہیں، اس رائے کے حاملین دس حضرات ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اختر امام عادل، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مفتی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا نیاز احمد مدنی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محمد ارشد مدنی۔

باقی ۳۷ حضرات نے کسی نہ کسی صورت میں سلامی دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ ایک مقالہ نگار ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی نے اس مسئلہ سے متعلق اپنی رائے ذکر نہیں کی ہے۔

آخر میں ایک وضاحت یہ ہے کہ پرچم کشائی اور پرچم کی سلامی دراصل ایک سیاسی اور سرکاری عمل ہے، لیکن ملک کے اکثریتی طبقہ نے اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو مشرکانہ رنگ دے دیا ہے۔ بعض جگہوں میں زمین پر ہندوستان کا نقشہ بنایا جاتا ہے، اس کے بیچ میں پرچم کی لکڑی نصب کی جاتی ہے، کسی پنڈت کے ذریعہ اگربتی جلائی جاتی ہے، ناریل پھوڑا جاتا ہے، ناریل کے پانی کا چھڑکاؤ ہندوستان کے نقشہ، گاندھی کی تصویر اور پرچم پر کیا جاتا ہے، گاندھی کی پیشانی پر لال ٹیکہ لگایا جاتا ہے، پرچم کشائی کے بعد آخر میں بھارت ماتا کی جے کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے صرف سیاسی رواج نہیں کہا جاسکتا، اور اب تو بھارت ماتا کا مندر بنانے کی بات کہی جارہی ہے۔

شق (ب) میں سوال ہے:

بعض ملکوں میں ایسے قومی ترانے مروج ہیں، جن میں مشرکانہ مضامین شامل ہیں۔ خود ہندوستان میں "وندے ماترم" پڑھنے کو کہا جاتا ہے، جس میں ارض وطن کی معبودیت کا تصور پایا جاتا ہے، کیا مسلمانوں کے لئے اس قسم کے ترانوں کا پڑھنا جائز ہوگا؟

تمام ہی مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ وندے ماترم اور اس جیسے مشرکانہ گیت کا پڑھنا جائز نہیں۔ ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا اختر امام عادل، مولانا خورشید احمد اعظمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا راشد حسین ندوی، سید خورشید حسن رضوی، مولانا سید امیر حسین گیلانی، مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی اور سید شکیل انور صاحب نے بہ حالت مجبوری وندے ماترم پڑھنے کی اجازت دی ہے، جبکہ مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی اور مولانا محمد شمس الدین صاحب نے بہ حالت مجبوری بھی وندے ماترم پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی اور مولانا یعقوب قاسمی نے اس موقعہ پر کھڑے ہونے کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر اس طرح کی کوئی مجلس ہو اور اس میں شرکت لازم ہو تو ترانہ میں ذکر کردہ جملوں کو پڑھنے پر علی الاطلاق کفر کا فتوی نہیں لگایا جائے گا، کیونکہ وندے ماترم کے معنی جہاں وطن کی پوجا کرنے کے ہیں وہیں دوسرے معانی بھی ہیں، لہذا پڑھنے والا جو مراد لے اسی اعتبار سے اس کا حکم ہوگا، لیکن انہوں نے دوسرے معنی نہیں بتائے ہیں۔ راقم الحروف کا ناپختہ خیال ہے کہ اجتماعی طور پر وندے ماترم پڑھنے کی مجبوری ہو تو وندے ماترم کے بجائے دوسری نظم یا کلمہ توحید گنگنا چاہئے، اور اجتماعی طور پر ایسے متنازع گیت کو قومی گیت سے خارج کرنے کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی نے لکھا ہے کہ ''وندے ماترم'' کے خلاف مسلم عوام اور عمائدین کو منظم ہو کر جدوجہد کرنی چاہئے۔ اس کے لئے میڈیا کی پوری طاقت استعمال کرنی چاہئے اور پورا دباؤ بنانا چاہئے اور جس اسکول اور کالج میں اس کا پڑھنا لازمی قرار دے دیا گیا ہو، وہاں سے اپنے بچے کو نکال لینا چاہئے۔

مولانا نعیم اختر قاسمی نے مشرکانہ ترانے اور اس میں شریک ہونے، دونوں کو ناجائز گردانا ہے۔ مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب نے مختصر جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مشرکانہ مضامین پر مشتمل قومی ترانے مسلمانوں کے لئے کسی طرح جائز نہیں۔ مفتی ذاکر حسن نعمانی نے وندے ماترم کو بہ طور حکایت پڑھنے کو درست قرار دیا ہے۔ انہوں نے دلیل میں یہ آیت پیش کی ہے: ''قالوا اتخذ اللہ ولدا سبحانہ'' (سورۂ یونس: ۶۸) میں ''اتخذ اللہ ولدا'' کفریہ کلمہ ہے، مگر قرآن نے اس کو نقل کیا ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔

وندے ماترم کو ناجائز قرار دینے والوں نے مختلف دلیلیں ذکر کی ہیں۔ مفتی عقیل الرحمن قاسمی اور مولانا محمد شمس الدین صاحب نے قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی ہے:

"قل أفغير الله تأمروني أعبد أيها الجاهلون، ولقد أوحي إليك وإلى الذين من قبلك لئن أشركت ليحبطن عملك ولتكونن من الخاسرين" (سورۂ زمر: ۶۵،۶۴)۔

مولانا محمد مصطفی قاسمی اور مولانا محمد شمس الدین صاحب نے یہ آیت ذکر کی ہے:

"إنه من يشرك بالله فقد حرم الله عليه الجنة ومأواه النار، وما للظالمين من أنصار" (سورۂ مائدہ: ۷۲)۔

مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی نے "إن الشرك لظلم عظيم" (سورۂ لقمان: ۱۳)، مولانا راشد حسین ندوی نے: "إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء ومن يشرك بالله فقد ضل ضلالا بعيدا" (سورۂ نساء: ۱۱۶) اور مولانا محمد اقبال قاسمی نے: "ولئن اتبعت أهواءهم من بعد ما جاءك من العلم إنك إذا لمن الظالمين" (سورۂ بقرہ: ۱۴۵) آیات پیش کی ہیں۔

مولانا یعقوب قاسمی، مولانا محمد شمس الدین اور مفتی مجاہد الاسلام قاسمی نے یہ حدیث ذکر کی ہے:

''لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق''۔

مولانا محمد عبید اللہ (لاہور) نے ''بخاری'' کی یہ حدیث لکھی ہے:

''عن الربيع بنت معوذ بن عفراء ... فجعلت جويريات لنا يضربن بالدف ويندبن من قتل من آباء ي يوم بدر، إذ قالت إحداهن: ''وفينا نبي يعلم ما في غد''۔ فقال النبي ﷺ: دعي هذه وقولي بالذي كنت تقولين'' (رواه البخاري، مشكاة ۲/۲۷۱)۔

مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا سید محمد ذاکر حسین صاحب جنہوں نے اضطرار کی حالت میں وندے ماترم پڑھنے کی اجازت دی ہے، دلیل میں یہ آیت پیش کی ہے:

"إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان" (سورۂ نحل: ۱۰۶)۔

شق (ج) کا سوال ہے:

جو ادارے ملک کے باشندوں کو انصاف فراہم کرتے ہیں وہ ملک میں مروج قانون شہادت یا دوسرے قوانین کی وجہ سے بعض اوقات ایسے فیصلے بھی کرسکتے ہیں جو اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر سے درست نہ ہوں، ایسے معاملات میں اگر دونوں فریق مسلمان ہوں تو انہیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ اور جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوا ہے کیا اس کے لئے اس سے استفادہ کی گنجائش ہے؟

تمام ہی مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ جس فریق کے حق میں غیر شرعی فیصلہ ہوا ہے، اس کے لئے اس سے استفادہ جائز نہیں ہوگا۔

اس سلسلہ میں مولانا ابراہیم، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محمد صادق مبارکپوری اور مولانا محمد شمس الدین صاحب نے حدیث: ''لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق'' سے استدلال کیا ہے۔ مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا محمد ارشد مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا سید امیر حسین گیلانی اور مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

''إنكم تختصمون إلي، وإنما أنا بشر، ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض، فإن قضيت لأحد منكم بشئ من حق أخيه، فإنما أقطع له من النار. فلا يأخذ منه شيئا'' (ترمذی کتاب الاحکام۔ باب ماجاء فی التشدید:۱/ ۲۴۸)۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب نے اس سلسلہ میں بخاری شریف کی دو حدیثیں ذکر کی ہیں:

''السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحب، وكره مالم يؤمر بمعصية، فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة'' (بخاری:۲/ ۱۰۵۷ باب السمع والطاعة مالم تكن معصية)۔

''لا طاعة في معصية، إنما الطاعة في المعروف۔ متفق عليه'' (مشکاۃ ۳۲۹ کتاب الامارۃ والقضاء)۔

مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب نے یہ عبارت نقل کی ہے:

''إن القضاء لايحل حراما''۔

اور مولانا ثابت شمیم رشادی نے امام بخاریؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

''من قضي له بحق أخيه فلا يأخذه، فإن قضاء الحاكم لايحل حراما ويحرم حلالا'' (بخاری:۲/ ۱۰۶۴)۔

مذکورہ سوال کے جواب میں مولانا اختر امام عادل، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد اقبال قاسمی اور مولانا محمد مصطفی قاسمی نے یہ تفصیل ذکر کی ہے کہ اگر حاکم نے ایسی شہادتوں پر اعتماد کیا جو شرعاً نامعتبر اور ناکافی ہیں، تو وہ فیصلہ دیانۃً نافذ نہیں ہوگا، جیسے زمین، جائداد وغیرہ کے مقدمہ میں عدالت حقیقت کے خلاف فیصلہ کردے، تو وہ چیز مدعی کے لئے حلال نہیں ہوگی، اس کے لئے اس فیصلہ سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہوگا، اور جن فیصلوں کی بنیاد ایسی شہادتوں پر ہو جو شریعت کی نظر میں بھی کافی ہوں اور ملکی قانون کی نظر میں بھی، تو اب یہ مقدمات دو طرح کے ہیں: ایک وہ جن میں محض سبب شرعی کا پایا جانا کافی ہے، قاضی کا حکم ضروری نہیں، جیسے مورث کی موت کی وجہ سے ورثاء کے لئے میراث کا حق، خرید وفروخت کی وجہ سے سامان پر خریدار کی ملکیت وغیرہ، ایسے معاملات میں غیر مسلم حاکم کا فیصلہ بھی معتبر ہوگا، لیکن دوسرے وہ امور جن میں سبب شرعی کا پایا جانا کافی نہیں، بلکہ قاضی کا حکم بھی ضروری ہے، ان میں غیر مسلم منصف کا فیصلہ معتبر نہیں ہوگا، جیسے فسخ نکاح، فسخ نکاح کے لئے محض اسباب فسخ کا پایا جانا کافی نہیں، بلکہ قاضی کا فیصلہ ضروری ہے۔

اسی سوال کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ اگر ایسے معاملات میں دونوں فریق مسلمان ہوں تو انہیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟

اس بارے میں مولانا عامر ظفر، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا ابوسفیان مفتاحی اور مولانا محمد ارشاد قاسمی وغیرہ تقریباً سب ہی حضرات کی رائے ہے کہ خلاف شریعت فیصلہ کو ٹھکرا کر دار القضاء یا شرعی پنچایت کی طرف ضرور رجوع کرنا چاہئے۔

مفتی عبد الرحیم صاحب نے لکھا ہے کہ فریقین میں سے کوئی عدالت میں جائے تو وہاں مسلم پرسنل لاء کو واضح کرنا چاہئے، اس کے باوجود غلط فیصلہ ہو تو اس کی اپیل کی جاسکتی ہے۔

جناب سید شکیل احمد انور صاحب نے لکھا ہے کہ ملکی قوانین کا جائزہ لے کر دیکھنا ضروری ہے کہ ان کے کون سے اجزاء اسلامی شریعت کے مغائر ہیں، ان اجزاء کو عوامی رائے عامہ کے طاقت ور اظہار سے بدلوانا چاہئے۔ عدالتی چارہ جوئی میں ملکی قانون کے بموجب جو فیصلے ہوں، وہ اگر اسلامی قانون شخصی کے دائرہ میں ہوں اور مسلم حریف کے خلاف صادر ہوں تو انہیں مسلم پرسنل لا کی بنیاد پر نظر ثانی کے لئے رجوع کرنا چاہئے۔

مولانا یعقوب قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ خلاف شریعت فیصلہ میں فریقین اور جملہ مسلمانوں کو اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہئے اور شرعی احکام کے مطابق فیصلہ صادر کرانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مسلمانوں کو شرعی قاضی کے تقرر کرنے کا حکومت سے مطالبہ کرنا چاہئے۔ راقم الحروف نے اپنے جواب میں لکھا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں خصوصا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو چاہئے کہ دستوری طور پر ملک میں اپنا موقف مسلمہ مذہب اور تہذیبی وجود کے حامل کے طور پر منوالیں، اور اپنے عائلی قوانین اور مذہبی امور کے سلسلہ میں ملک کے دستوری ڈھانچہ کے اندر تہذیبی و مذہبی خودمختاری کے حامل بن جائیں۔ اسی طرح دستوری ڈھانچہ کے اندر تہذیبی و مذہبی خودمختاری کے حامل بن جائیں، اس طرح دستوری و قانونی انتظام کے بعد ملکی عدالتوں میں مسلم پرسنل لا آف کورٹ قائم کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، اور اس میں مسلم قاضی اور ماہرین قانون اسلامی متعین کئے جاسکتے ہیں۔

مولانا ابوبکر قاسمی اور مولانا محمد مصطفی قاسمی نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ غیر مسلم ممالک کے مسلم باشندوں پر لازم ہے کہ حکومت وقت سے مطالبہ کریں کہ وہ کسی دین دار و پرہیزگار عالم کو مسلمانوں کا امیر مقرر کردے، یا از خود مسلمان کسی نیک وصالح عالم دین کو اپنا امیر مقرر کرلیں۔ وہ امیر مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے قاضی کا تقرر کرے۔ مولانا نیاز احمد مدنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شرعی محکموں کے قیام کے ساتھ ساتھ عوام کے اندر بیداری پیدا کی جائے اور ان کو بتایا جائے کہ تحکیم الی اللہ اور تحکیم الی غیر اللہ کیا ہے، غیر اسلامی محکموں میں مقدمہ پیش کرنے سے کون سی شرعی قباحت لازم آتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی مقالہ نگاروں نے یہ آیات پیش کی ہیں:

"فإن تنازعتم في شيء فردوه إلى الله والرسول، إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر، ذلك خير وأحسن تأويلا" (سورۂ نساء:۵۹)۔

"لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين، ومن يفعل ذلك فليس من الله في شيء إلا أن تتقوا منهم تقاة" (آل عمران:۲۸)

"الم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت، وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالا بعيدا" (سورۂ نساء:۶۰)۔

"فلا وربك لا يومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما" (سورۂ نساء:۶۵)۔

"ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون" (سورۂ مائدة:۴۴)۔

✧✧✧

عرض مسئلہ:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ مسائل

سوال نمبر ۴ (الف):

محمد ہشام الحق ندوی
(رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

اس سوال کی تمہید یہ ذکر کی گئی ہے:

امت مسلمہ بنیادی طور پر ایک ایسی امت ہے جس کو لوگوں تک حق کی دعوت پہنچانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس کے لئے ایک طرف یہ بات ضروری ہے کہ خود یہ امت فکر صحیح کی حامل ہو۔ حالات چاہے موافق ہوں یا ناموافق وہ احکام دین پر عامل ہو۔ دوسری طرف بندگان خدا کے ساتھ اس کا تعلق محبت و ہمدردی اور اخوت و نصرت کا ہو۔

اس پس منظر میں پوچھے گئے سوالات چار شقوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔

شق (الف) کی تفصیل اس طرح ہے:

موجودہ دور میں عالمی سطح پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ لوگوں میں تمدنی اور ثقافتی وحدت پیدا ہو جائے۔ ثقافتی انجذاب اور تہذیبی انضمام کی اس کوشش میں مذہب کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لئے مغرب نے ایک کوشش تو یہ کی کہ مذہب کو انسان کی عملی زندگی سے علاحدہ کردیا اور کچھ عباداتی رسوم ہی اس کے دائرہ میں باقی رکھی گئیں۔ مذہب کو مزید بے اثر کرنے کے لئے دوسری کوشش یہ کی جارہی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ راستے الگ الگ ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے اور ان مذاہب کی حیثیت ایک ہی منزل تک جانے والے مختلف راستوں کی ہے۔ بہت سے مسلمان دانشور بھی اس فکر کے اسیر ہوتے جارہے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے کیا یہ کسی بھی درجہ میں قابل قبول ہے؟

اس سوال کے عرض مسئلہ کے لئے اڑتالیس (۴۸) مقالات راقم الحروف کو موصول ہوئے۔ مقالہ نگار حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی (رکن اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان)، مولانا سید امیر حسین گیلانی (جمعیت علماء اسلام، پاکستان)، مولانا محمد عبید اللہ اسعدی، مفتی ذاکر حسن نعمانی (پشاور، پاکستان)، مولانا محمد عبید اللہ (لاہور)، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا ابو العاص وحیدی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اختر امام عادل، مفتی سید اسرار الحق سبیلی، قاری ظفر الاسلام، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، قاضی محمد ہارون مینگل (پاکستان)، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی اسعد قاسم سنبھلی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا محمد اقبال قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا ارشاد قاسمی، مولانا محمد شمس الدین، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد سلمان کھلی، مفتی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ثابت شمیم رشادی، سید خورشید حسن رضوی، سید شکیل احمد انور، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا عامر ظفر۔

مذکور الصدر سوال کی اس شق کا جواب دیتے ہوئے تمام مقالہ نگار حضرات نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ثقافتی انجذاب، تہذیبی انضمام اور وحدت

ادیان کے پرفریب نظریات کتاب وسنت کے مغائر اور شریعت اسلامی کی رو سے لغو اور باطل ہیں۔ مقالہ نگار حضرات کا عام احساس یہ ہے کہ یہ مسئلہ براہ راست اسلامی عقیدہ کا ہے، نیز یہ کہ یہ تصور درحقیقت اسلام کو غیر اسلام سے خلط ملط کرنے اور اسلام کی امتیازی حیثیت اور اس کے تشخص کے استیصال کی ناپاک کوشش ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں کسی قسم کی مصالحت اور مفاہمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

مقالہ نگار حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ نوع انسانی سے اسلام کا مطالبہ محض اسلامی عقیدۂ توحید ورسالت اور اس کے دیگر لوازمات کو تسلیم کرنے کا نہیں، بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ دیگر ادیان و مذاہب پر اسلامی عقائد اور اسلامی شریعت کی بالادستی اور فوقیت تسلیم کی جائے اور اسلام کے آخری اور مکمل دین اور مستقل تہذیب ہونے کا اعتقاد رکھا جائے۔ اسلام کو دین حق اور دیگر تمام ادیان کو باطل سمجھا جائے۔

مقالہ نگار حضرات نے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات واحادیث سے استدلال کیا ہے:

۱...... "إن الدين عند الله الإسلام" (سورۂ آل عمران: ۱۹) (مقالہ: مولانا برہان الدین سنبھلی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی مجاہد الاسلام قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ثابت شمیم رشادی، مولانا سید امیر حسین گیلانی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی سید اسرار الحق سبیلی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد اقبال قاسمی، مفتی اسعد قاسم سنبھلی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد شمس الدین)۔

۲... "اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينًا" (سورۂ مائدہ: ۳) (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی)۔

۳... "ومن يبتغ غير الإسلام دينًا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين" (سورۂ آل عمران: ۸۵)

(مقالہ مولانا راشد حسین ندوی، مفتی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد عبید اللہ (پاکستان)، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مفتی سید اسرار الحق سبیلی، مفتی اسعد قاسم سنبھلی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا ارشاد قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا شمس الدین)۔

۴... "وأن هٰذا صراطي مستقيمًا فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله ذلكم وصاكم به لعلكم تتقون" (سورۂ انعام: ۱۵۳)

(مقالہ: مولانا محی الدین غازی فلاحی، مفتی سید اسرار الحق سبیلی، مولانا محمد اقبال قاسمی)۔

۵... "ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم وساءت مصيرًا" (النساء: ۱۱۵)

(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

۶... "إن الذين يكفرون بالله ورسله ويريدون أن يفرقوا بين الله ورسله ويقولون نؤمن ببعض ونكفر ببعض ويريدون أن يتخذوا بين ذلك سبيلا أولئك هم الكافرون حقا وأعتدنا للكافرين عذابًا مهينا" (سورۂ نساء: ۱۵۰-۱۵۱) (مقالہ مولانا راشد حسین ندوی)۔

۷... "يا أيها الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة" (سورۂ بقرہ: ۲۰۸) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل، مولانا ثابت شمیم رشادی)۔

۸... "لكل أمة جعلنا منسكًا هم ناسكوه فلا ينازعنك في الأمر وادع إلى ربك إنك لعلى هدى مستقيم. وإن جادلوك فقل الله أعلم بما تعملون. الله يحكم بينكم يوم القيامة فيما كنتم فيه تختلفون" (سورۂ حج: ۶۷-۶۹) (مقالہ مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا ابو العاص وحیدی)۔

۹... "شرع لكم من الدين ما وصى به نوحًا والذي أوحينا إليك وما وصينا به إبراهيم وموسى وعيسى أن أقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه" (سورۂ شوری/ ۱۳) (مقالہ: مفتی عبد الرحیم قاسمی)۔

۱۰... "وأنزلنا إليك الكتاب بالحق مصدقًا لما بين يديه من الكتاب ومهيمنًا عليه فاحكم بينهم بما أنزل الله ولا تتبع أهواءهم عما جاءك من الحق لكل جعلنا منكم شرعةً ومنهاجًا" (سورۂ مائدہ: ۴۸) (مقالہ: مولانا ابو العاص وحیدی)۔

۱۱... "ألا لله الدين الخالص" (سورۂ زمر: ۳) (مقالہ: قاری ظفر الاسلام)۔

۱۲... "ودّوا لو تدهن فيدهنون" (سورۂ قلم: ۹) (مقالہ: مولانا محی الدین غازی فلاحی)۔

۱۳... "وما أرسلناك إلا كافة للناس بشيرًا ونذيرًا" (سورۂ سبا: ۲۸) (مقالہ: مولانا محمد عبید اللہ، پاکستان)۔

۱۴... "وإذ أخذ الله ميثاق النبيين لما آتيتكم من كتاب وحكمة ثم جاء كم رسول مصدق لما معكم لتؤمنن به ولتنصرنه" (سورۂ آل عمران: ۸۱) (مقالہ: مولانا محمد عبید اللہ)۔

۱۵... "هو الذي أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون" (سورۂ توبہ: ۳۳) (مقالہ: مولانا سید امیر حسین گیلانی)

۱۴...... "لكم دينكم ولي دين" (سورۂ کافرون: ۶) (مقالہ: قاری ظفر الاسلام، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محی الدین غازی فلاحی)۔

۱۵... "ودّوا لو تكفرون كما كفروا فتكونون سواء فلا تتخذوا منهم أولياء" سورۂ نساء: ۸۸) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل)۔

۱۶... "إنما اتخذتم من دون الله أوثانا مودة بينكم في الحيوة الدنيا" (سورۂ عنکبوت: ۲۵) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل)۔

۱۷... حدیث: "من تشبه بقوم فهو منهم" (ابوداؤد، کتاب اللباس، مسند احمد ۲/ ۵۰) (مقالہ: قاری ظفر الاسلام، مولانا محی الدین غازی فلاحی)

۱۸... حدیث: "خالفوا اليهود وخالفوا المشركين" (جامع صغیر ۴۳۶) (مقالہ: قاری ظفر الاسلام، مولانا ارشاد قاسمی)۔

۱۹... حدیث: "وإن بني إسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة، كلهم في النار إلا ملة واحدة، قالوا: من هي يا رسول الله؟ قال: ما أنا عليه وأصحابي" (ترمذی، مشکاۃ المصابیح ۱/ ۳۰، باب الاعتصام) (مقالہ: مولانا سید امیر حسین گیلانی، مولانا محمد اقبال قاسمی)۔

۲۰... "والذي نفس محمد بيده لو بدا لكم موسى فاتبعتموه وتركتموني لضللتم عن سواء السبيل، ولو كان حيا وأدرك نبوتي لاتبعني" (دارمی، مشکاۃ ۱/ ۶۸) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل، مفتی اسعد قاسم سنبھلی)۔

مولانا محمد ارشد مدنی نے مندرجہ ذیل احادیث سے بھی استدلال کیا ہے:

۱... "وكان النبي يبعث إلى قومه خاصة وبعثت إلى الناس عامة" (بخاری مع فتح الباری، کتاب التیمم)۔

۲... "بعثت إلى الأحمر والأسود" (مسلم، کتاب المساجد)۔

۳... "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد" (بخاری، کتاب الصلح)۔

۴... "والذي نفس محمد بيده لا يسمع بي أحد من هذه الأمة يهودي ولا نصراني، ثم يموت ولم يؤمن بالذي أرسلت به إلا كان من أصحاب النار" (مسلم، کتاب الایمان)۔

مفتی سید اسرار الحق سبیلی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

"عن عبد الله بن مسعود، قال: خط لنا رسول الله ﷺ خطا، ثم قال: "هذا سبيل الله"، ثم خط خطوطا عن يمينه وعن شماله، وقال: "هذه سبل، على كل سبيل منها شيطان يدعو إليه" وقرأ: وأن هذا صراطي مستقيما فاتبعوه" (احمد، نسائی، دارمی، مشکاۃ ۱/ ۵۸...۵۹)۔

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی اور مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی نے وحدت دین کو اسلام کا مطلوب قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کیا ہے:

"كان الناس أمة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين، وأنزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه" (سورۂ بقرہ: ۲۱۳)

(مولانا اختر امام عادل اور مولانا مصطفی قاسمی نے بھی اس آیت سے وحدت ادیان کے باطل ہونے پر استدلال کیا ہے)۔

مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی نے اس سیاق میں امت کی دو قسمیں بھی ذکر کی ہیں: امت اجابت اور امت دعوت۔ انہوں نے امت اجابت کو داعی اور امت دعوت کو مدعو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ امت اجابت کا فرض ہے کہ امت دعوت کو وحدت دین کی دعوت دے اور اس دعوت کی بنیاد نیکی کا پھیلانا، بدی کا مٹانا اور توحید کا عقیدہ ہو۔ کیونکہ ان کے بقول انبیاء کی دعوت دین کے بنیادی نکات یہی تین امور تھے۔ لہذا آج بھی اتحاد کی بنیاد یہی تین چیزیں ہوں گی۔ اپنی رائے کی تائید میں انہوں نے مندرجہ ذیل آیت بھی نقل کی ہے:

"كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" (سورۂ آل عمران: ۱۱۰)۔

مولانا موصوف نے اس ضمن میں مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کرتے ہوئے انبیائی دعوت کے منہج پر بھی روشنی ڈالی ہے:

"أدع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة، وجادلهم بالتي هي أحسن" (سورۂ نحل: ۱۲۵)۔

مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی وحدت ادیان پر مبنی اتحاد کو مصنوعی اتحاد قرار دیتے ہیں۔ مولانا سید ذاکر حسین شاہ سیالوی کا خیال ہے کہ توحید، تثلیث اور دہریت کے قائلین کی حقیقی منزل ایک کیوں کر ہو سکتی ہے؟ انہوں نے کیمونسٹوں کی الحاد اور انکار خدا پر مبنی غیر عملی وحدت کو مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر قسم کے جبر و استبداد کے باوجود یہ وحدت ستر سال کی مدت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ دوسری طرف اسلام کی قائم کردہ وحدت گذشتہ چودہ صدیوں سے کسی اقتدار کے بغیر صرف باطنی قوت کے سہارے باقی ہے۔

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی اور مولانا راشد حسین ندوی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مذہب کو خواہ مخواہ انسانوں کے درمیان واقع ہونے والے اختلافات اور جھگڑوں کی بنیاد قرار دے دیا گیا ہے، کیونکہ ان دونوں حضرات کے بقول اس قسم کے اختلافات تو ایک مذہب کے ماننے والوں کے درمیان بھی پائے جاتے رہے ہیں۔ مولانا راشد حسین ندوی نے اس کی مثال میں دو عظیم عالمی جنگوں، عراق ایران جنگ، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کے درمیان تصادم، افریقہ اور امریکہ میں کالوں اور گوروں کی لڑائی اور بھارت میں دلتوں اور اعلی ذاتوں کی جنگ کا ذکر کیا ہے۔ مولانا موصوف کے بقول یہ تمام جنگیں، ہم مذہبوں کے درمیان ہوئیں اور آج تک ان کا سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی صاحب کے نزدیک ان جھگڑوں کی اصل وجہ مفاد پرستی اور استحصال ہے، نہ کہ مذہب۔ ان کی رائے یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے اپنے عقائد و افکار پر قائم رہتے ہوئے انسانی وحدت کی بنیادیں تلاش کرنی چاہئے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مولانا سید امیر حسین گیلانی، سید شکیل احمد انور اور ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی نے وحدت ادیان کے ساتھ ساتھ مذہب کو انسان کا پرائیویٹ معاملہ قرار دینے اور اس کو سماجی زندگی سے الگ تھلگ کرنے پر تنقید کی ہے۔ اس تصور کو رد کرتے ہوئے مولانا محمد شمس الدین اور سید شکیل احمد انور نے اسلام کی عالمگیر اور آفاقی حیثیت، فرد و اجتماع، معاشرہ و ریاست اور نظام حکومت و سلطنت کے بارے میں اس کی عطا کردہ واضح تعلیمات، اصول، روایت اور طرز حیات پر قدرے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

بعض مقالہ نگار حضرات نے نظریہ وحدت ادیان کے پیدا ہونے اور رواج پانے کے اسباب و محرکات پر بھی روشنی ڈالی ہے، چنانچہ سید خورشید حسن رضوی نے اس نظریہ کو ہندو فلسفہ کی پیداوار قرار دیا ہے، جبکہ سید شکیل احمد انور تہذیبی انضمام کے رجحانات کو وطن پرستی اور قوم پرستی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ مولانا ابو العاص وحیدی اور مولانا نیاز احمد عبد الحمید مدنی نے نام نہاد دانشوروں کے ساتھ ساتھ اہل تصوف کو بھی اس نظریہ کی ترویج و اشاعت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

وحدت ادیان کے نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے مولانا ثابت شمیم رشادی، مفتی عبد الرحیم قاسمی اور مولانا مصطفی قاسمی نے اسلام کے سوا دیگر مذہب کے ماننے والوں کے داخلی امور میں عدم مداخلت کے اسلامی اصول پر بھی بحث کی ہے۔ ان حضرات نے اس سلسلے میں آیت: "لا إكراه في الدين" سے استدلال کیا ہے۔ مفتی عبد الرحیم قاسمی اور مولانا مصطفی قاسمی نے مندرجہ ذیل آیت سے بھی استدلال کیا ہے:

"وقل الحق من ربكم فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر" (سورۂ کہف:۲۹)۔

مفتی عبدالرحیم قاسمی کا استدلال اس آیت سے بھی ہے: "ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوًا بغير علم" (سورۂ انعام:۱۰۸)۔

اس تناظر میں مفتی عبدالرحیم قاسمی نے اسلامی حکومتوں کی رواداری اور مذہبی آزادی کی شاندار روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عبارتیں نقل کی ہیں:

۱۔۔۔ ''فهذه بلاد العنوة وأقر أهلها فيها على مللهم وشرائعهم'' (كتاب الأموال)

(یہ تمام ممالک غلبہ سے فتح کئے گئے تھے اور ان کے باشندے اپنے اپنے مذاہب اور شریعتوں پر باقی رکھے گئے تھے)۔

۲۔۔۔ ''فهم أحرار في شهاداتهم ومناكحاتهم ومواريثهم وجميع أحكامهم'' (كتاب الأموال)

(یہ لوگ اپنی گواہی کے احکام، نکاح، معاملات، وراثت کے قوانین اور دوسرے تمام شخصی احکام میں آزاد ہوں گے)۔

۳۔۔۔ تاریخ طبری جلد چار کے الفاظ یہ ہیں: ''ولا يحال بينهم وبين شرائعهم'' (ان کے اور ان کے قوانین کے درمیان حائل نہ ہوا جائے گا)۔

یہ تمام تفصیلات اس موضوع کے سلسلہ میں ظاہر کی جانے والی مقالہ نگار حضرات کی آراء سے متعلق تھیں۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت گلوبلائزیشن کے تناظر میں یہ موضوع اس سے زیادہ تفصیل کا متقاضی ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ''تہذیبوں کے درمیان تصادم یا مذاکرات'' اور ''بقائے باہم'' جیسے موضوعات عالمی سطح پر زیر بحث لائے جارہے ہیں۔

اس سلسلہ میں پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن کی کتاب ''تہذیبوں کے درمیان تصادم'' نے خصوصا گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد ماحول کو اور زیادہ ہنگامہ خیز بنا دیا ہے۔ ہزاروں مضامین اس کے بعد اس موضوع پر اخبارات ورسائل کی زینت بن چکے ہیں اور ان کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ تہذیبوں کے خدوخال، ان کی نشوونما، ان کا ارتقاء، مختلف تہذیبوں کے مابین تاثیر وتاثر اور ان تمام پہلوؤں کے سلسلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کو مدلل اور مفصل طریقہ پر واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ صورت حال کی نزاکت اور موضوع کی یہی وسعت وتہہ داری دراصل اس موضوع کے انتخاب کا جواز ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اگر ہم بحث ومناقشہ کے کارواں کو آگے بڑھاتے ہوئے اس موضوع کے تمام اہم نکات سامنے لانے میں کامیاب ہوگئے تو اس سے دیگر اقوام وملل سے ہمارے تعامل کی نوعیت بھی واضح ہوجائے گی اور اس کا منہج بھی متعین ہوجائے گا۔ ہمیں خوشی ہے کہ بعض مقالہ نگار حضرات نے سوال کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی سہی ان پہلوؤں کی طرف مختصر اشارات کئے ہیں۔

✦ ✦ ✦

عرض مسئلہ:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ مسائل

سوال نمبر ۴(ب،ج،د):

ظفر الاسلام اعظمی
(شیخ الحدیث وصدر المدرسین، دار العلوم مئو)

بندہ کوسوال ۴ کے جز(ب،ج،د) کی بابت عرض مسئلہ کا حکم دیا گیا ہے۔ جز(ب) کی تقریر یوں ہے:

دنیا کے بعض علاقوں میں غیر مسلموں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کوظلم اور استحصال کا شکار بنائے ہوا ہے، ہندوستان میں ایک بہت بڑی آبادی جو دلت کہلاتی ہے بصدیوں سے ہندوؤں میں اونچی ذات سمجھے جانے والے طبقہ کے مظالم کا شکار ہے، جن کو سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ بنائے رکھنے کی منظم اور منصوبہ بند کوشش ہوتی رہی ہے۔ اسی طرح بعض ملکوں میں کالی اور گوری نسل کے درمیان تفریق روا رکھی گئی ہے۔ اس صورت حال میں اس مظلوم طبقہ کے تئیں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ کیا مسلمانوں پر انسانی اخوت کے رشتہ سے ان کا تعاون کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے؟ یا چونکہ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہیں ہے، اس لئے وہ اس بارے میں جواب دہ نہیں ہیں؟

مقالہ نگا حضرات کی آراء سے درج ذیل نقاط سامنے آتے ہیں:

۱-ایسی صورت میں مظلوم کی مدد بغیر کسی شرط کے کی جائے گی ۲-شرط کے ساتھ کی جائے گی، ۳-ان کے ساتھ تعاون دینی فریضہ ہے، ۴-اخلاقی فریضہ ہے، ۵-تعاون نہ کرنے کی صورت میں وہ جواب دہ ہوں گے، ۶-وہ جواب دہ نہ ہوں گے، ۷-اس بابت سکوت اختیار کیا گیا ہے، ۸-صرف ظالم ومظلوم دونوں کو حق کی دعوت دیں گے، ۹-حق کی دعوت کے ساتھ ساتھ تعاون کریں گے۔

جن حضرات نے بغیر کسی شرط کے تعاون کا قول اختیار کیا ہے ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، مولانا ابوبکر قاسمی (دربھنگہ)، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ارشد مدنی، مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا شمس الدین آسام، مفتی ذاکر حسین (پشاور)، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی ارشاد احمد قاسمی، مولانا عبید اللہ (جامعہ اشرفیہ لاہور)، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مولانا نیاز احمد عبد الحمید مدنی، مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا قمر الزمان ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل (پاکستان)، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، مولانا سلطان احمد اصلاحی (علیگڑھ)، سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی، سید شکیل احمد انور، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا عامر ظفر (مئو)۔

بیشتر مقالہ نگار نے آیات قرآنی: "لا ینہا کم اللہ عن الذین...یا أیہا الناس إنا خلقنا کم من ذکر وأنثی، لایحب اللہ الجھر بالسوء من القول الامن ظلم، ولقد کرمنا بنی آدم" سے استدلال کیا ہے، اسی طرح ''انصر أخاك ظالمًا أو مظلومًا، من رأی منکم منکرا'' وغیرہ احادیث مبارکہ سے دلیل پکڑی ہے۔ مولانا عامر ظفر صاحب نے استدلال میں آیت قرآنی: "ووصینا الانسان بوالدیه حملته أمه وهنا" پیش کی ہے، جبکہ مولانا ابوبکر قاسمی نے ''سورۂ مائدہ'' کی آیت کے ساتھ حدیث ''أنصر أخاك'' پیش کی ہے۔ مولانا ابوسفیان مفتاحی نے ''أطعموا الطعام'' اور مولانا اختر امام عادل نے طبرانی، بزار اور مجمع الزوائد کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن مشہور ظالم حجاج کی تقریر سنی، اس میں اس نے بہت سی غلط باتیں کہیں، میں نے سوچا کہ اس کی اصلاح کروں اور اس کی غلطی پر متوجہ کروں، لیکن

مجھے قول رسول یاد آیا کہ "لا ينبغي للمومن أن يذل نفسه" میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا تھا کہ اپنے کو ذلیل کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے کو ایسے خطرات میں مبتلا کرنا جن سے حفاظت کی طاقت نہ ہو۔ موصوف نے اور بھی دلائل مجمع الزوائد ۶/ ۲۳۴، کتاب الخراج لابی یوسف ۲۱۶ ا ے پیش فرمائے ہیں۔ ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی عبد الرحیم قاسمی (بھوپال)، مولانا ابراہیم گجیافلاحی (گجرات) اور مولانا ابوالعاص وحیدی نے اپنے مدعا پر کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی (علی گڑھ) نے سنن ابوداؤد کی مشہور حدیث "ابغوني في الضعفاء فإنما ترزقون وتنصرون بضعفائكم" اور سید ذاکر حسین نے سیرت ابن ہشام کی عبارت: "تألفتهما ليسلما" پیش فرمائی ہے۔

مولانا اقبال احمد قاسمی نے: "إن الناس إذا رأو الظالم فلم يأخذوا على يديه أو شك أن يعمهم الله بعقاب منه" (مشکوۃ) نیز مولانا صادق مبارکپوری نے "بخاری" کی حدیث: "امرنا بسبع ونهانا عن سبع فذكر عيادة المريض... المظلوم" نقل فرمایا ہے مولانا ارشاد احمد قاسمی نے "ردالمحتار" کی ایک عبارت: "لا بأس للمسلم أن يعطي كافرا حربيا أو ذميا"

مفتی ذاکر حسن پشاوری نے فاحشہ کے کتے کو پانی پلانے کو اپنا مستدل ٹھہرایا ہے۔ مولانا ارشد مدنی کی دلیل اس طرح ہے: "جب معاہدوں کے تحت بنوخزاعہ مسلمانوں کے اور بنوبکر قریش کے حلیف بنے اور بنوبکر نے بنوخزاعہ پر یورش کردی اور قریش نے ان کی اسلحہ اور افراد کے ذریعہ پشت پناہی کی اور معاہدہ کو توڑ کر بنوخزاعہ کے ساتھ ظلم وزیادتی میں شریک ہوگئے تو آپ نے بنوخزاعہ کی مدد کی تھی (سیرت ابن ہشام)۔

جن حضرات نے شرط کے ساتھ مدد کئے جانے کا قول اختیار کیا ہے (یعنی مسلمانوں کو اگر ان کی مدد کرنے پر ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو مدد کرنی چاہئے) ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا اختر امام عادل، مفتی عقیل الرحمن قاسمی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا سلمان (گجرات)، مولانا راشد حسین ندوی، سید خورشید حسن رضوی۔

مولانا عبد الرشید صاحب قاسمی تحریر فرماتے ہیں: بلا اس کی فکر کئے ہوئے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں زمام حکومت ہے یا نہیں، مگر عصری سیاست پر بھی نظر رہنی چاہئے کہ اعلیٰ ذات والے ہماری اعانت کا مقصد کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں۔ اسی طرح مولانا اقبال احمد قاسمی لکھتے ہیں: "مدد تو کرنا چاہئے مگر پیش پیش نہیں رہنا چاہئے، نیز اس کا بھی خیال رہے کہ اونچی ذات کے لوگ مسلمانوں کے مخالف اور درپئے آزار نہ ہوں اور دلتوں کو مدد کر کے اتنا قوی نہ بنا دیا جائے کہ وہ کل مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا شکار بنانا شروع کردیں۔ مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی تحریر کرتے ہیں: "سیاسی تحریک وتدبیر کے ذریعہ ان پسماندہ طبقوں کو حقوق دلائیں"۔ مآل کے اعتبار سے یہ تینوں آراء تقریباً ایک ہی ہیں۔

اس تعاون کو بعضوں نے اخلاقی فریضہ شمار کیا ہے اور بیشتر حضرات نے دینی فریضہ۔ مولانا ابراہیم گجیافلاحی (گجرات) اس کو اخلاقی فریضہ شمار کرتے ہیں۔ مفتی حبیب اللہ قاسمی کی تحریر سے کوئی واضح پہلو نہیں نکلتا، کیوں کہ انہوں نے اولاً تحریر فرمایا ہے کہ "مسلمانوں کے لئے غیر مسلم طبقہ کا تعاون مذہبی فریضہ نہیں، پھر آگے تحریر فرماتے ہیں: بقدر وسعت تعاون میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ نہ معلوم ہو سکا کہ بقدر وسعت تعاون کرنے پر اطلاق کیا ہوگا؟ اخلاقی فریضہ یا دینی فریضہ"۔ ان دو کے علاوہ تمام مقالہ نگار نے اسے دینی فریضہ شمار کیا ہے۔

تعاون نہ کرنے کی صورت میں جوابدہی کے قائلین کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا نیاز احمد عبد الحمید مدنی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا قاضی محمد ہارون، مولانا محمد ظفر عالم ندوی۔ مولانا سنبھلی تحریر فرماتے ہیں: "ستم رسیدہ کی مدد علی الکفایہ ہے نہ کہ فرض عین"۔

عدم جوابدہی کے قائلین مفتی حبیب اللہ قاسمی، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی ہیں۔ مفتی اسعد قاسم سنبھلی تعاون کے بجائے مساوات کی بنیاد پر صرف انہیں دعوت دینے کے قائل ہیں۔ سید شکیل احمد انور (حیدرآباد) تحریر کرتے ہیں: "مدد تو دیں مگر ظالم ومظلوم دونوں کو دعوت حق ضرور دیں، ورنہ اس کے بغیر مساوات وغیرہ اندھے کنوئیں میں قیمتی مال ومتاع ضائع کرنے کے مترادف ہوگی"۔

ان تین کے علاوہ بقیہ تمام مقالہ نگار حضرات نے اس سلسلہ میں سکوت فرمایا ہے۔

قبل اس کے بندہ کچھ عرض کرے، چند باتیں تمہیداً پیش خدمت ہیں:

۱- ہندوستان کے حالات دیگر ممالک سے جداگانہ ہیں۔

۲- فرقہ وارانہ فسادات میں لوٹ مار کرنے والے اور ہوتے ہیں اور آرگنائز وایڈوائزر (مشیر) کوئی اور۔

۳- اس دور میں اکثریت کے لوگ (سیل فش) مفاد پرست ہوتے ہیں، اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم پر زیادتی اور ہمارے استحصال کے وقت دلت ہمارا ساتھ دیں گے یا نہیں؟

۴- "اذا ابتلی ببلیتین فلیختر أیھما أھون" اور "الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف" (الاشباہ والنظائر) کا ضابطہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے۔ مذکورہ بالا باتوں کی روشنی میں راقم عرض کرتا ہے کہ دلتوں کا تعاون تو کیا جائے گا، مگر اس عہد و پیمان کے ساتھ کہ ہمیں مظلوم کا ساتھ دینا ہے، خواہ مظلوم سیاسی اعتبار سے ہو، یا سماجی و معاشرتی اعتبار سے، مسلمان ہو یا دلت جیسی بھی زیادتی ہوگی، ہم دونوں ہی اس زیادتی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس سلسلہ میں "حلف الفضول" کا واقعہ بھی مستدل بنایا جاسکتا ہے۔

جز (ج) کی تقریر یوں ہے:

یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام میں خدمت خلق کی بڑی اہمیت ہے۔ اور قرآن وحدیث میں مختلف طریقوں پر اس کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسرے اہل مذاہب سے امت مسلمہ کا رشتہ اخوت انسانی پر مبنی ہے اور مسلمانوں سے اس کا دوہرا تعلق ہے: ایک انسانی بھائی چارہ کا اور دوسرے اسلامی اور ایمانی اخوت کا۔ ان حالات میں مسلمان اگر خدمت خلق کا کوئی ادارہ قائم کریں، جیسے ہاسپٹل وغیرہ، تو انہیں ان اداروں سے غیر مسلم حضرات کو نفع پہنچانے میں کیا صورت اختیار کرنی چاہئے؟ اسلامی نقطہ نظر سے ایسے اداروں کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا بہتر ہے، یا بلا تفریق مذہب تمام لوگوں کے لئے خدمت واعانت کے دروازہ کو کھلا رکھنا؟

اس جز کے تحت مقالہ نگار کے رجحانات مختلف ہیں:

۱- ان اداروں کو بلا تفریق مذہب وملت نفع پہنچانا چاہئے۔

۲- ان اداروں کو مخصوص رکھنا چاہئے۔

۳- مساوی حالات میں ترجیح ہونی چاہئے۔

مولانا محمد اقبال صاحب تحریر فرماتے ہیں: "اگر غیر مسلم طبقہ خوش حال ہے تو مسلمانوں کے لئے خاص رکھنا چاہئے"۔ مولانا محی الدین غازی فلاحی لکھتے ہیں: "اگر اداروں کے وسائل محدود ہوں تو انہیں مسلمانوں کے لئے خاص رکھنا چاہئے، بصورت دیگر ان کے دروازے سب ضرورتمندوں کے لئے کھلے رکھنے چاہئیں، ویسے کچھ مسلم ادارے ایسے ضرور ہونے چاہئیں جن کی محض ملی کے بجائے انسانی شناخت ہو۔ ان حضرات نے اپنے دعوی پر کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی۔

مساوی حالات میں ترجیح کے قائلین: ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا اختر امام عادل، مفتی عقیل الرحمن، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا خورشید احمد اعظمی، سید شکیل احمد انور، مولانا یعقوب قاسمی وغیرہ ہیں۔ مولانا برہان الدین سنبھلی تحریر فرماتے ہیں: بقدر استطاعت شرعاً مکلف ہیں اور اس میں "الأقرب فالأقرب" اور اصل "الاحوج فالاحوج" بھی ملحوظ رہنا چاہئے۔ مولانا سلمان صاحب رقم طراز ہیں: "اگر وسعت ہو تو ترجیح مسلمانوں کو ہوگی اور اگر وسعت نہ ہو تو اس ادارہ کو مسلمانوں کے لئے خاص رکھنا ہوگا۔ مولانا قاضی محمد ہارون مینگل اور مولانا عبداللطیف پالنپوری کا خیال ہے کہ اگر گنجائش ہو تو دونوں کے لئے، ورنہ صرف مسلمانوں کے لئے امداد خاص ہوگی۔ مولانا ارشد مدنی صاحب کی رائے ہے کہ غیر مسلمین کو بھی فائدہ پہنچانا چاہئے بشرطیکہ جنگی حالت نہ ہو اور وہ مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور نہ کرتے ہوں۔ مولانا مفتی اسعد قاسم صاحب تحریر کرتے ہیں: اس طرح کے اداروں کا بڑا حصہ مسلمانوں پر خرچ کیا جائے گا۔ مسلمان دوہرے حق کا مستحق ہے، آگے آپ فرماتے ہیں کہ انتظامی سطح پر صرف مسلمان خاص ہوگا، ہاں خدمت عام ہوگی۔ مولانا محمد اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ اگر پہلے سے سرکاری ادارے اس طرح کے قائم ہیں جو مسلم وغیر مسلم کے لئے عام ہیں

بہتر ہے کہ مسلمانوں کے لئے خاص کیا جائے۔ چونکہ سرکاری ادارہ میں زیادہ تر ملازم غیر مسلم ہوتے ہیں اور تعصب سے کام لیتے ہیں اور اگر پہلے سے ادارہ قائم نہ ہو تو دیکھنا چاہئے کہ وہاں آباد غیر مسلم طبقہ خوش حال تو نہیں ہے، اگر خوش حال ہو تو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا اور نہ رکھنا دونوں جائز ہیں۔ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی کی تحریر ساکت ہے۔ مذکورین کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات بلا تفریق مذہب وملت فلاحی ورفاہی اداروں سے مدد پہنچانے کے قائل ہیں اور دلائل میں بیشتر حضرات نے "لا ینہاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم" اور "ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ" نیز احادیث پاک "ارحموا من في الأرض یرحمکم من في السماء" اور بعضوں نے ثمامہ بن اثال کے مکہ مکرمہ میں قحط کے موقع پر مدد کرنے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچ سو اشرفیوں کے بطور امداد بھیجنے کو پیش کیا ہے۔

عارض کے خیال میں دونوں ہی کو انتفاع کا حق حاصل ہوگا، مگر اولیت وترجیح مسلمانوں کو ہوگی، نیز مسلمانوں کے مقامی حالات، تعداد اور ان کی مالی حالت کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ بعض فلاحی ادارے ایسا بھی کرتے ہیں کہ ناداروں کے علاج ومعالجہ کے لئے اسپتال کو خط لکھ دیتے ہیں کہ وہ اس مریض کا علاج کردے اور اس کی رقم کا بل ادارہ سے وصول کرے۔ اگر یہ فلاحی ادارے بھی ایسا کریں تو توسع میں کمی آسکتی ہے اور ترجیح کی یک گونہ صورت بن سکتی ہے۔

جز (د) کی تقریر یوں ہے:

جب کوئی قدرتی آفت آتی ہے، جیسے زلزلہ، سیلاب، متعدی امراض وغیرہ، تو اس کا اثر سماج میں بسنے والے تمام ہی لوگوں پر پڑتا ہے، اور سبھی لوگ مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں بعض فرقہ پرست عناصر ایسے ہیں کہ ایسی مصیبت کی گھڑی میں بھی وہ مختلف طبقات کے درمیان تفریق وامتیاز سے کام لیتے ہیں۔ مسلمانوں کی بھی بہت سی تنظیمیں ایسے مواقع پر ریلیف کا کام انجام دیتی ہیں، تو ان حالات میں برادران وطن کے ساتھ مسلم تنظیموں کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟

اس جز کے تحت مقالہ نگار کی مختلف آراء ہیں:

پہلی رائے: اکثر مقالہ نگار حضرات بلا تفریق مذہب وملت مساوی طور پر امداد دیئے جانے کے قائل ہیں۔ کسی نے استدلال میں "من یسر علی معسر یسر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ" (مشکاۃ) پیش کی ہے تو کسی نے "أطعموا الطعام" کا سہارا لیا ہے۔ بیشتر حضرات نے اپنے مدعا پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا سلمان صاحب اور مولانا قمر الزماں ندوی صاحب نے یکساں طور پر مدد دیئے جانے کے قول کے بعد فرقہ پرستوں کے مسلمانوں سے بغض رکھنے والے فرقہ پرستوں کا استثناء کیا ہے۔ مولانا یعقوب قاسمی تحریر کرتے ہیں: برابری کا رویہ اختیار کرنا چاہئے، البتہ اگر یہ معلوم ہوجائے کہ غیر مسلم طبقہ اپنے طبقہ کی امداد سے بے نیاز ہوگیا ہے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو ترجیح دینا چاہئے۔ مولانا سید اسرار الحق سبیلی کا خیال ہے کہ تعصب سے کام نہ لیں مگر اتنا خیال ضرور رکھیں کہ وہ مسلمان جو تعصب کا شکار ہوئے ہیں ان تک امداد پہنچانے کی کوشش کریں۔ سید محمد ذاکر حسن شاہ سیالوی فرماتے ہیں: اگر کفار کا میلان اسلام کی طرف ہو اور دعوت اسلامی وہاں پھیل سکتی ہو تو اولین فرصت میں غیر مسلمین کو دیا جائے۔ مولانا موصوف نے (الفقہ الاسلامی ۳/۲۰۰۹) کی ایک عبارت کو مستدل ٹھہرایا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو ترجیح دینا چاہئے۔ اس رائے کے قائلین درج ذیل ہیں:

مولانا عامر ظفر (مئو)، مفتی عقیل الرحمن، مولانا برہان الدین سنبھلی، مفتی جمیل احمد نذیری، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، سید خورشید حسن رضوی، مولانا تنظیم عالم قاسمی۔

بیشتر مقالہ نگار نے کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ دلیل دینے والوں میں سے بعض نے آیت قرآنی: "فإذا الذي بینك وبینه عداوۃ کأنه ولي حمیم" اور تفسیر قرطبی وتفسیر ابن کثیر کی عبارتوں کو بنیاد ٹھہرایا ہے۔ مولانا راشد حسین ندوی شرط کے ساتھ اولیت کے قائل ہیں، وہ لکھتے ہیں "ضرورت وحاجت کو دیکھا جائے، لیکن مسلمانوں کو پس پشت رکھا جارہا ہو اور غیر مسلمین کے لئے مختلف تنظیمیں ہوں تو مسلمانوں کو اولیت دی جائے گی۔ مولانا برہان الدین سنبھلی نے "الأقدم فالأقدم اور الأحوج فالأحوج" کا ضابطہ ملحوظ رکھنے کا قول اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی تحریر کرتے ہیں: ہنگامی حالات وفوری امداد میں تفریق نہ ہو، البتہ مستقل آبادکاری میں مسلمانوں کو ترجیح ہوگی، لیکن اصلاحی صاحب نے اپنے مدعا پر کوئی دلیل پیش نہیں

فرمائی۔ مولانا مفتی ارشاد احمد قاسمی تحریر کرتے ہیں: ''زکاۃ کی رقوم ہوں یا غالب مقدار زکاۃ کی ہو تو مسلمانوں کے لئے خاص ہے''۔ موصوف نے ایک مشورہ بھی دیا ہے کہ چندہ عام مظلوموں اور غریبوں کے نام کیا جائے، مصالح کے پیش نظر اکثر مسلمان پر اور اقل غیر مسلمین پر خرچ کیا جائے۔ مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب کے یہاں بھی زکاۃ کی رقوم صرف مسلمانوں پر غیر زکاۃ کی رقوم دونوں پر صرف کی جائے گی، بگر ترجیح مسلمانوں کو ہوگی۔

تیسری رائے مولانا عبدالرحیم قاسمی صاحب کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''مسلمانوں کے چندوں سے دی جانے والی رقم صرف غریب مسلمانوں کو ہی دینا فرض ہوگا، جن کو دوسری تنظیموں نے محروم کر دیا ہے''۔ اسی طرح مولانا محی الدین غازی فلاحی لکھتے ہیں: اگر مسلمانوں کی مدد کے لئے مسلم تنظیموں کے علاوہ کوئی دوسرا انتظام نہ ہو اور ان کے وسائل بھی محدود ہوں تو صرف مسلمان ہی خاص ہوں گے۔ مولانا مفتی اسعد قاسم سنبھلی کی تحریر سے بھی من وجہ اختصاص مترشح ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں: اگر ان کا فنڈ زکاۃ سے ہے تو غیر مسلم کی امداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر امداد سے ہے تو اولاً مسلمانوں کی امداد کی جائے گی، ان کی امداد سے کچھ بچتا رہے تو غیر مسلمین کے شریف خاندان کی دادرسی کی جاسکتی ہے۔ مولانا محمد اقبال صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔

عارض کے خیال میں ترجیح دینے والوں کی رائے میں قوت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آیت ربانی: إنما المؤمنون إخوة کے علاوہ الفاروق (۲ / ۲۰۳) کی اس عبارت سے استدلال کیا جاسکتا ہے: علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں: ''اسامہ بن زید کی تنخواہ جب اپنے فرزند عبداللہ سے زیادہ مقرر کی گئی تو عبداللہ نے عذر کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اسامہ کو تجھ سے اور اسامہ کے باپ کو تیرے باپ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے''۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بابت (بخاری ۲ / ۶۱۰) پر مذکور حدیث پیش کردی جائے:

''عن عمر أمر رسول الله أسامة على قوم فطعنوا في إمارته فقال: إن تطعنوا في إمارته فقد طعنتم في إمارة أبيه من قبله، وأيم الله لقد كان خليقا للإمارة وإن كان من أحب الناس إلي، وإن هذا لمن أحب الناس إلي بعده''۔

اسی طرح جب فتح مدائن کے بعد مال غنیمت آیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو ہزار ہزار درہم مرحمت فرمائے اور اپنے صاحب زادہ عبداللہ کو صرف پانچ سو درہم دیئے۔ حضرت عبداللہ نے عذر کیا اور کہا کہ جب یہ دونوں بچے تھے تو اس وقت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معرکہ میں پیش پیش رہا ہوں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہاں! لیکن ان کے بزرگوں کا جو رتبہ ہے وہ تیرے باپ دادا کا نہیں (خلفائے راشدین / ۱۶۳)۔

مرجحین کی تائید میں (بخاری / ۱۹۸) کی درج ذیل حدیث بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

''فانطلقت إلى رسول الله ﷺ فوجدت امرأة من الانصار على الباب حاجتها مثل حاجتي فمر علينا بلال فقلنا: سل النبي ﷺ: أيجزئ عني أن أتصدق على زوجي وأيتام لي في حجري وقلنا لاتخبر بنا فدخل، فسأله فقال: من هما، قال: زينب فقال: أي الزينب، فقال امرأة عبد الله، قال: نعم لها أجران اجر القرابة وأجر الصدقة''۔

اس لئے جب باہم مسلمانوں میں ایک دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے تو مسلمانوں کو غیر مسلموں پر بدرجہ اولی ترجیح دی جاسکتی ہے۔

❖❖❖

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے حدود

اور سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کا حکم

مولانا بدر الحسن قاسمی، کویت

۱- ارشاد باری تعالی ہے:

"وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين" (سورۂ انبیاء:۱۰۷)۔

"قل يا أيها الناس إني رسول الله اليكم جميعا" (سورۂ اعراف:۱۵۸)۔

"يا أيها الناس قد جاء كم الرسول بالحق من ربكم فآمنوا خيرًا الكم" (سورۂ نساء:)۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت خاص ان کی قوموں کے لئے ہوا کرتی تھی، لیکن میری بعثت تمام انسانوں کے لئے ہوئی ہے" (بخاری)۔

یہ اور ان کے علاوہ دوسری قرآنی آیات اور احادیث شریفہ سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اسلام کا پیغام تمام بنی نوع انسانی کے لئے عام ہے، اسلامی شریعت کسی خاص امت یا علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ ایک عالمی شریعت ہے، اور مذہب اسلام تمام قوموں اور امتوں کا مشترک حق ہے، اس کی راہ میں قومی، خاندانی، لسانی یا رنگ ونسل کی بنیاد پر کوئی بھی رکاوٹ نہیں ہے، اسلام دنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ وہ انسان کو فکری، اعتقادی، عقلی، وجدانی اور اخلاقی اعتبار سے بلند وبرتر بنائے۔

اس اعتبار سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک ازلی رشتہ قائم ہے، کیونکہ اگر غیر مسلم موجود نہ ہوں گے تو مسلمان اسلام قبول کرنے کی اور اللہ کے دین میں داخل ہونے کی دعوت کسے دیں گے؟

جنگ کبھی کبھار پیش آنے والی ایک حالت ہے، اور اس کا سہارا اضطرار کی حالت میں یا ان رکاوٹوں کی وجہ سے لینا پڑتا ہے جو اسلام مخالف افراد یا طاقتیں پیدا کرتی ہیں، اور عقیدہ کے انتخاب واختیار کے لئے حاصل انسانی آزادی میں کھلم کھلا مداخلت ہونے لگتی ہے۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات کا سہارا اسی وقت لیا تھا جب کفار ومشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ساری راہیں مسدود کر دی تھیں، انہیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا، اور ان کے سامنے اور کوئی بھی راستہ کھلا نہیں رکھا تھا، لہذا اگر دین کے ساتھ زیادتی نہ ہو رہی ہو، مسلمانوں پر حملے نہ ہو رہے ہوں، عہد وپیاں کی پامالی نہ ہو رہی ہو، کمزوروں کو ظلم وستم کا نشانہ نہ بنایا جا رہا ہو، تو ایسی حالت میں اسلامی نقطہ نظر سے جنگ وقتال اور غزوات وفوج کشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا" (بقرہ:۱۹۰)۔

اور ارشاد ہے: "لا إكراه في الدين" (بقرہ:۲۵۶)، اور ارشاد ہے: "وإن جنحوا للسلم فاجنح لها" (انفال:۶۱)۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے کسی طالب حق پر تلوار نہیں اٹھایا، اور نہ ہی کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی کو روا رکھا، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دشمنوں سے جنگ کی ہے جو برسر پیکار تھے، یا بعض معاصرین فقہاء کی تعبیر کے مطابق بدعہدی کے مجرم تھے۔

لہذا جنگ اسلام کی نظر میں نہ ہی اقدامی ہے کہ کفار کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجاتے رہیں، اس لئے کہ اللہ تعالی نے کفار کو اس لئے پیدا نہیں فرمایا کہ قتل وقتال کے ذریعہ انہیں فنا کر دیا جائے، اور نہ ہی یہ جنگ دفاعی ہے کہ مسلم علاقوں پر حملہ کا انتظار کیا جائے، بلکہ اسلامی لحاظ سے جنگ کبھی اقدامی ہوگی اور کبھی

دفاعی۔ اقدامی جنگ اس وقت ہوگی جب انسانیت پر ظلم بہت زیادہ بڑھ جائے گا اور دفاعی اس وقت جب دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جائیں گی۔

اسلام ایسے بلند اصولوں اور اعلیٰ قدروں کے ساتھ آیا ہے جو انسانی زندگی کو منظم اور دنیا و آخرت میں انسانوں کی سعادت کی ضمانت دیتے ہیں، لہٰذا اسلام کا یہ حق ہے کہ امتوں اور قوموں کے درمیان ان اصولوں اور قدروں کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرے، اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ سارے ہی نظام اور نظریات پھیلنا چاہتے ہیں خواہ وہ انسان کے وضع کردہ ہوں، تو پھر وہ نظام جو اس ذات کا وضع کردہ ہے جو انسانی نفوس کے امراض وعلل سے آگاہ اور ان کے علاج و معالجہ سے واقف ہے، اس کا زیادہ مستحق ہے کہ لوگوں کے درمیان عام ہو اور پھیلے، اسلام کسی خاص علاقہ یا خاص امت کے ساتھ مربوط نہیں ہے، وہ ایک قیامت تک رہنے والا اور تمام انسانوں کے لئے آیا ہوا دین ہے۔

اسلام چونکہ ایک عقیدہ اور چند اصول و اقدار کا نام ہے جن پر اہل اسلام ایمان رکھتے ہیں، لہٰذا اس کی نشر و اشاعت اس کا حق ہونا چاہئے، اور اسی طرح ان اصول و مبادی و اقدار کا دفاع بھی اسلام کی نشر و اشاعت کے تعلق سے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف خوش اسلوبی سے بلائیں۔

ارشاد ہے: "أدع إلی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن" (نحل:۱۲۵)

اور ارشاد ہے: "ولا تجادلوا أهل الكتاب إلا بالتي هي أحسن" (عنکبوت:۴۶)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید خواہش رہتی تھی کہ جنگ کا سہارا نہ لینا پڑے، اسی لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن بھیجا تو وصیت کی تھی کہ دعوت دینے سے پہلے جنگ نہ کرنا، دعوت قبول کرنے سے وہ انکار بھی کردیں تو اس وقت تک ان سے قتال نہ کرنا جب تک کہ وہ خود جنگ نہ شروع کریں، اگر وہ جنگ شروع بھی کردیں تو اس وقت تک ان پر تلوار نہ چلانا جب تک تم میں سے کسی کو قتل نہ کردیں، پھر تم انہیں یہ دکھا دینا اور کہنا کہ کیا اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ کسی ایک شخص کو ہدایت بخش دے وہ تمہارے لئے سارے جہاں سے بہتر ہے۔

اسی طرح اسلام غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے، ارشاد ہے: "لا ینهاكم الله عن الذین لم یقاتلوكم في الدین ولم یخرجوكم من دیاركم أن تبروهم وتقسطوا إلیهم إن الله یحب المقسطین" (سورۂ ممتحنہ:۸)۔

انسان معصوم اور اس کی جان قابل احترام ہے تاکہ خدا کی مفوضہ ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھا سکے، اس کے قتل کی اجازت ایک عارضی شئی ہے، وہ بھی اس کے شر کو دور کرنے اور نقصان کو روکنے کے لئے ہے، فقہاء کرام نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کافر بحیثیت کافر قتل کا سزاوار نہیں، اور نہ ہی کفر بحیثیت کفران کے جنگ کرنے کی علت ہے۔

علامہ امام ابن الھمام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول: "وقاتلوا المشركین كافة كما یقاتلونكم كافة" بتاتا ہے کہ ہمیں ان سے جس جنگ کا حکم دیا گیا ہے وہ ان کے برسر پیکار ہونے کی جزاء اور اس کا نتیجہ ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول: "وقاتلوهم حتی لا تكون فتنة" کہ ان کی طرف سے مسلمانوں کو اپنے دین سے پھرنے کے لئے کسی آزمائش و ابتلاء کا ظہور نہ ہو، خواہ مار پیٹ کے ذریعہ ہو یا جنگ و قتال کی شکل میں۔

اور اس بات پر تو تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ کفار میں سے غیر جنگجو کو قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی بچوں، عورتوں اور راہبوں کو۔ جہاں تک فقہاء اسلام کے دنیا کو دو حصوں دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کر رکھنے کا تعلق ہے تو وہ کسی نص کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ حالات کے پیش نظر مجتہدین فقہاء کا استنباط ہے، جیسا کہ علامہ ابوزہرہ نے اپنے مقالہ: "نظریة الحرب في الاسلام" میں لکھا ہے۔

۲-اسلام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفسیاتی رکاوٹوں اور پابندیوں کو روا نہیں رکھتا، اس لئے کہ وہ ایک آسمانی دین ہے اور تمام نوع انسانی کی ہدایت اور عدل و انصاف و طہارت و پاکیزگی پر قائم تہذیب و تمدن کو وجود بخشنے کے لئے آیا ہے، لہٰذا اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مشترک اقامتی علاقوں میں رہائش پذیر ہوں بشرطیکہ مسلمان اپنے اسلامی عقائد و اخلاق اور آداب و اطوار پر کاربند ہوں، تاکہ ان بہت سے لوگوں کے لئے امن و امان اور خیر و عافیت، انجذاب و کشش اور رشد و ہدایت کا سبب بنیں جو طبقاتی اور رنگ و نسل پر مبنی امتیاز اور بھید و بھاؤ کی مصیبت میں گرفتار ہیں، اور انتہائی مشکل اور صبر آزما معاشرتی مسائل کا سامنا کر رہے ہیں، اس لئے کہ یہ تو اسلام کے مقاصد و اغراض کا ایک جزء ہے کہ وہ محنت کش، پریشان حال اور کمزور لوگوں کی مصیبتوں کو دور کرے، ان کی گردنوں میں پڑی بیڑیوں کو توڑے، لوگوں کو غلط عقائد اور وحشیانہ رسم و رواج سے نجات دلائے، مسلمانوں کو غیروں کے ساتھ زندگی گذار...

کی ممانعت صرف وہاں ہے جہاں مسلمانوں کے خاندان اور مسلم بچوں میں اعتقادی واخلاقی برائیوں کے سرایت کر جانے کا اندیشہ ہو، لیکن اگر مسلم خاندان غیر مسلموں کے ساتھ اپنی اخلاقیات کو محفوظ رکھتے ہوئے، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا رہتے ہوئے، آزادی کے ساتھ اسلامی شعائر کی ادائیگی کرتے ہوئے اور اپنے بچوں ونونہالوں کے دینی عقیدہ کو محفوظ رکھتے ہوئے زندگی گذارنے پر قادر ہے تو ایسی حالت میں مشترک محلوں میں قیام کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

البتہ اگر اسلامی شعائر کی ادائیگی میں رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہوں، یا مسلم خاندانوں کے اخلاق واطوار غیر مسلموں کے رنگ میں ڈھل جانے کا اندیشہ ہو تو اس قسم کے مشترک رہائشی علاقوں میں قیام کرنا درست نہ ہوگا، تاکہ مسلم خاندان اپنے دین وعقیدہ کو محفوظ رکھ سکے، اور نئی نسل شرکیات ومنشیات یا اخلاقی انارکی کے دلدل میں پھنسنے سے محفوظ رہے۔

۳- غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک ونیکی اور عدل وقسط کا حکم دیا گیا ہے، اس سلسلے میں امام طبریؒ کا قول ہے: سب سے صحیح رائے وہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عدل ونیکی کے برتاؤ کے حکم میں تمام مذاہب اور ادیان کے ماننے والے شامل ہیں کہ ان کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرو، اللہ تعالی نے عمومیت کے ساتھ اپنے اس قول میں سبھوں کو شامل رکھا ہے، اور اس میں کسی قوم وملت کی تخصیص نہیں ہے، اور جن لوگوں نے اس کے نسخ کا دعوی کیا ہے ان کی بات بے معنی ہے۔

امام قرطبی (تفسیر قرطبی ۱۸/۵۹، احکام القرآن لابن العربی ۴/۱۷۸۵) فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالی کی طرف سے مسلمانوں کو رخصت واجازت دی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کریں جو مسلمانوں سے عداوت نہیں رکھتے اور نہ ان سے جنگ کرتے ہیں ایسے لوگوں کے ساتھ مسلمان خیر واحسان کا معاملہ کریں، اس طور پر کہ بطور احسان اپنے اموال کا کچھ حصہ بھی انہیں دیں۔

مفسر قرآن امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "وہ (اللہ تعالی) ان کفار کے ساتھ احسان اور حسن سلوک سے منع نہیں کرتا جو تم سے برسر پیکار نہیں ہیں کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو" (تفسیر ابن کثیر ۴/۳۷۳)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کفار کے ساتھ صلہ اور حسن سلوک جائز ہے بشرطیکہ وہ برسر پیکار نہ ہوں، اور یہ اخلاق کی اعلی ترین مثالوں میں سے ہے جن کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میں عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں" (موطا امام مالک)۔

۴- زلزلہ وسیلاب جیسے طبعی حوادث کی حالت میں ایک مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ امدادی کاموں میں حصہ لے، مال واشیاء امداد میں پیش کرے، اور مسلم وغیر مسلم کی تفریق نہ کرے، گرچہ ایک مسلمان کی جان کی حفاظت دوسروں کے مقابلے میں اولی ہے۔

بہت سی شرعی نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں چند درج ذیل ہیں:

"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (ممتحنہ:۸)، اور ارشاد ہے: "ليس عليك هداهم ولكن الله يهدي من يشاء وما تنفقوا من خير فلأنفسكم وما تنفقون إلا ابتغاء وجه الله" (بقرہ:۲۷۲)، اور ارشاد ہے: "ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرًا" (سورۂ دہر:۸)۔

امام بخاری ومسلم نے حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتی ہیں: قریش کے ساتھ صلح کے زمانے میں (صلح حدیبیہ) میں میری والدہ جو کہ مشرک تھیں مجھ سے ملاقات کے لئے آئیں، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! میری والدہ بڑی امیدوں سے میرے پاس آئی ہیں تو کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں، ان کے ساتھ صلہ کرو"۔

گرچہ مکہ والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ستایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا تھا پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام محمد بن حسن شیبانی کی روایت کے مطابق قحط کے زمانے میں مکہ والوں کے پاس کچھ مال بھجوایا کہ غریبوں میں تقسیم کردیا جائے (شرح السیر الکبیر ۱/۱۴۴)۔

اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے شام کے سفر کے دوران بیت المال سے ان نصرانیوں کی امداد کا حکم دیا تھا جو جذام کے مرض میں گرفتار تھے، اور بستر مرگ پر ہوتے ہوئے ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی تھی حالانکہ جس کے خنجر سے آپؓ کا سینہ چاک ہوا وہ ابولؤلؤ مجوسی تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرا اپنے غلام کو تاکیدی حکم دیا کرتے تھے کہ وہ قربانی کا گوشت اپنے یہودی پڑوسی کو ضرور دیا کرے، ایک یہودی کے ساتھ اس قدر

اہتمام پر ان کے غلام کو حیرت ہوئی تو آپ نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی اتنی تاکید کی کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ وہ اسے وراثت تک میں شریک قرار دے دیں گے (بخاری ومسلم)۔

اسی طرح حضرت عکرمہ، ابن سیرین اور امام زہری کی رائے میں غیر مسلم کو صدقہ فطر تک دینا جائز ہے، ان نصوص وآراء کی روشنی میں غیر مسلموں کو طبعی حوادث سے بچانے کے لئے ان کی امداد کرنے میں کوئی ممانعت باقی نہیں رہ جاتی۔

۵- جہاں تک کفار بیماروں کی عیادت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اصل امام بخاری کی وہ روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی غلام تھا جو آپ کی خدمت کیا کرتا تھا، جب وہ بیمار ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مشرک کی عیادت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ امام ماوردی کہتے ہیں: ذمی کی عیادت جائز ہے اور حصول ثواب اس تعلق پر ہے جو جوار، قرابت یا صحبت کی وجہ سے ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم محترم ابوطالب کی عیادت بھی ان کی بیماری کے زمانے میں فرمائی تھی اور ان کے سامنے اسلام پیش کیا تھا۔

البحر الرائق کے مصنف فرماتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں مشرکین کی عیادت کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ اس لئے یہ عمل بھی حسن سلوک کی ہی ایک قسم ہے اور اسلام کی خوبیوں میں سے ہے، حضرت امام احمد بن حنبل سے کفار کی عیادت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کی عیادت نہیں کی تھی اور ان پر اسلام نہیں پیش کیا تھا؟ ان سب کے باوجود بعض فقہاء کی رائے میں یہ جواز امید اسلام کے ساتھ مشروط ہے، علامہ ابن بطال فرماتے ہیں: اس کی عیادت کا جواز اسی وقت ہے جب یہ امید ہو کہ یہ عمل قبول اسلام کو اس کے نزدیک مرغوب بنا دے گا، اور اگر اس کی امید نہ ہو تو یہ جائز نہیں، جو بات ظاہر ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اختلاف مقاصد سے حالات مختلف ہو سکتے ہیں، ہو سکتا ہے اس کی عیادت کے نتیجہ میں مسلمانوں کی کسی اور مصلحت کی تکمیل ہوتی ہو (المغنی ۲/۴۰۹)۔

اسی طرح اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کافر کی تعزیت کر سکتا ہے اگر کوئی اس کا رشتہ دار مرجائے، سفیان ثوریؒ سے منقول ہے کہ مسلمان کافر کی تعزیت کرے گا اور کہے گا: "عظمت وسلطنت صرف اللہ کے لئے ہے"، امام حسن بصری فرماتے تھے کہ جب کسی کافر کی تعزیت کرو تو کہو: "لا یصیبک إلا خیر" امام ابن بطہ کا قول ہے: کافر کی تعزیت کے وقت مندرجہ ذیل کلمات کہیں جائیں گے، "اللہ تمہاری مصیبت پر تمہیں تمہارے دوسرے دینی بھائیوں سے بہتر اجر دے" (المغنی ۲/۴۰۹)۔

ہماری رائے یہ ہے کہ الفاظ کی تعیین وتحدید کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کافر کی تعزیت کرنے والا شخص جو مناسب حال کلمات سمجھے گا اختیار کرے گا، بشرطیکہ اس میں شرک کی تعظیم اور اہل شرک کی سربلندی کی دعا نہ ہو، امام شافعی سے ایک قول منقول ہے اور وہ امام احمد کی طرف منسوب ہے کہ کافر کی عیادت صرف اسی حالت میں جائز ہے جب اس کے اسلام کی امید ہو، لیکن اگر کافر مریضوں کی عیادت محاسن اسلام میں سے ہے تو کسی کافر کی موت پر ان کی تعزیت اولی ہے، خواہ ان میں سے کسی کے اسلام کی امید ہو یا نہ ہو، اس لئے کہ اللہ تعالی کا یہ ارشاد عام ہے: "لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا إلیھم إن اللہ یحب المقسطین" (الممتحنہ: ۸)۔

۶- جھنڈا ایک قومی شعار ہے، اور کسی استعماری قوت/ سامراج کی براہ راست غلامی سے ملک کی آزادی کی علامت کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ملک پر امن ہوتا ہے تو وہ جھنڈا فضا میں لہراتا رہتا ہے، اور جب ملک اپنی آزادی وخودمختاری میں کسی حادثہ کا شکار ہوتا ہے، یا اس کے کسی رہنما کی موت ہو جاتی ہے یا کسی طبعی حادثہ کے نتیجہ میں کسی بربادی ونقصان سے دوچار ہوتا ہے تو اس جھنڈے کو سرنگوں کر دیا جاتا ہے، جھنڈے کو بطور شعار اختیار کرنا ایک قومی روایت ہے جو تمام قوموں اور ملکوں میں رائج ہے، اور شرعی مباحات میں سے ہے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات وغیرہ کے مواقع پر جھنڈے کو استعمال کیا ہے، مصنف ابن ابی شیبہ میں مذکور ہے کہ جس نے سب سے پہلے جھنڈا استعمال کیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں (اثر رقم ۲۵/۲۶/۷۲/۷۲)۔

غزوہ احد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ مشرکین کا جھنڈا کون اٹھائے گا؟ کہا گیا: بنو عبد الدار، آپ نے فرمایا کہ ہم ان سے زیادہ مستحق وفا ہیں، مصعب بن عمیر کہاں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، حاضر ہیں، آپ نے فرمایا کہ اس علم کو اٹھالو، مصعب بن عمیر نے جھنڈا اٹھالیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چلنے لگے، وہ سب سے عظیم ترین جھنڈا تھا، اوس کا جھنڈا اسعد بن حضیر اور خزرج کا جھنڈا اسعد بن ابو عبادہ کے حوالہ کیا گیا۔

غزوہ موتہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفید علم اختیار کیا تھا، اور اسے حضرت زید بن حارثہ کے حوالہ کیا تھا، اور اسی طرح غزوہ تبوک کے موقع پر آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم اور جھنڈے بنوائے، اور سب سے عظیم ترین علم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حوالے فرمایا۔

جھنڈا چونکہ ایک قومی علامت ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھنڈوں کو استعمال فرمایا، انہیں علامت وفا تصور کیا، علم کو بلند رکھنے کا اہتمام فرمایا، اس مہم کے لئے بعض صحابہ کرام کی تخصیص فرمائی، اور صحابہ کرام نے دوران جنگ اس کے نہ جھکنے دینے کی پوری کوشش کی جیسا کہ غزوہ موتہ کے موقع پر حضرت زید بن حارثہ، عبداللہ بن رواحہ اور جعفر طیار رضی اللہ عنہم کے عمل سے ظاہر ہے کہ انہوں نے کسی طرح باری باری علم اٹھائے رکھا، اور اسے بلند باقی رکھنے کے لئے حتی الامکان کوشش کی، یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ علم کے اختیار کرنے، کسی جماعت یا حکومت کی طرف سے اسے بلند رکھنے، اسے جھکنے سے بچانے اور اسے ایک رمز اور شعار تصور کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اب جہاں تک جھنڈے کو سلامی دینے کا سوال ہے تو اگر یہ ایک رمزی عمل ہے، جیسے اسے لہراتے وقت کھڑا ہو جانا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس عمل کے ساتھ اس کی تقدیس اور اس کے سامنے سر جھکانے جیسے شرکیہ مظاہر نہ ہوں۔

یہی حکم قومی ترانہ کا بھی ہے، اگر اس کے احترام واعزاز اور اس کے لئے قیام میں کوتاہی وطنی وقومی خیانت تصور کیا جاتا ہو اور اس پر ضرر ونقصان مرتب ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں اس کی تکریم اور اس کے لئے قیام جائز ہوگا، البتہ اگر نقصانات کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے بغیر بھی سلامتی کی ضمانت ہو تو اس سے اجتناب بہتر ہوگا۔

جہاں تک ہندوستان کے متنازعہ قومی ترانہ کا تعلق ہے تو اس کا پڑھنا یا اس کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں کہ اس میں زمین کی عبادت و پرستش جیسے معانی شامل ہیں اور ارض وطن کے لئے ایسے اوصاف استعمال کئے گئے ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالی کے علاوہ کسی اور کے لئے درست وجائز نہیں ہیں۔

۷-غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی اور مالی معاملات جیسے بیع وشراء، کرایہ داری ورہن وغیرہ میں شرکت ایک مباح اور رائج عمل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے مروج اور مسلمانوں کے درمیان معمول بہ ہے، ان معاملات میں سے وہی ممنوع ہیں جو حرام ہیں، جیسے سود، منشیات، شراب اور سور کا گوشت اور ایسی ہی دوسری چیزیں، غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کی کچھ اور دوسری قسمیں بھی ہیں، مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوم حنین کے موقع پر صفوان سے ایک ڈھال عاریۃً لیا تھا، صفوان نے کہا کہ اے محمد! کیا اس پر آپ کا دائمی قبضہ رہے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں، بلکہ عاریۃً لے رہا ہوں، اور واپسی کی ضمانت ہے (ابوداؤد، حاکم، النسائی)، عاریت لینا معاملات اور آپسی عہد و معاہدہ کی قسم کی چیز ہے، اور اس میں مسلمان ہونے کی کوئی شرط نہیں، اس لئے کہ معاملات کے تعلق سے اصل اباحت واجازت ہے، الا یہ کہ اس کی حرمت پر دلیل موجود ہو۔

امام ابن مفلح نے (آداب شرعیہ) میں لکھا ہے کہ اگر مسلمانوں کو کسی کافر کے پاس امانت رکھنے کی ضرورت ہو تو یہ اس کے لئے جائز ہے (الآداب الشرعیہ ۲/ ۴۶۷)۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاہ ایلہ کا ہدیہ کردہ سفید خچر قبول فرمایا تھا، اور اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چادر عنایت فرمائی تھی، اسی طرح دومۃ الجندل کے حاکم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ریشم کا جبہ (عمدۃ القاری ۱۳/ ۱۶۸) اور مقوقس نے ایک باندی بطور ہدیہ پیش کیا تھا (فتح الباری ۵/ ۲۳۱)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کافر کا دیا ہوا ہدیہ مسلمان قبول کرسکتا ہے، اور اس پر کافر کو بدلہ دینا بھی جائز ہے تاکہ کسی کافر کا ہاتھ مسلمان کے ہاتھ سے اونچا نہ رہے، بدر کے قیدیوں کے تعلق سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور اس نے ان قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی ہوتی تو اس کی خاطر ان سبھوں کو رہا کردیتا (بخاری)۔ اور یہ اس کی ان کوششوں کا بدلہ تھا جو اس نے کعبہ میں معلق صحیفہ کے پھاڑنے میں کی تھی، اور بعض روایتوں میں ہے کہ طائف سے واپسی کے دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت ونصرت کا انعام ہوتا۔

علامہ بدرالدین عینی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنو دیل کے ایک شخص کو ہجرت کے موقع پر بطور رہنما اجرت پر لینے کے واقعہ پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مشرکین کو بھی محرم راز اور اپنے مال ودولت کا امین بنایا جاسکتا ہے اگر ان کی طرف سے امانت ومروت اور وفا شعاری کا تجربہ ہو، جس طرح آپ نے اس مشرک کو اپنا رہبر و محرم راز بنایا تھا۔

جہاں تک غیر مسلموں کے ساتھ معاملات وتعلق کے عام ضابطہ کا تعلق ہے تو وہ وہی ہے جو علماء اسلام اور فقہاء کرام نے بڑی دقت ومہارت کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں جیسا کہ محدث ظفر احمد عثمانی نے احکام القرآن میں نقل فرمایا ہے: کفار کے ساتھ تعلق کی تین قسمیں

ہوتی ہیں:

۱- موالات یعنی دوستی وقلبی تعلق

۲- مدارات یعنی ان کے ساتھ حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنا۔

۳- مواسات یعنی کچھ دے دلا کر ان کو فائدہ پہنچانا۔

جہاں تک پہلی قسم یعنی موالات کا تعلق ہے تو یہ بالکل ہی جائز نہیں، اور اسی کو اللہ تعالی کے اس قول میں منع کیا گیا ہے:

"لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء، بعضهم أولياء بعض، ومن يتولهم منكم فإنه منهم"

اور "يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا عدوي وعدوكم أولياء"۔

مدارات تین مواقع پر جائز ہیں:

۱- دفع ضرر کے لئے۔

۲- کافر کی دینی مصلحت کے لئے یعنی مدارات کے ذریعہ اس کے اسلام لانے کی توقع ہو۔

۳- اگر وہ مہمان ہو یا معزز لوگوں میں سے ہو تو اس کے اکرام کے لئے۔

خود اپنی مصلحت یا یعنی مال وجاہ کے حصول کے لئے غیر مسلم کی مدارات جائز نہ ہوگی، خاص کر اگر اس سے دین میں کسی ضرر کے لاحق ہونے کا اندیشہ ہو، اور اللہ تعالی اس قول میں موالات سے مراد مدارات ہی ہے: "لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء"، اور اسی لئے دفع ضرر کی حالت کو مستثنی کرتے ہوئے کہا گیا ہے: "إلا أن تتقوا منهم تقاة"، اس کے علاوہ دوسری آیات میں موالات سے مراد اس کے حقیقی معنی ہیں، اسی لئے وہاں کسی بھی قسم کا استثناء نہیں ہے۔

کافر کی اس کی دینی مصلحت کی خاطر مدارات کے جواز کی دلیل سورہ عبس میں اللہ تعالی کا یہ قول ہے: "فأنت له تصدى" اس آیت میں جس بات پر نکیر کی گئی ہے وہ کافر کو مومن پر مقدم کرنا ہے، نہ کہ صرف اس کی مدارات، اور بحیثیت مہمان کسی غیر مسلم کی مدارات کے جواز کی دلیل وہ روایت ہے جس میں بنو ثقیف کو مسجد میں ٹھہرانے کی بات کہی گئی ہے۔

اور شخصی منفعت جیسے جاہ ومال کے حصول کی خاطر غیر مسلم کے مدارات کی حرمت کی دلیل اللہ تعالی کا یہ قول ہے: "أيبغون عندهم العزة"۔

اب رہی تیسری قسم یعنی مواسات، تو مواسات اہل حرب کے ساتھ جائز نہیں، البتہ ذمی اور ان جیسے لوگوں کے ساتھ جائز ہے، اور اس کی صراحت سورۂ ممتحنہ میں موجود ہے، جو "لا ينهاكم" سے لے کر "هم الظالمون" تک کی قرآنی آیت میں ہے، وہاں مواسات کی تعبیر "تولی" سے مجازا کی گئی ہے، اور اس مجاز کا قرینہ یہ الفاظ ہیں: "أن تبروهم وتقسطوا إليهم" اور مدارات کا جواز صرف اس وقت ہے جب اس کے وقوع کا ظن غالب ہو، محض وہم وگمان کا اعتبار نہیں ہوگا، اور اسی وہم وگمان کو محل انکار سمجھا گیا ہے، قرآن کی آیت: "نخشى أن تصيبنا دائرة" میں مدارات کا یہی حکم ان لوگوں کے تعلق سے ہے جو اہل فسق وہوی میں سے ہیں۔

جہاں تک غیر مسلموں سے مدد لینے کی بات ہے تو آپ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے مدد طلب کی تھی، حالانکہ غزوہ حنین کے موقع پر وہ مشرک تھا۔

آپ ﷺ نے بنو قینقاع کے یہودیوں سے مدد لی تھی، اور مال غنیمت میں انہیں حصہ بھی دیا تھا۔

آپ ﷺ نے قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص سے مدد لی تھی اور قریش کے خلاف اسے بطور جاسوس استعمال کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ میں سے ابن عبد البر اور حنابلہ ایک دوسری رائے میں غیر مسلموں سے مدد طلب کرنے کو کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ جائز سمجھتے ہیں، خود آپ ﷺ نے مدینہ میں داخل ہوتے وقت یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، حلف الفضول میں شرکت کی تعریف کی اور اسے مستحسن قرار دیا تھا، اور طائف سے واپسی کے وقت مطعم بن عدی کے جوار میں داخل ہوئے تھے، یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ کفار کے ساتھ گٹھ جوڑ جائز ہے، اور پارلیمنٹ وغیرہ میں غیر مسلموں کو نمائندگی دی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے مفاد میں ہو۔

سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کا حکم:

نظام حکومت یا حاکم کے انتخاب کے لئے اسلام نے کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے، بلکہ عدل وانصاف کے قائم کرنے کا ایک عمومی فریم ورک بنانے پر ہی اکتفاء کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ کا قیام عمل میں آیا، اور پھر اس کے بعد سے عالم اسلام میں سیاسی طرز عمل یا نظامہائے حکومت کبھی خلافت راشدہ کے طرز پر تھے، تو کبھی منضبط بادشاہی وجود میں آئی، تو کہیں انتہائی آمرانہ نظام قائم ہوا۔

اسلام کا شورائی نظام موجودہ جمہوری نظام سے زیادہ فطرت کے قریب، زیادہ منضبط اور زیادہ اہمیت کا حامل ہے، بشرطیکہ حاکم آمرانہ مزاج نہ رکھتا ہو، لیکن جب سے مسلمانوں نے عملی میدانوں میں اپنی گرفت کھودی ہے اور علم وفن اور صنعت وحرفت کے میدان میں مغربی دنیا کو حیرت انگیز ترقی حاصل ہوئی ہے اور بر وبحر اور فضا سب کے سب مغربی ٹکنالوجی کے زیر سایہ اور ان کے بھیانک اسلحہ خانوں کی زد پر آ گئے ہیں موجودہ دور کے حالات نے دار الکفر اور دار الحرب کے مفاہیم کو بدل کر ہی رکھ دیا ہے۔

دوسری طرف دنیا کی ساری حکومتیں اور ممالک خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اقوام متحدہ کے نظام میں آ گئی ہیں اور اس کی ممبر ہیں، اسی طرح اکثر وبیشتر ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہیں، لہذا اس انداز میں کفر واسلام کی بنیاد پر ایک ملک کو دوسرے سے الگ کرنا جیسا کہ قدیم کتب فقہ میں موجود ہے اب ناممکن سا ہو گیا ہے، بلکہ اب استثنائی حالتوں کے علاوہ جیسے اسرائیل، کوئی ایسا ملک نہیں رہ گیا ہے جس کو دار الحرب کا نام دیا جاسکے، واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کی حفاظت کے لئے دار الاسلام ہجرت کے مقابلے میں بعض غیر اسلامی حکومتوں اور ملکوں کو زیادہ پر امن اور اپنے حقوق کے لئے زیادہ طاقتور ضامن پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی مفکرین اور دانشوران غیر مسلم حکومتوں جیسے یورپ وامریکا وغیرہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، اور اسی طرح لاکھوں مسلم طلبہ مغربی دانشگاہوں میں داخلہ کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی علمی سرگرمیوں کو مکمل کرسکیں اور وہیں قیام کرسکیں۔

دوسری طرف حکومتوں اور ملکوں کے دائرے میں دیکھئے تو زمین اپنی وسعتوں کے باوجود مسلمانوں پر تنگ ہو چکی ہے، حقیقی طور پر ایک بھی ایسی مسلم حکومت یا مسلم ملک موجود نہیں ہے جو ان تمام مسلمانوں کو اپنی حدود میں جگہ دے سکے جو غیر مسلم حکومتوں کے زیر سایہ جیتے ہیں، اور ایسا ملک ہوتا بھی تو وہ اپنی سرحدیں اس کام کے لئے کھول کر نہیں رکھ سکتا، اور اگر سرحدیں کھل بھی جائیں تو اس کے سلبی ومنفی نتائج کا علم تو صرف اللہ کو ہی ہے، دسیوں سال سے بنگلہ دیش میں لاکھوں غیر بنگالی مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے کسی سے مخفی نہیں ہے، ایسی صورت میں کھوکھلی مثالیت جیسے کہ دار الکفر سے دار الاسلام کی ہجرت یا فرار بالدین کی بات کرنا بالکل ہی غیر منطقی امر ہے، کتنے ایسے مسلم ممالک ہیں جہاں اپنے دین کے پابند لوگ کانٹوں پر جیتے اور اجنبی ملکوں اور دور دراز جزیروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں، کون سا دار الاسلام اس بات کے لئے تیار اور قادر ہے کہ وہ دوسو ملین ہندوستانی مسلمانوں یا فلپائن، روس اور چین جیسے غیر مسلم ممالک میں آباد لاکھوں مسلمانوں کو اپنے یہاں جگہ دے سکے، بالفرض اگر یہ ہو بھی جائے تو اس سے پیدا ہونے والے منفی اثرات کم خطرناک نہیں ہوں گے، بلکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے مفاد کو زیادہ نقصان پہنچے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلم اقلیتوں کے لئے ڈیموکریٹک نظام حکومت کا کوئی بدل نہیں ہے، ایسی حکومتوں میں رہنا جو ڈیموکریسی کو بطور نظام حکومت اور لادینیت (یعنی کسی مذہب کو نہ نقصان پہنچانا اور نہ ہی کسی کی جانبداری کرنا) کو بطور نظام فکر اپناتی ہیں اقلیتوں کے لئے سب سے بڑی نعمت اور دینی وقومی بنیادوں پر خونریزیوں اور نیست ونابود کرنے کی کوششوں سے ان کی حفاظت کا سب سے بڑا وسیلہ ہے، جیسا کہ بوسنیا وغیرہ کی مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے، ڈیموکریسی نہ تو کھلا کفر ہے اور نہ صریح منکر، بلکہ آمرانہ حکومتوں کو لگام لگانے کے سلسلے میں وہ اسلامی تعلیمات کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، اس لئے کہ سیاسی ادوار کا اختلاف وتعدد، صحافت کی آزادی، نظام قضا کی خودمختاری اور اپوزیشن میں اقلیت کے حقوق یہ سب وہ چیزیں ہیں جو قوموں اور امتوں کی شریفانہ زندگی کے لئے مطلوب ہیں۔

جہاں تک حلال کو حرام اور حرام کو حلال یا فرائض کے ساقط کرنے کا تعلق ہے تو اس قسم کے قوانین ناقابل قبول ہیں، خواہ وہ جمہوری ممالک کے پارلیمنٹوں سے بنے ہوں یا کسی آمریت پسند حاکم کے صادر کردہ احکام وفرامین کی شکل میں ہوں، اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، اور مسلمان اس قسم کے قوانین کو قبول کرنے پر مجبور نہیں ہیں جو اسلام کی واضح تعلیمات سے متصادم ہوں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ اس قسم کے قوانین کے خلاف کھڑے ہوں، اب جو مسلمان ڈیموکریسی کی دعوت دیتا ہے وہ یہ دعوت اسی اعتبار سے دیتا ہے کہ وہ حکومت کی ایک شکل ہے اور ڈیموکریسی کا طریقہ اس لئے اپنانا کہ اس کے ذریعہ عدل وانصاف

قائم ہو سکے، شورائی نظام وجود میں آئے، حقوق انسانی کا احترام ہو اور ظلم وزیادتی کو روکا جائے، تو اس میں کوئی ممانعت نہیں، اس میں یہ اصول کارفرما ہے کہ جس کام کے بغیر کسی واجب پر عمل نہیں ہو سکتا ہو وہ کام بھی واجب ہے، مقاصد شرعیہ کے لئے اگر کوئی وسیلہ متعین ہو جائے تو وہ وسیلہ بھی مقاصد کا ہی حکم لے لیتا ہے، ڈیموکریسی کی دعوت لازماً حاکمیت کا انکار نہیں ہے، اور محض خوارج جیسے نعرہ بلند کرنے میں کوئی فائدہ نہیں، جس کے بارے میں کہا جا چکا ہے: "كلمة حق أريد بها باطل"۔ جو چیزیں دین کی ثابت شدہ ہیں ان پر ان مجلسوں اور پارلیمنٹوں میں ووٹنگ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

غیر اسلامی ملکوں میں ڈیموکریسی کو قائم کرنا ضروری نہیں ہے کہ اسلام مخالف ہی ہو، ہاں اکثریت کی رائے اور اعتماد کی وجہ سے حکمراں جماعت کو دو دھاری ہتھیار ہاتھ لگ جاتا ہے جو کبھی کبھی مسلمانوں کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے جیسا کہ ہندوستان میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے جاری دباؤ اور بعض ایسے جزئی قوانین کے اجراء کی کوششیں ہیں جو مسلمانوں کے مسلم پرسنل لا سے متعارض ہیں، لیکن اکثر قوانین جو پارلیمنٹ پاس کرتی ہے وہ انتظامی قسم کی ہوتی ہیں اور وہ قریب وبعید کہیں سے دین پر اثر انداز نہیں ہوتی ہیں، اس لئے میری رائے میں انتخابی سرگرمیوں میں شرکت ممنوع نہیں ہوگی، اس لئے کہ پارلیمنٹ کی راہ سے آنے والی خرابیوں کا تدارک بھی پارلیمنٹ میں ہی ہو سکتا ہے۔

لیکن جہاں تک پارلیمانی عمل میں عدم شرکت، مسلمانوں کی اس میں عدم نمائندگی اور ممبران کی طرف سے عدم اختلاف کا تعلق ہے تو اس صورت میں اس بات کا زیادہ موقع فراہم ہوتا ہے کہ ایسے قوانین وضع ہو جائیں جو اسلامی تعلیمات سے متعارض ہوں اور اس کے نتیجہ میں خطرہ بڑھ جائے اور مسلمانوں کا زیادہ نقصان ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیاست شرعیہ کا مطلب ہے ایسے قوانین وضوابط جو حکومتی اداروں کو منظم کرتے ہیں، قوم کے معاملات کو انجام دیتے ہیں، روح شریعت سے متفق ہوتے ہیں اور اس کے مقاصد کو عملی جامہ پہناتے ہیں، ایسی سیاست شرعیہ کی تفصیلات صراحتاً قرآن وحدیث میں مذکور نہیں ہیں۔

علامہ ابن عقیل فرماتے ہیں: "سیاست ان اعمال وسرگرمیوں کا نام ہے جن کی موجودگی میں لوگ صلاح سے قریب تر اور فساد وبگاڑ سے بعید تر رہ سکتے ہوں، خواہ ان اعمال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع نہ فرمایا ہو (الطرق الحكمية/ص ۱۳)۔

علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں: سیاست حاکم کی طرف سے کوئی بھی ایسا عمل ہے جو وہ کسی مصلحت کو نظر میں رکھ کر انجام دیتا ہو، خواہ اس کے متعلق کوئی دلیل وارد نہ ہو، سیاست شرعیہ عموماً جلب مصلحت اور دفع مضرت پر مبنی ہوتی ہے، جیسا کہ سد ذرائع کے اصول سے سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ بات فطری ہے کہ حالات کا اعتبار کیا جائے گا، اور مختلف میدانوں کے اہل اختصاص کی آراء کی روشنی میں آئندہ کے منصوبے بنائے جائیں گے۔

جہاں تک سیاسی سرگرمیوں میں مشارکت، یا ایسے نظامہائے حکومت میں مناصب کے قبول کرنے کا سوال ہے جو لادینی ہیں، یا وضعی قوانین پر عمل پیرا ہیں تو یہ ہر زمانے میں بحث کا موضوع رہے ہیں، ایک جماعت اس مشارکت کو جملۃً وتفصیلاً نامقبول قرار دیتی ہے اور اسے خدائی قوانین کے مقابلے میں انسانی قوانین کو تسلیم کرنا تصور کرتی ہے۔

ان کی دلیل وہ نصوص ہیں جن میں خدا کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرنے پر کفر، یا فسق یا ظلم کا حکم لگایا گیا ہے۔

اور وہ نصوص ہیں جو حاکمیت کو صرف اللہ کے لئے خاص کرتی ہیں جیسے

"إن الحكم إلا لله أمر أن لا تعبدوا إلا إياه" (سورۂ یوسف: ۴۰)۔

اسی طرح وہ ممانعت ہے جو شریعت الٰہی کے علاوہ کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کے تعلق سے وارد ہوئی ہے۔

وہ آیات ہیں جو ظالموں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے منع کرتی ہیں۔

وہ آیات واحادیث ہیں جو موالات کفار سے منع کرتی ہیں۔

اس لئے کہ ان نصوص کی دلالت واضح اور قطعی ہیں، ان میں تمام مسلمانوں اور حکمرانوں کو شریعت الٰہی پر عمل کرنے کا پابند بنایا گیا ہے، اور طاغوت پرستی سے منع کیا گیا ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر راضی نہیں ہوگا وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

منہاج السنۃ میں امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کو واجب نہیں سمجھتا وہ کافر ہے، جو لوگوں

کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکام کی اتباع کے بغیر اپنی طرف سے عدل خیال کر کے فیصلہ کو جائز قرار دیتا ہے وہ بھی کافر ہے، انہیں نصوص کی وجہ سے بعض معاصر علماء کی رائے میں عدم مشارکت ہی اصل ہے۔

محمد قطب فرماتے ہیں:

ان تمام حالات میں اس مسلمان کے لئے جو جاہلیت کے حکم کا انکار کرتا ہے وزیر ہونا جائز نہیں (اقتضاء المعاصر ۵۰۹)۔

بعض لوگ تو اس موضوع کو شرک سے جوڑ دیتے ہیں کہ شرک کے عدم جواز سے پتہ چلتا ہے کہ حکم جاہلیت میں شرکت بھی ناجائز ہے، اس لئے کہ ان کی نظر میں ظالمین اور کفار کی وزارت میں شرکت حق اللہ کے ساتھ زیادتی اور اس کی پامالی ہے۔

اس میں ظالمین کے ساتھ موالات اور اخروی مصلحت کا ضیاع ہے۔

ظالمین کے اعمال کو مستحسن قرار دینا ہے۔

عوام کو گمراہ کرنا اور ظالم حکمران پر اعتماد پیدا کرنا ہے۔

اس میں ظالموں کے ساتھ شریک بنا کر نیک لوگوں کو بدنام کرنا ہے۔

اس رائے کے مقابلے میں ایک دوسری رائے بھی ہے جو مشارکت کے جواز کی قائل ہے، اس کی دلیل یوسف علیہ السلام کا وہ مطالبہ ہے جو انہوں نے عزیز مصر سے کیا تھا: "اجعلني على خزائن الأرض، إني حفيظ عليم"، دوسری آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود مختار نہیں تھے بلکہ بادشاہ کے تابع تھے، حکومت میں کوئی بڑی اور بنیادی تبدیلی لانے کا اختیار نہیں رکھتے تھے اور بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دین پر نہیں تھا، یہ نص عموم رکھتی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں ہے، یوسف علیہ السلام کی یہ دلیل کہ وہ حفیظ علیم ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر صاحب اہلیت کو یہ محسوس ہو کہ عدل کے قیام اور دفع شر کا امکان ہے یا یہ کہ وہ وطن اور اہل وطن کے لئے واضح مصلحت سمجھتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو پیش کرے، یا حکومت میں شریک ہو، خواہ حکومت اسلامی نہ ہو۔

اس کی تائید نجاشی والے واقعہ سے بھی ہوتی ہے، وہ اپنے اسلام لانے کے باوجود خدا کے نازل کردہ احکام سے ہٹ کر فیصلہ کرتے رہے، اور ایک غیر مسلم قوم کے بادشاہ بنے رہے، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کافر اور خارج از ملت قرار نہیں دیا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھی، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خط بھیجا تھا کہ میں صرف اپنے نفس کا مالک ہوں، امام ابن حجر نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک ڈھال اور بڑے نفع بخش تھے۔

ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر اسلامی حکومت میں مشارکت جائز ہے اگر اس پر کوئی بڑی مصلحت مرتب ہوتی ہو یا نقصان کا دفعیہ ہو سکتا ہو، خواہ شرکت کرنے والا حالات میں بنیادی تبدیلی لانے پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

مشہور مفسر قرآن امام شہاب آلوسی حضرت یوسفؑ کا قصہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اس میں منصب یا ذمہ داری کے مطالبہ کے جواز کی دلیل ہے اگر طالب منصب اقامت عدل پر قدرت رکھتا ہو، خواہ کسی کافر یا ظالم سے ہی کیوں نہ مطالبہ کرنا پڑے (روح المعانی ۵/۳)۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی وزارت یا سیاسی انتظامیہ میں مشارکت کا مقصد موجودہ پارلیمانی نظام یا جدید وزارتی انتظامیہ کے تحت نہ ظالموں کی ماتحتی ہے، نہ موالات کفار اور نہ غیر شریعت الٰہی کی تحکیم ہے، بلکہ وضعی نظام میں شرکت سے شرکت کرنے والے کا مقصد اگر وہ اپنے دین کا پابند ہے تو عدل کا قیام اور حتی الامکان شریعت الٰہی کی تطبیق ہے، اس شرط کے ساتھ کہ دین کے ساتھ مداہنت نہ ہو۔

اس موقف کی تائید سلطان العلماء عز بن عبد السلام کے اس قول سے ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے قواعد میں بہت ہی سنجیدہ اور فقہی اسلوب میں کہا ہے:

اگر مسلمانوں کے رسوخ کو پختہ کرنے اور ان کے وجود کی حفاظت کے لئے غیر اسلامی حکومت میں مشارکت ہی واحد وسیلہ ہو تو اس کے جائز ہونے بلکہ بعض حالات میں واجب ہونے میں کوئی شبہ نہیں، یہ معاملہ قیام عدل، دین کی حفاظت اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح پر شرکت کرنے والے کی قدرت سے مربوط ہے۔

اصل تو یہی ہے کہ انسان اس نظام میں شریک نہ ہو جو عدل کی بنیادوں پر قائم نہیں ہے، لیکن جیسا کہ کہا گیا: "مالا یدرک کله لا یترک جله" اور اسلامی شریعت کے مقاصد میں حسب امکان ظلم اور برائی کو کم کرنا اور جرم وزیادتی کے دائرے کو تنگ کرنا شامل ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فاتقوا الله ما استطعتم" (تغابن:۱۶)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: "لا یکلف الله نفسا إلا وسعها" (بقرۃ:۲۸۶)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اگر تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو جتنا ممکن ہو اس پر عمل کرو"۔

صحابہ کرامؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، اور قریش کے ظلم وزیادتی سے بچنے کے لئے نجاشی کے پاس پناہ گزیں ہوئے، اس لئے کہ یہ معاملہ نسبتاً آسان تھا، اور نجاشی اپنے اسلام لانے کے باوجود حکومت کرتے رہے، حالانکہ ان کی حکومت اسلامی نہیں تھی۔

اخف الضررین کا اختیار ایک اصولی مسئلہ ہے اور عقل وشرع دونوں کے نزدیک مقبول ہے، فقہاء نے منکرات پر سکوت کو اس وقت جائز قرار دیا ہے جب کسی منکر پر انکار اس سے کسی بڑے منکر کا سبب بن سکتا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کو انہیں بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے تھے جن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کیا تھا لیکن فتنہ کے خوف سے ترک کر دیا اور حضرت عائشہؓ سے فرمایا: "اگر تمہاری قوم ابھی ابھی شرک سے نہ نکلی ہوئی نہ ہوتی تو میں حضرت ابراہیم کی بنیادوں پر کعبہ کی تعمیر کرا دیتا" (یہ متفق علیہ روایت ہے)۔

بچھڑے کی پرستش وعبادت ایک فتنہ تھی، حضرت ہارون علیہ السلام اس فتنہ پر افتراق امت کے خوف سے خاموش رہے، انہوں نے فرمایا: "اے میرے بھائی! میری داڑھی وبال پکڑ کر نہ کھینچو، مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ پیدا کر دیا اور میری باتوں کا خیال نہ رکھا (طہ:۹۴)۔

اگر انسان سب سے بہترین عمل پر قادر نہ ہو اور حالات نامناسب ہوں تو کم تر پر اکتفاء کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں چند فقہی اصول ہیں جیسے:

المشقة تجلب التيسير... الضرارات تبيح المحظورات... الضرر يزال۔

اسی طرح دوسرے فقہی اصول وقواعد ہیں جو اس مسلمان کے سامنے وسیع آفاق کھول دیتے ہیں جو مخصوص اور استثنائی حالات میں گھرا ہو، پھر یہ کہ احکام شریعت کی بنا آسانی ویسر پر ہے نہ کہ حرج وتنگی اور دشواری پر، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (بقرۃ:۱۸۵)۔

"وما جعل عليكم في الدين من حرج" (حج:۷۸)۔

"فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه إن الله غفور رحيم" (بقرۃ:۱۷۳)۔

"إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان" (نحل:۱۰۶)۔

"ذلك تخفيف من ربكم ورحمة" (بقرۃ:۱۷۸)۔

"يريد الله أن يخفف عنكم وخلق الإنسان ضعيفا" (نساء:۲۸)۔

خود فقہاء کرام نے مقلد قاضی کی ولایت کو مجتہد قاضی کی عدم موجودگی میں جائز قرار دیا ہے، اسی طرح فاسق کی شہادت کو بھی اگر کوئی عادل موجود نہ ہو، اور فاجر کے ساتھ جہاد کو بھی اگر کوئی نیک اور پرہیزگار امیر نہ ہو۔

امام احمدؒ سے دریافت کیا گیا کہ ایک امیر ہے، قوی ہے لیکن فاجر ہے، اور دوسرا نیک وصالح ہے لیکن کمزور وضعیف ہے، دونوں میں سے کس کے ساتھ مل کر جہاد کرنا چاہئے؟ انہوں نے فرمایا: طاقتور فاجر کا فجور اس کی ذات کے لئے ہے، اور اس کی قوت وطاقت مسلمانوں کے لئے مفید ہے، جبکہ کمزور اور نیک کی نیکی تو اس کی اپنی ذات کے لئے ہے لیکن اس کے ضعف کا نقصان مسلمانوں کو پہنچے گا تو انسان کو جہاد طاقتور کے ساتھ مل کر کرنا چاہئے خواہ وہ فاجر ہو۔

حالات اور چیزوں کی درستگی واصلاح میں تدریج کا اختیار کرنا احکام شریعت اور سنت راشدین میں سے ہے، خود شریعت نے شراب کو حرام قرار دینے میں تدریجی اسلوب اختیار کیا ہے، اسی طرح تدریجی اسلوب ایک تکوینی سنت ہے جو انسان وحیوان اور نباتات سب میں جاری ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ڈیموکریٹک عمل میں شرکت شرعاً جائز ہے تو رائے دہندگی و نمائندگی، ووٹنگ کے عمل کی تنظیم، انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لینا عمومی مقصد کے حصول کے لئے جائز ہوگا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم ووٹنگ کو شہادت کے مرتبہ پر رکھیں جیسا کہ بعض معاصر فقہاء کی رائے ہے، یا اسے سفارش و توکیل اعتبار کریں، خواہ الیکشن میں آزادانہ کھڑے ہوں یا کسی سیاسی پارٹی کے ٹکٹ پر، پاکستان کی "اسلامی نظریاتی کونسل" نے جو ووٹنگ کی تعریف کی ہے کہ وہ توکیل و تفویض ہے تو اس میں شہادت کا معنی شامل ہے اور وہ (تولیت) کو مستلزم ہے، یہ کہنا کہ وہ توکیل ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رائے دہندگی میں گواہی، سفارش اور نیابت کے مفاہیم باہم گنجلک ہیں، اور فقہاء کے لئے اس مسئلہ کی شرعی نوعیت کی تعیین مشکل ہے، اس لئے کہ یہ ایک نئی اصطلاح ہے جو شریعت کے مفاہیم اور مصادر کی پرداخت نہیں ہے، بہر حال اگر عرف یہ ہے کہ مصلحت مقاصد شریعت میں سے ضروریات، حاجیات اور تحسینیات کی حفاظت کے ذریعہ مصلحت حاصل ہو تو سیاسی گٹھ بندی، سیاسی پارٹی اور سیاسی ادارے کی تشکیل جائز ہے، تاکہ مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت ہو سکے، جس طرح غیر مسلم ملکوں کے حکومتی محکموں اور پارلیمانی اداروں میں شرکت جائز ہے، جہاں تک ہر قسم کی مشارکت کے انکار پر اصرار، موالات وغیرہ مصطلحات و مفاہیم کی تفسیر و تشریح میں غلو پسندی، خلافت راشدہ، اسلامی حکومت یا حکومت الٰہی کے قیام کا نعرہ کی بات ہے تو یہ سب خوبصورت خواب رہ جائیں گے، شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپانے اور امر واقع کے انکار کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، اور اسی قسم کی فکر نے مسلمانوں کی زندگی کو حرام بنا رکھا ہے۔

ڈیموکریسی گرچہ اسلام کا جز نہیں ہے لیکن اس کے مثبت اور صالح قواعد جن سے یہ نظام تیار ہوتا ہے پہلے ہی سے اسلام میں موجود ہیں۔

حقوق، مساوات اور عدل و انصاف کے اصول موجودہ دنیا میں ڈیموکریٹک طریقوں سے ہی حقیقت بن سکتے ہیں، حقیقی ڈیموکریسی اس وقت لوگوں پر لوگوں کے ظلم کو روکنے، ظالم حکمراں کو اس کے منصب سے معزول کرنے اور موثر شورائی نظام کو وجود میں لانے کا ذریعہ بن گئی ہے، اور یہ ساری چیزیں اسلامی شریعت کے مقاصد اور اس کی فیاضانہ تعلیمات کا ایک حصہ ہیں۔

جہاں تک حلف برداری یا دستور کی قسم کھانے کا تعلق ہے تو وہ ایک قسم کا عہد ہے کہ دستور کے دفعات کی پابندی کی جائے گی اور منصب و عہدہ کے دوران پوری امانتداری اور باریکی کے ساتھ ذمہ داریوں کی ادائیگی کی جائے گی، دقیق معنوں میں وہ شرعی حلف نہیں ہے، اور ہو سکتا ہے کہ وہ بعض آمریت پسند حکومتوں میں حاکم کے نام کی قسم کھانے سے کم تر ہو، حلف برداری کے لئے تیار کی جانے والی عبارتوں میں تبدیلی کی جا سکتی ہے، ان کو صحیح عقیدہ کے مطابق بنایا جا سکتا ہے تاکہ وہ دین اسلام کی تعلیمات کے منافی نہ ہوں۔

مسلم اقلیتوں کے عائلی قوانین کی حفاظت کا ایک مثالی نظام اور ایک انوکھا تجربہ:

جب مسلم پر غیر مسلم کی ولایت ناقابل قبول ہے تو آخر ان مسلمانوں کے مسائل کا کیا حل ہے جو غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیت کی حیثیت سے زندگی گذارتے ہیں؟ وہ اپنے وجود کی حفاظت اور بحیثیت مسلمان کیسے جی سکتے ہیں جبکہ ان کے تمام سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی وضعی قوانین یا شرکیہ احکام کے تابع ہیں، جو سراسر اسلامی احکام کے منافی ہیں؟ ولایت خواہ خاص ہو یا عمومی سب غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے؟ وہ غیر شرعی احکام اور غیر مسلم حکام کی ولایت میں اپنے نکاح و طلاق اور وقف و میراث جیسے معاملات حل کرنے پر مجبور ہیں۔

مسلم اقلیتوں کی حیثیت سے بسنے والے مسلمانوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اور موجودہ نظامہائے حکومت میں انہیں اس کی اجازت نہیں مل سکتی کہ وہ مسلم ممالک کو ہجرت کر جائیں، اگر وہ اختیاری طور پر یا جبری حالات کے تحت نکل بھی جائیں تو دنیا میں کوئی بھی ایسی مسلم حکومت نہیں ہے جو تیار یا اس بات پر قادر ہو کہ اتنی بڑی تعداد میں ہجرت کرنے والی مسلم اقلیتوں کا استقبال کر سکے، اور انہیں اپنی زمین میں بسا سکے۔ اور کسی بھی مسلم ملک کی نیشنلٹی دے سکے، پھر کیا طریقہ ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد اسلامی شریعت کے سائے میں رہ سکے، جبکہ دنیا کے اکثر ممالک کفار و مشرکین، یہود و نصاریٰ یا ملحدین و کمیونسٹوں جیسے لوگوں کے محکوم ہیں۔

صرف ایشیا کے جنوب مشرق میں ایسی غیر مسلم حکومتیں پائی جاتی ہیں جن میں مسلم اقلیتوں کی بہت بڑی تعداد رہتی ہے، مثال کے طور پر ہندوستان میں تقریباً نوسو ملین ہندو، بدھسٹ اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان تقریباً دوسو ملین مسلمان رہتے ہیں، فلپائن، سری لنکا اور نیپال میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد رہتی ہے، اب ان مسلمانوں کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ عائلی قوانین کی حد تک بھی اسلامی احکام کے سائے میں زندگی گذار سکیں، حالانکہ عائلی قوانین کی طرف سے غفلت مسلمانوں کے وجود اور ان کے تشخص کے لئے خطرہ ہے، اور بت پرستانہ تہذیب، شیطانی و مشرکانہ زندگی، بے دینی، کمیونزم یا

اباحیت وجنسی بے راہ روی کے ماحول میں ان کی اولاد کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

مراکز افتاء میں جو سوالات اور استفتاءات آتے ہیں، جن میں اس ناقابل حل مسئلہ اور ان ممالک میں بسنے والی مسلم خواتین کے مسائل کے بارے میں پوچھا جاتا ہے جو بسا اوقات شوہروں کے ظلم وزیادتی کی وجہ سے یا کبھی وہاں کی سرکاری عدالتوں کے غلط رویہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ان کے جوابات پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ آج بھی قائم ہے، اور زمانے کے فقہاء کے نزدیک اس کے حقیقی حل موجود نہیں ہیں جو مسلمانوں کو ان کی پریشانیوں سے نجات دلاسکے، اور ان کے طرز زندگی کو منظم بناسکے، اور ان پر عمل کرنا غیر مسلم ملکوں میں رہتے ہوئے آسان بھی نہیں ہے، یہ جوابات انفرادی نوعیت کے ہوتے ہیں یہ بعض حالات میں قابل عمل ہوتے ہیں اور بعض دوسرے حالات میں نہیں۔

ان حالات کے پیش نظر میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ اس تجربہ کو پیش کروں جو مسلمانوں اور خاص طور سے غیر اسلامی ملکوں میں مسلم اقلیتوں کے عائلی مشکلات کے حل کرنے میں ایک منفردانہ حیثیت رکھتا ہے، میری رائے میں اس تجربہ کے ذریعہ مسلمانوں کے وجود وتشخص کو ضائع ہونے اور تحلیل ہونے سے بچانے میں مدد مل سکتی ہے، وہ طویل عملی تجربہ ہے جس کی عمر ستر سال سے بھی زیادہ ہے اور جس کو مضبوط شرعی وفقہی سند بھی حاصل ہے، ان انوکھے تجربہ سے میری مراد امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ ہے جو ہندوستان میں ستر سال سے قائم ہے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ، بڑے علماء وفقہاء کی رہنمائی ونگرانی میں اپنا کام کررہی ہے۔

اس تجربہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کسی شخصیت کا انتخاب بطور امیر ہوتا ہے اور اس کا کردار دقیق معنوں میں شیخ الاسلام کا کردار ہوتا ہے، اس کی قوت کا مدار اس پر ہے کہ اس کا انتخاب اعیان شہر، ارباب حل وعقد یا مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے کیا ہے، اس کے انتخاب اور اس منصب پر اس کی تقرری کے بعد اس کا کردار اور عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کو سیاسی حساسیت سے دور رہتے ہوئے غیر مسلم حکومت کے ساتھ مل کر منظم کرتا ہے، اور ان معاملات کو چھیڑنے سے گریز کرتا ہے جو ملک کے داخلی امن وسلامتی یا ان امور سے تعلق رکھتے ہیں یا جو دستور ملک کے شہری قوانین یا جنائی قوانین کے تحت آتے ہیں، بلکہ منتخب امیر کا کام مسلمانوں کے تشخص کی حفاظت کرنا ہوتا ہے، وہ حکومتی اداروں اور اہل کاروں کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کے شخصی یا عائلی قوانین میں مداخلت کریں، اس منصب پر تقرری کے بعد اسے قاضیوں کی تقرری کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اس نظام کے ذریعہ کبھی عائلی مسائل کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی بحیثیت حکم مسلمانوں کے درمیان نزاع اور جھگڑوں میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

امیر کے معین کردہ قضاۃ ہی بنیادی طور پر عائلی مسائل جیسے: نکاح، طلاق، فسخ اور تفریق بین الزوجین وغیرہ کو ضروری شرائط کی موجودگی میں دقیق فقہی معیار کے مطابق حل کرنے کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں، ان مسائل کی کارروائی سول کورٹ کے ہی طریقہ پر انجام پاتی ہے، یہ کارروائیاں تقریباً مفت یا دوسری عدالتوں کی بہ نسبت بہت کم خرچ پر انجام پاتی ہیں، جس کی وجہ سے مسلمان اس کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں، مزید برآں اس کے ذریعہ مسلمانوں میں شعور کی بیداری، اپنی عائلی وشخصی زندگی کو شرعی بنیادوں پر قائم کرنے اور نکاح وطلاق، وقف ومیراث جیسے مسائل میں وضعی ومشرکانہ قوانین کے اجتناب میں مدد ملتی ہے، امیر یا صدر تنظیم اموال زکاۃ کے جمع کرنے اور ان کو شرعی طریقہ سے ان کے مصارف میں خرچ کرنے کے لئے بیت المال قائم کرتے ہیں، مسلمانوں کی زندگی میں اس قسم کی داخلی تنظیم نے ہندوستان کے دو صوبے بہار واڑیسہ میں زبردست کامیابی حاصل کی ہے، یہاں تک بعض اوقات غیر مسلم حکومت اس بات پر مجبور ہوئی کہ وہ ان مسلم قاضیوں کے فیصلوں کو مانیں جن کو امارت شرعیہ کی طرف معین کیا گیا ہے، اور ان کے فیصلوں کا احترام کریں، اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں میں عظمت کا مقام رکھتے ہیں۔

اس جیسے نظام کی شرعی بنیاد وہ عمومی احادیث وآثار ہیں جن میں مسلمانوں کو اجتماعی زندگی اپنانے اور ایک امیر کے ماتحت رہنے کی دعوت دی گئی ہے، خواہ سفر میں تین ہی آدمی کیوں نہ ہوں، نیز دوسری اور بھی بہت سی دلیلیں ہیں جیسے عید وجمعہ قائم کرنا جس میں مسلمانوں کو کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو نگرانی اور منظم کرنے کا کام کرے، کتب فقہیہ میں ایسی بہت سی نصوص وارد ہوئی ہیں جو اس قسم کے نظام کو قائم کرنے کی تائید کرتی ہیں۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: "اگر ولاۃ کفار ہوں تو بھی مسلمانوں کے لئے اقامت جمعہ واعیاد جائز ہے، مسلمانوں کی رضامندی کے ذریعہ قاضی ان کے درمیان قاضی رہے گا اور مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ وہ اپنے لئے ایک مسلم والی تلاش کرلیں"۔

علامہ ابن الہمام اپنی کتاب فتح القدیر میں فرماتے ہیں: "اگر سلطان نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کی تقلید جائز ہو جیسا کہ بعض مسلم ممالک میں

ہے جن پر کفار نے غلبہ حاصل کرلیا ہے جیسے مغرب میں قرطبہ وبلنسیہ اور بلاد حبشہ، اور انہوں نے مسلمانوں کو اس پر باقی رکھا ان سے لیا جائے گا تو مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ اپنے میں سے کسی پر اتفاق کرلیں اور اس کو اپنا والی بنالیں، اور وہ والی کسی قاضی کی تعیین کرے، یا خود ہی قضا کے فرائض انجام دے'' (فتح القدیر ۶/۳۶۵)۔

کتب فقہیہ میں ''مسلمانوں کی آپسی رضامندی سے قاضی قاضی بن جائے گا'' کی عبارت بار بار آئی ہے، لیکن بہت سی مسلم اقلیتوں نے اس حکم سے غفلت برتا، نتیجۃ وہ اپنا وجود کھو بیٹھیں، اور ذلت وپستی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوگئیں، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امارت شرعیہ کا معائنہ اور اس کے قاضیوں کی تدریب کے نظام کا مطالعہ کرنے کے بعد امارت شرعیہ کے مثل ایک نظام اپنایا جائے، مرحوم قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ اس نظام کے ممتاز ترین قاضیوں میں سے تھے، انہوں نے اور مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم نے ہندوستان میں اسلامی وجود کی حفاظت اور مسلمانوں کے عائلی قوانین کے دفاع میں بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے بھی عنصری نظام کے خاتمہ کے بعد اس نظام سے استفادہ کا ارادہ کیا، ان کے عائلی قوانین سے متعلق اسلامی دستور کی تدوین ہوئی، اسے حکومت کے سامنے پیش کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے عائلی قوانین کو منظور کرے جو نکاح وطلاق وتفریق سے متعلق احکام شریعت کے مطابق سالوں سے مدون ومرتب ہیں۔

فقہاء کی تصریحات کسی ایک فقہی مسلک تک محدود نہیں ہیں بلکہ عام کتب فقہیہ میں بہت سی نصوص موجود ہیں۔

کویت سے شائع شدہ موسوعہ فقہیہ میں چاروں معروف فقہی مسالک کا خلاصہ ایسے شہر کے بارے میں ہے جس میں مسلمانوں کا کوئی امام یا خلیفہ نہ ہو، یا کسی شہر پر کفار کا غلبہ وقبضہ ہو، ان کی مستند کتابوں سے یہ نقل کیا ہے کہ آپسی جھگڑوں میں صلح وصفائی اور مسلمانوں کے امور کی تنظیم کے لئے قضاۃ کی تعیین ممکن ہے، ان مسالک کا خلاصہ یہ ہے:

اگر سلطان نہ ہو اور نہ ہی جس کی تقلید درست ہے وہ ہو یا وہاں تک پہنچنا دشوار ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے:

حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ آپس میں سے کسی پر اتفاق کرکے اس کو والی بنالیں، والی قاضی کی تعیین کرے گا، یا خود ہی قضاء کے فرائض انجام دے گا۔

مالکیہ کی رائے ہے کہ اگر امام کا وجود یا اس سے رابطہ دشوار ہو تو اہل رائے واہل علم ومعرفت ان میں سے کسی ایک کو جس میں قضاء کی شرائط کامل ہوں قاضی بنالیں گے، اور یہ تعیین ضرورت کی وجہ سے امام کی نیابت میں ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ قاضی کی تعیین جائز ہوگی اگر اس کی تعیین پر تمام اہل اختیار متفق ہوں، اور وہ اس کی مدد ونصرت پر قادر ہوں، بشرطیکہ دوسرے کے پاس فیصلہ کرانا ممکن نہ ہو۔

حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ اگر شہر قاضی سے خالی ہوجائے اور تمام اہل شہر جمع ہوکر اپنے لئے کسی قاضی کو متعین کرلیں، تو اگر امام مفقود ہوگا تو یہ عمل درست ہوگا اور اس کے احکام نافذ ہوں گے لیکن اگر امام موجود ہوگا تو یہ درست نہ ہوگا (فتح القدیر ۵/۴۶۱، رد المحتار ۵/۳۶۹، روضۃ القضاۃ ۱/۶، تبصرۃ الحکام ۱/۲۱، ادب القاضی للماوردی ۱/۱۲۹،۱۴۱)۔

یہ فقہی نصوص ان مسلمانوں کو ایک راہ فراہم کرتی ہیں جو اقلیتوں کی حیثیت سے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے قانونی حق کا استعمال کرسکیں، اور کسی دینی ذمہ دار پر اتفاق کرلیں جو کہ امیر، شیخ الاسلام یا مسلمانوں کا والی کہلائے گا، قضاۃ کی تعیین بھی دعاۃ کی طرح مختلف صوبوں کے لئے ہوگی، اور عائلی قوانین کی حد تک اسے فیصلہ کا اختیار ہوگا، لیکن تمام امور میں اس کو اختیار اعلی حاصل نہ ہوگا۔

ایک ہی شہر میں ایک سے زیادہ قاضی یا دینی ذمہ دار کی تعیین اگر اس کی ضرورت ہو، تو جائز ہے، فقہاء حنابلہ کی کتابیں اس کی صراحت کرتی ہیں:

اگر شہر کے دو جانب ہوں اور قاضی کی تعیین پر ایک ہی جانب راضی ہو، دوسری نہیں تو اس مخصوص جانب میں اس کی تعیین درست ہوگی اور دوسری جانب میں باطل ہوگی، اس لئے کہ دو جانبوں کا امتیاز دو شہروں کے امتیاز کی طرح ہے، اگر ولایت درست ہوگی تو اس کے احکام نافذ ہوں گے، اور طوعا وکرہا ولایت کے منعقد

ہونے کی وجہ سے وہ احکام لازم قرار پائیں گے (المغنی ۹/ ۱۰۶، کشاف القناع ۶/ ۲۸۸)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم اقلیتیں بے ترتیبی اور بے تنظیمی کی زندگی گزار رہی ہیں، اکثر و بیشتر مراکز اور اسلامی مجالس جو کہ دعوتی مراکز ہیں، انتہائی قابل احترام ہونے کے باوجود فقہاء سے تقریبا خالی ہیں، اور اگر ہیں بھی تو وہ صرف مسلمانوں کے عمومی مسائل میں جواب دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جبکہ فسخ و تفریق جیسے مسائل میں فیصلہ کے لئے مسلم اقلیتوں کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی ہیں، اس لئے ہمارا مشورہ ہے:

مسلمانوں کو اپنے معاملات کو منظم رکھنے کی اہمیت کی طرف اور اپنے عمومی مسائل کے ذمہ دار کے طور پر کسی بابصیرت دینی شخصیت کے اختیار و انتخاب کی طرف متوجہ کیا جائے، وہ ذمہ دار حسب ضرورت ایک قاضی یا ایک سے زیادہ قاضیوں کو مذاہب اربعہ کی کتب میں مذکور نصوص کے مطابق مقرر کرے۔

مسلمانوں کے عائلی قوانین کی حفاظت اور دینی تشخص کے دفاع کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کے قائم کردہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تجربہ کا جائزہ لیا جائے۔

مختلف ملکوں میں جس قدر بھی آزادی حاصل ہو اس میں رہتے ہوئے قاضیوں کی تعیین و فصل خصومات کی عملی تطبیق کے لئے ہندوستان کے بعض صوبوں میں قائم امارت شرعیہ کے تجربہ سے استفادہ کیا جائے۔

اور ان ممالک میں جو ڈیموکریسی کے منہج پر ہیں، اور سیاسی سرگرمیوں اور پارٹیوں کی تشکیل پر کوئی پابندی نہیں رکھتی ہیں، مسلم فقہاء پر واجب ہے کہ ایک شرعی رہنما ادارہ قائم کریں جو سیاست شرعیہ کی معرفت اور اس میں اختصاص رکھتی ہو تا کہ وہ انتخابات و رائے دہندگی کے تعلق سے مسلمانوں کی رہنمائی کرے، مسلمانوں کی ہمدرد پارٹیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے شرعی حدود و ضوابط متعین کرے، اور غیر مسلم اقوام کے ساتھ پرامن بقائے باہم کے اصول طے کرے، تا کہ موقع پرست اہل سیاست کے درمیان آ کر یہ اہم کام بربادی کا شکار نہ ہو جائے، مسلمان اپنے مصالح و مفاد کے لئے ایک پلڑے کو دوسرے پر بھاری کر دینے پر قادر ہوں، انہیں اتنا رسوخ حاصل ہو کہ درپیش خطرات اور نقصانات کا ازالہ کر سکیں اور حالات کو وہ زیادہ سے زیادہ اپنے قابو میں کر سکیں یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ جائے۔

اخیر میں کویت کی وزارت اوقاف و شؤون اسلامیہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نے اس بامقصد فقہی سمینار میں شرکت کا موقع فراہم کیا، وزارت نے اسلامک فقہ اکیڈمی کے ساتھ آغاز سے ہی بہترین تعاون کیا ہے، اللہ تعالی اس کے ذمہ داروں کو جزائے خیر دے، جن میں سرفہرست عزت مآب وزیر اوقاف و شؤون اسلامیہ جناب ڈاکٹر عبداللہ معتوق المعتوق اور وزارت اوقاف کے وکیل جناب عادل عبداللہ الفلاح ہیں، اللہ تعالی کویت کو ہر قسم کے شر اور برائی سے محفوظ رکھے۔

✦✦✦

غیر مسلم ممالک کی سیاست میں

مسلمانوں کی شرکت اور اس کے شرعی احکام

ڈاکٹر نور الدین الخادمی (تونس)

تمہید:

"غیر مسلم ممالک کی سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور اس کے شرعی احکام" کی بحث بالکل نئی اور تازہ بحث ہے، جو غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کو پیش آنے والے ایک بالکل نئے مسئلے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت پیش آیا جب ان غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کی تعداد دن بہ دن روز افزوں ہوتی گئی اور زندگی کے مختلف میدانوں میں ان کی موجودگی، فعالیت اور اثر و رسوخ میں نمایاں اضافہ سامنے آیا۔ اس نئے پیش آمدہ مسئلے نے کئی ایک سوالات کھڑے کیے۔ جو اس کی قانونی حیثیت اور اسلامی اصول و احکام اور مقاصد و اقدار سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس لیے پیش آمدہ مسئلے کے تئیں جو آراء و فتاوی موجود ہیں وہ بنیادی طور پر دو بڑے اور متضاد رجحانات کے درمیان بٹے ہوئے ہیں: ان میں سے ایک رجحان جواز کا اور دوسرا اس کے ممنوع و ناجائز ہونے کا ہے۔ دونوں رجحان رکھنے والی جماعتوں میں سے ہر ایک اپنے موقف کی تائید اور دوسروں کے موقف کی تردید کے لیے اپنے پاس دلائل و براہین رکھتی ہے۔

میں یہاں ان تمام آراء اور دلائل کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنا نہیں چاہتا، اس لیے کہ وہ معروف و مشہور ہیں اور متقدمین کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ان کا تذکرہ موجود ہے۔ تاہم ان میں سے بعض کو میں اس مقالے کی آئندہ سطور میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا، اس مقدمے میں بنیادی طور پر میرا مقصد تاکید و وضاحت کے ساتھ یہ بتانا ہے کہ یہ مسئلہ خصوصی اہمیت کا حامل اور موجودہ ترقی یافتہ زمانے کی پیداوار ہے۔ مزید یہ کہ یہ بہت سے مسلمانوں، بالخصوص ایسے مسلمان کفار کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں، ان کی اہم دینی ضرورت ہے۔

بنابریں اس مسئلے کے تعلق سے فقہی احکام و ضوابط کو عوام کے سامنے لانے کی کوشش نہایت درجہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے غیر مسلم ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کی ان کے معاملات کی توضیح، ان ملکوں میں ان کے وجود کے استحکام اور ان کی زندگی کے کارواں کو صحیح رخ دینے میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ اجتہادی منہج کی فعالیت اور فقہی اداروں اور اکیڈمیوں کی قوت و توانائی بھی اس سے کھل کر سامنے آتی ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام کی اس طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی اہلیت، اس کے احکامات و تعلیمات کے دائمی اور آخری ہونے کے اثبات میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس بنا پر اسلامک فقہ اکیڈمی آف انڈیا نے اس مسئلے اور اس طرح کے دیگر بہت سے نئے مسائل پر غور و تحقیق کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اور علمائے راسخین اور چیدہ اسکالرس کی آرا و مواقف کی روشنی میں ماضی میں منعقد ہونے والی اپنی علمی نشستوں اور فقہی کانفرنسوں میں ان پر بحث بھی کی ہے اور مستقبل میں بھی وہ اس کا ارادہ رکھتی ہے، چنانچہ اس موقع پر میں اس کانفرنس میں حصہ لینے اور شریک ہونے والے علما حضرات کا شکر گزار ہوں اور فقہ اکیڈمی اور اس کے ذمہ داروں، خصوصاً اکیڈمی کے جنرل سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا، ان کی دعوت کریمانہ اور بھرپور استقبال و تواضع کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اسی طرح ہمیں اپنے مرحوم بھائی اور شیخ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (اللہ ان پر رحم فرمائے اور انہیں شہدا اور صالحین کے جوار میں جگہ عنایت فرمائے) کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اخیر میں میں اپنے محترم بھائیوں سے ان غلطیوں اور کمیوں کے لیے معذرت کا طالب ہوں جو اس تحریر میں در آئی ہوں۔ اس لیے کہ یہ موضوع حساس اور دماغ سوز ہے اور اس تعلق سے بے نیازی ممکن نہیں کہ کوئی بھی اسکالر یا قاری ہماری صحیح رہنمائی یا ہم سے صادر ہونے والی غلطیوں کی نشان دہی اور تصویب کرے۔ اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے کہ: وفوق کل ذی علم علیم (ہر ذی علم کے اوپر اس سے زیادہ جاننے والا ہے) نیز اللہ تبارک و تعالی کا ارشاد گرامی

ہے: وقل رب زدنی علماً (اور کہہ دیجئے کہ اے رب ہمارے علم میں اضافہ کر دیجئے)۔

غیر مسلم ممالک کی سیاست میں شرکت سے کیا مراد ہے:

غیر مسلم ممالک کی سیاست میں شرکت سے مراد وہاں کی سیاسی سرگرمیاں یا سیاسی عمل انجام دینا، یا سیاست کو عملی سطح پر برتنا ہے، اور اصحاب علم کی تعریف کے مطابق سیاست امور عامہ کی تنظیم اور عوامی زندگی کو ایسا رخ دینے اور اس کا اس طرح بندوبست کرنے کو کہتے ہیں جو انھیں مصالح سے ہم کنار اور مفاسد سے دور کرنے والے ہوں۔ ابن نجیم نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ ایسا فعل ہے جو حکمراں کی طرف سے نظر میں آنے والے کسی فائدے کے لیے کیا جائے۔ خواہ اس تعلق سے کوئی جزئی دلیل پیش نہ کی جاسکے۔ جب کہ ابن عقیلؒ نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ کسی بھی ایسے عمل کو کہتے ہیں کہ جس کے تحت لوگ صلاح اور بہتری سے زیادہ قریب اور شر وفساد سے زیادہ دور ہوسکیں خواہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہ ہو۔ مزید برآں سیاسی شرکت ان تمام وسائل، کیفیات اور حرکت وعمل کو شامل ہے جو سیاست میں شامل یا سرگرم ایک شخص کے ذریعہ انجام پاتا ہے، ان وسائل وکیفیات اور حرکت وعمل میں سے چند یہ ہیں:

- سیاسی پارٹی تشکیل دینا، اس میں شامل ہونا، اسکے لیے اشتہار اور پروپیگنڈہ کرنا، اس کا دفاع کرنا نیز اس کی ذمہ داریاں نبھانا اور اس کے آثار ونتائج کو قبول کرنا۔
- انتخاب میں امیدوار بننا یا بنایا جانا، کنویسنگ کرنا، رائے عامہ کی جانچ پرکھ کرنا اور اس کا جائزہ لینا۔
- کسی دوسری پارٹی کے ساتھ اتحاد (الائنس) قائم کرنا، سیاسی بلاک تشکیل دینا اور سیاسی داؤ پیچ اختیار کرنا۔
- پیش آمدہ مشکلات کا جائزہ لینا اور ان کے حل دریافت کرنا۔
- انتظام وانصرام، حکومت، وزارت اور دستور سے تعلق رکھنے والے کاموں میں حصہ نبھانا۔

غیر مسلم ممالک کی سیاست میں شرکت کی اوصاف وخصوصیات میں سے ایک بات یہ ہے کہ اس کا تعلق غیر اسلامی ماحول سے ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ شرکت اسلامی اصول وقواعد کے ماتحت اور ان کے مطابق نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایسی چیزوں کی پابند اور ان سے جڑی ہوتی ہے جو زیادہ تر حالات میں اسلام کی مخالف اور اس کے متناقض ہوتی ہے۔ اس لیے سیاست میں شرکت کا یہ عمل عام معنوں میں اس طرح کا صرف ایک سادہ سیاسی عمل ہی نہیں ہوتا جس کے تحت پارٹیوں سے رابطہ وتعلق، پروپیگنڈے کا نظم، انتخابی مہم کے لیے ضروری اخراجات کی فراہمی جیسی چیزیں آتی ہیں، بلکہ اس کے تحت وہ تمام محرکات اور سرگرمیاں آتی ہیں جو ان پارٹیوں اور جماعتوں کی حمایت وپشت پناہی پر مبنی اور اسلام کے مخالف اور معارض ہوتی ہیں۔ ایسے میں اس سوال کی حیرتناکی اور پیچیدگی بڑھ جاتی ہے اور اس کا جواب بھی پیچ در پیچ اور شاخ در شاخ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے میں نے یہ بات کہی تھی کہ یہ مسئلہ اپنی دشواری اور پیچیدگی میں غایت درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اس مسئلے کے تعلق سے صرف جزئی دلیل، نص واحد اور ظاہری اور لفظی توجیہ ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر اجتہادی غور وفکر کی نگاہ ڈالی جائے، جس میں عمومی سطح پر دلائل کی رعایت اور بڑے اور بنیادی اصول وقواعد اور معتبر مقاصد شریعت کی رعایت شامل ہو۔

غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں سے کیا مراد ہے:

غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں سے مراد ایسے مسلمان ہیں جو ان ممالک میں بستے ہوں جو مسلمانوں کے نہ ہوں، یعنی مغربی ممالک اور بعض مشرقی ممالک جیسے چین، جاپان، متحدہ روس وغیرہ۔

ان مسلمانوں کی ایسے ملکوں میں بسنے والی اقلیت، گروپ یا کمیونٹی کی حیثیت سے شناخت کی جاتی ہے۔ ان کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جس کی اصل انہی ممالک سے وابستہ ہے جیسے یورپی، امریکی، روسی، چینی یا کناڈائی اصل یا اور یجن رکھنے والے مسلمان۔ دوسری قسم ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جو مسلم ممالک سے ان غیر مسلم ممالک میں روزگار، تعلیم، شادی بیاہ یا اسی طرح کے کسی اور سبب سے آکر مقیم ہوگئی ہو۔ ان دونوں قسموں کو اختصار کے ساتھ دیسی یا مقامی مسلمان اور مقیم یا باہر سے آئے ہوئے مسلمان کے طور پر جانا جاتا ہے۔

ان مسلمانوں کو زندگی کی متعدد مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے جن میں بعض سیاسی مشکلات بھی ہیں جیسے: ان ممالک میں پائی جانے والی سیاسی جماعتوں، قانون، نظام، سیاسی اور جماعتی تجربات کے ساتھ تعامل کے تعلق سے ان کا موقف کیا متعین ہونا چاہیے؟ یہ مسئلہ اس صورت میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ سیاسی پارٹیاں،

جماعتیں اور نظام و قانون کلی یا جزئی طور پر اسلامی تعلیمات اور اس کے نظام اور ڈھانچے سے متعارض ہوتے ہیں۔

علمائے متقدمین:

علمائے متقدمین نے صراحت کے ساتھ اس مسئلے سے تعرض نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ ان کے وقت میں اس شکل میں موجود نہیں تھا جس شکل میں آج موجود نظر آ رہا ہے، غیر مسلم ممالک میں سیاست، سیاسی پارٹی اور انتخاب کا عمل نیا ہے۔ وہ ادھر کی بعض دہائیوں میں پیدا ہوا اور فروغ پایا ہے۔ نیز خود مسلمانوں کی طرف سے سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کا عمل بھی پچھلے کچھ عرصوں میں ابھر کر سامنے آیا، جب مسلمانوں نے ایسے ممالک کا رخ کیا اور وہاں ان کی تعداد میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہونے لگا۔

تاہم ان متقدمین علما و فقہا نے ایسے مسائل کے بارے میں کلام کیا ہے جو سیاسی عمل میں شرکت، اس کے بارے میں فیصلہ دینے اور اس کو اصول و قواعد کی روشنی میں منضبط کرنے کے تعلق سے فقہی مرجع اور فریم ورک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مسائل میں سے چند یہ ہیں: ولاء اور برائ، تقیہ، غیر مسلموں سے استعانت، ایک مسلمان کا فاجر و فاسق شخص اور کافر بادشاہ کی طرف سے عطا کردہ منصب پر فائز ہونے کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں علما کے دو فریق ہیں: ایک فریق شروط و قیود کے ساتھ اس کی اجازت کا قائل ہے، اس قبیل کے علما میں ابن عطیہ، الماوردی، الکیا الهراسی، القرطبی، ابن تیمیہ، ال آلوسی کا نام آتا ہے۔ دوسرا فریق وہ ہے جو اس کی ممانعت کرتا ہے اور اس کے عدم جواز کا قائل ہے۔

ان دونوں رجحانات اور مواقف کی بنیادیں:

علمائے متقدمین کے یہ دونوں رجحانات علمائے معاصرین کے سامنے ہیں، ان دونوں میں سے ہر ایک کے مؤیدین اور اس کے اپنے اصول و قواعد ہیں۔ میں ایجاز و اختصار کے ساتھ یہاں ان اصول و قواعد کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ جہاں تک متعلقہ موقف کے حاملین اور ان کے رضا کار و مؤیدین کی بات ہے تو میرے خیال میں اس کے ذکر کا کوئی بڑا فائدہ نہیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ رسائل و مجلات، کتابچے، فکری سیاسی اور جماعتی لٹریچر وغیرہ مین موجود ہیں، وہاں انھیں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلا رجحان-غیر مسلم ممالک کی سیاست میں شرکت اور اس کی اثر اندازی:

اس رجحان کے حاملین کا نظریہ یہ ہے کہ مغربی ممالک میں مسلمانوں کی طرف سے سیاسی عمل میں شرکت میں کوئی حرج نہیں۔ ان کے اپنے اس نظریے کے حق میں متعدد دلائل ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

- بہت سے ایسے شرعی نصوص ہیں جن سے غیر مسلم ملکوں میں ولایت عامہ کی ذمہ داری نبھانے کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔ جیسے:

ایک غیر مسلم ملک اور ماحول میں یوسف علیہ السلام کا ولایت طلب کرنا، نجاشی جیسے صالح شخص کا ایسے نظام کے تحت حکمرانی کرنا وغیرہ۔ دعوت الی اللہ، اصلاح و رہنمائی، تربیت اور تعمیری سطح پر ماحول پر اثر اندازی کو حقیقی اور عملی شکل دینا، اس لیے کہ سیاسی زندگی میں اہل مغرب کے ساتھ اشتراک، ان کے ساتھ ربط قائم کرنے، اسلام اور اسلامی اقدار و اخلاق سے انھیں روشناس کرانے، انھیں اسلام کے حلقۂ بگوش کرنے اور مسلمانوں کی محدودیت، ان کے اپنے وجود میں سمٹے رہنے اور سماجی مقاطعہ جیسی صورت حال کو بدلنے کا موقع ملتا ہے، جو حقیقت میں اسلامی وجود کو حاشیے پر لا کھڑا کرتا اور حقیقی کردار سے دور تر کر دیتا ہے۔

- مسلمانوں کے مسائل کا حل اور مغربی ممالک میں ان کی اقامت کو آسان اور سہل بنانا اور انھیں ایسی چیزوں سے ہم کنار کرنا جو ان کے لیے نفع بخش اور مفید ہوں۔ چنانچہ ظاہری بات ہے کہ ان ممالک کے سیاسی عمل میں شرکت کے نتیجے میں بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں، جو مسلمانوں کے حق میں ہیں اور وہ ان کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

- اس سیاسی شرکت کے ذریعہ ان ممالک میں مقیم مسلمانوں کی اعانت اس کا طریقہ وہ ہے جسے آج کل پریشر گروپ، سیاسی بلاک اور لابیز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں بسنے والے مسلمان اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ وہ ان ممالک کو اس بات پر مجبور یا مطمئن کر سکیں کہ وہ وہاں کی مسلم کمیونٹی یا دنیا کے دیگر خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کو درپیش مسائل کے تعلق سے مثبت رویہ اختیار کریں۔

- شریعت کی عمومی خصوصیات (صلاحیت، واقعیت، توازن، ہمہ گیری اور دوامیت) پر زور دینا اور ان کو فعال و متحرک بنانا، اس لیے ہے کہ سیاسی

شرکت کے عمل کی شریعت کی بنیاد پر تشکیل اور صورت گری اس بات کی تائید و اثبات کا اہم ذریعہ ہو سکتی ہے کہ اسلامی شریعت مغرب اور دنیا کے دوسرے خطوں کے لیے بھی مناسب اور مفید ہے۔ اس میں موجودہ حالات اور زمانے کی رعایت شامل ہے، اور ان موجودہ حالات اور زمانے کا تعلق دنیا کے تمام ممالک اور عوام سے ہے۔ اسی طرح وہ تمام احوال وظروف کے ساتھ تعامل کرتی ہے، جس میں مغربی اور دوسرے ایسے غیر اسلامی ممالک بھی شامل ہیں جن کے احوال اور سیاسی، قانونی، انتخابی نظام اور میدان کار کے تعلق سے شرعی حیثیت سے کلام کیا جاسکتا ہے۔

- موجودہ صورت حال کی رعایت اور عرف وعادات کے اعتبار کے اصول پر عمل آوری فقہاء، مجتہدین، قضاۃ، مصلحین، دعاۃ اور مربین اور دوسرے لوگوں نے اس اصول کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا ہے۔ انھوں نے افتاء، اجتہاد، قضا نیز اصلاح وتربیت اور دینی رہنمائی کے عمل میں اسے ناگزیر شرط کا درجہ دیا ہے۔ جہاں ان علما کے مطابق اگر غیر مسلم ممالک کی سیاست میں مسلمان شریک نہ ہوں تو یہ موجودہ تقاضے سے تجاہل برتنے اور ایک ضروری شرط سے عمداً چشم پوشی اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔

دوسرا رجحان- سیاسی عمل میں شرکت سے ممانعت اور لوگوں کو اس سے دور رہنے کی ترغیب:

اس رجحان کے حاملین غیر مسلم ممالک میں موجود مسلمانوں کو وہاں کے سیاسی عمل میں شرکت سے لازمی طور پر روکتے اور منع کرتے ہیں۔ اس کے لیے ان کے پاس متعدد دلائل ہیں:

- بہت سی وہ نصوص جو ایسے لوگوں کو جو اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق اپنے فیصلے نہیں کرتے کفر وفسوق اور ظلم سے متصف کرتی ہیں۔ جن کے مطابق، حکم صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ وہ شریعت خداوندی کے علاوہ کسی اور شریعت کو اپنا حکم بنانے، ظالمین کی طرف جھکنے اور ان کے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار کرنے نیز کفار سے استعانت کرنے جیسے عمل سے روکتی ہیں۔
- ولاء اور براء اور الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کا نیز یہ اصول کہ مسلمانوں کی اعانت کی جائے اور کفار کے ساتھ معاندت کا رویہ رکھا جائے۔ اس رجحان کے حاملین کی نظر میں غیر مسلم ممالک کے سیاسی عمل میں مسلمانوں کی شرکت اس اصول کے سراسر خلاف ہے اور وہ کفار وملحدین سے دوستی اور ان کے ساتھ تعاون واشتراک کے عمل میں مسلمانوں کو مشغول کرنے والا اور خود مسلمانوں سے دور کر دینے والا عمل ہے۔ بلکہ بسا اوقات کفار کی طرف سے مسلمانوں کے تئیں دشمنی کے رویے پر خاموشی اختیار کیے جانے، اور مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمنوں کو مدد دینے کے نتیجے میں مسلمانوں کا عمل خود مسلمانوں کے خلاف اور ان کے حق میں نقصان دہ ہوتا ہے۔ اور اللہ کی شریعت میں ان تمام چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصول، چناں چہ سیاسی شرکت اسلام کے منہج واقدار اور اس کے احکام کے مخالف نظامہائے سیاست کا اعتراف کرنے اور انھیں اعتبار بخشنے نیز ان کے فساد انگیز پہلوؤں اور قبیح پالیسیوں سے چشم پوشی اختیار کرنے کے مترادف ہے۔ اور یہ تمام چیزیں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے قاعدے کے سراسر خلاف ہیں، اس لیے کہ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں یہ اصول معروف کا اقرار کرنے اور لوگوں کو اس کی دعوت دینے اور منکر کا انکار کرنے اور اس سے لوگوں کو باز رکھنے نیز اس منکر کو دور یا کم کرنے پر مبنی ہے۔
- یہ اصول کہ مسلمانوں کی شخصیت کی ایسی تشکیل کی جانی چاہیے جو دوسروں کے مقابلے میں منفرد خوبیوں اور امتیازات سے متصف ہو، اس بنا پر دیکھا جائے تو سیاسی شرکت ان کی شخصیت کے ایسے خط وخال کے ضیاع کا باعث بنتی ہے، کیونکہ وہ اس عمل کے نتیجے میں ایک بالکل دوسری اور الگ دنیا میں گھل مل جاتی اور موجودہ سیاسی صورت حال کی تابع اور ماتحت ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر بھی اپنے رفقا کی تقلید اور سیاسی نعروں اور شعارات کے پیچھے سرپٹ بھاگنے کا تقلیدی مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔
- سیاسی شرکت کا فائدے سے خالی ہونے کا اصول، چناں چہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اس کے نتیجے میں لوگوں کا مال، وقت اور کوشش یوں ہی بے کار ضائع جاتی ہے، اور اس کا کوئی قابل ذکر فائدہ سامنے نہیں آتا۔ اس کی حقیقت اس وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب سیاسی عمل میں شریک مسلمان اس بات کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ دوسری غیر اسلامی جماعتوں بالخصوص مغربی ممالک کی سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں ان کی مالی، تنظیمی، ابلاغی یا تقنیاتی قوت کس قدر کم ہے۔

غیر مسلم ممالک کی سیاست میں شرکت کے فقہی احکام:

● ان دونوں رجحانات اور روایوں کو پیش نظر رکھ کر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے تعلق سے کوئی متعین فقہی رائے اختیار کی جائے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب کہ اس مسئلے کو تمام شرعی قواعد وضوابط اور مقاصد شریعت کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔

یہ عمل اس رائے کو سامنے لانے میں موزوں فریم ورک کی حیثیت رکھتی ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ اس مسئلہ کا تعلق ان اجتہادی مسائل سے ہے جن کے تعلق سے صریح اور واضح نصوص موجود نہیں ہے۔ اسی طرح وہ مختلف فیہ مسائل میں سے ایک ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور اس کے متعلقات ایک دوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے ہیں، جس کا سبب اس کے دائرے اور آثار ونتائج اور دوسری چیزوں کا مختلف ہونا ہے، ان آثار و نتائج کو سامنے رکھ کر اس سلسلے میں گفتگو کرنا معقول اور مناسب فقہی احکام کے استنباط میں مددگار ہوگا۔

اس بنا پر سیاسی شرکت کے دائرے کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ فقہی احکام کا اسی پر دارو مدار ہے۔ بہرحال اس تعلق سے سب سے پہلے یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ مغربی ممالک کے سیاسی عمل میں شرکت کے ممکنہ میدانات کیا ہیں؟

غیر مسلم ممالک کے سیاسی عمل میں شرکت کے میدانات:

سیاسی عمل میں شرکت خود سیاسی عمل کے دائرے، ملک اور اس کے سیاسی نظام اور اس کے اپنے سیاسی وثقافتی ماحول کے مختلف اور گونا گوں ہونے کی بنا پر مختلف اور گونا گوں ہوتا ہے۔ ان میدانوں میں سے چند یہ ہیں:

● سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی تشکیل کا میدان یا دائرہ کار۔ ● غیر اسلامی پارٹیوں اور تنظیموں کے ساتھ تعامل کا میدان یا دائرہ کار۔

سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی تشکیل کا میدان:

غیر مسلم ممالک خصوصاً مغربی ممالک میں نافذ ملکی قانون کے تحت وہاں بسنے والے مسلمانوں کے لیے ایسی سیاسی پارٹی، ایسوی ایشن، تنظیم، یا قانونی ادارے کی تشکیل کے ذریعہ سیاسی زندگی میں شرکت اور حصہ داری ممکن ہوگئی ہے، جن کے ذریعہ پُرامن اور قانونی طور پر وہ اپنے آرا وافکار کو دوسروں تک پہنچا سکیں، اپنے حقوق ومطالبات حاصل کرسکیں، نیز اپنے خیالات کی نشرواشاعت کرسکیں اور لوگوں کو ان کی طرف بلاسکیں۔

سیاسی پارٹی اور سیاسی تنظیم کی تشکیل کے دائرے کا فقہی حکم:

اس عمل سے متعلق حکم کی تعیین وتحدید، اس کی نوعیت ومزاج اور اس کے اہداف ونتائج کی بنیاد پر ہوتی ہے، چناں چہ اگر یہ عمل نافع اور مفید ہو تو اسے اپنانے اور انجام دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اگر یہ عمل مسلمانوں کے حق میں نمایاں فوائد کا باعث ہوں اس کی وجہ سے ان ممالک میں ان کے وجود کو تقویت ملے، ان کی اجتماعیت میں مضبوطی اور دینی صورت حال کو پائیدار بنانے میں مددملتی ہو تو اس صورت میں اسے عمومی تاکید اور وجوب کفائی کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے۔

اس وجوب کفائی کا تعلق انھی لوگوں سے ہوتا ہے جو سیاسی شرکت کے بارے میں نظریہ سازی، منصوبہ بندی، تنظیم وتطبیق وغیرہ کی ذمہ داری انجام دے رہے ہوں، جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کا کام اپنی حیثیت اور کردار کے مطابق اس عمل میں ہاتھ بٹانا اور اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنا ہے، اور یہ ان قاعدوں پر مبنی ہے کہ ایسی چیز جس کے بغیر واجب کی انجام دہی ممکن نہ ہو تو وہ بھی واجب ہوتی ہے (مالا یتم الواجب الا بہ فھو واجب) اور وسائل کے احکام وہی ہیں جو مقاصد کے احکام ہیں۔ (الوسائل لھا أحکام المقاصد)۔

سیاسی جماعت یا تنظیم کی تشکیل سے متعلق فقہی حکم کے اصول ومقاصد:

یہ حکم متعدد اصول اور مقاصد شریعت سے تعلق رکھتا ہے:

☆ جلب مصالح اور ان کی تکثیر وتکمیل اور دفع مفاسد اور ان کی تقلیل وتخفیف کا اصول، اس بنا پر دیکھا جائے تو سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کی تشکیل، بہت سے مصالح کے حصول اور بہت سے مفاسد کے دفعیہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ ان مصالح میں سے اسلام کے مستقبل اور منفرد وجود کے تحفظ کا عمل ہے۔ نیز سیاست، حقوق، تمدن ومعاشرت اور معاش واقتصاد سے تعلق رکھنے والے ایسے بہت سے فائدے ہیں، جن کا حصول متعلقہ ممالک کے سیاسی وثقافتی نظام میں

شرکت اور عملی سطح پر انھیں برتنے کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔

☆ امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دعوت الی اللہ، حتی المقدور اصلاح ورہنمائی کا ارادہ اور کوشش (إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت- القرآن) کا اصول چنانچہ مسلمانوں کے تحت تشکیل دی گئی سیاسی جماعتیں دعوت الی اللہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے تحت لوگوں کی اصلاح وہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ اسی جماعتوں کے ذریعہ تعمیری پروگرام مرتب کئے جائیں۔ مفید خیالات کی اشاعت کی جائے، لوگوں کے دلوں اور موجودہ حالات وواقعات پر اپنا اثر قائم کرنے والے اعمال واخلاق اور سرگرمیاں اختیار کی جائیں۔ اس طرح سیاست اور قانون کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اس کے نتیجے میں بہت سے مفاسد ورذائل کا خاتمہ اور ان کی جگہ فضائل اور پاکیزہ اقدار کو تحریک اور فروغ دینا ممکن ہوجاتا ہے۔

☆ موالات اور مدد کا اصول۔ اس کے تحت اس طرح کی مسلم سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں بہت سے عربی اور اسلامی قضایا کی نصرت وحمایت میں نہایت نمایاں کردار ادا کرسکتی ہیں جیسے: فلسطین کا مسئلہ، امت کی ترقی اور عروج کا مسئلہ وغیرہ۔ اس ضمن میں صہیونی لابی اور خارجہ سیاست پر ان کے اثر ورسوخ کا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

☆ موجودہ صورت حال کو سامنے رکھ کر اسلامی شریعت کے احکام کے عملی نفاذ کا اصول۔ چناں چہ عمومی سطح پر مسلم عوام اور خصوصی سطح پر علما اور دعاۃ اس کے پابند ہیں کہ وہ موجودہ صورت کو سامنے رکھ کر شرعی احکام وضع کریں اور انھیں زندگی کے میدان میں لائیں۔ اور یہ اس شکل میں ممکن ہے، جس کا تذکرہ علامہ شاطبیؒ نے کیا ہے کہ شارع کے مقاصد میں اطاعت وامتثال کے لیے قانون اسلامی کی توضیح ہے، اس بنا پر یہ بات قطعاً مستبعد نہیں کہ سیاسی عمل میں مسلسل اور مستقل شرکت کے نتیجے میں علم، شریعت اور اس کی پاسداری کے تعلق سے نوع بہ نوع کے سینکڑوں فائدے سامنے آئیں اور کچھ عرصوں اور نسلوں کے بعد اسلامی شریعت کو فیصل بنانے اور اس کے تحت سیاسی نظام کو ترتیب دینے میں اس کا اہم رول ہوسکتا ہے۔ کسے معلوم کہ مغرب کی آئندہ نسلیں اولاً خدا کے فضل وکرم اور اس کے بعد اس وقت مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی اس طرح کی جہد وکاوش کے نتیجے میں ہدایت واستقامت کے راستے پر آجائیں۔

غیر اسلامی پارٹیوں اور تنظیموں کے ساتھ تعامل کا دائرہ اور میدان:

یہ میدان پہلے میدان سے زیادہ غامض اور پیچیدہ ہے۔ اس لیے کہ اس میں کم از کم تنظیمی، انسانی اور فکری آزادی وخودمختاری کو پیش نگاہ نہیں رکھا جاتا، تقریباً یہی حال پہلے دائرے اور میدان کا ہے، یعنی اس عمل میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ باہم مختلط ہوتے ہیں۔ دونوں ہی ایسی سیاسی پارٹی اور تنظیم میں شریک کار ہوتے ہیں جو غیر اسلامی اساس پر قائم ہوتی ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کس حد تک غیر اسلامی افکار واصول کی تائید وحمایت کرسکتا ہے؟ کس حد تک وہ کسی غیر مسلم کو انتخابی امیدوار کی شکل میں چن سکتا ہے اور لبرل، نیشنلسٹ یا عیسائی طریقۂ کار کو اختیار کرسکتا ہے۔ اس دائرہ کار سے متعلق حکم کی تعیین، اس کے استعمال ونتائج، اصول ومقاصد شریعت اور شرعی محاکے کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے ساتھ تعامل کا فقہی حکم:

اس دائرۂ کار سے متعلق فقہی حکم اس کے اہداف ونتائج یعنی ان کے تحت مرتب ہونے والے تمام مصالح ومنافع اور مفاسد ونقصانات کی روشنی میں طے پاتا ہے۔ چناں چہ اگر یہ تعامل مسلمانوں کے حق میں غالب اور جائز منافع وفوائد کو شامل ہو تو ان کے حصول اور انھیں عمل میں لانے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر مفاسد مصالح وفوائد پر غالب ہوں یا سیاست، دین اور تہذیب کے تعلق سے ان کا نقصان فائدے سے بڑھ کر ہو تو اسے بلاشبہ ترک کردیا جائے گا، اور اس کا متبادل خیر کی صورت میں تلاش کیا جائے گا اور یہ عمل کبھی مباح اور کبھی فرض کفایہ ہوگا اور اس کی ان دونوں حیثیتوں کا تعلق ان مختلف احوال وظروف اور نتائج وحقائق سے ہے۔ جن پر غور وفکر اور جن کا تتبع اور استقراء کیا جاتا ہے۔

اس لیے ہر سیاسی بلاک یا اسلامی گروپ کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ غور وفکر اور مشورے سے کام لے، تاکہ اس کے لیے یہ عمل جس صورت میں مناسب ہے، اس کا استنباط کرسکے۔

یہ فقہی حکم متعدد معتبر اور ثابت شدہ اصول وضوابط سے تعلق رکھتا ہے اور اس چیز پر مبنی ہے جسے فقہ الموازنات، فقہ الاولویات یا فقہ النوازل وغیرہ سے تعبیر کیا

جاتا ہے۔ اس لیے کہ صرف نصوص کے ظاہر یا متقدمین علما وفقہا کے اقوال پر بھروسہ کرتے ہوئے سیاسی عمل میں شرکت پر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اس لیے کہ، جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا، یہ مسئلہ نئے زمانے کی پیداوار ہے اور اس سلسلے میں کوئی واضح نص وارد نہیں ہوئی ہے۔

اس حکم کے شرعی اصول ومقاصد:

یہ حکم مختلف اصول اور مقاصد شریعت کی رعایت پر مبنی ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

● جلب مصالح یا ان کی تکثیر اور دفع مفاسد یا ان کی تقلیل۔ اس اصول کے مطابق، شریعت اسلامی کا مقصود انسان کے مصالح کو وجود میں لانا اور حاصل کرنا ہے۔ اگر یہ مشکل ہو تو زیادہ سے زیادہ اس کے حصول کی کوشش وکاوش کی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر کل کا وقوع مشکل ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے بڑے یا چھوٹے حصے کو اس بنا پر ترک کر دیا جائے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: ''جس چیز کا مکمل حصول ممکن نہ ہو تو اس کے اکثر حصے کے حصول کو ترک نہیں کیا جاتا'' (مالا یدرک کلہ لایترک جلہ) ٹھیک اسی طرح شریعت کا مقصود مفاسد اور شر کا ازالہ ہے، تاہم اگر پورے طور پر شرور ومفاسد کا ازالہ دشوار ہو تو یہ بھی کم نہیں کہ ان کے غالب اور اکثر حصے یا بعض حصے کا ازالہ ہو جائے۔

جلب مصلحت اور دفع مضرت کا یہ قاعدہ زیر نظر مسئلے کے تعلق سے فقہی حکم کی تحدید وتعیین میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے، چنانچہ غیر مسلم ممالک کے سیاسی عمل میں مسلمانوں کی شرکت سے نہایت بڑے پیمانے پر نہیں تو کم از کم چھوٹے پیمانے پر ہی سہی فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں، ان فائدوں میں مسلمانوں کا اپنے سیاسی، دستوری اور قانونی وجود کو مضبوط کرنا شامل ہے اور اس کا زندگی اور تمدن ومعاشرت سے تعلق رکھنے والے دوسرے اہم معاملات پر خوش گوار اثر مرتب ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ اس صورت میں سامنے آتا ہے کہ آدمی سیاسی عمل میں شرکت کے ذریعہ عملی طور پر معاشرے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے اور انھیں کفر والحاد سے نکال کر اسلام کے حلقہ بگوش کرنے کے عمل میں خاصی مدد ملتی ہے۔

اسی طرح اس کے ذریعہ بہت یا چند مفاسد کو دور کرنے کا موقع ملتا ہے، جیسے دینی واجبات کی ادائیگی سے محرومی، حقوق مدنیت کی سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک ہونے کی محرومی۔ اسی طرح ملک سے بھگا یا نکال دینا، مسلمانوں کو سیاست کا آلہ کار بنا کر ان پر یہ الزام لگانا کہ وہ اپنے آپ میں سمٹے رہنے والے، علاحدگی پسند اور غلو پسند لوگ ہیں، اور وہ اپنے دلوں میں دوسری تہذیبوں کے تئیں بغض وعداوت رکھتے ہیں۔

● دو شر یا مفاسد کے تعارض کے وقت ان میں سے چھوٹے کا ارتکاب اور بڑے سے اجتناب کیا جاتا ہے، اور قاعدے کے مطابق، زیادہ شدید اور سخت ضرر کو چھوٹے اور ہلکے ضرر سے زائل کیا جاتا اور اسے اختیار کر لیا جاتا ہے۔ سیاسی عمل میں شرکت کے اس مسئلے میں دو طرح کے شر یا مفاسد کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو سیاست میں شرکت کی بنیاد پر سامنے آتا ہے، جیسے اپنی انفرادیت اور شخصی امتیاز کو کھو دینا، ولاء اور براء کے اصول کو توڑنا، نیز امت کے مقابلے میں ان کے دشمنوں کی اعانت وغیرہ۔ دوسرا شر وہ ہے جو سیاسی عمل میں عدم شرکت کی بنیاد پر سامنے آتا ہے۔ جیسے مختلف حقوق سے محرومی، دعوت واصلاح اور اپنے وجود کو متعلقہ ممالک میں مستحکم اور پائیدار بنانے کے مواقع کا ہاتھ سے نکل جانا وغیرہ۔ یہ دونوں مفاسد ایک دوسرے سے متعارض ہیں۔ ایسے میں ضروری ہوگا کہ ان دونوں میں سے جو پہلو غالب ہو اسے ترجیح دی جائے۔ یعنی جو شر یا مفسدہ زیادہ بڑا، زیادہ دیر تک رہنے والا اور پھیلا ہوا ہو، اسے دور کیا جانا چاہیے اور دوسرے شر یا مفسدے کو گوارہ کرنا چاہیے اور ایسا کرنا مقاصد شریعت کے اسی مذکورہ اہم اور عظیم الشان قاعدے نیز قاعدہ العبرۃ للغالب (غالب پہلو کا اعتبار کیا جاتا ہے) اور قاعدہ دنیا میں مصالح ومفاسد کا ہونا ان کا غالب اور غیر خالص ہونا ہے، پر مبنی ہے۔

مصالح اور مفاسد کے تعلق سے اصلاً چیز کا اعتبار کیا جاتا ہے، وہ ان کے غالب اور غیر خالص ہونے کی بنیاد پر ہے۔ یعنی شرعی مصلحت بعض نقصانات سے خالی نہیں ہوتی، لیکن یہ نقصان یا ضرر کم اور تھوڑا ہوتا ہے، اسی طرح شرعی مفسدہ بعض فائدے سے خالی نہیں ہوتا لیکن یہ فائدہ کم اور تھوڑا ہوتا ہے۔ اس کی دلیل شراب اور جوے کے بارے میں فرمان باری تعالی ہے: واثمهما أكبر من نفعهما (اور ان کا گناہ یا نقصان ان کے فائدے سے زیادہ بڑھ کر ہے) اسلامی فقہ میں اس قبیل سے قصاص کی مصلحت ہے۔ قصاص کا منشا جان کا تحفظ ہے (ولكم في القصاص حياة) اس مصلحت کے حصول سے ارتکاب جرم کرنے والے کو ضرر پہنچتا ہے، لیکن یہ ضرر شریعت کی نظر میں ہلکا اور تھوڑا ہے۔ اس بنا پر قصاص سے نہ تو دست بردار ہوا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے ترک کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ اصل اعتبار غالب اور مصلحت غالبہ کا ہے۔ اس لیے اس میں موجود ضرر سے چشم پوشی اختیار کی جائے گی، کیونکہ جان کا تحفظ قتل کے مجرم کو قصاص کی تکلیف سے بچا کر آرام پہنچانے پر مقدم ہے۔ اس لیے کہ قصاص کی یہ تکلیف واذیت کم ہے اور مجرم کو اس سے بچانا اہم فائدے اور مصلحت کو ضائع کرنا اور اس کی جگہ

بڑے مفسدے اور ضرر کو مول لینا ہے۔ یہ بڑا مفسدہ یا ضرر انسانی جان کا غیر محفوظ ہونا اور اسے قتل وتخریب اور ہلاکت و بربادی سے دو چار کرنا ہے۔

غیر مسلم ممالک کی سیاست میں شریک ہونے والے مسلمانوں کو بہت سے اہم فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، تاہم یہ عمل کسی قدر ضرر اور فساد سے مطلقاً خالی نہیں ہے، جیسے ایسے فکری اور سیاسی اصول سے متعلق خاموشی اختیار کر لینا جو سراسر اسلامی شریعت کے مخالف اور اس سے متصادم ہیں، جب کہ انھی پر اس سیاسی جماعت کی بنیاد قائم ہو جس کے ایڈر اور پروگرام کو مسلمان اپنا امیدوار اور ایشو بناتے ہوں۔ بلاشبہ یہ ضرر اور فساد ہے اور اس لیے وہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں تاہم اس ضرر کا ارتکاب کیا جائے گا تاکہ اس کے ذریعہ اہم فائدے کو حاصل اور بڑی برائی سے بچا جا سکے، اس صورت میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ دل سے اسے برا جانیں اور اسلام کی تعلیمات وہدایات کو اپنے قلوب میں جاگزیں اور گرد وپیش کے ماحول میں زندہ اور پائیدار کرنے کی کوشش کریں۔ لوگوں کے سامنے حق اور باطل کی حقیقت واصلیت کو واشگاف کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح یہ بات بھی ان کے لیے لازم ہوگی کہ ان کی نیت وقصد خالص اللہ کے لیے ہو۔ وہ اس سیاسی شرکت کو اپنی ذاتی تشہیر اور ریا کا ذریعہ نہ بنائیں۔ محض وقتی سیاسی فائدے کے حصول اپنی یا پارٹی کی جیت، مال ودولت اور دنیاوی نعمتوں سے سرفراز ہونے کو اپنا مقصد نہ بنائیں۔ اس کے بجائے انھیں اپنی نیتوں کو خالص اور بے آمیز کرنا چاہیے اور اپنے اس عمل اور کوشش کے اجر کی اللہ سے امید کرنی چاہیے اور زیادہ اور ''بڑے'' حق کی یافت کے لیے ''چھوٹے باطل'' کو گوارہ اور اس پر صبر کرنا چاہیے۔

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ سیاسی عمل میں شرکت کی بنا پر مسلمان چھوٹے فائدے کے حصول کے ساتھ بڑے فساد کے شکار ہو کر رہ جائیں۔ مثلاً شرکت کو لے کر داخلی سطح پر مسلمانوں کے اندر اختلال وانتشار اور فتنے کا پیدا ہونا جس کے نتیجے میں باہمی مخالفت بغض وحسد بلکہ بسا اوقات اس سے آگے بڑھ کر قتل وقتال اور خوں ریزی کی بھی نوبت آ جاتی ہے۔ اس فتنے اور فساد کے ساتھ ناظمین اور ذمہ داروں کو بعض مالی فائدے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ شہرت مل سکتی ہے۔ بعض عہدے اور مرتبے حاصل ہو سکتے ہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ یہ نفع نہایت قلیل اور اس کے مقابلے میں خسارہ زیادہ ہے۔ بہر حال بڑا فائدہ وہ ہے جو اصلاً مسلمانوں کے اتحاد و یک جہتی اور ہم آہنگی کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے، اس لیے ایسی صورت میں اس عمل کو ترک کر دیا جائے گا اور اس میں شمولیت اختیار نہیں کی جائے گی۔ معلوم ہوا کہ اصل اعتبار غالب پہلو کا ہے۔ اور یہ کہ فساد اور شر کو دور اور زائل کیا جائے گا، خواہ وہ بعض بھلائی اور خیر کی طرف لے جانے والی ہو۔

(قل فیهما اثم کبیر ومنافع للناس واثمهما اکبر من نفعهما)۔

● غیر مسلم ممالک دار الدعوۃ ہیں دار الحرب نہیں۔ اس لیے کہ ان ملکوں میں مسلمان ایک معاہدے کے تحت مقیم ہیں، جن پر ان کی جماعت کے لوگوں کی طرف سے دستخط کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس معاہدے میں شامل دفعات اور شرائط کی پابندی کو قبول کیا ہے۔ اس بنا پر ایسے ممالک کو دار الحرب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بجائے وہ ایسا دار ہے جس میں حکمت وموعظت اور حجت وبرہان سے دوسروں کو قائل کرنے نیز ان ممالک میں رائج اصول سیاست ومعاشرت کی رعایت وپاسداری کی بنیاد پر دعوت واصلاح اور اپنے اثرات ونقوش قائم کرنے کے خاصے مواقع ہیں۔ مزید براں ان ممالک میں مسلمانوں کو اپنے دین ومذہب پر عمل کرنے اور بنیادی حقوق کے حصول کی آزادی حاصل ہے۔

غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی سیاسی شرکت کے اصول وضوابط اور ان کے لازمی حدود:

سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے ساتھ تعامل کے دائرہ کار سے متعلق فقہی حکم اپنے اطلاق اور عموم پر نہیں ہے، بلکہ وہ ایسے امور سے وابستہ ہے جو ان کی ضابطہ بندی اور صحیح تشکیل کرتے ہیں۔ حتی کہ وہ مقاصد اور قواعد جن کا تعلق اس حکم سے ہے وہ بھی شرعی، اخلاقی اور انسانی اعتبار سے مطلق قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ ان اصول وضوابط کو سامنے رکھنا، اس سیاسی شرکت کی شرعی واخلاقی خصوصیت کو منظر عام پر لانا اس کی اعلیٰ کامیابی اور فائدے کی ضمانت دیتا ہے، نیز وہ تردد اور تامل کا رویہ رکھنے والوں کو متشفی کرتا اور جو لوگ اس کے قائل ہیں ان کے اطمینان اور جوش وخروش میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے۔

سیاسی عمل میں شرکت کے ضابطے:

● خود شرعی مصلحت کے ضابطے: جیسا کہ ہم سیاسی شرکت کے بارے میں بیان کر چکے ہیں، فقہی احکام کا دار ومدار فائدے کی تحصیل پر ہے۔ خواہ ہم یہ کہیں کہ یہاں مصلحت نام ہے نفع غالب کے حصول اور فسادِ غالب کے نفع وازالے کا اور یہ فائدہ جس کا حصول مقصود ہے وہ منضبط اور مشروط ہے۔ نہ تو وہ عام اور اور مطلق ہے اور نہ ہی ہوائے نفسانی اور تغیر پذیر حالات کے ماتحت اور محکوم ہے۔ ان شرائط اور ضابطوں کی پابندی کی بنیاد پر سیاسی شرکت کا یہ حکم صحیح اور درست قرار پاتا ہے اور سیاسی عمل میں شریک لوگوں کو وہ ہدایت استقامت کی راہ دکھاتا ہے۔

فائدے یا مصلحت کے تعلق سے ضوابط کا خلاصہ:

مصلحت یا فائدے کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے۔ اس لیے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اسے صرف دنیاوی فوائد و منافع پر ہی موقوف رکھا جائے اور اس کی اساس یہ ہے کہ یہ دنیا آخرت کا اعلانیہ ہے اور یہ کہ تمام دینوی اعمال صرف اس لیے وضع کئے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ جنت کی ابدی سعادت حاصل ہو۔ اس بنا پر سیاسی شرکت کو صرف ایسے ہی فقہی فائدوں کے حصول پر جو صرف ہماری لذت و تفریح کی ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں اور قائم و دائم رہنے والے ان آثار ونتائج کے ترک پر موقوف ہونا چاہیے جو اصلاح نفس، زندگی کو کج روی اور انحرافات سے محفوظ رکھنے کی صورت میں سامنے آتے اور خدائی رضا و خوشنودی اور حصول مغفرت و جنت کا ذریعہ بنتے ہیں۔

● مصالح یا فوائد کے ضمن میں عبودیت، اخلاق اور انسانیت کے معنی شامل ہیں۔ چناں چہ غیر مسلم ممالک میں سیاسی شرکت کے عمل کے لیے چاہیے کہ وہ قصد ونیت اور ثواب خواہی نیز شارع کی مراد اور اس کی تعلیمات وہدایات کے اعتبار سے عبودیت کی صفت سے متصف ہو۔ اس طرح اخلاقی فضائل اور انسانی اقدار کی پاسداری کے اعتبار سے اسے اخلاقی اور انسانی عمل کی صفت سے متصف ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ صرف عملی منافع اور مادی استحصال کی بنیادوں پر قائم ہو، جس میں نہ تو دین کی رعایت شامل ہو نہ اخلاق وادب اور احسان وترحم کی۔

● مصالح غالب، راجح، کلی، عام اور قطعی ہوتے ہیں۔ علمائے متقدمین ومتاخرین کے مطابق، مصالح کے غالب اور راجح ہونے سے مراد ان کا غیر خالص یا دوسرے لفظوں میں بعض نقصانات اور تکلیف وفساد کے ساتھ ملا ہوا ہونا ہے۔ اس لیے صحیح معنوں میں خالص مصالح اور خالص مفاسد کا پایا جانا مشکل ہے۔ ان علما نے ذکر کیا ہے کہ مصلحت کے کلی یا عام ہونے سے مراد ان کا زندگی کے متعین دائرہ کار اور متعین زمرے پر موقوف و منحصر نہ ہونا ہے، معاملات پر نظر ڈالنے میں ہمہ گیری کا نقطہ نظر اپنایا جانا چاہیے۔ اسی طرح سیاسی شرکت کے فائدوں کی تحصیل کے سلسلے میں تمام یا اکثر مسلمانوں کی رعایت کی جانی چاہیے، چناں چہ مثال کے طور پر سیاسی شرکت کے فوائد و منافع کو صرف اس عمل سے وابستہ چند لوگوں یا کسی ایک سیاسی و انتخابی جماعت یا گروپ پر منحصر اور موقوف ہونا جائز نہیں ہوگا کہ اس صورت میں وہاں کے دوسرے تمام مسلمان اور مسلم جماعتوں کا نقصان ہو جائے۔

● اسلامی مبادی اور اساسیات سے خارج اور منحرف نہ ہونا، جیسے دین کی کسی ضروری چیز کا انکار کر دینا یا مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کرنا۔ اسی طرح مسلمان کے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ ایک مسلمان کے مقابلے میں کسی کافر کی حمایت ونصرت کرے الا یہ کہ مسلمان ظالم ہو۔ مسلم جماعتوں کے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ دہری وفاداری نبھانے کی کوشش کریں، یعنی وہ علاقے، قوم، وطن یا رشتے اور قرابت کی بنیاد پر کسی کو اہمیت اور وزن دیں۔ اس لیے کہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک ہی میزان اور پیمانہ ہونا چاہیے اور وہ اسلام ہے۔

سیاسی عمل میں شرکت کے لازمی امور:

لازمی امور سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کی رعایت غیر مسلم ممالک کے سیاسی عمل یا سرگرمیوں میں شرکت کے لیے ضروری ہے۔ اور یہ لازمی امور جائز اور مؤثر سیاسی شرکت کو وجود میں لانے والے شروط وضوابط کے ساتھ مل کر مکمل ہوتے ہیں۔

ان لازمی امور میں سے چند یہ ہیں:

● سیاسی عمل میں شرکت کے معاملات ومتعلقات، اس کے فوائد واثرات پر اچھی طرح غور وفکر کرنا تا کہ اس عمل میں مشغول یا اس کو انجام دینے یا اس سے بچے رہنے کے بارے میں کوئی بالکل واضح اور فیصلہ کن موقف تک پہنچا جا سکے۔ یہ موقف یا تو یقین قطعی کے ساتھ ہوگا یا ظن غالب کے ساتھ۔

● ظن کے غالب ہونے کا فقہ واجتہاد اور احکام کے باب میں اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں وہاں مقیم افراد، جماعتوں، پارٹیوں، تنظیموں اور اسلامی مراکز کے مابین شورائیت کی فضا کو استحکام اور فروغ دینا کافی معین ومددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اسلامی ممالک کے علما علمی اکادمیوں، فقہ وتحقیق کے مراکز اور اداروں کے ساتھ باہمی تبادلہ خیال اور مشورہ بھی اس عمل میں اہم معاونانہ کردار ادا کر سکتا ہے۔

● سیاسی عمل میں شرکت کے لیے سب سے زیادہ بابصیرت اور اہلیت واستعداد رکھنے والے فعال شخص کا انتخاب کرنا، اس لیے کہ عمومی سطح پر سیاست میں حصہ لینا اور خاص طور پر جب کہ اس کا تعلق غیر مسلم ممالک سے ہو، نظریہ سازی اور ارادہ وعمل کے اعتبار سے اعلیٰ قدرت وقابلیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ ان تمام چیزوں کا

مقصود یہ ہے کہ ان ممالک کی سیاست میں شرکت کا عمل بہتر طور پر عمل میں آئے اور اس عمل کے ضروری اور مطلوبہ فوائد حاصل کئے جاسکیں اور اس کی مضرتوں سے بچا جاسکے۔

- علمی، انتظامی اور سیاسی ادارہ کی تشکیل جس کا کام یہ ہو کہ وہ سیاست میں شرکت کے عمل کی ضروری تنظیم وترتیب کا فریضہ انجام دے سکے۔ عام مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قائم کر کے انھیں اس تعمیری ومؤثر سیاسی شرکت کے عمل مثبت اور فائدہ بخش ہونے کے بارے میں قائل ومطمئن کر سکے۔
- دعوت اور سیاسی عمل کے تعلق سے مسلم جماعتوں اور ان کے طریقۂ کار کی تنظیم وترتیب کے ذریعہ ان کے تحفظ کا جواز اور یہ جائز اہداف ومقاصد کے حصول کے لیے دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل اور تعاون میں مانع نہیں ہے۔
- اسلامی شریعت کی اصل مقاصدی فقہی روح اور مزاج کی اشاعت وتوسیع۔ معتبر اور مستند اجتہادی، تعلیلی اور مصلحتی علم وثقافت کا پھیلاؤ، نیز لوگوں کے ذہنوں کو اس طور پر تشکیل دینا اور تیار کرنا کہ وہ اس معاصر اجتہادی منہج کو قبول کر سکیں جو موجودہ زمانے اور عرف وعادت، اولویات وترجیحات، فقہ موازنات کی تطبیق، اطلاق وعمومیت اور ظاہری ساخت پر حد سے زیادہ اعتماد سے اجتناب اور معانی ومقاصد کی طرف التفات پر مبنی ہے، اور جس میں اشکال وکیفیات اور ثابت وقطعی کو بھی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیا جاتا۔ تعطیل، جدت کاری اور ترمیم وتبدیلی کو قبول نہیں کیا جاتا۔ علمائے متقدمین نے اس کی صراحت کی ہے کہ شریعت میں مقاصد ومعانی کا اعتبار ہوتا ہے الفاظ اور ان کی ظاہری ساخت کا نہیں۔ احکام کی مشروعیت کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں کی مصالح وفوائد سے ہے۔ زمان ومکان اور احوال کی تبدیلی سے فتوی بدل جاتا ہے۔ زمانے کی تبدیلی سے احکام کے بدل جانے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ان علما نے یہ بھی صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ اسلامی قانون کی دو قسمیں ہیں: ثابت وقطعی اور ظنی وتغیر پذیر، نیز یہ کہ وسائل اور مقاصد کے احکام یکساں ہیں وغیرہ۔۔۔ اس مقاصدی علم وثقافت اور اجتہاد وتعلیل سے متعلق شعور وآگہی کو مسلمانوں میں فروغ دینا، انھیں اسلام کے صحیح فہم سے قریب تر کرنا، اس واقعی اسلامی عمل اور سرگرمی کو وجود میں لاتا ہے جس میں موجودہ دنیا کے مطابق اپنی ذات کی تعمیر اور قوت واستحکام کے حصول کی صلاحیت پائی جائے، اسی طرح اس کے نتیجے میں سیاسی عمل میں شرکت کے تئیں اطمینان وقبولیت اور اس کے فائدوں کے اقرار کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

مصادر ومراجع:

۱- الاجتهاد المقاصدی: نور الدين الخادمی، طبع وزارة الأوقاف والشؤون الاسلاميه، قطر ۱۴۹۹ھ، قطر کے اشاعتی سلسلے ''کتاب الامۃ'' کے تحت یہ کتاب شائع ہوئی (شمارہ ۶۵ / ۶۶)۔

۲- ارشاد الفحول الی تحقيق الحق من علم الأصول: دار المعرفة، بيروت، تاریخ مذکور نہیں۔

۳- اصول الفقه: محمد ابو زهره۔

۴- الذخيرة: شهاب الدين القرافی۔

۵- القواعد الفقهية: الدكتور علی احمد الندوی: دار القلم دمشق چوتھا ایڈیشن ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۸ء۔

۶- قواعد المقری: تحقيق احمد بن عبد الله بن حميد، طبع جامعة ام القری - مکہ مکرمہ۔ تاریخ مذکور نہیں۔

۷- واعد الوسائل فی الشريعة الاسلامية: مصطفى بن كرامة الله مخدوم: دار اشبيليا، رياض پہلا ایڈیشن ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹ء۔

۸- مشاركة المسلم الأمريكي في الحياة السياسية الأمريكية: الدكتور علی محمد الصواء، استاذ فقه مقارن، كلية الشريعة، جامعه اردن، مجلة الشريعة والدراسات الاسلاميه جلد: ۱۷، شمارہ: ۵۱، شوال ۱۴۲۳ھ / دسمبر ۲۰۰۳ء۔

۹- مقاصد الشريعة عند الامام العز بن عبد السلام: الدكتور عمر بن صالح بن عمر: دار النفائس، اردن، پہلا ایڈیشن ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۳ء۔

۱۰- منهج فقه الموازنات في الشريعة الاسلامية: الدكتور عبد المجيد محمد اسماعيل السوسرة: مجلة البحوث الفقهية المعاصرة: شمارہ ۵۱ جلد: ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء۔

۱۱- الموافقات فی اصول الشريعة: ابو اسحاق الشاطبی: دار المعرفة بيروت، لبنان، تاریخ مذکور نہیں۔

غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل

اوران کا شرعی حل

مولانا اختر امام عادل
(جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور، بہار)

۱-الف: جمہوری انتخابات-احکام اور مسائل:

موجودہ دور جس میں مسلمان متعدد ممالک میں اقتدار سے محروم ہیں، اور اقلیتی زندگی گذار رہے ہیں، مسلمانوں کے لئے ان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں متعدد مسائل پیدا ہو گئے ہیں، ان مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ جمہوری ممالک میں انتخابات کا ہے، جہاں کسی ایک قوم، خاندان یا مذہب کی نہیں بلکہ اکثریت کے ووٹ سے کامیاب ہونے والی سیاسی جماعت کی حکومت ہوتی ہے، اور ان انتخابات میں بحیثیت امیدوار اور بحیثیت رائے دہندہ ہر قوم و مذہب کے افراد کو حصہ لینے کی اجازت ہوتی ہے، یعنی گویا یہ پرامن سیاسی مسابقت کا دور ہے اور اس میں جو پیچھے رہ جائے گا وہ بہت سے حقوق و ترقیات سے محروم رہ جائے گا۔

سلف صالحین کی تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حقوق عامہ کے تحفظ کے لئے عہدہ کی طلب اور اس کے لئے تگ و دو ممنوع نہیں ہے، بشرطیکہ اس میں اہلیت موجود ہو، اور اس کے آگے نہ بڑھنے کی صورت میں وہ چیز کسی غلط ہاتھ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

البتہ بہتر یہ ہے کہ خود پرچہ امیدواری داخل نہ کرے بلکہ اس کی طرف سے دوسرے لوگ پرچہ نامزدگی داخل کریں، تاکہ طلب عہدہ کی بنا پر لوگوں کی نگاہ میں متہم نہ ہو۔

رہی یہ بات کہ جمہوری ممالک میں جو پارلیمنٹ وجود میں آتی ہے اس کو اسلامی قانون سے کوئی غرض نہیں ہوتی، اور کبھی وہ ایسا قانون بھی بنا سکتی ہے جو شریعت کے خلاف ہو جبکہ پارلیامنٹ کے تمام اراکین کو ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے۔

یہ صورت حال بظاہر دشوار نظر آتی ہے، لیکن غور کیا جائے تو اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے، اس لئے کہ جمہوری ممالک میں پارلیامنٹ کے اراکین کو ملک کے جس دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے، وہ ملک کا وہ دستور ہے جس پر پورے قانون کی اساس ہے، اور جو اصولی طور پر نا قابل ترمیم مانا جاتا ہے، اور دو تہائی اکثریت سے جن قوانین میں تبدیلی ہوتی ہے ان سے حزب اختلاف کو اختلاف کرنے کا حق ہوتا ہے، اور اگر مان لیا جائے کہ زبردست اکثریت سے دستور میں بھی تبدیلی ممکن ہو تو مخالف اقلیت اظہار اختلاف کا حق رکھتی ہے، اور کم از کم پارلیامنٹ کی سطح تک اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہے، اور اس حد تک اختلاف رائے کے بعد میرے خیال میں متعلقہ ممبران پر حکومت کے اعمال کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

ووٹ کی شرعی حیثیت:

اس موقع پر ووٹ یا حق رائے دہی کی شرعی حیثیت بھی پیش نظر رہنی چاہئے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ووٹ کی تین حیثیتیں متعین کی ہیں:

۱-ایک حیثیت شہادت کی ہے۔

اس لحاظ سے اس پر شہادت کے احکام مرتب ہوں گے اور اصول شہادت کے مطابق جھوٹی شہادت دینا بدترین جرم ہے، اس کو شرک کے ساتھ گناہ کبائر میں شمار کیا گیا ہے (متفق علیہ، نیل الاوطار ۸/ ۵۶۵)۔

۲-ووٹ کی دوسری حیثیت سفارش کی ہے، اس لحاظ سے قرآن نے سفارش کا جو اصول بیان کیا ہے اس کی رعایت ضروری ہوگی۔

۳-ووٹ کی تیسری حیثیت وکالت کی ہے۔

۴-اور میرے نزدیک ایک چوتھی حیثیت رائے اور مشورہ کی بھی ہے، جیسا کہ حق رائے دہی کی اصطلاح سے مترشح ہوتا ہے، یعنی انتخابی کمیشن جس کو ملک کا سربراہ اور اس کے رفقاء کار چننے کا اختیار دیا گیا ہے، وہ سارے ملک کے عوام سے اس بارے میں مشورہ لیتا ہے، اور ان کو اختیار دیتا ہے کہ وہ مختلف امیدوار جو میدان میں موجود ہیں، ان میں سے کسی ایک کے بارے میں اپنی رائے دیں کہ کون شخص ملک کے لئے بحیثیت حاکم یا بحیثیت معاون حکومت زیادہ موزوں ہے؟ اور ووٹرز بیلٹ پیپر پر اپنے حق رائے دہی کا استعمال کرتے ہیں، اور انتخابی بورڈ کو رازدارانہ طور پر اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے مشورہ اور رائے کا جو ضابطہ ہے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا، احادیث میں مشورہ اور رائے کو امانت قرار دیا گیا ہے، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "المستشار مؤتمن" (رواہ الترمذی، مشکوۃ/ ۴۳۰) (یعنی جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہوتا ہے)۔

ب-ووٹ دینے کا حکم:

گویا ووٹ کی شرعی طور پر چار حیثیتیں ممکن ہیں، شہادت، شفاعت، وکالت اور مشورہ۔ شہادت کے نقطہ نظر سے ووٹ دینا واجب ہے اس لئے کہ قرآن نے سچی شہادت کو لازم قرار دیا ہے۔

"کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط" (سورۂ مائدہ/ ۸)، دوسری جگہ ارشاد ہے: "کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ" (سورۂ نساء/ ۱۳۵)۔

ووٹ کی چار حیثیتوں میں سے ایک حیثیت کے لحاظ سے ووٹ دینا واجب معلوم ہوتا ہے، خواہ اس کے ثمرات کچھ بھی ہوں، اور باقی تین حیثیت کے لحاظ سے اصلاً ووٹ دینا واجب نہیں ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ مستحب ہے، لیکن ثمرات کے لحاظ سے اس کی اہمیت بڑھ سکتی ہے، یعنی اس پر وجوب یا عدم وجوب کا حکم اس وقت کے حالات کی نزاکت کے لحاظ سے لگایا جائے گا، اس طرح دونوں پہلوؤں کے پیش نظر کم از کم یہ قدر مشترک ضرور نکلتا ہے کہ جمہوری انتخابات میں ووٹ دینے والا شخص نہ دینے والے کے مقابلے میں شریعت کے نزدیک زیادہ بہتر اور لائق تحسین ہے۔

ج-امیدوار کے انتخاب کا معیار:

آزاد امیدواروں کے انتخاب کے بارے میں فیصلہ ان کی ذاتی زندگی، عادات و اطوار اور مسلمانوں کے حق میں ان کے نظریات و خیالات سے کیا جائے گا، جو امیدوار مجموعی طور پر بہتر نظر آئے اس کو ووٹ دیا جائے گا۔

البتہ جو لوگ کسی سیاسی جماعت کے نمائندہ کی حیثیت سے میدان میں اترتے ہیں، ان میں بنیادی طور پر اس سیاسی جماعت کی پالیسی، انتخابی منشور، اور اس کے ہائی کمان کے خیالات و نظریات کا اعتبار ہوگا، جس کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ میدان میں اترتے ہیں۔

د-سیاسی جماعتوں سے اتحاد کا اصول:

انتخابات کے موقع پر مختلف سیاسی پارٹیاں مختلف مفادات کے تحت ایک دوسرے سے معاہدات کا سلسلہ بھی شروع کرتی ہیں، ایسے موقع پر اگر کوئی مسلم سیاسی جماعت کسی غیر مسلم سیاسی جماعت سے ملی مفادات کے تحت بعض معاہدات کرنا چاہے تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، خواہ وہ غیر مسلم سیاسی جماعت سخت گیر اور متعصبانہ نظریات ہی کی حامل کیوں نہ ہو، بشرطیکہ مسلم جماعت یا مسلم امیدواروں کا سیاسی تشخص اور ملی وقار مجروح نہ ہو، اور معاہد جماعت اپنے انتخابی منشور سے ان سخت گیر اور متعصبانہ نظریات کو خارج کرنے پر آمادہ ہو جو مسلمانوں کے مفادات سے متصادم ہوں، اور مشترکہ بنیادوں پر انتخاب لڑنے کے لئے تیار ہو۔

ھ-مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی تعلقات:

جن علاقوں میں مسلمان غیر مسلم اقوام کے درمیان رہتے ہیں وہاں سماجی زندگی میں ایک دوسرے کی قربت کی وجہ سے مختلف مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

تہذیبی اختلاط اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

سب سے پہلا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سماجی قربت ایک دوسرے کی تہذیبی اور اخلاقی زندگی پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے؟

مسلمانوں کو ہر ممکن حد تک غیر مسلموں کے طور وطریق اوران کے رسم وروایات سے دور رہنے کی تاکید کی گئی ہے، ان کی مشابہت اور نقل اتارنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، عبادات اور معاشرت کے تمام ممکنہ مسائل میں ایسی راہ منتخب کی گئی جس میں کسی قسم کے غیر اسلامی اثرات نہ پائے جائیں، اس موضوع پر متعدد حدیثیں موجود ہیں، جن میں اسلامی معاشرہ کو غیر اسلامی تہذیب سے پاک رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، مثلاً:

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من تشبه بقوم فهو منهم'' (رواہ احمد و ابوداؤد، مشکوۃ/ ۳۷۵ کتاب اللباس) (جو کسی قوم کی نقل اتارے اس کا شمار اسی کے ساتھ ہوگا)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اوپر دو زعفرانی رنگ کے کپڑے دیکھے تو ارشاد فرمایا:

''إن هذه من ثياب الكفار فلا تلبسها'' (رواہ مسلم، مشکوۃ/ ۳۷۴) (یہ کفار کا لباس ہے اس کو مت پہنو)۔

حضرت رکانہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''فرق ما بيننا وبين المشركين العمائم على القلانس'' (ترمذی: کتاب اللباس ۱/ ۳۵۸، حدیث غریب وقال الترمذی اسناده ليس بقائم) (ہمارے اور مشرکین کے عماموں میں فرق یہ ہے کہ ہمارا عمامہ ٹوپیوں پر ہوتا ہے ان کا نہیں)۔

حضرت بریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو پیتل کی انگوٹھی پہنے دیکھا تو فرمایا: ''میں تمہارے اندر بتوں کی بو محسوس کر رہا ہوں، اس نے وہ انگوٹھی پھینک دی اور پھر لوہے کی انگوٹھی پہن کر حاضر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم پر اہل جہنم کا زیور دیکھ رہا ہوں، اس نے اس کو بھی پھینک دیا، اور دریافت کیا کہ کس چیز کی انگوٹھی بناؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چاندی کی، اور اس کا وزن ایک مثقال سے کم رہے'' (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی، مشکوۃ/ ۳۷۸)۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إن اليهود والنصارى لا يصبغون فخالفوهم'' (متفق علیه، مشکوۃ: باب الرجل/ ۳۸۰) (یہود و نصاریٰ بالوں میں خضاب نہیں لگاتے، تو تم ان کی مخالفت کرو)۔

- حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''غيروا الشيب ولا تشبهوا اليهود'' (حديث حسن صحيح ہے، ترمذی: کتاب اللباس ۱۰/ ۳۰۵) (سفیدی کو بدلو اور یہود کی نقل نہ اتارو)۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو اس کا حکم دیا تو لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہود و نصاریٰ اس دن کا بہت احترام کرتے ہیں، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لئن بقيت إلى قابل لأصومن التاسع'' (رواہ مسلم، مشکوۃ: باب صیام التطوع/ ۱۷۹) (آئندہ سال اگر زندہ رہا تو نویں محرم کا بھی روزہ رکھوں گا)۔

حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللحد لنا والشق لغيرنا'' (ترمذی: ابواب الجنائز ا/ ۲۰۲) (لحد ہمارے لئے اور شق ہمارے غیروں کے لئے ہے)۔

حضرت ام سلمہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ اور اتوار کے دن بطور خاص روزہ رکھتے تھے اور فرماتے:

''إنهما يوما عيد للمشركين فأحب أن أخالفهم'' (رواہ ابوداؤد والنسائی وصححه ابن حبان، فتح الباری ۴/ ۲۰۵) (یہ دونوں دن مشرکوں کے عید کے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان کی مخالفت کروں)۔

حضرت شداد بن اوس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''خالفوا اليهود فإنهم لا يصلون في نعالهم ولا خفافهم'' (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ: باب السترۃ/ ۷۳) (یہود کی مخالفت کرو، وہ اپنے جوتوں اور خف میں نماز نہیں پڑھتے)۔

حضرت علیؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک عربی کمان تھی، آپ نے ایک شخص کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو آپ نے فرمایا اس کو پھینک دو اور اس طرح کی کمان لو (رواہ ابن ماجہ، مشکوۃ/ ۳۳۸)۔

حضرت عائشہ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا تقطعوا اللحم بالسكين فإنه من صنع الأعاجم''

(رواہ ابوداؤد، البیہقی فی شعب الایمان، وقالا: لیس ہو بالقوی، مشکوۃ: کتاب الاطعمۃ/۳۶۶)
(گوشت کو چھری سے نہ کاٹو، اس لئے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے)۔

حضرت ابوریحانہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی باتوں سے منع فرمایا: ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ آدمی اپنے کپڑے کے نیچے ریشم لگائے اس لئے کہ یہ عجمیوں کا طرز ہے، یا یہ کہ اپنے مونڈھے پر ریشم لگائے اس لئے کہ یہ بھی عجمیوں کا طریقہ ہے (رواہ ابوداؤد والنسائی، مشکوۃ: کتاب اللباس/۳۷۶)۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إن كدتم لتفعلوا فعل الفارس يقومون على ملوكهم وهم قعود فلا تفعلوا'' (اعلاء السنن ۱۷/ ۴۲۳)
(قریب ہے کہ تم لوگ فارس وروم والوں کی طرح کرنے لگو، وہ لوگ بھی اپنے بادشاہوں کے ارد گرد کھڑے رہتے تھے اور وہ بیٹھے ہوتے، ایسا نہ کرو)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے تہذیبی اختلاط کا شدید اندیشہ تھا، ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا:

''لتتبعن سنن من قبلكم شبرًا بشر وذراعًا بذراع حتى لو دخلوا جحرضبّ تبعتموهم قيل: يا رسول الله اليهود والنصارى قال: فمن؟'' (متفق عليه، مشكوة: باب تغير الناس/ ۴۵۸)
(تم اپنے سے پہلے والوں کی پوری طرح پیروی کروگے بالش در بالشت ہاتھ در ہاتھ، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں داخل ہوں گے تو ان کی دیکھا دیکھی تم بھی اس بل میں گھس پڑو گے، لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی مراد پہلے والوں سے یہود ونصاری ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: پھر اور کون؟)۔

کتب احادیث میں اس طرح کی بہت سی روایات موجود ہیں جن میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ تہذیبی اور تمدنی اختلاط سے منع کیا گیا ہے، قطع نظر اس سے کہ ان میں سے کون سا حکم کس درجہ کا ہے؟ ان احادیث میں جو بنیادی روح ہے وہ ہے مسلمانوں کی تہذیبی اور سماجی تطہیر کا حکم۔

۲-(الف): مخلوط آبادی میں قیام کا حکم:

میرے خیال میں مسلمانوں کی علیحدہ آبادی کی صورت اگر ممکن ہو تو اس کو اولین اہمیت دی جانی چاہئے، بصورت دیگر مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی میں قیام کرنا ناجائز نہیں ہے، بلکہ ایسے مسلمان جن کی زندگیاں صحیح اسلامی نمونوں پر استوار ہوں، ایسے لوگوں کے لئے مخلوط آبادی میں قیام اسلام اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید ہوگا، اور انہیں لوگوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کے اسلامی اخلاق وسیرت سے غیر مسلم متاثر ہوں گے اور اس سلسلہ میں سب سے بڑا نمونہ صحابہ کرام کی زندگی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اکثر صحابہ روئے زمین کے مختلف حصوں میں اسلام اور علوم اسلامیہ کی تبلیغ واشاعت کے لئے پھیل گئے، اور غیر مسلموں کے درمیان قیام پذیر ہوئے، اور اپنی دعوت وتبلیغ نیز اپنی اسلامی زندگیوں سے اسلام کے تعلق سے ان کے اندر مثبت تبدیلیاں پیدا کیں، صحابہ کے بعد اولیاء اللہ اور مشائخ بھی اس طریق پر گامزن رہے، اور یقیناً یہ اس معیار کے لوگوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے، لیکن عام مسلمانوں کے حق میں یہ مفید نہیں ہوگا۔

ب- غیر مسلموں سے سماجی تعلقات کا معیار:

جہاں تک غیر مسلموں سے سماجی تعلقات، ایک دوسرے کی خوشی وغم میں شرکت اور مدد اور لین دین کے مسائل کا تعلق ہے، تو اسلام اس سے منع نہیں کرتا، اسلام ایک انسانیت دوست، انسانیت نواز اور امن پرست مذہب ہے، وہ مذہبی مسائل میں جبر کا قائل نہیں ہے، اور اسی لئے جو لوگ اسلام قبول نہیں کرتے نہ ان کا سماجی بائکاٹ کرتا ہے نہ لوگوں کو ان سے عداوت ودشمنی پر بھڑکاتا ہے، نہ ان کی حق تلفی کی اجازت دیتا ہے، بلکہ وہ تمام انسانی اور شہری حقوق جو کسی انسان کو مل سکتے ہیں ان کو عطا کرتا ہے۔

اسلام ساری انسانیت کا دوست ہے اور ہر ایک سے اس کے حدود کے مطابق تعلقات رکھنے کی اجازت دیتا ہے، البتہ ہر تعلق میں یہ لحاظ ضروری ہوگا کہ اسلام اور مسلمانوں کی غیرت ووقار پر سوالیہ نشان نہ لگے، اور وہ اسلام کے مزاج یا اس کے بنیادی اصولوں میں سے کسی اصول سے متصادم نہ ہو، اس تمہید کے بعد اب اس ذیل کے چند مسائل پر نظر ڈالتے ہیں، جو اس باب کے تحت بالعموم اٹھائے جاتے ہیں:

غیر مسلموں کی خوشی وغم میں شرکت:

باہم سماجی اور انسانی تعلقات کی بنیاد پر ایک دوسری کی خوشی وغم میں شرکت کرنی پڑتی ہے، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ خلاف شرع کسی امر کا ارتکاب کرنا نہ پڑے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ غیر مسلم کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، بخاری وابوداؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے:

''قال كان غلام يهودي يخدم رسول الله ﷺ فمرض فأتاه النبي ﷺ يعوده فقعد عند رأسه فقال له: أسلم فنظر إلى أبيه وهو عنده فقال له: اطع أبا القاسم، فأسلم فخرج النبي ﷺ وهو يقول الحمدلله الذى أنقذه بي من النار'' (رواہ احمد والبخاری و ابوداؤد، نیل الاوطار ۷/ ۲۷۹، اعلاء السنن ۱۲/ ۵۳۴)

(ایک یہودی لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور اس کے سرہانے میں تشریف فرما ہوئے، پھر آپ نے اس سے کہا، مسلمان ہوجا، وہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا جو وہیں پر موجود تھا، اس کے باپ نے کہا: ابوالقاسم کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے میرے ذریعہ اس کو آگ سے نجات مرحمت فرمائی)۔

غیر مسلم کی تجہیز وتکفین میں شرکت:

رہا یہ کہ غیر مسلم کے جنازہ یا اس کی تجہیز وتکفین میں شرکت کرنا کیسا ہے؟ تو اس سلسلے میں علماء کی عبارتوں سے حکم شرعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرنے والا غیر مسلم کسی مسلمان کا قریبی رشتہ دار ہو اور اس سے زیادہ کوئی قریب ترین اہل تعلق موجود نہ ہو جو اس کی تجہیز وتکفین کی ذمہ داری اٹھا سکے، تو ایسے شخص کے لئے اپنے غیر مسلم رشتہ دار کی تجہیز وتکفین میں شرکت کرنا اور اس ذمہ داری کو نبھانا جائز ہے، اور اس حکم کا اصل مأخذ حضرت ابوطالب کا واقعہ انتقال ہے:

''حضرت ابوطالب کا انتقال ہوا اور حضرت علی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چچا کی موت کی خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو ان کی تجہیز وتکفین کا حکم دیا، اس لئے کہ حضرت علی بحیثیت بیٹا ان سے زیادہ قریب تھے، یہ روایت مختلف طرق سے مختلف کتابوں میں آئی ہے (نصب الرایہ ۲/ ۲۸۱، اعلاء السنن ۸/ ۲۸۲ بروایت ابوداؤد، نسائی، طبرانی، احمد، ابویعلی، بزار اور بیہقی، التلخیص الحبیر لابن حجر ا/ ۱۵۷، ۱۵۸)۔

ج- غیر مسلموں سے تحائف کا تبادلہ:

غیر مسلموں سے جائز مقاصد کے تحت عام حالات میں ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ جائز ہے، البتہ مخصوص حالات میں اس سے احتیاط کی جائے تو بہتر ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں دونوں طرح کا عمل منقول ہے، آپ نے کئی غیر مسلموں کا ہدیہ قبول فرمایا ہے۔ اور بعض کو خود بھی ہدیہ دیا ہے، جبکہ کئی غیر مسلموں کا ہدیہ آپ نے رد فرمادیا ہے۔

غیر مسلموں کی دعوت:

اسی طرح غیر مسلموں کی دعوت کرنے یا ان کی دعوت قبول کرنے کا بھی یہی حکم ہے، اگر شرح صدر ہو، اپنی صلابت ایمانی کے کمزور ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اور اس کی عادت نہ بنالی جائے تو غیر مسلموں کی دعوت قبول بھی کی جاسکتی ہے، اور ان کی ضیافت بھی کی جاسکتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے موقع پر ایک یہودیہ عورت کی دعوت قبول کی اور اس کا بھیجا ہوا گوشت تناول فرمایا، یہ بھی دریافت نہیں فرمایا کہ یہ کس کا ذبیحہ ہے (احکام القرآن للجصاص ۲/ ۳۹۴)۔

غیر مسلموں کے تہواروں کا تحفہ:

البتہ مذہبی تہوار میں مثلاً دیوالی یا ہولی یا کرسمس وغیرہ کے موقع پر جو تحفے یا دعوتیں دی جاتی ہیں ان میں تھوڑی سی تفصیل ہے۔

صحابہ اور سلف صالحین سے اس سلسلے میں دو قسم کے رجحانات منقول ہیں، مثلاً:

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے منقول ہے کہ کسی غیر مسلم نے ان کی خدمت میں نیروز کا ہدیہ پیش کیا تو آپ نے قبول کرلیا (الاقتضاء لابن تیمیہ/ ۱۲۰)۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا کہ مجوسیوں سے ہمارے تعلقات ہیں اور اس کی وجہ سے وہ اپنے تہوار کے موقع پر ہمیں ہدیہ دیتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اس دن جو ذبیحے ہوتے ہیں ان میں اگر گوشت وغیرہ دیں تو نہ کھاؤ، البتہ پھل وغیرہ کھاسکتی ہو (حوالہ بالا)۔

حضرت ابو برزہ اسلمی سے منقول ہے کہ مجوسیوں سے ان کے بعض روابط تھے، ان کے پڑوس میں وہ لوگ آباد تھے، نیروز اور مہرجان کے موقع پر وہ لوگ تحفے وغیرہ بھیجا کرتے تھے تو وہ اپنے گھر والوں سے فرماتے کہ پھل وغیرہ تو کھالو اور باقی چیزیں واپس کردو۔

ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ''ان آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایا اور تحائف کے باب میں تہوار سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اور نہ اس سے غیر مسلموں کی اعانت لازم آتی ہے، اس لئے غیر حربی کافروں کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، خواہ وہ تہوار کے موقع پر ہو یا کسی اور موقع پر'' (اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ/ ۱۲۰)۔

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بھی یہی رائے ہے، تحریر فرماتے ہیں: ''صرف دو جزو خاص قابل تعرض کے باقی رہ گئے، ایک یہ کہ ہدیہ دیوالی کا شاید اس تہوار کی تعظیم کے لئے ہو جس کو فقہاء نے سخت ممنوع لکھا ہے، دوسرا یہ کہ اس میں تصاویر بھی ہوتی ہیں ان کا اقتناء واحترام مستلزم للتقوم واستعمال لازم آتا ہے اور بعض فروع میں تصاویر کے تقوم کی نفی کی گئی ہے، تو اس میں اس حکم شرعی کا بھی معارضہ ہے، جواب اول کا یہ ہے کہ یہ عادت سے معلوم ہے کہ اس ہدیہ کا سبب مہدی لہ کی تعظیم ہے نہ کہ تہوار کی تعظیم، اور جواب ثانی کا یہ ہے کہ مقصود اہداء میں صورت نہیں بلکہ مادہ ہے، البتہ یہ واجب ہے کہ مہدی لہ فوراً تصاویر کو توڑ ڈالے'' (امداد الفتاوی ۳/ ۴۸۲)۔

اس کے بالمقابل حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ذخیرۃ الفتاوی کی ایک عبارت نقل کی ہے، اس تہوار کے موقع پر غیر مسلموں کے تحائف قبول کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، ذخیرہ کی عبارت ہے:

''لا ینبغي للمؤمن أن یقبل ہدیۃ کافر في یوم عید ولو قبل لا یعطیھم ولا یرسل إلیھم'' (فتاوی عبد الحی ا/ ۴۰۳)

(مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ کافر کا ہدیہ تہوار کے موقع پر قبول کرے، اور اگر قبول کرے تو ان کو ہرگز کوئی تحفہ بدلہ میں نہ دے اور نہ کسی کے ہاتھ بھیجے)۔

''فی یوم عید'' کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں کے تہواروں پر ہوسکتا ہے:

تھوڑی گنجائش تو ذخیرہ کی عبارت میں بھی موجود ہے۔ دونوں رجحانات کے درمیان تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ مذہبی تہواروں کے موقع پر دو طرح کے تحفے آتے ہیں، بعض وہ ہوتے ہیں جو بتوں اور دیوتاؤں پر چڑھائے جاتے ہیں، جن کو برادران وطن ''پرشاد'' کہتے ہیں، ان کا قبول کرنا جائز نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ ''ما اھل بہ لغیر اللہ'' کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے، اور ذخیرہ کی عبارت کا محل غالباً یہی صورت ہے، اور بعض وہ ہوتے ہیں جو اس موقع پر لوگوں میں تقسیم کرنے یا بچوں کے کھانے کے لئے بنائے جاتے ہیں، اس قسم کے تحفے قبول کرنے کی گنجائش ہے، اور علامہ ابن تیمیہ اور حضرت تھانوی کے فتوی کا محل غالباً یہی شکل ہے۔

اسی طرح سابقہ تفصیلات سے حکم شرعی یہ منقح ہو کر سامنے آتا ہے کہ غیر مسلموں کے غیر مذہبی تحائف قبول کرنا شرح صدر اور حالات کے مطابق جائز ہے، اور اگر حالات اجازت نہ دیں یا غیر مسلم کی نیت وعمل پر اطمینان نہ ہو تو قبول کرنا مناسب نہیں، اور مذہبی تحائف اگر بتوں پر چڑھائے ہوئے ہوں تو قبول کرنا جائز نہیں، اور اگر بتوں پر چڑھائے ہوئے نہ ہوں تو قبول کرنا جائز ہے۔

غیر مسلموں کو ان کے تہواروں میں تحفے دینا:

ذخیرۃ الفتاوی کے مذکورہ بالا جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے مذہبی تہواروں کے موقع پر ہدیہ دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، نہ ہدیہ کے بدلے میں ہدیہ دینا درست ہے اور نہ اپنی طرف سے اس میں پہل کرنا درست ہے، علامہ ابن تیمیہ نے ''اقتضاء الصراط المستقیم'' میں جو بحث کی ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے (اقتضاء الصراط المستقیم/ ۱۱۱)۔

د- غیر مسلموں سے چندہ لینا اور دینا:

مساجد ومدارس کے لئے غیر مسلموں کا چندہ قبول کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ ثواب سمجھ کر دیں، مساجد ومدارس کے مصالح کے خلاف نہ ہو، مسلمانوں پر آئندہ ان کے احسان جتلانے کا اندیشہ نہ ہو، اور وہ اس کے بدلہ اپنے عبادت خانوں کے لئے مسلمان سے چندہ نہ طلب کریں، ان شرائط کے ساتھ ہمارے علماء نے غیر

مسلموں کا چندہ لینے کی اجازت دی ہے (امداد الفتاوی ۲/ ۶۶۴، ۶۶۸، ۱۲۹، ۱۳۰)۔

ھ-غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں شرکت:

اسی سے اس کا حکم بھی نکلتا ہے کہ غیر مسلموں کے مذہبی میلوں اور تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت یا ان کے عبادت خانوں میں مسلمانوں کا جانا تفریح یا نمائندگی کی نیت سے جائز نہیں ہے، البتہ تجارت کی نیت سے جانا جبکہ وہاں معصیت نہ ہو اور مندر وغیرہ میں داخل ہونے کی نوبت نہ آئے تو اس کی گنجائش ہے۔

۳-جھنڈے کو سلامی دینا:

غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتیں بعض ایسے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں، جن کو دوسری قومیں محض سیاسی اور قومی مسئلہ سمجھتی ہیں، لیکن مسلمانوں کے لئے وہ مذہبی نوعیت کی ہوتی ہیں، مثلاً:

(الف) آج کل اکثر ملکوں میں جھنڈے کو سلامی دینے کا رواج ہے اور اسے جھنڈے کا احترام کہا جاتا ہے، جھنڈے کی سلامی کے وقت کسی شخص کا بیٹھا رہنا خلاف ادب اور قومی جرم مانا جاتا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے ہمارے علماء دیوبند میں اس سلسلے میں دو رجحانات پائے جاتے ہیں:

۱-ایک نقطۂ نظر مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ہے، مفتی صاحب موصوف کا فتوی یہ ہے: ''جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے، اور اسلامی ملکوں میں بھی ہوتی ہے، وہ ایک فوجی عمل ہے، اس میں اصلاح ہو سکتی ہے، مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ عمل قرار دینا صحیح نہیں ہے'' (نقیب: جلد ۷، پھلواری شریف پٹنہ، ۱۶/ جمادی الاول ۵۸ ۱۳ھ، ۹/ جولائی ۱۹۳۹ء یکشنبہ)۔

۲-دوسرا نقطۂ نظر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے، حضرت کا مفصل فتوی امداد الفتاوی میں ''عجالة كشف الحجاب عن مسئله تعظيم بعض الانصاب'' کے نام سے موجود ہے، حضرت نے اس عمل کو ناجائز اور غیر اسلامی قرار دیا ہے، اور اپنے موقف کی دلیلیں بھی ذکر کی ہیں۔

غور کیا جائے تو یہ دوسرا نقطۂ نظر دلائل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط ہے۔

ب-''بندے ماترم'' یا اس قسم کے دیگر قومی ترانوں کا حکم:

ب: جہاں تک ایسے قومی ترانوں کا مسئلہ ہے جن میں مشرکانہ مضامین شامل ہوں، ایسے ترانے خواہ جھنڈے کے پاس ہوں یا کسی دوسرے مقام پر کسی جگہ پڑھنا یا گانا جائز نہیں۔

البتہ ایسا شخص جو اس کے لئے مجبور ہو، اور ترانہ نہ پڑھنے کی صورت میں شدید نقصانات کا اندیشہ ہو ایسے شخص کے لئے بادل ناخواستہ یہ کلمات زبان سے دہرانے کی اجازت ہوگی، قرآن پاک کی اس آیت کی روشنی میں: ''إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان'' (مگر جن پر زبردستی کی جائے، اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو)۔

اگرچہ اس صورت میں بھی عزیمت یہ ہے کہ زبان سے یہ کلمات ادا نہ کرے، لیکن اپنے تحفظ کے لئے مذکورہ کلمات زبان سے ادا کرنے کی رخصت ہے۔

ج-باہمی نزاعات میں غیر اسلامی عدالتوں کے فیصلے:

غیر مسلم ممالک میں ایک اہم ترین مسئلہ باہمی نزاعات میں عدالتوں سے ملنے والے فیصلوں کا ہے، عدالتیں اپنے یہاں مروج قانون شہادت یا دیگر قوانین کو بنیاد بنا کر فیصلے کرتی ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ عدالت نے اپنے فیصلہ کی بنیاد جس چیز پر رکھی ہو وہ فی الواقع فرضی ہو، یا اسلامی اصولوں کی روشنی میں غلط ہو، اور فریقین جانتے ہوں کہ فیصلہ غلط ہوا ہے، ایسی صورت میں اگر مقدمہ کے دونوں فریق مسلمان ہوں تو ان کے لئے اس فیصلہ سے استفادہ کرنا شرعی طور پر جائز ہوگا یا نہیں؟

اس سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے اصول پر ایسے معاملات جن کو وجود میں لانے کا قاضی کو اختیار ہے، ان میں عدالتی فیصلہ سے استفادہ کرنا جائز ہے، اور جو معاملات اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہوں، ان میں عدالتی فیصلہ سے استفادہ درست نہیں ہے۔

اسی طرح ایسے معاملات جن میں سبب ملک کی وضاحت نہ ہو کہ کس ذریعہ سے مدعی کو ملکیت یا حق ملکیت حاصل ہوئی ہے مثلاً کسی زمین، جائداد یا سامان

پر ملکیت کا دعوی کرنے ایسے معاملات میں عدالت حقیقت کے خلاف فیصلہ کردے تو فیصلہ سے وہ چیز مدعی کے لئے فی الواقع حلال نہیں ہوگی، بلکہ اگر وہ مسلمان ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ حقیقت کے مطابق اللہ سے ڈرتے ہوئے حق، حقدار کو پہنچائے۔

البتہ ایسے معاملات جن میں سبب ملک کی وضاحت کی گئی ہو، مثلاً یہ چیز میری ہے اور میں نے اس کو فلاں سے خریدا ہے وغیرہ، یا نکاح وطلاق کے معاملات ایسے معاملات میں عدالت کا فیصلہ نافذ ہوگا، اور اگرچہ کہ فیصلہ خلاف واقع صادر ہو لیکن فیصلہ کے بعد وہ چیز اس فریق کے لئے جائز ہوجائے گی جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے۔

۴-ج، د: ہنگامی مواقع پر غیر مسلموں کی امداد:

یقیناً اسلام میں خدمت خلق کی بڑی اہمیت ہے، اور انسانیت کے ناطے اسلام ہر ایک کی خدمت کرنے کا حکم دیتا ہے، انسان تو انسان اسلام جانوروں کی خدمت کو بھی باعث اجر قرار دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: "إن لنا في البهائم أجرًا؟" (چوپایوں میں بھی ہم کو اجر ملے گا؟) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "في كل ذات كبد رطبة أجر" (ہر زندہ جگر والی مخلوق میں اجر ہے) (بخاری ومسلم، اعلاء السنن ۱۶/ ۱۵۲)۔

اسلام حسب توفیق ساری انسانیت کی خدمت کا حکم دیتا ہے، اور انسانی بنیاد پر غیر مسلموں کی نصرت واعانت کی اجازت ہی نہیں ترغیب دیتا ہے۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئیں جب کہ وہ مشرک تھیں، قریش سے معاہدہ کا زمانہ تھا، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی اور عرض کیا کہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی مدد کرسکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں کرو" (متفق علیہ، مشکاۃ ۴۱۸، ۴۱۹)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوہریرہ دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"الخلق عيال الله، فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله" (رواه البيهقي، مشكاة/ ۴۲۵)

(ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے، اللہ کو سب سے زیادہ وہ شخص پسند ہے جس کا برتاؤ اس کی مخلوق کے ساتھ زیادہ اچھا ہو)۔

اس طرح کی متعدد احادیث موجود ہیں جو انسانی بنیادوں پر تمام انسانوں کی خدمت کی ترغیب دیتی ہیں، اس لئے اگر مسلمان خدمت خلق کا کوئی ادارہ قائم کریں یا قدرتی آفات کے موقع پر امدادی اسکیم لے کر چلیں تو حتی المقدور غیر مسلموں کو بھی اس میں شامل کریں، مسلمانوں سے دوہرے رشتہ کی بنا پر ان کو اولیت ضرور دی جائے گی، لیکن اگر گنجائش ہو تو غیر مسلموں کو بھی اس میں ضرور شامل کرنا چاہئے، بالخصوص ہندوستان جیسے ممالک میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے، غیر مسلموں میں اس سے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھا ماحول قائم ہوگا۔

حضرت ثمامہ بن اثال نے اہل مکہ کو رسد بھیجنے پر پابندی لگادی، اہل مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تو آپ نے حضرت ثمامہ کو ہدایت کی کہ جس طرح پہلے مکہ غلہ آتا تھا اسی طرح آنے دیا جائے (مسند احمد بن حنبل ۲/ ۲۴۸، الوثائق السیاسیۃ/ ۷۵، ۷۶)۔

اس لئے غیر مسلموں کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ جو بھی رہے، لیکن مسلمانوں کو اپنے اسلامی اخلاق اور اصولوں کو چھوڑنا ہرگز مناسب نہیں۔

والله اعلم بالصواب۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مفتی سید اسرار الحق سبیلی، حیدرآباد

محور اول

الف، ب: مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا اور امیدوار بننا:

الیکشن پر بحث کرنے سے پہلے جمہوریت کی تشریح اور اس کے خدوخال بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جمہوریت کو انگریزی زبان میں (Democracy) کہا جاتا ہے، یہ یونانی لفظ Kratosاور Demos سے ماخوذ ہے، Demos کا معنی ہے: عوام اور kratos کا مطلب ہے: اقتدار، اس طرح ڈیموکریسی یا جمہوریت کا مفہوم ہوتا ہے کہ اقتدار اعلی عوام کے تئیں ہے، دوسرے الفاظ میں اسے ''عوامی حکومت'' بھی کہا جاسکتا ہے، مشہور عوامی رہنما ابراہم لنکن نے جمہوریت کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ عوام کے ذریعہ بنائی گئی، عوام کی خاطر اور عوام کی حکومت ہے۔ Govt of People, by the people and for the peopie

عام طور پر دو اقسام کی جمہوریت بیان کی گئی ہے:

۱- راست جمہوریت (Direct Democracy)

۲- بالواسطہ جمہوریت (Indirect Democracy)

جس حکومت میں تمام شہری راست طور پر شریک ہوتے ہیں، راست جمہوریت کہلاتی ہے، یہ جمہوریت اسپارٹہ اور ایتھنس (یونان) وغیرہ میں تھی، آج ممالک میں آبادی اور وسعت میں اضافہ کے پیش نظر راست جمہوریت ممکن نہیں، اس لئے بالواسطہ جمہوریت کو اپنالیا گیا ہے، جس میں حکومت کی باگ ڈور عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اس لئے اس کو بالواسطہ یا نمائندہ جمہوریت Representative Democracy کہا جاتا ہے، اس حکومت میں بھی اقتدار عوام کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، یہاں لیڈرشپ یعنی سیاسی حکمت عملی میں رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، عوام اس رہنمائی کا حق اپنے منتخب نمائندوں کو دیتے ہیں، لہذا جمہوری ممالک میں عوام میں عمدہ رہنمائی کی صلاحیت کو فروغ دینا اور ان کا سیاسی شعور بیدار کرنا ضروری ہے۔

اس لحاظ سے ووٹ کی حیثیت وکیل نامزد کرنے کی ہے، کہ عوام ووٹوں کے ذریعہ اپنے سیاسی اور قومی مسائل کو بخیر وخوبی انجام دینے کے لئے سیاسی قائدین کو اپنا وکیل اور نمائندہ منتخب کرتے ہیں، (اگر انتخاب کے معاملہ میں ہم نے کسی تنگ نظری اور ناانصافی کا مظاہرہ کیا، ذاتی مفادات کو مدنظر رکھا اور نااہل اور ظالم شخص/ پارٹی کو منتخب کیا تو اس کا گناہ اس کو منتخب کرنے والے اشخاص کو بھی ہوگا)، لہذا ایک ایسی قوم جس کی زندگی کا مقصد فساد کو دور کرکے اصلاح پیدا کرنا، سماجی ناانصافی کو ختم کرکے عادلانہ نظام قائم کرنا، سماجی اونچ نیچ اور تعصب کو ختم کرکے مساوات اور بھائی چارہ کا ماحول پیدا کرنا، اور ساتھ ہی اپنا ملی تشخص اور امتیاز برقرار رکھنا ہے، اس کے لئے جمہوری ممالک میں الیکشن میں حصہ لینے، اہلیت وصلاحیت رکھتے ہوئے الیکشن میں امیدوار بننے اور کسی ہمدرد، مخلص اور انصاف پسند خدمت گار کے لئے انتخابی مہم چلانے کے سوا کوئی دوسرا پرامن راستہ بہ ظاہر نظر نہیں آتا، اور یہ ان کے لئے نہ صرف جائز ہے، بلکہ مسلمانوں کو الیکشن کی اہمیت، اس کے دوررس نتائج اور الیکشن کے تئیں ان کی ذمہ داری کا شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ وہ جمہوری ملک میں پرامن زندگی گزارنے کے لائق ہوں، وہ اپنے دینی، دنیوی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو بہتر طریقہ پر حل کروانے کے موقف میں ہوں، اور وہ ایک باعزت شہری کی طرح ملک میں جینے اور ابنائے وطن کے دوش بہ دوش ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے کے اہل ہوں۔

ووٹ کی شرعی حیثیت بیان کرتے ہوئے بعض اہل علم نے اس کو شہادت کے زمرہ میں رکھا ہے کہ ووٹ دینے والا کسی امیدوار کے حق میں گواہی دیتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ شخص حکومت کے کاموں میں شریک ہونے کے لائق اور قوم وملت کے حق میں مفید ہے، اس پر اسے اعتماد ہے، اگر ووٹ کی حیثیت شہادت مان لی جائے تو قرآن کریم کی آیات سے اس کا وجوب ثابت کیا جاسکتا ہے۔

"ولا يأب الشهداء إذا ما دعوا" (سورۂ بقرہ: ۲۸۲) (اور گواہ انکار نہ کیا کریں جب (گواہی کے لئے) انہیں بلایا جائے)۔

"ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فإنه آثم قلبه" (سورۂ بقرہ: ۲۸۳) (اور گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو اس کو چھپائے اس کا دل گنہگار ہے)۔

"وأقيموا الشهادة لله" (اللہ کے لئے گواہی کا قیام عمل میں لاؤ)۔

اگر ووٹ کی حیثیت وکالت مانی جائے، جیسا کہ جمہوریت کی تشریح سے واضح ہوتا ہے، تو اس کا وجوب قرآن پاک کی ان آیات سے ثابت ہوگا، جن میں انصاف قائم کرنے، اصلاحی کام کرنے، نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ بہت سے احکام دیئے گئے ہیں، اگر استطاعت ہو تو یہ از خود انجام دینا چاہئے نہیں تو وکالۃً یہ فریضہ انجام دینا چاہئے، جمہوری ممالک میں عوام کے لئے اسی کا موقع ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات دیکھی جائیں: (سورۂ نساء: ۱۱۴، ۱۳۵، سورۂ مائدہ/ ۲، ۸، سورۂ انفال: ۱، سورۂ حج: ۷۷، سورۂ حجرات: ۹، ۱۰ اور ان احادیث کو بھی ملاحظہ فرمائیں: مسلم/ ۴۹، ۲۵۸، ۲۶۹۹، ۱۸۹۳، بخاری ۵ /۷۰، ۳ /۲۴۰)۔

اب امیدوار بننے کے بارے میں عرض ہے کہ اسلام میں عہدہ طلب کرنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

''إنكم ستحرصون على الإمارة، وستكون ندامة يوم القيامة'' (بخاری ۱۲/ ۱۱۱)
(عنقریب تم لوگ حکومت کی حرص کروگے، اور یہ عنقریب قیامت میں شرمندگی کا باعث ہوگی)۔

دوسری روایت ہے: ''سیدنا ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں اور میرے چچا کے دو بیٹے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، ایک نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں اپنی سلطنت میں کوئی عہدہ عنایت کیجئے، دوسرے نے بھی یہی بات کہی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! ہم ایسے آدمی کو عہدہ نہیں دیتے جو اس کی مانگ کرے اور اس کی حرص رکھے'' (بخاری ۱۳/ ۱۱۲، مسلم ۳/ ۱۴۵۶)۔

لیکن جمہوری ممالک میں بغیر عہدہ طلب کئے عہدہ ملنا ممکن نہیں، نیز جب عہدوں پر نااہل، غیر ذمہ دار، غاصب، ظالم اور متعصب لوگ فائز ہوجائیں تو ایسی حالت میں لائق، ذمہ دار اور انصاف پسند حضرات کے لئے اللہ کی مخلوق کو ظلم، ناانصافی، پسماندگی اور غربت سے چھٹکارا دلانا واجب ہوجاتا ہے، جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے شاہ مصر سے کہا تھا۔

اگر سیدنا یوسف علیہ السلام بادشاہ سے عہدہ کی درخواست نہیں کرتے تو یہ عہدہ اور اللہ کی نعمت (رحمت) کے حصول کا امکان بہ ظاہر مفقود تھا، کیونکہ مصر میں خاندانی بادشاہت وراثتاً چلی آرہی تھی۔

آج کم از کم ہندوستان کی صورت حال اس سے کہیں زیادہ بدتر نظر آتی ہے، حکمراں اور نوکر شاہی طبقہ مالی استحکام میں بہت زیادہ ملوث ہے، ملک میں ایک اچھی تعداد فاقہ کشوں اور بے روزگاروں کی ہے، مالی پریشانی سے تنگ آکر بہت سے لوگ خصوصاً کاشت کار طبقہ خودکشی پر مجبور ہو رہا ہے، منفعت بخش قومی اثاثہ جات کو فروخت کیا جارہا ہے، سرمایہ کاری کی تخفیف کے لئے مستقل مرکزی وزارت قائم کی گئی ہے، اس طرح ملک کی معیشت کھوکھلی کی جارہی ہے۔

اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کو جو جمہوریہ ہند میں نصف صدی سے زائد عرصہ گزار دینے کے بعد بھی الیکشن کو بہت ہی معمولی چیز سمجھے ہوئے ہیں، اور اس کے دینی اور ملی اثرات سے نابلد ہیں، ان کو الیکشن کے دینی، ملی، قومی، تہذیبی، سماجی، معاشرتی، حفاظتی (سیکورٹی) اور اقتصادی اثرات سے واقف کرانے اور شعور پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

ج- مخالف اسلام پارٹیوں میں شرکت وتعاون:

ایسی سیاسی پارٹیاں جنہوں نے قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے جذبات، تعصب اور نفرت کو ہوا دی ہے، اور وہ اسلام، مسلمانوں اور عیسائیوں کے

خلاف نفرت کا پرچار کر کے ملک کی اکثریت کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے کوشاں ہیں، اور وہ نسل کشی، کشت وخون اور فسادات کی آگ بھڑکا کر حکومت میں اکثریت حاصل کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتی ہیں، ایسی پارٹیوں کو ووٹ دینا اور اس میں شریک ہونا ہرگز جائز نہیں ہوگا، بلکہ حرام ہوگا، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب" (سورۂ مائدہ/ ۲)

گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو، اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے)۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ایسی پارٹیوں کے بعض امیدوار جو ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب ہو، تو ان کو ووٹ دینے میں کیا قباحت ہے، تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ایسے امیدوار کو ووٹ دینے سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، ایک ووٹ کی کمی زیادتی سے حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں، ایسے امیدوار کو ووٹ دینے میں ہوسکتا ہے کہ علاقائی سطح پر مسلمانوں کو کچھ فائدہ ہو، لیکن قومی سطح پر مسلمانوں کا قومی نقصان ہوگا، فقہ کا مشہور قاعدہ ہے:

''درء المفاسد أولی من جلب المصالح'' (الاشباہ والنظائر للسیوطی/ ۸۷) (مفاسد کو دور کرنا مصالح کو حاصل کرنے سے بہتر ہے)۔

د- سیکولر پارٹیوں سے مفاہمت:

انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیکولر سیاسی پارٹیوں سے مفاہمت، اتحاد، ان میں شرکت، ان کی حمایت اور مسلم مفادات کی بنیاد پر ان سے معاہدے کرنے کی شریعت میں گنجائش ہے، آج کے حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کو علاحدہ سیاسی پارٹی قائم کرنے کے بجائے سیکولر پارٹیوں سے ملی مفادات کی بنیاد پر مفاہمت کو ترجیح دینا چاہئے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے کے بعد مدینہ کے یہود اور آس پاس کے غیر مسلم قبائل سے معاہدہ کیا تھا، جسے ''میثاق مدینہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کہ وہ بیرونی حملہ آوروں کا متحدہ مقابلہ کریں گے، اور ہر مذہب والے کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہوگی، گویا یہ سیاسی اور دفاعی نوعیت کا معاہدہ تھا، آج کے حالات کے پیش نظر شرعاً یہ ضروری ہے۔

ھ- مشترکہ رفاہی اداروں کا قیام:

مسلمان اگر ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کریں جن کے تحت خدمت خلق کا فریضہ انجام دیا جائے، معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کی جائے، اچھی باتوں کی ترویج اور بری باتوں سے روکا جائے، تو ایسے ادارے اور تنظیموں میں غیر مسلم بھائیوں کو شریک کرنے میں کوئی حرج نہیں، سیرت نبوی میں اس کی مثال بعثت سے پہلے حلف الفضول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت کی صورت میں ملتی ہے، جس میں مکہ کے مظلوم افراد کی دادرسی اور امن وسلامتی کو یقینی بنانے کا معاہدہ کیا گیا تھا، بعثت کے بعد آخری زمانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ آج تک میں اس معاہدہ پر قائم ہوں، اگر آج بھی مجھے اس کے لئے بلایا جائے تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔ ''ولو أدعی به في الإسلام لأجبت'' (سیرت ابن ہشام ا/ ۱۳۴)۔

محور دوم

الف: علاحدہ مسلم آبادی میں رہائش:

(ہندوستانی) مسلمانوں کے لئے علاحدہ مسلم آبادی، مسلم محلہ اور علاقہ میں رہنا مخلوط آبادیوں میں رہنے سے زیادہ بہتر ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''أنا بريء من كل مسلم يقيم بين المشركين''، رواه الثلاثة وإسناده صحيح'' (سبل السلام ۴/ ۷۹)

(میں ان تمام مسلمانوں سے بیزار ہوں جو مشرکوں کے درمیان رہائش پذیر ہیں)۔

لیکن یہ حدیث دار الحرب میں رہنے والے مسلمانوں کی بابت ہے، جن پر ہجرت واجب ہے (سبل السلام ۴/ ۷۹)۔

علاحدہ آبادی میں رہنے سے مسلمان غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے زیادہ محفوظ رہ سکیں گے، نیز فسادات کے موقع پر بھی مسلمانوں کی جان

و مال اور عزت و آبرو کی زیادہ حفاظت ممکن ہے، مخلوط آبادی میں رہنے سے اس بات کا کم امکان ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلامی اخلاق و کردار سے متاثر کریں گے، بلکہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات کو قبول کرنے کا زیادہ امکان ہے، نیز اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ وہ غیر مسلموں کے درمیان اسلام کے تئیں منفی خیالات کو پروان چڑھائیں گے، اور اپنی بد اخلاقی اور لڑائیوں کے ذریعہ اسلام کی رسوائی کا سبب بنیں گے۔

ب-غیر مسلموں کے جلوس جنازہ میں شرکت اور ان کے لئے ایصال ثواب:

کسی غیر مسلم پڑوسی یا دوست کا انتقال ہو جائے تو اس کے گھر جا کر اس کو دیکھنا اور اس کے اہل خاندان سے تعزیت کی جا سکتی ہے، لیکن اس کے جلوس جنازہ میں شریک ہونا اور آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہنا جائز نہیں ہوگا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولا تصل علی أحد منهم مات أبدا ولا تقم علی قبره، إنهم كفروا بالله ورسوله وماتوا وهم فاسقون" (سورۂ توبہ/۸۴)

(ان میں سے کوئی مر جائے، تو اس (کے جنازہ) پر کبھی نماز نہ پڑھئے، اور نہ (دفن کے لئے) اس کی قبر پر کھڑے ہوئیے، کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، اور حالت کفر ہی میں مرے ہیں)۔

اسی طرح ان کے لئے ایصال ثواب کرنا بھی جائز نہیں ہوگا، اللہ تعالی کا واضح ارشاد ہے:

"ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين ولو كانوا أولي قربى من بعد ما تبين لهم أنهم أصحاب الجحيم" (التوبہ/۱۱۳)

(پیغمبر اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں، اگرچہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اس امر کے ان پر ظاہر ہو جانے کے بعد کہ وہ لوگ دوزخی ہیں)۔

ج-غیر مسلموں کی تقریبات کی مٹھائیاں:

غیر مسلموں کی غیر مذہبی تقریبات جیسے شادی وغیرہ کی مٹھائیاں استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں، بشرطیکہ وہ حلال اور پاک ہوں، البتہ مذہبی تقریبات کی مٹھائیاں وغیرہ جنہیں "پرشاد" کہا جاتا ہے، اور جنہیں مورتیوں پر چڑھایا جاتا ہے یا ان کے سامنے رکھ کر مذہبی رسوم ادا کئے جاتے ہیں ان کا کھانا ناجائز ہوگا۔ یہ اپنی روح اور منشاء کے اعتبار سے: "وما ذبح علی النصب" (سورۂ مائدہ: ۳) (اور جو پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے) (حرام ہے) میں داخل ہے۔

اسلام میں اس طرح کی مٹھائیاں کھانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور نہ کسی طور اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

د-پوجا میں چندہ دینا:

مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کی تعمیر میں چندے دینا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ شرک اور بت پرستی کا براہ راست مالی تعاون ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ مساجد، مدارس اور مذہبی جلسوں کے لئے غیر مسلموں کا چندہ قبول کریں۔

نیز اگر غیر مسلموں سے چندے وصول کئے جائیں تو وہ بھی مسلمانوں سے چندہ دینے کی خواہش کریں گے۔

ھ-الف: تہواروں میں شرکت:

مسلمانوں کے لئے دوسرے مذہبی گروہوں کے تہواروں اور مذہبی تقریبات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہوگا، مسلمانوں کو کفر اور شرک کے معاملہ میں کوئی سمجھوتہ یا مداہنت کی ضرورت نہیں ہے، مسلمانوں کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، بلکہ ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شرک سے بیزاری کا اظہار کریں، اور مشرکانہ رسوم و رواج سے دور رہیں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

"يا قوم إني بريء مما تشركون، إني وجهت وجهي للذي فطر السموات والأرض حنيفا وما أنا من المشركين" (سورۂ انعام/۷۹،۸۰)

(اے میری قوم! میں تمہارے مشرکانہ عمل سے بیزار ہوں، میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا،

اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)۔

ب-غیر مسلموں کو تہوار کی مبارکباد دینا:

غیر مسلموں کو ان کے تہواروں کے موقع پر مبارک باد دینا درست نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ جو مذاہب اسلام کی نگاہ میں باطل ہیں، جن کے تہواروں میں مشرکانہ رسوم ادا کئے جاتے ہیں، بے حیائی، فضول خرچی اور لہو ولعب کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، ایسے کاموں پر انہیں مبارکباد دینا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟

محور سوم

الف: قومی پرچم کو سلامی دینا:

ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، سرکاری مدارس اور سرکاری اداروں میں مذہبی رسوم ادا کرنے کی قانونی طور پر اجازت نہیں ہے، گو آج سیکولر ہندوستان کو واحد مذہبی ملک میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور غالباً اسی جذبہ کے تحت ''وندے ماترم'' کو قومی گیت قرار دیا گیا ہے، آج کل یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقع سے زمین پر ہندوستان کا نقشہ بنایا جاتا ہے، اس پر پرچم کی لکڑی نصب کی جاتی ہے، پرچم لہرانے سے پہلے کسی پنڈت کو بلا کر اگربتی جلائی جاتی ہے، ناریل پھوڑا جاتا ہے، ناریل کے پانی کا چھڑکاؤ ہندوستان کے نقشہ، گاندھی کی تصویر اور پرچم پر کیا جاتا ہے، پرچم کشائی کی جاتی ہے، اس کے ساتھ ہی بھارت کے نقشہ پر پھول کی بارش ہوتی ہے، پرچم کو سلامی دی جاتی ہے، بھارت کا ترانہ پڑھا جاتا ہے، آخر میں بھارت ماتا کی جے، سرسوتی ماتا کی جے کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے اسلام ان تمام چیزوں کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ یہ تمام کام ہندوؤں نے اپنے عقیدے کے مطابق گھڑ لئے ہیں، اور سیکولر ملک ہندوستان کے قومی تہوار (یوم آزادی، یوم جمہوریہ) کی تقریب کو اپنے عقیدے کے مطابق رنگ دیا ہے، ان کے عقیدے کے مطابق بھارت کی سرزمین ان کی ماں (ماتا) ہے، شمال کا حصہ سر ہے، جنوب کا پاؤں، مشرق ومغرب دونوں ہاتھ ہیں، چنانچہ درگا دیوی کی تصویر بعض جگہوں میں ہندوستان کے نقشہ کے اندر دکھائی دیتی ہے، جبکہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے صرف ہندو ہی نہیں، بلکہ سکھ اور عیسائی کے علاوہ مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

اس لئے مسلمانوں کو خانگی اداروں میں ان تمام رسوم کے بغیر پرچم کشائی کا عمل انجام دینا چاہئے، اگر پرچم کشائی کی جگہوں میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو تو مسلمانوں کو ان رسوم سے علاحدہ رہنا چاہئے، اور دل ہی دل میں شرک سے بیزاری کرنا چاہئے، زیادہ سے زیادہ اس موقع پر کھڑے ہونے کی اور قومی ترانہ ''جن گن من'' پڑھنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، مسلمانوں کو پرچم کو سلامی دینے کی بھی ضرورت نہیں، صرف کھڑا رہنا کافی ہے، مسلمانوں کے سلامی نہ دینے پر کوئی توجہ بھی نہیں دیتا، لیکن اگر کہیں مجبور کیا جائے تو کراہت کے ساتھ سلامی دی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ شرک کے دائرہ میں نہیں ہے، البتہ ان کے علاوہ دوسرے مشرکانہ افعال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

ب-وندے ماترم پڑھنا:

ہندوستان میں قومی گیت کے طور پر مسلمانوں کا ''وندے ماترم پڑھنا''، یا کسی بھی سیکولر ملک میں مسلمانوں کا ایسا قومی گیت پڑھنا جس میں سرزمین وطن کو معبود کا درجہ دیا گیا ہو، جائز نہیں ہوگا، مسلمانوں کو خود اس کے پڑھنے سے رکنا چاہئے، اور اپنے گھر والوں کو اس کے نہ پڑھنے کی تاکید کرنی چاہئے، کیونکہ اس کا پڑھنا کلمہ شرک زبان سے ادا کرنے کے برابر ہے، اگر مسلمان اپنے طور پر کسی سیاسی جلسہ کا انعقاد کریں تو ان کو یہ گیت اپنے پروگرام میں نہیں رکھنا چاہئے، اگر غیر مسلم، سیاسی یا سرکاری تقریب میں پڑھ رہے ہوں، تو اگر گنجائش ہو تو بیٹھ کر اپنا اختلاف ظاہر کرنا چاہئے، ورنہ کم از کم خاموش کھڑے رہنا چاہئے، اور دل میں کلمہ ایمان ادا کرتے رہنا چاہئے۔

ج: ہندوستانی عدالت کا فیصلہ:

جن مسائل میں سبب شرعی کا وجود کافی نہیں، بلکہ قاضی کا فیصلہ اور حکم ضروری ہے، ان مسائل میں غیر مسلم ججوں کا فیصلہ معتبر نہیں ہوگا، قاضی کا فیصلہ ضروری ہوگا، مثال کے طور پر غیر مسلم جج کا فسخ نکاح درست نہیں ہوگا، بلکہ شرعی دار القضاء سے رجوع ہونا پڑے گا، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ عائلی معاملات کو ہندوستانی عدالت کے پاس لے جانے کے بجائے دار القضاء میں شریعت کے مطابق حل کرائیں۔ نیز ہندستانی مسلمانوں خصوصاً آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو چاہئے کہ دستوری طور پر اپنے ملک میں اپنا موقف مسلمہ مذہب اور تہذیبی وجود کے حامل (Recognised Religious and Cultural Entity) کے طور پر منوالیں، اور اپنے عائلی قوانین جیسے: نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ اور دیگر مذہبی امور کے سلسلہ میں ملک کے دستوری ڈھانچہ کے اندر تہذیبی و مذہبی خود مختاری (Religious and cultural autonomy) کے حامل بن جائیں، اس طرح دستوری و قانونی انتظام کے بعد ملکی عدالتوں میں مسلم پرسنل لا آف کورٹ قائم کرانے کی گنجائش ہوسکتی ہے، اور اس میں مسلم قاضی اور ماہرین قانون اسلامی متعین کئے جاسکتے ہیں۔

محور چہارم

الف- اسلام ہی راہ نجات:

آج بہت سے صلح پسند غیر مسلم یہ کہتے ہوئے ملتے ہیں کہ مذاہب اللہ تک پہنچنے کے الگ الگ راستے ہیں، سب کی منزل ایک ہی ہے، بہت سے مسلمان بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، بعض مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ باہمی اتحاد و یکجہتی کو باقی رکھنے اور فسادات سے بچنے کے لئے اس طرح کی بات کہی جاسکتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی بات کرنا ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں، اس طرح کی بات کرنے والے تہذیبی انضمام کی فکر کے آلہ کار ہورہے ہیں، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے اسلامی اصولوں کو مسخ نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام سب سے منفرد، انسانیت کا نجات دہندہ اور برحق مذہب ہے، دوسرے مذاہب باطل اور اللہ کے نزدیک نامقبول ہیں، اسلام کا راستہ جنت کی طرف لے جانے والا اور اللہ تک پہنچنے والا ہے، دوسرے مذاہب کے راستے جہنم کی طرف جانے والے اور شیطان تک پہنچنے والے ہیں، اس بارے میں قرآن وحدیث کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا: ''یہ اللہ کا راستہ ہے'' پھر اس خط کی سیدھی اور بائیں جانب چند خطوط کھینچے اور فرمایا: یہ چند راستے ہیں، ان میں سے ہر ایک راستہ پر ایک شیطان ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے، پھر یہ آیت تلاوت فرمائیں: "وإن هذا صراطي مستقيما فاتبعوه" (یہ میرا سیدھا راستہ ہے، اسی کی پیروی کرو) (رواہ احمد والنسائی، الدارمی بحوالہ مشکاۃ)۔

ب- پس ماندہ طبقات کے تئیں مسلمانوں کا رویہ:

پس ماندہ طبقات جن کو برہمن سماج میں اچھوت کا درجہ حاصل ہے، اور آج بھی انہیں انتہائی حقیر سمجھا جاتا ہے، مسلمانوں کو ایسے طبقات کے ساتھ نرمی، ہمدردی اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کرنا چاہئے، مسلمانوں کو ان کی تحقیر کرنے سے بچنا چاہئے، اسلام نے انسانی مساوات کا جو درس دیا ہے، اور سماج میں ہر ایک طبقہ کو یکساں طور پر زندگی گزارنے کا جو حق دیا ہے اس سے انہیں واقف کرانا چاہئے، ضرورت پڑنے پر ان کی مدد اور حمایت کرنی چاہئے، فلاحی کاموں میں انہیں شریک کرنا چاہئے، انہیں اسلام سے قریب کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور حکیمانہ انداز میں انہیں اسلام کی دعوت دینی چاہئے، غرض حکومت نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں میں جس قدر استطاعت ہو ایسے طبقات کو انصاف دلانے کی کوشش کرنی چاہئے، ان کے ساتھ نرمی، ہمدردی اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہئے،

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: "لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم. إن الله يحب المقسطين" (سورۂ ممتحنہ/۸)

(اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا، جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے، اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں)۔

حدیث میں ہے:

''عن أبي هريرة عن النبي ﷺ: الساعي على الأرملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله، وأحسبه قال: وكالقائم الذي لايفتر وكالصائم لايفطر'' (بخاری ۱/۳۶۶، مسلم: ۲۹۸۲)

(سیدنا ابو ہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ضرورت منداور مسکین کی خاطر دوڑ دھوپ کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے''، میں سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: اور وہ ایسے نمازی کی طرح ہے جو کبھی نماز ختم نہ کرے، اور ایسے روزہ دار کی طرح ہے جو افطار نہ کرے)۔

ج-خدمت خلق کے ادارے:

خدمت خلق کے اداروں کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا بہتر نہیں ہے، بلکہ بلا تفریق مذہب تمام لوگوں کے لئے خدمت و اعانت کے دروازے کھلے رکھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفات بیان کی ہیں:

"ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما وأسیرا، إنما نطعمکم لوجه الله لانرید منکم جزاء ولا شکورا" (سورۂ دھر/۹)

(اور وہ لوگ (محض) اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں، (اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو محض اللہ کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ (زبانی) شکریہ)۔

اگر ہم غیر مسلم ضرورت مندوں کے لئے اعانت کا دروازہ بند کردیں، تو یہ ہمارے لئے مناسب نہیں ہوگا، اور یہ مومنانہ صفات کے خلاف ہوگا۔

د-آفت سماوی کے وقت راحت رسانی:

آفت سماوی جیسے زلزلہ، سیلاب اور وبائی امراض جیسی عام مصیبت کے وقت بھی بعض فرقہ پرست عناصر امداد اور راحت رسانی کے کاموں کا مظاہرہ کرتے ہوئے پائے گئے ہیں، ایسے موقع پر امداد و راحت رسانی انجام دینے والی مسلم تنظیموں کو چاہئے کہ وہ تعصب کا مظاہرہ تو نہ کریں، مگر اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ جو لوگ تعصب کا شکار ہوئے ہیں اور امداد سے بالکل محروم رہے ہیں، پہلے ان تک امداد پہنچانے کی کوشش کریں۔

❖❖❖

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا عبد الرشید قاسمی (جونپور)

۱- الیکشن یا انتخابات:

الیکشن چناؤ کو کہتے ہیں، اور یہ جملہ اب محاورہ بن گیا ہے (فیروز اللغات: ۱۳۰)۔

جمہوری حکومت کے لئے الیکشن خشت اول ہے، اگر بغیر الیکشن کے چند افراد نظام حکومت چلائیں تو آج کی اصطلاح میں ایسی حکومت جمہوری، عوامی، قومی نہیں ہوگی بلکہ آمریت کی ایک نئی شکل ہوگی۔

ووٹ:

ووٹ کا معنی کسی معاملہ کے لئے رائے دینا، عوامی نمائندوں کے انتخاب کے لئے تحریری اظہار رائے کی پرچی دینا وغیرہ ہے۔

(موصوف نے تقریبا چار صفحات میں ووٹ کی شرعی وملی حیثیت اور اس کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے ان عناوین کے تحت مفصل گفتگو کی ہے: ووٹ، ووٹ ایک رائے، ووٹ ایک امانت، ووٹ دینے میں غلطی ہوجائے، ووٹ ایک شہادت، ووٹ ایک سفارش، ووٹ ایک وکیل، ووٹ ایک سیاسی بیعت، ملی مسائل، ہجرت حبشہ، حلف الفضول او معاہدی یہود وغیرہ)۔

الف- مسلمان کو موجودہ جمہوری نظام پر مطمئن نہیں ہونا چاہئے اور اس کے دل میں ہمیشہ یہ آرزو رہنی چاہئے کہ اس زمین پر بھی خدائی حکمرانی نافذ العمل ہو اور کبھی وہ گھڑی ضرور آئے جس کے علم بردار خلفائے راشدین تھے، پس بدرجہ مجبوری جمہوری نظام قبول کیا جائے، کیونکہ غیر مسلموں کی مذہبی حکومت سے جمہوری حکومت دینی اور ملی اعتبار سے کم مضر ہے، بلکہ آج کے حالات میں ضروری ہے، ورنہ مسلمانوں کے سیاست سے کنارہ کش ہونے کی صورت اور سیاسی حقوق حاصل نہ کرنے میں خطرہ ہے کہ مذہبی اور قومی سطح پر مسلمان نت نئی مشکلات میں گھر جائیں گے، آئینی اداروں میں جو آوازیں ان کے حق میں اٹھتی رہتی ہیں وہ خاموش ہوجائیں گی، مسلمان مذہبی، تعلیمی، تبلیغی اور معاشرتی نیز اقتصادی حقوق کی حفاظت کرنے سے محروم ہوجائیں گے، پس معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے الیکشن میں حصہ لینا ووٹ دینا، امیدوار ہونا اور انتخابی مہم چلانا صحیح ہے۔

ب- ووٹ دینا شرعا واجب ہے:

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت، امانت، سفارش، وکالت اور سیاسی بیعت کی سی ہے، گواہی نہ دینا، غلط طریقے سے دینا، ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا اور امانت میں خرد برد کرنا حرام ہے۔

قرآن کریم میں ہے: "فإن أمن بعضكم بعضا فليؤد الذي اؤتمن أمانته وليتق الله ربه ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فإنه آثم قلبه" (سورۂ بقرہ/ ۲۸۳)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من كتم شهادة إذا دعي إليها كان كمن شهد بالزور" (جمع الفوائد: ۱/ ۶۲)

(جس کسی کو شہادت کے لئے بلایا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ألا أخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادة قبل أن يسئلها" (ایضا ۳۶۱)

(کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے، وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کردے)، ووٹ بھی بلاشک وشبہ ایک شہادت ہے، قرآن وسنت کے تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، انتخابات سے مسلمانوں کے ملی ومذہبی مفادات بھی متعلق ہوتے ہیں جس کا مشاہدہ ہے،

لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ کا صحیح استعمال کریں۔

ج-فرقہ پرست جماعتیں:

تنظیم، جماعت اور پارٹی بعد میں بنتی ہے، اس کی بنیاد وہ مرکزی نقطہ ہوتا ہے جس کے اشارہ پر تنظیم جنبش کرتی ہے، کبھی کسی ممبر کا مسلمانوں کے ساتھ مناسب رویہ ہو تو اس سے ان کی جماعتی فکر اور وفاداری پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ عصری سیاست کا یہ کمال ہے، ہندوستان میں جو تنظیمیں اسلام اور مسلمانوں کے حسد میں جھلس رہی ہیں، مفکر اسلام مولانا علی میاں صاحبؒ نے ان کی نبض شناسی یوں کی ہے: ''اس کا اصل مزاج اور اس کے وعدے اور ارادے نہیں بدلے، وہ اکثریت کے نہ صرف سیاسی وانتظامی اقتدار بلکہ ثقافتی، تہذیبی، تعلیمی، لسانی اور ایک حد تک اعتقادی اقتدار بلکہ انقلاب کی قائل و داعی اور ایک طرح سے تہذیبی، ذہنی، نسل کشی کی قائل ہے، اور اس کے لئے بتدریج عمل کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے، اس میں یونیفارم سول کوڈ، تعلیم گاہوں میں زبان اور رسم الخط کا تغیر، ہندو علم الاصنام، اجودھیا مندر کی تعمیر وغیرہ شامل ہیں، موجودہ وزیر اعظم کی ثناء گوئی یوں کی گئی، آپ خلیق ہیں، نرم مزاج ہیں، مسلمانوں کے بھی خیر خواہ ہیں اور سیکولرزم کے پابند ہیں، جناب آج بھی بزعم خود جمہوری اصولوں کے کاربند ہیں، ان کی سینہ زوری کو حضرت مفکر اسلام رحمۃ اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے: خود اٹل بہاری باجپئی نے اپنے انٹرنیٹ کے ایک مضمون میں اس بات کا فخریہ اعلان کیا ہے کہ ان کی رگوں میں جو روح کارفرما ہیں وہ آر ایس ایس کی پروردہ ہے'' (کاروان زندگی ۷/ ۱۱۵، ۱۱۶)۔

یہ فرقہ پرست جماعتیں کبر و نخوت اور مسلم دشمنی کی شکار ہیں، پس اس طرح کی جماعت اور اس کے ممبران کو ووٹ دینا ظلم کرنے کے مرادف ہے۔

بدی اور ظلم پر مدد کرنے کی اجازت نہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"۔ ع

لامہ ابن کثیرؒ نے بروایت طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کے لئے چلا وہ اسلام سے نکل گیا''۔

تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ "فلن أكون ظهيرا للمجرمين" کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ؟ اور ان کے مددگار، یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظلم کے دوات، قلم کو درست کیا ہے، وہ سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کر کے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے'' (معارف القرآن ۲۵-۳)۔

یہ فرقہ پرست پارٹیاں ظالم ہیں، ان کے مظالم روز روشن کی طرح عیاں ہیں، ان وعیدوں کے بعد بھی کس کی ہمت ہے کہ وہ ان کے قریب ہوں، اس کے بعد بھی ووٹ دیتا ہے، یا ممبری قبول کرتا ہے تو عنداللہ ماخوذ ہوگا، نیز ووٹ دینے میں ملت اسلامیہ کے لئے مضرت ہے جس کا ہمیں مشاہدہ ہے، لہٰذا جن جماعتوں کا مطمح نظر ملت اسلامیہ کو ذلیل اور ختم کرنا ہے، انہیں ووٹ دینا یا ان کی جماعت میں شریک ہونا درست نہیں۔

د-غیر مسلم سیاسی جماعتوں میں شرکت:

ہر وہ معاملہ جس میں ملی، مذہبی، تعلیمی اور اقتصادی فوائد ہوں ان کے لئے غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے اور ان میں شرکت درست ہے، چونکہ ان پارٹیوں کے منشور میں بھی یہی باتیں ہوتی ہیں، تو پھر یہ معاہدے خیر میں تعاون کے مثل ہوں گے، اور ہمیں تعاون کا حکم ہوا ہے: "وتعاونوا علی البر والتقوی"، محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ یہود اور حلف الفضول سے مقصود یہی تھا، ہمارے اسلاف نے کانگریس میں شرکت انہی اغراض سے کی تھی۔

ھ-انسانیت کی بہتری کی تدبیر کرنا:

"وتعاونوا علی البر والتقوی" اللہ تعالی نے غیروں سے معاملہ کرنے کے اہم قاعدہ اور اصول بتائے ہیں، علامہ رشید رضا مصریؒ فرماتے ہیں:

''البر اسم لمجموع ما يتقرب به إلى الله تعالى من الإيمان والأخلاق والآداب والأعمال وكل واحد منها يعد خصلة أو شعبة من البر'' (تفسیر قرآن ۱۸۳۹)

(بر، ان اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جس کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی حاصل کی جاتی ہے، نیکی، ایمان، اخلاق، آداب اعمال میں ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک بہترین عادت اور نیکی کا شعبہ شمار ہوتا ہے)، خلاصہ یہ کہ بر بہت جامع مفہوم رکھتا ہے، نیکی کی چھوٹی بڑی قسم اس کے اندر آ جاتی ہے، پس معلوم ہوا کہ ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کی جاسکتی ہیں جن میں مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ فلاحی کاموں میں تعاون کر سکتے اور لے سکتے ہیں۔

۲-(الف) مخلوط آبادی:

مشترکہ آبادی اختیار کرنے میں دو مسئلے پیدا ہوں گے: ایک اسلامی تعلیمات واخلاق کی قولاً عملاً تبلیغ کرنا، دوسرا مسئلہ ہماری نسلوں پر غیر اسلامی تہذیب کا اثر پڑنا، دونوں مسئلے اہم ہیں، لہذا غیر مسلموں میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ انہیں اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا اور جو مسلمان وہاں مقیم ہیں انہیں شریعت کے احکام بتلائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا، اس نیت سے رہائش اختیار کرنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے، حضرت مفکر اسلامؒ اسی کے قائل اور داعی رہے، چنانچہ اس آیت کریمہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"یا ایها الذین آمنوا ان تتقوا الله یجعل لکم فرقانا ویکفر عنکم سیئاتکم ویغفر لکم والله ذو الفضل العظیم" (انفال:۲۹)

(اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے اور تقوی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے اندر ایک شان امتیازی پیدا کردے گا اور اللہ بڑا فضل والا ہے)۔

حیرت اور بڑی ندامت اور تاسف کی بات ہے کہ مسلمان کسی ملک میں اتنی بڑی تعداد میں موجود ہوں اور اس ملک کے باشندوں پر اثر نہ پڑے اور زندگی ایک ہی رخ پر چلتی رہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم نے "ان تتقوا الله" پر پورا عمل نہیں کیا، آگے فرماتے ہیں کہ بعض ملکوں میں جن میں مسلمان تھوڑی تعداد میں بھی پہنچے ہیں ان میں انقلاب آ گیا، ترکی، اسپین، اور افریقہ کے کتنے ملکوں میں قوت ووسعت کے ساتھ اسلام پھیلا اور ان ملکوں کا صدیوں تک کا طرز زندگی بدل ڈالا۔

نیز فرماتے ہیں: ''ہندوستان بہر حال ہمارا وطن ہے، ہم کو اللہ نے یہاں پیدا کیا ہے اور ہمارے لئے اس سرزمین کا انتخاب کیا، آدمی کو اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے، یہ ہمارا گھر ہے، اس میں ہمیں ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے کہ جس سے لوگوں کی اصلاح ہو، بلکہ زندگی میں انقلاب آئے، تمام دنیا میں جو اندھیرا ہو رہا ہے اس میں کمی ہو، ظلم بند ہو، خدا کا خوف عام ہو، انسانیت کا احترام پیدا ہو'' (کاروان زندگی ۲۶۰-۷)۔

یہ بھی صحیح ہے کہ جوار اور تہذیب کا اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مدنی آقا نے یوں فرمایا:

''من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله'' (ابوداؤد ۱/ ۳۸۵)

(جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے)، عرف عام میں موافقت دوسرے کی بات کی تائید اور اس کا طرز عمل اختیار کرنے کو کہتے ہیں، اب ارشاد نبوی کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص مشرکین کا ہم خیال اور ان کے طرز عمل اور بود وباش کو اختیار کرتا ہے اس کا شمار مشرکین میں ہوگا، اس مؤمن میں شمار نہیں ہوگا جو دعوت اسلامی اور تعلیمات نبوی کی تبلیغ کے لئے مشرکین کے مابین رہائش اختیار کرتا ہے۔ ایک طرف تعلیمات اسلامی کی تبلیغ اور دوسری طرف تہذیبی اثر بظاہر دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ایسا نہیں ہے، کیونکہ ہمارے ذہن میں یہ کیوں آیا کہ ہماری نسل غیر اسلامی تہذیب کا شکار ہوجائے گی ہمارے ذہن نے اس کی ہدایت کیوں نہ کی کہ تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ایک پر کشش معاشرہ تشکیل دیں، اس میں ہماری نسل صوم وصلاۃ کی پابند ہو اور غیر مسلم بھی راحت کی سانس لیں، اگر بالفرض ایک علاقہ مخصوص کرلیں اور ہمارا مزاج تعلیمات نبوی میں ڈھل نہ سکے تو نسل کا مسئلہ دور اپنی خیر منانا پڑے گا، لہذا علاحدہ رہائش کی فکر کے بجائے مخلوط آبادی میں تعلیمات نبوی پر عمل کرنا چاہئے اور خوشگوار ماحول میں حکمت ومصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کی کوشش کرتے رہنا چاہئے، اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری نسل انشاء اللہ ان کی تہذیب سے محفوظ رہے گی۔

ب-غیر مسلموں کے جنازے میں شرکت اور ان پر قرآن خوانی کرنا:

"ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين ولو كانوا اولي قربى من بعد ما تبين لهم أنهم أصحاب الجحيم" (توبہ/۱۳)

(نبی اور جو مؤمنین ہیں ان کے لئے جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں، جب ان پر ظاہر ہو چکا کہ وہ اہل دوزخ ہیں) اور ارشاد ہے: "وما كان استغفار ابراهيم لأبيه إلا عن موعدة وعدها إياه فلما تبين له أنه عدو لله تبرأ منه" (سورۂ توبہ: ۱۱۴)۔ (اور ابراہیم کا اپنے باپ کے حق میں دعا مغفرت کرنا تو محض وعدہ کے سبب سے تھا جو انہوں نے اس سے کر لیا تھا، پھر جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بے تعلق ہو گئے)، کیونکہ جب موت کفر پر ہوئی تو شائبہ مغفرت بھی نہیں رہا، اس لئے کہ ارشاد باری ہے: "ولا تصل على أحد منهم مات أبدا ولا تقم على قبره" (سورۂ توبہ: ۸۴) (اور ان میں سے کوئی مرجائے اس پر کبھی نماز نہ پڑھئے، اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوئیے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے جلوس جنازہ میں شرکت کرنے، ان کے کریا کرم کے وقت کھڑے ہونے، ساتھ میں چلنے، کندھے دینے، غم کا اظہار کرنے اور ان کے لئے دعاء مغفرت کرنے اور ان پر قرآن خوانی کرنے کی شریعت میں گنجائش نہیں۔

ج-غیر مسلموں کے تحفے:

یہ دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک شادی، بچہ کی پیدائش اور دوکان و مکان کے افتتاح کے موقع پر ایسے تحفے کا لینا جائز ہے۔

''ولا بأس بطعام المجوسی کله إلا الذبیحة فإن ذبیحتهم حرام'' (عالمگیری ۵/۳۴۸)

(سوائے مجوس کے ذبیحہ کے تمام کھانوں میں کچھ حرج نہیں، کیونکہ ان کا ذبیحہ حرام ہے)۔ دوسرا تحفہ جو مندروں، تیرتھ گاہوں اور استھانوں کا چڑھاوا ہوتا ہے، اس کو پرشاد کہتے ہیں، اس کا قبول کرنا اور کھانا حرام ہے، کیونکہ وہ سب "ما ذبح علی النصب" میں داخل ہیں۔

د-غیر مسلموں کے مذہبی امور میں چندہ دینا:

مسلمان کا غیر مسلموں کے مذہبی امور میں چندہ دینا صحیح نہیں، کیونکہ یہ بھی تعاون علی الاثم ہے، البتہ چندہ لینے کی گنجائش ہے بشرطیکہ وہ ثواب یا اجرت کے طور پر دیں، اگر سیاسی غرض یا اس نیت سے چندہ دیں کہ مندروں کی تعمیر یا مذہبی امور میں چندہ لیں گے تو پھر ایسے چندہ کا قبول کرنا جائز نہیں، کیونکہ فی نفسہ چندہ دینا غلط نہیں بلکہ اس چندہ کا استعمال غلط موقع پر کرنا ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں:

''إنه لیس علیها منکرا وإنما المنکر فی استعمالها المحظور'' (۵/۳۴۸)۔

ھ (الف)-غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت:

غیر مسلموں کی تقریبات کئی طرح کی ہوتی ہیں:

۱- مثلاً شادی کی تقریب تو اس میں شرکت کی گنجائش نکل سکتی ہے، کیونکہ شادی کے موقع سے شرکت کی غرض مسرت کا اظہار اور مبارک باد دینا ہے۔

۲- غیر مسلموں کے یہاں بوقت موت بھی تقریب ہوتی ہے، اس میں شرکت کی گنجائش نہیں، قرآن کریم میں ہے: "ولا تصل علی أحد منهم مات أبدا ولا تقم علی قبره"۔ جب قبر پر قیام کی گنجائش نہیں تو شرکت کی اجازت کیوں کر ہو، کیونکہ شرکت میں وقت خرچ ہوگا۔

۳-غیر مسلموں کی موت کے چند دنوں بعد ایک تقریب ہوتی ہے، اس میں قریبی رشتہ دار اور دوست جمع ہوتے ہیں اور تعزیتی کلمات کہے جاتے ہیں، اس تقریب میں شرکت اور تعزیتی کلمات کہنے کی اجازت ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''إذا مات الکافر قال لوالدیه أو قریبه فی تعزیته أخلف الله علیك خیرا منه وأصلحك أی أصلحك بالاسلام ورزقك مسلما لأن خیریة به تظهر'' (۵/۳۴۸) (جب کافر کا انتقال ہو جائے تو اس کے والد یا رشتے دار سے تعزیت کے طور پر یوں کہے: اللہ تم کو اس کا بہترین بدلہ عنایت فرمائے اور تمہاری حالت درست کرے، یعنی اسلام کی توفیق دے کر تمہارا حال درست فرمائے، اور تم کو مسلمان بچہ عنایت کرے، کیونکہ اسی سے بہتری ظاہر ہو سکتی ہے)۔

۴- پوجا پاٹ وغیرہ کی بھی تقریب ہوتی ہے جس میں شرک اور کفر کے افعال اور اقوال انجام دیئے جاتے ہیں اور شرک و کفر اللہ کے نزدیک انتہائی مبغوض ہے: "إن الله لا یغفر أن یشرك به ویغفر ما دون ذلك" (سورۂ نساء: ۱۴۸)۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کی تقریبات جب منکرات سے خالی نہیں ہوتیں تو غیر مسلموں کی تقریبات کا کیا کہنا، ان کی تقریبات کا مطلب لہو ولعب اور افعال کفر و شرک ہوتا ہے، پس غیر مسلموں کی وہ تقریبات جو لہو ولعب اور افعال کفر و شرک پر مشتمل ہوں ان میں شرکت درست نہیں۔

(ب)-تہواروں پر مبارکباد دینا:

"ولئن اتبعت أهواءهم بعد الذی جاءك من العلم ما لك من الله من ولی ولا نصیر" (سورۂ بقرہ/۱۲۰)

(اور اگر آپ بعد اس علم کے جو آپ کو پہنچ چکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے تو آپ کے لئے اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی یار ہوگا اور نہ مددگار)۔

جب امت کو غیر مسلموں کی خواہشات سے اجتناب کا اس قدر صریح حکم ہے تو مبارکباد دینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے، اس لئے کہ مبارکباد دینے کا مطلب ان کی خواہشات کی تائید کرنا ہے، تائید کبھی صراحتاً ہوتی ہے اور کبھی اشارۃً اور مبارکباد دینا اشارۃً تائید ہے، پس مبارکباد دینا جائز نہیں۔

۳-(الف) پرچم کشائی اور سلامی:

پرچم کشائی اور سلامی دو نیتوں سے ہوگی، پرچم کشائی اگر بندگی کے طور پر کی گئی تو حرام ہے، کیونکہ بندگی صرف اللہ پاک کی ہوگی۔

"یا ایہا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون" (سورۂ بقرہ ۲۱/۸)

(اے انسانو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے قبل والوں کو، عجب نہیں کہ تم پرہیزگار بن جاؤ)، آیت ربانی سے اس امر کا اظہار ہوا کہ بندگی صرف اللہ رب العزت کی ہوگی، کیونکہ اللہ نے ہی نیست سے ہست اور عدم سے وجود بخشا، اس میں اس کا کوئی معاون نہیں، پھر بندگی کسی اور کی کیوں؟ اسلام نے صرف طواف کعبہ کے لئے اور حجر اسود کے بوسہ دینے کے لئے اور سلامی کے لئے قیام کی اجازت دی ہے، اس لئے تکریم واحترام کی منشاء سے بھی سلامی اور قومی پرچم کشائی کی گنجائش نہیں، خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ حج کے لئے تشریف لائے، حجر اسود کے بوسہ دینے کے بعد فرمایا:

''إني لأعلم أنك حجر لا تضر ولا تنفع ولولا أني رأيت النبي ﷺ يقبلك ما قبلتك'' (بخاری ۱/ ۲۱۷)

(میں بخوبی جانتا ہوں کہ تو پتھر ہی ہے نہ نقصان دے سکتا ہے اور نہ نفع، اگر میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا)۔

البتہ بوقت پرچم کشائی دیکھا دیکھی کھڑا ہوا تو عالمگیری سے اس جزئیہ سے پرچم کشائی اور سلامی کے لئے قیام کی اجازت نکل سکتی ہے:

''إذا دخل ذمي على مسلم فقام له إن قام طمعا في إسلامه فلا بأس به''

(اگر کوئی کافر مسلمان کے پاس آئے اور مسلمان اس کے اسلام قبول کرنے کی امید پر کھڑا ہو تو کوئی حرج نہیں)، لیکن ظاہراً مشابہت اور بھیڑ میں باعث اضافہ ہوگا، اسلام اپنے چاہنے والوں پر ایک الگ رنگ کا طالب ہے جس میں کسی رنگ کی مماثلت نہ ہو، ارشاد باری ہے:

"صبغة الله ومن أحسن من الله صبغة ونحن له عابدون" (سورۂ بقرہ: ۱۳۸)

(اللہ کا رنگ ہے اور اللہ سے بہتر کون رنگ ہے، ہم تو اسی کی بندگی کرنے والے ہیں)، لہٰذا شرعی نقطہ نظر سے پرچم کشائی اور سلامی صحیح نہیں۔

ب-مشرکانہ ترانے:

مشرکانہ گیت اور ترانے کو مشرکانہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں مخلوق کو خالق کا مقام دے دیا گیا، حالانکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

"ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا" خطاب عام نوع انسانی سے ہے، ان سے ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ تم خود ہی ساری کائنات ارضی کے مقصود ومطاع ہو پھر یہ کیسی حماقت کہ تم اور کسی مخلوق کو مقصود ومطاع بنالو، آیت ہر قسم کی شرک، ہر قسم کی مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دینے کے لئے کافی ہے۔

علامہ رشید رضا مصریؒ فرماتے ہیں: ''والأنداد عند جمهور المفسرين أعم من الأصنام والأوثان فيشمل الرؤساء الذين خضع بعض الناس خضوعا دينيا'' (تفسیر قرآن ۱/ ۷۸،۷۷،۷۶،۷۴)

(جمہور مفسرین کے نزدیک انداد اصنام سے عام ہے اس کے معنی میں سرداران قوم بھی شامل ہیں)۔

مذکورہ آیات اور تفسیری آراء سے ثابت ہوا کہ جن اشعار، گیت اور القاب وآداب میں شرک پایا جائے ان کا پڑھنا اور استعمال کرنا جائز نہیں، پس وندے ماترم کے پڑھنے کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے بلکہ اس کے لئے قیام کی بھی اجازت نہیں۔

(ج) غیر مسلم کے فیصلے:

"فإن تنازعتم في شئ فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير وأحسن تأويلا" (نساء/۵۹)

(پھر اگر تم میں باہم اختلاف ہو جائے کسی چیز میں تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا لیا کرو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی بہتر ہے، اور انجام کے لحاظ سے بھی خوشتر ہے)۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں:''ومنها الإسلام إلى قوله لأن القضاء من باب الولاية بل هو أعظم الولايات وهؤلاء ليست لهم أهلية أدنى الولايات وهي الشهادة فلأن لايكون لهم أهلية أعلاها أولى'' (بدائع الصنائع ۳/۷)

(آداب قاضی میں سے یہ ہے کہ قاضی مسلمان ہو، کیونکہ قضاء باب الولایات میں بڑی ولایت ہے اور بچے اور کافر ادنی ولایت کے بھی اہل نہیں اور ادنی ولایت شہادت کا درجہ ہے، پس یہ لوگ اعلی درجہ کی ولایت کے بدرجہ اولی اہل نہیں)۔

پس عبارت بالا سے ثابت ہوا کہ قاضی کو مسلمانوں پر ولایت عامہ حاصل ہے اور کافر کو مسلمانوں پر ولایت حاصل نہیں، نیز اگر دونوں فریق مسلمانوں ہوں تو انہیں کافر کو حاکم بنانا جائز نہیں اگر بنایا تو گنہگار ہوں گے، ارشاد باری ہے:"لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين ومن يفعل ذلك فليس من الله في شيء إلا أن تتقوا منه تقة" (سورۂ آل عمران:۲۸) (ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو حاکم نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے یہاں کسی شمار میں نہیں مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کچھ اندیشہ رکھتے ہو)۔

صاحب کشاف اور صاحب بیضاوی نے اندیشہ کی وضاحت یہ کی ہے: "إلا أن تخافوا من جهتهم أمرا يجب اتقاؤه" (مگر جب کہ تمہیں ان کی طرف سے کسی ایسی بات کا ڈر ہو تو اس سے بچنا ضروری)، پس معلوم ہوا کہ بخوشی کافر کو ثالث مقرر کرنا جائز نہیں الایہ کہ ضرر کا اندیشہ ہو، اگر فریقین مسلمان ہیں تو ان کے لئے عرفی عدالتوں میں جانا جائز نہیں اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک گیا تو بوقت مجبوری ثانی کا بھی جانا جائز ہوگا، کیونکہ فریق ثانی کی عدم حاضری کی صورت میں سزا ہوگی، اور دونوں فریقوں میں سے جس کے حق میں فیصلہ ہوا تو اگر شرعی طور پر حق دار ہے تو اس حق کا لینا صحیح ہے اور اگر کافر حاکم نے نامعتبر اور ناکافی شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کر دیا تو جس کے حق میں یہ فیصلہ ہوا ہے وہ دیانۃً نافذ نہیں ہوگا (تفسیر قرآن ۱/ ۲۰۳)۔

۴- (الف) منزل ایک ہی ہے:

یہ کہنا کہ راستے الگ الگ ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے عہد نبوی میں بھی مشرکین اسی جیسی بے ہودہ باتیں کرتے تھے، صاحب معالم التنزیل فرماتے ہیں:

''قال مقاتل يعني مشرك العرب كذلك قالوا في نبيهم وأصحابه أنهم ليسوا على شيء من الدين'' (تفسیر قرآن ۱/ ۲۲۲)

(امام مقاتل فرماتے ہیں کہ اسی طرح مشرکین عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے بارے میں کہتے کہ یہ لوگ کسی مذہب پر نہیں)، ایمان والوں کی زندگی اصول پر مبنی ہوتی ہے اور یہ اصول اور ضوابط بواسطہ نبی حجۃ الوداع کے موقع پر مکمل کئے گئے اور آپ کی ۲۳ سالہ عملی زندگی اصول وضوابط کے لئے سنگ میل ہے، پھر اسلام اور افکار باطلہ دونوں کی منزل ایک کیوں کر ہوگی، لہذا یہ کہنا کہ راستے الگ الگ ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے اسلامی نقطہ نظر سے ایک غلط بات ہے، مسلمانوں پر لازم ہے کہ عملاً وقولاً اس کی تردید کریں۔

(ب) ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا:

ارشاد ربانی ہے:"فلولا كان من القرون من قبلكم أولو بقية ينهون عن الفساد في الارض الا قليلا ممن انجينا منهم واتبع الذين ظلموا ما اترفوا فيه وكانوا مجرمين" (سورۂ هود/۱۱۶)

(جو امتیں تم سے پہلے گذر چکیں ہیں ان میں ایسے باشعور انسان کیوں نہ ہوئے جو ملک میں خرابی پھیلانے سے روکتے، ہاں ایسے تھوڑے سے تھے جن کو ہم نے ان میں سے مخلصی بخشی اور جو ظالم تھے ان ہی باتوں کے پیچھے لگے رہے جن میں عیش وآرام تھا اور وہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے)، پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں پر اخلاقی بگاڑ اور مالی استحصال اور کمزوروں پر مظالم اور رسوم ولوازم کا احتساب ضروری ہے۔

نیز ارشاد ہے:"كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" (سورۂ آل عمران/۱۲۰)

(تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہیں، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)، ملت اسلامیہ پر لازم ہے کہ مظلوموں کی اعانت کریں یہ ان کا ایک مذہبی فریضہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''انصر أخاك ظالما أو مظلوما، فقال رجل يا رسول الله أنصره مظلوما كيف أنصره ظالما، قال: تمنع من الظلم فذلك نصرك إياه'' (مسلم ۲/ ۳۲۰) (اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم، سائل نے عرض کیا اللہ کے رسول

مظلوم کی مدد کر سکتا ہوں ظالم کی مدد کا کیا طریقہ ہے، فرمایا: ظلم سے روک دو یہی تمہاری ظالم کے ساتھ مدد ہے)۔

لہذا غیر مسلموں کا وہ طبقہ جو غیر مسلموں ہی کی اعلی ذاتوں کے ظلم کا شکار ہے اس کی اعانت کی جائے، بلا اس کی فکر کئے ہوئے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں زمام حکومت ہے یا نہیں، مگر عصری سیاست پر بھی نظر رہنی چاہئے کہ اعلی ذات والے ہماری اعانت کا مقصد کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں۔

ج: خدمت خلق کے لئے اداروں کا قیام:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اطعموا الجائع وعودوا المريض وفكوا العانى'' (بخاری ۲/ ۸۴۳)
(بھوکے کو کھانا کھلاؤ، بیمار کی عیادت کرو، قیدی کو قید سے چھڑاؤ)۔

حدیث پاک میں خدمت خلق کی تین صورتیں بیان ہوئیں:...... ۱- بھوکوں کو کھانا کھلانا، ۲- بیمار کی مزاج پرسی کرنا، ۳- کوئی ناجائز مقدمات میں گرفتار ہو تو اسے چھڑانا، اللہ نے حیثیت دی ہو تو اس کی ضمانت کرادے، موقع پر پیسہ خرچ کردے۔

حدیث پاک سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خدمت کی صورت میں یہ نہ دیکھا جائے کہ مبتلا بہ کی فکر کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''الراحمون يرحمهم الرحمن ارحموا من فى الأرض يرحمكم من فى السماء'' (مشکوۃ ۲/ ۴۲۳)
(اللہ رحم کرنے والوں پر رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا)۔

''ارحموا من فى الارض'' میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ کوئی بھی مخلوق ہو اس پر بھی رحم کیا جائے، لہذا اسپتال وغیرہ کو مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس خدمت خلق میں ملت اسلامیہ پر بھی یکساں توجہ رہے۔

د- ریلیف کی تقسیم:

ریلیف کمزور، مظلوم اور مصیبت وآفت زدہ لوگوں کی خدمت کا ایک بڑا ذریعہ ہے، عصر حاضر میں امداد اور تعاون کے نام سے بڑے بڑے ادارے قائم ہو چکے ہیں، موجودہ حالات میں کہ فرقہ پرست تعاون کرنے میں مذہب، ملت اور فکر کے زاویہ سے نگاہ ڈالتے ہیں، پھر مصیبت زدہ کی مصیبت پر نظر عنایت کرتے ہیں، یہ ان کا ظرف، ان کی تعلیم اور ان کی ہی تربیت ہوتی ہے، انہیں ان کی تربیت گاہوں سے فرقہ پرستی کا چشمہ لگا کر بھیجا گیا ہے، وہ اس چشمے سے مسلمانوں کو تعاون کا مستحق نہیں سمجھتے، بلکہ ایسا بھی ہوا کہ مسلمانوں کے نام پر آئی ہوئی امداد کو ہڑپ لیا اور اپنے ووٹروں پر تقسیم کردیا، یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ ہمارا ظرف یہ ہونا چاہئے کہ مذہب وملت سے ماوراء ہو کر پریشان حال کی پریشانی کو دور کریں، ہمیں ہر وقت اپنے نبی ﷺ کی اس بے مثال ہدایت پر عمل کرنا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من يسر على معسر يسر الله عليه فى الدنيا والآخرة'' (مشکوۃ)
(جس شخص نے کسی تنگ دست کے لئے آسانی کی اللہ دنیا وآخرت میں اس پر آسانی فرمائے گا)۔

پس مسلم تنظیموں کا رویہ برادران وطن کے ساتھ ہمدردانہ اور اخوت وتعاون کا ہونا چاہئے، ورنہ پھر فرقہ پرست اور مسلمانوں میں کس بات کا امتیاز ہوگا؟۔

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی
(رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

ابتدائیہ:

اسلام نے انسان کو خواہ وہ جس مذہب اور جس ملک سے تعلق رکھتا ہو محترم ومکرم قرار دیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"ولقد کرمنا بنی آدم" (سورۂ بنی اسرائیل:۷۰) (بے شک ہم نے انسان (بنی آدم) کو عزت وتکریم بخشی)۔

یہاں سب بنی آدم مراد ہیں، صرف مسلمان نہیں ہیں، مزید ارشاد یوں ہے:

"لقد خلقنا الإنسان في أحسن تقويم" (سورۂ تین:۴) (یقیناً ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا)۔

واضح ہو کہ ہر انسان خواہ کسی بھی مذہب وملت پر ہو اچھی صورت اور عزت وتکریم والا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إن الله خلق آدم علی صورته" (مشکوۃ) (یقیناً اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا)۔

دوسرے لفظوں میں انسان تخلیق الٰہیہ کا شاہکار ہے، لہذا وہ روح کائنات اور اصل حیات ہے، رہا مذہب تو وہ اس کے تشخص کا ذریعہ ہے، جس طرح قوم وقبیلہ تشخص کا ذریعہ ہیں، اسلام اولاد آدم کو وحدت واکائی تصور کرتا ہے، ارشاد ربانی ہے: "هو الذي خلقكم من نفس واحدة" (سورۂ اعراف:۱۸۹) (اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے)۔

قرآن حکیم سراپا رحمت ہے، وہ بلاوجہ انسانوں سے مقاطعت کا حکم نہیں دیتا، وہ تو بنی نوع انسان کو ساتھ لے کر چلنے کا حکم دیتا ہے، اس کا خطاب یٰا یہا الناس (سب لوگوں) سے ہے، "المسلمون" (صرف مسلمانوں) سے نہیں۔

ایک قاعدہ کلیہ:

اگر مسلمانوں سے لڑائی کی جاتی ہے، انہیں گھروں سے نکالا جاتا ہے، یا انہیں گھروں سے نکالنے پر مخالفین کی حمایت کی جاتی ہے تو ایسے لوگوں سے قلبی لگاؤ نہیں ہو سکتا، ان سے لگاؤ ظلم ہوگا، ارشاد خداوندی ہے: "إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم في الدين وأخرجوكم من دياركم وظاهروا على إخراجكم أن تولوهم ومن يتولهم فأولئك هم الظالمون" (سورۂ ممتحنہ:۹) (اللہ تعالی تو صرف تمہیں ان لوگوں سے منع فرماتا ہے جو تم سے دین میں لڑے یا تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یا تمہیں نکالنے پر مدد کی، کہ ان سے دوستی کرو، اور جو ان سے دوستی کریں وہی ظالم ہیں)۔

اب رہی بات ان کی جو نہ مسلمانوں کو مارتے ہیں، نہ گھروں سے نکالتے ہیں اور نہ ہی گھروں سے نکالنے میں کسی گروہ کی مدد کرتے ہیں، تو ان کے لئے یہ حکم ہے، قرآن حکیم اعلان فرماتا ہے: "لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (سورۂ ممتحنہ:۸) (اللہ تعالی تمہیں ان غیر مسلموں سے منع نہیں فرماتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ کرو، بے شک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں)۔

بات واضح ہوگئی کہ دشمن اور مخالفت کرنے والے غیر مسلموں کے علاوہ دیگر سب غیر مسلموں سے ہمیں حسن سلوک اور احسان کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے معاملے میں انصاف کو لازم قرار دیا گیا ہے، دونوں آیات کے بین السطور سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کو صرف اسلام کی وجہ سے مارا جا رہا تھا اور گھروں سے نکالا جا رہا تھا، اس کے علاوہ مسلمانوں کا اور کوئی قصور نہیں تھا، وہ غیر مسلموں سے نہیں لڑ رہے تھے، بلکہ غیر مسلموں کی دہشت گردی کا شکار تھے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم بھیجے گئے سوالات کے جوابات کی طرف آتے ہیں:

۱-الف: دور حاضر میں ووٹ بہت بڑی قوت ہے، اس سے قومی وملی تحفظ کا کام کیا جاسکتا ہے، اور کسی غیر مسلم حکومت کے اندر مختلف طبقات کی زیادتیوں سے بھی بچا سکتا ہے، یہ مسلمانوں کی شدید ضرورت ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں سے بچا جاسکتا ہے اور ضرورت کے پیش آنے پر عمومی احکام بدل جاتے ہیں۔

علامہ وہبہ زحیلی نے اس نظریہ کی اس مقام پر طویل تفصیلات دی ہیں جو قابل مطالعہ ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ جمہوری نظام کئی معاملات میں اسلام سے میل نہیں کھاتا، مگر دیگر نظاموں سے اسلام کے نزدیک تر ہے، لہذا تغیر زمانی سے کچھ احکام کی تبدیلی کا نظریہ بھی اسلام کا مسلمہ نظریہ ہے: ”لا ينكر تغير الأحكام بتغير الزمان“ (زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے احکام کی تبدیلی کا انکار نہیں ہوسکتا)۔

اب جدید حالات میں ایسے ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں نظریہ ضرورت اور تغیر زمانی کی وجہ سے ملت کے مفاد میں الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور انتخابی مہم میں شریک ہونا شرعاً جائز ہوگا، اس طرح وہ اپنے حقوق کا پورا نہیں تو ایک حد تک تحفظ کرسکیں گے، معاشرے میں ان کی ایک آواز ہوگی اور وہ ایک حد تک اسلام کے اچھے اصولوں کو متعارف بھی کرا سکیں گے اور ابنائے وطن کے ساتھ عوامی فلاح وبہبود اور نیکی کے کاموں میں حصہ ڈال سکیں گے، یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

”لا حرج في الإسلام من قيام الدولة المسلمة بالتعاون مع المخلصين من غير المسلمين سواء كانوا من أهل الكتاب أم من غيرهم أتباع الديانات الأخرى وذلك من أجل تحقيق الخير المشترك والدفاع عن المصالح العامة والتعاون على إقامة العدل و نشر الأمن وصيانة الدماء أن تسفك وحماية الحرمات أن تنتهك ولو على شروط يبدو فيها بعض الأحجاف، عملا بالمثل الرائع الذى وضعه لنا الرسول ﷺ في صلح الحديبيه: والله لا تدعوني قريش إلى خطة يسألوني فيها صلة الرحم ويعظمون فيها حرمات الله إلا أعطيتهم إياه“ (نيل الأوطار ۸/ ۳۴، الفقه الإسلامي ۸/ ۶۴۱۸)۔

(اسلام میں کوئی حرج نہیں کہ اسلامی حکومت مخلص غیر مسلموں سے تعاون کرے، وہ غیر مسلم اہل کتاب ہوں یا دوسرے مذاہب کے ماننے والے ہوں، یہ اس لئے ضروری ہے کہ اس طرح مشترکہ بھلائی کے کام متحقق ہوسکتے ہیں اور مصالح عامہ کی تکمیل ہوسکتی ہے، عدل قائم کرنے میں تعاون ہوسکتا ہے، امن پھیل سکتا ہے، خونریزی سے بچا جاسکتا ہے، عزتوں کی بربادی سے بھی بچا جاسکتا ہے، بلکہ ایسی شرطوں پر بھی تعاون ہوسکتا ہے جن میں بظاہر مسلمانوں کی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے، یہ حضور علیہ السلام کی شاندار مثال پر عمل ہوگا، جو آپ علیہ السلام نے صلح حدیبیہ میں ہمارے لئے وضع فرمائی تھی۔ الفاظ یہ تھے: قسم بخدا قریش بھی مجھے جب ایسی بات کی طرف بلائیں گے جس میں وہ صلہ رحمی کے طالب ہوں گے اور اللہ کریم کی حرمتوں کی تعظیم کریں گے تو میں وہ انہیں عطا کردوں گا)۔

جب مسلمان اکثریت میں ہوں تو ان کی حکومت ایسا کرسکتی ہے، اور جب اقلیت میں ہوں تو ان باتوں کے حصول میں وہ غیر مسلم قوت سے بطور اولی تعاون کرسکتے ہیں۔

علامہ موصوف نے اگلے صفحات میں مزید وضاحت فرماتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ایسا تعاون صرف اہل کتاب سے نہیں بلکہ ہر مذہب کے لوگوں سے ہوسکتا ہے (ملاحظہ ہوں: صفحات ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۶۴)۔

ہاں اگر اسمبلی میں ایسا بل پاس ہورہا ہے کہ وہ اسلام کے مسلمہ عقائد کے خلاف ہے تو وہاں اس کے حق میں ووٹ نہ دیا جائے۔

(ب) اگر کوئی مسلم امیدوار انتخاب میں کھڑا ہے تو اسے لازماً ووٹ دیا جائے، غیر مسلم امیدوار کو اس امید پر ووٹ دینا کہ وہ مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ کرے گا، ضروری ہے، غیر جانبدار غیر مسلم کو ووٹ دینا مستحسن ہے، متعصب غیر مسلم جس سے اسلام کی مخالفت اور مسلمان دشمنی یقینی ہو ووٹ دینا حرام ہے، تو غیر مسلم ملک میں ووٹ کے استعمال کی یہ چار صورتیں ہیں، پہلی دو میں ووٹ لازم وواجب ہے، تیسری صورت میں مستحسن ومباح ہے، اور چوتھی صورت میں ممنوع وحرام ہے۔

آپ اگر ووٹ مسلمان کو دے رہے ہیں تو اس کی اہلیت اسلامی نکتہ نگاہ سے جانچی جائے گی، اور آپ اگر ووٹ غیر مسلم کو دے رہے ہیں تو اس کی اہلیت اس طرح جانچیں گے کہ وہ مسلم اقلیت کے کاز کے لئے کس حد تک مفید ہے، جو امیدوار زیادہ مفید ہوگا وہ ووٹ کا زیادہ حقدار اور اہل ہے، یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ عدل و

انصاف کے کام کرنے میں وہ کیسا ہے، رفاہی کاموں میں وہ کس حد تک مفید ہے، عظمتوں اور عزتوں کی حفاظت کرسکتا ہے یا نہیں، عوامی مسائل کے حل میں اس کا کردار کیا ہے، اس جانچ کے بعد آپ اسے ووٹ دیں گے، حکم قرآن پاک ملاحظہ فرمائیں:

"إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل" (سورہ نساء/ ۵۸)

(بے شک اللہ تعالی تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں اہل لوگوں کو دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو)۔

اب جو اہل ہو، انصاف والا ہو وہی ووٹ کی امانت کا حق دار ہوگا۔

(ج)......ایسی جماعتوں کو ووٹ دینا جو اسلام اور مسلمانوں کی سخت مخالف اور دشمن ہیں، جو موقع ملنے پر مسلمانوں کو قتل کرتی ہیں، مال لوٹتی ہیں، عمارات جلاتی ہیں، عصمتیں تباہ کرتی ہیں، شرعاً ناجائز اور حرام ہے، ارشاد ربانی ہے:

"ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار" (سورہ ہود/ ۱۱۳) (ظالموں کی طرف میلان نہ کرو پھر تمہیں آگ چھولے گی)۔

اس حکم خداوندی نے ایک قاعدہ بتادیا کہ ظالم کا ساتھ نہیں دینا ہے، اب غیر مسلم ملکوں میں جن جماعتوں کا شیوہ ہی مسلمانوں کو مارنا، قتل کرنا، عزت لوٹنا، گھر جلانا اور مال تباہ کرنا ہے، وہ ظلم کی انتہا کر رہی ہیں، لہذا ان سے تعاون شرعاً حرام ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان سے تعاون کر کے اپنی تباہی کا سامان کیا جائے۔

رہی یہ بات کہ ایسی جماعتوں کا کوئی ممبر ذاتی طور پر نیک خصلت ہو تو اس سے تعاون کیا جائے یا نہیں؟ تو مسئلہ کی نوعیات الگ ہیں، یہ بات تو واضح ہے کہ وہ اسمبلی میں اپنی پارٹی کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکے گا، اگر وہ اسمبلی تک ہی محدود ہے تو اسے ووٹ دینا ہرگز جائز نہیں ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے حلقہ کے حکام سے رابطہ رکھتا ہے، اس کا اثر ہے اور یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کا تحفظ کرے گا تو پھر اسے ووٹ دینا جائز ہوگا۔

اب تیسری شق کی طرف آتے ہیں کہ کیا مسلمانوں کو خود ایسی جماعتوں میں شامل ہونا جائز ہے، اوپر والی قرآنی آیت کی روشنی میں یہ قطعاً جائز نہیں ہے، بہت سارے غیر مسلم ممالک میں ایسے مسلمانوں کے تعاون کے مثبت نتائج نہیں نکلے ہیں، بلکہ الٹا انہیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے، یہ وہ حقائق ہیں جنہیں دنیا بھر کے مسلمان جانتے ہیں، لہذا ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسا جانے سے اجتناب بہتر ہے۔

(د)......ملی مفادات کے تحت انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے کئے جاسکتے ہیں، ان میں شراکت بھی کی جاسکتی ہے، اور حمایت بھی ہوسکتی ہے، ہم اوپر جز (الف) میں الفقہ الاسلامی ۸/ ۸۴۱۸ کے مصنف علامہ زحیلی کے حوالے سے بات کر آئے ہیں، سید نا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ فرمایا تھا اور جو آپ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا وہ ہم نیل الاوطار علامہ شوکانی ۸/ ۴۴ کے حوالے سے مذکورہ بالا عبارت میں نقل کر چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں علامہ زحیلی کی یہ عبارت بھی ملاحظہ فرماتے چلیں:

"والخلاصة أن الاسلام لايتوانى لحظة واحدة عن سعيه لإقامة علاقات طيبة مع غير المسلمين لتحقيق التعاون البناء في سبيل الخير والعدل والبر والأمن و حماية الحرمات ونحو ذلك" (الفقہ الاسلامی ۸/ ۶۴۲۱)

(خلاصہ کلام یہ ہے کہ یقیناً اسلام ایک لمحہ کے لئے اپنی اس تگ ودو میں سستی نہیں کرتا کہ غیر مسلموں کے ساتھ پاکیزہ رابطے رکھے تاکہ ایسے تعاون کا تحقق ہوسکے، جو خیر کے راستے، عدل، نیکی، امن اور عزتوں کے تحفظ وغیرہ پر مبنی ہو)۔

ان حوالہ جات سے واضح ہوا کہ ہر قسم کے غیر مسلموں سے مسلمانوں کے فائدہ کے لئے تعلقات رکھے جاسکتے ہیں اور ان سے مدد بھی کی جاسکتی، نیز انتخاب کے موقع پر ایسے روابط و مراسم بھی قائم کئے جاسکتے ہیں، شرعاً اس کی اجازت ہے۔

(ھ) اگرچہ اس سوال کا جواب شق (د) میں ضمناً آ گیا ہے، مگر ہم اس کی کچھ مزید وضاحت کئے دیتے ہیں، قرآن حکیم کا ارشاد ہے: "وتعاونوا على البر والتقوى" (سورہ مائدہ: ۲) (اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے سے تعاون کرو)۔

معروف کو پھیلانا، منکر سے روکنا، انسانیت کے نفع کے لئے کام کرنا، معاشرے میں عدل وانصاف اور سلامتی کی فضا قائم کرنا، مریضوں کی دیکھ بھال دواؤں اور رقوم سے کرنا، نادار طلباء کی لباس، کتب اور غذا سے مدد کرنا وغیرہ سب بر (نیکی) میں شامل ہیں اور متقی انسانوں کا یہ شیوہ ہیں۔

اسلام سلامتی، عدل وانصاف، رواداری اور فلاح انسانیت کا مذہب ہے، ہمیں تو جہاد کے دوران میں بھی نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا

ہے، ہم اوپر ذکر کرآئے ہیں کہ میثاق مدینہ اور صلح حدیبیہ میں لوگوں کی بہتری کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود ونصاریٰ اور مشرکین سے معاہدے کئے ہیں۔

علامہ زحیلی فرماتے ہیں: ''أخرج الإمام أحمد وأبوداؤد والنسائي وابن حبان والحاكم عن أنس بن مالك أن النبي ﷺ قال: جاهدوا المشركين بأموالكم وأنفسكم وألسنتكم '' (امام احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مشرکوں سے مالوں، جانوں اور زبانوں سے جہاد کرو) (الفقہ الاسلامی ۳/ ۲۰۱۴)۔

واضح بات ہے کہ استمالت قلبی کے لئے مالی امداد ہوگی، اگر تنظیمیں ہیں تو ان سے تعاون ہوگا، اور مل کر انسانیت کی بہبود کے لئے آگے بڑھنا ہوگا، مسلمان حکومتوں میں ذمیوں سے مل کر مسلمان ایسے سارے معاملات کرتے رہے ہیں تو کافر حکومت کے تحت اسلامی مصلحتوں کے لئے ایسا کرنا بہتر واولی ہوگا۔

انسانیت کی فلاح کے لئے ہم اپنے صدقات غیر مسلموں کو دے سکتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

'' وتحل الصدقة أيضا على فاسق و كافر من يهود ونصراني أو مجوسي، ذمي أو حربي'' (ایضا ۳/ ۲۰۵۷)

(صدقہ فاسق اور کافر کو دینا جائز ہے، خواہ وہ یہودی ہو، نصرانی ہو، مجوسی ہو، ذمی ہو یا حربی ہو)۔

یاد رہے کہ ذمی وہ غیر مسلم ہے جو اسلامی ریاست کی ذمہ داری پر اسلامی ملک میں رہتا ہو، اور حربی وہ غیر مسلم ہے جو غیر اسلامی حکومت کے تحت رہ رہا ہو اور اس غیر اسلامی حکومت سے مسلمان حالت جنگ میں ہوں، غور فرمائیے اگر غیر مسلم حکومت کے تحت ایک غیر مسلم شخص کو صدقہ دیا جاسکتا ہے، جو خالص نیکی اور اسلامی تشخص کا کام ہے تو باقی معاملات جو خالص دنیوی مسئلہ ہیں وہ کیوں نہیں کئے جاسکیں گے؟

صاحب کتاب نے مسئلہ کی وضاحت کے لئے قرآن حکیم سے دلیل لی ہے، ارشاد ربانی ہے:

"ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا" (اور وہ مسلمان اللہ تعالی کی محبت کی وجہ سے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)۔

مسکین اور یتیم تو مسلمان معاشرے میں موجود تھے، اسیر سے مراد تو اس دور میں صرف غیر مسلم جنگی شخص ہی بقول مصنف ہوسکتا ہے۔

صدقہ دیں، کھانا کھلائیں تو پھر دنیوی معاملات کیوں نہ کریں، صرف ضروری بات یہ ہے کہ آپ اپنی انفرادیت اور تشخص کو قائم رکھیں، اکثریت میں جذب نہ ہوجائیں، پھر کچھ اکثریتیں جذب کی مختلف تاریخی ادوار میں بہت شوقین رہی ہیں، لہذا ان کے ساتھ معاملات میں اپنے تشخص پر خصوصی توجہ ضروری ہے۔

۲-الف: اسلام کسی انسان سے مسلمانوں کو نفرت نہیں سکھاتا، اور بلا امتیاز مذہب وملت انسانیت کی خدمت کا درس دیتا ہے، مگر اسلامی اقدار کے تحفظ کو مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

"يا أيها الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة" (سورہ بقرہ: ۲۰۹) (مسلمانو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ)۔

اس سے واضح ہوا کہ مسلمان کے لئے اسلامی اقدار، معتقدات اور طرز زندگی پر عمل ضروری ہے، اگر ان معاملات میں پختگی ہے تو غیر مسلم معاشرے میں مل کر رہنے میں قطعاً حرج نہیں ہے، آپ کے اخلاق عالیہ اور اعمال فاضلہ سے لوگ متاثر ہوں گے، ہمارے اسلاف خواجہ اکبر سید معین الدین اجمیری، شیخ محترم سید نظام الدین اولیاء وغیرہ علیہم الرضوان نے غیر مسلم معاشرے میں رہ کر غیر مسلموں کو کتنا متاثر فرمایا، ہمیں بھی اسی انداز سے خدمت کرتے ہوئے اسلامی اقدار کو غیر مسلموں کے قلوب واذہان میں اتارنا چاہئے۔

اگر ہم خام ہیں اور اندیشہ ہے کہ غیر مسلم تہذیب کا ہم شکار ہوجائیں گے تو الگ آبادیوں میں رہنا بہتر ہے، مگر آج تو ساری دنیا ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے، آپ کیسے بچ سکیں گے، بہر حال مسلمان زعماء، علماء اور مفکرین کوشش کریں تاکہ مسلمانوں کا تشخص بحال رہ سکے (وما ذلک علی اللہ بعزیز)۔

ب: ہر معاشرے کی کچھ اقدار ہوتی ہیں، اگر وہ شرک نہیں ہیں تو اسلام ان سے نہیں روکتا، مثلاً ایک کافر کو ایسی قدروں کے پیش نظر آپ اپنے کھانے میں شریک کرلیتے ہیں تو جائز ہے، اسی طرح اگر غیر مسلم حلال وطیب کھا رہا ہے تو آپ اس کے ساتھ کھا سکتے ہیں، مثلاً کاٹا ہوا فروٹ، چاول پکے ہوئے ہوں، اور ان میں کوئی حرام شے ملی ہوئی نہیں ہے تو آپ کھا سکتے ہیں، حالت اضطرار وضرورت میں بھی کھا سکتے ہیں اور حالت اختیار میں بھی کھا سکتے ہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۲/ ۷۲۴)۔

جلوس جنازہ میں بھی کوئی غلط از قسم شرک رسم نہ ہو تو شمولیت کر سکتے ہیں، عبرت کے لئے ان کی آخری رسوم میں بھی میت کے پاس رہ سکتے ہیں، صرف اپنے دل کو حسب ارشادات قرآنی اطمینان دولت ایمان سے دلانا ضروری ہے، اگر جبراً ابھی آپ سے کوئی کام کرایا جارہا ہو تو دلی اطمینان ایمانی ہونا ضروری ہے، ارشاد ربانی ہے: "إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان" (سورہ نحل/۱۰۶) (ہاں جسے مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو)۔

غیر مسلموں کے لئے البتہ قرآن پڑھنا اور اس کا ایصال ثواب کرنا شرعاً ممنوع ہے، رواداری کا یہ مطلب نہیں کہ شرعی اصولوں کو چھوڑ دیا جائے، قرآن حکیم پڑھ کر صرف مسلمانوں کو ہی ایصال ثواب ہوتا ہے، ہمارے چاروں مجتہد ائمہ کا یہی مسلک ہے، اطمینان قلبی کے لئے کچھ حوالہ جات پیش ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلموں سے کئی معاملات میں معاملہ کرنا جائز ہے:

"جس نے اپنے مجوسی کرایہ دار یا مجوسی خادم کو (گوشت خریدنے) بھیجا، اس نے گوشت خریدا اور واپس آ کر کہا کہ میں نے یہودی، عیسائی یا مسلمان سے خریدا ہے، تو یہ گوشت کھانا جائز ہے، کیونکہ معاملات میں کافر (مجوسی) کا قول معتبر ہے، یہ خبر صحیح ہے، کیونکہ عقل و دین رکھنے والے کی طرف سے صادر ہوئی ہے، وہ اپنے دین میں جھوٹ کو حرام سمجھتا ہے اور حاجت اس خبر کی قبولیت کی طرف متوجہ کرتی ہے، کیونکہ معاملات کثرت سے وقوع پذیر ہوتے ہیں" (ہدایہ ۴/ ۴۵۳)۔

جو واقعات کثرت سے وقوع پذیر ہوں وہاں شریعت رعایت دیتی ہے اور عام حالات میں ممنوع چیز کی اجازت دے دیتی ہے، اب ایک قوم آپ کے غم و خوشی میں شریک ہوتی ہے تو جواباً آپ کو اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے ان کے غم وخوشی میں شریک ہونا چاہئے، یہ عبارت خصوصی توجہ کی طالب ہے:

"ولا بأس بعيادة اليهودي والنصراني لأنه نوع برٍّ في حقهم وما نهينا من ذلك وصح أن النبي ﷺ عاد يهوديًا مرض بجواره" (ہدایہ ۴/ ۴۷۲ مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان) (یہودی یا نصرانی کی بیمار پرسی میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ ان کے حق میں ایک قسم کی نیکی ہے، ہمیں اس سے (شرعاً) منع نہیں کیا گیا، اور یہ واقعہ صحیح ہے کہ نبی علیہ السلام نے اپنے پڑوسی بیمار یہودی کی عیادت فرمائی)۔

اس بات پر خصوصی توجہ فرمائیں کہ پیغمبر اعظم ﷺ نے بنفس نفیس ایک کافر کی عیادت فرمائی، ہمارے فقہاء نے اسے ایک قسم کی نیکی قرار دیا تو پھر ہم بھی غیر مسلموں کی عیادت کر سکتے ہیں، ان کے جلوس جنازہ کے ساتھ جا سکتے ہیں، کیونکہ شریعت نے اس سے منع نہیں کیا ہے، اور عملاً ایک خبر پر رسول اللہ ﷺ نے مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے، یہ افعال ایک قسم کی نیکی ہیں، یہ غمزدوں کی دلجوئی ہیں لہذا ممنوع نہیں ہیں۔

ج: اوپر بہت سے حوالے گزر چکے ہیں کہ پاک صاف یعنی حلال چیزیں غیر مسلموں سے لی بھی جا سکتی ہیں اور دی بھی جا سکتی ہیں، اپنے ساتھ انہیں قربانی کا گوشت بھی کھلایا جا سکتا ہے، صرف حرام کھانا ممنوع ہے، اور اس بات کا غیر مسلموں کو پتہ ہے، لہذا وہ مسلمانوں کو ہدیہ میں حرام چیزیں نہیں بھیجا کرتے۔

بتوں کا چڑھاوا وصول کر کے کسی غیر مسلم کو بطور ہدیہ بھیج دینا چاہئے، اس کے دو فائدے ہوں گے، جس نے آپ کو بھیجا ہے آپ وصول کر لیں گے تو اس کی دل شکنی نہیں ہوگی اور جس دوسرے غیر مسلم کو بھیجیں گے وہ اسے اپنے لئے باعث عزت سمجھ کر خوش ہوگا، البتہ بتوں پر چڑھاوا خود نہ کھائیں یہی بہتر ہے۔

غیر مسلموں کے تحائف قبول کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، ان سے مٹھائی وغیرہ لینا اور دینا جائز ہوگا، دعوتوں میں اگر کوئی بات ناپسندیدہ بھی ہو تو دعوت چھوڑنا غلط ہوگا۔

ہدایہ میں ہے: "ومن دعي إلى وليمة أو طعام فوجد ثمه لعبًا أو غناء فلا بأس بأن يقعد ويأكل. قال أبو حنيفة: ابتليت بهذا مرة فصبرت" (ہدایہ ۴/ ۴۵۵) (اگر کسی کو ولیمے یا کھانے کی دعوت دی جائے (وہ وہاں جائے) اور وہاں لہو ولعب اور گانا بجانا پائے تو کوئی حرج نہیں کہ وہاں بیٹھ جائے اور کھانا کھائے، امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایسی مشکل میں مبتلا ہوا تو میں نے صبر کیا)۔

لہذا اگر غیر مسلم اپنی عیدوں، تقریبات اور شادی وغیرہ میں بلاتے ہیں یا کھانے پینے کی چیزیں بھیجتے ہیں تو اسلام کے وسیع اخلاق کے پیش نظر آپ کو قبول کرنے ہوں گے۔

د: غیر مسلم مدرسے تعمیر کرا سکتے ہیں، مختلف معاملات میں مسلمانوں کی امداد کر سکتے ہیں، اور مسلمان انہیں مدد دے سکتے ہیں، ہاں قرآن حکیم نے صرف مساجد کی تعمیر کے لئے غیر مسلموں سے رقم یا چندہ لینے کی ممانعت فرمائی ہے، اگر وہ رقم پیش کریں تو مسجد کمیٹی وہ رقم کسی اور مصرف مثلاً غسل خانے اور مسجد سے باہر کی گلیوں پر خرچ کر دے اور غیر مسلموں کو اس کا مصرف نہ بتائے تو یہ جائز ہوگا، اب تعمیر مسجد کے سلسلے میں قرآنی حکم بھی پڑھ لیں:

إنما يعمر مساجد الله من آمن بالله واليوم الآخر وأقام الصلوة وآتى الزكوة ولم يخش إلا الله فعسى أولئك أن يكونوا مهتدين (سورہ توبہ: ۱۸)

(اللہ کی مسجدیں صرف وہ تعمیر وآباد کرتے ہیں جو اللہ وآخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اور نماز قائم کرتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ تعالی کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت پانے والوں میں ہوں)۔

اس آیت سے واضح ہوا کہ تعمیر مسجد کے لئے غیر مسلم کی رقم نہیں لگائی جاسکتی، باقی سب مسائل میں ان سے لین دین اسلامی اخلاق کی بنیاد پر جائز ہے۔

ھ- (الف) ایسی تقریبات میں شرکت جائز ہوگی، بس اس بات کا خیال رکھا جائے کہ خود شرکیہ افعال میں مبتلا نہ ہوں اور حرام کھانے سے بچیں، ویسے بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں نظریہ ضرورت واضطرار کے تحت وہ بہت سی ممنوع باتیں بھی کر سکتے ہیں، بس ایسی باتوں اور ایسے افعال کو دل میں برا سمجھا جائے۔

برصغیر کی تحریک کے دنوں میں ہمارے جید علمائے دیوبند مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہ ہندو برادری کے ساتھ سب معاملات میں شریک رہے، مل کر کھاتے رہے، مدارس کے لئے چندہ لیتے رہے، گاڑیوں میں مل کر سفر کئے، جلسوں میں باہم مل کر خطابات کئے، مہاتما گاندھی کو مساجد کے منبروں پر بھی لائے۔

(ب) غیر مسلموں کے تہواروں پر مبارک باد کہنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، مطلب تو صرف ہم وطنوں کو خوش کرنے کا ہے، ان کا مذہب قبول کرنے سے نہیں۔

۳- الف: جھنڈا کسی قوم کا ایک شعار ہوتا ہے، اور قومی شعار ہونے کی وجہ سے اسے محترم سمجھا جاتا ہے، اسلام کے ابتدائی دور، دور نبوی وخلافت راشدہ میں جسے جھنڈا ملتا تھا، وہ اسے اپنی عظمت کی دلیل سمجھ کر بہت خوش ہوتا تھا، اور جھنڈا ملنے کو وہ بہت بڑی ذمہ داری سمجھ کر اس کا حق پوری طرح ادا کرتا تھا۔

جنگ موتہ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے پاس جھنڈا تھا، ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا دوسرے ہاتھ میں پکڑا، وہ کٹ گیا تو دونوں بازوؤں سے تھاما، بازو کٹا تو منہ سے پکڑا، دوسرا مجاہد آگے بڑھا جھنڈا ان سے لیا مگر نیچے نہیں گرنے دیا۔

ہمارے اسلاف اس طرح جھنڈے کا احترام فرماتے تھے، اس سے پتہ چلا کہ قومی شعار کے طور پر ہم جھنڈے کو دور اول سے محترم سمجھتے رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جھنڈے کی سلامی کیا عبادت ہے؟ تو اس کا جواب قطعاً نفی میں ہے، عبادت کا جو مفہوم ومعنی ہے وہ انتہائی عاجزی اور تذلل ہے، کیا سلامی دینے والا اس معنی میں سلامی دے رہا ہوتا ہے، اس کا جواب ہے، ہرگز نہیں۔

شرعاً بھی عبادت کا مفہوم مندرجہ بالا مفہوم سے ملتا ہے، کہ آپ جسم کا اعلیٰ ترین حصہ زمین پر ٹیک کر سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں، کیا جھنڈے کی سلامی میں کوئی ایسی بات ہے؟ اگر نہیں تو پھر جھنڈے کی سلامی میں کوئی شرکیہ اور غیر اسلامی امر نہیں ہے۔

ساری دنیا کے مسلمان جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں، اور ارشاد نبوی ہے: "ما رآہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسن" (جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے)۔ پھر جھنڈا شعار ہے، تو یہ شعار اللہ کی ایک نقل ہے، لہذا جھنڈے کو سلامی دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ب: اسلام مزاجاً توحید پرست مذہب ہے، لہذا وہ شرک کی کسی شکل کو بھی پسند نہیں کرتا، ارشاد قرآنی ہے: "اعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً" (اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ)، "إن الشرك لظلم عظيم" (یقیناً شرک بڑا ظلم ہے)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک سے شدت سے روکا ہے۔

وطن سے محبت کا درس اسلام بھی دیتا ہے، مگر وہ وطن کو معبود بنانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، کون نہیں جانتا کہ پیغمبر اسلام کا درجہ ومرتبہ مسلمانوں کے نزدیک اللہ کریم کے بعد سب سے بڑا ہے، مگر کوئی مسلمان نبی علیہ السلام کو معبود ماننے کا قطعاً تصور نہیں کرسکتا، پھر وطن یا دیگر مناظر فطرت کو وہ کیسے معبود مان سکتا ہے، آسمانی کتابوں میں سے قرآن حکیم نے جس طرح تفصیل کے ساتھ عقیدہ توحید بیان فرمایا ہے، اس کا عشر عشیر بھی باقی کتب میں نہیں ہے، صرف چند آیات ایسی ہیں جن میں ذکر خداوندی نہیں ورنہ ہر آیت میں ذاتی وصفاتی اسماء، ضمائر اور اشارات وغیرہ ہیں اور پوری شدت سے شرک کی نفی کی گئی ہے۔

اب ایسے ترانے جن میں مشرکانہ مضامین ہیں یا وندے ماترم میں ارض وطن کی معبودیت کا تصور پایا جاتا ہے، ایسے ترانے شرعاً جائز نہیں ہیں، اگر ایسی صورت لاحق ہو جائے کہ اسے نہ پڑھنے سے جان جاتی ہو، یا کوئی عضو کٹتا ہے، تو دل میں ایمان کی دولت سمیٹ کر زبان سے اقرار کیا جاسکتا ہے، مگر جہاں تک ممکن ہو ایسے ترانوں کے پڑھنے سے اپنے آپ کو بچایا جائے، قرآن حکیم نے اس مسئلہ کو یوں بیان فرمایا ہے:

"من كفر بالله من بعد إيمانه إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان ولكن من شرح بالكفر صدرًا فعليهم غضب من الله ولهم عذاب

عظیم "(سورۃ النحل/۱۰۶)

(جو ایمان کے بعد اللہ تعالی کا انکار کرتا ہے، سوائے اس کے کہ اسے جبر واکراہ میں مبتلا کر دیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (تو وہ صاحب ایمان ہے) ہاں لیکن جس نے سینہ کفر کے لئے کھول دیا تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالی کا غضب ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے)۔

پتہ چلا جبر واکراہ کی صورت میں ضرورت کے تحت دل کو ایمان سے بھر کر کفریہ کلمہ زبان پر لایا جاسکتا ہے، مگر قومی سطح پر ایسی صورت میں بھی تشخص ختم ہو جاتا ہے، اور ملت کسی اور ملت میں کھو جاتی ہے، اور رسول ہاشمی علیہ السلام کی قوم شرک کے دلدل میں دھنس جاتی ہے "أعاذنا الله تعالى بفضله وكرمه"۔

ج:...... جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کے لئے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ وہ شرعی قضاء کے لئے اپنی کمیٹیاں قائم کریں، ایسی کئی کمیٹیاں غیر مسلم ملکوں میں موجود ہیں، شرعی قضا کے لئے وہاں علماء ہوتے ہیں، ان سے فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کرا کر صدق دل سے مان لئے جائیں، اس طرح وقت کی بچت بھی ہوگی، پیسے کی بچت بھی ہوگی، عدالتوں میں غیروں کی طعن وتشنیع سے بھی محفوظ رہیں گے، اور غیر مسلموں کے مذاق سے بھی بچ جائیں گے۔

اسلام تو ہر باطل قوت کو طاغوت کہتا ہے اور غیر مسلم عدالتیں بھی اسی ضمن میں آتی ہیں، ان کے پاس کیس لے جانے کی ضرورت ہی نہیں، ارشاد ربانی ہے:

"ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطن أن يضلهم ضلالاً بعيدًا" (سورۃ نساء/۶۰)

(کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ ان کا آپ پر نازل ہونے والے اور آپ سے پہلے نازل ہونے والے کلام پر ایمان ہے، وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کے پاس فیصلے لے جائیں حالانکہ انہیں طاغوت کے انکار کا حکم دیا گیا ہے، اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں دور کی گمراہی میں ڈال دے)۔

اب مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ شرعی قضا کے لئے اپنے علماء مقرر کریں اور قرآن وسنت کے مطابق ان کے فیصلوں پر عمل کریں۔

اگر وہ غیر مسلم عدالت میں فیصلہ لے گئے ہیں، اور جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوا وہ سمجھتا ہے کہ فیصلہ ناحق ہے تو مسلمان بھائی کا حق نہ مارے اور اس کا حق اسے دے دے۔

حدیث میں ہے: "ام المومنین ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ایک انسان ہوں تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو، ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی کسی دوسرے شخص سے دلیل وحجت میں زیادہ بولنے والا ہو تو میں جس انداز سے سنوں فیصلہ دے دوں تو میں اگر کسی کو اس کے بھائی (مدعا علیہ) کے حق سے کچھ دے دوں تو وہ اس شئی کو نہ لے، اس لئے کہ (اگر وہ لے گا تو سمجھ لے) میں اسے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں" (بخاری ۲/ ۱۰۶۲)۔

ہم مسلمانوں کو خواہ ہم اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں ہوں اپنے حق کے بغیر کوئی چیز نہیں لینی چاہئے، جھوٹ کو عدالت میں سچ ثابت کر کے کوئی چیز لینا جہنم خریدنے کے مترادف ہے (اللهم نجنا من المهالک)۔

۴- الف: اسلام ساری انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم فرماتا ہے، ایک حصہ وہ ہے جس نے نبی رحمت علیہ السلام کی نبوت کو مان لیا ہے، اسے امت اجابت کہا جاتا ہے، دوسرا حصہ وہ ہے جس نے حضور علیہ السلام کی نبوت کو نہیں مانا ہے، یہ امت دعوت ہے، امت اجابت پر لازم ہے کہ وہ اچھے انداز سے امت دعوت کو اسلام کی طرف بلائے۔

ارشاد باری ہے: "ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن" (سورۂ نحل/ ۱۲۵)

(آپ انہیں دانائی اور خوبصورت وعظوں سے اپنے رب کے راستے کی طرف بلائیں اور ان سے بہت اچھے انداز سے بحث فرمائیں)۔

اس انداز سے اسلام انسانی دنیا کو وحدت کی لڑی میں پرونا چاہتا ہے، امت کو یاد دلایا ہے: "كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر" (سورۂ آل عمران: ۱۱۰) (تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو)۔

معلوم ہوا اس امت کو اپنے لئے ہی نہیں بلکہ سب انسانیت کی بہتری کے لئے تخلیق فرمایا گیا ہے، جس کی تخلیق کی غرض وغایت ہی انسانیت کی بہتری ہے، وہ امت کسی قوم کو نقصان نہیں پہنچا سکتی، اس کا کام تو اچھائی کو پھیلانا ہے، اور بدی کا سدباب کرنا ہے، اس کی دعوت ساری انسانیت کے لئے ہے، لہذا اسے اسی نگاہ سے دیکھا جانا چاہئے، محدود طریقے سے نہیں، ہم عرض کر رہے تھے کہ اسلام وحدت انسانی کا خواہش مند ہے، دو آیات آپ نے ملاحظہ فرمالیں اب تیسری

آیت بھی ملاحظہ فرمائیں:

"كان الناس أمة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين و منذرين أنزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه" (بقرہ/۲۱۳) (لوگ ایک ہی جماعت تھے، اللہ تعالی نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے نبی بھیجے اور ان پر کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے اختلاف میں فیصلہ فرمائے)۔

لوگ ایک ہی انسان کی اولاد تھے، انہیں ایک اکائی کی طرح رہنا چاہئے تھا، مگر ان میں اختلاف پیدا ہوئے تو اللہ تعالی کے رسول انہیں وحدت کا درس دینے آئے، ان کے پاس کتاب ربانی تھی جس میں راہ حق متعین تھی، اس سے بھی پتہ چلا کہ اسلام وحدت کا درس دینے آیا تھا، اس وحدت کی بنیاد کتاب الہی تھی، کتاب الہی اللہ کریم کی ذات کو تسلیم کراتی تھی، اور نبیوں کی نبوت کا اقرار کراتی تھی، اس کی دعوت میں نیکی کا پھیلاؤ اور بدی کا گھٹاؤ تھا۔

اس دعوت پر لبیک کہنے والے امت اجابت تھے اور باقی سب لوگوں کو یہ دعوت الی اللہ دے رہے تھے، تاکہ ساری انسانیت ایک اکائی بن جائے۔ اب اگر کوئی گروہ دعوت اتحاد دیتا ہے تو دیکھنا ہوگا کہ اس کی دعوت کا مرکزی نکتہ کیا ہے، کیا نیکی پھیلانا، بدی مٹانا اور اللہ تعالی تک پہنچانا ہے، یا کوئی اور داعیہ اس دعوت کے پیچھے کارفرما ہے، کیا ثقافتی انجذاب اور تہذیبی انضمام پر قوموں کو متحد کیا جاسکتا ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں، قومیں نظریات کی بنیاد پر بنتی ہیں، ثقافتیں اور تہذیبیں دیرپا نہیں ہوتیں، یہ جوہر نہیں عرض ہے، اور ہر عرض عارضی ہے، لہذا یہ ملت واحدہ بنانے میں فعال عنصر نہیں بن سکتی ہیں۔

کاش مذہب اور بالخصوص اسلام کا مطالعہ کیا جاتا تو مذہب کو انسانی اتحاد کا سب سے بڑا داعیہ سمجھا جاتا، اسلام نے مختلف نسلوں کو، مختلف تمدنوں کو، مختلف تہذیبوں کو، مختلف رنگوں والوں کو، مختلف بولیاں بولنے والوں کو سیاسی قوت نہ ہونے کے باوجود یکجا کیا ہوا ہے، اور زمانے کے تند و تیز طوفان نے بھی اس وحدت کو کٹنے نہیں دیا، اگر انسانیت کو متحد کرنا ہے تو وحدت اسلامی کی طرف پلٹنا ہوگا جس کے عظیم قائد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا فضل لعربي على عجمي، ولا لعجمي على عربي، كلكم من آدم وآدم من تراب" (کتب حدیث)

(کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے، تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے)۔

فرمائیے کیا اس نظریہ پر وحدت انسانی کی عظیم عمارت کھڑی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہوسکتی ہے تو پھر بسم اللہ عمل شروع فرمائیں، حقائق کو چھوڑ کر اگر انسانوں کو اکٹھا کریں گے تو وہ حقیقی وحدت نہیں ہوگی، بے روح اجتماعیت ہوگی۔

یہ دلیل کہ راستے الگ ہیں منزل ایک ہے، ایک سراب ہے، ایک شخص اللہ تعالی کو واحد لاشریک مانتا ہے دوسرا کئی معبودوں کو مانتا ہے، منزل ایک کیسے ہوگی، ایک توحید کا قائل ہے دوسرا تثلیث (تین خداؤں) کا قائل ہے، آپ منزل ایک کیسے قرار دیں گے، ایک توحید کا قائل ہے دوسرا سرے سے ذات خداوندی کا منکر ہے، فرمائیں منزل کو ایک کیسے قرار دیں گے، اگر آپ ان متنوع گروہوں کو جبراً ایک کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کا حشر وہی ہوگا جو کمیونزم کا ہوا ہے کہ آپ ناکام ہوجائیں گے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام وحدت انسانی کا علمبردار ہے، مگر یہ وحدت نظریات پر قائم ہے، افکار پر قائم ہے، اصولوں پر قائم ہے، کسی مصنوعی وحدت کا اسلام ہرگز قائل نہیں ہے، روس میں کمیونسٹوں نے مصنوعی وحدت قائم کی، لباس وغذا میں بھی وحدت قائم کی، پھر کیا ہوا، جبر و سختی کی ساری کوششوں کے باوجود یہ وحدت ستر سال سے آگے نہ بڑھ سکی، جبکہ اسلامی وحدت گزشتہ چودہ صدیوں سے کسی اقتدار کے بغیر صرف باطنی قوت سے چل رہی ہے۔

ب: اسلام مظلوموں کی مدد کا حکم دیتا ہے، مسکینوں اور بے بسوں کی مدد کا حکم دیتا ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں ان غیر مسلموں کی امداد بھی ہوتی رہی جنہیں دعوت اسلام دینی تھی، سید کل علیہ السلام نے دو حضرات کو زکاۃ عطا فرما کر فرمایا:

"تالفتهما ليسلما" (سیرت ابن ہشام ۱/۴۹۶) (میں نے ان کی تالیف قلبی فرمائی تاکہ وہ مسلمان ہوجائیں)۔

اگر کفار کا میلان اسلام کی طرف ہو، یا ان کا اپنے معاشروں میں اثر ورسوخ ہو اور دعوت اسلامی وہاں پھیل سکتی ہو تو اولین فرصت میں انہیں مال خداوندی سے کچھ دیا جائے، خواہ یہ عطا غیر مسلم حکومتوں کی سطح پر ہو یا کچھ معاشروں، گروہوں یا قبائل کی سطح پر ہو (الفقہ الاسلامی ۳/۲۰۰۹)۔

اسی کتاب میں ۸ / ۶۴۱۸ پر بھی ایسی عبارات نقل فرمائی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مظلوم قوم کوئی بھی ہو خواہ وہ بت پرست ہی کیوں نہ ہو ان کی

مدد ضروری ہے، اب یہ مدد دینے والے پر موقوف ہے کہ وہ کس انداز سے مدد دے سکتا ہے، اگر وہ مدد دینے پر آسانی سے قادر ہے تو یہ مدد لازم ہے، دلت قوم دنیا کی مظلوم ترین قوم ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلمان حکومتیں ایک تنظیم قائم کرتیں اور اس طرح دنیا بھر کے مظلوموں کی مدد کرتیں، اگر یہ نہیں ہو سکا تو مسلمان تنظیمیں آگے بڑھیں اور مظلوموں کی مدد کریں، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو افراد آگے بڑھیں اور مظلوموں کی مدد کریں۔

اب اگر دلت یا کوئی اور ایسی مصیبت میں مبتلا ہے تو ان کی ہر قسم کی مدد مسلمانوں پر لازم ہے۔

ج:......اسلام میں انسانی خدمت پر بہت زور دیا گیا ہے، رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته" (جو شخص اپنے بھائی کے کام میں لگا ہوتا ہے اللہ تعالی اس کی حاجت برآری فرماتا ہے)۔

اس موضوع پر سرکار کریم علیہ التسلیم کے بے شمار ارشادات ہیں، یہ بے حد نیکی کا کام ہے، اور اسلام ہر نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیتا ہے، قرآنی ارشاد کے مطابق "واللہ یضاعف لمن یشاء" کے پیش نظر یہ سات سو گنا پھر کئی سات سو گنوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

سید العالمین علیہ صلوات رب العالمین نے حضرت سعدؓ کو والدہ کے ایصال ثواب کے لئے رفاہی کام یعنی کنواں کھدوانے کا حکم دیا، یہ کنواں بنام سعد (سعد کی والدہ والا کنواں) کے نام سے مشہور ہوا، اور کتب حدیث میں اسی نام سے یہ مذکور ہے، دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خواتین نے ذاتی ہسپتال بنا کر زخمیوں اور مریضوں کا علاج کیا، ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں قوم کو بہت توجہ دلائی ہے، اور عملاً ان مقدس ہستیوں نے خود ایسے کام کئے ہیں، ابن عربی نے ان اقدامات کو دیکھ کر ہمیں ایک فقرہ بھی عطا فرمایا: "من خَدَمَ خُدِمَ" (جو خدمت کرتا ہے پھر اس کی خدمت کی جاتی ہے)۔

سوال یہ ہے کہ ادارے قائم کر کے ان سے صرف مسلمانوں کی خدمت کا کام لیں یا انہیں سب مذاہب کے انسانوں کے لئے عام کر دیں تو اسلامی مزاج چاہتا ہے کہ ہم اسے عام کر دیں۔

اس سلسلہ میں یہ حدیث ملاحظہ فرمائیں جو سب معتبر حدیث کی کتابوں میں موجود ہے، کہ سیدنا عثمان غنیؓ نے یہودیوں سے نصف کنواں خرید ا کہ مسلمان بھی پانی لے سکیں، اب ایک دن یہودی اور ایک دن مسلمان پانی بھرتے تھے، پھر باقی نصف بھی مسلمانوں کے کہنے پر حضرت عثمان غنیؓ نے خرید لیا۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب مدینہ والوں کو یہودیوں سمیت اس کنویں سے پانی لینے کی اجازت مرحمت فرما دی، واضح بات ہے کہ مدینہ طیبہ میں اس وقت مسلمانوں کے علاوہ یہودی وعیسائی اور مشرک رہ رہے تھے، سب بئر عثمان سے پانی پیتے تھے، اس سے ثابت ہوا کہ انسانوں کی بہتری کے لئے جو کام ہوتا ہے اس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی شریک ہوتے ہیں، ہسپتال سے غیر مسلموں کو استفادہ کی اجازت ہونی چاہئے، عام استعمال کی چیزیں بھی سب کے لئے عام رہنی چاہئیں، اسلام نے منافقوں کی مذمت کی کہ وہ عام چیزیں نہیں دیتے، فرمایا: "ویمنعون الماعون" (اور وہ عام استعمال کی چیزوں سے روکتے ہیں)۔

"ویطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً ویتیماً وأسیراً" (سورۂ دہر: ۸) (اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)۔

یہاں تینوں الفاظ (مسکین، یتیم اور اسیر) مطلق ہیں، لہذا اس میں سب انسان شامل ہیں، تو شفا خانوں، کنوؤں، تالابوں، تعلیمی اداروں اور رفاہی اداروں میں سب انسانوں کی شراکت ہونی چاہئے، ہاں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ اسلامی تشخص کا مسلمان اقلیت خیال رکھے اور اسلام سے نیز اپنی اعتقادیات پر سوائے صورت ضرورت (کہ جان جانے یا اعضاء کے کٹنے کا خوف ہو) کے آنچ نہ آنے دے۔

د: قدرتی آفات سب انسانوں کو متاثر کرتی ہیں، اور جن کو متاثر کرتی ہیں وہ چند ساعتوں میں نادار اور غریب ہو جاتے ہیں، انسانیت کا تقاضا ہے کہ سب انسانوں کی مدد کی جائے، اسلام تو بے کسی میں کتوں کو بھی پانی پلانے کا قائل ہے۔

عام حالات میں اسلام رواداری کی یہ مثال پیش کرتا ہے، تو سیلاب، زلزلے اور طوفانوں اور گاڑیوں کے حادثوں وغیرہ میں بطریق اولی اسلام رواداری، حسن اخلاق اور بے بسوں کی مدد لازم قرار دیتا ہے، اسلام دوسرے مذاہب سے آگے ہے، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

"الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ" (اسلام سب سے آگے اور اوپر ہے اس سے آگے یا اوپر کوئی نہیں)۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

شرعی نقطہ نظر سے

مولانا راشد حسین ندوی

مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی

۱- (الف) اس بات کا پورا عقیدہ رکھتے ہوئے کہ حاکم اور شارع حقیقی صرف اللہ تعالی ہے، اسلامی نظام حکومت جو کتاب وسنت سے ثابت ہے قیامت تک کے لئے انسانی فلاح اسی کے قیام میں ہے، شریعت سے متصادم تمام وضعی قوانین ناقص اور نامکمل ہیں جو کہ ناقص فہم انسانی کا نتیجہ ہیں۔ ان تمام عقائد اور عزائم کے ساتھ میرے نزدیک الیکشن کے عمل میں مسلمانوں کی شرکت جائز ہے، لیکن اس میں مذکورہ عقائد وعزائم کے ساتھ مندرجہ ذیل شرائط کی پابندی بھی ضروری ہوگی:

۱- ووٹ دینا ایک طرح کی شہادت ہے کہ فلاں شخص میرے نزدیک نمائندگی کا سب سے زیادہ مستحق ہے، لہذا ووٹ دیتے وقت نمائندہ کے بارے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے اندر نمائندہ بننے کی قابلیت کے ساتھ ساتھ امانت داری کا وصف بھی پایا جارہا ہو، اور وہ دوسروں کے مقابلہ میں انفع للمسلمین ہو۔

۲- انتخابی مہم میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی بھی خلاف واقعہ بات نہ کی جائے، نہ مدمقابل پر بے جا الزامات لگائے جائیں، نہ اپنی جھوٹی تعریف کی جائے، نہ ایسے وعدے کئے جائیں جن کا پورا کرنا ناممکن ہو، خلاصہ یہ کہ الیکشن کے تمام عمل میں اس شرط کے ساتھ شرکت کی اجازت ہے کہ کسی محظور شرعی کا مرتکب نہ ہو۔

ب- ووٹ دینا واجب ہے:

میرے نزدیک مذکورہ مفادات کے حصول کے لئے ایسے نمائندہ کو ووٹ دینا واجب قرار دیا جاسکتا جس میں اس کی اہلیت ہو۔

ج- مسلم مخالف پارٹی میں شرکت اور اس کے نمائندہ کو ووٹ دینا:

سیاسی پارٹیوں کا نظام کچھ ایسا ہے کہ فرد واحد پارٹی کے عام رخ اور نظریہ پر کسی بھی موقع پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، لہذا اگر ایک شخص مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا ہے، ان کے مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کی پارٹی کا نظریہ اس کے نظریہ سے متصادم ہے تو ایسے شخص کو ووٹ دینا میرے نزدیک درست نہیں ہوگا، اسلئے کہ اس کو ووٹ دینا گویا ایک ظالم جماعت کو طاقتور بنانا اور خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔

البتہ اگر کسی شخص کے بارے میں یقین ہے کہ وہ اتنی زیادہ ہمدردی اور خیر خواہی رکھتا ہے کہ خواہ اپنی سیٹ گنوانی پڑے لیکن مسلمانوں کے خلاف آنے والے کسی بل کی حمایت نہیں کرے گا تو بشرط اہلیت اسی کو ووٹ دیا جائے۔

ایسی پارٹیوں میں مسلمانوں کی شرکت بھی میرے نزدیک کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہ پارٹیاں مسلمانوں کے خلاف ایجی ٹیشن چلاتی ہیں، قوانین پاس کرتی ہیں، اور ہر محاذ پر ان کو زیر اور پست حوصلہ کرنے کے درپے رہتی ہیں، لہذا اس میں شرکت کرنا تعاون علی الاثم والعدوان ہونے کے ساتھ ساتھ ملی غیرت وحمیت کے بھی منافی ہے۔

د- غیر مسلم پارٹیوں سے معاہدہ کرنا درست ہے:

اگر کسی سیاسی پارٹی سے معاہدہ کرنے میں مسلمانوں کا ملی مفاد وابستہ ہے تو میرے نزدیک ان سے معاہدہ کرنا، ان کی حمایت کرنا اور ان کو کامیاب کرنے

کی کوشش کرنا جائز بلکہ مستحسن ہوگا، اور جب تک وہ معاہدہ کی پابندی کریں اس وقت تک خود بھی معاہدہ کا پابند رہنا ضروری ہوگا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے خلاف قبیلہ خزاعہ سے معاہدہ کیا تھا، سیرت ابن ہشام میں ہے:

''ودخلت خزاعة فی عهد رسول الله ﷺ وعهده... الخ'' (سیرت ابن ہشام ۲/ ۳۹۰)

(خزاعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و پیمان میں داخل ہوئے)۔

اور مدینہ میں یہود سے معاہدہ کیا، اس معاہدہ کا پورا متن سیرت ابن ہشام میں موجود ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

ظاہر بات ہے کہ موجودہ عالمی تناظر میں مسلمان اور اسلام بہت ہی کمزور ہو چکے ہیں، لہذا میرے نزدیک ایسے معاہدوں کی گنجائش ہے۔

ھ- بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے غیر مسلم سے تعاون لینا:

اس کا جواب بھی میرے نزدیک اثبات میں ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف الفضول میں شرکت فرمائی، اس انجمن کے مقاصد قریب قریب وہی تھے جن کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے، اور اس کے ممبران ظاہر ہے سب کے سب کافر تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد ذکر فرمایا کرتے تھے کہ آج بھی اگر اس طرح کی تنظیم میں شرکت کی دعوت دی جائے تو قبول کروں گا (دیکھئے: السیرۃ النبویہ للندوی/ ۱۱۳)۔

غیر مسلموں سے تعلقات کا مسئلہ

۲- الف- مخلوط آبادی کے مقابلہ میں علاحدہ آبادی بسانا بہتر ہے:

اس معاملہ میں تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جس جگہ جس قوم کی اکثریت ہوتی ہے اسی کے تہذیبی اثرات نمایاں رہتے ہیں، اقلیت عام طور سے ان سے متاثر ہوجاتی ہے، علاوہ ازیں یہاں ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے موقعوں پر بار بار دیکھا گیا کہ جن محلوں میں مسلمانوں کی مضبوط آبادی رہی وہ شرانگیزیوں سے محفوظ رہے اور جہاں وہ قلیل تعداد میں تھے انہیں وہاں بھاری نقصانات سے دوچار ہونا پڑا، لہذا میرے نزدیک بہتر یہی ہے کہ مسلمان علاحدہ محلوں اور بستیوں میں آباد ہوں، یا ایسے محلوں میں رہیں جہاں کی غالب اور مضبوط آبادی مسلمانوں کی ہے۔

ردالمحتار میں ہے: سرخسی ''شرح السیر'' میں فرماتے ہیں: اگر خلیفہ اہل ذمہ کی سرزمین میں مسلمانوں کے لئے شہر بسائے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ اور کوفہ آباد کیا، اور ذمی وہاں پر گھر خرید یں اور مسلمانوں کے ساتھ سکونت اختیار کریں تو ان کو اس سے منع نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ ہم نے ان سے عقد ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے تاکہ وہ محاسن اسلام سے واقف ہوں کہ ان سے قبول اسلام کی امید رہے، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا اختلاط اور رہائش یہ مقصد پورا کرتے ہیں، شیخ شمس الائمہ حلوانی فرماتے تھے: یہ اس صورت میں ہے جب ذمی کم ہوں اور اس طرح سے ہو کہ ان کے اس طرح سے رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کی بعض جماعتوں میں نہ تعطل پیدا ہو نہ جماعت میں کمی آئے، چنانچہ اگر وہ اتنے زیادہ ہوں کہ بعض جماعتوں میں تعطل یا کمی کا سبب بن جائیں تو انہیں اس سے روک دیا جائے گا، اور انہیں ایسے کنارے رہنے کا حکم دیا جائے گا جہاں مسلمانوں کی کوئی جماعت نہ ہو، یہ تفصیل امام ابوحنیفہؒ کی امالی سے محفوظ ہے'' (۳/ ۳۰۱)۔

اور درمختار میں ہے: ''اور شہروں سے اہل ذمہ کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ شہر میں رہائش کے لئے ان کا مخصوص محلہ ہو جس میں مسلمانوں کی طرح حائل ہونے والی جماعت رکھتے ہوں، جہاں تک مغلوب ہو کر مسلمانوں کے درمیان ان کی رہائش کا تعلق ہے تو اس کا یہ حکم نہیں ہوگا'' (۳/ ۳۰۲، ۳۰۳)۔

ب- غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت:

ایک مسلمان رواداری کے تحت اپنے غیر مسلم پڑوسیوں اور دوست احباب کے ساتھ ایسے تمام کام انجام دے سکتا ہے جن میں شرکیہ اور کفریہ افعال ورسوم کی آمیزش نہیں ہے، جن کاموں میں شرکیہ رسوم میں شرکت کی صورت پائی جارہی ہو ان سے دور رہنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ شرک ظلم عظیم ہے: 'إن الشرك لظلم عظيم' (سورہ لقمان: ۱۳)۔

چنانچہ اگر کوئی تعلق والا غیر مسلم بیمار ہے تو اس کی عیادت جائز ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے چچا ابوطالب (زاد المعاد: ۱/ ۴۹۴) اور ایک یہودی

لڑکے (بخاری: کتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبی فمات) کی عیادت کرنا ثابت ہے، فقہی کتابوں میں بھی اس کو جائز قرار دیا گیا ہے (ہندیہ ۵ / ۳۴۸)۔

اسی طرح کافر کی تعزیت کرنا بھی جائز ہے (ہندیہ ۵ / ۳۴۸، شامی ۵ / ۲۷۴)۔

لیکن جہاں تک جلوس جنازہ اور آخری رسومات میں شرکت کا تعلق ہے تو مسئلہ یہ ہے کہ ان مواقع پر شرکیہ نعرے بلند ہوتے ہیں، اور مختلف دیوی دیوتاؤں کی جے وغیرہ بولی جاتی ہے، مسلمان کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں کی جاسکتی کہ وہ ان افعال کو پسند کرے گا پھر بھی اس کی شرکت سے رضامندی کی صورت ضرور معلوم ہوتی ہے، لہٰذا میرے نزدیک عام حالات میں ان امور میں شرکت مکروہ ہے، البتہ اگر کسی مصلحت کا تقاضہ ہو اور عدم شرکت میں کسی خاص قسم کا ضرر ہوسکتا ہو تو ایسے خاص حالات میں شرکت مباح ہوگی، عصر حاضر کے اصحاب فتاوی میں اس سلسلہ میں کچھ اختلاف ہے، اور اس اختلاف ہی کے پیش نظر مذکورہ بالا رائے ہم نے پیش کی ہے (دیکھئے: فتاوی رحیمیہ ۸ / ۱۸۰، احسن الفتاوی ۴ / ۲۳۳، منتخبات نظام الفتاوی ۲ / ۳۵۷ اور کفایت المفتی ۴ / ۱۹۱)۔

غیر مسلموں کے لئے ایصال ثواب:

جہاں تک کفار کے لئے ایصال ثواب کا سوال ہے تو ایصال ثواب بھی استغفار اور دعا ہی کا ایک انداز ہے جس کے سلسلہ میں قرآن میں صراحتاً ممانعت آئی ہے، ارشاد ہے:

"ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين ولو كانوا أولي قربى من بعد ما تبين لهم أنهم أصحاب الجحيم" (سورہ توبہ: ۱۱۳)

(لائق نہیں نبی کو اور مسلمانوں کو کہ بخشش چاہیں مشرکوں کی، اور اگرچہ وہ ہوں قرابت والے جبکہ کھل چکا ان پر کہ وہ ہیں دوزخ والے)۔

آیت کریمہ کی ان صراحتوں کے بعد میرے نزدیک کفار کے لئے ایصال ثواب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ج - غیر مسلموں سے پرشاد وغیرہ لینے کا حکم:

جہاں تک عام تحائف کا تعلق ہے (جن کو نذر و نیاز کے طور پر بتوں پر چڑھایا نہ گیا ہو) ان کو قبول کرنے اور استعمال کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے (دیکھئے: فتاوی رشیدیہ / ۴۸۸، امداد الفتاوی ۲ / ۵۵۴)۔

کفار سے ہدایا قبول کرنے کے مسئلہ کو قدیم اصحاب فتاوی نے بھی چھیڑا ہے، چنانچہ "فتاوی ہندیہ" میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ امام محمد نے "السیر الکبیر" میں مختلف روایات ذکر کی ہیں جن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے ہدیہ قبول کیا اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبول نہیں کیا۔ لکھا ہے کہ اس میں ابو جعفر ہندوانی نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ جس کے بارے میں آپ کا گمان ہوتا تھا کہ وہ جہاد کرنے کو مال و دولت جمع کرنے کی طمع سمجھتا ہے اس سے قبول نہیں کرتے تھے اور جس کا گمان یہ سمجھتے تھے کہ وہ جہاد کو اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے سمجھتا ہے اس سے قبول فرمالیتے تھے، پہلے شخص سے آج بھی ہدیہ قبول کرنا درست نہیں: "ولا يجوز قبول الهدية من مثل هذا الشخص في زماننا" (فتاوی ہندیہ ۵ / ۳۴۷)۔

اور دوسرے کے مثل سے آج بھی ہدیہ لینا جائز ہے: "وقبول الهدية من مثل هذا الشخص جائز في زماننا أيضا" (فتاوی ہندیہ ۵ / ۳۴۸)، بعض مشائخ نے دوسرے انداز سے تطبیق دی ہے (ایضا)۔

بتوں کا چڑھاوا درست نہیں:

جہاں تک بتوں پر یا دیوی دیوتاؤں پر نذر و نیاز کے طور پر چڑھائی گئی اشیاء کا تعلق ہے تو ان کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے:

"للاجماع على حرمة النذر للمخلوق ولا ينعقد ولا يشتغل الذمة به ولأنه حرام بل سحت (الى) وأخذه أيضا مكروه مالم يقصد الناذر التقرب إلى الله" (البحر الرائق بحوالہ فتاوی مولانا فرنگی محلی / ص ۳۲۶)

(اس لئے کہ نذر للمخلوق کی حرمت پر اجماع ہے، یہ نذر منعقد نہیں ہوتی اور نہ ذمہ اس سے مشتغل ہوتا ہے اور اس لئے کہ یہ حرام بلکہ خبیث ہے (پھر فرمایا) اور اس کا لینا بھی مکروہ ہے جب تک نذر ماننے والا التقرب الی اللہ کا قصد نہ کرے) (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ۱ / ۴۲۴، امداد الفتاوی ۴ / ۹۷، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱ / ۷۱)۔

''بتوں کے نام کی نذر کی ہوئی چیز شرعاً حرام ہے، کسی مسلمان کو اس کا کھانا جائز نہیں'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۱/۱۷)۔

خلاصہ کلام یہ کہ بتوں کا چڑھاوا (پرشاد) لینا یا استعمال کرنا درست نہیں ہے، بقیہ تحائف لینے کی گنجائش ہے۔

د- غیر مسلموں سے مساجد وغیرہ کی تعمیر میں تعاون لینا:

اس مسئلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر غیر مسلم مذکورہ امور میں تقرب اور ثواب سمجھ کر تعاون کرتا ہے تو اس سے تعاون لینا درست ہے، چنانچہ ہدایہ کی ''کتاب الوصیہ'' میں ہے:

''ومنها إذا أوصى بما يكون قربة في حقنا وفي حقهم (الى) وهذا جائز'' (هدايه ۴/ ۶۹۰، ۶۸۹)

(اسی میں ایک شکل یہ ہے کہ اس چیز کی وصیت کرے جو ہمارے حق میں بھی قربت ہو اور ان کے حق میں بھی...... اور یہ جائز ہے)۔

اور شامی میں ہے: ''(وأن يكون قربة في ذاته)... بخلاف الذمي لنا في البحر وغيره إن شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم'' (شامی ۳/ ۳۹۴)

(اور یہ کہ فی ذاتہ قربت ہو)...... برخلاف ذمی کے، اس لئے کہ بحر وغیرہ میں ہے کہ ذمی کے وقف کی شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے یہاں بھی قربت ہو اور ان کے نزدیک بھی) (مزید دیکھئے: امداد الفتاوی ۲/ ۶۶۵، ۶۶۸، فتاوی رحیمیہ ۹/ ۱۸۹، فتاوی رشیدیہ/ ۴۱۰، کفایت المفتی ۷/ ۸۱)۔

لیکن غیر مسلم کا چندہ لینا اور اس کا استعمال کرنا اسی وقت درست ہوگا جب یہ خطرہ نہ ہو کہ وہ بعد میں احسان جتلائے گا، یا اپنی مذہبی رسومات کے لئے چندہ طلب کرے گا، بصورت دیگر چندہ نہ لینا چاہئے۔

ھ- غیر مسلموں کی تقریبات میں تعاون:

غیر مسلموں کی مذہبی تقاریب میں تعاون کرنا ناجائز ہے۔

(الف) مخلوط افطار پارٹی میں شرکت کرنا:

جہاں تک غیر مسلم کی دعوت قبول کرنے کا تعلق ہے تو وہ جائز ہے: ''ولا بأس بالذهاب إلى ضيافة أهل الذمة. بكذا ذكره محمد رحمه الله'' (ہندیہ ۵/ ۳۴۷) (امام محمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ اہل ذمہ کی دعوت میں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

کبھی کبھار ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن مستقل عادت نہ بنائے (دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۷)۔

خود غیر مسلموں کی دعوت کرنا بھی جائز ہے: ''ولا بأس بضيافة الذمي وإن لم يكن بينهما إلا معرفة كذا في الملتقط'' (ہندیہ ۵/ ۳۴۷) (ذمی کی دعوت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ دونوں میں صرف تعارف ہو)۔

اور دعوت افطار بھی ایک دعوت ہی ہے، اس لئے اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن اس اباحت کے باوجود حقیر کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ اس طرح کی دعوتوں سے احتیاط کی جائے، اس لئے کہ ان میں روزہ داروں اور غیر روزہ داروں کا اجتماع ہوتا ہے، بلکہ عموماً غیر روزہ داروں کا غلبہ رہتا ہے جس کی وجہ سے روزہ داروں کو کئی دقتیں پیش آتی ہیں۔

عید کی تہنیتی تقریب میں شرکت:

دعوت کے جواز کے بارے میں تفصیل اوپر آ چکی ہے، دعوت افطار والی خرابیاں اس میں نہیں ہیں، البتہ اس میں شرکت کے بعد اس سے توقع رکھی جائے گی کہ وہ بھی ہولی و دیوالی کی ایسی ہی مشترکہ تقاریب کا انعقاد کرے یا ان میں شرکت کرے، اس لئے عام حالات میں اس میں بھی شرکت نہ کرنا ہی بہتر ہوگا، حالات اور علاقہ کے خصوصی تقاضوں کی وجہ سے شریک ہونا پڑے تو کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ خصوصی حالات میں بہتر اور مستحسن بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن عام حالات میں اس کی ہمت افزائی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

(ب) غیر مسلموں کو ان کے تہواروں پر مبارکباد دینا:

غیر مسلموں کے کسی معاملہ کی تحسین کرنا کفر ہے: ''(ویکفر) تحسین أمر الکفار اتفاقا'' (ہندیہ ۲/ ۲۷۷)
(کفار کے کسی بھی معاملہ کی تحسین وتعریف کرنا بالاتفاق کفر ہے)۔

اور مبارک باد دینے میں اس سے مشابہت ہے، اس لئے میری رائے میں عام حالات میں اس سے بچنا چاہئے۔

البتہ اگر ضرورت پڑ جائے، اور آپسی تعلقات ایسے ہوں کہ مبارکباد نہ دینے پر اس کو تکلیف پہنچے گی تو اس کو "لکم دینکم ولی دین" کے انداز میں مبارکباد دے دے، اس کی تائید فتاوی ہندیہ (۵/ ۳۴۸) کی ایک عبارت اور کفایت المفتی (۹/ ۳۳۹) کے ایک جواب سے بھی ہوتا ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب کے اس فتوی سے بھی اس مسئلہ کا اشارہ ملتا ہے: ''پس جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے مذہبی تیوہاروں میں سبیل لگانا یا پان وغیرہ تقسیم کرنا اگر ان کے تیوہار کی تعظیم وتکریم کے لئے ہو تو کفر ہے، اور قیام امن اور باہمی رواداری کی نیت سے ہو اور ان کے مذہبی اعمال کی تحسین مقصود نہ ہو، اور یہ کام ان کے خاص موقع سے علاحدہ راستے میں ہو تو مباح ہے (کفایت المفتی ۹/ ۳۳۹)۔

۳: الف-قومی جھنڈے کی سلامی:

آج کل بہت سے اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں میں جھنڈے کی سلامی کا رواج ہے، اس کو ملک سے محبت اور احترام کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

اس مسئلہ پر جب ہم فقہی حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں تو اس کے عدم جواز ہی کی طرف رجحان ہوتا ہے، اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱-اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "یا أیہا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون" (سورہ مائدہ: ۹۰) (اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے، سب گندے کام ہیں سو ان سے بچتے رہو تا کہ تم نجات پاؤ)۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: انصاب کے عموم میں لغۃً بھی اور نقلاً عن المفسرین بھی ایسے (جھنڈے جیسے) نشانات بھی داخل ہیں (امداد الفتاوی ۵/ ۶۴۶)۔

علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

''وکذا ما یفعلونہ من تقبیل الأرض بین یدی العلماء والعظماء حرام، والفاعل والراضی بہ آثمان، لأنہ یشبہ عبادۃ الوثن، وہل یکفر أن علی وجہ العبادۃ والتعظیم کفر وأن علی وجہ التحیۃ لا. وصار آثما مرتکبا للکبیرۃ. وفی الملتقط: التواضع لغیر اللہ حرام، وفی الوہبانیۃ یجوز بل یندب القیام تعظیما للقادم (فی ردالمحتار) ای إن کان ممن یستحق التعظیم'' (شامی ۵/ ۲۷۲، ۲۷۱)

(اسی طرح لوگ علماء اور امراء کے سامنے زمین کو بوسہ دینے کا جو عمل کرتے ہیں حرام ہے، اس کا فاعل اور اس سے راضی دونوں گنہ گار ہیں، اس لئے کہ اس میں مورتی پوجا سے مشابہت ہے، اور آیا کیا اس کی تکفیر کی جائے گی تو اگر عبادت اور تعظیم کے طور پر کرے تو کافر ہو جائے گا اور اگر تحیہ کے طور پر کرے تو کافر تو نہیں ہوگا لیکن گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، اور "الملتقط" میں ہے: غیر اللہ کے لئے تواضع کرنا حرام ہے، اور "وہبانیہ" میں ہے کہ آنے والے کے لئے کھڑا ہونا جائز بلکہ مستحب ہے (علامہ شامی فرماتے ہیں) بشرطیکہ وہ تعظیم کا مستحق ہو)۔

ان دلائل کے پیش نظر میری رائے میں جھنڈے کی سلامی دینا جائز نہیں ہے، لیکن اگر فتنہ کا اندیشہ ہو، اور اس سے دشمن کو مسلمانوں کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کا موقع مل رہا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھتے ہوئے مصلحۃً سلامی میں شریک ہو جائے (دیکھئے: امداد الفتاوی ۴/ ۷/ ۶۴، فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۸۸)۔

ب-مشرکانہ ترانہ پڑھنے کا حکم:

اسلام میں شرک کو سب سے بڑی برائی اور سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا ہے، سب گناہ معاف ہو سکتے ہیں لیکن شرک کی معافی نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالی فرماتا ہے: "إن اللہ لا یغفر أن یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد ضل ضلا مبینا" (سورہ نساء: ۱۱۶) (بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے کسی کو اور بخشتا ہے اس کو سوا جس کو چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا وہ بہک کر دور جا پڑا)۔

لہذا ان ترانوں کو گانے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، خدانخواستہ اگر ان کے شرکیہ مضامین پر عقیدہ رکھ کر پڑھا تو کافر ہو جائے گا، اگر عقیدہ نہ ہو تب بھی یہ فعل حرام ہوگا، البتہ اگر شرعی طور پر اکراہ کی شکل پائی جائے تو عزیمت تو اسی میں ہے کہ اس صورت میں بھی پڑھنے سے انکار کردے خواہ جان گنوانی پڑے، لیکن دل سے برا سمجھتے ہوئے اس صورت میں پڑھنے کی گنجائش ہوگی۔

ج- غیر شرعی فیصلہ سے استفادہ:

قرآن نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ مسلمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، ایسی کسی عدالت یا حکم کے پاس معاملہ لے ہی نہ جائیں جو اللہ اور رسول کی مرضی کے خلاف فیصلہ کرے۔

ارشاد ہے: "قل أطیعوا اللہ والرسول فإن تولوا فإن اللہ لا یحب الکافرین" (سورہ نساء: ۶۰)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ''فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی أنفسهم حرجًا مما قضیت ویسلموا تسلیما'' (سورۂ نساء: ۶۵)) (سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے، پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے)۔

ان نصوص سے صراحت سے معلوم ہو رہا ہے کہ کسی مسلمان کو اپنا معاملہ غیروں کے یہاں لے ہی نہیں جانا چاہئے، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں ظاہر ہے یہ مجبوری آ ہی جاتی ہے، تو ایسے خاص حالات میں میرے نزدیک اگر کسی مسئلہ میں کتاب وسنت کا کوئی صریح اور منصوص حکم موجود ہے اور عدالت اس کے خلاف فیصلہ کرتی ہے تو ایسی صورت میں جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اس کے لئے استفادہ جائز نہیں ہے، "لقوله فلا وربك لا یؤمنون الآیہ"۔ البتہ اگر وہ غیر منصوص اور مجتہد فیہ مسئلہ ہے تو اس صورت میں بھی بہتر تو یہی ہے کہ حکم شرعی کا اعتبار کرتے ہوئے استفادہ نہ کرے، لیکن اس صورت میں استفادہ کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔

اس مسئلہ کی تائید اس عبارت سے ہو سکتی ہے: ''ثم إذا قضی بالاجتهاد فإن خالف النص لا یجوز قضاء ہ وإن لم یخالف النص لکنه رأی بعد ذلك رأیا آخر لا یبطل ما مضی ویقضی فی المستأنف بما یراہ'' (ہندیہ ۳/ ۳۱۲)۔

۴- الف- وحدت ادیان کی بنیاد ہی غلط ہے:

میرے خیال سے وحدت ادیان کی فکر دو مرکزی بنیادوں میں سے کسی ایک یا دونوں پر قائم ہوا کرتی ہے:

ایک یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تمدنی اور ثقافتی وحدت پیدا ہو جائے گی، جس سے آپسی بھائی چارہ بڑھے گا، آپسی اختلافات کم ہوں گے، جنگ وجدال کے خطرات میں کمی آئے گی، اور اہل مذاہب کے درمیان فرقہ وارانہ منافرت بھی کم ہو جائے گی جس سے دنیا امن وآشتی کا گہوارہ بن سکے گی۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ خود مذاہب ہی میں اس کی طرف رہنمائی ہے، اور انہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب ادیان ایک ہی منزل تک لے جانے کے مختلف راستے ہیں۔

دونوں بنیادیں کھوکھلی ہیں:

لیکن احقر کے نزدیک دونوں بنیادیں بالکل کھوکھلی ہیں۔

جہاں تک پہلی اساس کا تعلق ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ اختلافات موجود ہیں، ان میں مذہب کا دخل بہت کم ہے، بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اکثر جنگیں ایک ہی مذہب کے متبعین کے درمیان ہوتی ہیں۔

اس لئے اس مقصد سے وحدت ادیان کا تصور پیش کرنا بے مقصد اور سراسر لغو ہے۔

اور جہاں تک دوسری اساس کا تعلق ہے، تو ہم دوسرے مذاہب سے بحث نہیں کرتے (اگرچہ یہ فکر ہمارے خیال سے کسی مذہب میں نہیں ہے)، اس لئے کہ دوسرے مذاہب کے بارے میں بتانے کا حق خود ان مذاہب کے متبعین کو ہے، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ہم پورے اعتماد، انشراح اور یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نظریہ کی کوئی گنجائش کبھی بھی طور پر نہیں ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "أفغیر دین اللہ یبغون... ومن یبتغ غیر الإسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الآخرة من الخاسرین" (آل

عمران: ۸۳، ۸۴، ۸۵)(اب کوئی اور دین ڈھونڈتے ہیں سوا دین اللہ کے اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا لاچاری سے اور اسی کی طرف سب پھر جاوینگے، تو کہہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسی کو اور عیسی کو اور جو ملا سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ہم جدا نہیں کرتے ان میں کسی کو اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں، اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خراب ہے)۔

ب-مظلوموں کا تعاون بقدر استطاعت واجب ہے:

اسلام کا اعلان ہے کہ تمام بنی نوع انسان، خواہ وہ کسی بھی جنس، قبیلہ یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بحیثیت انسان مکرم ہیں، اور یہ کہ تمام انسان ایک باپ حضرت آدم کی اولاد ہیں، معیار فضیلت: پرہیزگار، اخلاق عالیہ اور دوسری صفات محمودہ ہیں، نہ کہ کسی خاص طبقہ اور گروہ سے تعلق رکھنا۔

مسلمان کو بحیثیت مسلمان کے ایک اور ذمہ داری دی گئی ہے کہ وہ نہ صرف خود نیکیاں کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دے، برائیوں سے روکے اور مظلوموں کی مدد کرے، اور اللہ کی زمین پر عدل وانصاف کو قائم کرے، اللہ تعالی نے بڑی تفصیل کے ساتھ قرآن کریم کی سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ وغیرہ میں ان احکامات کو بیان فرمایا ہے۔لہذا میرے نزدیک مسلمانوں پر ان مظلوموں کی مدد اور نصرت حتی الوسع واجب ہوگی، البتہ مسلمان چونکہ خود یہاں بے دست وپا اور مظلوم بن چکے ہیں اس لئے موقع محل اور وقت کے اعتبار سے اس تعاون کی شکلیں بدل جائیں گی، چنانچہ استطاعت ہی کے اعتبار سے کبھی نصرت طاقت وقوت کے ذریعہ ہوگی، کبھی زبان سے اور کبھی تو صرف دل میں اس کو برا سمجھ کر اور مظلوم کی ہمدردی رکھنے سے ہی تعاون کا ثواب ہوگا۔

ج-خدمت خلق کے اداروں میں فرقہ واریت نامناسب ہے:

مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم ماں باپ اور عزیز واقارب پر بھی خرچ کرنے کی کئی جگہ تاکیدیں وارد ہوئی ہیں، پڑوسی، یتیم، مسکین اور لاچار پر بلا تفریق مذہب وملت خرچ کرنے کی بار بار تاکید وارد ہوئی ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ھے: "واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئًا وبالوالدین إحسانًا وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل" (سورۂ نساء:۳۶)۔

ان نصوص کے پیش نظر میرے نزدیک اس طرح کے خدمت خلق کے لئے قائم کئے جانے والے اداروں کو بلاتفریق مذہب وملت سب کے لئے عام رکھنا چاہئے، البتہ اس میں دو باتیں پیش نظر رکھنا ضروری ہیں:

۱- ایک یہ کہ زکاۃ کی رقم شرعاً غیر مسلموں پر صرف نہیں کی جاسکتی (ہدایہ ۱/۲۰۵)۔

اسی طرح تبرعات اور چندوں میں متبرعین کی جہت کا اعتبار ضروری ہوتا ہے (عام کتب فقہیہ مثلاً شامی ۳/۳۹۵)، لہذا اموال زکاۃ اور خاص کر مسلمانوں کے لئے کئے گئے چندوں کو غیر مسلمین کی دواؤں وغیرہ پر صرف کرنا درست نہیں ہوگا، ان کو صرف مسلمانوں پر مفت صرف کیا جائے۔

۲- دوسری بات یہ کہ اگر بالفرض کسی علاقہ میں ایسی صورت حال ہو جائے (ابھی میرے خیال سے عملاً شاذ ونادر ہی ایسا ہوا ہے) کہ غیروں کے ان اداروں سے مسلمانوں کا استفادہ کرنا مشکل ہو، اور مسلم ادارہ غیر مسلموں کو بھی نوازے اور اس کے پاس سب مسلمان ضرورت مندوں کو مستفید کرنا مشکل ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں مسلم ادارہ کو مسلمانوں کو ہی ترجیح دینی چاہئے، اس لئے کہ غیر مسلم کہیں بھی استفادہ کرلے گا، اور مسلمان کے لئے یہاں بھی گنجائش نہ رکھی گئی تو کہاں جائے گا۔

د-ریلیف میں حتی الامکان فرقہ واریت نہ کی جائے:

اس صورت میں بھی میرے نزدیک زکاۃ اور صرف مسلمانوں کے لئے چندہ کردہ رقوم غیر مسلموں پر صرف نہیں کی جاسکتیں، بقیہ رقوم میں ریلیف کے وقت اسلامی حسن اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ فرقہ واریت کے بجائے ضرورت اور حاجت دیکھی جائے، اگر غیر مسلم کو حاجت زیادہ ہو تو اسی کو اولیت دی جائے لیکن اگر غیر مسلموں کو نوازنے کے لئے مختلف تنظیمیں متحرک ہوں اور مسلمانوں کی غمخواری کرنے والا کوئی نہ ہو تو مسلمانوں کو اولیت دینی چاہئے۔

✦✦✦

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے چند اہم مسائل

مولانا محمد اقبال قاسمی

مدرسہ اسلامیہ، شکرپور بھروارہ

غیر مسلم ممالک اور جمہوریت:

غیر مسلم ممالک میں سیکولر حکومتوں کی تشکیل میں مسلمان نہ صرف حصہ لے سکتے ہیں، بلکہ انہیں پوری بیدار مغزی اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس میں بھرپور حصہ لینا چاہئے، تاکہ اپنے دینی وملی مصالح کا تحفظ کرسکیں، حکومت دور حاضر میں زندگی کے تمام شعبوں پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتی ہے، اس لئے حکومت کی تشکیل سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان اپنے دینی وملی وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے، جائز دنیاوی مصالح کی حفاظت نہیں کرسکتے بلکہ ان کا تشخص بھی خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔

۱-الف-الیکشن میں حصہ لینا:

موجودہ انتخابی نظام کے غیر اسلامی ہونے اور ان تمام خرابیوں کے باوجود جو سب پر عیاں ہیں جب یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ غیر مسلم ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اسلامی نظام حکومت کے قیام کے امکانات روشن نہیں ہیں تو مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ مذہبی آمریت کے بجائے جمہوریت کی تائید کریں، اور جمہوری نظام کا سب سے بنیادی عنصر الیکشن اور انتخابی عمل ہے تو مسلمانوں کے لئے انتخابی عمل اور الیکشن سے صرف نظر ممکن نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا صرف درست ہی نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے، تاکہ مسلم نمائندہ مسلمانوں کی آواز کو پارلیمنٹ تک پہنچا سکے، نیز پارلیمنٹ میں پاس ہونے والے قوانین سے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوں مسلمانوں کو آگاہ کرسکے۔ اور اس طرح کے قوانین کے خلاف قانونی دائرہ میں احتجاج کرسکے اور مذہبی تعلیمی، سماجی اور معاشی حقوق کے تحفظ کے لئے سعی کرسکے۔

الیکشن میں امیدوار بننا:

الیکشن میں امیدوار بننا، عوام سے ووٹ کی بھیک مانگنا، ووٹ حاصل کرنے کے لئے جھوٹے اور غلط وعدے کرنا، اپنے کو اس عہدے کے لائق اور دوسرے کو نالائق بتانا اور بے بنیاد دلائل دینا، اپنی پارٹی کی خوبیوں کو ذکر کرنا اور دوسری پارٹیوں کے نقص اور عیب کو بتانا۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایک ناروا بلکہ ایک غیر شریفانہ حرکت ہے، قرآن کریم اور احادیث رسول میں حب جاہ اور حب مال سے منع کیا گیا ہے اور عام حالات میں عہدہ طلب کرنے اور عہدہ سپرد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے:

''میں اور میرے دو چچازاد بھائی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو ان دونوں میں سے ایک نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ مجھے بعض اس حصہ پر حاکم بنا دیجئے جس پر اللہ نے آپ کو حاکم بنایا ہے، دوسرے نے بھی کچھ اس طرح درخواست کی تو اللہ کے رسول نے فرمایا کہ بخدا ہم کسی ایسے شخص کو حاکم نہیں بناتے جو عہدہ کا مطالبہ کرے یا اس کا حریص ہو'' (مشکوۃ شریف ۳۲۲/بحوالہ مسلم و بخاری)۔

دوسری روایت میں ہے:

''عن عبدالرحمن بن سمرة قال: قال لی رسول اللہ ﷺ: لاتسأل الإمارة فإنك أن أعطيتها عن مسئلة وكلت إليها وإن أعطيتها عن غير مسئلة اعنت عليها'' (مشکوۃ شریف ۲/۳۲۲)

(حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے اللہ کے رسول نے فرمایا کہ عہدہ کا سوال مت کیا کرو، کیونکہ اگر وہ عہدہ تجھے طلب پر ملا ہے

تو (خدا کی مدد اٹھ جائے گی اور) وہ تیرے حوالہ کردیا جائے گا (کہ تو جانے اور تیرا کام) اور اگر بغیر طلب کے ملا ہے تو اللہ کی مدد تیرے شریک حال رہے گی)۔

چونکہ ہندوستان اور اس طرح کے دیگر جمہوری ممالک میں عوامی نمائندگی کے شعبہ میں جانے کی صورت میں الیکشن اور انتخابی قوانین کے تحت الیکشن میں اپنے آپ کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تو ان خصوصی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے الیکشن میں حصہ لینا درست ہوگا۔ البتہ امیدوار کے لئے دو شرطیں ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اس عہدہ کی لیاقت رکھتا ہو جس کا وہ امیدوار ہے اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ دیانت دار اور امین ہو اور مقصد ہو مسلمانوں کی خدمت اور ان کے حقوق دلوانا، اس کے قلب میں حب جاہ کا مرض نہ ہو، وہ انصاف کے ساتھ لوگوں کے حقوق ان کے پاس پہنچانے کا قصد رکھتا ہو۔

ووٹ دینا:

انتخابات میں کھڑے ہونے والا ممبر اگر واقعتاً اس عہدے کے لائق اور امین اور متدین ہے، اور حقیقتاً اس عہدہ کے لائق ہے تو اس کو ووٹ دینا بالکل جائز اور درست ہے اور چونکہ اس سے مذہبی، ملی سماجی اور معاشی حقوق وابستہ ہیں اس لئے بغیر ترغیب اور دعوت کے از خود جا کر اس کے حق میں ووٹ دینا لازم ہے اور یہ شریعت مطہرہ کے نزدیک پسندیدہ اور مرغوب فعل ہے، حدیث شریف میں ہے:

''ألا أخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها'' (مشکوۃ شریف ۳۲۷ بحوالہ مسلم)۔

(کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص جو اپنی گواہی طلب کرنے سے پہلے ہی ادا کردے)۔

اور اسی طرح ضرورت کے مواقع میں اپنی شہادت چھپانا یا جھوٹی شہادت دینا حرام اور ناجائز ہے، قرآن کریم اور کتب احادیث میں بے شمار آیات واحادیث ہیں جو اس کی حرمت اور ناجائز ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

انتخابی مہم چلانا:

کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانے کا مسئلہ الیکشن میں امیدوار کے کھڑے ہونے کے جواز اور عدم جواز پر ہے۔ اگر امیدوار لائق اور متدین ہو تو پھر شریعت کے حدود میں منکرات اور غلط بیانی سے بچتے ہوئے انتخابی مہم چلانا اور اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنا حسب موقع جائز ہی نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے، ورنہ ناجائز اور حرام ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فقہی مقالات مولانا محمد تقی عثمانی ۲/ ۲۹۴، ۲۹۹، ۳۰۰)۔

ب- مذہبی مفادات کی بنا پر مسلمانوں کے لئے ووٹ کا وجوب:

جب انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات متعلق ہیں تعلیمی، معاشی، سماجی اور رفاہی حقوق وابستہ ہیں تو ایسی صورت میں جس طرح نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا ناجائز ہے اور گناہ کا باعث ہے، اسی طرح کسی اچھے، قابل اور ایسے شخص جس کے سینہ میں مسلمانوں کی ہمدردی اور غم خواری ہو، وہ ان کے ملی، مذہبی اور معاشی حقوق کے تحفظ کا قصد رکھتا ہو ان کو ووٹ دینا ایک فریضہ شرعی ہے، قرآن کریم نے جس طرح جھوٹی شہادت کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے اسی طرح سچی شہادت کو واجب اور ضروری قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں: "كونوا قوامين لله شهداء بالقسط" (تم اللہ کے لئے سچی گواہی دینے والے ہو جاؤ)۔ اور ارشاد ہے: "واقيموا الشهادة لله" (تم اللہ کے لئے شہادت کو قائم کرو)۔

اس مسئلہ میں مزید وضاحت کے لئے دیکھئے: کفایت المفتی ۹/ ۴۷، ۳، ۵، ۷، ۳ وغیرہ۔

ج- اسلام مخالف پارٹی میں شمولیت اور ووٹ:

اگر بعض ایسی سیاسی پارٹیاں الیکشن میں حصہ لیتی ہوں جنہوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنا لیا ہو لیکن ان کے بعض امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب اور درست ہو تو مسلمانوں کے لئے ان کے جماعتی آئین وقوانین سے قطع نظر اشخاص وافراد کے ذاتی حالات کی بنا پر انہیں ووٹ دینا ناجائز اور حرام ہے، اور اس طرح کی فسطائی اور فاشزم والی

پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت قطعا درست اور جائز نہیں ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ اور متاع مذہب اسلام اور اس کے قوانین واحکام ہیں، اس لئے اسلام مخالف پارٹیوں کے ساتھ کسی بھی حال میں سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا، اس سلسلہ میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا وہ مقالہ پیش نظر رکھا جاسکتا ہے جو مجلہ بحث ونظر شمارہ/ ۵۱ میں شائع ہوا ہے۔

د-انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ تال میل:

انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ملی مفادات کے تحت تال میل، معاہدے، ان میں شرکت اور ان کی حمایت کا مسئلہ حالات اور مصالح سے متعلق ہے، حالات اور مصالح جس کے متقاضی ہوں اس اعتبار سے معاہدے اور حمایت کا فیصلہ اس وقت کے مخلص، خیر خواہ مسلم قائدین کی صواب دید پر موقوف ہے، تاہم مندرجہ ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے:

۱- بڑے شر سے بچنے کے لئے چھوٹے شر کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۲- غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ شرکت پر یہ امید اور توقع ہو کہ قانون ساز اداروں اور حکومت میں شریک ہو کر وہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی مفادات کو حاصل کرنے اور نقصانات سے بچانے میں کوئی اہم رول ادا کرسکیں گے۔

۳- باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے اگر ایک اعتبار سے چند فوائد اور مصالح حاصل ہونے کی امید ہو اور دوسرے اعتبار سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی امور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو پھر "دفع الضرر مقدم علی جلب المنفعة" کے اصول کی روشنی میں انتخابی تال میل اور اشتراک جائز نہیں۔

الغرض مسلمانوں کا اجتماعی ملی مفاد مقدم ہے، وہ اگر باہمی تعاون اور اشتراک سے حاصل ہوتے ہوں تو پھر یہ اشتراک اور تعاون جائز ہے، اور اگر اس کی امید نہ ہو تو پھر جائز نہیں (دیکھئے: بیان القرآن جلد اول، کفایت المفتی ۹/ ۳۹۲)۔

ھ-معاشرہ میں عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے اجتماعی تنظیم قائم کرنا:

معروف کو پھیلانا، منکر سے روکنا، انسانیت کے نفع کے لئے کام کرنا اور معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا امت مسلمہ کا شرعی فریضہ ہے، ان مقاصد کے حصول کے لئے اگر بعض اوقات سماج کے مختلف طبقات سے تعاون حاصل کرنا پڑے اور غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر ان کاموں کو انجام دیا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ یہ تعاون علی البر والتقوی کے قبیل سے ہے جو شریعت کے نزدیک مطلوب ومحمود ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف الفضول کی تحریک میں شرکت کی اور بعثت کے بعد یہ فرمایا کہ اگر آج بھی مجھے اس کے لئے بلایا جائے تو میں اسے قبول کروں گا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اجتماعی تنظیم یا ادارہ قائم کرنا جائز ہے (دیکھئے: سیرت النبی ۱/ ۱۸۲، ۱۸۳)۔

واضح رہے کہ اس طرح کی تنظیم اور ادارہ قائم کرنے سے پہلے اس کے دستور اور آئین بنا لئے جائیں۔ اس کے دستور عدل وانصاف پر مبنی ہوں، مسلم اور غیر مسلم سب اس کے قانون کی نگاہ میں ایک درجے کے ہوں، تنظیم میں غیر مسلموں کی اکثریت نہ ہو اور حتی الامکان اس کے اہم اور بڑے شعبے مسلمانوں کے قبضے میں ہوں، غیر مسلموں سے تعاون بقدر ضرورت لیا جائے۔

۲-(الف) مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی یا علاحدہ آبادی؟

اسلام کے نظام معاشرت پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ مسلمان اپنی علاحدہ آبادی میں رہائش اختیار کریں یا ایسی مخلوط آبادی میں جہاں تہذیب وتمدن اور کلچر مسلمانوں کا چھایا ہوا ہو، تاکہ وہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رہ سکیں، کیونکہ پڑوسی اور ہمسایہ کا اثر ایک بدیہی امر ہے، ان کے قرب وجوار میں رہنے سے لازمی طور پر ان کے کلچر سے متاثر ہوں گے۔

غیر مسلموں کی آبادی میں مسلمانوں کی رہائش پذیر نہ ہونے کی بابت خود اللہ کے رسول کا صریح ارشاد موجود ہے: "أنا بريئ من كل مسلم أقام مع المشركين لاتراءى ناراهما" (مجمع الزوائد ۵/ ۲۶۰) (میں ہر اس مسلمان سے براءت کا اظہار کرتا ہوں جس نے مشرکوں کے ساتھ بود باش

اختیار کرلی ہو، ان کو تو اس طرح رہنا چاہئے کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے)۔

اسی طرح آیات براءت کے ذریعہ مشرکین کو حدود حرم سے نکل جائے کا الٹی میٹم دینا پھر وقت مقرر پر مکہ خالی کرا دینا، یہود کو مدینہ کے قریب سے نکل جانے کا حکم دینا پھر عہد فاروقی میں خیبر کو خالی کر کے جزیرہ عرب سے نکال دینا اس امر کی بین دلیل ہے کہ خدائے پاک کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کا معاشرہ ایک صالح، پاکیزہ اور دینی معاشرہ ہونا چاہئے، وہ غیر اسلامی تہذیب اور مشرکانہ رسم ورواج سے آلودہ نہیں ہونا چاہئے، وہاں پہنچنے کے بعد کوئی بھی آدمی اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اس سلسلہ میں علامہ شبیر عثمانی کی تفسیر سورۂ توبہ کی ابتدائی آیتوں کے ذیل میں پڑھنے کے لائق ہے (تفسیر عثمانی/۲۴۸)۔

آج کے حالات میں جبکہ پورے ہندوستان میں تعصب اور تنگ نظری لوگوں کے قلب وجگر میں پیوست کردی گئی ہے، جگہ جگہ فرقہ وارانہ مسلم کش فسادات کرائے جارہے ہیں، کسی بھی خطے میں مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو محفوظ نہیں ہے، ان کو مختلف نوع کے ذریعہ کمزور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، جہاں مسلمان قلیل تعداد میں ہیں یا بے سروسامانی کے عالم میں ہیں وہاں ان کو تر لقمہ سمجھ کر نگلنے کی کوشش کی جاتی ہے، تنگ نظری اور کٹر پنتھی غیر مسلموں کے دماغ میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ بظاہر ان کے اسلامی اخلاق وکردار سے متاثر ہونے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی علاحدہ آبادیاں قائم کریں اور وہاں رہائش اختیار کریں تاکہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رہ سکیں اور مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو، مذہبی عبادت گاہیں اور مراکز، مدرسے اور خانقاہیں، مساجد اور مقابر محفوظ رہیں، یا کم از کم ایسی مخلوط آبادی میں رہائش اختیار کریں جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں ان کی تہذیب وتمدن کا غلبہ ہو۔

ب- غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت اور میت کے پاس رہنا:

معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے لازم ہے کہ اپنے دوست یا پڑوسی کو کوئی خوشی یا غم لاحق ہو تو ان کی خوشی یا دکھ درد میں دوسرا دوست یا پڑوسی شریک رہے، ہر ایک دوسرے کے ساتھ حسن اخلاق کا نمونہ پیش کرے، اگر ان کے گھر موت واقع ہو جائے یا وہ کسی پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہو جائیں تو ان کے گھر جا کر ان کی تعزیت کرے، تسلی کے الفاظ بولے، بوقت ضرورت ان کا تعاون کرے اور خبر گیری کرتا رہے، یہ ہر ایک پڑوسی اور دوست کے ساتھ ہونا چاہئے، مسلمان ہو یا غیر مسلم ایسا کرنا عین اسلامی منشا اور مزاج کے مطابق ہے، کتب حدیث اس طرح کے اخلاق برتنے اور پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے سے بھری پڑی ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ کی پوری زندگی اس کا نمونہ ہے۔ لیکن غیر مسلموں کے جنازہ میں شرکت یا آخری رسومات کی ادائیگی کے وقت میت کے پاس کھڑا رہنا جائز نہیں، کیونکہ شریعت نے مسلمانوں کے جنازہ میں شرکت کا حکم ایک مسلمان کی تعظیم اور اکرام کی وجہ سے دیا ہے، اور غیر مسلم تو قابل اہانت ہے، نیز آخری موقع پر وہ مشرکانہ اور ہندوانہ رسوم کے ساتھ ان کو جلا کر خاکستر کرتے ہیں جن میں شرکت کم از کم تعاون علی الاثم ہے، کیونکہ وہ سارے رسومات شریعت اسلامی کے خلاف ہوں گے اور ہم شریک ہو کر گویا ان کی تائید کر رہے ہیں جبکہ اس کی ممانعت قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے:

"ولا تصل علی أحد منهم مات أبدًا ولا تقم علی قبره إنهم كفروا بالله ورسوله وماتوا وهم فاسقون" (سورہ توبہ: ۸۴)

(آپ ﷺ ان میں سے کسی کی نماز جنازہ مت پڑھئے جس کی موت کفر پر ہوئی ہو اور اس کی قبر پر کھڑے مت ہوئیے انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور ان کی موت فسق کی حالت میں آئی)۔

غیر مسلموں کے لئے ایصال ثواب اور قرآن خوانی:

ایصال ثواب اور قرآن خوانی کا مقصد ہے کسی بھی عبادت مالیہ یا بدنیہ کے ذریعہ مردے کو ثواب پہنچانا یا قرآن پڑھ کر ثواب پہنچانا، اس کے لئے تخفیف عذاب اور مغفرت کی دعا کرنا، اس کی نیکیوں میں اضافہ کرنا وغیرہ، اور یہ سب چیزیں مسلمان کے ساتھ مختص ہیں، اور غیر مسلم جس کی موت کفر پر ہوئی ہو اس کے لئے خلود فی النار واجب ہے وہ دائمی دوزخی ہے، "لا يخفف عنهم العذاب ولا هم ينصرون"۔

رسول پاک ﷺ کے عم محترم ابو طالب کا جب انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے ان کے لئے فرط محبت اور ادائے حق کے طور پر استغفار کرنا شروع کر دیا تو اللہ جل جلالہ نے آپ ﷺ کو اس سے منع کر دیا: "ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين ولو كانوا أولي قربى من

بعد ما تبين لهم أنهم أصحاب الجحيم" (سورہ توبہ/۱۱۳) (نبی اور ایمان والوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لئے استغفار کریں، خواہ ان کے رشتہ دار ہوں جبکہ ان کے سامنے یہ واضح ہو چکا ہو کہ وہ دوزخی ہیں) (اس کی تفسیر کے لئے دیکھئے: ترجمہ شیخ الہند مع تفسیر عثمانی/۲۷۱)۔

ج- مذہبی اور غیر مذہبی تقریبات کے موقع کی مٹھائیاں:

غیر مسلم حضرات اپنی مذہبی یا غیر مذہبی تقریبات کے موقع پر جو مٹھائیاں اور تبرکات اپنے مسلمان دوستوں کو پیش کرتے ہیں وہ اگر بتوں پر چڑھائے ہوئے ہوں تو مسلمانوں کے لئے ان کو کھانا حرام اور ناجائز ہے، وہ اپنی روح اور منشا کے اعتبار سے "ما ذبح على النصب" میں داخل ہیں (تفصیلات کے لئے دیکھئے: کفایت المفتی ۹/۳۳۵، فتاوی عبدالحی/۴۰۹، بحث ونظر شمارہ/۵۱)۔

اور اگر وہ مٹھائیاں بتوں پر چڑھائی ہوئی نہ ہوں تو ان کو کھانا جائز ہے، اسی طرح دیگر ماکولات ومشروبات کا استعمال شادی اور دوسری تقریبات میں بغیر کراہت جائز ہے، بشرطیکہ حلال اور پاک ہونے کا ظن غالب ہو اور برتن دھویا ہوا ہو۔

فتاوی ہندیہ میں لکھا ہوا ہے: "ويكره الأكل والشرب في أواني المشركين قبل الغسل ومع هذا لو أكل أو شرب فيها قبل الغسل جاز ولا يكون آكلا ولا شاربا حراما" (ہندیہ) (مشرکوں کے برتنوں میں کھانا اور پینا دھونے سے پہلے مکروہ ہے، اس کے باوجود اگر کوئی برتنوں میں دھونے سے پہلے کھا پی لے تو جائز ہے اور وہ حرام کو کھانے پینے والا شمار نہیں ہوگا)۔

د- مسلم عبادت گاہوں میں چندہ دینا اور ان کو تعمیر کرانا:

اگر کوئی غیر مسلم مسجد، مدرسے یا مذہبی جلسے جلوس میں چندہ دے یا اپنے روپئے سے ان کو تعمیر کرائے اور وہ اس کو کار ثواب سمجھے تو اس کے چندہ کو قبول کرنا اور اس کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کا حکم مسجد کا حکم ہوگا۔

علامہ شامی تحریر کرتے ہیں: "إن شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم كالوقف إلى الفقراء أو على مسجد القدس" (ردالمحتار ۳/ ۳۹۴) (دیکھئے: فتاوی رشیدیہ/ ص ۵۲۷)۔

واضح رہے کہ چندہ لیتے وقت غور کرلے کہ اس چندہ دینے میں مسلمانوں کو کسی دینی یا دنیوی ضرر یا طعنہ زنی یا افتخار واظہار منت کا اندیشہ تو نہیں ہے، یا آئندہ ہم سے مندر یا دیگر مذہبی تقریبات میں چندہ کا مطالبہ تو نہیں کرے گا، اگر اس طرح کی کوئی بات ہو تو ان سے تعاون کسی طرح کا نہ لیا جائے (مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ۴/ ۳۳۰، ۳۳۱، احسن الفتاوی ۶/ ۴۳۹، ۴۴۰)۔

غیر مسلم کی عبادت گاہوں اور مذہبی تہواروں میں چندہ دینا:

غیر مسلم کے معابد کی تعمیر اور مذہبی تہواروں اور جلسے جلوس میں چندہ دینا یا ان میں کسی طرح تعاون کرنا نص قطعی کی بنا پر حرام اور ناجائز ہے۔

مولانا تقی عثمانی فقہی مقالات میں لکھتے ہیں: "کسی مسلمان کے لئے چاہے وہ کوئی فرد ہو یا جماعت عیسائی اداروں میں یا چرچ میں چندہ دینا یا تعاون کرنا ہرگز جائز نہیں" (جدید فقہی مقالات ۱/ ۲۶۳) (نیز دیکھئے: جدید فقہی مسائل/ ۴۴۳)۔

ھ- الف- دعوت افطار:

اگر افطار میں غیر مسلم سیاسی وسماجی قائدین کو دعوت دی جائے اور مقصد ان تک اسلامی پیغام پہنچانا اور اس سے مانوس کرنا ہو یا مسلمان کو ملی یا سماجی فائدہ پہنچانا ہو تو دعوت افطار کا اہتمام مستحسن ہے اور بوقت افطار دعا، تسبیح اور افطار کے آداب کا خاص لحاظ رکھے تاکہ روحانی اعتبار سے تعلق مع اللہ کا اثر ان کے قلب ودماغ پر پڑے۔ لیکن اگر اس دعوت کا مقصد وزراء اور اعیان سلطنت کا قرب حاصل کرنا ہو یا تشہیر ہو یا اور کوئی دنیاوی غرض ہو تو پھر ایسی دعوت سے احتراز بہتر ہے۔

اور اگر غیر مسلم قائدین مسلمان کو دعوت افطار دیں اور افطار حلال وجائز مال سے تیار کریں، اس میں مسلمانوں کے اصول وآداب کی رعایت ہو اور نماز کا بھی نظم ونسق ہو تو افضل تو یہی ہے کہ شرکت سے بچا جائے تاہم شریک ہونا جائز ہے خصوصا ایسے وقت میں جب کہ ان کے سیاسی اغراض ہوں یا مسلمانوں کو فریب دے کر اپنے سے قریب کرنا چاہتے ہوں۔

(ب) غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت اور تہنیت:

غیر مسلموں کی تقریبات اور تہوار چونکہ فحش، عریانیت، بے حیائی اور منکرات و مغلظات نیز مشرکانہ رسومات پر مشتمل ہوتا ہے، نوجوان دوشیزہ لڑکیاں آراستہ ہو کر مورتیوں کی پوجا پاٹ کے لئے مندر اور دیگر استھانوں پر جاتی ہیں اور یہ سب چیزیں شریعت میں ناجائز اور حرام ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان تقریبات میں شریک ہو کر مشرکانہ افعال اور خرافات کی تائید کریں۔

اور جب شرکت ہی جائز نہیں تو مبارک باد دینا کیا درست ہوگا؟ اس لئے یہ موقع تہنیت اور مبارکباد کا نہیں بلکہ اسلام کو سمجھانے کا ہے

(دیکھئے: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی تحریر بحث ونظر شمارہ/۵۱)۔

۳-(الف) جھنڈے کو سلامی دینا:

غیر اللہ کی عبادت اور پرستش کا ناجائز اور حرام ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے اور تکریم واحترام بعض چیزوں کی مباح ہے لیکن احترام میں ایسا غلو جس سے عبادت کا شائبہ ہونے لگے مکروہ ہے لہذا پرچم کشائی اور جھنڈے کو لہرانے اور سلامی دینے کا مقصد چونکہ عبادت اور بندگی نہیں ہے، اس لئے وہ شرک کے دائرہ میں تو نہیں آتا لیکن احترام میں اس قدر غلو مکروہ ہے، اسی طرح ترانہ پڑھتے وقت احترام میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، لہذا مسلمانوں کو حتی الامکان ان سب چیزوں سے اجتناب کرنا چاہئے، اور اگر حکومت کی طرف سے دباؤ ہو اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو بادل ناخواستہ مذکورہ امور کے ارتکاب کرنے میں ان شاء اللہ مواخذہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہندوستان میں یہ مسئلہ بہت حساس نوعیت کا رہا ہے، اس پر بہت لوگوں نے لکھا ہے (دیکھئے: نقیب جلد ۷، فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۸۸، ماہنامہ الرشاد جلد ۴، شمارہ/ ۳۵)۔

مشرکانہ ترانے یا وندے ماترم پڑھنا:

وندے ماترم یا ایسے قومی ترانے پڑھنا جن میں شرکیہ مضامین ہوں اسلامی عقیدے پر حملے کے مترادف ہے، ایسے ترانے پڑھنا قطعاً حرام اور ناجائز ہے جن میں ارض وطن کی معبودیت کا تصور پایا جاتا ہو، کسی بھی مسلمان کے لئے کسی بھی حال میں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور اس بابت کسی بھی حکومت سے سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا، یہ تو اسلام کی اساس پر حملہ ہے۔

ارشاد ربانی ہے: "ولئن اتبعت أهواءهم من بعد ما جاءك من العلم إنك إذا لمن الظالمين" (سورۂ بقرہ: ۱۴۵)

(اگر آپ نے ان کی خواہش کی اتباع کی آپ کے پاس علم آجانے کے بعد تو بلاشبہ آپ ظالموں میں سے ہوں گے)۔

اور کل ہند مجلس تعمیر ملت نے یہ تجویز پاس کی ہے:

''اس سیمنار کا متفقہ احساس ہے کہ وندے ماترم کو قومی گیت قرار دینا نہ صرف مسلمانوں بلکہ ملک کی دوسری مذہبی اقلیتوں پر بھی ایسی چیز تھوپنا ہے جو ان کے ضمیر وعقیدہ کے خلاف ہے...... مسلمانوں کے لئے یہ گیت پڑھنا قطعاً جائز نہیں'' (الرشاد شمارہ نومبر ۲۰۰۰)۔

ج- جمہوری ممالک کے عدالتی فیصلے اور مسلمان:

انسان زمین پر خدائی احکام نافذ کرنے میں خدا تعالی کا نائب اور خلیفہ ہے، اس لئے اصل احکام، زندگی کے تمام شعبوں میں وہ خدائی احکام ہیں جن پر ہر شخص کو مکمل طریقے سے کاربند ہونا چاہئے خصوصاً مسلمانوں کو جنہوں نے کلمہ توحید کے ذریعہ خدائی نظام اور شرعی قوانین پر عمل پیرا ہونے کو اپنے ذمہ از خود لازم کرلیا ہے، رب ذوالجلال نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے تمام امور میں خواہ اتفاقی ہوں یا نزاعی خدا اور رسول کے حکم کی اطاعت کریں اور کوئی بھی معاملہ غیر مسلم عدالت میں نہ لے جائیں، غیر مسلم عدالت میں لے جانا شیطان کو حکم بنانے کے مترادف ہے۔ قرآن کریم نے ان لوگوں پر نکیر کی ہے جو اسلام کے مدعی ہونے کے باوجود اپنا فیصلہ کسی یہودی کے پاس لے جاتے ہیں۔

ارشاد ربانی ہے: "ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك. يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالاً بعيداً" (سورہ نساء: ۶۰)۔

۴-الف-وحدت ادیان ایک غیر اسلامی تصور:

لوگوں میں تمدنی اور ثقافتی وحدت پیدا کرنے کے لئے انسانوں کو ان کی عملی زندگی سے علاحدہ کر دینا اور مذہب کے دائرہ میں کچھ عبادتی رسوم کو باقی سمجھنا اور لوگوں کے قلب و دماغ میں یہ تاثر پیدا کرنا کہ مذاہب الگ الگ ہیں اور منزل مقصود ایک ایک غیر اسلامی تصور اور شریعت سے متصادم نظریہ ہے کیونکہ اس سے کفر وشرک پر مبنی مذاہب کی توثیق وتصویب ہوتی ہے، اسلام وحدت دین کا قائل ہے: "إن الدين عند الله الاسلام" نہ کہ وحدت ادیان کا۔

اللہ جل جلالہ کا پاک ارشاد ہے: "وأن هذا صراطي مستقيمًا فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله" (سورۂ انعام: ۱۵۳)

(یہ سیدھا راستہ ہے تم لوگ اسی کی اتباع کرو، دوسری راہوں کی اتباع نہ کرو ورنہ تم راہ حق سے ہٹ جاؤ گے)۔

وحدت ادیان کا نظریہ خالص کافرانہ اور مغربی نظریہ ہے، اگر کوئی مسلمان سارے مذاہب کو برحق سمجھے تو وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہے گا۔

مولانا تقی امینی صاحب اپنی کتاب میں مفاہمت بین المذاہب کی بابت یوں رقم طراز ہیں: ''موجودہ دور میں ''وحدت ادیان'' کے نام سے مفاہمت کی جو شکل نکالی گئی ہے وہ دراصل مذہب کے خلاف زبردست سازش اور چال ہے، مذہبی لحاظ سے اس کو قبول کرنا خود مذہب کے ''دیوالیہ'' ہونے کا اعلان کرنا ہے، اسلام اس کی موجودہ شکل کو ہرگز قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے'' (اسلام اور جدید دور کے مسائل/ص ۳۳۵)۔

ب-پسماندہ طبقے کا تعاون:

اسلام ایک انصاف پسند اور غمخوار مذہب ہے اس کے اندر انسانی ہمدردی اور بھائی چارگی ہے، وہ بلا تفریق مذہب وملت ہر ایک کے ساتھ انصاف کا حکم دیتا ہے اور ہر ایک کو ظلم سے روکتا ہے۔ اس کا حکم تو یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے اور ظالم کو ظلم سے روکا جائے۔

لہٰذا غیر مسلموں کے کسی طبقہ پر اگر کوئی طبقہ ظلم کر رہا ہو اور اس کو منصوبہ بند طریقے سے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے کمزور اور پسماندہ بنانا چاہتا ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اخوت انسانی کی بنا پر مظلوم طبقہ کی مدد کریں اور ظالم طبقہ کے خلاف آواز کو بلند کریں۔

حدیث پاک میں ہے: ''انصر أخاك ظالمًا أو مظلومًا فقال رجل يا رسول الله أنصره مظلومًا فكيف أنصره ظالمًا قال: تمنعه من الظلم فذلك نصرك إياه'' (مشکوۃ شریف ۲/ ۴۲۲) (تم اپنے بھائی کی مدد کرو، وہ ظالم ہو یا مظلوم، ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ مظلوم کی مدد تو برحق ہے لیکن ظالم کی مدد کس طرح کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روک دو یہی اپنے بھائی کی مدد ہے)۔

ج-خدمت خلق اور رفاہی ادارے:

یہ بات درست ہے کہ اسلام میں خدمت خلق کی بڑی اہمیت ہے، اور قرآن وحدیث میں مختلف طریقوں پر اس کی ترغیب دی گئی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسرے اہل مذاہب سے امت مسلمہ کا رشتہ اخوت انسانی پر مبنی ہے اور مسلمانوں سے اس کا دوہرا تعلق ہے ایک انسانی بھائی چارہ کا اور دوسرے اسلامی وایمانی اخوت کا، ان حالات میں مسلمان اگر خدمت خلق کا کوئی ادارہ قائم کریں جیسے اسپتال، اسکول، کالج، مسافر خانہ، سرائے وغیرہ تو دیکھنا چاہئے کہ جہاں ہم ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں وہاں پہلے سے سرکاری ادارے اس طرح کے قائم تو نہیں ہیں جو مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے عام ہیں، اگر قائم ہوں تو پھر بہتر ہے کہ ایسے اداروں کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھا جائے چونکہ سرکاری ادارہ سے غیر مسلموں کی ضرورت تو پوری ہوجاتی ہے لیکن مسلمانوں کی ضرورت پوری نہیں ہو پاتی چونکہ زیادہ تر ملازم غیر مسلم ہوتے ہیں جو متعصب ہوتے ہیں، انہیں مسلمانوں سے ہمدردی نہیں ہوتی۔ اور اگر پہلے سے کوئی ادارہ قائم نہ ہو تو دیکھنا چاہئے کہ وہاں آباد غیر مسلم طبقہ خوش حال تو نہیں ہے اگر خوش حال ہو تو پھر اس کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا بہتر ہے، اور اگر غریب، مفلوک الحال ہو تو پھر بلا تفریق مذہب تمام لوگوں کے لئے خدمت کا دروازہ کھلا رکھنا بہتر ہے۔

د-قدرتی آفات میں عام لوگوں کی مدد:

قدرتی آفات جیسے زلزلہ، سیلاب، متعدی امراض، طاعون وغیرہ کا اثر تو سماج میں بسنے والے تمام ہی لوگوں پر پڑتا ہے اور سبھی لوگ امداد کے محتاج ہوتے ہیں، ایسی مصیبت کی گھڑی میں بھی بعض فرقہ پرست عناصر کا مختلف طبقات کے درمیان امتیاز وتفریق سے کام لینا اخلاقی اور معاشرتی اعتبار سے انتہائی مذموم فعل ہے، مسلمانوں کی ریلیف تقسیم کرنے والی تنظیموں کو ان حالات میں برادران وطن کے ساتھ اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور بلا امتیاز وتفریق عصبیت کی دنیا سے الگ تھلگ ہو کر محتاجوں، بے کسوں کی مدد کرنی چاہئے، جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ اخلاق تھے۔

اس لئے ریلیف تقسیم کرتے وقت عمومی توجہ تو سبھی مصیبت زدہ پر ہونی چاہئے لیکن خصوصی توجہ مسلمانوں پر دینی چاہئے کیونکہ مسلمانوں کو دینے میں دوہرا ثواب ہے اور غیر مسلم کو ایک اور اگر ریلیف کا مال زکاۃ والا ہو یا کوئی ایسا مال ہو جو مسلمانوں کے لئے مختص ہو تو پھر اس کو مسلمانوں ہی کو دینا لازم ہے، غیر مسلم کو دینے سے زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا محمد ارشاد قاسمی بھاگل پوری
مدرسہ ریاض العلوم، گورینی، جونپور

جمہوری نظام میں ہر ایک کو اپنا نمائندہ قائد بنانے کا حق رہتا ہے، اس ووٹ کے حق میں وہ اچھے اور برے دونوں کا انتخاب کرسکتا ہے، مثلاً اس نے اگر ووٹ کسی اچھے کو نہ دیا تو اس کے منفی نتیجہ میں دوسرا ظالم فاسق اقتدار پر آسکتا ہے، جس میں فی الجملہ اس کو دخل ہوجائے گا، اس لئے ہندوستان جیسے ملک میں جمہوری نظام کی وجہ سے ووٹ اور انتخاب کی بہت اہمیت ہے، فعل خیر وشر کے ارتکاب یا اس کے سبب بننے میں ہر ووٹر کو فی الجملہ دخل ہے۔

ا-الف- مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا اور ووٹ دینا جائز ہوگا، اگر چہ ایسے قانون کی تجویز کا امکان ہو جو شریعت اسلام کے خلاف ہو، چونکہ اگر یہ کامیاب ہوگئے تو جمہوری قانون کے اعتبار سے جو مذہبی آزادی ہے اس پر آواز تو اٹھا سکیں گے کچھ احتجاج تو پیش کریں گے، مسلمان کا اور اسلام کا نمائندہ بن کر نمائندگی تو کرسکیں گے، حسب موقع کچھ نہ کچھ تو آواز اٹھائیں گے، پھر آہستہ آہستہ نمائندگی میں ترقی ہونے کی وجہ سے وہ ایسا مرتبہ اور عہدہ پاسکتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا مذہبی احتجاج سنا جاسکے گا، اس لئے بالکل کنارہ کشی کے مقابلہ میں الیکشن میں انتخابی مہم میں شریک ہونا انفع ہے۔

ب- یقیناً اس جمہوری نظام میں ووٹنگ کی بڑی حیثیت ہے، نظام حکومت کی تبدیلی میں اس کو اساس کا درجہ حاصل ہے، اور یہی کنجی ومفتاح نظام ہے، اور انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات وابستہ ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو ووٹ دینا اور اس میں شریک ہونا لازم ہے۔

مگر خیال رہے کہ ووٹ اسی وقت دینا اور الیکشن میں اسی امیدوار کو دینا شرعاً واجب ہوسکتا ہے جو اپنے مقابل کے اعتبار سے صالح، اسلامی مزاج یا مذہب اسلام کی رعایت کرنے والا ہو، مسلمانوں کے ملی مسائل سے دلچسپی رکھنے والا ہو۔

ج- ایسی پارٹی کا نمائندہ بننا جس نے اعلانیہ اور کھلم کھلا شعائر اسلامی کی توہین کی، مسلمانوں کے خون کو بہایا، ان کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا، معمولی معمولی بہانہ بنا کر ان کو ہلاک کیا، نہ ایسی پارٹی کا نمائندہ بننا درست ہے اور نہ ایسی پارٹی کو ووٹ دینا درست ہے۔

آیت قرآنیہ: "إنما ینهاکم الخ" کی وجہ سے ایسے معاندین اسلام اور مخالفین اسلام کی مخالفت بالکل درست ہے۔

اگر کوئی امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک ہو، مسلمانوں کے ساتھ رویہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہو تب بھی اس کو ووٹ دینا درست نہ ہوگا، چونکہ پارٹی کے منشور پر عمل کرے گا، اور پارٹی میں ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج، اصول، قانون کی ضرور رعایت کرے گا، اس کی ذاتی خصلت سے اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا پارٹی کے منشور اور مزاج سے اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔

خیال رہے کہ اس شخص سے فائدہ موہوم، اور منشور کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونا یقینی، لہٰذا یقینی کو موہوم کے تابع کر کے نہ ووٹ دینا جائز ہوگا، اور نہ ایسی جماعتوں میں شمولیت جائز ہوگی۔

د- انتخاب کے موقعہ پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات اور قومی فلاح وبہبود کے تحت معاہدے کئے جاسکتے ہیں، ان کے ساتھ شرکت بھی کی جاسکتی ہے، اور ان کی حمایت کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ وہ مذہب اسلام کے معاند اور مسلمانوں کے خلاف نہ ہوں، مسلمانوں کے مذہب کو پامال، اسلامی قانون کو ختم، شعائر اسلام کو ڈھا کر محض کفر وشرک کا بول بالا کرنے والی نہ ہو، تب ایسی صورت میں ان کی حمایت جائز ہے، اور اس کے جواز کے لئے نص قرآنی سورہ ممتحنہ کی یہ آیت ہے: "لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم الخ"۔

ھ- معاشرہ میں عدل وانصاف، امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے لئے سماج کے مختلف طبقوں سے خواہ وہ کسی بھی مذہب کے ہوں ان کے اشتراک کے ساتھ کام کیا جاسکتا ہے، اور ایسی تنظیمیں اور کمیٹیاں قائم کی جاسکتی ہیں جن میں غیر مسلموں کے ساتھ مل کر انسانی خدمات کی جاسکتی ہیں۔

مگر اس کا خیال رہے کہ وہ حقیقتا معاندانہ اور منافقانہ روش اختیار کرنے والے نہ ہوں، اور ایسا نہ ہو کہ ان کے مکروفریب سے اسلام پر اور اسلامی معاشرہ پر کوئی فساد جاری ہوجائے اور اسلامی تہذیب وتمدن پر کوئی نقصان آئے۔ اور طریقہ کار ایسا نہ ہو کہ اسلامی طریقے کے خلاف ہو تو ان مذکورہ شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔

اس کے جواز کی دلیل منفی پہلو سے متعلق ہے یعنی وہ امور جن میں اسلامی اصول اور مزاج سے ٹکراؤ نہ ہو، کسی قباحت اور معصیت پر مشتمل نہ ہو، سو یہاں ایسی بات نہیں، بلکہ خدمت خلق اور مکارم اخلاق سے متعلق ہے، اس کی اصل اور اساس مکارم اخلاق پر مشتمل ہے اور مذہب اسلام میں اس کی بڑی اساسی اہمیت ہے، اس کی تاکید کی گئی ہے، آپ کی بعثت ہی ایسے امور کے لئے ہوئی ہے۔

حدیث پاک میں ہے: ''إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق'' (بیہقی فی الشعب ۶/ ۲۳۱، مستدرک ۲/ ۶۱۳، مکارم ابن ابی الدنیا/ ص ۲۰۰) (میں بہترین اخلاق وعادات کے اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں)۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ پاک نے مجھے عمدہ اخلاق اور کامل درجہ کے عمدہ افعال کے لئے بھیجا ہے'' (بیہقی فی الشعب ۶/ ۲۳۱)

اس قسم کی بے شمار روایتیں احادیث کی متعدد کتابوں میں ہیں جن میں ایک دوسرے کے ساتھ حسن برتاؤ، ان کی دنیاوی ضرورتوں اور معاشرتی امور میں تعاون اور اعانت کا حکم ہے، اور یہ مومن اور مسلمان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے۔

۲- (الف) اہل اسلام کی مخلوط آبادی میں رہائش:

غیر مسلم کی اکثریتی آبادی میں مسلمانوں کی رہائش اور سکونت خصوصا اس دور میں جب کہ مسلمان ضعف ایمان کی وجہ سے بجائے اس بات کے کہ وہ اسلامی معاشرت اور اخلاق سے دوسری قوموں کو متاثر کریں اپنی تہذیب سے دوسروں کو گرویدہ کرسکیں، اور حسن معاشرت سے اسلام کی خوبی غیر قوموں میں رائج کرسکیں اور اسلام جو خود ایک بہتر کلچر، بہترین تہذیب اور طور وطریقہ اپنے اندر رکھتا ہے اس سے دوسری قوموں کو روشناس اور متاثر کرسکیں، وہ خود غیر مسلموں کی تہذیب میں ضم ہونے لگتا ہے، اس کی معاشرت کو قبول کرلیتا ہے، بچے بچیاں سب اسی معاشرت سے متاثر ہوجاتی ہیں، اور اسلامی طور طریق کو اور ان امور کو جسے شریعت نے واجب ولازم قرار دیا ہے اسے قید صعوبت سمجھ کر اس سے آزادی اختیار کرلیتی اور رہن سہن لباس وغیرہ میں انہیں کے طرز کو اختیار کرلیتی ہیں، حتی کہ روزہ نماز اسلامی فرائض سے بھی غافل ہوجاتی ہیں اور انہیں کی طرح فواحش کا ارتکاب کرنے میں کوئی شرم وجھجک محسوس نہیں کرتی ہیں، معمر اور بوڑھے پرانے تو اپنے اسلامی ماحول پر کسی نہ کسی درجہ قائم رہتے ہیں مگر ان کی اولاد اور نسل نو مذہب اور اسلامی معاشرت کو خیرآباد کہہ دیتی ہیں، اس پر تجربہ مشاہد ہے، لہذا مسلمانوں کو اسلامی معاشرت وتہذیب باقی رکھنے کے لئے جہاں تک ہوسکے مخلوط اور کثیر غیر مسلم آبادی میں سکونت ورہائش سے اجتناب اور گریز کرنا چاہئے۔

ارباب فقہ وفتاوی نے بھی اس کے بہتر نتائج نہ سمجھ کر ممانعت اور اجتناب ہی کا فتوی دیا ہے، چنانچہ علامہ شامی درمختار کی شرح میں لکھتے ہیں:

''أما إذا كثروا على وجه يؤدي إلى تعطيل بعض الجماعات أو تقليلها منعوا من ذلك وأمروا أن يسكنوا ناحية ليس فيها للمسلمين جماعة هذا محفوظ عن أبي يوسف في الأمالي'' (شامی مصری نسخہ ۴/ ۲۰۹)

(بہر حال جب ان کی تعداد زائد ہونے لگے ایسے طور پر کہ جماعت کے تعطل یا تقلیل کا باعث ہو تو اس سے روکا جائے گا اور حکم دیا جائے گا کہ وہ بستی کے کنارے رہیں جہاں مسلمانوں کی جماعت نہ ہو)۔

پھر علامہ شامی آگے چل کر سکونت کے جواز وعدم جواز کی علت اور مناط حکم کی تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بل يدور الحكم على القلة والكثرة والضرر والمنفعة وهذا هو الموافق للقواعد الفقهية'' (۴/ ۲۱۰)

(حکم کا مدار قلت اور کثرت پر ہے ضرر اور منفعت پر ہے، اور یہی موافق ہے قواعد فقہیہ کے)۔

حدیث پاک میں بھی اہل اسلام کو کفار ومشرکین کے درمیان رہنے کی ممانعت ہے۔

حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مشرکین صنم پرستوں کے ساتھ بود وباش اختیار کرے اس کا ذمہ خدا سے بری

ہے"۔

دوسری حدیث میں ہے: "عن عمر قال قال رسول الله ﷺ: لاتجالسوا أهل القدر ولا تفاتحوهم" (مشکوۃ/ ص۲۲)
(حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: قدریہ سے نہ مجالست کرو اور نہ ان کو گھر میں آنے دو)۔

خلاصہ یہ ہے کہ حتی الامکان مسلمانوں کو اپنے اسلامی معاشرہ کی حفاظت اور صیانت لازم ہے، اور مخلوط آبادی بجائے موثر ہونے کے عموماً اور تجربۃً متاثر ہوجاتی ہے، اور اپنا کلچر وتمدن اور تہذیب دوسروں میں مخلوط اور مغلوب ہوجاتا ہے، اس لئے احتیاط لازم ہے۔

ب- خیال رہے کہ پڑوسی ہونے کے اعتبار سے غیر مسلموں کے ساتھ خلط ربط اور باہمی معاونت اور آپسی تعاون کی ایک حد ہے: رہن سہن، ملنے جلنے اور اخلاقی امور کی تو ان کے ساتھ گنجائش ہے مگر ان کے ان امور میں جن میں مذہب شامل ہوجاتا ہو اور مذہب کی حیثیت سے جو کافرانہ امور کرتے ہیں جس میں وہ دوسرے مذاہب سے امتیازی امور اختیار کرتے ہیں اہل اسلام کو اس میں شرکت اور تعاون کی اجازت ہرگز نہ ہوگی۔

ہر مذہب میں میت کے ساتھ مرنے کے بعد کے امور میں مذہبی امور کی رعایت ہوتی ہے۔ لہذا اہل سلام کو دوسرے باطل مذہب میں شرکت ممنوع ہے، یہ ہے اصل تنقیح مناط۔ غیر مسلموں کے یہاں مُردوں کے ساتھ ارتھی کریا کرم اور شمشان گھاٹ جنازہ کو ایک خاص مذہبی امور کے ساتھ لے جاتے ہیں جو امور شرکیہ کفریہ ہوتے ہیں، لہذا یہ شرکت معیت لاش کو اٹھانا، شمشان گھاٹ جانا اور ان کو جلانا یہ سب امور اہل اسلام کے لئے ناجائز وحرام ہوں گے، اور ان کے آخری رسومات میں شریک ہونا درست نہ ہوگا، سوائے دنیاوی تعاون کے۔

شبہ کا ازالہ:

صحاح ستہ میں آپ ﷺ کا یہودی کے جنازہ میں شریک ہونا ثابت ہے۔

اس سے ہندو کے جنازہ میں شرکت کے جواز کو ثابت نہیں کیا جاسکتا، اس کے کئی وجوہ ہیں:

۱- یہ اہل کتاب کے ساتھ ابتداء میں موافقت کا حکم تھا بعد میں یہ حکم منسوخ ہوکر "خالفوهم" کا حکم ہوگیا۔

۲- اہل کتاب اور بت پرستوں کے معاملہ میں فرق ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے، بخلاف بت پرستوں کے۔

۳- اہل کتاب کے جنازہ میں سادگی کے ساتھ دفن کرنا ہوتا تھا، بخلاف ہنود ہند کے جنازہ میں کہ کافرانہ رسوم کے ساتھ جنازہ کو چتا میں ڈال کر جلانا ہوتا ہے، لہذا مسلمان کا ہنود کے جنازہ میں شریک ہونا جائز نہیں، ہاں عیادت کرسکتے ہیں، ایسے موقعوں پر ان کے غم میں اظہار شرکت لفظاً ولساناً کرسکتے ہیں، ان کے گھر جاکر تسلی وتعزیت کرسکتے ہیں۔

اہل فتاوی نے بھی اس شرکت جنازہ کو نادرست قرار دیا ہے، چنانچہ فتاوی محمودیہ میں ہے:

پڑوسی کافر بیمار ہو تو اس کی عیادت کرنا اور اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا تو ثابت ہے لیکن ارتھی پکڑنا اس کو جلانے کے لئے مرگھٹ جانا ثابت نہیں، اس سے بچنا لازم ہے (۱۵/۳۴۵)۔

اسی طرح فقیہ الامت مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ کا ایک فتوی ملاحظہ کیجئے:

سوال- مسلمان کو غیر مسلم کے جنازہ میں ہمراہ جانا یا غیر مسلم کو مسلم کے جنازہ کے ساتھ چلنا، تکفین وتدفین میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

جواب- درست نہیں (محمودیہ ۱۴/ ۲۹۲)۔

پس معلوم ہوا کہ مرن اور میت کے ساتھ جو خاص مذہبی نوعیت کے امور ہوتے ہیں وہ شرک اور کفر پر مشتمل ہوتے ہیں، لہذا ایسے موقع پر شرکت جائز نہیں۔

کافر غیر مسلم کے لئے ایصال ثواب:

خیال رہے مومن کے علاوہ کسی بھی غیر مسلم مشرک، کافر یہودی، نصرانی کے لئے مرنے کے بعد دعاء مغفرت ورحمت اور ایصال ثواب بالکل جائز نہیں، اور اس کی ممانعت نص قطعی سورۂ توبہ کی آیت: "ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين" سے ثابت ہے۔

ج-اس سوال میں دو شقیں ہیں: ایک تیوہار کے متعلق ہدایا یا تحائف کا، دوسرا تقریبات کے مواقع پر ہدایا یا تحائف کا، مثلاً شادی بیاہ، بچے کی پیدائش، دوکان کا افتتاح، تعمیر مکان کی مٹھائی وغیرہ، اس میں تھوڑی تفصیل ہے۔

اول- تیوہار کے متعلق:

اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

۱-ایک وہ ہے جس کا تعلق تہوار کے پوجاپاٹ سے ہے، بتوں پر چڑھائی گئی اور پیش کی گئی مٹھائیاں اور پھل فروٹ وغیرہ ہیں دوسرے وہ ہیں جو اپنے گھروں میں پکائے جاتے ہیں اور بازاروں سے گھروں میں لاکر بلا پوجاپاٹ کئے اور بغیر مندروں اور بتوں پر چڑھائے کھاتے اور تقسیم کرتے ہیں۔

ان دونوں کے احکامات الگ الگ ہیں:

۱-تہواروں کے موقع پر پوجاپاٹ اور مندروں اور بتوں پر چڑھائی گئی اور ان کی بھینٹ کی گئی چیزیں یہ مسلمانوں کے حق میں بالکل ناجائز اور حرام ہیں۔ نہ ان کا قبول کرنا درست نہ ان کا کھانا اور استعمال کرنا درست ہے۔

الجامع لاحکام القرآن میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ''وما ذبح على النصب، المعنى والنية فيها تعظيم النصب لا أن الذبح عليها غير جائز'' (۵/ ۶۰) (اور وہ جو نصب یعنی بتوں پر ذبح کئے جاتے ہیں (حرام ہیں)۔

عام کفار و مشرکین کے ہدایا کا حکم (جو دیوی دیوتاؤں اور چڑھاوا کے علاوہ ہو):

اول اس کے متعلق احادیث اور آپ کی عادت طیبہ اور آپ کا عمل، جو احکام کی اساس اور بنیاد ہے۔

امام بخاری نے باب قائم کیا ہے: ''باب قبول الهدية من المشركين'' اس کے تحت کئی روایتیں بیان کی ہیں جس میں ہاجرہؓ کے کافر بادشاہ کی جانب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبول کرنے کا ذکر ہے۔

اسی طرح یہ حدیث ہے: ''قال أبو حميد أهدى ملك أيلة للنبى ﷺ بغلة بيضاء فكساه بردًا''۔ نیز: ''أهدى للنبى ﷺ جبة سندس وكان ينهى عن الحرير''۔ نیز: ''إن كيدر دومة أهدى إلى النبى ﷺ'' (بخاری/ ص ۳۵۶)

(ابوحمید نے کہا: ایلہ کے بادشاہ نے سفید خچر اور چادر ہدیہ میں دی تھی۔ آپ کو ریشمی جبہ ہدیہ میں ملا تھا، اور اس کے پہننے سے آپ منع فرماتے تھے۔ کیدر دومہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ دیا تھا)۔

ایک اور روایت میں ہے:

''ان عياض حماد المجاشعى أهدى لرسول الله ﷺ فرسًا قبل أن يسلم فقال: إني أكره رفد المشركين''

''عن عامر بن ملك الذى يقال له ملا عب الألسنة قال: قدمت على رسول الله ﷺ بهدية فقال: إنا لانقبل هدية لمشرك'' (مجمع الزوائد ۴/ ۱۵۴)۔

''عن كعب بن مالك قال قدم عامر بن مالك أخو البراء، وهو مشرك۔ فأهدى للنبى ﷺ فرسين وحليتين۔ فقال ﷺ: لا أقبل هدية المشرك۔'' (احکام القرآن للشفیع ۳/ ۲۵)

(حماد مجاشعی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام لانے سے قبل گھوڑا دیا تو آپ نے فرمایا میں مشرکین کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔ ملاعب الالسنہ نے کہا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدیہ لے کر آیا تو آپ نے فرمایا: میں مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔ عامر بن مالک نے جو براء کے مشرک بھائی تھے اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو گھوڑے اور دو جوڑے ہدیۃً دیئے تو آپ نے فرمایا: میں مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا)۔

محدثین فقہاء و مفسرین آپ کی مختلف روایتوں کو سامنے رکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے مصلحت کی رعایت فرماتے ہوئے قبول کیا ہے، لہذا اہل ہند کے لئے بھی موجودہ دور میں مصالح کے پیش نظر قبول ہی کرنا بہتر ہے۔

فقہاء اور ارباب فتاوی کے اقوال:

فقہاء کرام نے اسے جائز گو احتیاط کے خلاف قرار دیا ہے۔

اسی طرح غیر مسلم کی غیر مذہبی تقریبات شادی بیاہ وغیرہ میں، بچے کی پیدائش کے موقع پر اور مکان کی تعمیر کی خوشی کے موقع پر ان کی تقریبات میں شرکت جائز ہے، گو حکم یہ ہے کہ حتی الوسع ان کی دوستی اور اختلاط سے پرہیز کرے، اس لئے کہ مصاحبت سے ان کے کفریہ رسوم و عادات کے مسلم معاشرہ میں سرایت کا احتمال ہی نہیں یقین رہتا ہے۔

د- مذہبی تعاون کے سلسلے میں دو شقیں ہیں:

۱- غیر مسلموں کا مساجد و مدارس میں چندہ دینا اور تعاون کرنا۔

۲- مسلمانوں کا مندروں میں اور تیوہاری امور میں چندہ دینا۔ ان دونوں مسئلوں کی صورت الگ الگ ہے، اور جواب بھی جداگانہ ہے۔

۱- غیر مسلموں کا مذہبی امور میں مسلمانوں کا تعاون کرنا۔

اگر وہ اسے نیک اور اچھا کام سمجھتے ہوں اور اس میں کسی تسلط اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو درست ہے، ارباب فقہ و فتاوی نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

اس کی دوسری شق یہ ہے کہ مسلمان ان کے مذہبی کافرانہ امور میں یا مذہبی تہوار میں یا مندر وغیرہ کی تعمیر میں تعاون کریں اور چندہ دیں، یہ صورت تو نص قطعی "لا تعاونوا علی الإثم والعدوان" میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

مگر ہندجیسی سرزمین پر جہاں اب کافرانہ حکومت ہے، آبادی میں کفار کا غلبہ ہے، باہم مل جل کر رہنا ہے، تعاون اور چندہ نہ دینے کی شکل میں ضرر و فتنہ، ضیاع مال و عزت کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں مجبوری اور اضطرار کے ذیل میں داخل کر دینے کی گنجائش نکل سکتی ہے، اس لئے ہر شق و صورت کا حکم الگ ہے۔

۱- کوئی فتنہ وفساد اور مال وجان وغیرہ کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو اور نہ جبر و اکراہ کیا جارہا ہو، نہ کوئی مجبوری ہو، محض ان کو خوش کرنے کے لئے اور دکھانے کے لئے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ان کے مذہبی تہواروں میں جو کفر و شرک پر مشتمل ہوتے ہیں، جیسے درگا پوجا، کالی پوجا وغیرہ اور تعمیر مندر وغیرہ میں دینا ناجائز اور حرام ہے، کہ یہ تعاون علی الاثم ہے۔ رازی کی احکام القرآن میں ہے: "نهي عن معاونة غيرنا على معاصي الله تعالى" (۴۲۹/۲)۔

اس کی دوسری شق وہ ہے کہ جس میں چندہ اپنی رضا و خوشی سے یا تعاون کی نیت و ارادے سے نہیں دیا جارہا ہے، بلکہ ماحول اور آبادی میں ان کے غلبہ کی وجہ سے فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے دیا جارہا ہو تو چندہ یا روپیہ دینا جائز ہے، اس صورت میں تعاون کی نیت نہ کرے، بلکہ دفع شر کی نیت کرے۔

ھ- ہندوؤں کی مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت کا حکم:

(الف) ہندوؤں کی مذہبی تقریبات جس نوعیت اور کیفیت پر ہوں گی اسی اعتبار سے ان کا حکم ہوگا۔

اگر غیر مسلم ہندوؤں کی تقریبات خالص مذہبی نوعیت کی ہیں اور ان میں کافرانہ اور مشرکانہ امور ہیں تو ایسی صورت میں شرکت ناجائز اور حرام ہے۔

(ب) مبارک بادی دینا درست ہے اس میں کسی کفریہ شرکیہ میں شرکت اور مصاحبت نہیں ہے، لہذا گنجائش ہے۔

مسلمان اقلیتوں کا غیر مسلم بھائیوں سے دوچار ہونے کا مسئلہ:

اس مسئلہ میں اصل تو یہ ہے کہ دعوتی ذہن اور تحریک اور مقصد کے علاوہ غیر مسلموں سے ربط اور خلط رکھنا ممنوع ہے، جس پر متعدد نصوص قرآنیہ اور احادیث پاک شاہد اور دال ہیں۔ لیکن سورہ ممتحنہ کی ایک آیت میں اللہ پاک نے معاند اور غیر متشدد اور غیر متعصب کافروں کے ساتھ اخلاقی اور صلہ رحمی جیسے روابط کو جائز قرار دیا ہے، اس اعتبار سے ایسے غیر مسلموں سے دنیاوی، سیاسی اور مصلحتی روابط کی گنجائش نکلتی ہے۔

۳- الف: جھنڈے کی سلامی اور قومی وملکی ترانہ:

اس مسئلہ کی وضاحت سے پہلے ایک تمہید پیش خدمت ہے۔

ا-شرائع میں تین قسم کے امور ہیں، ایک جس کا حرام اور ممنوع ہونا نصوص سے ثابت ہو، دوسرے حلت اصول شرعیہ اور نصوص سے ثابت ہو، اور اس کی اباحت کے منافی نصوص نہ ہوں، تیسرے منصوص حلت وحرمت نہ ہو، تو اس قسم ثالث میں دیکھا جائے گا کہ اسلام کے اصول اور مزاج کے موافق ہے یا نہیں، کسی وعید اور ممنوع اصول کے ذیل میں تفریحاً تو کوئی حکم ثابت نہیں ہے، خارج سے کوئی کراہت اور قباحت تو نہیں آ رہی ہے۔

پس ان امور پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا جائے گا، پھر ایسی صورت میں اس کی منفی صورت کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا، چونکہ اگر ممنوع اور کراہیت فی ذاتہ نہیں ہے بلکہ خارج سے ہے تو اس میں کچھ توسع کی گنجائش بھی ہوتی ہے، اب اس کی شقوں کو سنئے:

جھنڈے کا ثبوت:

قومی یا ملی یا جماعتی جھنڈا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، صحاح ستہ میں اس کا ذکر بکثرت ہے۔

متعدد صحابہ کرام سے جن میں حضرت ابوہریرہ، ابن عباس، جابر، حارث بن حسان، بلال، عبید اللہ بن بریدہؓ ہیں، جھنڈے کی روایتیں منقول ہیں، اور مختلف اوقات میں مختلف رنگوں کے جھنڈے تھے۔

اسی طرح حضرات صحابہ کے پاس بھی جھنڈے تھے، (شمائل کبریٰ جلد پنجم ۳۸۲، ۳۸۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس جھنڈا جائز ہے، اور خیر القرون سے امت کا اس پر تعامل بھی چلا آ رہا ہے۔

اب اس کی دوسری شق سلامی دینے کی ہے۔

سلامی کا مفہوم اور اسلامی قواعد واصول سے اس پر غور:

سلامی کا مفہوم اکرام واحترام اور تعظیم ہے۔ عبادت یا عبادت کا مفہوم انتہائی تخضع نہیں ہے۔ لہذا یہ عبادت اور پوجا کے ذیل میں داخل ہو کر حرام نہیں ہے اور حرمت کے دائرے میں نہیں آتا ہے۔

ب- وہ ترانے جو مشرکانہ اور کافرانہ ہیں، اسی طرح وندے ماترم کا حکم:

وہ تمام قومی ترانے جو کافرانہ مشرکانہ ہیں جن میں غیر اللہ کی پرستش کی بو ظاہر ہوتی ہے جن میں غایت درجہ تخضع وانکساری کا اظہار ہو، جن میں رب حقیقی کے اوصاف سے غیر اللہ کا اتصاف جس میں ماوی ملجاء ومنتہائے حاجات کا اظہار کیا گیا ہو ان کا پڑھنا، ان میں شریک ہونا ناجائز اور حرام ہے، یہی حکم "وندے ماترم" کا ہے، اس کے مضامین بھی کفریہ اور شرکیہ ہیں۔

اسی طرح ایک ترانہ ہندوانہ "رگھوپتی راگھو" کے متعلق فتاوی محمودیہ میں ہے: شرک اور معصیت میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، (یعنی جائز نہیں) (۱۲/۴۲۸)۔

ج- اس سوال کا حاصل یہ ہے کہ حکومت یا اور کسی محکمہ کی جانب سے مسلمانوں کے حق میں ایسے فیصلے جو اسلامی اصول اور شریعت اسلامیہ کے خلاف ہوں اس فیصلے کو وہ دوبارہ کسی اسلامی محکمے میں یا شرعی عدالت میں یا شرعی پنچایت میں لے جا کر مرافعہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔

سو اس کا بالکل واضح جواب ہے کہ خلاف شریعت فیصلہ مسلمانوں کے حق میں نافذ العمل ہوتا ہی نہیں، ایسے فیصلے پر وہ عمل کا مکلف ہوتا ہی نہیں، اگر یہ فیصلہ کسی مسلم عدالت نے کیا ہے اور وہ نصوص کے خلاف ہے تو وہ فیصلہ ہی صحیح اور معتبر نہیں، اور اگر کسی غیر مسلم عدالت یا غیر مسلم قاضی وجج نے کیا ہے تو ایسے خلاف شرع فیصلے پر مسلمانوں کا عمل کرنا ہی جائز نہیں بلکہ اسے شرعی عدالت اگر یہ نہ ہو تو علماء اور شرعی پنچایت میں دوبارہ فیصلہ کرا کر اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

کافر حاکم کی قضاء مسلمان کے حق میں معتبر نہیں۔ جیسا کہ درمختار میں ہے:

"وقضاء کافر علی مسلم ابد أو نحو ذلك كالتفريق بين الزوجين بشهادة المرضعة لاينفذ في الكل"۔

اور اسی طرح مسلمان قاضی کا فیصلہ مذہب کے خلاف یعنی شریعت کے خلاف نافذ نہیں ہوتا۔ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

"وحاصل هذه المسئلة انه يشترط لصحة القضاء أن يكون موافقا لرأيه اى لمذهبه مجتهدًا أو مقلدًا فلو

قضى بخلافه لا ينفذ'' (رد المحتار مصری ۵/۴۰۷)۔

پس ان عبارات فقہیہ سے معلوم ہوا کہ اگر کسی بھی محکمہ نے شریعت کے خلاف کوئی فیصلہ کیا ہے تو اسے چاہئے کہ شرعی عدالت یا جہاں شرعی فیصلہ ہوتا ہے وہاں مرافعہ کر کے صحیح شرعی فیصلہ کرے۔

۴- (الف) اس سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی طریق اور شعائر دیگر مذاہب مثلاً کفر، نصرانیت و یہودیت کے معاشرے اور تمدن میں ضم ہو جائے، اور سب کا رہن سہن، زندگی گذارنے کا طریقہ ایک ہو جائے، یہ ذہن اور فکر اسلامی اساس اور طریق کے خلاف ہے۔

خیال رہے کہ اسلام ایک مستقل مذہب ہے، اس کا طریق اور اس کا تمدن مستقل ہے، اس کی تہذیب اور اس کا تمدن خود اسلام سے ثابت ہے۔

قرآن میں ہے: "ومن يتبغ غير الإسلام دينًا فلن يقبل منه" (اسلام کے علاوہ تمام تہذیب و تمدن جو طریق اسلام، صاحب شریعت کے عملی اور قولی کے خلاف ہو مردود ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خالفوا اليهود وخالفوا المشركين'' (جامع صغیر/۲۲۶)۔

حاصل یہ ہے کہ اسلام کے پاس خود اپنی تہذیب و تمدن ہے، ولادت سے لے کر موت تک، کھانے پینے سے لے کر پاخانہ پیشاب کے احسن طریقے شریعت و سنت سے ثابت ہیں، دوسروں کے یہاں اس کے طریقے محفوظ اور منضبط نہیں، وہ آزاد ہیں، ان کا قائد ہوائے نفس ہے، یہاں قائد خدا، رسول، سنت، شریعت ہے، اس لئے یکسانیت اور یکساں معاشرہ درست نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام صرف عبادت و مساجد کے اعمال کا نام نہیں، بلکہ تمام عبادتی و معاشرتی امور میں بھی اس کی تعلیمات اور طریقے ہیں۔

ب- اس کا جواب اسی عنوان کے جواب (ھ) میں آچکا ہے، احسان اور بھلائی کا برتاؤ کرنا تمام کافروں کے ساتھ جائز ہی نہیں مستحسن ہے، قحط کے موقع پر آپ نے کفار مکہ کی ایک خطیر رقم سے اعانت فرمائی۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ''لا بأس للمسلم أن يعطى كافرًا حربيًا أو ذميًا، لأن صلة الرحم محمودة فى كل دين والإهداء إلى الغير من مكارم الأخلاق'' (ص ۳۵۲)۔

پس حاصل یہ نکلا کہ مظلوم طبقہ کی مدد اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے، کہ مظلوم کی مدد کرنے کا حکم انفراداً یا اجتماعاً ہے۔

ج- اس سوال کا بھی جواب اجمالاً (ھ) میں آچکا ہے۔ اس کا معقول جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق معاشرتی امور، مثلاً تعلیم، اخلاقی تربیت وغیرہ تو اس میں اشتراک اور عمومیت نہ ہو، اور علاج معالجہ ہاسپٹل وغیرہ ہو تو اس میں اصول اور طریق میں تو اسلامی ذہن ہو، مثلاً پردہ وغیرہ کے احکام، بے حیائی کے امور سے اجتناب، عورتوں کے آپریشن وغیرہ کے لئے عورت کا انتخاب، مگر خدمت عام ہو، ہر ایک اس سے فائدہ اٹھائے، ہندوستان جیسے علاقے میں جہاں مخلوط آبادی ہو وہاں ہاسپٹل کی خدمات عام ہوں تاکہ ان کے ہاسپٹل سے بھی مسلمان فائدہ اٹھا سکیں۔

د- مسلمانوں کی وہ تنظیمیں جو ریلیف وغیرہ کا کام کرتی ہیں، اس میں دونوں کی گنجائش ہے، مخصوص طریقے سے صرف اہل اسلام کے لئے بھی جائز ہے اور عام طور پر تمام اہل مذاہب کے حق میں بھی۔

بہتر جواب یہ ہے کہ اس میں شرعی اور وقتی مصالح اور معطی کی نیت اور مقصد کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

۱- اگر اس میں زکاۃ کی رقوم ہیں یا غالب مقدار زکاۃ ہے تو مسلمانوں کے لئے خاص ہے۔

۲- دینے والے اور لینے والے نے مسلمانوں کے نام سے لیا ہے تو معطی کے اعتبار سے صرف مسلمانوں کا حق وابستہ ہوگا، ۳- مصالح اور ہندوستان کی موجودہ فضا کے اعتبار سے مسلمانوں کا ہی نقصان ہوتا ہے، غیروں کا برائے نام یا دکھاوا ہوتا ہے، پھر یہ کہ ہندو حکومت اور اس کے اقتدار اعلی ہونے کی وجہ سے ان کی بہت جلد تلافی ہو جاتی ہے، اہل اسلام سے تفریق برتنے کی وجہ سے مسلمان زیادہ محتاج رہتے ہیں، مزید مسلمانوں اور کافروں کے مقابلہ میں اہل اسلام زیادہ حق دار ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ چندہ عام مطلق مظلوموں اور غریبوں کے نام کیا جائے، مصالح زمان کے پیش اکثر مقدار اہل اسلام اور اقل مقدار میں غیر مسلموں کو شریک کر لیا جائے۔ ☆☆☆

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا محمد ارشد المدنی

جامعۃ الامام ابن تیمیہ

ا-(الف): ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور مسلمانوں کی اپنی کوئی سیاسی پارٹی بھی نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو اس کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں، ایسی صورت میں اگر مسلمان الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا ترک کردیں تو مسلمان سیاسی اعتبار سے بالکل کمزور اور تباہ ہوجائیں گے، کیونکہ سیاسی قوت ایک ایسی قوت ہے کہ اس کے ذریعہ قوموں کی فلاح وبہبود کا کام انجام دیا جاسکتا ہے، اور اگر مسلمان سیاسی میدان بالکل خالی کردیں، اور اس کی قوت اور طاقت کو بالکلیہ غیروں کے حوالے ہوجانے دیں تو اس بات کا قوی اور غالب اندیشہ ہے کہ اغیار اس سے فائدہ اٹھا کر مسلم دشمنی کی وجہ سے ایسے ایسے قوانین نافذ کریں گے اور ایسا نظام مرتب کریں گے کہ جس کے نیچے مسلمان دب کر رہ جائیں گے۔ اس بنیاد پر قوم وملت کے مفاد کے پیش نظر مسلمان ان ممالک میں الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں، الیکشن میں امیدوار بن سکتے ہیں، ووٹ دے سکتے ہیں اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم بھی چلا سکتے ہیں۔

ب- بلاشبہ انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات بھی متعلق ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر مسلمانوں کے لئے ووٹ دینا شرعاً واجب تو قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ امام شافعیؒ کے قاعدہ "یجوز فی الضرورۃ مالا یجوز فی غیرھا" اور "أخف الضررین" کے تحت اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جائز ہے۔

ج- اگر ایسی سیاسی جماعتیں الیکشن میں حصہ لیتی ہوں، جنہوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو تو ایسی سیاسی جماعتوں میں نہ تو مسلمانوں کی شمولیت جائز ہوسکتی ہے اور نہ ہی انہیں ووٹ دینا، گرچہ اس کے بعض امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب ہو، کیونکہ ایسا دیکھا جاتا ہے کہ امیدوار کے ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہونے کی بنیاد پر اس کو ووٹ دے دیا جاتا ہے مگر پارلیمنٹ میں اس کے پہنچنے کے بعد اس کو مسلمانوں کے خلاف اور مسلم دشمنی کے ایجنڈے کو بروئے کار لانے میں مہرہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور پارٹی وہی کام سرانجام دیتی ہے جو اس کے اغراض واہداف میں شامل ہیں۔ لہذا مسلمانوں پر ایسی سیاسی پارٹیوں میں شمولیت اور اس کو ووٹ دینے سے احتراز واجب ہوجاتا ہے۔

د- انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے، ان میں شرکت اور ان کی حمایت کی جاسکتی ہے۔ البتہ معاہدے کی خلاف ورزی اور عدم پاسداری کی صورت میں ایسی پارٹیوں سے مسلمانوں کا الگ ہوجانا ضروری ہوگا۔

ھ- معروف کو پھیلانا، منکر سے روکنا، انسانیت کے نفع کے لئے کام کرنا اور معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا بلاشبہ امت مسلمہ کا شرعی واخلاقی فریضہ ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی میں غیر مسلم بھائیوں سے تعاون لیا جاسکتا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر اس فریضہ کو انجام دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایسے ادارے اور تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں، جن میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله إنه هو السميع العليم" (سورۂ انفال/۶۱)

(اور اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہو تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہوجایئے، اور اللہ پر بھروسہ کیجئے، بیشک وہ بڑا سننے والا خوب جاننے والا ہے)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلقات کو معمول کے مطابق بنانے کے لئے امن کی کوشش کرنا اور انسانیت کی فلاح کی خاطر باہمی دیانت دارانہ مساعی کرنا جس میں سب لوگ یکساں حصہ دار ہوں، جائز اور درست ہے۔

۲- (الف) موجودہ سیاسی حالات میں اپنے ملک کے اندر علاحدہ آبادی قائم کرنا، اور اس کو صرف مسلمانوں کے لئے خاص کرنا، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اس لئے سوال یہ نہیں ہے کہ ہم مخلوط آبادی میں باقی رہیں یا اپنی علاحدہ مسلم آبادی قائم کرلیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ مخلوط آبادی میں رہ کر ہم اپنے غیر مسلم بھائیوں کو کیسے متاثر کرسکتے ہیں، یا کم از کم ان کے تہذیبی اثرات سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک ایک مسلم تاجر نے ایک ایک علاقہ کو اپنے اخلاق وکردار سے اس قدر متاثر کیا کہ پوری کی پوری آبادی حلقہ بگوش اسلام ہوگئی۔ آج ہمارے اندر اسی اخلاق وکردار کی کمی ہے جس نے ہمیں علاحدہ رہائش اختیار کرنے کے لئے سوچنے پر مجبور کردیا ہے، بہرحال اس دور انحطاط میں اگر کسی مسلمان کو اپنے دین وایمان کی بقاء، عقائد واعمال کی سلامتی، اور اسلامی شعائر کی بجاآوری کی راہ میں مشکلات وپریشانیوں کا سامنا اور کوئی خطرہ واندیشہ نہ ہو، اور اگر کوئی خطرہ واندیشہ ہو بھی تو اسلامی حکومتوں کی طرف سے ان کو بھرپور تعاون ملتا ہو تو ان صورتوں میں مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ اگر مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونے کی صورت میں مسلمانوں کے لئے یہ ممکن نہ ہو کہ وہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے محفوظ ومامون رہ سکیں گے، اور اپنے دین وایمان پر قائم ودائم رہ کر اسلامی عقائد واعمال اور دینی شعائر کی بجاآوری کرسکیں گے تو ایسی صورت میں وہ اپنی علاحدہ آبادیاں بنالیں، جہاں وہ امن وامان کے ساتھ اسلامی شعائر کی بجاآوری کرسکیں، اور اپنے عقائد واعمال کو تہذیب وتمدن کے سانچوں میں ڈھالنے کے اہل ہوسکیں، تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے کچھ شعائر ایسے ہیں جن پر عمل پیرا ہونا اس وقت ممکن ہے جب مسلمانوں کو کلی آزادی نصیب ہو۔

ب- جب غیر مسلم دوست یا پڑوسی کے یہاں کسی کا انتقال ہوجائے تو ایسے موقع پر مسلمان ان کے جلوس جنازہ میں شرکت کرسکتے ہیں، مشہور تابعی مکحول کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کے جنازہ میں شرکت کی تھی۔ کنارے کنارے چلے، ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ فرمایا رشتہ نے آپ کو مجھ سے جوڑ دیا ہے۔ ان کی قبر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے نہیں ہوئے (مصنف عبدالرزاق ۶/ ۳۸)۔

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں: ''إن کانت قرابة قريبة بين مسلم وكافر فليتبع جنازته'' (مصنف عبد الرزاق ۶/ ۳۶)
(اگر قریبی رشتہ داری ہے مسلمان اور کافر کے درمیان تو مسلمان کو کافر کے جنازہ کے پیچھے چلنا چاہئے)۔

غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت ہو تو اس بات کی احتیاط کرنی ہوگی کہ مسلمان کا امتیاز باقی رہے۔ انسانی تعلق اور ہمدردی کا اظہار بھی ہو اور یہ بات بھی واضح ہو کہ اسلام کے علاوہ کسی بھی دین کو وہ صحیح نہیں سمجھتا، اس کے لئے مختلف صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

جنازہ کے آگے یا پیچھے چلنا، درمیان میں یا کنارے چلنا، سواری پر یا پیدل چلنا، ان میں سے ہر ایک کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ ایسے کسی بھی موقع پر اپنی دینی انفرادیت کو کھودینا صحیح نہیں ہے۔ اسے باقی رکھتے ہوئے آدمی حالات کے لحاظ سے خود فیصلہ کرسکتا ہے۔ اس سے بہرحال اتنی بات ثابت ہے کہ وقت ضرورت غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت ناروا نہیں ہے۔

اسی طرح مسلمان غیر مسلم کی آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہ سکتے ہیں، حضرت علیؓ نے اپنے باپ ابوطالب کی تدفین کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ انہیں کون دفن کرے گا؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ اپنے باپ کو دفن کرو۔ علیؓ نے عرض کیا وہ مشرک اور ہدایت سے محروم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ اور اپنے باپ کو دفن کرو (نصب الرایہ ۲/ ۲۸۱، ۲۸۲)۔

اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسلم غیر مسلم میت کو دفنا سکتا ہے، اور ظاہری بات ہے کہ جب دفنا سکتا ہے تو پھر وہاں رہ کیوں نہیں سکتا۔ لہذا مسلمان کا غیر مسلم کی آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

ج- غیر مسلم حضرات اپنے تیوہاروں اور دوسری تقریبات کے موقع پر مٹھائیاں اور ان کے عقیدہ کے مطابق تبرکات اپنے مسلمان دوستوں کو پیش کریں تو اسے قبول کرنے اور کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ وہ بتوں پر چڑھائے ہوئے نہ ہوں، غیر مسلم کے تحائف اور ہدیئے قبول کرنے نیز اس کے تبادلہ سے باہمی تعلقات استوار ہوتے ہیں، قربت بڑھتی ہے اور اختلافات اور نزاعات باہمی مٹتے ہیں۔

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں غیر مسلموں کے تحفے قبول کرنے اور اسے کھانے کا ثبوت موجود ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے تحائف قبول فرمائے ہیں اور کھائے بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پنیر کا ٹکڑا پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری طلب فرمائی، اللہ کا نام لے کر اسے قطع کیا اور تناول فرمایا (ابوداؤد)۔

نیل الأوطار میں ہے کہ پنیر حجاز میں تیار نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ شام وغیرہ سے آتی تھی (نیل الأوطار ا/۲۶)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہت سے غیر مسلم سلاطین اور سربراہان مملکت نے تحفے اور ہدیئے بھیجے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبول فرمایا اور بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی انہیں تحفے عنایت کئے۔

یہ اور ان کے علاوہ بہت ساری دلیلیں ہیں جن سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ غیر مسلموں کے تحائف اور ہدیئے قبول کرنے اور کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں البتہ وہ تحائف اور ہدیئے بتوں پر چڑھائے ہوئے ہوں تو اس کی حرمت کے سلسلے میں کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ وہ غیر اللہ کے نام کی چیز ہے اور ہر وہ چیز جو غیر اللہ کے نام کی ہو شرعاً حرام ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "قل لا أجد في ما أوحي إلي محرما علی طاعم یطعمه إلا أن یکون میتة أو دما مسفوحا أو لحم خنزیر فإنه رجس أو فسقا أهل لغیر الله به فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فإن ربك غفور رحیم" (الأنعام/ ۱۴۵)

(آپ فرمادیجئے کہ میں اس وحی میں جو مجھ پر نازل ہوئی ہے کھانے والے پر کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ وہ اسے کھائے، مگر وہ چیز جو مردار ہے یا بہنے والا خون ہے یا خنزیر کا گوشت ہے، کیونکہ یہ ناپاک ہے یا گناہ کی چیز ہے کہ اسے غیر اللہ کے نام پر مشہور کیا گیا ہو، اور اگر کوئی مجبور ہو جائے، نہ تو نافرمانی کرے نہ حد سے باہر نکل جائے تو تمہارا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے)۔

د- مساجد کی تعمیر اور مرمت وغیرہ میں غیر مسلموں کی اعانتوں کو قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ امام ابن الجوزیؒ قرآن کریم کی آیت:

"ما کان للمشرکین أن یعمروا مساجد الله شاهدین علی أنفسهم بالکفر" (التوبہ/ ۱۷) (یہ بات مناسب نہیں ہے کہ مشرکین اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، حالانکہ وہ اپنے بارے میں کفر کی گواہی دیتے ہیں) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مسجدوں کو آباد کرنے کا دو مفہوم ہے، ایک مسجدوں میں داخل ہونا اور اس میں جلوس اختیار کرنا، اور دوسرا مفہوم ہے اس کی تعمیر و مرمت کرنا۔ اور یہ دونوں چیزیں کافروں کے اوپر حرام ہیں۔ اور قرآن کریم کی اس آیت: "وما کان للمشرکین" سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مؤمنوں پر واجب ہے کہ وہ ان چیزوں سے کفار و مشرکین کو روک دیں (زاد المسیر ۳/ ۴۰۸)۔

غیر مسلم حضرات اگر مسلمانوں کے مذہبی جلسوں میں چندہ دیں، اسی طرح دینی مدارس کا تعاون کریں، تو ان کی اس طرح کی اعانتوں کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لئے خیر و فائدہ ہے، اور غیر مسلموں کی ہر وہ اعانت قبول کی جاسکتی ہے جس میں مسلمانوں کے حق میں نفع اور فائدہ ہو۔

غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کی تعمیر کے لئے تعاون کرنا درست نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کی ایک عمومی روایت ہے: "اجتنبوا أعداء الله في عیدهم" (اللہ کے دشمنوں کی عید سے بچو)۔

محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نیروز کے موقع پر اپنی زبان سے یہ لفظ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے (اقتضاء الصراط المستقیم: ۱۷۸)۔

حضرت عمرؓ کی عمومی روایت اور حضرت علیؓ کے اثر سے یہ بات مترشح ہوئی کہ غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں تعاون کرنا درست نہیں ہے۔

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی تعمیر کے لئے تعاون کرنا کفر اور شرک کے کاموں میں کافروں اور مشرکوں کا ہاتھ بٹانا ہے، اور قرآن کریم کا بیان ہے: "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورۂ مائدہ/ ۷) (اور تم لوگ اثم و عدوان کے کاموں میں تعاون نہ کرو)۔

(ھ) الف: مذہب اسلام میں غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت جائز نہیں ہے۔

غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت کے عدم جواز کے سلسلے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں:

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو سال میں دو دن جاہلی عید کا رواج دیکھا، دریافت کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے تمہارے لئے اس سے بہتر دو عیدیں مقرر کی ہیں (ابوداود)۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں تبدیلی کا لفظ بتاتا ہے کہ جب یہ دونئی عیدیں جاہلی عیدوں کی جگہ مقرر ہوئیں تو وہ عیدیں خود بخود منسوخ ہو گئیں، اور منسوخی کے بعد پھر ان میں شرکت کا مطلب اللہ تعالی کے حکم کی نافرمانی ہی ہوگی۔ مزید فرماتے ہیں کہ جاہلی عیدوں کا خاتمہ بتاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ اس حکم پر عمل درآمد کرایا ہوگا۔ ورنہ اس کے بغیر پرانی روایت کا یکسر ترک کر دینا انسانی فطرت کے خلاف ہے (اقتضاء الصراط المستقیم/

(۱۶۵)۔

شیخ الاسلام نے ایک دوسری جگہ ایک تاریخی حقیقت سے استدلال کیا ہے کہ جزیرۃ العرب میں یہود و نصاریٰ اور دوسری قومیں آباد تھیں اور قومی پیمانے پر اپنے تیوہار بھی مناتی تھیں، لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد کوئی مسلمان کبھی ان تیوہاروں سے متعلق نہیں ہوتا تھا، اس سے یہ بات فطرۃً طے ہو جاتی ہے کہ جب صدر اسلام میں غیر اسلامی تقریبات سے علاحدگی ہی اختیار کی گئی تو وہی طرز عمل آج بھی ہمارے لئے نمونہ رہے گا (اقتضاء الصراط المستقیم/۱۷۱)۔

مذکورہ تشریحات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت شرعاً حرام ہے، ہاں البتہ ان کی عید کے دن ان کے بازاروں میں خرید و فروخت کی غرض سے جایا جائے تو جا سکتا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے امام ابوالحسن آمدی معروف بہ ابن البغدادی کی کتاب "عمدة الحاضر و كفاية المسافر" سے ایک اقتباس نقل فرمایا ہے:

"امام احمد کے یہاں ان تقریبات میں شرکت ممنوع ہے، لیکن عید کے دن ان کے بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے جایا سکتا ہے:

"فأما ما يباع في الأسواق من المآكل فلا وإن قصد إلى توفير ذلك و تحسينه لأجلهم"

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مسلمان دکانداران عیدوں میں غیر مسلموں کے لئے اپنی دکان لگا سکتا ہے۔

ب- غیر مسلم بھائیوں کو ان کے تیوہاروں کی مبارکباد دینا بالاتفاق حرام ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن قیم الجوزیہ نے اپنی کتاب "احکام اہل الذمہ" میں لکھا ہے کہ کفر سے تعلق رکھنے والے شعائر جو اس کے ساتھ خاص بھی ہوں، کی مبارکباد دینا متفقہ طور پر حرام ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی مسلمان کافروں کو ان کی عید کے موقع پر مبارکباد پیش کرے یا یہ کہ کافروں کے روزہ پر انہیں مبارکباد دے اور اس سے اس طرح کہے، تمہیں یہ مبارک ہو یا یہ کہے کہ تم میری جانب سے اس عید کی مبارکباد قبول کرو، اس طرح کی مبارکباد پیش کرنے والا شخص گرچہ ذاتی طور پر کفر سے محفوظ بھی ہو تب بھی اس کا یہ فعل حرام ہوگا اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی کسی کو صلیب کو سجدہ کرنے پر مبارکباد دے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مبارکباد تو شراب پینے، کسی کو قتل کرنے یا حرام کاری پر دی جانے والی مبارکباد سے بھی بدترین اور اس کے غیظ و غضب کو دعوت دینے والی ہے، بہت سے لوگ جو دین پر چلنے کو اہمیت نہیں دیتے اور دینداری کی ان کے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں ہے اس طرح کی محرمات کا ارتکاب کرتے ہیں، اور اپنے اس فعل بد کی شناعت کا احساس نہیں کرتے، لہٰذا اگر کسی نے کسی کو کسی معصیت پر یا کسی بدعت و کفر کے ارتکاب پر مبارکباد دی تو وہ اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا مستحق بنا (احکام اہل الذمہ ۱/۲۰۵، ۲۰۶)۔

حافظ ابن القیمؒ کے اس قول سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کفار کو ان کی دینی عیدوں کے مواقع پر مبارکباد پیش کرنا حرام ہے۔ اس لئے کہ اس میں یہ اقرار و اعتراف ہے کہ مبارکباد پیش کرنے والا شعائر کفر سے راضی و خوش ہے۔ اندرونی طور پر چاہے وہ اس کفر سے راضی نہ ہو، مسلمانوں کے لئے یہ حرام ہے کہ وہ کفریہ شعائر سے ادنیٰ درجہ کی رضامندی کا اظہار کریں یا اس پر کسی کو مبارکباد دیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل دونوں آیات مبارکہ میں صراحت کردی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إن تكفروا فإن الله غني عنكم ولا يرضى لعباده الكفر وإن تشكروا يرضه لكم" (الزمر/۷) (اگر تم ناشکری کروگے تو اللہ تم سے بے نیاز ہے، اور وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری کو پسند نہیں کرتا ہے، اور اگر تم شکر گزار بنو گے تو وہ تمہاری طرف سے اسے پسند کرے گا)۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا" (سورۂ مائدہ/۳)

(آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی، اور اسلام کو بحیثیت دین تمہارے لئے پسند کر لیا)۔

۳- (الف) جن ملکوں میں بھی جھنڈے کو سلامی دینے کا رواج ہے، اور اسے جھنڈے کا احترام سمجھا جاتا ہے، ان کا یہ عمل سراسر مشرکانہ عمل ہے، اسلامی تاریخ میں جھنڈوں کے لہرانے کا ثبوت ملتا ہے۔ جنگوں اور فتوحات کے مواقع پر جھنڈے لہرائے جاتے تھے مگر کہیں جھنڈے کو سلامی دینے کا ثبوت نہیں ملتا۔ نہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں ایسا کیا، اور نہ خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرامؓ نے ایسا کیا، اور نہ قرون اولیٰ میں تابعین خلفاء اور تبع تابعین خلفاء نے اس کام کو انجام دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد" (بخاری ۱/۳۷۱، مسلم: ۲/۷۷، ابوداؤد ۳/۲۷۹)

(جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز نکالی جو دین میں نہیں ہے وہ مردود ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین من بعدی تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ، وایاکم ومحدثات الأمور فإن کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة'' (ابوداؤد۲/ ۲۷۹، ترمذی ۲/ ۹۲، ابن ماجہ/ ص۵، مسند احمد۴/ ۲۷)

(میری سنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنھم کی سنت لازم پکڑو اور اس کو مضبوطی اور سختی سے تھام لو، اور دین میں نئے نئے ایجاد کردہ کاموں سے بچو، کیونکہ دین میں ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے)۔

ان دونوں حدیثوں میں بدعات کے ایجاد کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے پر سخت وعید بتائی گئی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جھنڈوں کو احتراماً سلامی دینا ایک بدعت ہے۔

ب- کسی بھی ملک میں ایسے قومی ترانے مروج ہوں جن میں مشرکانہ مضامین شامل ہوں، جیسے ہندوستان میں وندے ماترم پڑھنے کو کہا جاتا ہے، جس میں ارض وطن کی معبودیت کا تصور پایا جاتا ہے، تو مسلمانوں کے لئے اس قسم کے ترانوں کا پڑھنا قطعاً جائز نہیں۔

ہندوستان کا قومی ترانہ وندے ماترم انتہائی تنگ نظر، متعصب، مشرکانہ اور کافرانہ خیالات وعقائد سے عبارت ہے۔ ترانہ کا مرکزی خیال جس میں مادر وطن کی پرستش کی مختلف اسالیب میں تبلیغ کی گئی ہے، اسلام کے عقیدہ توحید سے یکسر متصادم ہے۔ اگر مادر وطن کی پرستش ہندوستانی قومیت ہے۔ تو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایسی کسی قوم پرستی کا قبول کرنا کسی بھی صورت میں ممکن نہیں۔ پھر یہ کہ وندے ماترم جس متعصب، تنگ نظر اور مسلم دشمن ناول سے ماخوذ ہے اس سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا مسلمان بھی یہ گوارہ نہیں کرسکتا کہ اس نغمہ کے کسی لفظ کو زبان سے ادا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کی طرف سے اس ترانہ کی مخالفت ہوتی رہی ہے۔

ج- کسی بھی ملک کے وہ ادارے جو وہاں کے باشندوں کو انصاف فراہم کرتے ہیں اگر وہ ملک میں مروج قانون شہادت یا دوسرے قوانین کی وجہ سے ایسے فیصلے کرڈالتے ہیں جو اسلامی اور شرعی نقطہ نظر سے درست نہ ہوں تو معاملے کے دونوں فریقوں کا اس فیصلے سے استفادہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن کریم کا بیان ہے:

"فلا وربك لایؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم، ثم لایجدوا في أنفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما" (سورۂ نساء/ ۶۵)

(پس آپ کے رب کی قسم، وہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے جب تک آپ کو اپنے اختلافی امور میں اپنا فیصل نہ مان لیں، پھر آپ کے فیصلے کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تکلیف نہ محسوس کریں، اور پورے طور سے اسے تسلیم کرلیں)۔

اور جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوا ہے شریعت اسلامیہ میں اس کے لئے بھی اس سے استفادہ کی گنجائش نہیں ہے۔

ام سلمہؓ کی ایک روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إنما أنا بشر، وإنکم تختصمون إلي، ولعل بعضکم أن یکون ألحن بحجته من بعض، فأقضي له علی نحو ما أسمع، فمن قضیت له من حق أخیه شیئا فلا یأخذه، فإنما أقطع له قطعة من النار'' (متفق علیہ)

(یعنی میں ایک انسان ہی ہوں تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لایا کرتے ہو اور ممکن ہے بعض بعض کے مقابلے میں زیادہ چرب زبان ہو تو میں سننے کے مطابق فیصلہ کردوں، لیکن جس کے حق میں اس کے بھائی کی کسی چیز کا فیصلہ کردوں تو اسے چاہئے کہ اسے نہ لے، اس لئے کہ گویا میں نے اس کے حق میں جہنم کے ٹکڑے کا فیصلہ کردیا ہے)۔

۴- (الف) مغرب کی یہ فکر کہ تمام مذاہب کے راستے الگ الگ ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے، اور ان مذاہب کی حیثیت ایک ہی منزل تک جانے والے مختلف راستوں کی ہے، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے اور جو بھی مسلمان دانشور اس فکر کے اسیر ہوتے جارہے ہیں وہ الحاد وزندقہ کے شکار ہورہے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے مغرب کی یہ فکر کسی بھی درجہ میں قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام دنیا کا سب سے صحیح اور سچا مذہب ہے۔ اور جو اس بات کا عقیدہ نہ رکھے وہ مومن ومسلمان نہیں۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ومن یبتغ غیر الإسلام دینا فلن یقبل منه، وهو في الآخرة من الخاسرین" (سورۂ آل عمران/ ۸۵)

(اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین چاہے گا تو اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں گھاٹا پانے والوں میں ہوگا)۔

اللہ تعالیٰ کا ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "إن الدين عند الله الإسلام" (سورۂ آل عمران: ۱۹) (بے شک دین برحق اللہ کے نزدیک اسلام ہے)۔

ب- مسلمانوں پر انسانی اخوت کے رشتے سے ان کا تعاون کرنا امر مستحسن ہے، کیونکہ وہ بلاشک وشبہ مظلوم ہیں، اور مظلوم خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم ان کا تعاون کرنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ اور ان کے اخلاق کریمہ کا تقاضا ہے، خواہ حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کا تعاون کیا ہے۔ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جنگ بندی کا معاہدہ ہوا تو اس معاہدہ کی ایک شق یہ تھی کہ جو قبیلہ جس فریق کا چاہے حلیف بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس شق کے تحت بنوخزاعہ مسلمانوں کے اور بنوبکر قریش کے حلیف بنے (سیرت ابن ہشام ۳/۳۶۶)۔

لیکن جلد ہی بنوبکر نے بنوخزاعہ پر یورش کردی۔ قریش نے ان کی اسلحہ اور افراد کے ذریعہ پشت پناہی کی اور معاہدہ کو توڑ کر بنوخزاعہ کے ساتھ ظلم وزیادتی میں شریک ہوگئے۔ اس موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوخزاعہ کا تعاون کیا تھا جن کو غیر مسلموں کا ایک بڑا طبقہ ظلم وزیادتی اور استحصال کا شکار بنائے ہوا تھا۔

ج- مسلمان اگر خدمت خلق کا کوئی ادارہ قائم کریں جیسے اسپتال وغیرہ تو مسلمان ان اداروں سے غیر مسلم حضرات کو نفع پہنچا سکتے ہیں۔ غیر مسلم افراد کے ساتھ بھلائی اور احسان کے لئے قرآن مجید نے دو شرطیں لگائی ہیں: ...... ۱- جنگی حالت میں نہ ہوں، ۲- مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور نہ کرتے ہوں، چنانچہ ان ہی دو شرطوں کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ کس کے ساتھ بھلائی واحسان کا سلوک ہو اور کس کے ساتھ نہ ہو۔

اگر مذکورہ دونوں چیزیں نہ ہوں یعنی جنگی حالت میں نہ ہوں یا مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور نہ کرتے ہوں تو بلاتفریق مذہب ودھرم تمام لوگوں کے لئے خدمت اعانت کے دروازے کو کھلا رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وأحسنوا إن الله يحب المحسنين" (سورۂ بقرہ/۱۹۵) (احسان کرو، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے)۔

غیر مسلم افراد کے ساتھ ہر نوع کی بھلائی کرنے کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت کافی ہے:

"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (سورۂ ممتحنہ/۸) (اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو، جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

البتہ ایسے غیر مسلم جو اسلام کے جارحیت پسند دشمن ہیں اور مسلمانوں سے برسرپیکار ہیں، ان کو تعاون دینا اسلامی اصول کے خلاف ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے: "إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم في الدين وأخرجوكم من دياركم وظهروا على إخراجكم أن تولوهم ومن يتولهم فأولئك هم الظالمون" (سورۂ ممتحنہ/۹) (اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے، جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہیں نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی، جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے وہی ظالم ہیں)۔

شیخ الاسلام علامہ عبدالعزیز بن بازؒ فرماتے ہیں: جہاں تک حربی کافروں کی امداد کا سوال ہے تو کسی بھی طریقے سے ان کی امداد کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کے خلاف ان کی مدد کرنا نواقض اسلام میں شمار ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن يتولهم منكم فإنه منهم" (سورۂ مائدہ: ۵۱) (اور اگر تم میں سے کوئی انہیں اپنا دوست بناتا ہے تو اس کا شمار انہیں میں ہے) (فتاوی سماحۃ الشیخ ابن بازؒ: ص ۳۹۲)۔

د- جب کوئی قدرتی آفت آئے مثلاً زلزلہ، سیلاب، متعدی امراض وغیرہ تو ایسے مواقع پر ریلیف کا کام انجام دینے والی مسلم تنظیموں کو چاہئے کہ بلاتفریق مسلم وغیر مسلم سب کے ساتھ تعاون کریں، کیونکہ ان کے تعاون اور ہمدردی کے مستحق صرف اپنے ہم مذہب مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی ان کے تعاون وہمدردی کے مستحق ہیں۔ انسانوں کی خدمت کی راہ میں عقیدہ وخیال اور دین ومذہب کے اختلاف کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہئے، جو شخص ضرورت مند ہے اس کی مدد کرنا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، مشرک ہو یا اہل کتاب، رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا محمد شمس الدین
جامعہ اسلامیہ، نوگاؤں (آسام)

چونکہ تمہید سوالات میں ایک لفظ جمہوریت معمہ بنا ہوا ہے اور نوعیت سوالات میں جمہوریت ملحوظ خاطر ہے، اس لئے سب سے پہلے میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

اسلام کو جمہوریت اصطلاحی سے کوئی نسبت نہیں، بلکہ یوں کہہ دیا جائے کہ ان کے مابین بون بعید ہے جس کی وضاحت یہ ہے کہ نقلاً وعقلاً جمہوریت اسلام سے متضاد ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ جمہوریت کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جمہوری قانون کا مدار دلائل پر نہیں بلکہ اکثریت پر ہے، ہر چند کہ کثرت رائے قرآن وحدیث کے خلاف ہو۔ قرآن مجید نے اس کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے: "وإن تطع أكثر من في الأرض يضلوك عن سبيل الله" (سورہ انعام: ۸)۔ اہل علم، اہل دیانت، اہل فہم معدود چندہی ہوا کرتے ہیں۔

ہمارا ملک جمہوری ہے، اور اس جمہوری ملک کی صبح وشام ہماری مجبوری ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ جملہ قوانین (جو اسمبلی و پارلیامنٹ کے حوالہ سے آئے اس) پر عمل کیا جائے، قطع نظر اس کے کہ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ اور ادھر اسلام دین پر ثبات چاہتا ہے جس کے لئے ہلکی لغزش کو بھی برداشت نہیں کرتا، اب سوال یہ ہے کہ ان ممالک میں (جہاں جمہوریت پر مبنی حکومت ہو) مسلمانوں کے لئے الیکشن میں اور اس قسم کے امور میں قولاً یا عملاً شرکت جائز ہوگی یا نہیں؟

الف:..... حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی فرماتے ہیں کہ اگر حصہ لینے میں احکام اسلام پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور حصہ لے کر اہل اسلام کی خدمت کر سکے اور ان کو ظلم سے بچا کر حقوق دلا سکے تو حصہ لینا جائز ہے (فتاوی محمودیہ ۱۳/۴۲۵)۔

ب:..... اور انتخابات میں اگر چہ مسلمانوں کے ملی و مذہبی مفادات متعلق ہو سکتے ہیں، تاہم ان توہمات کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے شرعاً ووٹ کا وجوب نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کی اپنی بنائی ہوئی جمہوریت ہے جس کا اسلام قائل نہیں، البتہ سیاسۃً اس کا وجوب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی بھی قوم کا اندازہ جمہوریت کے اندر اس کی مردم شماری سے لگایا جاتا ہے، اگر مردم شماری میں کوئی قوم دیگر اقوام پر سبقت حاصل کر لیتی ہے تو مملکت جمہوریہ اس کی طاقت کو تسلیم کرتی ہے، اور پھر مردم شماری کا مدار اس کے یہاں ووٹ پر ہے اور اسی پر شہریت کا مدار بھی ہے۔ اگر ووٹر لسٹ میں نام درج ہے تو شہریت حاصل ہوگی ورنہ غیر شہری قرار دیا جاتا ہے، اور حقوق شہریت سے ایسے لوگوں کو محروم گردانا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ ووٹ کا دینا مملکت جمہوریہ کے مسلم باشندگان کے لئے دو وجہ سے ضروری ہے:

۱- مردم شماری کے لئے، تاکہ تشخص برقرار رہے اور ساکھ باقی رہے۔

۲- شہریت اور حقوق شہریت کے حصول کے لئے۔

ج: اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا مسلمان ان پارٹیوں کو کہ جنہوں نے اعلانیہ مخالفت اسلام کو اپنا مقصد بنالیا ہو ووٹ دیں یا نہ دیں؟ تو اس کے جواب میں حضرت محمود الحسن صاحب گنگوہی فرماتے ہیں کہ اس جمہوری ملک میں ووٹ اسلام اور کفر کی بنیاد پر نہیں دیئے جاتے اور نہ ہی اس بنیاد پر الیکشن لڑائے جاتے ہیں جس شخص کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ صحیح خدمت کرے گا، نفع پہنچائے گا، حقوق دلوائے گا، ظلم کو روکے گا، اس کو

ووٹ دیا جاسکتا ہے، اور ایسی سیاسی جماعتوں میں شمولیت بھی درست ہے، کیونکہ شرکت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس پارٹی کے نظریات وعقائد سے بھی ہم آہنگ ہو (ایضاً ۵ / ۱۴۷)۔

د: ملی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے ہوں تو یہ جائز ہے، شرعاً کوئی قباحت نہیں، بلکہ ایک مستحسن امر ہوگا، جس کی واضح دلیل صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔

ھ: اچھی باتوں کی ترویج اور انسداد منکرات کے لئے اگر غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل جل کر کام کیا جائے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہونا چاہئے، اور ہوگا بھی نہیں، کیونکہ یہ تو "تعاون علی البر" ہے جو ایک مستحسن امر ہے، اور شریعت کا مزاج بھی بالکل یہی ہے، قرآن کہتا ہے: "تعاونوا علی البر والتقوی" (سورہ مائدہ)۔ اور شرعاً اس کے قبیح نہ ہونے کی ایک بہت مضبوط دلیل یہ بھی ہے کہ جناب محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ فروکش ہوئے، تو اول وہلہ میں جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ یہی کہ مدینہ کی زمین ہموار کیا، مٹی بنائی اور انصار مدینہ و زعماء یہود کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھے، اور پھر یہ عقدہ حل کیا کہ "آج سے کوئی کسی پر حملہ نہیں کرے گا، کوئی تم پر آ کر اگر حملہ کرے تو دونوں مل کر اس سے مقابلہ کریں گے، وغیرہ وغیرہ اس سے ہمیں یہ روشنی مل جاتی ہے کہ اگر صلاح وفلاح امت اور اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں غیر مسلم بھائی ہمارے دوش بدوش چلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں اگر وہ ہمارے معروف میں شرکت کر کے ہمیں اپنے منکر میں شریک کرنا اور مبتلائے معصیت کرنا چاہیں، تو پھر ایسی صورت میں ان سے اور ان کی شرکت سے اجتناب ہمارے اوپر لابدی ہو جائے گا۔

۲- (الف) معاشرت:

جمہوری ملک جہاں ہر قسم کے لوگ رہتے اور بستے ہیں اور ہر مذہب کے لوگوں کو کھلی چھوٹ ہوتی ہے، ظاہر ہے وہاں مسلمان کا دیگر مذاہب والوں سے دن رات کا سابقہ ہے، چونکہ حکومت اسلامی نہیں ہے کہ غیر مذہب والوں کو برطرف کر کے مسلمان بےفکری کے ساتھ اپنی زندگی گذاریں، بلکہ سبھوں کے ساتھ مل کر رہنا ہے۔

اس سلسلہ میں وضاحت یہ ہے کہ اس کا اندازہ کہ مسلمان کے لئے ایسے وقت میں کیا بہتر ہے حالات سے ہوگا، اور اقلیت واکثریت کا بھی اس میں بڑا دخل ہے، اگر کسی جگہ پر مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم ہے اور وہ غیروں کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اس کا قوی امکان ہے تو اس صورت میں بوقت سہولت وہاں سے منتقل ہونا بہتر ہے، اور پھر چونکہ آئے دن فسادات کا سلسلہ بھی جاری ہے اگر اقلیت میں مسلمان ان کے ہاں ہوں تو پھر ان کی جان، ان کا مال اور عزت وعصمت پر ہر وقت خطرہ ہوتا ہے، اس لئے بہتر اس وقت یہ ہے کہ سب ایک جگہ رہیں تا کہ ان کی طاقت دو چند ہو جائے، ان کی رائیں مجتمع ہوں، اور "واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا" (سورہ آل عمران) پر عمل ہو جائے۔ اب رہ گئی یہ بات کہ قریب اور مخلوط آبادی میں اگر مسلمان سکونت پذیر ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ غیر اقوام اسلام قبول کر لیتے، تو اس سلسلہ میں اتنا ہی بتلانا کافی ہوگا کہ "دفع مضرت مقدم ہوا کرتا ہے جلب منفعت پر"۔

ب- رسومات:

پڑوسی کافر اگر بیمار ہو تو اس کی عیادت کرنا اور اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا تو حدیث سے ثابت ہے:

"کما ورد أن النبی ﷺ عاد یهودیا مرض فی جواره" (ہدایہ کتاب الکراہیۃ مسائل متفرقہ ۴/ ۴۸۵)۔

لیکن ارتھی (پایہ چارپائی) کا پکڑنا اور اس کو جلانے کے لئے مرگھٹ تک جانا ثابت نہیں، اس سے احتراز ضروری ہے، اسی طرح اس کے برعکس (فتاویٰ محمودیہ ۱۵ / ۳۴۵)، اور اگر ضرورت ہو تو پھر جائز ہے، درمختار میں ہے:

"ویغسل المیت المسلم ویکفن ویدفن قریبه الکافر الأصلی الخ عند الاحتیاج فلوله قریب فالأولی ترکه لهم" (درمختار علی ہامش، ردالمحتار ۱/ ۸۳۲)۔

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان اپنے قریب رشتہ دار کافر کو عند الضرورت کفن دفن کر سکتا ہے، اور شریک جنازہ ہوسکتا ہے، لیکن بلاضرورت

اچھا نہیں، پس جب قریب رشتہ دار کافر کے بارے میں یہ حکم ہے تو غیر قریب میں بدرجہ اولی یہ حکم ہوگا (فتاوی دار العلوم ۵ / ۲۸۳)۔

اور بعض لوگ جو غیر مسلم میتوں کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کا ڈھونگ رچاتے ہیں، شرعاً اس کی کوئی اصل نہیں، کیونکہ جس کے لئے کفر کا یقین ہو اس کے لئے دعاء مغفرت کرنا یا قرآن شریف پڑھ کر ثواب پہنچانا جائز نہیں۔ اس کی سب سے واضح دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

"ولا تصل على أحد منهم مات أبدًا ولا تقم على قبره إنهم كفروا بالله ورسوله وماتوا وهم فاسقون"

جس سے صریح طور پر کفار و منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کے اہتمام کفن دفن وغیرہ میں حصہ لینے کی ممانعت کردی، ایک اور آیت جس سے اس مسئلہ کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے وہ یہ ہے: "استغفر لهم أو لا تستغفر لهم إن تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم" (سورہ توبہ) کہ اگر ان کے لئے ستر مرتبہ بھی استغفار کیا جائے تب بھی رب رحیم اس کی مغفرت نہیں کرے گا، لہذا قرآن خوانی کرنا کہ ایصال ثواب ہو جائے تحصیل لاحاصل ہے۔

ج: غیر مسلم اپنے مسلمان دوستوں کو جو تبرکات پیش کرتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں: ۱- مذہبی، ۲- غیر مذہبی، مؤخر الذکر کی صورت میں جیسے شادی یا کوئی اور تقریبات مثلاً بچہ کی پیدائش وغیرہ تو اس میں ان کے تحفہ کا قبول کرنا جائز ہے، اور کھا بھی سکتے ہیں، اور مقدم الذکر کی بھی دو قسم ہے:

۱- وہ تبرکات بتوں پر چڑھائے ہوئے ہوں گے۔

۲- یا نہیں ہوں گے، اگر نہیں ہیں تو اس کے کھانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ صاحب احسن الفتاوی حضرت مولانا رشید احمدؒ فرماتے ہیں (احسن الفتاوی ۸ / ۱۶۲)۔ البتہ اسے نہ لینا بہتر ہے، لیکن اگر کسی مصلحت سے لے لیا تو شرعاً اس کھانے کو حرام نہ کہا جائے گا (فتاوی محمودیہ ۵ / ۲۲۷)۔

اور اگر وہ تبرکات بتوں پر چڑھائے ہوئے ہوں گے تو پھر اس کا کھانا حرام ہے، کیونکہ وہ "ما اهل لغير الله" میں داخل ہے۔

د: باہمی میل جول کی بنا پر یا ویسے بھی اگر غیر مسلم حضرات مسجد وغیرہ مثلاً مدرسہ یا کوئی مذہبی تعمیر و جلسہ وغیرہ میں تعاون پیش کریں تو جائز ہے، جبکہ وہ اس کو عبادت سمجھ کر رہا ہو (فتاوی محمودیہ ۲ / ۴۷۶)۔

مگر مولوی عبدالحی صاحبؒ لکھتے ہیں: "حسب تصریح معتبرات مال ہنود کا تعمیر معابد خاصہ اہل اسلام میں صرف کرنا درست نہیں ہے (فتاوی عبدالحیٰ / ص ۴۴۳)۔

اسی طرح اگر ہندوؤں کے مذہبی تقریبات میں چندہ وغیرہ کے ذریعہ تعاون کیا جائے تو یہ ناجائز ہوگا، اللہ تبارک و تعالی کے قول "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" کی وجہ سے (فتاوی محمودیہ ۹ / ۳۹۸)۔ ایسے ہی ان کی عبادت گاہوں مثلاً مندر وغیرہ کی تعمیر کے لئے امداد کرنا جائز نہیں ہے (فتاوی محمودیہ ۸ / ۲۹۳)، البتہ ان کے شر اور ضرر سے گلوخلاصی کے لئے ان لوگوں کو تملیکاً پیسے دے دیئے جائیں تو اس کی گنجائش ہے، پھر وہ جہاں چاہیں خرچ کریں (فتاوی محمودیہ ۱۲ / ۲۷۲)۔

ھ: آج کل غیر مسلم حضرات جو مسلمانوں کے ساتھ افطار میں شریک ہوتے ہیں عید کی تہنیتی تقریب رکھتے ہیں، اور مسلمانوں سے اس کی توقع ہوتی ہے کہ وہ بھی دوسرے مذہبی گروہوں کے تہواروں میں شریک ہوں تو ظاہر ہے یہ جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اگر کوئی سیاسی قائد مسلمانوں کی مسجد میں آ جاتا ہے یا پھر مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے نماز بھی پڑھ لیتا ہے، جلسے جلوس میں شرکت بھی کر لیتا ہے تو کیا مسلمان کے لئے اس بات کی گنجائش ہوگی کہ وہ بھی مندر میں جا کر کچھ دیر کے لئے پوجا کر لے؟ مسئلہ صاف ہے کہ شریعت مطہرہ اس کی اجازت نہیں دے سکتی، تو پھر میلے ٹھیلے میں شرکت کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے۔

الف: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں: "کفار کے میلوں میں ہرگز جانا درست نہیں، گناہ کبیرہ ہے اگرچہ قرض دار ہو، اور امید فروخت مال اور نفع کثیر کی ہو، مطلقاً شرکت ایسے مواقع کی گناہ اور حرام ہے (فتاوی رشیدیہ کامل / ص ۴۶۶ مطبوعہ رحیمیہ)۔

ب: جیسے ان کے میلوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہے، ایسے ہی غیر مسلم بھائیوں کو ان کے تیوہاروں کی مبارکباد پیش کرنا بھی درست نہیں (بحوالہ عبد

الحی اردو کامل/ ۵۳۳)۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ''غیر مسلم کے تہوار کی تعریف میں کچھ اشعار بنا کر ان کے بچوں کو دینا بالکل درست نہیں ہے، ان عبارات سے بخوبی یہ عقدہ حل ہوگیا کہ ان کو مبارکباد دینا بالکل درست نہیں ہے (فتاوی رشیدیہ کامل/ ۴۸۸)، اور یہ درست ہوگا بھی کیسے جبکہ محض تحسین اعمال کفار کو فقہاء کفر کا درجہ دے کر تجدید ایمان ونکاح کو لازم اور ضروری قرار دیتے ہیں۔

۳-(الف) قومی جھنڈے کی سلامی:

ہندی مسلمان اقلیت میں ہیں جبکہ غیر اقوام کی اکثریت ہے، اور ایسے ہی بعض دیگر ممالک کا حال ہے، انہیں پریشانی درپیش ہوتی ہے، جب بعض ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جنہیں غیر اقوام تو محض سیاسی حد تک تصور کرتے ہیں مگر مسلمانوں کی پرواز فکر تصور مذہبی کو جالیتی ہے، اگر سیاسی سمجھ کر کام کرے تو دین کا خطرہ، اور اگر دین سمجھ کر اس کے خلاف کرے تو پھر سیاسی پریشانی ہوتی ہے، آخر ایسے وقت کیا کرنا چاہئے؟ ظاہر ہے کہ پریشانی ہر طرف ہے، خلاصہ کلام ان پریشان کن امور میں سے ایک جھنڈے کی سلامی بھی ہے، اور وندے ماترم جیسے ترانے بھی ہیں جو کہ ناجائز ہیں۔

جھنڈے کی سلامی ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جھک کر اسے سلامی دیتے ہیں جو تعظیم کے طور پر ہوا ہے، اور تعظیماً جھکنا خدا کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کے سوا اگر کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کرے۔

تاہم اگر جھک کر سلامی دینے پر مجبور کیا جائے تو ممکن حد تک قانون وآئین کے دائرے میں رہتے ہوئے خود کو مستثنیٰ قرار دیئے جانے کی کوشش ہونی چاہئے، اور اگر کامیابی نہ ہوسکے اور ملازمت کا خطرہ ہو کہ اس کے بعد حرج شدید میں مبتلا ہوجائے گا تو پھر کراہت خاطر کے ساتھ سلامی جائز ہوگی کہ یہ ایک حاجت ہے، اور حاجت ضرورت کے درجہ میں آکر ناجائز چیزوں کے لئے وقتی اور عارضی طور پر وجہ جواز بن جاتی ہے:

''الحاجة تنزل منزله الضرورة'' اور ''الضرورات تبیح المحظورات'' (جدید فقہی مسائل: ص ۴۴۵)۔

(ب) شرک آمیز ترانے:

ایسے ہی وہ ترانے جن میں مشرکانہ مضامین شامل ہیں اس کا پڑھنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ بندہ جب کلمہ توحید لا الہ الا اللہ پڑھ لیتا ہے وہ اس بات کا صراحۃ اعتراف واقرار کرتا ہے کہ مستحق معبودیت صرف اللہ ہے، ہندوستان کے اندر وندے ماترم، پڑھنے کے لئے کہا جاتا ہے جو کہ حرام ہے، کیونکہ اس کے اندر ارض وطن کی معبودیت کا تصور پایا جاتا ہے، لہذا وندے ماترم اور اس جیسے ترانے کا پڑھنا حرام ہے۔

اس لئے اس سے بالکلیہ اجتناب ضروری ہے اگرچہ ملازمت کا خطرہ ہو، کیونکہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ جب دو طرح کی مصیبتیں بیک وقت اکٹھی ہوجائیں تو ''اهون البليتين'' کو اختیار کیا جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ صیانت ایمان اہون ہے صیانت ملازمت سے، اور پھر یہ کہ حفاظت ایمان واجب ہے نہ کہ حفاظت ملازمت۔

(ج) خلاف شرع فیصلہ پر عمل نہیں ہوسکتا:

جو ادارہ ملک کے باشندوں کو انصاف فراہم کرتا ہے اگر اس نے کوئی ایسا فیصلہ کردیا جو شرعی نقطہ نظر سے متصادم ہو اور فریقین مسلمان ہوں، تو پھر اس فیصلہ سے کسی کو استفادہ کا حق نہیں ہوگا، ان دونوں کو چاہئے کہ قاضی شرع کی عدالت میں مقدمہ دائر کریں اور پھر جو فیصلہ ہو اس پر عمل کریں۔

''لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق''۔

۴-(الف) اسلام ایک ابدی مذہب ہے:

اسلام کی افادیت کسی خاص زمانہ اور عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کی انسانی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت اور افادیت ابدی اور لافانی ہے، وقت کے بدلتے ہوئے حالات اور سماج کی تغیر پذیر روش اس کے مضبوط قانونی حصار کو زک نہیں پہنچا سکتی، اس نے جس طرح آج سے پندرہ سو سال پہلے تشنہ لب اور پیاسی انسانیت کو امن وسکون کا ساحل دیا تھا اور مردم خوروں اور خون آشاموں کو انسانیت کا پاسبان اور نگہبان بنا کر کھڑا کیا تھا، آج بھی کرسکتا ہے، لہذا یہ اعتراض ہی سرے سے بے بنیاد ہے کہ اسلام دور جدید کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اور بعض دانشور مسلمان جو یہ کہتے ہیں کہ راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، یہ نتیجہ ہے کالجوں کی بنیاد کا اور غیر دینی اور خالص مذہبی تعلیم سے چشم پوشی کا، ورنہ اگر وہ خالص دینی ماحول میں پرورش پاتے تو یقیناً اس فکر کے اسیر نہ ہوتے کہ تمام مذاہب کا خلاصہ ایک ہے، کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اسلام ایک سچا اور حق مذہب ہے، جبکہ اس کے بالمقابل دیگر ادیان عنداللہ معتبر نہیں ہیں، کیونکہ "ان الدین عند اللہ الاسلام" (سورہ آل عمران) اگر اس کے خلاف کوئی دین اختیار کرتا ہے وہ مقبول نہیں ہوگا "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ" (ایضا)۔

اور ظاہر ہے کہ جس طرح اجالا اور اندھیرا ایک نہیں ہو سکتا، اسی طرح یہ بات نہایت نامعقول اور ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی بغاوت و نافرمانی بھی اسی طرح پسند ہو جیسے اطاعت و فرمانبرداری، نجات اخروی کا مدار سب سے پہلے اللہ اور اسکے رسول کی فرمانبرداری پر۔ ہے جو اس سے محروم رہا، اس کے کسی عمل کا اعتبار نہیں

''فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنًا'' (معارف القرآن ۳۸/۲۶)۔

(ب) اسلام میں درس مساوات:

دنیا کے بعض علاقوں اور خصوصاً ہندوستان میں غیر مسلموں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے، اس طبقہ کو ہندوستان میں ''دلت'' کہا جاتا ہے، جن پر صدیوں سے ہندوؤں میں اونچی ذات سمجھے جانے والے طبقہ کی جانب سے مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، اور جن کو سماجی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ بنائے رکھنے کی منظم اور منصوبہ بند کوشش ہوتی رہی ہے، اور انہیں اس قدر پست کیا گیا کہ ڈوم، چمار، مسہر، وغیرہ جو دلت کہلاتے ہیں، قانوناً اپنی مندر میں ان کا داخلہ ممنوع کر دیا، یہاں تک کہ اونچی ذات والے غیر مسلم طبقہ کی چھتری کے سایہ میں یا ان کے سامنے کہیں وہ بیٹھ بھی نہیں سکتے، اور ان کے نزدیک دلت کی حیثیت کتے اور خنزیر سے بھی بہت زیادہ کم ہے۔ یہ اپنے انسانی حقوق مانگ نہیں سکتے، کیونکہ نہ ان کے لئے کوئی عدالت ہے اور نہ ہی انصاف کا کوئی کٹہرا، آخر کہاں جائیں جس جگہ جائیں گے وہیں منہ کی کھانی پڑے گی گویا

''منصف کی آستیں میں ہے خنجر چھپا ہوا'' ''انصاف کرنے والا ہی قاتل ہے آج کل''

لہٰذا اخوت کے ناطے ان کا تعاون کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے، اور ضروری ہے کہ جس طرح سے ہو سکے ان کی مدد کریں، خواہ حکومت کے پاس جا کر اس کے لئے بل پاس کرا کر یا پھر مذہبی سطح پر اس کی ذہن سازی کر کے، تاکہ وہ لوگ بھی سکون کا سانس لے سکیں۔

(ج، د) خدمت خلق ایک عبادت:

رفاہی اداروں کو متعین گروہ یا جماعت کے یا اشخاص کے ساتھ مخصوص رکھنا نہیں چاہئے، دو وجہوں سے:

ایک یہ کہ قرآن ایثار کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "یؤثرون علی أنفسھم ولو کان بھم خصاصۃ" (سورہ ممتحنہ)، قابل مدح امر یہی ہے کہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دے، ورنہ پھر نظر انداز بھی نہ کرے۔

دوم یہ کہ جب ابتلاء عام ہو جائے اور ہر ایک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو تو ایسے موقع سے یکطرفہ کام عصبیت و تنگ نظری اور تعلیمات اسلامی کے خلاف ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اس طرح کے کام میں مثلاً ہوسپیٹل کے ذریعہ خدمت ہو یا ریلیف کے ذریعہ امداد مسلم اور غیر مسلم کی تفریق سے کام لینا غیروں کا نظریہ ہے۔

ہاں مسلمانوں کے آپس میں جو دہرے رشتے ہیں، اس بنا پر انہیں حق تقدم ضرور حاصل ہوگا، اس طور پر نہیں کہ غیر بالکل محروم ہو جائیں، بلکہ از راہ انسانیت ان کی امداد کر کے اعلیٰ کردار اور بلند اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے۔

***

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

تنظیم عالم قاسمی

دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد

ووٹ کی شرعی حیثیت:

ووٹ دینے کا مطلب اس بات کی شہادت دینا ہے کہ وہ جس امیدوار کو ووٹ دے رہا ہے اس کے علم ودانست میں وہ قوم وملت کا خیر خواہ، جذبۂ خدمت خلق اور نمائندگی کی صلاحیت میں دوسروں سے بہتر ہے، اپنی جانب سے اسے اس بات کا اختیار دیتا ہے کہ وہ ایسے وزیر اعظم، بادشاہ اور سربراہ مملکت کا انتخاب کرے جو ملک کے مفاد میں بہتر ہو، جن میں قوم کی بھلائی کا جذبہ ہو اور وہ ایسی تمام چیزوں سے اجتناب کرے جن سے شہریوں کا دینی، معاشی، معاشرتی کسی بھی اعتبار سے نقصان پہنچ سکتا ہو۔

اسلام میں حکومت واقتدار صرف اس مقصد کے لئے مطلوب ہے کہ ملک میں خدا پرستی فروغ پائے، نیکیوں کا رواج ہو، صلاح وتقوی، صداقت وامانت، امن وسکون کے چرچے ہوں، باشندگان وطن کو ہر طرح کے حقوق دستیاب ہوسکیں، ظلم وزیادتی، بداخلاقی وبدکرداری، اللہ اور اس کے رسول کو ناراض کرنے والی تمام حرکتوں کا خاتمہ ہوسکے، جس امیدوار اور پارٹی سے ان اغراض کے حصول کا یقین ہو یا کم سے کم امید کا پہلو غالب ہو تو ایسی پارٹی کے نمائندگان کو ووٹ دینا واجب ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوں، اگر پارٹی مسلمانوں کی ہے مگر اس کا مقصد حب نفس وجاہ ہے تو اس سے بہتر وہ غیر مسلم پارٹی ہے، جو وطن کی خدمت کا جذبہ رکھتی ہے، جس سے نیکی اور سچائی کی امید ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو کوئی کسی شخص کو عوامی عہدہ سونپے جہاں اس معاشرہ میں اس امین سے بہتر کوئی فرد موجود ہو تو اس نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کی'' (تعریف بالاسلام ص ۲۵۹)۔

اور اگر تمام پارٹیاں اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں برابر ہوں، مسلمانوں کے تعلق سے کسی کا خیال درست نہ ہو تو اس وقت غور وفکر کرکے ایسی پارٹی کو ترجیح دی جائے گی جو نسبۃً دوسروں سے بہتر ہو، اور اس وقت فقہاء کے مشہور اصول ''اہون البلیتین'' پر عمل کیا جائے گا۔

مذکورہ مباحث کے پیش نظر خیال ہوتا ہے:

(الف) جمہوری ممالک میں مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا بشرط صحت نیت درست ہے

(ب) ووٹ دینا جہاں قومی فریضہ ہے، وہیں مسلمانوں کے لئے مذہبی فریضہ بھی ہے، اگر ووٹ نہ دینے سے ظالم حکومت کا برسر اقتدار آنا یقینی ہو تو ووٹ دینا مسلمان بالغ مرد وعورت پر واجب ہوگا۔

(ج) انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے، ان میں شرکت اور ان کی حمایت کی جاسکتی ہے جبکہ وہ پارٹیاں مسلمانوں کے مخالف نہ ہوں، حق کی ترویج ان کا مقصد اور مشن ہو، جو پارٹی نسبۃً بہتر ہو اس کا تعاون واجب ہے۔

(د، ہ) غیر مسلموں کے اشتراکیت کے ساتھ ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کی جاسکتی ہیں جن میں غیر مسلموں کے ساتھ مل کر اسلام کے مقاصد حاصل کئے جاسکیں

۲-الف: مسلمانوں کے لئے رہائش کا مسئلہ:

غیر مسلموں کے محلہ میں رہائش اختیار کرنے سے نفع کم اور نقصان زیادہ ہے اور قاعدہ ہے:

''إذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبًا'' (الاشباہ والنظائر / ۱۴۷)۔

اپنے اخلاق وکردار کے ذریعہ غیر مسلموں کو متاثر کرنے کا صرف امکان ہے، لیکن مشاہدات وتجربات سے غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات اور ان کے ماحول

کا اثر مسلمانوں، ان کے بچوں پر پڑنا یقینی ہے، مکی زندگی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کے ذریعہ کفار مکہ مسلمان نہ ہو سکے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے تہذیبی اثرات سے بچنے اور مذہبی آزادی کے لئے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسی وجہ سے فقہاء نے آریہ سماج یا کسی باطل جلسہ جلوس میں شرکت کی اجازت نہ دی ہے، اس لئے کہ فساد دین کا احتمال ہے (رشیدیہ ص ۵۷۵)۔

ب-غیر مسلم کے جلوس جنازہ میں شرکت:

اس سے جہاں غیر مسلم میتوں کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کے عدم جواز کا قطعی ثبوت ملتا ہے، وہیں جلوس جنازہ میں شرکت اور آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہنے کے عدم جواز کا بھی پتہ چلتا ہے، اس لئے کہ غیر مسلم کے جلوس جنازہ اور آخری رسم میں شرکت نماز جنازہ پڑھنے اور جنازہ کو دفن کرنے میں شرکت کی طرح ہے جو شرعاً جائز نہیں، علامہ قرطبی: "ولا تصل على أحد" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال علماؤنا هذا نص في الامتناع من الصلوات على الكفار" (الجامع لأحكام القرآن ۸/ ۱۴۰ دار الكتب العلميه)۔

البتہ غیر مسلم جنازہ کی زیارت جب کہ وہ گاؤں، پاس پڑوس کا رہنے والا ہو، کوئی بڑا سیاسی، یا عہدہ دار ہو اور اس خاص موقع پر مسلمان کا نہ جانا محسوس کیا جائے اور اس سے باہمی فاصلہ بڑھ جانے کا خطرہ ہو، تو جائز ہے۔ علامہ سیوطی کی رائے میں اگر چہ غیر مسلم جنازہ کی زیارت بھی درست نہیں ہے لیکن غیر مسلم اقوام کے ساتھ رہتے ہوئے سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے مصلحتاً اس کی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے، ہر غیر مسلم کے جنازہ کی زیارت کی عادت بنانا درست نہیں، جیسا کہ علماء نے غیر مسلم کے ساتھ کھانے کو جائز مگر عادت بنانے کو مکروہ لکھا ہے:

"إن كان ذلك مرة أو مرتين يجوز، لأن النبي ﷺ أكل مع كافرة فحملناه على ذلك ولكن يكره المداومة عليه" (نصاب الاحتساب ص ۱۱۰)۔

ج-غیر مسلموں کے تحفے اور ہدایا کی شرعی حیثیت:

غیر مسلموں کے ایسے تحفے قبول کرنا جائز ہے جن کا تعلق مذہبی تیوہاروں سے نہ ہو، جیسے شادی بیاہ، بچے کی پیدائش یا کسی اور خوشی کے موقع پر مٹھائی یا تحفہ دیں تو اسے کھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو تحفہ، یا مٹھائی بتوں پر چڑھائی ہوئی ہو، جس کو پرشاد کہا جاتا ہے، اس کا کھانا جائز نہیں، اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کے کھانے کو حرام قرار دیا ہے، ارشاد ہے: "وما أهل به لغير الله... الخ"۔ پرشاد اور چڑھاوا بھی اسی حکم میں ہے، کیونکہ وہ غیر اللہ کے نام پر چڑھایا ہوا ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ شرک کی تعظیم لازم آتی ہے، امام ابوبکر جصاص آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یوجب تحريمها إذا سمى عليها باسم غير الله" (احكام القرآن للجصاص ۱/ ۱۲۵)۔

بت کے بجائے اگر حضرت عیسیٰ مسیح کا بھی نام لیا جائے تو بھی جائز نہیں۔

"وقال أبوحنيفة وأبويوسف ومحمد وزفر ومالك والشافعي لاتؤكل ذبائحهم إذا سموا عليها باسم المسيح" (احكام القرآن ۱/ ۱۲۵)۔ اگر بتوں پر چڑھائی ہوئی شیرینی قبول کر لی جائے تو یہ قانون شرعی سے تجاوز کرنا ہوگا جو قطعاً ناجائز ہے۔

د-مسجد کی تعمیر میں غیر مسلموں کا چندہ لینا:

اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر کے لئے، اس کے کسی کام کے لئے، دینی مدارس یا مذہبی جلسوں کے لئے چندہ دے، یا کسی اور طرح کا تعاون پیش کرے اور وہ اسے اپنے عقیدہ میں نیک کام سمجھ کر دے اور اس سے یہ خطرہ نہ ہو کہ وہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو غلط استعمال کرے گا، وہ بھی اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر اور تیوہاروں یا جلسوں کے لئے تعاون کا مطالبہ کرے گا، یا کبھی موقع پر احسان جتائے گا تو ان شرائط مذکورہ کے ساتھ مسجد، مدرسہ یا کسی دینی کام کے لئے تعاون لینا درست ہے۔

ھ-غیر مسلم کے تیوہاروں میں شرکت:

اسلام انتہائی حساس، غیرت مند اور نازک مزاج ہے، اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی دوسرے سے حقیقی محبت، قلبی تعلق جائز نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا کام جائز ہے، جس سے مذہب اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب کا احترام لازم آتا ہو، ارشاد ہے:

"إن الدين عند الله الإسلام" (اسلام آنے کے بعد اب وہی اللہ کے یہاں ذریعۂ نجات ہے)۔

آفتاب نکلنے، ڈوبنے اور نصف النہار کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ آفتاب پرستوں کے ساتھ مشابہت ہے، جو دین اتنا حساس اور غیرت مند ہو تو وہ غیر مسلم کے تیوہاروں اور ان کی رنگ رلیوں میں شرکت کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ غیر مسلم سیاسی اور سماجی قائدین مسلمانوں کے ساتھ افطار میں شریک ہو سکتے ہیں، مگر مسلمانوں کے لئے غیر مسلم کی ایسی تقریبات میں شریک ہونا اور ان کے تیوہاروں میں مبارک باد دینا درست نہیں ہے، یہ رواداری نہیں بلکہ رضاء بالکفر ہے اور "الرضاء بالکفر کفر" کا قاعدہ مشہور ہے، اسی کے ساتھ یہ تعاون علی المعصیت ہے جو شرعاً حرام ہے۔

۳-(الف) جھنڈے کو سلامی دینا:

تمام تعریف، تعظیم و تکریم کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے، اس کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا، کسی کے سامنے جھکنا جائز نہیں ہے، اسی لئے اصحاب نظر و فکر نے احتراماً بزرگوں کو قبلہ و کعبہ لکھنے سے منع کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا تطروني" (بخاری و مسلم) (میرے لئے زیادہ بڑائی کے الفاظ استعمال نہ کرو)، جس شریعت کی حساسیت اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ زیادہ احترام کا جملہ غیر اللہ کے لئے استعمال درست نہیں، تو جھنڈا کے لئے جھکنا اور سلامی پیش کرنا کیسے درست ہوگا؟

دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور اس جیسے دیگر جمہوری ممالک میں سرکاری ماسٹر یا دیگر گورنمنٹ ملازمین کے لئے یہ مسئلہ بڑی پیچیدگی کا باعث بن جاتا ہے، مذہبی نقطۂ نظر کے ساتھ سیاسی اور سماجی پہلو نمایاں طور پر اس میں پایا جاتا ہے، اس لئے میرا خیال ہے کہ بغیر انحناء و احترام کے جھنڈے کو محض ہاتھ اٹھا کر سلامی دینا مصلحتاً جائز ہوگا، جیسا کہ بعد کے ارباب افتاء نے غیر اسلامی مملکت میں ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے، تورات، زبور، انجیل وغیرہ کے حلف اٹھانے کو مجبوراً جائز قرار دیا ہے، جبکہ تعظیم کی نیت نہ ہو (مجمع الفقہ الاسلامی کے فقہی فیصلے: ۱۸۸، ناشر اسلامک فقہ اکیڈمی)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی کا بھی یہی خیال ہے کہ "وہ (یعنی جھنڈے کو سلامی دینا) ایک فوجی عمل ہے، اس میں اصلاح ہو سکتی ہے مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ عمل قرار دینا صحیح نہیں ہے" (از نقیب جلد ۷، پھلواری شریف پٹنہ ۲۶/جمادی الاولی ۱۳۵۸ھ، جولائی ۱۹۳۹ء یکشنبہ)۔

ب: وندے ماترم پڑھنے کا حکم:

یہ سراسر شرک ہے، جس میں تاویل اور مصلحت کا اعتبار نہیں، اس لئے وندے ماترم یا اس قسم کے ترانے جن میں وطن کی معبودیت کا تصور پایا جائے، پڑھنا جائز نہیں۔

ج: اسلامی قانون کے خلاف فیصلہ:

قوانین اسلام کی اطاعت اور ان سے مستفاد روشنی کی اتباع مسلمانوں کا اصل شعار ہے، اسی کا حکم بھی ہے اور یہی نجات کا واحد راستہ ہے، تعلیمات قرآن کے خلاف کوئی فیصلہ توحید پرستوں کے لئے قابل عمل نہیں بلکہ وہ سختی سے قابل تنقید ہے، اگر کوئی عدالت اسلامی قانون کے خلاف فیصلہ دیتی ہے تو مسلم فریقین کے لئے اس پر عمل کرنا درست نہیں ہے: "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"۔ مخلوق کا بنایا ہوا اصول اسی حد تک معمول بہ ہے کہ وہ شریعت اسلامی سے نہ ٹکراتا ہو، امام احمد کے زمانہ میں خلق قرآن کا مسئلہ اٹھا تھا، امام صاحب نے تمام مصائب بصد خوشی قبول کر لئے لیکن اسلام کے خلاف قانون پر راضی نہ ہوئے، یہ طریقہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ثابت ہوتا ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"خذوا العطاء مادام عطاء، فإذا صار رشوة علی الدین فلا تأخذوه"

(تنخواہ لو اس وقت تک جب تک وہ تنخواہ رہے لیکن اگر وہ دین فروشی کے اوپر رشوت بن جائے تو نہ لو) (مجمع الزوائد ۵/۲۳۸)۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کبھی حکومت وقت کی طرف سے ایسے احکام جاری کئے جائیں جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو ایک توحید پرست، مسلمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان احکام کے بجائے اللہ کے حکم کی پابندی کرے، یہ طریق کار جہاں انفرادی طور پر اخروی نجات کا راستہ ہے، وہاں اس میں اجتماعی اصلاح کا زبردست صلاحیت بھی ہے، کیونکہ اگر عوام میں دینی شعور پیدا کر دیا جائے کہ وہ خالص اپنے دینی جذبے سے حکومت کے غیر اسلامی احکام کی تنفیذ میں حصہ دار بننے سے ہاتھ روک لیں تو ایک حکومت پر اس سے بڑے کسی دباؤ کا تصور نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ ہندوستان میں نفقۂ مطلقہ وغیرہ کے سلسلہ میں یہ آزمایا جا چکا ہے۔

۴-(الف) منزل ایک راستے مختلف:

اللہ ایک ہے، وہی ساری دنیا کا مالک اور خالق ہے، جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، ہونے والا ہے، سب میں اسی کی طاقت کارفرما ہے، اس کی کوئی نظیر ہے نہ مثیل،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لیس کمثله شیء" (سورۂ شوریٰ:۱۱)، "ولم یکن له کفوا أحد" (سورۂ اخلاص: ۴)، وحدانیت کے ساتھ رسالت کا اقرار ایمان کا اہم حصہ ہے، اس کے بغیر ایمان ویقین کی کوئی حیثیت نہیں، مسلم، غیر مسلم دونوں الگ الگ دو فرقے ہیں، بالترتیب ایک حق اور دوسرا باطل اور اس کا بطلان قرآن وسنت سے ثابت ہے، اہل عرب اللہ کو مانتے تھے مگر ساتھ ساتھ لات وعزیٰ، ہبل وغیرہ کو بھی مددگار مانتے تھے، اور خدائی میں شریک ٹھہراتے رہے، اس لئے وہ مشرک ٹھہرے: "ولئن سألتهم من خلق السماوات والأرض ليقولن الله" (سورۂ لقمان:۲۵)۔

آج کے غیر مسلم مذاہب مختلف ہونے کے ساتھ وحدانیت دین کا تصور رکھتے ہیں، یہ نظریہ کسی درجہ میں قابل قبول نہیں ہے، گنیش جی، ہنومان جی، سیتا، رام یا جس کو بھی معبود تصور کریں، کرتے ہیں اور انہیں خالق کائنات نہ سہی مگر معاون، مددگار ضرور تصور کرتے ہیں، قابل عبادت سمجھتے ہیں، ساتھ ہی رسالت کا اقرار نہیں کرتے، ارشاد خداوندی ہے: "ومن الناس من يتخذ من دون الله أندادًا يحبونهم كحب الله" (۲/۱۶۵) (بہت سے ایسے بھی لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور ان سے اللہ کی طرح محبت کرتے ہیں)۔

(ب) مظلوم طبقہ کے تئیں مسلمانوں کا رویہ:

اللہ تعالیٰ نے تخلیقی فطرت کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"یا أیها الناس إنا خلقنا کم من ذکر وأنثی وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند الله أتقا کم" (سورۂ حجرات: ۱۳)

دنیاداروں کے یہاں کالے، گورے کا فرق ہوسکتا ہے اور ہے، لیکن اسلام کی نظر میں تمام انسان انسانیت کے اعتبار سے یکساں حیثیت رکھتے ہیں، رنگ ونسل، قوم ووطن کے اعتبار سے تفریق جائز نہیں، کمزوروں اور دبے کچلے لوگوں کا تعاون، حتی الوسع ان کی ہمدردی نہ صرف اخلاقی فریضہ ہے بلکہ مذہبی فریضہ بھی ہے، اسلام کے مقصد میں داخل ہے کہ اہل حق کو حق دلوایا جائے، ظالم کا ہاتھ پکڑا جائے اور اچھی چیزوں کی ترویج کی کوشش کی جائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أنصر أخاک ظالمًا أو مظلومًا" (متفق علیہ)، حضرات محدثین نے صراحت کی ہے کہ مظلوم میں مسلم اور غیر مسلم دونوں داخل ہیں، دنیا کا جو بھی رویہ ہو لیکن مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ انسانی اخوت کے رشتہ سے ہر مظلوم کا تعاون پیش کرے، اس کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا معاملہ کرے۔ انسانیت کے اعتبار سے غیر مسلم بھی ہمارے حسن اخلاق کا حق رکھتا ہے، اس لئے اپنی صلاحیت کے بقدر مظلوم کا تعاون دینی فریضہ ہے، چاہے حکومت ہماری ہو یا نہ ہو۔

(ج، د) برادران وطن کے ساتھ مسلم تنظیموں کا رویہ:

جب کوئی قدرتی آفت آتی ہے تو بلا تفریق سماج کے تمام افراد اس کے شکار ہوتے ہیں اور سبھی لوگ مدد کے محتاج ہوتے ہیں، ایسے وقت میں مسلم ریلیف تنظیموں کو صرف انسانیت کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، مذہبی تعصب کی اجازت نہیں، چاہے غیر مسلم تنظیمیں مسلمانوں کو تعصب کے نقطۂ نظر سے دیکھیں یا تعاون کریں، اس لئے کہ عوض میں احسان کرنے کا نام صلہ رحمی نہیں ہے، سامنے والا چاہے اخلاق کے اعتبار سے جیسے ہی ہوں، ان کے ساتھ نرم مزاجی اور حسن گفتار کا حکم دیا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لیس الواصل بالمکافي ولکن الواصل الذي إذا انقطعت رحمه وصلها" (ترمذی ۲/۱۳)۔

حضرت عمر فاروقؓ ایک روز مسجد سے نکل رہے تھے کہ ایک نصرانی فقیر کو دیکھا، بھیک مانگ رہا ہے، فاروق اعظم اس کے پاس گئے، اور حال دریافت کرنے کے بعد فرمایا: یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا کہ تیری جوانی اور قوت کے زمانہ میں، ہم نے تجھ سے ٹیکس وصول کیا اور جب تو بوڑھا ہو گیا تو اب ہم تیری امداد نہ کریں، اس وقت حکم دیا کہ بیت المال سے اس کو تاحیات گذارہ دے دیا جائے (جواہر الفقہ ۵/۷۰)۔

مذکورہ بحثوں کا حاصل یہ ہوا کہ قدرتی آفت، ناگہانی مصیبت یا کسی اور بے چینی کے وقت غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے گا، ہاسپیٹل وغیرہ کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، بلکہ بلا تفریق مذہب تمام لوگوں کے لئے خدمت واعانت کا دروازہ کھلا رہنا چاہئے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان تمام جگہوں میں مسلمانوں کو مقدم رکھا جائے گا، کیونکہ ان سے دو رشتے ہیں ایک انسانی بھائی چارہ کا، دوسرے اسلامی وایمانی اخوت کا۔

✦✦✦

باب سوم مختصر مقالات

غیر اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات

ڈاکٹر محمد محروس المدرس (عراق)

عصر حاضر نت نئے حالات سے گذر رہا ہے، جو کسی بھی صورت میں اہل نظر سے مخفی نہیں، بایں وجہ مسلمانوں کا دنیا کو دارالحرب اور دارالاسلام میں تقسیم کرنا اس سیاق میں زیر غور اور تحقیق طلب مسئلہ بن گیا ہے، اس تقسیم کی گذشتہ ادوار میں اس وقت اہمیت رہی ہے، جب مسلمان ایک مربوط معاشرہ کی طرح تھے، اور آپسی اتحاد وقربت ویکسانیت کو برقرار رکھتے ہوئے پھیلتے گئے اور ان کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا، لہذا ان کی سرزمین دارالاسلام کہلاتی تھی اور ان کے علاوہ جو علاقے تھے دارالکفر سمجھے جاتے تھے۔

لیکن جب مختلف ملکوں اور علاقوں سے مسلمانوں کی سلطنت زوال پذیر ہوگئی، غیر مسلم ممالک کے باشندے دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو اس صورت حال کی تبدیلی کی وجہ سے سابقہ تقسیم نے ایک غور طلب مسئلہ کا رخ اختیار کرلیا، اور اس دور میں اس پر برقرار رہنے سے درج ذیل چیزیں لازم آتی ہیں:

الف- اپنے دین کی حفاظت کے لئے دارالکفر سے ہر مسلمان ہونے والے شخص کے ہجرت کا وجوب۔

ب- ان تمام علاقوں کے باقی ماندہ مسلمانوں کی ہجرت کا وجوب، جہاں سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوچکی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کی وجہ سے درج ذیل جیسے متعدد نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۱- ان کا اپنے مال وساز وسامان کو چھوڑنا۔

۲- زیر قبضہ تمام تجارتی یا سماجی یا سیاسی مراکز کا چھوڑنا۔

۳- علمی مراکز، اسلامی ادارے اور مساجد کا نقصان۔

۴- ان ممالک کے فرماں رواؤں کے تجاویز وقرارداد پر اثر انداز ہونے کے مواقع کا نقصان، جن کی وجہ سے عالم اسلام کے صورتحال پر اثر انداز ہونے کے امکان کا فقدان۔

۵- انکا ان معاشروں سے قطع تعلق اور ان ممالک کی شہریت کا نقصان، جس کی وجہ سے درج ذیل جیسے متعدد امتیازات ومراعات سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں

(الف)......دنیا کے مختلف ممالک میں امن وسلامتی، عزت واحترام بلکہ دعوت اسلامی کو فائدہ بخشنے والے تمام تعاون کو پہنچانے کے ساتھ، سفر کرنے کی اجازت۔

(ب)......جن ممالک کی شہریت ان کو حاصل ہے وہاں آنے جانے کی سہولت، جس کی وجہ سے دعوت کا کام آسان ہوسکتا ہے، اور اس کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

(ج)......ان آزادی سے فائدہ اٹھانے کا موقع، جنہیں وہاں کی حکومتیں اپنے باشندوں کو عطا کرتی ہے، جبکہ بسا اوقات بہت سے اسلامی ممالک میں بھی ایسی سہولیات میسر نہیں ہو پاتیں۔

(د)......عظیم علمی صلاحیتیں مثلاً ذرائع رابطہ وتعلق، ذرائع معلومات، حسن طباعت، اسلامی دعوتی پروگرام تیار کرنے کے لئے عمدہ الکٹرانک صنعت اور دنیا

کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والی کتابوں کی فراوانی، جنہیں وہ لوگ اپنی لائبریریوں کے لئے مہیا کراتے ہیں، سے استفادہ، جبکہ ان میں سے بیشتر چیزیں مسلم ممالک میں میسر نہیں ہو پاتیں۔

ان وجوہات کی بنا پر میں ان لوگوں کی تائید نہیں کرتا جو غیر اسلامی ممالک سے مسلمانوں کی ہجرت کے وجوب کے قائل ہیں، ورنہ نیپال، ہندوستان، فلپائن، تھائی لینڈ، سری لنکا اور میانمار کے مسلمان اس کے زیادہ ذمہ دار ہیں، چہ جائیکہ امریکہ، برطانیہ، جاپان، یورپی ممالک، لاتینی امریکہ، بیشتر افریقی ممالک، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ کے مسلمان باشندے۔

کیا اسے عقل گوارہ کرسکتی ہے؟ یا یہ مقاصد شریعت کے مطابق ہوسکتا ہے؟

میں دوبارہ اس چیز کو واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت نصوص پر بحث ومباحثہ نہیں کررہا ہوں، جبکہ ان میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے مجموعی مصالح کے پیش نظر تاویل کی گنجائش ہے نہ کہ کسی مخصوص جماعت یا گروہ کے مفاد کو دیکھتے ہوئے۔

جب ہم نے غیر مسلم ممالک میں موجود مسلمانوں کی بقا کو تسلیم کرلیا، تو اس قضیہ سے متعدد قابل بحث امور وابستہ ہیں، جن میں چند کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

۱- اپنے ممالک کے وزیر اعظم کے انتخاب میں شرکت کے تئیں ان کا طریقہ کار۔

۲- شریعت سے متصادم بعض امور پر مجبور کئے جانے کی صورت میں ان کا طریقہ کار۔

۳- کفار کو مسلمانوں پر فوقیت وغلبہ حاصل ہونے کی صورت میں، انکے زیر اثر کام کرنے کے تئیں ان کا طریقہ کار، جبکہ اللہ تعالی اسکی اجازت قطعی نہیں دیتے

۴- سودی لین دین معاملات میں ان کا طریقہ کار۔ اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ حنفیہ کی اس مسئلہ میں آراء مختلف ہیں۔

۵- جمعہ، جماعت، عیدین جو کہ مسلم حکمرانوں کی اجازت کے محتاج ہیں، ان کا قیام۔

۶- زکوۃ کا جمع کرنا اور صحیح مصرف میں اس کا استعمال، جبکہ یہ معلوم ہے کہ یہ مسلم حکمران کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

۷- ان کے علاوہ مسلمانوں کے نہایت ہی مخصوص امور مثلاً نکاح، طلاق، میراث، نفقہ، علاحدگی وتفریق جیسے دیگر معاملات جسے آج ہم مغربی قانون کے اصطلاح کی لفظی ترجمانی کرنے والے قانون دان کی زبان میں پرسنل لاء کے نام سے جانتے ہیں کے سلسلہ میں فیصلہ کرنے والے کی تعیین۔

میں یہاں ان مختلف مسائل میں سے صرف ایک مسئلہ یعنی مسلمانوں کا اپنے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے قاضیوں کی تعیین پر بحث کروں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ قاضیوں کا تقرر مسلمانوں کے فرمارواؤں کی متعدد خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے، جسے رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد ان کے خلفاء راشدین مختلف علاقوں میں قاضیوں کی تقرری کے ذریعہ انجام دیا کرتے تھے، اور یہ اب تک ایک مسنون طریقہ ہے۔

مغربی دستور کے احکام میں ہے کہ کسی بھی مملکت کے مطالبات کا دائرہ خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہوں، وہ تین چیزوں یعنی خارجی امن کی حفاظت، داخلی امن کی حفاظت اور لوگوں کو عدل وانصاف کی فراہمی میں ہی محصور ہیں۔

گذشتہ تفصیل اپنی انتہائی سادہ شکل میں بھی اسلامی ممالک پر منطبق ہوتی ہے، اس لئے قاعدہ ہے کہ ”ٹیکس حفاظت کی وجہ سے“ یعنی اگر کوئی مملکت اپنی رعایا کو داخلی وخارجی امن مہیا نہیں کراتی ہے، تو انہیں مالی استحقاق کی ادائیگی کا کوئی جواز نہیں۔

اور جہاں تک فیصلہ کا تعلق ہے تو اسے دراصل حقوق کو ان کے اہل تک پہنچانے، افراتفری کو دور کرنے اور صاحب حق کو خود اپنے طور پر حق حاصل کرنے سے روکنے، جس کی وجہ سے متعدد معاشرتی وسلامتی خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہے، سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صاحب حق کا بذات خود قصاص حاصل کرنے کے بجائے اس کام کو مخصوص سرکاری ملازم کے ذریعہ ایسے بااختیار عدالتی شخص کے فیصلہ کے بعد انجام دیا جاتا ہے، جن کے فیصلے کو نافذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں آتی، اور جو ان امور کو برمحل بیان کرنے کی وجہ سے نہ تو معزول کئے جاتے ہیں اور نہ ہی انہیں اس پر مجبور کیا جاتا ہے۔

فرانسیسی انقلاب کے بعد عدالتی، انتظامی وقانون سازی تینوں اختیارات کو الگ الگ رکھنے کے اصول کو اختیار کرنے پر اتفاق کرلیا گیا، اور ہر مملکت کے آئین کا لازم العمل حصہ قرار دیا۔

اور (عدالتی اختیار) کے احکام ہر دستور کے احکام کا جز بن گیا، اور دستور اس کی شمولیت کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ دستوروں نے انہیں اعلیٰ مقام عطا کیا ہے، ان دستوروں میں سے، سلطان عبدالحمید ثانی کے دور میں نافذ کیا گیا سلطنت عثمانیہ کا دستور، ۱۹۵۸ء کا عارضی عراقی دستور (دفعہ ۲۳ سے ۲۵ تک)، ۱۹۵۸ء کا متحدہ عرب ممالک کا عارضی دستور (فصل چہارم دفعہ ۵۹ سے ۶۳ تک) حکومت بحرین کا دستور (فصل چہارم دفعہ ۱۰۱ سے ۱۰۳ تک)، کویتی دستور (دستور عارضی کا دفعہ ۱۶۳ سے ۱۷۳ تک اور دستور دائمی کا دفعہ ۵۳)، لبنانی دستور (دفعہ ۳۰)، مراکشی دستور (فصل ۸۲ سے ۸۷ تک)، تونسی دستور (باب چہارم فصل ۶۴ سے ۶۷ تک)، سوڈانی دستور (باب پنجم، دفعہ ۹۹ سے ۱۰۷ تک) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اصولی طور پر افتاء (مسئلہ بیان کرنا) اس حکم کے بیان کرنے کو کہا جاتا ہے جس کے عمل پر کوئی پابندی نہیں ہوتی، جبکہ فیصلہ ان احکام کے بیان کرنے کو کہتے ہیں جنہیں لازمی طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام ایک خط میں حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ "تمہارے پاس جب کوئی قضیہ پیش کیا جائے تو اسے نافذ کرو کیونکہ بغیر نفاذ کے حق بیان کرنے میں کوئی فائدہ نہیں" اور بلا شبہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے امت کے ہر فقیہ تسلیم کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ مغرب کے خود ساختہ قانون میں جو چیزیں موجود ہیں، عین وہی چیزیں اسلامی فقہ و عمل میں پائی جاتی ہیں، کیونکہ قانون در حقیقت ان معاشرتی احوال کے منظم ضابطوں کے مجموعے کا نام ہے، جو عدم نفاذ کی صورت میں جزا کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، لہذا حکم کی پابندی وہ اہم چیز ہے جو فقہی یا (ہماری اصطلاح میں شرعی حکم) کو اسلامی نقطہ نگاہ سے بھی عدالتی فیصلہ کا درجہ عطا کرتا ہے۔

لیکن خود ساختہ قانون داں مروجہ ضابطہ کو قانون کا سرچشمہ مانتے ہوئے متعدد عذروں کا سہارا لینے لگے، ان کی دلیل یہ ہے کہ پابندی فی الواقع جماعت کی ضمیر کی آواز ہے، اور جو چیز مروجہ ضابطہ کے غیر پابند شخص کو ان کے معاشرہ میں قابل ملامت و تشنیع ٹھہرا دے وہی اصل جزا ہے۔

لیکن بیک وقت وہ دینی و اخلاقی ضابطوں کو جزا کے عنصر سے خالی ہونے کی وجہ سے قانون کا سرچشمہ نہیں مانتے، کیونکہ ان کی نظر میں "مذہب" (اس لفظ کی جانکاری کی حد تک) معاشرتی احکام سے عاری محض چند روایات وعبادات کا نام ہے، اس نظریہ میں ان کے عمل کے لحاظ سے دو غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

انہوں نے خانگی امور یعنی پرسنل لا کے لئے ضابطے مقرر کئے لیکن جب یہ ضابطے قانونی شکل اختیار کرنے کے قابل ہوئے تو خود ان کی مخالفت کرنے لگے اور جماعت کی تشنیع وضمیر کے محاسبہ وغیرہ کو جزا کا عنصر قرار دیتے ہوئے قانونی ضابطہ کا سرچشمہ سمجھے جانے والے عرف کا بھی انکار کرنے لگے، حتی کہ برطانوی آئین کے بیشتر قوانین مروجہ ضابطوں پر مشتمل ہیں، اسی طرح لبنانی دستور کے اکثر قوانین، مثلاً عہدوں کی گروہی تقسیم کرتے ہوئے مارونی عیسائی صدر جمہوریہ، سنی مسلم وزیر اعظم، شیعہ مسلم پارلیمنٹ اسپیکر، کی تعیین مروجہ ضابطوں پر اس قدر مبنی ہیں کہ جب مسلمانوں نے اس کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تو اس کی وجہ سے ایک بڑی جنگ چھڑ گئی، جو تقریباً دس سال تک جاری رہی، جس میں ہزاروں جانیں برباد ہوئیں لیکن مروجہ نظام اپنی حالت پر اسی طرح قائم رہا۔

سلطنت عثمانیہ کے اخیر دور سے ہی عیسائیوں نے اپنے دینی رہنما کے انتخاب، اوقاف کی نگرانی، دینی تعلیم اور اپنی مذہبی عدالتوں (جس پر ہم گفتگو کریں گے) پر مشتمل ملی یا ذاتی امور میں آزادی حاصل کر لیا تھا، اور ان مذہبی اداروں کی عدالتی حیثیت سمجھی جاتی تھی، اور اس مذہب کے تمام پیروکاروں پر دینی فریضہ کی حیثیت سے اس محکمہ کے احکام کی تعمیل ضروری تھا، اور کسی بھی فرد کے خلاف صادر حکم کے نفاذ میں حکومت کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی، اس طرح عرف عام یعنی فیصلہ بیان کرنے کو عدالتی حکم کی حیثیت دینے کے لئے لازمی طور پر جزا کے عائد کرنے کے عناصر پر مشتمل قوت باقی رہی۔

اب ہم ان ممالک کے مسلم اقلیتوں کے عدالتی ادارے کا ذکر کریں گے، جہاں سے مسلمانوں کی سلطنت ختم ہوگئی ہے، یا غیر مسلم کے زیر قبضہ ہونے کے باوجود بھی وہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ آیا ان کی عدالتی اداروں کو ہم واقعی عدالتی محکمے شمار کر سکتے ہیں؟

اور کیا ان کے سرگرمیوں کو اسلامی احکام سے عبارت قرار دے سکتے ہیں؟۔

اس سلسلہ میں میری ناقص رائے اثبات میں ہے۔

کیونکہ مغربی قانونی ضابطہ کے لحاظ سے بھی انہیں قانونی درجہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور فرمارواؤں کو ہندوستان، فلپائن اور تھائی لینڈ وغیرہ میں مسلمانوں کے قائم کردہ اداروں کی اہمیت سے مطمئن کرانے کے لئے بھی اس کا اختیار کرنا مناسب اور اسی میں مصلحت ہے، اور ان اداروں کو دوسرے ممالک میں جہاں مسلمانوں کی اچھی تعداد موجود ہے عام کرنے کی ضرورت ہے۔

فقہی نقطہ نگاہ، فقہی عمل و اسلامی طریقہ کار کے لحاظ سے بھی اس میں گنجائش ہے۔

کیونکہ فقہاء نے یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ جہاں کے مسلمانوں میں جمعہ کے شرائط پائے جاتے ہوں اور ان کا کوئی حاکم نہ ہو جو انہیں نماز پڑھا سکے تو انہیں چاہئے کہ اپنے ہی میں سے کسی ایک شخص کو جمعہ پڑھانے کے لئے مقرر کرے۔ یہ مسئلہ ابن عابدین میں موجود ہے۔

اسی طرح اگر مسلم مملکت کے حکمران نے زکوۃ وصول نہیں کیا، یا اسے زکوۃ کے نام سے وصول نہیں کیا، یا وصول کرنے کے بعد اس کو صحیح مصرف میں استعمال نہیں کیا، تو وہاں کے مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی دعوتی امور میں دلچسپی رکھنے والے عالم باعمل کے پاس جمع کردیں، اس کے بغیر زکوۃ ادا نہیں ہوگی، یا اگر ان شرائط کا حامل کوئی عالم بھی نہ ملے تو مسلمان کسی ایسے شخص کا انتخاب کریں جو اس کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہو، اس موضوع پر میں نے زکوۃ کے مصارف کے عنوان پر اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے اعظم گڑھ میں منعقدہ ایک سیمینار میں پیش کردہ مقالہ میں تفصیلی گفتگو کیا ہے۔

اسی طرح اگر مسلمانوں کا کوئی فرمارواں نہ ہو، یا وہ غیر اسلامی مملکت میں رہتے ہوں، تو انہیں اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ ہلال کے اثبات، اس کی رویت کے احکام اور اس سلسلہ میں شہادت لینے کے مسائل سے واقف کسی شخص کو اس کے لئے متعین کردیں۔

پھر اس کے مطابق روزہ رکھیں اور افطار کریں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

مسلمانوں کا اپنے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے کسی کا انتخاب جائز ہے۔

اور مسلمانوں کے نزدیک سب سے اہم ان کے پرسنل لا سے متعلق مسائل کا فیصلہ ہے کیونکہ وہ انسان کی نمایاں اور اہم ترین خصوصیات میں سے ہے۔

اور قاضی کی طرف سے صادر احکام عدالتی فیصلہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی شرعی طور پر تعمیل لازم ہے۔

مزید برآں پوری جماعت کا اس کے فیصلے سے رضامندی اور اس سے عدم رضامندی کی وجہ سے طعن وتشنیع کا نشانہ بننے کی صورت میں پابندی کا عنصر بھی موجود ہے۔

لہذا ان اداروں کی طرف سے ہندوستان، تھائی لینڈ اور فلپائن وغیرہ جیسے ممالک میں صادر فیصلے۔

(الف)......قابل قبول ہیں۔

(ب)......اور انہیں عدالتی حکم کا درجہ حاصل ہے۔

اور اس کی تعمیل نہ کرنے والا گنہگار ہے، اور مسلم طبقہ اس پر بائیکاٹ اور اس کے ساتھ ہر طرح کے معاملات ختم کردینے جیسے سزا کو نافذ کرسکتا ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے افراد کے ساتھ کیا، تا آنکہ وہ لوگ تائب ہوئے اور اسی طرح مالک نصاب ہونے کے باوجود زکاۃ نہ دینے والوں کے ساتھ کیا گیا، گویا اس میں سزا اور پابندی عائد کرنے کا عنصر دونوں پایا گیا، کیونکہ اس میں مغربی قانونی ضابطوں کے عناصر اور اسلامی احکام کے عناصر دونوں بخوبی موجود ہیں۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں انتخابات کے موقع پر مسلمانوں کا طرز عمل

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی (پاکستان)

مروجہ جمہوری نظام خواہ اسلامی مملکت میں رائج ہو یا غیر اسلامی مملکت میں، اسلامی طریق انتخاب نہیں، اور شرعی لحاظ سے اس میں متعدد مفاسد اور خرابیاں ہیں، جن کی نشاندہی علماء کرام نے فرمائی ہے، تاہم جب تک یہ نظام مسلم یا غیر مسلم ممالک میں رائج ہو اس وقت تک اس نظام سے متعلق جو شرعی احکام ہیں ان کی پابندی کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، اور انتخابات سے بے تعلق رہنا عام حالات میں جائز نہیں، جبکہ ایسا کرنے سے مسلمانوں کو نفع کی بجائے نقصان پہنچنے کا زیادہ اور قوی اندیشہ ہو، جس کی شریعت میں اجازت نہیں، شریعت کا مسلمہ اصول ہے کہ جب مسلمان دو مصیبتوں میں گرفتار ہونے لگے تو ان میں سے جو نسبتاً ہلکی مصیبت ہو اس کو اختیار کیا جائے۔

اب ایک طرف مروجہ جمہوری نظام ہے جو اسلامی احکام سے مطابقت نہیں رکھتا، اور دوسری طرف اس کی مخالفت کرنے کی صورت میں مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے حکم یہ ہے کہ ان حالات میں اسی نظام کے ساتھ چلیں، تاہم شرعی تقاضوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد قائم کردہ سوالات کے جوابات یہ ہیں:

الف، ب: اگر کسی مسلمان میں خدمت خلق کی اہلیت اور قابلیت موجود ہے اور وہ دیانت دار اور امانت دار ہو اور خاص طور پر اس سے مسلمانوں کے مذہبی اور ملی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہو اور ان حقوق کو تقویت ملتی ہو، تو اس صورت میں غیر مسلم ممالک میں انتخاب کے موقع پر انتخاب میں امیدوار بننا درست ہے، بلکہ اگر اس نیت سے ہو کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے کوشش کروں گا، یا دیانت داری اور امانت داری سے خلق خدا کی خدمت کروں گا، تو اس صورت میں موجب ثواب اور موجب اجر ہے، اسی طرح قومی اور مذہبی مفاد کے پیش نظر کسی ایسے امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جس میں اہلیت اور قابلیت موجود ہو اور وہ دیانت دار اور امانت دار ہو اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہ ہو، اور اس میں بہتر طریقہ جو سنت کے قریب ہے، بلکہ سنت کا تقاضہ ہے یہ ہے کہ امیدوار خود اپنا نام امیدواری کے لئے پیش نہ کرے، کیونکہ حدیث میں منصب طلب کرنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من طلب القضاء واستعان عليه وكل إليه الحديث'' (المستدرك)۔

(ج) ایسی جماعت سے وابستہ امیدوار کو ووٹ دینا درست نہیں، اگرچہ وہ امیدوار بذات خود نیک خصلت ہو، اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہو، کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ اس کی پالیسیاں مجموعی طور پر اپنی جماعت کے منشور کے خلاف نہیں ہوں گی، اور اگر بالفرض یہ امید بھی ہو کہ وہ اپنی جماعت کے منشور کے علی الرغم اپنی پالیسیوں میں مسلمانوں کی حمایت کرے گا، تب بھی اس کو ووٹ دینے میں یہ مفسدہ موجود ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کی پارٹی اسی امیدوار کی وجہ سے اکثریت حاصل کرے، اور حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائے، تو اس طرح اس پارٹی اور اس کے منشور کی حمایت لازم آئے گی، جو شرعاً جائز نہیں، اسی طرح ایسی جماعتوں میں مسلمانوں کے لئے شمولیت بھی ہرگز جائز نہیں۔

(د) دین اور مسلمانوں کی مصلحت کی خاطر انتخابات کے موقع پر غیر مسلموں کے ساتھ انتخابی معاہدے کرنا جائز ہے، اسی طرح شر سے بچنے اور

دوسروں کو بچانے کے لئے یا شر کو کم کرنے کے لئے ان کی حمایت کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ ان سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ نہ ہو، لیکن کسی ایسی غیر مسلم پارٹی میں شریک ہونا اور اس کے ساتھ اشتراک عمل اختیار کرنا، جس میں قیادت غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہو، جائز نہیں، اس سے اجتناب کرنا واجب ہے۔

احکام القرآن میں علامہ جصاص فرماتے ہیں:

''قال الله تعالى: يا أيها الذين آمنوا لاتتخذوا بطانة من دونكم، وقال: لاتتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض ومن يتولهم منكم فانه منهم فنهى فى هذه الآيات عن موالاة الكفار وإكرامهم وأمر باهانتهم وإذلالهم لهم ونهى عن الاستعانة بهم فى أمور المسلمين لما فيه من العزو وعلو اليد وكذلك كتب عمر إلى أبي موسى ينهاه أن يستعين بأحد من المشركين فى كتابة وتلا: لاتتخذوا بطانة من دونكم لايالونكم خبالا'' (۳/ ۱۲۲)۔

اور اسی میں ہے:

''وفى هذه الآية دلالة على أنه لاتجوز الاستعانة بأهل الذمة فى أمور المسلمين من العمالات والكتبة'' (۲/ ۴۴ بحوالہ جواہر الفقہ)۔

مفسر اعظم ابوالسعودؒ نے آیت "لايتخذ المؤمنون الكافرين أولياء" کی تفسیر میں بھی اس کی توضیح فرمائی:

''نهوا عن موالاتهم (الى قوله) أو عن الاستعانة بهم فى الغزو وسائر الأمور الدينية'' (تفسیر ابو السعود ۱/ ۲۲۶ بحوالہ بالا)۔

(۵) منکرات کو روکنے اور معروف کو پھیلانے کے لئے، یا دوسرے کاموں کے لئے جو تنظیمیں یا ادارے قائم کئے جائیں گے، اگر ان میں غیر مسلم غالب ہوں اور مسلمان مغلوب ہوں تو یہ جائز نہیں، اور اگر مسلمان اصل ہوں اور غالب ہوں اور غیر مسلم بھی ان کے ماتحت کام کرتے ہوں تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ اوپر اس کی تفصیل ذکر ہو چکی۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی
دار السلام، اسلامی مرکز، مالیر کوٹلہ، پنجاب

اصل مسئلہ پر کچھ کہنے اور متعینہ سوالات کا جواب دینے سے پہلے مندرجہ ذیل چند بنیادی باتیں ہم سب کے سامنے رہنی چاہئے، تاکہ اصل مسئلہ کو سمجھنے میں اور سوالات کا جائزہ لینے میں کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

۱- پہلی بات یہ کہ امت مسلمہ اپنی ترکیب، اپنے مزاج اور اپنے مقاصد کے اعتبار سے دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے، ڈاکٹر اقبال مرحوم کا یہ شعر اسی سچائی کو ظاہر کرتا ہے، وہ کہتے ہیں:

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اس امت کو اللہ تعالی نے خیر امت کا خطاب عطا فرمایا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

"كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" (آل عمران/۱۱۰)

(اب دنیا میں بہترین امت تم ہو جسے لوگوں کی اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم کرتے ہوں بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔

اس آیت سے امت کی فضیلت کے علاوہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کو برپا کرنے کا اور خیر امت بنانے کا مقصد کیا ہے۔

سورۂ توبہ میں ارشاد ہوا ہے: "الآمرون بالمعروف والناهون عن المنكر والحافظون لحدود الله" (توبہ/ ۱۱۲)

(وہ نیکی کا حکم کرنے والے اور بدی سے روکنے والے اور حدود الہی کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

قرآن پاک کے ارشادات سے یہ بات اچھی طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی طرح صرف جینے کے لئے نہیں ہے، اس کی زندگی برائے زندگی نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی کا ایک خاص مقصد ہے، اور وہ ہے معروفات کو قائم کرنا اور منکرات سے سوسائٹی کو پاک وصاف کرنا۔

۲- دوسری بات اصولی طور پر یہ سامنے رہنی چاہئے کہ قرآن مجید نے برائی کی ہر شکل سے کسی طرح کے تعاون کرنے سے روکا ہے اور حکم دیا ہے کہ تمہارے ہاتھ مدد کے لئے آگے بڑھیں تو صرف نیکی کے لئے، ارشاد ہی:

"وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (مائدہ/ ۲)

(نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور سرکشی کے معاملات میں کوئی تعاون مت کرو)۔

۳- تیسری بات اصولی طور پر یہ سامنے رہنی چاہئے کہ اسلام برائی کے ساتھ کسی طرح کے سمجھوتے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، بلکہ حسب استطاعت برائی کا مقابلہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من رأى منكم منكرًا فليغيره بيده إن لم يستطع فبلسانه وإن لم يستطع فبقلبه"

(تم میں سے کوئی شخص اگر کسی برائی کو دیکھے اگر طاقت ہے تو ہاتھ سے طاقت نہیں تو زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں ہے تو دل سے اس کو برا جانے)۔

مذکورہ بالا تینوں اصولی احکام شریعت کے بعد اب ہم مقرر کردہ سوالات پر آتے ہیں اور شریعت کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱- الف: اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ جمہوری نظام اللہ تعالی کے اقتدار اعلی کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے یہ طاغوتی نظام ہے، اور اس میں کسی طرح بھی شرکت

مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے۔

لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ بھارت کا آئین ایک فیڈرل سسٹم ہے اور عوامی حمایت کے بعد اس آئین کی وہ شکل بھی ہو سکتی ہے جو اسلامی شریعت سے متصادم نہ ہو، یعنی ہم اس آئین کے ذریعہ سیاست میں حصہ لے کر ایسی پوزیشن میں آسکتے ہیں جو اس ملک کی موجودہ تصویر کو آئینی طور پر بدل سکے، جیسا کہ اس زمانے میں نائجیریا میں ہوا ہے، نائجیریا کے صوبہ زمفرا میں ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اسلامی شریعت کے نفاذ کا اعلان کیا گیا تھا، اور یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا ہے پھر شمالی نائجیریا کے دوسرے صوبوں میں بھی شریعت کا نفاذ عمل میں آیا، اس لئے ہم شرعی طور پر یہ کہیں گے کہ شریعت کے مفادات کو سامنے رکھ کر بھارت یا اس جیسے ملکوں میں مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا اس صورت میں جائز ہوگا اگر مسلمان اپنی دیانت، امانت، اخلاق اور ان تمام حدود کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے جو اسلام نے ان کو سکھائی ہیں ان کاموں میں حصہ لیں، مگران تمام گراوٹوں سے بچتے رہیں جو بے ایمانی، دھاندلی بازی اور بدعہدی کی صورت وسیاست کا ایک لازمی حصہ بنتی جارہی ہے، ان کو اپنے مقام اور حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نیت اور ارادے کے ساتھ یہ سیاسی تدبیر اختیار کرنی جائز ہوگی کہ وہ اس کے ذریعہ خیر امت کے فرائض آسانی کے ساتھ ادا کرسکیں گے۔

ب- کسی خاص موڑ پر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں پر شرعی طور پر ووٹ دینا اسی طرح واجب ہوجائے جس طرح باطل قوتوں سے جہاد ضروری ہوتا ہے، ووٹ دراصل اس زمانے کا جہادی ہتھیار ہے جس سے آئینی طور پر انقلاب بھی برپا کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ الجزائر میں ہوچکا ہے۔

ج- جماعتی سیاست میں ارکان اپنی پارٹی کے وفادار ہوتے ہیں اور اس کی پالیسیوں کا پابند رہنا پڑتا ہے، اس لئے ایسی جماعت جو کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی مخالف ہو اور ان کے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہو اس کے افراد کو ذاتی حالات کی بنا پر ووٹ دینا پارٹی کو طاقت پہنچانا ہے، اس لئے ایسی جماعت سے وابستگی اور اس میں شمولیت بھی ہرگز درست نہیں ہے۔

د- ملی مفادات کے تحت غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے کرنا، ان میں شرکت اور ان کی حمایت کرنا درست ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمانے کے بعد مختلف غیر مسلم قبیلوں کو ملا کر ایک میثاق اور عہد نامہ مرتب فرمایا جو "میثاق مدینہ" کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ شرعاً اس کی حیثیت ایک معاہدے کی سمجھی جائے گی۔

ھ- غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر اچھے کاموں کے لئے مشترکہ کوشش کرنا بہت ہی مستحسن اور قابل قدر ہوگا جیسا کہ اس کی مثال اوپر مکہ مکرمہ کی زندگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل "حلف الفضول" میں شرکت فرمانے کی دی گئی ہے۔

۲- الف: مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا یا اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا یہ دونوں باتیں اس شہر کے مخصوص حالات اور ماحول پر منحصر ہیں، ہندوستان کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی علاحدہ محفوظ کالونیاں بنا کر رہیں۔

ب- غیر مسلم کے انتقال پر تعزیت، افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرنا تو بلاشبہ جائز ہی نہیں بلکہ انسانی اخلاق کا تقاضہ اور دعوتی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے، البتہ جنازے اور مخصوص رسومات میں شرکت اگر نہ کی جائے تو زیادہ بہتر ہے، باقی قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے اور یہ بڑی جسارت کی بات اور قرآن پاک کے ساتھ گستاخی ہے، انسانی تعلقات اور رواداری اپنی جگہ ہے لیکن کفر واسلام کا واضح فرق جو فرقان کریم نے جگہ جگہ بتادیا ہے واضح طور پر سامنے رہنا چاہئے، اور اس میں کسی مداہنت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ج- تقریبات کے موقع پر جو مٹھائی وغیرہ خوشی میں تقسیم کی جاتی ہے وہ ایک تحفہ ہے اور اس کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ اگر چڑھاوے کی قسم سے کوئی چیز ہو تو ہمیں مناسب طریقے پر یہ سمجھانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کا بھی چڑھاوا چاہے وہ کوئی مسلمان پیر وپیغمبر ہی کیوں نہ ہو جائز نہیں سمجھتے، اس سے ان کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ یہ بات کسی تعصب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اصولی بات ہے کہ اگر کسی مسلمان کی قبر پر بھی چڑھایا جائے تو وہ بھی درست نہیں ہے۔

د- بعض فقہاء نے مسجدوں میں غیر مسلم سے پیسہ لینے کو غیرت اسلامی کے خلاف لکھا ہے، اور بعض نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ اگر وہ ازخود اپنے عقیدے کے مطابق ثواب سمجھ کر دیتے ہیں تو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کو مسجد کی تعمیر میں لگایا جاسکتا ہے۔ اپنے غیر مسلم بھائیوں کو عام نیک

کاموں میں تعاون کی نیت سے دے دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، البتہ مندر وغیرہ کی تعمیر میں چندہ دینے سے گریز کرنا چاہئے۔

ھ- الف: اگر کوئی ایسا عمل نہ ہو جس کو مشرکانہ عمل کہتے ہیں اور تالیف قلب کے لئے ان کے تہوار میں شرکت کی جائے تو بظاہر اس میں شریعت کے خلاف کوئی عمل معلوم نہیں ہوتا۔

ب- تہوار کی مبارکباد دینے میں بظاہر کوئی شرعی قباحت نظر نہیں آتی۔

۳- الف: جھنڈے کو سلامی دینا ایک سیاسی عمل ہے، اس کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے شرعی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ب- جن ترانوں میں مشرکانہ مضامین شامل ہیں ان کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔

ج- خلاف شریعت فیصلے پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، "لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق" (جس معاملے میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے وہاں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی)۔

۴- الف: تمام مذاہب کا حق پر ہونا یہ بالکل خلاف واقعہ ہے، یہ کہنا کہ راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش ہے، قرآن مجید نے صاف اعلان کردیا ہے: "إن الدين عند الله الإسلام" (آل عمران: ۱۹) (دین اللہ کے نزدیک بس ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے)۔

اور فرمایا: "ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه" (آل عمران/ ۸۵)

(اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)۔

اصل میں وحدت دین ہے وحدت ادیان نہیں ہے، یعنی ابتدا میں تمام انسانوں کا دین ایک ہی تھا "كان الناس أمة واحدة" (سورۂ بقرہ: ۲۱۳)۔

پھر لوگوں نے الگ الگ راستے اپنا لیئے اور اس اصل سے دور ہوتے چلے گئے۔

ب- مسلمان اپنے مقام و منصب کے اعتبار سے اس بات کے لئے ذمہ دار ہیں کہ وہ سماجی طور پر رنگ و نسل کے امتیاز کو ختم کرکے تمام انسانوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کی فضا بنائیں، اس معاملے کا تعلق صرف حکومت سے ہی نہیں ہے اور نہ سب کام حکومت کے ذریعے ہوا کرتے ہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ سماجی اور معاشرتی طور پر رنگ و نسل کی تفریق مٹا کر احترام انسانیت کو فروغ دیں، ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے اور اپنی اس کوتاہی کو دور کرنا چاہئے کہ عبادت گاہوں سے باہر ہم اسلام کے اس نقطہ نظر کو عملی طور پر پھیلانے میں ناکام رہتے ہیں، اب یہ وقت کا تقاضا ہے کہ دبے کچلے لوگ جن کو سماج میں عزت و احترام کا وہ مقام نہیں مل سکا جو ہر انسان کا حق ہے ان کا وہ حق دلانے میں ہم ان کی مدد کریں اور ہر طرح کی تفریق کو مٹانے میں آگے بڑھیں۔

ج- خدمت خلق بلا تفریق مذہب سب کے لئے ہونی چاہئے، انسانی یا دعوتی نقطہ نظر سے اس میں تفریق برتنا اور اس کو صرف اہل اسلام کے لئے خاص کرلینا کم سے کم امت مسلمہ کے شایان شان نہیں ہے، سعدی نے خوب کہا ہے:

تو کہ از محنت دیگراں بے غمیں ہشاید کہ نامت نہند آدمی

اگر تو دوسروں کی تکلیف سے دکھ محسوس نہیں کرتا تو تیرا نام آدمی رکھنا مناسب نہیں ہے، آدمی تو وہی ہے جس میں آدمیت اور انسانیت ہو۔

د- ہمارا رویہ فرقہ پرست تنظیموں سے بالکل الگ ہونا چاہئے، اور ہمیں بلا امتیاز ہر ایک کے کام آنا چاہئے ان کی فرقہ پرستی کا جواب ہماری فرقہ پرستی نہیں ہے، اندھیرے کو اندھیرے سے نہیں روشنی سے دور کیا جاتا ہے۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

مفتی حبیب اللہ قاسمی (اعظم گڑھ)

ا-الف: مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا:

عصر حاضر میں ووٹ چونکہ بہت بڑی طاقت ہے، اس کو بڑی اہمیت وحیثیت حاصل ہے کیونکہ ووٹ ہی سے سیاسی اور سماجی زندگی میں قوموں کا درجہ ومقام متعین ہوتا ہے، ان کے حقوق کی حفاظت وصیانت اور پاسداری ہوتی ہے، نیز چونکہ مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی یا ایسے ارکان کے وجود کی وجہ سے جن کے انتخاب میں مسلم ووٹ موثر ہوتو ان کے ذریعہ مسلمانوں کے قومی مفادات کے ساتھ ساتھ ملی ومذہبی مفادات کا بھی تحفظ ہوتا ہے اور عدم شرکت وعدم شمولیت کی صورت میں قومی، ملی، مذہبی نیز اس طرح کے اور بھی نقصانات اور خطرات پیش آسکتے ہیں، جو شرکت وشمولیت کے نقصان سے زیادہ خطرناک، مہلک اور پریشان کن ہیں۔

لہذا اصول فقہ کہ ''جب دو مفسدے جمع ہوجائیں اور دونوں سے احتراز ممکن نہ ہو تو اقل درجہ کے مفسدے کو گوارا کیا جائے گا'' اور ''إذا ابتلی ببلیتین فلیختر أھونھما''، ''کما فی مسئلة المریض والعاری''، مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا، دوسرے امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا، اس کے لئے دوڑ دھوپ اور جدوجہد کرنا یہ سب امور شرعاً جائز ہوسکتے ہیں، کیونکہ بظاہر ان امور میں سے کسی میں بھی کسی طرح کی کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی ہے۔

ب: ووٹ کی شرعی حیثیت:

عصر حاضر میں مسلمان لیڈروں کا الیکشن میں حصہ لینا، دوسرے لیڈروں کو ووٹ دینا، قومی، ملی اور مذہبی حقوق کو حاصل کرنے، ان حقوق کے بقاء اور ان کی صیانت کے لئے چونکہ لازم کے درجہ میں ہوگیا ہے، اس کے بغیر کوئی مفر اور چارہ کار نہیں۔ لہذا حالت اضطرار اور مختلف فوائد کے پیش نظر مذکورہ انتخابات میں مسلمانوں کی شرکت اور ووٹ دینے کو واجب قرار دیا جاسکتا ہے۔

ج-اسلام مخالف سیاسی جماعتوں کو ووٹ دینا:

الیکشن میں حصہ لینے والی سیاسی جماعتیں جن کا مقصد اور نصب العین اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت وعداوت ہو، گرچہ ان کے بعض امیدوار بنفس نفیس اور ذاتی اعتبار سے کیوں نہ نیک خصلت اور اسلام ومسلمانوں کا بھی خواہ اور ہمدرد ہوں، ان کو ووٹ دینا جائز نہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے لئے ایسی جماعت میں شمولیت درست ہے، کیونکہ پوری جماعت اور کثیر تعداد کے مقابلہ میں افراد اور بعض اشخاص کی کوئی حیثیت اور ان کا کوئی مقام نہیں، یہ تن تنہا کچھ نہیں کرسکتے بلکہ خود یہ بھی جماعت کے تابع ہوتے ہیں، مزید یہ کہ ''الاعتبار للأکثر لا للأقل'' (یعنی اعتبار اکثر کا ہوتا ہے نہ کہ اقل کا) نیز یہ کہ شمولیت تعاون علی الاثم کے مرادف ہے، اور ارشاد باری ہے: ''ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان''۔

لہذا دونوں صورتوں (شمولیت اور ووٹ دینا) میں سے کوئی صورت درست معلوم نہیں ہوتی ہے۔

د-ملی مفادات کے تحت معاہدے کرنا:

شریعت کے دائرہ میں رہ کر ملی مفادات کے تحت غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے، ان میں شرکت اور ایسی پارٹیوں کی حمایت کی جاسکتی ہے، شرعاً یہ عمل جائز معلوم ہوتا ہے اور اس کی نظیر حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ معاہدہ ہے جو کفار مکہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔

ھ-غیر مسلم کے ساتھ اشتراک فی العمل:

امر بالمعروف ونہی عن المنکر، خدمت خلق، معاشرہ وسماج میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا، اور خوشگوار ماحول بنانا نص قرآن والحدیث واقعی امت مسلمہ کا فریضہ ہے، جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے: "کنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر"۔

سورۂ حجرات میں ہے: "إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم"۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انصر أخاك ظالمًا كان أو مظلومًا''۔

حتی الامکان تن تنہا مسلمانوں کو یہ فرائض انجام دینا چاہئے اوران مقاصد کے حصول کے لئے بلاشرکت غیر تنظیمیں قائم کرنا چاہئے، تاکہ مسلمان دوسرے کے ممنون کرم نہ ہوں اور مسلمانوں پر کسی کا احسان نہ ہو۔

لیکن اگر تن تنہا ان فرائض کی انجام دہی اور تنظیموں کا قیام ممکن نہ ہو، دشواریاں اور پریشانیاں آتی ہوں، آلام ومصائب کا سامنا ہو تو ضرورت کے موقع سے مختلف طبقات اور غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک جائز ہے کہ مسلمان ان کو ساتھ لے کر مذکورہ فرائض کو انجام دیں اور تنظیمیں قائم کریں، ''لا باس بہ''، جیسا کہ بہت سے غزوے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقوں کے ساتھ کی ہیں، اور متعدد مواقع ومتعدد امور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر یعنی کفار ومشرکین سے مشورہ لیا ہے اور ان کو ساتھ لے کر کام کیا ہے، اور جیسا کہ آزادی ہند کے موقع سے علماء کبار، دانشوران قوم، اور بڑے بڑے مسلم لیڈروں نے غیر مسلموں کے بڑے بڑے نیتاؤں، بدھی مانوں اور سیاست دانوں کو اپنی جماعت میں، اپنی پارٹی میں اور اپنی تحریک میں شریک کیا اور ان کو اپنے ساتھ لے کر آزادی کی جنگ لڑی، اداروں اور تنظیموں کو قائم کرنے میں ان کو شامل کیا اور ایسے موقعوں پر ان سے بھی تعاون لیا۔

حاصل کلام یہ کہ سماج کی مشترکہ ذمہ داریوں کو نبھانے، اچھی باتوں کی ترویج اور منکرات سے روکنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ کام کیا جاسکتا ہے، اور مذکورہ اغراض کو حاصل کرنے کے لئے ان کو بھی ساتھ لے کر ادارے اور تنظیمیں قائم کی جاسکتی ہیں۔

۲-الف: مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا:

مسلمانوں کے لئے مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا بہتر نہیں، وہاں سے کوچ کرنا اولی ہے، کیونکہ اختلاط کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی مثلاً عقائد متاثر ہوں گے، اخلاق بگڑیں گے، بدتہذیبی اور ناشائستگی پھیلے گی، غیر اسلامی چال چلن، رفتار وگفتار ان میں سرایت کرے گی، بسا اوقات طاعت وعبادت، نماز، روزہ کی ادائیگی میں دشواری اور پریشانی کا سامنا ہوگا، بالآخر بالتدریج اسلامی شعائر واعمال متاثر ہونے لگیں گے۔

ہاں اگر مسلمان بارسوخ، مقتدر، ذی جاہ اور رعب ودبدبہ والے ہوں، غیروں پر ان کا غلبہ ہو، دوسرے مغلوب ہوں، اور مسلمان اپنے اخلاق وکردار اور بہترین کیریکٹر کے ذریعہ غیروں کو واقعی متاثر کرسکتے ہوں اور عبادات کے قیام میں کوئی پریشانی نہ ہو تو ایسے افراد حکم مذکور سے مستثنی ہوں گے۔

اس کی نظیر دور نبوت میں موجود ہے کہ جب تک مکہ مکرمہ میں امن وسکون رہا، مسلمان محفوظ رہے اور کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں تھا تو مکہ مکرمہ ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رہائش پذیر رہے، بعدہ جب ظلم وتشدد کا پانی سر سے اونچا ہوگیا، فتنہ وفساد کی انتہا نہ رہی، عداوت کی حد ہوگئی، اہل ایمان کو اپنے ایمان، اپنے دین، اپنے مذہب اور اپنی جان ومال پر خطرہ محسوس ہونے لگا تو وہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرگئے اور مدینہ کو آباد کیا، مکہ کو خیرباد کہا۔

ب-غیر مسلم میت کے جلوس جنازہ میں شرکت، آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہنا اور ایصال ثواب کرنا:

غیر مسلم کے جلوس جنازہ میں شریک ہونا، آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہنا اور اس کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کرنا، یہ تمام امور مندرجہ ذیل وجوہات کی بناپر شرعاً جائز نہیں ممنوع اور حرام ہیں۔

پہلی صورت اس لئے ممنوع ہے کہ اس میں غیر مسلم میت کی تعظیم اور اس سے محبت کا اظہار ہے، اور کافر کی تعظیم اور اس سے محبت کرنا جائز نہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمان ولی کو اپنے ماتحت کافر میت کا گڑھا (قبر) کھود کر اس میں رکھنے کے بجائے ڈالنے کا حکم ہے، تاکہ تذلیل وتوہین ہو۔

کمافی الھدایہ: ''وإذا مات الکافر وله ولی مسلم، فإنه یغسله ویکفنه ویدفنه. بذلك أمر علي رضي الله عنه فی حق أبیه أبي طالب (الی قوله) وتحفر حفیرة من غیر مراعاة سنة التکفین واللحد ولا یوضع فیه بل یلقی'' (۱/ ۱۸۲ کتاب الجنائز)۔

فتاوی رشیدیہ کا ایک سوال مع جواب ملاحظہ ہو: سوال: رافضی کا ہدیہ دعوت اور نماز جنازہ میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟ جواب: رافضی کا ہدیہ اور دعوت کھانا گو درست ہے، مگر حضور نماز جنازہ اور ان سے محبت نادرست ہے (فتاوی رشیدیہ/ص ۵۷۸)۔

دوسری صورت اس لئے ممنوع ہے کہ سارے رسومات مشرکانہ و کافرانہ ہوتے ہیں، تو جس طرح کسی مسلمان کے لئے کسی غیر اسلامی رسم کو ادا کرنا جائز نہیں، اسی طرح ادائیگی رسومات کے وقت وہاں رہنا اور ان کا نظارہ کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ یہ ان کے اعمال کفریہ پر رضامندی کا اظہار ہے جو درست نہیں۔

تیسری چیز ایصال ثواب فی حق میت کافر اس لئے ممنوع ہے کہ مغفرت خاص ہے اہل ایمان کے لئے، اور کافر تو قول خداوندی: "إن الذین کفروا من أهل الکتب والمشرکین فی نار جهنم خالدین فیها" کا مصداق ہے۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آپ ﷺ کو استغفار للمشرکین سے روکا گیا ہے، جیسا کہ سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حقیقی چچا ابو طالب کے حق میں ان کی وفات کے بعد استغفار کرنا چاہا تو آپ ﷺ کو منع فرما دیا گیا۔

اسی طرح حضرت ابراہیم کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ انہوں نے پہلے اپنے والد ''آزر'' کے لئے دعاء مغفرت کرنے کا وعدہ فرمایا، لیکن پھر جب ان کو معلوم ہو گیا کہ ایمان کا در رحمت بند ہے اور وہ عداوت حق میں پوری طرح مبتلا ہیں، تو آپ علیہ السلام نے استغفار کرنا چھوڑ دیا، ارشاد خداوندی ہے:

"وما کان استغفار إبراهیم لأبیه إلا عن موعدة وعدها إیاه فلما تبین له أنه عدو لله تبرأ منه" (سورۂ توبہ/ ۱۱۴)۔

قسطلانی میں بروایت ابی ہریرہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ اپنی والدہ ''آمنہ'' کی قبر پر تشریف لے گئے اور رونے لگے اور فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے ان کے لئے استغفار کی اجازت چاہی لیکن نہیں دی گئی۔

''عن أبي هریرة أن رسول الله ﷺ أتی قبر أمه فبکی وأبکی من حوله فقال رسول الله ﷺ استأذنت ربی فی أن أستغفر لها فلم یأذن لی'' (قسطلانی علی هامش بخاری ۲/ ۶۷۵، بکذا فی الکرمانی علی هامش جلالین ۱/ ۱۶۷)۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے رئیس المنافقین ''عبداللہ بن ابی'' کے لئے دعاء مغفرت کرنی چاہی تو منع کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ آپ ستر بار بھی اس کے لئے دعاء مغفرت کریں تب بھی مغفرت نہ ہوگی (بخاری شریف ۲/ ۶۷۳)۔

حاصل جواب یہ ہے کہ کسی مسلمان کا کسی غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت کرنا، آخری رسومات کے وقت میت کے پاس رہنا، قرآن پاک پڑھ کر ایصال ثواب کرنا جائز نہیں، البتہ تعزیت کے لئے ان کے پاس جایا جا سکتا ہے (کمافی احسن الفتاوی ۴/ ۲۴۳، فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۲۹۲)۔

ج ۔ مشرکین کے ہدایا کا حکم:

غیر مسلم کے تحفے اور تبرکات کو مسلمانوں کے لئے قبول کرنا اور کھانا درست ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، (ہکذا فی فتاوی رشیدیہ/ص ۵۷۵)، تا کہ سابقہ محبت واخوت اور تعلق برقرار اور استوار رہے، لیکن اولی یہ ہے کہ خود نہ کھا کر کسی دوسرے غیر مسلم کو دے دے۔

عالمگیری میں ہے: ''لا یجیب دعوة الفاسق المعلن، لیعلم أنه غیر راض وکذا دعوة من کان غالب ماله من حرام مالم یخبر أنه حلال وبالعکس یجیب ما لم یتبین عنده أنه حرام، کذا فی التمرتاشی، وفی الروضة یجیب دعوة الفاسق والورع أن لا یجیبه'' (عالمگیری ۵/ ۳۴۳ باب الهدایا والضیافات، شامی ۵/ ۲۲۱)۔

مشکوۃ شریف میں ہے کہ قبیصہ بن ہلب نے آپ ﷺ سے طعام نصاری کے بارے میں دریافت کیا، دوسری روایت میں ہے کہ کسی شخص نے آ کر آپ سے کہا کہ میں طعام نصاری میں حرج سمجھتا ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے سینہ میں کوئی شک وشبہ نہ ہو (یعنی طعام نصاری حلال ہے)۔

''عن قبیصة بن وهلب عن ابیه قال: سألت النبی عن طعام النصاری، وفی روایة سأله رجل فقال: إن من الطعام أتحرج منه، فقال: لا یتخلجن فی صدرك شئ'' (مشکوۃ شریف/ ص ۳۵۸، کتاب الصید والذبائح)۔

البتہ اگر یہ تبرکات اور تحفے بتوں پر چڑھائے ہوں (یعنی پرشاد) تو پھر قبول کرنا شرعاً جائز نہیں، ممنوع اور حرام ہے، کیونکہ یہ ماذبح علی النصب کے مرادف ہے جس کے کھانے سے قرآن پاک میں نہی وارد ہے، ارشاد ہے: "حرمت علیکم المیتة (الی قوله) وما ذبح علی النصب" (سورۂ مائدہ: ۳) (تم پر حرام کیا گیا ہے مردار اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے)۔

بخاری شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ کسی مشرک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، اس کے گھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو دسترخوان پر بتوں پر چڑھایا ہوا جانور کا گوشت دیکھ کر صاحب خانہ سے فرمایا کہ بتوں کا چڑھاوا ہمارے لئے جائز نہیں۔ (بخاری شریف ۲/ ۸۲۷، باب ماذبح علی النصب والاصنام)۔

خلاصہ یہ کہ یہ تحفے اگر پاک ہوں تو خواہ مذہبی تقریب کے ہوں یا غیر مذہبی تقریب کے مسلمانوں کے لئے قبول کرنا اور استعمال کرنا دونوں جائز ہیں، ورنہ بصورت دیگر یہ تحفے ممنوع القبول ہیں، لیکن اگر قبول نہ کرنے کی صورت میں کسی فتنہ کا اندیشہ ہو تو قبول کرلے، لیکن اس کو کھائے نہیں۔

د- غیر مسلموں کا تعاون قبول کرنا:

اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مساجد و مدارس کی اعانت اور مذہبی جلسوں میں چندہ دینے کو اپنے عقیدہ کے مطابق کار خیر اور باعث ثواب سمجھتا ہے، اور اس سے یہ خطرہ نہ ہو کہ وہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو غلط استعمال کرے گا یا ان پر احسان جتلائے گا اور نہ یہ احتمال ہو کہ اہل اسلام اس کے ممنون ہو کر اس کے مذہبی شعائر میں شرکت یا اس کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے تو کافر کا تعاون قبول کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ احناف کے نزدیک کافر کے وقف کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ ان کے نزدیک قربت ہو، ظاہر ہے کہ مسجد وغیرہ میں خرچ کرنا جیسے مسلمانوں کے نزدیک قربت ہے، کفار و ہنود جو کچھ مسجد وغیرہ میں دیتے ہیں وہ بھی اس کو اعتقاداً قربت سمجھتے ہیں، جیسا کہ فتاوی شامی کے کتاب الوقف میں ہے:

''قوله أن يكون قربة فى ذاته الخ قال الشامى فتعين أن هذا شرط فى وقف المسلم فقط، بخلاف الذمى لما فى البحر وغيره أن شرط وقف الذمى أن يكون قربة عندنا وعندهم، كالوقف على الفقراء وعلى مسجد القدس'' (درمختار مع شامی ۳/ ۳۶۰، بکذا ذکر فی فتاوی رشیدیہ، ومحمودیہ، وامداد الفتاوی، ونظام الفتاوی)۔

لیکن مساجد کے لئے چندہ لینا غیرت اسلامی کے خلاف ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے اور یہ ذہن میں رکھا جائے کہ مسجد کی مسجدیت کے لئے مضبوط بلڈنگ، لمبے منار، سنگ مرمر ضروری نہیں، بلکہ چھپر بنا کر بھی کسی جگہ کو عبادت کے لئے مخصوص کردیا جائے تو اس میں عبادت کا وہی ثواب ملے گا جو پختہ عمارت میں ملتا ہے۔

البتہ مسلمانوں کے لئے ان کی مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کی تعمیر میں تعاون کرنا اور چندہ دینا درست نہیں، کیونکہ یہ تعاون علی المعصیۃ والکفر ہے جس سے اللہ تعالی نے منع فرمایا ہے، ارشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"۔

ہاں اگر تعاون نہ کرنے کی صورت میں ان کی طرف سے کسی طرح کا نقصان اور ضرر کا اندیشہ ہو تو دریں صورت تعاون کرنا اور چندہ دینا درست ہے، البتہ چندہ دیتے وقت یہ نیت کرلے کہ ہم چندہ مانگنے والے کو یہ پیسہ دے رہے ہیں، اور چندہ مانگنے والے سے بھی کہہ دے کہ بھائی یہ پیسہ ہم تم کو دے رہے ہیں، اس طور پر یہ تعاون کرنا اثم اور گناہ نہیں ہے۔

ھ- الف: غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت کا حکم:

غیر مسلموں کے کسی بھی تہوار میں مسلمانوں کا شریک ہونا ازروئے شرع ناجائز اور حرام ہے کیونکہ اس میں تعاون علی الکفر اور میلہ کی تکثیر و رونق ہے، جس سے قرآن نے منع فرمایا ہے، نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من كثر سواد قوم فهو منهم" جس کا حاصل یہ ہے کہ تکثیر سواد بھی ممنوعات شرعیہ میں سے ہے۔

ایک مرتبہ بعض صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل ایران کی طرح نیروز و مہرجان کی عید منانے کی اجازت چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔

طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور استواء شمس کے وقت نماز اس لئے منع کیا گیا کہ اس وقت آفتاب پرست اور بت پرست قومیں عبادت کرتی ہیں۔

قرآن کریم میں مجالس غیر مشروعہ میں شرکت پر نہی وارد ہے، فرمان خدا ہے:

"وقد نزل عليكم في الكتاب أن إذا سمعتم آيات الله يكفر بها ويستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا في حديث غيره إنكم إذا مثلهم" (سورۂ نساء/۱۴۰)

(اور تم پر کتاب میں یہ حکم دیا کہ جب تم اللہ کی آیات کو اس طرح سنو کہ اس کے ساتھ کفر کیا جارہا ہو اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہو تو تم ان کے ساتھ اس وقت تک نہ بیٹھو جب تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف نہ ہو جائیں، ورنہ تم انہی کے مثل ہو جاؤ گے)۔

ضحاک علیہ الرحمہ نے ابن عباسؓ سے آیت کی تفسیر یہ نقل کی ہے کہ آیت مذکورہ کے زمرہ میں قیامت تک کا ہر محدث فی الدین اور تمام بدعتی داخل ہے،

''قال الضحاك دخل في هذه الآية كل محدث في الدين وكل مبتدع إلى يوم القيامة'' (تفسیر معالم از فتاوی رشیدیہ/ ص ۱۴۷)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے "فلا تقعدوا معهم" میں "هم" ضمیر کا مرجع کفار اور قرآن کے ساتھ استہزاء کرنے والے کو مراد لیا ہے (جلالین شریف ۱/ ۹۰، تفسیر صاوی ۱/ ۲۳۷)۔

قطب عالم فقیہ عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں: ''مجمع میلہ کفار و فساق و روافض میں جانا خواہ تجارت کی وجہ سے ہو، خواہ انتظام کے واسطے، سب حرام کہ تکثیر و رونق اس میلہ کی ہوتی ہے (فتاوی رشیدیہ/ص ۵۵۶)۔

نیز مسلمان کی عبادتیں اپنی رونق و زینت میں کفار کی شمولیت کے محتاج نہیں، لہذا یہ تصور کہ ان کی آمد سے رونق بڑھے گی یہ غیر شرعی تصور ہے، اور یہ خیال کہ بھائی چارگی میں اضافہ ہوگا یہ بھی صرف ایک خیال ہے، شرکت کے باوجود تکاد تمیز من الغیظ کے وہ مصداق ہوتے ہیں، باقی سیاسی قائدین کا زبان سے ہمدردی کا اظہار یقولون بأفواههم ما ليس في قلوبهم کا مصداق ہے۔

خلاصہ یہ کہ دین اسلام ایک غیرت مند اور حساس دین ہے جو غیر اسلامی تہواروں میں شرکت کی قطعی اجازت نہیں دے سکتا اور نہ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔

لہذا مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کے کسی تہوار میں شریک ہونا جائز نہیں۔

ب۔ غیر مسلموں کو ان کے تہواروں کی مبارکباد پیش کرنا:

غیر مسلموں کو ان کے تہواروں کی مبارک باد پیش کرنا درست نہیں بلکہ ممنوع ہے، اس لئے کہ یہ فی الجملہ کفریہ عمل پر خوشی کا اظہار ہے، اور کفر پر راضی شخص کافر اور فعل حرام پر راضی شخص عاصی اور خدا کا نافرمان ہے:

''كما في الصاوي تحت قوله تعالى ''إنكم إذا مثلهم أي في الإثم أي كفرا أو غيره فالراضي بالكفر كافر والراضي بالمحرم عاص'' (صاوی مع جلالین ۱/ ۲۳۷)۔

فتاوی رشیدیہ کا ایک سوال مع جواب ملاحظہ ہو۔ سوال: ہندوؤں کے لڑکوں کو ان کے تہوار ہولی یا دیوالی میں بطور عیدی ان کے تہوار کی تعریف میں کچھ اشعار بنا کر جس طور پر کہ میانجی لوگ پڑھایا کرتے تھے پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ جواب: یہ درست نہیں (فتاوی رشیدیہ/ص ۵۷۱)۔

خلاصہ یہ کہ غیر مسلموں کو ان کے کسی بھی تہوار کی مبارکباد دینے سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہئے۔

۳۔ الف: جھنڈے کو سلامی دینا:

جھنڈے کو سلامی دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ یہ محض ایک سیاسی چیز ہے اور حکومتوں کا طریقہ ہے لیکن بچنا اولی ہے، اگر فتنہ کا ڈر ہو تو بادل نخواستہ کرنے میں انشاء اللہ مواخذہ نہیں ہوگا۔

اس کے متعلق حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ کا فتوی ملاحظہ ہو: ''جھنڈے کو سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے اور اسلامی ملکوں میں بھی ہوتی ہے، وہ ایک فوجی عمل ہے، اس میں اصلاح ہو سکتی ہے مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ عمل قرار دینا درست نہیں (نقیب پھلواری شریف پٹنہ ج ۷، ۲۶ جمادی الاولی ۵۸ ۱۳ھ مطابق ۹/ جولائی ۱۹۳۹، ماخوذ از فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۸۸)۔

ب-وندے ماترم ترانہ پڑھنا:

آغاز: ۱۸۵۷ء میں جو کہ انگریزی سامراج کے ظلم وتشدد و بربریت کا دور تھا اور اس میں زیادہ تر مسلمان، علماء اور اہل دین قتل اور پھانسی کے شکار بنائے جارہے تھے، ایک ہندو ادیب B.C Charji نے جو انگریز مسلم دشمن جذبہ کا حامل تھا ''وندے ماترم'' کے عنوان سے ایک ترانہ جس کی زبان سنسکرت ہے تیار کیا۔

حقیقت:......اس ترانہ میں اس عنوان کے ساتھ ساتھ کہ ''مسلمانوں پر حملہ کردو اور ملک سے باہر نکال دو'' ہندوستان کی سرزمین کو معبود کی حیثیت سے خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اور ہندو مذہب میں عبادت کا مفہوم رکھنے والی عبارت استعمال کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس میں دو پہلو ہیں: ایک تو اس کا مسلم دشمنی کا پہلو اور دوسرا مشرکانہ پہلو۔

ثانی الذکر پہلو چونکہ مشرکانہ ہے، لہذا مسلمان اسے نہیں پڑھ سکتے، کیونکہ اسلامی عقیدہ کے مطابق ''عبادت'' صرف اللہ کی کی جاتی ہے حتی کہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے ہمیں عبادت کا طریقہ بتایا ہے اور ہمیں راہ ہدایت دکھائی ہے، ان کی بھی عبادت نہیں کی جاسکتی اور نہ یہ جائز ہے، خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔

لیکن اگر اس طرح کی کوئی مجلس ہو اور اس میں شرکت لازمی ہو تو ترانہ میں ذکر کردہ جملوں کے پڑھنے پر علی الاطلاق کفر کا فتوی نہیں لگایا جائے گا، کیونکہ وندے ماترم کے معنی جہاں وطن کی پوجا کرنے کے ہیں وہیں دوسرے معانی بھی ہیں۔

لہذا پڑھنے والا جو مراد لے اسی اعتبار سے اس کا حکم ہوگا۔

ج-حاکم کے حکم کی سمع وطاعت:

ہر مسلمان پر حاکم کے حکم کی سمع وطاعت اور اس کا پابند ہونا از روئے شرع لازم اور ضروری ہے، لیکن یہ صرف انہی امور میں ہے جو امور شریعت حقہ کے موافق اور اس سے غیر متصادم ہوں ورنہ بصورت دیگر قابل قبول اور لائق عمل نہیں۔

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحب وكره ما لم يؤمر بمعصية، فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة'' (بخاری شریف ۲/ ۱۰۵۷ باب السمع والطاعة ما لم تكن معصية)۔

مشکوۃ شریف میں بروایت علیؓ منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لا طاعة في معصية، إنما الطاعة في المعروف'' متفق عليه (مشکوۃ شریف: ص ۳۲۹، کتاب الامارۃ والقضاء)۔

خلاصہ یہ کہ اگر کوئی ادارہ مروج قانون شہادت یا دوسرے قوانین کی وجہ سے مسلمانوں کے دو فریق کے کسی معاملہ میں خلاف شریعت کوئی فیصلہ کرتا ہے، تو یہ فیصلہ قابل قبول نہیں اور کسی فریق کے لئے اس پر عمل کرنا اور استفادہ کرنا درست نہیں، ان پر لازم ہے کہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق حضرات علماء کرام سے اپنا فیصلہ کروائیں اور اس کے مطابق عمل کریں۔

۴-الف: مختلف مذاہب کی حیثیت:

مذہب اور عمل دونوں علاحدہ شئی نہیں بلکہ دونوں ایک ہیں، دونوں میں لازم وملزوم کی نسبت ہے، کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "إن الذين آمنوا وعملوا الصلحت"، یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص مکمل طور پر اس وقت تک داخل ایمان نہیں جانا جاتا ہے، جب تک کہ وہ اس مذہب کے جملہ اصول وضوابط کو نہ اپنائے اور جملہ اوامر ونواہی پر کاربند نہ ہو۔

دنیا میں جتنے مذاہب، ملل وادیان ہیں ان کے جو ماننے والے ہیں، ان میں محبوب، پسندیدہ، معمول بہ و مامور من اللہ دین، دین اسلام اور اس کے متبعین ہیں، فرمان باری ہے: "إن الدين عند الله الإسلام" (اللہ کے نزدیک معتبر دین دین اسلام ہے)، بقیہ مذاہب، ملل وادیان یہ سب غلط، بے بنیاد، گمراہ اور منسوخ ہیں، ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں، ان کے طریقے اور راستے ملت اسلامیہ کے طریقوں اور اس کی راہوں سے بالکل جدا ہیں کہ دونوں

ذرہ برابر میل نہیں کھاتے، دونوں میں آگ، پانی کی طرح اجتماع ضدین کی نسبت ہے، اور راستوں کے مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں کی منزل بھی الگ الگ ہے، ایک کی منزل جنت ہے، دوسرے کی جہنم۔

خلاصہ یہ کہ دنیا میں جتنے مذاہب اور ان کے طرق ہیں، ہر ایک مذہب کا طریقہ، حیثیت اور منزل جداگانہ اور مختلف ہے۔

لہذا جملہ مذاہب کی حیثیت اور ان کی منزلوں کو ایک گردا ننا، ایک سمجھنا زعم فاسد ہے، جو کسی بھی درجہ میں قابل قبول نہیں۔

ب- کیا مسلمانوں پر مظلوم طبقہ کا تعاون کرنا ضروری ہے؟

مسلمانوں کے لئے غیر مسلم طبقوں کا تعاون کرنا مذہبی فریضہ نہیں ہے، اور عدم تعاون کی صورت میں مسلمان عند اللہ جواب دہ نہیں ہوں گے، کیونکہ زمام اقتدار غیروں کے ہاتھ میں ہے جس پر مسلمانوں کو تصرف نہیں اور مواخذہ بصورت تکلیف ہے، ارشاد باری ہے: "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها"۔

لیکن انسانیت کی بنیاد پر ان کی ضرورت میں کام آنا، ان کی فریاد رسی، حاجت روائی کرنا مطلوبات شرعیہ میں سے ہے۔

لہذا بقدر وسعت تعاون میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ج- خدمت خلق کے اداروں کو مخصوص رکھا جائے یا عام؟

ابتداء زمانہ کے کفار سے زیادہ ظالم، خونخوار، جان ومال کے بڑے دشمن، متعنت وسرکش آج کے کفار اور غیر مسلم نہیں ہیں، مع ہذا انبیاء کرام خصوصاً سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ اخوت، بھائی چارگی، عفو وکرم، احسان وسلوک، ملاطفت وموانست کا رویہ اختیار فرمایا، ہمدردی اور بہی خواہی کے ساتھ پیش آئے۔

لہذا ان باتوں کے پیش نظر ایسے ادارے مثلاً ہاسپیٹل وغیرہ سے جن کے قیام کا مقصد خدمت خلق اور مسلمانوں کی اعانت ہے غیر مسلموں کو بھی نفع پہنچانا چاہئے، اور بلا تفریق مذہب وملت تمام لوگوں کے لئے خدمت واعانت کے دروازہ کو کھلا رکھنا چاہئے، "ان اللہ یحب المحسنین" (اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔

لیکن زکوۃ کی رقم سے ان کو دوا وغیرہ نہیں دی جاسکتی، موجودہ حالات میں مسلمان اپنے ہاسپٹل ذاتی طور پر بنائیں اور مسلمانوں کے لئے وقف کردیں تو آج کے حالات میں زبردست صدقہ جاریہ ہوگا، بالخصوص جبکہ سرکاری ہوسپٹلوں میں مسلمانوں کے ساتھ دوہرا سلوک کیا جارہا ہو، ایسے وقت میں مسلمانوں کے ذاتی اسپتالوں کی اہمیت اور ضرورت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

د- مسلم تنظیموں کا رویہ:

ہندوستان جمہوری ملک ہے، اس میں جملہ اقوام مسلم، غیر مسلم، سکھ، عیسائی ہر ایک کے حقوق برابر ہیں۔

لہذا آفت یا کسی اور موقع پر جہاں دوسرے لوگوں کے حقوق بنتے ہیں، وہیں حکومت میں مسلمانوں کے بھی حقوق بنتے ہیں، حکومت کا تعاون کرنے میں طبقات کے درمیان تفریق اور امتیاز کرنا درست نہیں ظلم ہے، بقیہ لوگوں کی حق تلفی ہے، ایسے وقت میں جمہوری حکومت ہونے کی وجہ سے چونکہ مسلمانوں کا بھی حق بنتا ہے، اس لئے ایسی تنظیموں سے حقوق اور تعاون کا مطالبہ کرنا درست ہے، تفریق اور امتیاز برتنے کی صورت میں ان کے خلاف آواز بھی اٹھائی جاسکتی ہے، اللہ تعالی کا قول ہے: "إن اللہ لا یحب الجہر بالسوء من القول إلا من ظلم" (سورۂ نساء: ۱۴۸)۔

مسلم ریلیف کمیٹیاں ضرورت واحتیاج کے پیش نظر انسانیت کی بنیاد پر تعاون تو ہر ایک کا کرے، لیکن ترجیحی طور پر مسلمانوں پر زیادہ نظر رکھے، چونکہ اسلامی رشتہ کی بنیاد پر ان کا زیادہ حق بنتا ہے، اور اگر ریلیف میں زکاۃ کی بھی رقم شامل ہو جیسا کہ اکثر ایسے مواقع پر ہوتا ہے تو وہ رقم صرف مسلمانوں ہی پر صرف ہوگی غیر مسلم کو دینا درست نہ ہوگا۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مفتی جمیل احمد نذیری
جامعہ عربیہ عین الاسلام (مبارکپور)

۱- رائج نظام کے تحت جب تک کوئی شخص پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں پہنچے گا قوانین کی ترمیم و تنسیخ یا وضع میں حصہ نہیں لے سکتا، لہذا موجودہ الیکشن نظام میں غیر شرعی قوانین کی ترمیم و تنسیخ کی کوشش کی نیت رکھتے ہوئے حصہ لیا جائے، خواہ اس پر عمل کی نوبت آئے یا نہ آئے۔ اس کی نظیر وہ عبارت ہے جو مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے ''القصص السنی فی حکم حصص کمپنی'' کے تحت کمپنی کے سودی معاملہ کے متعلق لکھی ہے۔

''اور جن کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کر دیں تو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا، مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی'' (امداد الفتاوی ۳/۴۹۱)

الف: جائز ہے۔

مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ لکھتے ہیں: ''اگر نفع ہو یعنی دین کی، قوم کی، ملک کی صحیح خدمت مظنون ہو تو درست ہے'' (فتاوی محمودیہ ۵/۳۴۱)۔

ب: حالات کا تقاضا یہی ہے کہ واجب قرار دیا جائے۔

ج: حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''اس جمہوری ملک میں ووٹ اسلام اور کفر کی بنیاد پر نہیں دیئے جاسکتے ہیں، نہ ہی اس بنیاد پر الیکشن لڑائے جاتے ہیں، جس شخص کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ صحیح خدمت کرے گا نفع پہنچائے گا، حقوق دلوائے گا، ظلم کو روکے گا اس کو ووٹ دیا جائے، جو لوگ خود مسلمان اور دین و مذہب کے پابند ہیں وہ اگر نافع سمجھ کر کسی پارٹی کو یا کسی فرد کو ووٹ دیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس پارٹی کے نظریات وعقائد سے بھی متفق ہیں'' (فتاوی محمودیہ ۵/۱۶۷)۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جس حلقہ میں کوئی بھی امیدوار قابل اور نیک معلوم ہو اسے ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی شرعی جرم اور پوری قوم وملت پر ظلم کے مرادف ہے، اور اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ معلوم ہو، مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحسن ہے۔

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں: ''آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم وعمل اور دیانت داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے جس کام کے لئے یہ انتخابات ہو رہے ہیں''۔

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں:

''جو امیدوار نظام اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے'' (کتاب مذکور/ص ۲۹۵)۔

مذکورہ بالا عبارات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کرنے والی جماعت میں شمولیت یا اس کا امیدوار بننا یا کسی طور اس کی مدد کرنا اور ووٹ دینا جائز نہیں، ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہونا بھی بے فائدہ ہے، کیونکہ جہاں اسلام اور مسلمانوں کا معاملہ ہوگا، وہ اپنے جماعتی طرز فکر سے الگ نہ رہ پائے گا۔

ہاں اگر کوئی ایسا بارسوخ ہو کہ اپنی جماعت میں پالیسی ساز افراد میں شامل ہو، وعدہ کرے کہ میں اپنی جماعت کی سوچ، فکر اور ذہن کو بدلنے کی کوشش کرے گا، اسے ووٹ دینے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے، لیکن عام امیدوار، ہزار وعدہ کرے اس کی کوئی حیثیت نہیں، وہ صرف ووٹ لینے کے لئے وعدہ کرے گا اور کچھ نہ کر سکے گا۔

د: ملی مفادات کے لئے غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے کئے جا سکتے ہیں، ان میں شرکت بھی کی جا سکتی ہے اور اسی بنیاد پر ان کی حمایت بھی کی جا سکتی ہے، لیکن اس حمایت کی حیثیت عام مسلمانوں کے لئے محض ایک مشورہ کی ہوگی۔

ھ: جی ہاں! مذکورہ کام غیر مسلم اداروں یا افراد کے ساتھ مل کر کئے جا سکتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ساتھ ''حلف الفضول'' کا جو معاہدہ کیا تھا وہ اس کی نظیر ہے۔

۲- الف: غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے بچنے کے لئے مخلوط آبادی سے علاحدہ آبادی بہتر ہے، جو مسلمان مع اہل وعیال، عقائد و اعمال کے اعتبار سے اسلامی تہذیب و تمدن کا مکمل نمونہ ہوں وہی مخلوط آبادی میں رہ کر غیر مسلموں کو اپنے اخلاق و کردار سے متاثر کر پائیں گے، ورنہ کمزور قسم کے مسلمان خود ہی غیر مسلموں کی تہذیب میں رنگ سکتے ہیں (جیسا کہ اس کی تائید امداد المفتیین کے ایک سوال و جواب سے ہوتی ہے، دیکھئے: فتاوی دار العلوم مع امداد المفتیین ۱/ ۵۰)۔

ب: بس پڑوسی ہونے کے ناطے اس کے گھر چلا جائے، اور تماشہ بین کی حیثیت سے رہے، اس کے آخری مذہبی رسوم اپنے ہاتھ سے نہ ادا کرے، جلوس جنازہ میں جانا پڑ جائے تو بھی جلانے میں خود شریک نہ ہو (مستفاد از فتاوی احیاء العلوم جلد اول/ ص ۸۴، ۱۰۴، فتاوی محمودیہ ۵/ ۱۷۵)۔

غیر مسلم میتوں کے لئے ایصال ثواب کی کسی طرح گنجائش نہیں (فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۲۴، احکام و مسائل: ص ۱۱۰)۔

ج: بتوں پر چڑھائے ہوئے جائز نہیں، دوسرے قسم کے لینے کی گنجائش ہے۔

حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم صاحبؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہندو کی کتھا (بیان) وغیرہ کی شیرینی کھانا جائز ہے، مگر خلاف احتیاط ہے، ہاں اگر شیرینی دیوی، دیوتا وغیرہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کی قسم کی ہو تو کھانا حلال نہیں ہے، ان کے تیرتھ یاترا (جیسے مسلمانوں کے حج) کے تحفے کو تبرک نہ سمجھے تو لینے میں حرج نہیں'' (فتاوی رحیمیہ ۲/ ۲۳۲)۔

د: ایسے غیر مسلموں کی امداد نہ قبول کی جائے جو بدلے میں اپنے مذہبی تہواروں اور عبادت گاہوں وغیرہ کے لئے تعاون کے امیدوار ہوں، کیونکہ مندروں اور بت خانوں کی تعمیر یا ضروریات میں چندہ دینا جائز نہیں ہے، یہ تعاون علی المعصیت ہے۔ اسی طرح اگر احسان کے طور پر دیں تو بھی لینا جائز نہیں، البتہ اگر عبادت اور ثواب سمجھ کر دیتے ہیں تو اس کی امداد قبول کی جا سکتی ہے، خواہ مسجد کے لئے دے یا مدرسہ کے لئے (دیکھئے: فتاوی محمودیہ ۲/ ۷۶، ۴۷، فتاوی رحیمیہ ۹/ ۱۹۸، نیز فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۳۷۱)۔

ھ- (الف، ب): غیر مسلموں کی ایسی تقریبات جو ان کی عبادت کے قبیل کی ہوں اور بت پرستی وغیرہ ہو رہی ہو، اس میں شرکت جائز نہیں، اور جو محض جشن و اظہار، خوشی کے طور پر ہوں اور یہ جشن یا اظہار خوشی بھی اہل اسلام سے کسی معاند کی بنیاد پر نہ ہو تو شرکت کی گنجائش ہے، اور مبارکباد بھی دی جا سکتی ہے (مستفاد از فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۳۷۸)۔

۳- الف: جھنڈوں کو سلامی دینا اگرچہ شرعاً درست نہیں، لیکن اسے شرک بھی نہیں کہا جا سکتا، جھنڈے کسی ملک و جماعت کی علامت کے طور پر بنائے اور لگائے جاتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ علامت و نشان کی بذات خود اہمیت ہوتی ہے، غزوات میں بھی رسول اللہ ﷺ نے جھنڈے جنگ و جہاد میں نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے استعمال کئے تھے (جواہر الفقہ ۲/ ۱۴۴)، ظاہر ہے کہ وہ بھی نظم وضبط کی ایک علامت ہی تھی، لیکن آج جھنڈوں کی جو اہمیت ہے اور اسے ایک مستقل قومی نشان سمجھا جاتا ہے، وہ صورت حال نہ تھی۔

بہر حال احقر کا خیال یہ ہے کہ جھنڈوں کو سلامی دینا ملک و وطن کی ایک علامت (جو کہ اختلاط شرک سے محفوظ ہے) کے اعزاز کے طور پر بدرجۂ مجبوری گنجائش ہے۔

ج: جس کے حق میں یہ غیر شرعی فیصلہ ہوا ہے اس کے لئے اس سے استفادہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کی نظیر یہ حدیث نبوی ہے: ''عن أم سلمة أن رسول الله ﷺ قال إنما أنا بشر وإنكم تختصمون إلى ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض فأقضي له على نحو ما أسمع منه فمن قضيت له بشئ من حق أخيه فلا يأخذ منه شيئًا فإنما أقطع له قطعة من النار'' (مشكوة المصابيح ۲/ ۳۲۷ باب الاقضية والشهادات. كفاية المفتى ۸/ ۱۷۰ كتاب الغصب)

(حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں ایک انسان ہی ہوں، تم لوگ اپنے جھگڑے میرے پاس لے کر آتے ہو، یہ ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی، اپنی حجت دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ عمومی طریقہ سے پیش کردے اور میں اسی سے سن کر اسی کے حق میں فیصلہ کردوں، لہٰذا اگر میں کسی چیز کا اس کے بھائی کے حق میں فیصلہ کردوں تو وہ اسے ہرگز نہ لے، کیونکہ میں اسے جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں)۔

۴- الف: یہ وحدت ادیان کی دعوت ہے جو کہ باطل ہے، اسے کسی طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا، حق دین صرف اسلام ہے: "إن الدين عند الله الاسلام"۔ یہ کہنا کہ سارے مذاہب کی منزل ایک ہے، سراسر غلط ہے، اسلام کے علاوہ سارے مذاہب کی منزل جہنم ہے۔ اسلام کی منزل جنت ہے، متضاد نظریات وخیالات، متصادم عقائد ورجحانات رکھنے والے سارے مذاہب حق ہوں، عقلاً ناممکن ہے۔

ب: جی ہاں! انسانی اخوت کے رشتہ کی بنیاد پر دلت ومظلوم طبقہ کے ساتھ مسلمانوں کو تعاون کرنا چاہئے۔

ج: بلاتفریق مذہب، تمام لوگوں کے لئے خدمت واعانت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے، لیکن مسلمانوں کے ساتھ خصوصی معاملہ رکھنا چاہئے، دوہرے رشتہ کی بنیاد پر۔

د: مسلم ریلیف تنظیموں کو بلاتفریق مذہب سب کی مدد کرنی چاہئے، لیکن مسلمانوں کا خصوصی خیال رکھنا چاہئے۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا محمد قاسم مظفر پوری
سوپول، دربھنگہ

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں مقیم ہے، اور انہیں وہاں بہت سے مسائل بھی درپیش ہیں، ان مسائل کا حل تلاش کرنا فقہاء امت اور مفتیان کرام کی ذمہ داری ہے، ظاہر ہے ان مسائل سے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی صریح حکم تو نہیں مل سکتا، مگر اصولی باتیں جن کی بنیاد پر ان مسائل کو آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

چونکہ اس امت کو حق تعالیٰ نے امت وسط قرار دیا ہے، یہ دنیا میں بھی شہداء علی الناس ہیں، قیام عدل واعتدال اور اس راہ کی جدوجہد اس کی ذمہ داری ہے۔ "کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر" (سورۂ آل عمران/ ۱۱۰) کی روشنی میں معروف کو جاری کرنا اور منکر کا سد باب اس امت کے فرائض میں ہے۔

اسی طرح "من رای منکم منکرا فلیغیره بیده... الخ" (مسلم: ۱۷۷)، اور حدیث: "من لم يهتم بأمر المسلمين فليس منا" (الحدیث)، اور "أفضل الجهاد من قال كلمة عدل عند سلطان جائر" (ابن ماجہ: ۴۰۱۲)۔

۱-الف: ان سب نصوص کے پیش نظر احقاق حق، تحفظ بلاد واہل بلاد، انسانی حقوق واقدار کے احیاء اور اظہار حق کی جدوجہد آئین کے سطح سے بھی ضروری ہے، اور مذکورہ بالا مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے کسی بھی جمہوری ملک میں مختلف عوامی انتخابات خواہ پارلیمانی الیکشن ہو، اسمبلی الیکشن ہو، یا کارپوریشن اور پنچایتی الیکشن ہو اس میں امیدوار بننا، ووٹ دینا یا کسی مناسب امیدوار کے لئے جدوجہد کرنا جائز ہی نہیں بلکہ انسب واصلح ہے اور یہ ایک انسانی ضرورت ہے۔

ب- واضح رہے کہ جمہوری ملکوں کے مسلمانوں کے لئے ووٹ دینا اور اپنی رائے حق کو اشاعت وشہادت کے لئے دینا ضروری ولازمی ہے، اور صحیح نمائندہ کے لئے تائید کرنا اہم ذمہ داری ہے۔

ج- ایسی سیاسی جماعت جو اسلام اور مسلمانوں کی مختلف جہتوں سے مخالفت کر رہی ہو کسی بھی حال میں اس کے کسی بھی نمائندہ کو ووٹ دینا اس جماعت کے زور کو بڑھانا ہے، اور کسی مسلمان کو اس جماعت میں شرکت کرنا درست نہیں ہوگا، ذاتی طور پر کوئی امیدخواہ کتنا ہی سنجیدہ اور نیک خصلت ہو، ہر رکن پر پارٹیوں کی بالادستی ہوتی ہے۔

د- ملی مفادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے اور ان کی حمایت بعض حالات میں ضروری ہیں، اگر ایسی پارٹی اقتدار میں نہیں بھی آئے تو حزب مخالف کی حیثیت سے مدافعت اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

پس انصاف پسند پارٹی کے امیدوار کو قوت پہنچانا دراصل آئین کی راہ سے جو مظالم ومنکرات کی راہیں کھولی جاتی ہیں اس کے لئے دفاعی آئینی جدوجہد کو اپنانا اور ظلم کے خلاف اس پرامن راہ کو بقدر وسعت اپنانا شرعاً ضروری ہے۔

ھ- امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا اور انسانی زندگی کے بھلائیوں کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایسی فلاحی ورفاہی تنظیمیں قائم کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے، اس کا اہم ترین عملی نمونہ "حلف الفضول" نام کی وہ تاریخی تنظیم ہے، جس کا تفصیلی تذکرہ سیرۃ المصطفی میں موجود ہے۔

۲-الف: مسلمانوں کو اگر ایسا موقع ہو کہ وہ ایسی بستیاں بسائیں جہاں غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات اور تمدنی چھاپ سے محفوظ رہ سکیں تو شریعت اسلامیہ کی بلا شبہ یہی تعلیم ہے اور معاشرتی زندگی کے یہی تجربات بھی ہیں۔ اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مفہوم کو ذہن میں رکھنا چاہئے:

''عن جابر بن عبداللہ قال: بعث رسول اللہ ﷺ سریة إلی خثعم فاعتصم ناس منهم بالسجود فاسرع فيهم القتل، قال: فبلغ ذلك النبي ﷺ فأمر لهم بنصف العقل، وقال: أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين قالوا: يا رسول الله! ولم قال: لا تراءى ناراهما'' (ابوداؤد ۲۶۴۵)۔

یعنی مسلمانوں کو مشرکین سے الگ رہنا چاہئے، حتی کہ وہ ایک دوسرے کی آگ بھی نہ دیکھیں، اس کا مطلب یہی ہے کہ مخلوط زندگی کی وجہ سے لازمی طور پر اثرات قبول کریں گے، ایک حدیث میں یہ بھی وارد ہے: ''لا تصلح قبلتان في أرض واحدة'' (ترمذی، حدیث نمبر ۶۳۳)، ان نصوص کی روشنی میں مسلمانوں کی مستقل آبادی پہلی ترجیح ہو۔

اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو پھر غیروں کے درمیان رہتے ہوئے اپنے مذہبی اور تہذیبی شعائر و تشخصات کو محفوظ رکھنے کا عزم رکھے، جلب منفعت سے زیادہ دفع مضرت سامنے رہے۔

ب- غیر مسلم پڑوسی اور ایک ساتھ زندگی کے مختلف کاموں میں شریک رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ ان کے شادی وغم میں شریک رہنا سماجی رابطہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں:

۱- ایک موقع عیادت، علاج و معالجہ میں اعانت اور ممکن خدمت خلق کا ہے، اس کی شریعت میں نہ یہ کہ صرف گنجائش ہے بلکہ اس کی تعلیم و ترغیب وارد ہے، اس حدیث کے ترغیبی الفاظ پر غور کریں:

''عن أبي هريرة رضي الله عنه قال، قال رسول الله ﷺ إن الله تعالى يقول: يوم القيامة يا ابن آدم، مرضت فلم تعدني قال: يا رب: كيف أعودك أنت رب العالمين؟ أما علمت أن عبدي فلانا مرض...'' (بخاری)۔

میرے نزدیک یہ عام معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم یہودی بچے کی بیماری میں عیادت کی اور آپ نے اس حالت میں اسے اسلام پیش کیا تو اس بچے نے باپ کی اجازت پر اسلام قبول کرلیا۔

۲- غیر مسلموں کے جنازہ کے ساتھ اس کے جلوس میں شریک ہونا، اور اس کی آخری رسومات عملاً سر جھکا کے سونا، یہ اس کے خاص دھارمک طریقے ہیں، اس میں شرکت جائز نہیں، کیونکہ اس شرکت سے شعائر کفر کی تائید و تحسین ہوتی ہے، اس لئے یہ امر جائز نہیں ہے، اور اس کے لئے قرآنی نصوص موجود ہیں۔

۳- قرآن پڑھ کر ثواب پہنچانا، ایسا تو خوشامد میں ہی کیا جاسکتا ہے، دین میں اس کی گنجائش نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين" (توبہ/ ۱۱۳)۔

ج- غیر مسلم اپنی تقریبات، شادی اور تہواروں میں جو تحفے مسلمانوں کو دیتے ہیں، وہ علی العموم بتوں کے چڑھائے ہوئے نہیں ہوتے ہیں، لہذا اگر یقینی طور پر محقق ہو جائے کہ انہوں نے بتوں کے چڑھاوے والی چیز تحفہ میں بھیجی ہے تو اسے قبول نہ کیا جائے، ویسے ان کی عام دعوت خواہ تحفہ بھیج کر ہو یا خود وہ مدعو کر کے کھلائیں، فقہ کی تصریحات سے ان کا جواز معلوم ہوتا ہے (دیکھئے: فتاوی قاضی خاں کتاب الحظر والاباحۃ)۔

د- ایسے غیر مسلموں کا چندہ خواہ مسجد کے لئے ہو یا تعلیم گاہ کے لئے، جن کے بارے میں یہ یقین ہو کہ یہ ثواب سمجھ کر دے رہے ہیں، اور کبھی ان کی جانب سے کوئی تعاون کا مطالبہ برائے عبادت گاہ وغیرہ نہیں ہوگا تو ایسا عطیہ جائز ہے۔

اور اگر مقامی طور پر اس طرح کا اندیشہ اور احتمال ہو کہ وہ بھی اس چندہ کا بدل مالی یا الیکشن میں اس احسان کی بنا پر ووٹ وغیرہ کا ناجائز استحصال کریں گے تو یہ جائز نہیں، تمام اکابر نے اس کی صراحت کردی ہے۔

ھ- (الف) رمضان المبارک کے افطار کے موقع پر غیر مسلموں کو جمع کرنا اور ان کو افطار میں شریک کرنا، یا غیر مسلم سیاسی رہنماؤں کو بلانا دراصل ریا و سمعہ ہے، اسی طرح عید کی تقریبات میں ان کو مدعو کرنا دراصل برادران وطن کی تقریبات میں شریک ہونے کی راہ نکالنا ہے، ان کی مذہبی یا شادی بیاہ کی تقریبات میں جو منکرات ہوتی ہیں وہ ظاہر ہے، اگر کوئی شخص کسی حالت کی بنا پر مبتلا ہو جائے تو یہ دوسری بات ہے، آیت قرآنی ہے:

"ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار" (ہود/ ۱۱۳)۔

اس لئے مسلمانوں کو ان کی تقریبات میں شرکت سے اجتناب ضروری ہے۔

(ب) غیر مسلموں کو ان کے تیوہاروں میں مبارکبادی بھی جائز نہیں، دراصل مبارکبادی تو دعاء برکت ہے، اور یہ دعاء برکت ان اعمال پر جو سراسر مشرکانہ ہے، فحش ومنکرات کا مجموعہ ہے، دینا عقلا وشرعا جائز نہیں۔

۳- الف- جھنڈے کی سلامی:

سلام جس کا مقصد دعا بھی ہے، اظہار محبت بھی ہے، اور جس کو سلام کیا جاتا ہے اس کا اعزاز واکرام بھی ہے، اور مسلمانوں کے لئے اس کی حیثیت عبادت کی ہے، جو منصوص بھی ہے، اس لئے جب اسے عبادت کی روح حاصل ہے، تو جھنڈا کیا، خود بعض فرقے اور عقیدے کے لوگوں کو سلام کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لا تجالسوا أهل القدر ولا تفاتحوهم (أي لا تبدؤهم بالسلام)'' (عن عمر، ابوداؤد/ ۴۷۱۰)۔

لہذا جھنڈا ایک قومی وقار کی چیز ہے، وطن کا پرچم بین الاقوامی دنیا میں اس کی شناخت کو بتاتا ہے، اس کی اس حیثیت کو سامنے رکھنا چاہئے، وطن اور علامات وطن کا وقار برقرار رہنا چاہئے، اس کی پرستش ناجائز ہے۔

ب- ملک ووطن کے محاسن وقدرتی وسائل کو اجاگر کرنا کوئی مذموم نہیں، لیکن اس کی ایسی تعریف جو عبادت کے انداز کی ہو، اور وطن کو معبود کا درجہ دیا جارہا ہو، دراصل شرک کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے، ایک موحد کسی حال میں شرکیہ کلمات اور تصورات کو اپنے ذہن وزبان پر لانا حرام تصور کرتا ہے۔

شرک قولی ہو یا فعلی قلبی ہو یا لسانی، شرک فی العقائد والاعمال بھی شرعی نقطہ نظر سے حرام ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

"لا تسجدوا للشمس ولا للقمر" (فصلت/ ۳۷)، ایسے ترانے کو پڑھنا شرک کی تائید کرنا ہے۔

ج- غیر شرعی فیصلے جو حکومت کی عدالتوں سے حاصل کئے گئے، اور ڈگری کسی فریق کو مل گئی تو جس فریق کو ڈگری ملی ہے اس کو اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ حق بہرحال حق ہے، حق ناحق اور باطل نہیں ہوسکتا۔

پس جو شرعی فیصلے نہیں ہوئے دوسرے فریق کو استفادہ کرنے کے بجائے اصل مالک کو وہ چیز لوٹا دینی چاہئے، یا پھر اس فریق سے اپنے حق میں اسے بالعوض یا بلاعوض حلال بنالے، یا شرعی حدود میں پھر اس کا شرعی فیصلہ حاصل کرلے جو بغیر کسی خرچ کے اسے مل جائے گا، یہ بات اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ آخرت کے احتساب کا خوف ہو۔

۴- الف: جس طرح اسلام کے معتقدات اور اعمال متمیز ومتشخص ہیں، اسی طرح اسلامی تہذیب وثقافت بھی متعین اور معلوم ہیں۔ تہذیب کا انضمام اس طرح کہ سارے مذاہب کھانے پینے، لباس وپوشاک، شادی بیاہ، خوشی وغم، کاروبار، لین دین یعنی عقود ومعاملات، معاشرت واخلاقیات سب میں مشترک ہوں، میرے خیال میں یہی وہ چیز ہے جو ہمارے ملک میں قومی یکجہتی کے نام پر پھیلائی جارہی ہے۔

اسلام کی جامعیت اور اس کی اپنی تہذیب ہے جسے وحدت ادیان کے پرفریب نعرہ سے متاثر نہیں کیا جاسکتا۔ تمام انبیاء کے مابین دینی وحدت ہے، یعنی توحید، رسالت، آخرت وغیرہ، اس میں عقائد کے اعتبار سے تمام انبیاء برابر ہیں، لیکن شرائع من قبلنا سب جدا جدا ہیں۔

ب- مظلوم انسانوں کی خدمت، راحت اور سماجی مساوات وانصاف کے لئے جو متوازن اور ممکن جدوجہد ہو ضرور کرنا چاہئے، لیکن اس کی ایسی راہ نہ اختیار کی جائے کہ جس سے سماجی تصادم پیدا ہو، اور فتنہ کا نیا دروازہ کھلے، ان کے ساتھ بلند اخلاقی کا معاملہ ہو، جو اپنے اختیار کی چیزیں ہیں اس کے ذریعہ پہلے ان کی ہمدردی کی جائے۔

ج- مسلمانوں کے ہاسپیٹل، اسکول اور دوسرے ٹیکنکل ادارے جب قائم ہوں تو شروع سے ہی کچھ حدود وقیود واضح ہوں کہ بلاتفریق خدمت ہو، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: "إن الله يأمر بالعدل والإحسان" (نحل/ ۹۰)۔

د- ریلیف اور ناگہانی مصیبت میں کچھ ادارے ضرور ایسے ہوں جو بلا مذہب وملت راحت رسانی کا کام کریں۔

✦ ✦ ✦

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

مفتی محبوب علی وجیہی (رامپور)

۱- الف: جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور وہاں جمہوری نظام حکومت ہے، ایسی جگہ مسلمانوں کو الیکشن میں حصہ لینا ضروری ہے اور خدمت خلق اور جذبہ انسانیت کے تحت حکومت میں رہ کر اسمبلی یا پارلیمنٹ میں سب قوموں کے عموماً اور اقلیتوں کے خصوصاً جائز حقوق کے تحفظ کے لئے کام کرنا چاہئے، رشوت خوری بے ایمانی ظلم وستم سے دور رہنا چاہئے اور ووٹ انصاف پسند دیانتدار آدمی کو دینا چاہئے، حکومت کے ظلم وستم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا چاہئے، جھوٹ تہمت اور الزام تراشی سے دور رہنا چاہئے کہ یہ تمام چیزیں دین میں حرام ہیں۔

ب: اس ملک میں خصوصاً اور دیگر ممالک میں عموماً تحفظ اسلام اور تحفظ مسلمین اور حقوق مسلمین کے حصول کی نیت سے ووٹ دینا اگر ضروری قرار دے دیا جائے تو صحیح ہے، بشرطیکہ امیدوار کے شرائط بالا پر پورے اترنے کی امید ہو۔

ج: جو جماعتیں کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کی حد تک مخالف ہوں اور ان کے مقاصد میں اسلام اور مسلمانوں کو ستانا اور مٹانا، ان کو تباہ کرنا، ان کے مقدس مقامات کو ختم کرنا، کفر وشرک کی کھلم کھلا اعانت کرنا اور اس کو غالب کرنا، زبردستی دوسروں پر تھوپنا، نہ ماننے والوں کے ساتھ قتل وغارتگری کرنا، ان کے املاک کو تباہ کرنا ہو تو ایسی جماعت میں شامل ہونا سخت گناہ ہے اور اس جماعت کے افراد کو ووٹ دینا بھی ظلم وستم میں شرکت کرنا ہے، قرآن کریم میں ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" ایسی جماعت کے بعض افراد اگر اچھے ذہن والے ہوں تب بھی ان کو ووٹ دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ بھی اسی جماعت کے معاون ہیں۔

د: جو غیر مسلم سیاسی پارٹیاں غیر متعصب ہیں اور فرقہ واریت سے واقعی مقابلہ کرنا چاہتی ہیں اور اقلیتوں کو ان کے حقوق دینا چاہتی ہیں، ان کی حفاظت اور سلامتی کا معاہدہ کرتی ہیں تو ایسی جماعتوں میں شرکت کرنا اور ان سے تحریری معاہدے کر لینا پھر ان کی حمایت کرنا شرعاً درست ہے۔

ھ: ان کاموں کے لئے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے اور ایسے ادارے اور تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں جن میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر معروف اور احسن مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے اعلان نبوت سے پہلے مکہ کے نیک اور معتدل مزاج لوگوں کے ساتھ مل کر ایک جماعت بنائی تھی جس کا ذکر تاریخ میں بھی ہے اور مدینہ شریف آنے کے بعد یہودیوں سے امن وچین کے ساتھ معاہدے کئے تھے۔

۲- الف: میرے نزدیک اگر دور اول یا دور ثانی کے دیندار جیسے مسلمان ہوں تب تو مخلوط آبادی میں رہ کر غیر مسلموں کو اسلامی اخلاق اور کردار سے متاثر کرنے کی نیت سے رہنا احسن ہے، لیکن فی زمانہ تو عموماً مسلمان اپنے اخلاق وکردار میں اچھے ہیں کہ جو غیر مسلموں کو متاثر کرسکیں بلکہ خود ہی ان کی تہذیب اور معاشرے سے متاثر ہوجاتے ہیں، اس لئے ان سے دور ہی رہنا اچھا ہے، دوسرے جو ہندوستان میں فسادات کا سلسلہ جاری ہے اس کی وجہ سے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی بستیاں متحدہ طور پر الگ بنا کر غیر مسلموں سے دور رہیں تا کہ وقت پر اپنا دفاع کرسکیں۔

ب: مسلمانوں کو غیر مسلموں کے جنازے میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ ان کے مکان پر جا کر ان کی دلجوئی کے لئے تعزیت کرنا درست ہے، اور جس طرح غیر مسلم کے جنازے میں شرکت درست نہیں ہے اسی طرح اس کے آخری رسومات میں بھی شرکت کرنا ممنوع ہے، ایصال ثواب کے لئے شرط یہ ہے کہ جس کے لئے ایصال ثواب کیا جائے وہ مسلمان ہو اور ایصال ثواب کرنے والا بھی مسلمان ہو، پس غیر مسلموں کی میت

میں قرآن خوانی درست نہیں ہے۔

ج: شادی وغیرہ کے موقع پر جو تحفے دیئے جاتے ہیں اگر وہ بتوں پر چڑھائے ہوئے نہیں ہیں یا ان پر الفاظ کفریہ شرکیہ نہیں پڑھے گئے ہیں تو ان کا لینا اور کھانا جائز ہے، عالمگیری (ج ۴ ص ۱۰۸) میں ہے: لا بأس بأن يضيف كافرًا لقرابة أو لحاجة"، حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے خیبر میں ایک یہودیہ کی دعوت قبول فرمائی ہے، لیکن وہ مذہبی تقریبات جن میں بتوں پر شیرینی وغیرہ چڑھائی جاتی ہے یا غیر مسلموں کا مقتدا اپنی پوجا پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ پوجا بھی کرتا ہے تو ایسی چیزوں کا کھانا درست نہیں ہے، اگر کسی وجہ سے لے لے تو مسلمان خود نہ کھائے بلکہ کسی غیر مسلم کو کھلا دے۔

د: مسلمانوں کو غیر مسلموں کا تعاون مساجد کی تعمیر وغیرہ میں نہیں لینا چاہئے، قرآن کریم میں ہے:

"إنما يعمر مساجد الله من آمن بالله واليوم الآخر"

اسی آیت کے ذیل میں تفسیرات احمدیہ اور جواہر التنزیل میں غیر مسلموں کا تعاون حاصل کرنا ممنوع فرمایا ہے، اور حضور نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام کے عمل سے ایسی کوئی چیز نظر سے نہیں گذری جس سے غیر مسلموں کا تعاون مساجد کی تعمیر میں لینا معلوم ہو، لہذا اگر غیر مسلم حضرات تعاون دینا چاہیں تو مسلمانوں کو صاف منع کر دینا چاہئے اور بعض جہلاء کا یہ کہنا کہ اس رقم کو مسجد کی لیٹرینوں میں لگا دیں گے یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ لیٹرینیں وغیرہ بھی متعلقات مسجد میں ہیں، البتہ غیر مسلم ہم کو تملیک کر دیں تو ہم اپنی طرف سے لگا سکتے ہیں۔

ھ: آج کل جو یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے کہ مختلف قومیں ایک دوسرے کی مذہبی تقریبات میں شریک ہوں تاکہ اس سے تمام فرقوں میں ہم آہنگی پیدا ہو یہ محض سیاسی چال ہے، اس کے ذریعہ مسلمان قائدین کو اور مسلمانوں کو اپنی جماعت کے ووٹوں کے لئے آمادہ کرنا ہے، نیز اس ذریعہ سے اپنے مذہب کی طرف رغبت پیدا کرنا ہے تاکہ آنے والی نسلوں کو آسانی سے اپنا ہم مذہب بنایا جاسکے یا کم از کم شرک وکفر سے ان کو مانوس کیا جاسکے، لہذا میرے نزدیک اگر غیر مسلم حضرات مسلمانوں کے گھر آجائیں اور وقت افطار ہو اور از راہ مروت یا دلجوئی مسلمان ان کو شریک کرلیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن وہ افطار پارٹی کریں تو مسلمانوں کو جانا مناسب نہیں ہے، اور کوئی غیر مسلم عید کے موقع پر مسلمانوں کو مبارکباد دے تو اس کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح مسلمان بھی غیر مسلم کے گھر پر جاکر مبارکباد دے تو یہ بھی درست ہے لیکن ان کے مذہبی تہواروں میں شریک نہ ہو۔

۳- الف: جھنڈا فی نفسہ کوئی قابل احترام چیز نہیں ہے، صرف اس کی سلامی اس ملک کے اصول وقوانین کے احترام کو ظاہر کرنے کی وجہ سے رکھی گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس ملک کا ادب واحترام ہمارے دل میں ہے، پس اس نیت سے اگر جھنڈے کو سلامی دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ب: ایسے قومی ترانے جن میں فی الواقع مشرکانہ مضامین ہوں اور ان کی کوئی صحیح تاویل بھی نہیں ہوسکتی ہو تو ان کا پڑھنا درست نہیں ہے اور جن میں یہ بات نہ ہو اس کا پڑھنا درست ہے جیسے علامہ اقبال کا ترانہ، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، یا اس جیسا کوئی اور ترانہ ہو۔

ج: اول تو مسلمانوں کو غیر شرعی عدالتوں میں جانا ہی نہیں چاہئے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے: "ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الفاسقون" لہذا اپنے علماء سے شریعت کے مطابق فیصلہ کرانا چاہئے اور اگر بدرجہ مجبوری غیر شرعی عدالتوں میں جائیں تو اگر حق کے خلاف فیصلہ ہو تو نہ مانیں اور اگر حق کے مطابق ہو تو اس پر عمل کریں چاہے دنیا کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

۴- الف: میرے نزدیک کسی بھی درجہ میں یہ سوچ قابل قبول نہیں ہے، تمدنی اور ثقافتی وحدت مسلمانوں کی کسی دوسرے مذہب کے ساتھ نہیں ہوسکتی، اہل یورپ کا یہ عیارانہ دھوکا ہے، جو مسلمانوں کی تہذیب، تشخص اور اسلامی شعائر کو ختم کرنے کے لئے اس کا پروپگنڈا کیا کرتے ہیں، وہ مسلمان جو مذہبی معلومات نہیں رکھتے اور نہ ان کی نشوونما بچپن میں مذہبی ماحول میں ہوئی ہے وہ مسلمان بھی ایسی باتیں کرتے نظر آتے ہیں، لیکن ان کی ان باتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، ہمارا بنیادی اصول اور مسلمہ قاعدہ ہے کہ بغیر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے ہوئے اور آپ ﷺ کی اتباع کئے ہوئے کوئی آدمی نجات نہیں پاسکتا، اس لئے چند مذاہب کے حق پر ہونے اور منزل کے ایک ہونے کی بات قرآن وحدیث کے نقطہ نظر سے لغو اور غلط ہے۔

ب: کسی بھی انسان پر ظلم وستم کرنے اور اس کا استحصال کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑا جرم ہے جو مدت دراز سے چلا آرہا ہے، اسلام میں ذلت اور قوم کی اونچ نیچ کچھ نہیں ہے، اگر ہے تو کردار سے ہے، ہندوؤں کا طرز عمل دوسری قوموں کے لئے خاص کر مسلمانوں کے لئے انسانیت سوز اور قتل انسانیت اور نا قابل معافی گناہ ہے، چاہے وہ ہندوستان کے رہنے والے دلتوں کی شکل میں ہو یا یورپ کی کالی اور گوری نسل کے فرق کی وجہ سے ہو۔

قرآن کریم میں ہے:

یا أیہا الناس إنا خلقنا کم من ذکر وأنثی وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند اللہ أتقاکم

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''لا فخر لعربي علی عجمي ولا فخر لعجمي علی عربي، کلکم بنو آدم وآدم من تراب''

حضرت بلال اور صہیب رومی، سلمان فارسی وغیرہ رضی اللہ عنہم کا اسلام کی نظر میں وہی رتبہ ہے جو عربوں میں اعلی نسل کے لوگوں کا ہے، افسوس ہے کہ ہندوستان میں مسلمان قومیں آکر ہندوؤں کے نظریہ سے متاثر ہوگئیں، اسی لئے اسلام ہندوستان میں کم پھیلا، مسلمانوں پر لازم ہے کہ انسانی اخوت کے ناتے پسماندہ اور مظلوم قوموں کے ساتھ اعانت کریں خواہ وہ کسی بھی درجہ میں ہو۔

ج: ایسے ادارے جن سے کوئی بھی مصیبت زدہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اسے عام ہونا چاہئے اور ہر انسان کو ان سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے اگر کسی فساد کا خطرہ نہ ہو، جیسے ہاسپٹل یا تعلیمی ادارے، ان سے بلاتفریق مذہب تمام لوگوں کے لئے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

د: ہمیں ان فرقہ پرست عناصر کی طرف نہیں دیکھنا ہے جو انسانوں پر مصائب وآلام کے وقت صرف اپنے ہی لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں، ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمام انسانوں کی مدد اور خدمت کرنا چاہئے، مسلمانوں کی وہ تنظیمیں جو قدرتی آفات یا فسادات کے موقع پر ریلیف کا کام انجام دیتی ہیں انہیں ہر مصیبت زدہ کی خواہ وہ کسی بھی مذہب سے متعلق ہو اعانت کرنا چاہئے۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

مولانا خورشید احمد اعظمی (مئو)

اس وقت دنیا کے اکثر ممالک جمہوری نوعیت کے ہیں جن میں انتخابات کے ذریعہ حکومت بنتی ہے، اور یہ جمہوریت اور انتخابات خود شرعی اعتبار سے مناسب معلوم نہیں ہوتے، اس لئے کہ اس میں عوامی کثرت وتعداد کو حکم اور فیصل قرار دیا جاتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ عوام رائے اور عقل سے عاری ہیں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صائب الرائے اور اہل تدبر حضرات اپنی قلت کے باعث مغلوب ہوجاتے ہیں اور ناعاقبت اندیش عوام آندھی کی رو میں کسی غیر مناسب امیدوار کو نمائندہ بنالیتے ہیں، نیز طریقہ انتخاب میں بھی دھاندلی، جبر وتشدد اور جارحیت ایک مؤثر رول ادا کرتے ہیں، اس لئے یہ جمہوریت اور انتخاب بجائے خود مسلمانوں کے لئے ایک آزمائش ہیں، دوسری طرف اپنوں کا بھی رونا ہے کہ اسلام جو قول وعمل کا مشترکہ نام ہے، اب صرف قول کی حد تک رہ چکا ہے، جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق عمل ہی مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے۔

لیکن پھر بھی مسلمان جس ملک میں رہتا ہے اس ملک کا شہری ہے، اور دوسرے لوگوں کی طرح برابر کا حصہ دار ہے، اس لئے حتی الوسع معصیت سے اجتناب کے ساتھ اس ملک میں جاری دستور وقوانین پر کاربند ہونا چاہئے، اور اس ملک کے ان امور میں جو ایک شہری کی حیثیت سے اسے حاصل ہیں شریک رہنا چاہئے، انہیں امور میں سے ایک الیکشن میں حصہ لینا ہے۔

۱- الف: موجودہ جمہوری وانتخابی نظام گرچہ غیر شرعی ہے، اور کسی مسلمان کے لئے لمحہ فکریہ بھی، لیکن اگر مسلمان الیکشن میں حصہ نہ لیں تو ان کے اس عمل سے بھی کسی ظالم یا غیر مناسب امیدوار کو تقویت ملے گی اور اس کا تعاون کرنا لازم آئے گا، لہذا: "أهون وأيسر البليتين" پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کو الیکشن میں حصہ لینا چاہئے، اور حتی الوسع مناسب امیدوار کو تقویت پہنچا کر غیر مناسب امیدوار کو کمزور کرنا چاہئے۔

اسی طرح انتخابات میں کسی مسلمان کا امیدوار بننا بھی جائز ہوگا، امیدواری میں گرچہ ایک پہلو "طلب" کا بظاہر پایا جاتا ہے، جو شریعت میں ممنوع ہے، لیکن دوسرا پہلو قوم کی خدمت کا جذبہ مستحسن بھی ہے، اور ضروری نہیں کہ جو امیدوار جیت جائے وہ کسی منصب پر بھی فائز ہو، اس لئے یہ طلب ممنوع نہیں ہونی چاہئے۔

اور جب امیدوار بننا جائز ہے تو انتخابی مہم چلانا اور ووٹ دینا بھی جائز ہوگا۔

ب: الیکشن اور انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات بھی کسی حد تک متعلق ہیں، لیکن اس امکان کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے ووٹ دینے کو واجب قرار دینا شرعی طور پر درست نہیں معلوم ہوتا۔

ج: وہ سیاسی جماعتیں جنہوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے، ایسی جماعت میں مسلمانوں کی شمولیت درست اور جائز نہیں، اور نہ اس جماعت کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا جائز ہے خواہ وہ ذاتی طور پر کتنا ہی نیک خصلت ہو، "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان"۔ ووٹ کے ذریعہ امیدوار اور پارٹی کو تقویت پہنچتی ہے، اس طرح ایک اسلام مخالف طاقت کو مضبوط کرنا اور اس کا تعاون کرنا لازم آئے گا، خدشہ اس بات کا ہے کہ کہیں "ومن يتولهم منكم فإنه منهم" (المائدہ)، یا "ومن يتولهم منكم فأولئك هم الظالمون" (التوبہ) کا مصداق نہ ہوجائے۔

د: ملی مفادات کے پیش نظر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے کرنا درست ہے، اور اس کی شرعی حیثیت ملی مفادات کی اہمیت اور انکی ضرورت کے مطابق ہوگی۔

ھ: معروف کو پھیلانا، منکر سے روکنا، انسانیت کے نفع کے لئے کام کرنا اور معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا امت مسلمہ کا شرعی فریضہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "الدين النصيحة" (دین خیر خواہی کا نام ہے)، اور سب سے بہتر خیر خواہی دین حنیف اور دین اسلام کی دعوت ہے، اور سب سے زیادہ انصاف اور سچائی کی بات کلمہ لا إله إلا الله ہے، اس کی ترویج ہر مسلمان کا حتی الاستطاعت فریضہ ہے، ان خیر کے کاموں کو حتی الوسع مسلمانوں کو

اپنے بل بوتے اور اپنی ذمہ داری پر انجام دینا چاہئے، بتقاضائے ضرورت سماجی تنظیموں یا غیر مسلم بھائیوں سے تعاون لینے یا ان کو ساتھ لینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ان کے اثرات غالب نہ ہوں، اور کسی دینی مقصد کے حصول کے لئے غیر دینی یا دین سے متصادم طریقہ نہ اپنانا پڑے۔

۲- الف: مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا ہرگز مناسب نہیں ہے، کیونکہ موجودہ دور میں خود مسلمان اخلاقی انحطاط کا شکار ہیں، اس لئے وہ متاثر کرنے کے بجائے متنفر بنادیں گے، نیز وہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات وعقائد سے متاثر ہوکر اسلام کی حقیقت سے دور ہوتے جائیں گے جیسا کہ مشاہدہ ہے، آج جبکہ دنیا ذرائع اعلام کے سبب ایک گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے، مغرب کے اثرات مشرق میں تیزی سے اپنائے جارہے ہیں، اس لئے مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا مناسب نہیں، حدیث میں وارد ہے:

''أنا بريئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا يا رسول الله ! لم؟قال لاترای نار اهما'' (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

خطابیؒ نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے: ''وقال بعضهم: معناه أن الله قد فرق بين داری الإسلام والكفر. فلا يجوز لمسلم أن يساكن الكفار فی بلادهم'' (معالم السنن مع تهذيب ابن القيم ۳/ ۴۳۷)۔

ب:......وہ سماجی تقاضے جو اسلامی عقائد سے متصادم یا منافی ومعارض نہ ہوں، انکی اسلام میں اجازت اور ترغیب ملتی ہے، مثلاً پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک، کمزور اور مظلومین سے اظہار ہمدردی، صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ، اور بیماروں کی عیادت اور خبر گیری وغیرہ، اس سلسلہ میں آیات، احادیث، اور آثار موجود ہیں۔

البتہ کوئی غیر مسلم دوست، پڑوسی یا رشتہ دار جو انتقال کرجائے، اور شرک وکفر پر بظاہر اس کی حیات کا خاتمہ ہو تو اس کو غسل دینے کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ضرورت اور حاجت ہو تو بغیر اہتمام کے اس کو غسل دے کر کسی کپڑے میں لپیٹ کر کسی گڑھے میں دبادیں گے، اور اگر اس کی آخری رسومات کو پورا کرنے والے اس کے ہم مذہب موجود ہوں تو مسلمان اس میں کوئی تعاون نہیں کریں گے (شامی ۳/ ۱۳۴)۔

اور کسی رشتہ دار کے جلوس جنازہ میں شرکت بھی اہتمام کے ساتھ نہیں ہوگی، جنازہ سے آگے یا کنارے دوری بنائے ہوئے شرکت کی جاسکتی ہے، جس میں مسلمانوں کی انفرادیت اور اسلامی امتیاز کا تحفظ ہو (مصنف عبدالرزاق میں اس سے متعلق متعدد آثار موجود ہیں ۶/ ۳۶ اور اس کے بعد کے صفحات)۔

غیر مسلم کے لئے ایصال ثواب خواہ کسی بھی نوعیت سے ہو جائز اور درست نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کے لئے دعا واستغفار فرمایا، پھر جب قرآن میں اس سے منع کردیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کردیا۔

ج:......غیر مسلم حضرات اپنے تیوہار یا دوسرے مواقع پر جو ہدیہ وتحائف کسی مسلمان کو دیتے ہیں تو وہ تحائف جو ان کی مذہبی رسومات سے متعلق ہوتے ہیں ان کا قبول کرنا درست نہیں، اگر کسی مفسدہ یا شر سے بچنے کے لئے قبول کرلیا جائے تو کھانا جائز نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح غیر مسلموں کے عام تحفے سے بھی احتیاط برتنی چاہئے، ہاں اگر تحائف کے قبول کرنے میں غالب گمان یہ ہو کہ وہ اسلام سے قریب ہوگا تو عام ہدایا کے قبول کرنے میں مضائقہ نہیں ہونا چاہئے لیکن وہ ہدایا و تحائف جو تیوہار اور مذہبی رسومات سے متعلق ہوں ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔

د:......غیر مسلموں کا تعاون مساجد ومدارس میں تو جائز ہے مگر کسی مسلمان کا غیر مسلم عبادت گاہ یا تہوار کے موقع پر چندہ دینا جائز نہیں، اگر اضطرار یا مفسدہ لاحق ہونے کی نوبت ہو تو کسی خاص ہندو کے ذاتی تعاون کے ارادہ سے چندہ دے دے، اور جہاں اس بات کا اندیشہ ہو کہ مسجد میں ان کا تعاون کرنا اپنے تیوہار یا مذہبی مقامات کے لئے حصول چندہ کا پیش خیمہ ہوگا وہاں مسجد یا مدرسہ میں غیر مسلم کی اعانت کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔

ھ:......افطار پارٹی یا عید مبارک تقریبات جو غیر مسلموں کی طرف سے منعقد کی جاتی ہیں ان میں شریک نہیں ہونا چاہئے، اسلامی شعار کے وقار اور اہمیت پر آنچ آتی ہے، اور ان کا خاصہ جو تعبد وعبودیت ہے اس کے حصول یا للّٰہیت میں فرق پڑسکتا ہے، اس لئے:

الف:......مسلمانوں کو ایسی تقریبات میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔ ب:......چونکہ غیر مسلموں کے تیوہار غیر اللہ کی عبادت کو متضمن ہوتے ہیں، اس لئے اس کی مبارکباد دینا یا ان کی تقریبات ومیلوں میں شریک ہونا جائز نہیں، اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوگی اور تعاون علی الاثم ہوگا۔

۳- کسی مسلمان کے نزدیک اس کی زندگی کے شب وروز اسلامی دستور وشریعت کے مطابق گزر جانا ہی حقیقی مسلمان ہونا ہے، اس کی زندگی کا کوئی بھی حصہ اور

لحہ شریعت سے ہٹ کر یا اسلامی عقائد وقوانین سے معارض کسی امر کو اپنا کر گزارنا نہ گوارا ہے اور نہ ہی اسلامی شان کے مناسب، اور ایسا اس لئے ہے کہ اسلامی تعلیمات وقوانین انسانی زندگی کے تمام پہلو اور ضروریات کو جامع اور شامل ہیں، اس لئے اگر کوئی امر خلاف شریعت پیش آتا ہے تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حتی الوسع اس سے بچنے کی کوشش کرے، بلکہ اسے مٹانے اور ختم کرنے کی کوشش کرے، اگر غیر اسلامی حکومت کی طرف سے ایسی کوئی مجبوری آتی ہے تو جمہوری حدود وقوانین میں رہتے ہوئے اس کی مخالفت کرے اور قانونی چارہ جوئی کرے، اور حتی الوسع اس کے امتثال میں غیر شرعی طریقے سے اجتناب کرے۔

الف-جھنڈے کی سلامی ایک سیاسی امر ہے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک سیاست دین سے الگ نہیں، اس لئے اس موقع پر غیر شرعی طریقہ (بیجا تعظیم و احترام کہ ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر انتہائی خشوع وخضوع کی صورت اختیار کی جائے) سے بچتے ہوئے، فتنہ کے ڈر سے بادل ناخواستہ اسے انجام دیا جائے، عام طور پر جھنڈے کی سلامی کے وقت جو صورت اختیار کی جاتی ہے یعنی غایت تعظیم کی صورت، اسے ناجائز ہونا چاہئے۔

ب:ایسے ترانے جو شرکیہ مضمون پر مشتمل ہوں کسی مسلمان کا پڑھنا جائز نہیں ہوگا، اضطرار اور جبر کی صورت مستثنی ہے۔

ج:مسلمانوں کو اپنے مسائل اپنی شرعی پنچایتوں میں حل کرنا چاہئے، اور غیر شرعی عدالتوں میں جانے سے گریز کرنا چاہئے، کتاب اللہ اور سنت رسول کو حکم بنانے کے بجائے کسی غیر کو حکم اور فیصل بنانا کسی مسلمان کی شان نہیں ہے۔

قرآن کریم میں ہے:"فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم" (سورۂ نساء:۶۵)، اس لئے یہ جانتے ہوئے کہ ہم جہاں اپنا معاملہ فیصلے کے لئے لے جا رہے ہیں وہاں غیر شرعی اور غیر اسلامی صورت اختیار کی جائے گی اپنا معاملہ اس عدالت میں لے جانا درست نہیں، اور فریقین حق وناحق سے اکثر واقف ہوتے ہیں کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، اس لئے فیصلہ خواہ غیر شرعی عدالت کا ہو یا شرعی اور اسلامی عدالت کا، بظاہر گواہ اور قوت استدلال کے ذریعہ اگر فیصلہ اس کے حق میں ہوتا ہے، جو ناحق پر ہے اور وہ جانتا ہے کہ میں ناحق پر ہوں تو حاکم کے فیصلہ سے وہ چیز اس کے لئے حلال اور جائز نہیں ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:"انما أنا بشر وإنكم تختصمون إليّ ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض فأقضي له على نحو ما أسمع منه فمن قضيت له من حق أخيه بشئ فلا يأخذ منه شيئا فإنما أقطع له قطعة من النار" (سنن ابوداؤد حدیث ۲، ۳۵۸۳/ ۳۰۱)۔

"فلا يأخذ منه شيئا" نہی ہے، اور اس کے ساتھ وعید "فانما اقطع له قطعة من النار" بھی موجود ہے۔ یہ مقضی لہ کے لئے خاص ہدایت ہے۔

اور رہا معاملہ قاضی یا شرعی پنچایت یا عدالت کے نفاذ کا تو بعض امور میں ظاہراً وباطناً اور بعض امور میں صرف ظاہراً نافذ ہوگا۔

۴- الف: اسلامی نقطہ نظر سے انسانی زندگی سے متعلق کوئی بھی امر دین وشریعت سے الگ اور خارج نہیں ہے، اسلامی تہذیب وثقافت اپنی ایک شناخت اور پہچان رکھتی ہے، جس میں توحید خالص، ایمان بالآخرۃ وغیرہ امور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور یہ بھی بنیادی عقیدہ ہے کہ شریعت محمدی کے آجانے کے بعد پچھلی تمام شرائع منسوخ اور ناقابل عمل ہو چکی ہیں، اس لئے یہ کہنا کہ راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہے ایک پرفریب کلمہ ہے، اسلامی راستہ کے علاوہ تمام راستے مخدوش ہو چکے ہیں اور وہ منزل تک پہنچانے کے بجائے آگے کسی کھائی میں گرادیں گے۔

آج کل اسلام دشمن عناصر خاص کر یہودیوں کی سازش سے ثقافتی وحدت اور عولمہ کی کوشش زوروں پر ہے، مگر وہ اسلام جو خالص توحید کا داعی ہے مشرکانہ تہذیب وثقافت میں کیونکر ضم ہوسکتا ہے۔

ب:......اسلام نے ظلم کو کبھی بھی گوارا نہیں کیا، اور بلا تفریق مذہب وملت اور بلا امتیاز نسل ورنگ وہ ظلم کو ناپسند کرتا ہے، اور حتی الامکان مظلوم کی اعانت وتحفظ اور ظالم کو باز رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ "انصر أخاك ظالما كان أو مظلوما" اس لئے ایسے مظلومین کی اعانت مناسب طریقے سے حتی المقدور کی جائے گی۔

ج:......ایسے ادارے جو خدمت خلق کے لئے قائم کئے جائیں ظاہر ہے مسلمانوں کو اس سے نفع پہنچانا مقدم ہوگا لیکن غیر مسلموں کو اس سے محروم نہیں رکھا جائے گا، اسلام نے خدمت خلق کے ساتھ حسن خلق کی بھی تعلیم دی ہے۔

د:......گرچہ فرقہ پرست عناصر ان نازک حالات میں بھی اپنی فطرت سے باز نہیں آتے اور مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتتے ہیں لیکن مسلمانوں کی ریلیف کمیٹیاں ایسے مواقع پر امتیازی سلوک کر کے اپنی شناخت نہیں کھوئیں گی، مسلم تنظیمیں غیر مسلم آفت زدگان کے ساتھ بھی انسانی سلوک کریں گی۔

غیر مسلم ممالک میں انتخابات کے موقع پر مسلمانوں کا طرز عمل

سید امیر حسین گیلانی
جمعیۃ علماء اسلام، پاکستان

۱- الف: ووٹ اس حدیث مبارکہ "من رأی منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ" (رواہ المسلم والترمذی وابن ماجہ) کی رُو سے دینا چاہئے اور الیکشن میں حصہ لینا چاہئے، اس لئے کہ جہاں منکرات کے سدباب کے اور اسباب ہیں وہاں ووٹ بھی ایک مؤثر سبب ہے، اس لئے اس میں حصہ لینا چاہئے تاکہ قانون ساز ادارہ میں پہنچ کر اپنا کردار ادا کر سکے، ورنہ اپوزیشن بھی بڑی مؤثر قوت ہوتی ہے تو اس میں رہتے ہوئے اپنا مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔

دوسری وجہ، حدیث مبارکہ میں ہے کہ ظالم اور مظلوم کی مدد کرو! اور ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا اس کی مدد ہے (مسلم ۲/ ۳۲۰)، اس لئے الیکشن میں ہر ممکن کردار ادا کرنا چاہئے۔

ب:...... قوم میں جاکر اور علاقے میں رہ کر مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے، اس لئے اسے واجب قرار دیا جا سکتا ہے، ورنہ انہیں احکام کیسے بتائے گا اور انہیں اسلام کے خلاف اقدام کرنے سے کیسے روکے گا؟

اور بخاری شریف کی حدیث میں بحری جہاز کی مثال آئی ہے کہ جس کے نچلے حصے والے پانی کے حصول کے لئے اپنے نیچے والے حصے میں سوراخ نکال لیں تو اوپر نیچے سب کے سب غرق ہو جائیں گے (رواہ البخاری والترمذی)، اس لئے انتخابات میں شمولیت کو واجب قرار دیا جا سکتا ہے تاکہ مخالفین اسلام کو انکے اقدام سے روکا جا سکے۔

ج:...... آیت مبارکہ "وإن جنحوا للسلم فاجنح لها" (سورہ انفال: ۶۰) اور اس طرح جو معاہدہ نبی آخر الزماں ﷺ نے مدینہ منورہ میں ملکی مفاد پیش نظر کیا تھا باوجودیکہ مسلمان غالب تھے، تو اس سے کسی حد تک وجہ جواز بن سکتی ہے، وہ ذاتی اعتبار سے اچھے لوگ جماعت کے سرکردہ افراد کو اسلام کے خلاف اقدام کرنے سے روک سکیں (سیرت ابن ہشام)۔

(ج) کا جواب وہی ہے جو (ب) کا ہے کہ ان کو ووٹ دے کر انہیں جماعتی پالیسی میں کسی حد تک رکاوٹ کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، کہ وہ لوگ مسلمان ووٹروں کے ذریعہ کامیاب ہو کر اپنے ووٹروں کے مذہبی جذبات کا خیال رکھیں گے، اور جماعت کے ذمہ داران کو اسلام کے خلاف اقدام کرنے سے روک سکیں گے۔

د:...... ملی مفادات کے پیش نظر شرکت اور حمایت کی جا سکتی ہے اور اس کی حیثیت ایک عہد اور وعدے کی ہے۔

ھ:...... غیر مسلموں کے تعاون سے ایسی تنظیمیں جن میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کا مشترکہ مفاد ہو، تو اس صورت میں جائز ہوگا، جب مسلمانوں کا غلبہ ہو، امام محمدؒ نے "سیر کبیر" میں فرمایا:

"ولا بأس بأن يستعين المسلمون بأهل الشرك على أهل الشرك إذا كان حكم الإسلام هو الظاهر

علیہم'' (شرح کبیر ۲/۸۶ بحوالہ جواھر الفقہ ۲/۲۰۸)۔

حاصل یہ کہ اگر مسلمان کثیر ہیں تو پھر انہیں محکوم ہونا جائز نہیں ہے، درج بالا آیت اور دیگر آیات واحادیث مبارکہ سیاسی میل وجول وغیرہ کو منع کرتی ہیں۔ اور اگر مسلمان قلیل ہیں اور سیاسی لحاظ سے کمزور ہیں تو عذر مجبوری ہے۔

۲- الف: دین اسلام غیر مسلموں میں پھیلانے کے لئے ہے، اس لئے پختہ اور مضبوط مسلمانوں کو مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا چاہئے تاکہ اپنی مضبوطی اور پختگی کی وجہ سے اپنے حسن واخلاق سے ان کو متاثر کرسکیں۔ اور کمزور مسلمانوں کو علاحدہ رہنا چاہئے تاکہ ان کا اثر قبول کرنے سے بچ سکیں۔

ب:......اخلاقاً بھی پڑوسی اور محلہ داری کی وجہ سے غیر مسلموں کی غمی میں شریک ہو سکتے ہیں لیکن ان کے جنازہ میں شریک نہیں ہو سکتے۔

غیر مسلم کے لئے ایصال ثواب، دعاء، مغفرت وغیرہ بھی نہیں کر سکتے، اس لئے کہ قرآن مجید میں ممانعت ہے:

"ما کان للنبی والذین آمنوا أن یستغفروا للمشرکین ولو کانوا أولی قربی" (سورۂ توبہ/۱۱۲)۔

ج:......کھانے پینے کے بارے میں یہ ہے کہ اگر ظاہری طور پر کوئی پلید چیز وناپاک شئ اس میں نہ پڑی ہو تو کھانے کی اجازت ہے۔

د:......مساجد کے لئے اگر غیر مسلم خوشی سے تعاون کرتے ہیں اور ان سے نقصان کا بھی اندیشہ نہ ہو تو کفایت المفتی اور فتاوی دار العلوم دیوبند میں جواز کا فتوی ہے، البتہ ان کی عبادت گاہوں کے لئے مالی تعاون دینا جائز نہیں ہے۔

۵- الف:......شریک ہ ناجائز ہے۔

"وإذا رأیت الذین یخوضون فی آیاتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ" (سورۂ انعام/۶۷)۔

اس آیت مبارکہ سے شرکت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

ب:......غیر مسلم بھائیوں کے تہواروں کی مبارک باد دے سکتے ہیں، یہ ملکی واخلاقی رواج ہے۔

۳- الف: جھنڈے کا احترام ایک رواجی حیثیت سے ہے کہ یہ ملک کی علامت اور ایک وقار سمجھا جاتا ہے جیسے حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ میں اسلامی جھنڈا تھا تو کفار نے حملہ کر کے جھنڈے والا ہاتھ کاٹ دیا، اسی طرح دوسرا ہاتھ، بالآخر وہ شہید ہو گئے تو جھنڈا دوسرے صحابی نے تھام لیا، گرنے نہیں دیا (الاصابہ فی تمییز الصحابہ) اس واقعہ سے جھنڈے کا احترام معلوم ہوتا ہے، باقی جھنڈے کو سلامی دینا یہ بھی اپنے اپنے ملکوں کے احترام کا طریقہ ہے اور یہ بھی ایک رواجی اور رسمی سلامی ہوتی ہے ملکی وقار کے مدنظر ہوتا ہے، اس لئے خلاف شرع نہیں ہے۔

ب:......ترانہ تو جیسی حکومت ہوگی ویسا ہی ترانہ ہوگا، عوام مجبور ہوتی ہے، یعنی غیر مسلم حکومت میں مسلمان ترانہ نہیں بدل سکتے، اس لئے مسلمان مجبور ہیں۔

البتہ مسلمان یہ ترانہ پڑھنے سے حتی الامکان اجتناب کریں۔

ج:......قانون شہادت یا عائلی قوانین میں مسلمانوں میں تبدیلی کی قوت ہے تو فبہا، اگر تبدیلی کی طاقت نہیں تو پھر وہ معذور ہیں، اس لئے ایسی صورت میں مقامی علماء کرام اور دار الافتاء میں اپنے مسائل پیش کرنے چاہئیں۔ باقی اگر معاملات میں دونوں فریق مسلمان ہیں ان میں سے کسی نے اپنے حق میں ناجائز فیصلہ کروالیا تو اس سے استفادہ تو کر سکتا ہے لیکن واجب الرد ہے۔

حدیث رسول ہے: ''ایک فریق نے چرب لسانی سے اپنے حق میں فیصلہ کروالیا تو فرمایا کہ جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیا گیا'' (مشکوۃ/۲۷ ۳)، اس لئے لوٹانا واجب ہے۔

۴- الف:...... مسلمانوں کا تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی علاحدہ تشخص ہے اور ہر معاملہ میں مذہب اسلام کی راہنما ہدایات ہیں، اس لئے مذہب کو عملی زندگی سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

اور دوسری بات ہے کہ سب راستوں کی منزل ایک ہے یہ بھی کسی درجہ میں قابل قبول نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ اس سے تو پھر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت بالکل ختم ہوجاتی ہے کہ مسلم وغیر مسلم کی جب منزل ایک ہی ہے تو پھر اشاعت اسلام کے سلسلہ میں اتنی تکالیف، مصائب اور شہادتیں برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اور قرآن مجید میں ہے: "إن الدين عند الله الإسلام" (سورۂ آل عمران: ۱۷)

اور دوسری جگہ ہے: "ليظهره على الدين كله" (سورۂ توبہ: ۳۳)۔

کہ اب صرف اور صرف اسلام ہی نجات ومنزل کا واحد راستہ ہے۔

ب:...... اسلام ہی ایک دین رحمت ہے، اس لئے بطور انسانی ہمدردی ان سے تعاون کرنا چاہئے، کفار مکہ نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا تو اہل مکہ پر بھوک وقحط کا عذاب آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لئے پانچ سو اشرفی ابوسفیان کے ہاتھ بھیجی کہ انہیں اہل مکہ میں تقسیم کر دینا (شرح سیر کبیر ۱/۶۹ بحوالہ جواہر الفقہ ۲/۱۸۱)۔

ج:...... مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں سے خیر خواہی اور ہمدردی کریں۔

حدیث مبارکہ میں ہے: ''خير الناس من ينفع الناس'' (الجامع الصغير للسيوطي ۲/۹، كشف الخفا للعجلوني)
(تم میں سب سے بہتر انسان وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے)۔

اس لئے حالات کے مطابق جو طریقہ زیادہ مناسب ہو مثلاً ہسپتال، اسکول، رفاہی ادارے وغیرہ کی صورت میں ذرائع اختیار کرنا چاہئے، اور ان اداروں کو بلاتفریق مذہب تمام لوگوں کے لئے خدمت واعانت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے۔

د:...... جیسے ''ج'' کے جواب میں گذرا کہ حدیث مبارکہ: ''خير الناس من ينفع الناس'' کے تحت برادران وطن کے ساتھ انسانی ہمدردی ہونی چاہئے اور اس کے حالات کے تحت جو مناسب طریقے ہوں ان کے ذریعے خیر خواہی کرنی چاہئے۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

مفتی ذاکر حسن نعمانی
جامعہ عثمانیہ، پشاور (پاکستان)

دنیا میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمان، ہر مکان اور ہر حالت کے احکامات موجود ہیں، ان احکامات تک رسائی انفرادی یا اجتماعی اجتہادات کے ذریعہ ہوتی ہے، اس مبارک سعی کے لئے اللہ تعالی ہر دور میں اہل اور متدین لوگوں کو پیدا کر دیتے ہیں۔

سیاست اور الیکشن:

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس وقت دنیا میں موجودہ نظام سیاست کا کلمہ طیبہ جمہوریت ہے، جس کے مفاسد اور نقائص بے شمار ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میدان سیاست کو اس گندگی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے بلکہ دیگر میدانوں کی طرح اس شعبہ کی صفائی بھی امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔

شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں: ''ومن سيرتهم أن لا يشتغلوا بما لا يتعلق بتهذيب النفس والسياسة الملية'' یعنی انبیاء کرام کی سیرت میں تہذیب نفس اور سیاست ملیہ داخل ہے، اس لئے ملی سیاست کو برقرار رکھنا انبیاء کرام کی سیرت ہے۔

۱- (الف، ب) غیر مسلم ممالک میں الیکشن اور اس میں مسلمانوں کا حصہ لینا:

چونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کی ہر مکان، ہر زمان اور ہر حالت میں بالواسطہ یا بلاواسطہ، انفرادی یا اجتماعی طور پر حتی المقدور ذمہ داری ہے، کیونکہ مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان بھائی کے مکمل اسلام کا ذمہ دار ہے یعنی ایمان واعمال کی حفاظت، غیر مسلم ممالک کے الیکشن میں مسلمان امیدوار اپنی ذمہ داری بلاواسطہ پوری کرتا ہے بشرطیکہ امیدوار اہل اور دیانتدار ہو، اس مسلمان کو ووٹ دینے والا اپنی ذمہ داری بالواسطہ پوری کرتا ہے، انتخابی مہم چلانے والے بھی اپنی ذمہ داریاں بالواسطہ پوری کرتے ہیں، اور یہ افراد مل کر اجتماعی ذمہ داری پوری کرتے ہیں، اس تفصیل کے ساتھ ووٹ کی شرعی حیثیت بھی معلوم ہوگئی۔ اس کے استعمال کا وجوب بھی واضح ہوگیا۔

ج- مخالف اسلام پارٹی کو ووٹ دینا یا اس میں شمولیت:

ہر پارٹی کا الگ تشخص اس کے اپنے منشور کی وجہ سے ہوتا ہے، اگر منشور غیر اسلامی ہے تو ایسی پارٹی کو ووٹ دینا یا اس میں شامل ہونا گناہ ہے، اس لئے کہ ایک تو مسلمان اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا اور دوسری طرف گناہ میں تعاون کر رہا ہے، اگر کسی غیر اسلامی پارٹی کا امیدوار ذاتی طور پر نیک انسان ہو اس کو بھی ووٹ نہ دیا جائے، اس لئے کہ اگر وہ نیک ممبر کامیاب ہو جائے تو اپنی پارٹی کی پالیسی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔

د- غیر مسلم سیاسی پارٹی کے ساتھ اشتراک:

اگر اسلامی اقدار اور ملی مفادات کا تحفظ یا فروغ ممکن ہو تو غیر مسلم سیاسی پارٹی کے ساتھ معاہدہ یا اشتراک یا ان کی پارٹی یا کسی امیدوار کو ووٹ دینا صحیح ہے، فقہاء کرام کا قاعدہ ہے: ''الأمور بمقاصدها'' بظاہر یہ معاہدہ اور شرکت صحیح نہیں لیکن اعلی مقصد کے اعتبار سے صحیح ہے۔

۲- الف- غیر مسلموں کے ساتھ سماجی قربت:

اصل تو یہی ہے کہ مسلمانوں کا الگ جغرافیائی اور نظریاتی وطن ہو تاکہ تمام اسلامی اقدار پر مکمل آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہوں اور اغیار کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ ہاں اگر غیر مسلم دار الاسلام میں ذمی بن کر رہیں تو جائز ہے، اس لئے کہ دار الاسلام میں اسلامی فکر وتہذیب کا غلبہ ہوتا ہے،

کوئی کافر مستامن (ویزا والا) بن کر محدود عرصہ کے لئے اسلامی ملک میں رہائش پذیر ہو تو جائز ہے، اگر مسلمانوں کی اقلیت مجبوراً اور مقہوراً کفار کے سماج اور دار الحرب میں پھنس جائے تو ان پر دو باتیں لازم ہیں: اسلامی اقدار کا انفرادی اور اجتماعی تحفظ، دعوت وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دینا۔ اگر کوئی مسلمان مجبوراً مثلاً معیشت، علاج یا تعلیم کی وجہ سے غیر مسلم سماج میں رہ رہا ہے تو وہ بھی اسلامی اقدار کی حفاظت کرے گا اور حتی الوسع دعوت وتبلیغ کے فریضہ کو جاری رکھے گا، اگر مسلمان اس طرح ایمان وعمل صالح کے اسلحہ سے لیس رہیں تو کافی حد تک غیر مسلم سماج کے اثرات سے محفوظ رہیں گے۔

بلا مجبوری اور شدید ضرورت کے بغیر غیر مسلم سماج میں صرف هل من مزید کی ہوس کے ساتھ رہائش بڑی خطرناک بات ہے۔

ارشاد نبوی ہے: ''من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله'' (ابوداؤد)

(یعنی جو مشرک کی موافقت اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے تو وہ اس جیسا ہے)۔

ارشاد ہے: ''اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو''۔ خاص کر اس مادہ پرستی اور سیکولر کے دور میں، کیونکہ کفری تہذیب کے اثرات سے جلد متاثر ہو جائے گا۔ مسلمانوں کی سوچ مسلم ممالک میں بھی سیکولر بن رہی ہے، غیر مسلم ممالک چونکہ ترقی یافتہ ہیں اس لئے لوگ تعلیم، علاج، ملازمت اور تفریح کی خاطر ان ممالک کا رخ کرتے ہیں، ایمان اور اعمال صالحہ کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے اس لئے حتی الوسع غیر مسلم سماج سے اجتناب ضروری ہے۔

ب- کافر کی تعزیت:

کافر کی تعزیت صحیح ہے۔ عالمگیری میں ہے: ''وإذا مات الكافر قال لوالده أو قريبه في تعزيته أخلف الله عليك خيرًا منه وأصلحك أى أصلحك بالإسلام ورزقك ولدا مسلما'' (۵/ ۳۴۸) (جب کافر مرجائے تو اس کے باپ یا کسی قریبی رشتہ دار کو کہے: اللہ تعالیٰ تجھے اس سے بہتر بدل عطا فرمائے اور تجھے اسلام کے ساتھ سنوار دے اور تجھے مسلمان بچہ عطا کر دے)۔

غیر مسلم کے لئے ایصال ثواب:

کافر کے لئے ایصال ثواب صحیح نہیں۔ قرآن مجید میں جتنی آیات میں کسی مردہ کے لئے دعا مذکور ہے تو وہاں میت کا ایمان ضروری ہے۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ''ولا بأس بزيارة القبور والدعاء للأموات إن كانوا مؤمنين''

(مردوں کی زیارت اور ان کو دعا دینے میں کوئی حرج نہیں اگر وہ مومن ہوں) (بدائع الصنائع ۱/ ۳۲۰)۔

دعا کے علاوہ کسی عمل کا ثواب پہنچانے کے لئے میت میں ایمان شرط ہے، علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

''إن سعي غيره لما لم ينفعه إلا مبنيا على سعي نفسه وهو أن يكون مؤمنا صالحا''

(غیر کی سعی کا نفع موقوف ہے اپنی سعی پر اور وہ یہ ہے کہ میت خود صالح مومن ہو) (الکشاف ۴/ ۴۲۸)۔

ج- کفار کے ہدایا قبول کرنا:

عالمگیری میں ہے کہ کافر سے ہدیہ قبول کرنے کے بارے میں متضاد روایتیں ہیں: ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول کرنا جائز ہے۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول نہ کرے۔ تطبیق یہ ہے کہ ایسے کافر سے ہدیہ قبول نہیں کیا جس کا گمان تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مال کی خاطر لڑتے ہیں۔ دین کے اعزاز کے لئے نہیں۔ اور ایسے کافر کا ہدیہ قبول کیا ہے جس کا گمان تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کو معزز کرنے کی خاطر لڑتے ہیں، مال کے لئے نہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی یہی حکم ہے، اسی طرح اس کافر کا ہدیہ قبول نہ کرے جس کی وجہ سے دین کی پختگی، عزت، اور وقار کو دھچکا لگتا ہو یا ہدیہ کی وجہ سے اس کافر کے لئے نرم گوشہ اختیار کرلے، اگر مذکورہ نقصانات نہ ہوں تو کافر کا ہدیہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں (۵: ۳۴۷)۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر اپنی مشرکہ والدہ سے تحفہ قبول کیا تھا۔ اگر کفار کی مٹھائی بتوں کے چڑھاوے کی ہے تو اس کا قبول کرنا حرام ہے کیونکہ اس کے ساتھ غیر اللہ کا تقرب حاصل کیا گیا ہے۔

د- مسلمانوں اور کفار کا ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی تعاون:

کفار اگر مسلمانوں کے مذہبی جلسوں میں چندہ دیں یا مساجد کی تعمیر میں حصہ لیں یا مدارس کا تعاون کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالی اپنے دین کی مدد جس سے چاہے لے سکتا ہے اس کو نہ کوئی روک سکتا ہے نہ روکنا چاہئے۔ بیت اللہ کی تعمیر کفار قریش نے حلال چندہ کے ساتھ کی تھی۔ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ غیر مسلموں کو مذہبی لحاظ سے تقویت پہنچائیں، مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اسلام کو ہر زمان ہر مکان اور ہر حالت میں غالب رکھیں یہ غلبہ خواہ دلائل و براہین کا ہو یا پھر سلطنت وحکومت کے لحاظ سے۔

ھ- غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت:

غیر مسلموں کی تقریبات میں محض ظاہر داری کی بنا پر شرکت جائز ہے بشرطیکہ دیگر منکرات شرعیہ نہ ہوں، کیونکہ بعض جائز اور مباح امور بھی لغیرہ ناجائز بن جاتے ہیں، ان کی مذہبی تقریبات میں شرکت صحیح نہیں۔ اس طرح کی شرکت سے ان کے مذہب کو تقویت ملتی ہے۔

حدیث ہے: "من کثر سواد قوم فھو منھم" (جو کسی قوم کی جماعت کے تکثیر کا باعث بنے تو وہ اس قوم میں سے ہے) ہاں اگر دعوت وتبلیغ کی نیت سے شریک ہو تو جائز ہے۔

الف- ایک دوسرے کی مذہبی تیوہاروں میں شرکت:

مذہبی تقریبات میں مذہبی تقدس ملحوظ ہوتا ہے، کفار کا دین ان کے نزدیک مقدس ہے، اسلام جیسے دین کے ہوتے ہوئے کسی اور دین کی تعظیم قطعاً ناجائز ہے، ہاں تبلیغ کی نیت سے شرکت جائز ہے۔

ب- غیر مسلم کو مذہبی تیوہار پر مبارکباد دینا:

غیر مسلم کو ان کی مذہبی تیوہار پر مبارکباد دینا صحیح نہیں، کیونکہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مبارکباد دینے والے مسلمان بھی غیر مسلم کے تیوہار پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے اور اس خوشی کے اظہار میں ان کے تیوہار کی عظمت اور تعظیم پنہاں ہے۔

۳- الف- جھنڈے کی سلامی:

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"ومعظم شعائر اللہ أربعة: القرآن والکعبة والنبی ﷺ والصلاة" (چار بڑے شعائر ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز)

تفسیر قرطبی میں ہے: "فشعائر اللہ أعلام دینہ لا سیما ما یتعلق بالمناسك..."

(شعائر اللہ سے مراد دینی نشانیاں وعلامات ہیں۔ خاص کر وہ جن کا تعلق احکام حج سے ہے) مثلاً صفا، مروہ، بُدن، جمار، مسجد حرام، رکن اور عرفہ، قومی اور اسلامی جھنڈا قوم وملت کی عظمت کا نشان تو ہے، اسی طرح قومی یا وطنی شعار بھی ہو سکتا ہے، لیکن جھنڈے کو دینی شعار کہنا قابل غور اور قابل تحقیق ہے، اگر جھنڈے کو دینی شعار مان بھی لیں تو اس کے متعلق کوئی مخصوص اور منصوص عمل کا پتہ نہیں چلتا، ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سرنگوں ہونا قومی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، اس کی طرف سلامی محض ایک قومی رسم ہے، اور اگر سلامی کو ثواب سمجھا جائے تو پھر سرکاری سطح پر بدعت ہے۔

ب- مشرکانہ مضامین پر مشتمل قومی ترانہ پڑھنا:

قومی ترانہ کسی قوم اور ملک کی ملی سیاست، عقائد، مذہب اور وطن کی محبت اور نظریات کا ترجمان ہوتا ہے، مشرکانہ مضامین پر مشتمل قومی ترانہ پڑھنا اسلامی عقائد اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، ایسا ترانہ بوقت ضرورت بطور حکایت پڑھنا درست ہے، لیکن بلا ضرورت اس کی حقیقت کو جانتے ہوئے گاہے گاہے پڑھنا اندیشہ کفر ہے، اگرچہ پڑھنے والے کا اعتقاد اس کے مضامین کے برحق ہونے کا نہ ہو، کفریہ مضامین اور کفریہ جملوں کی نقل بطور حکایت جائز ہے، "نقل کفر کفر نہ باشد"، ارشاد باری ہے: "قالوا اتخذ اللہ ولداً سبحانہ. اتخذ اللہ ولداً" کفریہ جملہ ہے لیکن اللہ تعالی نے اس

جملہ کو بطور حکایت نقل کیا ہے۔

۴-(الف) تمدنی وثقافتی وحدت:

مسلمانوں کا ساری دنیا سے الگ اور امتیازی کلچر اور ثقافت ہے جس کو اسلامی ثقافت کہتے ہیں، اس اسلامی تمدن اور ثقافت کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی تعلیمات موجود ہیں، خواہ وہ لباس و پوشاک سے متعلق ہوں یا کھانے پینے سے متعلق یا دیگر اسلامی شعائر سے متعلق، مسلمان اگر اپنی اسلامی ثقافت کو کسی غیر قوم کے کلچر میں مدغم کردیں تو عملی زندگی سے اسلام ختم ہو کر رہ جائے گا، مسلمان اور کافر کا ظاہری امتیاز ختم ہو جائے گا۔ صحیح مسلم میں ہے: عبداللہ بن عمر بن العاص سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن هذه من ثياب الكفار فلا تلبسها" (یہ کافروں جیسے کپڑے ہیں پس ان کو نہ پہنو)، دوسری جگہ ارشاد ہے:

"من تشبه بقوم فهو منهم" (جس نے قوم کی مشابہت اختیار کی وہ شخص اس قوم میں شمار ہوگا)

مذہبی شعار میں مشابہت تو بہت خطرناک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اسلامی تہذیب و تمدن سکھایا ہے، اس تہذیب و تمدن کو چھوڑ کر دوسرے تمدن کو اختیار کرنا اسلام کے ساتھ بے وفائی ہے، اس بے وفائی کی وجہ مادہ پرستی ہے جو انسان کو سیکولرزم (دنیاویت پسندی) تک لے گئی ہے، جس کی وجہ سے مذہب کو اب ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں، ہر انسان کو جس طریقہ عبادت میں روحانی سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اس کا مذہب ہے، باقی سب لوگ انسان ہیں، ایک تہذیب و تمدن اختیار کرلیں تا کہ تمام انسان آپس میں پیار و محبت سے رہ سکیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کا پتہ نہ چلے کہ مسلمان ہے یا ہندو، یہودی ہے یا عیسائی، لہٰذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنی اسلامی تہذیب و تمدن کو عملاً برقرار رکھیں۔

ب- غیر مسلم مظلوم کی مدد:

اسلام سراپا رحمت والا مذہب ہے، حدیث ہے: "ارحم من في الأرض يرحمك من في السماء" (تو زمین والوں پر رحم کر و آسمان والا تم پر رحم کرے گا)، مصیبت زدہ اور مظلوموں کی مدد عین اسلامی تعلیمات ہیں۔

ج- خدمت خلق:

دکھی انسانیت کی خدمت بلا تفریق مسلم و غیر مسلم بہت بڑی عبادت ہے، خدمت خلق کے رفاہی اداروں سے کفار بھی مستفید ہو سکتے ہیں، اس کی مختلف شکلیں ہیں، مثلاً اسپتال بنا کر ان کا علاج کرنا، متعدی امراض کے وقت ان کا تعاون زلزلہ اور سیلاب کی صورت میں ان کی مدد کرنا انفرادی طور پر یا کسی ادارہ کے توسط سے، البتہ اتنا خیال ضروری ہے کہ زکاۃ کی رقم سے کفار کا تعاون صحیح نہیں کیونکہ زکاۃ کا مستحق مسلمان ہے، نفلی صدقات سے ان کی مدد کی جاسکتی ہے، کفار سے صرف قلبی دوستی کی ممانعت ہے۔

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی
جامعہ خیر العلوم، بھوپال

۱- الف: جمہوری نظام میں ووٹ کی طاقت کے اعتبار سے ہی سیاسی وسماجی زندگی میں قوموں کا درجہ ومقام متعین ہوتا ہے اور حقوق کی حفاظت ہوتی ہے، اگر مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ہو یا ایسے ارکان موجود ہوں جن کے انتخاب میں مسلم ووٹ اثر انداز رہا ہو تو ان کے ذریعہ نہ صرف مسلمانوں کے قومی بلکہ مذہبی مفادات کا بھی تحفظ ہوتا ہے، اگر مسلمان ایسے ممالک میں الیکشن سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں تو سیاسی اور قومی سطح پر ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی، بلکہ بعض حالات میں مذہبی حقوق سے بھی محروم ہو سکتے ہیں۔

ب-ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت، دوسری سفارش، تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک وصالح قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نااہل غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی، اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے (جواہر الفقہ ۲/ ۲۹۳)۔

ج-امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہونے والے کے لئے اس کام کی قابلیت اور امانت و دیانت شرط ہے، چنانچہ ''جواہر الفقہ'' میں ہے: کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لئے جو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے، ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ دیانت و امانت داری سے اس کام کو انجام دے گا، اب اگر واقع میں وہ اپنے اس دعوی میں سچا ہے یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبہ سے اس میدان میں آیا ہے تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۲۹۱)۔

اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانتدار نہ معلوم ہو، مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیل نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم کو فقہاء نے تجویز فرمایا ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۲۹۴)۔

اسلام اور مسلمانوں کی مخالف سیاسی جماعت کا امیدوار دیگر امیدواروں کے مقابلہ میں ذاتی طور پر قابلیت امانت و دیانت سے زیادہ متصف ہو، یا اس کے ذریعہ ظلم کو کم کرنے کا امکان ہو تو اس کو بھی ووٹ دینا جائز ہے، دین وایمان کی حفاظت کے ساتھ ایسی پارٹیوں میں مسلمانوں کی شرکت ممکن ہو تو شریک ہو سکتے ہیں۔

د-ملی مفادات کے تحت غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے کرنا اور ان میں شرکت کرنا یا ان کی حمایت کرنا درست ہے۔

کفایت المفتی میں ہے: جبکہ مسلمان کی قوت دشمن کے مقابلے اور مدافعت کے لئے کافی ہو تو بے شک مشرک سے امداد حاصل کرنا درست نہیں، لیکن جب ایک کافر قوت مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہو اور مسلمان کسی غیر مسلم طاقت سے اشتراک عمل کر کے اپنے آپ کو بچا سکتے ہوں تو ایسے وقت میں یہ حکم شرعی نہیں ہے (کہ اپنے آپ کو ہلاک اور برباد ہو جانے دو، مگر غیر مسلم سے اشتراک عمل کر کے اپنی جان نہ بچاؤ) (کفایت المفتی ۹/ ۳۲۴)۔

یہود کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ اور در مختار میں ہے کہ کافر سے حاجت کے وقت جنگ میں مدد لینا جائز ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی ایک جماعت سے دوسری جماعت کے خلاف مدد لی، اس کے بعد یہ ذکر کیا کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر میں تو کافر کی مدد لینے سے انکار فرمادیا تھا مگر اس کے بعد غزوہ خیبر میں یہود بنی قینقاع سے اور غزوہ حنین میں صفوان بن امیہ مشرک سے مدد لی۔

تو غزوہ بدر میں استعانت سے انکار فرمانا یا تو اس لئے تھا کہ مدد لینا اور نہ لینا دونوں باتیں جائز تھیں اور اس صورت میں غزوہ بدر اور غزوہ خیبر و حنین کے واقعات نے اس حکم کو منسوخ کردیا، نیز ہندوستان کی موجودہ صورت میں تو شریعت مقدسہ کے دوسرے اصول سے کفار کے ساتھ اشتراک عمل کا جواز معلوم ہوتا ہے وہ "اذا ابتلی ببلیتین فلیختر أهو نهما" کا اصول ہے (کفایت المفتی ۹/۳۳۹)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہود و نصاریٰ کے ساتھ نیکیوں پر تعاون اور برائیوں کو دفع کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔

ھ- انسانیت کے نفع اور معاشرہ میں عدل وانصاف قائم کرنے اور اچھی باتوں کی ترویج اور منکرات کو روکنے کے لئے غیر مسلم بھائیوں کے اشتراک کے ساتھ کام کیا جاسکتا ہے، اور ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کی جاسکتی ہیں جن میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے: مصالحت اور آشتی کے ساتھ زندگی گذارنا اور تجارت، زراعت، صنعت اور سیاست میں اشتراک عمل کرنا جائز اور بعض حالات میں واجب بھی ہوجاتا ہے، خصوصاً ایسے مقامات میں جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مشترک ہو، یا غیر مسلم آبادی کی کثرت ہو۔ بہر حال یہ لازم ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کے پابند رہیں اور مذہبی شعائر کی عزت وحرمت محفوظ رہے ورنہ پھر مسلمان پر مذہب کے تحفظ اور اس کا احترام قائم رکھنے کے فرائض عائد ہوں گے (کفایت المفتی ۹/ ۲۷۸، ۲۷۷)۔

۲- الف- حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من جامع المشرك و سكن معه فإنه مثله" (جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے) (ابوداؤد شریف کتاب الضحایا)۔

حضرت جریر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انا بری من کل مشرك يقيم بين أظهر المشركين قالو يا رسول الله: لم؟ قال لاتراء ى ناراهما"

(میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہ نے سوال کیا یا رسول اللہ اس کی کیا وجہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں)، تم یہ امتیاز نہیں کرسکو گے کہ یہ مسلمانوں کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے۔

فقہاء فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمان کا دار الحرب میں رہائش اختیار کرنا اور ان کی تعداد میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوجاتی ہے (تکملہ رد المحتار ۱/ ۱۰۱)۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے، تاکہ وہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رہ سکیں اور اگر مخلوط آبادی میں رہنا پڑے تو غیر مسلموں کے غلبہ والے علاقوں میں نہیں رہنا چاہئے۔

ب- پڑوسی کافر بیمار ہو، اس کی عیادت کرنا تو ثابت ہے لیکن ارتھی پکڑنا اور اس کو جلانے کے لئے مرگھٹ جانا ثابت نہیں، اس سے بچنا لازم ہے (فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۳۴۵، جامع الفتاوی ۱/ ۵۰۴)۔

کافر کے جنازہ کے ساتھ مرگھٹ تک جانا یہ جائز نہیں، کیونکہ اس میں کافر کی تعظیم وتکریم ہے اور وہ مستحق تعظیم نہیں (امداد المفتیین / 1018)۔

کافر کے لئے ایصال ثواب اور دعاء مغفرت مفید اور جائز نہیں (کفایت المفتی ۹/ ۲۸۱)۔

ج- غیر اللہ پر چڑھایا ہوا چڑھاوا حرام ہے، غیر مسلموں کی شادی بیاہ کی تقریب میں شوکت مباح ہے، اسی طرح شادی بیاہ کی تقریبات میں دعوت کھانا یا ہدیہ قبول کرنا مباح ہے (کفایت المفتی ۹/ ۲۷۷)۔

ہندوؤں کے ہاتھ کی روٹی اور مٹھائی کھانا مباح ہے، ان کے مذہبی تہواروں کی تقریب میں ہدیہ لینا درست نہیں (کفایت المفتی ۹/ ۲۷۰، ۲۷۱)۔

د- مندر بنانے میں مسلمانوں کا حصہ لینا درست نہیں، ایسا معلوم ہو کہ یہ کام مروۃً کرنا پڑا ہے، تو تجدید ایمان وغیرہ کا فتوی نہیں دیا جائے گا،

(فتاوی رحیمیہ ۴/ ۱۳)، اگر کسی نے ہندوؤں کے اس کام سے خوش ہوکر پسندیدگی کی راہ سے چندہ دیا، تو اس کے اسلام میں شبہ ہوگیا، اس کو احتیاطاً تجدید اسلام واجب ہے، لیکن اگر پسندیدگی کی راہ سے شریک نہیں ہو، ابلکہ کسی مجبوری کی وجہ سے چندہ دیا ہے تو وہ کافر نہیں ہوا، لیکن شرکت بھی گناہ سے خالی نہیں اور اب اس سے خلاصی کی سبیل توبہ اور انابت الی اللہ ہے (جامع الفتاوی ۱/ ۵۱۲)، مجبوری کی حالت میں ان کو پیسہ دے دے جو مانگنے آئے ہیں، یعنی ان ہی کی ملک کردے پھر وہ جہاں چاہیں خرچ کریں یعنی ہولی وغیرہ کی نیت سے نہ دے (جامع الفتاوی ۱/ ۵۱۱)۔

اگر یہ احتمال نہ ہو کہ کل کو اہل اسلام پر احسان رکھیں گے اور نہ یہ احتمال ہو کہ اہل اسلام ان کے ممنون ہو کر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے، اس شرط سے (غیر مسلموں کا مسجد و مدرسہ کے لئے چندہ) قبول کر لینا جائز ہے (امداد الفتاوی ۲/ ۶۶۴)۔

ہنود کا روپیہ مسجد پر لگانا اس شرط سے جائز ہے کہ وہ روپیہ کا مالک مسلمانوں کو بنادے اور پھر مسلمان اپنی طرف سے مسجد میں لگائیں بطور وقف کے ان کا روپیہ مسجد میں نہیں لیا جاسکتا۔ ہذا ہو حاصل ما فی وقف الذمی من الشامی وغیرہ (امداد المفتیین ۷۹۹، ۷۹۸)۔

کافر اگر قربت کی نیت سے مسجد تعمیر کرے یا مسجد کے لئے چندہ دے تو جائز ہے، البتہ اگر اس عمل کی وجہ سے مسلمانوں پر کفار کے افتخار و اظہار منت کا اندیشہ ہو تو ان کے اس عمل کو قبول کرنا جائز نہ ہوگا (احسن الفتاوی ۶/ ۴۴۰)۔

ھ- کبھی تو کسی کام میں شرکت اس لئے ہوتی ہے کہ شریک ہونے والے کے نزدیک اس کام کی عزت و وقعت بڑھے اور وہ بھی اس کام کے پسند کرنے والوں میں شمار ہو، یہ شرکت تو افعال کفر میں کفر اور افعال فسق میں فسق ہے، اور کبھی شرکت اس لئے ہوتی ہے کہ نفس فعل خواہ اس کے نزدیک گناہ اور عبث ہو مگر شریک ہونے والا اس کام کے کرنے والوں سے دوسرے وجوہ سے ملاپ رکھنا چاہتا ہے تو وہ ایسے کام میں شریک ہوجاتا ہے، حالانکہ اس کام کو غلط اور مہمل سمجھتا ہے تو ایسی شرکت اس کے لئے موجب کفر و فسق نہیں ہوتی، اب اگر اس کی مصلحت مقدم اور اعلی ہے تو شرکت مباح ہوجاتی ہے اور اگر یہ نہیں تو مکروہ رہتی ہے، ہندوؤں کے مذہبی میلوں میں مسلمان اس طرح شریک ہوں کہ ان کے کاموں کو مقدس سمجھیں ایسی شرکت غیر متصور ہے، ہاں ایسی شرکت کہ مسلمانوں کا ہندوؤں سے اختلاف نہ ثابت ہو، دونوں ایک ملک کے رہنے والے ہیں ان کی باہمی لڑائی مضر ہے، تو بشرطیکہ ان کے کسی مذہبی فعل کی طرفداری یا تعظیم نہ کریں مباح ہے اور بعض صورتوں میں جبکہ شریک کا مقصد کوئی اعلی ہو تو اباحت سے بڑھ کر وہ مستحب بھی ہوسکتی ہے۔

فرقہ وارانہ یکجہتی، خیر سگالی اور رواداری کی نیت سے غیر مسلموں کو ان کے تہواروں پر مبارکباد دی جاسکتی ہے۔

۳- الف: جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے اور اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتی ہے وہ ایک قومی عمل ہے، اس میں اصلاح ہوسکتی ہے مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ فعل قرار دینا صحیح نہیں (کفایت المفتی ۹/ ۳۳۸)۔

ب- وندے ماترم میں ارض وطن کی معبودیت کا تصور پایا جاتا ہے، ایسے مشرکانہ ترانے پڑھنا مسلمان کے لئے جائز نہیں (کفایت المفتی ۹/ ۲۳۶، ۲۳۸)

ج- مسلمانوں کو جہاں تک ہوسکے دار القضا کی طرف رجوع کرنا چاہئے، فریقین میں سے کوئی عدالت جائے تو وہاں مسلم پرسنل لا کو واضح کرنا چاہئے، اس کے باوجود غلط فیصلہ ہو تو اس کی اپیل کی جاسکتی ہے۔

۴- الف: سیاسی طرز فکر سے قطع نظر مفاہمت بین المذاہب کا کھلا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ مذاہب کے معاملہ میں ہر گروہ اپنا موقف چھوڑ کر ایک نئے موقف قبول کرنے پر آمادہ ہوجائے، اس قسم کی مفاہمت چونکہ مذہبی خودکشی کے مترادف ہے، اس بنا پر کسی مذہب کا ماننے والا بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوتا، پھر ایک طرف مذہب کے ماننے والوں کا یہ دعوی کہ صرف ان کا مذہب صحیح ہے بقیہ سب غلط ہیں اور دوسری طرف مذاہب کی موجودہ شکل کے درمیان ''بعد المشرقین'' کا اختلاف کہ ایک کو ماننے کے بعد قطعی طور پر دوسرے کا انکار لازم آئے، یہ دونوں حدیں ایسی ہیں کہ ان کی موجودگی میں مفاہمت بین المذاہب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، غالباً یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے مختلف مذاہب بت پرستی، یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت وغیرہ موجود تھے، لیکن ان کے درمیان مفاہمت کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔

قرآن حکیم سب سے پہلی کتاب ہے جس نے مفاہمت بین المذاہب کی بنیاد رکھی اور اس راہ کی مشکلات کو درج ذیل طریقوں سے حل کیا۔

"لا إكراه في الدين" (دین میں زبردستی نہیں)، "فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر" (جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے)۔

"ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم" (سورۂ أنعام)

(تم ان کو برا نہ کہو جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے (پوجتے) ہیں، ورنہ وہ بے سمجھے بوجھے حد سے تجاوز کر کے اللہ کو برا کہنے لگیں گے)۔

"شرع لكم من الدين ما وصى به نوحا والذي أوحينا إليك وما وصينا به ابراهيم و موسى و عيسى ان أقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه" (شوری) (تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کی نوح کو وصیت کی اور جس کی وحی ہم نے آپ کو بھیجی اور جس کی وصیت ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰ، اور عیسیٰؑ کو کی وہ یہ تھی کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو)۔

یہ آیتیں سابقہ شریعتوں کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے بارے میں رواداری کا حکم دیتی ہیں، یعنی ہر امت کو ہم ایک شریعت (دستور العمل) دے چکے ہیں آپ کو بھی ہم نے ایک شریعت دی ہے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس وقت کونسی شریعت بنیادی تعلیم سے ہم آہنگ اور قابل عمل ہے دراصل اسی میں سب کی آزمائش اور اسی میں کامیابی کا انحصار ہے۔

سابقہ شریعتوں میں تبدیلی کا ذکر دوسری آیتوں میں ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی شریعتوں میں تحریف ہو چکی، اس لئے وہ منسوخ کر دی گئیں، اور اب دین اسلام کی طرف دعوت دینا ضروری ہے یہی صراط مستقیم ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام نے اپنے دور عروج میں مختلف مذاہب کو جس قدر آزادی و سہولتیں دیں، موجودہ دور کی ترقی یافتہ سیکولر وغیر سیکولر حکومتیں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں، نیز ہر مذہب کو اپنی جگہ برقرار رکھ کر مفاہمت بین المذاہب کی جو راہ (وحدت دین) نکالی وہ موجودہ دور کی سیاسی راہ ''وحدت ادیان'' سے کہیں بلند اور قابل عمل ہے، موجودہ دور میں وحدت ادیان کے نام سے جو شکل نکالی گئی ہے وہ دراصل مذہب کے خلاف زبردست سازش اور چال ہے، مذہبی لحاظ سے اس کو قبول کرنا خود مذہب کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کرنا ہے، اسلام اس کی موجودہ شکل کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں (اسلام اور جدید دور کے مسائل، مولانا تقی امینی)۔

ب-جن علاقوں میں غیر مسلموں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو ظلم کا شکار بنائے ہوئے ہے، اور اس جگہ مسلمانوں کو اتنی استطاعت اور طاقت حاصل ہے کہ ان مظلوم طبقات کی مدد کرنے سے مسلمانوں کو ضرر لاحق نہیں ہوگا تو ان مظلوموں کا تعاون کرنا چاہئے۔

ج-عطیات اور رفاہ عام کے مد سے جو ہاسپیٹل یا رفاہی ادارے قائم کئے جائیں ان اداروں سے بلا تفریق مذہب غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچانا چاہئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمام مخلوق اللہ کے کنبہ کی طرح ہے، اس کے کنبہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا اللہ کو محبوب ترین ہے'' (مشکوۃ ۲/ ۴۲۵)۔

د-قدرتی آفات جیسے زلزلہ، سیلاب یا متعدی امراض وغیرہ سے متاثر ہونے والے سبھی لوگوں کی مدد کرنا بہتر ہے، لیکن جن علاقوں میں فرقہ پرست عناصر مختلف طبقات کے درمیان تفریق کریں اس وقت مسلمانوں کے چندوں سے دی جانے والی ریلیف صرف ان غریب محتاج مسلمانوں کو ہی دینا فرض ہوگا جن کو دوسری تنظیموں نے محروم کر دیا ہے، کیونکہ ان سے ہمارا دوہرا تعلق ہے ایک انسانی بھائی چارہ کا دوسری اسلامی اور ایمانی اخوت کا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام ایمان والے ایک انسان کی طرح ہیں اگر اس کی آنکھ میں تکلیف ہو تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے، اور اگر سر میں تکلیف ہو تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے

(رواہ مسلم مشکوۃ ۲/ ۴۲۲)۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا قاری ظفر الاسلام
(دار العلوم مئو)

۱- الف: ووٹ ایک امانت ہے اس امانت کی ادائیگی ضروری ہے۔

ساری صورتیں جائز اور درست ہیں، مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے جواہر الفقہ میں ایک مضمون تحریر فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: ''قرآن وحدیث کی روشنی میں ووٹ کی چند حیثیتیں ہیں، ایک شہادت کی یعنی وہ شخص شہادت دیتا ہے کہ نمائندہ اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت وامانت بھی، اگر واقع میں وہ شخص ایسا نہیں ہے تو وہ جانتے ہوئے ووٹ دیتا ہے تو جھوٹی شہادت دیتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی شہادت کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار کیا ہے (مشکوۃ)۔ اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر میں شمار کیا ہے (بخاری ومسلم)

دوسری حیثیت شفاعت اور سفارش کی ہے کہ ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، قرآن کریم میں ہے:

''ومن يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب لهن ومن يشفع شفاعة سئية يكن له كفل منها'' (سورۂ نساء: ۸۵)

ووٹ کی تیسری حیثیت وکالت کی ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۲۹۲،۲۹۱)، ووٹ نہ دینے کی صورت میں نیشنلٹی ختم ہونے کا بھی امکان ہوتا ہے۔

ب:...... چونکہ ان انتخابات سے مسلمانوں کے ملی و مذہبی مفادات متعلق ہیں اس لئے ووٹ دینا شرعاً واجب ہونا چاہئے، کیونکہ ملی و مذہبی مفادات کا تحفظ فرض ہے، مشہور مالکی فقیہ واصولی امام شاطبی تحریر فرماتے ہیں: ''فالضروریات هی الخمسة. حفظ الدین والنسل وغیرہ''۔

ج:...... باوجودیکہ علاقی نمائندے نیک ہوں پھر بھی انہیں ووٹ دینا قطعاً درست نہیں ہے، کیونکہ اسے ووٹ دے کر اس پارٹی کو مضبوط بنانا ہوا جس نے اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنا مشن بنالیا ہو، لہذا نہ تو اس پارٹی کو اور نہ ہی اس کے کسی نمائندے کو جو نیک خصلت اور ذاتی اعتبار سے ٹھیک ہو، ووٹ دینا درست ہے، اور پھر کیا یہ ضروری ہے کہ اس نمائندہ کے حالات کامیاب ہونے کے بعد پہلے ہی جیسے ہوں وہ تو پارٹی کے دستور کے مطابق کام کرے گا۔

د:...... انتخابات میں غیر مسلم سیاسی جماعتوں سے معاہدے اور ان میں شرکت مشروط طور پر نیز ان کے بائی لاز کو سامنے رکھ کر ہوسکتی ہے۔

''إذا ابتلی ببلیتین فلیختر أیهما أهون'' کا مشہور اصولی قاعدہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے۔

ھ:...... مسلمانوں کا غیر مسلم بھائیوں سے مل کر انسانیت کے نفع کے لئے کام کرنا اور معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا اور اچھی باتوں کی ترویج اور بری باتوں سے روکنا جائز ہے، دلیل میں ''حلف الفضول'' کا واقعہ موجود ہے جس میں فضل نامی شخص نے عہد کر رکھا تھا کہ مظلوم کی حمایت اور نصرت کی جائے گی اور ان کی اتباع بنو ہاشم و نبی نے کیا اور اس مقصد سے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اکٹھا ہوئے، عبد اللہ بن جدعان نے سب کے لئے کھانا تیار کرایا اس وقت سب نے مظلوم کی حمایت ونصرت کا عہد کیا کہ مظلوم خواہ اپنا ہو یا پرایا دیسی یا پردیسی حتی الوسع اس کی اعانت اور امداد سے دریغ نہ کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس معاہدہ کے وقت میں بھی موجود تھا، اس معاہدے کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ اونٹ بھی دیئے جاتے تو ہرگز پسند نہ کرتا اور اگر اب زمانہ اسلام میں بھی اس قسم کے معاہدہ کی طرف بلایا جاؤں تو بھی اس کی شرکت کو ضرور قبول کروں گا (سیرت المصطفی ۱/ ۹۵،۹۴)۔ متن دستور نبوی کے ۲۵ ویں دستور میں ہے: ''بنو عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایک امت ہیں، یہودیوں کے لئے ان کا دین اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین ہے یہی ضمانت ان کے موالی اور ان کے اپنے

لئے ہے مگر اس شخص کے سوا جو کوئی غلط کام کرے، یا غداری کا کام کرے وہ صرف اپنے لئے مصیبت پیدا کرتا ہے اور اپنے خاندان کے لئے'' (عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت از پروفیسر مظہر یسین/ ۱۳۴)۔

بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقینقاع کے یہود سے مدد لی تھی اور ان کو عطیہ بھی دیا تھا، واقدی کا بیان ہے کہ غزوہ خیبر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس یہودی بھی تھے (نصب الرایہ) جب جنگ میں غیر مسلمین سے مدد لی جاسکتی ہے تو صورت مسئولہ میں بدرجہ اولی تعاون لیا جاسکتا ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر حمید اللہؒ کے خطبات بھاولپور/ ۳۴۸)۔

۴- الف: میرے ناقص علم اور مطالعہ میں غالبا یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ مسلمانوں کو غیر مسلمین کی آبادی سے الگ تھلگ رہنا چاہئے، صلح حدیبیہ کے بعد جب کفار کا علی الاعلان مدینہ آنا جانا ہوا اور انہوں نے اسلامی اقدار کا قریب سے مطالعہ کیا تو جوق در جوق اسلام لانے لگے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ الگ بستی قائم نہ کریں اور حتی الوسع اپنے اخلاق کریمانہ واخوت انسانی سے ان کو متاثر کرتے رہیں۔

ب: سید جلال الدین عمری تحریر فرماتے ہیں: ''مشہور تابعی مکحول کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کے جنازہ میں شرکت فرمائی تھی، کنارے کنارے چلے، ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، اسی طرح ابووائل کہتے ہیں: میری ماں کا انتقال ہوا وہ نصرانیہ تھیں، میں نے حضرت عمرؓ سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا: جب اس کا جنازہ روانہ ہو تو تم سواری پر آگے آگے چلو''۔

حضرت مفتی محمود صاحبؒ نے تقریبات میں شرکت اور مردہ گھاٹ پر جانے کی اضطراری صورت میں اجازت دی ہے، تحریر کرتے ہیں: ''اگر بغیر اس کے گذارہ نہ ہو، حالات سے مجبور ہیں تو کم سے کم شرکت کریں اور جن جن چیزوں سے بچ سکتے ہیں بچنے کی کوشش کرتے رہیں، اور توبہ واستغفار کرتے رہیں'' (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/ ۴۷۲)۔ جب اضطراری صورت میں شرکت کرنے کے بعد بھی توبہ واستغفار کرنا ہے تو غیر مسلم میتوں پر قرآن خوانی کا جواز کیسے دیا جاسکتا ہے، اس لئے اس کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔

ج: بدون چڑھائی ہوئی اور بچہ کی پیدائش وشادی کی چیزیں ومٹھائیاں تو لی جاسکتی ہیں مگر چڑھائی ہوئی مٹھائیاں جنہیں پرشاد کہتے ہیں لینے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، آج کل دیپاؤلی کے موقع سے ہندو پرچیاں لوگوں کو دیدیتے ہیں کہ اتنی مٹھائی فلاں حلوائی کے پاس سے لے لیں یہ درست ہے، احادیث میں غیر مسلموں کو تحفے دینے اور تحفے قبول کرنے کا ثبوت ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک روایت ہے:

''أن كسرى أهدى له فقبل وإن الملوك أهدوا إليه فقبل منهم'' (ترمذی ۱/ ۱۹۱)۔

اسی طرح ابوداؤد میں ایک روایت ہے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدیہ دینے کا ثبوت ملتا ہے، نیز مشرکین سے ہدیہ کے عدم قبول پر بھی روایتیں ملتی ہیں:

''عن عبد الرحمن بن كعب بن مالك ورجال من أهل العلم أن عامر بن مالك الذي يدعى ملاعب الاسنه قدم على رسول الله ﷺ وهو مشرك فأهدى له فقال إني لا أقبل هدية مشرك'' (فتح الباری ۵/ ۱۴۴)

چونکہ روایات دونوں طرح کی ہیں، اس لئے اگر مسلمانوں کا مفاد اور غیر مسلمین کی تالیف قلب ہدیہ قبول کرنے میں ہو تو اسے قبول کرنا چاہئے۔

د: اگر وہ نیک نیتی کے ساتھ پن ودان کا کام سمجھ کر چندہ وغیرہ دیں تو لیتے وقت ان سے کہہ دیا جائے کہ اس کے بدل ہم چندہ وغیرہ نہیں دیں گے، نیز ہمارا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا، دوسری چیز یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے چندہ لینے سے ہی انہیں بھی دینا پڑتا ہے، اس لئے ہم حتی الوسع خود لینے سے اجتناب کریں، اس لئے مصلحت یہ ہے کہ خود لینے سے گریز کریں اور اگر کہیں لے رہے ہوں تو دھیرے دھیرے کمی کرتے جائیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ بند ہوجائے لیکن اگر کہیں مسلمان اتنے دبے کچلے ہوں کہ نہ لینے کے باوجود بھی انہیں دینا پڑے، نیز فساد فی الارض کا اندیشہ قوی ہو تو اضطراراً درست ہونا چاہئے، یا چندہ دیتے وقت یہ کہہ دیا کریں کہ اس رقم کا ہم نے آپ کو مالک بنا دیا۔

۵- (الف): ہندوؤں کے اکثر تہوار رام وکرشن سے متعلق ہیں، کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے رام وکرشن کو ہم پیغمبر نہیں مانتے، کیونکہ ان کا کردار قبل از تاریخ ہے اور ان کی تعلیمات پر پردہ بھی پڑا ہوا ہے۔ اور ''لكل قوم هاد'' کے تحت ہم ان کا انکار بھی نہیں کرسکتے، کیونکہ یہ بھی امکان ہے کہ یہ لوگ

اپنے زمانہ کے پیغمبر یا رشی منی رہے ہوں امتدادِ زمانہ و مرورِ ایام کے باعث ان کے ناموں میں غیر معمولی تغیر ہو گیا ہو جیسا کہ چند مثالوں سے ظاہر ہے، اس لئے ان کے تہواروں میں شرکت سے جہاں تک ہو سکے گریز اور کلی اجتناب کرنا چاہئے، ورنہ "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" کے تحت گناہگار ہوں گے۔

ب: مبارک باد دعا نہیں ہے، دعا کے لئے تو آشیرواد آتا ہے، پھر بھی اگر مبارک باد کی جگہ بدھائی کا لفظ استعمال کریں تو زیادہ موزوں ہوگا جیسے غیر مسلمین سے سلام کرتے وقت آداب کا استعمال کیا جاتا ہے، دوسری بات یہ کہ کوئی ہندو مسلمانوں سے مبارک باد کا مطالبہ تو نہیں کرتا، پھر بھی اگر ضرر یا تعلقات کی ناہمواری کا اندیشہ ہو تو بدھائی وغیرہ کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے، ویسے مطلقاً دعا دینے کا بھی ثبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی، اس نے وہ پیش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دعا دی کہ اللہ تمہیں حسین و جمیل رکھے، چنانچہ مرتے وقت اس کے بال سیاہ تھے (مصنف ابن عبدالرزاق ۱۰/ ۳۹۲)۔

۳- الف: جب ذی روح کو جھک کر سلام کرنے کی ممانعت ہے تو غیر ذی روح کے لئے کس طرح اجازت ہو سکتی ہے، اس لئے جھنڈے کو سلامی دینے سے احتراز کریں، اگر ضرورت شدیدہ ہو جس سے حرج میں پڑ جانے کا یقین ہو تو دل میں اسے برا سمجھتے ہوئے اور جھنڈے کی تعظیم دل میں نہ لاتے ہوئے سلامی دی جا سکتی ہے۔

دوسری وجہ جواز کی یہ بھی ہے کہ جھنڈے کو سلامی دینا آئین ہند یا اس ملک کے قوانین و دستور سے وفاداری کی علامت ہے، اس کی بنیاد پر اس شہری کو جان و مال و عزت و آبرو کی حکومت کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے، اگر سلامی نہ دی جائے تو اس ملک کے آئین سے بغاوت کا دفعہ لگایا جا سکتا ہے، اس لئے مشقت شدیدہ کے تحت درست ہونا چاہئے۔

ب: شریعت اسلامیہ ایسے ترانوں کا جس میں کفریہ و شرکیہ باتیں ہوں بالکل اجازت نہیں دیتی، برادران وطن کو اس پر مجبور بھی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ آئین ہند میں کچھ فنڈامینٹل حقوق ہیں جن کے اجزاء ہیں: رائیٹ آف ریلیجین (مذہبی حقوق)، رائیٹ آف فریڈم (حقوق آزادی)، رائیٹ آف ایکیولیٹی (حق مساوات) اور یہ حقوق ہر مذہب وملت کے ماننے والوں کو حاصل ہیں۔

ج: جس فریق کے حق میں عدلیہ نے ایسے فیصلے کئے ہیں جو شریعت اسلامیہ سے متصادم ہیں ایسے فیصلے سے استفادہ کی خواہ مدعی ہو یا مدعا علیہ ہرگز اجازت نہیں دینی چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم" (سورۂ نساء: ۶۵)، دوسری جگہ ہے: "ومن لم یحکم بما أنزل الله فاولئك هم الظالمون" (سورۂ مائدہ: ۴۵) دوسری آیت "هم الفاسقون" (۴۶) اور تیسری آیت "الكافرون" (۴۴) کی بھی ہے۔ ہاں اگر وہ مقدمہ مجتہد فیہ کے زمرہ میں آ سکتا ہے تو استفادہ کی گنجائش ملنی چاہئے، بشرطیکہ اس کا فیصلہ شریعت حق کے معارض نہ ہو۔ اسلامی عدالت (۱/ ۳۵۸، ۳۵۹) پر قاضی اول کے فیصلہ کو قاضی ثانی کے رد کرنے و نہ کرنے کی بابت تفصیلی طور پر موجود ہے جسے حضرت قاضی صاحبؒ نے بدائع الصنائع کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے، حضرت موصوف کی اسی تحریر سے عام لوگوں کے استفادہ نہ کرنے و نہ کرنے کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

۴- الف: یہ ایک طرح کا دھوکہ ہے، وحدت ادیان و انضمام ملل کی کہیں سے کلیۃً کوئی بھی اجازت نہیں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: "قل یا ایها الكافرون" سے "لكم دینكم ولي دین" (سورہ کافرون) دوسری جگہ ارشاد ہے: "ومن یبتغ غیر الإسلام دینا فلن یقبل منه" (سورۂ آل عمران: ۸۵) "ألا لله الدین الخالص" (زمر: ۳) "إن الدین عند الله الإسلام" (آل عمران: ۱۹) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید کے طور پر ارشاد فرمایا: "من تشبه بقوم فهو منهم" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خالفوا الیهود . . . الخ" جس مذہب میں اپنا تشخص اور امتیاز باقی رکھنے کی اور دوسرے ادیان وملل سے ممتاز رہنے کی تاکید قدم قدم پر موجود ہو وہ انضمام کی کب اجازت دے سکتا ہے۔

ب: مظلوم کے استحصال اور اس پر ہونے والے مظالم کا سد باب چاہے وہ کوئی مذہب وملت رکھتا ہو انسانی برادری کی وجہ سے ضروری ہے۔ شیخ وہبہ زحیلی اسے انسانی حق قرار دیتے ہیں جس کی ادائیگی ضروری ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ للدکتور وہبۃ الزحیلی ۴/ ۱۴)۔

جلد ۶ ر ۳۳ پر مصنف بن عبدالرزاق میں ہے: "تجوز وصیة المسلم للنصراني" (نصرانی کے لئے مسلمان کی وصیت جائز ہے)۔

اسی طرح علامہ ابوعبید فرماتے ہیں: ''یزید أن الله تعالی قد حمد علی الطعام المشرکین'' (کتاب الاموال لابی عبید: ۵۴۳) (اللہ تعالی نے مشرکین کو کھانا کھلانے پر تعریف فرمائی ہے)، الحاصل جب غیر مسلم کو وصیت تک کیا جا سکتا ہے اور اطعام طعام پر ثواب ہے تو اس پر ہونے والے مظالم کا دفاع کرنے میں بھی ثواب ہوگا اور اس کی اجازت ہوگی۔

ج: جنگ بدر میں ستر قید کئے ہوئے کفار و مشرکین کو جن جن صحابہ کرام کے حوالہ کیا گیا تھا ان سے حسن سلوک کی آپ نے تاکید فرمائی تھی۔

الجار الجنب کی تفسیر میں علامہ قرطبی تحریر فرماتے ہیں:

''فالوصاۃ بالجار مامور بها مندوب إليها مسلما كان أو كافرًا'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵/ ۱۸۴)

نیز تفسیر ابن جریر ۵/ ۵۱ پر تحریر ہے: ''وأولى القولين في ذلك بالصواب قول من قال معنى الجنب في هذا الموضع الغريب البعيد مسلما كان أو مشركا يهوديا كان أو نصرانيا''۔

حضرت قتادہ ایک عمومی بات بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ جو لوگ ہمارے ہم مذہب نہیں ہیں کیا ان پر بھی انفاق کیا جا سکتا ہے، اس پر آیت "وما تنفقوا من خير فلأنفسكم وما تنفقوا من خير يوف إليكم وأنتم لا تظلمون" نازل ہوئی (تفسیر ابن جریر ۵/ ۵۸۸)۔

مذکورہ تمام آیات قرآنیہ و احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ بلا تفریق مذہب و ملت اس طرح کے ہاسپٹل سے سب کو حق انتفاع ملنا چاہئے، ہاں اگر کوئی غیر مسلم مسلمانوں کی ایذاء رسانی و ضرر رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھتا ہو اور دین و اسلام کا پکا معاند اور دشمن ہو تو بندہ کے خیال میں ایسے مریضوں کو حق انتفاع نہیں ملنا چاہئے۔

د: راقم کی رائے یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ مسلمانوں سے امتیاز و تعصب سے کام لیں پھر بھی مسلمانوں کے فلاحی و رفاہی اداروں نیز ریلیف کا کام کرنے والی تنظیموں کو چاہئے کہ اس مصیبت اور نازک گھڑی میں ہر مذہب و ملت کو جہاں تک ہو سکے امداد پہنچانے کی کوشش کریں، برادران وطن کی اس امداد سے امکان ہے کہ ان کا دل اسلام کی طرف مائل ہو جیسا کہ ثمامہ بن اثال امیر نجد نے اسلام لانے کے بعد غلہ کی سپلائی مکہ کو بند کر دی تھی (جبکہ مکہ میں شدید قحط آیا ہوا تھا اور اہل مکہ بے حد متاثر تھے) چنانچہ اہل مکہ مدینہ کو ایک وفد بھیجتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ اے محترم ہمیشہ نیکی، مہربانی اور محبت کی تعلیم دیتے رہو، اب اپنے ہم وطنوں و ہم شہریوں پر رحم کرو، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ثمامہ کو ایک خط بھیجتے ہیں کہ غلہ کی بندش اٹھائی جائے اس کا مکہ والوں کے دل پر اثر ہونا چاہئے تھا اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تھا کہ ان کو اسلام کی طرف مائل کریں، اس کے بعد صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ مدینہ سے پانچ سو اشرفیاں جو اس زمانہ کی ایک بڑی رقم تھی مکہ کے سردار ابوسفیان کو بھیجتے ہیں کہ غربا کی امداد کے لئے بھیج رہا ہوں (خطبات بھاولپور از ڈاکٹر حمید اللہ/ ۲۸۴، ۲۸۵)

یہ تمام داد و دہش تو صرف تالیف قلب ہی کے لئے تھی، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ فرقہ پرست عناصر اس طرح کے اقدام سے آئندہ احتیاط برتیں۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

مولانا محمد ظفر عالم ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ

ا- اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان اپنی کوتاہی اور اجتماعی قوت کی کمی کی وجہ سے بہت سی ان نعمتوں سے محروم ہو گئے جو ان کو ظہور اسلام کے بعد صدیوں تک حاصل رہیں، مسلمانوں کے ہاتھوں سے ان کی حکومتیں یکے بعد دیگرے نکلتی گئیں اور یورپ کے افکار و خیالات اور ان کا بنایا ہوا نظام حکومت آہستہ آہستہ دنیا کے ممالک میں داخل ہوتا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا کی زیادہ تر حکومتیں جمہوری طرز کی ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان پوری دنیا میں ایک معتد بہ تعداد میں موجود ہیں، اور بیشتر ممالک میں زندگی بسر کر رہے ہیں، بہر حال جن جمہوری طرز کے ممالک میں مسلمان آباد ہیں، ان کے لئے جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل فقہ اسلامی کی روشنی میں ضروری ہے، ذیل میں سوالنامہ میں قائم کردہ سوالات کے جوابات درج کئے جا رہے ہیں۔

الف:...... جمہوری طرز کی حکومتوں میں مسلمانوں کے لئے اپنی دینی اور ملی حیثیتوں کو برقرار رکھنے اور اپنی تہذیب وتشخصات کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر ممکن جدوجہد جاری رکھیں، انہیں جدوجہد اور کوششوں میں ایک کوشش الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی مفید اور امانت دار امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا ہے، میرے نزدیک دین وملت، اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی امتیازات اور تشخصات کی حفاظت کی خاطر الیکشن میں حصہ لینا اور قوم وملت، انسانیت اور مسلمانوں کے حق میں مفید امیدوار کو ووٹ دینا اور اگر ضرورت ہو تو دیانتدار اور مفید امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز ہی نہیں واجب ہے، البتہ اس میں بذات خود امیدوار بننا ہر فرد کی اپنی صلاحیت وقوت اور حالات پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ میرا امیدوار بننا قوم وملت اور ملک ومعاشرہ کے لئے دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے تو اسے امیدوار بننے کا شرعاً حق حاصل ہے، لیکن اگر وہ خود یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کے مقابلہ میں قوم وملت اور ملک وسماج نیز مسلمانوں کے حق میں دوسرا شخص زیادہ مفید ہے بلکہ اس کے امیدوار بننے سے مسلمانوں اور قوم وملت کا نقصان اور دوسرا غیر مفید شخص درمیان میں کامیاب ہو سکتا ہے تو پھر ایسی صورت میں امیدوار بننا شرعاً درست نہ ہوگا، اور اگر حالات ایسے ہوں کہ کوئی مفید شخص میدان میں نہ ہو اور کسی اچھے اور مفید فرد کے نہ ہونے کی وجہ سے قوم وملت اور مسلمانوں کا نقصان یقینی ہو اور اپنے بارے میں مفید بننے کا پورا یقین ہو تو ایسی صورت میں امیدوار بننا واجب اور ضروری ہے، غرضیکہ یہ حکم حالات پر مبنی ہے۔

ب- الیکشن سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی امور جب وابستہ ہوں تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے کسی مفید اور دیانت دار شخص کے حق میں ووٹ دینا واجب ہے۔

ج- اسلام میں فرد کے مقابلہ میں جماعت کے مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے، ممکن ہے کہ اسلام اور مسلمان دشمن پارٹی کے بعض افراد نیک طبیعت ہوں اور ان سے بعض مسلمانوں کا انفرادی فائدہ بھی ہو، لیکن چونکہ پارٹی کا کوئی فرد پارٹی کی مجموعی اور بنیادی پالیسی سے علاحدہ کوئی پالیسی نہیں اختیار کر سکتا ہے اور اہم امور میں اس پارٹی کی پالیسی اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہوگی جس سے مسلمانوں کا ملی اور مذہبی نقصان ہوگا، لہذا ایسی پارٹی کا کوئی امیدوار یا فرد خواہ جس قدر نیک نظر آئے اس کو ووٹ دینا یا اس پارٹی میں کسی مسلمان کا شامل ہونا شرعاً جائز نہ ہوگا۔

د- ایسی سیاسی پارٹی جو مسلمانوں کے تئیں ہمدردی رکھتی ہو اور اس کی پالیسی میں مسلمانوں کے خلاف کوئی نظریہ نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کے بارے میں نرم رویہ ہو تو بلاشبہ ملی مفادات کے تحت ایسی پارٹی سے معاہدے، اس میں شرکت اور اس کی حمایت جائز ہوگی۔

ھ-سماج میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے لئے اگر غیر مسلموں کی ضرورت ہو اور غیر مسلموں میں انصاف اور امن پسند افراد موجود ہوں تو ان کے اشتراک سے کام کیا جاسکتا ہے اور تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی تنظیم اور تحریک ''حلف الفضول'' میں بعثت سے قبل بھی شرکت کی ہے اور بعثت کے بعد یہ فرمایا کہ اگر آج بھی مجھے اس طرف بلایا جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔

''ولو ادعی به فی الاسلام لأجبت'' (سیرت ابن ہشام ۱/ ۱۳۴)۔

۲- الف: غیر مسلم ممالک اور معاشرے جن میں غیر اسلامی تہذیب وتمدن کا غلبہ ہو، اگر غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان رہائش اختیار کریں تو اس کا امکان ضرور ہے کہ غیر مسلم بھائی مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور اسلامی اخلاق واقدار سے متاثر ہوں لیکن اس امکان سے کہیں زیادہ اس کا خدشہ رہتا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کی تہذیب اور عادات ورسومات اختیار کرلیں، ظاہر بات ہے دوسرا پہلو زیادہ مضر اور خطرناک ہے، لہذا ''دفع المضرة أولى من جلب المنفعة'' کے تحت مسلمانوں کے لئے اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا اور رہائش اختیار کرنا بہتر ہے۔ اس سلسلے میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً منقول ہے:

''أنا بریء من کل مسلم أقام مع المشرکین لاترای ناراهما'' (مرقاۃ شرح مشکاۃ ۷/ ۱۱۵) (مجمع الزوائد ۵/ ۲۵۹)
(میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے ساتھ مقیم ہو ان دونوں کی آگ ایک دوسرے کو نظر نہ آئے)۔

ان نبوی روایات وہدایات سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمان اپنی آبادیوں کے لئے ایسے خطے بنائیں جن میں مسلمانوں اور ان کی نسلوں کو اسلامی ماحول اور اسلامی تہذیب وثقافت مل سکے تو وہ غیر مسلموں کی غیر اسلامی تہذیب اور ان کے طرز رہائش اور ان کے افکار وخیالات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں، اس صورت میں مسلمانوں کے دینی مفادات کے ساتھ بعض حالات میں ان کی جان ومال، عزت وآبرو دینی مراکز اور عبادت گاہوں کی بھی حفاظت ہے۔

ب-غیر مسلم دوست یا پڑوسی کے یہاں کسی کا انتقال ہوجائے تو مسلمانوں کے لئے ان کی تعزیت کرنا درست ہے، فقہاء نے تعزیت کے لئے مناسب کلمات بھی ذکر کئے ہیں:

''إذا مات الکافر قال لوالده أو قریبه فی تعزیته أخلف الله علیك خیرًا منه وأصلحك أی أصلحك بالإسلام ورزقك ولدا مسلما'' (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۸)۔

لیکن ان کی میت کی آخری رسومات میں مسلمانوں کی شرکت درست نہیں اور نہ ہی قرآن پڑھ کر ان کے لئے ایصال ثواب کرنا درست ہے، اس سلسلہ میں قرآنی ہدایت بھی موجود ہے:

"ولا تصل علی أحد منهم مات أبدا ولا تقم علی قبره إنهم کفروا بالله ورسوله وماتوا وهم فاسقون" (سورۂ توبہ/ ۸۴)۔

اس آیت میں غیر مسلموں کی نماز جنازہ پڑھنے اور ان کی قبر پر کھڑے ہونے سے منع کیا گیا ہے، قبر پر کھڑا ہونا آخری رسوم میں شرکت کرنا ہے جس سے صراحۃً منع کیا گیا ہے، نماز جنازہ کا مقصود بھی مُردہ کے لئے استغفار اور نجات کی دعا کرنا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کے انتقال پر قرآن مجید کی تلاوت کا مقصد اس کے لئے دعاء مغفرت اور ایصال ثواب ہی ہے اور آیت میں اس کی ممانعت ہے۔

فقہاء کرام لکھتے ہیں: ''ولا یدعو للذمی بالمغفرة'' (فتاوی ہندیہ ۵: ۳۸۴) (یعنی ذمی کافر کے لئے دعا مغفرت نہیں کی جائے گی)۔

ج-غیر مسلموں کے پرشاد اور اس طرح کے مذہبی چڑھاوے کی چیزیں مسلمانوں کے لئے کھانا اور قبول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ "ما ذبح علی النصب" کے تحت ممنوع اور حرام ہیں، ہاں! قبول نہ کرنے کی صورت میں فتنہ کا اندیشہ ہو تو فتنہ سے بچنے کے لئے بادل ناخواستہ اسے لے لیا جائے پھر بعد میں اسے ضائع کردیا جائے۔

د-مساجد ومدارس میں غیر مسلموں کا تعاون ایسی صورت میں قبول کرنا کہ ان کے تہواروں اور عبادت گاہوں میں بھی مسلمانوں کو تعاون کرنا پڑے،

درست نہیں ہے۔

ھ۔الف: مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں شرکت کرنا درست نہیں ہے۔

ب۔غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں میں ان کو مبارکبادی دینا مسلمانوں کے لئے درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے شرک اور غیر اسلامی رسومات کی تائید وتحسین ہوگی جو قطعاً جائز نہیں ہے۔

۳۔ الف: کسی ملک کے جھنڈے کو سلامی دینے کا مقصد اس کے احترام کا اظہار ہوا کرتا ہے، بلاشبہ یہ ایک لا حاصل احترام ہے، اگر چہ اس میں بندگی وعبادت مقصود نہیں پھر بھی اس طرح کی تکریم شریعت اسلامی کی روح کے خلاف ہے، اس لئے یہ کراہت سے خالی نہیں۔

ب۔ایسے قومی ترانے جو مشرکانہ مضامین پر مشتمل ہوں جیسے ہندوستان میں وندے ماترم، بلاشبہ ان کا پڑھنا مسلمانوں کے لئے قطعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اسلام کے بنیادی عقائد اور اساسی فکر کے خلاف ہے۔

ج۔اگر غیر اسلامی عدلیہ ایسے مقدمہ میں جس میں دونوں فریق مسلمان ہیں ایسے شواہد کی بنیاد پر فیصلہ کردے جو شرعاً معتبر نہیں ہیں تو جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اس کے لئے اس سے استفادہ کرنا جائز نہیں ہے۔

۴۔ الف: اسلامی نقطۂ نظر سے یہ فکر صحیح نہیں کیونکہ اسلام وحدت دین کا قائل ہے نہ کہ وحدت ادیان کا، "إن الدين عند الله الإسلام" (سورۂ آل عمران: ۱۹) دوسری آیت ہے: "ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه" (سورۂ آل عمران: ۸۵)۔غرض یہ کہ یہ فکر کہ تمام مذاہب کی حیثیت ایک ہی منزل تک جانے والے مختلف راستوں کی ہے شرعاً درست نہیں ہے، اور اس کو کسی درجہ میں بھی قبول نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ب۔اسلام مظلوموں کی مدد کی تاکید کرتا ہے، بلاشبہ ان کی مدد کرنا اور ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنا مسلمانوں کا ایک اہم دینی فریضہ ہے، جس سے پہلو تہی اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جہاں ان کی مدد کی جاسکتی ہے اس کے باوجود مدد سے گریز کیا گیا تو بلاشبہ وہ عند اللہ جوابدہ ہوں گے۔

ج۔مسلمان جو ادارہ خدمت خلق کے لئے قائم کریں مثلاً ہاسپٹل وغیرہ ان کو تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذاہب واقوام کھلا رکھنا چاہئے، صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں کرنا چاہئے۔

د۔مسلم تنظیموں کو انسانی بنیادوں پر بلا تفریق مذہب وملت تمام متاثر لوگوں کا تعاون کرنا چاہئے۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا سلطان احمد اصلاحی (علی گڑھ)

۱- الف: دنیا کے وہ جمہوری ممالک جن میں انتخابات کے ذریعہ حکومت بنتی ہے، جس کی نمایاں مثالوں میں امریکہ اور ہندوستان کو پیش کیا جاسکتا ہے، ایسے تمام ممالک میں مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ شرعاً واجب ہے، ایک مسلمان کے لئے کمزوری کے مقابلے میں طاقت اور ضعف کے مقابلہ میں قوت ہر طرح سے مطلوب ہے، حدیث میں صاف طور پر قوی مومن کو ضعیف مومن سے بہتر کہا گیا ہے۔

''المؤمن القوی خیر وأحب إلی الله من المؤمن الضعیف'' (سنن ابن ماجه، مقدمه باب القصد، طبع قدیم)۔

قرآن کریم میں ہے: "قل اللهم مالك الملك تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدك الخیر إنك علی كل شيء قدیر" (آل عمران:۲۶)) کوئی وجہ نہیں کہ اس قوت میں سیاسی قوت کو شامل نہ کیا جائے، مزید برآں کتاب اللہ میں حکومت واقتدار کو عزت کی علامت اور اس سے محرومی کو ذلت سے تعبیر کیا گیا ہے، (آل عمران)

اس لئے اس ذلت کے مقابلے میں اقتدار کی عزت کا حصول ہر طرح سے مطلوب ہے، اس سے ہٹ کر ہندوستان جیسے ملکوں کے پس منظر میں مسلمانوں کے لئے اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ اور اپنے دیگر شہری حقوق کا حصول بھی بہت کچھ اس پر موقوف ہے کہ انتخابی سیاست سے اقتدار کے مراکز تک ان کی پہنچ اور اس پر ان کی پکڑ مضبوط سے مضبوط تر ہو، پس جب جان ومال کا تحفظ واجب ہے تو معروف قاعدہ فقہیہ:

''مالا یتم الواجب إلا به فهو واجب'' (ابن تیمیه (م۷۲۸ھ) السیاسة الشرعیه فی اصلاح الراعی والرعیة/ ۲۲، القاهره۔

امام غزالی (م۵۰۵ھ) کے یہاں یہ قاعدہ فقہیہ ان لفظوں میں ہے، جس سے یہ مزید کھلتا ہے:

''مالا یتوصل إلی الواجب إلا به وهو فعل المكلف فهو واجب'' (المستصفی / ۸۷، مكتبة الخیر مصر)

کے بموجب اس کے حصول کے لئے انتخابی سیاست کے طریقے پر عمل بھی اسی طرح واجب ہوگا، اس کی بدولت اقتدار کے مراکز میں حکیمانہ طریقے پر اسلام اور اسلامی شریعت کی ترجمانی کا جو موقع فراہم ہوگا، اس سے مزید اس کی اضافی ضرورت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، ہندوستان جیسے ملکوں کے دستور کا حلف اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کی بنیاد الحاد اور انکار خدا پر نہیں ہے، بلکہ عقیدے اور مذہب پر عمل کی آزادی اس کی بنیادی دفعات سے ہے، مسلمان اس کا حلف اسی کی نیت سے اٹھائے گا، اور حدیث کی صراحت ہے:

''إنما الأعمال بالنیات'' (صحیح البخاری جلد ۱، كتاب بدء الوحی باب كیف كان بدء الوحی إلی رسول الله ﷺ، طبع جدید، المطبعة السلفیه ومكتبة القاهره طبع اول ۱۴۰۰ھ)۔ پارلیامنٹ میں شریعت کے مغائر اگر کوئی قوانین پاس بھی ہوتے ہیں تو اس کے روکنے کا موثر ذریعہ ہے کہ اسی پلیٹ فارم سے اس کے برعکس کی وکالت کی جائے۔

ب: ہندوستان جیسے ملکوں میں مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات کے تحفظ کے لئے ان کا ووٹ دینا شرعاً واجب ہے، جیسا کہ اوپر (الف) میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

ج: مسلمان مخالف سیاسی جماعتوں کے نیک خصلت اور مسلمانوں کے ہمدرد امیدوار کے حق میں جماعتی فکر سے قطع نظر اس کے ان ذاتی اوصاف کی بنیاد پر ووٹ دینا جائز ہوگا، اسی طرح آر ایس ایس اور وی ایچ پی اور بجرنگ دل جیسی جماعتوں کو چھوڑ کر اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی نیت سے

مسلمانوں کا ایک طبقہ اگر بھاجپا میں شامل ہوتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس مقصد سے اس شمولیت کو درست قرار دیا جائے گا۔

د: انتخابات کے موقع پر ملی مفادات کے تحت غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے میں شرعاً کوئی قباحت تو نہیں ہے، لیکن ہندوستان جیسے ملکوں کے لئے یہ مطابق مصلحت نہیں ہے، معاہدے سے ہٹ کر ان میں شرکت اور ان کی حمایت کی پالیسی کو اختیار کرنا چاہئے، بلکہ اسی کا نام سیاست ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں کسی مسلمان ادارے، فورم یا تنظیم کا کسی خاص سیکولر جماعت سے اپنے کو وابستہ کر لینا مصلحت کے خلاف ہے، اس کا فائدہ کم نقصان زیادہ ہے، سیکولر پارٹیوں کے پلیٹ فارم سے ہی مسلمانوں کی سیاست زیادہ موثر اور کارگر اور نقصانات سے محفوظ تر ہے، اس لئے اسی پر زیادہ توجہ ہونی چاہئے۔

ھ: سماج کی مشترکہ ذمہ داریوں اور اچھی باتوں کی ترویج اور منکرات کو روکنے کے لئے غیر مسلموں کے اشتراک کے ساتھ کام کیا جا سکتا ہے، اور ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کی جا سکتی ہیں جن میں مسلمانوں اور غیر مسلم بھائیوں کا اشتراک ہو، حیات طیبہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں حلف الفضول کے معاہدے اس کے حق میں نظیر ہے، جس کے لئے نبوت کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر آج بھی مجھ کو اس جیسے کسی معاہدے کے لئے طلب کیا جائے تو میں اس کے لئے تیار ہوں یہاں تک کہ یہ میرے لئے عرب کے قیمتی ترین مال سرخ اونٹوں سے بھی عزیز اور محبوب ہوگا۔

(ابن ہشام: السیرۃ النبویہ ۱ / ۱۴۸، ۱۴۹، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ ہیں: "لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم ولو ادعى به في الإسلام لأجبت" ص ۱۴۹، دار الفکر، القاہرہ)۔

۳- الف: آج کے حالات کے پس منظر میں نئی آبادیاں بسانے کی صورت میں مناسب ہے کہ وہ مسلمان اکثریتی ہوں، البتہ غیر مسلموں کے لئے اس کے دروازے کو بالکل بند نہ رکھا جائے، اس صورت میں دونوں فائدے حاصل ہو جائیں گے، مسلمان غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے بھی محفوظ رہیں گے ساتھ ہی ان کے لئے غیر مسلموں کو اپنے اخلاق و کردار سے متاثر کرنا بھی آسان ہوگا، غیر مسلموں کو اسلامی اخلاق و کردار سے متاثر کرنے بلکہ اس سے آگے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کے مقصد سے ملک کی موجود مخلوط مسلمان غیر مسلم آبادی کافی ہے، البتہ اس میں بھی جہاں کہیں غیر مسلم اکثریت میں ہوں اور مسلمان گھرا کا دکا ہوں اور ناموافق حالات میں جان و مال کا یقینی خطرہ ہو تو اس طرح کی صورت حال میں بادل ناخواستہ ہی سہی مسلمان کو وہاں سے ہٹ کر مسلمان اکثریتی علاقے میں آباد ہو جانا مناسب اور بہتر ہے جبکہ بعض حالات میں ایسا کرنا واجب ہوگا۔

ب: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محبوب غیر مسلم چچا کے انتقال کے موقع پر ان کے صاحبزادے حضرت علیؓ سے کہا کہ جاؤ اور اس نعش کو مٹی میں دبا کر آجاؤ (ابن کثیر البدایہ والنہایہ ۲، ۳/ ۱۲۳، جہاں اصل الفاظ ہیں: اذهب فواره، جس کے ظاہر کا تقاضا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے ساتھ اپنے مشرک چچا کی تدفین کے لئے نہیں گئے، البتہ اسی موقع پر آگے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے: "أن النبي ﷺ عاد عن جنازة أبي طالب" اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازہ کے ساتھ گئے، لیکن اسی موقع پر صراحت ہے: "ولم يقم على قبره" دونوں کے درمیان تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں گئے اور دور سے ہی واپس آگئے، پہلی روایت سنن ابوداؤد اور سنن نسائی کی ہے)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدمت کے ساتھ گئے نہ اس کے دفن میں کوئی شرکت اور معاونت کی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان غیر مسلم کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکتا، مخصوص حالات میں "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت محدود دائرے میں اس کی اجازت دی جائے تو بات علاحدہ ہے۔ غیر مسلم پڑوسی اور غیر پڑوسی کی عیادت اور تعزیت البتہ کی جا سکتی ہے سلف سے اس کی نظیر موجود ہے (نصرانی کی عیادت اور اس کے جنازے کی متابعت کی بابت استفتاء پر علامہ ابن تیمیہ کا جواب:

"لا يتبع جنازته، أما عيادته فلا بأس بها فإنه قد يكون في ذلك مصلحة لتأليفه على الإسلام، فإذا مات كافرا فقد وجبت له النار ولهذا لا يصلى عليه" (فتاوی ابن تیمیہ ۲۴/ ۲۶۵، طبع جدید سعودی عرب، ترتیب: عبد الرحمن بن قاسم وابنہ محمد۔ تعزیت کے سلسلہ میں حضرت امام ابوحنیفہ کا فتویٰ اور حضرت حسن بصریؒ کی عملی نظیر ہے: امام ابویوسف: کتاب الخراج ۱۲۱، ۲۲۶ مصر، طبع ثانی ۱۳۵۲ھ)۔

غیر مسلم میت کے لئے قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ج: غیر مسلموں سے ان کے تہوار اور غیر مذہبی تقریب کے موقع پر مٹھائی اور تحفہ وغیرہ قبول کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ حلال و طیب ہو اور اس میں کسی حرام کی شمولیت نہ ہو، تہوار، غیر تہوار کسی بھی موقع پر بت پر چڑھائے ہوئے غیر مسلم کے کسی تحفہ اور پرشاد کو مسلمان کے لئے کسی حال میں کھانا جائز نہیں ہے، مصلحت کے تقاضے سے اس کو قبول کر لیا جائے تو بعد میں اس کا ضائع کر دینا واجب ہے، ویسے جہاں تک ہو سکے اس کو قبول کرنے سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔

د: معروف مسلک کی حیثیت سے مسجد کی تعمیر اور مرمت میں غیر مسلم کا تعاون قبول کرنا جائز ہے، اس سے مسلمانوں کے مدارس اور ان کے مذہبی جلسوں وغیرہ میں ان کا تعاون قبول کرنا بدرجہ اولی جائز قرار پاتا ہے، غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اسی طرح ان کے مذہبی تیوہاروں اور جلسوں وغیرہ کے لئے مسلمان تعاون کر سکتے ہیں، البتہ کسی مقام کی مخصوص صورت حال اس کے برعکس کا مطالبہ کرتی ہو تو اس کا لحاظ کیا جاسکتا ہے۔

ھ: الف- رمضان المبارک کی افطار اور عید وغیرہ کی ملی جلی تقریبات میں مسلمان شریک ہو سکتے ہیں۔

ب- غیر مسلموں کو ان کے تیوہار پر مبارکباد دینا درست ہے، بلکہ خیر سگالی کے جذبہ کے فروغ کے مقصد سے اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

۳- الف: اپنے ملک کے جھنڈے کو سلامی دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ایک مسلمان کی طرف سے ایسے موقع پر نیت یہ ہونی چاہئے کہ اس کا ملک جس کا یہ جھنڈا ہے وہ خوش حال اور شاداب اور آفتوں اور بلاؤں سے محفوظ رہے، غیر مسلم اکثریتی ملک ہونے کی صورت میں اللہ تعالی اس کے ان باشندوں کو اسلام کی طرف راغب ہونے کی توفیق عطا کریں، "إنما الأعمال" الخ کے فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب اس نیت سے جھنڈے کی سلامی دی جاسکتی ہے۔

ب: مشرکانہ مضامین کے ترانے کا کسی مسلمان کے لئے پڑھنا جائز نہیں ہے، ارض وطن کی معبودیت کے داعی "وندے ماترم" کے خلاف مسلم عوام اور عمائدین کو منظم جدوجہد کرنی چاہئے، اس کے لئے میڈیا کی پوری طاقت استعمال کرنی چاہئے، اور پورا دباؤ بنانا چاہئے اور جس اسکول اور کالج میں اس کا پڑھنا لازمی قرار دے دیا گیا ہو وہاں سے اپنے بچے کو نکال لینا چاہئے۔

ج: عدالت کے ذریعہ فیصلہ حق دار کے بجائے غاصب اور ظالم کے حق میں ہو جائے اس کا امکان تو اسلامی عدالت میں بھی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں خود اس کی صراحت ہے کہ ایک شخص اپنی چرب زبانی کی بدولت حق دار فریق پر غالب آجاتا ہے اور میں اسی کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں لیکن اس طریقے سے وہ جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے

(صحيح البخاری جلد ۲ كتاب المظالم والغصب، باب إثم من خاصم فی باطل وهو يعلمه، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ ہیں: ''إنما أنا بشر وإنه يأتيني الخصم فلعل بعضكم أن يكون أبلغ من بعض، فأحسب أنه صدق فأقضي له بذلك، فمن قضيت له بحق مسلم فإنما هي قطعة من النار، فليأخذها أو ليتركها'')

اس معروف حدیث نبوی میں سیکولر عدالت سے بھی جیت جانے والے غیر حقدار فریق کے لئے عبرت ہے، جس سے اس کا تقوی اور خوف خدا ہی اس سے باز رکھ سکتا ہے، حرام کا تعین ہونے کی صورت میں اس سے استفادہ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔

۴- الف: مذہب کو انسان کی پرائیویٹ زندگی کا معاملہ قرار دینا، اسی طرح وحدت ادیان کا نظریہ اس زمانے کے دو بڑے فتنے ہیں، سچے مسلمان کے لئے یہ دونوں ناقابل قبول ہیں اور ان کے سلسلے میں کسی بھی طرح کی نرمی اور لچک برتنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔

ب: اسلام کمزوروں کا دین ہے، اور کمزوروں کو اوپر اٹھانے میں اس کا تاریخی کردار ہے، سنن ابوداؤد کی مشہور حدیث قدسی ہے: مجھ کو کمزوروں میں تلاش کرو، تم کو روزی اور مراد انہیں کے طفیل میں حاصل ہوتی ہے: ''أبغوني الضعفاء فإنما ترزقون وتنصرون بضعفائكم'' (سنن ابوداؤد جلد ۱، كتاب الجهاد باب الانتصار)، اس لئے یورپ اور افریقہ کے کالے ہوں یا ہندوستان کے دلت اور آدیباسی، انسانی اخوت کے رشتے سے مسلمان کا ان کے کام آنا اور ان کی امداد و تعاون کرنا ہر طرح سے مطلوب ہے، حکومت اپنے ہاتھ میں نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے طور پر وہ ان کے سلسلے میں جو کچھ کر سکیں وہ ہر طرح سے پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ان کے اوپر فرض و واجب ہے۔

ج: مسلمانوں کے قائم کردہ اسپتال جیسے خدمت خلق کے اداروں کو غیر مسلموں کے لئے کھلا رکھنا چاہئے، مسلمانوں کے لئے ان کو مخصوص نہیں کرنا چاہئے، اس مقصد سے بہتر ہے کہ ان کے نام میں بھی بہت زیادہ دین اور ملت کا حوالہ نہ ہو، بلکہ قرآنی سورتوں کے بقرہ، عنکبوت اور روم کی طرح ان کے ناموں کو بھی عوامی اور آفاقی ہونا چاہئے۔

د: آفات ارضی و سماوی کے موقع پر مسلمان تنظیموں اور اداروں کو بلا تفریق مذہب وملت اپنی خدمات انجام دینی چاہئیں، اور ریلیف اور امداد کی تقسیم میں مسلمان اور غیر مسلم کو کوئی فرق و امتیاز نہیں کرنا چاہئے، کچھ غیر مسلم تنظیمیں اور ادارے اس کے برعکس کرتے ہیں تو وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتاح العلوم (مئو)

۱- الف: غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کو جب قانونًا سرکاری طور پر الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت ہو تو مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا شرعًا جائز ہوگا، اس نیت سے کہ الیکشن جیتنے کے بعد ملکی مفادات کے لئے کام کرے گا، اور ملی اور مذہبی مفادات میں کسی طرح کی کوئی آنچ نہ آنے دی جائے گی، اور اگر اس کے خلاف کا اندیشہ ہو تب بھی شرعًا جائز ہوگا، اس نیت سے کہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ اختلاط رکھتے ہوئے بتدریج انسانیت کے ساتھ ہمدردی کی بات کی جاتی رہے گی اور مذہبی اور دھارمک رواداری کو ان کے دل ودماغ میں ڈالا جاتا رہے گا، بہرصورت الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانے کو ترک نہ کیا جائے گا۔

چونکہ ہندوستان جمہوری ملک ہے اور یہاں بسنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کو یکساں طور پر اپنے مذہبی تشخص کے ساتھ جینے اور ملکی باشندگی کا قانونا حق ہے، اس لئے یہاں کے مسلمان باشندوں کو الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، ووٹ دینا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا شرعًا جائز ہوگا، امیدوار مسلمان ہو یا سیکولر ہر ذہنیت کا، بلکہ ہندوستان میں تو مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اتنا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی پارٹی بنائی جاسکتی ہے اور نہیں تو سیکولر ہندوؤں کی پارٹی کے ساتھ ضم ہوکر الیکشن میں حصہ لینا ووٹ دینا جائز ہے، اور مسلمان تو اتنے وافر تعداد میں ہیں کہ اتحاد ملی کے ساتھ اتنے امیدواروں کو جتا سکتے ہیں کہ جن پر سرکار بننا اور نہ بننا موقوف ہوگا، یہ حقیقت ہے اس پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنا چاہئے اور اپنے حق ووٹ کو ضائع نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس کو استعمال کرکے شریف الطبع امیدوار کو جتانا چاہئے۔

ب: انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات متعلق ہوتے ہیں، چنانچہ الیکشن کے دور میں امیدوار لوگ اپنی عوام سے قومی وملی اور مذہبی مفادات کے لئے اپنے جتائے جانے پر بہت سے وعدے کرتے ہیں اور حل کئے جانے کے دعوے کرتے ہیں اور بعض جیتنے کے بعد اپنے وعدے پورے بھی کردیتے ہیں یا پورے کئے جانے کی سعی پیہم کرتے ہیں اور اپنا خلوص دکھادیتے ہیں، لہذا اس بنیاد پر مسلمانوں کے لئے ووٹ دینے کو شرعًا واجب قرار دیا جاسکتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اسمبلی یا پارلیامنٹ میں ہی ان مفادات کی تجویز یا عدم پاس کی جاتی ہے، تو جب تک مسلمان یا کسی سیکولر پارٹی کا لیڈر اسمبلی یا پارلیامنٹ میں نہ ہوگا تو مذہبی وملی مفادات کے لئے باتیں کیسے کرسکتا ہے، لہذا ان مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے لئے ووٹ دینا شرعًا واجب ہوگا۔

ج: ایسی سیاسی جماعتیں جنھوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنا مقصد بنایا ہو تو اس کے اس ذہنیت کا کسی امیدوار کو ووٹ دینا شرعًا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس کو جتانے میں تعاون علی الاثم ہے جو بنص قرآن کریم: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ: ۲) ناجائز ہے۔

لیکن ان کا کوئی امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہو، سیکولر مزاج ہو اور مسلمان کے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہو تو مسلمانوں کے لئے اس کی جماعتی فکر سے قطع نظر اس کے ذاتی حالات کی بنا پر اس کو ووٹ دینا شرعًا جائز ہوگا، کیونکہ اس کو ووٹ دینے میں دفع مضرت ہے، اور فقہ کا قاعدہ ہے: دفع المضرۃ أولی من جلب المنفعۃ، البتہ خود مسلمانوں کے لئے ایسی سیاسی جماعتوں میں شمولیت درست نہ ہوگی، کیونکہ اس میں تعاون علی الاثم والعدوان ہے جو ناجائز ہے۔

د: انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے، ان میں شرکت اور ان کی حمایت کی جاسکتی ہے، اس میں کوئی حرج

نہیں ہے اور شرعاً اس کی حیثیت دفع مضرت کے طور پر جائز کی ہوگی۔

ھ: سماج کی مشترکہ ذمہ داریوں اور اچھی باتوں کی ترویج اور منکرات کو روکنے کے لئے غیر مسلم بھائیوں کے اشتراک کے ساتھ کام کیا جاسکتا ہے، نیز ایسے ادارے اور تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں جن میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن الله یؤید هذا الدین بقوم لا خلاق لهم"۔

۲- الف: جہاں مسلمان غیر مسلم اقوام کے ساتھ رہتے ہیں وہاں اگر یہ ممکن ہو اور سرکاری و قانونی کوئی رکاوٹ نہ ہو تو مسلمانوں کو اپنی علاحدہ آبادیاں اور محلے جات بنانا بہتر ہے، تاکہ وہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رہ سکیں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو بنابریں کہ سرکاری و قانونی رکاوٹ ہو تو مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا اس نیت سے بہتر ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلامی اخلاق و کردار کے ذریعہ متاثر کرسکیں اور اس طرح بود و باش اختیار کریں کہ غیر مسلموں کو کسی طرح کا کوئی تنفر نہ ہو، بایں طور کہ ان کے غریبوں کی امداد کردیا کریں اور ان کے مریضوں کی عیادت کرلیا کریں، لیکن اس شرط سے کہ مسلمان عورتیں ان کے گھروں میں آنے جانے کا کسی طرح کا سلسلہ نہ رکھیں۔

ب: مسلمان کے غیر مسلم دوست یا پڑوسی کے یہاں میت ہوجائے تو مسلمان کے لئے اس کے جلوس جنازہ میں شرکت جائز نہیں ہے (احسن الفتاوی ۴: ۲۴۳)

نیز غیر مسلم میت کی آخری رسومات کے وقت اس کے پاس رہنا بھی جائز نہیں، ہاں اگر کوئی سیاسی مجبوری ہو مثلاً جس پارٹی کی سرکار ہے اسی کا کوئی غیر مسلم لیڈر مرجائے اور مسلمان بھی اس پارٹی میں شریک ہے تو ایسے غیر مسلم میت کی آخری رسومات کے وقت مسلمان لیڈر کو رہنے کی گنجائش دی جاسکتی ہے ورنہ نہیں، اور غیر مسلم میتوں کے لئے قرآن کریم پڑھ کر ایصال ثواب کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم کے لئے استغفار سے منع فرمایا ہے، لہذا ایصال ثواب بھی ناجائز ہے، قرآن میں ہے: "إن تستغفر لهم سبعین مرة فلن یغفر الله لهم" (سورۂ توبہ/ ۸۰)۔

ج: غیر مسلم حضرات اپنے تیوہاروں اور دوسری تقریبات کے موقع پر مٹھائیاں اور اپنے عقیدے کے مطابق تبرکات اپنے مسلمان دوستوں کو پیش کرتے ہیں، جو تقریبات غیر مذہبی ہیں، مثلاً شادی اور بچہ کی پیدائش کے موقع پر اپنے مسلمان دوستوں کو ایسے تحفے پیش کریں جو بتوں پر چڑھائے ہوئے نہیں ہیں تو ان کا قبول کرنا اور کھانا دونوں جائز ہے۔

اور اگر غیر مسلم اپنے مسلمان دوست کو اپنے تیوہار مثلاً ہولی یا دیوالی وغیرہ کے موقع پر مٹھائیاں اور کھانا اور پوری وغیرہ دیں تو اس کو نہ لینا بہتر ہے، لیکن اگر کسی مصلحت سے لے لیا تو شرعاً اس کے کھانے کو حرام نہ کہا جائے گا (کذا فی فتاوی محمودیہ ۵/ ۲۲۷، ۵/ ۱۸۸)۔

اگر یہ تحفے تقریبات مذہبی میں اور بتوں پر چڑھائے ہوئے ہوں تو مسلمانوں کو ان کا قبول کرنا اور کھانا دونوں ناجائز ہے، کیونکہ یہ آیت کریمہ "ما أهل به لغیر الله" میں اور نذر لغیر اللہ میں داخل ہے، اور یہ دونوں شرعاً حرام ہیں۔

د- غیر مسلم حضرات باہمی میل جول کی وجہ سے مساجد، مدارس اور مذہبی جلسوں میں تعاون کرتے ہیں، تو اگر ان کی نیت فقط پن اور ثواب کی ہے تو مسلمانوں کے لئے ان کا تعاون لینا جائز ہے، ورنہ ناجائز، لیکن بہرصورت ان کے تعاون کو قبول نہ کرنا اولیٰ ہے، تاکہ ان کو احسان جتانے کا موقع نہ ملے اور غیر مسلم بھائیوں کی عبادت گاہوں کی تعمیر اور مذہبی تیوہاروں اور جلسوں کے لئے مسلمانوں کا تعاون کرنا کسی حال میں جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں تعاون علی الاثم والعدوان ہے جو نص قرآن سے حرام ہے (کذا فی فتاوی محمودیہ ۹/ ۳۹۸)۔

ھ- اگر رمضان المبارک اور عید وغیرہ کی مناسبت سے بہت سے غیر مسلم سماجی اور سیاسی قائدین مسلمانوں کے ساتھ افطار میں شریک ہوتے ہیں، عید کی تہنیتی تقریب رکھتے ہیں تو:

الف: مسلمانوں کے لئے غیر مسلم حضرات کی مذہبی تقریبات اور تیوہاروں مثلاً ہولی، دیولی اور رام لیلا میں شریک ہونا جائز نہیں، چنانچہ مفتی محمودؒ کے فتاوی میں ہے کہ ان کی مذہبی تقریبات میں شرکت خطرناک ہے (۱۲/ ۳۰۶)۔

ب: مسلمانوں کے لئے غیر مسلم بھائیوں کو ان کے تیوہاروں کی مبارکباد دینا شرعاً درست نہیں ہے۔

۳- الف: ملکوں کا اپنے جھنڈوں کو سلامی دینے کا رواج ہونا اور اسے جھنڈے کا احترام سمجھنا شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں، چنانچہ مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں: لہذا کسی خاص ہیئت ونوعیت کا تعین پھر اس کی خصوصیت کا اور اس میں خاص تقدس کا ادعاء بالکل غلط اور بے بنیاد ہے (جواہر الفقہ ۱/ ۱۴۵)۔

ب: بعض ملکوں میں ایسے قومی ترانے مروج ہیں جن میں مشرکانہ مضامین شامل ہیں، جیسے ہمارے ملک ہندوستان میں ترانہ وندے ماترم جس میں ارض وطن کی معبودیت کا تصور پیش کیا جاتا ہے، تو مسلمانوں کے لئے اس قسم کے ترانوں کا پڑھنا ناجائز ہے، کیونکہ یہ شرک ہے جو بنص قطعی حرام ہے۔

ج: جو ادارے ملک کے باشندوں کو انصاف فراہم کرتے ہیں وہ ملک میں مروج قانون شہادت یا دوسرے قوانین کی وجہ سے بعض اوقات ایسے فیصلے کر دیتے ہیں جو اسلامی اور شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں ہیں، مثلاً مطلقہ کے نان ونفقہ کا فیصلہ، تو ایسے معاملات میں اگر دونوں فریق مسلمان ہوں تو انہیں اس فیصلہ کو قبول کرنا جائز نہیں، اور جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوا ہے، اس کے لئے اس سے استفادہ کرنے کی شرعاً گنجائش نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ مذہب میں مداخلت ہے بلکہ اس فریق کو دار القضاء الشرعی کے فیصلہ پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

۴- الف: موجودہ دور میں عالمی سطح پر سوال میں مذکور کوشش اسلام دشمنی پر مبنی ہے، پس اسلامی نقطہ نظر سے کسی درجہ میں بھی یہ ترمیم قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ منزل بھی ایک ہے اور اس کا راستہ بھی فقط ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلام کا صراط مستقیم۔ بس ایسے مسلمانوں کی مرعوبیت سے کچھ خوفزدہ نہ ہونا چاہئے اور نہ اس پر توجہ کرنا چاہئے بلکہ ایمان کامل کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر توکل تام رکھے، اللہ تعالیٰ محافظ ہے۔

ب: اس صورت میں کہ غیر مسلموں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو ظلم اور استحصال کا شکار بنائے ہوئے ہے مسلمان کا رویہ اس مظلوم طبقہ کے ساتھ انسانیت دوستی کا اور احسان وہمدردی کا ہونا چاہئے اور مسلمانوں پر انسانی اخوت کے رشتہ سے ان کا تعاون کرنا ایک انسانی فریضہ ہے اور مذہبی فریضہ بھی ہے، چنانچہ صحاح کی روایت "أطعموا الطعام" اسی فریضہ مذہبی پر دلالت کرتی ہے اور اسی مذہبی فریضہ کے ادا نہ کرنے پر مسلمان جواب دہ ہو سکتے ہیں اگرچہ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہ ہو۔

ج: مسلمان اگر خدمت خلق کا کوئی ادارہ قائم کریں جیسے ہاسپٹل وغیرہ تو ان اداروں سے غیر مسلم حضرات کو بھی نفع ویسے ہی پہنچانا چاہئے جیسے مسلمانوں کو نفع پہنچایا جاتا ہے تاکہ ان کے اسلام کی کشش کا سبب بنے اور اسلامی نقطہ نظر سے ایسے اداروں کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا بہتر نہیں ہے، بلکہ بلاتفریق مذہب تمام لوگوں کے لئے خدمت واعانت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے تاکہ اسلام کے اخلاق کی بلندی کا ظہور ہو جائے۔

د: چونکہ قدرتی آفات مثلاً زلزلہ، سیلاب وغیرہ کا اثر سماج میں بسنے والے تمام ہی لوگوں پر پڑتا ہے جس کے سبب سبھی لوگ مدد کے محتاج ہوتے ہیں تو مسلمانوں کی جو تنظیمیں ایسے مواقع پر ریلیف کا کار خیر انجام دیتی ہیں تو ان حالات میں فرقہ پرست عناصر کی بدسلوکی کا خیال نہ کرتے ہوئے برادران وطن کے ساتھ بھی انصاف کا رویہ اختیار کرنا اولیٰ وافضل ہے، لیکن اگر ان اسلام دشمن بلکہ انسانیت دشمن عناصر کے امتیازی سلوک کے سبب کچھ کی زیادتی کی رخصت دی جا سکتی ہے، لیکن اسلام کے اخلاق عالیہ کے پیش نظر اور نص قرآنی: "وجادلهم بالتي هي أحسن" کے سبب اسلام کے اخلاق کریمانہ کے اعتبار سے امتیاز نہ برتنا احیاء سنت اسلام ہے، لہذا ترجیح ان کو دینا چاہئے۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی (جدہ)

اسلامک فقہ اکیڈمی نے بڑے اہم مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے، ان سوالات کے جوابات کے لئے عہد نبوی کے تین مراحل سے کافی مدد مل سکتی ہے، اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی، دوم، صحابہؓ کی ہجرت حبشہ اور وہاں کا قیام اور تیسرے، صلح حدیبیہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے بعد اسلام قوی سے قوی تر ہوتا چلا گیا، اور جمع احادیث اور فقہ وفتاوی کی تدوین کے دور سے لے کر صدیوں تک قوت وحکومت کا سرچشمہ رہا ہے، اس لئے غالبًا مکی دور کی تفصیلات اس طرح محفوظ نہیں کی گئیں، جیسے مدنی دور کی، حبشہ کی ہجرت اور مسلمانوں کے وہاں قیام کے حالات تو اور اندھیرے میں ہیں، مورخین یہ تو لکھتے ہیں کہ کس قبیلے سے کن حضرات نے ہجرت کی لیکن وہاں مقامی لوگوں سے ان کے سماجی ومعاشی تعلقات کیسے رہے؟ عبادت وتبلیغ کا کوئی نظم رہا یا نہیں؟ انہوں نے اپنی الگ کالونی بنائی یا اہل حبشہ کے ساتھ گھل مل کر رہے؟ کبھی کوئی تصادم ہوا؟ ازدواجی رشتے قائم ہوئے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ مسلمان فتح خیبر کے بعد لوٹے، اس درمیان اہم تعلیمات وفرائض پر مشتمل قرآن کا بڑا حصہ نازل ہوا، کیا ان تک ان چیزوں کو پہنچانے کا کوئی نظم کیا گیا تھا یا انہیں معذور سمجھ لیا گیا؟ غرضیکہ اسی طرح کے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہجرت حبشہ کو تحقیق کا موضوع بنایا جائے اور اس سے متعلق مختلف مصادر سے جو روشنی مل سکتی ہے ان کا جائزہ لیا جائے، تیسری چیز صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں جو مسلمانوں اور کفار کے آزادانہ میل جول کے مواقع ملے تھے، ان کے حدود کیا تھے؟ اس پر بھی زیادہ معلومات نہیں دستیاب ہیں۔

بہر حال دیئے گئے سوالات کے جوابات قرآن کی متعلقہ آیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ، اور مذکورہ بالا مراحل سے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں ان کی روشنی میں نیز مصالح اصل "تیسیر"، "اختیار اہون البلتین" اور اضطرار کے عام اصولوں کی روشنی میں تلاش کرنا ہوگا اور عہد حاضر کی بدلی ہوئی صورتحال اور پیچیدگیوں کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، اس کوشش میں راقم الحروف جن نتائج پر پہنچا وہ پیش خدمت ہیں:

۱- الف: جمہوری ممالک میں الیکشن میں سوالنامہ میں مذکورہ کسی حیثیت سے حصہ لینے کا تعلق مصالح سے ہے، مصلحت متقاضی ہو تو حصہ لیا جاسکتا ہے، مصلحت کا تعین کون کرے گا؟ ظاہر ہے اس کے لئے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد اور علماء ومخلص ملی کارکنوں کا کوئی مشترکہ پلیٹ فارم اور اتحاد ہونا چاہئے جو مصلحت طے کرے، اور جب وہ یہ طے کرلے تو اس سے الگ رویہ اختیار کرنا شرعًا ناجائز ہوگا کیونکہ، ید اللہ مع الجماعۃ، ومن شذ شذ فی النار۔ انتشار وتفرقہ کی شکل میں کچھ بھی طے کرلیں، کوئی فائدہ نہیں۔

ب- ووٹ دینا بنیادی حق اور سماجی ذمہ داری تو ہے، لیکن جب واضح طور پر اس سے ملی ودینی مفادات ومصالح وابستہ ہوں تو شرعًا واجب بھی قرار دیا جاسکتا ہے، "فانہ مالا یتم الواجب الا بہ فھو واجب"۔

ج- "جماعتی سیاست"، "وی ایچ پی کا نظام" اور "دل بدلی مخالف قانون" کی موجودگی میں جماعت سے باہر فرد کچھ نہیں کرسکتا، خواہ وہ بذات خود نیک خصلت ہو، اس لئے اس طرح کے فیصلہ میں دیکھنا ہوگا کہ ملکی صورتحال اور ریاستی سیاست میں ہمارے فیصلہ کا کیا اثر پڑے گا، مقامی وبلدیاتی اداروں میں تو پارٹی سے قطع نظر امیدوار کے انفرادی اوصاف اور ذاتی نیک طینتی مفید ہوسکتی ہے، لیکن ملکی وریاستی سطح پر اسے اپنی انسانیت دشمن پارٹی کا ساتھ دینا ہوگا یا اپنی نشست سے محروم ہونا ہوگا، اس لئے اس کو ووٹ دینے کا مطلب ہے کہ اسلام اور مسلمان مخالف جماعت کی تائید وتقویت، لہذا اس شخص کو ووٹ دینا یا اس پارٹی میں شمولیت کو درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔

د-اصولی طور پر حکمت عملی کے تحت ایسا کیا جاسکتا ہے، لیکن تجربہ بتا تا ہے کہ "انھم لا ایمان لھم" جب تک خود ہماری صفوں میں تخرب وتشتت اور انتشار وافتراق، موقع پرستی وخودغرضی، برادری وفرقہ بندی جیسے امراض ہیں دشمن ہماری کمزوری کوخوب سمجھتا ہے، چاہے نظریاتی طور پر ہم کچھ فیصلہ کرلیں لیکن اس کے عملی فائدے ممکن نہیں جب تک کہ ہمارے مختلف مکاتب فکر کے قائدین فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر (Minimum Common Programme) کے انداز پر اہم ملی ودینی مصالح کے حصول کے لئے متحدہ کوشش نہ کریں۔

ھ-سماج کی مشترکہ ذمہ داریوں اور اچھی باتوں کی ترویج اور منکرات کوروکنے کے لئے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اشتراک ضروری ہے بلکہ اس میں مسلمان علماء وقائدین کو پہل کرنی چاہئے، یہ "حلف الفضول" کے قسم کا اشتراک ہوگا جس کا رسول اللہ ﷺ نے نبوت وہجرت کے بعد بھی اچھے الفاظ میں ذکر فرمایا اور اس طرح کے معاہدہ میں شرکت کو سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ محبوب قرار دیا۔

"ما أحب أن لی به حمرا لنعم، لودعیت لمثله فی الإسلام لأجبت"۔

۲- الف: مسلمانوں کا وہ طبقہ جو غیر مسلمین سے خلط ملط رکھتا ہے عام طور پر اسلام سے دور اور مذہب کا نمائندہ نہیں ہوتا، غیر مسلمین ان ہی سے اسلام کو سمجھتے ہیں، اگر دیندار طبقہ ان سے ملے اور صحیح اسلام کی نمائندگی کرے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہوسکتی ہیں، اس جذبہ اور نیت سے مخلوط آبادیوں میں رہنا اور غیر مسلموں کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا خاموش جہاد ہے، صرف ان کے تہذیبی اثرات سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے علاحدہ آبادیاں بنانا ریت میں منہ چھپانے کے مانند معلوم ہوتا ہے، اپنے بہتر اخلاق واطوار، علم وہنر اور اچھے معاملات سے اس یلغار کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے، تحفظ کے خیال سے کوئی مسلم آبادی کو ترجیح دیتا ہے تو یہ مجبوری ہے۔

ب-معاشرہ میں ایک ساتھ رہنے والوں اور ملنے جلنے والوں کی خوشی وغم میں شریک ہونا انسانیت کا تقاضا ہے، غیر مسلموں کے جنازہ کو دیکھ کر کھڑا ہوجانا، ان کی عیادت کرنا تو سنت سے ثابت ہے، البتہ جنازہ کے ساتھ چلنا ایک اختلافی مسئلہ ہے، شافعیہ اور حنفیہ نے اس کی اجازت دی ہے اور راقم اسی کا قائل ہے کہ جن سے ان کی زندگی میں تعلقات اور میل جول رہا ہے ان کے مرنے کے بعد ان کے جسد خاکی کے ساتھ کچھ دور چلنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، البتہ ان کی مذہبی رسومات میں شریک نہ ہو، اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر مسلم بھی اپنے تعلقات والے مسلمانوں کے جنازہ میں شریک رہتے ہیں، البتہ نماز جنازہ کے وقت الگ کھڑے ہوجاتے ہیں "فنحن أحق بمکارم الأخلاق"، غیر مسلموں کے لئے دعا وقرآن خوانی نہ صرف یہ کہ بے مصرف ہے، بلکہ قرآن سے اس کی ممانعت سمجھ میں آتی ہے۔ "ولا تصل علی أحد منھم مات أبدا..." (سورۂ توبہ: ۸۴)۔

ج-غیر مسلموں سے ہدیہ کے تبادلہ کی مثال بھی سنت سے ثابت ہے (صحیح بخاری کتاب الہبہ ۳/ ۱۴۱، ۱۳۳) یہ ہدیہ کسی تقریب کی مناسبت سے ہو تو بھی کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا، البتہ اگر یہ پرشاد بتوں پر چڑھاوے یا کسی پوجا پاٹ کی انجام دہی پر ہو تو بہتر ہے کہ لینے سے معذرت کردے، اگر کسی کمزوری سے انکار کو بداخلاقی سمجھ کر قبول کرلیا ہے تو بہتر ہے کہ ان ہی کے کسی فرد کو کھلا دے "ھذا ما یبدو لی واللہ أعلم بالصواب"۔

د-اگر غیر مسلم عقیدت کی وجہ سے تعاون کرے تو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ممکن ہے اس سے اس کو مزید خیر وہدایت کی توفیق ہو، لیکن اگر بدلے کی نیت سے کررہا ہو تو بہتر ہے اسے رد کردیا جائے، کیونکہ اہل کفر کی مذہبی تقریبات وعبادتگاہوں کے لئے تعاون دینا گویا ان کے عقیدہ کی تائید کرنا ہوگا جو ایک مسلمان کے لئے صحیح نہیں ہے۔

ھ-الف: افطار وعید کے موقع پر غیر مسلموں کو مدعو کرنا کہ اس سے ان کو اسلام کے قریب کیا جائے، ان کی تالیف قلب ہو اور ان کے شر سے مسلمان محفوظ رہیں تو ایسا ضرور کرنا چاہئے، اسی طرح ان کے تہواروں میں بھی اسی غرض سے شریک ہوں، مثلاً ان کے میلوں میں دعوتی بک اسٹال وغیرہ لگانا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ان کی مذہبی رسومات سے دور رہے، رسول اللہ ﷺ عکاظ، ذوالمجاز اور المجنہ کے میلوں میں تبلیغ کی غرض سے تشریف لے جاتے تھے۔

ب- سماجی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ وہ اگر ہمارے تیوہاروں میں ہم کو مبارکباد دیتے ہوں تو ہم بھی ان کی مبارکباد کو ان کے تیوہار پر لوٹا دیں کہ جس کو وہ خوشی کی چیز سمجھتے ہیں وہ ان کو مبارک ہو جبکہ آدمی خود ان پر کوئی یقین نہ رکھتا ہو، "واذا حييتم بتحية فحيوا بأحسن منها أو ردوها" کے عموم میں یہ چیز آسکتی ہے۔

۳- الف: جھنڈے کی سلامی کو ایک سیاسی رواج ہی سمجھنا چاہئے، اس کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں ہوتی، اسی لحاظ سے جو سیاستکار ہیں ایسا کرتے ہیں تو کریں، اس پر مذہبی حیثیت سے نکیر کرنے کی ضرورت نہیں، وہ مذہب کے نمائندے نہیں ہوتے اور نہ یہ عمل مذہبی ہوتا ہے۔

ب- ایسے مشرکانہ ترانوں کے گانے سے احتراز لازم ہے، لیکن جہاں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو وہاں مجبوراً کوئی ایسے گانے والوں کے ساتھ خاموش شریک رہتا ہے تو اس سے اس کے دین وایمان میں ان شاء اللہ نقص نہیں آئے گا، کیونکہ ہر مسلمان کا یقین ہوتا ہے کہ زمین وآسمان یا جو بھی ان کے درمیان ہے وہ ہمارے لئے مسخر کیا گیا ہے، نہ کہ وہ ہمارے معبود ہیں، "الايمان اقرار باللسان وتصديق بالقلب وهما غير موجودين هنا"۔

ج- جب فریقین مسلمان ہوں تو صحیح یہ ہے کہ وہ اپنے مقدمات کو اپنی پنچائتوں اور جہاں تک ممکن ہو شرعی عدالتوں میں لے جایا کریں، ملک میں مروج قانون شہادت اور دوسرے قوانین کا سہارا لے کر اپنے مسلمان بھائی کے خلاف ایسی عدالتوں میں مقدمہ لے جانا اور اپنے حق میں فیصلہ ہونے پر اس سے استفادہ کرنا صحیح نہیں ہے، ناحق جو اپنا مقدمہ ایسی عدالتوں میں لے گیا، ظاہر ہے وہ اپنے حق میں فیصلہ ہونے پر اس سے استفادہ کرے گا خواہ اس فیصلہ سے حق دار کا حق مارا گیا ہو، لیکن اس سے وہ آخرت کی پکڑ سے نہیں بچ سکتا۔

۴- الف: انسانوں کے درمیان فساد وافتراق کی وجہ مذہب نہیں، بلکہ ان کے اندر پرورش پانے والے غلط رجحانات ہیں مثلاً خود غرضی، استحصال، نسل پرستی، علاقہ پرستی وغیرہ وغیرہ، جہاں ایک مذہب کے لوگ ہیں وہاں بھی ان برائیوں کی وجہ سے تصادم ہوتا رہتا ہے، اس لئے مذہب کو الزام دینا صحیح نہیں ہے، اور نہ اجتماعی زندگی سے مذہب کی بے دخلی حل ہے، اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے یہ قابل قبول نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہوتی کہ سب ایک راستے پر گامزن ہو جائیں تو وہ کر سکتا تھا، اس لئے اپنے عقائد وعبادات پر قائم رہتے ہوئے انسانی وحدت کی بنیادیں تلاش کی جائیں۔

ب- زمانہ قدیم سے دلتوں کو اونچی ذات والوں نے اپنے ظلم واستحصال کا نشانہ بنائے رکھا، لیکن ہم نے بھی اپنے دور اقتدار میں اس کی اصلاح کی عمداً کوئی خاص کوشش نہیں کی، بلکہ حکمراں طبقہ نے اونچی ذات والے ہندوؤں کے ساتھ تعلقات استوار کئے اور دلتوں کو ظلم وذلت کی چکی میں پستے چھوڑ دیا، ورنہ آج ان کی اکثریت اسلام کی گرویدہ ہوتی۔ اب بھی ہم اس سلسلہ میں کچھ کر سکیں تو ایک مذہبی فریضہ کی انجام دہی ہوگی، جب باگ ڈور تھی تو کچھ نہیں کیا، پھر اس کے انتظار میں بیٹھنا صحیح نہیں۔

ج- جو فلاحی ادارے مسلمان قائم کریں ان کو مسلمانوں کے لئے مخصوص نہ رکھیں ہر جاندار کی مدد نیکی ہے، البتہ مساوی حالات میں ترجیح ضرور ہونی چاہئے ان سے دہرا تعلق کی وجہ سے۔

د- ہنگامی حالات اور فوری امداد میں تفریق نہ ہو، البتہ مستقل آباد کاری میں مسلمانوں کو ترجیح وتخصیص ہو، اس فرق کی وجہ ادنی تامل سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

مولانا ابوالعاص وحیدی، جامعہ قاسم العلوم، بلرام پور (یوپی)

تمہیدی مباحث:

اس وقت جو مسلمان غیر مسلم ممالک میں آباد ہیں یقیناً ان کے بہت سے ایسے مسائل ہیں جو دور قدیم سے بہت مختلف ہیں، اس لئے موجودہ حالات میں اس فقہی قاعدہ پر عمل کیا جائے گا: ''یجوز فی الضرورۃ مالا یجوز فی غیرھا'' (الأم للامام الشافعی ۱۶۸/۴)۔

مگر اس فقہی قاعدہ کو استعمال کرتے ہوئے چند اصولی باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

۱- تعبدی امور چونکہ توقیفی ہوتے ہیں اور ان میں قیاس ورائے کا دخل نہیں ہوتا اس لئے ان میں عصری ضرورت کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔

۲- حقوق ومعاملات اور تعلقات عامہ جو غیر تعبدی امور ہیں ان میں عصری ضروریات اور تقاضوں کا لحاظ کیا جاسکتا ہے۔

۳- حقوق ومعاملات وغیرہ میں جو احکام منصوص ہیں جن کی حیثیت حدود اللہ کی ہیں ان سے بالکل تجاوز نہیں کیا جائے گا۔

۴- مذکورہ فقہی قاعدہ استعمال کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ بہر حال ضروری ہے کہ مسلمان اپنا دینی وملی تشخص باقی رکھیں۔

ان تمہیدی باتوں کے بعد اب سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

۱- الف: ہندوستان جیسے ممالک میں مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، الیکشن میں امیدوار بننا، کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا وغیرہ اصولی طور پر محل نظر ہیں، اس لئے کہ ان تمام چیزوں میں بڑی شرعی قباحتیں لازم آتی ہیں، اس بنا پر جماعت اسلامی ہند ایک مدت تک ان تمام امور کو خلاف شرع سمجھتی رہی مگر بعد میں اس نے ''یجوز فی الضرورۃ مالا یجوز فی غیرھا'' کے سامنے ہتھیار ڈال دیا اور ان تمام چیزوں کو درست قرار دے دیا۔ بہر حال ہندوستان جیسے ممالک میں مذکورہ تمام چیزیں موجودہ حالات میں بربنائے اضطرار وضرورت درست ہوں گی، مگر اس پر بڑی احتیاط سے عمل کیا جائے گا۔

ب: چونکہ دینی وملی مفادات کا تحفظ واجب ہے اور واجب کا موقوف علیہ بھی واجب ہوتا ہے اس لئے ووٹ دینا واجب ہوگا۔

ج: ایسی سیاسی جماعتیں جو اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالف ہوں ان کے کسی بھی نمائندہ کو ووٹ دینا درست نہیں ہوگا، بنابریں ایسی کسی جماعت میں مسلمانوں کی شمولیت بدرجہ اولی ناجائز ہوگی۔

د: انتخابات وغیرہ کے مواقع پر ملی مفادات کے تحت غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے معاہدے کئے جاسکتے ہیں اور ان کی حمایت کی جاسکتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار مکہ سے صلح حدیبیہ کی اور یہود مدینہ کے ساتھ معاہدے کئے، اس معاملہ میں اس سے استشہاد کیا جاسکتا ہے۔

ھ: اصلاح سماج اور رفاہ عامہ کے پیش نظر غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ تنظیمیں قائم کی جاسکتی ہیں، مگر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ کسی بھی موڑ پر اسلامی مفادات مجروح نہ ہوں۔

۲- الف: مسلمانوں کے لئے اپنی علاحدہ اور الگ تھلگ آبادیاں بنانا بہتر ہے تاکہ وہ غیر مسلموں کے تہذیبی وثقافتی اثرات سے محفوظ رہ سکیں، ہجرت مدینہ کی جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں ان میں یہ حکمت ومصلحت بھی پیش نظر تھی، اس لئے مدنی زندگی کے آغاز میں مدینہ کی طرف ہجرت فرض تھی، سنن ابوداؤد وغیرہ میں بعض احادیث ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کے گھر غیر مسلمین کے گھروں سے دور رہیں تاکہ ''لا ترای نار اھما'' یعنی باہم آگ اور دھواں وغیرہ بھی نہ دیکھ سکیں۔

ب: مذہب اسلام کی تعلیم مواسات کے تحت مسلمان کسی غیر مسلم دوست کی خوشی وغم میں شرکت کر سکتے ہیں، ان کی تعزیت کر سکتے ہیں، کچھ دور تک جنازہ

کے ساتھ جاسکتے ہیں، لیکن درج ذیل امور نہیں کر سکتے:

۱- آخری رسومات کے وقت میت کے پاس نہیں رہ سکتے، امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ کسی یہودی یا نصرانی کا انتقال ہو جائے تو اس کی مسلمان اولاد سواری پر جنازہ کے آگے چلے اور دفن کے وقت واپس ہو جائے، انہوں نے یہ بات حضرت عمرؓ کے ایک فتوی کے پیش نظر کہی ہے (المغنی لابن قدامہ ۳/۴۶۶)۔

۲- ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتے اور نہ قرآن پڑھ کر ان کے لئے ایصال ثواب کر سکتے ہیں، اس لئے کہ ایصال ثواب استغفار کے مترادف ہے،

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں: ''الصلاة على الكافر و الدعاء له بالمغفرة حرام بنص القرآن والاجماع'' (المجموع شرح المهذب ۵/۱۴۴)

ملحوظ رہے کہ قرآن مجید پڑھ کر ایصال ثواب مسلمانوں کے لئے بھی مختلف فیہ ہے، راجح یہ ہے کہ درست نہیں، اس لئے کہ نصوص کتاب وسنت سے اس کی تائید نہیں ہوتی، تو غیر مسلم کے لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ج: غیر مسلم حضرات سے تحائف کا تبادلہ ہو سکتا ہے، جیسا کہ سیرت نبوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، بنابریں غیر مسلم حضرات اپنے تیوہاروں اور دوسری تقریبات کے موقع پر بطور تحفہ جو مٹھائیاں دیتے ہیں انہیں قبول کیا جاسکتا ہے، البتہ وہ مٹھائیاں قبول نہیں کی جائیں گی جو بتوں پر چڑھائی گئی ہوں، اس لئے کہ نذر لغیر اللہ حرام ہے تو اس کے تحفے بھی حرام ہوں گے۔

د: مساجد، مدارس اور دینی جلسوں کے لئے غیر مسلموں سے چندہ لینا درست نہیں، اسی طرح ان کی مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کی تعمیر کے لئے چندہ دینا بھی درست نہیں، غیر مسلموں کے مصائب ومشکلات میں اور ان کی معاشی ضروریات میں انہیں چندہ دیا جاسکتا ہے۔

ھ: شادی بیاہ اور دوسری غیر مذہبی تقریبات میں مسلم اور غیر مسلم باہم ایک دوسرے کی تقریب میں شرکت کر سکتے ہیں لیکن مذہبی تقریبات میں یہ بات بالکل درست نہیں، جیسا کہ آج کل ہولی ملن میں مسلمان شرکت کرتے ہیں اور عید ملن میں ہندو حضرات کو شریک کیا جاتا ہے، یا افطار پارٹی وغیرہ میں ہندو حضرات کو مدعو کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ ہے کہ عید ملن وغیرہ بدعات ومحدثات ہیں جن سے مسلمانوں کو بھی اجتناب کرنا چاہئے، اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ مذہبی تیوہاروں میں باہم اشتراک وتعاون سے مسلمانوں کا دینی وملی تشخص مجروح ہو جاتا ہے اور یہ چیز تشبہ بالقوم بھی ہے اس لئے بھی مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنی مشہور کتاب ''اقتضاء الصراط المستقيم لمخالفة أصحاب الجحيم'' میں اس موضوع پر بڑی علمی وفقہی بحث کی ہے، انہوں نے مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کے اعیاد ومواسم (مذہبی تقریبات) میں شرکت کو کتاب وسنت اور اجماع وغیرہ سے حرام ثابت کیا ہے، اور اسے ایمان و اسلام کے لئے زبردست خطرہ قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں ان کی ایک نفیس بحث ملاحظہ ہو:

''وأما الاعتبار في مسئلة العيد فمن وجوه: أحدها أن الأعياد من جملة الشرع والمناهج والمناسك التي قال الله سبحانه: ''لكل أمة جعلنا منسكاهم ناسكوه'' (سورۂ حج/ ۶۸) كالقبلة والصلاة والصيام فلا فرق بين مشاركتهم في العيد وبين مشاركتهم في سائر المناهج، فإن الموافقة في جميع العيد موافقة في الكفر، والموافقة في بعض فروعه موافقة في بعض شعب الكفر، بل الأعياد هي من أخص ما تتميز به الشرائع ومن أظهر مالها من الشعائر. فالموافقة فيها موافقة في أخص شرائع الكفر وأظهر شعائره ولا ريب أن الموافقة في هذا قد تنتهي إلى الكفر في الجملة بشروطه'' (اقتضاء الصراط المستقيم، تحقیق و تعلیق ناصر بن عبدالکریم العقل، الطبعۃ الاولی، المجلد الاول، فصل فی الاعیاد: ص۴۷۱)

اس عبارت کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے اعیاد یعنی مذہبی تقریبات میں شرکت اسلامی تشخص کے لئے حد درجہ تباہ کن ہے۔

۳- الف: کسی جھنڈے کو سلامی دینا تو درست نہیں ہے، اس لئے کہ وہ تعبدی امور کے مشابہ لگ رہا ہے، البتہ آزادی یا سیاسی جماعت کی علامت کے طور پر جھنڈے نصب کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔

ب: وندے ماترم یا دوسرے مشرکانہ قومی ترانے اسلامی مزاج کے خلاف ہیں جنہیں مسلمانوں کے لئے پڑھنا جائز نہیں۔

وندے ماترم کا جو ترانہ ہے وہ ہمارے ملک کے سیکولر وجمہوری مزاج کے بھی خلاف ہے، اسی طرح وہ ترانہ ہمارے ملک کی آزادی کے بھی خلاف ہے،

چونکہ اس کے بعض اشعار میں انگریزوں کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔افسوس ہے کہ اس ترانہ پر اصرار کیوں کیا جارہا ہے؟

ج: ”تحاکم الی الطاغوت“ یعنی غیر اللہ کو حکم مان کر غیر اسلامی عدالت میں اپنا معاملہ لے جانا نص قطعی سے حرام ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی دو آیات ملاحظہ ہوں:

”ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالا بعيدا“ (سورۂ نساء/٦٠)۔

”فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما“ (سورۂ نساء/٦٥)۔

ان آیات کا نزول اگرچہ عہد نبوی کے مخصوص واقعات کے پس منظر میں ہوا ہے مگر ان کا مفہوم و منطوق عام ہے، اس لئے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنا معاملہ غیر اسلامی عدالت میں لے جائے، اس سلسلہ میں مسلمانوں کو شرعی دار القضاء یا شرعی پنچایت کی طرف رجوع کرنا چاہئے، افسوس اس سلسلہ میں مسلمانوں کا تغافل حد سے زیادہ بڑھا ہوا ہے، اس پر ہندوستانی مسلمانوں کو فوری توجہ دینا چاہئے۔

دراصل اگر غیر مسلم قاضی وجج نکاح وطلاق وغیرہ مسائل میں درست فیصلہ بھی کرے تو وہ مسلمانوں کے لئے شرعاً نافذ نہیں مانا جائے گا، اسی لئے انگریزی دور اقتدار میں مسلم قاضی وجج ہوتے تھے جو مسلمانوں کے نزاعی امور کا فیصلہ اسلام کی روشنی میں کرتے تھے۔

ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں اسلامی اقتدار نہیں ہے بطور ضرورت واضطرار غیر اسلامی عدالتوں کے درست فیصلے نافذ العمل ہوں گے۔

۴- الف: دنیا میں جو مذاہب ہیں ان کی راہیں اور منزلیں الگ الگ ہیں، لیکن مذہب اسلام کے علاوہ سارے مذاہب منسوخ ہیں، اب دنیا والوں کو مذہب اسلام کی دعوت دی جائے گی، اس سلسلہ میں درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

۱- ”وأنزلنا إليك الكتاب بالحق مصدقا لما بين يديه من الكتاب ومهيمنا عليه فاحكم بينهم بما أنزل الله ولا تتبع أهواءهم عما جاءك من الحق لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا“ (سورۂ مائدہ:۴۸)۔

۲- ”لكل أمة جعلنا منسكا هم ناسكوه فلا ينازعنك في الأمر وادع إلى ربك إنك لعلى هدى مستقيم“ (سورۂ حج/٦٧)۔

اسلام، یہودیت، عیسائیت وغیرہ مذاہب بعض امور میں ضرور مشترک ہیں، یہاں تک کہ مکہ کے کفار ومشرکین بھی اللہ تعالیٰ کے تعلق سے توحید ربوبیت وغیرہ کے قائل تھے، مگر اس بنیاد پر وحدت ادیان یا تقارب ادیان کا نظریہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہے، آج کل نظریہ وحدت ادیان کے اسیر وہی مسلم دانشور ہیں جو صحیح دین ودانش سے ناواقف ہیں یا وہ مسلم طبقہ ہے جو تصوف کا دلدادہ ہے۔

ب: دنیا میں جو قومیں سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر پسماندہ ہیں اور مظلوم بھی ہیں، ہم مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کا تعاون کریں، دراصل مذہب اسلام نے اپنی تعلیمات میں تمام انسانوں بلکہ تمام جانداروں کے ساتھ حسن سلوک، مہربانی اور ہمدردی کی تعلیم دی ہے۔

ج: یقیناً مذہب اسلام میں خدمت خلق کا بڑا وسیع تصور ہے جس میں مسلم وغیر مسلم اور انسان وغیر انسان میں تفریق نہیں کی گئی ہے، اس لئے اگر کوئی مسلمان خدمت خلق کا ادارہ کھولے جیسے ہاسپیٹل وغیرہ تو اس سے غیر حضرات کو بھی فائدہ پہنچانا چاہئے اور بلا تفریق مذہب وملت تمام لوگوں کے لئے خدمت و اعانت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے، چونکہ ہم خیر امت ہیں اس لئے اس بات کی پروا ہمیں نہیں کرنی چاہئے کہ غیر مسلم حضرات اپنے رفاہی اداروں میں تنگ نظری سے کام لیتے ہیں۔

د: زلزلہ، سیلاب اور متعدی امراض کے اثرات سماج کے تمام لوگوں پر پڑتے ہیں، مواسات کا تقاضا ہے کہ ایسے حالات میں تمام لوگوں کی اعانت کی جائے، جو مسلم تنظیمیں ریلیف کا کام کرتی ہیں انہیں چاہئے کہ برادران وطن کے ساتھ ہمدردی اور مواسات کا رویہ اختیار کریں۔

الیکشن میں حصہ لینے کی شرعی حیثیت

مفتی سعید الرحمن فاروقی (ممبئی)

۱-الف: الیکشن اور انتخابات کے نتیجے میں قانون ساز اسمبلیاں وجود میں آتی ہیں، اور یہی اسمبلیاں قوانین کی تنفیذ اجراء بلکہ تنسیخ کی بھی مختار ہوتی ہیں، گویا جمہوری حکومت کی باگ ڈور اسی مجلس قانون ساز کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگر چہ حکومتیں اسلامی نقطہ نظر سے مقصود بالذات نہ ہوں، لیکن بہت سے مقاصد حاصل کرنے میں معاون ضرور ہیں، مثلاً اعلاء کلمۃ اللہ، قیام عدل، دفع جور وظلم، حفاظت دین وایمان جان ومال وغیرہ، غرض یہ ہے کہ اللہ کے عائد کردہ فرائض اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں حکومتوں کا بڑا دخل ہے، بسا اوقات اس قوت کے بغیر یہ فرائض ادا ہی نہیں ہوسکتے۔ اس لئے مسلمانوں پر حسب استطاعت حکومتوں کا قیام بھی واجب ہے، موجودہ دور میں اس کے حاصل کرنے کا ایک طریقہ الیکشن وانتخابات ہیں، لہذا جہاں اس طریقہ کار کے ذریعہ کامیابی کا یقین یا ظن غالب ہوگا، وہاں اس کا روبہ عمل لانا یعنی الیکشن میں حصہ لینا امیدوار بننا، مہم چلانا وغیرہ واجب ہوگا۔ اور جہاں امکان ہوگا وہاں حصہ لینا جائز ہوگا، تاکہ مضرتوں سے بچ سکے، پوری دنیا میں آباد مسلمان کہیں اکثریت میں ہیں کہیں اقلیت میں ہیں، لہذا ہر جگہ کا حکم یکساں نہیں بلکہ مختلف ہوگا۔

جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہاں جمہوری نظام کی حکومت ہے، حکومت سازی کے سلسلے اور الیکشن اور انتخابات میں اہل حق اور اہل دین ایک طرف، بے دین یا بد دین دوسری طرف ہوں، وہاں مسلمان پر اہل حق کی تائید وتصدیق اور ان کا حکومت سازی کے لئے انتخاب کرنا واجب ہے، ہر قسم کے چھوٹے بڑے اختلافات کو بھلا کر متحد ہوجانا ضروری ہے، ایسے ہی مواقع کے لئے اللہ رب العالمین کا ارشاد "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" وارد ہوا ہے، اختلاف کے نتیجے میں پیدا ہوجانے والی کمزوری کو اس آیت "یا أیھا الذین آمنوا أطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا إن اللہ مع الصابرین" میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ تمام امور متعلقہ حرب میں (دشمنوں کو شکست دینے کے لئے) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا خاص لحاظ رکھو، تاکہ کوئی کام تمہارا خلاف شرع نہ ہو اور باہمی نزاع واختلاف مت کرو بلکہ متحد ہوکر دشمنوں کا مقابلہ کرو اگر تم میں باہمی نااتفاقی پیدا ہوگئی تو کم ہمت ہوجاؤ گے کیونکہ تمہاری طاقت منتشر ہوجائے گی اور ایک کا دوسرے سے اعتماد اٹھ جائے گا، ایسی صورت میں تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی تمہاری طاقت کمزور پڑ جائے گی) (بیان القرآن)۔

اللہ کے باغیوں اور دشمنوں کا مقابلہ مواقع اور حالات کے اعتبار سے کیا جانا ضروری ہے، تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، اور دین حق غالب آسکے۔ موجودہ دور کے جمہوری نظام میں ایسے ممالک میں جہاں مسلمان کی اکثریت ہو، مسلمانوں کو متحد ہوکر انتخابات کے ذریعہ دشمنوں کا مقابلہ کرنا بہترین اور آسان طریقہ ہے، اس لئے ایسے ممالک کے باشندوں پر خصوصا آمیات بالا کی تعمیل واجب اور ضروری ہے، احادیث مبارکہ میں بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متحد اور متفق رہنے کی تاکید اور اس کا فائدہ بھی بیان فرمایا۔

۲-جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں:

اس کی بھی دو صورتیں ہیں: الف-وہ جمہوری ملک جس میں مسلمان بڑی تعداد اور مؤثر اقلیت میں ہوں، ب-وہ جمہوری ملک جس میں مسلمان بہت چھوٹی اور گمنام غیر مؤثر اقلیت میں ہوں۔

(الف) کا حکم یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کو بھی جو انتخابات میں کلیدی اور مؤثر کردار کے حامل ہو سکتے ہیں، ہوا کے رخ پر بہہ جانے کے بجائے ان کے لئے ایسے طریقہ کار کی تلاش ضروری ہے جو تحفظ دین وایمان، جان ومال، عزت وآبرو کے لئے زیادہ سے زیادہ مؤثر اور مفید ہو سکے۔اور یہ کام پوری خوبی کے ساتھ بہتر طریقہ پر اہل صلاح وتقوی اور مجالس علماء کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے، اس لئے ان ممالک میں ایسی مجالس کا قیام ضروری ہے جو معروفات میں بندوں کی رہنمائی کریں اور منکرات سے ان کو بچا سکیں۔"فلولا نفر من کل فرقة" اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ معروفات کے پھیلانے اور منکرات سے روکنے میں حکومتوں کا بڑا دخل ہے۔اس مجلس کے ذمہ مسلمانوں کی اقلیتی جمہوری ملک میں اپنے نمائندوں کا انتخاب بصورت دیگر بے ضرر جماعتوں کے ساتھ اتحاد ان کا بنیادی فریضہ ہے اور وہاں کے بسنے والے مسلمانوں پر ان نمائندوں کی جو اہل صلاح نے منتخب کئے ہیں تائید وتصدیق نتائج وتاثیر کے اعتبار سے واجب یا جائز ہوگی۔

واجب الصورت میں جب ظن غالب ہو کہ حکومت ساز اسمبلی ہمارے ہی نمائندوں سے بن جائے گی ورنہ بقیہ دیگر صورتوں میں جواز کا حکم ہوگا۔اور ان کے قیام کی کوشش ضرور رہے گی، تا کہ مسلمانوں کی صیانت وحفاظت کی جا سکے اور ملی اور قومی مفادات کو نقصان پہنچنے سے بچایا جا سکے۔

ب-جن جمہوری ممالک میں مسلمان اقلیت میں رہتے ہیں، کوئی مؤثر مقام ان کا نہ ہو وہاں کے احکامات پہلی قسم سے مختلف اور جدا ہوں گے، اگر کہیں یہ صورت پیدا ہو جائے تو الیکشن میں حصہ لینے سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا، اس لئے اگر الیکشن میں حصہ نہ لینا قانونی جرم اور باعث ضرر نہ ہو تو کنارہ کشی اور اجتناب کا حکم ہوگا، تا کہ تعاون علی المعصیة کا سبب نہ بنے اور اس گناہ سے بچ سکے۔

اگر الیکشن میں حصہ لینا قانوناً ضروری ہو، اور حصہ نہ لینا جرم ہو، دفع ضرر کی نیت سے الیکشن میں حصہ لینے سے گناہ نہیں ہوگا، فقہی ضابطہ "الضرر یزال" اور "تعاون علی المعصیة" اس صورت میں براہ راست نہیں ہے، اس لئے دفع مضرت کے ارادے سے حسب ضرورت وحاجت حصہ لینا تعاون کرنا وغیرہ جائز ہوگا۔بعض مسلم اقلیتی جمہوری ممالک ایسے بھی ہو سکتے ہیں اور ہیں جہاں کوئی معتبر اور معتمد جماعت موجود نہیں ہے اور نہ ایسی جماعت قائم کرنے کی کوئی صورت بظاہر ممکن نظر آتی ہو، جتنی جماعتیں اور پارٹیاں موجود ہیں، وہ سب کے سب اسلام دشمنی پر متحد ہیں، پھر ان میں بھی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ایک وہ جن کی دشمنی مسلمانوں کے ساتھ اعلانیہ ہو، دوسرے وہ جن کی دشمنی اعلانیہ نہ ہو۔ایسے مقامات پر ان دونوں جماعتوں میں سے جس کا ضرر ونقصان کم ہو اور ووٹ دینا مجبوری ہو۔ووٹ دینا جائز ہوگا۔

سوال میں پیش کردہ صورت کا تعلق اسی قسم کے جمہوری ملک سے ہے، سوال کی اہمیت کے پیش نظر اور موضوع کی مناسبت کے سبب بقیہ دوسری صورتیں بھی لکھ دی گئیں۔اگر چہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تمام جمہوری ممالک اور اس کا نظام بے کار فرسودہ اور از کار رفتہ ہے، اس لئے دفع مضرت بھی غیر یقینی بلکہ بسا اوقات خوش خیالی کے سوا کچھ نہیں ہے۔یہ نظام پوری دنیا میں کہیں بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہا۔اعلی سے اعلی اور ادنی سے ادنی عہدہ داران با اختیار افراد واشخاص رشوت، فریب، مفاد پرستی، انانیت اور خود سری جیسے جرائم سے پاک نہیں۔ایسے لوگ دوسروں کے لئے باعث ضرر ہیں نہ کہ راحت رساں، پھر عدل وانصاف، ہمدردی، حقوق رسانی میں عملاً کیوں کر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ان کے اصلاح کی اس نظام میں کوئی صورت موجود نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جمہوری نظام کا بنیادی عنصر ہی غلط ہے۔ہر شخص کو رائے دہی کا حق واختیار اور ہر ایک کی رائے کی قیمت یکساں۔اسی طرح ہر کس وناکس کو امیدوار بننے اور مجلس قانون ساز کا رکن ہو جانے کا حق ہے۔اگر چہ وہ نہ قانون داں ہو نہ قانون ساز، بلکہ قانون شکن ہو تب بھی گنجائش نکل جاتی ہے، یہ دونوں بنیادی باتیں نہ صرف یہ کہ غلط ہیں بلکہ غیر معقول بھی ہیں، غرض یہ کہ از اول تا آخر پورا نظام غلط ہے، اس لئے خود اسے ختم کرنے اور بہتر نظام لانے کی ضرورت ہے اور وہ بلاشبہ اسلامی نظام ہی ہو سکتا ہے۔

ایک غلط چیز بھی دنیا پر ایسی مسلط ہوئی ہے جس کی بے سوچے سمجھے پیروی کی جارہی ہے، اس لئے ان کے احکامات تفصیل سے اوپر ذکر کئے گئے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ پوری دنیا کے جمہوری ممالک میں مسلمانوں کی تعداد اکثریت میں ہوگی یا اقلیت میں، اس طرح جمہوری ممالک دو قسموں پر منقسم ہو جاتے ہیں۔

۱-وہ جمہوری ملک جس میں مسلمان اکثریت میں ہوں۔

۲-وہ جمہوری ملک جس میں مسلمان اقلیت میں ہوں، پھر اقلیت والے ملکوں کی دو صورتیں ہیں:

الف-وہ جمہوری ملک جس میں مسلمان بڑی تعداد اور مؤثر اقلیت میں ہوں۔

ب-وہ جمہوری ملک جس میں مسلمان بڑی تعداد اور مؤثر اقلیت میں نہ ہوں۔

۱- جن جمہوری ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہو اور وہاں اہل حق و اہل دین ایک طرف، بد دین دوسری طرف، اس قسم کے ممالک میں مسلمانوں پر اہل حق و دیندار مسلمانوں کی نصرت واجب اور ضروری ہے۔

اگر بڑی آبادی اور مؤثر اقلیت میں مسلمان ہو تو حالات اور علاقے کے اعتبار سے حکم ہوگا۔ جہاں کہیں غلبے اور قوت کا ظن غالب ہوگا وہاں حمایت و نصرت واجب ہوگی، اور اگر ظن غالب نہ ہوگا بلکہ امکان ہو یا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہاں اسی اعتبار سے الیکشن اور انتخابات میں حصہ لینا جائز ہوگا۔

سوال نمبر ا کے الف، ب کے جوابات تفصیل بالا میں درج کئے گئے ہیں۔

ج-مسلمانوں کے لئے نہ تو ایسی سیاسی جماعتوں میں شمولیت درست ہوگی اور نہ ان کے نمائندوں کو ووٹ دینا درست ہوگا، اگرچہ وہ ذاتی اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتے ہوں، کیونکہ افراد و اشخاص جماعتی مقاصد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے، یوں گویا للاکثر حکم الکل کے تحت اسی جماعت میں شمار کئے جائیں گے۔ الا یہ کہ اس کے مدمقابل دیگر نمائندے جماعتی اور شخصی دونوں اعتبار سے اس سے زیادہ نقصان دہ ہوں تو وہ شخص اخف الضررین کا مصداق ہوگا، یا شخصی طور پر نسبتاً ہمدردانہ ہو مگر جماعتی اعتبار سے اس کی اصلاح کے بعد ہمدردی حاصل کی جا سکتی ہو۔

د-اگر مسلمان پارٹیاں موجود نہ ہوں، یا ان کا وجود و عدم برابر ہو تو غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے پیش نظر معاہدہ کر لینا اور ان کی حمایت و نصرت کرنا درست ہے، جیسا کہ بنو قریظہ اور دیگر قبائل کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ فرمایا تھا۔

ھ-اسی طرح اللہ کے حکم کے مطابق اہل کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتحاد کی بنیاد کی وضاحت فرما کر بدی یعنی شرک کے خلاف متحد ہونے کی دعوت دی تھی۔

۲- الف: مسلمانوں کے لئے ہر جگہ اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا بہتر ہے تاکہ غیروں کے تہذیبی مضر اثرات سے محفوظ رہ سکیں، قرآن کریم میں اللہ پاک نے غیروں کے ساتھ رہ کر اپنی تہذیب کھو دینے کو ظالم قرار دیا ہے۔

"إن الذين توفهم الملئكة ظالمي أنفسهم قالوا فيما كنتم قالوا كنا مستضعفين في الأرض. قالوا الم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئك مأواهم جهنم وساءت مصيرا"۔

(بے شک ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے (باوجود قدرت ہجرت کے پھر ہجرت کے تارک ہو کر) اپنے کو گنہگار کر رکھا تھا تو (اس وقت) وہ (فرشتے) ان سے کہتے ہیں کہ تم (دین کے) کس (کس) کام میں تھے (یعنی دین کے کیا کیا ضروری کام کیا کرتے تھے) وہ (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (اپنی بودوباش کی) سرزمین میں محض مغلوب تھے (اس لئے بہت سی ضروریات دین پر عمل نہ کر سکتے تھے یعنی ان فرائض کے ترک میں معذور تھے) وہ (فرشتے) کہتے ہیں (اگر اس جگہ نہ کر سکتے تھے تو) کیا خدا تعالی کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترک وطن کر کے اس (کے کسی دوسرے حصہ) میں چلا جانا چاہئے تھا (اور وہاں جا کر فرائض کو ادا کر سکتے تھے، اس سے وہ لاجواب ہو جائیں گے اور جرم ان کا ثابت ہو جائے گا) سو ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور جانے کے لئے وہ بری جگہ ہے) (ترجمہ از بیان القرآن ماخوذ از معارف القرآن ۲/۵۲۵)۔

احادیث مبارکہ میں اسلامی تہذیب کی حفاظت کے لئے کہیں "اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب..." اور کہیں "لاخرجن الیھود و النصاری من جزیرۃ العرب" وارد ہوا ہے، مشرکین و یہود کو ارض مقدس سے باہر کر دو۔

یہ ایک فطری اور عقلی ضابطہ ہے کہ اختلاط کی صورت میں مسلمان موثر نہیں۔ بلکہ متاثر ہی ہوں گے۔ اور یہ ایک ایسی ہی حقیقت ہے جس سے چند اللہ کے برگزیدہ بندوں کے سوا کوئی محفوظ نہیں رہ سکا ہے، اس لئے مخلوط آبادی میں رہائش کا موجودہ دور جواز بھی نہ ہونا چاہئے بہتری تو دور کی بات ہے۔

مشاہداتی نقصانات اس ممانعت وعدم جواز کی دلیل کے لئے کافی ہے مثلاً غیر مسلم لڑکیوں سے مسلمان کا نکاح کرنا وغیرہ۔

ب-غیروں کے جلوس میں شرکت اموات پر کی جانے والی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے وقت اس مجمع میں موجودگی، اسی طرح ایصال ثواب جائز و درست نہیں ہے۔ "من کثر سواد قوم فھو منھم" کی وعید اول الذکر دوصورتوں کے لئے ہے، جبکہ ایصال ثواب کی ممانعت آیت قرآنی "وما کان استغفار ابراھیم" سے ظاہر ہے، کیونکہ جب استغفار کی اجازت نہیں تو ایصال ثواب کی بدرجہ اولی نہیں ہوگی۔

ج-جو ہدایا وتحائف بتوں پر چڑھانے یا مذہبی رسومات سے گذارنے کے بعد پیش کی جائیں وہ لینا جائز نہیں ہے، اگر ان خرابیوں کے بغیر ہوتو جائز ہے۔

د-اس طرح کی اعانتوں کو قبول کرنا۔ جس کے عوض غیروں کے معبد اور ان کی مجالس کے لئے تعاون پیش کرنا پڑے، جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ تعاون علی المعصیۃ ہے اور وہ حرام ہے۔

ھ-ایسی تقریبات کا انعقاد مسلمانوں کا اس میں تعاون اور شرکت کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس سے عبادت کی حقیقت اور اس کی روح سیاست کی نظر ہوجاتی ہے اور زیادہ اہمیت اجتماع کی ہوتی ہے گویا پورا نظام نقض موضوع پر مبنی ہوتا ہے۔

۳- الف: جھنڈے کی سلامی فعل عبث ہے، ایک غیر ذی روح لاشعور علامت کے سامنے ایک باشعور ذی روح کا جھکنا بے وقوفی ہے، قلب موضوع بھی ہے، کیونکہ جھنڈے کی عظمت ان باشعوروں اور عقلمندوں کی وجہ سے ہے، وہی اس کے محافظ ونگہبان ہیں، ان باشعوروں کے وجود پر اس کا وجود موقوف ہے۔ یہ نہ رہ جائیں تو وہ بھی نہ رہے گا۔ نہ اس کی کوئی حیثیت رہے۔ لہذا ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جھنڈا ان کے سامنے جھک جائے نہ کہ یہ اس کے سامنے۔ غرض یہ کہ افضل کا مفضول کی عظمت وسلامتی کے سامنے جھکنا قلب موضوع یا فعل عبث اور ممنوع ہے، اور خدانخواستہ عقیدتمندی اور احترام کے ساتھ سلامی پیش کی جاتی ہے تو شرک بھی ہے، اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان جھنڈے کی سلامی کے لئے مامور کیا جائے اور نہ کرنے پر کسی دشواری، ہتک عزت وغیرہ سے گزرنا پڑے تو اوپر مذکور حقائق پیش نظر رکھتے ہوئے عقیدت اور احترام کے بغیر اس عبث ولایعنی کام میں شریک ہوجائے، تو مضائقہ ومواخذہ نہیں۔

ب-مسلمانوں کے لئے اس قسم کے ترانوں کا پڑھنا جائز نہیں۔

ج-عدلیہ کے فیصلے اگر اسلامی قوانین کے خلاف ہوں۔ اولا: تو مسلمان کو ایسی عدالت میں جانا ہی نہ چاہئے، دوم: ان معاملات کا احصاء کرنا چاہئے جن میں عدالت عموما غیر اسلامی فیصلے صادر کرتی ہے۔ اور اس سے مسلمانوں کو باخبر کرنا چاہئے، تاکہ وہ اس قسم کے فیصلے حاصل نہ کریں، نہ اس سے استفادہ کریں، اگر لاعلمی میں کوئی فریق انصاف فراہم کرنے والے اداروں میں اپنے مقدمات لے گیا اور اس کے حق میں فیصلہ کردیا گیا، تو اس کو اس فیصلے کے سہارے شریعت کے خلاف ناجائز حق سے استفادہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

۴- الف: سب سے پہلے تو یہ طے کرنا ضروری ہوگا کہ منزل کے اتحاد سے کیا مراد ہے، دنیوی زندگی کی کوئی منزل یا موت ومابعد الموت کی منزلیں؟ دنیوی زندگی کا اتحاد بداہۃ باطل ہے، البتہ سب موت پر متفق ومتحد ہیں، مگر کیفیات موت ومابعد الموت کے حقائق پر اتحاد کا دعوی بلا دلیل قابل التفات بھی نہیں۔ اور عقلی دلیل نہ لائی جاسکتی ہے نہ ہی مفید ہے، کیونکہ موت ومابعد الموت کے حقائق عقل کی گرفت سے باہر ہے، لہذا اس کے لئے صرف اور صرف نقلی دلیل ہی کام آسکے گی۔ اور نقلی دلیل میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی نقلی دلیلیں اگر موجود بھی ہوں تو غیر ثابت اور ناقابل استدلال ہیں، کیونکہ ان کے نقول متداول اور مستند طرق سے موجود نہیں ہیں اور جو کچھ ہیں وہ شکوک وشبہات سے خالی نہیں ہیں، اس لئے موت ومابعد الموت کے حقائق اور منزل کا تعین صرف اور صرف اس مذہب سے ہوسکتا ہے جس کے دلائل نقلیہ نہایت مستند شکوک

وشبہات سے پاک اور نا قابل انکار ہوں۔ اور یہ شرف صرف مذہب اسلام کے دلائل کو حاصل ہے جس کی تصریحات کے مطابق الگ الگ راستے والوں کی منزلیں الگ الگ ہیں، بلکہ ایک ہو ہی نہیں سکتی ہیں۔ ظالموں اور مشرکوں کے لئے جہنم اور عادلوں، وحدانیت پرستوں کے لئے جنت اور دونوں میں اتنا فرق ہے جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

ب-اس قسم کے مظالم کا حل اور سد باب اسلام میں ہے اور مسلمانوں پر ظالم ومظلوم دونوں کو کم از کم اس حقیقت سے آشنا کرنا اور اسلام کی دعوت دینا فرض ہے، تاکہ یہ فتنہ برتری وکمتری ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے، اور اس حقیقت کو سمجھانا کہ تم سب اور ہم سب پوری انسانیت ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت ہے اور ان کا جزمٹی ہے۔

اس طرح سب کی حقیقت واصلیت ایک ہے، پھر برتری وکمتری، اونچ نیچ، رنگ ونسل علاقائیت وقومیت انسانیت میں فرق وتفریق تفضیل و تحقیر کا معیار کیسے بن سکتی ہے؟

اس کے علاوہ مظلوموں کی مدد، پریشان حالوں کے کام آجانا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور ان کی حیات طیبہ کا ایک حصہ ہے، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی الفاظ میں تسلی دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاندار تعارف پیش کیا۔

”کلا واللہ لایخزیك اللہ أبدا، إنك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق“ (بخاری ۱/۳)۔

اس سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر سطح کے پریشان حالوں اور مظلوموں کے کام آجانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی..... جس میں مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اور قرائن وواقعات اس پر شاہد ہیں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ وہیں ایک مفید بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کے کام میں بڑی برکت ہوتی ہے اور سب سے بڑی برکت اور باعث راحت بات یہ ہوتی ہے کہ ایسے انسانوں کی نصرت من جانب اللہ ہوتی ہے اور کامیابیاں قدم چومتی ہیں، ناکامیاں منہ پھیر کر رخصت ہو جاتی ہیں۔

اس لئے مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے اسوہ مبارکہ پر گامزن رہنا مذہبی ذمہ داری ہے، بقدر استطاعت یہ کام مسلمانوں پر فرض ہے جس کے نتائج وثمرات دنیا وآخرت دونوں جہاں میں مرتب ہونے میں بھی شک نہیں ہے، پھر ایسا کام نہ کرنا امت کا بڑا خسارہ ہے۔

ج، د: رفاہی اداروں کے قیام اور ریلیف کے کاموں کا مقصد اصلا مسلمانوں کو راحت پہنچانا ہوتا ہے، اس لئے تقدیم وترجیح مسلمانوں کو ملنی چاہئے تاکہ اس کا اختصاص قائم رہے، تاہم کوئی غیر مسلم آجائے تو اس کے ساتھ امتیازی سلوک اور بے اعتنائی نہ ہونی چاہئے الا یہ کہ کوئی خاص مصلحت پیش نظر ہو۔

✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

عبداللطیف پالنپوری (گجرات)

۱- الف: اس سوال کے دو جز ہیں:

۱- مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا اور امیدوار بننا۔ ۲- مسلمانوں کا ووٹ دینا۔ دونوں جز کا الگ الگ جواب پیش خدمت ہے۔

۱- کسی مسلمان کا الیکشن میں حصہ لینا اور امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا اس شرط کے ساتھ درست ہے کہ وہ اس کی قابلیت وصلاحیت رکھتا ہو اور امانت داری اور قوم کی خدمت کے جذبہ کے ساتھ حصہ لے رہا ہو۔

۲- اگر امیدوار امانتدار، نیک، صالح اور قابل آدمی ہو تو اس کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے، اور غیر متدین شخص کو ووٹ دینا نہ صرف یہ کہ جھوٹی شہادت ہے اور بری سفارش ہے بلکہ ناجائز وکالت ہے (جواہر الفقہ ۲/۲۹۱)۔

اب رہی یہ بات کہ پارلیمنٹ کے تمام اراکین کو ملک کے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے جو بعض دفعہ شریعت اسلامی کے مغائر بلکہ اس سے متصادم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حلف وفاداری اس شرط اور نیت سے کہ جہاں تک خدا اور رسول اور شریعت کی نافرمانی نہ ہو میں وفاداری کروں گا، اٹھا لینے میں مضائقہ نہیں، اور پارلیمنٹ میں جانے کی نیت بھی یہ ہو کہ میں اپنی قوم وملت کے حقوق کی حفاظت کرنے اور حکومت کے ظلم وتشدد کا انسداد کرنے جا رہا ہوں (کفایت المفتی ۹/۳۷۲)۔

ب: اگر مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات انتخابات سے متعلق ہوں تو صحیح آدمی کو ووٹ دینا شرعاً لازم ہے (فقہی مقالات ۲:۲۸۷، کفایت المفتی ۹:۳۷۹، ۳۸۰)

ج: اگر الیکشن میں حصہ لینے والی کوئی سیاسی جماعت ایسی ہے جس نے علانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنا مقصد بنالیا ہو، لیکن اس جماعت کا کوئی امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہے اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہے پھر بھی اس کو ووٹ دینے سے احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ اس کو ووٹ دینا اس کی جماعت کو تقویت پہنچانا ہے، خصوصاً جبکہ اس کے مقابل دوسری سیاسی جماعتوں کے امیدوار بھی ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ مناسب رویہ رکھنے والے ہوں تو انہیں کو ووٹ دینا چاہئے، ہاں اگر دوسری سیاسی جماعتوں کے امیدوار ذاتی اعتبار سے بدخصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ عناد ودشمنی کا رویہ رکھنے والے ہوں اور پہلی جماعت کے امیدوار کی کامیابی یقینی یا غالب ہو تو ایسی صورت میں اس کو ووٹ دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، تاکہ کم از کم اس کے حلقہ میں مسلمانوں کے حقوق کو تحفظ حاصل ہو۔

د: انتخابات کے موقع پر جبکہ کوئی صحیح مسلم سیاسی پارٹی نہ ہو، تو شرعی حدود پر قائم رہتے ہوئے ملی وقومی حقوق کے تحفظ کے لئے غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ معاہدے کرنا، ان کے ساتھ شرکت کرنا شرعاً مباح اور جائز ہے (کفایت المفتی ۹/۳۷۰، ۳۷۱)۔

ھ: معروف کو پھیلانا، منکر سے روکنا، انسانیت کے نفع کے لئے کام کرنا اور معاشرے میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا یقیناً امت مسلمہ کا شرعی فریضہ اور طرہ امتیاز ہے، لہذا اگر تنہا مسلمانوں کی کوشش سے یہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہوں تو دوسرے طبقات کا تعاون نہیں لینا چاہئے، تاکہ مذہب اسلام کا خیر المذاہب ہونا اور امت مسلمہ کا خیر الامم ہونا روشن اور عیاں ہوجائے، البتہ اگر ان مقاصد کے حصول کے لئے دیگر طبقات اور غیر مسلموں کا تعاون لابدی اور ضروری ہو تو پھر شرعی حدود میں رہتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا صحیح ہے (مستفاد از کفایت المفتی ۹/۳۶۵، ۳۶۶)۔

۲- الف: موجودہ دور اور ملکی حالات کے تناظر میں مسلمانوں کو اپنی علاحدہ آبادیاں بنانا بہتر ہے، تاکہ وہ غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رہ سکیں، نیز فسادات کے موقع پر اجتماعی قوت کے ذریعہ اپنا دفاع کر سکیں۔

ب: غیر مسلم کی آخری رسومات کے وقت اس کے پاس رہنا یا اس کے جنازہ میں شرکت کرنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے، اسی طرح غیر مسلم کے لئے ایصال ثواب اور دعاء مغفرت نہ مفید ہے اور نہ جائز ہے (احسن الفتاوی ۴ / ۲۴۳، کفایت المفتی ۲ / ۲۸۲)۔

ج: مذہبی تقریبات اور تہواروں میں غیر مسلم حضرات اپنے مسلمان دوستوں کو جو تحفے اور تبرکات پیش کرتے ہیں، اس سے ان کا مقصد اگر تہوار کی تعظیم ہے تو لینا درست نہیں ہے، چاہے وہ بتوں کے نام پر چڑھائے ہوئے ہوں یا نہ ہوں، ہاں غیر مذہبی تقریبات جیسے شادی بیاہ، بچہ کی پیدائش وغیرہ کے موقع پر جو تحائف یا کھانا مسلمانوں کو دیا جائے اس کا لینا اور کھانا درست ہے، بشرطیکہ پاک ہونے کا یقین ہو (کفایت المفتی ۹ / ۲۷۰، ۲۷۴، ۲۷۶، فتاوی محمودیہ ۱۷ / ۲۷۰، امداد الفتاوی ۳ / ۴۸۱)۔

د: غیر مسلم حضرات مساجد، مدارس اور مسلمانوں کے مذہبی جلسوں میں تعاون پیش کریں تو چند قیودات کے ساتھ اس کا قبول کرنا صحیح ہے:

۱- اس کام کو وہ لوگ قربت اور ثواب کا کام سمجھتے ہوں، ۲- اس تعاون کے بعد احسان جتلانے کا اندیشہ نہ ہو، ۳- اس تعاون کے بدلے وہ لوگ اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر اور مذہبی تیوہاروں اور جلسوں کے لئے مسلمانوں سے تعاون کے خواستگار نہ ہوں (امداد الفتاوی ۲ / ۶۸۸، ۶۸۹، احسن الفتاوی ۶ / ۴۳۹)۔

رہا مسلمانوں کا ان کی مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کی تعمیر میں تعاون کرنا تو یہ درست نہیں ہے، اور تعاون علی الاثم کا ارتکاب ہے جس سے اجتناب لازم ہے، الا یہ کہ کسی جگہ مسلمان اقلیت میں ہوں اور چندہ نہ دینے کی صورت میں غیر مسلموں کی طرف سے ضرر کا اندیشہ ہو تو ان کو مالک بنانے کی نیت سے چندہ دے دیا جائے پھر اس کو وہ لوگ جہاں چاہیں خرچ کریں (فتاوی محمودیہ ۱۷ / ۳۸۸، ۱۷ / ۴۸۲)۔

۵- (الف): مسلمانوں کے لئے کفار کے ان میلوں اور اجتماعات میں شرکت ناجائز ہے جو مشرکانہ رسوم پر مبنی ہوں، حدیث شریف میں ہے: "من کثر سواد قوم فهو منهم"، ہاں اگر کسی ملی یا قومی مصلحت کی بناء پر مجبوری ہو تو اس شرط کے ساتھ مباح ہے کہ ان کے کسی مذہبی فعل کی طرفداری یا تعظیم نہ کی جائے (کفایت المفتی ۹ / ۲۷۷، ۲۷۹)۔

(ب): مجبوری میں گنجائش ہے۔

۳- الف: یہ محض سیاسی چیز ہے اور حکومتوں کا طریقہ ہے، اور اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتا ہے، بچنا اچھا ہے، اگر فتنہ کا ڈر ہو تو بادل ناخواستہ کرنے میں مواخذہ نہیں ہوگا، انشاء اللہ (فتاوی رحیمیہ ۶ / ۲۸۸)۔

ب: مسلمانوں کے لئے اس قسم کے ترانوں کا پڑھنا جائز نہیں ہے، جن میں مشرکانہ مضامین شامل ہوں۔

ج: ملک کے باشندوں کو انصاف فراہم کرنے والے ادارے اگر ایسا فیصلہ کریں جو شرعی نقطہ نظر سے صحیح نہ ہوں اور دونوں فریق مسلمان ہوں تو جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اس کے لئے اس فیصلہ سے استفادہ کی گنجائش نہیں ہے، دونوں کو چاہئے کہ دار القضاء یا شرعی پنچایت کے ذریعہ اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرائیں۔

۴- الف: سوال میں مذکور طریق، اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں ہے۔

ب: حتی المقدور انسانی اخوت کے رشتہ سے ان کا تعاون ایک اخلاقی فریضہ ہے۔

ج: خدمت خلق کے لئے قائم کردہ اداروں میں بلاتفریق تمام لوگوں کی خدمت و اعانت کی وسعت نہ ہو تو ایسے اداروں کو مسلمانوں کے لئے مخصوص رکھنا بہتر ہے، اور اگر تمام لوگوں کی خدمت کی وسعت ہو تو سب کے لئے دروازہ کھلا رکھنا چاہئے، مگر ترجیح مسلمانوں کو ہونی چاہئے۔

د: قدرتی حوادث جس سے تمام ہی لوگ متاثر ہوں، تو ایسے مواقع پر ریلیف کا کام انجام دینے والی مسلم تنظیموں کو برادران وطن کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کرنا چاہئے، تاکہ وہ لوگ اسلامی اخلاق سے متاثر ہوں۔

✧ ✧ ✧

تحریری آراء

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی/ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱- الف: اگر اکثر قوانین یا بالعموم خلاف اسلام بنتے ہوں یا بننے کا گمان غالب ہو تو ناجائز، ورنہ جائز۔

ب: واجب قرار دینا تو مشکل ہے، کیونکہ وجوب کے لئے قوی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ جائز، یا مناسب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ''جواہر الفقہ'' میں مفتی محمد شفیع صاحب نے انتخابات میں ووٹ کے استعمال کی شرعی حیثیت ایک شہادت کی بتائی ہے جس کا چھپانا شرعاً ممنوع ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۲۹۴)۔

لیکن ظاہر ہے کہ مفتی صاحب کی مذکورہ رائے پاکستان جیسے مسلمان اکثریت والے ملک کے پیش نظر دی گئی معلوم ہوتی ہے، مگر ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریت والے ملکوں کے تمام احکام میں مسلم اکثریت والے ملکوں سے برابری یا من کل الوجوہ مماثلت ضروری نہیں۔

ج: نہیں، کیونکہ پارٹی کے ٹکٹ پر جیتنے والے ممبران جماعت (پارٹی) کی پالیسی کے پابند ہوتے ہیں، چاہنے کے باوجود بعض مرتبہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے، بلکہ نہیں کرسکتے (ورنہ ممبری ختم ہونے تک کا خطرہ ہوجاتا ہے۔

د: جن پارٹیوں کی بنیاد ہی اسلام دشمنی اور مسلم دشمنی پر ہو ان سے معاہدہ کرنا اور اس میں شرکت کرنا شرعاً درست نہیں ہوگا۔

ھ: صاف اور اچھے ذہن اور غیر متعصب قسم کے غیر مسلموں سے تعاون لینا درست ہے اور انہیں جائز کاموں میں تعاون دینا بھی روا ہے۔

"لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا إلیھم" سے یہ مستفاد ہوتا ہے۔

۲- الف: اگر مسلمانوں کے غیر مسلموں پر اثر انداز ہونے اور اسلام سے انہیں قریب کرنے کا غالب گمان ہو تو غیر مسلموں کے درمیان مسلمانوں کا رہنا مناسب ہوگا، ورنہ نہیں، بلکہ اگر غیر مسلموں سے تہذیب وتمدن یا عقائد میں متاثر ہونے کا خطرہ یا معمولی امکان بھی ہو (جیسا کہ آج کل عموماً مشاہدہ میں آرہا ہے) تو ساتھ رہنا شرعاً جائز نہ ہوگا۔

ب: نہیں، "تعاون علی الإثم" ہونے کی وجہ سے۔

غیر مسلم کو ایصال ثواب کرنے کی شرعاً قطعی گنجائش نہیں ہے، "لا تصل علی أحد منھم مات أبدا ولا تقم علی قبرہ" کے تقاضے سے، دوسرے جائز کاموں میں شرکت کرنے کی گنجائش ہے، مثلاً جلوس جنازہ میں شرکت کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور دیگر ایسی رسومات جن میں تعبدی شان نہ ہو (غیر اللہ کی عبادت کا شائبہ نہ ہو) ادا کئے جانے کے وقت صرف موجود رہنے کی گنجائش نظر آتی ہے، عملی یا قولی شرکت کی نہیں، کیونکہ بظاہر تعبدی عمل نہ ہونے کے باوجود جنازہ میں ادا کئے جانے والے رسوم مذہبی ہی ہوتے ہیں اور معنیً تعبدی شان کے حامل۔

ج: تہواروں (اگر مذہبی عبادت کا رنگ نہ ہو) اور خوشیوں (مثلاً شادی بیاہ) کے مواقع پر ان سے مٹھائی لی جاسکتی ہے، البتہ مذہبی طور پر تقسیم ہونے والی کسی چیز کا لینا اور استعمال کرنا شرعاً درست نہ ہوگا، "ما أهل به لغير الله" کا مصداق ہونے کی وجہ سے۔

د: غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی تعمیر وغیرہ میں تعاون دینا شرعاً جائز نہیں (کیونکہ "تعاون على الإثم" ہوگا) اور اگر اس کا خطرہ ہو (بلکہ دور کا امکان بھی ہو) کہ غیر مسلم اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر میں جواباً تعاون لینے کی خواہش مند ہوں گے (یا مطالبہ کریں گے) تو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے اپنی عبادت گاہ مسجد وغیرہ کے لئے تعاون لینا بھی درست نہ ہوگا۔

ھ: الف: ایسی مذہبی تقریبات جن میں غیر اللہ کی عبادت ہونا معمول یا مظنون ہو ان میں شرکت جائز نہیں۔

ب: تیوہاروں پر مبارک باد دینا لفظی طور پر درست لگتا ہے۔

۳- الف: جھنڈا کو سلامی دینا شرعاً درست نہیں۔

ب: یہ بھی درست نہیں۔

ج: اگر شرعاً مسلمان کے لئے فی نفسہ اس کا استعمال جائز ہے تو اس سے استفادہ حلال ہوگا ورنہ نہیں، "إن القضاء لا يحل حراما"۔

۴- الف: ہرگز نہیں، "إن الدين عند الله الإسلام"، "ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه"۔

ب: ہر مسلمان پر امکانی حد تک ہر مظلوم اور ستم رسیدہ کی مدد کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ذمہ داری کا عین تقاضہ ہے کہ اس کے بارے میں مسئولیت ہو مگر "علی الکفایۃ" ہوگی، نہ کہ "عین" اور بقدر استطاعت ہوگی نہ کہ اس کے علاوہ۔

ج: مسلمان جیسا کہ اوپر گذرا، ہر مصیبت زدہ اور تکلیف میں مبتلا شخص کی مدد کرنے کا بقدر استطاعت شرعاً مکلف ہے اور ان میں "الاقرب فالاقرب" کا اصول بھی فطری ہے، یعنی اگر صرف ایک کی مدد کرنے کی استطاعت ہو اور ضرورت مند کئی ہوں تو اقرب کی مدد کرنا اقدم ہوگا، ظاہر ہے کہ غیر مسلم کے مقابلہ میں مسلم اقرب ہے، اور ایک اصل "الاحوج فالاحوج" بھی ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ "احوج" کو مقدم رکھا جائے۔

د: مذکورہ بالا جواب (ج) سے (د) کا بھی جواب معلوم کیا جاسکتا ہے۔

✧ ✧ ✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے اہم مسائل

مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی، جامعہ عربیہ، ہتھورا (باندہ)

۱- الف: جمہوری ممالک میں جہاں نظم وانتظام کا تعلق انتخابات سے ہے، وہاں الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا درست ہے، خواہ کسی اعتبار سے ہو، اور ملکی قوانین میں دستور کے ساتھ وفاداری کا جہاں تک معاملہ ہے تو مخالف شرع قوانین کچھ ہی ہوتے ہیں اور یہ جواز بنیادی مقاصد ومصالح پر مبنی ہے، کفار سے معاملات میں ایسے نظائر موجود ہیں کہ بنیادی مقاصد کے پیش نظر بہت سے ضرر کو بھی گوارا کرلیا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ اگر عین جنگ کے موقع پر کفار بعض مسلمانوں کو اپنے لئے آڑ بنالیں اور اب کفار کو نقصان پہنچانا بغیر مسلمانوں کو ضرر پہنچائے ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو نشانہ بنانے کی اجازت دی گئی ہے، سوال ایسے ممالک کا ہے جو بنیادی طور پر جمہوری اور سیکولر ہیں، جہاں قوانین کی وضع مفاد عامہ کے تحت ہوتی ہے۔

ب: ذاتی وملی مصالح ومفادات کی بقاء وتحفظ جب انتخابات سے متعلق ہے تو انتخابات میں حصہ لینا درست وبہتر تو ہے ہی، ضروری بھی قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ حالات کے تحت ضروری ہے۔

ج: جو جماعتیں اپنے دستور کی رو سے اسلام مخالف اور مسلمان دشمن ہیں ان کی جزئی مدد اور ان میں جزئی شرکت بھی درست نہیں، کیونکہ دو چار افراد کیا کرسکیں گے، جبکہ دستور ہی کچھ اور ہو۔

د: ملی مفادات کے تحت مناسب پارٹیوں سے معاہدہ ومعاملہ اور مدد سب درست ہے، بلکہ حسب موقع ضروری بھی ہے۔

ھ: جمہوری ممالک میں جہاں مختلف المذاہب لوگ رہتے ہیں مصالح کا مقتضی مل کر رہنا ہے، لہذا مشترکہ تنظیمیں ایک ضرورت ہیں اور ان میں مسلمانوں کی اچھی نمائندگی اور کارکردگی مسلمانوں اور اسلام کی اچھی شبیہ پیش کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

۲- الف: مسلمانوں کے لئے ہر اعتبار سے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی مستقل آبادیاں بنائیں، مخلوط آبادیوں میں رہ کر کام کی امید کم اور مضرتیں وخطرات زیادہ ہیں، مستقل آبادیاں ہوں جن کو مثالی بنایا جائے تو خود بخود مسلمان اثر انداز ہوں گے۔

ب: کافر کے لئے دعا واستغفار اور ایصال ثواب کی کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ جنازہ میں شرکت کی جاسکتی ہے، مگر جنازہ کی عمل میں شرکت کے بغیر، یعنی جلانے وغیرہ کے عمل میں شرکت نہ ہو، بس ساتھ رہ سکتے ہیں اور چل سکتے ہیں۔

ج: غیر مسلم اپنی تقریبات اگرچہ مذہبی کیوں نہ ہوں، ان مواقع میں کچھ پلائیں کھلائیں یا دیں تو گنجائش ہے، لیکن چڑھاوے والا سامان نہیں، اس کا لینا وکھانا غیر اللہ کے نام پر ہونے کی بنا پر درست نہیں ہے، البتہ کہیں مصلحت کا تقاضا ہو تو ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر کردے۔

د: اس طرح کا باہمی تعاون درست ہے، اصل تو یہ ہے کہ مسلمان بچے بالخصوص جبکہ اس کا امکان ہو کہ مسلمان کو بھی دینا وکرنا پڑے گا، لیکن حالات کے تحت کرنا پڑے اور کرنا پڑتا ہے تو نیت یہ کرلی جائے کہ مانگنے والوں کا تعاون اور ان کے لئے ہے، وہ جو چاہیں کریں، اس کام میں شرکت کی نیت نہ کریں۔

ھ: مذہبی تقریبات کی مناسبت سے کھانے پینے میں شرکت تو درست ہے، مگر نفس اعمال میں شرکت کسی طرح درست نہیں، عید کا کھانا پینا اس کے تحت

آتا ہے، مگر افطار کا مسئلہ مختلف ہے، وہ عبادت ہے جس میں بے جا توسع ہوتا جا رہا ہے۔

ایسے مواقع پر مبارکباد دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

۳- الف: جھنڈے کی سلامی کی بعض علماء نے اجازت دی ہے، اچھا نہ ہونا الگ بات ہے (ملاحظہ ہو: فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۸۸، بحوالہ مفتی کفایت اللہ، نقیب جولائی ۱۹۹۳ء)۔

ب: مشرکانہ مضامین پر مشتمل قومی ترانے، مسلمانوں کے لئے کسی طرح جائز نہیں ہیں۔

ج: جمہوری ممالک کی عدالتوں کے خلاف شرعی فیصلے جو باہمی معاملات میں ہوتے ہیں، ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اصلاً تو مسلمان کو ایسی عدالتوں سے ایسے معاملات میں رجوع نہ کرنا چاہئے، لیکن فیصلہ ہوجانے کے بعد دفع ضرر کی خاطر مدعا علیہ کو تو ماننا ہی ہوگا، رہا مدعی اور جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اس کے لئے حنفیہ کے اس قول کے تحت گنجائش ہوسکتی ہے کہ قاضی کا فیصلہ ظاہرا و باطنا دونوں طرح نافذ ہوتا ہے، اگرچہ مراد قاضی شرع وقاضی اسلام ہے، مگر ایسے ممالک میں کیا کیا جاسکتا ہے۔

۴- الف: راستے مختلف اور منزل ایک۔ یہ نظریہ سراسر غلط و باطل ہے، اور مسلمان کا اس کو تسلیم کرنا باطل مذاہب سے حسن عقیدت کو بڑھانے والا اور دین حق سے دلچسپی کو کم کرنے والا ہے۔

ب: انسانی اخوت اور اسلامی تعلیمات کے تحت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ برادران وطن کی بہتری کو سوچیں، اپنے معاملات تو درست رکھیں ہی، دوسری سطح میں بھی جد و جہد کرتے رہیں۔

ج: جمہوری ممالک میں رفاہی تنظیمیں جن کو مسلمان چلاتے اور قائم کرتے ہیں، ان کے افادے کو عام رکھنا و کرنا ضروری ہے، اس کے بہت سے فوائد ہیں، یہ بات الگ ہے کہ مسلمان بھائیوں کو اولیت دی جائے۔

د: ہنگامی حالات اور ناگہانی مصائب میں مسلمان کو عدل و انصاف اور حق و انسانیت کے مطابق معاملہ کرنا چاہئے، دوسروں کی تنگ نظری کو اسوہ نہ بنائیں، بلکہ "لکم دینکم ولی دین" کو اسوہ بنائیں۔

❖❖❖

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا نازبیر احمد قاسمی/اشرف العلوم کنہواں، سیتامڑھی (بہار)

جہاں تک ''مسلم غیر مسلم تعلقات'' کے حدود دائرہ کی بات ہے تو اس سلسلے میں ایک ''اصل کلی'' کے طور پر ہمارے سامنے نص قرآنی موجود ہے:

"لا یتخذ المومنون الکفرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذلك فلیس من الله فی شئ الا ان تتقوا منهم تقاة"

اس آیت کی روشنی میں دیگر احادیث نبویہ کی مدد سے تعلقات غیر مسلم کے ہر ہر نوع کے احکام آسانی کے ساتھ معلوم ہو جاتے ہیں۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''مسلمانوں کو چاہئے کہ ظاہراً یا باطناً کفار کو دوست نہ بنائیں''، لفظ اولیاء کا اطلاق اسی عموم کو چاہتا ہے، پھر ملحقات الترجمہ میں فرماتے ہیں:

''قوله ظاهرًا أو باطنًا'' أفاده إطلاق لفظ أولياء مع استثناء حال التقاه وإلا لم يصح الاستثناء لأن الخوف لايجوز الموالات الحقيقة القلبية لعدم الضرورة فيها. فإن القلب لايطلع عليه من يخاف منه'' فكان الأصل فى الموالات هو الحظر' والضرورى يقدر بقدر الضرورة وقد ارتفعت الضرورة بصورة الموالات (أى ظاهر الموالات) فلابد لصحة الاستثناء أن يكون المستثنى منه شاملا للصورة والمعنى أى ظاهر الموالات و باطنها فافهم''

مزید فرماتے ہیں: "تتقوا منهم تقاة" میں خوف سے مراد اندیشۂ قوی ہے صرف درجۂ وہم نہیں۔

آیت بالا سے گویا دفع مضرت کے لئے صرف ظاہری موالات کی اجازت ہے اور بس! حقیقی دوستی ہرگز جائز نہیں۔ اب یہ ظاہری خوش خلقی اور اچھا برتاؤ یعنی مدارات دفع مضرت کے لئے ہو یا کفار کے نفع دینی اور توقع ہدایت کی وجہ سے ہو یا پھر اکرام کے طور پر۔ باقی مالی تعاون، نفع رسانی اور احسان، یہ غیر حربی کے ساتھ جائز ہے، اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے، سورۂ ممتحنہ کی آیت: "لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم" سے "یحب المقسطین" تک، اور "إنما ینهاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین" سے "اولئك هم الظالمون" تک، میں اس کی صراحت موجود ہے۔

اس قرآنی اصل کلی کے بعد ضرورت نہیں کہ تعلقات غیر مسلم کے تمام جزئیات کو بھی زیر بحث لا کر اس کے متعلقہ احکام شریعت کی تفصیل اور وضاحت میں وقت ضائع کیا جائے۔

تعلقات کا ہر وہ نوع جو مداہنت فی الدین کو مستلزم ہوگا، رواداری کی ہر وہ شکل جو غیرت ایمانی اور دینی حمیت کے خلاف ہوگی، اور کسی بھی غیر اسلامی اور کفر و شرک کے شعائر کے احترام و تکریم تک پہنچا دینے والی ہوگی، اسے ہرگز جائز نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح تعلقات غیر مسلم کو نباہنے کی نیت سے جو فعل محض عبث و لا حاصل ہو یا جلب منفعت کی خاطر نہ ہو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

آخر میں اسی موضوع کے ذیل میں جو ایک سوال ''الیکشن'' کے بھی متعلق ہے اس سلسلے میں صرف اتنا واضح کر دینا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ''ووٹ'' کی جو شرعی حیثیت وکالت و شفاعت اور شہادت کی ہے اور اس کے متعلق شریعت اسلامیہ کی جو ہدایت و حد بندی ہے ان حدود کی رعایت اور ہدایت کی پابندی کی اہمیت شرعیہ واضح کرتے ہوئے عوام بلکہ خواص تک کی ذہن سازی بھی ہونی چاہئے، تا کہ وہ امیدواری کے میدان میں آتے ہوئے یا ووٹ دیتے ہوئے شرعی ہدایت کے استحضار کے ساتھ ہی الیکشن میں حصہ لے سکے، ورنہ یہ کہنے کی بات نہیں کہ ایک دم سے الیکشن میں حصہ لینا خواہ جس انداز سے بھی ہو محنت برباد گنہ لازم کا مصداق بھی ہو سکتا ہے۔ ✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری / جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، مرادآباد

۱- الف: انگریزوں کا رائج کردہ جمہوری نظام، حکومت اور طریق انتخابات عقل ونقل ہر اعتبار سے محل نظر ہے، اور موجودہ دور میں اس نظام میں اتنی خرابیاں در آئی ہیں جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا (فتاوی محمودیہ/ ۳۸۶)، اس لئے اس عمل میں کسی طرح بھی حصہ لینا بجائے خود ایک مفسدہ ہے، لیکن بدقسمتی سے چونکہ اب یہ نظام اکثر ممالک میں جڑ پکڑ چکا ہے اور اس کو نظر انداز کرنا مشکل ترین امر ہے اور اگر مسلمان اس سے بالکل الگ تھلگ ہوجائیں اور ووٹ کا استعمال ترک کردیں تو ان کے حقوق کے ضیاع کا واقعی خطرہ موجود ہے، اس لئے مجبوراً اس بڑے اور سنگین خطرہ سے بچنے کے لئے جمہوری ممالک کے الیکشن کے عمل میں امیدوار یا ووٹر کسی بھی حیثیت سے حصہ لینے کی اجازت دی جائے گی، تاکہ کسی نہ کسی درجہ میں حقوق کے تحفظ کا نظم ہوسکے۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: ''إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما'' (الاشباہ / ۱۴۵، جواہر الفقہ ۲/ ۲۹۴، فتاوی محمودیہ ۵/ ۱۶۲،۵/ ۲۴۱)۔

ب: ووٹ دینا ہر صورت میں تو واجب قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن حالات کے اعتبار سے بعض صورتوں میں واجب ہوسکتا ہے، مثلاً کسی مسلم دشمن یا ملک دشمن پارٹی کو اقتدار سے روکنے کے لئے ووٹ کا استعمال ضروری ہو (مستفاد کفایت المفتی ۹/ ۳۷۵)۔

ج: جمہوری نظام میں شخص کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ پارٹی کی اہمیت ہوتی ہے، لہذا مسلم دشمن جماعت کا امیدوار اپنی ذات سے کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو اس کی تائید دراصل مسلم دشمن پارٹی کی تائید کہلائے گی، اور اس کی حمایت کرنے سے مذکورہ پارٹی کو تقویت ملے گی، لہذا ایسی مسلم دشمن پارٹی میں شامل ہونا یا اس کے امیدوار کو ووٹ دینا "تعاون علی الاثم والعدوان" کی بنا پر ناجائز اور گناہ ہوگا۔

د- جب تک کوئی اور راستہ نہ نکلے "اھون البلیتین" کو اختیار کرتے ہوئے ملی مفادات کے اعتبار سے غیر مسلم سیاسی پارٹیوں سے اشتراک عمل کی گنجائش دی گئی ہے (کفایت المفتی ۹/ ۳۸۲) لیکن یہ ایک عارضی حکم ہے، اصل شرعی حکم اس موقع پر یہ ہے کہ مسلمانوں کو انفرادی طور پر کسی غیر مسلم پارٹی میں ضم ہونے کے بجائے خود ایسی جماعت تشکیل دینی چاہئے جس میں ان کا اثر سب سے زیادہ ہو، پھر یہ جماعت اصولی طور پر دیگر غیر مسلم پارٹیوں سے معاہدہ کرکے حسب معاہدہ اپنی جماعت کے انتخابی نشان پر انتخابات میں حصہ لے۔ اور کسی مسلم جماعت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مستقل طور پر کسی غیر مسلم پارٹی کے تابع محض بن جائے بلکہ اپنا امتیاز باقی رکھنا ضروری ہے۔

ھ- انسانیت کی خدمت دنیا میں امن وامان کے قیام اور کمزوریوں کی حمایت کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر انجمن یا تنظیم بنانا نہ صرف جائز بلکہ مفید اور مستحسن ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے ۲ سال قبل مکہ معظمہ میں ''حلف الفضول'' کے نام سے ایک بین القبائلی معاہدہ کیا گیا تھا، جس کی شرط یہ تھی کہ جب بھی مکہ میں کسی مظلوم پر ظلم ہوگا یا کسی کمزور کی حق تلفی کی جائے گی تو ہم سب مل کر مظلوم کا ساتھ دیں گے اور حق دار کو حق دلائیں گے، یہ معاہدہ مکہ کے مشہور سردار عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ہوا تھا جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی رونق افروز تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت ملنے کے بعد اس معاہدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اسلام کی حالت میں بھی اس طرح کے معاہدے کی طرف بلایا جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔ اس بنا پر مذکورہ اہم ترین مقاصد کے لئے غیر مسلموں سے اشتراک عمل میں شرعاً کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

''لقد شهدت فی دار عبدالله بن جدعان حلفًا لو دعيت به فی الإسلام لأجبت، تحالفوا أن ترد الفضول علی أهلها، ولا يغر ظالم مظلوما'' (الروض الانف ۱/ ۲۴۲، البداية والنهاية ۲/ ۲۹۶)۔ ✧✧✧

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ

۱- الف: موجودہ جمہوری حکومت کی بنیاد اس پر ہے کہ قانون کا ماخذ صرف جمہور کا اجتماعی ادارہ ہے، باشندگان ملک خود ہی قانون بنانے اور اس کے مطابق نظام حکومت چلانے کے مجاز ہیں، اکثریت جسے صحیح سمجھے جائز اور دستوری لحاظ سے درست اور جسے غلط قرار دے وہ قانوناً جرم کے دائرے میں آئے گا، جمہوری طرز حکومت میں عوام حاکم ہوتے ہیں، اس لئے ووٹ دینے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا حاصل شدہ حق حاکمیت دوسروں کو منتقل کرتا ہے اور کتاب وسنت سے بے پروا کو قانون سازی کا حق دیتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام کی بنیاد اس پر ہے کہ اللہ ہی مطاع حقیقی ہے، کسی دوسرے کے لئے آئین سازی اسی وقت زیبا ہے جبکہ وہ خدائی ہدایت کی روشنی میں قانون بنائے، اللہ کے سوا کسی اور کو مستقل قانون سازی کا حق دینا شرک ہے، اور اگر کوئی مسلمان غیر اللہ کے لئے قانون سازی کا حق تسلیم نہیں کرتا ہے، لیکن کسی ایسے ادارے میں شریک ہے جو خود کو قانون ساز سمجھتا ہو اور وہ اس قانون سازی میں معاون بھی ہو تو ایسا شخص فسق عظیم کا مرتکب ہے، لیکن اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر مسلمان اس کی رکنیت قبول نہ کریں یا انتخابات میں حصہ نہ لیں تو ان کے رہے سہے حقوق بھی ختم ہو جائیں تو بدرجہ مجبوری ان دو برائیوں میں سے کم تر کو گوارا کیا جاسکتا ہے، تاکہ دین، شعائر دین، اور ملی تشخص کے قیمتی اثاثے کو برقرار رکھنے میں مدد مل سکے۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ جو چیز بوقت ضرورت جائز ہوتی ہے وہ ضرورت کے بقدر ہی جائز ہوتی ہے، لہذا مذکورہ مقاصد کی تکمیل غیر مسلموں کو ووٹ دے کر ہوسکتی ہو تو مسلمانوں کو رکن بننے سے گریز کرنا چاہئے، تاکہ براہ راست غیر شرعی قانون سے اعلان وفاداری اور آئین سازی میں شرکت نہ ہو، اور اگر غیر مسلموں کے ذریعہ ان مفادات کا حصول ممکن نہ ہو تو پھر کسی مسلمان کو آگے بڑھنے کی اجازت ہوگی، لیکن اس کے ذہن میں بھی اس نظام کی قباحت وشناعت ہونی چاہئے، اور اس کے ساتھ ہی ایک کسک وتڑپ اس نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اسے بے چین رکھے، نیز دیگر لوگ بھی اس راہ کی جدوجہد سے غافل نہ ہوں۔

ب: ووٹ دینا کفر عملی اور فسق عظیم میں اعانت ہے، بدرجہ مجبوری رخصت ہے، لیکن عزیمت پر عمل کرنا اولی ہے، دوسرے طریقوں سے اپنی حیثیت منوانے کی کوشش ہونی چاہئے، رخصت پر عمل کرنے کی گنجائش ہے لیکن واجب کسی بھی حال میں نہیں۔

ج: دیکھا یہ جارہا ہے کہ پارٹی کے رخ ہی پر ممبران چلتے ہیں، اس لئے محض کسی ممبر کی ذاتی خصوصیات یا مقامی ضروریات اور مفادات کے پیش نظر فاشسٹ نظریات کی حامل جماعت کے کسی ممبر کو ووٹ دینا درست نہ ہوگا، اور نہ ہی ایسی جماعت میں شمولیت جائز ہوگی کہ اس کی وجہ سے ملی مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔

ھ: معاشرہ میں امن وسلامتی وغیرہ کے لئے غیر مسلموں کے اشتراک کے ساتھ کام کیا جاسکتا ہے، جس کے لئے احادیث میں مذکور واقعہ ''حلف الفضول'' بہترین نظیر ہے۔

۲- الف: عام حالات میں مسلمانوں کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ ایسی جگہ سکونت پذیر ہوں جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہوں، بلکہ وہاں سے نقل مکانی کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اور اس کے بچے غیر اسلامی تہذیب وتمدن سے محفوظ رہیں، کیونکہ غیر محسوس طریقے پر انسان اکثریت کے کلچر میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے، خصوصاً ہندوستان میں فسادات کے پس منظر میں حفاظتی نقطہ نظر سے مخلوط آبادی میں قیام کرنا غلط ہے، لیکن اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ وہ غیر مسلموں سے متاثر نہ ہوگا بلکہ اپنے کردار وعمل سے وہ اسلام کا مبلغ ثابت ہوگا تو ایسے شخص کے لئے ان کے درمیان رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام وغیرہ نے مختلف شہروں اور ملکوں کو اس وقت اپنا وطن بنایا جبکہ وہاں ان کے علاوہ کوئی اور اللہ واحد کا نام لیوا نہ تھا۔

ب: غیر مسلم کے جلوس جنازہ میں شرکت یا آخری رسوم کے وقت وہاں موجود رہنا درست نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی قریبی رشتہ دار ہو تو جلوس جنازہ سے دور رہ کر اور آخری رسوم جہاں انجام دیئے جا رہے ہوں وہاں سے ہٹ کر شریک ہوا جا سکتا ہے۔

غیر مسلموں کے لئے قرآن وغیرہ کے ذریعہ ایصال ثواب کرنا حرام ہے۔

ج: تہوار اور مذہبی تقریبات کے موقع کا تحفہ تو جائز ہے، البتہ بتوں پر چڑھائی ہوئی چیز پرشاد نا جائز ہے، کسی مسلمان کے لئے اس کا لینا جائز نہیں ہے۔

د: مساجد ومدارس میں غیر مسلموں کے تعاون کو قبول کیا جا سکتا ہے، البتہ ان سے چندہ مانگنا غلط ہے کہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے، لیکن مسلمان کے لئے مندر کی تعمیر، مذہبی جلوس، پوجا پاٹ وغیرہ کے لئے چندہ دینا ناجائز ہے، لیکن چندہ دیئے بغیر چھٹکارا نہ ہو تو مانگنے والوں کو مالک بنانے کی نیت سے دیدینے کی گنجائش ہے۔

ھ: غیر مسلموں کے تہوار اور مذہبی تقریبات میں شرکت نادرست ہے، اسی طرح سے تہوار کے لئے مبارکباد دینا بھی ممنوع ہے۔

۳- الف: جھنڈے کی سلامی میں احترام اور تعظیم کی ذہنیت کارفرما ہوتی ہے اور کسی کی تعظیم کے جواز کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اس کا مستحق ہو، اور کسی کا مستحق تعظیم ہونا موقوف ہے دلیل صحیح پر، اور جھنڈے کے لئے کوئی دلیل مستحق تعظیم ہونے پر موجود نہیں ہے، لہذا یہ ناجائز ہے، البتہ اگر صرف جھنڈا لہرانا ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

ب: جس ترانے میں وطن کی سرزمین کو معبود کا درجہ دیا گیا ہو، اسے پڑھنے یا پڑھنے کے دوران احتراما قیام کرنا حرام ہے۔

ج: غیر مسلم عدالتوں کے غیر شرعی فیصلوں کی تائید اور اس سے استفادہ کرنا جائز نہیں ہے۔

۴- الف: وحدت ادیان کا تصور کسی بھی درجے میں قابل قبول نہیں۔

ب، ج، د: مظلوم غیر مسلموں کی اعانت، ان کے دکھ درد میں شرکت، خدمت خلق کے ارادے سے غیر مسلموں کو فائدہ پہنچانا، قدرتی آفات کے موقع پر غیر مسلموں کی مدد جائز اور درست بلکہ باعث اجر وثواب ہے۔

* * *

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مفتی شیر علی گجراتی، دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر (گجرات)

۱-الیکشن سے متعلق جوابات:

الف: ملی مصالح کے پیش نظر الیکشن میں کھڑا ہونا ہی چاہئے، بشرطیکہ امیدوار کی نیت یہ ہو کہ وہ الیکشن مین جیت کر قانونی دائرہ میں رہتے ہوئے حتی الامکان ملی وقومی حقوق دلانے کی کوشش کرے گا اور حتی المقدور اصلاح اور ازالہ فساد کی سعی کرے گا۔

اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱-جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا جبکہ وہ غیر مسلم حکومت تھی۔

۲-اسی طرح ہمارے بعض اکابر کا معمول بھی الیکشن میں کھڑے ہونے کا رہا ہے، نیز ہمارے اکابر نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ سکوت اختیار فرمایا۔

۳-الیکشن میں حصہ لینے کے ساتھ بہت سے ملی ودینی فوائد وابستہ ہیں اور اس سے علاحدہ رہنے میں بہت سے خطرات ہیں۔

ب-ایسے نمائندہ کو جس سے عدل وانصاف کی امید ہو اور اس سے ملی وقومی مفادات وابستہ ہوں اس کو ووٹ دینا ہی چاہئے۔

ج-ایسی سیاسی جماعت جو علی الاعلان اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کرتی ہو، اس کے کسی ایسے امیدوار کو جس کا رویہ بظاہر مسلمانوں کے ساتھ مناسب ہو ووٹ دینا بالکل درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایسے امیدوار سے کوئی وقتی اور جزوی فائدہ تو ہوسکتا ہے، لیکن ملکی یا ریاستی سطح پر ایسے امیدوار سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ ایسے امیدوار کو ووٹ دینا در اصل اسلام دشمن پارٹی کو تقویت پہنچانا ہے، جو کسی طرح بھی جائز نہیں ہوسکتا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورۂ مائدہ/۲)۔

د-غیر مسلم سیاسی جماعت کے ساتھ انتخاب کے موقع پر ملی مفادات کے تحت معاہدہ کرنا، ان کی حمایت کرنا اور ان کا ساتھ دینا جائز ہے۔ صحیح اور جائز مقاصد کے تحت کفار سے معاہدہ کرنا قرآن کریم، سنت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

"وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله" (سورۂ انفال/۶۱)۔

اسی طرح صلح حدیبیہ، حلف الفضول (جس کی تحسین آپ ﷺ نے نبوت کے بعد بھی فرمائی) اور معاہدہ یہود مدینہ سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔

ھ-چونکہ مسلمان کی پیدائش کا مقصد ہی مخلوق خدا کی نفع رسانی ہے، اس لئے اگر مذکورہ بالا مقاصد کی ترویج واشاعت کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے تو وہ جائز ہوگا، بشرطیکہ ان کا اشتراک مستقبل میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے، نیز اس تنظیم اور ادارہ کے لئے کوئی خطرہ نہ ہو۔

دلائل حسب ذیل ہیں:

۱-"روى الشافعي في سنده عن ابن عباس رضي الله عنهما أن النبي ﷺ استعان بناس من اليهود في حربة"۔

۲-"قال النبي ﷺ: إن الله يؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر" (مسلم ۱/۷۲)۔

۳-ہر وہ کوشش جس سے اسلام کی ترویج ہو اور مخلوق خدا کو فائدہ پہنچے مستحسن ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وتعاونوا على البر والتقوى" (سورۂ مائدہ/۲)۔

۲-رہائش سے متعلق جوابات:

الف-بہتر اور مناسب یہ ہے کہ مسلمان الگ کالونیاں بنائیں یا مسلم اکثریت والے علاقوں میں رہیں۔لیکن اگر دعوت الی الحق کی خاطر کوئی مسلمان مخلوط آبادی میں رہنا چاہے تو رہ سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا اور اس کے متعلقین کا دین، جان، مال اور عزت محفوظ ہو۔لیکن اگر کسی وقت جانی یا مالی خطرہ پیدا ہو جائے تو اس وقت کسی محفوظ جگہ کی طرف منتقل ہونا ضروری ہوگا، بشرطیکہ اس پر قدرت ہو۔لیکن اگر منتقل ہونے پر قدرت نہ ہو تو وہ عنداللہ ماخوذ نہیں ہوگا، اللہ تعالی کا قول ہے:

"الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلة ولا یھتدون سبیلا" (سورۂ نساء/۹۸)۔

ب-بدرجہ ضرورت اور بوقت مصلحت معتبرہ کافر کا پڑوس اور انسانیت کے ناطے اس قسم کا تعاون جائز ہے جبکہ نیت درست ہو اور مداہنت کی صورت نہ ہو، البتہ ان کے مذہبی معاملات اور ان کی مذہبی رسومات میں شرکت کرنا جائز نہیں۔لہذا کافر کی عیادت، تعزیت اور اس کو پرسہ دینا جائز ہے، لیکن اس کو ایصال ثواب کرنا بالکل جائز نہیں ہوگا۔

ہاں اگر کافر پڑوسی بالکل مجبور ہو تو مسلمان پڑوسی ہونے کے ناطے اس کا جنازہ اٹھانے میں اور مرگھٹ تک پہنچانے میں تعاون کرسکتا ہے، جیسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو خواجہ ابو طالب کے دفن کا حکم فرمایا۔اسی طرح امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ حارث بن ابی ربیعہ کی والدہ نصرانی تھیں، ان کا انتقال ہوا تو بعض صحابہ ان کے جنازہ کے ساتھ ساتھ چلے (مصنف عبدالرزاق ۶/ ۳۶)۔

ج-بتوں کے نام پر چڑھائے ہوئے کھانے اور مٹھائیاں کھانا ناجائز اور حرام ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"

اور غیر مذہبی تقریبات کے کھانے اور تحفے قبول کرنا اور کھانا جائز ہے۔بشرطیکہ وہ پاک ہوں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم سلاطین وغیرہ کے ہدایا قبول فرمائے ہیں۔

د-مسجد وغیرہ کی تعمیر اور مذہبی تقریبات میں غیر مسلموں کا تعاون قبول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ آئندہ مسجد وغیرہ میں دخیل نہ ہوں۔

غیر مسلموں کے مندروں کی تعمیر اور مذہبی تقریبوں میں تعاون کرنا درست نہیں ہے، یہ "تعاون علی الإثم والعدوان" ہے۔ہاں اگر ضرر کا اندیشہ ہو تو چندہ لینے والے کو مالک بنا کر رقم دے دے اور تعمیر مندر وغیرہ کی نیت نہ کرے۔صرف اس کو مالک بنادے۔

ھ-غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں شرکت ناجائز اور حرام ہے، لیکن اگر کسی مصلحت کی بنا پر مجبوری ہو مثلاً دفع مضرت مقصود ہو یا تالیف مطلوب ہو تو شرکت جائز ہے بشرطیکہ ان کے کسی مذہبی فعل کی تعظیم نہ کرے۔

ہم موجودہ دور میں ایک جمہوری ملک میں رہتے ہیں جس کی اکثریت غیر مسلم ہے جو ہمیں آئے دن ہمارے تہواروں پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ہماری خوشی اور غم کے مواقع پر ہمارے ساتھ شریک ہوتے ہیں، یہ انتہائی روکھا پن ہوگا کہ وہ تو ہماری خوشی کے مواقع پر ہمیں مبارکباد دیں اور ہم ان کی خوشی کے مواقع پر اس سے جی چرائیں، اس لئے ان کے تہواروں کے موقع پر مبارکباد دینا جائز ہے بلکہ آپس میں محبت ومودت پیدا کرنے کے لئے اور باہمی نفرت کو ختم کرنے کے لئے ایسا کرنا بہتر ہے۔

۳-جھنڈے سے متعلق جوابات:

الف-جھنڈے کو سلامی دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ ایک سیاسی چیز اور فوجی عمل ہے اس کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں۔اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتا ہے۔ہاں اس میں یہ لحاظ رہے کہ حتی الامکان سلامی جھک کر اور ہاتھ جوڑ کر نہ ہو اور نیت یہ ہو کہ یہ حکومت کا ایک رواج اور سیاسی چیز ہے۔تعظیم مقصود نہ ہو۔

ب-وندے ماترم جیسا ترانہ جس میں شرکیہ کلمات ہوں مسلمانوں کے لئے اس کا پڑھنا جائز نہیں ہے، چاہے اس کا اعتقاد نہ ہو۔مسلمان قائدین کو اس قسم کے ترانہ کو منسوخ کرانے کی قانونی کوشش کرنا چاہئے۔

ج-مسلمانوں کو چاہئے کہ جگہ جگہ قائم امارات شرعیہ اور دار القضاء سے اپنے معاملات حل کرائیں اور اپنے مقدمات فیصل کرائیں لیکن اس کے باوجود

اگر کوئی مسلمان سرکاری کورٹ میں چلا گیا اور سرکاری جج نے اسلامی قانون کے خلاف فیصلہ کر دیا تو اس مسلمان کے لئے اس سے استفادہ بالکل جائز نہ ہوگا۔

۴-تمدنی اور ثقافتی وحدت سے متعلق جوابات:

الف: وحدت ادیان کا نظریہ اسلامی نقطہ نظر سے کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ یہ نظریہ کتاب وسنت کی بہت سی صریح نصوص کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ان الدین عند الله الاسلام" (سورۂ آل عمران/۱۹)۔

اسی طرح فرمایا: "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الآخرة من الخاسرین" (سورۂ آل عمران/۸۵)۔

ب-ایسے مظلوم طبقات کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ خیر خواہانہ اور ہمدردانہ ہونا چاہئے اور حتی الامکان مسلمانوں کو ان کا اخلاقی اور قانونی تعاون کرنا چاہئے اور ان کے حقوق دلانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ج-اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کا تقاضا یہی ہے کہ بلا تفریق مذہب وملت تمام انسانوں کے لئے خدمت کے دروازے کھلے رکھے جائیں اور تعصب وتنگ نظری سے کام نہ لیا جائے۔

✧✧✧

مناقشہ:

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

حضرات! دار کی فقہاء کے یہاں تقسیم اور موجودہ زمانے میں جو ممالک ہیں ان پر اس تقسیم کی تطبیق، دار الکفر میں امارت شرعیہ کے نظام کی شرعی حیثیت، اور نظام قضاء کے قیام کے لئے قوت تنفیذ یہ موضوعات یہاں زیر بحث نہیں ہیں بلکہ سوال نامہ میں جو نکات اٹھائے گئے ہیں ان تک ہی اپنی بحث کو مرکوز رکھنا ہے، مناقشہ کے آغاز کے لئے ملک کے بزرگ عالم دین مولانا افضال الحق جوہر قاسمی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ جو فرمانا چاہتے ہیں مختصر طور پر ارشاد فرمائیں۔

مولانا افضال الحق جوہر قاسمی:

مختلف موضوعات پر تمام علماء کرام نے اپنی رائے اور دلائل پیش کئے ہیں، اور اس مسئلہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے ہندوستان کے دو تین مسائل اہم ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستان ایسا ملک ہے جس کی بنیاد مذہبی مانی جاتی ہے چنانچہ ہمیشہ سے آج تک یہی ہوتا رہا ہے مذہبی بنیادوں پر یہ طے کر دیا گیا ہے کہ برہمن سب سے اونچی قوم ہے، چودھری سب سے نیچی قوم ہے، یہی بات اتنی پختگی سے پورے ملک میں کہی گئی ہے کہ آج تک ذات و برادری کا مسئلہ ختم نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے، حتی کہ مسلمان آئے، عرب سے آئے، مدینہ و مکہ سے آئے، بڑے بڑے علماء آئے لیکن یہاں آکر اسی رنگ میں رنگ گئے، یہاں اگر برہمن سب سے اچھی اور بڑی قوم تھی تو سید سب سے بڑی قوم مان لی گئی، پورے ملک کو چار جگہوں میں تقسیم کر لیا گیا جیسے ہندو تو میں تقسیم تھیں آج بھی تقسیم ہیں۔ ایسے ہی مسلمان بھی تقسیم ہو گئے، یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جو ختم ہونا چاہئے۔ آپ مساوات لے کر آئے تھے۔ "سؤر الإنسان طاهر" (انسان کا جھوٹا پاک ہے) آپ کے مسئلہ میں لکھا ہے کہ انسان چاہے جس قوم سے بھی ہو مسلم ہو غیر مسلم ہو اس کا جوٹھا پاک ہے۔

آپ کے یہاں مسئلہ لکھا ہوا ہے "كلكم من آدم و آدم من تراب" اس مساوات کی تعلیم دینی چاہئے تھی آپ نے نہیں دی، بلکہ یہاں سے ایک ایسی بات جو بالکل غلط تھی اور کوئی اس کی گنجائش نہیں تھی وہ آپ نے قبول کر لی، ایک بڑا مسئلہ ہے اور اس مسئلہ پر بحث ہونی چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان کی حیثیت کیا ہے، اس پر بحث کرنے کی گنجائش اس لئے نہیں ہے کہ اس وقت ہندوستان کا ایک دستور مرتب ہے، دستور مرتب کرنے والوں میں جہاں گاندھی جی نے امبیڈکر کو طے کیا تھا وہیں ان لوگوں نے چھ یا سات آدمی مقرر کئے تھے جن میں مولانا آزاد بھی تھے، جواہر لال نہرو بھی تھے، پٹیل بھی تھے، امبیڈکر بھی تھے، ایسے ہی اور آدمی تھے انہوں نے دستور کی بنیاد رکھ دی ہے، پوری دنیا میں اس کی مثال نہیں ہے۔ دستور کہتا ہے کہ آدمی برابر لہذا ایک چمار ایک برہمن اور سید پٹھان سب برابر، حیثیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے، مرد اور عورت کے لحاظ سے فرق نہیں ہے۔ فرق ہے عورت مرد کا لیکن عہدہ منصب اور ووٹ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے، برہمن کا ووٹ چمار کا ووٹ سب برابر ہے یہ بات بہت عجیب ہے، عظیم ترین بات ہے جو ہندوستان کو دی گئی ہے ہمیں اس کو کچھ نہیں کرنا ہے ہمیں اس کا پالن کرنا ہے، ہمیں اس پر توجہ دینی ہے اور اس کو بڑھانا ہے، اور اس وقت جو ہندوستان میں لڑائی لڑی جا رہی ہے وہ اس لئے لڑی جا رہی ہے کہ سب برابر ہیں، یا دہی ذات پات چلے جس کا نام باجپئی اور اڈوانی اور جوشی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہندو تو، پورا ملک ہندو ہوگا، پورے ملک میں ہندو حکومت ہوگی اور اس کے لئے دھیرے دھیرے وہ کام کر رہے تھے، خدا نے ان کو ناکام کر دیا ورنہ آگے جانے کیا کرتے، وہ لڑائی جو لڑی جا رہی ہے ہندوستان میں اسی لئے لڑی جا رہی ہے کہ سیکولرزم باقی رہے یا ہندوازم آئے، اس لڑائی میں اللہ تعالی نے آپ کی مدد کی، ہم مبارکباد دیتے ہیں اہل حیدرآباد کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے اس نظام کو پلٹنے میں بڑا کردار ادا کیا، تو ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس ملک کو کیا بنانا چاہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہندو ملک رہے گا، ہم کہتے ہیں مشترک ملک ہے مشترک ملک رہے گا، دستور آپ کا ساتھ دیتا ہے اور دستور نے اب تک جو کام کئے ہیں وہ آپ کی حمایت میں کئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دستور بدل جائے، ہم چاہتے ہیں کہ

دستور باقی رہے اس بنیاد پر مسئلہ کا حل نکالنا چاہئے، اس طرح کی چند باتیں ہیں جن کو بنیادی طور پر آپ نظر انداز کر کے سلجھے ہوئے مسائل میں ووٹ میں مت پڑیئے، وہ تو ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے ووٹوں نے جو آپ دیکھیں کیا کر دیا۔ کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا جو ہو گیا، یہ ووٹ کی طاقت سے ہوا اور ایک ایک ووٹ بڑا قیمتی ہے تو ووٹ میں طاقت بہت ہے، تو اس لئے کہنا ہے کہ ووٹ دینا حرام ہے، ناجائز ہے، مکروہ ہے یہ سب فضول کی بات ہے، اس ملک ہم بڑی طاقت ہیں جو لوگ اس کو ہندو ملک بنانا چاہتے ہیں ان کے خلاف لڑنے کے لئے یہ سب سے بڑا ہتھیار ہے اس لئے اس ہتھیار کو ضائع نہیں کرنا چاہئے، ان چند باتوں کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سعود عالم قاسمی:

حضرات! ایک تو گذارش یہ ہے کہ جن حضرات نے غیر مسلموں سے مسجد بنوانے کے سلسلے میں یا چندہ لینے کے سلسلہ میں [illegible] رائے دی ہیں وہ کوئی نص بھی پیش کر دیں، ہم تو پڑھتے ہیں: "ما كان للمشركين أن يعمروا مساجد الله شاهدين على أنفسهم بالكفر" یا نص کے علاوہ اگر صحابہ سے کوئی ایسی چیز ملتی ہے تو اسے پیش کر دیں۔ دوسرا سوال اس سلسلے میں یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلم آبادی میں مل کر رہنا چاہئے یا اپنی الگ آبادی بنا لینی چاہئے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی کہنا چاہئے کہ ہمارا جو انبیائی اور دعوتی موقف ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کو ہمیں ایک نعمت کے طور پر دیا ہے کہ اپنا دین اپنا ایمان اپنا قرآن اپنے رسول کی سنت ان کے سامنے پیش کر سکیں، اس موقع کو ہمیں ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ میں آپ کے سامنے وہ روایت بھی پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"المؤمن الذى يخالط الناس ويصبر على أذاهم خير من الذي لم يخالط الناس ولم يصبر على أذاهم"

اس طرح کی جو چیزیں ہمارے سامنے موجود ہیں اس میں امت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو پیش کرے، یقیناً میرٹ بھی ڈی میرٹ بھی۔ غیر مسلم آبادیوں میں رہنے کے نتیجے میں اگر [illegible] یا مارے جائیں گے تو ان کا حشر اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت عیسیٰ السلام کے ساتھ ہوگا، لہذا یہ را[illegible] مسلم آبادی میں رہنا چاہئے اور اس پر ہمیں یہ بھی بتانا چاہئے کہ اتمام حجت کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے اس لئے امت قائم ہوئی اس کے بعد کوئی دوسری امت نہیں آئے گی

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے تو...... زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

تیسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان کے سماجی مسائل میں پاکستان کے علماء کی رائے سے ہمیں کوئی بہت زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اس سے بہت سی غلط فہمیاں جنم لیں گی اور ان غلط فہمیوں کو پیدا کرنے کا موقع نہیں دینا چاہئے، ایسے مسائل جو اس طرح کے نہیں ہیں ہمارے سماج میں اس میں ضرور ان کی رائے ہمارے یہاں وقعت رکھ سکتی ہے، الیکشن کے سلسلے میں ہمارے یہاں فقہ اکیڈمی کا ایک طریقہ کار یہ رہا ہے کہ ایسے مسائل جن کا تعلق عصری مسائل سے ہو تو ان مسائل کے ماہرین کی ایک معقول تعداد بھی ہمارے یہاں ہوتی تھی لیکن وہ اب نہیں ہے، بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جن میں ہم لوگوں کو واقفیت نہیں ہے دستور، پارلیمنٹ، ووٹ کے مسائل بہت سی ایسی نزاکتیں جن میں ہمیں ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے جن کو علماء نہیں کر پاتے تو ہم چاہتے ہیں کہ ان سے بھی ہمارا استفادہ ہوتا۔

مولانا محمد ارشد قاسمی:

محترم صدر جلسہ اور حاضرین مجلس! چھوٹے چھوٹے سوالات کے بجائے ایک تمام دفعات پر مشتمل جامع سوال رکھنا چاہوں گا، بلاشبہ اسلامی نظام کے علاوہ تمام بین الاقوامی خود ساختہ نظام حکومت باطل ہے، تو مسلمان جہاں بھی ہوں جو بھی ہوں اور نظام حکومت کے ماتحت ہوں، خواہ وہ بادشاہت ہو، ڈیموکریٹک یا سیکولر حکومت ہو، انہیں چاہئے کہ ہر دین وسیاست دونوں میں اسلامی نظام حیات کو ہر طرح کے خوف وتردد سے ماوراء ہو کر پیش کریں، جمہوریت اور بادشاہت نظام حکومت اسلام کے نظریہ حکومت سے بالکل متصادم ہے، جنگ بدر کے علاوہ دیگر غزوات میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم جھنڈا کا استعمال کیا کرتے تھے، لیکن اس کی حیثیت صرف جھنڈے کی تھی، ان کو حد سے زیادہ تعظیم وتقدیس کی نگاہ سے نہیں دیکھا کرتے تھے، لیکن اسلامی فوج کا قدم کبھی نہیں رکا بلکہ روز بروز مختلف ممالک میں اپنا علم بلند کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اسرائیلی حکومت (اللہ کی اس پر لعنت ہو) کا بھی مسئلہ نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے، جس کی طرف میرے استاذ محترم جناب بدر القاسمی حفظ اللہ نے توجہ دلائی، کیونکہ اس حکومت کا قیام ظلم وجارحیت پر ہوا ہے، لہذا کسی مسلمان کا ان کے ساتھ دعوت یا قتل وقتال کے علاوہ کوئی دوسرا

معاملہ نہیں ہونا چاہئے، یہی میری رائے ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

جزاکم اللہ۔ اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک صاحب سے پوچھا کہ علم کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا:

معرفة الخير من الشر۔ شر کے مقابلے میں خیر کو جاننے کا نام علم ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ کوئی علم نہیں ہے، شر کے مقابلے میں تو خیر کو ہر شخص جانتا ہے علم نام ہے معرفة خير الشرين جہاں دو شر ناگزیر ہوں، ان دو میں کون سا شر بہتر ہے، تو مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں اور جن نظامہائے سیاست سے دوچار ہیں اس کی روشنی میں یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ جمہوریت نسبتاً ان کے لئے زیادہ مناسب ہے۔" والآن إن شاء الله نحن نستفيد من توجيهات الدكتور / مسفر القحطاني بالاختصار۔

ڈاکٹر مسفر القحطانی: (اردو ترجمہ)

مباحث کے خلاصہ پر تبصرہ کرنے میں جو سب سے اہم چیز ہے وہ یہ کہ تبصرہ کرنے والے کو چاہئے کہ سب سے بیشتر ان جدید مسائل وواقعات کا جامع اور باریک بینی کے ساتھ جائزہ لے جنہیں ماہرین قانون کی زبان میں اور کسی حد تک فقہاء کے تعبیر میں فقہی نقطۂ نگاہ سے جانا جاتا ہے، اور اس میں کسی طرح کی خرابی کی وجہ سے احکام پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، اور یہ فساد اس وقت بھی پیش آتا ہے جب کسی مسئلہ کے سلسلہ میں ایسی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں جو نہ صرف اس کی اصلیت ومعنویت سے بالکل ہی مختلف ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات ظاہری طور پر بھی ان کے درمیان توافق اور ہم آہنگی ناممکن ہوتا ہے، اس لئے ہمیں مسئلہ کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے اور کسی بھی طرح کے خارجی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے جس کی وجہ سے مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنے کے بعد اس کے مطابق اور مناسب حال دلیلیں پیش کرنے کی کوشش کریں گے جن میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اور یہ معاملہ صرف استنباط واستدلال تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ نئے مسائل کے تئیں فقہی جزئیات کی تخریج میں بھی اس طرح کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں، بلکہ علماء کو بھی چاہئے کہ جب وہ اس طرح کے واقعات پر گفتگو کریں تو اس طرح کے استشہادات ودلائل ومسائل کے درمیان کی وابستگی پر پوری باریک بینی ودقیقہ سنجی کے ساتھ توجہ دیا کریں۔

دوسری چیز جس کا تعلق ان میں سے اکثر مسائل سے ہوا کرتا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے، جو مصلحت کے اصول وقواعد سے متعلق ہے، علماء نے اصول سے مصلحت کی تین قسمیں کی ہیں، پہلی قسم قابل اعتبار مصلحت، یہ وہ ہے جو قرآن وسنت اجماع وقیاس جلی کے مطابق ہو، دوسری قسم ناقابل اعتبار مصلحت ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی وہ حجت بن سکتی ہے اور نہ ہی اس سے استدلال کیا جاتا ہے، یہ ایسی مصلحت ہے جو قرآن وحدیث کے نصوص قطعیہ سے بالکل متصادم ہو اور اجماع بھی اس کے خلاف ہو، ایک تیسری قسم مصلحت کی ہے جسے مصلحت مرسلہ کہا جاتا ہے، جسے نہ تو شارع نے لغو قرار دیا ہے اور نہ ہی انہیں قابل اعتبار سمجھا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے بیشتر مسائل مصلحت کی اسی قسم سے متعلق ہیں، لیکن جب علماء نے مصلحت مرسلہ کو دلیل کے طور پر پیش کیا انہوں نے اسے بحیثیت دلیل مطلق پیش نہیں کیا، جس کا نہ کوئی ضابطہ ہو اور نہ کوئی اصول وقواعد ہوں جنہیں کسی بھی استدلال کرنے والے یا مجتہد کو اختیار کرنا واجب نہ ہو، اور ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ جن مسائل کی مصلحت کو تلاش کررہے ہیں وہ ضروری اور ناگزیر مصلحت ہو، یعنی ان کا تعلق ضرورت وحاجت کے باب سے ہو...... دوسری شرط یہ ہے کہ یہ مصالح مصالح کلیہ ہوں نہ کہ جزوی مصالح ہوں، یعنی ان کا فائدہ عام مسلمانوں کو پہنچ رہا ہو نہ کہ کسی مخصوص جماعت تک ان کے مصالح وفوائد محدود ہوں، اور دوسروں کو ان سے نقصان پہنچ رہا ہو، تیسری بات یہ ہے کہ یہ مصالح قطعیہ ہوں یعنی مسلمانوں پر ان کا ظاہری اثر ہو یا ظنیہ بحیثیت ظن غالب ہوں، جن کی طرف اہل علم نے توجہ دلائی، اور ان تینوں شرائط کا امام غزالیؒ نے بھی تذکرہ کیا ہے، ان کے علاوہ دیگر فقہاء نے بھی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، حتی کہ امام شاطبی نے مجتہد کے لئے دو شرطیں بھی لازم قرار دی ہیں، پہلی شرط یہ ہے کہ مقاصد شریعت کو سمجھنے میں ان کو کمال حاصل ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ ان کے علاوہ ان کے اندر اجتہاد کے دیگر شرائط مثلاً کتاب وسنت کا گہرا علم ہو مقاصد شریعت کے سمجھنے میں فقہاء کرام کے اجماع واختلافات کا بھی علم ہونا چاہئے، اور اس طرح کے عمدہ موضوعات کی نشستوں میں اسی پر زیادہ زور دیا کرتا ہوں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ علماء ہند کی پختگی، بیدار مغزی اور دانشمندی خواہ وہ فقہی مباحث ہوں، سیاسی معاملات ہوں یا معاشرتی مسائل سے ان کا تعلق ہو، پر عمدہ دلیل ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

حضرات! ڈاکٹر مسفر صاحب نے بڑے اہم نکتہ کی طرف متوجہ کیا ہے میں خاص طور پر اس کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ حضرت قاضی صاحب ہمیشہ اس پر زور دیتے تھے کہ قضایا معاصرۃ پر غور کرتے ہوئے اصولی منہج کو سامنے رکھنا چاہئے۔ صرف فقہی جزئیات پر قناعت کرنا ہمارے لئے کافی نہیں ہوگا ان کی اہمیت سے انکار نہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ مصلحت مرسلہ اور اس کے تطبیق کی جو بحث شیخ مسفر نے فرمائی ہے وہ بہت اہم ہے۔

مولانا جلال الدین عمری:

محترم صدر مجلس اور علماء کرام! اسلامک فقہ اکیڈمی جس طرح کے بنیادی اور اہم مسائل کو چھیڑتی رہتی ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ ہم میں سے بہت سے حضرات نے اس کے سیمناروں میں شرکت بھی کی ہے، اس وقت بھی جو موضوعات زیر بحث ہیں میرا خیال ہے کہ وہ بہت ہی اہم اور بنیادی نوعیت کے ہیں۔ موجودہ حالات سے ان کا بڑا گہرا تعلق ہے، اور ان پر میرا خیال ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ سوچتے بھی رہتے ہوں گے۔ ایک بنیادی مسئلہ جو کل سے زیر بحث آیا اور درمیان میں آتا بھی رہا ہے وہ غیر مسلموں سے تعلقات کا مسئلہ ہے، کل اس پر تفصیل سے بحث ہوئی لیکن آج بھی مختلف عنوانات کے تحت اس کا ذکر آتا رہا ہے، میرا خیال ہے کہ اس میں بنیادی چیز جو دیکھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام کی بعض بنیادی تعلیمات ہیں، اس کے عقائد ہیں، اور وہ اساسی فکر ہے جس پر پوری شریعت اسلامیہ کا انحصار ہے، ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی اور دیکھنا ہوگا کہ ان تعلقات میں اسلام کا بنیادی فکر، اس کا عقیدہ اور اس کی اساسی تعلیمات متاثر نہ ہوں، اگر ان کو کہیں نقصان پہنچتا ہے یا وہ اساسی تعلیمات متاثر ہوتی ہیں یا اس کے عقیدے پر کہیں ضرب لگتی ہے، تو ظاہر ہے کہ اس طرح کے تعلقات سے ہمیں اجتناب کرنا ہوگا۔

یہ بات اس پہلو سے اہمیت کی حامل ہے کہ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں جیسے ہندوستان ہے، باوجودیکہ تقریباً پندرہ کروڑ مسلمان یہاں رہتے ہیں، لیکن اگر آدمی یہ دیکھے کہ ایک سو دس کروڑ کے درمیان وہ پندرہ کروڑ ہیں تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، جہاں بھی وہ اقلیت میں ہوں گے کسی نہ کسی طرح اکثریت کا دباؤ ہوگا، پریشر رہے گا ایک طرح کا، اس میں اس بات کا امکان ہے کہ کچھ ایسے بھی اقدامات ہم کر بیٹھیں جو شریعت سے مطابقت نہ رکھتے ہوں، یا کم سے کم شریعت کے مزاج سے میل نہ کھاتے ہوں، اس لئے کہ جب آدمی دباؤ میں کسی مسئلہ پر سوچتا ہے یا غور کرتا ہے تو اس طرح کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، یہ دباؤ آپ جانتے ہیں کہ سیاسی بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات اور سماجی بھی ہوتا ہے، تعلقات کا بھی ہوتا ہے، اور کچھ اپنی کمزوری کا احساس بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے مسائل کا جائزہ لیتے وقت اس بات کا ضرور خیال رکھنا ہوگا کہ ہماری کوئی چیز، ہماری بنیادی فکر، ہمارا عقیدہ توحید، شرک سے ہماری بیزاری اور ہمارا رسالت پر ایمان ویقین اور آخرت پر ایمان ویقین اور اس کی بنیادی اخلاقیات، یہ متاثر نہ ہوں۔ اس کے بعد جو تفصیلات ہیں اس میں اختلاف ہوسکتا ہے اور اس اختلاف کو ہمیں گوارہ کرنا ہوگا، البتہ اگر اکیڈمی کی اکثریت یا مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسا ادارہ کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کا احترام ہم سب کے لئے ضروری ہوگا، لیکن بہر حال یہ مان کر چلنا ہوگا کہ تفصیلات کے اندر ہمارے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے اس بنیادی بات کو تسلیم کرتے ہوئے۔

دوسری بات میں یہ عرض کروں گا کہ اسلام نے جو اخلاقی تعلیمات دی ہیں وہ بالکل عام ہیں، اور ان میں کوئی ایسی بات آپ کو نہیں ملے گی جس سے یہ محسوس کیا جائے یا سمجھا جائے کہ یہ صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے، مثال کے طور پر قرآن نے دیانت کی، امانت کی، عفت کی، عصمت کی، صداقت کی اور اس طرح کی بے شمار تعلیمات دی ہیں اور مسلمانوں کو ان کا پابند بنایا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے، اگر مسلمان بدکاری کا ارتکاب کرتا ہے، چوری کا ارتکاب کرتا ہے تو بھی اسے سزا ہوگی اور غیر مسلم اس کا ارتکاب کرتا ہے تب بھی اسلامی حکومت اسے سزا دے گی۔

میں اس فقہی بحث کو نہیں چھیڑ رہا ہوں کہ غیر مسلم بھی ان قوانین کے پابند ہوں گے یا نہیں؟ لیکن بہر حال اسلام کے نزدیک وہ اس کے لئے بھی ناجائز ہے، اسی طرح مسلمان اگر غیر مسلم سے معاملہ طے کرے اسلامی ریاست کے اندر تو وہ اسلامی حدود کا پابند ہوگا، بلکہ ابن قدامہ کہتے ہیں کہ کوئی مسلمان اگر کسی غیر مسلم ملک میں جائے مستامن بن کر تو وہاں بھی وہ دھوکے کا معاملہ نہیں کرسکتا، بہت صراحت کے ساتھ لکھا ہے، اس لئے کہ انہوں نے کہا ہے کہ اس بنیاد پر وہاں آنے کی اسے اجازت ملی ہے کہ وہ وہاں کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، اور وہاں دھوکہ نہیں دے گا، فریب نہیں دے گا۔ تو ظاہر ہے کہ جس چیز کی دوسرے ملک میں جانے کے بعد بھی اجازت نہیں ہے تو ہمیں اپنے ملک میں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اسلام کی بہت سی تعلیمات میں آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں سے اس میں خطاب ہے، جیسے: "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده" تو یہ بات میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے معاشرہ کو سامنے رکھ

کر کہی گئی ہے۔ خطاب مسلمانون سے اور مسلم معاشرہ سے ہے، لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ باتیں صرف مسلمانوں کے لئے ہیں، اس میں ظاہر ہے کہ غیر مسلم بھی آتے ہیں اور ان کے ساتھ بھی ہم اسی سلامتی کا رویہ اختیار کریں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ اسلام مسلمانوں کے اخلاق کو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو اور سمجھنا چاہئے کہ وہی اخلاق مسلمانوں کے لئے بھی نمونہ ہیں، اسلام کے لئے ایک نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ قرآن کے بالکل ابتدائی دور میں فرمایا: "إنك لعلى خلق عظيم" ہی فرمایا: "فقد لبثت فيكم عمرًا من قبله أفلا تعقلون" یعنی آپ کا کردار، آپ کی سیرت اس بات کی دلیل تھی کہ آپ صادق ہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، تو مسلمانوں کا کردار جتنا اونچا ہوگا غیر مسلم معاشرے میں وہ خود ایک سند بن جائے گا، ایک ثبوت ہوگا اس بات کا کہ اسلام دین حق ہے، اس لحاظ سے ہم ان کے ساتھ جو رویہ اختیار کریں اس میں اس کا ہمیں خیال رکھنا ہوگا۔ بعض وہ آیات جن کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے کہ "لا يتخذ المؤمنون الكافرون أولياء" ان سے ربط نہ رکھنے کی بات یا ان سے مودت کی ممانعت کی گئی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ اس پر میں چاہوں گا کہ اہل علم غور فرمائیں، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان چیزوں کا ان ہدایات کا تعلق حالت جنگ سے ہے یا حالت امن سے؟

اگر کسی قوم سے آپ جنگ کی حالت میں ہیں تو اس وقت جو احکام آپ نافذ کریں گے وہ بالکل مختلف ہوں گے اس سے، جو حالت امن میں نافذ کریں گے۔ قرآن نے صاف صاف فرمایا ہے کہ اہل ایمان غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں:

"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم"

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے منع نہیں کرتا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک بھی ہو، اور "تقسطوا إليهم" کا مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کا حصہ ان کو ادا کرو، ان کا قسط ان کو ادا کرو، ان کا جو حق بنتا ہو اس سے انہیں محروم نہ کرو، یہ رویہ اختیار کرنے کی بات کہی گئی ہے، پھر اس کے بعد آگے فرمایا کہ اللہ تو ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے تمہیں منع کرتا ہے، یہ رویہ اختیار کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تمہیں گویا مکہ سے نکالا، تمہارے ساتھ ظلم وزیادتی کی، ان کے ساتھ معاملہ دوسرا ہوگا، اس لئے کہ وہ اس وقت حالت جنگ میں ہیں، ان سے جنگ کی جارہی ہے ان کے جرائم کی وجہ سے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کی جتنی آیات ہیں ان کو اسی پس منظر میں دیکھنا ہوگا تبھی ہم اس کا صحیح معنی اور صحیح مفہوم متعین کرسکیں گے۔ اس سلسلے کی ایک خاص بات جس کی طرف بہت سے دوستوں نے توجہ دلائی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ میں بھی دو لفظ کہہ دوں، وہ یہ ہے کہ یہ امت اصلاً دعوت کی امت ہے، امت دعوت ہے، اسے دعوت کا کام کرنا ہے اس ملک میں اور پوری دنیا میں، یہ امت اس لئے ہے کہ اس دنیا میں شہادت علی الناس کا فرض انجام دے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام انجام دے، یہ اس امت کا فرض ہے، اور یہ فرض اس پر عائد ہوتا ہے غیر مسلموں کے درمیان، تو اس لحاظ سے آپ دیکھیں، اگر آپ کا مخاطب کے ساتھ ایسا رویہ ہو جس میں وہ دعوت کے دروازے اس کے لئے بند ہو جائیں تو گویا دعوت کی راہ میں آپ رکاوٹ بنے، آپ کا رویہ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ محسوس کرے کہ یہ میرا ہمدرد ہے، یہ میرا خیر خواہ ہے۔ پیغمبروں کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ ناصح اور امین ہوتے ہیں، وہ خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ مان کر چلنا چاہئے کہ ہمارا رویہ نصیحت کا ہوگا، نصح وخیر خواہی کا ہوگا، بھلائی کا ہوگا، تب ہی ان کے دل کھلیں گے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ جان دے دیں گے "لعلك باخع نفسك أن لا يكونوا مؤمنين" یہ اگر کیفیت نہیں ہے تو یقین جانئے کہ دعوت کے دروازے کھلیں گے نہیں۔

اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ آپ کا مخلص نہیں ہے، ظاہری طور پر آپ سے معاملہ کر رہا ہے، آپ کی دوستی بھی اس کی اغراض کے ساتھ وابستہ ہے، وہ آپ کے اس بڑے پیغام یعنی اللہ کے دین کو قبول کرے یہ آسان نہ ہوگا۔ اس لئے اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہئے اور ناصح وامین بن کر ان کے سامنے آنا ہوگا۔

ایک مسئلہ یہاں الیکشن کا بار بار آیا ہے اس کے سلسلہ میں بھی دو چار باتیں کہنا چاہوں گا، ایک بات تو یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کا عقیدہ ہے کہ انسان کو قانون دینے کا حق اللہ ہی کو ہے۔ اسلام اللہ کا دین ہے اور کسی دوسرے انسان کو یا کسی قوم کو یا کسی برادری کو یا کسی طبقہ اشراف کو یا کسی پارلیمنٹ کو قانون دینے کا حق نہیں ہے، ہمارے یہاں اصلاً قانون، شارع اصلاً اللہ ہے، اور یہ بات قرآن میں بہت سی آیات میں کہی گئی ہے، فقہ میں بھی کہی گئی ہے اور یہاں تک کہ فقہ واصول فقہ میں صراحت کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہم شارع مجازاً کہتے ہیں، شارع اصلاً خدا ہے، قانون دینے کا حق اسی کو ہے، اب آپ یہ دیکھئے کہ آپ ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس آبادی میں رہ رہے ہیں ہندوستان ہو یا امریکہ، برطانیہ ہو یا یورپ کا کوئی بھی ملک ہو جہاں اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ نہیں ہے وہاں اللہ کو

قانون ساز نہیں مانا جارہا ہے اور نہ یہ دیکھا جارہا ہے کہ کس معاملے میں اللہ کا حکم کیا ہے بلکہ وہ اپنا قانون نافذ کررہے ہیں، اس میں آپ کا کیا رویہ ہوگا یہ ہے اصل سوال، کیا ایسا رویہ ہوگا جس میں آپ یہ کہیں کہ ہم اس قانون کو ہی نہیں مانتے، ظاہر ہے کہ اگر آپ نہ مانیں گے تو اس کے ساتھ دوسری پیچیدگیاں پیدا ہوں گی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے، وہاں اسلامی قانون نافذ نہیں تھا لیکن غیر اسلامی قانون کے تحت آپ نے زندگی گذاری اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کا دین پیش کرتے رہے، اب یہاں الیکشن کا جو مسئلہ آتا ہے اس میں صرف دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ پارلیمنٹ کو یا کسی ادارے کو قانون بنانے کا حق نہیں ہے، موجودہ حالات میں ہمارے لئے بہتر صورت کیا ہوگی؟ جس میں مسلمانوں کا، اللہ کے دین کا، ملت کا مفاد جس سے بہتر طریقے سے حاصل ہوسکے، یہ مسئلہ ہے، اس میں رائے مختلف ہوسکتی ہے اور اس سے ہمارے لئے راہیں کھلتی ہیں، فرض کیجئے دعوت کی راہ کھلتی ہے یا اپنی بات رکھنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں، یا ہمارے مفادات کی حفاظت ہوتی ہے تو اس میں حصہ لینے کی ایک صورت بہرحال نکل آتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ضروری ہوگا کہ آپ یہ حقیقت بھی واضح کرتے رہیں، صرف اسی کو ہدف نہ بنالیں کہ اس دنیا میں کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسان پر حکمرانی کرے۔ حکمرانی کرنے کا حق صرف اللہ کو ہے، اور یہ کہ اس دنیا کے اندر کسی بھی گروہ کو یا کسی بھی جماعت کو قانون سازی کا حق ہم دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور دنیا میں جو ظلم و فساد ہورہا ہے اس کی اصل بنیاد یہی ہے، یہ ظلم اسی وقت ختم ہوگا، چاہے وہ امریکہ ظلم کررہا ہو یا یورپ کے ممالک ظلم کررہے ہوں یا اسرائیل کی طرف سے ظلم ہورہا ہو، یا کہیں بھی ظلم ہورہا ہو، یہ اسی وجہ سے ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کو قانون ساز نہیں مانا گیا اور اس کے قوانین کی پیروی نہیں کی گئی۔ ورنہ عدل و انصاف ہر جگہ قائم ہوسکتا تھا، یہ بات دنیا کے سامنے کہنے کی ضرورت ہے۔

ایک بات بار بار یہاں چھیڑی گئی ہے، وہ یہ کہ ظلم کے خلاف بہت سے لوگ کام کرتے ہیں اور بہت سے طبقات پر ظلم ہورہا ہے، اب ہم ان کے لئے عدل وانصاف کی آواز اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ ظلم جہاں بھی ہو عدل کی آواز اٹھانا مسلمان کی ذمہ داری ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں جس وقت دعوت دے رہے تھے شاید دس بیس پچیس افراد مسلمان تھے، لیکن آپ دیکھیں کہ مکی سورتوں میں ظلم کی ہر قسم کو چیلنج کیا گیا، بیس افراد ہیں اور ہجرت کرتے کرتے ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہوگئی تھی دو سو ہوگئی تھی، لیکن جس وقت یہ سورتیں نازل ہوئیں خاص طور پر آخری پارہ کی سورتیں تو اس میں آپ محسوس کریں گے کہ مسلمانوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، فرمایا:

"فلا اقتحم العقبة وما أدراك ما العقبة فك رقبة أو إطعٰم في يوم ذي مسغبة يتيمًا ذا مقربة أو مسكينًا ذا متربة" "كلا بل لاتكرمون اليتيم ولا تحاضون على طعام المسكين وتأكلون التراث أكلا لمًا"

کس سے خطاب تھا؟ مسلمان تو یہ کام نہیں کرتا تھا، ظلم کے خلاف آواز تھی اور اسے چیلنج کیا جارہا تھا۔ یہ تصویر مسلمان کی اس ملک میں ابھرنی چاہئے کہ وہ ظلم کے خلاف ہے، عدل کا علم بردار ہے، وہاں تو دس بیس آدمی مسلمان تھے اس وقت یہ آواز اٹھائی گئی، آج جب یہاں آپ ہم سمجھتے ہیں کہ اب پندرہ کروڑ کی آبادی ہے تو کیا آپ یہ آواز نہیں اٹھا سکتے، عدل قائم کرنے والے بن کر آپ اٹھئے پھر دیکھئے کہ اس دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

اور ایک بات یہ کہی گئی کہ اس میں کیا غیر مسلموں کا تعاون بھی حاصل کیا جاسکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس کی بھی گنجائش ہے، یہ ایک اہم چیز ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اسے یاد بھی فرمایا، اور دوسرے یہ کہ قرآن نے صاف صاف کہا ہے: "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" "بر" کا اصل معنی ہے حسن سلوک، حقوق کی ادائیگی، اگر یہاں کسی کے حقوق پامال ہورہے ہیں تو اس میں ایک دوسرے کا تعاون ہم کریں گے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سمینار میں جو باتیں/بحثیں چھڑی ہیں ان میں ہم کسی صحیح نتیجے تک پہنچیں اور مفید باتیں ہمارے سامنے آئیں۔

مفتی انور علی:

سوال نمبر ا کے جز (ا) کے جز (۳) میں ایک رائے یہ آئی ہے کہ بعض ایسی سیاسی جماعتیں الیکشن میں حصہ لیتی ہیں جنہوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو لیکن اس کے بعض امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب ہو تو کیا مسلمانوں کے لئے ان کی جماعتی فکر سے قطع نظر اشخاص و افراد کی ذاتی حالات کی بناء پر انہیں ووٹ دینا جائز ہوگا، اس سوال کے جواب میں ایک رائے مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب کی آئی ہے انہوں ایسی جماعت کو ووٹ دینے کے جواز کا قول نقل کیا ہے، میرے خیال میں ان کی یہ رائے عام مسلمانوں کے حق میں

انتہائی نامناسب ہے اور مجھے اس رائے سے قطعاً اتفاق نہیں ہے، مولانا افضال الحق جوہر قاسمی نے ووٹ کے بارے میں جو اپنی آراء ذکر کی ہیں ابھی چند منٹ پہلے وہ انتہائی قیمتی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کو ووٹ کی اہمیت سمجھنا چاہئے، ووٹ کو حرام ہونے یا مکروہ ہونے کا فتوی دینا ہمارے حالات کے لئے یکسر نامناسب ہے۔

مولانا محمد مصطفی ندوی:

مخلوط آبادی کے اندر مسلمانوں کی رہائش کے سلسلے میں ایک بات یہ کہ جہاں مسلم آبادی ہے ان کو نقل مکانی کی اجازت نہ دی جائے، اس لئے عام حالات میں اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ہے، ہاں! اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ان کی عزت و آبرو پر آنچ آنے لگے یا ان کے جان کی حفاظت مشکل میں پڑ جائے یا دین کی حفاظت مشکل ہو جائے تو اس وقت ان کے لئے ضروری ہے کہ وہاں سے نقل مکان کر لیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اگر کوئی آدمی نیا مکان بنانا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں غیر مسلم آبادی کے اندر اپنا مکان نہ بنائے، یہ مناسب ہوگا، دوسری بات یہ کہ تہوار کے سلسلے میں جو بات آئی تھی کہ مذہبی تہوار اور غیر مذہبی تہوار تو مذہبی تہوار کے تعلق میں تقریباً اتنا ہے غیر مذہبی تہوار کی جو بات آئی ہے اس میں جو مطلقاً ہدیے قبول کرنے کی بات جن لوگوں نے کہی ہے شاید وہ مناسب نہ ہو، غیر مذہبی تہوار کی دو قسمیں کرنی چاہئے بعض وہ تقریبات ہیں جیسے شادی بیاہ یا اس قسم کی تقریبات۔ ان تقریبات کے سلسلے میں ہدایا قبول کرنا، شریک ہونا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جس کو ہم کہہ سکتے ہیں عارضی تقریبات ہیں۔ لیکن وہ تقریبات جو کہ مذہبی تو نہیں ہیں لیکن وہ عارضی بھی نہیں ہیں۔ بلکہ مستقل وہ سال بھر ہوتے رہتے ہیں ہمارے خیال میں اس طرح کے تہوار جو ان کے یہاں رسم اختیار کر چکے ہوں جسے پورے سال وہ کرتے رہے ہوں ان کے ہدایا قبول کرنا جائز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اگر ہم ہدایا قبول کرتے ہیں تو ایسی صورت میں گویا کہ ہم دوسرے الفاظ میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، ہم گویا یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو صحیح کر رہے ہو، گویا ایک طرح سے ہم اس پر راضی ہیں۔ اور غیر اسلامی تہوار کے اوپر رضامندی ظاہر کرنا بھی درست اور صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ بھی ایک گناہ ہے جو تعاون علی المعصیۃ کے ذیل میں ہے، دوسری بات یہ کہی ہے کہ مذہبی تہوار کے سلسلے میں جو ان کے پرساد یا اس طرح کے ہدایا ہیں یقیناً ان کا قبول کرنا جائز نہیں البتہ ایک صورت میں قبول کرنا جائز ہو سکتا ہے، وہ صورت یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی مضطر ہو، اضطرار کی کیفیت میں مرنے کے قریب ہو ایسی صورت میں اس کے پاس پرساد آ رہا ہے تو صرف ایسی صورت میں اس کے لئے قبول کرنا جائز ہونا چاہئے البتہ عام حالات میں جائز نہیں ہوگا۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

''غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل'' کا موضوع یہ بہت ہی اہم اور بنیادی سوالات کا حاصل ہے اور آپ جو بھی فیصلہ کریں گے جو بھی پیغام یہاں سے جائے گا اس کا دائرہ صرف ہندوستان نہیں ہوگا اس بات کو آپ ذہن میں رکھیں، جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کی کم سے کم آدھی آبادی ۵۰ فیصد اور بعض لوگوں کا تجزیہ ہے کہ ۶۰ فیصد ان ممالک میں آباد ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں، خود ہندوستان کو آپ لے لیجئے یہاں جو آبادی مسلمانوں کی ہے ۱۵ سے ۲۰ کروڑ تک جو اعداد و شمار بتائے جاتے ہیں یہ آبادی اتنی بڑی اور اتنی غیر معمولی ہے کہ بہت سے بلاد اسلامیہ کو آپ سمیٹ لیجئے اور جمع کر لیجئے تب بھی اتنی بڑی تعداد نہیں بنتی اور اس کے علاوہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں مسلمان آباد نہ ہوں خواہ وہ امریکہ یا یورپ کے ممالک ہوں، ہر براعظم میں اور ہر ملک میں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں جہاں وہ اقلیت کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا فعال رول ہے ان ملکوں میں آپ جو فیصلہ فرمائیں گے اس فیصلہ کا تعلق محض ہندوستان سے نہیں ہوگا بلکہ جہاں جہاں بھی مسلم اقلیتیں ہیں، چاہے وہ امریکہ، یورپ، ایشیا یا آسٹریلیا ہو سب سے اس مسئلہ کا تعلق ہوگا اس حکم کا تعلق ہوگا جو آپ صادر فرمائیں گے، یہ بڑے نازک اور اہم مسائل ہیں، مان لیجئے الیکشنی سیاست کی بات ہو انتخاب میں حصہ لینے نہ لینے کی بات ہو یہ بہت ہی بنیادی اور دوررس مسائل ہیں۔ کوئی فتوی کوئی فیصلہ ایسا اگر یہاں سے جاتا ہے جو امت کے مفاد اور اسلام کے مفاد میں نہ ہو اور کوئی ایسی رائے جاتی ہے جس کی بنیاد پر مسلمان غیر معمولی مشکلات کا شکار ہو جائے، یہ بڑی آزمائش کی بات ہوگی ہم سب کے لئے، اس لئے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے اور تمام جو نکات بحث ہیں ان پر تنقیح کے ساتھ کلام کر کے ہم لوگوں کو کوئی رائے قائم کرنی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ موضوع سال ڈیڑھ سال سے بھیجا گیا تھا، لوگوں نے مقالات لکھے، بحثیں لکھی اور کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ شاید ہم نے مطالعہ کیا ہم نے بحثیں لکھیں، مقالات لکھے ایک زمانہ گزرنے کی وجہ سے کچھ ذہن سے وہ چیزیں غائب سی ہو گئیں ہیں، ہم ذہن پر دوبارہ زور ڈالیں اور اس موضوع کے جو مختلف نکات ہیں اس پر گفتگو کریں، مسلمانوں کی آبادی الگ ہو یا مخلوط، ظاہر بات ہے اس میں جو بھی آپ رائے دیں گے وہ چاہے فیصلہ ہو یا فتوی ہو یا سفارش ہو اس پر دونوں کے اثرات پڑیں گے تو وہ دونوں پہلوؤں کا آپ کو لحاظ رکھنا

پڑے گا، ایک تو پہلو یہ ہے کہ غیر مسلم محلوں میں مسلمان جو آباد ہیں بہت تھوڑی تعداد مسلمانوں کی ہے اور بہت قلیل تعداد ہے ان میں اگر دینی بیداری نہیں ہوئی، اپنے عقیدے ایمان دینی تشخصات کو محفوظ کرنے کا جذبہ نہ ہوا، اپنا نصاب تعلیم نہ ہوا، مدارس و مکاتب نہ ہوئے تو اس کا بڑا خطرہ ہے کہ محض اعمال میں کوتاہی نہیں بلکہ عقیدہ کی حد تک ہمارے بچے خطرہ میں پڑ جائیں گے، اور ان کا ایمان و دین خطرہ میں پڑ جائے گا۔ دوسری طرف یہ پہلو بھی ہے مسئلہ کا کہ اگر مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ پختہ مسلمان ہیں ان کا کردار اسلامی کردار ہو تو ان کے یہاں رہنے اور ان کے اخلاق و برتاؤ سے دعوت اسلام کی راہیں کھلتی ہیں۔ اور یہ مواقع فراہم ہوتے ہیں کہ ہم اپنے غیر مسلم بھائیوں تک اس پیغام کو پہنچائیں جس پیغام کو پہنچانے کے لئے ہم مبعوث کئے گئے ہیں۔ دونوں پہلوؤں کا موازنہ اور تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں کوئی ایسا معتدل فیصلہ کرنا ہے جو مجموعی لحاظ سے اس امت اور اسلام اور خود اس ملک کے لئے مفید ہو۔ بہر حال موضوع بہت ہی اہم ہے یہاں سے جو فیصلے جائیں گے جو سفارشات جائیں گی اس کی آواز بہت دور تک پہنچے گی اس لئے میری درخواست یہی ہے کہ ہم سب پوری بیداری کے ساتھ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں اور مناقشات اور مذاکرات میں ایسے پہلو جواب تک سامنے نہیں آسکے ہیں کو پیش کرنے کی کوشش کریں تاکہ جو کمیٹی ترتیب دی جائے وہ ان تمام چیزوں کا لحاظ کرتے ہوئے تجویز مرتب کرے، اس موضوع کے تحت جو چار سوالات قائم کئے گئے تھے اور چار حصوں میں سوالات تھے اس میں تین حصوں کا عرض پیش ہو چکا ہے تین عرض کل آپ کے سامنے پیش ہوئے تھے اور چوتھا جو حصہ ہے ان سوالات کا اس سے متعلق دو عرض باقی ہے، اس وقت سب سے پہلے میں چاہوں گا کہ وہ عرض بھی آپ کے سامنے پڑھ دیا جائے اور اس کے بعد گفتگو و مناقشے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

ہم اپنے مہمان محترم جناب محمد غفار شریف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے "مسلم اقلیتوں کے مصالح کے مدنظر فقہ اسلامی میں تجدید" کے موضوع پر قیمتی نکات پر مشتمل عمدہ تحقیق پیش کیا، اب ہمارے رفیق محترم جناب بدر قاسمی صاحب اس پر ایک مختصر تبصرہ فرمائیں گے، پھر اس کے بعد اس موضوع پر مناقشہ ہوگا۔

مولانا بدر الحسن قاسمی:

میں اپنے بھائی ڈاکٹر محمد غفار شریف کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس موضوع پر قیمتی گفتگو فرمائی جس کے ہم مسلمان نہایت ہی ضرورت مند ہیں، اور امت اسلامیہ کی پریشانیوں اور مشکلات پر بھی روشنی ڈالی، واقعہ یہ ہے کہ یہ موضوع جس پر ہمارے محترم گفتگو فرمارہے تھے نہایت ہی جامع موضوع ہے، جس میں انہوں نے فقہ النوازل میں تجدید کے نکات کو پیش کیا، لفظ تجدید اور اجتہاد کا علماء ہند کے نزدیک ایک خاص مفہوم ہے، جب وہ ان جیسے موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں تو نہایت ہی احتیاط و پرہیز کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں، موصوف کی گفتگو اور علماء ہند کی آراء کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہے، کیونکہ اجتہاد دراصل ان مسائل کے حل کرنے کا نام ہے جو مصائب کی شکل میں پیش آتے رہتے ہیں، اور تاریخ کے ہر دور میں اس کی کوشش ہوتی رہی، اور ہر مسلک میں ایسے فضلاء، علماء اور ممتاز شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں جنہوں نے اجتہاد سے کام لیا، اپنی آراء پیش کیں اور اپنے عصر کے نئے نئے مسائل کا حل پیش کیا، موصوف محترم نے اپنی تقریر میں فراخ دلی کے ساتھ مختلف چیزوں کو شامل کیا، مثلاً آسانیاں پیدا کرنے کے اصول اور مصلحت لانے والے اصول، خرابی دور کرنے کے ضابطوں کا تذکرہ کیا، ہر اختلافات سے بلند ہو کر دیگر فرقوں جیسے زیدیہ، شیعہ وغیرہ کی کتابوں اور ان کے نصوص کا بھی تذکرہ کیا، اور یہ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے، اور یہ نہایت ہی اہم معاملہ ہے اور نازک چیز ہے۔ یہاں میں عمومی طور پر بحث و مباحثہ کے طریقہ کار پر سرسری طور پر گفتگو کرنا چاہوں گا، اس لئے کہ ہم سب لوگ ان جیسے چھوٹے اور جزوی مسائل میں بھی اجتہاد میں اتفاق رائے پر زور دیتے ہیں، اور یقیناً یہ ایک حساس موضوع ہے، ساتھ ہی انہوں نے اپنی یہ رائے بھی پیش کی کہ فقہاء نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اتفاق شدہ امور میں ہی اختلافات پیدا ہوتے ہیں، اور چار صورتوں میں اختلافات کے پیدا ہونے کا امکان ہے، میری رائے میں یہ صورتیں تحقیق و مطالعہ کے عام طریقہ کار سے بہت حد تک ہم آہنگ نہیں ہیں، موصوف محترم نے بہت حد تک اس بات کی کوشش کی کہ تفصیلی صورتوں میں بعض متشددین اور اپنی رائے و مسلک پر شدت کے ساتھ قائم رہنے والوں کی رائے کے درمیان بھی موافقت پیدا کی جائے اور ان کے درمیان ہم آہنگی لائی جائے، اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ قاضی ان کی رائے اور مسلک کے مطابق فیصلہ دیں، مثلاً حنفیہ و شافعیہ کے نزدیک شارب نبیذ پر حد جاری کرنے کا مسئلہ ہے تو حاکم کو چاہئے کہ ان کے مسلک کے مطابق ہی فیصلہ دیں، لیکن ان تمام چیزوں میں وہی چیز لازم آتی ہے جس سے ہم نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مزید اس میں دو چیزیں غور طلب ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کی جزئیات فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، خواہ وہ حنفیہ کی ہوں یا شافعیہ یا مالکیہ

کی۔اس طرح کی جزئیات ان کتابوں میں موجود ہیں، جن کا تذکرہ ہم آہنگی و موافقت پیدا کرنے والی بحثوں میں عموماً کم کیا جاتا ہے، بلکہ انہیں فقہاء کے نزدیک موجود مختلف آثار کی ایک قسم سمجھی جاتی ہے، نبیذ کا ذکر جب عرب ماحول کے پس منظر میں کیا جاتا ہے تو اس سے شراب ہی مراد لی جاتی ہے، کیونکہ صحابہ کے درمیان بھی اس میں کافی اختلاف تھا، یہی غلط فہمی یہاں پیش آئی کہ امام ابوحنیفہ نے شرب خمر کو جائز قرار دیا کیونکہ نبیذ عرف عام میں شراب ہی کو کہا جاتا تھا،لیکن یہی مسئلہ جب مختلف کتابوں مثلاً "مصنف ابن شیبہ" اور امام سرخسی کی "المبسوط" میں وضو کے تعلق سے بیان کیا جاتا ہے تو وہاں نبیذ ہی مراد لیا جاتا ہے، کیونکہ مختلف صحابہ کرام مثلاً حضرت ابن عباسؓ حتی کہ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کرام نبیذ استعمال کیا کرتے تھے، تو وہاں کسی نے نشہ پیدا کردینے والی شراب کا مطلب نہیں لیا،تو اس قسم کی اصطلاحات سے بسا اوقات بالخصوص مسلک حنفی میں دوسرے فروعی مباحث نکل پڑتے ہیں۔لہذا موصوف محترم کا یہ پہلو قدرے تحقیق طلب ہے، تاہم مجموعی طور پر ان کی گفتگو نہایت ہی عمدہ بیش قیمت اور تحقیق پر مبنی ہے، میں نے ذاتی طور پر بھی ان سے استفادہ کیا کیونکہ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران موالاۃ، ولاء، براء کے مسائل کے تعلق سے نہایت اہم ودقیق نکتے بیان کئے، اور امت مسلمہ ان تحقیقات کی ضرورت مند بھی ہے کہ ولاء، براءت وموالاۃ کا مفہوم و مطالب کیا ہے، اور موالاۃ جائز، موالاۃ بالغیر جائز اور موالاۃ حرام کیا ہیں۔

بلاشبہ یہ نہایت ہی اچھی اور نئے افق کو وا کرنے والی چیز ہے، اسی لئے انہوں نے ان اختلافات پر بھی روشنی ڈالی جنہیں آج کل کے جذباتی نوجوان مذاہب اربعہ کے تعلق سے اکثر اچھالا کرتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کا ایک دین موجود ہے تو پھر ان مسالک و مذاہب کی کیا ضرورت، جو کہ بالکل ہی جاہلانہ کلام ہے، کیونکہ ہم آج بھی مختلف ممالک بشمول کویت کے نوجوانوں کو دیکھتے ہیں کہ کچھ ان میں نماز میں رفع یدین کرتے ہیں، جیسا پہلے کیا جاتا تھا، کچھ ایسے بھی ہیں جو رفع یدین نہیں بھی کرتے ہیں، اور اس طرح کے اختلافات تو اس دور میں بھی ہو رہے ہیں، ایک ہی چیز میں شیخ عبدالعزیز ابن بازؒ سابق مفتی اعظم سعودی عرب کی رائے کچھ ہوئی اور شیخ البانیؒ کی رائے کچھ اور ہوتی ہے، ایک ہی چیز کو ایک سنت قرار دیتے ہیں دوسرے بدعت، تو جب ہمارے اس دور میں بھی اس طرح کے اختلافات پائے جاتے ہیں تو ائمہ اربعہ یا ان کے علاوہ دیگر ائمہ کرام کو باعث الزام ٹھہرانا صحیح نہیں، اللہ ڈاکٹر محمد غفار شریف صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس نقطہ پر کافی جامع و تفصیلی گفتگو کی اور اس کی جزئیات کو نہیں چھوڑا۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں، اللہ ان کو اچھا بدلہ دے۔

مولانا زبیر احمد قاسمی:

میں مختصراً مسلم غیر مسلم تعلقات کے حدود اور دائرے کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں ایک اصل ہمارے سامنے نص قرآنی موجود ہے: "لا یتخذ المؤمنون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیء إلا أن تتقوا منهم تقاۃ"۔

اس آیت اور دیگر احادیث نبویہ کی مدد سے غیر مسلم کے ساتھ تعلقات کے احکام آسانی کے ساتھ معلوم ہو جاتے ہیں، حضرت تھانوی علیہ الرحمہ آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ظاہراً یا باطناً کفار کو دوست نہ بنائیں، لفظ اولیاء کا اطلاق اسی عموم کو چاہتا ہے، اس آیت کی روشنی میں آپ فرماتے ہیں کہ میری یہ بات کہ دوست نہ بنائے ظاہراً یا باطناً "أفاده إطلاق لفظ الأولياء مع استثناء حال التقة وإلا لم يصح في الاستثناء لأن الخوف لا يجوز الموالاة الحقيقة القلبية لأجل الضرورة فيها فإن القلب لا يطلع عليها من يخاف منه فكأن الأصل في الموالاة هو الحظر والضروری يقدر بقدر الضرورة وقد ارتفعت الضرورة بصورة الموالاة أی ظاهر الموالاة فلابد لصحة الاستثناء أن يكون المستثنى منه شاملا للصورة والمعنى"

مزید فرماتے ہیں: "تتقوا منهم تقاۃ" سے مراد خوف اور اندیشہ قوی ہے، صرف درجہ وہم نہیں، آیت بالا سے گویا دفع مضرت کے لئے صرف ظاہری موالات کی اجازت ہے اور بس، حقیقی دوستی جائز نہیں، اب یہ ظاہری خوش خلقی اچھا برتاؤ یعنی مدارات دفع مضرت کے لئے ہو یا پھر اکرام ضیف کے طور پر ہو، باقی رہا مواسات یعنی مالی تعاون نفع رسانی اور احسان یہ غیر حربی کے ساتھ جائز، اہل حرب کے ساتھ ناجائز، سورہ ممتحنہ کی جو آیت ہے:

"لا ینهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم" سے "يحب المقسطين" تک اور "إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم في الدين" سے "أولئك هم الظالمون" تک میں اس کی صراحت ہے، اس قرآنی اصل کے بعد ضرورت نہیں کہ تعلقات غیر مسلم کے ہر ہر جزئیہ کو بھی زیر بحث لا کر اس کے متعلق احکام شریعت کی تفصیل و وضاحت میں وقت گنوایا جائے۔ تعلقات کا ہر وہ نوع جو مداہنت فی الدین کو مستلزم ہو گا رواداری کی ہر وہ مشکل جو غیرت ایمانی اور دینی حمیت کے خلاف ہو گی اور کسی بھی غیر اسلامی یا کفر و شرک کے شعائر کے احترام وتکریم تک پہنچائے گی اسے ہرگز جائز نہیں کہا جاسکتا۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

شکریہ! مولانا زبیر صاحب، آپ کی بات بہت ہی اصولی اور بنیادی ہے بہر حال اصول طے کرنے کے باوجود اس کی تطبیق جزئیات پر بہت ضروری ہوتی ہے جو نئے مسائل آئیں گے ان پر تطبیق ان اصولوں کے تحت کرنی ہوگی اور اسی لئے ہم بیٹھے ہیں۔

مفتی نذیر احمد کشمیری:

کل گزشتہ جو عرض پیش کیا گیا تھا اس میں جھنڈے کی سلامی کا مسئلہ بھی تھا اس سلسلے میں ایک نکتہ ہمیشہ قابل غور رہنا چاہئے کہ کیا جھنڈا معبود کے درجے میں کسی بھی قوم کے یہاں ہے یا نہیں؟ غالباً صورت حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی قوم جھنڈے کو معبودیت کے مقام پر نہیں سمجھتی پھر یہ سلامی دینے کا مسئلہ صرف جھنڈے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی تعظیم کے مختلف طریقے دور جدید میں پائے جاتے ہیں مثلاً کسی شخص کی وفات ہوتی ہے تو اکیس توپوں کی سلامی دی جاتی ہے کسی شخص کی وفات ہوتی ہے تو چند منٹ کی خاموشی اختیار کی جاتی ہے یہ گویا دور جدید کے احترام کی نوعیتیں ہیں، اس لئے جھنڈے کی سلامی کو شرک کے درجے میں داخل کرنا درحقیقت ان بے شمار مسلمانوں کو مشکلات میں ڈالنا ہے جو مسلمان باہر ممالک میں کام کر رہے ہیں وہاں اگر وہ جھنڈے کی سلامی سے احتراز برتنے لگیں گے تو ان کے لئے اپنی نوکری کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہوگا ایک نکتہ تو یہ تھا، دوسرا نکتہ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ووٹنگ کے سلسلہ میں یہ رائے دینا کہ یہ شہادت ہے یا وکالت ہے یہ علمی رائے یقیناً لیکن ساتھ ساتھ امت کی صورتحال کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے صرف نظریاتی گفتگو کافی نہیں ہے عملی طور پر دیکھنا بھی ضروری ہے جبکہ ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ووٹنگ کے نتیجے میں صورت حال بدل گئی۔

دوسری طرف اگر ہم میں سے کوئی شخص یہ رائے دیتا ہے کہ ووٹ نہیں دیا جانا چاہئے کیونکہ یہ غیر مسلم ہے اور جمہوریت غیر اسلامی چیز ہے تو سوال یہ نہیں ہے کہ جمہوریت اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟ سوال یہ ہے کہ موجودہ جمہوریت کے اندر ہم کو انتخاب میں شرکت کرنا چاہئے یا نہیں؟ اس طرح کا نکتہ ہرگز نہیں سوچا جانا چاہئے کہ امت کو انتخابات سے روکنے کی ادنی سے ادنی کسی درجے کی کوشش کی جائے، ہاں رہا واجب کہنے کی بات تو واجب کہنا بھی اتنا مشکل ہے اس لئے کہ واجب کے لئے جس درجہ کی دلیل مطلوب ہے غالباً ووٹ ڈالنے کے لئے اس درجہ کی دلیل ملنا بہت مشکل ہے، ہاں یہ اسی صورت میں ہے کہ جب ووٹ کو شہادت کے درجہ میں رکھا جائے لیکن ظاہر ہے ووٹ کو غیر مسلم ممالک میں کسی غیر مسلم کے حق میں شہادت کے مفہوم میں لیا جانا مشکل ہے جیسا کہ فقہی مقالات میں بعض حضرات نے جس میں حضرت مولانا برہان الدین اور دوسرے حضرات ہیں جنہوں نے فرمایا ہے کہ یہ مسلم ممالک کے لئے ہوسکتا ہے، غیر مسلم ممالک کے لئے نہیں، بہر حال شہادت ہو یا وکالت ووٹنگ سے بچنے کے لئے تجویز ہرگز نہیں ہونی چاہئے اس کے بہت ہی مضر اثرات مرتب ہوں گے۔

مولانا بدر الحسن قاسمی:

مولانا نے جو نکتہ اٹھایا ہے اور اب سے پہلے بھی کئی بزرگوں نے اس طرح کی بات کہی اور لکھی ہے کہ واجب کہنے کے لئے قوی دلیل چاہئے اصولاً یہ بات ہے کہ کسی چیز کو انسان واجب اپنی طرف سے تو قرار نہیں دے سکتا، مسئلہ یہاں دلیل کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ ہم ووٹ کیوں دیتے ہیں یا الیکشن میں کیوں شرکت کرتے ہیں، اگر مسلمان کسی صوبے یا کسی ملک میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہم ووٹنگ میں حصہ نہ لیں تو مسلمانوں کی جان و مال محفوظ نہیں رہے گی تو صرف دفع ضرر یا دفع شر کے لئے جس درجہ کا خطرہ ہوگا اس درجہ کے لحاظ سے ہم اس کا حکم متعین کریں گے کہ یہ واجب ہے سنت ہے مکروہ ہے کہ حرام ہے، لیکن اس کو اس سے جوڑنا کہ کوئی قرآن میں نص ہو یا وجوب کے لئے کوئی حدیث صریح یا قوی دلیل ہو میں نہیں سمجھتا کہ اس کا دونوں مسئلوں سے جوڑ کیا ہے جب ہم کسی جمہوری ملک میں الیکشن میں شرکت کرنے کے مسئلہ کو اٹھاتے ہیں تو اس بنیاد پر نہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم جاکر وہاں الیکشن لڑا کرو اور اس میں شریک ہوا کرو، ہمارے یہاں تو مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں ہم اقلیت میں ہیں اور یہاں ہمارے بچاؤ کے لئے امکانی طور پر نو سو ملین ہندوؤں اور کرسچین اور دوسرے لوگوں کے بیچ میں جو راستے ہوسکتے تھے وہ صرف یہ کہ ہم یہاں کے جمہوری نظام میں شرکت کریں تاکہ پارلیمنٹ ہمارے ووٹ سے خالی نہ رہے، اب اگر ہم شرعی حیثیت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ شرکت ہمارے لئے نامناسب ہے یا ضروری ہے تو اسی درجے کا حکم ہوگا ووٹنگ کے لئے بھی، اگر شرکت نہ کرنے سے مسلمانوں کی جان و مال

محفوظ رہتی ہے تو شرکت کی کوئی ضرورت ہی نہیں، حالانکہ آپ شرکت اس لئے کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی جان و مال کا تحفظ اس سے مربوط ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے علمائے کرام کو اس پہلو سے غور کرنا چاہئے کہ الیکشن میں شریک نہ ہونے سے کس درجہ کا خطرہ ہے، اسی کی روشنی میں طے کریں گے کہ حرام ہے کہ واجب کہ مکروہ یا جو درجات احکام کے ہیں۔

مولانا اختر امام عادل:

میں نے اپنے مقالہ میں بحیثیت امیدوار حصہ لینے کی تین صورتیں بیان کی ہیں۔ جائز، ناجائز اور واجب۔ اور ووٹ دینے والے کی حیثیت سے رائے دہندہ کی حیثیت سے اس کی بھی چار شکلیں بیان کی ہیں جس میں ایک شکل واجب اور تین شکلوں کو حالات کے حساب پر اس کو موقوف رکھا ہے، جھنڈے کی سلامی کے تعلق سے جو حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کی طرف بات منسوب کی جاتی ہے اور جس کی کوئی دلیل نہیں بیان کی جاتی ہے، اس کے بالمقابل حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ اور دوسرے اکابر کی طرف جو بات منسوب ہے وہ انتہائی دلائل کے ساتھ ہے اور وہ جو جھنڈے کے بارے میں کل مولانا بدر صاحب نے بات کہی اور بھی لوگوں نے لکھا ہے کہ جنگوں میں اسلامی جھنڈے کے لئے کافی عظمت و احترام کا تصور اسلامی عہد میں ملتا ہے، یہ اصل میں فقہاء کے اس بات کو سامنے رکھنا چاہئے کہ فقہاء کے یہاں کسی کے لئے احتراماً کھڑا ہونا یہ ناجائز نہیں ہے اگر وہ قابل احترام ہو، فقہاء نے یہ صراحت کی ہے، درمختار وغیرہ میں یہ جزئیہ موجود ہے کہ اگر وہ شخصیت یا وہ چیز قابل احترام ہو تو اس کے لئے کھڑا ہونا صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحب ہے، سوال یہ ہے کہ جن روایات کو ہم پیش کرتے ہیں وہ اسلامی جھنڈوں کے تعلق سے ہے، حضرت تھانویؒ نے صراحت کی ہے کہ جو غیر اسلامی جھنڈے ہیں غیر مسلم ملکوں کے جھنڈے ہیں ان کے لئے ہم ان روایات کو کس طرح منطبق کر سکتے ہیں اس کو ذمی کے درجے میں زیادہ سے زیادہ ہم کر سکتے تھے اس کے لئے ہم اس کی کس طرح تطبیق کر سکتے ہیں، جہاں تک اس کا مسئلہ ہے کہ اس کو عبادت کے لئے بنایا گیا ہے یا نہیں بنایا گیا ہے اصل میں ہم اس کو یہ نہیں کہتے کہ یہ شرک ہے لیکن کم از کم عدم جواز کے درجہ میں ضرور آجاتا ہے کہ کسی غیر مستحق تعظیم یا کسی ایسی چیز کے احترام کے لئے کھڑا ہونا جو تعظیم کے لائق نہ ہو اور اس کے لئے ہم کھڑے ہوں اس کا احترام کریں اس پر ہمیں غور کرنا چاہئے یہ نہیں ہم کہتے کہ شرک ہے یا اس کی عبادت کے لئے ہم کھڑے ہو رہے ہیں، یہ ایک بت ہے کہ نہیں اس دور میں اس کو ہمیں سوچنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کل مولانا سعود عالم صاحب نے مساجد و مدارس کے لئے غیر مسلموں سے چندہ لینے کی صورت میں کوئی نص موجود ہے یا نہیں کے سلسلہ میں بات کہی تھی، مشرکین نے جو خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی یقیناً وہ لوگ مشرک تھے اور ان لوگوں نے پاک کمائی سے اس کی تعمیر کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعمیر کو باقی رکھا اور اس کو مسجد کے لئے قبول فرمایا تو یہ ایک بنیاد موجود ہے ہمارے لئے کہ ان سے تعاون لے سکتے ہیں۔

مولانا بدر الحسن قاسمی:

مولانا اختر امام عادل صاحب نے میری طرف جو باتیں منسوب کی ہے کہ جھنڈے کا عصر اول میں احترام پایا جاتا تھا، میں نے کھڑے ہونے اور بیٹھنے کا مسئلہ ہی نہیں رکھا، یہاں بھی جو بنیادی چیز سوچنے کی ہے وہ یہ کہ کسی بھی ملک میں چاہے ہندوستان ہو یا کوئی بھی غیر اسلامی ملک ہو ہر شخص کو اس پر مجبور نہیں کیا جاتا ہے کہ جھنڈے کو سلامی دو یا کھڑے ہو، عام حکم نہیں ہے صرف وہ لوگ کہ جو منسٹری میں ہوں یا کہیں جھنڈا اگر اٹھایا جا رہا ہے تو آپ کھڑے رہیں میں نے صرف یہ ذکر کیا تھا کہ جھنڈے کا فی نفسہ استعمال سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو بچانے کے لئے جھنڈا لے کر فوج کشی کی اور ان کو بچایا جیسا کہ مصنف ابن شیبہ میں ہے۔

دوسری بات میں نے یہ کہی تھی کہ جھنڈے کا استعمال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر غزوہ اور جہاد میں مختلف درجہ کے چھوٹے اور بڑے جھنڈے استعمال کئے اور ایک موقع پر فرمایا: "نحن أحق بالوفاء منهم" مشرکین کے جھنڈے کے مقابلے میں ہم وفاداری کے زیادہ مستحق ہیں تو جھنڈے سے وفاداری کا کیا تعلق جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ یہ علامت ہے گویا وفاداری کی تو میرا استدلال یہ ہے کہ جب جھنڈے کو رمز یا شعار کی حیثیت سے کسی ملک میں اختیار کیا جا سکتا ہے ضروری نہیں ہے کہ ہندوستان ہی میں ہو کویت میں بھی ہو سکتا ہے سعودی میں بھی ہو سکتا ہے کہیں بھی ہو سکتا ہے۔

تیسری بات اس کے علاوہ یہ ہے کہ غزوہ موتہ کے موقع پر حضرت جعفر طیارؓ کے دست مبارک کٹ گئے اس کے بعد بھی کوشش کر رہے ہیں کہ

جھنڈا بلند رہے یہ بلندی جو ہے اس سے صرف میں نے استدلال کیا اس بات پر کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ جھنڈے کو بطور رمز کے اختیار کیا جا سکتا ہے، فرض کیجئے کہ تمام وزراء موجود ہیں وہاں پر پانچ دس ہمارے مسلم وزراء بھی ہیں سب کے سب ترانے کے وقت کھڑے ہوتے ہیں یا جھنڈے کے وقت کھڑے ہوتے ہیں تو اگر مسلم وزراء نہیں کھڑے ہوتے ہیں تو یہ ملک کے ساتھ غداری سمجھی جاتی ہے اس سے ان کو سزا مل سکتی ہے اس سے ان کی نیشنلٹی کینسل ہو سکتی ہے، کیا یہ خطرہ مول لے کر فقہی حیثیت سے مسلمان وزیر کے اوپر یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ جھنڈے کا احترام نہ کریں بلکہ بیٹھے رہیں وہاں پر سرکشی کا منظر دکھلائے تو اس طرح سے مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ اور الجھتا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مسائل کو ذرا موجودہ زمانے کے سیاق میں سمجھنا مناسب ہے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی:

مجھے صرف ایک وضاحت کرنا ہے کوئی بات نہیں کرنا ہے اور نہ کوئی تبصرہ۔ اس وقت جھنڈا اسلامی کے سلسلے میں جو بحثیں ہوئی ہیں اس سے یہ مجھے محسوس ہوا کہ شاید سلامی کا مطلب سمجھنے میں کچھ تھوڑی سے فروگزاشت ہوئی ہے اس لئے بعض لوگوں نے اسے کفر کہہ دیا یا شرک کہہ دیا تو میں چاہتا ہوں کہ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی ایک بہت ہی حکیمانہ اور بہت ہی لطیف تقسیم ہے عبادت اور عظمت کے سلسلہ میں وہ آپ حضرات گوش گزار فرمالیں اور جن کے ذہنوں میں پہلے سے ہے وہ تازہ کرلیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے بہت لطیف فرق بیان کیا ہے عبادت اور عظمت کے درمیان، عبادت کے بارے میں فرمایا ہے: "أقصی غایة التذلل" انتہائی درجے کی ذلت کا اظہار کسی کے سامنے کیا جائے یہ ہے عبادت، اور ظاہر ہے جس کے سامنے انتہائی درجے کی ذلت کا اظہار کیا جائے وہ انتہائی معزز ہوگا، اور ایک ہے تعظیم، اس میں غایت درجے کی ذلت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اوسط درجے کی ذلت کا اظہار ہوتا ہے یعنی ہم جس کے سامنے ذلت کا اظہار کرتے ہیں وہ معظم ہوتا ہے اوسط درجے کا، تو فرمایا کہ غایت درجہ ذلت کا اظہار، جسے عبادت کہتے ہیں تو وہ کسی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں، یہ متفق رہا ہے سارے انبیاء کے درمیان، اوسط درجے کی عظمت جسے کہنا چاہئے وہ غیر اللہ کے لئے ہو سکتی ہے اور بعض دفعہ دونوں میں شکلا فرق نہیں ہوتا ہے نیت کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے بعض دفعہ شکلا فرق ہوتا ہے مثلاً سجدہ کرنا غیر اللہ کے لئے، یہ اس امت میں شکلا محدود ہو گیا ہے عبادت کے لئے، اب غیر اللہ کے لئے سجدہ نہیں کر سکتے، لیکن کھڑا ہونا نماز میں بھی ہم لوگ کھڑے ہوتے ہیں کسی کی آمد پر بھی کھڑے ہوتے ہیں یہ دونوں شکلیں ہو سکتی ہیں، کسی شخص کے لئے کھڑے ہونے میں غایت درجہ عظمت کا تصور نہیں ہوتا بلکہ اوسط درجہ کی عظمت کا تصور ہوتا ہے تو یہ جائز ہوگا ایسی شخصیتوں کے لئے بھی اور ایسی چیزوں کے لئے بھی جو منجملہ قابل عظمت ہیں۔ اس بحث میں غور کرتے وقت یہ ذہن میں رہے کہ عظمت اور چیز ہے، عبادت اور چیز ہے عبادت تو کسی (غیر اللہ) کے لئے جائز نہیں البتہ عظمت کی گنجائش ہے۔

اب یہ بحث رہ جائے گی کہ ہم لوگ جو سلامی دیتے ہیں جھنڈے کو وہ جھنڈا قابل عظمت ہے یا نہیں؟ اور سلامی کا طریقہ وہ عبادت والا نہ ہو غیر عبادت والا ہو اور غیر عبادت والے طریقہ میں الفاظ اور شکل اور عمل سے بھی فرق ہوگا کہیں نیت سے فرق ہوگا، بس مجھے اتنی بات عرض کرنی تھی۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

اب میں صدر جلسہ ڈاکٹر خالد مذکور صاحب سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ ہم سبھوں کو اس مناقشہ کے موضوع پر اپنے قیمتی وکلیدی کلمات سے نوازیں، جو ہم سبھوں کے لئے اس زمانہ میں زیادہ فائدہ مند ہو سکے اور مشعل راہ بن سکے۔

ڈاکٹر خالد عبداللہ المذکور: (اردو ترجمہ)

حضرات! میں آپ کے مناقشے، بحث ومباحثے اور قیمتی موضوعات بالخصوص اس اہم موضوع کا تہہ دل سے قدردان ہوں جس پر ہم نے گذشتہ شب گفتگو کی اور جس کی ایک کڑی آج صبح کی یہ گفتگو بھی ہے اور اس کے علاوہ جس پر اردو وعربی دونوں زبانوں میں کئی قیمتی مقالے پیش کئے گئے، لیکن وقت کی تنگی ان تمام مباحث پر تفصیلی گفتگو کرنے میں حائل ہے۔ اور فقہی اکیڈمیوں بشمول منظمة المؤتمر الاسلامی (تنظیم اسلامی کانفرنس) کی عالمی فقہ اکیڈمی کا یہ امتیاز رہا ہے کہ ان میں مختلف قیمتی اور اہم مقالے پیش کئے جاتے ہیں، لیکن اس کے لئے ایک "عارض" مقرر کرتے ہیں جو ان تمام مقالات ومباحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، کیونکہ تمام مقالات کو پیش کرنے اور ان پر بحث ومباحثہ کرنے کے لئے وقت کافی نہیں ہوتا ہے، اس لئے ان تمام مقالوں کا خلاصہ تیار کیا جاتا ہے، پھر اس پر مناقشہ ومباحثہ کیا جاتا ہے۔

محترم بھائیو! واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے ادارے جن میں آپ کا یہ معزز ادارہ بھی شامل ہے کی ہندوستان کے علماء اور وہاں کے باشندوں کے درمیان کافی اہمیت وقدر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف موضوعات جو متعین کئے جاتے ہیں، بالخصوص عصر حاضر اور اس کے نت نئے ایجادات واختراعات، سرعت وترقی، میڈیا و ذرائع ابلاغ جس نے نہ صرف پوری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے بلکہ ایک ایسے گھر کے مانند بنا دیا ہے جس میں چھوٹے کمرے ہیں، یہ تمام چیزیں اجتماعی اجتہاد کی محتاج ہیں، اور اس اجتہاد کا طریقہ بھی وہی ہے یعنی کتاب وسنت کے قطعی الدلالہ وقطعی الثبوت دلائل، اسی طرح اجتہاد کے مختلف وسائل میں سے علماء وفقہاء کا اجتہاد بھی ہے، خواہ وہ نقلی نصوص کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، اس سیاق میں قرآن وحدیث کے بعد فقہاء کرام کے وضع کردہ شرعی اصول وقواعد، اور اس کی حیثیت بھی وہی ہے جو حدیث سے مستنبط اصول وقواعد کے ہیں، کیونکہ یہ بھی دراصل قرآن وحدیث سے مستنبط ہیں، اسی طرح ہم اس سلسلہ میں اس عصر کے مصلحت پر مبنی عقلی دلائل کا بھی سہارا لے سکتے ہیں، جنہیں اس زمانہ کے مسلمان سمجھتے ہوں۔ ہمارے علماء وسلف صالحین رحمہم اللہ نے اپنے اپنے دور میں اجتہاد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھا، اور حتی الامکان مسائل میں اجتہاد کیا، لیکن ہر زمانے کی کچھ نئی چیزیں وایجادات ہوا کرتی ہیں، اور یہ شریعت اسلامیہ کی خصوصیت اور اس کے نصوص واصول وضوابط کی نرمی ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور کی نزاکت ومصلحت کا لحاظ رکھا جائے بشرطیکہ وہ قطعی الدلالۃ وقطعی الثبوت نصوص سے متصادم نہ ہوں۔

ہماری اس مناقشہ کی مجلس اور کل اور آج کی گفتگو کا ماحصل بھی برصغیر میں پیش آنے والے واقعات وحوادث اور مصائب کا تجزیہ کرنا ہے، ٹھیک کم وبیش یہی صورت حال شمالی امریکہ ویورپ کی ہے، جب وہاں میرا جانا ہوتا ہے تو میں وہاں بھی یہی سوال رکھتا ہوں، اور متعدد مسائل کو سوچنے و سمجھنے کا کافی موقع ملتا ہے، پھر میں کہہ رہا ہوں کہ اس قسم کے قضیے میں اجتہاد کی سخت ضرورت ہے، موافق ومخالف، مثبت ومنفی دونوں قسم کے دلائل موجود ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب تک اجتہاد باقی رہے گا ہر قسم کے دلائل پیش کئے جائیں گے، اور آراء میں اختلاف ہوتے رہیں گے، ہر مجتہد کی ایک رائے ہوا کرے گی، لیکن ہم اس اجتہاد کی وجہ سے آپسی اختلافات، رنجش، خودسرائی، بیزاری، وغیرہ کے شکار نہ ہوں، بلکہ حقیقت میں یہ ایک کوشش ہوتی ہے، اگر کوئی شخص مصلحت، نصوص قطعیہ، شرعی اصول وضوابط کے سمجھنے اور ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ کوئی مسئلہ بیان کرتا ہے، میں امید کرتا ہوں کہ ڈرافٹنگ کمیٹی جب اس سمینار کی قرارداد تیار کرے گی تو اس میں مصلحت، نصوص قطعیہ وشرعی اصول وقواعد تینوں کا خیال رکھا جائے گا، اور جب آپ مقالے کے خلاصہ کا مطالعہ کریں گے تو اسے علم کا ذخیرہ پائیں گے، ہم اہل عرب جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا اور جن کے جنس میں سے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، ہم اس وقت ہندوستان کے علماء کے زیادہ محتاج ہیں، غیر عرب علماء کے زیادہ حاجت مند ہیں، جنہوں نے امام بخاری سے لے کر عصر حاضر کے علماء، ہندوستان، ازبکستان اور ماوراء النہر کے فقہاء نے عظیم خدمات انجام دی، فقہی کتابیں لکھیں، احادیث کی شروحات قرآن کی تفسیر انہیں غیر عرب علماء کی تیار کردہ ہیں، ہمیں چاہئے کہ ان سے بلا کسی امتیاز استفادہ کریں، کیونکہ اسلام تقوی کے علاوہ اہل عجم واہل عرب کے درمیان کسی بنیاد پر تفریق نہیں کرتا، جب ہم اس میدان میں قدم رکھ رہے ہیں تو آپ یہ مت سمجھئے کہ میں آپ سے آگے نکل جاؤں گا، بلکہ آپ ہم سے بہت بہت آگے ہیں۔

یقیناً اس وقت آپ ایسے براعظم میں ہیں جہاں کی اکثریت غیر مسلموں کی ہے، لیکن میں دراصل ایک نتیجہ پر پہنچنا چاہتا ہوں کہ جب میں کویت میں ایک علاقہ میں گیا تو وہاں ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا، میں حیران رہ گیا کہ بوہرہ کی جماعت جن کی تعداد تقریباً بارہ ہزار ہے جیسا کہ میرے رفیق محترم بدر القاسمی نے بیان کیا، جب ان کے سردار یا ان کا کوئی بڑا یا ان کے رہنما، معلوم نہیں انہیں کیا کہا جاتا ہے، تشریف لائے تو وہ لوگ سلیقہ سے ایک وسیع میدان میں ایک صف میں کھڑے ہو گئے، ان کا لباس ایک ان کے مرد وعورتیں سب کے سب ایک ترتیب ونظام، الفت ومحبت، تعاون واخوت وصلہ رحمی کے جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں، تمام کے تمام محنت کش ہوتے ہیں، ہر طرح کے اختلافات سے دور رہتے ہیں، ہم مسلم اقلیتیں غیر اسلامی ممالک میں اتحاد واتفاق آپسی صلہ رحمی کو برقرار رکھنے کے زیادہ لائق ہیں، اور ہمارے جزوی وفروعی اختلافات ان میں حائل نہ ہوں، اور ہر مجتہد کی اپنی رائے ہوتی ہے، ہمیں چاہئے کہ ایسے مشترک اصول وضوابط مقرر کریں جو ہمیں امت اسلامیہ اور مسلمانوں کو درپیش خطرات کے مقابلہ اور میڈیا کی شکل میں خطرناک حملے جو ہمارے گھر کو معاشرتی وتربیتی اعتبار سے بگاڑ رہے ہیں اور ان جیسے دیگر مختلف مسائل کے تئیں متحد کر سکے۔

جب آپ بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس سلسلہ میں اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کریں گے تو ان میں موجود

چھوٹے چھوٹے اختلافات انشاء اللہ خود بخود ختم ہوجائیں گے، جب ہم ان کے مثبت و منفی دونوں پہلو کو سامنے رکھیں گے تو اختلاف کے امکانات کم ہوجائیں گے۔

اے کاش برصغیر جس کی اپنی ایک تاریخی، جغرافیائی، سیاسی و مالی اہمیت ہے اور اس کا سیاست کے میدان میں اپنا ایک اثر ہے، جہاں مسلمان سب سے بڑی اقلیت میں ہیں، ان کے ہاں بھی اسی طرح کا اتحاد و اتفاق نظم و نسق، تنظیم و ترتیب پایا جائے خواہ وہ سیاسی، تربیتی، معاشرتی میدان ہو تا کہ وہ ان میدانوں میں اپنا اچھا اثر چھوڑ سکیں، اور یہی میرے پورے کلام کا خلاصہ ہے کہ یہ امت بڑے بڑے مسائل اور اہم سیاسی اور معاشرتی قضیے کو حل کرنے پر متفق ہوجائیں، اس سلسلہ میں ذرائع ابلاغ جس نے پوری دنیا کو ایک گاؤں بلکہ ایک کنبہ میں تبدیل کردیا ہے اس کا بھی اہم رول ہوسکتا ہے اور اس قسم کی نشستیں، انٹرنیٹ، فضائی چینل اور ٹیلی فون سے گفتگو کے ذریعہ بھی منعقد کی جاسکتی ہیں، اس طرح سال میں ایک بار ملنے کے بجائے روزانہ تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملے گا اور یہی میرے کہنے کا مقصد ہے۔

اور اسی کی طرف میں لوگوں کو بلاتا ہوں، وہ مسائل جن کا تذکرہ مقالات و مباحث میں کیا گیا اور جن میں مجتہدین کے درمیان آپس میں اختلاف ہوتا ہے، یہ انسانی فطرت اور انسانی مزاج ہے، ہمارے سلف صالحین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، صحابہ کرام کے اندر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی اختلاف پایا گیا، تو ہمارے اندر اجتہادی اختلافات کا پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اجتماعی اجتہاد اور اجتماعی اجتہادی ادارے دراصل وقت کی ضرورت ہیں، تا کہ مسلمان اس سلسلہ میں متفق ہوسکیں، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم امت کے اہم اور بڑے مسائل کو اولیت دیں اور ان امور کی طرف توجہ کریں جن سے یہ امت دوچار ہورہی ہے، ان جیسے جزوی مسائل کو انشاء اللہ چھوٹے چھوٹے سمپوزیم اور مناقشہ کے پروگرام کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے، جس میں چند علماء کرام اپنی آراء پیش کریں گے اور بحث و مباحثہ کریں گے، پھر اس کی قرارداد تیار کی جائے گی۔

اسی طرح اسلامک فقہ اکیڈمیوں کو چاہئے کہ وہ فقہاء کے ساتھ ہر میدان کے ماہرین یعنی طب، تربیت، سیاست، معیشت کے ماہرین کو بھی شامل کریں، کیونکہ یہی ماہرین مسائل کی حقیقت و ماہیت کو بیان کریں گے اور فقہاء ان مسائل پر روشنی ڈالیں گے اور حکم بیان کریں گے، علماء ہند دنیا بھر میں ہر میدان میں اپنے کمال کی وجہ سے جانے جاتے ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ اس اکیڈمی سے ایسے ماہرین منسلک رہیں جو ہر ان میدان میں کمال رکھتے ہوں، جن پر اکیڈمی سمینار منعقد کیا کرتی ہے، جب اقتصادیات پر گفتگو کریں تو اس علم کے ماہر موجود ہوں، طب پر بحث کرنے میں ماہرین طب موجود ہوں، تربیت پر گفتگو کریں تو ماہرین تربیت موجود ہوں، اور اس طرح ہم اہم مسائل اور موجود تجربات دونوں کو بیک وقت جمع کر پائیں گے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو اپنی رضا کے لئے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ہم سبھوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کردے، اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

تمت

بعون الله تعالیٰ وبتوفیقه

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

نئے مسائل
اور
فقہ اکیڈمی کے فیصلے

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ٥ ایم اے جناح روڈ ٥ کراچی پاکستان

پیش لفظ

کوئی بھی فقہ یا قانون اپنی حرکیت سے ہی زندہ رہتا ہے۔ زندگی کی حرارت اور حرکت کسی بھی زندہ قانون میں نمایاں ہوتی ہے، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قانون کی تطبیق بہت نازک اور ذمہ داری کا کام ہے۔ قانون میں حرکت اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگی اصول اور قواعد کلیہ اور تعبیر قانون کے مسلمہ ضوابط کی بنیاد پر ہی برقرار رہ سکتی ہے، فقہ اسلامی کی پائداری اور حالات اور زمانے کی تبدیلیوں کے باوجود انسانی زندگی میں انضباط پیدا کرنے اور صحیح رہنمائی دینے کی بھرپور صلاحیت دراصل ان اصولی احکام کی رہین منت ہے جنہیں فقہاء نے کتاب وسنت سے مستنبط کیا ہے اور ہر عہد میں اس عہد کے حالات کو سامنے رکھ کر احکام فقہیہ کی تطبیق کا نازک فریضہ انجام دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ایسی جامع شخصیتیں موجود تھیں جو کتاب وسنت، فقہاء کے اجتماعی اقوال، قیاس کے اصولوں اور استنباط کے طریقوں پر حاوی تھیں، شرع کے عمومی مصالح اور تشریع کے اغراض ومقاصد پر ان کی نگاہ تھی اور وہ زمانہ شناس بھی تھے، لہذا انہوں نے اپنے عہد میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال اور ورع وتقویٰ کے ساتھ مقاصد شرع اور قوانین دین پر مضبوط گرفت رکھتے ہوئے اپنے وقت کی مشکلات کا حل نکالا۔ ان اصحاب افتاء بزرگوں کا فتویٰ رائج سکے کی طرح مسلم معاشرے میں قبول عام اختیار کرتا رہا۔

موجودہ حالات یہ ہیں کہ معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں، سائنس وٹکنالوجی کی ترقی نے نئے افق پیدا کئے، دنیا ایک چھوٹی سی بستی بن گئی، معاشی اور اقتصادی امور میں نئی ترقیات نے نئے مسائل کھڑے کئے۔ جو لوگ اسلام پر چلنا چاہتے ہیں اور شریعت کو اپنی معاشرت، تجارت اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں معیار ہدایت قرار دے کر زندگی گذارنا چاہتے ہیں ان کے سامنے ایسے سیکڑوں سوالات پیدا ہو رہے ہیں جن کے بارے میں وہ علماء واصحاب افتاء کی طرف رجوع کرتے ہیں اور رہنمائی کے طالب ہیں۔ دوسری طرف ایسی جامع شخصیتوں کا فقدان ہو گیا جو علم وتحقیق کی بنیاد پر ان مسائل کو حل کرسکیں اور جن کا تنہا فتویٰ بھی مسلم معاشرے میں قابل قبول ہو۔

اس لئے ضرورت تھی کہ اجتماعی فکر کی بنیاد ڈالی جائے اور علماء واصحاب دانش باہمی تبادلہ خیال کے ذریعہ ان مسائل کا ایسا حل نکالیں جو اصول شرع سے ہم آہنگ ہو اور فکری شذوذ سے پاک ہو۔

یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے "مجمع الفقہ الإسلامی الہند" کی تشکیل عمل میں آئی جس میں علماء اور فقہاء کے علاوہ ارباب علم ودانش، میڈیکل سائنس، معاشیات، سماجیات اور نفسیات کے ماہرین کو بھی شریک کیا گیا ہے، اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس علمی اور تحقیقی عمل کی آواز بازگشت ہندوستان سے باہر بھی سنی جانے لگی ہے۔

(قاضی) مجاہد الاسلام قاسمیؒ (مؤسس مجمع الفقہ الاسلامی الہند)

✧ ✧ ✧

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر عہد میں جو نئے مسائل پیدا ہوں، ان کو حل کرنا علماء کی ذمہ داری اور ان کا فریضہ منصبی ہے، سلف صالحین نے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے انفرادی کوششیں بھی کی ہیں، اور اجتماعی طریقہ کار بھی اختیار کیا ہے، یہ اجتماعی طریقۂ استنباط زیادہ محفوظ اور مامون صورت ہے، کیونکہ اجتماعی صلاحیت اور کوششوں کے ذریعہ انفرادی کوتاہیوں کی تلافی ہوجاتی ہے، چنانچہ عہد صحابہ میں حضرت عمر فاروقؓ نے اور صحابہ کے بعد حضرت امام ابوحنیفہؒ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا۔

موجودہ عہد تیز رفتار تبدیلیوں کا عہد ہے، اسی لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں ان اہل علم نے جن کو اللہ تعالیٰ نے دل دردمند اور فکر ارجمند سے نوازا ہے، فقہی مجامع قائم کئے ہیں، اور یہ اکیڈمیاں اجتماعی کاوشوں کے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنے میں بہت ہی اہم کردار ادا کر رہی ہیں، ہندوستان کے اکابر علماء بھی اس سلسلہ میں محدود سطح پر اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ ایسے مسائل کا حل کرنے پر توجہ دیتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے مستقل طور پر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کی بنیاد رکھی، اور وسیع سطح پر نئے پیدا ہونے والے فقہی مسائل پر غور وفکر کے لئے ایک عظیم الشان پلیٹ فارم مہیا کیا، جس نے نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے اہم فقہاء اور ارباب افتاء کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

چنانچہ اس اکیڈمی کے تحت اب تک ۲۵ فقہی سمینار منعقد ہو چکے ہیں، جن میں بحیثیت مجموعی ۱۳۵ مسائل پر غور کیا گیا ہے، ان سمیناروں کی تجاویز ''اہم فقہی فیصلے'' کے نام سے طبع ہو چکی ہیں، خیال ہوا کہ ان تجاویز کو اگر فقہی ترتیب کے مطابق فقہ اکیڈمی کے فیصلے کے نام سے شائع کیا جائے تو لوگوں کو استفادہ میں زیادہ سہولت ہوگی۔

چنانچہ ترتیب نو کے ساتھ یہ فیصلے شائع کئے جا رہے ہیں، انشاء اللہ کوشش کی جائے گی کہ آئندہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق تجاویز کو الگ الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جائے، اور لوگوں تک پہنچایا جائے، تاکہ لوگ اپنی ضرورت کے لحاظ سے استفادہ کر سکیں۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کے مؤسس حضرت قاضی صاحبؒ کے درجات بلند فرمائے اور ہم لوگوں کو اس لائق بنائے کہ ان کی اس چھوڑی ہوئی دینی وعلمی امانت کی نہ صرف یہ کہ حفاظت کریں، بلکہ اس کے مزید دوام واستحکام کا ذریعہ بنیں، وباللہ التوفیق۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

۲۷/ فروری ۲۰۱۶ء

✧ ✧ ✧

فقہی سمینار - ایک نظر میں

۱۹۸۹ تا ۲۰۱۶ء

سمینار	تاریخ	مقام	موضوعات
پہلا	۱-۳/ اپریل ۱۹۸۹ء	نئی دہلی	اعضاء کی پیوندکاری، برتھ کنٹرول، پگڑی۔
دوسرا	۸-۱۱/ دسمبر ۱۹۸۹ء	نئی دہلی	کرنسی نوٹ، بینک انٹرسٹ، تجارتی سود۔
تیسرا	۸-۱۱/ جون ۱۹۹۰ء	بنگلور	اسلامی بنکاری، مرابحہ، حقوق کی بیع۔
چوتھا	۹-۱۲/ اگست ۱۹۹۱ء	حیدرآباد	دوملکوں کی کرنسیوں کا تبادلہ، انشورنس، اسلامی بینکنگ
پانچواں	۳۰/ اکتوبر تا ۲/ نومبر ۱۹۹۲ء	اعظم گڑھ	زکوۃ سے متعلق جدید مسائل، ایک اہم مصرف: فی سبیل اللہ
چھٹا	۳۱/ دسمبر ۱۹۹۳ تا ۳/ جنوری ۱۹۹۴ء	عمرآباد	اسلام کا نظام عشر وخراج، اراضی ہند کی شرعی حیثیت۔
ساتواں	۳۰/ دسمبر ۱۹۹۴ تا ۲/ جنوری ۱۹۹۵ء	بھروچ، گجرات	مشینی ذبیحہ، رؤیت ہلال، احکام شرعیہ میں ضرورت وحاجت کی رعایت۔
آٹھواں	۲۲-۲۴/ اکتوبر ۱۹۹۵ء	علی گڑھ، یوپی	طبی اخلاقیات، نکاح میں شرط کا حکم، احکام شرعیہ اور عرف وعادت۔
نواں	۱۱-۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۶ء	جے پور راجستھان	مچھلیوں کی تجارت، قبضہ سے پہلے خرید وفروخت، شیئرز، اوقات سحر راجستھان۔
دسواں	۲۴-۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۷ء	ممبئی	اوقاف، حج وعمرہ، قسطوں پر خرید وفروخت، کلوننگ، اتحاد امت۔
گیارہواں	۱۷-۱۹/ اپریل ۱۹۹۹ء	پٹنہ	کفاءت، نکاح میں ولی کے اختیارات، احادیث ضعیفہ کا حکم۔
بارہواں	۱۱-۱۴/ فروری ۲۰۰۰ء	بستی، یوپی	انٹرنیٹ، نشہ کی طلاق، اختلافات ائمہ کی شرعی حیثیت
تیرہواں	۱۲-۱۶/ اپریل ۲۰۰۱ء	ملیح آباد لکھنؤ	انقلاب ماہیت، اموال زکوۃ کی سرمایہ کاری، جبری شادی، جدید ذرائع ابلاغ۔
چودہواں	۲۰-۲۲/ جون ۲۰۰۴ء	حیدرآباد	غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، اسلام اور امن عالم، جلاٹین، الکحل۔
پندرہواں	۱۱-۱۳/ مارچ ۲۰۰۶ء	میسور کرناٹک	جنیٹک سائنس، میڈیکل انشورنس، بینک سے جاری ہونے والے کارڈ، ڈی این اے ٹسٹ۔

سولہواں	۳۰/ مارچ تا ۲/ اپریل ۲۰۰۷ء	اعظم گڑھ/ یوپی	رمی جمار کا مسئلہ، مصنوعی آلہ تنفس، یوتھینزیا، نیٹ ورک مارکیٹنگ۔
سترہواں	۵ تا ۷/ اپریل ۲۰۰۸ء	برہان پور ایم پی	ماحولیات کا تحفظ، تعلیم گاہوں میں جنسی تعلیم، روزہ میں جدید طریقہ علاج کا استعمال، مسافت سفر کا آغاز، جائے ملازمت کا حکم۔
اٹھارہواں	۲۸/ فروری - ۲/ مارچ ۲۰۰۹ء	مدورائی/ تاملناڈو	قیدیوں کے حقوق، تعلیمی قرض، خواتین کی ملازمت، پلاسٹک سرجری۔
انیسواں	۱۲-۱۵/ فروری ۲۰۱۰ء	ہانسوٹ گجرات	غیر مسلم ممالک میں عدالت کے ذریعہ طلاق، کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت، ایام قربانی میں کس مقام کا اعتبار ہوگا، سونے اور چاندی کا نصاب، تورق کا مسئلہ، موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت۔
بیسواں	۵-۷/ مارچ ۲۰۱۱ء	رامپور یوپی	آبی وسائل اور ان سے متعلق شرعی احکام، مختلف النوع ملازمتیں اور ان کا شرعی حکم، مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام، تفریح - اس کے جائز وسائل اور شرعی ضوابط۔
اکیسواں	۳-۵/ مارچ ۲۰۱۲ء	اندور ایم پی	نشہ آور اشیاء، شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح، شریعت کے دائرہ میں انشورنس (تکافل) کی صورت
بائیسواں	۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء	امروہہ، یوپی	الیکشن سے مربوط شرعی مسائل، بیع وفا، بیع صکوک۔
تیئسواں	۱-۳/ مارچ ۲۰۱۴ء	جمبوسر، گجرات	عقد استصناع، میراث اور وصیت سے متعلق بعض پیش آمدہ مسائل، ہبہ سے متعلق ایک کثیر الوقوع مسئلہ، شہریت اور اس سے متعلق حقوق۔
چوبیسواں	۱-۳/ مارچ ۲۰۱۵ء	اوچیرا، کیرالا	قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت سے متعلق بعض مسائل، اسلام میں بچوں کے حقوق، غذائی مصنوعات میں حلال وحرام کے اصول، حلال سرٹیفکٹ کے اجراء کے لئے شرائط ومعیارات، اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ۔
پچیسواں	۵-۷/ فروری ۲۰۱۶ء	بدر پور، آسام	اہل کتاب سے متعلق مسائل واحکام، اسلام میں بوڑھوں اور کمزوروں کے حقوق، طلاق غضبان، وحدت امت - اصول وآداب، بین مذہبی مذاکرات - اصول وآداب۔

اصولی مسائل

فقہی اختلاف کی شرعی حیثیت [۱]

۱- احکام شرعیہ کے دو حصے ہیں: منصوص اور غیر منصوص، منصوص سے مراد وہ احکام شرعیہ ہیں جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں، اور غیر منصوص سے مراد وہ احکام ہیں جن کا تعلق ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کے اجتہاد واستنباط سے ہے۔ بلاشبہ ائمہ وفقہاء کے اجتہادات واستنباطات اور ان کا فقہی ذخیرہ ہمارا قیمتی سرمایہ اور شریعت اسلامیہ کا حصہ ہیں۔

۲- ائمہ مجتہدین کے درمیان مسائل میں جو اختلاف رائے ہے وہ اختلاف حق وباطل نہیں ہے بلکہ مختلف فیہ مسائل کی ایک بڑی تعداد وہ ہے جن میں افضل، غیر افضل، راجح، غیر راجح کا اختلاف ہے، باقی مسائل میں اختلاف کی نوعیت یہ ہے کہ ایک رائے صواب باحتمال خطا اور دوسری رائے خطا باحتمال صواب پر محمول ہے۔

۳- عامی جو کتاب وسنت اور دلائل شرعیہ سے واقف نہیں ہے، اس کے لئے راہ عمل یہ ہے کہ وہ کسی معتمد ومستند عالم دین سے مسئلہ شرعی معلوم کرکے اس پر عمل کرے، وہ اسی طرح شریعت پر عمل پیرا قرار دیا جائے گا۔

۴- ائمہ مجتہدین کی آراء پر عمل کرنے والی مختلف جماعتوں یا افراد کا ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا یا ان اکابر سلف کی مذمت کرنا یا ان کے فقہی استنباطات کو تمسخر کا نشانہ بنانا قطعاً حرام ہے اور یہ کسی مسلمان کے لئے دنیا وآخرت میں سخت بدنصیبی اور خسارہ کا سبب ہے۔

۵- اختلافی مسائل میں سلف صالحین کی روش رواداری، ادب واحترام، ایک دوسرے کے مقام ومنصب کو ملحوظ رکھنے اور ان کے علوم ومعارف کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھنے کی رہی ہے، ان حضرات نے علمی مباحثات میں ان آداب کی پوری رعایت کی ہے، بلاشبہ سلف صالحین کی روش ہمارے لئے مشعل راہ ہے، افراد امت کی ذمہ داری ہے کہ اسی روش کو اختیار کریں اور اختلافی مسائل میں راہ اعتدال پر چلیں۔

۶- اگر وقت اور حالات کی تبدیلی سے معاشرہ کسی مشکل صورت حال کا شکار ہو اور ائمہ مجتہدین کی فقہی آراء میں سے ایک پر عمل حرج اور دشواری کا باعث ہو اور دوسری فقہی رائے پر عمل سے یہ حرج دور ہو جائے تو ایسی صورت میں علماء وفقہاء جو اصحاب ورع وتقویٰ اور ارباب علم وفہم ہوں ان کے لئے دوسری رائے پر فتویٰ دینا جائز ہے جو باعث دفع حرج ہو، البتہ اس طرح کے مسائل میں انفرادی طور پر فتویٰ دینے کے بجائے اجتماعی طریقہ اختیار کیا جائے۔

۷- ایسے مسائل جن میں مستند علماء وفقہاء کی ایک جماعت عدول کی ضرورت سمجھے اور مسئلہ مجتہد فیہ میں ایک خاص فقہی رائے کو دفع حرج کے لئے اختیار کرے اور اس پر فتویٰ دے، اور دوسری جماعت اس سے اختلاف کرے اور اس فقہی رائے کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے، ایسی صورت میں عام لوگوں کے لئے اس رائے پر عمل کرنا جائز ہے جس میں عدول کرکے سہولت کی راہ اختیار کی گئی ہے، اور اصحاب افتاء کے لئے اس رائے پر بھی فتویٰ دینا جائز ہے۔

✧ ✧ ✧

[۱] بارہواں فقہی سمینار (بستی) بتاریخ ۵-۸/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۱-۱۴/ فروری ۲۰۰۰ء۔

ضعیف احادیث کے احکام[1]

۱- اس موضوع پر غور کرتے ہوئے سمینار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ فی زمانہ اہل علم کے یہاں اس باب میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ بعض حضرات کا حال یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی معتبر و نامعتبر روایات کو صحیح وثابت روایات کا درجہ دے رکھا ہے جو کسی بھی طرح ''من کذب علي متعمداً فلیتبوأ مقعده من النار'' کے تحت مطلوبہ احتیاط سے ہم آہنگ نہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو محض کسی حدیث کے سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس کو یکسر نا قابل اعتبار اور لائق رد سمجھتے ہیں، حالانکہ ضعیف احادیث بھی بعض مواقع پر مقبول ہیں، اور حدیث کا سند کے اعتبار سے ضعیف ہونا اس کے متن ومضمون کے مردود و نامقبول ہونے کو مستلزم نہیں۔

۲- جو روایات موضوع ہیں وہ قطعاً غیر معتبر ہیں، نہ ان سے استدلال کی گنجائش ہے اور نہ ان کے موضوع ہونے کی صراحت و وضاحت کے بغیر ان کو نقل کرنا جائز ہے۔ البتہ اگر کسی سند میں واضع حدیث راوی آجائے تو جب تک متن حدیث کے دوسرے طرق کی تحقیق نہ کر لی جائے محض اس سند کی وجہ سے حدیث کے متن ومضمون کو موضوع قرار دینا درست نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ کسی ایسی سند سے بھی یہ متن منقول ہو جس میں واضع حدیث راوی نہ آیا ہو۔

۳- اگر کسی حدیث کو متعدد فقہاء ومجتہدین اور محدثین نے بطور استدلال نقل کیا ہو یا اس روایت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہو یا اس حدیث کو رد کرنے کے بجائے اس کے متن میں تاویل کا راستہ اختیار کیا ہو، اور ظاہر و متبادر معنیٰ کے بجائے دوسرا معنیٰ متعین کیا ہو، تو یہ ''تلقی بالقبول'' ہے۔

۴- تلقی بالقبول کی وجہ سے سنداً ضعیف احادیث بھی مقبول کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔

۵- تلقی بالقبول کے علاوہ احادیث صحیحہ سے اور صحابہ کے فتاویٰ سے مطابقت کی بنا پر بھی احادیث ضعیفہ درجہ اعتبار حاصل کر لیتی ہیں۔

۶- جن احادیث کے رواۃ متہم بالکذب اور فاسق نہ ہوں، لیکن راوی کے خفت ضبط کے باعث روایت ضعیف ہو، ان کے لئے تعدد طرق مفید ہے، اور ایسی روایت ''حسن لغیرہ'' کے درجہ میں آجاتی ہے، بشرطیکہ دوسرے طرق میں بھی راوی پر خفت ضبط ہی کی تہمت ہو نہ کہ کذب وفسق کی۔ ایسی ضعیف حدیثیں جو دوسری نصوص ثابتہ سے متعارض ہوں یا جن میں ضعف راوی کے متہم بالکذب یا فسق کی وجہ سے ہو، تو یہ نہ فضائل میں معتبر ہوں گی اور نہ احکام میں۔

۷- ترغیب وترہیب میں ضعیف روایات معتبر ہیں، بشرطیکہ ان میں ضعف شدید نہ پایا جاتا ہو، اور وہ شریعت کی کسی اصل عام کے تحت آتی ہوں، اور ان پر عمل کرتے ہوئے اس میں بیان کئے ہوئے ثواب وعقاب کی امید تو رکھی جائے لیکن یقین جازم نہ ہو۔

۸- موجودہ علمی انحطاط کو دیکھتے ہوئے مناسب ہے کہ اہل علم اپنی تحریروں اور تقریروں میں صحیح وثابت احادیث کے نقل کا اہتمام کریں، اور جہاں ایسی ضعیف حدیثیں پیش کرنی پڑیں وہاں مناسب انداز پر ایسی حدیث کا درجہ اور مقام بھی واضح کر دیں، تاکہ ضعیف و بے اصل روایات کے نقل کرنے کا چلن نہ ہو جائے۔

۹- ایسی احادیث جو سند کے اعتبار سے ضعیف ہوں، لیکن ان میں ضعف خفت ضبط کی وجہ سے ہو نہ کہ فقدان عدالت کی وجہ سے، اور کسی نص صحیح وثابت سے متعارض نہ ہوں، ان سے احتیاطی احکام یعنی کراہت واستحباب ثابت کئے جا سکتے ہیں۔

۱۰- نیز جن احکام میں کوئی دوسری دلیل شرعی موجود نہ ہو، ان میں ایسی ضعیف الاسناد احادیث سے دیگر احکام بھی ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی احادیث علت غیر منصوصہ پر مبنی قیاس سے اولیٰ ہیں، یہی جمہور سلف کا مسلک ہے۔

نوٹ:...... مولانا عبداللہ جولم صاحب کو شق ۹ اور ۱۰ سے اتفاق نہیں ہے ✧ ✧ ✧

---

[1] گیارہواں فقہی سمینار (پھلواری شریف پٹنہ) بتاریخ ۲۹ / ذی الحجہ ۱۴۱۹ - ۲ / محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۷-۱۹ / اپریل ۱۹۹۹ء۔

شریعت میں ضرورت وحاجت کی رعایت

اور اس کے حدود[1]

اسلامی شریعت کا دائرہ کسی زمانہ یا ملک وقوم تک محدود نہیں ہے، بلکہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لئے اسلامی شریعت پر عمل کرنا واجب ہے، اسلامی شریعت جس طرح ان ممالک کے لئے ہے جن کی زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، اسی طرح غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے بھی لازم العمل ہے۔

دور حاضر میں حکومت کا دائرہ کار چند میدانوں تک محدود نہیں رہ گیا ہے، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں قانون سازی، منصوبہ بندی اور نگرانی حکومت اپنا فرض اور حق سمجھتی ہے، مغرب کے برپا کئے ہوئے غیر اسلامی نظام وماحول میں رہنے والے کروڑوں مسلمان (خصوصاً غیر مسلم ممالک کے مسلمان) سخت گھٹن اور تنگی میں ہیں، بہت سے اسلامی احکام پر عمل ان کے لئے حکومت کے قوانین کی وجہ سے دشوار تر ہوگیا، اگر اسلامی احکام کو چھوڑتے ہیں تو ان کا دل انہیں ملامت کرتا ہے، آخرت میں باز پرس اور عذاب کا خوف ان کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے، اور اگر ان اسلامی احکام کی کامل پابندی کرتے ہیں تو انتہائی ضیق اور تنگی میں مبتلا ہوتے ہیں، مروجہ قوانین ان پر قدغن لگاتے ہیں، زندگی کے بہت سے میدانوں سے انہیں دست کش ہونا پڑتا ہے۔

ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ شریعت کے رفع حرج، دفع ضرر، ضرورت واضطرار کے اصول کی روشنی میں ان بنیادی رہنما خطوط کی نشاندہی کردی جائے جن کی بنیاد پر علماء اور اصحاب افتاء دور حاضر کے عمومی ابتلاء اور حاجت کے مسائل کے بارے میں صحیح فیصلہ کرسکیں تاکہ شرعی اصول وقواعد کی روشنی میں جن مسائل میں شرعی جواز اور گنجائش موجود ہو، ان کے بارے میں امت مسلمہ کو غیر معمولی ضیق وحرج سے نکالا جائے، شریعت کے دائرے میں مسلمانوں کے لئے یسر وسہولت پیدا کی جائے، اور اصول ضرورت وحاجت کے بے محابا استعمال سے اباحیت اور ہوا پرستی کا جو سنگین خطرہ درپیش ہے اس کا سدّ باب بھی کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں شرکائے سمینار بہ اتفاق آراء درج ذیل تجاویز منظور کرتے ہیں:

محور اول

۱- بنیادی طور پر پانچ مصالح ہیں جن کا حصول احکام شرعیہ کا مقصود ہے۔ دین، حیات وزندگی (بشمول عزت وآبرو)، نسل، عقل اور مال کا تحفظ، جو امور ان مصالح کے حصول کے لئے اس قدر ناگزیر ہوجائیں کہ ان کے فقدان کی وجہ سے ان مصالح کے فوت ہوجانے کا یقین یا ظن غالب ہو، وہ ضرورت ہیں، ضرورت فقہاء کے یہاں ایک مستقل اصطلاح ہے، جس میں "اضطرار" بھی داخل ہے، تاہم یہ اصطلاح بمقابلہ اضطرار کے عام اور وسیع مفہوم کی حامل ہے۔

۲- حاجت ایسی کیفیت ہے جس میں انسان ان مصالح پنجگانہ کے حاصل کرنے میں ایسے قابل لحاظ مشقت وحرج میں مبتلا ہوجائے جن سے بچانا شریعت کا مقصود ہے۔ البتہ فقہاء کے یہاں کبھی ضرورت پر حاجت اور کبھی حاجت پر ضرورت کا اطلاق کردیا جاتا ہے۔

---

[1] ساتواں فقہی سمینار (بھروچ گجرات) بتاریخ ۲۶-۲۹/ رجب ۱۴۱۵ھ مطابق ۳۰/ دسمبر ۱۹۹۴ء-۲/ جنوری ۱۹۹۵ء۔

۳- ضرورت وحاجت دونوں کا تعلق بنیادی طور پر مشقت سے ہے، مشقت کا ایک درجہ وہ ہے جو تمام ہی احکام شرعیہ میں لازم ہوتا ہے، اس کا اعتبار تبدیلی احکام میں نہیں ہے، اور مشقت کبھی اس درجہ شدید ہوجاتی ہے کہ اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو ضرر شدید لاحق ہوجانے کا یقین یا غالب گمان ہو، یہ ضرورت ہے۔ کبھی اس سے کم درجہ کی مشقت ہوتی ہے، لیکن شریعت نے جس طرح کی مشقتوں کا انسان کو پابند کیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں غیر معمولی ہوتی ہے، یہ کیفیت حاجت ہے۔ بس ضرورت وحاجت کی حقیقت میں بنیادی فرق مشقت کی کمی وزیادتی کا ہے۔

۴- ضرورت وحاجت کے احکام میں بھی فقہاء نے فرق کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت کے ذریعہ ایسے منصوص احکام سے بھی استثناء کی گنجائش ہوتی ہے جن کی ممانعت قطعی ہو اور جو بذات خود ممنوع ہوں۔ حاجت اگر عمومی نوعیت کی نہ ہو تو اس کے ذریعہ ان ہی احکام میں استثناء کی گنجائش پیدا ہوتی ہے جن کی ممانعت بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ دوسری محرمات کے سد باب کے لئے ان سے منع کیا جاتا ہے۔

۵- حاجت اگر عمومی نوعیت کی ہو اور لوگ عام طور پر اس میں مبتلا ہوں تو یہ ضرورت کے درجہ میں آتی ہے، اور اس سے نصوص میں تخصیص واستثناء کی گنجائش ہوجاتی ہے۔

۶- ضرورت وحاجت کی بنیاد مشقت پر ہے اور مشقت ایک اضافی چیز ہے، اس لئے ضرورت وحاجت کی تعیین میں علاقہ ومقام، احوال زمانہ، لوگوں کی قوت برداشت، مسلم اکثریتی ممالک اور ان ممالک کے لحاظ سے جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں فرق واقع ہوسکتا ہے، اس لئے ہندوستان اور اس جیسے ممالک میں جہاں مسلمان اس موقف میں نہیں ہیں کہ قانون سازی کے کام میں موثر کردار ادا کرسکیں، ضرورت وحاجت کی تعیین میں اس پہلو کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۷- کسی امر کے بارے میں یہ متعین کرنا کہ وہ موجودہ حالات میں ضرورت یا حاجت کا درجہ رکھتا ہے، یہ نہایت نازک، احتیاط اور دقت نظر کا متقاضی ہے، اس لئے ہر عہد کے علماء، ارباب افتاء کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات کو پیش نظر رکھ کر طے کریں کہ اب کون سے امور ہیں جو ضرورت وحاجت کے درجہ میں آگئے ہیں اور ان کی وجہ سے احکام میں تخفیف ہوسکتی ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے نازک مسئلہ میں افراد واشخاص کے بجائے علماء کی ایک مقتدر جماعت ہی فیصلہ کرے، تاکہ دفع حرج کے نام پر اباحیت کا راستہ کھلنے نہ پائے۔

۸- محرمات کی کسی خاص صورت کو نص کے ذریعہ صراحتاً یا دلالۃً حرمت سے مستثنیٰ کردیا گیا ہو تو اس صورت میں حرمت باقی نہیں رہتی ہے، اور اس رخصت سے فائدہ اٹھانا واجب ہے، اس کے علاوہ جن صورتوں میں نص کے ذریعہ یا فقہاء کے اجتہاد کے ذریعہ رخصت وسہولت ثابت ہوتی ہے وہاں صرف رفع اثم ہوتا ہے۔

۹- ضرورت وحاجت کی بنا پر جو سہولت دی جاتی ہے، اصولی طور پر ان کی حیثیت استثنائی ہوتی ہے۔

محور دوم

ضرورت کی بنا پر اباحت ورخصت کا حکم حرام لعینہ از قبیل حق العبد، قتل نفس اور زنا کے ماسوا حقوق العباد، معاملات اور تمام ابواب فقہیہ پر اثر انداز ہوگا، اور اس کی تاثیر کے حدود درج ذیل تفصیلات کے مطابق مختلف ہوں گے:

۱- احکام اگر مامورات کے قبیل سے ہوں اور ان کے عدم امتثال سے صرف حق شارع متاثر ہوتا ہو، جیسے کلمہ کفر وغیرہ، تو حالت اضطرار میں فی نفسہ حرام ہوتے ہوئے بھی ان امور کے ارتکاب کی رخصت ہوگی، یعنی بقائے حرمت کے باوجود صرف رفع اثم ہوگا۔

۲- اگر احکامات از قبیل منہیات ہوں اور ان کی خلاف ورزی سے صرف حق شارع متاثر ہوتا ہو، جیسے اکل میتہ، لحم خنزیر، شرب خمر وغیرہ، تو بحالت اضطرار یہ چیزیں مباح ہوجاتی ہیں، یعنی رفع اثم ورفع حرمت دونوں ہوجاتے ہیں، اور محظور پر عمل واجب ہوگا۔

۳- اگر احکامات از قبیل منہیات ہوں اور ان کی خلاف ورزی سے حق العبد متاثر ہوتا ہو، جیسے ناحق قتل، زنا، اتلاف مال مسلم، تو اس کی دو صورتیں ہیں:

الف: اگر حق العبد کی تلافی ممکن ہو جیسے اتلاف مال مسلم، کہ اس کی تلافی بصورت ضمان ممکن ہے، تو اضطرار کی صورت میں بقائے حرمت کے ساتھ

رخصت ہوگی۔

ب: لیکن اگر تلف شدہ حق العبد کی تلافی ممکن نہ ہو جیسے قتل وزنا، تو اس کی رخصت بصورت اضطرار بھی حاصل نہ ہوگی، اور اس پر عمل کرنا حرام ہوگا۔

محور سوم

محرمات کی اباحت میں ضرورت کی طرح کبھی کبھی حاجت بھی موثر ہوتی ہے، اور بعض حالات میں حاجت کو ضرورت کے قائم مقام قرار دیا جاتا ہے، البتہ اس کے لئے کچھ حدود وقیود ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

الف: حاجت کے وقت محرمات کی اباحت میں دفع مضرت مقصود ہو، جلب منفعت مقصود نہ ہو، محض جلب منفعت کی غرض سے کسی حرام کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

ب: حاجت کی بنا پر غیر عادی مشقت کو دفع کرنا مطلوب ہو، وہ مشقت حاجت معتبرہ کے حدود میں نہیں آتی جو عام طور پر انسانی اعمال اور شرعی احکام میں پائی جاتی ہے۔

ج: مقصد کے حصول کے لئے کوئی جائز متبادل طریقہ موجود نہ ہو، یا موجود تو ہو مگر مشقت شدیدہ سے خالی نہ ہو۔

د: حاجت کی بنا پر جو حکم ثابت ہوگا وہ بقدر حاجت ہی ثابت ہوگا، اس سے زیادہ اس میں توسع پیدا کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

ھ: کسی مفسدہ کو دور کرنے میں کوئی اس سے بڑا مفسدہ لازم نہ آئے۔

و: حاجت واقعی ہو، محض موہوم نہ ہو۔

محور چہارم

اباحت محظورات کے سلسلہ میں ضرورت معتبرہ کے لئے درج ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱- ضرورت بالفعل موجود ہو، مستقبل میں پیش آنے والی ضرورتوں کا اندیشہ وخطرہ معتبر نہیں۔

۲- کوئی جائز مقدور متبادل نہ ہو۔

۳- ہلاکت وضیاع کا خطرہ یقینی ہو یا مظنون بظن غالب ہو۔

۴- محرمات کے استعمال یا ارتکاب سے ضرر شدید کا ازالہ یقینی اور نہ استعمال کرنے کی صورت میں اس کا وقوع یقینی ہو۔

۵- بقدر ضرورت استعمال کیا جائے۔

۶- اس کا ارتکاب اس کے مساوی یا اس سے کسی بڑے مفسدہ کا سبب نہ بنے۔

محور پنجم

۱- ''ضرورت وحاجت'' جس کی وجہ سے شریعت بہت سے احکام میں رخصت وسہولت دیتی ہے اس کے پیچھے متعدد اسباب ہوتے ہیں، یہ وہ اسباب ہیں جن کو فقہاء وعلماء ''اسباب رخصت'' اور ''اسباب تخفیف'' کے عنوان سے ذکر کیا کرتے ہیں۔

معروف قول کے مطابق یہ اسباب سات ہیں:

سفر، مرض، اکراہ، نسیان، جہل، عسر وعموم بلوی اور نقص۔

۲- ''عرف وعموم بلوی'' پر مبنی ہونے والے احکام میں اکثر وبیشتر ''ضرورت وحاجت'' اور ''رفع حرج'' ملحوظ ہوتا ہے، اگرچہ فقہی طور پر ''عرف وعموم بلوی'' اور اس پر مبنی ہونے والے احکام کا دائرہ کچھ وسیع ہے۔

محور ششم

۱- شرکاء سمینار کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی معاملہ میں عمومی حرج وتنگی اور حاجت عامہ پیدا ہونے کی صورت میں بعض اوقات اسے ضرورت واضطرار کا درجہ دے دیا جاتا ہے، اور سماج کو غیر معمولی ضرر اور تنگی لاحق ہونے کی صورت میں ممنوع وحرام چیز مباح قرار پاتی ہے۔

۲- جن چیزوں کی حرمت نصوص شرعیہ سے ثابت ہے، اگر ان میں سے کسی کے بارے میں حاجت عامہ اور عمومی حرج وضیق پیدا ہو تو انہیں ضرورت کا درجہ دے کر منصوص حرمت سے استثناء بہت ہی نازک اور ذمہ داری کا کام ہے، تمام اجتماعی اور ملی حاجات ایک درجہ کی نہیں ہوتیں، ان کا دائرہ اور ناگزیریت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، اس لئے اجتماعی حاجتوں کا شرعی حکم متعین کرنے سے پہلے ان میں سے ہر ایک کا انتہائی گہرا مطالعہ ضروری ہے۔

۳- جب کوئی اجتماعی حاجت اس درجہ اہمیت حاصل کر لے کہ اس سے لوگوں کا بچنا انتہائی دشوار اور اس کا کوئی جائز قابل عمل متبادل موجود نہ ہو یا قانونی جبر کی وجہ سے اس سے چارہ کار نہ ہو تو اس کی بنا پر منصوص حرمت پائے جانے کے باوجود اجتماعی حاجت موجود رہنے تک جواز کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

۴- کسی اجتماعی حاجت کے بارے میں اس طرح کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کا انتہائی گہرا اور عمیق جائزہ ضروری ہے۔ اس جائزے میں حسب ضرورت ماہرین قانون، ماہرین سماجیات وغیرہ سے مدد لی جائے، اجتماعی حاجت جس شعبۂ زندگی سے متعلق ہے اس سے تعلق رکھنے والے افراد سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی مقاصد شریعت اور احکام شریعت پر نظر رکھنے والے خدا ترس اصحاب بصیرت علماء اور فقہاء اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سی اجتماعی حاجت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اسے نظر انداز کرنے میں فوری طور پر یا مستقبل میں ملت کو غیر معمولی ضرر لاحق ہونے کا خطرہ ہے، لہٰذا اس کے جواز کا فیصلہ کیا جانا چاہئے۔

۵- جن معاملات میں اجتماعی حاجت کی بنیاد پر نصوص میں تخصیص یا استثناء کا مرحلہ درپیش ہے ان کا فیصلہ علماء اور اصحاب افتاء انفرادی طور پر نہ کریں، بلکہ علماء اور فقہاء کی معتد بہ تعداد پورے غور وخوض کے بعد مقاصد شریعت، احکام شریعت، فقہی اصول وقواعد کی روشنی میں باہمی مشورہ سے اس کا فیصلہ کریں، اجتماعی فیصلہ ہی ایسے نازک معاملات میں محتاط اور قابل اطمینان ہوتا ہے۔

نوٹ:...... مفتی شبیر احمد صاحب مرادآباد کو حرمت منصوص قطعی کی صورت میں حاجت عامہ کی وجہ سے گنجائش کے بارے میں اختلاف ہے۔

✧ ✧ ✧

شریعت میں عرف وعادت کا اعتبار

اور اس کے اصول وقواعد[1]

حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامی کی سب سے بڑی خصوصیت مسائل زندگی کی بابت عدل اور اعتدال ہے، نہ شریعت اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ وہ وضعی قوانین کی طرح ہر روز اور ہر آن تبدیلی قبول کرتی رہے، اور ایک بات خواہ کسی قدر بھی نامعقول اور مصالح اور اخلاقی قدروں کے مغائر ہو، لیکن اگر اس نے رواج کا درجہ حاصل کرلیا ہو، لوگ اس کو برتنے لگے ہوں تو اس کو بہر حال قبول کرلیا جائے، یہ مصالح انسان کی رعایت نہیں بلکہ مفاسد کے سامنے سپر انداز ہونا ہے، اور اسلام اس کی کسی طور پر اجازت نہیں دے سکتا، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو قانون زندگی کے ساتھ چلنا چاہتا ہو اور اپنی ابدیت اور دوام واستمرار کا مدعی ہو اس کے لئے ایک خاص حد میں سماجی رواجات اور عرف کو قبول کرنا ناگزیر ہے، چنانچہ فقہ اسلامی میں بہت سے احکام کی بنیاد عرف پر رکھی گئی ہے، قرآن وسنت، آثار صحابہ اور قیاس سے عرف وعادت کے معتبر ہونے کا ثبوت ملتا ہے، اور اس کے معتبر ہونے پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

اسی پس منظر میں فقہ اسلامی میں عرف کی حیثیت، اس کے مقام اور اس کے معتبر ہونے کی صورت واصول وشرائط پر تفصیلی بحث اور غور وفکر کے بعد درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

عرف کی حقیقت اور اس کی مختلف اقسام

۱- عرف لغوی طور پر جانی پہچانی چیز کو کہتے ہیں۔ اصطلاح شرع کے اندر عرف سے مراد وہ اقوال وافعال ہیں جو معاشرہ میں رائج ہوں اور لوگ ان پر عمل پیرا ہوں۔

۲- ''عادت'' کا لغوی معنی کسی امر کے مکرر پیش آنے کے ہیں، اور اصطلاحی طور پر عقلی رشتہ کے بغیر کسی امر کا اس طرح بار بار پیش آنا کہ طبعی امور کی طرح اس کی انجام دہی آسان ہوگئی ہو، عادت کہلاتی ہے۔

۳- عرف وعادت کے درمیان کوئی حقیقی فرق نہیں ہے، مصداق کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں گو مفہوم کے اعتبار سے جدا جدا ہیں۔

۴- عرف اور اجماع کے درمیان فرق یہ ہے کہ عرف عام لوگوں کے قول وعمل سے وجود میں آتا ہے جبکہ اجماع مجتہدین کے اتفاق کا نام ہے۔

۵- موضوع کے اعتبار سے عرف کی دو قسمیں ہیں: عرف قولی، عرف فعلی۔

بعض الفاظ یا تراکیب لوگوں کے درمیان کسی خاص معنی میں مروج ہو جائیں اور جب وہ بولا جائے تو کسی قرینہ اور عقلی دلیل کے بغیر وہ معنی سمجھا جائے، عرف قولی ہے۔ اور کسی عمل کے بارے میں لوگوں کی عادت ورواج عرف عملی ہے۔

۶- عرف لفظی اور عرف عملی دونوں احکام شرعیہ میں معتبر ہیں۔

دنیا کی بیشتر مسلم آبادیوں میں جو امر معروف ومروج ہو جائے وہ عرف عام ہے، اور جو کسی ایک شہر یا صوبہ یا کسی خاص آبادی یا ایک مخصوص طبقہ تک محدود ہو وہ عرف خاص ہے۔

---

[1] آٹھواں فقہی سمینار (علی گڑھ) بتاریخ ۲۷-۲۹ جمادی الاول ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۲-۲۴ / اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

۷- ہر وہ رواج وعرف جو شریعت کی کسی نص، یا مقصد ومصلحت معتبرہ سے ٹکراتا ہو وہ فاسد قرار پائے گا، جیسے مروجہ جہیز یا نقد رقم کا مطالبہ کرنا، لڑکیوں کو میراث سے محروم رکھنا، گروی زمینوں وغیرہ سے فائدہ اٹھانا۔

عرف کے معتبر ہونے کی شرطیں

شریعت میں عرف کے معتبر ہونے کی چار شرطیں ہیں:

۱- عرف کلی یا اکثری ہو، یعنی معاشرہ میں سو فیصد اس کا رواج ہو یا معاشرہ کی غالب اکثریت اس عرف پر عمل پیرا ہو۔

۲- کسی تصرف یا معاملہ کے پیش آنے سے پہلے وہ عرف موجود رہا ہو اور پیش آنے کے وقت تک موجود ہو۔

۳- معاملہ کرنے والوں کی طرف سے عرف کے خلاف کوئی صراحت موجود نہ ہو۔

۴- عرف کو اختیار کرنے کی صورت میں شریعت کی کوئی صریح قطعی نص یا شریعت کا کوئی قطعی اصول متاثر نہ ہوتا ہو۔

عرف اور شرعی دلائل میں تعارض

۱- عرف عام اگر کسی نص عام سے اس طور پر متعارض ہو کہ عرف عام پر عمل کرنے سے نص کا ترک لازم نہ آئے بلکہ نص کی تخصیص لازم آئے تو اس صورت میں عرف عام کی بنا پر نص عام کی تخصیص درست ہے۔

۲- اگر عرف عام نص سے متصادم ہو یہاں تک کہ عرف عام کا اعتبار کرنے میں نص کا ترک لازم آئے تو عرف عام شرعاً ناقابل قبول اور غیر معتبر ہوگا۔

۳- جن نصوص کا عرف پر مبنی ہونا ثابت اور متحقق ہو ان میں عرف کی تبدیلی سے حکم میں تبدیلی کی جاسکتی ہے، لیکن کسی نص کے بارے میں یہ طے کرنا کہ اس کی بنیاد عرف پر ہے، بڑا نازک اور انتہائی ذمہ داری کا کام ہے، یہ فیصلہ علوم اسلامیہ میں غیر معمولی مہارت رکھنے والے دقیق النظر، محتاط اور خدا ترس علماء اور فقہاء اجتماعی طور پر ہی کر سکتے ہیں۔

۴- اگر عرف عام ایسے مسئلہ سے متصادم ہو جس کا ثبوت قیاس سے ہے تو عرف عام کو ترجیح ہوگی اور اس کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جائے گا۔

۵- اگر عرف خاص کا دائرہ بہت محدود ہو تو اس کی بنیاد پر قیاس کا ترک کرنا درست نہیں۔

۶- اگر عرف خاص کا دائرہ بہت وسیع ہو تو اس کی بنا پر قیاس کا ترک کرنا درست ہے۔

۷- اگر عرف شریعت کے بنیادی مقاصد ومصالح سے متصادم ہو تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

عرف کی تبدیلی سے حکم میں تبدیلی

۱- ظاہر روایت کے جو مسائل صریح نصوص (کتاب وسنت) سے ثابت ہوں انہیں عرف کی بنیاد پر ترک نہیں کیا جائے گا، البتہ ظاہر روایت کے دوسرے مسائل کو عرف کی بنا پر ترک کیا جاسکتا ہے۔

۲- اگر ایک مکتب فقہ میں منقول اقوال عرف کے خلاف ہوں اور دوسرے مکتب فقہ میں ایسی رائے موجود ہو جو عرف وعادت کے مطابق ہو تو ایسی صورت میں عرف کے مطابق حکم کو (اعتبار عرف کی شرطوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے) اختیار کرنا ''عدول عن المذہب'' نہیں ہے، بلکہ عرف کو ہی اختیار کرنا ہے۔

۳- جو احکام فقہیہ نصوص کی بجائے محض عرف وعادت پر مبنی ہوں ان میں عرف کی تبدیلی کی صورت میں نئے عرف کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔

✧ ✧ ✧

غذائی مصنوعات میں حلال وحرام[1]

۱- غذائی اشیاء سے صحت اور زندگی کا تحفظ متعلق ہے اور یہ بات نہایت قابل افسوس ہے کہ بعض اوقات غذائی اشیاء کی تیاری اور فراہمی سے متعلق افراد اور کمپنیاں ان معیارات کو ملحوظ نہیں رکھتی ہیں جو حفظان صحت کے لئے ضروری ہیں، اسی طرح غذائی اشیاء اور دوسری استعمالی چیزوں میں ملاوٹ بھی پیدا کی جاتی ہے جو جھوٹ اور دھوکہ ہے، اس لئے اس طرح کی خدمت فراہم کرنے والے اشخاص وعہدے داروں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ حفظان صحت کے اصولوں کا پورا خیال رکھیں، اس مقصد کے لئے حکومت کی جانب سے مقرر کردہ قوانین کا پورا احترام کریں اور حکومت کو بھی چاہئے کہ وہ عوام کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے مؤثر قانون بنائے اور اس کو نافذ کرے۔

۲- پیداوار میں اضافہ کے لئے تدابیر اختیار کرنا شرعاً ممنوع نہیں ہے، بلکہ پسندیدہ ہے، لیکن افزائش کی لالچ میں ایسی کھاد اور دواؤں کا استعمال جو انسانی صحت کے لئے سخت مضرت رساں ہو، درست نہیں۔

۳- پھلوں کو قبل از وقت پکانے اور خوشنما بنانے، نیز غیر فطری طریقہ پر حجم بڑھانے کے لئے ایسے کیمکل کا استعمال جو انسانی صحت کے لئے حد درجہ نقصان دہ ہو شرعاً درست نہیں۔

۴- جانوروں کے دودھ کی مقدار میں اضافہ کرنے کے لئے کسی مصنوعی تدبیر کا اختیار کرنا فی نفسہ جائز ہے، لیکن اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ اپنانا جس سے جانور کو سخت تکلیف ہو یا حاصل ہونے والا دودھ انسانی صحت کے لئے مضر ہو درست نہیں۔

۵- بلاضرورت ماکول اللحم جانوروں کو بالقصد ناپاک غذا دینا جائز نہیں ہے، لیکن اگر ایسی کوئی غذا دی گئی تو ان جانوروں کے گوشت میں کوئی کراہت نہیں ہوگی، بشرطیکہ اس کے بدن سے نجاست کے اثرات ظاہر نہ ہوں۔

۶- اگر غذائی مصنوعات میں صحت کے لئے شدید مضر اشیاء کا استعمال کیا جائے تو یہ عمل ناجائز ہوگا۔

☆☆☆

---

[1] ۲۴واں فقہی سمینار (اوچیرا، کیرالا) بتاریخ ۹ تا ۱۱ / جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱ تا ۳ / مارچ ۲۰۱۵ء۔

حلال سرٹیفکٹ [۱]

۱- شریعت میں حلال وحرام سے متعلق واضح احکام موجود ہیں، ان پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور اس سے تساہل نہ صرف شدید گناہ ہے بلکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کی دوسری نیکیاں بھی ضائع ہوجاتی ہیں، اس لئے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں پوری احتیاط برتنی چاہئے اور جو مسلمان ادارے حلال سرٹیفکٹ جاری کرتے ہیں وہ پوری تحقیق اور تیقظ کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو انجام دیں۔

۲- لحمی غذائی مصنوعات کا استعمال کرنا جائز ہے، بشرطیکہ جانور کا حلال ہونا اور شرعی طریقہ پر ذبح کیا جانا متحقق ہوجائے۔

۳- جن مصنوعات میں حرام اجزاء کا استعمال بھی کیا جاتا ہے ان کے لئے حلال سرٹیفکٹ جاری کرنے کا اختیار صرف احکام شریعت کے واقف کار اور فنی مہارت رکھنے والے دیندار، معتبر افراد ہی کو ہوگا، کسی غیر مسلم یا غیر واقف کار کی تصدیق وخبر کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

۴- غذائی مصنوعات کے اجزاء کی تحقیق کے لئے مسلمانوں کو خود اپنی لیبارٹری کا انتظام کرنا چاہئے، تاہم اپنی لیبارٹری نہ ہونے کی صورت میں غیر مسلموں کے زیر نگرانی کام کرنے والی معتبر لیبارٹری کی رپورٹ پر بھی اعتبار کر کے سرٹیفکٹ جاری کرنے کی گنجائش ہے۔ تاہم حتی المقدور اس بات کی کوشش ہونی چاہئے کہ تحقیق وتجزیہ کا یہ عمل کسی معتبر مسلمان شخص کی نگرانی میں ہو۔

۵- حلال سرٹیفکٹ جاری کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے، یہ کام وہی ادارہ انجام دے سکتا ہے جس میں خدا ترس، احکام شریعت پر گہری نظر رکھنے والے علماء واصحاب افتاء اور معتبر مسلمان ماہرین پر مشتمل ہوں اور اس ادارہ کے نمائندے ذبح وغیرہ کے مراحل میں موجود رہ کر پوری تحقیق کے بعد سرٹیفکٹ جاری کریں اور مسلسل نگرانی رکھیں۔

☆☆☆

[۱] ۲۴واں فقہی سمینار (اوچیرا، کیرالا) بتاریخ ۹ تا ۱۱ / جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱ تا ۳ / مارچ ۲۰۱۵ء۔

وحدت امت-اصول وآداب[1]

۱- وحدت امت وقت کی ایک اہم ترین ضرورت اور دین حق کا اہم ترین مطلوب ہے اس وحدت کو نقصان پہنچانے والے اختلافات اس وقت کا بڑا مفسدہ ہے جس سے امت مسلمہ بدحال ہے، اختلاف کی وہ تمام صورتیں جو فطری اور محمود ہیں وہ ہرگز نقصان رساں نہیں، لیکن وہ بھی اگر شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ نہ ہوں تو وہ بھی امت کے لئے زہر ہیں۔

جو اختلافات مذموم ہیں وہ کتنے ہی اچھے جذبہ سے ہوں وہ بہر حال غیر شرعی ہیں۔

فقہی مسائل کے اختلافات میں جہاں اختلاف صرف افضل وغیر افضل اور راجح و مرجوح کا ہے ان میں اپنی رائے کو سراسر حق اور دوسری رائے کو سراسر باطل قرار دینا ہرگز درست نہیں ہے۔

جن مسائل میں اختلافات کی نوعیت حلال وحرام وجائز وناجائز کی ہے وہ بھی چونکہ مجتہد فیہ مسائل ہیں، اس لئے ان میں بھی دوسرے کے مسلک کی تغلیط اور اس کو مکمل باطل قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

اس لئے اس طرح کے تمام مسائل کو عوامی نہ بنایا جائے، انفرادی طور پر اپنا مسلک اور اس کے دلائل بیان کرنے میں مضائقہ نہیں، بلکہ بعض مواقع وضرورت پر بہتر ہیں، لیکن دوسرے مسلک والوں میں ایسے مسائل پر گفتگو ہو تو انصاف ودیانت کے ساتھ ہر موقف کے دلائل بیان کئے جائیں۔ شخصیات کا احترام اور انداز کلام میں شرافت ومتانت ملحوظ رکھی جائے۔

۲- جن مسائل میں اختلاف کی نوعیت عقیدہ کی ہے ان میں اپنے عقیدہ کا اثبات، دلائل کی توضیح درست ہے، لیکن دوسرے کو اشتعال دلانے والی طرز گفتگو سے اجتناب ضروری ہے، تبادلہ خیال میں اپنے مسلک کے مستدلات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ اور تفصیلاً بیان کیا جائے۔ مگر دوسرے کی توہین تنقیص اور تشنیع سے پرہیز کیا جائے، دوسرے کی طرف سے اگر نامناسب طرز کلام پایا جائے تو بھی اپنی طرف سے سنجیدگی وحدود کی رعایت برقرار رکھی جائے۔

۳- جس فکر یا عقیدہ کو کوئی شخص گمراہی سمجھتا ہو، لیکن ان کی بنیاد پر تکفیر کا قائل نہ ہو، ایسے فکر یا عقیدہ پر تنقید، اور جس فکر یا عقیدہ کو موجب کفر سمجھتا ہو اور اس کی بنیاد پر اس کے حاملین کو کافر قرار دیتا ہو اس پر تنقید، دونوں میں شرعی لحاظ سے فرق ہے۔

ایک موجب کفر ہے اور دوسرا موجب فسق وضلالت، لہذا دونوں پر تنقید کے شرعی آداب وحدود میں بھی فرق ہوگا۔

موجب کفر فکر وعقیدہ پر تنقید کے جو آداب ہیں وہ درج ذیل ہیں:

الف- حتی الامکان ان کو کافر کہنے سے گریز کیا جائے اور احتیاط سے کام لیا جائے۔

---

[1] ۲۵واں فقہی سمینار (بدر پور، آسام) بتاریخ ۲۵ تا ۲۷/ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ، مطابق ۵ تا ۷/فروری ۲۰۱۶ء۔

ب- دینی سماجی اور سیاسی مصالح وضروریات کی بنا پر ان کے ساتھ تعاون جائز ہوگا۔

ج- مقصد صرف احقاق حق اور ابطال باطل ہو نفسانی اغراض اُس میں شامل نہ ہوں۔

د- فریق مخالف کی حمیت وتعصب کو بھڑکانے کی کوشش نہ کی جائے۔

غیر موجب کفر فکر وعقیدہ کے حدود وآداب مندرجہ ذیل ہیں:

الف- اعتدال ورواداری کا اظہار ہو۔

ب- لہجہ میں خیر خواہی، نرمی ہو اور انداز ناصحانہ ہو، گفتگو تلخ وترش نہ ہو۔

ج- کسی کی نیت پر حملہ نہ ہو۔

۴- اس وقت شیعہ سنی اختلافات تنازعات بھیانک شکل اختیار کر چکے ہیں اور ان کی بنیاد پر امت مسلمہ بدترین جنگ اور خونریزی میں مبتلا ہے اور دشمنان اسلام نے منصوبہ بندی کر کے ہمارے ان اختلافات کو بھڑکا کر عالم اسلام میں تباہی مچا رکھی ہے۔ ایک فرقہ کے لوگ بے تحاشا دوسرے فرقے کے لوگوں کو قتل کر رہے ہیں، اور اس کو کار ثواب سمجھنے لگے ہیں۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اور اس کو فساد فی الارض سے تعبیر کرتا ہے۔

اس لئے اس وقت عالم اسلام کے مختلف ملکوں میں شیعہ سنی آویزش جو شکل اختیار کر چکی ہے اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اور اس خونریزی کو روکنے کے لئے مصالحتی کوششیں اور مذاکرات ہی واحد حل ہیں۔

۵- دنیا کے جس کسی حصہ میں سنی اور شیعہ مشترک آبادیاں ہیں وہ پُرامن بقائے باہم کے ساتھ مشترکہ اقدار کی بنیاد پر زندگی گذاریں، ایک دوسرے کی مقدس مذہبی شخصیت پر سب وشتم سے گریز کریں۔

باہمی منافرت اور جنگ وجدال کو روکنے کے لئے دونوں فرقوں کے علماء ومذہبی پیشواؤں کا اور اہل صلاح کا کلیدی کردار ہے، ممکنہ اسباب کے ذریعہ مصالحتی کوششیں اور مذاکرات بروئے کار لانے کی ان حضرات کی شرعی واخلاقی ذمہ داری ہے۔

☆☆☆

عباداتی مسائل

انقلاب ماہیت اور طہارت ونجاست وحلت وحرمت پر اس کا اثر [1]

۱- شریعت میں جن اشیاء کو حرام یا ناپاک قرار دیا گیا ہے ان کی حرمت ونجاست اس شئ کی ذات سے متعلق ہے، اگر کسی انسانی فعل، کیمیائی یا غیر کیمیائی تدبیر، یا کسی انسانی فعل کے بغیر طبی اور ماحولیاتی اثر کے تحت اس شئ کی اصل حقیقت اور ماہیت تبدیل ہوگئی تو اس شئ کا سابق حکم باقی نہیں رہے گا، اس میں نجس العین اور غیر نجس العین کا کوئی فرق نہیں۔

۲- تبدیلی ماہیت سے مراد یہ ہے کہ اس شئ کے وہ خصوصی اوصاف بدل جائیں جن سے اس شئ کی شناخت متعلق ہے، دوسرے غیر مؤثر اوصاف جو اس شئ کی حقیقت میں داخل نہیں، کا اس شئ میں باقی رہ جانا تبدیلی ماہیت میں مانع نہیں۔

۳- اگر حلال و پاک اشیاء میں حرام وناپاک شئ کا صرف اختلاط ہو، اصل حقیقت تبدیل نہ ہو، تو وہ حرام اور ناپاک ہی باقی رہے گی۔

۴- یہ سمینار محسوس کرتا ہے کہ الکحل اور جیلاٹین وغیرہ میں قلب ماہیت کے محقق ہونے یا نہ ہونے کے سلسلہ میں کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے پہلے ماہرین کیمیاء سے مناسب معلومات حاصل کرنا ضروری ہے، اس لئے یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں سے خواہش کرتا ہے کہ اس موضوع پر فیصلہ کو کسی قریبی آئندہ سمینار تک ملتوی رکھا جائے۔ اور پہلے اس سلسلہ میں ماہرین سے ضروری معلومات حاصل کی جائیں اور ان سے علماء وارباب افتاء کو آگاہ کیا جائے تا کہ ان کو رائے قائم کرنے میں سہولت ہو۔

۵- یہ سمینار مسلمان میڈیکل سائنس دانوں اور خاص کر عالم اسلام کے ارباب حل وعقد سے خواہش کرتا ہے کہ وہ طبی اغراض کے لئے دواؤں میں استعمال ہونے والے حرام وناپاک اجزاء کا متبادل نباتات، جمادات اور حلال مذبوح حیوانات سے دریافت کریں، تا کہ حرام ومشتبہ دواؤں سے اجتناب ممکن ہو سکے، کہ بحیثیت مسلمان یہ ان کا نہایت اہم مذہبی اور دینی فریضہ ہے۔

✧ ✧ ✧

[1] تیرہواں فقہی سمینار (کٹولی، لکھنؤ) بتاریخ ۱۸-۲۱/محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶/اپریل ۲۰۰۱ء۔

مسجد کی شرعی حیثیت [1]

مساجد کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر بالکل واضح ہے اور اس پر جمہور امت کا اتفاق ہے کہ جس مقام پر ایک بار مسجد بنادی گئی وہ قیامت تک کے لئے مسجد ہے، اب نہ اس کی خرید وفروخت ہوسکتی ہے نہ وہ خطہ ارض کسی اور کو ہبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی شخص یا حکومت اس کی حیثیت کو تبدیل کر سکتی ہے، مسجد دراصل وہ حصہ زمین ہے جسے ایک دفعہ مسجد کے لئے وقف کر دیا گیا ہو، مسجد صرف درودیوار اور مسجد میں استعمال ہونے والے تعمیری سامان کا نام نہیں، اس لئے اگر مسجد کی عمارت منہدم ہوجائے یا اسے ظلماً منہدم کر دیا جائے یا کسی وجہ سے طویل عرصہ تک وہاں نماز نہ پڑھی جائے تب بھی وہ مسجد باقی رہتی ہے، اور مسلمانوں پر اس کو دوبارہ آباد کرنا شرعاً واجب ہے۔

مسجد کا مقصد کائنات کے حقیقی خالق ومالک کی عبادت اور غیر اللہ کی معبودیت کی نفی ہے، اس لئے مسجد کی زمین پر بت خانہ بنانے کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی، کیونکہ یہ مسجد کے مقصد کے عین برعکس بات ہوگی، اور یہ نہ صرف مذہب وعقیدہ بلکہ تقاضائے عقل کے بھی خلاف ہوگا کہ کوئی چیز اپنے برعکس مقصد کے لئے استعمال کی جائے۔

اسلام دنیا میں عقیدہ توحید کا نمائندہ مذہب ہے اور وہ پوری انسانیت کو اس سچائی کی طرف دعوت دیتا ہے کہ اس کائنات کا خالق اور رب ایک ہی قادر مطلق ذات ہے جس کا کوئی شریک نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں عدل اور رواداری کی تعلیم بھی دیتا ہے، وہ مذہب کے معاملہ میں کسی جبر واکراہ کا قائل نہیں، اس نے اس بات سے منع کیا ہے کہ کسی فرد یا قوم کی انفرادی یا قومی اور مذہبی زمین پر قبضہ کر کے اسے زبردستی مسجد بنالیا جائے، اس لئے نہ صرف تاریخ بلکہ عقیدہ اور اسلامی تاریخ کی رو سے بھی یہ بات صریحاً غلط ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں کسی زمین یا کسی قوم کی عبادت گاہ پر قبضہ کر کے اسے مسجد بنایا ہو۔

لہٰذا اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سمینار متفقہ طور پر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ بابری مسجد یا کسی اور مسجد کے بارے میں ایسی کوئی صلح شرعی اعتبار سے قطعاً جائز نہیں کہ جس کا مقصد مسجد کی حیثیت کو تبدیل کرنا یا نعوذ باللہ اسے بت خانہ بنانا ہو، اور یہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اور علماء امت کا متفقہ فیصلہ ہے۔

✧ ✧ ✧

[1] تیرہواں فقہی سمینار (کٹولی لکھنؤ) بتاریخ ۱۸-۲۱/محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶/اپریل ۲۰۰۱ء۔

حج وعمرہ کے مسائل[1]

۱- حج اسلام کا ایک اہم رکن ہے، جو عمر بھر میں ایک ہی دفعہ فرض ہے، عام طور پر حجاج کو اس کے لئے طویل سفر کی مشقت بھی اٹھانی پڑتی ہے اور کثیر اخراجات بھی برداشت کرنے ہوتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا اجر وثواب بھی بے حد رکھا ہے اور آپ ﷺ نے اس عبادت کو ایک طرح کا جہاد قرار دیا ہے، پس حجاج کو چاہئے کہ وہ اس راہ کی مشقتوں کو ایک سعادت سمجھ کر برداشت کریں، افعال حج میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کے پہلو کو ملحوظ رکھیں اور جن مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے اور ایک میں توسع اور دوسرے میں احتیاط کا پہلو ہے، تو ایسی صورت حتی الوسع اختیار کرنے کی کوشش کریں کہ اس کا عمل دونوں ہی آراء کے مطابق درست قرار پائے، اور اس عظیم عبادت کی انجام دہی میں تن آسانی اور سہل انگاری سے بچا جائے۔

۲- حدود میقات سے باہر رہنے والے ہوں یا مکہ اور حل میں رہنے والے، اگر حدود میقات کے باہر سے مکہ کی نیت کر کے میقات سے آگے بڑھیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ احرام باندھ کر ہی میقات سے آگے بڑھیں، خواہ وہ حج اور عمرہ کی نیت سے جائیں یا کسی اور مقصد سے۔

موجودہ حالات میں جبکہ تجار، دفاتر میں کام کرنے والے، ٹیکسی چلانے والے اور دیگر پیشہ وارانہ کام کرنے والے کبھی ہر روز، کبھی ہر دوسرے تیسرے دن، اور بعض لوگوں کو تو ایک دن میں ایک سے زیادہ دفعہ حرم میں داخل ہونا پڑتا ہے، ایسی حالت میں اس طرح کے لوگوں کو ہر بار احرام اور اداء عمرہ کی پابندی بے حد مشقت طلب اور دشوار ہے، اس لئے ان حضرات کے لئے بغیر احرام باندھے حدود حرم میں داخلہ کی گنجائش ہوگی۔

۳- جو لوگ مکہ کے اصلاً رہنے والے ہیں یا وہاں مقیم ہیں، اصلاً ان کے لئے تمتع نہیں ہے، اس لئے انہیں اشہر حج میں عمرہ نہیں کرنا ہے، وہ شخص جس پر اس سال حج فرض ہے اور وہ اس سال حج کا ارادہ رکھتا ہے اسے اشہر حج میں میقات کے باہر جانے سے پرہیز کرنا چاہئے، اور اگر وہ تجارتی، دفتری اور اپنی پیشہ وارانہ مجبوریوں کے باعث باہر جانے پر مجبور ہے تو وہ تجویز (۲) پر عمل کرتے ہوئے میقات سے اندر داخل ہوتے ہوئے احرام نہ باندھے اور عمرہ نہیں کرے۔

مکہ میں مقیم سے مراد وہ لوگ ہیں جو اشہر حج کے شروع ہونے سے قبل صحیح طریقہ سے مکہ میں آ کر مقیم ہو گئے یا کم از کم ایک سال سے وہاں اقامت پذیر ہوں۔

۴- تمتع کرنے والے آفاقی حجاج حج کا احرام باندھنے سے پہلے مزید عمرہ کر سکتے ہیں۔

۵- رمی جمرات کے سلسلہ میں عام طور پر آج کے زمانہ میں حجاج میں جو بات رواج پا رہی ہے کہ وہ معمولی اعذار بلکہ بغیر عذر بھی خود رمی کو نہیں جاتے اور دوسروں کو نائب بنا دیتے ہیں، جملہ علماء اس پر متفق ہیں کہ اس صورت میں حج کا ایک واجب ترک ہو جاتا ہے، یہ نیابت شرعاً معتبر نہیں ہے اور ایسا کرنے والے پر دم واجب ہے، ہاں وہ لوگ جو جمرات تک چل کر جانے کی طاقت نہیں رکھتے یا بہت مریض اور کمزور ہیں ایسے لوگوں کے لئے نائب بنانا جائز ہے۔

۶- محض ازدحام عذر نہیں ہے، اس کا بہتر حل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس ازدحام میں جا کر رمی کرنے کا متحمل نہیں تو وہ وقت مسنون کے بعد وقت جواز بلکہ زیادہ دشواری میں وقت کراہت میں بھی رمی کر سکتا ہے، اس کے لئے یہ مکروہ بھی نہیں ہوگا۔

---

[1] دسواں فقہی سمینار (ممبئی) بتاریخ ۲۱-۲۴ / جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۴-۲۷ / اکتوبر ۱۹۹۷ء۔

۷- حنفیہ کے قول راجح کے مطابق ۱۰/ ذی الحجہ کے مناسک میں رمی، ذبح اور حلق کو ترتیب کے ساتھ انجام دینا واجب ہے، اور صاحبین اور اکثر فقہاء کے یہاں مسنون ہے جس کی خلاف ورزی سے دم واجب نہیں، حجاج کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو ترتیب کی رعایت کو ملحوظ رکھیں تاہم ازدحام اور موسم کی شدت، اور مذبح کی دوری وغیرہ کی وجہ سے صاحبین اور دیگر ائمہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے، لہذا اگر یہ مناسک ترتیب کے خلاف ہوں تو بھی دم واجب نہیں ہوگا۔

۸- دنیا بھر سے لاکھوں حجاج موسم حج میں مکہ پہنچتے ہیں اور مناسک حج ادا کرتے ہیں۔

الف: حج کے جملہ انتظامات کی ذمہ داری حکومت سعودیہ پر ہے، حج ایک اجتماعی عبادت ہے، اس کو نظم وضبط کے ساتھ ادا کیا جانا ضروری ہے، لاکھوں انسانوں کے قیام وسفر، ان کی صحت، جان ومال کا تحفظ بغیر نظم وضبط کے ممکن نہیں ہے، ایسے حالات میں حکومت سعودیہ بہت سی انتظامی پابندیاں عائد کرتی ہے جس سے حاجیوں کی تعداد اتنی رکھی جاسکے جس کا انتظام بہتر طور پر ہوسکے، حکومت سعودیہ کے انتظامی احکامات کی پابندی تمام ہی لوگوں پر ضروری ہے، یہ امر بالمعروف ہے جس کی اطاعت لازم ہے، لہذا حکومت سعودیہ کے احکام وضوابط کے مطابق سعودیہ میں مقیم مسلمانوں کو اگر ہر سال حج کرنے سے منع کیا جائے تو اس کی پابندی شرعاً ضروری ہے۔

ب: اگر کوئی شخص ان پابندیوں کی مخالفت کرتے ہوئے بھی احرام حج باندھ کر میقات سے آگے بڑھ جائے اور پھر پکڑا جائے اور اسے انتظامیہ واپس کردے تو اس کا حکم وہی ہوگا جو شرعاً محصر عن الحج کا ہے یعنی اسے حرم میں ایک دم دینا واجب ہوگا، اور جس تاریخ اور جس وقت پر حرم میں اس کی طرف سے دم احصار ادا کیا جائے گا اس وقت وہ احرام کی پابندیوں سے باہر آسکے گا۔

۹- اگر اصطلاح شرع کے مطابق واقعی حج بدل ہو تو اس صورت میں عام اصول کے مطابق حج إفراد ادا کیا جانا چاہئے، لیکن حج بدل کرنے والے کو چاہئے کہ حج بدل کرانے والے کو مسئلہ سمجھا کر اس سے حج تمتع یا مطلق حج کی اجازت حاصل کرلے، اگر کسی وجہ سے اس نے اس کے لئے اجازت نہیں لی تو چونکہ عام طور سے حج تمتع کیا جاتا ہے، خود حج کرانے والا اگر حج کرتا تو سہولت کی بنیاد پر حج تمتع کرتا، لہذا عرف وعادت کے پیش نظر مامور کے لئے حج تمتع کی اجازت ہوگی، اس صورت میں میقات سے عمرہ کا احرام بھی آمر کی طرف سے کرنا ہوگا اور اس صورت میں دم شکر بھی آمر کے خرچ سے ادا کیا جائے گا۔

۱۰- اگر طواف زیارت سے قبل کسی عورت کو حیض یا نفاس آجائے اور اس کے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کی گنجائش نہ ہو کہ وہ حیض یا نفاس سے پاک ہوکر طواف زیارت کرسکے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر طرح اس کی کوشش کرے کہ اس کے سفر کی تاریخ آگے بڑھ سکے تاکہ وہ پاک ہوکر طواف زیارت ادا کرنے کے بعد اپنے گھر واپس جاسکے، لیکن اگر ایسی ساری ہی کوششیں ناکام ہوجائیں اور پاک ہونے سے پہلے اس کا سفر ناگزیر ہوجائے تو ایسی حالت میں وہ طواف زیارت ادا کرسکتی ہے، یہ طواف زیارت شرعاً معتبر ہوگا، اور وہ پورے طور پر حلال ہوجائیگی، لیکن اس پر ایک بدنہ (بڑے جانور) کی قربانی بطور دم جنایت حدود حرم میں لازم ہوگی۔

۱۱- سفر حج میں کسی خاتون کے شوہر کا انتقال ہوگیا اور اس نے ابھی احرام نہیں باندھا ہے اور اس کے لئے وطن واپسی ممکن ہے تو وہ اپنے وطن واپس جاکر عدت گزارے، اور اگر احرام باندھ چکی ہے یا واپسی کا سفر دشوار ہے تو وہ ایام عدت میں حج وعمرہ ادا کرلے۔

۱۲- حج کا سفر کرنے والا ایام حج سے اتنا پہلے مکہ مکرمہ پہنچ رہا ہے کہ مکہ مکرمہ میں پندرہ یوم قیام سے پہلے ہی حج شروع ہوجاتا ہے اور منیٰ چلا جاتا ہے تو وہ مسافر ہوگا، اسے چار رکعت والی نمازوں میں قصر کرنا ہوگا۔

۱۳- بلاد عرب میں عموماً وتر کی تین رکعتیں دو سلام سے ادا کی جاتی ہیں، احناف کے لئے بھی ایسے امام کی اقتداء میں نماز وتر ادا کرنے کی گنجائش ہے، اگر امام وتر کی تین رکعتیں دو سلام سے ادا کرے تو حنفی مقتدی دو رکعت کے بعد سلام نہ پھیرے اور امام کے ساتھ تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہوجائے۔

✧ ✧ ✧

اوقاف سے متعلق مسائل [1]

۱- اسلام میں نیکی کے کاموں اور خیراتی مقاصد کے لئے زمین، جائداد اور مال وقف کرنا بہت بڑا کار ثواب اور صدقہ جاریہ ہے، اس لئے مسلمان جس ملک اور جس علاقہ میں بھی آباد ہیں نیک کاموں کے لئے زمین، جائداد اور مال وقف کرتے ہیں، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ بہت پرانی ہے، سیکڑوں سال سے ہندوستان کے ہر علاقہ میں آباد ہیں، اس لئے ہندوستان کے ہر صوبہ اور علاقہ میں مختلف دینی اور رفاہی وخیراتی مقاصد کے لئے مسلم اوقاف موجود ہیں، ان اوقاف کی حفاظت، انہیں ترقی دینا اور ان کی آمدنی وقف کرنے والوں کے مقاصد کے مطابق خرچ کرنا، نیز اوقاف کی املاک سے غاصبانہ قبضہ ختم کرنا ہندوستانی مسلمانوں اور حکومت ہند کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

۲- اوقاف کے بارے میں اسلام کا اصل نقطہ نظر یہ ہے کہ اوقاف دائمی ہوتے ہیں، اس لئے عام حالات میں ان کو فروخت کرنا یا منتقل کرنا جائز نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقف کے بارے میں ارشاد ہے: ''لاتباع ولاتوهب ولاتورث'' (نہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ ہبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہوسکتی ہے) لہذا اوقاف کی جائدادوں کو حسب سابق باقی رکھتے ہوئے انہیں نفع آور اور مفید بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہئے، اور اس سلسلہ میں ایسے قانون بننے چاہئیں جن سے اوقاف کی جائداد کا پورا تحفظ ہو اور وقف کرنے والوں کے مقاصد کی رعایت کے ساتھ اوقاف کی افادیت اور نافعیت میں اضافہ ہو۔

۳- دوسرے اوقاف کے مقابلہ میں مساجد کو زیادہ تقدس واحترام حاصل ہے، مساجد کی فروخت اور منتقلی کسی حال میں درست نہیں، حتی کہ اگر مسجد ویران ہوجائے اور وہاں نماز ادا کرنے کا سلسلہ موقوف ہوجائے تو بھی وہ زمین جہاں مسجد کی عمارت تھی مسجد ہی رہتی ہے، اور اسے مسجد کا تقدس واحترام حاصل ہوتا ہے، وہاں مسجد بنانے اور آباد کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا} [سورہ جن/۱۸]۔ {إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ} [سورہ توبہ:۱۸]۔

۴- مساجد میں نماز کی ادائیگی سے روکنا بدترین ظلم اور گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا [سورۃ بقرہ/ ۱۱۴]۔ کسی مسجد میں مسلمانوں کو خواہ کتنے طویل زمانہ سے نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا ہو یا اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا گیا ہو یا عمارت منہدم کردی گئی ہو، اسلامی شریعت کی نظر میں وہ مسجد ہی رہتی ہے۔

۵- آثار قدیمہ کے تحت جو مساجد ہیں ان میں نماز کی ادائیگی کو روکنا شرعاً ظلم ہے، ارشاد باری ہے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا [سورۃ بقرہ/ ۱۱۴]۔

۶- تقسیم ہند کے موقع پر ہندوستان کے بعض علاقوں (خصوصاً پنجاب، ہریانہ، دہلی اور مغربی یوپی کے بعض علاقے) سے بڑے پیمانے پر مسلمان پاکستان منتقل ہوگئے، ان علاقوں میں مسلمانوں کے مختلف النوع بڑے بڑے اوقاف (مساجد، مدارس، خانقاہیں، قبرستان، سرائے وغیرہ) ہیں، ان علاقوں میں اگر کچھ بھی مسلمان آباد ہیں تو ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ان اوقاف کے تحفظ اور انہیں نفع آور بنانے کی جدوجہد کریں، جو آبادیاں مسلمانوں سے کلیۃً خالی ہوچکی ہیں وہاں کے اوقاف کا تحفظ وہاں کے وقف بورڈ کی ذمہ داری ہے، اور قریبی مسلم آبادی کو ان کے تحفظ کی جدوجہد کرنی چاہئے۔

---

[1] دسواں فقہی سمینار (ممبئی) بتاریخ ۲۱-۲۴ / جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۴-۲۷ / اکتوبر ۱۹۹۷ء۔

۷- مساجد کے علاوہ دوسرے وہ اوقاف جو ان مقامات میں واقع ہیں جہاں پر دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہوگیا ہے اور ان اوقاف پر قبضہ غاصبانہ کا پورا خطرہ ہے، ایسے اوقاف کو فروخت کر کے دوسرے مقامات پر اسی نوع کے اوقاف قائم کرنا درج ذیل شرطوں کے ساتھ درست ہے:

الف: اس بات کی تحقیق کر لی گئی ہو کہ مسلمانوں کی آبادی ان مقامات سے کلیۃً ختم ہو چکی ہے، اور مستقبل قریب میں وہاں مسلمانوں کے آباد ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

ب: وقف جائداد کی فروختگی مناسب قیمت پر مارکیٹ ویلو کا لحاظ کرتے ہوئے کی جائے، اتنی کم قیمت پر اسے فروخت نہ کی جائے جتنی کم قیمت قیمتوں کے ماہرین نہیں لگا سکتے۔

ج: وقف کو فروخت کرنے والے متولی یا وقف افسر اس کی فروختگی اپنے کسی قریبی رشتہ دار یا کسی ایسے شخص کے ہاتھ نہ کرے جس سے اس کا مفاد وابستہ ہو، اسی طرح کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروختگی نہ کرے جس کا قرض یا مالی دین فروخت کرنے والے کے ذمہ لازم ہے۔

د: وقف جائداد کی فروختگی روپیہ پیسہ کے بجائے جائداد سے کی جائے، اور اگر کسی قانونی یا عملی دشواری کی وجہ سے نقد روپیوں سے فروختگی کی جائے تو جلد سے جلد اس کے ذریعہ جائداد خرید کر متبادل وقف قائم کر دیا جائے۔

ھ: وقف کے تبادلہ اور فروختگی کی اجازت شرائط استبدال کی تحقیق کر کے شرعی قاضی یا اوقاف کی ایسی شرعی کمیٹی دے جس میں مسائل اوقاف سے واقف متقی و خدا ترس علماء اور مسلمان متدین ماہرین قانون ضرور شامل ہوں، موقوفہ جائداد کی فروختگی اور تبادلہ کے لئے وقف بورڈ یا وقف آفیسر کی اجازت شرعاً کافی نہیں ہے، اس سلسلہ میں وقف ٹریبونل (Tribunal) کی اجازت شرعاً اس وقت معتبر ہوگی جب اس نے کم سے کم تین مستند مفتیان کرام کی رائے لینے اور مشورہ طلب کرنے کے بعد ان کے مشورہ کے مطابق فیصلہ کیا ہو۔

نوٹ:...... یہ وضاحت ضروری ہے کہ موقوفہ دوکان، مکان، زمین، جائداد کو فروخت کر کے جو دوکان، مکان، زمین، جائداد خریدی جائے گی وہ بھی انہیں مقاصد کے لئے وقف ہوگی جن کے لئے پہلا وقف پراپرٹی وقف تھی۔

۸- الف:...... ویران غیر آباد اوقاف کی آمدنی مقاصد واقف کی رعایت کرتے ہوئے وقف نامہ میں مذکور مدات پر صرف کی جائے، اور اگر یہ مدات موجود نہ ہوں تو ان سے قریب ترین مدات پر صرف کیا جائے، منشاء واقف کا لحاظ کئے بغیر دیگر مصارف پر صرف کرنا درست نہ ہوگا۔

ب:...... اگر ویران غیر آباد اوقاف فروخت کرنے پڑیں تو ان کا متبادل وقف قائم کرنا ضروری ہوگا۔

۹- مسجد پر وقف زائد اراضی جن کی نہ مسجد کو فی الحال ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت پیش آنے کی امید ہے، ان اراضی پر دینی تعلیم کا مدرسہ یا مکتب قائم کرنا درج ذیل صورتوں میں درست ہوگا:

الف:...... مسجد آباد نہ ہو اور مدرسہ یا مکتب قائم ہونے میں مسجد کے آباد ہونے کی امید ہو۔

ب:...... مسجد پر موقوف زائد اراضی پر قبضہ غاصبانہ کا شدید خطرہ ہے اور دینی مدرسہ یا مکتب قائم ہونے کی صورت میں قبضہ کا خطرہ ٹل جائے گا۔

ج:...... جس آبادی یا محلہ میں مسجد واقع ہے وہاں مسلمان بچوں کے لئے کوئی دینی مدرسہ یا مکتب قائم کرنے کے لئے کوئی مستقل بندوبست بھی نہ ہو تو مسجد پر وقف زائد اراضی میں دینی مدرسہ یا مکتب قائم کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لئے مسجد کے متولی یا منتظمہ کمیٹی سے اجازت لے لی جائے، بہتر یہ ہے کہ خود مسجد کی کمیٹی ہی اس مکتب یا مدرسہ کا بندوبست کرے۔

۱۰- مساجد پر وقف اراضی جن کا مقصد مساجد کے لئے آمدنی فراہم کرنا ہے، ان کو مناسب کرایہ پر مسلمانوں کی دینی، عصری یا ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے قائم کرنے کے لئے دیا جا سکتا ہے، لیکن معاملات اس طرح طے کئے جائیں کہ مساجد کی مالکانہ حیثیت مجروح نہ ہو۔

۱۱- جن مساجد کے پاس ان کے مصارف سے کہیں زیادہ آمدنی ہے اور یہ آمدنی سال بہ سال جمع ہو کر بڑا سرمایہ بنتی جا رہی ہے، مستقبل قریب میں بھی مساجد کو اس زائد سرمایہ کی ضرورت پیش آنے کی امید نہیں ہے، مساجد کی ایسی زائد آمدنی کو دوسرے مقامات پر (جہاں ضرورت ہو)

مساجد تعمیر کرنے یا محتاج مساجد کی امداد میں صرف کیا جائے، کیونکہ ہندوستان میں اب بھی ایسی بہت سی آبادیاں ہیں جہاں کوئی مسجد اور دینی مکتب نہیں ہے، مسلمان اذان کی آواز کو ترستے ہیں، مالدار مساجد کی فاضل آمدنی سے ایسی آبادیوں میں مساجد قائم کئے جائیں۔

۱۲- مساجد کے مصارف کے لئے موقوفہ اراضی اور جائدادوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک اہم مصرف مساجد کے ائمہ، مؤذنین اور دوسرے خدام بھی ہیں، شرکاء سمینار کا احساس ہے کہ بسا اوقات مساجد کی آمدنی میں گنجائش ہونے کے باوجود ائمہ ومؤذنین وغیرہ کی تنخواہیں بہت کم رکھی جاتی ہیں جو ان کی ضروریات کے لئے بالکل ناکافی ہوتی ہیں، اس لئے سمینار سفارش کرتا ہے کہ متولیان اور مساجد کے ذمہ داران ائمہ ومؤذنین وخدام مساجد کو بہتر سے بہتر اکرامیہ پیش کریں، اور ان کی تنخواہوں کے مسئلہ کو مساجد کے ضروری مصارف میں شمار کریں۔

۱۳- دیگر اوقاف کی زائد آمدنی جن کی اوقاف کو نہ فی الحال ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت پیش آنے کی امید ہے اور اس کی حفاظت متولیان کے لئے بہت مشکل ہے، حکومت یا بددیانت افراد کی طرف سے دست اندازی یا قبضۂ غاصبانہ کا خطرہ ہے، اوقاف کی ایسی زائد آمدنی کو اسی نوع کی مدات میں صرف کیا جائے، مثلاً مدارس کی زائد آمدنی کو مدارس میں، مسافر خانوں کی زائد آمدنی کو مسافر خانوں میں صرف کیا جائے۔

۱۴- اگر کسی وقف کی آمدنی معقول ہو تو محض زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے اس کی فروختگی درست نہیں کہ اصل وقف کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، البتہ اگر موقوفہ جائداد کی آمدنی اتنی قلیل ہو کہ وقف پراپرٹی کے ضروری اخراجات اس سے پورے نہ ہوتے ہوں بلکہ اس کے لئے قرض لینا پڑتا ہو اور اس موقوفہ جائداد کی آمدنی بڑھانے کی کوئی شکل نہ ہو، ایسی صورت میں تجویز (۷) میں ذکر کردہ شرائط (ب، ج، د، ہ) کی پابندی کے ساتھ موقوفہ جائداد کو فروخت کرکے زیادہ منفعت بخش جائداد خریدنا درست ہوگا، اگر واقف زندہ ہو تو اس سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔

۱۵- جن اوقاف کی عمارتیں مخدوش حالت میں ہیں اور وقف کے پاس تعمیر کے لئے سرمایہ موجود نہیں ہے، اور نہ ہی مستقبل قریب میں حاصل ہونے کی امید ہے، ایسے اوقاف کے متولیان کسی بلڈر سے ایسا معاملہ کرسکتے ہیں کہ بلڈر اس شرط کے ساتھ عمارت تعمیر کرے کہ ایک خاص مدت تک وہ پوری عمارت یا اس کا ایک حصہ اس کے پاس بطور کرایہ رہے گا، اور اس طرح اسے سرمایہ کاری کا فائدہ حاصل ہوجائے گا، اس طرح معاملہ کرنا درست نہیں کہ چند منزلہ عمارت کی ایک منزل یا دو منزل کی ملکیت بلڈر کی طرف ہوجائے۔

۱۶- قبرستان کی حفاظت کے لئے اس کے اردگرد چہاردیواری تعمیر کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، ایسا کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اطراف میں دوکانوں کی تعمیر کرادی جائے، لیکن دوکانوں کا راستہ قبرستان کے باہر سے ہونا چاہئے، اس کے لئے پیشگی کرایہ کے طور پر رقم لے کر دوکانوں کی تعمیر کرائی جائے، دوکانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی قبرستان کی حفاظت وضروریات میں صرف کی جائے، لیکن اس کا لحاظ رکھا جائے کہ دوکانیں تعمیر کرنے میں ایسی قبریں متاثر نہ ہوں جن کے نشانات باقی ہیں۔

۱۷- حکومت ہند نے مسلم اوقاف کے لئے جو پارلیمانی کمیٹی بنائی ہے اس کے سامنے وقف ایکٹ میں ضروری ترمیمات کا مسودہ پیش کرنے اور مفید تجاویز کے لئے سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی کے سکریٹری جنرل قاضی مجاہد الاسلام قاسمی سے سفارش کرتا ہے کہ اس کام کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دیں، جو جلد از جلد ضروری ترمیمات اور تجاویز مرتب کرکے پارلیمانی کمیٹی کے سامنے پیش کرے، اور اس مسئلہ میں فقہ اکیڈمی کی نمائندگی کرے۔

✧ ✧ ✧

زکاۃ میں بنیادی حاجت[1]

وجوب زکوٰۃ کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آدمی کے پاس جو مال ہے وہ اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو، حوائج اصلیہ میں جو امور قابل اعتبار ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱- اپنے اور اپنے اہل وعیال نیز زیر کفالت رشتہ داروں سے متعلق روزمرہ کے اخراجات۔

۲- رہائشی مکان کپڑے، سواری، صنعتی آلات، مشینیں اور دیگر وسائل رزق جن کے ذریعہ کوئی شخص اپنی روزی کماتا ہے۔

۳- حوائج اصلیہ کا تعین ہر زمانہ، علاقہ اور افراد کے حالات اور ان کے معیار زندگی کی روشنی میں ہوگا۔

۴- حوائج اصلیہ کے مد میں ضروریات زندگی اور روزمرہ پیش آنے والے اخراجات داخل ہیں، اور اعتبار سال بھر کے اخراجات کا ہوگا، اور آئندہ سال کی ضرورت کے لئے جو سرمایہ محفوظ رکھا جائے گا زکوٰۃ نکالتے وقت حوائج اصلیہ میں شمار ہو کر اموال زکوٰۃ سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

دَین (قرض) کی زکوٰۃ[2]

۱- دَین کی دو قسمیں ہیں: وہ دَین جس کے وصول ہونے کی کوئی امید نہ ہو، جیسے ڈوبی ہوئی رقم، اور وہ دَین جس کے وصول ہونے کی پوری امید ہو۔ جس دَین کے وصول ہونے کی کسی وجہ سے امید ختم ہوگئی ہو اگر وہ دَین کبھی وصول ہو جائے تو وصولی کے دن سے ایک سال گذرنے کے بعد ہی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲- مقروض اگر قرض دہندہ کے مطالبہ واصرار کے باوجود اس حد تک ٹال مٹول سے کام لے کہ دائن اس کی وصولیابی سے مایوس ہو جائے تو اس مال کی زکوٰۃ قرض دہندہ پر واجب نہ ہوگی، اگر ایسا قرضہ کبھی وصول ہو جائے تو اس پر سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۳- جس دَین کا وصول ہونا متوقع ہو اس کی تین صورتیں ہیں:

الف...... وہ دَین قرض کی صورت میں ہو، یا سامان تجارت کی قیمت کسی کے ذمہ باقی ہو، ایسے دیون میں وصول ہونے کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی۔

ب...... وہ دَین جو ایسے مال کے عوض ہو جو تجارت کے لئے نہیں تھا اور نہ قرض کے طور پر دیا گیا تھا، جیسے مال وراثت یا مال وصیت۔

ج...... ایسا دَین جو کسی مال کا عوض نہ ہو جیسے مہر، ان دونوں صورتوں میں دَین وصول ہونے کے بعد سال گذر جانے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

۴- سرکاری یا غیر سرکاری اداروں سے لئے جانے والے طویل المیعاد قرضوں کی صورت میں ہر سال جو قرض کی قسط ادا کرنی ہے اموال زکوٰۃ میں سے منہا کی جائے گی، اور باقی اموال زکوٰۃ پر زکوٰۃ واجب ہوگی، پورا قرض منہا نہیں کیا جائے گا۔

✧ ✧ ✧

[1] پانچواں فقہی سمینار (رشادنگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶ / جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰ / اکتوبر - ۲ / نومبر ۱۹۹۲ء۔

[2] پانچواں فقہی سمینار (رشادنگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶ / جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰ / اکتوبر - ۲ / نومبر ۱۹۹۲ء۔

تجارت میں پیشگی دی ہوئی قیمت اور کرایہ

دوکان ومکان میں دی گئی ڈپوزٹ کی رقم پر زکوۃ[1]

۱: الف- مال تجارت جس کی مشتری (خریدار) نے پیشگی قیمت ادا کردی ہے لیکن مبیع (خریدے ہوئے سامان) پر اس کا قبضہ نہیں ہوا ہے تو اس ادا کردہ قیمت کی زکوۃ خریدار پر واجب نہیں ہوگی، بلکہ بائع (فروخت کرنے والے) پر واجب ہوگی۔

ب..... مبیع (فروخت شدہ مال) کی زکوۃ بیع سلم (یعنی وہ تجارت جس میں قیمت پہلے ادا کی جاتی ہے اور خریدار کو مال ایک مدت کے بعد متعین تاریخ کو وصول ہوتا ہے، جیسے کسان کاشتکاری کے وقت نقد قیمت لے کر گندم یا چاول اس شرط پر فروخت کردیتے ہیں کہ وہ آئندہ فلاں متعین تاریخ کو فلاں قسم کا گندم یا چاول خریدار کے حوالہ کردے گا) اور بیع استصناع (یعنی وہ بیع جس میں خریدار کے آرڈر پر کوئی متعین چیز تیار کرکے صنعت کار حوالہ کرنے کا معاملہ طے کرتا ہے اور اس میں طے شدہ قیمت کل کی کل یا کچھ حصہ پہلے ادا کردیا جاتا ہے) کی صورت میں مشتری (خریدار) کو مبیع (فروخت شدہ مال) سونپے جانے سے قبل بائع پر واجب ہوگی، اور بیع سلم اور بیع استصناع کے علاوہ بیع کی وہ شکل جس میں مبیع کی تعیین ہوچکی ہے لیکن مشتری کا اس پر قبضہ نہیں ہوا ہے، تو اس کی زکوۃ بھی مشتری پر واجب نہیں ہوگی۔

۲- کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان ودوکان وغیرہ کو پیشگی دی گئی ضمانت کی رقم (Security Deposit) پر زکوۃ کرایہ دار کے ذمہ واجب نہیں ہوگی۔

شرکاء سمینار میں سے کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس مال کی زکوۃ مالک مکان پر ہوگی، اور دوسری رائے یہ ہے کہ اس مال کی زکوۃ کسی پر نہیں ہوگی۔

✦ ✦ ✦

[1] پانچواں فقہی سمینار (رشادنگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶ / جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰ / اکتوبر - ۲ / نومبر ۱۹۹۲ء۔

ہیرے و جواہرات پر زکوٰۃ[1]

الف- جو ہیرے جواہرات تجارت کی نیت سے خریدے گئے ہوں ان کی زکوٰۃ مالک پر واجب ہوگی۔

ب- جو ہیرے جواہرات زیورات وغیرہ کے لئے خریدے گئے ہوں، ان کی زکوٰۃ مالک پر واجب نہیں ہوگی۔

ج- ایک رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ لوگ بڑی بڑی رقوم ہیرے جواہرات کی خرید پر صرف کر دیتے ہیں اور اپنی نقد رقوم کو ہیرے جواہرات میں بدل کر مختلف مصالح کے تحت محفوظ کر لیتے ہیں۔

مجمع الفقہ الاسلامی کے سمینار میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس صورت میں لاکھوں لاکھ کی نقد رقم ہیرے جواہرات کی صورت میں ان کے پاس محفوظ ہو جاتی ہے جو کسی بھی وقت نقد کی صورت میں منتقل ہو سکتی ہے۔ بحث کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی کہ اس مسئلہ میں ایک جہت تو یہ ہے کہ ہیرے جواہرات، سونا چاندی نہیں ہیں جو خلقتاً نامی تسلیم کئے گئے ہیں، اور اس شخص کا کام ہیرے جواہرات کی تجارت بھی نہیں ہے اور نہ فوری طور پر خریدتے وقت باضابطہ تجارت کی نیت کی گئی ہے تاکہ بسبب مال تجارت ہونے کے اسے نامی قرار دیا جائے، اس جہت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو۔

دوسری جہت یہ ہے کہ ہیرے جواہرات ضروریات زندگی میں داخل نہیں اور اصحاب سرمایہ اپنے خاص مصالح کے لئے اپنے روپیوں کو جن کی مقدار غیر معمولی حد تک زائد ہوتی ہے، ہیروں اور جواہرات کی صورت میں محفوظ کر کے مختلف فوائد بھی حاصل کرتے ہیں، اور انہیں اس طرح اس کا اطمینان بھی رہتا ہے کہ ان ہیروں اور جواہرات کی صورت گویا ''زر نقد'' ہر دم ان کے پاس محفوظ ہے، اور اس کے نتیجہ میں فقراء کو شدید نقصان ہوتا ہے کہ نقد رقوم میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جو عام حالات میں ہیرے جواہرات کی صورت میں عام اصول کے پیش نظر واجب نہیں ہوتی۔

سمینار میں شریک علماء و اصحاب افتاء میں سے ایک خاصی تعداد نے پہلی جہت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس خاص صورت میں محفوظ ہیرے جواہرات کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

جبکہ دوسری بڑی تعداد علماء و اصحاب افتاء کی تھی جنہوں نے دوسری جہت کو سامنے رکھتے ہوئے اس خاص صورت میں ذخیرہ کئے ہوئے ہیرے جواہرات کو حکماً مال تجارت تسلیم کیا اور اس پر زکوٰۃ واجب قرار دیا۔ ہر دو جہت کے مطابق رائے رکھنے والے ممتاز علماء کے اسمائے گرامی ذیل میں علاحدہ علاحدہ درج کئے جاتے ہیں:

وجوب زکوٰۃ کے قائلین حضرات کے نام

۱-	قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب	
۲-	مولانا طیب الرحمن صاحب امیر شریعت	آسام

[1] پانچواں فقہی سمینار (رشاد نگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶/ جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰/ اکتوبر-۲/ نومبر ۱۹۹۲ء۔

۳-	مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب	بمبئی
۴-	مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب	
۵-	مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب	اعظم گڈھ
۶-	مولانا شمس پیرزادہ صاحب	بمبئی
۷-	مولانا انیس الرحمن قاسمی صاحب	پٹنہ
۸-	مولانا عبد الرحیم صاحب	بھوپال
۹-	مولانا مفتی عبد الرحمن صاحب	دہلی
۱۰-	مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب	سیتامڑھی
۱۱-	مولانا رفیق المنان صاحب	مبارک پور
۱۲-	مولانا مفتی نذیر احمد صاحب	بارہ بنکی
۱۳-	مولانا محمد شعیب صاحب	سرائے میر
۱۴-	مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب وغیرہم	

عدم وجوب زکوۃ کے قائلین کے نام

۱-	مولانا مفتی برہان الدین صاحب	لکھنؤ
۲-	مولانا حبیب الرحمن خیر آبادی صاحب	دیوبند
۳-	مولانا نعمت اللہ قاسمی صاحب	دیوبند
۴-	مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب	باندہ
۵-	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب	حیدرآباد
۶-	مولانا نسیم احمد قاسمی صاحب	پٹنہ
۷-	مولانا صدر الحسن ندوی صاحب	اورنگ آباد
۸-	مولانا محی الدین صاحب	گجرات، وغیرہم

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ [۱]

- پراویڈنٹ فنڈ (تنخواہ سے لازمی طور پر وضع ہونے والی رقم) جب تک اس پر قبضہ نہ ہوجائے اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب یہ رقم وصول ہوجائے اور بقدر نصاب ہواور اس پر ایک سال گذر جائے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

بعض اوقات کچھ لوگ قانون انکم ٹیکس کی زد سے بچنے یا دیگر مصالح کی خاطر اختیاری طور پر اپنی تنخواہ سے کچھ زائد رقم وضع کرا کر پی ایف (P.F.) جمع کراتے ہیں۔ یہ رقم اگر قدر نصاب کو پہنچ جائے تو سال بہ سال زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔اس اختیاری وضع کرائی ہوئی رقم کی حیثیت ودیعت کی ہے اور مال ودیعت پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

مدرسہ کے سفراء، محصلین اور مہتمم کی حیثیت [۲]

یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل مدارس زکوٰۃ وصدقات کی جو رقمیں وصول کرتے ہیں فوری طور پر خرچ نہیں ہوتیں، اور بسا اوقات خاصے عرصہ تک باقی رہ جاتی ہیں جس کی وجہ سے ادائیگی وعدم ادائیگی زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔لہٰذا فقہ اکیڈمی میں اس سے متعلق سوالنامہ کے جوابات کی روشنی میں ذیل کی تجاویز منظور کی جاتی ہیں:

زکوٰۃ کی وصولی میں مہتمم یا اس کا نائب (سفیر و محصل) طلبہ کا وکیل ہے۔مہتمم یا اس کے نائب (سفیر و محصل) کو دے دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔مہتمم مدرسہ کا فرض ہے کہ زکوٰۃ کی رقم حسب احکام شرع طلبہ پر صرف کرے۔

اموال مدرسہ پر زکاۃ [۳]

زکوٰۃ کی جو رقم مدارس یا بیت المال میں اکٹھا ہوتی ہیں ان کا کوئی مالک متعین نہیں، اسی طرح جو رقم از قسم عطایا وصدقات نافلہ اداروں کو مطلق وجوہ خیر میں صرف کرنے کے لئے یا متعین مدات پر صرف کرنے کے لئے دی جاتی ہیں وہ دینے والوں کی ملک سے نکل کر اللہ کی ملک میں داخل ہوجاتی ہیں، اس لئے بیت المال، مدارس یا دیگر رفاہی اداروں میں جمع شدہ رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

✧ ✧ ✧

---

[۱] پانچواں فقہی سمینار (رشاد نگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶/ جمادی الاول ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰/ اکتوبر-۲/ نومبر ۱۹۹۲ء۔

[۲] پانچواں فقہی سمینار (رشاد نگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶/ جمادی الاول ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰/ اکتوبر-۲/ نومبر ۱۹۹۲ء۔

[۳] پانچواں فقہی سمینار (رشاد نگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶/ جمادی الاول ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰/ اکتوبر-۲/ نومبر ۱۹۹۲ء۔

کمیشن پر زکوٰۃ کی وصولی[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پانچویں سمینار منعقدہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں کمیشن پر زکوٰۃ کی وصولی کا موضوع زیر بحث آیا۔ مقالات اور شرکاء کے مباحثات کی روشنی میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ کمیشن پر زکوٰۃ کی وصولیابی کا مروجہ طریقہ جائز نہیں۔

مال حرام کی زکوٰۃ[2]

۱- مال حرام کسی کی ملکیت میں آئے اور وہ بعینہ موجود ہو، نیز مال کا اصل مالک معلوم ہو تو اس شخص کو وہ پورا مال لوٹا دینا واجب ہے۔

۲- اگر مال حرام متعین طور پر معلوم نہ ہو سکے یا اس کی تعداد معلوم نہ ہو سکے تو غالب گمان کے مطابق مال حرام کی مقدار متعین کی جائے گی۔ اگر مالک معلوم ہو تو اتنی مقدار میں رقم اس کے مالک کو واپس کر دی جائے، اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو اسی مقدار میں بلانیت ثواب صدقہ کر دیا جائے۔

۳- اگر مال حرام کی واپسی اس پر واجب ہوئی اور اس نے واپس نہیں کیا اور مال حرام اس کے قبضہ میں باقی رہ گیا اور مال کا کوئی انسان مطالبہ کرنے والا نہیں ہے، ایسی صورت میں اس مال کی زکوٰۃ ادا کرنی بھی واجب ہوگی، اور زکوٰۃ ادا کرنے کے باوجود حقدار کو حق لوٹانے یا حق دار کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں بلانیت ثواب صدقہ کرنے کا حکم باقی رہے گا۔

مال حرام میں اصل یہی ہے کہ اگر ایسے مال کا طلب کرنے والا مالک موجود ہو تو اس کو واپس کر دیا جائے ورنہ صدقہ کر دیا جائے، اور اگر حرام وحلال مال مخلوط ہو تو تحری ورجحان قلب کے مطابق مال حلال کی مقدار متعین کر کے اس کی زکوٰۃ دی جائے، مال حرام میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مگر استحسان کا تقاضہ یہ ہے کہ پورے کے پورے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تاکہ یقینی اور اطمینان بخش طریقہ پر زکوٰۃ ادا کرنے والا فریضہ زکوٰۃ سے بری الذمہ ہو جائے، اور ظالمانہ اور حرام طریقوں سے لوگوں کے مال سے فائدہ اٹھانے والوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ نیز ایسا نہ ہو کہ مال حرام کھانے والا دوطرفہ فائدہ اٹھائے، اس طرح ایک طرف مال حرام سے انتفاع کرے اور زکوٰۃ سے بھی بچ جائے۔

✧ ✧ ✧

---

[1] پانچواں فقہی سمینار (رشادنگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶ / جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰ / اکتوبر - ۲ / نومبر ۱۹۹۲ء۔

[2] پانچواں فقہی سمینار (رشادنگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶ / جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰ / اکتوبر - ۲ / نومبر ۱۹۹۲ء۔

اموال زکوۃ کی سرمایہ کاری[1]

۱- بہت سے ممالک اور علاقوں میں مسلمانوں کی مفلوک الحالی اور معاشی پسماندگی نا قابل بیان ہے، مسلمانوں کی دین سے ناواقفیت اور اقتصادی بدحالی کا استحصال کرتے ہوئے غیر مسلم مشنریاں اور قادیانی مبلغین سرگرم عمل ہیں، اور غریب اور ناواقف مسلمانوں کی امداد کر کے اور انہیں اپنے قریب لاکر ان کے ایمان وعقیدہ کو بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ محتاج و نادار مسلمانوں کی معاشی بدحالی کا فوری طور پر مداوا کیا جائے، انہیں فقر وفاقہ کے اس چنگل سے نکالا جائے جس نے ان کے دین وایمان کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ ایسے مسلمان اموال زکوۃ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، ہر ملک اور علاقہ کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے نادار اور محتاج مسلمانوں کو خاص طور پر اموال زکوۃ سے مدد کریں، اور اگر اموال زکوۃ اس کے لئے کفایت نہ کریں تو دوسری مدات خیر سے ان کا تعاون کریں۔

۲- فقراء ومساکین کو زکاۃ کا جو مال دے دیا، انہیں اس مال پر تمام مالکانہ حقوق حاصل ہوجاتے ہیں، اس لئے اگر کسی فقیر ومسکین یا چند فقراء نے زکاۃ لینے کے بعد اسے استثمار یا تجارت وغیرہ میں لگا دیا تا کہ زکاۃ کی اس رقم سے آئندہ بھی فائدہ پہنچتا رہے تو ایسا کرنا جائز ہے، اس سے زکاۃ ادا ہوجائے گی۔

۳- زکاۃ دینے والے شخص یا زکاۃ دینے والوں کی جماعت کی طرف سے زکاۃ میں نکالی ہوئی رقوم کو کسی نفع بخش کاروبار میں لگا دینا تا کہ مستقبل میں اس کا نفع فقراء ومساکین اور دیگر مستحقین زکاۃ پر تقسیم کی جاتی رہے، جائز نہیں، اس طرح زکاۃ ادا نہ ہوگی۔

۴- فقراء کو معاشی طور پر خود کفیل بنانے کے لئے اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ فقیر جس پیشے اور صنعت سے وابستہ ہے، یا جس پیشے کو شروع کر سکتا ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے اسے کوئی مشین یا آلات صنعت وحرفت زکاۃ کی رقم سے خرید کر بطور ملکیت دے دیئے جائیں، یا فقیر کی تجارتی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی دوکان اسے مالکانہ طور پر زکاۃ کی رقم سے بنا کر دے دی جائے تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے، اس سے زکاۃ کی ادائیگی ہوجائے گی۔

۵- اگر رہائشی مکانات یا دوکانیں تعمیر کر کے فقراء کو رہائش یا تجارت کے لئے دے دی جائیں اور انہیں مکانات اور دوکانوں کا مالک نہ بنایا جائے تو اس سے زکاۃ کی ادائیگی نہیں ہوگی۔

۶- اداء زکاۃ کے وقت اس کو بہر حال ملحوظ رکھا جائے کہ مقامی محتاج ومستحقین محروم نہ رہ جائیں۔

✦✦✦

[1] تیرہواں فقہی سمینار (کٹولی، لکھنؤ) بتاریخ ۱۸-۲۱/ محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶/ اپریل ۲۰۰۱ء۔

فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟[1]

۱- شرکاء سمینار کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت مصارف زکوٰۃ [سورۂ توبہ: ۶۰] نے جن آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کو محدود کر دیا ہے ان میں وہ قطعی ہے، اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اور آیت مصارف زکوٰۃ [سورۂ توبہ: ۶۰] میں مذکور آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کا حصر حقیقی ہے اضافی نہیں ہے۔

۲- اس آیت میں مذکور ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق عام شرکائے سمینار کے نزدیک غزوہ اور جہاد عسکری ہے، بعض شرکاء سمینار کا نظریہ یہ ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' میں عسکری جہاد کے ساتھ وہ تمام کوششیں شامل ہیں جو آج کے دور میں واقعتاً دعوت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کی جا رہی ہوں، ان حضرات کے نام یہ ہیں:

مولانا شمس پیرزادہ صاحب، مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب۔ ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی صاحب

شیخ محمد محروس المدرس عراقی کی رائے یہ ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' کے مفہوم میں عموم ہے۔

۳- عام شرکاء سمینار کا خیال یہ ہے کہ دور حاضر میں دینی اور دعوتی کاموں کے لئے درکار سرمایہ کی فراہمی میں پیش آنے والی دشواری کے باوجود شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے ساتویں مصرف ''فی سبیل اللہ'' کا دائرہ وسیع کر کے اس میں تمام دینی اور دعوتی کاموں کو شامل کر لیا جائے، کیونکہ قرون اولیٰ میں اس تعمیم وتوسیع کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نیز ایسا کرنے سے مسلمانوں کے محتاج، نادار اور افلاس زدہ طبقہ کی مالِ زکوٰۃ کے ذریعہ کفالت جو زکوٰۃ کا اہم ترین مقصد ہے، فوت ہو جائے گا۔ اس نقطۂ نظر سے ان حضرات کا اختلاف ہے جنہیں دفعہ ۲ سے اختلاف ہے۔

عشری وخراجی اراضی[2]

شریعت اسلامی نے جس طرح دوسرے اموال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے، زرعی پیداوار سے بھی غرباء کا حق متعلق کیا ہے، جس کو عشر کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں کتاب وسنت کی ہدایات اور قرون خیر کے تعامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے زمین کی درج ذیل قسموں کو عشری قرار دیا ہے:

۱- وہ زمینیں جن کے مالکوں نے اسلامی فتوحات سے پہلے ہی اپنی خوشی سے اسلام قبول کر لیا ہو۔

۲- کسی علاقہ کو مسلمانوں نے فتح کیا اور مفتوحہ زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی ہوں۔

۳- جو زمینیں مسلم حکومتوں کی طرف سے مسلمانوں کو بطور جاگیر عطا کی گئی ہوں۔

---

[1] پانچواں فقہی سمینار (رشادنگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰/ اکتوبر- ۲/ نومبر ۱۹۹۲ء۔

[2] چھٹا فقہی سمینار (عمر آباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰/ رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۳ء- ۳ جنوری ۱۹۹۴ء۔

۴- جزیرۃ العرب کی تمام زمینیں جن کی فقہاء نے حد بندی کر دی ہے۔

۵- مسلمانوں کی رہائشی زمینیں جو قابل کاشت بنائی گئی ہیں، اور ان کے قرب وجوار کی زمینیں بھی عشری ہیں۔

۶- مسلمان ملک کی افتادہ زمینیں جن کو کسی مسلمان نے قابل کاشت بنایا ہو، اور ان کے قرب وجوار کی زمینیں بھی عشری ہوں۔

اور درج ذیل صورتوں کو خراجی قرار دیا گیا ہے:

۱- مسلمانوں کی مفتوحہ زمینیں جو غیر مسلم باشندوں ہی کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی ہوں۔

۲- وہ زمینیں جہاں کے غیر مسلم باشندوں نے صلح کر لی ہو اور زمین انہیں کے پاس رہنے دی گئی ہو۔

۳- مسلمانوں کی زمینیں جو غیر مسلموں کی ملکیت میں چلی جائیں اور پھر ان کو مسلمان حاصل کریں۔

۴- جو زمینیں مسلمان حکومت کی طرف سے جاگیر کے طور پر غیر مسلموں کی دی گئی ہوں۔

البتہ اصولی طور پر شریعت نے مسلمانوں کی زمین میں عشر اور غیر مسلموں کی زمین میں خراج واجب قرار دیا ہے، عشر میں بنیادی تصور عبادت کا ہے اور یہ زکوۃ ہی کی ایک قسم ہے اس لئے مسلمانوں کے حق میں اصل "عشر" ہے، اور چونکہ عشر کو ساقط کرنا ایک عبادت کو ساقط کرنا ہے، اس لئے جہاں عشر کے ساقط ہونے کی صراحت اور اس پر کوئی قوی نص موجود نہ ہو وہاں احتیاط کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے حق میں عشر ہی کے حکم کو باقی رکھا جائے۔ عشر کے سلسلے میں ان بنیادی اور متفقہ اصولوں اور ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی اراضی کی شرعی حیثیت کے متعلق سمینار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:

۱- ہندوستان میں مسلمانوں کی زرعی زمینوں کے متعلق یہ خیال کہ نہ ان میں عشر واجب ہے نہ خراج، درست نہیں ہے۔

۲- ہندوستان کی زمینیں مندرجہ ذیل صورتوں میں بالاتفاق عشری ہیں:

الف- مسلمان حکومت کی طرف سے مسلمانوں کو عطا کردہ زمینیں جو اب تک مسلمانوں کے پاس چلی آرہی ہیں۔

ب- جس علاقہ کے لوگ مسلم حکومت کے قیام سے پہلے بہ خوشی مسلمان ہو گئے ہوں اور ان کی زمینیں ابھی تک مسلمانوں ہی کے پاس چلی آرہی ہیں۔

ج- جو زمینیں عرصۂ دراز سے مسلمانوں کے پاس ہیں اور تاریخی طور پر ان کا خراجی ہونا ثابت نہیں ہے۔

جو مزروعہ یا افتادہ زمینیں حکومت ہند سے مسلمانوں کو حاصل ہوں۔ اس صورت کو بعض حضرات خراجی قرار دیتے ہیں۔

۳- جو زمینیں غیر مسلم حکومت یا افراد سے کسی مسلمان کو حاصل ہوئی ہوں، ان کے بارے میں شرکاء سمینار کی رائیں مختلف ہیں: بعض حضرات کے نزدیک ہندوستان کی تمام زمینیں عشری ہیں، اور بعض حضرات کے نزدیک اس صورت میں خراج واجب ہے۔

تاہم اس پر اتفاق ہے کہ احتیاط تمام ہی زمینوں میں عشر ادا کرنے میں ہے۔

✧ ✧ ✧

ادائیگی خراج کا طریقہ

اور خراج سے سرکاری محصول کی منہائی [1]

۱- بعض شرکاء کی رائے میں خراج واجب نہیں ہوتا۔

لیکن جو شرکاء سمینار ہندوستان کی خراجی زمینوں میں خراج لازم قرار دیتے ہیں اور خراج کو حق شرعی قرار دے کر واجب الادا کہتے ہیں، ان کا رجحان یہ ہے کہ زمین کا سرکاری لگان ادا کرنے سے خراج شرعی ادا نہیں ہوگا، بلکہ مسلمان مالک زمین پر لازم ہے کہ خراج خود نکال کر مصارف خراج میں صرف کرے۔

اور بعض شرکاء سمینار کی رائے ہے کہ خراج شرعی سے سرکاری لگان منہا کرنے کے بعد خراج کی باقی مقدار مصارف خراج میں صرف کرنا ضروری ہے۔

۲- ہندوستان کی خراجی زمینوں پر خراج مقاسمہ لازم ہے یا خراج موظف؟

اس سلسلے میں بعض شرکاء سمینار نے ادائیگی اور حساب کی سہولت کے پیش نظر تمام خراجی زمینوں میں خراج مقاسمہ لازم قرار دیا ہے۔

لیکن وجوب خراج کا رجحان رکھنے والے اکثر حضرات کے نزدیک جن زمینوں کے بارے میں تاریخی طور پر ثابت ہے کہ فتح اسلامی کے بعد ان پر خراج مقاسمہ لازم قرار دیا گیا تھا (مثلاً گجرات وراجپوتانہ) ان میں خراج مقاسمہ لازم ہوگا، اور اس کی مقدار وہی ہوگی جو اسلامی فتوحات کے وقت متعین کی گئی، اور باقی تمام خراجی زمینوں میں خراج موظف کی ادائیگی لازم ہوگی۔

۳- وجوب خراج کا رجحان رکھنے والے اکثر شرکاء سمینار نے توظیف عمری کو بنیاد بنا کر غلہ اور کپاس جیسی عام پیداوار کی خراجی زمینوں میں فی جریب ایک درہم نقد (یعنی ساڑھے تین ماشہ چاندی یا اس کی قیمت) اور پیداوار میں سے ایک صاع (یعنی تین کلو تین سو پچیس گرام) لازم قرار دیا ہے، اور سبزیوں کی زمین میں فی جریب پانچ درہم یا اس کی قیمت، اور انگور یا کھجور کے متصل درختوں والے باغ پر فی جریب دس درہم چاندی یا اس کی قیمت لازم قرار دی ہے۔

✧ ✧ ✧

---

[1] چھٹا فقہی سمینار (عمر آباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰ / رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱ / دسمبر ۱۹۹۳ء - ۳ جنوری ۱۹۹۴ء۔

زمینی پیداوار، درخت و سبزیوں پر عشر[1]

۱- زکوۃ کی طرح عشر بھی ایک فریضہ ہے جس کا تعلق زمینی پیداوار سے ہے، قرآن کریم میں اہل ایمان کو پاکیزہ کمائی سے زکوۃ اور زمینی پیداوار سے عشر کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔

یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِن طَیِّبَاتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَکُمْ مِنَ الْأَرْضِ [البقرہ: ۲۶۷]۔

عشر زمین کی ہر پیداوار پر واجب ہے یا کچھ چیزیں وجوب عشر سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کے عمومی دلائل، شرکاء سمینار کے مقالات وآراء پر غور وخوض کے بعد سمینار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:

۱- بشمول گھاس ودرخت وغیرہ ہر ایسی زمینی پیداوار پر عشر واجب ہے جس کی پیداوار سے مقصود نماء ہوتی ہے اور جسے آمدنی کی غرض سے پیدا کیا جاتا ہے، لہذا تمام غذائی اجناس، میوہ جات، پھلوں اور پھولوں پر عشر واجب ہے۔ البتہ خودرو درخت اور گھاس جن سے حصول آمدنی مقصود نہ ہو اس پر عشر واجب نہیں۔

۲- وہ درخت جن سے پھل مقصود نہیں ہوتا بلکہ جلانے یا فرنیچر اور عمارت وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں جیسے صنوبر، ساکھو، شیشم، بھاگوان وغیرہ، اگر کسی عشری زمین کو ایسے درختوں کے لئے خاص کرلیا گیا ہو اور ان کی کاشت سے آمدنی مقصود ہے، تو ایسے درختوں کے تیار ہونے میں چاہے جتنی مدت درکار ہو، کاٹے جانے کے وقت ان سے یا ان کی آمدنی سے عشر کی ادائیگی واجب ہوگی۔

۳- وہ سبزیاں جو عشری زمین میں بوئی جائیں اور جن سے مقصود آمدنی ہو، ان میں عشر واجب ہے۔ البتہ اپنے مکان کے گرد وپیش کی افتادہ اراضی یا اپنی چھتوں پر لگائی جانے والی سبزیاں وجوب عشر سے مستثنیٰ ہیں۔

مزارعت (بٹائی) والی کاشت پر عشر[2]

جن عشری زمینوں کی کاشت بطور بٹائی کے کرائی جاتی ہے، ان کی پیداوار پر عشر کے واجب ہونے کے سلسلے میں سمینار نے غور وفکر کیا اور اس سے متعلق آئے ہوئے تمام مقالات کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچا کہ:

۱- اگر زمین کا مالک اور بٹائی دار دونوں مسلمان ہوں تو دونوں پر اپنے اپنے حصہ کے بقدر عشر واجب ہوگا۔

۲- اگر مالک زمین مسلمان اور بٹائی دار غیر مسلم ہو تو مسلمان مالک پر اس کے حصہ کے بقدر میں واجب ہوگا۔

✧ ✧ ✧

[1] چھٹا فقہی سمینار (عمر آباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰/ رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۳ء-۳ جنوری ۱۹۹۴ء۔

[2] چھٹا فقہی سمینار (عمر آباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰/ رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۳ء-۳ جنوری ۱۹۹۴ء۔

عشر سے اخراجات زراعت کی منہائی[1]

۱- فقہی سمینار کے سامنے یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ آج کل کاشت کے جدید طریقوں میں زراعت کے اخراجات قدیم طرز کی کھیتی کے مقابلے میں کہیں زائد ہوتے ہیں، لہذا ان بڑھے ہوئے اخراجات کو واجب عشر کی ادائیگی سے پہلے اصلی پیداوار سے منہا کیا جائے تا کہ کاشت کاروں کو سہولت حاصل ہو۔

سمینار نے اس مسئلہ پر غور کیا اور اس کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد سمینار اس نتیجہ پر پہنچا کہ عشر اور نصف عشر شریعت کی طرف سے منصوص مقادیر ہیں، اور شریعت نے کاشت کو سیراب کرنے کی بنیاد پر اخراجات کی کمی وزیادتی کو اساس تسلیم کرتے ہوئے مقدار واجب میں فرق کیا ہے، اور دیگر کسی قسم کے اخراجات کی رعایت کرتے ہوئے مقدار واجب میں تبدیلی کا اعتبار نہیں کیا ہے، اور جو مقدار واجب شریعت نے طے کر دی ہے اس میں عقل وقیاس کا دخل نہیں، اور نہ کسی کو مقدار واجب میں تبدیلی کا حق ہے۔ دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ کاشت کے جدید طریقوں پر جہاں اخراجات زائد ہوتے ہیں، پیداوار کی مقدار میں بھی معتد بہ اضافہ ہوتا ہے۔

لہذا سمینار یہ طے کرتا ہے کہ کاشت کے جدید طریقوں کھاد یا دوا وغیرہ مصارف پر ہونے والے زائد اخراجات اصلی پیداوار سے منہا نہیں کئے جائیں گے۔

۲- حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دیگر فقہاء کی رائے میں آیات اور بعض احادیث کے عموم کے پیش نظر وجوب عشر کے لئے پیداوار کی مقدار کا کوئی نصاب نہیں ہے۔ ہر وہ شئ جو زمین سے پیدا ہو، چاہے وہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر مقدار میں، عشر کا نکالنا واجب ہوگا۔ امام ابو یوسف وامام محمد رحمہما اللہ ودیگر جمہور ائمہ کے نزدیک حدیث ''لیس فیما دون خمسة أوسق صدقة'' کی روشنی میں پانچ وسق سے کم اگر پیداوار ہو تو ایسے لوگوں پر عشر واجب نہیں ہے۔ سمینار کی رائے میں چھوٹے کاشت کار، یا قدرتی آفات کی وجہ سے بہت کم مقدار میں پیداوار حاصل ہونے کی صورت میں مطلقاً وجوب عشر کے قول کے نتیجے میں دشواریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسے حالات میں جبکہ کسی کاشت کار کی کل پیداوار پانچ وسق یعنی چھ کوئنٹل ۵۳ کلوگرام سے کم ہو تو صاحبین ودیگر جمہور ائمہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اگر کوئی ضرورت مند شخص اس پر عشر نہ نکالے بلکہ پوری پیداوار کو اپنے ذاتی استعمال میں لائے تو ایسا کرنا جائز ہے۔ بعض شرکاء کا رجحان ہے کہ اگر نصاب سے کم پیداوار ہو اور دوسرے ذرائع کفالت موجود نہ ہوں تو خود استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

✧ ✧ ✧

[1] چھٹا فقہی سمینار (عمر آباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰ / رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱ / دسمبر ۱۹۹۳ء - ۳ جنوری ۱۹۹۴ء۔

مکھانہ، مچھلی وریشم پر عشر[1]

۱- پانی میں کاشت کی جانے والی چیزیں مثلاً مکھانہ، سنگھاڑا وغیرہ زمینی پیداوار میں سے ہیں، اور ان سے استغلال ارض ہوتا ہے، اس لئے ان پر عشر واجب ہوگا۔

۲- تالابوں میں بغرض تجارت مچھلیوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ یہ زمینی پیداوار میں سے نہیں بلکہ اموال تجارت میں سے ہیں، اس لئے ان پر عشر کے احکام جاری نہ ہوں گے، بلکہ مال تجارت کی زکوۃ کا حکم ہوگا۔

۳- اگر عشری زمین میں شہتوت کی کاشت ریشم پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہے، اور شہتوت کے پتوں کو ریشم کے کیڑوں کی غذا حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، تو یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ جن اراضی کو شہتوت کے پتوں کے ذریعے ذریعہ آمدنی بنایا جاتا ہے ایسی اراضی پر شہتوت کے پتوں پر عشر واجب ہوگا۔ بعض شرکاء سمینار کی رائے میں پتوں پر عشر واجب نہیں، اس سے حاصل شدہ ریشم پر زکوۃ اموال اپنی شرائط کے ساتھ واجب ہوگی۔

مکان، چھت، گردوپیش کی افتادہ اراضی اور اراضی اوقاف پر عشر[2]

مکان کے اندر کی اراضی یا اس کی چھتوں یا مکان کے گردوپیش کی افتادہ اراضی میں ہونے والی سبزیاں، پھلوں وغیرہ، اسی طرح اوقاف کی اراضی خصوصاً وقف علی الاولاد کی اراضی میں عشر واجب ہے یا نہیں؟ ان مسائل پر غوروخوض کے بعد سمینار اس نتیجہ پر پہنچا:

۱- چونکہ وجوب عشر کے لئے زمین کا عشری ہونا شرط ہے، اور مکان کی زمین نہ عشری ہے اور نہ ہی خراجی، اس لئے مکان کے اندر کی اراضی یا اس کی چھتوں یا مکان کے گردوپیش کی افتادہ اراضی کی سبزیوں اور پھلوں وغیرہ میں عشر واجب نہیں ہوگا۔

۲- چونکہ وجوب عشر کے لئے زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ غیر مملوکہ اراضی میں بھی عشر واجب ہے۔ نیز عشر پیداوار میں واجب ہے نہ کہ زمین میں، اس لئے اراضی اوقاف میں بھی عشر واجب ہوگا، خواہ اوقاف عامہ کی اراضی ہوں یا وقف علی الاولاد کی۔

✧ ✧ ✧

[1] چھٹا فقہی سمینار (عمرآباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰ / رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱ / دسمبر ۱۹۹۳ء - ۳ جنوری ۱۹۹۴ء۔

[2] چھٹا فقہی سمینار (عمرآباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰ / رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱ / دسمبر ۱۹۹۳ء - ۳ جنوری ۱۹۹۴ء۔

وقف [۱]

وقف کو اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اور وقف کے ذریعہ بڑے بڑے تہذیبی وتمدنی، فلاحی اور رفاہی کارنامے انجام دیئے گئے ہیں، اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمینار نے درج ذیل امور طے کئے ہیں:

۱- ہندوستان میں مسلم اوقاف کو سرکاری وغیر سرکاری ناجائز قبضوں سے واگذار کرنے، اور وقف کی جائیداد کو جدید امکانات اور شرعی ضابطوں کی رعایت کرتے ہوئے بڑھانے، نفع آور بنانے اور ان کی سرمایہ کاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲- بیواؤں، مطلقہ عورتوں، یتیموں، بیماروں اور دیگر ضرورت مند لوگوں کی حاجت روائی کے لئے نئے اوقاف کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۳- ضرورت مند طلبہ کی اعانت اور ان کے لئے اسکالرشپ وغیرہ کی فراہمی کے لئے "فنڈ برائے تعلیمی امور" قائم کیا جائے۔

۴- دینی مراکز اور اسلامی مدارس کی تقویت کے لئے "فنڈ برائے دینی مراکز" کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۵- ان تمام شعبوں کے لئے اہل خیر حضرات کو چاہئے کہ دل کھول کر حصہ لیں جو انشاء اللہ ان کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا۔

رمی جمار کا مسئلہ [۲]

۱- حج اسلام کی ایک اہم ترین عبادت ہے، جو زندگی میں ایک ہی بار فرض ہے، اس لئے حجاج کرام کو چاہئے کہ حج میں افضل اور مسنون طریقہ پر عمل کریں اور زیادہ سے زیادہ احتیاطی پہلو کو ملحوظ رکھیں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تینوں دنوں (۱۰، ۱۱، ۱۲ ذوالحجہ) کو رمی کے اوقات میں کافی وسعت ہے اور ہر دن اگلے دن کے طلوع صبح صادق تک رمی کرنے کی گنجائش ہے۔ اس لئے اگر رمی کے لئے اپنے حالات کے لحاظ سے مناسب وقت کا انتخاب کیا جائے تو دشواری نہ ہو اور حادثات پیش نہ آئیں، کیونکہ زیادہ تر حادثات عجلت پسندی اور مسائل سے ناواقفیت کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔

۲- ۱۰ / ذوالحجہ کی رمی طلوع آفتاب سے پہلے اور صبح صادق کے بعد کرنا عام لوگوں کے لئے مکروہ ہے، البتہ معذورین، بیمار، خواتین اور ضعیف حضرات کے لئے اس وقت بھی رمی کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

۳- ۱۰ / ذوالحجہ کی نصف شب سے رمی کرنا کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ اس وقت رمی کا وقت ہی شروع نہیں ہوتا۔

۴- ۱۱، ۱۲ / ذوالحجہ کو رمی کا وقت زوال آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے اور اگلی تاریخ کی صبح صادق سے پہلے پہلے تک رہتا ہے، ان ہی اوقات میں رمی کرنا چاہئے اور حج فرض ادا کرنے والوں کو خاص کر اس کا اہتمام کرنا چاہئے، البتہ شدید مجبوری اور دشواری کی بنا پر اگر کسی شخص نے زوال سے پہلے رمی کر لیا تو امام ابوحنیفہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس پر دم واجب نہیں ہوگا۔

۵- ۱۱، ۱۲ / ذوالحجہ کو غروب آفتاب کے بعد رمی کرنا ازدحام کی موجودہ کیفیت کو دیکھتے ہوئے مکروہ نہیں ہے۔

---

[۱] چودہواں فقہی سمینار (حیدرآباد) بتاریخ ۱-۳ / جمادی الاولی ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰-۲۲ / جون ۲۰۰۴ء۔

[۲] سولہواں فقہی سمینار (مہذب پور، اعظم گڈھ) بتاریخ ۱۰-۱۳ / ربیع الاول ۱۴۲۸ھ مطابق ۳۰ / مارچ - ۱ / اپریل ۲۰۰۷ء۔

۶- ۱۲/ ذوالحجہ کو غروب آفتاب کے بعد رکے رہنے سے ۱۳/ ذوالحجہ کی رمی واجب نہیں ہوگی، ہاں اگر منیٰ میں ۱۳/ ذوالحجہ کی صبح صادق طلوع ہوجائے تو پھر ۱۳ کی رمی بھی واجب ہوجائے گی۔

قیام منیٰ کا حکم

۱- ایام منیٰ میں حجاج کے لئے منیٰ میں ہی رات گذارنا مسنون ہے، اس لئے حجاج کرام کو چاہئے کہ یہ راتیں منیٰ میں گذاریں اور بلاضرورت محض راحت وآرام کے لئے منیٰ سے باہر قیام کر کے ایک اہم سنت کے تارک نہ بنیں۔

۲- البتہ اگر جگہ کی تنگی اور حکومت کے نظام کی وجہ سے منیٰ کے باہر قیام کرنا پڑے تو اس میں حرج نہیں ہے۔

روزہ میں جدید طریقۂ علاج کا استعمال[۱]

۱- امراض قلب سے متعلق جو دوا زبان کے نیچے رکھی جاتی ہے، اگر روزہ کی حالت میں اس کا استعمال کیا جائے اور اس کے اجزاء یا اس دواء کے ملے ہوئے لعاب کو نگلنے سے مکمل طور پر بچا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

۲- تنفس وغیرہ کے مرض میں انہیلر کے استعمال سے روزہ فاسد ہوجائے گا۔

۳- جو دوا بھاپ کی شکل میں منہ یا ناک کے ذریعہ کھینچی جائے، خواہ مشین کے ذریعہ کھینچی جاتی ہو یا کسی اور طریقے سے، ان سے روزہ فاسد ہوجائے گا۔

۴- انجکشن کے ذریعہ جو دوا رگوں یا گوشت میں پہنچائی جاتی ہے، خواہ اس سے محض دوا کی ضرورت پوری کی جائے یا غذا کی، روزہ اس سے نہیں ٹوٹتا ہے، البتہ روزہ کی حالت میں غذائی ضرورت کی تکمیل اور تقویت کے لئے بلاضرورت انجکشن لینا مکروہ ہے۔

۵- گلوکوز چڑھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، البتہ چوں کہ یہ ایک درجہ میں انسان کی غذائی ضرورت کو بھی پوری کرتا ہے، اس لئے بلاعذر گلوکوز چڑھانا مکروہ ہے۔

۶- (الف)......اگر روزہ کی حالت میں موضع حقنہ (فضلات کے اخراج کی نالی کا آخری حصہ، جہاں سے بڑی آنت شروع ہوتی ہے)، تک اگر دوا پہنچادی جائے تو اس سے روزہ فاسد ہوجائے گا، خواہ دوا سیال ہو یا جامد۔

(ب)...... بواسیری مسّوں پر دوا لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، تاہم بلاضرورت شدیدہ روزہ میں اس کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

(ج)......امراض معدہ کی تحقیق کے لئے پیچھے کے راستہ سے محض آلہ داخل کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، البتہ اگر اس آلہ میں کوئی دوا یا تر چیز لگائی گئی ہو تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

۷- (الف) عورت کی شرمگاہ کے باہری حصہ میں دوا لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، لیکن اندر کے حصہ میں دوا رکھنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(ب)......مرد کی شرمگاہ میں دوا یا نلکی ڈالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

(ج)...... مرض کی تحقیق کے لئے رحم تک آلات پہنچائے جائیں اور ان آلات پر دوا یا کوئی اور شیٔ لگائی گئی ہو، تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

✧✧✧

[۱] سترہواں فقہی سیمینار (برہان پور، ایم پی) بتاریخ ۲۸-۳۰/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ۵-۷/ اپریل ۲۰۰۸ء۔

مسافت سفر کا آغاز[1]

۱- جو آدمی اپنے گھر سے اپنے شہر کے اندر ہی کسی مقام پر جانے کے لئے نکلے تو خواہ وہ کتنی ہی لمبی مسافت طے کرے، اگر اس کا ارادہ شہر کے اندر ہی اندر رہنے کا ہے، تو وہ شرعاً مسافر شمار نہیں کیا جائے گا اور اس کے لئے سفر کی وہ رخصتیں نہیں ہوں گی، جو مسافت شرعی کے سفر سے متعلق ہیں۔

۲- جو آدمی اپنی آبادی وشہر سے باہر سفر کے ارادہ سے نکلے، وہی شرعاً نماز میں قصر اور رمضان المبارک میں روزہ توڑنے کی اجازت کے مسئلہ میں مسافر ہوگا۔

۳- چھوٹے شہروں میں مسافت شرعی کا حساب اس جگہ سے ہوگا، جہاں شہر ختم ہوا ہے، یعنی شہر ختم ہونے کے بعد ۴۸ میل کا سفر کیا جائے تبھی وہ مسافر ہوگا۔

۴- بڑے شہروں میں- جن کی آبادی میلوں تک پھیل گئی ہے- مسافت شرعی کا شمار کس مقام سے ہوگا؟ اس میں دو نقاط نظر ہیں، زیادہ حضرات کی رائے ہے کہ جہاں شہر ختم ہوتا ہے، وہیں سے ۴۸ میل کی مسافت شمار کی جائے گی، دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس محلہ سے سفر شروع ہوا ہے، وہیں سے مسافت کا شمار ہوگا، البتہ اس پر سبھوں کا اتفاق ہے کہ نماز میں قصر کا حکم شہر سے باہر نکلنے کے بعد ہی شروع ہوگا اور اس طرح واپس ہوتے وقت شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے تک ہی قصر کرنا درست ہوگا۔

جائے ملازمت کا حکم[2]

۱- جائے ملازمت وتجارت میں طویل اقامت کے ساتھ ذاتی مکان بھی بنالینا دائمی قیام کی نیت پر دلالت کرتا ہے؛ اس لئے مذکورہ جگہ وطن اصلی شمار کی جائے گی؛ کیوں کہ وطن اصلی میں تعدد ہوسکتا ہے؛ اس لئے وہاں چار رکعت والی نماز پوری کی جائے گی۔

۲- جائے ملازمت وتجارت میں ذاتی مکان تو نہیں بنایا، بلکہ کرایہ کے مکان یا ادارہ وکمپنی کے فراہم کردہ مکان میں اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت سے رہائش پذیر ہے تو اس جگہ کو وطن اصلی کا حکم حاصل ہوگا اور وہاں ہر حال میں اتمام کرے گا۔

✦ ✦ ✦

---

[1] سترہواں فقہی سمینار (برہان پور، ایم پی) بتاریخ ۲۸-۳۰/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ۵-۷/ اپریل ۲۰۰۸ء۔

[2] سترہواں فقہی سمینار (برہان پور، ایم پی) بتاریخ ۲۸-۳۰/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ۵-۷/ اپریل ۲۰۰۸ء۔

ایام قربانی میں کس مقام کا اعتبار ہے؟[1]

جو شخص قربانی کا وکیل بنا رہا ہے وہ الگ مقام پر ہو اور جہاں قربانی کی جارہی ہو وہ الگ مقام ہو تو اوقات قربانی کی ابتداء وانتہا کے سلسلہ میں مقام قربانی کا اعتبار ہوگا؛ بشرطیکہ جس شخص کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے، اس پر ۱۰ / ذی الحجہ کی صبح صادق طلوع ہوگئی ہو؛ لہٰذا:

الف: جس شخص کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے اگر اس کے یہاں ۱۰ / ذی الحجہ شروع نہیں ہوئی، تو اس کی طرف سے قربانی نہیں کی جاسکتی، اگرچہ قربانی کئے جانے کے مقام پر اس دن ۱۰ / ذی الحجہ ہو۔

ب: جس شخص کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے اگر اس کے یہاں ۱۲ / ذی الحجہ کا غروب آفتاب ہو چکا ہے؛ لیکن جہاں قربانی ہو رہی ہے وہاں ابھی ۱۲ / ذی الحجہ باقی ہے تو اس کی جانب سے قربانی کرنا درست ہے۔

ج: جس شخص کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے اس کے مقام پر ۱۲ / ذی الحجہ کی تاریخ ہے اور جہاں قربانی کی جارہی ہے وہاں ۱۲ / ذی الحجہ گزر چکی ہے تو اب وہاں قربانی کرنا درست نہیں ہے۔

شق ''الف'' میں درج ذیل حضرات کا اختلاف ہے:

مفتی رشید احمد فریدی، مفتی عبدالودود مظاہری، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محمد عثمان گورینی، مولانا عبدالرب اعظمی، مفتی شوکت ثناء قاسمی، مفتی نعمت اللہ، مولانا محمد کامل قاسمی اور مولانا احتشام الحق۔ ان حضرات کے نزدیک مذکورہ صورت میں قربانی درست ہے، البتہ ان میں سے بعض حضرات کے نزدیک احتیاط اس میں ہے کہ اس صورت میں قربانی نہ کی جائے۔

شق ''ب'' میں مفتی سلمان پالنپوری صاحب کا اختلاف ہے، ان کے نزدیک مذکورہ صورت میں قربانی درست نہیں ہے۔

☆☆☆

[1] انیسواں فقہی سمینار (بانسوٹ، گجرات) بتاریخ ۲۷ تا ۳۰ / صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۲ تا ۱۵ / فروری ۲۰۱۰ء۔

قرآن کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت[1]

آج مورخہ ۳/ مارچ بروز شنبہ ۲۰۱۵ء ''قرآن کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت'' سے متعلق تجویز کمیٹی کے زیر بحث طے پایا:

۱- قرآن کریم اللہ تعالی کی نازل کردہ آخری کتاب ہدایت ہے، جو قیامت تک انس وجن کی رہنمائی کرتی رہے گی، دنیا میں چونکہ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں لہٰذا قرآنی تعلیمات کو عام انسانوں تک پہونچانے کے لئے مختلف زبانوں میں معتبر تراجم کو فروغ دیا جائے۔

۲- متن قرآن کے بغیر کسی بھی زبان میں تنہا ترجمہ قرآن کی اشاعت ناجائز ہے، لہٰذا اسے خریدنا، تقسیم کرنا، ہدیہ کرنا درست نہیں ہے۔

۳- عثمانی رسم الخط کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط میں قرآن مجید کی کتابت واشاعت ناجائز ہے۔

۴- قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنا اور اپنے اندر ناظرہ قرآن پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہر مسلمان مرد وعورت کا شرعی فریضہ ہے، اس لیے ہر شخص کو خود بھی یہ صلاحیت حاصل کرنی چاہئے اور اپنے بچوں اور زیر تربیت افراد کو اس کی تعلیم دلانے کا اہتمام کرنا چاہئے ورنہ وہ عند اللہ جواب دہ ہوں گے۔

۵- اصل تو یہ ہے کہ صرف عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی اشاعت کی جائے لیکن ضرورتاً عربی متن کے ساتھ غیر عربی رسم الخط میں درج ذیل شرائط کے ساتھ اشاعت کی گنجائش ہے: الف:..... قرآن کریم کی ترتیب نہ بدلے۔ ب:..... مخارج کا حتی الامکان لحاظ کیا جائے۔

ج:..... عثمانی وعربی رسم الخط کی تمام خصوصیات کے لئے جامع ومانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کے رسم الخط کو مکمل کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔

۶- نابینا اور معذور افراد سماج کی خصوصی توجہ اور ہمدردی کے مستحق ہیں، ان کی تعلیم کے لئے بریل کوڈ کی ایجاد نہایت اہم پیش رفت ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اس رمزی زبان کے ذریعہ نابینا حضرات کو زیادہ سے زیادہ علوم اسلامیہ سے استفادہ کی سہولت فراہم کی جائے۔

۷- بریل کوڈ کے مسلمان ماہرین سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس کوڈ کو زیادہ سے زیادہ عربی خط اور رسم عثمانی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں؛ تاکہ یہ رموز قرآن مجید کے اصل رسم سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو جائے۔

۸- چونکہ بریل کوڈ علامتی زبان ہے، رسم الخط نہیں اس لئے نابینا افراد کی حاجت وسہولت کے پیش نظر بریل کوڈ میں قرآن حکیم کی کتابت واشاعت جائز ہے، اور چونکہ یہ قرآن کریم کا رمز ہے اس لئے اس کا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ نابینا حضرات قرآن مجید کے صحیح تلفظ سے واقف شخص کی مدد سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کریں۔

۹- موبائل کی اسکرین پر نظر آنے والی آیات کو بے وضو نہ چھوا جائے۔

۱۰- موبائل اور اس قسم کے دیگر آلات کا ڈھانچہ اسکرین سے علیحدہ ہے، لہٰذا جب اسکرین پر قرآن مجید ہو تو موبائل یا دیگر آلہ کو ہاتھ میں لینے کے لئے باوضو ہونا ضروری نہیں۔

نوٹ:...... شرکاء سمینار میں سے مفتی جنید بن محمد پالن پوری (ممبئی)، مفتی محمد شاہد قاسمی (بھروچ) کی رائے میں قرآن مجید کے اصل متن کے ساتھ بھی غیر عربی رسم الخط میں اس کی کتابت جائز نہیں، نیز مولانا محمد ثوبان اعظم قاسمی (بہار) کی رائے میں یہ صورت بھی جائز نہیں ہے اور قرآن مجید کو بریل کوڈ میں منتقل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

[1] ۲۴واں فقہی سمینار (اوچیرا، کیرالا) بتاریخ ۹ تا ۱۱/ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱ تا ۳/ مارچ ۲۰۱۵ء۔

برصغیر میں مطبوعہ قرآن مجید کے نسخے [1]

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی آخری کتاب ہے اور قیامت تک انسانیت کی ہدایت اسی کتاب سے متعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور نہ صرف قراء وحفاظ کے ذریعہ اس کی حفاظت فرمائی گئی ہے، بلکہ متن قرآن کو جس طرح آپ نے املاء کرایا اور لکھوایا وہ طریقہ کتابت بھی رسم عثمانی کی صورت میں محفوظ ہے، عربی اور عجمی نیز مشرقی اور مغربی ممالک میں اسی طرح قرآن مجید کی کتابت ہوتی آئی ہے، البتہ اصل الفاظ سے ہٹ کر تسہیل تلاوت کے لئے جو رموز وعلامات اعراب استعمال کئے گئے ہیں ان میں کسی قدر فرق پایا جاتا ہے جس کا قرآن مجید کے الفاظ اور نفس متن کی کتابت سے تعلق نہیں، ہندو پاک میں قرآن مجید کی جس انداز پر کتابت ہوتی ہے وہ اس فن کی مرکزی شخصیت شیخ ابوعمرو الدانی (متوفی ۴۴۴ھ) کی تصریحات کے مطابق ہے، اور ہندوستان کے نہایت معتبر علماء، ارباب افتاء اور ماہرین فن کی توثیق کے ساتھ اس کی نشر وطباعت ہوتی آئی ہے، اس لئے اس میں تبدیلی اور بلاد عرب میں مروجہ رموز وعلامات کے مطابق اس کی کتابت نہ صرف غیر ضروری عمل ہے بلکہ یہ امت میں افتراق وانتشار کا سبب بن سکتا ہے، اس لئے امت میں جو طریقہ مروج رہا ہے کہ مختلف علاقوں کے لوگ اپنی سہولت کے اعتبار سے اس علاقہ میں مروج رموز کے مطابق قرآن مجید کی نشر واشاعت کی خدمت انجام دیا کرتے ہیں، اس کو اسی طرح باقی رکھا جائے اور کسی بھی ایسے عمل سے بچا جائے جو فتنہ وانتشار کا سبب بن سکتا ہو۔

[1] ۲۴واں فقہی سمینار (اوجین، کیرلا) بتاریخ ۹ تا ۱۱ / جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ مطابق ۱ تا ۳ / مارچ ۲۰۱۵ء۔

سماجی مسائل

نکاح میں لڑکی، لڑکے اور اولیاء کے اختیارات [۱]

۱: الف- شریعت اسلامیہ میں ولایت نکاح کا مفہوم یہ ہے: کسی کو دوسرے کے عقد نکاح کا اختیار حاصل ہونا۔

ب-اس کی دو صورتیں ہیں: ۱-ولایت اجبار، ۲-ولایت استحباب۔

ولایت اجبار: ایسا اختیار جو دوسرے کی رضامندی پر موقوف نہ ہو۔

ولایت استحباب: ایسا اختیار جو دوسرے کی رضامندی پر موقوف ہو۔

ج-شرعاً ولی کے لئے حسب ذیل صفات ضروری ہیں:

دماغی توازن کا درست ہونا، بالغ ہونا، آزاد ہونا، وراثت کا استحقاق ہونا، مسلمان ہونا۔

اولیاء کی ترتیب عصبات میں وراثت کی ترتیب کے مطابق ہے۔

۲- ہر عاقل و بالغ کو خواہ مرد ہو یا عورت، خود اپنا نکاح کرنے کا حق حاصل ہے، اور جو بالغ نہیں یا جس کا دماغی توازن صحیح نہ ہو تو ان کے نکاح کا اختیار اولیاء کو حاصل ہے، اور اس سلسلہ میں لڑکی و لڑکے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۳- عاقلہ بالغہ لڑکی کو ولی کی مرضی کے بغیر خود اپنا نکاح کرنے کا حق حاصل ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ اولیاء اور لڑکی کی رضامندی سے نکاح ہو۔

۴- عاقلہ بالغہ لڑکی اپنے نکاح میں کفاءت یا مہر کے مطلوبہ معیار کا لحاظ نہ کرے تو اولیاء کو قاضی کے ذریعہ تفریق کا حق حاصل ہوگا۔

۵: الف-جس لڑکی کا نکاح باپ یا دادا نے نابالغی میں کر دیا ہو وہ نکاح لازم ہے، الا یہ کہ وہ لڑکی اس وجہ سے اس نکاح کو پسند نہ کرے کہ باپ دادا نے اس کا نکاح کسی لالچ میں آ کر یا لاپرواہی سے کام لے کر یا بدتدبیری کے ساتھ کر دیا ہے، یا ولی اعلانیہ فاسق ہے تو اس کو قاضی کے ذریعہ حق تفریق حاصل ہے۔

ب-باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء کا کرایا ہوا نکاح درست ہے، البتہ اگر لڑکی اس نکاح پر مطمئن نہ ہو تو بوقت بلوغ اس کو نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

ج-کنواری لڑکی کے لئے اس حق (خیار بلوغ) کا استعمال بوقت بلوغ ضروری ہے، بشرطیکہ بلوغ سے پہلے اس کو نکاح کا علم ہو چکا ہو اور حکم شرعی کا بھی علم ہو، بصورت دیگر اس کو یہ اختیار نکاح کا علم ہونے تک یا مسئلہ کا علم ہونے تک باقی رہے گا۔

د-شوہر دیدہ یعنی ثیبہ لڑکی کو یہ حق (خیار بلوغ) اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک کہ اس کی طرف سے رضامندی کا اظہار نہ ہو، خواہ یہ اظہار صراحۃً ہو یا قرائن کے ذریعہ، اسی طرح یہ حق و اختیار اس وقت تک رہے گا جب تک کہ اس کو مسئلہ کا یا نکاح کا علم نہ ہو۔

۶- (الف) ایک سے زائد یکساں درجہ کے اولیاء موجود ہوں تو جو ولی پہلے نکاح کر دے اس کا نکاح صحیح ہے۔

ب-اور قریب تر ولی کی موجودگی میں نسبتاً دور کا ولی نابالغ لڑکی یا لڑکے کا نکاح کر دے تو قریب تر ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا، البتہ اگر قریب تر ولی کی رائے سے بر وقت واقف ہونا ممکن نہ ہو اور تاخیر میں کفو کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو دور کے ولی کا کرایا ہوا نکاح درست ہے۔

---

[۱] گیارہواں فقہی سمینار (پٹنہ) بتاریخ ۲۹/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ-۲/محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۷-۱۹/اپریل ۱۹۹۹ء۔

فون، ویڈیو کانفرنسنگ اور انٹرنیٹ کے ذریعہ نکاح[1]

نکاح کا معاملہ بہ مقابلہ عقد بیع کے زیادہ نازک ہے، اس میں عبادت کا بھی پہلو ہے، اور گواہان کی شرط بھی ہے، اس لئے انٹرنیٹ، ویڈیو کانفرنسنگ اور فون پر راست نکاح کا ایجاب وقبول معتبر نہیں، البتہ اگر ان ذرائع ابلاغ پر نکاح کا وکیل بنایا جائے اور وہ گواہان کے سامنے اپنے مؤکل کی طرف سے ایجاب وقبول کرلے تو نکاح درست ہوجائے گا، اس صورت میں یہ بات ضروری ہوگی کہ گواہان وکیل بنانے والے غائب شخص سے واقف ہوں یا ایجاب وقبول کے وقت اس کا نام مع ولدیت ذکر کیا جائے۔

جبری نکاح[2]

۱- لڑکا یا لڑکی جب بالغ ہوجائے تو شریعت نے انہیں اپنی ذات کے بارے میں تصرف اور نکاح کے سلسلے میں رشتہ کے انتخاب کا حق دیا ہے۔ یہ حریت شخصیہ شریعت اسلامیہ کے امتیازات میں سے ہے، بلکہ آج مغرب ومشرق کی بہت سی قوموں نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ انہی اسلامی تعلیمات سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔

۲- اولیاء کی جانب سے بالغ لڑکی یا لڑکے کو ان کی خواہش اور رضا کا خیال کئے بغیر کسی رشتہ پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں، لہذا اولیاء کا اپنی رائے پر اصرار اور اس پر مجبور کرنے کے لئے طرح طرح کی دھمکیاں دینا، اسلام کے دیئے ہوئے حقوق سے محروم کرنے کی ناروا کوشش ہے، جو کسی طرح درست نہیں ہے۔

۳- لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی چاہئے کہ اپنے اولیاء کے انتخاب کردہ رشتے کو ترجیح دیں، کیونکہ اولیاء کی شفقت ومحبت اور ان کے تجربہ کی وجہ سے عموماً یہی امید ہے کہ اولیاء نے ان کے لئے رشتے کا انتخاب کرتے وقت ان کے مفادات کا پورا پورا لحاظ کیا ہوگا۔

۴- نکاح کے منعقد ہونے یا نہ ہونے کا تعلق نکاح کے وقت رضامندی کے اظہار سے ہے، لہذا اگر بالغ لڑکے یا لڑکی نے نکاح کے وقت رضامندی کا اظہار کردیا تو نکاح منعقد ہوجائے گا۔

۵- اگر قاضی شرعی اور قضاء کے کام کرنے والے اداروں وذمہ داروں کے سامنے یہ بات بتحقیق ثابت ہوجائے کہ اولیاء نے بالغ لڑکی کے نکاح کے سلسلے میں جبر وزبردستی سے کام لیا ہے، اور اس کو مجبور کرکے بوقت نکاح ہاں کرالیا ہے، اور لڑکی رشتہ ہوجانے کے بعد اس رشتہ کو باقی وبرقرار رکھنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے اور فسخ کا مطالبہ کرتی ہے اور شوہر نہ بطور خود اسے جدا کرتا ہے اور نہ خلع وطلاق پر آمادہ ہے تو قاضی شرعی کو دفع ظلم کی غرض سے فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

✧ ✧ ✧

---

[1] تیرہواں فقہی سمینار (کٹولی، لکھنؤ) بتاریخ ۱۸-۲۱ / محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶ / اپریل ۲۰۰۱ء۔

[2] تیرہواں فقہی سمینار (کٹولی، لکھنؤ) بتاریخ ۱۸-۲۱ / محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶ / اپریل ۲۰۰۱ء۔

نکاح میں کفاءت[1]

۱- اسلام تمام بنی نوع انسان کو ایک اور برابر تسلیم کرتا ہے اور آدمی آدمی کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتا اور بحیثیت انسان ہر ایک کو برابر عزت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ [حجرات/ ۱۳]۔

اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے انسانوں کی طبقاتی تقسیم اور رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں کو اعلیٰ اور گھٹیا سمجھنا گوارہ نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ [الاسراء/ ۷۰]۔

۲- اسلام نے بہت صاف لفظوں میں اخوت اسلامی کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ [حجرات/ ۱۰]۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا"۔ اور فرمایا: "مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد الواحد إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى"۔

اس لئے ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، کسی کا دوسرے کو ذات برادری کی بنیاد پر حقیر سمجھنا اور نسب و نسل اور زبان پر فخر کرنا اسلامی تعلیمات کی صریح خلاف ورزی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"لا يحل لمسلم أن يحقر أخاه المسلم، كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه"۔

۳- نکاح کے ذریعہ دو اجنبی مرد و عورت زندگی بھر کی رفاقت کا عہد و پیمان کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے رازدار، پردہ پوش اور وجہ سکون بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ [بقرہ/ ۱۸۷]۔

اور ارشاد ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً [الروم/ ۲۱]۔

اسلام نکاح کو استوار اور پائیدار دیکھنا چاہتا ہے اور ایسی ہدایات دیتا ہے جن پر عمل کرنے سے نکاح اپنے مقاصد کو پورا کرے اور میاں بیوی تاحیات خوشگوار زندگی گذار سکیں۔

۴- کفاءت کی حقیقت مماثلت اور یگانگت ہے، میاں بیوی کے درمیان فکر و خیال، معاشرت، طرز رہائش، دینداری وغیرہ میں یکسانیت یا قربت ہونے کی صورت میں اس کی زیادہ امید ہوتی ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار گذرے، اور رشتہ نکاح مستحکم ہو، بے جوڑ نکاح عموماً ناکام رہتے ہیں، اور اس ناکامی کے برے اثرات ان دونوں شخصوں سے متجاوز ہو کر دونوں کے گھروں اور خاندانوں تک پہنچتے ہیں، اس لئے احکام نکاح میں شریعت نے کفاءت کی رعایت کی ہے۔

۵- مسلمان عاقل بالغ لڑکے اور لڑکی کا باہمی رضامندی سے کیا گیا عقد نکاح شرعاً منعقد ہو جاتا ہے، کفاءت لزوم عقد میں مؤثر ہے، صحت و انعقاد نکاح میں نہیں۔

---

[1] گیارہواں فقہی سمینار (پٹنہ) بتاریخ ۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ-۲/ محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۷-۱۹/ اپریل ۱۹۹۹ء۔

۶- کوئی بھی غیر مسلم اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلم سوسائٹی کا معزز فرد بن جاتا ہے، اسے پشتینی مسلمانوں کے برابر حقوق واحترام حاصل ہو جاتا ہے۔ مسلمان لڑکیوں کا نکاح اگر نو مسلم نوجوانوں سے کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ جائز ہوگا بلکہ موجب اجر وثواب ہے۔

۷- مرد کو عورت کا کفو ہونا چاہئے، عورت مرد کی کفو ہو یا نہ ہو، واضح رہے کہ کفاءت کا اعتبار صرف عورت کی طرف سے ہے، یعنی ضروری ہے کہ شوہر عورت کے معیار کا ہو یا اس سے بڑھ کر۔ عاقل بالغ مرد نے کفو میں نکاح کیا ہو یا غیر کفو میں، شرعاً منعقد اور لازم ہے، اس پر مرد کے اہل خانہ کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

۸- اگر عاقلہ بالغہ خاتون نے غیر کفو میں ولی کی رضامندی کے بغیر نکاح کر لیا تو یہ نکاح شرعاً منعقد ہوگا، لیکن اولیا کو قاضی کے یہاں مرافعہ کا حق ہوگا۔

۹- کسی لڑکے یا اس کے گھر والوں نے رشتہ نکاح طے کرتے وقت غلط بیانی سے کام لیا اور اپنے نسب وخاندان یا معاشی وسماجی حالت کے بارے میں خلاف واقعہ باتیں بیان کر کے نکاح کر لیا لیکن بعد میں اس کی دھوکہ دہی اور غلط بیانی ظاہر ہوئی تو وہ نکاح منعقد ہوگا لیکن لڑکی یا اس کے اولیاء کو مرافعہ کا حق ہوگا۔

۱۰- مسئلہ کفاءت میں دینداری کا اعتبار تو ضروری ہے، دیگر امور ایسے ہیں جن کا تعلق عرف وعادت اور سماجی حالات سے ہے، اس لئے پوری دنیا اور تمام ممالک واقوام کے لئے امور کفاءت کی تعیین وتحدید یکساں نہیں ہوسکتی، لہذا ہر ملک وعلاقہ کے علماء وفقہاء وہاں کے عرف وعادات اور سماجی احوال کے پیش نظر امور کفاءت کی تحدید وتعیین کریں گے، بلا اس کے کہ کفاءت کو آپس میں عزت وذلت وشرافت اور رذالت کے ساتھ جوڑا جائے۔

عقد نکاح میں شرائط کی فقہی حیثیت [1]

۱- نکاح میں اگر ایسی شرطیں لگائی جائیں جو نکاح سے واجب ہونے والی ذمہ داریوں اور حقوق ہی کو مؤکد کرتی ہوں تو وہ معتبر ہیں اور شوہر پر ان کو پورا کرنا واجب ہے۔

۲- نکاح کے وقت ایسی شرائط عائد کرنا جو عقد نکاح کے تقاضوں کے خلاف ہوں یا شریعت نے ان سے منع کیا ہو، غیر معتبر ہیں، جیسے شوہر کا نفقہ نہ دینے کی شرط لگانا یا جہیز وتلک کی شرط لگانا۔

۳- نکاح کے وقت ایسی باتوں کی شرط لگائی جائے کہ شریعت نے ان کو نہ لازم وواجب قرار دیا ہے اور نہ ان سے منع کیا ہے، تو ایسی شرطوں کو پورا کرنا واجب ہے۔

مہر کا شرعی حکم [2]

اس اجلاس کا احساس ہے کہ مہر کی سونے اور چاندی کے ذریعہ تعیین عمل میں آئے تا کہ پوری طرح عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور سکوں کی قوت خرید میں کمی کی وجہ سے ان کو نقصان نہ پہنچے۔ ☆☆☆

---

[1] آٹھواں فقہی سمینار (علی گڑھ، یوپی) بتاریخ ۲۷-۲۹ / جمادی الاول ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۲-۲۴ / اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

[2] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱ / جمادی الاول ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱ / دسمبر ۱۹۸۹ء۔

مطالبہ جہیز شریعت کی نظر میں[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ اجلاس اس صورت حال پر اپنی سخت تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ آج ہماری عائلی زندگی میں لڑکوں کی خرید و فروخت کا مزاج ہو گیا ہے اور انہیں مال تجارت بنالیا گیا ہے، کبھی لڑکوں کی طرف سے، کبھی ان کے والدین اور اقرباء کی طرف سے، اور کبھی خود لڑکی والوں کی طرف سے نہ صرف یہ کہ قیمت لگائی جاتی ہے بلکہ بھاؤ تاؤ کیا جاتا ہے، اور کون زیادہ سے زیادہ دے گا اس کی تلاش کی جاتی ہے، شرعاً نکاح میں لڑکی والوں سے کچھ لینا، وہ چاہے تلک کے نام پر ہو یا گھوڑے جوڑے کے نام پر ہو، یا مروج قیمتی جہیز کے نام پر ہو جائز نہیں، شریعت نے 'أحل لکم ماوراء ذلکم أن تبتغوا بأموالکم' (قرآن کریم) کے حکم ربانی کے ذریعہ مردوں پر نکاح میں مال خرچ کرنے کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ آج ہم نے اس حقیقت کو بدل ڈالا ہے اور عورتوں کو نکاح کے لئے مال خرچ کرنا پڑتا ہے، کبھی صریح مطالبہ ہوتا ہے اور کبھی عادت اور عرف ورواج کے تحت یہ ہوتا ہے، یہ ساری صورت حال چاہے اس طرح کا مال لینا ہو یا پیشکش کرنا ہو، شرعاً جائز ودرست نہیں ہے۔

اکیڈمی کا یہ اجلاس تمام مسلمانان ہند کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ مسلم معاشرے کو ان خطوط پر متوجہ کریں جو محمد رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے تجویز کیا ہے، اور شادیوں کو ہر طرح سادہ رکھیں اور ارشاد نبوی "أعظم النکاح برکۃ أیسرہ مؤنۃ" کے مطابق بغیر جبر ودباؤ اور فرمائش و مطالبہ نیز اسراف وتبذیر کے، بطریق سنت نبویہ انجام دیں۔

حالت نشہ کی طلاق[2]

۱- اگر کسی شخص نے لاعلمی میں نشہ آور حرام چیز کا استعمال کیا اور اسے نشہ طاری ہو گیا، اسی حالت نشہ میں اس نے بیوی کو طلاق دے ڈالی تو یہ طلاق واقع نہ ہوگی۔

۲- کسی شخص نے اگر کسی نشہ آور حرام چیز کا استعمال ایسی صورت میں بہ طور دوا کے کیا جب ماہر مسلم اطباء کی رائے میں اس کے مرض کا علاج اسی نشہ آور چیز سے ہی ہو سکتا ہے، یا بھوک اور پیاس کی غیر معمولی شدت میں (کوئی حلال چیز فراہم نہ ہونے کی وجہ سے) جان بچانے کے لئے نشہ آور چیز کا استعمال کیا اور اسے نشہ طاری ہو گیا۔ حالت نشہ میں اس شخص نے بیوی کو طلاق دے دی تو یہ طلاق واقع نہ ہوگی۔

۳- کسی شخص کو شراب یا کسی دوسری نشہ آور چیز کے استعمال پر مجبور کیا گیا۔ جبر واکراہ کی وہ صورت اختیار کی گئی جس میں اس کے لئے اس حرام چیز کا استعمال کرنا جائز ہو گیا، اس لئے اس نے نشہ آور چیز کا استعمال کیا اور نشہ طاری ہونے پر بیوی کو طلاق دے ڈالی تو یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

۴- جائز وحلال چیز کے استعمال سے اگر کسی شخص کو نشہ طاری ہو گیا اور حالت نشہ میں اس نے بیوی کو طلاق دے دی تو یہ طلاق شرعاً معتبر نہ ہوگی۔

۵- کسی شخص نے شراب یا کسی اور نشہ آور حرام چیز کا استعمال اپنی رضامندی سے جان بوجھ کر کیا اور اسے نشہ طاری ہو گیا لیکن وہ نشہ کی ابتدائی

---

[1] تیرہواں فقہی سمینار (کنولی، لکھنؤ) بتاریخ ۱۸-۲۱/محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶/اپریل ۲۰۰۱ء۔

[2] بارہواں فقہی سمینار (بستی، یوپی) بتاریخ ۵-۸/ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۱-۱۴/فروری ۲۰۰۰ء۔

حالت میں ہے جس میں ایک قسم کا سرور طاری ہوتا ہے البتہ ہوش وحواس برقرار رہتے ہیں اور انسان بات سمجھتا ہے۔ اسی حالت میں وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو اس کی طلاق واقع ہوگی۔

۲- اور اگر اس حالت میں اس کو شدید نشہ طاری ہو گیا، جس کی وجہ سے ہوش وحواس برقرار نہ رہا، بالکلیہ ہوش وحواس کھو بیٹھا، اور اس حالت میں اس نے الفاظ طلاق استعمال کئے تو اس کی طلاق واقع ہوئی یا نہیں اس سلسلہ میں شرکاء سمینار دو رائے رکھتے ہیں:

الف- اکثر شرکاء سمینار اس طلاق کو واقع نہیں مانتے، ان میں سے چند اہم نام یہ ہیں:

۱- مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب ۲- مولانا سید نظام الدین صاحب (امیر شریعت بہار واڑیسہ)

۳- مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب ۴- قاضی عبدالجلیل صاحب (قاضی امارت شرعیہ)

۵- مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب ۶- مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب (قاضی لکھنو)

۷- مولانا ابوالعاص وحیدی صاحب ۸- مفتی جنید عالم ندوی صاحب (مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ)

۹- مولانا محمد سلمان حسینی ندوی صاحب ۱۰- مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی صاحب

۱۱- مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب ۱۲- مفتی جمیل احمد نذیری صاحب

۱۳- مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب ۱۴- مولانا صباح الدین ملک قاسمی صاحب

۱۵- مفتی نسیم احمد قاسمی صاحب ۱۶- مولانا خورشید احمد قاسمی صاحب

۱۷- مولانا شفیق احمد مظاہری صاحب (بردوان) ۱۸- مولانا مبارک حسین ندوی صاحب (نیپال)

۱۹- مولانا خورشید انور اعظمی صاحب ۲۰- مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب

۲۱- مولانا قاری ظفر الاسلام صاحب ۲۲- مولانا راشد حسین ندوی صاحب

۲۳- مولانا ریاض احمد سلفی صاحب ۲۴- مولانا اسرار الحق سبیلی صاحب

ب- درج ذیل حضرات طلاق واقع ہونے کے قائل ہیں:

۱- مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب ۲- مفتی عبدالرحمن صاحب (دہلی)

۳- مفتی محبوب علی وجیہی صاحب ۴- مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب

۵- مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب ۶- مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب

۷- مولانا ابوبکر قاسمی صاحب ۸- مولانا ابوجندل صاحب

۹- مولانا اختر امام عادل صاحب ۱۰- مولانا تنویر عالم قاسمی صاحب

۱۱- مولانا عبداللطیف پالنپوری صاحب ۱۲- مفتی سعید الرحمن صاحب ممبئی

۱۳- مولانا عبدالقیوم صاحب ۱۴- مولانا عبداللہ مظاہری صاحب بستی

۱۵- قاضی کامل صاحب ۱۶- مولانا نذیر احمد کشمیری صاحب

۱۷- مولانا احمد دیولوی صاحب ۱۸- مولانا جمال الدین صاحب

۱۹- مولانا محمد حمزہ گورکھپوری صاحب ۲۰- مولانا ابرار خاں ندوی صاحب

خواتین کی میراث[1]

ملک بھر سے آئے ہوئے علماء اور فقہاء اور اصحاب افتاء کا یہ اجتماع اس بات پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ صوبہ اتر پردیش میں ابھی تک خواتین کے ساتھ وراثت کے معاملہ میں بے انصافی اور ظلم جاری ہے۔ یوپی کے موجودہ قانون کے مطابق خواتین کو زراعتی اراضی میں مرد وارثان کی موجودگی میں وراثت کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہ قانون ہندوستان کے آئین اور شریعت اسلامیہ سے متصادم ہے۔

اس سمینار کے شرکاء اس بات پر بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء کی دفعہ ۲ سے زراعتی اراضی کو نکال دیا گیا ہے جس کی بنیاد پر مسلمان خواتین اپنے شرعی حق وراثت سے قانونی طور پر محروم ہوگئی ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ علماء کرام نے اس سلسلہ میں کئی فتاویٰ جاری کئے ہیں جن کی وجہ سے زیادہ تر مسلم خاندانوں میں وراثت کی تقسیم قرآن وسنت کی روشنی میں کی جاتی رہی ہے۔

اس سب کے باوجود بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یوپی زمینداری ایکٹ اور شریعت ایکٹ میں فوراً ترمیم کی ضرورت ہے تاکہ خواتین کو عام طور سے اور مسلم خواتین کو خاص طور سے ان کے حق وراثت سے محروم نہ کیا جاسکے۔

مسلم وغیر مسلم تعلقات[2]:

۱- اسلام کا اپنا ایک مستقل نظام حکمرانی ہے۔ لیکن موجودہ عالمی حالات میں دوسرے غیر اسلامی نظامہائے حکومت کے مقابلہ میں مزوج جمہوری نظام ہی مسلم اقلیتوں کے لئے قابل ترجیح ہے۔ لہٰذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لئے انتخابی مہم چلانا جائز ہے۔

۲- مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات کا تقاضا ہے کہ وہ ووٹ دینے کا قانونی حق بھرپور طریقہ سے استعمال کریں۔

۳- جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ، اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو، ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو۔

۴- جمہوری سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کئے جاسکتے ہیں۔

[1] تیرہواں فقہی سمینار (کٹولی لکھنؤ) بتاریخ ۱۸-۲۱/محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶/اپریل ۲۰۰۱ء۔

[2] چودہواں فقہی سمینار (حیدرآباد) بتاریخ ۱-۳/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰-۲۲/جون ۲۰۰۴ء۔

۵- ملک اور انسانیت کے نفع اور معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے اور ان کے اشتراک سے تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔

۶- مسلمانوں کو ایسی جگہ رہائش اختیار کرنی چاہئے جہاں وہ اپنے دین وایمان اور اپنے تشخص کو برقرار رکھ سکیں اور تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہئے جس سے اپنے دینی وملی تشخص کی حفاظت کرسکیں۔

۷- اسلام میں غیر مسلم پڑوسیوں اور اہل تعلق کے بھی حقوق ہیں، اس لئے ان کی بیماری وغم کے موقعوں پر ان کی عیادت وتعزیت کی جائے گی۔

۸- وندے ماترم جیسے گیت میں شرکیہ الفاظ ہیں اور ہندوستان کی سرزمین کو معبود کا درجہ دیئے جانے کا تصور پایا جاتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے اس جیسے گیت کا پڑھنا شرعاً حرام ہے۔ اور ان پر اس سے احتراز کرنا لازم ہے۔

۹- اگر غیر اسلامی قانون شہادت یا دوسرے قوانین کی بنیاد پر کسی مسلمان کے حق میں خلاف شرع فیصلے ہوجائیں تو اس کے لئے اس سے استفادہ جائز نہیں ہے۔ یہ سمینار تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ اپنے تنازعات دارالقضاء ہی میں لے جائیں اور وہاں جو فیصلہ ہو اس کو قبول کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض مقدمات میں مسلمان قاضی کا فیصلہ ہی شرعاً معتبر ہے۔

۱۰- وحدت ادیان کا تصور غیر اسلامی ہے اور کتاب وسنت کی رو سے باطل اور عملی طور پر غیر مفید ہے، بلکہ یہ دراصل اسلام کے تشخص کو مٹانے کی ایک گہری سازش اور مسلمانوں کو گمراہی پر ڈالنے کی ایک ناپاک کوشش ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو ایسے فتنہ سے بچنا چاہئے۔

۱۱- اسلام انسانیت کا احترام کرتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے حتی المقدور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مظلوم غیر مسلم بھائیوں کی مدد کرنا ان کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔

۱۲- مسلمانوں کی طرف سے چلائے جانے والے خدمت خلق کے اداروں مثلاً ہاسپٹل وغیرہ کے ذریعہ بلاتفریق مذہب تمام لوگوں کی خدمت و اعانت کرنی چاہئے، یہی انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے، البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ زکاۃ کی رقم صرف مستحق مسلمانوں ہی پر خرچ کی جائے۔

۱۳- اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ قدرتی آفات کے موقع پر مسلم تنظیموں کی جانب سے برادران وطن کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا جائے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جائے۔

☆☆☆

تعلیم گاہوں میں جنسی تعلیم[1]

انسانی زندگی میں مختلف مراحل پیش آتے ہیں، زندگی کا ایک اہم مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب لڑکے اور لڑکیاں بلوغ کی منزل میں قدم رکھتے ہیں، بالغ ہونے کے بعد انسان سے جو ضروریات اور تقاضے متعلق ہوتے ہیں وہ فطری ہیں، اور اس لئے عام طور پر اس سلسلہ میں مستقل تعلیم کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ قبل از وقت بلوغ اور اس کے بعد ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ضرورتوں کا ادراک انسان کو بے راہ روی کی طرف لے جاتا ہے؛ اس لئے حکومت ہند تعلیم گاہوں میں جنسی تعلیم سے متعلق جو منصوبہ بنارہی ہے، سمینار اسے نہایت تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے۔ سمینار کا احساس ہے کہ:

۱- پرائمری اور مڈل سطح سے طلبہ اور طالبات کو جنسی تعلیم دینا اور انہیں صنفی اعضاء کے وظائف کے بارے میں بتانا دراصل مغربی ایجنڈ ہے جسے حکومت ہند نے قبول کرلیا ہے، یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے مغائر ہے، بلکہ خود ہندوملکی روایات اور مشرقی اقدار کے بھی خلاف ہے اور حکومت کو ایسی باتوں سے مکمل طور پر باز رہنا چاہئے، ورنہ اس کے اخلاقی اثرات نہایت نامناسب ہوں گے۔

۲- درحقیقت ضرورت اخلاقی تعلیم وتربیت کی ہے، جو نوجوانوں کو غیر قانونی روابط اور جنسی انحراف سے بچائے، ایڈز اور اس جیسی بیماریوں سے بچانے کا صحیح طریقہ اخلاقی تعلیم اور غیر شرعی تعلق سے مردوں اور عورتوں کو بچانا ہے، نہ کہ غیر قانونی تعلیمات کو محفوظ طریقہ پر انجام دینا، یہ تو گناہ اور برائی کی دعوت ہے، جو اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً جائز نہیں، نیز یہ سماج کے لئے اخلاق اور صحت دونوں ہی اعتبار سے تباہ کن ہے۔

۳- سمینار حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ تعلیم گاہوں میں جنسی تعلیم کے منصوبہ کو بلا تاخیر واپس لے لے، ہاں، اس کے بجائے اخلاقی تعلیم کے مواد کو شامل کیا جاسکتا ہے، جو تمام مذاہب کی مشترکہ ومسلّمہ اخلاقی اقدار پر اس طرح مشتمل ہو کہ نصاب پر کسی ایک مذہب کی چھاپ محسوس نہ ہو۔

قیدیوں کے حقوق[2]

عصر حاضر میں، بیرون ملک میں قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کے واقعات جس کثرت سے پیش آرہے ہیں، وہ ہر انسان دوست اور انصاف پسند شخص کے لئے لمحۂ فکریہ ہے، اس تناظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا یہ سمینار اسلامی واخلاقی نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے درج ذیل تجاویز منظور کرتا ہے:

۱- کوئی شخص جرم کا مرتکب ہو تب بھی اس کے انسان ہونے کی حیثیت باقی رہتی ہے، اسے اس کے جرم کی سزا ضرور ملنی چاہئے؛ لیکن وہ انسانی توقیر واحترام کے حق سے محروم نہیں ہوجاتا۔

۲- اگر کسی شخص پر جرم کا الزام ہو، تو جب تک وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ نہیں جائے، اس کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ اس کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کیا

[1] سترہواں فقہی سمینار (برہان پور، ایم پی) بتاریخ ۲۸-۳۰/ربیع الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ۵-۷/اپریل ۲۰۰۸ء۔

[2] اٹھارہواں فقہی سمینار (مدورائی، تامل ناڈ) بتاریخ ۲-۴/ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۸/فروری-۲/مارچ ۲۰۰۹ء۔

جاسکتا ہے

۳- کسی الزام کی بنیاد پر قید کرنا جائز ہے؛ بشرطیکہ کسی قوی قرینہ سے ہی الزام کی تائید ہو رہی ہو، یا ملزم پر شک کئے جانے کی واضح علامتیں موجود ہوں اور ایسی صورت میں قید کی مدت عدالت کی صوابدید پر ہے؛ لیکن یہ مدت اتنی طویل نہ ہونی چاہئے، جو کسی ثابت شدہ جرم پر دی جاتی ہے۔

۴- قیدیوں کے حقوق:

الف- بلاتفریق مذہب جملہ قیدیوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادت وعمل کی آزادی حاصل ہوگی، نیز اس کی مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کی جائے گی اور وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے، اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز کیا جائے گا۔

ب- قیدیوں کو جسمانی ضروریات- مثلاً: مناسب غذا، صاف پانی اور موسم کے لحاظ سے کپڑے، نیز علاج ومعالجہ کی سہولیات- فراہم کی جائیں گی، ان کو حفظان صحت کے لئے ورزش کی اجازت ہوگی، قیدیوں کو ایسی تنگ جگہ میں رکھنا درست نہیں، جہاں ٹھیک سے کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہو یا ہوا اور روشنی کا مناسب نظم نہ ہو۔

ج- قیدیوں کو سماجی حقوق- مثلاً: تعلیم وہنر سیکھنے، عام حالات میں دیگر قیدیوں سے ملاقات کرنے اور عزیز واقارب سے رابطہ کرنے کے حقوق حاصل ہوں گے، جہاں تک ریڈیو اور ٹی وی کا تعلق ہے تو یہ عموماً تفریحی چیزوں کا حصہ ہوتی ہیں؛ لہذا اس کی اجازت دینا ضروری نہیں؛ البتہ اخبارات پڑھنے کی اجازت دینا حکومت کی صوابدید پر ہے۔

د- مردوں اور عورتوں کو الگ الگ قید خانوں میں رکھا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ عورتوں کے حصہ کی نگراں افسر بھی خاتون ہی ہو، زنانہ قید خانہ میں اندرونی دیکھ بھال کا کام بھی عورتیں ہی سنبھالیں اور اسی طرح نابالغ اور بالغ قیدیوں کو بھی الگ الگ رکھا جائے۔

۵- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں کا نارکو اٹیسٹ کرنا، انہیں بے لباس کرنا، الکٹرک شاک لگانا، ان پر کتے چھوڑنا، ان کو برف کی سلوں پر ڈالنا، انہیں مسلسل جگنے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی کرنا یا تیز آواز سنانا یہ تمام امور ناجائز، غیر اخلاقی اور غیر انسانی ہیں، اسی طرح ایسی سزائیں جن سے کسی عضو کو نقصان پہنچے، یا اس کے تلف ہوجانے کا اندیشہ ہو یا ذہنی ودماغی صحت متاثر ہونے کا خطرہ ہو، بھی حرام ہے۔

۶- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا، ہتھکڑی پہنانا یا بیڑی ڈالنا شرعاً ناجائز ہے، البتہ اگر قیدی خطرناک اور عادی مجرم ہو، جس سے فرار ہونے کا یا خود یا دوسروں کو نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہو تو اس کو قابو میں رکھنے کے لئے قانون کی حدود میں مناسب تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔

۷- اگر مصلحت متقاضی ہو تو مجرم کو اتنے دنوں کی قید تنہائی دی جاسکتی ہے، جس کی میڈیکل آفیسر اجازت دے، اور یہ اتنی طویل نہ ہو کہ قیدی ذہنی مریض ہوجائے۔

۸- جبری کام لیا جانا اگر سزا کا حصہ ہو تو بطور تعزیر قیدی سے اس کے حسب طاقت جبری کام لیا جاسکتا ہے اور اس صورت میں وہ اجرت کا مستحق نہ ہوگا؛ البتہ حکومت اپنے قانون کے تحت اجرت دے تو یہ اس کے لئے حلال ہوگی، بصورت دیگر وہ اجرت کا مستحق ہوگا۔

۹- زیر سماعت قیدیوں کو اصولی طور پر بے قصور تصور کیا جائے، ایسے قیدی مجرم نہیں؛ بلکہ ملزم ہوتے ہیں، ان کے ساتھ مجرموں جیسا رویہ جائز نہ

اختیار کیا جائے؛ لہذا ان سے جبری کام لینا درست نہیں اور دیگر قیدیوں کے مقابلہ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک ضروری ہے۔

۱۰- زیر سماعت قیدیوں کو سماعت سے پہلے اتنے دنوں تک قید میں رکھنا جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا کے برابر ہے، درست نہیں، نیز فیصلے یا تحقیق حال میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے کہ دوران مقدمہ قید کی مدت سزا کی مدت سے لمبی ہو جائے اور اگر ایسا ہو تو اسے فوراً رہا کر دیا جائے۔

۱۱- بے قصور قیدی کو زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت کا مالی ہرجانہ دینا واجب ہے۔

۱۲- قیدی کو مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ کرنے، اپنے عزیز واقارب سے مشورہ کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے سارے حقوق حاصل ہوں گے۔

۱۳- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کی اجازت ہوگی۔

۱۴- اجلاس نے محسوس کیا کہ ملک میں قید خانوں اور قیدیوں کے تعلق سے جو قوانین اور قواعد نافذ ہیں، ان میں اکثر ان امور کا لحاظ رکھا گیا ہے، جو اسلامی نقطۂ نظر سے اوپر بیان کئے گئے ہیں؛ تاہم عملاً ان کو بہت کم نافذ کیا جاتا ہے؛ اس لئے یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ مذکورہ تمام حقوق قیدیوں کو عملی طور پر دیئے جائیں، اجلاس میں اس احساس کا بھی اظہار ہوا کہ عام طور پر کسی ٹھوس شہادت کے بغیر قانون اور سپریم کورٹ کی ہدایات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے شہریوں کو گرفتار کیا جاتا ہے، گذشتہ چند سالوں میں مسلم نوجوانوں کی اس طرح گرفتاری کے متعدد واقعات ہو چکے ہیں، جنہیں گرفتار کرنے کے بعد اذیت پہنچائی جاتی ہے، ٹارچر کیا جاتا ہے، کئی دنوں تک اپنی تحویل میں رکھنے کے بعد پولیس ان کی گرفتاری درج کرتی ہے اور عدالت میں پیش کرتی ہے، پولیس اور نفاذ قانون کے اداروں کے اس رویہ اور حکومت کی چشم پوشی کے نتیجے میں ملک میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے اور ملک کی جمہوریت داغدار ہو رہی ہے؛ اس لئے یہ اجلاس مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ پولیس کو قانون وقواعد اور سپریم کورٹ کی ہدایات کا پابند بنائے، اس کی خلاف ورزی کرنے والے عہدہ داروں کے خلاف عبرتناک کاروائی کرے اور سخت ہدایات جاری کی جائیں کہ قوی اور ٹھوس بنیاد کے بغیر کسی کو گرفتار نہ کیا جائے اور تعذیب اور ٹارچر کا طریقہ بالکل ختم کر دیا جائے۔

۱۵- اجلاس کا یہ بھی احساس ہے کہ امریکہ اور بعض یورپی ممالک نے دہشت گردی کا بہانہ بنا کر مختلف مقامات پر جو عقوبت خانے بنائے ہیں اور جن میں وحشیانہ طریقہ پر ایذاء پہنچائی جاتی ہے، یہ بین الاقوامی میثاقات اور اصولوں کی کھلی خلاف ورزی اور انسانیت سوز حرکت ہے، جس کا نوٹس اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں اور حقوق انسانی وشہری آزادیوں کی بین الاقوامی انجمنوں کو لینا چاہئے، ہم ان سب سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان عقوبت خانوں اور ان میں روا رکھے جانے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کریں، عالمی ادارے ان ممالک کے خلاف تہدیدات عائد کریں اور انہیں بین الاقوامی قوانین پر عمل کرنے کے لئے مجبور کریں۔

۱۶- سمینار اس صورت حال پر گہری تشویش ظاہر کرتا ہے کہ ملک کے بعض علاقوں میں بار کونسلیں اور وکلاء ان لوگوں کا مقدمہ لینے سے انکار کر رہے ہیں، جن کے خلاف دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے؛ حالاں کہ قانونی دفاع ہر شخص کا حق ہے اور یہ ایک مسلمہ عالمی قانون ہے کہ ملزم کو مجرم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، نہ ملک کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ یہ اخلاقی وانسانی تقاضوں کے مطابق ہے، وکلاء اور یہ ادارے انصاف قائم کرنے کے لئے ہیں، ان کا ایسی غیر منصفانہ حرکتوں کا مرتکب ہونا نہایت افسوسناک ہے؛ اس لئے سمینار وکلاء برادری اور بار کونسلوں سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایسے غیر قانونی رویہ سے گریز کریں اور حکومت سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کا سدباب کرے۔

غیر مسلم ممالک میں عدالت کے ذریعہ طلاق[۱]

۱- غیر مسلم ممالک کی عدالت کا جج اگر مسلمان ہو اور وہ فیصلہ کرتے وقت شرعی ضوابط کو ملحوظ رکھتا ہے تو اسے مسلم حاکم کے قائم مقام تسلیم کرتے ہوئے فسخ نکاح کے سلسلہ میں اس کا فیصلہ معتبر ہوگا۔

۲- جن غیر مسلم ممالک میں حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے لئے شرعی اصولوں کے مطابق قضاء کا نظام قائم نہیں ہے، وہاں کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ ارباب حل وعقد کے مشورے سے دارالقضاء، شرعی پنچایت یا ان جیسے ادارے قائم کریں اور اپنے نزاعات ومعاملات میں ان ہی کی طرف رجوع کریں۔

۳- طلاق چونکہ ابغض المباحات ہے، اس لئے اسے اختیار کرنے سے پہلے پورے طور پر مصالحت اور نباہ کی صورت نکالنی چاہئے اور حتی الامکان طلاق وخلع سے بچنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔

۴- غیر مسلم ممالک کی عدالت میں شوہر قانونی مجبوری کے تحت غیر مسلم جج کو درخواست دیتا ہے کہ میرا رشتہ نکاح ختم کردیا جائے اور جج تفریق کا فیصلہ کرتا ہے، تو جج کے فیصلہ تفریق کو طلاق بائن مانا جائے گا؛ البتہ بہتر ہے کہ عدالت کے فیصلہ کے بعد شوہر اپنی زبان سے بھی الفاظ طلاق کہہ دے۔

۵- اگر غیر مسلم ممالک کی عدالت میں غیر مسلم جج کے سامنے عورت رشتہ ازدواج کو ختم کرنے کے لئے درخواست دیتی ہے اور غیر مسلم جج اس کی درخواست پر شوہر کی اجازت سے تفریق کا فیصلہ کرتا ہے تو معتبر ہے، ورنہ یہ تفریق شرعاً معتبر نہیں ہوگی، ایسی صورت میں عورت یا تو شوہر سے خلع حاصل کرے یا دارالقضاء وشرعی پنچایت کے ذریعہ نکاح فسخ کرائے۔

مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام[۲]

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام سے متعلق مقالات، ان کی تلخیص اور عرض کو سامنے رکھ کر بحث ومباحثہ کے بعد درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

۱- مشترکہ خاندانی نظام ہو یا جداگانہ، دونوں کا ثبوت عہد رسالت اور عہد صحابہ سے ملتا ہے؛ لہٰذا دونوں ہی نظام فی نفسہ جائز ودرست ہیں۔ جہاں جس نظام میں شریعت کے حدود وقوانین کی رعایت وپاسداری اور والدین ودیگر زیر کفالت افراد اور معذورین کے حقوق کی حفاظت ہوسکے اور فتنہ ونزاع سے بچا جاسکے اس نظام پر عمل کرنا بہتر ہوگا، کسی ایک نظام کی تحدید نہیں کی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ اجلاس تمام مسلمانوں سے یہ اپیل کرتا ہے کہ مورث کے انتقال کے بعد جتنی جلدی ممکن ہو ترکہ کی تقسیم کرکے تمام شرعی وارثین کو ان کا متعینہ حصہ دے دیں تاکہ ایک دوسرے

---

[۱] انیسواں فقہی سمینار (ہانسوٹ، گجرات) بتاریخ ۲۷ تا ۳۰/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ، مطابق ۱۲ تا ۱۵/فروری ۲۰۱۰ء۔

[۲] بیسواں فقہی سمینار (رامپور، یوپی) بتاریخ ۲۹/ربیع الاول-۱/ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۵-۷/مارچ ۲۰۱۱ء۔

کے حقوق کا غلط استعمال نہ ہو اور یہ عمل باہمی نزاع اور نفرت وعداوت کا سبب نہ بن جائے۔ یہ اجلاس خاص طور سے عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف مسلمانوں کی توجہ کو مبذول کرانا چاہتا ہے؛ کیونکہ اس میں بہت زیادہ کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔

۲- مشترکہ خاندانی نظام کی بنیاد ایثار وقربانی اور باہمی تعاون پر ہے ورنہ یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا ہے، نیز عدل وانصاف کو قائم رکھنا بھی ضروری ہے، لہٰذا اگر خاندان کے سبھی افراد صاحب استطاعت ہوں تو زیر کفالت افراد کی تعداد کے اعتبار سے اخراجات دیں گے، اور اگر کوئی مالی اعتبار سے کمزور ہو تو ہر شخص اپنی آمدنی کے تناسب سے اخراجات برداشت کرے گا؛ البتہ خاندان کے سبھی حضرات کو چاہئے کہ جائز ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ کمانے والوں پر بوجھ نہ پڑے۔

۳- جب آمد وخرچ دونوں مشترک ہوں تو اخراجات کے بعد بچی ہوئی رقم سے خریدی گئی چیز میں سبھی افراد برابر کے حقدار ہوں گے۔

۴- جب سبھی بھائیوں کا ذریعہ آمدنی الگ الگ ہو اور سبھوں نے برابر برابر رقم جمع کی اور ایک بھائی نے اپنی زائد آمدنی کو بچا کر اپنے پاس رکھا تو یہ بھائی اپنی زائد آمدنی کا خود مالک ہوگا، دوسرے بھائی اس کے حقدار نہیں ہوں گے۔

۵- الف:...... اگر خاندان کے افراد کسی معاہدہ کے تحت کام کرتے ہوں تو جو بھی آمدنی ہوگی وہ خاندان کے سبھی افراد کے درمیان حسب معاہدہ تقسیم ہوگی خواہ وہ گھر پر کام کرتے ہوں یا باہر۔

ب:...... اگر کاروبار ایک ہی ہو، کچھ لوگ گھر پر کام کرتے ہوں اور کچھ لوگ گھر کے باہر تو اس صورت میں کل آمدنی سبھی افراد کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگی

ج:...... اگر الگ الگ کاروبار ہو اور ان کے درمیان کسی طرح کا معاہدہ نہ ہو تو باہر کمانے والوں کی آمدنی میں گھر کا کام دیکھنے والے حقدار نہیں ہوں گے۔

۶- والدین کی خدمت وکفالت لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں پر بھی حسب استطاعت واجب ہے۔ اگر ماں کو ایسی خدمت کی ضرورت ہو جس کو کوئی عورت ہی انجام دے سکتی ہے اور بہو کے علاوہ کوئی دوسری قریبی عورت خدمت کرنے والی نہ ہو نیز ماں مجبور ہو، خود سے وہ کام انجام دینے کے لائق نہ ہو تو ایسی صورت میں بہو پر ساس کی خدمت واجب ہوگی۔

۷- مشترک خاندان میں بھی شرعی پردہ کا اہتمام کیا جائے، کسی غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں ملنے سے، اور ہنسی مزاق نیز غیر ضروری گفتگو سے اجتناب کرنا لازم ہے، البتہ احتیاط کے باوجود اگر سامنا ہو جائے اور ہر طرح کے فتنہ سے بچنے کی کوشش ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۸- سماج کے معمر اور سن رسیدہ افراد انسانی سماج کے لئے بیش قیمت سرمایہ ہیں، ان کی راحت رسانی اور خدمت انسانی سماج کی ذمہ داری ہے، خصوصاً اولاد اور افراد خاندان کی ذمہ داری ہے کہ بوڑھوں کی خدمت کریں، ان کی عزت وتکریم کریں، اور انہیں اپنے ساتھ محبت اور الفت کے ساتھ رکھیں اور ان کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھیں۔

☆☆☆

آبی وسائل اور ان کے شرعی احکام[1]

پانی اللہ تعالیٰ کی بڑی اہم نعمت ہے، یہ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق بہت سے احکام دیئے، لہٰذا اس کی قدر کی جائے اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے پانی میں اسراف کی ممانعت کردی گئی، اور اس کو آلودہ کرنے سے سختی سے منع کردیا گیا ہے، اور چونکہ سبھی کو اس کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے اس میں کسی کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی گئی، نہ ہی ایسی ذخیرہ اندوزی کرنے کی اجازت دی گئی جو کسی کی حق تلفی کا سبب ہے۔

۱- جن امور میں پانی استعمال کرنے کی اجازت ہے ان میں بلاضرورت یا ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا اسراف ہے۔

۲- موقوفہ پانی میں اسراف کرنا حرام ہوگا اور اگر مملوکہ ومباح پانی ہے تو اس میں مکروہ ہوگا۔

۳- شریعت نے پانی کو صرف پاک رکھنے ہی کے احکام نہیں دیئے ہیں بلکہ پانی کو آلودگی سے بچانے کے لئے بھی شریعت نے متعدد احکام دیئے ہیں؛ لہٰذا یہ بھی ضروری ہے۔

۴- پانی کی قلت کے پیش نظر اگر حکومتیں مفاد عامہ کی خاطر پانی کے بعض استعمالات پر پابندی لگاتی ہیں تو یہ درست ہے اور اس پر عمل ضروری ہے بشرطیکہ یہ پابندی کسی شرعی یا طبعی ضرورت کو پورا کرنے میں رکاوٹ نہ ہو۔

۵- مملوکہ زمین کے نیچے پانی مباح الاصل ہے کسی کی ملک نہیں، بوقت ضرورت مصلحت عامہ کے پیش نظر حکومت بورنگ کرانے سے روک سکتی ہے۔

۶- پانی کی حفاظت اور اس کا ذخیرہ کرنا اصلاً حکومت کی ذمہ داری ہے تاہم افراد پر بھی اس کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے کہ زیر زمین پانی کی مناسب سطح باقی رکھنے کے لئے مناسب تدبیر اختیار کریں اور تعاون کریں۔

۷- بوقت ضرورت مفادہ عامہ کے پیش نظر ڈیم تعمیر کرنے کے لئے آبادی منتقل کی جاسکتی ہے بشرطیکہ فوری ایسا عادلانہ معاوضہ ادا کیا جائے جو لوگوں کے لئے تلافی مافات اور بازآبادکاری کے لئے کافی ہوسکے۔

۸- یہ ضروری ہے کہ سیلاب کے موقع سے بالائی اور نشیبی دونوں آبادیوں کے تحفظ کا خیال رکھا جائے اور حتی الامکان وہ صورت اختیار کی جائے جس میں کم سے کم نقصان ہو۔

۹- اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنا بغیر دوسروں کو ضرر پہنچائے درست ہے۔

۱۰- نہروں سے استفادہ بقدر ضرورت جائز ہے بشرطیکہ اس سے نہروں اور دوسرے لوگوں کو نقصان نہ ہو۔

۱۱- وہ تمام صورتیں جن میں پانی کو کسی چھوٹے بڑے برتن یا چیز میں بالقصد محفوظ کرلیا جائے، ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، البتہ پانی کو مملوک بنانے کے لئے ایسی شکل اختیار نہ کی جائے جس سے عوام الناس کو ضرر لاحق ہو۔

---

[1] بیسواں فقہی سمینار (رامپور، یوپی) بتاریخ: ۲۹ / ربیع الاول - ۱ / ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۵-۷ / مارچ ۲۰۱۱ء۔

۱۲- پانی پر ملکیت حاصل ہونے والی تمام شکلوں میں پانی کی تجارت جائز ہے جبکہ مفاد عامہ متاثر نہ ہو، لہٰذا عوامی نلوں اور پانی کے ذخائر سے اپنے حق سے زیادہ لے کر اور دوسروں کو ان کے حق سے محروم کر کے اس پانی کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

۱۳- نشیبی علاقوں میں پلاٹنگ کر کے انہیں فروخت کرنا اور آبادیاں بسانا جب کہ ضرر عام لاحق ہو، درست نہیں ہے؛ خواہ حکومت کی طرف سے ممانعت ہو یا نہ ہو

۱۴- ہر شہری کو پانی کی فراہمی حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ہے، وہ اس پر مناسب معاوضہ بھی لے سکتی ہے، اور معاوضہ پر قدرت رکھنے والوں سے اجرت نہ ادا کرنے کی صورت میں پانی روک لینے کا حق رکھتی ہے۔

۱۵- پانی کی نکاسی کا نظام بنانا اور شہریوں کی صحت کا خیال رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور عوام کا فریضہ ہے کہ وہ حکومت کے ایسے نظام وقوانین کا لحاظ رکھیں۔

شقاق بین الزوجین[1]

۱- اسلام میں نکاح ایک پاکیزہ اور مقدس رشتہ ہے، اور شریعت چاہتی ہے کہ اس رشتہ میں حتی المقدور دوام واستحکام ہو، اس لئے کسی واقعی معتبر سبب کے بغیر مرد کا طلاق دے دینا یا عورت کا خلع کا مطالبہ کرنا انتہائی ناپسندیدہ اور مذموم عمل ہے؛ اس لئے شوہر و بیوی کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو اس رشتہ کو ٹوٹنے سے بچائیں، اور اگر کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو قرآن مجید نے ایسے نزاعات کو حل کرنے کے لئے جو تدابیر ذکر کی ہیں ان کو اختیار کریں، اور ایک دوسرے کے ساتھ تحمل اور عفو و درگذر سے کام لیں۔

۲- اگر زوجین کے تعلقات خوشگوار باقی نہ رہیں، نکاح کے مقاصد سکون اور باہمی محبت ومودت فوت ہونے لگیں اور بیوی طلاق کا مطالبہ کرے تو شوہر کو چاہئے کہ طلاق دے دے، محض ایذا رسانی کی غرض سے اسے معلق بنا کر نہ رکھے، اور اگر شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو بیوی خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے اور ایسی صورت میں شوہر کو چاہئے کہ خلع قبول کر کے عورت کو آزاد کر دے۔

۳- زوجین کے درمیان ایسی تلخی جس کی وجہ سے موافقت مشکل نظر آئے اسے ''شقاق'' کہتے ہیں۔

۴- زوجین کے اولیاء کا بھی فریضہ ہے کہ وہ شقاق کی صورت میں ان کے درمیان صلح کرانے اور باہمی اختلافات کو دور کرنے، نیز دونوں کو حدود اللہ پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

۵- اگر زوجین کے درمیان شقاق پیدا ہو جائے اور بیوی شوہر کے ساتھ رہنے پر بالکل آمادہ نہ ہو تو قاضی اولاً صلح کرانے کی پوری کوشش کرے، اگر صلح نہ ہو پائے تو خلع کرانے کی سعی کرے۔

۶- شقاق کی صورت میں ہر ممکن کوشش کے باوجود کوئی حل نہ نکل سکے تو قاضی کے لئے ضرورتاً ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مسلک کے مطابق ان کی شروط معتبرہ کے ساتھ نکاح فسخ کرنے کی گنجائش ہے۔

☆☆☆

[1] اکیسواں فقہی سمینار (اندور، ایم پی) بتاریخ: ۹-۱۱/ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ مطابق ۳-۵/ مارچ ۲۰۱۲ء۔

نشہ آور اشیاء [1]

اللہ تبارک وتعالی نے انسان کو فائدہ پہنچانے والی چیزوں کو حلال اور طیب بنایا اور نقصان پہنچانے والی اشیاء کو حرام و ناجائز قرار دیا ہے، پورے دین اسلام میں فطرت انسانی کی رعایت ہر موڑ پر موجود ہے، کھانے پینے کی اجازت واباحت کے ساتھ ساتھ نقصان پہنچانے والی چیزوں کی ممانعت وحرمت قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں اصولی طور پر بیان کردی گئی ہے، انہیں محرمات میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں، جو عقل کو متاثر کرنے والی اور نقصان پہنچانے والی ہیں۔

انسانی اعضاء وجوارح میں عقل وخرد کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، انسان اسی عقل وخرد کے ذریعہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، اور اسی عقل کی بنیاد پر وہ احکام شرع کا مکلف ہوتا ہے، انسانیت کی بقا اور اس کی نافعیت عقل ہی کی سلامتی پر قائم ہے۔

عقل وخرد کو متاثر کرنے اور اخلاقی بگاڑ پیدا ہونے کا بڑا ذریعہ نشہ ہے، خواہ وہ کسی ذریعہ وشکل سے ہو، اس میں بے حد مضرت ہے، جس کے نتیجے میں انسان عقل وخرد سے بیگانہ ہو کر دین ودنیا کی تباہی کے راستے پر چل پڑتا ہے۔

شراب کی حرمت، شریعت میں مسلّم ہے؛ خواہ وہ کسی نام اور کسی عنوان سے متعارف ہو، اس سلسلے میں شریعت کا واضح اصول یہی ہے کہ ہر نشہ آور شی حرام ہے، آج نشہ کے لئے خمر وشراب کے علاوہ بہت سی اشیاء کا استعمال ہو رہا ہے جو جامد بھی ہوتی ہیں اور سیال بھی، مقدار میں بہت کم لیکن تاثیر میں زود سے زود تر اور شراب سے فائق، افیم، کوکین، ہیروئن، اسمیک، گانجا اور اس جیسی بہت سی اشیاء کی مضرت شراب سے کہیں بڑھ کر ہے، آج پوری عالمی برادری سماجی طور پر اس سے متاثر ہے، نشہ آور اشیاء نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اور پوری دنیا میں اس حوالہ سے تشویش پائی جارہی ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کے اکیسویں سمینار جامعہ اسلامیہ بخاری اندور منعقدہ ۳-۵ / مارچ ۲۰۱۲ء میں تفصیلی بحث ہوئی اور درج ذیل تجاویز پر اتفاق ہوا:

۱- پوری دنیا میں شراب اور دوسری نشہ آور اشیاء میں فرق کا جو طریقۂ کار اختیار کیا جارہا ہے وہ خطرناک، ناقابل فہم اور انسانی ہمدردی کے خلاف ہے۔ دوسری نشہ آور اشیاء پر عالمی برادری کا جو موقف ہے، وہی شراب کے لئے بھی اختیار کیا جانا ضروری ہے، امّ الخبائث شراب کے لئے بھی لائسنس نہ دیئے جائیں اور ان کی خرید وفروخت پر مکمل پابندی لگائی جائے۔

۲- دستور ہند کے رہنما اصول دفعہ ۴۷ میں مرقوم ہے کہ مملکت اس امر کی کوشش کرے گی کہ طبی اغراض کے سوا نشہ آور مشروبات اور مضر صحت مفرد ادویہ کے استعمال کی ممانعت کرے۔ اس دفعہ کے مدنظر شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء کی ہلاکت خیزی اور تباہ کاری کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سمینار حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے جلد از جلد نافذ کیا جائے اور اس سلسلے میں قانون سازی کی جائے۔

۳- یہ سمینار تمام انسانوں سے عموماً اور مسلمانوں سے خصوصاً اپیل کرتا ہے کہ وہ نشہ آور اشیاء سے دور رہیں، تاکہ ان کی ذہنی نشوونما اور جسمانی ارتقاء کا عمل متاثر نہ ہو اور وہ سماج پر بوجھ بننے کے بجائے اپنی گوناگوں بلکہ ہمہ جہت صلاحیتوں کی وجہ سے ملک وملت کے لئے مفید بن سکیں۔

۴- ہم سب کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ انسان کے پاس اس کے تمام اعضاء وجوارح، جسم وجان، عقل وشعور اور ادراک اس کی اپنی ملکیت نہیں بلکہ اللہ کی امانت ہے، اور وہ شریعت کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق ان کے استعمال کا پابند ہے، وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرسکتا، جس کی وجہ سے ان اعضاء کی خدمات متاثر ہوں یا کلیۃً ختم ہوجائیں۔ شراب کی حرمت منصوص ہے، خواہ وہ کسی نام اور کسی عنوان سے متعارف ہو اور وہ کسی بھی چیز سے بنے۔

---

[1] اکیسواں فقہی سمینار (اندور، ایم پی) بتاریخ: ۹-۱۱ / ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ مطابق ۳-۵ / مارچ ۲۰۱۲ء۔

۵- اس کے علاوہ اشیاء کی حرمت کا حکم نشہ پیدا کرنے پر ہے خواہ وہ نشہ سیال اشیاء سے ہو یا جامد اشیاء سے، انجکشن کے ذریعہ حاصل کیا جائے یا کسی اور طریقہ سے، یہ سب حرام ہیں اور ان سب سے احتراز لازم ہے۔

۶- افیون، بھانگ وگانجا وغیرہ کی کاشت وتجارت کا مقصود انہیں منشیات کے طور پر استعمال کرنا اور ان کی تیاری میں تعاون ہو تو یہ ناجائز اور ممنوع ہے۔

۷- وہ تمام منشیات ومسکرات جو بھانگ وافیم جیسی چیزوں سے تیار کی جائیں ان کا استعمال اور خرید وفروخت ناجائز وحرام ہے۔

۸- جو لوگ شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء کے استعمال کی عادت میں گرفتار ہیں وہ قابل سرزنش ہیں اور انہیں تمام ممکنہ تدابیر کے ذریعہ بچانے کی کوشش کرنا شرعی وانسانی فریضہ ہے۔

۹- جو لوگ اس بری عادت کو پھیلانے کا سبب بنتے ہیں خواہ کاروبار وتجارت کے ذریعہ ہو یا کسی اور طریقے سے، ایسے افراد اپنی حرکتوں سے باز نہ آنے کی صورت میں سخت سے سخت سزا کے مستحق ہیں۔

۱۰- ہر ایسی جائز تدبیر اختیار کرنا جس سے نشہ کی عادت چھوٹ جائے، شرعاً مطلوب، اور انسانی واخلاقی فریضہ ہے۔

۱۱- نشہ کی عادت چھڑانے کے لئے اگر جائز اشیاء سے علاج کی کوئی صورت کارگر نہ ہو، اور حالت مجبوری کی ہو، تو ماہرین اطباء کے مشورہ سے تدریجی طور پر نشہ آور اشیاء سے بھی علاج کی گنجائش ہے۔

۱۲- جسم وجان اور صحت وصلاحیت سب اللہ کی نعمت وامانت ہیں، ان کی ہر ممکن حفاظت انسان پر فرض ہے، اس لئے نشہ آور اشیاء سے احتراز کے ساتھ ان تمام اشیاء کے استعمال سے بھی بچنا ضروری ہے جو جسم وصحت کو نقصان پہنچاتی ہیں اور خطرناک بیماریوں کا ذریعہ بنتی ہیں مثلاً سگریٹ، بیڑی، گٹکھا، تمباکو نوشی وغیرہ۔

الیکشن سے مربوط شرعی مسائل[1]

۱- جمہوری نظام میں ووٹ کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس حق کا بھر پور استعمال کریں۔

۲- الیکشن میں باصلاحیت اور اہل افراد کا اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا جائز وبہتر ہے۔

۳- قانون ساز اداروں میں ملّی مفادات کے تحت مسلمانوں کی نمائندگی ضروری ہے؛ البتہ اگر کوئی قانون ایسا بنایا جائے جو شرعی احکام یا انسانی مصالح کے خلاف ہو تو اس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا مسلم ممبران کا دینی وملّی فریضہ ہے۔

۴- مسلم ممبران کا یہ بھی دینی وملّی فریضہ ہے کہ شرعی احکام یا انسانی مصالح کے خلاف جو قوانین پہلے سے بنے ہوں، ان میں تبدیلی کرانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

۵- منتخب ممبران کے لیے دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۶- ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں مسلمانوں کے لیے الیکشن میں حصہ لینا ایک ناگزیر ضرورت ہے؛ لہٰذا ایسی سیاسی پارٹیوں میں شرکت درست ہے جن کا منشور فرقہ واریت پر مبنی نہ ہو۔

۷- مسلم خواتین کے لیے شرعی احکام کی رعایت کے ساتھ ووٹ دینا درست ہے۔

☆☆☆

---

[1] بائیسواں فقہی سمینار (امروہہ، یوپی) بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء۔

میراث و وصیت سے متعلق مسائل [1]

۱- قانون میراث شریعت کا ایک اہم ترین حصہ ہے اور مسلمانوں کے لئے اسی کے مطابق ترکہ کی تقسیم شرعی فریضہ ہے، لہٰذا اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے لئے احکام شریعت کے مطابق نظام میراث نافذ نہ ہو تو وہاں مسلمانوں کو چاہئے کہ حکومت سے نظام میراث کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے، اس کے لئے پُرامن جدوجہد کی جائے اور جب تک ایسا نظام قانونی طور پر نافذ نہ ہو، رضاکارانہ طور پر اسے نافذ کرنے کی سعی کی جائے۔

۲- جن ممالک میں اسلام کا قانون میراث جاری نہیں ہے، اور وصیت کے بغیر ورثہ کو ان کا شرعی حق نہ مل سکے، وہاں اس طرح کا وصیت نامہ لکھنا واجب ہوگا، جو مورث کی موت کے بعد قانون شریعت کے مطابق ترکہ کی تقسیم کا ذریعہ بن سکے، البتہ مورث وصیت نامہ کو نافذ کرانے کے لئے اپنی زندگی میں کسی کو وکیل (وصی) بنادے تاکہ مورث کی وصیت کے بعد اگر ورثہ میں اضافہ یا کمی ہو جائے تو حکم شریعت کے مطابق حذف واضافہ کا حق اسے حاصل رہے۔

۳- ورثہ کے حصص شرعیہ کا وصیت نامہ لکھنا حدیث: ''لاوصیۃ لوارث'' (وارث کے لئے وصیت کا اعتبار نہیں) کے خلاف نہ ہوگا، کیونکہ اس حدیث کا مصداق وہ وصیت ہے جس میں کسی وارث کو ضرر پہنچانا مقصود ہو۔

۴- وارث کے حق میں حق شرعی سے زائد کی وصیت کرنا معتبر نہیں، البتہ اگر دوسرے ورثہ راضی ہوں تو اس کا اعتبار ہوگا اور ورثہ کی یہ رضامندی مورث کی موت کے بعد ہی معتبر مانی جائے گی۔

۵- کوئی مسلمان کسی کافر کا اور کوئی کافر کسی مسلمان کا شرعاً وارث نہیں ہوسکتا۔

۶- ایسے غیر مسلم ممالک جہاں مسلمان سے غیر مسلم قرابت دار کو اور غیر مسلم سے مسلمان قرابت دار کو ملکی قانون کے مطابق موت کے بعد چھوڑے ہوئے مال میں حصہ دلایا جاتا ہو، وہاں مسلمان کے لئے اس حیثیت سے اس کا لینا جائز ہوگا کہ اسے حکومت کی طرف سے یہ مال حاصل ہورہا ہے۔

۷- ترکہ کی تقسیم میں اختلاف سے بچنے کے لئے اگر مورث اپنی زندگی میں ہی اپنے ترکہ کی حصۂ شرعی کے مطابق تقسیم کے لئے تحریر لکھ دے تو جائز ہے، البتہ اگر وارث کی موت سے پہلے ورثہ کی تعداد میں اضافہ یا کمی ہو جائے تو اس نئی صورت حال کے مطابق ہی ترکہ کی تقسیم ہوگی۔

۸- شوہر کے لاولد ہونے کی صورت میں اگر بیوی کے علاوہ کوئی شرعی وارث نہ ہو تو بیوی دو طرح سے ترکہ کی حقدار ہوگی۔ ایک اپنے حصۂ شرعی کے اعتبار سے، دوسرے علم میراث کی اصطلاح کے مطابق ''من یرد علیہم'' میں داخل ہونے کی وجہ سے۔ لیکن اگر شوہر اپنی بیوہ کا حق محفوظ رکھنے کے لئے کوئی تحریر بھی لکھ دے تو کوئی حرج نہیں۔

۹- غیر وارث کے لئے ایک تہائی تک وصیت کرنے میں ورثہ کی رضامندی کی ضرورت نہیں۔

۱۰- وارث کے لئے وصیت کرنے کی صورت میں یا غیر وارث کے لئے ایک تہائی ترکہ سے زیادہ کی وصیت کی شکل میں مورث کی زندگی میں ورثہ کی اجازت کافی نہیں ہے، مورث کے مرنے کے بعد تمام ورثہ کی رضامندی ضروری ہے۔

☆☆☆

---

[1] تئیسواں فقہی سمینار (جمبوسر، گجرات) بتاریخ: ۲۸، ۲۹ ربیع الثانی و یکم جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ مطابق ۱-۳/ مارچ ۲۰۱۴ء۔

اسلام میں بچوں کے حقوق[1]

۱- بچوں کے حق پرورش کے سلسلے میں بنیادی ہدایات یہ ہیں:

الف:......حضانت شرعاً واجب ہے اور یہ فریضہ اصلاً ماں کا ہے، اس کو یہ کام انجام دینا چاہئے، اگر ماں نہ ہو اور حضانت کی حقدار اگر ایک ہی عورت موجود ہو تو بچہ کی پرورش اس پر واجب عینی، اور متعدد ہوں تو واجب کفائی ہے۔

ب:...... پرورش میں بچہ اور پرورش کنندہ، دونوں کی رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔

ج:......عام حالات میں ماں کو پرورش کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ بعض مخصوص حالات میں جبکہ کوئی دوسرا موجود نہ ہو اور بچے کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو مجبور کیا جائے گا۔

د:...... پرورش کے لئے بچہ ماں کے پاس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ اپنی بنیادی ضروریات مثلاً کھانا، پینا اور استنجا کے لائق نہ ہو جائے، بچہ میں سات سال کی عمر ہے اور لڑکی بالغہ یا قریب البلوغ تک ماں کے پاس رہے گی۔

ھ:...... پرورش کرنے والے کا عاقل، بالغ، امانت دار اور پرورش پر قدرت رکھنے والا ہونا ضروری ہے، اور عورت ہو تو یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ جس شخص کے نکاح میں ہو وہ زیر پرورش بچہ کا غیر محرم نہ ہو۔

و:......جن صورتوں میں بچہ کو تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے مضرت کا اندیشہ ہو تو ان صورتوں میں حق پرورش ساقط ہو جائے گا۔

۲- الف:......والدین اور سرپرستوں پر بچوں اور بچیوں کو اتنی تعلیم دینا ضروری ہے جس سے وہ اپنی دینی ذمہ داریاں ادا کرنے کے اہل ہو جائیں، اسی طرح حسب ضرورت عصری تعلیم بھی دی جائے اور اس سلسلہ میں شرعی حدود کی رعایت رکھی جائے۔

ب:......اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے اور وہ تعلیم شرعی اصول سے متصادم نہ ہو، اور کوئی بات ایمان و اخلاقیات کے منافی نہ ہو اور نہ ہی بے راہ روی وانحراف کا باعث ہو تو اس کی پابندی مسلمانوں کو کرنی چاہئے۔

ج: آج کل بچوں کے لئے جس جنسی تعلیم کا مطالبہ کیا جارہا ہے اس کی گنجائش اسلام میں بالکل نہیں ہے کیونکہ اس کے مفاسد بہت ہیں اور اس سے بے راہ روی پیدا ہوتی ہے، ایسی عمر میں بچوں کو اخلاقیات کی تعلیم دی جانی چاہئے۔

۳- نکاح کے بارے میں اسلامی تعلیم اور شرعی ہدایت یہ ہے کہ بلوغ کے بعد بچہ اور بچی کی شادی میں زیادہ تاخیر نہ کی جائے، کیونکہ اس سے جسمانی، روحانی اور سماجی نقصانات پیدا ہوتے ہیں، بعض مصالح کی وجہ سے کمسنی میں نکاح کا جواز ہے لیکن بہتر اور پسندیدہ بلوغ کے بعد کا نکاح ہی ہے۔

---

[1] ۲۴واں فقہی سمینار (اوچیرا، کیرالا) بتاریخ ۹ تا ۱۱/ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱ تا ۳/ مارچ ۲۰۱۵ء۔

۴- بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف ہے کہ بچہ قابل رحم اور لائق شفقت ہے، لہٰذا حسب استطاعت اس کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے اور ذہنی وجسمانی نشوونما کے لئے بہتر مواقع فراہم کئے جائیں۔

۵- والدین یا اولیاء بچوں سے بقدر استطاعت ایسے گھریلو کام لے سکتے ہیں جن کا تعلق تربیت اور آداب زندگی سکھانے سے ہو، اسی طرح انہیں ایسا پیشہ ورانہ کام بھی سکھا سکتے ہیں جو ان کے حق میں مفید ہو۔

۶- جو والدین معاشی تنگی کا شکار ہوں، حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کا تکفل کرے اور ان کے لئے وظائف جاری کرے۔

۷- اگر اسلام کے اصول تعلیم وتربیت کی رعایت رکھی جائے تو بچوں سے جرائم کا صدور نہیں ہوگا۔ جرائم کی شرعی سزا جاری کرنے کے لئے بلوغ شرط ہے، لہٰذا نابالغ چوری، قتل اور زنا جیسے جرائم کا ارتکاب کرے تو اس پر حدود وقصاص کا اجراء نہیں کیا جائے گا، البتہ تادیب کی جائے گی۔

۸- والدین، اولیاء اور اساتذہ کو بچوں کی تادیب کا حق حاصل ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ تکلیف دہ اور مضرت رساں نہ ہو، اور شرعی حدود کے اندر ہو۔

۹- تادیب کے طور پر انہیں بچہ جیل میں رکھا جاسکتا ہے، لیکن ان کو سخت سزائیں دینا ناجائز ہے، سزائیں ان کی قوت برداشت کے مطابق دی جائیں، اور پرمشقت کام نہ لیا جائے اور ان کی اصلاح کے لئے جیلوں میں تعلیم وتربیت کا نظم کیا جائے۔

۱۰- بے سہارا بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اور خبر گیری اولاً ان کے رشتہ داروں پر، پھر حکومت پر، پھر سماج یا بالفاظ دیگر عامۃ المسلمین پر ہے، اس سلسلہ میں ہر شعبہ کو اپنی ذمہ داری کا احساس رکھنا چاہئے۔

۱۱- حد درجہ افلاس کی وجہ سے اپنا بچہ دوسرے کے حوالہ کرکے اس سے مکمل طور پر لاتعلق ہو جانا درست نہیں ہے، اس سلسلہ میں حکومت اور سماج کو سامنے آنا اور اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔

۱۲- والدین اور اولیاء پر ذہنی یا جسمانی طور پر معذور بچوں کی دیکھ ریکھ لازم ہے، خواہ گھر میں رکھ کر ہو یا ناگزیر ضرورت پر ہسپتال میں رکھ کر ہو، اور ایسے بچوں کا علاج حتی المقدور صبر واستقامت کے ساتھ کیا جائے، اور اللہ سے اس پر اجر کی امید رکھی جائے۔

☆☆☆

اہل کتاب سے متعلق مسائل واحکام[1]

۱- اہل کتاب قرآن وحدیث کی ایک اصطلاح ہے اور عہد نبوت سے ہی اہل کتاب کا لقب یہود ونصاری دونوں گروہوں کے ساتھ خاص ہے، جمہور فقہاء بشمول متاخرین احناف نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

۲- صابئین کی تحقیق میں آراء انتہائی مختلف رہی ہیں، اس لئے ان کا معاملہ ہنوز مشتبہ ہے، اس لئے کسی ایک رائے کو اختیار کرنا مشکل ہے۔

۳- یہود ونصاری جب تک تورات وانجیل اور اپنے پیغمبر کے ماننے کے مدعی ہیں وہ قرآن وحدیث کی اصطلاح میں اہل کتاب کہلائیں گے، جو عیسائی یا یہودی منکر خدا اور مذہب بیزار اور وحی وپیغمبر کے سرے سے منکر ہیں وہ اہل کتاب کے ہرگز مصداق نہیں، نکاح وذبیحہ کے باب میں ان کا حکم اہل کتاب کا نہ ہوگا۔

۴،۵- بابی، بہائی، سکھ اور قادیانی خواہ نسلی ہو یا بذات خود ان مذاہب کو اختیار کیا ہو وہ اہل کتاب میں داخل وشامل نہیں۔

۶: الف، ب- کتابیہ سے نکاح فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود موجودہ دور میں کسی بھی ملک میں کتابیہ سے نکاح عموماً مفاسد ومضرات سے خالی نہیں، لہذا مسلمانوں کو اس سے گریز کرنا چاہئے۔

۷- کسی کتاب کا آسمانی اور کسی انسان کا نبی ورسول ہونا یہ دونوں مسئلے اعتقادات سے متعلق ہیں اور اعتقادات کے لئے دلائل قطعیہ کا ہونا ضروری ہے اور دیگر اقوام کی مذہبی کتابوں اور ان کے مقتداؤں کے نبی ورسول ہونے پر کوئی یقینی دلیل نہیں، لہذا دیگر اقوام کی مذہبی کتابوں کا قرآن مجید کی بہت سی اعتقادی اور اخلاقی تعلیمات میں محض موافقت کی وجہ سے ان کتابوں کے آسمانی کتاب ہونے کا یقین نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ایسی شخصیتوں کے پیغمبر ہونے کا بھی یقین نہیں کیا جاسکتا ہے جن کے بارے میں کتاب وسنت خاموش ہیں۔

۸: الف- ہمدردان قوم وملت علماء وعوام پر لازم ہے کہ ایسے عصری معیاری تعلیمی اداروں کے قیام پر توجہ دیں جن میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی واخلاقی تعلیم وتربیت کا بھی نظم ہو، جب تک ایسے اداروں کا نظم نہ ہو تو بدرجہ مجبوری ان اداروں میں جہاں اخلاقی ودینی عقائد کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو احتیاطی تدابیر کے نظم کے ساتھ تعلیم دلانے کی گنجائش ہے۔

ب- نان ونفقہ، حقوق زوجیت اور حسن معاشرت کے تعلق سے جو حقوق مسلمان بیویوں کے ہیں وہی حقوق کتابیہ بیویوں کے بھی ہیں، محض کتابیہ ہونے کی بنا پر ان کے حقوق سے راہ فرار اختیار کرنا اور چھوڑ کر بھاگ آنا درست نہیں، ہاں اگر کتابیہ بیویوں کی رفاقت سے دین متاثر ہو رہا ہو تو پھر اس سے علاحدگی اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

ج- اگر زوجہ کتابیہ اپنے مذہب کے مطابق مذہبی رسوم انجام دینا چاہے تو شوہر اس حد تک اس سے چشم پوشی سے کام لے گا کہ جس کا ضرر خود پر یا اپنے بچوں پر نہ پڑے۔

د- غیر مسلم رفاہی اداروں میں خدمت کرنے اور ان سے استفادہ کرنے میں مسلمانوں کو احتیاط برتنا چاہئے، اگر ان اداروں میں کسی ملازم کے ذمہ کوئی ایسا کام سپرد کیا جائے یا قرض وغیرہ سے استفادہ کے نتیجہ میں کوئی ایسا کام کرنا پڑے جس میں عیسائیت کے مشن کی اعانت یا ترویج ہو یا باطل عقائد ونظریات سے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی خدمت سے انکار واجب ہے اور استفادہ جائز نہیں۔ ملی وسماجی مسلم تنظیموں کی یہ ذمہ داری ہے کہ متبادل نظام پر توجہ دیں۔

---

[1] ۲۵ واں فقہی سمینار (بدرپور، آسام) بتاریخ ۲۵ تا ۲۷ / ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۵ تا ۷ / فروری ۲۰۱۶ء۔

اسلام میں بوڑھوں اور کمزوروں کے حقوق[1]

اسلام ایک دین فطرت ہے جو اخلاق وآداب اور معاملات کی ایسی تعلیم دیتا ہے جو انسان کو انسانیت کی تکمیل تک پہنچا دیتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تعلیم ہے، اسلام کے عطا کیے ہوئے مکارم اخلاق کا ایک اہم عنصر معذورین اور سن رسیدہ لوگوں کی قدر ومنزلت اور ان کے حقوق کی ادائیگی ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ معذوروں اور عمر رسیدہ لوگوں کی عزت اور ان کی ہر طرح کی ضرورتوں کا مکمل خیال رکھا جائے۔

اس تناظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا یہ تاریخی سمینار اسلامی اور اخلاقی نقطہ نظر کو واضح کرتے ہوئے درج ذیل تجاویز منظور کرتا ہے:

۱- اگر انسان کے پاس مال ہو تو اصولی طور پر اس کا نفقہ خود اس کے اپنے مال میں واجب ہے، البتہ بیوی کا نفقہ ہر حال میں شوہر پر واجب ہے۔

۲- اگر والدین تنگ دست ہوں تو اولاد کے ذمہ ان کا نفقہ واجب ہے، اولاد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے والدین کو کسب معاش پر مجبور کریں، اگرچہ والدین کسب پر قادر ہوں۔

۳- دوسرے قریبی رشتہ داروں کا نفقہ وعلاج اس وقت واجب ہوگا جبکہ تنگ دست ہونے کے ساتھ کسب سے بھی عاجز ہوں۔

۴- والدین اگر خود کفیل ہوں تو اولاد پر ان کا نفقہ واجب نہیں، لیکن اولاد کو چاہئے کہ اخلاقی طور پر والدین کی ہر جائز خواہش کو پورا کریں۔

۵- والدین کی خدمت اولاد کا فریضہ بھی ہے اور ان کے لئے دنیا وآخرت کی سعادت کا باعث بھی، ضرورت سے زائد معاش اور بلند معیار زندگی حاصل کرنے کے لئے خدمت کے محتاج والدین کو چھوڑ کر دوسرے شہر، دوسری ریاست یا دوسرے ممالک میں جانا اس وقت جائز ہوگا جبکہ والدین کے خدمت گار موجود ہوں اور والدین اس پر راضی بھی ہوں۔

۶- ساس اور سسر کی خدمت بہو پر شرعاً واجب نہیں ہے، لیکن شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے خدمت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

۷- ماں باپ کی خدمت بیٹا اور بیٹی دونوں پر واجب ہے۔

۸- اگر والدین بالکل مجبور ہوں یا ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوں کہ بیٹی کی خدمت کے محتاج ہوں اور بیٹی کے علاوہ کوئی خدمت گار نہ ہو تو ایسی صورت میں بیٹی کو والدین کی خدمت کرنی چاہئے، شوہر کو چاہئے کہ اس کی اجازت دے۔

۹- اولاد کا اپنے والد کو نکاح ثانی سے روکنا جائز نہیں ہے اور اگر باپ اپنی اس بیوی کے اخراجات کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو اس کی زوجہ ثانیہ (سوتیلی ماں) کا نفقہ بھی اس کی غنی اولاد پر واجب ہے۔

۱۰- والدین کی زندگی میں تقسیم جائیداد کا مطالبہ کرنا اولاد کا حق نہیں، والدین خود اپنی مرضی سے تقسیم کر کے مالکانہ تصرف دیدیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

---

[1] ۲۵واں فقہی سمینار (بدر پور، آسام) بتاریخ ۲۵ تا ۲۷ / ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ، مطابق ۵ تا ۷ / فروری ۲۰۱۶ء۔

۱۱: الف- اپنے بزرگ رشتہ داروں کو اپنے ساتھ رکھ کر خدمت کرنا یا بہ وقت ضرورت دوسرے خدمت گار کے ذریعہ ان کی خدمت کرانا شرعی فریضہ ہے، اس لئے اولڈ ایج ہوم اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں، البتہ بے سہارا لوگوں کے لئے ایسا اولڈ ایج ہوسٹل جن میں شرعی تقاضے پورے ہوتے ہوں بنانے کی اور وہاں رکھنے کی شرعاً گنجائش ہے۔

ب- جو لوگ خود یا خدمت گار کے ذریعہ اپنے والدین کی خدمت کر سکتے ہیں، ان کے لئے بوڑھے والدین کو ان کی اجازت ومرضی کے بغیر ایسے ہاسٹل میں رکھنا جائز نہیں، البتہ اگر ضرورت کے تحت اور والدین کی اجازت ومرضی سے ان کو ہاسٹل میں رکھا جائے تب بھی اولاد پر واجب ہے کہ وہ مسلسل ان کی خبر گیری کرے، اور ان سے ملاقات کرتا رہے۔

۱۲- حکومت عمر رسیدہ لوگوں کو رعایتیں فراہم کرنے کے لئے جو عمر مقرر کرتی ہے اس عمر کو پہنچنے سے پہلے ان مراعات سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

طلاق غضبان[1]

پچیسواں فقہی سمینار منعقدہ ۵ تا ۷ فروری ۱۶ء بمقام بدر پور آسام کے موضوعات میں ایک اہم موضوع طلاق غضبان کا ہے، یعنی حالت غضب میں دی گئی طلاق کا حکم کیا ہے؟ کافی بحث ومباحثہ اور غور وخوض کے بعد شرکاء سمینار جس نتیجہ پر پہنچے وہ درج ذیل ہے:

۱- نکاح ایک ایسا رشتہ ہے جس میں شرعاً دوام واستحکام مطلوب ہے، اور جن باتوں کی گنجائش رکھی گئی ہے، ان میں طلاق سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل ہے، جس کا بہ وقت ضرورت ہی استعمال کرنا چاہئے، لہٰذا شوہر کو چاہئے کہ غصہ کی حالت میں اپنے دل ودماغ پر قابو رکھے اور طلاق کے الفاظ زبان پر لانے سے احتراز کرے۔

۲- غصہ کی حالت میں دی گئی طلاق شرعاً واقع ہوگی، البتہ اگر غصہ جنون کی حد تک پہنچ گیا ہو اور شوہر غصہ کی حالت میں دماغی توازن کھو چکا ہو، اسے یہ معلوم نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے تو ایسی حالت میں اس کا حکم مجنون کا ہوگا اور اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

☆☆☆

---

[1] ۲۵واں فقہی سمینار (بدر پور، آسام) بتاریخ ۲۵ تا ۲۷ / ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ، مطابق ۵ تا ۷ / فروری ۲۰۱۶ء۔

معاشی مسائل

جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عقود و معاملات[1]

۱- "مجلس" سے مراد وہ حالت ہے جس میں عاقدین کسی معاملہ کو طے کرنے میں مشغول ہوں۔ "اتحاد مجلس" کا مقصد ایک ہی وقت میں ایجاب کا قبول سے مربوط ہونا ہے۔ اور "اختلاف مجلس" سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں ایجاب وقبول میں ارتباط کا تحقق نہ ہو سکے۔

۲- الف-فون اور ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ بیع میں ایجاب وقبول معتبر ہوگا، انٹرنیٹ پر بھی اگر بیک وقت عاقدین موجود ہوں اور ایجاب کے بعد فوراً دوسرے کی طرف سے قبول ظاہر ہو جائے تو بیع منعقد ہو جائے گی، اور ان صورتوں میں عاقدین کو متحد المجلس تصور کیا جائے گا۔

ب-اگر انٹرنیٹ پر ایک شخص نے بیع کی پیشکش کی، اور دوسرا شخص اس وقت انٹرنیٹ پر موجود نہیں تھا، بعد کو اس نے اس پیشکش کرنے والے کا پیغام حاصل کیا، یہ صورت تحریر و کتابت کے ذریعہ بیع کی ہوگی، اور جس وقت وہ دوسرا شخص اس پیشکش کو پڑھے اسی وقت اس کی جانب سے قبولیت کا اظہار ضروری ہوگا۔

۳- اگر خریدار اور بائع نے اپنے معاملہ کو مخفی رکھنا چاہا اور اس کے لئے سکریٹ کوڈ (Secret Code) استعمال کیا تو کسی شخص کے لئے اس معاملہ سے باخبر ہونے کی کوشش جائز نہیں ہوگی، البتہ کسی اور شخص کا حق شفعہ یا کوئی اور شرعی حق اس عقد یا بیع سے متعلق ہو تو اس کے لئے اس مخفی معاملہ کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا درست ہے۔

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت[2]

موجودہ دور میں سونا چاندی ذریعہ تبادلہ نہیں رہا، اور کاغذی نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں سونے چاندی کی جگہ لے لی ہے، حکومت کے قوانین بھی کاغذی نوٹوں کو مکمل طور پر ثمن کی حیثیت دیتے ہیں اور بحیثیت ثمن نوٹوں کو قبول کرنا لازم قرار دیتے ہیں، غرضیکہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت عرف اور رواج میں زر قانونی کی ہوگئی ہے۔ کرنسی کے اس ہمہ گیر رواج نے جو شرعی اور فقہی مسائل پیدا کئے ہیں ان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے اور غور وخوض کرنے کے بعد شرکاء سمینار درج ذیل نکات پر متفق ہوئے:

۱- کرنسی نوٹ سند وحوالہ نہیں ہے بلکہ ثمن ہے اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی وقانونی کی ہے۔

۲- عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا چاندی) کی جگہ لے لی ہے اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام

---

[1] تیرہواں فقہی سمینار (کٹولی، لکھنؤ) بتاریخ ۱۸-۲۱/محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶/اپریل ۲۰۰۱ء۔
[2] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱/جمادی الاول ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱/دسمبر ۱۹۸۹ء۔

پایا جاتا ہے، اس لئے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے، لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی وبیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار۔

۳- دوملکوں کی کرنسیاں دواجناس ہیں، اس لئے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی وبیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے۔

۴- کرنسی نوٹوں پر زکوۃ لازم ہے۔

۵- نوٹوں میں زکوۃ کا نصاب، چاندی کے نصاب کی قیمت کے مساوی ہوگا۔

۶- مؤخر مطالبات کے سلسلے میں کرنسی نوٹوں کی قوت خرید اور قدر وقیمت میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کا احکام شرعیہ میں اعتبار کیا جائے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں شرکاء سمینار کے درمیان دونقطہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ کمیٹی کی رائے میں اس مسئلہ کے بارے میں کوئی فیصلہ آئندہ مزید غور وفکر کے بعد کیا جائے گا۔

قسط پر خرید وفروخت [1]

۱- خرید وفروخت کے معاملہ میں ادھار فروخت کی صورت میں بمقابلہ نقد قیمت کا اضافہ جائز ودرست ہے، اور اس طرح کی خرید وفروخت بھی درست ہے بشرطیکہ معاملہ کو مکمل کرتے وقت بات اس پر ختم کی جائے کہ یہ خرید وفروخت ادھار اتنی قیمت پر اور اتنی مدت کے لئے ہو رہی ہے(۱)۔

۲- ادھار قیمت یکمشت ادا کی جائے یا چند حصوں وقسطوں میں، دونوں صورتیں درست ہیں۔

۳- اس طرح کی خرید وفروخت کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ معاملہ کو مکمل کرتے وقت قیمت متعین ہو جائے، ابتداءً خواہ صرف ادھار قیمت ذکر کی جائے یا نقد وادھار دونوں۔

۴- ادھار خرید وفروخت میں نقد معاملہ کے مقابلہ میں قیمت کی زیادتی ربا کے تحت نہیں آتی، جیسے نقد خرید وفروخت میں جو بھی قیمت ہو وہ مبیع یعنی خرید کردہ سامان کے بالمقابل ہوتی ہے، اسی طرح ادھار خرید وفروخت کے مقابلہ میں بھی طے شدہ قیمت خرید کردہ سامان کے بالمقابل ہوتی ہے۔

---

[1] دسواں فقہی سمینار (ممبئی) بتاریخ ۲۱-۲۴/ جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۴-۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۷ء۔

(۱) تیسرے فقہی سمینار منعقدہ جون ۱۹۹۰ء میں مرابحہ کے ذیل میں فیصلہ نمبر ۴ کے شق ب میں کہا گیا ہے کہ "یہ درست نہیں ہوگا کہ معاملہ کرتے وقت یہ کہا جائے کہ اگر نقد خریدا جائے تو یہ قیمت ہوگی اور ادھار خریدا جائے تو دوسری قیمت، یا ادھار کی مدت کے کم یا زیادہ ہونے پر قیمت کی کمی اور زیادتی کا ذکر معاملہ کرتے وقت کیا جائے، بلکہ بینک خریدار کو مطلوبہ سامان کا نمونہ دکھا کر وضاحت کرے کہ اس کی قیمت اتنی مدت میں اتنی قسطوں میں ادا کرنی ہوگی، اور بینک کو اس کی لاگت پر اتنا منافع دینا ہوگا (اور یہی بینک سے خریداری کی قیمت ہوگی)"۔

معاملہ کی اصل معیاری اور احسن صورت وہی ہے جس کا ذکر بذیل تجویز مرابحہ کیا گیا ہے یعنی ادھار اور نقد کی علاحدہ علاحدہ قیمتیں معاملہ کرتے وقت نہیں بتائی جائیں ایسا کرنا درست نہیں۔ لیکن اگر اس کے باوجود یہ اصل معاملہ طے کرنے سے پہلے ہوئیں اور مجلس عقد میں ہی معاملہ کسی ایک صورت پر متعین طور پر کرلیا گیا تو یہ عقد صحیح ہو جائے گا۔ یہ واضح رہے کہ ادھار اور قسطوار بیع میں مثلاً تین مہینہ یا ایک سال مدت قیمت کی ادائیگی کے لئے مقرر کی گئی اور خریدار نے وقت مقرر پر قسط ادا نہیں کی اور تین ماہ کے بجائے چھ ماہ یا ایک سال کے بجائے ڈیڑھ سال ادائیگی میں لگ گئے تو اس زائد مدت کی وجہ سے قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔

۵- متعینہ مدت میں قیمت یا قسط کے ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید کسی طرح کی زیادتی کا مطالبہ اور معاملہ سود کے تحت داخل ہے، خواہ معاملہ کرتے وقت اس طرح کی شرط لگائی گئی ہو، یا یہ کہ بعد میں اس طرح کا مطالبہ کیا جائے۔

۶- جس شخص نے بطور رہن کوئی سامان اپنے پاس رکھا ہو، اس کا رہن رکھے ہوئے سامان سے نفع اٹھانا سود ہے جو کسی حال میں جائز نہیں ہے۔

۷- رہن کا سامان اگر رہن رکھنے والے کے پاس ہلاک ہو جائے تو سامان کی قیمت اگر دین کے برابر ہے، تو کسی کے ذمہ کوئی حق نہیں رہا، اگر سامان کی قیمت کم ہے، تو دین کی باقی رقم دین والے (جس کے پاس رہن تھا اس) کے ذمہ واجب ہوگی، اگر سامان کی قیمت زیادہ ہے، تو اگر رہن لینے والے کے عمل ولا پرواہی کو اس میں دخل ہے تو دین سے زیادہ قیمت رہن لینے والے کے ذمہ واجب ہوگی۔

۸- دین کو وقت پر ادا نہ کرنے کی صورت میں قرض دار کو بار بار متوجہ کرنے کے بعد جب کہ اس کا ٹال مٹول ظاہر ہو، قرض خواہ کو اجازت ہے کہ سامان کو واجبی قیمت پر بیچ کر اپنا حق وصول کر لے۔

۹- قسط وار خرید وفروخت کی صورت میں فروخت کردہ سامان کو اگر بائع اس وقت تک کے لئے روکتا ہے جب تک کہ اس کو تمام قسطیں وصول نہ ہو جائیں، تو یہ درست نہیں، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ فریقین یہ طے کر لیں کہ خرید کردہ سامان بطور رہن فروخت کنندہ کے قبضہ میں اس وقت تک رہے گا جب تک اس کی جملہ اقساط ادا نہ ہو جائیں۔

۱۰- طے شدہ مدت تک بعض قسطوں کو ادا کر دینے کے بعد بقیہ قسطوں کے ادا نہ کرنے کی صورت میں بائع (فروخت کنندہ) کو یہ حق نہیں ہے کہ فروخت کردہ شئ کو واپس لے لے اور ادا کردہ قسطوں کو واپس نہ کرے۔

۱۱- خرید کردہ سامان کو مشتری (خریدار) کے قبضہ میں دے کر رہن قرار دینا درست نہیں ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ خریدار سے بیچنے والا بطور رہن لے لے، اور اس کے بعد پھر مشتری کو عاریۃً دے دے۔

۱۲- کریڈٹ لیٹر کی اجرت کی بابت کمیٹی نے یہ طے کیا کہ اس سلسلہ میں مزید غور وخوض کیا جائے۔

۱۳- قرض کی دستاویز (رسیدات، پرچیاں وغیرہ) کا کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا کہ اب وہ قرض وصول کرے، اور مالک ہو جائے، قرض دینے والا یا واجبات کا مستحق واجب رقم سے کم لے کر اس معاملہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے، اس طرح کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

۱۴- واجب الاداء رقم کی مقدار کم کر کے فوری وصول کر لینا جسے "ضع وتعجل" کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اگر اصل معاملہ میں کوئی مدت ادا دین کی معین نہ ہو تو جائز ہے کہ یہ ایک طرح کا تبرع ہے، اور اگر مدت معین ہو تو اس طرح کا معاملہ جائز نہیں ہوگا کہ جس پر دین واجب ہے وہ مدت کا فائدہ اٹھا کر واجب الادا دین کو کم کرا رہا ہے۔

۱۵- دین کی ادائیگی کے لئے طے شدہ مدت سے قبل دین کی ادائیگی کا مطالبہ جبکہ قسطیں وقت پر ادا نہ کی جارہی ہوں، درست ہے، اس لئے کہ فریقین نے جو معاہدہ کیا ایک فریق نے جب اس کی خلاف ورزی کی تو دوسرے پر بھی اس کی پابندی لازم نہیں رہ گئی۔

۱۶- جملہ اقساط کی ادائیگی سے قبل اگر مدیون (خریدار) کی موت ہو جائے تو بھی معاملہ علی حالہ باقی رہے گا، جیسا کہ دائن کی موت کی صورت میں باقی رہتا ہے، بشرطیکہ بائع (دائن) اس پر راضی ہو۔

✧ ✧ ✧

عقد مرابحہ کے شرعی اصول [1]

۱- مرابحہ کا فقہاء کے نزدیک ایک متعین مفہوم ہے۔

۲- اسلامی بینکوں میں مرابحہ جن شکلوں میں رائج ہے وہی شکلیں اس سمینار میں زیر بحث ہیں۔

۳- مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ عقود ومعاملات میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے محض الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا، لہٰذا مرابحہ کے نام پر جو معاملات مروج ہیں ان کی حقیقت کا اعتبار ہے محض ان کے ناموں کا اعتبار نہیں ہے۔

۴- اسلامی بینکوں میں استعمال ہونے والی مرابحہ کی شکلیں مرابحہ کی معروف شرطوں کے ساتھ اسی صورت میں جائز ہوں گی جب کہ:

الف- بینک کی طرف سے جاری کردہ مخصوص فارم (Quotation) میں بینک کے ذریعہ فروخت کی جانے والی اشیاء کی نوعیت، ان کی کیفیت (Quality) اور دوسری ضروری صفات واضح طور پر ذکر کی گئی ہوں تاکہ جہالت اور ابہام کی وجہ سے معاملہ کے ہر دو فریق کے درمیان کسی نزاع کا امکان باقی نہ رہے، نیز اس قیمت خرید یا لاگت پر بینک کو ملنے والے نفع (قیمت)، اس کی ادائیگی کی مدت اور اقساط کی صراحت کردی گئی ہو۔

ب- یہ درست نہیں ہوگا کہ معاملہ کرتے وقت یہ کہا جائے کہ اگر نقد خریدا جائے تو یہ قیمت ہوگی اور ادھار خریدا جائے تو دوسری قیمت، یا ادھار کی مدت کے کم یا زیادہ ہونے پر قیمت کی کمی اور زیادتی کا ذکر معاملہ کرتے وقت کیا جائے، بلکہ بینک خریدار کو مطلوبہ سامان کا نمونہ دکھا کر وضاحت کرے کہ اس کی قیمت اتنی مدت میں اتنی قسطوں میں ادا کرنی ہوگی، اور بینک کو اس کی لاگت پر اتنا منافع دینا ہوگا (اور یہی بینک سے خریداری کی قیمت ہوگی)۔

حقوق کی فقہی حیثیت [2]

۱- بیع میں مال کی شرط جوہری ہے۔

۲- مال کی حقیقت نصوص شرعیہ نے متعین نہیں کی ہے۔ پس اس کا اصل مدار ہر عہد کے اس عرف ورواج پر ہے جو شریعت سے متصادم نہ ہو۔

۳- وہ تمام حقوق جن کی مشروعیت اصالۃ نہیں بلکہ صاحب حق سے کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے، ایسے حقوق پر عوض لینا جائز نہیں جیسے شفعہ۔

۴- جو حقوق نصوص شرعیہ سے ثابت ہوں البتہ ان سے مالی منفعت متعلق ہوگئی اور عرف میں ان کا عوض لینا مروج اور معروف ہو چکا ہو، نیز ان کی حیثیت محض دفع ضرر کی نہ ہو اور نہ وہ شریعت کے عمومی مقاصد ومصالح سے متصادم ہوں، ایسے حقوق پر عوض حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔

۵- کون سے حقوق کس نوع میں داخل ہیں، اور اس تفصیل کے مطابق عصر حاضر میں مروج کون سے حقوق قابل عوض ہیں اور کون قابل عوض نہیں ہیں، ان کی تعیین وتطبیق کے لئے مستند دار الافتاء اور اصحاب فتویٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

---

[1] تیسرا فقہی سمینار (بنگلور) بتاریخ ۱۳-۱۶ / ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱ / جون ۱۹۹۰ء۔

[2] تیسرا فقہی سمینار (بنگلور) بتاریخ ۱۳-۱۶ / ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱ / جون ۱۹۹۰ء۔

قبضہ کی حقیقت اور اس سے متعلق احکام[1]

۱- اصولی طور پر قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، تاہم اگر قبضہ سے پہلے بیع کر دی جائے تو یہ بیع فاسد ہوگی نہ کہ باطل، اور قبضہ کے بعد مفید ملک ہوگی۔

۲- کتاب وسنت میں قبضہ کی حقیقت اور اس کی کوئی خاص صورت مقرر نہیں کی گئی ہے، گویا شریعت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کے عرف کو اصل قرار دیا ہے، لہذا ہر عہد کے مروجہ طریقوں اور اشیاء کی مختلف انواع کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت متعین ہوگی۔

۳- فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ اصل میں مبیع پر خریدار کے ایسے استیلاء کا نام ہے کہ مبیع پر اس کے تصرف میں کوئی مانع باقی نہ رہے، اسی کو فقہ کی کتابوں میں "تخلیہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۴- بیع قبل القبض کی ممانعت "غرر انفساخ" کی علت پر مبنی ہے، یعنی جب تک مبیع خریدار اول کے ہاتھ نہ آجائے اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ مبیع اس کے قبضہ میں آہی نہ پائے، اور وہ خریدار دوم کو مبیع کی حوالگی پر قادر نہ رہے۔

۵- بیع قبل القبض کی ممانعت کا تعلق اموال منقولہ سے ہے، اموال غیر منقولہ میں بیع قبل القبض جائز ہے، بشرطیکہ خریدار کے لئے انتفاع سے کوئی قوی مانع نہ پایا جاتا ہو۔

۶- اگر ایک شخص کسی بائع (فیکٹری وغیرہ) سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دے، اور ابھی خریدا ہوا مال فیکٹری نے روانہ بھی نہ کیا ہو، تو یہ صورت بیع قبل القبض میں داخل ہے اور جائز نہیں ہے۔

۷- اگر ایک شخص کسی فیکٹری وغیرہ سے خرید کر اس کو کسی خاص ذریعہ (جہاز، ٹرانسپورٹ، پرمٹ وغیرہ) سے سامان کی ترسیل کا آرڈر دے اور مطلوبہ سامان فیکٹری سے روانہ بھی کر دیا جائے اور نقصان کی صورت میں خریدار اس کا ضامن ہوتا ہو، نیز ترسیل کی اجرت خریدار کے ذمہ ہے، تو جس ذریعہ سے مال روانہ کیا جائے اس کا قبضہ خریدار کی طرف سے وکالۃً قبضہ متصور ہوگا، لہذا اس صورت میں مال پہونچنے سے پہلے خریدار کو فروخت کرنا جائز ہے، اور یہ بیع قبل القبض میں داخل نہیں، البتہ جس شخص نے اس خریدار سے مال خریدا ہے اس خریدار دوم کے لئے مال پہنچنے سے پہلے دوبارہ بیع جائز نہیں، اور اگر بیع کرے تو یہ بیع قبل القبض کے زمرہ میں داخل ہوگی۔

✧ ✧ ✧

[1] نواں فقہی سمینار (جے پور) بتاریخ ۲۷-۳۰/ جمادی الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۱-۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کی خرید وفروخت[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی میں موجود مچھلیوں کی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے، فی زمانہ مچھلیوں کے کاروبار کی بعض ایسی صورتیں مروج ہوگئی ہیں جن کے اس زمرہ میں شامل ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے نویں سمینار منعقدہ جامعۃ الہدایہ جے پور میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی اور درج ذیل امور طے پائے:

۱- ندی، نالے، نہریں جو کسی خاص شخص کی ملک نہیں ہوتیں بلکہ سرکار ان کو اشخاص یا کوآپریٹو سوسائٹی یا گرام پنچایت کو مخصوص مدت کے لئے بندوبست کردیتی ہے، یہ مچھلی کے حق شکار پر ہوتا ہے، اس لئے یہ معاملہ عقد اجارہ کی صورت ہے اور جائز ہے۔ لیکن سرکار کے لئے مناسب ہے کہ ایسے تالاب کا بندوبست نہ کرے جس سے عام لوگوں کو ضرور پہنچ سکتا ہو۔

۲- پانی میں رہتے ہوئے مچھلی کو فروخت کردینا جائز نہیں ہوگا۔ اگر بائع تالاب کی ان مچھلیوں کا مالک ہو تو اس صورت میں یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر بائع حسب حکم شرع ان مچھلیوں کا مالک بھی نہیں اور اسے پانی سے نکالے بغیر فروخت کرتا ہے تو یہ بیع باطل ہوگی، البتہ اگر حوض چھوٹا ہو اور وہ مچھلیاں آسانی کے ساتھ نکال کر خریدار کو حوالہ کی جاسکتی ہوں تو ایسی صورت میں پانی میں رہتے ہوئے مچھلی فروخت کی جاسکتی ہے۔

۳- مچھلی کے مالک ہونے کی تین صورتیں ہیں:

الف- تالاب میں مچھلیاں قدرتی طور پر آگئی ہوں اور تالاب کے مالک نے ان مچھلیوں کو روکنے کی تدبیر کی ہو۔

ب- مچھلیوں کی غرض سے تالاب بنوایا گیا ہو۔

ج- کسی شخص نے تالاب میں مچھلی کی افزائش کے لئے مچھلی کے زیرے ڈالے ہوں۔

نوٹ:...... مولانا شاہین جمالی صاحب (مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ) کے نزدیک موجودہ وسائل ماہی گیری، تعامل اور حاجات انسانی کی رعایت کے نقطہ نظر سے مملوکہ مچھلیاں پانی کے اندر ہوں اور تالاب ایسا ہو کہ جال اس کا احاطہ کرلے، تب ان کو پانی کے اندر بھی فروخت کرنا جائز ہے۔

✧ ✧ ✧

۱- نواں فقہی سمینار (جے پور) بتاریخ ۲-۳۰ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۱-۱۴ / اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

شیئرز اور ان کی خرید و فروخت[1]

۱- کسی کمپنی کا خرید کردہ اکویٹی شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، وہ محض اس بات کی دستاویز نہیں ہے کہ اس نے کمپنی کو اتنی رقم دی ہے۔

۲- ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی ابتدائی خریداری جو ابھی سرمایہ اکٹھا کرنے کے مرحلے سے گزر رہی ہیں، شرعاً خریداری نہیں بلکہ اس کمپنی میں شرکت ہے۔

۳- عام طور پر کمپنیوں کی دوسری املاک نقد سرمایہ سے زیادہ ہوتی ہیں، اس لئے کمپنیز کے شیئرز کی خریداری درست ہے، لیکن اگر معلوم ہوجائے کہ ادا کردہ نقد اس مقدار نقد کے برابر یا اس سے کم ہے جس کی شیئرز نمائندگی کرتا ہے تو ایسی صورت میں شیئرز کی خریداری اس کی مقررہ قیمت سے کم یا زیادہ پر درست نہ ہوگی۔

۴- جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حرام ہے، مثلاً شراب وخنزیر کے گوشت کی تجارت یا سودی قرضے دینا وغیرہ، ان کے شیئرز کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

۵- شرکاء سمینار کا احساس ہے کہ ہندوستان میں ایسی کمپنیز کا قیام قابل عمل ہے جو خالص اسلامی اصول تجارت کے اعتبار سے کاروبار کریں، سمینار مسلم تجار اور ماہرین معاشیات کو اس طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اپنی دینی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ایسی کمپنیز کے قیام کی جدو جہد کریں جو کامل طور پر اسلامی احکام پر کاربند ہوں۔

لیکن چونکہ فی الحال ایسی کمپنیاں ہندوستان میں موجود نہیں ہیں یا بہت کم ہیں جو خالص اسلامی بنیادوں پر کاروبار کرتی ہوں، اس لئے جن مسلمانوں کے پاس نقد سرمایہ ہو اور اپنے مخصوص حالات کی بنا پر ان کے لئے جائز تجارت میں اس سرمایہ کو لگانا قابل عمل نہ ہو ان کے لئے ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے جن کا بنیادی کاروبار حلال ہو (مثلاً انجینئرنگ کے سامان یا عام استعمال کی مصرفی چیزیں تیار کرنا) اگرچہ انہیں بعض قانونی مجبوریوں کی وجہ سے سودی معاملات میں ملوث ہونا پڑتا ہو۔

۶- جن مسلمانوں نے ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدے جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے لیکن وہ کمپنیز ضمنی طور پر بعض ناجائز تصرفات میں بھی ملوث ہوتی ہیں، ان مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ شیئر ہولڈرس کی سالانہ میٹنگ میں کمپنی کو آئندہ ایسے ناجائز تصرفات سے روکنے کی کوشش کریں، اور دوسرے شیئر ہولڈرس کو افہام وتفہیم کے ذریعہ اس بات پر آمادہ کرنے کی سعی کریں کہ وہ بھی ان کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے میٹنگ میں ان کی تائید کریں۔

۷- اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور اس کی مقدار معلوم ہو تو شیئر ہولڈر کے لئے منافع میں سے اس کے بقدر صدقہ بلا نیت ثواب کردینا ضروری ہے۔

---

[1] نواں فقہی سمینار (جے پور) بتاریخ ۲۷-۳۰/ جمادی الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۱-۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

۸- اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہو گیا ہے اسی تناسب سے ملنے والے منافع سے نکال کر بلا نیت ثواب اپنی ملک سے نکال دینا ضروری ہے۔

(نوٹ: دفعہ ۷ اور ۸ میں مولانا رئیس الاحرار ندوی صاحب کے نزدیک سود کی رقم غیر مسلم ہی کو دی جائے)۔

۹- کمپنی کی اپنی قانونی شخصیت ہے جو شیئر ہولڈرس کی اجتماعی حیثیت کی نمائندگی کرتی ہے، بورڈ آف ڈائرکٹرس کمپنی کے منتخب کردہ افراد کا مجموعہ ہے جو کمپنی کی طرف سے تصرفات کرتا ہے اور اس طرح شیئر ہولڈر کے مجموعہ کا وکیل ہے، لہذا بورڈ آف ڈائرکٹرز کے تصرفات جو کمپنی کے مقرر کردہ اصول وضوابط کی حدود میں ہوں، کی بالواسطہ ذمہ داری بھی شیئر ہولڈرس پر آتی ہے۔

۱۰- حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی تجارت کرنا درست ہے۔

۱۱- فیوچر سیل (Future Sale) جس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع نقصان برابر کر لینا مقصود ہوتا ہے، اسلامی شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہے کیونکہ یہ کھلا ہوا جوا ہے۔

۱۲- غائب سودا (Forward Sale) جس میں بیع تو ہو جاتی ہے لیکن اس کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، بیع نہیں وعدۂ بیع ہے، مقررہ تاریخ آنے پر ایجاب وقبول ہونے کے بعد ہی بیع وجود میں آئے گی۔

۱۳- حاضر سودے (Spot Sale - Cash Sale) میں شیئر سرٹیفکٹ پر قبضہ سے پہلے خرید کردہ شیئرز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۱۴- شیئر سرٹیفکٹ حاصل ہونے کے بعد خریدار کا اس پر قبضہ متحقق ہو جاتا ہے، اگرچہ بعض انتظامی دشواریوں کی وجہ سے کمپنی میں اس کا نام اندراج نہ ہو سکا ہے، لہذا اس شیئر کو خریدار فروخت کر سکتا ہے۔

۱۵- جن شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے ان کی خرید وفروخت میں بروکر کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے، ناجائز اور حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت میں بحیثیت بروکر کام کرنا جائز نہیں ہے۔

کمپنیوں کے شیئرز[1]

۱- ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار خالص حلال ہے، اسلامی مالیاتی ادارہ یا کوئی بھی مسلمان ان کے شیئرز خرید سکتا ہے۔

۲- ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار خالص حرام ہے، ان کے شیئرز کی خریداری ہرگز جائز نہیں ہے۔

✧ ✧ ✧

[1] چھٹا فقہی سمینار (عمر آباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰/رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱/دسمبر ۱۹۹۳ء - ۳/جنوری ۱۹۹۴ء۔

پگڑی کی شرعی حیثیت [1]

۱- مالک مکان زر ضمانت وڈپوزٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے بہتر ہے کہ اس کو بعینہ محفوظ رکھا جائے، اگر مالک اس کو خرچ کردے تو وہ اس بات کا ضامن ہوگا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کردے۔

۲- اگر کوئی مکان یا دوکان کرایہ پر دیا جائے اور مالک مکان مروجہ پگڑی کے نام پر اصل ماہوار کرایہ کے علاوہ بھی نقد رقم کرایہ دار سے وصول کرے تو سمجھا جائے گا کہ مالک مکان نے بحیثیت مالک اپنے مکان کو کرایہ دار سے واپس لینے کے حق سے دست برداری کا عوض وصول کرلیا ہے۔ یہ رقم اس کے لئے اس حق کے عوض ہونے کی بنیاد پر جائز ہوگی۔ آئندہ اگر مالک مکان کرایہ دار سے مکان واپس لینا چاہے تو کرایہ دار کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مکان خالی کرنے کے عوض جس پر ہر دو فریق راضی ہوجائیں مالک مکان سے وصول کرلے، اور اسی طرح کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کے حق میں باہمی طے شدہ رقم کے عوض اپنے اس حق سے جو اس نے اصل مالک سے عوض دے کر حاصل کیا تھا دست بردار ہوسکتا ہے۔

۳- مالک مکان نے پگڑی لئے بغیر مکان کرایہ پر دیا اور اجارہ کی مدت معاہدہ میں مقرر نہیں کی گئی ہو تو اس صورت میں مالک مکان کو حق ہوگا کہ جب چاہے مکان خالی کرالے۔ البتہ مالک مکان کو چاہئے کہ خالی کرانے کا نوٹس اور خالی کرنے کی تاریخ کے درمیان ایسی مہلت دے جو مقامی حالت کے پیش نظر مناسب ہو اور جس میں مالک اور کرایہ دار کو کوئی خاص ضرر لاحق نہ ہو، اور کرایہ دار کو چاہئے کہ اس مناسب مہلت میں مکان خالی کردے۔

۴- جو مکان یا دوکان بغیر پگڑی لئے کرایہ پر دی گئی ہو، مالک مکان کو مکان واپس کرتے وقت کرایہ دار کے لئے اس سے پگڑی طلب کرنا جائز نہ ہوگا۔

۵- سمینار مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ اپنے معاملات میں شریعت کا خاص خیال رکھیں، شریعت چاہتی ہے کہ کسی بھی معاہدہ کے بارے میں معاہدہ کے ہر دو فریق تمام ضروری متعلقہ امور کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ باہم طے کرلیں تاکہ آئندہ کوئی نزاع پیدا نہ ہو اور فریقین ضرر سے محفوظ رہیں۔ اس سلسلہ میں سمینار خصوصیت سے یہ سفارش کرتا ہے کہ کرایہ داری کا معاملہ طے کرتے وقت مدت کا تعین کرلیا جائے اور اگر مالک مکان عوض لے کر ہمیشہ کے لئے اپنے مکان خالی کرانے کے حق سے دست بردار ہونا چاہتا ہے تو فریقین صراحۃً آپس میں اس کو طے کرلیں۔

✧ ✧ ✧

[1] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱/ دسمبر ۱۹۸۹ء۔

بنک انٹرسٹ[1]

بنک انٹرسٹ کے سود ہونے پر شرکاء سمینار کا اتفاق ہے۔ انٹرسٹ کی رقم بنک سے نکالی جائے یا چھوڑ دی جائے؟ نکال لی جائے تو کس مصرف میں خرچ کی جائے؟ اس سلسلہ میں طے پایا کہ:

۱- بینکوں سے ملنے والی سود کی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے بلکہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہئے۔

۲- بینک کے سود کی رقم کو بلانیت ثواب فقراء ومساکین پر خرچ کر دیا جائے اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

۳- سود کی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جاسکتا۔

۴- اکثر شرکاء سمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقات واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے۔ بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء ومساکین تک محدود رکھنا چاہئے۔

تجارتی سود[2]

سود خواہ ذاتی مصارف کے قرضوں پر لیا دیا جائے یا تجارتی وکاروباری قرضوں پر، شریعت اسلامیہ کی نظر میں بہر حال حرام ہے۔ یہ سمجھنا کہ سود کی حرمت کا اطلاق تجارتی وکاروباری قرضوں پر نہیں ہوتا قطعاً غلط ہے۔ نیز یہ خیال کہ تجارتی وکاروباری قرضوں کا وجود زمانہ نزول قرآن میں نہیں پایا جاتا اس لئے حرمت ربو کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا، کسی طرح درست نہیں۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ تجارتی وکاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین عرب جاہلیت، نیز ان قوموں میں جن سے جاہلی عرب کے تجارتی روابط تھے رائج اور شائع تھا۔ چنانچہ تجارتی وکاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین تحریم ربا کا اولین مورد ہے۔ اس کے علاوہ بالفرض اگر تجارتی وکاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین کا وجود زمانہ نزول قرآن میں نہ بھی پایا جاتا تب بھی مستقل شرعی دلائل دونوں قسم کے قرضوں (ذاتی وشخصی اور تجارتی وکاروباری) پر اضافے یعنی سود کی حرمت کے بارے میں قائم ہیں۔ قرآن وسنت، اجماع وقیاس اور امت محمدیہ کا عمل متوارث سب یہی بتاتے ہیں کہ حرمت ربوٰ کے بارے میں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا کہ قرض لینے دینے کا مقصد اور محرک کیا ہے؟

سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد تک کم ہے یا نامناسب حد تک زیادہ۔ شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شرح سود اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہے اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز، دلائل شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے۔

---

[1] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱ / جمادی الاول ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱ / دسمبر ۱۹۸۹ء۔

[2] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱ / جمادی الاول ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱ / دسمبر ۱۹۸۹ء۔

ہندوستان کے پس منظر میں انشورنس کا حکم [1]

ہندوستان کے موجودہ حالات اور مسلمانوں کو درپیش ہر آن جان اور مال کے خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے جان و مال کے تحفظ اور قیام امن کے سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داریوں اور بسا اوقات نہ صرف غفلت بلکہ حکومت کے عملہ کی طرف سے فسادات کی ہمت افزائی اور بعض اوقات اس میں شرکت اور پھر مسلمانوں کے جان و مال کو پہنچنے والے نقصانات کی تلافی میں حکومت کی طرف سے کوتاہی اور اس وجہ سے کہ وہ ہندوستان کی انشورنس کمپنیاں بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت سے ہی متعلق ہیں، ان ہی حالات کی روشنی میں ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کے چوتھے سمینار منعقدہ مورخہ ۲۷-۳۰ محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۹-۱۲ / اگست ۱۹۹۱ء بمقام دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد میں غور کیا گیا تھا۔

شرکاء سمینار کا عام رجحان یہ تھا کہ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے جان و مال کا بیمہ کرانا جائز قرار دینا چاہئے، لیکن دوران بحث یہ نقطہ اٹھایا گیا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں پہنچنے والے جانی و مالی نقصان کو بیمہ کے ذریعہ رائج انشورنس قانون کے تحت تحفظ حاصل ہے یا نہیں؟ اور مندرجہ ذیل تجویز منظور کی گئی:

''کمیٹی نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور یہ محسوس کیا کہ انشورنس کمپنیوں کی پالیسی اس سلسلہ میں واضح نہیں ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں ہونے والے جانی و مالی نقصانات کو موجودہ انشورنس قانون کی رو سے تحفظ حاصل ہوتا ہے، اور اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے غور کیا جائے اور انشورنس کے ماہرین سے مختلف اسکیموں کے بارے میں پوری معلومات حاصل جائیں، سمینار کے عام اجلاس میں کمیٹی کی اس تجویز سے اتفاق کیا گیا اور مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر ماہرین سے پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد کوئی قطعی رائے قائم کرے:

۱- مولانا مجیب اللہ ندوی جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ

۲- مولانا برہان الدین سنبھلی دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۳- مولانا عبید اللہ اسعدی جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ

۴- مولانا عتیق احمد بستوی دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۵- مولانا مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی دار العلوم دیوبند

۶- مولانا مفتی احمد خان پوری جامعہ تعلیم الدین، ڈابھیل

۷- مولانا عبد الاحد ازہری معہد ملت، مالیگاؤں

۸- مولانا مفتی منظور احمد کان پوری جامع العلوم، کان پور

۹- مولانا نظام الدین اشرفی دار العلوم اشرفیہ، مبارک پور

۱۰- مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی دار العلوم دیوبند

---

[1] پانچواں فقہی سمینار (رشاد نگر اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶ / جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰ / اکتوبر - ۲ / نومبر ۱۹۹۲ء۔

۱۱- مفتی عبدالقدوس رومی آگرہ

۱۲- مولانا نذیر احمد قاسمی دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

۱۳- مفتی جنید عالم قاسمی امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

۱۴- مولانا خلیل الرحمن اعظمی جامعہ دارالسلام، عمرآباد

۱۵- مولانا خلیل الرحمن سجاد ندوی لکھنؤ

۱۶- جناب عبدالستار یوسف شیخ بمبئی

۱۷- مولانا مجاہد الاسلام قاسمی امارت شرعیہ، پٹنہ''

اسلامک فقہ اکیڈمی کے سمینار منعقدہ مورخہ ۳-۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰-۳۱ / اکتوبر اور ۱-۲ / نومبر ۱۹۹۲ء بمقام جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کے موقع پر اس سلسلہ میں ضروری معلومات اور ان پر غور کر کے کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے سلسلہ میں کمیٹی مذکور کے موجودہ ارکان اور مزید دیگر علماء پر مشتمل ایک کمیٹی نے پوری صورت حال پر غور کیا، اور خاص کر انشورنس کے قانون کی اس دفعہ پر غور کیا گیا جس سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فسادات کی صورت میں جان و مال کو پہنچنے والے نقصانات کو تحفظ نہیں مل سکتا، لیکن اس سلسلہ میں ''لائف کارپوریشن آف انڈیا'' کی جاری کردہ تفصیلات پر غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس اعلامیہ کی دفعہ (۱۰) شق (B.III A.) میں فرقہ وارانہ فسادات سے پہنچنے والے نقصانات کا استثناء دراصل دفعہ ۱۰ سے حاصل ہونے والی ان مراعات سے استثناء ہے جن کے تحت حادثاتی موت کی صورت میں اصل انشورنس پالیسی پر مستزاد اضافی رقم دی جاتی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ عام طور پر حادثاتی موت میں اصل انشورنس پالیسی سے زائد رقم دیئے جانے کا پروویژن فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں پہنچنے والے جانی اور مالی نقصانات کو شامل نہیں ہوگا، یعنی اس صورت میں انشورنس پالیسی پر اضافی رقم نہیں ملے گی، لیکن جتنی بھر انشورنس پالیسی ہے جیسے دیگر عام جانی و مالی نقصانات میں ملتی ہے اسی طرح اس میں بھی ملے گی، اس نقطہ کے واضح ہو جانے کے بعد ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کی یہ کمیٹی (مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے ۱۹۶۰ء میں انشورنس کے سلسلہ میں جو فیصلہ کیا تھا، نیز ملک کی مؤقر درسگاہ ''دارالعلوم دیوبند'' سے اس بابت جو فتویٰ دیا جا چکا ہے) مجلس کے فیصلے اور دارالعلوم کے فتویٰ کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل قطعی فیصلہ کرتی ہے:

''مروجہ انشورنس اگرچہ شریعت میں ناجائز ہے کیونکہ وہ ربو، قمار، غرر جیسے شرعی طور پر ممنوع معاملات پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کی جان و مال، صنعت و تجارت وغیرہ کو فسادات کی وجہ سے ہر آن شدید خطرہ لاحق رہتا ہے، اس کے پیش نظر ''الضرورات تبیح المحظورات''، رفع ضرر، دفع حرج اور تحفظ جان و مال کی شرعاً اہمیت کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان و مال کا بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت ہے''۔[1]

اس فیصلہ پر دستخط کرنے والے اہم علماء کرام کے اسماء گرامی:

۱- حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب دارالعلوم دیوبند

۲- حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب دارالعلوم دیوبند

۳- حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی ندوۃ العلماء، لکھنؤ

---

[1] واضح رہے کہ فقہ اکیڈمی کی طرف سے یہ تجویز اور سمینار میں شریک اہل علم کی طرف سے اس کی تائید کا یہ مطلب نہیں کہ انشورنس مسلمانوں کی حفاظت کا ضامن ہے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس انشورنس کے بعد جو بھی صورت پیش آئے اس میں ملنے والی سب رقم انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز و درست ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ صرف فسادات کی صورت میں جان و مال کے نقصان کے بعد جو کچھ ملے اور جو حق قانون و ضابطہ میں بتایا جائے، اس کے مطابق ملنے والا مال تو انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز و درست ہوگا اور بقیہ صورتوں میں صرف اپنی جمع کردہ رقم کے بقدر لینا اور استعمال کرنا جائز ہوگا، زائد کا نہیں۔ اور انشورنس کی صورت میں زائد کے جواز کی جہت حکومت کی نااہلی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے اس کی طرف سے اور اس پر ضمان کی ہے

۴- حضرت مولانا حبیب اللہ قاسمی صاحب مفتی ریاض العلوم، گورینی
۵- حضرت مولانا محمد ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور، ویشالی
۶- حضرت مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب اشرف العلوم کنہواں، سیتامڑھی
۷- حضرت مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی صاحب دار العلوم دیوبند
۸- حضرت مولانا انیس الرحمن قاسمی صاحب امارت شرعیہ، پٹنہ
۹- حضرت مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
۱۰- حضرت مولانا عزیز الرحمن فتح پوری صاحب بمبئی
۱۱- حضرت مولانا رفیق المنان قاسمی صاحب احیاء العلوم، مبارک پور
۱۲- حضرت مولانا سید مصطفی رفاعی ندوی صاحب صدر الاصلاح، بنگلور
۱۳- حضرت مولانا معاذ الاسلام صاحب مراد آباد
۱۴- حضرت مولانا اشفاق احمد صاحب جامعہ شرعیہ، سرائے میر

(مبتلیٰ بہ کی صواب دید پر اجازت کی گنجائش ہے)

۱۵- حضرت مولانا عبد اللہ مغیثی صاحب اجراڑہ، میرٹھ
۱۶- حضرت مولانا محمد ارشد قاسمی صاحب اجراڑہ
۱۷- حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب حیدرآباد
۱۸- حضرت مولانا عبد الجلیل قاسمی صاحب جامعہ اسلامیہ، سمرا چمپارن
۱۹- حضرت مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڈھ
۲۰- حضرت مولانا محمد جنید عالم ندوی قاسمی صاحب دار الافتاء امارت شرعیہ، پٹنہ
۲۱- حضرت مولانا مفتی نسیم احمد قاسمی صاحب رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی
۲۲- حضرت مولانا بدر احمد مجیبی ندوی صاحب خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ
۲۳- حضرت مولانا نجیب احمد قاسمی صاحب جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ
۲۴- حضرت مولانا محمد صدر الحسن ندوی صاحب اورنگ آباد
۲۵- حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مدرسہ شاہی، مراد آباد

(احقر کو املاک کے بیمہ سے اتفاق ہے جیون کے جواز سے اتفاق نہیں ہے)۔

۲۶- حضرت مولانا محمد عبد الرحیم قاسمی صاحب جامعہ حسینیہ خیر العلوم، بھوپال
۲۷- حضرت مولانا مبارک حسین ندوی قاسمی صاحب نیپال
۲۸- حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی صاحب دار العلوم گورکھپور
۲۹- حضرت مولانا شمیم احمد صاحب جامعۃ مفتاح العلوم مئو

۳۰- حضرت مولانا سعید الحق قاسمی صاحب مدنی دار القرآن مئو

۳۱- حضرت مولانا محمد یوسف قاسمی صاحب جامعہ امداد العلوم زید پور، بارہ بنکی

۳۲- حضرت مولانا سرفراز احمد صاحب جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مبارک پور

۳۳- حضرت مولانا افضال احمد قاسمی صاحب خطیب مسجد نیو پاٹلی پترا کالونی، پٹنہ

۳۴- حضرت ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب دار قدرت، میسور، کرناٹک

۳۵- حضرت مولانا عبد القیوم پالن پوری صاحب مدرسہ جامعہ نذیریہ، کاکوسی، گجرات

۳۶- حضرت مولانا عبد اللہ قاسمی صاحب استاد جامعہ اسلامیہ، بنارس

۳۷- حضرت مولانا عبد الرحمن قاسمی پالن پوری صاحب دار العلوم چھاپی، گجرات

۳۸- حضرت مولانا محمد عمران مظاہری صاحب دار العلوم چھاپی، گجرات

۳۹- حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب مدرسہ بیت المعارف، الہ آباد

۴۰- حضرت مولانا تنویر عالم قاسمی صاحب مدرسہ اشرف العلوم کنہواں، سیتامڑھی

۴۱- حضرت مولانا مفتی انور علی اعظمی صاحب دار العلوم مئو

۴۲- حضرت مفتی اقبال احمد صاحب دار العلوم دیوبند

۴۳- حضرت مولانا شعیب اصلاحی صاحب مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ

۴۴- حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب قاضی شریعت بہار واڑیسہ، پٹنہ

۴۵- حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ

۴۶- حضرت مولانا بدر الحسن قاسمی صاحب کویت

۴۷- حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب استاد جامعہ عربیہ، ہتھورا، باندہ

۴۸- حضرت مولانا محمد راشد صاحب دار العلوم دیوبند

۴۹- حضرت مولانا مفتی جمیل احمد نذیری صاحب استاد جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مبارک پور

۵۰- حضرت مولانا ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی صاحب شعبۂ معاشیات، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

۵۱- حضرت مولانا شمس پیرزادہ صاحب بمبئی

(اضطراری صورت ہی میں اجازت دی جاسکتی ہے)

۵۲- حضرت مولانا نذیر احمد قاسمی صاحب بارہ بنکی

(ضرورت شدیدہ کا لحاظ ضروری ہے)

۵۳- حضرت مولانا خبیب احمد قاسمی صاحب اسلامک فقہ اکیڈمی پھلواری شریف، پٹنہ

✧ ✧ ✧

دو ملکوں کی کرنسیوں کا ادھار تبادلہ [۱]

دو ملکوں کی کرنسیوں کے باہمی تبادلہ کے مسئلہ میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کی طرف سے منعقد ہونے والے دوسرے فقہی سمینار میں یہ طے ہو چکا ہے کہ دو ملکوں کی کرنسیاں دو جنس ہیں جن کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔

چوتھے سمینار میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ دو ملکوں کی کرنسیوں کے تبادلہ میں عوضین پر فوری قبضہ مجلس عقد میں ضروری ہے یا نہیں؟ شریک علماء کے دو رجحانات سامنے آئے۔ ایک رائے یہ ہے کہ مجلس عقد میں ہر دو عوض پر فوری قبضہ ضروری نہیں، ایک عوض پر قبضہ کافی ہے، کیونکہ نوٹوں کی حیثیت کلی طور پر سونے چاندی جیسی نہیں کہ یہ اعتباری اور اصطلاحی اثمان ہیں۔

علماء کی ایک جماعت اسے خلقی اثمان (سونے چاندی) کی طرح تصور کرتی ہے، اس لئے بدلین پر قبضہ کو مجلس عقد میں ضروری قرار دیتی ہے۔ البتہ یہ حضرات عام طور پر قبضہ کی تعریف کو وسیع کرتے ہوئے ڈرافٹ اور چیک کے حصول کو اصل بدل پر قبضہ کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ اجلاس ہر دو موثر آراء کو سامنے رکھتے ہوئے طے کرتا ہے کہ دو ملکوں کی کرنسیوں کے ادھار تبادلہ میں بہر حال احتیاط برتی جائے، لیکن واقعی حاجت وضرورت کی صورت میں اول الذکر رائے پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

سود [۲]

۱- ربو (سود) قطعی حرام ہے، اور جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے۔

۲- سود ادا کرنے کی حرمت بذات خود نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سود خواری کا ذریعہ ہے، اس لئے بعض خاص حالات میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کر کے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ کون سا عذر معتبر ہے اور کون سا نہیں، اور کون سی حاجت قابل لحاظ ہے اور کون سی قابل لحاظ نہیں، اس سلسلہ میں معتمد اصحاب افتاء کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔

۳- ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں جن پر سرکار کی طرف سے چھوٹ (Subsidy) دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی اضافی رقم چھوٹ (Subsidy) کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں۔

۴- ہندوستان میں حکومت جب اراضی مملوکہ کو اکوائر کرتی ہے (یعنی بحکم سرکاری وہ اراضی مفاد عامہ کے لئے جبراً خریدی جاتی ہیں) اور حکومت اس کی قیمت مالکان اراضی کو اپنے ضابطوں کے پیش نظر اپنی منشا کے مطابق ادا کرتی ہے۔ مالکان اراضی سرکاری حکم کے خلاف عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں، عدالتیں عادلانہ قیمت کا تعین کرتی ہیں اور مالکان اراضی کو اکوزیشن کی تاریخ سے بذریعہ فیصلہ عدالت اس قیمت کے علاوہ اضافی رقم بھی سود کے نام سے دلاتی ہیں۔ سمینار کی رائے میں یہ اضافی رقم سود نہیں بلکہ قیمت کا جزء ہے جس کا لینا اور اپنے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔

۵- سرکاری بنکوں سے ملنے والے ترقیاتی قرضوں اور ان پر ادا کیے جانے والے سود کے مسئلہ پر ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں غور کر کے کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے علماء و متخصصین کی ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کرتا ہے جو مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کسی نتیجہ پر پہنچے۔

---

[۱] چوتھا فقہی سمینار (حیدرآباد) بتاریخ ۷-۳۰/۲ محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۹-۱۲/ اگست ۱۹۹۱ء۔

[۲] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱/ جمادی الاول ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱/ دسمبر ۱۹۸۹ء۔

اسلامی مالیاتی ادارہ[1]

اسلامی مالیاتی ادارہ کو ریزرو بینک کے حکم کی وجہ سے جبراً اپنے سرمایہ کا پانچ فیصد حصہ سرکاری تمسکات میں محفوظ کرنا پڑتا ہے، اس پر حکومت سود بھی دیتی ہے، تو شرکاء سمینار کے نزدیک یہ صورت درست ہے کہ اس محفوظ سرمایہ پر ملنے والے سود کو بتدریج محفوظ سرمایہ بنا دیا جائے، اور اصل سرمایہ دھیرے دھیرے نکال لیا جائے۔

اسلامی بنکاری[2]

دور حاضر کے مالیاتی اور اقتصادی نظام میں بینک ایک کلیدی حیثیت کا حامل ہے، فاضل سرمایہ کو جمع کر کے مختلف اقتصادی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس کے ذریعہ سرمایہ بھی فراہم ہوتا ہے اور قومی پیداوار میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ مزید برآں بینکنگ ادارے متعدد ایسی خدمات بھی انجام دیتے ہیں جو تجارت، صنعت اور زراعت کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی معاشی جدوجہد اور سرمایہ کاری بھی اس امر کی محتاج ہے کہ وہ موجودہ بینکوں کی طرف رجوع کریں۔ مگر یہ پورا نظام بینکنگ سود کی بنیاد پر قائم ہے جسے اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ سودی نظام غیر عادلانہ اساس پر قائم ہے۔ سود پر مبنی عقد سرمایہ دار کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ ہر حال میں ایک متعین شرح پر منافع وصول کرے، جب کہ صاحب العمل (Entreneur) کا منافع اس کی اقتصادی جدوجہد کی کامیابی یا ناکامی پر منحصر ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ عقد فاسد ہے کیونکہ یہ ظلم پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ سود موجودہ زمانہ میں تفریق دولت اور ترکیز سرمایہ (Concentration of Wealth) کا مؤثر ترین ذریعہ بن گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں موجودہ معاشرہ میں قرض پر دیئے جانے والے سرمایہ (Loan Capital) کو جو تسلط اور قاہرانہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے اس کا شعور تقریباً سارے ہی اصحاب فکر کو کسی نہ کسی درجہ میں حاصل ہو گیا ہے۔

سود کے مفاسد کا یہ ایک مجمل بیان ہے، اس کے مضر اور ظالمانہ اثرات کا حصر یہاں ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ شریعت انسان کی معاشی جدوجہد کی اہمیت کی نہ صرف یہ کہ منکر نہیں ہے بلکہ وہ اس جدوجہد کو ابتغاء فضل اللہ قرار دیتی ہے۔ یہ شریعت انسانوں کے معاشرہ میں بالعموم اور معاشی جدوجہد کے میدان میں بالخصوص عدل و رحمت، دیانت اور امانت کی نہ صرف مقتضی ہے بلکہ وہ بھی ایسے احکام، اصول اور اقدار بھی فراہم کرتی ہے جن پر ایک صحت مند، عادلانہ اور مشفقانہ نظام معیشت قائم ہوتا ہے، سود کی حرمت فی الحقیقت اسی مقصد کے پیش نظر کی گئی ہے۔ اسلامی نظام معیشت ظالمانہ مقابلہ اور تنافس کے بدلے باہمی اخوت، عدل اور مساوات اور عام انسانوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کی وسیع بنیادوں پر قائم ہے۔

ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو بھی انہی بنیادوں پر استوار کریں، تا کہ ایک طرف وہ اس نظام عدل و مساوات کے داعی بن سکیں اور دوسری طرف اپنی معاشی اور معاشرتی زندگی کو بہتر اور مضبوط بنیادوں پر قائم رکھ سکیں۔

---

[1] چھٹا فقہی سمینار (عمر آباد، تامل ناڈ) بتاریخ ۱۷-۲۰ / رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱ / دسمبر ۱۹۹۳ء - ۳ / جنوری ۱۹۹۴ء۔

[2] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱ / دسمبر ۱۹۸۹ء۔

غیر سودی بنیادوں پر بینکنگ کے نظام کے لئے شریعت حقہ نے جو اصول وضوابط عطا فرمائے ہیں وہ موجودہ دور کے مسائل کا بہتر حل پیش کرتے ہیں، بلکہ ہمیں یقین ہے کہ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے وہ موجودہ طریق تنظیم سے بہتر ہیں۔ ان کے اختیار کرنے سے مسلمانوں کی معاشی حالت بھی بہتر ہوگی اور ایسا عادلانہ معاشرہ قائم ہوگا جس کا ہمارا ملک بدرجہ اولیٰ محتاج ہے۔ یہ سمینار سمجھتا ہے کہ مضاربت (Equity Participation)، مشارکت (Partnership) اور مرابحہ (Mark up Pricing) جیسے اصولوں سے قابل عمل اور بہتر نظام بینکنگ قائم کیا جاسکتا ہے، ایسا نظام مالیات اور سرمایہ کاری جو ملک کے لئے ایک پیغام بھی ثابت ہو اور قابل عمل نمونہ بھی۔ البتہ اس سمینار کو اس بات کا مکمل شعور ہے کہ موجودہ عصر کے متعدد مسائل اور سرمایہ کاری کے متعدد وسائل اور معاملات کے پیش نظر ان اصولوں کے انطباق کے لئے ہمیں انتھک جدوجہد کرنا ہوگی، اسلامی نظام بینکنگ کا خاکہ مرتب کرتے وقت مندرجہ ذیل اصولی ہدایات کو ملحوظ رکھنا ہوگا:

۱- اسلام سودی نظام تعاقد کی ہر شکل کو حرام قرار دیتا ہے۔

۲- اسلام مالیاتی اور اقتصادی عقد میں جانبین کے لئے عدل کو ضروری شرط قرار دیتا ہے، جس کا مقتضی یہ ہے کہ صاحب المال اور صاحب العمل دونوں کے ساتھ عدل ہو، صاحب المال منافع میں شریک ہو اور سرمایہ کے نقصان کا مکمل ذمہ دار قرار دیا جائے، جب کہ صاحب العمل (مستقرض) نفع میں شریک ہو اور بصورت نقصان وہ اپنی محنت کی اجرت سے محروم ہو۔

۳- زر کو وسیلہ سمجھا جائے نہ کہ مطلوب بالذات، جس طرح بضائع ضروریہ اور عیش وراحت کے سامان ہوتے ہیں۔

۴- سرمایہ کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھا جائے اور اس کے ذریعہ انسانوں کی حقیقی ضروریات اور ان کی مالی اور اقتصادی استعداد میں اضافہ کا ذریعہ بنایا جائے، برعکس موجودہ طریق تصرف کے، جہاں سرمایہ کو صاحب المال اور بینک اپنی ازدیاد دولت کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

۵- سرمایہ کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ کمزور اور پسماندہ طبقات کی معاشی حالت میں بہتری ہو اور نا منصفانہ تقسیم اور تفریق دولت میں کمی واقع ہو۔ اس اصول کے پیش نظر اسلامی بینکوں کو سرمایہ کی تقسیم اور فراہمی کرتے وقت ضروریات، تحسینیات اور کمالیات میں اول الذکر کو ترجیح دینا ہوگا، اور شرح منافع کے ساتھ اس امر کا بھی لحاظ کرنا ہوگا کہ ملت کے کمزور اور ضعیف صاحبان استعداد کی ہمت افزائی کی جائے۔

۶- ان تمام وسائل تمویل سے احتراز کرنا ہوگا جو اگرچہ عصر حاضر میں مروج ہیں لیکن خیانت، دھوکہ اور کتمان حقیقت کے شاہکار ہیں۔

۷- ان اصولی ہدایات اور اسلامی نظام معیشت ومعاشرت کے عمومی مقاصد، اس کی اخلاقی روح، دیانت وصداقت کی عملی اقدار کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا تاکہ یہ کوشش محض ایک میکانئی مشن نہ بن جائے بلکہ حقیقی معنوں میں جاری نظام منافعت، لوٹ کھسوٹ، نفسانیت کی جگہ پر نظام رحمت اور باہمی خیر سگالی اور تعاون کا آئینہ دار ہو۔

اسی مقصد کے پیش نظر سمینار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ماہرین اور علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو شریعت کے مذکورہ اصول اور اس کی عمومی ہدایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہندوستان کے حالات اور مسلمانوں کے مسائل کے پیش نظر ایسا نظام مالیات تجویز کرے جو مسلمانوں کی امنگوں اور ان کی پسندیدہ اقدار کا آئینہ دار بھی ہو اور ان کے حقیقی معاشی مسائل کا حل بھی۔

✧ ✧ ✧

غیر سودی امدادی سوسائٹیاں[1]

۱- ہندوستانی مسلمانوں کے اقتصادی اور معاشی حالات کے پیش نظر ایسے امدادی مالیاتی اداروں کا قیام ضروری اور مفید ہے جو عامۃ المسلمین سے بلا سود قرض حاصل کریں اور ضرورت مند مسلمانوں کو سود کی ادنیٰ آمیزش کے بغیر قرض فراہم کرسکیں۔

ایسے ادارے دراصل رفاہی اور فلاحی ادارے ہوتے ہیں جن کی بنیاد صلہ، احسان اور تعاون پر ہوتی ہے۔

۲- قرض خواہوں سے قرض میں دی گئی رقم سے زائد وصول کرنا، چاہے اس کا کوئی سا بھی طریقہ اختیار کرلیا جائے، ہرگز جائز نہیں، اور قرض سے زائد حاصل کی گئی رقم شرعاً سود ہے۔ لہذا ذاتی مفاد یا ادارے کے مفاد یا دیگر رفاہی اسکیموں پر خرچ کرنے کے لئے بھی قرض سے زائد کوئی رقم وصول کرنا جائز نہیں، نیز ان اداروں میں جمع شدہ رقوم کو فکسڈ ڈپازٹ میں رکھنا اور ان پر سود حاصل کرنا بھی حرام ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایسے اداروں سے انتظامی مصارف کس طرح پورے کئے جائیں تو یہ "فقہی سمینار" اس کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں کو درست قرار دیتا ہے:

الف- ایسے مالیاتی اداروں کو کچھ اصحاب خیر ایک ملی ضرورت سمجھ کر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اپنے خرچوں سے چلائیں، یعنی انتظامی اخراجات کا بار یہ اصحاب خیر برداشت کریں۔ اگر یہ ادارے مسلمانوں میں اپنا یہ اعتماد حاصل کرلیں کہ یہ خالص شرعی حدود میں عام مسلمانوں کی مالی امداد کے لئے اور ان کو سودی لین دین سے بچانے کے لئے کام کررہے ہیں اور علماء کرام کی رہنمائی بھی ان کو حاصل ہے تو قوی امید ہے کہ اہل ثروت مسلمان ایسے اداروں کے انتظامی مصارف بلکہ ترقیاتی مصارف کے لئے بھی آگے بڑھیں گے۔

ب- سمینار کی رائے میں ایسے تمام امدادی مالی اداروں کو ہر طور پر یہ کوشش کرنی چاہئے کہ سرمایہ کا کچھ حصہ پیداواری ذرائع میں لگا کر جائز آمدنی حاصل کی جائے، اور کم از کم اتنی آمدنی ضرور حاصل کرلی جائے جس سے سوسائٹی کے انتظامی اخراجات پورے کئے جاسکیں۔

ج- سمینار کے شرکاء میں سے متعدد علماء کی رائے یہ ہے کہ اجر الخدمۃ (Service Charge) یا انتظامی اخراجات (Operational Expenses) اگرچہ وہ ضروری اور واقعی اخراجات تک محدود ہوں، قرض خواہوں سے نہیں لئے جاسکتے، بعض علماء کی رائے میں اگرچہ یہ اصلاً جائز ہیں لیکن سود کا دروازہ کھل جانے کا خطرہ ہے، اس لئے اسے قطعی طور پر ممنوع قرار دیا جانا چاہئے۔

دیگر علماء (شرکاء سمینار) کی رائے میں اس طرح کے اداروں کا قیام مفید اور ضروری ہے، اور اگر اصحاب خیر کی طرف سے تعاون یا پیداواری ذرائع میں سرمایہ لگا کر بقدر ضرورت جائز آمدنی حاصل کرکے بھی ادارہ چلانا ممکن نہیں ہو تو ادارے کے ضروری اور حقیقی انتظامی اخراجات قرض خواہوں سے وصول کئے جاسکتے ہیں کہ اس ادائیگی کا کوئی نفع نہ سرمایہ جمع کرنے والوں کو پہنچتا ہے اور نہ ادارہ کے لئے ذریعہ آمدنی ہے۔

ان علماء کی رائے میں ان واقعی اور ضروری اخراجات کے تعین میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اصلاً قرض کی جو روح شریعت کے پیش نظر ہے اس کے ساتھ قرض خواہوں سے ان اخراجات کا وصول کرنا میل نہیں کھاتا، لیکن ان اخراجات کے وصول کرنے کی اجازت ناگزیر حالت کی وجہ سے دی جارہی ہے۔ لہذا ان اخراجات کے تعین میں حد درجہ احتیاط برتی جائے۔

ضروری اور واقعی اخراجات محتاط انداز کے ساتھ متعین کئے جاسکتے ہیں لیکن اگر حسابی مدت کے پورا ہونے کے بعد یہ معلوم ہو کہ انتظامی اخراجات کی مد میں وصول کی گئی تخمینی رقم حقیقی اخراجات سے زائد ہو تو یہ زائد رقم قرض خواہوں کو وصول کئے گئے خرچ کے تناسب سے واپس کردینا واجب ہوگا۔ ☆☆☆

---

[1] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱ / جمادی الاولی ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱ / دسمبر ۱۹۸۹ء۔

غیر سودی بینکنگ[1]

کمیٹی کی تفصیلی رپورٹ پیش ہوئی، اس رپورٹ کی تلخیص اردو زبان میں جناب عبدالحسیب صاحب سابق ڈائرکٹر ریزرو بینک آف انڈیا اور جناب محمد حسین کھٹکھٹے نے شرکاء سمینار کے سامنے پیش کی۔

اس رپورٹ میں یہ امر واضح کیا گیا ہے کہ جب تک بینکنگ کے موجودہ قوانین میں ترمیم نہیں کی جاتی اور بینکوں کو تجارت اور صنعت میں براہ راست سرمایہ لگانے کی اجازت نہیں دی جاتی، موجودہ قانون کے تحت غیر سودی اسلامی بینک قائم نہیں کئے جاسکتے۔

رپورٹ میں متبادل کے طور پر ''انڈین کمپنیز ایکٹ'' اور ''کوآپریٹو کریڈٹ'' کے تحت اسلامی مالیاتی اداروں اور غیر سودی سوسائٹیز قائم کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ بعض خاص حالات میں پارٹنرشپ کی گنجائش بھی ہوسکتی ہے۔

رپورٹ کی روشنی میں مضاربت، شرکت، مرابحہ اور اجارہ جیسے اسلامی طریقہ تجارت کو نیز بینکس کی ان خدمات کو اختیار کئے جانے کی سفارش کی گئی ہے جو سود سے پاک ہیں، جنہیں (Non Banking Services) کہا جاتا ہے۔

اس رپورٹ میں ایک ایسے مرکزی ادارہ (وفاق) کے قائم کرنے کی سفارش بھی کی گئی ہے جو اس طرح کے قائم اسلامی مالیاتی اداروں کو کنٹرول کرے، ان کے استحکام اور قابل اعتماد ہونے کے سرٹیفکٹ جاری کرے، نیز اگر ایسے نئے مالی ادارے قائم کئے جانے کا منصوبہ ہو تو پہلے ان کی صلاحیت کار اور قابل اعتماد ہونے کے سلسلے میں ضروری جائزہ لے اور انہیں اس سلسلے میں مفید مشورہ دے، اور ایک مالیاتی ادارہ کے منجمد سرمایہ کو دوسرے مالیاتی ادارہ کے ذریعہ مفید اور جائز کاروبار میں لگانے کا انتظام کرے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ سفارش بھی کی گئی ہے کہ مستند علماء پر مشتمل ایک ایسا بورڈ بھی تشکیل دیا جائے جو وقتاً فوقتاً ان اسلامی مالیاتی اداروں میں اختیار کئے گئے طریق تجارت پر غور کرکے شرعی حیثیت سے رہنمائی کرے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے چوتھے سمینار منعقدہ ۹-۱۲ / اگست بہ احاطہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، میں بینکنگ کمیٹی کی اس رپورٹ کی تحسین کی گئی، اور شریک علماء وفقہاء و ماہرین کی آراء کو سننے کے بعد طے کیا گیا کہ:

۱- یہ اجلاس اس رپورٹ کو ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کی دستاویزات کے ساتھ ریکارڈ کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور بینکنگ کمیٹی کے ارکان کا اس جامع رپورٹ کے پیش کرنے پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

۲- یہ سمینار طے کرتا ہے کہ علماء کا ایک بورڈ مجمع الفقہ الاسلامی کے ذریعہ تشکیل دیا جائے جو ماہرین کی طرف سے اس طرح کے اسلامی مالیاتی اداروں میں روزمرہ پیش آنے والے سوالات اور عملی مشکلات جنہیں بینکنگ کے ماہرین کی طرف سے انہیں پیش کیا جائے، وہ ان پر شرعی رائے اور فتویٰ صادر کرے، نیز مذکورہ بالا رپورٹ میں اٹھائے گئے سوالات کا فقہ اسلامی کی روشنی میں جائزہ لے کر ان کا شرعی حل پیش کرے۔

۳- سمینار یہ بھی طے کرتا ہے کہ بینکنگ اور اسلامی اقتصادیات کے ماہرین پر مشتمل ایک مستقل بورڈ تشکیل دیا جائے جو مسلسل اپنا کام جاری رکھے اور ایسے بہتر سے بہتر ممکن العمل مالیاتی اداروں کے قیام کے لئے نمونے تیار کرے جن کی بنیاد پر ایسے اداروں کا قیام عمل میں آسکے جو مختلف مالی خدمات انجام دے سکیں، جن کی ضرورت مسلمانان ہند کو ہے، اور وہ شرعاً درست اور قانوناً قابل عمل ہوں۔

۴- یہ بھی طے کیا گیا کہ علماء کے بورڈ میں ایک یا دو بینکنگ کے ماہرین، اور ماہرین کے بورڈ میں ایک یا دو علماء کو بھی رکھا جائے۔

---

[1] چوتھا فقہی سمینار (حیدرآباد) بتاریخ ۲۷-۳۰ / محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۹-۱۲ / اگست ۱۹۹۱ء۔

بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ[1]

اس سمینار میں بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ پر اس نقطۂ نظر سے بحث کی گئی کہ کس صورت میں سود پایا جاتا ہے اور کس صورت میں نہیں پایا جاتا؟ کیوں کہ اسلام میں غریبوں کا استحصال ہونے کی وجہ سے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اس پس منظر میں جو قراردادیں منظور ہوئیں وہ اس طرح ہیں:

۱- چونکہ معاملات میں اصل اباحت ہے، اس لئے اے ٹی ایم کارڈ جس کے ذریعہ مشین سے اپنی جمع کردہ رقم نکالی جاتی ہے، کے استعمال میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

۲- ڈیبٹ کارڈ کا استعمال، اس کے ذریعہ خرید وفروخت اور ایک کھاتہ سے دوسرے کھاتہ میں رقم کی منتقلی درست اور جائز ہے۔

۳- اے ٹی ایم کارڈ اور ڈیبٹ کارڈ کے حصول اور استعمال کے لئے جو رقم ادا کی جاتی ہے وہ کارڈ کا معاوضہ اور سروس چارج ہے، اس لئے اس کا ادا کرنا جائز ہے۔

۴- کریڈٹ کارڈ کی مروج صورت چونکہ سودی معاملہ پر مشتمل ہے، لہذا کریڈٹ کارڈ یا اس قسم کے کسی کارڈ کا حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

نیٹ ورک مارکٹنگ[2]

۱- ملٹی لیول مارکیٹنگ کی مروجہ شکلیں مختلف مفاسد کو شامل ہیں، اس میں دھوکہ، غرر، بیع کو ایک غیر متعلق چیز کے ساتھ مشروط کرنا، ایک معاملہ کو دو معاملوں سے مرکب بنا دینا اور شبہ قمار وغیرہ خلاف شرع باتیں پائی جاتی ہیں، اور خریداروں کا اصل مقصد سامان خرید کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ غیر معمولی کمیشن حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

۲- چونکہ اس میں شرکت جائز نہیں ہے، اس لئے دوسروں کو اس میں شریک کرنا اور نیچے کے ممبروں کی وساطت سے کمیشن حاصل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

۳- مسلمانوں کو اس طرح کے تمام کاروبار سے بچنا چاہئے اور کسی بھی ایسی تجارت میں شامل نہیں ہونا چاہئے، جو اسلام کے مقرر کئے ہوئے اصول تجارت سے متصادم ہو۔

✧ ✧ ✧

---

[1] پندرہواں فقہی سمینار (میسور، کرناٹک) بتاریخ ۱۰-۱۲ / صفر ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۱-۱۳ / مارچ ۲۰۰۶ء۔

[2] سولہواں فقہی سمینار (رشادنگر، اعظم گڈھ) بتاریخ ۱۰-۱۳ / ربیع الاول ۱۴۲۸ھ مطابق ۳۰ / مارچ - ۲ / اپریل ۲۰۰۷ء۔

تعلیمی قرض [1]

تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور ہر علم نافع کی اسلام نے حوصلہ افزائی کی ہے، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے فرد، سماج اور حکومت تینوں کو اپنا کردار ادا کرنا ضروری ہے، اس پس منظر میں یہ سمینار حکومت، سے مطالبہ کرتا ہے کہ:

ہمارے ملک میں تعلیم اتنی مہنگی ہو چکی ہے کہ ملک کے غریب شہریوں خاص کر مسلمانوں کی اکثریت کے لئے معاشی پسماندگی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کا حصول مشکل ترین امر بن گیا ہے، یہ ملک مختلف مذہبوں، زبانوں اور تہذیبوں کا گلدستہ ہے، اس میں کسی ایک طبقہ کا پچھڑ جانا یقیناً قومی ترقی کے لئے نقصاندہ ہے؛ اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں اپنا موثر رول ادا کرے، اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مسلمانوں کو بلاسودی قرض فراہم کرے، نیز تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسلمان بچوں کو معقول اسکالرشپ فراہم کرے اور اس کے حصول کی شرائط کو آسان کرے۔

یہ اجلاس مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے کہ:

۱- ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کو اولین ترجیح دیں اور اپنی آمدنی کا معقول حصہ ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کریں۔

۲- مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنی نئی نسل کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر ملکی، ریاستی اور علاقائی سطح پر اطلاعاتی ادارہ، انجمن، سنٹر قائم کریں، جو ملک اور بیرون ملک میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع اور حکومت کی تعلیمی امدادی اسکیموں سے نئی نسل کو واقف کرائیں۔

۳- مختلف علوم اور کورسوں کے لئے اسکالرشپ فراہم کرنے والے اداروں، تنظیموں کے مابین رابطہ اور تعاون، اطلاعات کے تبادلہ کا نظم قائم ہو؛ تا کہ طالب علموں کو اسکالرشپ کے حصول میں سہولت ہو۔

۴- ریاستی اور علاقائی سطح پر ایسے تعلیمی فنڈ قائم کریں، جس سے ہونہار اور ضرورتمند بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مدد کی جاسکے۔

۵- عصری علوم کے ماہرین خصوصاً ریٹائرڈ اور پروفیشنل حضرات کو چاہئے کہ وہ اپنی معلومات اور تجربات سے نئی نسل کی موثر رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

۶- علماء اور اصحاب ثروت کو چاہئے کہ وہ ان حضرات کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی منظم کوشش کریں۔

۷- مسلمانوں کے عصری تعلیمی ادارے، اخراجات میں ایسی سہولتیں فراہم کریں کہ ضرورتمند و باصلاحیت طلبہ ان سے بآسانی فائدہ اٹھاسکیں، بالخصوص ڈونیشن کے بھاری اور غیر شرعی بوجھ سے مسلمان طلبہ وطالبات کو آزاد کریں، کہ یہ نہ صرف غیر اسلامی؛ بلکہ غیر انسانی طرز عمل بھی ہے۔

یہ اجلاس مسلمان طلبہ وطالبات کو تلقین کرتا ہے کہ:

۱- علم مؤمن کی متاع گم گشتہ ہے؛ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ پروفیشنل علوم کو انسانی خدمت کے جذبہ سے حاصل کریں۔

۲- مسلمان طلبہ وطالبات کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی دینی پہچان کے ساتھ محنت اور تعلیمی مسابقت کو اپنا شعار بنائیں۔

۳- اپنے تعلیمی اخراجات کی تکمیل کے لئے حسب ضرورت اسکالرشپ اور غیر سودی قرض حاصل کرنے اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

۴- جس طرح سود کا لینا حرام ہے، اسی طرح شریعت نے سودی قرض لینے اور سود ادا کرنے کو بھی حرام قرار دیا ہے؛ اس لئے بنیادی طور پر تعلیم کے لئے سودی قرض حاصل کرنا جائز نہیں؛ البتہ اگر کسی کے پاس مالی گنجائش نہ ہو، غیر سودی قرض نہ مل پائے اور اس کے مطلوبہ تعلیم سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہو تو ایسے طلبہ کو چاہئے کہ کسی معتبر مفتی کے سامنے اپنے حالات رکھ کر ان کے مشورہ پر عمل کریں۔

---

[1] اٹھارہواں فقہی سمینار (مدورائی، تامل ناڈ) بتاریخ ۲-۴/ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۸/ فروری-۲/ مارچ ۲۰۰۹ء۔

خواتین کی ملازمت[1]

۱- یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام خاندانی نظام کے استحکام کو بڑی اہمیت دیتا ہے؛ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر اس نے مردوں وعورتوں کی ذمہ داریوں میں تقسیم کار سے کام لیا ہے کہ گھر سے باہر کی ذمہ داریاں جن میں کسب معاش کی تگ ودو بھی داخل ہے، مردوں سے متعلق ہوں گی اور گھر کے اندر کے امور عورتوں سے متعلق ہوں گے، یہ وہ بہترین تقسیم کار ہے، جو مسلم معاشرہ میں آج بھی بڑی حد تک خاندانی استحکام کو باقی رکھے ہوئے ہے؛ اسلئے کسب معاش بنیادی طور پر مردوں کی ذمہ داری ہے نہ کہ عورتوں کی، عورتوں کو بلاضرورت آزادی وترقی کے نام پر کسب معاش پر مجبور کردینا ایک سماجی ظلم ہے، کہ عورتیں بچوں کی پرورش ونگہداشت اور امور خانہ داری وغیرہ اپنے منصبی فرائض بھی انجام دیں. اور اس دوڑ دھوپ میں بھی مردوں کی شریک ہوں۔

۲- عام حالات میں شریعت نے خواتین پر کسب معاش کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے؛ لیکن شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان کے لئے کسب معاش مباح ہے۔

۳- شریعت نے اصولی طور پر خواتین پر نفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے؛ البتہ بعض حالات میں ان پر نفقہ کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

۴- شرعی حدود وشرائط کا پورا پورا لحاظ کرتے ہوئے عورت کے لئے معاشی جدوجہد جائز ہے۔

۵- عورت کے اندرون خانہ کسب معاش کے لئے کوئی صورت اختیار کرنے کی اجازت ہے؛ بشرطیکہ اس سے شوہر اور بچوں کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

۶- الف- شوہر یا ولی اگر عورت کی کفالت کر رہے ہوں، تو ہر عورت کے لئے کسب معاش کی غرض سے گھر سے باہر جانے کے لئے ان کی اجازت ضروری ہے، خواہ وہ جگہ مسافت سفر سے کم ہو یا اس سے زیادہ۔

ب- رات میں کسب معاش کی خاطر عورت کے باہر نکلنے کے لئے شوہر یا محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

۷- خواتین کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلیں تو درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

الف- ولی یا شوہر کی اجازت شامل ہو، سوائے اس کے کہ ولی یا شوہر نفقہ نہ دیتا ہو اور اس کے لئے خود کسب معاش کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

ب- شرعی پردہ کی مکمل رعایت ہو۔

ج- لباس مردوں کے لئے باعث کشش نہ ہو۔

د- خوشبو کے استعمال سے پرہیز ہو۔

ھ- مردوں سے اختلاط بالکل نہ ہو۔

و- اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی کی نوبت نہ آئے۔

ز- شوہر اور بچوں کے حقوق سے بے اعتنائی نہ ہو۔

۸- ملازمت کرنے والی خواتین ایسے اداروں میں کام کریں، جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں؛ لیکن ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں، تو اس صورت میں ضروری ہوگا کہ ادارہ کا کوئی مرد تنہائی میں کسی خاتون کارکن سے بات نہ کرے، اگر ذمہ دار مردوں کے ساتھ تبادلہ خیال کی

[1] اٹھارہواں فقہی سیمینار (مدورائی، تامل ناڈ) بتاریخ ۲-۴/ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۸/فروری-۲/مارچ ۲۰۰۹ء۔

ضرورت ہو تو خواتین پردہ کے اہتمام کے ساتھ بیٹھیں، اپنی آواز میں لوچ سے پرہیز کریں، اسی طرح خواتین کارکن ذمہ دار مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور بے تکلفی کا ماحول ہرگز نہ بنائیں۔

۹- جوان عورتوں کے لئے ایسے اداروں میں کام کرنا جائز نہیں، جہاں ان کے ساتھ مرد کارکن بھی شریک کار ہوں۔

۱۰- ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنے اقارب سے دور تنہا مستقل قیام کرنا جائز نہیں، اگر کسی عورت کے ساتھ بہت مجبوری ہو تو پھر وہ مفتی سے رابطہ کر کے اپنی مشکل کا حل تلاش کر سکتی ہے۔

۱۱- سیمینار حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ خواتین کے لئے رات کی ڈیوٹی کو ممنوع قرار دیا جائے؛ کیوں کہ رات کے وقت ڈیوٹی کے لئے جائے ملازمت تک جانا یا جائے ملازمت پر قیام کرنا ان کی جان و ناموس کے تحفظ کے لئے خطرہ ہے اور یہ ہمارے ملک کے معاشرتی اقدار کے بھی مغائر ہے۔

۱۲- سیمینار حکومت، تعلیمی و رفاہی اداروں اور خاص کر مسلمان انتظامیہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے الگ درسگاہیں اور خواتین کے لئے الگ ہسپتال، اسی طرح شعبہ ہائے زندگی میں عورتوں کے لئے علاحدہ کاؤنٹرز قائم کریں؛ تاکہ خواتین اور لڑکیاں پاکیزہ اخلاقی ماحول میں تعلیم و علاج وغیرہ کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکیں اور ضرورت مند خواتین کے لئے روزگار کے مواقع بھی بڑھیں۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت [۱]

۱- مؤخر مطالبات اور بقایا جات کو قیمتوں کے اشاریہ یا سونے چاندی کی قیمت سے مربوط کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں اور ظن وتخمین پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل بھی ہے اور سخت نزاع کا باعث ہو سکتا ہے، نیز دونوں صورتوں میں ربا کا دروازہ بھی کھل سکتا ہے۔

۲- بہتر ہے کہ مہر مؤجل سونے یا چاندی میں مقرر کیا جائے جیسا کہ اس سے پہلے بھی اکیڈمی فیصلہ کر چکی ہے، ایسی صورت میں بوقت ادائیگی مقررہ مقدار میں سونا یا چاندی ادا کرنا ہوگا، اور اگر اس وقت دونوں فریق اتنی مقدار سونا یا چاندی کی قیمت کے پیسوں کی ادائیگی پر اتفاق کر لیں تو یہ بھی جائز ہے، یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جبکہ کسی شئی کی اجرت یا قیمت سونے یا چاندی میں طے کی جائے۔

☆☆☆

[۱] انیسواں فقہی سمینار (بانسوٹ، گجرات) بتاریخ ۲۷ تا ۳۰/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۲ تا ۱۵/فروری ۲۰۱۰ء۔

تورق کا مسئلہ [1]

بعض دفعہ انسان کو نقد رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے کوئی قرض دینے والا نہیں ملتا، لہٰذا وہ شخص کوئی مال ادھار زیادہ قیمت پر خرید کر کسی تیسرے شخص کے ہاتھ نقد کم قیمت پر فروخت کر دیتا ہے تا کہ اسے نقد رقم حاصل ہو جائے، یہ صورت دور قدیم سے رائج ہے، فقہاء حنابلہ کے یہاں اس صورت مسئلہ کے لئے ''تورق'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جمہور فقہاء کے نزدیک دو علیحدہ عقد ہونے کی بنا پر یہ صورت جائز ہے۔ دور حاضر میں بعض اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے تورّق کے نام سے بعض معاملات کرتے ہیں جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، اس پس منظر میں سمینار میں غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے بعد درج ذیل قرار دادیں طے پائیں:

۱- اگر اسلامی بینک یا کوئی اور مالیاتی ادارہ قرض لینے والے کے ہاتھ سامان زیادہ قیمت میں ادھار فروخت کر کے کم قیمت میں خود ہی یا اس کا کوئی ذیلی ادارہ خریدتا ہے تو یہ ناجائز ہے۔

۲- اگر بینک حقیقت میں خرید و فروخت نہیں کرتا بلکہ یہ صرف کاغذی کارروائی ہوتی ہے تو یہ بھی شرعاً ناجائز ہے۔

۳- اگر اسلامی بینک قرض لینے والے کے ہاتھ اپنا کوئی سامان زائد قیمت میں ادھار فروخت کر کے بے تعلق ہو جائے اور خریدار اس سامان کو قبضہ میں لینے کے بعد اپنے طور پر کسی ایسے شخص کے ہاتھ کم قیمت میں نقد فروخت کر دے جس کا اس بینک سے اس معاملہ میں کوئی تجارتی تعلق نہ ہو تو یہ صورت جائز و درست ہوگی۔

کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت [2]

۱- شریعت اسلامیہ نے مسلمانوں کو معاملات کی صفائی کی طرف خاص توجہ دلائی ہے، اس لئے مسلمان اپنی معاشرت میں معاملات کی صفائی کا خاص اہتمام کریں، خصوصاً تجارت اور کاروبار میں اس کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے۔ ایک شخص تجارت کر رہا ہے، اور اس کی اولاد بھی اس کاروبار میں شریک ہے تو جو بیٹے باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو رہے ہیں، ان کی حیثیت (شریک، اجیر یا معاون کے طور پر) شروع سے متعین ہو جائے، تو خاندانوں میں ملکیت کے اعتبار سے جو نزاعات ہوتے ہیں ان کا بڑی حد تک سدّ باب ہو جائے گا، اس لئے اس طرح کے معاملات میں پہلے سے حیثیت متعین کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

۲- اگر والد نے اپنے سرمائے سے کاروبار شروع کیا، بعد میں اس کے لڑکوں میں سے بعض شریک کار ہو گئے، مگر الگ سے انھوں نے اپنا کوئی

---

[1] انیسواں فقہی سمینار (ہانسوٹ، گجرات) بتاریخ ۲۷ تا ۳۰/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۲ تا ۱۵/فروری ۲۰۱۰ء۔

[2] انیسواں فقہی سمینار (ہانسوٹ، گجرات) بتاریخ ۲۷ تا ۳۰/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۲ تا ۱۵/فروری ۲۰۱۰ء۔

سرمایہ نہیں لگایا اور والد نے ایسے لڑکوں کی کوئی حیثیت متعین نہیں کی، تو اگر وہ لڑکے باپ کی کفالت میں ہیں تو اس صورت میں وہ لڑکے والد کے معاون شمار کئے جائیں گے، اور اگر باپ کی زیر کفالت نہیں ہیں تو عرفاً جو اجرت عمل ہوسکتی ہے وہ ان کو دی جائے۔

۳- اگر والد کے ساتھ بیٹوں نے بھی کاروبار میں سرمایہ لگایا ہو اور سب کا سرمایہ معلوم ہو کہ کس نے کتنا لگایا ہے تو ایسے بیٹوں کی حیثیت باپ کے شریک کی ہوگی، اور سرمائے کی مقدار کے تناسب سے شرکت مانی جائے گی، سوائے اس کے کہ سرمایہ لگانے والے بیٹے کی نیت والد کے یا مشترکہ کاروبار کے تعاون کی ہو شرکت کی نہیں۔

۴- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمائے سے شروع کیا ہو لیکن بہ طور احترام دوکان پر والد کو بٹھایا ہو یا اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا، والد کو دوکان پر بٹھانے یا ان کے نام پر دوکان کا نام رکھنے سے کاروبار میں والد کی ملکیت و شرکت ثابت نہ ہوگی۔

۵- باپ کی موجودگی میں اگر بیٹوں نے اپنے طور پر مختلف ذرائع کسب اختیار کئے اور اپنی کمائی کا ایک حصہ والد کے حوالے کرتے رہے تو اس صورت میں باپ کو ادا کردہ سرمایہ باپ کی ملکیت شمار کی جائے گی۔

۶- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہوگیا لیکن کاروبار کی جگہ باقی ہو، خواہ وہ جگہ مملوکہ ہو یا کرائے پر حاصل کی گئی ہو، اور اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی جگہ اور اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا تو اس صورت میں جس نے سرمایہ لگا کر کاروبار شروع کیا، کاروبار اس کی ملکیت ہوگی، والد کی ملکیت نہیں ہوگی، لیکن وہ جگہ (خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر لی گئی ہو) دوبارہ کاروبار شروع کرنے والے کی نہیں بلکہ اس کے والد کی ہوگی، اور والد کی وفات کی صورت میں اس میں تمام ورثہ کا حق ہوگا، اور اسی طرح کاروبار کا گڈول بھی باپ کا حق ہے اور اس کی وفات کے بعد تمام ورثہ کا حق ہوگا۔

۷- اس موضوع سے متعلق سماج میں پیش آنے والے مختلف مسائل ہیں جن کو واضح کرنے اور عام مسلمانوں کو ان سے واقف کرانے کی ضرورت ہے؛ اس لئے یہ اجتماع اکیڈمی سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ایک مفصل رہنما تحریر تیار کرے اور ان میں جو مسائل قابل تحقیق ہوں حسب گنجائش آئندہ منعقد ہونے والے سمیناروں میں انہیں اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ طے کرے۔

۸- ائمہ وخطباء اور علماء کرام سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں معاملات کی صفائی کے سلسلے میں ذہن سازی کریں، اور شرکت و میراث وغیرہ کے جو شرعی اصول واحکام ہیں ان سے ان کو آگاہ کریں، خاص طور پر والدین، اولاد، بھائیوں اور میاں بیوی کے درمیان شرکت کے مسائل سے واقف کرائیں۔

مختلف النوع ملازمتیں[1]

۱- الف: فوج کا بنیادی مقصد ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور غیر معمولی حالات میں امن وامان کا قیام ہے، یہ دونوں مقاصد شریعت اسلامیہ میں بھی مطلوب ہیں، اس لیے مصلحت عامہ کے پیش نظر فوج کی ملازمت مسلمانوں کے لیے جائز ہے، البتہ حتی الامکان غیر شرعی اقدام سے احتراز ضروری ہے۔

ب- پولیس کا محکمہ بھی دراصل امن وامان قائم کرنے اور شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے اس لئے اس کی بھی ملازمت جائز ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے فرض کی انجام دہی کے لئے کسی طرح کا ظلم وستم وغیرہ نہ کیا جائے۔

ج- ملک کی سلامتی، امن وامان کے قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے انٹلی جینس کی ملازمت درست ہے، البتہ ہر ایسے طریقۂ کار سے اجتناب لازم ہے جو غیر شرعی اور حقوق انسانی کے خلاف ہو۔

د- عدلیہ کا مقصد انصاف کی فراہمی اور ظلم وحق تلفی کی روک تھام ہے، لہٰذا عدلیہ کی ملازمت درست ہے۔

ھ- حکومت کی طرف سے رعایا کی فلاح و بہبود کی غرض سے مختلف ٹیکس عائد کئے جاتے ہیں اور ان کے لیے محکمے و ادارے قائم ہیں ایسے اداروں کی ملازمت شرعی حدود کا لحاظ کرتے ہوئے جائز ہے۔

۲- الف: بینک کا بنیادی کام سودی لین دین کا ہے اس لیے اصولی طور پر بینک یا کسی سودی کاروبار کے ادارے کی ملازمت جائز نہیں ہے۔

ب- بینک کی ایسی ملازمت جس کا تعلق براہ راست سودی معاملات (سود کے لکھنے اور لینے و دینے وغیرہ) سے نہ ہو ایسی ملازمت کی گنجائش ہے، اور اس سے بھی بچنا بہتر ہے۔

ج- بینک کے لئے عمارت وغیرہ کا کرایہ پر دینا مکروہ ہے۔

د- انشورنس کمپنیاں عام طور سے سود و قمار کا کام کرتی ہیں لہٰذا ایسی کمپنیاں جن میں سود و قمار یا کسی ایک کا نظام ہو ان کی ملازمت جائز نہیں ہے۔

ھ- انشورنس کی وہ کمپنیاں جن کا نظام سود و قمار سے پاک ہو ان کی ملازمت درست ہے کہ جان و مال کی حفاظت اسلام کے مقاصد میں سے ہے۔

و- شراب سازی کے کام و کارخانہ میں کسی طرح کی بھی ملازمت ناجائز ہے۔

ز- ایسی اشیاء جن کا استعمال شراب سازی کے لیے کیا جاسکتا ہے ان کا شراب سازی کا کام کرنے والوں کے ہاتھوں فروخت کرنا اور ایسے کاموں کی ملازمت کی گنجائش ہے مگر اس سے بچنا بہتر ہے۔

۳- الف- ایسے سوپر مارکیٹ کی ملازمت جس میں شراب کے علاوہ اکثر جائز اشیاء فروخت ہوتی ہوں اور ملازمت کا تعلق براہ راست شراب سے

---

[1] بیسواں فقہی سمینار (رامپور، یوپی) بتاریخ: ۲۹/ ربیع الاول- ۱/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۵-۷/ مارچ ۲۰۱۱ء۔

نہ ہوتو ایسی ملازمت جائز ہے۔

ب- اسلامی نقطۂ نظر سے مخلوط تعلیمی نظام درست نہیں ہے؛ البتہ جہاں جداگانہ تعلیمی نظام کی سہولت نہ ہو وہاں ضرورۃً اس سے استفادہ کی گنجائش ہے، اور مخلوط تعلیم گاہ نیز جہاں صنف مخالف کو تعلیم دینے کی نوبت آئے وہاں تدریسی ملازمت کی گنجائش ہے البتہ شرعی حدود و ہدایات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

ج- یہ سمینار مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کریں جو جداگانہ نظام پر مبنی ہوں اور ان میں شرعی حدود و احکام کی پوری رعایت ہو، نیز تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ معیار کو پورا کرتے ہوں؛ تاکہ مسلمان طلبہ و طالبات ان مفاسد سے بچتے ہوئے تعلیم حاصل کر سکیں جو آہستہ آہستہ عصری تعلیمی اداروں کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

د- پیشہ وکالت فی نفسہ جائز ہے؛ البتہ غلط مقدمات کی پیروی اور صاحب حق کی حق تلفی کے لیے وکالت اور کذب بیانی وغیرہ جائز نہیں ہے۔

ہ- طبابت (ڈاکٹری) انسانی خدمات اور آمدنی کا بہترین ذریعہ ہے، طبیب کا بطور ملازمت کسی اسپتال میں اجرت پر کام کرنا اور علاج کرنا جائز ہے۔

و- بلاضرورت کسی مریض کا ٹسٹ کرانا، آپریشن تجویز کرنا یا کسی دوا کا دینا محض اضافۂ آمدنی کے لیے جائز نہیں ہے، ایسا کرنا خیانت اور بد دیانتی ہوگی اور اس طور پر حاصل کیا ہوا مال جائز نہیں ہوگا۔

۲- مرد مریض کے لیے مرد معالج اور خاتون مریض کے لیے خاتون معالج ہونا چاہئے؛ البتہ ضرورت کے موقع پر صنف مخالف کا علاج کیا جاسکتا ہے۔

۳- بلاضرورت کسی کے جسم کے ایسے حصے پر نظر کرنا یا مس کرنا جو ستر میں داخل ہے، جائز نہیں ہے؛ البتہ بوقت ضرورت معالج کے لیے مریض کے ایسے قابل ستر حصہ کو جس کا تعلق مرض سے ہے، بقدر ضرورت دیکھنا اور چھونا جائز ہے۔

۴- ہوٹل کی ملازمت فی نفسہ جائز ہے۔ ہوٹل میں قیام کرنے والے اشخاص کا اپنے طور پر اس میں محرمات کا استعمال ہوٹل مالک کے لیے حاصل ہونے والے کرایہ پر اثر انداز نہیں ہوگا، اس کی اجرت اور کرایہ جائز ہے۔

۵- ہوٹل مالک یا اس کے کسی ملازم کے ذریعہ محرمات کی فراہمی تعاون علی الاثم براہ راست شمار ہوگی اور اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہوگا۔

☆☆☆

اسلامی تکافل[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کے اکیسویں فقہی سمینار (۳-۵ / مارچ ۲۰۱۲ء) منعقدہ جامعہ اسلامیہ بنجاری میں غور وخوض اور تبادلہ خیال کے بعد درج ذیل امور باتفاق رائے طے ہوئے:

انسانی زندگی خطرات سے گھری ہوئی ہے، خاص طور سے صنعتی انقلاب کے بعد جہاں معاشی ترقی کے وسیع تر مواقع پیدا ہوئے اور انسان کے لئے آسانیاں بڑھیں وہیں مشینی انقلاب نے خطرات میں بھی اضافہ کیا۔ انسان فطری طور پر چاہتا ہے کہ ممکنہ تدابیر واسباب کے ذریعہ ایسی پیش بندی کی جائے کہ خطرات سے ممکن حد تک اس کا تحفظ ہو، اور اگر کوئی حادثہ پیش ہی آجائے تو وہ اس کے لئے مالی طور پر نا قابل برداشت نہ رہے۔

شریعت اسلامیہ انسان کی اس فطری خواہش کو نظر انداز نہیں کرتی، بلکہ اسلام میں مستقبل کی پیش بندی اور ممکنہ خطرات سے تحفظ کی تدابیر کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ قرآن وحدیث میں اجتماعی تعاون، امداد باہم، اور تبرع وایثار کی واضح ہدایات موجود ہیں، شریعت میں خطرات کی تقسیم وتخفیف کا تصور بھی ملتا ہے، جس سے ایک فرد کا نقصان پوری جماعت میں تقسیم ہوجائے اور فرد کے لئے اس کو برداشت کرنا آسان ہوجائے۔

اسلامی تکافل کی بنیاد دراصل انہی تصورات پر قائم ہے، جس میں ہر شریک کے لئے بہتر مستقبل کی پیش بندی کی جاتی ہے، اور ممکنہ خطرات سے تحفظ کا سامان کیا جاتا ہے، اس بنا پر یہ سمینار محسوس کرتا ہے کہ تکافل کو مفاسد سے بچاتے ہوئے مضبوط شرعی بنیادوں پر مستحکم کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ جو لوگ ان مقاصد کے حصول کے لئے مروجہ غیر اسلامی انشورنس کمپنیوں اور سود وقمار پر مبنی اداروں کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان کو صحیح اسلامی متبادل فراہم کیا جائے۔

۱- تکافل کی سب سے بہتر اور شریعت کے اصول ومقاصد سے ہم آہنگ صورت یہ ہے کہ اس کی بنیاد خالصتاً تعاون پر ہو، اور ممبروں کے لئے سرمایہ کاری کے ذریعہ نفع حاصل کرنے کو اس کے ساتھ جوڑا نہ جائے۔

۲- اسلامی تکافل کی تشکیل کے لئے تین شرعی اساس موجود ہیں: ہبہ بالعوض، التزام بالتبرع یا وعدۂ ہبہ، اور وقف۔ مختلف قانونی احوال وظروف میں ان میں سے کسی کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۳- تکافل کی مختلف صورتوں کے مروجہ طریقۂ کار کا جائزہ لینے اور اس سلسلہ میں تفصیلی ہدایات مرتب کرنے کے لئے اکیڈمی عنقریب ایک کمیٹی تشکیل کرے گی جس میں کم از کم پانچ علماء نیز انشورنس، مالیات اور قانون سے متعلق تین ماہرین شامل ہوں، جو عمومی طور پر اس مسئلہ میں غور کریں اور ہندوستان کے قانون کے پس منظر میں بھی قابل عمل صورت کی نشاندہی کریں۔

۴- تکافل کی جو بھی صورت اختیار کی جائے یہ ضروری ہے کہ تمام امور کی نگرانی کے لئے انتظامی کمیٹی کے علاوہ ایک شرعی نگراں بورڈ بھی قائم کیا جائے جس کو تمام معاملات کے دیکھنے کا پورا اختیار ہو اور اس کا فیصلہ کمپنی کے لئے ہر حال میں واجب العمل ہو۔

۵- یہ سمینار اپیل کرتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مصیبت زدہ افراد کی اعانت کے لئے اوقاف قائم کریں، امداد باہمی کی انجمنوں کو وجود میں لائیں، اور مختلف اداروں، کمپنیوں اور پیشوں سے مربوط افراد باہمی تعاون کے ایسے نظام کو فروغ دیں کہ حادثات سے دوچار ہونے والے ساتھیوں کے نقصانات کی تلافی ہوسکے، اور معاونین اجر وثواب کے لئے اس کام کو انجام دیں۔

۶- اسلامک فقہ اکیڈمی حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ ربا وقمار سے پاک تکافل کمپنی اور مالیاتی ادارے کے قیام میں تعاون فراہم کرے اور قانونی رکاوٹوں کو دور کرے۔

---

[1] اکیسواں فقہی سمینار (اندور، یوپی) بتاریخ: ۹-۱۱ / ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ مطابق ۳-۵ / مارچ ۲۰۱۲ء۔

بیع الوفاء[1]

۱- بیع وفا کے موضوع پر تمام مقالات، تحریروں اور بحث ومباحثہ کے بعد شرکاء سمینار کا احساس ہے کہ ہمارے معاشرہ سے باہمی تعاون اور قرض حسنہ کا جذبہ کم اور قرض کی واپسی میں ٹال مٹول کا مزاج بڑھتا جا رہا ہے، اس لیے سمینار امت مسلمہ سے اپیل کرتا ہے کہ قرض حسنہ کی جو فضیلت ہے اس کو حاصل کرنے اور قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کی قباحت سے بچنے کی فکر پیدا کی جائے، ساتھ ہی ساتھ شریعت اسلامی سے اس بارے میں جو رہنمائی ملتی ہے اس پر عمل کیا جائے۔

۲- شریعت میں رہن کا مقصد قرض کی وصولیابی کو یقینی بنانا ہے، لہٰذا قرض دہندہ کے لیے مال مرہون سے استفادہ کرنا جائز نہیں، یہ غریبوں کا استحصال اور سودخوری کا ایک ذریعہ ہے۔

۳- اگر قرض دہندہ مال مرہون سے فائدہ اٹھائے تو انتفاع کے بقدر رقم قرض سے منہا ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ اگر قرض کی پوری رقم کے بقدر انتفاع کر چکا ہو تو مال مرہون بغیر کسی مطالبہ کے مقروض کو واپس کرنا واجب ہوگا۔

۴- اگر کوئی شخص سخت ضرورت مند ہو، اس کو نہ قرض حسن ملے اور نہ ہی رہن پر قرض ملے اور وہ نقد رقم حاصل کرنے کے لیے اپنی کوئی چیز کسی کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، جب کہ اس کا ارادہ ہو کہ بعد میں اس کو دوبارہ خرید لے گا تو اس کی گنجائش ہے، البتہ واپس خریداری کا ذکر اس معاملے کے کرنے کے درمیان نہ کیا جائے؛ بلکہ اس سے الگ باہمی معاہدہ ہو جائے کہ خریدار اسے اسی قیمت پر دوبارہ بائع کو فروخت کر دے گا تو ایسا کرنا درست ہوگا، اس صورت میں کہ خریدار کے لیے مبیع سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، تاہم اس سے احتیاط کرنا بہتر ہے۔

۵- کسی بھی جائداد- دکان و مکان- کو کرایہ پر لین دین کے لیے ضمانت کے نام سے لی جانے والی رقم شرعاً قرض کے حکم میں ہے۔

۶- قرض کی بنا پر کرایہ میں مروجہ اجرت کے مقابلہ میں غیر معمولی کمی (غبن فاحش) ''کل قرض جر نفعا فهو حرام'' کے تحت ناجائز ہے۔

صکوک[2]

موجودہ دور میں جو مالیاتی ادارے قائم ہوئے ہیں، ان میں سے بعض انسانی ضرورتیں اور معاشی مصلحتیں متعلق ہیں، نیز اپنے بنیادی مقاصد کے اعتبار سے وہ شریعت اسلامی کے مزاج و مذاق سے متصادم نہیں ہیں؛ لیکن ان کے لئے ایسا طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے جس میں شرعی نقطۂ نظر سے بعض مفاسد داخل ہو گئے ہیں، علماء اسلام کا فریضہ ہے کہ وہ ان کا ایسا متبادل پیش کریں، جو اپنے طریقۂ کار کے اعتبار سے بھی شریعت اسلامی سے ہم آہنگ ہوں، اسی طرح کی ایک کوشش اسلامی مالیاتی اداروں نے سود پر مبنی باؤنڈز کے مقابلہ 'صکوک' کی صورت میں کی ہے، جس کی بنیاد مختلف شرعی عقود پر رکھی گئی ہے؛ تاہم اس کی صورت میں بہت تنوع ہے اور شرکاء سمینار کا احساس ہے کہ صورت مسئلہ کو مزید سمجھنے اور اس پر حکم شرعی کی تطبیق کے سلسلہ میں مزید غور کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے ''تجویز کمیٹی'' کی رپورٹ کو ریکارڈ کیا جاتا ہے اور اس مسئلہ کو مستقبل کے لئے موقوف رکھا جاتا ہے۔

---

[1] بائیسواں فقہی سمینار (امروہہ، یوپی) بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء۔

[2] بائیسواں فقہی سمینار (امروہہ، یوپی) بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء۔

ہبہ سے متعلق مسائل[1]

۱- ہبہ کرنے والے کو چاہئے کہ جو شئ ہبہ کرنی ہو، اگر وہ قابل تقسیم ہو تو اسے تقسیم کر کے ہبہ کرے۔

۲- اگر مشاع یعنی مشترکہ چیز کو ہبہ کیا جائے تو اگر چہ قیمت واہمیت کے لحاظ سے اس کے مختلف حصوں کی حیثیت میں فرق ہو، لیکن اس کی تقسیم اور قبضہ کے سلسلہ میں ان لوگوں کے درمیان کوئی باہمی نزاع نہ ہو جن کو ہبہ کی گئی ہے تو یہ ہبہ درست ہے۔

۳- ہبہ کے مکمل ہونے کے لئے کہ شرط ہے کہ جس کو ہبہ کیا گیا ہو وہ اس پر قبضہ بھی کر لے۔

۴- جس کو ہبہ کیا گیا ہے، اگر وہ ہبہ کرنے کے وقت نابالغ ہو اور اس کی طرف سے ولی قبضہ کر لے تو کافی ہے۔ بالغ ہونے کے بعد دوبارہ قبضہ کی ضرورت نہیں۔

عقد استصناع (آرڈر پر سامان تیار کرانے کا معاملہ) سے متعلق مسائل[2]

۱- عقد استصناع اصلاً بیع ہے اور یہ ہر اس چھوٹی بڑی منقول اور غیر منقول چیز میں جائز ہے جن میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں:

(الف) وہ چیز قابل صنعت ہو۔

(ب) وہ چیز اس لائق ہو کہ مقدار، وصف، وزن اور سائز وغیرہ کے ذریعہ اس کو متعین کیا جا سکتا ہو۔

(ج) اس چیز کی تیاری میں میٹریل صانع (آرڈر لینے والے) کی طرف سے ہو۔

(د) اس میں استصناع (آرڈر پر خرید وفروخت) کا تعامل اور رواج ہو۔

(س) عقد کے وقت اس چیز کی جنس، نوعیت، وزن، سائز، ڈیزائن اور دیگر مطلوبہ صفات کی وضاحت اس طرح کر دی جائے کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

۲- عقد استصناع کے بعد فریقین معاملہ کے پابند ہوں گے اور کسی فریق کو دوسرے فریق کی رضا کے بغیر معاملہ کو فسخ کرنے کا حق واختیار حاصل نہ ہوگا۔

۳- صانع (آرڈر قبول کرنے والے) کو اختیار ہوگا کہ وہ سامان خود تیار کرے یا دوسرے سے تیار کرائے، البتہ مُستَصنِع یعنی آرڈر دینے والا اس شئ کے حاصل ہونے سے پہلے کسی دوسرے کے ہاتھ نہیں فروخت کر سکتا۔

۴- عقد استصناع میں آرڈر قبول کرنے والے کے لیے بیعانہ کی رقم سے اپنے حقیقی نقصان کی تلافی کرنا درست ہے۔

۵- عقد استصناع میں مبیع کی حوالگی کی مقررہ تاریخ کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں آرڈر دینے والے کو ہونے والے حقیقی نقصان کی تلافی کے لیے فریقین عقد کے وقت اگر کسی شرط پر اتفاق کر چکے ہوں تو اس کے پابند ہوں گے۔

☆☆☆

---

[1] تیئیسواں فقہی سمینار (جمبوسر، گجرات) بتاریخ: ۲۸، ۲۹ ربیع الثانی وکیم جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ مطابق ۱-۳/ مارچ ۲۰۱۴ء۔

[2] تیئیسواں فقہی سمینار (جمبوسر، گجرات) بتاریخ: ۲۸، ۲۹ ربیع الثانی وکیم جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ مطابق ۱-۳/ مارچ ۲۰۱۴ء۔

طبی مسائل

طبی اخلاقیات اور اطباء کے فرائض [1]

۱: الف- علاج کرنے کا حق اس شخص کو حاصل ہے جو فن کا علم رکھتا ہو اور تجربہ کار ہو، اور اس کے علم اور تجربہ کی کسی مستند و معتبر ذریعہ نے تصدیق کی ہو، صحیح علم و تجربہ کے بغیر علاج معالجہ کرنا جائز نہیں۔

ب- جس شخص کو علاج معالجہ کی شرعاً اجازت نہیں ہے، اگر اس کے علاج کی وجہ سے مریض کو غیر معمولی ضرر لاحق ہو جائے تو ضمان عائد ہوگا۔

۲- اگر کسی مستند معالج نے علاج میں کوئی کوتاہی کی اور اس کی وجہ سے مریض کو ضرر پہنچ گیا تو معالج ضامن ہوگا۔

۳- اس طرح قدرت کے باوجود مریض یا اس کے اولیاء کی اجازت کے بغیر اگر ڈاکٹر مریض کا آپریشن کردے اور آپریشن مضر یا مہلک ثابت ہو تو ضمان لازم آئے گا۔

۴- اگر مریض بے ہوش ہے اور اس کے اولیاء وہاں موجود نہ ہوں اور ڈاکٹر یہ محسوس کرتا ہو کہ اس کی جان یا عضو کی حفاظت کے لئے فوری آپریشن ضروری ہے، اور اس نے اجازت کے بغیر آپریشن کردیا مگر مریض کو نقصان پہنچ گیا تو ڈاکٹر ضامن نہ ہوگا۔

۵- اگر کسی شخص کے رشتہ نکاح کی بات چل رہی ہے اور وہ کسی مرض یا عیب میں مبتلا ہے جس پر مطلع ہونے کے بعد مخطوبہ عورت اس سے نکاح کرنے پر راضی نہ ہوگی، ڈاکٹر کو اپنے مریض کے مرض یا عیب کا علم ہے، اس صورت میں اگر عورت یا اس کا ولی ڈاکٹر سے ملاقات کرکے مریض کے مرض یا عیب کے بارے میں رشتہ نکاح کے حوالہ سے مریض کی صحیح صورت حال معلوم کرنا چاہیں تو ڈاکٹر کے لئے ضروری ہے کہ صحیح صورت حال کی خبر دے دے، لیکن ڈاکٹر سے اگر اس بارے میں عورت یا اس کے اولیاء نے رابطہ قائم نہیں کیا تو اس کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ عورت یا اس کے اولیاء کو اس مرض یا عیب کی اطلاع دے۔

۶- ڈرائیور کی بینائی کے متاثر ہونے کی صورت میں ڈاکٹر پر ضروری ہوگا کہ وہ متعلقہ محکمہ کو باخبر کردے، اسی طرح ہوائی جہاز کا پائلٹ یا ٹرین اور بس کا ڈرائیور اگر نشہ کا عادی ہو اور اس سے مسافروں کو خطرہ لاحق ہو تو ڈاکٹر پر لازم ہوگا کہ وہ متعلقہ محکمہ کو آگاہ کردے۔

۷- اگر ڈاکٹر کو اپنے مریض کے جرم کی اطلاع ہو اور جرم میں کوئی بے گناہ شخص ماخوذ ہو رہا ہو تو اس بے گناہ شخص کی براءت کے لئے ڈاکٹر پر حقیقت حال کا اظہار ضروری ہے، رازداری سے کام لینا اس کے لئے جائز نہ ہوگا۔

✧ ✧ ✧

---

[1] آٹھواں فقہی سمینار (علی گڑھ، یوپی) بتاریخ ۲۷-۲۹/ جمادی الاول ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۲-۲۴/ اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

ضبط ولادت [1]

۱- کوئی بھی ایسا عمل جس کا مقصد نسل انسانی کے سلسلے کو منقطع یا محدود کرنا ہو اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف اور ناجائز ہے۔

۲- بطور فیشن خاندان کو مختصر رکھنے یا تجارت وملازمت کی مشغولیتوں کے متاثر ہونے یا سماجی دلچسپیوں میں رکاوٹ پیدا ہونے کی وجہ سے اولاد کی ذمہ داری سے انکار وگریز کو شرع اسلامی کسی حال میں قبول نہیں کر سکتی۔

۳- جو خواتین بلند معیار زندگی کے حصول یا زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی خاطر نوکریاں کرنا چاہتی ہیں اور اپنے مقصد تخلیق اور اس مقدس فریضے کو بھول جاتی ہیں جو قدرت نے نسل انسانی کی ماں کی حیثیت سے ان پر عائد کیا، ان مقاصد کی خاطر خاندان کو محدود کرنے کا تصور قطعاً غیر اسلامی ہے۔

۴- جو بچہ موجود ہے اس کی پرورش، رضاعت، اور نشوونما میں اگر ماں کے جلد حاملہ ہونے کی وجہ سے نقصان کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں مناسب وقفہ قائم رکھنے کی خاطر عارضی مانع حمل تدابیر اختیار کرنا جائز ہے۔

۵- دائمی منع حمل کی تدابیر کا استعمال مردوں کے لئے کسی بھی حال میں درست نہیں ہے، عورتوں کے لئے بھی منع حمل کی مستقل تدابیر ممنوع ہیں، سوائے ایک صورت کے۔ وہ استثنائی صورت یہ ہے کہ ماہر قابل اعتماد اطباء کی رائے میں اگلا بچہ پیدا ہونے کی صورت میں عورت کی جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہوجانے کا ظن غالب ہو، تو اس صورت میں عورت کا آپریشن کرا دینا تاکہ استقرار حمل نہ ہو سکے جائز ہے۔

۶- عارضی منع حمل کی تدابیر اور ادویہ کا استعمال بھی عام حالت میں جائز نہیں۔

۷- چند استثنائی صورتوں میں عارضی منع حمل کی تدابیر وادویہ کا استعمال مردوں اور عورتوں کے لئے درست ہے، مثلاً:

☆ عورت بہت کمزور ہے۔ ماہر اطباء کی رائے میں وہ حمل کی متحمل نہیں ہو سکتی اور حمل ہونے سے اسے شدید ضرر لاحق ہونے کا قوی اندیشہ ہو۔

☆ ماہر اطباء کی رائے میں عورت کو ولادت کی صورت میں ناقابل برداشت تکلیفوں اور ضرر میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو۔

✦✦✦

---

[1] پہلا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۲۳-۲۵/شعبان ۱۴۰۹ھ مطابق ۱-۳/اپریل ۱۹۸۹ء۔

اعضاء کی پیوندکاری[1]

۱- کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو چکا ہو اور اس عضو کے عمل کو آئندہ جاری رکھنے کے لئے کسی متبادل کی ضرورت ہو تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے:

الف-غیر حیوانی اجزاء کا استعمال۔

ب-ایسے جانوروں کے اعضاء کا استعمال جن کا کھانا شرعاً جائز ہے اور جو بطریقہ شرعی ذبح کئے گئے ہوں۔

ج-جان کی ہلاکت یا عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو اور اس مطلوبہ عضو کا بدل صرف ایسے جانوروں میں ہی مل سکتا ہے جن کا کھانا حرام ہے، یا حلال تو ہے لیکن بطریق شرعی ذبح نہیں کئے گئے ہیں، تو ایسی صورت میں ان غیر ماکول یا ماکول اللحم مگر غیر مذبوح جانوروں کے اعضاء کا استعمال جائز ہے۔

اور اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو تو خنزیر کے اجزاء کا استعمال جائز نہیں۔

۲- اسی طرح ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقت حاجت استعمال کیا جانا جائز ہے۔

۳- اعضاء انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔

۴- اگر کوئی مریض ایسی حالت میں پہنچ جائے کہ اس کا کوئی عضو اس طرح بے کار ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ کسی دوسرے انسان کا عضو اس کے جسم میں پیوند نہ کیا جائے تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائے گی، اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کی کو پورا نہیں کر سکتا، اور ماہر قابل اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضو انسانی کی پیوند کاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے، اور عضو انسانی کی پیوند کاری کی صورت میں ماہر اطباء کو ظن غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی اور متبادل عضو انسانی اس مریض کے لئے فراہم ہے، تو ایسی ضرورت، مجبوری اور بے کسی کے عالم میں عضو انسانی کی پیوند کاری کرا کر اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کے لئے مباح ہوگا۔

۵- اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اگر اس کے دو گردوں میں سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو بظاہر اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر نہیں بدلا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچالے۔

۶- اگر کسی شخص نے ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوند کاری کے لئے استعمال کئے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جا سکتا اور ایسی وصیت اور خواہش شرعاً قابل اعتبار نہیں۔

(نوٹ:......مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب کو دفعہ ۴، ۵ سے اتفاق نہیں ہے)۔

✦ ✦ ✦

[1] دوسرا فقہی سمینار (دہلی) بتاریخ ۸-۱۱/جمادی الاول ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱/دسمبر ۱۹۸۹ء۔

ایڈز[۱]

۱- اگر کوئی مرد ایڈز کا مریض ہو، مگر اس نے اپنا مرض ظاہر کئے بغیر کسی خاتون سے نکاح کرلیا تو ایسی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔ اور اگر نکاح کے بعد مرد اس بیماری میں مبتلا ہوجائے اور خطرناک حد تک پہنچ جائے تو خاتون کے لئے فسخ نکاح کا حق ہوگا۔

۲- ایڈز کی مریضہ اگر حاملہ ہوجائے اور مستند ڈاکٹروں کی رائے میں غالب گمان یہ ہے کہ بچہ بھی اس مرض سے متاثر ہوگا، تو ایسی صورت میں حمل میں جان آنے سے پہلے جس کی مدت فقہاء نے ۱۲۰ دن لکھی ہے، اسقاط کرانے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۳- ایڈز کے مریض کو اگر مرض نے پورے طور پر اپنی گرفت میں لے لیا ہو اور وہ زندگی کے معمولات کو ادا کرنے سے معذور ہوگیا ہو تو ایسے شخص کو مرض موت کا مریض سمجھا جائے گا۔

۴- ایڈز کے مریض کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر والوں یا متعلقین کو اس مرض سے مطلع کردے اور خود بھی احتیاطی تدابیر ملحوظ رکھے۔

۵- ایڈز کا مریض اگر اپنے مرض کو چھپانے پر ڈاکٹر سے اصرار کررہا ہے اور ڈاکٹر کی رائے میں اس کے مرض کو راز میں رکھنے سے اس کے اہل خانہ، متعلقین اور سماج کو ضرر لاحق ہونے کا قوی اندیشہ ہے تو ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے کہ محکمہ صحت اور متعلقہ حضرات کو اس کی اطلاع کردے۔

۶- ایڈز اور دوسرے متعدی امراض میں مبتلا افراد کے بارے میں ان کے اہل خانہ، متعلقین اور سماج کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کو تنہا اور بے سہارا نہ چھوڑیں، طبی احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی پوری نگہداشت کریں اور انہیں علاج معالجہ اور احتیاطی تدابیر فراہم کرنے میں پورا تعاون کریں۔

۷- ایڈز زدہ بچے بچیوں کو تعلیم سے محروم کرنا درست نہیں ہے، ضروری احتیاطی طبی تدابیر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی تعلیم وتربیت کا نظم کیا جائے۔

۸- طاعون زدہ علاقہ میں آمد ورفت پر پابندی مستحسن چیز ہے، البتہ ضرورت ومجبوری کے حالات مذکورہ پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔

۹- ایڈز کے مرض میں مبتلا شخص کا اپنے مرض کی نوعیت سے واقف ہونے کے باوجود اس مرض کو کسی بھی صحت مند انسان کی طرف عمداً منتقل کرنا حرام ہے اور ایسا کرنا گناہ کبیرہ ہے، اس طرح کے عمل کا مرتکب اس عمل کی نوعیت اور اس کے فرد یا معاشرے پر برے اثرات پڑنے کے اعتبار سے سزا کا مستحق ہے۔

کلوننگ[۲]

۱- کلوننگ کے سلسلہ میں جو تفصیلات اور صورتیں اب تک سامنے آئی ہیں، اور ان کی وجہ سے جن اخلاقی اور سماجی نقصانات کا خطرہ ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی بھی طریقہ پر انسانی کلوننگ حرام ہے۔

۲- نباتات وحیوانات میں ایسی کلوننگ جو انسانی مفاد میں ہو اور جو انسان کے لئے دینی اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے مضرت رساں نہ ہو، جائز ہے۔

۳- اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سمینار حکومت ہند سے اپیل کرتا ہے کہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں جن کی رو سے ملکی یا غیر ملکی تحقیقاتی ادارے یا تجارتی کمپنیاں ہمارے ملک کو انسانی کلوننگ کی تجربہ گاہ نہ بنائیں۔

---

[۱] آٹھواں فقہی سمینار (علی گڑھ، یوپی) بتاریخ ۲۷-۲۹ / جمادی الاولی ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۲-۲۴ / اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

[۲] دسواں فقہی سمینار (ممبئی) بتاریخ ۲۱-۲۴ / جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۴-۲۷ / اکتوبر ۱۹۹۷ء۔

جلاٹین[۱]

۱- جلاٹین ایک نامیاتی (Organic) مرکب ہے، جو ایک قسم کا پروٹین ہے۔ یہ جانوروں کی کھال اور ہڈیوں میں موجود ایک دیگر قسم کے پروٹین کولاجن (Collagen) سے کیمیائی تبدیلیوں کے بعد بنایا جاتا ہے۔ جو کیمیائی اور طبعی طور سے کولاجن سے یکسر مختلف ایک نئی قسم کے پروٹین کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور اپنی رنگت، بو، ذائقہ اور کاصیات میں بھی کولاجن سے جدا ہوتا ہے۔

۲- شریعت نے جن اشیاء کو حرام قرار دیا ہے اگر ان کی حقیقت اور ماہیت تبدیل ہو جائے تو ان کا سابق حکم باقی نہیں رہتا ہے۔ کسی شئی کے وہ خصوصی اور بنیادی اوصاف جن سے اس شئی کی شناخت ہوتی ہے، وہی اس شئی کی حقیقت و ماہیت ہیں۔ اکیڈمی کے سامنے فنی ماہرین کے ذریعہ جو تحقیق سامنے آئی ہے، اس کے مطابق جلاٹین میں ان جانوروں کی کھالوں اور ہڈیوں کی حقیقت باقی نہیں رہتی ہے جن کے کولاجن سے جلاٹین بنایا جاتا ہے۔ بلکہ وہ ایک نئی حقیقت کے ساتھ نئی چیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کے استعمال کی گنجائش ہے۔ ماہرین کی رائے میں اختلاف کے پیش نظر شرکاء سمینار میں سے مولانا بدر الحسن قاسمی نے حرام جانوروں کے اجزائے جسم سے حاصل شدہ جلاٹین کے استعمال سے گریز کرنے کو ترجیح دی۔

۳- فقہاء کے اختلاف اور غذائی اشیاء کی اہمیت ونزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے سمینار مسلمان صنعت کاروں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ حلال جانور اور اس کے حلال اور پاک اجزاء سے جلاٹین تیار کریں، تاکہ اس کے حلال و پاک ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔

الکحل[۲]

۱- الکحل ایک کیمیائی مادہ ہے، جو مختلف پھلوں اور اناج کے نشاستہ (Carbohydrate) یا شکر سے بنایا جاتا ہے، اس کی بہت ساری قسمیں ہیں جن میں صرف ایک قسم نشہ آور ہے۔

۲- بعض دواؤں میں ایتھائیل الکحل (Ethyl Alcohol) کا استعمال ہوتا ہے، یہ الکحل نشہ آور ہے، اور دوا میں شامل ہونے کے بعد بھی اس کی حقیقت نہیں بدلتی لیکن علاج و معالجہ کے باب میں شریعت نے جو سہولت روا رکھی ہے اس کے تحت مجبوراً الکحل آمیز ادویہ کا استعمال درست ہے۔

۳- عطریات میں جو الکحل استعمال ہوتا ہے، فنی ماہرین کی تحقیق واطلاع کے مطابق وہ نشہ آور نہیں ہے۔ اس لئے یہ ناپاک نہیں ہے۔

✧ ✧ ✧

---

[۱] چودہواں فقہی سمینار (حیدرآباد) بتاریخ ۱-۳/ جمادی الاول ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰-۲۲/ جون ۲۰۰۴ء۔

[۲] چودہواں فقہی سمینار (حیدرآباد) بتاریخ ۱-۳/ جمادی الاول ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰-۲۲/ جون ۲۰۰۴ء۔

میڈیکل انشورنس[1]

شریعت اسلامی میں جوئے کی کوئی بھی شکل جائز نہیں۔اس وقت میڈیکل انشورنس کی جو صورت رائج ہے وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے جوا میں شامل ہے اور اس نے علاج کو خدمت کے بجائے نفع آور تجارت بنا دیا ہے۔اس پس منظر میں سمینار نے میڈیکل انشورنس کے بارے میں درج ذیل فیصلے کئے ہیں:

۱- میڈیکل انشورنس، انشورنس کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح بلاشبہ مختلف قسم کے ناجائز امور پر مشتمل ہے، لہذا عام حالات میں میڈیکل انشورنس ناجائز ہے اور اس حکم میں سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۲- اگر قانونی مجبوری کے تحت میڈیکل انشورنس لازمی ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن جمع کردہ رقم سے زائد جو علاج میں خرچ ہو، صاحب استطاعت کے لئے اس کے بقدر بلا نیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔

۳- موجودہ مروج انشورنس کا متبادل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ممکن ہے اور آسان صورت یہ ہے کہ مسلمان ایسے ادارے ونظام قائم کریں، جن کا مقصد علاج ومعالجہ کے ضرورت مندوں کی ان کی ضرورت کے مطابق مدد کرنا ہو۔

جنیٹک ٹسٹ[2]

موجودہ سائنسی ترقی نے انسانیت کو بہت سے فائدے پہنچائے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی نقطۂ نظر سے اس میں بعض منفی پہلو بھی موجود ہیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی جنیٹک سائنس اور DNA ٹسٹ ہے، چنانچہ جنیٹک سائنس کے سلسلے میں جو تجویزیں پاس ہوئیں، وہ اس طرح ہیں:

۱- اگر جنیٹک ٹسٹ کے ذریعہ ثابت ہو جائے کہ رحم مادر میں پرورش پانے والا بچہ ایسا ناقص العقل اور ناقص الاعضاء ہے جو نا قابل علاج ہے اور پیدائش کے بعد اس کی زندگی ایک بوجھ اور اس کے اور گھر والوں کے لئے تکلیف دہ رہے گی، تو ایسی صورت میں حمل پر ایک سو بیس دن گذرنے سے پہلے پہلے والدین کے لئے اس کا اسقاط جائز ہے۔

۲- اگر جنیٹک ٹسٹ کے ذریعہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی شخص کی اگلی نسل میں پیدائشی نقائص کے امکانات ہیں، تو اس اندیشہ کے پیش نظر سلسلہ تولید کو روکنا قطعاً ناجائز ہے۔

۳- اگر جنیٹک ٹسٹ کے ذریعہ کسی شخص کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ وہ آئندہ جنون یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو سکتا ہے جو شرعاً فسخ نکاح کا سبب ہے تو فسخ نکاح کے لئے محض یہ ٹسٹ کافی نہیں ہوگا۔

۴- علاج کی غرض سے امراض کی شناخت اور تحقیق کے لئے جنیٹک ٹسٹ کرانا اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

---

[1] پندرہواں فقہی سمینار (میسور، کرناٹک) بتاریخ ۱۰-۱۲/صفر ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۱-۱۳/مارچ ۲۰۰۶ء۔
[2] پندرہواں فقہی سمینار (میسور، کرناٹک) بتاریخ ۱۰-۱۲/صفر ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۱-۱۳/مارچ ۲۰۰۶ء۔

ڈی این اے ٹسٹ[1]

ڈی این اے (DNA) ٹسٹ کے سلسلے میں سمینار نے حسب ذیل فیصلے کئے ہیں:

۱- جس بچے کا نسب شرعی اصول کے مطابق ثابت ہو اس کے بارے میں ڈی این اے ٹسٹ کے ذریعہ اشتباہ پیدا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

۲- اگر کسی بچہ کے بارے میں چند دعوے دار ہوں اور کسی کے پاس واضح شرعی ثبوت نہ ہو تو ایسے بچے کا نسب ڈی این اے ٹسٹ کے ذریعہ متعین کیا جاسکتا ہے۔

۳- جو جرائم موجب حد و قصاص ہیں ان کے ثبوت کے لئے منصوص طریقوں کے بجائے ڈی این اے ٹسٹ کا اعتبار نہیں ہوگا۔

۴- حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے جرائم کی تفتیش میں ڈی این اے ٹسٹ سے مدد لی جاسکتی ہے اور قاضی ضرورت محسوس کرے تو اس پر مجبور بھی کرسکتا ہے۔

موت کی حقیقت اور مصنوعی آلہ تنفس[2]

۱- جب سانس کی آمد و رفت پوری طرح رک جائے اور موت کی علامات ظاہر ہو جائیں تب ہی موت کے واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور اسی وقت سے موت سے متعلق وصیت کا نفاذ، میراث کا اجراء اور عدت کا آغاز وغیرہ احکام جاری ہوں گے۔

۲- اگر مریض مصنوعی آلہ تنفس پر ہو، لیکن ڈاکٹر اس کی زندگی سے مایوس نہ ہوئے ہوں اور امید ہو کہ فطری طور پر تنفس کا نظام بحال ہو جائے گا تو مریض کے ورثہ کے لئے اسی وقت مشین کا ہٹانا درست ہوگا جب کہ مریض کی املاک سے اس علاج کو جاری رکھنا ممکن نہ ہو، نہ ورثہ ان اخراجات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور نہ اس علاج کو جاری رکھنے کے لئے کوئی اور ذریعہ میسر ہو۔

۳- اگر مریض آلہ تنفس پر ہو اور ڈاکٹروں نے مریض کی زندگی اور فطری طور پر نظام تنفس کی بحالی سے مایوسی ظاہر کردی ہو تو ورثہ کے لئے جائز ہوگا کہ مصنوعی آلہ تنفس علاحدہ کردیں۔

✧ ✧ ✧

[1] پندرہواں فقہی سمینار (میسور، کرناٹک) بتاریخ ۱۰-۱۲ / صفر ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۱-۱۳ / مارچ ۲۰۰۶ء۔

[2] سولہواں فقہی سمینار (مہذب پور، اعظم گڈھ) بتاریخ ۱۰-۱۳ / ربیع الاول ۱۴۲۸ھ مطابق ۳۰ / مارچ - ۲ / اپریل ۲۰۰۷ء۔

یوتھنیزیا کا حکم [1]

شریعت اسلامی میں انسانی جان کی بڑی اہمیت ہے اور حتی المقدور اس کی حفاظت خود اس شخص کا اور دوسروں کا فریضہ ہے، اس لئے:

۱- کسی مریض کو شدید تکلیف سے بچانے یا اس کے متعلقین کو علاج اور تیمارداری کی زحمت سے نجات دلانے کے لئے عمداً ایسی تدبیر کرنا کہ جس سے اس کی موت واقع ہو جائے حرام ہے اور یہ قتل نفس کے حکم میں ہے۔

۲- ایسے مریض کو گو مہلک دوا نہ دی جائے مگر قدرت کے باوجود اس کا علاج ترک کر دیا جائے تاکہ جلد سے جلد اس کی موت واقع ہو جائے، یہ بھی جائز نہیں ہے۔

پلاسٹک سرجری [2]

۱- جسمانی عیب دور کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری جائز ہے، اور عیب سے مراد جسم میں پائی جانے والی ایسی صورت ہے، جو معروف و معتاد اور عمومی تخلیقی کیفیت سے مختلف ہو، چاہے پیدائشی عیب ہو یا بعد میں پیدا ہو جائے۔

۲- جسمانی تکلیف کے ازالہ کے لئے اگر ڈاکٹر کا مشورہ ہو پلاسٹک سرجری جائز ہے۔

۳- درازی عمر کی وجہ سے طبعی طور پر انسان کی ظاہری حیثیت میں جو تغیر آتا ہے، جیسے جھریوں کا پیدا ہو جانا وغیرہ، ان کو ختم کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری جائز نہیں۔

۴- ناک اور دوسرے اعضاء، خلقی طور پر کم خوبصورت اور غیر متناسب ہوں؛ مگر انسان کی عمومی معتاد خلقت کے دائرہ سے باہر نہ ہوں تو زینت اور محض خوبصورتی کے لئے پلاسٹک سرجری جائز نہیں۔

۵- اپنی شناخت چھپانے کے لئے پلاسٹک سرجری جائز نہیں، سوائے اس کے کہ مظلوم کو ظالم سے بچنے کے لئے ایسا کرنا پڑے۔

✧ ✧ ✧

---

[1] سولہواں فقہی سمینار (مہذب پور، اعظم گڈھ) بتاریخ ۱۰-۱۳ / ربیع الاول ۱۴۲۸ھ مطابق ۳۰ / مارچ - ۲ / اپریل ۲۰۰۷ء۔

[2] اٹھارہواں فقہی سمینار (مدورائی، تامل ناڈ) بتاریخ ۲-۴ / ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۸ / فروری - ۲ / مارچ ۲۰۰۹ء۔

اعضاء و اجزاء انسانی کا عطیہ [1]

انسانی اعضاء و اجزاء کے عطیہ سے متعلق تمام مقالات کے جائزے اور مباحث کے بعد سمینار یہ محسوس کرتا ہے کہ اس موضوع کا تعلق جہاں شرعی احکام سے ہے وہیں طبی جدید سہولیات اور تحقیقات سے بھی ہے، اس سمت میں آئے دن نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اس لئے بتدریج شرعی احکام بھی آتے رہیں گے۔ اس وقت تک کی جو جدید طبی تحقیقات سامنے آئی ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل تجاویز سمینار نے طے کئے ہیں:

۱- خون انسانی جسم کا ایک اہم اور بنیادی جزء ہے جس سے حیات انسانی کا بقا مربوط ہے، اگر کسی انسان کو خون کی ضرورت پڑ جائے اور ماہر ڈاکٹر کی تجویز ہو کہ اس کے لئے خون ناگزیر ہے تو انسانی جان بچانے کے لئے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو عطیہ کرنا جائز ہے، اسی طرح کسی مسلمان کے لئے اس سے لینا بھی جائز ہے۔

۲- ایسے بلڈ بینک جہاں لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیتے ہیں اور وہ بینک ضرورتمندوں کو مفت خون فراہم کرتے ہیں وہاں مسلمان کے لئے خون کا عطیہ کرنا جائز ہے۔

۳- رضا کارانہ بلڈ کیمپ لگانا اور بلڈ بینک قائم کرنا بھی انسانی ضرورت کے پیش نظر جائز ہے اور یہ انسانی خدمت میں شامل ہے۔

۴- ایسے نازک موقع پر جہاں خون کا عطیہ نہ کرنے کی صورت میں جان کا خطرہ ہے وہاں مطلوبہ گروپ کے حامل موجود شخص کے لئے اپنا خون عطیہ کرنا ایک اہم انسانی فریضہ اور شرعاً پسندیدہ عمل ہے۔

۵- موجودہ طبی تحقیق کے مطابق زندہ شخص کے جگر کے بعض حصہ کو دوسرے ضرورتمند انسان کو منتقل کرنا ممکن ہو گیا ہے اور عطیہ کرنے والے کے جگر کے بقیہ بچے ہوئے حصے کا چند مہینوں میں مکمل ہو جانا تجربہ میں آچکا ہے، اس لئے جگر کی منتقلی اور پیوند کاری اپنے کسی عزیز یا دوست کے لئے رضا کارانہ طور پر جائز ہے، البتہ خرید و فروخت قطعاً جائز نہیں ہے۔

۶- انسانی دودھ کا بینک قائم کرنا جائز نہیں، اگر بینک قائم ہو تو اس میں دودھ جمع کرنا اور اس میں کسی طرح کا تعاون کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

۷- مرد یا عورت کے مادہ تولید کا بینک قائم کرنا یا کسی مرد یا خاتون کا کسی بینک کو یا کسی ضرورتمند کو مادۂ تولید فروخت کرنا یا بلا قیمت فراہم کرنا یا لینا حرام ہے۔

۸- زندہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ دوسرے ضرورتمندوں کے لئے منتقل کرنا جائز نہیں ہے، البتہ مردہ کا قرنیہ کسی ضرورتمند کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں اس سلسلہ میں فیصلہ کو موخر کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

[1] ۲۴واں فقہی سمینار (اوچیرا، کیرالا) بتاریخ ۹ تا ۱۱ / جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱ تا ۳ / مارچ ۲۰۱۵ء۔

جدید آلات و ذرائع

انٹرنیٹ اور جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال [1]

اس موضوع پر گفتگو اور بحث و تمحیص کے بعد باتفاق شرکاء سمینار درج ذیل فیصلے کئے گئے:

۱- اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کی حفاظت و بقا کے لئے ہر ممکن جد و جہد و سعی امت مسلمہ کا اہم فریضہ ہے۔

۲- "وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ" کے مطابق اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے جدید و قدیم ہر ممکن جائز ذریعہ و وسیلہ کا استعمال کرنا درست ہے، بلکہ ضرورت و حالات کے مطابق مفید و موثر وسیلہ کا استعمال کرنا ضروری ہے۔

۳- ابلاغ و ترسیل کے جدید ذرائع میں ریڈیو کا استعمال دینی مقاصد کے لئے کوئی قباحت نہیں رکھتا، خواہ یہ استعمال اس کے پروگرام سے استفادہ کی صورت میں ہو، یا پروگرام میں عملاً شرکت کر کے ہو، یا یہ کہ خود اپنا ریڈیو اسٹیشن قائم کرکے۔

۴- بنیادی طور پر انٹرنیٹ آج کے زمانے کا سب سے اہم ذریعہ ابلاغ ہے، اس کی حیثیت اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لئے ایک ذریعہ اور وسیلہ کی ہے، اور ذرائع کا حکم شرعی متعین کرتے وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ ان ذرائع کا استعمال کن مقاصد کے لئے ہو رہا ہے، ذرائع و وسائل کا استعمال جائز مقاصد کے لئے شرعاً جائز اور ناجائز مقاصد کے لئے ناجائز ہے، پھر ان کا شرعی حکم اس طرح متعین ہوگا کہ ان مقاصد کا حصول فرض و واجب ہے یا مستحب ہے یا مباح ہے۔ اور ان وسائل کا استعمال مکمل طور پر ان مقاصد کے حصول کے لئے جس حد تک ضروری ہو اسی کے بقدر ان وسائل کا استعمال فرض یا مستحب یا جائز ہوگا۔

ان اصولوں کی روشنی میں شرکاء سمینار کی رائے ہے کہ انٹرنیٹ کا استعمال ایک شرعی، دینی، دعوتی، اجتماعی فلاح کے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت سے جائز اور بعض دفعہ ضروری ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ عرض اور پیشکش کے طریقے میں منکرات اور محرمات شرعیہ سے بچا جائے۔

۵- ٹیلی ویژن ایک ایسا ذریعہ ابلاغ ہے جس کے ذریعہ نہ صرف آواز بلکہ بولنے والوں کی صورتیں بھی سامعین و ناظرین کے سامنے پیش ہوتی ہیں، کبھی نقل نشر مباشر (براہ راست) کے ذریعہ چلتی پھرتی صورتیں منتقل کی جاتی ہیں، اور کبھی کسی مجلس، کسی عمل، کسی کھیل یا کسی تقریب کو ویڈیو کیسٹ میں محفوظ کرلیا جاتا ہے اور بعد میں اس کو نشر کیا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے مسئلہ میں ایک دشواری تو یہ ہے کہ اس میں جو صورتیں ناظرین تک منتقل ہوتی ہیں آیا وہ اس تصویر کشی کا محل اور مورد ہیں جن کے ممنوع ہونے کی صراحت حدیث نبوی میں آئی ہے یا نہیں؟ عام طور پر علماء ہند اس طرح کے عکس ریز کیمروں سے لی گئی تصویر کو بھی اس تصویر کشی کا

---

[1] بارہواں فقہی سمینار (بستی، یوپی) بتاریخ ۵-۸ / ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۱-۱۴ / فروری ۲۰۰۰ء۔

حصہ مانتے ہیں۔ ممالک عربیہ کے بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ فوٹو گرافی ممنوع تصویر سازی کا محل نہیں۔

ٹیلی ویژن کے ساتھ دوسری دشواری اس کے استعمال کی ہے، تفریحات (Entertainment)، تجارتی اشتہارات کے ذریعہ عورتوں کی عُریاں تصویروں کی اشاعت، بے حیائی فحاشی کو عام کرنا، ایسی فحش فلموں کا نشر کیا جانا جس کو باپ بیٹا، ماں بیٹی ایک ساتھ دیکھ نہیں سکتے، پھر بچوں کو اس طرح اپنے سحر میں گرفتار کر لینا کہ ان کی تعلیمی دلچسپی ختم ہو جائے۔ یہ وہ بُرائیاں ہیں جن کی وجہ سے ٹیلی ویژن موجودہ سماج کے لئے ایک بڑا ناسور بن گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ٹیلی ویژن کے ذریعہ کچھ مفید کام لئے جاسکتے ہیں اور لئے جاتے ہیں، لیکن معاشرے کو پہونچنے والا ضرر اس سے حاصل ہونے والے نفع سے کہیں زائد ہے "واثمهما أكبر من نفعهما".

ان حالات میں شرکاء سمینار ٹیلی ویژن کے استعمال اور اس کے ذریعہ ان منکرات وفواحش کی اشاعت کو ناجائز اور معاشرے کے لئے تباہی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اس سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں۔

۶- ایک اہم سوال ان چینلس کے حکم شرعی کا ہے جو خالص دینی ودعوتی مقاصد کے لئے قائم کئے گئے ہیں اور قائم کئے جارہے ہیں اور ہر طرح کی فحاشی، عُریانی سے پاک اور خالی ہیں، کیا ایسے چینلس (Channels) کا قائم کرنا اور ان سے استفادہ کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

تمام شرکاء سمینار اس کو جائز قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض حضرات ان حالات میں بھی اجازت نہیں دیتے جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱- مولانا عبد اللطیف پالنپوری صاحب	۲- مولانا عبد القیوم پالنپوری صاحب
۳- مولانا عبد الرحمن پالنپوری صاحب	۴- مولانا محمد حمزہ گورکھپوری صاحب
۵- مولانا مفتی محمد زید صاحب	۶- مولانا زبیر احمد صاحب مظاہر علوم

مولانا برہان الدین سنبھلی اور مولانا ارشد قاسمی کی رائے یہ ہے اگر براہ راست نشر (Live) ہو تو جائز ہوگا، اور اگر محفوظ کیا ہوا پروگرام (Recorded Programme) نشر کیا جائے تو جائز نہیں ہوگا۔

✦✦✦

ذبح کے مسائل [1]

محور اول

۱- ذبح لغت میں چیرنے پھاڑنے کو، اور شرع میں قابو یافتہ جانور کے غذا و سانس کی نالیاں اور دونوں شہ رگ یا ان میں سے اکثر کے کاٹنے، اور غیر قابو یافتہ جانور کے بدن کے کسی بھی حصہ کو زخمی کرنے کو کہتے ہیں۔

۲- ذبح کی دو قسمیں ہیں: ذبح اختیاری اور ذبح غیر اختیاری۔

ذبح اختیاری میں جانوروں کی چاروں رگیں (حلقوم، مری، ودجین) یا ان میں سے اکثر کاٹ دی جاتی ہیں، اور یہ ان جانوروں میں ہوتا ہے جو عمل ذبح کو انجام دیتے وقت ذابح کے قابو میں ہوں، پالتو جانوروں میں عام طور پر ذبح اختیاری ہوتی ہے، سوائے اس کے کہ جانور قابو سے باہر ہو جائے۔

ذبح غیر اختیاری جانور کے بدن کے کسی بھی حصہ کو زخمی کر کے خون بہا دینے کو کہتے ہیں۔ ذبح غیر اختیاری ان جانوروں میں ہوتا ہے جو عمل ذبح کو انجام دیتے وقت ذابح کے قابو میں نہ ہوں۔ غیر پالتو (شکاری) جانوروں میں ذبح غیر اختیاری ہوتا ہے، الا یہ کہ ایسے جانور کو پال لیا جائے یا وہ کسی اور طریقہ سے زندہ حالت میں قابو میں آجائے۔

۳- ذبح اختیاری اور غیر اختیاری کے مشترکہ شرائط درج ذیل ہیں:

۱- ذابح کا مسلمان یا کتابی ہونا۔

۲- ذابح کا عاقل ہونا۔

۳- بوقت ذبح اللہ کا نام لینا۔

۴- اللہ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام شامل نہ کرنا۔

۵- بوقت ذبح جانور کا زندہ رہنا۔

۶- جانور کی موت ذبح کی وجہ سے ہونا۔

۷- آلہ کا تیز دھار دار کاٹنے والا ہونا۔

ذبح اختیاری کے مخصوص شرائط:

۱- متعین مذبوح پر تسمیہ پایا جانا۔

۲- متعین رگوں کا کاٹنا۔

۳- تسمیہ اور عمل ذبح میں زیادہ فاصلہ نہ ہونا۔

---

[1] ساتواں فقہی سمینار (بھروچ گجرات) بتاریخ ۲۶-۲۹ / رجب ۱۴۱۵ھ مطابق ۳۰ / دسمبر ۱۹۹۴ء - ۲ / جنوری ۱۹۹۵ء۔

ذبح غیر اختیاری کے مخصوص شرائط:

۱- شکاری حالت احرام میں نہ ہو۔

۲- جانور حرم کا شکار نہ ہو۔

۳- شکار کرنے والا جانور یا پرندہ تربیت یافتہ ہو۔

۴- شکار اگر شکاری جانور کے ذریعہ ہو تو اس کو شکار کے لئے چھوڑتے وقت اور اگر تیر و نیزہ وغیرہ سے کیا جائے تو اس کو پھینکتے وقت تسمیہ کہا گیا ہو۔

۴- ذبح اختیاری اور غیر اختیاری دونوں کے مواقع علیحدہ علیحدہ ہیں، جب ذبح اختیاری ناممکن ہو اسی وقت ذبح غیر اختیاری کی اجازت ہوتی ہے، لہذا اختیاری کی جگہ غیر اختیاری کی گنجائش بالاتفاق نہیں ہے۔

محور دوم

۱- ذبح کرنے والے کے لئے شریعت میں جس اہلیت کا اعتبار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ذبح کرنے والا عاقل ہو، بالغ ہو، یا اگر نابالغ ہو تو باشعور ہو، اور مسلمان ہو یا کتابی ہو۔

۲- کتابی سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب ہو جس کی تصدیق قرآن نے کی ہو، آج کے دور میں یہود و نصاریٰ کتابی ہیں۔

۳- آج کے زمانہ میں جو لوگ اپنے کو عیسائی یا یہودی کہتے ہیں انہیں کتابی تصور کیا جائے گا اور ان کا ذبیحہ حلال ہوگا، الا یہ کہ ان کا ملحد، منکر خدا ہونا یقینی طور پر معلوم ہو جائے۔

۴- قادیانی کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، چاہے وہ اپنے کو احمدی کہے یا لاہوری۔

۵- واضح رہے کہ ذبح کی شرعی حقیقت کا پایا جانا ضروری ہے، چاہے ذابح مسلم ہو یا کتابی، اس لئے وہ تمام صورتیں جن میں براہ راست یا کسی مشین کے ذریعہ کسی جانور کو اس طرح ہلاک کیا جائے کہ اسے شرعاً ذبح نہیں قرار دیا جاسکتا تو وہ ہلاک شدہ جانور ذبیحہ نہیں کہا جائے گا اور حلال نہیں ہوگا، مثلاً گولی مار کر ہلاک کر دینا، یا بجلی کی لہروں کے ذریعہ ذبح کی جگہ کو جلا دینا، یا جسم کے کسی اور حصہ کو زخمی کر کے خون نکال دینا، یا اس جیسی دوسری صورتیں۔

محور سوم

۱- از روئے شرع اسلام ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جانا چاہئے، اور غیر اللہ کے نام پر اگر کوئی جانور ذبح کیا جائے تو وہ حلال نہیں رہتا۔

اگر کوئی جانور ذبح کیا جائے اور اس پر بسم اللہ نہیں کہی گئی تو ایسا یا تو بھول کر ہوا ہوگا یا قصداً بسم اللہ ترک کی گئی ہوگی، اگر بسم اللہ بھول کر چھوڑی گئی تو وہ ذبیحہ حلال ہوگا، اور اگر بسم اللہ قصداً چھوڑی گئی تو جمہور فقہاء کے مسلک کے پیش نظر وہ ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر بطور استخفاف بسم اللہ نہیں پڑھی جائے تو ذبیحہ حلال نہیں ہوتا، لیکن اگر مقصود استخفاف نہ ہو مگر جان بوجھ کر کوئی شخص بسم اللہ نہ کہے تو چونکہ بسم اللہ کہنا ان کے نزدیک سنت ہے، ایسا ذبیحہ حلال ہوگا۔

واضح رہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک بسم اللہ کہنا واجب ہے اور سیدنا امام شافعیؒ کے نزدیک مسنون ہے، بہر حال تسمیہ واجب ہو یا مسنون، ہر مسلمان سے یہی امید کی جاتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر بغیر اللہ کا نام لئے ذبح نہیں کرتا۔ لہذا ذبیحہ کسی بھی مسلمان کا ہو اس کے بارے میں ہم اس تحقیق کے مکلف نہیں ہیں کہ آیا اس پر قصداً بسم اللہ چھوڑی گئی ہے، اس لئے ہر مسلمان کے ذبیحہ کو حلال تصور کرنا چاہئے۔

۲- واضح رہے کہ بسم اللہ کہنا عمل ذبح پر واجب ہے، اس لئے اگر عمل ذبح متعدد ہوگا تو بسم اللہ بھی متعدد ہوگا، اور اگر عمل ذبح ایک ہوگا تو بسم اللہ بھی

ایک بار کہنا کافی ہوگا۔

مثلاً ایک جانور کو بسم اللہ کہہ کر ذبح کیا گیا لیکن عمل ذبح مکمل ہونے سے پہلے وہ بھاگ کھڑا ہوا، اب اگر دوبارہ اسے ذبح کیا جائے گا تو دوبارہ بسم اللہ کہنی ہوگی۔

اور اگر ایک ہی بار چھری چلائی جائے اور اس ایک عمل ذبح سے بیک وقت کئی جانور ذبح ہو جائیں تو ایک بار کہی ہوئی بسم اللہ کافی ہوگی۔

واضح رہے کہ ذبح اختیاری میں ہر بار ذبح اور بسم اللہ کہتے وقت ذبیحہ کا معلوم و متعین ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ ایک یا زائد جن جانوروں کی نیت کر کے بسم اللہ کہی گئی ہے ان کی جگہ دوسرے جانور ذبح ہوں گے تو وہ حلال نہیں ہوں گے۔

۳- بعض اوقات جانور ذبح کرتے ہوئے ایک سے زائد افراد ذبح کے عمل میں شریک ہوتے ہیں، مثلاً چھری کے قبضہ پر دو آدمیوں کا ہاتھ ہو یا ایک کمزور شخص کے ہاتھ کے اوپر دوسرے شخص کا ہاتھ ہو، تو ایسی صورت میں دونوں ہی افراد کو بسم اللہ کہنی ہوگی، جانور کا ہاتھ پیر و سر پکڑنا ذبح کرنے میں شرکت نہیں ہوگی۔

محور چہارم

۱- آج یہ طریقہ رواج پا رہا ہے کہ جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے بجلی یا کسی اور ذریعہ سے بے ہوش کیا جاتا ہے اور اسے جانوروں کے لئے الم اور تکلیف کم کرنے کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ سمینار کو اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے، اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ بغیر بے ہوش کئے عمل ذبح پورا کیا جائے۔

لیکن اگر کہیں یہ عمل رائج ہو اور جانور کو بے ہوش کر کے ہی ذبح کیا جاتا ہو، اور اس کا اطمینان ہو کہ الیکٹرک شاک یا دوسرے بے ہوشی کے ذرائع کے استعمال کی وجہ سے جانور محض وقتی طور پر بے ہوش ہوا ہے، مرا نہیں ہے، اور اس کا اطمینان ہو کہ پوری احتیاط کے ساتھ الیکٹرک والٹیج اس طرح ایڈجسٹ کیا جاتا ہے کہ اس سے صرف بے ہوشی عمل میں آتی ہے، تو ایسے بے ہوش جانور کو اگر ذبح کیا جائے تو ذبیحہ حلال ہوگا۔

✧ ✧ ✧

مشینی ذبیحہ[1]

مشینی ذبیحہ کے مسئلہ پر اسلامک فقہ اکیڈمی کے ساتویں سمینار منعقدہ بھروچ میں بحث کی گئی تھی اور اس کی بعض صورتوں کے جواز اور بعض صورتوں کے ناجائز ہونے پر اتفاق ہوگیا تھا۔ ایک صورت کی بابت علماء و مفتیان کرام کی رائیں مختلف تھیں، اور سمینار کا احساس تھا کہ اس مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جائے اور مجوزین و مانعین کے دلائل کا خلاصہ دوبارہ مندوبین کی خدمت میں بھیجا جائے تاکہ وہ پھر غور کر کے مسئلہ پر رائے دے سکیں۔ چنانچہ اکیڈمی نے دوبارہ اسی سلسلہ میں مفصل سوالنامہ بھیجا اور اس پر جو جوابات آئے ان کی روشنی میں درج ذیل امور طے پائے:

۱- اگر جانور بجلی کے ذریعہ چلنے والی زنجیر یا پٹہ سے لٹک کے بے ہوشی کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد ذابح کے سامنے پہنچتا ہے اور ذابح بسم اللہ کہہ کر اس کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیتا ہے، اور جانور کے ذبح کے وقت اس کے زندہ ہونے کا یقین ہے، تو یہ صورت بالاتفاق جائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں صرف جانور کا نقل و حمل مشین کے ذریعہ ہو رہا ہے، باقی فعل ذبح ہاتھ سے انجام دیا جاتا ہے۔ اکیڈمی مسلمان ارباب مسالخ سے خواہش کرتی ہے کہ وہ اسی طریقہ کو رواج دیں، اور اگر ضرورت محسوس ہو تو ذبح کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے کئی ذابح کا تقرر کیا جائے۔

۲- مشینی ذبیحہ کی ایسی صورت جس میں جانور کے نقل و حمل اور ذبح دونوں کام مشین سے انجام پائیں، اس طرح کہ بٹن دبانے کے ساتھ مشین حرکت میں آجائے اور اس مشین پر باری باری جانور آتا جائے۔ اس صورت کی بابت تین رائیں ہیں:

الف- پہلا جانور حلال ہوگا۔ اس کے بعد جو جانور ذبح ہوتے جائیں وہ جائز نہیں ہیں، یہ اکثر شرکاء سمینار کی رائے ہے۔

ب- پہلا جانور بھی حلال نہ ہوگا، یہ بعض حضرات کی رائے ہے جو درج ذیل ہیں:

مفتی شبیر احمد قاسمی، مراد آباد　مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی، بنارس

مولانا بدر احمد مجیبی، پٹنہ　مولانا ابوالحسن علی، گجرات

ج- پہلا جانور بھی حلال ہوگا، اور بعد میں جو جانور اس فعل ذبح کے منقطع ہونے سے پہلے پہلے ذبح ہو جائیں وہ بھی حلال ہیں۔ یہ رائے درج ذیل حضرات کی ہے:

مولانا رئیس الاحرار ندوی، مولانا صباح الدین ملک فلاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا جلال الدین انصر عمری، مولانا یعقوب اسماعیل، مولانا صدر الحسن ندوی، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی نسیم احمد قاسمی اور مولانا اعجاز احمد قاسمی۔

۳- جن حضرات کے نزدیک مشین کے ذریعہ ذبح کی صورت میں پہلا جانور حلال ہو جاتا ہے ان کے نزدیک اگر ایسی مشین ایجاد ہو جائے جس سے بڑی تعداد میں چھریاں متعلق ہوں، اور بٹن دباتے ہی بیک وقت چل کر ایک ایک جانور کو ایک ساتھ ذبح کر دیتی ہوں تو یہ تمام جانور حلال ہو جاتے ہیں۔

۴- واضح رہے کہ مشینی ذبیحہ کے بارے میں یہ احکام مشین کی مخصوص ہیئت اور وضع کو سامنے رکھ کر طے کئے گئے ہیں، ہر طرح اور ہر وضع کی مشین پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا، بلکہ مشین کی مخصوص ہیئت اور طریقہ کار کی روشنی میں اس کا حکم مقرر کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] نواں فقہی سمینار (جے پور) بتاریخ ۲۷-۳۰/ جمادی الاولی ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۱-۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

متفرق مسائل

اعلامیہ برائے اتحاد امت [1]

ہندوستانی مسلمان اس وقت نت نئے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، ان مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ اپنے دین و ایمان اور تہذیبی شناخت و پہچان کو ہندوستان کے موجودہ ماحول میں باقی رکھنا ہے، اور اسی جذبہ کو اپنی نئی نسل میں منتقل کرنا ہے اور یہ کام سب کو مل جل کر کرنا ہے، تاکہ اس سرزمین میں اسلام کی کھیتی ہری بھری اور سرسبز و شاداب رہے اور ہم اپنے وجود سے برادران وطن کو بھی نفع پہنچاتے رہیں۔

اس اہم ضروری اور بنیادی کام کے لئے ہم سب کو ذات، برادری، خاندان کی تقسیم سے اونچا اٹھ کر اور مسلک و مشرب کے تمام اختلافات سے بالاتر ہو کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑنا ہے، رنگ و نسل کے فرق کو مٹانا ہے، زبان اور علاقہ کے بت کو آستین سے نکالنا ہے، اور اس حقیقت کو دل و دماغ میں بٹھانا ہے کہ اتحاد و اتفاق ہی زندگی ہے اور انتشار و اختلاف موت، مگر افسوس کہ کچھ دنوں سے یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے کہ ہندوستانی مسلمان زندگی کی شاہراہ (اتحاد و اتفاق) کو چھوڑ کر موت (انتشار و اختلاف) کی طرف بڑھ رہے ہیں جو ہماری دینی، ملی اور اسلامی زندگی کے لئے حد درجہ خطرناک ہے، اس لئے عالم اسلام کے باوقار ادارہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی مجلس فقہی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۴ تا ۲۷ / صفر ۱۴۰۸ھ میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے اخوت و اتحاد کی اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلمان اپنے فقہی اور مسلکی اختلافات میں اعتدال اور توازن کے دامن کو نہ چھوڑیں اور ایک دوسرے کی دل آزاری نہ کریں۔

آیئے اس موقع پر ہم اپنے اس سبق کو تازہ کریں کہ:

ہم ایک خدا کے بندے ہیں، ہم سب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آخری رسول مانتے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن حکیم خدا کی آخری کتاب ہے، ہم جب نماز پڑھتے ہیں تو کعبہ ہی کو اپنا قبلہ بناتے ہیں، ہمارا دین "اسلام" ہے جس سے قیامت تک کے لئے اللہ راضی ہو گیا، اور ہم نے اپنی نجات کے لئے اس دین اسلام کو اپنا لیا۔

اس لئے ہم عہد کرتے ہیں کہ:

۱- ہم تمام مسلمان خواہ کسی ذات، برادری، خاندان اور مسلک و مشرب سے وابستہ ہوں، ایک رہیں گے، اور اپنی عملی زندگی سے اسلامی اخوت اور مساوات کا ثبوت دیں گے۔

۲- اپنے مسلک اور مشرب کے اختلاف کو علمی دائرہ تک محدود رکھتے ہوئے امت کی اجتماعیت کو متاثر نہ ہونے دیں گے۔

۳- ایک دوسرے کے امام، رہنما اور پیشوا کے احترام کو ملحوظ رکھیں گے، اور ان کی شان میں ایسی باتوں کے اظہار سے پرہیز کریں گے جن سے ان کی عزت و توقیر میں فرق آتا ہو۔

۴- ہم لوگ آپس میں بھی ایک دوسرے کا احترام کریں گے، نہ کسی کا مذاق اڑائیں گے اور نہ دل آزاری کریں گے، ایک دوسرے کی جان و مال

---

[1] (اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی جانب سے دسواں فقہی سمینار حج ہاؤس ممبئی میں ۲۱-۲۴ / جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۴-۲۷ / اکتوبر ۱۹۹۷ء کو منعقد ہوا جس میں ملک بھر سے آئے ہوئے علماء، فقہاء اور اہل افتاء نے بڑی فکرمندی اور دردمندی کے ساتھ اپنے دستخط سے درج ذیل اعلامیہ برائے اتحاد امت جاری کیا)۔

اور عزت وآبرو کا پاس ولحاظ رکھیں گے۔

۵- اچھے اور نیک کام میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے، ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی، اخباری بیان بازی اور پوسٹر بازی سے گریز کریں گے، اور ہم اپنی زندگی سے اس حقیقت کو اجاگر کریں گے کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں نہ کہ فریق۔

۶- اپنے اختلافی اور نزاعی مسائل آپسی گفتگو سے حل کریں گے، اور جہاں شرعی دار القضاء قائم ہو وہاں اپنے مسئلہ کو پیش کریں گے۔

۷- ہم اپنی اجتماعی زندگی میں صبر، تحمل، برداشت اور رواداری کا ثبوت دیں گے۔

۸- ذات، برادری، قبیلہ اور خاندان کی تقسیم میں الجھ کر اپنی زندگی اور اجتماعی شیرازہ بندی کو ہرگز نقصان نہ پہنچنے دیں گے، اور اس حقیقت کا اظہار کریں گے کہ اللہ کے یہاں بڑائی کا معیار تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

۹- اپنے فروعی اور جزوی اختلافات کو دین اور عقیدہ کی بنیاد اور اساس نہیں بنائیں گے، اور اپنی اجتماعی اور ملی زندگی میں ایک مستحکم عمارت کی طرح رہیں گے جس کی اینٹیں ایک دوسرے سے تقویت حاصل کرتی ہیں۔

۱۰- بعض فرقہ پرست عناصر اور سیاسی استحصال کرنے والی قوتیں منظم سازش کے تحت مسلمانوں کو مختلف قسم کی گروہ بندی اور فرقہ بندی میں مبتلا کر رہی ہیں، ہم مسلمان اپنے شعور اور مومنانہ فراست سے ان سازشوں اور منصوبوں کو ناکام بنائیں گے۔

نوٹ:...... اس اعلامیہ کی خواندگی وباضابطہ منظوری ممتاز علماء کی موجودگی میں ہوئی۔

دینی وعصری اداروں کے طلبہ [1]

یہ سمینار عربی مدارس کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ہے کہ:

۱- طلبہ کو جدید حالات پر احکام شرعیہ کے انطباق کا اہل بنانے کے لئے فقہی سمینار میں آنے والے مسائل اور دوسرے جدید مسائل پر طلبہ کا بین المدارس مذاکرہ منعقد کرائیں، اور اگر مدارس خواہش کریں تو اسلامک فقہ اکیڈمی ایسے مذاکروں میں تعاون کے لئے ممتاز علماء میں سے کسی صاحب سے ایسے مواقع پر شرکت کے لئے درخواست کرسکتی ہے۔

۲- دینی مدارس کے طلبہ کے لئے سمینار یہ بھی مناسب سمجھتا ہے کہ معاشیات اور مختلف عصری علوم کے محاضرات کا نظم کیا جائے تاکہ طلبہ ان علوم کی مبادیات اور اس کی بنیادی فکر کو سمجھ سکیں اور احکام شرعیہ کو ان سے مربوط کرسکیں، اور اسلامک فقہ اکیڈمی اس سلسلہ میں ممکن تعاون کے لئے تیار ہے۔

یہ سمینار اس بات کی بھی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ عصری درسگاہوں کے طلباء کے لئے ایسے محاضرات اور کیمپس (Camps) کا نظم کیا جائے کہ اس کے ذریعہ ان کو اسلام کے مختلف شعبوں کی بنیادی تعلیمات، اسلام کے بنیادی اصول تعلیم، اسلامی قانون کی تاریخ اور اس کی ہر عہد میں انسانیت کی رہنمائی کی صلاحیت اور ضروری اصطلاحات سے واقف کرایا جائے۔ سمینار کی خواہش ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی اس سلسلہ میں مناسب اقدام کرے۔

---

[1] تیسرا فقہی سمینار (بنگلور) بتاریخ ۱۳-۱۴ / ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱ / جون ۱۹۹۰ء۔

وظیفہ طلبہ[1]

مدرسہ میں طلباء کے قیام وطعام اور تعلیم وغیرہ پر جو مجموعی مصارف آتے ہیں، ان کا حساب لگا کر ہر طالب علم پر واجب الادا ماہانہ اخراجات کے بقدر مدز کوۃ سے ادا کئے جائیں۔ یہ ادائیگی بصورت نقد یا چیک طالب علم کو دی جائے، اور خود مہتمم مدرسہ بھی یہ رقم زکوۃ اکاؤنٹ سے نکال کر مدرسہ کے عام اکاؤنٹ میں اس کی طرف سے جمع کرسکتا ہے، بشرطیکہ بوقت داخلہ، فارم داخلہ میں طالب علم کی طرف سے اور اگر نابالغ ہو تو اس کے ولی کی طرف سے یہ تصریح کرادی جائے کہ مہتمم مدرسہ اس کی طرف سے از مدز کوۃ اس کے اخراجات مدرسہ کو ادا کرنے کا مجاز ہوگا۔

اسلام اور امن عالم[2]

۱- تشدد کا ہر وہ عمل جس کے ذریعہ کسی فرد یا جماعت کو کسی شرعی جواز کے بغیر خوف وہراس میں مبتلا کیا جائے یا اس کی جان ومال، عزت وآبرو، وطن ودین اور عقیدے کو خطرے سے دوچار کیا جائے دہشت گردی ہے، خواہ یہ عمل کسی فرد کی طرف سے ہو یا جماعت وحکومت کی طرف سے۔

۲- کسی بھی حکومت وریاست کی طرف سے ایسی تدبیریں اختیار کرنا جن سے کسی فرد اور جماعت کو اس کے واجبی حقوق سے محروم کیا جائے، یا ان کو کسی طرح کا نقصان پہنچایا جائے دہشت گردی میں داخل ہے۔

۳: الف- کسی بھی طرح کی ناانصافی کے خلاف مناسب اور مؤثر طریقہ پر آواز کا اٹھانا مظلوم کا ایک حق ہے۔

ب- مظلوم کی طرف سے ظلم کا دفاع دہشت گردی نہیں ہے۔

۴- ظلم کرنے والوں کا تعلق جس طبقہ اور گروہ سے ہو، اس کا بے قصور افراد سے ظلم کا بدلہ لینا جائز نہیں ہے۔

۵- دہشت گردی کے سد باب کی صورت یہ ہے کہ تمام لوگوں کو مساوی طریقہ پر عدل وانصاف فراہم کیا جائے، انسانی حقوق کا مکمل احترام، جان ومال اور آبرو کا مکمل تحفظ کیا جائے، نسلی، قبائلی، مذہبی اور لسانی امتیازات کا لحاظ کئے بغیر تمام انسانوں کو باعزت زندگی گذارنے کا موقع دیا جائے۔

۶- کسی کی جان ومال اور عزت وآبرو پر حملے کی صورت میں اس کو مدافعت کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

☆☆☆

---

[1] پانچواں فقہی سمینار (رشادنگر، اعظم گڑھ) بتاریخ ۳-۶/ جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰/ اکتوبر-۲/ نومبر ۱۹۹۲ء۔

[2] [illegible]واں فقہی سمینار (حیدرآباد) بتاریخ ۱-۳/ جمادی الاول ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰-۲۲/ جون ۲۰۰۴ء۔

ماحولیات کا تحفظ[1]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس دنیا میں پیدا کیا ہے، اس میں اس کی راحت وسکون کے اسباب بھی پیدا فرمائے ہیں، ان میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو آلودگی کا سبب بنتی ہیں، لیکن رب کائنات نے اسی دنیا میں ایسے وسائل بھی پیدا فرمادیئے ہیں جو آلودگیوں کو تحلیل کرتے رہتے ہیں، انسان کو ان کے مضر اثرات سے بچاتے ہیں، اور جو چیزیں آلودگی کا سبب بنتی ہیں وہی تحلیل ہونے کے بعد کائنات کے فطری نظام میں تقویت اور بہتری کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صنعتی انقلاب نے جہاں انسانیت کو بہت سے مفید وراحت بخش وسائل زندگی فراہم کئے ہیں، وہیں ان کی وجہ سے فضائی، آبی اور صوتی آلودگیوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، موسموں کا توازن متاثر ہوا ہے، طرح طرح کی بیماریاں جنم لے رہی ہیں، اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر اس پر قابو نہیں پایا گیا تو اس کے نتائج انسانیت کے لئے نہایت تکلیف دہ اور ہلاکت خیز ہوں گے، ان آلودگیوں کو جذب کرنے کے وسائل کی بھی سائنس نے رہنمائی کی ہے، لیکن کم سے کم اخراجات کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی غرض سے صنعت کار ان کا استعمال نہیں کررہے ہیں، جو غیر اسلامی اور غیر انسانی طرز عمل ہے، اس پس منظر میں حسب ذیل تجویزیں منظور کی جاتی ہیں:

۱- صنعت کاروں پر واجب ہے کہ اگر ایسی صنعتیں قائم کریں جو آلودگی پیدا کرتی ہوں، تو ایسے وسائل بھی استعمال کریں جو ان آلودگیوں کو تحلیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں، تاکہ ماحول کو اور ماحول کے واسطے سے دوسرے انسانوں کو اس کا نقصان نہیں پہنچے۔

۲- ملٹی نیشنل کمپنیوں کا ملک میں آنا بعض جہتوں سے یقیناً مفید ہے، کہ اس سے مارکیٹ میں مسابقت پیدا ہوتی ہے اور صارفین کو معیاری اشیاء فراہم ہوتی ہیں، لیکن یہ صنعتیں اپنے ساتھ صنعتی فضلوں کا انبار اور مختلف نوع کی آلودگیاں بھی ساتھ لارہی ہیں، اس لئے سمینار حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ ملکی کمپنیاں ہوں یا غیر ملکی ان کے لئے ایسے قوانین بنائے جائیں اور ان پر عمل کا پابند کیا جائے جو ماحول کے تحفظ میں معاون ہوں اور مضر اثرات سے بچاتے ہوں۔

۳- اس وقت ماحولیاتی آلودگی کے سبب جن خطرات سے دنیا دوچار ہے، یہ زیادہ تر ترقی یافتہ ممالک کی دین ہے، ان ممالک نے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے اور سستی سے سستی پیداوار حاصل کرنے کی غرض سے صنعتوں کو ماحول دوست بنانے پر توجہ نہیں دی، اور آلودگیوں کو تحلیل کرنے کے وسائل اختیار نہیں کئے، یہاں تک کہ اب جب کہ آلودگی کا مسئلہ ایک بھیانک صورت اختیار کرچکا ہے، وہ اس کے اثرات کو دور کرنے کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں قبول کرنے سے گریز کررہے ہیں۔ سمینار مطالبہ کرتا ہے کہ وہ انسانیت کے تئیں اپنے رویہ کو درست کریں اور حکومت ہند سے اپیل کرتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور ایک اہم عالمی طاقت ہونے کی حیثیت سے اس سلسلہ میں ترقی یافتہ ممالک کو ان کی ذمہ داریوں کا پابند کرنے کی کوشش کرے۔

۴- تمام ابناء وطن کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کا اہتمام کریں، ایسی چیزیں جو آبادی میں آلودگی پیدا کرنے والی ہیں اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے والی ہیں، جیسے راستوں اور آبادیوں کے درمیان قضاء حاجت، گھر سے باہر کھلی ہوئی نالیاں نکالنا، صاف جمع شدہ پانی میں گندگیوں کا اخراج، آبادی کے درمیان بھٹی اور چمنیاں قائم کرنا، گاڑیوں میں کراسن تیل کا استعمال، بے جا طریقہ پر لاؤڈ اسپیکر کا استعمال وغیرہ، ان سے احتراز کریں، تاکہ سماج خطرناک بیماریوں اور دوسرے نقصانات سے محفوظ رہے۔

✣ ✣ ✣

[1] سترہواں فقہی سمینار (برہان پور، ایم پی) بتاریخ ۲۸-۳۰/ربیع الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ۵-۷/اپریل ۲۰۰۸ء۔

تفریح وسیاحت - اس کے احکام و شرعی ضوابط[1]

۱- فلم سازی، کارٹون اور ڈرامہ:

۱- غیر ذی روح اشیاء مثلاً تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کی عکس بندی جائز ہے۔

۲- تفریحی مقاصد کے لئے ذی روح کی عکس بندی جائز نہیں ہے۔

۳- تعلیمی، اصلاحی اور دعوتی مقاصد کے لئے عکس بندی اور اس سے استفادہ کی گنجائش ہے خواہ اس میں ضمناً ذی روح کا عکس آ گیا ہو۔

۴- ایسی عکس بندی جن میں کسی عورت کی تصویر ہو یا انبیاء وصحابہ کی تمثیل ہو یا دیگر کوئی شرعی منکر ہو، بنانا اور ان کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

۵- ایسے کارٹون جن میں خدوخال واضح ہوں وہ تصویر میں شمار ہو کر ناجائز ہیں۔

۶- ایسے کارٹون بنانا جس سے کسی کی اہانت مقصود ہو جائز نہیں ہے اگرچہ اس میں خدوخال واضح نہ ہوں۔

۷- ایسے کارٹون جو عریانیت پر مشتمل ہوں یا برائی کی ترغیب دے رہے ہوں وہ بھی جائز نہیں ہیں۔

۸- تربیتی مقصد سے بچوں کے لئے ایسے کارٹون بنانا جن میں خدوخال واضح نہ ہوں اور بچوں کے لئے نفسیاتی، اخلاقی اور لسانی نقطۂ نظر سے مفید ہوں جائز ہے۔

۹- کارٹون سازی کی جو شکلیں جائز ہیں ان کو ذریعہ آمدنی بنانے اور اس مقصد کے لئے ملازمت کرنے کی گنجائش ہے۔

۱۰- اچھے کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کے لئے مکالمات اسٹیج کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ اس میں موسیقی یا کسی کی کردار کشی یا مرد وزن کا اختلاط یا انبیاء وملائکہ اور صحابہ کی تمثیل نہ ہو نیز غیر شرعی اور غیر اخلاقی امور سے پاک ہو۔

۲- مزاح:

الف- مزاح جائز ہے بشرطیکہ وہ جھوٹ، فحش نیز استہزاء وایذارسانی پر مشتمل نہ ہو۔

ب- ایسے مزاحیہ پروگرام یا مزاحیہ مشاعرے جن سے دینی یا دنیوی مصالح متاثر ہوں، جائز نہیں ہیں۔

ج- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو ذریعہ معاش بنالینا مناسب نہیں ہے۔

د- ایسے پروگرام جن کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا ہو شریعت کے مزاج کے خلاف ہیں؛ البتہ بہ غرض علاج اس کی گنجائش ہے۔

۳- سیاحت:

الف- اسراف سے بچتے ہوئے تفریحی مقصد کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا جائز ہے۔

ب- ایسے مقامات جہاں جان یا عزت وآبرو کا تحفظ خطرے میں ہو، وہاں نہ خود جانا درست ہے اور نہ اہل وعیال کو ساتھ لے جانا درست ہے۔

ج- تفریح کے لیے ایسی جگہوں میں جانا جہاں غیر شرعی امور کا غلبہ ہو جائز نہیں ہے، اور ایسے مقامات پر جانے والوں کو سواری کرائے پر دینے اشیاء خورد ونوش فروخت کرنے کے لئے دکان لگانے کی گنجائش ہے۔

---

[1] بیسواں فقہی سمینار (رامپور، یوپی) بتاریخ: ۲۹/ ربیع الاول - ۱/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۵-۷/ مارچ ۲۰۱۱ء۔

د- جائز مقاصد کے لیے ٹراویلس کمپنیوں کا قیام درست ہے۔

ھ- سیاحت کا تعلق مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کو مضبوط کرنے، اپنے گزرے ہوئے لوگوں کے کارناموں کو اجاگر کرنے اور مذہبی و قومی تاریخ سے روشناس کرانے سے ہے، اس لئے جو مسلمان اس پیشہ سے جڑے ہوئے ہیں، ان سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے اسلامی نقطۂ نظر سے ان مقاصد کو پورا کرنے والے پیکیج تیار کریں تا کہ مسلمان نوجوانوں کو بے راہ روی اور احساس کمتری سے بچایا جاسکے اور غیر مسلم بھائیوں کے سامنے بھی مسلمانوں کی صحیح تصویر آسکے۔

۴- کھیل کود:

الف- ایسے کھیل جو انسان کے وسیع تر مفاد میں ہوں، جن سے جسمانی قوت، چستی ونشاط کی بحالی میں مدد ملتی ہو جائز ہیں بشرطیکہ وہ منکرات سے خالی ہوں۔ دینی یا دنیوی حقوق وفرائض سے غفلت یا کسی بھی جاندار کی اذیت کا باعث نہ ہوں۔

ب- عام حالات میں شریعت نے مرد وعورت کی ستر پوشی کے لیے جو اصول مقرر کیے ہیں، کھلاڑیوں کے لیے بھی ان کی پابندی ضروری ہے۔

ج- جن کھیلوں کے بارے میں احادیث میں ترغیب آئی ہے وہ مستحب ہیں، ان کے علاوہ مروجہ کھیلوں میں جو مذکورہ بالا اصول کے مطابق ہوں وہ جائز ہیں۔

د- کھیل کی ہار جیت میں پیسے کی شرط اگر یک طرفہ ہو یا کسی تیسرے فریق کی جانب سے ہو تو جائز ہے، اور اگر شرط جانبین سے ہو تو ناجائز ہے۔

ھ- وقت انسانی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے، لہٰذا ازروئے شرع کوئی بھی ایسا کھیل کراہت سے خالی نہیں ہوگا جو اپنے طریقے اور لباس کے اعتبار سے تو محرمات پر مشتمل نہ ہو لیکن اس میں کھیلنے یا دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو۔

و- جو کھیل جائز ہیں انہیں دیکھنے اور ان کے لیے ٹکٹ خریدنے کی گنجائش ہے۔

ز- جو لوگ کھیل میں شریک نہیں ہیں لیکن کسی فریق یا فرد کے جیتنے پر آپس میں پیسوں کی بازی لگائیں تو یہ بھی قمار میں داخل ہے، و حرام ہے۔

ح- کھیل کی ایک وقتی تفریح کی حد تک تو گنجائش ہے، مگر اس کو زندگی کا مقصد بنالینا جائز نہیں ہے۔

ط- تعلیم وکسب معاش کے جائز سرگرمیوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو کھیل کے لئے وقف کر دینا مناسب نہیں ہے۔

☆☆☆

تجویز بہ سلسلہ تحفظ خواتین [۱]

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على خاتم النبيين

ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين، أما بعد۔

اس وقت پوری دنیا میں خواتین کے حقوق اور ان کے تحفظ کا مسئلہ زیر بحث ہے، خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں مغربی دنیا کا تصور یہ ہے کہ شوہر و بیوی ایک دوسرے کے پارٹنر ہیں، ان میں کسی کی حیثیت صدر خاندان اور قوام کی نہیں ہے؛ اس لئے اہل مغرب کا خیال یہ ہے کہ حق طلاق کے معاملہ میں مرد و عورت کو یکساں درجہ حاصل ہونا چاہئے اور کوئی بھی فریق عدالت کے رابطہ کے بغیر علاحدگی حاصل نہیں کرسکتا، اسی طرح تعدد ازدواج کی اجازت نہ عورت کے لئے ہونی چاہئے اور نہ مرد کے لئے، میراث میں دونوں کا حق برابر ہونا چاہئے، حق ولایت باپ اور ماں دونوں کو حاصل ہونا چاہئے، ۱۸/ سال سے پہلے نہ لڑکیوں کو نکاح کی اجازت ہونی چاہئے اور نہ لڑکوں کو، ولد الزنا کا نسب زانی سے ثابت ہونا چاہئے، لڑکا ہو یا لڑکی ۱۸/ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ اپنے جسم کے مکمل طور پر مالک ہیں، اور ان کے حق میں جنسی لذت اندوزی پر کوئی ممانعت نہیں ہونی چاہئے، املاک پر مشترکہ ملکیت ہونی چاہئے اور طلاق کے بعد املاک کی دونوں کے درمیان مساویانہ تقسیم ہونی چاہئے، مرد خود اپنی منکوحہ سے اگر اس کی رضامندی کے بغیر جنسی تمتع کرے، تو اس کو بھی جرم اور زنا شمار کیا جانا چاہئے، خواتین کو مانع حمل وسائل استعمال کرنے اور اپنا حمل ساقط کرانے کی اجازت ہونی چاہئے۔

یہ وہ تجاویز ہیں جو اقوام متحدہ کی خواتین کمیٹی کے ۵۷/ ویں اجلاس منعقدہ: ۱۴-۱۵/ مارچ ۲۰۱۳ء میں پیش کی جانے والی ہیں، جس کا عنوان ہے: ''عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے خلاف تشدد اختیار کئے جانے والے تمام تر طریقوں کی روک تھام اور ان کا خاتمہ'' ××× نیز مغربی قوتوں کی طرف سے کوشش کی جارہی ہے کہ اقوام متحدہ کے تمام ممبر ممالک اس پر دستخط کردیں، اور جو ممالک اس پر دستخط کریں گے، اگر اُن ممالک میں اس کے خلاف قانون باقی رکھا گیا تو اقوام متحدہ کو اس میں مداخلت کرنے اور ان حکومتوں کو بین الاقوامی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

اگرچہ ان قوانین کی زد تمام ہی آسمانی اور غیر آسمانی مذاہب پر پڑتی ہے؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ تمام مذہبی گروہوں نے اس بات کو عملاً قبول کرلیا ہے کہ مذہب سے ان کا تعلق محض رسمی ہوگا، زندگی کے دوسرے مسائل میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوگا، یہ صرف اُمت مسلمہ ہے، جو آج بھی مذہب کو اپنی پوری زندگی میں حکمراں تسلیم کرتی ہے؛ اس لئے ٹکراؤ براہ راست مسلمانوں سے ہوگا، عالم اسلام اور ملت اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ وہ حکمت اور بلند حوصلگی کے ساتھ اس صورتِ حال کا مقابلہ کریں اور ہرگز ایسی غیر اخلاقی مہم سے متأثر نہ ہوں۔

ایک اہم مسئلہ پوری دنیا میں خواتین کے ساتھ ظلم و زیادتی اور تشدد کا بڑھتا ہوا رجحان ہے، خود ہمارے ملک ہندوستان میں خواتین پر تشدد اور جنسی ہراسانی کے جو واقعات پیش آرہے ہیں، وہ انتہائی افسوس ناک بلکہ پوری قوم کے لئے باعث شرم ہیں، ہر طرف سے اس کی روک تھام کے لئے سخت قوانین بنائے جانے کا مطالبہ ہو رہا ہے، اور حکومت اس پر غور کر رہی ہے۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ خود فطرت نے مردوں اور عورتوں کے درمیان صلاحیتوں کا اور قویٰ کا فرق رکھا ہے؛ اس لئے خاندانی نظام کے استحکام اور سماج کو پاکیزہ رکھنے کے لئے مساوات کی نہیں، عدل کی ضرورت ہے، مردوں پر ان کی صلاحیتوں کے مطابق ذمہ داریاں عائد کی جائیں اور عورتوں پر

---

[۱] بائیسواں فقہی سمینار (امروہہ، یوپی) بتاریخ: ۲۵-۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء۔

ان کی صلاحیت کے لحاظ سے، پھر جس پر جو ذمہ داریاں ہوں اور ان کی جو صلاحیتیں ہوں، اسی لحاظ سے ان کے حقوق وفرائض مقرر ہوں؛ اسی لئے اسلام نے تمام مالی ذمہ داریاں، خاندان کی کفالت اور اس کی حفاظت مردوں کے ذمہ رکھی ہے، عورتوں کو اس سے فارغ رکھا گیا ہے؛ لیکن خاندانی نظام میں استحکام اور انتظام کو برقرار رکھنے کے لئے مرد کو صدر خاندان بنایا گیا ہے اور اس کی حیثیت ''قوام ونگران'' کی مقرر کی گئی ہے، عائلی زندگی سے متعلق تمام احکام کی بنیاد اسی اُصول پر ہے۔

اسی طرح اسلام کی نظر میں خواتین کے تحفظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور مردوں پر اس کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے؛ لیکن وہ اس بات پر بھی توجہ دیتا ہے کہ ان اسباب ومحرکات کو ختم یا کم سے کم کر دیا جائے جو انسان کو جرم پر اُکساتی ہیں، ایسا ماحول بنایا جائے جس میں لوگوں کے اندر جرم کی تحریک ہی پیدا نہ ہو، پھر اس کے ساتھ ساتھ جرائم پر سخت سزائیں مقرر کی جائیں؛ تاکہ مظلوم کے ساتھ بھی انصاف ہو اور مجرم کے ساتھ بھی ناانصافی نہ ہو، جرم کے محرکات کو روکے بغیر صرف سخت سزائیں مقرر کر دی جائیں، تو اس سے جرم کا سدباب نہیں ہوسکتا اور یہ بات تقاضاء انصاف کے بھی خلاف ہے۔

اس پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بائیسواں فقہی سیمینار منعقدہ: ۲۶-۲۸ / ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۹-۱۱ / مارچ ۲۰۱۳ء، جامعہ اسلامیہ عربیہ، جامع مسجد امروہہ میں اس موضوع سے متعلق درج ذیل تجاویز منظور کی جاتی ہیں:

(۱) انسانی آبادی — بہ شمول مغربی اور مغرب زدہ ممالک — کا غالب ترین حصہ کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ ہے اور سماجی وازدواجی زندگی میں عورتوں اور مردوں کے درمیان مکمل مساوات، نیز لڑکوں اور لڑکیوں کو بغیر کسی قانونی رشتہ کے فطری اور غیر فطری طریقہ پر جنسی لذت اندوزی کی اجازت دینا تمام مذاہب کی مسلمہ تعلیمات کے خلاف ہے؛ اس لئے جب یہ ممالک جمہوریت اور رائے عامہ کے احترام پر مبنی نظام حکومت کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کا فریضہ ہے کہ ایسے مذہب بیزار اور اخلاق باختہ قوانین سے خود بھی اپنا دامن بچائیں اور دوسروں پر بھی ان کو مسلط کرنے کی کوشش نہ کریں۔

(۲) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مساوات کا یہ تصور اپنی تفصیلات کے ساتھ قانونِ فطرت سے متصادم ہے اور جب بھی انسان قانون فطرت سے ٹکراتا ہے تو اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوتا ہے، جس کی ایک مثال ایڈز جیسی جان لیوا اور موذی بیماری ہے؛ اس لئے پوری دنیا کا فریضہ ہے کہ وہ قانونِ فطرت سے متصادم ہونے کا خیال ترک کر دے اور الہامی قوانین کی برتری کو تسلیم کرے؛ کیوں کہ یہ خود خالق فطرت کا نازل کیا ہوا قانون زندگی ہے، جس سے بڑھ کر کوئی اور ذات انسانیت کی مصلحت اور مضرت سے آگاہ وباخبر نہیں ہوسکتی۔

(۳) عالم اسلام سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ مغرب کی اس سازش کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس کا مقصد خواتین کے حقوق کا تحفظ نہیں ہے؛ بلکہ خاندان سے متعلق اسلام کے بنیادی تصور کو ڈھا دینا ہے؛ اس لئے وہ پوری قوت کے ساتھ اس خدا بیزار، انسانیت مخالف اور اخلاق دشمن مہم کی مخالفت کریں اور ہرگز ایسے کسی مسودہ پر دستخط نہ کریں۔

(۴) حکومت ہند سے اپیل کی جاتی ہے کہ اس ملک میں بسنے والی تمام ہی مذہبی اکائیوں کے نزدیک اس طرح کے قوانین ناقابل قبول ہیں، اور ملک کے دستور میں تمام شہریوں کو جو مذہبی آزادی عطا کی گئی ہے، سراسر اس کے مغائر ہے، اس لئے ہندوستان کو ان تجاویز پر ہرگز دستخط نہیں کرنا چاہئے۔

(۵) حکومت ہند سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ جنسی جرائم کے سدباب کے لئے صرف زنا پر سخت سزا کو کافی نہ سمجھے؛ بلکہ ان اسباب ومحرکات کو روکے، جو اس گناہ پر اُکساتے ہیں، جیسے: شراب کے کارخانے بند ہوں، مکمل طور پر نشہ پر پابندی عائد کی جائے، جو دستور ہند کے رہنما اُصول کا حصہ ہے، جداگانہ نظام تعلیم کی تشکیل کی جائے، اجنبی مرد وعورت کے اختلاط کو حتی المقدور روکا جائے، لڑکوں اور لڑکیوں کو ڈھیلے ڈھالے اور ساتر لباس پہننے کا پابند کیا جائے، فحش فلموں اور میڈیا کے ناشائستہ پروگراموں کو روکا جائے، خواتین کے لئے نائٹ ڈیوٹی کو ممنوع قرار دیا جائے،

نکاح کے لئے لڑکوں کے حق میں ۲۱ سال کی اور لڑکیوں کے حق میں ۱۸ سال کی شرط ختم کردی جائے اور اس طرح کی احتیاطی تدابیر کے ساتھ پھر زنا پر خواہ وہ باہمی رضامندی سے ہو یا جبر کے ساتھ سخت سزا مقرر کی جائے۔

(۶) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف قانون کے ذریعہ کسی برائی کو روکا نہیں جاسکتا، جب تک کہ دل و دماغ میں تبدیلی نہ لائی جائے، اس لئے اس وقت زنا، قتل، رہزنی اور کرپشن کے بڑھتے ہوئے واقعات اور ان واقعات میں تعلیم یافتہ لوگوں کے یکساں طور پر ملوث ہونے کے اعتبار سے یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ حکومت اخلاقی تعلیم کو تعلیمی اداروں کے نصاب میں لازمی جزو کی حیثیت سے شامل کرے، ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اخلاق پر مبنی تربیتی پروگرام نشر کئے جائیں اور تجارتی اشتہارات کو اخلاقی قدروں کا پابند بنایا جائے۔

(۷) مسلمان ایک داعی گروہ ہیں اور ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ صرف زبان ہی سے نہیں؛ بلکہ اپنے عمل کے ذریعہ بھی اسلام کی دعوت پیش کریں، خواتین سے متعلق حقوق ادا کرنے کا اہتمام کریں، ان پر مظالم کے ارتکاب سے بچیں، عورتوں کو شرعی اصولوں کے مطابق میراث میں ان کا حق دیا کریں، طلاق کے بے جا استعمال سے پرہیز کریں، نکاح کو عبادت کے بجائے تجارت نہ بنالیں اور ایک ایسے سماج کی تعمیر کریں، جو واقعی اُس حسن سلوک کا بہترین مظہر ہو، جس کا اسلام میں حکم دیا گیا ہے اور جس میں خواتین کی عزت و توقیر کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہو۔

☆☆☆

شہریت سے متعلق مسائل[1]

۱- اسلام ایک دین اور مسلمان ایک امت ہیں، اسلام مسلمانوں کو ایک وحدت سے جوڑتا ہے اور ان کو ایک جسم وجان کا درجہ دیتا ہے، اس لحاظ سے اسلام کا اصل مزاج یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہوں، کلمہ کی بنیاد پر ایک امت ہیں، اور ان کے درمیان کسی تفریق وامتیاز کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی جانبدارانہ سلوک کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۲- البتہ عہد جدید میں مغرب کے اثرات سے موجودہ نظام شہریت نے جو حد بندیاں قائم کی ہیں اور جغرافیائی بنیادوں پر انسانوں میں تقسیمات کی گئی ہیں نیز ہر ملک کے شہری کو ایک الگ قوم تصور کیا جاتا ہے، افسوس کہ اس کے اثرات امت مسلمہ پر بھی پڑے ہیں، مختلف ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کو قوم واحد کی بجائے مختلف قوموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان کی آزادانہ نقل وحرکت اور قیام وسکونت میں مشکلات پیدا ہوگئی ہیں، گو یہ نظام، اسلام کے آفاقی نظریۂ وحدت سے ہم آہنگ نہیں ہے، لیکن موجودہ بین الاقوامی احوال اور علاقائی مصالح واسباب کے تحت ملکوں میں شہریت کا جو نظام رائج ہے، موجودہ حالات میں اس کو قبول کرنے کی گنجائش ہے۔

۳- مسلم یا غیر مسلم ملک کا مسلمان کسی مسلم ملک میں شہریت کا خواہش مند ہو اور اس کے اپنے ملک میں دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کو سخت خطرہ درپیش ہو تو اس مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا لازم ہوگا۔

۴- کسی ملک کے مسلمان مجبور ہو کر دوسرے مسلم ملک میں پناہ گزین ہو جائیں تو ایسے ملک کا فریضہ ہے کہ وہ ان پناہ گزینوں کو تمام شہری حقوق عطا کرے۔

۵- کسی مسلمان کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی درج ذیل صورتیں ہیں:

(الف) ایسا غیر مسلم ملک جہاں دین وایمان جان ومال اور نسل کے تحفظ کو خطرہ ہو وہاں کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ اس قسم کے خطرات نہ ہوں تو جائز ہے۔

(ب) کسی ملک کی غیر اسلامی تہذیب وتمدن سے متاثر ہو کر وہاں کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

(ج) محض معیار زندگی بلند کرنے کے لیے مسلم ملک کے کسی شہر کا غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا ناپسندیدہ ہے۔

(د) معاشی مجبوریوں طبی ضرورتوں، اور تعلیمی مقاصد کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت کا حصول جائز ہے۔

(ہ) دعوتی اغراض کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا مستحب ہے۔

☆☆☆

---

[1] تیئیسواں فقہی سمینار (جمبوسر، گجرات) بتاریخ: ۲۸، ۲۹ ربیع الثانی وکیم جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ مطابق ۱-۳/ مارچ ۲۰۱۴ء۔

رحم کو کرایہ یا عاریت پر دینا[1]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے، اس پر قائم رہنے میں نہ صرف آخرت کی نجات ہے؛ بلکہ دنیا کی بھی فلاح ہے، شریعتِ اسلامی چونکہ اس ذات کی نازل کی ہوئی ہے، جس نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے اور اس کی فطرت بنائی ہے؛ اس لئے یہ شریعت پوری طرح فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے "فطرة الله التي فطر الناس عليها" شیطان چونکہ انسانوں کا دشمن ہے، اس لئے اس کی خاص مہم یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کو فطرت سے بغاوت پر اکسایا جائے اور اس کو اُن فطری قوانین سے برگشتہ کر دیا جائے، جن میں اس کی بھلائی مضمر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے عزائم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"ولأضلنهم ولأمنينهم ولآمرنهم فليبتكن آذان الأنعام ولآمرنهم فليغيرن خلق الله ومن يتخذ الشيطان ولياً من دون الله فقد خسر خسرانا مبينًا" (نساء: ۱۱۹)۔

افسوس کہ موجودہ مغربی تہذیب اس تصور پر مبنی ہے کہ انسانی زندگی میں مذہب و اخلاق کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے؛ اس لئے وہ فطرت سے بغاوت کی راہ پر چل رہی ہے، نکاح کے بجائے غیر قانونی رشتہ کی اجازت، ہم جنسی کی اجازت، بے پردگی و عریانیت کو بنیادی حق کی حیثیت دینا، نسلِ انسانی کی افزائش کو روکنا اور اس طرح کے کتنے ہی مسائل ہیں، جو پوری طرح اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت سے متصادم ہیں، اور ان کا ارتکاب نہ صرف اخلاقی نقطۂ نظر سے بلکہ طبی پہلو سے بھی سخت ضرر رساں ہے، اور لاعلاج بیماریوں کو پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام جانداروں میں افزائشِ نسل کے لیے جنسی جذبات رکھے ہیں، اور ان میں انسان بھی شامل ہے، لیکن اس باب میں انسان کو ایک خصوصی شرف عطا کیا گیا ہے کہ وہ عفت وعصمت کا جوہر رکھتا ہے، صنفی اعتبار سے شوہر اور بیوی کی وفاداری ایک دوسرے تک محدود ہوتی ہے، شوہر و بیوی کے ذریعہ توالد وتناسل کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، یہ انسانی فطرت ہے، اور پہلے انسان ابو البشر حضرتِ آدمؑ کے وقت سے یہ سلسلہ جاری وساری ہے:

"يا أيها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرا ونساء" (النساء: ۱)۔

اسی سے خاندان وجود میں آتے ہیں، والدین اور اولاد کی شناخت قائم ہوتی ہے، اور ایک دوسرے سے متعلق حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین ہوتا ہے، دوسرے جانداروں کا کوئی خاندان نہیں ہوتا، نہ ان کی کوئی نسلی شناخت ہوتی ہے، اور نہ ہی ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریوں کا اس طرح کا نظام ہوتا ہے جو نظام انسانی سماج میں پایا جاتا ہے، یہ پہچان سماجی اعتبار سے انسان کا بہت بڑا شرف ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے احسانات میں شمار کیا ہے:

"يا أيها الناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا" (الحجرات: ۱۳)۔

ایک اور موقع پر فرمایا گیا ہے: "وهو الذي خلق من الماء بشرا فجعله نسبا وصهرا" (الفرقان: ۵۴)۔

عصرِ حاضر میں خدا نا آشنا اور اخلاق بیزار تمدن اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ انسان صنفی مسائل میں پوری طرح قانونِ فطرت سے آزاد ہو جائے اور اپنی شناخت کو کھو دینے میں اسے کوئی تامل نہ ہو، ایسی ہی صورتوں میں ایک وہ ہے جس کو رحم کو کرایہ پر یا عاریت پر دینے سے تعبیر کیا جاتا ہے، آج کل اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں:

الف: مادۂ منویہ شوہر کا ہو، بیضہ اجنبی عورت کا ہو، اور اس کی پرورش خود اس شخص کی بیوی کے رحم میں ہو۔

---

[1] تئیسواں فقہی سمینار (جمبوسر، گجرات) بتاریخ: ۲۸، ۲۹ ربیع الثانی و یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ مطابق ۱-۳/ مارچ ۲۰۱۴ء۔

ب: مادہ شوہر کا ہو، بیضہ خود اس کی بیوی کا ہو، لیکن جنین کی پرورش اجنبی عورت کے رحم میں ہو۔

ج: مادہ اجنبی مرد کا ہو، بیضہ اس عورت کا ہو جو اپنے شوہر کی اجازت سے اولاد کی خواہاں ہو، اور کسی اور عورت کے رحم میں اس کی پرورش ہو۔

د: مادہ اجنبی مرد کا ہو، جو عورت اولاد کی خواہاں ہے، اسی کا بیضہ ہو، اور خود اسی کے رحم میں جنین کی پرورش ہو۔

ان چاروں صورتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ یا تو جو عورت ماں بننا چاہتی ہے، اس کی اولاد کے لئے اجنبی مرد کا مادہ استعمال کیا جائے یا اجنبی عورت کا بیضہ، یا اجنبی عورت کا رحم، ان تمام ہی صورتوں میں متعدد اخلاقی اور نفسیاتی مفاسد شامل ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

☆ ایک عورت اپنے رحم میں ایک اجنبی مرد کے نطفہ کی پرورش کرتی ہے، اس طرح وہ انجام اور مآل کے اعتبار سے اسی فعل کی مرتکب ہوتی ہے جس کا ارتکاب کوئی زانیہ عورت کرتی ہے۔

☆ یہ بات انسانی شرافت کے مغائر ہے کہ اس کے اعضاء اور خاص کر صنفی اعضاء کا استعمال متاع تجارت کی طرح ہونے لگے۔

☆ اس سے مادریت کا تقدس مجروح ہوتا ہے، اور اس طرح بے حد مقدس و محترم اور پاکیزہ رشتہ ایک تجارتی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

☆ اس سے نفسیاتی اثرات پڑ سکتے ہیں، جس عورت نے نو دس ماہ حمل کی تکلیف اٹھائی ہو، بچہ پیدا ہوتے ہی اسی بچے سے اس کی گود محروم ہو جائے، یہ بات اس کو سخت صدمے سے دوچار کر سکتی ہے، یہاں تک کہ اس کے دماغ پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔

☆ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ماں چونکہ اپنے پیٹ میں بچہ کی پرورش کے وقت اور پھر ولادت کے مرحلہ میں غیر معمولی تکلیف سے گزرتی ہے، چنانچہ خود قرآن کریم نے "حملته أمه كرها ووضعته كرها" (الأحقاف: ۱۵) کے الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچا ہے، جو عورت ان مشقتوں سے گزری نہیں ہو، کیا اس کے دل میں وہی دردمندانہ جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، جو ان مرحلوں سے گزرنے والی ماں کے اندر ہوتے ہیں؟

☆ جس شوہر نے اپنی بیوی کے لئے کسی اجنبی مرد کے نطفہ کو قبول کیا ہو، کیا اس کے بارے میں توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے نتیجے میں اگر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ اسکے ساتھ ایک باپ جیسا رویہ اختیار کرے گا، اور عصمت و آبرو کے پہلو سے وہ اس فطری حجاب کو برقرار رکھے گا جو ایک باپ اور بیٹی کے درمیان ہوتا ہے

☆ اس کی وجہ سے بیضہ دینے والی، حمل کی تکلیف اٹھانے والی خواتین کے درمیان مولود کے حق پرورش کے بارے میں نزاع پیدا ہو سکتا ہے، بلکہ اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

☆ سب سے اہم بات یہ ہے کہ نسلی شناخت اور تشخص انسان کے لئے سرمایۂ افتخار ہے، اور ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی یہ شناخت کھونے نہ پائے، شناخت کا کھو جانا اس کے لئے انتہائی ذلت کی بات ہوتی ہے، اور وہ ہر طریقے پر اس کا تحفظ چاہتا ہے، اسی لئے شریعت نے زنا کو اتنی شدت کے ساتھ منع کیا اور اس کے لئے سخت ترین حد مقرر کی ہے، خود جس شخص کو باپ یا ماں کے بارے میں شک ہو کہ معلوم نہیں کہ میری ماں یہ ہے یا وہ ہے؟ تو یہ بات بھی اس کے لئے بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے، نسب کی شناخت جیسے باپ سے متعلق ہوتی ہے، ویسے ہی ماں کے ساتھ بھی اس کا تعلق ہوتا ہے، بلکہ بعض خاندان تو اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں ماں کی طرف سے ہی چلتے ہیں۔

ان مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اجلاس متفقہ طور پر فیصلہ کرتا ہے کہ:

۱- بطور اجارہ یا عاریت کسی عورت کا اپنے رحم میں اجنبی مرد کے نطفہ یا دوسرے کے بیضہ کی پرورش کرنا قطعاً حرام ہے، یہ انسان کو اس کی شناخت سے محروم رکھنے کی ایک سازش ہے، اور اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے بنائے ہوئے فطری نظام سے بغاوت ہے۔

۲- کسی مرد کے لئے یہ بات قطعاً جائز نہیں کہ وہ اپنا مادہ کسی اجنبی عورت کے رحم میں بارآور کرنے کے لئے یا اس کے بیضہ سے اختلاط کے لئے دے۔

۳- ڈاکٹروں کے لئے بھی یہ بات جائز نہیں کہ وہ ایسے غیر اخلاقی عمل میں تعاون کریں۔

۴- حکومتِ ہند کو ایسا قانون بنانا چاہئے جو انسانی اہانت، شرافتِ انسانی کی پامالی اور نسب کے اختلاط پر مبنی اس عمل کو سختی سے روکے۔

۵- برادرانِ وطن سے بھی اپیل کی جاتی ہے کہ وہ حکومت سے اس اہانت آمیز عمل کو روکنے کے سلسلہ میں مطالبہ کریں؛ کیونکہ اس طرح کے غیر اخلاقی حیاء سوز قانون فطرت کے مغائر فعل کی کسی بھی مذہب میں اجازت نہیں۔

۴- اس قانون کے علاوہ بھی علماءِ ہند کا یہ نمائندہ اجتماع حکومت سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ایسے کسی بھی عمل کی اجازت دینے سے باز رہے جو مذاہب کے مسلمہ اخلاقی اقدار اور ہندوستان کی ثقافتی روایات کے مغایر ہو۔

اعلامیہ

تعلیم اور تعلیمی اداروں کی فرقہ واریت سے حفاظت [1]

ہندوستان ایک جمہوری ملک اور مختلف مذاہب اور ثقافتوں کا گلدستہ ہے، یہی رنگارنگی اس ملک کی اصل خوبصورتی ہے، اور اسی نسبت سے پوری دنیا میں اس کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ملک کا دستور بنانے والے نے بھی اس حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے، مگر افسوس کے فرقہ پرست طاقتیں اس ملک کی شبیہ کو بگاڑ دینا چاہتی ہیں، اور وہ اقلیتوں کے مذہبی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے کوشاں ہیں، اسی سلسلہ کی ایک سازش تعلیمی اداروں کو زعفرانی رنگ میں رنگ دینے کی ناز یبا کوشش ہے، حکومت کی ہدایت پر بعض ریاستوں میں سوریہ نمسکار کو لازم قرار دیا گیا ہے یا اس کی ترغیب دی جارہی ہے، بچوں سے مورتی پوجا کرائی جاتی ہے، نیز گیتا اور اکثریت کے مذہبی تصورات کو نصاب کا جزء بنانے کی کوشش ہورہی ہے، اس پس منظر میں ملک بھر کے علماء اور فقہاء اور اہل دانش کا یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایسی نامناسب کوششوں سے باز آجائے، اقلیتوں کی مذہبی آزادی، ملک کے دستور اور اس کی تکثیری روایت کو پیش نظر رکھیں، اور تمام مذاہب کے یکساں احترام کو زندگی کے تمام شعبوں اور خاص کر تعلیم میں ملحوظ رکھیں، نیز یہ اجتماع علماء اور ملت کے خواص سے اپیل کرتا ہے کہ وہ عصری تعلیم کے ایسے اسکول قائم کریں جو معیاری عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ بنیادی دینی تعلیم اور اسلامی تربیت سے طلبہ وطالبات کو آراستہ کریں، اور ان کا بنیادی مقصد تجارت نہ ہو بلکہ ملت کے نونہالوں کو بہتر تعلیم وتربیت اور اخلاق سے آراستہ کرنا ہو۔

☆☆☆

[1] (اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی جانب سے ۲۴ ویں فقہی سمینار دار العلوم اسلامیہ، اوچیرہ، کیرالا میں ۹-۱۱/ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ مطابق ۱-۳/ مارچ ۲۰۱۵ء کو منعقد ہوا جس میں ملک بھر سے آئے ہوئے علماء، فقہاء اور اہل افتاء نے بڑی فکرمندی اور دردمندی کے ساتھ درج ذیل اعلامیہ برائے اتحاد امت جاری کیا)۔

بین مذہبی مذاکرات - اصول وآداب [1]

آج مورخہ ۷/ ۲/ ۲۰۱۶ء کو تجویز کمیٹی کی میٹنگ میں بین مذہبی مذاکرات اصول وآداب کے موضوع پر غور وخوض کے بعد مندرجہ ذیل تجاویز بہ اتفاق مرتب ہوئیں:

۱- مذہبی، سماجی اور سیاسی بنیادوں پر بین مذہبی مذاکرات کئے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ ان مذاکرات سے مسلمانوں کے مذہبی تصورات وعقائد متاثر نہ ہوں، اور ان کو رواداری، پُرامن بقاء باہم، دعوت دین، غلط فہمیوں کے ازالہ اور سماجی وسیاسی مشکلات کے حل کے لئے استعمال کیا جائے۔

۲- مختلف مذاہب کے درمیان بعض قدریں مشترک ہیں، اس لئے مفید مقاصد کے لئے دیگر مذاہب کی کتابوں سے استفادہ اور حوالہ کی گنجائش ہے۔

۳- دیگر اہل مذاہب کے مذہبی رسوم واعمال میں شرکت جائز نہیں ہے۔

۴- ہم آہنگی برقرار رکھنے اور فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے عام حالات میں ایسے مباح اعمال سے دست بردار ہونا درست نہیں جو مسلمانوں کی متوارث تہذیب کا حصہ ہیں۔

۵- عقیدۂ توحید ورسالت اقوام عالم کے سامنے پیش کرنا اور جملہ کفر وشرک کے رسوم واعمال سے براءت کا اظہار کرنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے، البتہ اس بات کی پوری کوشش کی جائے کہ اظہار براءت کے ایسے طریقے اور اسالیب اختیار نہ کیے جائیں جن سے دیگر اہل مذاہب کی دل آزاری ہو۔

۶- صحت مند انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لئے مشترکہ سماجی مسائل جیسے غربت، کرپشن (بدعنوانی)، بے حیائی، عورتوں، مزدوروں اور سن رسیدہ افراد کے ساتھ زیادتی وغیرہ پر مختلف اہل مذاہب کے ساتھ مذاکرات وقت کی اہم ضرورت ہیں اور مسلمانوں کو اس میں حصہ لینا چاہئے۔

۷- مسلمانوں کے دینی، قومی اور اجتماعی مفادات کے تحفظ کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں، مذہبی تنظیموں اور شخصیات کے ساتھ بہ وقت ضرورت شرعی اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے مذاکرات کرنا نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن ہے۔

۸- بین مذہبی مذاکرات کو ثمر آور بنانے کے سلسلہ میں درج ذیل اقدامات مفید ثابت ہوسکتے ہیں:

الف- مذاکرات کی صلاحیت کے حامل مسلم اسکالرس کا ایک وفاق بنایا جائے۔

ب- ہر صوبہ کے ممتاز دینی مدارس اور جامعات میں تقابلی مطالعۂ ادیان ومذاہب پر خصوصی توجہ دی جائے، اور اس کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا جائے۔

ج- ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں قائم مذاہب وادیان کے شعبوں سے مسلسل رابطہ رکھا جائے اور ان سے استفادہ کی بھرپور کوشش کی جائے۔

د- مختلف ادیان ومذاہب کے رہنماؤں کا ایک متحدہ پلیٹ فارم تشکیل دیا جائے، جس کے اجتماعات وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف اہم علاقوں میں منعقد کیے جائیں۔

---

[1] ۲۵واں فقہی سمینار (بدرپور، آسام) بتاریخ ۲۵ تا ۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ، مطابق ۵ تا ۷/ فروری ۲۰۱۶ء۔

ھ- ملک کی مختلف مذہبی تنظیموں اور اداروں سے براہ راست مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے کے عملی اقدامات کیے جائیں۔

و- مسلمانوں میں خدمت خلق کے رجحانات کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے، اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے رفاہی تنظیمیں (N.G.O) قائم کی جائیں اور اس غرض کے لیے قائم اداروں کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

دیگر فقہ اکیڈمیوں کے فیصلے

۱- مکہ فقہ اکیڈمی کے فیصلے (اردو ترجمہ، مطبوعہ ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی)

۲- جدہ فقہ اکیڈمی کے فیصلے (اردو ترجمہ، مطبوعہ ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی)

۳- یورپین افتاء کمیٹی کے فیصلے (اردو ترجمہ، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی)

☆☆